زندگی اک روشنی
رخسانہ نگار عدنان

زندگی اک روشنی

رخسانہ نگار عدنان

خواتین ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی

باراول 2007ء

ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ

پریس .... پرنٹ لائن

سول ایجنٹ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی

انتساب

مٹی کی ان دو ڈھیریوں کے نام

جن کے تلے

میری پیاری امی جی

اور

ابا جی ابدی نیند سو رہے ہیں

میرا دوسرا ناول "زندگی ایک روشنی" کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ چار سال تین ماہ کی شب و روز کی ذہنی و جسمانی مشقت کا نتیجہ اور چار سال تین ماہ کی محبت کا ثمر۔ اپنی تخلیق سے محبت کا ثمر جیسے ایک ماں اپنے بچے کی پیدائش سے پہلے اس کی محبت میں جکڑی جاتی ہے کچھ ایسی ہی محبت مجھے بھی اس کہانی کے پلاٹ سے اس کے کرداروں سے اور ان کے انجام سے ہو گئی تھی۔

اس ناول کی کہانی نہ تو بہت خاص اور نہ بہت ہٹ کر ہے اور نہ اس کے کردار غیر معمولی ہیں۔ آپ کو اپنے اردگرد اس کہانی کا کوئی نہ کوئی کردار جیتا جاگتا، چلتا پھرتا زندگی کے اندھیروں میں روشنی کی کرن تلاشتا دکھائی دے جائے گا۔ میرے خیال میں جب بھی کوئی کہانی کار قلم ہاتھ میں لے کر پہلی کہانی لکھنے کی کوشش کرتا ہے اس کی پہلی کہانی میں اس کی پچھلی زندگی اس کے ماضی اس کے بچپن کی کوئی نہ کوئی جھلک شعوری یا لاشعوری طور پر شامل ہو جاتی ہے۔

صوفی صاحب کا کردار اس کہانی کا بنیادی کردار اور وہ کردار جس نے مجھ سے یہ پوری کہانی لکھوائی، جس جیتے جاگتے کردار کو بنیاد بنا کر میں نے یہ کہانی لکھی۔ وہ آج اس دنیا میں نہیں۔ اونچا لمبا صحت مند سرخ و سفید رنگت سرمئی آنکھوں کے ساتھ باریش چہرہ بارعب آواز میں تپتی دوپہروں میں مدرسے کے بچوں کو کلام پاک پڑھاتا ہوا میرے بچپن کی یادوں کا سب سے طاقتور حصہ ہے جسے میں نے اس ناول میں پینٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول کے کچھ کرداروں کو روشنی مل گئی اور کچھ اندھیروں میں بھٹکتے رہے جیسے مین تارا اور سلطان بخت۔ سید سلطان بخت کے انجام کو خاصی تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ اسے کسی Crucial end سے دوچار کرنا چاہیے تھا۔ اس کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے اور پڑھنے والے بھی میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ ہمارے پیارے ملک کے کسی بھی جاگیردار کسی بھی فیوڈل لارڈ نے بھی Crucial end کا سامنا نہیں کیا اگرچہ اس کے خلاف چارج شیٹ بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ اخبار میں بھی آ چکی ہو۔ یہ ہمارے فیوڈل سسٹم کی خوش قسمتی ہے یا ہماری بدقسمتی...... کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔

آمنہ معاذ زینب اور خاص طور پر عبدالمتین اور زینب کوئی ماڈل رول نہیں نہ عام زندگی سے کچھ ہٹ کر یا فوق الفطرت انسان تھے۔ نا آسودہ خواہشوں کی تعداد جب ان کی عمر کے سالوں سے تجاوز کر گئی تو پھر ان سے اسی ردعمل کی توقع کی جا سکتی تھی جو انہوں نے کیا۔ جبر سے چیزیں بنتی نہیں بگڑتی ہیں اور یہ جبر اگر انسانوں پر خصوصاً بچوں پر ہو تو پھر ان کی شخصیت میں ان دیکھی دراڑیں رہ جاتی ہیں کبھی نہ بھرنے والے خلا۔ یہ اس کہانی کا مین تھیم تھا پھر شہباز اور نزہت کی کہانی، جس میں شہباز بیک وقت ہیرو بھی ہے اور ولن بھی۔ ہمارے معاشرے کی ایک ٹیپیکل Possessive male figure اور اس سب میں کچھ بھی Plot filling نہیں تھا ایک ہی کہانی کے تانے بانے ہیں۔

ایک قبیلہ چھوڑ دیا اور اک دنیا آباد رکھی
میں نے شعر لکھا اور شجرے کی بنیاد رکھی
تو نے کہا تھا عشق میں تنہا کیسے جی سکتا ہے کوئی
تجھ کو بھول گئے اور تیری بات ہمیشہ یاد رکھی

سلیم کوثر نے یہ اشعار لکھ کر میرے حالات و خیالات کی ترجمانی کر دی۔ اپنے اردگرد گھر میں بہن بھائی اور گھر سے باہر پڑھنے والے بہت تھے (جنہیں دیکھ کر ہی کتاب سے دوستی کی لت پڑی) لکھنے والا......؟ نہیں...... کوئی بھی نہیں تھا۔ حرف سے لفظ تک اور لفظ سے جملے جملے سے پوری کہانی تک کا سفر مشکل ہی نہیں ناممکن سا بھی تھا۔ بہت سالوں تک کتابیں پڑھتے، ان کے بارے میں سوچتے، اپنے خیالوں سے الجھتے، نت نئی کہانیاں سنتے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ میں لکھ بھی سکتی ہوں۔ قلم لے کر کاغذ سیاہ کرنا مشکل نہیں مگر ایک کہانی لکھ کر اس کے کرداروں کی زندگیوں کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور یہ واقعی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے اس ناول کو پڑھ کر فیصلہ کریں کہ میں نے یہ ذمہ داری کہاں تک نبھائی اور کہاں کہاں ڈنڈی ماری۔

آپ کی محبتوں کی قرض دار اور دعاؤں کی طالب

رخسانہ نگار

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی جو جسم کو چھوتی تو پورے وجود کو تر سے بھی ہلکا کر دیتی۔ آسمان پر بادل نہیں تھے مگر ان کے ہونے کا احساس موجود تھا کہ ہر طرف مٹیالی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وقت کون سا تھا اس کا اندازہ اسے نہ ہو سکا۔ صبح کا یا شام کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ سب کسی سرسبز باغ میں دری بچھائے بیٹھے تھے شاید پکنک منانے آئے تھے۔ سب کے موڈ موسم کی طرح بہت خوشگوار تھے۔ بابا صاحب، اماں جی، عبدالمبین، عبدالمتین، زینب، جویریہ اور وہ خود سب نامعلوم کن باتوں میں مگن تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جویریہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ کبھی اچھل اچھل کر سب کے گرد گھومنے لگتی۔ کبھی دوڑ کر پھول توڑنے لگتی وہ، جو پھول توڑ کر لاتی بابا صاحب کی جھولی میں ڈال دیتی۔ تھوڑی دیر بعد بابا صاحب نے وہ سارے پھول اس کی جھولی میں ڈال دیے۔ وہ بابا صاحب کے ساتھ ہی تو بیٹھی تھی، اچانک اس کی نظر مشرق سے اٹھتے آندھی کے بگولے کی طرف گئی۔ وہ بگولہ اس تیزی سے آسمان پر پھیلا کہ ہوا اور روشنی اس کے دامن میں گم ہونے لگی۔ اس نے بابا صاحب کا بازو ہلا کر انہیں اس طرف متوجہ کیا۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہی بابا صاحب کا چہرہ تشویش، فکر اور خوف کے بادلوں سے اٹ گیا۔ ان کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ بس آسمان ہی کو تکے جا رہے تھے اس نے گھبرا کر ان کا کندھا ہلایا مگر انہوں نے پلک نہ جھپکی اس نے باقیوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب ابھی بے فکری اور خوش باشی سے باتوں میں مگن تھے۔ اچانک بجلی کا زوردار کڑکا کوندا اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔

اس کا چہرہ جیسے پسینے میں نہا گیا اس نے زور سے چیخنا چاہا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

جیسے ہی اندھیرا چھٹتا ہے وہاں سے وہ باغ غائب ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے چھ رنگین نقشین دروازے تھے۔ ان دروازوں پر سونے چاندی کے تاروں کا کام تھا۔ سب سے پہلے عبدالمبین پہلا دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا ہے دروازہ بند ہو جاتا ہے پھر عبدالمتین پھر زینب پھر اماں جی پھر بابا صاحب پھر جویریہ اور سب کے پیچھے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ وہ حیران و ششدر وہاں اکیلی کھڑی رہ جاتی ہے اور کوشش کے باوجود ان کے پیچھے نہیں جا پاتی اس کے پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہیں پھر آہستہ آہستہ چار دروازے ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں صرف دو رہ جاتے ہیں وہ بھی۔ اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔

اس کی آنکھ کھلی اس کا پورا وجود خوف سے لرز رہا تھا۔ سارا بدن پسینے میں نہا گیا تھا اور چہرہ پانی کے قطروں سے یوں تر تھا جیسے کسی کو پانے کا بخار چڑھ جاتا ہے۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے

چاروں جانب دیکھا کہ میں کہاں ہوں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو' ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" جیسے ہی کیک کٹا خوب صورت و براق لباس پہنے بچے زور زور سے تالیاں پیٹتے ہوئے گانے لگے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو مائی سویٹ ہارٹ۔" کہتے ہوئے رعنا فخر حیات نے جھک کر قیمتی آف وہائٹ شیروانی میں ملبوس سفیان کا خوشی سے دمکتا چہرہ چوم لیا۔

"تھینک یو مام!" اس نے بھی جواباً ان کے دونوں گال چٹ چٹ چوم ڈالے۔

"ہیپی برتھ ڈے مائی سن!" فخر حیات نے بھی آگے بڑھ کر سفی کا ماتھا چوما۔

"تھینک یو پپا!" اس نے مسکرا کر بوسہ انہیں لوٹایا۔

"چلو بھئی رعنا بچوں کو کیک کاٹ کر دو۔" وہ سفیان کی شیروانی کا بٹن بند کرتی رعنا سے بولے۔

"تو پپا! پہلے میرا گفٹ۔" وہ ان کا بازو تھام کر لاڈ سے بولا۔

"گفٹ کون سا؟" وہ انجان بن کر بولے۔

"میری برتھ ڈے کا پپا۔" وہ منہ بسور کر بولا۔

"وہ دے تو دیا ہے۔" ان کی آنکھیں بھی ہونٹوں کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔

"کون سا؟" وہ حیرت سے بولا۔ "مام کون سا گفٹ دیا ہے پپا نے؟" رعنا بھی دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے بھی کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"بھئی' یہ سارا ارینجمنٹ اور سب سے بڑھ کر یہ۔" انہوں نے زور سے اس کے دائیں گال کو چوم ڈالا تو شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"پپا!" وہ سرخ چہرہ لیے ان سے لپٹ گیا۔

"اچھا بھئی تمہارا گفٹ باہر موجود ہے۔ جا کر دیکھ لو۔" وہ اس کے بال سہلا کر بولے۔

"کیا ہے پپا؟" وہ جلدی سے ان سے الگ ہو کر بولا۔

"تمہاری اسپورٹس سائیکل جو اس روز تم نے پسند کی تھی۔"

"یاہو!" وہ باہر کی طرف لپکا۔

"لیکن پپا! آپ نے تو کمپیوٹر کا وعدہ کیا تھا۔" وہ جاتے جاتے ٹھٹھک کر بولا۔

"نیکسٹ ٹائم مائی چائلڈ!" انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔

"اوں پپا!" وہ لاڈ سے ٹھنک کر بولا۔

"بری بات سفی!" رعنا نے اسے یونہی گھرکا۔

"او فہد! ریحان! سب سائیکل دیکھ کر آئیں۔" اس نے دوستوں سے کہا اور سب اس کے پیچھے باہر نکل گئے۔

"اس دفعہ آپ نے کمال کیا بچوں کے اور وہ بھی صرف سفیان کے فرینڈز کے سوا اور کسی کو انوائیٹ نہیں کیا۔ کیا سوچیں گے بھیا اور بھابی۔ نا آپ کا کوئی دوست آیا نا میری کوئی فرینڈ' سب گلہ کریں گے۔ اس بار تو سفی کی سالگرہ رو کھی پھیکی سی رہی ہے۔" رات کو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ صاف کرتی رعنا نے کہا۔ وہ تینوں ابھی پی سی سے ڈنر کر کے لوٹے تھے۔

"اس کی وجوہات تھیں اور تمہیں معلوم بھی ہیں۔"

فخر حیات نے ڈریسنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے ہوئے تکیہ سیدھا کیا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے صبح پانچ بجے آپ کی جاپان کی فلائٹ ہے۔ فخری! یہ کاروباری مصروفیات تو چلتی رہتی ہیں لیکن ایسا موقع تو سال بعد آتا ہے اور پھر ہماری کون سی دس پانچ اولادیں ہیں' ایک ہی تو بیٹا ہے اور وہ بھی۔" رعنا کی آواز بھرا گئی۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی ہاتھ میں پکڑی نائٹ کریم کی شیشی اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

"اوہو بھئی' حد کرتی ہو رعنا اس میں اس درجہ رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے یہ تو نہیں ہوا کہ ہم نے برتھ ڈے مس کر دی۔ سیلیبریٹ تو کی ہے ناں چاہے گھریلو ہی سہی پھر بھی سفی کے دوست آئے۔ جس کا یہ فنکشن تھا۔ ڈنر بھی ہم تینوں نے اکٹھے خوشگوار ماحول میں کیا اور یہی میری خواہش بھی تھی کہ میں جانے سے پہلے تم دونوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔ دو ہفتے مجھے بہت لمبے لگ رہے ہیں۔ تم دونوں کے بغیر وہاں تم خود سوچو۔" وہ اٹھ کر چلتے ہوئے رعنا کے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور نرمی سے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ رعنا ہتھیلیوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی رہی فخر نے اسے اپنی طرف گھما کر ہاتھ ہٹائے رعنا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"رعنا ڈارلنگ ڈونٹ ڈو دس پلیز۔" وہ گھٹنوں کے بل ذرا سا جھکے اور اس کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹنے لگے۔ رعنا نے بھیگی پلکیں اٹھا کر انہیں انتہائی کرب سے دیکھا۔ ان کا دل پانی بن کر پگھلنے لگا ان حسین کٹوروں میں تو فخر حیات کا دل بند تھا۔ ان مدھ بھرے پیالوں پر تو وہ پہلی نظر میں دیوانہ وار نثار ہوا تھے اور شادی کی رات انہوں نے رعنا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی ان سرمئی جھیلوں کو نمکین پانیوں سے آلودہ نہیں کریں گی لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

"آپ کو معلوم ہے پھر بھی۔" آنسو فخر حیات کی ہتھیلیوں کو بھگو گئے وہ تڑپ اٹھے۔ رعنا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور انہیں سہارا دیتے ہوئے بیڈ تک لے آئے۔

"مجھے معلوم ہے سب میری جان۔" وہ رعنا کی ٹھوڑی کو انگلی سے اٹھاتے ہوئے مدھم لہجے میں بولے۔ "اس لیے تو میں آج نہیں کیا صرف تمہاری خوشی کی خاطر معلوم ہے نا تمہیں۔" انہوں نے سر ہلا دیا۔

"پھر بھی ایسے کر کے میرا استقبال کر رہی ہو۔" شکوہ ان کے لبوں سے پھسلا۔

"سوری۔" رعنا نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"ٹھیک ہے ورنہ بنو۔" انہوں نے رعنا کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹا کر نرمی سے کہا۔ اور اپنا چہرہ ان کی جانب جھکا دیا۔

"اونہوں نہیں بھئی۔" ان کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا وہ انہیں ہاتھوں سے پرے دھکیل کر بولی۔

"یہ ہوئی ناں بات شاباش۔" وہ ہنس کر بولے "ایسے ہی خوش رہنا ہے میرے پیچھے بھی۔ اپنا بھی خیال رکھنا ہے اور سفی کا بھی۔"

"اور آپ کو بھی اپنا بہت خیال رکھنا ہے۔ کھانا باقاعدگی سے کھانا ہے۔ یہ نہیں کہ کام میں لگے اور لنچ گول کر گئے۔ یہاں کی طرح میں وہاں بھاگم بھاگ لنچ لے کر آفس نہیں پہنچوں گی اور روز فون کرنا ہے صبح کو اور شام کو۔" رعنا نے ان کے ہاتھ محبت سے تھام لیے پھر ہدایات دیں۔

"بابا کہا جو ہے کہ روزانہ دو بار نہیں چار بار فون کروں گا کھانا باقاعدگی سے لوں گا اور تم مجھے یہ ہدایات یوں دے رہی ہو جیسے میں پہلی بار جا رہا ہوں۔ کہا بھی تھا کہ میرے ساتھ چلو صرف دو ہفتوں کی تو بات ہے تفریح بھی ہو جائے گی' اتنے عرصے سے ہم باہر گھومنے پھرنے نہیں گئے تم تو بس گھر کی ہو کر رہ گئی ہو۔" وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے ذرا خفگی سے بولے۔

"سفی کے ایگزام ہونے والے ہیں اور وہ اسٹڈیز میں انتہائی کیئر لیس ہے' میں سر پر نہیں ہوں گی تو بالکل ہی بگڑ جائے گا۔ دوسری ہماری این جی او کی سالانہ تقریبات اسی ہفتے سے شروع ہونے والی ہیں۔ اتنے اہم موقع پر چیف ایگزیکٹو ہی گھومنے پھرنے نکل جائے تو پھر تو ہو گیا کام۔" انہوں نے گھٹنے سمیٹ کر سینے سے لگائے۔

"معلوم ہے مجھے یہ ساری ایکسکیوزز جو تم ہر بار رٹو طوطے کی طرح میرے سامنے دہرا چکی ہو۔" وہ منہ بنا کر کچھ بے زاری سے بولے۔

"تو میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا بہانے بنا رہی ہوں۔" وہ غرا کر ان کے اوپر چڑھ دوڑی۔

"ارے رے!" انہوں نے تکیہ اٹھا کر اپنا بچاؤ کیا۔
"حد ہے بھئی۔" انہوں نے تکیہ نیچے کر کے غصے میں بولتی رعنا کو دیکھا۔
"میں کب کہہ رہا ہوں جھوٹ ہے۔ اچھا اب پلیز مجھے سونے دو۔ دیکھو بارہ بیس ہو گئے ہیں۔ صبح مجھے اٹھنا بھی ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولے۔
"اچھا ٹھیک ہے سو جائیں۔" وہ اٹھنے لگی۔
"تم کہاں چلیں تمہارے بغیر مجھے نیند آئے گی، مائی سلیپنگ پلو۔" وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولے۔
"اب دو ہفتے ایسے ہی سونا ہے۔ آج ہی سے پریکٹس شروع کر دیں۔" وہ پھر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھیں اور نائٹ کریم ہاتھوں پر ملنے لگی۔ فخر حیات ڈریسنگ ٹیبل کی تیز روشنی کے نیچے پنک نائٹی میں دہکتے حسین روپ کو دیکھے گئے۔

♥ ♥

"سید سلطان بخت گدی نشین آف احمد پور شرقیہ۔ ہائے شاہ جی!"
کہتے کہتے وہ خوامخواہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بیڈ پر اوندھے لیٹے لیٹے اس نے ہاتھ میں پکڑی سید سلطان بخت کی گولڈن نازک فریم میں مقید تصویر سائیڈ ریک پر رکھی اور سیدھی ہو کر سلطان بخت کو دیکھنے لگی جو واش روم سے تولیے سے منہ رگڑتے ہوئے باہر نکلے تھے اور اب تولیہ گردن کے گرد لپیٹے اس حسن کی جوالہ مکھی کو دیکھ رہے تھے جس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور سفید دانتوں کی موتیوں جیسی لڑی اس کو اور حسین بنا رہی تھی۔ بعض لوگوں کی مسکراہٹ ان کی ہنسی سے بالکل جدا ہوتی ہے اور ہر بار اسے ہنستے مسکراتے دیکھ کر سید سلطان بخت نے سوچا کہ وہ ہنستی زیادہ اچھی لگتی ہے یا مسکراتی۔
"کیا؟ ہائے شاہ جی؟" انہوں نے تولیہ کا گولہ بنا کر اس کی طرف اچھالا جو اس نے آسانی سے کیچ کر لیا۔
"یہی کہ آپ سب سے اپنا اتنا لمبا تعارف کراتے ہیں جیسے مجھ سے کرایا تھا۔" وہ بیڈ سے ٹانگیں نیچے لٹکا کر جھلانے لگی۔
"نہیں جانِ جان! یہ تو خاص الخاص صرف تمہارے لیے تھا۔" وہ گمبھیر آواز میں بولے۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے تکے جا رہے تھے اس کے رخسار لو دینے لگے۔ پلکیں لرزنے لگیں۔
"مجھ سے ہی کیوں؟" بےوقت اس کے منہ سے نکلا۔
"کیونکہ پہلی نظر میں تم اس دل کی بلا شرکت غیرے ملکہ بن بیٹھی تھیں۔ تم سے سلسلہ دراز جو کرنا تھا۔ اسی لیے پورا تعارف پہلے جملے میں ہی کرا دیا تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کس سے ٹکرائی ہو۔" اس کے قریب بیٹھ کر انہوں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بدک کر ان کے بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی۔
"تو شاہ جی! دس از فاؤل۔" وہ اپنی شہادت کی انگلی اٹھا کر انہیں وارن کرنے لگی جو دلچسپی سے اس کے نازک شاخ جیسے لچک دار سراپے کو نگاہوں کے رستے دل میں اتار رہے تھے اور نزاکت تو اس کے سراپے سے زیادہ اس کی عمر میں تھی کہ سولہ سترہ سال کی عمر میں تو ہر لڑکی پر بھی ٹوٹ کر روپ آتا ہے یہ تو پھر نین تارا تھی۔ سراپا حسن ہی حسن جیسے شراب کی پوری بوتل میں نشہ ہی نشہ ہوتا ہے پہلے گھونٹ سے لے کر آخری قطرے تک شرط صرف ڈھکن کھولنے کی ہے اور اس سے پہلے بوتل کے حصول کی۔
اور بوتل کا حصول وہ کر چکے تھے۔ دوسرا مرحلہ باقی تھا اور یہ تو ان کو ایمان کی حد تک یقین تھا کہ وہ شراب کی طرح نشہ ہی نشہ ہے اور اس نشے کا تصور ہی ان کے رگ و پے کو مدہوش کر دیتا تھا اور یہ مدہوشی ان پر اس پہلی ملاقات سے طاری تھی جب وہ اچانک ان کی گاڑی کے آگے آتے آتے لہرا گئی تھی۔ کالج روڈ کا موڑ انہوں نے جوں ہی تیز رفتاری سے کاٹا۔ سفید لباس میں ملبوس ایک قیامت ان کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچی تھی اور جس طرح وہ سیمیں بدن لہرانے کے بعد سنبھلتے ہوئے تن کر ان کو کھڑی گھور رہی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی بت بن چکے تھے، جسے اس کے حسن کا صور ہی ہوش میں لایا تھا۔

"وہی مشہور زمانہ پہلی نظر میں کیوپڈ کا نشانہ اور شکاری خود ہی گھائل، ہے نا شاہ جی!" بچوں کی سی قلقل کرتی ہنسی انہیں واپس لے آئی۔
"یس مائی پریٹی ڈول۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے "اور اب تو یہ دل کہیں کا نہیں رہا بس تمہاری ان زلفوں میں الجھ گیا ہے، چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔" وہ اس کی طرف جھکے تو وہ تڑپ کر ان سے دور ہٹ گئی اس کا چہرہ پل بھر میں سرخ آگ کی طرح دہکنے لگا جس کی تپش سلطان بخت کے دل کو سلگانے لگی۔
"شاہ جی پلیز!" وہ نیچی نظروں سے بمشکل کہہ سکی۔
"اوکے اوکے ڈارلنگ! اب کچھ نہیں چلو کہیں آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے اور ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگے۔
"اونہہ۔ اس اندھی گاڑی میں جس کے بلیک شیشے کوئی بھی منظر اپنی اصلی رنگت میں نہیں دکھاتے۔ میں نہیں جاؤں گی اس طرح۔" وہ ٹھنک کر بولی اور خفا سی ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔
"اونہوں جانِ سلطان! یوں بات بات پر خفا نہیں ہوتے۔ بس کچھ عرصہ صبر کر لو پھر جہاں جی چاہے جیسے جی چاہے میرے ساتھ گھومتی پھرنا۔" انہوں نے شیشے میں اس کے روٹھے روٹھے سے عکس کو بہلاتے ہوئے کہا۔
"کچھ عرصہ، کچھ عرصہ آخر کتنا عرصہ؟ چھ ماہ ہو چلے ہیں۔" کم عمری کے پاس اپنے ہی صبر کے پیمانے ہوتے ہیں جو بڑی جلدی جلدی بھر جاتے ہیں۔ اس کا مزاج اسی طرح بگڑا بگڑا سا تھا۔
"ارے صرف چھ ماہ ہی تو ہوئے ہیں، لوگ تو صحرائے عشق عبور کرنے کے لیے صدیوں کا انتظار کرتے ہیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے پرفیوم کی شیشی اٹھائی۔
"شاہ جی اب ایسے بے وقوفوں کا زمانہ نہیں رہا۔ آج کل تو تو نہیں تو اور سہی اور نہیں تو اور سہی کا زمانہ ہے۔" اس کا انداز صاف سلطان بخت کو چڑانے والا تھا۔ لباس پر خوشبو انڈیلتے ان کے ہاتھ ٹھٹک کر رہ گئے۔
"نین تارا! اوروں کی تو مجھے خبر نہیں مگر تم ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔" ان کا لہجہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گیا تھا۔
"کم آن شاہ جی! نین تارا آپ کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی، اس کی خبر آپ کو بھی ہے۔" اس نے اپنی صراحی دار گردن اٹھا کر کہا۔
"آئی نو مائی لو!" وہ ہلکا سا ہنسے "بس اب میں بابا جان سے جلدی بات کروں گا پھر یہ چھپ چھپ کر ملنے سے تو جان چھٹے گی۔"
"بابا جان سے آپ کیا بات کریں گے؟" وہ یکسر انجان بن کر بولی اور اپنے کیوٹکس والے خوبصورت ناخنوں کا مشاہدہ کرنے لگی۔
"تارا جی! آپ کی یہی معصوم ادائیں تو ہمیں لے ڈوبی ہیں۔" وہ اس کے قریب آئے اور پرفیوم کی ایک تیز پھوار اس کی جھکی ہوئی سنو وائٹ گردن پر چھڑکی۔
"شاہ جی!" اس نے ہاتھ اٹھا کر خوشبو کی بوچھاڑ کو روکنا چاہا۔
"پھر تم ہو گی تمہارے شاہ جی ہوں گے اور زمانے بھر کے عیش۔" انہوں نے شیشی واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔
"شاہ جی ایک قید سے نکال کر دوسری جیل میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔
"جیل؟ کون سی جیل؟" وہ ذرا سا چونکے۔
"آپ کی حویلی جیل نہیں تو اور کیا ہے! یہاں تو پھر میں آپ کے جانے کے بعد ادھر ادھر ہر جگہ گھوم پھر لیتی ہوں۔ مام کے ساتھ آؤٹنگ پر شہر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ فرینڈز سے ملنے چلی جاتی ہوں اور مام کے ساتھ اسٹوڈیو وغیرہ، بعد میں شاہ جی آپ کے نام کی زنجیر پاؤں بھی نہیں ہلانے دے گی۔ شاہ جی! ایسی حبس بھری فضا میں

تو نین تارا گھٹ کر مر جائے گی۔" اس کی آواز اپنی بیچارگی کے احساس ہی سے بھرا گئی۔

"نین تارا! ایسی باتیں کر رہی ہو کیا میری رفاقت تمہارے لیے سزا ہو گی؟" وہ اس کے پاس آ بیٹھے۔

"شاہ جی! میں آپ کو سچ بتاؤں۔" وہ ایک لمحے کو ان کی روشن آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "شاہ جی! آزاد پنچھی کے لیے قید سے بڑی بھی کوئی سزا ہوتی ہے آپ خود بتائیں۔"

"محبت سزا ہے نین تارا؟" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ افسردگی سے بولے۔

"ہاں شاہ جی! سزا ہی تو ہے۔ اس سزا کی سب سے پہلی اذیت پتا ہے کیا ہے؟" اس نے اپنی موٹی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔

"کیا؟"

"اپنے آپ کو ختم کر دو' دوسرے کے وجود میں ڈھل جاؤ۔ اپنی خواہشیں دوسرے کی محبت میں قربان کر دو۔ اپنی قربانی شاہ جی! سب سے پہلے اپنی ذات کی قربانی اور جو خود کو قربان کرنا نہیں چاہتا۔ وہ سچی محبت نہیں کر سکتا شاہ جی!" اس کے لہجے میں سمندروں کی سی گہرائی تھی۔

"نین تارا! اتنی سی عمر میں تم نے یہ اتنی بڑی باتیں کہاں سے سیکھیں؟ کالج تو تم محض 'تفریحاً' جاتی ہو یا جاتی ہی نہیں۔" وہ حیرت سے اس کی چاکلیٹ براؤن کشادہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

"شاہ جی! سچ کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا اور یہ جس پر عیاں ہو جائے تو اس کی عمر گھٹتا ہے اور یہ کہاں لکھا ہے کہ عقل کی باتیں کالج میں سکھائی جاتی ہیں۔ کالج میں جا کر تو بجنوں کی رہی سہی عقل بھی جاتی ہے۔ مجھ جیسوں کی۔" وہ پھیکی سی ہنسی سے بولی۔

"ہاں سنجیدگی اس کے چہرے پر سوٹ نہیں کرتی' بعض چہرے صرف ہنسی کے لیے بنے ہوتے ہیں اگر وہ سنجیدہ ہو جائیں تو یکایک بوڑھے نظر آنے لگتے ہیں۔ اتنے نوجوان بدن پر بوڑھا چہرہ؟" وہ نہیں سوچ کر ہی جھرجھری سی آ گئی۔

"اے یہ کیا فلسفہ جھاڑ رہی ہو' چلو باہر چلتے ہیں تمہاری عمران باتوں کی نہیں ہے۔ تم بس کالج جایا کرو وہاں روز ایک تولہ عقل رخصت کر آیا کرو۔ تمہیں اس کی اجازت ہے کیونکہ مجھے تمہاری عقل کی بہت زیادہ ضرورت نہیں اس لیے تم بس خوش رہا کرو اور ہم سے پیار کیا کرو۔" وہ اس کی طرف جھکے وہ پرے کھسک گئی۔

"شاہ جی! مجھ سے اب پڑھا نہیں جاتا اور میں نے کون سی نیچری چھیچھری کرنی ہے جو کتابوں میں اپنی جان ہلکان کروں اور شاہ جی دو کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ بندہ یا تو عشق کر سکتا ہے یا پڑھائی اور آپ تو مجھے کالج کے پہلے روز ہی ٹکرا گئے تھے پھر میں نے کیا پڑھنا تھا بس وہی دن جب آپ احمد پور جاتے ہیں کالج چلی جاتی ہوں۔ کلاس رومز کے چکر لگا آتی ہوں۔ اب تو ماما بھی افسوس کرتی ہیں کہ ناحق داخلہ فیس بھری۔" وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس گئی اور ہیئر برش اٹھا کر اپنے شانوں تک لہراتے گھنے بالوں میں بڑی نرمی سے پھیرنے لگی۔

"اونہوں نینو جان؟ تمہیں کیا پیسوں کی کمی ہے جو یہ چھوٹے چھوٹے پچھتاوے پالتی ہو۔ رنگت خراب ہو جائے گی اور یہ میں کبھی نہیں چاہوں گا سنا تم نے۔" انہوں نے پیچھے سے آ کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لینا چاہا وہ تڑپ کر دائیں طرف نکل گئی۔

"بس شاہ جی! یہ پیار محبت نہیں۔ اس سے تنگ آ گئی ہوں۔ میرا کیریئر داؤ پر لگ گیا ہے۔" اس نے بال غصے سے پیچھے کی طرف جھٹکے۔

"وہاٹ؟" ان کے تیور بدل گئے۔

"پانچ اشتہار' کیا صرف یہی کام رہے گا میرا شاہ جی۔ میں اسکرین کی دنیا میں تہلکہ مچانا چاہتی ہوں اور آپ جانتے ہیں میں یہ کر سکتی ہوں۔ آپ مجھے قید نہ کریں۔" وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور پردہ کھسکا کر نیچے سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھنے لگی۔

"نین تارا بات سنو" وہ اس کے قریب آ کر انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولے اس نے ایک نظر ان کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی اور پھر نیچے دیکھنے لگی۔

"اس طرح کی خرافات اب تم بھول جاؤ۔ تم اب صرف میری ہو اور میری چیز صرف میری دسترس میں رہتی ہے۔ اسے صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں' زمانے بھر کی ٹکے ٹکے کی نظریں میں اس پر پڑنے نہیں دیتا۔ انڈر اسٹینڈ اور میری محبت تمہیں اتنا کچھ دے گی کہ اشتہاری کمپنیاں تمہیں اپنے آگے پانی بھرتی نظر آئیں گی۔ تمہیں خبر نہیں کہ تم سلطان بخت کی منظورِ نظر ہو احمد پور کا اکلوتا وارث۔ دنیا کے خزانے تمہارے آگے ڈھیر کر دوں گا۔"

اس نے ایک اچٹتی سی بے تاثر نگاہ سلطان بخت پر ڈالی اور پردہ آگے کرتے واپس مڑ گئی۔

"شاہ جی! یہ سب میرے لیے کافی نہیں ہے۔" وہ ہونٹوں کی لپ اسٹک درست کرتے ہوئے بولی اس پر سلطان بخت کی تنبیہہ کا کچھ خاص اثر نہیں لگتا تھا۔

"کیا مطلب؟" ان کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔

"مطلب کا آپ کو پتا ہے شاہ جی!" اس نے ٹشو سے ہونٹوں کے کنارے درست کیے اور خود کو آئینے میں تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کا بے نیاز رویہ سید سلطان بخت کو اندر ہی اندر اور بھڑکا رہا تھا۔

"نین تارا!" وہ بلند آواز میں دھاڑے۔ نین تارا نے شدید غصے سے انہیں گھورا۔

"شاہ جی پلیز۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں احساس دلایا۔

"یہ سب تمہیں میرے نزدیک آنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب اس کا وقت گزر گیا۔ سلطان بخت جب کسی چیز پر ہاتھ رکھ دیتا ہے پھر اسے کائنات کی کوئی طاقت اس سے دور نہیں کر سکتی Keep in mind۔" وہ برف لہجے میں بولے نین تارا نے ذرا سی آنکھیں سکوڑ کر انہیں دیکھا۔

"شاہ جی! میں چیز نہیں ہوں Keep in mind۔" اس نے ان کا لہجہ انہیں لوٹایا۔

"تم جو بھی ہو اب صرف میری ہو اور تم پر میرے علاوہ کوئی اور اس طرح کی نگاہ نہیں ڈال سکتا اور یہ کیریئر کا خناس بھی تمہارے دماغ میں تمہاری اس بڈھی کھوسٹ نائیکہ ماما جانی نے ڈالا ہے' مجھے معلوم ہے! اسے یہ سب سمجھا دینا جا کر ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔" انہوں نے بہت کو کھینچتے ہوئے حقیر لہجے میں کہا۔

"شاہ جی شی از مائی مدر مائنڈ یور لینگویج۔" نین تارا نے احتجاجاً کہا۔

"اونہہ مدر۔ اس پروفیشن میں کوئی ماں' بہن بھائی باپ نہیں ہوتا۔ یہ رشتے زمین سے اگتے ہیں یا آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی آگا پیچھا نہیں ہوتا اور نہ ان کا آگا پیچھا کھوجنا چاہیے بس ذلت اور شرمندگی ہی ہاتھ آتی ہے اس لیے تم بھی نین تارا اس ریڈی میڈ ماں کو ماں ہی سمجھو ورنہ وہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور اب وہ یہ ماڈلنگ وغیرہ کا رعب جما کر مجھ سے تمہارے بڑے اونچے دام وصول کرنا چاہتی ہے۔ میں اس کی نیت کو سمجھ گیا ہوں۔" ان کے لہجے میں شیر کی سی غراہٹ اور حقارت تھی۔

"شاہ جی! میری ماں کے بارے میں یہ سب کہتے ہوئے آپ کو کم از کم میرے جذبات کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مجھے بہت افسوس ہوا ہے آپ کے خیالات جان کر۔ آپ میری ماں کو جو کچھ بھی سمجھتے ہیں مگر اتنا یاد رکھیں میں اس عورت کی بیٹی ہوں' گڈ بائے۔" وہ پل بھر میں انہیں آئینہ دکھا کر دروازہ کھول کر تھپاک سے باہر نکل گئی۔

"نین تارا! نین تارا!" سلطان بخت اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے گئے مگر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی وہ چند لمحے اسے جاتے دیکھتے رہے پھر سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات کس قدر تاریک ہے حالانکہ سارا آسمان ستاروں کی روشنی سے جگ مگ کر رہا ہے لیکن تاریک رات کے مہیب اندھیروں کے لیے یہ روشنی ناکافی ہے۔ چاند نہ ہو تو ستاروں کی روشنی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ روشنی کے لیے چاند بہت ضروری ہے اور اگر کسی کے پاس چاند نہ ہو تو؟

"تو کیا وہ اندھیرے میں سفر کرتا رہے یا رک کر تارا سحری کا انتظار کرے یا اس حتمی روشنی کا جس کے نکلنے کے بعد کسی چاند کسی تارے کی روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہاں جب دن نکل آتا ہے تو پھر کسی اور روشنی کی احتیاج نہیں رہتی۔ سب رستے خود بخود روشن ہو جاتے ہیں لیکن دن کب نکلے گا!" اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

دن کے آثار تو ابھی اس کی زندگی میں کہیں بھی نہیں۔ اگر سورج نکل بھی آئے تمام رستے روشن بھی ہو جائیں تو بھی اسے کیا معلوم کس رستے پر سفر کرنا ہے اور کس رستے پر بچ کر چلنا ہے۔ ان رستوں کی پہچان تو کوئی خضر ہی کروا سکتا ہے اور خضر کہاں سے آئے۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ آنکھوں کو ستاروں کی روشنی بھی چبھنے لگی تھی۔

دو چار دن یا ایک آدھ ہفتہ یا پھر پندرہ بیس دن اس کے بعد؟ یہ سوال اس قدر خوفناک تھا کہ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں کس قدر گرمی تھی اور حبس بھی مگر اس کے باوجود سب کس قدر اطمینان اور بے فکری سے سو رہے تھے۔ اس نے ایک نظر اپنے سامنے بچھی ہوئی چارپائیوں کی لمبی قطار پر ڈالی' سب ہی بے خبر سو رہے تھے۔ کوئی اوندھا' کوئی سیدھا' کوئی آڑا' اور اس عمر کی نیند ہی تو اس عمر کا سرمایہ ہوتی ہے اور اس کے پاس تو یہ سرمایہ بھی نہیں رہا تھا۔ کئی راتوں سے اس کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ اس نے دائیں بائیں دونوں طرف نگاہ ڈالی سب ہی سو رہے تھے کوئی بھی جاگ نہیں رہا تھا۔ رات کے شاید ایک یا دو بجے کا ٹائم ہو گا۔ اس وقت کون جاگے گا بھلا وہ تھک کر پھر لیٹ گیا۔

"حالانکہ یہ کوئی اس قدر بھی فکر کی بات نہیں مگر پھر بھی۔" اس نے گہرا سانس لیا گندے میلے ڈھیلے ڈھالے تکیے کو اس نے سر کے نیچے دوہرا کیا۔

دو تین دن میں رزلٹ آنے والا ہے پھر؟ جس خطرے کے بارے میں وہ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ آج وہ سامنے آ گیا تھا۔ آج ناظم صاحب نے اسے اس کے باقی ساتھیوں کی طرح آفس میں بلایا تھا۔ آج اس کی ظفر محسن اور شبیر کے ساتھ ہال کمرہ دھونے کی باری تھی۔ وہ پوری تندھی سے برش رگڑ رگڑ کر فرش دھونے میں مگن تھا جب غفور چچا نے اسے ناظم صاحب کا پیغام پہنچایا تو اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔ وہ خاموشی سے غفور چچا کو تکتے گیا ظفر اور وہ دونوں لڑکے اس کی حالت دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔

"جاؤ بھئی آج تمہاری باری ہے۔ ہم تو کل بھگت آئے تھے۔ چلو شکر ہے ادھر سے تو جان چھوٹے گی۔ باہر کی دنیا دیکھیں گے۔" ظفر نے ہنس کر اس کی کمر میں ہلکا سا دھمو کا لگایا۔ وہ گرتے گرتے بچا تو وہ تینوں اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ وہ اسی طرح ہر بات پر زور زور سے قہقہے لگایا کرتے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر شلوار کے پائنچے نیچے کیے' فولڈ کی ہوئی آستینوں کے کف سیدھے کیے ان کے بٹن بند کیے۔ ہاتھ سے قمیص کے دامن کی سلوٹیں درست کیں۔

"آ جاؤ جلدی سے پھر انہوں نے اور لڑکوں کو بھی بلانا ہے۔" غفور چچا اس کی بے کار کی مصروفیت سے تنگ آ کر بولے اور باہر کی طرف بڑھ گئے۔ وہ تینوں کو ایک نظر دیکھ کر سست قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا۔ گیلے فرش پر اس کے گیلے پاؤں ایک پل کو نشان چھوڑتے اور پھر معدوم ہو جاتے۔

"یار! یہ تو اس طرح جا رہا ہے جیسے اسے خدانخواستہ پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ احمق ہے یہ بھی بلکہ الو۔" شبیر نے اسے سنانے کو اونچی آواز میں کہا اور پھر تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

"یار الو نہیں' الو کا پٹھا ہاں ہاں۔" ظفر اپنے ازلی گنوار پنے سے بولا اس نے ایک قہقہے کو انہیں پلٹ کر کچھ رنج اور کچھ بے بسی سے دیکھا۔

"جلدی آ جانا۔ پرنس آف ویلز' ابھی بڑا کام باقی ہے۔ کہیں وہیں کھڑے ہو کر سوچ بچار نا کرنے لگ جانا۔" محسن نے ہانک لگائی۔

"اور سوچتے سوچتے سو جاؤ وہ بھی کھڑے کھڑے' دریائی گھوڑے کی طرح ہاہاہا۔" شبیر اپنی مثال پر خود ہی داد دیتے ہوئے ہنسنے لگا۔

اس نے دروازے کے پاس پڑی اپنی پرانی بدرنگ گھسی ہوئی کھیڑی پہنی۔ جھک کر اس کے بکل بند کیے اب تو دونوں پاؤں کے بکسوے بالکل ٹوٹنے کے قریب تھے۔ یہ جوتی پچھلی دفعہ عید پر ملی تھی مگر فنڈ نہیں مل سکے تھے۔ اب اس بار عید پر پروگرام تھا کہ سب کو نئے جوتے ملیں گے مگر اگلی عید تک تو وہ یہاں نہیں ہو گا۔ اب تو اسی جوتی کے ساتھ اسے گزارہ کرنا ہو گا جو اب گھسنے کے ساتھ ساتھ اسے چھوٹی بھی ہو گئی تھی۔ وہ تو اب اس کے بکل بند بھی نہیں کرتا تھا۔ ورنہ پاؤں زخمی کر دیتی تھی۔ آج تو ناظم صاحب کے پاس جانا تھا اس لیے بند کر لی تھی۔ تین سال پرانی تھی۔ اب تو اس کا پاؤں خاصا بڑا ہو گیا تھا۔

غفور چچا ناظم صاحب کے کمرے کے آگے رکھے گملوں کو پانی دے رہے تھے' بھولا برآمدے کے فرش پر پوچا لگا رہا تھا۔ غفور چچا نے اسے آفس جانے کا اشارہ کیا تو وہ کمرے کی طرف بڑھا۔

"اوئے جوتا تو اتار جا نظر نہیں آتا۔ صفائی کر رہا ہوں میں۔" جیسے ہی وہ برآمدے میں دو قدم چلا بھولا تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور پوچے والا ہاتھ لہرا کر بولا وہ کھڑا اسے دیکھے گیا۔

"بٹ بٹ کیا دیکھ رہا ہے' اتنے بڑے بڑے دیدے کس لیے رکھے ہیں۔ نظر نہیں آتا کہ جوتے اتار لوں میں' گدھا نہ ہو تو۔" وہ پھر چیخا تو اس نے ٹانگ دوہری کر کے ذرا سی اوپر اٹھائی اور بکل کھولنے لگا جوتے اتار کر اس نے ہاتھ میں پکڑے اور برآمدے کے باہر رکھ کر دوبارہ مڑا اور بڑی احتیاط سے خشک فرش پر پاؤں رکھتا ہوا آفس میں داخل ہو گیا۔

"السلام و علیکم!" اس نے جھجک کر اندر رجسٹر میں گم ناظم صاحب کو ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام' کون؟" انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر جیسے پہچان گئے۔

"ہاں آؤ بھئی بیٹھو میں نے تمہیں بلایا تھا۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دھیرے سے شکریہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پین رجسٹر میں رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے' وہ شاید بات کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہے تھے اور اس کی وجہ بھی تھی کہ ناظم صاحب اس ادارے کے سب سے پڑھے لکھے سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ وہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے ان کا لہجہ انتہائی مہذب اور الفاظ بہت چنیدہ ہوتے تھے' لمبی سے لمبی بات کو بھی وہ چند منتخب جملوں میں بڑی متانت سے ختم کر دیتے تھے۔ سننے والا خواہ مخواہ ہی قائل ہو جاتا تھا' بحث یا نکتہ چینی کے لیے وہ مقابل کے پاس کچھ نہ چھوڑتے تھے ان کے سالانہ خطاب ان کی آواز کی گھمبیرتا اور دلکش انداز کی وجہ سے چھوٹے بچے بھی غور سے سنتے تھے چاہے ان کے پلے کچھ بھی نہ پڑ رہا ہو۔

"معاذ بیٹا! تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ چند ایک روز میں تمہارا رزلٹ آؤٹ ہونے والا ہے میٹرک کا۔" بالآخر انہوں نے بات شروع کی۔

"جی سر!" اس کی نظریں اپنے ننگے پاؤں سے الجھنے لگیں۔

"مجھے امید ہے انشاء اللہ تم کوئی بڑی کامیابی حاصل کرو گے' کیونکہ تم ہمارے ادارے کے سب سے ذہین اور محنتی طالب علم ہو اور ہمیں بجا طور پر تم پر فخر ہے۔" وہ خاموش رہا۔ انہوں نے کچھ توقف کیا۔

"اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ اس رزلٹ کے آؤٹ ہونے کے بعد۔" وہ ایک لمحے کو پھر رکے "تمہیں یہاں سے جانا ہو گا۔" اس نے ایک شکایتی نگاہ ان پر ڈال کر جھکا لی۔

"یہ اس ادارے کا اصول بھی ہے اور ہماری مجبوری بھی۔ یہاں فنڈز بھی انتہائی محدود ہیں۔ اب ماشاء اللہ تم جوان ہو' سمجھدار ہو' باشعور ہو اپنے بارے میں بہتر انداز میں سوچ سکتے ہو۔ رستہ ہم نے تمہیں دکھا دیا ہے' تعلیم کے ذریعے منزل تک پہنچنا اب تمہارا کام ہے اور منزلوں کے رستے اکثر بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ کئی بار سراب

رستے میں آکر مسافر کو سیدھے رستے سے بھٹکا دیتے ہیں اور کبھی راہزن سیدھی سوچ کے خزانے لوٹنے چلے آتے ہیں۔ ان سے ہشیاری از حد ضروری ہے۔ کھرے اور کھوٹے گناہ اور نیکی میں فرق کرنے والی آنکھ کو کبھی بند نہ ہونے دینا۔ یہ فرق تمہیں کوئی نہیں بتائے گا تمہارے اندر یہ آنکھ موجود ہے۔ اس کی بات ہمیشہ کان لگا کر سننا راستے خود ہی سدھرتے چلے جائیں گے۔"

وہ ایک لمحے کو رکے انہوں نے اپنی عینک اتار کر اپنے آگے رکھی اور ہتھیلیاں بند آنکھوں پر رکھ دیں۔ یہ ان کی عادت تھی کچھ دیر بعد انہوں نے ہاتھ اٹھا لیے۔

"مختصر رستے عموماً پرکشش اور دل کو رجھانے والے ہوتے ہیں مگر ان کا انجام انتہائی تاریک غاروں میں جا کر ہوتا ہے۔ جہاں سے پھر واپسی کا کوئی رستہ نہیں ہوتا۔ سیدھا اور سچا رستہ لمبا اور کانٹوں بھرا ہوتا ہے مگر اس کا انجام ہمیشہ بہت نیک، بہت پرسکون ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کہ پہلا قدم ہی دشوار ہو گا پھر قدم خود بخود گناہ کے رستے پر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب تم اپنے محتسب خود ہو اپنا احتساب بھی تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیے جو بھی کرو۔ سوچ سمجھ کر کرنا۔ میرا خیال ہے کہ تم میری باتوں کو نا صرف دھیان سے سن رہے ہو بلکہ ذہن نشین بھی کر چکے ہو۔" انہوں نے عینک اٹھا کر پھر سے لگا لی۔

"جی سر!" اس نے ایک لمحے کو انہیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"کوئی بات جو تم کہنا چاہتے ہو یا پوچھنا چاہتے ہو؟" ان کی فراخدلانہ پیشکش پر اس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ تذبذب کے عالم میں تھا۔

"ہاں ہاں پوچھو کیا کہنا ہے؟" انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"سر! میں یہاں سے کہاں جاؤں گا؟" اتنے دنوں سے ذہن میں کانٹے کی نوک کی طرح بیٹھا سوال اس نے بالآخر ان کی محبت بھری گفتگو سے متاثر ہو کر کر ہی دیا۔

"ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا مگر چپ رہے، وہ مدد طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

"کالج میں ایڈمیشن لے لینا اور ہاسٹل میں رہ لینا۔ تمہارا کوئی رشتہ دار۔" انہوں نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

"اب تک تمہاری یہاں سولہ سترہ سالہ زندگی میں کوئی ملنے نہیں آیا۔ اس کا مطلب ہے کوئی ہو گا نہیں اور ہوا بھی تو کون ایسے میں کام آتا ہے۔ بہرحال یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں تمہارے بارے میں جو بھی معلومات ہمارے پاس ہوں گی بہم پہنچائی جائیں گی۔ شاید کوئی کلیو مل جائے۔ نہیں تو رستے میں ایک نہیں ہزار در کھلے۔ میٹرک کلیئر تو تم ہو ہی جاؤ گے کہیں چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جاب کر لینا شہر میں ہاسٹلز ہیں اس طرح کے لوگوں کے لیے جہاں کمرہ لے لینا یا کسی کے ساتھ شیئر کر لینا۔"

یہ سب اسے طفل تسلیاں لگیں "کیا ناظم صاحب نہیں جانتے تھے کہ آج کل ایم اے کر کے لوگ جاب کے لیے دھکے کھا رہے ہیں، مجھ میٹرکولیٹ کو کون جاب دے گا۔" اس نے کڑھ کر سوچا۔

"بہرحال اب تم جاؤ۔ رزلٹ آنے کے بعد تم یہاں ایک ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ دو ہفتے رہ سکتے ہو۔ اس سے زائد نہیں کیونکہ تمہاری جگہ کسی اور بے سہارا کو پناہ دی جا سکے۔ تم خود کو اس بڑی تبدیلی کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لو کہ اب تمہیں اپنے بل بوتے پر بھی زندگی میں قدم رکھنا ہے اور تم یونہی کنفیوزمت ہو، کچھ بھی نہیں ہو گا بس چند ایک روز مشکل ہوں گے جو سیٹ ہونے میں لگیں گے۔ اس کے بعد انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا بس گھبرانا نہیں اپنے حوصلوں کو بلند رکھنا۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔ کبھی کبھی آتے جاتے رہنا ملنے کے لیے مجھے خوشی ہو گی۔"

یہ ان کی گفتگو کے شاید اختتامی جملے تھے، جس کا اب صاف مطلب تھا کہ اٹھو اب، جاؤ یہاں سے کیونکہ انہوں نے آہستگی سے اپنے سامنے پڑا رجسٹر کھول لیا تھا۔

"سر!" وہ آہستگی سے کھڑا ہوا۔

"ہاں کہو۔" ان کے چہرے پر ابھی بھی دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

"سر! میں بہت پریشان ہوں، نا معلوم کیا ہو گا۔ میں کہاں جاؤں گا؟" وہ اب رو دینے کو تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"او ہو ینگ مین بی بریو۔" وہ ذرا سا ہنسے "اس طرح کے واہموں میں پڑو گے تو ضرور خوار ہو گے کہ نا معلوم کیا ہو گا، کیسے ہو گا جب سر پر پڑے گی تو سب کچھ آسان ہوتا چلا جائے گا۔ ڈونٹ وری۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کسی ہاسٹل میں انتظام کر لینا پھر جب سمجھ آتی جائے گی تو خود ہی رستے کھلتے جائیں گے اوکے۔"

"ہاسٹل میں ارینجمنٹ کر لینا جیسے میرا بینک بھرا ہوا ہے ہونہہ!" وہ ان کے افسانوی دلاسوں سے جل گیا تھا وہ جانے کے لیے مڑا۔

"اور ہاں پریشان نہ ہو تمہیں جاتے وقت کچھ رقم بھی دی جائے گی۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے پھر تم اتنے پریشان نہ رہو گے۔" انہوں نے اپنے تئیں اسے بہت بڑی خوش خبری سنائی مگر اس کے دل کی کلی کھل نہ سکی۔

"تھینک یو سر!" اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خدا حافظ۔" کہہ کر اس نے چک اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ ناظم صاحب نے اسے جاتے دیکھا اور دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر رجسٹر پر جھک گئے۔

اور اس دن سے وہ ان ہی ہولناک سوچوں میں گھرا ہوا تھا کہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا۔ کوئی رشتہ دار نہیں کوئی احباب دوست ایسا نہیں جو کچھ دن کے لیے اسے اپنے پاس رکھ سکے۔ اب یہاں سے نکلتے ہی اگلے روز تو اسے کالج میں ایڈمیشن ملنے سے رہا۔ کالج میں ایڈمیشن رزلٹ کے کم از کم ڈیڑھ دو ماہ بعد ہوتا ہے اور کلاسز اس سے دو تین ہفتوں بعد اسٹارٹ ہوتی ہیں۔ اس سارے عرصے میں وہ کہاں رہے گا۔ اس سائبان سے نکل کر جہاں اس نے اپنی ساڑھے سولہ سالہ زندگی کے دن رات گزارے تھے، وہ سارے دن اس کی آنکھوں کے آگے کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ وہ چھت پر ٹکٹکی باندھے اس فلم کو دیکھے گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"میں نے آج رعنا کی طرف فون کیا تھا فخر بھائی تو جاپان گئے ہیں اور دیکھیں جاتے وقت فون بھی نہیں کیا اور سنی کی برتھ ڈے پر بھی ہمیں انوائیٹ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے تو بالکل ہی ہمیں دودھ میں سے بال کی طرح نکال علیحدہ کر دیا ہے اب ایسا بھی کیا۔" عفت آرا جلے کٹے لہجے میں دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

"ارے بھئی فخر کیا پہلی بار بیرون ملک گیا ہے جو ہر طرف ڈھنڈورا پیٹ کر جاتا اور ہم اس کے لیے ہار پھول لے کر جاتے۔ اس کا بزنس ہے اس سلسلے میں اسے آئے دن کہیں نہ کہیں جانا پڑتا ہے۔ اب اگر ہر بار وہ آتے جاتے فون کھڑکائے تو تم کہو گی۔ یہ کیا کم ظرفوں کی طرح آتے جاتے فون کھڑکاتے ہیں، سچ کہتے ہیں انسان سب کو خوش نہیں کر سکتا اور پھر خاص طور پر عورت ذات کو جو ہر بات میں گلے شکوے کے ہزار پہلو نکال لیتی ہے۔" نواز صاحب نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو بندہ اپنوں سے ہی گلہ کرتا ہے نا اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنے آتے جاتے کی اطلاع کیوں نہیں دیتے کیونکہ پھر اس طرح انہیں اپنے رشتہ داروں بلکہ ہم جیسے غریب رشتہ داروں کو تحائف جو دینا پڑیں گے۔" عفت آرا ان کے سامنے صوفے پر آبراجمان ہوئیں۔

"بائی دا وے تم نے کیا کہا، یہ غریب رشتہ دار کون ہیں؟" نواز صاحب نے آنکھیں سکوڑ کر ذرا کڑے تیور سے انہیں دیکھا۔

"اونہہ! انجان بنتے ہیں۔ یہ بھی مجھے سمجھانا پڑے گا۔" وہ سلگ کر بولیں انداز صاف طعنہ دینے والا تھا۔

"بڑی ناشکری ہو بھئی عفت آرا بیگم! ایسا نہیں ہے خدا کا دیا ہمارے گھر میں۔ ہزاروں لاکھوں سے اچھا کھاتے"

پہنتے اوڑھتے ہیں پھر بھی۔" وہ افسوس سے سرہلا کر بولے۔ "پھر بھی ایسی ناشکری کرتی ہو۔ اللہ ناراض ہوتا ہے اس طرح کے گلے شکوؤں سے۔"

"چلو لیکچر شروع ہو نہ، جس میں کچھ کُن نہ ہو۔ وہ نصیحتیں زمانے بھر کی کرتا ہے نواز صاحب!" وہ جلے کٹے لہجے میں بولیں۔

"کیسی نصیحت؟ کیسا لیکچر؟ بھئی یہ تو خود تمہیں سمجھنا چاہیے۔" انہوں نے لاپروائی سے کہہ کر پھر سے اخبار کھول لیا۔

"خبردار جو اس جھوٹ سچ کے پلندے کو میرے سامنے کھولا تو۔" وہ انگلی اٹھا کر دھمکانے والے لہجے میں بولیں۔ "حد ہو گئی جہاں میں سامنے آکر بیٹھی دو باتیں کرنے کے لیے وہاں ضرور یہ اعمال نامہ کھول حفظ کرنے بیٹھ جائیں گے پتا نہیں کون سے خزانے کا نقشہ دیا ہوتا ہے اس میں جو صبح سے رات تک آنکھیں گاڑے اسے حفظ کرتے رہتے ہیں۔" عفت آرا کو ان کی اخبار بینی سے بے حد چڑ تھی۔

"اچھا لو بھئی، بند کیے دیتا ہوں۔ خزانے مل بھی جائیں تو بھی تمہیں یہی کہنا ہے کہ کم ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسے۔ "اور بھول گئیں ابھی پچھلے ماہ رعنا نے تمہیں کتنا نفیس و نازک گولڈ کا سیٹ دیا تھا جو فخر نے اسے مسقط سے لاکر دیا تھا۔ تم نے حد سے زیادہ اس کی تعریف کی تو آتے وقت اس نے تمہیں ہی تھما دیا۔" انہیں ایک دم سے یاد آیا تو جتا بیٹھے۔

"وہ کاغذ جتنا ہلکا پھلکا جیسا سیٹ اور وہ فخر اس کے لیے نہیں لائے تھے وہ تو خود ہی میری سالگرہ کا تحفہ کہہ کر مجھے دیا تھا۔ فخر کے لائے ہوئے تحفوں میں تو اس کی جان ہوتی ہے وہ انہیں یونہی ادھر ادھر بانٹتی مر نہ جائے۔"

"عفت آرا!" بہن کے لیے بیوی کا گھٹیا لہجہ نواز کو برا لگا۔

"ہاں تو اور کیا فخر اس کے لیے گولڈ نہیں لاتے۔ ڈائمنڈ اور پلاٹینم لاتے ہیں گولڈ تو ہم جیسوں کے لیے ہے" وہ بھسم لہجے میں کڑھ کر بولیں۔

"اُفوہ! کیوں خوامخواہ میں اپنا خون جلاتی رہتی ہو۔ بھئی اگر خون ہی جلانا ہے فضول میں جلنا کڑھنا ہی ہے تو بندہ یہ سوچ کر بھی جل کڑھ سکتا ہے کہ یہاں کتنوں کے ہاتھ روز مزدوری ہے گھر جتنے بڑے ہیں اور ایسے لوگوں کی صبح پاکستان میں ہوتی ہے دوپہر لندن میں اور شام پیرس میں تو اس بات پر جلو تو کوئی بات بھی ہے۔" وہ اسے چھیڑنے کو بولے۔ "دیکھو عفت آرا!" وہ ذرا آگے کو جھکے۔ "میری اچھی بیوی! خدا نے یہ دنیا اسی ڈھب پر پیدا کی ہے ہر کسی کو اس کے نصیب کا لکھا ہی ملتا ہے اور نصیب کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا، جو چیز جو رزق میرے نصیب میں لکھا ہے اسے کوئی مجھ سے چھین نہیں سکتا۔ چاہے ساری دنیا مل کر زور لگا لے اور جو میرے نصیب میں نہیں ہے چاہے ساری دنیا مل کر کوشش کرے مجھے نہیں مل سکتا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے اگر اس کو دل میں نقش کر لو تو بہت سی باتوں پر خود بخود صبر آجاتا ہے دل پُرسکون ہو جاتا ہے۔ فخر محنت کرتا ہے اپنے بیوی بچوں کی جدائی بھی سہتا ہے دن رات ایک کرتا ہے تو پھر کہیں جا کر پھل پاتا ہے۔ اس کی محنت کی نوعیت اور ہے میری اور، بلکہ ہر کسی کی علیحدہ علیحدہ۔ اس میں دوسروں سے حسد کرنے سے فائدہ۔" وہ عفت آرا کو سمجھا رہے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اس پر ان باتوں کا رتی برابر اثر نہیں ہوگا۔ شادی کے پہلے دن سے لے کر آج تک وہ اسے سمجھاتے رہتے تھے مگر اپنی کم مائیگی کا احساس تو اس کے دل سے ایک لمحے کے لیے بھی کم نہیں ہوتا تھا۔ نواز ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں ایس ڈی او تھے اور عفت آرا کے نزدیک ان کی تنخواہ کارپوریشن کے کسی کلرک کے برابر تھی وہ تنخواہ کو محض دس پندرہ دنوں میں اڑا دیتی تھیں۔ نواز ایماندار تھے کافی حد تک۔ مگر اتنے جتنے کہ آج کے دور کا ہر شخص ہے۔ تھوڑا سا جھوٹ۔ تھوڑا سا سچ تھوڑی سی دھاندلی، تھوڑی سی نرمی، ہر شخص کی طرح وہ اپنا حق سمجھتے تھے اور جو تھوڑی بہت مناسب حد میں رہتے ہوئے اوپر کی آمدنی آتی تھی اس سے باقی کے پندرہ بیس دن گزرتے تھے اور ان ہی پندرہ بیس دنوں میں عفت آرا جل جل کر اپنا خون کوئلہ بناتی تھیں۔ پھر بھی تلخی ان کی باتوں ان کے لہجے ان کی سوچ

میں اتر آتی تھی۔ پھر ٹی وی میں آتی ماڈلز اور نمائشی گھروں ان کے رہن سہن سے لے کر پڑوس کے بچوں کے اچھے لباس تک کو دیکھ دیکھ کر وہ ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں اور رعنا سے تو انہیں اس معاملے میں خاص پرخاش تھی، ان کے حساب سے وہ لاکھوں کروڑوں میں کھیل رہی تھی اور دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہی تھی۔ مڈل کلاس سے وہ ایک دم سے اپر ہائی کلاس میں جا پہنچی تھی، جو عفت آرا سے ہضم نہیں ہوتا تھا اور رعنا کی اس دنیاوی جنت کے مزے لینے کے لیے ان کا بھی دل چاہتا وہ مہینہ دو مہینہ بعد ان کے سر پر جا سوار ہوتیں۔ سارا دن وہاں گزارتیں رعنا کا گھر اس کا اعلا اور مہنگا ترین فرنیچر، لگژری رہن سہن نوکر چاکر، رعنا کا لباس، جیولری، دو دو گاڑیاں ہر ہر چیز پر ان کا دل کوئلوں پر پڑے سیخ کباب کی طرح پلٹ پلٹ کر سلگتا رہتا اگرچہ رعنا واپسی پر انہیں سارے تحائف، ان کے کپڑے جوتے جیولری، پرس، بچوں کے کپڑے امپورٹڈ پرفیوم نواز بھائی کے لیے قیمتی سویٹر شرٹس، ٹائیاں اور بہت کچھ لاد کر بھیجتی مگر ان کا دل شاد ہوتا۔ نہ ان کی آنکھ تشکر کے احساس سے چھلکتی بس دل جیسے اور بجھ سا جاتا کہ یہ تو بہت کم ہے میں تو اس سے بھی زائد کی حقدار ہوں۔ نواز کا سمجھانا بجھانا سب بے کار جاتا۔

ان کے دل کی ہوس دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ تو انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ان کے یہ دن پھر جائیں گے۔ اس بات کا انہیں خدا کے وجود سے بھی زیادہ یقین تھا مگر اس وقت تک انہیں صبر نہیں آ رہا تھا دل بے کل بے کل ہو جاتا اور...... اور 'اور' کی پکار کیے ہی جاتا۔ بازار جاتیں بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز میں بکتی قیمتی اور مہنگی ترین اشیاء ان کی حسرتوں کو اور بڑھا دیتیں۔ نواز اسے سمجھاتے کہ تم بازار کم جایا کرو نا ایسا کچھ دیکھو گی نا جی جلے گا نا اس قدر ترس ترس کر نڈھال ہو گا مگر وہ جائے بنا رہ بھی نہ پاتیں۔ ایک دن چھوڑ دوسرے دن بازار نکل جاتیں۔ وہ کبھی اچھرہ یا رنگ محل نہیں گئی تھیں۔ ہمیشہ لبرٹی، پوورا مایا فورٹریس جاتیں، چاہے انہیں ایک رومال ہی کیوں نہ خریدنا ہوتا اور پھر دل میں ہزاروں حسرتیں سمیٹ کر واپس آتیں، فرسٹریشن کا یہ بخار کئی کئی دن ان کے دل سے نہ اترتا، وہ خود کو بھلا بسلا کر تھک جاتیں اور اس دوران گھر میں ہر ایک سے جنگ کرتیں۔ کبھی بچوں کی مار کٹائی اور کبھی نواز سے لڑائی۔ کبھی کام والی کی شامت آتی اس کے ہر کام میں مین میخ نکال کر اسے بھگا دیتیں اور اب تو نواز نے انہیں سمجھانا بھی چھوڑ دیا تھا اور رعنا عفت آرا کی حاسد نظروں سے بہت خوف کھاتی تھی کہ کب بھابی کی حاسد نظر اس کے خوشحال و خوش باش گھر کو نہ لگ جائے۔ وہ عفت آرا کو نظر انداز کرتی تھی۔ اکثر عفت آرا کی آمد کا سن کر کہیں نہ کہیں نکل جاتی۔ مگر عفت آرا اس کے آنے تک چاہے وہ رات گئے آتی گھر ہی میں موجود رہتی۔ رعنا اس بات سے بے حد خائف تھی کئی بار فخر سے کہہ چکی تھی کہ ہم اسلام آباد یا کراچی چلے جاتے ہیں وہاں کم از کم عفت آرا کی زبردستی کی مہمان نوازی سے تو جان چھوٹ جائے گی مگر فخر کا بزنس سرکل ہی لاہور میں تھا وہ کیسے کہیں اور چلے جاتے۔

"اور دیکھو اس بار ہمیں سالگرہ پر بھی انوائیٹ نہیں کیا، حد نہیں ہو گئی۔" عفت آرا نے رنج کا ایک اور پہلو نکالا۔

"بھئی، رعنا نے بتایا تو تھا کہ انہوں نے کسی کو بھی انوائیٹ نہیں کیا تھا۔ گھر میں ہی چھوٹا سا فنکشن کیا تھا سنی کے دوستوں کو بلا کر۔"

"نواز ہم کسی نہیں ہیں۔" عفت آرا نے کسی پر زور دے کر کہا۔

"اچھا تو پھر کیا ہیں۔" وہ جھنجلا کر بولے۔

"معلوم ہے آپ کو اچھی طرح سے پھر بھی۔" ان کا لہجہ حسرت زدہ ہو گیا۔

"اوہو بھئی عفت آرا بس بھی کرو یہ فضول کی ٹینشن حد ہوتی ہے خود اذیتی کی بھی۔" وہ چڑ کر بولے۔

"یہ خود اذیتی ہے کوئی ہمارا اتنا قریبی عزیز ہمیں اس قدر اہم موقع پر اگنور کر دے تو تکلیف نہیں ہوتی۔"

"وہ تو تمہیں ہر غیر اہم موقعے پر بھی ہو جاتی ہے تمہاری تکلیف کون سی نئی ہے۔" نواز کندھے اچکا کر بولے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔

"بھئی یہ دیکھو۔" انھوں نے ہاتھ جوڑے "اب بخشو اس فضول کے ٹاپک کو اور جا کر دو کپ چائے بنا لاؤ۔ چائے پی کر باہر چلتے ہیں آؤٹنگ کے لیے۔ آج پھر تمہارا میٹر الٹا چل رہا ہے شام تک سر پر پٹی باندھ لو گی۔ اس سے بہتر ہے کہ باہر جا کر تازہ ہوا کھا آؤ۔" انھوں نے صلح جو لہجے میں کہا۔

"ہاں ایک تازہ ہوا ہی تو آپ کھلا سکتے ہیں اور ہے کیا آپ کے پاس۔" وہ افسردہ لہجے میں کہہ کر اٹھیں۔

"حد ہے بھئی' ہر بات میں ناشکرے پن کا کوئی نہ کوئی موضوع نکال لیتی عفت آرا! تمہارا بھی جواب نہیں۔" عفت آرا انھیں گھورنے لگیں۔

"اب جاؤ بھی۔ اتنی دیر میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو وہ بے دلی سے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"نین تارا! آخر کیا مسئلہ ہے تم شاہ جی کو کیوں مسلسل نظر انداز کر رہی ہو ہفتہ بھر سے تم نے ان کی کوئی فون کال اٹینڈ نہیں کی اور اب آج پھر ان کا فون آیا اور تم علم ہونے کے باوجود آرام سے کالج چلی گئیں واٹس ناٹ اے رائٹ وے مائی چائلڈ۔" زیور گل اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی برسنے لگی اور وہ جو اپنے بیڈ پر اوندھی لیٹی فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی ایک دم سے اچھل کر سیدھی ہو گئی۔

"توبہ ہے مام! ڈرا دیا آپ نے۔" اس نے دھک دھک کرتے دل پر بے ساختہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اتنا تو دل ہے میری جان کا چڑیا جتنا۔" زیور گل اس کی حالت دیکھ کر ہنسی اور اس کے پاس آ بیٹھی اور پیار سے اس کے چہرے پر بکھری لٹیں درست کرنے لگی۔

"تو اور کیا مام! آپ کو پتا ہے پھر بھی اچانک۔" وہ بچوں کی طرح بسور کر بولی۔

"ڈیئر تمہارے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اس لیے ناک نہیں کیا سوری۔" زیور گل نے اس کا گال تھپتھپایا "اچھا چلو اٹھو شاباش اب اٹھ کر ہاتھ لو فریش ہو جاؤ اور اپنا سب سے اچھا ڈریس پہنو۔" وہ سوچتے ہوئے بولی "جو شاہ جی نے تمہیں لاسٹ ٹائم اسلام آباد سے لے کر دیا تھا سی گرین پر ملٹی کلر کی امبرائڈری والا پہنو وہ تمہیں بہت سوٹ کیا تھا اور خوب جی لگا کر تیار ہونا۔ شاہ جی شام سے پہلے ہی آ جائیں گے اور انھیں احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم پچھلے پورے ہفتے انھیں اگنور کرتی رہی ہو۔" وہ جو دو زانو بیٹھی زیور گل کی باتیں سن رہی تھی سر جھٹکنے لگی۔

"اوں ہوں مام! میرا دل بھر گیا ہے شاہ جی سے مجھے اب وہ اچھے نہیں لگتے۔"

"او یو شٹ اپ ڈارلنگ! ایسے الفاظ تو خواب میں بھی نہیں سوچنا کم از کم ابھی۔ ابھی تو۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر چپ کر گئی۔

"مام شاہ جی بہت خراب ہیں' حد سے زیادہ پوزیسو اور کافی زیادہ Congested mind میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتی۔" اس نے چوکڑی ماری اور پھر سے میگزین اٹھانے لگی۔

"تو نین تارا! شاہ جی اس وقت میرے لیے سب سے اہم ہیں اور میں انھیں کبھی مس نہیں کرنا چاہوں گی۔ وہ پوزیسو نہیں سوبر اور سمجھ دار ہیں اور نوجوانوں کی طرح چھچھورے نہیں میری اتنی ریسپیکٹ کرتے ہیں۔ یو نو اور۔"

"مام! اسی لیے تو لڑائی ہوئی۔" اس زیور گل کی بات کاٹی۔

"کس بات پر؟"

"انھوں نے آپ کی انسلٹ کی تھی کہ آپ مجھے استعمال کرنا چاہ رہی ہیں۔ شاہ جی نے یہ کہا مجھے بے حد برا لگا۔ میں ان سے اس بات پر لڑی' مام شاہ جی کو ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مام! سنگر ہونا کوئی بری چیز ہے آپ تو ملک کی اتنی مشہور سنگر ہیں اور وہ پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ مجھے ان کا انداز قطعاً پسند نہیں آیا۔" وہ غصے میں بول کر چپ کر گئی۔

"کیا کہہ رہے تھے شاہ جی؟" زیور کا لہجہ بے تاثر سا تھا۔

"انھوں نے کہا نہیں۔ بس ان کا انداز ایسا تھا۔" اس نے زور زور سے میگزین کے ورق الٹے۔

"کیسا کیا؟" زیور گل نے ہاتھ بڑھا کر میگزین اٹھایا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔

"کچھ نہیں چھوڑیں مام!" وہ کترانے لگی۔

"بولو نا!"

"مام! یور آرا ے سنگر Not . a Prostitute ہے نا۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جھجک کر بولی۔ اب زیور گل پر خاموشی چھا گئی۔

"بولیں نا مام ایم آئی رائٹ؟" اس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے زیور گل کے گال چھوئے۔

"ہوں!" زیور گل نے کتنی دیر کا رکا ہوا سانس خارج کیا۔

"چھوڑو نین! ایسی بات نہیں کرتے' تم نے خوامخواہ سوچا شاہ جی کا ایسا ہرگز مطلب نہیں ہوگا۔" زیور گل کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"نہیں مام! ان کا یہی مطلب تھا۔" وہ زور دے کر بولی۔

"دراصل ہمارے ہاں ابھی تک سنگر ایکٹریس' ماڈلز اور۔۔۔ اور پھر Prostitute (طوائف) کو ایک ہی کلاس سمجھا جاتا ہے۔"

"ڈیٹس رونگ مام! یہ غلط ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"ہیں یہ صحیح نہیں ہے پھر بھی ایسا سمجھا جاتا ہے گانا اداکاری کرنا یہ تو فن ہے اور اچھا چھوڑو تم یہ فضول بحث ہے۔" اس نے موضوع کو سمیٹا "اور اٹھ کر ریڈی ہو جاؤ۔ شاہ جی شاید دو تین بجے تک پہنچ جائیں گے اور اگر تم ان سے ناراض بھی ہو تو بھی اپنے ناراضی کو کیش کراؤ ان کے سامنے روٹھو تا کہ وہ تمہیں منائیں اور اس صلح کے بدلے میں ان کے ساتھ جا کر کھلے دل سے شاپنگ کر کے آؤ۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور محبت میں یونہی ہوا کرتا ہے۔ اس طرح چھپ کر ان کی فون کالز کو نظر انداز کر کے تم انھیں اور Irritate (غصہ دلانا) کرو گی اور ہم ان کی ناراضی افورڈ نہیں کر سکتے۔ اٹھو میں تمہارے لیے ڈریس نکالتی ہوں۔" وہ وارڈ روب کی طرف بڑھی۔

"مام آج کل آپ ٹی وی نہیں جا رہیں۔"

"ٹی وی پر اب میرا کام ہوتا کون ہے۔ پچھلے ہفتے ایک ملی نغمہ ریکارڈ کرایا تھا اور بس ٹی وی پر آج کل نوجوان نسل کے پاپ سنگرز کا قبضہ ہے ایک دم ہی سے ٹرینڈ بدلا ہے' ہم جیسی لائیٹ سنگنگ کرنے والیاں اب گھروں میں بیٹھی برتن مانجھ رہی ہیں یا شادی بیاہ کے فنکشنز میں بڑے سنگرز کے گائے ہوئے گیت کاپی کرنے کے لیے بلائی جاتی ہیں۔ تارا ڈیئر! اب میرے بزنس میں جان نہیں رہی۔ ہر پروفیشن میں فن بعد میں ہوتا ہے بزنس پہلے فلم والے بھی فریش آواز مانگتے ہیں اور ٹی وی والے بھی۔ حد تو یہ کہ ٹی وی کے لیے معمولی سے اشتہار کے لیے چھوٹا سا جنگل گانا ہو اس کے لیے بھی ینگ لڑکیوں کی ڈیمانڈ ہے۔ ہماری آوازیں بھی اب انھیں بھونڈی' بے سری اور تھکی ہوئی لگتی ہیں۔ ہمارے فن کی طرح آج کل ان طرح دار سنگر لڑکیوں اور لڑکوں کی ڈیمانڈ ہے جو گلے سے گائیکی نہیں کرتے بلکہ بدن سے کرتے ہیں ایڈورٹائزرنگ ایجنسیوں والے بھی کہیں دیکھ کر یوں نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے دیکھا ہی نہیں۔" وہ اس کے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

"بٹ مام یور آرا ے گریٹ سنگر۔ آپ نے اتنے عرصے ٹی وی فلم میں گانے گائے ہیں اور بڑے مشہور پھر اتنی جلدی یہ لوگ آپ کو اگنور کیسے کر سکتے ہیں۔" وہ بیڈ سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"تارا! یہ تو گئے دنوں کی باتیں ہیں اور شوبز میں گیا دن فلم کے پرانے اور گھسے ہوئے ٹیپ کی مانند آتا ہے جسے کوئی بھی دوبارہ ریوائنڈ کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس وقت ہم لوگوں کی ڈیمانڈ تھی ہمارے گانے' ہماری آواز' ہمارا انداز سب پسند کیا جاتا تھا اور اب ہمارے دور کی سہ پہر ڈھل رہی ہے اور ڈھلتے پہر پر کون بھروسا کرتا ہے اب تو شام سر پر ہے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم اپنے فیوچر کو جتنی جلدی ہو سکے محفوظ کر لو۔ وقت کا کچھ بھروسہ نہیں کب

آنکھیں بدل لے۔" اس نے ڈریس منتخب کر کے بیڈ پر رکھا اور اس کے پاس آبیٹھی۔

"مام! میں کیسے محفوظ کرلوں فیوچر کو۔ مجھے تو گانا بھی نہیں آتا بقول آپ کے میری آواز بے سری ہے اور پھر گائیکی اچھے اور خوشحال مستقبل کے لیے بہت سوٹ ایبل نہیں۔ ویسے بس میں آج کل کالج جارہی ہوں۔" وہ بچکانہ لہجے میں بولی۔

"بے وقوف کبھی کالج جا کر بھی کسی کا مستقبل محفوظ ہوا ہے' آج کل کی بے چاری شریف لڑکیاں جو کالج میں پڑھتی ہیں ان کا فیوچر کیا ہوتا ہے' اچھے رشتوں کے انتظار میں لڑکیاں دھڑا دھڑ ایم اے کررہی ہیں اور اچھے رشتے مل بھی جائیں تو وہ صرف ہاؤس وائف ہی بن جاتی ہیں اور یہ کون سا بھلا بہت روشن اور محفوظ مستقبل ہوا جب شوہر کا جی چاہا اٹھا کر بیوی کو استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح ڈسٹ بن میں ڈال لیا۔ چار سال نہیں گزرے بیوی دو بچے پیدا کر کے شوہر کے لیے بالکل Use to قسم کی چیز بن جاتی ہے' جس پر وہ بھولے سے ہی التفات کی نگاہ ڈالنا پسند کرتا ہے۔ کچھ سمجھوتہ کرلیتے ہیں اور کچھ ساری زندگی ادھر ادھر منہ مارتے پھرتے ہیں اور جو بیوی ذرا احتجاج کرے اسے فارغ بھی کردیتے ہیں اور پھر وہ بے چاری ساری زندگی اس کے بچے پالنے میں گزار دیتی ہے یہ ہوتا ہے محفوظ مستقبل۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنسی وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ فیوچر نہیں ہوتا یہ تو بالکل غیر یقینی سا بھروسہ ہے کسی پر' فیوچر وہ ہوتا ہے جو انسان خود بنائے۔"

"وہ کیسے مام!" وہ بھولپن سے بولی۔

"یہ میں تمہیں بتاؤں گی۔ اس فیوچر کا پہلا پڑاؤ شاہ جی ہیں تابندہ! پہلی سیڑھی پہلا قدم کس قدر اہم ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے اور پہلا قدم اگر مضبوطی سے اٹھایا جائے تو پھر میری جان! منزل کو جاتا ہر راستہ آسان ہو جاتا ہے اور تمہیں اپنے رستوں کو یونہی آسان بنانا ہے۔ اب اٹھو جلدی سے تیار ہو کر شاہ جی کو آپ شاندار ویلکم کہو اور آج کی ساری شاپنگ صرافہ بازار سے کرنا۔ کم از کم ایک ڈائمنڈ کا سیٹ' اپنی ناراضی کو کیش کرانا اور کے چلو اب جلدی کرو بارہ تو بج رہے ہیں۔"

"مگر مام! وہ تو مجھ سے شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔" جلد ہی اسے ایک اور یاد آیا۔

"احمق ہم لوگ اگر شادیاں رچانے بیٹھ جائیں پھر ہم میں اور ڈسٹ بن میں پڑی بے چاری گھریلو بیویوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ شادی تمہارا گول نہیں ہونا چاہیے۔ شادی نہیں کرو گی تو ہر روز دلہنوں کے سے ناز اٹھواؤ گی' شادی کرلو گی تو سارا چارم کھو بیٹھو گی۔ جب بھی شاہ جی شادی کی بات کریں' مجھے بتانا میں اگلا قدم بتاؤں گی تمہیں۔ یاد رکھنا شادی ہمارا مقصد نہیں چلو اب اٹھو تیار ہو جاؤ فاسٹ۔" وہ چٹکی بجا کر اسے اٹھانے لگی۔

"مام! مجھے آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ شادی کے بغیر شاہ جی نہیں مانیں گے اور شادی کے بغیر میں ان کو کیسے خوش کرسکتی ہوں۔"

"یہ بھی میں تمہیں بتاؤں گی۔ خوش کرنے کے ایک ہزار ایک طریقے کہ شاہ جی گاؤں کا رستہ بھول جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو ناؤ ہری اپ۔" اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی وہ تا بھی سے زیور گل کو دیکھے گئی۔

"چلو اب بت بنی کیا دیکھ رہی ہو۔ باتھ روم میں گھسو۔" زیور نے اسے باتھ روم کی طرف دھکیلا اور خود باہر نکل گئی۔

"کیا شاہ جی سچ کہہ رہے تھے کہ مام میرے دام وصول کرنا چاہ رہی ہیں۔ مجھے پہلے بھی کچھ شک تھا اور اب ان کا انداز مجھے اچھا نہیں لگ رہا اور شاہ جی سچ کہہ رہے تھے کہ یہ کیا ہیں۔ اس طرح تو مام مجھے بار بار Use کریں گی پہلے شاہ جی پھر کوئی پھر کوئی اور۔" وہ باتھ روم کے آئینے کے سامنے کھڑی سوچے گئی۔

"نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں خود کو اس طرح استعمال نہیں ہونے دوں گی نیور۔" اس نے خود کو دلاسہ دیا اور شاور کھولنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥
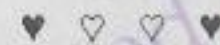
اسے یہاں کون چھوڑ کر گیا تھا اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کے ماں باپ کون تھے کہاں تھے یا ماں باپ کیا ہوتے ہیں اسے کچھ پتا نہیں تھا اور آج سے پہلے اس نے ان سوالوں پر کبھی غور نہیں کیا تھا بس اسے لگتا تھا کہ وہ بس سائبان میں پیدا ہوا ہے۔ پہلے وہ سائبان کی جونیئر برانچ میں تھا جہاں اس جیسے چھوٹے چھوٹے بے شمار بچے اور بچیاں تھیں۔ چھ سال تک وہ وہاں رہا تھا نہیں بلکہ بیچ میں ڈیڑھ سال اس نے سائبان سے باہر گزارا تھا اور ان اٹھارہ ماہ میں اسے ایک بار بھی سائبان کی یاد نہیں آئی تھی۔ کیا نام تھا ان کا اس نے سوچنا چاہا اسے یاد نہیں آیا ہاں ان دونوں کے ہلکے سے ہیولے اسے یاد تھے۔

مرد سانولا تھا۔ اونچا لمبا جیسے جٹ ہوتے ہیں اور عورت خوب موٹی تازی اور گوری چٹی تھی۔ وہ سفید رنگ کی گاڑی میں تین بار سائبان آئے تھے اس کی عمر اس وقت ڈھائی تین سال یا اس سے کچھ اوپر ہوگی دوسری بار جب وہ سائبان آئے تو اس روز وہاں کے سارے چھوٹے بچے جو اس کے ہم عمر تھے کو اچھے کپڑے پہنا کر باری باری ان کے سامنے لے جایا گیا تھا۔ عورت نے اسے پسند کیا تھا' مرد نے عورت کی رضا پا کر چوں نہیں کی تھی' دونوں سائبان کے ناظم صاحب کے آفس چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ اسے اپنے ساتھ اسی سفید لمبی سی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ سائبان سے باہر لمبی سی شفاف سڑکوں پر وہ گاڑی یوں دوڑ رہی تھی جیسے بطخ نرم پانیوں پر روانی سے تیرتی ہے۔ اس نے اپنے ہوش میں پہلی بار گاڑی کا سفر کیا تھا۔ وہ عورت راستہ بھر جھک جھک کر اس کا جائزہ لیتی رہی تھی کبھی اس کی آنکھیں' کبھی رنگت اور کبھی اس کی صحت کو اپنے شوہر سے ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ بار بار اسے یوں جانچ رہی تھی کہ اس کو اپنانے کا فیصلہ کر کے اس نے کوئی غلطی تو نہیں کی گاڑی ایک خوب صورت سے گھر میں داخل ہوئی تھی اور اس گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے اس کے لیے زندگی کا مفہوم یکسر بدل گیا تھا وہ ایک دم سے بے حد اہم ہو گیا تھا۔

شام کو دونوں میاں بیوی اسے بازار لے گئے تھے' اس کے لیے مہنگے ترین شاپنگ سینٹر سے بہت سارے کپڑے جوتے کھلونے اور ابتدائی قاعدے خریدے گئے تھے۔ پھر اسے آئسکریم کھلائی گئی تھی۔ اب وہ عورت مطمئن تھی کافی حد تک خوش بھی' صبح کی طرح غیر مطمئن اور الجھی ہوئی نہیں تھی اس کا شوہر بھی خوش تھا پھر اگلے سات ماہ اس کی زندگی کے حسین ترین دن تھے جو اس کی یادوں ـــــ میں ایک رنگین جھولا تھا جس میں وہ اب بھی کبھی کبھار جھولا کرتا تھا۔ صبح اس کا ناشتہ' دودھ جوس' فروٹ' مارملیڈ' جیم جیلی' انڈے' فرنچ ٹوسٹ اور نہ جانے کیا کیا ہوتا تھا۔ اسے ایک مانٹیسوری میں داخل کرا دیا گیا تھا جہاں وہ عورت اسے خود چھوڑنے جاتی تھی اور خود ہی لے کر آتی۔ دوپہر لنچ اس کی پسند کا ہوتا وہ عورت اکثر اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ان دونوں کے کہنے پر وہ انہیں مما پاپا کہنے لگا تھا۔ اس پورے گھر میں اب اس کا راج تھا۔ اس کا کمرہ اسی طرح سجا ہوا تھا جیسے ٹی وی اور فلموں میں بچوں کے کمروں کو سجا ہوا دکھاتے ہیں۔ اس کے کمرے میں بے تحاشا کھلونے تھے بہت سارے تو مما پاپا نے خریدے تھے اور کافی اسے گفٹ ملے تھے۔ معاذ کو ایڈاپٹ کرنے کے بعد انہوں نے اپنے گھر میں بہت بڑا فنکشن کیا تھا۔ اس گیٹ ٹوگیدر میں انہوں نے معاذ کو اپنے بیٹے کے طور پر متعارف کرایا تھا۔ مہمان اس کے لیے ڈھیر سارے گفٹس لائے تھے' وہ بہت خوش تھا اس کے ڈھیر سارے کزنز دریافت ہوئے تھے ان سب کا تعارف مما نے اس لیے کرایا تھا وہ سب اس سے بظاہر خوشی خوشی ملے تھے مگر اندر سے کوئی بھی خوش نہ تھا۔ اس کا پتا اسے رات کو مما پاپا کی گفتگو سے چلا' وہ سب اس سے جیلس تھے کہ ایک انجان خون کو انہوں نے اپنا وارث بنا دیا ہے۔ اس بات پر پاپا کے قریبی عزیز' ان کے بہن بھائی وغیرہ بے حد ناخوش تھے۔ مگر ان دونوں کو اس کی قطعاً "پروا" نہیں تھی۔

مگر اس کی خوشیوں کے دن بے حد مختصر تھے۔ صرف چھ ماہ اس دوران وہ مما پاپا کے ساتھ مری' بھوربن اور ایبٹ آباد بھی گیا تھا۔ جہاں بے حد ٹھنڈ تھی' اے سی کے بغیر بھی۔ اسے بے حد مزہ آیا وہ مال روڈ پر مما کی انگلی چھوڑ کر ان کے آگے بھاگ بھاگ جاتا تھا اور مما فکر مندی سے بار بار آواز دے کر اسے واپس آنے کو کہتیں' پھر مری ہی میں آخری روز مما کی طبیعت خراب ہو گئی۔ پاپا بے حد پریشان تھے وہ دونوں ڈاکٹر کے پاس گئے اور جب

واپس آئے تو اپنے ساتھ اس کے لیے بہت بڑی تبدیلی لائے۔ پپا بے خوش تھے وہ باقاعدہ شور مچاتے تھے۔ بار بار مما سے لپٹ رہے تھے۔ مما کی خوشی شرمیلی سی تھی ان کی رنگت خوامخواہ سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ معاذ کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے نیند آ رہی تھی وہ مما کے ساتھ سونا چاہتا تھا جب اس نے مما کو اپنے ساتھ لیٹنے کی ضد کی تو پپا نے پہلی بار اسے بری طرح ڈانٹا تھا۔ مما نے انہیں ٹوکا تو بھی وہ اسے غصے سے گھورتے رہے تھے۔ پھر مری سے آنے کے بعد اس کی زندگی کی کایا ایک بار پھر سے پلٹ گئی مما کا رویہ اس سے کافی بدل گیا تھا پپا تو سفر کے دوران ہی اس سے بے زار ہو چکے تھے اور اب تو وہ اسے بلانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، وہ اس کی ہر بات پر اسے خوامخواہ ڈانٹ دیتے تھے وہ مما سے کوئی ضد کرتا، مما بیزار سی ہو جاتیں۔ وہ تو اب اسے اسکول چھوڑنے اور لینے بھی نہیں جاتی تھیں۔ نا اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں، نا اس کے کپڑے بدلتیں، نا اسے باہر لے کر جاتیں دونوں خود ہی شام کو باہر چلے جاتے۔ کبھی کبھار اسے بھی لے جاتے مگر سارے راستے اس سے اجنبی بنے رہتے۔ وہ ان کے ڈانٹنے کی وجہ سے بے حد سہما رہتا تھا۔ اسے پپا سے بے حد ڈر لگتا تھا، مما سارا وقت اپنے کمرے میں آرام کرتیں اسے ان کے کمرے میں جانے کی بھی اجازت نہ تھی۔

اور آخر ایک روز مما کو پپا ہاسپٹل لے گئے۔ وہ مما کی خراب طبیعت دیکھ کر رونے لگا تھا۔ اس نے دل سے ان کی صحت یابی کی دعا کی تھی۔ مما دو دن ہاسپٹل رہی تھیں اور جب واپس آئیں تو ان کے ساتھ دو کانچ کے کھلونے تھے ایک گڈا، ایک گڑیا، دونوں بے حد سرخ و سفید اور خوب صورت تھے۔ سارے گھر میں جیسے بھونچال آ گیا مٹھائیاں تقسیم کی گئیں ہر طرف فون کھڑکائے گئے، سارا دن مبارکباد کے لیے لوگ آتے جاتے رہے۔ اتنی گہماگہمی میں وہ کہیں چھپ ہی گیا اب تو وہ کسی کو بھی یاد نہیں تھا مما اپنے کمرے میں ان دونوں کے ساتھ لیٹی رہتیں، پپا ہر وقت مما کے کمرے میں اور نوکروں کی دوڑیں لگی رہتیں۔ اسے نہ وقت پر کھانا ملتا نہ صاف ستھرا لباس، مالکوں نے آنکھیں بدلیں تو ملازموں کے تیور بھی اس سے بدل گئے۔ وہ ایک بار جب سب گھر میں نہیں تھے مما کے کمرے میں گیا اس نے ان دونوں بچوں کو پیار کرنا چاہا، مما نے سہولت سے اسے کمرے سے جانے کو کہہ دیا، وہ کمرے میں آ کر کتنی دیر روتا رہا۔

پھر اسی گھر میں اس کے باقی کے دن بے حد دشوار گزرے تھے۔ سائبان سے بھی زیادہ، پپا اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی خوامخواہ چڑ جاتے۔ مما اسے دیکھ کر نظرانداز کر دیتیں۔ ان کا سارا ٹائم ان دونوں کی دیکھ بھال میں گزر جاتا۔ ان کا کمرہ ننھے ننھے کھلونوں سے بھر گیا تھا۔

ایک روز جب مما چھوٹے کا دودھ لینے کے لیے بوا کو کہنے گئیں تو معاذ نے روتے بچے کو اٹھانا چاہا، وہ جھک کر اٹھا ہی رہا تھا کہ ایک دم سے پپا نے اسے پیچھے سے جھڑک کر آواز دی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" چھوٹا اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا تھا، پپا نے اس کی وہ پٹائی کی کہ جو سائبان کے ناظم نے بھی کبھی نہ کی ہوگی۔

نتیجتاً دوسرے دن وہ اسے واپس سائبان چھوڑ گئے۔

اس وقت کی بات کچھ اور تھی، وہاں سے نکل سائبان واپس آ گیا مگر اب کہاں جائے گا۔ اس کا تو کوئی جاننے والا بھی نہیں اس چار دیواری سے باہر۔ اس نے کروٹ بدلی اور سائبان واپس آنے کے بعد کتنی راتیں اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا تھا، اسے وہ عالی شان گھر بے حد یاد آتا تھا۔ وہاں کی آسائشیں اور اعلا رہن سہن اور یہاں کی ٹوٹی پھوٹی بان کی چارپائیاں اور گندے بستر، اسے کئی راتیں نیند نہیں آئی تھی اور روزانہ گدلے پانی جیسی دال دیکھ کر اسے ابکائی آ رہی تھی، سائبان کا عملہ اور دوسرے بڑے بچے اس کا مذاق اڑاتے رہتے تھے بشیر چچا ہنستا۔

"جب گدھی تھانے سے ہو آئے پھر گدھیوں میں نہیں ملتی، اب ان حضرت کے بھی مزاج نہیں مل رہے، دال حلق میں اٹکتی ہے کیا بات ہے بھئی۔" اور وہ محض دل مسوس کر رہ جاتا زندگی نے بڑا دکھ دینے والا مذاق کیا تھا جس کی شکایت وہ کسی سے بھی نہیں کر سکتا تھا اور تھا بھی کون جو سنتا۔

آہستہ آہستہ وہ پھر سے سائبان کا عادی ہو گیا، وہاں کا کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا اب اسے ناگوار نہیں گزرتا تھا اس نے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر ایک بات پر وہ اڑ گیا تھا ناظم صاحب سے کہ وہ ضرور پڑھے گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ صفائی کی ڈیوٹی بدلوا کر اس نے شام کو کروائی اور سب سے مشکل کہ یتیم خانے کے دوسرے بچوں کے ساتھ صاحب حیثیت لوگوں کے در کھٹکھٹا کر کھانا لے کر آنا جس کھانے میں بوٹیاں زیادہ ہوتیں وہ خود بخود ناظم صاحب کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ دوسرا سارا عملہ آپس میں تصفیہ کر لیتا اور بچوں کے حصے میں پھر وہی پانی جیسی دال آتی۔

کبھی کبھی کوئی صاحب ثروت گوشت چاولوں کی دیگ پکا کر یتیم خانے دے جاتا تو اس روز وہ سب بھی یہ نعمتیں کھا لیتے ورنہ سال کے تین سو پینسٹھ دن دال سلامت۔

وہ صبح کو یتیم خانے کے چند بچوں کے ساتھ سرکاری اسکول جاتا۔ دوپہر سے شام تک کچن میں کام کرواتا اور رات کو بستر بچھاتا اب اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا اور پھر رات کو جب جسم تھکن سے ٹوٹ رہا ہوتا اور ہال کمرے میں تمیں بچوں کی چارپائیاں دو قطاروں میں بچھی ہوتیں اور سب رات کے پہلے پہر ہی ناظم صاحب کے مولا بخش سے ڈر کر سو جاتے تو وہ چپکے سے کتابیں لے کر باہر کھلے صحن میں لگے پول کی جلتی روشنی میں پڑھنے کے لیے آ جاتا۔ شروع شروع میں سارا عملہ اس کا مذاق اڑاتا تھا مگر وہ اپنی اس ضد پر مستقل مزاجی سے قائم رہا۔ چند دنوں بعد ان کا مذاق ختم ہو کر مدح سرائی میں بدل گیا۔ سب اس کی محنت کو سراہنے لگے اور اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہر سال کلاس میں اول آنے لگا اور اب پرسوں پھر رزلٹ ہے، نا معلوم کیا ہو، کتنے مارکس آئیں۔ اللہ میاں مجھے آسانی سے کالج میں ایڈمیشن مل جائے۔

ساری باتیں بھول کر وہ دعا میں مشغول ہو گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"کیا ہوا؟" تخت پر بیٹھی کلام پاک کی تلاوت کرتیں اماں اس کی چیخ پر ایک دم سے گھبرا گئیں، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔ اس کا سارا چہرہ پسینے سے تر تھا اور جسم ابھی بھی ہولے ہولے کپکپا رہا تھا، اس نے اجنبی نگاہوں سے اماں کو دیکھا۔

"آمنہ، آمنہ بیٹی! کیا ہوا؟" اماں اس کے پاس آ کر اسے محبت سے ہلاتے ہوئے بولیں۔

"ج۔ جی۔" اس نے پلکیں جھپکیں تو جیسے سارے ساکن منظر میں جان پڑ گئی۔

"ک۔ کچھ نہیں۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں ٹالنا چاہا۔

"خواب میں ڈر گئی ہو؟" وہ اس کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

"ہاں اماں! بڑا عجیب خواب تھا۔" اس نے کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔ "اماں! تیسری بار آیا ہے یہ خواب مجھے۔"

"ہزار بار سمجھایا ہے کہ بیٹا فجر کی نماز پڑھ کر مت سویا کرو، بڑے اوٹ پٹانگ خواب آتے ہیں اور نحوست بھی پھیلتی ہے گھر میں اور رزق سے برکت بھی اٹھ جاتی ہے اور صوفی صاحب الگ خفا ہوتے ہیں۔ تمہاری اس عادت سے۔" اماں نے ہزار بار کی دہرائی ہوئی نصیحت پھر اس کے کانوں میں انڈیلی۔

"اہں آہم۔" صوفی صاحب کھنکارتے ہوئے بیرونی دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئے۔ آمنہ نے جلدی سے دوپٹہ کھول کر سر اور سینے کو ڈھانپا۔

"کیا ہوا رابعہ بی بی اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟" وہ اماں کو افسوس کی حالت میں بیٹھے دیکھ کر بولے۔

"کچھ نہیں صوفی صاحب! یہ آمنہ خواب میں ڈر گئی تھی۔ اسے ہی سمجھا رہی تھی کہ فجر کے بعد مت سویا کرے۔" وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"کیوں آمنہ بیٹا! تمہاری یہ عادت ختم کیوں نہیں ہوتی۔ اس سے نحوست پھیلتی ہے اور گھر میں برکت نہیں رہتی اللہ تعالیٰ خفا ہوتا ہے، رزق بانٹنے والے فرشتے منہ موڑ کر چل دیتے ہیں اور یوں خدا کی رحمت ٹھکرانا اچھی بات نہیں ویسے بھی دن چڑھے کے خواب، جھوٹے اور انسان کی قوت متخیلہ کا من گھڑت شاہکار ہوتے ہیں اس

لیے ڈراتے ہیں ان پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔" وہ اس کے قریب پڑے موڑھے پر بیٹھ گئے۔

"بابا صاحب! بڑا عجیب خواب تھا۔" وہ دھیمی آواز میں نظریں جھکا کر بولی۔

"خواب تو بیٹا بس دو طرح کے ہوتے ہیں نیک اور بد' نیک تو سب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں انسان کی زندگی میں مبارک لمحوں کی آمد کا پتا دیتے ہیں اور میرے پیارے آقائے دوجہاں کا فرمان ہے کہ نبوت کے چالیس حصوں میں سے ایک حصہ اچھے اور نیک خواب ہیں اور آپ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا ہاں اچھے اور نیک خواب ہوں گے جو کہ بشارت کا درجہ رکھیں گے۔

اور رہ گئے برے خواب وہ یا تو معدے کی گرانی کی وجہ سے ہوتے یا پریشان خیالی کی وجہ سے اور اگر یہ دونوں وجوہ نہ ہوں تو پھر یہ شیطان کے بہکاوے اور اس کے ڈراوے ہوتے ہیں جو انسانی ذہن میں واہمے اور وسوسے پیدا کر کے اسے منتشر کرتے ہیں۔ ایسے خواب دیکھو تو بائیں طرف تھوک کر اعوذباللہ پڑھو اور لاحول ولا قوت پڑھو' کیسی کو سنانے کی ضرورت نہیں۔"

اسے بچپن سے بہت خواب آتے تھے اور جب بھی وہ خواب سنانے کی کوشش کرتی صوفی صاحب اسے یہ ہی نصیحت سنایا کرتے۔ اس کا خواب نہیں سنا کرتے تھے کہتے تھے کہ اچھے خواب مبارک ہوتے ہیں اسے خود تک محدود رکھو یا پھر اسے سناؤ جو اللہ کے حکم سے ان معاملوں میں کچھ سوجھ بوجھ رکھتا ہو اور برے خوابوں کو شیطانی وسوسے سمجھ کر بھول جاؤ۔

"بابا صاحب! بہت عجیب خواب تھا۔" وہ ابھی تک خواب کے سحر میں تھی۔

"ہو گا' یقیناً" ہو گا پر بیٹا جو میں نے کہا ہے کہ دن میں آنے والے خواب جھوٹے اور محض ذہن کو پریشان کرنے والے ہوتے ہیں' ان کو ذہن پر سوار نہیں کرنا چاہیے۔ چلو اٹھو شاباش اٹھ کر وضو کرو اور دو نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے سکون کی دعا مانگو۔"

"جی اچھا" کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رابعہ بی بی! ناشتہ اگر تیار ہو تو لے آئیں' مدرسے کا ٹائم ہو چلا ہے۔ بچے پڑھنے کے لیے آ چکے ہیں۔" انہوں نے برآمدے میں چولہے کے آگے بیٹھی اماں سے کہا۔

"بس صوفی صاحب تیار ہے لا رہی ہوں۔" وہ چائے مٹی کے بڑے پیالے میں [illegible] ہوئے بولیں۔

"زینب اور جویریہ کدھر ہیں؟" وہ اندر کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"جویریہ اسکول کے لیے تیار ہو رہی ہے اور زینب میری قمیص کی سلائی کر رہی ہے۔"

"ہوں!" وہ ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی داڑھی میں خلال کرنے لگے' آمنہ وضو کر کے اندر کمرے کی طرف جانے لگی۔

"عبدالمبین آج آئے گا مدرسے۔"

"جی صوفی صاحب! آج اتوار ہے نا بس آنے ہی والا ہو گا۔" اماں ناشتہ ان کے آگے تپائی پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"وہ آئے تو تم بھی اسے سمجھانا وہ حفظ قرآن میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ اس کے قاری صاحب نے اس کی شکایت بھیجی ہے' یہی حال اس کا ادھر تھا اس لیے میں نے اس ناخلف کو قاری عبدالحفیظ کے مدرسے میں بھیجا کہ وہ بچوں کو قرآن حفظ کرانے کے ماہر ہیں مگر وہاں جا کر بھی اس نے اپنی روش نہیں بدلی' میں ابھی اس کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ خود ہی سنبھل جائے جس روز معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا تو پھر کام خراب ہو جائے گا یہ تمہیں معلوم ہے۔" غصے سے ان کا باریش چہرہ سرخ ہو گیا۔

"جی!" وہ سر جھکا کر ادب سے بولیں۔

وہ خاموشی سے بسم اللہ پڑھ کر ناشتہ کرنے لگے' وہ باادب ان کے پاس بیٹھی رہیں۔

"عبدالمتین نے کب آنا ہے شہر سے؟"

"شاید اگلے ہفتے آئے اس کے بعد تو اس کے امتحان شروع ہو جائیں گے۔" وہ اسی مئودب لہجے میں بولیں۔

"آمنہ آٹھویں کی تیاری کر رہی ہے۔ اگلے ماہ امتحان ہیں اور اسے پرائیویٹ طور پر بیٹھنا ہے اس میں۔" انہوں نے پیالہ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔

"جی کر رہی ہے۔"

"وہ صوفی صاحب!" وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گئیں۔

"ہاں کہیے کیا بات ہے۔" انہوں نے نوالہ چائے میں بھگویا۔

"عبدالمبین اسکول جانا چاہتا ہے۔" وہ ڈر ڈر کر نیچی نگاہوں سے بولیں۔

"جب اسکول بھیجتا تھا تو اسے وہ دشوار تھا۔" وہ گرجے آمنہ نفل ادا کر کے برآمدے میں آ گئی۔

"اور اب یہ اللہ کا کلام دشوار ہے اسے' رابعہ بی بی! میری ایک بات سن لیں۔ آپ کا یہ ہونہار سپوت کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ صرف شیطانی خرافات میں پڑنا چاہتا ہے۔ عبدالمتین بھی تو ہے پہلے قرآن حفظ کیا حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اب ایف اے کا امتحان دے رہا ہے۔ آمنہ اس سال مڈل کا امتحان دے لے گی اور زینب اگلے سال' جویریہ اس سال پرائمری پاس کرے گی۔ ساتھ میں تینوں نے قرآن اور حدیث کی تعلیم بھی لی ہے مگر تمہارا یہ لاڈلا کچھ نہیں کرے گا۔ یہ تم مجھ سے لکھوا لو۔ یہ صرف اور صرف میرا نام ڈبوئے گا۔ صوفی عبدالرحمٰن' باقی اللہ کا نام ڈبوئے گا یہ میرے باپ دادا کی کمائی ہوئی عزت کو مٹی میں ملائے گا۔ یہ بات تم میری لکھ لو یہ دنیا میں صرف یہی خباثت دکھانے کے لیے آیا ہے۔ یہ شیطان کا چیلۂ خاص بنے گا' اسی لیے میں نے اسے اسکول سے ہٹا کر اس نیک رستے پر ڈالا ہے کہ شاید خدا اس کے دل میں نیک خیالات کو جگہ دے مگر ایسا ہونا بے حد مشکل لگ رہا ہے مجھے۔ اس کے خیالات بہت کمزور اور ایمان کمزور تر ہے۔ یہ بہت جلد شیطان کے ہتھے چڑھ کر اس کا آلۂ کار بن جائے گا اور میں اپنے مالک سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس دن کے دکھانے سے پہلے اس جہان فانی سے اٹھا لے۔" انہوں نے غصے سے کہتے ہوئے دونوں ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف اٹھائے اور ناشتہ ادھورا چھوڑ کر عمامہ درست کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

"صوفی صاحب ناشتہ۔" اماں صرف اتنا ہی کہہ سکیں۔

اور صوفی صاحب کی پیشین گوئی پر یہ گاؤں ہی نہیں دور دراز کے علاقوں کے لوگ بھی یقین رکھتے تھے۔ آمنہ کا دل آنے والے وقت کے خوف سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور اماں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف منہ کر کے اللہ سے اس برے وقت سے پناہ مانگنے لگیں۔

پناہ کی دعا مانگنا ہمارا کام ہے' اور پناہ دینا یا نہ دینا اس کی مرضی!

● ● ● ● ●

"السلام علیکم بابا جان! آپ نے مجھے بلایا۔" سید سلطان بخت نے کمرے میں داخل ہو کر سید سبطین شاہ کو سلام کیا جو بیڈ پر اپنے آگے رکھے زمینوں کے بہی کھاتے جانچ رہے تھے۔

"ہاں ہاں۔ آؤ سلطان بخت! بھئی تمہیں لاہور سے آئے چار دن ہونے کو آئے اور اس دوران صرف دو بار تم نے مجھے اپنی شکل دکھائی' وہ بھی میرے بلانے پر۔ آخر ایسی کون سی مصروفیت ہے کہ تمہیں باپ سے ملنے کا بھی ٹائم نہیں ملتا۔" انہوں نے بہی کھاتہ ہاتھ سے پرے کھسکاتے ہوئے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ انہوں نے سلطان بخت کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارا کیا وہ ان کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"سوری بابا جان! ایسی تو کوئی خاص مصروفیت نہیں' کام کی تھکن اور کچھ سفر کی تھکاوٹ اس بار نہ جانے کیوں زیادہ ہو گئی جس کی وجہ سے ہلکا سا ٹمپریچر فیل ہو تا رہا ہے' اسی لیے دو ایک دن تو مکمل بیڈ ریسٹ ہی کرتا رہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں بھی حاضر نہیں ہو سکا۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کچھ شرمندگی سے بولے۔

"تم نے مجھے کیوں نہ بتایا ڈاکٹر کو بلوا کر چیک اپ کرایا؟" وہ ایک دم سے ان کے لیے متفکر ہو گئے۔ "اسی لیے چہرہ بجھا ہوا ہے اور مجھے تو کچھ کمزور بھی لگ رہے ہو۔ کیا ضرورت ہے اس قدر کام کو سر پر سوار کرنے کی۔" ہمیشہ کے وہی بابا جان گھبرا اٹھے ان کی صحت و سلامتی میں تو ان کی جان اٹکی تھی۔

"بابا جان! ایسی کوئی بات نہیں۔ یونہی ذرا موسم بدل رہا ہے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے چھوٹی چھوٹی تکالیف کے لیے ڈاکٹر بلانا مجھے پسند نہیں' اسی لیے آپ کو نہیں بتایا تھا کہ آپ خوامخواہ فکر مند ہوں گے۔" وہ محبت سے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولے۔

"سلطان بخت! تم میں میری جان اٹکی ہے اور یہ وہم نہیں حقیقت ہے اور انسان حقائق کے بارے ہی میں فکر مند ہوتا ہے۔ واہموں اور وسوسوں کو جھٹکا جا سکتا ہے۔ حقائق سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔" وہ اس کے ہاتھوں کو لبوں سے چھوتے ہوئے گہری محبت سے بولے۔

"اوہ بابا جان! میں بچہ نہیں ہوں اب۔" وہ یونہی ہنس دیے۔

"یہ بات تم — کہہ سکتے ہو' میں نہیں۔" وہ سرہانا گراں ہی کے انداز میں بولے۔

"اچھا چھوڑیں ان باتوں کو' یہ بتائیں کہ مجھے کیوں بلایا تھا آپ نے۔"

"سلطان بخت! زمینوں کی طرف دھیان دیا کرو۔ ان کے حساب کتاب اب میرے بس کی بات نہیں رہے۔ کچھ عمر کا تقاضا بھی ہے کہ بہت کام اب مجھ سے نہیں ہوتا' اس لیے جلد تھکنے لگتا ہوں۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تم اب ان کاموں میں دلچسپی لو۔ ان کے بارے میں تمہیں سب علم ہونا چاہیے کہ کہاں پر کیا ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے اس سال میرا حج پر جانے کا پروگرام ہے۔ انشاءاللہ اگر میرے اللہ کو منظور ہوا تو پھر وہاں کچھ عرصہ رہوں گا۔ تمام مقدس مقامات کی جی بھر کر زیارت کروں گا۔ اسی میں مجھے چار پانچ ماہ کا عرصہ لگ جائے گا پھر واپسی پر یو کے جانا ہے بائی پاس کے لیے اور اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ خدا جانے واپس آنا نصیب ہو یا نہیں۔ اس لیے اب تم سب کچھ سمجھ لو تاکہ میرے بعد اچھی طرح سنبھال سکو۔" وہ دھیرے دھیرے ان کا ہاتھ تھپتھپا رہے تھے۔

"پلیز بابا جان! ایسی باتیں نہ کریں اور بائی پاس آج کل کون سا ہوا ہے۔ ہر دوسرا بندہ کروا رہا ہے اور اللہ کے فضل سے آپ کا آپریشن بھی کامیاب ہو گا اور آپ ہنستے کھیلتے واپس آئیں گے یہ سب کچھ سنبھالنے۔ مجھے ابھی ان کاموں کی سمجھ نہیں۔ مجھے ان میں نہ الجھائیں۔"

"نہ سلطان بخت! ایسی باتیں نہ کرو۔ زندگی اور موت کے بہی کھاتے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ہم اس کے بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے اور تمہیں ایک نہ ایک دن ان کاموں میں الجھنا ہی ہے تو ابھی سے کیوں نہیں۔ اب تم باقاعدگی سے زمینوں پر جایا کرو' مزارعوں سے ملو جلو۔ ان سے واقفیت پیدا کرو۔ ان زمینوں سے محبت کرو گے تو یہ بھی تم سے محبت کریں گی۔ کاٹن مل کا تو پورا ہولڈ تمہارے پاس ہے۔ اس کی تو مجھے فکر نہیں۔ شہرینہ کے نام جو گلاس فیکٹری ہے وہ بھی تمہارے انڈر کنٹرول ہے اور لاہور میں دونوں فرمز کی دیکھ بھال تمہارے ذمے ہے، جو تم بڑی اچھی طرح سے نبھا رہے ہو۔ ان کی تو مجھے فکر نہیں۔ بزنس کو تم مزید پھیلانا چاہو تو پھیلاؤ' اسی کو اچھی طرح سے چلانا چاہو تو بھی کچھ حرج نہیں کہ انسان کو کثرت کا لالچ کہیں کا بھی نہیں رہنے دیتا۔ بس اب زمینوں کی طرف دھیان دو۔ ان سب کے وارث اب تم ہی ہو۔" ان کا سانس پھولنے لگا۔

"بابا جان! فار گاڈ سیک۔ زمینوں کے بکھیڑے میری سمجھ میں نہیں آتے۔ آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جاؤں گا۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سمجھو گے تب نا جب یہاں رہو گے۔ تمہیں تو شہر کی ہوائیں اشارہ بھی کرتی ہیں تو تم اڑتے ہوئے جاتے ہو۔" انہوں نے سلطان بخت کی بیزاری پر تپ کر کہا۔ سلطان بخت نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کچھ تھا جس نے سلطان بخت کو مضطرب سا کر دیا۔ وہ کرسی کی پشت پر خوامخواہ ہاتھ پھیرنے لگے۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی جو کم از کم سلطان بخت کے لیے معنی خیز تھی۔

"بابا جان! کام ہی سے تو جاتا ہوں نا۔" کافی دیر بعد وہ پست آواز میں محض یہی کہہ سکے۔

"خدا کرے تم کام ہی سے جاتے ہو۔" ان کی آہ میں بہت کچھ تھا "سلطان بخت! کچھ بھی کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تم احمد پور شرقیہ کے گدی نشین ہو۔ کیا یہ کام تمہیں زیبا ہے؟ اپنے خاندانی وقار اور منصب سے کبھی نظر نہ چرانا ورنہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا نہ کردار کی ضمانت نہ آباء کی کمائی ہوئی عزت۔"

ان کے جملے چھری کی طرح سلطان بخت کو چیر گئے۔ کیا ان کو سب خبر ہے۔ انہوں نے ٹٹولتی نظروں سے سبطین شاہ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور کچھ کچھ افسردگی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سلطان بخت کچھ اندازہ نہ لگا سکے۔

"بابا جان! آپ کو مجھ پر شک ہے کوئی۔" وہ آہستگی سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"سلطان بخت! یہ جو والدین ہوتے ہیں' یہ قدرت کی بڑی انوکھی مخلوق ہوتی ہے' ان کو قیاس' گمان' شک' خیال سے کچھ غرض نہیں ہوتی' اپنی اولاد سے متعلق تو ان کے اندر یقین کا جہان آباد ہوتا ہے۔ تمہارا ہر اٹھتا ہوا قدم مجھے بتا دیتا ہے کہ یہ کس سمت کو گامزن ہو گا۔ تمہاری ہر نگاہ مجھے ایک پل میں تمہارے اندر کا سارا احوال سمجھا جاتی ہے۔ میری ٹانگوں پر کمبل ڈال دو۔"

انہوں نے ہی کھاتے پرے کھسکائے اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ سلطان بخت نے اٹھ کر بیڈ کی پائنتی پر پڑا کمبل ان کی ٹانگوں پر پھیلا دیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کمبل سینے تک اوڑھ لیا۔ نیلے سمندر کے جھاگ جیسے کمبل سے نکلا ان کا چہرہ یکدم بوڑھا بوڑھا سا لگنے لگا تھا۔

"بہر حال' آج میں نے تمہیں ان باتوں کے لیے بھی بلایا تھا مگر سب سے ضروری بات ابھی رہتی ہے۔" ان کی نظریں اب بالکل سادہ ہو گئی تھیں۔ سلطان بخت کا سانس جیسے بحال ہونے لگا۔

"کل سیدہ آرہی ہے پرسوں ہم بھائی صاحب کی طرف شادی کی تاریخ لینے جائیں گے۔ میری کوشش ہو گی کہ تاریخ اسی ماہ کے آخر کی ہو یا پھر اگلے ماہ کے شروع کی۔ بہت لمبے دن میں نہیں ڈلواؤں گا۔" ان کا انداز سلطان بخت کو مطلع کرنے کا سا تھا' اصلاح لینے کا نہیں اور ویسے بھی وہ اپنے طے کردہ حتمی فیصلوں پر کسی کی صلاح نہیں لیتے تھے۔

"بابا جان! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" انہوں نے کرسی پر پہلو بدل کر کچھ اونچی آواز میں کہا۔

"سید سلطان بخت!" ان کی آواز نہ صرف اونچی تھی بلکہ گرج دار بھی تھی۔ سلطان بخت نے نظریں جھکا لیں۔

"اب کوئی بہانا نہیں سنوں گا۔ تم اب بچے نہیں ہو۔ میرے حساب سے تو تمہاری شادی آج سے دس سال قبل ہو جانی چاہیے تھی مگر یہ تمہاری فضول کی ضد تھی کہ ابھی نہیں کرنی پھر اسٹیٹس جا کر تم نے پانچ سال برباد کیے محض ایم بی اے کی ڈگری کے لیے۔ اب پھر بہانا مگر اب کوئی ایکسکیوز میں نہیں سنوں گا۔ بہت ہو چکا۔" وہ غصے سے سیدھے ہو کر بولے۔

"بابا جان! میرا دل نہیں مانتا۔ میں کیا کروں۔" وہ جیسے بے بس ہو کر بولے۔

"سلطان بخت! دل کی سنو گے تو کہیں کے نہ رہو گے۔"

سلطان بخت نے ایک شکوہ بھری نگاہ ان پر ڈالی۔

"ایسے مت دیکھو مجھے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر رہا۔ میں تمہارا باپ ہی نہیں اس خاندان کا بڑا بھی ہوں اور ہر فیصلے کا حق مجھے حاصل ہے اور وہ بھی انصاف کے ساتھ۔"

"یہ انصاف ہے؟" سلطان بخت نے احتجاج کیا۔

"کیا برائی ہے صالحہ میں۔" وہ آنکھیں سکوڑ کر بولے۔

"میں نے کب کہا کوئی برائی ہے۔" وہ چڑ کر بولے۔
"تم سے بڑی ہے۔ بس دو چار برس۔" انہوں نے پھر ٹیک لگالی۔
"دو چار برس۔" وہ حیرت سے چلا کر بولے۔ "پورے سات برس۔ بابا جان کم ہوتے ہیں۔"
"تمہاری بہن حسین شاہ سے پورے نو برس بڑی تھی۔ انہوں نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کبھی تمہاری بہن کو ذرا سا بھی طعنہ نہیں دیا۔ پھولوں کی طرح رکھا ہے اپنے گھر میں اسے۔ پھر تم کیوں چلا رہے ہو۔" وہ آرام سے بولے۔
"بابا جان! اگر میں کہوں کہ میں حسین شاہ نہیں ہوں اور مجھے صالحہ سے شادی نہیں کرنی پھر؟"
"سلطان بخت!" سبطین شاہ کی آنکھیں جیسے باہر نکلنے کو تھیں۔
"اپنی حد پہچانو ورنہ خطا کھا جاؤ گے۔" ان کا تنفس تیز چلنے لگا تھا۔ "آج یہ بات کی ہے۔ آئندہ کبھی خیال میں بھی نہ لانا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔" ان کا رنگ یک لخت زرد ہو چلا تھا۔
"بابا جان! آر یو آل رائٹ۔" سلطان بخت گھبرا کر ان کے پاس آ بیٹھے ان کی ٹھنڈی پیشانی کو چھو کر پوچھا۔
"ٹھیک ہوں میں۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔ وہ کچھ دیر اپنے آپ پر قابو پاتے رہے۔
"بابا جان! میں آپ کی بہن سیدہ سلطانہ نہیں ہوں جس کا ہم عمر رشتہ خاندان میں نہ ملا تو وہ کنواری مر جائے گی۔ بابا جان! میرے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔" انہوں نے آہستہ آواز میں التجا کی۔
"سلطان بخت! ظلم تمہارے ساتھ نہیں ہوگا تو تمہاری بہن سیدہ کے ساتھ ہو جائے گا پھر کیا کرو گے؟ اس کا ہنستا بستا گھر اجڑنے میں ایک پل نہیں لگے گا۔ حسین شاہ اب اتنا بھی اچھا نہیں ہے اپنی بہن سے پیاری نہ ہوگی سیدہ اسے۔" وہ اب دھیرے دھیرے سینے کو مسل رہے تھے۔
"بابا جان!" سلطان بخت نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔
"جاؤ سلطان بخت! جا کر شادی کی تیاری کرو۔ کل سیدہ آئے گی تو کہتا ہوں اس کو شہر لے جانا اب اس کام میں میں مزید تاخیر نہیں ہونے دوں گا اور اب تم ایک دو ماہ شہر جانے کا نام نہ لینا۔ ادھر بہت کام ہوگا اور سب تم نے ہی کرنا ہے۔ اب جاؤ تم مجھے آرام کرنا ہے۔" انہوں نے آنکھیں موند لیں۔
"بابا جان! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"
"میں ٹھیک ہوں بس آرام کروں گا۔" انہوں نے کمبل اوپر تک لے لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔
سلطان بخت کچھ دیر کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر تھکے تھکے قدموں سے آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔

"السلام علیکم اماں جان!" عبدالمبین نے گھر میں داخل ہوتے ہی صحن میں بیٹھی رابعہ بی بی کو سلام کیا جو تخت پر بیٹھی شلجم کاٹ رہی تھیں۔
"وعلیکم السلام بسم اللہ میرا عبدالمبین آیا ہے۔" اماں جی کی آنکھیں کیا سارا وجود جیسے اسے دیکھ کر جی اٹھا وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔
"پتر! آج اتنی دیر کر دی میں نے ناشتہ نہیں کیا تیرے انتظار میں۔" وہ اس کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے منہ چوم کر بولیں۔
"رش زیادہ تھی اماں جان! اس لیے دیر سے نکلا تھا۔ چھٹی ہونے کے باوجود قاری صاحب نے پچھلا آموختہ یاد کرنے بٹھا دیا تھا کہ اگر جا نہیں رہے تو پڑھ ہی لو۔" اس کا موڈ حد سے زیادہ خراب لگتا تھا۔
"یہ تو اچھی بات ہے عبدالمبین! میرا بیٹا جلدی حافظ بن جائے گا۔" اماں جی خوش ہو کر بولیں اور بازو پکڑ کر اسے اپنے پاس تخت پر بٹھانے لگیں مگر وہ بیٹھا نہیں اسی طرح تن کر کھڑا رہا۔
"اماں جان! آپ خوش ہوتی رہیں اور حافظ میں کبھی نہیں بن سکتا۔ یہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔" وہ غصے سے بولا اور ٹخنوں سے اوپر کی شلوار نیچی کرنے لگا۔

"اللہ نہ کرے۔" اماں جی نے نفی میں سر ہلایا۔
"آپ نے بابا صاحب سے بات کی تھی۔" وہ اسی تیکھے چتون کے ساتھ اکڑا کھڑا تھا۔
"بات کرنے کا کیا ہے کر لی تھی میں نے بات۔" اماں جی اس کے غصیلے انداز کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے شلجم کاٹنے لگیں۔
"کیا کہا انہوں نے؟" اس نے آنکھیں سکوڑ کر انہیں دیکھا۔
"وہی جو پہلے کہا تھا کہ پہلے تم حفظ کر لو گے پھر اسکول جا سکو گے جیسے عبدالمتین گیا تھا۔" انہوں نے چھلے ہوئے شلجم کے ٹکڑوں کو چھری کی نوک سے کچوکے لگانے شروع کیے۔
"ہاں، پھر اسکول جاؤں گا جب بوڑھا ہو جاؤں گا کیونکہ جوانی گزرنے تک میں حافظ نہیں بن سکتا اور اماں جی! بڈھے طوطے کون پڑھائے گا اور آپ ان سے کہہ دیں۔ میں میں ہوں اور عبدالمتین عبدالمتین ہے۔ میں بھیا جتنا ذہین نہیں ہوں نہ مجھے ان جیسا بننے کا شوق ہے۔ ان کو شوق ہے سب کو خوش کرنے کا۔ مجھے نہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔
"اماں جی! میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ان سے کہیں کہ مجھے اسکول میں داخل کروا دیں ورنہ......" پتا نہیں اس کے فیصلے کی شدت زیادہ تھی یا صوفی صاحب کے خوف کا خیال آ گیا تھا کہ اس نے جملہ روک کر لب سختی سے بھینچ لیے اسی وقت باہر بچوں کا شور اٹھا لگتا تھا چھٹی ہو گئی ہے مدرسے میں اب صوفی صاحب گھر آنے والے ہوں گے۔
"عبدالمبین! پتر چھوڑ کیوں اپنا خون جلاتا ہے ان باتوں سے۔ میرا بچہ پہلے ناشتہ کر لے تیرے لیے میں نے گاجر کا حلوہ بنایا ہے۔ مولیوں والا پراٹھا بھی ہے اور سبز چائے باداموں والی۔ چل میرا بچہ ہاتھ منہ دھو۔" وہ اٹھ کر لاڈ سے اس کو ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔
"تم اندر کمرے میں چلو اور اب کوئی بات نہ کرنا۔ تمہارے بابا صاحب خفا ہوں گے۔ میں پھر تم سے کہہ رہی ہوں ان کو اس طرح اچھا نہیں لگتا ہے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے چپل پیروں میں کھسڑ کھسڑ کرتی برآمدے میں بنے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔
"ہونہہ! بابا صاحب کو خفا ہونے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کمرے میں آمنہ بیٹھی معاشرتی علوم کی کتاب لیے "برصغیر میں مغلوں کا دور حکومت" کو زور و شور سے رٹا لگا رہی تھی۔ زینب اس کے پاس نیم دراز بڑی بے نیازی سے کوئی کہانیوں کی کتاب پڑھ رہی تھی۔
"آ! مبین! آ گئے تم۔" آمنہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ دونوں کی عمروں میں بمشکل ڈیڑھ پونے دو سال کا فرق تھا دونوں کی بہت بنتی تھی عبدالمبین کے مدرسے جانے کا سب سے زیادہ قلق آمنہ کو ہوا تھا۔ اس کا اکلوتا دوستانہ جو ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ ہر ہفتے اتوار کی صبح کا انتظار بڑی شدت سے کرتی تھی اس روز عبدالمبین گھر آتا تھا ایک دن کے لیے۔ محض صبح سے شام تک کے لیے۔ شام تک صوفی صاحب اسے واپس مدرسے کی طرف ہنکا دیتے تھے۔
"ہاں آ گیا ہوں۔ تمہیں دکھتا نہیں۔ بڑے معرکے سر کر کے۔ قرآن و حدیث کی دنیا میں ذہانت و فطانت کے جھنڈے گاڑ کے۔" وہ چڑ کر بولا۔ زینب کا بازو پکڑ کر اسے پرے دھکا دیا اور خود دھپ سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔
"کیا تکلیف ہے تمہیں؟" زینب اس بے جا مداخلت پر کتاب پائنتی پر پٹخ کر غصے سے بولی۔
"جو تمہیں ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔
"آنے والے ہیں بابا صاحب۔ بتاتی ہوں میں ان کو۔ تم ان سے صحیح رہتے ہو۔" وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔
"اور کیا میں نہ بتاؤں گا۔ تم خیر سے کیا حفظ کر رہی تھیں۔" اس نے زینب کے ہاتھ میں پکڑی "طلسم ہوشربا" کو گھور کر دیکھا۔
"تمہاری طرح تو نہیں گندے گندے ناول چھپ کر پڑھتی ہوں۔" صوفی صاحب نے ایک بار عبدالمبین کو

کوئی جاسوسی ڈائجسٹ چوری چھپے پڑھتے پکڑ لیا تھا۔ جسے پھاڑتے ہوئے انہوں نے واہیات اور فحش کتاب کا نام دیا تھا۔

"نہیں نہیں۔ تم تو دینیات کا سبق یاد کر رہی تھیں۔ بڑے نمبر ٹانکنے آتے ہیں تمہیں بابا صاحب کے آگے اور مجھے پتا ہے تم اندر سے کیا ہو۔" وہ لڑائی بڑھانے کو دوبدو بولا۔

"کیا؟ کیا ہوں میں۔" وہ ذرا چیخ کر کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"چھپ چھپ کر انڈین فلموں والے اخبار پڑھتی ہو۔ وہ ممتاز کوچوان کا بیٹا شہر سے اپنی بہن چھمو کو لا کر دیتا ہے مجھے سب پتا ہے 'میں چپ رہتا ہوں' اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"بکواس کرتے ہو تم 'ایک نمبر کے جھوٹے ہو۔ تم اتنے اچھے ہوتے تو بابا صاحب تمہیں یوں اٹھا کر دوسرے مدرسے میں نہ پھینک آتے۔" وہ بھی جوابا" اسی لڑاکا انداز میں بولی۔ آمنہ کتاب کھولے آنکھیں پھاڑے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں یونہی لڑا کرتے تھے۔

"اس وقت میری نہیں تمہاری بات ہو رہی ہے۔ بابا صاحب آتے ہیں تو میں بتاتا ہوں ان کی نیک پروین درسی کتابوں کے اندر رکھ کر کیا حفظ کر رہی ہے۔" وہ ایک دم سے لپکا اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

"دو میری کتاب۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میں جو مرضی پڑھوں۔" وہ چیخ کر آگے بڑھی اور کتاب چھیننی چاہی۔

"مبین کے بچے! دو میری کتاب۔" وہ اس کے پیچھے لپکی۔ عبدالمبین دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔

"بابا صاحب آگئے ہیں مبین! دے دو اس کی کتاب۔" آمنہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ اس نے کھڑکی سے بابا صاحب کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

"اب یہ کتاب میں بابا صاحب ہی کو دوں گا۔ پھر دیکھنا" اس چالاکو کی وہ کیسی چٹنی بناتے ہیں وہ بھی مزیدار۔ باہ سب کھائیں گے۔" وہ چٹخارا لے کر بولا۔

"ہوں ہوں۔ دو میری کتاب۔ مجھے نہیں پتا۔" زینب بھوں بھوں کر کے رونے لگی۔

"اب نہ ملی بچو جی۔" وہ اسے چمکار کر بولا "اب تم تیار ہو جاؤ چٹنی بننے کے لیے۔"

"اماں جی! دیکھیں یہ مبین کے بچے کو۔ دو مجھے۔" وہ چیخ کر اس پر جھپٹی۔

"اونہوں میں نہ دوں۔" وہ اسے غنچہ دے کر کمرے کے دوسری طرف بھاگ گیا۔

"مبین بابا صاحب!" آمنہ نے اسے خبردار کرنے کی کوشش کی مگر دیر ہو چکی تھی۔ بابا صاحب دروازے میں کھڑے غضب ناک نگاہوں سے عبدالمبین کو گھور رہے تھے۔ زینب اور آمنہ اپنے اپنے دوپٹے درست کرنے لگیں۔

"عبدالمبین! یہ کیا ہو رہا ہے۔" وہ گرجے۔

"کچھ نہیں بابا صاحب!" اس نے کتاب والا ہاتھ پیچھے کر کے سر جھکا لیا۔

"تو یہ شور کیسا تھا؟" انہوں نے تینوں کا جائزہ لیا۔

"کچھ نہیں بابا صاحب! میں تو ابھی آیا ہوں۔" وہ ذرا سا پیچھے دیوار کی طرف کھسکتے ہوئے بولا۔

"اور آتے ہی دنگا فساد شروع کر دیا تم نے۔ سدھر نہیں سکتے تم اور یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟" ان کی عقابی نگاہوں نے تاڑ لیا تھا۔ وہ ایک قدم عبدالمبین کی طرف بڑھے۔ وہ تھوڑا اور پیچھے ہو گیا۔

"کچھ نہیں بابا صاحب! کتاب ہے۔" وہ ان کے قدم بڑھانے سے ڈر گیا۔

"دکھاؤ مجھے۔" انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔

اس نے ایک نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔

"کہا کہہ رہا ہوں میں عبدالمبین۔ دو مجھے۔" انہوں نے گرجدار آواز میں ذرا آگے بڑھ کر کہا۔ مبین نے بڑی بے بسی سے آمنہ اور زینب کی طرف دیکھا۔ زینب کی حالت خراب تھی۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے بابا صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش دور سے نظر آرہی تھی۔

"عبدالمبین! کیا کہہ رہا ہوں میں۔ ادھر دو مجھے۔" انہوں نے ہاتھ اس کے آگے پھیلایا۔ سرخ گہری لکیروں کے جال سے مزین ان کی چوڑی ہتھیلی اس کے آگے تھی۔ اس نے کتاب ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔ انہوں نے کتاب دیکھی اور جس طرح کے تاثرات ان کے چہرے پر پیدا ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر عبدالمبین کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"یہ کچھ پڑھنے جاتے ہو تم۔ اس نیک مقصد کے لیے اتنی دور بھیجتا ہوں میں تم کو۔" فضا میں مولیوں والے پراٹھے کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

"یہ شیطانی علم سیکھنے جاتے ہو تم۔ جھوٹ کے پلندے اٹھائے گھر آتے ہو بہنوں کے پاس۔" وہ اس کے سر پر کھڑے بارود کے گولے کی طرح برس رہے تھے۔

"بابا صاحب! یہ تو سب۔" اس کی زبان لڑکھڑا گئی زینب ڈر کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

"ہاں یہ تو سب کیا ہے تو؟" انہوں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ "بولو اس مقصد کے لیے میں تمہیں ادھر بھیج رہا ہوں۔ میں جتنا تمہیں ان چیزوں سے دور رکھنا چاہ رہا ہوں۔ تم اتنا ہی ان کے جال میں الجھتے جارہے ہو ہر طرف سے تمہاری شکایتیں آرہی ہیں۔ قاری عبدالحفیظ نے اتنا بڑا رقعہ لکھ کر بھیجا ہے کہ تم سبق یاد نہیں کرتے۔ تمہارا دھیان سپارے کی طرف ہوتا ہی نہیں اور اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارا دھیان کدھر ہوتا ہے' ان کتابوں کی طرف 'شیطان کے ان فریبوں کی طرف' بولو جواب دو مجھے۔" انہوں نے کتاب کو دو ٹکڑے کر کے دونوں ہاتھوں سے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

"بابا صاحب! میں۔" تکلیف سے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

"ہاں کرو بکواس آگے سے۔ تم ادھر کس مقصد کے لیے جاتے ہو؟ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں تاکہ اس ملعون ادب میں حافظ بن جاؤ۔ تم پر میری باتوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ کیوں تمہارے دل پر مہر لگتی جارہی ہے۔ بولو بولو۔ کس مٹی کے بنے ہو تم۔" انہوں نے زور زور سے دو طمانچے اس کے دونوں گالوں پر جڑے اور کندھے سے قمیص پکڑ کر اسے زور زور سے جھٹکے دیئے۔

"تم مجھے جانتے نہیں۔ میں نے تو بڑے بڑے اڑیل ٹٹوؤں کو سیدھا کیا ہے۔ تم کیا بلا ہو میرے آگے۔ اب میں تمہیں سیدھا کر کے ہی چھوڑوں گا۔ بولو دھیان سے پڑھو گے یا نہیں۔" انہوں نے کس کے دو تین مکے اس کے کمر پر لگائے۔ اس کی کمر دوہری ہو گئی اور وہ نیچے جھک گیا۔

"بولو جواب دو مجھے۔ تم نے پڑھنا ہے یا نہیں۔" وہ اسے لاتوں سے مارنے لگے۔

"بابا صاحب! پڑھوں گا۔ بابا صاحب! پڑھوں گا۔" وہ مار کھاتے ہوئے رونے لگا۔

"یہاں میرے سامنے پڑھوں گا اور ادھر جا کر ان شیطانی کاموں کو سینے سے لگا لیتے ہو۔ جھوٹ تمہارے خون میں اتر گیا ہے۔ کیسے اعتبار کروں میں تمہارا عبدالمبین! تم نے میرا مان توڑا ہے۔ مگر میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا' حفظ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا' چاہے اس کے لیے مجھے تمہاری کھال ہی کیوں نہ کھینچنی پڑے۔" انہوں نے جھک کر اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور بے دردی سے پیٹنا شروع کر دیا۔ باہر ناشتے کی ٹرے ہاتھ میں لیے رابعہ بی بی خوف اور بے بسی سے رونے لگیں۔

"آمنہ! چھڑی لاؤ میرے کمرے سے۔" وہ اسے پیٹتے پیٹتے ہانپنے لگے تو بولے۔ آمنہ کا خوف سے برا حال تھا' زینب کونے میں سہمی سہمی کھڑی تھی۔

"نہیں بابا صاحب! نہیں خدا کے لیے۔" وہ روتے ہوئے ان کے آگے کھڑی ہو گئی۔ "بابا صاحب! اس بار معاف کر دیں اسے' خدا کے لیے بابا صاحب۔ آئندہ پڑھے گا بابا صاحب۔" اس نے صوفی صاحب کا بری طرح سے برستا ہاتھ تھام لیا۔

"تم ہٹ جاؤ آمنہ! آگے سے۔ آج میں اس کے دماغ سے یہ خناس نکال کر ہی رہوں گا۔ صاحبزادے نے

اسکول جانا ہے اب یہ خرافات پڑھنے کے لیے۔ میں تمہیں اسکول کی شکل نہیں دکھاؤں گا جب تک تم قرآن حفظ نہیں کر لیتے۔ یہ تم یاد رکھنا ورنہ دوسرے بہت سے طریقے آتے ہیں مجھے۔" انہوں نے اس کے گرے ہوئے وجود کو ایک اور ٹھوکر ماری۔ عبدالمبین اب سسکیوں سے رو رہا تھا۔ سجدے میں گرا اس کا وجود ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا۔

"بابا صاحب! ام میری خاطر خدا کے لیے بابا صاحب۔" آمنہ نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے..... ان کا سانس پھول رہا تھا ایک قہرناک نگاہ اس کے گٹھڑی وجود پر ڈالی اور "ہونہہ بتا دو اس کو سب اچھی طرح سے۔" کہہ کر غصے میں کھولتے باہر نکل گئے۔ رابعہ بی بی جلدی سے واپس مڑ گئیں۔

"مبین۔" آمنہ نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔

"دفع ہو جاؤ تم بھی۔" وہ اسی طرح پڑے پڑے چیخا۔

"دم کڑا ابھی نہیں گئی۔ آمنہ! چھوڑ دو تم اسے۔ شکر ہے میری جان بچ گئی۔" زینب نے سکون بھرا بے فکری کا سانس لیا۔ آمنہ نے ملامت بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔ وہ کندھے اچکا کر پھٹی ہوئی کتاب کے دونوں حصے جوڑ کر دیکھنے لگی۔

"گوند سے جڑ جائے گی۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

گڈ آفٹرنون ام جان۔" کیپٹن شہباز خان نے خاکم بدہن "میں گم مسز خان سے کہا جو اس کی آواز سن کر جیسے اچھل ہی پڑی تھیں۔

"شہباز خان! میرا بچہ۔ تم کب آئے۔ مجھے نہیں پتا چلا۔" وہ حیرت اور خوشی سے بولیں۔

"ابھی ابھی آپ کے سامنے۔" شہباز خان نے آگے بڑھ کر ان کا ماتھا اور ہاتھ چوم لیے۔

"میں کتنا مس کر رہی تھی کیسے بتاؤں پرسوں تمہارا فون آیا۔ میں سوئی ہوئی تھی۔ مجھے ایاز نے بتایا۔ مجھے کس قدر افسوس ہوا کہ میں بات کرتی تو تمہیں آنے کا کہہ دیتی۔ میں نے رات کو کال بک کرائی۔ تم میس میں تھے ہی نہیں۔" وہ ان کے زانو پر ہاتھ رکھے محبت پاش نظروں سے ماں کی بے قراری کو دیکھ رہے تھے۔

"مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ خود میرا بھی دل چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کو۔ اسی لیے تو پندرہ دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں کہ کچھ دن آپ کے پاس گزار لوں۔ ادھر بہت بوریت ہونے لگی تھی۔ آپ کو مس کر رہا تھا بہت۔" انہوں نے اٹھ کر مسز خان کی وہیل چیئر دھکیل کر کھڑکی کے پاس کی۔ باہر دور سرو کے پیڑ کے پیچھے سورج گم ہو رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

"جھوٹ۔ تم مجھے مس کر رہے تھے یا کسی اور کو؟" انہوں نے ہنستے ہوئے گردن موڑ کر کہا۔

"اوں ہوں ام جان!" وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ سینے پر ہاتھ باندھے آرمی یونیفارم میں ان کا چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، مضبوط کسرتی جسم اور مردانہ کھڑے کھڑے نقوش سے مزین گندمی چہرہ۔ ان کی مسکراتی چمک دار آنکھوں کو مسز خان نظر بھر کر نہ دیکھ سکیں۔ دل ہی دل میں ان کی نظر اتاری۔

"بھائیوں سے ملے ہو۔" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولیں۔

"تو ام جان! آپ کو پتا ہے، میں سب سے پہلے آپ ہی سے ملتا ہوں آ کر۔ ویسے بھی ابھی ان کے آفس آف ہونے کا ٹائم نہیں ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں مل لوں گا۔"

"کھانا؟" ان کا انداز سوالیہ تھا۔

"نہیں۔ اب تو ٹائم نہیں ہے۔ شام ہو رہی ہے۔ بس چائے لوں گا ابھی چینج کرنے کے بعد۔ آپ زیتون بانو سے کہہ کر اچھی سی چائے بنوا لیں اور ساتھ میں کچھ اسنیکس وغیرہ۔ بھوک لگی ہوئی ہے مجھے۔ صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے ام جان! میں چینج کر لوں پھر بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ باہر کی طرف بڑھے۔

"بائی دا وے ام جان! آپ مجھے کس لیے مس کر رہی تھیں، آپ نے بتایا نہیں۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولے۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ تمہیں یہ جملہ ہضم نہیں ہو گا، ضرور پوچھو گے۔" وہ ہنس پڑیں۔

"ہاں تو بتائیں نا۔" وہ ان کے پاس آ کر بولے۔

"کیوں شہباز خان! ایک ماں اپنے بیٹے کو کسی مقصد کے بغیر یاد نہیں کر سکتی، جو اس کی نظروں سے دور ہو۔" ان کا لہجہ جتانے والا تھا۔

"وائے ناٹ ام جان! لیکن آپ نے اس کا ذکر تین دن پہلے نہیں کیا تھا، جب میں نے آپ کو تفصیل سے فون کیا تھا اور چھٹی کا ذکر بھی کیا تو آپ نے کہا کہ ابھی رہنے دو۔ اب یکایک آپ کو میری یاد کیوں ستانے لگی۔"

"صحیح ہے بھئی۔ تم پیچھا نہیں چھوڑو گے۔" انہوں نے وہیل چیئر کھینچی۔ شہباز خان جلدی سے آگے بڑھے اور وہیل چیئر آہستگی سے دھکیلتے ہوئے ان کے بیڈ کے پاس لے آئے۔

"تمہارے ماموں کی طبیعت آج کل بالکل اچھی نہیں ہے۔" وہ افسردہ لہجے میں بولیں۔

"کیوں کیا ہوا انہیں؟"

"انجائنا کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ آج کل وقفے وقفے سے ہو رہی ہے۔ ان کا فون آیا تھا تین دن پہلے، پھر کل میں نے فون کیا تھا۔ آج بھی کیا۔ انہوں نے خود سے تو ذکر نہیں کیا مگر ان کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ مجھے نزی نے بھی بتایا تھا اسی لیے۔"

"اسی لیے کیا؟"

"اسی لیے تمہیں مس کر رہی تھی۔ تم ہوتے تو میں بھائی جان کو دیکھ آتی جا کر۔ ایاز اور اظہر کو تو ٹائم نہیں ملتا آفس سے۔ چھٹی ہو تو [illegible] اب میں کس کے ساتھ جاؤں۔ تم چھٹی لے کر آئے ہو تو اگر کہو تو چلتے ہیں۔"

"آپ کا دل چاہ رہا ہے جانے کو؟"

"ہاں بیٹا! بالکل میرا بڑا دل چاہ رہا ہے ان سے ملنے کو۔" وہ بے قراری سے بولیں۔

"تو چلیں ٹھیک ہے پھر کل صبح ہی نکل چلتے ہیں۔ دو چار دن رہیں گے۔ میں اپنے ایک دو دوستوں سے بھی مل لوں گا۔ آپ کی بھی آب و ہوا چینج ہو جائے گی ویسے بھی آج کل پنڈی کا موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔"

"دیکھا! مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ میرا بیٹا ضرور میرا کہا مانے گا۔ میں ایک اشارہ کروں گی میرا فرماں بردار بچہ ہے۔ خدا تمہیں ترقی دے۔ زندگی میں کامیابیاں دے۔" ان کی آنکھیں خواہ مخواہ جھلملا گئیں۔

"ام جان! میں آپ کا کہا نہیں مانوں گا تو اور کس کا مانوں گا۔ آپ کا بیٹا ہوں نا۔"

"بیٹے تو وہ دونوں بھی ہیں۔ خیر....." انہوں نے ٹھنڈا سانس لیا "تم چینج کرو میں چائے منگواتی ہوں پھر روانگی کا پروگرام بناتے ہیں۔"

"اوکے ام جان! میں بس پندرہ منٹ میں آیا۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ مسز خان زیتون بانو کو چائے کے لیے آواز دینے لگیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"سلطان بخت! کدھر جا رہے ہو۔" سیدہ آپا کی آواز پر سلطان بخت جو تیزی سے گاڑی کی چابی جھلاتے باہر جا رہے تھے، ٹھٹک کر رک گئے۔ سیدہ آپا کی آواز سن کر انہیں خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی وہ اپنی شال کندھوں پر درست کر رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے ابھی ابھی آئی ہیں اور وہ کس لیے آئی ہیں۔ یہ سوچ کر ہی سلطان بخت کی ساری خوشی ہوا ہو گئی۔ ان کے قدم یک دم ڈھیلے پڑ گئے۔

"السلام علیکم آپا! آپ کب آئیں؟" وہ سست قدموں سے ان کی طرف بڑھے۔

"وعلیکم السلام ابھی آئی ہوں پر لگتا ہے تمہاری کہیں جانے کی تیاری ہے۔ کسی خاص جگہ کہ تیاری ٹھیک

ٹھاک ہے۔" انہوں نے ناقدانہ انداز سے ان کا سر سے پاؤں تک جائزہ لے ڈالا۔ پستئی رنگ کے قیمتی ٹوپیس میں بلیک لیدر کے شوز پہنے وہ غضب ڈھا رہے تھے۔ وہ سبطین شاہ کی جوانی کی ڈپلیکیٹ تھے اور سبطین شاہ کو لوگ جوانی میں یوسف ثانی کے نام سے پکارتے تھے اور سلطان بخت بھی ان ہی کی طرح سرخ وسفید رنگت اور سیاہ گھنگھریالے بالوں کے مالک تھے۔ سرمئی آنکھیں ان کی شخصیت کی وجہ کشش تھیں۔

"نہیں کچھ خاص نہیں۔ ذرا شہر تک جا رہا تھا۔" ان کی آواز سے بھی تازگی غائب ہو گئی تھی۔

"شہر کیا بہت نزدیک پڑتا ہے تمہیں اور بہن کا گھر دور۔" وہ کچھ طنز سے بولیں۔

"آپا! آپ کو معلوم تو ہے۔" ان کا لہجہ چڑا ہوا تھا۔ وہ ان کے پاس پڑے صوفے پر تکلف سے بیٹھ گئے۔

"چلو اب یہ پابندی بھی ختم ہو جائے گی۔ کل صبح جا رہے ہیں ہم تاریخ لینے۔ ابھی جانا تھا پر اب شام زیادہ ہو گئی۔ اس لیے بابا جان نے کہا ہے کہ صبح چلیں گے۔ مجھے گھر سے نکلتے خاصا ٹائم لگ گیا اور تم سناؤ کیا حال چال ہے۔ لگتا ہے بہت مصروف رہنے لگے ہو۔ حمیدہ! اشرینہ کہاں ہے؟" سلطان بخت سے بات کرتے کرتے انہوں نے پاس سے گزرتی ملازمہ سے بارعب آواز میں پوچھا۔

"جی اپنے کمرے میں ہوں گی۔" وہ مؤدب ہو کر بولی۔ "بلاؤں جی!"

"ہوں گی کیا؟ تمہیں خبر نہیں کہ وہ واقعی اپنے کمرے میں ہے یا نہیں۔" سیدہ ذرا غصے سے بولیں۔ "اتنی بے خبر ہو تم۔"

"جی ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ گھنٹہ پہلے میں نے انہیں اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد میں کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔" وہ کھسیانے لگی۔

"گھر میں رہتی ہو۔ اپنے ہوش و حواس بحال رکھا کرو۔ جاؤ اب۔" وہ اسے جھاڑتے ہوئے بولیں۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔

"ہاں تو شہر میں کوئی خاص کام ہے تمہیں؟" ان کا بارعب لہجہ ہنوز برقرار تھا جو سلطان بخت کو خاصا ناگوار گزرا۔

"ظاہر ہے کام ہی سے جا رہا تھا سیر و تفریح کے لیے تو نہیں۔" وہ بگڑ کر بولے۔

"سلطان بخت! مجھے معلوم ہے کہ تم اب بڑے ہو چکے ہو۔ اس کا ثبوت اپنے گستاخ لہجے سے نہ دو۔ میں نے تمہیں گودوں کھلایا ہے۔ اتنا حق ہے مجھے کہ تم سے ہر لہجے میں بات کر سکوں۔ اماں جان تمہیں صرف جنم ہی دے سکی تھیں۔ اتنا تناور درخت تمہیں ان ہاتھوں نے بنایا ہے۔" وہ جہاندیدہ عورت تھیں۔ فوراً سلطان بخت کے لہجے کو بھانپ گئیں۔

"سوری آپا! میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں کام ہی سے جا رہا تھا شہر۔ ادھر کام بڑھ گیا ہے آج کل اس لیے۔" وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

"اچھی بات ہے۔ مرد کام کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔" انہوں نے نخوت سے سر جھٹکا "لیکن اچھے اور کامیاب مرد وہی ہوتے ہیں جو کام اور گھر دونوں کو مناسب طریقے سے ڈیل کر سکیں کیونکہ گھر والوں کو بھی بہرحال تمہاری ضرورت ہے۔" وہ جانے انہیں کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ سلطان بخت نے کوفت سے پہلو بدلا۔

"میں گھر کو بھی پورا وقت دیتا ہوں۔ آپ بابا جان سے پوچھ لیں۔" ان کا انداز بھی جتانے والا تھا۔

"مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہیں گھر کو کچھ زیادہ وقت دینا ہو گا۔ پہلے تو شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں۔ اس کے بعد نئی نویلی دلہن کو۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔"

"جی اچھی طرح۔" ان کا انداز کچھ تمسخرانہ تھا۔

"تمہیں ان میں سے کون سی بات مضحکہ خیز لگی، تیاریوں والی یا نئی نویلی دلہن والی؟" وہ بھی سیدہ آپا تھیں۔ کہاں چوکنے والی تھیں فوراً ان کے لہجے کی بو پا گئیں۔

"آپا پلیز! مجھے یوں کٹہرے میں کھڑا کر کے بات نہ کیا کریں۔ میں چھوٹا بھائی بھی ہوں آپ کا۔" وہ کچھ اکتا کر بولے۔

"اسی لیے تو تم سے اتنے نرم لہجے میں بات کرتی ہوں ورنہ تمہیں معلوم ہے۔" ہاں واقعی سلطان بخت کے ساتھ ان کا لہجہ نرم ہی ہوتا تھا ورنہ دوسروں سے تو وہ اس طرح سے بات کرتی تھیں جیسے وہ کیڑے مکوڑے ہوں ان کا مزاج شاہانہ تھا۔ ادھر اماں جان کے مرتے ہی سارا گھر سنبھالا تو سسرال جاتے ہی ساس فوت ہو گئیں تو ادھر کا بھی سارا انتظام ان کے کندھوں پر چل رہا تھا۔ اسی بادشاہت نے ان کے لہجے میں خوامخواہ رعونت پیدا کر دی تھی۔

"جانتا ہوں میں آپ کا نرم لہجہ۔" سلطان بخت جل کر بولے۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" وہ تنک کر بولیں۔

"معلوم ہے آپ کو سب۔" وہ منہ دوسری طرف کر کے بولے۔

"کیا معلوم ہے مجھے؟" وہ کچھ دیر خاموش رہے۔

"آپا! آخر شادی کی اتنی جلدی کیا ہے؟" کتنی دیر سے ابلتا ہوا جملہ ان کے لبوں سے پھسل ہی گیا۔

"سلطان بخت! ابھی جلدی ہے تمہارے لیے۔" ان کی آواز خاصی بلند تھی اور انداز مشتعل......

"آپا! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" وہ کچھ غصے سے بولے۔

"بچے تو ہو نہیں۔ اس دسمبر میں پورے تینتیس سال کے ہو جاؤ گے تو شادی کیا سر سفید کر کے کرو گے۔" آپا سچ کے معاملے میں خاصی منہ پھٹ تھیں۔

"میں تینتیس کا ہو جاؤں گا اور وہ آپ کی نئی نویلی دلہن پھر پورے چالیس سال کی نہیں ہو جائے گی۔ آپا! چالیس سالہ دلہن کو میرے پلے باندھیں گی آپ۔ کیا کانا ہوں میں لنگڑا ہوں یا قلاش ہوں کیا کمی ہے مجھ میں۔" وہ چلا کر بولے۔

"آہستہ بولو سلطان بخت! آج سے بیس سال پہلے یہی باتیں اگر حسین شاہ کرتے تو آج تمہاری آپا بھی پچھلے قبرستان میں اپنی جگہ پا چکی ہوتی۔ مت بھولو اس گھر کے احسان کو اور وہ اگر کچھ عمر کی ہو جائے گی تو اس میں بھی تمہارا قصور ہے۔ ہم تو آج سے دس بارہ سال پہلے شادی کو تیار تھے جب تمہیں اسٹیٹس جانے کا جنون چڑھا تھا۔ اسی شادی سے فرار کے لیے نا۔ کیا ملا کیا فرار؟ ڈگری لے کر کیا تم ایسی نوکری تلاش کر سکے ہو جو تمہیں اس جائیداد جتنی مراعات دے سکے یا اتنی جاگیر تمہیں یونس میں دے سکے جس کے تم اکلوتے وارث ہو اور جو صالحہ کے جہیز میں آنے والی ہے۔" وہ گرج دار آواز میں بولیں۔ "نہیں نا" اگر ایسا ہوتا تو اب تک تم صالحہ کے لیے نہ بیٹھے ہوتے اور صالحہ بھی تمہیں یوں بری لگ رہی ہے کہ تمہاری جو ادھر ادھر منہ مارنے کی عادت ہے۔ وہ تمہیں تمام عمر خوار کرے گی۔ سلطان بخت! عزت و وقار سے جینا سیکھو۔ صالحہ سے اچھی نیک پارسا اور سمجھ دار بیوی تمہیں کہیں نہیں ملے اور اگر تم اسے چھوڑنے یا اس سے شادی نہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو ایسی کوئی بھی خواہش اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دو، اگر تم ایسا کوئی ہلکا سا بھی اشارا کرو گے تو حسین شاہ تمہاری پچاس سالہ آپا کو اس سفید چونڈے کے ساتھ اس گھر کی دہلیز پر ہمیشہ کے لیے بٹھا جائے گا۔ اس معاملے میں وہ کوئی مروت برتنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ سمجھے تم۔"

"آپا! یہ تو بلیک میلنگ ہے۔" وہ بس یہی کہہ سکے۔

"بے شک ہو مگر اسی بلیک میلنگ کے تحت ہی تو حسین شاہ تمہاری بہن کی ڈولی لے کر گیا تھا کہ اسے اپنی بہن بھی تو بیاہنی تھی۔ اب تم ان فضول کی سوچوں سے پیچھا چھڑاؤ۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ صالحہ نہ صرف سلجھی ہوئی اور نیک طینت ہے بلکہ خوبصورت بھی ہے۔ یہ تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔" وہ شاید ان کی تاکا جھانکی کی عادت پر طنز کر رہی تھیں۔ وہ کلس کر رہ گئے۔

"اچھا میں اب جاؤں۔" کچھ دیر بعد وہ اکتا کر کھڑے ہو گئے۔

"کہاں؟"

"شہر جا رہا تھا۔ بتایا تو ہے۔" وہ تنک کر بولے۔

"کل دوپہر میں چلے جانا۔ ابھی ہم دونوں کو بابا جان نے بلایا ہے۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اور صبح ہم نے ادھر جانا ہے تاریخ لینے! اگلے ماہ کے پہلے ہفتے کی تاریخ ہو گی۔ دن تھوڑے ہیں اس لیے میں اب پندرہ بیس دن ادھر ہی رہوں گی تیاریوں کے سلسلے میں۔ کل ہم تاریخ رکھ آئیں پھر کل دوپہر میں تمہارے ساتھ شہر چلوں گی زیور کا آرڈر دینا ہے۔ ادھر کا میں تقریباً سب کام کر آئی ہوں۔ اس لیے اب ادھر ہی رہوں گی۔" وہ یہ سب کچھ فیصلہ کُن انداز میں بتا رہی تھیں۔

"کل آپ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں۔ مجھے آج ہی جانا ہے۔" وہ کچھ خفگی سے منہ بسور کر بولے۔

"سلطان بخت! شاید آپ نے سنا نہیں۔ ابھی ہم دونوں کو بابا جان کے پاس چلنا ہے۔ کچھ ضروری معاملات ڈسکس کرنے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔" وہ غصے میں انہیں اسی طرح آپ جناب سے مخاطب کرتی تھیں۔

"آپا پلیز! مجھے کام ہے۔" وہ اب کے نرم پڑ کر بولے۔

"ہو گا مگر بابا جان کے حکم سے زیادہ ضروری نہیں۔ چلو بابا جان انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ دوٹوک انداز میں کہہ کر کھڑی ہو گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"بس بھائی جان! بڑا دل بے قرار سا تھا آپ کو دیکھنے کے لیے، ملنے کے لیے۔ وہ تو شہباز خان آ گیا چھٹی لے کر تو میں آ گئی ورنہ کہاں آ سکتی تھی۔ قدرت نے مجبوری ایسی ڈال دی ہے نہ اپنی مرضی سے کہیں آ سکتی ہوں نہ جا سکتی ہوں چلو جو میرے اللہ کی رضا۔ اس نے بہت سوں سے بہتر نعمتیں بن مانگے عطا کر رکھی ہیں۔" کہتے کہتے مسز خان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"ہاں۔ میرا بھی بڑا دل چاہ رہا تھا کہ تم سے ملوں۔ فون کی بات اور ہوتی ہے۔ ان فاصلوں نے تو ایک دوسرے کی شکلوں کو ترسا دیا ہے۔ میں خود آج کل میں آنے کی سوچ رہا تھا اگر تم نہ آتیں تو مجھے تو آنا ہی تھا۔" وہ جیسے افسردہ سے ہو گئے۔

"آپ اب میرے ساتھ ہی چلیے گا ایاز اور اظہر بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔"

"ہوں دیکھتے ہیں۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولے۔ "ہاں ینگ مین! کتنی چھٹی لے کر آئے ہو۔"

"ماموں جان! پندرہ دن کی۔"

"کیوں خیریت تھی جو اتنے دن کی چھٹی لی۔"

"بس ماموں جان! ویسے ہی دل چاہ رہا تھا۔ ایک تو پچھلے دنوں ہمارا کورس ختم ہوا تھا اسکردو میں چھ ہفتوں کا۔ بڑا ٹف پیریڈ تھا۔ اس کی تھکن اتارنی تھی کچھ میری چھٹیاں بھی ڈیو تھیں۔۔۔۔۔"

"ارے میں نے کہا بھی کہ چھٹیاں ابھی رہنے دو۔ اب آگے کام آئیں گی۔ بس بھائی جان اب اور انتظار نہیں ہوتا۔ اس بار اسی لیے آئی ہوں۔ نزہت کا ایف ایس سی بھی مکمل ہو گیا ہے اور شہباز خان بھی آج کل کسی کورس پر نہیں۔ کنسٹرکشن کا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے پچھلے حصے میں جہاں شہباز خان کا پورشن بنوا رہی ہوں۔ تقریباً ایک دو ماہ لگیں گے سب کچھ مکمل ہونے میں۔ بس یہ آخری ارمان ہے اور اللہ سے دعا ہے کہ جیتے جی یہ آخری خواب بھی اپنی آنکھوں سے پورا ہوتا دیکھ لوں پھر بے شک بلاوا آ جائے۔"

"امی جان پلیز!" شہباز خان نے انہیں ٹوکا۔

"ہاں عابدہ! اب مجھے بھی اپنی زندگی سے کچھ نہیں لینا۔ بس بیٹی کے فرض سے اللہ سبکدوش کرے۔ آج کل میری طبیعت ویسے ہی بہت خراب رہنے لگی ہے۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"ڈاکٹر کو چیک کرایا ہے آپ نے۔" وہ فکرمندی سے بولیں۔

"ہاں۔ وہ تو دکھایا ہی ہے میڈیسن بھی باقاعدگی سے لے رہا ہوں مگر پھر بھی۔۔۔۔۔ چلو چھوڑو۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیے۔ "ارے بھئی نزہت بیٹی! چائے میں کیا دیر ہے۔" انہوں نے دروازے کی طرف آواز لگائی۔

"سہیل تو شاید ابھی آفس سے نہیں آیا۔ اس کی بیوی بھی نظر نہیں آ رہی۔" مسز خان نے پوچھا۔

"اچھا ہے نہیں نظر آ رہی گی۔۔۔۔۔ ہوتی نہیں۔ بس عابدہ اسی لیے تو۔۔۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے شاید شہباز خان کا خیال آ گیا تھا۔ اس وقت نزہت چائے کی ٹرالی کھینچتی ہوئی اندر آ گئی۔

"پھوپھو سے ملی ہو نا۔" ممتاز خان نے پوچھا۔

"جی ابو جی۔" اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

"میرا بیٹا آج کل فارغ ہے۔" مسز خان محبت سے بولیں۔

"جی پھوپھو!" وہ بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔ ممتاز خان اور مسز خان چائے میں چینی بہت کم لیتے تھے۔ اس نے دونوں کپ ان کے آگے رکھ دیے تیسرا مرحلہ دشوار تھا۔ آخر ہمت کرنا پڑی۔

"آپ چینی کتنی لیں گے۔" بمشکل اس نے نظریں اٹھا کر شہباز خان کو دیکھا جو اس کے تاثرات کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لے رہے تھے۔ ممتاز خان اور مسز خان آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"جتنی آپ ڈال دیں بلکہ اگر نہ بھی ڈالیں تو کچھ مضائقہ نہیں، خاکسار ذرا بدمزہ نہ ہو گا۔" دھیمی آواز میں تفصیلاً جواب ملا۔

"اوکے۔" اس نے بھی جواباً کہا اور پھیکی چائے کا کپ ان کے آگے سرکا دیا اور خود شوگر پاٹ ہاتھ میں اٹھا کر باہر جانے لگی۔

"نزہت بیٹا! آپ چائے نہیں پیو گی۔" مسز خان نے آواز لگائی۔

"پھوپھو! میں نے چولہے پر رکھی ہوئی ہے۔ ادھر ہی پی لوں گی۔" وہ کہہ کر نکل گئی۔ شہباز خان بدمزہ ہو گئے انہوں نے پھیکی چائے کا گھونٹ بھرا جو اندر جا رہا تھا اور باہر تو وہ اگلنے سے رہے۔

"امی جان! چائے پھیکی ہے۔ چینی شاید نزہت ڈالنا بھول گئی ہیں۔" وہ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے۔

"او ہو اچھا۔ میں منگواتا ہوں چینی۔ نزہت بیٹا! چینی تو لاؤ۔" ممتاز خان جلدی سے بولے۔

"ماموں جان! میں ادھر ہی سے ڈال لیتا ہوں جا کر۔" وہ ایک دم کپ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو ممتاز خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا تو آپ اپنے گھر آئے مہمانوں کی اس طرح پھیکی چائے سے تواضع کرتی ہیں۔" وہ ایک دم سے اس کے پیچھے جا کر بلند آواز میں بولے تو شربا بھونتی نزہت اچھل ہی پڑی۔

"توبہ ہے۔ آپ نے تو ڈرا ہی دیا مجھے۔" وہ زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"او ہو اس قدر ڈرپوک ہیں آپ۔ لائیں دیکھیں۔ کس رفتار سے بھاگ رہا ہے آپ کا دل نازک۔" انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھنا چاہا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اس کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا۔

"کیا ہے آپ کو۔" وہ دوپٹہ ٹھیک طرح سے سینے پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"وہی جو آپ کو ہے۔" وہ اسی شرارت سے بولے۔

"چینی چاہیے آپ کو۔ یہ لیں اور جائیں یہاں سے۔" اس نے جلدی سے شیلف پر پڑا شوگر پاٹ ان کے آگے کیا۔

"صرف چینی پر نہ ٹرخایے۔ ہمیں تو یہاں سے اور بھی بہت کچھ چاہیے۔" ان کے ذو معنی جملے پر وہ سرخ ہو گئی باہر بھی نہیں بھاگ سکتی تھی کہ دروازے میں تو وہ ایستادہ تھے۔

"نزہت! یاد کیا تھا؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"کس کو؟" وہ انجان بن کر بولی۔

"دعا کرتی ہو میرے لیے؟" وہ چوکھٹ سے ٹیک لگائے اس کے چہرے پر ڈوبتی ابھرتی قوس قزح کو نظروں کے رستے دل میں اتار رہے تھے۔

"دعائیں بتا کر نہیں کی جاتیں۔ اوہ میری ہنڈیا۔" وہ ایک دم سے سوں سوں کی تیز آواز پر ہنڈیا کی طرف پلٹی اور ڈھکن اتار کر دیکھنے لگی۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی۔ مجھے فضول باتوں میں الجھا دیا۔ ساری ہنڈیا لگ گئی۔ اتنی محنت سے قورمہ بنا رہی تھی اینڈ میں آپ کی انٹری ضروری تھی۔ اندر جا کر بیٹھیں آپ ورنہ میں پھوپھو کو آواز دیتی ہوں۔" وہ چولہا بند کرکے تیز تیز بولے چلی گئی۔

"نزہت! تم ویسی کی ویسی ہی اسٹوپڈ ہو، جیسی بچپن میں ہوتی تھیں۔ یہ نہیں کہ فیانسی اتنی دور سے اتنے عرصے بعد ملنے آیا ہے۔ دو گھڑی اس سے کوئی محبت بھرے لہجے میں بات کرلی جائے۔ تمہیں اپنی ہنڈیا کی فکر ہے اور میں پاگلوں کی طرح بھاگا چلا آیا اور وہاں بیرکس کی چوکیوں پر بیٹھ کر یاد کرتا رہا اور وہ بھی تم جیسی فضول لڑکی کو۔" انہیں بھی غصہ آگیا۔ ہنڈیا کو ان پر فوقیت جو دی جارہی تھی۔

"ہاں تو کس نے کہا تھا مجھے یاد کرنے کو۔ دھیان سے اپنی ڈیوٹی انجام دینی تھی۔ ارتکاز ہی تو ختم ہوگیا ہے ہماری قوم میں۔ اسی لیے تو مسلسل ناکام ہو رہی ہے۔ ہر بندہ اپنا دھیان اپنی ڈیوٹی کی طرف رکھے تو جب کچھ درست نہ ہو جائے یہی دیکھیں میں اپنی "ڈیوٹی" سے غافل ہو کر آپ کی فضول باتوں میں لگی تو میری ہنڈیا جل گئی اور ابو جی کو تو ذرا بو آجائے لگے ہوئے سالن کی، وہ تو ٹرے واپس کر دیتے ہیں۔ اب اتنی جلدی میں دوسرا سالن کیسے تیار کروں۔ اب کھڑے کیا ہیں۔ جائیں یہاں سے۔" وہ جھلا کر بولی۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری ہنڈیا۔" وہ بھی کپ سلیب پر پٹخ کر باہر نکل گئے۔

"ہاں تو میں نے خط لکھا تھا آپ کو کہ آکر میرا کام خراب کریں۔ رومانس کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے۔ ہونہہ۔" وہ بھی جواباً زور سے بولی۔ شہباز خان غصے میں اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"او مینا میرا دل کھو گیا نہ جانے کیا ہو گیا۔ او مینا۔" وہ چپ چاپ برآمدے کی سیڑھیوں پر سر جھکائے سوچوں میں گم بیٹھا تھا جب ظفر نے اس کے آگے ہاتھ لہرا لہرا کر گانا شروع کر دیا۔

"او میرے فلاسفر! میرے بقراط اور ارسطو! آخر تجھے کن جہانوں کی فکروں نے آن گھیرا ہے۔ کچھ اپنے یاروں کو بھی تو بتا۔ اچھا بھلا تو ہوتا تھا۔ اب ہر وقت اداس الو کی طرح آنکھیں پھاڑے ارد گرد سے بے خبر نہ جانے کدھر کھویا رہتا ہے۔" اس نے ایک دھپ معاذ کی کمر پر رسید کی اور اس کے برابر سیڑھیوں پر آبیٹھا۔

"بولتا نہیں کیا گونگا ہو گیا ہے اور ویسے بھی آج کل تم جس رفتار سے محض "ہاں" "نہیں" کہہ رہے ہو۔ بہت جلد تمہاری بولنے کی قوتیں تم سے رخصت مانگ لیں گی اور تم اشاروں کی زبان میں بات کرو گے پھر کوئی سمجھے گا کوئی نہیں سمجھے گا۔ بہتر ہے میرے یار! ابھی ہمیں سمجھا دو کہ تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے۔ معاشی، معاشرتی، سماجی، اخلاقی، ذہنی، دینی، افلاکی کس قسم کی گتھیاں درپیش ہیں تمہیں۔" وہ اس کے کسی بھی جواب کا انتظار کیے بغیر نان اسٹاپ بولے چلا جارہا تھا۔

"او پھوٹو بھی منہ سے کچھ۔" اس نے زور سے اس کا کندھا ہلایا۔

"کچھ نہیں یار! بس ویسے ہی۔" اس نے زمین سے تنکا اٹھایا اور اسے موڑنے لگا۔

"یار! ہم یار ہیں تیرے، ہم سے دل کی بات نہیں کہے گا تو کیا دیواروں سے کہے گا یا پھر ناظم صاحب سے۔ جن کے پاس ہر بات، ہر پریشانی کا حل ڈھیر ساری نصیحتوں کا پلندہ موجود ہے۔"

وہ تنکے کے ساتھ الجھتا رہا۔

"یار! بتاؤ گے نہیں۔ میرا تو اب دماغ خراب ہونے لگا ہے تمہاری اس منحوس خاموشی سے آخر کوئی وجہ بھی تو

ہو۔" وہ جھلا اٹھا۔

"بتایا نا کچھ بھی نہیں۔ بس ویسے ہی دل نہیں چاہتا بولنے کو۔" تنکا ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔

"خیر پہلے تو تم ٹھیک تھے آج سے چند ہفتے پہلے تک۔ یہ دورے تو تمہیں اب ہی پڑنے شروع ہوئے ہیں اور آج تو میں سب پوچھ کر ہی ہلوں گا۔ بہت تمہاری شکل دیکھ لی میں نے یہ سڑی ہوئی۔" وہ پوچھے بغیر ٹلنے والا تھا بھی نہیں۔

"بھئی بتایا نا کچھ خاص نہیں۔" اس نے ریزے ہوا میں اچھال دیے۔

"چلو عام ہی بتادو۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"تمہیں معلوم تو ہے۔" اس نے دور اڑتے پرندوں کو اپنے آشیانوں کی طرف جاتے دیکھا۔

"کیا معلوم ہے۔ بھئی مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں ان معاملوں میں کیا ہر معاملے میں کوڑھ مغز ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو آٹھ جماعتیں ہی نہ کرلیتا۔ بس تم مجھے سمجھاؤ بلکہ بتاؤ۔" اس نے معاذ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"چلو! پرسوں رزلٹ آرہا ہے۔ ہفتہ ڈیلے ہوگیا ورنہ اب تک آچکا ہوتا۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"تو تمہیں فیل ہونے کا ڈر ہے یا رزلٹ کے آنے کا۔" اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔

"یہ بات نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟" وہ الجھ کر بولا۔

"یار! تمہیں معلوم تو ہے کہ ادھر سلطان میں ہمارا یہ آخری سال تھا اور اب رزلٹ کے بعد یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔ میں کہاں جاؤں گا۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے اس دنیا میں۔ بس اسی بات کی وجہ سے......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ رونا جو بہت آرہا تھا۔

"بس اتنی سی بات۔ او گھامڑ گدھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ارے تیرا یار کس لیے ہے۔ یہاں سے جانا تو اکٹھے ہی ہے نا تم بس میرے ساتھ چلنا۔" وہ زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"کدھر؟"

"بھئی میرے گھر۔ گاؤں اور کدھر۔" وہ بے فکر سے بولا۔

"تمہارا گھر بھی ہے؟" معاذ حیران رہ گیا۔

"تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں بے گھر ہوں خدانخواستہ۔" وہ برا مان کر بولا۔

"نہیں۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا مگر پھر ادھر رہنا۔"

"بھئی ادھر رہنا کیا؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"نہیں۔ اگر تمہارا گھر موجود ہے تو پھر ادھر کیوں رہ رہے ہو۔"

"اس لیے کہ میری ماں مجھے رکھنا نہیں چاہتی، سو مجھے یتیم خانے میں داخل کرا دیا گیا۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"تمہاری ماں بھی ہے؟" معاذ کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔

"سوتیلی ہے، پر ابا اپنا ہے سگے والا ذاتی۔" اس نے پاؤں جھلانے شروع کر دیے۔

"تو پھر تم ادھر کیوں پڑے ہو، وہ بھی اتنے برسوں سے۔ یہاں کا ماحول تمہیں معلوم ہے کتنا اذیت ناک اور تکلیف دہ ہے۔ ہر وقت کی مار کٹائی ٹھکائی۔ پھر گھٹیا کھانا اور سب سے بڑھ کر گھر گھر جا کر کھانا مانگ کر لانا۔ کتنی اذیت ہوتی ہے اس کام سے۔ تمہارے تو سب موجود ہیں۔ ماں سوتیلی سہی، باپ، گھر، گاؤں۔ پھر تم ادھر کیوں رہے؟" معاذ پریشان ہوا تھا۔

"او میری جان! یہاں سب چلتا ہے۔ وہ شبیر ہے نا! اس کی ماں زندہ ہے پر اس نے دوسری شادی کرلی۔ دوسرا باپ شبیر کو برداشت نہیں کرتا۔ اس لیے وہ بچپن سے یتیم خانے میں ہے۔ ادھر اسے یتیم اور لاوارث ہی لکھوایا گیا ہے میری طرح۔ امتیاز کے چچا، تایا سب موجود ہیں مگر کوئی اسے رکھنے کو تیار نہیں اور میں تمہیں بتاؤں وہ منا

جس کا نام بھی اس کے ماں باپ نہیں رکھ سکے۔ سائبان نے اسے منیر عرف منا کا نام دیا ہے۔ اس کے ماں باپ' بہن بھائی سب موجود ہیں۔ اس کا باپ سبزی منڈی میں مزدوری کرتا ہے۔ غربت کی وجہ سے اس کا باپ اسے اور اس کی چھوٹی بہن کو ادھر چھوڑ گیا تھا۔ اس کی وہ بہن تو ایک سردیوں میں یہاں شدید سردی اور گرم کپڑوں کی کمی کی وجہ سے بیمار پڑ گئی اور ہفتے بعد مر گئی۔ اس کے ماں باپ نے شکر کیا کہ ایک مصیبت کم ہو گئی۔ یہاں سب چلتا ہے اب یتیم خانے کا یہ مطلب نہیں سب یہاں رہنے والے یتیم ہی ہیں۔" اس کے انکشافات سے معاذ کو اپنی پریشانی بھول گئی۔

"اور تم' تم یہاں کیوں ہو؟"

"ہاں' میری کوئی معاشی مجبوری نہیں۔ بس اخلاقی مجبوری تھی۔"

"اخلاقی مجبوری!"

"ہاں۔ میرے ادھر گھر رہنے سے میری ماں کا اخلاق بہت گر جاتا تھا۔ اسے بداخلاقی سے بچانے کے لیے ابا مجھے ادھر چھوڑ گیا تھا۔ ویسے ابا سال میں دو تین بار ملنے آجاتا ہے اور بھئی میں یہاں خوش تھا بہت۔ کوئی فکر نہ فاقہ۔ ادھر کی مار تو کچھ بھی نہیں جو چار چوٹ کی مار میری ماں لگاتی تھی۔ انگیٹھی سے جلتی لکڑی نکال کر اس نے جو میری کمر پر نقوش بنائے ہیں تم دیکھو تو بے ہوش ہو جاؤ۔ اسی لیے تو ابا مجھے ادھر چھوڑ گیا۔ ادھر کی مار مجھے پھول لگتی تھی اور اب تو وہ بھی نہیں۔ اب ہم جوان مرد ہیں۔" اس نے اپنے "ڈولے" پہ ہاتھ مارا۔

"اور اب تمہاری ماں برداشت کرلے گی تمہیں؟"

"اس کے تو بڑے بھی کریں گے۔ اب تو منتیں کرتی ہے کہ ادھر آجاؤ ابا اب بیمار رہنے لگا ہے۔ اس سے کھیتی باڑی نہیں ہوتی اور اماں نے پیدا کیا کیا ہے۔ ایک سوکھی چمرخ کالی کلوٹی بیٹی جسے بہن کہنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ اب اماں کی اکڑ بھی دم توڑ چکی ہے۔ اب تو اس گھر کا وارث میں ہی ہوں نا۔ اب تو میری قدر ہونی ہی ہے۔ ابا اماں تو دن گن رہے ہیں کہ میں کب گاؤں آتا ہوں۔ وہ تو مجھے کافی عرصے سے لے جانا چاہ رہے تھے۔ میں ہی نہیں جانا چاہتا تھا۔" معاذ نے اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"اب تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں یار! مجھے تو ادھر کالج میں داخلہ لینا ہے۔ میں گاؤں وغیرہ نہیں جا سکتا۔" وہ اسی افسردگی سے بولا۔

"او میرے اداس طوطے! جب داخلہ ہو گا تو واپس آجانا مگر ابھی یہاں سے تم میرے ساتھ ہی چلنا۔ چلو جب تک داخلہ نہیں ہو جاتا گاؤں کی سیر کے مزے چکھنا۔ میری ماں کی لمبی زبان دیکھنا اور میری اس کلو بہن کے نخرے دیکھنا۔"

"نہیں یار! شکریہ۔ مجھے ادھر ہی رہ کر اپنا کچھ بندوبست کرنا ہے۔"

"ارے یار! کیوں تکلف برتتے ہو۔ کرلینا انتظام بھی۔ پر ابھی تم میرے ساتھ ہی چلو گے رزلٹ کے بعد۔ بس میں نے کہہ دیا ہے۔ چلو اٹھو اب اداسی چھوڑو اور اپنا سامان سمیٹو اندر جاکر۔ رزلٹ پرسوں آرہا ہے میں ابھی نوٹس بورڈ پڑھ کر آرہا ہوں اور پرسوں ہی ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔ اوکے۔"

"شکریہ..." وہ ہچکچا رہا تھا۔

"شکریہ کو چھوڑ' یار کہا ہے تو بن کر بھی دکھائیں گے۔ چلو اندر چلتے ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ اتنا آسرا ابھی بہت تھا فی الحال۔

"کل ہم "ریگل" میں "دی جنگل کوئین" دیکھیں گے۔ ریگل کے دہی بڑے کھائیں گے۔ تبت روڈ کے گول گپے اور رات کو گوالمنڈی میں سردار کی مچھلی۔ کل شام ہماری لاہور میں آخری شام ہو گی کم از کم میری۔ اس کے بعد تو وہی سڑا ہوا گاؤں اور کھیتی باڑی ہو گی۔ اس لیے کل ہم ایک بھرپور دن گزاریں گے۔" وہ چلتے ہوئے خود ہی پروگرام بنانے لگا۔

"نہیں یار! میرے پاس پیسے نہیں۔" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"ارے چھوڑو یار! پیسے کس کے پاس ہیں۔ خود ہی انتظام ہو جائے گا کوئی نہ کوئی۔ شبیر اور محسن بھی ہوں گے ہمارے ساتھ۔ بڑا مزہ آئے گا تم دیکھنا تو سہی۔ تم اندر چلو میں ابھی آتا ہوں کچھ پیسوں کا بندوبست کرکے۔" وہ اسے ہال کمرے کی طرف دھکیل کر خود واپس مڑ گیا۔

"پیسوں کا انتظام کرکے مگر کہاں سے۔" معاذ سوچنے لگا۔

♥ ♡ ♡ ♥
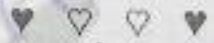
"مبین! تم جا رہے ہو؟" صبح کی مار کے بعد نہ اس نے ناشتا کیا تھا اور نہ دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اماں جی نے دوپہر کو اس کی منتیں کیں ڈھیر سارا پیار کیا' پھر جاکر اس نے دو نوالے لیے تھے اور اب سرِ شام ہی جانے کے لیے تیار تھا۔ دھلا ہوا استری شدہ نیلے کا کڑکڑ کرتا کلف والا شلوار قمیص پہن کر وہ تیار کھڑا تھا۔

"ہاں میں جا رہا ہوں تمہیں کوئی کام ہے؟" وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

"اس وقت اتنی شام کو نہ جاؤ۔ صبح جلدی چلے جانا۔" وہ اس کے اکھڑے لہجے میں نظرانداز کرکے فکرمندی سے بولی۔

"ہاں تاکہ رات یہاں رکوں اور صبح پھر ذرا سی دیر ہو جانے پر پہلے بابا صاحب سے اور پھر قاری صاحب سے جاکر کرارے کرارے جوتے کھاؤں۔ یہی چاہتی ہو نا تم' پہلے اس زینو کی بچی نے مار پڑوائی اور اب تم میری کھال ادھڑوانا چاہتی ہو۔" وہ کچھ غصے سے بولا۔

"صبح تو..." وہ ایک لمحے کو رکی۔ "زینب کا قصور تو نہیں تھا۔ تم خود بتا دیتے بابا صاحب کو۔"

"وہ سن رہے تھے میری بات اور اگر بتا بھی دیتا تو انہوں نے کون سا یقین کرلینا تھا یا اتنی بلاوجہ کی پٹائی پر مجھ سے معذرت کرلیتے نہیں ہونہہ۔" صبح والی چوٹیں دکھ دینے لگی تھیں۔

"وہ ہمارے بابا صاحب ہیں۔ اگر مار بھی دیتے ہیں تو اس میں اس قدر خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ شاید اسے تسلی دینا چاہ رہی تھی مگر اس کا جملہ اسے اور تپا گیا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں' وہ چاہیں تو ہمیں چھت سے الٹا بھی لٹکا دیں یا تیل کی کڑاہی میں پکوڑوں کی طرح تلوا دیں۔ انہیں اس کا حق ہے کیونکہ وہ ہمارے بابا صاحب ہیں۔ ہر ظلم کا انہیں خدائی حق حاصل ہے۔ آمنہ! باپ کی ماریں اور قصاب کی ماریں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے اور یہی حال ادھر قاری صاحب کا ہے۔ وہ پڑھاتے کم اور چمڑی زیادہ ادھیڑتے ہیں اور کیوں نہ ادھیڑیں۔ بابا صاحب نے انہیں اس کا پورا حق دے رکھا ہے۔ معلوم ہے جس روز وہ مجھے ادھر چھوڑ کر آئے تھے۔ قاری صاحب سے کہہ آئے تھے کہ اسے بس حافظ بنانا ہے' اس کے لیے کچھ بھی طریقہ استعمال کریں تو قاری صاحب ہنس کر بولے' چلیں تو پھر ٹھیک ہے گوشت ہمارا ہڈیاں آپ کی۔ جب یہ حفظ کرے گا تو آکر ہڈیاں لے جائیں۔" وہ ذرا رکا۔

"اور اس کا ثبوت دکھاؤں تمہیں۔ یہ میری کمر سے قمیص ہٹا کر دیکھو۔" وہ اس کے آگے کمر کرکے کھڑا ہو گیا اور خود ہی ہاتھ پیچھے لے جاکر قمیص اوپر کرنے لگا۔ آمنہ نے ڈرتے ڈرتے قمیص کا کونہ پکڑ کر اوپر کیا ساری کمر سرخ کالے بید کے نشانوں سے اٹی ہوئی تھی جیسے اس کے جسم پر کسی انسان کی نہیں کسی زیبرے کی کھال ہو۔ کالی سیاہ دھاریوں والی۔ اس نے جلدی سے قمیص نیچے کردی۔

"مبین! تمہیں درد نہیں ہوتا اتنی مار پڑنے پر۔" اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

"پہلے ہوتا تھا اب نہیں ہوتا اب تو ایک دو دن پٹائی نہ ہو تو جسم خواہ مخواہ ٹوٹنے لگتا ہے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر انگڑائی سی لی۔

"تو تم سبق اچھی طرح یاد کرلیا کرو نا۔"

"سبق میں چاہے زیر زبر بھی حفظ کرکے سنا دوں۔ قاری صاحب کوئی نہ کوئی غلطی دریافت کر ہی لیتے ہیں۔ ان

آٹھ ماہ میں صرف ایک دن مجھے غلطی دریافت نہ ہونے پر مار نہیں پڑی تھی۔"

"اس دن تمہیں سبق جو یاد ہو گا۔" وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں اس دن قاری صاحب کو بخار تھا اور انہوں نے میرا سبق نہیں سنا تھا۔ ہے نا لطیفہ۔" وہ ہنسا۔

"اچھا تو تم اب نہ جاؤ۔ اتنی شام ہو رہی ہے، صبح چلے جانا پلیز۔" وہ خوامخواہ اداس ہو رہی تھی۔

"نہ بابا! میں باز آیا۔ صبح بابا صاحب تہجد سے بھی پہلے مجھے اٹھا دیں گے اور اتنی سردی میں دوڑ لگوا دیں گے۔ اس سے بہتر ہے میں ابھی چلا جاؤں اللہ دتا تانگے کا آخری چکر ادھر چھوڑنے جا رہا ہے۔ آدھے گھنٹے تک میں بھی ساتھ ہو لیتا ہوں۔ دیکھنا ذرا اماں جی مارے محبت کے میرے لیے صبح سے دال کا حلوہ بنا رہی ہیں، تیار ہوا یا نہیں۔ اگر دیر ہے تو انہیں کہو رہنے دیں، اگلے ہفتے لے جاؤں گا۔" وہ مڑ کر اپنے دھلے ہوئے تینوں جوڑے تھیلے میں ڈالنے لگا۔

آمنہ تھوڑی دیر بعد اسٹیل کے ڈبے میں حلوہ اٹھائے اندر چلی آئی۔

"تھیلے میں ڈال لیتا۔ اماں جی کہہ رہی ہیں۔ گرم ہے، جا کر ذرا دیر کے لیے اس کا ڈھکن کھول دینا اور رات کو گرم دودھ کے ساتھ کھایا کرنا۔" آمنہ نے اسے اماں جی کا پورا پیغام پہنچایا۔

"گرم دودھ وہاں مجھے تم کر کے دو گی نا۔ ویسے بھی وہاں روز دودھ نہیں ملتا۔ ایک دن بعد ملتا ہے۔" اس نے تھیلا اٹھایا۔

"آمنہ! تم نے داخلہ بھجوا دیا ہے۔"

"ہاں، پچھلی بار متین بھائی فارم پر کروا کے لے گئے تھے۔"

"تمہاری تیاری کیسی جا رہی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ چلو، اماں جی سے مل لو پھر وہ مغرب کی نماز پڑھنے لگ جائیں گی۔" اسے باہر نکلتے دیکھ کر وہ بولی۔

"ادھر ہی جا رہا ہوں اور دیکھنا، اگلے سال ہم دونوں اکٹھے نویں جماعت میں داخلہ لیں گے۔ تم پاس ہو جاؤ تو۔" وہ اس کے پاس رک کر بولا۔

"تم اس سال حفظ کر لو گے؟" وہ کچھ خوشی سے بولی۔

"حفظ تو میں کبھی بھی نہیں کر پاؤں گا۔ یہ تو تم لکھ لو۔ ہاں اسکول میں داخلہ ضرور لوں گا۔ میرا دماغ متین بھائی جتنا تیز نہیں ہے کہ حفظ بھی کر لوں اور میٹرک کی سند بھی لے لوں۔ میں بس کچھ دن اور ہوں ادھر۔ میرا وہاں دل نہیں لگتا۔ آمنہ! میں جلد ہی ادھر آ جاؤں گا اور اگر بابا صاحب نے میری زیادہ مرمت کی تو میں یہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا کہیں بھی۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔" وہ بڑے نڈر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"مبین! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، بابا صاحب کو پتا چل گیا تو تمہیں معلوم ہے نا۔" وہ خوفزدہ ہو گئی۔

"معلوم ہے۔ کیا کر لیں گے میری کھال اتروا دیں گے تو اتروا دیں۔ مجھے اب کچھ ڈر نہیں۔ اب تو اپنی باڈی خاصی مضبوط ہو گئی ہے۔ چھوٹی موٹی مار سے ڈینٹ نہیں پڑتا۔" وہ اپنے ڈولے پر ہاتھ مار کر بے خوفی سے بولا۔

"مبی! ایسا نہ کرنا پلیز! تم دل لگا کر پڑھو۔ حفظ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ بس ایک آدھ سال لگے گا پھر تم بھی اسکول میں داخل ہو جانا بابا صاحب بھی خوش ہو جائیں گے۔" وہ اسے سمجھانے لگی۔

"بابا صاحب کو خوش کرنا اس جنم میں تو ممکن نہیں۔ ہاں شاید اگلے جنم میں ایسا کر سکوں۔ فی الحال میرا خرچ ہونے کا کوئی پروگرام نہیں۔ تم یہی چاہتی ہو مگر میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں اور نہ اتنا احمق ہوں۔ چاہے تو تم یہ سب اماں جی کو یا بابا صاحب کو بتا دینا۔ میں وہاں ٹکنے والا نہیں۔ بس چند ماہ اور ادھر ہوں مجھے خاص وقت کا انتظار ہے۔" وہ کہتے ہوئے اماں جی سے ملنے اندر چلا گیا۔ اس کا جواب سنے بغیر اور اس کے ہونق چہرے کی طرف دیکھے بغیر۔

"اگر بابا صاحب کو علم ہو گیا، وہ تو اسے جان سے مار دیں گے۔ میں اماں جی کو، بابا صاحب کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اللہ میاں سے دعا کروں گی کہ وہ اس کا دل پھیر دے اور اپنے علم کی طرف اسے

راغب کر دے اور بابا صاحب کے دل میں اس کی ڈھیر ساری محبت ڈال دے اور بغیر کسی کھوٹ یا ذاتی مفاد کے دوسروں کے لیے دعا کی جائے تو اللہ میاں ضرور قبول کرتا ہے۔ میں ابھی نماز پڑھ کر دعا کرتی ہوں۔"

♥ ♡ ♡ ♥

"اوہو فخر! اور کتنے دن لگائیں گے۔ میں بہت مس کر رہی ہوں آپ کو اور سنی بھی۔ پلیز اب جلدی آ جائیں۔" رعنا فون پر بے قراری سے بولی۔

"ڈارلنگ بتایا تو ہے کام سے کام نکل رہا ہے یہاں۔ ہمارے بزنس کا اس قدر اسکوپ ہے میں تو دیکھ کر ہی دنگ رہ گیا ہوں۔ جس کمپنی سے میں ایگریمنٹ کرنے آیا تھا اس کے علاوہ دو اور پرائیویٹ فرمز سے بات چل نکلی ہے۔ سرمایہ ان کا ہو گا کام ہمارا۔ ان لوگوں کو ہمارا کام بہت پسند آیا ہے۔ ادھر ووڈ ورک کی اور وہ بھی ہینڈ میڈ کی بہت ڈیمانڈ ہے، شکر ہے میں یونہی چند ایک سیمپل لے آیا تھا۔ کچھ جاپانی دوستوں کو گفٹ کرنے کے لیے ادھر تو بہت مانگ ہے۔ بہرحال میں اسی ہفتے تک پوری کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد آ جاؤں۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔" فخر نے تفصیل بتائی جو رعنا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری جو کانفرنس یا سیمینار کیا تھا؟ وہ ہو گیا اسلام آباد میں۔" آواز خاصی کم آ رہی تھی۔

"نہیں پرسوں ہے۔ میں کل جاؤں گی۔"

"بھئی اونچا بولو ذرا۔ میں نے تمہارے اور سنی کے لیے ڈھیر سارے گفٹس خریدے ہیں۔ ادھر موسم بے حد خوبصورت ہو رہا ہے۔ سنی کی اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں، اس کے ٹیسٹ کیسے ہوئے ہیں۔" فخر اب خاصی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

"سنی پڑھائی میں بالکل انٹرسٹ نہیں لے رہا، اس کا رزلٹ بہت خراب آیا ہے، وہ اب ٹیوٹرز سے بھی توجہ سے نہیں پڑھ رہا۔ اسکول سے بھی شکایتیں آ رہی ہیں۔ پلیز فخر آپ جلدی آ جاؤ۔ میں سنی کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔ وہ گھر میں بھی نہیں ٹکتا۔ مجھے بھی کل جانا ہے۔ دو تین دن مجھے ادھر لگ جائیں گے۔"

"مجھے آواز نہیں آ رہی لگتا ہے لائنوں میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تم اپنا خیال رکھنا اور سنی کا بھی۔ اسے بتاؤ کہ میں اگلے ہفتے آ کر اس کے کان کھینچوں گا۔ اگر اس کا رزلٹ اچھا نہ آیا۔ تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ میں پھر فون کروں گا، تم موبائل اپنے پاس ہی رکھنا۔ میں رات کو یا پھر کل فون کروں گا۔" آواز پھر گم ہو گئی تھی۔

"فخر! آپ ٹھیک ہیں نا۔ کھانا وقت پر لیتے ہیں۔" اسے خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں تم سنی کے اسکول وزٹ کر آؤ، اس کے ٹیچرز سے اس کے پرابلمز ڈسکس کرو۔ میں انشاء اللہ جلد ہی آ جاؤں گا۔ ڈونٹ وری مائی ڈارلنگ۔ اینڈ ٹیک کیئر۔ میں پھر فون کروں گا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

"سارے گاما۔ سارے گاما۔" ماسٹر حامد بخش لہک لہک کر گا رہے تھے۔

"گاؤ نا۔ تم بھی ماسٹر جی کے پیچھے۔" زیور گل نے بیزار شکل بنائے بیٹھی نین تارا سے کہا۔

"نو مام! دیٹس ویری ٹف اور ویسے بھی یہ سب مجھے پسند نہیں۔" نین تارا نے ناک چڑھا کر کہا اور فرشی نشست سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھی۔

"پسند کی بچی۔ آخر تمہاری پسند کیا آسمان سے اترے گی۔ آخر تم زندگی میں کیا کرو گی۔ گانا تم سے نہیں جاتا حالانکہ اللہ نے اتنی سریلی آواز اس ناقدری کے حلق میں ڈال دی ہے۔ دو چار اشتہار کیے میں نے کہا چلو چل نکلے گی تو کسی نہ کسی فلم یا سپرہٹ ڈرامے میں بھی اٹک ہی جائے گی کہ وہ سید زادہ ٹکر گیا۔ اس نے اس پر بھی پابندی لگا دی۔ ڈانس سے تم کوسوں دور بھاگتی ہو۔ چلو اسکرین کی اور بات ہے۔ ایک دنیا دیکھتی ہے مگر یہ رقص تو ہماری وراثت ہے۔ بندہ ہفتے میں ایک آدھ فنکشن گھر میں ہی سہی اٹینڈ کر لے تو پریکٹس ہوتی رہے۔ دوسرے کچھ

وسیلہ بھی لگا رہے اور مجھے اس کی فکر بھی ہلکان نہ کرے کہ میرے بعد یہ کیا کرے گی۔ ماسٹر جی اس چھوکری نے تو میرا بھیجا ہلا کر رکھ دیا ہے مگر کسی کام کی ہامی نہیں بھرتی۔"

زیور گل کب سے اس پر بھری بیٹھی تھی۔ اب اس کے انکار پر برس پڑی۔ نین تارا بے نیازی سے اپنے ہاتھوں کی ایکسر سائز کرتی رہی۔

"دیکھ رہے ہیں ماسٹر جی! اس کے اطوار۔" اس کی بے نیازی اسے اور آگ لگا گئی۔

"ارے خانم! تم چھوڑو یہ چھوٹے چھوٹے دھندے۔ اسے فلم میں لے آؤ۔ چانس میں دلوا دیتا ہوں شہرت اور پیسے دونوں کے لیے یہ شارٹ کٹ ہے۔" ماسٹر جی نے مفت مشورہ دیا۔

"اور ماسٹر جی! تباہی کے لیے بھی۔ ماسٹر جی جس طرح کی فلمیں ہمارے ہاں بنتی ہیں، اسے دیکھ کر بے اختیار خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ہمارے ملک کے بے چارے فلم بین بڑے حوصلے والے ہیں جو ایسی چیزوں کو ایک بند کمرے میں بیٹھ کر برداشت کرتے ہیں۔ مجھے ایسی کوئی چیز زبردستی بھی دکھانے کی کوشش کی جائے میں تو سینما اسکرین کو آگ لگا دوں۔ فلم میں تو مجھے کام نہیں کرنا اور وہ بھی خاص طور پر ادھر کی فلمیں۔" نین تارا نے ٹانگیں سیدھی کیں اور پاؤں آگے کر کے ایک خاص انداز سے ان کی ایکسر سائز کرنے لگی۔ گورے سفید بلور جیسے پاؤں بڑے لچک دار انداز سے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ ماسٹر جی نے موٹے عدسوں والی عینک اتار کر کرتے کے دامن سے صاف کی اور پھر لگا کر پاؤں کے اس بلوریں جوڑے کو دیکھنے لگا۔ منہ سے پان کی پیک سائیڈ سے بے اختیار بہہ رہی تھی۔

"دیکھا دیکھا اس کی بکواس کو۔ یہ نواب زادی آسمان سے اتری ہے جو اس کے لیے خاص قسم کی فلمیں بنائی جائیں۔" زیور گل پھر گرم ہو گئی۔

"ارے کہو تو ادھر کام دلوا دیتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔ ایک ہی رات میں ہٹ ہو جاوے گی جب فلم نکلے گی۔" ماسٹر جی پیک نگلتے ہوئے بولے۔

"نہ بابا کچھ بھی سہی اپنا دیس تو اپنا ہے پھر اس دشمن کو جا کر اپنا فن اپنا وجود دان کریں جسے ساری عمر وفا تو کیا دوستی بھی نہ کرنا آئی اور ماسٹر جی! دشمنی دوستی ایک طرف، وہاں ہمارا سپرہٹ سے سپرہٹ ایکٹر بھی گیا تو ذلیل ہو کر ہی آیا۔ وہ اسے گھٹیا کردار دیتے ہیں۔ چار پیسوں کے لیے اپنی عزت تو خراب کی، وطن کا نام بھی ڈبویا اور ان کو تمسخر کا موقع بھی دیا۔ میں باز آئی ایسے فن سے۔" نین تارا کے پاس ہر بات کا کرارا کرارا جواب موجود تھا۔

"ماسٹر جی! یہ لڑکی مجھے کوئی نہ کوئی روگ لگا کر چھوڑے گی۔" زیور گل نے بے بسی سے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اپنی ان کزنوں کو دیکھا ہے، موتی اور پارو کو۔ کیسے دھڑا دھڑ نوٹ چھاپ رہی ہیں۔ الناسید ھا کام کر کے پہلے اشتہارات میں کام کیا اور اب ہر دوسری فلم میں آ رہی ہیں۔ دونوں تیری ہم عمر ہیں اور ایک تو ہے کچھ نہ کرنے جوگی۔" زیور گل کا بس نہیں چل رہا تھا۔

"مام! ان دونوں کا حوالہ نہ دیں تو بہتر ہے۔ ان جیسا کام کرنے سے بہتر ہے، آدمی جا کر کسی اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔" وہ آرام سے صوفے پر سیدھی لیٹ گئی اور پاؤں جھلانے لگی "ویسے مام! ہماری فیملی میں پیسہ کمانے کا کوئی باعزت طریقہ بھی ہے یا نہیں۔"

"ہاں ہے!" زیور گل کا انداز جلا کٹا تھا۔

"کیا؟"

"کسی ارب پتی سے چند سالوں کے لیے شادی کر لو اور سارا کچھ اپنے نام کرا کے آرام سے طلاق لے لو اور پھر سے اس زندگی میں واپس آ کر عیش کرو مگر تم سے تو وہ بھی نہ ہو گا۔"

"گڈ آئیڈیا۔" نین تارا ہنسی۔ "شاہ جی مام۔" اس نے یاد دلایا۔

"بیگم صاحب! وہ سید صاحب آئے ہیں۔" نوکر نے اندر آ کر بتایا۔

"ہاں بلاؤ۔" اس نے نوکر سے کہا۔ "اور ماسٹر جی! آپ ذرا یہ ستار اور ہارمونیم اٹھا کر ادھر سے جائیں۔" ماسٹر جی نے سر ہلایا اور ہارمونیم اٹھا کر اندر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"نین تارا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" زیور گل کچھ دیر بعد بولی۔

"کیوں مام؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو۔ جاؤ یہاں سے۔" وہ سختی سے بولی تو نین تارا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مام! میں ان سے مل تو لوں۔" اس نے دبے لہجے میں کہا۔

"نین تارا! اٹھو یہاں سے۔" اب کے ذرا زیادہ سختی سے کہا گیا تو وہ برا سا منہ بنا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"آداب آئیے آئیے شاہ جی! آج اتنے دنوں بعد ہمیں درشن کرائے۔ ہم تو ترس گئے تھے۔ موبائل بھی آپ کا بند ہے، آف تھا۔ نین تارا انتظار کر کر کے تھک گئی۔ دو بار فلیٹ بھی گئی۔ ادھر بھی لاک تھا۔ بہت اداس ہو رہی تھی وہ آپ کے لیے۔" زیور گل اٹھ کر شاہ جی کا استقبال کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں بتاتے گئی۔

"بیٹھیں پلیز۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"اب کدھر ہے نین تارا؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔ تین دنوں سے کمرے میں بند ہے۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ بار بار بلا کر تھک گئی ہوں کہ چلو میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلو۔ موسم بدل رہا ہے کچھ اپنے ڈریسز خرید لو، جوتے اور جیولری مگر وہ تو میری ایک نہیں سن رہی۔ آج آپ آ گئے ہیں۔ آپ ہی اسے لے کر جائیں اور میری بچی کو ڈھیر ساری شاپنگ کرائیں۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے اس کا آپ کی جدائی میں۔" زیور گل نے آتشی ساڑھی کا ڈھلکتا پلو گھما کر شانے پر ٹکایا اور خود ذرا سا ہو کر بیٹھ گئی۔

"آج تو شاپنگ مشکل ہے گل جی۔ کچھ دنوں بعد لے جاؤں گا۔" شاہ جی نے سنجیدگی سے کہا اور سگار کا کش لینے لگے۔ زیور گل کے ماتھے پر ایک پل کو بل ابھرا۔

"شاہ جی! اب اسے چاہت کی ڈور میں باندھ کر یوں بے آس تو نہ کریں۔"

"گل جی! بے آس نہیں کر رہا وقت کی کچھ کمی ہے۔ اصل میں مجھے اپنی فیکٹری کے لیے کچھ مشنری خریدنے جرمنی جانا ہے۔ تقریباً مہینہ لگ جائے گا۔ یہی بتانے آیا ہوں اور یہ رکھ لیں۔" انہوں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے چیک نکال کر درمیان میں پڑی میز پر رکھ دیا۔ زیور گل نے فوراً جھپٹ کر چیک اٹھا لیا تیس ہزار کا تھا۔

"ایک مہینے کے لیے صرف تیس ہزار شاہ جی اتنے تو نین تارا کو پندرہ دن کے لیے کافی ہوں گے۔"

"میں اور لکھ دیتا ہوں۔" انہوں نے جیب سے چیک بک نکال کر پچاس ہزار کا چیک لکھ کر زیور گل کو تھمایا۔

"دونوں رکھ لیں۔" وہ فراخدلی سے بولے تو زیور گل کے سخت چہرے پر کچھ مسکراہٹ ابھری۔

"شاہ جی! یہ آپ اسے خود ہی جا کر دیں۔ مجھ سے نہیں لے گی۔ آپ کی بات اور ہے۔" وہ کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"کدھر ہے نین تارا۔"

"اپنے کمرے میں۔ آئیے میں لیے چلتی ہوں آپ کو۔" اس نے دونوں چیک انہیں تھمائے۔

نین تارا کھڑکی کے آگے کھڑی تھی شاہ جی نے دروازے پر پہنچ کر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"ہائے شاہ جی آداب۔" وہ بے تحاشا خوش ہو کر بولی۔ اس نے اپنا خوبصورت چھوٹا سا ہاتھ ایک ادا سے ماتھے تک لے جا کر سلام کیا تو ایک پل کو شاہ جی کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ بے اختیار ان کا دل چاہنے لگا کہ وہ اسے اپنے دل میں چھپا کر کہیں دور لے جائیں، بہت دور۔ جہاں صالحہ کے خیال کا سایہ تک نہ ہو۔ صالحہ کا خیال آتے ہی ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

"آیئے نا۔ ادھر کیوں رک گئے۔" اس کی سریلی آواز انہیں حقائق کے کانٹوں سے کھینچ لائی۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھے۔
"یہ تم تین دن سے کمرے میں کیوں بند ہو گل جی کہہ رہی تھیں۔" شاہ جی اندر آ گئے۔
"میں؟" اس نے سوالیہ انداز میں انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا "نہیں تو۔" شاہ اس کے قریب آ گئے۔
"آپ نے جو اتنے دنوں سے پلٹ کر میری خبر نہیں لی۔" اس نے منہ بسور کر بچوں کی طرح گلا کیا اور مصنوعی خفگی سے دوسری طرف رخ کر لیا۔ شاہ جی جیسے بے اختیار ہونے لگے۔
"میں تم سے بے خبر رہ سکتا ہوں۔ بھلا کوئی اپنی زندگی سے بھی بے خبر رہ سکتا ہے۔" وہ اس کے نازک کندھوں پر پڑی اخروٹی زلفوں سے کھیلتے ہوئے جیسے بے خود ہو کر بولے۔
"اسی لیے تین دن سے موبائل بھی آف کیا ہوا تھا۔" اس نے پیار بھرا شکوہ کیا۔
"موبائل ادھر ہی رہ گیا تھا آفس میں' آف نہیں کیا ہوا تھا۔" انہوں نے دھیرے سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔
"جھوٹ۔" وہ اس کے بہت قریب کھڑے تھے۔ اس سے نظر نہیں اٹھائی جا رہی تھی ان کی گرم سانسوں سے اس کی گردن نم ہو رہی تھی۔
"تمہارے سر کی قسم جان۔" وہ اس کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرنے لگے۔ وہ تڑپ کر محبت کے حصار سے نکل گئی۔
"شاہ جی! نو فاؤل۔" وہ ان کی حالت کا مزہ لیتے ہوئے کھلکھلانے لگی۔
"آخر کب تک بھاگو گی اس فاؤل سے نینو۔" وہ ہنس کر پھر قریب آنے لگے۔
"اسی لیے تو کہتی ہوں۔" وہ ایک ادا سے پلکیں جھپک کر بولی۔
"کیا؟"
"تھرو پراپر چینل پر کام کرنا چاہیے۔" وہ نازک سراپے کی کمان کو ذرا سا موڑ کر بولی۔
"یو مین۔" وہ اور قریب آ گئے۔
"شاہ جی! انجان نہ بنیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔
"کیا! بتاؤ نا۔" وہ اس کی طرف جھکے۔
"شاہ جی! آئی وانٹ ٹو میری یو۔ ڈو یو وانٹ؟" (میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں آپ بھی چاہتے ہیں؟) وہ ان کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔
"نینو ڈارلنگ! ابھی ان باتوں کے لیے عمر پڑی ہے۔" انہوں نے بازو اس کی کمر کے گرد رکھا۔
"تو شاہ جی! یہی وقت ہے ان باتوں کا' جب پیار عروج پر ہو۔" اس نے ان کی شرٹ کا بٹن کھولا۔
"پیار تو عروج پر ہے' اسے اور بڑھانا ہے۔" انہوں نے اسے اپنی طرف سمیٹنا چاہا۔
"پلیز شاہ جی میں مذاق نہیں کر رہی۔" اس نے باہر نکلنا چاہا۔
"میں کب کہہ رہا ہوں کہ مذاق کر رہی ہو۔" وہ اس کی ٹھوڑی کو چھو کر بولے۔
"پھر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" وہ معصومیت سے بولی' شاہ جی کا دل بے کل ہونے لگا۔
"وہ تو کر رہا ہوں۔" وہ جیسے خود سے بولے۔
"کب شاہ جی۔" وہ خوشی سے چلائی۔
"بہت جلد کب؟" وہ بے قراری سے بولی۔
"اچھا چھوڑو! ان باتوں کو۔ کر لیں گے شادی بھی۔ میں ایک ماہ کے لیے جرمنی جا رہا ہوں کام سے۔ فون روز کرتا رہوں گا۔ تم اداس نہیں ہونا۔" وہ اداس لہجے میں بولے۔

"جرمنی شاہ جی قریب کا گاؤں نہیں ہے۔ میں آپ کے بغیر اتنے دن نہیں رہ سکتی۔" وہ ناراضی سے منہ موڑ کر بولی۔
"آئی نو مائی سویٹ ہارٹ! بس ایک مہینہ جیسے تیسے گزار لو پھر ہم ہمیشہ کے لیے اکٹھے ہو جائیں گے۔" وہ اس کی پریشان لٹوں کو سلجھانے لگے۔
"ایک شرط پر شاہ جی!" وہ لاڈ سے بولی۔
"کیا؟"
"آپ مجھ سے نکاح کر کے جائیں۔"
"نکاح بچوں کا کھیل نہیں ہے نین تارا۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔
"آئی نو شاہ جی! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ اس کے بغیر آپ کو جانے نہیں دوں گی۔" وہ ضد سے بولی۔
"ضد نہیں کرتے نینو آ جاؤں گا نا' شاید مہینے سے بھی پہلے۔" وہ اسے اپنے ساتھ لگانے لگے۔
"نہیں شاہ جی! مجھے نہیں پتا۔ آپ مجھ سے نکاح کر کے جائیں۔ ورنہ مجھے ساتھ لے کر جائیں۔ بس اسے آپ میری ضد سمجھیں ورنہ پھر ادھر نہ آنا دوبارہ۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔
"رہ لو گی میرے بغیر؟" وہ اس پر جھک کر بولے۔
"آپ رہ لیں گے تو میں بھی رہ لوں گی۔" وہ منہ موڑ کر بولی۔
"اتنی ظالم نہ بنو ڈارلنگ۔" وہ اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولے "اچھا یہ دو چیک ہیں۔ پچاس ہزار کا اور تیس ہزار کا جو دل چاہے خریدنا اور خوش رہنا واپس آ کر تمہیں خوش کر دوں گا۔ تمہاری کوٹھی بھی تو مکمل ہونے والی ہے پھر تمہیں ادھر لے جاؤں گا۔" وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہے تھے۔
"نہیں شاہ جی! آج مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف نکاح یا پھر مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔" وہ بہل نہیں رہی تھی۔ ضد پر اڑی ہوئی تھی۔
"نین تارا! ضد نہیں کرتے۔ کہہ دیا نا کہ جلد آ جاؤں گا۔"
"تو شاہ جی! آج میری بات مانیں گے آپ۔" وہ اسی انداز میں بولی۔
"اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے فیکٹری پہنچنا ہے کام سے' تم یہ رکھو ابھی' مجھے اگلے ہفتے جانا ہے۔ کل بھی میں ادھر ہی ہوں پھر آ جاؤں گا۔ یہ لو پکڑو۔" انہوں نے چیک اسے پکڑانے چاہے۔
"شاہ جی! میں آپ کی رکھیل نہیں ہوں جو ان چار پیسوں سے بہل جاؤں گی۔ مجھے آپ کی رفاقت کا ٹھوس ثبوت چاہیے ابھی اور اسی وقت۔ ان چیکوں کو سنبھال کر رکھیں۔ کسی اور داشتہ کے کام آئیں گے۔" اس نے چیک ان کے منہ پر دے مارے۔
"نین تارا!" شاہ جی کا ہاتھ اٹھا اور اس کے پھول سے گال پر نشان چھوڑ گیا۔
وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ جی کو دیکھے گئی جو غصے سے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔

• • • • •

"عابدہ! تمہیں تو معلوم ہے مجھے یہ مرض لگے چوتھا سال ہونے کو آیا ہے مگر ساڑھے تین سال میں نے اس کی وجہ سے اتنی تکلیف نہیں اٹھائی جتنی ان چھ ماہ میں جھیل چکا ہوں بیٹھے بیٹھے۔" وہ نحیف آواز میں کہتے کہتے سینے پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے سانس لینے لگے۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے زندگی سے خالی بالکل ویران اور وحشت زدہ۔ مسز خان کو خوف آنے لگا۔
"بھائی! بھائی جان! آپ ٹھیک ہیں نا؟" انہیں پتا نہیں چلا کہ ان کی اپنی آواز بھی لرز رہی تھی۔ وہ کون سی بہت صحت مند و توانا تھیں' پانچ سالوں سے جسمانی معذوری انہیں اندر سے بھی دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔
"ٹھیک ہوں میں' اس طرح کا درد تو اب روز کا معمول بن گیا ہے۔" وہ پھیکی سی بے رونق ہنسی ہنس کر بولے اور

چھاتی کو ہولے ہولے مسلنے لگے۔

"ایسا کیا ہو گیا ہے بھائی جان جو اب تکلیف بڑھ گئی ہے' کسی اچھے اسپیشلسٹ کو دکھائیں نا۔ میں شہباز سے کہتی ہوں' آپ کو سی ایم ایچ میں لے جائے۔ وہاں آپ کا مکمل چیک اپ ہو جائے گا۔ ابھی ہم ہیں یہاں دو ایک روز' میں آج ہی شہباز سے کہتی ہوں۔" وہ فکرمندی سے بھائی کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"اب اس کا کچھ فائدہ نہیں عابدہ! میری تو دعا ہے بس نزہت کا فرض ادا ہو جائے تو میں اسی گھڑی اپنے خالق سے جا ملوں پھر مجھے ایک لمحہ بھی حیات سے ادھار نہیں چاہیے' ایک لمحہ بھی نہیں۔" ان کی آواز بھرا گئی اور سانس لینا جیسے اور بھی دشوار ہو گیا۔ سینے کا زیر و بم بڑھ گیا تھا۔

"بھائی جان خدا کے لیے ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ آپ ہزاروں سال جئیں' میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ آپ کا ہونا میرے لیے کتنا بڑا سہارا ہے' آپ کو کیا معلوم۔ میں آج ہی شہباز کے ساتھ آپ کو بھیجتی ہوں چیک اپ کے لیے۔" مسز خان رونے لگیں۔

"ارے عابدہ! بے وقوف ہو تم' اب یہ ڈاکٹروں کا کام نہیں ہے۔" وہی مردہ [illegible]۔ مسز خان کو خوف آنے لگا۔

"بھائی جان پلیز۔" وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے اختیاری سے بولیں۔

"آخر ایسا کیا ہو گیا' کیوں اس قدر مایوس ہو گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو نزہت کو آپ اپنے ہاتھوں سے رخصت کریں گے' اسے اپنے گھر میں آباد اور خوش و خرم دیکھیں گے۔ ان شاء اللہ۔" وہ انہیں حوصلہ دینے لگیں۔

"اللہ کرے۔" ان کا انداز وہی مایوس کن تھا' انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"سہیل کی آفس ٹائمنگز تو بہت ٹائٹ ہیں۔ کل بھی رات گئے آیا تھا' پرسوں سے ایک بار ہی تو ملا ہے مجھے۔" انہوں نے موضوع بدلا۔

"اسی کا تو سب کیا دھرا ہے۔" وہ سیدھے ہو کر غصے سے بولے۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ حیرت سے بولیں۔

"تمہیں نہیں معلوم کیا۔ عابدہ! یوں انجان بن کر میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو' میں پہلے ہی اس کے کارنامے کی وجہ سے زخم زخم ہوں۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولے۔

"بھائی جان!" مسز خان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں۔

"نہ وہ یہ گھٹیا حرکت کرتا نہ میں اپنی نظروں سے گرتا۔ چلو یہاں تک بھی ٹھیک تھا لیکن [illegible] کا انتخاب... عابدہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل میں بھاگ جاؤں۔ بس یہ نزہت کی زنجیر میرے پیروں کو جکڑے ہوئے ہے۔ جونہی بھاگ جانے کا سوچتا ہوں' یہ میرے پیروں میں کھنکنے لگتی ہے۔ میں کیا کروں' کہاں جاؤں؟" وہ بے بسی سے اپنی دائیں ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے بولے۔

"ہاں' سہیل نے یہ اچھی حرکت نہیں کی۔ خاندان کی عزت کی پروا کی اس نے نہ اپنی۔ کوئی اس طرح کرتا ہے محض شادی کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا' مگر وہ تو شاید کہہ رہا تھا کہ ریشم کے گھر والے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"سب بکواس ہے ان دونوں کا ڈراما۔ عابدہ! اس حرافہ نے سہیل کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی ہے اسے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اگر ٹھیک ہوتی' اس کا چال چلن مجھے اچھا لگتا' نیک شریف لڑکیوں جیسا ہوتا تو کیا میں سہیل کو اجازت نہ دے دیتا۔ میرا تو ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کی خواہش میں کیسے ٹال سکتا تھا' وہ ایک بار کہتا' میں سو بار سر کے بل جاتا اس کا رشتہ لینے مگر۔" ان کا سانس پھول گیا۔

"بھائی جان! کیا اس کے پاس کورٹ میرج کے سوا اور کوئی رستہ نہیں تھا۔ میں تو شادی میں آ ہی نہیں سکی تھی۔ ان دنوں بیمار ہی اس قدر تھی۔" مسز خان کافی حد تک اس واقعے سے لاعلم تھیں۔ واقعے کا علم تو سارے جہان کو تھا' بس اس کی جزئیات سے بے خبر تھیں۔

"مت کہو اس کو شادی۔ وہ تو ہماری بربادی تھی' ہماری عزت غیرت کی لاش کا جنازہ تھا وہ۔" وہ زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جیسے ان لمحوں کو جھٹلا رہے تھے' وہ بہت غصے میں تھے۔

"ریشم کے گھر والے راضی نہیں تھے کیا؟" وہ ان کے غصے سے خائف ہو کر آہستہ آواز میں پوچھنے لگیں۔

"عابدہ! ایسیوں کے گھر والے نہیں ہوتے' اس نے جھوٹ بولا تھا کہ اس کا باپ سوتیلا ہے اور اس کے بہن بھائی بھی بدچلن ہیں اور اس کا باپ اس کے وجود کا بیوپار کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ماں مجبور ہے۔ اس کے باپ کے ہاتھوں۔ اسی لیے وہ سہیل کو مجبور کر سکی کہ وہ اس سے کورٹ میرج کر لے' حالانکہ میں پہلی ملاقات میں ہی اس کی اصلیت جان چکا تھا۔ پھر بھی میں اس کی شادی سہیل کے حد سے زیادہ اصرار اور ضد کی وجہ سے کرنے پر راضی تھا۔ تھوڑی سی تحقیق سے ہی اس کی اصلیت کھل گئی تھی کہ۔" وہ سانس لینے کو رکے۔ "اس کی ماں کا تعلق اس بازار سے ہے۔ جہاں جسموں کا بیوپار ہوتا ہے اور ریشم اس کے عیاش لمحوں کا نتیجہ تھی۔ اس کی خبر اسے خود بھی نہیں تھی پھر بھی اس کے باپ کا حوصلہ۔" ان سے سانس کے ردھم کو جاری رکھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی میں صرف ان کے سانس کے اتار چڑھاؤ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنی قوتیں مجتمع کر رہے تھے۔

"کون سا باپ؟" مسز خان نے پوچھا۔

"اس کی ماں کا وہ شوہر جس سے اس نے شرعی نکاح نو سو چوہے کھانے کے بعد کر لیا تھا۔ پتا نہیں وہ کس قسم کا شریف آدمی ہے' جس نے آنکھوں دیکھی مکھی نگلی ہے۔ بہرحال ریشم کے بہن بھائی بدچلن نہیں تھے بلکہ وہ خود ماں کے نقش قدم۔" ان کا سانس پھر تیز چلنے لگا۔

"بھائی جان پلیز! آپ آرام کریں۔ لعنت بھیجیں ایسے لوگوں پر' آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" مسز خان گھبرا کر بولیں اور ہاتھ بڑھا کر انہیں لٹانا چاہا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

"عابدہ! آج مجھے کہہ لینے دو۔ دل کا بوجھ ہلکا تو ہو۔" وہ ہانپتے ہوئے مدھم آواز میں بولے۔

"اور اس بے حیا نے بہن کا خیال کیا' نہ بوڑھے باپ کا اور اس گندی نالی کے کیڑے کو اپنی دستار میں سجا کر لے آیا۔ وہ ابھی بھی اس کے کرتوتوں سے بے خبر ہے' کبھی طوائف بھی کسی ایک کی بنی ہے۔ اب تو وہ اور بھی کھل گئی ہے دن رات۔"

ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا جیسے میلوں بھاگ کر آ رہے ہوں اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ زور زور سے سینے کو مسلنے لگے۔

"بھائی جان پلیز! خدا کے لیے آپ لیٹ جائیں' آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ دفع کریں ان باتوں کو۔ میں پھر سن لوں گی۔ آپ لیٹیں' آرام کریں۔"

مسز خان ان کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھیں۔ ان کی تکلیف ان اذیت ناک باتوں سے اور بڑھ سکتی تھی اور خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مسز خان دہل گئیں۔

"عابدہ! میری بات سنو۔" وہ ذرا سا لیٹتے ہوئے پھولے سانس کے درمیان بمشکل بولے۔

"بھائی جان! میں ابھی یہیں ہوں ایک دو دن' پھر سن لوں گی۔ آپ آنکھیں بند کر کے ریلیکس کریں۔ خود کو اتنا ٹینس مت کریں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت سے بولیں۔

"عابدہ! ہاتھ تو میں جوڑتا ہوں تمہارے آگے۔ پتا نہیں زندگی اتنی مہلت دے نہ دے مگر تم میری نزہت کو اپنی بہو جلد از جلد بنا کر لے جاؤ۔ وعدہ کرو..." وہ خود کو کھینچ کھینچ کر بول رہے تھے۔

"وعدہ۔ بھائی جان! آپ کے سر کی قسم۔ نزہت میری ہی بہو بنے گی۔ بس اب آپ چپ کر جائیں۔ کچھ نہ سوچیں۔" وہ ان کی طبیعت سے سخت پریشان ہو اٹھی تھیں۔

"تھینک یو عابدہ! تم نے میرا بوجھ ہٹا دیا۔ تھینک یو۔" انہوں نے مدھم لہجے میں کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"صوفی صاحب! بس آپ کی دعاؤں سے اور اللہ کی مہربانی سے زندگی کے سارے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ دو بیٹیاں تھیں۔ وہ کٹھن فرائض۔ اللہ کے فضل سے دونوں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ بہت خوشحال نہ سہی مگر اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ چھوٹی کا گھر والا ذرا تنگ کرتا ہے۔ چار دن کماتا ہے۔ آٹھ دن بیٹھ کر کھاتا ہے بلکہ اڑاتا ہے پھر فاقے تڑاکے۔ خیر بیٹی صبر والی اور سمجھ دار ہے سب سنبھال لیتی ہے۔ تھوڑا بہت پس انداز کر ہی لیتی ہے۔ اتنی پریشانی نہیں۔ بس گھر والی ذرا بیمار رہتی ہے اس کی بھی عمر کا تقاضا ہے۔ ساری عمر کام کر کر کے ہڈیوں کے جوڑوں نے گھس کر تنگ تو کرنا ہی ہے۔ حکیم جی کی دوا دارو سے بھلی چنگی بھی ہو جاتی ہے۔ پنشن آ رہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ گزارہ ہو رہا ہے۔ اب کوئی خاص فکر نہیں۔"

ماسٹر عنایت اللہ مدرسے میں صوفی صاحب کے پاس بیٹھے اپنا احوال سنا رہے تھے۔

"اچھی بات ہے عنایت اللہ! ہر حال میں اللہ کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔ وہ بڑا رحیم ہے۔ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ہم اس کی نعمتوں کا شکر کہاں ادا کر سکتے ہیں۔" صوفی صاحب نے اپنی سفید سینے سے نیچے جاتی داڑھی کو مٹھی میں لے کر سلجھایا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ان کا رنگ اس عمر میں بھی سرخ و سفید تھا۔ ہاتھ پھیرنے سے رنگ اور دمکنے لگا۔

"چلو بچو! تم بھی اب چھٹی کرو، کل سبق اچھی طرح یاد کر کے آنا ورنہ کل چھٹی نہیں ملے گی۔" انہوں نے اپنے آگے بیٹھے تین چھوٹے چھوٹے بچوں سے کہا جو زور زور سے ہلتے ہوئے سبق یاد کر رہے تھے۔ ان کے چہرے صوفی صاحب کی بات سن کر کھل اٹھے۔ انہوں نے فوراً سے پیشتر قاعدے بند کیے اور صوفی صاحب جی السلام و علیکم۔" کہتے ہوئے نورانی قاعدے سینے سے لگائے کمرے سے باہر پڑی چپلیں پیروں میں اڑستے گھروں کو بھاگ گئے۔

"کوشش تو کرتا ہوں صوفی صاحب کہ پوری یکسوئی سے پورے خضوع و خشوع سے اس کی عبادت کروں۔ اس کا شکر ادا کروں۔ دل لگا کر نماز پڑھوں ویسے بھی اب اور کرنے کو ہے بھی کیا۔ پر پتا نہیں صوفی صاحب یکسوئی نہیں ملتی۔ دھیان نہ چاہتے ہوئے بھی بٹ جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ پڑھتے پڑھتے ہی ارتکاز ٹوٹنے لگتا ہے۔ خیالوں کے بے لگام گھوڑے الٹی سیدھی پگڈنڈیوں پر خوامخواہ ہی دوڑنے لگتے ہیں۔ رکوع اور سجدے میں بمشکل خود کو مجتمع کرتا ہوں کہ پھر قیام میں کھڑے ہوتے ہی بھٹکنے لگتا ہوں۔ اللہ سے سچے دل سے رابطہ جوڑنا چاہتا ہوں پر کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر پاتا۔" ماسٹر عنایت اللہ جیسے بے بسی سے بولے۔

"کوئی بات نہیں ماسٹر عنایت اللہ! کوشش جاری رکھو۔ وہ تو تمہاری خلوص نیت کو جانتا ہے ناں وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ تم ایک قدم اس کی طرف چلو گے۔ وہ دس قدم تم تک دوڑ کر آئے گا۔ عنایت اللہ تم مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہو۔ سائنس پڑھتے رہے ہو۔ اس ذات باری نے انسانی جسم میں دل یونہی نہیں بنایا اپنے قیام کے لیے بنایا ہے پر ہم انسان اس کی قیام گاہ کو شیطان کی آماجگاہ بنا کر پھر بھی اس کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" صوفی صاحب پر اثر لہجے میں بول رہے تھے۔

"صوفی صاحب! میں نے بتایا ناں۔" ماسٹر صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔

"دیکھیں ماسٹر صاحب! حق تعالیٰ انسان کی ان بشری کمزوریوں سے واقف تھا تب ہی تو اس نے انسانی دل کے چار حصے بنائے۔ سائنس یہی کہتی ہے ناں۔"

وہ مسکرائے، ماسٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ چار حصے انسانی جسم میں تازہ خون کی ترسیل کا کام تو کرتے ہی ہیں مگر ان کا روحانی مقصد حق تعالیٰ کا ذکر خیر ہمہ وقت کرنا ہے۔ چلو اگر یہ نہیں کر سکتے، ساری توجہ اس کو نہیں دے سکتے تو تم اس دل کو تقسیم کر لو۔ چار حصوں میں جیسے گھر کے چار کمرے۔ ایک آرام کے لیے۔ ایک سب گھر والوں کے لیے۔ ایک مہمانوں اور ملنے جلنے والوں کے لیے اور ایک اللہ کی یاد کے لیے۔ پھر اس حصے میں اس کمرے میں کسی اور کو نہ آنے دو۔ اسے صرف اللہ تعالیٰ

کے لیے مختص کر دو پھر دنیا داری کے دھندوں کی فکروں سے اس حصے کو آلودہ نہ کرو۔" ان کا میٹھا لہجہ سید ھا دل میں اتر رہا تھا۔

"یہی تو کر رہا ہوں صوفی صاحب! پھر بھی کوشش کے باوجود دنیا داری کے دھندوں کی فکریں کسی نہ کسی کونے کھدرے سے نکل کر اس حصے میں آ ہی جاتی ہیں۔" ماسٹر صاحب کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔

"اس میں تمہارا قصور نہیں ماسٹر عنایت اللہ! دیکھو ناں، اگر ایک کمرہ مکمل طور پر بھی بند ہو تو بھی کھڑکیوں دروازوں کی درزوں سے گرد آ ہی جاتی ہے۔ بس روز جھاڑ پونچھ کر لیا کرو۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس کوشش کے دوران مکمل ارتکاز حاصل کر ہی لو گے۔" وہ اسی محبت بھرے انداز میں بولے۔

"شکریہ صوفی صاحب! بس آپ کی یہی باتیں ہیں جو دل کو کھینچ کر ادھر لاتی ہیں۔ آپ سے کچھ باتیں کر کے دل کو سکون ملتا ہے۔" ماسٹر صاحب کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

"السلام و علیکم صوفی صاحب! اسلام ماسٹر جی!" فقیر حسین دس ماہ کے بچے کو گود میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کا تیرہ چودہ سال کا لڑکا بھی تھا۔

"آؤ آؤ فقیر حسین! وعلیکم السلام۔" صوفی صاحب نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"صوفی صاحب! اس بچے کو دم کرنا ہے، اس کی ماں نری وہمی ہے۔ کہتی ہے یہ دودھ نہیں پیتا اور کچھ کھا بھی نہیں رہا۔ پچھلے دنوں بخار چڑھا تھا اسی لیے چڑچڑا ہو گیا ہے، کھاتا پیتا نہیں۔ میں نے سمجھایا بھی مگر مانی نہیں۔ کہتی ہے جا کر صوفی صاحب سے دم کرا کے آؤ۔" فقیر حسین نے بیٹھتے ہوئے آمد کا مقصد بیان کیا۔

"ارے فقیر حسین! مائیں تو ہوتی ہی وہمی اور جھلی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کا سارا کچھ تو ان کی اولاد ہوتی ہے۔ جس کے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں ان کی جان ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ماں کے دل کو بنایا ہی ایسا ہے اولاد کے عشق اور بلائی جیسا۔ آگے کرو بچے کو۔ دم کر دوں۔" کہہ کر انہوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں اور پھر بچے کی پیشانی کو انگلیوں سے چھو کر منہ میں آیات پڑھنی شروع کیں بچہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے انہیں دیکھنے لگا۔ فقیر حسین اور ماسٹر صاحب نظریں جھکا کر بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد صوفی صاحب نے بچے کے چہرے پر پھونک ماری اور محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"فقیر حسین! تمہاری گھر والی قرآن پاک پڑھی ہوئی ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی صوفی صاحب!" فقیر حسین نے فخر سے کہا۔

"اس سے کہنا کہ بچے کو دودھ پلاتے وقت یا کچھ کھلاتے وقت تین بار سورہ قریش اس کے دودھ یا کھانے پر پڑھ کر پھونک دے۔ انشاء اللہ کھانے پینے لگے گا۔"

"وہ کون سی سورت جی؟" فقیر حسین دیہاتی لہجے میں بولا۔

"سورہ قریش۔ آخری پارے میں ہے۔" وہ نرمی سے بولے۔

"اچھا جی!" فقیر حسین نے ادب سے سر ہلا دیا۔ "اور صوفی صاحب ذرا اس کو بھی دم کریں۔ یہ لڑکا تو میرے کسی کام کا نہیں رہا۔ ماسٹر صاحب سے پوچھ لیں نہ اس نے پانچویں پاس کی ہے اسکول سے بھاگتا تھا۔ چار چوٹ کی مار مارتا رہا ہوں کہ کسی طرح پانچ جماعتیں پڑھ لے پر نہیں جی۔ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔" فقیر حسین نے بیٹھے بیٹھے لڑکے کے کان مروڑے۔

"اونہوں فقیر حسین! سختی سے نہیں۔ نرمی سے، پیار اور محبت سے سمجھاتے تو سمجھ جاتا۔ سختی سے چٹانیں ٹوٹتی ہیں۔ تم انسان کو بنانا چاہ رہے ہو سختی کی بنیاد پر۔" صوفی صاحب کچھ خفگی سے بولے۔

"یہی بات صوفی صاحب میں اسے سمجھاتا تھا کہ پیار سے بچے کو سمجھاؤ، پڑھ لے گا مگر اس نے نمبروں کی طرح مار مار کر پڑھائی سے بھگا دیا۔" ماسٹر صاحب بھی فوراً بولے۔

"نہ جی۔ اس پر مار کا، پیار کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پہلے پیار ہی کرتا تھا۔ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا تو پھر مارا تھا۔" فقیر

حسین نے فوراً اپنی صفائی پیش کی "چلو اسکول اب نہیں جاتا تو میرے ساتھ کھیتوں پر جائے اتنا کام اب مجھ اکیلے سے نہیں ہوتا۔ کون سا میرے ابّے کی زمینیں ہیں۔ مالکوں کو تو ٹیم (ٹائم) پر کام تیار چاہیے ہوتا ہے۔ پر اس کے پنڈوں میں بیک (پیپ) پڑ گئی ہے۔ کام کا کہوں تو موت پڑتی ہے اسے۔" فقیر حسین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ لڑکے کو کچا چبا جائے۔

"ایسے نہیں کہتے فقیر حسین! لڑکا ایسی ڈانٹ ڈپٹ سے باغی ہو جائے گا۔"

"ادھر آؤ بیٹا! میرے پاس۔" صوفی صاحب نے لڑکے کو محبت سے بلایا۔ وہ سر جھکا کر ذرا سا آگے کو کھسک آیا۔

"بیٹا! والدین اولاد نرینہ کی خواہش اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ بڑی ہو کر ان کا بازو بنے، ان کے کام میں ہاتھ بٹائے۔ باپ نے تمہیں کھلا پلا کر اتنا بڑا کیا ہے۔ اب تمہارا فرض ہے اس کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ بڑا اچھا بچہ ہے قرآن شریف تو اس نے دو سالوں میں ختم کر لیا تھا۔ مانو گے نا میرا کہا؟" انہوں نے محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"فقیر حسین! اسے دم کی ضرورت نہیں۔ میں نے سمجھا دیا ہے۔ اب اگر ضد کرے تو پھر میرے پاس لے آنا۔" وہ بولے۔

"شکریہ صوفی صاحب! بڑی مہربانی جی آپ کی۔" وہ ادب اور تشکر کے احساس سے بھیگا بھیگا بولا "اچھا جی سلام علیکم۔" وہ کہتے ہوئے گود کے بچے کو لے کر کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام!" صوفی صاحب نے لب ہلائے۔

"بڑا ظالم شخص ہے جی، بچے کو قصائی کی طرح پیٹتا ہے اور مارنے پر آئے تو بیوی کا بھی بھرتا بنا دیتا ہے پھر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اولاد بگڑ گئی ہماری۔" اس کے جاتے ہی ماسٹر صاحب بولے۔

"اللہ معاف کرے ہمارے گناہوں کو۔ بڑا حق ہوتا ہے اہل و عیال کا گھر کے سربراہ پر۔" صوفی صاحب نے ایک پل کو سر جھکا کر اٹھایا۔

اس کا بڑا کڑا حساب ہو گا۔ اللہ ہمیں معاف کرے اور سب کو نیکی کی توفیق دے۔" خوف خدا سے ان کا چہرہ یکدم زرد سا ہو چلا تھا۔

"بالکل جی بالکل۔" ماسٹر صاحب نے تائید کی۔

"صوفی صاحب السلام وعلیکم!" ایک آدمی دروازے میں نمودار ہوا۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے سر اٹھایا۔

"جی آپ کو بڑے شاہ جی نے حویلی میں بلایا ہے۔" اس نے پیغام دیا۔

"ٹھیک ہے۔ شام کو حاضر ہو جاؤں گا، میرا شاہ جی سے سلام کہنا۔" وہ بولے۔

"اچھا جی۔ اللہ حافظ۔" کہہ کر وہ شخص واپس پلٹ گیا۔

"اچھا صوفی صاحب! میں بھی چلتا ہوں۔" ماسٹر صاحب بھی کھڑے ہو گئے تو صوفی صاحب نے الوداعی مصافحے کے لیے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

♥ ♡ ♡ ♥
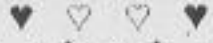
وہ دن اس کی زندگی کا یادگار دن تھا۔ اس نے ہوش تو اسی شہر میں سنبھالا تھا۔ شاید آنکھ بھی یہیں کھلی ہو مگر اتنی کھلی آنکھوں سے اس نے شہر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ایک دو بار "سائبان" کی طرف سے سب بچے مختلف تاریخی عمارتوں کی سیر کو گئے تھے مگر بڑی سی کھٹارا بس میں بھرے ہوئے کھچا کھچ بچوں کے ساتھ مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کی سیر کا وہ مزہ نہیں آیا تھا جو اس روز معاذ کو شبیر، محسن اور ظفر کے ساتھ ریس کورس، لارنس گارڈن اور چڑیا گھر جانے کا آیا تھا۔ وہ چاروں صبح گیارہ بجے نائب ناظم خورشید کو بتا کر "سائبان" سے نکل آئے تھے۔ کس روٹ کو کون سی ویگن جاتی ہے۔ ظفر کو سب معلوم تھا۔ پونے بارہ بجے وہ چودہ نمبر میں بیٹھ کر ریگل پہنچے تھے۔

"الفلاح" میں "دی جنگل کوئن" شروع ہونے والی تھی۔ ظفر نے رش کے باوجود چار ٹکٹیں خرید ہی لیں۔ فلم بالکل بکواس تھی۔ معاذ کی طرح ان تینوں کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ آدھی فلم دیکھ کر ہی اٹھ آئے۔ معاذ تو پہلی بار سینما آیا تھا۔ دیوار جتنی بڑی اسکرین پر چلتے پھرتے انسان اسے مافوق الفطرت ہی لگے تھے۔ کتنی دیر تک وہ انہیں مبہوت ہو کر دیکھتا رہا، اسٹوری پر توجہ اس نے بعد میں دی۔ اتنی دیر میں وہ تینوں اٹھ چکے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے باہر نکل آیا۔

"بکواس فلم تھی۔ پیسے ضائع کیے۔" محسن بڑبڑایا۔

"چلو تمہارے کون سے پلے سے گئے ہیں۔" ظفر نے زور سے کان میں انگلی گھمائی۔

"ادھر "ریگل" میں کون سی لگی ہے۔" اس نے ذرا آگے ہو کر بورڈ پڑھنا چاہا۔ "صرف بالغوں کے لیے" انگلش فلم کا نام تو ظفر نہ پڑھ سکا۔ ہاں اردو میں لکھا صرف بالغوں کے لیے۔ پڑھ لیا "چلو یار! یہ مزے کی ہو گی۔ یہی دیکھتے ہیں ادھر تو بے کار ہی گئے۔" اس نے تینوں کو آنکھ مار کہا۔

"یار! شو شروع ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے کیا کریں۔" ان کا پکا پروگرام تھا فلم دیکھنے کا۔

"اب! واپس چلیں۔ دیر ہو گئی ہے، ناظم صاحب کو پتا چل گیا تو وہ ناراض ہوں گے۔" معاذ ان کے پروگراموں سے گھبرا کر بولا۔

"ارے۔ ظفری یار! بولا بھی تھا اس الو کو نہ لے کر آؤ، یہ مزہ کر کرا کرے گا۔" محسن خفگی سے بولا۔

"ارے چھوڑو، اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ چلو تمہیں چمن کی آئس کریم کھلاتا ہوں۔ ایک بار کھائی تھی۔ ابھی تک ذائقہ یاد ہے، پستے بادام والی۔"

وہ آگے چل پڑا۔ تینوں اس کے پیچھے چل پڑے۔

صرف بالغوں کے لیے واقعی دیکھنے کے قابل نہیں تھی۔ معاذ کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ وہ دس منٹ بعد ہی باہر بھاگ آیا مگر وہ تینوں جم کر اندر بیٹھے رہے اور وہ ان کے انتظار میں الوؤں کی طرح باہر ٹہلتا رہا۔ اس کے پاس تو ویگن کے کرائے کے پیسے بھی نہیں تھے۔

"یار! قسم سے مزہ آ گیا۔" فلم ختم ہوتے ہی تینوں باہر آ گئے۔

"چلو نا یار! چلتے ہیں اب۔" تین بج چکے تھے۔ معاذ بہت بور ہو چکا تھا۔

"اس کی وہی رٹ لگنے والی چلو نا۔ چلو نا۔" شبیر بیزار ہو کر بولا۔

"چلو یار! اب کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ پیٹ میں چوہوں کا فائنل میچ ہو رہا ہے۔" محسن پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"مزنگ روڈ کے آلو چنے یا گول گپے۔" ظفر نے چوائس پوچھی۔

"ارے گولی مارو گول گپوں کو۔ بڑی بھوک لگی ہے یہیں سے ایک ایک برگر لے لو۔" شبیر کو بھی شدت کی بھوک کا احساس ہوا۔

"برگر سے پیٹ نہیں بھرے گا، صبح آنے کی خوشی میں ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ نان چنے لو۔" محسن کو زیادہ ہی بھوک لگی تھی۔ نان چنے کھاتے ہی پھر معاذ نے جانے کی بات کی۔

"چھوڑو یار! جانا ہی ہے۔ اب ہمیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کل تو ہم نے چلے ہی جانا ہے۔ آج عیش کر لینے دو۔ چلو چڑیا گھر چلتے ہیں۔"

پھر معاذ کی کوشش کے باوجود کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ انہوں نے تھیٹر میں ڈرامہ بھی دیکھا۔ جس میں انڈین گانوں پر کھلا ڈلا ڈانس کیا گیا تھا۔ ان تینوں نے خوب انجوائے کیا، معاذ کا تو خون خشک ہو رہا تھا۔ ناظم صاحب ان معاملوں میں بہت سخت تھے۔

"پتا نہیں کیا ہو گا۔ میں کیا کہوں گا۔" وہ اندر ہی اندر ہول رہا تھا۔

رات کو انہوں نے گوالمنڈی میں سردار کی مچھلی کا ڈنر کیا، ابھی تو ظفر کا بڑا دل للچا رہا تھا کہ "ہیرا منڈی جائیں

پاس ہی تو ہے۔ دیکھیے کے سری پائے بھی کھائیں گے۔ کوئی رونق شونق دیکھتے۔" اس نے حسرت سے کہا۔

"یار! نو تو بج گئے ہیں۔ کھانا کھاتے ہمیں دس بج جائیں گے۔ اب پھر سہی۔" شبیر نے اس کی بے لگام حسرتوں پر بند باندھنا چاہا۔

اور واقعی جب گیارہ بجے انہوں نے سائبان کا گیٹ کھٹکھٹایا اور چوکیدار نے ان چاروں کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ وہ چاروں جیسے ہی اندر داخل ہوئے، چوکیدار نے انہیں گیٹ کے دوسری طرف بنے چھوٹے سے کمرے کی طرف دھکیلا۔

"چلو ادھر تمہارے لیے ڈنر کا اہتمام کیا گیا ہے۔" اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ معاذ کے پورے جسم میں خوف سے جھرجھری سی دوڑ گئی۔

اندر کمرے میں کون تھا' یہ تو اسے پتا نہ چل سکا مگر کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے ان پر ڈنڈوں اور لاتوں سے حملہ کر دیا گیا۔

"حرامزادوں! الفنگوں! یہ صلہ دیا تم نے اتنے سالوں کی پرورش کا۔ نمک حرامو! کتو! جس تھالی میں ساری عمر کھایا' اسی میں چھید کیا تم نے۔ آج تمہاری ہڈی پسلی ایک نہ کردی تو نام میرا بدل دینا۔" یہ نائب ناظم کی آواز تھی۔ انہیں اس قدر بے دردی سے پیٹا گیا کہ چند لمحوں بعد وہ چاروں بے ہوش ہو چکے تھے۔ ننگے فرش پر وہ بے سدھ پڑے تھے۔

"ارے یہ کیا کیا۔ اس قدر مارا ہے تم لوگوں نے انہیں۔" معاذ کے ڈوبتے ہوئے حواسوں نے ناظم صاحب کی آواز سنی۔

"کیا معاذ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کا تو کل رزلٹ ہے' بورڈ نے اس کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی پوزیشن بن رہی ہے۔ تم نے اس کا کیا حال کر دیا ہے' کل میں کیا جواب دوں گا سب کو۔" ناظم صاحب غصے اور افسوس سے بول رہے تھے۔ معاذ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ گال پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں دو موٹے موٹے موتی لیے بھونچکی کھڑی انہیں دیکھے گئی۔ یہ اس کی سترہ سالہ زندگی کا پہلا تھپڑ تھا اور وہ بھی اس ہستی سے جس کو وہ اپنا دل دان کیے بیٹھی تھی۔ تن من کی شرط کے وارنے کو تیار تھی اور من کا تو سوال ہی کیا' اس کا من تو بنا ہی شاہ جی پر دیوانہ وار نثار ہونے کے لیے تھا اور آج اس بے دردی سے اس ستم گر نے اس کے پھول سے نازک رخسار کو چھیل ڈالا اور ابھی بھی ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور غصہ جیسے سوا ہوتا جا رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ۔

"اس طرح کی کوئی بھی بکواس کرنے سے پہلے نین تارا! اپنی اوقات ذہن میں رکھا کرو۔ ہماری ذرا سی نظر کرم نے اگر تمہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا ہے تو یہ سب لٹنے میں دیر نہیں لگے گی۔ کیا تمہیں سب کتنا سوٹ کرتا ہے' سوچنا اس بات پر۔ اللہ حافظ۔"

وہ غصے سے تن فن کرتے کمرے یا "گل کدہ" سے نکل گئے' جس تیزی سے انہوں نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی تھی' اگر چوکیدار بجلی کی سی تیزی سے گیٹ وا نہ کرتا تو یقیناً وہ گاڑی گیٹ سے ٹکرا دیتے۔ گل کدہ کی خاموش فضاؤں کو فنا کرتی ہوئی سید سلطان بخت کی بی ایم ڈبلیو زن سے باہر نکل گئی تھی اور ریکارڈنگ پر جانے کے لیے تیار ہوتی زیور گل کے ہاتھ سے لپ اسٹک گر گئی۔ اس نے دوڑ کر کھڑکی کھول کر لان سے باہر جاتی سڑک پر شاہ جی کی گاڑی کے ہیولے کی آخری جھلک دیکھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ انہیں قدموں پر پلٹ کر نین تارا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ اپنے بیڈ پر اوندھی لیٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ہچکیوں کی شدت سے اس کا دھان پان سا وجود سارے کا سارا لرز رہا تھا۔

"تارو! کیا ہوا میری جان!" زیور گل نے تیزی سے بیڈ کے پاس پہنچ کر جھکتے ہوئے نین تارا سے پوچھا۔ جس

نے زیور گل کی آواز کو ان سنی کر دیا تھا۔ وہ اسی اسپیڈ سے رو رہی تھی۔

"تارو! میری جان! میری بچی! کیا بات ہے۔ کیوں اس طرح رو کر میرا دل دہلا رہی ہو۔ سیدھی ہو۔" زیور گل نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے سیدھا کرنا چاہا۔ نین تارا نے بری طرح سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"نین تارا! What,s happened" وہ ایک دم سے گل خانم بن کر بولی۔ نین تارا بس اسی لہجے سے ڈرتی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" وہ سسکیاں روک کر سیدھا ہوتے ہوئے ذرا غصے سے بولی۔

"تو رو کیوں رہی ہو۔ سیدھی ہو کر بیٹھو اور مجھے بتاؤ۔" اس کی رعب دار آواز پر نین تارا جھنجلا کر اٹھ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ اور آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ آنسوؤں سے دھلا ہوا سرخ و سفید چہرہ اور دمکنے لگا۔

"کیا ہوا ہے؟" زیور گل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ایک دم سے اس کی نظر اس کے بوٹی کی طرح سرخ رخسار پر پڑی جہاں تین نشان ابھرے ہوئے تھے۔ انگلیوں کے۔ زیور گل کو گویا کرنٹ لگا۔

"یہ۔ یہ۔" انہوں نے انگلی سے اس کے گال کو چھوا۔ "کیا۔ کیا ہوا ہے؟" وہ بے یقین لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔" نین تارا نے بسورتے ہوئے پھر رخسار رگڑنا چاہا۔

"بتاؤ مجھے۔ کیا ہوا ہے۔ شاہ جی نے ہاتھ اٹھایا ہے تم پر۔ بولو؟" اس کے لہجے میں بے پناہ سختی تھی۔

کچھ دیر کی ہچکچاہٹ کے بعد نین تارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہاٹ!" زیور گل پوری کی پوری گھوم گئی۔ "اس سید زادہ کی یہ جرات۔ میرے گھر میں' میری لخت جگر پر۔ میری کلی جیسی نازک بچی پر۔ اوہ تو۔" وہ بے یقینی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہ بتایا۔ وہ شریف زادہ سامنے ہوتے ہوئے ادھر سے جاتا نا۔" غم و غصے سے زیور گل کا برا حال تھا۔ نین تارا کی لمبی لمبی پلکوں پہ ٹنگے سے دو موتی ٹوٹ گئے۔ وہ غیر ارادی طور پر بایاں پاؤں زور زور سے ہلانے لگی۔

زیور گل نے ایک گندی گالی بکی "میرے سامنے ہوتا ابھی وہ۔ میں اس کا منہ نوچ لیتی۔" اس نے غصے سے پھر گالی دی۔ نین تارا ماں کی ہمدردی پا کر پھر سے اشک بہانے لگی۔ کچھ دیر زیور گل اپنے غصے پر قابو پاتی رہی۔

"کیا ہوا تھا؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ نین تارا چپ رہی "بولو نینو! کیا ہوا تھا؟" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت سے اس کے بال سنوار کر بولی۔

"مام! وہ وحشی ہے۔" وہ سسکی۔

"یس آئی نو مائی ڈارلنگ۔" زیور گل نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ وہ پھر سے سسکنے لگی۔

"اچھا اب نہیں رونا۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ بولو کیا ہوا تھا۔" زیور گل نے نرمی سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

"مام! کچھ بھی نہیں۔" وہ بھولپن سے بولی۔

"پھر بھی میری جان!" اس نے محبت سے اس کے گال کا بوسہ لیا۔

"مام! میں نے شاہ جی سے کہا کہ جرمنی جانے سے پہلے ابھی اور اسی وقت مجھ سے نکاح کریں۔ بس انہیں غصہ آ گیا۔" نین تارا نے بایاں پاؤں جھلاتے ہوئے کہا۔

"وہاٹ! آر یو میڈ (تم پاگل ہو)؟" زیور گل چلائی۔

"کیوں مام! اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ دولت کمانے کا یہ بہترین شارٹ کٹ ہے اور پھر مجھے تو واقعی شاہ جی سے محبت بھی ہو گئی ہے۔" آخری جملہ مدھم لہجے میں کہا گیا۔

"محبت کی بچی! کبھی کسی طوائف نے بھی محبت کی ہے؟" زیور گل نے دانت پیسے۔

"کیا؟ کیا کہا مام آپ نے؟" اب چلانے کی باری نین تارا کی تھی۔

"اگر شاہ جی نے تمہیں اس بات پر تھپڑ مارا ہے۔ تو بہت اچھا کیا ہے کیونکہ اس بات پر میں تمہیں جان سے بھی مار سکتی ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نین تارا کو فنا کر ڈالے۔

"مام!" وہ احتجاجاً چلائی۔

"مت چلاؤ! مجھے تم سے اس حماقت کی توقع نہیں تھی۔ اسٹوپڈ گرل۔" وہ غصے سے بولی۔ "لیکن نہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس طرح کی احمقانہ، عقل سے عاری بات صرف تم ہی کر سکتی ہو نین تارا صرف تم" اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "نامعلوم میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی کہ تم مکمل نہ ہو سکیں۔" وہ سر ہاتھوں میں پکڑ کر کاؤچ پر ڈھیر ہو گئی۔

"مام! شاہ جی کو قابو میں کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں، اگر وہ ایک بار جرمنی چلے جاتے پھر انہوں نے ادھر کا رخ کیوں کرنا تھا اور ویسے بھی وہ ایک دن کا کہہ کر جاتے ہیں اور دو ہفتے تک نظر نہیں آتے۔ میں ان کی صرف دوست ہوں نا اس لیے، بیوی ہوں تو ان کی مجال نہیں یوں غائب ہونے کی۔" وہ اپنے تئیں زیور گل کو بڑے پتے کی بات سمجھا رہی تھی۔

"نین تارا! نین تارا! کیپ کوائٹ۔" زیور گل شدید غصے کے عالم میں چلائی "یو فولش گرل! کاش میں تمہیں عقل سکھا سکتی یا کہیں سے خرید کر دے سکتی۔" زیور گل بے بسی سے بولی۔

"بے وقوف لڑکی! کیا تم نے اس مرغی کی کہانی نہیں سنی جو روز سونے کا انڈا دیتی تھی پھر اس کے احمق مالک نے سارے انڈے حاصل کرنے کے لیے اسے ذبح کر دیا اور احمق پن میں تم نے اس شخص کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟ اس سید زادے کو نیک، پارسا، شریف لڑکیوں کی کمی ہے جو تم جیسی طوائف زادی کو اپنی عزت کا تمغہ پہنائے گا۔ وہ ادھر آتا رہے گا تا قیامت اگر تم اس کی محض دوست رہو گی۔ جس دن بیوی بن جاؤ گی اس دن اسے کھو دو گی۔ نین تارا! میں تمہیں یہ بات طوطے کی طرح رٹوا رٹوا کر تھک گئی اور آج تم نے وہی بکواس کر دی۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہارا گلا دبا دوں۔" زیور گل کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

"مام! مائنڈ یور لینگویج۔" نین تارا کی سوئی طوائف زادی پر اٹک گئی تھی۔

"شٹ اپ! مجھے لینگویج نہ سمجھاؤ جو آئینہ وہ سید زادہ تمہیں دکھا گیا ہے اس میں خود کو دیکھو اور پہچانو اور کبھی نہ بھولنا کہ تم کیا ہو۔ انڈر اسٹینڈ۔" زیور گل کا بی پی ہائی ہو چکا تھا وہ غصے میں چلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور نین تارا اس کے آخری جملے پر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"آئینہ؟ کون سا آئینہ؟"

♥ ♡ ♡ ♥

"بس شاہ جی! کل شام کوشش کے باوجود حاضر نہیں ہو سکا آپ کی خدمت میں۔ فیصل آباد سے کچھ مہمان آ گئے تھے۔ مدرسے سے متعلقہ حضرت مولانا احمد خان رومی اور ان کے کچھ احباب۔ ان کے ساتھ گفتگو اور خاطر مدارت کی وجہ سے میں حاضر نہیں ہو سکا۔ میں نے قادر بخش کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا تھا اور نہ آنے کی وجہ بھی بتا دی تھی۔ آپ کو پیغام مل گیا تھا نا۔" صوفی صاحب کین کی آرام دہ کرسی پر ایستادہ سید سبطین شاہ سے معذرت خواہ انداز میں کہہ گئے۔

"جی صوفی صاحب! آپ کا پیغام مجھے مل گیا تھا نا آنے کی وجہ آپ نے بتا دی، اس لیے معذرت کی تو ضرورت نہیں، ایسا ہو جاتا ہے اور اچھا ہی ہوا۔ کل آپ نہیں آئے، کل میں شاید آپ کو وقت دے بھی نہ پاتا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"کیوں شاہ جی، وجہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟" صوفی صاحب نے مؤدب انداز میں کہا۔

"بس صوفی صاحب! کیا بتاؤں، اب اس دل کا بھروسا نہیں رہا۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسے۔

"کیا مطلب؟" صوفی صاحب چونکے۔

"کل شام طبیعت کچھ بگڑ گئی تھی اس لیے، کل شام تو ہم نے اپنے کمرے میں ہی گزار دی۔" صوفی صاحب کو ان کا چہرہ کمزور سا لگا۔

"اللہ خیر کرے صحت کاملہ عطا فرمائے آپ کو۔ آپ کو ہمارے سروں پر تا قیامت قائم و دائم رکھے، اب کیسی

طبیعت ہے آپ کی؟" صوفی صاحب فکرمندی سے بولے۔

"بہتر ہوں اب اور صوفی صاحب! تا قیامت کی تو دعا نہ دیں۔ یہ تو ہمارے لیے بددعا ہو جائے گی۔ اس مرض قاتلہ کے ساتھ تو چند دن گزارنا بھی ہمارے لیے قیامت گزرنے سے کم نہیں۔ خدا ہر ایک کو اس موذی تکلیف سے محفوظ رکھے۔ بندہ کہتا ہے کہ کل کی آتی آج آ جائے۔" شاہ جی اپنی بیماری سے ازحد تنگ آ چکے تھے۔

"اللہ رحم کرے آپ پر۔ میں تو ہر لمحہ آپ کی صحت کے لیے دعاگو رہتا ہوں۔ آپ جیسا رحم دل، مہربان حاکم خدا ہر علاقے کو نصیب فرمائے اور جو خدا کے پیارے بندے ہوتے ہیں، وہ مخلوق کے بھی پیارے ہوتے ہیں اور شاہ جی! اس گاؤں کا تو بچہ بچہ آپ کی صحت اور زندگی کے لیے دعاگو رہتا ہے، آپ کا سلوک جو سب سے اس قدر مہربان اور محبت والا ہے پھر نماز کے بعد آپ کی صحت کے لیے مسجد میں دعا کروائی جاتی ہے۔ جب اتنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھیں تو رحمت باری ضرور جوش میں آتی ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ نصیب فرمائے گا۔ آمین! مجھے یقین ہے۔" صوفی صاحب محبت و عقیدت کے جذبے میں ڈوبے ہوئے بول رہے تھے۔

"آپ کی محبت ہے صوفی صاحب اور گاؤں والوں کی بھی ورنہ میں تو بڑا گناہ گار بندہ ہوں اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ بندوں کے حقوق کب کوئی پورے طور پر ادا کر سکا ہے۔ سرداری تو صوفی صاحب کانٹوں کی سیج ہے، ایک پل سکون کا نہیں ملتا۔"

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔" صوفی صاحب نے عقیدت سے سر ہلایا۔ "شاہ جی ایسے سردار تو قسمت والوں کو ملتے ہیں، اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے کہ جن میں اپنے منصب کی نزاکت کا اس حد تک احساس ہے جزاک اللہ۔" صوفی صاحب نے اپنی ریش مبارک کو مٹھی میں لے کر...

"دعا کیا کیجیے ہم گناہ گاروں کے حق میں بھی صوفی صاحب!" شاہ جی پھیکے لہجے میں بولے۔

"کیوں نہیں شاہ جی! کیوں نہیں، ہمارا تو رواں رواں آپ کے لیے دعاگو ہے۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔" انہوں نے شاہ جی کو یقین دلایا۔

"میں نے کل بھی آپ کو اسی لیے بلوایا تھا کہ ہم نے آپ کے چھوٹے شاہ جی کی شادی کا ارادہ فرمایا ہے۔ اگلے مہینے کی چار تاریخ مقرر کی گئی ہے یعنی اب بمشکل بیس پچیس دن ہیں۔ شادی تو ہم بے شک سادگی ہی سے کریں گے اکلوتے بیٹے کا باپ ہونے کی حیثیت سے سلطان بخت کے متعلق ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں جو ہم پورے کرنا چاہتے ہیں لیکن اس منصب کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو ہمیں ایسا کرنے سے روکتے ہیں کہ شان و شوکت اور دھوم دھڑکا نہ تو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور نہ ہماری خاندانی روایت۔ اس لیے ہم نے شادی کی تمام تقریبات سادگی سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کل صبح کی نماز کے بعد آپ پورے گاؤں میں اعلان کروا دیں کہ کل کسی گھر میں چولہا نہیں جلے گا۔ سب گاؤں والے حویلی ہی سے کھانا کھائیں گے اور شادی کی تیاریوں کے لیے حویلی کے اندرونی کام کاج کے لیے گاؤں کی عورتیں کل صبح سے حویلی میں آ جایا کریں۔ اس کے علاوہ آپ کل صبح نماز فجر کے بعد مدرسے کے بڑے لڑکوں کو لے کر مردان خانے میں آ جائیے گا جہاں قرآن خوانی ہو گی۔ شادی کے دن تک روزانہ ایک قرآن پاک ختم ہو گا اور کل دوپہر کو حویلی کے زنان خانے میں میلاد شریف ہو گا جس میں آپ کے گھر کی خواتین اور تمام گاؤں کی عورتیں شرکت کریں۔" وہ سانس لینے کو رکے۔

"اس کے علاوہ چونکہ میرا ارادہ سلطان بخت کو اس بار الیکشن میں کھڑا کرنے کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ سلطان بخت کے اور میرے، بہت سے احباب شہر اور دوسرے ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں جو شاید گاؤں آنے کا وقت نہ نکال سکیں، اس لیے ولیمے کی ایک تقریب لاہور کے پی سی ہال میں بھی ہو گی، جس میں میری طرف سے شرکت کریں، مجھے خوشی ہو گی۔" یہ دعوت ایک بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ صوفی صاحب کا سینہ خوشی اور فخر سے پھول گیا۔

"پہلی بات تو شاہ جی! میری طرف سے آپ کو اس مبارک موقع کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ چھوٹے

شاہ جی کو زندگی کی ہر خوشی اسی طرح آپ کے سایہ عاطفت میں عطا فرمائے۔ دوسرے آپ کے تمام احکامات انشاءاللہ میں پوری طرح سے بجالاؤں گا۔ گاؤں میں سب کو خبر ہو جائے گی اور سب کام انشاءاللہ ہاتھوں ہاتھ ہو جائیں گے' آپ بالکل فکر نہ کریں۔" انہوں نے شاہ جی کو تسلی دی۔

"مجھے آپ سے یہی امید تھی۔" شاہ جی نے اطمینان کا سانس لیا۔

"آپ صبح مدرسے سے فارغ ہو کر حویلی آجایا کیجیے گا' ادھر کے کچھ کاموں کی نگرانی ہو جائے گی۔"

"کیوں نہیں شاہ جی! آپ ہمارے مائی باپ ہیں' آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" وہ فرمانبرداری سے بولے۔

"شرمندہ نہ کریں صوفی صاحب! میں آپ کو کوئی حکم دے سکتا ہوں۔ نعوذباللہ اور سنائیے۔ بچوں کا کیا حال ہے' سب خیریت سے ہیں۔" انہوں نے موضوع بدلا۔

"آپ کی دعاؤں اور مہربانیوں سے شاہ جی۔" صوفی صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"عبدالمتین کیا کر رہا ہے شہر میں؟" ان کا انداز سرسری سا تھا۔

"انٹر کا امتحان دے دیا ہے' اب کوئی کورس کر رہا ہے۔ تھرڈ ایئر کی کلاسیں شروع ہونے تک جی۔"

"آگے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے صوفی صاحب! گاؤں بلوائیے اسے۔ ادھر اسکول میں آکر ماسٹر بن جائے' مستقبل سنور جائے گا اس کا۔ بی اے کر کے کیا کرے گا۔ شہر میں نوکریاں کہاں۔" انہیں عبدالمتین کا شروع ہی سے شہر میں پڑھنا پسند نہیں آیا تھا۔

"میں نے تو کہا تھا شاہ جی! پر وہ نہیں مانتا۔ تعلیم کا دیوانہ ہے جی۔ پڑھنا چاہتا ہے میں نے کہا۔ چلو دو سال اور ہیں شوق پورا کر لے پھر تو ادھر ہی آنا ہے۔" صوفی پست لہجے میں شرمندہ سے بولے۔

"کہہ دینا اسے کہ ادھر آکر اسکول سنبھالے۔ گاؤں کے بچے اور کچھ نہیں پرائمری پاس تو ہو جائیں۔ حکومت کو اکثر پیٹ میں مروڑ اٹھتے ہیں' شرح خواندگی بڑھانے کے۔ سارا ملک پرائمری پاس ہو جائے تو اس روز روز کے پیٹ درد سے ہماری بھی جان چھوٹ جائے۔" وہ نخوت و بیزاری سے بولے۔

"بالکل جی' اب اگر ہر گاؤں قصبے کو آپ جیسے مہربان حاکم مل جائیں تو شرح خواندگی خود بخود سو فیصد ہو جائے گی۔" صوفی صاحب خوشامدانہ انداز میں بولے۔

"اور بچے بھی پڑھ رہے ہیں آپ کے کیا؟" ان کا لہجہ یکایک حقیر سا ہو گیا تھا۔ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے' مزاج کا بھی اور ملک کا بھی۔

"نہیں جی۔ سب قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک تو سب سے ضروری یہی تعلیم ہے۔ دنیاوی تعلیم تو بعد کی باتیں ہیں اور میں وہ اپنے بچوں کو دلانا بھی نہیں چاہتا۔ اتنا علم تو جی حاکموں کو درکار ہوتا ہے۔ ہمارے بچوں نے آگے چل کر مسجدوں میں اذانیں ہی تو دینی ہیں اور اس کام کے لیے دنیا کی تعلیم ضروری نہیں۔" صوفی صاحب نے شاہ جی کی تسلی کرنا چاہی اور ان کی تسلی ہو بھی گئی۔

"بالکل بالکل صوفی صاحب! یہی تو میں کہتا ہوں کہ کسان کا بچہ کسان نہیں بنے گا تو کیا ہوم سیکریٹری بنے گا۔ ہر انسان اگر اپنے پیشے' اپنے منصب' اپنے کسب کو پہچان لے تو ہمارا معاشرہ سدھر نہ جائے' ادھر تو روڑی اٹھانے والا بھی اپنے بچے کو وزیر بنانا چاہتا ہے۔ الٹی سیدھی خواہشات دماغ میں فتور ڈالتی ہیں' جس سے معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں کہ ہر شخص اپنے اصل سے منہ موڑے ہوئے ہے۔ اسکولوں سے معاشرے کے باغی تیار ہو کر نکلتے ہیں' جن سے ملک میں دنگا فساد اور شر پھیلتا ہے۔ اسی انتہا پسندی نے ہمیں پوری دنیا میں بدنام کر دیا ہے۔ سب ہمیں شرپسند قوم سمجھنے لگے ہیں حالانکہ ہم تو اس دین کے پیروکار ہیں' جس کی اساس ہی امن اور سلامتی ہے۔ کیوں صوفی صاحب؟" شاہ جی کے اندر کا سیاستدان انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ اپنے طبقے کی برتری اور اخباری شہ سرخیوں کا سیر حاصل تبصرہ انہوں نے انڈر میٹرک صوفی صاحب کے سامنے انڈیلا جن کی دنیا شاہ جی سے شروع ہو کر مسجد و مدرسہ میں ختم ہو جاتی تھی۔

"بالکل جی بالکل۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔" اختلاف کی گنجائش یا تردید کی وجہ تو کوئی بھی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے' اب آپ جائیں اور کل صبح ہی سے آجائیے گا۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی! مجھے اجازت دیجیے۔" وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"ٹھہریے ذرا!" شاہ جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"دین محمد!" انہوں نے آواز لگائی۔ دین محمد شاید دروازے سے ہی چپکا کھڑا تھا' دوڑا دوڑا اندر آیا۔

"جی سرکار۔" وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"دیکھو گودام سے دو بوری گندم' ایک بوری چاول اور ایک بوری چینی کی صوفی صاحب کے گھر پہنچا دو اور ہاں گھی کے دو کنستر اور گڑ کی بوری بھی۔ سمجھے۔" وہ بارعب لہجے میں بولے۔

"بہت بہتر سرکار۔" وہ اسی طرح ہاتھ باندھے چلا گیا۔

"بڑی مہربانی شاہ جی! بڑی مہربانی۔" صوفی صاحب نے جھک کر دوبارہ مصافحہ کیا اور خوشی خوشی باہر کی طرف بڑھ گئے۔

جاپانی آرکسٹرا مدھم سروں میں مغربی دھن بجا رہا تھا' ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں اکثر لوگ ڈنر کرنے میں مشغول تھے' ڈائننگ ہال کا ماحول بہت خوابناک سا تھا۔ ہال کی تمام لائٹیں بجھی ہوئی تھیں' صرف ہال کے سینٹر میں لگا بڑا سا خوبصورت سنہری فانوس روشن تھا' فانوس آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر حرکت کر رہا تھا' اس میں لگے ننھے ننھے بلبوں سے نکلتی روشنی کی کرنیں سارے ماحول کو منور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں' مگر ہال چونکہ بڑا تھا اور تمام میزیں بھی سینٹر سے ہٹ کر راؤنڈ اباؤٹ کی شکل میں رکھی گئی تھیں' اس لیے کوئی بھی میز مکمل طور پر روشنی کی زد میں نہیں تھی۔ ٹیبلز کے سینٹر میں ایک ایک کینڈل روشن تھی' جس سے ماحول خاصا خوابناک سا ہو گیا تھا۔ ہال میں خاموشی تھی۔ صرف ہلکی سرگوشیوں کے ساتھ چمچوں اور کانٹوں کی میوزیکل سی آواز تھی جو اسی ماحول کا حصہ لگ رہی تھی ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ لوگ کھانا کھانے میں مگن تھے' ہال میں انتشار نہیں تھا۔ چند ایک میزیں خالی تھیں۔

"کل صبح گیارہ بجے میری فلائیٹ ہے واپسی کی۔"

"اوہ مسٹر حیات! آپ کے ساتھ وقت بہت اچھا' بہت پلیزنٹ گزرا' امید کرتی ہوں آپ نیکسٹ ٹائم بھی ہمیں اپنی میزبانی کی سعادت دیں گے۔" مسز سانتے روایتی مہمان نوازی کے انداز میں بولی اور یہ فخر حیات کو معلوم تھا کہ اس روایتی انداز کے پیچھے سانتے کی محبت بھی تھی۔

"کیوں نہیں مسز سانتے! میرا بھی آپ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔" فخر حیات نے جواباً کہا' "آپ بہت خوبصورت عورت اور بہت اچھی میزبان ہیں۔" فخر حیات کی تعریف کا اچھوتا انداز مسز سانتے ہوشومن کے گال ایک پل کو رنگین کر گیا۔ "اب آپ کو نیکسٹ ٹائم پاکستان آنا ہو گا۔"

"کیوں نہیں مسٹر حایات! آپ کے ساتھ بزنس کیا ہے۔ ہم کیوں نہیں آئیں گے' ضرور آئیں گے۔" وہ فوراً بولی۔

"کیا صرف بزنس کی وجہ سے؟" فخر حیات نے ذرا آگے ہو کر چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"اوہ نو' مسٹر حایات! ڈونٹ ڈو دس (ایسا نہ کریں)۔" وہ جھینپ گئی۔ اس کی پلکیں لرزنے لگیں اور نیپکن منہ تک لے جاتی انگلیاں خوامخواہ تھرتھرانے لگیں۔ چھیڑنا مرد کی ہابی سہی لیکن عورت اگر چھڑ جائے اور چھڑی ہوئی عورت شاید خود اپنے بھی بس میں نہیں رہتی' یہی حال سانتے ہوشومن کا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا تھا' فخر حیات اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو انجوائے کر رہے تھے۔

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔" انہوں نے معصومیت سے سانتے کے لمبوتری انگلیوں والے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس معصوم ادا سے مسز سانتے قتل ہوتے ہوتے بچی۔ حواسوں کا سارا سرکٹ جیسے معطل ہو گیا تھا اور ساری بجلیاں اس ہاتھ سے آگے دوڑ پڑی تھیں۔

"آر یو میرڈ مسٹر حایات؟" وہ کافی دیر بعد بمشکل بولی۔

"پلیز مسز سانتے! آپ مجھے حایات مت کہیں۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی مجھے حیوانات یا پھر میرے ہونے پر لمبا سا "ہا" کر کے افسوس کر رہا ہو۔ آپ مجھے فخر کہہ سکتی ہیں۔" فخر حیات نے خوبصورتی سے اس سوال کو نظر انداز کر دیا۔

"اوہ سوری اگر آپ ہرٹ ہوتے ہیں اس طرح۔ میں آپ کو "فوخر" کہہ دوں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔

"فوخر۔ وہاٹ۔ یعنی فوکر طیارہ۔ اوہ میرے خدا۔" فخر حیات نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا ہوا۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"تھنگ (کچھ نہیں)" وہ جبراً "مسکرا دیے۔

"کیا آپ بیئر کا شوق فرمائیں گے۔" اس نے بیرے کو ادا سے اشارہ کیا۔

"آف کورس۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔

"آپ ایک اچھے پارٹنر ثابت ہوں گے۔" وہ خوشی سے بولی۔

"بالکل آزمائش شرط ہے۔" وہ فوراً" بولے۔

"مسٹر ہوشومن نہیں آئے۔" انہوں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"He is busy (وہ مصروف ہیں)" وہ ناک سکوڑ کر بولی۔

اس نے اپنے گلے میں پڑے نیکلس سے کھیلنا شروع کر دیا۔ "اصل میں صرف وہ ہی بزی نہیں' آپ دیکھو گے' ادھر جاپان میں ہر شخص بزی ہے کیا مرد کیا عورتیں۔ یہ صحیح ہے' اچھی بات ہے۔" نیکلس سے کھیلتے ہوئے وہ جیسے خود کلامی کر رہی تھی "ایک قوم کو نمایاں حیثیت کے لیے دنیا بھر میں ترقی کے لیے مصروف ہونا ہی پڑتا ہے۔ مگر ہم سب انسان بھی تو ہیں اور حایات صاحب" اس کی چمکیلی آنکھوں کی جوت بجھ رہی تھی "ہم عورتیں تو کچھ زیادہ ہی انسان ہوتی ہیں' انہیں تو ہر وقت ہر لحہ توجہ اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے' چاہے عورت مغرب کی ہو یا مشرق کی' ایم آئی رائٹ؟" اس کے سوال پر فخر حیات خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

"یہاں کا مرد بزی رہتا ہے مگر مصروفیت کے دوران بھی وہ اپنی ضرورت کہیں نہ کہیں سے پوری کر لیتا ہے' اسی لیے مطمئن ہو جاتا ہے مگر عورت مطمئن نہیں ہو پاتی' اس کا اندر کچھ اور۔ اور کیفیت لا اپتا ہی رہتا ہے۔ حایات! کیا پاکستان میں بھی عورت اور اور کرتی رہتی ہے یا وہ اندر باہر دونوں سے طرف سے مطمئن ہے۔"

اس کا سوال فخر حیات کے لیے اس کی گفتگو کی طرح بے محل تھا' اس کی نظروں کے اصرار سے گھبرا کر فخر حیات نے کندھے اچکا دیے۔

"معلوم نہیں۔ میں عورت تو نہیں ہوں۔" انہوں نے خوامخواہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں یہی تو بات ہے مسٹر حایات! جس معاشرے کے مرد اپنے معاشرے کی عورت سے' اس کی خواہشات سے' اس کی نفسیات سے بے خبر ہوں اس معاشرے کی عورت کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ ہمارے مرد بھی ہماری نفسیات' ہماری ضروریات سے بے خبر ہیں۔" اس کے لہجے میں انجانے' ان کہے دکھ بول رہے تھے۔

"مسٹر حایات! عورت کو اگر مرد بھی نہیں سمجھے گا تو کون سمجھے گا۔" دکھی لہجے میں پوچھا گیا۔ سوال اور بھی الجھا دینے والا تھا۔

"آپ نے لٹریچر پڑھا ہے مسٹر حایات؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس میں Swift کی کتاب ہے بلکہ یہ تو اب بچوں کے نصاب میں شامل ہے Gulliver,s travels اس میں ایک سفر کی روداد میں بتایا گیا ہے کہ ایک سیارے کے لوگ جو بہت مصروف رہتے ہیں۔ اس سیارے کی عورتیں رومانس لڑانے دوسرے سیارے پر جاتی ہیں۔ یہ بات کتاب میں مزاح کے طور پر پیش کی گئی ہے مگر یہ

بڑے اور گہرے دکھ کی بات ہے۔ ہے نا۔" اس نے فخر حیات کی رائے جاننا چاہی' وہ محض مسکرا کر رہ گئے۔

"چلیں چھوڑیں۔" اس نے ہاتھ اور کندھے ایک ساتھ جھٹکے۔

"بزنس میں آپ دونوں پارٹنر ہیں۔" فخر حیات نے یونہی پوچھا۔

"اوہ نو۔ یہ سب بزنس میرے فادر کا تھا۔ اسی لیے ہوشومن نے مجھ سے شادی کی اور مجھے اب اپنی کم عمری کی اس حماقت پر افسوس ہے کیونکہ وہ ایک اچھا بزنس مین تو ہے مگر ایک اچھا لائف پارٹنر نہیں ثابت ہو سکا۔ اس کا دن رات' صبح و شام سب بزنس ہے۔ اس نے میرے فادر کے بزنس کو بہت پھیلا دیا ہے مگر میرے لیے اس کے پاس ٹائم نہیں اور اب مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہے' میں اس بات پر بہت کڑھا کرتی تھی مگر اب نہیں۔"

اس نے اپنے چھوٹے سے ہینڈ بیگ سے لپ اسٹک اور ہینڈ مرر نکالا اور اپنی لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

"تو آپ اس سے پیچھا چھڑا لیں۔" فخر حیات نے آسان تجویز پیش کی۔

"یہ ممکن نہیں وہ بہت ضروری ہے' ہمارے بزنس کے لیے اب یہ ہم دونوں میں طے ہو چکا ہے کہ ہم اپنے اپنے طور پر اپنی زندگی گزاریں گے۔ اپنے طور پر ٹائم کو پلیزنٹ کرنے کے لیے دوسرے کی اجازت کی ضرورت نہیں۔" وہ خود اعتمادی سے اپنی صراحی دار گردن کو مزید ہوا میں اوپر اٹھا کر بولی۔ ڈارک بلو ویلوٹ کی شارٹ شرٹ اور بلیک منی اسکرٹ میں پر کشش قیمتی جیولری پہنے' وہ تمام جاپانی عورتوں سے زیادہ خوبصورت اور چارمنگ تھی یا شاید ماحول کا اثر تھا یا رعنا سے اتنے دنوں کی دوری کا۔ فخر حیات کو آج کل سب عورتیں حسین دکھائی دے رہی تھیں۔

"تو پھر آج کی شام تو ہمارے نام ہونی چاہیے' ویسے بھی آپ ایک خوبصورت عورت اور مہمان میزبان ہیں۔" ذو معنی انداز میں کہے گئے فقرے سماتے ہوشومن کو بہت کچھ سمجھا گئے' اس کی سفید چاندی سی رنگت کھل اٹھی۔

"اوہ شیور وائے ناٹ۔ میں واقعی ایک مہمان میزبان ہوں۔ دوسرے کمپلیمنٹ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ خود اعتمادی سے بولی "ویسے بھی اتنے دنوں کی دوستی کا کچھ تو حق ہے نا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟" خوبصورت جملوں کے اختتام پر اس نے ایک بھدا اور فضول سا سوال کیا۔

"اوہ نو۔ بزنس کی مصروفیات نے اس طرح سوچنے ہی نہیں دیا۔" انہوں نے فوراً" کہا۔

"اوہ یو بزی بزنس مین۔" وہ سر ہلاتے ہوئے زور سے ہنسی۔ اسی وقت ویٹر بوتل اور دو گلاس ٹرے میں رکھے چلا آیا' دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

• • • • •

"اور اس بار لاہور بورڈ کے میٹرک کے سالانہ امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے معاذ احمد نے۔"

تالیوں کی گونج میں معاذ احمد لڑکھڑاتی ٹانگوں اور کانپتے وجود کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھا۔ بورڈ کے چیئرمین نے مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا اور گولڈ میڈل اس کے گلے میں پہنایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میڈل پہننے کے لیے اس سے ذرا سی بھی گردن جھکائی نہیں جا رہی تھی اور سیدھا کھڑے ہونے سے کمر میں ناقابل برداشت تکلیف ہو رہی تھی۔ بایاں بازو اس قدر زور سے موڑا گیا تھا کہ وہ اس سے ہلا بھی نہیں سکتا تھا' وہ اسے اپنے وجود کا حصہ لگ بھی نہیں رہا تھا' رات کی مار سے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

اور جب مار کھانے والوں میں ناظم صاحب نے اسے بھی پایا تھا تو ان کا رنگ اڑ گیا تھا' بورڈ کی طرف سے اس کے بلاوے کا خط آ چکا تھا کہ اس کی پوزیشن بنی ہے۔ جس کی وجہ سے کل رزلٹ کی اناؤنسمنٹ کے دوران اس کا موجود ہونا لازمی ہے' دوسرے پہلی بار "سائبان" کا کوئی طالب علم اتنی آؤٹ اسٹینڈنگ پرفارمنس دکھا رہا تھا جو کہ "سائبان" کے لیے بہرحال ایک Regard (عزت) کی بات تھی' دوسرے اس کارڈ کو استعمال کر کے وہ "سائبان" کے لیے بہت سے فنڈز اکٹھے کر سکتے تھے۔ بورڈ میں پوزیشن حاصل کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں' تھی۔ وہ

بھی ایک یتیم و بیسر لڑکے کی۔ "سائبان" جیسے گھٹے گھٹے ماحول اور عام سرکاری اسکول کے ناقص طرز تعلیم اور
سہولتوں کے فقدان کے باوجود اس قسم کی کارکردگی؟ ناظم صاحب بہت پُرجوش تھے نگران کا سارا ہوش معاذ کو یوں
بے ہوش دیکھ کر ہوا ہو گیا تھا' اس کے ماتھے سے بھی خون جاری تھا۔
یہ ٹھیک تھا کہ ان کی ہدایت تھی کہ ان لڑکوں کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے۔
مگر یہ بات بہرحال ان کے علم میں نہ تھی کہ معاذ بھی ان حرامزادوں میں شامل ہے۔ معاذ کو سب جانتے تھے اور
اس کے شریفانہ چال چلن اور رویے کی وجہ سے سب اس کی عزت کرتے تھے۔
لیکن پرسوں رات "سائبان" کے رکھے گئے چندے کے باکس جب ناظم صاحب کے آفس پہنچے تو اس وقت وہ
اپنے چھوٹے بیٹے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوئے تھے' وہاں انہیں دیر ہو گئی' نائب ناظم تمام باکسز آفس میں
کھلے چھوڑ کر خود باہر ٹہلنے لگا' ہواخوری کے لیے حالانکہ کمرے کے باہر چچا غفور بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ معلوم نہیں کس
وقت محسن' ظفر اور شبیر پچھلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے اور تین بکسوں پر ہاتھ صاف کر کے رفوچکر ہو گئے' وہ
رات تو ناظم صاحب کی ہاسپٹل میں ہی کٹ گئی۔ بیٹا بہت بیمار تھا' نائب ناظم اور غفور چچا اسی طرح آفس لاک
کر کے سونے چلے گئے۔
اگلے دن گیارہ بجے جب ان بکسوں کو کھولا گیا تو پانچ میں سے تین تو بالکل خالی تھے اور باقی میں صرف پچاس اور
ساٹھ روپے تھے۔ ناظم صاحب اور نائب ناظم کو آگ لگ گئی۔ نائب ناظم تو رات بکسوں میں موجود رقم دیکھ چکا تھا'
سب سے پہلے شک غفور چچا پر کیا گیا۔ اسے بلا کر پوچھ گچھ' نرمی اور سختی دونوں طرح سے کی گئی مگر وہ ضعیف آدمی
بری طرح سے رونے لگا' وہ تو اس وقت "سائبان" میں آیا تھا جب اس نے ابھی پوری طرح سے بولنا بھی نہیں
سیکھا تھا تمام عمر اس نے یہیں گزار دی تھی اور اب تو وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور پھر ہر روز چندے کے بکس
اس کے سامنے ہی آتے تھے۔ کھلتے تھے بلکہ کھلے پڑے رہتے تھے۔ اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا پھر اب
وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا ناظم صاحب کو اس کا یقین تھا۔
بہرحال تھوڑی سی تفتیش کے بعد ان تینوں کی غیر حاضری سامنے آ گئی اور ان تینوں کا کردار اس قسم کا تھا کہ
شک کی گنجائش ہی نہیں تھی اور معاذ انجانے ہی میں پٹ گیا۔ ناظم صاحب نے اس کی مرہم پٹی کروائی' پین کلرز
دے دے کر رات بھر میں اسے چلنے کے قابل بنایا اور اس کی پوزیشن فرسٹ ہو گی' اس کا یقین تو انہیں بھی نہیں
آ رہا تھا۔

"معاذ احمد! بہت بہت مبارک ہو آپ کو اتنی شاندار کامیابی حاصل کرنے پر۔ میری اور میرے آفس کی جانب
سے آپ کو ڈھیروں ڈھیر مبارکباد۔" چیئرمین بورڈ نے مسکراتے ہوئے اسے خوش دلی سے مبارکباد دی۔
"تھینک یو سر۔" اس نے جبراً مسکرا کر کہا۔ اتنا سا مسکرانے پر بھی اس کے جبڑے کراہ اٹھے۔
"کیا آپ کو امید تھی کہ آپ کی فرسٹ پوزیشن آئے گی؟"
"میں نے محنت فرسٹ پوزیشن کے لیے نہیں کی تھی۔ سر! میں نے تو محنت یہ سوچ کر کی تھی کہ میری طرف
سے کوئی کمی نہ رہ جائے کتابوں اور تعلیم کا حق ادا کرنے میں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"ویل سیڈ معاذ احمد! مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ آپ اپنی آئندہ زندگی میں بھی اسی طرح تعلیم کا حق ادا کرتے
رہیں گے جیسے اب کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے۔ ویل ڈن ینگ مین! ہمیں اپنی نوجوان نسل پر فخر ہے آپ جیسے
نوجوان ہی اس ملک کی قسمت سنواریں گے۔" چیئرمین بورڈ نے اس کے کندھے تھپکے۔ درد کی ایک لہر اس کے
وجود میں دوڑ گئی۔
"آپ کا کیا خیال ہے' آپ کی اس کامیابی میں کس کا کنٹری بیوشن زیادہ ہے' آپ کے پیرنٹس کا' آپ کے
اساتذہ کا یا آپ کی محنت کا؟"
ایک صحافی نے مائیک آگے کر کے روایتی سوال پوچھا۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں میرا تعلق Orphan House (یتیم خانے) سے ہے اور یتیم خانے میں وہ بچے
رہتے ہیں جن کے والدین نہیں ہوتے' اس لیے اس بارے میں آپ میرا خانہ خالی چھوڑ دیں۔" وہ زخمی
مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اساتذہ کی بھی محنت ہے اور میری بھی۔ مگر سب سے بڑھ کر میرے اللہ کی مہربانی جس
نے میری محنت کو قبول کیا۔"
"مستقبل میں آپ کا کیا بننے کا ارادہ ہے؟" سوال کیا گیا۔ اس نے ایک لمحے کو سر جھکا کر سوچا۔
"صراط مستقیم پر چلنے کا۔" اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری "کہ زندگی میں شارٹ کٹس بہت ہیں اور
شارٹ کٹس کے ذریعے حاصل کردہ کوئی بھی کامیابی بہت جلد تاریک ناکامی میں بدل جاتی ہے۔ اس لیے میں
چاہتا ہوں تھوڑی سی فتح' تھوڑی سی کامرانی حاصل کروں' لیکن صرف صراط مستقیم پر چل کر۔" ناظم صاحب کی
نصیحت اسے یاد تھی۔ وہ ایک عزم سے بولا اور سامنے بیٹھے ناظم صاحب مسکرا اٹھے۔ ان کی گردن فخر سے تن گئی۔
اب تقریب کا اختتام ہونے والا تھا۔ جس کے لیے فوٹو سیشن شروع ہوا۔ کھٹا کھٹ کیمروں کی فلش لائٹس
چمکیں اور چیئرمین بورڈ سینئر اساتذہ اور دوسری تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے ساتھ کھڑے معاذ احمد
کو کتنے ہی کیمروں نے اپنے اندر مقید کر لیا اور یہ لمحہ۔ اس کی زندگی پر انمٹ نقش ثبت کرتا ہوا مسکرا کر آگے بڑھ
گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"آمنہ نے مڈل کا امتحان دے دیا ہے۔ آج کل فارغ ہے میرا خیال ہے صوفی صاحب! اسے ماسٹر صاحب کی بی
بی کے پاس سلائی کڑھائی سیکھنے کے لیے بھیج دوں۔ وہ اس کام کی ماہر بھی جاتی ہیں' پورے گاؤں میں۔ اگر آپ کی
اجازت ہو تو؟"
صوفی صاحب عشاء کی جماعت کرا کے ابھی گھر آئے تھے' جیسے ہی انہوں نے کھانا ختم کر کے ہاتھ دھوئے اور
اللہ کا شکر ادا کر کے بستر پر آ کر بیٹھے اور قبل اس کے کہ وہ "بخاری کی تیسری" ضخیم جلد اٹھا کر اس میں
گم ہوتے رابعہ بی بی نے موقع غنیمت جان کر بات چھیڑ دی' وہ بات سن کر کچھ دیر سوچتے رہے۔
"کیا سلائی کڑھائی تم اسے نہیں سکھا سکتیں؟" بارعب لہجے میں پوچھا گیا۔
"صوفی صاحب! آپ کو معلوم تو ہے مجھے اس قدر کب آتا ہے۔ بمشکل پھٹے کو سی سکتی ہوں یا پھر کوئی کپڑا
اچھی طرح قطع کر کے دے تو سی سکتی ہوں اور آج کل کا تو زمانہ اس طرح کا ہے کہ لڑکیوں کو ہر ہنر آنا چاہیے'
پڑھائی لکھائی اگر ضروری ہو گئی ہے تو گھریلو امور میں بھی انہیں طاق ہونا چاہیے۔ آپ کو تو معلوم ہے۔" رابعہ بی
بی نے عاجزی سے انہیں زمانے کی ڈیمانڈز سے آگاہ کرنا چاہا۔
"ماسٹر صاحب کے گھر بھیجنے میں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں کیونکہ ادھر ماسٹر صاحب کے سوا اور ہوتا بھی کوئی
نہیں لیکن ان کا گھر تھوڑی دور ہے۔ باقی گاؤں کے گھروں سے ذرا ہٹ کے۔" وہ جیسے سوچ سوچ کر نکتہ اعتراض
نکالنے لگے۔
"عبدالمبین ہوتا تو وہ اسے چھوڑ آیا کرتا۔" رابعہ بی بی نے عبدالمبین کے ادھر ہونے کی افادیت بتائی۔
"اس کا نام مت لو۔" وہ فوراً چڑ کر بولے۔ "وہ ادھر آ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ سوائے بدحرامی کے۔ خیر میں
خود ہی چھوڑ آیا کروں گا' جانا کس وقت ہوا کرے گا۔"
"یہی کوئی گیارہ بجے سے ایک بجے تک۔ دو گھنٹے کافی ہیں۔" وہ بولیں۔
"تو پھر زینب کو بھی اس کے ساتھ کر دو۔ دونوں اکٹھی سیکھ لیں گی ورنہ اگلے سال اس کا بھی جنجھٹ ہو گا۔" وہ کچھ
ناگواری سے بولے۔ "اور ماسٹرنی جی سے کہنا کہ انہیں ذرا جلدی اور توجہ سے سکھا دیں' یہی کوئی تین چار ماہ میں پھر
آمنہ کی دسویں کی کتابیں شروع ہو جائیں گی۔"
"آمنہ کو آپ اسکول بھیجیں گے' میرا مطلب ہے ادھر تو لڑکیوں کی نویں دسویں کی کوئی جماعت نہیں ہوتی۔"
رابعہ بی بی تعجب سے بولیں۔ "تو پھر کیا شہر میں۔" وہ خود ہی جملے کی نزاکت بھانپ کر چپ کر گئیں۔

"فضول باتیں کرنے کا مطلب۔" وہ خفگی سے ابرو اچکا کر بولے۔" آمنہ نے جیسے اس سال مڈل کا پرائیوٹ امتحان دیا ہے اسی طرح دسویں کا بھی دے لے گی اور دس جماعتیں اس کے لیے کافی ہوں گی لیکن اگر اس نے آگے پڑھنا چاہا تو اسی طرح بارھویں کا گھر بیٹھے پرائیوٹ امتحان دے دے گی۔" رابعہ بی بی صوفی صاحب کی روشن خیالی پر حیران رہ گئیں مگر اظہار نہ کیا۔

"آگے تو جی پڑھائی مشکل ہو جاتی ہے۔ گھر میں کہاں پڑھا جائے گا۔" وہ انہیں مزید ٹٹولنا چاہ رہی تھیں۔

"تم نے کی ہیں بارہ جماعتیں جو تمہیں معلوم ہے کہ پڑھائی مشکل ہو جاتی ہے۔" وہ چڑ کر بولے۔" بہر حال یہ میں نے ایک بات کی ہے۔ اگر وہ پڑھنا چاہے تو کیونکہ مجھے یقین ہے عبدالمتین کی طرح اسے بھی پڑھائی لکھائی کا شوق ہے اور یہ زینب بھی عبدالمبین کی طرح پڑھائی لکھائی سے بھاگتی ہے۔ اسے گھر کے کاموں میں لگایا کرو۔" صوفی صاحب کی سب بچوں پر نظر تھی' انہیں معلوم تھا کہ کون سے بچے کا رجحان کس طرف ہے۔" اب تم جاؤ' مجھے پڑھنا ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"صوفی صاحب! عبدالمتین کب آئے گا۔" پیاسی ممتا تڑپ کر بولی۔

"شاید اس ہفتے آئے۔ امتحان تو اس کے کب کے ختم ہو چکے ہیں اور اب شہر میں کوئی کورس کر رہا ہے پڑھائی کا' کہہ رہا تھا اگلے سال دو جماعتوں کا اکٹھا امتحان پاس کرے گا۔ بہت شوق ہے میرے بیٹے کو علم حاصل کرنے کا۔ دیکھنا تم رابعہ بی بی! میرا بیٹا بہت آگے جائے گا میری طرح۔" وہ فخر سے خوش ہو کر بولے۔

"آمین صوفی صاحب' اللہ کرے۔" وہ بھی خوش ہو گئیں اور باہر جانے لگیں۔

"اور ہاں' وہ جو گندم اور چاول شاہ جی کی طرف سے آئے تھے تم نے وہ احتیاط سے سنبھال کر کوٹھڑی میں رکھوا لیے ہیں۔"

"جی صوفی صاحب! میں نے خود رکھوائے تھے۔"

"اب تھوڑا تھوڑا کر کے انہیں صاف کروا لینا۔ کل میرا ایک مرید چھالیاں سے دیسی گھی کا کنستر لائے گا وہ بھی سنبھال کر رکھ لینا۔" انہوں نے امام بخاری اٹھاتے ہوئے تاکیداً کہا۔

"جی اچھا۔" وہ تابعداری سے کہہ کر باہر چلی گئیں۔

اور آمنہ جو کب سے دروازے سے چپکی ان کی گفتگو سن رہی تھی رابعہ بی بی کو دیکھتے ہی خوشی سے ان سے لپٹ گئی۔

"ہائے اماں جی! بابا صاحب نے اجازت دے دی' ماسٹرنی جی کے گھر جانے کی اور مجھے آگے اور آگے پڑھنے کی بھی نا۔ بابا صاحب کتنے اچھے ہیں۔ اماں جی! ادھر میں نئی کلاس کی کتابیں بھی لے جایا کروں گی۔ ماسٹر صاحب سے شروع کروں گی' آپ بابا صاحب کو یہ مت بتائیں' وہ کہیں گے۔ گھر بیٹھ کر ریڈھو بھائی سے پڑھو اور اماں جی! بھائی تو اب کئی کئی مہینے گھر نہیں آتے۔" وہ سانس لیے بغیر مدھم آواز میں سب کچھ کہہ گئی۔

"اچھا اچھا لے جانا۔ نہیں کہوں گی صوفی صاحب سے اور یہ کون سا کوئی گناہ کا کام ہے۔ پڑھنا ہی ہے۔ اور ماسٹر صاحب تو خود بہت نیک' بہت اچھے ہیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔" رابعہ بی بی نے اس کی بانہیں گلے سے نکالیں اور آگے بڑھیں۔

"اماں جی! زینب بھی نہیں مانے گی' ساتھ جانے کے لیے وہ پہلے ہی انکار کر چکی ہے۔" آمنہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔

"اب اس کے بابا صاحب نے کہا ہے۔ میں نے تو ان سے نہیں کہا تھا' انہوں نے خود ہی کہا تھا۔ اب تو اسے جانا ہی پڑے گا' تم بتا دینا کہ یہ صوفی صاحب نے کہا ہے۔ نہیں تو وہ ناراض ہو جائیں گے میں ماسٹرنی جی کے گھر ذرا پیغام بھجواؤں کہ کل گیارہ بجے سے تم دونوں آ جایا کرو گی۔ زینب کو بھی بتا دو جا کر۔" وہ کمرے میں چلی گئیں۔

"اللہ کا شکر ہے' بابا صاحب نے کوئی لمبا چوڑا اعتراض نہیں کیا گھر سے نکلنے پر اور مجھے آگے پڑھانے پر بھی۔

ہائے یہی تو میری آرزو ہے کہ میں بھی بھائی کی طرح خوب پڑھوں' وہ بھی شہر جا کر موٹی موٹی انگریزی کی کتابیں۔ آج بابا صاحب پڑھائی پر راضی ہوئے ہیں۔ کل شہر بھی بھیج دیں گے۔ میں اللہ میاں سے دعا کروں گی۔ زینب دیکھیں کیا کہتی ہے۔ اسے بتاتی ہوں جا کر۔" وہ تیز تیز قدموں سے وسیع صحن عبور کرتے ہوئے اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

شدید غصے کے عالم میں وہ "گل کدہ" سے نکل آئے تھے اور اسی طیش کے عالم میں انہوں نے گاڑی جی ٹی روڈ سے اتار کر گاؤں جانے والی ذیلی سڑک کی طرف موڑ دی۔ آج انہوں نے بہت تیز ڈرائیونگ کی تھی۔ رستے میں کہیں نہیں رکے تھے' بس اندھا دھند گاڑی دوڑاتے چلے گئے۔ غصہ شدید تھا کہ نین تارا نے انہیں کوئی عام سا گرا پڑا تماش بین سمجھا ہے' جو ہر ناچنے والی کے پاس جاتا ہے' پھر جوں جوں سفر طے ہوتا گیا' ان کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوتا گیا۔

"آج وہ نکاح پر بضد کیوں تھی۔" ذیلی سڑک پر اترتے ہی ان کے ذہن نے نین تارا کے حق میں پہلا سوال جڑا۔

"آج میں اتنے دنوں بعد اس سے ملنے گیا اور بجائے میرا دل سے سواگت کرنے کے وہ نیا سبق کھول کر بیٹھ گئی۔ آگے ادھر گھر کی ٹینشن کم ہے جو یہ شادی؟" ان کی بھنویں خواہ مخواہ تن گئیں۔" اس کی فرسٹریشن نے میرے اعصاب تھکا دیے ہیں' جی چاہتا ہے کہیں دور بھاگ جاؤں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ سب رشتے ناتوں کی زنجیریں کاٹ کر۔"

انہوں نے اسٹیرنگ وہیل پر غصے سے مکا مارا۔ سڑک پر آگے ایک سات آٹھ سالہ بچہ بکریوں کا ریوڑ ہنکائے لیے جا رہا تھا' انہوں نے ہارن پر ہاتھ رکھا تو اٹھانا ہی بھول گئے۔ ہارن کی کرخت آواز سے بکریاں ہراساں ہو کر سڑک پر ادھر ادھر بھاگنے لگیں' بچے کے لیے انہیں ایک سمت میں ہنکانا دشوار ہو گیا۔ انہوں نے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔ ایک بکری کا ننھا سا سفید گالے جیسا بچہ جو تیزی سے ماں کے پیچھے سڑک کے دوسری طرف بھاگا۔ گاڑی کی اسپیڈ اور ہارن کی آواز سے خوفزدہ ہو کر گاڑی کے آگے کھڑا رہ گیا۔ ذرا آگے جا کر انہوں نے یونہی گردن موڑ کر دیکھا' اس بچے کے کچلے ہوئے وجود کے گرد تمام بکریاں اور مالک بچہ کھڑے تھا۔

"ہونہہ!" وہ پھنکارے۔" جیسے معلوم ہے سڑک ٹریفک کے لیے ہوتی ہے تو یوں بھیڑ بکریوں کی چراگاہ بنانے کا مطلب؟ پھر تو یہی کچھ ہوتا ہے۔" انہوں نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔ انہیں ذرا برابر بھی ملال نہیں تھا' نہ انہوں نے اسپیڈ کم کرنے کی کوشش کی' گاؤں کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔

"نین تارا ٹھیک کہتی ہے' آخر نکاح کرنے میں کیا حرج ہے۔ آخر ہر محبت کا منطقی انجام یہی تو ہوتا ہے اور مجھے تو اس سے شدید محبت بھی ہے اور وہ بھی تو میرے بغیر نہیں رہ سکتی تو پھر شادی میں کیا حرج ہے اور شادی تو دلوں کے ملاپ کا نام ہے نہ کہ مجبوری اور بلیک میلنگ کا' جیسے آج کل میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ کوئی شادی ہے اگر میرا دل خوش نہیں ہے تو یہ تو مجھے اپنی بربادی لگ رہی ہے۔" اسٹیرنگ پر ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور اسپیڈ پر رکھا پاؤں بھی۔

"ان تکلیف دہ دنوں کو خوش کن دلفریب بھی تو بنایا جا سکتا ہے۔" ان کے دل نے راہ سجھائی۔" اگر آج کل میں' میں نین تارا سے نکاح کر لوں' کم از کم میرا دل تو خوش ہو جائے گا اور نین تارا بھی۔ اس مفت کی ٹینشن سے بھی ریلیف مل جائے گا' جو آج کل شادی کی صورت میں میرے اعصاب پر سوار ہے اور نین تارا۔ آہ جس کے ساتھ میں اتنی بڑی زیادتی کر آیا ہوں۔" انہیں پچھتاووں نے آن گھیرا' کیسی بے دردی سے انہوں نے اس کے پھول جیسے رخسار پر تھپڑ کھینچ مارا تھا' ان کا دل چاہا اپنے ہاتھ کو کاٹ ڈالیں' انہوں نے اضطرابی کیفیت میں ایک دم سے اسپیڈ پر رکھا پاؤں کھینچ لیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"آخر میں اس ساری جائیداد کا تنہا وارث ہوں اور بابا جان کا بائی پاس خدانخواستہ ہو سکتا ہے... آخر کیوں نہیں

ممکن۔" انہوں نے پیشانی کو مسلا۔ "آخر سب کو خدا کے پاس جانا ہی ہے۔ کسی کو آج، کسی کو کل۔" انہوں نے کھیتوں پر پھیلی دور تک سنہری سفید دھوپ کو پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"اگر میں نکاح کر لیتا ہوں نین تارا سے تو بابا جان کے بعد بھلا کون پوچھنے والا ہے، میں کسی کے آگے جواب دہ نہیں اور نین تارا میں کون سی برائی ہے، وہ کون سی پروفیشنل ہے۔ اس کی ماں کا دھندا اس کے ساتھ، میری نین تارا تو کنول کے پاکیزہ پھول کی طرح ہے اور صالحہ تو تمام عمر دھری رہے گی اور شرع میں تو چار کی اجازت ہے، پھر کیوں نہ میں اپنے دل کی خوشی پوری کروں۔"

ایک ایک کر کے سوچ کے پتھر راستے سے ہٹتے جا رہے تھے، رستہ اب دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔

"نین تارا شہر میں اور صالحہ گاؤں میں۔ کسی کو کیا خبر ہو گی اور ہو بھی جائے تو مجھے کسی کا ڈر نہیں۔" ہر طرف سے تسلی کی صدائیں آ رہی تھیں۔

"مجھے واپس جانا چاہیے نین کے پاس۔ وہ رو رہی ہو گی، اس کا دل تو چڑیا کے بچے سے بھی نازک ہے۔ جانے میرے اس سنگ دل رویے پر کیسے ٹوٹ کر چور چور ہوا ہو گا۔ اس کے زخم کا مرہم تو اب میری محبت ہی ہو گی، ہاں مجھے واپس چلنا چاہیے۔ ابھی اور اوہ!"

ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ تو سیدہ آپا کو جیولر کے پاس چھوڑ کر نین تارا سے ملنے گئے تھے، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ سیدہ آپا کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد آنے کا کہہ کر "اور اب تو۔" انہوں نے کلائی میں بندھی گھڑی کے چمکتے ڈائمنڈ ڈائل کی طرف نگاہ کی۔ دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔

سارا نشہ جیسے ہرن ہو گیا۔ انہوں نے گاڑی ریورس کی اور پوری رفتار سے بھگانے لگے کہ اچانک دائیں طرف سے دو عورتیں کھیتوں سے نکل کر سڑک کی طرف بڑھیں، دونوں گاڑی کے نیچے آتے آتے بچیں اور وہ کوئی بکری کے بچے تو نہیں تھے، جنہیں سلطان بخت چل کر آگے نکل جاتے۔ انہوں نے زور سے بریک لگائے اور غصے سے باہر کی طرف دیکھا۔ لڑکی پہلے ہی ان کی گاڑی کی طرف آ چکی تھی۔ وہ دھک سے رہ گئے۔

♥ ♥

محترم بابا صاحب!

السلام و علیکم!

امید ہے آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے، آپ کی اور گھر والوں کی خیریت کی میں اللہ سے امید کرتا ہوں۔ اماں جی بھی بخیر و عافیت ہوں گی، میرا اسلام ان کی خدمت میں عرض کیجیے گا۔

بابا صاحب، میں گاؤں آنا چاہتا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں سکا۔ پہلے "انٹرمیڈیٹ" کے امتحانوں کی مصروفیات تھیں۔ آپ کی دعاؤں اور اللہ کے کرم سے میرے امتحان بہت اچھے ہوئے ہیں، اگلے ماہ کے اختتام یا اس سے اگلے ماہ کے شروع میں رزلٹ آنے کی توقع ہے۔ مجھے امید ہے، آپ کی دعاؤں سے میرے مارکس بہت اچھے آئیں گے۔

بابا صاحب! عام طور پر لوگ امتحانوں کے بعد کے وقفے کو آرام اور تفریح کے لیے موزوں سمجھتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ ان لوگوں کے لیے ہو گا جن کے پاس واضح مستقبل کا کوئی خاکہ ہو یا خوش امیدی کے لیے وافر وسائل ہوں، جبکہ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے اور مجھے اپنے مستقبل کو بہت روشن، بہت مضبوط بنانا ہے اپنے زور بازو پر، اور ایسا کرنے کے لیے میرے پاس تفریح یا آرام کے لیے وقت نہیں ہے۔ امتحانوں کے بعد کا وقت میرے خیال میں مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے اچھا وقت ہوتا ہے، ایگزام کے فوراً بعد میں نے ایک اکیڈمی جوائن کر لی ہے۔ جہاں میں تھرڈ ایئر کا کورس دو ماہ میں کور کر کے اب سے چار ماہ بعد ہونے والے تھرڈ ایئر کے ایگزام میں بیٹھنے کے قابل ہو سکوں گا۔ میں نے اپنے پرنسپل صاحب سے بات کر لی ہے، تھرڈ ایئر کے ایگزام کے رزلٹ آنے تک وہ مجھے فورتھ ایئر کی کلاسز میں بیٹھنے کی اجازت دے دیں گے اور میں ایک سال میں دو جماعتیں کور کر لوں گا جو کہ میری کامیابی کے لیے پہلا قدم ہو گا۔

بابا صاحب! مجھے بہت آگے جانا ہے مگر مثبت اور سیدھے رستے سے۔ اس کے لیے مجھے وقت کی قدر کرنی ہے، اسی لیے میں یہ سب کر رہا ہوں۔ شام کو کمپیوٹر کورس اور انگلش لینگویج کا کورس بھی کر رہا ہوں۔

صبح کے چار گھنٹے ایک دواساز فیکٹری میں دوائیوں کی پیکنگ کا کام کر رہا ہوں، جس کا کچھ معاوضہ مل جاتا ہے، جس سے میں اپنے کچھ تعلیمی اخراجات پورے کر لیتا ہوں، لیکن یہ رقم میری ضروریات کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ اس لیے میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے میرے ماہانہ تعلیمی اخراجات کی مد میں جو پیسے بھیجتے ہیں، اس میں کچھ اضافہ کر دیں تاکہ میں پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ اپنا دل پڑھائی میں لگا سکوں، امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے اور گاؤں کا چکر فی الحال میں نہیں لگا سکتا، میری مصروفیات کے بارے میں تو آپ جان ہی چکے ہیں۔ اس لیے ابھی گاؤں آنا مشکل ہے، ہاں جب میں باقاعدہ فورتھ ایئر میں ہو جاؤں گا پھر کچھ روز کے لیے گاؤں آؤں گا۔

اماں جی اور بہنوں کو میرا اسلام کہیے گا۔ آمنہ کے پیپرز کیسے ہوئے ہیں؟ امید ہے اچھے ہوئے ہوں گے اس کے لیے میں اپنے ایک دوست کے ہاتھ نویں جماعت کا کورس بھیج رہا ہوں، اس سے کہیے گا کہ پڑھنا شروع کر دے۔ زینب بھی اب آٹھویں کی تیاری کر رہی ہو گی۔

بابا صاحب اگر آپ آمنہ کو شہر اسکول میں داخل کروا دیتے تو زیادہ بہتر تھا، باقی آپ جو مناسب سمجھیں۔ عبدالمبین کیسا ہے، اس کا حفظ قرآن کیسا جا رہا ہے؟ جویریہ کو میرا پیار کہیے گا۔ اب اجازت دیں۔ امید ہے، آپ میری درخواست پر غور فرمائیں گے اور پیسوں میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں گے، بابا صاحب یہ میرے بہترین مستقبل کے لیے ضروری ہے۔ نماز پنجگانہ میں باقاعدگی سے ادا کر رہا ہوں اور تلاوت قرآن بھی۔ اجازت دیجیے

آپ کا بیٹا

عبدالمتین

آخری جملہ اس نے شاید صوفی صاحب کو خوش کرنے کے لیے لکھا تھا جن کے ماتھے کے بل اس کا خط پڑھتے پڑھتے گہرے ہوتے چلے گئے تھے۔ اماں جی ان کے چہرے کے بدلتے زاویوں کا ہنڈیا میں ڈوئی چلاتے مشاہدہ کر رہی تھیں، خط پڑھ کر انہوں نے تہہ کر دیا اور خود جیسے کہیں دور پہنچ گئے۔ ماتھے پر بل لیے لب بھینچے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اماں جی سے صبر نہ ہو سکا تو اٹھ کر چلی آئیں۔

"کب لکھا ہے عبدالمتین نے آنے کے بارے میں۔" وہ پاس آ کر بے قراری سے بولیں۔

"ہوں۔" وہ چونکے پھر ایک گہرا سانس لے کر خط تخت کے سرہانے ڈال دیا۔

"بتایا نہیں آپ نے، کب لکھا ہے اس نے آنے کے بارے میں۔" وہ ان کی چپ سے خائف ہو کر بولیں۔

"رابعہ بی بی! یہ شہری ہوا بھی مکڑی کے جال کی طرح ہوتی ہے دار العنکبوت، سب سے حقیر نظر آنے والا جال درحقیقت سب سے مضبوط ہوتا ہے جو اس میں ایک بار جکڑا گیا، وہ پھر سلامت واپس نہیں آ سکتا۔" وہ اپنی داڑھی کو سلجھانے لگے۔ "اللہ ہو۔" آسمان کی طرف نگاہ دوڑا کر انہوں نے کہا۔

"اللہ نہ کرے صوفی صاحب! کیا مطلب۔" اماں جی کچھ دہل کر بولیں۔

"رابعہ بی بی! اب عبدالمتین کا اس پسماندہ گاؤں میں آنا بہت مشکل ہے، اسے آگے جانا ہے بہت۔ اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے۔ اس نے خط پیسوں کے لیے لکھا ہے نہ کہ آنے کے بارے میں بتانے کے لیے اس کا آنا اب ناممکن ہی سمجھو۔" اماں جی منہ کھولے انہیں دیکھے گئیں۔ "مغرب کی اذان ہونے والی ہے میں اب چلتا ہوں۔" انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور متوازن قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اماں جی نے خط اٹھایا اور اندر کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"آمنہ سے پڑھواتی ہوں۔ یہ تو مشکل مشکل باتیں کرتے ہیں۔ بچہ پردیس میں ہے، پیسوں کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے، تو بھلا بتاؤ کیسی دل دکھانے والی پیشن گوئیاں کرنے لگ گئے ہیں اب صوفی صاحب۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"سہیل ڈیئر! آ بھی جاؤ اب۔ ریئلی آئی فیل بور۔" سیاہ ڈھیلی ڈھالی سلکی نائٹی میں ملبوس ہاتھ سے جمائی روکتے ہوئے ریشم رائٹنگ ٹیبل پر ایک فائل میں سر دیئے سہیل سے بولی۔

"ہوں۔ آ رہا ہوں۔ سو جاؤ تم۔" وہ جیسے چونک کر بولا۔

"ڈارلنگ کم آن۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔ باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔" اس نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لے کر کہا۔ سہیل ایک لمحے کو فائل شائل سب بھول گیا۔

"یار آتا ہوں، مجھے اس طرح سے ڈسٹرب نہ کرو۔" وہ اس کے پوز سے نگاہیں چرا کر بولا اور فائل کو پھر سے پڑھنے لگا۔

"آخر اس فائل میں کیا ہے، تم گھنٹہ بھر سے اس سوکن پر نگاہیں جمائے بیٹھے ہو۔" وہ تلملا کر اٹھ بیٹھی۔

"بتایا نا ضروری ہے۔ بڑا اہم نوٹ لکھنا ہے مجھے، تم مجھے یکسوئی سے کچھ کرنے دو تو پھر ہے نا۔" سہیل چڑ کر بولا۔

"معاملہ کیا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ نا۔" وہ اٹھ کر آئی اور اس کے بالوں کو اپنی ریشمی انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے پیار سے بولی۔

"بینک لون کا مسئلہ ہے۔ فوڈ منسٹر کے اسپیشل ایڈوائزر کا کیس ہے، اس کو ڈیڑھ کروڑ کا لون چاہیے۔ اس سے مجھے بہت سے کام رہتے ہیں اور وہ منسٹر صاحب کے ذریعے منٹوں میں میرے کام کروا بھی دیتا ہے، بڑا مہربان دوست ہے میرا۔ اب اسے کام پڑا ہے تو ہمارے باس صاحب اکڑے ہوئے ہیں کہ ان حضرت کے ذمے پہلے ہی پانچ کروڑ کا قرضہ واجب الادا ہے، پہلے وہ اس کا کچھ کریں پھر اگلی منظوری ہوگی۔" سہیل نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے ریشم کے بالوں میں حرکت کرتے ہاتھ کو نرمی سے اپنے ہاتھ میں لے کر سارا معاملہ اسے سمجھایا۔

"باس کا مسئلہ کیا ہے؟" وہ گھوم کر آگے آئی اور ٹیبل سے اپنی نازک کمر ٹکا کر بولی۔

"شاید ایمانداری۔" سہیل نے قیاس کیا "لیکن نہیں، اس کا پچھلا ریکارڈ اتنا بھی شفاف نہیں ہے، اس طرح کے خاصے کام موصوف پہلے انجام دے چکے ہیں۔ حالانکہ واسطی صاحب نے اچھی خاصی گولڈن آفر بھی کی ہے، اسے ای سیکٹر میں دو سو گز کے پلاٹ کی مگر وہ مانتا ہی نہیں اور مجھے یہ کام کروانا ہے، وہ پلاٹ ہمیں بھی تو مل سکتا ہے"

"واؤ۔" ریشم مسرت سے بولی "ونڈر فل اگر ایسا ہو جائے تو۔"

"مگر مشکل ہے نا۔ کیس اپروو ہو تو پھر ہے نا۔" سہیل مایوسی سے بولا۔

"تم کہو تو میں کوشش کروں۔" اس نے سہیل کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"تم؟" وہ حیرت سے اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "تم کیا کرو گی وہ تو اسٹون مین ہے بلکہ آئرن مین۔"

"ڈارلنگ حسن کی گرمی سے بڑے بڑے پتھر پگھل جاتے ہیں اور لوہا ہوتا ہی پگھلانے کے لیے ہے، پھر جیسے چاہو ڈھال لو یو نو۔" وہ ایک ادا سے اترائی اور اس کے کندھے سے ٹک کر بولی۔

"سب ہماری طرح موم کے نہیں ہوتے میری جان! محبت کی ایک کرن پڑی اور سیال بن کر بہنے لگے۔" سہیل نے جھک کر اس کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے چھوا، وہ زور سے ہنس پڑی اور فائل اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"تمہارا باس جم جاتا ہے؟" فائل پڑھتے پڑھتے وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"میرا خیال ہے جاتا ہے۔" وہ پین سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"اپنے باس کا سامنا کرا دو پھر دیکھتی ہوں، وہ کتنے پانی میں ہے۔" اس نے فائل بند کر کے میز پر پھینکی۔

"یار! یہ کام بہت مشکل ہے اور میں اسے ہر حال میں کرنا چاہتا ہوں اگر یہ منظوری ہو جاتی ہے تو ریشم ڈارلنگ! ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ پلاٹ کے علاوہ ہیڈ کوارٹر میں پروموشن اور اس کے بعد ترقی کی لمبی لائن کو عبور کرنا کچھ دشوار نہیں۔" سہیل کی آنکھیں ایسے حسین مستقبل کے خواب بننے لگیں، جسے ایک رکاوٹ کے

بعد پانا کچھ دشوار نہیں تھا۔

"سہیل! پتا ہے میں نے تمہارا انتخاب کیوں کیا تھا حالانکہ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے، میرے گرد پروانوں کا ہجوم تھا اور تمہارے دقیانوسی بیک گراؤنڈ کے باوجود مجھے تم ہی کیوں بھائے تھے۔" وہ جا کر ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھ گئی اور شیشے میں بلیک کلر میں اپنے دمکتے رنگ و روپ کو دیکھ کر خود ہی محظوظ ہونے لگی۔

"اس سپاس نامے کو دہرانے کا یہ کون سا وقت ہے۔" سہیل نے کچھ ناگواری سے کہا۔

"ہے نا ڈیئر۔" وہ برش اٹھا کر نرمی سے اپنے براؤن ریڈ بالوں میں کرنے لگی۔

"تمہاری چوائس میں نے اس لیے کی تھی کہ تم میں آگے بڑھنے کی بہت لگن ہے اور اس کے لیے تم کوئی بھی Source (ذریعہ) استعمال کر سکتے ہو۔ تم اسٹیٹس کی سیڑھی کا ہر طرح سے مقابلہ کر سکتے ہو۔ آگے والے کو گرا کر یا پیچھے والے کی ہمدردی پا کر۔ مجھے تم میں یہی بات بھائی تھی۔" اس نے بال ایک جھٹکے سے لہرائے۔ "ورنہ تمہاری کلاس میں اس طرح کے Germs کا ہونا بڑی مشکل بات ہے۔ وجہ تمہاری کلاس کے والدین کا اولاد کو حق حلال کی کمائی کھلانے کا مان کہ ان کی اولاد شارٹ کٹس میں نہیں بھٹک سکتی۔ مان تو تمہارے والد صاحب کا تھا کہ تم کچھ بھی غلط نہیں کر سکتے۔ ان کے کوڈ آف مورلٹی کے خلاف ہے نا۔" وہ تمسخر سے ہنسی، اس نے ایک ادا سے شیشے میں خود کو دیکھا "ڈارلنگ ایم آئی رائٹ۔"

"یس۔" سہیل نے بے دھڑک کہا۔

"تمہاری تربیت میں انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی، صرف دولت کی کمی کے سوا۔ ہے نا۔" اس نے بھنورا سی آنکھیں سہیل پر جمائیں۔ سہیل خفیف سا مسکرایا۔

"اور اسی چیز نے تمہارے اندر بہت سی خواہشات کو جنم دے دیا اور ان تشنہ خواہشوں کو صرف دولت ہی پورا کر سکتی تھی اور ڈارلنگ! ویسے بھی میں تم کو اس میں حق بجانب سمجھتی ہوں۔" اس نے نائٹ کریم کی بائل اٹھائی۔

"آخر ہمیں زندگی ایک بار ہی تو ملتی ہے، اسے ترس ترس کر سسک سسک کر کیوں گزاریں۔ میرا تو یہ آئیڈیا ہے۔" وہ نرمی سے کریم ہاتھوں پر ملنے لگی۔

"بالکل۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"اچھی زندگی گزارنا صرف معاشرے کے چند لوگوں کا حق نہیں ہمارا بھی تو ہے۔ وہ کون سا آسمان سے اترے ہیں کہ دنیا میں جنت کے مزے لوٹیں اور ہم ایک ایک چیز کو ترسیں۔ اس ترس سے کس قدر فرسٹریشن پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ شاید تمہیں بھی نہیں۔ سہیل! میرا بچپن اسی ترس کا شکار تھا، جب مجھے چھوٹی سی الیکٹرک ڈول سے لے کر بسکٹ کے ایک پیکٹ کو حسرت سے دیکھنا پڑتا تھا، میرے پیرنٹس مجھے جنم دینے کے سوا کوئی بھی کمال نہ کر سکے میرے لیے، مجھے ایسی ترس زدہ حقیر زندگی سے نفرت تھی، اسی لیے میں نے بہت بچپن میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایسی زندگی نہیں گزاروں گی، اچھی زندگی کی جو بھی قیمت مجھے ادا کرنی پڑی میں کروں گی۔" وہ اب کریم کو زور زور سے ہاتھوں پر رگڑ رہی تھی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے پتا ہے۔ ہمارے ابو کا موٹو کیا تھا، تھوڑا کھاؤ مگر حق حلال کا کھاؤ۔ ساری زندگی حلال حلال کی گردان سنتے میرے اندر سے اس جذبے کی محبت ہی حلال ہو گئی۔ چھوٹا تھا، خواہشیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں، اچھا اسکول، اچھا بیگ، اچھے شوز، اچھا بابا ڈریس کچھ بھی میری دسترس میں نہیں تھا، ہم عمروں کو مہنگے کھلونوں سے کھیلتے دیکھ کر حسرتوں کو ہوا ملتی اور بھڑک اٹھتی تھی۔ بڑا ہوا تو حسرتیں بھی جوان ہو گئیں، اچھی شرٹ سے لے کر اچھے جوتے تک، اچھے تعلیمی ادارے سے لے کر اچھی گاڑی تک سب کو حسرت سے سوچا کرتا تھا۔ اچھی گاڑی تو دور کی بات عام سی سیکنڈ ہینڈ کرولا بھی ہمارے لیے کوئی عجوبہ خاص تھی، بس ان ہی حسرتوں نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکوں، آخر معاشرے میں اور بھی تو لوگ ہیں جو ہر جائز

وناجائز طریقے سے کماتے اور اڑاتے ہیں۔ وہ کس کی پکڑ میں ہیں نہ قانون کی نہ خدا کی۔ خدا تو تماشا دیکھ رہا ہے اور قانون کو پیسے کے ذریعے تماشا بنایا جا سکتا ہے ہمارے معاشرے کی سپر پاور پیسہ ہے اور ریشم! مجھے اس سپر پاور کو گھر کی لونڈی بنانا ہے' چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔" اس کے انداز میں ذرا بھی لچک نہ تھی۔

"Yes that the man I chose for me"

(ہاں' یہی وہ آدمی ہے جو میری پسند تھا) وہ جوش سے بولی۔

"سہیل! بس ہر معاملے پر ڈیلنگ میں تمہاری پارٹنر ہوں' مجھے تم صرف وائف نہ سمجھنا گھر کا چراغ۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"حرام حلال کی تفریق صرف رزق کے معاملے ہی میں ہمیں بہت سی لذتوں سے محروم نہیں کرتی' بلکہ زندگی کے ہر معاملے پہ اپنی ٹانگ اڑاتی ہے۔ بیوی تو میں تمہاری ہوں۔ یہ اسٹیمپ مجھ پر سے کوئی نہیں اتار سکتا لیکن اگر میرا حسن' میرا وجود کہیں بھی ترقی کے سلسلے میں تمہارے کام آ سکتا ہے تو سہیل! ایسی سوچنے کے لیے ایک پل بھی نہیں مانگوں گی' تم بھی دقیانوسی مردوں کی طرح اس بات کو انا' غیرت اور جھوٹی عزت کا مسئلہ نہ بنانا' ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیے' تم سمجھ رہے ہو نا۔" وہ اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو' بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے ہم دونوں کو بہت کچھ کرنا پڑے گا' تم فکر نہ کرو۔ میں دقیانوسی مرد نہیں ہوں جو بیوی کو سات پردوں میں چھپا کر اسے بے کار کی شے بنا دیتا ہے۔ میں تو اس بات پر فخر محسوس کروں گا کہ سب کو معلوم ہو کہ میرے پاس کون سا کوہ نور ہے۔ میں اس معاملے میں ذرا بھی mind Congested (تنگ ذہن) نہیں ہوں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔"

اس نے جیسے ریشم کی سوچ کی ہر رکاوٹ کو دور کر دیا۔ اب وہ خود کو مکمل طور پر آزاد محسوس کر رہی تھی' سب کچھ کرنے کے لیے۔

"آئی پراؤڈ آف مائی چوائس۔" وہ فخر سے بولی۔ "کل مجھے اپنے ایم ڈی سے ملوانا بلکہ انہیں صرف دور سے مجھے دکھا دینا پھر کرشمہ دیکھنا اپنی پرنس کا۔" وہ اطمینان سے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"اور اب اس بوگس فائل کو بند کرو۔ اس پر نوٹ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب تمہارا ایم ڈی خود لکھے گا۔ ناؤ کم آن۔" وہ کہتے ہوئے بستر پر دراز ہو گئی۔ سہیل نے مسکرا کر فائل بند کی۔

"میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥
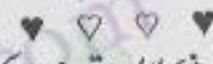
"کس قدر ناقابل یقین بات لگتی ہے' میں نے بھلا اس قدر محنت کب کی تھی پھر بھی۔۔۔ پتا نہیں اللہ مجھ پر اس قدر مہربان کیسے ہو گیا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس کا شکر کیسے ادا کروں۔"

وہ کتنی دیر سے گولڈ میڈل اور اعزازی سرٹیفکیٹ سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ آج کے اخبار میں اس کی تصویر بھی آئی تھی اور اس کے خیالات کا اظہار بھی۔ اس نے ناظم اور نائب ناظم دونوں سے معافی مانگی تھی کہ اسے ظفر وغیرہ کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا' وہ ان تینوں سے دل ہی دل میں ناراض بھی ہو گیا تھا کہ ان کی گھٹیا حرکت کی وجہ سے اسے سب کے سامنے اتنی حقت اور ذلت اٹھانا پڑی' مگر ان تینوں نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اسے خوب گلے لگا کر مبارک باد دی تھی اور ٹریٹ کا مطالبہ بھی کیا تھا' وہ سب باتوں کے جواب میں خاموش رہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ تولے کا تو ہو گا؟" پیچھے سے وہ ظفر کی آواز پر اچھل ہی پڑا' اس کا اشارہ معاذ کے ہاتھ میں پکڑے گولڈ میڈل کی طرف تھا۔

"کیا مطلب؟" اس نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"او' ہو میری مینا کے تو ٹھیک ٹھاک پر پرزے نکل آئے ہیں۔ ایک ہی رات میں۔ صحیح ہے بھئی عشرت کا اپنا ہی نشہ ہوتا ہے' جس کے سر چڑھ جائے' اس کی نزدیک کی نظر اچھی خاصی کمزور ہو جاتی ہے اور دور تو وہ دیکھتا ہی

نہیں۔" ظفر نے زور سے معاذ کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"فضول باتیں نہ کیا کرو۔" معاذ نے کچھ غصے سے کہہ کر میڈل مخملیں ڈبی میں ڈالا' اسے لفافے میں بند کر کے اپنے آگے پڑے اٹیچی کیس میں رکھنے لگا۔

"کیا بات ہے میری جان! ایک ہی رات میں ہماری باتیں فضول ہو گئیں۔ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔ ویسے تالا خرید لیا ہے تم نے؟" وہ لہجے کی ٹون بدل کر ذرا ہمدردی سے بولا۔

"وہ کس لیے؟" معاذ ہی تیکھے چتون سے بولا۔

"بھئی اس خزانے کو محفوظ کرنے کے لیے کم از کم تالا تو خرید لو بلکہ دو لو۔" اس نے آنکھ سے ڈبی میں بند میڈل کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے خشکی سے کہتے ہوئے سرٹیفکیٹ اٹیچی میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔

"دیکھ لو پھر نہ کہنا۔ خبر نہ ہوئی وہ کیا ہے۔" اس نے انگلی سے چٹکی کو تھپتھپایا۔ "سنی اے تیرا الفیا شہر جھبو۔۔۔" وہ گنگنایا۔ لہجے میں بہت کچھ تھا۔ معاذ ایک لمحے کو چپ کر گیا۔

"اچھا یہ چھوڑو' یہ بتاؤ تیاری ہے تمہاری۔ ابھی دو بجے کی گاڑی سے نکلنا ہے مجھے تو گاؤں کے لیے۔ چلنا ہے میرے ساتھ۔" اس نے معاذ کا دھیان دوسری طرف لگایا۔ وہ چپ رہا۔

"محسن اور شبیر کہاں گئے؟" معاذ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"محسن تو اپنی پھوپھی کے پاس فیصل آباد چلا گیا اور شبیر ادھر ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا' اب وہیں رہ لے گا۔ تم پھر تیار رہو۔" اس نے پھر کہا۔ "میں تو یار! بوریا بستر باندھ کر آیا ہوں' تم سے پوچھنے آیا تھا ساڑھے بارہ ہونے والے ہیں۔ چلنا ہے تو بتاؤ۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"تم چلو میں آتا ہوں۔ ذرا یہ سمیٹ لوں۔" اس نے پاس پڑا اپنا سوٹ تہہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ جلدی آؤ' میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"یہ ظفر کا بچہ نیت کا خراب ہے۔ اس کی نظر میرے میڈل پر ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے مجھے مارنے سے بھی گریز نہیں کرے گا' مجھے میڈل ساتھ نہیں لے کر جانا چاہیے پھر کہاں رکھوں اسے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"آئیڈیا۔" کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی چٹکی بجائی اور میڈل کی ڈبی اٹیچی سے نکال کر قمیص کے اندر چھپائی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"جنتاں! او جنتاں! کہاں مر گئی ہو۔" رعنا نے لاؤنج کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ اسی وقت ایک چالیس سالہ ادھیڑ عمر عورت گیلے ہاتھ چادر کے پلو سے صاف کرتی اندر داخل ہوئی۔

"جی بیگم صاحب! آپ نے آواز دی۔" وہ شاید بھاگم بھاگ آئی تھی' اس کا سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔

"آواز کی بچی! کمبخت بہرے چیخ رہی ہوں کم سنائی دیتا ہے تمہیں۔" رعنا غصے سے دانت پیستے ہوئے جھنجلا کر بولی۔

"میں نے تو جیسے ہی سنا فوراً بھاگی آئی۔" وہ سر جھکا کر عاجزی سے بولی۔

"فوراً بھاگی آئی۔" رعنا بڑبڑائی "کچن کی کیا پوزیشن ہے؟" کچھ دیر بعد وہ اپنے غصے پر قابو پا کر بولی۔

"جی کیا مطلب؟" وہ نا سمجھی سے چونک کر بولی۔

"مطلب تمہارا سر۔" رعنا کو پھر طیش آ گیا۔ "جنتاں! میرا جی چاہتا ہے' تیری اب چھٹی کر دوں' سٹھیا گئی ہے تو۔ اب بات تیرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے' چاہے جیسی بھی ہو۔ میں بکواس کر رہی ہوں مینیو میں کیا کیا پکایا ہے' معلوم ہے تجھے یا وہ بھی بھول گئی کہ آج تین بجے صاحب کو آنا ہے اور اب ایک بج رہا ہے۔ مجھے ابھی تیار ہو کر انہیں ایئرپورٹ لینے جانا ہے۔"

وہ وقت کی کمی کی وجہ سے اور کچھ جنتاں کی بدحواسیوں کی وجہ سے بری طرح سے جھنجلا رہی تھی' اسی وقت

لاؤنج میں لگے اسپینش گھڑیال نے ٹن سے ایک بجایا۔

"وہ جی جو آپ نے کل بتایا تھا' سب کھانے تیار ہیں۔ صرف پلاؤ اور روٹیاں ابھی نہیں بنائیں آپ صاحب کو لینے جائیں گی تو چاول پکاؤں گی' یہ دونوں چیزیں تو جی گرم گرم ہی اچھی لگتی ہیں۔" وہ گھبرا گھبرا کر بول رہی تھی۔

"ڈائننگ ٹیبل پر برتن سیٹ کردیے ہیں۔" وہ سختی سے بولی۔

"ہاں جی' کردیے ہیں۔" وہ سر جھکا کر منمنائی۔

"چلو پھر دفع ہو جاؤ اور باقی کا کام نپٹاؤ۔ آج صاحب تقریباً "بیس دن بعد گھر آرہے ہیں۔ مجھے کوئی کمی نظر نہیں آنی چاہیے' نہ گھر کے انتظام میں اور نہ کھانے پینے میں۔ ورنہ مجھے تم اچھی طرح جانتی ہو۔" رعنا کے لہجے میں واضح حقارت اور دھمکی تھی۔

"جی بیگم صاحب!" اس کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔

"اسی وقت باہر سے کسی کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"جاؤ دیکھو! کون ہے' اس وقت مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ کہہ دینا۔" جنتاں فوراً" باہر کی طرف پلٹی اور رعنا کے لاؤنج چھوڑنے سے پہلے دوبارہ موجود تھی۔

"وہ جی۔ آپ کی بھابھی صاحبان آگئی ہیں میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی مگر۔" اسی وقت عفت آرا بولتی ہوئی اندر آگئی۔

"السلام وعلیکم رعنا کیا حال ہیں بھئی۔ تمہارے ملازم بڑے سرچڑھے ہیں۔" آتے ہی سلام جھاڑ کر وہ فل والیوم سے بولی۔

"میں اندر آرہی تھی تو وہ چوکیدار خان کا بچہ جھوٹ بکے جارہا تھا کہ تم گھر پر نہیں ہو' دن میں بھی شاید نیند کی گولیاں استعمال کرتا ہے جسے گھر کے اندر اور باہر کے افراد کی خبر نہیں' ذرا فخر آجائیں تو اس کو تو فارغ کرواور یہ تمہاری بدحواس ملازمہ مجھے ڈرائنگ روم کی طرف گھسیٹے جارہی تھی جیسے میں کوئی غیر ہوں یا اجنبی جسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا ہے۔" وہ رعنا کے ماتھے کی شکنوں پر غور کیے بغیر نوٹے اور اسٹاپ کے بنا بولے چلی گئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آج اتنے دن ہوگئے تھے' نہ تمہارا کوئی فون آیا نہ فخر کا اتا پتا۔ میرا تو دل ہولنے لگا۔ میں نے کہا' جاکر آج پتا کرکے آؤں کہ کیا بات ہے۔ کوئی خیر خبر ہی نہیں۔" اور رعنا کا مارے غصے اور کوفت کے جواب دینے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا اور جواب کی کسی کو ضرورت بھی کب تھی۔

"او بیٹھو نا تم۔ گھر سے نکلا ہی نہیں جاتا۔ کمبخت گھر کے کام کاج ہی ختم نہیں ہوتے' ایک ختم کرو تو دوسرا تیار ہے۔ وہ کیا محاورہ ہے کہ ہاں یاد آیا کہ بیکار مباش کوئی کام کیا کر' نئے نہیں تو پرانے ادھیڑ کر سیا کر۔

بس اسی نئے پرانے کے چکر میں فرصت کا ایک پل نہیں ملتا۔ آج بھی وقت نہیں تھا ذرا بھی۔ ٹیلر سے زوبی کا یونیفارم لینے جانا تھا' دوپہر کا کھانا بھی نہیں بنایا' میں نے کہا یہ کام تو جان نہیں چھوڑیں گے میں جاکر ذرا پتا تو کر کے آؤں۔" عفت آرا نے چادر لپیٹ کر ایک طرف رکھی اور دوپٹہ سیٹ کرکے رعنا کی شکل دیکھنے لگی۔

"جاؤ تم تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ سر پر سوار ہو۔" رعنا کو اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو جنتاں پر برس پڑی' وہ فوراً" سے پیشتر باہر بھاگ گئی۔

"فون کرکے پتا کرلیتیں آپ۔ مگر اس قدر مصروفیت تھی تو۔" وہ بیزار اور کوفت زدہ لہجے میں یہی کہہ سکی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم خفا ہوگی کہ اتنے دنوں سے میں نے چکر کیوں نہیں لگایا' بس وہی اللہ ماری مصروفیت جان کو آئی۔ میں نے تو بتیرا نواز سے جھک جھک کی ہے کہ ایک جزوقتی ملازمہ ہی مجھے رکھوادو وہ کیا کہتے ہیں کہ نکے نکے کم (کام) تو ٹوٹ موئی ان۔" وہ بے دریغ پنجابی محاوروں کا استعمال کیے جارہی تھی۔ "پر تمہارے بھائی ادھر سے سنتے ادھر سے اڑاتے ہیں' شکر ہے پیڑوں والی لگوادی ہے' ورنہ تو الامان الحفیظ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"اور سناؤ' فخر کی کوئی خیر خبر۔" وہ دم لینے کو رکی۔

"آرہے ہیں آج شام کو۔" رعنا نے جھلاتے ہوئے لہجے میں صحیح وقت بتانے سے گریز کیا۔

"اچھا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے میں صحیح وقت پر آئی۔ ابھی نواز کو فون کردیتی ہوں۔ شام تک بچوں کو لے کر ادھر ہی آجائیں۔ اب فخر سے مل کر ہی جائیں گے' اتنے دن ہوگئے ان کی صورت دیکھے۔" رعنا کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی مگر اس آگ کو بھی اسے خود ہی بجھانا تھا۔

"آج تو معلوم نہیں رات کو وہ کس وقت آئیں۔ فلائیٹ ان کی شاید لیٹ ہوجائے۔ مجھے انہوں نے صحیح ٹائم نہیں بتایا تھا۔ راستے میں شاید کچھ دیر کے لیے سنگاپور اتریں گے' پھر وہاں سے آئیں گے' رات تو کیا شاید کل صبح تک۔" رعنا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عفت آرا کو اٹھوا کر باہر پھنکوادے۔

"اے چلو' جب بھی آئیں۔ ہماری تو دعا ہے' ساتھ خیریت کے آئیں' بہرحال ہم رات تک تو انتظار کریں گے۔ ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔" عفت آرا نے ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر رکھیں اور آرام سے بیٹھ گئی۔

"سیفی کہاں ہے۔ نظر نہیں آرہا۔" وہ رعنا کے تاثرات سے انجان بنتے ہوئے بولی۔

"اسکول گیا ہوا ہے اور کہاں جاتا ہے۔" رعنا جل کر بولی۔

"کیسی جارہی ہے اس کی پڑھائی۔" ہنوز بے نیازی برقرار تھی۔

"اچھی ہے۔"

"تم نے کافی دنوں سے چکر نہیں لگایا۔ تمہارے بھائی یاد کررہے تھے۔" وہ پھر لگاوٹ پر اتر آئی۔

"اسلام آباد گئی ہوئی تھی' فون کرکے تو گئی تھی نواز بھائی کو۔" وہ دل جلے انداز میں بولی۔

"خالی فون سے کیا ہوتا ہے' بہرحال آؤ بیٹھو۔ تم کہیں جارہی ہو۔"

"ہاں۔ مجھے جانا ہے ذرا اپنی ایک دوست کی طرف۔" وہ بہانا بنا کر بولی۔

"ہاں تو تم چلی جاؤ۔ میں ہوں ادھر نوکروں کے سر پر۔ سیفی آئے گا تو کھانا نکلوادوں گی۔ تم کھا کر جاؤ گی۔" وہ فوراً" مالکانہ استحقاق جتاتے ہوئے بولی اور رعنا کا دل چاہا' سامنے دیوار سے اپنا سر ٹکرادے۔

"آپ خواہ مخواہ ادھر بیٹھ کر وقت ضائع کریں گی' مجھے واپسی تک رات ہوجائے گی اور فخر کا تو میں نے آپ کو بتا ہی دیا ہے۔" وہ انہیں سمجھانے یا بھگانے کی آخری کوشش کے طور پر بولی۔

"اے ایسی تو کوئی بات نہیں۔ نواز اور بچے تو آہی جائیں گے۔ اچھا ہے تمہارے پیچھے گھر کی راکھی ہوجائے گی' میں تو کہتی ہوں' نوکروں کے سر پر یوں گھر کھلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے' بڑے دلوں کے بے ایمان اور کھوٹے ہوتے ہیں یہ' ادھر مالک گھر سے نکلے' ادھر ان کی نیتوں میں فتور آیا اور تم تو ہو سدا کی لاپروا اور معصوم۔" عفت آرا نے آخر میں رعنا کو خوشامد سے پٹانا چاہا جس کا کچھ خاص اثر نظر نہیں آیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں بھابھی! سب ملازم پرانے اور وفادار ہیں۔"

"وہ تم نے سنا نہیں' گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔" وہ آج محاورے رٹ کر آئی ہوئی تھی۔ "اور میں تو کہوں۔" وہ ذرا رازداری سے آگے ہو کر بولی۔

"یہ فخر کو گئے کتنے دن ہوگئے۔" اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔

"بیس کے قریب۔" رعنا بیزاری سے بولی اور تھک کر صوفے پر ڈھے گئی۔

"لو بھلا بتاؤ' یہ کوئی تک ہے' بیوی بچے کے بغیر موئے چینیوں کے دیس میں اتنے دن لگانے کی۔ نہ مجھے بتاؤ' وہ کون سا مرد ہے۔ جو چار دن بیوی کے بغیر یا صاف کہوں تو عورت کے بغیر کاٹ سکتا ہے۔" وہ پتا نہیں اب کون سا انکشاف کرنے جارہی تھی' رعنا کی بیزاری اور بڑھ گئی۔

"فخر ایسے نہیں ہیں بھابھی!" اس کی نگاہیں بھٹکتے ہوئے وال کلاک کی سمت اٹھ گئیں۔ ایک بج کر پچیس منٹ۔ اس کا دل بے قراری سے پھڑپھڑانے لگا۔

"اے رہنے دو تم۔ یہ مرد تو ہوتا ہی سرہانے کا سانپ ہے' کس وقت ڈس لے' اس کا کوئی پتا تھوڑی ہے اور تم سدا کی بھولی' بس اعتبار کیے جانا۔ رعنا بے وقوف! آنکھیں اور کان کھلے رکھا کر' یہ فخر جو جلدی جلدی باہر کے دورے کرتا ہے۔ اس کے ساتھ خود جایا کر' ورنہ ایک دن پچھتاؤ گی۔" وہ اس کا دل دہلانے لگی۔

"خدا نہ کرے۔ بھابھی! فخر ایسے نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ آپ فضول میں شک نہ کریں۔"

"ارے شک نہ کروں تو اور کیا کروں۔ بتاؤ مجھ سے تم نے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے لیے فخر جا رہے ہیں اور بیس دن لگا کر آئے' بولو ہے نا شک کی بات۔" وہ آنکھیں پھیلا کر بولی۔

"کام سے گئے تھے' وہ سیر سپاٹے پر نہیں گئے تھے۔ روز دوبار فون کرتے تھے کہ کام کی وجہ سے رکنا پڑ گیا ہے ورنہ وہ کہاں رہنے والے ہیں۔" وہ فخر کی صفائی میں بولی۔

"اچھا بی بی! ہمارا کام تو سمجھانا تھا' آگے تمہاری مرضی۔ ڈیڑھ بج رہا ہے۔ میں نے تو صبح ناشتہ بھی ہلکا لیا تھا' ذرا کسی ملازم کو آواز تو دو کھانے کے لیے۔ میں تو بازار بھی گھنٹہ پھرتی رہی ہوں۔ بڑی زوروں کی بھوک لگ گئی ہے۔" عفت آرا کہتے ہوئے صوفے پر ہی نیم دراز ہو گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"نزہت بیٹا! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کر سکوں۔" ممتاز خان ایزی چیئر پر بیٹھے تھے۔

"کیسی باتیں ابو جی؟" وہ پوری توجہ سے بولی۔ ہاتھوں کے کٹوروں میں معصوم سا چہرہ ٹکائے اپنی طرف محبت و دلچسپی سے دیکھتی وہ انہیں چھوٹی سی گڑیا لگی۔ پتا نہیں اس کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہوتی ہیں یا نہیں۔ ان کے دل نے آہ بھری۔

"باتیں کیا بیٹا! بس یوں ہی دل چاہ رہا تھا' تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کو۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"تو ابو جی! میں تو سارا وقت آپ ہی کی طرف متوجہ رہتی ہوں اور مجھے گھر میں کام ہی کیا ہے۔" وہ کرسی ان کے قریب کر کے بیٹھ گئی۔

"وہ تو گھر کے کاموں میں ادھر ادھر لگی مجھے کچھ وقت دے دیتی ہو۔ ورنہ میں تو تمہاری فراغت کا ہی انتظار کرتا رہ جاتا ہوں۔ کب تم فارغ ہو کب ہم باپ بیٹی جی بھر کر باتیں کریں۔" وہ محبت سے بولے۔

"ابو جی! آپ مجھے کہہ دیا کریں۔ جب آپ کا دل چاہے اور گھر کے کام کون سے خاص ہوتے ہیں۔ صفائی ستھرائی اور کھانا پکانا اور یہ تو سب چلتا ہی رہتا ہے۔"

"سہیل آ گیا؟" حالانکہ وہ ابھی ان سے مل کر گیا تھا پھر بھی پوچھ بیٹھے۔

"جی ابو جی۔ ابھی تو آپ سے مل کر گئے ہیں۔"

"ہوں معلوم ہے مجھے۔" وہ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ وہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"ابو جی۔" اس نے دھیرے سے پکارا۔ میرون کلر کے سادہ سوٹ میں اس کی گندمی رنگ دمک رہی تھی۔

"بیٹا! میری زندگی کا کچھ۔"

"ابو جی پلیز۔" اس نے اپنا ہاتھ ان کے منہ کے آگے رکھ دیا۔ "ابو جی! میں نے آپ کی وجہ سے خود کو سنبھالا ہوا ہے۔ اگر آپ اس قسم کی باتیں کریں گے تو میں بھی ٹوٹ پھوٹ جاؤں گی۔" اس کی آواز بھرانے لگی' نہ عمر زیادہ تھی نہ حوصلہ۔

"معلوم ہے مجھے۔" ان کا سر جھک گیا۔ "مگر بیٹا! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے حوصلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔" وہ نا معلوم کیا کہنے جا رہے تھے۔

"ابو جی۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"بیٹا! خدا جانے آگے کیا حالات پیش آئیں' تم سر حال۔" وہ چپ کر گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دونوں

بس کسی سوچ میں گم تھے۔

"تمہاری ماں کا زیور کدھر ہے؟" کافی دیر بعد ممتاز خان نے غیر متوقع سوال کیا۔

"لاکر میں ہے ابو جی الماری کے۔"

"لاکر کی چابی کس کے پاس ہے۔"

"میرے پاس۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"ہوں۔ نزہت! وہ زیور تمہارے لیے ہے اگر کبھی اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو بے دھڑک استعمال کر لینا کہ وہ تمہارا ہی ہے۔"

"ابو جی! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"میں نے عابدہ سے کہا تو ہے جلد سے جلد کا۔ لیکن پھر بھی پتا نہیں کون جیتتا ہے ہماری تدبیر یا تقدیر۔"

"ابو جی۔" وہ رو ہی پڑی۔

"بیٹا! میں تمہیں حقائق سے آگاہ کرنا چاہ رہا ہوں۔ جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ تم نہیں دیکھ سکتیں۔ سہیل میرا بیٹا اور تمہارا بھائی سہی لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں وہ اجنبیت دیکھی ہے' جس نے مجھے یہ سب سوچنے پر مجبور کر دیا ہے' پتا ہے بیٹا! جب نیتوں میں فرق آتا ہے تو آنکھ خود بخود اجنبی بن جاتی ہے' ایسی آنکھ سے پہچان اٹھ جاتی ہے اپنے کی' دوست کی اور پرائے کی ایسی آنکھ بے دید بے لحاظ اور بے مروت ہو جاتی ہے اور ایسے میں کچھ بھی بعید نہیں' تم اپنا حوصلہ مضبوط کرو اور خود پر اعتماد کرنا سیکھو' ہر اس بات پر عمل کرنا جو تمہارا دل کہے کہ صحیح ہے۔" وہ ذرا رکے۔

"نزہت! یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ حق و باطل کی پہچان کا پیمانہ ہمارے اندر ہی ہوتا ہے' وقت پڑنے پر اسی کو استعمال کرنا۔ وہ تمہاری صحیح رہنمائی کرے گا۔ وہ عورت جو اس کی بیوی ہے' اس کی صحبت سے پرہیز کرنا ہر طور اور سہیل' میں اس کے بارے میں کیا کہوں جب اپنا خون بے وفائی پر اتر آئے' بہر حال میری دعائیں تمام زندگی تمہاری راہوں میں روشنی کرتی رہیں گی۔ اس کا مجھے یقین ہے اور تم بھی یہ یقین رکھنا اور کبھی کسی غلط رستے پر قدم نہ رکھنا۔ یہ چند باتیں تمہیں جو تم سے کرنا تھیں۔" لاؤنج میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"بیٹا! فون سنو جا کر۔" انہوں نے تھک کر پشت کرسی کی بیک سے ٹکا دی۔

وہ گم صم اٹھ کر فون سننے چل دی۔

"ہیلو السلام و علیکم۔" اسے آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔

"و علیکم السلام۔" وہ بے خیالی سے بولی۔

"میرا خیال ہے پہچانا نہیں۔" دوسری طرف آواز فریش تھی۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں پہچان گئی

"ہیلو ہیلو بھئی کدھر گم ہو تم۔" دوسری طرف بے تابی زیادہ تھی۔

"سن رہی ہوں۔ چیخ کیوں رہے ہیں۔" وہ تنگ کر بولی۔

"بدتمیز! ایسے بولتے ہیں۔ ویسے کیا سن رہی ہو۔" انداز چھیڑنے والا تھا۔

"جو آپ فرما رہے ہیں۔" وہ اب پوری طرح متوجہ تھی۔

"میں نے تو ابھی کچھ فرمایا نہیں' جس روز فرماؤں گا' محترمہ کے حواس ٹھکانے آ جائیں گے۔"

"آپ کی کسر باقی ہے' میرے تو پہلے ہی حواس ٹھکانے آ چکے ہیں۔" اسے ابو جی کی باتیں یاد آئیں۔

"خیریت۔" تعجب سے پوچھا گیا۔

"خیریت ہی ہے۔" اس کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ "اس وقت فون کرنے کی کیسے زحمت کی؟" اس کی نظر گیارہ بجاتے کلاک پر پڑی۔

"اچھا وقت ہمیشہ دیر سے آتا ہے نا۔" شہباز خان کے لہجے میں شرارت تھی۔

"اور برے وقت کے بارے میں کیا خیال ہے' وہ بہت آہستگی سے گزرتا ہے۔" اس نے طنز کیا۔
"نزہت! تم کبھی اچھی بات نہیں کر سکتیں۔ مجھے تو کبھی کبھی شک ہونے لگتا ہے۔"
"کیا؟" اس کے کان کھڑے ہو گئے۔
"یعنی کہ اس رشتے میں تمہاری رضا شامل نہیں۔"
"اگر ایسا ہو تو پھر۔" وہ اکھڑ لہجے میں بولی۔
"تو بھی کچھ نہیں۔ ہم فوجی جوان زبان کے پکے ہوتے ہیں' وعدے کے مضبوط۔ آزمائش شرط ہے۔ مقابل کی مرضی کی پروا نہیں کرتے۔" پوری ڈھٹائی سے کہا گیا۔
"Time will qulify every thing۔ (وقت سب کچھ ثابت کر دے گا) وہ جواباً" بولی۔
"شیور شیور۔"
"پھوپھو ٹھیک ہیں؟" اس نے موضوع بدلا۔
"معلوم نہیں ادھر سے بند کر کے ادھر کروں گا' مگر اب تو وہ سو چکی ہوں گی۔ صبح کروں گا۔"
"تو اتنی رات گئے فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ کو شک تھا کہ صبح نہیں ہو گی۔"
"صبح کا یقین تو اپنے وجود سے بڑھ کر ہے مگر اس وقت دل نے اکسایا تھا کہ تم انتظار کر رہی ہو گی۔"
"اچھا تو آپ بھی دل کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں۔"
"تمہیں نہیں معلوم۔" بڑا جتانے والا اصرار تھا' وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔
"ماموں جان کیسے ہیں؟"
"ٹھیک ہیں بس۔" وہ افسردگی سے بولی۔
"کیا مطلب۔"
"پتا نہیں کیوں اتنی مایوس کن باتیں کرنے لگے ہیں' میرا دل بہت پریشان ہے۔" وہ کوشش کے باوجود بے اختیار سی ہو کر کہہ گئی۔

"تم تو بس اور ہو نزہت! ماموں جان بیماری کی وجہ سے ڈپریس ہیں اور کوئی بات نہیں۔ تم ان کو حوصلہ دیا کرو۔"
"وہ میری کہاں سنتے ہیں۔ ابھی بھی ایسی ایسی باتیں کر رہے تھے کہ بس۔" اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔
"اچھا تم زیادہ ٹینس نہ ہو' سب ٹھیک ہو جائے گا' میں اسی ہفتے شاید چکر لگاؤں۔ اصل میں سہیل بھائی کی وجہ سے وہ بہت Lonely (اکیلے) محسوس کرتے ہیں' تم ان کو ٹائم زیادہ دیا کرو' انہیں اچھی اچھی کتابوں کا شوق ہے' وہ ان سے ڈسکس کیا کرو' اسی بہانے تمہیں بھی کچھ پڑھنا آجائے گا۔" وہ جو بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی' آخری جملہ سن کر تلملا اٹھی۔
"کیا مطلب ہے آپ کا' مجھے پڑھنا نہیں آتا یا مجھ میں اچھا پڑھنے کا ذوق نہیں ہے۔" وہ غصے سے بولی۔
"میں نے یہ کب کہا۔" وہ مصنوعی بھول پن سے بولا۔
"آپ!" وہ دانت پیس کر رہ گئی۔
"ہاں بولو نا آپ؟ میں تمہیں بہت یاد آتا ہوں' مجھے بہت مس کرتی ہو تم' ہے نا یہی کہنا چاہ رہی تھیں نا۔" شہباز خان نے جلدی جلدی کہا۔
"جی نہیں خوش فہمی ہے آپ کی۔ فون بند کریں' میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہ رہی۔" وہ غصے سے بولی۔
"لو اپنا دل چاہ رہا ہے باتیں کرنے کو اور مجھے کہہ رہی ہو کہ فون بند کروں۔ تم کر دو فون بند۔" اسے چھیڑنے میں شاید اسے مزہ آتا تھا۔
"فون میں نے نہیں آپ نے کیا تھا۔" وہ بھی ڈھٹائی سے بولی۔
"معلوم ہے نا' میں فون بند نہیں کروں گا اور تم یونہی غصے غصے میں مزے لیتی رہو گی' دل میں تو پھلجھڑیاں'

پٹاخے لڈو اور معلوم نہیں کیا کیا پھوٹ رہے ہوں گے ہے نا۔" نزہت جل کر رہ گئی۔
"ایسی کوئی بات نہیں۔ بھاڑ میں گیا فون لڈو پھلجھڑیاں اور پٹاخے۔ خدا حافظ۔" اس نے زور سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ فون بند کرنے سے پہلے اس نے شہباز خان کا بھرپور قہقہہ سنا تھا۔ جس سے اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اس کا دل جو ابھی کچھ دیر پہلے بوجھل سا تھا۔ اب یک بیک ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"آمنہ! ادھر آؤ' تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔" عبدالمبین نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر اسے آواز دی اور وہ جو اماں جی کے ساتھ بیٹھی مٹر چھیل رہی تھی' فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی۔
"عبدالمبین! کام نہ کرنے دینا اسے۔ دوپہر کے کھانے کو دیر ہو رہی ہے' ابھی تمہارے بابا صاحب آتے ہوں گے' آتے ہی وہ کھانا مانگ لیں گے۔" اماں جی نے اسے اٹھ کر بھاگتے دیکھ کر فوراً" ٹوکا۔
"بس اماں جی! ابھی آئی دو منٹ میں۔" وہ رک کر کہتے ہوئے اندر بھاگ گئی۔
"کیا ہے؟" عبدالمبین چارپائی پر اپنا تھیلا نما بستہ لیے بیٹھا تھا۔ آمنہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔
"جویریہ اور زینب کہاں ہیں۔" اس نے بستے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے پوچھا۔
"جویریہ تو ساتھ والوں کے ہاں کھیلنے گئی ہے۔ زینب اوپر دھوپ میں کپڑے پھیلانے گئی ہے اور آکر اسے نہانا ہے۔ اس لیے تم ان دونوں کے آنے کی فکر نہ کرو۔ البتہ بابا صاحب آنے والے ہیں۔"
"ابھی نہیں آتے وہ۔ مدرسے میں کوئی ملا صاحب آئے ہوئے ہیں' ان کے ساتھ مناظرے میں مگن ہیں' دیر سے آئیں گے۔ ان کی تم فکر نہ کرو۔" وہ بے فکری سے بولا اور بستے میں سے ڈرائنگ کی موٹی کاپی نکالی' جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی' اسے ڈرائنگ کا بے حد شوق تھا' وہ یہ کاپی مدرسے بھی لے جایا کرتا تھا اور چھپ چھپ کر اپنا شوق پورا کیا کرتا تھا۔
اس نے یہ کاپی عبدالمتین سے منگوائی تھی' جب وہ اسکول جایا کرتا تھا' بعد میں بابا صاحب نے اسے اسکول سے اٹھوا کر مدرسے میں ڈال دیا۔ باقی کتابوں کو تو اس نے واقعی خدا حافظ کہہ دیا مگر اس کاپی کو ابھی تک سینے سے لگایا ہوا تھا۔ اس کاپی میں اس نے بڑے بڑے شاہکار تخلیق کر رکھے تھے۔ جو اگر کسی اسکول ایگزیبیشن میں رکھے جاتے تو یقیناً" کوئی نہ کوئی انعام جیت کر لاتے' مگر افسوس اس خداداد صلاحیت کی اکلوتی قدردان اور فین آمنہ تھی' وہ اسی سے اپنی خوشی شیئر کیا کرتا تھا۔
"کچھ نیا بنایا ہے کیا۔" وہ اس کی کاپی نکال کر دیکھتے ہوئے بولی۔
"ہاں!" وہ جوش سے بولا۔ "زبردست کہو زبردست۔" اس نے کاپی نکال کر اپنے زانو پر رکھی۔
"آج صبح مدرسے سے چھٹی ہوئی' نماز کے بعد درس تھا۔ سبق تو آج ہونا نہیں تھا' میں نے تھیلا اٹھایا اور ادھر چل پڑا اور آج پتا نہیں کیا بات تھی' وہ میدا کوچوان گاؤں کے باہر موجود نہیں تھا' میں نے بھی اس کا انتظار نہیں کیا اور پیدل ہی چل پڑا' سورج ابھی نکلا نہیں تھا' مدھم مدھم سا اندھیرا اور دھیمی دھیمی سی روشنی آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے' دونوں کے درمیان الوداعی ڈائیلاگ چل رہے تھے۔ میں ان سرگوشیوں کو مزے سے سنتے ہوئے چل رہا تھا کہ راستے میں جھیل آگئی وہی جہاں لوگ مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا آج صبح کتنی سردی تھی۔ ہر چیز جم رہی تھی۔ سردی تو مجھے بھی لگ رہی تھی مگر گرم کپڑوں اور تیز چلنے کی وجہ سے اس کا احساس ذرا کم تھا۔ جھیل کے پاس پہنچ کر سردی میں یکایک اضافہ ہو گیا۔ میرے دانت بجنے لگے۔ وہاں پیر مست سائیں کی جھونپڑی ہے' جھونپڑی میں آگ جل رہی تھی اور خالی لنگی پہنے وہ مست سائیں جھیل کنارے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ میں اس کی جھونپڑی میں جا کر آگ تاپنے لگا۔ چند قدموں پر تو جھیل تھی اور پتا ہے اس وقت جھیل میں پانی رواں دواں نہیں تھا۔ پانی کا ہلکا سا شور تو تھا' مگر پانی بالکل ساکن تھا۔ پوچھو کیوں؟" اس نے آمنہ کے اشتیاق کو بھڑکانا چاہا۔

"کیوں؟؟" وہ بھی مشتاق تھی پوری توجہ سے بولی۔

"کیونکہ پانی کی اوپری سطح پر ہلکی ہلکی برف جمی ہوئی تھی۔ اسی وقت سورج نکل آیا تو عجیب منظر تھا۔ سورج کی کرنیں جب جھیل پر جمی برف پر پڑیں تو ایسے لگا' جیسے ہزاروں ہیرے جگمگا اٹھے ہوں' میں حیرانی میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان ہیروں کو پکڑنا چاہا تو میری چیخ نکل گئی۔ پوچھو کیوں۔" وہ اپنی کہانی کو ڈرامائی بنا رہا تھا۔ آمنہ اس کے ڈرامے کے سحر میں پوری طرح سے گرفتار ہو چکی تھی۔

"کیوں؟؟"

"کیونکہ برف کی تیز قلم میری انگلی کو چیر گئی تھی۔ ایک دم سے خون چھوٹ گیا۔ دیکھو خون میرے دامن پر اور انگلی کا زخم بھی۔" اس نے قمیص کا دامن اور انگلی دکھائی۔

"پھر میں نے پنسل کاپی لے کر وہ منظر بنانے کی کوشش کی' صرف کوشش کیونکہ میں اس منظر کو بالکل ویسے بنانے سے قاصر تھا' جیسے قدرت نے بنایا تھا' میں کتنی دیر تک وہ منظر بناتا رہا۔ جب وہ مکمل ہوا تو ایک دم پیچھے سے آواز آئی۔

"ونڈر فل۔ بیوٹی فل' ایکسیلنٹ۔" میں اچھل پڑا۔ میرے پیچھے مدرسے والے گاؤں میں جو ہائی اسکول ہے' اس کے ڈرائنگ ماسٹر بشیر صاحب کھڑے تھے۔

"لڑکے! تم خود کو ادھر کیوں ضائع کر رہے ہو' تمہیں نہیں معلوم قدرت نے تمہارے اندر کتنی پاور ڈالی ہے اس فن کے لیے۔" وہ میری کاپی کے ورق اٹھاتے جاتے تھے اور سر دھنتے جاتے تھے۔ "یہ دیکھو" انہوں نے کمنٹس بھی لکھے ہیں۔ بہت کم تصاویر میں غلطی نکلی ہے۔ کہہ رہے تھے۔ تم شہر میں کسی اچھے آرٹ اسکول میں جاؤ۔ اگر یہ نہیں کر سکتے ہو تو یہیں سے میٹرک کر کے لاہور میں بڑا کالج ہے فائن آرٹس کا' ادھر داخلہ لے لو۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم ایک دن اس فن میں بڑا نام کماؤ گے' میری بات لکھ لو۔ یہ دیکھو وہ تصویر جو کل" اس نے آخری ورق الٹا ہی تھا کہ کسی نے اس کے ہاتھ سے کاپی جھپٹ لی۔

"ہاں' نام تم کیوں نہیں کماؤ گے۔ تم گھر سے نکلے ہی اس شیطانی وصف میں نام کمانے ہو۔ بد بخت' بد نصیب' ملعون' خبیث! میں تجھے کس رستے پر ڈالنا چاہ رہا ہوں اور تو کس راستے کی طرف رسیاں تڑا تڑا کر جا رہا ہے۔" طیش بھری صوفی صاحب کی آواز نے گویا ان کے سروں پر بم برسا دیے۔ آمنہ تو اچھل کر دو فٹ دور جا کھڑی ہوئی۔ عبدالمبین بیٹھے بیٹھے تھر تھر کانپنے لگا' انہوں نے بن دیکھے ہی اس کی کاپی کے پرزے پرزے کر دیے۔ وہ ورق پھاڑتے جاتے تھے اور مغلظات کا طوفان ان کی باوضو زبان سے اڈ تا جا رہا تھا۔

عبدالمبین کی عجب کیفیت تھی' چند لمحے پہلے جو وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کاپی کے پرزے ہوتے دیکھ کر جیسے وہ ساکت ہو گیا تھا کسی پتھر کی طرح' پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے تین سال سے اکٹھے کیے خزانے کو ریزہ ریزہ ہوا میں بکھرتے دیکھ رہا تھا اور آمنہ کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا' اسے معلوم تھا' ابھی کچھ دیر بعد جو سلوک کاپی سے کیا گیا ہے وہی عبدالمبین سے کیا جائے گا' اس کا دل پتے کی طرح لرزتے ہوئے عبدالمبین کے نہ پٹنے کی دعا کر رہا تھا۔ "کاپی کی تو خیر ہے بھائی اسے اور لا دیں گے' لیکن اللہ میاں جی! اب اسے مار نہیں پڑنی چاہیے' اب تو وہ پندرہ دن بعد آیا ہے۔ پھر بھی بابا صاحب ہر بار اسے بات بے بات بری طرح سے پیٹتے ہیں' اللہ میاں جی' معاف کر دینا اب کے اسے مار نہ پڑے۔" کاپی کو اس کے انجام تک پہنچانے کے بعد صوفی صاحب خوفناک تیور کے ساتھ عبدالمبین کی طرف بڑھے ہی تھے کہ آمنہ کی چیخ نکل گئی۔

"نہیں بابا صاحب! نہیں پلیز بابا صاحب نہیں۔" وہ ایک دم سے ان کے قدموں پر گر پڑی۔ صوفی صاحب نے جھک کر آمنہ کو بازو سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے اسے دروازے تک لے گئے اور خاموشی سے اسے دروازے سے باہر کر کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔

"بابا صاحب! نہیں پلیز! بابا صاحب نہیں۔" وہ پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹنے لگی۔

"آمنہ! مت روؤ ادھر آ جاؤ۔" اماں جی نے خوف سے گھٹی آواز کے ساتھ اس کو کندھے سے کھینچا۔

"اماں جی! بابا صاحب اس کو مار ڈالیں گے۔ اماں جی! مبی کو بچالیں اماں جی! میرا بھائی۔" وہ پاگلوں کی طرح روتے ہوئے چلانے لگی۔

"آمنہ! چپ کرو' کچھ نہیں ہوتا۔" اماں جی نے اسے مدھم آواز میں جھڑکا۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ اور پھر چند لمحوں بعد جیسے کمرے میں چیخوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

"بابا صاحب! نہیں۔ اب نہیں کروں گا' اب نہیں بابا صاحب۔" وہ چیخے جا رہا تھا۔ صوفی صاحب اسے ہنٹر سے پیٹ رہے تھے۔ ان کے پاس مدرسے والا ہنٹر کہاں سے آیا' یہ سوال سوچنے کے لیے اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ بس دروازہ پیٹے گئی۔

"بابا صاحب اللہ کے واسطے دروازہ کھولیں! بابا صاحب اللہ کے واسطے۔" وہ چیخ رہی تھی اماں جی کے روکنے کے باوجود۔ اندر وہ شاید اس کی کھال ادھیڑ کر ہی دم لینا چاہتے تھے' اس کی چیخ و پکار کا ان پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بے آواز اسے پیٹے جا رہے تھے' اندر سے بس عبدالمبین کی چیخوں اور ہنٹر کی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"بابا صاحب! خدا کے واسطے' اب معاف کر دیں' اب نہیں کروں گا' پھر نہیں کروں گا۔" اس کی دل خراش التجائیں اماں جی' آمنہ اور سیڑھیوں میں ساکت کھڑی زینب کے دل ہلا رہی تھیں۔

"بابا صاحب! حجرے میں بڑے شاہ جی آئے ہیں۔ آپ کو فوراً "بلا رہے ہیں۔" ایک دم سے زینب بھاگتی ہوئی آئی اور دروازے کے باہر بلند آواز سے بولی۔ اندر سے ہنٹر کی آواز رک گئی اور چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ صوفی صاحب کا غیظ و غضب سے [illegible] چہرہ باہر نکلا اور عقاب جیسی بڑی بڑی سرخ آنکھیں زینب پر گاڑ کر [illegible]

"کیا بات ہے؟" [illegible] وہ مری طرف [illegible] گئی۔

"بابر شاہ صاحب [illegible]" وہ جھوٹ [illegible]

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ ان ہی غضب ناک تیور کے ساتھ بولے۔

"وہ وہ جمیل بتا کر گیا ہے۔" اس نے مسجد کے مجاور کا نام لیا۔

"اچھا اسے کمرے سے نکلنے نہ دینا۔" کہتے ہوئے انہوں نے عمامہ درست کیا اور باہر کی طرف بڑھ گئے۔ اندر عبدالمبین مجروح حالت میں زمین پر پڑا تھا۔

"عبدالمبین! بھاگ جاؤ ابھی۔ کہیں بھی۔" زینب نے اسے زور سے اٹھانا چاہا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آج ان کے ہاتھوں سے مر جاؤں گا۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ ہذیانی انداز میں چلایا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ لڑکی تھی یا حسن کی دہکتی دو آتشہ آگ۔ انہیں لگا گندم کے کھیتوں میں دور دور تک آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور ہر چیز اس آگ میں بھڑ بھڑ جلنے لگی تھی' خود ان کا چہرہ یک لخت تانبے کی طرح تپنے لگا اور کانوں سے جیسے دھواں نکلنے لگا۔

سولہ سترہ سال کی اس تباہی کا رنگ سرخ تھا کہ سفید' انہیں پتا نہیں چل سکا کہ سرخی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور سفیدی کہاں ختم ہوتی ہے۔ بے داغ شفاف چکنی جلد جس کو بے اختیار چھونے کے لیے ان کی انگلیاں بے چین ہو اٹھیں۔ کالی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں جن میں پھیلا کاجل' ان کو قاتلانہ ادا بخش رہا تھا۔ کشادہ پیشانی کے اردگرد پریشان سنہری زلفیں جن کو سنوارنے کے لیے ان کے ہاتھ مضطرب ہو اٹھے۔ کمان سا تنا اس کا نازک سراپا اور سواتی لباس کے اندر اس کی پتلی لچکیلی کمر' سلطان بخت کے ایمان کو ڈانوا ڈول کرنے لگی۔ تباہی اس کے حسن میں تھی کہ اس کی کم عمری میں۔ سلطان بخت فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ بالی عمر بھی تو ایک آگ ہے اگر بھڑک اٹھے تو سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ اگر دھیمی آنچ سے جلتی رہے تو حسن کو پختگی عطا کرتی ہے۔

سولہ سترہ سال کی عمر ہی ایسی تھی، روڑی پر بھی ایک بار تو حسن آتا ہی ہے، مگر وہ روڑی تو نہیں تھی، وہ تو تباہی تھی، آگ تھی جو سب کچھ تباہ کرنے آئی، سب کچھ جلا دینے۔ سلطان بخت اسے پلک جھپکے بغیر تکے جا رہے تھے کہ اس کے سوا ان کا اپنے اوپر سب اختیار جاتا رہا تھا۔

"اندھا ہے کیا؟ جنگلی جانور کی طرح موٹر سڑک پر لے کر نکل آیا ہے۔ انسانوں کو کیا کیڑے مکوڑے سمجھ رکھا ہے تو نے، جو اس اونچی موٹر میں بیٹھ کر تجھے دکھتے نہیں۔" وہ خود جتنی حسین تھی۔ اس کی آواز اس سے بھی سریلی تھی، پہاڑی چشموں کی طرح چھم چھم کرتی سلطان بخت کی سماعتوں میں گھنٹیاں بجاتی دل میں اتر گئی یا شاید انہیں ہی اس کے طعنوں تشنوں میں اس قدر شیرینی محسوس ہوئی تھی۔

"گونگا بھی لگتا ہے نواب کا بچہ۔ آئندہ سے بندے کے پتر کی طرح گاڑی لے کر نکلنا ورنہ یہ پتھر اٹھا کر تیرا اور تیری موٹر کا وہ حشر کروں گی کہ کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ سنا تو نے۔" وہ سلطان بخت کی نظروں سے ٹپکتی امرت رس سے بے خبر وانجان پتھر برسائے گئی۔

"اری چل چھو مرا! چھوڑ اس نامراد کو، چلیں، ہمیں دیر ہو رہی ہے دفع کر اس منحوس کو۔ مارنے چلا ہے کسی کو جان سے یا مرنے نکلا ہے ہمیں کیا۔ چل آ چلیں۔" پیچھے کھڑی ادھیڑ عمر عورت تیز اور کرخت آواز میں اس لڑکی سے بولی۔

جواب میں اونہہ کہہ کر اسی عورت کی طرف مڑ گئی اور دھپ دھپ زمین پر پاؤں مارتی دونوں گاڑی کے پاس سے نکل کر گاؤں جانے والی پگڈنڈی کی طرف ہولیں۔

دونوں اس علاقے کی نہیں لگتی تھیں۔ عورت چہرے مہرے سے پھر بھی پنجاب کی لگتی تھی۔ مگر لڑکی کے نقوش خالصتاً "پٹھانی یا پہاڑی تھے"، کھڑے کھڑے تیکھے خوبصورت نقوش جو پہاڑی چشموں سے دھلے ہوئے تھے۔ دونوں نے لمبے لمبے پٹھانی فراک پہن رکھے تھے، پیروں میں سخت چمڑے کے گھسے نما جوتے اور پٹھانی عورتوں جیسے چاندی کے ڈھیر سارے زیورات پہنے ہوئے تھیں۔

لڑکی اب بھی چمکیلے اور اکسا دینے والے انداز میں لاپروائی سے چل رہی تھی جبکہ عورت کی رفتار میں پختگی اور تیزی تھی۔ وہ چلتے چلتے مڑ کر لڑکی کو آہستہ چلنے پر ڈانٹ بھی رہی تھی۔ سلطان بخت دور تک انہیں جاتے دیکھتے رہے۔

"اب کہاں جاؤں۔ کوئی رستہ نہیں رہا جیسے دور دور تک کٹھنائیاں ہی کٹھنائیاں ہوں۔" انہوں نے تھک کر گاڑی کی سائیڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

ان کا دل کتنی سمتوں میں اڑا جا رہا تھا، اس کی خبر انہیں بھی نہیں تھی۔

● ● ● ● ●

گاڑی چھکا چھک دوڑے جا رہی تھی اور وہ سوتے جاگتے دماغ کے ساتھ کھڑکی سے باہر گھور اندھیرے میں روشنی تلاشنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باہر ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ کہیں کہیں رستے میں کوئی ٹمٹماتی سی روشنی ایک لمحے کو دکھائی پڑتی اور پلک جھپکنے میں اندھیرے کے بھوکے پیٹ میں جا سماتی۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ جس کی وجہ سے اندھیرا کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ باہر اگر دیکھنے کو کچھ نہیں تھا تو اندر کے منظر میں بھی اسے ذرہ برابر کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

ظفر تو اس کے سامنے والی سیٹ پر بے سدھ منہ کھولے ہر طرف سے بے خبر زوردار خراٹے لیے جا رہا تھا۔ خراٹوں کی وجہ سے اس کا منہ اور پیٹ بار بار پھول اور پچک رہے تھے۔ جیسے کوئی سائیکل کے ٹائر میں ہوا بھر رہا ہو، خراٹے بھی سات سروں میں تھے۔ کبھی مدھم، کبھی تیز اور کبھی کسی چنگھاڑ کی طرح اور معاذ بے بسی سے کسی سانڈ کی طرح ادھ موئے اس کے وجود کو تکے جا رہا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو سیٹ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ جو

ٹرین کے جھٹکوں پر دھیرے دھیرے ایسے حرکت کرنے لگتے، جیسے وہ اس کے وجود کا حصہ ہی نہ ہوں۔ عذیر پر وہ محاورہ بالکل فٹ آ رہا تھا، سویا مویا ایک برابر۔

ٹرین کے اندر جلتی لائٹ بھی کسی قبر پر جلتے دیئے سے مشابہ تھی۔ پیلی زرد مدقوق سی۔ ڈبے کی کھڑکیوں کے اکثر شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، جن سے ہوا اندر داخل ہو رہی تھی، مگر جتنے بھی لوگ تھے سب بے خبر سو رہے تھے۔ ویسے بھی رات کے تین بج رہے تھے دوپہر کی ٹرین لیٹ تھی۔ وہ رات گیارہ بجے پہنچی اور سوا بارہ بجے چلی تھی۔ اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں اکڑوں بیٹھے بیٹھے ان کی کمریں جواب دے گئی تھیں۔ اس لیے ظفر مرے ہوئے بیل کی طرح سو رہا تھا جب کہ معاذ کو تھکن میں اور نیند نہیں آئی تھی۔ وہ الوؤں کی طرح جاگ رہا تھا۔

"پتا نہیں ابھی کتنا سفر باقی ہے۔" اس نے اکتا کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

صبح کے پانچ بجے ٹرین کسی اسٹیشن پر جا رکی۔ دو چار مسافروں نے سامان اٹھایا اور نیچے اتر گئے۔ ظفر ابھی تک سو رہا تھا بے سدھ و بے خبر۔ معاذ نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

"ظفر! دیکھو یہ تو وہ اسٹیشن نہیں، جہاں ہم نے اترنا ہے۔" اس کے دو دفعہ اونچا اونچا بولنے اور ہلانے سے اس نے بمشکل تمام آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر صبح کاذب کی مدھم روشنی پھیل رہی تھی۔ تیز اور زوردار ہوا نسیم سحر کے لطیف جھونکوں میں بدل چکی تھی۔ پلیٹ فارم کے ایک طرف چائے پانی کا کھوکھا تھا۔ جہاں چالیس واٹ کا پیلا مدقوق بلب جل رہا تھا۔ اس کی بیمار روشنی کے برعکس اس کا مالک بے حد چست اور پھرتیلا تھا ادھر ادھر چائے کی پتیلی بھر بھر کر کپ بنا رہا تھا۔ نیچے اترنے والے اکثر مسافر جا کر اس کے کھوکھے کے آگے بچھی دو چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ آگے اسٹیشن ماسٹر کا دفتر تھا۔

ظفر نے دونوں بازو اٹھا کر بھرپور انگڑائی لی۔

"چل یار اٹھا سامان۔" اس نے جمائی روکتے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑا۔

"آ گیا تمہارا گاؤں۔؟" معاذ خواہ مخواہ ڈھیلا پڑ گیا جیسے اسے امید نہیں کہ ظفر کا گاؤں کبھی آئے گا بھی۔

"ہاں مگر ابھی آگے تانگے کا گھنٹے بھر کا سفر ہے۔ سب سے زیادہ تھکا دینے والا، چلو سامان اٹھاؤ۔ گاڑی چلنے والی ہے۔ ادھر زیادہ دیر نہیں رکتی۔" اس نے جھک کر اپنا چھوٹا سا ٹرنک اٹھایا اور قلیوں کی طرح سر پر اٹھا کر جوتے پاؤں میں اٹکاتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔ معاذ نے بھی اس کی تقلید میں اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور اس کے پیچھے چل پڑا، جوتے تو وہ گھنٹہ پہلے ہی پہنے بیٹھا تھا۔

ظفر کی بات صحیح تھی تانگے کا سفر سب سے زیادہ تھکا دینے والا اور اکتا دینے والا تھا،

آخر خدا خدا کر کے اس ڈھینچوں ڈھینچوں کا سفر تمام ہوا، دونوں اپنا اپنا سامان اٹھا کر پھر چل پڑے۔ ان کے آگے گندم کا وسیع کھیت تھا، گندم پکنے میں ابھی دن تھے۔ ہرے ہرے پودے لہلہا رہے تھے۔ اور ٹھنڈی مگر لطیف ہوا ان کے کانوں میں جانے کون سی سرگوشیاں کیے جا رہی تھی کہ وہ سر دھن رہے تھے۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ فضا میں خوشبودار خاموشی سرسرا رہی تھی۔ جس کی زبان وہی سمجھ سکتا تھا جو اس لمحے میں جی رہا ہو۔ کہیں کہیں کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اطراف میں ایک ہی ٹریکٹر دیکھا، ایک کسان بیلوں کی صحت مند جوڑی کے ساتھ ہل چلا رہا تھا۔ ظفر اس سارے حسین منظر سے بے خبر دہقانوں کے سے انداز میں پودوں کو زور زور سے پاؤں مارتا چلا جا رہا تھا۔

"جلدی چلو تم تو دلکی چال چل رہے ہو۔ کھیت کا مالک آ گیا تو بس دیہاڑی لگانی پڑ جائے گی، ہم اس کے سونے کو روندے جا رہے ہیں۔" ظفر نے مڑ کر اس کی سست چال پر تنقید کی۔

"ہم کھیت سے ہٹ کر بھی تو جا سکتے تھے۔" معاذ نے جواب دیا۔

"ادھر سے پھر گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ یہ شارٹ کٹ تھے۔ بس اب جلدی چلو۔" وہ زور زور سے قدم اٹھاتے ہوئے بولا تو معاذ نے بھی رفتار بڑھا دی۔

کھیت کا سفر ختم ہوا کچی گلیوں کا شروع ہو گیا جن کے کناروں پر چوڑی چوڑی نالیاں تھیں کچھ نالیاں صاف تھیں کچھ گندگی اور غلاظت سے اٹی ہوئی تھیں۔ کہ جنہیں ایک نظر دیکھتے ہی معاذ کو ابکائی آنے لگا۔

ٹین کے سبز رنگ کے دروازے کو ظفر نے زور سے لات ماری' دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا شور مچاتا ہوا اندر جا کھلا۔

"اوئے کون ہے الو دا پٹھہ۔" اندر سے کرخت آواز آئی۔

"ابا! میں تیرا ظفری۔" اس نے بلا جھجک اندر داخل ہوتے ہوئے بان کی مضبوط اور کھری چارپائی پر بیٹھے کالے سیاہ جشیوں کے سے ناک نقشے والے ابے سے کہا۔ جو گڑ گڑ حقہ پی رہا تھا۔ وہ ظفری کی آواز سنتے ہی کھل اٹھا اور حقے کی نے کو پرے دھکیلتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ظفری کی طرف بانہیں پھیلا دیں۔

"او میرا ظفری آیا۔ اطلاع تو کرنی تھی پتر۔" ظفر اپنے باپ کے طویل و عریض جثے میں سما گیا۔

"ابا! سرپریز (سرپرائز) دینا تھا۔" اس نے دانت نکوسے۔

"اوئے کیا دینا تھا۔" وہ اس کے سر پہ چپت لگا کر بولا۔

"ابا خوشی کی خبر کو سرپریز کہتے ہیں۔" اس نے باپ کو سمجھایا۔

"ہاں پڑھ لکھ جو آیا ہے۔ بڈھے طوطوں کو بھی پڑھا بلکہ رٹوا۔" کچے صحن کے دوسری طرف بنے طویل و وسیع ورانڈے سے دھوتی کرتا پہنے ابے سے بھی کالی بھجنگ موٹی اور چھوٹی سی عورت مردوں جیسی بھاری کرخت آواز میں بولتی ہوئی باہر آئی۔ معاذ اسے دیکھ کر ایک پل کو ڈر سا گیا۔

"ابا بعض لوگوں کے لیے سرپرائز غم اور دکھ کی خبر کو بھی کہتے ہیں کیوں معاذ؟" وہ ابے کے شانے پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے معاذ کی طرف مڑا۔

"ابا! یہ اپن کا جگری یار ہے۔ معاذ بڑا لیق (لائق) بڑا محنتی ہے۔ اول آیا ہے اس بار دسویں جماعتوں کے امتحان میں۔" اس نے معاذ کا ہاتھ کھینچ کر اس کا تعارف کرایا۔

"جیندا رہ" ابے نے معاذ کے سر پر زور سے ہاتھ پھیرا۔

"اماں ناراض لگتی ہے۔" ظفر چھیڑنے کو بولا۔ وہ دوسری چارپائی پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

"میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا اپا اماں نے۔" وہ جھوٹ موٹ خفا ہوتے ہوئے بولا۔

"نہ تجھے سلام کرنے کی توفیق کیسے ہوتی۔" وہ ہاتھ نچا کر لڑاکے انداز میں بولی۔ "جھوٹ تو تیری رگ رگ میں ہے۔"

"ابا! دیکھا تو نے یہی کچھ ہوتا تھا اب میرے ساتھ ' پرا سے بتا دوں اب میں یہ سب نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"اے بھلی لوک چپ کر جا۔ پتر گھر آیا ہے اس کا یار بھی' کوئی لسی ٹکر کا انتظام کر۔"

"ہاں ملک فتح کر کے آیا ہے نا جو اس کے لیے دیگیں چڑھاؤں۔" وہ اپنی چھپنی سی ناک سکوڑ کر ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے اسی مرچیلے لہجے میں بولی۔

"جا دفع ہو کھانے کا انتظام کر۔ میرا بچہ رات بھر سفر کر کے آیا ہے۔ آتے ہی تو نے کل کل شروع کر دی ہے۔" ابا غصے میں آکر گرجا تو دیوار پر بیٹھا کالا کوا ڈر کر اڑ گیا۔

"اب یہی کچھ سننا تھا میں نے۔ نوکرانی ہوں نا اس گھر کی اب اور جوتیاں کھاؤں گی اور مجھے صلہ کیا ملنا ہے۔" ادھر کون سا ڈر تھا۔

"بک بک کیے جا۔ زبان تیری سولی پہ بھی نہ رکے۔ وہاں بھی چلتی جائے گی۔ جا دفع ہو جا جلدی سے روٹی ٹکر لے کر چلو پترو! تم دونوں منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ کھانا تیار ہے۔" وہ مڑ کر ان دونوں سے بولا تو ظفر اس کا ہاتھ تھام کر ورانڈے کی طرف آگیا۔

"سامنے والے کمرے سے گزرے گا تو اس کے آگے غسل خانہ ہے۔ اسی سال ابا نے فلش بھی ڈلوائی ہے۔ بڑا اچھا غسل خانہ بنوایا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے معاذ کو برآمدے سے اندر کیا۔

وہ جیسے ہی بڑے کمرے سے گزر کر آگے بڑھا' چھوٹی سی اندھیری ڈیوڑھی میں اچانک سامنے سے کوئی چڑیل اندر داخل ہوئی۔ ہاں وہ چڑیل ہی تھی کالے سیاہ بلکہ سیاہ کالے ہاتھ پاؤں منہ بال سب کالے بھجنگ' صرف لمبے لمبے دانت دودھیا سفید تھے۔ معاذ کی چیخ نکل گئی ظفر دوڑا آیا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" وہ پریشانی سے ڈرے سہمے معاذ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ بس شعلہ بار نگاہوں سے گھورتی اس چڑیل کو دیکھے گیا۔

"ارے تو ڈر گیا' یہ کالو ہے۔ اماں کی دھی۔ تجھے بتایا نہیں تھا۔" اس نے معاذ کے کان میں سرگوشی کی۔ "چڑیل ہے پوری' ہے نا۔" وہ گم صم کھڑا اس کی ہاں میں ہاں بھی نہ ملا سکا۔

"کیا بکواس کی تو نے؟" وہ ہاتھ نچا کر چیختے ہوئے بولی۔

"میں کہہ رہا ہوں جنت سے حور آئی ہے۔ دودھ کی نہر سے صبح کا غسل کر کے۔" وہ اس کے بالوں سے ٹپکتے قطروں کی طرف اشارہ کر کے بولا تو وہ اور چیخنے لگی۔

"دیکھ اماں! ادھر آ یہ ظفری کالے منہ والا مجھ سے بکواس کر رہا تھا' اماں مجھے چڑیل کہتا ہے۔ اماں ادھر آ۔" وہ چیخنے لگی تو ظفر نے معاذ کا ہاتھ کھینچ کر تیز قدموں سے غسل خانے کی طرف اسے دھکیلا اس نے جلدی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر وہ مستقل کسی چیل کی طرح چیخ رہی تھی۔

"یا خدا! میں یہ کدھر آگیا ہوں۔" اس نے سر پکڑ لیا۔ "ان کالے جشیوں میں ظفر اور میں تو انگریز لگ رہے ہیں۔"

♥ ♡ ♡ ♥

"آپ ایک ہفتے کا کہہ کر گئے تھے اور پورے دس دن لگا کر آئے ہیں پتا ہے آپ کے بغیر میں خود کو کس قدر ادھورا محسوس کرتی ہوں۔" وہ شکوہ کرتے ہوئے فخر حیات کے شانے پر سر رکھتے ہوئے دوپٹے کو شانے پر پھیلایا۔

"اور میرا حال نہیں پوچھو گی۔ کچھ بھی تو کوئی بھی چیز مجھے مکمل نہیں کرتی' نہ کوئی یاد نہ کوئی شخص۔ بس ہر لمحے تمہاری دوری اور اپنے نامکمل ہونے کا احساس ستاتا رہتا ہے۔ اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کام کی وجہ سے اتنے دن لگ گئے ورنہ میں تو تیسرے دن آجاتا۔ تم بن تو ایک لمحہ گزارنا دشوار ہوتا ہے جان۔" فخر حیات نے ٹیبل پر دھرا اس کا نازک گورا سفید ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا۔

"جی سب ڈرامہ ہے ایسا ہوتا تو جلدی نہ آجاتے۔" وہ بڑی ادا سے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کام کے دوران آپ کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ مجھے معلوم ہے نہ میں نہ میرا احساس۔"

"یہ تو پھر ہوتا ہی ہے نا تم بھی تو ایک ہفتہ اسلام آباد اور پھر مری گزار آئی تھیں نا' جب سیمنار کے لیے گئی تھیں کام کے دوران مجھے بھول تو ہو گی۔" ان کا انداز بھی جتانے والا تھا۔

"اف ہاتھ تو چھوڑیں میرا سب کہہ کر حساب تو برابر کر لیتے ہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"تو گلہ نہ شکوہ۔ آج اتنے دنوں بعد ہم نے اکٹھے کھانا کھایا ہے۔ اس وقت صرف پیار کی باتیں ہونی چاہئیں' آج تم کتنی حسین لگ رہی ہو' بالکل شادی کے اولین دنوں کی طرح رعنا آئی رسیلی مس یو۔"

فخر حیات نے اس کا دھیان ہر چیز' ہر بات ہی سے ہٹا دیا۔ مرد کے پاس سب سے مضبوط مہوبکی تو ہے جسے وہ ہر نازک اور کمزور لمحے میں استعمال کر کے فوراً بازی اپنے حق میں کر لیتا ہے۔ اور عورت سب کچھ جانتے بوجھتے بھی صدیوں سے اس مہرے کے ہاتھوں پٹتی چلی آرہی ہے۔ مگر لفظوں کی حقیقت کو کبھی نہیں جان سکی یا جان کر انجان بن جاتی ہے۔

"آئی لو فخر!" آواز اس کے دل کی گہرائیوں سے آئی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں میں جہاں جاؤں ساتھ چلا کرو' کم از کم اس ادھورے پن کے احساس سے تو نجات مل جایا

کرے گی مگر تم خوامخواہ۔" انہوں نے منہ بنا کر کہا۔
"آپ کو معلوم تو ہے سب۔" اس نے کچھ کہنا چاہا فخر نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روک دیا۔
"میں اس بورنا ٹپک سے فیڈ اپ ہو چکا ہوں اور یار! مجھے ایک بات تو بتاؤ۔" انہیں کچھ یاد آیا۔
"کیا؟؟"
"پرسوں شام بھابھی اور بھائی جان کو فون کر کے تم نے بلوایا تھا۔ سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ سارے رستے میں سوچتا آیا کہ تم لینے آؤ گی گھر میں سیفی کے ساتھ، تمہارے ساتھ مزے کی کمپنی رہے گی۔ خوب باتیں ہوں گی مگر ادھر تو......"
"پلیز فخری! اس موضوع پر بات نہ کریں، میرا پہلے ہی بہت خون جلا ہوا ہے۔ وہ خود ہی چلی آئی تھیں میری خیر خیریت دریافت کرنے، پھر انہیں بلانے سے بہتر ہے کہ بندہ کسی پہاڑ کو ہلا لے وہ اپنی جگہ سے ٹل جائے گا مگر بھابھی جان الاماں۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "اور آپ نے بھی جھٹ پٹ سارے گفٹس نکال کر ان کے حوالے کیے اور اب مجھے آج کل میں ان کی طرف جانا ہے تو خالی ہاتھ کیسے جاؤں گی وہ تو پھر میرے ہاتھوں کی طرف دیکھیں گی۔"
"اگر گفٹس اس دن نہ دیتا تو انہوں نے اگلی صبح تک جم کر بیٹھے رہنا تھا اسی لیے تو انہیں فارغ کیا تھا۔"
"کیا کر سکتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ اس مسئلے کا حل۔ میں تو تنگ آ جاتا ہوں۔ ان کے اتنے لمبے قیام اور بے تکی گفتگو سے۔" فخر نے اکتا کر کہا۔
"کہا بھی تھا اسلام آباد یا کراچی چلے جائیں۔"
"یار! تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ شہر ساتھ کے محلے ہوں، ادھر ہمارا کام نہیں سارا بزنس ادھر ہے پھر اس شہروں میں اگر یہ بھابھی جان وغیرہ آ گئیں پھر تو یہ مہینہ مہینہ جانے کا نام نہیں لیں گی یہ بھی تو دیکھو۔"
"ہاں یہ تو ہے۔"
"میں تو اس دن کو رو رہا ہوں جب......"
"بس فخر پلیز......" رعنا نے یکدم ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ اس کا گولڈن خوبصورت میک اپ سے دمکتا چہرہ ایک پل میں بجھ کر رہ گیا تھا۔
"اوکے۔ چھوڑو اس موضوع کو۔" انہوں نے دھیرے سے کہہ کر اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا "ریلیکس۔"
"چلیں اب......" انہوں نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔
"کافی نہ پی لیں۔" رعنا نے کہا۔
"چلو وہ بل لے آئے تو اسی کو کافی کا کہتے ہیں۔"
"تمہیں اپنا گفٹ پسند آیا۔" انہوں نے اس کی نازک گردن میں پڑا ڈائمنڈ کا خوبصورت نیکلس دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"آف کورس یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"
"پورا ایک دن لگا تھا مجھے اس کو پسند کرنے میں۔"
"اوہ ساڑھے گیارہ ہو گئے گھر جاتے جاتے بارہ بج جائیں گے، سیفی ویٹ کر رہا ہو گا ہمارا۔" رعنا کی نگاہ ایک دم سے فخر حیات کی گولڈن رسٹ واچ پر پڑی۔
"سو گیا ہو گا اب وہ۔" وہ کچھ ناگواری سے بولے۔ موضوع بدلنے پر انہیں غصہ آ گیا۔
"نہیں کہاں سویا ہو گا۔" وہ فکرمندی سے بولیں۔ "فخری! سیفی بہت کیئرلیس ہو گیا ہے۔ اس کے ایگزام ذرا اچھے نہیں ہوئے، رزلٹ بس سو سو آئے گا حالانکہ ٹیوٹر کے ساتھ میں خود بھی اسے کافی ٹائم دیتی رہی ہوں۔ مگر پھر بھی......" اس کا ذہن فخر حیات سے ہٹ کر سیفی پر مرکوز ہو گیا تھا۔

"خیر ہے پاس تو ہو ہی جائے گا۔" وہ لاپروائی سے بولے۔
"صرف پاس ہونا کافی نہیں میں تو اسے آؤٹ اسٹینڈنگ پوزیشن پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ آخر وہی تو ہمارا آنے والا کل ہے فخری آپ بس اس کو ٹائم دیا کریں۔"
"ہر وقت تمہارے دماغ پر سیفی سوار رہتا ہے۔ کیا میں بھی اس کے ساتھ چپک جاؤں اور بزنس میرا باپ دیکھے گا۔ تمہارے دماغ کو تو مالیخولیا ہو گیا ہے، سیفی کا۔ تمہارے پاس اب بات کرنے کو کوئی موضوع نہیں سوائے سیفی کے تو چلو گھر۔" وہ ایک دم آگ بگولہ ہو کر اٹھے۔ والٹ نکالا، نوٹ ٹیبل پر پٹخے اور دھم دھم کرتا باہر نکل گئے، رعنا ہکا بکا انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ کتنی دیر سے گراؤنڈ میں بیٹھی زور زور سے گھاس نوچ رہی تھی۔ چند لمحے اس کے ہاتھ رکے وہ بے خیالی سے سامنے سر اٹھا کر آتی جاتی لڑکیوں کے گروپس دیکھتی، ان کی بے فکری ہنسی کی آواز اسے عجیب تنہائی کا احساس دلاتی وہ اس ہنسی کی گونج میں کھو سی جاتی۔ تھوڑی دیر بعد پھر سے اپنے مشغلے میں مگن ہو جاتی۔
آج کتنے دنوں بعد وہ یونہی اٹھ کر کالج چلی آئی تھی۔ شاہ جی اس دن کے جو گئے تو ابھی تک ان کی کچھ اطلاع خبر نہ تھی اور اس بار تو اس نے بھی غصے میں آ کر ان کا پتا لینے کی کوشش نہ کی تھی بظاہر وہ تو ان سے خوب ناراض تھی مگر دل تو اسی رات ان کو دیکھنے کے لیے تڑپنے لگا تھا، اور آج انہیں گئے پانچواں روز تھا اس کے دن رات کا سکون غارت ہو چکا تھا۔ دن میں کسی پل چین نہ آتا تھا اور رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ اس کا دماغ جیسے پھٹنے کو تھا۔ پرسوں اس نے سلیپنگ پلز بھی لی تھیں۔ ساری رات نیند نہ آئی کروٹیں بدل بدل کر اس کے پہلو دکھنے لگے۔ اور دن چڑھے جو وہ بے سدھ ہو کر سوئی زیور گل نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ایک بجے اٹھایا تو وہ خود سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔
"اگر یہ محبت ہے تو پھر یہ ایک طرفہ کیوں ہے میں ہی بے سکونی و بے قراری کی اس آگ میں کیوں جل رہی ہوں۔" اس نے زور سے گھاس کا گچھا نوچا۔
"انہوں نے تو پلٹ کر خبر نہ لی۔" اس کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئیں۔
ان پانچ دنوں میں وہ زیور گل سے چھپ چھپ کر بے تحاشا رو چکی تھی مگر رونے سے تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ شاہ جی آئے تھے نہ اس کے دل کو قرار آیا تھا۔ آج وہ کالج آ گئی گم صم کلاسز اٹینڈ کیں نہ کتاب میں کچھ پڑھا جا رہا تھا نہ ٹیچر کا لیکچر سمجھ میں آ رہا تھا۔ آخر اکتا کر وہ گراؤنڈ میں آ بیٹھی، اسے کالج میں ایڈمٹ ہوئے چھ سات ماہ ہو چلے تھے، مگر وہ بمشکل دو تین ہفتے ہی آ سکی تھی اس لیے کسی دوست کے ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا، اسکول میں بھی اس کی دوستی بے حد محدود تھی۔ جب لڑکیاں اپنے گھروں کی، بہن بھائی ماں کی محبتوں و دوستوں کے قصے سناتیں رات کے کھانے سے لے کر نئے سوٹ کے پرنٹ تک وہ سب ایک دوسرے کو بے تکان سنائے جاتیں تو نین تارا اپنے خول میں سمٹ جاتی۔ اس کے پاس ایسا سنانے کو کچھ بھی نہیں تھا وہ کیا سناتی کہ۔
"آج صبح اماں نے ریاض نہیں کیا۔"
"آج ان کے ماسٹر صاحب دیر سے آئے تو ماں کا موڈ بے حد خراب تھا۔ آج اماں نے کون سے سُر کا کاتا ریکارڈ کرایا۔"
"آج ان کے ہاں کلاسیکل اور نیم کلاسیکی موسیقی کی محفل تھی جس میں پکے راگ کے نمونے پیش کیے گئے کلاسیکل رقص بھی سحر انگیز، کسی نے بڑے تال سے رقص کیا وغیرہ وغیرہ۔"
ایسی باتیں سن کر لڑکیاں اسے اتنی عجیب نظروں سے دیکھتیں کہ اسے اپنے آپ پر شرم آنے لگتی، ایک آدھ دفعہ کے بعد اس نے مکس اپ ہونے کی کوشش ہی ترک کر دی۔ وہ اپنے آپ میں سمٹی رہتی۔ یہی حال کالج میں تھا یہاں بھی اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور پڑھنے میں تو اس کا بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ بس زیور گل نے ڈگری کا لیبل لگوانے کے لیے اسے ادھر بھیج دیا تھا اور اب وہ بھی پچھتا رہی تھی کہ انگریزی کے چار حرف ہی سیکھنے تھے تو

کوئی شارٹ کورس کرلیتی۔

مگر آج کل تو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا نہ زیور گل کا کوئی مشورہ نہ کوئی منظر؟ اس نے اکتا کر پاس پڑے بیگ سے موبائل نکالا اور گھر گاڑی کے لیے فون کیا۔

"بی بی جی! وہ تو بیگم صاحبہ لے گئی ہیں ٹی وی اسٹیشن ان کی ریکارڈنگ تھی کوئی۔ وہ ایک گھنٹے بعد آئیں گی پھر گاڑی بھجوادیں گی۔" نوکر بولا تو اس نے "کوئی ضرورت نہیں گاڑی بھجوانے کی۔" تلخی سے کہہ کر موبائل آف کرکے بیگ میں رکھا۔ اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور سست قدموں سے گیٹ کی طرف چل پڑی۔

سڑک بالکل خالی تھی۔ دور تک رکشہ ٹیکسی کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اسی ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتی رہی کہ وائٹ شیراڈ اس کے پاس آکر رکی۔

"ہیلو نین تارا! ہاؤ آر یو؟" مانوس آواز پر اس نے رک کر پکارنے والے کو دیکھا۔

"ہیلو فائن۔" انکل جمی بال کالے سیاہ ڈائی کیے اپنی مخصوص فضول سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آؤ میں ڈراپ کردوں۔ کہاں جانا ہے۔؟" وہ فوراً بولے۔

"نو تھینکس..... "وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے لاپروائی سے بولی "آپ کہاں جارہے ہیں۔؟"

"ٹی وی اسٹیشن۔"

"چلیں پھر مجھے بس ادھر ہی لے چلیں۔ ماما ادھر ہی ہیں۔" وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"کالج آئی تھیں؟" وہ بہت خوش ہوگئے تھے۔

"ظاہر ہے۔" اس نے گہرا سانس لے کر کالج کی بیرونی باؤنڈری وال کو دیکھا۔

"کیا خیال ہے کولڈ ڈرنک نہ ہوجائے۔" وہ پھیلنے لگے اور نین تارا کو ان سے [illegible] چڑ تھی۔ وہ خواہ مخواہ پھیل جاتے تھے اگر ذرا سی لفٹ کرادو۔ وہ دل میں سلگی۔

"نو تھینکس موڈ نہیں۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔

"ہی ہی..... اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ موقع بھی ہے، دستور بھی۔" بعض لوگوں کی ہنسی اس قدر بے سری ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیا جائے (اگر گاڑی ان کی نہ ہو تو) وہ خاموش رہی۔

"آج کل کیا کررہی ہو؟" انہیں ایک پل چین نہیں آرہا تھا۔

"فی الحال تو آپ کی گاڑی میں Suffer کررہی ہوں۔" اس نے سفر پر زور دیا۔

"یہ میری گڈ لک ہے۔" وہ پھر بے تکے پن سے ہنسے۔

"انکل پلیز! اسپیڈ اور بڑھائیں۔ میں پہلے ہی بہت بور ہورہی ہوں ورنہ گاڑی روکیں میں نیچے اتر جاتی ہوں۔"

وہ اکتا کر تیز لہجے میں بولی تو انہوں نے گھبرا کر اسپیڈ پر رکھا پیر زور سے دبادیا۔ نین تارا نے ہاتھ بڑھا کر ڈیک آن کردیا۔ کم از کم ان کی بے تکی گفتگو سے تو نجات ملے گی مگر میوزک میں ایسے بندے کی چوائس کیسے اچھی ہوسکتی ہے۔ اس نے دو منٹ بعد ڈیک آف کردیا۔ گاڑی ٹی وی اسٹیشن کے گیٹ سے اندر داخل ہورہی تھی۔

زیور گل ریکارڈنگ روم میں تھی۔ وہ جدون صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی وہ فون پر کسی سے بات کررہے تھے۔

"جی تو نین تارا آئی ہیں ویلکم، نین تارا! کم آن یوں خود کو ضائع نہ کرو بچے۔ کام کرو خدا نے تمہیں جو حسن اور صلاحیتیں دی ہیں ان کا فائدہ اٹھاؤ۔" فون سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

"انکل! میرا موڈ نہیں ہے پلیز اس قسم کی گفتگو کرنے کا۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"اوکے نہیں کرتے گفتگو۔" انہوں نے ہاتھ جھاڑے "تم میرا ایک کام کردو۔"

"جی فرمائیں۔" وہ اسی بیزار ٹون میں بولی۔

"نہیں، پہلے پرامس کرو کہ کروگی۔"

"کام کیا ہے؟ آپ بتائیں کرنے والا ہوا تو کردوں گی۔"

"انکل کا کام نہیں کروگی؟" وہ خفگی سے بولے۔

"انکل پلیز، بتائیں گے تو ہامی بھروں گی۔"

"تو گویا انکل پر اعتبار نہیں، میں تم سے کوئی ایسا ویسا کام کراؤں گا۔"

"اوکے پرامس۔" وہ موضوع نپٹانا چاہتی تھی۔

"ابھی اسی وقت۔"

"اوکے ابھی اسی وقت۔"

"یہ دیکھو۔" وہ ایک پیپر اٹھا کر اس کے پاس لے آئے۔ "یہ اسکرپٹ ہے ایک اشتہار کا اسے ایک نظر دیکھ لو ابھی شوٹ کروانا ہے۔"

انہوں نے پیپر اس کے آگے کیا تو اس نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھو تم پرامس کرچکی ہو۔"

"انکل! یہ غلط بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے۔"

"مجھے معلوم ہے سب۔ اتنی اچھی تم ماڈلنگ کرتی ہو، دیکھا وہ دو ایڈز جو تم نے کیے تھے کیسے تھے۔ ابھی تک بہت سی کمپنیاں تمہاری ڈیمانڈ کررہی ہیں۔ پلیز تارا صرف یہ کہ بہت مہنگا اشتہار ہے کاسمیٹکس کی مشہور کمپنی کا۔ شوٹ کے فوراً بعد پے منٹ، انکل کا [illegible] لو۔" وہ اسے لالچ دیتے ہوئے بولے۔

"ہاں تو شاید کوئی [illegible] سا خیال ہے ان کے پیچھے اپنا کیریر بھی داؤ پر لگا بیٹھی ہوں۔ نہیں تو نہ سہی۔" اس نے [illegible] اور اسکرپٹ لے کر پڑھنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"قل قل قل" وہ کوئی چشمہ تھا یا پہاڑی جھرنا، اتنی خوبصورت ہنسی کی آواز صوفی صاحب نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ان کے متوازن قدم ایک پل کو ٹھٹھک کر رک گئے، تیسرے کلمے کی تسبیح کرتی ان کی زبان یک لخت رک گئی۔ انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر قہقہے کے جائے وقوع کی طرف دیکھا۔

"یہ تو ماسٹر صاحب کا گھر ہے۔" وہ اپنے دھیان سے چونکے۔ ان کی دونوں بیٹیاں بیاہی ہیں اور اگر وہ نہ بھی بیاہی ہوتیں تو بھی اس قدر خوبصورت ہنسی کی آواز ان کی ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب کی گھٹیا کی مریض بوڑھی بیوی کو اتنی جوان ہنسی ہنسنے کے لیے، دوسری بار کیا دسویں بار بھی جنم لینا پڑتا تو بھی ایسی ہنسی نہیں ہنس سکتی تھی۔ وہ جیسے الجھ کر رہ گئے۔

ماسٹر صاحب کے قریبی عزیزوں میں بھی کسی کی ایسی بے تکلف نڈر اور دلکش ہنسی نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ ان کے [illegible] یہ معمہ تھا پھر۔

"صوفی صاحب! ماسٹر صاحب تو گھر پر نہیں ہیں اگر آپ کو بیٹھنا ہے تو اندر اطلاع کروں۔" بارہ چودہ سال کا لڑکا ان کو یوں ٹھٹھکے کھڑے دیکھ کر ان کے پاس آکر بولا تو وہ جیسے کسی طلسم سے باہر آگئے۔

"نن..... نہیں ان سے پھر مل لوں گا۔" کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگے کہ اس دلفریب ہنسی کے سحر سے باہر آسکیں، حالانکہ ان کے دل نے احتجاج کیا تھا کہ اس پیش کش کو ٹھکرانے کا کوئی جواز نہیں اندر چل کر بیٹھنے سے شاید یہ معمہ حل ہوجاتا۔

انہوں نے با آواز بلند لاحول ولا قوۃ کی تسبیح کرنی شروع کردی "سب شیطان کے جال ہیں" تسبیح کے ساتھ وہ دل میں بڑبڑائے۔

"ہائے وہ کیسی باتیں کرتی ہے آمنہ! قسم سے مزہ آجاتا ہے۔" زینب چٹخارہ لے کر بولی۔
"ہاں یہ تو ہے۔" آمنہ نے مصروف انداز میں جواب دیا۔
"ورنہ قسم سے وہاں بڑی بوریت ہوتی ' ماسٹرانی جی تو بابا صاحب سے بھی بڑھ کر بور ہیں۔ لڑکیوں یہ نہ کرو' لڑکیوں سانس نہ لو لڑکیوں زندہ کیوں ہو۔ لڑکیوں دیکھتی کیوں ہو۔ لڑکیوں تمہاری آنکھیں کیوں ہیں لڑکیوں زبانوں کو کاٹ ڈالو۔ قسم سے آمنہ میں بہت عاجز آگئی ہوں' صرف ایک ہفتے میں اگر وہاں جھومرنہ آجاتی تو میں نے تو آج کل میں' چاہے بابا صاحب میری ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ جواب دے دینا تھا' ادھر جانے سے۔ یہ ہر وقت لڑکیوں کی گردان ہم نے سیکھنا خاک ہے۔ وہاں پر کچھ۔" وہ خالصتاً "ماسٹرانی جی کے لہجے میں نقل اتار رہی تھی بارعب بلند آواز میں "لڑکیوں اوردھم آواز میں کلام کرو۔" آمنہ کی ہنسی نکل گئی۔
"زینو! آہستہ بولو بابا صاحب آنے والے ہیں۔
"ہائے کبھی تو تم کہو زینب خوب اونچا بولو۔ بابا صاحب باہر بیٹھے ہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ پتا نہیں ہم کب آزاد ہنسی ہنس سکیں گے۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔
"زینب بکواس نہ کرو۔ بابا صاب' بہت اچھے ہیں۔" وہ ہر حالت میں یہی نعرہ بلند کرتی تھی۔ "بابا صاحب' بہت اچھے ہیں۔"
"تمہارے لیے ہوں گے خیر چھوڑو بابا صاحب کا ٹاپک چودہ سال پرانا ہے۔" وہ بدتمیزی سے بولی آمنہ کو بہت برا لگا۔ مگر اس سے کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔
"آمنہ وہ اتنی خوبصورت کیوں ہے۔ ہر لحاظ سے' اس کی رنگت جیسے دودھ اور ملائی ہو۔ اتنی چکنی جلد ہے کہ پانی بھی پھسلتا ہے۔ اس کی آنکھیں ستاروں کو ماند کرتی ہیں۔ اور آواز اس قدر سریلی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ سنتے جاؤ اور نازک اتنی کہ جیسے ہاتھ لگاؤ تو ٹوٹ جائے گی۔" زینب کھوئی کھوئی سی بول رہی تھی۔
"زینو! کیا ہو گیا ہے تمہیں' فراک کی باڈی الٹی جوڑ رہی ہو۔" آمنہ نے اس کا دھیان سلائی مشین کی طرف گھمایا۔
"آمنہ تمہیں وہ کیسی لگتی ہے۔؟"
"مجھے۔۔۔۔" آمنہ نے قینچی ہاتھ سے رکھ دی۔
"ہاں بتاؤ نا!" زینب اس کی دلچسپی دیکھ کر فوراً "بولی۔
"زینب! اصل میں خوبصورت تو وہ واقعی بہت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں' مگر مجھے اس کی جو بات اچھی لگتی ہے وہ اس کا اعتماد اور نڈر انداز ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ میٹرک پاس ہے۔ میٹرک اور وہ بھی کسی پسماندہ علاقے سے حیرت ہوتی ہے نا۔" آمنہ نے زینب کی تائید چاہی۔
"وہ نڈر بےباک ہے تو اس نے سوات سے مردان آکر میٹرک کیا اپنے چچا کے گھر چار سال رہ کر۔ اور اب۔۔۔۔"
زینب دھیرے سے کھسکی "پتا ہے۔ وہ ادھر کیوں آئی ہے؟"
"کیوں؟"
"اس کے ابا بھی ہمارے بابا صاحب کی طرح سخت ہیں' وہ اس کی شادی کسی جاہل ٹرک ڈرائیور سے کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اماں کو لے کر اپنی خالہ یعنی ماسٹرانی جی کے گھر مردان سے اکیلی چلی آئی' ہے نا بہادر؟"
"بابا صاحب سخت تو نہیں ہیں اور وہ بھی ہماری شادی کسی ٹرک ڈرائیور سے نہیں کریں گے۔ انہیں جہالت سے نفرت ہے۔" آمنہ کی سوئی بابا صاحب پر رک گئی تھی۔
"فضول بات۔۔۔" زینب کو جیسے اس کی بے عقلی پر افسوس ہوا۔ بابا صاحب کی علم دوستی کا یہاں کیا ذکر۔" زینب کڑھ کر بولی۔ "بے وقوف وہ ادھر آگے پڑھنے کے لیے آئی ہے۔ اس کی ماں ادھر رہے گی اور وہ خود شہر جا کر آگے پڑھے گی کالج میں۔ پر میرے خیال میں اب اس کا شہر جانا مشکل ہے۔" زینب اور قریب کھسک گئی۔

"کیوں؟" آمنہ نے بھولپن سے پوچھا۔ اور یہ سچ بھی تھا جس دن سے جھومر آئی تھی زینب سارا وقت ہی اس کے ساتھ چپکی رہتی تھی' مجال ہے جو ماسٹرانی جی کی کڑک دار لڑکیو پر دھیان بھی دے۔
"آدھا گاؤں تو اس کا سچا عاشق ہو گیا۔"
"کیا مطلب؟" آمنہ سمجھی نہیں۔ "سچا عاشق کیا؟"
"جو اس کی خاطر اپنی جان کی بھی پروانہ کرے اور آدھا گاؤں جھوٹا عاشق ہے۔"
"یہ بے وقوف جو بوڑھے لوگ ہیں دل میں اس کے عاشق ہو چکے ہیں مگر اظہار نہیں کر سکتے۔ تو ہوئے نا جھوٹے عاشق" زینب نے اپنے تئیں اسے بڑے پتے کی بات سمجھائی۔
"زینب! تم بہت فضول ہو گئی ہو' میں بابا صاحب سے تمہاری شکایت کروں گی ایسی باتیں کرنے میں۔" آمنہ نے اسے جھڑکا۔
"کرو نا شکایت بابا صاحب سے' کچھ نہیں تو وہ بھی اس کے عاشق ہو جائیں گے۔ مگر پوچھو کون سے والے۔" وہ دیدہ دلیری سے بول رہی تھی۔
آمنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا' پوچھنے کو زبان ساتھ نہیں رہی تھی۔
"جھوٹے والے عاشق۔۔۔۔ہاہاہا"
وہ زور سے ہنسی تو کمرے کے باہر کھڑے ان کی باتیں سنتے صوفی صاحب کی پیشانی عرق آلود ہو گئی' ان کا جسم کمزور پڑنے لگا۔ انہوں نے چور نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ دھیرے سے واپس مڑے اور کھلے دروازے سے دوبارہ باہر نکل گئے۔ ان کے قدموں کا رخ ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"سلطان بخت آخر یہ کیا طریقہ ہے۔" سیدہ آپا نے اندر کمرے میں داخل ہو کر ناگواری سے کہا اور سلطان بخت جو پردے گرائے مکمل اندھیرا کیے صوفے پر نیم دراز بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ کسی سوچ میں گم سگریٹ کا کش لگا رہے تھے۔ ان کی آواز سن کر اچھل ہی پڑے' کمرہ سگریٹ کے دھوئیں اور بو سے بسا ہوا تھا۔
"سلطان بخت!" وہ غصے' استعجاب و حیرت سے انہیں سگریٹ پیتے دیکھ رہی تھیں۔ سلطان بخت خوب شرمندہ ہوئے' انہوں نے آگے بڑھ کر ٹیبل پر رکھے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھا دیا۔
"یہ فضول کام تم نے کب شروع کیا۔۔۔۔" ان کا اشارہ اسموکنگ کی طرف تھا انداز بے حد ناگوار و ناپسند۔
"آپا! ابھی ٹینشن میں۔" انہیں کچھ جواب نہیں سوجھ رہا تھا' بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے خجالت سے بولے۔
"ہائے دا وے وہ کون سی ٹینشن تھی جس نے تمہیں اک منحوس چیز کو ہونٹوں سے لگانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے بے حد افسوس ہے تم پر۔" وہ ہنوز اسی اسٹائل میں بازو کمر سے ٹکائے کھڑی تھیں۔
"کس بات کا افسوس آپا؟" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کے پردے ہٹانے لگے۔ سیدہ نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔
"سلطان میرے بھائی' میرے بچے! کیا تم بہت بڑے ہو گئے ہو جو اپنی پریشانیاں مجھ سے شیئر نہیں کرتے۔ میں تمہاری بہن ہی نہیں تمہاری ماں' تمہاری دوست بھی تو ہوں۔ تمہیں کیا چیز تنگ کر رہی ہے۔" وہ محبت و ہمدردی سے ان کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولی۔
"آپا! کچھ بھی نہیں مجھے بھلا کیا چیز تنگ کرے گی۔؟" وہ ٹالنے والے انداز میں بولے۔
"سلطان! غیر سمجھنے لگے ہو مجھے۔" ان کا لہجہ دکھی ہو گیا۔
"آپا پلیز' میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ جھنجلا اٹھے۔
"آخر کس بات کی ڈسٹربنس ہے پتا بھی تو ہو۔" وہ اونچی آواز میں بولیں۔

"آپ... آپ کو نہیں پتا ہے...؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولے۔

"وہ بات جس کا کوئی مقصد کوئی وجہ نہ ہو اُن کو بار بار دہرانے سے فائدہ؟ تم اللہ پر بھروسا کیوں نہیں کرتے۔ یہ بھی تو ناممکن نہیں، ذہن کو کسی بات کے لیے تیار کرنا کیا مشکل ہے وہ بات، جو بظاہر تمہیں ناممکن نظر آ رہی ہے اگر تمہارا اس سے واسطہ پڑ جائے تو کیا معلوم وہ کس قدر آسان ہو، تم کیوں اس طرح محض سوچ سوچ کر خود کو الجھا رہے ہو۔ اس طرح الجھنیں بڑھتی ہیں، کوئی حل نہیں نکلتا۔" وہ اسے دھیرے دھیرے سمجھانے لگیں۔ وہ بیڈ کے کنارے پر ٹکے غیر حاضر دماغی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

"آپا! کیا واقعی ایسا ہوتا ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولے۔

"کیا...؟" وہ ان کے پاس آ بیٹھیں۔

"کہ جو چیز بظاہر ناممکن لگ رہی ہو مشکل اور انہونی اگر کر گزرو تو کوئی زمین آسمان نہیں ملتے۔" وہ کسی دھیان میں بول رہے تھے۔

"یہ تو ہمارے ذہن کی بات ہے نا اگر ہم خود کو تیار کر لیں، اپنے ذہن کو سمجھا لیں تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔" وہ کسی اور رخ سے بات کر رہی تھیں اور وہ کسی اور پہلو پر سوچ رہے تھے۔

"آپا زندگی تو ایک بار ہی ملتی ہے نا؟" سیدہ انہیں ناسمجھی سے دیکھنے لگیں۔

"ہے نا آپا..." وہ اصرار سے بولے۔

"بالکل...!"

اگر وہ بھی انسان اپنی مرضی سے نہ گزارے تو کیا فائدہ؟"

"انسان کی مرضی کیا ہے؟" سیدہ نے الٹا سوال کیا۔

"جو اس کا دل کہے کر گزرو۔" وہ بلا جھجک بولے۔

"تو جو وہ کر گزرتا ہے، اسی کو تو تقدیر کہتے ہیں ہونی کو ہی تقدیر کہا جاتا ہے نا۔"

"اور انہونی کو..." وہ ٹلنے والے نہیں تھے۔

"بظاہر یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف لگتی ہیں مگر انہونی ہی تو ہونی ہوتی ہے اگر ہو جائے تو تقدیر ہے اور تقدیر کیا ہے۔"

"کیا ہے؟" ان کا ذہن بھٹک رہا تھا۔

"اللہ کی مرضی۔"

"اور انسان کی مرضی۔" وہ اسی نکتے پر اٹکے ہوئے تھے۔

"جو ہو جائے وہ تقدیر جو نہ ہو سکے اس میں اللہ کی مصلحت۔"

وہ انہیں سمجھا نہیں پا رہی تھیں یا وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ دونوں اپنی اس لاحاصل کوشش کے نتیجے میں خاموش ہو گئے۔

"چلو اٹھو فضول ذہن الجھانے سے فائدہ۔" آخر سیدہ نے خاموشی توڑی۔

"شادی میں دن کتنے رہ گئے ہیں دو ہفتے، بابا جان تمہارے لاتعلق رویے سے بے حد پریشان ہیں اوپر سے ان کی طبیعت، سلطان کچھ تو خیال کرو اور میں دونوں طرف کی تیاریوں میں پاگل ہو رہی ہوں۔ کچھ تو میرا ہی خیال کر لو کہ کم از کم مجھے ذہنی سکون ہی دے دو اور اس طرح کا حلیہ بنا کر تم مجھے اور پریشان کرتے ہو۔" سیدہ رو دینے کو تھیں۔

"آپا! میرے بس میں کچھ نہیں۔" وہ بے بسی سے بولے۔

"آپا کی خوشی بھی نہیں، اس کی زندگی بھی نہیں۔" انہوں نے سر اٹھا کر سیدہ کے اداس چہرے کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"اٹھو میرے چاند! میری خاطر خود کو سنبھالو۔" وہ پیار سے ان کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

"آپا بہت مشکل ہے۔" وہ پھر سے بکھرنے لگے۔

"چندا! کچھ بھی مشکل نہیں بس تمہیں لگ رہا ہے، صالحہ کو دیکھو گے تو سارا ذہنی خلجان بھول جاؤ گے۔ جنت کی حور ہے، جو خدا نے دنیا میں تمہارے آنگن کو نصیب کی ہے۔ تم ایک بار خود کو سنبھالا تو دو سب گلے شکوے بھول جاؤ گے۔" سیدہ کی بات سن کر وہ حلق تک کڑوے ہو گئے۔

"سلطان دیکھو تو اس گھر میں اتنے زمانوں کے بعد خوشی آ رہی ہے۔ بابا جان کس قدر خوش ہیں۔ شہرینہ کس قدر پُرجوش ہے اور میرا جو برسوں کا ارمان تھا کہ تمہیں شہزادہ بنا دیکھوں ہماری خوشیوں کا ہی خیال کر لو۔"

"آپا... آپا میری خوشی..." وہ ٹوٹے دل سے بولے۔

"اپنوں کو خوش کرنے سے ہی خوشی ملتی ہے۔" وہ انہیں بے حد خود غرض لگیں۔

"تو مجھے خوش کر کے بھی آپ لوگوں کو خوشی مل سکتی ہے میں بھی تو آپ کا اپنا ہوں۔" وہ تلخی سے گویا ہوئے۔

"سلطان بخت، جو تم چاہ رہے ہو وہ ممکن نہیں۔" وہ خود کو سمجھا کر آئی تھیں کہ غصے میں نہیں آنا۔

"کیوں ممکن نہیں، ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

وہ غصے اور بے بسی کے احساس کے تحت چپ کر گئیں۔

"ہاں تو صحیح کہہ رہی تھی کہ کچھ بھی ناممکن نہیں، بس میں ہی ہمت ہارے بیٹھا ہوں۔ بس آپا کچھ بھی ناممکن نہیں اگر انسان چاہے تو ہے نا آپا۔" وہ ایکدم سے جوش میں آ گیا۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔" سیدہ بھی خوش ہو گئیں۔

"بس تو آپا جان آپ بے فکر ہو کر جائیں اب میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی۔" وہ ایکدم ہلکے پھلکے ہو گئے تھے جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔

سیدہ خوش ہو گئیں۔

"خوش رہو۔" انہوں نے ان کا ماتھا چوم کر دعا دی۔ "سہرا بندی والی رات میں تمہاری دستار بندی بھی ہو گی کہ بابا جان نے شادی کے فوراً بعد حج کرنے کے لیے جانا ہے۔ وہ تمام امور تمہیں تفویض کر جانا چاہ رہے ہیں۔" وہ انہیں بتا رہی تھیں وہ سر ہلانے لگے۔

"ٹھیک ہے آپا! میں ابھی فریش ہو کر نیچے آتا ہوں، بابا جان کے پاس پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ سیدہ نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور کھڑی ہو گئیں۔

"جلدی آنا میں بابا جان کو سٹنگ روم میں لے کر آتی ہوں اکٹھے چائے پئیں گے۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ سید سلطان بخت کسی خیال کے تحت مسکرانے لگے۔

"کیوں خود کو اس طرح گھر بیٹھ کر ضائع کر رہی ہو، ایم ایس سی میں ایڈمیشن لے لو۔ میں یہی کہنے آئی ہوں تم سے۔ ہاں اور آج یہ بات منوا کر جاؤں گی۔" راحیلہ دھونس والے انداز میں بولی۔

"تمہیں معلوم تو ہے۔" وہ پھیکے سے انداز سے بولی۔

"کیا معلوم ہے یہی کہ تمہارے ابو ٹھیک نہیں رہتے گھر گرہستی کی ذمہ داری تمہارے نازک کندھوں پر آ پڑی ہے۔ وغیرہ وغیرہ، فضول بہانے، نزہت میری جان یہی عمر ہے کیریئر بنانے کی، اپنے بارے میں سوچنے کی، انکل کی بیماری جو ہے وہ تو ہے وہ تمہارے گھر بیٹھنے سے ختم نہیں ہو جائے گی اور چار بندوں کا کتنا کام ہوتا ہے بلکہ دو بندوں کا تمہارے بھائی اور بھابی بقول تمہارے اکثر گھر سے باہر رہتے ہیں پھر کیوں خود پر ظلم کر رہی ہو۔"

"چھوڑو یہ موضوع راحیلہ! میں واقعی بہت پریشان ہوں، ابو آج کل بالکل ٹھیک نہیں۔ مجھے معلوم ہے اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے میں کیا کروں؟" وہ بے بسی سے رو پڑی۔

"ہے... بے وقوف روتی کیوں ہو بھائی سے بات کرو۔" راحیلہ نے اس کے آنسو پونچھے۔

"بھائی ہو نہ، وہ ملتے کب ہیں۔ رات کو آتے ہیں تو سیدھا بیڈ روم میں اور صبح بینک جانے کے لیے بیڈ روم

سے سیدھا گیٹ' میرا تو خیال ہے انھیں میری شکل بھی یاد نہیں ہوگی۔ ابو بھی آواز دے کر بلائیں تو ابو شام کو آؤں گا۔ کہہ کر باہر نکل جاتے ہیں۔ میں ابو سے کہہ کر تھک گئی ہوں کہ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں مگر وہ مسکرا کر ٹال دیتے ہیں میں کیا کروں۔"

"تمہاری بھابھی۔"

"اس کا نام نہ لو۔ وہ دوسری قسم کی عورت ہے' ہم لوگوں سے' بہت مختلف۔ مجھے اس کی سرگرمیاں ہی بے حد مشکوک لگتی ہیں پتا نہیں کون کون سے لوگ اسے ڈراپ کرنے گھر آتے ہیں اور وہ خود ہر وقت کسی میک اپ کمپنی کا اشتہار بنی رہتی ہے۔"

"پھر اس کا کیا حل ہو۔ تمہارے ابو کیا کہتے ہیں؟"

"وہ صرف میری شادی کی رٹ لگائے بیٹھے ہیں۔"

"تو پھر اپنے فیاسی سے بات کرو۔"

"ان سے کیا بات کروں' بے شرم بن کر کہوں کہ مجھے لے جاؤ ابھی پھوپھو کہہ کر بھی گئی ہیں ابو سے کہ دو ماہ بعد انشاءاللہ۔" وہ چپ کر گئی۔

"کیا کہہ کر گئی ہیں؟" راحیلہ کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

"راحیلہ! میرا دل ذرا بھی خوش نہیں ہے' ایسے لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ بس کیا کروں۔" وہ بہت وحشت زدہ ہو رہی تھی۔

"وہم ہے تمہارا۔" راحیلہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا" پھر شادی کی تیاریاں تو ہو رہی ہوں گی خوب۔"

"کیوں مذاق اڑاتی ہو میرا۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"خدا نہ کرے میں تمہارا مذاق اڑاؤں۔ تم ویسے ہی زود رنج ہو رہی ہو خود کو سنبھالو۔ شادی اگر جلدی ہونی ہے تو خود تھوڑی بہت تیاری کرلو' پیسے وغیرہ تو ہوں گے تو دونوں چلیں گے کسی دن بازار۔"

"راحیلہ! میرا دل نہیں چاہتا۔ دل جیسے بجھ سا گیا ہے' ابو کچھ ٹھیک ہو جائیں تو پھر تمہیں فون کروں گی' کچھ کپڑے برتن وغیرہ خرید لائیں گے۔ ابو نے پیسے تو مجھے دے رکھے ہیں اور زیور تو امی کا پڑا ہی ہے۔" وہ افسردگی سے بول رہی تھی۔

"تم اپنی شکل تو درست کرو نزہت! اللہ پر بھروسہ رکھو وہ... اچھا کرے گا میں اگلے ہفتے چکر لگاؤں گی۔ اور سناؤ کوئی فون شون آیا؟" اس کا اشارہ کس طرف تھا نزہت سمجھ گئی۔

"نہیں کہاں اتنے دن ہو گئے ہیں۔" وہ اسی اداس لہجے میں بولی۔

اس وقت زیور گل اندر داخل ہوئی۔

"چشم بددور میں صدقے میں قربان ایسا لگ رہا ہے جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ خدا میری بچی کو بری نظر سے بچائے۔ اس کے حسن کو کبھی گہن نہ لگے۔" وہ اس کا سر چومتے ہوئے بولی۔

"مام! میرا میک اپ خراب ہو جائے گا۔" وہ بگڑتے ہوئے ذرا پرے کھسکی۔

"بہت جچ رہا ہے تم پر یہ ڈریس۔" وہ ذرا پیچھے ہٹ کر اس کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"تھینکس ....." وہ بے نیازی سے بولی۔

"مام! سلور شوز پہنوں نا اس کے ساتھ۔"

"لیس میں نکالتی ہوں۔" وہ فوراً" اس کے شوریک کی طرف بڑھی۔

"جدون صاحب تمہارے کام سے بے حد خوش تھے' ایک گھنٹے میں تم نے دو ریکارڈنگز کرائیں دونوں کی پرفارمنس Superb۔ (شاندار) نینو! تم مانو یا نہ مانو تمہارے اندر بہت ٹیلنٹ ہے۔ اب یہی دیکھ لو۔"

اس نے جوتے صاف کرتے ہوئے نین تارا کے آگے رکھے۔

"صرف تمہاری ماڈلنگ دیکھتے ہوئے فضل حسین صاحب تمہیں اپنی فلم کے لیے ہیروئن کاسٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ ان کی فلم ریلیز ہونے سے پہلے سپر ہٹ ہو جاتی ہے ایکٹرز تو ان کی فلم میں ایکسٹرا کے رول کے لیے مرے جاتے ہیں اور انھوں نے تمہیں مرکزی کردار دے دیا۔ یو آر لکی مائی ڈارلنگ! میری تو کل سے نیندیں اڑی ہوئی ہیں' خوشی سنبھالی نہیں جا رہی۔"

"مام واپسی کب تک ہوگی۔؟" وہ شوز پہن کر سیدھی ہوئی۔

"ظاہر ہے ایسے فنکشنز تو رات گئے تک چلتے ہیں۔ دو تین تو بج ہی جائیں گے کیوں؟"

"مجھے نیند آجائے گی نا۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"نیند آئے گی تو ہم فوراً" گھر آ جائیں گے۔ ڈونٹ وری پارٹی کے بعد فضل حسین صاحب ایگریمنٹ سائن کروائیں گے۔ میں ان سے کہوں گی کہ وہ فنکشن سے پہلے ہی یہ نیک کام کر لیں۔ فنکشن تو پھر پھیلتا ہی جاتا ہے یہ ٹھیک رہے گا ہے نا۔" وہ اس کی رائے لینے کو بولی۔

"ہاں یہ صحیح ہے مگر مام! سلور سکرین کے لیے تو بڑا کام کرنا پڑتا ہے۔ مجھ سے اس قدر کام نہیں ہوگا۔" وہ نزاکت سے بولی۔

"اتنا کام کوئی ایک دن میں تھوڑا کروائیں گے۔

"کچھ نہیں بس تم اب چلو۔ بہت دیر ہو گئی ہے دس تو بج رہے ہیں۔" وہ گھڑی پر نگاہ ڈال کر بولی۔

"مام! ایک بات پوچھوں۔؟" وہ آہستہ آواز میں بولی۔ زیور گل نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر کو وہ آرام سے پڑھ سکتی تھی۔

"مت پوچھو نین تارا! اتنے قیامت حسن پر یوں سوگواری مت طاری کرو۔ حسن کو نظر لگ جائے گی۔ اور تم کسی سے کم نہیں ہو' تمہیں ٹھکرانے والا ابھی پیدا نہیں ہوا اور جو ایسا کرنے کا سوچے گا وہ پچھتائے گا ضرور۔ تم کوئی روگ مت سوچ کر اپنے دل میں بٹھا کر خود کو پریشان مت کرو۔"

اس نے محبت سے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

"مام! میں کوشش تو کرتی ہوں۔" اس کے حلق میں گولہ سا پھنسنے لگا۔ آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔

"نین تارا! پھر وہی بات' جس کو تمہاری پروا نہیں تم اس کے لیے خود کو یوں گھلاؤ۔ تم کوئی گری پڑی ہو میری جان خود کو ایسے مضبوط قلعے کی طرح کرو جسے کوئی ایرا غیرا تسخیر نہ کر سکے۔ تم زیور گل کی بیٹی ہو جس کا اپنے زمانے میں بھی کوئی رقیب نہیں تھا۔ مقابلہ کرنے کی ہمت کس میں تھی۔"

وہ پتا نہیں اسے کیا سمجھا رہی تھی اور نین تارا کا سنبھلا ہوا دل پھر سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اسے شاہ جی بے طرح سے یاد آنے لگے تھے۔ آج انہیں دیکھے پورے گیارہ دن ہو گئے تھے اس کا دل چاہا کہیں بھاگ جائے۔

"بوٹے ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" زیور گل نے پاس سے گزرتے ملازم سے کہا۔

"مام! آج جانا ضروری ہے۔" وہ رسیاں تڑوانے لگی۔

"نین تارا!" زیور گل غصے سے بولی "چلو" اس کا لہجہ غضب ناک ہو چلا تھا۔ نین تارا نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہیلو! کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے' لگتا ہے ہوا وں نے ہمارے آنے کی خبر کر دی تھی۔"

مانوس آواز نے جیسے نین تارا کے پورے وجود کو دھڑکن بنا دیا۔ خوشی اور بے قراری سے اس نے مڑ کر دیکھا۔ سید سلطان بخت سیاہ ڈنر سوٹ میں مسکراتا چہرہ لیے دروازے کے فریم میں ایستادہ تھے۔ زیور گل کا ماتھا شکنوں سے اٹ گیا۔

"شاہ جی آپ.....؟" وہ لپک کر ان کی طرف بڑھی' ساری ناراضی دور ہو گئی۔

"نین تارا!" زیور گل نے سختی سے آواز دی تو اس کے بے اختیار قدم ٹھٹھک گئے۔

"کیوں مادام خفا ہیں ہم سے، کوئی بھول ہو گئی۔؟" وہ زیور گل کو جلانے والے انداز میں بولے اور آگے بڑھ کر نین تارا کے کندھے کے گرد بازو حمائل کر کے پورے استحقاق سے کھڑے ہو گئے۔

"شاہ جی دس از ٹو مچ (یہ زیادتی ہے)۔" زیور گل غصے سے بولی۔

"نین تارا! چلو گاڑی میں بیٹھو چل کر۔"

"نین تارا کہیں نہیں جائے گی مادام! کیوں تارا؟" انہوں نے جھک کر اس کی ریشمی زلفوں کو لبوں سے چھوا' نین تارا کے پورے بدن میں برقی رو دوڑ گئی۔

"مام! آپ جائیں میں نہیں جاؤں گی۔ شاہ جی بہت دنوں بعد آئے ہیں۔" وہ ان سے ذرا پرے ہوتے ہوئے بولی' زیور گل کو فکر لگ گئی۔

"نین تارا! تم ہوش میں تو ہو نا؟" وہ غصے سے چلائی۔

"مام! آئی ایم سوری پھر سہی آپ کے ساتھ۔۔۔" وہ اسی بے خوفی سے بولی' محبت بندے کو اسی طرح نڈر و بے خوف کر دیتی ہے۔

"تھینک یو مائی سو۔۔۔" سلطان بخت نے دھیرے سے اس کے کان میں کہا۔

"شاہ جی! نین تارا میرے ساتھ جا رہی ہے ایک فنکشن میں' آپ پھر کسی وقت تشریف لے آئیں۔" زیور گل بڑے حوصلے سے ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"مام! آئی ایم سوری' آج تو نین تارا کہیں نہیں جا سکے گی۔ بلکہ آپ بھی کیونکہ نکاح نامے میں سرپرست کے سائن آپ ہی نے تو کرنے ہیں۔" سلطان بخت کی بات پر زیور گل کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جب کہ نین تارا بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"زیور گل! میں سید سلطان بخت باہوش و حواس ابھی اور اسی وقت نین تارا بنت زیور گل سے نکاح کے لیے تیار ہوں۔ قاضی صاحب اور گواہان میرے ساتھ آئے ہیں' آپ کی اجازت پر اندر آنے کے منتظر ہیں۔ میں انہیں اندر بلا لوں۔"

ان کا مسکراتا ہوا انداز اور آگ لگانے والے جملوں نے زیور گل کو بھڑکا کر رکھ دیا۔

"شاہ جی! آپ ہوش میں ہیں۔" غصے سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

"مادام! میں بتا چکا ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکے۔

"مگر میں اس کے لیے تیار نہیں۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ جی کو اٹھوا کر شہر سے باہر پھنکوا دے۔

"مگر آئی ایم سوری میں آپ سے تو نکاح نہیں کر رہا ہوں' نین تارا سے کر رہا ہوں۔ اور وہ تو راضی ہے' کیوں نینو؟" انہوں نے بے حس و حرکت کھڑی نین تارا کے ہاتھ کو تھام کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"یہ آپ کی بھول ہے شاہ جی! آپ کو شاید معلوم نہیں ہمارے طبقے میں اتنی کم عمری میں بیٹیاں نہیں بیاہی جاتیں۔ آپ جا سکتے ہیں' چلو نین تارا۔"

وہ کہتے ہوئے باہر کی طرف مڑ گئی۔ سلطان بخت نے لبوں کو بھینچ کر اس بات کو سنا' نین تارا نے مایوسی سے انہیں دیکھا اور آہستگی سے ماں کے پیچھے باہر نکل گئی۔

• • • • •

"سائبان" میں گزارے گئے دن اگر مشکل تھے تو ادھر گزرنے والے دن مشکل ترین تھے۔ جس طرح اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ "سائبان" سے نکل کر کدھر جائے' اس طرح اب بھی وہ پریشان تھا کہ ظفر کے گھر سے بھاگ کر وہ کہاں جائے۔ کالج میں ایڈمیشن کے لیے ابھی دن پڑے تھے اور اس کے پاس رقم بھی محدود سی تھی' جو اسے آتے وقت ناظم صاحب نے خرچ کے لیے دی تھی وہی اس نے ایڈمیشن کے لیے سنبھال لی تھی'

اسکالرشپ کی رقم ملنے میں تو ابھی بہت وقت تھا' کالج میں داخل ہونے کے تقریباً دو تین ماہ بعد۔ اب اگر وہ ادھر سے نکل کر شہر چلا جاتا ہے تو بس اندازی ہوئی رقم اس کے کھانے پینے اور سر چھپانے میں اٹھ جاتی تھی۔ اس رقم کو بچانے کے چکر میں وہ یہ عذاب سہے جا رہا تھا ظفر تو یہاں آ کر اسے جیسے بھول ہی گیا تھا۔

وہ دن چڑھے تک تانگیں پسارے سویا رہتا۔ اس کا ابا اسے لاتیں مار مار کر اٹھاتا اور کسی گدھے کی طرح ہنکاتا ہوا کھیتوں کی طرف لے جاتا۔ ظفر خود کو کھینچ کھانچ کر گھنٹہ بھر کھیتوں میں کام کرتا پھر وہیں کسی درخت کی چھاؤں میں پڑی چارپائی پر ہو گرتا تو دوپہر ڈھلے تک وہیں پڑا رہتا' اس کا باپ اسے بے تکان گالیاں دیتا تھا۔ چارپائی کو آتے جاتے ٹھوکریں مارتا اور وہ کسمسا کر پھر سے بے خبر ہو جاتا۔ دوپہر ڈھلے گھر آ کر وہ انڈے میں بنے چکن میں گھس جاتا۔ جتنی روٹیاں چنگیر میں دسترخوان میں لپٹی رکھی ہوتیں۔ وہ دیگچی میں موجود سالن کے ساتھ سانس لیے بغیر ہڑپ کر جاتا۔ اسے کھاتے دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے پہلے کبھی زندگی میں کھانا کھایا ہو گا پھر بڑی بڑی ڈکار لیتا باتھ روم میں گھس جاتا' پھر پورے گھنٹے بعد گیلے سر منہ کے ساتھ اودھر سے برآمد ہوتا تو کمرے میں گھس جاتا۔ پھر لٹھے یا کھوڑا بوسکی کا سوٹ زیب تن کرتا' تیز پرفیوم کی آدھی شیشی خود پر انڈیلتا۔ سر میں تیل لگا کر کنگھی کرتا' پیروں میں کھسہ اکلوتا سنہری تلے والا کھسہ ڈالے وہ صحن میں آ جاتا' جہاں معاذ کسی مسکین قیدی کی طرح سرجھکائے بان کی چارپائی پہ بیٹھا ہوتا۔

"چل جانا ہے تجھے' میں اپنی پھوپھی کے گھر جا رہا ہوں۔" وہ بڑی بے نیازی سے اس کے پاس پل بھر کو کھڑا ہو کر پوچھتا تو معاذ نفی میں سر ہلا دیتا۔ وہ روز اپنی خالہ یا پھوپھی کی طرف جاتا تھا' ماسی کی گڈی اور پھوپھی کی زبین اس کی منظورِ خاص تھیں کہ وہ دونوں کو برابر وقت دیتا۔ وہ ان کے گھر جا کر اپنی چہیتی کزنوں کی کمپنی میں اس بری طرح سے غرق ہو جاتا کہ معاذ کو بھول ہی جاتا اس لیے معاذ نے ایک دو دفعہ کے بعد جانا ہی چھوڑ دیا۔ ان دونوں گھروں کی لڑکیوں نے شاید پہلی ہی کام کیا تھا جہاں لڑکا دیکھو آپے سے باہر ہو جاؤ۔ زبین اور گڈی کی چھوٹی بہنیں معاذ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتیں کہ وہ وہاں سے دم دبا کر بھاگ جاتا مگر بھاگ کر جاتا کہاں۔ گھر میں کالو نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ظفر کی سوتیلی ماں اور بہن معاذ کو پھانسنے کے چکر میں تھیں۔

"اوئے تم کتنے سوہنے ہو اسی لیے مغرور ہو۔" وہ اماں کے سامنے ہی بے تکلفی سے اس کے پاس آ بیٹھتی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔ اس کے بدن اور لباس سے پھوٹتی پسینے کی ناقابل برداشت بو معاذ کا دماغ الٹا دیتی۔

"تمیز سے بات کرو۔" وہ بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح اچھل کر پرے ہو جاتا۔

"اوئے تمیز سے بات کرو' گھر میں بیٹھے ہو میرے۔" وہ بدمعاشوں کی طرح اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولتی اور تمیز مجھے سکھاؤ گے تم آپ؟" وہ منٹ بھر میں آگ بگولہ ہو جاتی۔

"کالو! کتنی ہو چھ کہ کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھی ہو؟" وہ چولہے سے آگ جلاتی اماں کو چلا کر متوجہ کرتی۔

"تو دفع کر اس مردود کو۔ اس منحوس نے لا کر گھر میں ڈال دیا ہے' کرتی ہوں کچھ اس کا بھی انتظام۔" اماں چولہے سے منہ ہٹا کر اس کو اور دھمکاتی۔

"اماں! اسے ادھر سے بھیجنے کی بات نہ کرنا ہاں۔ یہ اب کالو کا ہے۔"

وہ ہوا یا' با آواز بلند معاذ پر اپنی ملکیت جتاتی تو اس کا دل کرتا زمین کا دروازہ کھول کر مڑ کر دیکھے بنا بھاگتا چلا جائے۔

"تیرے بھی کل پرزوں کی کچھ خبر نہیں۔ کبھی کچھ کہے' کبھی کچھ۔" اماں نے زور لگا کر چولہے میں پھونک ماری۔ آگ جل اٹھی۔

"اماں! تو جو بھی کہے' پر اسے ادھر سے بھیجنے کی بات نہ کرنا۔ یہ اب ادھر سے مر کر ہی جائے گا ہاں۔"

معاذ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ کس دھڑلے سے اس پر تا عمر کا استحقاق جتائے جا رہی تھی اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا' بے بسی کی انتہا تھی۔

"بڑی پاگل ہے تو کالو!" اماں لاڈ سے آ کر اسے ذرا سا پرے دھکا دیتی "تجھے پسند ہے تو پھر جھگڑتی کیوں ہے اس

سے۔" وہ پسینے میں نچڑی قمیص کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر سکھانے لگتی۔

"میں کب لڑتی ہوں۔ یہ گلفام اپنے پیچھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا' اس کو سمجھالے ورنہ مجھے بڑے طریقے آتے ہیں سدھارنے کے۔" یعنی وہ انسان نہ ہو کوئی گھوڑا یا گدھا ہو۔

"اماں! میں نے کہہ دیا بس اب تو ابا سے بات کرلے ہاں۔" وہ تو سب کچھ طے کیے بیٹھی تھی۔ معاذ کے کان کھڑے ہوگئے۔

"چل کرلوں گی بات۔ اس میں کیا ہے بلکہ اس کو تو خوش ہونا چاہیے نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ادھر گھر بھی مل جائے گا اور گھر والی بھی۔ کوئی دمڑی لگائے بغیر اور تیرے ابا سے زمین میں حصہ بھی ولادوں گی ظفری سے زیادہ۔ اب تو خوش ہے ناتو ماجے؟" اماں اس کے اتنے پیارے نام کو اس اختصار سے پکارتی تو اس کا جی چاہتا کہیں ڈوب مرے۔

"ہاں تو اور کیلکے چتر اس کے بھیجے میں یہ بات نہیں آتی اماں! بس تو وہاں کی تیاری پکڑ۔ اس کو میں خود ہی سنبھال لوں گی۔" وہ اماوس کی رات اسے لے پالک بنائے بیٹھی تھی۔

"منہ دھو رکھو تم اپنا فضول لڑکی!" آخر کتنا صبر کرتا کہہ بیٹھا بس پھر...!

"تو نے مجھے فضول کہا۔ اماں سنا تو نے؟" وہ بے قابو ہو کر اتنی زور سے چیخی کہ اماں تو کیا قبرستان کے مردے بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے اور اماں کے کوئی جواب دینے سے پیشتر ہی اس نے ماں کو جھنجوڑ ڈالا۔

"اماں! سنتی ہو؟" اس نے اور گلا پھاڑا۔

"ہو چیخ کیوں رہی ہے تو فکر نہ کر۔ اس کے تو بڑے بھی سیدھے ہو جائیں گے' یہ کیا چیز ہے۔ آج ہی تیرے ابا سے بات کرتی ہوں نہ مانا تو دیکھنا اور بڑے طریقے آتے ہیں تیری ماں کو۔ تیری آنکھ میں آنسو نہیں آنے دوں گی۔" ماں بیٹی سے بھی زیادہ وہ فضول ہے۔ معاذ نے دل میں سوچا اور اٹھ کر باہر چل دیا۔

اسے آئے ابھی پندرہ دن نہیں ہوئے تھے اور وہ الٹا تو اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی۔ جاگ رہا ہوتا تو آکر اس کی پائنتی بیٹھ جاتی۔ اس کے پیر دبانے لگتی۔ کبھی سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی۔ وہ وحشت زدہ ہو کر سوتے میں اٹھ کر بھاگتا' وہ اس کے پیچھے پیچھے آجاتی۔ اس نے سارے گاؤں میں مشہور کر دیا تھا کہ میری آج کل میں معاذ سے شادی ہونے والی ہے' سب نے جیسے یقین کر لیا تھا۔ ظفر بھی شاید ان باتوں پر یقین کر بیٹھا تھا۔ تب ہی تو اس رات وہ بستر پر لیٹا تارے گننے کے ساتھ ساتھ دل میں یہاں سے جانے کے دن گن رہا تھا جب ظفر اس کے پاس آکر پوچھ بیٹھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

باہر کا موسم بھلے کتنا ہی حسین و دلفریب کیوں نہ ہو' اندر اگر اداسیاں پر پھیلا کر بیٹھ جائیں تو باہر کے موسم کی اٹھکھیلیاں بیزار کرتی ہیں۔ کتنے ہی دنوں سے اداسی اس کے اندر اس طرح سے پنجے جما کر بیٹھی تھی کہ جونک کی طرح۔ بہلانے کے باوجود وہ اس بے سبب اداسی سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی اور اس کا اظہار بھی وہ کسی سے نہیں کر سکتی تھی ویسے بھی سننے والا کون تھا۔ ابو جی کی حالت نے تو پہلے ہی اس کا دل سہار رکھا تھا۔ وہ ان کے سامنے اپنے اندر اداسی سے لبالب بھرے اس پریشر ککر کی ذرا سی بھاپ بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ بس خود پر خاموشی اور جبر کا سیفٹی والو لگائے اس مار دینے والی اداسی کو جھیل رہی تھی۔

کتنے ہی دن ہوگئے تھے کیپٹن شہباز کا نہ کوئی فون آیا تھا نہ کوئی خبر' پھپھو کا فون بھی بس پچھلے ہفتے آیا تھا اور ان سے بھلا وہ کیا بات کر سکتی تھی۔ بھائی تو پہلے ہی انجان بنے بیٹھے تھے' راحیلہ دوسرے چوتھے روز فون کر لیتی تھی اس سے وہ اس فضول سی اداسی کا کیا سبب بیان کرتی۔ وہ الٹا مذاق اڑانا شروع کر دیتی۔

حالانکہ آج کل تو وہ ابو کو بھرپور کمپنی دے رہی تھی' ان کو اخبار پڑھ کر سناتی۔ سیاسی خبروں پر بحث کرتی۔ ٹی وی کا ہر نکما پروگرام ضرور ان سے ڈسکس کرتی۔ فضول بولتی جاتی سارا دن بغیر تھکے گھر کے سارے کام کیے جاتی۔ زندگی بظاہر بے حد مصروف لگنے لگی تھی مگر "لگنے" میں اور "ہونے" میں بڑا فرق ہوتا ہے اور وہ ہزار جتن کے باوجود اس فرق کو نہیں مٹا سکی تھی۔ اپنی ہنسی بھی اس کو کھوکھلی لگتی تھی' سارے دن کی تھکن کے بعد جب بستر پر لیٹتی تو نیند اس کی آنکھوں سے اڑن چھو ہو جاتی۔

وہ اپنی کیفیت پر خود پریشان تھی۔

"آخر کیا ہونے والا ہے؟" اس نے تھک کر خود سے پوچھا۔

"وہی جس سے تم آنکھیں چرا رہی ہو۔" کوئی اندر سے بے ساختہ بولا تو جیسے اس کی جان ہوا ہونے لگی۔

"فضول وسوسے۔" اس نے زور سے سر جھٹکا اور چائے کے لیے کھولتے پانی میں پتی ڈالنے لگی۔

"اب تو ابو جی کافی بہتر ہیں شکر ہے اللہ کا۔" وہ خود سے بولی۔ "اب تو انہوں نے بھائی کی فکر کرنی بھی چھوڑ دی ہے۔ اچھا ہے اگر انہیں ہماری پروا نہیں تو ہمیں بھی ان کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ کپ نکالتے ہوئے خود سے بولی اسی وقت باہر گاڑی کا ہارن زور زور سے بجنے لگا۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے باہر گیٹ کی طرف دیکھا۔ ہارن مسلسل بج رہا تھا۔

"ابو ڈسٹرب ہوں گے۔ دیکھتی ہوں۔ باہر کون ہے' بے وقوف مسلسل ہارن پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔" وہ بڑبڑاتی باہر جانے لگی عین اسی وقت ریشم اپنے کمرے سے نکلی۔

ریڈ نیٹ کی ٹائٹ شرٹ کے ساتھ بلیک ٹراؤزر میں ملبوس' فل میک اپ کیے' خوشبوؤں میں بسی وہ کھڑکی کے پاس سے گزری۔ اس کے نازک جوتے کی باریک ہیل ٹک ٹک کرتی چند لمحوں کے لیے گھر کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر گئی' وہ گیٹ کھول کر باہر چلی گئی۔

نزہت نے صحن میں لگے وال کلاک کی طرف دیکھا رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ بھائی بھی ابھی تک نہیں آئے تھے اور یہ خدا جانے... اس نے کتنی دیر کا رکا ہوا سانس خارج کیا اور چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔ باہر صحن تک آکر اس نے یونہی سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ کالا سیاہ آسمان تاروں سے جگر جگر کر رہا تھا۔ "یہ ٹائم تھا اس کے جانے کا بھلا؟ نہ جانے ہوتی کہاں ہے۔" وہ خود سے بولی گیٹ بند کر کے ابو کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"اب اللہ کرے ابو جی نہ پوچھیں کہ گیٹ پر کون تھا۔" وہ دروازے کے آگے رک گئی۔

"کہہ دوں گی۔ کوئی بھائی کو پوچھنے آیا تھا۔" اس نے قدم دروازے کے اندر رکھا۔

"مگر اس کی ہیل کی ٹک ٹک پیروں میں چھنکتی پازیبوں اور بازوؤں میں کھنکتی چوڑیوں کی آواز ضرور ابو نے سنی ہو گی اور انہیں ضرور خبر ہو گئی ہو گی۔ اب کیا بہانہ کروں گی کہیں پھر نہ ابو کی طبیعت خراب ہو جائے۔

"ابو جی نے ضرور ساری آوازیں سنی ہوں گی۔ رحم کرنا۔" اس نے دھیرے سے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی اور آہستگی سے ان کے بستر کی طرف بڑھی۔

"ابو جی! آپ سو تو نہیں گئے۔ چائے میں کچھ دیر لگ گئی تھی۔" اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ذرا اونچی آواز میں بولی۔ اس کی آواز جیسے پورے سارے گھر میں گونج کر رہ گئی۔ وہ ایک دم سے خوفزدہ ہو گئی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا نہ پلکیں جھپکی تھیں نہ اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ابو جی!" وہ ڈرتے ڈرتے ان کی طرف بڑھی' انہوں نے کوئی حرکت نہ کی۔

"ابو جی!" اب کے اس نے قریب جا کر زور سے پکارا اور ان کا سینے پر دھرا ہاتھ دھیرے سے ہلایا جو اگلے ہی لمحے جھول کر نیچے آگرا۔ وہ ششدر رہ گئی۔ ان کی آنکھیں بے جان ہو چکی تھیں' وہ اسے ہر قسم کے سوال و جواب سے آزاد کر گئے تھے۔

"ابو جی!" اس کی دل دوز چیخ نے' اتنے دنوں کی چھائی خاموشی و سناٹے کی اس بھیانک چادر کو چیر ڈالا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"جھومرا تمہاری دادی بہت خوبصورت ہے کیا؟" زینب کے لہجے میں حسرت' رشک اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

"خوبصورت؟" جھومر نے جیسے فضا میں مکھی اڑائی۔ "ارے خوبصورتی کا لفظ ہی میری دادی سے نکلا ہے۔

کوئی اگر پوچھے خوبصورت کسے کہتے ہیں تو اس کا جواب ہوگا وادئ سوات۔"

اس کے لہجے میں فخر، غرور، محبت اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

"ایسا کیا ہے اس میں؟" زینب نے کچھ منہ بنا کر پوچھا۔

"ایسا کیا نہیں ہے اس میں۔ پہاڑ اتنے بلند و بالا کہ ہیبت کی تشریح ان سے ہوتی ہے۔ سرسبز و شاداب گھاٹیاں کہ انسان سمجھے میں اپنی جنت میں واپس آگیا ہوں۔ برفیلے شفاف پانی کہ آئینہ ان میں اپنی صورت دیکھے تو ترخ جائے اور سب سے بڑھ کر دریائے سوات۔ واہ واہ۔ کیا کہنے۔" اس نے جیسے آہ بھری کہ اسے اظہار کے لیے شاید لفظ نہیں مل رہے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے اس کی خوبصورتیوں کی تصویر بصیرت کے آئینے پر لا رہی تھی۔

"جیسے مرد ہوتے ہیں، کون سے ہوتے ہیں؟" وہ آنکھیں کھول کر ایک دم سے بولی، سر جھکا کے مشین چلاتی آمنہ بھی ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی ہیروں کی طرح جگمگاتی آنکھیں زندگی سے بھرپور تھیں، چاشت کے روشن لمحے اس کے چہرے کی سرخی و سفیدی کے آگے جیسے شرما رہے تھے۔

"جیسے مرد وہ ہوتے ہیں جو اوپر سے نیک اور مسکین سے دکھیں اور اندر سے بدنیت اور موقع شناس۔ دریائے سوات بھی ایسا ہی ہے۔" اس نے عجیب تشبیہ گھڑی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی دریائے سوات اور مرد۔" بات زینب کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

"دریائے سوات کو مینگورہ سے ذرا آگے دیکھو تو مسکین سا سہما سہما سمٹ کر بہنے والا۔ یہی دریا کالام میں جا کر بدمست شیر بن کر دھاڑنے لگتا ہے۔ اس کی روانی اور شور کے آگے ساری آوازیں دم توڑ دیتی ہیں، اس کا پاٹ اس قدر چوڑا ہو جاتا ہے کہ جو اس میں ایک بار گم ہو جائے پھر نہیں ملتا۔"

"لڑکیو!" استانی جی کی گرجدار آواز سنائی دی۔ "یہ کام ہو رہا ہے؟" اس کا لہجہ ایکدم سے مدھم ہو گیا۔

"ثریا! جھومر کو بولنے کی بیماری ہے اور بدحرامی کی بھی۔ اس کو اپنے پاس بٹھا کر ان کو کام نہیں کرنے دے گی اور اس کی ہنسی کی آواز گھر کی دیواریں پھلانگتی جنگل تک جاتی ہے۔ کل صوفی صاحب ماسٹر صاحب سے شکایت کر کے گئے ہیں کہ مہمان سے کہیں۔ دھیمی آواز میں ہنسا کریں۔" استانی جی دھیمی آواز میں چبا چبا کر بول رہی تھیں۔

"اماں کی طرح کوڑھ مغز ہوتی تو میٹرک نہ کرتی۔ تمہاری طرح لکڑیاں ڈھو رہی ہوتی اور ابا جیسے کسی ظالم سر پھرے شوہر کی جوتیاں سیدھی کر کے نسوار کی ڈبیا بھر رہی ہوتی۔" وہ کون سا ڈرنے والی تھی اسی والیوم میں ترخ کر بولی۔

"او میرے خدا!" استانی جی نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "لڑکی دھیرے بول یہ شریفوں کا علاقہ ہے۔ گاؤں کے یہ پہاڑ نہیں جہاں کوئی سننے والا نہیں۔ کیوں ہماری عزت کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئی ہے۔ کوئی سنے تو جانے جنگل سے آئی ہو۔" استانی جی آخر میں بالکل ہی من من کرنے لگیں، آخری جملے انہیں سنائی ہی نہ دیے۔

"کھالہ (خالہ) اونچا بولا کرو "لڑکیو" یہ جان نکال لیتی ہو اور باقی سب کچھ پتا نہیں کس کو سناتی ہو۔ مجھے تو بس مکھیوں کی بھن بھن سنائی دیتی ہے۔ اچھا اب دھیما بولوں گی۔ تم اماں سے بات کرو۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟" وہ استانی جی کو نپٹا کر ان کی طرف مڑی۔

"اماں کی بچی!" اس کی ماں نے بیٹھے بیٹھے پاؤں سے چپل نکال کر اس کی کمر کا نشانہ لیا۔

"ہائے میں مرگئی اماں! کیا کہوں تجھے۔" وہ درد سے جھکتے ہوئے بولی۔

"اب حلق پھاڑ کر چیخی تو جلتی لکڑی لا کر تیرے حلق میں ٹھونس دوں گی نامراد۔" اس کی ماں کا والیوم اس سے بھی اونچا تھا، استانی جی نے گھور کر بہن کو دیکھا۔

"پہلے تم تو دھیما بول لو۔ حد ہے۔ لڑکیو!" وہ ایک دم سے دونوں کو دیکھ کر گرجیں جو ماں بیٹی کا کامیڈی شو مزے سے دیکھ رہی تھیں۔ استانی جی کی لڑکیو پر تینوں سر جھکا کر کھٹ کھٹ کرنے لگیں۔

"پتا ہے۔ حویلی میں شادی ہے چھوٹے شاہ جی کی۔" زینب نے جھومر کو اطلاع دی۔

"اچھا پھر؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تم چلو نا۔ آج کل ادھر ڈھولک بھی رکھی ہوئی ہے۔ صبح کو میلاد بھی ہوتا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ صبح کو میلاد، شام کو محفل موسیقی۔" وہ کھرے پن سے بولی۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" زینب نے کندھے اچکائے۔

"تم تو جاتی ہو گی ڈھولک پر؟" اس نے استفسار کیا۔

"نہیں صرف میلاد میں۔ ایک دن تھوڑی دیر کے لیے گئے تھے اور بس۔" زینب نے یاس زدہ لہجے میں کہا۔

"کھالہ (خالہ) سے کہوں گی کہ چلے۔ پر نہیں۔ وہ نہیں مانیں گی، ویسے بھی ان کے ساتھ جانے سے بہتر ہے بندہ نہ جائے۔" وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"ہمارے ساتھ چلنا میلاد میں۔" آمنہ نے پیشکش کی۔

"جانا ہے تو ہم ڈھولک میں چلیں گے تمہارے ساتھ۔ اماں سے کہوں گی۔"

"پھر کل چلیں گے شادی میں آٹھ دس دن تو رہ گئے ہیں، بڑا مزہ آتا ہے ویسے ادھر۔" زینب تو پہلے ہی تیار تھی۔

"پر میرے پاس تو اچھے کپڑے نہیں ہیں۔" جھومر مایوسی سے بولی۔

"ہم نے کوئی شادی میں جانا ہے۔ ابھی تم ان ہی کپڑوں میں چلنا سب پر رعب پڑے گا کہ تم سوات سے آئی ہو۔" آمنہ نے فوراً کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں اماں سے پوچھ لوں گی۔ وہ مان جائے گی۔ تم کل صبح جلدی آ جانا۔"

"ادھر ہی سے۔" زینب بولی۔ "ہمارے گھر نہیں آؤ گی؟"

"ہاں ادھر ہی سے۔ تمہارے گھر پھر بھی سہی۔"

"بابا صاحب کو بتانا ہو گا۔ ہے نا زینو؟" آمنہ بولی۔

"نہیں۔ ہم اماں جی کو بتا کر آئیں گے۔ اس میں کیا ہے حویلی ہی تو جانا ہے۔ ماسٹر صاحب ہمیں چھوڑ آئیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں یہ صحیح ہے۔"

"لڑکیو!" استانی جی کی گرج پر دونوں سر جھکا کر کام کرنے لگیں۔ جھومر البتہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"بی بی صیب! چائے؟" جنتاں کی آواز پر رعنا نے چونک کر اسے دیکھا۔ کاؤچ پر نیم دراز وہ گہری سوچ میں گم تھی۔

"ہاں رکھ دو۔" اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی، جنتاں چائے رکھ کر کھڑی ہوئی تو رعنا دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں دبا رہی تھی۔

"بی بی صیب! طبیعت ٹھیک ہے۔" اس نے کچھ ڈرتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ہوں!" اس نے یونہی کہہ کر گردن جھٹکی۔ "ٹھیک ہوں میں، صاحب نہیں آئے ابھی تمہارے۔"

"نہیں جی۔ ابھی تو پانچ بجے ہیں۔ صاحب جی چھ بجے تک آتے ہیں۔"

"اندھی ہو گئی ہو تم۔ اپنی آئی سائٹ چیک کراؤ۔ چھ بج رہے ہیں۔" رعنا ماتھے پر بل ڈال کر ناگواری سے کلاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"معاف کرنا جی۔ وہ جی میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔"

رعنا نے ایک نظر کچھ بیزاری سے اسے دیکھا پھر چپل پہن لی اور سر کاؤچ کی بیک سے ٹکا دیا۔

''سر دبادوں جی آپ کا'' وہ کچھ لجاجت سے بولی' رانا چپ رہی۔
''دبادو۔ بہت درد ہے۔ پین کلر بھی لی ہے مگر۔'' وہ آنکھیں موند کر بولی تو جنتاں آگے بڑھ کر دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگی۔
اسکائی بلو جارجٹ کے سوٹ پر نیوی بلو شیشوں اور کڑھائی کا کام تھا۔ سادہ سے سوٹ میں اس کا خوبصورت سراپا صندلی کاؤچ کی جیسے قیمت بڑھا گیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت میک اپ کے بغیر بھی دمک رہی تھی۔ غلافی بند پپوٹوں کے نیچے اس کی سرمئی آنکھیں جیسے ساکت تھیں۔ جنتاں کے جھریوں بھرے سانولے موٹے ہاتھوں کے نیچے خوشبودار اخروٹی گھنگھریالی زلفوں کی آبشار تھی۔
''کاش اتنے حسین وجود کے اندر دل بھی اتنا ہی حسین ہوتا۔''
جنتاں کے دل سے سسکی سی نکلی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگیں۔
''ہاتھوں میں جان نہیں ہے تیرے۔ چل چھوڑ سارے بال خراب کر دیے۔'' رعنا نے اس کے ہاتھ حقارت سے پرے جھٹکے اور بالوں پر نزاکت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔
''ساڑھے چھ ہو رہے ہیں' یہ فخر آج کل کچھ زیادہ لیٹ نہیں آنے لگے۔'' اس کی بے چین نظریں پھر سے گھڑی کی سوئیوں سے جا ٹکرائیں۔ جنتاں مودب کھڑی رہی' رعنا نے کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔
''اچھی چائے بنانے لگی ہو اب تم۔'' پتا نہیں کیسے تعریف رعنا کے منہ سے پھسل گئی۔
''سیفی کہاں ہے؟'' چند لمحوں بعد اس نے پوچھا۔
''بابا صاحب کا استاد آگیا ہے جی۔ وہ پڑھ رہے ہیں۔'' جنتاں دھیمے لہجے میں بولی۔ دو آنسو اس کی جھکی نظروں سے پھسل کر اس کے میلے آنچل میں سما گئے۔
''پڑھ رہے ہیں۔'' رعنا بڑبڑائی۔ ''اس لڑکے کے بھیجے میں پتا نہیں [illegible] نہیں [illegible] اس کا فائنل رزلٹ۔ او گاڈ۔'' اس نے کپ تپائی پر رکھ دیا۔
''اسی دن سے فخری کا موڈ بے حد خراب ہے۔ آخر وہ بھی بے چارے کیا کریں۔ اس سیفی کے بچے کو دنیا جہاں کی ہر سہولت' ہر آسائش میسر ہے۔ پھر بھی اس قدر پوئر رزلٹ میرا تو سر ہی شرم سے جھک گیا اس کا کارڈ فخری کو دکھاتے ہوئے۔ پتا نہیں اس کا کیا بنے گا سارا الزام سارا تاؤ تو ماں ہی سہتی ہے نا۔'' کہتے کہتے وہ افسردہ ہو گئی' جنتاں چپ رہی مگر اس کے دل کو جیسے ایک گونہ خوشی کا احساس ہوا (نہ جانے کیوں؟)
''میں جاؤں جی؟'' وہ چند لمحوں بعد بولی۔
''جنتاں! جب میں باہر جاتی ہوں صبح شام میں' تو بابا صاحب کیا کرتے رہتے ہیں اپنے کمرے میں؟'' وہ اس کے جانے کے سوال کو نظر انداز کر کے پُرسوچ لہجے میں بولی۔
''اپنے کمرے میں ہی ہوتے ہیں جی۔'' وہ سادگی سے بولی۔
''کمرے میں تو سارا ٹائم نہیں رہتا اور اگر رہتا بھی ہے تو کیا کرتا رہتا ہے کمرے میں کبھی دیکھا۔'' وہ کچھ کڑے لہجے میں بولی۔
''نہیں جی۔ بابا صاب خفا ہوتے ہیں کمرے میں نہیں آنے دیتے' فون کرتے رہتے ہیں شاید اس لیے۔'' وہ کچھ ڈرتے ڈرتے بولی۔
''یہ موبائل نے اس کا بیڑہ غرق کر دیا ہے اسٹوپڈ۔'' رعنا خود سے بولی۔ اسی وقت باہر پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔
''صاحب آگئے ہیں جی!'' جنتاں فوراً بولی۔
''یہ کپ لے جاؤ۔'' رعنا نے خالی کپ اس کی طرف بڑھایا' جسے پکڑ کر وہ باہر نکل گئی۔
''ہیلو ڈارلنگ! ہاؤ آر یو؟'' فخر حیات کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب عادت فریش لہجے میں بولے۔

''فائن!'' وہ انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''حیرت ہے۔ آج آپ اس وقت گھر پر موجود ہیں۔'' فخر حیات کا لہجہ طنزیہ تھا یا رعنا کو لگا۔ اس نے کچھ غور سے فخر کے چہرے کی طرف دیکھا۔
''میں تو اب اکثر ہی گھر پر ہوتی ہوں' ہاں آپ آج کل خاصے مصروف ہونے لگے ہیں۔'' وہ ان کا کوٹ اتارتے ہوئے بولی۔
''بزنس جو بڑھ گیا ہے جاناں لیکن۔'' انہوں نے کاؤچ پر بیٹھ کر شوز اتارنے شروع کیے۔ ''آپ آج کل گھر پر کیوں پائی جا رہی ہیں؟''
''ویسے ہی۔ میں نے اپنی ایکٹیویٹیز کچھ کم کر دی ہیں۔'' وہ سرسری سے لہجے میں بولی۔
''خیریت؟'' وہ اچنبھے سے بولے۔
''سیفی کی اِل پرفارمنس کی وجہ سے۔''
''ہاہ!'' وہ زور سے [illegible] تمسخرانہ انداز میں ہنسے ''اس اسپیشل اٹینشن کا سیفی صاحب پر کیا اثر ہوگا بھلا۔''
''فخری پلیز! اس طرح تو مت بی ہیو کریں۔ بچہ آپ کے رویے جج (سمجھ) کر سکتا ہے۔'' رعنا نے نرم لہجے میں احتجاج کیا۔
''آئی نو اور تمہیں معلوم ہے نا کہ میں نے اسے کبھی اگنور نہیں کیا مگر اس کے باوجود اس کا رزلٹ۔'' انہوں نے سر جھٹکا۔ ''رعنا! میں سیفی کی طرف سے سخت ڈس ہارٹ (دل برداشتہ) ہو چکا ہوں۔''
''پلیز فخری آپ اگر حوصلہ ہار دیں گے تو میں کیا کروں گی۔ مجھے یقین ہے اے لیول میں وہ بہت اچھی پرفارمنس شو کرے گا۔ وہ اپنے رزلٹ پر شرمندہ ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' وہ فخر حیات کے کندھے تھامے انہیں حوصلہ [illegible]
[illegible]
''اوکے دیکھ لیتے ہیں۔'' انہوں نے کندھے اچکائے۔
''تم ذرا چائے کا تو کہو۔ میں ہاتھ لے لوں۔ آج آفس میں بھی چائے پینے کا ٹائم نہیں مل سکا پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ چائے کے بعد لانگ ڈرائیو پر نکلتے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھے۔
''اور تم اپنا یہ بیماروں جیسا حلیہ تو درست کرو۔ رعنا! میں تمہیں ہمیشہ فریش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے نا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔
''میں۔'' وہ اپنے حلیے پر نگاہ کر کے کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ ''آپ ہاتھ لے کر آئیں۔ میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔ سر میں درد تھا۔ اب ٹھیک ہے۔'' وہ ہونٹوں کے کونے ذرا سے پھیلا کر بولی۔
''اوکے!'' وہ واش روم میں چلے گئے تو رعنا ان کا کوٹ وارڈ روب میں ہینگ کرنے لگی۔ وارڈ روب کا دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے کوٹ کا باہر نکلا حصہ ہاتھ سے اندر کیا تو اندرونی جیب میں جیسے کوئی کاغذ سا چبھا اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔
وہ کوئی تصویر تھی کسی خوبصورت بلکہ بہت خوبصورت لڑکی کی۔ رعنا جیسے گنگ رہ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

''ابو جی نے مجھے کبھی بہو نہیں کہا تھا' ہمیشہ بیٹی کہتے تھے۔ اصل بیٹیاں تو بہوئیں ہوتی ہیں کہ انہوں نے آخر دم تک ساتھ رہنا ہوتا ہے۔ بیٹیاں تو اپنے گھروں کو چلی جاتی ہیں' ہمیشہ مجھے نزہت پر ترجیح دیتے' کہتے تھے تم اس گھر کی اصل مالکن ہو' یہ تو مہمان ہے۔ ہائے میرے اتنے پیار کرنے والے ابو جی ہمیں کیوں تنہا چھوڑ گئے۔ ہم تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا رات کا۔ نزہت چائے بنانے گئی تو میرا بھائی آگیا مجھے لینے کہ ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہائے ابو جی میں کیوں اس کے ساتھ چلی گئی۔ آپ سے آخری بات بھی کوئی نہ کر سکی۔ آپ نے تو چپکے سے منہ موڑ لیا ہائے۔''

یہ بین، یہ واویلا ریشم کا تھا یا اس کے کان دھوکا کھا رہے تھے۔ اگر یہ آواز ریشم کی تھی تو پھر واقعی دنیا میں ہر چیز دھوکا ہے۔ کسی کا کوئی اصل نہیں۔ ہر اصل کے نیچے ایک اور اصل ہے۔ کچھ بھی نقل نہیں۔ نزہت ابوجی کی چارپائی کی پٹی پر سر ٹکائے پتھر ہوئی بیٹھی ریشم کی ان ترانیاں سن رہی تھی۔

"سر سوکا اتنا پیار کہاں سننے میں آتا ہے آج کل۔ بچی صبر کر۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ایک عورت پیچھے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"ارے ان لوگوں نے تو مشہور کر رکھا تھا کہ بہو ٹھیک نہیں مگر یہ تو...." ارد گرد کے گھروں کی عورتیں اور خاندان والے ریشم کی چیخ و پکار سے متاثر ہو کر چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ پھر جنازہ اٹھنے پر اس نے جو کہرام مچایا لوگ نزہت کی غشی کو بھول گئے۔ اس کو کتنی عورتوں نے قابو کر رکھا تھا اور وہ چیخ چیخ کر بین کیے جا رہی تھی۔ جنازہ جانے کے کتنی دیر بعد وہ بمشکل سنبھلی۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوا تو سب کو پوچھنے میں ریشم آگے آگے تھی اور نزہت کو دلاسا دینے میں بھی۔

"نزی میری بہن! صبر کرو اللہ کو یہی منظور تھا۔" وہ اسے بغل میں دبائے دلاسا دینے لگی۔

"اللہ میری خطائیں معاف کرے۔ ان کی خدمت میری قسمت میں نہ تھی۔ میں نے ان کی قدر نہ جانی نہ تمہاری۔ مجھے معاف کر دو۔ میری اچھی بہن! میں تم لوگوں کے لائق نہ تھی شاید۔ میں بھی کوشش کے باوجود اپنے دل کو تم لوگوں کے لیے وسیع نہ کر سکی۔ یہ سب اللہ کی مرضی سے ہوا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔"

وہ نزہت کے آنسو پونچھتے ہوئے دھیرے دھیرے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہے جا رہی تھی اور نزہت تو ریشم کے اس روپ پر ابوجی کا صدمہ بھی جیسے بھول چلی تھی۔ سوئم کے بعد دور پرے کے رشتے دار جانے لگے۔ گہرے سرمئی کاٹن کے سوٹ میں ملبوس سلیقے سے دوپٹے کی بکل مارے ریشم دیکھ بھال میں آگے آگے تھی۔ نزہت تو ایک کونے میں بیٹھی بس کلام پاک پڑھے جا رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے۔

"سہیل بیٹا! ہم چاہتے ہیں ایک دو روز میں جب تک میں یہاں ہوں ہم نکاح کر لیں اور رخصتی چالیسویں کے فوراً بعد۔"

مسز خان کی آنسوؤں میں بھیگی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ ابوجی کے کمرے میں بیٹھی تھیں کمرے کی کھڑکی لاؤنج میں کھلتی تھی۔ جہاں وہ بیٹھی کلام پاک پڑھ رہی تھی، دو موتی اس کی آنکھوں سے ٹپک کر مقدس صحیفے میں جذب ہو گئے۔

"پھپھو اس قدر جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے نزہت آپ کی امانت ہے۔ چالیسویں کے بعد کوئی سا دن رکھ لیں گے شادی کا۔" سہیل نے جواب دیا۔

"نہیں بیٹا! اب اور دیر نہیں کرنی۔ اب میرے دل نے اس بات کی صلاح دی ہے۔ پہلے ہی بہت دیر کر دی میں نے۔ میرا بھائی تشنہ لب چلا گیا، اللہ اس کی روح کو ٹھنڈا رکھے۔ میں بس آج کل میں یہ کام کر لینا چاہتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔ شہباز کی چھٹی بس آج کی ہے۔ اس لیے تم آج شام کا وقت رکھ لو۔ نیک کام ہے۔ اس میں کون سے ہم نے باجے گاجے بجوانے ہیں۔ یہ میرے دل کی خواہش ہے بیٹا!"

"مگر پھپھو! لوگ کیا کہیں گے۔ ابھی تو ابوجی!" وہ چپ ہو گیا۔

"سہیل! یہ بات تم مت کہو کہ لوگ کیا کہیں گے۔ تمہیں یہ سوٹ نہیں کرتا۔" مسز خان کے بڑے بیٹے ایاز کا لہجہ بہت کچھ جتا دینے والا تھا۔

سہیل نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ معاملہ گرم ہو جاتا مسز خان بیچ میں آ گئیں۔

"ایاز! تم چپ کرو۔ سہیل بیٹا! تمہاری کیا صلاح ہے۔ بیٹا ہم کوئی غیر تو ہیں نہیں۔ نہ ہمیں جہیز کا لالچ ہے نہ کسی اور کا۔ بس یہ بچی میرے دل کی خوشی ہے اور اس کے اپنا ہو جانے کا خوش کن احساس مجھے دے دو۔ مجھ پر

تمہارا یہ احسان ہوگا۔" وہ عاجزی و محبت سے بولیں۔

"ٹھیک ہے پھپھو! جیسی آپ کی خوشی۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"پھر آج شام چھ بجے کا ٹائم ٹھیک رہے گا۔ سارا انتظام ایاز اور اظہر تمہارے ساتھ مل کر کریں گے کیونکہ شہباز کو علی الصبح یہاں سے روانہ ہونا ہے۔" وہ باقی تفصیلات طے کرنے لگیں، اس سے کلام پاک پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

"نزہت! ذرا میرے ساتھ آؤ۔" ایک دم سے ریشم اس کے پاس آ کر بڑی محبت سے بولی۔

"...کہاں؟" وہ اس کی اچانک آمد سے اچھل ہی تو پڑی تھی۔

"ڈرائنگ روم تک۔ میری کچھ عزیز خواتین تمہیں پرسہ دینا چاہتی ہیں ان کے پاس۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس نے کلام پاک بند کر کے اوپر الماری میں رکھا اور دوپٹہ درست کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی۔

ڈرائنگ روم میں دو پینتیس چالیس کے درمیان کی عمروں والی خواتین بیٹھی تھیں، قیمتی مگر سادہ لباس میں ان کے چہرے [illegible] تھے، وہ شکل ہی سے خرانٹ اور چلتا پرزہ ٹائپ لگ رہی تھیں۔ سانولی سلونی رنگت پر دونوں نے [illegible] تھا۔ تعارف کرانے پر دونوں نزہت کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"میری آنٹی صنوبر [illegible] اور [illegible]" ریشم تعارف کرا کے ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"بہت افسوس ہوا آپ کے والد کی [illegible] کا سن کر۔" صنوبر کے لہجے میں کہیں بھی افسوس کا شائبہ نہیں تھا جیسے کوئی [illegible] اجلہ پڑھتا ہے۔ البتہ اس کی [illegible] گول گول آنکھیں نزہت کے سراپے کا بھرپور اور باریک بینی سے جائزہ [illegible] کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ صنوبر نے آنکھ سے عارفہ اور [illegible] دونوں جیسے [illegible] اٹھیں۔ نزہت کو عجیب سی وحشت نے آ گھیرا۔

[illegible] مجھے کچھ کام ہے۔" وہ ایک دم سے اٹھی اور ان کے جواب دینے سے پہلے ہی تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور تیز قدموں سے کاریڈور میں چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی کہ دوسری طرف سے آتے شہباز سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس کے وجود سے پہلے ہی پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ انہیں سامنے دیکھ کر اور حواس باختہ ہو گئی۔ دروازے کے آگے تو وہ کھڑے تھے۔

"پلیز نزہت ایک منٹ [illegible] جگہ سے ہلے بغیر بولے تو وہ کھڑی رہ گئی۔

"بہت افسوس ہوا مجھے ماموں جان کا کہ میں چاہوں بھی تو لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔" ان کا لہجہ دکھ کا غماز تھا۔ وہ سر جھکائے چپ کھڑی رہی مگر آنسوؤں کا ریلا سا آنکھوں میں امڈ آیا۔ کتنے ہی لمحے خاموشی سے [illegible] گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک ایک کر کے بہنے لگے۔

"بس کرو پلیز مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" شہباز نے آگے بڑھ کر انگلی کی پور سے اس کے اشک پونچھے۔ "کاش میرے پاس تمہارے دکھ کا مداوا ہوتا۔

"مگر یہ سب قدرت کی طرف سے ہے جس کا کوئی مداوا نہیں کر سکتا مگر میں یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ تمہارا یہ دکھ آخری تھا۔ اس کے بعد آنسو بہانے کے لیے تم کبھی تنہا نہیں ہو گی۔ ہر آنسو، ہر ہنسی میں میں تمہارا شریک ہوں گا۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر میری یہ ہر ممکن کوشش ہو گی کہ کبھی تمہاری آنکھوں میں ایسی برسات نہ اترے۔ میرا پیار تمہارے ہر دکھ کا مداوا بن جائے۔ ان شاء اللہ۔"

اس سے اب کھڑے رہنا محال ہو گیا تھا اگر کوئی دیکھ لے تو۔ اس کے دل میں خدشہ ابھرا۔

"اور مبارک ہو۔" وہ اب اس کے چہرے کو مکمل طور پر فوکس کیے ہوئے تھے۔ اس نے چونک کر ایک پل کو پلکیں اٹھائیں۔ ان کی محبت پاش نگاہوں کی تاب نہ لا کر پھر سے جھکا دیں۔

"آج شام کو ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ نزہت! اب یہ دوری چند دنوں کی ہے۔ کوئی میرے دل سے

پوچھے کہ ان لمحوں سے بڑھ کر قیمتی میری زندگی میں کوئی لمحہ نہیں ہوگا جب تمہارا نام میرے نام کو معتبر کردے گا۔ تم بھی ایسا ہی سوچتی ہو نا۔"

وہ اس کے جھکتے ہوئے چہرے کے قریب ہو کر بولے تو اس کی سانسیں گھٹنے لگیں۔

"جائیے۔۔۔ پلیز۔" اپنی آواز خود اس تک بھی نہیں پہنچی تھی۔

"کم از کم مبارک ہی دے دو کنجوس!" وہ شاید اس کی حالت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"کس بات کی؟" وہ بے ساختہ گھبرا کر پوچھ بیٹھی۔

"میرا شام کو نکاح ہے نا۔ تم آؤ گی؟" وہ شرارت سے بولے۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" وہ کہہ کر جھپاک سے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"تمہارے تو بڑے بھی آئیں گے۔ قاضی صاحب تمہیں کان سے پکڑ کر لائیں گے۔ دیکھتا ہوں۔ کتنی دیر چھپو گی۔" وہ کہتے ہوئے لاؤنج کی طرف مڑ گئے اور وہ بند دروازے کے پیچھے کھڑی اپنے دل کی منتشر دھڑکنوں کو سنبھالنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"نین تارا! رک جاؤ۔" سلطان بخت کی غصیلی مگر مدھم آواز نے قدم بڑھاتی نین تارا کے قدموں کو جیسے جکڑ لیا۔ انہوں نے پیچھے سے اس کے کندھوں کو سختی سے پکڑا اور اپنی طرف اسے گھمایا۔

"کیا یہ تمہارا مطالبہ نہیں تھا؟" ان کے چہرے کے نقوش تن گئے تھے۔

نین تارا دل میں سہم گئی۔ اسے اس دن کا تھپڑ یاد آ گیا تھا۔ وہ خود کو کوئی بھی جواب دینے کے قابل محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ زیور گل کو بھی مجبوراً "رکنا پڑا۔

"بولو۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" اس کے نازک کندھوں پر جمے ان کے ہاتھوں میں مزید سختی آ گئی تھی۔ نین تارا کا نازک بدن کانپ کر رہ گیا اور ہونٹ بولنے کی کوشش میں محض پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"شاہ جی مجھ سے بات کریں۔ بچی کو ہراساں نہ کریں۔" اب کے زیور گل سے برداشت نہ ہو سکا۔ غصے میں آگے بڑھ کر بولی۔

"خانم! تم چپ رہو۔ یہ تمہارا معاملہ نہیں۔" وہ بھڑکے ہوئے انداز میں دھاڑے۔

"آہستہ بولیے شاہ جی! یہ آپ کی حویلی نہیں' ہمارا غریب خانہ ہے۔" زیور گل بغیر خوف کھائے چلائی۔

"غریب خانہ یا عیش خانہ؟" وہ تمسخر سے ہنکارے۔

"آپ لوگوں کے لیے عیش خانہ اور ہمارے لیے غریب خانہ۔"

وہ کھلی چوٹ کر گئی۔ سلطان بخت نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنی نظریں نین تارا کے زرد پڑتے چہرے پر جما دیں۔

"نینو! کیا تم میری نہیں ہونا چاہتیں؟" ان کا لہجہ یک بیک شبنمی ہو گیا تھا۔ نین تارا پل بھر میں پانی بن کر بہنے لگی۔

"میں صرف آپ کی ہوں شاہ جی!" وہ خود سپردگی کے سے انداز میں بولی' شاہ جی کی روح تک سرشار ہو اٹھی۔

"بولو مادام! اب کیا کہتی ہو؟" وہ فاتحانہ انداز میں بولے۔

نین تارا اچھی اور مضبوطی سے قدم اٹھاتے ہوئے زیور گل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ماما! شادی تو مجھے ہر حال میں شاہ جی سے ہی کرنی ہے اور یہ ہم دونوں میں سے کسی کے لیے۔ گھاٹے کا سودا نہیں۔ اب آپ خود سوچ لو۔" نین تارا کے بیباک انداز پر زیور گل نے پل بھر میں اپنی سوچ کا رخ موڑا۔ اس نے دونوں کو گہری نظر سے دیکھا اور دو قدم چل کر سلطان بخت کے قریب آ گئی۔

"شاہ جی! میری کچھ شرائط ہیں۔ نین۔۔۔ تم ادھر جاؤ۔" اس نے دور پڑے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"معلوم ہے زیور گل! تم نے اس نازک موقع کے لیے بہت سی شرائط سنبھال کر رکھی ہوں گی۔ تمہاری کلاس

کی یہی تو خوبی ہے۔ موقع سے جی بھر کے فائدہ اٹھانا۔" ان کا طنزیہ لہجہ کاٹ دار تھا۔

"پھر بھی آپ جیسی باعزت کلاس ہماری کلاس کی جوتیاں چاٹتی ہے۔ ہے نا شاہ جی؟" زیور گل کب چوکنے والی تھی۔

"تم اس وقت سب کچھ کہنے میں حق بجانب ہو خانم!" سلطان بخت آرام دہ انداز میں پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ زیور گل ان کے سامنے پڑی کرسی پر آ بیٹھی۔ نین تارا البتہ اسی طرح کھڑی تھی۔

"میری پہلی شرط۔" زیور گل نے آغاز کیا۔ "سب کچھ لکھا جائے گا شاہ جی پکے کاغذ پر۔ ابھی اور اسی وقت۔" اس نے انہیں باور کرایا۔

"مجھے تمہاری ہر ادا کی خبر ہے اسی لیے میرا وکیل میرے ساتھ آیا ہے۔ کچے کام نہیں کرتا میں۔" انہوں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگے۔

"یہ نکاح خفیہ رہے گا' جب تک ہم چاہیں گے۔"

"ایک منٹ۔" شاہ جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"کیا صرف نکاح پڑھانے کا پروگرام ہے' میں تو شادی کرنے آیا ہوں' بارات بھی لایا ہوں۔" ان کا انداز زیور گل کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی سونے کی چڑیا کی جان اس بدمست شیر میں آ سمائی تھی۔

"وہی میرا مطلب ہے۔" وہ بادل نخواستہ بولی۔

"تھینک گاڈ۔" انہوں نے مصنوعی طور پر اطمینان کا سانس لیا۔

"حق مہر ہماری مرضی کا ہوگا۔" لہجہ صاف و جھکانے والا تھا۔

"اوکے۔" ان کا اطمینان دیدنی تھا۔ نین تارا کھڑی ان پر سو جان سے نثار ہو رہی تھی۔

"پچاس لاکھ کیش ہوں گے۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"زیور گل بیٹی بیچ رہی ہو تو پھر تو برداشت ہے پر سائن بھی کرنا ہوں گے۔"

"شٹ اپ شاہ جی!" اسے آگ لگ گئی۔

"یو شٹ اپ۔ بیٹی کی سوداگر۔" وہ جواباً اس سے بلند آواز میں دھاڑے۔

"شاہ جی۔ آئی ایم سوری۔ آپ جا سکتے ہیں۔" وہ بہت کچھ برداشت کر کے یک لخت کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"زیور گل! میں تمہاری بیٹی سے شادی کر رہا ہوں' سید سلطان بخت آف احمد پور اور تم چھوٹے دکانداروں کی طرح مول تول کر رہی ہو۔ میں خود ہی حق مہر میں نین تارا کے نام اس قدر لکھ دوں گا کہ تم پیشگی اپنے لیے کسی فزیشن کو بلا رکھو کہ تمہارے حواس جانے کا خطرہ ہے۔ گلزار! اندر آؤ۔" آخری جملہ انہوں نے دروازے کے باہر کھڑے کن میں سے کہا جو ان کی آواز سنتے ہی بوتل کے جن کی طرح حاضر تھا۔

"جاؤ اور باہر موجود میرے سب دوستوں کو اندر بلا لاؤ۔" وہ "جی شاہ جی" کہہ کر باہر نکل گیا۔

"اور زیور گل اندر سے کوئی چادر لا کر نین تارا کو دے دو کہ یہ اپنے جسم کو ڈھانپ لے۔" وہ اس کے باریک لباس سے جھانکتے گورے بدن سے نظریں چراتے ہوئے بولے۔

آدھ گھنٹہ بعد نین تارا سلطان بخت کی زوجیت میں آ چکی تھی اور حق مہر میں اتنا کچھ تھا کہ زیور گل حقیقتاً "بے ہوش ہو گئی۔ جس کی بے ہوشی و بے خبری سے فائدہ اٹھا کر سلطان بخت نے نین تارا کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف بڑھے۔ نکاح کے بعد سب لوگ جا چکے تھے۔

"چلو جان سلطان بخت! زیست کے ان حسین لمحوں کو امر کر لیں۔"

وہ اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے باہر پورچ تک آتے ہوئے بولے۔ تو وہ کچھ اور ان کے پہلو میں سمٹ گئی۔ ان کے باہر جاتے ہی زیور گل نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے اس کاغذ کو نکالا اور از سر نو پڑھنے لگی۔

"اتنا کچھ' او میرے خدا!" خوشی سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ "کاش میری نین تارا جیسی دو بیٹیاں ہوتیں تو میں مرنے کے بعد کبھی بہشت کی تمنا نہ کرتی۔Nain Tara my heaven's key (نین تارا میری جنت کی چابی) آئی لو یو مائی ڈاٹر! آئی لو یو مائی سویٹ ہارٹ۔" وہ خوشی سے دیوانی ہو اٹھی اور جھوم جھوم کر کمرے میں ناچنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"صوفی صاحب!" زابعہ بی بی کچھ کہتے کہتے جھجک گئیں۔ وہ چائے کا خالی پیالہ لیے باہر جا رہی تھیں۔ صوفی صاحب کل کے اخبار کو سرسری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی جھجک پر سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگے وہ ہنوز خاموش تھیں۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" انہوں نے اخبار کا اندرونی صفحہ کھولا۔

"وہ عبدالمبین آئے گا اس اتوار کو۔" انہوں نے تھوک نگل کر بمشکل پوچھا۔

"نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولے۔

"بائیس دن ہو جائیں گے کل اسے۔" وہ دنوں کی گنتی میں اپنی بے قراری عیاں کر رہی تھیں۔

"رابعہ بی بی! اگر اب وہ پڑھ رہا ہے ادھر کچھ دل لگا کر تو اسے پڑھنے دو' ایک دو سال کی بات ہے۔ اس نے کوئی تاعمر وہاں نہیں رہنا۔ کچھ بن جائے گا۔ اگر ایک دو ماہ گھر نہیں آئے گا تو کوئی بھونچال نہیں آجائے گا دنیا میں۔" وہ تلخی و بیزاری سے بول رہے تھے۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ سر جھکا کر بولیں "اس کے کپڑے میلے ہو گئے ہوں گے سارے۔ دھونے کا مسئلہ ہو گا۔ وہاں سے آتا کپڑے دھلنے سوکھنے تک رہتا پھر بھلے چلا جاتا۔" "نہیں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی کہہ بیٹھیں۔

"وہاں سب طالب علم چھٹی کے دن اپنے کپڑے خود ہی دھوتے ہیں ہم بھی دھویا کرتے تھے۔ وہ کسی ریاست کا شہزادہ نہیں۔ ہم بھی اپنے والدین کے اتنے ہی پیارے تھے مگر ہمارے والدین نے یوں اپنے دل ہتھیلی پہ سجا کر نہیں رکھے ہوتے تھے' ذرا ذرا سی بات پر مرے نہیں جاتے تھے وہ۔ اللہ سے محبت کا ثبوت دینے کے لیے کچھ تو قربانی دینا ہی پڑتی ہے اور یہ تو بہت معمولی ہے۔ تم اللہ کا شکر ادا کرو وہ اللہ کے پاک کلام کو اپنے سینے میں سمو رہا ہے۔"

وہ ہنوز بے تاثر چہرہ لیے کھڑی تھیں۔ صوفی صاحب کی گفتگو کا ان پر کچھ خاص اثر دکھائی نہیں رہا تھا۔

"جلیل گیا تھا اس ہفتے' اسے تمہاری دی ہوئی سوغاتیں دینے۔ بتا رہا تھا' ٹھیک ہے وہ۔" اب وہ پھر بیزاری سے بولے۔ ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"جلیل نے ہی تو بتایا ہے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"کیا بتایا ہے اس نامراد نے؟" وہ چونکتے ہو کر بولے۔

"اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے مولوی صاحب نے' جس کی وجہ سے اس کا ٹخنہ زخمی ہو گیا ہے صوفی صاحب!" وہ رونے لگیں۔

"نامراد یہ چغلیاں کھاتا ہے گھر آ کر۔" وہ بڑبڑائے۔ "رابعہ بی بی! حوصلہ۔ حوصلہ کرو۔ ایسی کیا بات ہے۔ میری کمر پر ہنٹروں کے نشان دیکھے ہیں نا تم نے' ہمارے استادِ گرامی کی نشانی ہے۔ ہمیں تو فخر ہے اس مار پر۔ چار دن کی سختی جھیل لی۔ کچھ حاصل تو کر لیا' نامراد تو نہیں رہے۔"

رابعہ بی بی کے آنسو اب تواتر سے بہہ رہے تھے۔

"اور بکواس کرتا ہے جلیل! آج میں اس کے کان کھینچوں گا' ایک آدھ گھنٹہ کے لیے قاری صاحب نے یونہی زنجیر ڈالی ہو گی۔ کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی۔ اب ٹھیک ہے وہ میں نے پتا کروایا تھا۔"

رابعہ بی بی کو معلوم تھا وہ ان کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں۔

"وہ کہہ رہا تھا آکر مجھے لے جائیں' نہیں تو مدرسے کی چھت سے کود کر جان دے دوں گا۔" وہ دیوار کو تھام کر بے

قابو ہو کر بولیں۔

"رابعہ بی بی! اپنے دل کو مضبوط کرو۔" وہ زوردار آواز میں گرجے "ایسی گیدڑ بھبکیوں میں آؤ گی تو اپنی ہی جان سے جاؤ گی۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ اس کی میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔ ایسی دھمکیاں ہم بھی دیا کرتے تھے' عمل کرنے کے لیے پہاڑ کا جگر چاہیے۔"

وہ دھیمی آواز میں ان کی طفل تسلیوں سے بے نیاز روتی رہی۔ صوفی صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"دیکھو تو' عبدالمتین کا دوبارہ کوئی خط نہیں آیا۔" کچھ دیر بعد انہوں نے رابعہ بی بی کا دھیان دوسری جانب لگایا۔ وہ ململ کے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگیں۔

"بہت جلدی شہر کی آب و ہوا میں رچ بس گیا ہے وہ۔" وہ خود سے بولے۔ رابعہ بی بی اٹھ کر باہر جانے لگیں۔ انہوں نے ان کی تشویش پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

"اور ہاں سنو" وہ رابعہ بی بی کو باہر جاتے دیکھ کر بولے۔ وہ رک گئیں۔

"آمنہ اور زینب سے کہو سلائی کا کام جلد سیکھ لیں۔ زیادہ سے زیادہ اگلے مہینے تک۔ یہ وہاں جو لڑکی آئی ہے۔ ماسٹر صاحب کی رشتہ دار وہ بہت تیز اور ہوشیار لڑکی ہے اور میرے خیال میں کسی حد تک بے باک بھی۔ تم آمنہ اور نزہت کو سمجھا دینا کہ اس کے ساتھ زیادہ نہ اٹھیں بیٹھیں۔ صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔" وہ چپ چاپ سنے گئیں۔

"میں خود بھی گیا تھا ماسٹر کے پاس کہ اس لڑکی کو سمجھائیں' بے پردہ گاؤں میں نکل آتی ہے۔ ادھر یہ بات اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ شریف گھروں سے متعلق مگر وہ شاید اس کو قائل نہیں کر سکے۔ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں رہنے کے بیچ میں چلتی ہے سنا تو شاید اسے آتا ہی نہیں' لڑکیوں کے لیے یہ چیز تباہی ہے۔ تم آمنہ اور زینب کو سختی سے میری طرف سے سمجھا دینا۔ جب تک وہ ادھر ہے ہم انہیں نہ ہی بھیجیں تو اچھا ہے۔" یہ انہوں نے آخر میں تجویز پیش کی۔

"اب دونوں کا ہاتھ رواں ہو گیا ہے۔ میں ان کو سمجھا دوں گی۔" وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں' صوفی صاحب کو رابعہ بی بی کا ان کی تجویز سے انکار کرنا اچھا نہیں لگا تھا مگر پھر بھی وہ خاموش رہے اور اخبار کی طرف دوبارہ متوجہ ہو گئے۔

♡ ♥ ♡ ♥

شام سات بجے نکاح ہو گیا۔ نکاح کے وقت وہ کس قدر روئی تھی حالانکہ محض سائن ہی تو کرنا تھے۔ جو اس نے آج سے پہلے بھی بے شمار دفعہ کیے تھے' امتحانوں کے داخلہ فارمز سے لے کر نہ جانے کہاں کہاں مگر آج کے دستخط کرنے میں کیا بات تھی کہ اس کا دل ہی قابو میں نہ آ رہا تھا۔ پھپھو اور باقی لوگ اسے سنبھال سنبھال کر نڈھال ہو گئے۔ ایک تو ابو جی کی اچانک موت کا صدمہ' اوپر سے یہ اتنا اچانک کام' یہ اس کے لیے تو یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے ابو ترستے چلے گئے تھے' وہ کام ان کے جاتے ہی تیسرے دن انجام پا گیا۔ شادی کے معاملے میں رب نے شاید ان دونوں بہن بھائی کی قسمت ہی ایسی بنائی تھی۔ سہیل بھائی نے کورٹ میرج کر لی اور اس کی شادی ابو کی دنیا سے رخصت ہونے کے محض تین دن بعد یوں.... اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو کر رہا تھا' خوشی کی معمولی سی رمق بھی دل کے کسی کونے سے نہیں جھانک رہی تھی۔ بس آنسوؤں کی بوچھاڑ تھی جو امڈے چلی آ رہی تھی پھپھو نے اسے زور سے ڈانٹا۔

"ہر کام حکمِ الٰہی ہوتا ہے' ہم بندے بے اختیار ہیں' کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ اگر ایک پتا اپنی مرضی سے حرکت نہیں کر سکتا تو ہم بندے کیا چیز ہیں۔ بھائی کا اس طرح جانا' نکاح کا ہونا' سب اس کے حکم سے ہے' ہم محض احکام بجا لانے والے ہیں۔ نیک کاموں میں اس طرح رو کر بدشگونی نہیں کیا کرتے۔ اس کی رضا میں دل کو راضی کر لو پھر دل ٹھہر جائے گا۔ اب میں تمہاری آنکھ میں آنسو نہ دیکھوں۔"

اس کو سینے میں سموئے وہ سختی اور نرمی سے اسے سمجھا رہی تھیں' اس کے آنسو جیسے خود بخود تھم گئے۔

کیپٹن شہباز تو نکاح کے فوراً بعد ہی چلے گئے' اس سے یہ نیا رشتہ استوار ہونے کے بعد ملے بغیر ہی' اس کے دل میں تشنگی سی رہ گئی۔ وہ ابو کے کمرے میں پھپھو کی آغوش میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں آکر ماں کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے اور اسے بھی جو اس کے اندر آنے پر اور سمٹ گئی' صبح پھپھو اور ان کے بڑے دونوں بیٹوں کو بھی روانہ ہونا تھا' اس کا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ان کے جانے کے بعد وہ بھری دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔

رات کو اچانک مسز خان کی طبیعت خراب ہو گئی' غم اور خوشی کی ملی جلی شدتوں نے ان کے دل و دماغ پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا اور دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر کو بلوایا گیا' اس نے فوری طور پر کچھ انجکشن وغیرہ لگائے جن کے اثر کے تحت وہ سو گئیں۔

ڈاکٹر نے انہیں سفر کرنے سے منع کر دیا۔

"ٹھیک ہے' ہم امی جان کو کچھ دنوں بعد لے جائیں گے بلکہ شہباز کو اگلے ہفتے آنا ہے' وہی انہیں آتے ہوئے لے آئے گا۔" ایاز نے کہا تو نزہت کے دل کو عجیب سی ڈھارس بندھ گئی جب کہ ریشم کا موڈ خراب ہو گیا' نہ جانے کیوں؟ نزہت اس کے بگڑے تیور دیکھ کر ... نے لگی۔

♥ ♡ ♥ ♡

"معاذ! تم کالو سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" ظفر کا سوال اس قدر اچانک اور فضول تھا کہ معاذ چارپائی سے اچھل کر اٹھ بیٹھا اور حیرت سے چاند کی روشنی میں ظفر کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھنے لگا' اسے فوری طور پر کوئی جواب سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" اس نے معاذ کی خاموشی سے جانے کیا اخذ کیا۔

"ظفر! تمہیں معلوم ہے' میں یہاں شادی کرنے نہیں آیا اور شادی کی لکیر تو شاید میرے ہاتھوں میں کہیں ہے ہی نہیں۔"

اس نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر چاند کی روشنی میں لکیریں دیکھنے کی کوشش کی۔

"مجھے زندگی میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے' اتنا کچھ کہ زندگی کی روشنی میں ان لکیروں سے وہ کچھ حاصل کر سکوں جو کچھ ان میں تحریر نہیں۔ تم جانتے ہو نا؟"

اس نے مٹھیاں بند کرتے ہوئے ظفر کی طرف دیکھا' جس نے معاذ کے جواب پر جیسے سکھ کا گہرا سانس لیا تھا۔

"اماں اور کالو نے ابا کی جان کھائی ہوئی ... سے بیاہ کرنا چاہتے ہو۔ ان ہی دو فضول عورتوں کی وجہ سے میں یتیم خانے میں رہتا رہا ہوں' یہ دونوں عورتیں کسی کی زندگی پُرسکون گزرنے نہیں دیتیں۔ معاذ! ان کی شکلیں جس قدر بدصورت ہیں ان کے اندر ان سے زیادہ کریہہ اور کالے ہیں کہ جو ان کی بدصورتی کی زد میں آگیا۔ وہ زندگی بھر اپنے نصیبوں کی سیاہیاں دھوتا رہتا ہے۔ بدصورتی شکلوں میں نہیں ہوتی' یہ تو دل بدصورت ہوتے ہیں' جو برے ارادوں سے دوسروں کی زندگیاں بے سکون کرتے ہیں۔" وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔

"تم آرام کرو' میں ابا سے کہہ دوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "لیکن مجھے معلوم ہے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا؟" معاذ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"معاذ! یہ دونوں اس انکار پر چین سے نہیں بیٹھیں گی' خیر تم فکر نہ کرو۔" وہ کہہ کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ معاذ کے لیے فکر کا نیا در وا کر گیا۔

صبح کے چند گھنٹے امن سے گزرے۔ وہ دونوں ماں بیٹی اندر کے کمرے میں گھسی خدا جانے کیا کر رہی تھیں۔

"مجھ سے کیسی غلطی ہوئی' میں ظفر سے کہہ دیتا' میں اگلے مہینے چلا جاؤں گا۔ اب تو اڈیشن ہونے میں بھی پندرہ بیس دن رہ گئے ہیں' جا کر اپنا کوئی ٹھکانہ کر ہی لیتا۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا وہ اس طرح آکر دوسروں کے در پر

نہیں پڑ جاتے۔ میں اس معاملے میں اللہ سے مایوس کیوں ہوں' صبح کو محنت مزدوری کر تا رات کو کہیں نہ کہیں سونے کا ٹھکانا مل ہی جاتا۔" وہ خود کو سمجھا رہا تھا۔ اسی وقت ظفر کا ابا ٹین کا دروازہ زور سے کھول کر اندر داخل ہوا۔

"ہائے ظفری کے ابا! ہم لٹ گئے' ہم برباد ہو گئے۔ ہائے مجھ غریب پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہائے۔"

ابھی ابے کا ایک پاؤں دہلیز کے اندر دوسرا چوکھٹ میں تھا کہ ظفری کی ماں اپنا سینہ پیٹتی ہوئی باہر نکلی۔ اس کی اچانک چیخ سے معاذ بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہو گیا تجھے؟ کیوں پاگلوں کی طرح چلا رہی ہے۔" اس نے دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے اسے جھڑکا۔

"ہائے میں پاگل نہ ہوں گی کیا' مجھ پر یہ قیامت ٹوٹ پڑی۔" اس نے سینے پر دو ہتھڑ مارے۔

"کیا ہو گیا تجھے؟ کیا ماں مر گئی تیری جو یوں بین ڈال رہی ہے۔" ابا چیخا۔

"ماں مرے تو برس بیتے' اب تو میں اپنی بچی کی خوشیوں کے خواب دیکھوں۔ پر کسی نامراد کو وہ بھی نہیں بھائے۔" وہ اور چیخنے لگی۔

"تجھے جا کے کچھ نہ بتا۔" ابا چارپائی گھسیٹ کر نیم کے نیچے لے گیا اور اس پر بیٹھ گیا۔

"میرا دس تولے کا سونے کا سیٹ ظفری کے ابا! ہار بندے' انگوٹھی سب غائب' ہائے میں مر کیوں نہ گئی؟" وہ بری طرح اپنی رانوں کو پیٹنے لگی۔

"اری نامراد! آیا کہے ہے' مجھے کچھ سمجھ میں نہ آئے۔" ابا نے جھنجلا کر کہا۔ اسی وقت ظفر باہر سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا' وہ شاید کھیتوں سے آیا تھا' مٹھی میں ہاتھ منہ سر اٹا ہوا تھا۔

"فارسی بولوں ہوں میں۔" وہ چیخی۔ "جو تیری سمجھ میں نہ آئے' چوری ہو گیا میرا زیور' میری زندگی کا سارا سرمایہ' نہ چیخوں نہ پیٹوں میں۔"

"چوری ہو گیا' تیری عقل ماری گئی ہے' دن چڑھے ادھر چور کہاں؟" ابا نے اسے جیسے دن اور رات کا فرق سمجھایا۔

"چور کو کیا دکھے دن ہے کہ رات' اسے تو بس چوری سے گرج (غرض) ہوئے۔ ہائے میں لٹ گئی صندوق میں تالا لگا کر رکھا تھا' تالا ٹوٹا پڑا ہے۔ زیور غائب' کون لے گیا' باہر سے کیوں آیا۔ ہائے کوئی جائے میرے بھائی کو بلا کر لائے۔ اس کی تھانے داری سے تو بڑے سے بڑا چور بک پڑے ہے' وہ خود ہی پتا لگا لے گا چور کا۔" وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔

"اماں! ایک بندہ مل گیا۔" کالو اندر سے بڑا سا سونے کا کانٹا لے کر آگئی۔

"کہاں کہاں سے ملا؟" اماں اس پر جھپٹی۔

"اماں! اس کے کپڑوں کے اندر سے تکیے میں۔" اس نے بلا جھجک معاذ کی طرف اشارہ کیا۔ معاذ کو تو گویا کرنٹ چھو گیا' ابا اور ظفر بھی اسے دیکھنے لگے۔

"میں پہلے ہی کہوں تھی' یہ کوئی گھر کا بندہ ہے چور باہر سے نہیں آیا' ہائے کوئی میرے بھائی کو بلا کر لائے وہی اس گھر کے نمک حرام چور سے تیرا سارا زیور نکلوائے گا۔ احسان فراموش' آستین کا سانپ لے کر آگیا تیرا بیٹا۔ ہم نے اس کی خدمتیں کیں' اس نے یہ صلہ دیا ہمارے ہی گھر میں نقب لگائی۔ ہائے ظالم تجھے حیا نہ آئی۔" اماں نے آگے بڑھ کر دو ہتھڑ اسے مارے' وہ اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ "اسی لیے تو یہ آج جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔" انہیں سب خبر تھی اس کے ارادوں کی۔

"بکواس نہ کر' میں دیکھتا ہوں اندر چل کر' یہ کیوں چوری کرے گا۔" ابا اٹھ کھڑا ہوا۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا ان کی شکلیں جس قدر بھیانک ہیں' اندر اس سے دل بھی کالے ہیں۔ معاذ! اب تم ادھر نہیں رہ سکو گے۔ اس کا بھائی اول درجے کا غنڈہ' بدمعاش حوالدار ہے۔ وہ آگیا تو شاید تم ادھر سے زندہ جا بھی نہ سکو۔ اسے کسی گواہی کی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ قانون اس کے گھر کا ہے۔" ظفر اس کے پاس کھڑا دھیرے

دھیرے بول رہا تھا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

"میں۔۔۔۔ میں۔۔۔" اس کے لب ہلے۔

"تم اندر جا کر ایک دو ضروری کپڑے سمیٹو' میں تمہیں رات میں ادھر سے نکال دوں گا۔ یہ عورت چین سے نہیں بیٹھے گی۔ اس کا بھائی ابھی گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے' صبح مجھے جاتے ہوئے ملا تھا۔ رات کو آئے گا' تم رات کو نکل جانا' موسم بھی مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان پر بادلوں کو دیکھا۔

"میں ظفری کے ابا! صبر نہیں کروں گی۔ اس لڑکے کو تم تھانے بھجواؤ' پولیس اگلوائے گی۔ اس سے باقی سچ۔" وہ بولتی ہوئی باہر آ رہی تھی۔

"ارے بھلی لوگ صبر کر۔ شام کو نیاز آ جائے گا تو ہمیں فیصلہ کریں گے' یوں تھانے جا کر گھر کی عزت نہ رول' یہ مہمان ہے ہمارا' نیاز شہر سے رات تک آ جائے گا تیرا زیور کہیں نہیں جاتا' مل جائے گا تجھے۔" ابا اسے سمجھا رہا تھا۔

"میں صبر کروں' تم اس چور کو کچھ نہ کہو۔ اسے تمہارا بیٹا سینے سے لگائے کھڑا ہے۔" وہ دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر اور چیخی۔

"پوچھتا ہوں میں بھی' تم اب اندر جاؤ۔ میں نیاز کو پیغام بھجواتا ہوں۔" ابا اسے ٹھنڈا کرنا چاہ رہا تھا۔

"میری جان پر بنی ہے' تم کہو اندر جاؤں۔ میں جا رہی ہوں تھانے۔ سپاہی لے کر آؤں گی' اس چور کی نگرانی کے لیے جو چوری کر سکتا ہے وہ بھاگ بھی سکتا ہے۔" وہ باہر کی طرف بڑھی۔

"ارے بھلی لوگ نیک بخت! تو اندر چل میں ہوں نا یہاں اس کی نگرانی کے لیے۔ شام تو ہونے والی ہے' دیکھو کتنا کالا سیاہ بادل آ رہا ہے' مینہ نہ برس پڑے۔ تو رستے میں جاتے جاتے بھیگ جائے گی۔ میں نیاز کو پیغام بھجواتا ہوں۔ تو چل اندر۔" ابا نے نرمی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر موڑا۔

"دیکھو ظفری کے ابا! اگر میرا زیور نہ ملا اور یہ چھورا ادھر سے بھاگ گیا تو خدا کی قسم قیامت اٹھا دوں گی ہاں۔" وہ دھمکی دیتے ہوئے منہ پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے تو اندر چل۔" ابا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کیا' اسی وقت بادل زور سے گرجے۔

"مینہ برسنے والا ہے۔" ابے نے اوپر کر کے کہا۔

"کالو! پچھلے صحن سے کپڑے اور چارپائیاں اٹھا لے۔" اماں کہتی ہوئی اندر بڑھی۔

"چلو تم دونوں بھی اندر۔" ابے نے انہیں دیکھ کر کہا تو ظفری اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں آ گیا۔

"ظفر تمہیں معلوم ہے؟"

"یار! مجھے سب معلوم ہے' تم اب یہ اٹیچی کیس رہنے دو' کسی بڑے شاپر میں اپنے کپڑے اور کچھ ضروری سامان ڈال لو' یہ عورت چین نہیں لے گی۔ مجھے معلوم ہے۔"

"ظفر! تمہارے ابا کیا سوچیں گے۔" وہ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اتنا گھٹیا الزام' اسی وقت بادل زور سے گرجے اور بوچھاڑ کی صورت بارش برسنے لگی۔

"ابے کو سب معلوم ہے' تم فکر نہ کرو۔ یہ اس کا ڈرامہ ہے سارا' یہ بارش کہاں سے ہونے لگ گئی۔" وہ فکر سے کھڑکی کے آگے کھڑا ہو کر بولا۔

"چلو۔۔۔ رات گزار لو۔ کل دیکھیں گے۔" وہ مڑ کر معاذ سے بولا جو دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا دبا رہا تھا۔

"خیریت؟ تم تو یار پریشان ہو گئے۔ بہادر بنو۔" اس نے زور سے ہاتھ اس کے کندھے پر مارا۔

"نہیں یار! ویسے ہی صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔" معاذ جبراً مسکرا کر بولا۔

"چلو پھر تم آرام کر لو۔ میں باہر کے حالات کا جائزہ لوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

♥ ♡ ♥

ان تینوں کو ماسٹر صاحب حویلی کے گیٹ کے آگے چھوڑ گئے تھے' چادریں اچھی طرح اوڑھے وہ تینوں آگے پیچھے حویلی میں داخل ہوئیں۔

"ہائے کتنی گرمی لگ رہی ہے' ادھر تو چادر اتار دیں نا۔ مصیبت۔"

جھومر نے ڈیوڑھی میں چار قدم آگے چلتے ہی چادر سر اور کندھوں سے اتار کر محض سائڈ پر نکالی۔

"ابھی نہ اتارو۔" آمنہ تیز تیز چلتے ہوئے بولی' وہ سب سے آگے تھی۔ اس نے چادر میں منہ بھی اچھی طرح سے چھپایا ہوا تھا۔ صوفی صاحب کی پردے کی سختی نے اسے محض پندرہ سال کی عمر میں ہی اتنی اچھی طرح پردہ کرنا سکھا دیا تھا جب کہ جھومر پہاڑوں کی آزاد فضا میں پھرنے والی لڑکی تھی' اسے چادر سے گھٹن ہو رہی تھی یہ چادر بھی آمنہ اور زینب کے کہنے پر اوڑھ کر آئی تھی۔

آمنہ ڈیوڑھی سے ہوتے ہوئے برآمدے سے آگے بنے بڑے ہال کمرے میں داخل ہو گئی۔ جب کہ وہ دونوں ٹہلتی پیچھے آ رہی تھیں۔ ڈیوڑھی کے موڑ پر ہی جھومر کی دائیں طرف سے اپنے کمرے کی سیڑھیاں اتر کر آتے سید سلطان بخت سے بری طرح سے ٹکر ہو گئی' وہ چکر کھا کر گرنے کو تھی اگر آگے بڑھ کر زینب اسے تھام نہ لیتی' تو شاید وہ اب تک زمین بوس ہو چکی ہوتی۔ سلطان بخت پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھ ٹکرانے والے اس نشہ ہوش ربا کو تکے جا رہے تھے۔ اس بھری دوپہر میں دیکھے جانے والے خواب کو انہوں نے بڑی مشکلوں سے آنکھوں سے کھرچا تھا کہ یہ آج پھر سے آن ٹکرائی۔ زینب اسے تھامے کھڑی تھی اور وہ خود اس کا ہاتھ سختی سے اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔ جھومر بھی ان کی بے خود نگاہوں میں جیسے اپنے ہوش بھلائے کھڑی تھی۔ دونوں ہی ہوش و خرد سے بے خبر نہ جانے کہاں گم تھے۔

"چلو نا!" زینب نے زور سے اسے جھٹکا دیتے ہوئے جھڑک کر کہا۔ تو دونوں جیسے گہری نیند سے جاگ اٹھے۔ سلطان بخت نے فوراً جھومر کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دونوں کے پہلو سے کترا کر باہر نکل گئے اور جھومر تو ابھی بھی ساکت کھڑی تھی۔

"کیا پتھر کی ہو گئی ہو مرو اندر۔" زینب نے اسے ہولے سے دھکا دیا۔

"یہ کون تھا؟" وہ اسی نیند زدہ کیفیت میں بولی۔ چادر ڈھلک کر اب زمین پر جا گری تھی۔ جس کا اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ زینب نے جھک کر اس کی چادر اٹھا کر اس کے سر پر ٹکا دی۔

● ● ● ● ●

رات اگرچہ گہری ہو چکی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سر میں جیسے شب برات کے پٹاخے چھوٹ رہے تھے' دھن دھنا دھن۔۔۔ ایک لمحے میں سر کے اندر درد کی بے شمار ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جیسے اس کے سر پر ڈنڈوں سے وار کیے گئے ہوں۔ خون کا قطرہ نہ نکلا ہو اور درد کے لامتناہی سلسلے چھڑ گئے ہوں۔ جسم برسات میں نکلے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ بارش پورے زور و شور سے برس رہی تھی مگر اس کی آنکھیں بے تحاشا جل رہی تھیں۔ اس کا ٹمپریچر بڑھتا جا رہا تھا۔ ذہن کا سارا عذاب بدن جھیل رہا تھا۔ کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ جلتی بلتی آنکھوں سے نیند بھی جیسے دور بھاگ گئی تھی۔ سر درد اور بخار کی تکلیف کی وجہ سے یوں بھی نیند کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' ویسے بھی اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ سارا دن کسی نے جھوٹے منہ بھی اس سے کھانے کو نہیں پوچھا تھا' حالانکہ اسے کمرے میں بیٹھے سب پتا چل رہا تھا کہ گھر میں جھگڑے کی کل کل کے باوجود کھانا بھی پکا ہے اور سب نے کھایا بھی ہے مگر شاید اس کے نصیب کا ایک دانہ بھی نہیں تھا جو اسے مل جاتا اور بظاہر تو اسے بھوک بھی نہیں تھی۔

بخار اور سر درد نے بے حال کر رکھا تھا اگر کچھ کھا بھی لیتا تو شاید الٹی آ جاتی۔ حلق میں بھی جیسے تنور جل رہا تھا' پیاس سے اس کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے جلتی آنکھیں کھولیں۔ کمرے کی روشنی بجھی ہوئی تھی صرف باہر سے بارش برسنے کی آواز آ رہی تھی' سفید بادلوں کی روشنی سے کمرہ کچھ روشن

لگ رہا تھا پہلے بادل بھی گرج رہے تھے اور بجلی بھی چمک رہی تھی مگر اب صرف بارش ہو رہی تھی۔ شاید زیادہ لیٹنے سے بھی جسم دکھنے لگا ہے۔ وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھا۔ وہ شام سے اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ کھلی کھڑکی سے تیز سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا' کھڑکی کے دونوں پٹ ایک شور سے بند ہوئے پھر اگلے پل کھل بھی گئے۔ وہ پوری ہمت سے اٹھا اور دو قدم چل کر کھڑکی کے دونوں پٹ مضبوطی سے تھام کر کھڑا ہو گیا۔

ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتی ٹھنڈی یخ بوندوں نے اس کے گرم چہرے کو چھوا' اسے سردی سے جھرجھری سی آ گئی۔ دل چاہا پلٹ کر پھر بستر میں لیٹ جائے مگر بارش اچھی بھی لگ رہی تھی۔ بہت دنوں بعد اتنی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہتھیلی کھلے آسمان کے نیچے کی۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے پل بھر میں اس کے ہاتھ کو بھگو گئے اس نے گیلا ہاتھ اپنے منہ پر پھیرا۔ گھر میں مکمل طور پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ لگتا تھا۔ سب سو چکے ہیں ظفر جو شام کو اسے کمرے میں بٹھا کر گیا تھا' پلٹ کر اس نے خبر نہ لی تھی۔

"پتا نہیں اب کیا ہو گا؟" کمزوری اور تھکن سے اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ کھڑکی کی چوکھٹ پر ڈال دیا اور بے بسی سے کشادہ بھیگے آسمان کو دیکھنے لگا۔

"کاش میرا بھی اس دنیا میں کوئی ہوتا۔ ماں' باپ کوئی' بہن بھائی۔ کوئی بھی۔"

بارش کا پانی تھا یا شاید اس کی آنکھ سے قطرے ٹپکے تھے۔ اسی وقت باہر دھیمے قدموں کی چاپ سنائی دی' اس نے آستین سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"معاف کرنا یار! کافی دیر ہو گئی۔ یہ چڑیلیں سوتیں تو میں کچھ لے کر آتا ناں' حالانکہ ابا تو مجھے کافی دیر سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں کچھ کھانے کو دے آؤں۔ تم نے لائٹ کیوں نہیں جلائی۔"

ظفر مدھم آواز میں وضاحت پیش کرتا ہوا اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں شاید کھانے کی ٹرے تھی جو اس نے معاذ کے بستر پر ہی رکھ دی اور بستر کے اوپر دائیں طرف لگا لائٹ کا بٹن دبایا تو سامنے والی دیوار کے بلب کی پیلی سنہری روشنی سے کمرہ یک لخت روشن ہو اٹھا۔

روشنی ہوتے ہی اندھیرا' مایوسی اور دکھ کہیں کھڑکی سے باہر کود گئے۔ روشنی بہت سارے ان دیکھے دکھوں کو چاٹ جاتی ہے۔ اندھیرا مایوسی اور بے بسی کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ اندھیرا اندیشوں اور خدشوں کا گھر ہے۔ روشنی یقین اور اعتماد کا۔

"پر نہیں یار! وہ دونوں نہیں سوئیں۔ اب تک کمرے میں جنگی سپاہیوں کی طرح جاگ رہی ہیں' جیسے کسی بھی وقت میدان جنگ سے دوبدو لڑائی کا بلاوا آ سکتا ہے۔ ابا تنگ آ کر سو گیا۔ میں باورچی خانے میں کچھ لینے گیا تو اماں کسی آدم خور بلا کی طرح میرے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی کہ ایک چور کو اس گھر سے کھانے کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ جانے کیا کیا بکواس۔۔۔ اس کی زبان سے الامان الحفیظ۔"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "اس نے زیادہ چیخ چیخ کی تو میں باہر آ گیا۔ بڑی ہی بدبخت' خانہ خراب عورت ہے۔ ساری عمر کو میرے سر پر عذاب۔ آجاؤ تم! اب کھا لو یہ' میں چائے بھی لے کر آیا ہوں۔ تم نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔"

وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑے گیلے ہو رہے تھے۔ بالکل پانی میں نچڑے ہوئے۔

"باہر تو اچھی خاصی ٹھنڈ ہو گئی ہے۔ میں باہر نکلا تو مجھے سردی لگنے لگی۔ حالانکہ دوپہر کو موسم اچھا بھلا تھا۔" وہ خود ہی بولے جا رہا تھا۔ معاذ روشنی سے منہ موڑے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے خدا جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔

"ابھی جاؤ یار! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ یہ افلاطون والی سوچیں پھر سوچ لینا۔" ظفر نے پلٹ کر اسے اسی پوزیشن میں وہیں کھڑے دیکھ کر کہا۔

"پھوپھی کے گھر سے لایا ہوں۔ گوشت والا پلاؤ بھی ہے اور زردہ بھی۔ سمجھ' آج تیری دعوت ہے۔ پھوپھی کی

تھانے دار نند آئی ہوئی تھی' اس بے چاری نے اپنی نند کے ڈر سے مجھے چھپا کر کھانا دیا۔ روٹی بھی ہے۔ آلو شوربے کے ساتھ۔ اب آجاؤ۔ مجھے بھی دوبارہ بھوک لگ گئی ہے۔ ان منحوسوں نے تو مسور کی دال پکائی ہوئی تھی۔ اتنے اچھے موسم میں موڈ کا خانہ خراب کر دیا۔ ان فسادی عورتوں نے۔"

اس نے تپ کر زردے کا بڑا سا لقمہ منہ میں ڈالا اور پلٹ کر معاذ کو دیکھنے لگا۔

"آنا یار! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کا بازو پکڑ کر بولا۔ معاذ احساس بے چارگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہاری آنکھیں تو لال سرخ ہو رہی ہیں۔ روتے رہے ہو مرد بنو یار!" اس نے معاذ کی پیشانی کو چھوا۔

"اوہو! تمہیں تو تیز بخار بھی ہے۔ مجھے شام کو بھی تمہاری طبیعت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔"

"چلو آؤ پہلے کھانا تو کھا لو۔ شکر ہے چاول ہیں۔ تم وہی کھانا۔ کھانے کے بعد چائے کے ساتھ تمہیں بخار کی کوئی گولی لا دیتا ہوں۔ ابا کے پاس ہو گی۔" وہ ہمدردی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"آؤ نا۔ کھڑکی سے تو ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔" اس نے کھڑکی کا ایک پٹ بند کیا جو ہوا سے فوراً "ہی کھل گیا۔

معاذ آہستگی سے چلتا ہوا اپنے بستر پر آ گیا۔

"یار! تم نے رہنے دینا تھا کھانا۔ خوامخواہ تکلیف کی۔ رات ہی تو تھی گزر جاتی۔" اسے واقعی بھوک نہیں تھی۔ "اور مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔"

"یار! کیوں شرمندہ کرتے ہو' پہلے ہی میں تمہارے ساتھ نظریں نہیں ملا سکتا۔ کتنے مان سے میں تمہیں لایا تھا کہ اب میں جوان ہو گیا ہوں۔ اب یہ عورت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی مگر یہ میری بھول تھی۔ عورت کو ہر عمر میں مرد کو زیر کرنے کے' تباہ کرنے کے ایک ہزار ایک طریقے آتے ہیں۔ ابا جانتا ہے۔ وہ جھوٹی ہے' مکار ہے مگر اس کے منہ پر نہیں کہہ سکتا۔ جب ابا ہی اس کے سامنے بے بس ہے تو میرے ہاتھ تو ابھی بالکل خالی ہیں۔ میں کس برتے پر رعب جماؤں۔ یہ مکار آدھی سے زیادہ زمین اپنے نام کرا چکی ہے۔ میرا ابا شروع ہی سے زن مرید ہے۔ سارے رشتہ داروں کے منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھ کٹوا چکا ہے۔ رہی سہی کسر اس کا تھانے دار بھائی پوری کر دیتا ہے۔ آئے دن اس کا دنگا فساد ہوتا ہے۔ ابا اب نہ صرف بوڑھا ہو گیا ہے بلکہ کمزور بھی۔ بڑی جلدی ان لوگوں کے آگے ہمت ہار دیتا ہے۔ اگر حالات اسی طرح رہے اور باقی کی زمین بھی اس نے ہتھیالی تو شاید میں گاؤں ہی چھوڑ دوں' فائدہ تمام عمر کی ذلت سہنے کا۔ جو عورت باپ کے ہوتے ہوئے مجھے بارہ سال تک یتیم خانے میں رکھ سکتی ہے۔ وہ کیا نہیں کر سکتی۔" وہ بے دلی سے بدلے ہوئے لہجے میں رومال کا کونہ موڑتے ہوئے دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

"چل چھوڑ دفع کر تو ان باتوں کو۔ یہ سب تو چلتا ہی رہے گا۔ میں بھی اتنی جلدی ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔ ادھر سے کیا بھی تو ایک آدھ کا ٹاٹا (گردن) اتار کر ہی جاؤں گا۔ ظفری نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔"

اگلے ہی پل وہ پہلے والا ظفر بن گیا۔ آدھی روٹی کا نوالہ بنا کر شوربے میں بھگونے لگا۔

"کھا نا یار! میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ تیرے لیے چمچ بھی لایا ہوں۔"

اس نے ٹرے میں پلیٹ کے نیچے پڑا چمچ اس کی طرف بڑھایا جو اس نے آہستگی سے تھام لیا۔

ظفر کی مایوس کن گفتگو نے اس کے دل کو مزید دہلا دیا' اس کی بھوک پہلے ہی سے اڑ چکی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"سہیل! رائس کیسے بنے ہیں؟" سنجیدگی سے چاولوں کی پلیٹ پر جھکے سہیل سے ریشم نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

"اچھے ہیں ٹیسٹی۔" اس نے چمچ روک کر نارمل لہجے میں تعریف کی۔

"میں نے نزہت سے پوچھ کر بنائے تھے۔ نزہت کی کوکنگ بہت زبردست ہے۔ چائنیز اور کانٹی نینٹل کھانوں میں تو یہ ایکسپرٹ ہے۔"

سست روی سے چاول کھاتی نزہت کو دیکھتے ہوئے ریشم نے تعریف کی۔

"ہوں۔" سہیل نے سرسری لہجے میں کہا اور پلیٹ پر جھک گیا۔
نزہت کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ ابوجی اس کے کھانوں کے کس قدر دلدادہ تھے۔ کہتے تھے اس کے ہاتھ میں ذائقہ اس کی ماں کے کھانوں جیسا ہے۔ پھر کہتے "تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں" وہ پوری طرح متوجہ ہو جاتی۔
"تمہارے کھانوں میں لذت اس لیے ہوتی ہے کہ تم نماز پڑھتی ہو۔ تمہاری دادی، بہشتن بھاگاں، نماز کی بڑی پابند تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بھی بڑی لذت تھی۔ وہ نمک مرچ گھول کر بھی دے دیتیں۔ ہم وہ بھی چٹ کر جاتے تھے۔ کہتی تھیں نماز پڑھنے والی عورت کے ہاتھ میں قدرتی طور پر لذت آجاتی ہے۔"
وہ اتنی تعریف پر جھینپ سی جاتی۔ "ابوجی! میں کب پابندی سے نماز پڑھتی ہوں۔"
"پڑھتی تو ہو نا، میرے لیے یہی بات خوشی کا باعث ہے۔" وہ حوصلہ افزائی کیے جاتے۔ اسی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں وہ اتنے اچھے اچھے کھانے پکانے سیکھ گئی تھی۔ وہ اسے خود بازار سے اچھی اچھی کھانا پکانے کی کتابیں لا کر دیتے۔ وہ خود اچھے کھانوں کے شوقین جو تھے۔ "اسی شوق نے انہیں انجائنا کی تکلیف لگا دی تھی جو آج وہ مجھے یوں تنہا چھوڑ گئے۔"
چاولوں کے دانے اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا اور ایک نظر بیگانگی سے کھانا کھاتے بھائی کی طرف دیکھا، حالانکہ ابوجی کی وفات کے بعد ریشم یکسر بدل گئی تھی مگر سہیل۔ اس کا رویہ ہنوز اس کے ساتھ بیگانہ اور اجنبی سا تھا۔ نزہت کے لیے اس کے رویے میں بس اس درجہ اپنائیت تھی جیسے دو شناسا کسی اسٹیشن پر چند گھنٹوں کے لیے ساتھ ساتھ آبیٹھے ہوں۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ ایک تو باپ کی جدائی کا نیا نیا زخم۔ اوپر سے بھائی کا اتنا سرد رویہ اسے رلا رلا دیتا۔ وہ تو پھپھو ابھی تک ادھر تھیں جو اسے سمیٹ لیتی تھیں ورنہ شاید وہ رو رو کر ہی ختم ہو چکی ہوتی۔ کل سے وہ اپنی بہن کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ دو چار روز ادھر رہنے کا پروگرام تھا ان کا۔ پھر شہباز نے انہیں آکر لے جانا تھا۔
"میں کہہ رہی تھی سہیل جس طرح سے پھپھو اصرار کر رہی ہیں رخصتی پر تو اس حساب سے دن کتنے رہ گئے ہیں۔ ہمیں کچھ تو تیاری کرنی چاہیے۔" ریشم کی آواز اسے کھانے کی میز پر واپس کھینچ لائی۔
"ہوں۔" بیورو کریس والا "ہوں"
کہہ کر سہیل نے ڈونگا اپنی طرف کھسکایا۔ "میں تو نزہت سے کہہ رہی ہوں ایک دو بار میرے ساتھ بازار چلے۔ کچھ موٹی موٹی خریداری کر لیتے ہیں۔ سوگ اور دکھ اپنی جگہ دنیاداری بھی تو نبھانی ہے۔ ______ مجھے تو خود اس کے دکھ کا پورا پورا احساس ہے۔ مگر کیا کروں۔ اب دنیا والوں کا سامنا تو ہم نے کرنا ہے۔ لوگ یہ تو نہیں دیکھتے کہ کسی کو کیا دکھ ہے۔ کسی پر کیا بیتی۔ لوگ تو یہ دیکھیں گے۔ باپ کے بعد بھائی بھاوج نے کیا دیا۔ کتنا دیا۔
وہ اس وقت خالصتاً گھریلو خاتون بنی ہوئی تھی۔ آج کل اس کا حلیہ بھی ٹھیکل گھریلو خواتین کی طرح ہی ہوتا تھا۔ گھر میں تعزیت کے لیے آنا جانا جو تھا۔ وہ سوسائٹی بٹر فلائی کی ڈریسنگ اور گرومنگ سب فی الحال غائب تھا۔ معلوم نہیں وہ واقعی یہ سب چھوڑ چکی تھی یا یہ کسی ڈرامے کا حصہ تھا۔ نزہت بس گھونٹ گھونٹ پانی پیے جا رہی تھی۔
"اب پھپھو بھلے کہتی رہیں کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ہمیں دنیا دکھاوے کو ہی سہی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا۔" وہ سہیل سے نہ جانے کیا اگلوانے پر اپنا زور خطابت صرف کر رہی تھی۔
"ہوں!" اس نے پھر ہنکارا بھرا۔ "تو چلی جاؤ کسی روز اسے لے کر بازار۔" جیسے اس کا نام لینا کوئی گناہ کی بات ہو۔ پپوٹوں کی حدیں توڑ کر باہر آتا پانی ہونٹوں سے نیچے اترنے لگا۔
"کل چلے جاتے ہیں۔ پھپھو بھی اپنے رشتہ داروں سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہو

گا۔" وہ فوراً تیار ہو گئی۔
"لاکر کی نچلی دراز میں تیس ہزار پڑے ہیں۔ فی الحال ان سے کام چلا لینا۔" سہیل نے کھانا ختم کرتے ہوئے نیپکن سے ہاتھ پونچھے۔
"کل پھر ٹھیک رہے گا ناں نزہت! دس گیارہ بجے چلے چلیں گے۔" اس نے نزہت کی رضامندی ضروری سمجھی۔
"نہیں۔ مجھے ابھی نہیں جانا کہیں بھی۔" پھنسی پھنسی آواز میں کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔ اس کے انکار پر ریشم نے بڑی مشکل سے ضبط کا گھونٹ بھرا۔ یوں منتیں کرنا اس کی فطرت کبھی بھی نہیں رہی تھی۔
"بیٹھو تو۔" اس نے نزہت کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھایا "سہیل! آپ اس کو سمجھائیں ناں۔ دنیاداری کی خاطر ہی اسے یہ سب تو کرنا پڑے گا۔ مرنے والوں کے ساتھ کون مر سکتا ہے۔ جہیز کے نام پر کچھ تو ہونا چاہیے۔ دلہن کی سسرال میں قدر ہوتی ہے۔" اس کی اس دلیل پر نزہت نے ایک عجیب سی نظر اس پر ڈالی اور پھر نظریں جھکا لیں۔
"مجھے نہیں شوق ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "اور مجھے بازار بھی نہیں جانا۔ کچھ بھی لینے۔" لہجہ [illegible] اور ڈھیلا سا تھا۔ ریشم نے اس کے جھکے ہوئے سر کو غصے اور نفرت سے دیکھا مگر پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر کنٹرول پا لیا۔
"نزہت! میری بہن! ایسے مت کہو۔ بھائی کا دل برا ہو گا۔ دل پر پتھر رکھ کر اب یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا نا۔" اس نے آنکھ سے سہیل کو اشارا کیا کہ وہ بھی منہ سے کچھ پھوٹے۔
"چلو اگر اس کا ابھی نہیں موڈ تو ہفتہ بھر ٹھہر جاؤ۔ پھپھو چلی جائیں گی تو پھر چلی جانا۔ مجھے بھی دو چار روز تک اسلام آباد جانا ہے۔ وہاں مجھے ایک آدھ دن لگ جائے گا۔ میں ہو آؤں تو پھر تم چلی جانا۔" سہیل نے کہہ کر بات ختم کی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
ریشم کو بے تحاشا غصہ آیا۔ جی چاہا نزہت کی گردن مروڑ دے یا جا کر سہیل کا سر پھاڑ دے۔ وہ غصے میں پیر پٹختی سہیل کے پیچھے لپک گئی اور نزہت ٹیبل پر سر رکھ کر چپ چاپ آنسو بہانے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات آہستہ آہستہ بھیگ رہی تھی مگر رعنا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ کتنی دیر تک تو وہ یونہی بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ آخر تھک کر اٹھ بیٹھی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ کمرے کی خاموش فضا میں فخر حیات کے ہلکے ہلکے خراٹے گونج رہے تھے۔ وہ رعنا کے دوسری طرف اس کی بے خوابی سے بے خبر سو رہے تھے۔ رعنا نے ایک نظر فخر حیات کی طرف دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر سامنے لگے ڈریسنگ ٹیبل کے مرر میں خود کو دیکھنے لگی۔
"کتنا سارا وقت گزر گیا۔" اس کے اندر سے کوئی بولا۔ اس کے دل سے آہ نکلی۔ آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ وہ دھیرے سے اٹھی۔ اس کی سفید ریشمی نائٹی کی سرسراہٹ کا بھلا بے خبر سوئے فخر حیات پر کیا اثر ہوتا تھا۔ رعنا نے ایک لمحے کو مڑ کر اسے دیکھا اور پھر کمرے کے شمالی کونے میں بنی دیوار پر وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔ الماری کا پٹ کھول کر وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔
سائیڈ کیبنٹ سے اس نے لاکر کی چابیاں نکالیں۔ لاکر کھول کر اس نے ذرا سا جھک کر اندر دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر مخملیں البم باہر نکالی۔ لاکر اسی طرح کھلا چھوڑ کر وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر آبیٹھی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے البم کھولی اور اس میں لگی تصاویر دیکھنے لگی۔ نائٹ بلب کی روشنی تصاویر دیکھنے کے لیے کافی تھی۔ گہرا سانس لے کر اس نے صفحہ پلٹا پھر ایک ایک کر کے وہ صفحے پلٹتی چلی گئی۔ ایک صفحے پر جیسے اس کی بینائی منجمد ہو گئی۔ اس نے جھک کر لب اس تصویر پر رکھ دیے اور اپنی مرمریں انگلیوں سے تصویر میں لگے بے جان وجود کو چھونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گر کر تصویر کو بھگونے لگے۔ اس کا دل جیسے بے قابو ہونے لگا۔ وہ دیوانہ وار تصویر کو چومنے لگی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ

رہے تھے۔ ایک مدت کا رکا ہوا لاوا جیسے پھوٹ نکلا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار سسکی نکلی۔

فخر حیات کے وجود میں جنبش پیدا ہوئی انہوں نے کروٹ بدل کر اپنے بائیں طرف دیکھا۔ رعنا البم کھولے بے تحاشا رو رہی تھی اور یہ منظر فخر حیات کے لیے نیا نہیں تھا۔ انہوں نے بمشکل نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں اور سامنے لگے وال کلاک میں ٹائم دیکھنے کی کوشش کی، رات کے پونے دو بج رہے تھے۔

"سو جاؤ اب۔" لہجہ کچھ بیزار سا تھا۔

"نیند نہیں آرہی۔" بھاری نم لہجے میں رعنا نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"سلیپنگ پلز لے لو اور سو جاؤ۔ یوں رونے سے فائدہ۔" مشورہ دے کر انہوں نے پھر سے کروٹ بدل لی اور لمحوں میں پھر سے گہری نیند میں ڈوب گئے۔

رعنا نے ایک زخمی نگاہ اس کے بے حس وجود پر ڈالی اور نئے سرے سے رونے لگی۔ سسکیاں دبانے سے اس کا گلا درد کرنے لگا۔ کچھ دیر رونے سے اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا تو اس نے سائیڈ ریک پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو لے کر اپنا منہ اور آنکھیں رگڑیں اور بوجھل دل کے ساتھ البم بند کر دیا۔ کچھ دیر یونہی بیڈ سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر البم دوبارہ لاکر میں رکھا اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ نیند ابھی بھی اس پر مہربان نہ ہوئی تھی۔ آج شاید چاند کی بارہ یا تیرہ تاریخ تھی۔ چاند کی جگمگاتی کرنوں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا۔

"معلوم نہیں آج میرا دل اس قدر بے کل کیوں ہے نہ جانے وہ کس حال میں ہے۔ خدایا میں کیا کروں۔" اس کا دل پھر سے بکھرنے لگا۔ اس نے سر کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکا دیا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ مگر آنسو نہیں رک رہے تھے۔ پھر سے بہنے لگے تھے۔ وہ چپ چاپ روئے گئی۔

"یہ لو ٹیبلٹ اور کھا کر ریسٹ کرو۔ یوں خود کو ہلکان کرنے سے کیا حاصل! خواہ مخواہ خود کو ہلکا رہی ہو۔"

پیچھے سے فخر حیات نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے مڑ کر دیکھا وہ دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ لیے کھڑے تھے۔ اس نے چہرہ صاف کیے بغیر خاموشی سے ٹیبلٹ ان کے ہاتھ سے اٹھائی اور منہ میں رکھ لی۔

وہ پانی پی رہی تھی جب فخر حیات واپس مڑ کر بیڈ پر لیٹ گئے اور سوچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ رعنا نے گلاس ریک پر رکھ دیا۔

"آکر سو جاؤ اب۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ بہت تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ آج کل آفس میں کام جو بہت ہے۔"

فخر حیات کے کہنے پر وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی بستر پر آکر لیٹ گئی۔ پلاسٹر آف پیرس کے خوبصورت ڈیزائن سے منقش چھت کو سپاٹ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"سو جاؤ جان! یوں ٹینس مت ہو۔" فخر حیات نے نرمی سے اس کے تکیے پر بکھرے ریشمی بال سلجھائے۔ رعنا نے ایک گہرا سانس لیا اور گردن گھمائے بغیر ترچھی نظروں سے اپنے پہلو نشین کو دیکھا۔

"آپ سو جائیں۔ میں بھی سو جاؤں گی۔" فخر حیات نے پیار سے اس کے رخسار کو چھوا۔

"اوکے ڈیئر اب پلیز سو جاؤ۔" کہتے ہوئے انہوں نے کروٹ بدلی اور پہلے کی طرح چند لمحوں ہی میں گہری نیند سو گئے۔ رعنا نے سینے میں دبی ہوئی سانس خارج کی اور ایک نظر فخر حیات کی طرف دیکھا۔

"یہ وہی شخص ہے، جو مجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے ڈیپارٹمنٹ کے دس چکر لگایا کرتا تھا۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

دونوں کی مڈبھیڑ بیچ سڑک پر ہوئی تھی، جب سائیکالوجی کی بکس کو سینے سے لگائے رعنا فخر حیات کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ اسے چوٹ تو زیادہ نہ آئی مگر اس حادثے میں فخر حیات کا چین سکون لٹ گیا۔ ایک مصروف بزنس مین ہونے کے باوجود وہ کیمپس کے ارد گرد منڈلانے لگے۔ جو کبھی ان کے نزدیک گھٹیا رومانس کی شکل تھا، آج وہ خود اس کا شکار ہو چکے تھے اور رعنا اپنے بھائی اور بھاوج کی دست نگر اور بھاوج بھی ایسی جو اڑتی چڑیا کے پر گن لے اور جس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس مفت کے بوجھ کو کل کی جگہ آج کہیں کسی کنویں، کسی دریا میں لڑھکا دے۔

"نواز کی تنخواہ میں بچوں کا پورا نہیں پڑتا اور یہ مفت کی نیکی ماں باپ گلے ڈال گئے ہیں۔ اوپر سے پڑھائیوں کے خرچ۔ ماں باپ ہوں تو یہ چونچلے بھی اچھے لگتے ہیں۔ بھائی بیچارہ کہاں سے یہ چالان بھرتا پھرے پہلے ہی اس مہنگائی کے ہاتھوں عاجز آئے ہوئے ہیں۔" عفت آرا دن کے چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار بار یہ جملے چیختے چنگھاڑتے بچوں کی مرمت کرتے رعنا کے کانوں میں انڈیلتا نہ بھولتی اور وہ دن میں یہ سب سن سن کر سو بار مرتی۔

اوپر سے فخر حیات کا رومانس وہ تو شاید اس نئے عذاب کے ڈر سے یونیورسٹی ہی چھوڑ جاتی۔ "اگر بھائی کو ذرا بھی پتا چل گیا تو؟" بہیں آکر اس کی ٹی گم ہو جاتی کہ فخر حیات اپنے والد کو لے کر اس کا رشتہ لینے چلے آئے۔ عفت آرا کی تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے الزامات کی پٹاری کھولتی۔ نواز بھائی نے ہاں کر کے ان لوگوں کے اصرار پر شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔

اور محض دو ماہ بعد ہی اس کے ایم اے کی پروا کیے بغیر بھائی نے اس کی رخصتی کر دی۔ محض چند جوڑوں اور چند سو روپوں میں۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی جو سسرال میں آکر وہ سونے میں تلی اور شوہر کی بے پایاں محبت رعنا کو تو دنیا میں جنت مل گئی۔ اس کے سارے خدشے ہوا ہو گئے۔ اپنے سے زیادہ خوش نصیب کوئی ملتا نہ تھا۔ قسمت ہر طرح سے اس پر مہربان تھی اور فخر حیات۔۔۔ جہاں وہ پیر رکھتی وہاں وہ آنکھیں بچھاتے۔

"مگر اب۔۔۔ اب کیا ہو گیا ہے ایسا۔" اس نے زور سے درد کرتی اپنی کنپٹی دبائی۔

اگلی صبح آفس جاتے فخر حیات بڑی پریشانی کے عالم میں اپنی وارڈ روب کی درازوں۔ اپنے کپڑوں کی تلاشی لے رہے تھے، جب رعنا نے ان کے آگے وہ تصویر کر دی جو کل اسے ان کے کوٹ کی جیب سے ملی تھی۔

"اوہ تمہیں یہ کہاں سے ملی؟"

"آپ کے کوٹ کی جیب سے۔" اس نے کھوجتی نگاہوں سے فخر حیات کو دیکھا۔

"ہاں یہ میرے کوٹ کی جیب ہی میں تھی۔ یہ ہمارے نئے کلائنٹ ہیں جاپان میں ان کی مسز کی تصویر ہے میں نے منگوائی تھی۔ اصل میں مسٹر ہوشو من خود نہیں آسکتے" معروفیت کی وجہ سے۔ ان کی وائف شاید اسی ہفتے یا اگلے ہفتے آئیں گی۔ ایک بزنس ڈیل کے سلسلے میں۔ ہالی ڈے ان میں ان کی بکنگ کرائی تھی۔ آج کل میں ان کا فون یا فیکس آنے والا ہے۔ جس سے ان کی فلائیٹ کے بارے میں پتا چل جائے گا۔" کوٹ پہنتے ہوئے وہ اسے ساری تفصیل سے آگاہ کرتے چلے گئے تو رعنا کا رات بھر سے عجب خدشوں میں گھرا دل جیسے پرسکون ہو گیا۔

اور آج شام کو بھی فخر حیات نے اسے آکر بتایا تھا کہ مسز ساننے نہیں آرہیں۔ اس لیے اگلے ہفتے تک مجھے خود جاپان جانا پڑے گا۔" اور وہ جوان سے کہنے والی تھی کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی تو وہ خود ہی بولے۔

"سیفی کو آج کل سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔ اس کا فائنل قریب ہے۔ اس لیے تم تو جا نہیں سکو گی ورنہ میرا موڈ تھا کہ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں۔ وہاں کچھ دن تو لگ ہی جاتے ہیں چلو پھر کبھی سہی۔"

رعنا کو ذرا اچھا نہ لگا نہ ان کا لہجہ نہ انداز۔ شاید وہ طنز کر رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر اب کچھ نہیں تھا۔ رعنا کا دل ٹھٹک سا گیا۔ دل ان کی طرف سے آج کل یونہی بدگمان ہوا جا رہا تھا۔ ہر چیز اسے مشکوک کر رہی تھی اور اظہار کے لیے کوئی راستہ کوئی وجہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"کیا فخر حیات مجھ سے بیزار ہو چکے ہیں یا ان کے دل نے کوئی راہ ڈھونڈلی ہے۔"

نیند سے بوجھل آنکھوں نے دل سے جو سوال کیا وہ حقیقتاً "نیند اڑا دینے والا تھا مگر نیند کی گولی اپنا اثر دکھا چکی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"عبدالمبین! تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟" اس کا ہم جولی اس کا ہم درس مبشر بڑی ہمدردی و پیار سے اس سے پوچھ رہا تھا جو اپنے آگے پڑے دال روٹی کے خوان سے بے نیاز سر نیہوڑائے نہ جانے کن جہانوں کی سیر میں گم تھا۔

مبشر کی بات سن کر اس نے نہ تو سر اٹھایا، نہ کوئی جواب دیا۔

"عبدالمبین! کھانا نہیں کھانا؟" مبشر اسی پیار سے بولا۔ عبدالمبین نے زور سے نفی میں سر ہلایا مگر اٹھایا نہیں۔

"کیوں؟" بہت معصوم سے لہجے میں استفسار کیا گیا۔

حالانکہ یہ کیفیت تو خود پر بھی کئی بار گزر چکی تھی۔ جب بے تحاشا مرمت کے بعد اور لگاتار گدلے مٹیالے پانی جیسی بے ذائقہ دال کھانے سے اس کا من صاف انکار کر دیتا تو وہ خود سے بھی یہ سوال نہیں کر سکتا تھا اب بھی اس نے بدرنگ دال سے نظریں چرا کر اس سے پوچھا۔

عبدالمبین نے اس بے ہودہ سوال پر سر اٹھا کر اسے کچھ غصے سے گھورا مگر پھر خود ہی ڈھیلا پڑ گیا۔

"مبشر! مجھے ایک بات بتاؤ۔" اس نے تھوک نگل کر صاف آواز میں پوچھا۔

"بولو۔" مبشر اس کے اور قریب کھسک آیا۔

"کیا میں انسان ہوں؟" اس نے عجیب سا سوال پوچھا۔

"ظاہر ہے، تمہیں کوئی شک ہے؟" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم شک کی بات کر رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔" وہ مایوس و رنجیدہ لہجے میں بولا اور سر اٹھا کر دودھیا سفید بے رنگ آسمان کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے۔ دور تک پھیلے کھلے وسیع صحن کی دھوپ برآمدے تک آ رہی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ تم انسان ہو اور بلکہ وہ کیا کہتے ہیں اشرف.... ہو۔" اشرف المخلوقات اس کی زبان پر چڑھ نہیں رہا تھا۔ وہ خجالت سے سر کھجانے لگا۔

"ہونہہ!" عبدالمبین پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"جس قدر آج مجھے مار پڑی ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا۔ میری پیٹھ پر لگے بید کے نشانوں سے خون رس رہا ہے۔ اتنی چبھن، اتنا درد ہو رہا ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ میری پوری کمر دوہری ہو گئی ہے... اکڑی ہوئی ہے کہ میں گردن بھی نہیں جھکا سکتا۔ لیٹنا تو دور کی بات ہے اور تم بتاؤ۔ اس طرح بھلا کسی انسان کو پیٹا جاتا ہے۔ اس طرح کوئی کسی حیوان، کسی گدھے کو نہیں مارتا جس طرح آج قاری صاحب نے مجھے مارا ہے اور یہ دال؟"

اس نے دال کی پلیٹ کو ہلکی سی ٹھوکر ماری۔ دال تڑپ کر کناروں سے باہر جا گری۔ "یہ تو کالے پانی کے قیدیوں کو بھی نہیں دی جاتی ہوگی جیسی ہمیں ملتی ہے۔ اسے کوئی انسان تو کیا جانور بھی نہ کھائے دولتی مار کر نالی میں گرا دے پھر بتاؤ۔ میں کہاں سے انسان ہوں۔" اس کا لہجہ تحقیر بھرا تھا۔

"تم سبق یاد کیوں نہیں کرتے؟" وہ ہمدردی سے بولا۔

"اچھا اگر میں سبق یاد کروں گا تو کیا میری کھال نہیں ادھڑے گی؟ نہیں مبشر! کھال ادھڑنے کے لیے سبق یاد ہونا شرط نہیں۔" وہ حد درجہ مایوس و غمگین تھا۔

"مبشر! مجھے بہت درد ہو رہا ہے، بہت۔" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "ہائے میری کمر۔"

"مبین، میرے بھائی!" مبشر اس کے اس طرح رونے پر خود بھی پانی بن کر بہنے لگا۔ اسے گلے لگا کر اس کے بال سہلانے لگا کمر پر ہاتھ تو کیا وہ انگلی بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ آج صبح قاری صاحب نے اسے پرانی چارپائی کے بان کی طرح ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مرمت پر باقی لڑکوں نے پانی کی طرح سبق یاد کر لیا تھا۔

"چلو تم اندر بستر پر الٹے ہو کر لیٹو۔ میرے پاس زخموں کی ٹیوب ہے۔ میں وہ تمہیں لگا دیتا ہوں۔"

"اندر نہیں جانا۔ آج مجھے قاری صاحب نے سزا دی ہے کہ آج سارا دن اور ساری رات مجھے اس برآمدے میں اسی جگہ پر بیٹھ کر گزارنی ہے۔ یہ دیکھو زنجیر ڈال دی ہے انہوں نے میرے پاؤں کے ساتھ۔" اس نے پاؤں سے بندھی زنجیر آگے کی جس کا دوسرا سرا برآمدے کے ستون سے بندھا تھا۔ مبشر کا دل رونے لگا۔

"اچھا میں ٹیوب یہیں لے آتا ہوں۔ تمہیں لگا دوں گا۔ یہ کھانا کھا لو پھر میں تمہیں چاچا کریم بخش کی دکان سے

درد کی گولی بھی لا دوں گا اور نیچے کینٹین سے چائے کا کپ بھی۔ تم میرے اچھے بھائی کھانا کھا لو۔" وہ پیار بھرے لہجے میں اس کا بازو تھام کر بولا۔

"مبشر! مجھے کھانا نہیں کھانا۔" وہ آستین سے آنسو پونچھ کر ضدی لہجے میں بولا۔

"عبدالمبین! ضد نہیں کرتے اس طرح فاقہ کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم نے ابھی سبق بھی یاد کرنا ہے ورنہ پھر کل سزا ڈبل ہو جائے گی۔ اس کا کیا فائدہ۔" وہ اسے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔

"ہو جائے مجھے پروا نہیں۔ پہلے کون سا اچھا سلوک ہوتا ہے ادھر۔" وہ بے پروائی سے نڈر لہجے میں بولا۔

"عبدالمبین! پڑھنا تو پڑے گا نا۔ تمہیں اپنے بابا صاحب کا بھی پتا ہے نا۔ انہوں نے تمہیں ادھر اسی مقصد کے لیے بھیجا ہے۔ چاہے کچھ کر لو۔ قرآن تو تمہیں حفظ کرنا ہی پڑے گا۔" مبشر نے اسے ادھر بھیجنے کا مقصد یاد دلایا۔

"کون سی حدیث میں لکھا ہے کہ اس طرح جانوروں کی طرح پیٹ پیٹ کر قرآن یاد کرواؤ۔ بتاؤ مجھے کون سی حدیث میں لکھا ہے۔ کون سا فرشتہ یہ حکم لے کر نازل ہوا تھا۔" وہ زور سے گلا پھاڑ کر چیخا۔

"آہستہ بولو، اندر برابر کمرے میں قاری صاحب آرام کر رہے ہیں۔ ادھر صاف آواز جاتی ہے۔" مبشر نے اسے خبردار کیا۔

"کیا کریں گے وہ آ کر۔ مجھے قتل کر دیں ٹکڑے کر دیں، اور ماریں گے۔ مار دیں اس روز روز کے مرنے سے تو بہتر ہے ایک دفعہ ہی مر جاؤں۔" وہ جذباتی پن سے اسی طرح بولا۔

"تم سبق یاد کر لیا کرو نا۔ میں بھی تو کرتا ہوں، باقی لڑکے بھی تو کرتے ہیں نا۔ زاہد کو دیکھو، وہ بھی تو ہے نا۔ قاری صاحب کتنی تعریف کرتے ہیں اس کی۔"

"ہٹ مثال دو اس کی۔ وہ گاؤں کے نمبردار کا بیٹا ہے۔ تین ٹائم اس کے لیے اعلا سے اعلا خوان، گھر سے سج کر آتے ہیں جن میں قاری صاحب کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ چار گھنٹے میں سبق لے کر گھر واپس چلا جاتا ہے اور قاری صاحب نے اسے ہاتھ لگا کر خود مرنا ہے۔ نمبردار انہیں گاؤں بدر نہ کروا دے گا۔"

"تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے مبین! ہم نے بھی تو پڑھنا ہے نا۔ مرغ کھانے والے کا بھی دماغ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا دال کھانے والے کا۔ تم یہ بات کیوں سوچتے ہو اور جتنا دماغ استعمال کرو۔ اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا بڑی دانائی سے۔

"تم کرو اپنے دماغ کو استعمال۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" وہ اسی ڈھٹائی سے بولا۔

"تمہارے بابا صاحب.... تمہیں ان کا پتا ہے نا؟" مبشر نے اسے پھر ڈرانا چاہا۔

"مت لو ان کا نام۔ میں اب ان سے نہیں ڈرتا اور میں اب کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ کوئی میرا کیا کرے گا۔ مجھے مارے گا نا تو مارے، اس سے زیادہ تو نہیں مار سکتا نا۔ ہے نا؟" اس نے ہاتھ پیچھے لے جا کر اپنی کمر سے قمیص ہٹانی چاہی۔

"اور یہ بابا صاب کی بھول ہے کہ اس طرح قاری صاحب مار مار کر، زنجیریں باندھ کر مجھے حفظ کرا لیں گے۔ مبشر! میں تمہیں بتا دوں اب چاہے کچھ بھی ہو جائے میں حفظ نہیں کروں گا۔ مجھے اب اس بات کی ضد ہے۔" وہ جوشیلے پن کی آخری حد کو چھو رہا تھا۔

"توبہ استغفار۔ نعوذباللہ۔ عبدالمبین! اللہ سے ڈرو۔ ایسی باتیں توبہ توبہ۔ ایک معلم دین کے بیٹے کو ایسی باتیں زیب دیتی ہیں۔ ایک مسلمان کو۔ توبہ کرو۔" اس نے زور زور سے توبہ کرتے ہوئے اپنے کان چھوئے اور آسمان کی طرف نگاہ کر کے اللہ سے توبہ کرنے لگا۔

"کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں وہ کچھ کروں گا جس کا بابا نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ مبشر! مجھے نفرت ہے ہر اس چیز سے، ہر اس بات سے جو بابا صاحب کو عزیز ہے۔ جو انہیں پسند ہے میں ان کی پسند کو، ان کے

خواب کو' ان کی خواہش کو' ان کی زندگی کو۔ سب کو' سب کو تہس نہس کردوں گا سب کچھ۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔" وہ زور زور سے چیخ رہا تھا' اس پر جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر دال روٹی کی ٹرے دور صحن میں پھینک دی اور اپنا سر زور سے برآمدے کے ستون سے ٹکرا دیا۔ مبشر کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا' اس کی چیخم دھاڑ سے اندرونی کمرے سے دو تین لڑکے بھاگ کر آئے اور مبشر کے ساتھ اسے سنبھالنے لگے جو بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"چٹا ککڑ بنیرے تے۔ چٹا ککڑ بنیرے تے۔
کاسنی دوپٹے والی اے' منڈا عاشق تیرے تے۔"

گاؤں کی میراثن بے سری اور بھونڈی آواز میں ڈھولک پیٹ پیٹ کر ٹپے گا رہی تھی۔ میراثن کے ساتھ آئی چار پانچ لڑکیاں تالیاں بجا بجا کر گاتے ہوئے اس کا ساتھ دے رہی تھیں جبکہ باقی کی رشتہ دار خواتین اونچی نشستوں پر بیٹھی بے توجہی سے اس شور کو سن رہی تھیں' ان میں سے زیادہ تر اپنی ذاتی گفتگو میں مگن تھیں۔ سیدہ آپا شادی اور گھر کے انتظامات میں ادھر ادھر دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔

"تم لوگوں کو جہاں موقع ملتا ہے۔ فوراً" ہڈحرامی پر اتر آتی ہو گھر میں اتنا کام بکھرا پڑا ہے اور خود نواب زادیاں ادھر آ کر ڈھول پیٹنے میں مشغول ہیں۔ نامرادیں' کام چور۔ پیچھے صحن میں اماں لطیفن اکیلی بیٹھی چاول صاف کر رہی ہے اور یہ ساری ڈار کی ڈار ادھر آ بیٹھی ہے۔ دفع ہو۔ جا کر اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ شام تک دونوں بوریاں صاف ہونی چاہئیں اور بھی بہتیرے کام پھیلے ہوئے ہیں۔"

سیدہ کی پھنکار پر میراثن کے دائیں طرف بیٹھی نوکرانیوں کی ٹولی سیکنڈوں میں تتر بتر ہو کر ادھر سے بھاگ نکلی۔

"بھابھی! آپ لوگ ادھر ہال کمرے میں بری کے جوڑے ٹانکے جا رہے ہیں ان کو ایک نظر دیکھ لیں۔ خدیجہ درزن صحیح ٹانک رہی ہے یا نہیں۔ شہر سے دو درزی بھی بلائے ہیں وہ کل آئیں گے' خاص اور قیمتی جوڑے وہ ٹانک کریں گے آ کر۔"

سیدہ قیمتی کپڑوں میں ملبوس سنگل اور ڈبل صوفوں میں دھنسی بیگمات سے مخاطب ہوئی تو وہ پانچوں اپنے بھاری بھرکم جثے لے کر بمشکل صوفوں سے نکلیں اور سیدہ کے پیچھے چل پڑیں۔

"آؤ تم لوگوں کو بھی بھابھی جان کے کپڑے دکھاؤں۔ دیکھنا کس غضب کے ہیں۔" شہرینہ نے آمنہ کے کان میں سرگوشی کی تو زینب اور جھومر کے بھی کان کھڑے ہو گئے وہ تو پہلے ہی کپڑے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں۔

"چلو چلتے ہیں۔" زینب تو فوراً" کھڑی ہو گئی۔

"زینب! دیر ہو رہی ہے بابا صاحب آنے والے ہوں گے ہمیں لینے کے لیے۔" آمنہ نے دبے دبے لہجے میں سر اٹھا کر پاس کھڑی زینب سے کہا۔

"ابھی تو ہم آئے ہیں۔ اتنی دیر کہاں ہوئی۔" وہ لاپروائی سے بولی "ہے نا جھومر؟" اس نے اپنے خواجہ سے گواہی مانگی جو یقیناً" اس کے حق میں تھی۔

"ہاں تو اور کیا ابھی تو ہم آئے ہیں۔ دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ توبہ ہے آمنہ! تم تو بہت ڈرپوک ہو۔ اپنے بابا صاحب کو تم نے ہوا بنا رکھا ہے۔ مجھے بھی تو دیکھو ابا کو چکمہ دے کر ادھر آئی ہوں۔ بندے کو بہادر ہونا چاہیے۔" وہ اپنے کارنامے پر نازاں تھی۔ "چلو بس کپڑے دیکھ کر چل پڑیں گے۔" جھومر نے زینب کو بازو سے آگے دھکیلا تو مجبوراً" آمنہ کو بھی اٹھنا پڑا۔

"چلو نا تم تینوں کیا کھسر پھسر کر رہی ہو۔" شہرینہ نے مڑ کر انہیں ٹوکا۔

"ہاں چل رہے ہیں۔" زینب اور جھومر تیزی سے شہرینہ کے برابر ہو گئیں۔

شہرینہ آمنہ کی ہم عمر تھی۔ سید سبطین شاہ کی چھوٹی صاحبزادی۔ باپ اور بھائی بہن کی لاڈلی۔ شکل و صورت

اور قدبت میں وہ سیدہ اور سلطان بخت دونوں کو کاٹ گئی تھی۔ اتنی خوبصورت تھی کہ آئینہ بھی اسے مبہوت ہو کر دیکھتا رہ جاتا تھا۔ اسی لیے سیدہ نے ابھی سے اسے سختی سے پردہ کرانا شروع کر دیا تھا۔ اب تک تو وہ مری کانونٹ میں پڑھتی رہی تھی' لیکن اب سیدہ نے بھائی اور باپ دونوں سے کہہ دیا تھا کہ اب اسے گھر پر تعلیم دلوائی جائے جس کے لیے شہرینہ ابھی راضی نہیں تھی اور ضد منوانے کے لیے' اس کی ایک بھوک ہڑتال ہی کافی ہوتی بابا جان کے لیے' یہ اسے معلوم تھا۔ اس لیے اسے سیدہ کے غصے کی بھی پروا نہیں تھی اور سلطان بخت کو بھی منانا اس کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا۔

وہ تینوں ہال کمرے کے دروازے کے آگے جھجک کر رک گئیں۔ دروازہ مضبوط چمکدار لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اس کی چوکھٹ اتنی اونچی تھی کہ بندے کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑتا۔ ویسے تو ساری حویلی ہی میں قیمتی اور مضبوط لکڑی کا کام کیا گیا تھا مگر ہال کمرے کا دروازہ ہی اس کی انفرادیت کا گواہ تھا۔ چوکھٹ کی پانچ انچ چوڑی پٹی پر بے انتہا نفیس و نازک بیل بوٹے بنے ہوئے تھے کہ آمنہ کی انگلیاں بے ساختہ انہیں چھونے لگیں۔ جیسے وہ اصلی ہوں۔ جھومر نے بھی سر اٹھا کر توصیفی نظروں سے دروازے کو سراہا۔ زینب البتہ اس قسم کے احساسات سے بے نیاز دروازے سے اندر جھانکنے کی کوشش میں تھی۔

"آ جاؤ نا۔ رک کیوں گئیں؟" شہرینہ مڑ کر آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ ویسے بھی تینوں ہی سیدہ آپا کی سخت طبیعت سے خائف تھیں کہ کہیں ڈانٹ کر بھگا ہی نہ دیں مگر خیر گزری کہ سیدہ درزن کے سر پر سوار تھیں۔

"یہ دوپٹہ کیسے جوڑا ہے۔ اس کی بیل اوپر آنی چاہیے تھی' یہ شرٹ اس طرح ہینگ کرتے ہیں۔ خدیجہ! تم اب بوڑھی ہو گئی ہو اپنی بیٹی کو یہ ہنر سکھاؤ۔ اس کو تم نے پڑھائیوں میں لگا رکھا ہے جیسے کمشنر لگوانا ہے۔" سیدہ متنفر لہجے میں بولیں۔

"لڑکی تو وہ بہت ہوشیار ہے۔ پانچویں میں پڑھتی ہے۔ میں نے کون سا اسے آگے پڑھانا ہے۔" خدیجہ گھگھیا کر بولی۔

"نہیں پی ایچ ڈی کرواؤ اس کو۔ باپ کمہار' ماں درزن اور بیٹی ڈاکٹر۔ اتنے اونچے خواب مت دیکھو مجھے سب خبر ہے' تم جو آج کل پر پرزے نکال رہی ہو اور اس دوپٹے کا پھول بنانا تھا تاکہ سنہری کنارے چاروں طرف سے نظر آئیں اسے ادھیڑ کر دوبارہ لگاؤ' یہاں یہ مکیش کا سوٹ تم نے کچ لگایا ہے۔"

وہ تنقید پر تنقید کیے جا رہی تھیں' خدیجہ کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ وہ الٹے سیدھے طریقے سے کپڑے رکھ رہی تھی اور ابھی سیدہ کہہ رہی تھیں کہ یہ عام سے کپڑے رکھ رہی تھی یہ عام سے کپڑے ہیں خاص کپڑے تو درزی ہی ٹانک کرے گا آ کر۔ "اگر عام کپڑے ایسے ہیں تو خاص کپڑے کیسے ہوں گے۔" کپڑوں کی چمک دمک دیکھ کر جھومر کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے تو آج تک پیوند لگی فراکیں' کھدر کی گھیردار قسم کی کڑھائیوں سے بوجھل قمیصیں اور اونی شالیں دیکھی تھیں یا زیادہ سے زیادہ مرینہ اور پشمینہ کے قیمتی کپڑے سے بنی پٹھانی فراکیں اور اس کی آخری پرواز شنیل اور ویلوٹ تھی جو اس کی اور اس کے علاقے کی تمام عورتوں کی پہنچ سے باہر کا کام تھا اور یہاں؟

اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں اس کے جھونپڑی نما مٹی کے گھر میں کوئی لوہے جست کا صندوق تھا نہ پیٹی۔ ایک لکڑی کا بکس سا تھا جس میں اس طرح کا ایک بھی دوپٹہ تو کیا ایک رومال بھی نہیں تھا' جب میدانی علاقوں سے جانے والی بے فکر سیاحوں کی ٹولیاں ان کی وادی میں سیر کرنے آتیں تو ان کے قیمتی لباس اسے اور اس کی ہم عمروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ مٹی کے جلتے لیمپ کی مدھم روشنی میں رات گئے تک ان فکر گندم سے آزاد لوگوں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی کہ یہ کہاں رہتے ہوں گے۔ کہاں سے آتے ہوں گے' جہاں رہتے ہوں گے وہاں تو یقیناً" دودھ کی نہریں بہتی ہوں گی اور اب وہ انہیں فکر گندم سے آزاد لوگوں کے درمیان کھڑی تھی۔

"یہ آسمانی سوٹ کس قدر خوبصورت ہے اور وہ پیلا۔ ہائے کاش میرا بھی ایسا ہوتا اور آمنہ۔ وہ سبز سوٹ دیکھو' قسم سے آنکھوں میں اتر رہا ہے۔"

زینب بھی جھومر کی طرح ہر سوٹ پر نثار ہو رہی تھی۔

"آہستہ بولو۔ کیوں ندیدوں کی طرح تبصرے کر رہی ہو۔" آمنہ نے اسے دھیمی آواز میں جھڑکا' جس کا زینب پر کچھ اثر نہ ہو۔

ہال کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لمبی قطار جوتوں کے ڈبوں کی لگی تھی۔

"ایک دو تین......" جھومر نے گننے شروع کیے پورے اکتیس ڈبے تھے۔

پورے اکتیس ہیں اتنے سارے۔" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تو زینب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

"جوتے ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"ابھی تو ہیں جوڑے اور آنے ہیں قیمتی سوٹوں کے ساتھ' آپا سب میچنگ لائی ہیں۔" شہرینہ نے فوراً ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"آپا جی! یہ چالیس جوڑے ہیں پورے۔" خدیجہ شاید گنتی کر رہی تھی۔

"انتیس رہ گئے وہ کل کر دینا مگر آج ان سب کو دوبارہ پریس کر کے سوٹ کیس میں رکھ کر جانا۔" سیدہ کڑے لہجے میں بولیں وہ نرم بات بھی سخت لہجے میں کہنے کی عادی تھیں۔

"آپا! میرا بارات کا سوٹ ٹیلر کب لائے گا؟" شہرینہ یاد آنے پر ان کے پاس جا کر بولی۔

"زینب! ان لوگوں کے پاس اس قدر پیسہ ہے۔" جھومر کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

"یہ پیسہ نہیں ہے بے وقوف! یہ تو کپڑے اور جوتے ہیں اور اگر تم ان کا پیسہ دیکھ لو تو شاید پاگل ہو کر دوبارہ اپنی وادی میں بھاگ جاؤ۔ ان لوگوں کے پاس پیسہ گننے والا نہیں تولنے والا ہے۔" زینب نے اور اسے ہراساں کیا۔

"زینب ان لوگوں کے پاس اس قدر پیسہ کہاں سے آیا؟" وہ اسی بے خود انداز میں بولی۔

"اللہ نے دیا۔" زینب لاپروائی سے بولی۔

"تو اللہ ہمیں کیوں نہیں دیتا؟" اس کی نظریں ہنوز آنکھوں کے آگے پھیلے لہراتے ست رنگے ملبوسات پر تھیں۔

"اللہ کی مرضی۔" زینب اسی طرح بولی۔

"ہم اللہ کی مرضی میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں؟" جھومر نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔

"اللہ کی عبادت کر کے۔" آمنہ نے اس کے دائیں پہلو سے بے اختیار جواب دیا۔

"ہونہہ بے وقوف!" زینب نے ہنکارا بھرا۔ "عبادت کر کے ہمیں صرف جنت کے وعدے پر ٹرخایا جاتا ہے۔ مال اور پیسہ پھر بھی نہیں ملتا۔ وہ ان لوگوں کو ملتا ہے جو کبھی بھولے سے بھی اللہ کو یاد نہیں آتے۔ رج کے اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں۔ اپنی من مانیاں کرتے ہیں۔ خلق خدا کو اپنے ظلم کے نتیجے میں عاجزی عطا کرتے ہیں' جس کی وجہ سے اللہ کے ماننے والوں کی تعداد تو نہیں بڑھی ہاں اس کو پکارنے والوں کی بڑھ گئی ہے جو ہر ظلم پر صرف یہ فریاد کرتے ہیں۔ "ہمیں پیدا کرنے والے تو کہاں ہے' ان کو ایسا اور ہم کو اتنا حقیر پیدا کیوں کیا۔" یہ جب جی چاہے جس کو جی چاہے' روند کر گزر جاتے ہیں۔ ان کو پیسہ ملتا ہے۔ ہمیں صرف وعدے ملتے ہیں۔ عبادتوں کے نتیجے میں بشارتیں ملتی ہیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں۔"

زینب جو گھر میں بیٹھ کر آٹھویں کر رہی تھی' عالمانہ زہر اس کے اندر کس طرح پیدا ہوا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو زینب! اللہ سے ڈرو۔" آمنہ نے بمشکل بڑی بہن کا حق ادا کیا۔

"صرف ہم ہی ڈریں۔ یہ کیوں نہیں ڈرتے جو بغیر کسی ڈر خوف کے انسان کو یوں مار دیتے ہیں جیسے کوئی چیونٹی

ہاتھ میں لے کر مسل دے پھر بھی اللہ انہیں کچھ نہیں کہتا بلکہ شاباشی میں اور پیسہ دیتا ہے اور اگر عبادت کرنے سے پیسہ ملتا تو سب سے زیادہ پیسہ بابا صاحب کو ملنا چاہیے جو ساری ساری رات اللہ کی حاضری میں کھڑے رہتے ہیں۔ اور صبح سوجے پاؤں' تھکے وجود اور خالی جیب کے ساتھ اپنے بوریے پر سو جاتے ہیں۔" زینب نے اتنا زہریلا سچ کہاں سے سیکھا تھا۔ وہ تو بہت لاابالی سی بہت لاپروا سی لڑکی تھی۔

"اور اگر تم سمجھو تو یہی حقیقی پیسہ ہے۔" آمنہ صوفی صاحب کے لہجے میں بولی۔

"اگر یہ پیسہ ہے تو اس سے مجھے اس طرح کا ایک سوٹ ہی بنوا دو۔ نہیں بنوا سکتیں!" وہ خود ہی تمسخر سے ہنسی۔

"اگر یہ پیسہ ہے تو تمہیں مبارک۔" آمنہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"بابا صاحب سن لیں زینب کو تو کیا سوچیں۔" وہ زینب کا لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر سوچنے لگی۔

"اچھا اس بحث کو چھوڑو۔ زینب! ہم بھی ان جیسے امیر کیسے ہو سکتے ہیں؟" جھومر کی سوئی ادھر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"ان کے گھر ڈاکا ڈال کر۔" زینب جل کر بولی۔

"اور کوئی آسان طریقہ نہیں؟" جھومر مایوسی سے بولی۔

"ایک اور طریقہ بھی ہے مگر اب دیر ہو گئی۔ تم پہلے آجاتیں تو پھر قابل عمل تھا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"وہ کیا؟" جھومر نے بے تابی سے پوچھا۔

"اگر تم سیدہ آپا کی نند کی جگہ ہوتیں تو یہ سب کپڑے تمہارے ہوتے۔ اس ساری دولت جاگیر کی تم مالک ہوتیں اگر تم سیدہ آپا کی نند ہوتیں۔" زینب کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ جھومر تپ گئی۔

"تم بہت فضول بکواس کرتی ہو اور بھی بہت طریقے ہیں اگر سوچو تو۔"

"اچھا واقعی! وہ [illegible] ایسا کوئی طریقہ اگر تمہیں معلوم ہے تو مجھے ضرور بتانا مگر علیحدگی میں۔ یہ آمنہ تو اس پر بھی عمل نہیں کرنے دے گی مجھے معلوم ہے۔"

وہ آمنہ کی شعلہ بار نگاہوں سے مصنوعی طور پر ڈر کر بولی۔

"چلو تم لوگ اگر چلنا ہے تو۔ دیر ہو گئی ہے۔ بابا صاحب آ گئے تو پھر ڈانٹ پڑ جائے گی۔ ادھر بہت ٹائم لگ گیا ہے۔" آمنہ زینب کو گھورتے ہوئے پیچھے کی طرف مڑ گئی۔ تو وہ دونوں بھی کندھے اچکا کر اس کے پیچھے باہر نکل گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"سیفی! ادھر آؤ۔" سیفی جو رعنا کو سٹنگ روم میں بیٹھے دیکھ کر کنی کترا کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے کاریڈور کی طرف مڑنے لگا تھا اس کی پکار پر بے اختیار ٹھٹک گیا۔

"سنا نہیں' ادھر آؤ۔" وہ اب کے ذرا کڑے لہجے میں بولی۔

تو سیفی نے شکایتی نظروں سے ماں کو دیکھا کہ اسے اس لہجے کی عادت نہیں تھی پھر سست قدموں سے رعنا کی طرف بڑھا۔ بلیک جینز اور اورنج شرٹ میں سفیان بارہ تیرہ سال کا صحت مند' دراز قد لڑکا تھا' شکل و صورت میں رعنا سے زیادہ مشابہ تھا بہ نسبت فخر حیات کے۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" رعنا نے اس کے حلیے کا ناقدانہ جائزہ لیا'

"وکی کی طرف سے۔" وہ بے خوف لہجے میں نظریں اٹھا کر بولا۔

"اس وقت۔ ٹائم دیکھا ہے؟ شام کے ساڑھے پانچ بج رہے ہیں' تمہیں معلوم بھی ہے پانچ بجے تمہارے ٹیوٹر آجاتے ہیں' تم وکی کی طرف کیوں گئے؟"

رعنا باہر جا رہی تھی' گاڑی ابھی پورچ سے نکلی نہیں تھی کہ اس نے سیفی کے ٹیوٹر کو باہر جاتے دیکھا تو معلوم کرنے پر پتا چلا کہ سیفی صاحب تو موجود نہیں اور ٹیوٹر بے چارہ آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اب واپس جا رہا ہے۔ تو رعنا گاڑی سے نکل آئی کہ سیفی کی کلاس لے کر باہر جائے گی۔

"ممّا! وہ مجھے لینے آیا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے اسپورٹس کار لے کر دی ہے۔ وہ اسی میں آیا تھا پھر میرے انکار کرنے کے باوجود مجھے گھمانے لے گیا۔ میں آپ کے کمرے میں پرمیشن لینے آیا تھا مگر آپ باتھ لے رہی تھیں۔ اس لیے۔" وہ اسی طرح دیکھتے ہوئے وضاحت سے بولا۔

"غضب خدا کا عمریں ابھی پندرہ سال بھی نہیں ہوئیں۔ اسپورٹس کاروں کا بھی شوق چرا گیا' ایسے والدین ہوتے ہیں ناجن کے بے جا لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے سپوت سڑکوں پر حادثے کرتے پھرتے ہیں۔ تم اس بچّی کے ساتھ میری اجازت کے بغیر گئے کیوں؟ مجھے تو تمہارا وہ دوست لگتا ہی زہر ہے۔ بالوں کی پونی' کانوں میں بالی' ہاتھ میں کڑا۔ پتا نہیں کس جنس سے تعلق ہے اس کا۔" رعنا کو اور غصہ آگیا۔

"ممّا سوری۔ آئندہ آپ سے اجازت لے کر جاؤں گا۔" وہ رعنا کا خراب موڈ دیکھ کر فوراً" آگے بڑھ کر لجاجت سے بولا۔

"اوکے۔ جاؤ تم اپنے روم میں' تمہارے سر دوبارہ ساڑھے چھ بجے آئیں گے۔ دس منٹ میں جا کر کتابیں کھولو۔" اسے معلوم تھا سیفی کے لیے یہ سزا ہی کافی ہے کہ سر دوبارہ آئیں گے اور پڑھنا تو پڑے گا۔

"ممّا میں نے ہوم ورک تو کر لیا تھا۔ اب سر آکر کیا کریں گے۔" وہ احتجاجاً" رعنا کا ہاتھ جھٹک کر بولا جو ابھی چند لمحے پہلے محبت سے تھامے کھڑا تھا۔

"تو ایکسکیوز۔ اب سر دوبارہ آئیں گے۔ مجھے تمہاری کوئی شکایت نہ ملے۔ چلو اپنے کمرے میں۔ فائنل سر پر ہے اور تم ہوم ورک لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔ چلو جو میں نے کہا ہے۔" وہ سختی سے بولی تو وہ پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"پتا نہیں اس کو پڑھنے کا شوق کیوں نہیں ہے۔ میں اور فخری تو۔" سوچتے ہوئے اس نے اتنی زور سے ہونٹ کاٹے کہ خود ہی منہ سے "سی" نکل گیا۔ ہونٹ سے شاید خون نکل آیا تھا۔ انگلی سے چھو کر دیکھنے لگی۔

"آہا رعنا تو موجود ہے۔ کیا حال ہے بھئی۔" عفت آرا کی پرجوش آواز پر رعنا کا جی چاہا۔ اپنا آپ ہی پکل ڈالے کہ وہ کیوں موجود ہے۔ وہ اسی طرح آیا کرتی تھیں۔ اچانک اور بن بلائے۔ عفت آرا کے ساتھ ان کی دونوں بڑی بیٹیاں فرح اور ندا تھیں۔

"اب شام غارت۔" رعنا دل میں سلگی۔ بیگم ہاشمی کی طرف پارٹی تھی اور بیگم ہاشمی کو ٹالنا بھی ایک درد سر تھا ابھی ان کا فون آجائے گا۔

"آپ بھابھی! بیٹھیں۔" وہ حسب عادت دل پر جبر کر کے بولی۔

"ہاں ہاں۔ آجاؤ بھئی۔ تم دونوں کیوں رک گئیں۔" عفت آرا نے مڑ کر ان دونوں کو چکارا۔ ندا بیگ ہاتھ سے رکھ کر آگے بڑھی اور دونوں نے جیسے شرما کر سلام کیا۔ رعنا نے سوٹ کیس نما بیگ کو گھورتے ہوئے دونوں کے سلام کا جواب دیا۔ تینوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"شکر ہے رعنا گھر پر مل گئیں۔ وہ تمہاری موئی بڈھی کھوسٹ ملازمہ کہہ رہی تھی۔ بیگم صیب تو ابھی گئی ہیں گاڑی میں۔" وہ جنتاں کے لہجے کی نقل اتار کر بولی۔

"ہاں میں نکلی تھی باہر مگر ایک ضروری کام یاد آنے پر اندر آگئی گاڑی اسی لیے باہر گیٹ کے قریب کھڑی ہے۔ بس میں جانے والی تھی۔" رعنا نے جلد سے جلد ان کی بے وقت آمد کا مقصد جان لینا چاہا۔

"اچھا کہیں جا رہی ہو گی۔ تو بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں ابھی یہیں ہوں بلکہ دونوں بچیاں بھی ادھر ہی ہیں۔ اصل میں دونوں کے امتحان ختم ہوئے تو خوامخواہ ضد کرنے لگیں کہ امی ہم نے کہیں چھٹیاں گزارنے جانا ہے۔ اب تمہارے بھائی کی اتنی پہلی تو ہے نہیں کہ انہیں مری وغیرہ بھجوا دوں۔ رہ گئے رشتہ دار تو نہ کوئی چاچا نہ تایا۔ ایک تم ہی تو ہو میں نے کہا اللہ رکھے پھپھو جو ہے تمہاری' چلو ادھر ایک ہفتہ گزار آؤ۔"

ان کی آمد کا مقصد جان کر رعنا کا جی چاہا گھر تو کیا وہ دنیا ہی چھوڑ دے۔ پہلے ہی وہ آج کل فخر حیات کے رویے کی

وجہ سے بہت ٹینس ہو رہی تھی۔ اوپر سے عفت آرا بیگم آئے دن اس کے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرتی رہتی تھی۔ بیٹیوں کو ادھر رکھنے کا مطلب تھا۔ عفت آرا کو بھی ادھر رکھنا اور ان کو تو چند گھڑی برداشت کرنا ہی اپنے حواس مختل کر دینے کے مترادف تھا۔ وہ اسی طرح بندے کے اعصاب ناکارہ کر دیا کرتی تھیں۔ بے چین اور حسد بھری نظروں سے اور ندیدوں والی گفتگو کر کے۔ رعنا نے ایک گہرا سانس لیا۔

"بھابھی! مجھے خوشی ہوتی اگر یہ دونوں یہاں رہتیں۔ اصل میں کل شام کو ہم جاپان جا رہے ہیں۔ اس لیے گھر میں تو کوئی ہو گا نہیں۔" فوراً" ہی اس کے ذہن نے بہانا گھڑا۔

"ایں۔ یہ اچانک جاپان کیوں؟" عفت آرا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جو جنتاں کو چائے کے لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹ کر لاتے دیکھ کر فوراً" بند بھی ہو گیا۔

"اچانک تو نہیں کچھ دنوں سے بن رہا تھا' اصل میں فخر کو ادھر کچھ کام تھا پہلے بھی میں ساتھ نہیں گئی تھی تو ناراض ہو رہے تھے۔ سیفی کے ایگزام میں بھی خاصے دن ہیں ایک آدھ ہفتہ ان کے ساتھ گھوم پھر آتے ہیں۔" وہ بات تفصیلات بتاتی چلی گئی۔

"تو کیا گھر نوکروں کے سر پر کھلا چھوڑ جاؤ گی۔ آج کل تو کسی کا بھروسا نہیں۔ یہ بچیاں ہیں نا۔ میں بھی آجایا کروں گی' رات کو تمہارے بھائی آجایا کریں گے۔" انہوں نے فوراً" اپنی فی سبیل اللہ خدمات پیش کیں۔

"نہیں اس بار فخر کہہ رہے تھے۔ گھر کو لاک کر کے جانا ہے' باہر چوکیدار رہے گا' دو چار ملازمین نے تو چھٹی پر گاؤں جانا ہے اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ سب کو ہی ایک ہفتے کی چھٹی دے دیتے ہیں۔" رعنا نے کہا تو عفت آرا نے آدھا کباب توڑ کر منہ میں رکھ لیا۔ انہیں آگے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا کہ کس طرح رعنا کو مجبور کر کے دونوں لڑکیاں ادھر ہی چھوڑ جائیں۔ آخر بھری ٹرالی نے انہیں زیادہ دیر اس ذہنی رسہ کشی میں مبتلا نہ رکھا۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی' ورنہ میں نے تو کہا تھا کہ ہم رہ جاتے ہیں' اچھا ہے گھر کی حفاظت بھی ہو جائے گی باقی تم میاں بیوی بہتر سمجھتے ہو۔" عفت آرا نے پیسٹری اٹھا کر کھانا شروع کر دی۔

"مجھے تو خوشی ہوتی مگر اب جو فخر اصرار کر رہے ہیں تو انہیں بار بار انکار بھی نہیں کر سکتی۔" حالانکہ فرح اور ندا کو رکھنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا مگر عفت آرا کی کمینی فطرت نے اسے اپنے خون سے بھی دور کر دیا تھا' وہ جتنا ان سے بچنا چاہتی' وہ اتنا ہی قریب آتے تھے۔

"اب تو فخر سے کہوں گی۔ چاہے ہمیں ایک ہفتے کے لیے مری بھوربن بھجوا دیں۔ بھابھی تو ہمیں چیک کرتی رہیں گی' سیفی کو بھجوا دوں گی۔" ان تینوں کو فری اسٹائل انداز میں چیزوں سے انصاف کرتے دیکھ کر رعنا سوچنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"السلام وعلیکم صوفی صاحب!" ماسٹر صاحب نے حجرے کے اندر داخل ہو کر چٹائی پر بیٹھے صوفی صاحب کو سلام کرتے ہوئے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"اب جاؤ تم اور مسجد کی تمام صفیں باہر احاطے میں لے جا کر اچھی طرح جھاڑو اور مسجد کے صحن کو دھلوا دو۔ دو تین لڑکوں کو ساتھ لگا کر اچھی طرح صفائی کر ڈالو۔ عصر کی نماز تک صحن خشک کر کے صفیں بچھا دینا۔" وہ جلیل کو ہدایات دینے لگے۔ وہ رٹو طوطے کی طرح ان کے ہر جملے پر ضرور سر ہلا کر "جی صوفی صاب۔" کہے جا رہا تھا۔ ان کی بات ختم کرنے پر بھی "جی صوفی صاب۔" کہہ کر وہیں سینے پر ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا رہا۔

"جاؤ اب۔" منتظر کھڑے دیکھ کر انہیں کہنا پڑا تو وہ "جی صوفی صاب۔" کہہ کر سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"بہت دنوں بعد آئے ہیں ماسٹر صاحب!" صوفی صاحب ماسٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی بس کچھ مصروفیت ایسی رہی ہے۔ شہر گیا ہوا تھا۔ دو روز ادھر لگ گئے اپنی ہمشیرہ کے گھر۔ کچھ کتابیں اردو بازار سے خریدنی تھیں اس لیے۔ اب ریٹائرمنٹ کا زمانہ یونہی تو نہیں گزرتا بہت اچھی اسلامی معلوماتی کتابیں لایا ہوں۔ دو فلسفے کی بھی ہیں' آپ کو دکھاؤں گا دو ایک روز میں لا کر۔" ماسٹر صاحب نے تفصیلاً" جواب دیا۔

"اللہ برکت دے آپ کے شوق میں۔ آج کل تو لوگوں میں مطالعے کا شوق عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ معاشی مسائل نے لوگوں کے ذہنوں کو بری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ دال، روٹی، آٹا، چینی، گوشت، سبزی انہیں کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیتے ہر شخص اس ذہنی جکڑن کا شکار ہے۔ چہروں پر وہ پہلی سی فرصتیں، بے فکریاں نظر ہی نہیں آتیں۔ کتاب کس نے پڑھنی ہے اور کتاب تو بندہ تب ہی پڑھ سکتا ہے جب ذہن آزاد ہو ہر فکر سے۔ پھر کتابوں کی قیمت اللہ اللہ......" صوفی صاحب بولے۔

"درست فرمایا آپ نے۔ یہ ٹھیک ہے آج کل ہر بندہ معاشی مسائل کی وجہ سے پریشان ہے۔ ان مسائل نے اس کی ذہنی فراغتیں چھین لی ہیں مگر میرے خیال میں ایک کتاب ہی ہے جو اسے ان مسائل سے کچھ دیر کے لیے دور لے جا کر ذہنی بے فکری و یکسوئی بھی عطا کرتی ہے۔ اگر ہم اپنی پریشانیوں کا حل کتاب پڑھنے میں تلاش کریں تو یقین کریں ہمارے ذہن پورے نہیں تو آدھے ضرور فریش ہو جایا کریں۔ مگر آپ کی بات بھی صحیح ہے کہ ایک تو لوگوں کا اس طرح دھیان ہی نہیں جاتا، دوسرے کتابوں کی قیمتیں واقعی آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں۔ عام آدمی سے دور جو سب سے زیادہ پریشانیوں اور الجھنوں کا شکار ہے۔" ماسٹر صاحب نے اختلاف کرتے ہوئے بھی صوفی صاحب سے اتفاق رائے برقرار رکھا۔

"یہی ساری بات ہے جو لمحہ فرصت ہمیں ملتا ہے۔ اسے سو کر یا ایک دوسرے سے کدورتیں بڑھا کر یا پھر انہیں بے کار مسائل پر سوچ سوچ کر برباد کر دیتے ہیں حالانکہ بے کار وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی کتاب پڑھ لے۔" صوفی صاحب خود مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ مذہبی کتابوں کے علاوہ مطالعے کا بھی شوق رکھتے تھے۔

"بالکل درست فرمایا آپ نے، لیکن آج کل کا زمانہ اس طرح کا آگیا ہے۔ ماحول اس طرح کا بن گیا ہے۔ کوئی چاہے خواہ نہ چاہے، دوسرے اسے اپنے مسائل میں شامل کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ اسی طرح کی دو مصیبتیں آج کل میرے گھر میں بھی آئی ہوئی ہیں۔"

ایک دم سے ماسٹر صاحب کا دھیان اپنے موجودہ مسائل کی طرف مڑ گیا ورنہ گھر اور زندگی کے مسائل کو انہوں نے بھی کتابوں کے مقابلے میں ساری زندگی اہمیت نہیں دی تھی۔ ماسٹرنی بے چاری لڑ لڑ کر اب صابر و شاکر ہو گئی تھی۔ سارا گاؤں کہتا تھا کہ ماسٹرنی بہت صبر والی ہیں۔ بہت قناعت والی۔ اب یہ کوئی ماسٹرنی کے دل سے پوچھے۔ انہوں نے یہ صبر و قناعت کہاں سے حاصل کی۔ من کو مارتے جاؤ۔ خواہشوں کو کچلتے جاؤ (بے شک یہ نیک کام خود نہ کرو، حالات کریں۔) تو ایک روز من مر ہی جاتا ہے۔ خواہشوں کا چوں چوں کا مربہ پک کر صبر کی چاشنی میں ڈھل ہی جاتا ہے۔ یہی کچھ ماسٹرنی کے ساتھ بھی ہوا۔

"کیسی مصیبتیں؟" صوفی صاحب چونکے "میں نے تو سنا ہے۔ آج کل آپ کے گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"مہمان!" ماسٹر صاحب نے دانت پیسے "بلائے جان کہیں جی۔"

"نہیں ماسٹر صاحب! ایسا نہ کہیں، اللہ ناراض ہوتا ہے۔"

"صوفی صاحب! آپ کو کیا معلوم۔ خیر۔" انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "میری سالی کا شوہر اور اس کا کوئی مہمان، جس سے وہ اپنی بیٹی جھومر کا نکاح کرنا چاہتا ہے دو روز سے آ کر ہمارے سر پر سوار ہیں۔ باپ چلاتا ہے۔ "ام ابھی نکاح کرے گا مولوی کو بلاؤ" بیٹی چیختی ہے۔ "ابا امری لاش سے نکاح کروائے گا تو کرو۔ ام نہیں کرے گا۔" دونوں پٹھان والیوم میں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ میں دونوں کو ڈانٹ ڈانٹ، پکڑ پکڑ کر ٹھنڈا کرتا ہوں۔ دونوں تھوڑی دیر میں پھر سے ہانڈی کی طرح پکنے لگتے ہیں۔ اب اس کے باپ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ سے پوچھ کر آؤں کہ ولی یا سرپرست کی مرضی ہو اور لڑکی غل غپاڑہ مچاتی ہو کہ اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے تو کیا نکاح ہو سکتا ہے؟" ماسٹر صاحب نے مسئلہ بیان کیا۔

"کیا لڑکی پاگل ہے؟" صوفی صاحب چونک کر بولے۔

"کہاں صوفی صاحب! وہ تو آدھی دنیا کو پاگل بنا دے۔" ماسٹر صاحب اکتائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"تو پھر ایسی صورت میں تو نکاح نہیں ہو سکتا۔ اگر لڑکی راضی نہ ہو تو۔" صوفی صاحب بولے۔

"اس کا باپ کہتا ہے میں زبردستی پکڑ کر تیرا انگوٹھا لگوا لوں گا۔ تب تو ہو جائے گا؟" ماسٹر صاحب نے بے بسی سے اپنے ہم زلف کے "روشن" خیالات بیان کیے۔

"نری جہالت ہے ماسٹر صاحب! نکاح کوئی مذاق نہیں ہے، اپنے مہمان سے جا کر کہیں کہ مذہب اس طرح کے مذاق کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ سراسر گناہ ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے اپنی داڑھی میں خلال کیا اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں رگڑ کر اپنے چہرے پر اچھی طرح سے پھیریں جیسے کوئی منہ دھوتا ہو۔ ان کا سرخ و سفید رنگ اور سرخ ہو کر دمکنے لگا۔

"میں تو میں بھی بیٹ بیٹ کر تھک گیا ہوں۔ یہ بات دونوں کی سمجھ میں آتی ہے نہ دونوں یہاں سے جاتے نظر آتے ہیں۔" ماسٹر صاحب حد سے زیادہ بیزار تھے۔

"اللہ ان لوگوں کو عقل دے۔ نیکی کی ہدایت دے۔" صوفی صاحب بولے۔

صوفی صاحب کو دوپہر کے کھانے کے لیے آواز دینے کے لیے زینب حجرے کے اندرونی دروازے کے پاس پہنچی تھی۔ جب جھومر کے نکاح کی بات اس کے کان میں پڑی۔ آدھی پوری بات سن کر وہ اندر کمرے کی طرف بھاگی جہاں آمنہ بیٹھی اپنی نویں جماعت کی کتاب کھولے کوئی سبق رٹ رہی تھی۔

"آمنہ! آمنہ تم نے کچھ سنا؟" وہ بھاگی بھاگی اس کے پاس پہنچ کر پھولے سانس کے درمیان بولی، اندرونی کمروں اور صحن کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا جو بہت بڑا جو تھا۔

"کیا؟" آمنہ نے غیر دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"جھومر کا نکاح ہو رہا ہے۔ اسی نوگو اس گندے زینور کے ساتھ۔ پتا نہیں آج، پتا نہیں کل۔" اس نے پوری بات کب سنی تھی اس لیے آدھی اپنے پاس سے بنا کر بولی۔

"اچھا۔" آمنہ ایک پل کو ٹھٹکی اور پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی "ہو رہا ہو گا۔"

"تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟" زینب اس کے ٹھنڈے انداز پر بولی۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے، وہ بتا تو رہی تھی کہ اس کے ابا کس طرح چاہ رہے ہیں تو ہو رہا ہو گا نکاح۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"یہ آمنہ کسی طرح کی ہے۔ غیر جذباتی اور احمق۔" زینب دل میں بڑبڑائی۔

"بابا صاحب آگئے ہیں۔ اماں جی کہہ رہی ہیں آ کر دستر خوان بچھائیں آپ دونوں۔" جویریہ اندر آ کر دونوں سے بولی۔

"تم چھوٹی ہو دستر خوان نہیں بچھا سکتیں، ہر وقت پڑھائی کا بہانہ۔ زیادہ لاڈلی بن کر اماں بی کی گود میں گھسی رہتی ہو۔ آمنہ! یہ چھوٹی ہے اب پانچویں میں پڑھتی ہے۔ اس عمر میں تو میں اماں جی کے ساتھ آٹا گوندھتی تھی۔ سبزی بناتی تھی اور یہ لاڈو دستر خوان نہیں بچھا سکتی۔" زینب، جویریہ پر الٹ پڑی جو اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھی۔ ڈر کر آمنہ کے پاس جا کھڑی ہوئی، جس نے جویریہ کا پیغام سن کر کتاب بند کر دی تھی۔

"بہت ہڈ حرام ہو گئی ہے یہ، اماں جی اور بابا صاحب کے لاڈ میں..... ہم سے تو کوئی اس طرح پیار نہیں کرتا تھا۔ یہ زیادہ انوکھی ہے۔"

زینب بولے جا رہی تھی۔ جویریہ ہراساں کھڑی تھی۔

"آپی! میں نے کیا کیا ہے؟" وہ ڈرے ڈرے لہجے میں آمنہ کا کاندھا پکڑ کر معصومیت سے بولی۔

"کچھ نہیں۔ یہ زینب یونہی بول رہی ہے۔ تم جاؤ۔ ہم آ رہے ہیں، تم جا کر دستر خوان بچھاؤ۔" زینب کی بدستور

گھورتی نگاہوں پر اس نے جویریہ کو ہدایت کی۔

وہ تو میں بچھا آئی تھی۔ اب کھانا نکالنا اور لگانا ہے میں نے تو برتن بھی لگا دیے تھے۔ پانی بھی رکھ دیا تھا اور گلاس بھی۔" اس نے جلدی جلدی کاموں کی فہرست گنوائی۔

"شاباش!" آمنہ نے اس کے ماتھے پر آئے بال سنوارے "بس آگیا تمہیں چین۔ دسترخوان بچھا آئی تھی یہ۔" آمنہ نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے بیزار سی بیٹھی زینب سے کہا۔

"ہونہہ۔ بچھا آئی ہے تو مجھ پر کوئی احسان کیا ہے۔" وہ کہہ کر کھڑی ہو گئی۔ جویریہ فوراً باہر بھاگ گئی کہ کہیں زینب اسے خوامخواہ ہاتھ ہی نہ جڑ دے۔

"تم اتنی چڑچڑی کیوں ہو رہی ہو۔" آمنہ نے اسے پیچھے سے ٹوک کر پوچھا۔

"میں کیوں چڑچڑی ہوں گی۔" وہ اور چڑ کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔ تین دن سے جھومر سے ملاقات جو نہیں ہوئی۔ بابا صاحب نے منع کر دیا ہے۔ ان کے گھر میں مہمان جو آئے ہوئے ہیں۔ تم اس لیے اداس ہو۔" آمنہ اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

"آمنہ جھومر سے ملنے چلیں؟ دوپہر کو جب بابا صاحب کھانا کھا کر سو جائیں۔" وہ لجاجت سے اس کا بازو تھام کر بولی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بابا صاحب سے جوتے کھانے ہیں' وہ سوتے ضرور ہیں مگر انہیں سب خبر ہوتی ہے کون کہاں ہے۔ نہ بابا! میں یہ خطرے والا کام نہیں کر سکتی اور بھلا جھومر سے مل کر کیا کرنا ہے تم نے۔" وہ دروازے میں پہنچ کر بولی۔

"ویسے ہی۔" حالانکہ وہ اس کے "نکاح" کے متعلق جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

"ویسے ہی تو پھر رہنے دو جو کچھ ہو گا۔ خود ہی پتا چل جائے گا۔" وہ آگے چل پڑی۔

"حویلی جانے کا بہانا کر کے نکل جائیں گے۔" وہ اس کی بات ان سنی کر کے بولی۔

"نہ بابا! پہلے ہی اماں جی ہم سے خفا ہیں۔ اس روز بھی حویلی چلے گئے تھے شکر ہے۔ بابا صاحب کو معلوم نہیں ہوا انہوں نے کہہ رکھا ہے اگر حویلی جانا ہو تو اماں جی کو ساتھ لے کر جائیں۔ اس لیے تم اس بات کو تو رہنے ہی دو اور چلو اب اماں جی آواز دے رہی ہیں۔" وہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"تم نہ جانا۔ میں تو کسی نہ کسی طرح آج ضرور جاؤں گی ابھی کھانے کے بعد۔" وہ خود سے کہتے ہوئے سوچنے لگی "جویریہ کے ساتھ اماں جی سے کوئی بہانہ کر کے۔" وہ ترکیب سوچنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ شاید ٹیبلٹ کے اثر کے تحت گہری نیند سو رہا تھا' کچھ سارے دن کی ٹینشن' کچھ بخار اور سر درد کا اثر کھانا اور بخار کی گولی کھانے کے بعد بمشکل اسے نیند آئی تھی۔ اب کوئی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہا تھا۔

اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون ہے۔ نیند سے بوجھل آنکھیں کھل ہی نہیں رہی تھیں' سر ابھی بھی درد سے پھٹ رہا تھا۔

"معاذ! اٹھو۔ اٹھو...... آنکھیں کھولو۔" شاید ظفر تھا اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں بخار کی وجہ سے جل رہی تھیں۔ سر نیند سے گھوم رہا تھا۔

"معاذ اٹھو نا۔ اٹھ کر بیٹھو۔" ظفر نے زبردستی اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانا چاہا' اس کا وجود بے جان ہو رہا تھا اس سے اٹھا ہی نہ گیا۔

"معاذ! اماں کا تھانے دار بھائی آگیا ہے۔ وہ تین کانسٹیبل لے کر ادھر ہی آ رہا ہے۔ اس نے تمہیں چاہے کوئی ثبوت ملے نہ ملے گرفتار کر کے لے جانا ہے۔"

"میں تو سمجھا اب تم شاید ہی گاؤں کا رخ کرو۔ یہ شہری زندگی کی مصروفیات تو مکڑی کے جال کی طرح ہوتی ہیں۔ بندے کو چاروں جانب سے جکڑ لیتی ہیں۔"

عبدالمتین سعادت مندی سے ان کے آگے گردن جھکائے' دونوں ہاتھ گود میں دھرے بڑے انہماک سے ان کی گفتگو کی ٹھنڈی مار سہہ رہا تھا۔

"بابا صاحب آپ کو معلوم تو ہے۔ میں نے دو تین پڑھائی کے کورس شروع کر رکھے ہیں۔ ادھر رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس علم اور ڈگریاں دونوں وافر ہوں۔ آپ کے دیے ہوئے سب سے قیمتی علم کی بنیاد پر میں ان ڈگریوں کے حصول کے لیے نکلا ہوں اور بابا صاحب! میری حتی الامکان کوشش ہے کہ میرے کسی رزلٹ پر آپ کا سر شرم سے نہ جھکے بلکہ آپ فخر سے سب کو بتا سکیں کہ آپ کا بیٹا محنتی اور کامیاب ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں تول تول کر بول رہا تھا' نگاہیں اور سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

"اگر تمہاری یہ سوچ نیک نیتی پر مبنی ہے تو میری دعا ہے' اللہ تمہاری سوچ میں برکت دے اور تمہاری کامیابیوں میں بھی۔ میری دعائیں' میری مناجاتیں سب تمہارے لیے ہیں کہ محنتی ہونہار اولادیں ہی والدین کی دعاؤں کی حقدار ہوتی ہے مگر جو بات تمہارے سلسلے میں از حد ناگوار گزری ہے بہتر ہے کہ تم اسے جان لو۔" ان کے لہجے میں ابھی بھی اس کے لیے پہلے جیسا پیار اور خصوصی توجہ نہیں تھی۔ لگتا تھا وہ اس سے بہت خفا تھے مگر بابا صاحب کو منانا اسے آتا تھا۔ پہلی اولاد والدین کی کمزوری ہوتی ہے اور عبدالمتین کو بھی ان کی اس کمزوری کا علم تھا اور اس کا اس نے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ مبین کو اگر معمولی غلطی پر مار پڑتی تھی تو عبدالمتین کو صوفی صاحب محض سرزنش کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ توجہ و محبت کے اسی تضاد نے نا صرف عبدالمبین کو صوفی صاحب سے متنفر کر رکھا تھا بلکہ دونوں بھائیوں میں ذہنی و قلبی دوری پیدا کر دی تھی۔

"آپ کو جو ناپسند ہے آپ حکم کریں بابا صاحب! میں اپنی جان پر کھیل کر آپ کا حکم بجا لاؤں گا۔" اس نے ذرا سا سر اٹھا کر ان کے بارعب چہرے کو دیکھا "اگر آپ کو میرا شہر جانا وہاں پڑھنا ناپسند ہے تو بابا صاحب! میں آج ہی سے یہیں رہ لوں گا۔ کبھی دوبارہ شہر کا نام نہیں لوں گا' آپ یقین کریں۔" اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے یقین سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم اسی قدر سعادت مند ہو۔" صوفی صاحب اس کی سعادت مندی سے متاثر ہو کر بولے۔ "مگر عبدالمتین تمہارا اس طرح شہری فضا میں گھل مل جانا بلکہ وہیں کے ہو کر رہ جانا مجھے سخت ناپسند ہے۔ تم گاؤں پورے ڈیڑھ سال بعد آئے ہو جبکہ شہر ادھر سے محض ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ تم جو کچھ بھی کر لو' جتنا بھی شہری رنگ میں رنگ جاؤ تم ہو ادھر کے ہی' احمد پور شرقیہ کے۔ یہ تم یاد رکھنا اور جب بھی گاؤں تمہیں پکارے تمہیں لوٹ کر ادھر ہی آنا ہو گا' اس بات کا تم مجھ سے آج وعدہ کرو۔"

وہ نپے تلے بے اعتبار سے لہجے میں بولتے ہوئے باریک بین نگاہوں سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔

"وعدہ بابا صاحب!" وہ ان کی بات ختم ہونے سے پیشتر ہی بول اٹھا' وہ اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس کے جواب پر کسی خوشی' کسی اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔

"بابا صاحب! آپ جو کہیں گے۔ جب کہیں گے' میں آپ کی خدمت میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ دوبارہ مضبوط لہجے میں گویا ہوا۔

"نہیں' عبدالمتین! اب ایسا شاید ہی ممکن ہو۔" کچھ دیر بعد انہوں نے کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔

"کیوں بابا صاحب! ایسے کیوں کہہ رہے ہیں' آپ۔ میں یہاں کیوں نہیں آؤں گا۔ یہاں گھر ہے میرا۔ آپ ہیں میرے معزز والد' میرے دوست۔ میری اتنی اچھی اماں جی۔ آمنہ' زینب' عبدالمبین' جویریہ سب ہی تو ادھر ہیں۔ تو پھر میں کیوں نہیں آؤں گا۔" وہ بے چینی سے انہیں جیسے یقین دلانے لگا۔

مشکل ہے بہت تمہاری یقین دہانیوں کے باوجود۔" انہوں نے کتنی دیر کا رکا ہوا سانس زور سے سینے سے خارج کیا۔ "تمہارا اب ادھر آکر رہنا رچ بس جانا مشکل ہے۔ محض تین سالوں ہی میں تم پندرہ سال کے رہن سہن کو چھوڑ کر شہری بودوباش وہاں کے طور طریقے اپنا چکے ہو۔" حالانکہ اس نے تو آتے وقت اپنے لباس میں ان تمام لوازمات کا خیال رکھا تھا جو بابا صاحب کو پسند تھے گردن تک بٹن بند قمیص جس میں سانس رکنے لگتا تھا۔ کانوں سے اوپر تک تراشے ہوئے بال، ٹخنوں سے اونچی شلوار۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، سر پر باریک جالی کی ٹوپی۔ سب اس کے دیہاتی رہن سہن کی غمازی کر رہے تھے۔ پھر بابا صاحب کو شہری بودوباش کی بو کدھر سے آئی۔

"ہر بات پر بلا سوچے سمجھے جلدی سے وعدہ کر بیٹھنا کمزور کردار کے لوگوں کا وتیرہ ہوتا ہے اور میں نے تمہارا کردار اس قدر کمزور تو نہیں ڈھالا تھا کہ فوراً میرے کہنے پر وعدہ کر بیٹھے۔ حالانکہ اگر تم ایک لمحے کو سوچتے تو اس وعدے پر عمل کرنا خاصا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن کام ہے۔ تم ادھر پڑھ رہے ہو پھر نوکری ادھر کرو گے۔ کیونکہ گاؤں میں تو تمہاری ڈگریوں کے وزن کے مطابق کوئی نوکری نہیں ہوگی پھر ایک عرصہ شہری آزاد فضا میں رہنے کے بعد تا عمر کے لیے گاؤں آکر رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوگا۔ تم نے شاید سوچا نہیں۔" وہ مایوسی سے بول رہے تھے ٹوٹ ٹوٹ کر۔

"اور تمہارا یہ حلیہ۔" ایکدم سے وہ جلال میں آگئے شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے وہ گھبرا کر اپنے لباس کو دیکھنے لگا۔

"کک۔ کیا ہوا بابا صاحب! میرا لباس ٹھیک نہیں۔" وہ دامن پر ہاتھ پھیر کر ان دیکھی شکنیں صاف کرنے لگا۔

"لباس میں تو تم نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔" وہ طنز سے بولے "مگر یہ یہودیوں جیسی داڑھی کیا صوفی عبدالرحمٰن کے صاحبزادے کو زیبا ہے۔" وہ اس کی فرنچ کٹ کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولے۔ حالانکہ یہ بھی اس نے گاؤں آنے کی وجہ سے محض ڈیڑھ ہفتے میں رکھی تھی ورنہ وہ شہر میں کلین شیو رہتا تھا۔ صوفی صاحب کو اس کی یہ محنت بھی پسند نہیں آئی۔

"بابا صاحب اصل میں گاؤں آنے سے پہلے مجھے وہ ہو گیا تھا چکن پاکس۔ وہ کیا کہتے ہیں اس کو گاؤں میں آکڑا کاکڑا۔ سرخ رنگ کے تکلیف دہ دانے۔ سب سے زیادہ داڑھی میں تھے اس وجہ سے مجھے شیو کرانا پڑی ورنہ آپ کو تو معلوم ہے کہ......" اسے جلدی میں اور کوئی بہانہ نہ سوجھا۔

"جھوٹ مت بولو مجھے خود سلیمان نے بتایا تھا ایوب کے بیٹے نے کہ تم کلین شیو رکھتے ہو ادھر۔ آج کل کے رجحان کے مطابق۔ داڑھی رکھنے والوں کو ادھر بنیاد پرست سمجھا جاتا ہے دہشت گردی کی علامت بنے ہے نا۔" صوفی صاحب اس کے بارے میں کس قدر باخبر ہیں اسے آج علم ہوا تھا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ دھڑکنے لگا انہیں تو اس کے خیالات کا بھی علم تھا۔

"اسلام کی بنیادی شق ہے یہ مومن کا زیور اس کی شان ہے۔ تف ہے تم پر جو اپنے زیور کو نالیوں میں بہاتے ہو کیونکہ تمہیں شرم آتی ہے اب بنیاد پرست کہلاتے ہوئے۔ مومن اور مسلمان کہلاتے ہوئے۔ عبدالمتین! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی اور مجھے معلوم ہے تم اب بھی ادھر کیوں آئے ہو ورنہ ادھر کے دقیانوسی گھٹے ہوئے ماحول میں تم کبھی قدم نہ رکھتے۔" وہ کسی میزائل کی طرح اس پر برسے تھے اور اب جلال میں کھڑے ہوگئے تھے عبدالمتین بھی اپنے کانپتے وجود پر قابو پا کر فی الفور کھڑا ہو گیا۔

"کیونکہ پچھلے دو ماہ سے میں نے تمہیں پیسے نہیں بھیجے۔ تم صرف پیسوں کی خاطر ادھر آئے ہو ورنہ ڈیڑھ سال میں تمہیں ایک بار بھی توفیق نہ ہوئی میرے ہزار کہنے پر بھی۔ تمہارا اب ادھر گزارا مشکل ہے اور سنو۔" وہ جاتے جاتے مڑ کر وارننگ کے سے انداز میں بولے۔ "اگر تم ادھر رہنا چاہو تو شوق سے رہو مگر تمہیں دینے کے لیے میرے پاس ابھی کوئی پیسے نہیں ہیں۔ بھیجنے ہوئے تو اگلے ماہ کچھ رقم بھجوا دوں گا جتنا مجھ سے ہو سکا اور اب اس طرح ادھر رہنے سے تمہارا قیمتی وقت ضائع ہو گا، پڑھائی کا حرج ہو گا مجھے یقین ہے تم مزید وقت ضائع نہیں کرو گے۔" وہ پھنکارتے ہوئے مڑے۔

"اور عبدالمتین مجھ سے اب زیادہ توقع مت رکھنا تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔" وہ کہہ کر غصے میں بھرے ہوئے اپنے حجرے کی طرف بڑھ گئے۔ عبدالمتین پیشانی سے پسینہ خشک کرنے لگا۔

"توبہ ہے کیا بچوں کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑے رہتے ہیں۔ ننھے چوزے سمجھ رکھا ہے انہیں۔ خدا نے باپ بنایا ہے مگر باپ والی شفقت سینے میں نہیں رکھی۔ بچے نہ ہوئے مشینیں ہو گئیں۔ ان کے سانچے میں ڈھل کر نکلیں ان کے اپنے کوئی ارمان نہیں۔ بچہ اتنے دنوں بعد گھر آیا ہے میں تو اس کی شکل کو ترس گئی تھی اور انہوں نے تو اس طرح باتیں کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے کہ یہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کریں۔ ایک کو ویسے ہی جیل میں ڈال رکھا ہے دو مہینے ہو گئے اسے گھر آئے کیسا ہنس مکھ شرارتی بچہ تھا میرا۔" اماں جی دوپٹے سے آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

"مار مار کر اسے شیطان بنا کر چھوڑیں گے۔ پھر کہتے ہیں اولاد بے ادب اور گستاخ ہو جاتی ہے۔ ارے مارنے سے تو جانور بھی بدک جاتا ہے۔ انسان کو تو پیار سے سدھارو قرآن کو تو......"

آگے عبد اوب نے زبان پر قفل ڈال دیا۔ وہ سوں سوں کر کے ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگیں۔ عبدالمتین چپ چاپ انہیں روتے دیکھتا رہا۔

کل جب سے عبدالمتین آیا تھا اماں جی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کی پسند پر انہوں نے آج دوپہر کے کھانے میں پسندے اور قتلمہ بنایا تھا۔ کتنے شوق سے کھاتا ہے وہ دونوں چیزیں اور صوفی صاحب سارا مزہ خراب کر گئے۔ سوچ سوچ کر انہیں رونا آ رہا تھا۔

"اب جتنا سخت بول گئے ہیں اسے 'یہ ادھر ٹکے گا اب۔" وہ روتے روتے اسے گم صم بیٹھا دیکھنے لگیں جو سر جھکائے اپنے پاؤں کو گھور رہا تھا۔

بابا صاحب تو اسے ننگا سا جواب دے گئے تھے۔ اس کی ساری فنکاری دھری کی دھری رہ گئی تھی اور اب وہ واقعی واپسی کا سوچ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"چلے گئے شاہ جی۔" زیور گل نے سوالیہ نظروں سے تنتے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر آتی نین تارا سے پوچھا۔ سلطان بخت کے ساتھ وہ پورے تین دن گزار کر آئی تھی نئی کوٹھی میں۔ جو انہوں نے اس کے نام کی تھی۔ اگرچہ ابھی کنسٹرکشن کا کچھ کام باقی تھا مگر شاہ جی اس کے اصرار پر کام بند کروا کر اسے کوٹھی میں لے گئے تھے۔

رات کا کھانا دونوں نے پی سی میں کھایا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسے ڈراپ کرنے "گل کدہ" آئے تھے۔ زیور گل سے کھڑے کھڑے دو چار باتیں کیں اور پھر نین تارا کے ساتھ واپسی کے لیے باہر نکل گئے۔ پندرہ منٹ بعد نین تارا انہیں گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تھی۔ بائل گرین فینسی سوٹ میں اس کا گورا رنگ چمک رہا تھا مگر اب اس حسین چہرے کا سب سے خوبصورت زیور اس کی مسکراہٹ غائب تھی۔ تو چہرے کی جگمگاہٹ بھی جیسے ماند پڑ گئی تھی۔

وہ تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر گر گئی۔ زیور گل کے سوال کا بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زیور گل نے گردن موڑ کر اسے تنقیدی نگاہوں سے دیکھا جو اب ست ہاتھوں سے کانوں کے ٹاپس اتار رہی تھی۔

"ڈائمنڈ کے ہیں انہیں بیڈ روم میں جا کر اتارو۔ ادھر نوکر چاکر پھرتے رہتے ہیں۔ کب کون ہاتھ دکھا جائے خیال رکھا کرو۔" وہ کڑے لہجے میں بولی تارا کی فراخ پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"معلوم ہے مجھے۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر لاپروائی سے بولی زیور گل نے کچھ غصے بھری نظر اس کے گستاخ انداز پر ڈالی۔

"بیٹیاں بیاہی جائیں تو ایسے ہی گستاخ ہو جاتی ہیں سر کش۔" کوئی مدتوں پہلے اس کے کان میں بولا تھا جب اس نے بھی اپنی ماں کی رضا کے بغیر خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ زندگی مکافات عمل کا نام ہے۔ اس نے ضبط کا گھونٹ بھر کے گہرا سانس لیا۔

"ہنی مون کا کیا پروگرام ہے نینو؟" زیور گل کا لہجہ خود بخود نرم پڑ گیا تھا۔ کماؤ بیٹی اور وہ بھی سونے کی چڑیا جیسی۔ زیور گل کی نگاہ بے ساختہ وال پینٹنگ میں لگے مرر میں نظر آتے اپنے جھریوں بھرے عکس پر پڑی تو اس کا لہجہ نرم ہونا ہی تھا۔
"جب وہ جرمنی کے ٹرپ سے واپس آجائیں گے تب۔" وہ بڑے پیار سے سلطان بخت کا ذکر کر کے بولی۔
"کہاں کا پروگرام ہے؟" زیور گل محبت سے بولی۔
"سوئٹزر لینڈ۔" اس نے جھک کر اپنے نازک پاؤں سینڈل کی قید سے آزاد کیے اور پاؤں کی انگلیاں ہاتھوں میں لے کر ہولے ہولے دبانے لگی۔
"تھک گئیں کیا؟" زیور گل کا لہجہ ہنوز شہد میں لتھڑا ہوا تھا۔
"ہوں۔" پتا نہیں جواب نفی میں تھا کہ ہاں میں۔
"ہنی مون پر بھی جاؤ تو میری "ہدایات" کا خیال رکھنا۔" زیور گل اس کے سانچے میں کمان جیسے جھکے سراپے کو نظروں میں تولتے ہوئے بولی۔
"ہوں۔" وہی مبہم سا "ہوں" زیور گل کو پھر ابال اٹھنے لگا۔
"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں کبھی بھی' یہ بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کے موڈ کا موسم کب بدل جائے کچھ پتا نہیں چلتا اور یہ نہ ہو کہ تم کوئی زنجیر پیروں میں ڈال کر کھلونا سی بن جاؤ اور ان کا موڈ بدل جائے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔" نکاح والی رات سے زیور گل اسے یہ ہدایت نامہ ازبر کرا رہی تھی۔
نین تارا جھلا اٹھی اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
"مام! ایسا شاہ جی احمق ہیں جو ایسا کریں گے' آپ کو کیا معلوم وہ اس معاملے میں خود کس قدر محتاط ہیں آپ کو اس فکر میں گھلنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا میری کسی بھول کے باوجود۔" وہ چبا چبا کر بولی۔
شاہ جی کی اتنی احتیاط پسند طبیعت نے ویسے بھی ان تین دنوں میں اس پر خاصا تکلیف دہ اثر ڈالا تھا۔ اسے یہ سب بہت توہین آمیز لگا تھا اور اب زیور گل کی بیہودہ تکرار...... اسے غصہ آنا لازمی تھا۔
"یہ تو اچھی بات ہے۔" زیور گل نے اطمینان بھرا سانس لیا۔
"ویسے بھی بچے! یہ شرفا نفس کے بڑے بے قابو ہوتے ہیں' کیچڑ میں کھلے کنول پر بھی پھسل پھسل جاتے ہیں مگر اپنی نسل کے معاملے میں بڑے وضع دار بڑے باغیرت ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے کہ اسی کیچڑ میں سے انہیں کوئی نہ کوئی اپنے کیے کا پھل مل جائے وہ بڑا درست ہوتا ہے ساری عمر اس آئینے میں اپنا منہ دیکھ کر ذلت سے نگاہیں چراتے رہتے ہیں۔"
زیور گل حقارت سے بول رہی تھی' نین تارا چپ رہی۔
"تمہیں فی الحال ایسی کوئی غلطی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ تنبیہہ کر کے بولی۔
"مام پلیز! اسٹاپ اٹ۔" وہ بیزار کن لہجے میں ہاتھ اٹھا کر بولی پہلے ہی دل اتنا اداس ہو رہا تھا۔
"یہ سوٹ شاہ جی نے لے کر دیا ہے۔" زیور گل کو اپنی تکرار کا احساس ہوا تو فوراً موضوع بدل کر بولی۔
"ظاہر ہے۔" نین تارا کے انداز میں لاپروا سا فخر تھا۔
"بندہ دل والا ہے۔" زیور گل تحسین آمیز لہجے میں بولی اور سائیڈ پر پڑی چیک بک اٹھا کر نین تارا کے آگے کر دی۔
"یہ کس لیے؟" انداز تیکھا سا تھا زیور گل کو ذرا نہ بھایا۔
"گاڑی بہت تنگ کر رہی ہے چینج کرنی ہے۔ معلوم تو ہے تمہیں۔" وہ بڑے ضبط سے بولی۔
"کتنی رقم نکلوائیں گی؟" وہ چیک بک ہاتھ میں لے کر بولی۔
"ابھی فی الحال پانچ لاکھ۔ کل جانا ہے مجھے شوروم۔ تم چلو گی۔"
"نہیں میں کل ریسٹ کروں گی۔" وہ تھکن کے اظہار کے لیے انگڑائی لے کر کچھ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی

کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
"پیپر، تو دیں۔"
زیور گل نے فوراً سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے پین نکال کر اسے تھمایا اس نے چیک پر سائن کر دیے۔
"اب تم آرام کرو کافی رات ہو گئی ہے۔ ویسے بھی پچھلے پورے ہفتے سے تم بے آرام رہی ہو۔ دیکھو نا آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑ گئے ہیں۔" زیور گل چیک بک لیتے ہوئے بولی۔
"ہوں۔" وہ صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔
شاہ جی کے جاتے ہی سب کچھ خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔ ان تین دنوں کے ساتھ سے اسے لگ رہا تھا اسے زندگی ملی ہی ان تین دنوں میں ہے' پہلے تو شاید وہ زندہ ہی نہیں تھی۔ ان تین دن اور تین راتوں میں جس قدر محبت توجہ شاہ جی نے اسے دی تھی' اس کا تو رواں رواں شاہ جی شاہ جی جپ رہا تھا۔ جی کر رہا تھا کسی سے کوئی بات نہ کرے بس ان کے خیالوں میں ان کی یادوں میں کھوئی رہے۔
یہ تین خوبصورت خواب آگیں شب و روز...... محبت کے خمار سے جیسے اس کے بدن کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دور خیالوں کی وادی میں اتر گئی۔ جہاں شاہ جی نے محبت سے اس کا نازک بدن اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں' ہونٹ خوامخواہ مسکانے لگے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"کیا ہے کیا ہو گیا۔" اس نے بمشکل تمام آنکھیں کھول کر گھبرائے ہوئے ظفر کی طرف دیکھا۔ اینٹھن سے کمر جیسے تختہ ہو رہی تھی۔ سر اور آنکھوں میں ابھی بھی درد تھا اس کا بخار کم ہوا تھا مگر اترا نہیں تھا۔
"[illegible] تاواں کا تھانے دار بھائی دو کانسٹیبل لے کر ادھر آ رہا ہے بلکہ لو سنو......" اس نے کان باہر ٹین کے لرزتے دروازے کی طرف لگا کر کہا' "وہ آگئے ہیں دروازہ بج رہا ہے۔ میرے بھائی! میرے دوست! تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ معاذ! تمہارا مستقبل...... یہ بدمعاش تھانے دار بغیر کسی گواہی ثبوت کے تمہیں اندر کر دے گا۔ تمہارا کردار مشکوک ہو گیا تو پھر تمہیں کہیں داخلہ نہیں ملے گا۔ تم بھاگ جاؤ یہاں سے ابھی اسی وقت۔ کھڑکی سے کود کر پچھلی دیوار میں جو چھوٹا دروازہ ہے وہاں سے......"
اس نے مڑ کر دوسری چارپائی کے نیچے پڑا اس کے کپڑوں کا شاپر اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا۔
"ہماری گلی سے نکلو تو دائیں طرف چلتے جانا' دو گلیاں گزر کر کماد کا کھیت ہے اس کے کنارے کنارے سیدھے چلے جانا۔ کھیت ختم ہوگا تو دائیں طرف مڑ کر پگڈنڈی پر ہو لینا۔ پگڈنڈی پکی سڑک پر ہی ختم ہو گی۔ وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی بس مل جائے گی۔ اٹھو اب شاباش! ہمت کرو' یہ تمہاری ساری زندگی کا معاملہ ہے۔"
دروازہ اب بھی زور و شور سے بج رہا تھا۔ ظفر نے اس کے سوئے جاگے وجود کو بستر سے کھینچ کر نکالا اسے اب ظفر کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اپنے مستقبل کو تو وہ کسی بھی صورت داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ ظفر سے شاپر لے کر سینے سے لگایا' اندھیرے میں ٹٹول کر جوتی پہنی اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔
"ٹھہرو ذرا ایک منٹ......" ظفر نے اسے دھیرے سے پکارا۔ کمرے میں بس کھلی کھڑکی سے آسمان کی روشنی آ رہی تھی جو اب بھی بادلوں کے گھیرے میں تھا اس نے مڑ کر دیکھا۔
"یہ لو۔" اس نے اپنی ہتھیلی معاذ کے آگے کھولی۔ کوئی چیز اندھیرے میں اس کے ہاتھ پر چمک رہی تھی۔
"یہ کیا ہے؟" وہ کوشش کے باوجود نہ جان سکا۔
"تمہارا گولڈ میڈل۔"
"یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" معاذ حیرت سے بولا۔ اس کا ذہن جیسے پوری طرح سے جاگ اٹھا تھا۔ "یہ تو...... یہ تو میں نے......" اس سے بولا نہیں جا رہا تھا گلے میں شدید درد تھا۔ ذہن بیدار ہوتے ہی درد کا احساس

جاگ اٹھا تھا۔ اس نے بے اختیار گلے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ تم نائب ناظم کو دے کر آئے تھے کہ ناظم صاحب کو کہیں اسے امانتاً اپنے پاس رکھ لیں۔ میں جب واپس آؤں گا تو ان سے لے لوں گا اور نائب ناظم ــــ پرلے درجے کا بے ایمان اور فراڈ شخص ہے۔ ہم نے اس روز چندے کا صرف ایک بکس خالی کیا تھا' باقی کے سب پیسے اس نے اڑائے تھے۔ میں نے تمہیں اسے میڈل دیتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں پچھلی کھڑکی میں کھڑا تھا تمہارے کمرے سے نکلتے ہی میں نے اسے قہقہہ لگاتے سنا تھا۔ اس کا ارادہ یقیناً" ناظم صاحب تک یہ امانت پہنچانے کا نہیں تھا اور وہ جب گیٹ پر ہمیں الوداع کہنے آیا تو آخری بار مصافحہ کرتے ہوئے میں اس کے گلے لگ گیا اور اس کی سائیڈ کی جیب سے میڈل اڑا لیا۔ اب چلو تم وہ لوگ اندر آ چکے ہیں شاید۔ ایاز نہیں کچھ دیر روک سکتا ہے ہم کھڑکی پھلانگو میں تمہیں راستہ سمجھاتا ہوں۔"

اس نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑکی کی طرف کیا۔ معاذ نے دونوں ہاتھوں کا زور چوکھٹ پر ڈالا اور اچھل کر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف سے چھپاک کی آواز آئی۔ وہاں پانی اور کیچڑ کا چھوٹا سا تالاب تھا' جس کی سطح ٹخنوں سے اوپر تک تھی۔

"ادھر سے نکلو۔" ظفر چھلانگ مار کر اس کے پیچھے کودا اور آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ بارش رک چکی تھی مگر آسمان اب بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بارش ابھی مزید ہو گی۔ تیز تیز چلتے ہوئے ظفر اسے راستہ سمجھانے لگا۔ وہ کچھ سمجھ رہا تھا اور جو نہیں بھی سمجھ رہا تھا اس پر بھی سر ہلا رہا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔

رستہ یاد رہتا یا وہ بھول کر راستہ بھٹک جاتا۔ "کہیں نہ کہیں تو پہنچ ہی جاؤں گا۔" اس نے سوچا۔

"اچھا ظفر' یار! تمہارا شکریہ اب تم جاؤ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ تمہیں بھی غیر حاضر پا کر کوئی گڑبڑ کر دیں۔ میں تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گا اگر کبھی زندگی میں دوبارہ ملاقات ہوئی یا میں اس قابل ہوا کہ تمہارے لیے کچھ کر سکوں تو تمہاری دوستی اور اس احسان کا حق ادا کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔" اس نے چلتے چلتے ایک دم سے رک کر ظفر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تشکر بھرے انداز میں کہا۔

"یار! کیوں شرمندہ کرتے ہو ایسی ہوتی ہے دوستی۔ تمہیں اس طرح اتنے خراب موسم میں جبکہ تم بیمار بھی ہو' گھر سے نکالنے پر مجبور ہوں۔" ظفر شرمندگی سے جھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم نے اپنا حق ادا کیا باقی جو کچھ ہوا وہ میری تقدیر کا حصہ ہے۔ تمہیں اس پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر کوئی اپنی تقدیر کا لکھا خود جھیلتا ہے۔ بس آگے اللہ میرے لیے آسانیاں پیدا کرے' تم میرے لیے دعا کرنا۔ اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"آمین۔ میری تو دل سے یہی دعا ہو گی۔ اچھا دوست! ٹائم کم ہے۔ کبھی زندگی میں دوبارہ ملاقات ہوئی تو پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ تمہارا یہاں سے جلد از جلد نکلنا ضروری ہے۔ یہاں سے سیدھے جا کر دائیں ہاتھ مڑنا ہے۔ سمجھ گئے نا۔" اس نے پھر سے راستہ دہرانے کی کوشش کی' معاذ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے پتا ہے' اب تم جاؤ۔ اللہ حافظ۔" وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"اللہ حافظ۔" ظفر نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ "بس اب مزید دیر نہ کرو۔" وہ فوراً" ہی اس سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔

معاذ نے ہاتھ ہلایا اور تیز رفتاری سے اندھیرے اور کچے رستے پر مضبوطی سے پاؤں رکھ کر چلنے لگا۔ ظفر اسے موڑ مڑنے تک دیکھتا رہا جیسے ہی معاذ دائیں طرف مڑا وہ گہرا سانس لے کر واپس پلٹ گیا۔

کچھ دیر تک وہ صحیح راستے پر چلتا رہا مگر اندھیرا اور کیچڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے بار بار رستے سے ہٹنا پڑ رہا تھا۔ کئی جگہوں پر تو گہرے گڑھے تھے جن سے بچنے کے لیے وہ یقیناً" رستہ بدل بیٹھا تھا کیونکہ اسے چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی تھی مگر نہ تو کوئی پگڈنڈی ہی آئی اور پکی سڑک آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چاند نہ ہونے کی وجہ سے

اندھیرا بھی زیادہ تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"وہ راستہ بھول گیا ہے۔" اس کا جسم پہلے ہی تھکن سے چور ہو چکا تھا' اوپر سے رستہ بھولنے کا خوفناک خیال اسے نڈھال کر گیا' دل چاہ رہا تھا اسی کیچڑ میں گر کر سو جائے۔

زور سے بادل گرجے' تڑ تڑ موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ اس کے فوراً" بعد بجلی کا جھماکا ہوا اور بارش تیزی سے برسنے لگی۔ دور و نزدیک اسے کوئی سایہ دار درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچی پگڈنڈی کے دونوں طرف چھوٹے قد کے پودوں والے کھیت تھے۔ جن کے کنارے بھی کوئی بڑا درخت نہیں تھا اس نے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔ وہ چند ہی منٹوں میں مکمل طور پر بھیگ گیا تھا۔ بارش اس قدر تیز تھی اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ اور ناک سے دھواں نکل رہا تھا۔ بخار بھی جیسے تیز ہو رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اسے زوردار ٹھوکر لگی وہ کسی چیز پر گرتے گرتے بچا۔ زمین میں دھنسا ہوا کوئی بورڈ تھا بجلی زور سے چمکی۔

"احمد نگر شرقی۔" گارے سے اٹے بورڈ پر وہ بمشکل پڑھ سکا۔

"پکی سڑک پر چلتا رہا تو شاید کہیں نہ پہنچ سکوں' اسی گاؤں کے اندر چلنا چاہیے شاید کہیں پناہ مل جائے۔" اس نے سنبھل کر اٹھتے ہوئے سوچا۔

اس کے کپڑے اور سامان کا شاپر کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ وہ کچی سڑک سے اتر کر ذیلی پگڈنڈی پر ہو گیا جو شاید گاؤں کے اندر جاتی تھی۔ سردی سے اس کے دانت بجنے لگے تھے۔

"پتا نہیں ابھی اور کتنا چلنا پڑے گا سارے رستے ختم ہو گئے ہیں۔" اس نے کپکپاتے ہوئے اوپر برستے آسمان کو دیکھا' بارش ابھی بھی ہو رہی تھی مگر اب اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ پگڈنڈی پر بہت پھسلن تھی' وہ سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ پہلے ہی دو دفعہ گر چکا تھا۔ کپڑے ہاتھ پاؤں سب کیچڑ سے لت پت تھے۔

"شاید یہ ذلت کی انتہا ہے۔" اس نے سوچا۔

"کیا پتا اس سے بڑی اور کٹھن مشکل بھی کوئی رستے میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہو۔" کوئی اس کے اندر سے ہنسا۔ اس نے سوچوں سے سر جھٹکا اور اپنی پوری توجہ سنبھل کر چلنے کی طرف مبذول کر دی۔ چلتے چلتے دور سے اسے مسجد کے مینار نظر آئے تو اس کا دل جیسے انوکھی خوشی سے بھر گیا۔

"اللہ تیرا شکر ہے کچھ نظر تو آیا۔ تیرے گھر سے بڑھ کر پناہ اور کون دے سکتا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور ذرا تیزی سے اپنے اور مسجد کے بیچ حائل رستہ عبور کرنے لگا۔

آٹھ دس منٹ کی مسافت تھی وہ ہانپتے کانپتے پہنچ ہی گیا۔

مسجد کا دروازہ بند تھا اس نے لکڑی کے اونچے بڑے دروازے پر دستک دی۔ ایک دم سے بادل گرجے' بارش از سر نو تیزی سے ہونے لگی۔

"پتا نہیں ان بادلوں کو آج کتنا برسنا ہے۔" اس نے جھنجلا کر سوچا۔

وہ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دستک کی آواز فضا میں گونج کر رہ گئی تھی' کافی دیر گزر گئی کوئی نہیں آیا۔ اس نے ایک بار پھر زور سے دروازہ بجایا بلکہ دھڑ دھڑایا۔ چند لمحوں بعد پھر وہی خاموشی...... تیسری بار اس نے پوری قوت سے دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ ڈالا۔

"کون ہے' کون ہے؟" اندر سے کوئی رعب دار آواز میں زور سے چلاتے ہوئے دروازے کی طرف آیا۔

"اللہ کا بندہ ہوں' اللہ کے گھر کی پناہ چاہیے۔ بارش میں بری طرح سے بھیگ چکا ہوں۔" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ اب تو بارش کی بوندیں تلوار کی طرح کاٹ کر اسے گزر رہی تھیں۔ وہ جیسے گر جانے کو تھا۔ وہ سارا وزن دروازے پر ڈال کر کھڑا تھا کہ ایک دم دروازہ کھل گیا' وہ جو دروازے سے چپکا کھڑا تھا دھاڑ سے اندر جا گرا۔

"اوہو بھئی کیا مصیبت ہے۔ کون ہو؟" جلیل نے جو اسے زمین پر سر کے بل چت لیٹے دیکھا تو جھنجلا کر کہا' معاذ بے حس ہو چکا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
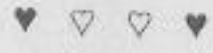
"اماں جی! مجھے کرتے کی یہ سلائی استانی جی سے سمجھنی ہے۔ جویریہ کو لے جاتی ہوں۔ بس تھوڑی ہی دیر میں آجاؤں گی، بابا صاحب کے اٹھنے سے پہلے۔" کھانے کے بعد صوفی صاحب جیسے ہی اپنے حجرے میں گئے زینب نے اماں جی کی منت سماجت شروع کردی۔

"زینب! تمہارا دماغ درست ہے۔ تمہارے بابا صاحب کو پتا چل گیا تو تمہیں ان کے غصے کی خبر ہے۔ تم رہنے دو کرتے کو پھر کبھی سیکھ آنا جاکر۔ آج کل ویسے بھی وہ بہت غصے میں ہیں، عبدالمتین کو ڈانٹ ڈپٹ کر شہر بھگا دیا نہ اسے کچھ دیا، خالی ہاتھ نکال دیا۔ میرے بچے کا اتنا سا منہ نکل آیا تھا۔ بھلا بتاؤ لیکن ان کے آگے کچھ بول سکتی ہوں یا میرے بولنے کی کچھ قدر ہے۔ اب تم منہ اٹھا کر چل پڑو۔ وہ آجائیں تو میرے سفید چونڈے کا لحاظ کیے بغیر مجھے چوٹی پکڑ کر باہر کردیں گے۔ تم رہنے دو ایسی سلائی جس میں ایسی ذلت ہو۔"

اماں جی متین کے جانے سے پہلے ہی بہت ناخوش تھیں، دو دن تو چپکے چپکے روتی رہی تھیں۔ صوفی صاحب نے ان کی منت سماجت کی بھی پروا نہیں کی تھی، جو شخص ایک بار ان کی نظر سے گر جاتا تھا پھر اس کا دوبارہ ان کی نظر میں سمانا ناممکن تھا۔ عبدالمتین کو وہ نظر سے گرا چکے تھے پھر اب بی بی کی کون سنتا۔

زینب نے ہار نہ مانی، آمنہ تو باہر برتن دھو رہی تھی اس نے پہلے ہی ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔

"اماں جی! بس پندرہ بیس منٹوں سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ بابا صاحب کو تو پتا بھی نہیں چلے گا ان کے اٹھنے سے پہلے ہی آجاؤں گی۔ ویسے بھی انہیں تو معلوم ہی ہے کہ اس وقت میں آمنہ کے ساتھ اندر کمرے میں ہوتی ہوں۔ وہ کون سا اندر آئیں گے ہمیں دیکھنے۔ اماں جی پلیز۔" وہ اب رو دینے کو تھی۔

اماں جی کو اس پر ترس آنے لگا مگر صوفی صاحب کے جلال کی بھی خبر تھی۔

"زینب! یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تمہیں پتا ہے نا انہیں سب خبر ہوتی ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ حجرے میں جاکر ضروری نہیں وہ سو ہی گئے ہوں۔" وہ کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔

"اماں جی میں دیکھ آئی ہوں، وہ سو گئے ہیں۔ آج صبح سے تو وہ مدرسے میں بچے پڑھا پڑھا کر تھک گئے ہیں اس لیے مجھے پتا ہے وہ ضرور تھوڑی دیر آرام کریں گے اماں جی بس تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔" وہ ان کے گھٹنوں سے لپٹ کر منت بھرے لہجے میں بولی۔

"دیکھ لو زینب!" وہ تذبذب میں تھیں۔

"کہہ دیا نا بس تھوڑی ہی دیر لگے گی چلو جویریہ! میں چادر لے آؤں اور کرتا بھی۔" وہ ان کو نیم رضامند دیکھ کر فوراً سے پیشتر اٹھ کھڑی ہوئی جویریہ نے اماں جی کی طرف دیکھا، وہ چپ تھیں وہ اٹھ کر زینب کے پیچھے باہر نکل گئی۔

زینب جاتے جاتے باہر صحن میں برتن دھوتی آمنہ کو ٹھینگا دکھا گئی تو وہ مسکرانے لگی۔

"دیکھ لو کہیں واپسی پر یہی ٹھینگا تمہیں نہ دیکھنا پڑ جائے۔" آمنہ نے اس کے پیچھے سے آواز لگائی۔

"برتنوں کے ساتھ منہ بھی دھلوا لینا۔" وہ ڈیوڑھی میں پہنچ کر بولی اور پھر آمنہ کا جواب سنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

چادر میں اچھی طرح سے منہ سر لپیٹ کر وہ جویریہ کا ہاتھ تھامے تیز قدموں سے ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف جارہی تھی۔

"اللہ کرے جھومر ہی مل جاتے ہی۔ اگر استانی جی نکر گئیں تو وہ جھومر سے ملنے بھی نہیں دیں گی یا جھومر کا لڑاکا باپ جس کی چار دنوں میں ہی سارے گاؤں میں شہرت ہوگئی ہے اس لیے تو اماں جی نے ہمیں ادھر آنے سے روک دیا ہے اللہ میاں! بابا صاب کو پتا نہ چلے۔" اوپر اوپر سے تو وہ بہت بہادر بن کر چلی آئی تھی اندر سے دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"جوی! جلدی چلو نا۔ یہ جلیل کے بچے نے دیکھ لیا تو جھٹ بابا صاب سے شکایت جڑ دے گا، شکایتی ٹٹو ہے

پورا۔" وہ جویریہ کو سستی سے چلتے دیکھ کر بولی۔

"مجھے کھیلنے جانا تھا نسیم کی طرف۔ چھوٹی آپی! آج اس کی گڑیا کی مہندی ہے۔ بابا صاب نہیں جانے دیتے اس نے اتنے مجھے بلایا ہے اور آپ مجھے اِدھر لے آئی ہیں، جائیں گے تو بابا صاب اٹھ جائیں گے۔" وہ منہ بسور کر بولی اس کے قدموں کی سستی کا یہی راز تھا۔

"ہر وقت کھیل۔ بابا صاب صحیح ڈانٹتے ہیں تمہیں۔ کبھی پڑھ بھی لیا کرو۔

"اچھا چلو اب تیز۔ بس فوراً چلیں گے گھر تو تم کھیلنے چلی جانا۔" وہ اسے راضی کرتے ہوئے بولی تو اس نے اسپیڈ بڑھا دی۔ ابھی وہ ماسٹر صاحب کے گھر کے آدھے راستے میں تھی کہ اس نے قدموں کی آواز پر مڑ کر دیکھا تو ہکا بکا رہ گئی۔

جھومر اکیلی اس کے پیچھے ہی آرہی تھی، وہ حویلی والی سمت سے آرہی تھی۔ زینب کو شک گزرا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"جھومر! تم ادھر کہاں۔ میں تم سے ہی ملنے آرہی تھی۔" وہ اس کے قریب آنے پر بولی۔

"وہ میں خالہ کے ساتھ حویلی گئی تھی میں سمجھی کہ تم لوگ بھی ادھر ہوگے۔ خالہ کو ادھر کچھ کام تھا انہوں نے ابھی بیٹھنا تھا اور ڈھولک بھی نہیں بج رہی تھی میں بور ہو کر واپس آگئی۔" اس نے سواتی شال لاپروائی سے کندھے پر انکا رکھی تھی اس کے آبشاروں جیسے اخروٹی بال کولہوں سے نیچے جارہے تھے۔ وہ اپنے ننگے سر سے بے نیاز کھلے رستے میں محو گفتگو تھی، زینب کو اس کی آزادی پر رشک آیا۔

"اس طرح اگر ہم باہر نکل آئیں تو شاید بابا صاحب ہماری کھالوں میں بھس بھروا دیں۔" اس نے جھرجھری لے کر سوچا۔

"تم کہاں جارہی تھیں؟"

"تم سے ہی ملنے آرہی تھی اتنے دن ہوگئے تھے میں نے کہا کہ تم سے مل آؤں۔" زینب نے سوچا اب وہ کے گی چلو گھر چل کر بیٹھتے ہیں پھر باتیں کریں گے۔

"اچھا۔" وہ خوامخواہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "اتنے دن ہوگئے تھے، مجھے تو پتا نہیں چلا۔"

زینب کو اس کی ہنسی پر ایک دم سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہوگیا، اسے لگا جھومر اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس نے اپنے نقاب کا کونہ ہاتھ میں زور سے موڑا۔

"تمہارا ابا آیا ہے، ابے سوات سے۔" متجسس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھی۔

"ہاں آیا ہوا ہے۔" اس نے لاپروائی سے اپنے چہرے کو چھوتی لٹ کو جھلا کر پیچھے کیا۔

"آؤ ہمارے گھر آجاؤ۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" زینب کو بیچ رستے کا خیال بار بار ستا رہا تھا یہ تو شکر تھا کہ دوپہر کا ٹائم تھا زیادہ تر لوگ اس وقت کھیتوں میں یا گھروں میں آرام کرتے تھے۔

"نہ بابا تمہارا وہ مولوی ابا بہت ظالم ہے ایک دم سنگدل۔ بندے کو اپنی لال آنکھوں سے ایسے گھورتا ہے جیسے اگلے کا خون ہی پی جائے گا یا کلیجہ چبا جائے گا کسی آدم خور کی طرح۔" جھومر کی بات زینب کو آگ ہی تو لگا گئی۔ وہ خود دل میں کتنی ہی بابا صاحب کے خلاف تھی مگر یوں کسی غیر کے منہ سے باپ کی برائی اس سے برداشت نہیں ہوئی جویریہ نے بھی مڑ کر جھومر کو گھورا۔

"جھومر! وہ میرے بابا صاب ہیں، تمہارے ابے کی طرح کوئی جاہل گنوار نہیں جو یونہی کسی کو کھا جائیں گے۔ بابا صاحب تو ایسے ویسوں کو منہ نہیں لگاتے۔" زینب نے اس کے باپ کو جاہل کہہ کر بابا صاب کی توہین کا بدلہ لے لیا۔

"تو جاؤ پھر مجھ سے کیوں ملنے آئی ہو ایک جاہل باپ کی جاہل بیٹی سے۔ میں نے تمہیں خط نہیں لکھا تھا کہ مجھ سے ملو آکر۔ اپنے عالم باپ کی چھپر چھاؤں میں بیٹھو جاکر۔ یوں چھپ چھپا کر کیوں ملنے آئی: ہونہہ۔" وہ نخوت و حقارت سے کہہ کر دو قدم آگے بڑھ گئی تو زینب کو بھی غصہ آگیا۔

"سمجھتی کیا ہے خود کو جاہل پٹھانی۔ بدتمیز جنگلی۔" وہ دل میں جھلتی ہوئی مڑی۔
بڑے شاہ جی کے منشی کا بیٹا سلیم ان سے چند قدم دور کھڑا شاید کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ زینب اسے راستے میں کھڑے دیکھ کر کتراتے ہوئے ذرا ہٹ کر گزرنے لگی وہ اس کے رستے میں ہی کھڑا تھا۔ لامحالہ اسے سلیم کے پاس ہی سے گزرنا پڑا۔ سلیم نے عجیب سی نظروں سے زینب کو دیکھا۔ زینب نے رفتار اور بڑھادی 'وہ دل میں پچھتا رہی تھی کہ کیوں آمنہ کی بات نہ مانی اور اس جاہل اور مغرور لڑکی سے ملنے چلی آئی۔
چند قدم آگے چل کر اس نے یونہی مڑ کر دیکھا سلیم جھومر کے پاس جا پہنچا تھا اور اس کے انتہائی قریب کھڑا خدا جانے کیا بات کر رہا تھا۔ اسے دور سے جھومر کے تاثرات کا اندازہ تو نہ ہو سکا مگر وہ بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی 'دور سے اس کا ہلتا سر زینب کو نظر آ رہا تھا۔
"بابا صاحب صحیح کہتے ہیں کہ یہ لڑکی اچھی نہیں ہے۔" اس نے دونوں کو اتنے پاس پاس کھڑے دیکھ کر سوچا۔
"چلو نا چھوٹی آپی! مجھے دیر ہو رہی ہے مجھے کھیلنے جانا ہے پھر بابا صاحب اٹھ جائیں گے۔" جویریہ اس کی محویت سے اکتا کر بولی۔
"اچھا چلتے ہیں۔" اس نے ہلکی سی چپت جویریہ کے سر پر لگائی تو وہ پیر پٹختے ہوئے اس سے آگے آگے چلنے لگی۔ وہ دونوں ابھی بھی محو گفتگو تھے 'زینب عجیب سا احساس لیے جویریہ کے پیچھے چل پڑی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"فخر ہمیں آپ کے ساتھ جاپان جانا ہے 'میں نے بھابھی جان سے کہہ دیا ہے کہ ہم جاپان جا رہے ہیں اب اگر ہم نہیں جاتے تو وہ کہیں گی میں نے ان سے غلط بیانی کی اب تو ہمیں ضرور ہی جانا پڑے گا۔" آج فخر حیات کا موڈ خلاف معمول اچھا تھا۔ دونوں نے شام کی چائے اکٹھے پی تھی آج ان کی کمیونٹی میں انگلش اسکول کی سالانہ تقریبات کا فنکشن تھا 'رعنا ادھر چیف گیسٹ کی حیثیت سے گئی تھی چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچوں نے بڑے خوبصورت پروگرام پیش کیے تھے۔
دو گھنٹے کا پروگرام تھا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی بوریت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل دماغ جیسے بہت دنوں بعد ہلکا پھلکا ہوا تھا 'سارے بچے اسے اپنے بہت قریب محسوس ہو رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا بہت سارا وقت مزید ان کے ساتھ گزارے حالانکہ اتنے چھوٹے بچے اسے کبھی بھی اٹریکٹ نہیں کرتے تھے۔ الٹے سیدھے سوال کر کے سر کھا لیتے ہیں 'جب سیفی اس عمر میں تھا تو اس کی سوال کرنے کی عادت سے رعنا بہت کوفت کا شکار ہوتی تھی۔ ایک ایک بات کو دس بار بتانا ـــــ پڑتا تھا یعنی مکمل توجہ۔ جو وہ کبھی بھی نہ دے پاتی اس کے پاس ٹائم ہی نہیں ہوتا تھا مگر آج تو اس کے ذہن کی کیفیت ہی اور تھی۔ وہ ان بچوں کے درمیان جیسے اندر سے کھل اٹھی تھی 'اپنی کیفیت اسے خود حیران کر رہی تھی۔
ابھی اس نے فخر کے ساتھ اپنے سارے احساسات شیئر کیے تھے 'بہت دنوں بعد دونوں یوں مل کر بیٹھے تھے۔ فخر نے بڑے دھیان 'بڑی توجہ سے اس کی ساری تفصیلات سنی تھیں جو کہ رعنا کے لیے ایک حیران کن بات تھی۔
"اسی لیے تو کہتا ہوں گھر میں گھس کر خود کو Spoil (ضائع) نہ کرو 'باہر نکلا کرو تمہاری این جی او کا دائرہ کار تو بہت وسیع ہے۔ سوشل کاموں میں حصہ لینے سے بھی ذہنی سکون ملتا ہے انسان اندر سے مطمئن و خوش ہو تو اسے سب اچھا لگتا ہے اور وہ خود بھی اچھا لگتا ہے جیسے اس وقت تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔" فخر نے ایکدم کہا تو وہ پل بھر میں سرخ پڑ گئی۔
"تو کیا پہلے اچھی نہیں لگتی تھی۔" وہ خفگی سے بولی۔
"پہلے بھی اچھی لگتی تھیں مگر رعنا ڈیئر فضول کی ٹینشن لے کر تم اپنے حسن کو اپنی خوبصورتی کو گھن لگا رہی ہو۔ بے خوابی تمہیں پتا ہے نا چہرے کی تازگی کی کتنی بڑی دشمن ہے۔ بے خوابی کا علاج سلیپنگ پلز میں نہیں ہے خود کو ایکٹو کرو جیسے پہلے تم بہت ایکٹو رہا کرتی تھیں۔ بار بار جانا 'جم جانا این جی او کی کوئی میٹنگ مس نہ کرنا۔ اپنے

سرکل کی ہر ایکٹوٹی میں حصہ لینا تمہیں کتنا فریش رکھتا تھا مگر اب کچھ عرصہ سے معلوم نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے تم ایکدم ڈل سی ہو کر رہ گئی ہو۔ تمہیں یاد ہے نا شادی کی پہلی رات میں نے تم سے کیا کہا تھا۔" وہ جو بڑے دھیان سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سوچنے لگی کہ فخر نے پہلی رات اس سے کیا کہا تھا۔
"رعنا! تم مجھے ہمیشہ فریش نظر آنا مجھے ڈل 'سست اور اپنے آپ سے بے خبر لوگ خصوصاً عورتیں بالکل پسند نہیں۔ میں تمہیں Ever Fresh دیکھنا چاہتا ہوں۔" رعنا کو سوچتے دیکھ کر انہوں نے خود ہی اپنی پہلی رات کی ڈیمانڈ اسے یاد کرادی۔ رعنا کچھ شرمندہ سی ہو گئی یہ تو ایک شوہر کا حق بھی ہے۔
"ٹھیک 'مجھے یاد ہے مگر مجھے ڈل بنانے میں بھی آپ کا ہاتھ ہے۔" وہ آج دل کی ہر بات شیئر کر لینا چاہتی تھی۔
"وہ کیسے؟"
"آپ مجھ سے لاپروا جو ہو گئے ہیں 'بالکل دھیان نہیں دیتے کہ میں نے کیا پہنا ہے۔" کتنے دن کا شکوہ اس کی زبان سے پھسل ہی پڑا۔
"رعنا ڈیئر! میں تم سے کبھی لاپروا نہیں ہوا 'اگر لاپروا ہوا ہوتا تو کیسے جان پاتا کہ آج کل تم خود سے کس قدر غافل ہوتی جا رہی ہو 'کتنے ہفتوں سے تم پارلر نہیں گئیں۔ جم جانا تم چھوڑ چکی ہو اور اگر میں تم سے لاپروا ہوا بھی ہوں گا تو یہ بزنس اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہوا ہو گا کہ میں تم پر توجہ نہ دے سکا ورنہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔"
"یہ تو تھا فخری! آپ نہ مجھ پر توجہ دیتے تھے 'نہ گھر پر 'نہ سیفی پر۔" وہ پچھلے دنوں ان کے رویے کی وجہ سے بڑی ڈس ہارٹ رہی تھی۔ دکھ سے بولی۔
"سیفی پر تم جو حد سے زیادہ توجہ دے رہی ہو شاید اس لیے۔" فخر نے بھی دل کی بات کہہ ہی دی۔
"اسے ہم دونوں کی توجہ کی ضرورت ہے فخری۔" وہ نرمی سے بولی۔
"تو کیا مجھے توجہ کی ضرورت نہیں۔" وہ ذرا سا اس کی طرف جھک کر بولے۔
"دونوں۔" وہ تھوڑا پیچھے کھسک گئی تو اسے ایکدم بھابھی یاد آ گئیں 'اس نے فوراً اپنا سکہ فخر کے آگے رکھ دیا۔
"دیکھو میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میں ابھی جاپان جاؤں یا نہیں۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "شاید اس فرم کے ساتھ ہماری ڈیل طے ہی نہ ہو سکے کیونکہ وہ لوگ انٹرسٹ شو نہیں کر رہے۔ اصل میں یہ ڈیل ان کا سائیڈ بزنس تھا اور آج کل جس طرح سے پوری دنیا میں بزنس کا ڈاؤن فال آیا ہوا ہے 'ہر بزنس مین ایکسٹرا انویسٹمنٹ کرنے سے پہلے دس بار سوچتا ہے۔ شاید اسی لیے وہ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ کوئی ریسپانس شو نہیں کر رہے۔ بہرحال اگر جانا ہوا تو تمہیں ضرور لے کر جاؤں گا آئی پرامس۔" وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولے۔
"اور بھابھی جان کو کیا کہوں گی جنہیں میں ٹکا سا جواب دے چکی ہوں کہ ہم جاپان جا رہے ہیں۔ میں بچیوں کو نہیں رکھ سکتی۔" وہ پرتشویش انداز میں بولی عفت آرا کے مزاج کا اسے علم تھا۔
"رعنا! یہ تمہاری زندگی ہے۔ اسے دوسروں کے اندیشوں میں کیوں برباد کر رہی ہو۔ کون کیا اور کیسے سوچتا ہے اس بات کو دفع کرو 'یہ دیکھو کہ تمہیں کیا پسند ہے۔ تم کیسے جینا چاہتی ہو مجھے کیا پسند ہے تم صرف یہ سوچو اور اگر تم اس طرح اپنے رشتہ داروں کے معاملے میں ہلکان ہوتی رہیں تو خدانہ کرے 'بہت جلد ہماری ازدواجی زندگی کسی نہ کسی بڑے مسئلے کا شکار ہو جائے گی۔ میں تمہیں پوری سنجیدگی سے سمجھا رہا ہوں 'تم اس بات پر سوچو۔" وہ بہت سنجیدہ تھے بھابھی جان کے گھرانے کی طرف اس کا واضح جھکاؤ یقیناً انہیں پسند نہیں تھا مگر وہ کیا کرتی اس نے کچھ بے بسی سے فخر کی طرف دیکھا۔
"یوں مت دیکھو میری طرف۔ سب کچھ تمہارے بس میں ہے۔" وہ اس کی نظروں کا مفہوم جان کر بولے۔
"پتا نہیں مجھے تو خود پتا نہیں چلتا کہ کیا میرے بس میں ہے اور کیا نہیں 'آج آپ اتنی توجہ دے رہے ہیں کل بالکل اجنبی بن جائیں گے۔ فخری! یہ چیز مجھے اندر سے توڑ کر رکھ دیتی ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"رعنا! خود کو مضبوط کرو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی کا حصہ ہیں' ان پر یوں اپنی جان ہلکان کرو گی تو جلد کوئی روگ لگا بیٹھو گی۔ تم اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچو اور اس کا حل خود سے نکالو جاپان جانا کوئی حل نہیں جتنا فرار ہو گی اتنا مسئلہ تمہارے سر پر سوار ہوتا جائے گا۔"

"کیا حل ہے اس کا میں تو ابھی سے تھک گئی ہوں' ابھی تو بہت لمبا سفر پڑا ہے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"تمہاری بہادری۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو' اگر وہ تمہیں بلیک میل کر رہی ہیں تو ان کی کمزوری بھی تو تمہارے پاس ہے۔ اس عورت کی کمزوری دولت ہے۔ اسی کمزوری کی خاطر اس نے اپنا بہت کچھ گروی رکھ چھوڑا ہے' تم اس کی اس کمزوری سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتیں۔" وہ اسے سمجھا رہے تھے وہ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"رعنا! مجھے خود احساس ہے کہ کہیں کچھ نہ کچھ ہم سے غلط ہو گیا ہے مگر اب اس غلطی پر سوچنے سے کچھ حاصل نہیں' میں نے جو کچھ بھی کیا تمہاری خوشی کی خاطر کیا۔ ورنہ ہمارے پاس کس بات' کس چیز کی کمی تھی۔ تم جانتی ہو۔" وہ دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے اسے سمجھا رہے تھے۔

"یہاں کیا غلط ہو گیا۔" رعنا کوشش کے باوجود نہ جان پا رہی تھی' اس نے بے بسی سے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے فخر حیات اسے دکھ سے دیکھنے لگے۔

"کاش تمہیں میں وہ خوشی لا کر دے سکتا۔" فخر حیات نے بے بسی سے اس کے سوگوار روپ کو دیکھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

باہر جیپ رکنے کی آواز آئی۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد بھاری بوٹوں کی چاپ صحن سے ہوتی ہوئی کچن کے دروازے تک آ کر رک گئی۔ اس نے برتن دھونے کا عمل جاری رکھا۔ جیسے اس وقت پوری کائنات میں اس سے اہم اور کوئی کام ہی نہیں۔ چہرے پر نظروں کی تپش کا احساس بڑھا تو اس نے ذرا سا رخ سیدھا کر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کیپٹن شہباز خان فل آرمی یونیفارم میں کیپ ہاتھ میں لیے' بصارتوں کی پوری شدتوں کے ساتھ اسے تکے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر سنک میں جا گری۔

"سلام السلام وعلیکم۔" آواز میں کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

"ارے یہ تم ہو نزہت! میں سمجھا برتن دھونے والی ماسی ہے۔"

اس کو سلام کے جواب میں جو یہ سننے کو ملا اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ صبح ہی پھپھو کے اصرار پر اس نے سی گرین اور بلو امتزاج کا یہ کاٹن کا سوٹ پہنا تھا جو اس پر بہت جچ رہا تھا۔ پھپھو نے دو تین بار اس کی تعریف کی تھی' ریشم نے بھی سراہا۔ میک اپ تو خیر اس نے کیا کرنا تھا' چالیسویں میں بھی ابھی کافی دن تھے۔ وہ تو ایسے کپڑے بھی پہننا نہیں چاہ رہی تھی۔ پھپھو کے بصد اصرار پر تیاری کی تھی' دوپہر کے کھانے پر کیپٹن شہباز کا انتظار تھا پھر پھپھو کے کہنے پر تین بجے سب نے کھانا کھایا۔ وہ بھی بے دلی سے کھانا کھا کر اب کچن میں آ کر برتن دھو رہی تھی جب وہ اچانک آ ٹپکا۔ پھپھو کو اس کے ساتھ ہی جانا تھا۔

"ہاں ماسی ہے' برتن دھونے والی تو اتنی بد تمیزی سے دروازے میں کھڑے ماسی کو کیوں گھورے جا رہے ہیں۔" وہ تنگ مزاجی سے بولی۔

"اے لڑکی حد ادب' میں تمہارا مجازی خدا ہوں اور میں تمہیں کیوں گھورنے لگا' ایسی کون سی تم قلوپطرہ ہو۔ عام سی گندمی رنگت' قابل قبول ناک نقشہ اور قد بھلا دیکھو میرے ساتھ جچتا بھی ہے۔ میں تو ام جان کے جذبات کا خیال رکھ کے مان گیا تھا ورنہ ایک سے بڑھ کر ایک۔۔۔"

"تو نہ کرتے خیال' میں نے آپ کی منت نہیں کی تھی۔ نہ میں ... ن سے گلنام ہیں آپ۔ بڑی خوش فہمی مجھے نہیں آپ کو ہے۔" کہتے کہتے اس کی آواز پھٹ گئی' وہ بے اختیار رونے لگی اور دروازے میں ایستادہ اس کے لمبے چوڑے وجود کو ایک طرف دھکا دے کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

"ارے ارے نزہت! بات تو سنو۔" شہباز کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے کیا پتا تھا' وہ اس کے مذاق کو سیریس لے لے گی۔

"بے وقوف لڑکی۔" وہ منہ میں بڑبڑا کر مسز خان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"کتنی گھنی ہوتی ہیں' یہ شریف زادیاں بھی' سب کچھ کر کرا کے بھی ہاتھ صاف رکھتی ہیں۔" ریشم اپنے کمرے کی کھڑکی سے کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔ نفرت سے بڑبڑائی اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔

وہ کافی دیر تک ام جان کے پاس بیٹھا رہا وہ کمرے میں نہ آئی۔

"ام جان! بھوک لگ رہی ہے' کچھ کھانے کو تو منگوائیں اور پلیز جلدی سے تیاری بھی کر لیں۔ ہمیں آج ہی نکلنا ہے' آدھے گھنٹے تک۔ سفر بھی لمبا ہے اور مجھے تو چھٹی بھی نہیں ملی۔ مجھے کل شام تک واپس پہنچنا ہے۔" کافی دیر کے انتظار لاحاصل کے بعد اس نے ماں سے کہا۔

"شہباز! یہ تمہاری بری عادت ہے ہر کام میں جلدی مچانے کی' صبح صبح نکل جائیں گے اب شام تو ہو رہی ہے۔" وہ کچھ خفگی سے بولیں۔

"نہیں ام جان! بتایا نا کل مجھے رپورٹ کرنی ہے چھٹی نہیں ملی۔ اب آپ پلیز جلدی کریں اور مجھے پلیز کچھ کھانے کو تو منگوا دیں' صبح سات بجے کا ناشتہ کیا ہوا ہے۔"

"تین بجے سب نے انتظار کر کر کے کھانا کھایا' تم گھنٹہ پہلے نہیں آ سکتے تھے۔" وہ بولیں۔

"ام جان! میرا ذاتی آفس نہیں ہے۔ گورنمنٹ کا ملازم ہوں میں' جب چھٹی ملنی تھی تب ہی آنا تھا۔" وہ کچھ خفگی سے بولا اس کا مزاج بگڑتے دیکھ کر مسز خان نزہت کو آوازیں دینے لگیں۔

"جی پھپھو۔" چند لمحوں بعد وہ سوجی آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ ان کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

"سوئی تھیں بیٹا۔" وہ اس کی شکل دیکھ کر بولیں۔

"جی پھپھو۔" سوجی آنکھوں کا یہی جواز بن سکتا تھا۔

"بیٹا! اگر کھانے کو کچھ تھوڑا بہت ہے تو لا دو اس کو اور پھر آ کر میرا بیگ بند کر دو۔ پیکنگ تو مکمل ہے میری۔ ابھی چلنے کو کہہ رہا ہے۔" وہ "جی اچھا" کہہ کر باہر نکل گئی۔

"بچی بہت پریشان ہے' میرے ساتھ دل لگا ہوا تھا اس کا۔ اب میں بھی کیا کروں' ادھر کسی ڈاکٹر سے آرام ہی نہیں آ رہا اور نہ رہی ہے۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"سہیل تو گھر پر نہیں ہو گا۔" شہباز نے پوچھا۔

"نہیں۔ صبح ہی میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں آج چلی جاؤں گی اور باقی تفصیلات بھی بتا دی تھیں۔ اب دیکھو موڈی بندہ ہے۔ کہہ رہا تھا شام کو جلدی آ جاؤں گا آتا ہے کہ نہیں۔ اور شہباز! تم اس طرح کیوں نہیں کرتے کھانا جا کر کچن ہی میں کھا لو وہ بچی بے چاری پھر ٹرے سجا کر لائے گی۔ صبح سے کام میں لگی ہوئی تھی اب تھک گئی ہو گی۔" وہ شہباز سے بولیں تو اس کے دل کی مراد بر آئی۔

"جی اچھا۔" کہہ کر وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔

وہ فریج میں سے سالن نکال کر گرم کر رہی تھی۔

شہباز کچن میں لگی ٹیبل کے گرد پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چپ چاپ کھانا گرم کرتی رہی۔ چہرے پر واضح ناراضی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا سی گرین اور بلو کا امتزاج اس پر بہت اٹھ رہا تھا۔ اس کا نازک بدن اور بھی کمزور ہو گیا تھا۔ شاید ... جان کے صدمے کی وجہ سے۔ اس نے سالن کا ڈونگا اس کے آگے رکھا چاولوں کی پلیٹ اوون سے نکالی اور روٹی کے لیے توا چولہے پر رکھا۔

"نہ روٹی رہنے دو۔ میں بس چاول لوں گا تھینک یو۔" اس نے خاموشی سے توا اتار دیا۔ پانی کا جگ بھر کر رکھا

اور گلاس میز پر رکھ کر باہر کی طرف مڑنے لگی تھی کہ شہباز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"بیٹھو ادھر۔" وہ حکمیہ لہجے میں بولا۔
"میں نے پھپھو کا بیگ دیکھنا ہے جا کر۔" وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔
"ابھی میں نے کھانے کے بعد چائے بھی پینی ہے۔ اس لیے بیگ کی کوئی جلدی نہیں۔ تم ادھر بیٹھو میرا ساتھ نہیں دو گی۔" ان کا اشارہ کھانے کی طرف تھا۔
"میں کھا چکی ہوں۔" وہ بیٹھتے ہوئے سرد مہری سے بولی۔
"یار اتنے سے مذاق کو سیریس لے لیا نزہت، تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو۔" اس نے نزہت کے خفا چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے وارفتگی سے کہا۔
"ہونہہ۔" اس نے ہونٹ سکوڑے۔
"اگر ام جان کا دل ادھر نہ بھی ہوتا تو بھی تم صرف میرے لیے تھیں۔ اتنا یاد رکھنا کہ تم مجھے کب سے پسند ہو یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔"
"اور جو ابھی کہا وہ۔" وہ خفگی سے بولی۔
تم کتنی خالص، کتنی پاکیزہ ہو اور تمہاری پاکیزگی میرے لیے کیا ہے میں چاہوں بھی تو تمہیں نہیں بتا سکتا نزہت! I Love Your purity اینڈ آئی لو یو۔ یہ کلیشے ہے لیکن اس کا کلیشے ہونا ہی چارم فل ہے۔ جتنی بار اس کو دہرائیں، اتنی بار اس میں نیا پن محسوس ہو گا اور نزہت میری محبت میری چاہت صرف اور صرف تمہاری امانت ہے میں نے کبھی کسی اور لڑکی کی اور عورت پر وہ نگاہ نہیں ڈالی جو صرف تمہارا حق ہے۔ جسم فانی ہوتے ہیں مگر کردار امر ہوتے ہیں یہ میرا یقین ہے۔" وہ کھانا آگے رکھے بڑی سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھا۔
نزہت کو یہ سب سننا کتنا عجیب لگ رہا تھا اسے کوئی شرم کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی معلوم نہیں کیوں۔ شہباز کے لفظوں نے جیسے اسے گھیر لیا تھا، وہ لفظوں کے بھنور میں ڈوب ابھر رہی تھی گم سم سن رہی ہو تا سب۔" وہ اس کو بت بنے دیکھ کر ذرا زور سے بولا۔
"ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔
"میں پھپھو کی پیکنگ دیکھ لوں۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں باہر کی طرف بڑھی۔
"کیپٹن شہباز!" وہ ایک دم سے رک کر بولی۔ "شیشہ کتنا خالص ہوتا ہے کہ اس کے آر پار سب نظر آتا ہے۔ ہے نا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو اس نے سر ہلا دیا۔
"اگر شیشہ ٹوٹ جائے اس کو جوڑ دیا جائے وہ جڑ تو جائے گا مگر اس کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی تو کیا اس کا خالص ہونا اب مشکوک ہو جائے گا، حالانکہ ہو گا تو وہ اب بھی شیشہ ہی۔" وہ شاید اس سے سوال کر رہی تھی۔

"ظاہر ہے۔"
"اس میں شیشے کا تو کوئی قصور نہیں، وہ خود سے تو نہیں ٹوٹتا۔ اپنی خوبصورتی کو خود تو تباہ نہیں کرتا۔" اس کے لہجے میں کیسا گہرا دکھ تھا۔ کیپٹن شہباز جان نہ پایا وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"کم آن یار! میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی تم پتا نہیں کون سا فلسفہ جھاڑنے بیٹھ گئیں۔ اب مجھے کچھ کھانے دو، خالی پیٹ اتنی بھاری بھاری باتیں کرو گی تو مجھے سفر میں دس بار رکنا پڑے گا اس لیے مجھے تم اپنے اتنے ثقیل فلسفے سے بخشو۔"
اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ کر جلدی سے کھانا شروع کر دیا۔
نزہت چند لمحے کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر ایک گہرا سانس لے کر باہر نکل گئی۔

اُسے آج ادھر آئے تین روز ہونے والے تھے جس ابتری کی حالت میں وہ یہاں پہنچا تھا، صرف پناہ مل جانا ہی بہت بڑی بات تھی مگر صوفی صاحب نے اس کی کتھا سن کر اس سے بڑی محبت و ہمدردی کا سلوک کیا تھا۔ اس رات جب وہ بے ہوش ہو کر مسجد کی چوکھٹ پر گرا تھا، جلیل بھاگ کر صوفی صاحب کو بلا لایا تھا۔
اولاد کی تربیت کے معاملے میں سختی صوفی صاحب کی طبیعت کا حصہ تھی اور وہ اس کے لیے ذرا سی نرمی کے بھی حق میں نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے اولاد آنے والا کل ہے، تیار ہونے والی فصل ہے اور جو لوگ آنے والے کل سے یا فصل کی تیاری میں کسی بھی مرحلے میں غفلت، لاپروائی اختیار کرتے ہیں، وہ اپنا مستقبل خود تباہ کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں بہت زیادہ سخت تھے۔
یہ ان کی شخصیت کا ایک پہلو تھا، دوسری طرف اپنی معاشرتی زندگی میں وہ بہت معاون اور محبت کرنے والے انسان تھے جو شخص ایک بار ان کی صحبت میں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتا پھر وہ ساری زندگی کے لیے ان کا مرید بن جاتا۔ بات کرنے کے دوران ان کا انداز ان کا لب و لہجہ انتہائی شائستہ، مہذب اور مدلل ہوتا تھا کہ مقابل چاہنے کے باوجود بھی ان سے اختلاف نہ کر پاتا اور یہی ان کی شخصیت کا خوبصورت پہلو تھا کہ وہ عام لوگوں سے بھی بڑی محبت سے ملتے تھے اور ان کی اسی محبت کی ایک بوند پانے کے لیے ان کے گھر آنگن کا آسمان اور اس کے ننھے پرندے چونچ کھولے ان کی طرف تکتے رہتے تھے اور اس معاملے میں ان کا دل ایک دم سے بانجھ ہو جاتا جیسے ان کے پاس گھر والوں کے لیے ایک قطرہ الفت بھی نہیں ہے۔
یہی ان کی طبیعت کا وہ پہلو تھا جس نے ان کے بچوں خصوصاً دونوں بیٹوں کو ان سے خائف کر دیا تھا۔ بڑا عبدالمتین تو پھر بھی ان سے منہ دکھاوے کی محبت و الفت جتاتا رہتا تھا کہ اسے ابھی اپنا مستقبل بنانے کے لیے صوفی صاحب کی مالی معاونت کی ضرورت تھی مگر عبدالمبین ان کے سخت پتھریلے رویے کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا اور اتنے زیرک صوفی صاحب کو اس کڑوی حقیقت کا احساس نہیں ہو پا رہا تھا یا وہ جان بوجھ کر پہلو تہی کر رہے تھے کہ آہستہ آہستہ عبدالمبین سختی کا عادی ہو کر سدھر جائے گا۔ ان کے ساتھ مسجد اور مدرسے کی ذمہ داری سنبھال لے گا کیونکہ انہیں معلوم تھا عبدالمتین اب شہر سے کبھی نہیں لوٹے گا اسے "برائٹ فیوچر" کی مکڑی نے اپنے تانے بانے میں جکڑ لیا تھا اگر اس تانے بانے سے وہ اسے کھینچ بھی لاتے تو وہ ان کے کسی کام کا نہ رہتا مکڑی نے اس کی ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں اور خالی بھس کا انہوں نے کیا کرنا تھا۔
معاذ کو اتنی خستہ حالت میں دیکھتے ہی ان کے بنیادی انسانی محبت بھرے جذبات جاگ اٹھے، انہوں نے اسی وقت جلیل کی مدد سے اسے حجرے کے اندر پہنچایا۔ جلیل کو حکیم صاحب کی طرف دوڑایا اور صبح جب اسے ہوش آیا، صوفی صاحب اس کے پاس ہی تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ ان کا بارعب چہرہ، مضبوط جسم، سرخ و سفید رنگت اور جلالی کشادہ آنکھیں، جنہیں وہ تسبیح کے دانوں پر مرکوز کیے دھیرے دھیرے لب ہلاتے دانے پھیر رہے تھے۔ معاذ نے انہیں دیکھا اور پھر سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔
"کیا نام ہے لڑکے تمہارا؟" ان کی بھاری بارعب آواز پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
"معاذ جی۔" اس نے بمشکل خود کو سنبھال کر آنکھیں کھولیں۔
"کہاں کے رہنے والے ہو؟"
یہ سوال اتنا مشکل، اتنا تکلیف دہ، اتنا دکھ بھرا تھا کہ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں، کچھ اس کی صورت اتنی بھولی بھالی تھی کہ مقابل اس کے بارے میں کوئی برا گمان کر ہی نہیں سکتا تھا اس کی بند آنکھوں کے گوشے کیا نم ہوئے صوفی صاحب کا دل جیسے پانی ہو گیا۔ وہ تسبیح بستر کے سرہانے رکھ کر اس کا ہاتھ سہلانے لگے۔
"بتایا نہیں تم نے کہ کدھر کے رہنے والے ہو۔" اب کے ان کا لہجہ نرم ہی نہیں محبت بھرا بھی تھا۔ معاذ کے دل کو حوصلہ ہوا۔
اس نے "سائبان" سے لے کر ظفر کے گھر سے فرار تک ساری کہانی آہستہ آہستہ ان کے گوش گزار کر دی۔

"ہوں۔ اس کا مطلب ہے خوب ذہین ہو۔ ٹاپ کیا تھا تم نے بہت اچھی بات ہے۔ یتیم خانے میں رہنا بری بات نہیں اور نہ قابل شرم یہاں ایسے ایسے بھی بچے ہیں جو محلوں میں رہتے ہیں اور ان کے ذہن کند ہوتے ہیں علم کے معاملے میں اور اگر چل بھی پڑیں تو منفی رخ پر۔ منفی ذہن والے یہ رئیس زادے جب معاشرے کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں تو ہر طرف لاقانونیت' وحشت اور ظلم برپا کر دیتے ہیں کہ ان کے علم کا حق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا پھر انہیں کس بات کا ڈر؟ جب کوئی حق کو مانتا ہی نہ ہو پھر وہ اس سے ڈرتا بھی نہیں۔

حق سے تو وہ ڈرتا ہے جو علم رکھتا ہے اور معاذ علم والے ہر دور میں معاشرے میں اپنا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انسانوں کی نظر میں بھی اور خدا کی نظر میں کہ علم انبیاء کی میراث ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے یتیم خانے میں رہ کر علم کی قدر کو جانا' کتابوں کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے پھٹے لباس کو شرف بخشا۔ اگر ہمارے معاشرے کے سارے نہ سہی آدھے بچے بھی اس طرح علم سے محبت کرنے لگیں تو پھر اس معاشرے کی ترقی اور بہتری کے لیے ہمیں گردنیں اٹھا کر بڑی سرکار کی طرف نہ دیکھنا پڑے مجھے خوشی ہوئی تمہارے بارے میں جان کر۔"

معاذ کو علم نہیں تھا وہ اس کی تعلیمی کاوش کو یوں سراہیں گے۔ وہ دیکھنے میں ہی بہت سخت' بہت کھردرے لگتے تھے مگر ہر انسان کا باطن اس کے ظاہر سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ نظریں جھکا کر ان کو سنتا رہا۔ پھر تین دن تک انہوں نے اس سے وہی محبت بھرا خصوصی سلوک روا رکھا۔ گھر میں بھی سب کے سامنے اس کی خوب تعریفیں کیں۔

"رابعہ بی بی! وہ والدین کس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی اولاد معاذ جیسی ہوتی ہے آج اگر وہ زندہ ہوتے تو اتنے ہونہار بچے کو دیکھ دیکھ کر اپنے اللہ کا شکر نہ ادا کر رہے ہوتے۔ ایک ہم ہیں اپنی اولاد کے سروں پر موجود' انہیں ہر گرمی سردی' بھوک ننگ سے بچانے کو موجود اور پھر بھی کوئی ایسا نہیں جس کو میں فخر کی نظر سے دیکھوں۔ ایک عبدالمتین تھا' جس پر میرا دل فخر کرتا تھا کہ وہ ضرور میری محنت کا پھل بنے گا۔ وہ پھل تو ضرور بنے گا مگر اس کو چکھنے والے کوئی اور ہوں گے' اس کا فیض بھی ہمارے نصیب میں نہیں۔ عبدالمبین کا مجھے کیا سبھی کو علم ہے کہ اس کا ذہن کیا وجود بھی کبھی ہمارے لیے باعث فخر نہیں رہا اور اگر وہ ایک بے ضرر اچھا انسان بھی بن جائے تو بھی میں اللہ کا شکر ادا کروں گا جو ہونا مشکل ہے اور رابعہ بی بی! بیٹیاں تو پرائے آنگنوں کے پھول ہوتی ہیں۔ ان پر کیا مان کرنا۔" آخر میں آکر ان کا لہجہ بہت شکست خوردہ سا ہو گیا۔

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں جو تعلیم یہ لڑکا حاصل کر رہا ہے وہی تو ہمارا عبدالمتین بھی حاصل کر رہا ہے اگر وہ تعلیمی میدان میں آگے جائے گا تو آپ کا ہی نام روشن ہو گا۔" اماں جی نے انہیں حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

"نہیں رابعہ بی بی! عبدالمتین کی سرشت میں ہمارے لیے وفا نہیں ہے اور زندگی تو کھیل ہی وفا اور بے وفائی کا ہے افسوس صد افسوس۔ کاش زندگی اتنی وفا ضرور کرے کہ نہ میری پیشن گوئیوں کو سچ ہوتا دیکھو۔ میں ولی نہیں ہوں نہ غیب کا علم رکھتا ہوں۔ یہ تو صاف سیدھے حقائق ہیں جو مجھے سب بتا رہے ہیں اگر ان کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جائے۔" وہ بہت پژمردہ سے تھے۔

"بابا صاحب کو صرف اپنی ہی اولاد میں کیڑے نظر آتے ہیں' معلوم نہیں کیوں۔ دوسروں کا کھمبا بھی انہیں بھلا لگتا ہے۔" زینب بڑبڑائی۔

آمنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ دونوں صوفی صاحب اور اماں جی سے کچھ فاصلے پر بیٹھی پرانا سویٹر ادھیڑ رہی تھیں۔ جس کی اون سے اماں جی کو کمبل بنوانا تھا۔

"آپ اللہ سے دعا کریں۔ آپ اللہ کے نیک بندوں میں سے ہیں اور والدین کی دعا اولاد کے حق میں ضرور قبول ہوتی ہے۔" اماں جی ڈرتے ڈرتے بولیں۔

"بڑا گناہ گار بندہ ہوں میں اللہ کا۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"دعا۔ اب یہی ایک ہتھیار رہ گیا ہے۔ ہمارے پاس زندگی کی باقی جنگ لڑنے کے لیے۔ ورنہ دونوں بیٹوں سے مجھے کچھ خاص امید نہیں۔"

"صوفی صاحب! اللہ کی رحمت سے مایوسی کیسی۔ عبدالمبین اب پڑھائی میں خاصا بہتر ہو گیا ہے۔ تب ہی تو اس کے قاری صاحب نے اسے چار دن کی چھٹی دی ہے گھر آنے کے لیے۔" اماں جی انہیں دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

عبدالمبین اندر بستر میں لیٹا کھلی کھڑکی سے ساری گفتگو سن رہا تھا' گو بابا صاحب کی کوئی بھی بات اس کے لیے نئی نہیں تھی۔

"پڑھائی میں وہ کبھی بہتر نہیں ہو سکتا رابعہ بی بی!" انہوں نے ہنکارا ابھرا۔ "میں نے چھٹی پر بلوایا ہے اسے۔ بڑے شاہ جی کی خصوصی تاکید تھی کہ دونوں بیٹوں کو شادی میں ضرور لے کر آؤں کہ وہ بھی اپنے مالکوں کی خوشی میں خوش ہو سکیں اور انہیں جھک کر سلام کر سکیں اور انہیں اپنے مالکوں سے بات کرنے کا طریقہ آسکے۔ عبدالمتین کو ایک ہفتے میں چار خط لکھے کہ چھوٹے شاہ جی کی شادی ہے اور بڑے شاہ جی نے خصوصی طور پر ہمارے پورے گھرانے کو مدعو کیا ہے اور ہمارا شریک ہونا کس قدر ضروری ہے۔ مدرسے کی آمدن اور مسجد کی دیکھ بھال سے جتنی تنخواہ ملتی ہے اگر اس پر گزارہ کریں تو رابعہ بی بی! ہمیں مہینے کے بیس دن فاقوں پر گزارا کرنا پڑے اور یہ تمہارے بڑے شہزادے کی تعلیم پر میں جو پانی کی طرح پیسہ بہا رہا ہوں۔ یہ کہاں سے آرہا ہے سب بڑے شاہ جی کی مہربانیاں ہیں۔ ان کی محبتیں ہیں جو اس قدر مہربان ہیں' وہ بدلے میں اتنا تو چاہیں گے کہ پانے والے محض انہیں سر جھکائے نگاہیں سرنگوں کرکے سلام کریں تو ان کے کتنے جذبوں کی تشنگی دور ہو جائے مگر تمہارے صاحبزادے نے صفاچٹ لکھ بھیجا۔ امتحان ہیں میں نہیں آسکتا۔ یہی بات اگر لنگ میں شاہ جی کے آگے بیان کروں تو وہ ہمیں اپنی جوتیوں کے پاس بھی جگہ نہ دیں۔ سال بھر کا راشن پانی علیحدہ بند۔ جو کھلاتا ہے وہ آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔ ان کی عتاب بھری نظر اس کا عذاب کون سہے گا۔ وہ تمہارا لاڈلا تو ادھر ہو گا اور مجھے جھوٹ پر جھوٹ گھڑ کر شاہ جی کو مطمئن کرنا ہو گا اسی لیے اس نالائق کو چار دن کی چھٹی پر ادھر بلوا لیا کہ شاہ جی کی خفگی زیادہ نہ بڑھ سکے۔" وہ دونوں سے ہی بے حد نالاں تھے۔

"بچہ ہے ابھی سمجھ جائے گا آہستہ آہستہ میں سمجھاؤں گی۔" اماں جی نے ماؤں والا روایتی جملہ اتنی آہستہ آواز میں کہا کہ صوفی صاحب بمشکل سن پائے۔

"بچہ نہیں ہے' وہ پورے سولہ سال کا ہونے کو آیا ہے اتنا تو سمجھ نہیں کہ اچھے برے میں فرق نہ کر سکے۔ اس کی آنکھ دیکھی ہے تم نے کبھی۔" وہ گرجے۔ "اس کی آنکھ میں لحاظ نہیں مروت نہیں اور کسی کا بھی ڈر نہیں اس کی آنکھ ہی مجھے ڈراتی ہے رابعہ بی بی! تم سے میں خاص کہتا ہوں اس کے لیے اللہ سے جھولی پھیلا پھیلا کر عاجزی سے مانگا کرو۔ اس کے لیے اللہ کا رحم مانگو اور نیکی کی ہدایت۔"

عبدالمبین بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "بابا صاحب' مجھ سے اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"وہ بھی میرا خون ہے اسے اگر کانٹا چبھے گا تو درد مجھے ہی ہو گا' اگر اس سے میں سختی سے پیش آتا ہوں تو اس کی بہتری کے لیے اسے آئندہ کے کانٹوں سے بچانے کے لیے مگر وہ یہ بات نہیں سمجھتا۔ وہ ایک باپ کے جذبات کو نہیں سمجھتا جس کے دل نے اس سے ڈھیروں امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ رابعہ بی بی! اسے سمجھاؤ نہیں اس کے لیے دعا کرو۔ بہت زیادہ دعا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

"پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے' انہیں بچے کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں امیدیں لگا رکھی ہیں مگر کبھی دو بول پیار کے نہیں بولتے۔ سختی سے تو پتھر پاش پاش ہوتے ہیں سنورتے نہیں۔ یہ بات نہیں سمجھتے۔" اماں جی بڑبڑاتے ہوئے اندر کمرے کی طرف دیکھنے لگیں جہاں عبدالمبین لیٹا ہوا تھا۔

معاذ جی جان سے ان کا معتقد ہو گیا تھا محض تین روز میں۔ اگر اسے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے شہر نہ جانا ہوتا تو وہ شاید یہیں صوفی صاحب کے پاس رہ جاتا۔ ان کی قربت میں اس کے دل کو بہت سکون ملا تھا اور صبح نماز

فجر کے بعد سحر کا اجالا پھیلنے سے پہلے جب صوفی صاحب خوش الحانی سے سورہ یٰسین اور سورہ رحمٰن کی باآواز بلند تلاوت کرتے تو معاذ جیسے کسی سحر میں جکڑ جاتا۔ صرف تین دن ہی اس نے ان کی صحبت میں گزاریں اسے لگا اب دل کو اور کوئی حسرت نہیں ان کی آواز میں ان کی گفتگو میں جادو تھا۔

ان تین دنوں میں معاذ کو پتا چلا کہ روزمرہ زندگی میں اللہ سے رابطہ کتنا ضروری ہے۔

"کام تو سب ہو جاتے ہیں۔ ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن اگر انہیں اللہ کے نام سے شروع نہ کرو اس کے آگے دعا مانگ کر ان کے انجام خیر کا نہ سوچو تو کام سے برکت اور لطافت اٹھ جاتی ہے۔" صوفی صاحب نے اسے بتایا۔

وہ ساتوں وقت پورے خضوع و خشوع سے اللہ کے آگے جھکتے تھے۔ پانچ وقت مسجد میں باجماعت اور دو وقت تنہائی میں۔ مذہب سے محبت ان کی زندگی میں رچ بس چکی تھی ان کا پروفیشن بھی دین تھا اور محبت بھی۔ جیسے خوبصورت رنگوں سے سجی پھولدار چادر جس کے دھاگوں سے چاہیں بھی تو رنگ جدا نہیں کیے جاسکتے۔ اسی طرح دین سے محبت صوفی صاحب کی زندگی میں شامل تھی۔

کل شام اس نے صوفی صاحب سے جانے کی بات کی۔

"چلے جانا ایک دو روز اور رک جاؤ پھر نہ جانے کب ملو۔ ملو بھی یا نہیں۔" وہ محبت سے بولے۔

"نہیں صوفی صاحب! کالج میں داخلے شروع ہو چکے ہوں گے۔ مجھے اب جانا ہے۔ اللہ نے چاہا تو آتا رہوں گا۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"وہاں جاؤ گے کس کے پاس۔۔؟" ان تین دنوں میں ہی وہ اس کی اس قدر فکر کرنے لگ گئے تھے۔

"کسی ہوٹل وغیرہ میں چند دن رہ لوں گا۔ داخلہ ہو جائے گا تو پھر ہاسٹل چلا جاؤں گا۔"

"میرا بیٹا ہے نا شہر میں عبدالمتین، جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا۔ اب فورتھ ایئر میں ہے۔ بہت لائق، بہت ذہین ہے تمہاری طرح۔ وہ بھی کسی ہاسٹل میں رہتا ہے۔ میں تمہیں اس کا پتا لکھ دوں گا تم اس سے مل لینا جا کر وہ تمہاری مدد کرے گا۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

"شکریہ صوفی صاحب! اور میں آپ کی کس کس بات کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں۔ مجھے یہاں رکھا، میری تیمارداری کی۔ اور سب سے بڑھ کر جو میں ساری زندگی بھول نہ پاؤں گا۔ وہ آپ کی محبت ہے۔ جو آپ نے مجھے دی۔"

معاذ بہت شرمیلا لڑکا تھا۔ "سائبان" نے اس کے اندر اعتماد پیدا ہونے ہی نہیں دیا تھا لیکن اسے لگا آج اگر وہ صوفی صاحب کا شکریہ ادا نہیں کرے گا، ان سے دل کی بات نہیں کہے گا تو پھر شاید اسے زندگی میں دوبارہ یہ موقع مل ہی نہ سکے۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم بھی میرے بچوں جیسے ہو۔ بلکہ سچ پوچھو تو ان تین دنوں میں مجھے تم ان سے بڑھ کر عزیز ہو گئے ہو۔ تمہارے اندر بہت قابلیت ہے، اپنی قابلیت کے بل بوتے پر جب کچھ بن جاؤ تو کبھی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھانا۔"

"دیکھو بچے! احسان اتارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اس طرح کا احسان زندگی میں اگر موقع ملے تو کسی دوسرے کے ساتھ کر دو۔ تمہیں بہت سکون ملے گا، اپنے علم کو ہمیشہ مثبت استعمال کرنا کبھی اس کے منفی استعمال کے بارے میں خواہ اس میں کتنا ہی مالی فائدہ کیوں نہ ہو کبھی نہ سوچنا۔" وہ عقیدت سے سر ہلانے لگا۔

"میرا تو خیال تھا تم ایک دو روز اور رہو گے، بہرحال تم نے وجہ ہی ایسی بتائی ہے کہ میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ تمہارے لیے دعا کرتا رہوں گا کہ اللہ تمہیں نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور برے افعال سے دور رکھے۔" وہ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بولے۔

"صوفی صاحب! میں کبھی کبھار آپ سے ملنے آجایا کروں؟" اس نے جھجک کر پوچھا۔

"شوق سے بیٹا! میرا دل، میرا گھر تمہارا منتظر رہے گا۔" وہ محبت سے بولے۔

"تم ابھی جا کر ذرا گاؤں کی سیر کر آؤ۔ کل دوپہر کا کھانا کھا کر نکل جانا۔ شام سے پہلے شہر پہنچ جاؤ گے۔ گاؤں کی سیر کے لیے میں تمہارے ساتھ عبدالمبین کو کر دیتا ہوں۔ میرا دوسرا بیٹا جس سے تم آج دوپہر ملے تھے آج ہی مدرسے سے چار دن کی چھٹی پر آیا ہے۔" وہ اس پر بہت مہربان ہو رہے تھے۔

"صوفی صاحب میں کل صبح جلدی نکلنا چاہتا ہوں تاکہ ٹائم پر پہنچ کر وہاں کہیں رہنے کا ٹھکانہ کر سکوں۔"

"چلو دیکھیں گے کل۔ میں جا کر عبدالمبین کو بھیجتا ہوں۔ تم گاؤں کی سیر کر آؤ۔ اگر جانا چاہو تو بڑے شاہ جی کی حویلی بھی ہو آؤ وہاں آج کل رات میں بھی دن کا سماں لگتا ہے، چھوٹے شاہ کی شادی ہے نا۔ اکلوتے وارث ہیں حویلی کے اس لیے خوب دھوم دھام سے سب تقریبات ہوں گی۔ اگر شاہ جی دونوں میں سے کوئی بھی ملے تو دعا سلام لے لینا۔ عبدالمبین ساتھ ہوگا۔ اسے پتا ہے ان کا۔ بڑے لوگوں سے سلام دعا رکھنے میں بھی بڑا فائدہ ہے زندگی میں کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ایسوں سے کام پڑ ہی جاتا ہے۔ میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"عبدالمبین کو بھیجتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

عبدالمبین جتنا بیزار اسے پہلی ملاقات میں نظر آیا تھا اب بھی اسی طرح اکتایا ہوا اور تنگ مزاج لگ رہا تھا۔ وہ اسے مارے بندھے صوفی صاحب کے سامنے سیر کے لیے لے کر نکل تو آیا تھا۔ مگر اس کا سیر کا بہرحال کوئی ارادہ تھا۔ نہ پروگرام کیونکہ اپنے گھر اور مسجد کی حدود ختم ہوتے ہی اس کے قدم بے حد ڈھیلے پڑ گئے اور مزاج مزید کڑوا ہو گیا۔

"کہاں جانا ہے تمہیں؟" وہ رک کر لڑنے والے انداز میں اس سے پوچھنے لگا۔

"جدھر تم لے جاؤ۔" معاذ ذرا پیار سے بولا۔

"ہا ہا۔۔۔۔" وہ اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔ "اتنا اعتبار نہ کرو۔ مجھ پر تو میرے باپ کو اعتبار نہیں۔ میں تمہیں اندھے کنوئیں پر لے جا کر اس کی منڈیر سے دھکا بھی دے سکتا ہوں۔" وہ معاذ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں مجھے کسی کے ہاتھوں مرنا منظور ہے مگر کسی کو مارنا نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"وہ تو تم مجھے شکل ہی سے بزدل اور ڈرپوک لگ رہے ہو۔" عبدالمبین ذرا گردن اکڑا کر بولا۔

"ہاں وہ تو میں ہوں، مجھے خواہ مخواہ کسی سے جھگڑنا نہیں آتا۔" معاذ فوراً مان گیا۔

"چاہے کوئی تمہیں گھونسا مار جائے یا چوہے کی طرح تمہاری گردن مروڑ جائے۔ تم پھر بھی یہی کہو گے۔ مجھے خواہ مخواہ کسی سے جھگڑنا نہیں آتا۔" وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" "یہیں کھڑے رہو گے، چلنا نہیں۔" وہ گلی کے بیچ میں کھڑے تھے چند قدموں پر تنگ دھڑنگ کپڑوں سے بے نیاز چھوٹے بچوں کا گروپ کینچے کھیل رہا تھا۔ معاذ انہیں دیکھنے لگا۔

"بڑا شوق ہے تمہیں سیر کا، یہ میں تمہیں بتا دوں ادھر کوئی شالامار باغ نہیں نہ کوئی چڑیا گھر ہے۔ جس کی تم سیر کو نکلے ہو یہ تو گاؤں ہے کھیت کچی گلیاں ٹوٹے پھوٹے گھر ایک کنوار چند ٹیوب ویل اور ایک حویلی بس۔ مسجد کی سیر تو تم کر ہی چکے ہو۔" وہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تم مجھے کیوں لے کر آئے ہو، میں جا کر صوفی صاحب سے کہہ دوں گا کہ تم کہہ رہے تھے یہاں سیر کے لائق کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔" وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس نے پہلی ملاقات ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ عبدالمبین صوفی صاحب کو دیکھتے ہی کانپنے لگتا ہے۔

"ویسے تم کہتے ہو تم کسی سے جھگڑتے نہیں اور اب۔" عبدالمبین نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"چلیں پھر واپس۔" معاذ کو اس کی بے بسی اچھی لگی۔

"کھیت دیکھ لو۔ رہٹ پر لے جاتا ہوں۔" وہ لٹھ مارنے والے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا تو معاذ بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگا۔

”مبین! تم پڑھتے ہو۔“ معاذ کا دل چاہ رہا تھا اس ناراض لڑکے سے دوستی کرے۔ اس کے تنے ہوئے چہرے کے پیچھے چھپے اصلی چہرے کو جانچے۔

”پڑھتا ہوں۔ تمہیں تکلیف ہے۔“ وہ بدتمیزی سے بولا۔ اصل میں وہ معاذ کو بیزار کر کے سیر والے منٹے سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا۔

”نہیں بھئی پڑھنا تو بڑی اچھی بات ہے‘ مجھے تکلیف کیوں ہوگی بلکہ مجھے تو خوشی ہے۔“ معاذ اس کی بدتمیزی کو نظرانداز کر کے صلح جو انداز میں مسکرا کر بولا۔ عبدالمبین نے منہ پھیرلیا۔ اب وہ گاؤں سے نکل آئے تھے۔ کھیت شروع ہو چکے تھے۔ چاول کی پنیری کو پانی دیا گیا تھا۔

”کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟“ وہ پھر بولا۔

”حفظ کر رہا ہوں۔“ وہ اسی طرح منہ پھیرے دیہاتی لہجے میں خفا خفا سا بولا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے مبارک ہو۔ مجھے بھی بڑا شوق ہے‘ حفظ کا مگر.....“ وہ چپ کر گیا۔

”تو کر لو اس کے لیے کون سی فیسیں بھروانی پڑتی ہیں بس اپنے جسم پر گینڈے کی کھال چڑھوانی پڑتی ہے اور باقی سب خیر ہے گوشت قاری صاحب کا ہڈیاں تمہاری۔“ ساری گفتگو کے دوران ایک بار بھی اس کا لہجہ نارمل نہیں ہو سکا تھا‘ اکھڑا ہوا ناراض سا۔

”اچھا تمہیں کیا پسند ہے۔ میرا مطلب ہے تمہیں حفظ کے علاوہ کون سا شوق ہے‘ آؤ ادھر بیٹھ جاتے ہیں۔“ ٹیوب ویل کی موٹی سی دھار کھیتوں میں بہہ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی بنے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ ادھر بیٹھ کر ایک دم سے خنکی کا احساس ہونے لگا۔

”یہ شوق میرا نہیں بابا صاحب کا ہے۔“ وہ منہ بگاڑ کر بولا۔

”اچھا تو تمہیں کس چیز کا شوق ہے۔ جیسے مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میرا دل کرتا ہے ایک ایک لفظ ایک ایک حرف کو اپنے اندر جذب کر لوں۔“

”مجھے بھی بڑا شوق تھا پنسل سے اسکیچ.....“ اس نے زبان دانتوں تلے دبالی اور آنکھیں سکیڑ کر دور امرود کے درخت پر بیٹھے ہوئے طوطے کو غور سے دیکھنے لگا جو کچے امرود کو چونچیں مار رہا تھا۔

”اچھا یہ تو بڑا اچھا شوق ہے‘ کسی سے سیکھا ہے تم نے.....؟“

”نہیں۔“ وہ ہاتھ مار کر ٹیوب ویل کی موٹی دھار کو بکھیرنے لگا۔

”کیا کچھ بنایا ہے‘ مجھے دکھاؤ گے۔“ معاذ نے اشتیاق ظاہر کیا۔

”نہیں ہے کچھ بھی میرے پاس‘ بابا صاحب نے سب پھاڑ دیا۔ میری اتنی موٹی کاپی تھی‘ اتنے خوبصورت منظر تھے اس میں اور.....“ وہ بالکل پانی کے قریب ہو کر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”اور اب میں دوبارہ کبھی کچھ نہیں بناؤں گا بالکل بھی۔“ وہ جیسے خود سے عہد کر رہا تھا۔

”صوفی صاحب نے کیوں پھاڑ دی۔“

”انہیں میرے ہر شوق سے نفرت ہے۔ میری پسند انہیں ناپسند ہے مجھے اسکول جانے کا شوق تھا انہوں نے مجھے اسکول سے اٹھوا کر حفظ پر ڈال دیا۔ مجھ پر جانوروں کی طرح تشدد کیا جاتا ہے اور بابا صاحب کہتے ہیں اس علم کو حاصل کرنے کے لیے اتنی ہی سختی سہنی پڑتی ہے۔ کیا ہمارا دین ڈنڈے کے زور پر پھیلا ہے۔ مجھے بتاؤ اور حفظ کرنا تو محبت اور شوق کا سودا ہوتا ہے۔ مجھے حفظ کرنے سے بھی انکار نہیں تھا مگر بابا صاحب ہر کام سختی سے‘ اپنی مرضی سے کرانا چاہتے ہیں۔ میں پڑھنا چاہتا تھا وہ مجھے بھائی کی طرح بنانا چاہتے تھے۔ ہر فن مولا۔ ہر علم میں طاق۔ بھائی مجھ سے بہت زیادہ ذہین ہیں یہ وہ بھی جانتے ہیں۔ میرا دل نہیں لگتا حفظ کرنے میں۔ پھر قاری صاحب کی مار۔ میں بس کچھ ماہ ہوں ادھر پھر میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا کہیں بھی۔ میرا اب یہاں دل نہیں لگتا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا صرف اماں جی اور آمنہ اچھی لگتی ہیں ان سے ملنے آجاتا ہوں اور اب تم مجھے سمجھانا مت۔ میں نے تمہیں

اس لیے یہ سب نہیں بتایا کہ تم مجھے سمجھاؤ اور اگر چاہو تو سب بابا صاحب کو بھی بتا دینا۔ مجھے اب کسی کا ڈر نہیں۔ ڈر تو مار کا ہوتا ہے نا اور میں اتنا پٹ چکا ہوں کہ مجھے اب اس کا بھی ڈر نہیں رہا۔“

وہ بے خوفی سے پانی سے کھیلتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھل گیا تھا۔ معاذ کو اس بگڑے ہوئے لڑکے پر بہت پیار آ رہا تھا مگر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان تین روز میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ صوفی صاحب اپنے گھر والوں کے ساتھ خصوصاً عبدالمبین کے ساتھ بہت سخت ہیں اور اس کے حق میں بولا گیا کوئی نرم کلمہ انہیں قائل کرنے کی بجائے اور بھڑکا دیتا ہے۔

”تم ایسا کرو نا حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ پڑھتے رہو اور اپنی اسکیچ ڈرائنگ بھی جاری رکھو۔ یہ حفظ تو تمہارا بہت جلد ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ سال میں جس حساب سے تمہارے قاری صاحب تمہیں مار پیٹ کر اس کے لیے تیار کر رہے ہیں‘ تم جلد حافظ عبدالمبین بن جاؤ گے پھر تم اسکول میں داخل ہو جانا‘ اپنے بھائی کی طرح۔ پھر تمہیں جو مضامین پسند ہوں وہ رکھ لینا۔ چاہے ڈرائنگ رکھ لینا پھر کالج میں داخلہ لینے شہر آجانا۔ وہاں میں بھی تو ہوں گا پھر بہت مزہ آئے گا۔“ معاذ نے بچوں کی طرح اسے بہلا کر اس کے مستقبل کی مکمل تصویر کشی کر دی۔ عبدالمبین کے چہرے پر بڑی استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

”اسکیچ ڈرائنگ تم مجھ سے زیادہ بہترین کرو گے اگر کرو تو؟“

”خواب بننے میں کوئی حرج نہیں سب کو حق حاصل ہے مگر اپنے بارے میں خواب بنو تو زیادہ اچھی بات ہے۔ دوسروں کے معاملے دوسروں کے لیے چھوڑ دو چلو واپس چلتے ہیں یا تمہیں ابھی مزید سیر کرنی ہے۔“ وہ بڑے طنز سے ”سیر“ پر زور دے کر بولا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایک اچھا لڑکا ضائع ہو جائے گا۔“ معاذ کو راستہ بھر ایک عجیب سے ملال نے گھیرے رکھا۔ اسے عبدالمبین واقعی اچھا لگا تھا مگر وہ شاید اسے پسند ہی نہیں کرتا تھا محبت اور دوستی ون وے ٹریفک کی طرح ہو تو جلد ہی ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دونوں گھنٹے بھر میں واپس گھر پہنچ گئے‘ اس کے بعد معاذ کی عبدالمبین سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی رات گزری صبح ہوتے ہی اس نے اپنے کپڑوں اور دو چار کتابوں کا شاپر جلدی سے تیار کر لیا۔ وہ جلد سے جلد شہر پہنچ جانا چاہتا تھا مگر ایک تو صبح سے مسلسل بارش ہو رہی تھی‘ کبھی ہلکی کبھی تیز۔ دوسرے صوفی صاحب کے پاس کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہ صبح سے معاذ کے پاس آئے ہی نہیں تھے۔

”صوفی صاحب کہتے ہیں‘ وہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“ معاذ کے بار بار استفسار پر جلیل نے اسے آکر بتایا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔ دوپہر ہو گئی صوفی صاحب نہ آئے اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے کے اندرونی دروازے کی طرف آگیا جو گھر کے اندر صحن میں کھلتا تھا۔ اندر سے مختلف آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ٹائم پاس کرنے کے لیے ان آوازوں کو سننے لگا۔

”اماں جی منع کر دیں اس مبین کے بچے کو۔ سارے بادام چکھنے کے بہانے کھا گیا ہے۔ ہم نے گھنٹہ لگا کر چھیلے تھے۔“ زینب نے زوردار چیخ مار کر اماں جی سے کہا۔

”عبدالمبین! انسان بنو کیوں بہنوں کو تنگ کر رہے ہو۔“

”اماں جی میں نے کب کھائے ہیں بادام‘ میں تو چکھ رہا ہوں چاولوں میں کڑوے بادام آگئے تو پھر انہیں ہی بابا صاحب سے ڈانٹ پڑے گی۔ میں تو ان کا بھلا کر رہا ہوں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہتے ہوئے ایک اور مٹھی چھیلے ہوئے باداموں کی بھری اور منہ میں ڈال لی۔

”دفع ہو جاؤ تم یہاں سے عبدالمبین! اماں جی سارے کھا گیا۔“ زینب نے عبدالمبین کو زوردار دھکا دیا۔

”مت بول بھائی کو ایسا‘ پہلے ہی وہ اتنے دنوں بعد گھر آیا ہے۔“ اماں جی نے الٹا زینب کو ڈانٹا تو وہ اسے منہ چڑانے لگا۔

"اماں جی آپ بھی تو اسے منع کریں نا سارے تو یہ کھا گیا ہے' چاولوں میں کیا ڈالیں گے۔" آمنہ بھی پرے بیٹھی ناریل باریک باریک کاٹتی عبدالمبین کی شرارت دیکھ رہی تھی۔

"نہ کر پتر! صوفی صاحب آتے ہوں گے انہوں نے مہمان کے لیے پکوائے ہیں' بطور خاص گڑ والے چاول۔ موسم جو ایسا ہو رہا ہے ورنہ آج کوئی گھر میں چولہا جلنا تھا' آج تو حویلی میں چھوٹے شاہ جی کی مہندی ہے۔ تم لڑکیوں کو جلدی سے کام نپٹانے دو۔ انہوں نے اپنی تیاری بھی کرنی ہے ابھی جا کر۔ شام سر پر آ گئی ہے۔" اماں جی اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"مہمان کے لیے بطور خاص پکوائے ہیں' کبھی میرے لیے تو کچھ نہیں پکوایا بطور خاص۔ میں بھی تو اب چند دنوں کے لیے آتا ہوں وہ بھی مہینوں بعد۔ پھر آپ کہتی ہیں کہ تمہارے بابا صاحب تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔" عبدالمبین کی سوئی مہمان کی خاطر داری پر اٹک گئی۔

دل میں رنج کا ایک نیا سبب پیدا ہو گیا۔ وہ گھر چاہے ہفتے بعد آئے یا چھ ماہ بعد صوفی صاحب نے اسے کبھی پیار سے چھاتی سے نہیں لپٹایا' کبھی اس کی خاطر داری کے لیے اماں جی کو کوئی خاص حکم نہیں دیا بلکہ انہیں تو شاید پتا بھی نہیں تھا کہ عبدالمبین کو کیا پسند ہے کیا ناپسند۔ حالانکہ عبدالمتین شروع شروع میں جب بھی شہر سے آتا۔ صوفی صاحب اس کے لیے باداموں والا قورمہ' گاجروں کا حلوہ' گوشت کا پلاؤ اور فرنی تیار کرواتے تھے۔ اس کی پسند کی ساری ڈشوں کا انہیں علم تھا' ایک بیٹے سے اس درجہ الفت کا اظہار اور دوسرے سے غایت درجے کی بے نیازی۔ عبدالمبین کے دل میں گرہیں بڑھتی جا رہی تھیں اور صوفی صاحب نے اس کے دل کی کوئی بھی گرہ کبھی کھولنے کی کوشش نہیں کی' کبھی اس کے روٹھنے کی' رونے کی' بلاوجہ چیخنے کی' ناراض ہونے کی وجہ دریافت نہیں کی تھی۔ کبھی کبھار اسے خیال گزرتا شاید وہ ان کی اولاد ہی نہیں یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھیں اپنے پرائے پن پر بھر آتیں۔

"نہ بیٹا! مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں' وہ بے چارہ بچہ تو بے گھر ہے' یتیم ہے نہ سر پر باپ نہ دعا کرنے والی ماں پھر اتنا نیک شریف اس کی......"

"میں بدمعاش ہوں لفنگا ہوں' وہ اگر پاک پوتر ہے۔" وہ اور جل گیا۔ غصے میں باداموں کے چھلکوں کی پلیٹ کو اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ دور سیڑھیوں کے پاس جا گری۔

"نہ پتر! اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ شیطان ورغلاتا ہے' اپنے اندر برداشت پیدا کر۔" اماں جی کے ہاتھوں سے کفگیر چھوٹ گیا۔

"اماں جی جلدی کریں۔ ہم نے ابھی اپنے کپڑے بھی استری کرنے ہیں صبح سے بجلی بھی نہیں ہے۔ آپ انگیٹھی میں سے کوئلے لوہے کی استری میں بھر دیں' میں کپڑے تو استری کر لوں' شام ہونے کو ہے۔ مبین کا تو کام ہے ہر وقت جھگڑنا۔" زینب نے آخری جملہ بالکل زیر لب کہا اگر عبدالمبین سن لیتا تو اینٹ اٹھا کر اس کا سر پھاڑ دیتا۔

زینب کا تو بس نہیں چل رہا تھا صبح ہی حویلی پہنچ جاتی' حویلی کے باہر مسلسل بجتے ڈھول کی آواز اسے اور بے چین کر رہی تھی۔

"اچھا پہلے چاول تو دم دے لوں پھر کوئلے لے لینا۔" اماں جی نے سر جھکائے اپنے آپ میں کڑھتے عبدالمبین کو افسوس بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اماں جی! سلام اماں جی!" جلیل باہر سے تقریباً "بھاگتا ہوا اندر آیا اور بارش سے بچتا بچاتا صحن میں کھڑے پانی میں چھپا چھپ کرتا سیدھا برآمدے میں آ کر اماں جی کو سلام کیا۔

"تیرے پیچھے کیا گاؤں کے کتے لگے ہیں جو یوں حواس باختہ ہوا جا رہا ہے۔" عبدالمبین اس کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر بیزاری سے بولا۔

"اماں جی! وہ جھومر نہیں تھی ماسٹر صاحب کی مہمان چھوکری جھومر۔ جو کئی دنوں سے اپنی ماں کے ساتھ ادھر

تھی۔" اس نے عبدالمبین کی پھنکار پر کوئی توجہ نہیں دی۔

جھومر کے ذکر پر زینب بھی سر اٹھا کر جلیل کو دیکھنے لگی' اماں بی کی شلوار میں ازاربند ڈالتی آمنہ بھی رک گئی۔

"ہاں ہاں بول آگے' وہ جو ماسٹر کی بھانجی تھی پشاور سے آئی تھی' بڑی سوہنی بچی ہے بہت خوبصورت۔ کیا ہوا اسے؟" اماں جی نے اس کی پریشان صورت دیکھ کر چاولوں کے دیگچے پر ڈھکن رکھ دیا۔

"وہ گھر سے بھاگ گئی ہے جی' آج صبح ہی پتا چلا شاید کل رات کو شاید آدھی رات کو۔ وہ حویلی میں منشی ہے نا اس کا بیٹا سلیم' اس کے ساتھ۔ دوپہر تک گھر والے چپکے چپکے اسے ڈھونڈتے رہے' اب جب سلیم کے بھی غائب ہونے کا پتا چلا تو انہیں یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ جھومر سلیم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ کئی دنوں سے گاؤں کے لوگ اسے سلیم کے ساتھ آتے جاتے دیکھ رہے تھے۔ حویلی کے باہر لوگ اکٹھے ہوئے ہیں' سب یہی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔ اماں جی ایک پل کو چپ ہی ہو گئیں' خبر ہی ایسی تھی۔

"وہ تو جی بہت خراب لڑکی تھی سب کہتے ہیں اس کا......" ان کی چپ کی شہ پا کر جلیل چٹخارے لے کر باقی کوائف بیان کرنے لگا۔

"جلیل! تم جاؤ ادھر سے۔" اماں بی نے ایک چور نظر سے زینب اور آمنہ کو دیکھ کر کہا۔ جو اس کو بڑی توجہ سے سن رہی تھیں۔ ویسے بھی اسے صوفی صاحب نے جبیں کا گھر کے اندر آنا منع کر دیا تھا مگر وہ ابھی تک کوشش کے باوجود ان کے حکم کی مکمل تعمیل نہیں کر پاتا تھا۔ روانی میں پہلے کی طرح منہ اٹھائے گھر کے اندر چلا آتا۔

"اس کی آج کل میں صوفی صاحب کے ہاتھوں مرمت ہو گی پھر اس کے بھیجے میں یہ بات آئے گی۔" اماں جی نے اسے دیکھ کر سوچا۔

"اچھا جی ٹھیک ہے۔" وہ ست قدموں سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

ڈیوڑھی سے اندر جاتے صوفی صاحب مل گئے۔ جلیل کو اندر سے آتے دیکھ کر ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تم اندر کیوں آئے تھے؟" وہ گرجے تو جلیل کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے خبر سنانے کے جوش میں وہ ان کا حکم تو بھول ہی چکا تھا۔

"وہ جی میں۔ وہ میں تو......" وہ کھڑے کھڑے گھگھیانے لگا۔

"گدھے تیرے بھیجے میں دماغ نہیں ہے جب ایک بار کہہ دیا کہ یوں اونٹ کی طرح منہ اٹھائے گھر میں نہ گھسا کر تو کیوں سمجھ میں نہیں آتا تمہیں۔" انہوں نے ایک زوردار ہاتھ اس کی گردن پر کھینچ مارا اور جلیل تڑپ کر دروازے سے لپٹ گیا۔

"معاف کر دیں صوفی صاحب! آئندہ نہیں آؤں گا۔" وہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پرے دھکیل کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"دفع ہو جاؤ اب تم مجھے ادھر کبھی نظر نہ آؤ۔" انہوں نے اسے دروازے سے باہر دھکیلا۔ وہ آنکھیں پونچھتا ہوا باہر چلا گیا۔

صوفی صاحب کی گرج سن کر زینب اور آمنہ فوراً "کمرے میں بھاگ گئی تھیں۔ وہ صحن میں آئے تو عبدالمبین بے نیازی سے بادام چھیل رہا تھا۔ انہوں نے ایک تنقید بھری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا۔

"ہوں۔" انہوں نے ہنکارا ابھرا۔

"لاؤ عبدالمبین! بادام مجھے دے دو' میں چاولوں کو دم لگا رہی ہوں۔" ان کی آواز پر عبدالمبین سعادت مندی سے باداموں کی پلیٹ لے کر ان کے پاس آ گیا۔

"پک گئے چاول؟" صوفی صاحب برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"جی بس دم پر ہیں دس پندرہ منٹوں میں تیار ہوتے ہیں۔"

"معاذ جانے کو تیار بیٹھا ہے اسے شہر کے لیے بس پکڑنی ہے۔ دیر نہ ہو جائے اسے۔ بچے کو ابھی شہر جا کر اپنا

کوئی ٹھکانہ بھی کرنا ہے۔"

"معاذ سے اتنی لگاوٹ اتنی محبت!" عبدالمبین نے تنفر سے باپ کو دیکھا۔

"سنا تم نے کچھ۔" صوفی صاحب کچھ دیر بعد اماں جی سے بولے۔

"کیا؟" وہ پوری طرح متوجہ تھیں۔

"وہ ماسٹر صاحب کی مہمان لڑکی۔ میں کیا کہتا تھا ایسی لڑکیاں ٹھیک نہیں ہوتیں جو رستے کے بیچ میں چلیں۔ بھاگ گئی ہے منشی کے لڑکے سلیم کے ساتھ۔ حالانکہ وہ منشی قسمیں کھا رہا ہے اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس کی قسموں کو کس نے سننا ہے۔ اسی لیے میں منع کرتا تھا کہ جب تک وہ نابنجار لڑکی ادھر ہے زینب اور آمنہ کو ادھر نہ بھیجو۔ ایسیوں کی صحبت سے بھی اللہ بچائے۔" انہوں نے اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیا۔

"کب جاتی تھیں وہ مہینے بھر سے جانا چھوڑ رکھا ہے۔" رابعہ [illegible] کر بولیں۔

"میں نے تو کہہ دیا شاہ جی سے کہ اگر وہ مل جائے تو اسے سرعام سنگسار کیا جائے تاکہ گاؤں میں پھر کسی لڑکی کو ایسی گندی حرکت کرنے کی جرات نہ ہو۔ وہ ہمارے گاؤں کی نہیں تھی صد شکر ہے وہ علاقہ غیر سے آئی تھی ورنہ ہمارے گاؤں کی کس قدر بدنامی ہوتی۔ بہرحال سلیم نے ایک گھٹیا حرکت کی حالانکہ ایسا لگتا نہیں تھا وہ اگر وہ گرفت میں آگیا تو اسے بھی سنگسار ہی کیا جائے گا یہ میرا اور شاہ جی کا فیصلہ ہے۔ جو گاؤں کے لوگوں کے سامنے کیا گیا اور کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا سنا ہے اس لڑکی کے ماں باپ واپسی کا سامان باندھ رہے ہیں۔ ایسی اولادیں والدین کا بھی منہ کالا کر دیتی ہیں۔ ایسی بدبخت اولاد تو پیدا ہوتے ہی مار دی جائے جو جوان ہو کر ماں باپ کو بے شرمی کا زہر دے۔" وہ غصے سے بول رہے تھے۔ عبدالمبین باریک لکڑی کی نوک سے راکھ میں لکیریں کھینچ رہا تھا۔

"تم بھی تیار ہو جاؤ شام کو حویلی چلنا ہے سب نے۔ تمہیں یہاں [illegible] کے لیے نہیں بلایا میں نے شاہ جی آج بھی دونوں کا پوچھ رہے تھے۔ وہ ناخلف تو آیا نہیں میری تاکید کے باوجود۔" "انہیں [illegible] عبدالمبین پر غصہ آگیا۔

"اب تم بھی جلدی سے فارغ ہو جاؤ اور لڑکیوں کو تیار کر کے حویلی لے جاؤ۔ شاہوں کے مزاج کا کچھ پتا نہیں چلتا کب بگڑ جائے۔ میں دیکھتا ہوں جلیل کو آکر چاول لے جائے معاذ کے لیے۔ اسے رخصت کر کے میں تو پھر حویلی ہی چلا جاؤں گا سیدھا۔ تم لوگ بھی جلد آنے کی کوشش کرنا۔" وہ اٹھ کر حجرے کی طرف بڑھے تو معاذ دروازے سے ہٹ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

وہ اندر آکر اس کا احوال پوچھنے لگے۔

تھوڑی دیر میں جلیل چاول لے کر آگیا۔ وہ خاموشی سے چاول کھانے لگا۔ صوفی صاحب نے بھی تھوڑے سے پلیٹ میں نکالے۔

چاول کھاتے ہی وہ رخصت لینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"جلیل تمہیں شہر جانے والی سڑک تک چھوڑ آئے گا، ساتھ خیریت کے پہنچو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ عبدالمتین کا خط اور پتا میں نے تمہیں دے دیا ہے جا کر اس سے مل لینا وہ تمہاری مدد کرے گا اگر دل چاہے تو کبھی کبھار خط لکھ لیا کرنا یا آنا چاہو تو ملنے آجانا۔"

وہ اسے محبت سے رخصت کرتے ہوئے بولے۔ وہ ان سے گلے مل کر مصافحہ کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ جلیل دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے سامان کا تھیلا لے کر آگے چلنے لگا۔

معاذ نے ایک الوداعی نظر دروازے میں کھڑے صوفی صاحب کے بارعب سراپے پر ڈالی اور ہاتھ ہلا کر جلیل کے پیچھے چل پڑا۔

"رابعہ بی بی! میں جا رہا ہوں حویلی، تم لڑکیوں کو لے کر جلدی پہنچو اس صاحبزادے کو لے کر بھی۔" انہوں نے

حجرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا اور باہر نکل آئے۔

"دیکھا! بابا صاحب کو ڈانٹ کر گئے ہیں۔ آمنہ جلدی کرو استری، مجھے ابھی نہانے بھی جانا ہے اتنا ٹائم ہو گیا۔ وہاں کیا کیا مزے ہو رہے ہوں گے۔ جھومر کی ساری خبر تو ادھر ہی ملے گی۔" زینب صوفی صاحب کی آواز سن کر بے قراری سے بولی۔

"تم تو پاگل ہو جتنی تم شادی میں جانے کے لیے بے قرار ہو رہی ہو۔ کیا پتا وہاں اتنا مزہ نہ ہی آئے۔" آمنہ نے کپڑے استری کر کے اسے پکڑائے۔ "اور بے چاری جھومر کی کیا [illegible] ملے گی، کسی کو اس کے بارے میں کیا پتا؟"

"میں نے بھی تو اسے سلیم کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس روز تو اس کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا مجھ سے تو سیدھے منہ بات ہی نہیں کی ایسی مغرور ہو رہی تھی وہ۔ مجھے کیا پتا تھا اندر سے اس کا یہ چکر ہے۔" زینب اس دن سے جھومر سے خار کھائے بیٹھی تھی۔

"کیا پتا وہ نہ بھاگی ہو، صرف اپنے باپ کے ادھر سے جانے کی منتظر ہو۔ وہ بھی تو اس کا رشتہ زبردستی اس ٹرک ڈرائیور سے کر رہا تھا۔" آمنہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے۔ ایسے کاموں میں اس کا دماغ خوب کام کرتا تھا، کیا پتا اس نے باپ سے چھٹکارے کے لیے یہ راہ نکالی ہو۔" زینب بھی اس کی ہم خیال ہو کر بولی۔

"اچھا تم جاؤ اور جلدی نہا کر نکلو پھر مجھے بھی نہانا ہے۔ باقی باتیں بعد میں کر لینا۔ تمہیں بابا صاحب کا پتا ہے نا دیر ہو گئی تو خفا ہوں گے۔" آمنہ حسب عادت بولی۔

"ایک تو بابا صاحب کا ڈر ہر دم تمہارے سر پر سوار رہتا ہے۔ جا رہی ہوں میں۔ بابا صاحب کے ڈر سے سکون سے نہانے بھی نہ دینا پہلے ہی بارش کی وجہ سے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کپڑے لے کر باہر نکل گئی۔

"لو یہ جوڑا تو ادھر ہی رہ گیا اس لڑکے معاذ کا۔" آمنہ کی نظر کرسی پر پڑے معاذ کے استری شدہ جوڑے پر پڑی جو اس رات کیچڑ میں لت پت تھا۔ اماں جی نے دھو کر آج ہی اسے استری کے لیے دیا تھا۔

"وہ نہیں چلا ہی نہ گیا ہو۔" وہ سوٹ اٹھا کر حجرے کی طرف بڑھ گئی اندر مکمل خاموشی تھی۔

"بابا صاحب!" اس نے مدھم سی آواز دی کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دروازے کی جھری سے دیکھا حجرہ بالکل خالی تھا وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آگئی کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

"وہ، وہ کہیں چلا تو نہیں گیا اس کا جوڑا۔" اس نے ہاتھ میں کپڑے استری کیے ہوئے تہہ شدہ جوڑے کو دیکھا اسی وقت حجرے کا بیرونی دروازہ کھول کر مدرسے کا ایک ساتھ آٹھ سالہ طالب علم اندر آیا اسے کھڑے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"بنا صاد ادھر جو مہمان لڑکا ٹھہرا تھا بابا صاحب کا، وہ باہر تو نہیں ہے؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"نہیں باجی جی! وہ تو چلے گئے ہیں ابھی جلیل بھائی کے ساتھ وہ انہیں شہر کی بس میں بٹھانے گئے ہیں۔" وہ جواب دے کر واپس مڑ گیا۔

"بے چارے کا جوڑا بیچ بیچ۔" وہ افسوس کرتے ہوئے واپس مڑنے لگی کہ اس کی نظر سرہانے کے نیچے پڑی کسی چمکتی چیز پر پڑی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے آگے بڑھ کر سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈال کر دیکھا وہ معاذ کا گولڈ میڈل تھا۔ چاول کھانے سے پہلے تک وہ اسے حفاظت سے اپنے تکیے کے نیچے رکھے بیٹھا تھا کہ جاتے وقت جیب میں ڈال لے گا۔

"یہ تو گولڈ میڈل ہے شاید وہی جو بابا صاحب کہتے تھے اسے میٹرک میں فرسٹ پوزیشن لینے پر ملا تھا۔ وہ یہ بھی ادھر ہی بھول گیا۔" میڈل ہاتھ میں پکڑے اسے ایک اور افسوس نے آن گھیرا۔

"آمنہ آمنہ کہاں ہو تم؟" اسے حجرے کے باہر عبدالمتین کی آواز سنائی دی۔

"اگر اس نے دیکھ لیا تو یونہی لے لے گا مجھ سے۔ اس غریب کی دس سالوں کی محنت کا اعزاز اسے لینے تو وہ دوبارہ

ادھر ضرور آئے گا۔" اس نے میڈل کپڑوں میں چھپالیا اور باہر نکل آئی عبدالمبین اسے آوازیں دیتا ہوا اماں جی کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"یہ میں بابا صاحب کو دے دوں گی وہ خود ہی سنبھال کر رکھ لیں گے مگر آج رات تو بابا صاحب شاید ہی حویلی سے واپس آئیں چلو کل سہی۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی اور کمرے میں رکھے اٹیچی کی طرف بڑھی۔ اس کا لاک کھول کر میڈل بڑی احتیاط سے نچلے کپڑوں کی تہہ میں رکھ دیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کا بھلا شہر میں کون تھا۔ "سائبان" جانے کی اب کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ وہاں تو اب کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں۔ جو چلا گیا سو چلا گیا۔ وہ صوفی صاحب کے دیے ہوئے ایڈریس پر عبدالمتین کے ہاسٹل پہنچا شام ڈھل چکی تھی جب وہ اسٹیشن پر بس سے اترا تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

"کوشش کے باوجود بہت دیر ہو گئی' اب اللہ کرے کہیں رہنے کا ٹھکانہ مل جائے۔" اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سوچا۔

وہ پوچھتے پوچھتے عبدالمتین کے کمرے تک جا ہی پہنچا۔ دروازے پر دستک دی تو ایک لمبا تڑنگا داڑھی مونچھ سے بے نیاز بیس بائیس سال کا لڑکا بلیک شرٹ اور بلیو ٹراؤزر میں باہر نکلا اس کے ہاتھ میں کتاب تھی شاید پڑھ رہا تھا اس نے معاذ کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"جی فرماؤ کس سے ملنا ہے جناب کو۔" عجیب طنزیہ سا لہجہ تھا۔

"جی مجھے عبدالمتین سے ملنا ہے صوفی صاحب کا بیٹا۔ صوفی عبدالرحمان کا جو احمد پور شرقیہ میں رہتے ہیں۔"

"اوہ!" اس نے ہونٹ سکیڑے۔

"کیا کام ہے تمہیں اس سے۔" اب کے اس نے معاذ کا سر سے پاؤں تک بغور جائزہ لیا۔

"مجھے ان تک صوفی صاحب کا خط پہنچانا ہے اور...." وہ جھجک گیا۔ "ایک کام بھی ہے ان سے۔"

"خط مجھے دے جاؤ۔"

"وہ خود کہاں ہیں؟" اس نے ذرا سا آگے ہو کر کمرے کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

"اصل میں عبدالمتین ایک ہفتہ ہوا یہ ہاسٹل چھوڑ گیا ہے۔ اس کے ہاسٹل کے ڈیوز (واجبات) بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ جو وہ کلیئر نہیں کر پا رہا تھا اس لیے اس نے ہاسٹل چھوڑ دیا۔" لڑکا ابھی تک دروازے میں ڈٹا کھڑا تھا۔

"مم مگر مجھے تو سب نے یہی بتایا ہے کہ عبدالمتین یہاں ہی ہے یہ اس کا کمرہ ہے۔" اس پر جیسے ناامیدی کا بم آن پھٹا۔

"ہاں وارڈن صاحب کے اندراج میں تو وہ ابھی یہاں ہی ہے مگر حقیقت میں اس نے ایک ہفتہ پہلے یہ ہاسٹل چھوڑ دیا تھا وہ تین دن چپکے چپکے اپنا سامان لے جاتا رہا۔ مجھے بھی پتا نہیں چل سکا اور پھر اچانک غائب ہو گیا۔ اپنا کوئی پتا پیغام چھوڑے بغیر اس کے والد صاحب اب اسے پیسے جو نہیں بھیجتے تھے۔ وہ بے چارہ کہاں سے ہاسٹل کے ڈیوز کلیئر کرتا۔" لڑکے کا لہجہ عبدالمتین کے لیے ہمدردانہ تھا۔

"اوہ!" معاذ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"ان کا کوئی اتا پتا؟" اس نے شاپر پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

"بتایا نا وہ کسی سے مل کر نہیں گیا' اگر خط دے کر جانا ہے تو دے جاؤ ورنہ جاؤ یہاں سے اب۔ مجھے پڑھنا ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"نہیں خط تو میں انہیں ہی دوں گا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"جاؤ پھر یہاں سے میرا ٹائم کیوں برباد کیا فضول میں۔" اس نے تنگ مزاجی سے کہا اور مڑ کر دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

اب معاذ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ اس کا تو شہر میں کوئی واقف کار بھی نہیں تھا۔ وہ افسردہ سا ہاسٹل سے نکل کر فٹ پاتھ پر سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کافی دیر چلتے چلتے تھک گیا تو ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ پارک میں بھی اس وقت مچھروں کی یلغار نے عاجز کر دیا۔ بمشکل وہاں آدھا گھنٹہ بیٹھ سکا۔ ٹھکانے کی پریشانی نے بھوک پیاس بھی ختم کر دی تھی۔

"کسی ہوٹل کا پتا کرتا ہوں' دو چار دن کی بات تو ہے۔" وہ سوچنے لگا۔ سستے ہوٹل تو ادھر اسٹیشن کے پاس تھے اب شہر میں ہوٹل کہاں ہیں اسے کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے ہاسٹل سے نکلنے سے پہلے ہاسٹل کے ایک کمرے کا کرایہ پوچھا تھا جو اس کی پہنچ سے بہت دور تھا اس لیے چپ چاپ باہر نکل آیا۔

چلتے چلتے وہ کسی پوش ایریا میں نکل آیا تھا۔ خوبصورت پر شکوہ بڑی بڑی کشادہ کوٹھیاں جن کے دیو ہیکل گیٹ بند کھڑے تھے۔ وہ دور کھڑا ان کوٹھیوں کو دیکھنے لگا۔

"کتنے خوش قسمت ہیں ان گھروں میں رہنے والے' ایک فرد کے پاس کتنے کتنے کمرے ہوں گے کئی کئی فٹ جگہ اور مجھ جیسے جنہیں ٹھکانے کے لیے دو فٹ جگہ بھی نصیب نہیں۔" اس سے پہلے کہ فرسٹریشن پوری طرح اس پر حملہ کرتی اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔

"گلزار ولا" بے حد خوبصورت ماربلڈ کوٹھی تھی' جس کا نقشہ دوسری کوٹھیوں سے مختلف بھی تھا اور بے حد پرکشش بھی۔ اس نے یونہی گیٹ کے اندر جھانکا دور تک جاتی بجری کی سڑک کے اختتام پر پورچ میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں پورچ میں جلتی لائٹس نے گیٹ تک کو روشن کر رکھا تھا۔

"اوئے کیا بات ہے؟" اندر سے چوکیدار کی گرجدار آواز پر وہ اچھل ہی پڑا۔

"چور اچکے شام ہوتے ہی نکل پڑتے ہیں۔ ٹھہر تو جا کرتا ہوں میں تجھے پولیس کے حوالے۔" وہ کرخت آواز اور خوفناک شکل والا چوکیدار گیٹ کھول کر اس کو پکڑنے کے لیے لپکا۔ معاذ نے دوڑ لگا دی' وہ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی گن بھی تھی اور وہ مستقل چلاتا ہوا آ رہا تھا۔

"موقع کی تلاش میں تھا کہ دیکھوں کوئی ہے کہ نہیں' میں ہاتھ کی صفائی دکھا جاؤں ٹھہر تو سہی تو ذرا چور۔" وہ مسلسل اس کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ معاذ نے اپنی اسپیڈ بڑھا دی۔ آگے موڑ آ گیا وہ جونہی تیز رفتاری سے مڑنے لگا۔ دوسری طرف سے آتی کسی تیز رفتار گاڑی نے اسے اس زور کی ٹکر ماری کہ وہ گاڑی سے بری طرح ٹکرا کر کئی فٹ دور جا گرا۔ ایکسیڈنٹ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ اگلے ہی پل اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"دیکھو نزہت! اب تو پھپھو بھی چلی گئی ہیں' تمہیں ان سے جھجک تھی نا' اب تو کوئی بہانہ نہیں۔ ابو جان کو آج مہینہ ہونے کو ہے ان کا سوگ تو اپنی جگہ رہے گا اسی طرح مہینے گزرتے چلے جائیں گے۔ ہم وقت کو روک تو نہیں سکتے۔ اس کا تو کام ہی بھاگنا ہے اور عقل مند وہی ہے جو وقت کی رفتار کو پہچانے۔" ریشم اسے آج پھر گھیر کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ ناشتے کی ٹیبل پر ابھی چائے پی کر فارغ ہی ہوئی تھیں۔ سہیل بینک جا چکا تھا' مسز خان شہباز کے ساتھ کل شام کو لاہور واپس جا چکی تھیں دس روز بعد آنے کے لیے۔

"اور تم تو بہت سمجھدار بہت اچھی لڑکی ہو۔ خود سوچو یہ ہماری عزت کا معاملہ نہیں' تمہارے بھائی کی جسے اب دنیا داری نبھانی ہے۔ آخر لوگوں کے منہ بند کرنے کے لیے کچھ تو دیں گے نا۔ ورنہ لوگ کہیں گے ماں باپ تو تھے نہیں سر پر۔ بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ چلو میں تو غیر ہوں۔ میرا تم بے شک خیال نہ کرو مگر اپنے بھائی کے بارے میں ضرور سوچو۔ تم سے کچھ نہیں کہتے مگر سوچ سوچ کر اپنا دماغ خراب کر لیتے ہیں۔ اتنی بری عادت ہے سہیل کی میں کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں کہ آپ ہی نزہت سے... کہیں وہ میرے ساتھ بازار چلے اور کچھ نہیں عروسی

جوڑا تو خریدنا ہی ہے نا مگر ان کی ایک چپ۔ ریشم! میں کیسے کہوں اس سے 'اسے ابو جان کا بہت غم ہے دوسرے وہ مجھ سے خفا خفا سی رہتی ہے اور میں کسی بھی طرح اسے منانے سے قاصر ہوں۔"

ریشم اپنے پاس سے کہانی گھڑ کر بولی اور نزہت کو بھی اس کی کہانی پر ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا۔ سہیل ایسا کم گو کبھی بھی نہیں تھا جتنا ریشم اسے بتا رہی تھی اور نزہت کے بارے میں سوچنا اس نے مدت ہوئی چھوڑ دیا تھا۔ جب اس نے بھی ابو جان کے ساتھ ریشم سے اس کی شادی کی مخالفت کی تھی۔

"تم مجھے بتاؤ" آخر بازار جانے میں کیا حرج ہے محض ایک دن کے لیے۔

"کوئی حرج نہیں۔" وہ کپ کے کناروں سے کھیلتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔

"تو چلو اٹھو پھر تیار ہو جاؤ۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے لگیں گے۔ سہیل سے میں پیسے لے چکی ہوں۔" وہ خود ہی بولتی جا رہی تھی۔

"کوئی ضروری ہے کیا؟" اس نے شکست خوردگی سے سر اٹھا کر سر پر کھڑی ریشم کو دیکھ کر پوچھا۔

"بالکل ضروری ہے۔ اب وقت ضائع نہیں کرو چلو اور چل کر تیار ہو جاؤ میں بھی تیار ہوتی ہوں جا کر سہیل کو بتا دوں کہ ہم جا رہے ہیں کہیں پیچھے سے فون کھڑکاتے رہیں کلثوم بھی ابھی نہیں آئی کام پر۔" ریشم جلدی جلدی چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی برتن رکھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو نزہت کو بھی بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔

وہ کمرے میں جا کر بے دلی سے تیار ہونے لگی تیار ہو کر وہ بیڈ پر گم صم سی بیٹھ گئی۔

"راحیلہ کو فون کرتی ہوں۔" وہ اٹھ کر ایکسٹینشن کی طرف بڑھی۔

"اچھا اوکے خدا حافظ۔" دوسری طرف ریشم شاید سہیل کو فون کر رہی تھی اس نے الوداعی جملہ کہہ کر فون رکھا تو نزہت راحیلہ کا نمبر ملانے لگی۔ فون راحیلہ نے ہی اٹینڈ کیا۔

"میں تو تمہاری طرف ہی آ رہی تھی۔" راحیلہ بولی۔

"ابھی نہ آؤ شام میں آجانا۔" اس نے منع کر دیا۔

"تو اس میں اس قدر بیزار ہونے کی کیا بات ہے اچھی بات ہے ان کو تمہارا خیال تو آیا یہ بتاؤ ویسے بازار کس سلسلے میں جا رہی ہو۔"

"شادی کی تیاری کے سلسلے میں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"نزہت! خوش باش جاؤ دیکھو غم خوشی اس زندگی کے ساتھ جڑے ہیں 'انکل کی زندگی میں یہ خوشی نہیں تھی مگر ان کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ اب ان کی خواہش ان کے بعد پوری ہو رہی ہے تو ان کی خاطر اپنے دل کو شاد کر لو یوں آزردہ خاطر رہ کر تم ان کی روح کو تکلیف دے رہی ہو۔" راحیلہ نے اسے سمجھایا۔

"راحیلہ! پتا نہیں کیا بات ہے کسی بھی بات سے میرا دل خوش نہیں ہوتا۔ پتا نہیں کیوں دل کو دھڑکا سا لگا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے ابھی کچھ ہونے والا ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل ہی آئے۔

اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑا کہ ریشم ابھی ادھر آجائے گی تو اس کے آنسو دیکھ کر پھر بے کار کی نگاوٹ دکھائے گی۔ جس سے اسے الجھن ہوتی تھی۔

"تمہارا وہم ہے سب مائی ڈیئر! ایسا کیا ہو [illegible] ... کے خوش ہونے کے دن آ رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو بس چند دن اور۔ ہمارے دولہا بھائی کی سناؤ خوش خوش تو گئے ہیں نا۔ ملاقات ہوئی؟" وہ شوخ لہجے میں اسے چھیڑنے لگی۔

"فضول باتیں نہ کیا کرو' وہ پھپھو جان کو لینے آئے تھے۔" اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تو بھئی [illegible] میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے تم ان کی منکوحہ ہو۔ خیر تم اب بازار جاؤ میں شام میں چکر

لگاؤں گی۔ اچھی اچھی شاپنگ کرنا شام کو آکر دیکھوں گی اور دیکھو اب بالکل اداس نہیں ہونا تمہیں میری قسم۔"

"اوکے اوکے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"چلو نا نزہت دیر ہو رہی ہے۔" ریشم اس کے کمرے میں آکر بولی۔ وہ پیرٹ کلر کے جارجٹ کے سوٹ میں ملبوس تھی۔

"اچھا راحیلہ! میں جا رہی ہوں تم شام کو ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گی خدا حافظ۔" ریشم نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"ریڈی۔" وہ نزہت سے بڑی محبت سے بولی۔

"ہوں چلیں۔" فون رکھ کر اس نے الماری سے اپنی چادر نکال کر اوڑھی اور ریشم کے پیچھے نکل آئی۔

"پہلے کہاں جائیں۔" وہ احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے بولی۔

"جہاں مرضی لے جائیں۔" اس نے سب کچھ ریشم پر چھوڑ دیا۔

"تم بہت سادہ ہو نزہت!" ریشم نے مسکرا کر کہا۔

"اس میں سادگی کی کیا بات ہے۔" نزہت کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پھر ریشم نے گاڑی سپر مارکیٹ کے آگے جا کر ہی پارک کی گاڑی لاک کر کے دونوں مارکیٹ کے اندر چلی آئیں۔

"پہلے چار پانچ زبردست قسم کے ڈریسز دیکھتے ہیں پھر میک اپ اور جوتے۔ اس کے بعد اگر ٹائم بچا تو جو تم کہو گی وہ خرید لیں گے۔ اصل میں ان چیزوں میں تمہاری پسند شامل ہونا ضروری ہے۔ باقی تو کوئی بھی خرید کرا سکتا ہے۔" وہ دکانوں کے آگے سے گزرتے ہوئے بولی نزہت نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر وہ ایک بہت بڑے بوتیک میں داخل ہوئیں جہاں بالوں کی وگ سے لے کر مصنوعی ناخن تک دستیاب تھے۔ وہ نئے ڈریسز کی طرف آ گئیں۔ انہوں نے تین سوٹ پسند کیے ایک رسٹ کلر کا نازک کام والا سوٹ دوسرا چیری کا اور تیسرا فیٹ کا۔

"کیا خیال ہے اب لہنگا نہ دیکھ لیں۔" بوتیک سے باہر نکل کر ریشم بولی۔

"ہوں۔" وہ سر اٹھا کر بڑی بڑی جگمگاتی شاپس کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایک سے ایک اعلا اور خوبصورت ڈیزائن والا سوٹ ہینگ کیا گیا تھا۔

"اب اتنی جلدی بندہ کیا پسند کرے اور کیا نہ کرے 'اتنے دنوں سے کہہ رہی تھی مگر تم بات مانتی بھی تو نہیں ہو۔ اب دو تین گھنٹوں میں بھلا کیا کیا خریدیں گے۔" ریشم بولتی جا رہی تھی۔

شروع میں جب ریشم ان کے گھر آئی تو کئی دن تک وہ اس سے ایک لفظ تک نہ بولی تھی اور نزہت اسے دیکھ کر سوچتی کہ شاید یہ مغرور حسینہ زبان نہیں رکھتی اور اب؟ اس نے گہرا سانس لیا۔

"بھئی کدھر گم ہو۔ دیکھو نا یہ والا سوٹ۔" ریشم نے جھنجھلا کر اسے گولڈن خوبصورت دبکے اور موتیوں کے کام والے لہنگے کی طرف متوجہ کیا۔ جو روشنیوں میں اور بھی جگمگا رہا تھا۔

"اچھا ہے۔" اس نے ذرا سا لہنگے کو چھو کر کہا۔

"کچھ خاص نہیں۔" ریشم نے ناک چڑھائی پھر دکاندار ایک کے بعد ایک اعلا سے اعلا روایتی لہنگا دکھاتا چلا گیا مگر ریشم کو کوئی پسند نہیں آ رہا تھا۔

"جلدی بھی کریں ہمیں یہاں بیٹھے گھنٹہ ہو گیا ہے۔" نزہت نے اکتا کر ریشم سے کہا تو اس نے بادل نخواستہ کافی کلر کا سوٹ پسند کر ہی لیا۔

"توبہ یہ بھی ایک معرکہ تھا۔" لہنگا خرید کر وہ باہر نکلیں تو ریشم نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"اب کاسمیٹکس کی طرف چلتے ہیں۔" وہ خود ہی فیصلے کیے جا رہی تھی۔ نزہت اس کے ساتھ چل پڑی کاسمیٹکس کا سامان نکلواتے انہیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ جب وہ دکان سے باہر نکلیں تو نزہت بری طرح تھک چکی

تھی۔ ایک تو اتنے عرصہ بعد شاپنگ کے لیے نکلی تھی پھر وہ بھی اتنی لمبی چوڑی شاپنگ۔ تھکن اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

"تھک گئی ہو؟" ریشم نے باہر نکلتے ہی بڑے پیار سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوہ مجھے یاد آیا یہاں نزدیک ہی بالکل مارکیٹ کی بیک سائیڈ پر عارفہ آنٹی کا گھر ہے۔ وہ جو اس دن آئی تھیں نا' ابو جان کا افسوس کرنے۔ چلو ان کی طرف چلتے ہیں۔ کچھ کھائیں پئیں گے اور تھوڑی تھکن اتاریں گے۔" ریشم نے تجویز پیش کی۔

"نہیں نہیں' دیر ہو جائے گی بس' اب گھر چلتے ہیں۔" نزہت نے فوراً انکار کر دیا۔

"بھئی نہیں دیر ہوتی ابھی تو ہمیں آئے صرف تین گھنٹے ہوئے ہیں ہمیں سہیل کو شام چار بجے تک کہہ کر آئی ہوں اور ابھی تو صرف دو بجے ہیں۔ ہم چار بجے سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم چلو تو۔" پھر اس نے نزہت کی ایک نہ سنی اور تھرڈ فلور پر موجود عارفہ آنٹی کے فلیٹ کے آگے پہنچ کر ہی دم لیا۔

بیل بجانے پر بارہ تیرہ سال کے لڑکے نے دروازہ کھولا۔

"آنٹی ہیں گھر میں۔" ریشم نے پوچھا۔

"جی بیگم صاحبہ ہیں۔" لڑکا پیچھے ہٹ گیا تو دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ عارفہ سامنے لاؤنج ہی میں بیٹھی تھی' ان کو دیکھ کر کھل اٹھی۔

"ویلکم ویلکم مائی چائلڈ! ریشو آئی ہے۔" وہ اٹھ کر ریشم سے گلے ملنے لگی۔

"آنٹی! یہ نزہت! ملی تھیں نا آپ اس سے۔" اس نے تعارف کرایا تو عارفہ نے اسے پیار سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"یاد ہے مجھے' میں اسے بھول سکتی ہوں' اتنی پیاری بچی کو۔" وہ محبت سے بولی۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"آج کہاں رستہ بھول پڑیں۔" عارفہ نے شکوہ کیا۔

"شاپنگ کے لیے نکلے تھے بس تھکاوٹ ہو گئی تو سوچا آپ کے گھر کچھ ایزی ہو جائیں۔"

اسی وقت وہی لڑکا ٹرے میں مینگو اسکواش کے دو گلاس رکھ کر لے آیا۔

"ہائے آنٹی! یہ کیوں تکلف کیا آپ نے ہمیں تو بھوک لگی تھی۔" ریشم بے تکلفی سے بولی۔

"کھانا بھی تیار ہے پہلے پیاس تو بجھا لو۔" وہ دونوں گھونٹ گھونٹ اسکواش پینے لگیں۔ نزہت کو تو ویسے بھی بہت پیاس لگ رہی تھی اس نے فوراً ہی گلاس خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیا۔ عارفہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"آنٹی فرنیچر نیا لیا ہے۔" ریشم نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

نزہت کو ایک دم سے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے زور سے آنکھیں جھپکیں۔ سامنے وال کلاک پر جہاں ابھی شاید دو بج رہے تھے۔ اب بارہ بج کر دس منٹ ہو گئے تھے۔ اس نے خود پر کنٹرول کر کے ریشم کی طرف دیکھا وہ کرسی پر بیٹھی جھول رہی تھی۔ اسے لگا اس کا صوفہ بھی گول گول گھومنے لگا ہے' تیز تیز' اور تیز گول چکر میں۔

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ریشم۔ مجھے کیا۔" اگلے ہی پل وہ صوفے پر گر گئی۔

ریشم نے ایک اطمینان بھری نظر اس پر ڈالی اور ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹرے میں رکھا۔ اپنے ہینڈ بیگ کی سائیڈ پاکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا' عارفہ نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا لائٹر اس کے سگریٹ کے پاس لے جا کر آن کیا۔ ایک شعلہ سا ایک پل کو لپکا۔

ریشم نے ایک لمبا کش لے کر ڈھیر سارا دھواں ناک کے راستے نکالا۔

"سب انتظام مکمل ہے نا۔" وہ عارفہ سے بولی۔

"بالکل سب کچھ تیار ہے صرف تمہارا ہی انتظار تھا۔" عارفہ نے ایک معنی خیز نگاہ بے خبر نزہت پر ڈالی۔

"ڈوز کا اثر کتنی دیر تک رہے گا۔" ریشم نے پوچھا۔

"تین گھنٹے تک۔" عارفہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"اور ہمارا کام تو دو گھنٹوں میں ختم ہو جائے گا۔"

"کام ایک دم پرفیکٹ ہونا چاہیے انڈر اسٹینڈ۔" ریشم صوفے سے ٹیک لگا کر سگریٹ پیتے ہوئے بولی تو عارفہ سر ہلا کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

• • • • • •

سرد مگر بے حد خوشگوار ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے نہر کے ارد گرد کھڑے چھوٹے چھوٹے پودے جھوم جھوم کر لہرا رہے تھے اور جو اونچے اونچے قد آور درخت تھے۔ ہوا کی وجہ سے ان کے پتے ایک دوسرے سے مل کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوا شاخوں میں سے گزرتی تو شاں شاں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ آسمان کہیں سے نیلا کہیں سے سرمئی اور کہیں سے تیز سلیٹی رنگ کا ہو رہا تھا۔ ایسے جیسے ابھی بارش برسنے لگے گی حالانکہ بادل اتنے زیادہ نہیں تھے مگر موسم کا مزاج بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔ نہر کا پانی سبک خرامی سے بہت مدھم سروں میں بہہ رہا تھا بائیں طرف آگے ہی آگے۔ نہر کے کناروں سے آگے دور تک پھیلا سبزہ جیسے بارش میں نہایا ہوا تھا۔ کھلا کھلا سا سبز رنگ آنکھوں کو نئی زندگی بخش رہا تھا۔ نہر کے کنارے ننھے ننھے پودے دراصل پھولوں کے تھے۔ اس نے اب کے ذرا غور کیا۔ سرخ سفید اور پیلے گلاب کے پھول سب پودوں کے سبز پتوں سے جھانک رہے تھے بڑے بڑے کھلے ہوئے گلاب۔ گلاب ہی گلاب۔ اس کی نظر نہر کے دوسرے کنارے سے دور تک گئی۔ تاحد نظر گلاب کے پودے تھے اتنے پھول ایک ہی جگہ اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔ ان پھولوں کی خوشبو کا ایک پوری فضا میں پھیل گئی۔ سارا منظر ہی معطر ہو گیا۔ وہ پھولوں کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ کسی پرندے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو کونجوں کی ایک ڈار نہر کے پانیوں کے بالکل اوپر۔ بلکہ اس کے سر کے بے حد قریب نہر کے شفاف پانی میں ان کا عکس بالکل واضح تھا۔ کونجیں بے قراری سے نہر کے اوپر آگے پیچھے منڈلانے لگیں ان کے شور میں بھی اضطراب نمایاں تھا۔ سارا منظر ہی جیسے بے چین ہوا تھا اور چند لمحے کا سکون اس اضطراب میں کہیں کھو گیا۔

وہ بھی بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اچانک کونجیں غول کی صورت میں نہر کے پانی کے ساتھ اڑتی ہوئی دور چلی گئیں۔ نہر کے پانی کے اوپر بائیں طرف دور ہی دور۔ وہ ابھی کونجوں کو دور جاتے ہوئے دیکھ ہی رہی تھی کہ اسے ماحول میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے نہر سرک رہی ہے اپنی جگہ سے۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کونجوں کے تعاقب میں نہر بھی اپنا پانی اور گلاب کے پھولوں سے لدے پودے سمیٹ کر اسی سمت میں سرکتی ہوئی دور چلی گئی جدھر کونجیں گئی تھیں۔ اتنا حیران کن منظر اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا کہ نہر چند لمحوں میں اپنی جگہ سے غائب ہو جائے۔ اتنی بڑی پانی سے بھری نہر اور اب اس کی جگہ خشک بھوری مٹی کی زمین تھی۔ سارے پھول پودے درخت غائب ہو چکے تھے۔ فضا سے گلابوں کی خوشبو بھی غائب تھی حتیٰ کہ اونچے لمبے دیو قامت درخت بھی۔ اتنا جادوئی منظر کہ آسمان نے جونہی تپتے سورج کی شکل میں آگ برسانی شروع کی اس کی چیخ نکل گئی۔

"او جی یہ محترمہ تو بن ٹھن کر خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہیں۔ وہ بھی دن دیہاڑے۔ اماں جی! دیکھیں آکر آمنہ کی بچی کو۔ نیند سے اٹھی ہے اور وہ بھی کوئی خواب دیکھ کر...."

آمنہ نے ایک اجنبی نظر اپنے ارد گرد پر ڈالی۔ یہ تو ان کا کمرہ تھا۔ وہ مہندی کے فنکشن میں جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں کہ اچانک بارش بہت تیز ہو گئی۔ ہر طرف کالی رات چھا گئی۔ گھنے بادل آئے تھے اور خوب گرج گرج کر برس رہے تھے کہ ان کی گرج سن کر دل دہل رہا تھا تو اماں جی نے کہا۔

"ابھی بارش کا زور ٹوٹے گا تو پھر جائیں گے۔" گاؤں کے راستے کون سے پختہ تھے۔ کچی گلیوں سے گزر کر حویلی جانا تھا۔ سب طرف بے تحاشا کیچڑ ہو چکا تھا۔ وہ اندر کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔ پھر وہیں بستر

پر آڑی ترچھی ہو کر لیٹ گئی۔ زینب جلے پیر کی بلی کی طرح اندر باہر پھر رہی تھی۔ بارش پر خفا ہو رہی تھی۔ کبھی آمنہ سے مکالمے بول جاتی۔ کبھی باہر برآمدے میں اماں جی کے پاس چلی جاتی۔ پھر وہ باہر ہی ٹک کر بیٹھ گئی۔ آمنہ کھلی کھڑکی سے بارش کا نظارہ کرتے کرتے نہ جانے کب سو گئی۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا۔

"اور وہ خواب؟" اس نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کا جسم برف کی طرح یخ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ خواب اور حقیقت جیسے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس جادوئی منظر کو اس کا ذہن خواب تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے زینب کو دیکھے گئی جو بولتی ہوئی اندر آئی تھی۔

"بھئی آمنہ بی بی! تم تو خوابوں کی شہنشاہ ہو جب دل چاہا۔ بستر پر دراز ہوئے، پٹ سے آنکھیں بند کیں اور کھٹ سے خوابوں کی کیسٹ کا بٹن دبا دیا۔ لو جی لمبے لمبے طویل مزے دار پر بہار خواب جھٹ سے حاضر۔ نہ حقیقت کی چبھن نہ سچ کی کڑواہٹ۔ بس مزے ہی مزے وہ بھی مفت، پیسہ نہ دھیلا لگے اور مزہ بھی چوکھا آئے۔"

زینب دھپ سے اس کے قریب آ بیٹھی۔ وہ ابھی تک غائب دماغ بیٹھی تھی۔

"اے سوئی ہوئی ہو کہ جاگ رہی ہو؟" زینب نے اس کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ اس کے جھٹکے نے بچھو کی طرح آمنہ کے ہاتھ پر جیسے ڈنک مارا۔ سارا فسوں جیسے اڑنچھو ہو گیا۔

"جاؤ تم ادھر سے۔"

وہ اجنبی آواز میں بے رخی سے بولی۔ جی چاہ رہا تھا پھر سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جائے اور وہ اتنا عجیب خواب پھر سے ریوائنڈ کر کے دیکھے جس کا چند لمحے پہلے وہ حصہ تھی اور اب وہ کچھ بھی نہیں تھا اور یہ "کچھ بھی نہیں" کا خیال اسے پریشان کر گیا۔ وہ سب کیا تھا۔ اس نے پریشانی سے اپنی پیشانی مسلی۔

"اچھا تو کیا میرے جانے سے پھر سے تمہیں وہ خواب آ جائے گا۔ اور آمنہ بی بی! یہ دن کے خواب تو ہوتے ہی سراسر جھوٹے ہیں۔ وہ بھی بھری شام میں آنے والے خواب۔ سمجھیں سرکار۔" وہ خوب لطف لینے کو ہنسی۔

"کب تک ان خوابوں کے کھلونوں سے خود کو بہلاؤ گی۔ حقیقت کیا ہے۔ میں بتاؤں۔ تمہیں ان تمام خوابوں کی۔" زینب اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تم آمنہ بنت عبدالرحمان المعروف صوفی صاحب آف احمد پور شرقیہ کے ایک معمولی امام مسجد کی بیٹی ہو جن کی تم اکلوتی لخت جگر نہیں ہو۔ تمہارے علاوہ ان کے چار اور بھی جگر کے ٹکڑے ہیں جو انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ ان کا بس نہیں چلتا۔ وہ ان جگر کے ٹکڑوں کو واقعی ٹکڑوں میں بدل دیں کہ کوئی بھی ان میں سے فرشتہ نہیں بن سکا۔ سب کے سب گوشت پوست کے ڈھیروں ڈھیر خواہشیں رکھنے والے کمینے انسان بن گئے ہیں۔ جس کی انہیں توقع نہیں تھی اور اب اپنی خواہشوں کے خوبصورت محل کا ملبہ جب انہیں اپنی نافرمان گستاخ اولاد کی شکل میں نظر آتا ہے تو بابا صاحب کا خون کھولنے لگتا ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا۔ وہ ہم سب کو ایک مشین میں ڈال کر اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالیں اور کسی تنور میں جا کر بیک کر دیں۔ چچ چچ چچ۔"

وہ بغیر کسی ڈر خوف کے اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

"اس پر بے چاری ان کی صاحبزادی دن دیہاڑے آنکھیں موند کر حسین پھولوں اور کلیوں سے سجے سپنے دیکھتی ہیں۔ جن کی تعبیر ایک بھیانک اور بیچاری سی زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ڈیئر سسٹر! یوں خود کو دھوکا دینا چھوڑ دو۔ یہ حالات سے فرار کا کوئی بہترین یا قابل عمل طریقہ نہیں ہے۔ سمجھیں ہونہہ!"

وہ طنز بھرے لہجے میں ہنکارا بھرتی باہر نکل گئی۔ وہ اکثر یونہی مقابل کا جواب سنے بغیر اسے نظر انداز کر کے نکل جایا کرتی تھی۔

"کس قدر فضول ہے یہ زینب بھی۔ میں کیوں حالات سے فرار چاہوں گی بھلا۔ میں کوئی ناخوش ہوں اس کی طرح۔ بابا صاحب مجھے دل و جان سے پسند ہیں اگر وہ سخت ہیں تو ہماری بہتری کے لیے ہی سختی کرتے ہیں۔ وہ کوئی ہم پر ظلم تو نہیں کرتے اور خوابوں پر کس کا اختیار ہے۔" وہ ہاتھوں سے بال سنوارتی ہوئی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

"اگر خواب خود آئیں تو اس میں کسی کا کیا قصور، میں تو یونہی لیٹی تھی اور وہ خواب۔" وہ پھر سے اس خواب کو سوچتے ہوئے اس کے فسوں میں کھونے لگی۔ "کتنا رنگین، کتنا خوبصورت خواب تھا مگر پھر وہ سب کہاں چلے گئے یکایک۔" منظر اس کی آنکھوں کے آگے روشن ہونے لگا۔

"اماں جی! یہ جھومرا ایسی لڑکی تو نہیں لگتی تھی جو گھر سے بھاگ جائے۔" زینب کو نت نئے چسکے لینے کا شوق تھا وہ باہر تخت پر بیٹھی اماں جی سے آج کے دن کی گرم ترین خبر پر تبصرہ کرنے لگی۔

"ہوں۔" اماں جی نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ وہ ویسے بھی زینب سے بہت احتیاط، بہت طریقے سے گفتگو کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں اس سے ذرا بے تکلفی سے بات کر لو، وہ بہت آگے نکل جاتی تھی۔ اماں جی نے نیلی کریپ کی قمیص کا دامن سیدھا کیا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بارش ہلکی ہو تو ہم جائیں۔ صوفی صاحب خفا ہو رہے ہوں گے۔ تم دونوں نے تیار ہونے میں دیر لگائی ورنہ ہم بارش شروع ہونے سے پہلے بھی نکل سکتے تھے۔" وہ زینب کو خفگی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ہم نہیں، صرف آمنہ۔" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "میں تو بہت دیر سے تیار بیٹھی سوکھ رہی ہوں۔ یہ آمنہ بی بی سب سے آخر میں تیار ہوئی تھیں۔ ہائے بارش کب رکے گی۔ حویلی میں کتنا مزہ آ رہا ہو گا۔"

"آمنہ نے سارے گھر کا پھیلاوا سمیٹا پھر سب کے کپڑے استری کیے۔ صوفی صاحب کا حجرہ صاف کیا پھر وہ نہانے گئی تھی۔" اماں جی نے اسے جتا کر آمنہ کے دیر کرنے کی وجہ بتائی۔ وہ ان سنی کر کے ٹانگیں جھلاتی رہی۔

"ویسے اماں جی! آمنہ کا نام اصغری ہونا چاہیے تھا مراۃ العروس والی۔ آپ نے پڑھی ہے ناں ڈپٹی نذیر احمد کی جو بابا صاحب نے ہمیں بچپن سے حفظ کرنے کے لیے دی ہوئی ہے۔"

"اور تمہارا نام اکبری۔" اماں جی چڑ کر بولیں تو کھڑکی میں کھڑی آمنہ کو ہنسی آ گئی۔

"حالانکہ اکبری بڑی تھی۔ میں تو چھوٹی ہوں آمنہ سے۔ خیر دفع کریں۔ ہائے اماں جی! کب جائیں گے حویلی۔ بارش کو بھی ابھی اتنی شدت سے ہونا تھا۔" وہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "اماں جی! جھومر کہاں گئی ہو گی بھلا۔ اتنی تو بارش ہو رہی ہے صبح سویرے سے۔" اسے پھر سے جھومر کی یاد ستانے لگی۔

"تمہیں بہت فکر ہے اس نامراد کی۔ جہاں اس کے سینگ سمائے ہوں گے چلی گئی ہو گی۔" اماں جی سلگ کر بولیں۔

"اماں جی! یہ اچھی بات تو نہیں ہے ناں یوں گھر سے بھاگ جانا۔" یہ اس کا دل پسند موضوع تھا اور وہ اس پر بہت بولنا چاہ رہی تھی۔ بس اماں جی ہی اسے لفٹ نہیں کروا رہی تھیں۔

"ہوں۔" اماں جی نے پھر ہوں کہہ کر پیچھا چھڑانا چاہا۔

"لیکن یہاں بھی تو اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونا تھا۔ اس کا ابا اس کی شادی اس غنڈے ٹرک ڈرائیور سے کرا دیتا۔ تو اس نے اچھا نہیں کیا؟" وہ اماں جی سے پتا نہیں کون سا سرٹیفکیٹ لینا چاہ رہی تھی۔

"زینب!" اماں جی نے غصے سے اسے پھر گھرکا۔ "والدین کی نافرمان لڑکیاں انہیں اپنا دشمن جان کر گھر سے بھاگ کر اپنا نصیب خود تراشنے نکلتی ہیں اور انجانے ہی میں مقدر کے اندھے گڑھے میں جا گرتی ہیں اور اس فاش جرم کے ارتکاب کا احساس انہیں کرنے کے بعد ہوتا ہے۔" مگر وہ یہ سب ابھی زینب سے نہیں کہنا چاہتی تھیں۔ اس کی عمر ابھی ان باتوں کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ کہیں تجسس ہی میں وہ بھی اپنا نصیب خود تراشنے کا نہ سوچنے لگ جائے کہ ادھر باپ کے سخت رویے اور گھر کے پابند ماحول سے وہ بہرحال خوش نہیں تھی۔ اماں جی کو اس بات کا علم تھا۔ ماں تھیں بیٹی کے ہر اٹھتے قدم کو دیکھ کر اس کے خیال گمان کے بارے میں اندازہ لگا سکتی تھیں مگر وہ اسے خوش کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ صوفی صاحب اپنے اصولوں کے معاملے میں بہت سخت تھے اور جس طرح کے صوفی صاحب کے خیالات تھے وہ بیٹیوں کو بھی ایسی ہی کسی تقدیر سے باندھنے کی کوشش کریں گے جو ان کی طرح ہو۔

ڈنڈے کے زور پر انسان کو موم کرنے والی تقدیر اور یہ بات رابعہ بی بی صوفی صاحب کو کبھی نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ دل سختی سے نہیں نرمی سے موم کیے جاتے ہیں اور زینب کا دل تو بہت نرمی سے موم ہونے والا تھا مگر صوفی صاحب کی بے جا سختی نے اس موم کو بگاڑ کر بے ہیئت سا کر دیا تھا جس کا انہیں احساس تک نہ تھا۔

اماں جی کی گھرکی پر زینب جھک کر اپنے جوتے کا اسٹرپ بند کرنے لگی۔

"بیٹا! ہر گھر کا اپنا ماحول' اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس طرح کے ماحول سے آئی ہو جہاں یہ معیوب نہ سمجھا جاتا ہو۔ اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا! کوئی بھی علاقہ' کوئی بھی گھر صرف اچھے یا صرف برے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہوتا۔ ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے ایک جیسے حالات میں دو تین بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ فطرت وراثت نہیں ہوتی جو ترکے میں منتقل کی جا سکے۔ جیسے جھومری ماں ایک اچھی اور نیک اور عورت دکھتی ہے۔ مگر بیٹی کا فعل؟ اس میں ایک حد تک تو اس کی ماں قصوروار ہے مگر مکمل طور پر ہم اسے الزام نہیں دے سکتے۔ ورنہ تو بچے' اچھی بیٹیاں والدین کی رضا اور ان کی فرمانبرداری کو ہی اولیت دیتی ہیں چاہے طبعاً سرکش ہوں۔ یہی اللہ کو بھی پسند ہے اور ان کی اسی فرمانبرداری سے خوش ہو کر اللہ ان کی زندگی خوشگوار بنا دیتا ہے۔"

اماں جی نے بڑے پیار سے دھیرے دھیرے اسے سمجھایا۔

"آپ کی طرح خوشگوار زندگی؟ ہے نا۔" وہ طنز سے بولی۔

"مجھے کیا ہوا ہے بیٹا! میں تو بہت خوش ہوں۔ صوفی صاحب نے ساری زندگی میرا اپنی بساط سے بڑھ کر خیال رکھا ہے۔ اچھا کھانے کو' پہننے اوڑھنے کو' رہنے کو' محفوظ چھت سب کا ہی ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ وہ بظاہر سخت دکھتے ہیں مگر وہ میرا' تمہارا' ہم سب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بیٹا! دیکھو ہم کتنے لوگوں سے شاندار اور اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس گاؤں میں بہت سے گھر ایسے ہیں جہاں دن میں ایک بار بمشکل چولہا جلتا ہے' یا سالوں بعد ہر فرد کا ایک ایک نیا کپڑا بنتا ہے۔ ہم تو اللہ کا شکر ہے ہر طرح کی نعمت سے ہر وقت لطف اندوز ہوتے ہیں' اچھا کھاتے ہیں' اچھا پہنتے ہیں۔ یہ سب صوفی صاحب کی توجہ' ان کے خیال کا طریقہ ہی تو ہے۔"

اماں جی اتنا نہیں بولتی تھیں۔ وہ تو ضرورتاً بھی چند لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں مگر آج زینب کے خیالات کو سدھارنے کی نیت سے وہ اپنی تمام قوت اور ذخیرہ الفاظ استعمال کر لینا چاہتی تھیں۔

"اماں جی! کیا صرف اچھا کھانا اچھا پہننا ہی انسان کی ضرورت ہے۔ کیا توجہ اور محبت کے اظہار کا خدا نے انسان کو اور کوئی طریقہ نہیں سکھایا۔ اماں جی کھانا اور پینا تو حیوانوں کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ انسان کو تو ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چاہیے۔ بابا صاحب سختی کریں' بے شک کریں۔ ہمارے سدھارنے کے لیے مگر کیا ہر وقت اماں جی؟ کسی وقت تو انہیں ہماری آنکھوں میں بھی جھانکنا چاہیے۔ ہمارے اندر کی خواہش کو کھوجنا چاہیے۔ میرا کتنا دل کرتا ہے۔ بابا صاحب ہم سے کھل مل کر باتیں کریں۔ ہمارے ساتھ ہنس کر بولیں۔ پیار سے ڈانٹیں' جھڑکیں' مجھے کہیں "زینب! تم نکمی ہوتی جا رہی ہو پڑھائی میں۔ زینب بیٹا! تمہیں اس بار عید پر کیسے کپڑے بنوا کر دوں؟ تمہیں چلغوزے پسند ہیں سب کے لیے مونگ پھلیاں اور صرف تمہارے لیے چلغوزے لایا ہوں۔ سب سے چھپا کر کھانا۔" اماں جی! کسی وقت تو۔ کسی وقت تو میری طرف... ہماری طرف دیکھیں۔" کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ بھاگ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ شاید پانی پینے' شاید آنسو بہانے! اماں جی دکھ سے اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

"یہی تو میں تمہارے بابا صاحب کو نہیں سمجھا سکتی کہ ہر وقت کی سختی تو پتھروں کو بھی ریزہ ریزہ کر ڈالتی ہے۔ یہ معصوم تو پھر انسان ہیں گوشت پوست کے۔" اماں جی کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے۔

"اماں جی! اب کیا کریں۔ اتنی دیر ہو گئی ہے شام ہو چلی ہے۔" آمنہ نے کھڑکی سے انہیں افسردہ ہوتے دیکھا تو فوراً "باہر آ کر ان سے بولی۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔" وہ فوراً" سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"عبدالمبین کو بھیجا تھا کہ جا کر تانگہ ہی لے آئے دین محمد کا۔ وہ بھی ابھی تک نہیں لوٹا' وہاں سیدہ بی بی کا منہ پھول جائے گا کہ ہم لوگ ان کی برابری کی کوشش میں خاص بنتے ہیں۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح صبح سویرے کیوں نہیں آ کر بیٹھے۔" انہیں سیدہ کی طنز بھری نگاہ یاد آ گئی جو کل شام حویلی جانے پر سیدہ نے ان پر ڈالی تھی۔

"اس میں خاص بننے والی کون سی بات ہے۔ ہم صبح سے جا کر وہاں کیا کریں۔ ہزاروں تو ان کے ملازم ہیں' عورتیں بھی مرد بھی کام کرنے والے۔ یہاں گھر کا بھی سارا کام ہوتا ہے اور نمازوں کی ادائیگی بھی۔ بابا صاحب خود ہی تو ہمیں منع کرتے ہیں ادھر ہمیں سویرے سویرے جانے سے۔" آمنہ بولی۔

"یہ بات بڑے لوگ نہیں سمجھتے۔ دیکھو یہ زینب کہاں چلی گئی۔ ابھی تو ادھر ہی بیٹھی تھی میرے پاس۔" زینب کے اس طرح اٹھ کر جانے سے ان کا دل بے چین ہوا جا رہا تھا۔

"اماں جی! لے آیا ہوں تانگہ۔" عبدالمبین ڈیوڑھی سے اندر آتے ہوئے بولا۔

"شاباش پتر! اب جاؤ تو کل شام کو آؤ۔ صحیح بولتے ہیں تمہارے بابا صاحب تمہیں۔ کوئی کام تو ڈھنگ سے کر لیا کرو۔" اماں جی اسے دیکھ کر خفگی سے بولیں۔

"سارا نزلہ میرے اوپر ہی گرتا ہے جیسے میں ہی فالتو ہوں اس گھر میں۔" وہ غصے سے بولا۔ "دین چاچا حویلی کچھ سواریاں لینے گئے ہوئے تھے۔ یہ آتے تو میں انہیں لے کر آ آیا خود تانگے کے آگے جت جاتا۔ اب جلدی چلیں ورنہ ادھر بابا صاحب کو میری وہ نالائقی کا ایک اور بہانا مل جائے گا۔ آ جائیں' باہر ہوں میں۔" وہ غصے اور بیزاری سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

اماں جی نے گہری سانس لیتے ہوئے چادر اوڑھی۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔

"زینب! آمنہ! جلدی کرو بچے! یہ بارش تو لگتا ہے آج نہیں رکے گی اور وہ جویریہ کی بچی صبح کی حویلی جا کر بیٹھی ہوئی ہے۔ جا کر اس کی اچھی طرح خبر لیتی ہوں۔ بہت خود سر ہوتی جا رہی ہے یہ۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے صحن عبور کرنے لگیں' آمنہ اور زینب بھی چادریں اوڑھ کر ان کے پیچھے آ گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

پتوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ ہرے بھرے ہونے کے بعد خزاں کی بے درد ہوائیں انہیں کہاں کہاں اڑا لے جائیں گی کہ چمن کی زمین بھی انہیں اپنانے سے منکر ہو جائے گی تو شاید پتے شاخوں پر اگنے سے ہی منکر ہو جائیں۔

کلیوں کو اگر معلوم ہو جائے کھلنے کے بعد' پھول بننے کے بعد بظاہر محبت بھرے ہاتھ ان کے نازک بدن کو کیسے پتی پتی کر کے آگ پر بکھیر دیں گے تو شاید کسی شاخ پر کبھی کوئی کلی نہ کھلتی۔

اور اگر بیٹیوں کو علم ہو کہ جس گھر کے آنگن نے انہیں زندگی کے لمس سے' محبت سے آشنا کیا ہے' تقدیر کی بے درد ٹھوکریں انہیں کن پتھروں سے جا پھوڑیں گی تو شاید زمانے میں کہیں کوئی بیٹی جنم نہ لیتی۔

"میرا خیال ہے' مجھے اب چلنا چاہیے۔ سہیل کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ تم اپنا کام بہت ہوشیاری سے کرنا اسی لیے تمہیں اتنے دن پہلے سے انفارم کر دیا تھا۔ اس پراجیکٹ کے بارے میں۔ دیکھو عارفہ آنٹی! اور معاملوں کی تو خیر ہوتی ہے مگر یہ معاملہ خالصتاً "میری زندگی کی' سمجھوتا کا معاملہ ہے۔ تمہیں پتا ہے نا۔" ریشم نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور زور زور سے جھلاتے ہوئے کہنے لگی۔ پھر ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر ذرا غور سے لاتعلق سی بیٹھی عارفہ کی شکل دیکھنے لگی۔

"بڑی معاملہ فہم ہو گئی ہے تو ریشو! کیا سہیل کو شہد لگا ہے جو تو اسی کو چمٹ کر بیٹھ گئی ہے۔ ہمارے پاس کام زیادہ ہے اور کرنے والے کم۔" عارفہ آنکھیں نچا کر بولی۔

"ہاہا...." ریشم نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

"واؤ آنٹی جی! کیا بات کہی ہے۔" ایک طویل قہقہے کے بعد وہ ذرا دیر کو رکی "شہد لگا سہیل۔

"چلو یونہی سمجھ لو عارفہ آنٹی! تم عمر میں اور تجربے میں یقیناً مجھ سے زیادہ ہو مگر زمانہ میرا بہرحال تمہارے زمانے سے آگے ہے اور آج کا زمانہ سپر سونک انفارمیشن کا زمانہ۔ آج کا بچہ تمہاری عمر کے تیس سالہ فرد سے زیادہ ہوشیار سوچ اور آگے کی نظر رکھتا ہے۔ اس کے پاس معلومات و مشاہدات کے انبار ہیں اور تم لوگ ابھی تک وہی پٹے پٹائے فارمولے سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔ اسی لیے تو تم لوگوں کی آخری عمر سرکاری اسپتالوں کے برآمدوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزرتی ہے اور تمہارے عاشقوں میں سے کوئی بھولے سے بھی تمہارے درشن کو نہیں آتا۔ ایم آئی رائٹ مائی ڈیئر آنٹ؟" اس نے آگے کو جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ مسلا۔

عارفہ نے ناسمجھی سے کندھے اچکائے۔ "پتا نہیں کون سی زبان بول رہی ہے تو۔"

"وہ جو تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"مطلب؟" عارفہ نے گولڈ لیف کا نیا پیکٹ کھولتے ہوئے ابرو اچکائے۔

"تمہارا سنہری فارمولا۔ بازاری عورت کبھی کسی کی نہیں ہو سکتی۔ کوٹھا ہی اس کا بھگوان' اس کا ایمان ہے۔ کوٹھے سے بچھڑے گی تو دھندے سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ کوٹھا نہیں سجائے گی تو کھائے گی کہاں سے۔ نہ آنٹ جی! میں اس فارمولے کو بالکل نہیں مانتی۔" وہ زور سے سر ہلا کر بولے گئی۔

"یہ تم لوگوں کی بھول ہے۔ تم ہو تو میری ماما کی کزن مگر عقل میں ان سے بہت دور ہو۔ دیکھا ماما کو' کیسا کاٹھ کا الو ڈھونڈا اس نے اور ماما ایک ٹکٹ میں دو مزے لے رہی ہے۔ جب چاہا منہ کا ذائقہ بدلنے کو تم سے آملی جب چاہا اس نیک شریف سماج کے ٹھیکیدار کی عزت دار زوجہ بن گئی۔ ہے نا عقل مندی۔ کوٹھا سجائے بغیر دولت میں کھیل رہی ہے۔" وہ رکی۔

"میں نے یہی ماما کا سنہری اصول پلے سے باندھ لیا۔ سہیل جیسا کاٹھ کا الو مجھے کہیں نہیں ملے گا جو میری خاطر اپنے خاندان کی عزت داؤ پر لگا کر مجھ سے کورٹ میرج کر سکتا ہے۔ وہ بغیر دم ہلائے سر اٹھائے میرے اشاروں پر تاعمر بندر کا ناچ بھی دکھا سکتا ہے۔ سہیل کے ساتھ مجھے دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ نگینہ بائی کی بیٹی جس نے اپنی زندگی کے بیس سال کوٹھے پر گھنگھروؤں کی چھن چھن پر ناچتے گزارے۔ اس کی بیٹی ایک بہت بڑے گورنمنٹ بینک آفیسر کی عزت دار بیگم ہے اور یہ نزہت چڑیا' یہ تو میرے آگے پھر پھرا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس جیسی تو کئی میری جیب میں پڑی ہیں' یہ تو بس اس کے بڈھے کھوسٹ مرحوم باپ نے مجھے ضد دلائی کہ میری بیٹی بہت شریف' بہت پارسا ہے۔ مجھ جیسی گھٹیا شہرت کی حامل لڑکی اس کی بہو بنی تو اس کی معصوم بیٹی کی پارسائی پر حرف آئے گا۔ بس اسی دن سے ریشم نے سوچ لیا تھا کہ اس بڈھے کا غرور ایک دن پاش پاش کروں گی۔ جب اس کی بیٹی کی عزت کے اشتہار گلی گلی لگیں گے۔ پر اس کی قسمت اچھی تھی۔ یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی کمبخت دنیا سے اٹھ گیا۔ خیر۔" اس نے رک کر گہرا سانس لیا۔

"یہ رہ گئی تھی چیونٹی۔ اس کو مسلنا ضروری تھا کہ سہیل زندگی بھر مجھ سے آنکھ اٹھا کر بات نہ کر سکے۔ صاف کہہ دوں گی۔ پہلے اپنی بہن کے کرتوت تو دیکھو پھر مجھ سے بات کرنا۔" ریشم کا پلان بہت واضح بہت زبردست تھا۔ عارفہ رشک بھری نگاہ سے اس کل کی چھوکری کو دیکھنے لگی جو عقل میں اس سے کئی گنا بڑی لگ رہی تھی۔

"اور رہ گئی شہد والی بات تو عارفہ جی! سہیل تو ہے ہی سونے کی کان اور اس کان کی دریافت کا سہرا میرے سر ہے۔ میں اس کان سے کھود کھود کر سونا نکالوں گی۔ اپنی اور تم سب کی جھولیاں بھروں گی اور جس دن یہ کان خالی ہوئی۔ سہیل نرا مٹی کا تودہ بن گیا اس دن ریشم کھلے آسمان کو نئے سرے سے فتح کرنے نکل پڑے گی اور کان کو مٹی کا تودہ بنانے میں، میں بہت دن نہیں لگاؤں گی آنٹ جی! وقت کی قدر ہی تو میری زندگی کا سب سے اہم اصول ہے جوانی گزر گئی تو اس دن کھودھندا چوپٹ اور اس دن کے آنے سے پہلے مجھے بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور تم ڈیئر

آنٹ عمر کی بوڑھی' عقل کی موٹی خالہ ان باتوں کو نہ سمجھو گی۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سب کام بہت ہوشیاری سے کرنا۔ مووی' تصاویر سب بہت پرفیکٹ ہونا چاہئیں ایک دم اوریجنل۔ کہیں جھول نہیں چھوڑنا۔ انڈراسٹینڈ۔" وہ اپنا شولڈر بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"تم نے بتایا نہیں۔ کام ختم ہونے کے بعد چھوکری کا کیا کرنا ہے۔" عارفہ نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا۔

"تمہارے کسی کام آئے گی تو تم رکھ لینا بونس کے طور پر ورنہ تصاویر اور مووی دکھا دینا۔ خود ہی کہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرے گی۔ اس طبقے کے لوگوں کو عزت کی خاطر خودکشی کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ میری کہانی Authentic (سچی) ہو جائے گی کہ نزہت راحیلہ کے کسی کزن کے ساتھ بھاگ گئی۔ آخری کال وہ راحیلہ کو ہی کر کے آئی تھی۔ آگے جو تمہارا دل چاہے کرنا۔ ایسا گولڈن چانس تمہیں زندگی میں دوبارہ نہیں ملے گا۔ مال بغیر دھیلا خرچ کیے مل رہا ہے وہ بھی کھرا ایک دم زیرو میٹر۔" وہ آنکھ دبا کر بولی۔

"دعائیں دو اپنی ریشو کو۔ چلتی ہوں۔ کافی ٹائم ہو گیا۔ گاڑی بڑی دور پارک کی ہوئی ہے۔" وہ بیگ کندھے سے لٹکا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

"لڑکا ہوشیار ہے نا اسٹوڈیو میں۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

"فکر ہی نہ کرو' دونوں کی دمیں میرے پاؤں تلے ہیں۔ بڑے لمبے چکروں میں پھانس رکھا ہے دونوں کو۔ راشد تو ایکسپرٹ ہے فوٹو گرافی اور مووی میکنگ میں۔ اور عاصم کا کام بھلا کون سا دشوار ہے۔ اس کے تو مزے ہی مزے ہیں۔" وہ آنکھ دبا کر زور سے ہنسی۔ "تم جاؤ۔ ڈونٹ وری۔ سب فکریں' اپنی بلائیں عارفہ آنٹی کو دے جاؤ۔ بائے۔" تو ریشم نے بھی مطمئن ہو کر ہاتھ ہلایا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

"ارے چھوکرے! آ کر دروازہ لاک کر۔" عارفہ نے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکا کچن سے نکل کر دروازہ لاک کرتا۔ دو لڑکے بے حد گھبرائے ہوئے حواس باختہ دروازہ دھاڑ سے کھول کر اندر داخل ہوئے اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

"تم؟" عارفہ غصے اور حیرت سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دونوں کو دیکھ کر زور سے چلائی۔

"میڈم! غضب ہو گیا۔ سارا کام ٹھیک ہو گیا تھا۔ رنی مال لے کر بھی فرار ہو گیا تھا بلے کے ساتھ۔ چوکیدار کو تو ہم نے جاتے ہی ختم کر دیا تھا۔ میں اور وحید بائیک تک پہنچنے والے تھے کہ اچانک پیچھے سے پولیس کی پیٹرولنگ آ گئی۔ رنی کمبخت گاڑی بھگا لے گیا' بائیک دور تھی۔ ہم بھاگ نکلے بڑی مشکل سے پولیس کو غچہ دے کر ادھر تک پہنچے ہیں۔ یہی قریبی اسٹیشن تھا' کیا کرتے۔" بلیک لیدر کی جیکٹ اور جینز میں ملبوس لمبا تڑنگا لڑکا بے تحاشا پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان تفصیل بتانے لگا۔ دوسرا لڑکا بھاگ کر فلیٹ کی بالکنی میں چلا گیا تھا شاید نیچے دیکھنے کے لیے۔

"باہر پولیس آ گئی ہے۔ اس کے ساتھ مزید فورس ہے' او مائی گاڈ بھاگو ادھر سے۔" بالکنی میں کھڑا لڑکا ایک دم سے چلایا اور چھلانگ مار کر لاؤنج میں آ گیا۔ اس کی پکار سنتے ہی پہلے لڑکے نے مڑ کر بیرونی دروازہ کھولا اور دونوں آندھی طوفان کی طرح بھاگ نکلے۔

"او مائی گاڈ.... ستیاناس ہو ان دونوں کا۔ ہمارے پلان کا بیڑہ غرق کر گئے۔ یہ فلور تو پہلے ہی پولیس کی نظروں میں ہے۔" عارفہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"میڈم پولیس۔" چھوٹا لڑکا جو کچن کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا' اندر آ کر فق چہرے کے ساتھ بولا۔ "آپ نے گارڈ کو بھی واپس بھیج دیا اب تو پولیس ضرور ادھر کی تلاشی لے گی۔ بھاگ نکلیں آپ بھی ادھر سے ہم تو مع ثبوت کے پکڑے جائیں گے۔" وہ اگلے ہی لمحے لمبی جست لگا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

عارفہ جیسے خواب سے جاگی لپک کر اندر اسٹوڈیو کی طرف بڑھی۔

"راشد! عاصم! پولیس کا ریڈ پڑ گیا ہے۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ' سب سامان پیچھے پلاٹ میں پھینک دو۔ لڑکی

کو بے شک ادھر ہی پڑا رہنے دو۔" عارفہ کی تیز آواز پر وہ دونوں، جو اپنے کام میں مصروف تھے، اچھل ہی پڑے۔
عارفہ نے نفرت سے ایک تیز نظر بے ہوش برہنہ نزہت کے وجود پر ڈالی اور پھر بڑے اطمینان سے فلیٹ سے باہر نکل کر سیڑھیاں اتر گئی۔
عاصم بھی عارفہ کے پیچھے ہی سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔ سب کچھ ایسے ہی پڑا تھا۔ ادھر جان بچانے کی فکر تھی سامان کی پروا کس کو تھی۔
راشد کمرے سے نکلتے نکلتے ایک پل کو ٹھٹکا۔ اس نے پلٹ کر اس بے گناہ و بے قصور مجبور لڑکی کو دیکھا۔ اس کا دل جیسے کانپ اٹھا۔
"یہی کچھ تو میرے ساتھ کیا ان ملعون لوگوں نے اور میں بھی یہی کچھ کرنے چلا ہوں مخلوق خدا کے ساتھ۔" اس نے اگلے ہی لمحے بیڈ شیٹ کھینچی اور نزہت کے اوپر ڈال کر اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔
اسٹوڈیو کی کھڑکی اس بلڈنگ کے پچھلی طرف کھلتی تھی۔ وہ ایک خالی پلاٹ تھا جس کے گرد چھوٹی سی اینٹوں کی دیوار تھی۔ پلاٹ میں لوگ کچرا پھینکا کرتے تھے۔ کارپوریشن کا ٹرک کئی کئی ہفتے ادھر سے کچرا اٹھانا بھول جاتا تھا اب بھی اس پلاٹ میں کوڑے کی کثیر مقدار جمع تھی۔ جگہ جگہ ڈھیر بنے ہوئے تھے۔ راشد نے کھڑکی کہنیوں سے کھول کر ایک پل کو سوچا اور بازوؤں میں اٹھائے اس بوجھ کو چار منزلہ نیچے کوڑے کے اس ڈھیر پر پھینک دیا چادر سمیت ڈھیر کے اندر چھپ کر وہ جیسے کوڑے کے ڈھیر کا ہی حصہ معلوم ہونے لگی۔ راشد نے پلٹ کر کرسی پر پڑے اس کے کپڑے اٹھا کر اسی ڈھیر کے اوپر پھینک دیے۔
"اس کی بے ہوشی کی ڈوز ابھی تین گھنٹوں کی ہے۔ اللہ کرے یہ ان تین گھنٹوں کے دوران ہی کچرے کے نیچے دم گھٹ کر مر جائے۔" راشد نے اس کے حق میں صدق دل سے دعا کی۔
کندھے سے لٹکے کیمرے کو کھولا اور اس کی فلم نکال کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور اسی ڈھیر پر پھینک دیے۔ یہی حال اس نے وڈیو فلم کا بھی کیا پھر کھڑکی اس نے اچھی طرح برابر کر کے بند کی اور کمرے سے نکل کر بالکونی کے دائیں طرف جاتے پانی کے پائپ کے ساتھ لٹک کر نیچے اتر گیا۔ تب تک پولیس فلیٹ کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ اس کے کان بھاری بوٹوں کی آواز سن چکے تھے۔ وہ پانی کے پائپ سے نکلتا ہوا پیچھے گلی میں اتر گیا۔
"بینک ڈکیتی کے ان مفرور ملزموں کی تلاش میں پولیس نے آدھے گھنٹے میں ساری بلڈنگ کے فلیٹ چھان مارے۔ اس فلیٹ کی خصوصی تلاشی لی گئی جہاں سے کچھ مشکوک چیزیں ملی تھیں اور جس میں کوئی موجود نہیں تھا اسٹوڈیو کی کھڑکی کھول کر ہر طرح سے جائزہ لیا گیا کہ وہ دونوں ادھر سے ہی تو نہیں بھاگے۔
کھڑکی کے نیچے کوڑے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا اور چار دیواری کے باہر سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ سورج ڈھل چکا تھا اور شام کے اندھیرے ہر طرف پھیل رہے تھے۔
"وہ دونوں ادھر سے فرار ہو چکے ہیں۔" پولیس انسپکٹر نے حتمی انداز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ تلاشی لینے والے چاروں سپاہی بھی اس کے پیچھے نکل گئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"بابا جان! آپ جلدی سے تیار ہو کر باہر جائیں۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔ بارش کی وجہ سے مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام تو اندر ہال میں کیا گیا ہے۔ مگر گیٹ پر بھی تو کسی کو ویلکم کہنے کے لیے موجود ہونا چاہیے ناں اس بارش کو بھی آج ہی ہونا تھا برسے جا رہی ہے بغیر سانس لیے۔" سیدہ اندر کمرے میں داخل ہوتے ہی بولیں۔
سید سبطین شاہ اپنا کلاہ سر پر سجا رہے تھے۔ کلف شدہ لٹھے کے سفید براق سوٹ پر بلیک ویسٹ کوٹ پہنے وہ تیار کھڑے تھے۔
"ماشاءاللہ بہت اچھے لگ رہے ہیں بابا جان۔ بہت ہینڈسم۔" سیدہ باپ کو دیکھ کر محبت سے مسکرائیں۔
"شکریہ بیٹا جی۔" وہ بھی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواباً مسکرائے۔
"سلطان بخت کدھر ہے؟ وہ تیار ہوا کہ نہیں۔ آج صبح سے میں نے اسے نہیں دیکھا حالانکہ انتظام تو سارا ہو

چکا ہے۔ بہت لوگ ہیں کام کرنے والے مگر سیدہ! تم خود سوچو، انتظامات کو دیکھنے کے لیے بھی تو کسی کو سر پر موجود ہونا چاہیے ناں اور یہ سلطان بخت، پتا نہیں یہ اپنی ذمہ داریوں کو کب محسوس کرے گا۔" وہ پرفیوم لگاتے ہوئے بولے۔
"بابا جان! مت پوچھیں۔ اسی کا تو رونا ہے سارا۔" سیدہ بے دم سی ہو کر صوفے پر گر گئیں۔ "سر پر موجود ہونے کے واسطے تو میں اس طرف اور اس طرف گھن چکر بن کر رہ گئی ہوں۔ ادھر گھر کے کاموں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں۔ شہرینہ بے چاری ہے مگر اسے بھی کدکڑے بھرنے سے ہی فرصت نہیں۔ اس کا بچپنا بھی بھائی کی طرح خدا جانے کب رخصت ہو گا ورنہ تو اس کی عمر کی لڑکیاں ہمارے ہاں پورے پورے گھر کی ذمہ داری سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ اماں جان رخصت ہوئیں تو میں کوئی بیس پچیس برس کی تھی، محض چودہ سال کی اور آپ گواہ ہیں بابا جان! کبھی جو آپ کو گھر میں بدانتظامی کا گلہ ہوا ہو۔" سیدہ بھری بیٹھی تھیں۔
"سچ ہے سیدہ! تم نے بڑی بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا۔" وہ ان کے سامنے پڑی کین کی گول کرسی پر بیٹھ گئے۔ "اور یہ سلطان بخت اسی قدر لاپروا اور احساس سے عاری ہے۔ اس کی وجہ سے تو میرا یہ حال ہے اگر جو یہ میرا دل خوش کر دیتا۔ سب ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر احسن طریقے سے نبھا لیتا تو کیا بیماری اس قدر جلد مجھ پر قابو پا سکتی تھی۔" سید سبطین شاہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔
"بابا جان! یہی تو دکھ کی بات ہے سلطان بخت۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ "اسے یہ سب کچھ خود سمجھنا ہے ادھر تو سمجھانے کا بھی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ ادھر صالحہ اکیلی پھر رہی ہیں بیٹھی وہ سب سنبھال تو لیتی ہے۔ مگر ان دنوں میں تو کم از کم اسے آرام کرنا چاہیے۔ میرا ایک پاؤں ادھر دوسرا ادھر۔ ابھی بھی ادھر سے آ رہی ہوں۔ سب کاموں کو فائنل کر کے سوٹ کیسوں کو لاک لگا آئی ہوں۔ جہیز کا آدھے سے زیادہ سامان تو آ ہی چکا ہے اور یہ بھی ادھر مسئلہ ہے کہ اسے سیٹ کون کروائے۔ اسی لیے تو میں نے سب سامان ایک کمرے میں رکھوا کر باہر سے تالا لگوا دیا ہے۔ خود ہی صالحہ آ کر اپنی مرضی سے سیٹ کرے گی۔ میری تو ہمت جواب دے گئی ہے۔ پاؤں اور ٹانگوں میں شدید درد ہے۔ ان کمبخت نوکروں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر۔" سیدہ نے ٹانگیں اٹھا کر صوفے پر رکھ لیں اور اپنے دونوں پاؤں ہاتھوں میں لے کر ہولے ہولے دبانے لگیں۔
"بیٹا! تم نے کچھ دیر آرام کر لینا تھا۔ کسی سے دبوا لینا تھا اتنا ریوڑ نوکروں کا باہر پھر رہا ہے۔ اس طرح جو تم اندر ریسٹ رہو گی۔ تو بیمار پڑ جاؤ گی۔ ابھی تو اصل فنکشنز رہتے ہیں۔" بابا جان فکر مندی سے بولے۔
"بابا جان! اتنا ٹائم کہیں ہے میرے پاس بس۔ آج اور کل کا تو دن ہے۔ ویسے کی خیر ہے ادھر تو کوئی خاص کام نہیں ہو گا۔ شام سے پہلے تو آپ سب کو شہر چلے جانا ہے ہوٹل کے فنکشن کے لیے۔"
"ہوں۔" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔
"کیا سوچ رہے ہیں بابا جان؟"
"زندگی کا لمبا سفر سیدہ! جو میں طے کر آیا ہوں اب تو چند قدم باقی ہیں، وہ چاہے ایک جست میں طے کر لوں یا ذرا ٹھہر ٹھہر کر۔ مگر ٹائم زیادہ نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی میری آنکھوں کے سامنے دور، کہیں بہت دور بھاگی جا رہی ہو اور اس کے تعاقب میں میرا دم پھولا جا رہا ہے سیدہ یہ......" ان کے چہرے کا رنگ یک لخت زرد ہو چلا تھا آنکھوں میں عجیب سی وحشت برسنے لگی تھی۔ خالی خالی نظروں سے وہ سیدہ کو دیکھ کر بے بسی سے بولے۔
"بابا جان پلیز! ایسا مت کہیں۔ ہمت کریں۔ انشاءاللہ آپ کا بائی پاس کامیاب ہو گا۔ ڈاکٹرز آپ کی تمام رپورٹوں سے مطمئن ہیں۔ بس ایک ماہ کی تو بات ہے۔ انشاءاللہ آپ ہنستے مسکراتے اپنے قدموں پر چل کر حویلی آئیں گے اپنی راجدھانی سنبھالنے۔" سیدہ اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھیں، ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تسلی دیتے ہوئے بولیں۔
"کیا ڈاکٹرز۔ کیا ان کی رپورٹس ہونہہ۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہلکا سا ہنسے۔ "میرا دل مطمئن نہیں سیدہ! ڈاکٹرز

کی تسلی کے باوجود میرا دل رتی برابر بھی خوش نہیں۔ خوش گمانی کی کوئی رمق نہیں اس میں اور دل بھی جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ تم لوگ خوش رہو' آباد رہو' اسی طرح پھلتے پھولتے رہو میرے بعد سیدہ! شہرینہ کا بہت خیال رکھنا ناسمجھ سی ہے اور کچھ جذباتی بھی۔ بہت جلد جذبات میں آکر خطرناک قدم بھی اٹھالیتی ہے' بس مجھے اس کی اس عادت سے ڈر لگتا ہے۔ ماں کی محبت نہیں ملی نا شاید اس لیے۔"

"سلطان بخت میں بھی تو یہی خرابی ہے۔ اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جس کو یہ سب سنبھالنا ہے شہرینہ کو تو میں قابو کرلوں گی۔" سیدہ کڑوے لہجے میں بولیں۔

"سیدہ! وہ سنبھل جائے گا تو بہت کچھ بچالے گا۔ نہیں سنبھلے گا تو ہاتھ ملے گا' یہ وقت بڑا بے وفا ہے۔ نادانوں کے ساتھ بہت دیر تک انگلی پکڑ کر نہیں چلتا۔ آج تو مجھے سب کچھ اس کے حوالے کردینا ہے۔ سمجھو آج رات ہی سے اس میں بردباری آگئی تو آگئی ورنہ......" وہ چپ کرگئے۔ سیدہ بھی خاموش رہیں۔ دونوں شاید وسوسوں کے ہجوم میں گھر گئے تھے یا بولتے بولتے تھک گئے تھے اور آنے والے دنوں کا نقشہ اپنی آنکھوں میں بن رہے تھے یا ایک دوسرے کے منہ سے کوئی خوش آئند جملہ سننے کے منتظر تھے۔

"بارش پھر تیز ہوگئی ہے۔" کمرے کی خاموشی نے جس چیز کا احساس دلایا' وہ سیدہ کو کھینچ کر حال میں لے آئی اور سبطین شاہ تو ابھی بھی چپ تھے جیسے ان کے پاس الفاظ ہی ختم ہوگئے ہوں۔ سیدہ نے ایک نظر باپ کے جھکے ہوئے غمزدہ چہرے پر ڈالی یہ وہ شخص تھا جو چلتا تھا تو زمین کانپتی تھی۔ سر اٹھا کر دیکھتا تو فلک پر اڑتے پنچھی لمبی اڑان لینا بھول جاتے تھے۔ ان کے ایک اشارے پر ہزاروں خادم سر کٹوانے کو بے تاب رہتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی جو ان کے حکم سے ذرا سی بھی روگردانی کرجائے اور اماں جان۔ ان بےچاری کا تو سبطین شاہ کے آگے پتا پانی ہوتا تھا سیدہ نے اپنی چودہ سالہ زندگی میں اماں جان کو ابا جان سے نظر اٹھا کر کلام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ سفید ململ کے دوپٹے کے ہالے میں لپٹا ان کا چہرہ ہمیشہ جھکا ہی رہتا تھا جیسے اس وقت بابا جان کا۔ بے بسی کا احساس کس طرح انسان کو لاچار کردیتا ہے جیسے زہر نکلا سانپ یا کوئی بے ضرر کیڑا ایک بزدل ہوجاتے ہیں۔ موت کی قربت کے خیال نے ہی زندگی سے سارا حسن' ساری توانائی کشید کرلی تھی انہوں نے بابا جان کو دیکھ کر ایک سرد سانس لیا۔

"بابا جان! ایسا بھی تو نہیں ہوسکتا۔ آپ کچھ عرصہ میرا مطلب ہے کچھ زیادہ دن سلطان بخت کے پاس اس کے سر پر رہتے اسے کچھ اپنے طریقے سے کام سمجھاتے اتنی جلدی تو وہ......" وہ بے ربط جملوں کے درمیان باپ کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ "صالحہ ذرا حویلی میں قدم جمالیتی۔"

"کل کو کس نے دیکھا ہے۔" وہ بے بسی سے ہنسے۔ "سیدہ! یہ وقت' یہ دن ہی تو نہیں ہے میرے پاس بس یہی گنتی کے سات دن۔ اگلے ہفتے جدہ کی فلائیٹ ہے میری اور پندرہ دن بعد لندن۔ اگر کہیں ہو تو رک جاتا ہوں اگر رکنے سے سانس بڑھنے کی امید ہے تو۔" ان کا چہرہ پھر سے زرد پڑ گیا۔

آج کل ان کی ہارٹ پرابلم بہت بڑھ گئی تھی اور ڈاکٹرز کا اصرار بھی کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے وہ جا کر بائی پاس کرالیں۔ ورنہ خطرہ بڑھتا جارہا ہے۔ ان کی میڈیکل رپورٹس بالکل اچھی نہیں آرہی تھیں۔ ای سی جی گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے بالکل بھی ٹھیک نہیں آرہا تھا ہلکا ہلکا درد ہمہ وقت سینے کے سمندر میں ہلکورے لے کر انہیں اندر ہی اندر گھائل کرتا جارہا تھا اور رپورٹس کا ذکر انہوں نے کسی سے نہیں کیا تھا۔

"بابا جان!" سیدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ان کے ہاتھ چومنے لگیں۔ "آپ ہی تو ہمارا سرمایہ ہیں۔ ہمارا سب کچھ بابا جان سب کچھ۔ کاش سلطان بھی اس بات کو سمجھ لیں۔" آنسو ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"سیدہ کم آن! جہاں اتنا ٹائم گزر گیا۔ کچھ دن اور سہی' تم دعا تو کرتی ہونا۔ کیا پتا اللہ ان دعاؤں ہی میں اثر ڈال دے۔ آج خوشی کا موقع ہے یوں رو کر دل کو پریشان مت کرو۔ جاؤ دیکھو جا کر سلطان تیار ہے تو باہر حجرے میں آئے آج دستار بندی کی رسم ہوجائے تو میرے کندھوں کا بوجھ بھی ہلکا ہو۔ بس اب مزید دیر مت کرو۔ پہلے ہی رات ہو چلی ہے پھر تم خواتین کی مہندی کی رسم ہے' اس کے بعد مہندی صالحہ کی طرف بھی لے کر جانی ہے۔ اسی میں صبح

ہوجانی ہے۔ چلو اٹھو میری بہادر بیٹی! جا کر سب کام ہنسی خوشی کرو۔ تمہارے حوصلے تو میرا دل بڑھاتے ہیں۔ تم اتنی لگن اتنی محبت سے سب کام کررہی ہو۔ یقین جانو میرا دل تم سے بہت خوش ہے۔ رہ گیا سلطان بخت تو دیکھنا آج ہی جب دستار بندی کی رسم ہوگی' اس کے فوراً بعد اس میں خود بخود احساس ذمہ داری پیدا ہوجائے گا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ہمارے بابا جان میری لاابالی طبیعت سے عاجز تھے جیسے ہی ذمہ داری کی گٹھڑی انہوں نے میرے کندھے دھری' ساری مستی شوخی ہوا ہوگئی۔ یہی سلطان کے ساتھ ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔" وہ ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنے لگے۔

"اللہ کرے بابا جان۔" سیدہ کا لہجہ ناامید سا تھا انہوں نے سلطان بخت کو گودوں کھلایا تھا اس کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ اول تو سلطان بخت میں سبطین شاہ جیسی بردباری اور سمجھ پیدا ہونا ہی مشکل تھا۔ اگر ایسا ہو بھی جاتا تو بھی اس میں خاصا ٹائم لگنا تھا اور اس دوران کیا کیا نقصان ہوجائیں گے' یہی اندیشے سیدہ کو کھلائے جارہے تھے۔ سبطین شاہ نے سیدہ کے پرسوچ چہرے کو دیکھا تو چند لمحے پہلے جو انہوں نے خود کو اور سیدہ کو حوصلہ دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ ناکام ہوتی نظر آرہی تھی۔ یکایک ان کے اعصاب بے تحاشا تھکن کے احساس سے چٹخنے لگے سب کچھ رائیگاں ہوتا نظر آرہا تھا۔ ایک عمر کی تپسیا۔ ان کے آباء کا ڈوبتا شجرہ نسب۔ ایسا کیوں تھا۔ کیوں اندر ہی اندر بہت کچھ کھو جانے کا' زائل ہوجانے کا احساس بڑھتا چلا جارہا تھا۔ زندگی نے تو ایک دن بے وفائی کرنی ہی تھی یہ تو کوئی اس سے بھی بڑھ کر اندیشہ سود و زیاں تھا جو سبطین شاہ کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو سیدہ؟" اندر کے شاں شاں کرتے آندھیوں کے شور کو دبا کر وہ بولے۔

"کچھ نہیں۔ بابا جان کچھ بھی نہیں۔" سیدہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولیں اور سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"سلطان ٹھیک ہوجائے گا۔ ہاتھ کا کھلا ہے۔ سخی' مجھولنانے پر آئے تو پھر دریغ نہیں کرتا۔ یہی عادت بری ہے اس میں ویسے تو سب ٹھیک ہے۔" وہ جانے کس کو دلاسا دے رہے تھے۔

"دل کا بھی بہت کھلا ہے بابا جان۔" سیدہ تلخی سے بولیں۔

"ہاں معلوم ہے مجھے سیدہ دو خرابیاں نہ ہوتیں تو تراشیدہ ہیرا تھا میرا بیٹا۔" دونوں پھر چپ ہوگئے' باہر سے ہلکا ہلکا شور اندر آرہا تھا۔

"سیدہ! صالحہ کو اچھی طرح سمجھا دینا کہ اسے سلطان کو کس طرح ڈیل کرنا ہے۔ بہت طریقے سے اس پر اس طرح سے چھا جائے کہ اسے ادھر ادھر کا دھیان ہی نہ آئے۔ اب تو سب کچھ صالحہ کے ہاتھ میں ہے' وہ چاہے گی تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئے۔

"بابا جان صالحہ میں یہ کوالٹی نہیں ہے۔ وہ تو بہت دبو سی ہے۔ ڈرپوک۔ میری کوششوں کے باوجود اس میں اپنی بات منوانے کا حوصلہ پیدا ہی نہیں ہوسکا۔ جس طرح کے بابا جان ہمارے گھروں کے گھٹے ہوئے ماحول ہیں ان میں صالحہ جیسی لڑکیاں ہی پروان چڑھ سکتی ہیں۔ چپ چاپ دیوار کے ساتھ لگ کر زندگی گزار دینے والی۔"

"یہ غلط ہے سیدہ! ماحول کو الزام مت دو۔ تم نے بھی تو ساری زندگی دونوں گھروں کے ماحول کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہے ورنہ حسین شاہ میں بھی سید زادوں والی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔" وہ انہیں خفا کر بولے۔

"میری بات اور ہے بابا جان! مجھے یہاں بھی بڑا پن ملا اور سسرال میں بھی۔ کچھ حسین شاہ آپ سے ڈرتے تھے کچھ مجھ سے مرعوب تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ ابھی تک سلطان صالحہ کو دل سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اللہ ہی اس نیا کو پار لگائے۔"

"میرا تو خیال تھا شہر میں ہمارے جو پراجیکٹس ملٹی نیشنل کمپنی کو چھوڑ کر باقی تمام کام ادھر سے وائنڈ اپ کروا کے ادھر شہر کے مضافات میں گاؤں سے ذرا قریب ہی منتقل کرالوں' وہیں ساری خرابی کی جڑ ہے۔ مگر سلطان راضی نہیں۔"

"بابا جان! کہاں کہاں سے کیا کیا وائنڈ اپ کروائیں گے۔ یہاں وہ کون سی نیکیاں کما رہا ہے' اس کے سب

افعال کی خبر مل جاتی ہے۔ مجھے بھی، آپ کو بھی۔ نظر انداز کر دیں تو الگ بات ہے، اس کی موجودگی میں گاؤں کے لوگ خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے جب حاکم کے سائے میں رعایا خود کو غیر محفوظ سمجھے حالانکہ بارہا میں سلطان کو یہ باور کرا چکی ہوں کہ اس طرح کی چھوٹی حرکات اسے زیبا نہیں دیتیں۔ اس کا منصب ان باتوں سے بہت اعلا ہے مگر جس شخص کو اپنی پہچان نہیں وہ کسی کی کیا پہچان رکھ سکتا ہے۔

"شہر میں خدا جانے اسے کون سی بلا چمٹ گئی ہے آج کل دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے اس پر۔ اور سمجھتا ہے مجھے کچھ خبر نہیں۔ اس کے کارندے اس کے ساتھی بعد میں ہیں میرے وفادار پہلے۔ وہ پلک جھپکنے سے بھی پہلے مجھے سب خبر کر دیتے ہیں اور گھائل کر دینے والیوں کے طریق کار سب وہی ہیں صرف شکار گاہیں بدل لی ہیں۔ انھوں نے کوٹھوں سے اتر کر کوٹھیاں آباد کر لی ہیں۔ سیدہ! میرے جانے کے بعد سلطان پر ذرا کڑی نگاہ رکھنا خاص طور پر جب یہ شہر جائے۔ تمہارا بیٹا زوار شاہ اب بڑا ہو رہا ہے۔ اسے بہانے بہانے سے سلطان کے ساتھ کر دیا کرو۔ کچھ بزنس کی سمجھ اسے بھی آجائے گی اور کچھ شاید سلطان کو بھانجے کی حیا آجائے۔"

"ہونہہ۔" سیدہ منہ بنا کر بولیں۔ "اسے بہنوئی کی حیا نہیں تو بھانجے کی کیا آئے گی۔ کئی بار حسین شاہ نے مجھے سلطان کی شہری مصروفیات کے بارے میں واضح الفاظ میں بتایا۔ میں جان کر انجان بن گئی۔ جھوٹ موٹ اس کی صفائی میں قسمیں کھاتی رہی مگر میرے قسمیں کھانے سے......" اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے، آجاؤ اندر۔" سیدہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بولیں۔

"وہ شاہ جی! باہر مہمان آئے ہیں۔ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔ دور سے آئے ہیں جی شاید اسلام آباد سے۔" سبطین شاہ کا ملازم خاص اندر آکر مودب لہجے میں بولا۔

"وہ آفریدی صاحب نہ ہوں۔ میں دیکھتا ہوں جا کر۔" سبطین شاہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "سیدہ! جاؤ دیکھو سلطان کو بھیجو جا کر۔ خاصا ٹائم ہو گیا ہے، چلتا ہوں میں۔" وہ کہہ کر ذرا تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

بارش کی شدت کے باوجود ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ ہال سے باہر بیرونی رستے سے آتے تک سرخ سنہری شامیانے تنے ہوئے تھے۔ فلڈ لائٹس کی تیز روشنی نے دور تک ماحول کو جگمگا رکھا تھا۔ روشنی اتنی زیادہ تھی کہ زمین پر پڑی سوئی بھی ڈھونڈنا مشکل نہ تھی۔ سبطین شاہ اپنے خصوصی مہمانوں سے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ انہیں لے کر وہ اسٹیج پر اپنی نشست خاص کی طرف بڑھے۔ اسٹیج کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سارے اسٹیج پر سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا تھا اور سینٹر میں خوبصورت رنگوں اور بیل بوٹوں سے سجا ایرانی غالیچہ تھا جو دیکھنے میں ہی بہت قیمتی لگتا تھا۔ غالیچے کے اوپر شفاف شیشے کی سینٹرل ٹیبل پر پڑی تھی جس کا چوکھٹا گولڈن تھا۔ میز کے دوسری طرف ڈارک میرون ویلوٹ کے بڑے بڑے صوفے اور سائیڈوں پر کرسیاں بچھی تھیں صوفوں کے نرم و گداز کشنوں میں آدمی دھنستا چلا جاتا تھا۔ سینٹرل ٹیبل کے عین اوپر خوبصورت فانوس روشن تھا، شاہ صاحب اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لڑانے لگے اور اندر سے سلطان بخت کی غیر حاضری پر پیچ و تاب کھاتے رہے۔

صوفی صاحب اسٹیج سے نیچے ہال کے بیرونی دروازے تک بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے تھے۔ وہ شام کو ہی شاہ صاحب سے مل چکے تھے۔ اس لیے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، انہوں نے ذرا گردن موڑ کر دیکھا۔ عبدالمبین ان کے بائیں طرف پڑی تیسری کرسی پر چپکے سے آکر بیٹھ گیا تھا۔ صوفی صاحب نے اسے گھور کر دیکھا وہ ان کی تاکید کے باوجود خاصا لیٹ آیا تھا مگر وہ ان کی "گھوری" کو نظر انداز کیے سامنے اسٹیج پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ صوفی صاحب نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا۔

"پتا نہیں اس گدھے کو کب سمجھ آئے گی۔" وہ جھنجلا کر لبوں میں بڑبڑائے۔ جلیل اسٹیج کے دائیں طرف کونے میں گھس کر کھڑا تھا۔ انہوں نے اسے آنکھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا، وہ فی الفور ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ جلیل کی اس خوبی پر تو جان دیتے تھے۔ بوتل کے جن کی طرح ہر وقت ہر جگہ دستیاب ہو جاتا تھا۔

"اس عبدالمبین کے بچے سے کہو، جا کر شاہ صاحب کو سلام کر کے آئے۔ آگ چوڑا ہو کر کرسی پر ڈھے گیا ہے۔ الو خبیث۔" وہ غصے سے دانت کچکچا کر دھیمی ٹون میں بولے۔ جلیل ان کا پیغام لے کر عبدالمبین کے پاس چلا گیا۔ صوفی صاحب کا حکم سنتے ہی عبدالمبین اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا، وہ اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ اس نے دوبارہ گردن موڑ کر جلیل سے کچھ کہا۔

"وہ جی عبدالمبین کہتا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ آئیں۔" جلیل نے پاس آکر پیغام دیا تو صوفی صاحب تلملا کر رہ گئے اور پھر ناچار انہیں اٹھ کر اسٹیج کی طرف بڑھنا پڑا۔ عبدالمبین بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

"حد کر دی شاہ صاحب! آپ نے بھی۔ صرف چار دنوں بعد آپ کی فلائٹ ہے جدہ کے لیے۔ ہم نے تو آپ کے اعزاز میں عشائیہ دینا تھا اگلے ہفتے دولہا صاحب کے ہمراہ۔" آفریدی صاحب سبطین شاہ سے کہہ رہے تھے۔

"مجبوری ہے نا آفریدی صاحب! معلوم تو ہے سب آپ کو۔" شاہ جی سامنے آتے صوفی صاحب کو یکسر نظر انداز کر کے بولے۔

"واپسی کب تک ہوگی؟"

"انشاء اللہ چار ماہ بعد بشرط زندگی۔" شاہ جی مسکرائے "زندگی نے وفا کی تو آپ کی دعوت ادھار رہی۔"

"السلام و علیکم شاہ صاحب۔ مبارک ہو۔" صوفی صاحب نے اسٹیج پر آگے بڑھ کر شاہ جی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو سبطین شاہ کو با دل نخواستہ ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور بے دلی سے ہاتھ بھی تھامنے پڑے۔

"و علیکم۔ خیر مبارک۔" انداز لٹھ مار سا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے صوفی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے تھے دوسرے پل پھر آفریدی صاحب کی طرف رخ موڑنے لگے۔

"شاہ جی! یہ عبدالمبین آیا ہے آپ کو سلام کرنے۔" صوفی صاحب ملتجیانہ انداز میں انہیں متوجہ کرتے ہوئے بولے۔

"ہوں۔" شاہ جی نے ابرو اچکا کر عبدالمبین کو بڑی نخوت سے دیکھا اور مصافحے کے لیے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو قطعاً" نظر انداز کر دیا۔

"تمہارا بڑا بیٹا نہیں آیا صوفی۔" ان کا لہجہ حقارت بھرا تھا۔

"جی وہ آجائے گا آج رات یا......" صوفی صاحب اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھے گڑبڑا کر رہ گئے۔

"جھوٹ مت بولو۔ اتنی لمبی داڑھی کے ساتھ جھوٹ تمہارے منہ پر جچتا نہیں۔ بیٹے کو کمشنر بنوانے جا رہے ہو جو اس پر گاؤں کی ہوا ممنوع قرار دے دی ہے۔ بڑے پر پرزے نکال لیے ہیں تم جیسے لوگوں نے۔" سبطین شاہ اپنے منصب سے بہت نیچے آکر بات کر رہے تھے مگر انہیں شاید اس کی خبر نہیں تھی۔

"نہیں جی۔ وہ تو اس کے امتحان......" صوفی صاحب کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑے شاہ جی کے یہ روٹھے روٹھے انداز دیکھ کر "اب آئے گا تو جی ادھر گاؤں ہی میں اسکول میں آپ ماسٹر لگوا دیں اسے۔" وہ ہکلا ہکلا کر بول رہے تھے۔ عبدالمبین کے لیے ان کا یہ انداز اجنبی تو نہیں تھا۔ بچپن سے شاہوں کے سامنے اپنے باپ اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کو پاؤں پڑ کر بات کرتے دیکھتا آیا تھا مگر پھر بھی آج اسے اس ماحول، اس فضا میں بڑے شاہ کا اتنا حقیر رویہ اور بابا صاحب کا گڑگڑانے والا انداز بہت برا لگا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ ماسٹر لگوا دوں جیسے وہ لگ ہی جائے گا۔" وہ نفرت سے بڑبڑائے تو صوفی صاحب الٹے قدموں ہو لیے۔

"آفریدی صاحب! دیکھا آپ نے۔ یہ نتیجہ ہے چار حرف پڑھنے کا۔ ذرا ان لوگوں کو الف ب کی پہچان ہوئی نہیں، یہ اپنی اوقات بھول کر نکل پڑتے ہیں دنیا فتح کرنے۔ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ یہ مولوی، اس کا گھر میں ناک تک اناج سے بھروا دیتا ہوں۔ کھاتے ہمارا ہیں۔ یہ کمی لوگ اور چوری چوری ہمارے ہی راج میں نقب لگانے

کی تیاری کرتے رہتے ہیں۔ آستین کے سنپولیے۔ علم بٹتا ہے تو عقل بھی بانٹو ان پیدائشی جاہل لوگوں میں۔ اپنے گریبانوں میں جھانکنا بھی سکھاؤ ان کیڑے مکوڑوں کو۔ ہونہہ۔"

سبطین شاہ کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تیر تھا۔ صوفی صاحب اپنی نشست پر جا کر دوبارہ اسی عقیدت مندی سے اسٹیج پر بیٹھے اپنے "ان داتا" کو دیکھنے لگے اور ماتھے پر آیا پسینہ اپنا عمامہ نیچے کر کے اسی میں جذب کرنے لگے مگر عبدالمبین اسٹیج کے پیچھے بنی جگہ پر کھڑا ان کی نفرت کا زہر اپنے اندر اتار رہا تھا۔

"چھوڑیں شاہ جی! آپ کیوں اپنا فشار خون بڑھاتے ہیں۔ یہ تو چھوٹے لوگ ہیں۔ تھالی میں زیادہ ڈال دو تو منہ کو آنے لگتے ہیں۔ ہاں خالی تھالی میں ہڈی ڈال دو تو دنوں اسی کو چوستے رہتے ہیں۔ ان کو جتنا زیادہ دو گے یہ اتنا ہی سر پر چڑھیں گے۔ ان کا علاج یہی ہے کہ انہیں ان کی اوقات سے بڑھ کر منہ نہ لگاؤ۔ میرا تو یہی طریقہ کار ہے۔" آفریدی صاحب بھی شاید ان "چھوٹے لوگوں" سے عاجز تھے فوراً بولے۔

"بس آفریدی صاحب! دل بڑا ہلکا ہے میرا۔ فوراً ان کی کسمپرسی پر رحم آجاتا ہے۔ کچھ خدا کا خوف کہ چلو خدا نے اتنا جو دیا ہے اس کا صدقہ سہی۔"

"شاہ جی! تمہیں اپنے ان جملوں پر کبھی پچھتانا پڑے گا بہت زیادہ۔ کاش تم اس دن کو دیکھنے کے لیے زندہ رہو تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ چھوٹے لوگ کیسے ہوتے ہیں اور ان کو اگر تھالی بھر کر بھی دو تو کبھی بھار وہ تھالی کو تم جیسوں کے منہ پر الٹا بھی دیتے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گا ایک دن کہ بھری تھال پہ چھوٹے لوگ کیسے منہ پر دے مارتے ہیں جس کا مان تمہیں زمین پر ڈھنگ سے چلنے بھی نہیں دیتا۔ تم زمین کے خدا ہو تو آسمان پر بھی کوئی خدا موجود ہے۔ ایک دن تمہیں بتاؤں گا۔"

سبطین شاہ کے ریمارکس نے عبدالمبین کے اندر آگ سی بھڑکا دی۔ ایک لاوا سا کھولنے لگا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ خود پر قابو پانے کے لیے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

رات جب بارش تڑپ کر روئی
تو ہوائیں چیخ چیخ رہیں
مگر خوشبو نے
اپنی ساری پھول پتیاں
اجاڑ رستوں کے حوالے کر دیں

"کاش میں نے کبھی جنم نہ لیا ہوتا نہ پیدا ہوئی ہوتی اور اگر پیدا ہو گئی تھی تو کب کی مر کھپ چکی ہوتی اور آج ایک بھولی بسری کہانی بن چکی ہوتی۔"

یہ دعا بھی بی بی مریم نے اپنے لیے مانگی تھی جس پر خدا نے ان کی تسلی کے لیے فرشتے کو پیامبر بنا کر بھیجا تھا کہ وہ اپنے ہونے پر شرمندہ نہ ہوں کہ ان کے وجود سے جنم لینے والا خدا کا نیک بندہ ایک انسانیت کے درد کا مداوا بنے گا۔ مگر وہ تو مریم نہیں تھی نہ اتنی پاک نہ پرہیزگار نہ اتنی خدا رسیدہ کہ اس دعا کے جواب میں خدا اس کے لیے آسمان سے فرشتے روانہ کر دیتا۔ وہ تو اس خاکی زمین کی ایک عام سا خاکی وجود تھی جس کا وجود ہی آج اسے عمر بھر کے لیے اپنی نظروں سے گرا گیا تھا۔

"کاش انسان کو وجود کے بغیر پیدا کیا گیا ہوتا۔" آنسو بھری آنکھوں نے سر اٹھا کر جگمگاتے ستاروں سے مزین خاموش تماشائی آسمان کو دیکھا۔

یا کم از کم عورت کو بے بدن پیدا کیا ہوتا کہ اس کا اپنا بدن اس کے لیے ساری زندگی کسی دشمن کی طرح صف آرا رہتا ہے۔ وہ اپنی روح کی پروان کی طرف کیا دھیان کرے۔ جنم دن سے لے کر مرن دن تک اس کا بدن ہی تو اسے اپنی طرف زیادہ متوجہ رکھتا ہے۔

بچپن ہے تو پھول سا کھلا بدن۔ جوان ہوتی ہے تو یہی بدن اس کی زندگی اس کی سلامتی کے لیے ہر لمحہ ایک ایٹم

بم بنا رہتا ہے۔ کس لمحے ان دیکھے بے درد ہاتھ اس ایٹم بم کے دھماکے سے اس کی ہستی کو مٹا ڈالیں پھر اسی بدن میں تو اس کی اپنی دلچسپیوں اپنے شوق کے ہزار دریچے وا ہوتے ہیں۔ سجنا سنورنا خود کو آئینے میں رخ بدل بدل کر دیکھنا اور خوبصورت جوان جسم کو دیکھ دیکھ کر خود ہی محظوظ ہونا یہ ہمہ وقت کا دھیان اسے کب اسی بدن کے اندر چھپی پیاسی توجہ کی بھکارن روح کی طرف دیکھنے دیتا ہے۔

یہ بدن ساری زندگی روح کے حق کا غاصب بنا رہتا ہے۔ سب سے بڑا دشمن بھی سب سے بڑا حبیب بھی! اور پھر مرن دن تک وہ اسی بدن کو سنوار سنوار کر اپنے مرد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے سو جتن کرتی رہتی ہے اور عمر کی بڑھتی پرچھائیوں کو جھٹلانے کے لیے مصنوعی سہاروں سے چمٹی رہتی ہے تا آنکہ لمحہ اجل آپہنچتا ہے تو اسے اس دکھی روح کا احساس ہوتا ہے جس کی طرف اس نے زندگی کی بہاروں میں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ہوتا تو جانو اس شخص کا کیا حال ہو جس کو تا عمر کی جستجو کے بعد منزل نظر آئے اور اسے چھونے کا اذن بھی نہ مل سکے۔

اور یہ تو احوال ہوا اس عورت کا جو تمام عمر بدن کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ اسی میں گم ہو کر دھیان کی دنیا گم کر بیٹھتی ہے مگر وہ جس کا بدن ایٹم بم کی طرح پھٹ کر رہتے ہیں اس کے وجود زمین کے پرخچے اڑا ڈالے اس کے درد کا اندازہ کون کر سکتا ہے اور ایسے میں نہ تو آسمان پھٹتا ہے نہ زمین شق ہوتی ہے نہ تارے ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ نہ پرندے سہم کر شور و غل کا طوفان اٹھاتے ہیں۔ بس چپ چاپ کوئی جیتے جی مر جاتا ہے اور مناظر فطرت چپ چاپ تماشا دیکھتے چلے جاتے ہیں۔

"کاش میں ابو جی کے ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔ کاش ان کی آئی مجھے آگئی ہوتی۔" لایعنی سوچوں کو جھٹک کر وہ گھٹنے کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کس قدر تکلیف دہ لمحے تھے جب اس کی آنکھ کچرے کے اس ڈھیر کے نیچے کھلی تھی۔ چند لمحے تو وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کہاں ہے۔ زمین کے اوپر یا زمین کے نیچے اپنی لحد میں یا آسمانوں کے اوپر۔ اس کے چاروں اطراف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گھنگھور خاموشی اور جو بدبو کا طوفان اس کے ناک کے نتھنوں سے دماغ میں گھس رہا تھا اسے لگ رہا تھا اس کا دماغ چند لمحوں ہی میں پھٹ جائے گا۔ نامعلوم وہ کب سے۔ زندہ بھی تھی یا نہیں اور اگر تھی تو کب سے؟ اگر اس کی سانسیں چل رہی تھیں تو اس قاتل جان مشک بد تعفن کے ہاتھوں وہ اب تک مر کیوں نہیں گئی اس نے جسم و جاں کی تمام طاقتوں کو یکجا کر کے اپنے اوپر پڑے غلاظتوں کے ڈھیر کو پرے جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یا اللہ میں کہاں ہوں۔" گھومتے سر کو تھامتے ہوئے اس نے بمشکل تمام چاروں طرف دیکھا۔ سامنے، دائیں بائیں چاروں طرف دیواریں ہی دیواریں تھیں اور وہ کوڑے کے ڈھیر میں کوڑے ہی کی چھوٹی سی ڈھیری لگ رہی تھی۔ ماحول کا اندازہ ہوتے ہی اسے خود سے گھن آنے لگی۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی مگر اگلے لمحے اسے پھر سے اسی ڈھیر میں خود کو چھپانا پڑ گیا۔ اس کے بدن پر تو کپڑے کی ایک دھجی تک نہ تھی۔

"یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا۔" اسے ایک دم سے کسی بہت بڑے نقصان کا احساس ہوا۔ اس نے کوڑے کے ڈھیر کو ٹٹولا۔ اس وقت گزرے ہوئے وقت یا آنے والے خطرے کا احساس نہیں تھا صرف بدن کو ڈھکنے کا سوال تھا ستر پوشی جو انسان کا سب سے پہلا احساس تھا۔ بھوک سے بھی پہلے آدم اور حوا نے اپنے بدن کو چھپانے کے لیے پتوں کا لباس پہننا بے حد ضروری سمجھا تھا۔ اس وقت اسے بھی صرف اپنے جسم کو چھپانے کا خیال تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح کوڑے کے ڈھیر میں اس کی غلاظتوں کا احساس کیے بغیر ہاتھ مارے جا رہی تھی۔ اس کی چند منٹوں کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ اس کے ہاتھ اپنے کپڑے آگئے تھے۔ تاروں کی روشنی ان کو پہچاننے کے لیے کافی تھی۔

"میں یہاں کیسے پہنچی۔" وہ کوڑے کے ڈھیر میں مسلا ہوا لباس پہن کر پلاٹ کی دیوار کے ساتھ سکڑ کر بیٹھ گئی۔

"میں تو شاپنگ کرنے نکلی تھی اور......" اس نے زمین پر دونوں ہاتھ مارے۔

"رحیم! اللہ تجھے تباہ کرے جس طرح تو نے میری زندگی برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ او میرے اللہ او میرے

خدا میں کدھر جاؤں، کس سے کہوں میرے ساتھ کیا ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم میرے ساتھ کیا ہو گیا۔" عجیب سا احساس زیاں ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیا ایسے بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی عورت اتنی شقی القلب بھی ہو سکتی ہے اس قدر ظالم۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا تیرا میرا رشتہ ہی کیا تھا۔ بھلا ظالم بد بخت عورت...... یا اللہ میں کیا کروں۔ میں کس کس کے آگے صفائیاں پیش دوں گی۔ میں اسی ڈھیر کے نیچے مر کیوں نہیں گئی۔ کیوں میں اتنی سخت جان ثابت ہوئی۔ کیوں میں یہ سب ذلت جھیل کر بھی زندہ ہوں۔ کون دے گا میری پاکبازی کی گواہی۔ مجھ پر یقین رکھنے والے تو منوں مٹی تلے چلے گئے۔ اس پتھر جیسے بھائی کا سامنا میں کیسے کروں گی۔ کیسے اسے اپنے دامن کے داغ دکھاؤں گی۔"

لحہ بہ لحہ شدت سے بہت کچھ کھو جانے کا احساس بڑھ رہا تھا۔ آنسوؤں میں روانی تیز تر ہوتی جا رہی تھی منہ بھینچ بھینچ کر سسکیاں روکنے سے اس کا گلا درد سے پھٹنے لگا۔

لیکن اگر آنسوؤں کی شدت اس کے دامن پر لگے داغ دھو سکتی اگر اس کا رونا چلانا اسے دوبارہ سے پہلے والی معصوم و بے گناہ نزہت بنا سکتا تو وہ رو رو کر دریا بہا دیتی مگر ان آنسوؤں کی رائیگانی کا احساس اس کے درد کو اور بڑھا رہا تھا۔

"یا اللہ۔ میں کیا کروں کہاں جاؤں یہ کون سی جگہ ہے کون سا علاقہ ہے پتا نہیں شہر کوئی اور نہ ہو۔ میں کس کے پاس جاؤں گی۔" سوچیں بے ربط ہوئی جا رہی تھیں کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی بس تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ نکلتے تھے۔

سردی گرمی، بھوک پیاس سب احساس مٹ چکے تھے۔ خیال تھا تو صرف اپنی حالت کا۔ اپنے ساتھ بیت جانے والے حادثے کا۔ جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب زندگی کی کہانی کو کہاں سے شروع کرے اور کیسے کرے۔ جیسے بچہ پہلا قدم اٹھائے تو اسے کچھ پتا نہیں ہوتا دوسرا قدم کس سمت میں اٹھے گا۔ اٹھے گا بھی یا وہ لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔

حالانکہ سردی کافی زیادہ تھی مگر اسے کچھ احساس نہیں تھا بس سکڑی سمٹی کونے میں بیٹھی روئے جا رہی تھی سر اٹھا کر دیکھا۔ درد کی ٹیسیں سر کے پچھلے حصے میں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ لگا کر سر کے اس حصے کو چھوا تو "سی" اس کے منہ سے نکلی۔

"شاید زخم ہے ادھر" اس نے قیاس کیا مگر یہ زخم تو بھر جائے گا چند روز میں۔ اور یہ جو پورا بدن نیلا ہو گیا ہے اس کے داغ کیسے دھلیں گے۔" وہ پھر سے رونے لگی۔ اس پلاٹ میں مکمل اندھیرا تھا۔

باہر سے جو اسٹریٹ لائٹ کی روشنی آ رہی تھی۔ وہ بھی پلاٹ کو روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ سر کے اوپر آسمان سے باتیں کرتی بلڈنگ تھی یہ پلاٹ اس بلڈنگ کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف دیواریں تھیں باہر جانے کا راستہ کہیں بھی نہیں تھا۔

"اب ادھر سے کیسے نکلوں" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سانسوں کے احساس نے ستر پوشی کا احساس دلایا تھا اور زندگی کی طلب نے چھت کی ضرورت کا خیال۔

"دن نکل آیا تو ادھر سے کیسے نکلوں گی۔ ابھی تو رات کی سیاہی نے سب کچھ ڈھانپ رکھا ہے۔" اس نے اٹھ کر دیوار کی اونچائی کا جائزہ لیا ایک جگہ دیوار کے ساتھ دس پندرہ اینٹوں کی لائن لگی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے' اس پر چڑھ کر باہر کود جاؤں گی۔" وہ اینٹوں کے پاس آ کر رک گئی مگر کچھ دن نکل آئے' اس وقت پاس ہی کی مسجد سے موذن نے "اللہ اکبر" پکارا تو وہ وہیں بیٹھ کر پھر سے رونے لگی۔

کبھی وہ یہ الفاظ اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری میں سنا کرتی تھی۔ تو کبھی ان لفظوں کی گہرائی' ان کی تاثیر اور ان کی اہمیت کا اس قدر احساس نہیں ہوا تھا کہ بہت سی نعمتیں بہت سی نعمتوں کا احساس ہونے ہی نہیں دیتیں۔ چار دیواری کی نعمت نے کبھی "اللہ اکبر" کی پہلی صدا میں جو زندگی کی مہک ہے' اس کے بارے میں کبھی سوچنے ہی

نہیں دیا تھا آج اس نے اذان کا ایک ایک لفظ اس طرح تول تول کر سنا جیسے وہ اس پوری کائنات میں یہ مقدس الفاظ سننے والا تنہا اور پہلا وجود ہے۔ ہر ہر صدا پر موتی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرتے رہے جنہیں وہ ہتھیلیوں پر سجاتی رہی۔ کوئی دعا اسے یاد نہیں آ رہی تھی بس اذان کی گونج دار آواز کا احساس ہی ہر احساس پر حاوی تھا۔

"ہاں ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ اگر خدا مجھے مارنا چاہتا تو اسی ڈھیر کے نیچے مار دیتا شاید میرا کچھ خاص کام ابھی کرنا باقی ہے۔ میرے خدا تو میرا گواہ ہے اور تو ہی حاکم اعلا ہے میرے بارے میں ایسا فیصلہ کبھی نہ کرنا جو مجھے از خود زندگی سے دور لے جائے کہ میں حرام موت بد سے بدتر حالت میں بھی قبول نہ کروں گی۔" وہ دعا مانگ کر کچھ مطمئن سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

اسے اپنے وجود سے اٹھتی بدبو کا احساس ہوا' اس نے سر جھٹک دیا۔ "ظاہر ہے گندگی کے ڈھیر سے نکلو گے تو بدبو کے بھبکے ہی اٹھیں گے خوشبو تو آنے سے رہی اور جب یہ ناقابل برداشت بدبو دنیا سونگھے گی تو کون اس کا ایک پل کا ساتھ بھی گوارا کرے گا کون؟"

کیپٹن شہباز کی شبیہہ اس کی آنکھوں کے آگے لہرائی تو وہ جیسے ڈھے جانے کو تھی۔ اس کے قدموں سے جان نکلنے لگی۔ اسے ٹہلتے کافی وقت گزر گیا اور آسمان کی سیاہی میں ہلکی سی نیلاہٹ گھلنے لگی وہ کچھ دیر کھڑی اس نیلاہٹ کو دیکھتی رہی پھر "بسم اللہ" پڑھ کر اینٹوں کی اس لائن کی طرف قدم بڑھایا۔ بچپن کے اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اس طرح کے ایڈونچر کا اسے پہلی بار تجربہ ہو رہا تھا۔ اینٹیں اس کے قدموں تلے لرزیں اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار کو مضبوطی سے تھام لیا اور ذرا سا سر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھا۔

باہر سڑک تھی اور کہیں کوئی ذی روح دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ اس نے پورا زور لگا کر اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور دیوار پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ اگلے پل دیوار سے نیچے سڑک کے کنارے کود گئی۔ تکلیف کے شدید جھٹکے کا احساس ہوا مگر اگلے پل وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی چادر کو اچھی طرح اپنے وجود کے گرد لپیٹا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

• • • • •

وہ کئی دن سے محسوس کر رہی تھی بلکہ دیکھ رہی تھی کہ فخر حیات کچھ الجھے الجھے اور پریشان سے دکھائی دے رہے ہیں۔ رعنا ان سے پوچھتی تو وہ صاف ٹال جاتے۔ "تمہیں وہم ہوا ہے ایسی تو کوئی بات نہیں۔" کہہ کر وہ جگہ ہی چھوڑ جاتے۔ مگر ان کے اس طرح کہنے سے نہ تو رعنا کی تسلی ہوتی نہ فخر حیات اسے کسی بھی لمحے ریلیکس محسوس ہوتے گھر میں رہتے تو فون' موبائل ہمہ وقت ان کے کان سے لگا رہتا یا فون کے انتظار میں ٹہل ٹہل کر کمرے کی لمبائیاں ناپتے رہتے۔ کئی بار رعنا کی رات کو آنکھ کھلتی تو بیڈ پر چت لیٹے چھت کو گھور رہے ہوتے۔ رعنا کے سیدھے ہوتے ہی جھٹ سے آنکھیں بند کر کے سوتے بن جاتے۔ اکثر رات کو اس نے انہیں کھڑکی میں کھڑے اندھیرا کھوجتے دیکھا تھا۔

"ادھر کیوں کھڑے ہیں؟" وہ پریشان ہو اٹھتی۔

"ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ تم سو جاؤ۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیتے۔

"آپ کو نیند نہیں آ رہی تھی تو مجھے جگا دیتے۔" وہ بیڈ سے اتر کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہونا چاہتی تو وہ فوراً پلٹ کر بستر پر آ لیٹتے۔

"خوامخواہ تمہیں کیوں تکلیف دیتا۔ تم گہری نیند سو رہی تھیں اور اب ویسے بھی مجھے نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤ تم بھی۔" وہ جھٹ سے سونے کے لیے آنکھیں بند کر لیتے۔ رعنا لب بھینچ کر انہیں تکے جاتی۔

"فخر! آخر کیا بات ہے۔ کیا پریشانی ہے آپ کو۔ ایسا کون سا مسئلہ ہے جو آپ مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے۔

اس طرح آپ کی صحت بھی گرتی جا رہی ہے۔ آئینے میں خود کو دیکھیں کس قدر کمزور لگ رہے ہیں اور آنکھوں کے گرد کیسے حلقے پڑ گئے ہیں۔ میں آپ کے بارے میں فکر کیوں نہ کروں۔ میں آپ سے الگ ہوں کیا؟" کل رات بھی انہیں سپاٹ چھت کو دیکھتے پا کر رعنا ان سے فیصلہ کن بات کرنے کے لیے اٹھ بیٹھی کہ آج ان سے اصل بات معلوم کر کے ہی رہے گی۔ معاملہ اب اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا پراسرار رویہ کب دیکھا تھا اس نے فخر حیات کا۔

"رعنا! پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔" ان کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔ رعنا اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"فخر!" کافی دیر بعد اس کے منہ سے محض یہی نکل سکا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔

"آپ کی یہ بے سکون حالت مجھے جو مینٹلی ڈسٹرب کر رہی ہے' اس کا اندازہ ہے کچھ آپ کو۔" شکوہ اس کے لبوں سے کیا پھسلا آنکھیں زار و قطار رونے لگیں۔ بہت دنوں کا دبا ہوا لاوا جیسے پھوٹ نکلا تھا۔ فخر حیات اسے خاموشی سے روتے سنتے رہے کہ آنکھیں تو انہوں نے ابھی بھی نہیں کھولی تھیں۔ وہ کتنی دیر یونہی آنسو بہاتی رہی۔ فخر حیات پر اس کی اشک شوئی کا کچھ اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتا نہیں ان کا دل اس قدر پتھر کیوں ہو چلا تھا اور یہ احساس ہی جان لیوا اور انتہائی تکلیف دہ تھا کہ محبوب بیوی پاس بیٹھی آنسو بہاتی رہے اور اس کی ایک آہ پر جان لٹانے والا شوہر برف کی سل بنا لیٹا رہے۔ اس خیال نے جیسے رعنا کو کسی بچھو کی طرح ڈنک مارا۔

کیا فخری میری فیلنگز سے اس حد تک بے نیاز ہو چکے ہیں کہ انہیں میرے آنسو بھی پانی کے بیکار قطروں سے بڑھ کر نہیں لگ رہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر اپنا منہ اور آنکھیں صاف کر لیں۔ اس کا چہرہ اور ناک کی نوک خوب رونے سے سرخ انار کی طرح دہکنے لگی تھی اور آنکھوں میں غم ناک لالی تیر رہی تھی۔ فخر حیات نے آنکھوں کے جھروکوں سے عزیز از جان بیوی کے پرسوز روپ کو دیکھا اور ایک طویل گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔

"فخر! آپ کو بتانا ہو گا آج کہ کیا بات ہے۔ آپ کی یہ چپ میری جان لے لے گی۔ اگر آپ نے آج بھی کچھ نہ بتایا تو...... تو......" وہ کوئی سخت بات کہتے کہتے رک کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

"رعنا! خدانخواستہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جس پر تم میری' اپنی جان لینے کی بات کرو۔" فخر حیات کہنیوں کے بل پیچھے کھسک کر اٹھے اور تکیہ اونچا کر کے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولے۔

"اور ڈیئر! بات اگر کوئی ہے بھی تو تم فکر نہ کرو' تمہیں شامل کیے بغیر میں کسی بھی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں خود تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا بس اتنے دنوں سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ کوشش کر رہا تھا کہ کچھ بات بن جائے جیسے ڈوبنے والا ڈوبنے سے پہلے آخری کوشش کے طور پر خوب ہاتھ پاؤں مارتا ہے' بالکل ایسے ہی میں نے بھی بہت کوشش کی...... کہ......" انہوں نے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے گھنگھریالے بالوں میں پھنسائیں' چہرے پر ہنوز گہری سوچ اور سنجیدگی کے بادل تھے۔

"ک...... کیسی کوشش؟" رعنا کا رنگ اڑ سا گیا۔ اس کا دل یک بیک تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ "کیا۔ کیا ہو گیا ہے فخر! کیا ہونے والا ہے۔" وہ بری طرح سے ہراساں لگ رہی تھی۔

"او ڈیئر! کام ڈاؤن۔ ایسی سیریس بات کوئی نہیں ہے۔ بس تم تھوڑا سا ویٹ کر لو کل شام تک میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا۔ پھر جو تمہارا مشورہ ہو گا وہی کریں گے۔" فخر حیات نے دھیرے سے اس کا کندھا تھپکا۔

"فخر! کیسی بات ہے۔ پلیز بتائیں مجھ سے کل شام تک انتظار نہیں ہو گا۔ کل میں اور آج میں کیا فرق ہے' ویسے بھی ڈیڑھ بج رہا ہے رات کا۔ نیا دن تو طلوع ہونے ہی والا ہے۔" رعنا بے قراری سے بولی۔

"خدا کرے یہ دن واقعی نیا ہو۔" فخر بڑبڑائے۔ "رعنا! یوں بے قراری مت دکھاؤ۔ خود کو کمپوزڈ رکھو۔ خود کو اس طرح آؤٹ آف کنٹرول کرو گی تو کیا پتا زندگی میں کبھی کوئی اس سے بھی کڑا امتحان آ پڑے' پھر کیا کرو گی۔ اپنے

اعصاب پر قابو پانا سیکھو۔" ان کا انداز ناصحانہ تھا۔

"ابھی تک آپ کو میری قوت برداشت کا اندازہ ہی نہیں ہوا جو سانحہ میرے ساتھ بیتا ہے۔ کیا زندگی کے دامن میں اس سے بھی کڑا امتحان ہے باقی۔" رعنا تلخی سے بولی اس کی آنکھوں کے گوشے از سر نو بھیگنے لگے تھے۔ "کیا میرے اعصاب کی مضبوطی کو آپ اب بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اتنا سب کچھ بیت جانے کے بعد بھی۔"

آنسو تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ فخر حیات نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

"مجھے تم پر تمہارے اعصاب کی مضبوطی پر کوئی شک نہیں' میری جان! زندگی دراصل امتحانوں کا سلسلہ ہے ایک کے بعد دوسرا۔ کوئی چھوٹا تو کوئی بڑا اور ان کے وزن کا اندازہ بھی ہماری قوت برداشت ہی سے ہوتا ہے۔ اب جو حالات ہمیں آئندہ درپیش آئیں گے' وہ بھی انہیں امتحانوں کی ایک کڑی ہوں گے اور تم نے مشکل سے مشکل وقت کو بھی بڑی ہمت سے سہا ہے۔ مجھے معلوم ہے بلکہ مجھ سے زیادہ کسے معلوم ہو گا۔"

وہ اس کے بال سہلا رہے تھے' اس کے آنسوؤں سے فخر حیات کے گاؤن کا کندھا بھیگا جا رہا تھا۔ "Please dont weep" (مت رو) انہوں نے ذرا جھک کر انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کیے۔ "کل شام کو ہم کسی پرسکون جگہ پر چل کر بیٹھیں گے پھر میں تمہیں سب بتا دوں گا اور کوئی خدانخواستہ بڑا طوفان نہیں آنے والا بس......" وہ چپ کر گئے۔

"تم فکر مت کرو۔ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔ اب تم سو جاؤ کیونکہ مجھے صبح جلدی بلکہ بہت جلدی نکلنا ہے۔ گھر سے تقریباً چھ بجے کے قریب' اس لیے مجھے کچھ دیر آرام کر لینے دو۔ کل کا دن فیصلہ کن ہو گا۔ لیٹ جاؤ اب۔" کہتے ہوئے انہوں نے آہستگی سے اس کا سر اپنے کندھے سے ہٹایا اور خود تکیہ درست کر کے لیٹ گئے۔ رعنا نے ایک نظر انہیں دیکھا اسے معلوم تھا اب چاہے وہ جتنی مرضی ضد کر لے فخر اسے کچھ نہیں بتائیں گے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ فخر حیات تھوڑی دیر میں ہی کروٹ بدل کر شاید سو گئے۔ اسے یہی لگا خود اسے بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدل بدل کر وہ اس رات کو سرکانے کی کوشش کرتی رہی صبح کے قریب اسے نیند آ ہی گئی۔

اگلا سارا دن اس نے بہت بے قراری سے گزارا۔ گھر سے باہر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گیارہ بجے تو وہ سو کر اٹھی تھی۔ فخر حیات جا چکے تھے۔ سیفی بھی اسکول جا چکا تھا اور اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور بہت عرصے بعد اس نے معمول کے خلاف اورنج جوس کے بجائے اسٹرونگ چائے کا ایک کپ لیا۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس یہی بات ذہن کو کھائے جا رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا معاملہ ہے۔ کب شام ہو کب اس الجھن سے چھٹکارا ملے۔ وہ سارا دن خود سے الجھتی رہی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں۔ لاؤنج سے لان میں۔ واکنگ میں سے اسٹڈی میں۔ کہیں بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ حالانکہ آج اس کو صبح میں پارلر بھی جانا تھا اور شام میں ان کی این جی او نے چائلڈ لیبر کے خلاف ایک واک کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں شامل ہونے کا اس کا اب کوئی ارادہ نہیں تھا۔

دو بجے کے قریب عفت آرا کا فون آ گیا۔ "شکر ہے وہ خود نہیں آ گئیں۔" فون اٹینڈ کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ وہ تو عفت آرا کا فون بھی اٹینڈ نہ کرتی۔ اسے تو فخر حیات کے فون کا انتظار تھا۔ اس بے تابی میں اس نے سی ایل آئی پر آئے نمبر پر بھی دھیان نہیں دیا۔

"بی بی! ہم ہی فون کریں تو کریں۔ تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ ایک کال کر کے غریب بھائی بھاوج کی خیر خبر ہی لے لوں۔ ادھر موئے بلوں نے جان سولی پر لٹکا رکھی ہے۔ بجلی کے بل اور فون کے بل تو آسمانوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان بلوں کو دیکھنے سے پہلے بندہ طاقت کے انجکشن لگوائے۔ پر بی بی! یہ تو ہم غریبوں کی پریشانیاں ہیں۔ تم جیسوں کے لیے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں پھر بھی تمہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ خود سے فون کر کے بندہ پوچھ ہی لے کہ جیتے ہو یا مر گئے۔"

وہ سانس لیے بغیر سلام دعا سے بے نیاز نان اسٹاپ شکووں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئیں۔ پہلے تو رعنا کا دل چاہا لائن ڈس کنکٹ کر کے ریسیور سائیڈ پر رکھ دے مگر اسے معلوم تھا۔ اس کا فائدہ کیا الٹا نقصان ہی ہو گا۔ وہ خود چل کر گھر آجائیں گی۔ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے۔ ایسا دوبارہ وہ پہلے بھی کر چکی تھیں اور اس کا انجام رعنا ان کی چار پانچ گھنٹوں کی میزبانی کر کے بھگت چکی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اس بار کمبخت فون کا بل ہی چار ہزار آیا۔ لو بھلا بتاؤ۔ ہم کون سا لندن یا دبئی فون کھڑکاتے ہیں جو ہزاروں میں بل آیا شہر میں ہمارے ایسے کون سے احباب کی لائن لگی ہے۔ جن سے بات کیے بغیر ہمیں چین نہیں پڑتا۔ ایک تم ہی تو ہو اور وہ بھی میں تمہیں فون کروں تو کروں۔ تمہارے بھائی تو وہ بھی نہیں کرتے۔ اب تمہیں ایسی بھاوج کہیں ملے گی جو بھائی سے زیادہ تمہاری پروا کرتی ہو۔" وہ اسے جتاتے ہوئے بولیں۔

"نواز بھائی ٹھیک ہیں؟" عفت آرا کے سانس لینے کو غنیمت جان کر رعنا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں ان کو کیا ہونا ہے۔ جو ہونا ہے ہماری جانوں کو ہی ہونا ہے۔ چار ہزار فون کا بل، سات ہزار بجلی کا بل، ایک ہزار گیس کا بل، بچوں کے اسکولوں کی فیسیں، ان کی وین کی فیس، ٹیوشن فیس، گھر کا خرچ، دودھ کا بل، اخبار والے کا بل، جمعدار کا بل، کپڑے دھونے والی ماسی کا بل۔ رعنا! تم جانو میں تو جلد ہی ان بلوں کی وجہ سے پاگل ہو کر کسی جنگل میں نکل جاؤں گی اور تمہارے بھائی چند ہزار لا کر پہلی کو میری ہتھیلی پر رکھتے ہیں تو گویا اپنے تئیں انہوں نے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ ان چند نوٹوں کو ٹھکانے لگانے میں چند دن کیا گھنٹے بھی نہیں لگتے اور پھر وہی فقر و فاقہ مگر تمہیں ان باتوں کا بھلا کیا پتا۔ تم تو عیش کی زندگی گزار رہی ہو۔ اللہ جانے ہماری کب سنے گا۔"

عفت آرا رعنا کی کوفت کا خیال کیے بغیر، بغیر کومے اور فل اسٹاپ کے بولے جا رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ کسی کا خیال کم ہی کرتی تھیں اور بھلا رعنا کو ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس کے اپنے اکاؤنٹ میں جتنی رقم تھی۔ اس نے کبھی اس کا حساب رکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک تو پہلے ہی وہ رات سے پریشان تھی۔ اوپر سے عفت آرا کی فضول گفتگو۔ اس کا دل چاہا فون اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارے۔

"بھابھی جان! اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں آرام کرنے جا رہی ہوں۔" وہ جتنی بیزاری اپنے لہجے میں سمو سکتی تھی سمو کر بولی۔

"خیریت؟ کیا ہوا طبیعت کو...... نصیب دشمناں۔" انداز صریحاً طنزیہ تھا۔

"سر میں شدید درد ہے اور کچھ ٹمپریچر بھی فیل ہو رہا ہے۔" وہ اسی بیزار لہجے میں بولی۔

"موسم جو بدل رہا ہے۔ تم کہو تو میں آجاؤں۔ تم آرام کرنا۔ گھر کی دیکھ بھال میں کر لوں گی۔" ان کی فی سبیل اللہ خدمت کی عادت نہیں بدل سکتی تھی۔

"جی نہیں شکریہ۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ملازم موجود ہیں۔ مجھے گھر کی فکر نہیں ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"چلو اچھی بات ہے۔ تمہیں اپنوں سے زیادہ نوکروں پر بھروسا ہے۔" بات میں سے منفی ترین پہلو کھوجنا عفت آرا کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ رعنا نے غصے کا گھونٹ بھرا مگر خاموش رہی۔

"خیر میں تمہارے آرام میں مخل نہیں ہوں گی۔ اس وقت فون میں نے تمہیں ایک کام سے کیا تھا۔" خلاف معمول وہ جلد ہی اپنے لہجے کی ٹون بدل کر بولیں۔

"جی سن رہی ہوں میں۔" جب وہ کافی دیر تک کچھ نہ بولیں تو رعنا کو کہنا پڑا۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ میں نے دو سال پہلے اوپر والا پورشن بنوانا شروع کیا تھا۔ نیچے تو چلو گھر ہماری ضرورت کے مطابق ہی ہے اگرچہ تمہارے محل کے آگے فقیر کی کٹیا ہی لگتا ہے۔ مگر خیر ہم غریبوں کو یہی محل لگتا ہے۔"

رعنا کو حسرت ہی رہی کہ عفت آرا بھی اپنی زندگی میں کبھی کسی لمحے بھرپور شکر کا انداز اختیار کریں کہ جس قدر نعمتیں انہیں حاصل ہیں وہ بہت سے لوگوں کو حاصل نہیں مگر وہ ہمیشہ دوسروں کو حاصل مراعات کو دیکھ دیکھ کر اپنا کلیجہ جلاتی رہتی تھیں۔ اسی جلاپے نے انہیں ہائپر ٹینشن کا تحفہ بھی دے دیا تھا مگر انہوں نے جلنا کڑھنا ترک نہیں کیا تھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ چلو اوپر ایک پورشن ڈلوا کر کرائے پر چڑھا دوں گی۔ دو چار ہزار آجایا کریں گے یہ جو بلوں کی ادائیگی کے لیے مجھے بچوں کی ضروریات کی کھینچ کھانچ کر چھانٹی کرنا پڑتی ہے۔ اس میں کچھ سہولت ہو جائے گی۔ کام شروع تو کرا لیا مگر رستے میں آگئی پھر تمہارے بھائی صاحب کی تنگی پیسہ۔ اب پیسے کے بغیر تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تم نے جو کچھ رقم دی تھی۔ اس سے دیواریں تو ساری اٹھ گئیں۔ انہوں نے آفس سے لون لیا۔ وہ بھی اس میں اڑنچھو ہو گیا اب اتنے عرصے سے وہ دیواریں کھڑی میرا منہ چڑا رہی ہیں۔ کچھ پیسے ہاتھ میں ہوں تو میں لینٹر ڈلواؤں چلو کم از کم وہ دیواریں ہی گرنے سے محفوظ ہو جائیں۔ ان میں خدانخواستہ ایک آدھ بھی گر پڑی تو جانو کس قدر نقصان ہو جائے گا۔ ہم غریب تو کوئی بچہ بیمار پڑ جائے تو دعا کرتے ہیں کہ ایسے ہی لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جائے کجا کوئی حادثہ۔ اللہ میری توبہ۔"

ان کے فون بند کرنے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے اور رعنا کا سر اب درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ شاید آج عرصے سے قائم مروت کی دیوار ڈھے ہی جائے گی۔ اس نے اپنی کنپٹی دباتے ہوئے غصے سے سوچا۔

"بہرحال میں نے تمہیں فون کیا تھا کہ اگر تم ہمیں کچھ عرصے کے لیے تین لاکھ روپے ادھار دے دو تو تمہاری بڑی مہربانی۔ گھر کرائے پر چڑھ جائے گا تو میں ایک دو کمیٹیاں ڈال کر آہستہ آہستہ تمہارا قرض اتار دوں گی۔ پہلے بھی تم نے ہم پر بڑے احسان کیے ہیں ایک یہ بھی سہی۔ تمہیں معلوم ہے بینک سے قرض لو تو ایک آدھ سال ہی میں قرض سے دوگنا سود سر پر چڑھ آتا ہے۔ آج کل لینٹر کے لیے موسم بھی موزوں ہے۔ اگر تم ہامی بھرو تو میں اپنے آرکیٹیکچر سے رابطہ کروں ہماری کچھ مشکل تو آسان ہو گی۔ گھر کے اخراجات کی۔" خلاف معمول ان کا لہجہ عاجزانہ سا تھا۔

"میں فخر سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گی۔" رعنا نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"اتنی رقم تو تمہارے اپنے اکاؤنٹ میں بھی موجود ہو گی۔ فخر حیات سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"بھابھی! آپ کو علم ہے میں کوئی بھی کام فخر کے علم میں لائے بغیر نہیں کرتی۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"صرف ہم سے متعلقہ کام۔" وہ ہنکارا بھر کر بولیں۔ "ورنہ تو تم ہر کام میں خود مختار ہو اور فخر بھلا تمہیں کیوں انکار کرے گا۔"

پتا نہیں بعض لوگوں کی ہر بات میں کانٹے کیوں اگے ہوتے ہیں۔

"نہیں میں کوئی بھی کام فخر کو بتائے بغیر نہیں کرتی چاہے وہ مجھ سے متعلق ہو یا کسی اور سے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"اور فخر تمہیں بتائے بغیر چاہے جو مرضی کرتا پھرے اور تم اس کی مرضی کا دم بھرتی رہو۔ بی بی! اتنی بھی پتی ورتا نہ بنو۔ کچھ بیویوں والے حقوق بھی رکھو۔ کچھ اس کی بھی خبر رکھا کرو۔" پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ رعنا کی آنکھوں کے آگے فخر حیات کی آج کل کی کیفیت پھرنے لگی۔

"کہاں کھو گئیں۔ بہرحال فخر سے بات کر کے مجھے آج یا کل میں لازمی فون کر کے بتا دینا۔ میں نری آس میں ہی نہ ڈولتی رہ جاؤں پھر میں نے آگے بھی بات کرنی ہے۔" وہ خواہ مخواہ رعب جماتے ہوئے بولیں، رعنا چڑ گئی۔

"بتا دوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔" وہ ریسیور رکھ دینا چاہتی تھی۔

"چلو تم نہ بتانا۔ میں کل شام میں خود ہی چکر لگا لوں گی تمہارے بھائی کے ساتھ۔ کافی دن سے تمہاری طرف نہیں آئی۔ تمہاری طبیعت کا بھی پوچھ لوں گی۔" عفت آرا نے فٹافٹ پروگرام ترتیب دے ڈالا۔ اب رعنا انہیں آنے سے صاف منع تو نہیں کر سکتی تھی۔ بس جھنجلا کر رہ گئی۔

"او کے خدا حافظ۔" اس نے فوراً سے پیشتر فون کریڈل پر ڈال دیا اور اتنی زور سے سانس لیا جیسے صدیوں سے رکا سانس سینے سے نکالا ہو۔

"تو واز بھائی کی ہمت ہے' جو اس عجیب و غریب نمونے کے ساتھ گزارا کرتے ہیں' ان کی محض چند منٹوں کی گفتگو بندے کو پاگل کر دینے کے لیے کافی ہے۔ مائی گاڈ۔" اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا' کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔

"فخر نے فون نہیں کیا ورنہ اس وقت تک تو ان کا ایک آدھ فون ضرور آجاتا ہے۔" دو بجنے کو تھے۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور ریسیور اٹھا کر فخر حیات کے آفس کا نمبر ملانے لگی۔

"سر تو سیٹ پر موجود نہیں ہیں۔ وہ آئیں گے تو میں انہیں آپ کا میسج دے دوں گا۔" ان کا سیکریٹری بولا تو اس نے تھک کر ریسیور رکھ دیا۔

"اب کیا کروں؟" بیڈ روم میں جانے کو مطلق دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سر کا درد بڑھ گیا تھا۔

"وہ جی بیگم صیب! صاحب کا فون آیا ہے ادھر دوسرے کمرے میں' وہ شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ رات کو بہت دیر سے گھر آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ بیگم صیب کو بتا دو۔" جنتاں اندر آکر ادب سے بولی۔

"کب۔ کب آیا فون؟" وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ابھی جی' جب آپ فون پر بات کر رہی تھیں تو انہوں نے دوسرے فون پر جو کھانے کے کمرے میں رکھا ہے اس پر بات کی تھی۔ میں نے کہا کہ بیگم صیب کو بلاؤں تو وہ بولے نہیں' بس یہ پیغام دے دینا' اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں۔ رات کو دیر ہو جائے گی مجھے۔ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔" جنتاں نے تفصیل بتائی۔

"مائی گاڈ۔ وہ فون کرتے رہے اور ادھر بھابھی میری جان کھاتی رہیں۔"

"کیا فخر صاحب آؤٹ اسٹیشن گئے ہیں کہیں؟" اب کے وہ ذرا بارعب لہجے میں بولی۔

"جی میرے علم میں یہ بات نہیں ہے' وہ ایک گھنٹہ پہلے سیٹ چھوڑ کر باہر نکلے تھے اس کے بعد میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔" سیکریٹری مؤدب لہجے میں بولا۔

"اوکے۔" کہہ کر اس نے تھک کر ریسیور رکھ دیا۔

"جنتاں میرے لیے چائے کا ایک اسٹرونگ سا کپ لاؤ اور ڈرائیور سے کہو آدھے گھنٹے تک مجھے باہر جانا ہے گاڑی تیار کرے۔"

"اچھا جی!" وہ سر ہلا کر جانے کو مڑی۔ "وہ بیگم صیب آپ نے صبح سے اتنی بار تیز چائے پی ہے یہ تو صحت کے لیے....." جنتاں رعنا کی شعلہ بار نگاہوں کو دیکھ کر باقی کی ہمدردی ہونٹوں کے پیچھے دبا کر رہ گئی۔

"جاؤ یہاں سے اور زیادہ میرے بارے میں فکر مند نہ ہو' جو کہا ہے وہ کرو۔" جی۔ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"توبہ ہے لگتا نہیں' یہ بارش آج رکے گی۔ صبح سے بغیر سانس لیے برسے چلی جا رہی ہے۔ ساری شادی کا مزہ کرکرا کر دیا۔ سارا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔" سیدہ اندر باہر آتے جاتے بڑبڑا رہی تھیں۔ حویلی میں کھچا کھچ مہمان بھرے ہوئے تھے۔ ہال کمرے میں عورتیں بیٹھی تھیں۔ ہال سے ملحقہ دونوں کمرے بھی خواتین کے قبضے میں تھے۔ باہر صحن میں بیٹھنے کا بھی انتظام تھا مگر بارش کی وجہ سے وہ سارا پروگرام ٹھپ ہو گیا۔ اب مہندی کا فنکشن بھی ہال ہی میں کیا جانا تھا۔ دوسرے شہروں سے تو تمام مہمان آچکے تھے' ارد گرد کے قریبی گاؤں سے ابھی بھی اکا دکا تانگہ یا گاڑی بھر کر آرہی تھی۔

"آٹھ نو بجنے کو ہیں پتا نہیں کب شروع کریں گے یہ۔" ایک عورت بڑبڑائی اس کا گود کا بچہ روئے جا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ نہ بیٹھ سکتی تھی نہ اسے لے کر پھر سکتی تھی اور گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ آج رات تو تقریباً ساری ادھر گزارنی تھی۔

گاؤں کی میراثن ڈھولکی پیٹے جا رہی تھی۔

"لڈی ہے جمالو پاؤ لڈی ہے جمالو۔" لگتا تھا اس کا پسندیدہ گانا یہی ہے' وہ شام سے کوئی سو مرتبہ یہ تان اٹھا چکی تھی' اب پھر ڈھولک پر یہی تھاپ اٹھا رہی تھی۔ گانے کے سر ایسے تھے کہ ارد گرد بیٹھی لڑکیوں کے ہاتھ تالیاں

پیٹ پیٹ کر سرخ ہو گئے تھے۔

"توبہ ہے ماسی! تمہیں اور کوئی گانا نہیں آتا۔ شام سے یہی گائے جا رہی ہو۔ میرے ہاتھ ٹوٹنے والے ہو گئے ہیں تالیاں پیٹ پیٹ کر۔" ایک پٹاخہ سی لڑکی میراثن کے کالے بھجنگ موٹی انگلیوں والے متحرک ہاتھوں کو پکڑ کر بولی اور ساتھ ہی اس کے آگے اپنے دونوں ہاتھ بھی پھیلا دیے۔

"یہ دیکھو۔" اس کے ہاتھ اتنے سرخ ہو رہے تھے جیسے ابھی ان سے خون نکل پڑے گا۔

"چلو بھئی وارنے کے پیسے اس کو دے دو۔" میراثن اس کے پھیلے ہاتھوں پر روپیہ رکھ کر پھٹے ڈھول کی طرح ہنسنے لگی۔

"دفع دور۔" لڑکی نے روپیہ اس کے منہ پر اچھالا اور اٹھ کر دوڑ چلی گئی تو باقی لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔

"آپ کب آئی تھیں؟" رابعہ بی بی نے ماشی سے پوچھا۔ انہیں ادھر ہی بڑی مشکل سے جگہ ملی تھی' آمنہ اور زینب ان کے پہلوؤں میں گھس کر بیٹھ گئی تھیں۔ پہلے ہی ان کا ٹکراؤ ڈیوڑھی میں سیدہ سے ہو گیا تھا۔

"بڑی جلدی آگئیں آپ رابعہ بی بی!" طنز اور تحقیر ان کے انداز اور لہجے دونوں سے ہویدا تھی۔

"وہ بارش کی وجہ سے۔" رابعہ بی بی ہکلانے لگیں۔

"تمہارے لیے یہ انوکھی بارش ہو رہی تھی۔ سارا گاؤں شام سے آیا بیٹھا ہے وہ بھی تو بارش میں بھیگ کر ہی آئے ہیں۔ جن کو مالکوں کی خوشی کا خیال ہے اور پھر یہ بات ہے کہ تم لوگوں کو ویسے ہی کچھ پر لگ گئے ہیں' خود کو کچھ سمجھنے لگ گئے ہو۔ ہر فنکشن میں لیٹ نہ کوئی کام نہ دھام۔" وہ خوامخواہ بڑبڑاتی ہوئی ہال کمرے کی طرف مڑ گئیں۔ رابعہ بی بی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

"یہاں عزت صرف پیسے والے کی ہے رابعہ بی بی!" صوفی صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔ "پیسہ نہیں ہے پاس تو پھر چلتا پھیلو کہ یہ لوگ تو جھکے ہوئے سر پسند ہوتے ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر اندر بڑھ گئیں۔ ماشی نے انہیں دیکھا تو کھل اٹھیں۔ فوراً اشارہ کر کے اپنے پاس بلانے لگیں۔ وہ رستے میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے ہاتھوں اور کپڑوں سے بچتی بچاتی ماشی کے پاس پہنچ ہی گئیں۔

"میں تو کب سے آپ کی راہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا شاید آنا ہی نہ ہو۔"

رابعہ بیٹھیں تو آمنہ اور زینب بھی ان کے ساتھ پھنس کر بیٹھ گئیں ایک دو عورتوں نے ناگواری سے ان کو مڑ کر دیکھا پھر جب ان کے چہرے دیکھے تو مسکرانے لگیں۔

"بس بارش کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ رستے میں اس قدر کیچڑ تھی کہ پیدل تو آ ہی نہیں سکتے تھے اور تانگہ اتنی جلدی فارغ ہی نہ ہو سکا۔ اس لیے دیر ہو گئی اور نہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

رابعہ بی بی نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا اور ذرا گردن اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ سارا ہال ہی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ گاؤں کی سب ہی عورتیں موجود تھیں۔ سیدہ صحیح خفا ہو رہی تھیں کہ وہی لیٹ آئی ہیں۔

"اسی لیے تو میں دوپہر میں ہی ماسٹر صاحب کے ساتھ آگئی تھی۔ مجھے معلوم تھا' یہ بارش نہیں رکے گی اور بابا سیدہ کی ناراضی کون مول لے سکتا ہے۔" آخری جملہ انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" رابعہ بی بی پھیکی سی مسکراہٹ سے بولیں۔ "سیدہ کا بھی قصور نہیں ہے بے چاری دونوں کے کاموں میں گھن چکر بنی ہوئی ہیں۔ ایسے میں غصہ آہی جاتا ہے۔" وہ اپنی ازلی مروت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بولیں۔

"غصہ بھی ایک حد تک ہی اچھا لگتا ہے۔ بس جی! یہ نہیں کہ اگلے کو پیروں تلے ہی کچل ڈالو۔ کل میں شام کو ذرا دیر سے آئی۔ مت پوچھیں ساری عورتیں بیٹھی تھیں کیا کمہار کی بیوی' کیا بڑھئی کی سب کے سامنے میری انہوں نے وہ عزت افزائی کی کہ بس کیا بتاؤں۔" ماشی رو دینے کو تھیں۔

"تقریب تو بڑی اچھی ہو جاتی۔ یہ بارش نے کام خراب کیا ہے۔ کتنی مدت بعد اس حویلی میں اس طرح کی رونق لگی ہے۔ اللہ ادھر کی رونق برقرار رکھے۔"

رابعہ بی بی نے سیدہ کا موضوع لپیٹ دیا۔ حویلی کی دیواریں بھی بہت تیز سماعتیں رکھتی تھیں انہیں اس کا ایک

بار تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ یہی ساری باتیں سیدہ یا بڑے شاہ جی کو مرچ مسالے کے ساتھ پتا چل سکتی تھیں اور اس کا سارا الزام رابعہ بی بی کے سر پر بھی آسکتا تھا اور صوفی صاحب نے انھیں حویلی میں جا کر بہت محتاط رویہ اختیار کرنے کی ہدایات کر رکھی تھی۔

"ہاں بہت زمانوں بعد ایسی رونق لگی ہے۔ سیدہ کی شادی پر رونق لگی تو تھی مگر اس وقت بڑی بی بی کا غم بھی تازہ تھا اور آج کی تو بات ہی اور ہے۔ حویلی کے اکلوتے وارث کی شادی کا مبارک دن ہے اس لیے جتنے بھی ہنگامے جاگیں کم ہیں۔ آج اگر بڑی بی بی زندہ ہوتیں' یہ ساری رونق شور ہنگامہ چہل پہل اپنی آنکھوں سے دیکھتیں تو کیسے پھولے نہ سماتیں۔ اولاد کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی ماں باپ کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف ماں باپ ہی کو ہو سکتا ہے۔" ماشی کو ہر موضوع پر بولنے کا ملکہ حاصل تھا۔

"بالکل' والدین سے زیادہ اولاد کی خوشی میں کون خوش ہو سکتا ہے۔" رابعہ بی بی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"مگر بعض ایسے بھی بد نصیب ہوتے ہیں جو نعمت ربانی کو ٹھوکر مار کر زمانے کی ٹھوکریں گلے لگانے چل پڑتے ہیں۔" ماشی نے ایک دم سے کہا تو رابعہ بی بی ان کا منہ تکنے لگیں۔ اگلے پل انھیں سمجھ آگئی کہ ماشی کا اشارا کس جانب ہے۔

"ہوں!" وہ خود سے اس طرف آنا نہیں چاہتی تھیں۔

"بد بخت لڑکی' میری بہن کو ساری عمر کے لیے جیتے جی قبر میں ڈال گئی۔"

ماشی کی آواز اب خاصی دھیمی تھی۔ "بے چاری رات سے اس بارش کے ساتھ روئے جا رہی ہے۔ اگر شوہر کے غصے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید وہ بین ڈالتی۔ اپنے کپڑے پھاڑ کر جھومر کی تلاش میں گاؤں سے باہر نکل جاتی۔ اتنا بڑا داغ دیا ہے بیٹی نے۔ پھر بھی ماں کا دل دیکھیں۔ اس کی جدائی میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ اسے اس بد بخت کے اٹھائے گئے غلط قدم کا نہیں آرہا۔ بس اس کے غلط ہاتھوں میں چلے جانے کا غم ستائے جا رہا ہے۔"

"جھومر تو اچھی لڑکی تھی' میں خود اس سے ملی تھی پھر اس نے ایسا قدم کیوں اٹھایا اور دو مرے وہ تو اس گاؤں میں اجنبی تھی اور اسے ادھر آئے تو میرے خیال میں ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہی ہوا تھا پھر ایسا کام؟"

رابعہ بی بی کا تجسس بھی لفظوں کی صورت میں ڈھل کر ان کے لبوں تک آہی گیا۔ آمنہ اور زینب تو پہلے ہی پوری طرح سے ان کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں اور زینب ہی "مزے" تو لینے حویلی آنے کے لیے بے تاب تھی اس نے معنی خیز انداز میں آمنہ کو کہنی بھی ماری تھی۔ آمنہ نے اسے گھورا۔

"بس' بہن جی! جب انسان کے برے دن آجائیں۔ اچھی بھلی لڑکی تھی اور میں تو کہوں بہت چالاک ہوشیار بھی نہیں تھی۔ بس اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ادھر سوات میں بھلا کب ہے اتنا پڑھنے کا رواج اور وہ بھی لڑکیوں کو پڑھانے کا جس کا باپ بھی ان پڑھ ٹرک ڈرائیور ہو اور ماں ویسے بھی چٹی ان پڑھ تو اسے کس نے پڑھانا تھا۔ چچا ایک دو بار ان کے گھر گیا۔ چچا کی بچی بھی ساتھ تھی جو مردان میں اسکول میں پڑھتی تھی اس کی کتابیں دیکھ کر جھومر کو بھی پڑھنے کا شوق چڑھا تو ماں باپ سے وہ ضد لگائی کہ مردان آکر ہی دم لیا۔ ماں باپ کی اکلوتی تھی۔ ماں نے دل پر پتھر رکھ کر اسے چچا کے گھر بھیج دیا اور باپ تو رہتا ہی ٹرک کی مال برداری پر تھا۔ ماں بے چاری اکیلی رہ گئی تو ادھر بھی کبھار جھومر سے ملنے مردان چلی آتی تھی۔ وہیں سے اس نے میٹرک کیا اور میں تو کہوں۔ اس کے چچا کے گھر کا ماحول بھی بہت اچھا تھا بہت سخت اور پتھریلا تو نہیں تھا جیسا اس کے باپ کے گھر کا تھا۔ شرعی حد میں رہتے ہوئے پردے کی چال چلن کی پابندی پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ اس کی چچی بھی سلجھی ہوئی سمجھدار عورت ہے' ادھر پنجاب کی ہی ہے۔ بس جیسے ہی جھومر نے میٹرک کیا۔ اس کا باپ اس منحوس ٹرک ڈرائیور کا رشتہ لے آیا اس کے لیے۔ جھومر نے تو طوفان اٹھا دیا اور بات یہ عقل کی تھی بھی نہیں۔ کہاں جھومر دیکھا تو ہے آپ نے اسے اتنی خوبصورت کہ دیکھو تو لگتا ہے شیشہ بھی میلا ہے اس کے آگے۔ اور وہ ٹرک ڈرائیور پچاس سال کا ٹھا پٹھان' نسوار کھا کھا کر اس کا سارا منہ گلا ہوا۔ شکل پر خباثت اور جھومر کا باپ اس سے بڑا خبیث۔ جس نے رقم جھومر کے

بدلے ہو ر رکھی تھی اس بڈھے کھوسٹ سے۔ جھومر کے باپ کا تو ٹرک بھی اپنا نہیں تھا۔ وہ بھی اس بڈھے نے لے کر دیا تھا۔ اب بھلا وہ اس کی جان چھوڑتا' جب باپ زبردستی نکاح کا کہہ کر ایک ہفتے کے اندر تیاری کرنے کا حکم دے کر پنڈی گیا تو دونوں ماں بیٹی ادھر آگئیں میرے پاس۔ میں نے خدا ترسی کو رکھ لیا۔ ماسٹر صاحب کی گھرکی کی بھی پروا نہیں کی۔ سچ کہوں تو جھومر بہت تیز ہو چکی تھی یا باپ کے گھٹیا پن نے اسے اس قدر ہوشیار کر دیا تھا۔ بہرحال اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ ادھر نہیں آسکے گا اور وہ مزے سے شہر جا کر کالج میں داخلہ لے لے گی۔ مگر وہ جس نے پیسہ لگا رکھا تھا وہ اس کے باپ کی جان بخشی کرتا تھا بھلا۔ دونوں ادھر آگئے۔ روز کی لڑائی جھگڑا۔ ایک دو دفعہ تو جھومر اس کے باپ نے ہاتھ بھی اٹھایا۔ ماسٹر صاحب نے تو دو تین دفعہ منہ پھاڑ کر چلے جانے کو بھی کہا مگر ان کا کوئی فیصلہ ہوتا تو وہ جاتے اور آج صبح وہ واقعہ ہو گیا۔ وہ شاید کل رات کے پچھلے پہر ہی میں بھاگ چکی تھی کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی۔" ماشی نے کب سے بھرا دل کا غبار نکالا اور سارا واقعہ من و عن رابعہ بی بی کے گوش گزار کر ہلکی پھلکی ہو گئیں۔

"زیادہ غلطی تو اس کے باپ کی ہوئی نا جو اس کو اس طرح فروخت کر رہا تھا۔" رابعہ بی بی بولیں۔

"ان کے ہاں یہ سب کچھ چلتا ہے۔ جھومر کے باپ نے کچھ انوکھا نہیں کیا تھا اور اگر ایسا کچھ تھا بھی تو اسے یوں گھر سے فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ماں باپ کے منہ پر تو جو کالک مل گئی' سو مل گئی۔ خود اللہ جانے کن حالوں سے گزر رہی ہو گی۔ بھلا ایسی لڑکیوں کو نصیب کوئی پھولوں کی سیج پر بٹھاتا ہے۔ اسی لیے تو لوگ بیٹوں کے پیدا ہونے پر خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔ ہماری بھی تو بچیاں ہیں۔ کیسی سیدھی بھلی ماشی جانو اللہ تعالیٰ کی گائیں اور آپ کی تینوں بچیاں بھی اللہ ان کے نصیب اچھے کرے ماں باپ اگر غلط فیصلہ کریں بھی تو اولاد کو فرمانبردار رہنا چاہیے کہ والدین سے زیادہ اولاد کا خیر خواہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ ہم تو یہ جانیں۔"

ماشی نا جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ "یہ کیا اچھے اور گھر سے بھاگ نکلے اس طرح کیا وہ کسی ریاست کی مہارانی بن گئی ہو گی۔ خدا جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہو گی۔"

ماشی نے بھی اپنی بچیوں کی تربیت بڑے سخت طریقے سے کی تھی۔ خصوصاً "بیٹیوں کے ساتھ نرمی کی وہ بھی قائل نہیں تھیں۔

"اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے اور صحیح رستہ دکھائے۔" رابعہ بی بی نے حسب عادت دعا دی کیونکہ وہ کسی کو بھی برا نہیں کہہ سکتی تھیں۔

"ہو سکتا ہے ماں باپ کے ادھر سے جانے کا انتظار کر رہی ہو۔ کہیں جا کر چھپ گئی ہو۔"

"اگر وہ واپس نے ادھر کا رخ بھی کیا تو سوائے جوتیوں اور لعن طعن کے اسے کچھ نہیں ملے گا بابا۔ میں تو اسے دوبارہ اپنے گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھنے دوں گی۔ پہلے ہی میں ماسٹر صاحب کی بہت نافرمانی کر چکی ہوں۔"

ماشی کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔

"اس کے والدین چلے گئے۔"

"نہیں جی۔ بے چارے شرم سے منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ رات ہونے کا انتظار کر رہے تھے' اوپر سے بارش برس رہی ہے۔ آج رات کو نکل جائیں گے۔ جھومر کے باپ سے تو اس ملعون نے ٹرک بھی چھین لیا ہے۔ اب بیچارہ ادھر جا کر پتھری ڈھوئے گا۔ ایسی اولاد تو جنم لیتے ہی مر جائے جو ماں باپ کو اس بڑھاپے میں ایسی ذلت بھری زندگی سے دوچار کرے۔" ماشی کو پھر غصہ آگیا۔

"کیا وہ واقعی منشی کے بیٹے کے ساتھ گئی ہو گی؟" رابعہ بی بی نے پوچھا۔

"اللہ جانے کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اس نامراد نے۔" وہ منہ بھر کے بولیں "سب کہہ رہے ہیں سلیم کے ساتھ گئی ہے بھلا اسے سلیم کا پتا کہاں سے چلا۔ پر بابا چل گیا ہو گا۔ گھر میں بھی تو نہیں ٹکتی تھی چار بار تو ادھر حویلی آئی ڈھولک دیکھنے کے بہانے۔ آتے جاتے کہیں نین لڑا لیے ہوں گے کمبخت نے۔"

ماسٹنی کا بس نہیں چل رہا تھا کہیں سے ڈھونڈ کر جھومر کا قیمہ بنوادیں۔

"ہوں!" رابعہ بی بی چپ رہیں تو ماسٹنی بھی دل کی بھڑاس نکال کر خاموش ہو گئیں۔

"اللہ ہتم دونوں اُدھر چھپ کر بیٹھی ہو اور میں دس بار بشیراں سے ڈیوڑھی میں جا کر پوچھ چکی ہوں کہ آمنہ اور زینب ابھی نہیں آئیں۔"

شہرینہ ان کے پیچھے سے آ کر زوردار آواز میں بولی تو وہ دونوں جو محو ہو کر جھومر کی داستان سن رہی تھیں۔ اچھل ہی پڑیں۔

"ہاں ہم ابھی آئے ہیں تھوڑی دیر پہلے۔" آمنہ نے گردن موڑ کر ملائم مسکراہٹ سے شہرینہ کے بجے سنورے روپ کو دیکھا گولڈن نشو کے چوڑی دار پاجامے اور فراک میں اس کا گورا رنگ چمک رہا تھا۔

"چلو آؤ میرے ساتھ۔ اوپر چلتے ہیں۔ تمہیں اپنی بھابی جان کا کمرہ دکھاتی ہوں۔ قسم سے دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گی اتنی خوبصورتی سے سجا ہوا ہے.... آؤ نا!"

وہ آمنہ کا ہاتھ کھینچ کر بولی زینب کو تو اس دعوت کا سنتے ہی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس کے تو دل کی مراد بر آئی تھی۔ آمنہ نے ایک نظر اماں جی کی طرف دیکھا وہ بھی ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اماں جی! ہم جائیں۔" اس نے اجازت طلب کی۔

"جاؤ مگر واپس ادھر ہی آجانا پھر میں تمہیں اتنے رش میں کہاں ڈھونڈتی پھروں گی۔"

وہ اجازت دیتے ہوئے بولیں تو دونوں شہرینہ کے پیچھے عورتوں کے جم غفیر میں رستہ بناتی ہوئی چل پڑیں۔

♥ ♡ ♡ ♥
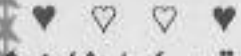
"ہیلو ماما!" نین تارا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سامنے ایزی چیئر پر بیٹھی زیور گل سے بولی اور زیور گل کے پاس پڑے صوفے پر گرنے کے انداز میں ڈھیر ہو گئی ایک دو پل ایسے ہی گزرے۔ زیور گل تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ نین تارا سیدھی ہوئی ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی موبائل اور ہینڈ بیگ سینٹرل ٹیبل پر رکھے اور پیروں سے سینڈل اتارنے لگی۔

"کہاں سے آرہی ہو تم؟" زیور گل زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"لانگ ڈرائیو سے۔" اس نے پاؤں اٹھا کر صوفے پر رکھے اور آرام دہ انداز میں لیٹ گئی۔

"زندگی بھی لانگ ڈرائیو ہے نیناں! بٹ ناٹ فار انجوائے منٹ۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"مطلب؟" نین تارا لاپروائی سے ابرو اچکا کر بولی۔

"تمہیں کوئی ٹریفک سارجنٹ نہیں روکتا جبکہ ابھی تمہارا ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں بنا۔"

"تو اتنی جرات ابھی کسی ٹریفک سارجنٹ میں نہیں کہ وہ نین تارا کو روک سکے۔"

وہ اسی لاپروائی سے بولی۔ ڈارک پرپل کلر کے سوٹ میں اس کا نازک شاخ سا بدن کسی سانچے میں ڈھلا ہوا لگ رہا تھا۔ شارٹ سلیو میں گورے سفید مرمریں بازو جنہیں وہ بطور تکیہ سر کے نیچے رکھ کر نیم دراز ہو گئی اور ترچھی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"آخر کب تک خود کو یوں Spoil (ضائع) کرتی رہو گی۔" زیور گل کچھ افسوس زدہ لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا ماما! میں کب خود کو ضائع کر رہی ہوں۔" وہ اچنبھے سے بولی۔

"یہ خود کو ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ دیکھو نیناں! جب وقت گزر جاتا ہے' تو وہ اپنے پیچھے بہت یادوں کے ساتھ بہت سے خسارے بھی چھوڑ جاتا ہے۔ جن کو پورا کرنے کی پھر کوئی صورت نہیں رہتی۔"

زیور گل ایزی چیئر پر آگے ہو کر بیٹھ گئی۔

"کیسے خسارے؟" وہ تیکھے چتون سے بولی۔

"تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔" زیور گل دو ٹوک انداز میں بولی۔

"میں نے کیا سوچنا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کیا؟" وہ جتانے والے انداز میں بولی۔

"معلوم ہے مجھے سب جو تیر تم نے مارا ہے۔ دیکھو تارا! شاہ جی تمہاری منزل کے رستے میں آنے والا محض ایک شارٹ کٹ ہے منزل نہیں۔"

آج پھر زیور گل پر پند و نصائح کا دورہ پڑا ہے۔ نین تارا نے بیزاری سے سوچا۔

"کیسا شارٹ کٹ؟" نین تارا صوفے سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے محض اس طرح خفیہ نکاح کرنے سے سلطان بخت نے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لیا ہے اپنی دولت و جاگیر کا حقدار بنا دیا ہے۔ نہیں تارا! یہ سب سراب ہے۔" وہ خود ہی نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "اس نے محض تمہیں بہلانے کے لیے چند ماہ یا کچھ عرصے کے لیے تم پر استحقاق جتانے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ وہ سمجھتا ہے میں نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس کے اس ڈھونگ سے کس قدر مالی فوائد حاصل کر سکتی ہو کہ پھر وہ بھی گزرا وقت بن جائے گا۔ جو پیچھے محض پچھتاوے چھوڑ جاتا ہے۔" زیور گل کی لایعنی گفتگو نین تارا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

"ماما! ضروری نہیں جو تجربہ آپ کے ساتھ ہوا ہے وہی میرے ساتھ بھی ہو۔" نین تارا چڑ کر بولی۔ "مجھے معلوم ہے شاہ جی میرے ساتھ کتنے سنیئر ہیں اور اگر انہوں نے میرے ساتھ کوئی فاؤل گیم کھیلنے کی کوشش کی تو یہ انہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ میں عمر اور تجربے میں ان سے اور آپ سے بہت کم سہی مگر مجھ میں اتنی سمجھ ضرور ہے کہ اگر کوئی میرے ساتھ کوئی فاؤل کھیلنا چاہے۔ تو اس کو میں ہاتھ پکڑ کر روک سکتی ہوں۔ اتنی جرات ہے مجھ میں۔" وہ کچھ غصے میں آ کر بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے بی معصومہ! اسے کوئی بھی فاؤل گیم کھیلنے کے لیے تم سے اجازت لینے کی ضرورت ہو گی جبکہ وہ تم سے یہ کھیل کھیل بھی چکا ہے اور تمہیں اس کی کچھ خبر بھی نہیں۔ جس طرح اس نے تمہاری معصومیت اور بے خبری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح تم بھی اس کو خبر کیے بغیر جس قدر بھی فائدہ حاصل کر سکتی ہو کر لو۔ اسے میری نصیحت سمجھو یا اپنے لیے ایک گائیڈ لائن اور بہت جلد تمہیں اس گائیڈ لائن سے مدد لینی پڑے گی۔ یہ تم میری بات لکھ لو۔ اور رہی بات میرے تجربے کی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ کمرے میں چند منٹ کی خاموشی چھا گئی۔ "تم نے تو محبت بھی پلاننگ کی طرح کی ہے اتنی کم عمری کے باوجود تم نے یہ بڑا کام کا کیا ہے کہ اس خوبصورت جذبے نے تمہیں مکمل طور پر اندھا نہیں کیا۔

محبت پہلی نظر میں ہی ہوتی ہے اور یہ ہماری دوسری نظر ہوتی ہے جو فیصلہ کرتی ہے۔ آیا ہمیں یہ محبت آگے بڑھانی چاہیے یا نہیں یا اپنے قدم یہیں روک لینے چاہئیں' اور جو دوسری نظر کے پیمانے پر اعتبار کرتے ہیں میں سمجھتی ہوں وہ لوگ کافی حد تک عقل مندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ تم نے دوسری نظر میں شاہ جی کے رئیسانہ قد کاٹھ کا اندازہ لگا کر اپنی پہلی نظر کی تائید کی۔ بہت اچھا کیا مجھے خوشی ہے کہ یہ سمجھ داری میری بیٹی کے حصے میں آئی جبکہ میں نے......"

وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔

"میں نے تو صرف محبت کی تھی پہلی نظر ہی آخری تھی۔ میں نے دوسری نظر پر اعتبار کیا ہی نہیں وہ ایک مڈل کلاس سیا 'نیک شریف' سمجھدار شخص تھا جو نہ جانے کیسے کس کے بہکاوے میں آ کر میرے چوبارے پر قدم دھر بیٹھا تھا پھر بہت عرصے تک ادھر سے اٹھ ہی نہ سکا اور میں اس کی پہلی نظر کے دھارے میں بہتی چلی گئی اور پھر مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ نہ اپنی ماں کی التجائیں' نہ اپنی حیثیت و اوقات' اپنے اور اپنے محبوب کے درمیان موجود معاشرتی عزت کے پیمانے۔ بس میں اس کے ساتھ کچے دھاگے میں بندھی چلی گئی۔

اس نے مجھے شرعی طور پر اپنایا اور اس بات نے مجھے راتوں رات فرش سے عرش پر پہنچا دیا۔ طوائف کو تو چلو بھر عزت دے دو تو وہ عزت دینے والے پر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا ڈالتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس

نے مجھے چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر دیا جسے میں نے چند ہی دنوں میں گھر بنا ڈالا۔ صبح و شام اس پرائے گھر کو چمکاتی۔ اپنے اندر کی انتہائی سگھڑ عورت سے پوچھ پوچھ کر اس کے لیے پکوان پکاتی۔ شام کو بن سنور کر کسی گاہک کا نہیں اپنے سچے شوہر کا پلکیں بچھا کر انتظار کرتی تو جانو مجھ سے بڑا خوش نصیب اس کرۂ ارض پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس رشتے پر اپنے پچھلے سارے تعلقات قربان کر دیے۔ اپنی سگی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا کہ اس کے آنے سے میرے شوہر کا پوتر گھر ناپاک ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کی خاطر ساری دنیا سے کٹ کر گھر کے دریچے، دروازے، آسمان کی طرف کھلنے والا زینہ، ہر رستہ خود پر بند کر دیا اور بدلے میں اس کی ڈھیروں ڈھیر محبتیں رات بھر میرے وجود پر گل پاشی کرتیں۔ تو میں اپنے آپ سے باہر ہو جاتی۔ یہ سپنا تو اس روز ایک چھناکے سے ٹوٹا جب تمہیں میرے وجود میں پرورش پاتے چوتھا مہینہ تھا۔ وہ شریف زادہ ایک طوائف سے جی بھر کر دل بہلا کر کاغذ کا ایک تین حرفی ٹکڑا میرے سوئے ہوئے وجود کے نیچے دبا کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور میرے پاس تو ایسا کچھ آسرا بھی نہیں تھا کہ چھ آٹھ مہینے اس کے چھوڑے ہوئے کسی مادی تحفے کے سہارے گزار سکتی۔ مکان جسے میں نے جان مار کر گھر بنایا تھا پھر سے کرائے کا مکان بن گیا۔ اگلے مہینے مالک نے خالی کرا لیا۔ زیور کے نام پر وہ صرف موتیے کے ہار پھول، گجرے میرے تشنہ وجود کی زینت بناتا رہا تھا اور لباس کی قیمت تو کسی بھی زمانے میں قابل ذکر نہیں رہی یہ لباس اور بے لباس کا تصور تو انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ کچھ لوگ بہت کچھ پہن اوڑھ کر بھی ننگے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کا اندر اس قدر غلیظ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی پوستین، کوئی بھی بیش قیمت پوشاک اس کی غلاظت کو چھپانے میں ناکام رہتی ہے اور میں ایسے ہی شخص کے ہاتھوں کھلونا بن گئی جو من کا کالا تھا۔"

زیور گل اپنی زندگی کے اس سانحے پر اس قدر رو چکی تھی کہ اب اسے یہ کہانی روٹین کی کوئی بات لگتی۔ ایک بار بھی یاد کرتے ہوئے آنکھیں گیلی نہیں ہوئی تھیں۔ جزئیات کا علم تو نین تارا کو بھی تھا مگر اتنی تفصیل وہ ماں کے منہ سے پہلی بار سن رہی تھی۔

"اپنے ساتھ ہونے والے اس گھناؤنے کھیل کو ایک یاد بنا کر میں تمام عمر رو تو نہیں سکتی تھی نہ اس یاد کے سہارے عمر بتائی جا سکتی تھی اور اس کمین فطرت شخص کو ڈھونڈنا بھی محض وقت کا زیاں تھا کیونکہ وہ جاتے وقت اپنے سارے حساب بے باق کر گیا تھا حق مہر کے بیس روپے بھی اسی کاغذی لفافے میں موجود تھے۔ پھر اس پر انگلی اٹھانے کا میرا کوئی حق نہیں تھا اور محبت تو لفظوں اور جذبوں کا کھیل ہے جو چاہے اسے جان سے بڑھ کر سمجھ لے اور جو چاہے اسے پیروں کی دھول بنا لے اگلا قدم اٹھاؤ پچھلا بھول جاؤ۔ میں نے بھی یہی سبق سیکھا کہ محبت زندگی نہیں زندگی کا ایک معمولی حصہ ہے۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اور نین تارا پھر وہی ماں جسے میں بڑھاپے کی دہلیز پر قابل رحم حالت میں ٹھوکر مار کر محبت کی اس اندھی وادی میں اترنے چلی تھی حقیقت کا پہلا پتھر لگتے ہی مجھے ماں کے درد، اس کے تنہائی کا احساس ہوا۔ میں اس کی طرف لوٹ کر تو گئی مگر اس کے دھندے کو دوبارہ سینے سے لگانا مجھے گوارا نہیں تھا اور اس معاملے میں، میں نے ماں کے بے تحاشا اصرار کی بھی پروا نہیں کی۔ تمہارے دنیا میں آنے تک کا عرصہ میں نے بہت خاموشی سے اپنی ماں کے ساتھ ایک پسماندہ علاقے میں کرائے کے ایک کمرے میں گزارا۔ تم تین ماہ کی تھیں جب میں تمہیں ماں کے حوالے کر کے روزی کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور یہ تو مجھے معلوم تھا مجھ جیسی عورت جس کے پاس نہ تعلیم ہے نہ ڈگری، نہ کوئی ہنر۔ اسے کوئی قابل عزت نوکری ملے گی بھی نہیں اسی لیے اچھے وقت کے ایک دوست جو ٹی وی اسٹیشن پر پروڈیوسر تھا اس کے پاس چلی گئی۔

ایکٹنگ وغیرہ کا بھی مجھے کچھ تجربہ نہیں تھا۔ ہاں آواز بہت اچھی تھی۔ جس کا اچھے وقت میں بہت چرچا رہا تھا اور کچھ دل کے اس روگ نے اس میں سوز بھر دیا تھا۔ پروڈیوسر کو میں نے اپنی دکھ بھری داستان نہیں سنائی۔ یہی کہا کہ کچھ عرصہ ریسٹ کے لیے مری اور بھوربن گزار کر آئی ہوں اور اب اپنے پیشے سے بد دل ہو کر تھوڑی سی لائن بدلنا

چاہتی ہوں۔ گانا چاہتی ہوں اگر آپ سرپرستی کریں تو شاید کچھ سیکھ سکوں۔ اگر میں اسے اپنی داستان خوب رو دھو کر سناتی تو میرے بھرم کا لباس اس کے سامنے تار تار ہو جاتا تو یقین جانو، وہ مجھے پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ دیتا مجھے پھر آنے کا کہہ کر ٹرخا دیتا اور وہ "پھر" کبھی نہ آتا کیونکہ یہ معاشرہ بے کسوں اور مجبوروں پر رحم بھری نظر تو ڈالتا ہے۔ زبان ہلا کر "چچ چچ" بھی کرتا ہے مگر ان کی بے کسی کم کرنے کے لیے کسی قسم کی مدد پر تیار نہیں ہوتا میں نے خود کو بہت فریش، بہت خوش باش شو کیا۔ پروڈیوسر اور اس کے ساتھیوں میں ہنسی مذاق اور ہلکی پھلکی گفتگو میں کہیں بھی انہیں اپنے اندر پڑنے والی دراڑوں کی خبر نہ ہونے دی۔

"سنا ہے گل جی آپ نے شادی کر لی ہے۔" اس کا ایک ساتھی بولا۔

"کیوں صاحب آپ بھی تو شادی شدہ ہیں۔ مجھے بتائیں شادی شدہ کا کیا مطلب ہے؟"

"شادی کا مطلب خوشی۔" وہ فوراً بولا۔

"اور شدہ کا؟" میں نے پوچھا۔

"تمام۔۔۔ ختم۔" دوسرا جھٹ سے بولا۔

"یعنی شادی شدہ کا مطلب ہے آپ کی خوشی بھری زندگی ہوئی تمام۔"

میری بات پر اس کمرے میں چھت پھاڑ قہقہہ لگا۔

"اور جناب مجھے ابھی اپنی زندگی سے قطرہ قطرہ بے تحاشا خوشی کشید کرنی ہے۔ جس دن اپنی خوشیوں بھری زندگی سے اکتا گئی۔ اس دن یہ خودکشی کر لوں گی اور ساتھ میں آپ جیسے کسی چاہنے والے کو لے ڈوبوں گی۔"

میری بات کو سب نے بہت انجوائے کیا۔ پروڈیوسر صاحب نے اسی وقت پر تکلف چائے کے بعد آڈیشن کا اہتمام کیا اور میری آواز کو گانے کے دوسرے انترے میں ہی او کے کر دیا۔

اگلے دن سے میرے گانوں کی ریکارڈنگ شروع ہو گئی پرانی زندگی کو میں نے انجان پن کا کفن پہنا کر زیست کے اندھے گوشوں میں دفن کر دیا۔ نئی زیور گل نے جنم لیا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں خوب کام ملنے لگ گیا۔ دس فلموں میں سے چار کے تین چار گانے تو مجھے ضرور ہی ملتے۔ ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کام اور بھی کرتی رہی مگر جسم فروشی کا گندا کام چھوڑ دیا اور میں تمہیں بھی اس دھندے کی طرف نہیں جانے دوں گی لیکن اس بات کی گواہ میں خود یا میرا خدا ہے کہ میں نے وہ کام کلی طور پر شادی کے بعد چھوڑ دیا۔ مگر مجھ سے متعلقہ لوگ مجھے دور دور سے جاننے والے لوگ اس بات کا کبھی یقین نہیں کریں گے اور میں نے اپنی زندگی کا ایک نچوڑ نکالا ہے کہ ہماری کلاس کی لڑکیاں چاہے کتنی ہی نیک پروین کیوں نہ بن جائیں۔ اس طبقے کی مہران پر لگی ہی رہے گی اور اس معاملے میں یہ معاشرہ بہت بے رحم ہے فوراً "سنگ" ہاتھوں میں اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے اسی لیے میں تم سے کہتی ہوں کہ تم خود کو اتنا طاقتور کر لو کہ نہ تو گند میں اپنا وجود گندا کر سکو اور نہ معاشرے کے ہاتھوں سے پتھر کھا سکو۔"

"مام! مجھے آپ پر فخر ہے۔" نین تارا کافی دیر کے سکوت کے بعد آہستگی سے بولی۔ "آپ نے ایک بے حد مشکل زندگی گزاری ہے اور مجھے ان مشکلات کی کبھی ہوا نہیں لگنے دی۔ یو آر گریٹ مام۔"

"میری جان! یہی میں چاہتی ہوں کہ آئندہ بھی تمہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تم اپنے لیے خود آسانیاں پیدا کرو۔"

"کیسے مام! آپ کو معلوم تو ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ شاہ جی کے اتنے مالدار ہونے کا علم بھی مجھے بعد میں ہوا۔ اس میں میری کوئی پلاننگ نہیں تھی اور میں نے ان سے نکاح کیا ہے اور شاہ جی کوئی چھوٹی آسامی نہیں ہیں بہت ساؤنڈ پرسن ہیں ہر لحاظ سے آپ کو معلوم ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مگر میری جان یہ رشتے بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں، خاص طور پر ہماری کلاس میں اس طرح رات کے اندھیرے میں جڑنے والے رشتے کچے دھاگے سے بھی بودے ہوتے ہیں۔ ذرا سی تیز ہوا چلی تو تڑاخ سے ٹوٹ جاتے ہیں اور

خسارے میں، صرف ہم ہی رہتے ہیں اور ہاتھ چھڑانے والے اسی طرح جا کر پوترا اپنے رستے کو چل پڑتے ہیں۔"
زیور گل تلخی سے بولی۔
"مام! میں نے بھی تو کوئی کچا کام نہیں کیا' بہت سی جائیداد پیسہ روپیہ اپنے نام کرایا ہے پھر آپ کو کاہے کی فکر ہے۔" نین تارا پر اعتماد لہجے میں بولی۔
"یہ سب تب صحیح ہوتا اگر تم اس سے محبت نہ کرتی ہوتیں۔"
زیور گل بولی تو نین تارا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"بیٹا! محبت انسان کو کمزور کر دیتی ہے اس نے یہ سب کچھ مجھے بہلانے کو اور تمہیں رجھانے کو تمہارے نام تو کر دیا ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں جب وہ تم سے آنکھیں پھیرے گا تو یہ سب جادو نگری کی طرح دھواں بن کر اڑ جائے گا اسے فرینکفرٹ گئے کتنے دن ہو چلے ہیں دو ہفتے کے قریب ہے.... نا؟"
زیور گل نے پوچھا تو نین تارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"کتنے فون کیے اس نے تمہیں؟" تو نین تارا نے سر جھکا لیا۔
"ایک بھی نہیں ہے نا۔" زیور گل اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بولی۔
"ابھی تمہاری شادی کو سمجھو مہینہ بھی نہیں ہوا اور وہ تم سے اس قدر انجان ہے۔ اس کی جذبوں کی آگ تمہیں پاتے ہی سرد پڑ گئی کیا؟ تم بے قرار ہو تو وہ کیوں نہیں۔ دو طرفہ محبت کا تو یہی تقاضا ہے نا۔"
زیور گل کہہ رہی تھی نین تارا سن رہی تھی۔
"تو جو اتنی جلدی بدل سکتا ہے صرف چند دنوں کے لیے سہی تو آگے اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ تمام عمر تمہاری زلف کا اسیر رہے گا۔ نین تارا بازار حسن کے مکینوں میں اور اہل ثروت' دولت مندوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ یہ کسی ایک کے ہو کر نہیں رہتے۔ یہ کلیہ ہم سو فیصد نہ سہی مگر نانوے فیصد پر لاگو کر سکتے ہیں حقیقت یہی ہے کہ طوائف اور رئیس زادے کسی ایک کے ہمیشہ کے لیے ہو کر نہیں رہتے۔"
"مام پلیز۔" نین تارا کو اتنے زہریلے لفظوں کی ماں کی زبان سے توقع نہیں تھی' اس نے تو خود کو کبھی طوائف زادی بھی نہیں سمجھا تھا۔ زیور گل نے اسے حتی الامکان اپنے سابقہ پیشے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی اس لیے اسے یہ لفظ کسی گالی یا طمانچے سے کم نہیں لگتا تھا۔
"مام! آپ کی ان تمام باتوں کا مقصد کیا ہے آخر؟ آپ کو جو کہنا ہے۔ مجھ سے کھل کر کہیے یوں ہیر پھیر کر بجھارتیں نہ بجھوائیں۔ میں پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہوں۔"
نین تارا اکتا کر بولی۔ وہ شاہ جی کی بے التفاتی سے پہلے ہی پژمردہ تھی' اوپر سے زیور گل کی ایسی باتیں۔ اسے اب غصہ آنے لگا۔
"میں صرف یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ اپنے آئندہ آنے والے مستقبل کے.... لیے خدا نہ کرے کہ وہ میرے جیسا ہو۔ خود کو تیار کرو۔ اپنے اندر کوئی ہنر پیدا کرو کہ کل کلاں کو اگر تم پر کوئی وقت آن پڑے تو تم کچھ کر سکو کیونکہ ڈگری تو تمہارے پاس بھی کوئی نہیں ہے۔ شوبز کی طرف تمہیں شاہ جی کی محبت نہیں آنے دے رہی۔" وہ طنزاً بولی۔
"پھر بتائیں۔ میں کیا کروں۔" نین تارا زچ ہو کر بولی' وہ اب گفتگو کو لپیٹنا چاہ رہی تھی۔
"شاہ جی کو تمہارا سلور اسکرین پر آنا ناپسند ہے مگر تم پس پردہ تو کام کر سکتی ہو نا! اس کی شاہ جی کو بھلا کیسے خبر ہو گی۔"
"وہ کیسے؟" نین تارا ماں کی شکل دیکھنے لگی۔
"وہی پیشہ اپناؤ جو میرا ہے۔"
"کیا مطلب؟"

"گلوکاری۔ تمہاری آواز اچھی ہے بس تھوڑے سے ریاض کی ضرورت ہے' ماسٹر جی کے پاس ہفتہ پندرہ دن لگاؤ۔ آواز لے میں آجائے گی تو یہ کام مزہ دینے لگے گا۔ میری بس تم سے یہی درخواست ہے۔"
نین تارا نے کچھ دیر سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر کھڑی ہو گئی۔
"او کے مام! جیسی آپ کی مرضی۔ میں بھی اپنی فراغت سے تنگ آچکی ہوں۔ کل سے ماسٹر جی سے کلاس لوں گی اب میں جاؤں۔"
زیور گل خوشی سے حیرت زدہ رہ گئی اور اثبات میں سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دی تو وہ باہر نکل گئی۔

● ● ● ● ●

رات کے سیاہ بخت سینے پہ
جو لفظ درج ہوتے ہیں
تقدیر کے ان مٹ نقوش بن کر
سیاہ لبادہ اوڑھے
گردن کے روشن اجالوں میں نکل پڑیں
تو تمام خلقت میں
وحشتِ عام پھیل جائے

گھر کی طرف جاتے وہ تمام رستے' وہ تمام گلیاں جن میں وہ کم سنی سے لے کر جوانی تک بے خوف و خطر چلتی تھی۔ اسے اس طرح سے ازبر تھے کہ اگر نیند میں آنکھیں بند کر کے بھی چلتی تو رستہ بھٹک نہیں سکتی تھی مگر وقت نے یکا یک کیسا پلٹا کھایا تھا کہ ماں کے پیار کی طرح مہربان ان رستوں میں کانٹوں کا جنگل اگ آیا تھا۔ اجنبیت اور نامانوسیت کا دکھ دینے والا احساس ہر قدم پر بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تمام رستے جو اس کے گھر تک جاتے تھے وہ آج تک ان پر پورے استحقاق سے بڑے اعتماد سے قدم اٹھایا کرتی تھی' آج اس کے قدم ہی ساتھ نہیں دے رہے تھے بار بار ڈگمگا کر اسے اس کی بے وزنی کا احساس دلا دیتے تھے۔ بار بار آنکھوں کے آگے تنی دھند کی دبیز چادر دن کے لحہ بہ لحہ بڑھتے اجالوں کو دھندلا رہی تھی۔ کبھی چادر کے کونے سے آنکھوں کو رگڑتی' کبھی ہاتھ کی پشت سے آنکھیں ملتی' چادر کو ہر کا کر رستہ دیکھنے کی کوشش کرتی رستہ تو نظر آجاتا قدم بھی آگے بڑھ جاتا مگر دل جیسے ایک قدم اور گہرائی میں ڈوب جاتا۔ خوش امیدی' خوش فہمی کا ننھا سا جگنو بھی کہیں ٹمٹما نہیں رہا تھا۔
اسے بخوبی علم تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور جو ہو گا وہ کتنا سنگین ہو گا کہ وہ پیش بندی کے طور پر اس سے نمٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ گھر کا رستہ طویل تھا' آئندہ کے لیے لائحہ عمل کے طور پر بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا مگر کوئی سوچ بھی اس کو دامن نہیں پکڑا رہی تھی۔ کوئی بھی نقطہ ذہن میں جم نہیں رہا تھا سوائے آنے والے ہولناک منظر کی تصویر کے۔
"یا اللہ! میں کیا کروں' میں مر کیوں نہ گئی۔" بے بسی کے احساس نے اس مضبوطی سے جکڑا کہ اس نے قدم روک کر بے اختیار اوپر نیلے آسمان کی طرف دیکھا اپنے سوال کا' اپنی بے بسی کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ رگڑا اور پھر قدم آگے بڑھا دیے۔
روشنی کی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں سڑکوں پر گاڑیاں دوڑنے لگی تھیں۔ سویرے سویرے ڈیوٹی پر جانے والے بڑی تندہی سے کار یا موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ پیدل چلنے والوں میں سے جو اس کے پاس سے گزرے' ایک آدھ نے ذرا رک کر اس خستہ حلیے میں منہ سر چھپائے لڑکھڑاتی چال والی لڑکی کو بغور دیکھا اور صد شکر کہ کسی نے رک کر توجہ نہیں دی۔ کوئی سوال نہیں کیا کہ اس کے پاس تو کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا وہ تو آج خود سراپا سوال بن گئی تھی' اب گھر جا کر اپنے ہاں جائے کے سوالوں کے جواب کس طرح دے گی بھائی بھی وہ جو کسی پتھر سے کم نہیں۔ اچھے دنوں میں بھی سہیل کا رویہ اس کے ساتھ کسی دور دیس کے اجنبی سے کم نہیں تھا اور اب تو پھر؟ اس کے دل سے آہ نکلی۔

"میں کیا کہوں گی سہیل بھائی سے؟" لڑکھڑاتے قدم ایک بار پھر سڑک پر جم گئے۔

"میں کل سے کہاں تھی کہاں سے آرہی ہوں۔" سوالوں کا تازیانہ اس قدر زوردار تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے لہرانے لگے، اس نے اپنے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ پیچھے سے کسی نے اسے سنبھالا دیا۔

"کیا بات ہے بی بی! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ کدھر جانا ہے تمہیں؟" ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ٹھ..... ٹھیک ہوں میں۔ ویسے ہی چکر آگیا تھا۔" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور دھیرے سے پرے کھسک گئی وہ اسے ابھی بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" اب کے اس کا لہجہ کچھ کڑا تھا۔ اس کا حلیہ بھی تو مشکوک سا ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی لٹا پٹا مسافر گھر کا راستہ بھول گیا ہو۔

"میں ہاسپٹل سے آرہی ہوں۔ میری ماں ہاسپٹل میں ہے۔ رات جاگتی رہی ہوں ان کے پاس اس لیے چکر سا آگیا تھا اب ماں کے لیے گھر ناشتہ لینے جارہی ہوں۔" ایک دم اس نے بہانہ گھڑا۔

"کیوں تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں کیا؟" لہجہ ابھی بھی غیر مطمئن سا تھا۔

"بھائی ہوتا ہے دوبئی میں، اسے فون کیا ہے۔ ایک دو روز میں آجائے گا۔ میں چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے، ماں انتظار کر رہی ہوگی۔" اس آدمی کا اگلا سوال سنے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔

"ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ ماں انتظار کر رہی ہوگی۔"

اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اسے لگا اس کی ماں آج ہی اس سے بچھڑی ہے، آج ہی وہ مری ہے۔ آج ہی وہ ماں کی تدفین کے بعد اس کی قبر کی تازہ گیلی مٹی میں وہ اپنے ہاتھ منہ مٹی کرکے لوٹی ہے۔ "کاش ماں! تم زندہ ہوتیں۔ تم نے رات بھر جاگ کر گھر کی چوکھٹ پر میرا انتظار کیا ہوتا۔ میری سلامتی کی میری عصمت و پاکیزگی کی حفاظت کی دعائیں خدا کے آگے گڑگڑا کر مانگی ہوتیں تو ماں اگر میں اس حال میں بھی لوٹتی تو چاہے تو مجھے کوڑے مار مار کر میرا وجود لہولہان کر دیتی۔ مجھے ٹھوکریں مار کر گھر سے نکل جانے کو کہتی۔ باپ دادا کی عزت مٹی میں ملانے پر میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیتی، میرا چہرا اپنے تھپڑوں کی بارش سے خون میں نہلا دیتی ماں تو مجھے مار مار کر اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیتی مگر تو زندہ تو ہوتی۔ ماں میں کس سے اپنی بے گناہی بیان کروں گی۔ ماں میں کس کس کو بتاؤں گی کہ دنیا نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔ میرے پھول جیسے معطر پاک وجود کو کیسے کیچڑ میں میلا کیا ہے۔ ماں میں کہاں سے اپنی بے گناہی کے ثبوت لاؤں۔ کس کو گواہ بناؤں، کون سنے گا میری فریاد، کون کان دھرے گا میری آہ و بکا پر میں کس سے کہوں جا کر؟"

بین کرتی اس کی اپنی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، چیخیں اس کے گلے میں گھٹ رہی تھیں۔ شاید وہ سامنے سے آتی کسی گاڑی سے ٹکرا کر خود کو ختم کر لیتی کہ آنکھ اٹھانے پر اسے اپنے گھر Sweet Home Home کو جاتا رستہ دکھائی دیا کہ وہ رستہ آج سے پہلے اسے کبھی اتنا انمول اتنا قیمتی نہیں لگا تھا۔ آج اسے اس کی قیمت لگانا بھی ناممکن لگ رہا تھا جیسے وہ اس رستے پر چلی تو یہ رستہ میلا ہو جائے گا۔

شاید یہ بہت جلد میرے لیے نعمت ممنوع ہو جائے جیسے پہلی خطا، پہلے گناہ کے بعد آدم سے اس کی حسین جنت ہمیشہ کے لیے چھن گئی تھی۔ اس کے آنسو، اس کی فریادیں، اس کی آہ و بکا کچھ بھی تو اسے جنت کے حسین باغوں تک دوبارہ نہ لے کر جا سکی، یہاں تک کہ توبہ کے بعد بھی جنت کا حصول ایک ناممکن عمل ہی رہا کہ ان باغوں تک جانے کے لیے بھی ساری عمر گناہوں سے دور رہنے کی ریاضت آدم کو ہی کرنا پڑے گی آدم کی تو توبہ قبول ہو گئی کہ وہ اس کی بارگاہ میں کی گئی تھی جو رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ میری توبہ تو انسانوں کے حضور ہوگی اور انسان خدا سے بڑا خدا بن بیٹھا ہے اگر اسے یہ منصب مل جائے تو۔

جوں جوں گھر قریب آتا جا رہا تھا۔ اس پر رقت طاری ہوتی جا رہی تھی، زندگی سے دوری کا امکان بڑھتا جا رہا تھا۔ جیتے جی موت کو گلے لگا لینے والی صورت بنتی جا رہی تھی۔ کبھی یہ گھر اس کی خوشیوں کا اس کے خوابوں کا گہوارہ تھا اس گھر میں اس نے پہلی بار آنکھ کھولی، خدا کی عطا کردہ اس ارضی جنت کو دیکھا جس میں اس کے اردگرد ماں باپ کی صورت میں خدا کے دو حسین و دلفریب محبت کے روپ کھڑے تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسے وان کرکے پروان چڑھایا تھا۔ اسے گوشت پوست کے لوتھڑے سے آرزوؤں امنگوں خوابوں اور خواہشوں کا متمنی انسان بنایا، اس گھر کے آنگن میں ابوجی نے اسے جھولا ڈلوا کر دیا جہاں وہ اپنی پڑھائی سے فارغ ہو کر تمام وقت جھولتی رہتی اور اپنی نرسری پوئمز زور زور سے گاتی رہتی جس پر سہیل بھائی کا پارہ آسمانوں سے باتیں کرنے لگتا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کتاب ہاتھ میں لیے دھاڑتے امی سے احتجاج کرتے اور اگر امی موجود نہ ہوتیں تو باہر آکر اسے ایک دو زوردار ہاتھ بھی جڑ دیتے وہ رونے لگتی تو امی گھر کے جس گوشے میں بھی ہوتیں اس کا رونا سن کر بھاگی چلی آتیں۔

"سہیل! اپنے غصے کو کنٹرول کرنا سیکھو۔ معصوم بہن پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں۔ آلینے دو تمہارے ابوجی کو آج ان سے تمہاری ٹھیک ٹھاک کلاس کراؤں گی۔"

وہ نزہت کو اپنی آغوش میں لے کر سہیل کو سرزنش کرتیں۔

"آج میں نے ہاتھ اٹھایا ہے اگر یہ اسی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے بھونڈے گیت گاتی رہی تو ایک دن میں اس کا گلا دبا دوں گا۔" سہیل پر ماں کے غصے کا رتی برابر بھی اثر نہ ہوتا۔

"تم نزی کو ہاتھ تو لگا کر دیکھو، میں تمہارے ہاتھ نہ توڑ دوں گی۔ چھوٹی بہنوں پر لوگ جان دیتے ہیں ایک تم ہو سارے زمانے سے نرالے۔ خدا نہ کرے نزہت کبھی تمہارے آسرے پر پڑے اور تم اس پر یہ ظلم توڑو اور اگر ایسا ہو خدا وہ دن میری زندگی میں نہ لائے کہ مجھے تم سے اسی کٹھور پن کی امید ہے۔ تمہیں نہ ماں باپ سے پیار ہے نہ اس ننھی پری سے۔ خدا معلوم تمہارا دل اس قدر پتھر کیوں ہے۔ کس پر چلے گئے تم؟"

امی خواہ مخواہ رونے لگتیں تو سہیل بھائی سخت گڑبڑا جاتے اور بڑی منت سماجت سے انہیں منانے لگتے۔ اور امی آج وہ دن آہی گیا کہ میں سہیل بھائی کے آسرے پر آ پڑی ہوں اور آج یہ دن آپ کی زندگی میں نہیں آیا، اللہ نے آپ کی سن لی اور میں کس کو سناؤں اپنی کس کو بتاؤں۔ اب کون مجھے اپنی آغوش میں لے گا۔ کون میرے آنسو پونچھے گا۔ میں تو خود آئینہ دیکھنے کے قابل نہیں رہی تو کون میرا چہرہ دیکھے گا۔

اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے سڑک کراس کی۔ پھر سہیل اور اس کے درمیان کٹھور پن کی یہ دیوار بڑھتی ہی چلی گئی وہ امی ابو کی لاڈلی تھی اور سہیل کو اس سے خواہ مخواہ کی چڑ تھی۔ سہیل پڑھائی میں تو اچھا تھا مگر اسے ناجائز طریقے بہت بھاتے تھے۔ دو تین بار امتحانوں میں نقل کے دوران پکڑا گیا جس کی وجہ سے ابوجی کی نظروں میں اس کا امیج بالکل ہی ڈاؤن ہو گیا اور نزہت پڑھائی میں بھی اچھی تھی اور ماں باپ کی خوب فرمانبردار بھی۔

اس چیز نے اسے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بنا رکھا تھا۔ سہیل نے ابوجی کی سخت سرزنش پر دو تین بار انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا، جس کی وجہ سے امی ابو کو بہت صدمہ ہوا پھر بیٹے کی طرف سے ملنے والے ان صدموں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ امی کے انتقال کے بعد سہیل کی دلچسپی گھر میں صفر ہو کر رہ گئی۔ نزہت سے برتی جانے والی بے نیازی میں وقت گزرنے کے ساتھ مزید اضافہ ہو چکا تھا اور پھر اس کی ریشم سے کورٹ میرج جس کی ابو اور نزہت نے بہت مخالفت کی تھی مگر سہیل نے ان کی مخالفت کی پروا کیے بغیر اس حسین ڈائن کو لا کر اپنے گھر کی زینت بنا لیا۔

ریشم اگر اچھی نکل آتی تو شاید ابوجی سہیل کے اس جرم کو بھی معاف کر دیتے مگر بازاری عورت کی اس بیٹی نے ان کے آباء کی صدیوں کی بنی عزت کی چادر کو ادھیڑنا شروع کر دیا۔

اس نے گھر کے آگے رک کر چادر کے کونے سے اچھی طرح اپنا منہ صاف کیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا۔ حلق میں تو جیسے کانٹے اُگے ہوئے تھے۔ چادر کو اچھی طرح اوڑھا اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو چکی تھیں اور ٹانگیں ہولے ہولے کانپنے لگی تھیں۔

"یہ میرا گھر ہے۔ میری ایسی حالت اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ میرے اللہ مجھے حوصلہ دے زندگی دی ہے تو حوصلہ بھی دے۔" اس نے سینے کے اندر زور زور سے دھڑ دھڑاتے دل کو سنبھالا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

"کاش سارے گھر کی برقی رو سمٹ کر اس ننھی گھنٹی میں آسمائے اور اس کی ننگی تاریں میرے وجود کو چھو کر اس کا خاتمہ کر دیں اور میں کسی کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھوں۔"

اس کے دل نے بے اختیار دعا کی گھنٹی گھر کی خاموش فضاؤں میں دور تک گونجی تھی۔ انتظار کا دورانیہ سولی پر لٹکے کسی شخص پر گزرے تکلیف دہ عمل کی طرح تھا اس نے اپنی گیلی یخ ہتھیلیوں کو آپس میں جکڑا۔

کتنے لمحے خاموشی سے سرک گئے' اطلاعی گھنٹی کا کوئی رسپانس نہیں ہوا تھا۔ اس نے خوف سے لرزتے دل پر قابو پا کر دوسری بار پھر بیل کو دبایا اس بار انتظار طویل نہ تھا۔ دوسری گھنٹی بجنے کے چند لمحوں بعد ہی مین گیٹ دھڑ سے کھل گیا' سامنے وہ حرافہ اس کی معصوم زندگی کی قاتلہ بنی سنوری کھڑی تھی۔ اور بج ڈبل جارجٹ کے سوٹ پر اور بج بھڑکتا ہوا میک اپ کیے وہ شاید کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے ایک نفرت بھری اجنبی نگاہ سے نزہت کو دیکھا جیسے کوئی بے وقت آنے والے بھکاری کو دیکھتا ہے۔

"کون ہو تم؟" لہجے میں نفرت حقارت یا ناشناسائی اور گیٹ پر استحقاق بھرے انداز کے سارے تیر موجود تھے۔

"تم۔" نزہت نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کون ہو تم اور ادھر کیا لینے آئی ہو۔" وہ دیدہ دلیر عورت اب گیٹ کے بیچ کھڑی تھی اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے تھے' آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

"ہٹو میرے راستے سے' تم یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتیں تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کا تو میں تمہیں ابھی بتاؤں گی' کیسے تم نے ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔ ہٹو پرے تم۔" نزہت نے اس کے کمر پر رکھے بازو کو دھکیل کر اندر جانے کے لیے رستہ بنانا چاہا مگر اس آہنی صفت عورت کا بازو ہٹانا کچھ آسان کام نہیں تھا۔

"آوارہ' بے حیا۔" ریشم نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر جڑا' نزہت کی آنکھوں کے آگے نیلے پیلے اور بج ستارے سے جگمگانے لگے۔ "جو یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کو بھی بلوا لیتی ہوں۔ سہیل! سہیل! ادھر آؤ' دیکھو تمہاری پاکیزہ بہن تمہارے پرکھوں کی عزت کو کیسا حسین بٹہ لگا کر کس دیدہ دلیری سے گھر کے اندر گھسی رہی ہے۔"

کیسا تقدیر نے ایک ہی رات میں پلٹا کھایا تھا تخت کو تختہ کر دیا تھا۔ وہ جو گھر میں آنگن میں کھیلنے والا معصوم و معطر پھول تھا۔ کسی غیر نگاہ نے اس کے پاکیزہ کردار کو میلی نظر سے نہ دیکھا تھا اور جسے ابو جی بازار کی بیٹی کہتے تھے وہ گھر آنگن کی محفوظ چھت تلے باکردار بنی کھڑی تھی اور وہ بازار میں غیر محفوظ اپنوں ہی کی نظر میں مشکوک و بے کردار بنی کھڑی تھی۔ سہیل کی نفرت انگیز نظروں نے اس کے رہے سہے حوصلے بھی منہدم کر دیے۔ اس نے خود اپنے اندر ان حوصلوں کی شکستہ عمارت کو دھڑ دھڑ کرتے سنا اس کا تمام بدن ٹھنڈے پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ خوف کی سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ رہی تھی۔ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اس سے کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا۔ ان سب کے باوجود اس نے آخری بار اپنی ہمت مجتمع کرنے کی کوشش کی خشک پپڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"بھائی بھائی۔" کہنے کی دیر تھی اس کی آنکھوں میں آنسو اس بری طرح سے امڈے کہ سامنے کا منظر ہی چھپ گیا۔

"کیوں آئی ہو یہاں۔ جس کے ساتھ بھاگ کر رات بھر منہ کالا کیا ہے۔ اس کے پاس لوٹ جاؤ۔ اس گھر میں اب تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم نے اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی عزت کو گندگی کے جس پاتال میں پھینکا ہے۔ بہتر ہے تم خود بھی اس میں جا گرو اور یہ تمہارے لیے اب کچھ دشوار نہیں کہ پہلا قدم تو تم اٹھا ہی چکی ہو اور اگر اس گندگی میں جانے کو دل نہ چاہے تو اس شہر میں بڑی بلند عمارتیں ہیں۔ کسی سے بھی کود کر مر جاؤ اس طرح کہ تمہارا چہرہ مسخ ہو کر اتنا منحوس ہو جائے کہ کوئی بھی نہ شناخت کر سکے کہ تم کسی عزت دار شخص کی بھی بیٹی رہی ہو اور تمہاری لاش وصول کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔"

اس کا لہجہ برف کے اندر منجمد ہوا تھا اور ایک ایک لفظ کسی بر فیلے تیر کی مانند نزہت کی سماعتوں پر برس رہا تھا اس نے بے یقینی سے منہ اٹھا کر بھائی کے برف چہرے کو دیکھا یہ تو اسے معلوم تھا۔ سہیل کا ری ایکشن اس سے کم نہیں ہو گا مگر اس طرح کے لفظ اس طرح کا انداز۔ اسے لگا اسے دھوکا ہوا ہے اس کے ساکت بدن میں جنبش ہوئی۔ وہ ذرا آگے کو بڑھی تو ریشم اس طرح بدک کر پیچھے ہٹی جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"بھائی۔ بھائی! میری بات تو سنیں۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو میں تو اس کے ساتھ۔"

وہ گڑگڑاتے ہوئے آگے بڑھ کر جیسے سہیل کے قدموں میں گرنے لگی۔ سہیل نے پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر گیٹ کے پٹ اپنی طرف سمیٹ لیے اور چٹخنی لگاتے ہوئے تیز آواز میں چلایا۔

"تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ نہیں سننا۔ تمہارے مر جانے کی خبر میں نے سارے شہر کو دے دی ہے۔ اب زندہ بدن لے کر پھرو گی تو بد روح کہلاؤ گی۔ لوگ وحشت زدہ ہو کر بھاگ جائیں گے بہتر ہے جہاں رات گزار آئی ہو' وہیں ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ۔ اب دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا یہاں کوئی تمہارا منتظر نہیں۔"

واسطہ بھائی! آپ کو میرے مرے ہوئے ابو جی کا واسطہ بھائی! میں آپ کی نزی ہوں بھائی! امی ابو جی کی نزی بھائی مجھے پہچانو۔ مجھ پر رحم کھاؤ تو مجھے ایک موقع دو بات کرنے کا۔ بھائی! دروازہ کھولو خدا کی قسم تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔ بھائی میں کہاں جاؤں گی؟ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ بھائی! میں پتا نہیں کس طرح یہاں تک آئی ہوں مجھے اس طرح مت دھتکارو بھائی آپ کو اللہ کا واسطہ بھائی امی کا واسطہ بھائی دروازہ کھول دیں میں مر جاؤں گی۔ میں کھڑی کھڑی بے آسرا مر جاؤں گی۔ بھائی مجھے اس گھر کے سوا اور کوئی راستہ نہیں آتا خدا کے لیے دروازہ کھول دو بھائی۔ بھائی سہیل بھائی میرے اچھے بھائی مجھے معاف کر دو میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا' خدا کی قسم آپ کو اللہ کی قسم بھائی ایک بار مجھے اندر آنے دو میں پھر کہیں نہیں جاؤں گی کبھی بھی بھائی بھائی۔۔۔"

بے ربط جملوں کے دوران اس کی آواز پھٹ رہی تھی اس پر دیوانگی سی طاری ہوئی۔ وہ زور زور سے بند گیٹ سے سر ٹکرانے لگی۔ اس کی چادر ڈھلک کر اس کے قدموں کو چھو رہی تھی۔ وہ ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ سر کو دروازے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس علاقے کے باسی سویرا دیکھنے کے عادی نہیں تھے۔ گھر بڑے بڑے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے کافی کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے اس کی دیوانگی کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔ سوائے خاموش آسمانوں میں بیٹھا فیصلے کا کارڈ محفوظ کیے خدا کے۔ اس کی ہسٹریائی چیخوں میں شدت آ گئی اور ماتھے سے خون رسنے لگا مگر اسے کوئی ہوش نہیں تھا ہوش میں آنے کے بعد سے وہ جو خود کو سمیٹ کر حوصلہ کیے بیٹھی تھی یوں بھائی کے اجنبی بننے پر سارے حوصلے سارے ضبط کھو بیٹھی۔

"بھائی مجھے لے جاؤ۔ مجھے اندر لے جاؤ بھائی! یہ گھر میرا بھی تو ہے۔ بھائی! میں نے کچھ بھی نہیں کیا کسی سے بھی پوچھ لو میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا لوں گی۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو کہیں بھی نہیں گئی تھی میں تو بازار گئی تھی۔ بھائی اللہ کے واسطے گیٹ کھولو۔ مجھے اندر لے جاؤ۔ بھائی مجھے اندر آنے۔۔۔۔ میری بات۔۔۔۔ بھائی میں نے۔"

اس کے ہوش و حواس گم ہونے لگے خود کو سنبھالنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور وہ مٹی کی ڈھیری کی طرح سیاہ گیٹ کے آگے کسی گٹھڑی کی طرح زور سے آن گری۔

☼ ☼ ☼

مکاں ہے آگے لامکاں کی جستجو ہے
رستے کبھی باعثِ سفر نہیں ہوتے
بھری بہار میں رونے کو جی چاہتا ہے
جذبات موسموں کے زیرِ اثر نہیں ہوتے
برستی ہے بارش اور آگ بجھتی نہیں
کون کہتا ہے اب یہ قہر نہیں ہوتے
کتنی ویران ہوتی انسان کی زندگی
آنکھوں میں خواب اگر نہیں ہوتے

وہ پاگلوں کی طرح چار گھنٹوں سے گاڑی دوڑائے جا رہی تھی۔ پتا نہیں کیسی فرسٹریشن اس کے اعصاب پر طاری ہوگئی تھی۔ وہ تین بجے کے قریب گھر سے نکلی تھی اور اب سات بجنے کو تھے۔ روشن بھڑکیلا دن بجھ کر مٹیالے اندھیرے میں چھپ رہا تھا۔ شہر مرکزی لائٹوں سے جگ مگ کرنے لگا تھا۔ روشن نیون سائن دور سے دیکھنے والے کی توجہ کھینچ رہے تھے سڑکوں پر ٹریفک کا لوڈ بڑھ گیا تھا۔ دفاتر اور کام وغیرہ سے فارغ ہو کر لوگ اب گھروں کو رواں دواں تھے دن بھر کے کام کاج کے بعد اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے گھر سب کے لیے کشش کا موجب تھا۔

"کیا کروں گی میں گھر جا کر فخر کو تو رات کو دیر سے آنا ہے اور گھر جا کر پھر وہی ٹینشن سوار۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے فخر کو۔ دن بدن بدلتے ہی جا رہے ہیں۔ پتا نہیں وہ مجھ سے اس قدر دور ہو گئے کہ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ انہیں اب مجھ میں کوئی اٹریکشن نظر ہی نہیں آتی۔ یہ سپاٹ سی زندگی۔ پتا نہیں ہم کتنے سالوں سے گزار رہے ہیں اور مجھے اس کا احساس تک نہ ہوا۔ اپنی ذات کے غم اور سوشل ایکٹویٹیز کے خود ساختہ جال میں خود کو اس طرح سے الجھا بیٹھی کہ فخر کب مجھ سے مس ہونے لگے مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور اب جب میری آنکھیں کھلی ہیں۔ میں ان کی توجہ حاصل کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھ سے دامن کھینچتے جا رہے ہیں اور آج کل تو حد ہو گئی ہے۔ ان کا الجھا الجھا رویہ اور مبہم سا انداز۔ یا اللہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔" اس نے زور سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا سامنے سڑک پر کوئی گاڑی اس کے آگے نہیں جا رہی تھی مگر وہ انجانے میں نہ جانے کب سے ہارن پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔

"لگتا ہے میں پاگل ہو رہی ہوں۔" اس نے ہارن سے ہاتھ اٹھا کر اسپیڈ پر رکھا پاؤں ذرا پیچھے کیا۔ اسپیڈ میٹر کی سوئی اسی اور ستر کے درمیان لرز رہی تھی۔ اتنی فاسٹ ڈرائیونگ اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

"اوہ میں نے تو شاید صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔"

اچانک دائیں طرف چائنیز ریسٹورنٹ کی جگمگاتی لائٹوں نے اسے یاد دلایا۔ وہ واقعی صبح سے بھوکی تھی اور اب بھی سات بج چکے تھے۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا اس نے گاڑی ٹرن کرتے ہوئے ریسٹورنٹ کے پارکنگ میں کھڑی کی۔ گاڑی لاک کر کے موبائل اور ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال کر اندر بڑھی۔

یہ ریسٹورنٹ فخر کا پسندیدہ سپاٹ تھا۔ ڈنر کے لیے اکثر وہ دونوں یہیں ——— آتے تھے جب بھی چائنیز کا موڈ ہوتا تھا اور۔

"سیفی کو بھی تو چائنیز بہت پسند ہے میں اس کو ہی ساتھ لے آتی جب میں گھر سے نکلی وہ اسکول سے آیا ہی تھا۔" اسے یاد آیا۔ "پتا نہیں اس نے ٹیوشن لی یا نہیں۔ بہت پڑھائی کا چور ہے وہ کھانا کھاتے ہی میں گھر چلتی ہوں۔" ٹیبل کے گرد پڑی کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اسے بہت سی سوچوں نے گھیر لیا۔

مینو بک میں سے اس نے ویٹر کو آرڈر دیا اور خود گھر کا نمبر ملا کر سیفی کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"سیفی بابا ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہے ہیں۔ ٹیوشن انہوں نے پڑھ لی تھی۔" جنتاں نے بتایا۔

"کھانا بھی انہوں نے کھا لیا تھا جی۔" اس کے سوال پر جنتاں بولی۔

"جی تھوڑی دیر کے لیے آرام بھی کیا تھا۔ کھیلنے باہر نہیں گئے۔"

"صاحب کا کوئی فون آیا؟" اس نے پوچھا حالانکہ وہ خود بھی دو تین بار آفس فون کر چکی تھی۔ فخر کا موبائل تو مسلسل آف جا رہا تھا۔ پتا نہیں کس مصروفیت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس نے جھنجلا کر موبائل پٹخا تھا۔

"نہیں جی کوئی فون نہیں آیا۔" جنتاں بولی۔

"ٹھیک ہے میں ابھی گھر آتی ہوں۔ تم سیفی کو پوچھ کر کھانا دے دو۔" اس نے موبائل آف کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں اس کی ٹیبل اشتہا انگیز، خوشبودار اور کلر فل رنگوں کی ڈشز سے سج گئی۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی اتنی بھوک اسے پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ کھانے کے دوران اس نے سلاد کی طرف بھی دھیان نہیں دیا حالانکہ سلاد اس کی کمزوری تھی کھانے کے بعد اس نے کافی کا آرڈر دیا۔ کچھ اعصاب کو سکون ملے گا۔ اس نے کرسی پر پرسکون انداز میں بیٹھتے ہوئے سوچا اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

ہال میں رش نہیں تھا۔ بس دو چار ٹیبلز ہی فل تھیں اس نے یونہی گردن گھما کر بائیں طرف دیکھا تو جیسے اس کی نگاہیں پتھر کی ہو گئیں۔ اس نے پلکیں جھپک کر بے یقینی سے سامنے کے منظر کو دیکھا۔ خود کو یقین دلانے کے لیے وہ پوری گھوم گئی۔

فخر حیات کسی الٹرا ماڈرن خوبصورت خاتون کے ساتھ بہت خوشگوار موڈ میں کھانا کھا رہے تھے رعنا نے زور سے گردن کو جھٹکا دیا۔ فخر حیات کا موبائل کھانے کی ٹیبل پر ان کے بائیں ہاتھ میں مردے کی طرح پڑا تھا حالانکہ ابھی صرف دس منٹ پہلے اس نے فخر کے موبائل پر کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر۔

اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی آنکھوں کے آگے اپنی کانٹوں بھری رات کا رت جگا اور دن بھر کی کوفت بھری ٹینشن گھوم گئی وہ کوشش کے باوجود خود پر ضبط نہ رکھ سکی اور بڑے جارحانہ انداز میں ان کی ٹیبل کی طرف بڑھی وہ دونوں اس سے بے خبر خوش گپیوں میں مگن تھے۔

"فخر! کین آئی سٹ ہیئر؟" (کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں) قریب جا کر اس نے فخر کے قریب جھکتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

تو ایک پل کو فخر حیات کا لقمہ اور جملہ دونوں جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئے انہوں نے بے یقینی سے رعنا کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میں خود پر قابو پا لیا۔

"وائے ناٹ شیور۔" فخر حیات نے اپنی خوشگوار ٹون کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ "یہ میری کلاس فیلو بھی رہ چکی ہیں ثمن۔" وہ عورت دور سے جتنی اٹریکٹو نظر آ رہی تھی۔ قریب سے اور بھی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ فخر حیات جیسے شخص کا ذوق کوئی ایسا ویسا تو نہیں ہو سکتا۔ اس نے ثمن کے صبیح چہرے پر نظریں گاڑ کر سوچا۔

"میرا تعارف نہیں کرواؤ گے۔" وہ دونوں ہتھیلیاں ٹیبل پر جما کر ذرا سا اور جھکی ثمن بھی دلچسپی سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"مائی وائف رعنا۔" اب کے فخر حیات کا لہجہ بہت خشک سا تھا۔

"اگر آپ کھانے سے پوری طرح لطف اندوز ہو چکے ہوں تو گھر چلیں۔" وہ تیکھے لہجے میں فخر کے روکھے پن کی پروا کیے بغیر فخر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"نہیں... ہم نے ابھی ڈنر اسٹارٹ کیا ہے۔ تم جاؤ گھر میں آ جاؤں گا۔" فخر حیات کا انداز قطعاً اجنبی تھا رعنا جیسے جھلس کر رہ گئی۔

"میں پوچھ سکتی ہوں کیا یہی آپ کی مصروفیت تھی جس کی وجہ سے آپ دن بھر آفس میں موجود نہیں تھے اور آپ نے اپنا موبائل بھی مسلسل آف کر رکھا تھا کہ اس کی ناخوشگوار بیپ آپ کے خوشگوار موڈ کو ڈسٹرب نہ کر دے۔" وہ چبا چبا کر جیسے لہجے میں براہ راست فخر حیات سے بولی تھی۔

ثمن لاتعلقی سے کھانا کھا رہی تھی اسے ان دونوں کی بحث لاحاصل لگ رہی تھی۔ کانٹے اور چمچ کے ساتھ

ساتھ اور دو چار کتابیں انگریزی کی نہ کوئی ایڈریس نہ کوئی پتا۔ میرا خیال ہے یہ گھر چھوڑ کر آیا ہوگا جوان خون یونہی ماں باپ سے کوئی نہ کوئی تلخی کر بیٹھتا ہے اور دھمکی کے طور پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔" کیپٹن شہباز نے لاپروائی سے تبصرہ کیا۔

"نہ بیٹا! مجھے تو یہ ایسا نہیں لگتا چہرے مہرے سے کسی اچھے نیک ماں باپ کی اولاد لگتا ہے اللہ اس کو زندگی دے اسے جلد سے جلد ہوش آئے ہمارے ذمے خدا نہ کرے کسی کی زندگی پڑے۔" مسز خان نے خلوص دل سے دعا کی۔

"امّ جان! آپ نے کچھ دیر کے لیے اسے گاڑی کی نیم تاریکی میں دیکھا اس کا شجرہ نسب تک پڑھ ڈالا کہ کسی نیک والدین کی اولاد لگتا ہے، جب تک اسے ہوش نہیں آجاتا۔ ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے اوپر سے آپ نے میری چھٹی کروادی دو دن کی حالانکہ میں بہت مشکل سے آیا تھا ایک دن کی چھٹی لے کر۔ اب پتا نہیں اسے کب ہوش آتا ہے۔" کیپٹن شہباز اپنی چھٹی کی وجہ سے بہت الجھے ہوئے تھے۔

"اور اسی پریشانی میں مجھے پنڈی فون کرکے نزہت کا حال معلوم کرنا بھی یاد نہیں رہا، کیا کہے گی اچھی پھوپھو ہے جب سے گئی ہے، مڑ کر کوئی خیر خبر ہی نہیں لی۔ وہ تو پہلے ہی مجھے نہیں آنے دے رہی تھی۔ ریشم کم ذات ہی نہیں بہت کمین فطرت بھی ہے۔ آج کل اس نے جو اچھی بہو اور اچھی بھابی کا چولا پہنا ہے اس سے وہ کسی کو دھوکا بھی دے سکتی ہے۔ میں نزہت کو سمجھا کر تو آئی تھی مگر پھر بھی وہ بہت بھولی ہے۔" مسز خان کا دھیان نزہت کی طرف چلا گیا۔

"امی جان! نزہت اب اتنی بھی بچی نہیں دوسرے ریشم بھابی جہاں تک میرا خیال ہے کافی حد تک سدھر گئی ہیں۔ مسلسل اتنے دن تو کوئی ڈرامہ نہیں کرسکتا کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی بات بھی انسان کو سرتاپا بدل کر رکھ دیتی ہے ہوسکتا ہے ماموں جان کے انتقال نے انہیں اپنی کوتاہی کا احساس دلا دیا ہو اگر وہ اچھی بنی ہوئی ہیں تو بھی ان کی نیت پر شک کرکے انہیں پھر سے اسی حالت کی طرف مڑ جانے کے لیے نہیں اکسانا چاہیے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔" کیپٹن شہباز ہر چیز کا مثبت پہلو دیکھنے کے عادی تھے۔

"چھوڑیں اس موضوع کو امّ جان! اس لڑکے کو ہوش نہیں آیا۔ آپ دعا کریں۔ مجھے چھٹی بڑھوانی نہ پڑ جائے۔ یہ تو طے ہے جب تک اسے ہوش نہیں آجاتا۔ میں ڈیوٹی جوائن نہیں کرسکتا۔"

"میں نے سوچا تھا، جاتے ہی شادی کی کچھ تیاری کرلوں گی۔ کچھ ہی تو دن ہیں چند ایک اچھے جوڑے اور زیور تو خریدنا ہی ہے نا۔ آتے ہی یہ مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ اللہ کرے اسے آج ہوش آجائے تو کل ایاز اور ظفر کی بیویوں کو کچھ رقم دے کر بازار بھیجوں گی۔ کچھ ریڈی میڈ سوٹ خرید لائیں زیور کے لیے تو میں خود جاؤں گی یا فون کرکے جیولر کو گھر بلوالوں گی۔" مسز خان کو آج کل یہی فکر لاحق تھی۔

"کاش یہی کام ماموں جان کی زندگی سب خوشی خوشی ہو جاتا۔" کیپٹن شہباز نے ورق پلٹتے ہوئے یونہی سوچا۔

"اب دونوں طرف کس قدر سادگی و افسردگی سے تیاری کی جارہی ہے۔ نزہت کتنی کمزور ہوگئی ہے۔ چپ چپ سی خاموش۔ نکاح کی خوشی بھی اس کے افسردہ روپ کو رنگ اور مسکراہٹ نہ دے سکی کتنا عجیب سا لگ رہا تھا سب اس نے ماموں جان کی موت کا صدمہ بہت گہرا لیا ہے۔ میں تو اس کی مسکراہٹ کو ترس گیا ہوں اس کے ملیح چہرے پر دھیمی سی مسکان کس قدر بھلی لگتی ہے۔ جی کرتا ہے تکے جاؤ۔" وہ خیال ہی خیال میں نزہت کا مسکراتا روپ دیکھ کر خود بھی ہلکے سے مسکرانے لگے۔

"بس اب تو چند ہی دن ہیں پھر یہ مسکان ہمیشہ کے لیے میری بصارتوں کے سامنے سج جائے گی۔ کتنی حسین ہوگی وہ صبح جب بیدار ہونے پر میں اس کانچ جیسی نازک لڑکی کو میں اپنے پہلو میں پاؤں گا۔"

پہلی صبح کا تصور ہی اتنا خوش کن تھا کہ بیٹھے بیٹھے ایک دم سے ان کا موڈ بے حد اچھا ہوگیا۔ انہوں نے میگزین لپیٹ کر رکھ دیا اور ایک نظر معاذ کو دیکھا۔ اس کی بند آنکھوں کے پپوٹے دھیرے دھیرے لرز رہے تھے یا تو اسے

ہوش آچکا تھا یا اسے ہوش آرہا تھا۔ انہوں نے اسے ہوش میں آتے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور کچھ دیر خاموشی سے اسے بغور دیکھنے لگے۔ معاذ نے چوری چوری آنکھیں کھولیں۔ کیپٹن شہباز اسی پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ وہ جلدی سے پھر آنکھیں بند کرنے لگا کہ وہ بول اٹھے۔

"بس بھئی، بہت سو لیے تم اب ہوش میں آجاؤ۔ گاڑی سے ٹکرانے کی تم نے مجھے دو دن سزا دی ہے، اب دوبارہ کومے میں نہ چلے جانا۔ تمہاری بڑی مہربانی، میں کوئی فارغ بندہ نہیں ہوں۔ ڈیوٹی جوائن کرنی ہے مجھے جاکر تم نے مجھے نرس بنا کر باندھا ہوا ہے۔"

کیپٹن شہباز کی ہشاش بشاش آواز اور ہلکے پھلکے جملوں نے معاذ کو آنکھیں کھلی رکھنے پر مجبور کردیا۔ وہ ان سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ سامنے دیوار پر نادیدہ نقطے کو دیکھنے لگا۔

"مسٹر میں ادھر ہوں آپ کا خادم جس کی گاڑی کو بھرا شہر چھوڑ کر آپ نے ٹکر مارنے کا شرف بخشا تھا۔" انہوں نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی اور کرسی کھسکا کر اس کے قریب لے آئے۔ معاذ نے ترچھی نگاہ سے انہیں دیکھا کہ جناب میں جان بوجھ کر تو آپ کی گاڑی سے نہیں ٹکرایا تھا۔

"ہائی داوے خودکشی کے اب تو اور بھی بہت سے طریقے رائج ہوچکے ہیں۔ اس اولڈ اسٹائل آف سوسائیڈ (خودکشی) میں تو غریب ڈرائیور بھی بے موت مارا جاتا ہے۔ چاہے اس بے چارے کے چند دنوں بعد سہرے کے پھول کھلنے ہوں پھانسی نہ سہی عمر قید تو مل ہی جانی تھی مجھے اگر تم دنیا کو ٹاٹا کر جاتے۔" وہ ہنوز شگفتہ موڈ میں تھے معاذ نے کچھ کہنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

"آپ اپنی اس بے ضرر سی شرارت پر کچھ تبصرہ نہیں فرمائیں گے۔" کیپٹن شہباز اسے بولنے پر اکسانا چاہ رہے تھے۔

معاذ نے آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"پ۔ پانی۔" ان کی ذہین چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر یہی کہہ سکا۔

"کیا ڈو۔۔۔"

"پانی ہے۔" وہ کمزور آواز میں شرمندگی سے بولا۔

"اوکے۔" کیپٹن شہباز اس کا ہاتھ چھوڑ کر اٹھے اور سائیڈ ریک میں رکھی منرل واٹر کی بوتل سے گلاس بھرنے لگے۔ انہوں نے اسے کمر سے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے دو گھونٹ پیے۔

"تھینک یو۔" لیٹتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔

"یار! شکریہ تو تمہارا، تم ہوش میں آگئے ورنہ میں تو اب واقعی پریشان ہوچلا تھا کہ کہیں خدانخواستہ تم دو چار سالوں کے لیے کومے میں چلے جاتے تو پھر میرا ضمیر تو مجھے خوامخواہ ملامت کرتا رہتا۔" وہ گلاس رکھ کر پھر سے کرسی پر آبیٹھے۔

"میں کہاں ہوں؟" معاذ نے ذرا سی گردن گھما کر دائیں طرف دیکھا۔

"ظاہر ہے ہاسپٹل میں۔" کیپٹن شہباز اب گہری نظر سے اس کا مشاہدہ کررہے تھے۔

"کون سے ہاسپٹل میں۔" اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"جہاں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولے۔ "یار! تمہیں بل دینا ہے۔ تم اس بات کو چھوڑو کون سے ہاسپٹل میں۔ تم یہ بتاؤ تم میری گاڑی سے کیوں ٹکرائے۔ کہیں کوئی واردات وغیرہ تو نہیں کرکے بھاگ رہے تھے۔ یہ اچھا خاصا پولیس کیس بن سکتا ہے۔ تم کون ہو تمہارے سامان یعنی شاپر بیگ میں سے صرف دو جوڑے کپڑوں کے اور چند کتابیں برآمد ہوئی ہیں جن سے کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ کہ جناب کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ادھر اتنا مختصر توشہ سفر اٹھائے کیوں گاڑیوں سے ٹکراتے پھر رہے ہیں۔"

ان کی مزاحیہ ٹون پر معاذ نے شکوہ بھری نظر سے انہیں دیکھا۔ اپنی حالت کا سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"مرد ہو ینگ مین! یوں لڑکیوں کی طرح آنسو نہ بہاؤ۔
پہلے اپنا نام بتاؤ۔"
"معاذ۔" وہ آہستگی سے بولا۔
"کہاں کے رہنے والے ہو۔؟" ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی اس سوال پر معاذ نے کچھ پریشانی سے انہیں دیکھا ور کوئی جواب نہ دیا۔ سامنے دیوار پر نادیدہ نقطے کو گھورنے لگا۔
"تم نے جواب نہیں دیا۔ گھر کہاں ہے تمہارا۔؟" وہ غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہے تھے۔
"گھر نہیں ہے۔" اس کے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔
"گھر نہیں ہے کیا مطلب۔؟" انہوں نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا "کیا کسی شاخ پر اُگے تھے" ظاہر ہے گھر تو ہو گا چھوڑ آئے ہو۔؟" وہ کڑی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔
"نہیں۔" معاذ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کا جواب کس طرح آسان بنا کر پیش کرے۔
"پھر؟" سوالیہ نظریں اسے تکلیف دے رہی تھیں۔
"میں 'سائبان' میں رہتا تھا پہلے۔" اس کی آنکھوں میں پانی بھر بھر کر آ رہا تھا اور حلق میں گولہ سا پھنس رہا تھا۔ وہ آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر پا رہا تھا۔
"سائبان/ واٹ؟" کیپٹن شہباز کی سمجھ میں نہ آیا۔
"یتیم خانہ ہے۔" معاذ نے اتنی آہستگی سے کہا کہ انہیں بمشکل سنائی دیا۔
"اوہ۔" انہوں نے ہونٹ سکوڑے۔
"تمہارے پیرنٹس؟"
"اگر ہوتے تو کیا میں یتیم خانے میں پلتا۔" وہ کچھ تلخی سے بولا۔
"اب اب کہاں رہتے ہو۔"
"فی الحال کہیں بھی نہیں۔ ایک دوست کے ساتھ گاؤں گیا تھا۔ ابھی ادھر ہی سے آ رہا تھا"
"مگر وہ تو تم ایسے بھاگ کر آ رہے تھے جیسے تمہارے پیچھے کوئی لگا ہوا تھا۔" کیپٹن شہباز نے مشکوک انداز میں پوچھا۔
"میں یونہی ایک گھر کے اندر جھانک رہا تھا چوکیدار پتا نہیں کیا سمجھا۔ وہ میرے پیچھے چور چور کہہ کر بھاگا تو میں بھی۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"ہوں۔" کیپٹن شہباز نے گہرا سانس لیا۔
"اب اب کہاں جاؤ گے؟" کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔
"کالج میں ایڈمیشن لینا ہے پھر ہاسٹل میں۔" اس کی تو یہی پلاننگ تھی۔
"اچھا پڑھتے ہو بھی تمہارے سامان میں سے کتابیں نکلی تھیں' کون سی کلاس میں پڑھتے ہو۔" کیپٹن شہباز کے رویے میں اس کے لیے یکایک دلچسپی پیدا ہو گئی انہیں پڑھنے کے شیدا لوگ بہت پسند تھے۔
معاذ کا حوصلہ بڑھا' وہ ذرا سا اٹھ کر بیٹھا اور انہیں تفصیل بتانے لگا۔

* * * *

جب سے وہ گھر آئی تھی۔ چینج کیے بغیر بیڈ روم میں ٹہل ٹہل اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے گھر میں نہیں' کسی اجنبی کے گھر میں ٹہل رہی ہے۔ جس کی اجازت کے بغیر وہ اس گھر میں داخل ہو گئی ہو اور اب نہ جانے مالک کا کیا ردعمل ہو۔
"آج مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا او مائی گاڈ۔" تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ گہرا سانس لیتی سر دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر خود سے بے یقینی سے کہتی۔
فخر حیات کی شخصیت کا یہ کون سا پہلو تھا جو آج تک مجھ سے پوشیدہ رہا۔ یہ تو میں بھی جانتی تھی کہ ان کی دلچسپیاں شہر بھر میں میری ذات کے علاوہ بھی بہت ہیں۔ پر اس حد تک کہ وہ مجھے Own کرنے سے بھی انکار کر دیں گے' یہ تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں تو فخر پر اندھا اعتماد کرتی تھی کہ چاہے زمین آسمان ایک ہو جائے یہ دنیا ساری کی ساری بدل جائے۔ فخر مجھ سے دھوکا نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے محبت کی ہے ٹوٹ کر' میں ان کی پسند بن کر اس محل میں اتری تھی بلکہ ابھی ان کی ضد بھی رہی ہوں۔ انہوں نے اپنے اسٹیٹس سے بغاوت کر کے' اپنے سرکل کی پروا کیے بغیر مجھے حاصل کیا تھا۔ کیسے بھول جاؤں میں ان کی دیوانگیوں کو اور اس بات کو صد۔ اِں تو نہیں بیت گئیں یا شاید بیت گئی ہیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔" وہ صوفے پر گر سی گئی۔
"اور آج ایک غیر عورت کے سامنے ان کے انداز اس قدر اجنبی تھے۔ وہ مجھ سے کب اتنے بیزار ہو گئے کہ مجھے وہ اپنے گلے میں لٹکا ہوا ایک طوق سمجھنے لگے کہ جو ان سے دور ہو تو وہ ذہنی طور پر خود کو مطمئن محسوس کرتے ہیں۔ میرے مالک! یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی۔" اس نے صوفے کی بیک سے زور سے سر ٹکرایا۔
"مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" کوئی اس کے اندر سے بولا۔ "اتنی انسلٹ کے بعد میں کیوں یہاں آ گئی یہاں اب ایسا کیا ہے میرا جس کی وجہ سے میں پھر آ گئی' جس کی وجہ سے میں ادھر ہوں۔ انہوں نے آج محفل میں مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو پھر میں ادھر کیوں آ گئی۔" اس نے آنکھیں چھت پر ٹکا کر خود سے سوال کیا۔
"پھر کہاں جاتی کس کے پاس' کون سا گھر ہے میرا۔ ماں باپ تو رہے نہیں اور بھائی بھائی خود میرے ہاتھوں کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ چلی بھی جاتی تو عفت آرا ایک دن مجھے وہاں جینے نہ دیتیں تو پھر اور کہاں جاتی۔" یکدم ہی اپنی بے بسی کا خیال کر کے اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو امڈنے لگے وہ کتنی دیر تک سی خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔
انسان مر جائے تو ہر طرف واویلا ہوتا ہے' رونا دھونا ہوتا ہے' لوگ بین ڈالتے ہیں اور کوئی جیتے جی مر جائے تو کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو گئی اور چار کنال کے اس وسیع و عریض محل میں کسی کی کو خبر بھی نہیں ہو سکی کہ رعنا فخر حیات آج مر گئی۔
اس کی دھیمی دھیمی سسکیاں کمرے کی خاموش فضا میں گونج رہی تھیں۔
پتا نہیں وہ کس طرح گاڑی ڈرائیو کر کے گھر پہنچی تھی۔ کس نے گیٹ کھولا۔ رستے میں جتناں ملی تھی' اس نے کیا کہا' بیغی کدھر ہے' ہوا کہ نہیں' اس نے کچھ کھایا یا نہیں' رعنا کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو اسی بے خودی کی کیفیت میں اپنے کمرے میں چلی آئی اور اب اس وقت سے اپنی خاموش موت کا ماتم منا رہی تھی۔
دیوار پر لگے وال کلاک نے ہلکی سی ٹن کے ساتھ رات کا ایک بجایا تو اس نے کچھ چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ کوٹ بازو پر رکھے چہرے پر ہزاروں سالوں کی تھکن لٹکائے فخر حیات کمرے میں داخل ہوئے۔
اگر کوئی عام سا دن ہوتا تو رعنا سوئی ہوئی ملتی۔ فخر حیات کب اور کس وقت آئے اسے خبر نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی جاتی تو فخر حیات کے چہرے پر لکھی تھکن کی تحریر پڑھتے ہی رعنا سو جان سے اپنے محبوب شوہر پر نثار ہو جاتی مگر آج؟
آج تو اس کا جی چاہ رہا تھا' ان کی شکل دیکھ کر نفرت سے منہ پھیرے۔
فخر حیات نے موبائل سائیڈ ریک پر رکھا۔ کوٹ ہینگ کیا۔ بیڈ پر بیٹھ کر خاموشی سے جرابیں اور جوتے اتارے' گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل کے دراز میں رکھی یہ سب ان کی روٹین کے کام تھے۔ جیسے آج بھی کچھ ہوا ہی نہیں اس کے بعد وہ واش روم میں چلے گئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد سلیپنگ سوٹ میں فریش ہو کر واپس آئے ڈریسنگ

ٹیبل سے برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگے۔ وہ کسی معمول کی طرح اپنے سارے کام انجام دے رہے تھے اور رعنا کسی بت کی طرح صوفے پر بے حس و حرکت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ برش انہوں نے واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں، تم نے آج جو حرکت کی، وہ تمہیں کرنی چاہیے تھی۔" بیڈ کے کنارے اس کے مقابل ٹکتے ہوئے انہوں نے گفتگو کا تیکھا آغاز کیا۔

"مجھے آپ کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دینا، میں ادھر صرف اس لیے بیٹھی ہوں کہ اب میرے لیے کیا حکم ہے۔ کیونکہ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔" رعنا نے بے لچک کھردرے انداز میں انہیں غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا، تم نے آج جو گھٹیا حرکت کی، اس کا تمہارے نزدیک کیا جواز بنتا ہے۔ کیا میں کوئی ٹین ایجر ہوں جو لڑکیوں کو ہوٹلنگ کراتا پھرتا ہوں جو تم نے کسی ان پڑھ عورت کی طرح ایکٹ کیا۔" اب کے ان کی آواز بھی بلند تھی اور اس میں غصے کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

"مجھ سے کوئی سوال مت کریں۔" رعنا نے زور سے آنکھیں بند کر کے دھیمی مگر ترش آواز میں کہا۔ "مجھے میرا مقام بتائیں، اب مجھے کہاں جانا ہے۔"

"رعنا!" انہوں نے دانت پیس کر جملوں کو جیسے کنٹرول کیا۔

"تم نے آج بہت غلط حرکت کی، جس کی میں کم از کم تم سے توقع نہیں کرتا تھا، وہ میری کلاس فیلو تھی، ثمن، پندرہ سال بعد مجھ سے ملی تھی، یہ وہ لڑکی تھی جو یونیورسٹی میں میرے ایک اشارے پر سو جان سے مجھ پر نثار ہونے کے لیے تیار تھی اور میں نے ساری کلاس کے سامنے علی الاعلان کہا تھا کہ میری بیوی وہ ہو گی جسے میرے ساتھ دیکھ کر ثمن جیسے لوگ بھی رشک کریں گے اور آج وہ گھر جا کر کس قدر ہنسی ہو گی، میری حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر۔"

"بھونڈے جواز مت پیش کریں میرے آگے۔" رعنا زور سے چیخی۔

"آہستہ بولو۔" فخر حیات نے جواباً غصے سے کہا۔

"میں آہستہ نہیں بولوں گی فخر! جو کھیل آپ میری ناک کے نیچے کھیلتے رہتے۔ آج وہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور آپ کہتے ہیں میں چپ رہوں آواز بھی نہ نکالوں۔ یہ نہیں ہو گا میں چیخوں گی جس طرح آج ایک غیر عورت کے سامنے آپ نے مجھے ڈی گریڈ کیا۔ قہقہے تو اس نے میری حالت دیکھ کر لگائے ہوں گے۔ فخر! جو کچھ آج آپ نے کیا۔ اس کے بجائے آپ مجھے گولی مار دیتے مگر مجھے اس طرح ذلیل نہ کرتے میں نے جو کچھ کیا اپنا حق سمجھ کر کیا، اب غیر عورت آپ کے پہلو میں جو میری جگہ بیٹھی ہو اور میں اف بھی نہ کروں اور آپ نے میرے ساتھ۔"

اس کی ہچکی بندھ گئی، آنسو اس کی پلکوں کے بند توڑ کر کسی ریلے کی طرح بہہ نکلے تھے۔

"رعنا، رعنا میری جان! ایسے مت کہو۔" اس کی حالت دیکھ کر فخر حیات بے قراری سے اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھے، اسے کندھوں سے تھامنا چاہا، وہ بدک کر ان سے دور جا بیٹھی۔

"تمہیں معلوم ہے۔ میں آج صبح چھ بجے گھر سے نکلا ہوں بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے۔ اسلام آباد کا پانچ گھنٹے کا سفر پھر تین گھنٹے کی طویل بزنس میٹنگ اس کے بعد میں اسلام آباد ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکا صرف میٹنگ کے دوران میں نے کافی پی تھی۔ چھ بجے میں ادھر پہنچا ہوں راستے ہی میں ثمن مل گئی یقین کرو اس کے اصرار پر ہی میں اس کے ساتھ ڈنر پر راضی ہوا وہ چودہ سال بعد اسٹیٹس سے آئی تھی پھر سارا دن میں نے اس قدر ٹینشن میں گزارا تھا تو اتنی ریلیکسیشن تو میرا حق بنتی تھی ورنہ شاید میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا، جتنا برڈن آج کل میری نروز پر ہے، تمہیں میں کیسے بتاؤں اور ڈنر کے دوران ہم صرف اسٹوڈنٹ لائف کی باتیں کرتے رہے اور میں نے

اپنی ہیپی میرڈ لائف کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور ابھی یہ ذکر چل ہی رہا تھا کہ تم سے ایرا غیرا ... ہو گیا۔"

"میں نے مس بی ہیو کیا۔" رعنا روتے روتے دھاڑی۔

"چلو غلطی میری بھی ہے، میں نے ڈبل مس بی ہیو کیا مگر اس وقت سارے دن کی کوفت کے بعد میں اتنا ایگزاسٹ ہو چکا تھا کہ تمہارا غصہ مجھے بالکل بے جا لگا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا اور میں اسے لے کر ہوٹل سے نکل آیا۔ واقعی غلطی میری بھی ہے اور اس کے لیے میں تم سے ایکسکیوز بھی کرتا ہوں۔"

ان کا لہجہ اب بدل چکا تھا۔ اب وہ اپنے بیڈ روم میں جو تھے اور بیوی بیڈ روم کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے۔ بیوی اپ سیٹ ہو تو بیڈ روم کا سکون اپ سیٹ ہو جاتا ہے اور اس وقت انہیں سکون چاہیے تھا۔

"بس کریں۔ ... ضرورت مجھے آپ کے ایکسکیوز کی، اٹھ گیا آپ کا اعتبار میری نگاہوں سے۔"

"رعنا! ہم ایک دو دن کے ساتھی نہیں ہیں، ساری زندگی اکٹھی گزارنی ہے ہمیں۔"

"اب مشکل ہے، بہت فخر حیات!" وہ تلخی سے بولی۔

"بچوں جیسی باتیں مت کرو، اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ چلو میں تم سے سوری بولتا ہوں۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری مائی سویٹ ہارٹ" وہ پہلے والے فخر حیات کے سے انداز میں بولے مگر رعنا سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی رہی۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے منہ پھیر لیا۔

"رعنا ہمارے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے آج مجھے تم سے تمام باتیں کرنی ہیں بلکہ ہمیں آج بیٹھ کر بہت سی تفصیلات طے کرنی ہیں۔ اس لیے پلیز اپنا موڈ درست کرو۔ یہ لڑائی کا وقت نہیں ہے۔" فخر حیات صلح جو انداز میں بولے شام والے فخر حیات کا پرتو بھی نہیں تھا ان کے انداز میں۔

"مگر مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"پھر وہی بچوں والی ضد۔" وہ زچ ہو کر بولے "رعنا! یہ ہمارے فیوچر کا بلکہ ہماری زندگی کا معاملہ ہے بلکہ سیفی کے فیوچر کا معاملہ۔ آج بیٹھ کر کچھ فیصلے کرنے میں میرا ساتھ دو۔" وہ لجاجت سے بولے۔ رعنا کو ان کے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ خاموشی سے بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔

"اچھا تم مجھے ایک بات بتاؤ۔"

"کیا تمہیں اس طرح کرنا چاہیے تھا ریسٹورنٹ میں، اگر میرے ساتھ بزنس سرکل کی کوئی خاتون ہوتی۔ کیا تب بھی تم اس طرح کرتیں کیا اس طرح کی پوزیشن میں تمہیں اس طرح ایکٹ کرنا زیب دیتا تھا۔ میں کوئی بیس سال کا نوجوان لڑکا تو نہیں جو تمہیں بھول کر کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ تم مجھ سے یہ ساری انکوائری گھر آ کر بھی کر سکتی تھیں۔ جب تم نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ ہی لیا تھا۔" وہ آہستگی سے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں بیوی نہیں ہوں۔ آپ کا طوق ہوں۔ آپ کے گلے میں لٹکا ہوا، ہے نا۔" وہ غصے سے ان کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

"پھر وہی غصہ، وہی تکرار۔" فخر حیات نے کوفت سے سر ہلایا۔ "اب چھوڑو بھی اس موضوع کو، جب میں نے سوری کہہ دیا ہے۔"

"فخر حیات! یہ معاملہ اتنا چھوٹا نہیں جو آپ کے سوری کہنے سے دب جائے گا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"تو کیا پھانسی چڑھاؤ گی مجھے گولی مار دو مجھے کہ میں ایک غیر عورت کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا تھا۔ کسی کو گھر سے بھگا کر لایا تھا جو تم سے برداشت نہیں ہو سکا اور تم یوں خود کو اور مجھے تماشا بنائے کھڑی ہو گئیں ہمیں نرمی اختیار کرتا جا رہا ہوں اور تم سر پر چڑھتی جا رہی ہو۔ جاؤ بھاڑ میں، جو جی میں آتا ہے کرو۔ مجھے بھی پروا نہیں۔ میں تم لوگوں کے لیے مر کھپ رہا ہوں جب تمہیں ضرورت نہیں تو سب جائے جہنم میں۔"

فخر حیات نے بیڈ کے پائے کو ٹھوکر ماری' بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور زور زور سے بولتے ہوئے دروازہ دھاڑ سے بند کر کے باہر نکل گئے۔
اور رعنا اس پل پل بدلتے روپ والے مرد کو دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

مسز خان اپنے بستر پر سو رہی تھیں یا بیہوش تھیں ڈاکٹر اسٹیتھو سکوپ لیے ان پر جھکا کھڑا تھا گھر کے باقی افراد ان کے بستر کے گرد پریشان صورتیں لیے کھڑے تھے۔ جیسے ہی کیپٹن شہباز کمرے میں داخل ہوئے اندر کا منظر ان کے لیے شاکنگ تھا۔
شام کو تو وہ مسز خان کو بھلی چنگی اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا چھوڑ کر گئے تھے اور اب وہ معاذ کے ہوش میں آجانے کی خوشخبری انہیں سنانے آئے تھے کہ اندر داخل ہوتے ہی انہیں یہ منظر دیکھنا پڑا۔
"کک..... کیا ہوا امی جان کو۔" وہ بے جان قدموں سے آگے بڑھے اور بڑے بھائی سے مخاطب ہوئے۔
"طبیعت خراب ہوگئی تھی اچانک۔" وہ کیپٹن شہباز سے نگاہیں ملائے بغیر بولے۔
"کیسے خراب ہوگئی' شام کو تو میں انہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا ہوں۔ بالکل فریش موڈ میں۔" وہ مسز خان کے سرہانے کی طرف بڑھے' مسز خان کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا زرد ہو رہا تھا۔ جیسے بستر پر کوئی مردہ پڑا ہو۔
"طبیعت تو خراب ہونی ہی تھی کہ خبر ہی ایسی ملی تھی۔" ایاز کی بیوی پلٹ کر بولی۔
"کون سی خبر؟" وہ چونک کر سیدھے ہوئے۔
"تم چپ کرو۔ یہ موقع ہے ان باتوں کا۔" ایاز نے بیوی کو جھڑکا۔
"کوئی خبر نہیں ویسے ہی امی جان کا بی پی لو ہو گیا تھا۔" ایاز کا انداز سراسر ٹالنے والا تھا۔ کیپٹن شہباز کی دونوں بھابیوں نے معنی خیز انداز میں آنکھیں مٹکا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔
شہباز نے پریشانی سے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ ماں کی طرف متوجہ تھے۔
کیپٹن شہباز کے اندر عجیب سی گھنٹی بجنے لگی جیسے کچھ ہو گیا ہے۔ کچھ بہت عجیب' بہت پریشان کن۔ کچھ بہت غلط' ان کا دل اندر ہی اندر جیسے بیٹھ سا گیا جیسے کچھ ان سے متعلق ان کی ذات سے وابستہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اندر ایک عجیب سا کچھ کھو جانے کا احساس جاگ اٹھا تھا۔
"کیا؟ کچھ اتنا شدید کہ جس کے نتیجے میں مسز خان نیم مردہ حالت میں ان کے سامنے لیٹی تھیں۔
کیپٹن شہباز نے ان کے بیڈ کی پشت کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا دیا۔
ڈاکٹر انہیں چیک کر کے سیدھا ہوا۔ سب ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔ جس کے چہرے کے تاثرات یقیناً خوشگوار نہیں تھے۔

● ● ● ● ●

"کاش میں ادھر نہ آیا ہوتا۔" اس نے گھنٹے بھر میں پچاسویں بار سوچا تو اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی سولہ سترہ سالہ زندگی میں اس لفظ کاش کو کروڑوں بار سوچا تھا۔
بہت بچپن ہی میں اس "کاش" نے اس کی انگلی پکڑلی تھی جب وہ نا ظموں یا "سائبان" کے دوسرے عملے کے ہاتھوں پٹتا تھا جب بے تحاشا بھوک میں اسے کھانے کو ایک لقمہ بھی نصیب نہ ہوتا اور جب گھر گھر در کھٹکھٹاتے' روٹیوں کے ٹکڑے اور کھانوں کے خوان اکٹھے کرتے وہ عالیشان گھروں کے مالکان کا انداز نخوت دیکھتا' ان کی ترس بھری یا تحقیر بھری نظروں کو اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کرتا۔ تو یہ کاش دھیرے سے اس کا دامن ہلا دیتا۔
"کاش میں بھی ان جیسے کسی گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ یہی مالکانہ انداز مجھے بھی نصیب ہوا ہوتا۔"
"پھر ایک دفعہ نہیں' بہت دفعہ اس سہ حرفی لفظ نے اس کی سوچ کے رستے میں آ کر ڈیرہ جمایا اور ہر دفعہ ایک گہری سرد آہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی۔ مگر آج تو یہ لفظ مسلسل اس کے کانوں میں بجے جا رہے تھے۔
"کاش میں ادھر نہ آیا ہوتا۔" بستر پر دراز بے ہوش پژمردہ مسز خان اور ان کے گرد بلکہ ارد گرد موجود ان کا پورا

خاندان جن میں ان کے تینوں بیٹے دونوں بہوئیں اور چار پوتے پوتیاں تھیں اور وہ.....؟"
وہ بھلا کس حیثیت سے اس مکمل گھر کو نامکمل رنگ دینے بیٹھا تھا' شام کو جب اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا گیا' اگرچہ ابھی اس کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا بلکہ ڈاکٹرز اسے ڈسچارج کرنے پر راضی بھی نہیں تھے مگر کیپٹن شہباز نے زبردستی اسے ڈسچارج کرایا تھا۔
"ڈاکٹر صاحب! صبح مجھے ڈیوٹی جوائن کرنی ہے پھر اس کی دیکھ بھال کے لیے کون آئے گا۔ گھر میں تو سب موجود ہیں۔ اسے دیکھ لیں گے مگر ادھر بہرحال کوئی نہیں آئے گا۔ باقی میڈیکل ٹریٹمنٹ کے لیے بھی گھر پر کوئی مسئلہ نہیں ڈاکٹر ہمارے ہمسائے ہیں' انہیں ٹریٹ کر لیں گے۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔"
ڈاکٹرز کو پوری تسلی دے کر وہ کمرے سے اس کی ڈسچارج شیٹ لے کر ہی نکلے اور اس دوران معاذ اپنے بستر پر دراز سوچتا رہا کہ کیپٹن شہباز اسے اتنی جلدی کیوں ڈسچارج کرانا چاہ رہے ہیں۔
"شاید ہاسپٹل کے اخراجات سے گھبرا کر' مگر ابھی تو میرا زخم بھی ٹھیک نہیں ہوا۔" اس نے پٹی کو ہاتھ لگایا۔
"مگر میں کہاں جاؤں گا اسپتال سے نکل کر' شام بھی تو ہو چکی ہے۔ اس وقت میں کہاں ٹھکانا کروں گا۔" نئی فکر و پریشانی نے اسے آن گھیرا۔
"میرا سامان بھی خدا جانے کدھر ہے' اس میں رقم موجود بھی ہے یا نہیں؟"
وہ کیپٹن شہباز سے کہنا چاہ رہا تھا۔ "سر مجھے ابھی ایک دو روز یہاں رہنے دیں' میں خود ہی چلا جاؤں گا۔" مگر کس ناتے سے کہتا۔ اسپتال کے اخراجات ان ہی کو ادا کرنے تھے انہیں احساس ہوگا اس بات کا' جب وہ پیمنٹ کرنے ریسپشن پر گئے تو اس کا دل گھبرا سا گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"اب بھلا کدھر جاؤں گا یا اللہ کیوں مجھے بے ٹھکانا پیدا کیا؟ ایک مدت سے اپنے ہونے کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ آخر کہاں تک دفاع کروں' اتنی دنیا' اتنے لوگ بے وجہ مرے جا رہے ہیں کوئی ٹرین کے حادثے میں' کوئی بس کے سانحے میں' کوئی راہ چلتے سڑک کے بیچ' آخر میری جان ایسی کون سی قیمتی ہے جو تو اسے بچائے چلا جا رہا ہے۔ اس جان کو' اس وجود کو لے کر میں کدھر جاؤں کہ تیری اس اتنی بڑی زمین پر دو چار فٹ جگہ بھی تو اس کے سمانے کے لیے نہیں ہے۔ نہ زمین کے اوپر' نہ زمین کے نیچے۔" وہ اللہ سے گلہ کرتے ہوئے رو دینے کو تھا۔
"چلو ینگ مین! نیچے اترو۔ بہت ٹائم ہو گیا' سات بجنے کو ہیں۔ یہ ہاسپٹل والوں کے ڈیوز ہی کلیئر ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کا چارج تو اس کا چارج!" وہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر بولے اور اس کی طرف دیکھے بغیر سائیڈ ریک پر رکھی دوائیوں اور چیزوں کو الگ الگ شاپرز میں ڈالنے لگے۔
معاذ یک ٹک ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی سوچوں کو زبان کس طرح دے۔ کیسے انہیں اپنے خدشوں سے آگاہ کرے یا کم از کم ان سے اپنے اگلے ٹھکانے کا ہی پوچھ لے۔
"اٹھو نا یار! کم از کم جوتے ہی پہن لو۔ میں پہلے ہی خاصا لیٹ ہو چکا ہوں۔" اسے یوں گم صم بیٹھے دیکھ کر انہوں نے جھنجھلا کر کہا تو اس کے وجود میں جنبش پیدا ہوئی۔
"وہ نہ چاہتے ہوئے دھیرے سے بستر سے نیچے اترا اور جوتے پہننے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا اس نے ایک ہاتھ سے بیڈ کو اور دوسرے ہاتھ سے گھومتے سر کو تھام لیا۔
"بی بریو ینگ مین! اب تم ٹھیک ہو' بس ذرا ہمت کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے دو چار روز میں' چلو اب سامان تو سمٹ گیا۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تو وہ پھر کچھ نہ کہہ سکا کہ یہ چکر کمزوری یا بیماری سے نہیں آ رہے۔ یہ تو خدشوں اور واہموں کے چکر ہیں جو اسے ایک مدت سے آ رہے ہیں۔ اس نے بیڈ سے اتر کر آہستگی سے قدم آگے بڑھائے۔
"کچھ رہ تو نہیں گیا؟" کیپٹن شہباز نے مڑ کر آخری نظر بیڈ اور سائیڈ ریک پر ڈالی' ریک کے دراز کھول کر دیکھے۔

"نہیں کچھ نہیں ہے اب۔" وہ شاپرز تھامے اس کے پاس آکر بولے دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہاسپٹل سے باہر آ گئے۔ کیپٹن شہباز اس کی وجہ سے آہستہ چل رہے تھے۔ پارکنگ میں ان کی جیپ کھڑی تھی وہ اس کی طرف بڑھے، معاذ پارکنگ کے باہر کھڑا رہا کہ شاید وہ اسے باہر کسی اسٹاپ تک اتار دیں گے پھر آگے کا سوچ کر اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔

"چلو آؤ بیٹھو۔" انہوں نے فرنٹ ڈور کھول کر اسے آواز دی تو وہ آہستگی سے سیٹ پر جا بیٹھا۔ انہوں نے جیپ ہاسپٹل سے نکالی اور سڑک پر لے آئے۔

"یار بقراط! ایک تو تم سوچتے بہت ہو، تمہیں دیکھ کر مجھے شیکسپیئر کا ہیملٹ یاد آ جاتا ہے کیا کردار تھا وہ بھی۔ سوچیں ہی سوچیں اور عمل صفر ایسے لوگ زندگی میں ناکام ہوتے ہیں یہی بات شیکسپیئر کے ڈرامے کے آخر میں سامنے آئی کہ جو لوگ عمل کا ہاتھ اپاہج سوچوں کو تھما دیتے ہیں، وہ بالآخر زندگی کی دوڑ ہار جاتے ہیں اس لیے میرے ننھے دوست! اتنا مت سوچا کرو، کبھی کبھی بغیر سوچے سمجھے بھی کچھ نہ کچھ کر گزرنا چاہیے۔" وہ اسے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر سنجیدگی سے بولے۔

یہ تو شام ہی سے نوٹ کر رہا تھا کہ کیپٹن شہباز آج غیر معمولی طور پر نہ صرف سنجیدہ ہیں، بلکہ کچھ پریشان بھی ہیں ورنہ تو وہ اس کے ساتھ بہت ہلکے پھلکے انداز میں بات کیا کرتے تھے اور پہلی ملاقات ہی میں اسے بہت خوش باش بھی لگے تھے مگر شام ہی سے وہ اسے کچھ الجھے الجھے اور کچھ افسردہ سے دکھائی دے رہے تھے اور اپنی یہ بات وہ ان تک نہیں پہنچا سکتا تھا کہ اس کا بہرحال ان سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"پھر کھو گئے کہیں۔" موڑ کاٹتے ہوئے کیپٹن شہباز نے اسے دیکھ کر کہا تو وہ چونک گیا۔

"نہیں تو..." اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔ وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"سر! ہم کہاں جا رہے ہیں، میرا مطلب ہے...." وہ ہاتھوں کی انگلیاں موڑنے لگا۔

"سر...!" کیپٹن شہباز کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "یار! یہ تم مجھے سر کس حساب میں کہتے ہو۔ میں تمہیں کیمسٹری کی ٹیوشن پڑھاتا ہوں یا الجبرا سمجھاتا ہوں یا تم میرے پاس جاب کرتے ہو یا میں نے کسی سبجیکٹ میں ڈاکٹریٹ کر رکھا ہے یا گورنمنٹ نے مجھے کسی اعلا فوجی یا شہری اعزاز سے نوازا ہے۔ جو تم مجھے اس قدر اعلا "سر" کہہ کر پکارتے ہو۔" کیپٹن شہباز نے اس کی پکڑ پہلے ہی لفظ پر کر لی اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان کے سوال کا کیا جواب دے کہ وہ انہیں سر کیوں کہتا ہے۔

"معلوم نہیں۔" انہوں نے دوبارہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ دھیرے سے بولا۔

"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے یا نہیں۔" وہ ذرا سا ہنسے۔ "یار زندگی میں یوں شکست خوردہ رویہ اپناؤ گے تو بہت جلد میدان عمل میں ڈھیر ہو جاؤ گے۔ اپنے اندر جرات پیدا کرو، قوت فیصلہ کی اور آرگیو (دلیل) دینے کی۔ یوں ایک ہی لمحے میں ہتھیار پھینک کر چپ نہ ہو جایا کرو۔ خیر ہم گھر جا رہے ہیں۔"

"اب کس کے گھر...؟" یہ سوال کوشش کے باوجود وہ پھر لبوں پر نہ لا سکا۔ ظاہر ہے ان کا ہی گھر ہوگا، وہ تو بے گھر ہی اس دنیا میں نازل ہوا تھا۔ اس نے تلخی سے سوچا اور چند منٹوں بعد ہی جیپ خان ولا کے خوبصورت گیٹ کے آگے جا رکی۔

گیٹ سے مسز خان کے کمرے تک کا سفر بھی اس نے خدشات کے درمیان ہی طے کیا کہ اب تک کوئی بھی سائبان اس کے سر پر چھت بن کر نہ ٹھہر سکا تھا، کچھ اس معاملے میں اس کا نصیب ہی اس کا رقیب بنا بیٹھا تھا کہ گھر تو ہوتے ہی نصیب والوں کے ہیں۔ بہت بچپن میں جب گھر کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہ تھا۔ وہ تو سائبان کو ہی گھر سمجھتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ معاشرے کے باقی لوگ بھی اسی طرح کے "سائبانوں" میں رہتے ہوں گے بڑے بڑے ہال کمرے اور پختہ سیمنٹ سے بنے برآمدوں والے گھروں میں جہاں ایک ناظم اور دوسرا نائب ناظم ہوتا ہوگا، دال پکانے والا چاچا نبی بخش اور ناظم صاحب کے احکام بجا لانے والا غفور چاچا، کپڑے تو اپنے سب لڑکے خود ہی دھوتے تھے یا پھر چوکیدار چاچا، جو دیر سویر سے آنے والے لڑکوں کی جی بھر کر ٹھکائی کرتا تھا یا اگر کوئی لڑکا مٹھی گرم کر دیتا تو اس کا یار بھی بن جاتا تھا۔ پھر اس کے اپنے بھی بتیرے کام ہوتے تھے جو ان لڑکوں کی فوج سے نکلا کرتے تھے۔ وہ علاقے کا تھانیدار تھا کہ اس سے کوئی نہیں بگاڑ سکتا تھا اس کے بگڑنے کا مطلب تھا کہ جو چند گھنٹوں کی آزادی ملتی ہے وہ بھی سلب، ظفر کا تو وہ پکا یار تھا اور معاذ کو تو وہ ویسے ہی سہمی ہوئی چڑیا کہہ کر مروت میں کبھی کبھار باہر جانے دیتا اور وہ گیٹ سے باہر ذرا سا ٹہل کر واپس آ جاتا۔

گھر سے پہلی بار اس کا واسطہ تب پڑا تھا جب وہ مالدار جوڑا اسے اپنے عالیشان سنگ مرمر سے بنے محل میں لے گیا تھا، وہاں وہ جتنا بھی وقت رہا یہی سمجھتا رہا کہ اصل میں یہ گھر نہیں جنت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ بندوں کے لیے دنیا میں بنا رکھی ہے۔ جب اسے واپس سائبان بھجوا دیا گیا تو اس نے سوچا وہ واقعی جنت تھی اور وہ چند دنوں کے لیے اس کی سیر کو گیا تھا۔

پھر اس نے گھر کی تلاش کے سفر کو ملتوی کر کے خود کو علم کے سفر کی راہ میں ڈال دیا، کتابوں میں پینٹ کیا گیا گھر بہرحال اس کے لیے خواب ہی رہا جہاں بہن بھائیوں کی چہکاریں ہوں، ماں باپ کا لاڈ اور بچوں کی ضدوں اور فرمائشوں پر ہلکی سی پھٹکار ہو۔ جہاں سائبان جیسے ادارے کا پرتو بھی نہ ہو چاہے چھوٹا سا ہو مگر اپنا گھر ہو۔ اپنا

پھر ظفر کا گھر، جس نے اس کے تصوراتی محبتوں کے خمیر سے گندھے گھر کے تصور میں ہلچل مچا دی، بے زاری، نفرت، لالچ، ہوس اور برے تصورات کے رنگوں کے وہ چھینٹے اڑے کہ اس کے خوبصورت پاکیزہ گھر کی تصویر ہی میلی ہو کر رہ گئی۔

پھر صوفی صاحب کا گھر

ہاں ادھر آ کر اس کا دل کچھ ٹھہر سا گیا تھا۔ کچھ پرسکون سا جیسے وہ اپنے گھر کے کہیں آس پاس ہی ہے، بہت قریب، صوفی صاحب کی سخت طبیعت اور کچھ روکھے رویے سے اس کی طبیعت کچھ دیر کو مکدر ضرور ہوتی تھی مگر پھر ان کی محبت اور کئی رنگوں سے، سجی ان کی شخصیت نے اس کے آگے اپنا رنگ جما ہی لیا تھا۔ پھر حجرے کے اس طرف سے آتی خالص گھریلو ماحول کی سوندھی سوندھی خوشبو... جو اسے اپنے حصار میں جکڑتی چلی گئی تھی، اس ماحول کا حصہ بن جانے کو اس کا دل مچل مچل کر رہ گیا تھا، جہاں سے اماں بی کی پیار بھری ڈانٹ اسے حجرے میں بیٹھے سنائی دیتی تھی۔ سچی مگر جذبات سے بھرپور، اپنی اولاد سے گہرے تعلق کا احساس لیے اور صوفی صاحب کون سا اپنے بچوں کے مفادات سے لاتعلق تھے۔ ان پر غصہ ہوتے مگر ان کی بہتری کے لیے جب۔ کوئی ان کے بچوں کی بھلائی کی راہ میں حائل ہوتا، وہ اس کے آگے چٹان بن کر کھڑے ہو جاتے، اسی طرح کے ماں باپ کی تو اس کا دل خواہش کرتا تھا۔ پھر زینب، آمنہ اور جویریہ کی نوک جھونک اور اس نوک جھونک کو تیزی اور نیا رنگ عبدالمتین کی آمد نے دیا تھا۔ عبدالمتین وہ سڑیل سا بیزار لڑکا جیسے خود سے تو کیا سارے زمانے سے خفا ہو، صوفی صاحب کی ہر پھٹکار کا خاص ٹارگٹ، مگر پھر بھی اماں جی اور بہنوں سے محبت کرنے والا عبدالمتین، وہ سب اس مکمل گھر کے مکین کس طرح اس کے دل میں گھر کر گئے تھے کہ چند ہی دنوں میں اسے سب کچھ اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا اور آج جب وہ انہیں سوچ رہا تھا تو لگ رہا تھا وہ سب پاس ہی ہیں، اس کے آس پاس۔

"او ہو بھئی۔ دھیان سے۔" برآمدے کی پہلی سیڑھی اس کے پاؤں سے ٹکرائی تو کیپٹن شہباز کی آواز اس کے آگے سے ابھری۔

"یار! تم کہاں کھو جاتے ہو۔ لڑکیوں کی طرح سوچ بچار میں گم ابھی پھر سے زمین بوس ہو جاتے تو سمجھو پھر سے نیا کیس بن جاتا۔ لگتا ہے تم مجھے ڈیوٹی جوائن نہیں کرنے دو گے۔" انہوں نے کھڑے کھڑے ٹھیک ٹھاک اس کی کلاس لے لی۔ وہ شرمندہ ہو کر آگے بڑھا۔

مسز خان کے کمرے میں جا کر کیپٹن شہباز شاید اسے بھول ہی گئے تھے، وہ مسز خان کے بستر کے آگے سر جھکائے

نہ جانے کس گیان دھیان میں گم ہو گئے تھے اور معاذ شرمندہ سا ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھا رہا تھا۔ ان کے گھر کے باقی افراد خاموشی سے آ جا رہے تھے۔ کوئی چار گھڑی کو بیٹھتا پھر اٹھ کر چل دیتا۔ شاید سب بہت مصروف تھے اور کسی نے بھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یا پھر کیپٹن شہباز سب کو بتا کر گئے تھے' وہ کمرے میں موجود چند ایک فالتو چیزوں کی طرح خود کو سمجھ رہا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد کیپٹن شہباز کو جیسے یاد آیا۔

"او ہو معاذ! تم ادھر ہی بیٹھے ہو۔ ابھی تمہارے لیے اتنا بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ تم ریسٹ کرو جا کر۔ یہ میری ام جان ہیں۔ اس وقت ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ورنہ تم سے مل کر بہت خوش ہوتیں۔ جب سے تم ہاسپٹل میں تھے' تمہاری صحت اور سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ بہت اچھی ہیں میری ام جان' کل تمہیں ان سے ملواؤں گا بلکہ مجھے تو صبح سویرے ہی چلے جانا ہے۔ جانے سے پہلے ام جان کو تمہارے بارے میں بتا کر جاؤں گا۔ گھر کے باقی لوگوں سے ام جان تمہیں ملوا دیں گی۔ آؤ تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں' اور اب تمہیں ادھر ہی رہنا ہے۔ سنا ام جان کے پاس' کہیں ہاسٹل وغیرہ جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب تمہارا بھی گھر ہے۔ چلو اٹھو۔" کیپٹن شہباز کے آخری جملے پر کمرے میں موجود چار نفوس نے کچھ حیرت اور شاید غصے بھری نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"یہ میرے بڑے بھائی ہیں' دونوں ادھر ہی ہوتے ہیں اور یہ دونوں ان کی مسز۔ بہرحال' تمہیں ام جان کے ساتھ رہنا ہے۔" کہہ کر اس کے آگے چل پڑے تو وہ بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل آیا۔

"ان لوگوں کے پورشنز علیحدہ ہیں۔ اس پورشن میں صرف ام جان اور ان کی ملازمہ رہتی ہیں یا پھر جب میں چھٹی پر آ جاؤں' اب تم رہو گے۔ ام جان تم سے بہت پیار کریں گی۔ انہیں ذہین لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ پہلے ہی تمہیں ادھر رکھنے کا کہہ چکی ہیں۔ اس لیے تم اب یہاں سے جانے کی بات نہ کرنا۔ کالج میں ایڈمیشن کے بعد دل لگا کر پڑھنا اور یہ تمہارا کمرہ ہے۔ میں فون کرتا رہوں گا۔" وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر بڑھے اور لائٹ کا بٹن آن کر دیا۔ سارا کمرہ دودھیا روشنی میں نہا گیا۔ چھوٹا سا خوبصورت کمرہ تھا۔ کمرے میں سنگل بیڈ' ٹو سیٹر صوفہ' رائٹنگ ٹیبل اور چیئر تھی۔ زمین پر پردوں کا ہم رنگ کارپٹ بچھا تھا۔

"یہ اس طرف واش روم ہے یہ سامنے الماری' ادھر تمہارے کپڑے پڑے ہیں۔ فریش ہونا چاہو تو ہو جاؤ۔ ابھی ملازم کھانا لے کر آئے گا۔ کھا کر تم اپنی میڈیسن لینا اور پھر مکمل ریسٹ کرنا۔ انشاءاللہ کل تک تم بہت بہتر ہو جاؤ گے۔ میں چلتا ہوں' اب جانے سے پہلے ملنے آؤں گا۔"

"تمہیں کچھ پوچھنا تو نہیں؟" جاتے جاتے انہیں خیال آیا تو رک کر بولے۔

"جی۔۔۔" اس نے تھوک نگلا' اسے بہت پیاس لگی ہوئی تھی۔

"مجھے ادھر نہیں رہنا سر! میں ہاسٹل میں۔۔۔"

"اچھا بس۔ اس وقت یہ بحث نہیں۔ یہ باتیں اگلی میٹنگ میں ہوں گی۔ تم اب آرام کرو' کھانا تمہارا ابھی آتا ہو گا۔ میں بھی جا کر ام جان کو دیکھوں۔ او کے۔" وہ ہولے سے اس کا کندھا تھپک کر باہر نکل گئے تو ان کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو وہ دیکھتا رہ گیا۔

"یہ کیا مصیبت ہے۔ میں اس طرح کسی کے گھر کیسے رہ سکتا ہوں۔" اس نے مڑ کر ایک نظر کمرے کو دیکھتے ہوئے جھنجلا کر سوچا۔ "پتا نہیں کون لوگ ہیں' کیسے ہیں پھر ان کے باقی گھر والے۔ وہ تو شاید میرا ادھر آنا بھی پسند نہیں کر رہے تھے۔ میرا رہنا کیسے گوارا کریں گے۔ بیٹھے بٹھائے نئی کہانی' میں ادھر لوگوں میں اپنا ذہن سیٹ کرتا پھروں گا یا پڑھوں گا۔" وہ سر پکڑ کر بیڈ کے کنارے ٹک گیا۔

"یہ کل چلے جائیں گے تو میں ان کے پیچھے یہ گھر چھوڑ جاؤں گا۔ ہاں یہ میرے لیے بہتر ہے۔ ضروری نہیں ان کی بات پر تکیہ کر کے بیٹھ جاؤں اور ان کے گھر والے مجھے دھکے دے کر۔۔۔ نہیں مجھے۔ نئی الجھنوں میں نہیں پڑنا۔ میں کل ہی یہ گھر چھوڑ جاؤں گا۔ یہ سب تو مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ بہت عجیب۔" وہ سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات تو گزر ہی گئی تھی جیسے تیسے فخر حیات رات بھر کمرے میں نہ آئے۔ وہ کدھر سوئے گھر میں موجود بھی تھے یا نہیں۔ رعنا کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ رات بھر نیند اس کی آنکھوں سے روٹھی رہی تھی اور آج دوسری رات بھی اسے جاگتے ہوئے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنسو بہاتے ہوئے گزری تھی اور اب تو اسے لگ رہا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ نہ دل سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہوتا تھا نہ اپنی بے بسی سے چھٹکارا پانے کا کوئی رستہ سوجھا تھا اگر سمجھوتہ نہیں کرتی تو کہاں جاتی۔ بھائی کے گھر جانے سے بہتر ہے خودکشی کر لے اور خودکشی۔۔۔" اسے تو موت سے بہت ڈر لگتا تھا۔ زندگی سے پیار جو بہت رہا تھا۔ یہ پیار اسے فخر حیات ہی نے تو دیا تھا۔ جب کوئی دن رات آپ کے حسن کے قصیدے پڑھے' آپ پر والہ و شیدا ہو۔ آپ کو سوئی چبھے وہ اپنی جان فدا کرنے کو تیار ہو۔ آپ کی ذرا سی آہ بھی اسے سینے پر برچھی کی مانند لگے تو پھر زندگی سے پیار ہو ہی جایا کرتا ہے۔

اور اب یہی پیار اس کی جان لینے پر تل گیا تھا۔ فخر حیات کو اب نہیں بلکہ کچھ عرصے سے اس کی کچھ بھی پروا نہ رہی تھی۔ وہ ان کے سامنے بیٹھی بھی ہوتی تو انہیں نظر نہ آتی۔ نامعلوم ان کی نظروں میں ایسا کیا سما گیا تھا جس نے رعنا کی شبیہ تک کھرچ ڈالی تھی۔ ایک خود ساختہ مصروفیت کا چولا تھا جو فخر حیات رعنا کو دیکھتے ہی زیب تن کر لیتے' پھر رعنا کچھ بھی نہ کہہ پاتی ہاں اسی مصروفیت کے چولے کو پہنے پہنے وہ اسے بلینک چیک تھمانا نہ بھولتے تو رعنا از خود فخر حیات کے چولے سے خفگی کو بھی بھول جاتی مگر اب تو کچھ عرصے سے یہ نظر کرم بھی خاصی کم ہو چکی تھی۔ رعنا کو ڈھیٹ بن کر خود سے بتانا پڑتا کہ اس کا بیلنس ختم ہونے کو ہے۔

"آخر میں نے پہلے آنکھیں کیوں نہ کھولیں۔ کیوں اتنا کچھ ہو جانے دیا۔" کیوں انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے کھونے دیا۔" مخملیں بستر میں تو جیسے ببول کا صحرا اگ آیا تھا' کسی پہلو چین نہیں مل رہا تھا۔ اپنی بے وقعتی کا احساس لحظہ لحظہ قتل کیے جا رہا تھا۔

"فخر حیات اگر صرف میرے شوہر ہوتے تو شاید آج کے واقعے پر میں اس قدر ہرٹ نہ ہوتی مگر انہوں نے تو مجھ سے محبت کی تھی۔ محبت بھی وہ جس کی کوئی حد نظر نہ آتی تھی۔ ان کی حد کو اگر چھونا چاہتی' تلاشنا چاہتی تو محبت کا سمندر اسے اپنے اندر سمو لیتا۔ اسے پھر اور کچھ سوجھتا ہی نا۔

اور اب یکایک محبت کا وہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر ایک قطرہ آب بن کر سورج کی تیز کرن کی تاب نہ لا کر ہوا میں کہیں تحلیل ہو چکا تھا اور ہوا کو کون جانچ سکتا ہے۔ کون چھان سکتا ہے کہ اس قطرہ آب کو ہی کوئی ڈھونڈ لائے اس کے دل نے دہائی دی۔" آنسو بھر بھر پھر آنکھوں سے بہنے لگے۔

"آخر اس ماتم سے کیا حاصل' یہ تو معلوم ہو ہی چکا کہ فخر بدل چکے ہیں بہت دیر ہوئی مجھے خبر ہوئی ہے مگر اب کیا کروں۔" اس نے زور سے آنکھیں رگڑیں۔ سمجھوتے کے سوا جھک جانے کے سوا اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو فراموش کر دینے کے سوا اور کوئی راستہ قابل عمل لگ ہی نہیں رہا تھا۔ اس راستے میں اس کے دل کے ہزار ٹکڑے ہو رہے تھے اور ہر ٹکڑا فریاد کناں تھا۔ وہ کیا کرتی۔ وہ تو فخر کی محبت میں اس طرح کھوئی تھی' اتنی پر اعتماد تھی کہ کل کو اگر یہ محبت کا سورج ڈھل گیا تو وہ کیا کرے گی۔ اپنے لیے کچھ بھی تو پس انداز نہ کر سکی تھی' کوئی قیمتی مالیت کی جائیداد' کوئی ہینڈسم اکاؤنٹ کا بینک بیلنس' کوئی بیش قیمت گوہر نایاب' کوئی پلازہ' کوئی پراپرٹی کچھ بھی تو نہیں' وہ تو ان کی محبت کو ہی اپنی دولت سمجھے بیٹھی تھی۔ جسے کوئی چور اچکا بھی نہیں چرا سکتا تھا ورنہ آج اس کی سوچ کا رخ دوسرا ہوتا۔ کوئی تو ٹھوس' مضبوط راہ اسے بھی سوجھتی یا پھر وہ گوہر نایاب جسے وہ کھو چکی ہے۔ کچھ بھی تو اس کی جھولی میں نہ بچا تھا اب وہ روتی نہ تو کیا کرتی' وہ پھر سے ماتم کناں انداز میں تکیے پر ہاتھ مار مار کر رونے لگی۔

اسی طرح آہ و بکا کرتے جب دن کا مدھم اجالا ہر سو پھیلنے لگا۔ لان سے پرندوں کے چہکنے کی آوازیں آنے لگیں تو نیند اور غم کے بھاری احساس سے بوجھل اس کی پلکیں آنکھوں پر گرنے لگیں۔ وہ شاید کچھ ہی دیر سوئی تھی جب کمرے میں ہونے والی کھٹ پٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بھاری پپوٹے بمشکل کھولے۔ سامنے وال کلاک میں دس بج رہے تھے' اس کا مطلب ہے۔ وہ کم از کم پانچ گھنٹے ضرور سوئی ہے۔ اس نے اکڑے ہوئے بدن کو سمیٹ کر کروٹ لی۔

فخر حیات ڈریسنگ ٹیبل کے آگے تیار ہو رہے تھے۔ وہ نہا چکے تھے۔ ان کی کھٹر پٹر سے ہی تو اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ سپاٹ نظروں سے انہیں بالوں میں برش پھیرتے دیکھتی رہی۔ انہوں نے برش ٹیبل پر رکھ کر پرفیوم اٹھا کر چھڑکا۔ شیشے میں نظر آتے اس کے عکس پر اک ناراض سی نظر ڈالی۔

"اٹھ کر ناشتہ کر لو۔" وہ ایک لمحے کو رکے۔

"یوں بے کار سوچوں سے خود کو ہلکان مت کرو اپنے ذہن کو وسیع کرو' آج بھی تم ہی میری محبت اور میری بیوی ہو اور تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ فضول کی سوچیں صرف تمہارے لیے نہیں' ہم دونوں کے لیے ہی تباہ کن ہیں۔ ہماری فیملی کے لیے بھی۔ بس اٹھ جاؤ۔" وہ اس کے بہت قریب ہو کر بولے۔ وہ سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"گڈ مارننگ' اینڈ آئی لو یو مائی ڈیئر وائف۔!" انہوں نے ذرا سا جھک کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

"ایک آنسو اس کی دائیں آنکھ سے دھیرے سے نکل کر کان کے پیچھے گم ہو گیا۔ رات بھر کی بے چین سوچوں کے بعد اس کا ذہن جیسے خالی ہو چکا تھا۔ اب کچھ بھی سوچنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا۔ یونہی لیٹی رہے۔ اور کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

"اس گھر کے سوا اور کون ساٹھکانا ہے میرا۔ میں کسی افسانے کے ناول کا کردار تو ہوں نہیں کہ شوہر نے نظریں پھیریں' راہ سے بھٹکا تو میں گھر چھوڑ کر نئی دنیا دریافت کرنے نکل پڑوں' اسی زخمی وجود اور ذہن کے ساتھ مجھے اسی گھر میں رہنا ہو گا کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔"

فخر حیات کا ذرا سا التفات اسے آج بھی پہلے دن کی طرح پگھلا دیتا تھا۔ رات کی بات علیحدہ تھی جب وہ بہت طیش میں تھی' اسے کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا' نہ فخر حیات کی سوری نہ کوئی دلیل۔

اور اب تو دن تھا دن جو روشن ہوتا ہے اور روشن دلیلیں لاتا ہے۔ رات خود بھی تاریک ہے اور اکثر وہ چیزوں کے تاریک پہلو ہی دکھاتی ہے۔ زندگی کو بہت کٹھن' بہت دشوار بنا کر پیش کرتی ہے۔ یہ دن ہے جو ان کٹھنائیوں کا توڑ پیش کرتا ہے اور پھر بندے کو ان کٹھنائیوں کو دور کرنے کے لیے کمربستہ ہونے پر پل بھر میں آمادہ بھی کر لیتا ہے۔ اس نے کھڑکیوں پر پڑے پردوں سے چھن چھن کر آتی تیز روشنی کو دیکھا۔

اس طرح لیٹے رہنے سے' رونے دھونے سے' ایک دوسرے سے پہلو تہی اختیار کرنے سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اس کے نیم خوابیدہ ذہن نے انگڑائی لی۔ اور وہ ذرا سی کھسک کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سر ابھی بھی بھاری اور بوجھل ہو رہا تھا مگر رات کے مقابلے میں کم' اس نے سامنے لگے ڈریسنگ ٹیبل کے جہازی سائز مرر میں خود کو دیکھا وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ الجھے ہوئے بال' ستا ہوا چہرہ' سوجی ہوئی آنکھیں' بے رنگ چہرہ' بے تاثر ہونٹ اور ملگجا مسلا ہوا لباس۔ کچھ بھی تو اسے رعنا ثابت نہیں کر رہا تھا وہ تو کوئی مڈل کلاس کی لڑاکا پژمردہ مسائل میں گھری خود سے بیزار بیوی لگ رہی تھی۔ اسے اپنا عکس دیکھ کر خود سے الجھن ہونے لگی۔

"یہ مسائل سے نپٹنے کا کون سا طریقہ ہے رعنا! اٹھو اور خود کو فریش کرو۔ یہ تو حالات کا معمولی سا کڑا رخ تھا۔ جس پر تم نے خود کو اس حد تک بگاڑ ڈالا کہ خدانخواستہ اس سے کڑی مصیبت ٹوٹ پڑے تو تم پہچانی نہ جاؤ۔" اس نے خود کو جھڑکا اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وارڈروب کھول کر لباس منتخب کرنے لگی۔ پرپل کلر کا سوٹ اسے اچھا لگا اور وہ واش روم میں گھس گئی۔

"شاید میرا ہی رویہ غلط تھا' مجھے اس طرح ہوٹل میں ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جاہل ان پڑھ عورتوں کی طرح میں فخر حیات سے لڑنے کھڑی ہو گئی۔ اگر وہ ان کی کوئی بزنس پارٹنر یا کوئی کلائنٹ ہوتی تو فخر کی ریپوٹیشن کتنی خراب ہو جاتی۔ واقعی غلطی کافی حد تک میری بھی تھی اور فخر کی بھی تو ہے جنہوں نے موبائل تک ... رہا تھا۔ مجھے تو شک میں پڑنا ہی تھا۔" بالوں میں برش کرتے اس کے ہاتھ اور اپنا تجزیہ کرتا ذہن باہر سے آنے والی تیز آواز پر ٹھٹھک کر رک گیا۔

"ہائے میرا دل تو رات ہی سے پریشان تھا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ مجھے رعنا کی طرف سے بے چینی سی لگی ہوئی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے تو میں بے چین ہو کر صبح ہی بھاگی۔ ان کو بھی آفس سے چھٹی کرائی کہ نہیں آج تو ضرور رعنا کی طرف جانا ہے۔ دیکھتی ہوں کمرے میں' کیسی طبیعت ہے۔ کسی ڈاکٹر کو نہیں بلوایا۔"

عفت آرا کی تیز آواز تو رعنا لاکھوں کے ہجوم میں سے پہچان سکتی تھی۔ یہ تو اس کے اپنے گھر میں بھی جہاں سناٹا اور سکون ان کے لڑائی جھگڑے سے بھی بے سکون نہ ہو پایا تھا۔ رعنا نے جلدی سے برش ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخا لپ اسٹک اٹھا کر تیزی سے ہونٹوں پر پھیری۔ بیڈ پر پڑا دوپٹہ کھینچ کر گلے میں ڈالا اور لائٹ آف کر کے تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور کمرے سے نکلتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کرنا نہ بھولی۔

فخر حیات کو کسی کا بھی اپنے بیڈ روم میں داخل ہونا سخت ناگوار گزرتا تھا۔ یہ ان کی خاص ہدایت تھی کہ چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو اسے بیڈ روم میں نہیں لے کر آنا۔ مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے۔ ملازمین میں سے بھی صرف جنتاں کو کمرے میں آنے کی اجازت تھی' وہی کمرے کی صفائی بھی کرتی تھی اسی لیے رعنا عفت آرا کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی باہر نکل آئی کہ ابھی اس کا فخر حیات سے پہلا جھگڑا نپٹا بھی نہیں تھا کہ یہ نیا ایشو کھڑا ہو جاتا۔

"او ہو رعنا! ماشاء اللہ اب تو ٹھیک لگ رہی ہو' نہا دھو کر آئی ہو فریش۔" سامنے سے آتی عفت آرا نے آنکھیں سکوڑ کر رعنا کو دیکھا۔ "چلو اچھا ہے طبیعت خود ہی ٹھیک ہو گئی ورنہ مجھے تو بہت فکر لاحق ہو گئی تھی کہ خدا خیر کرے کیا بات ہو گئی۔" وہ رکے بغیر بولے گئیں۔

"سلام بھائی جان!" رعنا نے بیزار آواز میں کہا۔ صبح کی ابتدا ہی اچھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اندر جنم لیتی خوش امیدی فوری ہی دم توڑنے لگی تھی۔ سامنے ڈائننگ ٹیبل پر فخر حیات ارد گرد سے بے نیاز ناشتہ کرنے میں مگن تھے۔ نواز بھائی ان سے ذرا پرے چائے پی رہے تھے۔

"وعلیکم' خوش رہو۔ آباد رہو۔ اسی طرح مسکراتی رہو۔ میری تو دعا ہے۔ بھئی ماں کی جگہ ہوں۔ دعائیں ہی دے سکتی ہوں۔ آؤ بھائی سے تو ملو۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جانثار انداز میں بولیں تو رعنا ایک گہرا سانس لے کر آگے بڑھ گئی۔

"السلام علیکم بھائی جان۔" وہ ان کے برابر جا کھڑی ہوئی۔

"وعلیکم السلام آؤ بیٹھو بھئی۔ کیا بات تھی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا اب تمہاری۔

"یہ اس کی ناسازی طبع کی خبر خدا جانے کس نے اڑائی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے فخر کی طرف دیکھا جو اس سارے منظر سے ابھی بھی لاتعلق نظر آ رہے تھے۔ اور سچ تو یہ تھا عفت بھابھی انہیں ایک پل کو بھی برداشت نہ ہوتی تھیں' رعنا کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہوں بھائی جان! بس سر میں درد تھا ذرا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"یہ تمہاری بھابھی نے صبح سے شور مچا رکھا تھا کہ میں آج آفس نہ جاؤں۔ تمہیں دیکھنے جانا ہے۔ میں نے بھی سوچا بہت دن ہو گئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔ تم نے تو آنا جانا ہی کم کر دیا ہے۔ لگتا ہے' بہت مصروف ہو گئی ہو۔ بچے بھی یاد کر رہے تھے۔" وہ شکوہ بھرے انداز میں بولے۔

"اچھا کیا بھائی جان! آپ نے' میں خود سوچ رہی تھی آپ سے ملنے کے لیے اور آپ کی طبیعت کیسی ہے۔" وہ رسمی سے انداز میں بولی۔

"ارے اپنے کمبخت نوکروں سے کہو' کھانے کو کچھ لے آئیں۔ بھئی' میری تو عادت ہے صبح منہ اندھیرے اٹھنے کی۔ نماز پڑھتی ہوں' قرآن کی تلاوت کرتی ہوں پھر اپنے لیے چائے کا ایک کپ بناتی ہوں۔ بس پھر بچوں کے اٹھنے کے بعد تو سمجھو میری دوڑ لگ جاتی ہے۔ ان کے لیے ناشتہ بناؤ' یونیفارم تیار کرو' نواز کا ناشتہ' بچوں کے لنچ باکس بنانے میں تو سمجھو گھن چکر ہی بن جاتی ہوں۔ اب تمہاری طرح ملازم تو ہیں نہیں ہمارے گھر میں۔ پھر جب یہ سب گھر سے جاتے ہیں۔ نواز آفس اور بچے اسکول تو گھر جیسے کسی کشتی کے اکھاڑے کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔

پھیلاوا سمیٹتے سمیٹتے ہی بارہ بج جاتے ہیں۔ اپنے کھانے پینے کا تو کمبخت ہوش ہی نہیں رہتا۔ آج بھی صبح سے چائے کا ایک کپ ہی پی رکھا ہے۔ آتے آتے بھی گھر کے سو کام کر کے آئی ہوں دوپہر کے لیے کل کا سالن پڑا تھا آٹا گوندھ کر آئی ہوں' بچوں کے لیے گھر کے کپڑے نکال کر آئی ہوں' کچن کے برتن دھو دھا کر' یہ گھر کے کام تو سمجھو جان ہی کھا جاتے ہیں پھر بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ تم خوش بخت ہو جو ان جھمیلوں میں نہیں پڑیں۔ سیفی کتنے بجے آتا ہے۔ اسکول سے' وہ تو ملا ہی نہیں ہم سے۔" وہ ذرا سا بھی سانس لیے بغیر بولے جا رہی تھیں اور فخر حیات کے چہرے کے تاثرات شدید ہوتے جا رہے تھے وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر چائے پینے لگے تھے۔

"دو بجے آتا ہے۔" رعنا دھیرے سے بولی۔ وہ عفت آرا کے آگے بے بس تھی۔ انہیں پلٹ کر جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ یہ تو آج اسے احساس ہوا تھا کہ قدرت نے ہر طرف سے اس کی بے بسی کا اہتمام کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آگے رکھے سلائس پر جیم لگانے لگی۔

"ہاں۔ بچے بھی گھر دو بجے ہی آتے ہیں۔ ایں یہ آج فخر حیات آفس نہیں گئے۔" انہیں ایک پل کو خیال آیا تو بے دھڑک پوچھ بیٹھیں۔

"نہیں..." فخر حیات نے محض لب ہلائے۔

"چلو اچھا ہوا۔ آپ گھر پر مل گئے آپ دونوں سے بات ہو جائے گی اور پھر ملاقات بھی تو ہو گئی ورنہ تو کبھی کبھار ہی آتی ہوں تو آپ گھر پر ملتے ہی نہیں۔ آج تو میں آئی بھی خاص طور پر آپ سے ملنے تھی چاہے آپ کے انتظار میں مجھے رات کے بارہ کیوں نہ بج جاتے۔" رعنا کا دل دھڑکا پھر کوئی نیا مطالبہ۔ وہی تقاضا جو اس دن فون پر کر رہی تھیں۔ نواز بھائی بے تاثر چہرے کے ساتھ چائے پی رہے تھے جیسے بیوی کی گفتگو سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں یا پھر وہ کچھ سن ہی نہیں رہے۔

"خیریت... کیا بات ہے جو مجھ سے ملاقات ضروری تھی۔" فخر حیات نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ کپ بدستور ان کے لبوں سے لگا تھا۔

"بتاتی ہوں۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ناشتہ تو کر لیں۔ آپ ادھر ہی ہیں نا۔" اسی وقت جنتاں ناشتے کی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لے آئی تو ان کی زبان کو بریک لگ گئی۔ جنتاں نے ناشتہ ٹیبل پر چنا تو عفت آرا ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ فخر حیات اور نواز اٹھ کر لاؤنج میں جا بیٹھے۔ رعنا نے صرف اورنج جوس ہی لیا۔

"تو نا بھی تم' ابھی بھی ڈائٹنگ وائٹنگ کرتی ہو' ہزار نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھی ناشکروں کی طرح پانی کا گلاس پی کر اٹھ جانا ناشکرا پن نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک دنیا ان نعمتوں کو ترستی ہے اور تم اپنی مصنوعی کے چکروں میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں اور سچ کہوں رعنا! تم تو ابھی بھی اس قدر اسمارٹ ہو کہ تم سے چار ہو تو کہیں اور دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی اب تمہاری شادی کو سترہ اٹھارہ سال تو ہونے کو آئے ہیں۔ چھوڑو اب ان احتیاطوں کو۔ اب فخر حیات کہیں بھاگنے والے نہیں۔"

وہ آنکھ دبا کر بولیں تو رعنا کے دل نے ایک آہ بھری۔ اس نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے فخر حیات کی طرف دیکھا جو انگلش اخبار کا مطالعہ بڑے انہماک سے کر رہے تھے اور نواز بھائی خاموشی سے بیٹھے تھے۔

"سینس میں توازن نہ ہو تو رشتے بھی بے وزن ہو جاتے ہیں۔" اس نے فخر حیات کے بے نیازانہ انداز کو دیکھ کر سوچا۔ عفت آرا کا ناشتہ پورے پینتیس منٹ میں تمام ہوا۔ رعنا نے اکتا کر چائے کا ایک کپ پی ہی لیا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔ بڑا اچھا ناشتہ تھا۔ بہت مزہ آیا۔ ہمیں ایسا ناشتہ روز روز کہاں نصیب ہوتا ہے یہ تو اللہ نے تم جیسوں کے نصیب میں لکھ رکھا ہے۔ مجھے بھی چائے دینا۔ جب تک چائے کے دو تین کپ نہ پیوں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ ناشتہ کیا بھی ہے یا نہیں۔" انہوں نے رعنا سے چائے کا چوتھا کپ مانگا۔ وہ بے بسی سے سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کپ اٹھا کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں تو رعنا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملازم آ کر ٹیبل سے برتن سمیٹنے لگے۔ جنتاں کی موجودگی کا یہ فائدہ تھا کچھ بھی کہنا نہیں پڑتا تھا وہ سب کچھ خود ہی کروا لیتی تھی۔

"اب تو موسم کافی بدل گیا ہے۔ رات کو کافی ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور رات کو تو میں نے لحاف نکال لیے۔ بچے روز سردی سردی کرتے تھے۔ میں نے کہا اب لحاف میں آرام سے لیٹنا۔ روز کمبل دیکھ کر رونے لگ جاتے تھے۔"

"کس قدر فضول باتیں ہوتی ہیں اس عورت کی۔ جن کا نہ کوئی سر نہ پیر۔" فخر حیات کا جی چاہا اٹھا کر کوئی چیز عفت آرا کے سر پر دے ماریں۔

"آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی تھیں کیونکہ مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے اور رعنا کو بھی میرے ساتھ جانا ہے۔ اس لیے آپ پہلے بات کریں۔" فخر حیات نے بڑی مشکل سے اپنے اندر اٹھتے اشتعال کو دبا کر مناسب لہجے میں کہا۔ ان کی بات پر نواز ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اس عورت کی وجہ سے انہیں ہمیشہ ہی خفت اٹھانی پڑتی تھی۔ وہ دل میں کڑھنے لگے۔

"ارے لو تم لوگ کہیں جا رہے ہو۔ میں نے تو کہا آج آفس نہیں گئے تو چھٹی ہی ہو گی۔ دن گھر پر گزاریں گے۔" وہ خواہ مخواہ ہنسیں فخر چپ رہے۔

"ٹھیک ہے آپ لوگ جائیں۔ ہم ادھر ہی ہیں' شام کو یا جب بھی آپ لوگ آئیں گے پھر بات کر لیں گے۔" پتا نہیں عفت آرا کا خمیر کس مٹی سے اٹھا تھا۔ کسی بھی بات پر شرمندہ ہوتی ہی نہیں تھیں۔

"نہیں آپ ابھی بات کریں۔ ہماری واپسی معلوم نہیں کب ہو ہمیں ذرا پاسپورٹ آفس جانا ہے پھر ٹریول ایجنسی اور پھر شاپنگ کرنے بہت کام ہیں شاید ہمیں واپسی پر رات ہو جائے۔ آپ لوگوں کو گھر بھی جانا ہو گا' بچے ادھر اکیلے ہوں گے آپ کے۔" انہوں نے جتا کر کہا تو نواز نے گھور کر بیوی کو دیکھا۔

"ہیں یہ پاسپورٹ آفس کیوں جانا ہے۔ خیریت ہے کہیں سیر سپاٹے کا پروگرام ہے باہر کا۔" وہ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اچنبھے سے بولیں۔

"بتا... سمجھ لیں۔" وہ مختصراً بولے۔

"خیر بات تو کچھ بھی نہیں ہے کچھ خاص نہیں اور آپ کے لیے تو بالکل بھی بڑی بات نہیں۔ ہمیں پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ گھر کے اوپر پورشن ڈلوانا ہے بس اس لیے۔ میں نے رعنا سے بات کر لی تھی کہہ رہی تھی۔ بھائی کل پرسوں آ کر لے جائیں۔ پورشن بن جائے گا تو کرائے پر دے دیں گے۔ ایک دو سالوں میں کمیٹی ڈال کر آپ کا قرض لوٹا دیں گے۔ بس اتنی چھوٹی سی بات تھی۔" عفت آرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہوں..." فخر حیات نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بات اتنی چھوٹی نہیں بہرحال پانچ لاکھ چھوٹی رقم نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ میرا دیوالیہ ہو چکا ہے۔ میرا کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ میں مقروض ہو چکا ہوں۔ وہ بینک کرپٹ قرار دے چکے ہیں جن کے قرض مجھے اپنے بزنس کے تمام شیئرز فروخت کر کے ادا کرنے پڑے باقی کے واجبات بھی میں نے سب کچھ بیچ کر ادا کیے ہیں۔ میری کاروباری تباہی کی وجہ کیا ہے۔ اس سے یقیناً آپ کو کچھ غرض نہ ہوگی۔ بس اب یہ گھر بچا ہے' دونوں گاڑیوں کا بھی سودا ہو چکا ہے۔ اس لیے ان حالات میں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم یہ ملک چھوڑ جائیں۔ میں نے جاپان سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں کافی کام کر بھی چکا ہوں۔ وہاں گھر لے لیا ہے۔ بزنس کے لیے آفس بھی۔ ادھر سے سب کچھ وائنڈ اپ کر چکا ہوں' بس اب ٹکٹ کنفرم کرانے ہیں یا تھوڑی بہت شاپنگ کر کے سفر کی تیاری کرنی ہے یعنی ہم لوگ اگلے ہفتے کسی بھی دن ادھر سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں آج کل میں آپ لوگوں سے ملنا بھی تھا کہ آپ کو یہ سب بتا دوں بس بزنس کی الجھنوں نے سانس ہی نہیں لینے دیا کہ کسی کو کچھ بتا سکوں۔ بہرحال اب جو کچھ بھی ہے۔ آپ کے گوش گزار کر دیا ہے۔ امید ہے آپ میری پوزیشن سمجھ گئے ہوں گے۔ ورنہ میں نے کبھی آپ کی ہیلپ کرنے سے نہ تو رعنا کو روکا ہے نہ خود انکار کیا ہے۔"

فخر حیات کے الفاظ تھے یا بم کے گولے جو ان تینوں کے سروں پر آ کر پھٹے تھے۔ عفت آرا کا دل تو اگلے ہی پل

خوشی سے جھوم اٹھا تھا کہ رعنا کا بھی دیوالیہ ہو چکا ہے۔ رعنا پھٹی پھٹی آنکھوں سے فخر حیات کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ ان کے انکشافات بہت اچانک اور جان لیوا تھے۔ نواز بھی پریشانی سے فخر حیات کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ سب مذاق میں کہہ رہے ہوں۔

"ہمیں افسوس ہے۔ آپ اس قدر کٹھن حالات سے گزر رہے ہیں۔ اور ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، مگر فخر حیات! کیا باہر جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں، آپ ادھر ہی کاروبار نئے سرے سے سیٹ کریں۔ ادھر آپ کا گھر بھی تو ہے۔" نواز نے کچھ دیر بعد کہا۔

"نہیں اب یہ ممکن نہیں میں سب طرف سے جائزہ لے چکا ہوں۔ ملک چھوڑے بغیر چارہ نہیں۔ ادھر ہماری کاروباری ساکھ بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ جاپان میں میرے دوست ہیں جن کے بزنس میں میں شریک ہو رہا ہوں اسی لیے میں ادھر جانے کو ترجیح دے رہا ہوں باقی رہا ادھر کا مسئلہ، جب بھی ہم لوگ سیٹ ہوں گے واپس آجائیں گے کیونکہ ہمیں ادھر ہی آنا ہے چلو رعنا! تم تیار ہو جاؤ باقی تفصیلات میں تمہیں راستے میں بتا دوں گا۔ آج بہت سارے کام کرنے ہیں ہماری روانگی میں صرف تین چار دن تو ہیں ابھی سیفی کے اسکول بھی جانا ہے۔ سرٹیفکیٹ لینے اب تم درست کرو میں ذرا کمرے سے موبائل اور گاڑی کی چابی لے آؤں۔" کہہ کر وہ اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"یہ۔ یہ کیا کہہ گئے ہیں فخر حیات۔ رعنا! یہ سب کیا ہے۔" عفت آرا جیسے شاک سے نکلیں۔ "یہ باہر جانے کی بات کیوں کر رہے ہیں۔" وہ جیسے حواس باختہ سی لگ رہی تھیں۔

"مجھے تو خود بھابی! کچھ علم نہیں۔ یہ سب باتیں ابھی ان کے منہ سے سن رہی ہوں۔ آپ کے سامنے، اور یہ سب کچھ اتنا اچانک ہے کہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں، کیا کہوں۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دماغ جیسے خالی ہو کر رہ گیا تھا۔ نواز نے افسوس سے بہن کی طرف دیکھا۔

"چلو عفت آرا چلیں، رعنا! میں پھر چکر لگاؤں گا تم خود کو سنبھالو، تم اس قدر پریشان ہو تو سوچو فخر حیات کس قدر پریشان ہوں گے۔ برسوں کا جما جمایا بزنس جھٹ پٹ ختم ہو جائے تو بندے پر کیا نہیں گزر جاتی، تم اس کو بھی حوصلہ دو اور خود بھی ہمت باندھو، اپنی یہ زندگی... اس میں یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

"لو ہم آئے تھے کہ کچھ تو مدد ملے گی ان کی طرف سے، یہاں تو الٹی گنگا بہنے لگی۔ انہوں نے کہا کہ وہ طریقہ اختیار کرو کہ یہ لوگ خود ہی شرمندہ ہو کر چلے جائیں اور اب اندر سے دونوں میاں بیوی کی کیا صلاح ہے اللہ جانے، اوپر سے یہ ڈرامہ ہو رہا ہے۔ حد ہے، ویسے رعنا! تم اچھا نہیں کر رہی ہو، میں نے تو ہمیشہ تمہارا خیال ہی رکھا، تمہارے ماں باپ سے بڑھ کر۔ قیمتی سے قیمتی چیز کے لیے بھی تمہارے آگے دریغ نہ کیا۔ اور آج مجھے یہ صلہ مل رہا ہے۔" عفت آرا بڑبڑا رہی تھیں۔ رعنا ہنوز سر پکڑے بیٹھی تھی۔

"چلو! اب اٹھو، وہ خود اتنی پریشان ہے۔ تم اپنی مصیبت ڈال دو۔" نواز نے انہیں بازو سے گھسیٹا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی شوہر کے پیچھے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

ماں

تیری یاد کو لفظ بناتی ہوں

تو وہ تیرے لہجے کی خوشبو کو ترستے ہیں

جیسے

کوری مٹی کے کھنکناتے برتن پر

پانی کے چند قطرے گریں

تو محض کھن کی آواز آتی ہے

کوئی لہجہ ہاتھ آتا ہے نہ کوئی لمس

اور

شب و روز کی محنت سے جوڑے یادوں کے وہ چند لفظ

حقیقت کی ایک ہی ٹھوکر سے ترخ جاتے ہیں کہ

تو نہیں ہے

اور جو ہستی کی تکان سے بوجھل آنکھیں

تیری یاد کے خواب بننا چاہیں

تو خاموش دھندلے خاکے

تیری شبیہ کے رنگوں کو ترستے ہیں

آنکھوں کی تھکن بڑھتی ہے

خوابوں کی الجھن بڑھتی ہے

بے صدا لفظ

بے شبیہ تصویریں

دکھوں کی چبھن کو بڑھاتی ہیں

زیست کی تکان کو بڑھاتی ہیں

کوئی کندھا نہیں

کوئی آغوش نہیں

کوئی دلاسا نہیں

اور تیری طرف جاتا کوئی رستہ نہیں

بس

مٹی کا گھروندہ ہے

جو تیرا نشان بتاتا ہے

مجھ کو پاس بلاتا ہے

بے کلم کیسے جاؤں

اپنے درد کیسے بتاؤں

یادوں کے تانے بانے بنتے ہیں ٹوٹتے ہیں

تو بے بسی ہاتھ تھام لیتی ہے

کچھ کرنا ہو گا۔" اس نے مڑ کر سیاہ گیٹ پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور بے جان قدموں سے اس کی مخالف سمت میں چلنے لگی۔

"نصیب تو سارا ہی بگڑ چکا ہے۔ کہتے ہیں جب بخت ساتھ نہ دے تو اپنا سایہ بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔" میرے ساتھ بھی یہی کچھ نہ ہو، پھر کہاں جاؤں گی۔" وہ ست قدموں سے چلتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔ اس نے چادر سے اپنا منہ اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔

قدم جانے بوجھے رستوں پر پڑ رہے تھے حالانکہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس رستے پر اتنی دور اسے یوں بھی آنا پڑے گا اور اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی جو کوئی سواری لے لیتی۔ چلتے چلتے اسے واقعی گہری شام ہو گئی۔ جب اس نے کال بیل پر انگلی رکھی تو مغرب کی اذانیں ختم ہو چکی تھیں۔ اندھیرا بڑی مہارت سے کونے کھدروں میں بھی روشنی کو سیاہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی پہلی بیل کے جواب میں کوئی نہ

آیا تو اس نے چند لمحوں بعد دوبارہ کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسی وقت گیٹ کے اندر کھٹر پٹر ہوئی۔

"کون ہے جی؟" فرید بابا کی جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس کے دل نے طمانیت بھرا سانس لیا۔ ٹانگیں چل چل کر شل ہو چکی تھیں اب منزل پر پہنچتے ہی گرنے کو بے تاب ہو گئیں۔

"میں... فرید بابا زہت..." اس نے گلا صاف کر کے ذرا اونچی بشاش آواز میں کہا۔ گیٹ کھل چکا تھا فرید بابا نے اسے کچھ تنقیدی نظروں سے دیکھا' انداز اجنبی سا تھا۔ نزہت کے دل کو دھچکا لگا۔

"را... راحیلہ ہے...؟" وہ اس کی نظروں سے گڑبڑا کر بولی۔

"اچھا جی" وہ کچھ بھی جواب دیے بغیر اندر مڑ گیا وہ اس کے پیچھے اندر داخل ہونا چاہتی تھی کہ اس نے مڑ کر سختی سے گیٹ بند کر دیا۔

"آپ باہر رہو میں پہلے اندر سے پوچھ لوں۔" درشتی سے کہہ کر وہ اندر مڑ گیا تو نزہت کے جیسے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ یہ فرید بابا تو اسے دیکھتے ہی نہال ہو جایا کرتا تھا۔ "نزہت بیٹی آئی ہے۔ جی آیاں نوں' جی آیاں نوں' آپ تو جی ادھر آتے ہی نہیں ہو اور راحیلہ بی بی ہر پل آپ کی طرف آنے کو بے قرار رہتی ہیں جی۔" اور آج... اس نے آنسوؤں کو پیچھے دھکیل کر ایک گہرا سانس لیا۔

"نصیب واقعی ہر بہتری سے مکر گیا ہے' میرے لیے بدل گیا ہے۔" اس کے دل نے پُریقین انداز میں کہا۔

"کہہ دو۔ میں گھر پر نہیں ہوں۔" اسے دور سے راحیلہ کی مانوس آواز سنائی دی تو اس کا جی چاہا۔ یہیں زمین کے اندر کہیں غرق ہو جائے۔ اسی وقت قدموں کی چاپ نزدیک آئی اور گیٹ کھل گیا۔ سر پر سیاہ اندھیرے کی چادر تنی جا رہی تھی۔

"بی بی گھر پر نہیں ہیں جی۔" وہی روکھا خشک ناشناسا لہجہ۔ نزہت نے دیوار کو تھام لیا۔

"را... راحیلہ گھر پر ہے بابا! خدا کے لیے اس سے کہیں' میری بات سن لے میں اندر نہیں آتی وائی گاڈ بابا! میں اندر نہیں آؤں گی مگر اس سے کہیں' صرف چند لمحوں کے لیے میری بات سن لے۔ اسے اللہ کا واسطہ۔ میری اپنی پرانی دوستی کا واسطہ۔" وہ بے اختیار روتے ہوئے گڑگڑانے لگی۔ تو فرید بابا نے اسے ترس بھری نظروں سے دیکھا اور اندر کی طرف مڑ گیا مگر جانے سے پہلے دروازہ بند کرنا نہ بھولا۔

"بابا! کہہ دو' میں گھر پر نہیں ہوں۔ میں اس سے نہیں مل سکتی خالہ گھر پر ہیں۔ انہیں پتا چل گیا تو آفت آجائے گی۔ میں کتنی صفائیاں پیش کروں۔ وہ یقین نہیں کریں گی۔ پہلے ہی وہ مشکوک ہو رہی ہیں۔ امی ابو سختی سے منع کر کے گئے ہیں مجھے۔ پلیز آپ جا کر اس سے کہہ دیں کہ راحیلہ بازار گئی ہے پھر کبھی آجائیے۔" راحیلہ کی سخت آواز پر اس کا دل یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"بیٹا! وہ سخت مشکل میں دکھتی ہے۔ ایک بار جا کر اس کی بات سن لو۔ بے شک اس کی مدد نہ کرنا مگر وہ اللہ کا واسطہ دے رہی ہے۔ سن لو جا کر۔ بیگم صاحبہ کو میں دیکھتا ہوں ادھر آنے لگیں گی تو روک لوں گا یا آپ کو بتا دوں گا' آپ اس کی بات سن لیں جا کر۔" فرید بابا کا لہجہ سراسر ترس کھانے والا تھا۔ اب نوکر بھی اس پر ترس کھائیں گے۔ اس نے دیوار سے ہولے... سر ٹکرایا۔

اندر چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی پھر قدموں کی آواز ابھری۔ رخ گیٹ کی طرف ہی تھا۔ شاید راحیلہ نے جواب دے کر بھیج دیا تھا۔ اس نے مایوسی سے سر اٹھا کر تاریک آسمان پر ٹمٹماتے اکا دکا ستاروں کو دیکھا۔ اسی وقت گیٹ کھل گیا۔

راحیلہ اس کے سامنے کھڑی تھی جس کی آنکھوں سے اس کی پہچان تک مٹ چکی تھی۔ چہرہ بے تاثر اور روکھا۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی اس قدر خوش ہوتی تھی جیسے عید کا چاند نظر آ گیا ہو۔

"کیوں آئی ہو ادھر' جاؤ جہاں رات گزار کر آئی ہو ادھر ہی چلی جاؤ۔ تم نے میری دوستی کو دھوکا دیا ہے آج مجھے تمہیں اپنی دوست کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ میری خالہ آئی ہوئی ہیں۔ ان کے کانوں میں تمہاری آمد کی بھنک

بھی پڑ گئیں تو وہ میرا رشتہ اپنے بیٹے سے توکیا توڑیں گی۔ پچھلے بھی تمام تعلق توڑ کر چل پڑیں گی۔ رات کو تمہارے بھائی اور بھابی نے خوب تماشا لگایا تھا ان کے سامنے آ کر۔ میری عزت دو کوڑی کی نہیں رہنے دی۔ امی ابو گھر پر نہیں ہیں بہتر ہے کہ تم ادھر سے چلی جاؤ تم نے بات سننے کے لیے اللہ کا واسطہ دیا تھا تو میں نے سن لی۔ اب میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ کیونکہ مجھے تمہاری جھوٹی سچی کوئی کہانی نہیں سننی۔" وہ ذرا سا گیٹ کھولے بمشکل چہرہ باہر نکالے اس سے تند لہجے میں مخاطب تھی۔

اس دوران اس نے ایک بار بھی نزہت کی آنکھوں سے بہتے جھرنوں اور ان سے پھوٹتی بے بسی کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو اس راحیلہ سے بے حد مختلف اور انجان لگ رہی تھی۔ جو کبھی نزہت کی بے حد قریبی دوست غم خوار و غمگسار رہ چکی تھی۔

نزہت نے جواب دینے کی کوشش کی۔ اس کے لب ذرا سا کانپے مگر آواز اور الفاظ نے ساتھ نہ دیا۔ راحیلہ نے ایک پل کو اس کے اجڑے ہوئے حلیے پر نظر کی' وہ فقیروں سے بدتر لگ رہی تھی۔ گرد اور مٹی سے اٹے ہاتھ پاؤں اور کچلا ہوا میلا لباس اور اس کے وجود سے اٹھتی بے حد ناخوشگوار گندگی کی بدبو' کسی کو بھی دو پل اس کے پاس کھڑا نہیں رہنے دے سکتی تھی۔ رو رو کر سوجی ہوئی آنکھیں' خشک بے رونق چہرہ' روکھے پپڑی زدہ ہونٹ' راحیلہ گیٹ بند کرنے لگی۔ نزہت نے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کیا کہتی "آج تو اس کے سارے الفاظ' سارے انداز بے اثر ثابت ہو رہے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان کسی بھی ذی روح پر اثر نہیں کر رہے تھے۔

اگلے ہی پل وہ آگے بڑھی اور ادھ کھلے دروازے کو دھکیل کر راحیلہ کے قدموں میں گر پڑی۔

"راحیلہ خدا کے لیے اللہ کے واسطے مجھے صرف آج کی رات سر چھپانے کی جگہ دے دو' صرف آج کی رات میں صبح کا اجالا ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ راحی! میں بے قصور ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں صرف آج کی رات... پلیز تمہیں اللہ کی قسم' اپنے امی ابو کی قسم' صرف ایک رات... صرف آج کی رات پناہ دے دو۔" وہ اس کے قدموں پر سر پٹخے جا رہی تھی۔

• • • • •

تڑپ	میرے	بے	قرار	دل	کی
کبھی	تو	ان	پہ	اثر کرے	گی
کبھی	تو وہ	بھی	جلیں گے	اس	میں
جو	آگ	دل	میں	دہک رہی	ہے
ہماری	سانسوں	میں	آج		تک
وہ	حنا	کی	خوشبو	مہک رہی	ہے

پتا نہیں قنات کے دوسری طرف کون مہدی حسن کا جانشین پورے سُر تال کے ساتھ با آواز بلند گا رہا تھا۔ گانے کی سلیکشن فنکشن کی مناسبت سے بالکل موزوں تھی۔ گائیکی میں کہیں بھی جھول نہیں تھا۔ پختہ انداز' میں لفظوں کا ٹھیک ٹھاک جماؤ صرف آواز میں ناپختگی اور کچا پن نہ ہوتا تو کوئی بھی نہ جان سکتا کہ یہ آواز کسی نوخیز و نوعمر لڑکے کی ہے۔ یہی لگ رہا تھا کوئی منجھا ہوا گلوکار بڑی لگن سے گا رہا ہے۔

"واہ زبردست۔ تالیاں اوئے ہوئے۔" سننے والوں میں سے کسی لڑکے کی بلند آواز گونجی ساتھ ہی زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔

"معید المبین! زبردست' کیا آواز ہے۔ کیا گلا ہے یار! لگتا ہے تو قاری عبدالحفیظ کے پاس حفظ قرآن کی نہیں بلکہ سُر تال کی تعلیم لینے جاتا ہے۔ زبردست' مزہ آ گیا۔ ایک بار پھر..."

وہی لڑکا تالیوں کی گونج ختم ہوتے ہی بے اختیاری سے بولا تو دوسرے لڑکے بھی اس کی تعریف کرنے لگے ساتھ میں ہنسی مذاق بھی۔

"ارے صوفی صاحب! یہ تو آپ کا لخت جگر لگتا ہے۔ یہ آپ نے اسے کس کام پہ لگا دیا' اچھا بھلا آپ مسجد

مدرسہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک گورنمنٹ سے تنخواہ لیتے ہیں پھر حویلی سے بھی خوب اناج جاتے ہیں اور بھی جو ممکن ہو ہم مدد کر دیتے ہیں۔ مگر پھر آپ نے اولاد کو اللہ کی راہ پر لگانے کے بجائے یہ بھانڈوں اور میراثیوں کے کام پر لگا دیا۔ مانا آج کل اس پیشے پر بھی خوب دھن برس رہا ہے۔ تھکے سے نکما بھانڈ میراثی پجارو میں گھوم رہا ہے۔ جہازوں میں اڑتا پھر رہا ہے۔ پر یہ تو خاندانی پیشہ وروں کے کام ہیں' آپ کو تو اپنے خاندان' نام' منصب اور پیشے کا لحاظ رکھنا چاہیے۔"

بادشاہ کے عتاب سے یونہی تو غریب غربا نہیں لرزا کرتے۔ آسمان پر اللہ بادشاہ اور زمین پر یہ بنے بنائے بادشاہ۔ اگر جلال میں آجائیں تو کیڑے مکوڑوں کو تو کہیں پناہ نہیں ملتی اور صوفی صاحب نے ہمیشہ اس قسم کی صورتحال سے بچنے کی کوشش کی تھی جو آج عبدالمبین کی بے ہودہ حرکت کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔

"آپ تو کہتے تھے آپ کا عبدالمبین حفظ کر رہا ہے آج کل۔ بہت جلد آکر مدرسے کے نظم و نسق میں آپ کا ہاتھ بٹائے گا بڑا تو عبدالمتین شہر کا ہو کر رہ گیا! اچھا آپ نے اسے انٹر کرنے کے لیے شہر بھیجا۔ صوفی صاحب! آپ کی اولاد کے خون میں کیا وفا نہیں رہی۔ حق حلال کا کھلا رہے ہوتا۔ ذرا خیال کرنا تھا۔"

بڑے شاہ جی کے طنز و تحقیر میں ڈوبے جملے صوفی صاحب کو پاتال میں دھکیل رہے تھے۔ کھانا کھایا جا چکا تھا جس کے بعد لڑکے بالے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ دوسری قنات میں جا کر انہوں نے اپنی محفل جمائی تھی۔ گاؤں کے کچھ معززین اور کچھ مہمان ٹولیوں کی شکل میں کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مگن تھے' جبکہ سبطین شاہ اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے کہ عبدالمبین کی پرکشش اور بلند آواز نے یکایک سارے ماحول کو جیسے خاموش کر دیا تھا۔ سب ہی دھیان سے اس کا خوبصورت گیت سننے لگے جو وہ بڑے جذب کے عالم میں گا رہا تھا۔ جیسے ہی تالیوں کی آواز بلند ہو کر خاموش ہوئی اور شاہ جی کو علم ہوا کہ گلوکار عبدالمبین تھا۔ صوفی صاحب کا بیٹا۔ وہ فوراً "بغیر کسی اگلے پچھلے لحاظ کے برس پڑے اور صوفی صاحب جو پہلے ہی یہ جان کر کہ آواز عبدالمبین کی ہے غصے سے بھر گئے تھے۔ بڑے شاہ جی کے جملوں نے آگ پر جلتی کا کام کیا' وہ ایک پل کو تو تن میں جیسے دھنس سے گئے۔ دوسرے ہی پل وہ بڑے شاہ جی کو کوئی بھی جواب دیے ان سے نگاہیں ملائے بغیر جلال میں بھرے ہوئے اٹھے اور دوسرے ٹینٹ کی طرف بڑھ گئے۔ سبطین شاہ نے انہیں ایک نظر بغیر جواب دیے جاتے دیکھ کر کچھ ناگواری سے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر آفریدی صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آفریدی صاحب نے بھی بڑے دھیان سے عبدالمبین کا گانا سنا تھا۔

"ماشاء اللہ کیا گلا پایا ہے نوجوان نے۔ اگر اس لڑکے کی ٹھیک ٹھاک سرپرستی کی جائے تو شاہ جی! تو یہ آگے چل کر بڑا نام کمائے گا' میں تو متاثر ہو گیا ہوں اس کی آواز سے۔ بہت اچھی اور دل کو چھونے والی آواز ہے۔ ذرا اسے بلوائیں تو سہی کچھ اور بھی سنتے ہیں۔ ذرا لطف رہے گا۔ کیا یہ صوفی صاحب کا بیٹا ہے؟" آفریدی صاحب نے شاید سبطین شاہ کے کلمات دھیان سے نہیں سنے تھے' اس لیے اپنی دھن میں کہتے چلے گئے۔

"ارے چھوڑیں آفریدی صاحب! یہ اس ٹائپ کے لوگ نہیں جو بہت آگے جاتے ہیں یا کسی بھی فیلڈ میں بہت نام کماتے ہیں۔ یہ تو بس صبح و شام گھر گھر سے روٹیاں اکٹھی کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کا مقصد حیات صرف روٹیوں کا حصول ہوتا ہے یا پھر مسجدوں میں جا کر صفیں بچھانا اور اذانیں دینا۔ کوئی بڑا کام ان سے نہیں ہوتا۔ لڑکے کی آواز اب اتنی بھی خاص نہیں جو تہلکہ مچا دے۔ آواز میں لوچ نہیں ہے اور کچا پن تو بہت زیادہ ہے۔"

پتا نہیں آج کل سبطین شاہ صوفی صاحب کے اس قدر خلاف کیوں ہو رہے تھے۔ شاید عبدالمتین کے شادی میں شرکت نہ کرنے سے۔ مگر یہ تو کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی۔ عبدالمتین کون سا شہر میں ڈپٹی کلکٹر لگا تھا جو اس کے نہ آنے سے شاہ جی کی ہتک ہوئی تھی بس! انہیں آج کل ویسے ہی وہم ہونے لگا تھا کہ صوفی صاحب اپنی اولاد کے ذریعے کوئی اونچا مقام حاصل کرنے کے چکر میں ہیں۔ وہ بھی شاہ جی کو زینہ بنائے بغیر شاید صوفی صاحب کے کسی مخالف کا پروپیگنڈہ کام کر گیا تھا کہ آج کل صوفی صاحب کی ہر "ادا" ان کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگی

"خیر۔ وہ کون سا کوئی پیشہ ور گانے والا ہے۔ آواز میں کچا پن تو ہو گا ہی' ویسے مجموعی طور پر میں تو کہوں گا۔ لڑکے کی آواز زبردست تھی۔ میں تو مان گیا۔"

آفریدی صاحب نے اپنی گھنی مونچھوں کو خواہ مخواہ مروڑتے ہوئے سبطین شاہ کی بات کو رد کیا۔

"ارے چھوڑیں جی۔ کیا بچوں والی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ اس بار آپ کا سینٹ کی سیٹ پر کھڑے ہونے کا ارادہ ہے کیا؟" شاہ صاحب نے اکتا کر موضوع بدلا۔

"بالکل جی۔ بالکل کیوں نہیں...." آفریدی صاحب پرجوش ہو گئے۔

"مبین یار! اب کوئی دوسرا گانا ہو جائے۔ یار! تیری آواز میں تو نکھار آ گیا ہے۔ لگتا ہے دن رات ریاض کرتا ہے۔ ادھر مدرسے میں۔"

دس بارہ لڑکے گول دائرے میں چسکڑا مارے دری پر بیٹھے تھے' عبدالمبین ان کے درمیان میں آگے ہو کر بیٹھا ہوا تعریف کے ڈونگرے سمیٹ رہا تھا۔ اپنی تعریف سن سن کر اس کا چہرہ مرکری لائٹس میں سرخ انار کی طرح دہک رہا تھا۔ اس کا رنگ بھی آج کل کافی صاف ہو گیا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ قد بھی خاصا لمبا ہو گیا تھا۔ جسم بھی بھرا بھرا سا ہو رہا تھا۔ کالے سیاہ گھنگھریالے بال سر پر سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ سیاہ آنکھوں میں عجیب سی خوشی ہلکورے لے رہی تھی شاید اپنی ذات پر اعتماد کی خوشی تھی۔ صاف ستھرے کریم کلر کا شلوار سوٹ اور اوپر بلیک کلر کا ویسٹ کوٹ پہنے دور سے دیکھنے پر وہ ایک پرکشش اور خوبصورت لڑکا لگ رہا تھا۔

مگر اس وقت صوفی صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیں۔ اس کا چہرہ اس بری طرح سے مسخ کر دیں کہ کوئی اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔ اس کا گلا گھونٹ ڈالیں کہ دوبارہ اس کے گلے سے گانے کے لیے کوئی منحوس آواز نہ نکل سکے۔ عبدالمبین کو یوں خوش و مسرور دیکھ کر خون آگ کے شراروں کی طرح ان کی رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے وہ تیزی سے مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ غصے سے ان کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے جیسے آگ کے شعلے لپک رہے تھے جو دور ہی سے عبدالمبین کو بھسم کر دینا چاہتے تھے' انہوں نے اسے کس نیک رستے پر ڈالنا چاہا اور وہ بھٹک کر کس طرح شیطانی رستے کو اپنا تا جا رہا تھا۔ یہ خیال ہی صوفی صاحب کی ہستی ہلا دینے کو کافی تھا مگر اس وقت کسی بھی دکھ اور افسوس کی جگہ غصے اور طیش کی انتہا تھی کہ بجائے اس کی اس معصومانہ حرکت کو نظر انداز کر دینے کے اسے جان سے مار دینے پر تل گئے تھے۔ عبدالمبین کی ان کی طرف سائیڈ تھی۔ وہ انہیں دیکھ ہی نہیں سکا کہ وہ کس جلالی موڈ میں اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اچانک سامنے بیٹھے لڑکے کی نظر بالکل قریب آتے صوفی صاحب کے پر جلال سرخ چہرے پر پڑی۔ وہ اگلے ہی پل چھلانگ مار کر اٹھ بھاگا۔

"صوفی صاحب آ گئے۔ صوفی صاحب آ گئے۔"

دیوانہ وار کہتا وہ لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ٹینٹ سے باہر بھاگ گیا۔ دوسرے لڑکے بھی بوکھلا کر اٹھے اور عبدالمبین کو تو اٹھنے کی بھی مہلت نہ مل سکی تھی انہوں نے پیچھے سے ہی اس کی گردن اپنے آہنی پنجے میں جکڑ لی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کمر پر مکے برسانے شروع کر دیے تھے۔

"خبیث! ملعون! الو کے پٹھے! میں نے تجھے اس کام کے لیے اس کام کے لیے ادھر بھیج رکھا ہے کہ تو جائے اور یہ میراثیوں اور بھانڈوں والا ناچ گانا سیکھے۔ کیوں تیرا دل اتنا شیطانی تماشوں کی طرف کھنچتا ہے۔ کیوں تو نے میری' میرے باپ دادا کی عزت نیلام کرنے کا ٹھیکہ اٹھا لیا ہے۔ کیوں بار بار میری عزت ادھیڑنے سے تیرا جی نہیں بھرتا۔ تجھے نیک کام کی طرف ڈالتا ہوں اور تو بدی کی طرف دوڑتا ہے۔ کیوں؟ کیوں؟"

اب وہ اسے لاتوں اور دونوں ہاتھوں کے زوردار تھپڑوں سے پیٹ رہے تھے ان کی مار پیٹ اور طیش بھری آواز سن کر لوگ ان کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مگر آگے بڑھ کر صوفی صاحب کا ہاتھ روکنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔ صوفی صاحب اسے کسی جانور کی طرح دھپا دھپ کوٹے جا رہے تھے اور وہ گٹھڑی کی طرح ان کے

مکوں کی زد میں ادھر ادھر لڑھکے جا رہا تھا۔ چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے بغیر کوئی آواز نکالے جیسے پٹنا اس کا معمول ہو اور پیٹنا صوفی صاحب کا۔

"تو گانا گانے سے پہلے' یہ ڈھولکی تالی سیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گیا۔ عبدالمبین! تیری ہزار نسلوں میں کوئی گویا پیدا نہ ہوا تو تو کہاں سے ہمارا نام ڈبونے کو جنم لے بیٹھا۔ عبدالمبین! تو میرے گناہوں کی سزا بن کر آیا ہے۔ اپنے سیاہ منحوس چہرے کو لے کر ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو جا۔ کبھی مجھے اب اپنا یہ لعنتی چہرہ نہ دکھانا میں اب تجھے نہیں دیکھنا چاہتا نہ اپنے گھر میں نہ اپنی نظروں کے سامنے۔ تو مر جا' دفع ہو جا مگر مجھے کبھی دکھائی نہ دینا۔ زمین میں دفن ہو جا۔ سمندر میں غرق ہو جا کہیں جا کر۔" وہ اسے مار مار کر خود بھی نڈھال ہو چکے تھے۔ ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور ان کے ہاتھ لال سرخ بوٹی کی طرح ہو رہے تھے۔ جیسے ان سے ابھی لہو رسنے لگے گا۔

"ارے اس صوفی کو کہو۔ بس کرے اب۔ کیوں بد شگونی پھیلا رہا ہے۔ اس اچھے اور نیک دن میں اپنی فضول بکواس کر کے۔ اس سے کہو تماشا لگانا ہے تو اپنے گھر جا کر لگائے۔ نکالو ان کو یہاں سے۔"

دوسرے ٹینٹ سے آتی سبطین شاہ کی خفگی بھری آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ کسی بھی پیامبر کے سندیسے کے بغیر آسانی سے سنی جا سکتی تھی۔ صوفی صاحب کے زور زور سے برستے ہاتھ ایک لمحے کو بے جان ہو کر رہ گئے۔

"بس کریں صوفی صاحب! بہت ہو گیا۔ بچہ ادھ موا ہو گیا ہے۔" ماسٹر صاحب شاید ابھی آئے تھے آگے بڑھ کر صوفی صاحب کے ہاتھ تھام کر بولے۔

"ارے جاؤ' اسے بے جا کر پانی وانی پلاؤ۔" وہ مڑ کر کسی سے بولے۔

"چھوڑ دو ماسٹر صاحب! آج میں اس کو مار کر ہی دم لوں گا۔" وہ اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کمزور لہجے میں بولے۔ شاہ جی کی بیزار خفا آواز نے جیسے ان کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی' بادشاہ خفا ہو جائے تو عوام کی طاقت یونہی نچڑ جایا کرتی ہے۔

"ارے چھوڑیں بھی صوفی صاحب! کیا ہو گیا ہے۔ یہ کوئی جگہ ہے اس طرح کا تماشا لگانے کی۔ خود کو تماشا بنوا رہے ہیں آپ۔ جلیل! پانی لے کر آؤ صوفی صاحب کے لیے اور عبدالمبین کو گھر لے جاؤ۔" وہ مڑ کر پاس کھڑے جلیل سے بولے۔

"اسے گھر نہ لے کر جانا ورنہ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔" وہ غضب سے بولے۔

"کیا ہو گیا ہے صوفی صاحب! اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ بچہ ہے اور بچے ایسے کام کیا ہی کرتے ہیں۔ جوان خون ہے۔ دلچسپی کے سو طریقے نکالے گا۔ آپ کو اسے اتنا سیریس نہیں لینا چاہیے تھا ہو جائے گا ٹھیک۔ آپ کو اپنی تربیت پر بھروسا نہیں ہے۔" وہ انہیں کرسی پر بٹھا کر دھیرے دھیرے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے نرمی سے بولے۔

صوفی صاحب شاید اس وقت ماسٹر صاحب کو بھی خاطر میں نہ لاتے اگر سبطین شاہ کی بیزار بیزار سی خفگی کا انہیں خیال نہ آتا' وہ خاموشی سے ماسٹر صاحب کی نصیحتیں سننے لگے۔

○ ○ ○

"تو یہ سب کچھ اس طرح سے ہونا تھا۔" کتنی دیر کے بعد اس نے اپنی گود میں رکھا سر اٹھا کر کالے سیاہ آسمان پر جگمگاتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ رات کا شاید آخری پہر تھا' ستاروں کی جگمگاہٹ بڑھ گئی تھی۔ آسمان کی سیاہی نیلگوں ہونے والی تھی فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی مگر اسے بالکل بھی سردی نہیں لگ رہی تھی وہ رات بارہ بجے کے بعد باہر آئی تھی' تب سے وہ اسی ماربل کی سیڑھی پر بیٹھی نہ معلوم کون کون سے حسابات کھول رہی تھی۔

پرسوں عفت آرا اور نواز کے جانے کے بعد فخر حیات اسے شاپنگ کے لیے لے گئے تھے وہ اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کیے جا رہے تھے۔ یونہی بغیر کسی وجہ کے۔ اور وہ کسی بے جان ڈمی کی طرح ان کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ اس کی عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے آدھ گھنٹے بعد ہی فخر حیات نے شاپنگ ختم کر دی اور اسے لے کر ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے ویسے بھی لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔

"رعنا! کب تک اس طرح بے حسی کا مظاہرہ کرتی رہو گی حالانکہ میں تم سے اپنے دل کی گہرائیوں سے ایکسیوز کر چکا ہوں۔ اگرچہ تمام قصور میرا نہیں تھا پھر بھی......"

انہوں نے اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ ویٹر آرڈر لے کر جا چکا تھا۔ ہال میں اکا دکا میزیں بھری ہوئی تھیں۔ ابھی تو صرف ڈیڑھ بجا تھا۔ انہوں نے یونہی گردن گھما کر ہال کا جائزہ لیا۔ ان کی نظریں ہال میں لگے وال کلاک پر ایک پل کو رکیں۔ رعنا نے ان کی تمہید کا کوئی ریسپانس نہیں لیا تھا۔

"صبح جو کچھ میں نے نواز بھائی اور بھابھی جان کے سامنے کہا۔ تم کیا اس پر مجھ سے خفا ہو؟"

انہوں نے اس کے بے تاثر رویے کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ رعنا اپنی انگلیوں سے الجھنے لگی جواب کوئی نہیں دیا۔

"میں اسی سلسلے میں تو تم سے بات کرنا چاہتا تھا' سب تفصیلات ڈسکس کرنا چاہتا تھا' مگر پھر حالات ایکدم اتنا اچانک سب کچھ الٹ پلٹ ہوا کہ میرے پاس وقت ہی نہ رہا کہ تم سے بات کر سکوں۔ اس میں کچھ غلطی تمہاری بھی ہے۔ لیکن اگر ہم اسی طرح ایک دوسرے کی غلطیوں کو پکڑ کر بیٹھ رہے تو جو تھوڑا بہت سنوارنے کو بچا ہے' وہ بالکل ہی بگڑ کر رہ جائے گا۔ پلیز رعنا کچھ تو کہو۔ میں تمہارے خیالات جاننا چاہ رہا ہوں۔" آخر میں وہ بالکل عاجز ہو کر بولے۔

"کیا رہ گیا ہے میرے کہنے کو اب۔ کیا جاننا چاہ رہے ہیں آپ اب' کیا رہ گیا ہے اب سلجھنے کو جو میری اٹینشن سے سلجھ جائے گا۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر تلخی سے بولی۔ سب باتیں اس کی توقعات کے بالکل برعکس ہوئی تھیں۔ ایسا کچھ تو اس نے بہرحال سوچا بھی نہیں تھا کہ فخر حیات اتنی اچانک یہاں سے کوچ کا حکم دے دیں گے۔ اس کا ذہن جو پہلے ہی کئی دنوں سے منتشر تھا۔ اب اور پریشان ہو گیا تھا۔

"بہت کچھ۔ بہت کچھ ابھی بھی باقی ہے۔ میں۔ تم۔ سیفی اور ہماری آئندہ کی زندگی جس کو ہمیں سیٹ کرنا ہے۔ رعنا! کیا تم میرے حوصلے' میرے ول پاور کو داد نہیں دو گی کہ اتنے کڑے حالات میں بھی میں نے خود کو کس طرح سے سنبھال رکھا ہے۔ اگر میں بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ اتنے ٹینس حالات میں کچھ بھی مثبت پہلو سامنے نہ رکھوں تو تمہیں احساس ہے حالات کتنے بے قابو ہو جائیں۔"

وہ رعنا کو حالات کی سنگینی کا احساس دلانا چاہ رہے تھے۔ پرانی رعنا۔ ان پر جان لٹانے والی رعنا کو جھنجوڑ رہے تھے مگر پتا نہیں اس کی حسیات پر کیسی برف جم گئی تھی جو فخر حیات کی عاجزی' نرم رویے اور محبت سے بھی پگھل نہیں رہی تھی۔

"کیا ابھی حالات بے قابو ہونا باقی ہیں؟"

اس نے لاتعلقی سے شیشے سے باہر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھا' حالانکہ پوچھنا تو وہ یہ چاہ رہی تھی کہ حالات اتنے بے قابو کس طرح ہو گئے کہ ہمیں یہاں سے اپنا سب کچھ اکھاڑ کر ہجرت کرنا پڑ رہی ہے۔ ایک جما جمایا مضبوط پھیلا ہوا بزنس کیسے چند مہینوں میں دیوالیہ ہو گیا۔ کیسے حالات اتنے بگڑ گئے کہ وہ اب اپنے وطن میں رہ بھی نہیں سکتے۔ وطن سے محبت و انسیت اپنی جگہ۔ مگر رعنا کی ادھر رہنے کی مجبوری اس محبت و انسیت سے بھی سوا تھی جس نے چند گھنٹوں میں ہی اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ انہیں پاکستان سے باہر جا کر رہنا پڑے گا' چند سالوں کے لیے یا شاید ہمیشہ کے لیے تو اسے فخر حیات کی بے وفائی کا رنج بھی بھول گیا۔ اس کا اضطراب دیدنی تھا مگر فخر حیات اس کی بے چینی سے لاتعلق نظر آتے تھے۔

"بہت کچھ باقی ہے رعنا جان! بہت کچھ...... تم میرا ساتھ تو دو' میری ہمت تو نہ ڈھاؤ رعنا! آگے کی تمام تر جنگ مجھے تمہاری ہمت اور تمہاری محبت کے بل بوتے پر جیتنی ہے۔ پلیز رعنا! مجھے مضبوط کرو۔ مجھے اپنے دائمی ساتھ کا یقین دلا کر میرا حوصلہ بڑھاؤ پلیز۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اس نئی افتاد نے مجھے توڑنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔

رعنا! میں آج بھی تمہاری محبت اور توجہ کا اتنا ہی طلب گار ہوں جتنا تمہارے اولین ساتھ کے دن سے تھا.... ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ مائی پوزیشن پلیز۔"

بہت مدھم آواز میں اس کے ٹیبل پر دھرے نازک ہاتھ پر وہ اپنا ہاتھ رکھے التجا کر رہے تھے۔ رعنا کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اسی ساتھ کا تو بہت دنوں سے اس کا دل بھی متقاضی تھا۔ اسی حوصلے۔ اسی محبت کا۔ فخر حیات نے اس کی ڈیمانڈ کو اتنے دنوں سے کیوں محسوس نہیں کیا؟ وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہی تھی۔ جیسے پوری کائنات میں وہ بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ بالکل تنہا اور اب فخر حیات کو اس کے ساتھ کی ضرورت تھی تو بلا جھجک انہوں نے ہاتھ پھیلا دیے۔ فقیری کا یہ انداز پروردگار نے عورت کو کیوں عطا نہیں کیا کہ وہ جب بھی مانگنا چاہے۔ بلا جھجک اپنے پہلو میں سونے والے ہم سفر سے پورے استحقاق کے ساتھ اس کا ذہنی و قلبی ساتھ مانگ لے اور مانگنے پر اس کی جھولی ہمیشہ ہی بھر جائے جیسے جیسے اب.....

رعنا نے ایک گہرا سانس لے کر اپنا دوسرا ہاتھ فخر حیات کے ہاتھ پر رکھ دیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ جو پچھلے چند دنوں میں بیتا اسے یکسر بھول کر پرانی سنگت کی ہمراہی میں نئے خواب بنے جائیں۔ اس نے دل کو سمجھایا۔

"تھینک یو، تھینک یو مائی سویٹ ہارٹ۔" فخر حیات کے انداز ممنونیت پر ایک مدھم سی بے جان مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو کر گزر گئی اور وہ جواب میں "یو ویلکم" بھی نہ کہہ سکی۔

پھر سب کچھ جلدی جلدی طے ہو گیا۔ ان کی اگلے ہفتے کی سیٹیں بھی کنفرم ہو گئیں، پاسپورٹ تو تینوں کے موجود ہی تھے۔ تھوڑی بہت پیکنگ کی گئی۔ قیمتی سامان دو بڑے کمروں میں رکھ کر کمرے لاک کر دیے گئے، صرف ٹی وی لاؤنج کھلا چھوڑا اور یہ سب کتنے عرصے کے لیے تھا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

"کیا پتا یہ گھر بھی فروخت کرنا پڑے۔ کچھ عرصے بعد۔"

سامان لاک کرتے ہوئے اس کے دل سے ہوک ابھری۔ "یہ سب کچھ اس نے اتنے سالوں میں دنیا بھر کے ملکوں سے کتنے چاؤ سے خریدا تھا۔ اپنے گھر کو سجانے کے لیے۔ ان بیش قیمت اشیاء کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے گھر کو صحیح معنوں میں ہوم سویٹ ہوم بنانے کے لیے۔ ان ہی خوبصورت قیمتی اور بیش قیمت اشیاء کو دیکھ دیکھ کر تو عفت آرا جلا کرتی تھیں۔ رعنا کی قسمت کو حسد و رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھی اور آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جیتے جی انہیں چھوڑ جانا تھا۔

"اگر یہ گھر بھی بک گیا تو؟" اس کا دل جیسے اس خیال پر ٹھہر سا گیا دھڑکنا ہی بھول گیا ایک پل کو۔

"نہیں ہیں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ گھر سیل ہو گیا تو آخری آس بھی دم توڑ جائے گی۔ میں یہ گھر کم از کم کبھی نہیں سیل ہونے دوں گی۔" وہ جو سیفی کا سوٹ کیس پیک کرنے جا رہی تھی۔ اس کی بلیک ہائی نیک سوٹ کیس پر پھینک کر مڑی اور تیزی سے کمرے سے نکل کر بیڈ روم میں مصروف فخر حیات کے پاس چلی آئی۔

"فخر! میں نے بلا چوں چرا آپ کی ہر بات مان لی۔ کچھ بھی انکار نہیں کیا، کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ آپ کو معلوم ہے نا۔" ان کے ہاتھ میں پکڑی فائل اس نے ایک طرف رکھ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایکدم سے کہا۔

"ہاں بالکل۔ یہ صحیح ہے اور میں اس کے لیے تمہارا شکریہ.....!"

"نہیں فخر! ہمارے ریلیشن شپ میں شکریہ تھینک یو جیسے تکلفات کی کوئی گنجائش نہیں نہ اس کی ضرورت ہے۔" وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولی۔ "مجھے اس کے بدلے آپ سے صرف ایک بات کا اقرار چاہیے۔ ایک وعدہ۔ ایک یقین دہانی اور اس میں کوئی بھی اتار چڑھاؤ یا ترمیم حالات کے مطابق میں برداشت نہیں کروں گی۔ آپ کو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھانا ہو گی اور جس دن آپ نے یہ قسم توڑی اس دن رعنا بھی ختم ہو جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے۔" وہ جذباتی انداز میں کہہ گئی۔

"پلیز رعنا! تمہاری ہر بات میرے سر آنکھوں پر۔ بھی میں نے آج تک تمہاری کسی بات سے انکار کیا ہے۔" وہ نرمی سے اس کے گال سہلا کر بولے۔

"بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔" وہ کھڑی رہی۔ اس نے جیسے ان کی پیشکش کو سنا ہی نہیں تھا۔

"پہلے کی تمام باتوں کی اور بات مگر آج کا وعدہ۔ پلیز فخر آئی ایم سیریس۔" اس کی آنکھوں میں بھی التجا تھی۔ چہرے کا رنگ جیسے اڑا ہوا سا تھا۔

"اچھا وعدہ۔ میں جان پر کھیل جاؤں گا مگر تم سے کیا گیا یہ وعدہ ضرور ایفا کروں گا۔ آئی پرامس۔" اس کی سنجیدگی دیکھ کر فخر حیات نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"آپ یہ گھر کبھی بھی سیل نہیں کریں گے، چاہے ہم سڑکوں پر رل جائیں یا فٹ پاتھ پر آ جائیں۔ آپ یہ گھر سیل نہیں کریں گے۔ کبھی بھی۔ اس گھر کے باہر لگی نیم پلیٹ بھی کبھی نہیں اترے گی۔ کبھی بھی نہیں۔ پرامس۔!"

وہ ان کے ہاتھوں کو سختی سے اپنے ہاتھوں میں لیے کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں جیسے فخر حیات کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

"آئی پرامس۔ تمہاری نہیں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ گھر میں کبھی نہیں سیل کروں گا۔ ٹھیک ہے ناؤ یو ریلیکس۔" وہ اس کے ہاتھوں کو ذرا سا دبا کر محبت بھرے لہجے میں بولے تو وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"تھینک یو۔" اس کے ہونٹوں سے خفیف سا نکلا اور اگلے لمحے وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر جانے لگی۔

"رعنا! وجہ پوچھ سکتا ہوں۔؟" پیچھے سے انہوں نے دھیرے سے پکارا۔

"کیا وجہ پوچھنے کی ضرورت ہے آپ کو نہیں معلوم وجہ۔؟" وہ خوب چبا کر بولی اور ایکدم سے اس کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر پانی اتر آیا۔

"آپ کو نہیں معلوم فخر آپ اس قدر انجان ہیں کہ ادھر کسی کو آنا ہے۔ کبھی نہ کبھی اور اگر خدانخواستہ اس گھر کی نیم پلیٹ بدل چکی ہو۔ اس کی تلاش ایک تھکا دینے والی مسافت کے بعد اس کے لیے لاحاصل ثابت ہو تو رعنا کو ابھی مر جانا چاہیے۔ فخر ابھی۔"

وہ زور زور سے بلبلاتی روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو فخر حیات کے آدھے دھڑ سے جیسے جان ہی ختم ہو گئی۔ اس کے آنسوؤں اور دکھی فریاد نے انہیں بہت کچھ یاد دلایا، وہ اسی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں صحرا میں نکل جائیں، مگر صحرا میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک جلتا بلتا صحرا تو ان کے اپنے اندر برسوں سے گرد اڑا رہا ہے۔ اس کی پیاس کب بجھے گی۔ وہ بیڈ پر گر سے گئے۔ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر خود کو لاحاصل سوچوں میں کھو جانے دیا۔

اور آج وہ عفت آرا سے ملنے گئی تھی۔ آخری بار کہ اگلے روز انہیں یہ شہر یہ زمین ہی چھوڑ جانا تھی۔ سیفی بھی اس کے ساتھ تھا۔ فخر حیات کو کسی سے ملنے جانا تھا۔ وہ انہیں ڈراپ کر کے خود چلے گئے تھے۔ رات کا کھانا ان کا نواز بھائی کی طرف ہی تھا۔

مگر عفت آرا کا رویہ بہت دل دکھانے والا تھا، انہوں نے رعنا سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ بس ہر بات کا منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیتی رہیں۔ رعنا نے اپنی، فخر حیات کی ساری مجبوری کھول کر ان کے سامنے رکھ دی مگر جواباً "وہ صرف طنزیہ ہنکارا ہی بھر کر رہ گئیں۔ نواز بھائی بھی موجود تھے۔ وہ بیوی کو اس کے رویے پر گھورتے رہے مگر انہوں نے ذرا پروا نہ کی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ رعنا خود کس قدر رنجیدہ ہے اور آخری بار ان سے ملنے آئی ہے۔

"اے بی بی رہنے دو یہ جھوٹ اس کی پوٹ ہمارے سامنے نہ کھولو۔ ہمیں نہیں معلوم کیوں جا رہے ہو تم لوگ یہاں سے؟" وہ ہاتھ اور آنکھیں نچا کر بولے گئیں۔

"یہاں رہے تو غریب بھائی کی کوئی نہ کوئی ضرورت ہر دوسرے روز تمہارے گلے ہی پڑے گی تو کیوں نہ ادھر سے کوچ ہی کرو نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ نہ ہوں گے نہ کوئی آکر تم سے اپنی ضرورتیں بیان کرے گا۔ چاہے تم اس کی ضرورت پہلے پوری کرتی تھیں یا نہیں۔ کم از کم اگلے کا من تو ہلکا ہو جاتا تھا اب پردیس جا کر اللہ جانے صورت کو ہی ترس جاؤں میں دکھیاری۔"

وہ اچانک چھکوں پھکوں رونے لگیں۔ نواز اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ رعنا شرمندہ سی ہو کر اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ عفت آرا کو دلاسا دینے کا ــــ کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور وہ دلاسا دیتی بھی تو کون سا اس نے مطمئن ہو جانا تھا۔ اس لیے وہ چپ چاپ بیٹھی اس کی سسکیاں سنتی رہی اور جواب میں جھوٹی تسلی کوئی بھی تسلی نہ دے سکی۔

"بھابھی! میں فون کر لیا کروں گی۔ جلدی جلدی آخر جب عفت آرا کا رونا طویل ہو گیا تو رعنا کو کہنا ہی پڑا جس پر عفت آرا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور دوپٹے کے پلو سے منہ رگڑنے لگی۔

"تمہاری مہربانی ہو گی بی بی! ہم کیا کہہ سکتے ہیں مجبور جو ہوئے۔" کچھ دیر بعد وہ طنز سے بولیں۔

پھر رات کے کھانے تک وہ اسی طرح عفت آرا کی کڑوی کسیلی باتیں سن سن کر اپنا جی جلاتی رہی۔ شاید وہ کھانے سے پہلے ہی واپس آجاتی اگر فخر حیات کو واپسی پر ادھر آنے کا نہ کہہ چکی ہوتی۔ سیفی سارا وقت بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اسے عفت آرا کے رونے سے یا رعنا کے شرمسار چہرے سے کچھ غرض نہ تھی۔

"بچھ جو ہوا۔" رعنا نے اس کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھ کر سوچا۔ کھانا کھاتے ہی وہ لوگ اٹھ کر واپس آگئے۔

"پتا نہیں اب کب یہ صورتیں دیکھیں۔" اس نے گہرا سانس لے کر گود میں رکھی البم کھولی جس کا مخملیں کور اس کے آنسوؤں سے گیلا ہو چکا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس پر سر رکھے روتی رہی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے ورق الٹنے شروع کیے' ہر تصویر آنسوؤں میں بھیگتی رہی۔ دور سے موذن کی آواز نے رات کے گزر جانے کا اعلان کیا اس کی کمر بیٹھ بیٹھ کر اکڑ چکی تھی۔

اب سے صرف تین گھنٹے بعد ان کی فلائٹ تھی جاپان کے لیے اور اس بات کا علم صرف اسے تھا کہ وہ اپنا دل' اپنی روح یہاں ہی چھوڑے جا رہی ہے۔ صرف اس کا مٹی کا وجود جہاز میں بیٹھ کر ہجرت کرے گا۔ آنسو پھر سے ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"رعنا!" فخر حیات نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تو اس نے چونک کر البم بند کر دی۔

"چلو کب تک یہاں بیٹھی رہو گی۔ رات گزر گئی۔ ہم انشاءاللہ آئیں گے ادھر۔ یہ گھر ہمارا ہے۔ ہم پھر سے اسے آباد کرنے آئیں گے۔ آؤ مل کر اللہ کے حضور دعا کریں کہ جب ہم لوٹیں تو ہمارا یہ گھر سچی خوشیوں سے مہک اٹھے۔ کوئی کمی کوئی تشنگی نہ رہے۔ سب محرومیوں کا ازالہ ہو جائے اور جو دعا سچے دل سے کی جائے۔ میری جان! وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ اٹھو آؤ میرے ساتھ اور پورے یقین سے خدا کو پکارو۔ وہ تمہاری ضرور سنے گا۔ آؤ۔"

فخر حیات نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دھیرے دھیرے کمرے کی طرف لے کر بڑھے۔ وہ لٹی پٹی ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی۔

اور آج آخری بار جب اس نے جہاز کی کھڑکی سے اپنے اس آشیانے کو کھوجنے کی کوشش کی جو ہزاروں میل نیچے کہیں حسرت سے تکتے ہوئے انہیں الوداع کہہ رہا تھا۔ اس محل جیسے گھر میں جس میں وہ دلہن بن کر اتری تھی سولہ سنگھار کیے اور جس میں اس کے ہر خواب نے حقیقت کا روپ دھارا تھا۔ اب ایک اجاڑ خوابیدہ محل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ جس کے ویران برآمدے میں جنتاں کھڑی یقیناً "انہیں ہاتھ ہلا کر الوداع کہہ رہی ہو گی۔

رعنا نے تھک کر اپنا سر فخر حیات کے کندھے پر ٹکا دیا دو دن سے وہ سو نہ سکی تھی۔ ظالم یادوں نے اس کے ذہن سے سکون اور آنکھوں سے نیند ہی لوٹ لی تھی۔ اب جبکہ دل کو یقین ہو گیا کہ وہ جو بہت کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ اسے ایک بار کھوجنے تو آنا ہی ہو گا۔ ضرور آنا ہو گا۔ اس نے خود کو یقین دلایا تو دل کو جیسے قرار سا آگیا۔ اس نے آنکھیں

موند لیں۔

تھوڑی دیر میں فخر حیات کے کندھے سے سر ٹکائے وہ گہری نیند سو چکی تھی

☼ ☼ ☼

"چلیں جی۔ یہ کام ہی ہو گیا۔ اب تو گل جی! آپ خوش ہیں نا بہت گلے رہنے لگے تھے آپ کو ہم سے کہ اب ہم آپ کو بھول گئے ہیں۔ جو کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کرتے۔ اب تو سارے گلے شکوے رفع ہو جانے چاہئیں آپ کے دل سے۔"

قریشی نے چیک پر سائن کر کے چیک زیور گل کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"تھینک یو قریشی جی! دیکھیں جی گلہ تو اپنوں ہی سے ہوتا ہے نا۔ اپنے اگر منہ پھیر لیں۔ دیکھ کر بھی آنکھیں چرا لیں تو قریشی جی' آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ یہ دل تو ہوتے ہی کانچ جیسے نازک ہیں ایسے دل خراش مناظر پر تو چور چور ہوتے ہی ہیں۔" زیور گل نے چیک تھام کر ایک ادا سے اپنے ہونٹوں سے چھوا اور اٹھلا کر بولی۔

"تو پھر اس چور چور شیشہ دل کو بھی تو اپنوں ہی نے جوڑ دیا ہے نا اب بتائیں۔ کہیں ذرا سے جوڑ کا بھی نشان باقی رہا گیا ـــــ خوبصورت عکس جھلملا رہا ہے اپنوں کی محبت کا۔"

قریشی نے پرے صوفے پر بیٹھی سنہری نازک سی نین تارا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دل میں سموتے ہوئے کہا۔

اس کی پاگل بھوکی نگاہوں سے بے نیاز تانگ پر ٹانگ دھرے اسے زور زور سے جھلائے جا رہی تھی۔ وہ جیسے اس سارے منظر میں کہیں موجود ہی نہیں تھی اور اس کی یہ بے توجہی قریشی صاحب کی بے چینی کو اور ہوا دے رہی تھی۔

"دل بس موم جیسا ہے قریشی جی! اپنوں کی دوری میں دل ان ہی بھرپور نرم گرم محبتوں کو تو ترستا ہے۔"

زیور گل نے چیک پر بڑی نفاست سے اپنی لمبی انگلیاں پھیریں۔ قریشی کی نگاہوں کی گستاخی سے یا تو وہ آگاہ ہی نہیں تھی یا جان بوجھ کر انہیں گستاخ ہونے کا موقع دے رہی تھی۔

"پھر ریہرسل کب شروع کی جائے۔ میرا خیال ہے کل صبح ہی رکھ لیتے ہیں۔ فلم کی آدھی سے زیادہ شوٹنگ تو مکمل ہو چکی ہے گانوں کا کام رہتا تھا۔ سو آج اس کی بھی امید بن گئی ہے۔" قریشی اب براہ راست نین تارا سے مخاطب تھا۔ اس نے ایک سرسری سی نظر قریشی کے بے ہنگم پھیلے ہوئے سراپے پر ڈالی اور لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔

"ہوں ریہرسل بھی شروع کر دیں گے جلد ہی۔ ویسے تو قریشی جی! میں نے تو کہا تھا۔ فلم کے باقی تین گانے بھی نین تارا ہی گائے گی مگر آپ نے بھروسا ہی نہیں کیا۔ اصل میں تو وہ تینوں گانے ہی فلم کی جان ہیں۔ سارا تھیم ہی ان گانوں میں ہے اور اپنی نیناں کی آواز اتنی بھی کچی نہیں ہے۔ چند ہفتوں کے ریاض ہی سے پیشہ ور گانے والیوں کو پیچھے چھوڑ گئی ہے' اتنا ٹیلنٹ ہے اس کے اندر۔ گاتی ہے تو ایک سماں بندھ جاتا ہے کوئل اس کی آواز سن لے تو کوکنا بھول جائے۔ سنی تو ہے آپ نے اس کی آواز۔"

زیور گل نے مبالغہ آرائی کی انتہا کر دی ورنہ تو اسے بھی معلوم تھا۔ نین تارا کی آواز نہیں اس کے وجود کی نزاکت کا جادو چند ہی دنوں میں ہر طرف سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ سب کو ہی یکایک عام سی آواز والی پرانی زیور گل کی بیٹی کی آواز میں سُر کی دیوی گاتی نظر آنے لگی ہے اور یہی الفاظ اب قریشی کے منہ میں تھے۔

"بس میں کیا شک ہے نین تارا کے گلے میں ہی تو سُر کی دیوی نے جنم لیا تھا۔ جو ایک بار سنتا ہے اس کا مداح ہو جاتا ہے اور گل جی! یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے۔ آج کل کی یہ سنگرز جن کے گلے میں سریلی آواز کی جگہ بلبلیاں رو رہی ہوتی ہیں۔ صرف میوزک کی دھما دھم میں شہرت کی سیڑھیاں پھلانگے جاتی ہیں' ان کو تو میں گھاس بھی نہیں ڈالتا یہ تو نین تارا کی آواز کی کشش تھی کہ میں نے اپنی اتنی مہنگی فلم کے چار گانے فوری طور پر اس کے لیے بک کر

لیے اور جو ایک رسک ہی ہے۔ کوئی بھی فلمساز جس نے اپنا کل سرمایہ داؤ پر لگا رکھا ہو۔ ایسا رسک کبھی نہیں لیتا مگر میں نے نین تارا کے اندر چھپے جوہر کو پرکھ لیا ہے۔ تب ہی تو یہ رسک بڑے آرام سے لیا ہے۔ رہ گئے باقی کے تین گانے تو وہ آپ کو معلوم ہی ہے پہلے ہی سے میڈم بہار گا چکی ہیں۔ فلم کی شوٹنگ بھی اسٹارٹ ہونے سے پہلے میں نا صرف ان کو بک کر چکا تھا بلکہ ایک موٹی رقم ان کو ایڈوانس میں بھی دے چکا تھا۔ اس لیے مجبوری سمجھیں۔ چلیں اس کی تلافی اگلے پراجیکٹ میں کر دیں گے۔ وعدہ رہا میری اگلی فلم انشاء اللہ ایشیا کی میگا ہٹ فلم ہوگی۔ پورا ایک کروڑ لگانے کا ارادہ ہے میرا اس میں بس آپ جیسے مہربان دعا کریں گے تو......"

اتنی لمبی بات کے اختتام سے پہلے ہی قریشی کا سانس بری طرح سے پھول گیا۔ اسے دمے کا مرض تھا اور یہ بھی بڑی ہمت کی بات تھی جو وہ پچھلے چار منٹ سے بغیر رکے مسلسل بول رہا تھا۔

"خیر یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے میڈم بہار کو آپ نے کب بک کیا تھا یا میڈم نے آپ پر نظر کرم......" زیور گل نے ماچس کی تیلی پھینک کر قریشی کے بھڑکنے کا مزہ لیا۔ "مارکیٹ میں بیٹھے ہیں آخر ہم بھی۔" قریشی نے پھولے سانس کے درمیان کچھ غصے سے زیور گل کو دیکھا پھر اگلے ہی پل وہ ڈھیلے پڑ گئے۔

"دفع کریں جی۔ کہا جو ہے اگلی دفعہ ساری کسریں نکال دوں گا۔ آپ ریہرسل کی تاریخ اور وقت بتائیں جی۔ مجھے ابھی ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔ اپائنٹمنٹ ہے میرا آج۔"

"قریشی جی بوڑھے ہو رہے ہو۔ اپنی صحت کا دھیان رکھا کرو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے کہ جو گوشت کا پہاڑ بنے جا رہے ہو۔" زیور گل نے ٹھٹھا لگایا۔

"گل جی! ارے چھوڑیے مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ آزمائش شرط ہے۔" وہ کمینگی سے بائیں آنکھ دبا کر بولا۔ "اس پر گوشت کا کوہ ہمالیہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بشرطیکہ وہ کوہ ہمالیہ سونے کی کان پر بیٹھا ہو۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے۔ انڈسٹری کی ساری تتلیاں ہی کوہ ہمالیہ کو سر کرنے کے چکر میں رہتی ہیں اگر میں شیخی نہ بگھاروں تو الگ بات ہے۔"

قریشی صاحب نے اگلے پچھلے سارے حساب چکا دیے۔ زیور گل بھی دبک سی گئی۔ ان باتوں میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ یہ قریشی کمبخت سونے کی کان پر ہی تو بیٹھا تھا۔ لگاتار دو سالوں سے اس کی ہر فلم سپرہٹ جا رہی تھی باکس آفس پر۔ اس کی ہر نئی آنے والی فلم اس کی پچھلی فلم کا ریکارڈ توڑ دیتی تھی۔ اسی وجہ سے تو وہ سب سے مہنگا فلم ساز اور پروڈیوسر تھا۔ کسی ہما شما ہیروئن یا سنگر کو تو وہ منہ ہی نہیں لگاتا تھا۔ یہ تو زیور گل کی خوش نصیبی تھی جو نین تارا کو دیکھتے ہی گوشت کے پہاڑ میں چھپا اس کا ننھا سا دل دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ نین تارا کو سنتا وہ خاک بھی نہیں تھا۔ اس کی سماعتیں تو اس کی بصارتوں میں آکر بہری ہو جاتی تھیں۔

"زیور گل نے یہ ہیرا کدھر چھپا رکھا تھا مکار بڑھیا۔"

وہ آڈیشن کے دوران یک ٹک نین تارا کو تکتے ہوئے سوچے جا رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا۔ اس نوخیز ان چھوئی تتلی کو ابھی اپنی مٹھی میں چھپا کر اڑا لے جائے پھر اس نے بنا سوچے سمجھے نین تارا کو اپنی نئی فلم میں بطور گلوکارہ بک کر لیا اور اب اس کمبخت لالچی بڑھیا کو چیک تھمانے کے باوجود اس تتلی کو چھو کر دیکھنے کی کوئی امید پیدا نہیں ہو رہی تھی اس خواہش نے اس کے اندر کے اضطراب کو بھڑکا دیا تھا۔ بار بار سانسیں ناہموار ہوتی جا رہی تھیں۔

"ریہرسل کا بتاؤ پھر مجھے اپنا شیڈول بھی سیٹ کرنا ہے۔" وہ ایک اور گلاس چڑھانے کے بعد کچھ بیزاری سے بولا۔

"کل صبح گیارہ بجے ہم آئیں گے اسٹوڈیو۔ ٹھیک ہے نا نہناں۔" زیور گل جیسے اس کی بے تابیوں کے مزے لے رہی تھی لاپروائی سے بولی۔

"تو ٹھیک ساڑھے دس بجے میرا ڈرائیور آجائے گا نین تارا کو پک کرنے۔" قریشی کی جیسے مراد بر آئی۔

"نہیں۔ تمہیں ڈرائیور بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود آجائیں گے پورے گیارہ بجے اسٹوڈیو۔" زیور گل فوراً بولی۔

"تم کیا کرو گی زیور گل آکر۔ اب تمہارے آرام کے دن ہیں' آرام کرو۔ اولاد کے سکھ تو نصیبوں والوں کے حصے میں آتے ہیں۔" وہ اونچی آواز میں بے ہنگم سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"تو اس عمر میں میں طعنے سنوں کہ بیٹی کی کمائی پر بیٹھ کر عیش کر رہی ہوں نا بابا میں خود آؤں گی اس کے ساتھ۔ پھر میری بچی بھولی بھالی ابھی تو اسے گھر کا رستہ صحیح سے نہیں آتا میں اسے اسٹوڈیو کی بھول بھلیوں میں بھیج دوں قریشی! اتنا احمق سمجھ رکھا ہے مجھے۔ یہ بال زیور گل نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔" زیور گل پیشہ ورانہ انداز میں چبا چبا کر بولی۔

"گھر کا رستہ ہم اسے سمجھا دیں گے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو کیوں سوئی؟" وہ اپنے پیلے پیلے پان زدہ دانت نکوستے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بیزار بیٹھی نین تارا سے بولا۔

"مما بہتر جانتی ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی آؤں گی۔" وہ بھی فوراً بولی۔ بہرحال اکیلے جانے کا رسک تو وہ نہیں لے سکتی تھی۔ اس گوشت کے پہاڑ کی نیت کوئی ڈھکی چھپی تو نہیں تھی۔ قریشی کا منہ لٹک گیا' ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کل گیارہ بجے کا مطلب گل جی! گیارہ بجے ہی ہے۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔

"فکر ہی نہ کرو قریشی جی! اپنی جان پر کھیل کر تمہارے شیڈول کی پابندی کریں گے۔ آخر بچی کا پہلا کنٹریکٹ ہے۔ پہلا کام صحیح کرے گی تو کامیابی کے زینے پر قدم جمائے گی نا۔" زیور گل بڑی ذمہ داری سے بولی تو قریشی سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ دروازے کے پاس بیٹھا اس کا سیکریٹری بھی اس کے ساتھ نکل گیا۔

"ریچھ' سمجھتا ہے۔ میں اس کے داؤ پیچ سے انجان ہوں بہت اچھی طرح آزمائے ہوئے ہیں اس کے یہ انداز میرے۔" زیور گل اس کے باہر نکلتے ہی بڑبڑائی۔

"مما جانی! مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ کل پتا نہیں میں ٹھیک سے ریہرسل کر بھی پاؤں گی یا نہیں۔ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

نین تارا زیور گل کی بڑبڑاہٹ سن کر اور بھی گھبرا کر بولی اور کچھ قریشی کی بھٹکتی نظروں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔

"ڈونٹ وری میری جان! تمہاری مما جانی تمہارے ساتھ ہوگی نا اور یہ ریہرسل وغیرہ تم دیکھنا کچھ بھی مشکل نہیں' تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تم اتنا اچھا کام کر آؤ گی۔" زیور گل بچوں کی طرح اسے چمکارتے ہوئے بولی۔

"مما! میرا دل اس لیے بھی گھبرا رہا ہے اگر شاہ جی کو پتا چل گیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ انہوں نے اس طرح کے سب کاموں کے لیے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے اور میں نے ان سے پرامس بھی کر رکھا ہے۔" اپنی گھبراہٹ کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے نین تارا بولی۔

"ابھی بچی ہو میری جان!" زیور گل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ارے چھوٹو بڑے ایسے وعدے وفا ہوتے ہیں۔ شاہ جی نے کون سے وعدے وفا کیے ہیں۔ پندرہ دن کا کہہ کر گئے تھے۔ مہینہ ہونے کو آیا ہے۔ لی کوئی خیر خبر تمہارے شاہ جی نے تمہاری تم کیوں اس کی جھوٹی قسموں میں ہلکان ہوئی جا رہی ہو۔ سرکار کی قسمیں' پیار کے وعدے میری جان ٹوٹ جانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔"

زیور گل خوامخواہ ہنس پڑی۔ آج تو بات بات پر اس کی ہنسی چھوٹ رہی تھی۔

"اول تو اسے پتا ہی نہیں چلے گا اگر کل کو پتا چل بھی گیا تو میں کہہ دوں گی میں نے زبردستی تم سے گوایا تھا۔ تم ٹینشن تمہیں' ٹینشن ریلیز کرنے کے لیے اوکے۔ اب کوئی فکر نہ کرو۔" وہ کندھے جھاڑ کر جیسے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"بالکل ایزی ہو کر سونا۔ کوئی بوجھ دل پر نہ رکھنا۔ ابھی تمہاری عمر اس طرح کی ٹینشن پالنے کی نہیں ہے۔ انجوائے کرنے کی ہے۔ اب سو جاؤ جا کر۔ میں اب آرام کروں گی۔ سارا دن ریسٹ کا ٹائم نہیں مل سکا۔ صبح ماسٹر جی آدھمکیں گے پھر تم کو کوئی نیند پوری نہیں ہوئی پھر صبح گیارہ بجے اس گوشت کے پہاڑ کی ریہرسل بھی ہے۔ اس کی تیاری کے لیے بھی کچھ وقت تو چاہیے ہوگا۔ اوکے مائی سویٹ ہارٹ اب جا کر کمپلیٹ ریسٹ لو گڈ نائٹ۔"

✡ ✡ ✡

"ام جان یہ معاذ ہے۔ دیکھیں آپ کی دعاؤں سے یہ اب صحت یاب ہے اور آپ کے سامنے بیٹھا ہے اور آپ خوامخواہ اس کی فکر میں بستر سنبھال کر بیٹھ گئیں یا پھر مجھے ہی آپ نے ہفتے بھر کی چھٹیاں کروانا تھیں۔ اپنی پٹی سے لگا کر بٹھار کھا ہے۔"

کیپٹن شہباز نے بستر پر لیٹی مسز خان کا ماتھا چوم کر لاڈ سے کہا اور ذرا پرے کرسی پر بیٹھے معاذ کا ان سے تعارف کرایا۔

مسز خان بیٹے کی بات سن کر یونہی ہلکا سا ہنسیں۔ اگلے ہی لمحے ہنسی جیسے ان کے لبوں پر بجھ سی گئی جیسے آگ کا شعلہ ایک پل کو بھڑکے اور اگلے ہی پل بجھ جائے۔ ایک عجیب سی فکر کل جب سے ہوش میں آئی تھیں کیپٹن شہباز کو ان کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی نظر آ رہی تھی جیسے سب کچھ ختم ہو جانے پر عجیب سی بے بسی کا احساس انسان کے چہرے سے چھلکنے لگتا ہے یا بہت کچھ جو زندگی بتانے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ لٹ گیا ہے اور جو باقی بچا ہے وہ کچھ ایسا قابل ذکر نہیں کہ کل سے کوئی بھی بات انہیں خوش نہیں کر رہی تھی۔ ایک عجیب سی افسردگی ان کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ کیپٹن شہباز نے ساری زندگی بھی ان کو اس قدر پژمردہ نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب وہ دونوں ٹانگوں سے محروم ہوئی تھیں۔

"بیٹا! اب آپ ٹھیک ہیں۔ زخم کیسے ہیں۔؟"

کچھ دیر بعد مسز خان نے معاذ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ کیپٹن شہباز اب بالکل خاموش تھے' ماں کے چہرے کی بھیانک خاموشی انہیں کل سے بار بار چپ کرائے جا رہی تھی۔ وہ بڑے جوش سے کوئی بات شروع کرتے اگلے ہی لمحے ماحول کی افسردگی انہیں دودھ کے جھاگ کی طرح خاموش کرا دیتی۔ سارا ولولہ ختم ہو جاتا۔ اب بھی ماں کی استہزائیہ ہنسی جیسے ان کی ساری قوتیں منجمد کر گئی تھی اور نئے سرے سے توانائی مجتمع کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ مسز خان نے معاذ سے کیا پوچھا' انہیں کچھ پتا نہیں چل سکا۔

"جی ٹھیک ہوں اب۔" معاذ نے دھیرے سے کہا۔

"ادھر آئیں میرے پاس۔" انہوں نے محبت سے کہا تو معاذ جھجک کر اٹھا اور ان کے بیڈ کے پاس آ کر رک گیا۔

"ادھر بیٹھیں۔" انہوں نے ہاتھ سے بیڈ کی سائیڈ کی طرف اشارہ کیا وہ جھجکتا ہوا ذرا سا ٹک گیا۔

"پڑھتے ہو۔ مجھے شہباز نے بتایا تھا۔ ماشاءاللہ لائق اور ذہین ہو۔ مجھے جان کر بہت خوشی ہوئی۔ تم ادھر رہو گے تو تمہیں ادھر کوئی تکلیف نہیں ہو گی' یکسوئی سے پڑھنے کا موقع مل سکے گا۔ تم ادھر رہنے پر خوش ہو نا۔"

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں جیسے ان سے بولا نہ جا رہا تھا' دو دن کی بیماری نے ان کی ساری طاقت سلب کر لی تھی رنگ بھی پیلا زرد ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں ہاتھوں پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔ شہباز نے ماں کی طرف دیکھا۔

"جی!" معاذ نے ہولے سے کہا اور ایک نظر پاس بیٹھے شہباز کی طرف دیکھا۔ "مگر میں ہاسٹل جانا چاہتا ہوں۔ میں ادھر ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔" اس نے جھجک کر اپنا مدعا بیان کیا۔ کیپٹن شہباز نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے کل سے دو تین دفعہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ وہ ادھر نہیں رہنا چاہتا۔

"دیکھو ینگ مین! فضول گفتگو سے پرہیز کرو تو زیادہ اچھا ہے۔ جب میں نے تم سے کہہ دیا کہ تمہیں ادھر ہی رہنا ہے تو پھر بار بار ہاسٹل کا تذکرہ کیوں؟ ہاسٹل میں پڑھائی کم اور عیش زیادہ ہوتے ہیں۔ کیا تمہیں وہ عیاشیاں چاہئیں۔" وہ اسے گھور کر دیکھ رہے تھے اور وہ جیسے شرمندہ ہوا جا رہا تھا۔

"جی نہیں مجھے تو پڑھنا ہے بہت اور میں ہاسٹل پڑھنے کے لیے ہی جانا چاہتا ہوں۔ عیش کے لیے نہیں' آپ کو معلوم ہے۔ میری آپ سے ریکویسٹ ہے میں ادھر نہیں رہنا چاہتا۔ میں خود میرا مطلب ہے۔ آپ کا بہت شکریہ آپ نے اتنی محبت دی۔ میرا علاج کروایا مگر اب مجھے اجازت دیں۔ میں کل چلا جاؤں۔ کل سے ایڈمیشن بھی

اوپن ہو رہے ہیں۔ اب تو مجھے کچھ مشکل نہیں ہو گی۔ آرام سے ہاسٹل اور کالج میں داخلہ مل جائے گا۔"

وہ ایک ہی سانس میں جلدی جلدی کہہ گیا کہ کہیں بیچ میں بھول نہ جائے۔ کیپٹن شہباز ابھی بھی اسے تیز نگاہوں کی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔

"معاذ! میں نے تم سے......" وہ کچھ تیزی سے بولنے لگے۔ مسز خان نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں خاموش کرا دیا۔

"کیوں بیٹا! یہاں آپ کو کوئی تکلیف ہے۔" وہ معاذ سے بولیں۔ ان کا محبت بھرا مہذب لہجہ معاذ کو شرمسار کر رہا تھا' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"دیکھو بچے! خودداری اچھی چیز ہے بلکہ بہت اچھی چیز ہے۔ مضبوط اور پائیدار فیوچر کے حصول کے لیے خودداری سے بڑا ہتھیار کوئی نہیں۔ یہ انسان کو اپنے مقصد کی خاطر لڑنے کے لیے توانائی فراہم کرتا ہے' لیکن اگر یہی ہتھیار مقصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بننے لگے تو اسے نیام میں کر دینا چاہیے۔ تم ہاسٹل میں جا کر رہو گے۔ پڑھو گے لیکن ہاسٹل کے اخراجات کا کیا کرو گے؟"

"میں پارٹ ٹائم......" اس نے تیزی سے بولنا چاہا۔

"میٹرک کے بعد پارٹ ٹائم نہیں ملا کرتی اگر مل بھی گئی تو کسی ہوٹل میں بیرا گیری یا اور کوئی بہت معمولی سی نوکری جو تمہاری اچھی سوچ کو ہو سکتا ہے کرپٹ کر دے پھر وقت الگ ضائع ہو گا اور اگر میرے بچے! پارٹ ٹائم کے بغیر اپنا وقت ضائع کیے بغیر تمہیں پڑھنے کا موقع مل رہا ہے تو تم فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ یہاں تمہیں گھر کا آرام بھی ملے گا اور پڑھنے کے لیے سازگار ماحول بھی۔" وہ ایک پل کو رکیں۔ "اور میں تمہیں یہاں صرف اس لیے روک رہی ہوں کہ تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں خدانخواستہ تم غلط ہاتھوں میں پڑ کر ضائع نہ ہو جاؤ۔ دوسرے بیٹا! اگر ہم تمہیں رکھ کر تم پر احسان کریں گے تمہارے خیال میں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ یہ تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔ میری تنہائی بٹ جائے گی۔ میرے لیے شہباز کی دوری کو سہنا آسان ہو جائے گا۔ کیا تم اس بیمار ضعیف بڑھیا کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرو گے؟"

انہوں نے اپنے موٹی موٹی سبز نیلی رگوں بھرے کمزور ہاتھ میں معاذ کا ہاتھ لے کر اتنی محبت سے پوچھا کہ پھر اس سے انکار نہ ہو سکا۔

"بس دو چار سالوں کی تو بات ہے پھر تم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ گے پھر چاہے جہاں مرضی جا کر رہنا۔ ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنا فیوچر بنا لو۔ خود کو ضائع کیے بغیر۔ شہباز! میں صحیح کہہ رہی ہوں نا۔"

"جی۔ جی......" وہ چونک کر بولے۔ انہوں نے بیٹے کی خاموش الجھی ہوئی کیفیت کو افسوس بھری نظر سے دیکھا۔

"تو پھر یہ طے ہو گیا نا کہ تم یہاں ہی رہو گے۔ بار بار ادھر سے جانے کی بات نہیں کرو گے۔ میں تمہاری سرپرستی کر کے خوشی محسوس کروں گی۔ تمہیں اگر ادھر کوئی تکلیف ہو یا کچھ چاہیے ہو تو تم بلا جھجک مجھ سے آ کر کہہ سکتے ہو۔ ام جان کہہ کر یا کیپٹن شہباز تمہارے بڑے بھائی جان ہیں۔ ان سے کہہ سکتے ہو' ٹھیک؟"

معاذ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر کیپٹن شہباز کی طرف دیکھا

"تھینک یو بیٹا!" مسز خان نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر پیار دیا۔

"چلو تم تیار ہو کر آؤ۔ میں تمہیں بازار سے کچھ شاپنگ کروا لاؤں۔ تمہارے پاس تو بس یہی سوٹ ہے پھر بعد میں تمہیں وقت ہو گی۔ تم تیار ہو جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔"

کیپٹن شہباز کو جلدی تھی کہ ماں سے اس اچانک ہونے والی خرابی طبع کی وجہ دریافت کریں پھر سب کا معنی خیز گم صم رویہ بھابھیوں کی خفیہ اشارے بازی۔ انہیں کل سے بے چین کیے ہوئے تھی۔ وہ معاذ کو بھیج کر ماں سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔

"شہباز بیٹا! یہ کھڑکیوں کے پردے برابر کر کے دروازہ بند کر جانا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔ تم سے ان شاء اللہ رات کو بات ہوگی۔"

مسز خان نے فوراً" ہی ان کی بات کاٹ کر کہا اور تھکاوٹ کے اظہار کے طور پر آنکھیں بھی بند کر لیں۔ کیپٹن شہباز دل مسوس کر رہ گئے اور کھڑکیوں کے پردے گرا کر سست قدموں سے باہر چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

حویلی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ ویسے بھی بارش کافی دیر سے رک چکی تھی۔ نوکروں نے حویلی کے اندر اور باہر از سر نو صفائی کر دی تھی۔ حویلی کے بڑے گیٹ سے لے کر اندرونی عمارت کے صدر دروازے تک کا راستہ بالکل خشک کر دیا گیا تھا۔ جیسے وہاں کبھی بارش ہوئی ہی نہ ہو۔ باہر بھی جدھر مردان خانے کا انتظام شامیانوں میں کیا گیا تھا۔ مرکری لائٹس کی تیز روشنیوں میں صفائی اور بہترین انتظام منہ سے بول رہا تھا۔ کھانے کی میزوں پر جہاں سات اقسام کے کھانے چنے گئے تھے۔ سفید براق میز پوش بچھے ہوئے تھے۔ صاف ستھری چھری اور چینی کی کراکری جگمگ کر رہی تھی اس بار تو گاؤں کے عام لوگوں کے لیے بھی اعلا انتظام کیا گیا تھا۔ اگرچہ ان کا کھانا دوسرے ٹینٹ میں لگایا گیا تھا۔ انہیں بھی چینی کے نازک برتنوں میں دیا گیا تھا اور گاؤں کے لوگوں نے بھی بڑی تمیز اور تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانا کھایا تھا کہ ایک پلیٹ بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ بڑے شامیانے میں اب کھانے کے بعد موسیقی کی محفل جمی ہوئی تھی ویسے تو اصل محفل رات گئے سہرا بندی اور دستار بندی کی رسم کے بعد شروع ہونا تھی جس میں ملک کے نامور گلوکاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ جو حویلی کے پچھلے حصے میں موجود گیسٹ روم میں سید صاحب کی فراخ دلانہ میزبانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے بلاوے کے منتظر بیٹھے تھے۔

حویلی کے اندر اب خواتین کا کھانا شروع ہو چکا تھا۔ پچھلا صحن سفید براق میز پوشوں سے ڈھکی ترتیب وار میزوں سے سج چکا تھا۔ جن پر رکھی کھانوں کی ڈشوں سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو خواتین اور بچوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی مگر سیدہ کی کڑی نگرانی کرتی نظروں کے باعث سب بہت دھیرج اور سلیقے سے کھانے کی میزوں کی طرف بڑھی تھیں۔ سیدہ کسی سخت ماسٹنی کی طرح صدر دروازے کے آگے کھڑی ایک ایک کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کوئی بد تہذیبی کا مظاہرہ تو نہیں کر رہا۔ سیدہ کو بد تمیزی اور بے سلیقگی سے چڑ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی موجودگی میں حویلی کے ملازمین بھی پوری طرح سے چوکس تھے اور بڑی پھرتی سے کھانے کی فراہمی اور گندے برتنوں کی صفائی ہو رہی تھی۔ روسٹ مرغ اور روسٹ مٹن گاؤں والوں کے لیے من و سلویٰ سے کم نہیں تھا۔ قورمہ تو خیر کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی دعوت میں مل ہی جایا کرتا تھا یا ذرا خوشحال گھروں میں پک بھی جایا کرتا تھا جبکہ سیخ کباب، تکہ بوٹی گوشت کی بڑی بڑی بوٹیوں سے اٹی بریانی ان کی برسوں کی خوابیدہ بھوک کو بیدار کر رہی تھی۔ ادھر ڈش بھرتی ادھر خالی ہو جاتی۔ جیسے ہی پہاڑی کی شکل میں بھری ڈش ٹیبل پر رکھی جاتی لیگ پیس تو میز پر رکھنے سے پہلے ہی اچک لیے جاتے۔

اماں جی ایک پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سالن لے کر ایک طرف زمین پر بیٹھ کر ہی کھانے لگی تھیں۔ پہلا لقمہ منہ میں لے جانے سے پہلے ہی انہیں خیال آیا کہ انہوں نے سارے میں آمنہ اور زینب کو تو کہیں دیکھا ہی نہیں، دونوں شہرینہ کے ساتھ دلہن کا کمرہ دیکھنے گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کا دل ایک دم سے پریشان ہو اٹھا انہوں نے لقمہ وہیں پلیٹ میں رکھ دیا اور خود اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"خیریت آپ کھانا نہیں کھا رہیں؟" "نہیں کھانا چھوڑ کر اٹھتے دیکھ کر پاس کھڑی ماسٹنی کچھ حیرت سے بولی۔

"آمنہ اور زینب پتا نہیں کدھر ہیں۔ میں نے کافی دیر سے انہیں دیکھا نہیں۔ پتا نہیں کھانا بھی کھا رہی ہیں یا نہیں۔" وہ کچھ فکر مندی سے بولیں۔

"لڑکیاں بالیاں ہیں۔ ہوں گی ادھر ادھر۔ لڑکیاں آج خوش بھی تو بہت ہیں ایسی شادی پہلے کب دیکھی ہے انہوں نے۔ ادھر ادھر کہیں کد کڑے لگا رہی ہوں گی۔ چین تو کہیں انہیں ہوتا نہیں۔ جویریہ تو ابھی آپ سے کھانا لے کر گئی ہے۔ وہ دونوں بھی یہیں کہیں کھا رہی ہوں گی جانا کہاں ہے۔ آپ فکر مند کیوں ہوتی ہیں۔ کھانا کھائیں ایمان سے روسٹ مرغ کا تو جواب نہیں۔ اس قدر ذائقے دار ہے کہ کیا بتاؤں اور پھر گرما گرم۔ آپ نے تو شاید ابھی چکھا بھی نہیں۔ یہ چاول سالن تو بندہ گھر میں بھی کھاتا رہتا ہے۔"

انہوں نے پلٹ کر ان کی پلیٹ میں پڑے تھوڑے سے چاول اور سالن کو دیکھا۔ ماسٹنی کی فل سائز پلیٹ مٹن روسٹ مرغ کی دو ٹانگوں اور تکہ بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔

"نہیں مجھے کچھ خاص بھوک نہیں۔ رات کو اس طرح کی مسالے والی چیز کھاؤں تو رات بھر سینہ جلتا ہے۔ آمنہ اور زینب ایسی غیر ذمہ دار تو نہیں کہ اتنی دیر سے غائب ہوں اور ماں کی خبر بھی نہ لیں میں انہیں پہلے دیکھ لوں۔ پھر کھانا کھاؤں گی۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر بولیں۔ واقعی انہیں ہال کمرے سے گئے کوئی آدھا گھنٹہ تو ہونے والا تھا۔ انہوں نے پہلے دھیان ہی نہیں دیا تھا اور اب یکایک ان کا دل بے چین ہو اٹھا تھا۔

"ارے بی بی جی! زینب تو وہ رہی۔ حکیم چراغ کی بیٹی ثریا کے ساتھ۔ وہ دیکھیں، نیلے کپڑوں میں کھڑی ہے۔ آمنہ بھی ادھر ہی ہوگی۔"

ماسٹنی نے تیز آواز میں کہا تو وہ بھی گردن موڑ کر ماسٹنی کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھنے لگیں۔ زینب ثریا کے ساتھ پٹر پٹر باتیں کرتے ہوئے مرغ کی ٹانگ بھنبھوڑ رہی تھی۔ ان کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ انہوں نے خواتین کے بھاری جسموں سے ادھر ادھر ہو کر آمنہ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر آمنہ انہیں کہیں نظر نہ آئی۔

"ثریا! یہ جھومر تو بڑی خراب لڑکی نکلی۔ تمہیں پتا چلا نا اس کے بارے میں، دیکھو کیسے غائب ہو گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح بلکہ نہیں دودھ میں سے بال کی طرح۔ ہے نا۔"

زینب کے پاس آج ایک ہی موضوع تھا جھومر۔ اسے ثریا ملی تو وہ اس سے شروع ہو گئی۔

"میں تمہیں بتاؤں مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا۔ وہ سلیم کے ساتھ کسی چکر میں ہے۔" زینب ذرا آگے ہو کر رازداری سے بولی۔

"یہ تو سارے گاؤں کو پتا ہے۔ دن رات اس کے ساتھ آتی جاتی جو تھی حویلی میں، اس میں کون سی نئی بات ہے۔" ثریا نے منہ بنا کر کہا اور پورا کباب منہ میں ڈال لیا۔

"تمہیں بھی پتا تھا اس بات کا؟"

"ہاں ایک بار وہ میرے ساتھ ہی حویلی گئی تھی۔ پہلے خوامخواہ ادھر ادھر پھرتی رہی۔ ادھر اس کا کوئی واقف تو تھا نہیں پھر غائب ہو گئی۔ میں اسے ڈھونڈنے نکلی گھر جانے کے لیے تو وہ باورچی خانے کے پچھواڑے سلیم کے ساتھ منہ سے منہ جوڑے اللہ جانے۔ مجھے تو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کیا کیا حرکتیں کرتی تھی۔ میں تو دوسری بار اسے حویلی چھوڑ کر ہی بھاگ آئی تھی۔ کمبخت اکیلی یا اسی کے ساتھ واپس آئی ہوگی۔ میں نے بابا آئندہ اس کے ساتھ جانے سے توبہ کر لی۔ ویسے بھی ابا جی اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ میں جھومر جیسی لڑکی کے ساتھ پھروں اسے تو سارا گاؤں ہی اچھی لڑکی نہیں سمجھتا تھا۔"

ثریا نے دوسری بار بریانی کی پلیٹ منہ تک بھرتے ہوئے "رائے عامہ" کا ذکر کیا۔

"ارے رہنے دو۔ یہ گاؤں والے سارے ہیں ہاتھ نہ پہنچے تھو کوڑی۔ جھومر کسی کے ہاتھ جو نہ آئی تھی۔ تم بتاؤ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ کتنی خوبصورت تھی کہ جی کرتا تھا اسے آنکھ جھپکے بغیر دیکھتے جاؤ اس سے نفرت کرنے اور خار کھانے کو کس کا دل کرتا ہوگا۔ یہ تو سب گاؤں کے مردوں کے ڈھکوسلے تھے۔ ادھر جھومر انہیں لفٹ کرا دیتی ادھر وہ اچھی لڑکی بن جاتی۔"

زینب ادھر ادھر کی پروا کیے بغیر جھوم جھوم کر بسم اللہ کیے جا رہی تھی۔ اس نے کباب پلاؤ پر رکھے اور کھانا شروع کیا۔

"اتنی اچھی ہوتی تو پھر بھاگتی کیوں؟" ثریا نفرت سے بولی۔ "دوسری لڑکیوں کا بھی تو اعتبار خراب کیا ہو نہ اچھی لڑکی۔" ثریا نے بڑا سا نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"تم رہنے دو یہ سب......"

"تجھے گھر باہر اور کوئی موضوع نہیں ملتا اس منحوس لڑکی کے سوا۔" پیچھے سے آ کر اماں جی نے اتنی زور سے اس کی چوٹی موڑی کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"صبح سے اسی پر بولے جا رہی ہے اور کھا یوں رہی ہے جیسے زندگی میں پہلی بار کچھ دیکھا ہو۔ جانوروں کی طرح زور زور سے منہ چلاتے ہوئے اور وہ بھی کھڑے ہو کر.... سیدھا شیطان کی آنتوں میں جائے گا۔" اماں جی اس سے سخت خفا لگ رہی تھیں۔

"افوہ اماں جی! آپ میں بھی بابا صاحب کی روح حلول ہو گئی ہے' گھر میں وہ سانس لیتے ہوئے بھی آداب و تشریح بیان کرتے نہیں تھکتے ادھر آپ شروع ہو گئی ہیں۔ شادی میں بندہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ جیسے میں شادی میں نہیں جمعہ کی نماز میں آئی ہوں۔"

زینب بالوں کی تکلیف سے دوہری ہو گئی تھی۔ خاصی بدلحاظی سے آنکھیں نکال کر بولی۔ ارد گرد کی خواتین اس کی اونچی آواز سن کے گردنیں موڑ کر دیکھنے لگیں۔ اماں جی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ زینب سے انہیں ایسی ہی بدتمیزی کی توقع تھی اسی لیے تو وہ اسے زیادہ منہ نہیں لگاتی تھیں' اس کی بہت سی فضول حرکتیں بھی نظر انداز کر جاتی تھیں۔

"کھاتے ہوئے بھی پٹر پٹر بولے جا رہی ہو۔ کچھ طریقہ' کچھ تہذیب نہیں ہے تمہیں۔ باپ کا نام بدنام کرو گی۔" انہوں نے آہستہ آواز میں گھر کا۔

"باپ کا جتنا نام ہے نا اماں جی! وہ ان کے لیے کافی ہے۔ مزید میرے یا کسی اور کے اعمال سے اس کا وزن نہ تو گھٹے گا نہ بڑھے گا۔ اس لیے آپ فکرمند نہ ہوں۔" وہ اسی بدتمیزی و تلخی سے بولی

"آمنہ کہاں ہے؟" وہ بہت کچھ اپنے اندر اتار کر تحمل سے بولیں۔

"مجھے کیا پتا۔" وہ اسی کڑوے پن سے کندھے اچکا کر بولی۔

"تمہارے ساتھ گئی تھی۔ شہرینہ! تم دونوں کو دلہن کا کمرہ دکھانے گئی تھی یا نہیں؟" وہ دھیمی آواز میں ذرا سختی سے بولیں۔

"وہ ہاں ہم تینوں اوپر ہی جا رہے تھے کہ راستے میں مجھے ثریا مل گئی۔ یہ مجھے اتنے دنوں بعد تو ملی تھی۔ اماں جی! یہ آج کل شہر میں اپنی خالہ کے گھر رہ رہی ہے نا۔ چھٹیوں میں گاؤں آئی ہوئی ہے' آٹھویں کا امتحان دے گی یہ۔ آپ بھی بابا صاحب سے کہیں' مجھے بھی شہر بھجوا دیں۔ میں اسکول میں پڑھوں گی۔" اس کی بے وقت کی راگنی اماں جی کو سخت بری لگی۔

"فضول وقت میں فضول ضد تمہاری۔ یہ موقع ہے اس قسم کی باتوں اور فرمائشوں کا احمق لڑکی! میں پوچھ رہی ہوں آمنہ کدھر ہے۔" وہ اب کچھ غصہ میں آ گئی تھیں۔

"وہ دونوں اوپر چلی گئی تھیں میں تو ثریا کے ساتھ ادھر آ گئی تھی۔ ہم دونوں باتیں کرنے لگ گئیں تو پھر کھانا لگ گیا تو مجھے پتا نہیں وہ کدھر ہے۔ ہو گی ادھر ہی کہیں شہرینہ کے ساتھ۔ بڑی دوستی ہے اس کی سید زادی قلوپطرہ شہرینہ کے ساتھ۔"

آخری جملہ اس نے ذرا جھک کر آہستگی سے کہا کہ اگر سیدہ نے سن لیا تو آ کر پیچھے سے اس کا گلا ہی دبا دیں گی۔ شہرینہ وہ طوطا تھی جس میں حویلی کے ہر فرد کی جان اٹکی تھی۔

"بہن کی کچھ خبر نہیں اور خود پیٹ کا دوزخ بھرے جا رہی ہو۔ زینب! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہاری تربیت

میں مجھ سے کون سی کمی رہ گئی تمہارے اندر نہ احساس ذمہ داری ہے' نہ دوسروں کا خیال۔ خود غرض و بے حس لڑکی!"

اماں جی بڑبڑاتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھ گئیں' وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے پھر ایک نظر میزوں کے اطراف میں ڈالی کہ شاید آمنہ انہیں کہیں نظر آ جائے۔ آمنہ کہیں بھی نہیں تھی۔ جویریہ بھی اپنی ہم جولیوں کے ساتھ کھانا کھانے میں مگن تھی۔ ان کی تشویش بڑھ گئی۔ وہ کچھ تیز قدموں سے ہال کمرے کی طرف بڑھیں کمرہ بالکل خالی تھا۔ صرف دو چار چھوٹے بچے سوئے ہوئے تھے یا ایک دو چھوٹی لڑکیاں اپنا کھانا لے کر کھانے اور باتوں میں مگن تھیں وہ ہال کمرہ عبور کر کے اگلے برآمدے کی طرف نکل آئیں۔

"بوا جی! آپ نے شہرینہ بی بی کو دیکھا ہے؟" سیڑھیاں اترتی حویلی کی پرانی عمر رسیدہ ملازمہ سے انہوں نے پوچھا۔

"وہ تو جی شاید تھوڑی دیر پہلے بڑی بی بی کے کمرے میں جا رہی تھیں۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں چندھیا کر بولی۔

"ساتھ میں کون تھا ان کے؟" وہ دھڑکتے دل سے بولیں۔

"کوئی نہیں بی بی! اکیلی تھیں۔ خیر تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں سب خیر ہے۔ دلہن بیگم کا کمرہ اوپر ہے نا؟" انہوں نے بوا کی تشویش نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اوپر ہی ہے' یہ سیڑھیاں ختم ہوں گی تو دائیں طرف کے برآمدے میں دوسرا کمرہ ان کا ہے۔ پر آپ کو ادھر جا کر کیا کرنا ہے؟" وہ جانچتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ کر بولی۔

"کچھ نہیں کرنا مجھے۔" وہ بوا سے کترا کر سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ زینب کی بچی کدھر رہ گئی؟" وہ دونوں باتوں میں مگن اوپر جا رہی تھیں کہ آمنہ کو زینب کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو وہ رک کر بولی۔

"اسے رستے میں اپنی کوئی سہیلی مل گئی تھی۔ شاید حکیم صاحب کی بیٹی' اسی کے ساتھ گپ شپ کرنے کھڑی ہو گئی ہے۔"

وہ دونوں برآمدے میں ہی کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگیں آمنہ شہرینہ کو اپنی تعلیم کے بارے میں بتا رہی تھی کہ اس نے اس بار میٹرک کا پرائیوٹ امتحان دینا ہے۔

"پرائیوٹ کیوں ریگولر کیوں نہیں؟" شہرینہ نے اعتراض کیا۔

"بابا صاب کہتے ہیں۔"

"ارے بی بی! آ جائیں۔ کھانا لگ گیا ہے' بڑی بی بی کہہ رہی ہے سب آ جائیں جلدی جلدی۔"

حویلی کی ملازمہ زور سے آمنہ سے ٹکرائی۔ وہ کرتے کرتے بچی' ملازمہ اسی طرح شور مچاتی برآمدے سے گزر گئی۔ ہال میں بیٹھی خواتین میں ہڑبونگ مچ گئی۔ سب فی الفور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ہجوم سے بچنے کے لیے سیڑھیوں پر کھڑی ہو گئیں۔

"ہم چلتے ہیں اوپر۔ وہ خود ہی آ جائے گی۔ کھانا بھی لگ گیا ہے' ہم جلدی سے کمرہ دیکھ کر آ جاتے ہیں۔ زینب بعد میں دیکھ لے گی۔" شہرینہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔

"ثریا سے اس کی بچپن کی دوستی ہے۔ اب وہ شہر چلی گئی ہے نا پڑھنے اپنی خالہ کے گھر۔ اس لیے دونوں دنوں بعد ملی ہیں' اتنی جلدی ان کی باتیں کہاں ختم ہوں گی۔" آمنہ بھی اس کی تقلید میں اوپر چڑھتے ہوئے بولی۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ آمنہ! تم اس قدر ذہین ہو۔ بورڈ کے امتحان میں تمہارے اتنے اچھے مارکس آئے تھے پھر تم ریگولر کیوں اسکول میں داخل نہیں ہو جاتیں۔ ریگولر پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔"

"میں نے بتایا نا بابا صاحب کو پسند نہیں اس لیے۔" وہ اسی ٹون میں بولی۔

"اس میں پسند ناپسند کی کیا بات ہے۔ یہ تو تمہارا حق ہے' ہر لائق فائق طالب علم کا حق۔" شہرینہ منہ بنا کر بولی۔

"بابا صاحب کو جو بہتر لگتا ہے۔ وہ وہ کرتے ہیں۔ اس میں حق یا فرض والی کوئی بات نہیں۔"

وہ خشک لہجے میں بولی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ بابا صاحب کے خلاف مذاق میں یا سنجیدگی میں کچھ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ فوراً" روکھا سا لہجہ بنا لیتی تھی۔

"بھئی تم تو اپنے بابا صاحب کی ہر غلط صحیح پر پکا ایمان رکھتی ہو اور میرا تمہارے ایمان کو چیلنج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔" شہرینہ ہنس کر بولی۔

"لو آگیا کمرہ۔ پورا ایک ہفتہ لگا ہے۔ کمرے کی ڈیکوریشن وہ کیا کہتے ہیں تزئین و آرائش میں۔ تم دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔ کل تو بھابھی بیگم آجائیں گی پھر کمرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ کل تو بڑا رش ہو گا"

شہرینہ نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی چابی سے لاک کھولنے کی کوشش کی۔ لاک پہلے ہی کھلا ہوا تھا اسی وقت دروازہ کھلا اور سید سلطان بخت وجیہہ سراپا لیے ان کے سامنے کھڑے تھے۔

"لالہ جی! آپ ہیں ادھر؟" شہرینہ ایکدم سے انہیں اپنے سامنے دیکھ کر ڈر گئی۔

ہاں کیوں؟" انہوں نے کچھ ناراضی سے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ انہیں بھی شاید اس کا ادھر آنا اچھا نہیں لگا

"کچھ نہیں۔ ہم بس کمرہ دیکھنے آئے تھے۔ یہ آمنہ ہے میری دوست۔" اس نے پیچھے کھڑی آمنہ کا سائیڈ پر ہو کر تعارف کرایا تو سلطان بخت کی اس پر نظر پڑی۔

نظر کیا پڑی جیسے نظر ٹھہری گئی۔ ایک دو تین چار اکٹھے پانچ پل گزر گئے۔ وہ اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے زمین پر وہ پہلی لڑکی ہو۔

"لالہ جی! ہم کمرہ دیکھ لیں۔" ان کی محویت سے شہرینہ کچھ خائف ہو کر بولی۔

"ہاں ہاں۔" وہ جیسے صدیوں کا سفر ان پانچ پلوں میں کر آئے تھے چونک کر بولے۔

"آمنہ کون؟" ان کے لب اتنی آہستگی سے ملے جیسے وہ کسی سحر کے زیر اثر ہوں۔

"صوفی صاحب کی بڑی بیٹی اور کون۔" اب کے شہرینہ کچھ بیزاری سے بولی جبکہ آمنہ اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ رہی تھی۔

"یہ اتنی بڑی ہو گئی۔" ان کے لہجے میں خوشگوار سی حیرت در آئی تھی۔ نظریں ایک پل کو اس کے چہرے کے طواف سے منکر نہ ہوئی تھیں' اس کے سادہ سے نقوش سے مزین گندمی چہرہ' جس کی جان اس کی چمکیلی کالی سیاہ آنکھیں تھیں اور سلطان بخت کو ایسا لگا ایسی آنکھیں انہوں نے دنیا میں پہلے کہیں نہیں دیکھیں۔ بے اختیار ہی چاہا ان آنکھوں کو قریب سے' بہت قریب سے ہو کر دیکھیں۔ ان کا دل ہمکنے لگا۔ بے اختیار ہی!

"شہرینہ پلیز۔ ذرا سیدہ آپا سے پوچھ آؤ کہ میرے کپڑے کہاں ہیں' کمرے میں تو موجود نہیں ہیں اور بابا جان کے دس بلاوے آچکے ہیں۔ میں تیار ہونے سے عاجز بیٹھا ہوں۔

ان کے ذہن نے ترکیبوں کی پٹاری میں سے جھٹ تجویز نکالی۔ شہرینہ نے کچھ بددل ہو کر سر ہلایا۔

"میں جا کر آتی ہوں جا کر۔" وہ جانے کے لیے پلٹنے لگی۔

"میں بھی آتی ہوں تمہارے ساتھ شہرینہ۔" آمنہ فوراً" اس کے پیچھے لپکنے لگی۔

"ارے تم ادھر ہی رہو نا۔ میں بس ابھی گئی اور ابھی آئی۔ تم دو منٹ ٹھہرو ادھر۔" وہ چٹکی بجا کر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

اور اتنی پر رونق حویلی میں جیسے یک بیک موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ پوری کائنات میں صرف دو نفوس رہ گئے تھے۔ ایک تھر تھر کانپتا وجود لئے نوخیز آمنہ اور دوسرے اس کی قربت کا طلب گار لحہ لحہ اس کی طرف بڑھتا سلطان

بخت کا پاگل دیوانہ دل۔

"کمرہ نہیں دیکھنا آمنہ؟" ان کی گمبھیر نشیلی آواز آمنہ کو اپنے بہت قریب سے سنائی دی تو جیسے اس کے ہاتھ پیروں میں سے جان ہی نکل گئی۔ قدم زمین میں گڑے رہ گئے اور پلکیں بے جان سی ہو کر آنکھوں پر گری رہ گئیں۔

"ن۔ نہیں جی مجھے جانا ہے۔" اس نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی کپکپاتی ہوئی آواز اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہی تھی۔

"شہرینہ ابھی آجائے گی۔ پہلے آکر کمرہ تو دیکھ لو پھر چلی جانا۔"

وہ ایکدم سے آگے بڑھے اور اس کی نازک گندمی کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی اور آمنہ کے پورے وجود کو جیسے ہزار واٹ کے جھٹکے لگنے لگے۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی مگر کچھ بھی تو اس سے ہو نہیں پا رہا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنا ہاتھ بھی نہ چھڑا سکی۔ انہوں نے ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے خود پر گرا سا لیا وہ شاید زمین پر ہی ڈھے جاتی کہ وہ اسے خود سے لگا کر کھینچتے ہوئے کمرے کے اندر لے گئے اور وہ کسی بے جان لاش کی طرح پھٹی پھٹی آنکھیں لیے ان کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

• • • • •

"میں کیسے نہ تم سے منہ پھیرتی' تمہیں دیکھ کر اجنبی کیوں نہ بن جاتی۔ اگر تم میری جگہ ہوتیں اور رات جو تماشا تمہارے بھائی اور بھابھی نے آکر لگایا۔ اگر تم میری جگہ ہوتیں نزہت! تو شاید تم میری شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتیں۔ تمہیں معلوم ہے رات پہلی بار' زندگی میں پہلی بار میں نے بار بار سوچا کہ کاش میں تم سے کبھی نہ ملی ہوتی۔ کبھی زندگی میں میں نے تمہاری صورت نہ دیکھی ہوتی اور اگر دیکھی تھی' زندگی کی راہوں میں ٹکرانے والے ہزاروں چہروں کی طرح فراموش کر چکی ہوتی' مجھے رات کو تمہاری دوستی پر اتنا پچھتاوا' اتنی ندامت ہوئی کہ بہت سارے الفاظ مل کر بھی اس شرمندگی کو بیان نہیں کر سکیں گے۔"

یہ راحیلہ تھی اور اس کی زبان کون سی آگ اگل رہی تھی۔ اگر نزہت کے بس میں ہوتا تو وہ اس کے بیڈ پر بیٹھنے کے بجائے کہیں زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں جا دفن ہوتی۔

راحیلہ اس کی فریاد اور اس کے آنسوؤں سے پگھل گئی' اسے اپنے قدموں میں گرے دیکھ کر شاید اس لمحے خدا کا خوف اس کے سارے احساسات پر غالب آگیا تھا کہ اس نے جھک کر اسے بازوؤں سے اٹھایا۔

"آؤ اندر آجاؤ' کیوں سڑک پر تماشا بنواؤ گی۔" اسے گیٹ سے اندر کرتے ہوئے بھی اس کا لہجہ اور آنکھیں بے حد اجنبی تھیں۔ نزہت کے آنسو جیسے خود بخود خشک ہو گئے' اگرچہ اسے رات بھر کے لیے پناہ مل گئی تھی راحیلہ پر اس کے آنسوؤں کا اثر ہوا تھا مگر نجانے اس کے اپنے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا تڑخ تڑخ۔

راحیلہ جو اس کی دس سال پرانی دوست تھی۔ ان دونوں نے بچپن کی حدود ایک ساتھ عبور کر کے لڑکپن اور پھر جوانی میں قدم رکھا تھا' راحیلہ کے سوا اس نے کوئی اور دوست بنانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یہی حال راحیلہ کا بھی تھا' اس کی بھی ساری تشفی نزہت ہی سے ہو جاتی تھی۔ دونوں کے دل کے تار ایک دوسرے کی دوستی میں اس طرح ملے ہوئے تھے کہ اکثر انہیں ایک دوسرے سے بہت سی باتیں کہنی بھی نہیں پڑتی تھیں۔ ان کی قلبی دوستی انہیں بہت کچھ بن کہے سمجھا جاتی تھی اور آج اس قلبی دوستی کی موت ہوئی تھی۔

دوستی کی بھی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔

ایک نمائشی دوستی ہوتی ہے محض اوپر اوپر سے جیسے بندہ اپنے کسی روز ملنے والے سے ملنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہ دوستی اسی روز کے ملنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دوسری دوستی جو ہر دم ساتھ رہنے سے ہوتی ہے۔ مگر یہ بھی قلبی دوستی نہیں ہوتی یہ بھی بس اوپر اوپر سے ہوتی ہے' دل کی اندرونی تہوں سے اوپر اوپر۔ جیسے دودھ یا لسی کے اوپر تیرتا مکھن مکھ یا کوئی بال جسے جب چاہو ہاتھ سے پکڑ کر الگ کر دو بس سفر کا ساتھ ادھر سفر تمام ہوا۔

غم' خوشی یا عادات کی نسبت ایک ہونے سے بھی دوستی قائم ہو جاتی ہے۔ کسی کا غم دو چار دفعہ بانٹ لیا' سن لیا'

اس سے بھی دوستی کا تعلق قائم ہو جاتا ہے یا دو ہنس مکھ لوگوں میں ہنسی بھی وجۂ دوستی بن جاتی ہے اور بہت سے لوگوں میں تو عادات کے ایک جیسا ہونے کی وجہ سے بھی یہ رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

مگر راحیلہ سے تو اس کی دوستی ان تمام اقسام سے بالاتر تھی، بہت پرانی بھی اور بہت گہری بھی دل کے اندرونی پرتوں سے بھی نیچے تک اپنی جڑیں مضبوطی سے جمائے ہوئے۔ یہی قلبی دوستی ہوتی ہے۔ جس میں ایک دوسرے کو بہت کچھ بتانے، بہت کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، بس خود بخود احساس اور ادراک اور محبت کا انوکھا سا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کے لیے بہت ملنا بھی ضروری نہیں۔ وہ گریجویشن کے بعد گھر بیٹھ گئی تھی جبکہ راحیلہ نے ماسٹرز کرنے کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا، دونوں کی ہفتوں یا مہینوں ملاقات نہ ہو پاتی مگر پھر بھی دونوں کو ایک دوسرے کا بے حد خیال رہتا تھا، ایک دوسرے سے فون پر رابطہ بحال رہتا، جونہی نزہت کا دل اسے یاد کرتا راحیلہ خود بخود اس سے ملنے چلی آتی۔

عجیب سی کشش تھی دونوں کے تعلق میں اور دونوں کے گھر والوں نے بھی ان کی دوستی پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ دونوں بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار ہیں۔ کبھی کسی معاملے میں دوسرے کو غلط صلاح نہیں دیں گی اور آج؟

آج ایسا کیا ہو گیا کہ وہ سارا زمانہ تو کیا اپنی اتنی مضبوط اور محبت کرنے والی دوست، اس کے گھر والوں کی نظروں میں بھی معصوم نہ رہی تھی۔

راحیلہ کا سرد انداز، اجنبی روکھا رویہ اسے جو کچھ سمجھا رہا تھا، اس حقیقت سے اس کی نگاہیں چار نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ جو ترخ ترخ کی آواز آئی یہ اس قلبی دوستی کے چکنا چور ہونے کی آواز تھی بس اس کے کان ہی بہرے ہو گئے ہیں اور حواس جیسے معطل!

وہ مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے گھسٹتی ہوئی اس کے بیڈ روم تک آئی تھی۔ وہی اس کے گھر کا نقشہ وہی اس کے بیڈ روم کا رستہ، وہی سارا سامان، وہی گھر، وہی عمارت، وہی سب لوگ۔

پھر کیا بدل گیا تھا۔ اس نے کاریڈور میں داخل ہونے سے پہلے بھیگی نظروں سے آسمان کو دیکھا تھا، سب کچھ ویسے ہی رہتا ہے بس انسان بدل جاتے ہیں بلکہ انسان بھی نہیں بدلتے۔ ان کی تقدیریں، ان کے مقدر بدل جاتے ہیں جو اردگرد کے سارے ماحول سارے لوگوں کو ہی بدل ڈالتے ہیں۔

"تمہارا لباس بہت خراب ہو رہا ہے اور حلیہ بھی۔ تم یہ میرا سوٹ پہن لو، باتھ لے لو۔ میں اتنی دیر میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں، شاید تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

راحیلہ کا لہجہ میکانکی تھا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو۔ نزہت کسی بت کی طرح کمرے کے وسط میں کھڑی رہی۔

راحیلہ نے خود ہی آگے بڑھ کر وارڈ روب کھولی اپنا ایک سوٹ اسے تھمایا اور خود باہر جانے لگی۔

"تم جلدی سے نہا کر فریش ہو جاؤ۔ میں اتنی دیر میں چائے وغیرہ لاتی ہوں۔" وہ کہہ کر جانے لگی۔ بات دہرانے کی ضرورت اسے کیوں پیش آئی، شاید وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔

"اور ہاں پلیز تم اگر نہا کر جلدی فارغ ہو جاؤ تو باہر نہ آنا۔ بلکہ باتھ روم ہی سے باہر نہ آنا میں آجاؤں گی تو خود ہی دروازہ ناک کروں گی۔ خالہ جان لاؤنج میں ہی بیٹھی ہیں، ہو سکتا ہے، وہ میرے کمرے کی طرف آجائیں اور تم شاور بھی ٹب بھر کر جلد بند کر دینا تاکہ آواز... تم سمجھ رہی ہو نا۔"

اس کا انداز اب کے بیزار سا تھا۔ وہ گلے پڑا ڈھول بجانے پر بے حد مجبور لگ رہی تھی اور دل میں شاید اس دوستی کو بھی کوس رہی تھی جس نے اسے آج یہ ڈھول گلے میں لٹکانے پر مجبور کیا تھا۔ نزہت نے سر ہلا دیا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی، راحیلہ نے باہر جا کر بیڈ روم کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔

"کبھی کبھی موت زندگی سے بھی نایاب لگتی ہے، ناقابل حصول، خواہ اس کے لیے کتنا ہی گڑگڑاؤ۔ آج کتنے لوگ ہوں گے، جو زندگی پانے کے لیے کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو کر گڑگڑا رہے ہوں گے۔

وہ باتھ روم کا دروازہ بند کر کے شیشے کے آگے کھڑی بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔ بار بار موت کی آرزو اس کے دل سے نکل رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک اٹھی کہ وہ لاحاصل خواہش کے حصول کے لیے گڑگڑا رہی ہے، اگر اسے موت آئی ہوتی تو رات اس کوڑے کے ڈھیر پر ہی آجاتی۔ اس نے بیسن کی ٹونٹی کھول کر ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر بھر کر پینا شروع کر دیا۔

"دیکھو، میں تمہارے لیے ابھی کھانا لے آئی ہوں، ایک تو شاید تم صبح سے بھوکی ہو، تمہیں بھوک بھی لگی ہو گی۔ اس لیے خالی پیٹ چائے کیا پینی۔ دوسرے ایک آدھ گھنٹے میں جب کھانا لگے گا تو مجھے خالہ جان کے ساتھ ہی ڈنر کرنا پڑے گا اور اس وقت تمہارے لیے کھانا لانا بھی مشکل ہو گا۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔"

مگر اس وقت اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اس کے سامنے ٹیبل پر دو بڑے اشتہا انگیز کھانوں کے ڈونگوں سے بھری رکھی تھیں۔ ایک ڈونگے میں قیمہ مٹر تھا، دوسرے میں قورمہ، تیسرے میں اس کا پسندیدہ پالک گوشت، ایک پلیٹ میں چکن بریانی اور کباب تھے اور ساتھ رومال میں لپٹی روٹیاں۔

اسے بہت بھوک لگ رہی تھی حالانکہ اس سے پہلے اسے بھوک کا احساس تک نہیں تھا شاید نہانے سے یا پھر اپنے سامنے پورے ڈیڑھ دن کے بعد کھانا دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

"ویسے یہ اہتمام خالہ جان کے لیے کیا گیا تھا ورنہ اتنی جلدی شاید میں تمہارے لیے صرف چائے ہی لا سکتی۔ تم اچھی طرح پیٹ بھر کر کھالو میں ذرا باہر کی خبر رکھتی ہوں۔" وہ اسے نہ جانے کیا جتاتے ہوئے بولی۔

"اور ہاں تم پلیز۔ کھانے کے بعد یہ برتن وغیرہ یہیں پڑے رہنے دینا، میں آتے ہوئے کوشش کروں گی تمہارے لیے چائے لے کر آؤں۔ او کے۔" وہ جاتے ہوئے دروازہ اچھی طرح سے بند کر گئی۔

شاید اس دوستی کی کچھ باقیات ابھی ہیں، جو راحیلہ اس کی کیفیت سمجھ کر باہر چلی گئی تھی۔ وہ واقعی اس کے سامنے کھانے پر ٹوٹ پڑنے سے جھجک رہی تھی۔ اس کے باہر جاتے ہی وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ کل سے اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے، واقعی پیٹ کو دوزخ کہا گیا ہے کہ اس کی آگ سب سے طاقت ور ہوتی ہے، جو صرف خوراک کے ایندھن سے بجھ پاتی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے میز کی طرف دیکھا، آدھے سے زیادہ کھانا وہ ہڑپ کر چکی تھی۔ اسے ایک دم ہنسی سی آگئی۔ ایک بار جب ابو جی کو وہ کوئی کالم سنا رہی تھی، اخبار سے، جب اس نے پڑھا تھا۔

اسلام دے پنج رکن چھیواں ٹک

چھیواں نہ ہووے تو پنجوں جان مک

(اسلام کے پانچ رکن ہیں اور چھٹا روٹی اور اگر چھٹا نہ ہو تو پانچوں رکن خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔)

تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہاں اسلام جیسا پرکشش مذہب اور اس کے مقدس ارکان اور کہاں روٹی جیسی معمولی چیز۔ تب ابو جی نے اسے سمجھایا تھا۔

"بیٹا! خدا نہ کرے تمہارا کبھی بھوک سے واسطہ پڑے تو تمہیں معلوم ہو کہ اگر روٹی نہ ہو پیٹ میں تو انسان اسلام تو کیا خدا سے بھی منکر ہو سکتا ہے۔ بھوک سے بڑا مذہب آج تک دنیا میں کوئی نہیں گزرا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں غربت کی انتہا کفر تک لے جا سکتی ہے۔"

اسے ابو جی کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور شاید سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی اور آج اسے یہ تجربہ بھی ہو گیا تھا، واقعی بھوک سے بڑا کوئی اور مذہب نہیں۔

پھر راحیلہ کمرے میں آئی ہی نہیں، اس نے برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور خود خالی ذہن کے ساتھ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"یہ تو محض ایک رات کاٹھکانا ہے اس کے بعد۔" اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھنا چاہا۔

"پلیز تم نہ تو کمرے سے باہر آنا اور نہ دروازے کھڑکیوں کے پردے ہٹانا۔ روشنی دیکھ کر یونہی خالہ جان کو کوئی

شک گزر گیا تو میرے حق میں بالکل بھی اچھا نہیں ہو گا۔“ اس کے کانوں میں راحیلہ کی التجا گونجی تو وہ پردہ چھوڑ کر کرسی پر گر سی گئی۔

”یا اللہ! یہ زندگی جو اک امتحان کی طرح میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں اس امتحان کا پل صراط کیسے عبور کروں‘ کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ کوئی ہاتھ تھامنے والا۔“ اس کی سوچ اس جملے پر ٹھٹک کر رک گئی۔

”پتا نہیں اب وہ مجھے قبول کرے یا نہیں۔“ اس نے انگلی سے اپنی پیشانی کو مسلا۔

”پتا نہیں ادھر خبر کس انداز میں پہنچائی گئی ہے اور پھپھو جان کیا سمجھیں اور... اور کیپٹن شہباز۔“ اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکرایا۔

”بھی بھی خوش فہمی ہے نزہت بی بی! جب تمہارا اپنا خون‘ تمہارا ماں جایا‘ تمہیں اپنانے کو تیار نہیں۔ وہ تو پھر اور ان سے جو رشتہ ہے وہ کس قدر نازک ہے اور تم اب داغ داغ وجود پر کس طرح ان کی بے داغ‘ براق عزت کی چادر اوڑھ سکو گی۔ کون تمہیں یہ حق دے گا۔ کیپٹن شہباز...؟ کبھی نہیں... یاد ہے آخری ملاقات میں چمن میں انہوں نے کیا کہا تھا شاید قدرت نے وہ الفاظ ان کے منہ سے نکلوائے تھے۔“

”نزہت! عورتیں تو دنیا میں کروڑوں ہیں ایک سے بڑھ کر ایک‘ شوبز جو حسین چہروں کی مارکیٹ ہے‘ ان میں سے کتنی ہیں جن کو سچی محبت نصیب ہوتی ہے۔ نزی! عورت کے نقوش اس کے قد و خال کتنے ہی اٹریکٹو کیوں نہ ہوں‘ مرد صرف ایک بات پر جان دیتا ہے وہ ہے عورت کا کردار اس کی سیرت... عورت کے اندر کا خالص پن خالص عورت‘ اگر تم دنیا بھر میں سروے کرو تو ننانوے فیصد مردوں کی پہلی ڈیمانڈ ہو گی خالص عورت اور تم کتنی خالص‘ کتنی پاکیزہ ہو اور تمہاری پاکیزگی میرے لیے کیا ہے۔ میں چاہوں میں تو تمہیں Explain نہیں کر سکتا۔ نزہت!

”I love purity and I love you–

مجھے خالص سے محبت ہے اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ سب کلیشے (گھسے پٹے جملے) مگر اس کا کلیشے ہونا ہی چارم فل ہے۔ جتنی بار اس کو دہراؤ اتنی ہی بار اس میں نیا پن محسوس ہوتا ہے اور نزہت میری چاہت‘ میری محبت‘ صرف اور صرف تمہاری امانت ہے۔ میں نے کبھی کسی اور عورت اور لڑکی پر وہ نگاہ نہیں ڈالی جو صرف تمہارا حق ہے۔

جسم فانی ہوتے ہیں مگر کردار امر ہوتے ہیں‘ یہی میرا یقین ہے کہ تمہارا بے داغ کردار ہی میری محبت ہے۔“

یہ کیپٹن شہباز کے واضح الفاظ تھے اور جو اس نے جواباً ”کہا تھا۔

”کیپٹن شہباز! شیشہ کتنا خالص ہوتا ہے کہ اس کے آرپار سب نظر آتا ہے۔ اگر شیشہ ٹوٹ جائے‘ اس کو جوڑ دیا جائے اور وہ جڑ بھی جائے مگر اس کی ظاہری خوب صورتی یقیناً“ تباہ ہو جائے گی تو کیا اس کا خالص ہونا بھی مشکوک ہو جائے گا۔“

”بالکل... ظاہر ہے۔“

”شیشہ تڑخ جائے‘ اپنی خوبصورتی کھو بیٹھے‘ یونہی کسی کے ہاتھ سے پھسل کر چور چور ہو جائے تو اس میں شیشے کا کیا قصور۔ یہ تو اس کی تقدیر ہوئی نا اور کوئی تقدیر کے لکھے کا سزاوار کیسے ہو سکتا ہے کیپٹن شہباز!“

”لیکن مجھے معلوم ہے۔“ وہ اضطرابی کیفیت میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہاں سب تقدیر کے لکھے ہی سزاوار ٹھہرتے ہیں اور یہ داغ۔ یہ دراڑ جو میری تقدیر میں لکھی تھی‘ جس میں میرا ذرہ بھر بھی دوش نہیں۔ میں تاعمر اس کے لیے سزاوار ٹھہروں گی‘ سب کی نظروں میں‘ مجھے معلوم ہے۔ یہ سزا میری آخری سانس کے تمام ہو جانے تک مجھے ملتی رہے گی۔ کوئی بھی مجھ سے اس معاملے میں رعایت نہیں کرے گا۔ کیا شہباز... کیا پھپھو اور کیا مجھ سے قریب ترین کوئی بھی شخص اور میں کبھی بھی اپنے حق میں صفائی پیش نہ کر سکوں گی۔“ اس کا سر یکایک درد سے پھٹنے لگا۔

”کیا ضروری ہے۔ میں ان سب سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگنے جاؤں جبکہ مجھے معلوم ہے۔ مجھے کوئی بھی معاف نہیں کرے گا۔ اگر ذلت و رسوائی تقدیر میں لکھی ہی جا چکی ہے تو بہتر نہیں کہ میں اسے تنہا ہی جھیل جاؤں اب کسی کو بار بار اپنی رسوائی کی داستان کیوں سناؤں‘ جب میں نے کچھ کیا بھی نہیں۔“ کیپٹن شہباز نے یہ سب سن کر ہی مجھ سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ کیا ضروری ہے جو وہ طے کر چکے ہیں۔ جا کر ان کی زبان سے سنوں اور پھر سے موت کی تمنا کروں اور پھپھو... پھپھو شاید ان کے دل میں میری دکھ بھری کہانی سن کر کچھ ترس‘ کچھ ہمدردی جنم لے لے مگر وہ بیٹے کے دل میں تو وہ جذبات نہیں جگا سکیں گی پھر جہاں محبت و چاہت کی جگہ ترس و ہمدردی لے لے۔ اس جینے سے تو مرنا اچھا ہے۔

میں اب کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی‘ کسی سے بھی نہیں نہ سہیل بھائی سے‘ نہ شہباز سے‘ نہ پھپھو سے۔“ اس نے رک کر فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ ”بس ادھر رات گزار کر کل یہ شہر چھوڑ دوں گی‘ لاہور کے علاوہ اس ملک میں اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے شہر اور قصبے ہیں۔ کہیں نہ کہیں جاب کر کے چھوٹا موٹا سر چھپانے کا آسرا کر لوں گی بس رات گزر جائے۔

یہ صحیح ہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب وہ خود سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ شاید خود کو دلاسا دینے کا اس سے اچھا اور کوئی طریقہ نہیں تھا جو چھن گیا تھا۔ اس خسارے کے احساس کو کم کرنے کے لیے۔

”میں جتنی منت سماجت کروں گی‘ جتنی دلیلیں پیش کروں گی‘ جس قدر روؤں گی۔ اسی قدر سب مجھ سے کنارہ کریں گے تو کیوں نہ میں ان سے کنارہ کر جاؤں ان کے منہ پھیرنے سے پہلے۔“

”سوری۔ مجھے دیر ہو گئی اصل میں خالہ جان نے کھانے کا کہہ دیا تھا اور پھر کھانا کھاتے یہ ٹائم ہو گیا۔ مجھے معلوم ہے تمہیں چائے کی طلب ہو رہی ہو گی۔ تم تو چائے کی بہت رسیا ہو۔“ راحیلہ اچانک اندر آئی تھی۔

نزہت خاموشی سے اسے دیکھنے لگی اس کے ہاتھ میں بھاپ اڑاتے چائے کے دو مگ تھے جو اس نے نزہت کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیے۔

”ہاں۔ کبھی ایسا تھا جب اس کی صبح کی ابتدا اور دن کی انتہا چائے سے ہوتی تھی اور آج اس نے شاید چالیس گھنٹوں بعد چائے کی شکل دیکھی تھی۔ ابھی ماضی کو دہرانے اس کو یاد کرنے کو ایک عمر باقی ہے۔ اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر مگ اٹھایا‘ راحیلہ نے بھی مگ اٹھانا چاہا کہ اس کا ہاتھ مگ پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔

”آئی تھنک خالہ جان آواز دے رہی ہیں مجھے‘ تم نے سنا۔“ اس کے کان شاید باہر ہی لگے تھے‘ نزہت نے کچھ جواب نہیں دیا۔

”کہیں وہ یہاں ہی نہ نکل آئیں۔ میں اب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک ہی آؤں گی۔ تم چائے پی کر بے شک لائٹ بجھا کر ریسٹ کر لینا۔ اوکے۔“ وہ عجلت میں اسے ہدایت دیتے ہوئے اپنا کپ اٹھا کر باہر بھاگ گئی۔

”یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔“ اس نے راحیلہ کے پیچھے ہلتے پردے کو دیکھ کر سوچا اور چائے کے گرم گرم گھونٹ جلدی جلدی حلق سے اتارنے لگی۔

☼ ☼ ☼

”مجھے نہیں معلوم شہباز بیٹا! اس سارے واقعے میں کس قدر سچائی ہے اور کتنا جھوٹ‘ ہم ہاسپٹل میں تھے معاذ کے پاس‘ جب سہیل کا فون آیا تھا۔ میں کاریڈور ہی میں تھی‘ فون میں نے ہی اٹینڈ کیا۔ زیتون بانو میرے پاس بیٹھی میری ٹانگیں دبا رہی تھی۔ سہیل کا لہجہ‘ اس کا انداز بہت عجیب سا تھا۔ خیر بہت اچھا‘ بہت خوش اخلاقی سے تو وہ کبھی بھی نہیں بولا تھا مگر پرسوں رات تو جیسے اس کے منہ میں زبان ہی کوئی اور تھی۔

اس کا پہلا جملہ ہی مجھے منوں مٹی تلے دفن کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ”پھپھو! نزہت اپنی کسی دوست کے کزن کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے‘ آج دوپہر کو... اور میں اب رات گئے تک سارے شہر میں اس کو تلاش کر چکا ہوں۔ اس کا کہیں نام و نشان نہیں اور وہ لاکر سے امی مرحومہ کا سارا زیور‘ میرے کمرے کی درازوں اور سیف سے

جیولری اور تقریباً" پچاس ہزار نقد لے گئی ہے۔ میں آپ کو یہ سب بتانا نہیں چاہتا تھا' میرا خیال تھا۔ میں اس کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ آپ لوگوں کو اس کی اس شرم ناک اور گھٹیا حرکت کا علم نہیں ہوگا مگر افسوس میں اس کمزات کو تلاش نہیں کرسکا۔ ریشم نے اور میں نے اسے بہت ڈھونڈا ہے اور اب جبکہ رات کے دو بج رہے ہیں' وہ اگر اب مجھے مل بھی جائے تو بھی میں اسے اپنے گھر میں اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی داخل نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے میری ماں باپ کی' آپ کی' اپنے شوہر کی عزت کا کچھ خیال نہیں کیا اور ایسی بدذات کی میں شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کروں گا۔ مجھے بس آپ کو یہی اطلاع دینی تھی۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

وہ بنا رکے' بنا کچھ سوچے مجھے میرے سر پر آسمان گراتا چلا گیا اور اس کے بعد مجھے پتا نہیں چل سکا کہ ریسیور کب میرے ہاتھ سے چھوٹا اور کب میں وہیل چیئر پر ہی دوہری ہوگئی۔ آنکھ کھلی تو یہ کرب ناک حقیقت پوری آنکھیں کھولے موجود تھی۔

سہیل نے اس کے بعد ایاز اور اظہر دونوں کو یہ ساری بکواس بنا کوئی کمی بیشی یا لحاظ کے سنا ڈالی تھی۔ میرے ہوش ہوتے ہی زیتون بانو کے واویلے سے پورا گھر جمع ہوگیا' لائن ڈس کنیکٹ نہیں ہوئی تھی۔ ریشم نے ساری بات مزید اضافے کے ساتھ تمہاری بھابیوں کو بھی سنا ڈالی تھی۔ اب بتاؤ۔ مجھ سے بڑا سخت جان اور کون ہوگا کہ اتنے بڑے حادثے کا سن کر بھی تمہارے سامنے جیتی جاگتی بیٹھی ہوں۔"

مسز خان کیپٹن شہباز کو اپنی اچانک بیماری کی وجہ بتاتے ہوئے رو بھی رہی تھیں اور کیپٹن شہباز کے تو جیسے سارے وجود سے زندگی کی رمق تک نچڑ گئی تھی۔ وہ بے یقینی و بے بسی سے ماں کے زرد جھریوں بھرے چہرے اور دھیرے دھیرے ہلتے ہونٹوں کو یک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ مسز خان شاید سانس لینے کو رکی تھیں یا بیٹے کے احساسات جاننے کو' وہ اب بہت غور سے کیپٹن شہباز کو دیکھ رہی تھیں۔

"شہباز! تم ٹھیک ہو نا....." کافی دیر بعد وہ شہباز کا ہاتھ ہلا کر بولیں۔

"جی۔" بہت مدھم آواز سے ان کے ہونٹ ہلے۔

"بیٹا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ اس سارے معاملے کو میں کیا سمجھوں۔ ایک بات تو میرے بچے! تم بھی جانتے ہو کہ نزہت ایسی نہیں تھی بالکل بھی' جیسا سہیل اور ریشم نے بتایا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا۔" وہ زور دینے والے انداز میں بولیں' وہ ان کی رائے جاننا چاہ رہی تھیں۔

"پتا نہیں۔" وہ بے کیف انداز میں ان کا ہاتھ واپس ان کی گود میں رکھتے ہوئے بولے۔

"کیا مطلب بیٹا؟ نزہت تو بہت اچھی تھی بہت اچھی..... وہ ایسی حرکت کرہی نہیں سکتی اتنا تو تمہیں بھی ہوگا نا۔ اب تک بہت دنیا دیکھ چکے ہو تم۔" وہ بیٹے کی مبہم سی کیفیت دیکھ کر بے ربط انداز میں بولیں۔

"کیا پتا چلتا ہے ام جان! دنیا کس وقت کس رنگ میں ڈھل جائے۔ ام جان! کچھ بھی تو پتا نہیں چلتا کسی بھی بات کا۔ کچھ بھی تو یقین سے نہیں کہا جاسکتا' یہاں سب کچھ بے یقین سا ہے۔ کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا' موسم بھی عجب سی ڈھب سے بدلنے لگے ہیں۔ اب جون میں اس سال درجہ حرارت دو تین درجے تک پہنچ گیا تھا اور اس بار دسمبر میں ٹمپریچر اڑتیس تک رہا ہے۔ ام جان! کچھ بھی تو کنفرم نہیں ہے نہ موسم' نہ وقت نہ لوگ..... کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔" وہ کتنے عجیب انداز میں بول رہے تھے۔

مسز خان کو لگا' کیپٹن شہباز کی دماغی رو بہک گئی ہے۔ وہ بالکل سپاٹ چہرہ لیے اتنے اہم ایموشنل واقعہ پر اتنے غیر منطقی انداز میں تبصرہ کررہے تھے' جیسے یہ کوئی بہت ہی عام سی بات ہو۔

"مگر مجھے پتا ہے' یقین ہے۔ نزہت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ جو کہانی گڑھی ہے یہ ان دونوں میاں بیوی کی گھٹیا سوچ کی اختراع ہے اور کچھ بھی نہیں۔ معلوم نہیں بچی کے ساتھ کیا گزری ہے۔ وہ تو پہلے ہی مجھے آنے نہیں دے رہی تھی میں نے ہی خواہ مخواہ آنے کی ضد کی۔ اب اس وقت کو پچھتا رہی ہوں۔" وہ جیسے خود سے باتیں کررہی تھیں' کیپٹن شہباز نے جواباً "کچھ بھی نہ کہا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے بھاگ جائیں۔ ایک لمحے کی تاخیر

کیے بغیر اور پھر دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کریں۔

"لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں' کہاں سے نزہت کی خبر لوں۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"پچھلے دو دن کے اخباروں سے۔" ان کا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔

"شہباز خان!" مسز خان کو بہت برا لگا۔

"ام جان! آپ کو نہیں معلوم ایسی خبریں ایسے واقعات کی مسالے دار رپورٹیں صرف اخباروں کے اندرونی صفحات اور اکثر بیرونی صفحات پر بھی آتی ہیں۔" وہ مسز خان کے ٹوکنے کے باوجود سنجیدگی سے بولے۔

"تم معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے' یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔" انہوں نے کچھ نرمی سے کہا۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں' یہ کوئی چھوٹی بات نہیں اور ایسی نازک خبریں چھپ نہیں سکتیں اور نہ ان کی نزاکت کو چھپایا جاسکتا ہے۔" ان کے سنگ دلانہ جواب پر مسز خان نے کچھ بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"لیکن یہ ایسی بات نہیں کہ ہم سہیل یا ریشم کے من گھڑت قصے پر قناعت کرکے بیٹھ جائیں۔ ہم میں سے خود کسی کو جاکر واقعے کی تصدیق کرنا چاہیے۔ وہ دونوں تو پرلے درجے کے غلط ہیں۔"

"پلیز ام جان!" وہ ہاتھ اٹھا کر ایک دم سے چیخے' مسز خان نے کچھ ڈر اور حیرت سے انہیں دیکھا۔ "کتنے غلط ہیں وہ' بتائیں مجھے کتنے غلط ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھا ہے کسی نے کیچڑ سے بھرے گندے جوہڑ میں خود سے چھلانگ لگادی ہو۔ اپنے کپڑے' اپنے چہرے کو کیچڑ سے لت پت کرلیا ہو۔ کون کرتا ہے۔ بتائیں مجھے۔ کون ذی ہوش ایسا کرسکتا ہے۔ خود سے کون اپنا لباس' اپنا گریبان تار تار کرتا ہے۔ کون خود سے برہنہ ہونا گوارا کرتا ہے۔ کبھی دیکھا ہے آپ نے کوئی شخص بھرے بازار میں کسی چوراہے پر خود اپنے کپڑے ایک ایک کرکے اتار ڈالے برہنہ ہوجائے۔ کوئی ہوش و خرد سے بیگانہ پاگل بھی ہو اسے بھی اپنی ستر پوشی کا احساس ہوتا ہے۔ ام جان! کون اپنی عزت کی چادر کے چیتھڑے خود اڑاتا ہے۔ ام جان! کون اپنے بے داغ لباس کی دھجیاں اڑاتا ہے کوئی کتنا ہی کرپٹ کتنا ہی گھٹیا' کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو' اپنے آپ کو خود سے ننگا کوئی بھی نہیں کرتا۔ کیا سہیل اس قدر گھٹیا دیوانہ ذلیل اور بے غیرت ہے جو اپنی عزت کی نیلامی کی خبر خود گھر گھر فون کرکے پہنچائے گا۔ خود سب کو بتائے گا کہ اس کے گھر کی چھت اڑ گئی ہے' آسمان ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ بے لباس ہوگئے ہیں۔ ذلت و رسوائی کے در ان پر وا کر دیے گئے ہیں۔ کون اس حد تک کرسکتا ہے کہ اپنی ذلت کا سامان خود تیار کرکے سارے زمانے میں اپنی ہنسی اڑوائے پھر بھی آپ کہتی ہیں کہ یہ ان کی خود ساختہ گھٹیا سوچ کا فسانہ ہے۔

ام جان! آپ' خود کو ان کے غلط ہونے کی آڑ لے کر خود کو فریب دے سکتی ہیں ام جان میں نہیں۔"

وحشت سے ان کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہکنے لگی تھیں اور چہرہ حدت جذبات سے سرخ ہو چلا تھا انہیں شاید خود پر بھی قابو نہ رہا تھا۔

"تو کیا تم سمجھتے ہو نزہت واقعی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے' نقدی اور زیور لے کر۔" مسز خان ان کی حالت کو نظر انداز کرکے بھڑکتے ہوئے بولیں۔

"کیا ابھی یہ سب تصور کرنے کی' سمجھنے کی گنجائش باقی ہے آپ کے نزدیک۔" وہ تلخ لہجے میں بولے۔

"گنجائش تو ہمیشہ باقی رہتی ہے اگر ہم جذبات کی عینک اتار کر حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیں تو۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"ام جان اگر یہ سب سن کر کوئی شخص اپنے جذبات کو ٹھنڈا اٹھا رکھ سکتا ہے تو پھر اردو لغت میں ایسے شخص کو بہت ہی رذیل القابات سے نوازا گیا ہے۔" وہ اسی زہر خند لہجے میں گویا ہوئے۔

"تو اس کا منطقی نتیجہ کیا ہونا چاہیے۔" انہوں نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔

"کیا آپ اس قسم کے واقعات کے منطقی نتائج سے بے خبر ہیں۔" وہ طنز سے بولے۔

"شہباز خان! ماں کے ساتھ طنز مت کرو' میں اس مسئلے کو بہت تحمل و برداشت اور حقیقت پسندی سے سلجھانا

چاہتی ہوں، تمہاری رضامندی کے ساتھ۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔

"کیا آپ اس سارے واقعے یا اس کی جزئیات پر یقین نہیں رکھتیں۔ کیا آپ کو یقین ہے۔ سہیل نے آپ کو یہ سب محض بھکانے کے لیے کہا ہے جبکہ ایسا کرنے سے اسے کچھ بھی مفاد حاصل نہیں ہو سکتا سوائے اس کی اپنی رسوائی کے۔" وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"بات سہیل یا ریشم کی سچائی کی نہیں یہ تو بعد میں پرکھا جائے گا۔ پہلی بات تو نزہت کی بازیابی ہے۔ وہ کس حال میں ہو گی۔ مجھے اس بات کی ازحد بے چینی ہے۔ وہ زیور اور نقدی تو کسی حال میں نہیں لے کر جا سکتی۔ مجھے اس کا یقین ہے۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"ہاں۔ کسی کے ساتھ فرار ہو سکتی ہے۔ ہے نا۔" وہ پھر طنز سے بولے تو مسز خان نے انہیں تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

"کسی بھی بات کے بارے میں اس قدر جلد فیصلہ مت کرو۔ کم از کم نزہت کی بازیابی تک۔"

"اس کی بازیابی کے لیے آپ پولیس سے رجوع کریں۔ وہ ایسے کیسز بہت بہتر طریقے سے حل کرتی ہے۔ مغویہ کی بازیابی تو پولیس کے بائیں ہاتھ کا کمال ہے "اگر مغویہ واقعی اغوا ہوئی ہو۔" ان کا طنزیہ لہجہ ہنوز برقرار تھا۔

"شہباز خان! بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ کر بات کرو۔" وہ تحمل سے بولیں۔

"ام جان! اب کون سی بات کرنا باقی ہے۔" وہ کرسی کی پشت پر جھک کر بولے۔

"بہت کچھ باقی ہے ابھی "اگر تم سمجھو تو۔"

"کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اتنا میں سمجھ چکا ہوں اور مزید مجھے کچھ بھی سمجھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ تلخی سے بولے تو مسز خان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب انہیں مزید بات کرنے پر کیسے آمادہ کریں۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی، صرف گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک تھی۔

"میں چاہتی ہوں بلکہ میں صبح ایاز کو پنڈی کو بھیج رہی ہوں۔ اس طرح بیٹھ رہنے سے کیا ہو گا۔" وہ کچھ دیر بعد کھنکھار کر بولیں۔ وہ چپ رہے۔

"وہ حالات کا اچھی طرح سے جائزہ لے کر آئے گا اور میں نہیں چاہتی کہ یہ معاملہ ہم کسی بھی طرح پولیس کے حوالے کریں، مجھے یہ گوارا نہیں۔"

"ام جان! بہت ساری باتیں جو ہمیں زندگی میں ناپسند ہوتی ہیں کہ ان کا ہونا شاید ہم گوارا نہ کریں مگر وہ ہو جاتی ہیں۔ ہماری ناپسندیدگی کے باوجود بڑی ڈھٹائی ہے کہ ہم ان کا ہونا نہیں روک سکتے۔" وہ ایک لمحے کو رکے۔

"آپ کسی کو بھی پنڈی نہیں بھیجیں گی۔ جتنی عزت افزائی میری اس رشتے کے حوالے سے ہونی تھی ہو چکی۔ اب میری آپ سے ریکویسٹ ہے۔ پلیز ام جان! اس بات کو یہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ میں اس پر دوبارہ بھی بات کرنا پسند نہیں کروں گا۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔" وہ حتمی انداز میں چبا چبا کر بولے۔

"شہباز! ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کا کوئی نہ کوئی۔"

"ام جان! شب بخیر۔ آپ بھی سو جائیں اب۔ کافی رات ہو چکی ہے مجھے صبح جانا بھی ہے میں صبح جاتے ہوئے آپ سے مل کر جاؤں گا۔ اگر آپ سوئی ہوئیں تو میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ آپ اس بات کو مائنڈ مت کیجیے گا۔ اوکے گڈ نائٹ۔" انہوں نے آگے بڑھ کر مسز خان کے ماتھے کو ہولے سے اپنے ہونٹوں سے چھوا، ان کی کھڑکی کا ایک سمٹا ہوا پردہ برابر کیا اور مڑ کر ان کی طرف دیکھے بغیر ٹیبل لیمپ کی لائٹ آن کی اور دروازے سے نکلتے ہوئے مین لائٹ آف کی اور بہت آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔

ان کا رخ اپنے کمرے کے بجائے باہر لان کی طرف تھا۔ رات پوری طرح سے بھیگ چکی تھی، سیاہ تاروں بھری رات کی چادر سارے آسمان پر پھیل چکی تھی، فضا میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی خنکی اس پاس کو چار سو پھیلا رہی تھی مگر اس وقت ان کا ذہن، ان کی حسیات ہر احساس، ہر خوشبو سے بیگانہ تھیں۔ وہ پشت پر ہاتھ

باندھے گھاس پر ٹہلنے لگے۔

"تو یہ سب یوں ہونا تھا۔" کافی دیر ٹہلنے کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر کالے سیاہ آسمان کو دیکھا۔

"بعض لوگوں کے بارے میں ہمارے مشاہدات کس قدر فضول نکلتے ہیں۔ بالکل الٹ اور میری زندگی۔ کیا اس میں اس واقعے کے بعد روشنی کی کوئی رمق بچی ہے، جس کے ذریعے میں کوئی قدم، کوئی بہتر قدم اپنے حق میں اٹھا سکوں گا۔"

☼ ☼ ☼

کمرے میں بے حد خاموشی تھی۔ صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر تختہ ہو چکی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دکھتا ہوا سر دبایا۔

"پتا نہیں یہ راحیلہ کہاں رہ گئی۔ وہ آئی تو میں اس سے کوئی پین کلر یا سلیپنگ پلز ہی لے لیتی۔ یا اللہ یہ نیند ہی کیوں نہیں آجاتی اور درد۔" اس کے منہ سے سی کی آواز نکلی۔

"یہ درد کیسے کم ہو گا۔" رو رو کر آنکھیں سوج چکی تھیں پپوٹے اتنے بھاری ہو گئے تھے کہ شاید اب ان میں رونے کا دم بھی نہیں رہا تھا۔ جوڑ جوڑ میں جیسے درد کا جہان آبسا تھا۔

"ابھی رات اتنی طویل ہے اور پھر صبح، صبح رات سے بھی خوفناک" تکلیف دہ سوچوں نے اس کی آنکھوں سے نیند بالکل ہی اڑا دی تھی۔

"مجھے خود جا کر دیکھنا چاہیے شاید راحیلہ نظر آجائے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "کہیں وہ مائنڈ نہ کر جائے، وہ مجھے منع کر کے گئی تھی۔" دروازے کی طرف بڑھتے اس کے قدم تھم گئے۔

پھر ایک جھٹکا دینے والی سوچ نے اس کا دامن ہلا دیا۔

"آخر میں کب تک اس کمرے میں اس کا انتظار کروں۔ اسے خود خیال ہونا چاہیے تھا۔ وہ سات بجے گئی تھی اور اب پونے دس بج رہے ہیں۔" بھاری پپوٹوں کے نیچے آنکھوں کی زمین پھر سے بھیگنے لگی، اپنی بے وقعتی کا احساس پھر سے رلانے لگا تھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمایا اور باہر نکل گئی۔

کاریڈور میں کوئی نہیں تھا۔ وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ راحیلہ کے سامنے والا کمرہ اس کے امی ابو کا تھا جو شاید لاک تھا۔

"اگر وہ بھی ادھر ہوتے تو شاید کبھی مجھے اپنے گھر میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دیتے حالانکہ انکل اور آنٹی بھی مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ میری کم گوئی اور ڈیسنٹ مینرز کی میرے منہ پر تعریف کرتے تھے۔"

"نزہت، راحیلہ کی طرح بالکل بھی بے مقصد نہیں بولتی، بہت ڈیسنٹ ہے۔" اس کی امی اکثر پیار سے کہتیں مگر یہ تو گئے دنوں کی بات ہے۔ اس کے دل نے آہ بھری۔

وہ آہستگی سے کاریڈور عبور کر کے لاؤنج کی طرف بڑھی۔ کچن سے برتنوں کی کھٹر پٹر کی آواز آ رہی تھی۔

"راحیلہ ادھر نہ ہو۔" اس کے دل میں خیال گزرا۔ ابھی انہوں نے ڈنر کیا ہی نہ ہو، اس کی خالہ ہائی کلاس سے تعلق رکھتی ہیں جدھر رات کا کھانا کیا کسی بھی کھانے کے اوقات مقرر نہیں ہوتے۔ اس نے ذرا سا آگے ہو کر کچن کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ ان کی نوکرانی سنک کے آگے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے ڈنر ہو چکا ہے۔ لاؤنج میں دیکھوں گی اگر راحیلہ نظر آ گئی تو ٹھیک ورنہ واپس چلی جاؤں گی۔" اس نے دل میں طے کیا۔ لاؤنج سے آوازیں آ رہی تھیں۔

"میں سونے سے پہلے میڈیسن لیتی ہوں۔ ملازمہ سے کہہ جانا۔ میرے بیڈ روم میں گرم دودھ کا گلاس رکھ جائے۔ دوا لیے بغیر نیند نہیں آتی۔ آپا اور بھائی جان تو کل ہی آئیں گے بارہ ایک بجے تک۔"

یہ آواز یقیناً اس کی خالہ کی تھی۔ وہ لاؤنج کی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ تھوڑا سا پردہ سرکا ہوا تھا۔ کھڑکی کے آگے پڑے صوفے پر اس کی خالہ ہی بیٹھی تھیں سامنے چیئر پر راحیلہ خوب بیٹھی تھی۔

”جی ان کا فون آگیا تھا شام کو۔ کل صبح قل کر کے ہی لوٹیں گے۔“ راحیلہ بہت ادب سے بول رہی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو نزہت اس کا خوب مذاق اڑاتی۔

”یہ مسئلہ بھی بیچ میں ہونا تھا خیر۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولیں۔ اس کی خالہ ہاتھ چلا چلا کر بات کرنے کی عادی تھیں۔ والیوم بھی ان کا خاصا بلند ہوتا تھا' ہاتھ چلا چلا کر بات کرنے کا ایک فائدہ انہیں یہ بھی ہوتا تھا کہ جس جس کی نگاہ ان کی ڈائمنڈ کی انگوٹھیوں پر نہیں پڑتی تھی وہ بھی دیکھ کر مرعوب ہو جاتا۔ اب بھی ان کے دونوں ہاتھوں کی تین انگلیوں میں قیمتی ڈائمنڈز جگمگا رہے تھے۔

نزہت کی ملاقات ان سے راحیلہ کی دونوں بہنوں کی شادیوں میں ہو چکی تھی۔ وہ کروڑ پتی یا شاید ارب پتی بزنس مین کی بیوی تھیں۔ یہ کروڑ پتی ہونا ان کے ایک ایک انداز سے جھلکتا تھا' وہ بات سر اٹھا کر مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کبھی دایاں اور کبھی بایاں ہاتھ بڑے متفکرانہ انداز میں اٹھا کر اور جسم کو ایک خاص زاویے پر کسی کمان کی طرح سیدھا اٹھا کر بات کرنے کی عادی تھیں' ان کی آواز تو بہت بھاری نہیں تھی مگر والیوم بہت بلند ہوتا تھا کہ جب وہ بول رہی ہوتی تھیں تو کسی کی بات سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ سب آوازیں ان کی بارعب آواز کے نیچے دب کر رہ جاتی تھیں ویسے بھی وہ بہت کم کسی کو منہ لگانا پسند کرتی تھیں۔ خاندانی تقریبات میں بھی کم کم شامل ہوتی تھیں اور جب بھی شرکت کرتی تھیں۔ ایک تو ان کا بیش قیمت لباس' قیمتی جیولری اور شخصیت کا رعب ہی انہیں سب سے ممتاز کرتا تھا۔ دوسرے وہ خود بھی خاندان کے لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ بہت خاص اور بہت کم لوگوں سے بات کرنا پسند کرتی تھیں۔

”نا معلوم آج کل ادھر کیسے پائی جا رہی ہیں۔ یہ غرور تکبر کی دولت مند بیوی۔“ نزہت نے پیچ کلر کے قیمتی سوٹ میں ملبوس اس عورت کو دیکھ کر سوچا۔

”ہاں یاد آیا۔ راحیلہ بتا رہی تھی کہ وہ کوئی رشتہ جوڑنے۔“ اسے یاد آیا۔

”ان کا تو شاید ایک ہی بیٹا تھا تو کیا راحیلہ سے۔“ اس کے ذہن میں خیال ابھرا اور راحیلہ کی طرف دیکھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ راحیلہ کا ناک میں دم کر دیتی چھیڑ چھیڑ کر مگر اب ان دونوں کے درمیان ایسے کسی بھی مذاق کا کوئی رشتہ نہیں رہ گیا تھا۔

”رات کو خوب تماشا بنایا اس مینٹل عورت اور اس کے شوہر نے علی تمہاری وہ دوست یا نہیں۔“

”جی معلوم نہیں۔ میں نے معلوم نہیں کیا۔“ راحیلہ کچھ ہکلا گئی۔

”مجھے تو یقین نہیں آتا۔ اتنی گری ہوئی اور بے ہودہ حرکت کرنے والی لڑکی تمہاری دوست ہو سکتی ہے۔ جس کے گھر والے اس قدر ال مینرڈ ہوں۔ اس کی بھابی کیسے بڑھ بڑھ کر بتا رہی تھی کیا نام تھا اس لڑکی کا۔“ وہ یونہی اٹکیں۔

”نزہت...!“ راحیلہ کے ہونٹ جیسے خواب کے عالم میں ہلے۔

”ہاں وہی اس کی بھابی کہہ رہی تھی کہ وہ تو شروع ہی سے بدکردار تھی مختلف لڑکوں سے اس کا کھلے عام ملنا جلنا تھا باپ زندہ تھا تو وہ اس کو شہ دیتا تھا' اس کی آزادی پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتا تھا بلکہ بھابی کے روکنے پر اس نے اسے گھر سے نکالنے کی دھمکی دے دی تھی اور اس کا بھائی کیسے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر کھڑا تھا۔ بیوی کی قینچی کی طرح چلتی زبان پر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کسی سدھائے گدھے کی طرح سر ہلائے جا رہا تھا۔ تمہارا ایسے لوگوں سے دوستانہ کیونکر ہو گیا۔ یہ لوگ تو موری کے کیڑے ہوتے ہیں۔ کیچڑ میں رہ کر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ میں تو شکر کرتی ہوں' تمہارے انکل ساتھ نہیں تھے

وہ تو پہلے ہی اس پرپوزل پر بہت خوش نہیں ہیں۔ ان کے سرکل میں ریحان کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت' طرح دار' امیر گھرانوں کی لڑکیاں موجود ہیں۔ ایک تو تمہارے انکل کے بزنس پارٹنر کی بیٹی حجاب تھی۔ بے پناہ حسین اور اوپر سے ارب پتی باپ کی اکلوتی اولاد۔ مانو اس رشتے پر آ کر تو مجھے کتنے دن تمہارے انکل

سے باقاعدہ جنگ کرنی پڑی۔ پتا نہیں کیسے جا کر راضی کیا انہیں۔ وہ بھی میں نے ریحان کو اپنا ہم خیال کیا تب' آئندہ ایسی لڑکی سے بالکل کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا کجا دوستی رکھنا۔“ وہ اپنی شیخیاں بگھارتے ہوئے اسے تنبیہہ کر کے بولیں۔

”وہ میری دوست تو نہیں تھی۔ وہ تو محض کلاس فیلو تھی صرف سیکنڈ ایئر میں۔“ راحیلہ کی گھگھیائی ہوئی آواز پر اسے یقین نہیں آیا اس نے کچھ حیرت اور رنج کے عالم میں پردہ ذرا سا اور سرکا کر راحیلہ کا جھکا ہوا چہرہ دیکھنا چاہا۔ عین اسی وقت راحیلہ کی نگاہ اس پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔

”محض کلاس فیلوشپ اور وہ بھی کب کی بات اور وہ لوگ اس طرح تم پر الزام دھرنے چلے آئے جیسے وہ تمہاری بہت کلوز فرینڈ ہو۔ بہرحال آئندہ تم احتیاط کرنا' اس قسم کے تعلقات بنانے میں بلکہ اب تمہیں اپنے تعلقات اور دوستی وغیرہ کو ہماری کلاس کے مطابق جانچنا چاہیے۔ پہلے کی بات اور تھی' کسی بھی ایرے غیرے کو تم دوست بنا سکتی تھیں مگر اب تمہارا تعلق ہم سے جڑ رہا ہے۔ اس لیے ایسے معاملات کو ہماری نظر سے او کے کرنا۔ انڈر اسٹینڈ۔“

راحیلہ تو شاید ان کے طنز اور دھمکیوں میں سے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی بس مضطرب انداز میں کبھی سامنے بیٹھی فرعون کو دیکھتی اور کبھی کھڑکی میں ایستادہ نزہت کو۔ اب وہ نزہت کے آگے ہاتھ بھی نہیں جوڑ سکتی تھی کہ خدارا تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اس کی آنکھوں کی التجا پڑھتے ہی نزہت وہاں سے ہٹ گئی۔

”کچھ بھی نہ کرنے پر اتنا بڑا داغ میرے دامن پر لگ گیا ہے بلکہ پورا وجود ہی جیسے کوڑھی ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی میرے سائے کے قریب سے بھی گزرنا نہیں چاہتا۔ آخر ایسا کیا کر دیا میں نے۔“ وہ کمرے میں آتے ہی کرسی پر گر کر زار و قطار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”راحیلہ اس قدر [illegible] تھی مجھ سے تعلق رکھنے پر۔ میرے اللہ! مجھے موت دے دے۔ ایسی ذلیل زندگی مجھے نہیں چاہیے۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔

”رونے سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ چاہے وہ صبح تک روتی رہتی یا تمام عمر اسے کس نے چپ کرانا تھا۔“ کافی دیر بعد اس نے خود ہی دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کر لیا۔

”یہ رونا تو اب شاید عمر بھر کا ہے۔“ خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے افسردگی سے سوچا۔ گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔ شاید مجھے اس کرسی پر بیٹھے ہی رات تمام ہو جائے گی۔ کرسی پر اپنے وجود کو سیدھا کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

”نزہت! تمہیں ادھر نہیں آنا چاہیے تھا اگر خالہ دیکھ لیتیں تو جانو میرا کیا حال کرتیں۔ تمہیں اپنی عزت کا نہیں تو میرا خیال ہی کر لینا چاہیے تھا' کتنے کڑے حالات میں میں نے تمہیں ادھر رکھنے کا رسک لیا ہے' تمہیں اس بات کا ہی خیال کر لینا چاہیے تھا۔ خالہ جان کی گفتگو تو تم سن ہی آئی ہو' اگر انہیں ذرا سی بھی بھنک مل جائے تمہاری موجودگی کی تو وہ میرا کیا حال کریں۔ تم تو شاید ایک رات گزار کر یہاں سے چلی جاؤ۔ میں ساری زندگی اپنے خاندان والوں اور گھر والوں کے آگے سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ رہوں گی۔“

راحیلہ شاید بے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ مدھم آواز میں سخت لہجہ اور سخت ترین الفاظ بولتی وہ اس کے سر پر کھڑی بمباری کر رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسے سخت احسان فراموش اور گھٹیا گردان رہی تھی اور اس کی بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ جواباً کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

”سوری۔“ اس نے جھکے سر اور شکستہ لہجے میں کہا تو کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی' پھر کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔

”نزہت! میں مجبور ہوں۔ پلیز تم میری مجبوری کو سمجھو۔ ہم لڑکیاں ایسی ہی ان دیکھی زنجیروں سے بندھی ہوتی ہیں۔ اپنے اچھے مستقبل کی زنجیریں' ماں باپ کی عزت و غیرت کی زنجیریں۔ تمہیں معلوم ہے نا۔“ راحیلہ اس کے

سامنے بیڈ پر آبیٹھی اور نرم لہجے میں بولی۔

"ہوں۔" وہ ابھی بھی سر نہ اٹھا سکی۔

"تم اب لیٹ جاؤ۔ آرام کرلو۔ میں تمہارے لیے چائے بھی لاتی ہوں اور گرم دودھ بھی جو لینا پسند کرو۔" اس نے شاید ٹرے پیچھے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ ہر کام وہ بہت احتیاط سے کر رہی تھی کہ ذرا سی آواز بھی کمرے سے باہر نہ نکلے۔

"تھینک یو۔" اس کا واقعی اب کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"چائے لے لو۔ ساتھ میں سر درد کی ٹیبلٹ بھی ہے۔" راحیلہ اس کے تھینک یو کو سنے بغیر اٹھی اور اسے چائے کا مگ اور ٹیبلٹ دینے لگی۔ ابھی بھی اس کے دل کو اس کی احتیاج کی خبر ہو جاتی تھی کہ وہ اسی ٹیبلٹ کے لیے تو بہت مجبور ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ اس نے خاموشی سے ٹیبلٹ لے کر پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ نگل لی۔ راحیلہ اپنا کپ لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگیں۔

"تم نے اب کیا سوچا ہے؟" کچھ دیر بعد راحیلہ نے [illegible] خاموشی کو توڑا۔

"کیا سوچنا ہے کل صبح اس شہر سے کہیں بھی چلی جاؤں گی کسی اور شہر یا قصبے میں۔" وہ اس سے نظریں ملائے بغیر چائے کی بھاپ پر نظریں جما کر بولی۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔" راحیلہ کو اس کی بات ذرا پسند نہ آئی۔

"ٹھیک ہوتا تو یوں دربدر بھٹک رہی ہوتی، کسی گاڑی کے نیچے نہ خود کو دے چکی ہوتی۔" اس نے نم آواز میں تلخی سے جواب دیا۔

"نزہت! یہ کوئی حل نہیں، جو ہو چکا وہ ہو چکا مگر آگے کے لیے تمہیں کچھ قابل عمل، کچھ بہتر حل سوچنا چاہیے ایک باعزت زندگی گزارنے کے لیے۔" راحیلہ چونکہ بالکل محفوظ اپنے گھر میں بیٹھی تھی۔ اس لیے خوش فہمی کے جھولے جھول رہی تھی۔

"باعزت زندگی اور..." وہ ہلکا سا ہنسی "کیا اب مجھے کبھی مل سکتی ہے۔ نہیں راحیلہ! یہ تو آدم کی جنت گم گشتہ کی طرح ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھوں سے نکل چکی ہے اور اب کوئی معجزہ بھی مجھے پہلے جیسی باعزت زندگی نہیں دلا سکتا۔" اس کی نظریں مگ کی تہہ میں بچے آخری چند گھونٹوں پر تھیں۔

"نزہت! اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ یہاں..."

"راحیلہ! پلیز کتابی باتیں مجھ سے مت کرو کل سے آج رات تک میں اس دنیا کا جو روپ دیکھ چکی ہوں اس کے بعد کوئی خوب صورت ترین بہلاوا بھی مجھے بہلا نہیں سکتا۔"

"اچھا اس بات کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ بلکہ شروع سے کہ یہ سب کیا ہے۔ کیسے ہوا، مجھے تو وہی معلوم ہے نا جو بکواس سہیل اور ریشم کر کے گئے، وہ بھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" راحیلہ اپنا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر بولی "بلکہ پلیز تم اب بستر پر آجاؤ ایسے خود کو اتنا نہ تھکاؤ ابھی۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"وہ جو کچھ کہہ کر گئے ہیں، سمجھو وہی سچ ہے۔" وہ اسی تلخی سے بولی۔

"جب تم نے مجھے فون کیا تھا میں نے تب ہی کہا تھا کہ کیا ضرورت ہے اس کے ساتھ بازار جانے کی۔" راحیلہ اس کی بات ان سنی کر کے بولی۔

نزہت کو یاد نہیں آیا کہ راحیلہ نے ایسی کوئی تاکید اسے کی تھی یا نہیں یا غم کے جھٹکوں نے اس کے ذہن سے ایسی بہت سی تاکیدی باتیں محو کر دی تھیں۔ وہ سامنے دیوار پر نادیدہ نکتے کو دیکھتے ہوئے سوچتی رہی۔

"تم اس کے ساتھ بازار سے کہاں چلی گئیں اور وہ گھر واپس پہنچ کر خود کو معتبر ثابت کرنے میں کامیاب ہوئی۔" راحیلہ پتا نہیں انسانی جبلت کے ہاتھوں مجسس تھی یا اس کا دکھ بانٹنا چاہ رہی تھی۔ اس کی نیت جو بھی تھی نزہت کم از کم آج کی رات اس کی خفگی مول نہیں لے سکتی تھی، یہی تو وہ ستا تھا جس نے آج بے بسی کے تجربے

کنار میں اسے سہارا دیا تھا۔ چاہے رات بھر کے لیے۔ وہ بھی اسے دھتکار دیتی تو وہ کہاں جاتی؟

وہ دھیرے دھیرے جتنا کچھ اسے ہوش و خرد سے بیگانہ ہونے سے پہلے معلوم تھا اور جیسی حالت میں اس نے خود کو ہوش میں آنے کے بعد پایا بغیر کسی اضافے یا ترمیم کے اسے سناتی چلی گئی۔ راحیلہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"کم از کم سہیل بھائی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا جبکہ انہیں اپنی بیوی کے بارے میں علم بھی تھا اور بہن کے کردار کی بھی خبر تھی کہ وہ خود سے اپنی مرضی سے کبھی رات گھر سے باہر نہیں گزار سکتی۔ انہیں تمہیں اندر بلا کر سب کچھ اطمینان سے معلوم کرنا چاہیے تھا۔" راحیلہ سب کچھ سن کر افسوس زدہ لہجے میں بولی۔

"ان کے نزدیک حقیقت اور افسانے کے پیمانے بدل چکے ہیں۔ ان کے حواس اور دماغ اب بیوی کی زبان و احساسات کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

"شاید وہ اس وقت بہت غصے میں ہوں جب انسان [illegible] ہے تو بہت سی باتوں بہت سے حقائق کو وہ سمجھ ہی نہیں پاتا جب ان کا غصہ اترا ہو گا۔ آج دن بھر میں یا شام کو یا اب رات گئے تک۔ رات بھی بہت سے بھیدوں پر پڑے پردے اٹھا دیتی ہے۔ انوکھے انکشاف سچائی کے بارے میں اکثر رات ہی کو ہوا ہوتے ہیں۔" راحیلہ نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"اگرچہ دیر تو ہو چکی ہے لیکن ابھی رات کا ایک حصہ ہی تو گزرا ہے۔ کیا پتا سہیل بھائی کو کچھ عقل آ ہی گئی ہو۔ غصہ اتر گیا ہو تو شاید عقل کا کوئی دریچہ تازہ ہوا سے کھل ہی گیا ہو۔"

"پتا نہیں۔" وہ سر زور سے کرسی کی پشت سے ٹکرا کر بے بسی سے بولی۔

"نزہت! ایک آخری کوشش کر دیکھو۔" راحیلہ بولی۔

"کیسی کوشش؟" وہ اسی طرح سر رکھے پڑی رہی۔

"ہم سہیل بھائی کو فون کرتے ہیں۔ میں خود ان سے بات کروں گی دیکھو! ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ تم خود ان سے بات کرنا۔ معافی مانگ لینا اگر انہوں نے تمہارے سسرال میں یہ خبر بیوی کے کہنے میں آکر کر دی ہو تو بھی ان سے معذرت کی جا سکتی ہے۔ نند بھاوج کی فرضی جنگ میں تم غصے کی حالت میں میری گھر آکر رات رہ گئی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ بہت کچھ ابھی بھی سمیٹا جا سکتا ہے۔ اگر سہیل بھائی چاہیں تو نزہت۔ انہیں فون کرتے ہیں شاید وہ ہماری بات سمجھ لیں۔ اس وقت ویسے بھی وہ چڑیل سو چکی ہوگی۔" راحیلہ اسے اکسا رہی تھی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ سہیل بھائی کے دل میں نہ پہلے میرے لیے کوئی جگہ تھی اور اب تو شاید بالکل بھی نہیں۔ چاہے میں ان کے سامنے سر پھوڑ کر مر جاؤں۔" وہ اپنی تھکی تھکی آنکھوں کو مسل کر مایوسی سے بولی۔

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں فون لے کر آتی ہوں، خدا خدا کر کے خالہ جان اپنے بیڈ روم میں گئی ہیں اور ہاں نزہت! میں تم سے معافی بھی مانگنا چاہتی ہوں خالہ جان کے الفاظ کی اور اپنے رویے کی۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

"معافی کیسی میں نے برا نہیں مانا۔ جو ہاتھ تقدیر نے میرے ساتھ کیا ہے۔ اس کے بعد کسی کے بھی الفاظ مجھے برے نہیں لگنے چاہئیں اور نہ لگے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"نزہت! یہ میری مجبوری تھی اور ہے۔" وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ "تمہیں معلوم ہے نا ہمارے اور خالہ جان کے اسٹیٹس کا فرق۔ انکل کا شمار ملک کے دس بڑے صنعتکاروں میں ہوتا ہے اور اتنے بڑے گھر سے میرے لیے پرپوزل آنا کوئی چھوٹی بات نہیں اور میرے والدین، جو پہلے ہی دونوں بیٹیوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ آپا اور نبیلہ دونوں ہی اپنے گھروں میں معاشی لحاظ سے بہت تنگ ہیں۔ آپا کا تو سسرال ہی اس قدر بڑا ہے کہ دو نندیں اور ایک دیور بیاہنے کے باوجود ابھی بھی چار افراد ساجد بھائی کو بیاہنے ہیں۔ بچوں کی ذرا ذرا سی ضروریات تو امی ابو پوری کرتے ہیں اور نبیلہ کا شوہر تمہیں پتا ہے پانچ سالوں میں اس نے بیس کام بدلے ہیں اور کہیں ٹک کر کوئی کام نہیں کیا نبیلہ کی بھی سب ضرورتیں امی ابو کے ذمے ہیں۔ ایسے حالات میں خالہ جان کا ہمارے گھر کا رخ کرنا جبکہ

خاندان میں ان کے جوڑ کی نہ سہی بہرحال ان کے برابر کی ایک دو فیملیز موجود ہیں پھر بھی خالہ جان نے امی کا خیال کیا۔ امی ابو تو ان کے احسان کے بوجھ سے ابھی سے دبے جا رہے ہیں تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیوں نہ اپنے بوڑھے والدین کی خوشی کی خاطر اپنی ایک دوستی... صرف ایک دوستی کو ہی قربان کرنا ہے اور یوں بھی لڑکیوں کی دوستیاں کب دیرپا ہوتی ہیں۔ والدین کے گھر نہ ختم ہوں تو شوہر یا سسرال والے ناپسندیدگی کی سند دے کر انہیں ایک ہی جھٹکے سے ختم کروا لیتے ہیں میں فون لاتی ہوں۔" وہ جیسے خود سے باتیں کر رہی تھی پھر نزہت کا کوئی بھی جواب لیے بغیر فون لینے باہر چلی گئی۔

فون کی بیل مسلسل جا رہی تھی کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

"لگتا ہے گھر میں کوئی نہیں۔" راحیلہ نے ریسیور کان سے لگا رکھا تھا۔

"ہیلو جی! میں راحیلہ ہوں سہیل بھائی! نزہت کی دوست۔" دوسری طرف شاید سلسلہ مل گیا تھا۔ راحیلہ پُرجوش آواز میں بولی۔ نزہت نے جلدی سے اسپیکر کا بٹن آن کر دیا۔

"کہو کیا کام ہے۔" وہی سرد اجنبی لہجہ۔ نزہت کا جسم بے جان ہونے لگا۔

"سہیل بھائی پلیز! آپ نزہت کے لیے دل میں کوئی گنجائش پیدا کریں وہ بے قصور ہے اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ ریشم اسے دھوکے سے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ آپ خود پوچھ...."

"شٹ اپ۔ ول یو شٹ اپ۔" سہیل کی دھاڑ سے راحیلہ کا بیڈ روم بھی گونج اٹھا "تم فون رکھو گی یا میں تمہارے گھر فون کر کے تمہارے والدین کو تمہارا کچا چٹھا کھول کر بتاؤں۔ ایک تو اس ذلیل کو اپنے کسی یار کے ساتھ بھگا دیا اور اب اس کی سفارشی بن کر آئی ہو You wagabond آوارہ لڑکی۔"

"اتنی انسلٹ...." راحیلہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی' دونوں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"میں نے منع کیا تھا نا تمہیں۔" راحیلہ کی بے عزتی کے احساس اور اپنے بھائی کی اتنی گندی زبان پر نزہت شرمسار تھی بہت۔

"اب کیا کرو گی؟" راحیلہ شاید موضوع بدل دینا چاہتی تھی۔

"جی تو چاہتا ہے کہیں سے زہر مل جائے۔"

"موت ملنی ہوتی تو کل ہی نہ مل جاتی تمہیں' اس پر سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"پھر کیا کروں؟" وہ سر تھام کر بولی۔

"ادھر تو فون کر ہی چکے ہیں خبیث لوگ۔"

"معلوم نہیں شاید...."

"بتا رہے تھے رات کو کہ یہ خوشی کی خبر کو تمہاری سسرال پہلے دے کر آئے ہیں۔ کیا عجیب اور گھٹیا بھائی ہے مجھے تو یقین نہیں آتا ہے۔ اچھا ہی ہے خدا نے ہمیں کوئی بھائی نہیں دیا۔" راحیلہ بولی۔

"اور اب تم کوئی بھی افسانوی سچویشن کے بارے میں سوچنے کے بجائے حقیقت کو فیس کرنے کا سوچو۔"

"کیا مطلب؟"

"میں کل تمہیں ٹرین پر بٹھا دوں گی یا کوچ میں۔ تم لاہور چلی جاؤ۔ تمہاری پھوپھو تم پر مہربان ہیں پھر وہ ریشم کی حقیقت سے بھی واقف ہیں۔ اس سارے گھٹیا افسانے پر یقین کرنے سے پہلے ایک بار ضرور تمہاری بات سنیں گی پھر تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ تمہیں ادھر ہی جانا چاہیے۔"

"نہیں۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" وہ خوف زدہ انداز میں نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نزہت! that's better فون کرنے کا کچھ فائدہ۔ نہیں تمہیں خود جانا چاہیے اب اگر میری پوزیشن یوں ایکورڈ نہ ہو چکی ہوتی تو میں خود تمہارے ساتھ جاتی یا کم از کم ابو کو بھیجتی مگر اب یہ سب مشکل ہے۔ تمہیں خود ہی

جانا ہو گا۔ رات ابھی پڑی ہے تم اچھی طرح سوچ لو نزہت! میرے خیال میں یہی بہترین ہے۔" وہ اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی' وہ ان لوگوں کا سامنا کیسے کر سکتی تھی وہ بھی اس طرح۔ اسے یہ ناممکن لگا۔

"نہیں راحیلہ! میں یہ نہیں کر سکتی۔"

"نزہت! اگر تمہیں تھوڑی بہت عزت کی زندگی چاہیے تو ادھر ہی جاؤ۔ تم ان کے نکاح میں ہو' جب تک نکاح قائم ہے۔ تم ادھر ادھر کیسے جا سکتی ہو۔ اگر وہ خدانخواستہ قبول نہ کرنا چاہیں تو پھر... اللہ کرے ایسا نہ ہی ہو ان کے سینوں میں سہیل جیسا دل نہ ہو۔"

نزہت نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا اب پلیز تم آ کر لیٹو تو' رات بہت ہو چکی ہے۔ تمہیں اب ریسٹ کرنا چاہیے بہتر ہے نیند کی گولی لے لو۔"

"ہاں دے دو۔" وہ خود بھی ان تکلیف دہ سوچوں سے نجات پانا چاہتی تھی۔ سلیپنگ پلز لینے کے بعد بھی اسے فوراً نیند نہ آئی۔

مختلف چہرے' بھولے منظر گول دائروں میں بنتے بگڑتے رہے' اس کا جسم آہستہ آہستہ بے جان ہونا شروع ہوا اگلا دن طلوع ہوئے بھی کئی گھنٹے گزر گئے مگر وہ بے خبر سوتی رہی اور راحیلہ جو اسے امی ابو کی آمد سے پہلے ہی یہاں سے بھیج دینا چاہتی تھی' اس کی نیند کی وجہ سے مجبور ہو گئی۔

آخر ساڑھے گیارہ بجے راحیلہ نے ہی اسے جھنجوڑ کر اٹھایا' ٹائم دیکھ کر وہ خود بھی حیران رہ گئی۔

راحیلہ اس کے لیے ناشتہ لینے گئی تو وہ منہ ہاتھ دھو کر آ گئی۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے' اب تو دن کا وقت ہے۔" ناشتے کے بعد اس نے چائے کا کپ رکھا ہی تھا کہ راحیلہ بول پڑی۔ وہ جلد اسے بھگا دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ امی ابو آ جاتے تو پھر بہت مشکل ہو جاتی' ابھی تو خالہ نے ہی ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ کنفیوز تھی۔

"نزہت! یہی بہتر ہے۔ باقی اللہ پر چھوڑ دو۔"

"راحیلہ! راحیلہ! کدھر ہو بھئی۔" اسی وقت راحیلہ کی امی کی آواز سنائی دی تو دونوں ہی اچھل پڑیں۔

"تم کمرے سے باہر نہ نکلنا بلکہ کمرہ اندر سے لاک کر لو میں ابھی آتی ہوں۔" وہ فی الفور دروازہ بند کر کے باہر بھاگ گئی اور نزہت کو پھر سوچوں کی منجدھار میں چھوڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

رات کے بارہ بجنے والے تھے اور نیند کیپٹن شہباز کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"کیا یہ چھوٹی بات ہے جسے میں بھلا دوں فراموش کر دوں۔" ہر پہلو پر جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔

"گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی نہیں بلکہ میری منکوحہ اسے میں اپنا لوں' صرف اس یقین کی بنیاد پر کہ اس کا ماضی اس سلسلے میں بے داغ ہے.... نہیں۔"

سوال و جواب کا عجب بھنور سا تھا' جس میں وہ ڈوب ابھر رہے تھے کہ انہیں کال بیل کی آواز سنائی دی۔

"اس وقت کون آ گیا۔ شاید میرا وہم ہے۔" انہوں نے ٹائم دیکھا۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ وہ دوسری گھنٹی کا انتظار کرتے رہے اور پھر تین منٹ بعد دوسری بیل بجی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

زیتون بانو شاید سونے جا چکی تھی ورنہ وہ تو پہلی بیل پر دوڑ کر دروازہ کھول دیتی تھی۔ زیتون بانو کے کوارٹر کی بجھی ہوئی لائٹ دیکھ کر انہوں نے سوچا اور گیٹ کی طرف بڑھے۔

"کون؟" ان کے ہاتھ ایک پل کو گیٹ کے لاک پر رکے۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

"کون ہے؟" اب کے انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

میں۔۔۔ میں ہوں۔" بہت مدھم۔۔۔ بہت باریک سی آواز۔
ان کے دل کی گھنٹی نے انہیں بہت کچھ بتادیا۔ انہوں نے اگلے پل گیٹ کھول دیا۔
ان کے سامنے زہت کھڑی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹی وہ سیاہ رات کا ہی حصہ معلوم ہو رہی تھی۔

● ● ● ● ●

"آمنہ!" وہ آواز تھی یا صور اسرافیل۔
اتنی بڑی حویلی جو انسانوں کے ایک جم غفیر سے بھری ہوئی تھی' ابھی چند پل پہلے قبل جب سید سلطان بخت نے اس کی کلائی پکڑی تھی تو کسی سوئے ہوئے محل کی طرح جامد و ساکت ہو گئی تھی۔ صرف حسیات کی دنیا آباد معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سینے میں دھڑکتے دل کی دھمک نیچے بجتے ڈھول کے شور سے بھی زیادہ تھی اور اس کی کلائی کا وہ حصہ جہاں سے سلطان بخت نے اسے تھام رکھا تھا' وہ زندہ تھا اور باقی اس کا تمام وجود جیسے برف کی سل بن چکا تھا اور کسی بے جان معمول کی طرح سلطان بخت کے ساتھ کھنچا چلا جا رہا تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا' کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مزاحمتی قوتیں سب کی سب سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی سلطان بخت کو پرے دھکیلنے یا خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی' بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے پیر و مرشد خدا کے بعد اپنے چچے بادشاہ کے ولی عہد کا یہ روپ دیکھتی رہ گئی تھی۔
اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان بخت یہ حرکت بھی کر سکتا ہے جبکہ اسے ابھی اس "حرکت" اور اس سے پیدا ہونے والے کسی بھی نتیجے کی خبر نہیں تھی۔ ابھی تو اس کے وجود میں جو جوان عمر کی تبدیلیاں آ رہی تھیں' وہ ان سے بے خبر تھی۔ چہ جائیکہ کسی مرد کا اس طرح اسے چھونا اور پھر کھینچ کر تنہا کمرے میں لے جانا بس خوف کی ایک بے پناہ طاقت تھی' جس نے اسے چہار جانب سے کسی آکٹوپس کی طرح اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا کہ اس کے منہ سے "سی" تک نہیں نکل سکا تھا۔ کلائی سے نیچے اس کا پورا بدن کسی ٹوٹی ہوئی ڈال کی طرح جھول رہا تھا' اس سے پہلے کہ اس پر وہ قیامت گزر جاتی جس کا تصور کیا گمان تک کا گزر اس کی سوچ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اماں جی کی گونج دار پکار نے اسے ہوش و حواس کی دنیا میں لا پٹخا۔ ہزاروں نفوس کے ساتھ وہ حویلی جو چند لمحے پہلے مردہ ہو چکی تھی' ایک دم سے پھر اپنے شور اور ہنگاموں کے ساتھ بیدار ہو گئی تو اسے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے۔ خوف' بے یقینی اور مسمریزم کے حصار کو اس پکار نے یک لخت ہی کاٹ ڈالا۔ وہ سلطان بخت کو پرے دھکا دینا ہی چاہتی تھی کہ اماں جی دروازے پر نمودار ہوئیں۔
"آمنہ!" ان کی آواز سے لگا وہ صرف آمنہ ہی کو دیکھ رہی ہیں' سید سلطان بخت کہیں سلیمانی ٹوپی پہن کر ان کی نظروں سے روپوش ہو چکے ہیں۔ جیسے ہی اماں جی کا وجود دروازے کی چوکھٹ پر ظاہر ہوا' سید سلطان بخت کو ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
وہ آگے بڑھیں اور ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لٹکتا آمنہ کا ہاتھ وہیں سے تھام لیا جہاں سے سلطان بخت نے چھوڑا تھا اور اسے تقریباً" کھینچتے ہوئے واپس مڑیں۔ سلطان بخت وہیں کسی قد آور پول کی طرح گڑے کھڑے تھے۔
"اگر بادشاہ ہی عوام کے گھروں میں نقب لگانے لگیں تو پھر کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا' شاید خدا پر بھی نہیں۔" دروازے کی چوکھٹ پر ایک لمحے کو رک کر گردن موڑے بغیر انہوں نے کانپتے لہجے میں کہا اور آمنہ کو کھینچ کر تیزی سے چوکھٹ عبور کر گئیں۔ ان کی رفتار بہت تیز تھی' جیسے کبھی جوانی میں وہ کسی اجنبی نامحرم شخص کی نگاہ کی غلاظت کو محسوس کر کے تیز قدموں سے رستہ بدل لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے سیڑھیاں بھی بہت روانی سے عبور کیں' سیڑھیاں اترنے کے دوران ایک بار بھی ان کے گھٹنوں نے کسی تکلیف کی شکایت نہیں کی کہ جو تکلیف وہ منظر وہ دیکھ کر آئی تھیں' اس کے بعد انہیں اپنے بدن کی کسی تکلیف کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔
آمنہ کی زبان لکڑی کی طرح اس کے تالو ہی سے چپک کر رہ گئی تھی' کوشش کے باوجود وہ اپنی صفائی میں اماں جی سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اماں جی اسے اسی طرح گھسیٹتی ہوئی اس جگہ لے آئیں جہاں عورتیں کھانا کھا رہی تھیں۔ منظر ابھی بھی وہی تھا جو وہ چند لمحے پہلے چھوڑ کر گئی تھیں۔ کھانوں سے سجی میزیں اور ان پر ٹوٹتی خلق

اگرچہ اب اس کی شدت میں کمی آ چکی تھی مگر انہماک میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ سب ہی گوشت' مرغی بھنبھوڑنے میں لگی ہوئی تھیں۔ کسی نے بھی اماں جی یا آمنہ کی آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا تو ان کے چہروں پر گزرتی آفت کو دیکھنے کی فرصت کسے تھی۔
اماں جی نے پہلی رو میں ذرا آگے کھڑی زینب کا کندھا زور سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ ابھی بھی بے تحاشا کھاتے ہوئے ثریا سے محو گفتگو تھی۔ اس مداخلت پر تڑپ کر مڑی کہ کھینچنے والے کو بے نقط سنائے۔ اماں جی کا متغیر چہرہ اور ساتھ میں اڑی رنگت لیے کھڑی آمنہ کو دیکھ کر اس کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا۔
"چلو گھر۔" ان کی دھیمی سی گھرکی میں کیا تھا کہ زینب کچھ پوچھ ہی نہیں سکی۔
"ثریا! میں ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر وہ اماں جی اور آمنہ کے پیچھے چل پڑی۔ اماں جی کی رفتار اب نارمل تھی۔ اگر وہ اس رفتار سے دوڑتیں تو سیدہ ضرور انہیں جالیتی اور پھر سیدہ کی انکوائری کو بھگتانا ناممکن ہو جاتا تھا۔
"اماں جی! اماں جی! کیا ہوا ہے؟" زینب بھاگ کر ان سے آملی۔
"کچھ نہیں' ہم گھر جا رہے ہیں۔"
وہ اسی سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے ہال کمرے کے دروازے کے پاس۔۔۔ گاجر کے حلوے کی پلیٹ اٹھائے کھڑی جویریہ کی طرف بڑھیں۔
"جویریہ! ادھر آؤ۔" ان کی آواز خاصی اونچی تھی اور جویریہ تو ان کے غصے سے بہت ڈرتی تھی جو انہیں بہت ہی کم آتا تھا مگر بہت شدید آتا تھا۔ وہ پلیٹ وہیں چوکھٹ پر رکھ کر ان کی طرف مڑی۔
"جی اماں جی!" وہ سعادت مندی سے بولی۔
"ہم گھر جا رہے ہیں' دروازے پر دیکھو' جلیل ہے تو اس سے کہو ہمارے لیے تانگہ کروا دے' نہیں تو ہمارے ساتھ پیدل ہی چلے۔ دوڑ کر جاؤ دروازے کی طرف۔" وہ حکمیہ لہجے میں بولیں تو جویریہ کو دوسری بات پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ الٹے قدموں دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگ گئی۔
"چادریں لے لو تم دونوں۔" وہ ہال کمرے کے کھلے طاق سے اپنی چادر اٹھاتے ہوئے بولیں۔ دونوں نے بڑھ کر اپنی چادریں اٹھائیں اور اچھی طرح اوڑھنے لگیں۔
"اماں جی! کیا ہوا ہے؟" زینب سے رہا نہ جا سکا تو پھر سے بولی۔
"کچھ نہیں اور اب دوبارہ کچھ نہیں پوچھنا۔" وہ کچھ غصے سے بولیں تو زینب خاموش ہو گئی۔
"تم کہاں چلی گئی تھیں' تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔" وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی تھی' ڈیوڑھی کے پاس پہنچ کر آمنہ سے بولی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا' اس کی کلائی ابھی تک اماں جی کے ہاتھ میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس نے چادر بھی ایک ہاتھ سے اوڑھی تھی۔
"کیا اماں جی کو خیال ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گی' اگر انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑا تو۔" اس نے خود سے ایک قدم آگے جاتی اماں جی کو دیکھ کر سوچا۔
"پتا نہیں کیا آفت آ پڑی ہے۔ کوئی بھی خوشی ڈھنگ سے منانے نہیں دیتا کوئی۔" زینب دونوں کو چپ دیکھ کر بڑبڑائی۔
"اماں جی! کہاں جا رہی ہیں اس وقت؟" پاس سے گزرتی گاؤں کی ایک عورت نے رک کر پوچھا۔
"گھر۔" وہ مختصر جواب دے کر آگے بڑھ گئیں۔ وہ عورت حیرت سے انہیں دیکھے گئی۔ اس وقت لوگ گھروں سے آ رہے ہیں' یہ گھر جا رہی ہیں۔ وہ حیران ہوتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔
"اماں جی! جلیل مل گیا تھا' وہ تانگہ لینے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا پیدل نہیں جا سکتے' بہت کیچڑ ہے' آپ دروازے تک پہنچیں گی تو وہ تانگہ لے آئے گا۔"
جویریہ بھاگی بھاگی واپس آئی اور انہیں بتانے لگی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ اماں جی نے کوئی جواب نہ دیا

اور بڑے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ جویریہ ان سے ذرا پیچھے ہو کر زینب کے ساتھ چلنے لگی' اب دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ یقیناً" ایک دوسرے سے اس اچانک واپسی کا سبب پوچھ رہی ہوں گی۔ وہ دروازے تک پہنچیں تو جلیل وہاں موجود تھا۔

"تانگہ لے آیا ہوں اماں جی!" وہ نظریں جھکا کر مؤدب لہجے میں بولا۔ اماں جی ہولے سے سر ہلا کر باہر کھڑے تانگے کی طرف بڑھ گئیں۔ اماں جی اور آمنہ پیچھے بیٹھ گئیں جبکہ زینب اور جویریہ آگے بیٹھ گئیں۔ تانگہ چل پڑا۔ جلیل آگے دوسرے پائیدان پر کھڑا تھا۔ آسمان پر ستارے نکل آئے تھے۔ بارش کے بعد کا آسمان بہت نکھرا نکھرا لگ رہا تھا جیسے اس پر کبھی بادل آئے ہی نہیں تھے۔ دور سے جھینگر کے بولنے اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جوں جوں تانگہ حویلی سے دور ہو رہا تھا' روشنی اور آواز معدوم ہوتی جارہی تھیں۔ حویلی سے باہر رات اپنے اندھیرے کے ساتھ جوان ہو چکی تھی' شاید گیارہ بجے کا ٹائم تھا۔ تقریباً" سارا گاؤں تو حویلی میں دعوت اڑا رہا تھا۔ اکثر گھروں میں روشنی بھی نہیں جل رہی تھی۔ تانگہ کچی پکی کیچڑ زدہ پگڈنڈیوں پر چلتا جارہا تھا۔ چونکہ تانگے میں بیٹھے سبھی سوار خاموش تھے' اس لیے بھی فضا کی خاموشی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ صرف گھوڑے کے ٹاپوں کی تھوڑی بہت آواز جب کیچڑ کے نیچے کوئی پکا ٹکڑا آجاتا یا پھر پہیوں کی چر چر ہوتی۔ ایسی ہی خاموش بھیانک فضا آمنہ کے اندر چھائی جارہی تھی۔ ایسی خاموشی جس کا مفہوم نہیں ہوتا' بس خوف ہی خوف تھا' اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے کی طرح۔ وہ اپنی قمیص کے دامن کو یک ٹک گھورے جارہی تھی' جیسے اس میں کچھ کھوج رہی ہو۔

اماں جی کے اندر باہر کی اس خاموش فضا کے برعکس ایک طوفان بپا تھا۔

"اگر مجھے کچھ دیر ہو جاتی؟" سب سے بلند آواز اس خدشے کی تھی۔

"اگر خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو صوفی صاحب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ اگر وہاں میرے بجائے کوئی اور آجاتا' وہ یہ سب دیکھ لیتا..... وہ تو بڑا آدمی ہے' اس کو کسی نے کیا کہنا تھا' جو چاہے وہ سب کچھ کر گزرتا۔ میری بچی کی زندگی برباد ہو جاتی' میں کس کے پاس فریاد لے کر جاتی۔" وہ خود سے ہی الجھی جارہی تھیں۔

"یہ آمنہ ادھر گئی ہی کیوں۔ یہ بچی تو نہیں ہے' اتنی سمجھ نہیں اس میں۔ اس کو تو میں گھر جا کر ٹھیک کروں گی۔" کبھی وہ غصے سے بت بنی آمنہ کو گھورنے لگتیں۔

"میں صوفی صاحب کو کیا بتاؤں گی' وہ سنیں گے تو....."

"وہ کیا کر سکیں گے۔ جیسے میں خاموشی سے اپنی عزت سنبھال کر چلی آئی' اسی طرح وہ بھی چپ کر جائیں گے۔ شور تو زور آوروں کا ہوتا ہے' کمزور کب کچھ بول سکتا ہے۔ بولے گا تو اس کی سنے گا کون؟"

وہ خود ہی سوال جواب کے بھنور میں چکرا رہی تھیں۔ رستہ بھی تو طویل ہو گیا تھا۔ انہوں نے اکتا کر کچے پکے دلدلی رستے کو دیکھا جس میں تانگہ ادھر ادھر ڈولتا جارہا تھا۔

"پتا نہیں اماں جی پر اب کون سی وحی اتری ہے' اچھا بھلا کھانا ابھی شروع ہوا تھا۔ گاجر کا حلوہ تو میں نے چکھا بھی نہیں۔ ملنجن اور سبز چائے کی خوشبو کتنی اچھی تھی۔ ابھی تو ڈھولک بجنی تھی' مہندی لگنی تھی۔ یہ اٹھا کر لے آئیں' واپس اسی قید خانے میں۔"

زینب دل ہی دل میں جھنجلا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اماں جی سے لڑ پڑے۔ جویریہ پر بچپنے کی نیند حاوی ہونے لگی تھی۔ وہ زینب کی گود میں لڑھکتی جارہی تھی' زینب نے کچھ ناگواری سے اسے دیکھا۔ یوں اسے سوتا دیکھ کر اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر لیا' کہیں نیچے کیچڑ ہی میں نہ لڑھک جائے۔

آخر خدا خدا کر کے تانگہ گھر کے دروازے کے آگے جا کر رکا' جلیل نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"جلیل! چابی لائے صوفی صاحب سے؟" اماں جی کیچڑ سے بچ کر نیچے اترتے ہوئے بولیں۔

"دروازہ کھلا ہے جی۔" جلیل دروازے کے قریب پہنچ کر بولا۔

"دروازہ کھلا ہے' کیوں خیریت تم آخر میں تالا تو ڈال کر گئے تھے پھر دروازہ کس نے کھولا۔؟" وہ حیرت زدہ سی آگے بڑھ کر بولیں۔

"عبدالمبین اندر ہے جی۔" وہ اسی طرح سر جھکائے بولا۔

"کیوں؟ وہ کیوں آیا' وہ تو شادی میں گیا تھا۔" ان کے اندر بڑھتے قدم تھم گئے۔

"وہ جی۔" جلیل جھجک گیا۔

"کیا ہوا اسے' طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی؟" وہ پریشان ہو گئیں۔

"وہ جی صوفی صاحب نے اسے مارا تھا تو ماسٹر صاحب کے کہنے پر میں اسے گھر چھوڑ گیا تھا۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

زینب نے بیزاری سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "یہ تو بابا صاحب کا روز کا کام ہے' کون سی نئی بات ہے ہونہہ!" وہ بڑبڑائی۔

"موقع محل بھی نہیں دیکھتے صوفی صاحب! اب بھلا سب کے سامنے بچے کا تماشا لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر وقت کی مار کٹائی اسے باغی کر دے گی اتنا نہیں سوچتے۔ وہ جوان ہو رہا ہے' بچہ نہیں رہا اب وہ۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر کی طرف بڑھیں۔ ان کے بائیں ہاتھ میں ابھی تک آمنہ کی کلائی تھی۔ درد سے اس کا برا حال تھا۔ یوں لگ رہا تھا ان کے ہاتھوں کی گرفت اس کی کلائی ہی توڑ دے گی مگر وہ اماں جی سے ہاتھ چھڑا بھی نہیں سکتی تھی۔

"کیا کیا تھا عبدالمبین نے؟" وہ مڑ کر دروازے سے باہر کھڑے جلیل سے بولیں۔

"وہ جی گانا گا رہا تھا دوستوں کے بیچ میں' صوفی صاحب نے سن لیا۔ انہیں غصہ آگیا تو....." وہ چوکھٹ کے قریب ہو کر بولا۔

"جب ہو گئی' ایسا کون سا جرم کر ڈالا تھا اس نے۔ شادی کا موقع تھا اور یہ بھی کوئی نہ کوئی غلط حرکت کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اب بھلا گانا گانا اسے زیب دیتا ہے۔ اللہ کے پاک کلام کو سینے میں اتار رہا ہے' کون سمجھائے آج کل کی نادان نسل کو۔ ماں باپ کی عزت کو دو کوڑی کا کر دیتی ہے۔ دروازہ بند کر کے تم جاؤ واپس۔"

وہ اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے اندر کی طرف مڑ گئیں۔ زینب اور جویریہ پہلے ہی کمرے میں جا چکی تھیں۔ آمنہ تو ان کے ساتھ گھسٹتی چلی آرہی تھی۔

اماں جی نے کمرے میں جا کر آمنہ کو بان کی کھری چارپائی پر ایسا دھکا دیا جیسے وہ کوئی ربڑ کی گیند ہو۔ وہ ذرا سا اچھلی اور پھر وہیں سر جھکا کر ساکت بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں اپنی سرخ بوٹی کی طرح دکھتی کلائی پر جمی تھیں۔

"مجھے تم سے کم از کم یہ امید نہیں تھی آمنہ! تم کوئی بچی تو نہیں تھیں جو اس کے ساتھ اٹھ کر چل پڑیں اور....."

اماں جی کو غصے کی وجہ سے آگے کے کوئی الفاظ نہیں سوجھے تو خود بھی دوسرے بستر پر بیٹھ گئیں۔ پریشانی میں وہ چادر بھی اتارنا بھول گئی تھیں۔ غصے اور رنج سے ساکت بیٹھی آمنہ کو دیکھے جارہی تھیں جو کوشش کے باوجود ان سے اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

"اماں جی! میرا کوئی قصور نہیں تھا' میں تو....." آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا اس کا گلا درد سے پھٹ جائے گا۔ اگلے ہی پل ٹپ ٹپ آنسو اس کی لال سرخ کلائی پر گر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"واہ نین جی واہ' بالکل اسی طرح گانا ہے اب آپ نے جیسی ریہرسل کی ہے مگر "کو" کی لے کو تھوڑا بڑھا کر اور "دل" پر مائیک کو ذرا ہونٹوں کے پاس کر کے کہ آواز میں جذبات کی پوری شدت ابھرے' آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔ اس طرح سے مائیک کو ہونٹوں کے قریب لا کر آنکھوں میں جذباتیت سمو کر اور....."

قریشی اپنے بے ہنگم وجود کے ساتھ اس کے اوپر ہی گر رہا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پرفیوم کی بہت تیز حسیات کو چیرتی ہوئی خوشبو اٹھ رہی تھی تو منہ سے غلیظ بو کے بھبکے آرہے تھے۔ اس کے گٹر کے منہ جیسا بڑا سا دہانہ جب نین تارا کے منہ کے بالکل قریب آکر کھلتا تو اس کے پیلے کالے بدنما اونچے نیچے دانت صاف نظر آتے۔ تمباکو' پان' سگریٹ اور شاید کثرت نوشی سے کالے سیاہ مسوڑھے ان دانتوں سے دور کھسکے جارہے تھے اور جو بدبو آتی نین تارا کو لگا اگر وہ چند منٹ اور اس بدبو کے گٹر کو برداشت کرتی رہی اس کا یا تو دماغ پھٹ جائے گا یا وہ اسے دھکا دے کر ادھر سے بھاگ جائے گی یا پھر اسے بہت زور کی ابکائی آجائے گی۔ وہ جو اس پر تعریف کے ڈونگرے برسائے جارہا تھا' وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ اس پائے کی سنگر ہے نہ قریشی کی اتنی قربت اسے کچھ بھی اچھا گانے دے رہی ہے۔ وہ محض چاپلوسی میں اس کی تعریف کیے جارہا تھا اور زیور گل سامنے نرم گداز صوفے میں دھنسی قریشی کے منیجر کی فراہم کردہ ریفریشمنٹ سے پورا پورا انصاف کررہی تھی۔ نین تارا کے منہ کے بگڑتے زاویے شاید دور سے اسے نظر نہیں آرہے تھے۔

"ایسے اس طرح مائیک کو پاس لائیں۔ ہاتھ ذرا سا لہرا کر آنکھوں میں نشہ سا تو......"

"قریشی صاحب! اسٹاپ اٹ!" وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ "میں یہاں گانا گانے آئی ہوں' ایکٹنگ کرنے نہیں آئی جو آپ مجھے مسلسل ہدایات دیے جارہے ہیں۔ ہونٹوں کو موڑ کر' آنکھوں کو جھکا کر' ابرو کو لہرا کر وغیرہ وغیرہ۔ اگر اسی طرح گانا گانا ہے تو فار گاڈ سیک مجھے معاف کریں' آپ کسی اور سنگر سے گانا گوالیں۔"

وہ اس سے دس فٹ دور پڑی کرسی پر دھم سے جا بیٹھی۔ قریشی اس کے تیور دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔

دل میں غصہ تو بہت آیا "بالشت بھر کی چھوکری نہ گلے میں سُر نہ آواز میں لے اور اتراہٹ دیکھو جیسے ملکہ ترنم اس کو اپنا جانشین بنا کر گئی ہیں' کمبخت قابو میں ہی نہیں آرہی۔ گوری چمڑی اور چکنے بدن کا وار دوزخ اس جیسی تو ہر روز میں دس جیب میں لیے پھرتا ہوں' نمبرون ہیروئن کا جھانسا دلا کر۔ اور یہ بڑھیا مکار بھونکے جارہی ہے۔ پیٹ کا دوزخ اس کا بھر نہیں رہا اور دیدے بیٹی کی نگرانی پر لگے ہیں۔ کوئی بات نہیں زیور گل! دکھا لو جس قدر ہوشیاری دکھانی ہے۔ میرا نام بھی قریشی ہے نا اس الہڑ تتلی کو بھرے پرے گلشن سے مٹھی میں بند کرکے لے گیا تو میرا نام بدل دینا۔ سارے رنگ اس کے چرا کر نہ تیری اور اس کی اتراہٹ کو خاک میں ملایا۔ بس تھوڑا سا انتظار اور قریشی!"

وہ دل میں بل کھاتے ہوئے خود کو دلاسا دے کر آگے بڑھا۔

"نین جی! آئی ایم سوری آپ کو غصہ آگیا۔ جوانی کا غصہ ہے نا' پل پل من میں سماتا ہے۔ اصل میں میں بھول گیا تھا کہ آپ کوئی اناڑی گانے والی نہیں ہیں' جو مجھے یوں ہدایات دینی پڑیں۔ اصل میں سرمایہ بہت لگا بیٹھا ہوں نا اس فلم میں۔ پاکستان کی پہلی اتنی مہنگی فلم بن رہی ہے' اس لیے دل ڈر تا رہتا ہے۔ خدشوں میں گھر جاتا ہے کہ چلو ڈبل نہ سہی جو لگایا ہے وہی وصول کرلوں تو یہ تجربہ برا نہیں۔ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے' بھول نہ رہ جائے ایکٹنگ میں' سنگنگ میں۔ بس عجب وہمی سا ہو چلا ہوں آن دنوں۔"

وہ ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے لگاوٹ سے بولا۔

"آپ کو ناگوار گزرا' میں معذرت خواہ ہوں۔ اب آپ غصہ تھوک دیں اتنے حسین مکھڑے پر یہ ناراضی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں تو بس میٹھی میٹھی مسکان ہی سجتی ہے' کیوں گل جی!" وہ پھر سے اس کے قریب چلا آیا تھا اور زیور گل نے جو دور سے بیٹی کے بگڑے تیور دیکھے تو گھبرا کر چلی آئی۔

"کیا ہوا نینو! آر یو آل رائٹ' مائی لونگ چائلڈ۔" وہ گھبرائی گھبرائی سی اس کے اوپر آجھکی اور بڑے لاڈ سے اس کا غصیلا بیزار چہرہ چوم کر بولی۔

"یس مام!" وہ بیزاری سے کہہ کر گردن گھما کر قریشی کی مخالف سمت میں دیکھنے لگی'

"آیئے نا نین جی! اب میری توبہ' مزید انسٹرکشنز ___ (ہدایات) نہیں دوں گا۔ کمبخت نالائق' سنگرز کے ساتھ کام کرکے عادت پڑ گئی ہے خوامخواہ اس زبان کو چلنے کی ورنہ آپ کی بات تو دوسری ہے۔ بتائیں نا گل جی! بے بی

کو۔" اس نے زیور گل کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی' اگرچہ دل میں بہت کلس رہا تھا' اتنے ناز تو اس نے کسی ہیروئن کے بھی نہیں اٹھائے تھے۔ یوں من من کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ لڑکیاں تو خود اس کے قدموں میں بچھ بچھ جاتی تھیں۔ سب سے کامیاب ہدایت کار تھا وہ آج فلم انڈسٹری کا۔

"لگتا ہے ننھاں! تھک گئی ہے۔ صبح سے تو کام کررہی ہے۔ مسلسل دو گھنٹے سے آپ کی ریہرسل ہی ختم نہیں ہو پارہی۔ گیارہ بجے سے شروع ہوئے تھے اور اب دو بجنے کو ہیں۔ قریشی جی! میرا خیال ہے اتنی ریہرسل کافی ہے' آج پہلا دن ہے نا اور تارا کو تو عادت بھی نہیں ہے اتنا کام کرنے کی' گھر میں بھی ماسٹر صاحب صرف ایک گھنٹہ ریاض کرواتے ہیں پھر دو تین گھنٹے ریسٹ کے دیتے ہیں۔ بہت نازک ہے میری بچی' آپ اس کو اپنی وہ دو دو تین تین من کی ہیروئن یا سنگر نہ سمجھیں جن کا سارا زور اپنا وزن بڑھانے پر ہوتا ہے اور کام زیرو۔ اور میری بچی کا تو آج پہلا دن ہے' کیوں نینو! تھک گئی ہو نا؟؟"

وہ ایک بار پھر نین تارا پر جھکی۔

"ارے لڑکے! ایک گلاس ایپل جوس کا تو لاؤ' کچھ اس میں جان پڑے۔ دیکھو ان تین گھنٹوں میں اتنی سی شکل نکل آئی ہے میری بچی کی۔"

زیور گل کے لاڈ پر قریشی کو آگ ہی لگ گئی مگر کیا کرتا' اس آگ کو رستہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تو وہ دونوں آئی تھیں۔ ایک گھنٹہ پھر سے میک اپ فریش کرنے میں لگایا صرف پینتیس منٹ کی ریہرسل ہوئی تھی جس میں یہ نازک پری تھک کر چور ہوگئی تھی اور اب قریشی کو نظر آرہا تھا کہ یہ بیل مشکل سے منڈھے چڑھے گی' چلو اچھا ہے نہ گائے۔ گانے تو میں کسی سے کروا ہی لوں گا مگر یہ ہاتھ آئے تو سہی۔ جس کے لیے اتنی موٹی رقم کا چیک اس حرام خور بڑھیا کو لکھ کر دیا تھا۔

قریشی نے نظر بھر کر نین تارا کے نازک بدن کو دیکھا' اس کے سارے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ دل چاہا یہاں کھڑے کھڑے اپنا سارا بدن کھرچ ڈالے۔ عجب سی وحشت اس کے سر پر سوار ہورہی تھی۔ نظروں میں صرف نین تارا کا گڑیا سا بدن سما گیا تھا' باقی سب لوگ آوٹ آف فوکس ہوگئے تھے۔

"چلو چندا! جوس پی کر گھر چلتے ہیں' تم جاکر ریسٹ کرو' کہیں تمہاری طبیعت ہی خراب نہ ہوجائے۔ مجھے اپنی بچی کی صحت سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں' کیوں قریشی! ٹھیک ہے نا؟"

نین تارا اپنے چھوٹے سے دہانے سے ایپل جوس کے ننھے ننھے سپ لے رہی تھی۔ زیور گل کی آواز نے ایک بار پھر سارے منظر میں جان بھر دی تھی۔ سب پھر سے قریشی کو اپنی جگہ پر نظر آنے لگے۔ بیزار بیٹھے کیمرہ مین' ریکارڈنگ روم میں بیٹھے آڈیو ایڈیٹر اور کرسی پر بیٹھی نین تارا اور اس پر جھکی زیور گل۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ نین تارا تک رسائی ناممکن نظر آرہی تھی۔ قریشی کی سانسیں ناہموار ہونے لگیں۔ فرسٹریشن کو یہی رستہ نظر آیا تھا' وہ ہانپتے ہوئے صوفے پر ڈھے گیا اور جیب سے Inhaler (دمے کے مریضوں کے لیے دوا) نکال کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس پر استھما کا شدید دورہ پڑا تھا۔ زیور گل نے بیزاری سے اس گوشت کے پہاڑ کو دیکھا اور نین تارا کو اٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔

"مام! آپ نے مجھے یہ کس فضول کام میں لگا دیا ہے اور یہ بندہ سب سے بڑھ کر فضول ہے۔ اف مائی گاڈ! اس بیہودہ شخص کو برداشت کرنے کے لیے پتھر کے اعصاب ہونے چاہئیں۔ مام! میں اس کے ساتھ کام نہیں کرسکتی۔"

اسٹوڈیو سے نکلتے ہی نین تارا شروع ہوگئی' وہ سخت بیزار تھی۔ شاہ جی کی بے اعتنائی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے جو ایڈونچر شروع کیا تھا' اس کا پہلا موڑ ہی اسے انتہا درجے کی کوفت میں مبتلا کرگیا تھا۔

"نین تارا! یہی شخص تمہارا انڈسٹری میں مقام بنائے گا' تم یہ کیوں بھول جاتی ہو۔ اس وقت یہ انڈسٹری کا سب سے مضبوط پلو ہے۔ یہ کرے گا تو انڈسٹری ملبے کا ڈھیر بن جائے گی اور دوسرے ہم اس سے ایڈوانس کے طور پر

ساری رقم لے چکے ہیں۔ اب تو ایگریمنٹ پورا ہی کرنا پڑے گا۔" زیور گل نے اسے سمجھایا۔

"میں ایسے کسی سمجھوتے کو نہیں مانتی۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود ہے کہ میں اس بے ہنگم شخص کے منہ پر مار سکوں۔ مام! مجھے اس شخص کے ساتھ کام نہیں کرنا۔ دوسرے گانا بے حد مشکل کام ہے اور محنت طلب بھی۔ مجھ سے نہیں ہوگا اور اس طرح تو بالکل بھی نہیں ہوگا جس طرح کی آس آپ لگا کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ تیسرے میں خود کو بہت گلٹی فیل کرتی ہوں کہ میں نے شاہ جی کو چیٹ کیا ہے۔ جس دن انہیں میرے اس دھوکے کا علم ہو گیا' ان کا اعتبار ہی مجھ سے اٹھ جائے گا۔ اس وقت آپ تو پیچھے ہٹ جائیں گی' میں ہی شاہ جی کی نظروں میں معتوب ٹھہروں گی۔ وہ ویسے بھی اسی ہفتے واپس آ رہے ہیں اور یہ ریہرسل وغیرہ میں ان کی موجودگی میں تو بالکل نہیں کر سکتی۔ کسی نہ کسی دن بات کھل جائے گی اور نتیجہ کیا ہوگا۔ مجھے اس نتیجے کی پروا زیادہ ہے۔ ہر بات سے زیادہ مام! میں شاہ جی کی محبت سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔ مام! He is my love (وہ میری محبت ہیں) میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی اور ان کو دھوکا دینے کا مطلب ہے ان کی محبت سے محرومی اور یہ میں کسی صورت میں گوارا نہیں کروں گی۔ میں کل ریہرسل پر بالکل نہیں آؤں گی۔ آپ اس گوشت کے پہاڑ سے ایگریمنٹ کینسل کرا دیں۔"

گاڑی جیسے ہی پورچ میں رکی نین تارا نے اپنی بات ختم کی۔ گاڑی کا دروازہ کھولا اور تیز قدموں سے اندر کی طرف بڑھ گئی زیور گل کا جواب سنے بغیر۔

"شاہ جی کے بغیر نہیں رہ سکتی' شاہ جی کی ایسی کی تیسی اور تیری بھی۔ وہ چھنانک کی لڑکی مجھے بتاتی ہے کہ میں محبت کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تیری ایسی محبت کو میں آگ نہ لگا دوں گی جو ہمارے پیشے کے درمیان حائل ہوگی۔ نین تارا تو میری بیٹی ہے تو یاد رکھ میں تیری ماں ہوں اور ہمارا پیشہ صرف دھن ہے' میں خود کبھی چاہتی ہوں تو شاہ جی کے بغیر نہ رہ سکے مگر ایک شاہ جی نہیں..... ہر موڑ پر جتنے شاہ جی ملیں' وہ سب تیرے لیے ضروری ہو جائیں کہ یہ کمبخت لکشمی شاہ جی جیسوں پر مرتی ہے اور میں اس لکشمی دیوی پر۔ ساری عمر اس کے تعاقب میں گزار دی ہے' اب تو یہ قابو آئی ہے۔ ایسے کیسے ہار مان لوں۔ دیکھتی ہوں کون فتح یاب ہوتا ہے۔ تیری محبت یا میری دیوانگی۔"

زیور گل غصے سے بھناتے ہوئے گاڑی سے اتری اور نین تارا کے پیچھے چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں رابعہ بی بی!" صوفی صاحب کی حیرت بھری آواز خاموش فضا میں گونجی۔ "تمہارا اشارہ آدھی رات کو دماغ چل گیا ہے' جو ایسی غلط بات کر رہی ہو۔ کیا ایسے ہو سکتا ہے' میں نہیں مانتا۔ تم کو غلط فہمی ہوئی ہوگی' وہ کوئی اور ہوگا۔"

یہ بات جتنی صوفی صاحب کے لیے شاکنگ تھی' اس سے زیادہ عبدالمبین کے لیے تھی۔ وہ درد سے بے حال ہوا جا رہا تھا' کمر جیسے اس کی کھال چھلی جا رہی تھی اور زخموں پر کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ سیدھا تو لیٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور کروٹ لیتا تو کمر کا درد بے حال کر دیتا۔ دائیں طرف کمر کے اندر جیسے کسی نے بھاری سی اینٹ رکھ دی تھی اور سر میں علیحدہ دھنا دھن پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ کبھی سر کے بیچ' کبھی کنپٹی میں تو کبھی گردن کے اوپر۔ صوفی صاحب کا ہاتھ بھی تو بہت بھاری تھا پھر مارنے کا پچیس تیس سالہ تجربہ..... کوئی بھی وار چوکتا نہیں تھا اور عبدالمبین کو تو حیرت تھی کہ اس کی مار پیٹ کا سننے کے باوجود اماں جی اس کے پاس نہیں آئی تھیں۔ شادی سے لوٹ آنے کے بعد بھی وہیں اپنے کمرے میں تھیں' اس کا پتا کرنے بھی نہیں آئی تھیں۔ وہ کتنی دیر تک بے چینی سے ان کا انتظار کرتا رہا تھا۔ گھر آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ تینوں سو بھی گئی تھیں۔ گھر کی مکمل خاموشی بتا رہی تھی۔ اسے غصہ آ گیا۔

"کسی کو بھی میرا خیال نہیں' اماں جی کو بھی مجھ سے پیار نہیں۔ ان سے اتنا نہیں ہو سکا کہ آ کر میرا پتا ہی کر لیں۔ مجھے گھر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ کوئی گھر ہے جہاں میری ضرورت ہی نہیں پھر میں ادھر کیوں آ جاتا ہوں۔"

باغیانہ خیالات کے ساتھ ہی اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کافی دیر گزر گئی اس نے آنسو خشک کر لیے۔

"مجھے خود جانا چاہیے اماں جی کے پاس اور انہیں بتاتا ہوں میں صبح ہی یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور پھر واپس نہیں آؤں گا۔"

وہ دل میں ارادہ کر کے چارپائی سے اٹھا۔ درد کی ٹیس کی وجہ سے اس کے منہ سے "سی" کی آواز نکلی۔ اپنی بے بسی پر اور دل بھر آیا۔ وہ بمشکل اٹھ کر دروازے تک ہی گیا تھا کہ اسے صوفی صاحب کے کھنکھارنے اور گھر میں داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے قدم وہیں جم گئے۔ صوفی صاحب با آواز قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"اب یہ اماں جی سے میری خوب شکایت لگائیں گے' اپنی طرف سے سارا قصہ بڑھا چڑھا کر بیان کریں گے جو کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری کریں گے۔ کہیں پھر نہ دوبارہ میری مرمت کرنے ادھر آ جائیں۔ ابھی ان کا دل بھرا ہی کہاں تھا' اگر باسط صاحب ہاتھ نہ روک لیتے تو ان کا وحشی پن اتنی جلدی کب اترتا ہے۔ پتا نہیں کون کون سے بدلے مجھ سے لیتے رہتے ہیں۔ عبدالمتین صحیح رہا ہے نا جو شہر چلا گیا ہے ان کے مظالم سے جان چھڑا کر۔"

وہ تنفر سے سوچتا ہوا ان کے کمرے کی طرف بڑھا' کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ اماں جی آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھیں۔

"تو اماں جی جاگ رہی ہیں پھر بھی میرا پتا نہیں کرنے آئیں۔ یہ بھی بابا صاحب کی چمچی ہیں' ان کی خفگی کے ڈر سے میرے پاس نہیں آئیں۔ کیا فائدہ ایسی ماں کا۔ مجھے تو لگتا ہے میں ان دونوں کا بیٹا ہی نہیں' انہوں نے مجھے کسی کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا ہوگا۔ اسی گناہ کی سزا دے رہے ہیں یہ مجھے۔" اماں جی کے جاگنے کا پتا چلتے ہی وہ سلگ گیا۔ غصے سے سوچتا ہوا کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا کہ اپنے متعلق مزید ان دونوں کے خیالات جان سکے۔

"میں خدا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اس نے ہماری عزت داغدار ہونے سے بچالی۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتی تو آمنہ چھوٹے شاہ جی کی عیاشی کی نذر ہو جاتی۔ صوفی صاحب! ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے' ان کو تو کوئی اف بھی نہ کرتا۔ میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی کہ چھوٹے شاہ جی کو نہ پہچان سکوں اور آپ کہہ رہے ہیں مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ابھی اتنی نہیں سٹھیائی میں۔"

اماں جی کے منہ سے انوکھا انکشاف سن کر وہ اپنی جگہ جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ اماں جی بولتے بولتے اب رونے لگی تھیں۔ صوفی صاحب بھی حیرت زدہ سے چپ تھے۔ کتنی دیر تک تو ان کے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا۔

"بس کھانے کا پہلا لقمہ اٹھاتے ہی میرے دل کو کچھ ہوا کہ میں آمنہ اور زینب کو دیکھوں۔ دونوں شہرینہ کے ساتھ دلہن کا کمرہ دیکھنے گئی تھیں۔ زینب تو وہیں مجھے کھانا کھاتی نظر آ گئی مگر آمنہ مجھے نہ مل سکی اور میرا دل کہے جا رہا تھا' کچھ غلط ہونے والا ہے۔" اماں جی نے زور سے اپنی ناک رگڑی۔

"تم نے ان دونوں کو شہرینہ کے ساتھ جانے ہی کیوں دیا۔" صوفی صاحب کی لرزتی ہوئی آواز کمرے کی تاریک فضا میں ہولے سے ابھری۔

"لڑکیاں بالیاں ہیں' شوق ہوتا ہے انہیں دلہن کا کمرہ دیکھنے کا۔ اب مجھے کیا علم کہ یہ..... مجھے تو سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے چھوٹے شاہ جی..... انہوں نے آمنہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا' اسے کمرے میں لے جا چکے تھے اور شاید دروازہ بند کرنے لگے تھے کہ میں نے آمنہ کا ہرا دوپٹہ دروازے میں سے اندر جاتے دیکھ لیا۔ میں نے اسے اسی پل پکار لیا تو اس شیطان کے قدم بھی رک گئے اور دیدہ دلیری دیکھیں کوئی شرمندگی' کوئی شرمساری نہیں۔ صوفی صاحب! اگر ہم جیسے لوگوں کی عزت یہاں محفوظ نہیں وہ بھی شاہوں جیسے بظاہر نیک لوگوں کے ہاتھوں تو عام آدمی کا سوچیں' پھر میں وہاں کیسے رکتی۔ میں اللہ پاک کا کیسے شکر ادا کروں۔"

وہ پھر سے رونے لگیں اور صوفی صاحب تو جیسے کچھ بول ہی نہ پا رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اس واقعے کی توجیہہ گھڑ رہے تھے شاید۔

"اس لیے تو جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو ایک بار دل کانپ جاتا ہے' ورنہ آمنہ جیسی بیٹیاں کبھی زندگی میں دکھ دے سکتی ہیں۔ اتنی اچھی' اتنی سعادت مند۔" اماں جی بولیں۔

"ہم نے آمنہ سے نہیں پوچھا' اس کا کیا کام تھا یوں اکیلے میں اوپر جانے کا۔ چھوٹی بی بی اسے چھوڑ کر کہاں گئیں۔" صوفی صاحب کافی دیر بعد بولے۔ شاید وہ ابھی بھی شاہ جی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہچکچا رہے تھے۔

"وہ تو اس قدر سہمی ہوئی تھی' میں اس سے کیا پوچھتی۔ صوفی صاحب! ہمارے گھر کا ماحول آپ کے سامنے ہے' کوئی غلط بات آپ کو کم از کم آمنہ کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ خدا جانے شہرینہ بی بی اسے یوں تنہا چھوڑ کر کیوں گئیں اور چھوٹے شاہ جی کہاں سے آ ٹپکے' یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر اب میرا دل تو بہت ڈر رہا ہے صوفی صاحب! ہم بہت کمزور لوگ ہیں' بہت کمزور۔ اگر ایسی کوئی بات خدانخواستہ پھر ہو جائے ہم تو کچھ بھی کرنے جوگے نہیں۔ ہماری بچیاں ہیں اور آگے پیچھے کون سے قبیلے کنبے والے ہیں' دو چار رشتہ دار ہیں' وہ بھی ہماری طرح روٹیاں گن گن کر پکانے والے۔ ہم شاہوں کے مقابل کہاں آ سکتے ہیں اور چھوٹے شاہ جی... صوفی صاحب! ایک بار مرد کی نظر کہیں ٹھہر جائے تو اس سے چھپنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میرا دل ڈر رہا ہے۔ جی چاہ رہا ہے اپنی بچیوں کو کہیں جا کر چھپا دوں۔ انہیں تو اتنی بھی حیا نہیں آئی کہ کل ان کی شادی ہونے والی ہے۔ ان کے گھر والوں کو ان کی ہونے والی بیوی کو پتا چلے تو ان کا کردار کتنا گر جائے گا مگر پتا نہیں بڑے لوگوں کا کردار کن چیزوں سے گرتا اور اونچا ہوتا ہے' پر ہمارے لیے تو کردار اور بدکرداری میں عزت ہوتی ہے۔ صوفی صاحب! کچھ تو کہیں' مجھے تسلی دیں' میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔"

اماں جی گھبرائی ہوئی تھیں' کبھی رونے لگتیں اور کبھی نارمل ہو جاتیں اور باہر کھڑے عبدالمتین کا دل چاہ رہا تھا جا کر چھوٹے شاہ جی کا گلا دبا دے یا اسے گولی مار دے۔ وہ اپنا سارا درد بھول گیا تھا۔ اسے تو آمنہ سے پیار بھی اس قدر تھا۔ کبھی اس سے معمولی سا جھگڑا بھی اس نے نہیں کیا تھا اور آج اس کے ساتھ شاہ جی نے ایسی گھٹیا حرکت کر دی۔

"میری معصوم بہن کس قدر ڈری ہوگی۔ یا اللہ! تو نے ظالموں اور شیطانوں کو اس قدر طاقتور کیوں بنایا ہے۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

"میں کیا تسلی دوں تمہیں' میں خود پریشان ہو گیا ہوں۔ بات ہی ایسی ہے اور سچ پوچھو تو یہ سب جھوٹ بھی نہیں ہو سکتا۔ چھوٹے شاہ جی کی رپورٹ واقعی اچھی نہیں ہے۔ یہ تو بڑے شاہ جی ہیں جو ان کے گندے چہرے پر اپنی نیکیوں کا پردہ ڈالے بیٹھے ہیں ورنہ......" صوفی صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"سنا ہے چھوٹے شاہ جی تو شادی پر راضی ہی نہیں تھے۔ انہیں سیدہ بی بی کی یہ نند پسند ہی نہیں تھیں۔ بہت عرصے سے بڑے شاہ جی ان پر دباؤ ڈال رہے تھے مگر وہ راضی نہیں ہوتے تھے اور سنا ہے انہوں نے کہیں شہر میں بھی کسی سے شادی رچا رکھی ہے یا کوئی رکھیل رکھی ہوئی ہے' جو بھی کہانی ہے' بہرحال ان کی شہرت اس معاملے میں ہرگز قابلِ بھروسہ نہیں۔ بہت کچھ سن رکھا ہے جو لبوں تک نہیں آ سکتا مگر ان سب باتوں کے باوجود آج جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا اس سے واقعی میرا بھی دل ڈر رہا ہے پھر ہم واقعی بہت کمزور لوگ ہیں۔ اللہ نے گناہگار کے لیے سزا اور نیکوکار کے لیے جزا کا اعلان تو کر رکھا ہے مگر گناہگاروں کو جب وہ ڈھیل دیتا ہے اور مظلوم جب اس ڈھیل کی زد میں آتے ہیں تو پھر اللہ فوری طور پر سزا دینے کے لیے نیچے نہیں آتا بلکہ مظلوموں کو اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا پڑتا ہے اور معجزوں کا آج کل دور نہیں۔"

وہ اندھیرے میں نامعلوم نقطے پر نگاہیں جمائے' بہت آہستہ آہستہ بوجھل لہجے میں بول رہے تھے۔ باہر رات کی خاموش فضا تھی' اس لیے باہر کھڑے عبدالمتین اور دوسرے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی آمنہ کو ان کی باتیں صاف

سمجھ میں آ رہی تھیں۔ زینب اور جویریہ تو کب کی سو چکی تھیں' آج اس کی زندگی نے شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا اور پہلے قدم نے ہی اس کی نیند اچٹ لی تھی۔

"اگر شعور اس قدر اذیت ناک ہوتا ہے تو خدایا! تو کسی اچھی لڑکی کو یہ شعور نہ دے' یہ بہت خوفناک ہے' بہت ڈر والا۔" وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگی چپکے چپکے روئے جا رہی تھی اور اتنے بھیانک واقعے کو ذہن میں لاتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی' جس نے اس کے ماں باپ کی نیند بھی اڑا دی تھی۔

"اور جو جھومر کا واقعہ ہوا ہے وہ؟" اماں جی کو یاد آیا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے' ہم بندے تو صرف قیاس کر سکتے ہیں۔" صوفی صاحب کھل کر اس بات پر اپنی رائے نہیں دینا چاہتے تھے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

"بہت خوبصورت تھی جھومر اور گاؤں کی سب ہی عورتیں یہی کہہ رہی تھیں کہ چند ہی دنوں میں اس کا حویلی میں بہت آنا جانا ہو گیا تھا' منشی کا بیٹا تو یوں ہی مفت میں مارا جائے گا۔"

"رابعہ بی بی! ادھر ادھر کی باتوں پر جتنا سوچو گی اتنا ہی ذہن خراب ہوگا۔" صوفی صاحب شاید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے تھے' ٹوک کر بولے۔

"صوفی صاحب! میں تو وہ باتیں کرتی ہوں جن پر سوچ کر بندہ کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" صوفی صاحب چونکے۔

"بڑے شاہ جی حج کرنے جا رہے ہیں۔"

"ہاں یہ تو سب کو پتا ہے' شاہ جی شادی کے اگلے ہفتے ہی جا رہے ہیں شاید۔"

"اور آج چھوٹے شاہ جی کی دستار بندی بھی ہو چکی ہے' حج کی مدت تو چلو مہینے دو مہینے کی ہوگی مگر اس کے بعد بڑے شاہ جی اپنے علاج کے لیے شاید ولایت بھی جائیں گے' سنا ہے۔" اماں جی بولیں۔

"نہیں تو پھر واپس آنے میں بہت دن لگ جائیں گے' اس دوران سب کچھ چھوٹے شاہ جی سنبھالیں گے۔"

"ظاہر ہے۔"

"یہی بات تو صوفی صاحب! مجھے ہولائے دے رہی ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا رابعہ بی بی! یوں ہی ڈر رہی ہو۔ میں بڑے شاہ جی سے بات تو نہیں کر سکتا کہ ایسی بات سن کے تو وہ میری کھال ہی کھنچوا دیں گے کہ..." وہ رک گئے۔ "کچھ کچھ تم بھی صحیح کہہ رہی ہو۔" وہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔

"بیٹیوں کے معاملات صوفی صاحب! بہت نازک ہوتے ہیں' آپ کو تو معلوم ہے وہ بڑے شاہ جی کے جاتے ہی کوئی ایسا ویسا حکم دے دیں۔ کوئی ڈراوا' کوئی پیشکش' کوئی دھمکی' صوفی صاحب! ہم تو اف بھی نہیں کر سکیں گے۔" اماں جی بہت ڈر گئی تھیں۔

"پھر کیا کریں؟" صوفی صاحب کا سارا اجلال اوپری تھا یا پھر بیٹیوں کے معاملے ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑا طرم خان بھی خود کو بہت بے بس محسوس کرتا ہے۔

"صوفی صاحب! ایک طریقہ ہے۔" اماں جی بولیں۔

"کیا؟" "نہیں تو اس اندھیرے میں کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

"ہم آمنہ کا کہیں آج کل میں نکاح کر دیتے ہیں۔" اماں جی کی بات جتنی صوفی صاحب کے لیے اچانک تھی اتنی ہی آمنہ اور عبدالمتین کے لیے بھی۔

"نکاح!" وہ حیرت سے اچھلے۔ "وہ بھی آج کل میں' ناممکن۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی جلدی اور اچانک' اول تو رشتہ ڈھونڈنا ہی ناممکن ہے پھر بڑے شاہ خفا ہوں گے کہ بالا ہی بالا سب کام کر لیے ہیں۔"

"آپ بڑے شاہ جی کا ڈر دل سے نکال کیوں نہیں دیتے۔" اماں جی چڑ کر ذرا اونچا بولیں' حالانکہ وہ تو کبھی صوفی کے سامنے ذرا سی بھی بلند آواز میں نہیں بولی تھیں۔

"ہماری بیٹی کا معاملہ ہے' کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو جاتی ہے تو کون ذمہ دار ہوگا۔ بڑے شاہ جی اس وقت بیٹے کو قصوروار ٹھہرائیں گے؟ کبھی نہیں۔ ہمیں ہی کچھ سوچنا ہوگا۔"

"سوچتے ہیں مگر نکاح نہیں' اس پر تو سب لوگ اس اچانک افتاد کی وجہ پوچھیں گے کہ اچانک صوفی صاحب کو کیا سوجھی۔ کل شادی ہے پھر جانے کا کیا کرنا ہے؟"

"میں نہیں جاؤں گی تو سیدہ کا عتاب کون جھیلے گا اور اب میں ادھر بچیوں کو بالکل نہیں لے کر جانا چاہتی اور انہیں گھر میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔" اماں جی کی جان وسوسوں میں گھر گئی تھی۔

"تم تو بہت ڈر گئی ہو رابعہ بی بی! چلو اللہ بہتر کرے گا۔ میں کچھ سوچتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہی پڑے گا' کیونکہ بڑے شاہ جی کے جاتے ہی چھوٹے شاہ جی کو کھلی چھٹی مل جائے گی پھر وہ تو ہم جیسوں کو کچھ سمجھتے بھی نہیں' کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔ تم بھی اب سو جاؤ' آمنہ سو گئی؟"

"سو گئی ہوگی' بچی کا اتنا سامنہ نکل آیا تھا۔" وہ فکر مندی سے بولیں۔

"غلطی تمہاری ہے' تمہیں ان کو اکیلا جانے ہی نہیں دینا چاہیے تھا' سو جاؤ اب۔" کہہ کر شاید وہ بستر پر لیٹ گئے تھے۔ اماں جی کچھ دیر چپ بیٹھی رہیں پھر وہ بھی لیٹ گئیں اور باہر کھڑے عبدالمعین کے جسم میں تو جیسے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔

"چھوٹے شاہ جی کی بے راہ روی کی سزا میری بہن کیوں بھگتے کہ اسے جلد بازی میں کسی ایسے ویسے بابا صاحب جیسے مولوی کے پلے سے باندھ دیا جائے جو ساری زندگی اس سے بھی بے رحم درندے کا سلوک کرے۔ نہیں' میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ آمنہ کا نکاح بھی میں نہیں ہونے دوں گا۔ بابا صاحب اپنے جیسا کوئی قصائی ڈھونڈ لیں گے۔" وہ واپس کمرے کی طرف مڑا۔

"اور چھوٹے شاہ جی آپ کو تو میں ایسا مزہ چکھاؤں گا اس گھٹیا حرکت کا کہ آپ ساری زندگی اپنے ہی گھاؤ چاٹتے رہیں گے' تب بھی مجھے آپ پر ترس نہیں آئے گا۔ عزت صرف تم جیسے طاقتوروں کی نہیں ہوتی عزت تم جیسے ظالموں کی بھی تو ہوتی ہے اور میں دیکھوں گا تم کس طرح اپنی دولت سے اپنی عزت کی تار تار چادر کو سیتے ہو' میں دیکھوں گا۔"

وہ دل میں پختہ ارادہ باندھتا ہوا مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اور آمنہ کو لگا اماں جی نے اس کے نکاح کا کہہ کر اس کے وجود کو کسی سولی پر لٹکا دیا ہے۔ اس گناہ کی پاداش میں جو اس نے کیا ہی نہیں اور اب کب اس کا وجود اس سولی سے نیچے اتارا جائے گا' اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

دستار بندی سے لے کر مہندی کی رسم تک' مہندی سے لے کر سہرا بندی تک اور پھر بارات کی روانگی سے لے کر واپسی تک سیدہ کا دل سلطان بخت کا بیزار موڈ دیکھ کر الٹا سیدھا دھڑکتا ہی رہا۔ انہیں لگتا ابھی سلطان بخت ساری رسیاں تڑا کر کہیں بھاگ جائیں گے اور ان کی ساری زندگی کی محنت اکارت چلی جائے گی۔ مہندی کی رات سے بارات کی صبح تک انہوں نے ایک بار بھی نیند کی نیت سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ جلے پیر کی بلی کی طرح سلطان بخت کے کمرے کے باہر سیڑھیوں میں' حویلی کے کمروں میں' بری کے بکسوں اور زیور کی الماری کے پاس ہی بار بار بھٹکتی رہیں ایک بار جب بڑے شاہ جی تہجد کے لیے اٹھے تو سیدہ کو یوں بے قراری سے ادھر ادھر پھرتے دیکھا تو ٹوک دیا۔

"تم بھی سو جاؤ سیدہ! اب ساری رات گزر گئی۔ چند گھنٹے آرام کرلو' کل پھر بہت کام ہوگا۔ تمہاری آنکھیں لال سرخ ہو رہی ہیں؟"

"نہیں بابا جان! مجھے نیند نہیں آ رہی اور اب چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ صالحہ اس گھر کی رونق بن کر آجائے گی تو پھر میں خوب چین کی نیند سوؤں گی۔ ابھی تو مجھے بہت بے چینی ہے۔"

"صرف بے چینی ہے' بھائی کی شادی کی خوشی نہیں۔" وہ ذرا سا ہنسے۔

"بھائی خوش نہیں تو مجھے کیا خوشی ہوگی۔" وہ بڑبڑائیں۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ پوچھ بیٹھے۔

"کچھ نہیں بابا جان! خوشی بے چینی ہی تو ہے جس نے میری نیند اچاٹ کر دی ہے' بس اب تو وہ خوشی بھرا لمحہ آنے ہی والا ہے۔ کچھ نفل پڑھوں گی' اتنے میں فجر ہو جائے گی' نماز پڑھ کر ایک چکر گھر کا بھی لگا آؤں گی۔ سہرا بندی سے پہلے واپس آجاؤں گی پھر بارات کی روانگی۔ تو اب سونے کا وقت ہی کون سا ہے' اب تو مصروفیت کا وقت ہے۔ آپ جا کر آرام کر لیں' آپ کے لیے جاگنا اور بے آرام رہنا درست نہیں۔" وہ باپ کو مطمئن کرتے ہوئے بولیں۔

"میں آرام کر چکا۔ اب سلطان کے سہرا بندھنے کا انتظار ہے۔ اللہ مجھے وہ گھڑی دیکھنا نصیب کرے۔"

"آمین!" سیدہ بے اختیار بولیں تو وہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ سیدہ نے ایک گہرا سانس لیا اور سر اٹھا کر سلطان بخت کے کمرے کی طرف دیکھنے لگیں جس کی لائٹ ساری رات جلتی رہی تھی اور کتنی بار جب وہ کمرے کے پاس سے گزریں' ان کے بولنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ شاید وہ موبائل پر کسی سے باتیں کرتے رہے تھے۔ سیدہ نے دو چار بار کان دروازے سے لگائے بھی مگر ان کے خاک پلے نہ پڑا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے وہ پھر انہیں الجھا الجھا سا دکھ رہے تھے۔ یہی بات ان کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ ایسے موڈ میں سلطان بخت کچھ بھی کر سکتے تھے۔ پتا نہیں انہیں کس کی شرم روکے ہوئے تھی یا شاید سیدہ کی دعائیں اثر دکھا رہی تھیں جو وہ دن رات چپکے چپکے اللہ سے اپنی عزت رکھنے کے لیے کیے جا رہی تھیں۔

اور سیدہ سمجھتی تھیں کہ سلطان بخت سے ان کی بے چینی مخفی ہے' حالانکہ اندر لیٹے سلطان بخت کو معلوم تھا سیدہ کس طرح ان کے کمرے کے پھیرے لگا رہی تھیں۔ بار بار آکر کی ہول سے دیکھنے کی کوشش کرتیں اور جب سیدہ بالکل پاس ہوں تو ایسا لگتا کوئی سایہ سا کیوں دروازے سے چپک جاتا ہے۔ سلطان بخت کو اپنا آپ کسی بے بس پرندے کی طرح لگ رہا تھا جس کے پر کاٹ کر اس کمرے میں مقید کر دیا گیا ہو۔

ان کے پر تو بڑے شاہ جی کی روانگی نے باندھ رکھے تھے یا پھر سیدہ کی ہزار منتوں نے' سیدہ کی بیس سالہ ازدواجی زندگی کی بقا نے ورنہ وہ اس عورت صالحہ سے کبھی شادی نہ کرتے جو کل آکر اس بیڈ روم کے سارے حقوق شیئر کرنے والی تھی۔ یہی سوچ سوچ کر ان کا مزاج بے حد بگڑ رہا تھا۔

صالحہ کا سوچ کر ہی ان پر کوفت سوار ہونے لگتی تھی۔ انہیں بڑی عمر کی پکی پکی عورتیں سخت ناپسند تھیں جو ہر بات' ہر کام میں اپنی رائے کو آخری اور حتمی سمجھتی ہیں۔ ایسی میچور پختہ عورتوں کا خیال ہوتا ہے' جس قدر سمجھ ان میں ہے اتنی کسی میں بھی نہیں۔ انہوں نے ہوش سنبھالا تو حویلی کی بوڑھی ملازمائیں انہیں بے پناہ ممتا دینے کی کوشش کرتیں۔ ایک اماں جان کیا اس جہان سے اٹھیں' انہیں لگا ان کے اردگرد موجود ہر عورت نے ان کے لیے اماں کا روپ دھار لیا ہے اور سب ہی اپنی ممتا کے خزانے سلطان پر لٹانا چاہتی ہیں' جوان سیدہ تو اماں جان کی آنکھیں بند کرتے ہی ان کی سیٹ پر آبیٹھی تھیں' ان کی پیدائشی گارجین۔

"سلطان! یوں نہ کرو' بارش میں نہ بھاگو' ملازموں کو منہ نہ لگاؤ' بچوں جیسی حرکتیں نہ کرو' یہ تمہیں زیب نہیں دیتا' تم اس حویلی کے وارث ہو' عقل سے کام لو۔ اچھا ہوا اماں جان تمہاری نسبت صالحہ سے طے کر گئیں' صالحہ تو بہت سمجھ دار ہے' ہر کام پھونک پھونک کر کرنے والی' بہت عقل مند' تمہاری طرح لاابالی نہیں' کم از کم تمہیں سنبھال تو لے گی نا۔"

"ہونہہ! سنبھال تو لے گی نا جیسے اس عمر میں بھی مجھے اماں جان کی ضرورت ہے۔ کوئی نادان بچہ ہوں میں جسے ان کی سرپرستی اس کی ممتا کی ضرورت ہے۔ بڑی آپا یہ کیوں نہیں سمجھتیں' مجھے اس عمر میں ماں کی نہیں ایک ساتھی' ایک خوبصورت ہم سفر کی ضرورت ہے۔ جو کلیوں کی طرح ان چھوئی ہو' پھولوں کی طرح شگفتہ اور رنگوں

کی طرح شوخ، خوشبو کی طرح چنچل اور اس کی ہنسی کسی جھرنے کی مانند ہو' خوبصورت اور بے اختیار۔۔۔ نہ کہ کسی دریا کی مانند جو ایک ہی سمت میں بہت دھیان سے بہے جا رہا ہو۔ انہیں معلوم نہیں مجھے خوبصورت' کم عمر' نادان لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جن کی ہر حرکت میں بے اختیاری ہو' شوخی اور شرارت کہ اس کی ناسمجھی نادانی کو میں ٹوکوں نہ کہ وہ میری اماں جان بن کر' میری استانی بن کر مجھے ہر وقت قاعدہ ہاتھ میں دے کر زمانے اور زندگی کی اونچ نیچ سمجھاتی رہے۔ I hate sensibility" وہ جھلا کر بستر سے اٹھے۔

آمنہ کی معصومیت اور کم سنی نے رات بھر کے لیے پھر انہیں اس جھلتے جہنم میں دھکیل دیا تھا کہ وہ ایک بڑی عمر کی پختہ عورت نما لڑکی کے شوہر بننے جا رہے تھے۔ جو کل شب اس بستر پر بڑے استحقاق سے براجمان ہو گی اور وہ سوائے اسے دیکھنے اور کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکیں گے۔

"اگر میں آمنہ کو ذرا سا چھو کر ذرا سا قریب ہو کر دیکھ لیتا تو۔۔۔" ایک لطف بھرے احساس نے ان کے اندر انگڑائی لی "مگر اس ملانی جی نے کام خراب کر دیا۔ خیر بابا جان ایک بار حج پر چلے جائیں پھر ذرا آمنہ کو قریب سے دیکھیں گے بہت قریب سے۔ پھر تو کوئی آڑ نہیں ہو گی' سیدہ کی حجت بھی تو تمام ہو جائے گی۔ اس کی مرد رو میرے پلے جو پڑ جائے گی' حسین شاہ کی دھمکی کا توڑ بھی ہو جائے گا۔ اگر وہ سیدہ کے بارے میں کچھ بھی غلط سوچنا چاہیں تو صالحہ تو ہو گی ہی سارے حساب بے باق کرنے کے لیے۔

بس کل رات کی تو بندش ہے' پرسوں ولیمے کے فوراً" بعد میں نین تارا سے ملنے جاؤں گا' ہاں کتنے دن ہو گئے اپنی اس معصوم چنچل' قلوپطرہ سے ملے۔" انہیں نین تارا کی یاد ستانے لگی۔ کتنی بار انگلیاں بے چین ہوئیں کہ نین تارا کا نمبر ڈائل کریں مگر انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا۔ صرف دو دن کی تو بات ہے' ہر بار خود کو سمجھاتے ادھر بابا جان حج کے لیے روانہ ہوں گے' ادھر خوشی کے سب رستے خود بخود کھل جائیں گے۔ ابھی تو وہ نین تارا کو جرمنی کا کہہ کر گاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بس کل ہی اسے بتاؤں گا کہ وہ واپس آ چکے ہیں۔ اگلے دن اس کے پاس ہوں گے۔" بس دو راتیں تو درمیان میں ہیں پھر میں ہوں گا اور میری نین تارا ڈارلنگ۔" وہ بستر پر کروٹیں لینے لگے۔

"کبھی کبھی وقت کتنی سست روی سے گزرتا ہے کہ ایک ایک پل صدیوں پر محیط لگتا ہے جیسے آج کی رات اور کل کی رات بھی تو۔ ان کے اندر سے کوئی بولا "ہاں کل کی رات شاید آج سے بھی بھاری ہو اور طویل ترین بھی۔"

وہ آنے والی رات کا تصور اپنے ذہن میں تراشنے لگے۔

خدا خدا کر کے سیاہ رات نے دھیرے دھیرے اپنی ماتمی پوشاک کھسکائی اور اپنا روشن بدن ظاہر کیا۔ جیسے ہی سورج نے آنکھیں کھولیں سلطان بخت کی بوجھل آنکھوں میں نیند اتر آئی۔ چند لمحوں میں وہ ایک بے آرام رات گزار کر گہری نیند سو چکے تھے۔

دس بجے سہرا بندی تھی اور بارہ بجے بارات کی روانگی۔ ساری رسمیں کرتے ایک ڈیڑھ بج گیا۔ بارات روانہ ہوئی۔ سلطان بخت نے ساری رسمیں کسی روبوٹ کی مانند نبھائیں۔ آف وائٹ قیمتی ڈریس جس کی شیروانی کے گلے پر نازک گولڈ کا کام تھا۔ سلطان بخت کا سرخ و سفید رنگ اور بھی دمک اٹھا تھا۔ وہ تیار ہو کر اپنی خوابگاہ سے باہر آئے تو سیدہ نے انہیں دیکھتے ہی دل میں سو بار ان کی نظر اتاری اور دو کالے بکرے تاج دین کے حوالے کر دیے۔

وہ سیڑھیاں اتر کر ہال کمرے میں آئے' خاندان کی عورتیں انہیں دیکھتے ہی "ماشاء اللہ" کا ورد کرنے لگیں۔

"کسی بد نگاہ کی نظر نہ لگ جائے میرے چاند سے دولہا کو۔" سیدہ نے دل میں سوچا اور اسی وقت دو کالے بکرے اور منگوا کر باہر بھجوائے۔

"اللہ آپا جان! لالہ تو آسمان سے اترے ہوئے کوئی پری زاد لگ رہے ہیں۔ کتنے پیارے' آپا جان! دیکھا نہیں جا رہا ان کی طرف' ہے نا؟"

شہرینہ اچانک ہی ہال کمرے میں داخل ہوئی اور اپنی فطری بے ساختگی سے بولی۔ سلطان بخت ہولے سے مسکرائے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ماشاء اللہ کہو شہری! اللہ نظر بد سے بچائے' ہمارے راج دلارے کو۔" سیدہ نے اسے ٹوکا۔

"چلو' سلطان بخت بابا جان پہلے ہی بہت خفا ہو رہے ہیں' بہت دیر ہو گئی۔" سیدہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلطان بخت کو اٹھا کر قاضی کے سامنے جا بٹھائیں۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جس نے سالوں سے سیدہ کا خون خشک کیا ہوا تھا۔ حسین شاہ نے بارات کا شایان شان استقبال کیا تھا کہ سبطین شاہ کوشش کے باوجود انتظام میں ایک بھی نقص نہ نکال سکے۔ سیدہ نے اطمینان کا سانس لیا کہ بابا جان خوش ہیں' جاتے ہی بارات کی تواضع ٹھنڈے مشروبات سے کی گئی تھی۔ اس کے فوراً" بعد ہی نکاح تھا۔

نکاح کے پیپرز پر سلطان بخت نے بڑی دل جمعی سے سائن کیے تھے۔ سیدہ کے سارے خدشے ہوا ہو گئے تھے۔ انہیں ایک دم سے لگا کہ دنیا کس قدر حسین ہے اور زندگی کتنی پُر لطف۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا بوجھ جوان کی ساس بہشتن اور ماں بہشتن ان کے کندھوں پر ڈال گئی تھیں۔ آج وہ اس سے سبکدوش ہو گئی تھیں۔

"بابا جان! مبارک ہو بہت بہت۔"

سیدہ نے چادر میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ سبطین شاہ سے بولیں۔ "تمہیں بھی سلطان بخت بہت مبارک ہو' اللہ پاک تمہیں دنیا جہان کی خوشیاں نصیب کرے' تم نے والدین کا مان رکھا۔ اللہ تمہیں نیک اولاد نصیب کرے۔"

"سیدہ! تمہیں بھی مبارک ہو بہت' یہ سب تمہاری ہمت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔" سبطین شاہ نے بیٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اللہ کی مہربانی بابا جان! اچھا میں اب اندر چلتی ہوں' میرا خیال ہے ادھر اب میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ صالحہ کو دیکھوں جا کر۔" کہہ کر وہ اسٹیج کے پچھلی طرف اتریں اور حویلی کے اندر چلی گئیں۔ جب وہ صالحہ کے کمرے میں داخل ہوئیں نکاح کے پیپرز اس کے پاس سائن ہونے کے لیے آ چکے تھے۔ ایجاب و قبول کا مرحلہ بخوبی طے ہو چکا تھا اور اب صالحہ پین ہاتھ میں پکڑے کپکپاتے ہاتھ پیپرز پر دھرے بیٹھی تھی۔

"صالحہ! میری بہن مبارک ہو' سائن کرو سب لوگ انتظار میں کھڑے ہیں۔" سیدہ نے جھک کر صالحہ کا سر اپنے ساتھ لگایا اور اس کے کان میں بولیں۔ صالحہ کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"صالحہ! تم تو بہت بہادر ہو' ہمت کرو' یہ مرحلہ تو آنا ہی تھا۔ چلو شاباش میری بہن۔" وہ آہستگی سے اس کا کندھا تھپک کر بولیں تو صالحہ نے کانپتے لرزتے ہاتھوں سے پیپرز پر سائن کر دیے۔

مبارک سلامت کا شور اٹھا' سیدہ نے سر اٹھا کر فضا میں ایک گہرا سانس لیا۔

"اللہ تیرا شکر ہے' تو نے مجھے اس فرض سے بخوبی سبکدوش کیا۔" سیدہ نے دھیرے سے کہا اور پھر جھک کر روتی صالحہ کو چپ کرانے لگیں۔

بعد کے سب مرحلے بہت تیزی سے طے ہو گئے۔

کھانا' چھوٹی موٹی دو چار رسمیں اور پھر رخصتی۔ سیدہ صالحہ کے ساتھ حویلی آئی تھیں۔ کلام پاک کے سائے میں صالحہ کو حویلی میں لے جایا گیا۔ کچھ دیر کے لیے دلہن کو ہال کمرے میں بٹھایا گیا' منہ میٹھا کرانے کی رسم کی گئی۔ خاندان کی عورتیں دلہن کی تعریف کرتے ہوئے ہلکا پھلکا مذاق کرنے لگیں مگر اب سیدہ کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جلدی سے دلہن کو اس کی خواب گاہ میں پہنچا کر خود آرام کرنا چاہ رہی تھیں۔ ان کے پاؤں کی ایڑیوں میں جیسے کسی نے کیل ٹھونک دیے تھے۔ ایک ایک قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ کئی دنوں سے تو وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر مصروف تھیں۔ سب سے اجازت لے کر انہوں نے صالحہ کو اٹھایا اور اوپر خواب گاہ کی طرف لے گئیں۔ شہرینہ نے دوسری طرف سے دلہن بھابھی کا بازو تھام رکھا تھا۔

"آپا جان! دلہن بھابھی کتنی پیاری لگ رہی ہیں مگر یہ بولتیں نہیں۔" سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شہرینہ نے کہا۔

"بولیں گی شہری بی بی! بولیں گی دلہن بھابھی اور جب یہ بولیں گی تو پھر کوئی نہیں بول سکے گا۔" شہرینہ کی ایک شادی شدہ کزن نے شہرینہ کے کان میں بلند سرگوشی کی۔ "تمہارے لالہ بھی نہیں۔"

"بتول! کیا بے کار کی باتیں کر رہی ہو تم بچی کے ساتھ۔" سیدہ ماتھے پر شکنیں ڈال کر بولیں تو بتول سنبھل گئی۔ سیدھی ہو کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

دلہن کو کمرے میں بٹھا کر کچھ دیر سیدہ اور شہرینہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔

"اچھا صالحہ! اب تم ایزی ہو جاؤ بلکہ ٹیک لگا کر کچھ ریلیکس ہو جاؤ، ہم اب چلتے ہیں۔ میں جا کر سلطان بخت کو بھیجتی ہوں۔ تمہارا نائٹ سوٹ ادھر سامنے ڈریسنگ میں لٹکا ہے۔ یہ سائیڈ ٹیبل پر پانی' دودھ' کولڈ ڈرنک' فروٹ سب موجود ہیں' کچھ کھانا پینا چاہو تو کھا پی لینا۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا' ٹھیک ہے' اب ہم چلتے ہیں۔ چلو شہری۔" سیدہ نے اٹھتے ہوئے پیار سے صالحہ کا منہ چوما' اس کا جھومر اور ٹیکہ درست کیا اور شہرینہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"شب بخیر دلہن بھابھی!" وہ جھک کر صالحہ کے پاس ہو کر بولی۔ صالحہ نے ہولے سے گردن ہلا کر محبت سے اسے دیکھا۔

دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل گئیں جیسے ہی ان کے پیچھے کمرے کا دروازہ بند ہوا صالحہ نے کب کا سینے میں رکا ہوا سانس خارج کیا اور سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ خوبصورتی سے زیادہ اس میں کشادگی تھی۔ پلاسٹر آف پیرس سے بنی' بہت خوبصورتی' اونچی چھت' روایتی سج تو سجائی نہیں گئی تھی' نہ مصنوعی لڑیوں سے' نہ پھولوں سے۔ کمرہ اس لحاظ سے بالکل سادہ تھا۔ صرف بیڈ کے سامنے دیوار پر پھولوں سے "ویلکم" لکھا ہوا تھا اور کونے کی میزوں میں تازہ پھولوں کے گلدستے سجے تھے' جن کی بھینی بھینی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

"پتا نہیں سلطان بخت کس مزاج کے ہوں' سنا ہے' بہت خشک مزاج ہیں سیدہ بھابھی کی طرح۔ میں تو پہلے ہی ان کے ساتھ اپنی زندگی کے بہت کٹھن سال گزار کر آئی ہوں' اگر یہ بھی ایسے ہوئے تو۔۔۔" اس نے کمرے کی سجاوٹ سے دھیان ہٹا کر سلطان بخت کو سوچنا شروع کر دیا۔

"اماں بابا کے بعد سیدہ بھابھی نے میری کتنی کڑی تربیت کی ہے' میں ہی جانتی ہوں جیسے وہ اپنی پسند کے سانچے میں بھابھی ڈھال رہی ہوں۔ اللہ کرے یہ اچھے ہوں' حسین بھائی تو ان کو اچھا نہیں سمجھتے تھے' بہت غلط باتیں سن رکھی تھی سلطان بخت کے بارے میں انہوں نے۔ پتا نہیں کیا ہو گا۔" وسوسوں نے اس کا گھیراؤ کرنا شروع کر دیا اور جوں جوں انتظار طویل ہوتا گیا وسوسے بڑھتے چلے گئے۔

رات کا شاید ڈیڑھ بج رہا تھا' اس کا دماغ غنودگی میں تھا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی وہ ایک دم سے الرٹ ہو کر بیٹھ گئی۔ سانس روکے سر جھکا کر نیچی نظروں سے دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

سلطان بخت نے ایک نظر بیڈ پر براجمان اس ڈھیر پر ڈالی' اس وقت ان کے دل میں کتنی خواہش تھی کہ جاتے ہی وہ بستر پر دراز ہو جائیں' کل کے رت جگے اور دن بھر کی مصروفیت سے بہت تھکن ہو رہی تھی۔ انہوں نے حسرت سے اپنے بستر کو دیکھا اور صوفے پر بیٹھ گئے' کچھ دیر یوں ہی بیٹھے سوچتے رہے پھر اٹھے اور بیڈ کی طرف بڑھے۔ صالحہ کا دل بہت رفتار سے دھڑکنے لگا۔ وہ بیڈ کے پاس آ کر رک گئے۔ جھک کر سائیڈ ریک کا دراز کھولا' اس میں سے سگار کیس نکالا اور واپس پلٹ گئے۔ صالحہ کا دل ایک پل کو تھم کر پھر ہولے ہولے دھڑکنے لگا۔ اب سلطان بخت صوفے پر بیٹھے بڑے آرام سے سگار پی رہے تھے جیسے وہ ڈپارچر لاؤنج میں بیٹھے ہوں اور ان کی فلائٹ ابھی لیٹ ہو۔

صالحہ کی کمر اکڑ گئی اور سر جھکائے جھکائے گردن دکھنے لگی مگر ان کے اٹھنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دس بارہ منٹ اور گزر گئے۔ صالحہ کو اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔ سلطان بخت اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ صالحہ نے

تھوڑی سی گردن اونچی کی۔

"صالحہ! میں بہت تھک چکا ہوں اور اس وقت میں صرف آرام کرنا چاہتا ہوں' کچھ ان لوگوں کی جلد بازی۔۔۔ میں ابھی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں تھا مگر سیدہ آپا اور بابا جان' بہرحال تمہیں شاید کچھ دن یا کچھ مہینے انتظار کرنا پڑے میرے ذہنی طور پر تمہیں قبول کرنے کے لیے۔ تم اٹھ کر چینج کر لو اور بستر خالی کر دو' میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" ڈریسنگ روم سے وہ چینج کر کے آئے اور اس کے پاس رک کر بولے۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بیڈ کے دوسری طرف چلے گئے' شاید لیٹنے کی غرض سے۔ صالحہ اس طرح رخ موڑے آہستگی سے بیڈ سے نیچے اتری۔

"اور ہاں یہ تمہارا رونمائی کا تحفہ۔۔۔ آپا جان نے کہا تھا ضروری ہوتا ہے' انہوں نے خود ہی مجھے خرید دیا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہے' تم خود کھول کر دیکھ لینا اور کے' گڈ نائٹ۔ پلیز لائٹ آف کر دینا لیفٹ سائیڈ پر بٹن ہے تھرڈ والا۔" انہوں نے اس کی طرف بیڈ پر کوئی چیز اچھالی تھی۔ صالحہ نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ لائٹ کا بٹن آف کیا اور ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے کے دوسرے حصے میں ہلکی روشنی جل رہی تھی' اس لیے مکمل طور پر اندھیرا نہیں ہوا۔

صالحہ نے ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا جیسے تقدیر نے پہلی رات ہی اس پر شوہر کی محبت اور استحقاق کا دروازہ بند کر دیا تھا اور بند دروازے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کل بڑے شاہ جی حج کے لیے جا رہے ہیں اور چھوٹے شاہ جی کے تیور بھانپنا کچھ مشکل نہیں۔" صوفی صاحب ولیمے سے اگلی رات رابعہ بی بی سے کہہ رہے تھے۔

"پھر؟" وہ کچھ خوف زدہ ہو کر بولیں۔

"میں آج گیا تھا سرکار کے دفتر اپنے تبادلے کے لیے۔ میں سوچ رہا ہوں جب تک بڑے شاہ جی واپس نہیں آ جاتے' ہم عارضی طور پر یہ گھر یہ علاقہ چھوڑ دیتے ہیں۔ دو چار مہینوں کی تو بات ہے پھر واپس آ جائیں گے' کیا خیال ہے؟" صوفی صاحب کی تجویز اتنی اچانک تھی کہ اماں جی کچھ بول ہی نہ سکیں۔

"وہاں سرکار کے دفتر میں جو تبادلے والا افسر تھا۔ قدرت خدا کی دیکھو' وہ میرا شاگرد نکلا۔ پورے پانچ سال اس نے مجھ سے پڑھا تھا اور اس کا باپ میری بڑی عزت کرتا تھا۔ افسر تو مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا' خیر میں اسے کیا پہچانتا' اس نے حوالے دیے تو مجھے یاد آیا۔ میں نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا اور کہا کہ مجھے ایک دو دن میں ہی کہیں اور تبدیل کر دیا جائے' چاہے کسی شہر میں' کسی گاؤں یا کسی قصبے میں۔ اس نے میری بڑی عزت کی' چائے منگوائی' ساتھ پیسٹریاں' بسکٹ وغیرہ' میں نے آنکھ اٹھا کر کسی طرف نہ دیکھا۔ بس یہی کہا کہ پہلے میرے آرڈر جاری کرے پھر میں کسی چیز کو ہاتھ لگاؤں گا۔ اس نے اسی وقت اپنے ٹائپسٹ کو بلایا اور میرا آرڈر ٹائپ کر دیا۔ میں آرڈر ساتھ لے کر آیا ہوں' شیخوپورہ میں تبادلہ کر دیا ہے انہوں نے۔ کل شاہ جی جائیں گے تو کل رات ہی ہم ادھر سے نکل جائیں گے۔ تمہارا اشک درست نکلا' چھوٹے شاہ جی کا دو دن مجھ پر خصوصی التفات رہا ہے' جس کو بڑے شاہ جی بھی ناپسند کر رہے تھے مگر انہیں باپ کی پروا کب ہے۔ مجھے ان کے رویے سے خطرے کی بو آ رہی ہے' وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں اور ہم ماننے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ تم ادھر ابھی کسی سے اپنے تبادلے کا ذکر نہ کرنا۔ بس موٹا موٹا ضروری سامان باندھ لو' باقی سامان کو ایک کمرے میں بند کر کے تالا ڈال دو۔ ہم چند ماہ بعد آ ہی جائیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ تم سن رہی ہو نا سب رابعہ بی بی! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔"

اماں جی حیران ان کا منہ تکے جا رہی تھیں' کچھ نہ بول سکیں۔

• • • • •

"تم!" کیپٹن شہباز کے لبوں سے نکلنے والے اس دو حرفی لفظ کی آواز اس قدر خفیف تھی کہ نزہت سن بھی نہ سکی۔ بس ان کی حیرت زدہ آنکھیں گولائی میں کھلے ہونٹوں کو دیکھ کر وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ ماتھے سے ماتھے تک اوڑھی سیاہ چادر کو مزید نیچے سرکانے لگی۔ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں مگر وہ انہیں اٹھا نہیں پا رہی تھی۔ پلکوں کا

لرزتا کیپٹن شہباز کو بھی نظر آ رہا تھا۔ مین گیٹ پر جلتی لائٹ ان کے سروں پر روشن تھی مگر اسے معلوم تھا آج کیپٹن شہباز کو تو لرزتی پلکوں میں کوئی خوبصورتی کوئی نزاکت نظر نہیں آ رہی ہوگی۔ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے دل کی دھڑکنوں کے بدلتے رخ کے ساتھ بدل رہے تھے' ان کے چہرے پر چند لمحے پہلی حیرت کی جگہ اب نفرت غصہ اور بیزاری ظاہر ہونے لگی تھی۔

نزہت کی صرف پلکیں ہی نہیں پورا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا بلکہ ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ تو بڑھتی جا رہی تھی اسے لگ رہا تھا' وہ چند لمحے اور کھڑی رہی تو یقیناً "یا تو گر پڑے گی یا پھر اس کی روح پرواز کر جائے گی مگر اسے اپنے سخت جان ہونے کا بھی یقین تھا۔ یہی یقین تو اسے اس رات کے اندھیرے میں ادھر تک لے آیا تھا اور کیپٹن صاحب پورے کے پورے اپنے چوڑے چکلے دراز وجود کے ساتھ دروازے میں جمے کھڑے تھے۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟"

ان کی آواز اسے بے حد خوفناک لگی۔ سرد' سماعتوں کو منجمد کر دینے والی اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں اٹھا کر ان کے اجنبی چہرے کو دیکھا پھر نظریں جھکالیں۔ اس کی زبان میں تو شاید اب بولنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔

راحیلہ اسے کوچ میں سوار کروا کر چلی گئی تھی کیونکہ ٹرین کا ٹائم تو گزر چکا تھا کوچ میں کوئی اکیلی عورت سوار نہیں تھی۔ زیادہ تر مرد تھے یا پھر میاں بیوی۔ کنڈیکٹر بھی اسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ کئی منٹ اسے گاڑی کے اندر ہی کھڑے ہونا پڑا۔ بالآخر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو اپنی بیوی کے ساتھ سات آٹھ نمبر کی سیٹ پر بیٹھا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں ادھر بٹھا دو۔" اس نے اپنی سیٹ خالی کر کے کہا تو نزہت اور کنڈیکٹر دونوں نے اسے مشکور نظروں سے دیکھا وہ چپکے سے اس کی بیوی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کوچ چل پڑی۔

"لاہور جا رہی ہو؟" اس کی بیوی نے تفتیش کا آغاز کیا۔

"جی..."

"جی میں میڈیکل کالج میں پڑھتی ہوں ویسے میری پھپھو بھی ادھر ہیں" اگر کوچ لیٹ نہ ہوئی کیونکہ ہمارے ہاسٹل کا گیٹ آٹھ بجے کے بعد بند کر دیا جاتا ہے اگر دیر ہو گئی تو شاید میں پھپھو کے پاس چلی جاؤں۔" اس نے فوراً "بہانا گھڑا۔

"ساتھ کوئی نہیں جا رہا تمہارے؟"

"نہیں جی' تقریباً" مہینے میں ایک دفعہ آتی جاتی ہوں۔ میری ایک ہی بہن ہے' جو ادھر امی کے پاس رہتی ہے۔ ابو نہیں ہیں میرے۔ میری سسٹر مجھے چھوڑنے آئی تھی۔"

"تو ادھر پنڈی میں کالج نہیں ہے' ادھر داخلہ لے لیتا تھا۔"

جیسی اس نے کہانی گھڑی تھی' اس لحاظ سے تو اسے پنڈی میں ہی داخلہ لینا چاہیے تھا۔

"جی ادھر میرا داخلہ نہیں ہو سکا تھا۔"

کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا' مزید سوالوں سے بچنے کے لیے پھر اس کے بعد اس عورت نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس دوران سفر ادھر ادھر کی چند باتیں ہی کیں۔

پھر جب کوچ نے انہیں اڈے پر اتارا تو بہت رات ہو چکی تھی۔ راستے میں گاڑی کا وہیل بدلنا پڑا تھا۔ اس میں کافی وقت لگ گیا۔ تین چیک پوسٹ آئیں۔ وہاں پہلے ہی گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ ان کی باری آتے آتے آدھ پون گھنٹہ لگ گیا اور نتیجتاً وہ رات گیارہ بجے کے قریب اڈے پر پہنچے۔

"اب تو تم ہاسٹل نہیں جا سکو گی؟" جیسے ہی وہ کوچ سے نیچے اتری' اس عورت نے کہا اور باہر پھیلی کالی سیاہ رات کی چادر دیکھ دیکھ کر اس کا اپنا دل کانپا جا رہا تھا۔ اگرچہ اڈے پر کافی رونق تھی۔ ٹیکسی اور رکشہ والے ہی اس کے گرد منڈلانے لگے تھے مگر اسے معلوم تھا اڈے کے باہر کیسی تاریک رات ہوگی۔

"جی۔ اب تو بہت ٹائم ہو گیا' چوکیدار کبھی بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا۔

ہاتھ ٹھنڈے پسینے سے یخ ہو رہے تھے۔ ایک تو اس کی زندگی کا پہلا تنہا سفر' پھر اس جان لیوا حادثے کی جونک جو اس کی جان کو چمٹی تھی۔ اس کا لہجہ خشک کیے دے رہی تھی' پیچھے تو جو کچھ رہ گیا تھا' وہ تو اس کے لیے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا مگر جو آگے پیش آنے والا تھا۔ اس کا سامنا کیسے کرے گی۔ کیسے اپنے منہ سے سب کو اپنی ذلت کی داستان سنائے گی۔ کیسے ایک ایک کا دامن پکڑ کر کہے گی کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ جو ہے تقدیر کی سازش ہے۔ اسی کا دھوکا ہے اور اس دھوکے نے میری جیتی جاگتی پاکیزہ زندگی کو کیچڑ میں بدل دیا ہے۔ گندے جوہڑ کا کیچڑ۔ اسے رونا آنے لگا۔

اردگرد گاڑیوں' رکشوں کے ہارنز کی 'پی پاپی پا' نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اڈے پر زندگی پوری طرح سے جاگ رہی تھی۔ کنڈیکٹر سب کا سامان نکال نکال کر دے رہا تھا۔ وہ ہتھیلیاں مسلنے لگی۔

"اگر میں دن میں پہنچ جاتی تو کم از کم اس خوف کے عذاب سے تو نہ گزرنا پڑتا۔"

اس نے سر اٹھا کر مصنوعی جگمگ کرتی روشنیوں سے بہت اوپر ٹمٹماتے ستاروں سے مزین سیاہ آسمان کو دیکھا۔

"اب کدھر جاؤ گی پھر اتنی رات گئے۔" وہ عورت اس کی پریشان و ہراساں صورت دیکھ کر بولی۔ اسے شاید اس پر رحم آ رہا تھا۔ اس کا شوہر اپنا سامان نکلوا رہا تھا۔

"پھپھو... پھپھو کے گھر..." اس کے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"کدھر ہے تمہاری پھپھو کا گھر۔" وہ عورت ہمدردی سے بولی تو اس نے ایڈریس بتایا۔

"چلو بھئی' لے لیا سامان۔ رکشہ کر لیتا ہوں' آج بٹھا بٹھا کے پورے دو گھنٹے ضائع کیے۔" اس کا شوہر اپنی بیوی کے پاس آ کر بولا۔

"تو اور کیا' اس کے پھپھو کے گھر... بیچاری بچی کو مل رہی ہے۔ بے چاری کو ہاسٹل جانا تھا۔ اب اس کا تو گیٹ بند ہو گیا ہوگا۔ بے چاری اب جائے گی کہاں' اتنی رات گئے۔" عورت ہمدردی بھرے لہجے میں نزہت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"اوہ... پھر...؟" وہ فکرمندی سے بولا۔ دونوں میاں بیوی ہی نیک دل لگتے تھے جو آج کل کے زمانے میں کسی سے آدھی رات کو ہمدردی کا رسک لے رہے تھے۔

"اس کی پھپھی کا گھر ہے ادھر' آپ کہیں تو ہم جاتے ہوئے نہ چھوڑ دیں اسے' گزرنا تو ادھر ہی سے ہے۔" عورت شاید شوہر سے ڈرتی تھی' ڈرے ڈرے لہجے میں اجازت لیتے ہوئے بولی۔ شوہر نے اسے ایک پل بیوی کو کڑی نظر سے گھورا پھر شاید اسے ساتھ کھڑی مسکین صورت بنائے نزہت پر ترس آ گیا۔

"چلو... کوئی حرج نہیں میں پھر ٹیکسی کرا لیتا ہوں۔" وہ آدمی مڑتے ہوئے بولا۔

اگرچہ اب اسے کسی پر اتنے بڑے حادثے کے بعد اعتبار تو نہیں کرنا چاہیے تھا' وہ دوسری بار اعتماد کے سوراخ سے ڈسنے جا رہی تھی۔ مگر کیا کرتی اس کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کوئی نہ تھا۔ خود اکیلے جانے کا حوصلہ بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے اکیلے اتنا لمبا سفر بھی کر آئی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک مگر وہ تو کوچ تھی اور کوچ میں تو اس کے علاوہ بہت سے مسافر اور بھی تھے اس لیے وہ پریشان نہیں ہوئی تھی مگر اس وقت کسی رکشے یا ٹیکسی میں اکیلے جانے کی دہشت ہی اسے مار ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

"پتا نہیں یہ اللہ نے اس کے لیے فرشتے بھیجے ہیں یا اس بچی کھچی زندگی کو مزید ریگزار بنانے کے لیے راہزن۔" ٹیکسی میں اس عورت کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

لیکن شکر ہی ہوا وہ اسے پھپھو کے گھر کے دروازے کے آگے ہی اتار کر گئے اور جب تک دروازہ کھل نہیں گیا وہ ٹیکسی رکوا کر دیکھتے رہے۔

اور وہ انہیں ان کی نیکی کے صلے میں اندر آنے کو بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ ابھی تو اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ اسے بھی اندر جانے کا راستہ ملتا ہے یا نہیں۔

وہ انسانوں کے روپ میں خضر تھے' اسے منزل تک پہنچا کر چلے گئے۔ اب پتا نہیں یہ منزل تھی بھی یا نہیں۔

کیپٹن شہباز کی چبھتی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ سر جھکائے سوچتی رہی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے؟" دھیمی مگر کرخت آواز اسے اس کی سوچوں سے باہر کھینچ لے آئی۔

"ارے کون آیا ہے؟ اتنی رات گئے کون آ گیا۔ شہباز کون ہے۔" ایاز کی آواز اتنی اچانک تھی کہ دونوں ہی جیسے اچھل پڑے اور نزہت کا دم تو مزید ہوا ہونے لگا۔

"جائیں آپ جا کر دیکھیں نا۔ کون آیا ہے' کسی نے گیٹ کھولا بھی یا نہیں۔"

ایاز کی بیوی فائزہ اس کے ساتھ ہی بولتی چلی آ رہی تھی اور وہ دونوں پتھر کے بت بنے ان کو گیٹ کی طرف آتا دیکھتے رہے' کیپٹن شہباز کو لگا ان کے سارے سوال دم توڑ گئے ہیں۔ اب کسی سوال جواب کی ضرورت نہیں۔

"کون ہے؟ پوچھ کر دروازہ کھولنا تھا۔ بارہ تو بج رہے ہیں' اس وقت تو..." اور نزہت پر نظر پڑتے ہی ایاز تو جیسے بولنا ہی بھول گیا۔

"ہاں نہیں تو کیا' اس وقت تو کالے کرتوتوں والے ہی آتے ہیں چور لٹیرے' یہ کوئی اچھے لوگوں کے آنے کا وقت ہے..." فائزہ اگرچہ پہلے ہی نزہت کو دیکھ چکی تھی مگر جملہ تقریباً پورا کر کے ہی اس نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"نزہت! تم اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟" ایاز کے حیرت زدہ سوال نے اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر دیں۔ کتنی دیر کا رکا ہوا سیلاب بہہ جانے کو تیار تھا۔

"اللہ میری توبہ' اللہ میری توبہ۔" فائزہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا' توبہ تلا کرنے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ نفی میں زور زور سے سر ہلا رہی تھی جیسے کسی کا بہت ہی ناقابل یقین منظر اسے نظر آ گیا تھا۔

"بھئی۔ کون آیا ہے۔ یہ شور کیسا ہے گیٹ پر؟" اظہر کیوں پیچھے رہتا اور شہباز کی توبہ' مجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اتنی رات گئے ان لوگوں کو ڈور بیل کی ایک ہی آواز نے کیسے اٹھا دیا' جب کہ ان دونوں کے پورشنز بھی خاصے ہٹ کر تھے۔

"آپ دیکھیں جا کر۔ کیا ہو گیا آدھی رات کو' امی جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

اظہر کی بیوی عالیہ ان کے ساتھ بولتی آ رہی تھی۔

"کمال ہے ویسے آدھی رات کی گردان سارے ہی کر رہے ہیں اور سویا ہوا کوئی بھی نہیں تھا۔ سب چوکس آنکھوں اور ہوشیار چہروں کے ساتھ ادھر ہی دوڑے چلے آ رہے ہیں۔"

کیپٹن شہباز نے جھنجلا کر سوچا۔ ایک گہرا سانس لیا اور دروازہ چھوڑ کر واپس جانے کو مڑ گئے۔

"اب ظاہر ہے۔ میرے یہاں کھڑے رہنے یا سوال جواب کرنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ اب تو "دنیا" آ گئی ہے۔ سب سوال خود ہی کر لے گی۔

"کون آیا ہے شہباز یا کوئی اور مسئلہ ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے؟" اظہر بھائی کی مصنوعی حیرت اور بے ربط جملے کیپٹن شہباز کو اندر تک بیزار کر گئے۔ ان کا جی چاہا ہمیشہ کے لیے اس منظر سے کہیں غائب ہو جائیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔ اظہر کے کسی سوال کا انہوں نے جواب نہیں دیا۔ نہ مڑ کر دیکھا کہ نزہت کو دیکھتے ہی ان دونوں میاں بیوی کی کیا حالت ہوئی ہے۔

"ہائے یہ تو نزہت ہے' دیکھ رہے ہیں آپ؟" اظہر کی بیوی عالیہ نے ایک چیخ ماری تھی۔

"...اردگرد کے ہمسائے بھی اٹھ کر آ جائیں کہ نزہت آئی ہے۔ آدھی رات کو۔" اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے عالیہ کی چیخ سن کر دل میں جلتے ہوئے سوچا۔

"تم اس وقت کہاں سے آئی ہو؟" اظہر نے کڑے لہجے میں اس کے قریب آ کر پوچھا۔

"ہائے اللہ میری توبہ' حوصلہ دیکھو' دلیری دیکھو۔ آدھی رات کو اکیلی کیسے آ گئی۔ کیا دن نہیں چڑھنا تھا؟" عالیہ نے اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے دن تو بھلے کاموں کے لیے ہوتا ہے' کوئی لوگ رات میں نیکیاں کماتے پھرتے ہیں۔" فائزہ کیوں چپ رہتی۔ نزہت نے روتی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"سوچو' مفت میں ہی سب مسئلے حل ہو گئے' وہ کیا کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکری۔ رنگ بھی چوکھا آئے۔ نہ مایوں مہندی کا خرچا' نہ بارات لے جانے کا بکھیڑا' نہ ڈولی اٹھانے' نہ جہیز بنانے اور نہ ولیمے کا جھنجٹ۔ دلہن بیگم خود ہی چل کر گھر آ گئیں۔ زمانہ جو کمپیوٹر کا آ گیا ہے' ابھی پتا نہیں ان گناہگار آنکھوں نے کیا کیا دیکھنا ہے۔"

فائزہ کی چلتی زبان کے آگے تو بڑے بڑوں کی بولتی بند ہو جایا کرتی تھی اور آج تو اسے "ان ٹائم" موقع ملا تھا۔ وہ کیوں چانس مس کرتی۔

"ارے آگ لگاؤ ایسے کمپیوٹر کے دور کو جو اس طرح دیدوں کا پانی مار دے۔ میں تو کہتی ہوں۔" عالیہ نے اپنی زبان کی دھار تیز کرنا چاہی۔

"چپ کرو تم دونوں۔" اظہر نے پلٹ کر انہیں جھاڑا۔

"کیسے آئی ہو تم؟" وہ پھر نزہت کی طرف متوجہ ہوئے۔ لہجہ ہنوز مار دینے والا تھا۔

"مم۔ مجھے پھپھو سے ملنا ہے۔" خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرتے ہوئے اس نے بمشکل کہا۔

"امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں' اس وقت انہیں نہیں جگایا جا سکتا' محض تمہاری "ملاقات" کے لیے۔" انہوں نے کورا سا جواب دیا۔ اب چاروں اس کی شکل دیکھ رہے تھے کہ اب جاؤ یہاں سے۔ ادھر تمہارا اور کوئی نہیں رہتا۔ اگر وہ بھی آج وحشانی کے سارے ریکارڈ توڑ کر ہی جائے گی ادھر سے۔ اسی طرح جامد کھڑی رہی۔ ان کی تلوار جیسی نگاہوں کو اپنے اوپر سہتے ہوئے دیکھ کر بھی۔

اسے اب ادھر سے کہیں نہیں جانا۔ یہ تو اس نے دل میں طے کر لیا تھا کیونکہ اب اس چوکھٹ کے سوا اس کے لیے اور کوئی قدم جمانے کی جگہ نہیں بچی تھی اور ویسے بھی اتنی رات گئے وہ اور کہیں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس اجنبی شہر میں۔

"میں ان سے ملنے آئی ہوں۔" وہ کمزور لہجے میں ہولے سے بولی۔

"ہاں۔ وہ بھی تو تمہارے درشن کو جیسے مری ہی جا رہی ہیں۔ انہیں مرنے کے قریب تو کر دیا ہے۔ اب لگتا ہے مار کر ہی جاؤ گی۔" عالیہ کی سرگوشی اگرچہ فائزہ کے کان میں کی تھی مگر سب نے سن لیا' جواب کسی نے نہیں دیا۔

"اب کیا ادھر کھڑے ہو کر رات گزارنی ہے' جو فیصلہ کرنا ہے کریں۔" فائزہ نے کچھ دیر بعد اکتا کر کہا۔

"امی جان تو سو رہی ہیں۔ بہتر ہے انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ عالیہ! تم نزہت کو گیسٹ روم میں لے جاؤ۔ یہ صبح ان سے مل لے گی پھر جو ان کا فیصلہ ہو گا۔"

اظہر نے کچھ دیر بعد سوچ کر کہا تو نزہت کو لگا اسے دوبارہ زندگی کا پروانہ مل گیا ہو۔ چار دیواری' ایک گھر میں اسے رہنے کی نوید جو مل گئی تھی۔ رات بھر کے لیے اور صبح اسے چاہے پھپھو کے پاؤں ہی کیوں نہ پکڑنا پڑیں وہ پکڑ لے گی۔

☼ ☼ ☼

سیدہ نے ہولے سے دروازہ بجایا' دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا' ان کی ہلکی سی دستک پر مزید کھل گیا۔

"بھئی اٹھے نہیں ابھی تک۔"

وہ کہتی ہوئی اندر آ گئیں اگر انہوں نے سلطان بخت سے کہا تھا تو وہ پہلے ہی کمرے میں موجود نہ تھے اور صالحہ کرسی پر چپ چاپ ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں جکڑے گود میں رکھے' ہاتھوں کو تکے جا رہی تھی۔ اس نے سیدہ کی آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

"نئی زندگی کی پہلی صبح بخیر۔"

سیدہ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی ہولے سے چوم کر کہا۔ صالحہ کا ستا ستا اداس و ملول چہرا انہیں رات کی ساری کہانی سمجھا گیا تھا۔

سیدہ کی دعا پر صالحہ نے نم آنکھوں سے جن میں شکوے ہی شکوے تھے‘ انہیں دیکھا سیدہ صاف نظریں چرا گئیں اور آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹانے لگیں۔

"میں نے سوچا کافی ٹائم ہوگیا ہے۔ میں خود ہی جا کر اٹھا آؤں۔ میں گھر سے بھی ایک چکر لگا آئی ہوں۔ ناشتہ جو ادھر بھجوانا تھا۔ اب تم جلدی سے شاور لے کر فریش ہو جاؤ تو میں تمہارے کپڑے نکال دیتی ہوں۔ نیچے ڈائننگ ٹیبل پر بابا جان سب کا انتظار کر رہے ہیں۔"

جلدی جلدی مصروف لہجے میں کہتی پردے ہٹا کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

"دیکھو ان میں سے کون سا نکالوں؟"

انہوں نے تین سوٹ جو وہ اندر الماری سے نکال لائی تھیں۔ اس کے آگے کیے۔ اس نے سرسری نگاہ سے انہیں دیکھا اور پھر اپنے پہلے مشغلے میں مصروف ہوگئی۔

"میرا خیال ہے یہ اورنج والا صحیح ہے۔ شروع شروع کے دنوں میں اس طرح کے شوخ رنگوں اور بھاری کام والے کپڑے پہنے جائیں تو پہنے جاتے ہیں ورنہ بعد میں تو ایک دو بچے ہو جائیں تو یہ ساری قیمتی کپڑے صندوقوں میں بند ہو جاتے ہیں اور تمہارے تو دونوں طرف کے کپڑے ہی اتنے قیمتی اور تعداد میں بھی اتنے زیادہ ہیں کہ تمہیں تو دن میں کم از کم چار دفعہ ڈریس چینج کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے نا پھر یہ۔" بھاری کام والا اورنج سوٹ انہوں نے اس کے آگے کیا۔ اس نے بمشکل سر ہلا دیا۔

"چلو پھر تم واش روم میں‘ میں کسی کو بلا کر استری کروا دیتی ہوں اور پلیز! جلدی کرنا۔ بابا جان کا ناشتہ پہلے ہی خاصا لیٹ ہو چکا ہے۔ آج انہوں نے ایک ہی ضد پکڑی ہے کہ بہو کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔ ویسے بھی ادھر تو آج دوپہر کا ولیمہ ہے۔ اور تین گھنٹوں بعد ہی فنکشن شروع ہو جاتا ہے جب کہ رات کو سب کو شہر جانا ہے۔ ہوٹل میں جو فنکشن رکھا ہے نا جس میں۔"

سیدہ بغیر سانس لیے بولے جا رہی تھیں‘ صالحہ خاموشی سے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ سیدہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور چپ کر گئیں۔

"میں کیا کروں صالحہ! تم کیا سمجھتی ہو‘ میں تمہارے دکھ سے انجان ہوں مگر تمہارا یہ دکھ ایسا ہے کہ تمہیں خود ہی اسے اپنے سینے پر سہنا ہوگا۔ اپنا خون جگر جلا کر اس کی پردہ داری کرنا ہوگی اور جس دن اس کو خلق خدا کو بیان کرو گی اس دن تمہارا اپنا وجود بھی سچائی کھو بیٹھے گا۔ ہماری عورتیں اسی طرح کے غم سہہ کر ہی تو معتبر ہوتی ہیں۔"

سیدہ بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگیں۔ رات انہوں نے سلطان بخت کی بیزار‘ کوفت زدہ شکل ہی سے بھانپ لیا تھا کہ اس کا صالحہ کے ساتھ کوئی بھی نیک سلوک کرنے کا ارادہ نہیں‘ پھر انہوں نے سلطان بخت کو رات تین بجے باہر ٹیرس پر جھکے سگار پیتے دیکھ لیا تھا اور اس کے ایک گھنٹے بعد بھی۔

سیدہ کے خدشے درست ثابت ہوئے تھے۔ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔ سلطان بخت کو صالحہ پسند نہیں اور وہ کسی مصیبت کی طرح ہی اسے اپنے ساتھ قبول کریں گے۔

"جو مرضی آئے کرے۔ میں کیا کروں‘ سالوں اس پریشانی نے میری جان سولی پر لٹکائے رکھی ہے کہ اگر سلطان بخت نے صالحہ سے شادی نہ کی تو حسین شاہ میرے ساتھ کیا کرے گا۔ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہ تھی‘ اب کم از کم یہ عذاب تو میرے سر سے اتر گیا نا‘ ہر بندہ اپنے مفاد کی سوچتا ہے میں کیوں نہ سوچوں اب یہ صالحہ کی قسمت اس کے نصیب.... میں بہت قربانیاں دے چکی‘ دونوں گھروں کی خاطر‘ جس طرح میں نے اپنے مسئلے کو خود سمجھداری ہوا کا رخ دیکھ کر حل کیا۔ اسی طرح صالحہ کرے۔ سب اسی طرح کرتے ہیں۔ کوئی کسی کا مسئلہ حل نہیں کرتا۔ سلطان بخت اس کے ساتھ کیسے نباہ کرتا ہے‘ کرتا ہے یا نہیں کرتا‘ عقل مند ہوگی تو قابو کر لے گی۔ بے وقوفی

کرے گی تو خود کو تباہ کرنے والی بھی خود ہوگی۔ اب یہ میرا درد سر نہیں۔"

وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور سوٹ کی پنیں نکالنے لگیں۔

"اور اس بے وقوف کو دیکھو جہاں اتنے دن صبر کیا ہے خود پر‘ وہاں کچھ دن اور صبر کر لے۔ بابا جان حج پر چلے جائیں گے تو پھر بے شک جو مرضی من مانی کرتا پھرے‘ واپس آکر بھی انہوں نے تجوری سنبھالنا ہے اور دیکھا جائے تو سلطان بخت بھی صحیح ہے۔ یہ صالحہ کہاں اس کے ساتھ جچتی ہے۔ چہرے اور ہاتھوں پر ابھی سے جھریاں پڑ رہی ہیں‘ رنگ کچھ صاف ہے‘ اس لیے کچھ اور نمایاں ہوتی ہیں‘ سلطان بخت شہزادہ لگ رہا تھا کل‘ ایسی دلہن پا کر اس کا تو دل رکھنا ہی تھا‘ ہاہ! ہمارے بڑوں کے فیصلے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئیں کہ باہر جا کر کسی ملازمہ کو کپڑے استری کرنے کے لیے آواز دیں۔

۞ ۞ ۞
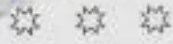
حویلی کا خوبصورت وسیع ہال اس وقت سبطین شاہ کے معزز مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ خوش گپیوں میں مگن تھے۔ جس کی وجہ سے بیک گراؤنڈ میں بجتے میوزک کی آواز بہت کم آرہی تھی بیرے ادھر ادھر مختلف آرڈرز سرو کرتے پھر رہے تھے۔ آج سید سبطین شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ خواب جو ان کی آنکھیں مدتوں سے دیکھ رہی تھیں‘ آج اس خواب کی تکمیل ہوگئی تھی۔ سید سلطان بخت کے سر پر سہرا سج گیا تھا۔ اور مرحوم بھائی سے کیا گیا وعدہ وفا کرنا ان کی زندگی کی دو بڑی خواہشات تھیں اور سلطان بخت کی ٹال مٹول کی وجہ سے کئی بار انہیں اس خواہش کا تکمیل پانا ناممکن لگا تھا۔ اسی کشمکش نے تو ان کے دل کو ناتواں کر ڈالا تھا۔ بات صرف بیٹے کو دولہا بنانا یا مرحوم بھائی سے کیے گئے وعدے کی تکمیل نہیں تھا بلکہ سیدہ کی بیس سالہ پرانی گرہستی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کا بھی مسئلہ تھا اور وہ حسین شاہ کی طبیعت سے بھی واقف تھے اگر سلطان بخت اس شادی کے لیے راضی نہ ہوتا تو حسین شاہ نے نہ تو چچا کے بڑھاپے یا ان کی بیماری کا خیال کرنا تھا نہ اپنی جوان ہوتی اولاد کا نہ اپنی بیس سالہ پرانی ازدواجی زندگی کا وہ صرف تین حرف سیدہ کے منہ پر مار کر اسے حویلی سے چلتا کر دیتا کئی بار کھلے الفاظ میں سیدہ کی زبانی حسین شاہ نے چچا کو کہلا بھی بھیجا تھا بس یہ دو دھاری تلوار تھی جس نے کئی سالوں سے سبطین شاہ کی آنکھوں سے پرسکون نیند کو بھگا رکھا تھا۔ کل خیر و عافیت سے نکاح ہوا تو ان کو لگا وہ ایک بار پھر جوان ہوگئے ہیں اور سرے سے ان کے سینے میں دل کی توڑ پھوڑ ہوئی ہی نہیں۔ اور اس تمام عرصے میں سلطان بخت کا رویہ بہت کوآپریٹو رہا تھا کہیں بھی انہوں نے چوں چاں نہیں کی تھی اور آج کی دعوت نے ان کی سالوں کی تھکن ہی اتار ڈالی تھی۔ وہ اب خوش دلی سے اپنے دیرینہ دوستوں سے گپ شپ لگا رہے تھے۔

"سبطین شاہ جی! یہ کیا بات ہوئی ادھر بیٹے کے سر پر سہرا سجا ادھر آپ جہاز میں اڑ کر ولایت جا رہے ہیں‘ کچھ دن تو بہو بیٹے کی خوشی کو انجوائے کرتے۔" ان کے بے تکلف دوست ہشام بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس بیگ صاحب اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی‘ بیٹے کو دولہا بنا دیکھ لیا بیٹی ماشاءاللہ سے پہلے ہی اپنے گھر بار کی ہے۔ رہ گئی چھوٹی بچی تو وہ میں نے شروع دن سے سلطان بخت سے کہہ رکھا ہے کہ وہ میری نہیں اس کی ذمہ داری ہے۔ وہی اس کا باپ‘ وہی اس کا بھائی اور وہی سرپرست اور شہرینہ‘ سچ پوچھئے تو مجھ سے زیادہ بھائی کو ہی باپ سمجھتی ہے۔ ہر بات اس کے گوش گزار کرتی ہے‘ کیوں بھئی سلطان بخت! اس میں تو کم از کم کوئی مبالغہ نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟" وہ پاس کھڑے بیٹے کا کندھا ہلا کر بولے جو اپنے دوست سے کوئی بات کر رہے تھے۔

"جی بابا جان اس میں کوئی شک نہیں انکل! شہرینہ میری ہی ذمہ داری ہے‘ اور یہ ذمہ داری مجھے جی جان سے عزیز ہے۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں۔"

سلطان بخت نے فوراً مسکراتے ہوئے باپ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سبطین شاہ کا سر فخر سے بلند ہوگیا اور اس میں جھوٹ بھی کچھ نہ تھا۔ شہرینہ میں واقعی سلطان بخت کی جان تھی۔ اور سبطین شاہ نے کبھی شہرینہ کے معاملے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اسے اسکول میں داخلہ بھی سلطان بخت نے کرایا تھا اب جب کہ سبطین شاہ کا خیال

تھا کہ شہرینہ کی تعلیم بس کی جائے تو سلطان بخت نے کہہ دیا تھا کہ شہرینہ ان کی ذمہ داری ہے اور اس کے بارے میں ہر فیصلہ کرنے کا حق صرف انہیں ہی حاصل ہے، جسے سبطین شاہ نے خوش دلی سے مان بھی لیا تھا۔

"پھر واپسی کب تک ہوگی؟ ہمیں تو آپ کی واپسی کا انتظار رہے گا۔" ہشام بیگ بولے۔

"انشاء اللہ تین چار ماہ میں، اس سے زیادہ بہرحال نہیں۔"

وہ پُر اعتماد لہجے میں بولے تو سلطان بخت نے کچھ بدمزہ ہو کر ہاتھ میں پکڑا پیپسی کا گلاس پاس سے گزرتے ویٹر کی ٹرے میں رکھ دیا۔ آج ان کی بوریت کی انتہا ہو چکی تھی۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا جا رہا تھا۔ مسلسل فارمیلٹی نبھاتے نبھاتے وہ تھک چکے تھے اور رات کی بیزاری نے انہیں اور کوفت زدہ کر دیا تھا۔ صالحہ کے بارے میں جیسے ان کے خیالات پہلے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر بھی رتی برابر تبدیل نہ ہوئے تھے۔ کوئی بھی مثبت تبدیلی ان میں نہ آسکی تھی، وہ جیسی ان کے تصور میں تھی، خاموش بڑی بڑی سی۔ بعینہٖ ویسا ہی انہوں نے رات اسے دلہناپے کے روپ میں پایا۔ وہ ایک پل کو بھی انہیں متاثر نہ کر سکی تھی۔ اور یہ سوچ ان کے سکون کو غارت کر دینے کے لیے کافی تھی کہ اب اس کوفت زدہ شخصیت کو انہوں نے تاعمر خندہ پیشانی سے نہ صرف سہنا ہے بلکہ اس کے ساتھ قدم بقدم زندگی بھی گزارنی ہے۔

انہوں نے سینے سے ایک گہرا سانس کھینچا۔ ایک نظر باپ کے مطمئن چہرے پر ڈالی جو دوست سے باتوں میں مگن تھے۔ سارا ہال ہی انہیں مطمئن اور خوش باش چہروں سے بھرا نظر آیا۔ ایک وہی تھے، بے چین و مضطرب جن کے اعزاز میں یہ فنکشن ہو رہا تھا۔ انہوں نے کوٹ کی آستین ہٹا کر گولڈن رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ نو بجنے کو تھے۔ فنکشن ابھی ایک دو گھنٹے اور جاری رہنا تھا مگر اب ان کی برداشت کا پیمانہ چھلکنے کو تھا۔ وہ پاس کھڑے دوست سے معذرت کر کے ہال سے باہر آ گئے۔ کاریڈور میں بھی لوگوں کا رش تھا۔ ویسے بھی یہ ہوٹل کافی مشہور تھا اس وقت ہوٹل میں عموماً رش ہی ہوتا ہے، وہ بیزار ہو کر باہر لان میں چلے آئے۔ لان سے باہر پارکنگ میں گاڑیاں ہی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ لان کے نسبتاً کم رش اور ذرا تاریکی والے حصے میں چلے آئے اور کوٹ کی جیب سے موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگے۔

"ہیلو نین تارا! ہیلو۔۔۔!" وہ اس کی آواز سنتے ہی پہچان گئے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں ایک مخصوص لے میں آ گئیں۔

"شاہ جی آپ ہیں۔ ہائے اللہ میں آپ کو کس قدر مس کر رہی تھی، یہ آپ ہیں کس قدر بے وفا۔ اتنے دنوں کے بعد فون کیا۔ ابھی بھی فون کرنے کی کیا ضرورت تھی، میں مر جاتی تو پھر فون کر لیتے۔"

وہ سچ مچ رونے لگی اور سلطان بخت کو یہ احساس ہی بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا کہ نین تارا کی حسین آنکھوں میں آنسو آئے۔

"نینو! مائی سویٹ ہارٹ! مائی ڈارلنگ آئی ایم ساری، رئیلی سوری مگر تمہیں تو پتا ہے، میں بزی تھا بہت، آج ہی پہنچا ہوں جرمنی سے میں۔"

"آپ آ رہے ہیں ابھی۔" وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولی۔

"آپ آ رہے ہیں نا؟" وہ بہت پُرجوش ہو گئی تھی۔ وہ تذبذب کا شکار ہو گئے۔ آج تو ان کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کی طرف جانے کا مگر نین تارہ کی دعوت دیتی پُرجوش کھنکتی آواز نے ان کے ارادے کمزور کر دیے۔

"نہیں۔ آج تو نہیں۔ ابھی آیا ہوں۔ ابھی تو گاڑی۔۔۔" وہ کچھ ہچکچا کر بولے۔

"شاہ جی! آپ کو میری قسم شاہ جی! اگر آپ آج نہ آئے تو قسم سے آپ کی نین تارا مر جائے گی۔ بہت انتظار کر لیا میں نے۔ اب ایک پل نہیں رہ سکتی آپ کو دیکھے بغیر۔ نین نے قسم کھالی ہے، آپ یاد رکھیں۔" اس کی دھمکی اتنی دلفریب تھی کہ سلطان بخت کا جی چاہا فنکشن پر لعنت بھیج کر وہ اڑتے ہوئے اس تک جا پہنچیں۔

"اچھا بابا کوشش۔۔۔" وہ ذرا سا ہنسے۔

"نہیں کوشش نہیں شاہ جی! آپ کو آنا ہوگا۔ آپ کو میری قسم۔" وہ ہٹیلے لہجے میں بولی، شاہ جی تو اس لہجے پر قربان ہو کر سو بار آنے کو تیار ہو جاتے۔

"اوں۔۔۔" وہ کچھ کہنے جا رہے تھے کہ زوردار مردانہ قہقہے کی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

"کون۔۔۔ کون بیٹھا ہے ادھر تمہارے پاس؟" وہ چونک کر بولے۔ نین تارہ جیسے ایک لمحے کو چپ کر گئی۔

"کک۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔" وہ ہکلا گئی۔

"یہ کوئی نہیں تھا، کوئی مہمان آیا ہوا ہے، تم اپنے بیڈ روم میں ہو۔" سلطان بخت کا لہجہ مشکوک تھا۔ "یہ کمبخت فیوڈل لارڈز کو ذرا گھاس ڈال دو۔ یہ ہمیں اپنی پراپرٹی ہی سمجھنے لگتے ہیں اور اگر ان کی پراپرٹی کو ہضم کرنا ہے تو یہ ہی شو کرتے رہو کہ سرکار ہم آپ کی جاگیر ہی تو ہیں۔" نین تارا کو زیور گل کی بات یاد آ گئی۔

"آں۔ ہاں مہمان تھے۔ ماما کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں تو ادھر ہوں کامن روم میں، مما کے پاس ہی تھی وہیں سے اٹھ کر آئی ہوں۔ آپ پھر آ رہے ہیں نا بات ٹالیں نہیں، بتائیں مجھے۔" وہ اٹھلا کر اپنی پہلی ٹون میں واپس آتے ہوئے بولی۔

ایک تو یہ الو کا پٹھا قریشی خود جس قدر بے ہنگم ہے، اسی طرح بیہودہ اس کے قہقہے ہیں۔ ادھر بیٹھ کر ہنستا ہے۔ ایئرپورٹ تک آواز جاتی ہے۔ جہاز لینڈ کرنا بھول جاتے ہیں۔

نین تارا نے دانت کچکچا کر سامنے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے قریشی کو گھور کر دیکھا۔ وہ آج بیرسٹر کے لیے نہیں گئی تھی اور وہ خبر لینے گھر چلا آیا تھا، زیور گل نے اسے ڈنر پر روک لیا۔ زیور گل کھانا لگوانے گئی، قریشی پر رومانس سوار ہونے لگا۔ وہ نین تارا پر باقاعدہ فریفتہ ہی ہو گیا۔ اس کی لچھے دار گفتگو نے سچ مچ نین تارا کے سادہ مزاج کو جلانا شروع کر دیا تھا وہ ابھی چند منٹ پہلے اس کا نازک ہاتھ تھام کر اس کی نزاکت اور خوبصورتی میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا اور نین تارا کا کومل دل جو شاہ جی کی جدائی میں ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ قریشی کے موٹے نرم گداز ہاتھوں کا لمس پاتے ہی بے قابو ہونے لگا تھا۔ اس کی بیزاری اور اکھڑ پن کہیں دور جا بیٹھے تھے، وہ قریشی کی میٹھی مسکان اور دل آویز توصیفی جملوں کے حصار میں گھرے تھوڑا مسکرا رہی تھی۔ قریشی کے دل کی دھڑکنیں بے ہنگم ہونے لگیں۔ اس کی محنت ٹھکانے لگنے جا رہی تھی۔ یہ خود بخود ہموار ہو رہی تھی۔ نین تارا بہت آہستگی سے اس کے جال میں آنے ہی والی تھی کہ اس کے موبائل کی بیپ بج اٹھی قریشی کے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھوڑ کر موبائل پر جھپٹی تھی اور پھر اسکرین پر آئے نمبر کو دیکھتے ہی موبائل لے کر لاؤنج میں چلی گئی۔ قریشی کا دھڑ دھڑ کرتا دل ٹھنڈا ٹھار ہو کر سست روی سے دھڑکنے لگا۔ اب وہ زیور گل اونچے اونچے قہقہوں کے ساتھ خدا جانے کون سی کے کول گپے سنا رہا تھا۔

اور شاہ جی کی آواز سنتے ہی نین تارا کو اپنی کچھ دیر پہلے کی بے اختیاری یاد آ گئی۔

"ہاں میں آتا ہوں گھنٹے تک۔" وہ اس کو انکار تو نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے تو اتنے دنوں سے فون نہیں کیا تھا کہ پھر اس کی آواز یقیناً انہیں اور بے قرار کر دیتی۔ اور وہ اس سے ملے بغیر رہ نہ پاتے۔

"او کے۔ پھر میں آتا ہوں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک۔" وہ رابطہ منقطع کرنے جا رہے تھے۔

"او سنیں۔ سنیں شاہ جی۔" وہ ذرا سا چلائی۔

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" انہوں نے پارکنگ سے اپنے کچھ دوستوں کو اندر آتے دیکھا تھا۔ وہ اب کاریڈور کی طرف بڑھ رہے تھے، سلطان بخت انہیں ریسیو کرنا چاہ رہے تھے، جلدی سے بولے۔

"وہ اصل میں شاہ جی میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ادھر مما کے کچھ گیسٹ آئے ہوئے ہیں وہ خدا جانے کب جاتے ہیں۔ آپ ادھر آئیں گے تو ہم دونوں کی پرائیویسی ڈسٹرب ہوگی۔" وہ رک رک کر بولی۔

"تو پھر۔۔۔؟" وہ ماتھے پر شکن ڈال کر بولے۔ "ایسے کون سے خاص مہمان ہیں جو اتنی دیر تک رکیں گے، تم زیور گل سے میری بات کراؤ۔ میں بات کرتا ہوں۔" وہ خشک لہجے میں بولے، ان کا سارا نشہ اس بدمزگی پر ہرن ہونے کو تھا۔

"وہ تو ادھر باتوں میں مگن ہیں۔ میں انہیں نہیں بلواؤں گی، وہ مما کے کوئی کزن ہیں۔ شاید اسلام آباد سے آئے ہیں اور ادھر تو مما نے ابھی کسی کو بھی ہمارے تعلق، آئی مین نکاح وغیرہ کے بارے میں نہیں بتایا اور آپ جب آئیں گے تو میں آپ کو رات کو کہیں نہیں جانے دوں گی تو اس طرح پھر۔۔۔" وہ جھجک کر چپ کر گئی۔

"تو پھر کیا کریں؟" سلطان بخت الجھ کر بولے۔

"آپ ہی بتائیں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"تو ایسا ہے کہ تم پھر سید ہاؤس آجاؤ۔ ڈرائیور تو ہے نا۔ اس کے ساتھ آجاؤ۔ وہیں آجاؤں گا۔" ان کے ذہن میں ترکیب آئی۔

"سید ہاؤس کھلا ہے اور ابھی تو ادھر شاید کنسٹرکشن ہو رہی ہے۔"

"نہیں، کام مکمل ہو چکا ہے، فنشنگ بھی تقریباً ہو چکی ہے اور چوکیدار ایک دو ملازموں کے ساتھ موجود ہے۔ ادھر میں ابھی فون کرکے کہہ دیتا ہوں کہ وہ بیڈ روم کھلوا دے۔" وہ جلدی جلدی بولے۔

"شاہ جی! مجھے آپ سے گلہ ہے۔" وہ منہ بنا کر لاڈ سے بولی۔

"اب کیا ہے؟" وہ کچھ اکتا کر بولے۔

"آپ نے کوٹھی تو میرے نام کر دی اور نام وہی رکھا ہوا ہے اپنا فیملی نیم "سید ہاؤس"" وہ کچھ رنجیدہ لہجے میں بولی۔

"بھئی، تمہارا ہی ہے وہ گھر، بلکہ سب کچھ جو کچھ تمہارے نام ہے اور جو نہیں بھی تم کیوں فکر کرتی ہو۔ جب میں نے اپنا آپ تمہارے نام کر دیا تو پھر چیزوں اور کوٹھیوں کی کیا اوقات۔" وہ سر اونچا کرکے بارعب لہجے میں بولے۔

"بہر حال، تم وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک پہنچ جانا، میں بھی گھنٹے تک نکل آؤں گا۔ او کے۔"

"اوکے شاہ جی بائے۔" وہ بھی خوش دلی سے بولی تو سلطان بخت نے موبائل آف کر دیا اور نین تارا مسکراتی ہوئی ڈائننگ ٹیبل کی طرف آگئی۔ آج قریشی کا التفات اس کے لیے مبارک ثابت ہوا تھا۔ پارٹ ٹائم کے لیے قریشی کی محبت بھی بری نہیں۔ اتنے بے ہنگم وجود میں دل بڑا رومانٹک ہے قریشی کا۔ وہ مسکراتے ہوئے قریشی کے سامنے جا بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد جب کہ ابھی فنکشن جاری ہی تھا۔ سلطان بخت سبطین شاہ سے اجازت لے کر ہوٹل سے نکل آئے۔

"بابا جان! ایک ضروری کام سے جانا ہے، بہت ایمرجنسی ہے۔ اس لیے جانا پڑ رہا ہے۔ ہمیں گاؤں رات کو بھی دیر ہی سے پہنچوں گا۔ آپ گھر جا کر بتا دیجئے گا پلیز۔" وہ ہولے ہولے ان کے کان میں کہہ رہا تھا اور سبطین شاہ اپنے کسی مہمان کے پاس کھڑے سر ہلانے لگے۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں اپنی خفگی کا اظہار بھی کرنا چاہا۔ سلطان بخت کو روکنا بھی چاہا۔

"بس تھوڑا سا تو ٹائم ہے، سلطان بخت! اب میرے ساتھ ہی چلنا، اس طرح فنکشن چھوڑ کر جانا اچھی بات نہیں۔" وہ رو نہ سکے انہیں پیچھے سے روک کر آہستگی سے بولے۔

"آئی ایم سوری بابا جان! مجھے ابھی پہنچنا ہے میں دو ایک گھنٹے تک آجاؤں گا۔" وہ اب ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

"سلطان بخت! سب مہمان کیا سوچیں گے برا لگتا ہے یہ فنکشن تمہارے لیے تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے اگر تم ہی۔ اس طرح۔۔۔" وہ اٹک اٹک کر ان کے بہت قریب ہو کر بولے۔

"بابا جان! آپ ہیں نا ادھر پلیز، ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ، مجھے ضروری کام نہ ہوتا تو میں کبھی نہ جاتا، خدا حافظ۔" وہ عجلت میں ان سے پیچھا چھڑا کر باہر نکل گئے۔ سبطین شاہ کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

"یہ کبھی نہیں سدھرے گا۔ اپنی حرکتوں سے مجھے مار کر ہی دم لے گا۔ نالائق بیہودہ احمق۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔ "اس کے ضروری کام اونہہ! جیسے مجھے پتا نہیں، اسے میں دیکھ لوں گا۔ بہت اس نے من مانی کر لی۔" وہ غصے سے بل کھاتے پیچھے مڑ گئے۔

پھر تمام فنکشن کے دوران لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ایک ایک کے پاس جا کر احوال پوچھنے کے دوران بھی ان کا دھیان اسی ایک نقطے کی طرف لگا رہا۔

"جانے سے پہلے کچھ ایسا انتظام کر جاؤں کہ سلطان بخت کے پر کٹ جائیں۔ اڑنا بھی چاہے تو پھڑپھڑا کر رہ جائے۔"

صالحہ سے ان کا رویہ صبح ناشتے کی میز پر ہی ان سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا، نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کے ایک دوسرے کے بارے میں شادی کی پہلی صبح کیا تاثرات ہوتے ہیں کیا انہیں معلوم نہیں تھا اور اس کی ذرا سی جھلک بھی انہوں نے دونوں کے چہروں پر نہیں پائی تھی پھر صالحہ کا اجڑا اجڑا سا روپ میک اپ اور قیمتی لباس کے باوجود چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی اداسی، بے حد سنجیدہ چہرہ اور لیے دیے سے انداز انہیں بہت کچھ سمجھا چکے تھے۔ وہ صبح ہی سے اس نقطے پر سوچنے سے بچنا چاہ رہے تھے اور اب سلطان بخت کے غیر ذمہ دارانہ رویے نے انہیں پھر سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر ایک ایک کرکے مہمان رخصت ہونے لگے۔ وہ استقبالیہ پر کھڑے سب سے الوداعی کلمات بولتے رہے اور سلطان بخت کی غیر موجودگی پر مختلف بہانے گھڑ کر سب سے معذرت بھی کرتے رہے، آخر میں گاؤں کے چیدہ چیدہ مہمان رشتے دار ہی رہ گئے۔ وہ بھی جا کر گاڑیوں میں بیٹھنے لگے۔

"غلام بخش! میری بات سنو ادھر آکر۔" انہوں نے دور کھڑے سلطان بخت کے محافظ خاص کو آواز دی۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا۔ بڑے شاہ جی کی آواز سن کر مستعدی سے مڑا اور کندھے سے لگی اپنی کلاشنکوف درست کر کے ان کی طرف بڑھا۔

"جی شاہ جی!" وہ پاس آکر مودب لہجے میں بولا۔

"تم کدھر جا رہے ہو؟" وہ اس پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔

"گ۔۔۔ گاؤں جی۔۔۔" وہ کچھ ہکلا گیا۔

"تم چھوٹے شاہ جی کے ساتھ نہیں گئے؟" ان کا انداز کڑا تھا۔

"جی انہوں نے منع کر دیا تھا۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"جب میں نے تم سے کہہ رکھا ہے کہ تم کو ہر وقت ان کے ساتھ رہنا ہے۔ جب بھی وہ کہیں باہر جائیں تو پھر۔" وہ بخت کھردرے لہجے میں بولے۔

"جی میں نے کہا تھا مگر وہ نہیں مانے۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"تم اپنی گاڑی کسی اور کو دے آؤ اور میرے ساتھ آجاؤ۔" وہ اسے حکم دے کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ واپس مڑ گیا۔ اور چند لمحوں بعد ان کی گاڑی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا سبطین شاہ پیچھے بیٹھے تھے۔

"پیچھے آؤ غلام بخش۔۔۔" انہوں نے حکم دیا۔ غلام بخش فوراً "فرنٹ ڈور" چھوڑ کر ان کے ساتھ پرے ہٹ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

"گاڑی چلاؤ مگر رفتار بہت کم رکھنا۔" انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا اس نے سر ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"تم کب سے ہو سلطان بخت کے ساتھ؟" وہ نیچی آواز میں غلام بخش سے بولے۔

"جی تقریباً" تین سال سے۔"

"ہوں جب سے سلطان بخت باہر سے آیا ہے۔ تم ہی اس کے ساتھ ہو۔ اب مجھے بتاؤ، وہ جب ادھر شہر میں

آتا ہے تو کدھر کدھر جاتا ہے۔" ان کی آواز ابھی بھی مدھم تھی۔

"جی فیکٹری' آفس اور......"

"ان رسمی جگہوں کو چھوڑ کر۔ ان کا مجھے پتا ہے۔" وہ تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"جی اور تو کہیں نہیں' بس گاؤں......" وہ سر جھکا کر بولا۔

"بکواس مت کرو غلام بخش! تم سلطان بخت کے ساتھ رہتے ہو' اس لیے شاید مجھے نہیں جانتے' میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنوا سکتا ہوں کہ تمہارے گھر والوں کو اس کی راکھ بھی نہ مل سکے گی۔ سنا تم نے۔"

"جی شاہ جی۔" وہ منمنایا۔

"شاہ جی کا بچہ......" وہ سر اٹھا کر غصہ سے بربڑائے۔ "جو میں نے پوچھا ہے' وہ بتاؤ مجھے۔"

"میں کیا بتاؤں شاہ جی! جو آپ پوچھ رہے ہیں۔ بتا تو رہا ہوں۔" وہ اب کے ذرا ڈر کر بولا۔

"تمہیں سلطان بخت کا گارڈ کس نے مقرر کیا تھا؟" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

"جی آپ نے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' سلطان بخت اتنا بزدل ہے کہ کوئی اس پر حملہ کرے تو وہ حملہ کرنے والوں کی آنکھیں نکال کر ان کی ہتھیلی پر نہ رکھ دے اور اپنی حفاظت کے لیے تم جیسے نمک حراموں کی شکل دیکھے یا ہمارے اس قدر دشمن ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو چند میل کے فاصلے پر بھی گارڈ کے بغیر نہ بھیج سکوں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے؟" وہ دانت پیس کر بول رہے تھے۔ وہ چپ رہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے اور میں نے تم سے پہلے دن کہا تھا کہ تم نے نا صرف چھوٹے شاہ جی کی حفاظت کرنی ہے بلکہ ان کی تمام سرگرمیوں کی وقتاً فوقتاً مجھے رپورٹ دینی ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

"جی شاہ جی!" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"تمہارے اور تمہارے خاندان کے حقے پانی کا میں نے ٹھیکہ نہیں اٹھایا کہ تمہیں دانہ دنکا تو تم پر لٹاتا رہوں اور کام سے تم جی چراتے رہو۔" وہ اب بھی خاموش رہا۔ سبطین شاہ نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔

"ہاں' اب مجھے آرام سے بتاؤ۔ وہ کون کون سی جگہیں ہیں جہاں سلطان بخت گزشتہ ایک سال میں چار بار سے زیادہ گیا ہے۔ یا خاص طور پر ادھر جاتا ہے' ہیرا منڈی کو چھوڑ کر۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں بولے۔

غلام بخش نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"بولو' میں کیا بکواس کر رہا ہوں میرے پاس تمہارے ایکشن دیکھنے کے لیے ٹائم نہیں ہے۔" وہ دھاڑے' اب کے ان کی آواز بھی خاصی بلند تھی۔

"وہ جی اگر چھوٹے شاہ جی کو کچھ معلوم پڑ گیا تو' وہ تو جی انہوں نے......" وہ بے بسی سے اپنی انگلیاں مروڑنے لگا۔

"تم بکواس کرو۔ باقی کی ذمہ داری میری ہے۔"

"وہ جی ادھر ایک کوٹھی ہے گل کدہ' وہاں جاتے ہیں جی صاحب۔" وہ ہچکچا کر بولا۔

"کیا اس نے کبھی کوئی کوٹھی نہیں دیکھی احمق! ادھر کس سے ملنے جاتا ہے' کون رہتا ہے' ادھر اس کا؟" وہ غصے سے اس کی گردن پر مکا مار کر بولے۔

"وہ کوئی ماں بیٹی ہے' مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی' صرف باہر ہی گاڑی کے پاس۔"

"کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔" وہ پر سوچ لہجے میں بولے۔

"تقریباً سال بھر سے یا شاید اس سے زیادہ۔"

"اب بھی جاتا ہے میرا مطلب ہے آج کل۔"

"جی آج کل کا تو مجھے پتا نہیں' پچھلے دو ہفتوں سے تو وہ حویلی ہی میں تھے۔"

"اور حویلی آنے سے پہلے کب گیا تھا۔"

"اسی روز جی۔ ادھر سے ہو کر پھر حویلی آئے تھے۔"

"کوئی گہرا چکر وکر تو نہیں؟" وہ شاید خود سے بولے تھے اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے وہ گڑبڑا گیا۔

"پتا نہیں جی!" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"ڈرائیور کو ادھر کا ایڈریس بتاؤ۔" وہ حکمیہ انداز میں بولے۔

تقریباً بیس منٹ بعد ان کی گاڑی گل کدہ کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔

"جاؤ دیکھو یا پتا کرو' سلطان بخت ادھر آیا ہے' اگر اس کی گاڑی کھڑی ہے تو مجھے بتاؤ آکر۔" ان کے حکم پر وہ چھلانگ مار کر گاڑی سے اترا اور گیٹ کی طرف بڑھا انہوں نے ایک نظر کوٹھی کو دیکھا پوش ایریا تھا شہر کا۔ کوٹھی کافی بڑی تھی خوبصورت اور ماڈرن طرز پر بنی ہوئی۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ سبطین شاہ نے سر آگے کر کے گیٹ کے اندر پورچ میں دیکھنا چاہا۔ پورچ میں کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔

"وہ جی چوکیدار بتا رہا تھا۔ ادھر کوئی نہیں آیا۔" غلام بخش چند لمحوں بعد آکر بولا۔

"گھر میں کون کون ہے۔ اس وقت......"

"جی چوکیدار کہہ رہا ہے' گھر میں اس وقت ملازمین کے سوا کوئی نہیں ہے' دونوں ماں بیٹی شاید کسی دعوت وغیرہ میں گئی ہیں۔"

"اچھا تم ادھر ہی رکو۔ کہیں پرے ہٹ کر گھر کی نگرانی کرو۔ چھوٹے شاہ جی اگر ادھر آئیں تو مجھے فون......" دور دور تک مارکیٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور اپنا موبائل وہ اسے نہیں دے سکتے تھے پھر خود کیسے رابطہ کرتے۔

"چلو تم یہیں رکو۔ میں واپسی پر تمہیں پک کر لوں گا اگر مجھے تاخیر ہو جائے یعنی دو گھنٹے سے زائد تو پھر تم ادھر سے گاؤں چلے جانا۔ چلو ڈرائیور۔" کہہ کر انہوں نے سر اندر کر کے ڈرائیور کو حکم دیا اور چند لمحوں میں ہی گاڑی تیزی سے سڑک پر بھاگتی چلی گئی۔ غلام بخش نے بے بسی سے گاڑی کی ہیڈلائٹس کو دور ہوتے دیکھا۔ اور گہرا سانس لے کر سڑک کراس کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

عبدالمتین کا رویہ صوفی صاحب کے لیے بہت حیران کن تھا۔ سید سلطان بخت کے ولیمے میں جو بی سی میں ہو رہا تھا بڑے شاہ جی نے پورے گاؤں میں سے بس دو چار ہی معززین کو شرکت کی دعوت دی تھی' رسمی دعوت تو دوپہر کو گاؤں میں ہوئی تھی اور گاؤں کے چند خوش قسمت افراد میں سے ایک صوفی صاحب بھی تھے جنہیں اس تقریب میں شرکت کی دعوت ملی تھی اور دعوت میں شرکت نہ کر کے صوفی صاحب بڑے شاہ جی سے خفگی مول نہیں لے سکتے تھے' کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ بڑے شاہ جی کو دو چار ماہ بعد واپس گاؤں ہی آنا تھا اور یہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا' بڑے شاہ جی کی موجودگی میں چھوٹے شاہ جی کو کبھی کھیلنے کی اجازت نہیں مل سکتی اور صوفی صاحب نے دل میں سوچ لیا تھا جیسے ہی بڑے شاہ جی اپنا علاج اور حج کر کے واپس آئیں گے' صوفی صاحب واپس گاؤں آجائیں گے اور آتے ہی آمنہ کا کسی مناسب جگہ جلد سے جلد نکاح کر دیں گے۔

وہ دوپہر میں ہی شہر آگئے تھے کہ عبدالمتین سے ملاقات کر کے اسے اپنے ٹرانسفر کے بارے میں بتا سکیں اور ساری صورتحال بھی جس سے آج کل ان کا گھرانہ گزر رہا تھا۔ بے شک دل ہی دل میں اپنے اس ہونہار بیٹے سے خفا تھے۔ مگر وہ اس سے زیادہ دن خفا بھی نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ اپنی اولاد میں انہیں آمنہ اور عبدالمتین ہی سے تو بہت پیار تھا بلکہ سب سے زیادہ پیار اور توجہ عبدالمتین کے حصے ہی میں آئی تھی' شہر آنے سے پہلے وہ ان کی آنکھ کا تارا ہوا کرتا تھا اس کی کوئی بھی بات' کوئی بھی فرمائش ٹالنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے ویسے بھی ان کے

خیال میں اس نے کبھی ان سے کوئی بے جا فرمائش کی بھی نہیں تھی اور وہ عبدالمعین کی طرح نالائق اور نافرمان بھی نہیں تھا بلکہ تعلیمی میدان میں ہمیشہ اپنی کارکردگی دکھا کر ان کا سر ہی فخر سے بلند کرتا تھا اسی لیے تو بڑے شاہ جی کی خفگی کے باوجود انہوں نے اسے شہر اعلا تعلیم کے لیے بھیج دیا تھا۔ عبدالمتین کی خواہش پر ہی انٹر کے بعد بھی اسے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا۔

عبدالمعین کی طرح نہیں جس نے مسلسل کئی سالوں سے انہیں زچ کر رکھا تھا' پہلے اسکول میں ڈالا تو وہاں نہیں پڑھتا تھا۔ وہاں بھی اس کی اوٹ پٹانگ حرکتیں اور کھیل تماشے صوفی صاحب کو برافروختہ کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے اور جب سے حفظ قرآن کی تعلیم میں ڈالا تھا تب سے تو اس نے انہیں بہت عاجز کر رکھا تھا اور ابھی تک جہاں سے چلا تھا' وہیں کھڑا تھا نالائقوں کا سینگ۔۔۔۔ وہ اسے اکثر دل ہی دل میں یہ خطاب دیتے تھے اور پرسوں جب سے انہوں نے مہندی کی تقریب میں گانا گانے پر اس کی خوب دھنائی کی تھی۔ وہ انہیں دوبارہ نظر ہی نہیں آیا تھا۔ رہتا گھر ہی میں تھا مگر صوفی صاحب کی آمد کی خبر پاتے ہی کسی کونے کھدرے میں روپوش ہو جاتا تھا پتا نہیں وہ انہیں اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتا تھا یا ان کی نہیں دیکھنا چاہتا تھا انہیں کون سی اس کی پروا تھی۔ وہ تو اس کے نظر نہ آنے پر ہی مطمئن تھے اور عبدالمتین سے تو وہ اس لیے خفا تھے کہ وہ گاؤں ان کے اصرار کے باوجود بہت کم آتا تھا اور اب تو بہت بلانے پر بھی توجہ نہ دیتا جیسے اس بار شادی میں بڑے شاہ جی کے سامنے انہیں شرمندہ کروا دیا تھا۔

"وہ لڑکا معاذ آیا تھا تمہارے پاس میرا خط لے کر۔" اس کے روکھے رویے کے باوجود صوفی صاحب اس سے بہت لگاوٹ سے بول رہے تھے۔

اور وہ مسلسل انہیں نظر انداز کیے کمپیوٹر کی بورڈ سے کھیل رہا تھا۔

"کون سا لڑکا؟" وہ انہیں دیکھے بغیر بولا۔

"معاذ جو ادھر شہر میں پڑھنے آیا تھا میٹرک میں ٹاپ کیا تھا اس نے' میں نے اسے تمہارے پاس بھیجا تھا کہ تم اس کی کچھ رہنمائی کر دینا۔ ادھر اس کا کوئی واقف کار نہیں تھا اس لیے۔"

"بابا صاحب! میں یہاں فارغ نہیں ہوتا جو ہر ایرے غیرے کی رہنمائی کرتا پھروں۔ مجھے ادھر پڑھائی سے فراغت نہیں پھر میں نے دو شارٹ کورسز بھی شروع کر رکھے ہیں کہ یہاں نوکری محض ڈگری کی بنیاد پر نہیں ملتی اور مجھے یہاں بہت اعلا مقام بنانے کے لیے بہت محنت کرنا ہے اور اس محنت کے دوران میں بھلا کہاں سے وقت نکالوں کہ لوگوں کی رہنمائی کروں۔ آپ گاؤں میں بیٹھے یہ نیک کام کر رہے ہیں۔ یہی کافی ہے اور ویسے بھی وہ میرے پاس نہیں آیا تھا' آتا تو شاید آپ کی وجہ سے میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر دیتا۔"

عبدالمتین کا لہجہ حد درجے بیزار کن تھا اور تیکھا بھی۔ صوفی صاحب کچھ دیر تو حیران ہی رہ گئے عبدالمتین نے تو کبھی ان سے اونچی آواز میں بات نہ کی تھی شاید بہت محنت کر رہا ہے اس لیے چڑچڑا ہو گیا ہے۔" ان کے دل نے اس کی حمایت کی۔

"ویسے بھی اپنی تعلیم کا خرچ اٹھانے کے لیے میں ایک جگہ پارٹ ٹائم بھی کر رہا ہوں۔ ایک ہوٹل میں رات کو چھ گھنٹے کاؤنٹر مین کی جاب ہے' آپ تو میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے اس لیے۔" وہ جتا جتا کر بولا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں عبدالمتین! تم نے جب جب جتنی رقم مانگی میں نے تمہیں بھیجی ہے۔" وہ سست لہجے میں بولے۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ جب میری تعلیمی اخراجات کم تھے مگر اب ان میں اضافہ ہو گیا ہے اور آپ کی بے نیازی میں بھی۔ کتابیں اس قدر مہنگی ہیں پھر شارٹ کورسز کی فیس' کھانے پینے' پہننے اوڑھنے کا خرچ اور پھر ہاسٹل کے اخراجات مگر آپ کو میری کوئی پروا ہی نہیں رہی کہ مجھے ادھر کس چیز کی ضرورت ہے' کس کی نہیں۔ ایک ایک روپے کے لیے مجھے کس قدر سوچنا اور کتنا کام کرنا پڑتا ہے' آپ کو کیا علم۔"

"تو بیٹا! مجھے لکھ بھیجنا تھا ناں۔۔۔"

"بس بابا صاحب! میں بار بار آپ کے آگے ہاتھ پھیلا کر آپ کی ہمدردی اور ترس کی بھیک نہیں مانگ سکتا۔ صرف اس کمرے کا کرایہ ہی پندرہ سو روپے ہے۔ کھانا پینا علیحدہ' درد سر۔ اور آپ محض ڈیڑھ ہزار روپے بھیج کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں' بہرحال کچھ دنوں کی بات ہے۔ مجھے کوئی نہ کوئی اور اچھی جاب مل جائے گی میرے ایگزام ہو جائیں تو گریجویشن کی ڈگری بھی مل جائے گی پھر مجھے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ اس کی کتابوں کی قیمت خرید کم از کم آپ کی خیرات کی رینج سے بہت دور ہو گی۔" وہ ان کی بات کاٹ کر اکھڑ لہجے میں بولا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو عبدالمتین! بیٹا! میں نے تو حتی الامکان کوشش کی ہے ہمیشہ تمہاری ضروریات کو ترجیح دی ہے اور ہر مہینے اپنی بساط سے بڑھ کر تمہیں رقم بھیجتا ہی رہا ہوں۔ تمہیں معلوم تو ہے میری تنخواہ کتنی ہے۔ یہ تو شاہ جی کی مہربانی ہے' جو زندگی کی گاڑی سہولت سے چل رہی ہے ورنہ اس تنخواہ میں اپنے کنبے کے ساتھ گزارہ بھلا کس طرح ممکن ہے پھر تم لوگوں کی تعلیم بھی۔۔۔"

"بس بابا صاحب! میں نے بتایا ناں میرے سلسلے میں آپ کی تکلیف اب چند روزہ ہے۔ پہلے بھی کئی ماہ سے کون سا میں آپ کے آسرے پر بیٹھا ہوں۔" وہ روٹھے ہوئے بیزار انداز میں بولا۔

"ایسے نہیں کہتے۔ مجھے سب سے پہلے تمہارا خیال ہے۔ تم بس اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو' ویسے تمہیں چھوٹے شاہ جی کی شادی میں شرکت ضرور کرنا چاہیے تھی۔"

"میرے پاس ٹائم نہیں تھا۔" وہ تڑخ کر بولا۔ صوفی صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔

"ایسے کاموں کے لیے ٹائم نکالنا پڑتا ہے۔" انہوں نے رک کر اس کی شکل دیکھی۔ "بہرحال میں آج ادھر ولیمے کی تقریب میں شامل ہونے آیا ہوں اگر تم ساتھ چلو تو اچھا ہے۔ شاہ جی خوش ہو جائیں گے۔" انہوں نے ہمت نہ ہاری۔

"میں نے کہا ناں' میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ بابا صاحب! میں ابھی بس شام کی ڈیوٹی کے لیے نکلنے والا ہوں۔ آپ جائیں بے شک۔"

وہ کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر بولا۔ صوفی صاحب نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ کتنا بدل گیا تھا یا شاید وہ خود بدلتے جا رہے تھے ورنہ اتنی بدتمیزی پر تو وہ سامنے والے کی کھال ادھیڑ دیا کرتے تھے۔

"میری ٹرانسفر ہو گئی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولے۔

"اچھا آپ کی بھی ٹرانسفر ہو گئی ہے۔" اس کی تمسخرانہ ہنسی صوفی صاحب کو غصہ دلانے کو کافی تھی مگر موقع محل کا لحاظ کر کے وہ پھر ضبط کا گھونٹ پی گئے۔

"شیخوپورہ میں۔" وہ خود ہی بولے۔ شیخوپورہ کا نام سن کر عبدالمتین کے ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے۔

"اور کوئی جگہ نہیں ملی تھی؟" وہ منہ بگاڑ کر بولا۔

"پوچھو گے نہیں کیوں ٹرانسفر ہو گئی میری۔" وہ خود ہی اس کی بات نظر انداز کر کے بولے۔

"مجھے کیا لینا۔" وہ بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولا اس کے سارے انداز ہی صوفی صاحب کے لیے نئے تھے۔ وہ شہر کے طرز زندگی میں پوری طرح ڈھل چکا تھا۔

"بڑے شاہ جی حج کرنے جا رہے ہیں اور وہیں سے انہیں اپنے علاج کے لیے لندن جانا ہے۔ انہیں تین چار ماہ لگ جائیں گے' اس لیے میں نے اپنی ٹرانسفر کروالی ہے۔"

"اس میں ٹرانسفر کروانے کی کیا بات تھی بھلا۔ انہیں آنا تو جانا تھا۔ وہ کون سے آپ کے ان داتا ہیں۔"

"چھوٹے شاہ جی کا مزاج بہت فرق ہے بڑے شاہ جی کی نسبت' دوسرے ان کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں' کردار کی مضبوطی کے لحاظ سے اس لیے۔" ان کی زبان ان کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"تو اس کا آپ سے کیا تعلق۔ انہوں نے کیا مدرسے پر تالا ڈلوا دینا ہے' جو آپ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" اس نے بدتمیزی سے کہا۔

"عبدالمتین!" وہ غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مجھے نہیں معلوم تھا۔ اس شہری تعلیم کا تمہارے دماغ پر الٹا اثر ہو رہا ہے۔ تمہیں بات کرنے کی تمیز اور تہذیب نہیں رہی، تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ میں کس پریشانی میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ کس لیے بچوں کو لیے دربدر دھکے کھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ تمہاری بہنیں جوان ہو رہی ہیں مگر تمہیں اس سے کیا، تم اس درجہ خود غرض ہو کہ محض غرض کی خاطر ہر رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہو۔ اور اگر غرض نہیں تو کوئی رشتہ نہیں، ماں بہنیں تمہیں کس قدر یاد کرتی ہیں، تمہیں اس کا ذرا بھی خیال نہیں۔ ان کے ساتھ تمہاری کوئی غرض جو نہیں اٹکی۔ ماں کے بلاوے کا کوئی احساس، نہ میرے کہنے کا۔ خود غرض انسان! مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا ہے تمہاری گفتگو سن کر۔ تم... یہ..."

وہ انگلی اس کی طرف اٹھا کر غصے اور افسوس سے بولتے چلے گئے۔ "بس ہم نے اسی ہفتے کے آخر میں گاؤں چھوڑ دینا ہے۔ اللہ حافظ۔"

کہہ کر وہ تیز قدموں سے آگے بڑھے۔ زور سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔ عبدالمتین چند لمحوں کے لیے ان کے غصے سے خوفزدہ ہوا تھا پھر ڈھٹائی سے کندھے اچکا کر بیٹھ گیا۔

"بہنیں جوان ہو رہی ہیں تو میں کیا کروں۔ مجھے اپنے بکھیڑے ادھر کیا کم ہیں۔ دیر کر دی مجھے اس فضول کی گفتگو میں اور پیسے بھی نہیں دے کر گئے۔ الٹا میرا وقت برباد کیا۔" وہ بڑبڑاتا ہوا باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کے شاید پونے تین بجے کا عمل تھا جب سید سبطین شاہ کی بلیک پجارو "سید ہاؤس" کے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دینے لگی۔ نیم غنودگی میں بیٹھا چوکیدار ہڑبڑا کر اٹھا اس نے جلدی سے گھڑی میں ٹائم دیکھا اور گیٹ کی درزوں سے آتی گاڑی کی تیز لائٹس کو۔

"اس وقت کون آگیا کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

اس نے ہڑبڑا کر پیچھے مڑ کر اندرونی عمارت کی طرف دیکھا۔ باہر کی گاڑی نے زور زور سے ہارن دینا شروع کر دیا تھا اس نے جلدی سے مین گیٹ وا کر دیا۔ "بڑے شاہ جی ہیں۔" گیٹ کے ہول سے جھانکتے ہی وہ حواس باختہ ہو گیا۔

"پاگل، الو کے پٹھے سو رہے تھے تم۔ تمہاری نیندیں پوری کرنے کو ادھر رکھا ہے۔ تمہیں موٹی اجرت پر۔" گاڑی رکتے ہی شاہ جی اس پر برس پڑے۔

"وہ جی شاہ جی! ذرا جھونک آگئی تھی۔ معاف کر دیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

سبطین شاہ نے حقارت بھری نظر اس کے مسکین چہرے پر ڈالی اور اندر پورچ کی طرف دیکھا، اگلا پل ان کو حیرت زدہ کر گیا۔

سلطان بخت کی بی ایم ڈبلیو پورچ میں کھڑی ان کا منہ چڑا رہی تھی۔

"یہ... یہ سلطان بخت..." وہ انگلی اٹھا کر گاڑی کی طرف اشارہ کر کے چوکیدار کی طرف بڑھے چوکیدار کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"سلطان بخت اندر ہے۔" دوسرے پل وہ خود کو سنبھال چکے تھے۔ ڈپٹ کر بولے۔

"اس وقت رات کے تین بجے یہ ادھر کیا کر رہا ہے۔ گاؤں نہیں گیا۔" وہ کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر خود سے بولے۔

غلام بخش کو گل کدہ کے آگے اتار کر وہ اپنے لیگل ایڈوائزر ہمایوں خان کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے اپنی وصیت لکھوائی۔ کچھ قانونی مشورے کیے اور پھر سب سے اہم نقطہ اپنی وصیت کا جس کی خاطر انہوں نے ہمایوں خان کو رات کے سوا بارہ بجے بستر سے اٹھایا تھا، وہ خاص طور پر لکھوایا۔ سارا کچھ کرتے کراتے انہیں تقریباً ڈھائی بج گئے۔

"اب گاؤں جانے میں تو بہت وقت لگ جائے گا "سید ہاؤس" ہی چلنا چاہیے، دو تین گھنٹوں بعد تو صبح ہو جانی ہے۔" اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون دینے کے لیے انہیں فوری طور پر آرام دہ بستر کی ضرورت تھی۔ دوسرے وصیت نامہ مکمل کرانے کے بعد ان کی طبیعت بھی بہت ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے سید ہاؤس کا رخ کیا مگر ادھر سلطان بخت کی موجودگی ان کے لیے بہت حیران کن تھی۔

وہ چوکیدار کو نظر انداز کر کے اندرونی عمارت کی طرف بڑھے۔

ماسٹر بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ شاید لاکڈ تھا۔ وہ بند دروازہ دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔ کسی نوکر کو آواز دینا ہی چاہتے تھے کہ اندر سے کسی لڑکی کی کھنکدار ہنسی کی آواز ان کے بوجھل اعصاب پر کسی تازیانے کی مانند لگی۔

اور دوسری آواز یقیناً "سلطان بخت" کی تھی۔

ان کی برداشت کی حد یہیں تک تھی۔

"سلطان بخت! نکلو باہر، بدبخت انسان!" انہوں نے طیش کے عالم میں بند دروازے کو زور زور سے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ جس کی گونج سے پوری کوٹھی ہل کر رہ گئی۔

وہ تکلیف دہ رات اس نے آنکھوں ہی میں کاٹ دی، اگرچہ آج بستر بھی نرم تھا اور کچھ صلۂ رحمی کی امید بھی جوان تھی۔ کم از کم پھپھو اسے یوں بے یار و مددگار تو دھکا نہ دیں گی۔ یہ اس کے دل کو یقین تھا۔ عالیہ بھابھی نے جاتے سے سرسری سے انداز میں اس سے کھانے کی صلاح ماری مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

اور یہ تو اسے آدھی رات کے بعد احساس ہوا کہ خالی پیٹ اسے نیند نہیں آسکتی۔ وہ پر بارہ ایک بجے راحیلہ کے گھر بمشکل دو چار لقمے کھائے تھے۔ اس کے بعد سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا حتیٰ کہ پانی بھی نہیں پیا تھا اور اب رات کے آخری پہر وہ اٹھ کر باہر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ گھر والوں کے استقبال کے انداز نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ یہ سب اس کے لیے انڈی کیٹر (اشارہ) تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس ستمگر کا رویہ اس کی توقع کے خلاف تو نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں کیپٹن شہباز کی طرف سے کچھ تو نرم سلوک کی توقع تھی۔ شاید۔ شاید... پچھلی محبت کی کوئی رمق، کوئی یاد، کوئی نرم احساس انہیں اس سے اچھا نہ سہی قابل قبول سلوک کرنے پر مجبور کر دے مگر یہ سب اس کی خوش خیالی تھی کہ اتنے زہر آلودہ موسم میں بھی جب کہ ہر طرف سے بے مروتی اور تنفر کی زہریلی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے دل نے ابھی بھی خوش فہمی کے چند شگوفے کھلا رکھے تھے اور ان شگوفوں کے دم گھٹ کر مرتے ہی اس کی ہمت جیسے دم توڑ گئی تھی۔ وہ بے دم سی ساری رات بستر پر پڑی رہی۔ کئی بار آدھا آدھا گھنٹہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی مگر نیند تو اس سے اس کے نصیب کی طرح ہی روٹھ گئی تھی۔

اور صبح شاید پانچ بجے تھے جب اس نے بیرونی گیٹ کھلنے اور کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور باہر جانے کی آواز سنی، دل چاہا اٹھ کر کھڑکی میں جا کر دیکھے۔ باہر کون ہے مگر پھر اسی بے ہمتی نے اس کے بدن کو پتھر کر دیا وہ بے حس پڑی گیٹ کے بند ہونے اور گاڑی کے جانے کی آواز سنتی رہی۔

پھر دن نکل آیا۔ روشنی کھڑکی کے پردوں سے اندر آنے لگی جب نیند نے اس کے در کھٹکھٹائے اور وہ جو پھپھو سے ملاقات کے بعد اپنے حق میں ہونے والے فیصلے کی بے چینی سے منتظر تھی۔ نیند کی اس دستک کو زیادہ دیر نہ ٹال سکی اور پھر دن کے گیارہ بجے تک بے سدھ پڑی سوتی رہی۔

عالیہ اسے دوبارہ جگانے آئی۔ اسے بے خبر سوتے دیکھ کر واپس چلی گئی۔

"نزہت! اٹھ جاؤ۔ ام جان کافی دیر سے اٹھ چکی ہیں۔ وہ بار بار ایاز کو پنڈی جانے کا کہہ رہی ہیں۔"

عالیہ کی زوردار آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، چند لمحے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ہے کدھر، سمجھنے پر سارے حواسوں پر جیسے اوس ہی پڑ گئی۔ دھیرے سے دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر بیٹھ گئی۔

"تم منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ روم میں آجاؤ۔ میں تمہارا ناشتہ ادھر ہی منگوا دیتی ہوں۔ پھر جا کر ام جان سے مل لینا۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئی۔

اگر وہ باعزت طریقے سے دلہن بن کر گھر میں اترتی تو کیا عالیہ کی جرات تھی۔ اس سے اس لہجے میں بات کر سکتی۔

"میرے خدا مجھے یہ کس کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے تو نے۔" شکوہ پھر سے اس کے لبوں سے پھسل گیا۔ وہ سست قدموں سے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتہ کرنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا' پھپھو کا سامنا کرنے کا خیال ہی اسے ہراساں کیے دے رہا تھا۔

بے دلی سے اس نے آملیٹ کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی اور سلائس توڑ کر لقمہ منہ میں ڈالا تو پہلے نوالے پر ہی اسے احساس ہوا کہ اسے تو شدید بھوک لگی ہوئی ہے۔ پھر ساری سوچوں کو جھٹک کر اس نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ عالیہ آتے جاتے اسے یوں ندیدوں کی طرح کھاتے دیکھ کر منہ کے کیسے زاویے بنا رہی تھی۔

"آخر میں ہی کیوں ساری دنیا کی پروا کروں' جب میں نے کچھ نہیں کیا۔ حد ہو گئی میں مر بھی جاؤں تو تب بھی مجھے ہی قصوروار ٹھہرائیں گے۔ تو بھاڑ میں جائے یہ دنیا۔"

پیٹ میں ایندھن پڑتے ہی اپنی ذات کی ہونے والی مسلسل نفی کا اسے احساس ہوا۔ اس نے بھر بھر کر چائے کے دو کپ بڑے اطمینان سے گھونٹ گھونٹ کر کے پیے۔ اس کا اطمینان دیکھ کر عالیہ کی بے چینی بڑھ گئی۔ اب وہ بالکل ہی اس کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔ نزہت انجان بنی چائے پیتی رہی۔ دوسرے کپ کا آخری گھونٹ پی کر اس نے کپ سائیڈ پر رکھے نیپکن سے ہاتھ اور منہ صاف کیے اور عالیہ کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"چلیں۔" اسے عالیہ کی بے چین شکل پر ترس آگیا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اصل میں میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔" اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ صفائی دیے بغیر نہ رہ سکی۔ عالیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں چلتی ہوئی مسز خان کے کمرے تک جا پہنچیں۔

"ام جان اندر ہیں۔ تم جا کر ان سے مل لو۔" وہ کہہ کر اجنبی انداز میں واپس مڑ گئی۔ نزہت نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔ اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ آنے لگا تھا۔ "میں پھپھو کا سامنا کیسے کروں گی۔" اس نے فضا میں گہرے گہرے دو تین سانس لیے ادھر پھر سے دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے آجاؤ۔" پھپھو کی نحیف آواز ان کی علالت کا پتا دے رہی تھی۔ وہ دل کڑا کر کے دروازہ دھکیل کر اندر چلی آئی۔ مسز خان بستر پر بیٹھی دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں' اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

"نزہت تم!" ان کے بوڑھے لب ہولے سے کپکپائے۔

"پھپھو' پھپھو! میں پھپھو۔!" وہ خود پر ضبط نہ رکھ سکی اور بھاگ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ کتنی ہی دیر روتے گزر گئی۔ تو اسے خیال آیا کہ پھپھو نے اسے چپ نہیں کرایا۔ کوئی تسلی' کوئی دلاسا نہیں دیا۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں کوئی بھی تاثر نمایاں نہ تھا۔ نہ ہمدردی کا' نہ محبت کا' نہ نفرت کا۔ نہ اس سے اپنے دوسرے رشتے کا بس وہ اسے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی شخص نظر آنے والی کسی چیز کو دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

اور یہ سپاٹ نظر اسے بہت ذلت آمیز لگی' ان تین چار دنوں میں پیش آنے والے حالات سے بھی زیادہ اس کی ہر طرح کی امید بلکہ خوش امیدی بھی پھپھو سے ہی بندھی تھی۔ اور اب ان کی اجنبی نگاہ نے اسے بتا دیا کہ اب خوش امیدی کی کرن بھی باقی نہیں' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کر کے سر پر دوپٹہ اچھی طرح جما کر وہ نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی۔ بہت مؤدب انداز میں۔

اسے یقین تھا اب یا چند لمحوں بعد پھپھو اسے ادھر سے جانے کے لیے کہیں گی۔

"تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟" شاید دس منٹ بعد ان کی آواز کمرے کی خاموش فضا میں گونجی۔

"اکیلی آئی ہوں۔" وہ جی کڑا کر کے حلق سے آواز نکال کر بولی بہت مضبوط لہجے میں مگر نگاہیں ہنوز گود میں دھرے ہاتھوں پر جما رکھی تھیں۔

"تم نے گھر سے باہر قدم کیوں نکالا' وہ بھی اکیلے؟" ان کا انداز بہت کڑوا تھا۔ نزہت کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس سے اس طرح سوال و جواب کریں گی۔ وہ تو بس انہیں اپنی دکھ بھری ذلت میں ڈوبی کہانی سنانا چاہ رہی تھی اور ان کا وہ پیار پانا چاہ رہی تھی۔ جو ان چار دن کی ملی بے تحاشا ذلت کے احساس کو کہیں اور پھینک دے کہ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔

"میں خود نہیں گئی تھی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"رحیم کے ساتھ گئی تھیں' کیا تمہیں اس کے بارے میں علم نہیں تھا یا تم ننھی بچی تھیں۔ اس نے کہا اور تم اس کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑیں۔"

وہ غصہ کر سکتی تھیں۔ انہیں غصہ کرنے کا حق بھی تھا مگر یہ غصہ تو نہیں تھا۔ یہ تو بیگانگی تھی۔ نزہت نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"سب مجھے ہی قصوروار کیوں ٹھہرا رہے ہیں آخر میں نے کیا کیا ہے کوئی میری بات کیوں نہیں سنتا۔ میرا یقین کیوں نہیں کرتا آخر۔۔۔" وہ چیخ پڑی' اس کی برداشت کی حد ہو چلی تھی۔

"چیخو مت اور تمہیں ادھر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ بھی اس طرح اکیلے۔ آخر میری میرے بیٹے کی بھی کوئی عزت ہے تمہیں اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اس طرح آدھی رات کو جوان کنواری لڑکیاں کیا اپنی ہونے والی سسرال میں آتی ہیں بھلا کہیں آج تک ایسا ہوتے سنا تم نے۔" غصے سے ان کا سانس پھول گیا تھا اور نزہت حیرت و خوف سے جھپکانا بھی بھول گئی تھی۔

"تماشا بنوا لیا تم نے اس گھر میں' مجھے میرے بیٹے کی نظروں میں گرا دیا ہے اگر کچھ ہو بھی گیا تھا تو تم سے اتنا نہ ہوا کہ بھائی کے پیر پکڑ لیتیں۔ اس سے معافی مانگ لیتیں' مگر کم از کم یوں تن تنہا گھر چھوڑ کر ہماری اپنی عزت یوں بھرے بازار میں تو نہ لے آتیں۔ چلو مانا کہ رحیم نے تمہارے ساتھ کوئی فراڈ کیا۔ اس کے جال سے اگر تم صحیح سالم نکل بھی آئیں تو کیا ضمانت ہے ان دو دنوں میں تم کہاں کہاں سے آئی ہو اور یوں آدھی رات کو اپنے سسرال کا در کھٹکھٹا کر خود کو معتبر ثابت کرنا چاہ رہی ہو۔ میں نے اس دن کے لیے تمہیں اس گھر میں لانے کے خواب دیکھے تھے نہ بینڈ بجے نہ باجا نہ کوئی بارات چلے' نہ ڈولی اترے اور تم سیاہ رات کا تاریک حصہ اوڑھ کر اس گھر کی عزت بننے چلی آؤ اور میں تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاؤں' تمہاری حماقتوں اور شرمناک حرکت پر تمہیں شاباشی دوں' ساری دنیا میں تمہاری مظلومیت کا ڈھول تمہارے ساتھ مل کر پیٹوں۔

بولو اتنا ہلکا سمجھ لیا تم نے مجھے۔ میرے گھر کی بنی برسوں کی عزت کو اتنا ہلکا سمجھ لیا تم نے۔ اور یہ سمجھ لیا کہ پھر بھی میں تمہیں اپنا لوں گی۔ اپنے گھر میں پناہ دے دوں گی۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ میرا بیٹا اتنا ارزاں نہیں ہے' تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم منہ کالا کر کے آؤ اور ہم تمہیں چودھویں کا چاند جان کر اپنے آنگن میں اتار لیں گے۔ کبھی نہیں' کبھی بھی نہیں۔" ان کا سر زور زور سے نفی میں ہل رہا تھا۔ اور نزہت تو شاید اپنے حواسوں ہی میں نہیں تھی۔

• • • • • •

اماں جی' آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ ہمیں اپنا گھر چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے' وہ بھی سارا سامان سمیٹ کر؟" زینب نے منہ بنا کر ٹرنک میں تہ شدہ کپڑوں کو اوپر نیچے رکھتی اماں جی سے پوچھا۔

"بتایا تو ہے' تمہارے باباصاب کی ٹرانسفر ہو گئی ہے' اس لیے جانا پڑ رہا ہے گھر چھوڑ کر۔ آخر کتنی بار پوچھو گی۔ صبح سے پچاس بار تمہیں بتا چکی ہوں' تم دھیان سے صرف کام کیوں نہیں کرتیں۔ اتنا کچھ سمیٹنا پڑا ہے ابھی'

رات ہونے کو ہے' بیچ میں صرف کل کا دن ہے۔ پرسوں دوپہر کو یا پھر اس سے اگلی صبح ہمیں جانا ہے اور تم کام سمیٹنے کی بجائے میرا بھیجا چاٹے جارہی ہو۔"

اماں جی نے زور سے کپڑے ٹرنک میں پٹخے اور زینب کو جھڑکتے ہوئے بولیں۔ یہ سچ تھا' اس طرح ایکدم سے بیٹھے بٹھائے اپنا گھربار چھوڑ کر جانا انہیں بھی بہت دکھ دے رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر مضطرب بھی بہت تھیں اور احتجاج کا ایک لفظ یوں منہ سے نہیں نکال سکتی تھیں کہ یہ سب کچھ وہ اپنی بچیوں کے تحفظ کے لیے ہی تو کرنے جارہی تھیں' ورنہ اس گھر سے تو جیسے ان کا جنم جنم کا رشتہ تھا۔

وہ بیاہ کر سولہ سال کی عمر میں اسی کچی مٹی کے گھر میں آئی تھیں۔ پندرہ سولہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ ماں باپ کے گھر سے ہنڈ کلیا پکاتی' گڑیا اور مٹی کے کھلونوں سے کھیلتی' وہ صوفی عبدالرحمٰن کی زوجیت میں آگئی تھیں۔ اسی گھر میں ان کی آنکھیں پہلی بار...... سنہری سپنوں اور ان کی تعبیر سے آشنا ہوئی تھیں۔ گھر میں تھا ہی کون' صوفی صاحب اور ان کی ضعیف اندھی والدہ جو رابعہ بی بی کے آنے کے بعد محض چار سال ہی زندہ رہ سکیں۔ پھر عبدالمتین کی پیدائش' اس کے ساتھ ہی صوفی صاحب نے پچھلے کچے کمرے گرا کر پختہ کرائے تھے۔ اینٹوں اور شہتیروں کی جگہ سیمنٹ اور ٹی آر کی پختہ چھتیں ڈلوائی تھیں پھر ہر بچے کی آمد کے ساتھ گھر کی پختگی اور تزئین میں اضافہ ہوتا رہا اور اب تو ان کو اپنے مرنے کا خیال بھی آتا تو تصور کی آنکھ انہیں اسی آنگن سے ان کا جنازہ اٹھتے دکھاتی تھی کہ یکایک یہ دربدری کی افتاد ان پر آن پڑی تھی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور صوفی صاحب کے کپڑے احتیاط سے تہ کرکے ٹرنک میں رکھتی آمنہ کو دیکھا۔ اس دن سے وہ جیسے مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی زینب کی طرح گھر چھوڑنے کی وجہ نہیں پوچھی تھی' نہ اس سلسلے میں ذرا بھی لب ہلائے تھے۔

"جگہ بدلے گی' نیا ماحول ملے گا' خود ہی آمنہ کا دھیان بٹ جائے گا۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ اور پھر ہم کون سا مستقل جارہے ہیں' چھ آٹھ مہینوں کی تو بات ہے۔ بڑے شاہ جی آجائیں گے' ٹھیک ہو کر ہم بھی واپس اپنے گھر آجائیں گے۔" انہوں نے سر جھٹک کر خود کو تسلی دی۔

"اماں جی! پہلے تو کبھی بابا صاب کی ٹرانسفر وغیرہ نہیں ہوئی تو اب کیوں بھلا۔"

زینب پر کبھی کسی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ برا منائے بغیر اگلے ہی پل پھر سے بولی تو رابعہ بی بی نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر جیسے افسوس سے سر ہلانے لگیں۔

"بہت ڈھیٹ ہو تم! پہلے اگر ٹرانسفر نہیں ہوئی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کبھی بھی نہیں ہوگی۔ وہ حکومت کے ملازم ہیں' سرکار جب چاہے' جدھر چاہے' کسی کی بھی ٹرانسفر کر سکتی ہے۔ اتنی پڑھی لکھی تو تم ہو تاکہ یہ بات سمجھ سکو۔" انہوں نے ہلکا سا دھموکا اس کے کندھے پر لگایا۔

"تو اماں جی! اب ہم کبھی اپنے گھر میں دوبارہ نہیں آئیں گے۔ ہمارا تو اتنا زیادہ سامان ہے' ہم سارا لے جائیں گے۔" زینب کا واقعی اب کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صبح سے کپڑے' جوتے' کتابیں' برتن اور نہ جانے کیا کیا سمیٹتے شام ہوگئی تھی پھر اپنے گھر کو چھوڑ کر جانے کا احساس' وہ پسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گئی۔

"آئیں گے' آئیں گے کیوں نہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی جب بڑے شاہ جی حج کرکے واپس آجائیں گے تو......"

اماں جی نے فوراً کہا۔

"بڑے شاہ جی اگر سرکار سے' میرا مطلب ہے گورنمنٹ سے سفارش کریں گے واپس ادھر ٹرانسفر کی۔"

زینب بھی منہ کی بات پکڑنے والی تھی جھٹ سے بولی۔

"ہوں۔" اماں جی سنبھل کر بولیں۔

"تو وہ تو ابھی ادھر ہی ہیں۔ ابھی بابا صاب جا کر ان سے بات کرلیں' وہ جانے سے پہلے ان کی سفارش کردیں۔"

زینب کا دماغ ان باتوں میں خوب چلتا تھا۔

"لڑکی! میں تمہارا کیا کروں' فضول کی بحث کیے جارہی ہو۔" اماں جی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"کیوں' اب کیا ہوا ہے' میں نے کیا کہا ہے۔" زینب پریشان ہو کر بولی "اور اماں جی! آپ نے یہ کیوں منع کیا ہے کہ ابھی گاؤں میں کسی سے بھی ذکر نہیں کرنا کہ ہم جارہے ہیں۔ جویریہ بے چاری کو بھی صبح سے گھر میں باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ اسکول بھی جانے نہیں دیا اسے۔ اپنی سہیلیوں سے بھی نہیں ملی وہ۔ روئے جارہی ہے کمرے میں اور اپنے کھلونوں کی گٹھڑی باندھ کر اس کے سرہانے بیٹھی ہے' مجھے تو اس پر ترس آرہا ہے۔"

زینب کو ایکدم سے اماں جی کا فرمان اور جویریہ کا رونا دھونا یاد آیا جو صبح سے گھر میں قید تھی۔

"یا اللہ میں کدھر جاؤں' اس لڑکی کے ہاتھوں ایک تو میں پہلے ہی پریشان ہوں۔" وہ زچ ہو کر بولیں۔ "زینب! تم مجھ پر ایک احسان کر سکتی ہو۔" وہ عاجزی سے بولیں۔

"اماں جی! خدا کے لیے اب کوئی کام مت کہیے گا۔ صبح سے گٹھڑیاں باندھ باندھ کر میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اب میں مزید کچھ نہیں کروں گی۔" وہ فوراً انہیں اپنی سرخ ہتھیلیاں دکھاتے ہوئے بولی۔

"نہیں میری بچی! تم اب کچھ مت کرو' صرف جا کر ہنڈیا چولہے سے اتار کر چپ کرکے وہیں بیٹھ جاؤ' بس ادھر واپس نہیں آنا۔ میں آکر روٹیاں پکاتی ہوں تم بس ادھر سے اٹھ جاؤ۔" اماں جی نے جیسے اس کی منت کی۔

"چلی جاتی ہوں اور ہنڈیا تو میں دس منٹ پہلے ہی آپ کے کہنے پر اتار کر آگئی تھی' آپ بھول گئی ہیں شاید۔"

اس نے پیچھے کھسک کر دیوار سے ٹیک لگائی اور ناقدانہ انداز میں سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

"اماں جی! جب ہم واپس آئیں گے تو اس کمرے میں قلعی ہلکے سبز رنگ کی کراؤں گی' جیسا سونف کا رنگ ہوتا ہے۔ یہ پیلے رنگ کی سفیدی مجھے زہر لگتی ہے' دیکھتے ہی لگتا ہے کمرے کو یرقان ہوا ہے۔ اماں جی! جدھر ہم جارہے ہیں وہ ہمارا گھر کیسا ہوگا؟" وہ چپ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

"معلوم نہیں' جاؤ گی تو دیکھ لینا۔ آمنہ یہ نیلا والا سوٹ اپنے بابا صاب کے اس ٹرنک میں رکھ دو' ان کے رومال اور ٹوپیاں بھی رکھ لی ہیں' جرابیں اور گرم چادر بھی یاد سے رکھ لینا۔"

"کون سا مری جارہے ہیں۔ شیخوپورہ میں تو سنا ہے ادھر سے بھی زیادہ گرمی پڑتی ہے۔ ویسے اماں جی! ایک بات ہے' یہ آئیڈیا گورنمنٹ کو بہت اچھا سوجھا ہے' لاہور بھی تو شیخوپورہ کے بالکل پاس ہے۔ ہم لاہور جائیں گے سیر کرنے بلکہ ہم لاہور ہی میں گھر لے لیں گے۔ عبدالمتین بھی تو وہیں ہے' سب مل کر رہیں گے۔ ادھر واپس آکر کیا کرنا ہے' پھر سے گاؤں میں۔ ہم لاہور جا کر رہیں گے' کتنا مزہ آئے گا۔ میں تو اسکول میں داخلہ لے لوں گی۔ اس کے بعد کالج اور پھر یونیورسٹی اور آمنہ تم بھی دسویں میں جا کر ادھر اسکول میں ہی داخلہ لینا۔ اماں جی! آپ بابا صاب سے کہہ دیں' ہمیں واپس ادھر نہیں آنا۔ یہاں ہے ہی کیا' ٹوٹی پھوٹی دھول مٹی سے اٹی سڑکیں' گندے سندے کچی مٹی کے گھر' ایک سڑا ہوا دو چار کھوکھے نما دکانوں والا بازار' دیہاتی گندی سندی لڑکیاں' عورتیں اور [illegible] کھیت ہی کھیت۔ رات میں مچھر اس قدر ہوتے ہیں کہ میں ساری رات نہیں سو پاتی اور دن میں مکھیوں کی یلغار بھن بھن کرتی رہتی ہے۔ اماں جی! ہم لاہور ہی میں رہ جائیں گے' آپ بابا صاب سے کہیں گی' بیٹھے بیٹھے اس نے خوابوں کی ایک نئی دنیا بسالی تھی۔ ملتجی لہجے میں آگے بڑھ کر ان کے گھٹنے تھام کر بولی۔ اماں جی نے بے بسی سے اسے دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

"کہاں جارہی ہیں' بابا صاب سے بات کرنے؟" وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"روٹیاں پکانے اور سر درد کی دوا کھانے۔ تم نے بول بول کر میرا سر کھا لیا ہے' بے وقوف لڑکی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

"اماں جی بھی حد کرتی ہیں' اتنی اچھی تو میں نے بات کی ہے' ہے نا آمنہ!" وہ اب آمنہ کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"ہوں۔" وہ سر جھکا کے اپنے کام میں مگن رہی۔

"تم کیا ہر وقت گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی رہتی ہو' شکل پر بارہ بجے رہتے ہیں اتنے دنوں سے' آخر ہوا کیا ہے

تمہیں۔ دو تین دن سے میں دیکھ رہی ہوں' لگتا ہے نیند میں چلتی رہتی ہو۔" وہ اس کا بازو ہلاتے ہوئے ذرا زور سے بولی۔

"اماں جی صحیح کہتی ہیں' تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور اب تم باقی لوگوں کا بھی خراب کر رہی ہو۔ ہٹو' مجھے کام مکمل کرنے دو' اماں جی پہلے ہی غصے میں گئی ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر ناراضی سے بولی اور اٹھ کر چارپائی پر پڑا کپڑوں کا ڈھیر ٹٹولنے لگی۔

"میرا دماغ ٹھیک ہے مگر باقی سب لوگوں کے دماغوں کو اللہ جانے کیا ہوا ہے۔ الٹے الٹے کام کر رہے ہیں۔ لو بیٹھے بٹھائے اپنا گھربار چھوڑ کر مہاجروں کی طرح چل پڑو بوریا بستر گدھے پر لاد کر۔ مجھے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ پتا نہیں یہ سب کس کے دماغ کا فتور ہے اور بابا صاب۔۔۔ بابا صاب پہلے کون سا نارمل موڈ میں رہتے تھے اور اب تو جیسے غصہ ان کے اعصاب پر بھی سوار ہو گیا ہے۔ صبح مدرسے کے دو تین بچوں کی اس بے دردی سے پٹائی کی انہوں نے بے چاروں کی چیخوں نے میرا دل ہلا دیا۔ بھلا ان کی مار کٹائی کی مہم کے لیے عبدالمبین کیا کم تھا جو۔۔۔ اس۔"

اس کی زبان اٹک گئی۔

"آمنہ! عبدالمبین تو کل صبح مدرسے چلا گیا تھا' اسے تو شاید علم ہی نہیں کہ ہم ادھر سے جا رہے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد ہی تو اماں جی نے یہ سمیٹا سمیٹی شروع کی ہے' ہے نا۔"

زینب بھی کبھی بڑے پتے کی بات کر جاتی تھی' اس بات کا خیال تو اسے بھی نہیں آیا تھا کہ عبدالمبین کو تو پتا ہی نہیں کہ وہ ادھر سے جا رہے ہیں۔ آمنہ کے تیزی سے چلتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے زینب کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ بات تو ہے' عبدالمبین کو تو پتا ہی نہیں۔ ٹھہرو میں اماں جی سے پوچھتی ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"زینب! تم پوچھ جا کر' میں ٹرنک تو بند کر لوں پھر دسترخوان بھی لگانا ہے مجھے آ کر۔" وہ جو تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھی' چوکھٹ ہی میں رک کر بولی اور واپس مڑ کر خوامخواہ ٹرنک میں رکھے کپڑے الٹے سیدھے کرنے لگی۔

"ہاں' میں پوچھ کر آتی ہوں۔ یہ بھی اچھی رہی۔" زینب نے آمنہ کی طرف کچھ خاص دھیان نہیں دیا اور اٹھ کر باہر کی طرف چل پڑی۔

"یہ سب میری وجہ سے تو ہو رہا ہے زینب! میں تمہیں کیسے بتاؤں' میری وجہ سے میرے بابا صاب اپنا گھربار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اپنا گھر' اپنی چھت' اپنا آنگن جسے چھوڑنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' محض میری وجہ سے اور میں اس معاملے میں کبھی اپنے ماں باپ سے سر اٹھا کر تمہاری طرح سوال نہیں کر سکوں گی اور ان سے یہ بات کبھی نہیں کہہ سکوں گی کہ "بابا صاب! مجھے یہ گھر' یہ آنگن' اس میں لگے آم' جامن' امرود اور لیموں کے پیڑ' اس کی کچی پکی سیڑھیاں' اس کی کشادہ بہت بڑی چھت' اس کی منڈیریں' اس کا ایک ایک گوشہ مجھے کس قدر پیارا ہے۔ بابا صاب ہم ادھر سے نکلے تو کیا ہمیں دوبارہ کبھی بھی ایسا گھر مل سکے گا۔ اماں جی! اپنا گھر چھوڑ کر نہ جائیں۔" میں کبھی ان سے یہ فرمائش نہیں کر سکتی' کبھی نہیں۔ میرا دل ادھر سے جانے کو نہیں چاہ رہا' نہ جائیں۔"

☆ ☆ ☆

سبطین شاہ کی ٹھوکروں سے بیڈروم کا دروازہ تو کیا پورا "سید ہاؤس" لرز کر رہ گیا۔

ان کے سر پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور ٹانگوں سے دروازہ پیٹتے جا رہے تھے۔ باہر سے ملازموں کے دوڑنے کی آواز آئی اور اگلے ہی پل دروازہ کھل گیا۔

سید سلطان بخت سرخ' بے تحاشا نیند سے بوجھل آنکھیں لیے بے ترتیب حلیے میں ان کے سامنے کھڑے

تھے۔ ان کے ریشمی گاؤن کی ڈوریاں بھی کھلی تھیں اور ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا تھا۔

"کون ہے باہر؟" دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے ایک غلیظ گالی بھی بکی تھی مگر سبطین شاہ کی شکل دیکھتے ہی جیسے ان کے حواس اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔ آنکھیں ایکدم سے پوری کھل گئیں' لاشعوری طور پر ان کے ہاتھ گاؤن کی کھلی ڈوریاں بند کرنے لگے۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ بابا جان! آپ اس وقت' یہاں۔" وہ ہکلا ہکلا کر بول رہے تھے۔

سبطین شاہ نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کوئی بھی جواب دیے بغیر انہیں دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرہ مکمل طور پر بند تھا' کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے' سائیڈ ٹیبل پر لیمپ کی روشنی آن تھی' باقی تمام لائیٹیں بجھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ناخوشگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی زیادہ کہ سبطین شاہ کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھنا پڑ گیا۔ کبھی اپنی بھری جوانی میں وہ بھی اس "بو" کے بڑے رسیا ہوا کرتے تھے مگر وہ تو گئے دنوں کی بات ہے۔ سلطان بخت کے بیڈ کی چادر پر شکن تھی۔ تکیے اور کشن بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑے تھے۔ اے سی کی کولنگ زیادہ ہونے کی وجہ سے کمبل بھی کھلا ہوا تھا جو کہ آدھا بیڈ پر' آدھا بیڈ سے نیچے جھول رہا تھا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر ڈریسنگ روم کا دروازہ دھکیلا۔ اندر ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ اسی طرح واش روم کی طرف بڑھے' وہاں بھی انہیں اس کھنکدار ہنسی کا وجود نہ ملا۔

"سلطان بخت! ابھی تمہارے کمرے میں تمہارے ساتھ ادھر کون تھا' بلکہ میں نے خود اس کی آواز سنی ہے' وہ کون تھی؟" بالآخر وہ کمرے کے وسط میں رک کر سلطان بخت کی بوجھل آنکھوں میں جھانکتے ہوئے چبا چبا کر بولے۔

"کون؟" سلطان بخت حیرت سے گویا ہوئے۔ "کون بابا جان! میرے کمرے میں کس نے ہونا تھا۔ آپ کو وہم ہوا ہے کوئی۔" وہ بہت معصومیت سے انہیں جھٹلا رہے تھے۔ سبطین شاہ اس معصوم جھوٹ کو سچ مان بھی لیتے اگر انہوں نے وہ کھنکدار ہنسی اپنے کانوں سے نہ سنی ہوتی۔

"سلطان بخت! مت جھٹلاؤ مجھے۔" وہ بھڑک کر بولے' اب ان سے کھڑے رہنا محال ہو گیا تھا وہ آگے بڑھ کر راکنگ چیئر پر بیٹھ گئے۔

"بابا جان! میں کیوں جھٹلاؤں گا آپ کو خدانخواستہ۔ میں تو سویا ہوا تھا گہری نیند' آپ کو ضرور کوئی وہم ہوا ہے۔" وہ بہت یقین سے بولے۔

"ہاں جب تم جیسے خودسر بیٹے جوان ہو جائیں تو بوڑھے باپوں کو ایسے وہم ہوا ہی کرتے ہیں مگر سلطان بخت! میں ابھی اتنا بوڑھا' اتنا خبطی نہیں ہوا کہ دو انسانوں کی آوازوں میں فرق نہ کر سکوں۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے بہت۔ میری ساری خوشی کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔ اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے کہ میں اس کمرے کے ماحول کو نہ پہچان سکوں۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں رک رک کر بول رہے تھے۔

"بابا جان! میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ میں تو ادھر بالکل اکیلا تھا۔"

"بس کرو سلطان بخت! میرے اعصاب تمہاری مزید غلط بیانی سننے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر غصے سے بولے۔ "کہیں میں نے کسی دانا کی بات پڑھی تھی' جس کا مفہوم آج سمجھ میں آ رہا ہے کہ تمہارے بچے کمانوں سے نکلے ہوئے تیر ہیں' تم انہیں اچھی یا بری تربیت تو دے سکتے ہو مگر ان کے خیالات کو جکڑ نہیں سکتے' ان کے دماغ کو اپنی سوچ کے مطابق نہیں چلا سکتے۔ مجھے آج اس کا مطلب سمجھ میں آ رہا ہے۔"

وہ افسوس زدہ لہجے میں سر ہلا کر بولے۔۔۔ کچھ زیادہ جاگنے سے ان کے اعصاب بری طرح سے تھک گئے تھے' شادی کے اتنے دنوں کی مصروفیات' رات کا فنکشن اور آخری مصروفیت نے تو جیسے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب ان کے دل میں ایک ہی خواہش تھی کہیں بھی گہری نیند اوڑھ کر سو جائیں اور وہ ادھر نیند ہی تو اوڑھنے آئے تھے۔

"باباجان! میرے خیال میں آپ تھک گئے ہیں بہت زیادہ۔ کل دن بھر بھی آپ نے آرام نہیں کیا اور اب بھی اس وقت خدا جانے کہاں سے آ رہے ہیں۔ فنکشن تو میرے خیال میں ساڑھے بارہ بجے ختم ہو گیا تھا۔ میں خود اس قدر تھک گیا تھا' ویسے بھی مجھے ادھر آتے آتے ڈیڑھ بج گیا تھا' اس لیے گاؤں بھی نہیں جا سکا۔ میں سمجھا آپ چلے گئے ہوں گے' میں صبح سویرے نکل جاؤں گا۔ بہرحال آپ اب ادھر آرام کریں' میں کوئی دوسرا بیڈ روم کھلوا لیتا ہوں۔ اب تو صبح ہونے میں کچھ ہی دیر ہے۔ میں اتنی دیر میں فریش ہوتا ہوں۔ آپ کچھ ریسٹ کر لیں پھر گاؤں چلتے ہیں' رات کو دس بجے آپ کی فلائٹ ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے۔"

"تم ادھر ہی لیٹ جاؤ' میں کسی دوسرے بیڈ روم میں چلا جاتا ہوں۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کمرے کا ماحول انہیں ایک پل پر سکون نہ ہونے دیتا۔

"باباجان! مجھے آرام نہیں کرنا' آپ لیٹ جائیں۔"

"نہیں' میں ساتھ والے بیڈ روم میں چلتا ہوں۔" سرہلاتے ہوئے وہ باہر نکل گئے۔

دوسرا بیڈ روم کھلا ہی تھا۔ انہوں نے اندر جا کر صرف جوتے اتارے اور بیڈ پر دراز ہو گئے۔ ان کا بدن تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ شاید وہ چند منٹوں ہی میں گہری نیند سو جاتے کہ اچانک ان کے کانوں نے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ ان کا نیم خوابیدہ بدن جیسے کسی اسپرنگ پر اچھلا۔ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ سلطان بخت کی بی ایم ڈبلیو گیٹ سے باہر جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سلطان بخت ہی تھا اور اس کے ساتھ دوسرا جو بھی تھا' سبطین شاہ کو اتنا پتا چل گیا کہ وہ کوئی لڑکی تھی۔

"بہت پچھتاؤ گے سلطان بخت! تم پچھتاؤ گے آنے والے محض چند دنوں میں' تم بہت پچھتاؤ گے۔" انہوں نے کھڑکی کے بریکٹ پر زور سے مکا مارا۔

"Horrible Experience (خوفناک تجربہ) شاہ جی! اوہ مائی گاڈ بے حد خوفناک۔"

نین تارا کا زوردار قہقہہ سبطین شاہ کے اندر کسی نیزے کی انی کی طرح گڑ گیا۔ انہوں نے زور سے کھڑکی بند کی اور غصے میں کھولتے اپنے بستر کی طرف بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"چھوٹی بی بی! آپ کو حسین شاہ جی بلا رہے ہیں۔" ملازمہ نے دروازے پر دستک دے کر پیغام دیا۔ صالحہ جو ستا ہوا چہرہ لیے بیڈ پر ساکت بیٹھی تھی' ملازمہ کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ جواب کی منتظر کھڑی تھی اور جانچتی ہوئی نظروں سے اس کے اجڑے اجڑے روپ کو بھی دیکھ رہی تھی۔ ایک دن کی بیاہتا' بے رونق چہرہ' شکن زدہ لباس' اپنے حال سے بے خبر صالحہ کو دیکھ کر اس نے تو متجسس ہونا ہی تھا۔

"لالہ کہاں ہیں؟" صالحہ نے ذرا سنبھل کر پوچھا اور چہرے کے تاثرات میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"کتابوں کے کمرے میں جی۔" اس کی آنکھوں کے ڈیلے ابھی بھی متحرک تھے

"تم جاؤ' میں ابھی آتی ہوں۔" صالحہ نے فوراً ہی جواب دیا تو وہ سرہلا کر ہٹ گئی۔

"اب کم از کم لالہ کے سامنے تو مجھے اس حال میں نہیں جانا چاہیے۔" اٹھ کر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"سلطان بخت! تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا بالکل بھی۔" اس نے اپنے ویران چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پہلی رات ہی ٹھکرائے جانے کا احساس کیا کم تھا کہ وہ کل رات حویلی ہی نہیں آیا۔ ایک طویل انتظار کے بعد حسین لالہ اسے خود ہی لے آئے تھے۔ شرمندہ شرمندہ سی سیدہ بھی ساتھ تھیں۔

"فنکشن میں دیر ہو گئی ہو گی۔ لوگ بھی تو اتنے انوائٹڈ تھے' اتنی جلدی کہاں آ سکتے ہیں دونوں۔ باباجان کے حلقہ احباب کا تو آپ کو علم ہے۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولیں۔

"سیدہ! میں دو گھنٹے ہوئے ادھر ہی سے آیا ہوں' مہمان رخصت ہونا شروع ہو چکے تھے اور اب جو میں نے فون

کیا ہے ہوٹل کی انتظامیہ نے بتایا ہے۔ فنکشن ختم ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے' تم فضول کی صفائیاں پیش مت کرو۔"

ان کا انداز بہت اکھڑا اکھڑا تھا۔ بہن کی یہ بے وقعتی ان سے سہی نہ جا رہی تھی۔ صالحہ کے انداز میں کچھ بھی تو انہیں نئی دلہنوں والا نظر نہ آیا تھا' نہ شرمائی لجائی' نہ سمٹی سمٹائی۔ وہ خاموش' بے حد چپ چپ تھی۔ محفل میں موجود سب لوگوں کے وجود سے بھی شاید بے خبر۔ حسین شاہ نظروں ہی نظروں میں اسے جانچ چکے تھے۔ حسین شاہ کے اکھڑے' کھنچے انداز نے سیدہ کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ معاملے کو کیسے سنبھالیں۔ صالحہ کی سلطان بخت سے شادی ہی میں تو ان کا چھٹکارا نہیں تھا۔ اس شادی کو بہت خوش باش دکھانا بھی تو ضروری تھا ورنہ سیدہ کو حسین شاہ کا علم تھا' وہ دل کے کس قدر سخت ہیں۔ سیدہ کو معاملہ ہاتھوں سے نکلتا نظر آ رہا تھا۔

"چلو صالحہ! بہت انتظار ہو گیا' ڈیڑھ بجنے کو ہے۔ گاؤں کا راستہ محض ایک پون گھنٹے کا ہے' اب تو ڈیڑھ دو گھنٹے ہو چکے ہیں' تم گاڑی میں چل کر بیٹھو۔"

ان کے حکم پر صالحہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں بھی تھکاوٹ سے اس کا برا حال تھا' وہ فوراً ہی اس تکلیف دہ حالت سے نکلنا چاہ رہی تھی پھر حسین شاہ کے انکار کے باوجود سیدہ زبردستی ان کے ساتھ چلی آئیں اور صبح ناشتے کے بعد واپس حویلی چلی گئیں اور صالحہ نے تمام دن سوتے ہوئے گزارا تھا۔ نیند بھی ٹوٹ ٹوٹ کر آتی رہی۔ بار بار ٹھکرائے جانے کا احساس اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھاتا رہا۔

"باباجان اور سلطان بخت آ گئے ہیں۔ ہم شام سے پہلے ہی تمہیں لینے آ جائیں گے پھر باباجان کو جانا بھی ہے۔ ان کی رات دس بجے کی فلائٹ ہے۔ تم اٹھ کر نہا دھو کر تیار ہو جاؤ' گولڈن پشواز میں نکال کر آتی ہوں'"

تھوڑی دیر پہلے آنے والا سیدہ کا فون بھی اس کے دل میں خوشی کی دھڑکن کو نہ جگا سکا' بلکہ یہ چند گھنٹوں کی ملنے والی آزادی بھی ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کوئی بھی جواب دیے بغیر فون رکھ دیا تھا اور اب حسین شاہ کا پیغام۔

اس نے فریش ہو کر کاٹن کا پیرٹ گرین کڑھائی والا سوٹ پہنا' بالوں میں برش کیا اور دوپٹہ اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر اسٹڈی میں آ گئی۔ حسین شاہ اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔

"آؤ صالحہ بیٹا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ نیند پوری ہو گئی۔" انہوں نے اٹھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"جی لالہ!" وہ نظریں نیچی کیے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

"کھانا کھا لیا؟ تم نے لنچ پر میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حنا دوبار تمہیں بلانے گئی۔"

"جی!" اس نے مختصر جواب دیا۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"تم نے سلطان بخت کو کیسا پایا؟" ان کا سوال اتنا اچانک اور ڈائریکٹ تھا کہ صالحہ ایکدم سے بوکھلا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ حسین شاہ اس سے یہ سوال پوچھیں گے' اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں تم سے کچھ' سلطان بخت کو تم نے کیسا پایا؟" اب کے ان کے لہجے میں کچھ سختی تھی۔

"ایک دو دن میں کیا پتا چلتا ہے لالہ!" اس نے نظریں جھکا کر ہولے سے جواب دیا۔

"ایک دو دن نہیں' محض پرسوں رات کے چند گھنٹے' ہے نا۔" وہ ترش روئی سے بولے۔ صالحہ کا سر کچھ اور جھک گیا۔ اسے حسین شاہ سے ایسے سوالوں کی توقع نہ تھی۔

"اس کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟" یہ سوال بھی خاصا تکلیف دہ تھا' وہ چپ رہی۔

"صالحہ!" وہ اونچی آواز میں بولے۔

"جی لالہ!" اس کی آواز میں نمی سی اتر آئی۔

"سلطان بخت کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟" انہوں نے جیسے گن گن کر الفاظ ادا کیے۔

"ٹھیک۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"یہ کوئی جواب نہیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگے۔ صالحہ سر جھکا کر ان کے اٹھتے پڑتے قدم گنتی رہی۔

"مجھے اس سے یہی امید تھی' وہ جس قدر آگے جا چکا ہے' وہ یہی کچھ کر سکتا تھا۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں جیسے خود سے کلام کر رہے تھے۔ صالحہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"اور اب چچا جان کا جانا بھی کچھ اچھی بات نہیں۔ انہوں نے بھی فوراً ہی بوریا بستر باندھ لیا جیسے جان چھڑا کر جا رہے ہوں۔" وہ اب جھنجلا رہے تھے۔

"دیکھو صالحہ! میری بات غور سے سنو۔" وہ اس کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھے۔ "مجھے تمہاری خوشی اور خوش باش زندگی اس دنیا کی ہر چیز سے پیاری ہے۔ میں نے اپنے مرتے ہوئے والدین کو اس بات کا عہد دے رکھا ہے کہ میں تمہاری خوشی کو اپنی خوشی سے مقدم جانوں گا اور میں مرتے دم تک خود کو اس عہد کا پابند جانتا ہوں۔" وہ بہت مضبوط لہجے میں بول رہے تھے۔ "یہ تو مجھے معلوم ہے سلطان بخت کا رویہ تمہارے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں رہا۔" صالحہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں لالہ......!" وہ کہنا ہی چاہتی تھی' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروا دیا۔

"مجھے سب معلوم ہے' بچہ نہیں ہوں میں۔ کوئی جھوٹ مت بولنا اور نہ مجھے کسی خوش فہمی میں الجھانا' ایک وفادار بیوی بننے کے چکر میں۔" وہ جیسے چیخ کر بولے۔ "تم کوئی لاوارث نہیں ہو' نہ کسی غریب پسماندہ گھرانے کی پسی ہوئی' والدین کی مجبوریوں میں جکڑی ہوئی بیٹی ہو اور نہ کسی بے نام گھرانے سے تعلق ہے تمہارا۔ تم حسین شاہ کی بہن ہو جس کی بیوی سیدہ سلطان بخت کی بہن ہے۔ ایک بات میری کان کھول کر سن لو' اگر مجھے سلطان بخت کی کسی بھی زیادتی کا علم ہوا' سیدہ بمع طلاق کے کاغذات ۔۔۔ اسی دن سلطان بخت کی حویلی میں موجود ہوگی اور میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی بھی صفائی نہیں سنوں گا' نہ اپنی اٹھارہ بیس سالہ رفاقت کا خیال کروں گا۔ تم سے بڑھ کر مجھے کچھ بھی عزیز نہیں اور سلطان بخت کے کرتوتوں کا علم ہے مجھے اور اس کو پٹہ ڈالنا بھی مجھے آتا ہے۔ تمہیں اس سے ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اس حویلی کی مالکن بن کر گئی ہو' اسی طرح سے بی ہیو کرنا۔ اگر من من کرو گی تو ساری زندگی سڑتی رہو گی' تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

اس نے سر ہلایا۔

"جاؤ جا کر تیار ہو جاؤ' وہ لوگ تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں اور یہ تیاری ظاہری نہ ہو' خود کو اندر سے تیار کرو' ہر قسم کی صورت حال کا مضبوطی سے مقابلہ کرنے کے لیے۔ صالحہ! خود کو بھی کمزور نہ ظاہر کرنا اور تم کمزور ہو بھی نہیں' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اتنا یاد رکھنا' اپنی زمین پر کسی کو قدم نہ رکھنے دو ورنہ بے دخل ہو کر رہ جاؤ گی۔ اب یہ فیصلہ کر کے حویلی میں داخل ہونا کہ اس حویلی میں تمہارے سوا اور کوئی جگہ نہیں پا سکتا' جاؤ اب۔"

وہ کسی معمول کی طرح اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

حسین شاہ کی باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تو پتی ورتا قسم کی بیوی بننے کا فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کے شوہر کو آخر کار اس کے پاس لوٹ ہی آنا ہے۔

"اور یہ "آخر کار" کب آئے گا' کون جانے اور میں اس دن کو دیکھنے کے لیے زندہ بھی رہوں یا نہیں اور میں انتظار کیوں کروں گی۔ اگر قدرت نے گیند میرے کورٹ میں ڈال ہی دی ہے تو میں کیوں نہ اسے سلیقے سے کھیلوں۔ آخر سیدہ بھابھی کی ساری سختیاں بھی تو میں نے سہی ہیں۔ کیا اس دن کے انتظار میں کہ پہلی رات ہی ٹھکرا دی جاؤں۔ جو منصب میرا ہے اس حویلی میں' وہی تو سیدہ کا ہے اس گھر میں۔ اگر وہ ساری زندگی اپنے منصب کا ناجائز فائدہ اٹھاتی رہی ہیں تو میں کیوں جائز فائدہ نہ اٹھاؤں' اب میں اس طرح اپنی باری کھیلوں گی سیدہ بھابھی کہ آپ کو اور آپ کے بھائی کو بھی اس کھیل کا مزہ آ جائے گا۔ آخر میرے ساتھ لالہ بھی تو ہیں۔"

آئینے کے سامنے تیار ہوتے ہوئے وہ مسلسل خود سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ لپ اسٹک کا آخری کوٹ لگا کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

باٹل گرین اے شیپ کی شرٹ اور تنگ پاجامے میں سلیقے سے میک اپ کیے وہ صبح والی اجڑی اجڑی مایوس صالحہ سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔

"گولڈن پشوا نے...... نکال آئی ہوں۔" اس نے منہ بنا کر سیدہ کے لہجے کی نقل اتاری۔ بس سیدہ بھابھی! آپ کا دخل میری زندگی میں یہیں تک تھا' آج ایک نئی صالحہ نے جنم لیا ہے۔ اپنے بارے میں ہر فیصلہ خود کرنے والی صالحہ!" اس نے مسکرا کر خود کو دیکھا اور گلاب کے گجرے بالوں میں اٹکانے لگی۔

"بی بی! مہمان آ گئے ہیں' آپ کو بڑی مالکن اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔" اسی وقت خادمہ پیغام لے کر آئی تو اس نے شیشے میں دیکھ کر سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے آمنہ دوڑ کر آؤ' دیکھو تو کتنی تیز کی بارش ہو رہی ہے۔ کالے سیاہ بادل' گھنگھور گھٹائیں' ٹھنڈی یخ ہوا۔ جویریہ' اماں جی! دیکھیں تو آ کر۔"

زینب کی پرجوش کھنک دار آواز جس میں انوکھی مسرت کا احساس تھا' نے سارے آنگن میں جیسے شور مچا دیا۔ آمنہ تو جیسے اپنے دھیان ہی سے چونک اٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر صاف کیا اور دوپٹہ درست کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

باہر واقعی موٹے موٹے قطروں کے ساتھ چھما چھم بارش برس رہی تھی۔

"ہیں اندر تو بالکل پتا نہیں چلا کب بادل آئے' کب ایسا موسم بنا۔" وہ بھی آسمان کی طرف منہ کر کے حیرت زدہ خوشی سے بولی۔ چند منٹ پہلے جو چہرہ پژمردہ ہو رہا تھا' یکدم سے کھل اٹھا۔

"مغرب کے وقت تو ایسا کچھ موسم نہیں تھا' یکدم سے ہی اللہ کی رحمت ہو گئی۔" اماں جی بھی ان کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ "اور جویریہ کو تو دیکھو عصر شام پڑ کر سو گئی ہے۔ میں اندر اسے جگانے ہی تو گئی تھی' تمہارے بابا صاب آ گئے تو اس کے بے وقت سونے پر خفا ہوں گے۔ ابھی کھانا کھا کر سو جاتی' اٹھا رہی ہوں' اٹھ نہیں رہی۔"

اماں جی کہتے ہوئے برآمدے میں بنے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ توا چولہے پر ہی تھا۔ وہ پیڑھی پر بیٹھ کر پیڑے بنانے لگیں۔

"ہاں' صبح سے تو رو رہی تھی' اب تو اس کو سونا ہی تھا۔ گھر چھوٹنے کا سب سے زیادہ رنج اسی کو تو ہے۔ اس کا تو اسکول بھی ادھر ہے اور سہیلیاں بھی۔ ہمیں تو کچھ خاص فرق نہیں پڑے گا' ایک چار دیواری سے نکلیں گے' دوسری میں جا قید ہوں گے' کیوں آمنہ؟" زینب ہاتھ پھیلا پھیلا کر بارش کے قطروں سے کھیل رہی تھی۔

"ہر وقت اوٹ پٹانگ نہ بولا کرو' تمہارے بابا صاب آتے ہوں گے کھانے کے لیے' دسترخوان لگاؤ جا کر۔" اماں جی نے پیڑا بناتے ہوئے زینب سے کہا۔

"زینب! یہ ہماری اس آنگن میں شاید آخری بارش ہو۔" اس دم بادل زور سے گرجے اور بجلی کا ایک کوندا لپکا' زینب اور آمنہ سمٹ کر پیچھے برآمدے میں ہو گئیں' پانی کی تیز بوچھاڑ ان کے کپڑے بھگو گئی۔

"شاید ہو سکتا ہے ہم واپس آ جائیں' بابا صاب کا کچھ پتا تھوڑی ہے۔" زینب لاپروا انداز میں بولی۔

"زینب! پتا نہیں ادھر اتنا کھلا آنگن' اتنا بڑا آسمان' اتنا روشن دن ہوگا کہ نہیں۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ آمنہ!" زینب پھر سے آ کر برآمدے کے کنارے کھڑی ہو گئی۔

"بھئی وہاں کھلا آسمان ہو گا کہ نہیں' روشن دن نکلے گا کہ نہیں' ہم ان دیکھے اندیشوں سے اب جو خوشی ملی ہے اس کو کیوں غارت کر رہی ہو۔ کل جو ہوگا' وہ کل دیکھیں گے۔ آج تو دیکھو کیسی اچھی' کیسی ٹھنڈی خوشبودار بارش برس رہی ہے۔ مزہ آ گیا' اماں جی! تھوڑا سا سوجی کا حلوہ تو بنا لیں۔" وہ منہ سکوڑ کر چلائی۔

"آمنہ! آؤ نہائیں۔" زینب خوشی سے جیسے پاگل ہو رہی تھی' وہ صبح سے تو بیزار بیٹھی تھی۔ اب سہانے موسم

نے اس کے موڈ کو کیسے بحال کیا تھا' واقعی قدرت بڑی فیاض ہے۔ اس کے دامن میں اتنے انعامات ہیں کہ بہت سے انعام تو وہ بے وجہ ہی خلق پر لٹاتی رہتی ہے۔ اب یہ خوشی جو انھیں بارش کی شکل میں ملی' اس میں نہ تو کوئی خرچ اٹھا' نہ محنت' نہ کوئی کاوش۔ بس آپوں آپ ہی خوشی ان کے آنگن میں آ برسی۔

"دماغ ٹھیک ہے' سردی ہے' اچھی خاصی۔" آمنہ سکڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"ارے زینب! میری بات سنو' بچے اوپر دو چارپائیاں پڑی ہیں۔ اوہ تو مجھے یاد نہیں رہا' ابھی تو نیا بان ڈلوایا تھا' جا میری بچی بھاگ کر وہ تو اتار لا۔ ذہن سے نکل گیا ہے' یاد ہی نہیں رہا۔"

ساری فضا میں اماں جی کے پھلکوں کی سوندھی سوندھی خوشبو رچی جا رہی تھی کہ ان کے ناخوشگوار حکم نے زینب کی ساری خوشی پر اوس ڈال دی۔

"رہنے دیں اماں جی! ہم نے کون سی ساری چارپائیاں لاد کر لے جانی ہیں۔ اگر دوبارہ آئے تو پھر بنوا لیں گے' اس میں کون سے بہت پیسے لگتے ہیں۔ انہیں بھی ٹھنڈی بارش کا مزہ لینے دیں۔" زینب لاپروائی سے بولی۔

"مرنے کی بچی! میں کہتی ہوں دوڑ کر جاؤ اور اتار لاؤ' ساری تباہ ہو جائیں گی۔ تمہارے بابا صاب خفا ہوں گے' اتنے رئیس نہیں ہیں ہم' ابھی پچھلے ہفتے تو انھوں نے بنوائی ہیں۔" اماں جی خفگی سے بولیں۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ جلیل کا بچہ کہاں ہے' اس سے کہیں۔ اتنی بھاری چارپائیاں مجھ سے اٹھائی جائیں گی بھلا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"جلیل کو بخار ہے' اندر حجرے میں لیٹا ہے۔ جاؤ آمنہ! یہ تو ڈھیٹ ہے' تم ہی لے آؤ جا کر۔"

"اماں جی! اب تو ساری بھیگ چکی ہوں گی' ہمارے کپڑے بھی بھیگ جائیں گے۔" بارش میں اور تیزی آ گئی تھی۔ "اچھا جاتی ہوں۔"

اس سے انکار نہیں ہو سکا' اس نے بھاگ کر سیڑھیوں کی طرف جست لگائی۔

"سنبھل کر جانا' پھسلن ہو گی۔" اماں جی نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"میں بھی آتی ہوں۔" زینب نے دوپٹہ برآمدے میں پڑے تخت پر پھینکا اور اس کے پیچھے بھاگ گئی۔

دونوں نے مل کر چارپائیاں گھسیٹیں اور کمر پر لاد کر سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ ہوا بہت تیز تھی' شاں شاں کی آواز کے ساتھ بارش کی بوچھاڑ بھی آ رہی تھی۔ آمنہ دوپٹے سے الجھ کر گرنے لگی۔

"اس کو تو اتار آتیں۔ ابھی گر جانا تھا۔ ہڈی پسلی یقیناً کھسک جاتی۔" زینب نے ایکدم سے دوپٹہ اس کے گلے سے کھینچا اور گولہ بنا کر نیچے صحن میں اچھال دیا۔

"اوہو کیا کر رہی ہو' میرا دوپٹہ خراب ہو جائے گا۔" بہت چھوٹی سی تھیں دونوں' جب سے صوفی صاحب نے انھیں چھوٹی چھوٹی اوڑھنیاں لا کر دی تھیں اور سختی سے دن رات اوڑھنے کا حکم دیا تھا۔ زینب تو کئی بار اس پھندے سے الجھ کر روئی تھی' اماں جی سے لڑتی۔ "مجھ سے نہیں اوڑھا جاتا یہ۔ مجھے گرمی لگتی ہے' مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ابھی اتار دیتی ہوں' بابا صاب آئیں گے تو اوڑھ لوں گی۔" وہ اتار اتار پھینکتی مگر پھر بابا صاحب کی سختی اور اماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے دونوں کو ایسی عادت ہوئی کہ اب تو کبھی سوتے میں بھی ان کا دوپٹہ شانوں سے جدا نہیں ہوتا تھا اور جویریہ نے تو ان سے بھی چھوٹی عمر میں دوپٹہ اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ اسکول جاتی ہے' دوپٹہ اوڑھے گی تو اسکول جانے کی اجازت ملے گی۔" بابا صاب کے حکم پر جویریہ اسکول جانے کی لالچ میں بہت جلد بہت اچھی طرح سے دوپٹہ اوڑھنا سیکھ گئی تھی اور آج اچانک زینب نے اس کے گلے سے دوپٹہ کھینچا تو اسے لگا' وہ آسمان کے نیچے ننگی کھڑی ہے۔ گھبرا کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

"اوہو چلو بھی' ہوا کتنی یخ ہے۔ میرے تو دانت بجنے لگے ہیں۔" زینب نے اس کی کیفیت کی پروا کیے بغیر چارپائی کمر پر لادی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"بچیاں کہاں ہیں رابعہ بی بی!" صوفی صاب کی بلند آواز نے دونوں کے قدم پہلے زینے پر ہی روک دیے۔

"اسٹور میں سے کچھ سامان نکال رہی ہیں۔ اچانک ہی تو بارش برسنے لگی۔ ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا' اندر کمرے میں تھے ہم۔"

اماں جی نے سیڑھیوں کے پاس آمنہ کے دوپٹے کا گولہ دیکھ لیا تھا۔ زینب کا دوپٹہ پہلے ہی تخت پر دھرا تھا اور اوپر چھت سے اترنے کا مطلب صوفی صاحب کے سامنے پورا صحن عبور کر کے آنا تھا۔ اماں جی نے بات بنائی۔

"میں دسترخوان لگاتی ہوں' آپ بیٹھیں حجرے میں جا کر۔ ابھی کھانا لگ جاتا ہے۔"

"نہیں' کھانا میں کھا کر آیا ہوں' حویلی ہی سے آ رہا ہوں۔ بڑے شاہ جی کی فلائٹ ہے' انھیں چھوڑنے ایئرپورٹ جانا پڑے گا۔ میں بتانے آیا تھا' مجھے واپسی پر کچھ دیر ہو جائے گی۔ آپ لوگ کھانا کھا کر آرام کر لینا۔"

صوفی صاحب کی بات پر سیڑھیوں میں چارپائیاں لاد کر کھڑی بچی آمنہ اور زینب کی جان میں جان آ گئی۔ دونوں اب سردی سے ٹھٹھرنے لگی تھیں۔ بارش کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"بڑے شاہ جی نے آج ہی جانا ہے' ابھی کل تو ولیمہ ہوا ہے۔" اماں جی حیرت سے بولیں۔

"ہاں' انھیں آج ہی جانا ہے۔ پیکنگ وغیرہ ہو گئی؟" وہ جانے لگے تھے۔

"جی تقریباً ہو گئی ہے۔"

"ہاں تیاری رکھو' کل شام تک ان شاء اللہ نکل جائیں گے۔" وہ جاتے جاتے بولے۔

"جلیل آپ کے ساتھ جا رہا ہے۔" اماں جی نے پیچھے سے پوچھا۔

"نہیں' اوہ مجھے یاد آیا۔" وہ ٹھٹھک کر رکے۔ "اسے تو بخار ہے' آپ ذرا خود اٹھو اس سے کھانے اور دوا وغیرہ کا پوچھ لو۔ احمق لڑکا روئے جا رہا ہے کہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بھلا اسے اب کہاں لے کر جاؤں گا۔ چھوٹا سا مسجد ہے جس کے اوپر چھوٹا سا چوبارہ ہے' میں اسے کہاں رکھوں گا' ادھر کی بات اور تھی' یہاں جگہ کی بھی تنگی نہیں' آپ بھی ہیں' جوان بچیوں کے درمیان تو اسے نہیں رکھ سکتا' اسے سمجھاؤ جا کر۔"

"آپ سے ہل گیا ہے' بہت۔ اتنے عرصے سے تو ہے آپ کے ساتھ' اس کا آپ کے سوا دنیا میں اور ہے ہی کون۔ وہ بھی سچا ہے۔" اماں جی ممتا سے لبریز لہجے میں بولیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے' گھر میں اسے لے جا نہیں سکتا۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولے۔

"افوہ' یہ اماں جی کیا فضول کی بحث لے بیٹھی ہیں۔ ہم ادھر ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔" زینب جھنجلا کر بولی۔

"ادھر مسجد میں وہ کیا کرے گا' پڑ کر سونا ہی ہے رات کو۔ کچھ عرصہ رکھ لیں پھر کہیں چھوٹی موٹی نوکری دلا دیجیے گا۔ ادھر سے نکل کر خدانخواستہ کسی غلط ہاتھ میں نہ پڑ جائے۔ معصوم سا ذہن ہے' اس کا ہوش سنبھالا ہے تو آپ ہی کو دیکھا ہے۔" اماں جی ہمدردی سے بولیں۔

"چلو دیکھ لیں گے۔ ابھی کل تو سامان چھوڑنے ساتھ جائے گا۔ اچھا' میں چلتا ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کر لینا۔" وہ تاکید کرتے ہوئے حجرے کی طرف بڑھ گئے۔

"اتنی بارش میں کیسے جائیں گے؟" اماں جی وفادار بیویوں کی طرح فکرمندی سے ان کے پیچھے لپکیں۔

"گاڑی باہر کھڑی ہے' حویلی سے کہہ کر آیا تھا۔" اللہ حافظ کہہ کر وہ حجرے میں چلے گئے۔

"اترو مرو دونوں' دوپٹے اتار کر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ صوفی صاحب دیکھ لیتے تو میری شامت ہی آ جاتی۔" اماں جی نے اکڑی مرغیوں کی طرح چارپائیوں کو ٹوکروں کی طرح کمر پر لاد کر بیٹھی آمنہ اور زینب سے کہا۔

"آپ چارپائیاں اتروا لیں' اب چاہے ہم دونوں بخار سے مر جائیں۔" زینب زور سے بولتے ہوئے تیز تیز سیڑھیاں اترنے لگی' آمنہ اس کے پیچھے تھی۔

"آرام سے اترو' پھسل جاؤ گی۔"

دونوں نے چارپائیاں جا کر ڈیوڑھی میں پٹخیں اور دوپٹے اٹھا کر کمرے کی طرف بڑھیں۔

"تم لو بارش کا مزہ' بہت خوشی منائی جا رہی تھی۔ ہائے میں مر گئی' کتنی ٹھنڈ ہے۔" آمنہ سردی سے کانپتے

ہوئے الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

"اب نہانا پڑے گا تو نانی یاد آجائے گی۔" وہ کپڑے اٹھا کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ زینب کی بھی وہی حالت تھی۔

اماں جی حجرے کی طرف بڑھیں کہ جا کر جلیل کا حال پوچھیں۔

"تسلی دیتی ہوں جا کر کہ تجھے ساتھ ہی لے کر جائیں گے۔" وہ خود سے کہتے ہوئے اندر داخل ہوئیں، جہاں جلیل منہ لپیٹ کر پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

مسز خان تکیے پر سر رکھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔ مسلسل بولنے سے ان کا سانس پھول گیا تھا۔ چہرے کی زردی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ہونٹ چپ ہونے کے باوجود بھی جیسے پھڑپھڑا رہے تھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نزہت ساکت وجود پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ انہیں یک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ اسے ابھی تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ابھی ابھی پھپھو نے اس سے کہا ہے۔ اسے لگا آج ایک بار پھر سہیل نے اس پر گھر کا دروازہ بند کر دیا ہے اور وہ ویران سڑک پر کھلے آسمان تلے اس سیاہ گیٹ سے ٹکریں مار رہی ہے۔ برسوں والا سانحہ آج ایک بار پھر دہرایا گیا ہے۔ اس دروازے سے اٹھ کر اب وہ کدھر جائے گی؟ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے ایک لمبے وقفے کے بعد پلکیں جھپکیں، کتنی دیر کا سینے میں رکا سانس بہت آہستگی سے خارج کیا تو اسے معلوم ہوا، اس کے سینے میں دل ابھی بھی دھڑک رہا ہے، اس آخری پناہ گاہ کے چھن جانے کے بعد بھی۔ اسے لگ رہا تھا، اس نے اس اجنبی بے مہر دنیا میں آج ہی جنم لیا ہے۔ اسے خود ہی اٹھنا ہو گا، پنجوں کے بل، خود ہی زمین پر قدم جمانے ہوں گے، خود ہی سر اٹھانا ہو گا۔ اپنے آپ کو، اپنے وجود کو خود ہی پورے قد کے ساتھ زمین پر کھڑا کرنا ہو گا ورنہ شاید وہ یہیں بیٹھی لوگوں کی ٹھوکریں کھاتی رہے گی۔ ہر کوئی آ کر اسے بساط بھر لات ضرور جمائے گا۔ کبھی کوئی قتل بھی کر جاتا ہے، اس کا فعل قابل گرفت نہیں سمجھا جاتا اور کبھی کوئی بنا کچھ کیے ہی زمانے کی ٹھوکروں کا حقدار ٹھہرتا ہے، جیسے وہ مسلسل چار دنوں سے سب کی دی ہوئی ذلت سمیٹے جارہی تھی۔ بنا کچھ بھی غلط کیے اور کوئی اس کی فریاد سننا تو دور کنار، جاننے کا بھی روادار نہیں تھا تو پھر وہ کیوں ہر ایک کے آگے دامن پھیلائے جارہی تھی، آخر کس آس میں۔

"اگر نصیب میں ٹھوکروں سے مرنا ہی لکھا ہے تو کیا اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ایک بار جینے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکتی۔" کوئی اس کے اندر سے بولا۔

وہ ایکدم سے اٹھ کھڑی ہوئی، ایک آخری خاموش فریاد بھری نظر اس بوڑھے وجود پر ڈالی جس سے اس کے دل نے بہت آس لگائی تھی اور آس بھی اسی سے پوری ہوتی ہے جس کے دل میں خدا رحم ڈالے۔ وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ عالیہ دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی معنی خیز مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ سب کچھ سن چکی ہے۔ زینب خاموشی سے اس کے پاس سے گزر گئی۔

دروازہ کھلنے پر ہلکی سی چوں کی آواز آئی تو مسز خان نے آنکھیں کھول دیں۔ اب ان کا سانس نارمل رفتار میں چل رہا تھا۔ سینے میں بے قابو ہوتا دل بھی اب تھم تھم کر دھڑک رہا تھا۔ نزہت کمرے سے جاچکی تھی۔ انہیں یکدم ایک بے کلی نے آن گھیرا۔ وہ آہستہ سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"کیا میں نے صحیح کیا ہے؟" ان کے دل نے گویا چیخ کر پوچھا۔ "میں تو اتنے دنوں سے پاگلوں کی طرح نزہت کے لیے بے چین تھی اور آج میں نے اسے دیکھتے ہی دھتکار دیا۔ مجھے اگر اس پر یقین ہے تو پھر اس بے یقینی کا مظاہرہ کیوں۔"

"السلام وعلیکم ام جان!" اسی لمحے معاذ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ انہوں نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے ام جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" ان کی سپاٹ نظروں اور سلام کا جواب نہ دینے

پر وہ گھبرا کر ان کے پاس آ کر بولا۔

"وعلیکم السلام ٹھیک ہوں میں۔" وہ آہستگی سے بولیں۔ "تم اتنی جلدی کالج سے لوٹ آئے۔"

"ابھی کلاسز باقاعدہ کہاں اسٹارٹ ہوئی ہیں۔ میں تو یونہی چلا گیا تھا کالج دیکھنے، کلاسز تو شاید اگلے ہفتے سے اسٹارٹ ہوں گی۔ شہباز بھائی صبح کس وقت گئے؟" وہ اس جگہ پر بیٹھ گیا جہاں چند لمحے پہلے نزہت بیٹھی تھی۔

"جاؤ نزہت کو بلا کر لاؤ۔" انہوں نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی، بے چینی سے بولیں۔

"کون نزہت؟" معاذ حیرانی سے بولا۔ رات کو وہ سو چکا تھا، صبح وہ جلدی نکل گیا تھا اس لیے اسے نزہت کی آمد کے بارے میں پتا ہی نہیں تھا۔

"تمہیں نزہت کا نہیں پتا۔" وہ کچھ حیرت سے بولیں۔ معاذ نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا ام جان!" وہ آہستگی سے انہیں چھو کر بولا۔

"ابھی پاگل نہیں ہوئی میں۔ چلو مجھے وہیل چیئر پر بٹھاؤ، میں خود اس کے پاس جاتی ہوں، کہیں کچھ کر ہی نہ بیٹھے۔" آخری جملہ انہوں نے لبوں میں ادا کیا۔ معاذ نے اٹھ کر کمرے کے کونے میں رکھی ان کی چیئر گھسیٹ کر بیڈ کے پاس کی اور انہیں سہارا دے کر چیئر پر بٹھایا۔

"چلو جلدی۔" وہ خود وہیل دھکیلنے لگیں تو معاذ نے چیئر کا رخ باہر کی طرف کر دیا

"پتا نہیں وہ کس کمرے میں ہے۔ زیتون کو بلاؤ، اس کو علم ہو گا۔" وہ وہیں رک کر بولیں۔ اسی وقت زیتون بانو کچن سے نکل کر آئیں۔

"نزہت کدھر ہے زیتون؟" وہ بے قراری سے بولیں۔

"جی گیسٹ روم میں ہے شاید۔ ابھی تو آپ کے کمرے میں تھی۔"

زیتون نے جواب دیا۔ مسز خان نے خود ہی چیئر آگے بڑھانی شروع کر دی۔ گیسٹ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نزہت کمرے کے وسط میں کھڑی چادر اوڑھ رہی تھی۔ وہ شاید جارہی تھی۔ ہلکی سی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا، مسز خان اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ معاذ کے لیے یہ لڑکی بالکل اجنبی تھی، ملول چہرہ اور سرخ سوجی آنکھیں لیے وہ اسے پہلی نظر میں اچھی لگی۔

"معاذ! زیتون سے کہو تین کپ چائے کے بنا کر اس کمرے میں لے آئے، میں نے صبح سے چائے نہیں پی اور ہاں، ادھر آؤ سامنے۔" وہ معاذ سے کہہ رہی تھیں، وہ چیئر چھوڑ کر سامنے آگیا۔

"یہ نزہت ہے، تمہارے بھائی کیپٹن شہباز کی دلہن۔ میں شاید تم سے ذکر کرنا بھول گئی تھی۔ شہباز کا نزہت سے نکاح ہو چکا ہے۔ ایک بھائی تھا، اسے ایمرجنسی طور پر جاب کے سلسلے میں باہر جانا پڑ گیا۔ وہی رات کو میرے فون کرنے پر نزہت کو ادھر چھوڑ گیا ہے۔ تم رات کو سو چکے تھے، اس لیے تمہیں پتا نہیں چلا۔"

وہ بہت پر یقین لہجے میں بول رہی تھیں۔ نزہت نے حیرت سے انہیں دیکھا،

"اور نزہت! یہ معاذ ہے، شہباز نے اسے اپنا چھوٹا بھائی بنا لیا ہے، بہت اچھا لڑکا ہے۔ ابھی اس نے ایف ایس سی میں ایڈمیشن لیا ہے، میٹرک میں ٹاپ کیا تھا اس نے۔ یہ اب ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے۔ معاذ! جاؤ، زیتون سے چائے کا بولو اور ہاں، دونوں پورشنز میں جا کر میرا پیغام دے دو کہ ایاز بھائی اور اظہر بھائی شام کو جب بھی گھر آئیں، اپنی بیویوں کے ساتھ فوراً میرے پاس آئیں۔ مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" معاذ سر اثبات میں ہلا کر باہر نکل گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" معاذ کے باہر جاتے ہی وہ نزہت سے مخاطب ہوئیں، وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"بیٹھ جاؤ نزہت!" اب کے ان کا لہجہ حکمیہ تھا، وہ پیچھے ہٹ کر بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"اتنی سرزنش کرنے کا حق تو ماں کو بھی ہوتا ہے، اگر بھابھی تمہیں اتنا ڈانٹتیں تو کیا تم چادر اوڑھ کر گھر چھوڑنے پر تل جاتیں۔" ان کا لہجہ اپنائیت بھرا تھا۔ کچھ دیر پہلے انگارے برساتے لب، اب ہلکی سی مسکان لیے ہوئے تھے۔ نزہت کا دل جیسے پانی ہونے لگا۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔" وہ چیئر دھکیل کر اس کے پاس لے آئیں۔ نزہت نے نفی میں سرہلا دیا اور سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی' ان کی آنکھوں میں پہلی سی نہ سہی مگر ایک اپنائیت ضرور چھلک رہی تھی۔ نزہت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' وہ ایکدم سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھی' ان کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"پھپھو! آپ میری کھال بھی ادھیڑ سکتی ہیں' آپ کو پورا حق ہے مگر میرا یقین کریں' میں بے قصور ہوں' میں نے کچھ نہیں کیا۔"

وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ مسز خان کا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر ٹک گیا۔

"میں جانتی ہوں مگر سب لوگ نہیں۔ میں یقین کر لوں گی اب بھی کر لیں گے۔ میں تمہارے حق میں دعا کر سکتی ہوں۔ اللہ غیب سے تمہاری گواہی پیدا کرے۔" وہ آہستگی سے بولیں۔ نزہت نے رونا بند کر دیا۔ پتا نہیں وہ کب سرخرو ہو گی' ہو گی بھی یا نہیں۔ اس نے آزردگی سے سوچ کر سر اٹھایا اور چہرہ صاف کرنے لگی۔

"نزہت! تمہیں اس گھر میں جگہ دینا میرا کام ہے اور جگہ بنانا تمہارا۔ تمہیں معلوم ہے نا جگہ دینے اور بنانے میں بہت فرق ہوتا ہے یوں کہ پھر تم وہ جگہ چھوڑنا بھی چاہو تو وہ زمین تمہارے قدم جکڑ لے اسے تم سے جدائی گوارا نہ ہو۔

تمہارا سفر کٹھن بھی ہے اور شاید طویل بھی باقی لوگوں کی خیر ہے۔ نہ مجھے' نہ تمہیں اس کی پروا ہونی چاہیے مگر شہباز بری طرح سے بدگمان ہو چکا ہے۔ اس کے دل کا آئینہ صاف کرنا تمہارا کام ہے' میری تمام تر دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے کہہ رہی تھیں اور نزہت تو ابھی دل میں جگہ ملنے کی خوشی ہی منا رہی تھی' جگہ بنانے کا مرحلہ تو ابھی بعد میں آنا تھا۔ وہ اس پل کی خوشی کو کیوں تباہ کرتی جو اسے کتنے ہزار آنسوؤں کی قیمت پر ملا تھا۔ اس نے پھر سے مسز خان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

ہال کمرہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا' بارش نے لوگوں کو کھلے سے اندر ہال میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ابھی سبطین شاہ سب لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر اندر گئے تھے۔ زیادہ تر تو ان کے قریبی عزیز ہی تھے جو شادی کے بعد سے ابھی تک یہاں تھے اور شاید سبطین شاہ کا فوری طور پر جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگوں کو دو تین دن بعد دوبارہ نہ آنا پڑے۔ ایک بار کی آمد میں ہی دونوں کام بھگتا لیے جائیں۔ کل ابھی ولیمہ ختم ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی روانگی جو چار دن بعد تھی' آج کے لیے کنفرم کر دی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اب جلد سے جلد اس ماحول سے دور بھاگ جانا چاہتے تھے۔ سلطان بخت نے جیسے انہیں اندر سے نڈھال کر دیا تھا۔ اتنی جلدی جانے پر سیدہ ان سے خوب خفا ہوئی تھیں مگر انہوں نے اپنی تکلیف کا بتا کر ان کی ناراضی دور کر دی تھی۔

"چلیں بھئی! جلدی کریں' جن لوگوں کو ایئرپورٹ ساتھ جانا ہے وہ چل کر گاڑیوں میں بیٹھیں' ٹائم تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔ سفر بھی ہے اور بارش کی وجہ سے موسم بھی خراب ہو گیا ہے۔ چلیں جلدی کریں' بڑے شاہ جی کہہ رہے ہیں سب لوگ چل کر گاڑیوں میں بیٹھیں۔"

شاہ جی کا مصاحب خاص سب کے لیے پیغام لے کر آیا تو ہال میں ہلچل سی مچ گئی' لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر باہر جانے لگے۔

"او سیدہ! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ صالحہ نہیں آئی۔" شاہ جی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ سیدہ کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراً بولے۔

"آئی ہے بابا جان!" سیدہ نے مڑ کر دیکھا۔ صالحہ ان کے پیچھے اندر داخل ہوئی تھی۔ سیدہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں' ناک کی نوک ابھی بھی سرخ ہو رہی تھی۔ سبطین شاہ کے دل کو عجب سے دکھ نے آن گھیرا۔ اپنی سخت گیر طبیعت کے باوجود انہیں اپنی یہ بیٹی بہت پیاری تھی۔ شریکِ حیات کے گزر جانے کے بعد اس نے ان کا ہر ہر قدم پر باقاعدہ ساتھ دیا تھا۔ ادھر سے جانے کا خیال بھی صرف سیدہ اور شہرینہ سے جدائی کا سوچ کر بھاری تھا۔ انہیں بیٹے کا بھی ارمان تو بہت رہا تھا مگر اس کی عجیب سرکش طبیعت نے سبطین شاہ کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔

"میرے پاس بہت ٹائم نہیں ہے' بس چند منٹ اور۔" سبطین شاہ نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر کہا۔ سیدہ کی آنکھیں از سرِ نو بھیگنے لگیں۔ صالحہ کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"شہرینہ کہاں ہے؟"

"ادھر ہی ہے' بلواؤں اس کو۔"

"نہیں' رہنے دو۔ جاتے ہوئے اسے ساتھ لے کر جاؤں گا ایئرپورٹ۔" انہوں نے منع کر دیا۔ کمرے میں کچھ دیر کو خاموشی ہو گئی۔

"صالحہ بیٹی! یہ گھر' یہ حویلی آج سے سب تمہارے حوالے ہے' ٹھیک ہے آج سے پہلے سیدہ ہی سب دیکھ بھال کرتی تھی اور یہ اس کا بڑا پن ہے۔ ہم پر احسان بھی کہ اپنی گھر داری کے باوجود وہ اس گھر کے ذرے ذرے کا بہت دھیان سے خیال رکھتی تھی' اس لیے ہم اس کے شکر گزار ہیں۔ اللہ اس کو اس کی بے لوث خدمت کا اجر دے اور میں تم سے بھی کہوں گا کہ ہمیشہ سیدہ کی کسی ماں' کسی ساس کی طرح عزت کرنا' کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس سے مشورہ لے لیا کرنا۔ اگرچہ سب اختیار تمہارا ہے مگر تجربہ سیدہ کا بہرحال تم سے زیادہ ہے اور سیدہ بیٹی! تم بھی پہلے ہی کی طرح اس گھر کو اپنا گھر جاننا' صالحہ کوئی غیر نہیں' تمہاری بہن ہے۔ اس سے تمہارے بہت سے رشتے ہیں' ان کو میں دہرانا نہیں چاہتا اور اس سلسلے میں تو مجھے قطعاً کوئی فکر نہیں کہ صالحہ گھر کا انتظام اچھی طرح نہیں چلا سکے گی۔ صالحہ ایک سمجھ دار' ذہین لڑکی ہے اور مجھے خوشی ہے' میں اس گھر کو ایک اچھا تحفہ صالحہ کی شکل میں دے کر جا رہا ہوں۔ صالحہ تم چاہو گی تو یہ گھر جنت بن جائے گا' تم چاہو گی تو دوزخ کہ گھر کو جنت اور جہنم بنانا عورت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ گھر کی پوری کی پوری ذمہ داری تمہارے ذمے ہے' بمع سلطان بخت — سلطان بخت سارے کام بخوبی' ذمہ داری سے' بہت اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔ سوائے اپنی دیکھ بھال کے۔ اس میں کچھ کمزوریاں ہیں' ان کمزوریوں کو جاننا اور ان پر قابو پانا تمہارا کام ہے۔ حوصلے سے ذمہ داری اور محبت سے زندگی کے سفر کو شروع کرو گی تو اختتام پر خود کو بہت کامیاب' بہت مطمئن پاؤ گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔" انہوں نے صالحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جی چاچا جان!"

"سلطان بخت تمہارا ہے' ہزاروں بندوں میں اس نے اقرار کیا ہے۔ تم ہی اس گھر کی مختار اور سلطان کی زندگی کی شریک ہو۔ جو بھی کام' جو بھی فیصلہ کرو بہت اعتماد اور بھروسے سے کرنا' میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ مرد کو پانا مشکل نہیں مگر اسے تا عمر اپنا بنائے رکھنا کہ وہ کہیں بھی جائے تمہارا ہی رہے۔ یہ مشکل کام تمہیں ہی انجام دینا پڑے گا' باقی اللہ سب خیر کرے گا۔"

"بابا جان! آپ صرف تین ماہ کے لیے جا رہے ہیں۔" سیدہ نے انہیں ٹوکا۔

"معلوم ہے مجھے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولے۔ "اور ہاں' ایک میری التجا سمجھو' درخواست یا حکم۔" وہ دونوں کی طرف دیکھ کر بولے۔

"جی بابا جان!" سیدہ سعادت مندی سے بولیں۔

"شہرینہ میری امانت ہے تم لوگوں کے پاس' اس کا بہت خیال رکھنا۔ بیٹا! وہ کانچ کی طرح ہے' کسی کانچ کی طرح ہی اس کی دیکھ بھال کرنا' بہت پیاری ہے وہ مجھے' اس کانچ کو کبھی بکھرنے نہ دینا۔" کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گئے۔

"بابا جان! شہرینہ ہمیں بھی جان سے بڑھ کر پیاری ہے' آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ محض تین ماہ میں ہم شہرینہ کو کوئی ایسی تکلیف نہیں دے سکتے جو آپ کو دکھ دے۔" سیدہ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ سہلایا۔

"او ہو بابا جان! فلائٹ کا ٹائم ہوا جا رہا ہے اور آپ ابھی تک ادھر ہیں۔" سلطان بخت نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔

"اللہ کے حوالے میرے بچوں خدا تمہیں ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" کہہ کر انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور سلطان بخت کے پیچھے باہر نکل گئے۔ سیدہ چوکھٹ میں کھڑی ہو کر دعائیں پڑھتے ہوئے نم آنکھوں سے ان کی سلامتی مانگنے لگیں۔ صالحہ صوفے پر بیٹھ کر گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

گاڑیوں کا قافلہ گاؤں سے باہر نکلا' گاؤں کے تقریباً سب ہی لوگ بیرونی سڑک پر شاہ جی کو الوداع کہنے آئے تھے' خراب موسم کے باوجود لوگوں کی محبت دیدنی تھی۔ شاہ جی بڑے والہانہ انداز میں سب کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔

حالانکہ اس سے پہلے بھی سبطین شاہ دو حج کر چکے تھے' کئی بار ملک سے باہر جا چکے تھے مگر آج جیسی کیفیت پہلے کبھی نہ تھی' انہیں لگ رہا تھا وہ یہ منظر آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ اپنا گاؤں' اپنی حویلی' کچی پکی پگڈنڈیاں' اندھیرے میں ڈوبے لہلہاتے کھیت' اونچے سرسبز درخت' مسجد کے دو سفید مینار اور مٹیالے سے رنگ کا گنبد' گیلی مٹی سے آتی سوندھی سوندھی خوشبو' کچھ بھی انہیں دوبارہ نظر نہیں آئے گا۔ انہوں نے تھک کر سر اندر کر لیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

پھر وہ تمام راستہ کچھ نہیں بولے' بس آنکھیں بند کیے اپنے اندر کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ کب گاڑیوں کا قافلہ ایئرپورٹ کی روشنیوں کی زد میں آیا انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

فلائٹ روانہ ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا' اس لیے الوداعی مرحلہ بہت تیزی سے نپٹایا گیا۔

"سلطان بخت! اب سب کچھ تمہارے حوالے اللہ کے بعد۔ یہ سلطنت' یہ جاگیریں' یہ باغات میں نے' تمہارے باپ دادا نے بہت محنت سے بنائے' ان کا خیال رکھنا جیسے بچپن سے لے کر آج تک میں تمہارا رکھتا آیا ہوں' اسی طرح میری اپنے باپ دادا کی عزت کا خیال رکھنا' مجھے بس تم سے یہی کہنا ہے۔" وہ بھیگی آنکھوں کی ساتھ بیٹے کو سینے سے لپٹا کر بولے۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"اللہ حافظ پھر ملیں گے بشرط زندگی۔" وہ ان کا ماتھا چوم کر باقی کرم جوشی سے ملاتے ہوئے بورڈنگ لاؤنج سے آگے بڑھ گئے اور سلطان بخت خالی خالی نگاہوں سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔

پھر بہت سارے لمحے چپکے سے گزر گئے۔ سلطان بخت کے کانوں نے جہاز اڑنے کی تیز آواز سنی تو ایک گہرا سانس ان کے سینے سے خارج ہوا۔ چند لمحوں کی مغموم کیفیت جیسے جہاز اڑنے کے ساتھ ہی کہیں اوپر فلائی کر گئی۔

سلطان بخت نے سر اٹھا کر دور جاتے جہاز کو دیکھا تو انہیں لگا جہاز کے اڑتے پروں کے ساتھ ہی ان کے پر بھی کھل گئے ہیں اور کھلے پروں کے ساتھ وہ بہت اوپر ہی اوپر بنا کسی رکاوٹ کے اڑے چلے جا رہے ہیں' کھلی بدمست ہواؤں میں لمبی اڑان کے ساتھ۔

"لو بھلا بتاؤ۔ ہم کوئی چور ہیں جو یوں چھپ چھپا کر نکل جائیں' ایسا تو کوئی گناہ نہیں کیا کہ سب سے منہ چھپا جائیں تمہارے بابا صاب کی بھی عجب منطق ہے۔ کہتے ہیں بس ایسے ہی چلو کسی سے بھی ملے بغیر' ایسے کوئی اچھا لگتا ہے' برسوں کا ساتھ ہے۔ اب یونہی اٹھ کر چلے جائیں پھر واپس بھی آنا ہے' رہنا تو یہیں ہے' پھر کوئی ہمیں منہ لگائے گا۔ یہیں آ کر رشتے ناتے جوڑنے ہیں۔ قبیل دار ہیں ہم۔ بچیاں بیاہنی ہیں' بہوئیں لانی ہیں اس طرح خدانخواستہ منہ کالا کر کے جائیں گے تو کوئی دوبارہ ہمیں اپنی دہلیز پر قدم رکھنے دے گا۔ توبہ کرو۔ لوگ سو طرح کے شک میں نہ پڑیں گے کہ خدانخواستہ کیا معاملہ تھا جو یوں چھپ چھپا کر گئے تھے۔ دو چار مہینوں کے لیے اور ہی کہانیاں نہ بنیں گی۔ اللہ معاف کرے' میں تو ایسے نہیں جاؤں گی۔"

اماں جی چائے کا پیالہ آگے رکھے مسلسل خود سے بولے جا رہی تھیں۔ آمنہ کھرے میں بیٹھی دوپہر کے کھانے کے برتن دھو رہی تھی۔ زینب جویریہ کے ساتھ مل کر صحن میں بکھرا ہوا سامان سمیٹ رہی تھی۔ ابھی صوفی صاحب کہہ کر گئے تھے "سامان تیار رکھو۔ جلیل ٹرالر لے کر ابھی آتا ہے۔ شام سے پہلے نکل جائیں گے اور کسی

سے ملنے ملانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خواہ مخواہ سو طرح کے سوال کریں گے لوگ' کیوں جا رہے ہیں' کیسے جا رہے ہیں' پھر واپس آنا ہے تو کیوں واپس آنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تم بس تیاری پکڑو۔ گھنٹے تک نکلنا ہے۔"

وہ اپنا عمامہ درست کرتے ہوئے آرڈر دے کر باہر چلے گئے اور اماں بی جن کے سر میں صبح ہی سے شدید درد تھا۔ چائے کے ساتھ اسپرو لے رہی تھیں' یہ نیا حکم سن کر جیسے آگ بگولا ہی ہو گئیں۔ مگر صوفی صاحب کے آگے بولنے کی تو مجال نہ تھی۔ ان کے جاتے ہی دل کی بھڑاس نکالنے بیٹھ گئیں۔

"ہاں تو اماں جی! آپ مت کریں بابا صاب کے حکم کی پروا' آپ جا کر اپنی سہیلیوں سے مل آئیں۔ ماسٹرنی جی سے' خدیجہ درزن سے' چاچا صابر کی بیوی سے اور کنوئیں والی نانی سے۔ آدھے گھنٹے میں جا کر سب سے مل آئیں بلکہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں' میں بھی اپنی سہیلیوں کو آخری سلام کر آؤں گی۔ پھر اللہ جانے کب واپس آئیں۔ بابا صاب تو ابھی نہیں آئیں گے۔ ہم ان کے آنے سے پہلے ہی واپس آ جائیں گے۔ انہیں بھلا کیا پتا چلے گا۔" زینب مزے سے آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"چپ کرو تم اپنے فضول مشورے اپنے پاس ہی رکھا کرو۔"

وہ اسے ڈانٹ کر بولیں۔ اور پھر چائے کا پیالہ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ آمنہ اب برتن دھو کر پلاسٹک کی بڑی سی ٹوکری میں رکھ رہی تھی۔

"آمنہ! اسی ٹوکری میں سارے برتن ڈال دو' وہ ادھر سے توا اور چمٹا بھی اٹھا لو' چھری بھی رکھ لینا دھیان سے دیکھ کر۔ کوئی چیز رہ نہ جائے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ضرورت کے وقت بہت کام آتی ہیں یہ ٹوکری اسی طرح ٹرے میں رکھ لیں گے پھونکنی بھی رکھ لینا یاد سے۔ اب تو چولہا نہیں جلانا پڑے گا۔ ہائے یہ دن بھی آنا تھا۔"

گھر سے جدائی کا خیال ایک دم سے ان کا دل چیرنے لگا۔

"تیری مرضی میرے مولا! ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس میں ہماری کوئی بہتری ہو گی۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں اور پھر چائے پینے لگیں۔ آمنہ چیزیں سمیٹ کر ٹوکری میں رکھنے لگی۔

"یہ لو پیالہ' یہ بھی دھو لو اور اسی ٹوکری میں رکھ دو۔" انہوں نے چائے پی کر پیالہ زینب کو تھمایا اور خود اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جویریہ بچے! جا اندر سے میرا برقعہ لے کر آ میں کم از کم سیدہ سے تو مل آؤں۔ واپس آ کر میں نے اپنا سفید چونڈہ نہیں کٹوانا ملکانی سے' وہ اس بات کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔"

جویریہ بھاگ کر اندر کمرے سے ان کا برقعہ لے آئی' وہ اوڑھنے لگیں۔

"اماں جی! میں بھی آؤں؟" زینب للچا کر بولی۔

"چپ کر کے بیٹھو' پہلے ہی بھگتان بھگت رہے ہیں۔" وہ آمنہ کی طرف دیکھ کر منہ میں بڑبڑائیں۔ "اور دیکھنا' صوفی صاحب آئیں تو کہنا ادھر ہی ہیں اسٹور وغیرہ میں یا کہہ دینا ساتھ والی کے ہاں گئی ہوں۔"

وہ کچھ سوچ کر بولیں اور پھر جویریہ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئیں۔

باہر چلچلاتی دھوپ تھی۔ رات کی بارش کے بعد آسمان بالکل صاف تھا' صبح سے خوب سفید دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ حویلی تک جاتے جاتے انہیں پسینہ سا آ گیا' ایک تو دھوپ کی تیزی' دوسرے صوفی صاحب کی خفگی کا خیال اور رفتار بھی تو ان کی خاصی تیز تھی' جلد واپسی کا جو خیال تھا۔

"سیدہ ہیں اندر؟" انہوں نے ہال کمرے کے باہر رک کر نوکرانی سے پوچھا۔

"اندر ہی ہیں۔" وہ بولی تو رابعہ بی بی سر ہلا کر اندر چلی آئیں۔ سیدہ مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ رسمی سلام دعا کے بعد رابعہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"وہ بی بی! میں آپ سے ملنے آئی تھی' صوفی صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے ادھر سے۔ دو چار مہینوں کے لیے۔" آہستہ آواز میں انہوں نے مدعا بیان کیا' جگہ کا نام قصداً بتانے سے گریز کیا۔

"کیا؟" سیدہ تیوری چڑھا کر بولیں۔ "یہ رات رات میں صوفی کا کدھر تبادلہ ہو گیا؟"

"جی۔ کافی دنوں سے سرکاری چٹھی آئی ہوئی تھی۔ ادھر شادی کی خوشی تھی پھر بڑے شاہ جی کی روانگی' اس لیے کہہ نہ سکے۔" وہ بہت عاجزی سے بولیں۔

"آپ بھی صوفی صاحب کے ساتھ جا رہی ہو تو بچے اکیلے رہیں گے کیا؟" سیدہ کا سوال سراسر بچکانہ تھا۔

"جی سب ہی جا رہے ہیں۔ صوفی صاحب کہہ رہے تھے۔ وہ شاہ جی سے کہہ کر جلد سے جلد واپس ادھر آکر تبادلہ کرالیں گے' بس تھوڑا سا سامان لے کر جا رہے ہیں۔" ان کا لہجہ اور مسکین ہو گیا۔

"اچھا ویسے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ بابا جان ادھر ہوتے تو صوفی صاحب کو کبھی جانے نہ دیتے۔ کسی افسر کی مجال نہیں تھی کہ ان کی بات ٹال سکے۔" سیدہ سر اٹھا کر بولیں۔

"جی!" رابعہ بی بی سر جھکا کر بولیں۔

"اچھا' کب جانا ہے؟"

"آج ہی جی' شام کو۔ کل ادھر مسجد کا انتظام سنبھالنا ہے نا۔"

"اور ادھر کا انتظام کون دیکھے گا۔" ایکدم سے انہیں خیال آیا۔

"جی ادھر بھی کوئی امام صاحب آ گئے ہیں' وہ مسجد میں ہی ہیں۔ صوفی صاحب بتا رہے تھے' ویسے مجھے کچھ خاص معلوم نہیں۔"

"اچھا' میں سلطان بخت سے کہوں گی' اس مسئلے کے بارے میں وہ ضرور کچھ کریں گے' آپ تسلی رکھیں۔" وہ یہی سمجھیں کہ رابعہ بی بی سفارش کا کہنے آئی ہیں۔

"بڑی مہربانی جی' اب اجازت دیں۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

صوفی صاحب کو پتا نہ چل جائے کا ہوا ان کی جان ہلکان کر رہا تھا' سیدہ نے اثبات میں سر ہلا کر معانقہ کیا اور رابعہ بی بی جویریہ کی انگلی پکڑ کر کمرے سے نکل آئیں۔

عین اسی وقت سلطان بخت کی گاڑی پھاٹک سے اندر داخل ہوئی' گاڑی سے بچ کر پھاٹک کی طرف بڑھیں۔ گاڑی ان کے پاس ہی رک گئی اور سلطان بخت گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ انہوں نے رابعہ بی بی کو پہچان لیا تھا شاید۔

"اماں جی! ہم سے ناراض ہیں کیا' آداب۔" وہ ان کا رستہ روک کر خاصی بے تکلفی سے بولے۔ رابعہ بی بی نے برقعے کے اندر ہی آہستگی سے سلام کا جواب دیا اور آگے بڑھنے لگیں۔

"اتنی جلدی کس بات کی ہے' اندر تو آئیں۔" سلطان بخت کی یہ بے تکلفی انہیں بہت عجیب لگ رہی تھی۔

"جی' میں اندر سے ہی آ رہی ہوں' مجھے ذرا جلدی ہے' اجازت دیں۔ آؤ جویریہ۔" وہ جویریہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر پھاٹک کی طرف بڑھیں۔

"کیا بات ہے' ملانی جی کے مزاج نہیں مل رہے۔" سلطان بخت کا لہجہ عجب بہکا بہکا سا تھا۔ انہیں خوف سا محسوس ہوا' انہوں نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

"شاہ جی! سنا ہے' صوفی صاحب ادھر سے جا رہے ہیں' گاؤں چھوڑ کر۔ انہوں نے کسی کو نہیں بتایا' بالکل چوری چھپے جا رہے ہیں۔ پر آپ کے خادم تو آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں نا۔"

فیکے کے معنی خیز بلند لہجے نے جیسے ان کے قدموں سے جان ہی کھینچ لی' ان کے قدم خود بخود ڈھیلے پڑ گئے۔

"جا رہے ہیں' کہاں؟" سلطان بخت نے حیرانی سے پوچھا۔

"پتا نہیں جی' کہیں تبادلے کا چکر چلایا ہے۔ ہم تو ادھر کی مصروفیت میں مگن تھے' صوفی صاحب نے فائدہ اٹھایا اور اب کسی خطرناک جاسوس کی طرح فرار ہونا چاہتا ہے۔" فیکے کو سب خبر تھی۔

"ہوں' شام تک مجھے پوری خبر دو کہ صوفی صاحب کدھر تشریف لے جا رہے ہیں اور کیوں۔ مکمل رپورٹ'

سمجھے۔" دور سے آتی سلطان بخت کی آواز نے رابعہ بی بی کی جیسے جان ہی نچوڑ لی۔

"یہ ہوتا ہے انجام مجازی خدا کے حکم کو رد کرنے کا۔ اب اس شیطان نے اپنے ہرکارے پیچھے بھیج دیے' خدا معلوم اس کی کیا نیت ہے۔ اللہ رحم کرے' صوفی صاحب تو مجھے زندہ دفن کر دیں گے۔"

رابعہ بی بی کے پسینے چھوٹ گئے اور جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تم سب کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی' شہباز اور نزہت کے بارے میں۔"

مسز خان کے کمرے میں ان کے دونوں بیٹے اور دونوں بہوئیں موجود تھیں۔ معاذ جو ٹی وی لاؤنج سے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا' ادھ کھلے دروازے سے مسز خان کی آواز سن کر دروازے کی اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ایک تجسس تھا جس نے اسے یوں چھپ کر اندر کی گفتگو سننے پر مجبور کیا تھا۔ نزہت کو وہ صبح سے دیکھ رہا تھا' وہ جہاں بیٹھی ہوتی' تھوڑی دیر بعد سر جھکا کر رونا شروع کر دیتی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ایسے گر رہے ہوتے جیسے بارش کے قطرے ہوں' ٹپ ٹپ گرتے۔

معاذ حیران تھا کہ اس کی آنکھوں میں اس قدر آنسو کہاں سے آ گئے ہیں اور اسے یہ بھی حیرت تھی کہ وہ کیوں مسلسل روئے جا رہی ہے اور کوئی اسے چپ نہیں کرا رہا۔ سب اسے روتے دیکھ کر یوں انجان بن جاتے جیسے یہ اس کا معمول ہو۔ وہ اس طرح رات کو اچانک کیسے آئی پھر صبح کیپٹن شہباز کا سب سے بغیر ملے چلے جانا اور سب گھر والوں کا نزہت سے اتنا قریبی رشتہ اور اتنا روکھا روکھا سا انداز ان سارے سوالوں نے اسے دروازے کے باہر ہی رکنے پر مجبور کر دیا' حالانکہ وہ جانتا تھا اگر اس طرح کسی نے اسے کھڑے دیکھ لیا تو شاید اسے ادھر سے چلتا ہی کر دیا جائے مگر اس وقت اسے کسی خوف کی پروا نہ تھی' نزہت گیسٹ روم ہی میں تھی۔

"اور یقیناً رو رہی ہو گی۔" اس نے دل میں قیاس کیا۔

"ام جان! آپ کا حکم سر آنکھوں پر' آپ جو کہیں گی ہم سنیں گے اور بجا لائیں گے۔ نزہت اور شہباز کا معاملہ یقیناً ہمارے گھر کا معاملہ ہے مگر گستاخی معاف مجھے آپ سے کچھ اور کہنا ہے۔"

اظہر نے ان کی بات سے بغیر جلدی سے کہا تو مسز خان سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"یہ لڑکا جس کا نام معاذ بتایا جا رہا ہے' یہ ادھر کس حساب میں رہ رہا ہے۔" اظہر کی آواز اور الفاظ اتنے صاف تھے کہ کچن میں برتن دھوتی زینت بانو نے بھی یقیناً سنے ہوں گے۔ معاذ نے دیوار کا سہارا لیا۔

"اس وقت معاذ کا کیا ذکر' میں نے تم لوگوں کو دوسرے مسئلے پر بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

"آپ جانتی ہیں نا کہ معاذ کا معاملہ بھی ایک مسئلہ ہے اور ام جان! یہ سچ بھی ہے۔ آپ نے کیا سوچ کر اور ہم سے بن پوچھے ایک انجان اور غیر لڑکے کو اس گھر کا فرد بنا لیا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں' زمانے کے کیا حالات ہیں' اس طرح کے لڑکے گھروں میں جگہ بناتے ہیں پھر اس گھر کا صفایا اور گھر والوں کو ختم کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھے آپ کے اس خود ساختہ فیصلے سے نہ صرف دلی رنج ہوا ہے' بلکہ میں کہتا ہوں اسے ابھی اور اسی وقت ادھر سے چلتا کریں۔" ان کے لہجے میں کوئی لحاظ نہ تھا۔

"صرف یہی نہیں' یہ لڑکا اگر کسی گینگ کا رکن نہیں تو بھی یہ کل کو ہمارے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ ہماری بچیاں ہیں اور مجھے یہ گوارا نہیں کہ ایسا کوئی بھی انجان لڑکا گھر کا فرد بن کر ہمارے درمیان رہے۔ اظہر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ اسے صبح ہی ادھر سے نکالیں۔"

ایاز بھی اظہر کے چپ ہوتے ہی بول اٹھے' عالیہ اور فائزہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں تو باہر کھڑے معاذ کا جی چاہا' وہ ابھی ادھر سے بھاگ جائے۔

"بس کرو تم لوگ۔" مسز خان غصے سے بولیں۔ "اسے شہباز ہی یہاں لایا تھا' وہی اس کے بارے میں فیصلہ

کرے گا۔ اس وقت معاذ کا کوئی ذکر نہیں۔ اظہر! تم فون اٹھا کر لاؤ اور شہباز کو فون کرو میں اس سے بات کروں گی کہ اگلے ہفتے اس کی رخصتی ہے۔"

ان کی زبان لڑکھڑا سی گئی 'رخصتی کا تو اب کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ "اگلے ہفتے سادگی سے ولیمے کی تقریب ہوگی' وہ اگلے جمعے کے روز ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آجائے' میں بات کرتی ہوں اس سے 'فون لاؤ۔"

وہ حکمیہ لہجے میں بولیں' چاروں میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"ام جان! پہلے معاذ کے بارے میں فیصلہ ہوگا۔"

اظہر نے دو ٹوک لہجے میں کہا جس میں ذرا بھی لچک نہ تھی۔ مسز خان بے بسی سے اسے دیکھنے لگیں۔

● ● ● ● ● ●

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی' جیسے کوئی اہم فیصلہ سنانے سے پہلے کمرۂ عدالت میں چند لمحوں کے لیے خاموشی ہو جاتی ہے اور اس خاموشی میں معاذ کو اپنے دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ایک اور دربدری؟" اس نے دکھ سے سوچا۔ "اب کدھر جاؤں گا؟" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"اظہر! تم مجھے مجبور مت کرو' کچھ بھی سخت کہنے پر۔" اس بھیانک خاموشی کو مسز خان کے ٹھوس لہجے نے توڑا۔ "ابھی میں زندہ ہوں' اگر تو یہ گھر اینٹوں اور دیواروں کا ہے تو بھی یہ اینٹیں اور دیواریں کاغذوں میں میرے نام ہیں اور اگر یہ مکان ایک منظم گھر ہے تو بھی اس کی سربراہ میں ہوں۔" وہ ذرا سا رکیں۔

"میں نے تمہیں الگ ضرور کیا ہے مگر یہ علیحدگی بھی اسی چھت کے نیچے ہے' جس کا مختار فی الحال اللہ نے مجھے بنایا ہے۔"

ان کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی بہت سخت تھے۔ شاید اس کے جواب میں ان کے دونوں بیٹے یہ گھر چھوڑنے کی ہی دھمکی دے ڈالتے۔

"مگر اس کے باوجود میں کوشش کرتی ہوں کہ کسی بھی جگہ اپنے اس حق کا غلط استعمال نہ کروں۔ میرے بچو! وہ معصوم لڑکا بے سہارا ہے خدا نے اگر ہمیں اس کے سہارے کے لیے وسیلہ بنایا ہے تو اس میں ہمارا کچھ کمال نہیں۔ جو کچھ اللہ نے تمہیں اس دنیا میں دیا ہے' اس میں اس نے بہت سے جائز حقداروں کا حق بھی رکھا ہے۔ اگر یہ لڑکا غنڈہ ہے یا بد معاش یا کسی گینگ کا رکن' ہو سکتا ہے تم درست کہہ رہے ہو لیکن پھر بھی شہباز کو آلینے دو۔ تینوں بھائی مل کر کوئی فیصلہ کر لینا۔ وہ مجھے منظور ہوگا۔" وہ آخر میں آکر نرم پڑ گئیں۔

"اٹھو وہ فون لے کر آؤ اور شہباز کا نمبر ملاؤ۔"

وہ اپنی بات ختم کرکے بولیں تو ایاز نے اظہر کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی فیصلہ کیا اور ایاز نے اٹھ کر کمرے کے کارنر اسٹینڈ پر پڑا فون اٹھا کر سینٹرل ٹیبل پر رکھا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس کا رابطہ شاید کیپٹن شہباز سے ہو گیا تھا' رسمی سلام دعا کے بعد اس نے ریسیور مسز خان کو پکڑا دیا۔

"السلام علیکم کیپٹن شہباز! کیا حال ہے؟" مسز خان نے کھنک دار آواز میں بیٹے کو مخاطب کرکے کہا۔

"وعلیکم السلام ام جان! میں ٹھیک ہوں۔" ماں کے پہلے سلام کرنے پر ان کا لہجہ کچھ شرمسار سا تھا۔

"میں نے کہا کہ تم نہ تو مل کر ہی گئے مجھ سے اور نہ جا کر ہی فون کیا اپنی خیریت سے پہنچنے کا۔ دن بھر دل پریشان سا ہی رہا تو اب میں نے ایاز سے کہا کہ تمہیں فون کرلے۔ میں خود بات کروں گی۔" وہ بہت نارمل انداز میں بول رہی تھیں۔

"میں صبح آپ سے ملنے آپ کے کمرے میں آیا تھا' آپ سو رہی تھیں میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔" وہ بہت مدھم لہجے میں بول رہے تھے۔

"اور فون کیوں نہ کیا؟" وہ جتا کر بولیں۔ اظہر اور ایاز اب ماں کی بیٹے سے دلار بھری گفتگو بیزاری سے سن رہے تھے۔ عالیہ اور فائزہ پہلے ہی بھاگنے کو پر تول رہی تھیں۔

"بزدل تھا۔" مختصر جواب دیا۔

"چلو خیر ہے' میں نے کرلیا۔ اب ایسا ہے شہباز کہ میں نے تمہارے دونوں بھائیوں کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا ہے۔" وہ ایک پل کو رکیں۔ "تمہیں معلوم ہے نا زہت آچکی ہے۔ یہاں ہمارے گھر۔" وہ جواب سننے کو رکیں' دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

"سہیل نے بہت بے غیرتی کا ثبوت دیا' جوان بہن کو یوں گھر سے نکال کر۔ خیر وہ ہے ہی ایسی خصلت کا مالک' اس کا کیا گلہ کرنا۔ اب چونکہ نکاح تو ہو چکا ہے تو اگلے جمعہ کو ولیمے کی تقریب رکھ لیتے ہیں۔ میں اظہر سے کہہ کر ہال ڈے ان میں بکنگ کروا لیتی ہوں۔ تم بس چھٹی کی درخواست دے کر آنے کی تیاری پکڑو۔"

ان کا لہجہ اتنا ہلکا پھلکا تھا جیسے ان کا ترتیب دیا گیا پروگرام سن کر کیپٹن شہباز خوشی سے اچھل ہی تو پڑیں گے۔

"سوری ام جان! مجھے ابھی فی الحال دو تین ماہ تک چھٹی نہیں مل سکتی' آپ اس قسم کے کسی بھی پروگرام کو بھول جائیں۔" وہ تلخی سے بولے۔

"کیپٹن شہباز! تمہیں معلوم ہے تم کس سے مخاطب ہو۔ ماں ہوں میں تمہاری۔ تمہارا بیٹ مین نہیں۔" وہ غصے سے بھڑک کر بولیں' ان کی آواز میں دبدبہ تھا۔

"میں نے ایسا کچھ غلط نہیں کہا ام جان! جس نے آپ کو اس قدر غصہ......" کیپٹن شہباز نے توجیہہ پیش کرنا چاہی۔

"مجھے بحث نہیں چاہیے 'شہباز! جو بات میں کہہ رہی ہوں۔ اس کو توجہ سے سنو۔ تم اگلی جمعرات کی شام کو میرے کمرے میں موجود ہو گے۔ اگر اس کے لیے تمہیں نوکری سے ریزائن بھی کرنا پڑے تو کر آنا' یہ گھر تمہاری چند ہزار کی نوکری پر نہیں چل رہا۔ یہ محض تمہارا شوق تھا جو دو تین سالوں میں یقیناً پورا ہو چکا ہے۔ آنا تمہیں ہر حال میں ہے [illegible] سمجھو۔" وہ [illegible] انداز میں بولیں۔

"ام جان! ابھی نہیں آسکتا۔ آپ مجھے [illegible] کوشش کیوں نہیں کرتیں۔" وہ جھنجلا کر بولے۔

"تمہیں ابھی ہی آنا ہے۔ جمعرات کو ڈنر تم ہمارے ساتھ کرو گے۔ میں کھانا تمہاری پسند کا بنواؤں گی۔ تمہارا ولیمے کا ڈریس اظہر تمہارے ٹیلر کو آرڈر کر آئے گا۔ تم کلر بتا دو صرف۔"

"ام جان پلیز سن لیں آپ۔" وہ ایک دم سے غصے میں آکر بولے۔ "میں نہیں آؤں گا۔ کبھی بھی نہیں' اس ذلت کو اپنے گلے کا ہار بنانے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ آپ کو اپنے بیٹے کی خوشی اور عزت سے زیادہ اپنے بھائی کے گھر کا گند سمیٹنے کی فکر ہے تو معاف کیجئے یہ گند صاف کرنے میں' میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہیں کی تو کاغذی کارروائی بھی لکھ بھیجوں گا۔" وہ سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر بولے۔

"شٹ اپ کیپٹن شہباز! ول یو شٹ اپ۔" غصے کی شدت سے ان آواز جیسے پھٹنے کو تھی۔ "جمعرات کی شام کو تم گھر نہ آئے تو جمعہ کی صبح مری ہوئی ماں کا چہرہ دیکھنے بھی مت آنا اور میرے دونوں بیٹے اتنے سعادت مند ضرور ہیں کہ میری وصیت کی لاج رکھیں گے اور تمہیں میرے جنازے کو کندھا تو کیا' میری صورت بھی دیکھنے نہیں دیں گے۔ خدا حافظ۔" غصے سے ان کا جسم کانپ رہا تھا۔

"پانی۔ اظہر! مجھے پانی دو۔" وہ تیز تیز دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ اظہر نے تیزی سے سائیڈ ٹیبل پر پڑا پانی کا ڈھکا ہوا گلاس انہیں تھمایا۔ انہوں نے دو بڑے گھونٹ لے کر گلاس واپس تھما دیا۔

"ڈارک بلو کلر کا تو پیس آج کل کے فیشن کے مطابق ٹھیک رہے گا۔ تم صبح ہی شہباز کے ٹیلر کو آرڈر بک کرا آنا اور عالیہ تمہیں جو رقم میں نے شاپنگ کے لیے دی تھی۔ کل اس سے جا کر ایک خوبصورت برائیڈل ڈریس اور تقریباً گیارہ مزید ریڈی میڈ خوبصورت دلہنوں والے لباس خرید لینا۔ دو ایک دن میں کپڑوں کا کام مکمل کر لو۔ اور جیولر کو جو میں نے تین سیٹوں کا آرڈر دیا ہوا ہے۔ اسے جا کر یاد دلا دینا شاید میں خود بھی اس کی طرف چکر لگاؤں۔ جوتے اور میک اپ وغیرہ کا سامان باقی کے دو تین دنوں میں ہو جائے گا۔ جمعرات تک سب تیاری مکمل

ہونی چاہیے۔" چند لمحے پہلے کی فرسٹریشن ان کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔

"اور ہاں ایاز! تم صبح پہلی فرصت میں باری کے پریس چلے جانا' ولیمے کے کارڈ بہت خوبصورت ہونے چاہئیں اور ہالی ڈے ان میں ولیمے کے فنکشن کی بکنگ کل ہی کروالو تو اچھا ہے۔ باقی اور جس بات کی کمی بیشی ہوں وہ پھر دیکھ لیں گے' سردست تو یہ اہم تیاریاں مکمل ہونی چاہئیں' منگل کی شام کو نزہت کو مایوں بٹھانا ہے اور بدھ کو مہندی کا چھوٹا موٹا فنکشن گھر ہی میں ارینج کروالینا۔ کھانا وغیرہ ہوٹل سے آجائے گا۔ اظہر! میری الماری کی دراز میں میری چیک بک پڑی ہے۔ میں نے اس میں دو چیک سائن کردیے ہیں' ایک پچاس ہزار کا اور دوسرا شاید ستر ہزار کا ہے۔ باقی جتنی ضرورت ہوگی مجھے بتادینا۔ شادی میں کوئی کمی نہیں ہونا چاہیے' اب تم لوگ جاؤ میں اب آرام کروں گی۔"

وہ چاروں انہیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ان کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

"اور ہاں ایاز! شہباز کا کمرہ کل ہی ڈیکوریٹر کو دکھادینا' میرا خیال ہے اس کے کمرے کو پینٹ کی ضرورت بھی ہوگی' باقی جو پھر وہ کہے۔ ہر لحاظ سے بہت منفرد ہونا چاہیے' تمہیں معلوم ہے نا شہباز کو انفرادیت سے کتنا لگاؤ ہے' اب جاؤ تم لوگ۔ شب بخیر۔"

انہوں نے تکیے پر سر رکھ دیا' وہ چاروں ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔

"لائٹ آف کرجانا۔" وہ آنکھیں بند کیے بولیں۔

معاذ آہستگی سے اپنے کمرے میں آگیا۔

ابھی اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ وہ پھر ایک بار فیصلے کی تلنگی سے بندھ گیا تھا' وہ نزہت کی حالت قطعاً بھلا چکا تھا۔ اب صرف اپنے بارے میں ہونے والے آخری فیصلے کا انتظار سا لگ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"صوفی صاحب! صوفی صاحب! وہ دیکھیں جی' وہ چھوٹے شاہ جی آئے ہیں۔"

وہ پھولے ہوئے سانسوں کو قابو میں لاتے ہوئے بولا تو صوفی صاحب کے عمامہ باندھتے ہاتھ وہیں کے وہیں تھم گئے۔ باہر ٹرالر پر سامان لادا جاچکا تھا۔ ساتھ میں ایک پک اپ انہوں نے کرائی تھی جس میں رابعہ بی بی اور تینوں بچیاں بس بیٹھنے ہی والی تھیں۔

گاؤں چھوڑنا ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے اس گاؤں میں آنکھ کھولی تھی' اپنے والدین کی وہ اکلوتی اولاد تھے۔ اس ناتے سے ان کی تمام تر محبتوں کی دولت کے اکلوتے وارث بھی۔ ان کے والد بھی' اسی مسجد' اسی مدرسے کا نظم و نسق سنبھالتے رہے تھے۔

صوفی صاحب نے اپنے والد کی تمام امیدوں کو پورا کیا تھا۔ قرآن حفظ کرنے کے علاوہ حدیث اور فقہ کی خاطر خواہ تعلیم بھی انہوں نے حاصل کی تھی پھر والد صاحب کی زندگی ہی میں مدرسہ سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے اس مسجد اور مدرسے کو پختہ کرا کے ایک نئی شان بخشی تھی' جب بھی مدرسے کے لیے مسجد کے لیے کوئی بھی نئی تعمیر ہوتی وہ سمجھتے ان کے قدم اپنی سلطنت میں اور مستحکم ہوگئے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ تو روز اول سے ہواؤں میں پیر جمانے کی کوشش کررہے تھے اور آج پرواز کا حکم بھی مل گیا تھا بلکہ دربدری کا۔

وہ بار بار اپنے دل کو تسلی دیتے۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے فقط چند ماہ کی بڑے شاہ جی کے آتے ہی ہم واپس آجائیں گے۔ اس میں اتنا غم زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" اور ہر بار ان کا دل اس تسلی کو قبول کرنے سے انکار کردیتا۔

جلیل نے اس آفت کے آنے کی اطلاع دی' جس سے بچ کر وہ ادھر سے جارہے تھے۔

"السلام علیکم صوفی صاحب!" عین اسی وقت سید سلطان بخت حجرے کے نیچے دروازے سے سر جھکا کر اندر داخل ہوئے۔ صوفی صاحب نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا۔

"وعلیکم السلام شاہ جی! مجھے حکم کرتے میں خدمت میں حاضر ہوجاتا۔" وہ سلطان بخت سے مصافحہ کرتے ہوئے عاجزی سے بولے۔ ان کے ہاتھوں کی خفیف لرزش سلطان بخت سے چھپی نہ رہ سکی۔

"نہیں صوفی! حاضر تو ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے معرکہ ہی اتنا بڑا سر کرلیا ہے۔" وہ کھڑے کھڑے طنزیہ لہجے میں مخاطب ہوئے۔

"مم... میں نے کیا کیا ہے؟" وہ کھسیانے لہجے میں بولے۔ "آپ بیٹھیں تو شاہ جی! کھڑے کیوں ہیں' ارے جلیل! شاہ جی کے لیے کچھ..."

"کچھ تو اضع و خاطر کی ضرورت نہیں ہے صوفی صاحب!" سلطان بخت نے ہاتھ اٹھا کر ان کو وہیں روک دیا۔ "ان سب کو ادھر سے چلتا کرو' مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

صوفی صاحب کا دل الٹی ردھم سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے جلیل اور اس کے ساتھ کھڑے دو لڑکوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ سلطان بخت کے ساتھ آئے دو بندے باہر ہی کھڑے تھے۔

"یہ اس طرح اچانک بوریا بستر باندھنے کا طوفانی خیال آپ کے مبارک ذہن میں کیوں کر پیدا ہوا؟" صوفی صاحب ابھی خود کو سنبھال ہی رہے تھے کہ انہوں نے پوچھا۔

"مم... میں نے تو نہیں شاہ جی..." صوفی صاحب ہکلا کر بولے۔

"آپ بیٹھیں تو میں بتاتا ہوں۔"

"اتنا فالتو وقت میرے پاس نہیں ہے' میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر گپیں ہانکوں۔ بیٹھے بٹھائے اس ہجرت کا سبب مجھے بھی معلوم ہے اور تمہیں بھی۔ اس پر بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں' میں ادھر کچھ اور کہنے آیا ہوں۔" آخری جملے پر سلطان بخت کا درشت لہجہ کچھ نرم پڑ گیا تھا۔

"حکم شاہ جی! حکم... آپ کے غلام ہیں..." صوفی صاحب نے سینے پر ہاتھ باندھ کر نم آنکھوں کو جھپکتے ہوئے بڑی بے بسی سے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ آپ ادھر سے نہیں جاؤ گے۔" ان کا انداز صاف حکمیہ تھا۔

"جی...!" صوفی صاحب کا کھلا منہ ان کی اندرونی کیفیت کی غمازی کررہا تھا۔

"کہاں تبادلہ ہوا ہے تمہارا؟" وہ آنکھیں سکوڑ کر تیکھے چتون سے بولے۔

"جی وہ..." صوفی صاحب نے تھوک نگلا۔ "لاہور میں۔" ایک دانستہ جھوٹ جو ان کی چلتی سانسوں کو پھانسی کی سولی پر بھی چڑھا سکتا تھا۔

"کس علاقے میں؟"

"مم... مصری شاہ..." ان کے ذہن میں یہی نام آسکا۔

"تمہیں اگر جانا ہے تو ایک دو دن لگا آؤ۔ میں دو چار دنوں میں دوبارہ ادھر تبادلے کا انتظام کرتا ہوں۔ سارے گھر کو اٹھا کرلے جانے کی ضرورت نہیں۔" شاہ جی کا واضح اشارہ اتنا ناقابل فہم نہیں تھا کہ صوفی صاحب کو بات سمجھ میں نہ آتی۔

"اور دوسری بات..." صوفی صاحب نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنا چاہا۔ سلطان بخت نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

"اسے میری درخواست سمجھیں' حکم یا خواہش' جو میں کہنے جارہا ہوں۔" سلطان بخت کی اگلی بات نے صوفی صاحب کے رہے سہے حوصلے بھی منہدم کردیے' وہ نڈھال بصارتوں سے انہیں تکنے لگے۔

"میں آپ کی بڑی صاحبزادی' کیا نام ہے اس کا۔" وہ ایک پل کو شان بے نیازی دکھانے کو رکے۔ "آمنہ ہے نا۔ اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسلام کی اس واضح شق کو آپ کے سوا اور کون اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اسلام میں چار شادیاں جائز ہیں' اس میں کچھ بھی قباحت نہیں۔"

صوفی صاحب کی کشادہ پیشانی پر پسینہ آبدار موتیوں کی طرح چمکنے لگا۔ ان کے دل میں بھنور سے پڑنے لگے۔

"شا۔۔۔ شاہ جی! چھوٹا منہ بڑی بات، مخمل میں کبھی ٹاٹ کا۔۔۔"

"بس بس۔ یہاں اردو کی کلاس لینے نہیں آیا جو کہا ہے اسی کو کافی جانو، بات دہرانے کی یا وضاحتیں پیش کرنے کی مجھے عادت نہیں۔ میں کیا کر رہا ہوں، اس کا ذمہ دار میں ہوں اور جواب دہ بھی میں۔ آپ کو اس سلسلے میں ہراساں یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں یہ نکاح اسی ہفتے کرنا چاہتا ہوں اور اب مزید کوئی دلیل نہیں سنوں گا۔" سلطان بخت نے حاکمانہ انداز میں اپنی بات ختم کی۔

"بڑے شاہ جی آئیں گے تو۔۔۔" صوفی صاحب نے گھگھیا کر آخری تنکے کا سہارا لینا چاہا۔

"ان کو مطمئن کرنا میرا کام ہے، آپ کو اس سلسلے میں اپنی بوڑھی عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں۔" سلطان بخت کا لہجہ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ "کیا یہ اعزاز تمہارے لیے کم ہے کہ ہم تمہارے اس نیچی چھت والے ٹاٹ کے حجرے میں آئے ہیں اور تمہیں اتنا بڑا اعزاز بخش رہے ہیں۔ اپنی قرابت داری میں شریک کر رہے ہیں، تمہیں تو اس خوشی میں ہی مر جانا چاہیے۔" سلطان بخت نے تمسخرانہ انداز میں صوفی صاحب کے پریشان چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"خو۔۔۔ خوشی تو بہت ہے شاہ جی! کیوں نہیں۔۔۔ میں اس قابل کہاں۔ یہ تو میری قسمت ہے جو آپ میرے غریب خانے میں مجھے اتنا بڑا انعام۔۔۔"

"مجھے سپاس نامہ نہیں چاہیے۔ جو کہا ہے گھر میں جا کر اس کی خبر کرو اور جمعرات کی شام چھ بجے میں گاؤں کے چند معززین کے ساتھ آؤں گا۔ رات کے کالے اندھیروں میں یہ کام نہیں کروں گا۔ دن کے اجالوں میں آؤں گا۔ مجھے نہ کسی کا ڈر ہے، نہ میں کسی کے آگے جواب دہ ہوں، چاہو تو ابھی سارے گاؤں میں چرچا کرا دو۔ آج سے تم اور تمہارا گھرانہ ہمارے خاص سایۂ عاطفت میں ہو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ چلتا ہوں میں۔ اللہ حافظ۔" وہ جانے کے لیے مڑے۔

"وہ شاہ جی! ایک درخواست تھی۔" صوفی صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔

"ہوں بولیں۔" سلطان بخت نے اپنی شال کو ہلکا سا جھاڑا۔

"وہ بچے بہت خوش تھے کہ لاہور جا رہے ہیں، سیر کریں گے سب تیار تھے اگر آپ کی اجازت ہو تو صرف ایک دن کے لیے انہیں گھمانے لے جاؤں۔ پرسوں شام کو واپس آ جائیں گے، بچوں کی خوشی ہے ورنہ ان کے دل مرجھا جائیں گے۔" صوفی صاحب نے اٹک اٹک کر اپنی بات پوری کی۔ سلطان بخت نے ایک گہری نظر سے صوفی صاحب کو دیکھا۔

"آپ کب سے بچوں کی خوشی کا اس درجہ خیال رکھنے لگے ہیں۔ صوفی صاحب!" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ صوفی صاحب شرمندہ سے ہو گئے۔

"ٹھیک ہے لے جاؤ مگر پرسوں شام کو واپسی ہونی چاہیے ورنہ تمہیں معلوم ہے، میں لاہور تو کیا تم دنیا کے کسی گمنام گوشے میں بھی چلے جاؤ گے تو میں تمہیں تمہاری کھال سمیت نکال لاؤں گا۔ کوئی ہوشیاری مت دکھانا اور یہ جو کاٹھ کباڑ کا ڈرا لدا گھڑا کیا ہے باہر، اس کو واپس گھر لے آؤ۔ خدا حافظ۔" وہ صوفی صاحب کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر کے حجرے سے نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

"شاہ جی! یہ زیادتی ہے۔ آپ نے مجھ سے اچھا نکاح کیا ہے۔ آپ تو ملنے سے بھی گئے۔ پہلے تو آپ کو میرے بن ایک پل چین نہیں آتا تھا۔ اب کیا ہو گیا ہے شاہ جی! میں تنگ آ گئی ہوں ان دوریوں سے، ایسا نہ ہو کہ وقت بدل جائے، پھر آپ قریب آنا چاہیں اور میں فاصلے بڑھاتی چلی جاؤں۔" نین تارا کے تیور ہی آج بدلے ہوئے تھے۔ وہ بہت غصے میں لگ رہی تھی اور غصے میں تو اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایک تو سلطان بخت اسے ذرا بھی ٹائم

نہیں دے پا رہے تھے۔ دوسرے اس رات کی ذلت جب سبطین شاہ نے اچانک ان کی کتنے دنوں کی پیاسی جدائی پر دھاوا بول دیا تھا، ان سے خفا تو وہ اسی رات سے تھی۔

"میں اس رات کا واقعہ کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ گھر میرا ہوتا "سید ہاؤس" پھر دیکھتی کون ایسے آدھی رات کو بیڈ روم کے دروازے کو ٹھوکریں مار کر مجھے نکال باہر کرتا۔ اگر میں ماما کو سب بتا دیتی تو وہ طوفان اٹھا دیتیں۔ اس قدر پیار ہے انہیں مجھ سے اور ایک آپ ہیں کہ پلٹ کر۔۔۔"

اس کی سسکیوں میں تیزی آ گئی۔ سلطان بخت کے دل پر چھریاں سی چلنے لگیں۔

"پلیز نین تارا پلیز کول ڈاؤن۔ تم تو بہت سمجھ دار ہو اسی لیے تو میں نے تم سے کبھی کچھ غلط کرنے کا سوچا ہی نہیں، سیدھا اور صاف رستہ اپنایا بس کچھ مجبوریاں تھیں۔ اب وہ بھی نہیں رہیں۔ میں تمہارا ہوں، سرتاپا تمہارا۔ میں بھی، میرا مال و دولت بھی اور میری سب جاگیر بھی۔ میں کل آؤں گا، تمہارے پاس پھر پورے دو دن رہوں گا۔ اور۔۔۔"

"اوہو بھئی! سمجھنے کی کوشش کرو، کل آؤں گا تو پھر بیٹھ کر ڈسکس کریں گے سب کچھ۔ دیکھو نا ڈیر ابھی تو بابا جان گئے ہیں، ان سے رابطہ بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔ اپنے آنے والے بہترین کل کے لیے مجھے آج تو کچھ کام کرنا ہی ہو گا نا۔ تم تو سمجھ دار ہو نا اگر میں یہی باتیں ماما سے کروں تو وہ ایک پل مجھے تمہارے پاس نہ بیٹھنے دیں، فوراً جاگیر کے کاموں کی خبر گیری کرنے کو کہیں۔ یہی تو موقع ہے، سب کچھ اپنے ہاتھوں میں لینے کا۔" سلطان بخت نے بہت مدھم لہجے میں نین تارا کو بہلایا اور وہ بھی رونا بھول گئی۔

"مگر مجھے اس کا کیا فائدہ ہے جو پہلے میرے نام کیا ہے وہ کون سا مجھے سونے کے انڈے دے رہا ہے۔ آدھی رات کو آپ کے ابا حضور آ کر مجھے بیڈ روم سے بے دخل کر دیتے ہیں۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"اوہو نین! ہو گئی بات بہت دفعہ۔ اب ختم کرو اس قصے کو۔" سلطان بخت نے جھنجلا کر کہا۔ "آگے دیکھو کتنی زبردست کتنی خوبصورت زندگی تمہارا میرا انتظار کر رہی ہے۔ اب ہم ہوں گے، تم ہو گی اور خوبصورت تنہائیاں۔"

"کون ہے یہ چڑیل، کس اپنی لگتی کو یہ خرافات سنا رہے ہیں آپ۔" صالحہ نے اچانک پیچھے سے آ کر موبائل ان کے ہاتھ سے چھیننا چاہا۔ وہ تو ان کی گرفت بہت مضبوط تھی جو موبائل ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ان کے پاس ہی بستر پر گر گیا۔ صالحہ شعلہ بار نگاہوں سے انہیں گھور رہی تھی۔ اس کے سینے کا زیر و بم اس کے اندرونی فشار کا پتا دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے آگ کی طرح دہک رہا تھا اور ناک کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلطان بخت کو ادھیڑ کر رکھ دے۔

"او کے پھر بات کریں گے۔ بائے۔" سلطان بخت نے موبائل اٹھا کر نین تارا سے کہا، دوسری طرف اس کے "کون تھا، کون تھا؟" کی پکار کو یکسر نظر انداز کر کے موبائل آف کر دیا۔

"تم شاید اپنی اوقات بھول رہی ہو کہ میں نے تمہیں کس اوقات میں رکھا ہوا ہے۔" موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے سرد مگر نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں آپ کو اپنی اوقات ہی تو یاد دلا رہی ہوں، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میری اوقات کیا ہے۔ مسٹر سلطان بخت! جانتے ہیں میں کون ہوں؟" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے مقابل پوری طرح سے تن کر کھڑی تھی۔

انہیں تھوڑی دیر میں حسین شاہ کی طرف جانا تھا، آج ان کی دعوت تھی ادھر اسی لیے تو وہ ڈریسنگ روم میں تیار ہو رہی تھی۔ وہ ہی بھول گئے تھے کہ صالحہ اندر ہے اور انجانے میں نین تارا کا نمبر ملا بیٹھے۔

"میں اس وقت کوئی جھگڑا نہیں چاہتا اور نہ تم جیسی جاہل سے الجھنا چاہتا ہوں، اگر تم تیار ہو تو چلیں تمہارے طرم خان بھائی کے گھر جس کی شہ پر یوں اکڑ کر کھڑی ہو۔" وہ اس سے کترا کر گزرے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے

جا کر برش سے بال سنوارنے لگے۔

"سلطان بخت! تم نے میرے بھائی کی شبیہ کو ابھی دیکھا ہی نہیں۔ تم مجھ سے الجھنا نہیں چاہتے' جھگڑنا نہیں چاہتے مگر میں تم سے الجھنا چاہتی ہوں' جو جھگڑا کل پرسوں اس حویلی میں ہونا ہے اسے آج ہی ہونے دو ابھی اور اسی وقت۔ بولو کس سے وہ بازاری جملے بول رہے تھے۔"

"تڑاخ..." سلطان بخت نے برش ٹیبل پر پٹخا اور مڑ کر ایک زوردار طمانچہ صالحہ کے منہ پر جڑ دیا۔ ہاتھ اس قدر زوردار تھا کہ صالحہ بری طرح سے گول گھومتی ہوئی بیڈ کے کنارے سے جا ٹکرائی۔

"شٹ اپ گھٹیا عورت! مائنڈ یور لینگویج اینڈ گیٹ لاسٹ..." وہ قریب آ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر خونخوار لہجے میں بولے۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے اور جس کو چاہو بلا لاؤ۔ اپنے بھائی کو۔ اپنے باپ کو تم سے۔" انہوں نے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر اسے ماری اور پلٹ کر جانے لگے کہ صالحہ نے ایک دم سے اٹھ کر انہیں پیچھے سے ایک زوردار دھکا دیا۔

"باپ اور بھائی کی بات بعد میں مجھ سے کرنا۔ پہلے مجھے تو دیکھ لو۔" وہ الجھے ہوئے بال' سرخ تھپڑ زدہ چہرہ اور آنسو بھری آنکھیں' جن میں نفرت ہی نفرت تھی' لیے ان کے سامنے کھڑی تھی اور یہ دھکا سلطان بخت کی زندگی کا پہلا دھکا تھا ورنہ آج تک تو انہیں کوئی نرم انگلی سے نہیں چھو سکا تھا۔

اس اچانک زوردار دھکے نے ایک پل کو انہیں گنگ کر دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرانے سے بمشکل بچے تھے اور اس کی امید انہیں کم از کم صالحہ سے ہرگز نہ تھی۔

وہ تو سمجھے تھے کہ پہلی رات میں ٹھکرائے جانے کے بعد وہ ساری زندگی ان کی حویلی کے کسی کونے میں روتے دھوتے گزار دے گی مگر آج جب وہ ان کے مقابل آئی تو انہوں نے اس کا علاج مار پیٹ اور نفرت بھری ٹھوکروں میں ڈھونڈا' مگر وہ تو ان سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئی۔ گاؤں کی عورت پھر سید زادی اور شوہر سے دست درازی...؟

یہ تو ان کی زندگی کا پہلا ہی واقعہ تھا' وہ بھی آنکھوں دیکھا۔ مگر اگلے ہی لمحے ان کی حیرت پر شدید ترین غصے اور وحشت کا حملہ ہوا۔ وہ کسی زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹے تھے کہ شاید اسے مار کر ختم ہی کر ڈالتے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

صالحہ جو اپنی جان بچانے کے خیال سے بھاگنے کا سوچ ہی رہی تھی' دستک پر وہ بھی ٹھٹک کر رہ گئی۔ سلطان بخت نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا اور نفرت سے صالحہ کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ چند لمحوں بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

"یس آجاؤ۔" وہ بارعب آواز میں بولے' صالحہ جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو کر اپنے چہرے کو رگڑنے لگی۔ اسی وقت شہرینہ کمرے میں داخل ہوئی' صالحہ برش اٹھا کر بال سلجھانے لگی۔

"آؤ شہرینہ بیٹا! خیریت...؟" سلطان بخت نے شیریں لہجے میں کہا

"لالہ! حویلی سے سیدہ آپا کا فون آیا ہے کہ آپ لوگ ابھی نکلے یا نہیں۔"

"آں ہاں..." انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے انجان بنی زلفیں سنوارتی صالحہ کو دیکھا۔ "بس نکلنے ہی والے ہیں تم نہیں جا رہیں۔"

"نہیں..." وہ منہ بسور کر بولی۔

"کیوں بیٹا تم کیوں نہیں جا رہیں' حنا تمہارا پوچھے گی کہ میری سہیلی خالہ کو کیوں نہیں لائے۔" وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے صالحہ نے برش زور سے ٹیبل پر پٹخا اور سٹی پر بیٹھ کر کلینزر سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

"لالہ آپ کو میرا کچھ خیال نہیں ہے۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں آنکھوں میں آنسو لا کر بولی۔

"کیسی بات کی تم نے' مجھے تمہارا خیال نہیں تو اور کس کا ہے بھلا۔ اس پوری دنیا میں ایک تم ہی تو سب سے زیادہ میرے دھیان میں رہتی ہو۔" وہ بہن پر پوری جان سے فدا نظر آ رہے تھے۔

"دھیان کی دنیا کے کسی کونے کھدرے میں۔" صالحہ زور سے ہنس کر بولی۔

"جی بھابھی بیگم! آپ نے کچھ کہا۔" شہرینہ شاید کہیں اور ہی تھی' وہ صالحہ کے جملے کو سمجھی ہی نہیں۔

"بولو شہرینہ! کیا کہنا ہے تمہیں۔ سلطان بخت اس کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔

"لالہ مجھے ایڈمیشن لینا ہے فرسٹ ایئر میں۔ داخلے کے دن نکلے جا رہے ہیں اور آپ کو کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ اتنے سارے دن شادی میں لگ گئے ہیں' اس لیے بھولی رہی مگر آج میری دوست کا فون آیا تھا کہ کل ایڈمیشن فارم جمع کروانے کی آخری ڈیٹ تھی۔ اب میرا کیا ہوگا۔" وہ پھر سے آنکھوں میں آنسو لانے لگی۔

"پگلی اتنی سی بات کے لیے روتی ہو' ایگزام سے ایک منٹ پہلے تک میری بہنا کے لیے ایڈمیشن کا ٹائم ہے۔ سمجھیں۔ تم اس کی فکر کیوں کرتی ہو۔" انہوں نے ہولے سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"کیا مطلب؟" شہرینہ ذرا نہ سمجھی۔

"اچھا تم آج ہی مجھے اپنے ڈاکومنٹس دے دو' مجھے کل شہر جانا ہے۔ میں ایڈمیشن فارم فل کروا کے جمع کروا دوں گا او کے۔"

"سیدہ آپا کہتی ہیں تمہیں آگے نہیں پڑھنا' بس اب حویلی میں بیٹھو اور دیواروں کو تکو۔" آنسو اپنی اس تصویر کشی پر چھلک پڑے۔

"آپا سے میں خود بات کر لوں گا' اگر میرے بیٹے کو شوق ہے تو کوئی اس کی راہ میں نہیں آ سکتا۔" وہ پیار سے بولے۔

"سچ لالہ پھر تو ٹھیک ہے لالہ۔" وہ خوشی سے کھڑی ہو گئی۔

"اب سیدہ آپا سے بات کر لیں' وہ تو کہہ رہی تھیں حنا بھی بس اولیول کرے گی' آگے اسے بھی نہیں پڑھنا۔"

"بھئی یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے حنا کے فادر چاہیں گے تو اسے پڑھائیں گے' نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی وہ ذرا تنگ ذہنیت کے لوگ ہیں۔ تعلیم کی اہمیت کو کیا جانیں۔" سلطان بخت نے جلتی آن لگاتی صالحہ کو سنایا۔

"تنگ ذہن شاید ہوں' بدکردار نہیں۔" صالحہ شہرینہ کا خیال کیے بغیر چیخ کر بولی تو سلطان بخت کو غصے کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔

"اس عورت نے اپنی زبان کھولنے کا فیصلہ کر لیا ہے' بہتر ہے سلطان بخت اس کو کبھی چور اہے پر منہ نہ لگانا۔" ان کے دل نے تنبیہہ کی۔

"او کے شہرینہ! اب تم کمرے میں جا کر ریڈی ہو' تم ہمارے ساتھ جا رہی ہو۔ چلو شاباش ہری اپ۔" سلطان بخت نے اسے کھڑا کر کے کہا تو وہ "جی اچھا لالہ" کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔

"سلطان بخت! بہت پیار ہے نا تمہیں شہرینہ سے' تو اتنا یاد رکھنا' اتنا بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیار میرے لالہ کو مجھ سے ہے اور میں حسین شاہ کی اکلوتی بہن ہوں۔ شہرینہ تمہاری اکلوتی بہن نہیں' سیدہ آپا بھی ہیں۔ یاد رکھنا۔" صالحہ تیز لہجے میں کہتی ہوئی ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

"لگتا ہے اس رات کی صبح نہیں ہوگی۔ کتنی لمبی رات ہے اور کاش اس کی صبح ہو بھی نہیں۔" صوفی صاحب نے ایک گہرا سانس لے کر ساتھ والے بستر کی طرف دیکھا۔ رابعہ بی بی کروٹ کے بل لیٹی ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

بندھا بندھایا سارا سامان ٹرالر سے اترواتے اور کمروں میں رکھواتے انہیں اچھی خاصی تھکن ہو گئی تھی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟" صوفی صاحب اکتا کر اٹھ بیٹھے۔ وہ خاموش رہیں کیونکہ

انہیں معلوم تھا کہ ان کی ”سمجھ“ صوفی صاحب سے زیادہ تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔

”پتا نہیں یہ سلطان بخت کے دماغ میں کون سا شیطانی کیڑا کلبلا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ بچپن میں یہ مجھ سے قرآن شریف پڑھتا تھا تو میں اسے بہت نیک' باتمیز اور سمجھدار سید زادہ سمجھتا تھا۔ جس نے جوان ہو کر اپنے خاندان کی ناموس کو یقیناً ”اپنی ہر نفسانی خواہش سے برتر جاننا ہے۔ مگر شام کو وہ مجھ سے جس بدتمیزی اور جہالت سے بات کر رہا تھا' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید دولت کی فراوانی اسی طرح نیک بیجوں سے کانٹے دار بول اگاتی ہے۔“ وہ ایک آہ بھر کر بولے۔

”کل شام زیادہ دور تو نہیں۔“ رابعہ بی بی ہولے سے بولیں۔ ”اور جمعرات صرف تین دن بعد صوفی صاحب کیا سوچا ہے۔“

”میرا تو دماغ لگتا ہے خالی ہو گیا ہے' یہ ہماری قسمت ہے اگر سمجھا جائے کہ سلطان بخت نے اپنے گندے کردار کے چھینٹے ہم پر نہیں مارے اور ایک شرعی راستہ اختیار کیا ہے مگر اس راستے میں کتنے تکلیف دہ موڑ ہیں یہ میں جانتا ہوں۔ اس دوران اگر بڑے شاہ جی آ گئے' وہ تو میری کھال ہی اتروا دیں گے کہ میں نے ان کی برابری کرنے کی کوشش کی۔ اپنے بیٹے کو انہوں نے کیا کہنا ہے۔ اور آمنہ' آمنہ کے ساتھ جو سلوک وہ کریں گے۔ اس کی جتنی بھی انتہا سوچو۔ کم ہے۔“ وہ جھرجھری سی لے کر بولے۔

”اور بڑی مالکن کو بھول گئے آپ' وہ توجہ کرنے نہیں گئیں ادھر ہی ہیں' ان کے قہر سے خدا بچائے۔ انہیں اس احمقانہ خواہش کی بھنک بھی پہنچ گئی تو صوفی صاحب وہ ہم غریبوں کی کٹیا کو آگ لگوانے میں ایک پل کی دیر نہیں کریں گی اور اس معاملے میں تو اب بڑی حویلی والے بھی شامل ہیں۔ حسین شاہ کی ظالمانہ فطرت کو کون نہیں جانتا۔ وہ تو ہم سب کو زندہ زمین میں گڑوا دے گا۔ وہ تو بڑی مالکن سے بھی سخت طبیعت کا ہے۔ اس وقت کون سے چھوٹے شاہ جی ہماری مدد کو آئیں گے۔“ رابعہ بی بی رو ہی پڑیں۔

”یہی سوچ سوچ کر تو میں پاگل ہو رہا ہوں رابعہ! ہم کوئی ایک دو تین نہیں پورا کنبہ ہے ہمارا۔ آمنہ کو لے کر ہم زمین کے اندر تو روپوش ہونے سے رہے۔ اور اس کا مطلب ہے چھوٹے شاہ جی کا ساری عمر کا بیر' اگر عمر بچی تو اس کی آنکھ میں تو ذرا بھی لحاظ نہیں وہ تو پوری طرح سے برائی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اگر اس کی خواہش کو رد کیا گیا تو وہ کچھ بھی بہت غلط' بہت برا کر سکتا ہے۔ یا اللہ! رحم کر۔ میں اتنا طاقتور نہیں کہ چھوٹے شاہ جی کے اٹھے ہاتھ کو روک سکوں۔“

وہ گھبرا کر اٹھے اور چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ آسمان پر چاند ستارے ان کی پریشانی سے بے خبر اپنی ہی انجمن میں مگن تھے۔ رات کے اس پہر آسمان کا جوبن عروج پر تھا۔ وہ ایک پل کو اپنی پریشانی بھول کر آسمان کی چھب دیکھنے لگے۔ گہری' نیلی تاحدِ نظر پھیلی جگمگاتے ستاروں سے روشن آسمان کی چادر جیسے انہیں اپنی طرف کھینچنے لگی۔ آسمان کا یہ روپ ان کے لیے کب نرالا تھا' وہ تو بہت کم سنی سے طویل راتوں کو نیلے سیاہ روشن چمکیلے نیالے آسمان کو جانتے تھے۔ جب سبق یاد کرنے کے لیے انہیں رات رات بھر جاگنا پڑتا' سرد ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں اٹھ کر یخ پانی سے وضو کرنا پڑتا تو بھی ان کی نگاہ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ جایا کرتی تھی۔

”آپ نے بتا دیا' آپ کا تبادلہ کدھر ہوا ہے۔“ رابعہ بی بی کی آواز نے ان کا انہماک توڑا۔

”ایک ننھا سا' لنگڑا سا جھوٹ۔ شیخوپورہ تمہیں لاہور کا بتایا ہے بھلا شیخوپورہ کون سا لاہور سے میلوں میل کے فاصلے پر ہے۔“ وہ جیسے اپنی ہی ہنسی اڑا کر بولے۔

”میں صبح جاؤں بڑی مالکن کے پاس' ان سے ذرا طریقے سے بات کر کے کسی حل کا پوچھوں۔“ رابعہ بی بی ہولے سے بولیں۔

”دماغ خراب ہے تمہارا۔“ وہ غصے سے پلٹے۔ ”یہ جو چند گھنٹے ملے ہیں آزادی سے کچھ سوچنے کے وہ بھی چھن جائیں گے۔ حویلی میں کوئی بھی شخص ہماری اس سلسلے میں مدد نہیں کر سکتا اور رابعہ بی بی! یہ بھی طے ہے کہ میں

اپنی آمنہ کو اس درندے کی ہوس کی بھوک مٹانے کو پیش نہیں کروں گا۔ نکاح کر کے چار دن یا چار ہفتوں میں جب اس کا جی بھر جائے گا' وہ اسے حویلی کے پچھواڑے بنے اپنے آبائی قبرستان میں ڈال دے گا۔ یہ امیر زادوں کا وتیرہ ہے۔ وہ جوتوں اور کپڑوں کی طرح خواہشیں بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے میں آمنہ کو اپنے ہاتھوں سے زہر دے دوں مگر شرع کی آڑ میں اسے اس بے ہودہ کھیل کا حصہ نہیں بننے دوں گا۔“

”شرع ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہی تو ہے' ابھی پرسوں اس بدبخت کی شادی ہوئی ہے۔ بیس دیہاتوں نے اس کی شادی کے دھوم دھڑکوں میں حصہ لیا ہے اور آج چوتھے دن یہ ایک اور نکاح رچانے چلا ہے۔ بے شرم انسان اور جو کھلونے اس نے شہر میں رکھے ہوں گے وہ علیحدہ۔“ ان کی سانس ناہموار سی ہو چلی تھی۔

”اب ایک ہی رات ہے' آر یا پار' میں ابھی آتا ہوں' تھوڑی دیر میں۔ تم سونا نہیں۔“ وہ جیسے کوئی فیصلہ کر کے بولے اور جوتے پہن کر دروازے کی طرف جانے لگے۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہیں' کچھ تو بتا کر جائیں۔“ رابعہ بی بی گھبرا کر بولیں۔

”کچھ غلط نہیں کرنے جا رہا' بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں' تم اٹھ کر نفل پڑھو' اللہ سے دعا مانگو' وہ ہمارے حق میں ضرور بہتری کرے گا۔“ اللہ کے حوالے کر کے وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

”آمنہ! سو گئی ہو؟“ زینب خاصا اونچے بولی کہ اگر آمنہ سو بھی گئی ہو تو اس کی آواز سن کر ضرور اٹھ جائے۔

”نہیں۔“ آمنہ نے آہستگی سے جواب دیا۔

”یہ بابا صاحب کو کیا ہوا۔ یکایک سارا سامان اتروا لیا اور ہمیں بستر بچھا کر سونے کا حکم دے دیا۔“

”مجھے کیا معلوم۔“ وہی بے حس سا جواب' زینب کو غصہ آنے لگا۔

”ایک تو میں تم سے بھی تنگ آ گئی ہوں۔ اللہ جانے کس کے پاس اپنی زبان رکھوا آئی ہو۔ تمہیں تکلیف کیا ہے آخر۔“ وہ اس پر الٹ پڑی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ آمنہ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

”یہ بابا صاحب! اس وقت کہاں گئے ہیں آدھی رات کو۔“ اس کے تیز کانوں نے صوفی صاحب کو باہر جاتے سنا۔ ”بابا صاحب کی سرگرمیاں کچھ پراسرار سی نہیں ہو گئیں' اب تو ڈانٹتے اور ڈپٹتے بھی کم ہیں' بس کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے ہیں اور اب آدھی رات کو خدا جانے کہاں گئے ہیں۔“

”پتا نہیں۔“ آمنہ نے بیزاری سے کہا۔

”پتا نہیں' تمہیں کسی بھی معاملے سے دلچسپی کیوں نہیں۔ تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ شام کو چھوٹے شاہ جی آئے تھے۔ بابا صاحب سے ملنے حجرے میں۔“

وہ اچانک بولی تو جیسے آمنہ کو ہزار واٹ کا کرنٹ لگا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زینب کو دیکھنے لگی۔

”کیا کیا کہا تم نے۔“ آمنہ نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ صاف سنی۔

”چھوٹے شاہ جی آئے تھے' بابا صاحب سے ملنے۔ حویلی تک ہمارے جانے کی خبر پہنچ گئی اور ہم وہیں کے وہیں۔ اور تمہیں کیا ہوا ہے اس طرح مینڈک کی طرح اچھل کر کیوں بیٹھی ہو۔“

”وہ۔ وہ کیا کہنے آئے تھے۔“ آمنہ اٹھ کر زینب کے پاس آ بیٹھی۔ زینب حیران سی ہو کر دیکھنے لگی۔

”مجھے کیا معلوم' کیا کہنے آئے تھے۔ ویسے بھی انہوں نے کہنا سننا کیا تھا' امیر آدمی نے بھلا غریب مولوی سے کیا کہنا ہو گا۔ بابا صاحب کے جانے کا سن کر ملنے آئے ہوں گے۔ مجھے تو جویریہ نے بتایا تھا میں نے کون سا خود انہیں دیکھا تھا۔ مگر تمہیں کیا ہوا ہے؟“ آمنہ اس کے ساتھ جڑی جا رہی تھی۔

”زینب! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ اس سے چمٹ کر بیٹھ گئی۔

"کیا مطلب۔ تمہیں کیوں ڈر لگ رہا ہے؟" زینب نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
"زینب چھوٹے شاہ جی بہت غلط آدمی ہیں یہ۔ سب میری وجہ سے تو ہوا ہے۔" اتنے دنوں سے وہ سب کچھ اپنے اندر دبا کر بیٹھی رہی تھی' اب اسے لگتا تھا وہ بولے گی نہیں تو مر جائے گی۔
"کیا مطلب' کیا ہوا ہے آمنہ! مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تم سیدھی تو ہو کر بیٹھو۔" وہ کچھ جھنجلا کر بولی۔
"اس روز حویلی میں مہندی والے دن ہم دلہن کا کمرہ دیکھنے گئے تھے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔
"ہاں مگر تم کہاں تھیں۔ مجھے تو وہ باتونی ثریا ٹکرا گئی تھی۔"
"میں شہرینہ کے ساتھ اوپر گئی تھی' کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر چھوٹے شاہ جی تھے ان کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں' جیسے خون ہو۔ انہوں نے بہانے سے شہرینہ کو نیچے بھیج دیا اور پھر۔" وہ رونے لگی۔
"پھر۔؟" زینب کا دل دھک دھک کرنے لگا۔
"انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کمرے میں گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ ان کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔ جیسے مجھے کھا ہی جائیں گے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا مگر میں کوشش کے باوجود چیخ نہیں سکی اور ان کے ساتھ گھسٹنے لگی۔" وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ زینب بمشکل سن پا رہی تھی۔
"تم چلی گئیں اندر کمرے میں۔" زینب حیرت سے بولی۔
"عین اسی وقت اماں جی آ گئیں' انہوں نے مجھے آواز دی تو چھوٹے شاہ جی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اماں جی مجھے نیچے لے آئیں۔ پھر اسی وقت ہم گھر آ گئے تھے۔"
"اچھا تو یہ قصہ تھا۔" زینب کو اس دن کی افراتفری کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔
"زینب! شاہ جی اچھے آدمی نہیں ہیں۔ بابا صاحب اور اماں جی نے اسی لیے تو گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب شام میں وہ پھر آ کر کیا کہہ گئے ہوں گے کہ بابا صاحب نے ارادہ بدل لیا۔" اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اس کے گھٹنوں سے اٹھایا۔
"ہاں تم سچ کہہ رہی ہو' ایسا ہی ہو گا تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" اس کے کانوں نے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ "کون آیا ہے باہر اس وقت آمنہ۔" وہ ڈر کر بولی' باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی' آمنہ نے زینب کا ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لیا۔
"مم۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے زینب! اس وقت کون آ گیا۔ بابا صاحب بھی نہیں ہیں۔"
وہ کانپ کر بے حد مدھم آواز میں بولی' اسی وقت قدموں کی چاپ صحن سے گزر کر ان کے کمرے کے باہر آ کر رک گئی۔ ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

☼ ☼ ☼
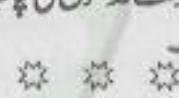
"نین تارا! جلدی کرو' قریشی کا پھر فون آیا ہے۔ گھنٹے بھر میں وہ چار فون کھڑکا چکا ہے۔ تمہاری تیاری ہی تمام نہیں ہو رہی۔" زیور گل تیز تیز بولتی' نین تارا کے کمرے میں آ گئی۔ نین تارا اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے چکی تھی۔ بیڈ پر پڑا ہینڈ بیگ اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا' گلے میں پڑا اسکارف درست کیا اور مسکرا کر ماں کو دیکھنے لگی۔
"آئی ایم ریڈی ماما! چلیں۔" اورنج ٹی شرٹ کے ساتھ ڈارک بلو ٹراؤزر میں اس کا نازک بدن نگاہوں کے رستے دل میں اترا جا رہا تھا۔
"کیوں قریشی کو تم نے ہارٹ فیل کروانا ہے' وہ تو پہلے ہی تمہیں دیکھ کر مرنے والا ہو جاتا ہے۔" زیور گل نے ٹھٹھا لگایا۔
"اوہ ماما! اس کا نام نہ لیا کریں' میرا جی متلانے لگتا ہے۔" وہ ماں کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اٹھلائی۔

"ارے اپنے دل کو قابو کرنا سیکھو۔ اس انڈسٹری میں تو قریشی سے بھی زیادہ ناقابل برداشت لوگوں کی قربت برداشت کرنا پڑتی ہے۔" زیور گل بولی۔
"ماما ڈونٹ بی فاؤل۔" وہ رک کر بولی۔ "آپ نے مجھ سے پرامس کر رکھا ہے کہ صرف قریشی کی اسی فلم میں سنگنگ کرنی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ مجھے اس انڈسٹری سے وحشت ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر شاہ جی۔"
"بس کرو یہ شاہ جی نامہ' شاہ جی جیسے پرندے کبھی اس منڈیر پر بیٹھتے ہیں' تو کبھی اس پر' ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ان کے بھروسے پر اپنا فیوچر تباہ نہ کرو۔ ہزار دفعہ طوطے کی طرح رٹا چکی ہوں پھر بھی نہیں سمجھتیں۔" زیور گل کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔
"ماما پلیز' ایک دم سے غصہ نہ ہو جایا کریں۔" نین تارا لجاجت سے بولی۔ اسے زیور گل کے غصے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ بچپن ہی سے زیور گل نے اس پر بڑی سختی رکھی تھی' ذرا سی بات نہ ماننے پر اسے رات رات بھر کے لیے کاٹھ کباڑ' چوہوں اور کیڑوں سے بھرے اسٹور میں بند کر دیا کرتی تھی۔ پھر نین تارا کا چیخنا چلانا' رونا دھونا' معافی' کچھ بھی زیور گل پہ اثر نہیں کرتی تھی۔ اس خوف کا اثر نین تارا کے ذہن پر ابھی تک تھا۔
"جلدی چلو بہت ٹائم ہو گیا ہے۔" زیور گل غصے سے کہہ کر پورچ کی طرف بڑھی۔ جہاں قریشی کا ڈرائیور ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ دونوں کو گاڑی کی طرف آتے دیکھ کر اس نے مستعدی سے پچھلے دونوں دروازے کھول دیے۔ دونوں بیٹھ گئیں تو ڈرائیور نے دروازے بند کر کے فرنٹ ڈور کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے فوراً گیٹ وا کر دیا۔
"آخر تم اس فراڈیے سے تمام پراپرٹی کے کاغذ پر کب لکھواؤ گی۔ نکاح والی رات تو وہ مجھ سے ہاتھ کر گیا۔ جعلی پیپرز پر سب کچھ تمہارے نام لکھ کر میری آنکھوں میں دھول جھونک گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس رات تم "مسید ہاؤس" سے یوں دھول جھونک کر نکلتیں۔" گاڑی جیسے ہی گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی زیور گل دھیمی سُروں میں پھر شروع ہو گئی۔
"کل آ رہے ہیں نا شاہ جی' دو تین دن رہیں گے۔ میں بات کروں گی۔"
"میں خود بات کروں گی اس سے۔" زیور گل پھر تڑپ کر بولی۔
"اب اس سے کہو تمہیں حویلی لے جائے اصل ٹھکانا تو وہی ہے نا تمہارا' اب تو اس کا باپ بھی ادھر نہیں۔ جس کے سامنے امیرزادے کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ تمہیں لے جائے حویلی' باپ آئے تو کہہ دے کہ اس نے تم سے نکاح کر لیا ہے۔ اگر اکڑتا ہے' منوا سکتا ہے کچھ بھی۔" زیور گل نے اپنا پلان اس کے سامنے رکھا۔
"میں بھی یہی چاہتی ہوں ماما کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں نے شاہ جی سے محبت کی ہے ماما اور ان کے علاوہ یہ ڈال ڈال تیتری کی طرح پھرنا مجھے پسند نہیں۔ مجھے تو صرف شاہ جی کا ساتھ اچھا لگتا ہے۔" وہ بڑے جوش سے مدھم آواز میں کہہ رہی تھی' چہرے پر اندرونی سچ کا تاثر رنگ بھر رہا تھا۔
"یہ شاہ جی سے بھی تو پوچھو نا کہ اسے صرف تمہارا ساتھ ہی پسند ہے یا اس کے علاوہ بھی۔"
"ماما پلیز! میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ جیسے درد سے کراہی۔ زیور گل اس دن کی اس کی دکھتی رگ کو بار بار چھیڑے جا رہی تھی۔ وہ ذرا سا چڑ کیا بیٹھی تھی۔
"نین تارا! آخر کب تک تم یہ فریب کھاتی رہو گی۔ اسی فریب میں آ کر تم نے اس سے نکاح کر لیا۔"
"ماما' اسی لیے تو کیا ہے کہ مجھے صرف اسی کا ہو کر رہنا ہے۔" وہ ایک عزم سے بولی۔
"ہونہہ' یہ تجربہ تیری ماں نے بھی تو کیا تھا' کیا ہاتھ آیا اس کے سوائے تکلیفوں بھری زندگی کے۔ یہ شریف لوگ اندر سے بڑے عیار ہوتے ہیں۔ مطلب پرست' چار دن کی عیاشی کی اور پھر تو کون' اور میں کون؟" زیور گل دکھ سے بولی۔

"ہر ایک کے ساتھ ایک جیسا احوال نہیں ہوتا مام۔" نین تارا ہولے سے بولی۔

"ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ تجھے میری بات پر یقین نہیں آتا تھا نا‘ اسی لیے تو تجھے سلطان بخت کے عقد میں دے دیا ورنہ میں سختی کرکے بھی تجھے روک سکتی تھی۔ صرف اس لیے کہ تجھے خود تجربہ ہو جائے‘ اس کھیل کا۔" زیور گل نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نین تارا نے ایک نظر ماں کو دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"مام کو بھی وہم ہو گیا ہے۔ شاہ جی کم از کم میرے ساتھ فریب نہیں کر رہے اور کل تو انہوں نے آنا ہے سب دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر لوں گی۔ انہیں ضرور ہی مجبور کروں گی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ احمد پور لے کر جائیں۔"

نین تارا دل میں ارادہ باندھنے لگی۔ گاڑی قریشی کی پرشکوہ کوٹھی کے گیٹ کے آگے جا کر رکی‘ ہارن پر گیٹ کھل گیا۔

"صاحب اندر ہیں۔ آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔" جیسے ہی گاڑی پورٹیکو میں رکی ملازم نے آگے بڑھ کر گاڑی سے اترتی زیور گل سے کہا۔

"خیریت....!" وہ حیرت سے بولی۔ "کہاں تو جلدی آؤ کا طوفان اٹھا رکھا تھا اس قریشی نے اور اب کہاں خود کمرے میں گھس کر بیٹھ گیا ہے۔" زیور گل نین تارا سے بولی۔

"مجھے خود یہ شام کو سرسل والا آئیڈیا بالکل پسند نہیں آیا بھلا اس وقت بھی کوئی کام کرتا ہے۔" نین تارا اکتا کر بولی۔

"تم اندر ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھو‘ میں آتی ہوں ابھی۔" زیور گل نے اسے ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس چھوڑا اور خود قریشی کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ نین تارا نے جھنجلا کر کندھے جھٹکے اور دروازے کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ڈرائنگ روم بہت شاندار تھا۔ بڑا سا ہال نما کمرہ چار قسم کے قیمتی صوفہ سیٹ پڑے تھے‘ انتہائی خوبصورت گہرے ڈارک براؤن اور لائٹ پھولوں والا قالین اور اسی رنگ کے پردے‘ چھت سے قیمتی فانوس لٹک رہے تھے۔ سائڈ ٹیبلز پر قیمتی نازک کرسٹل کے شوپیسوں کی بھرمار تھی‘ دیواروں پر بیش قیمت تصاویر سجی تھیں۔

"گوشت کے پہاڑ کی چوائس اچھی ہے۔" خود سے کہہ کر نین تارا نے ڈرائنگ روم کا جائزہ موقوف کیا اور سینٹرل ٹیبل پر پڑے میگزین اور انگلش اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"ہمارے گھر میں تو کاغذ صرف ڈائریکٹری کی شکل میں موجود ہے‘ وہ بھی لکھا ہوا۔" اس نے دو چار منٹ بعد فیشن میگزین بھی بند کر دیا اور اخبار اٹھا دیکھنے لگی۔ اخبار اسی ہفتے کا تھا۔ وہ موٹی موٹی دو چار خبریں پڑھنے کے بعد صفحے الٹنے لگی۔ اندرونی صفحے کے تیسرے صفحے کے درمیان میں چھپی بڑی سی گروپ فوٹو پر اس کی نظریں جیسے جم سی گئیں۔

وہ شاہ جی کو تو ہزاروں لوگوں میں آنکھیں بند کر کے پہچان سکتی تھی۔ اس نے آہستگی سے صفحہ تہہ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کے قریب کیا۔ درمیان میں سلطان بخت تھے اور ان کے دائیں بائیں تقریباً آٹھ لوگ کھڑے تھے۔

"سید سبطین شاہ کے اکلوتے صاحبزادے سید سلطان بخت کی دعوت ولیمہ کی تصویر جس کا فنکشن مقامی ہوٹل میں کل شب ہوا۔"

اس نے ذرا دقت سے انگریزی میں لکھی ہوئی نیچے کی ڈیڑھ سطری خبر پڑھ ہی لی۔ خبر پڑھ کر وہ بے جان نظروں سے پھر تصویر کو دیکھنے لگی۔ یقین نہ آنے کی کوئی وجہ بھی نہ بچی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج مہندی تھی‘ مسز خان نے شادی کی ساری رسمیں روایتی طریقے سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں وہ کسی کی بھی نہیں سن رہی تھیں اور ویسے بھی ان کے آگے کوئی بول بھی نہیں سکتا تھا۔ کل رات انہوں نے

مایوں کی رسم کروائی تھی۔ زیادہ لوگ تو انوائیٹ نہیں تھے صرف گھر کے افراد کچھ قریبی ہمسائے اور کچھ شہر میں بیٹوں اور مرحوم شوہر کے احباب کے گھرانے تھے۔ ڈھولک تو پرسوں ہی منگوالی تھی۔ اگرچہ بجانی کسی کو بھی نہ آتی تھی۔ اظہر اور ایاز کی چھوٹی بچیاں اسکول سے آنے کے بعد ڈھول پر طبع آزمائی کرنے ضرور آتی تھیں یا زیتون بانو کچن کے کام سے فارغ ہو کر بڑے جوش سے ان بچیوں کو آواز دے کر بجانے بیٹھ جاتی۔ مسز خان کو اس بے ہنگم شور سے عجیب طرح کی مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ اگرچہ دل کے اندر دور کہیں خدشے اور واہمے بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انہیں ستانے کو سر اٹھانے لگتے تھے۔

"اگر جمعرات کو شہباز نہ آیا اور جمعہ کو بھی تو....؟"

اس "تو" کے آگے ان کی نبضیں ڈوبنے لگتیں۔ شادی کی ساری تیاریاں بہت دھوم دھام سے کروائی تھیں انہوں نے۔ عالیہ اور فائزہ کی طنزیہ نگاہوں کے باوجود جیولر کے پاس وہ خود گئی تھیں‘ ایک بار ان دونوں کے ساتھ ولیمے کا سوٹ بھی منتخب کرنے گئی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے نزہت سے بھی کہا کہ وہ بھی ساتھ چل کر اپنی پسند کا سوٹ لے مگر اس نے بڑی التجا سے انہیں منع کر دیا تھا۔

"پھپھو پلیز! مجھے ایسے کسی بھی کام کے لیے مجبور مت کریں۔ آپ کو تو سب معلوم ہے۔" وہ رو پڑی تھی۔

عالیہ اور فائزہ کی چبھنے والی نظریں اس کے شکستہ بدن کے آرپار جاتی تھیں۔ وہ دن میں بیس دفعہ مسز خان سے کوئی مشورہ کرنے آتیں اور چالیس دفعہ کوئی نہ کوئی دل کو چیر دینے والا طنزیہ فقرہ نزہت کے کانوں میں ضرور ہی اتار کر جاتیں۔

"واہ بھئی نزہت کے تو مزے ہیں‘ نہ داج کا جھنجھٹ نہ رخصتی کے جوڑے کا کھڑاگ‘ نہ جہیز کا بکھیڑا اور تو اور رخصتی کی زحمت۔ سب کچھ ریڈی میڈ بلکہ ہم جیسوں کا درد سر۔ لوگوں کے نصیب اچھے ہوتے ہیں سب کچھ پکا پکایا خود بخود ان کی پلیٹ میں آ جاتا ہے۔" فائزہ ہنستی۔

"اور لوگ ناشکرے ہوتے ہیں پھر بھی برے برے منہ بنا کر حلق سے اتارتے ہیں۔ شکل پر سارے جہاں کی مسکینی برستی ہے‘ یہ بھی تو کمال دیکھیں۔" عالیہ کی چونچ کیوں بند رہتی بھلا اور نزہت کو اس دس مرلے کے پورشن میں کوئی کونا کھدرا نصیب نہ ہوتا‘ ان کی پاٹ دار آوازوں سے بچنے کے لیے۔ اور ان سب کا اسے ایک ہی علاج نظر آتا۔ آنسو۔ وہ روئے جاتی۔ اٹھتے بیٹھتے کچن میں چھوٹا موٹا کام زیتون بانو کے منع کرنے کے باوجود کرتے‘ کھانا کھاتے‘ چائے پیتے‘ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ بھر آتی۔

البتہ مسز خان کے سامنے‘ بہت محتاط رہنے کی کوشش کرتی کہ ان کے سامنے آنکھ نہ بھیگے‘ اس لیے نظریں جھکائے ہی رکھتی۔

اس اندوہناک سانحے نے اس کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان پندرہ سترہ دنوں میں ہی وہ سوکھ کے کانٹا بن گئی تھی۔ بھوک اس کی ختم ہو چکی تھی‘ نیند رات بھر نہ آتی۔ جو دن چڑھتا تو عالیہ اور فائزہ کی باتیں اسے پاگل بنا دینے کو کافی ہوتیں۔

اس کا جی ہزار بار ملامت کرتا کہ اگر زمانے کی نظروں میں وہ گھر سے بھاگ ہی گئی تھی تو پھر کہیں بھاگ ہی جاتی‘ کم از کم دن رات کی اس تہمت بھری ذلت سے تو بچ جاتی۔ ہر لمحے وہ ہزار بار مرتی تھی‘ ہزار بار جیتی تھی اور جب بھی مر کر جیتی اپنے جینے پر خوب ہی روتی۔

"آخر آپ کی آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے آ گئے ہیں‘ میں تو سخت حیران ہوں۔"

معاذ مسز خان کی دوائیوں کا شاپر اٹھائے ان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ لاؤنج میں دھواں دھار روتی نزہت پر اس کی نظر پڑی‘ پہلے تو اس نے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر کے گزر جانا چاہا کیونکہ وہ جس دن سے اسے دیکھ رہا تھا وہ بس رو رہی تھی‘ آج اس سے ضبط نہ ہو سکا تو پاس آ کر پوچھ ہی بیٹھا۔ دوائیوں کا شاپر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کے قدموں کے پاس کارپٹ پر بیٹھ کر بولا تو نزہت اس کی آواز سن کر اچھل ہی پڑی‘ یہ تو اسے معلوم تھا کہ اس

کے اس محبوب مشغلے میں کوئی مخل نہیں ہوتا' اسی لیے بڑے مگن انداز میں رو رہی تھی۔

"ن۔ نن۔ نہیں' میں تو ویسے ہی۔" اس نے جلدی سے اپنے پیلے دوپٹے سے منہ رگڑنے کی کوشش کی۔

"آپ کا منہ رگڑ رگڑ کر بالکل ہی چھل گیا ہے' اوپر کا پلستر تو اتر ہی چکا ہے' اندر سے یہ پیلا زرد بے رونق چہرہ نکل آیا ہے پرسوں شہباز بھائی آپ کو دیکھیں گے تو پہچاننے ہی سے انکار کردیں گے کہ میری دلہن تو بدل دی گئی ہے اور آپ اس بات پر ایک بار پھر دھواں دھار انداز میں رونا شروع کردیں گی۔" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ نظریں اس کے بھیگے چہرے اور بھیگی پلکوں پر جمی تھیں' جہاں ابھی بھی اوس پڑی تھی۔

"آپ کیوں روتی ہیں اتنا۔" وہ بہت پیار سے بولا' نزہت نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"میں کب رو رہی تھی۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"میں آپ کو کیا کہوں' شہباز بھائی کے حوالے سے تو آپ میری بھابی لگیں گی مگر......" اس نے جیسے ہی شہباز کا نام لیا' نزہت کی آنکھیں پھر بھرنے لگیں۔

"اوہ اللہ کے واسطے۔" معاذ نے بے ساختہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "یہ ساون بھادوں کا بقیہ پروگرام اگلے سیزن کے لیے اٹھا رکھیں۔ اچھا میں آپ سے شہباز بھائی کے حوالے سے کوئی رشتہ نہیں جوڑتا' میں آپ کو آپی کہہ سکتا ہوں' میری کوئی بہن نہیں۔" وہ شوق سے بولا۔ "بلکہ بہن کیا میرے تو ماں باپ بھی نہیں اور اس سے بڑا لطیفہ یہ کہ میرا کوئی گھر بھی نہیں۔ نزہت آپی! مجھے اس اتنے بڑے لطیفے پر بہت رونا چاہیے نا بلکہ پہروں رونا چاہیے' میرا تو کوئی بھی نہیں۔" وہ سنجیدہ تھا' نزہت اپنے آنسو بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ گھر۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر لاؤنج کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ڈیڑھ کنال کا ہے مگر اس میں میرے لیے چند فٹ کی جگہ نہیں اور ہو بھی کیوں۔ میرا بھلا اس گھر سے' اس کے مکینوں سے کیا ناتا ہے۔ جو مجھے یہاں جگہ ملے اور آپ کو پتا ہے اب کے شہباز بھائی آئیں گے تو ناظر بھائی اور ایاز بھائی ام جان پر زور دیں گے کہ مجھے یہاں سے چلتا کرنے کے لیے بھرپور دباؤ ڈالیں گے' بلکہ مجھے لازمی ادھر سے جانا ہوگا اور یہاں سے کہاں جاؤں گا' یہ مجھے نہیں معلوم۔ یہ گھر جہاں آکر مجھے ایک مدت بعد کچھ سکون' کچھ اپنائیت کا احساس ملا تھا۔ اگرچہ مجھے پتا تھا مجھے یہاں نہیں رہنے دیا جائے گا اور میں دیکھیں کتنا ڈھیٹ ہوں پھر بھی نہیں روتا؟

"اور اگر میں آپ کو اپنی پچھلی زندگی کی تکلیف دہ کہانی سناؤں تو آپ کے حساب سے تو مجھے آج سے پانچ سات سال پہلے ہی رو رو کر خود کو ختم کرلینا چاہیے تھا مگر پتا ہے نزہت آپی! میں کیوں نہیں روتا۔" وہ سیدھا ہو کر بولا۔

"میرے ایک ٹیچر تھے' وہ کہتے تھے۔ اگر تم زندگی کے دکھوں پر ٹوٹ کر روؤ گے تو تم بکھر جاؤ گے اور جب بکھرو گے تو کوئی بھی تمہیں سمیٹنے نہیں آئے گا۔ تم اگر روتے رہو گے تو کرچی کرچی ہو کر بکھر جاؤ گے پھر جتنا زیادہ بکھرو گے اتنا ہی زیادہ تمہیں خود کو سمیٹنے میں وقت لگے گا اور ہو سکتا ہے جب تم خود کو سمیٹ کر اٹھو گے تو اتنے پیچھے رہ چکے ہو گے کہ تمہارے ساتھ چلنے والے تمہاری آواز بھی نہ سن سکیں۔

انہوں نے کہا تھا۔ "معاذ بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا' کبھی مت رونا' آنسو تمہیں کمزور کردیں گے' خود کو ہمیشہ جمع رکھو گے تو طاقتور رہو گے اور زمانے کے مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکو گے۔ ہنسنے والوں کے ساتھ سب ہنستے ہیں' رونے والوں کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔"

آنسو انسان کو تنہا کردیتے ہیں اور میں تو اس بھری پڑی دنیا میں اس قدر تنہا ہوں کہ مزید تنہا ہونا افورڈ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں' اگر میں روؤں گا تو مجھے چپ کرانے کوئی نہیں آئے گا۔ آپ اتنے دنوں سے رو رہی ہیں' آپ کو کس نے چپ کرایا بلکہ آپ کے آنسوؤں سے دوسروں کو شہہ ملی کہ آپ میں صرف اتنی طاقت ہے کہ آپ اپنے ہر زخم کا انتقام خود سے لیتی ہیں۔

آپی! پلیز مت روئیں' آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں' پہلے دن سے میں آپ کے لیے بہت دعا کرتا ہوں۔ آپ

اپنے آنسو خود صاف کریں' اپنے چہرے کو اپنے دکھ کا اشتہار نہ بنائیں۔ آپی! اللہ نے آپ کا بھرم رکھا پھر آپ اللہ کا بھرم کیوں نہیں رکھتیں۔"

"اللہ کا بھرم۔" وہ حیرت سے بولی۔

"اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا' بقول آپ کے آپ اللہ کی اس مہربانی کا اس انداز میں شکر ادا کررہی ہیں کہ رو رو کر سارے زمانے کو بتا رہی ہیں کہ اللہ نے آپ کے ساتھ برا کیا۔ اس نے تو آپ کے ساتھ اچھا کیا' آپ کو اس کڑے وقت میں اچھے برے کی پہچان دی اور آپ کو ایک کٹھن غم عطا کرکے اپنے قریب کرلیا کہ غم والے دل اللہ کو بڑے محبوب ہوتے ہیں۔

آپی! آپ اگر خود کو پاک دامن سمجھتی ہیں تو پھر یوں رو رو کر لوگوں کے آگے صفائیاں کیوں دیتی ہیں۔ آپ کی حاجت لوگوں سے تو نہیں' اللہ سے ہے پھر صاف دل سے فقط اللہ سے سوال کیوں نہیں کرتیں۔ لوگوں سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا' سوائے تہمتوں اور الزاموں کے۔ اگر آپ خود کو حق پر سمجھتی ہیں تو پھر اپنے اندر مضبوطی پیدا کریں' لوگوں کی پروا مت کریں' لوگ آپ کو محض کمزور کریں گے۔ جیسے آپ کے آنسو خود آپ کو۔"

"تم نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھیں۔" وہ اپنی حیرت چھپا نہ سکی۔

"وقت سے آپی! وقت سے بڑا کوئی استاد نہیں۔ بس آپ روتی اچھی نہیں لگتیں' مجھے آپ سے صرف یہی کہنا تھا اور پتا نہیں کیا کیا کہہ گیا ہوں۔" وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

"معاذ! مجھے لوگوں کی پروا کب ہے' میں تو پھپھو اور شہباز......"

"آپی! آپ کی ذات کے باہر سب لوگ ہی ہیں' زمانہ ہی ہے' بس اپنی خبر لیں۔ اپنے اندر کی مضبوطی چیک کریں پھر کوئی بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اوہ میں تو ام جان کو دوائیں دینے جارہا تھا۔ انہوں نے فوراً لانے کو کہا تھا۔" یاد آنے پر وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری کوئی بات اگر بری لگی ہو تو سوری ویسے میں آپ کو آپی کہہ سکتا ہوں۔ کم از کم جتنے دن ادھر ہوں۔" وہ کھڑے کھڑے بولا۔

"کون جانے کون کب تک یہاں ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"آپی! ویٹس ناٹ فیئر۔ میرا اتمام ترمنجا کھانے کے باوجود پھر وہی راگنی۔" وہ افسوس سے سر ہلا کر بولا۔

"اوکے میں کوشش کروں گی۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"تھینک یو۔" کہہ کر وہ تیزی سے مسز خان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر اس کے بعد واقعی نزہت نے خود کو ضبط کے مرحلے سے گزارا' آنسو آنکھوں میں آتے' وہ اٹھ کر کسی نہ کسی بے ضرر سے کام میں مگن ہوجاتی۔ ڈسٹنگ کرنے لگتی' استری کیے ہوئے کپڑوں کو از سر نو درست کرنے لگتی۔ بالوں میں برش پھیرنے لگتی' وہ زیادہ تر اب کمرے ہی میں رہتی۔ عالیہ اور فائزہ کی دل جلی گفتگو سے بچنے کے لیے۔ مہندی کا فنکشن جمعرات ہی کو رکھا گیا تھا۔ باہر لان ہی میں سارا انتظام کیا گیا تھا۔ مسز خان شام ہی سے باہر لان میں بیٹھی تھیں اور آنے والے چیدہ چیدہ مہمانوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کررہی تھیں۔ رات دس بجے تک تمام مہمان آگئے' کھانا بھی سرو کردیا گیا' کھانے سے فارغ ہوتے بارہ بج گئے تو لوگ بیزار ہونے لگے' بہوؤں کے بار بار کہنے پر مسز خان نے مہندی کی رسم شروع کرنے کی اجازت دے دی۔

نزہت کو سرخ زرتار دوپٹے کی چھاؤں میں باہر لان میں رکھی جھولے نما نشست پر بٹھایا گیا۔ زرد سوٹ میں اس کے چہرے کا رنگ بھی زرد ہی لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی اداس روشنی نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا کر رکھا تھا' اس کی لانبی پلکیں بار بار لرز رہی تھیں' سات سہاگنوں نے اس کے ہاتھ پر رکھے پتے پر مہندی رکھی' بالوں میں تیل لگایا' مہندی اور تیل سے لتھڑے ہاتھوں کے ساتھ ہی اسے مٹھائی کھلائی گئی۔ زیتون بانو زور زور سے ڈھولک پیٹ رہی تھی' لڑکیاں بالیاں اوٹ پٹانگ گانے گا رہی تھیں۔ مسز خان اس خوبصورت منظر میں جیسے

کھوسی گئی تھیں۔ چہرے پر دھیمی سی مسکان لیے وہ نزہت کے اُداس شرمیلے چہرے کو تکے جارہی تھیں۔ جب ایاز نے موبائل لاکران کو تھمایا۔

دوسری طرف شہباز تھے جنہیں اب تک ان کے حساب سے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔

''ام جان! میں معذرت چاہتا ہوں' میں نے بہت سوچا' بہت کوشش کی مگر میں خود کو آنے پر مجبور نہیں کرسکا۔ ہوسکے تو میری اس خطا کو معاف کردیجیے گا' میں نہیں آسکتا۔ کچھ عرصے بعد چھٹی ملی تو شاید آجاؤں' خدا حافظ۔'' وہ ابھی کچھ بول ہی نہ پائی تھیں کہ دوسری طرف سے کال آف ہوگئی۔

انہیں لگا ساری روشنیاں بجھ گئی ہیں۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہے۔ موبائل ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اپنے ڈولتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کرسی کے ایک طرف گرسی گئیں۔

● ● ● ● ● ●

اماں جی کی مدھم سسکیوں بھری فریاد ہوا کی لہروں پر لرزتی ہوئی پورے کمرے میں گردش کررہی تھی۔ سجدے میں گرا ان کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ باآواز تلاوت و ترجمہ کے ساتھ وہ اس طرح گریہ وزاری کررہی تھیں کہ سننے والے کا دل پانی بن کر بہنے لگے۔ رات کا تیسرا پہر اور ایک کمزور بڑھاپے کے ویران آنگن میں قدم رکھتی آواز کی فریاد تو عرش ہلا سکتی تھی' جس طرح ان کا سجدے میں گرا وجود صوفی صاحب کے دل کو اندر تک پگھلا گیا۔

''یوں زبردستی کی ہجرت انہیں بھی کب گوارا تھی۔ دل اندر سے رو رہا تھا مگر وہ کہاں برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو مضبوط ظاہر کرتے رہتے تھے مگر رابعہ بی بی تو بہرحال اتنا مضبوط دل نہ رکھتی تھیں۔ خود پر کتنے برداشت اور ضبط کے بند باندھے تھیں پھر سلطان بخت کی دھمکی نے تو انہیں اندر تک سہما دیا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ آمنہ کو اپنے پروں میں چھپا کر کہیں دور غائب ہوجائیں۔ وہ صوفی صاحب سے کھل کر اپنے دل کا احوال تو نہیں کہہ سکتی تھیں مگر اللہ سے تو رو رو کر دعا کرسکتی تھیں۔

صوفی صاحب کچھ دیر کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر آہستگی سے ان کی طرف بڑھے۔

''رابعہ بی بی! اٹھو' اللہ مہربان نے یقیناً تمہاری فریاد سن لی ہوگی۔ وہ یقیناً ہمیں کوئی روشن اور نیک راستہ دکھائے گا۔ اٹھو' چلنے کی تیاری کرو۔''

صوفی صاحب کی مدھم گمبیر آواز انہیں اپنے بے حد قریب سنائی دی اور جھکے ہوئے کندھے پر ان کے بھاری گرم ہاتھ کا لمس رابعہ بی بی کو اگلے ہی پل ہوش کی دنیا میں لے آیا۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ململ کے دوپٹے سے آنسوؤں سے دھلا چہرہ صاف کیا۔ صوفی صاحب ان کی طرف ہی متوجہ تھے۔

''کہاں جانے کی تیاری؟'' وہ کچھ اچھنبے سے بولیں۔

''کسی جائے پناہ کی طرف جہاں ہماری عزت' جو ہماری جانوں سے بڑھ کر معتبر ہے۔ محفوظ ہوسکے۔'' وہ آہستگی سے بولے۔ ''میں پک اپ لینے گیا تھا' باہر کھڑی ہے۔ تم بس بچیوں کو اٹھا کر ضروری سامان کی دو تین گٹھڑیاں اور جو اشد ضرورت کا سامان ہے۔ وہ گاڑی میں رکھو۔ جلیل باہر گاڑی کے پاس انتظار کررہا ہے۔ ہمیں صبح کی پو پھٹنے سے پہلے ہی ادھر سے چلے جانا چاہیے۔'' وہ بہت اداس لہجے میں پست آواز سے بول رہے تھے۔

''مگر ابھی تو رات۔'' اماں بی نے کچھ کہنا چاہا۔

''بس رابعہ بی بی! سوال نہیں! کوئی سوال نہیں۔ اکثر بہت زیادہ سوال رستہ کھوٹا کرتے ہیں۔ بس اٹھو اور بچیوں کو اٹھاؤ بلکہ وہ میرے خیال سے جاگ ہی رہی ہیں۔ میں جلیل کو اندر بلاتا ہوں' آکر سامان گاڑی میں رکھوائے۔''

وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر باہر نکلے۔ دروازے کے پاس ہی آمنہ اور زینب دروازے سے جڑی کھڑی تھیں۔ صوفی صاحب انہیں دیکھ کر ایک پل کو ٹھٹکے اور پھر سر جھکا کر خاموشی سے ڈیوڑھی کی طرف بڑھ گئے کچھ بھی ان سے کہے بغیر!

اور آمنہ کو ان کا جھکا سر دیکھ کر اپنے وجود پر بہت خفت محسوس ہوئی۔

''کاش میں پیدا نہ ہوئی ہوتی تو میرے بابا صاحب کا سر آج نہ جھکتا۔'' زینب اس کی کیفیت سے بے خبر لپک کر اماں جی کے پاس جا پہنچی۔

''اماں جی! ہم جارہے ہیں؟'' خوشی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

''آں ہاں! آمنہ اور جویریہ کو بھی اٹھاؤ۔'' اماں جی نے سنجیدگی سے کہہ کر زیرو کا بلب آف کیا اور سو پاور کا فلپس کا بلب جلایا' کمرہ ایک دم پیلی روشنی سے جگمگا اٹھا۔

اماں جی کمرے کے سامان کا جائزہ لینے لگیں۔

۞ ۞ ۞

''کہا تھا' منع بھی کیا تھا ہم نے ام جان کو۔ یہ شادی بیاہ کوئی گڈی گڈے کا کھیل نہیں۔ یہ زبردستی کے سودے نہیں ہوتے' دل کی خوشی کی بات ہوتی ہے۔ اگر شہباز نہیں مانتا تو رہنے دیں۔ اس کے لیے کیا جہان بھر کی لڑکیاں مرگئی ہیں' جو یہ نزہت ہی اس کے گلے ڈالنے پر تل گئیں۔ مگر ام جان کو تو اپنی بات' اپنی ضد سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں اور پھر بھتیجی کی خاطر۔۔۔ بے شک بیٹا جو مرضی کر گزرے۔ انہوں نے بس اپنی منوائی۔'' اظہر غصے سے ٹہلتے ہوئے بولے جارہے تھے۔

''اور اب جو خاک اڑے گی ہماری عزت پر۔ اس کی کچھ خبر ہے آپ کو۔'' ایاز چمک کر بولے۔

''یہی خیال تو مارے دے رہا ہے۔ سارے شہر کو مدعو کر رکھا ہے اور شام ہونے میں کتنے گھنٹے ہیں۔ محض تین چار۔ ام جان نے تو بے ہوش ہو کر بستر سنبھال لیا ہے۔ لوگوں کو جواب دینے کو تو ہم ہی رہ گئے ہیں نا۔ کیا بہانا کریں گے سب کے سامنے' کیسے کیسے جھوٹ گھڑیں گے۔ ایاز! میرا تو سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہوا جارہا ہے۔''

اظہر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور وحشت سے اپنے سر پر دو ہتھڑ مارے۔

''ام جان جیسی خود ضدی ہیں ویسا ہٹ دھرم شہباز ہے۔ میرے سامنے آجائے' میں تو اس کا منہ تھپڑوں سے لال کردوں۔ عین وقت پر جس نے شادی سے۔۔۔ ان ماں بیٹے نے عزت کو کھیل بنا رکھا ہے اور ایک وہ وبال جان جو آکر ادھر بیٹھ گئی ہے۔ وہ سالی لیے کوڑے۔ ''گھر سے نکل گئی تھی۔ کہیں منہ کالا کرلیا تھا تو وہیں دفع ہوئی رہتی۔ ادھر ہماری زندگیاں کیوں عذاب بنانے چلی آئی منحوس لڑکی۔''

ان کے منہ سے جیسے کف نکلنے لگا۔ طیش کے مارے انہیں اپنی زبان اور اپنے جذبات پر قابو محال لگ رہا تھا۔

''ہاں وہی تو ہے فساد کی جڑ۔ اس رات نہ گھر میں داخل ہونے دیتے۔ دروازے بند کرلیتے۔ خود ہی دفع ہوجاتی۔ شہباز نے اسے کوئی سامنہ لگا لیا تھا۔ ام جان کو بھی پتا نہ چلتا۔ خود ہی رو دھو کر دفعان ہوجاتی۔ دیدہ دلیر لڑکی آدھی رات کو بھی نہیں ڈری۔ کیسے ڈھٹائی سے اتنا بڑا جرم کرنے کے بعد بھی اپنی سسرال چلی آئی۔''

''سوچیں ذرا ایسی نڈر لڑکی بعد میں ادھر کیا کیا نہ تماشے لگائے گی۔'' ایاز نے لقمہ دیا۔

''یہی سب کچھ تو شہباز کو نظر آگیا ہے۔ اس نے آنے سے صاف انکار کردیا۔ وہ تو پہلے ہی نہیں مان رہا تھا۔ ام جان نے اپنی ہٹ دھرمی سے اس شادی بلکہ بربادی کی تیاریاں کروائیں۔ بری پہ پیسہ برباد کیا۔ زیور بنایا۔ ہوٹل کی بکنگ اور کمرے کی آرائش' ام جان کی ذہنی صحت اب کسی بھی طرح قابل اعتبار نہیں رہی۔ یہ اپنی فضول خواہشوں سے ہمیں برباد کرجائیں گی۔''

''آہستہ بولیں' وہ جاگ گئیں تو کھڑے کھڑے دو کوڑی کا کردیں گی۔''

ایاز محتاط لہجے میں بولے۔ دونوں ام جان کے کمرے کے باہر بنے کاریڈور میں ٹہل رہے تھے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ رات فون سنتے ہی مسز خان کی جو طبیعت بگڑی' ابھی تک نہ سنبھلی تھی۔

''شہباز کو چھٹی نہیں ملی۔ صبح آجائے گا۔ اسی غصے میں تو ام جان کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا ہے۔'' عالیہ ہنس ہنس کر سب کو ٹال رہی تھی۔

''کیا ادھر ٹہل ٹہل کر شہباز کو زمین سے برآمد کرائیں گے۔ پارلر سے دوبار فون آچکا ہے۔ اس مہارانی کو پارلر

لے کر جانا تھا۔ بکنگ جو کروا رکھی ہے۔ اب بتائیں کیا کریں۔" عالیہ اس وقت ان کے سر پر آ کر بولی۔

"ہم کیا بتائیں۔ پوچھو جا کر اپنی پیاری ام جان سے جنھوں نے یہ سارا کھڑاگ کھڑا کیا ہے۔ ہماری تو خود عقلیں پریشان ہیں سوچ سوچ کر۔ شہباز کو دس فون کیے۔ وہ نواب کا بچہ آواز سنتے ہی فون بند کر دیتا ہے۔ اب تو اس نے موبائل بھی آف کر دیا ہے۔ سامنے آجائے تو میں اسے شوٹ کر دوں۔" اظہر ایک بار پھر غصے سے بھڑک کر بولے۔

"اب دولہا بہادر کے بغیر تو یہ فنکشن ہونے سے رہا۔" عالیہ نے ان کے غصے کو اور ہوا دی۔

"ظاہر ہے اور جگ ہنسائی کروائی ہے ہمیں۔" ایاز کڑھ کر بولے۔

"اب سب سے کوئی بہانہ کر دیتے ہیں کوئی فوتگی وغیرہ کا۔" اظہر کچھ دیر بعد بولے۔

"فیملی سے باہر جانے والوں میں تو یہ بہانہ چل جائے گا۔ یہ جو گھر میں جلوس اکٹھا ہوا ہے۔ اس کو کیا کہیں۔" ایاز نے تھک کر دیوار کا سہارا لیا۔

"یہی تو مصیبت ہے ساری۔"

"ام جان اٹھ گئیں؟" ایاز کو خیال آیا تو عالیہ سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میں نہیں گئی کمرے میں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "میری امی جان، بھائی بھابی اور دونوں بہنوں نے صبح سے پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ دولہا ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ انہیں تو پہلے ہی یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ رخصتی سے پہلے دلہن گھر میں موجود ہے۔ سہیل کے باہر جانے والا بہانہ بھی بودا نکلا۔ میرے بہنوئی اپنے کسی کزن سے ملنے پنڈی گئے تھے۔ وہ سہیل کے بینک ہی میں کام کرتا ہے۔ وہیں انہوں نے اسے بھی دیکھ لیا۔ ابھی اسی ہفتے کی بات ہے۔" سوال پر سوال، تفتیش پر تفتیش۔ میرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ فائزہ الگ منہ سجائے پھر رہی ہے۔ اس کے میکے والوں نے اس کی جان کھا رکھی ہے۔

"پہلے اس کام میں کون سا مزہ رہ گیا تھا۔ کہا بھی کہ سادگی سے دو چار لوگوں کو بلا کر فنکشن کر لیتے ہیں۔ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے۔ بیٹے اور بھتیجی کو دولہا دلہن کے روپ میں دیکھنے کا۔ نہیں۔ ایک ہی ضد سارے جہان کو بلاؤ۔ خوب ہنسی اڑوائی ہماری اس عمر میں۔ لوگ ہنس رہے ہیں، پھبتیاں کس رہے ہیں۔ دلہن کی موجودگی پر ٹھٹھول کر رہے ہیں اور خود ساسوجی پلنگ سنبھال کر بیٹھ گئی ہیں۔ منہ تو ہمیں ہی سب کے لگنا ہے نا۔" عالیہ تو جیسے پھٹ ہی پڑی۔

"کیا۔ کیا حل ہے۔ آپ کی نظر میں اس کا؟" وہ تنک کر بولی۔

"ایک آخری کوشش۔"

"وہ کیا؟" ایاز نے سوالیہ نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

"شہباز سے کانٹیکٹ کرنے کی۔ اسے سمجھانے کی آخری کوشش۔"

"فضول۔ وہ صبح سے فون ہی اٹینڈ نہیں کر رہا۔ موبائل اس کا آف ہے۔ بات کس سے کریں۔ اور ٹائم اب اتنا شارٹ رہ گیا ہے۔ کوئی اسے جا کر زبردستی لا بھی نہیں سکتا۔"

"تو چلو پھر ام جان کو اٹھاتے ہیں۔ ان کی پیدا کردہ اس دردسری کا علاج ان ہی سے دریافت کرتے ہیں۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولے۔

"بھابھی! پارلر سے فون آیا ہے کہہ دوں، ہم نہیں آ رہے۔ اپائنٹمنٹ کینسل کر دیں۔" فائزہ کاریڈور میں داخل ہوتے ہی عالیہ سے بولی۔ عالیہ استفہامیہ نظروں سے شوہر اور دیور کو دیکھنے لگی۔

"ابھی ٹھہر جاؤ۔ اس سے کہو آدھے گھنٹے تک انفارم کر دیں گے۔"

اظہر نے کہہ کر مسز خان کے کمرے کی راہ لی۔ عالیہ اور ایاز بھی ان کے پیچھے ہی تھے۔

مسز خان جاگ رہی تھیں۔ بستر پر چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھیں۔ زیتون بانو ان کی پائنتی بیٹھی ہولے ہولے

ان کی پنڈلیاں دبا رہی تھی۔

اظہر نے کھنکھار کر ماں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا مگر وہ متوجہ نہ ہوئیں۔ ہنوز ٹکٹکی باندھے چھت پر نادیدہ نقطے کو گھورتی رہیں۔

"ام جان! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اظہر ان کے قریب آ کر نرمی سے بولے۔

"ٹھیک۔" بہت آہستگی سے ان کے لب ہلے۔ نگاہیں ابھی تک اسی مقناطیسی نقطے پر جمی تھیں۔

"کچھ کھایا آپ نے؟" وہ ان کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

"ہوں۔" مبہم سا جواب تھا۔ اظہر کو اور کوئی سوال نہیں سوجھ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ماں کو حالات کی سنگینی کا احساس کیسے دلائیں۔ ایاز اور عالیہ بے تابی سے ان کے اگلے ڈائیلاگ کا انتظار کر رہے تھے۔ عالیہ نے دائیں ٹانگ کا بوجھ بائیں پر منتقل کیا۔ کمرے میں کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی اور اس خاموشی سے سب کا دل گھبرا رہا تھا۔ خاموشی سے تو کچھ بھی واضح نہیں ہوتا۔

"کیا وقت ہو گیا ہے؟" مسز خان نے اچانک نگاہیں چھت سے ہٹا کر اظہر کو دیکھا۔

"چار بج چکے ہیں؟" اظہر نے کن اکھیوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا جہاں ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔" وہ ہولے سے بڑبڑائیں۔ تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"شاید ام جان کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔" ایاز بھابی کے کان میں بولے۔

"پہلے کون سا درست تھا۔" عالیہ جل کر بولی۔

"سب انتظامات مکمل ہیں؟" مسز خان کا [illegible] بھی انہیں جز بز کر دینے والا تھا۔

"ام جان! انتظامات تو کب سے مکمل ہیں لیکن۔"

"[illegible]" اظہر کی بات کاٹ کر بولیں۔

"نہیں مگر۔۔۔۔۔"

"ساڑھے تین بجے جانا تھا اس نے ابھی تک بھیجا کیوں نہیں اسے؟" بات کاٹ کر بولیں۔

"شہباز نے آنے سے انکار کر دیا ہے تو زینت کو کس لیے پارلر بھیجیں۔ ہمیں تو اور پریشانی لگی ہے۔ سب لوگوں کو مہمانوں کو ہم کیا بتائیں اور ہوٹل کی بکنگ، سارے انتظامات اور۔۔۔۔" اظہر غصے سے بول رہے تھے۔

"تمہیں کس بات کی پریشانی ہے؟" مسز خان ہنوز پرسکون لہجے میں بولیں۔

"کیا آپ نہیں جانتیں۔ بتا تو دیا ہے آپ کو شہباز نہیں۔۔۔۔۔"

"آئے گا۔ وہ لازمی آئے گا۔ مجھے پتا ہے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ وہ میرا بیٹا ہے۔" وہ بڑے آرام سے بولیں۔

"ہمیں کسی ٹوکرے سے اٹھایا تھا کیا؟" ایاز نے جل کر دل میں سوچا۔

"ام جان! وہ کیسے آسکتا ہے۔ فون پر اس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ موبائل اس کا آف ہے۔ آٹھ بجے **فنکشن** کا ٹائم ہے۔ چار گھنٹوں میں کیا ہو سکتا ہے؟" وہ اضطراب بھرے لہجے میں ہاتھ مل کر بولے۔

"احمق ہو اظہر تم۔" مسز خان ہولے سے ہنسیں۔ "اتنا نہیں جانتے۔ فون پر وہ کیسے مل سکتا ہے۔ وہ سفر میں ہوگا۔ موبائل وہ سفر کے دوران آف رکھتا ہے۔ بڑی بری عادت ہے اس کی اور سمجھانے کی اسے بھلا کیا ضرورت ہے۔ وہ بھلا میری بات رد کر سکتا ہے۔"

تینوں کو پکا یقین ہو گیا کہ مسز خان کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔

"ام جان کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ رات اس نے آپ سے کیا کہا تھا۔ آپ کو یاد نہیں شاید۔" اظہر جھنجھلا کر بولا۔

"یاد ہے۔۔۔۔۔"

"السلام و علیکم ام جان!" کمرے میں گونجنے والی اس آواز نے سب کو جیسے دم بخود کر دیا۔ شہباز اپنا سفری بیگ

اٹھائے چہرے پر برسوں کی تھکن لیے کمرے کے وسط میں کھڑے تھے ان کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور حلیہ بہت رف ہو رہا تھا۔

"وعلیکم السلام آ گیا میرا بیٹا۔ میرا شہباز میرا کماؤ لال ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" مسز خان بشاش لہجے میں کہتے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔

شہباز آہستہ سے قدم اٹھا کر ان کے بستر کی سائیڈ پر جا بیٹھے۔ مسز خان نے ہاتھ بڑھا کر ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"میرا بچہ' میرا لال۔ ہمیشہ خوش رہو ساں کی دعائیں ساری عمر تیرے رستے کے کانٹے چنتی رہیں گی۔ تو نے ماں کا دل خوش کیا۔ اللہ تجھے خوشیوں بھری زندگی دے گا مجھے یقین ہے شکریہ بیٹا۔"

وہ اس کا نہ ' ما تھا اور مرحوم کر خوشی کے عالم میں بول رہی تھیں۔

"ام جان! میں آپ کی حکم عدولی نہیں کر سکا کوشش کے باوجود۔"

"چلو اظہر بیٹا! ایاز! جا کر مہمانوں کو دیکھو' انتظامات کا جائزہ لو۔ عالیہ! تم شہباز کے کھانے کے لیے کچھ لے کر آؤ اور فائزہ سے کہو' نزہت کو فوراً "پار لرلے کر جائے اور سب مہمانوں کو خاص طور پر تم دونوں کے میکے والے جو بہت بے قرار تھے شہباز کی غیر موجودگی سے' ان کو جا کر بتا دو۔ بے چین دلوں کو سکون آ جائے۔" وہ بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں۔

"زیتون بانو! اٹھو۔ تم جا کر کچن میں دیکھو۔ کیا صورت حال ہے۔ شہباز کے لیے کچھ لاؤ اور میں اچھی بھلی ہوں۔ یونہی نہ موقع بے موقع مجھے دبانے بیٹھ جایا کرو۔"

وہ زیتون بانو کو جھڑک کر بولیں تو وہ دانت نکوسنے لگی اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

"شہباز بیٹے! تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو' نہا بعد میں لینا۔ میں بھی صبح سے ابھی تک تمہارے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں۔ فریش ہو آؤ تو ماں بیٹا مل کر کھاتے ہیں۔ سمجھو آخری کھانا۔ اس کے بعد تو تم اپنی دلہن کے ساتھ ہی کھایا کرو گے کیوں عالیہ! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

انہوں نے بیزار کھڑی عالیہ سے کہا۔ جو کوئی بھی جواب دیے بغیر پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔ ایاز اور اظہر بھی فوراً اس کے پیچھے چل پڑے ماں بیٹے کے یہ انوکھے لاڈ کے طریقے انہیں ہضم نہیں ہو رہے تھے۔

"پہلے تماشا بنوا دیتے ہیں پھر مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔" ایاز بڑبڑا کر باہر نکلے تو شہباز نے حیرت سے بھائیوں کی طرف دیکھا جنہوں نے اس سے بات کرنا گوارا نہ کیا تھا۔

"ام جان! یہ۔" وہ ذرا حیرت اور دکھ سے بولے۔

"یہ! مسز خان دھیرے سے ہنسیں۔ "یہ دنیا ہے میرے بچے' بہن بھائی بھی شریک ہو جاتے ہیں تماش بینوں کی صف سجانے والوں میں۔" وہ ایک بار پھر اسے محبت سے اپنے ساتھ لپٹانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

سفر جاری تھا۔ جلیل آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ صوفی صاحب ان چاروں کے ساتھ پیچھے بیٹھے بک اپ سے باہر دیکھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے آہستہ آہستہ گرا رہے تھے ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال بنا تھا۔ تسبیح کے دانوں کے ساتھ ہلتے لب چپ تھے مگر وہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ آمنہ چادر میں پوری چھپی ہوئی تھی۔ چہرہ بھی اس نے چادر کے اندر کر رکھا تھا۔ زینب پوری کی پوری اس پر لڑھکی سو رہی تھی یہی حال جویریہ کا تھا جو آدھی اماں جی کی گود میں اور آدھی کپڑوں کی گٹھڑیوں پر مدہوش ہو کر سوئی ہوئی تھی۔ اماں جی وقفے وقفے سے آنکھوں کے نم گوشے صاف کرتیں اور سینے سے ایک سرد آہ خارج کرتیں تو صوفی صاحب گھور کر ان کو ضرور دیکھتے۔ وہ سر جھکا کر جویریہ کے بال سنوارنے لگتیں۔

"عبدالمبین کو تو کچھ بھی نہیں پتا۔ وہ پریشان ہو گا۔" پورے سفر کے دوران اماں جی نے صرف یہ دو جملے بولے تھے۔

"عبدالمتین کو تو پتا تھا۔ وہ کتنا پریشان ہو کر بھاگا چلا آیا۔" صوفی صاحب نے تنگ کر کہا تو وہ لاجواب سی ہو کر جویریہ کو تھپکنے لگیں۔

صبح صادق کی ہلکی ہلکی نیلی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی جب ان کی گاڑی پکی سڑکوں پر دوڑنے کے بعد اس چھوٹے سے شہر کی اندرونی کچی پکی گلیوں کو روندتی ہوئی ایک نیم پکی بلکہ خستہ حال گلی کے آخری کونے میں بنی چھوٹی سی مسجد کے آگے جا رکی۔

مسجد چو کور رقبے پر بنی ہوئی تھی مسجد کی چھت بہت اونچی تھی جس کی وجہ سے اوپر کی منزل پر بنا گھر اور بھی اونچا بلکہ آسمان سے باتیں کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ زینب نے نیم مندی آنکھوں سے دور ہی سے مسجد اور علاقے کا جائزہ لے کر گھر کو ناپسند کر دیا تھا اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ صوفی صاحب کے اشارے پر چاروں نیچے اتریں تو زینب کا دل چاہا اترنے سے صاف انکار کر دے۔

گلی میں بالکل سناٹا تھا۔ کھمبے کا پیلی زرد روشنی والا مدقوق سا بلب ابھی بھی جل رہا تھا۔ کھمبے کے نیچے دو مریل سے کتے جسم کھینچ کھینچ کر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔ مسجد میں فجر کی جماعت ہو رہی تھی۔

صوفی صاحب نے آگے بڑھ کر مسجد کی بغل میں بنی سیڑھیوں کا دروازہ جس پر ایک زنگ آلود بڑا سا تالہ جھول رہا تھا جیب سے چابی نکال کر اسے کھولا۔ جلیل گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ مل کر سامان اتار رہا تھا۔

"آ جاؤ' چلو لوگ اوپر۔" صوفی صاحب کی آواز پر وہ چاروں آہستہ آہستہ ان کے پیچھے اندھیری سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ صوفی صاحب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیوار پر ہاتھ مار کر نادیدہ روشنی کے لیے کسی بٹن کا وجود تلاشتے رہے مگر بٹن کا ملنا بھی ہو گیا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہی چھوٹا سا صحن یا برآمدہ تھا مکمل طور پر چھتا ہوا۔ وہاں پر بھی گھپ اندھیرا ہی ہوتا اگر گلی کے رخ کی ایک کھڑکی ادھر کھلی ہوئی نہ ہوتی جس کی وجہ سے ملگجی سی روشنی اس اندھیرے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ہی دو کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ دونوں بند تھے۔

گلی کی اس کھڑکی کے نیچے مٹی کے تیل کا چولہا پڑا تھا اور دیوار پر ایک سلیب سی بنی ہوئی تھی شاید برتن رکھنے کے لیے۔ ایک ٹوٹی ہوئی پلیٹ اور ایک مٹی کی پیالی پہلے ہی وہاں رکھی ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا یہ کچن ہے اس کچن کے بالمقابل دوسری طرف شاید غسل خانہ تھا۔ اس کا لکڑی کا دروازہ جس کی درزوں کو لوہے کی پتریاں لگا کر بند کیا گیا تھا۔ کھلا تھا۔ سارا گھر مٹی اور دھول کی دبیز تہوں سے اٹا ہوا تھا۔ دیواروں سے لٹکتے جالے جھک جھک کر ان کو شاید سلام کرنے نیچے آ رہے تھے۔ انہیں لگا جیسے وہ موہنجو داڑو کے کسی کھنڈر میں آ گئے ہیں۔

صوفی صاحب نے آگے بڑھ کر کمروں کے دروازے کھول دیے عجیب طرح کی تیز بدبو کا جھونکا تھا جو سب کے تنفس سے ٹکرایا۔ سب نے ہی بے اختیار منہ اور ناک پر ہاتھ رکھ لیے جیسے مرے ہوئے چوہوں کی یا کسی اور مردہ جانور کی بو ہوتی ہے۔

زینب کا جی چاہا' وہ جو آخری سیڑھی کے بالکل پاس کھڑی ہے وہیں سے بھاگ جائے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔

"توبہ' لگتا ہے اس کا بک کو بھی کسی نے نہیں کھولا۔"

اماں بی رونہ سکیں تو بولیں اور کہہ کر کچھ گھبرا سی گئیں اور دو قدم صوفی صاحب سے پرے کھسک گئیں جو ان کی بات پر انہیں خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"پہلے امام صاحب اکیلے ہی رہتے تھے۔ اہل و عیال پیچھے ان کے کسی گاؤں میں تھے' وہ نیچے مسجد میں بنے حجرے ہی میں رہ لیتے تھے۔ یہ حصہ تو انہوں نے استعمال ہی نہیں کیا۔" پتا نہیں انہوں نے کس طرح جواب دے دیا۔ شاید وہ خود بھی مکان کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ صحن میں پرندوں کے فضلات کے ڈھیر لگے تھے اس کی بدبو نے بھی ماحول کو ناقابل برداشت بنا رکھا تھا۔

صوفی صاحب نے کمرے کی بائیں دیوار کے ساتھ لگے ڈیش بورڈ پر پہلے بٹن کو دبایا۔ کمرے کا اکلوتا بلب پوری شان سے جل اٹھا مگر کمرے کی حالت تو صحن سے بھی ناگفتہ تھی۔ ایک دیوار تو بالکل سیلاب زدہ تھی اور سفیدی جو کبھی شاید پیلے رنگ کی تھی۔ اب اس کا رنگ بالکل فق ہو چکا تھا۔ دیواروں اور فرش کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا چھت لی آر کی تھی۔ اس کی اینٹوں کی درازوں میں چھپکلیاں اور نامعلوم کون کون سے حشرات تھے جو روشنی ہوتے ہی کونے کھدروں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ کمرے میں اکلوتی بان کی چارپائی تقریباً ٹوٹی ہوئی تھی اور وہی اس کمرے کا اکلوتا فرنیچر تھا۔ کمرے میں نہ کوئی روشندان تھا نہ کوئی کھڑکی۔ اماں جی سمیت سب کے دلوں پر جیسے اوس پڑ گئی۔

دوسرا کمرہ البتہ کچھ بہتر تھا۔ پہلے کمرے سے کچھ کشادہ بھی تھا اور اس میں کھڑکی بھی تھی۔ کمرے کی سفیدی بھی کچھ بہتر حالت میں تھی۔ ایک کرسی اس کمرے کے بیچوں بیچ بڑی شان سے پڑی شاید ان کا منہ چڑا رہی تھی۔

"ہم ادھر کیسے رہیں گے۔" آمنہ نے دل میں سوچا۔ وہ بس رو دینے کو تھی۔ یہی حال زینب کا بھی تھا۔

"اماں جی! واپس چلیں گھر۔ مجھے نہیں ادھر رہنا۔ یہ گھر گندا ہے۔ واپس چلیں۔" جویریہ نے ٹھنک کر رونا شروع کر دیا۔

"خاموش بیوقوف! چپ کراؤ اسے رابعہ بی بی!" صوفی صاحب جویریہ کے رونے پر غصے اور جھنجلاہٹ میں بولے۔ اماں جی جھک کر جویریہ کو پیار سے سمیٹنے لگیں جو ان کی گود میں مچلی جا رہی تھی۔

اسی وقت جلیل نے سامان اوپر لانا شروع کر دیا۔

"تم لوگ صفائی کرو گھر کی۔ صاف ہو جائے گا تو اچھا لگے گا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ سفیدی دوبارہ ہو جائے۔ میں ذرا مسجد میں امام صاحب اور دوسرے لوگوں سے مل لوں۔ نماز کا وقت بھی نکلا جا رہا ہے۔ تم لوگ جلدی سے نماز پڑھ کر صفائی شروع کرو۔" صوفی صاحب گھر کی حالت اور ان چاروں کی مرجھائی صورتوں سے نظریں چرا کر نیچے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

"اور ہاں' ناشتہ نہ بنانا۔ ابھی تو سامان کھلنے میں بھی کچھ ٹائم لگے گا۔ جلیل سامان رکھ لے تو میں اس کے ہاتھ ناشتہ باہر سے منگوا لیتا ہوں۔" وہ ایک پل کو رکے۔

"رابعہ بی بی! ابھی ہمیں کچھ عرصہ ادھر ہی رہنا ہے شوق سے نہ سہی مجبوری سے ہی۔ اس لیے بچیوں کو سمجھا دو۔"

"او میرے اللہ۔ اماں جی! ہم ادھر رہیں گے۔ کبھی نہیں۔" زینب نے بہت دیر کا ہوا سانس اپنے سینے سے خارج کیا اور ناک چڑھا کر ایک حقارت بھری نظر پورے گھر پر ڈالی۔

"سنا نہیں۔ تمہارے بابا صاحب کیا کہہ گئے ہیں۔ ہمیں ابھی ادھر ہی رہنا ہے کچھ عرصہ۔" اماں جی سنجیدگی سے بولیں اور اپنی چادر اتار کر تہہ کرنے لگیں اور سینے پر پھیلا ململ کا دوپٹہ کھول کر سر پر اوڑھ لیا۔ آمنہ نڈھال سی ہو کر چھت کو جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ نیچے سے آتی سیڑھیوں کے پاس سامان کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ جویریہ انہیں گٹھڑیوں پر بیٹھ کر پھر سے اونگھنے لگی تھی کہ اسے ایک دم سے پھر کچھ یاد آیا۔

"اماں جی! گھر چلیں نا۔" وہ پھر سے رونے کی تیاری پکڑنے لگی۔

"اچھا بچے! چلیں گے۔ کیوں نہیں چلیں گے۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ بس تھوڑے دن ہی ادھر رہیں گے۔ اچھے بچے تو اماں کا کہا مانتے ہیں نا۔ پھر ادھر تمہارا بھائی بھی تو آئے گا عبدالمتین' وہ میری جوئی کو سیر کروانے لائے گا۔ اچھی اچھی چیزیں لے کر دے گا۔ وہ تو تم سے بہت پیار کرتا ہے ناں۔" اماں جی اسے ساتھ لپٹا کر پچکارنے لگیں۔ جویریہ نے بڑے دھیان سے ان کی بات سنی۔

"سچ اماں جی! بھائی آئے گا۔" اس کے معصوم چہرے پر چمک سی آ گئی۔

"ہاں آئے گا۔ میں تمہارے بابا صاحب سے کہوں گی۔ وہ آج یا کل جا کر اسے لے کر آئیں پھر جویریہ کو اپنے

ساتھ سیر کروانے لے جائے گا۔"

"پکی بات اماں جی؟" جویریہ کی خوشی کا جیسے کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

"پکی بالکل پکی۔" اماں جی نے اس کے چھوٹے ننھے سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو وہ چند منٹ پہلے گھر کا غم بھول کر جلیل جو سامان اٹھا اٹھا کر اوپر لا رہا تھا۔ اس میں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھانے لگی۔

"اونہہ! پکی بات۔ اتنا اچھا بھائی ہوتا تو گاؤں نہ کبھی بھولے سے ملنے آتا۔ چھ ماہ سے اوپر ہو چلے نواب صاحب نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا اور ادھر سیر کروائیں گے۔ دیکھنا تم اب ہم اس گندخانے سے کہیں بھی نہیں جا سکیں گے کبھی بھی نہیں۔ یہیں پر سڑ کر مر جائیں گے۔ میں، تم' اماں جی' سب۔"

زینب گلوگیر آواز میں بولی اور آمنہ کے پاس جا کر سیڑھی پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر خاموش آواز سے رونے لگی۔

"بیٹے۔ زینب پتر! پاگل ہو گئی ہو۔ خدا نہ کرے مریں ہمارے دشمن۔ بیٹا! صبر کرتے ہیں۔ دکھ مصیبت کی گھڑی میں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ وہ ہماری حالت سے ہم سے زیادہ باخبر ہے۔ یوں حوصلہ نہیں ہارتے۔ اس میں بھی ضرور اللہ کی کوئی بہتری ہو گی۔ تم تو سمجھدار بیٹی ہو میری۔ اس طرح رو کر میرے بچے پریشان مت کرو۔" اماں جی اس کے پاس آ کر اس کا سر تھپکتے ہوئے بولیں۔

"بابا صاحب ہمیں کیوں ادھر لائے۔ کتنا گندا' کتنا چھوٹا سا گھر ہے یہ۔ میرا ادھر دم گھٹنے لگا ہے۔ ہمیں بس واپس لے جائیں مجھے نہیں ادھر رہنا۔ جو ہو گا ہم ادھر ہی جھیل لیں گے۔ بس آپ بابا صاحب سے کہیں۔" اس نے ایک منٹ میں اپنی آنکھیں۔ چھوٹے آنسوؤں سے تر کر لیا تھا۔ زینب کے اس طرح بے ساختہ رونے سے آمنہ ... اور نہ زینب تو بہت ڈھیٹ تھی۔ چھوٹی موٹی پریشانی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔

"اچھا بیٹے چلیں گے۔ ابھی آئے ہی تو نہیں جا سکتے۔ کچھ دن صبر کرو۔ میں بات کروں گی تمہارے بابا صاحب سے۔ ادھر ہم تم لوگوں کی بہتری کے لیے ہی تو آئے ہیں اگر تم لوگ خوش نہیں تو ہم واپس چلے جائیں گے۔ چلو اٹھو شاباش۔ بہن کے ساتھ مل کر کام کرو۔ صفائی کرو۔ سامان لگاؤ جگہ ٹھکانے پر پھر دیکھنا یہ گندا گھر بھی اچھا لگنے لگے گا۔ تم تو میری بہت حوصلے والی بیٹی ہو نا۔" اماں جی خلاف معمول اسے بہت اچھے طریقے سے ہینڈل کر رہی تھیں۔

"آمنہ! بہن کو سمجھاؤ۔" انہوں نے بالکل چپ بیٹھی دونوں کا مکالمہ سنتی آمنہ سے کہا۔

آمنہ نے ایک افسوس بھری نظر سے ماں کو دیکھا۔

"اماں جی! میں کون سا زینب سے پانچ سات سال بڑی ہوں۔ کیا میرا دل نہیں رونے کو ادھر سے بھاگ جانے کو چاہ رہا۔" اس نے بولتی نظروں کا رخ بدل کر زینب کو دیکھا۔

"آؤ زینب! صفائی کریں۔ ہم بھلا اپنا سامان کون سے کمرے میں لگائیں گے۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

"اونہہ! بڑا یہ شیش محل ہے نا جو تمہیں علیحدہ سے کوئی شاندار کمرہ ملے گا۔ کہیں بھی گھس جاؤ اس ڈربے میں بڑے چوہوں کے بل ہوں گے۔" وہ کلس کر بولی مگر اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔

"اچھا تم اٹھو تو۔ دیکھتے ہیں۔ تم کس بل میں پوری آ جاؤ گی اور میں کس میں۔ تم اٹھو تو سہی۔" آمنہ نے زبردستی اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے آمنہ کے ساتھ اٹھ گئی۔

اماں جی کچن میں بیٹھ کر چولہا کھول کر جائزہ لینے لگیں۔

"لگتا ہے۔ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ بہت کچھ غلط ہو گیا ہے۔ بچیوں کا یوں رونا اور دل برا کرنا۔" چولہے کی بتیاں اوپر کھینچتے ان کے ہاتھ رک گئے۔ وہ توہم پرست نہیں تھیں اور ایک مولوی کی بیوی تو ہم پرست ہو بھی نہیں سکتی۔ مگر نہ جانے کیوں ان کا دل خود کہہ رہا تھا۔ انہوں نے ادھر آ کر اچھا نہیں کیا۔ ایک ان دیکھے ملال کے غبار

نے ان کے نڈھال وجود کو جیسے چار جانب سے اپنے حصار میں لے لیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے مسٹر سلطان بخت؟" سلطان بخت اتنی تیز آواز پر اپنی نشست سے جیسے اچھل ہی پڑے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ گل کدہ پہنچے تھے۔ ملازم انہیں لاؤنج میں ہی بٹھا گیا تھا۔

"میں بی بی کو اطلاع دیتا ہوں جی۔" وہ نین تارا کو ان کی آمد کا بتانے چلا گیا تو وہ سگار سلگا کر اس کی آمد کے بعد کے حسین تصور میں کھو گئے جب پیچھے سے نین تارا کی چیل جیسی آواز نے انہیں کرنٹ لگا دیا۔ وہ انگلش اخبار کا کوئی صفحہ ان کی آنکھوں کے آگے لہرا رہی تھی۔ وہ ٹھیک سے دیکھ نہ پائے۔

"واٹ نان سینس تارا ڈارلنگ! یہ ویلکم کا کون سا انداز ہے۔" وہ خفت سے کچھ برا مان کر بولے۔

"دس از ناٹ نان سینس مسٹر شاہ جی! نان سینس تو یہ ہے جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے۔ میں آپ کو کیا سمجھتی رہی۔ آپ کو میں نے اپنے خدا کا درجہ دیا۔ آپ کی خاطر میں نے اپنی ماں کی نافرمانی کی اور آپ نے مجھے یہ صلہ دیا ہے۔" وہ اخبار ان کے آگے پٹخ کر آبدیدہ لہجے میں بولی۔

"آخر ہوا کیا ہے۔ ایسا کیا دیکھ لیا تم نے اخبار میں جو یکا یک یوں بپھرنے لگیں۔"

انہوں نے کچھ اکتاہٹ بھرے انداز میں جھک کر نیچے کارپٹ پر گرے اخبار کو اٹھا کر دیکھا۔ صفحے کے مرکزی حصے میں سبطین شاہ اور کچھ قریبی احباب کے ساتھ گروپ فوٹو تھا۔ ان کے ولیمے کے فنکشن کی تصویر اور نیچے لکھی موقع کی تفصیل۔ ایک پل کو تو انہیں کوئی جواب کوئی جھوٹ نہیں سوجھا۔ انہوں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ نین تارا تک یہ خبر اس ذریعے سے پہنچے گی۔ اور گھر سے نکلنے کے بعد تو یہ بات ان کے گمان میں بھی نہ تھی ورنہ وہ ذہن میں کوئی نہ کوئی معقول "کہانی" گھڑ کر نکلتے۔

"تصویر ہے بھئی 'میری بابا جان کے ساتھ۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولے۔ چند لمحے لگے تھے انہیں خود کو سنبھالنے میں اور اب وہ نین تارا کے ہر حملے کے لیے خود کو تیار سمجھ رہے تھے۔

"مگر ایسا کون سا اہم موقع تھا جس کی تصویر اتنے طمطراق سے اخبار میں شائع ہوئی ہے۔" وہ جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں چیخ کر بولی۔

"میرا خیال ہے اتنی انگلش تو تمہیں بھی آتی ہے۔" وہ لاپروا انداز میں کہہ کر سگار کی راکھ جھاڑنے لگے۔ "غصہ ذرا بھی نہیں دکھانا۔ نین تارا کے شعلہ جوالہ موڈ کا جواب صرف اور صرف تحمل ہے۔"

"آتی ہے مگر میری انگلش اتنی اچھی نہیں۔ پڑھ تو لی ہے میں نے مگر مطلب سمجھ میں نہیں آیا اس لیے آپ سے اس نمایاں خبر کا ترجمہ پوچھ رہی ہوں۔" وہ غصے سے ان کے سامنے تن کر آکھڑی ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولی۔

"کم آن ڈارلنگ! میں اتنا اچھا موڈ لے کر آیا تھا اور تم کیا یہ فضول کی بحث لے کر کھڑی ہو گئی ہو۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ کہیں باہر چلتے ہیں۔" وہ ہولے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"شٹ اپ مسٹر سلطان بخت! شٹ اپ۔ اتنا سستا سمجھ لیا ہے آپ نے مجھے۔ جب جی چاہے گا آ کر مجھ سے کھیل لیں گے۔ معاف کیجئے گا میں آپ کی باربی ڈول نہیں ہوں جسے آپ مہنگے داموں خرید کر لائے ہیں اور اب کبھی کبھار یاد آنے پر اس پر بچی کھچی محبت کی ایک نظر ڈالنے آجاتے ہیں۔ میں بیوی ہوں آپ کی 'نکاح کیا ہے آپ نے مجھ سے اور جو کھیل آپ نے مجھ سے کھیلا ہے وہ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا بہت مہنگا۔" وہ خوفناک انداز میں غرا رہی تھی۔

"تارا مائی سویٹ ہارٹ۔ اتنا غصہ۔" انہوں نے اس کی سرخ ہوتی ناک کو چھوا وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی اور ان کے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا۔

"تم غصے میں کیسی قیامت ڈھا رہی ہو۔ یہ کوئی میرے دل سے پوچھے۔" وہ اس پذیرائی پر ذرا بھی بے مزہ نہ

ہوئے بڑے مخمور لہجے میں بولے۔

"قیامت تو آپ نے مجھ پر ڈھائی ہے شاہ جی۔ میرا وجود بازار کا کوئی رلا ہوا کھلونا نہیں تھا۔ آپ سے پہلے تو مجھے ہوا کے سوا کسی نے چھوا تک نہیں تھا۔ مجھ سے پوچھیے کن کن حیلوں بہانوں سے میں نے اپنی ماں کی لاکھوں کروڑوں کی ڈیلنگ کو لات ماری تھی۔ صرف آپ کی محبت 'آپ کی چاہت کے حصول کی خاطر اور آپ نے یہ صلہ دیا مجھ کو۔ اپنی ہی نظروں میں بے مول کر دیا مجھ کو۔" وہ صوفے پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"نین تارا میری جان یوں مت روؤ پلیز۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔ نیو آئی لو یو آئی ریئلی۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لینا چاہا۔ وہ روتے روتے ایک لخت چپ کر گئی اور اچھل کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھی۔

"مت چھوئیں مجھے۔ مجھے آپ سے گھن آرہی ہے۔ جھوٹے 'دغاباز' فریبی ماما ٹھیک کہتی تھیں۔ تم لوگ تو بھنورے ہوتے ہو۔ پیسوں کی جھلک دکھا کر پھول پھول کا رس چوسنے والے۔ اب مجھ سے کیا چاہیے آپ کو قدموں میں تو رول دیا اور کتنا ذلیل کریں گے۔ تیتی بکھیر کر خوش ہوں گے۔ آئی ہیٹ یو۔"

وہ بولتے ہوئے کبھی رونے لگتی۔ کبھی چیخنے لگتی۔ عجیب ہسٹریائی کیفیت ہو رہی تھی اس کی اور سلطان بخت کو اس کے اتنے سخت ردعمل کی توقع نہ تھی۔

"پلیز نین تارا! سمجھنے کی کوشش کرو' میں نے شادی ضرور کی ہے مگر وہ مجھے قطعاً "پسند نہیں۔ میں نے اسے چھوا تک نہیں۔ وہ میری مجبوری تھی۔ صرف بابا جان کی خاطر 'آپا کی خاطر۔" اب وہ گڑگڑانے لگے تھے۔ منتوں پر اتر آئے تھے۔

"شاہ جی! اتنے کم عمر تو نہیں ہیں آپ۔ فلمیں بھی بہت دیکھ رکھی ہوں گی اور گھٹیا ناول اسٹوریز بھی پڑھ رکھی ہوں گی۔ یہ ڈائیلاگ کہیں سے لیا ہوگا۔" وہ زہر خند لہجے میں چبا چبا کر بولی۔

"نین تارا! بی ہیو یور سیلف۔" اتنی انسلٹ پر سلطان بخت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"رویے پر تو آپ اپنے غور کریں مسٹر سلطان بخت! اگر یہ آپ کی مجبوری تھی تو بھی آپ نے مجھ سے اجازت لینا تو درکنار مجھے بتانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ الٹا جھوٹ اور فریب سے مجھے الو بناتے رہے کہ آپ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کا اندازہ غلط ہوگا۔ مجھے سوچ کر گھن آرہی ہے۔ یہ تھی آپ کی مجھ سے محبت......"

"نین تارا! میری بات آرام سے سنو' میں ساری بات تمہیں بتانا چاہتا تھا مگر اس وقت......"

"مت جھوٹ پہ جھوٹ گھڑیں۔"

"تھکی نہیں آپ اس قدر جھوٹ بول کر۔ میرے اعتماد کو' میرے اعتبار کو چکنا چور کیا ہے آپ نے۔ میں آپ کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ چلے جائیں آپ یہاں سے۔" وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتے بول رہی تھی۔

"نین تارا! میری بات تو سنو۔ دیکھو یہ بات نہیں ہے کہ میں نے تمہیں کبھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔" سلطان بخت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس معاملے کو کیسے سنبھالیں۔ نین تارا بری طرح ان سے بدظن ہو چکی تھی۔

"بات مجھ سے کرو مسٹر سید زادے! یہ کیا کھیل کھیلا تم نے میری پھولوں جیسی معصوم بچی کے ساتھ۔ ارے دھوکے باز۔ میں نے تیرا اعتبار کیا اپنی ان چھوٹی بچی تیرے ہاتھوں میں دی۔ یہ قدر جانی تم نے ہائے میں تجربہ کار گھاگ بڑھیا دھوکا کھا گئی تم جیسے فریبی سے۔"

زیور گل کو شاید اب ان کی آمد کی خبر ہوئی تھی۔ چیختی ہوئی اندر آگئی اور سلطان بخت کا جی چاہا۔ دونوں کو شوٹ کر دیں۔ زیور گل کی بکواس سن کر تو ان کا خون کھول اٹھا۔

"زیور گل! یہ میرا اور نین تارا کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم بیچ میں مت بولو۔"

"اور نین تارا میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ جواباً چیخی۔ "تم میرے آگے جواب دہ ہو۔ میری بچی معصوم ہے۔ تم پھر اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے پٹا لوگے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ بولو کیوں دیا تم نے یہ دھوکا۔ وہ بازاری عورت

تھی۔ تماشا لگانا بھی جانتی تھی اور تماشا بنانا بھی۔

اس کی آواز لاؤنج کی دیواروں کو پھلانگتی ہوئی کس کس کی سماعتوں میں جارہی تھی اسے اس کی کچھ خبر نہ تھی وہ بے تکان بولے جارہی تھی۔

"نین تارا میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں اگر بات تمہاری سمجھ میں آگئی تو پھر جو تم کہوگی۔ میں وہی کروں گا۔"

وہ بات کو سمیٹنے کے خیال سے نین تارا کی طرف بڑھے اور اس کا ہاتھ تھام کر باہر جانا چاہا۔ زیور گل چیل کی طرح نین تارا پر جھپٹی۔

"اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے مجھ سے بات کرو' سمجھے۔" وہ تن کر دونوں کے بیچ آکھڑی ہوئی۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا اس بڑھاپے میں۔ ہٹو پیچھے' مجھے اپنی بیوی سے بات کرنے دو۔" سلطان بخت نے اسے دھکا دے کر بیچ میں سے ہٹانا چاہا مگر ان کا دھکا اسے ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلاسکا۔

"بیگم صیب! ملک صیب کا ڈرائیور آیا ہے آپ کو اور بی بی کو لینے۔" اسی وقت ملازم نے اندر آکر اطلاع دی۔ اندر کا منظر اس کے لیے نیا نہیں تھا۔

"آرہے ہیں ہم۔" وہ ملازم سے بلند آواز میں بولی۔ "چلو نین تارا!" اس نے پلٹ کر نین تارا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

"نین تارا! تم نہیں جاسکتیں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔" وہ دروازے کے پاس آکر ڈپٹ کر بولے۔

"بہت آپ کے اس طرح کے فضول حکم مان چکی ہوں میں' جب آپ نے میرا کوئی مان نہیں رکھا تو مجھے بھی آپ کی کوئی پرواہ نہیں۔ چاہے آپ چوراہے پر کھڑے ہو کر حکم چلاتے رہیں مسٹر سلطان بخت۔"

وہ جاتے جاتے ایک پل کو رکی اور ایک بھرپور نظر ان کے پژمردہ چہرے پر ڈالی اور ماں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"یہ تو میری توقع سے زیادہ تیز نکلی ہے۔" تھوڑی دیر بعد وہ خود کو سنبھال چکے تھے اور اب نین تارا کو دوبارہ قابو کرنے کی ترکیب سوچنے لگے۔

رات کا ایک بجا تھا جب زیور گل اور نین تارا کی گاڑی گل کدہ کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ گیٹ کے بالکل پاس سلطان بخت کی بی ایم ڈبلیو کھڑی تھی۔ نین تارا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ "یہ ابھی تک یہیں ہیں۔" وہ ماں کی طرف دیکھ کر بولی' جو گاڑی سے باہر نکل رہی تھی۔ سلطان بخت گاڑی کے اندر موجود تھے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلے اور نین تارا کی طرف بڑھے۔

"چلو میرے ساتھ۔" انہوں نے بے حد مضبوطی سے اس کی نازک کلائی پکڑی اور اس کی مزاحمت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

"مام! مام! ہیلپ می۔ مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا۔" نین تارا چیخ رہی تھی۔

"سلطان بخت! اتارو میری بیٹی کو۔ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو' میں پولیس کو فون کروں گی۔ یہ کوئی مذاق نہیں۔" زیور گل وہیں کھڑے کھڑے چلائی۔

"مام پلیز۔" نین تارا کی پکار پر زیور گل آہستگی سے سلطان بخت کی گاڑی کی طرف بڑھی مگر اتنی دیر تک وہ گاڑی گیٹ تک لے جاچکے تھے۔

اگلے ہی پل کھلے گیٹ سے گاڑی باہر جاچکی تھی۔

"چوکیدار! گیٹ بند کرلو۔" زیور گل نے مطمئن لہجے میں چوکیدار کو حکم دیا اور خود اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی چوکیدار نے کچھ حیرت سے مالکن کو دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر گیٹ بند کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

حجلہ عروسی انتہائی خوبصورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ پہلی نظر ہی میں کمرہ کی آرائش کرنے والے کے ماہر ہاتھوں کو داد دینے کو جی چاہتا تھا۔

گرے گولڈن بے حد قیمتی مگر نازک فرنیچر کے ساتھ کارپٹ بھی ڈارک گرے اور لائٹ کلر کا بچھا تھا۔ کبھی کیپٹن شہباز کے دل نے اس طرح اپنے حجلہ عروسی کو سجانے کی دل میں خواہش کی تھی اور اسی کلر کے فرنیچر کا ذکر یونہی باتوں باتوں میں ام جان سے بھی کیا تھا۔ آج ان کی وہ تمام خواہشیں تو مجسم ہو کر نگاہوں کو سیر کر رہی تھیں مگر ان کا دل بری طرح سے بجھا ہوا تھا۔ کمرے کی مین لائٹ کے ساتھ خوبصورت فانوس عین ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر چھت پر جگمگا رہا تھا۔ خوبصورت سلکی گرے گولڈن پردے کمرے کی خوبصورتی میں حصہ دار تھے۔ کمرے میں گلاب کی تیز اور موتیے کی مدھم بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر چیز مکمل تھی۔ خوشبو' روشنی' آرائش اور وہ بھی جو کبھی ان کے دل کی پہلی آرزو تھی۔ ان کی نگاہوں کے سامنے لی پنک کلر کا خوبصورت عروسی جوڑا زیب تن کیے سر کو تقریباً گھٹنوں میں دیے ان کی توجہ کی منتظر بیٹھی تھی۔ مگر اس کو مخاطب کرنے کی اس کے جگر جگر کرتے حسن کی اور روپہلے روپ کو چھو کر قریب سے دیکھنے کی ذرا بھی تمنا ان کے دل میں نہ تھی۔ بس دل چاہ رہا تھا۔ اس خوبصورت ماحول سے اس ناپسندیدہ وجود کو اٹھا کر کہیں بہت دور پھینک آئیں جہاں وہ زندگی بھر انہیں دوبارہ نظر نہ آئے نفرت کی ایک تازہ لہر ان کے سینے میں ابھری۔

غصہ اور نفرت اس قدر زیادہ تھی جو اس ماحول کی خوبصورتی اور حسن سے بھی کم نہ ہو رہی تھی۔ الٹا ان کا دم گھٹ رہا تھا۔

ہوٹل کا فنکشن بڑا زبردست رہا تھا۔ ان کی آمد نے سب کے منہ بند کردیے تھے۔ پھر دولہا دلہن کا ایک طویل فوٹو سیشن اور مووی کا مرحلہ جس میں انہوں نے ذرا بھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ تمام مرحلے ان کے دل کی خوشی سے نہیں طے کیے جارہے۔ وہ یہاں صرف اپنی ماں کی محبت کے ہاتھوں بندھ کر بیٹھے ہیں اور یہ جو نازک سی خوبصورت لڑکی ان کے پہلو میں بہت قریب' اتنے قریب کہ اس کے جسم کی نرم سی حرارت ان کے وجود کو مسلسل بے چین کیے جارہی ہے۔ جو لوگوں کے تعریفی جملوں اور کمنٹس پر بھی بالکل بے حس بیٹھی ہے۔ ان کے دل کی مراد نہیں۔ ان کے من کی خوشی نہیں۔ انہوں نے اپنے مضبوط دل کی بے قراریوں کو ذرا بھی چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا۔ ان کی ایکٹنگ ایک دم پرفیکٹ تھی۔ ان کے شو میں کہیں بھی جھول نہیں تھا۔

مگر وائے...... وہ تو دنیاداری تھی دنیا کو دھوکا دے دیا مگر اب......

انہوں نے کوٹ کے بٹن کھولے۔

وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اسے اپنی شدید نفرت سے بھی آگاہ کرنا چاہتے تھے۔

پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔

نزہت کا جی چاہا' پینڈولم کی طرح مضطرب انداز میں چکر کاٹتے اس سفاک شخص سے ہاتھ باندھ کر پوچھے۔

"آخر مجھے اور کتنی سزا دوگے۔" ایک باغی آنسو اس کی بوجھل پلکوں کا بند توڑ کر اس کی کلائی کے گجروں میں کہیں گم ہوگیا۔

کیپٹن شہباز نے وارڈ روب کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ ان کے کپڑوں کے ساتھ نزہت کے کپڑے لٹکے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دو سوٹ ہینگر سے نکالے اور بیڈ پر رکھ کر تہہ کرنے شروع کردیے۔ نزہت نے نیچی نظروں سے ان کی اس عجیب مصروفیت کو حیرت سے دیکھا۔ سوٹ تہہ کرکے انہوں نے ڈریسنگ روم سے اپنا بیگ گھسیٹا۔ زپ کھول کر دونوں سوٹ اس میں رکھے زپ بند کی۔

کوٹ اتار کر بیڈ کی پائنتی رکھا۔ کلائی کی گھڑی اتاری۔ بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارے' موزے کھینچ کر فرش پر ڈالے اور کھڑے ہو کر ایک نظر اسی پوزیشن میں بے حس بیٹھی نزہت کو دیکھا اور واش روم کا رخ کیا۔

اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ سے کوٹ موزے جوتے اور گھڑی چڑھا کر بیگ ہاتھ میں تھامے کہیں جانے کو

تیار کھڑے تھے۔

نزہت کے سینے میں دھڑکتا دل جیسے تھم جانے کو تھا۔

"یہ تمہارا رونمائی کا گفٹ جو مجھے شام کو ام جان نے دیا تھا۔ کھول کر دیکھ لینا۔ کیا ہے۔" انہوں نے کھڑے کھڑے کوئی چیز اس کی طرف پھینکی۔ جانے کو قدم بڑھائے پھر کچھ سوچ کر ایک پل کو رکے۔

"رونمائی کا گفٹ اپنی پسند سے میں نے نکاح کے بعد ادھر آنے کے اگلے روز ہی خرید لیا تھا۔ اب سوچ رہا ہوں۔ جاتے ہوئے اسے دریائے جہلم کی نذر کردوں۔ یہ اس کا بہتر مصرف ہوگا۔" وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"میں جارہا ہوں۔ اپنوں کی عزت کا مان رکھنے آیا تھا۔ شاید دوبارہ آؤں یا شاید کبھی نہ آؤں۔ مجھے ابھی کچھ پتا نہیں۔" انہوں نے سر کو جھٹکا دیا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"اور۔ اور۔" نزہت کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ اچھل کر اپنی شرم و حیا کو چولہے میں جھونک کر ان کے سامنے کھڑی تھی سر اٹھا کر۔

"اور... میری عزت' میرا مان کون رکھے گا؟" کب کے رکے آنسو بھل بھل اس کے حسین سجے ہوئے چہرے پر پھسلنے لگے اور کیپٹن شہباز تو جیسے اس کو دیکھ کر پلک جھپکنا ہی بھول گئے۔ وہ نزہت نہیں تھی۔ وہ تو انہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔

"کیا یہ دلہن بن کر اتنی حسین بھی لگ سکتی تھی۔ اس کی ستواں کھڑی ناک سرخ ہوگئی تھی۔ خوبصورت ترشے ہوئے لب کپکپا رہے تھے۔ وہ سراپا حشر' سراپا سوال بنی ان کی سامنے کھڑی تھی۔

بس اسی لمحے کا ڈر تھا انہیں۔ سب۔ سب کچھ اس لمحے میں تہس نہس ہو سکتا تھا۔

انہوں نے بمشکل تمام خود کو دوسرے رخ پر گھمایا اور نظروں کا رخ بدلا مگر دل۔ دل تو بے ایمان ہو چکا تھا نظروں کے سامنے ہتھیار لیے کھڑا تھا۔

"پلٹو اور دیکھو۔ دیکھو۔ ایک بار۔ ایک بار اور صرف ایک بار مڑو۔ دیکھو تو سہی دیکھو نا۔" حکم پر حکم دیے جارہا تھا ان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ بیگ کے اسٹریپس پر انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔

"تم جانتے ہو' تم جانتے ہو دل کی گہرائیوں سے۔ نزہت بے قصور ہے۔ پھر اس بے جا کی انا اور اکڑ سے کیا حاصل۔ کیوں اپنے دل کی خوشی سے منہ موڑ رہے ہو۔ سوچو تو؟؟"

"چپ کرو تم بند کرو اپنی فضول بک بک۔" انہوں نے دل کو زور سے جھڑکا اور دوبارہ سے نزہت کی طرف رخ موڑ لیا۔ وہ ابھی بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

"کون میری عزت رکھے گا۔ آپ کو میرا ذرا بھی خیال نہیں۔"

اس کا دوسرا جملہ ان کو زمین بوس کرنے کے لیے کافی تھا۔ جی چاہا بس سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے حسین چہرے کو اپنے سینے میں چھپالیں۔ اس کے نازک بدن کو اپنی بانہوں کو گھیرے سے کبھی نہ نکلنے دیں۔ کبھی بھی نہ۔

"میں ان کی عزت رکھنے آیا تھا جو میری عزت کا خیال رکھے رہتے ہیں اور عزت کا دھیان بھی ان کا رکھا جاتا ہے۔ جن کی کوئی عزت ہوتی ہے اور یہ بات تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔"

وہ اس کو جھٹک کر دروازے کی طرف بڑھے۔

"جھوٹ ہے سب۔ جھوٹ ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا پھر کوئی کیوں نہیں مانتا۔ میں بے گناہ ہوں' پاک ہوں' پہلے دن کی طرح جب میں پیدا ہوئی تھی۔ آخر کوئی میری بات کیوں نہیں مانتا کیوں نہیں سنتا لیکن شہباز آپ تو مجھے جانتے ہیں۔" وہ بری طرح سے بکھر رہی تھی۔ ان کے کوٹ کی آستین کھینچ کر روئے جارہی تھی۔

"جانتا تھا پہلے' اب۔" انہوں نے۔ اتنی زور سے اپنا ہونٹ کاٹا کہ اس میں سے خون رسنے لگا۔ دل مسلسل ان کی انا کی راہ میں مزاحم ہو رہا تھا۔ فرار کے سارے رستے جیسے بند ہوتے جارہے تھے۔ شاید وہ

تھک کر بیگ پرے پھینک ہی دیتے اور پلٹ کر اس در نایاب کو اپنے ساتھ لپٹا ہی لیتے مگر پھر انا کا کوڑیالہ سانپ پھن اٹھا کر ان کے سامنے اپنی سیاہ زہریلی زبان نکال کر کھڑا ہوگیا۔

"یہ وہی لڑکی ہے جو دو راتیں گھر سے باہر گزار کر آئی ہے۔ اس کے گھر والوں نے بھی اسے قبول نہیں کیا' تم اس قدر بے غیرت ہو کہ اس گند کو سینے سے لگاؤ گے۔ کیپٹن شہباز! تم تو بہت دعوے کرتے تھے اپنی ہم سفر کی پاکیزگی کے۔ یہ۔ تمہاری پاک باز ہم سفر... دو راتیں نہ جانے کس کس کے بستر کی زینت بن کر تم تک پہنچی ہے' تف ہے کیپٹن تم پر۔"

انہوں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

"یوں واویلا کروگی تو خود ہی تماشا بنوگی۔ جتنی عزت مل گئی ہے' اسی پر قناعت کرو تو زیادہ بہتر ہے اور یہ بھی تمہاری اوقات' تمہارے کردار سے بہت بڑھ کر ہے۔ اگر سمجھو تو۔" وہ جو پیچھے سے ان کا دامن پکڑ کر روک لینا چاہتی تھی۔ انہیں پاؤں پڑ کر روک لینا چاہتی تھی۔ زور سے بند ہوتے دروازے سے جا ٹکرائی۔ کیپٹن شہباز جا چکے تھے۔

"ابھی تو شروعات ہیں اس کانٹوں بھرے سفر کی' یوں روؤگی تو بکھر جاؤگی۔ ہاں جو عزت مل گئی ہے۔ اسی کو غنیمت جانو۔ کبھی میری عزت کا مان رکھنے میں یہ شخص سب سے آگے ہو' وہ وقت کبھی تو آئے گا۔

ہم سفری تو اب تا عمر کی ہے صرف یہی رات تو نہیں۔ یہ رات رائیگاں گئی تو کیا! ابھی تو بہت عمر باقی ہے۔ ایک رات کے بعد ایک اور رات پھر ایک اور پھر ایک اور...." آنسو بہے جارہے تھے۔ اسے خود کو تسلی دینا بھی نہیں آرہا تھا۔

"اللہ سے مانگو۔ وہ ضرور دے گا۔ وہ ضرور دیتا ہے۔" اندھیرے میں جیسے کوئی کرن چمکی۔

"جو سچے دل سے اس سے مانگتا ہے وہ ضرور دیتا ہے اور تم جو یہ آنسو بے کار میں بندوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بہائے جاتی ہو' کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ان ہی آنسوؤں کو اس خالق کے آگے پیش کرو وہ ان کو موتی سمجھ کر چن لے گا۔

"اس گھر میں جگہ دینا میرا کام ہے۔ جگہ بنانا تمہارا۔" بہت سی آوازیں' سوچیں اس کے اندر آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔

"یہ دنیا تو محض چند دنوں کی ہے۔ اس کے لیے ابدی خوشیوں کا کیا مانگنا اور بندوں کی کیا خبر' لاکھ دامن پھیلاؤ ایک بھی سکہ محبت کا اس پھیلے دامن میں ڈالیں نہ ڈالیں۔ بندے تو من کے موجی ہوتے ہیں۔ اپنے من کی سنتے ہیں۔ دوسروں کی فریاد کب ان کو بھائی کرتی ہے۔

"یہ تو اللہ ہے' جو ایک سچے موتی کے بدلے خزانوں کے خزانے بخش دیتا ہے۔ بغیر جتلائے۔ اسی نے تو پہلے بھی مجھے اپنی رحمت کی چادر میں چھپا کر میری عزت کو داغ دار ہونے سے بچایا۔ وہ مجھ پر اس درجہ مہرباں ہے۔ معاذ ٹھیک کہتا ہے اور میں اس کی مہربانیوں سے بے خبر بندوں کی آگے گڑگڑائے جارہی ہوں' ایک لاحاصل عمل۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنے سجے روپ کا ایک ایک گہنا آنکھ سے ٹپکتے ایک ایک موتی کے ساتھ اتارا۔

جس کے لیے یہ سب کچھ سنوارا تھا۔ سجایا تھا۔ وہی نہیں تو یہ قیمتی گہنے مٹی کا ڈھیر ہیں۔ مٹی کا ڈھیر۔" اس نے سارے زیور بے دلی سے اٹھا کر دراز میں ڈال دیے اور کپڑے بدلنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

پندرہ منٹ بعد وہ کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں دھلے چہرے کے ساتھ پورے خضوع و خشوع سے اپنے رب کے آگے جھکی لگن اور توجہ کے سچے موتی بکھیر رہی تھی۔

جب کیپٹن شہباز کا واپسی کا سفر شروع ہوا تو ان کے دل نے پیچھے کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ اس گوہر نایاب کی طرف جسے وہ ٹھوکر مار آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

''ہر شخص کو تجربہ کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ مشاہدے سے' دوسروں کے تجربے سے کوئی بھی نہیں سیکھتا۔ کوئی نہیں مانتا۔ میں نے ماما کی بات کو ان کی تھیوری کو نہیں مانا۔ ان کی پریکٹیکل لائف کے تجربے کو نہیں مانا' ان کی اسٹوری کو صرف اسٹوری سمجھا اور آج میرے پریکٹیکل کا نتیجہ بھی ان کی کہانی سے مختلف نہیں نکلا۔

سلطان بخت نے وہی کیا جو ان کے خاندانی لاء آف کسٹمز نے کہا اور وہ آئندہ بھی وہی کریں گے جو ان کی خاندانی روایت حکم کرے گی۔ وہ کبھی بھی میری خاطر' ایک گائیکہ کی بیٹی کی خاطر اپنے خاندانی وقار سے نہیں ٹکرائیں گے۔ میری حیثیت ان کی بیوی ہونے کے باوجود ہمیشہ ثانوی' سیکنڈری رہے گی۔ بنیاد تو خاندان ہوتا ہے نا اور میری تو اپنی کوئی بنیاد نہیں۔ میں کسی کی کیا بنیاد بنوں گی۔''

وہ فاؤنڈیشن اٹھا کر آہستہ آہستہ چہرے پر ملنے لگی۔ رات گزر گئی اس کے نشان باقی تھے اور اب کوئی اس سے کہہ رہا تھا کہ اسے ان نشانوں کا ماتم بہت دیر تک نہیں منانا بلکہ ان کو دیکھ کر اذیت کا مداوا ڈھونڈنا ہے۔

وہ رات سلطان بخت کے سو جانے کے بعد ایک پل نہیں سوئی تھی۔ پہلے تو بہت دیر تک بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔ اتنا روئی کہ اسے لگا اس کا تکیہ بھیگ گیا ہے پھر اس نے محسوس کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ختم ہو گئے ہیں۔ اب اور نہیں رویا جائے گا اور یوں بھی زیور گل کہتی تھی۔

''نین تارا! تم کبھی نہ رونا میں تمہارے حصے کے سارے آنسو بہا چکی ہوں ان ہی آنسوؤں کو چراغ بنا کر اپنی راہوں کے اندھیرے دور کرنا۔''

''سب کچھ گنوانے کے بعد مام کو اپنے تہی دامن ہونے کا احساس ہوا تھا۔ عزت' جوانی' حسن جب سب کچھ لٹ گیا تو خبر ہوئی۔ وہ تو خالی ہاتھ ہیں مگر میں وقت کو اپنے ساتھ یہ داؤ نہیں کھیلنے دوں گی۔

آج سے خواب کا دور ختم۔ آگہی کا شروع۔ نین تارا! وقت کی پکار سنو جاگو اور اپنی رفتار پر غور کرو۔ تمہیں اب پیچھے مڑ کر ٹوٹے ہوئے وعدوں سے کچھ نہیں تلاشنا۔ آگے نئی منزل کی راہوں پر قدم بڑھانے ہیں۔''

اس نے بہت نرمی سے اپنے گالوں کو تھپتھپایا۔

''بریک فاسٹ کے بعد آج کا کیا پروگرام ہے؟'' سلطان بخت تیار ہو کر ڈریسنگ روم سے نکلے تو جیسے خوشبو کا جھونکا کمرے میں آ گیا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر از سر نو یونہی اپنے جمے جمائے بالوں کو پھر سے سیٹ کرنے لگے۔

''میں تو ریڈی ہوں۔ جو آپ کہیں۔'' وہ پف کے ذریعے فاؤنڈیشن درست کرتے ہوئے فریش لہجے میں بولی۔

''آج تمہیں شاپنگ کراتے ہیں۔ ڈھیر ساری۔ سارا دن باہر ہی گزاریں گے۔ موسم بھی کافی خوشگوار ہے۔ لنچ اور ڈنر تمہاری پسند کی جگہ پر ہوگا۔ کیا خیال ہے۔'' سلطان بخت ہر طرح سے اپنی غلطی کا مداوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' مسکراتے ہوئے وہ مصروف لہجے میں بولی۔

پھر واقعی ان کا سارا دن بے حد مصروف گزرا۔ سلطان بخت نے اسے دل کھول کر شاپنگ کرائی تھی۔ لنچ دونوں نے ''کبانہ'' میں کیا تھا اور ڈنر ''بی سی'' میں اور اس سارے کے دوران نین تارا نے ایک بار بھی سلطان بخت کو محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ایک رات میں کتنا بدل گئی ہے۔ اس کا ذہن کس رفتار سے مستقبل کی پلاننگ کر رہا ہے۔

''آپ نے واپس کب جانا ہے۔ احمد پور؟'' ڈنر کے دوران سلاد ٹونگتے ہوئے نین تارا نے بڑے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''کل صبح۔ کیوں؟'' انہوں نے ابرو اچکا کر پوچھا اور چور آنکھوں سے نین تارا کے تاثرات کا بھی جائزہ لیا۔

''یونہی' کل صبح آپ مجھے جاتے ہوئے گل کدہ ڈراپ کر دیں کیونکہ گاڑی تو میری گھر ہی کھڑی ہے۔''

''تو تم سید ہاؤس میں رہ لینا۔ وہ بھی تو تمہارا گھر ہے بلکہ تمہارا اپنا۔ میں دو چار دنوں میں چکر لگا لوں گا۔''

''میرا اپنا ہے صرف کاغذوں میں۔ اور ویسے بھی میں ادھر اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں۔'' اس نے اپنی طنزیہ ٹون کو فوراً ''نارمل'' کر لیا تھا۔

''فکر کیوں کرتی ہو' مجھ سمیت ہر چیز تمہاری ہے۔ بس وقت آنے دو۔'' وہ حسب عادت اسے تسلی دینا نہ بھولے۔ جس سے وہ اب لاپرواہ ہو چکی تھی۔ ''اور پہلے بھی تو تم اکیلی رہ لیا کرتی تھیں۔ اس فلیٹ میں جو میں نے شادی سے پہلے تمہیں گفٹ کیا تھا۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے آپ کی غیر تقسیم شدہ محبت اور میری بے انتہا چاہت مجھے کبھی بھی تنہا نہیں ہونے دیتی تھی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کڑوے پن سے بولی۔

''اب بھی کچھ نہیں بدلا ڈیر! نہ میری محبت میں کمی آئی ہے نہ تمہاری چاہت میں کھوٹ۔'' انہوں نے فرائیڈ فش کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔ ''ارے ہاں اس فلیٹ کا کیا بنا' دوبارہ ادھر نہیں گئیں کبھی۔ اسی طرح لاکڈ پڑا ہے۔'' انہیں یاد آیا۔

''وہ تو میں نے کینسل کر دیا تھا۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''کب؟'' وہ حیران رہ گئے۔ ''اور مجھے بتایا تک نہیں۔''

''کیونکہ آپ بھی بہت سے کام مجھے انفارم کیے بغیر اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ وہ تو پھر میری چیز تھی۔ اس پر اعتراض کرنے کا کم از کم آپ کو کوئی حق نہیں۔'' وہ ذرا سا بھی چوکے بغیر بڑے آرام سے بولی۔

''کم آن نین تارا! اب بھول بھی جاؤ اس نامراد قصے کو۔'' وہ تلخی سے کانٹا پلیٹ میں پٹخ کر بولے۔

''نہیں شاہ جی! یہ قصہ نہیں ہے۔ یہ تو میری نامراد محبت کا کینسر ہے جو کھا گیا ہے اسے۔ اور آپ کو پتا ہے اس کینسر نے میری تمام تر محبت کو زہر آلود کر دیا ہے۔ اب تو میرے اندر زہر ہی زہر ہے۔'' وہ چبا چبا کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''نین! تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔'' وہ دنگ رہ گئے تھے اس کی شدت پسندی دیکھ کر۔

''اچھے ڈائیلاگ ہیں نا شاہ جی؟'' وہ ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''سام کے لوگ ہیں نا منصور علوی' وہ کہتے ہیں میری ڈائیلاگ ڈیلیوری بہت اچھی ہے۔'' وہ فوراً ''بات کا رخ ہی بدل گئی۔

''انہوں نے تم سے کون سے ڈائیلاگ بلوائے تھے اور تم ان خرافات میں کیوں پڑتی ہو۔ یہ تمہاری ماں کا پروفیشن ہے اسی تک محدود رہنے دو۔'' وہ کچھ غصے سے بولے۔

''شاہ جی! ماں تو میری ہے نا۔ اس فیکٹ کو تو آپ نہیں جھٹلا سکتے۔ پھر گھر میں اسی پروفیشن سے متعلقہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ تو حویلی چلے جاتے ہیں تو میں اپنی تنہائی سے گھبرا کر ان کی کمپنی لینے آ جاتی ہوں تو ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں ویسے بھی یہ لوگ اچھوت نہیں ہوتے۔ میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔ آپ بھول جاتے ہیں۔'' وہ لاپروائی سے چائنیز رائس کا چمچ منہ میں بھر کر بولی۔

''مگر اب تمہارا تعلق مجھ سے ہے۔ تم بھی یہ بات بھول جاتی ہو۔'' وہ اسے جتا کر بولے۔

''کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا میرا بھی وہی حال ہوا ہے آپ لوگوں جیسی بننا چاہا تو آپ نے پٹخ کر مارا اور میری اوقات یاد دلا دی کہ میں کون ہوں۔ سام کی کمپنی میں رہنا چاہتی ہوں تو آپ کو گوارا نہیں۔'' وہ پھر خواہ مخواہ ہنس کر بولی۔ ''ویسے آپ میرے بارے میں اس قدر پوزیسو کب سے ہو گئے ہیں اپنی پہلی شادی کے بعد یا دوسری کے بعد؟'' وہ آج شاہ جی سے خوب دل لگی کر رہی تھی۔ تاک تاک کر نشانے لگا رہی تھی۔

''نین تارا پلیز۔ مجھے ڈنر کرنے دو اور یہ منحوس ٹاپک تو اب لگتا ہے' ساری زندگی ہی چلے گا۔'' وہ کڑھ کر بولے تو نین تارا ان کی شکل دیکھ کر پھر سے ہنس پڑی۔

اور اگلی صبح جب سلطان بخت نے اسے گل کدہ کے آگے ڈراپ کیا تو اس نے بڑی گرمجوشی سے انہیں خدا حافظ کہا۔

اور گل کدہ میں جو نین تارا داخل ہوئی' وہ پرسوں رات زبردستی سلطان بخت کی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھ کر جانے والی نین تارا سے بالکل مختلف تھی۔ آج وہ صرف اور صرف زیور گل کی بیٹی اس کے فیوچر کا گولڈن چانس بن کر داخل ہوئی تھی۔

دو دن اس نے زیور گل کی اس ہدایت پر کہ اپنے جذبات پر بند باندھنا ہے کے تحت گزار دیے تھے۔ "نین تارا جذبات میں آکر بچی سجائی بساط نہ الٹ دینا۔ بے مول عزت داؤ پر لگائی تھی۔ اب اس کا کچھ مول تو اس سید زادے سے وصول کرنا۔"

☆ ☆ ☆

شام تک سارا گھر دھل بھی گیا تھا اور تمام سامان بھی سیٹ ہو گیا تھا یوں بھی سامان تھا ہی کتنا [illegible] میں سے بھی آدھا سلطان بخت کی دھمکی کے بعد وہیں چھوڑ آئے تھے۔ تھوڑے سے سامان سے بھی ڈربہ نما گھر خوب بھرا بھرا سا لگ رہا تھا۔

"اچھا ہی ہوا جو وہاں آدھے سے زیادہ سامان وہاں چھوڑ آئے ورنہ سامان نے اس ڈربے میں ہونا تھا اور ہم نے باہر گلی میں۔" زینب صفائی کے بعد بولی تھی۔

زینب نہا کر اب اماں بی کے پاس بیٹھی روٹیاں پکتے دیکھنے لگی۔ آج وہ خلاف توقع ان کا سر بھی نہیں کھا رہی تھی اور فضول بول بھی نہیں رہی تھی۔ بس گھٹنوں پر سر رکھے ان کی کسی بات پر ہوں ہاں کر رہی تھی۔ آمنہ نہا کر نکلی تو اسے بھی زینب کی خاموشی پر تعجب ہوا۔

"گھر جو کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ اسی لیے اداس ہے اور چپ بھی۔" اس نے سوچا اور کنگھی اٹھا کر بال سنوارنے لگی۔ جویریہ پہلے ہی اماں بی کے گھٹنے سے جڑی بیٹھی تھی۔ زینب کی طرح بالکل چپ اور گم صم۔ آمنہ کو رونا آنے لگا۔

"یہ سب میری ہی وجہ سے تو ہوا ہے۔ جویریہ دونوں چپ ہیں اماں جی سوچوں میں گم ہیں اور بابا صاحب چپ چپ ہیں۔ اللہ میاں جی ہماری آزمائش جلدی ختم کر دینا۔" وہ دھیرے دھیرے کنگھی لیے بالوں میں چلاتے ہوئے سوچنے لگی۔

شام کو گلی کی کچھ عورتیں ان سے ملنے آئی تھیں۔ اپنی بچیوں کو قرآن پڑھانے کے لیے اماں بی سے بات کرنے۔

"پیچھے مسجد میں مدرسہ بھی تو ہے۔ صوفی صاحب تو فجر کی نماز کے بعد بچوں بچیوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتے ہیں۔" ان کی بات پر اماں جی نے کہا۔

"وہ جی اصل میں بچیاں بڑی ہیں۔ تقریباً" آپ کی بیٹیوں جتنی یا اس سے تھوڑی بڑی۔" ایک عورت ذرا جھجک کر بولی۔ "تو انہیں ہم مسجد یا مدرسے میں تو نہیں بھیج سکتے نا۔"

"اتنی بڑی بچیوں کو آپ نے ابھی تک قرآن نہیں پڑھایا؟" اماں جی سے رہا نہ گیا تو کہہ ہی بیٹھیں۔

"بس جی چھوٹی تھیں تو مسجد میں کوئی مولوی صاحب ہی ڈھنگ کے نہ آئے تھے۔ محلے میں ایک آپا جی تھیں انہوں نے بہت سی لڑکیوں کو قرآن پڑھایا تھا۔ ان کی وفات کے بعد تو کوئی بھی نہیں۔ آپ لوگوں کا سنا تو اسی لیے چلے آئے۔" ایک عورت جو ان میں ذرا سمجھ دار بھی تھی' بولی۔ باقی تینوں تو مسلسل اندر کمروں کا' آمنہ اور زینب کا جائزہ لینے میں لگی ہوئی تھیں۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ یہ تو کار ثواب ہے۔ آپ جب جی چاہے بچیوں کو بھیج دیجیے گا۔ میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" گھر کا کام ابھی بکھرا پڑا تھا۔ اماں جی نے انہیں فارغ کرنا چاہا۔

"ارے نہیں جی شکریہ۔ آج تو آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔ آج تو آپ کھانا بھی گھر نہ پکائیے گا۔ ہم جا کر بھیجتے ہیں۔" وہ عورت اماں جی کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں شکریہ۔ کھانا تو میں بنا رہی ہوں۔ ہم اگر آپ لوگوں کے کام آسکیں تو مجھے خوشی ہو گی۔" اماں جی انہیں سیڑھیوں تک چھوڑنے گئیں۔ وہ ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترنے لگیں۔

"عجیب سی تھیں' کیسے دیدے گھما گھما کر سارے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے پہلے یہ ڈربہ دیکھا نہیں اور ہمیں یوں دیکھ رہی تھیں جیسے ہمارے سروں پر سینگ ہوں۔ ان کے جاتے ہی زینب جھاڑو چھوڑ کر بولی۔ اسے تو آج ویسے ہی غصہ آئے جا رہا تھا۔

"یوں نہیں کہتے۔" اماں جی نے اسے ٹوکا۔

"ایسے نہیں کہتے' ویسے نہیں کہتے' ہر وقت نصیحت۔ اس گھر میں اور کچھ ہے بھی نہیں۔"

اور زینب کی یہ جھنجلاہٹ کئی روز تک اس پر طاری رہی۔ اس کی جھنجلاہٹ اس دن خوشی میں بدل گئی جب اچانک عبدالمتین گھر آگیا۔ سارے گھر میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پورے آٹھ ماہ بعد گھر آیا تھا۔ اماں جی تو اسے دیکھتے ہی نہال ہو گئیں۔

"میرا پتر۔ کتنا جی کر رہا تھا تجھے دیکھنے کو اور اب ادھر آئے کتنے دن ہو چلے۔ کتنی ہی بار کہا صوفی صاحب سے۔ عبدالمتین کو تو بلائیں۔" اماں جی اسے گلے سے لگا کر بولیں۔

"ان ہی کے بلاوے پر تو آیا ہوں ورنہ مجھے ٹائم کہاں تھا؟" وہ آہستگی سے ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میرے بچے [illegible] کون سی جہاں داری کے کام آن پڑے ہیں جو تو حد درجہ مصروف رہنے لگا ہے۔ سب طالب علم بھی پڑھتے ہیں وہ بھی ماں باپ بھائی بہنوں کو وقت دیتے ہیں یا تو ان سے بھی زیادہ مصروف ہو گیا ہے۔" اماں جی ہولے سے اس کے سر پر چپت لگا کر بولیں۔

"اماں جی! پڑھنا آسان کہاں ہے اور پھر مجھے صرف پڑھنا تو نہیں اپنے لیے بہت بڑا مقام بھی حاصل کرنا ہے۔ آپ لوگوں کے ہی سر فخر سے بلند ہوں گے۔" وہ ان کی بات پر کچھ کھسیا کر بولا۔

"اماں جی! بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت پڑھنے اور نام کمانے کے لیے بہت مصروف نظر آنا بھی ضروری ہے۔ کوئی بھی پوچھے کہ دو وقت نہیں ہے۔" زینب عبدالمتین کا بازو پکڑ کر شرارت سے بولی۔

"تو بہت تیز ہو گئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔" عبدالمتین نے اس کے بال آہستہ سے کھینچے۔

"ہائے بھائی! شکر ہے آپ آئے اب تو میرے دل کی مراد پوری ہو گی ورنہ تو میرا دل چاہ رہا تھا' ادھر سے بھاگ ہی جاؤں۔" اس کا نرم رویہ پا کر زینب خوش ہو کر بولی۔

"اب کیا ہے ادھر؟" وہ سرسری لہجے میں بولا۔

"ماں جی! اتنے دنوں سے تو بھائی کا انتظار میں کر رہی تھی۔ اب مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔ مجھے بات کرنے دیں۔" عبدالمتین پلنگ پر بیٹھ کر جوتے اتار رہا تھا۔ کچھ نہیں بولا۔

"چھوٹی آپی! اسیر کی بات کرنی ہے نا؟" جویریہ فوراً" زینب کا بازو ہلا کر بولی۔

"بس تم ہر جگہ موجود۔" زینب اسے جھڑک کر بولی۔ "اماں جی اسے اسکول میں داخل کیوں نہیں کراتیں آپ؟" وہ آج کل جویریہ سے بہت چڑی ہوئی تھی۔

"کہا تو ہے تمہارے بابا صاحب سے۔ آج کل میں ہو جائے گی۔" صوفی صاحب ابھی واپسی کے خیال سے جویریہ کو ادھر داخل کرانے سے گریزاں تھے۔

"بھائی! کھانا کہ چائے؟" آمنہ نے چوکھٹ پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

"ابھی صرف چائے۔ کھانا بعد میں۔" وہ آرام سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور سر گھما کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ "توبہ کتنا چھوٹا گھر ہے اماں جی ہمارے گاؤں والے گھر کا تو بڑا کمرہ ہی اس پورے گھر جتنا بنتا ہے۔"

"تو ادھر آنے کی ضرورت کیا تھی۔ بابا صاحب کا جذباتی پن ابھی تک کم نہیں ہوا ہر کام میں عجلت پسندی اور دھونس۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"زینب! تم جاؤ ادھر سے اور آمنہ کا ہاتھ بٹاؤ کھانا پکانے میں۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ صوفی صاحب آنے والے ہوں گے۔" اماں جی نے سنجیدگی سے کہا۔

"بس ہر وقت خوف ہی سر پر سوار رکھتی ہیں۔ کوئی بات تو کرنے دیں۔" زینب بدتمیزی سے بولی۔

"زینب!" وہ غصے سے گرج کر بولیں۔ "عبدالمتین ابھی ادھر ہی ہے۔ کر لینا اپنی احمقانہ باتیں بعد میں۔"

"سیر کروائی ہے بھائی آپ نے ہمیں سارے لاہور کی۔ سن لیا اور اس معاملے میں میں بابا صاحب والی دھمکی سے بھی نہیں ڈروں گی، ہاں۔" وہ پیر پٹخ کر وہاں سے چلی گئی۔

"دیکھا اس لڑکی کا دماغ دن بدن کتنا خراب ہوتا جا رہا ہے۔" اماں جی غصے سے بولیں۔

"تو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ بابا صاحب بھی ہر بات میں اتنی زیادہ سختی اور روک ٹوک کرتے ہیں۔ باغی تو ہونا ہی ہے۔" وہ آرام سے بولا۔

"وہ یونہی نہیں کرتے سختی۔ زمانے کا حال دیکھا ہے۔ اپنی آمنہ ہمارے لیے تو ابھی بچی ہی ہے اور وہ چھوٹے شاہ جی اس سے تین گنا عمر میں بڑے ہمارے لیے کتنے محترم ہیں۔ اس خاندان کا ہر فرد اور کتنی خدمت کی ہے تمہارے باپ نے اس حویلی کی۔ انہوں نے یہ لاج رکھی ان کی وفاداری کی۔ بچی پر غلط نگاہ ڈالی۔" اماں جی اپنی ناقدری کا سوچ کر رونے کو تھیں۔

"اماں جی! آپ کو نہیں پتا زمانہ کہاں جا رہا ہے۔ آپ لوگ ابھی تک زمانے سے سو سال پیچھے جی رہے ہیں۔ نئے زمانے کی کوئی بات کان میں پڑے گی تو آپ کے لیے تو وہ انوکھی بات ہی ہوگی۔ بابا صاحب نے سب کو کنوئیں کا مینڈک بنا رکھا ہے۔ باہر نکل کر دیکھیں دنیا کہاں جا رہی ہے ہم ابھی تک اپنی فرسودہ سوچوں کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ چادر، چار دیواری، برقعہ، پردہ مذہب کو جان سے بڑھ کر سر پر سوار کر رکھا ہے۔ کسی کے سیدھے فعل کو بھی بدنیتی جاننا۔" وہ اپنی بے پرکی ہانکے جا رہا تھا۔

"صوفی صاحب سچ کہتے تھے۔ عبدالمتین بہت بدل گیا ہے۔" اس کی بات پر اماں جی نے دکھ سے سوچا۔

"پتر زمانہ کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے۔ آبرو عزت اور نیک نامی تو نہیں بدل سکتی نا۔ ان کا سودا تو کسی بھی زمانے میں اچھا نہیں سمجھا گیا۔" وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

اماں جی! کیا ہے یہ عزت آپ کے نزدیک؟" وہ تنک کر بولا۔

"تجھے نہیں معلوم عزت کیا ہے؟" اماں جی حیرت سے بولیں۔

"اماں جی! آپ ابھی تک وہیں کھڑی ہیں جہاں سے پیدا ہونے کے بعد چلی تھیں اگر آپ زمانے کے ساتھ چلتیں تو آپ کو معلوم ہوتا۔ آج زمانے میں عزت صرف پیسے کی ہے اور آبرو پیسے والے کے گھر کی لونڈی ہے، ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔"

"چل یہی سہی۔ ہم پیسے والے ہوتے تو کسی کی جرات بھی نہ ہوتی ہماری عزت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی لیکن سارا زمانہ تو پیسے والا نہیں تو لوگ یوں اپنی عزت اتار کر چوراہے پر تو نہیں لٹکا دیتے۔ اگر ان کے پاس پیسہ نہیں ہوتا۔ ہم بھی یوں در بدر نہ ہوتے۔ اپنی عزت بچانے کو ہی آئے ہیں۔" اماں جی دکھ سے بولیں۔

"یہی تو غلط کیا آپ نے۔" وہ زور دے کر بولا۔

"کیا غلط کیا ہم نے؟" وہ حیرت سے بولیں۔

"یہاں آ کر اپنا گھر بار چھوڑ کر۔ وہیں رہتے کوئی آپ کو منہ میں تو نہ ڈال لیتا۔"

"منہ میں کوئی ڈال سکتا بھی نہیں۔ اس نے صرف اپنی گندی نیت کی ہوس پوری کرنے کے لیے ہماری بچی پر نگاہ ڈالی تھی اور صرف نگاہ ہی نہیں وہ تو پوری طرح سے ذلالت پر آمادہ تھا پھر ہم وہاں کیسے رہ سکتے تھے۔"

"کیا کر لیتا وہ زیادہ سے زیادہ؟"

"پتر تو اُن باتوں کو نہیں سمجھتا۔ وہ صرف وقتی طور پر اپنا دل بہلانے کے لیے۔" آگے ان کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ "اور ہماری بچی کوئی راہ میں پڑی چیز تو نہیں۔ ابھی اس کے ماں باپ زندہ ہیں۔ ہم یہ برداشت کر سکتے تھے۔" اماں جی غصے سے بولیں۔

"فضول کی ہٹ دھرمی۔۔۔ اماں جی کیا تھا اس میں۔ وہ نکاح ہی تو کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اٹھا کر تو نہ لے جاتا آمنہ کو۔ نکاح کر لیتا۔ حویلی لے جاتا۔ اس سے بڑی عزت کی بات اور کیا ہوگی۔ آمنہ حویلی کی مالکن کے برابر آجاتی۔ حق مہر میں خوب لمبی چوڑی رقم لکھوا لیتے زمین، جاگیر۔ کوئی کوٹھی آمنہ کے نام لکھوا لیتے۔ آپ کے بھی وارے نیارے ہو جاتے آمنہ کے طفیل ہم بھی اچھے دن دیکھ لیتے۔ کھلا پیسہ آجاتا۔ سب کا مستقبل بن جاتا پھر بھلے وہ بعد میں آمنہ کو چھوڑ دیتا۔"

اگر اس گھر کی چھت بھی اماں جی پر آگرتی تو انہیں حیرت نہ ہوتی نہ اتنا دکھ اتنا رنج ہوتا۔ انہیں لگا اب وہ زندگی بھر پلک نہیں جھپک سکیں گی۔ عبدالمتین کی باتیں تھیں یا پاتال کی گہرائیوں سے آتی کسی گندے جوہڑ کی سرانڈ۔ ان کا سانس بند ہونے لگا۔

"خبیث! شیطان! مردود! بدبخت! حرامزادے۔ تو نے اپنی بہن، اپنی معصوم پاک بہن کو بکاؤ مال سمجھ لیا ہے بدمعاش۔ الو کے پٹھے، بے غیرت میں تجھے خون کر دوں گا ملعون۔"

صوفی صاحب کی آواز تھی یا کسی شیر کی گرج اور عبدالمتین پر ہونے والا حملہ اس قدر اچانک تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کے بارے میں بھی نہ سوچ سکا۔ وہ کسی بھوکے شیر کی طرح اس پر پل پڑے تھے۔

"اس دن کے لیے میں نے تجھے جوان کیا تھا کہ تو بہنوں کی عزت کی بولی لگوائے گا۔ نمرود کے جانشین پیسے کے پجاری۔ تیری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی۔ کسی بے غیرت کا خون لگتا ہے تیری رگوں میں۔ میرا اتنا گندا آلودہ خون نہیں ہو سکتا۔ تو یہ الفاظ بولنے سے پہلے زمین کے اندر کیوں نہ دفن ہو گیا۔ آستین کے سانپ! ہم تیری موت پر صبر کر لیتے۔"

"نکل جا ادھر سے، چلا جا۔ دفع ہو جا۔ میں سمجھوں گا تو شہر میں یا کسی حادثے میں مر گیا۔ اسپتال والوں نے تیری لاش لاوارث سمجھ کر دفنا دی۔ تو مر گیا ہمارے لیے عبدالمتین! تو مر گیا۔ نکل ادھر سے۔"

جوش و جنون میں ان کا بدن کانپ رہا تھا۔

انہوں نے اسے کالر سے پکڑ کر گھسیٹا اور صحن کی طرف زوردار دھکا دیا۔

"ہاں چلا جاتا ہوں۔ جا رہا ہوں مجھے بھی اس جیل خانے میں آنے کا کچھ شوق نہیں جہاں آپ ہمیں انسان نہیں جانور سمجھتے ہیں کیونکہ آپ خود وحشی ہیں۔ غیر تہذیب یافتہ۔" وہ آستین سے اپنے ہونٹ سے بہتے خون کو زور سے رگڑ کر بولا۔

"نکل ادھر سے گندی تہذیب کے نمائندے اور میں کبھی مرتے دم تک تیری صورت نہ دیکھوں، حرام خور عزت کے دلال تو آج سے میرے لیے مر گیا۔ نکل دفعان ہو ادھر سے۔ دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا، تیرا منہ کالا کروا دوں گا۔"

انہوں نے اسے سیڑھیوں کی طرف زوردار دھکا دیا اور وہ زخمی چیتے کی طرح قلانچیں بھرتا ننگے پاؤں ایک لمحے ہی میں ساری سیڑھیاں پھلانگ گیا۔

اور سیڑھیوں کے آخر میں جلیل جو کھانے کا ڈھکا ہوا خوان لیے آ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر حیرت سے سیڑھیاں چڑھنا بھول گیا۔

آمنہ جو چائے کی پیالیاں ٹرے میں سجا رہی تھی۔ اس اچانک ہنگامے پر اپنے سینے پر ہاتھ رکھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی جب غصے، جوش اور غم سے کانپتے صوفی صاحب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ سفید لٹھے

جیسا ہو رہا تھا۔ بالکل بے رنگ۔ زینب سیڑھی پر ساکت بیٹھی تھی اور اماں جی کمرے کی دہلیز پر دل تھامے کھڑی تھیں۔

"ابھی تیرا باپ زندہ ہے آمنہ! تیری آبرو پر کوئی میلی نگاہ ڈالے میں اس کی آنکھ نہ پھوڑ ڈالوں۔ میرے بچے تو کوئی غم نہ کرنا ابھی تیرے ماں باپ زندہ۔۔۔"

صوفی صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر اپنا کانپتا ہاتھ رکھا اور جملہ پورا کیے بغیر سینے سے اٹھتی درد کی ٹیسیں کو دبائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ درد کی شدت سے ان کا سینہ دوہرا ہوا جا رہا تھا اور وہ ضبط کی آخری انتہا کو چھوتے سیڑھیاں اترتے چلے جا رہے تھے۔ جلیل نے ان کے ہلدی ہوتے چہرے کو دیکھا تو صوفی صاحب کی زوردار پکار کے ساتھ انہیں تھامنے کو آگے بڑھا جو آخری سیڑھی پر بیٹھ رہے تھے۔

• • • • • •

وہ تو مدرسے کے اندر کا منظر دیکھ کر ہی ٹھٹک گیا' حالانکہ وہاں کچھ بھی انوکھا نہ تھا۔ چھوٹے بچے اسی طرح سپارے رحلوں پر رکھے ہل ہل کر اونچی آواز میں پڑھ رہے تھے' ان کا شور مسجد کے باہر تک آ رہا تھا' اس منظر میں اس کے لیے جو انوکھی بات تھی' وہ ان بچوں کو پڑھانے والا استاد تھا۔ اس کی سترہ اٹھارہ سالہ زندگی میں شاید یہ پہلی بار اس نے دیکھا تھا کہ صوفی صاحب کی جگہ کوئی اور مولوی صاحب بچوں کو قرآن پاک کا درس دے رہے تھے۔

"بابا صاحب! آج بچوں کو کیوں نہیں پڑھا رہے۔"

وہ منہ میں بڑبڑایا "ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ ان کی چاہے کتنی ہی طبیعت کیوں نہ خراب ہوتی' وہ مدرسے کی چھٹی بالکل نہیں کرتے تھے۔ وہ بیٹھے رہتے اور کوئی بڑا لڑکا باقی لڑکوں کے سبق کی نگرانی کیا کرتا تھا مگر مدرسے سے وہ ناغہ نہیں کرتے تھے۔ پوچھتا ہوں اندر جا کر' شاید بابا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔ اس دن جب میں ادھر سے جا رہا تھا' کافی چپ چپ لگ رہے تھے۔ جاتے وقت مجھے کوئی جھاڑ بھی نہیں پلائی اور میرے قاری صاحب کو کوئی کڑا پیغام بھی نہیں بھیجا کہ عبدالمبین کو خوب کھینچ کر رکھنا۔"

وہ خود ہی سوچتا ہوا مدرسے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ تو آج بھی معمول کے مطابق صبح کا سبق سناتے ہی مدرسے سے چل پڑا تھا۔ گھر آنے کے لیے وہ جیسے ہی مسجد کے دائیں طرف مڑ کر گھر کے بیرونی دروازے کی طرف آیا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا۔

دروازے پر بڑا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔

"یہ کیا' ایسا تو آج تک نہیں ہوا تھا کہ صوفی صاحب کے گھر کو تالا لگا ہو۔"

"کیا ہو گیا ہے بھلا اور مجھے پتا نہیں چل سکا۔" وہ گم صم کھڑا تھا۔

"کس سے معلوم کروں؟" ابھی دن پوری طرح سے روشن اور چمکیلا نہ ہوا تھا۔ آسمان کی نیلاہٹیں ابھی باقی تھیں' سبک رفتار خنک ہوا صبح سویرے کا پتا دے رہی تھی' وہ واپس مدرسے کی طرف مڑا۔

"صوفی صاحب کی تو ٹرانسفر ہو گئی' وہ ادھر سے چلے گئے ہیں۔" بچوں کو پڑھانے والے مولوی صاحب کا جواب اسے حیران کر گیا۔

"ن۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے' ان کا ٹرانسفر۔۔۔ اور مجھے پتا نہیں' میں ان کا بیٹا ہوں عبدالمبین۔ قاری عبدالحفیظ کے مدرسے میں پڑھتا ہوں' ایک ہفتے بعد تو آیا ہوں' مجھے بھلا علم کیوں نہ ہو گا کہ ان کا تبادلہ ہو رہا ہے اور انہیں کہیں جانا ہے۔" وہ بے یقینی سے بول رہا تھا۔ اسے لگا یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے یا شاید اس سے مذاق کر رہا ہے۔ "وہ چھٹی لے کر گئے ہیں یا یونہی کہیں کسی کام سے۔" اس نے مولوی کی تائید چاہی۔

"نہیں' وہ چھٹی لے کر نہیں گئے' ان کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ شاید لاہور میں سرکاری حکم پر۔ تم نے گھر کے دروازے پر تالا نہیں دیکھا' ویسے ابھی ان کا سارا سامان نہیں گیا' اس لیے وہ تالا لگا گئے ہیں۔ جب لے جائیں گے تو گھر مجھے مل جائے گا۔ میں ان کی جگہ ادھر آیا ہوں نا۔"

اس کے جواب پر عبدالمبین کا دل چاہا ایک زوردار مکا اس کے ہڈیوں بھرے جبڑے پر کس کر مارے۔ "یہ ہوتا کون ہے ہمارا گھر لینے والا۔"

وہ اسے گھورتا ہوا کوئی جواب دیے بغیر مسجد سے باہر نکل آیا۔

"اب کدھر جاؤں؟" اس نے ہاتھ میں پکڑے گندے کپڑوں کے تھیلے کو دیکھ کر سوچا اور اب تو بھوک بھی لگ رہی تھی' اس وقت تک تو اماں جی اس کے لیے دو دیسی گھی کے بل دار پراٹھے' سالن اور حلوے یا دہی کے ساتھ تیار رکھتی تھیں۔ وہ گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"ایسا کیا ہو گیا تھا کہ بابا صاحب اچانک گھر چھوڑ کر چلے گئے' وہ بھی مجھے خبر کیے بغیر۔" اس نے پشت ٹکا کر دروازے کو ہولے سے دھکا دیا۔

"خیر میں کون سی ان کے نزدیک کوئی اہم ہستی ہوں جسے وہ بتاتا یا پوچھنا ضروری سمجھیں گے ہونہہ!" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کچی پگڈنڈی پر آ گیا۔

"اب کدھر جاؤں۔" اس نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا' کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ اس کے ڈھور ڈنگر ہل کے ساتھ جتے ہوئے تھے۔ کچھ کھیتوں میں ٹریکٹر چل رہا تھا' ہر طرف صبح کی گہما گہمی تھی۔ ایک وہی گم صم بے خبر سا کھڑا تھا۔ چاروں طرف گھومتی نگاہیں دائیں طرف ایستادہ خوبصورت اونچی حویلی پر ٹک گئیں۔

"جی چاہتا ہے اس حویلی کو آگ لگا دوں یا اس پر ہل چلا دوں' اس نے ہی تو ہمارے گھر کو آگ لگائی ہے۔ چھوٹے شاہ جی! میں بھی اس قابل ضرور ہوں گا' تجھے تیری حرکت کا مطلب سمجھا سکوں۔" اس کا جلتا کڑھتا ذہن اور سلگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ماسٹر صاحب کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

"ارے عبدالمبین! تم کب آئے؟" ماسٹر صاحب اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئے'

"جی ابھی آیا ہوں تو گھر پر تالا۔" وہ جھجک کر چپ ہو گیا۔

"ہاں ہاں اندر آؤ۔ آج تو تمہاری چھٹی کا دن ہو گا' اسی لیے آئے ہو۔"

وہ اس کی بات ٹالتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے آئے۔ صحن میں بچھے تخت پر اسے بٹھایا اور خود پاس رکھے موڑھے پر بیٹھ گئے۔

"جی آج چھٹی ہے' گھر میں گیا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور مسجد میں بھی۔"

اس کی آواز رندھ گئی۔ یہ بات بیان کرنا ہی اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھی کہ صوفی صاحب کی جگہ کوئی اور شخص مسجد کی اجارہ داری سنبھالے ہوئے تھا۔

"ہاں بس کچھ اچانک ہی ہوا' صوفی صاحب نے کچھ ٹھیک سے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تبادلہ ہو گیا ہے ان کا لاہور میں' اچانک ہی اور اس قدر جلد۔ ویسے ایسا ہوتا تو نہیں' پتا نہیں کیا بات تھی' میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ انہوں نے تو وجہ نہیں بتائی اور پریشان بھی بہت لگ رہے تھے۔" ماسٹر صاحب بولے۔ عبدالمبین پریشان نظروں سے انہیں تک رہا تھا۔

"چلو تم فکر نہ کرو' میرا خیال ہے ابھی وہ اپنا سامان بھی پورا نہیں لے کر گئے' ابھی آئیں گے دوبارہ تو تمہیں بھی لے جائیں گے۔" وہ اس کی پریشانی سمجھ کر بولے۔

"سامان کی طرح میرے بغیر بھی ان کا گزارہ بہت خوب ہو سکتا ہے' مجھے معلوم ہے۔" وہ کڑھ کر بولا۔

"ارے نہیں' تم کوئی غلط سوچ نہ پالو۔ اصل میں انہیں فوراً جانا ہو گا' اس لیے تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکے۔ بہرحال تم ان کے لیے سامان تو کیا دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر قیمتی ہو' اولاد ہو ان کی۔" ماسٹر صاحب اس کا ہاتھ تھپک کر بولے تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اپنے گرد آلود جوتوں کو گھورتا رہا۔

"اچھا تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو منگواتا ہوں۔" وہ اس کی گود میں دھرے میلے کپڑوں کے تھیلے کو تخت پر رکھتے ہوئے بولے۔

"ارے نیک بخت! بچہ آیا ہے۔ عبدالمبین۔ اس کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ۔" انہوں نے برآمدے سے آگے بنے باورچی خانے کی طرف منہ کرکے آواز لگائی، جہاں سے برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"چلو تم ادھر غسل خانہ ہے، منہ ہاتھ دھولو۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

"ناشتہ کرنے کے بعد چائے کا پیالہ ہاتھ میں لیے وہ پھر سوچ رہا تھا۔ "اب کدھر جائے" ماسٹرنی جی نے اس کے لیے بڑے مزے کا ناشتہ بھجوایا تھا۔ دیسی گھی میں تر تر پراٹھے اور شلغم گوشت کا سالن" اس نے جی بھر کر کھایا۔

ماسٹر صاحب برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

وہ چائے بھی پی چکا اور اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔

"ماسٹر صاحب! میں کدھر جاؤں؟" رہ نہ سکا تو خود ہی اٹھ کر ان کے پاس چلا آیا۔

"ارے جانا کدھر ہے، یہ تمہارا گھر نہیں۔ میاں ادھر ہے ہی کون، ہم بڈھا بڈھی تو ہیں۔ تم نے کل شام ہی کو مدرسے جانا ہے نا تو چلے جانا ادھر ہی سے۔ اب چاہے جا کر آرام کرلو یا جو جی چاہے۔" بے فکری سے اخبار کے صفحات پلٹتے ہوئے بولے۔

"مگر گھر۔۔۔" وہ اٹک کر بولا۔

"گھر!" انہوں نے اخبار لپیٹ کر گود میں رکھ لیا۔ "گھر کا مسئلہ تو ہے، ویسے تو صوفی صاحب کو تمہیں ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا۔ خیر، ہوگی ان کی کوئی مجبوری۔ مجھ سے بھی جاتے وقت مل کر نہیں گئے، ورنہ میں کم از کم ایڈریس تو پوچھ لیتا۔ بہرحال وہ تمہاری طرف سے بے خبر تو نہ ہوں گے۔ آج یا کل میں تمہارے مدرسے کا چکر ضرور لگائیں گے، اس لیے کل تمہیں ادھر ضرور ہی جانا چاہیے۔"

"میں اب مدرسے نہیں جاؤں گا۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"کیوں بھئی! مدرسے کا کیا قصور اور اب تو میرا خیال ہے تمہاری منزل قریب ہے۔ پندرہ پارے تو ہو چکے ہیں تمہارے، مجھے صوفی صاحب بتا رہے تھے۔"

"جی!" وہ نروٹھے پن سے بولا تو وہ اس کی شکل دیکھنے لگے۔

"کیا کروں گا پڑھ کر، قرآن حفظ کرکے کسی مسجد میں مولوی لگ جاؤں گا یا امام اور پھر بس۔ جس کا جی چاہے، مجھے مذہبی انتہا پسند کہہ کر جیل پہنچوا دے یا مجھے اور میری عزت کو دو کوڑی کا بنا کر گاؤں سے نکلوا دے۔"

"اسی لیے تو میں کہتا تھا تم سے کہ نویں جماعت سے نہ بھاگو،" اگرچہ وہ میری ریٹائرمنٹ کا آخری سال تھا۔ اب تم نے انٹر کرلیا ہوتا۔ ایک سند ہاتھ آجاتی اور قرآن حفظ کی ڈگری بھی چھوٹی نہیں۔ اچھے سے اچھے کالج میں محض اسی ڈگری کی بنیاد پر تمہیں داخلہ مل جاتا پھر کوئی بھی تمہیں عزت دار نوکری مل جاتی۔ قرآن کے قاری و حافظ کے دیوانوں کو مذہبی انتہا پسند کہہ دینا محض ایک پروپیگنڈہ ہے، ورنہ ہمارے مذہب کو، دین اور اسلام کی تحریک کو ابھی بھی پڑھے لکھے حفاظ قرآن کی اشد ضرورت ہے، بلکہ جتنی آج اسلام کو جانثار پروانوں کی ضرورت ہے، جو سر میں کھولتے جوش کے بجائے باہوش عقل رکھتے ہوں۔ اتنی ضرورت کبھی بھی نہ رہی تھی۔" ماسٹر صاحب ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"بابا صاحب مجھے اسکول میں پڑھنے دے رہے تھے ان دنوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"تمہارا اپنا بھی جی نہیں تھا پڑھنے میں، سچ کہوں تو۔" ماسٹر صاحب لگی لپٹی رکھے بغیر بولے۔ "تمہارے بھلے کا ہی سوچا تھا انہوں نے۔ چلو اگر کوئی ڈگری نہیں لیتے تو قرآن کی تعلیم حاصل کرکے کم از کم مسجد تو سنبھال ہی لوگے نا۔ خیر، اب بھی کچھ نہیں بگڑا، چاہو تو دو چار ماہ بعد میٹرک کے امتحان ہونے والے ہیں، تھوڑی تیاری کرکے بیٹھ جاؤ۔ آرام سے نکل جاؤ گے، ذہن تمہارا اچھا ہے۔"

ماسٹر صاحب کا بس چلتا تو روئے زمین پر ہر ذی روح خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان، چرند پرند یا کیڑے مکوڑے سب کو میٹرک کے امتحان میں ضرور بٹھوا دیتے۔ ابھی بھی ان کے اندر شوق کے اس شعلے نے لپکا دیا تھا۔

"کیا کروں گا جی امتحان دے کر میٹرک پاس کو کون پوچھتا ہے۔" عبدالمبین بیزاری کی انتہا پر تھا۔

"ارے اسی طرح تو سیڑھی چڑھو گے نا۔ ساتھ میٹرک کرلوگے، ساتھ قرآن حفظ۔ ایف اے کرتے ہی کوئی نہ کوئی اچھی نوکری مل جائے گی۔"

ماسٹر صاحب نے اس کا جی للچانا چاہا مگر وہ بھی چکنا گھڑا تھا۔ عبدالمبین جسے صوفی صاحب کا جوتا ڈنڈا نہ علم کے رستے پر ڈال سکا تھا تو ماسٹر صاحب کے دام میں بھلا وہ کیوں کر آتا۔

"سوچوں گا۔" وہ اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلتا ہوا بیرونی دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

"عجیب سر پھرا لڑکا ہے۔ صوفی صاحب بے چارے صحیح معنوں میں اس سے عاجز تھے۔ نالائق، کند ذہن، غبی سا۔" وہ اسے یوں جاتے دیکھ کر غصے سے بڑبڑا دیے۔

وہ سارا دن عبدالمبین نے گاؤں میں گاؤں سے باہر گشت کرکے گزارا۔ شام کو وہ پھر ماسٹر صاحب کے گھر چلا آیا۔ ماسٹرنی نے اس کے میلے کپڑے دھو کر تار پر لٹکا دیے تھے۔ اس کے آتے ہی ماسٹر صاحب نے اسے ہاتھ منہ دھونے کو کہا۔ ماسٹرنی نے دسترخوان لگایا، مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ کھانا کھاتے ہی اندھیرا پھیل گیا۔

"صحن میں رات کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے، تمہارا بستر اندر برآمدے میں لگایا ہے، میں بھی ادھر ہی لیٹوں گا۔"

ماسٹر صاحب کا انداز کچھ روٹھا روٹھا سا تھا مگر اسے کون سی پروا تھی۔ "جی اچھا" کہہ کر اٹھ گیا۔ کچھ دیر صبح والا اخبار جو تخت پر دھرا تھا، اٹھا کر دیکھتا رہا، دو چار لائنیں پڑھیں، ورق الٹے پھر سیدھے کیے اور اخبار دوبارہ تخت پر دھر کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ ماسٹر صاحب کوئی موٹی سی کتاب لے کر اپنے بستر پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے عینک کے پیچھے سے گھور لیتے۔

کچھ دیر بعد وہ آکر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ ماسٹرنی اندر کمرے میں تھیں۔

"پھر کیا سوچا تم نے، میٹرک کے امتحان کے بارے میں۔" اسے بیٹھا دیکھ کر ماسٹر صاحب بولے یعنی ان کے دماغ میں ابھی تک یہ بہتری کا کیڑا ابھی تک کلبلا رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ رکھائی سے بولا تو برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ بلب کی پیلی چمکدار روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب سے بلب بند کرنے کو تو نہیں کہہ سکتا تھا۔

"یہی عمر ہوتی ہے کچھ بن جانے کی۔۔۔ تھوڑی محنت کرلوگے، اپنی جان پر سختی جھیل لوگے تو مستقبل بنالوگے اپنا۔ حفظ میں تو تمہارے اور چار چھ مہینے لگیں گے۔ میری مانو تو میٹرک کے امتحان میں بیٹھ جاؤ۔" ماسٹر صاحب اسے سدھارنے کو پوری طرح سے تلے نظر آرہے تھے۔

"ماسٹر صاحب! میں میٹرک چھوڑ ایم اے بھی کرلوں نہ تو میرا مستقبل بنے گا نہ میں بابا صاحب کو پسند آؤں گا۔ اصل میں تو انہیں مجھ سے دل سے نفرت ہے۔ یہ اسی نفرت اور بے زاری کا تو اظہار ہے کہ وہ مجھے بنا بتائے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں کس لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں۔" وہ بہت بیزار تھا اور شاید غصے میں بھی۔ اس سے اپنی یہ بے عزتی ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ اس کے ماں باپ، اس کے گھر والے بنا اس کی پروا کیے اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

"ارے یہ تو وقتی بات ہے، صوفی صاحب آج نہیں تو کل آہی جائیں گے تمہیں لینے۔ بتایا نا ان کی کوئی مجبوری ہوگی، ورنہ کون شوق سے ایسے اپنا گھر بار چھوڑ کر جاتا ہے اور یہ تم سے کس نے کہا کہ کوئی باپ اپنی اولاد خصوصاً اپنے بیٹے سے نفرت کرسکتا ہے۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتے ہیں، اسی لیے تو تمہیں سدھارنے کو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے۔"

"ہاں جیسے میں کوئی جانور ہوں، جب دیکھا ڈنڈا لے کر پیٹنا شروع کردیا۔" وہ بگڑ کر بولا۔

"تم ہمت کرکے میٹرک کی تیاری کرلو اور امتحان میں بیٹھ جاؤ پھر دیکھنا صوفی صاحب تم سے کتنا خوش ہوں گے۔ وہ تو علم سے بہت محبت کرنے والے ہیں، انہیں تو جنون کی حد تک شوق ہے اپنے بچوں کو بہت پڑھانے کا اور میں

تمہیں ایک بات بتاؤں۔ اس دنیا میں وہی بڑا نام پیدا کر سکا ہے اور مقام بھی جس نے علم کی اہمیت کو جانا۔ یہ علم ہوتا ہے جو آدمی کو تخت پر بٹھاتا ہے اور یہ بے علمی ہوتی ہے جو آدمی کو بیل کی طرح ہل میں جوتتی ہے۔ جو اہمیت علم کی ہے، اس کا اندازہ تم اس بات سے لگاؤ کہ علم حاصل کرنے کے لیے چین تک جانے کا حکم ہے اور..."

وہ بڑے جوش سے بول رہے تھے۔ سانس لینے کو رکے تو انہیں عبدالمبین کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دیے۔ انہوں نے انگلی سے ناک پر ڈھلکتی عینک کو اونچا کر کے دیکھا، وہ منہ کھولے سو رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کا جی چاہا تھا ہاتھ میں پکڑی یہ موٹی سی کتاب اٹھا کر اس کے سر پر دے ماریں۔

"احمق، نالائق، الو، گدھا..." وہ خاصی اونچی آواز میں اسے ان القابات سے نوازتے رہے۔

اگلے دن بھی اس کی یہی روٹین رہی۔ ناشتہ کر کے گھر سے نکل گیا اور رات گئے لوٹا۔ اب ماسٹر صاحب اسے منہ پھاڑ کر ادھر سے جانے کا بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ شام کو گرد آلود حلیہ لے کر لوٹا تو وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئے۔

"نہالو جا کر، کتنے گندے کپڑے ہو رہے ہیں تمہارے۔" وہ رہ نہ سکے تو بولے۔

اگلی صبح وہ پھر ناشتہ کر کے باہر جانے لگا تو ماسٹر صاحب نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

"عبدالمبین! تمہیں آج مدرسے نہیں جانا، تمہاری چھٹی تو کل شام کو ختم ہو گئی تھی۔" اب اسے بھگانے کا یہی طریقہ ان کی سمجھ میں آیا تھا۔

"جب تک بابا صاحب نہیں آتے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا اور ہاں ماسٹر صاحب! میں نے سوچ لیا ہے کہ میں میٹرک کا امتحان دوں گا۔ آپ شام کو میرے لیے کتابیں نکال کر رکھیں، میں رات کو پڑھنا شروع کروں گا۔"

بہت سوچنے کے بعد ماسٹر صاحب کے گھر میں ٹکنے کا اسے یہی نسخہ سمجھ میں آیا تھا۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ کھل سا گیا۔

"واقعی یہ تو بہت اچھی بات ہے تو آؤ ابھی مل کر اندر الماری سے کچھ کتابیں نکال لیتے ہیں۔" وہ خوشی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"ابھی نہیں، شام کو میں آؤں گا پھر... ابھی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ انہیں ٹال کر باہر نکل گیا۔

ضروری کام تو اسے ادھر کوئی بھی نہیں تھا، دن میں دو چار بار جا کر گھر دیکھتا کہ شاید تالا کھل گیا ہو اور بابا صاحب لوٹ آئے ہوں، اماں جی کواڑ کھولے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں مگر روز سے تو ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت باغی ہو رہا تھا۔

وہ دن میں ایک بار حویلی کی چار دیواری کے گرد بھی چکر لگانا نہ بھولتا۔ اسے معلوم تھا، اسے بھلا ادھر کس نے پہچان لینا ہے۔ میں کون سا کسی امیر سید زادے کی اولاد ہوں۔ ایک معمولی مولوی کا بیٹا ہوں جسے اس حویلی کے ایک شیطان نے اپنی گندی نظروں سے نکال باہر کیا۔

حویلی کی پچھلی دیوار سے ٹیک لگائے وہ سوچ رہا تھا۔

"اس حویلی میں نقب لگانی ہے، ایسے کہ کسی کو علم بھی نہ ہو اور حویلی لٹ جائے۔" وہ دیوار کو گھورتے ہوئے سوچنے لگا۔

"اے کون ہے تو... ادھر کیا کر رہا ہے؟" حویلی کا کوئی ملازم تھا۔ پچھلا گیٹ کھولتے ہوئے اسے دیکھ کر گرجا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں حویلی کے کھلے گیٹ سے نکلتی سیاہ شیورلیٹ پر تھیں جو آہستہ آہستہ باہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے ہی گاڑی اس کے قریب سے گزرنے لگی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر کوئی خاتون تھی حویلی کی، کوئی مہ لقا اور اسے معلوم تھا یہ کون تھی۔

"شہرینہ بنت سبطین شاہ۔ شاہ جی کی چھوٹی صاحبزادی۔"

گاڑی دھول اڑاتی کچی پگڈنڈی پر دوڑتی جا رہی تھی۔

"اس حویلی میں نقب لگانی ہے کہ کسی کو علم بھی نہ ہو۔" اس کے لب مسکرانے لگے۔ چوکیدار کچھ کہتے ہوئے اس کی طرف لپکا تو وہ تیزی سے بھاگ کر دائیں طرف مڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

"دو دن دو راتیں، آخر ایسا کیا کام تھا شہر میں کہ آنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مظفر صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ آپ نے صرف ان سے فون پر بات کی تھی۔ کوئی ان سے میٹنگ نہیں تھی، کوئی بزنس میٹنگ اور کوئی بزنس ڈیل بھی نہیں تھی۔ نہ کوئی کاروباری مصروفیت، نہ کوئی دوسرا اہم کام پھر سلطان بخت! آپ نے یہ دو دن اور دو راتیں کہاں گزاریں۔ "سید ہاؤس" کے پہرے دار تمہارا کھاتے ہیں اور تمہاری بولی بولتے ہیں۔ شاہ جی ادھر نہیں ہیں، ادھر نہیں آتے، رات کو آئے تھے، صبح چلے گئے، رات کو نہیں آئے، شام کو ہی چلے گئے تھے۔ جھوٹے، دوغلے اور بے ایمان۔ جیسا مالک ویسے خدام۔"

صالحہ کے تیز غصے بھری چیخ و پکار اوپر کے بیڈ روم سے نیچے لاؤنج تک صاف آ رہی تھی۔

"تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں میں، نہ تمہارا زر خرید کہ تمہیں رپورٹ پیش کروں کہ میں کدھر تھا اور کدھر نہیں۔ تم اپنی اوقات میں رہو، بے ہودہ عورت۔" سلطان بخت جواباً دھاڑے۔

"بے ہودہ میں نہیں، تم ہو مسٹر سلطان بخت! اور میں بھی تمہاری زر خرید یا گھر میں بندھی کوئی بھیڑ بکری نہیں جو تمہارے سارے کرتوت دیکھ کر بھی اف بھی نہ کر سکے۔ میں بیوی ہوں تمہاری اور مجھے پورا حق ہے، میں تمہاری خبر رکھوں کہ تم اس گھڑی کون سا گل کھلانے جا رہے ہو۔" وہ ان سے بلند آواز میں چیخی تھی۔

"اور تمہیں معلوم ہے میں اس گھڑی دوزخ میں ہوں اور تمہارے حسد، جلن اور رشک کی آگ میں جل رہا ہوں۔ اپنی بدنصیبی کے گل کھل جانے پر رو رہا ہوں۔" انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا نازک کرسٹل کا گلدان اٹھا کر دروازے پر دے مارا۔ وہ پل بھر میں ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔

"بدنصیبی کو تو میں اپنی رو رہی ہوں، جو تم جیسے دھوکے باز سے زندگی جڑ گئی اور یاد رکھو سلطان بخت! میں کوئی شیشے کا گلدان نہیں جو تمہاری دسترس میں ہے اور جب تمہارا جی بھر جائے تو تم اٹھا کر اسے دیوار پر دے مارو۔ میں ہوں، سیدہ صالحہ شاہ۔ تمہیں، مجھے پتا ہو گا کہ تم نے یہ دو دن کہاں گزارے، جبکہ تمہیں شہر میں کوئی کام بھی نہیں تھا۔" وہ بنا ڈرے، خوف کھائے اس کے سامنے تن کر آ کھڑی ہوئی۔

"صالحہ شاہ! دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ تم نے چند ہفتوں میں میری زندگی کا سکون فنا کر کے رکھ دیا ہے اور میری برداشت اب ختم ہو رہی ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" سلطان بخت اپنے ہی بال دونوں ہاتھوں سے نوچ کر وحشت بھرے عالم میں بولے۔

"نہیں سلطان بخت! یہ تمہاری بھول ہے کہ میں دفع ہو جاؤں گی ادھر سے۔ تم نے میری زندگی تباہ کی ہے، میں تمہاری زندگی سے سکون، خوشی، اطمینان سب کچھ نوچ پھینکوں گی، سب کچھ... اور میں تمہارے ان ڈراموں کے فریب میں بھی نہیں آنے والی۔ جب زندگی ہی داؤ پر لگ گئی، سب کچھ پہلی رات ہی اجڑ گیا تو پھر ڈر کس بات کا۔ ڈر تا تو وہ ہے جس کے کسی چیز کے کھو جانے کا خوف ہو، میرے پاس تو ایسا کچھ بھی نہیں جس کے لٹنے کے ڈر سے میں خاموش رہوں گی، زبان بند رکھوں گی۔ جانا تمہیں ادھر سے ہو گا، یہ میرا کمرہ ہے، میرا دل چاہے گا تو میں جاؤں گی، نہیں تو تم مجھے دھکے دے کر بھی نہیں نکال سکتے۔"

وہ جا کر ایزی چیئر پر بیٹھ گئی اور بڑے سکون سے جھولنے لگی۔ سلطان بخت کی وحشتوں سے ایک گونا گوں سکون اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ یہی منظر تو اس کی آنکھیں دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ سلطان بخت نے سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور پھر پیر پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر جونہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئے، ان کی نظر سامنے بیٹھی سیدہ آپا پر پڑی جو بہت افسوس اور رنج بھری نظروں سے ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سلطان بخت کے اعصاب اور تن گئے۔

"آپا۔۔۔ آپا! یہ کیا عذاب آپ نے میرے سر پر سوار کر دیا ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے میں خودکشی کر لوں۔ اس عورت نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ اس قدر بدتہذیب، زبان دراز اور بے ہودہ عورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔" وہ غصے سے انگلیاں چٹخا کر بولے۔ "اور آپ کہتی تھیں صالحہ جیسی بے زبان اور محبت کرنے والی پورے خاندان میں اور کوئی نہیں۔ یہ۔۔۔ یہ صلہ دیا آپ نے مجھے میری قربانی کا۔" وہ انگلی سے سیڑھیوں سے اوپر اپنے بیڈ روم کی طرف اشارہ کر کے غصے سے بولے۔

"پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے سلطان بخت! یہ پہلے تو بالکل بھی ایسی نہ تھی۔ اس کے تو منہ میں زبان نہ تھی، پتا نہیں اتنا زہر اس کے اندر کہاں سے آ گیا۔ میں تو خود اس کی زبان درازی سن کر حیران بیٹھی ہوں۔" سیدہ پریشانی سے بولیں۔

"سن لیا نا آپ نے، دیکھ بھی لیں اس کی بے ہودگیاں، میں کہاں تک برداشت کروں اور کیوں کروں۔" وہ کوفت بھرے انداز میں اپنی کنپٹی دبا کر بولے۔

"میرے بھائی! قربانی بھی تو میری خاطر دی ہے نا! برداشت بھی میری خاطر کرنا پڑے گا۔"

"آپا جان! میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں، میری برداشت کی حد ختم ہو رہی ہے، اس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ چوری چھپے میری فون پر گفتگو سنتی ہے۔ نوکروں سے، سیکریٹریوں سے، ڈرائیور سے، چپراسی سے کرید کرید کر میری مصروفیات کے بارے میں سوال کرتی ہے۔ منیجر کو دن میں دس فون کھڑکاتی ہے، سلطان بخت کیا کر رہے ہیں، کدھر ہیں، کس کے ساتھ، جی رہے ہیں کہ مر رہے ہیں۔ اس نے سب کی نظروں میں مجھے دو کوڑی کا کر دیا ہے۔ میں اب اور برداشت نہیں کروں گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"میرے بھائی! تم بھی تو اپنے اندر لچک پیدا کرو، بیوی ہے تمہاری۔ کچھ توجہ، کچھ محبت اسے بھی تو دو، پیار و محبت سے تو پتھر بھی موم ہو جاتے ہیں۔" سیدہ نرم لہجے میں بولیں۔

"بیوی ہے تو کیا ڈگڈگی بنا کر گلے میں لٹکا لوں، چوراہے میں بجاتا رہوں کہ لوگو دیکھو یہ میری بیوی ہے اور رہا سوال محبت و توجہ کا۔ آپا! وہ مجھے پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ آتے ہی دنگا فساد شروع کر دیتی ہے، مجھے دیکھتے ہی اسے پتنگے لگ جاتے ہیں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، ان چند ہفتوں میں، میں نے کیا کیا سہا ہے۔ میں بابا جان کے بیڈ روم میں سو رہا ہوں۔ گھٹیا، فضول، جاہل، بے ہودہ، ال مینرڈ۔" انہوں نے زور سے زمین پر پاؤں مارا۔ ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال تھا اور بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

"اب کیا کریں، یہ دن رات کا تماشا بھی تو اچھا نہیں۔ یہ وہ حویلی ہے، جس میں سے چڑیا کے چہکنے کی آواز بھی باہر نہیں جاتی تھی اور تم دونوں کی چیخ و پکار نوکروں سمیت پورا گاؤں سنتا ہے۔ سارے گاؤں میں، ساری برادری میں وہ چہ مگوئیاں ہو رہی کہ خدا کی پناہ۔ ان جھگڑوں کی آوازیں حویلی کی دیواریں پھلانگ کر باہر جاتی ہوں گی تو لوگ کیا کیا نہ قصے بناتے ہوں گے۔ بابا جان کو ابھی ادھر سے گئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں، ابھی تو ان کے آنے میں بھی کچھ ماہ ہیں۔" سیدہ کلس کر بولیں۔

"تو آپ کا خیال ہے، میں یہ تماشا لگاتا ہوں۔ وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ توپ کا گولہ ہے وہ بارود سے بھری۔ میں اف بھی نہیں کرتا اور وہ چیخنے لگتی ہے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں، اس نے میری زندگی حرام کر دی ہے۔ اس کا کوئی حل سوچ لیں آپ، ورنہ میں ذمہ دار نہیں۔ اگر میں نے کچھ ایسا ویسا سوچ لیا۔" وہ تن فن کرتے لاؤنج سے باہر چلے گئے۔

"برداشت کی حد تو لگتا ہے سب ہی کی ختم ہو رہی ہے۔ کوئی کسی کو نہیں سہار رہا۔" سیدہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اسی وقت صالحہ سیڑھیاں دھڑ دھڑاتی نیچے اتری۔ انہیں سامنے بیٹھے دیکھ کر ایک پل کو ٹھٹکی اور پھر کندھے اچکا کر ہال کی طرف جانے لگی۔

"صالحہ! ادھر آؤ۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولیں۔

"جی!" اس نے بڑے بے نیاز انداز میں ایک رخ پر گردن موڑی، وہیں کھڑے کھڑے۔

"یہ سب کیا ہے۔۔۔؟" وہ اپنا شدید ردعمل ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔

"کیا۔" وہ لاپروائی سے بڑے شاہانہ انداز میں بولی۔

"یہ دن رات کے جھگڑے، یہ تماشا جو تم دونوں نے لگا رکھا ہے۔" وہ کچھ غصے سے بولیں۔

"اچھا تو بھابھی بیگم! آپ کو اس تماشے کا چسکا ـــــ نہیں بیٹھنے دیتا آپ کو اپنے گھر میں۔" وہ "آپ کے اپنے گھر میں" پر زور دے کر بولی۔ "تب ہی آپ دن میں دوبار دوڑی آتی ہیں۔ بلا ٹکٹ تماشا دیکھنے۔" اس کا انداز، لہجہ اور الفاظ سب کچھ سراسر سلگا دینے والے تھے۔ سیدہ کا وجود جلنے لگا۔

"تمیز سے بات کرو صالحہ!" وہ اپنے سخت الفاظ کو دانتوں تلے دبا کر بولیں۔

"تمیز۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "کیا اس اونچی حویلی والوں کو معلوم ہے تمیز کس کو کہتے ہیں۔ سیدہ بھابھی! پہلے یہ تمیز نام کی چڑیا اپنے "باتمیز" بھائی کے کندھے پر بٹھائی ہوتی پھر دوسروں سے اس کی بابت دریافت کرنا تھا پھر ایسے سوال کرتی آپ بہت اچھی لگتیں۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"صالحہ! مجھ سے طریقے سے بات کرو، تمہیں معلوم نہیں میں کون ہوں۔" وہ غصے سے ابرو اچکا کر بولیں۔

"بھابھی بیگم! طریقے ہی سے کر رہی ہوں۔ آپ کو معلوم ہے مجھ سے یہاں اسی طریقے کی ڈیمانڈ کی جاتی ہے اور مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا کہ آپ کون ہیں، کہیں تو تفصیل سے بیان کروں۔ آپ ایک آمر ہیں، آج تک بلا روک ٹوک دونوں گھروں میں آمرانہ حکومت کرتی آئی ہیں۔ کہیں تو اس حکومت کے خواص بیان کروں، میں کل تک آپ کی اس حکومت کی ادنیٰ رعایا تھی۔" وہ انہیں بھڑکانے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھی۔

"میرے تحمل و توقع کو چھوڑو۔۔۔" وہ بات کو سنبھالنے کی غرض سے بولیں۔

"آپ کا تحمل و توقع کس کو نہیں معلوم۔ آپ خیر سے چوبیس میں سے بائیس گھنٹے ادھر ہی پائی جاتی ہیں، اس لیے آپ کے تحمل و توقع کے بارے میں بتانا کیا مشکل ہے۔" وہ ان کی بات کاٹ کر زہرخند لہجے میں بولی۔

"صالحہ!" سیدہ چیخ اٹھیں۔

"دھیرے بھابھی بیگم! یہ آپ کی نہیں میری حویلی ہے، آہستہ بات کریں۔ یہ حویلی حق مہر میں میرے نام منتقل کی جا چکی ہے۔ آپ تو شاید اب خاص خاص باتیں بھولنے لگی ہیں، عمر کا بھی تو تقاضا ہے۔"

وہ مذاق اڑا رہی تھی ان کا اور سیدہ کا جی چاہا حویلی کی اس نئی مالکن کا منہ نوچ لیں، آج تک کسی نے ان سے اس لہجے میں بات کرنے کی جرأت نہ کی تھی نہ کسی میں مجال تھی۔

"تمہاری ہی کیا بس کا تمہیں اس قدر گھمنڈ ہو چلا ہے تو کچھ اس کی ساکھ کی بھی فکر ہے یا بس دنگا فساد پر ہی زور ہے۔"

اب سیدہ کتنا زبان کو نرم الفاظ کا سہارا دیتیں، انہوں نے یہ کوشش ہی ترک کر دی۔

"ساکھ کی فکر میں کیوں کروں جنہوں نے اس کی خام بنیادیں اٹھائی ہیں، وہ فکر کریں۔" وہ اسی ٹیڑھے لہجے میں بولی۔

"صالحہ! کچھ ہوش کے ناخن لو تم، اس جلن سے سب کچھ تباہ کر لوگی۔ اپنی زندگی، سلطان بخت کی خوشیاں اور اس حویلی اور خاندان کی نیک نامی۔" سیدہ کو چند لمحوں بعد ہی اپنا لہجہ بدلنا پڑا۔

"آپ نے اس وقت یہ فکر کیوں نہ پالی، جب آپ کا یہ سید زادہ بھائی اپنے اندر بد اعمالیوں کی پرورش کر رہا تھا، اس وقت اگر آپ نے ہوش کے ناخن لیے ہوتے، یہی سوالنامہ اور ڈراوا جو آپ مجھے بڑے طمطراق سے دے رہی ہیں، اگر چند برس پہلے اپنے اس بگڑے ہوئے بھائی کو دیا ہوتا تو آپ کو روز یہ تماشا دیکھنے ادھر آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔"

صالحہ تو جیسے ان سے جنم جنم کا بدلہ لینے پر تلی ہوئی تھی۔ سیدہ اس کل کی بے زبان بکری کا منہ دیکھ کر رہ گئیں۔

”اور میرا مشورہ مانیں تو بھابھی بیگم! آپ بھی اب ہوش کے ناخن لیں۔ یہی وقت جو آپ ادھر کے تماشے دیکھنے میں برباد کر رہی ہیں‘ اپنے گھر کی خبر لیں۔ خیر سے آپ کے دونوں بچے بھی تو نوجوانی کی دہلیز پر قدم دھر چکے ہیں جن کو آپ پردے میں بٹھا کر سمجھ رہی ہیں نسلوں کی نیک نامی محفوظ کر لی۔ ذرا پردے کے اندر بھی خبر رکھیے گا اور اپنے فرزند ارجمند کو محض سید زادہ سمجھ کر نظر انداز نہ کیجیے۔ یہ سید زادے بلا کے تماش بین ہوتے ہیں۔ بڑی رنگین طبیعت ہوتی ہے ان کی۔ دور کیوں جائیے‘ آپ کے بھائی کی مثال سامنے ہے۔“ سیدہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی صالحہ ہے‘ وہ تو بغیر پلک جھپکے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

”میری باتوں پر غور فرمائیے گا اور اس حویلی کے معاملوں کو اس حویلی کے افراد کا ہی دردِ سر رہنے دیں‘ آپ کی مہربانی ہوگی۔ میں اب آرام کروں گی‘ آپ تو شاید شام تک ادھر ہی قیام فرمائیں گی۔“

وہ ایک بار پھر انہیں حویلی میں بار بار آنے کا طعنہ دے کر سیڑھیاں پھلانگتی اپنے کمرے میں غائب ہو گئی۔

”او میرے اللہ! اس کے اندر کون سی بدروح سما گئی ہے‘ ایسی شیطان طبیعت صالحہ کی تو نہ تھی۔“ سیدہ نے بے یقینی سے اپنا سر تھام لیا۔

اور شام کو جب وہ یہ دکھ بھری داستان حسین شاہ کو سنانے بیٹھیں تو وہ بھی بول اٹھے۔

”غلط تو نہیں کہا صالحہ نے‘ کچھ اپنے گھر کی بھی خبر لو اور تمہارے بھائی کے پیچھے کیا تمہارے آنے جانے سے سدھر جائیں گے۔ وہ ایک چکنا گھڑا ہے‘ اپنی فطرت نہ بدلے گا۔“ حسین شاہ کا تحقیر بھرا لہجہ انہیں آگ لگا گیا۔

”آخر کیا کیا ہے میرے بھائی نے۔ آپ دونوں اس کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔“ وہ تڑپ کر بولیں۔

”یہ پوچھو وہ کیا نہیں کرتا۔ یہ اس کا شہر بار بار آنا جانا تمہیں نظر نہیں آتا۔ شہر کے ہر بدکاری کے اڈے پر نئے نکور مال کی پہلی بولی سید سلطان بخت کی ہوتی ہے اور شہر میں جو اس کا من پسند کھیل ہے اس کا تو تمہیں علم ہی ہو گا اور گاؤں کے اندر بھی کئی مثالیں چھوڑی ہیں آپ کے بھائی نے۔ وہ لڑکی جو تمہارے گاؤں میں مہمان آئی تھی اور تمہارے بابا جان کے منشی کے بیٹے کے ساتھ بھاگ گئی‘ کیا تمہیں نہیں ہو سکتا کہ وہ سلطان بخت کی ہوس بھری نگاہوں سے بچ سکی ہو اور نیا واقعہ تو تمہیں معلوم ہے‘ تمہارے گاؤں کی مسجد کے صوفی صاحب ادھر سے کیوں چلے گئے۔ سیدہ! میں ادھر انجان نہیں بیٹھا‘ مجھے اس کے پل پل کی خبر ہے۔ یہ تو میرا حوصلہ ہے جو میں ابھی تک اس کی حرکتوں کو برداشت کیے جا رہا ہوں‘ نہ جانے کس شیطان کی روح ہے اس کے اندر کہ اس کی ہوس کی سیری نہیں ہوتی۔ جوانی ہم پر بھی آئی تھی مگر ایسی اندھی نہیں کہ ہر طرف منہ مارتے پھریں۔ سب کو خبر ہے ایک بس تم ہی آنکھیں بند کیے اس کے افعال سے بے خبر ہو‘ اس کو سمجھاؤ ورنہ میں صالحہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی زیادہ دن برداشت نہ کر سکوں گا‘ ہاں۔“ حسین شاہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور ان انکشافات نے تو سیدہ کو جیسے گنگ ہی کر دیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”پتا نہیں کیا کیا کہانیاں گھڑ گئے ہیں‘ پچی جھوٹی۔ یا اللہ! بابا جان جلد سے جلد آ جائیں تو وہی آ کر اس تماشے کو سمیٹیں پھر سب کے منہ بند ہوں گے۔“ وہ روتے ہوئے دل میں دعا کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

صوفی صاحب کو انجائنا کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔ انہوں نے ساری زندگی کسی غم‘ فکر یا پریشانی کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا تھا۔ ہمیشہ اپنے سخت دل اور سخت رویے سے غم و فکر کو پچھاڑا ہی تھا‘ شکست نہ کھائی تھی۔ یہ یکایک کیا ہو گیا کہ انہوں نے ایک فکر سے آنکھ کیا ملائی تمام غم اور پریشانیاں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگیں۔ ابھی دربدری کے زخم تازہ تھے کہ جان سے پیارا بیٹا ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے فیصلے کو جھٹلانے لگا‘ اب ان کا دل اس قدر بھی سخت جان نہ تھا کہ یہ سختی بھی چپ چاپ جھیل جاتا۔

”عبدالمبین مدرسے سے چھٹی لے کر چلا گیا تھا تو تم نے اسے گاؤں میں دیکھنا تھا جا کر۔“ ان کی آواز میں ابھی نقاہت تھی۔ انہوں نے پاس مودب کھڑے جلیل سے کہا جو چند لمحے بیشتر عبدالمبین کے مدرسے سے اس کا پتا کر کے لوٹا تھا۔

”گاؤں جانے سے آپ نے منع کیا تھا جی!“ وہ اسی طرح سر جھکائے بولا۔

”ہاں یاد آیا‘ میں نے منع کیا تھا تمہیں۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولے۔ ”گاؤں ہی گیا ہو گا‘ ہے بھی زمانے بھر کا احمق‘ کچھ ایسا ویسا کر دے یا بول دے۔ چھوٹے شاہ جی کا اللہ جانے مزاج کیسا ہے۔ اچھا ہوتا اسے آتے وقت ساتھ ہی لے آتے۔“

صوفی صاحب تاسف بھرے لہجے میں بولے۔ رابعہ ان کی پائنتی پر بیٹھی ہولے ہولے ان کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ ململ کی بکل میں ان کا پورا وجود ہل رہا تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ رو بھی رہی تھیں اور رو تو گزشتہ دو دنوں سے مسلسل رہی تھیں۔ جیتے جی عبدالمبین کے بچھڑنے کا غم اور عبدالمبین بھی تو ان کی پیاسی نگاہوں کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ صوفی صاحب پر دل میں غصہ بھی آ تا جو اسے یوں چھوڑ کر چلے آئے۔

”چلو‘ تم جا کر ہاتھ منہ دھو لو‘ کھانا نیچے لے جا کر کھا لینا۔ میں عصر کی نماز کے وقت نیچے آ جاؤں گا۔ جماعت بھی میں ہی کراؤں گا۔“ انہوں نے جلیل کو جانے کے لیے کہا۔

”ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں پوری طرح سے‘ پھر ڈاکٹر نے سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے بھی منع کیا ہے۔“ رابعہ دھیرے سے بولیں۔

”تو کیا میں بستر سے جڑ جاؤں رابعہ بی بی! میری روزی اللہ نے اسی میں لکھی ہے کہ میں اس کی مسجد اور اس کی مخلوق کی خدمت کرتا رہوں۔ اگر اس خدمت کا معاوضہ میں بستر پر لیٹ کر وصول کروں گا تو اپنے بچوں کو حرام کھلاؤں گا اور اگر میری موت سیڑھیاں اترتے یا چڑھنے سے لکھی ہے تو ڈاکٹر کی ہدایت اسے ٹال نہیں سکتی۔“ عبدالمبین کو گھر سے نکالنے کے بعد آج پھر انہیں جلال آیا تھا۔ چہرہ یکدم سرخ ہو چلا تھا اور آنکھیں غصے سے پھیل سی گئی تھیں۔ رابعہ چپکی ہو کر بیٹھی رہیں۔ صوفی صاحب سے بحث تو خیر انہوں نے زندگی بھر نہ کی تھی‘ اب بھی کمرے میں خاموشی چھائی تو باہر بھی خاموشی تھی۔ آتی سردیوں کی دوپہر کے آخری پل تھے۔ سناٹا گھروں کے اسکولوں میں پھیلا رہا تھا۔

”بچیاں کہاں ہیں؟“ کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولے۔

”آمنہ پڑھ رہی ہے اور جویریہ بھی۔ اس کا تو اسکول نیا ہے‘ ابھی کام بہت ملتا ہے اسے‘ اسی لیے آمنہ کے پاس بیٹھ کر کام کر رہی ہے۔“

”اور زینب کیا کر رہی ہے؟“ صوفی صاحب سب کی سرگرمیوں پر شروع ہی سے نگاہ رکھتے تھے۔

”جویریہ کی قمیص کی ترپائی کر رہی ہے۔ اسکول کا یونیفارم ہے اس کا۔“ انہوں نے آہستگی سے جواب دیا۔ چند لمحے اور خاموشی سے سرکے‘ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

”جلیل! تم جا کر منہ ہاتھ دھوؤ۔“ ان کے کہنے پر جلیل باہر نکل گیا۔

”میں چاہتا ہوں زینب بھی آمنہ کے ساتھ ہی میٹرک کا امتحان دے لے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولے تو اماں جی کے پاؤں ہاتھ تھم سے گئے۔ انہوں نے کچھ اچنبھے سے صوفی صاحب کی صورت دیکھی۔

”وہ کیسے دے سکتی ہے۔ اس نے ابھی ایک دو ماہ پہلے تو رو رو کر مڈل کا امتحان دیا ہے۔ ابھی تو اس کا نتیجہ بھی نہیں آیا۔“

”نتیجہ آنے والا ہے چند دنوں تک۔ آمنہ اور زینب کی عمروں میں بمشکل سال ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ میں چاہتا ہوں دونوں....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”تم نے بات کی تھی اس رشتہ کرانے والی سے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ پھر بولے۔

”کی تھی۔“ رابعہ پژمردگی سے بولیں۔

”پھر؟“ صوفی صاحب کا لہجہ مشتاق تھا۔

”اس کے پاس تو وہی رشتے ہیں‘ ریڑھی والا‘ پان والا‘ سبزی والا‘ بیکری میں ملازم سموسے تلنے والا....“

"لاحول ولا قوۃ۔" ابھی شاید ان کی فہرست اور بھی ہوتی، صوفی صاحب اونچی آواز میں بڑبڑائے۔

"اس سے کہنا تھا تم نے، ہم تجھے اس طبقے سے تعلق رکھتے نظر آتے ہیں۔ کل شام کو بھی اس رنگ ساز کا رشتہ اٹھالائی تھی۔ اس کی گھروالیاں کسی تنور پر روٹیاں لگانے والی نظر آتی تھیں۔"

صوفی صاحب تلخی سے بولے۔ کل جو تین عورتیں آمنہ کے رشتے کے لیے آئی تھیں، صوفی صاحب نے انہیں صحن سے گزرتے دیکھ لیا تھا۔ عبدالمتین کو گھر سے نکالنے کے بعد انہیں یکایک ہی لگا ان کے کندھوں پر بڑا بوجھ آن گرا ہے اور اس بوجھ کی وجہ سے ان کے کندھے جھکے جا رہے ہیں۔ انہیں لگا ان کا جسم کمزور پڑ رہا ہے اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے۔

"چند ایک ماہ بعد گاؤں جانا پڑا یا نہیں۔ دونوں صورتوں میں دونوں بچیوں یا کم از کم آمنہ کا کہیں نکاح یا شادی ہو جائے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔" یہ ان کی تین دن پہلے کی سوچ تھی اور انہوں نے اپنی بیوی کو بھی اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ محلے میں رشتہ کرانے والی کو بلوا کر اس سے بات کریں۔ ان کی بات کے نتیجے میں کل جو وہ رشتہ لے کر آئی تو دونوں میاں بیوی کو بے حد ناگوار گزرا۔ جلد بازی میں بھی بہرحال ان کا آمنہ یا زینب کو کسی گٹر میں گرانے کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔

"اس سے کہو کسی پڑھے لکھے اچھے گھرانے کا رشتہ لائے۔" صوفی صاحب چند لمحوں بعد بولے۔

"یہی کہا ہے میں نے اسے، کہہ رہی تھی کہیں چپراسی یا کلرک ہے۔ اس کا رشتہ لائے گی، ادھر دفتری کتنے ہیں، چھوٹا سا تو علاقہ ہے۔ بے چاری کوشش تو کر رہی ہے، علاقے کے لحاظ سے رشتے ہوں گے نا۔"

"بہرحال کوشش کرو ان دو چار ماہ میں اگر ہو جائے تو اچھا ہے۔"

صوفی صاحب کو جلدی لگ گئی تھی۔

"تم جا کر جلیل کو کھانا دو، صبح منہ اندھیرے کا نکلا ہوا تھا۔ پتا نہیں راستے میں اس نے کچھ کھایا بھی یا نہیں۔ اپنے بیٹوں سے اچھا تو یہی نکلا، اپنی اولاد اسی لیے انسان..." عبدالمتین کا دکھ ان کے لہجے، ان کی آنکھوں میں جھلکنے لگا تھا۔ انہوں نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تو اماں جی ایک گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اور ہاں، زینب سے کہو آمنہ کے ساتھ امتحان کی تیاری کرے، ابھی کافی دن ہیں، ہو جائے گی اس کی تیاری۔ سارا دن فارغ ہی رہتی ہے وہ۔" رابعہ چوکھٹ کے پاس پہنچیں تو انہوں نے یاد دلایا۔

جلیل برآمدے میں چولہے کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ انہیں اس پر ترس آیا اور پیار بھی۔ بے چارہ صبح سے ہمارے واسطے خوار ہو کر آیا ہے، اب بھوک لگی ہوگی۔

وہ پیڑھی پر بیٹھ کر چولہا جلانے لگیں۔

"تم اتنی دور جو گئے تھے تو گاؤں بھی چلے جاتے، کوئی پوچھتا تو کہہ دیتے، میں تو صوفی صاحب کے ساتھ گیا ہی نہیں۔" توا چولہے رکھ کر وہ بولیں۔

"صوفی صاحب نے مجھے جھوٹ کہنے سے منع کر رکھا ہے۔" وہ سنجیدگی سے سر جھکائے جھکائے بولا تو اس کی بات پر اماں جی خوامخواہ شرمندہ ہو گئیں۔

"مصلحتاً جھوٹ بولنے میں تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔" وہ کچھ دیر بعد پیڑہ بناتے ہوئے خفت مٹانے کو بولیں۔

"میں کل پھر چلا جاؤں گا، عبدالمبین کے مدرسے بھی اور ادھر نہ ہوا تو گاؤں بھی۔ آج شام کو تو وہ یوں بھی مدرسے چلا ہی جائے گا۔ اس کی چھٹی جو ختم ہو جائے گی۔" وہ ان کی شرمندگی رفع کرنے کی خاطر بولا۔

"جلیل! تیرا یہاں دل لگ گیا۔" وہ موضوع بدل کر بولیں۔

"کچھ کچھ اماں جی! اصل میں میرا کام تو پہلے بھی مسجد ہی میں ہوتا تھا اور اب بھی، اسی لیے مجھے کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ اماں جی! جو نیچے مؤذن صاحب ہیں نا شفیق بھائی! وہ بہت پڑھے لکھے ہیں، ان کے پاس بہت موٹی موٹی کتابیں ہیں، ماسٹر صاحب کی طرح حدیث اور تفسیر کے علاوہ انگریزی کی بھی۔ انہوں نے بہت پڑھ رکھا ہے۔

فارسی، عربی، انگریزی۔" وہ جوش سے انہیں بتانے لگا۔

"اچھی بات ہے، علم حاصل کرنا تو۔" انہوں نے روٹی بیل کر توے پر ڈالی۔

"میں نے ان سے کہا کہ مجھے بھی پڑھا دیا کریں، رات میں، میں ان کے پاس ہی سوتا ہوں نا! انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ پڑھا دیا کریں گے۔"

جلیل بہت خوش تھا، اپنی بات ان سے کہہ کر۔ اسے تو کسی سے اپنے دل کی بات بھی نہیں کہنی آتی تھی۔ ہوش میں آ کر آنکھ کھولی تو خود کو مسجد میں پایا اور صوفی صاحب کے رعب نے کتنا عرصہ اسے بولنے کی طاقت بھی نہ دی تھی۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ جلیل بچے! پڑھ لو گے، اپنا کوئی مستقبل بنا لو گے، مسجد میں رہنے سے تو تمام عمر نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرنے اور صفیں جھاڑنے میں گزارو گے۔ بے شک یہ بھی برا فعل نہیں مگر علم سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ افسردہ لہجے میں بول رہی تھیں، اسی طرح کے خواب تو انہوں نے عبدالمتین اور عبدالمبین کے لیے بھی بُنے تھے اور ادھر تو جیتے جی سب کچھ ہی الٹ ہونے جا رہا تھا۔ انہوں نے سالن پلیٹ میں ڈال کر روٹی جلیل کے آگے رکھی۔ وہ لقمہ توڑ کر کھانے لگا۔

☼ ☼ ☼

"داستان چھوڑ آئے ہیں۔" کیپٹن شہباز پر یہ فقرہ بالکل صادق آتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے ایک داستان ہی تو چھوڑ آئے تھے۔ کیا وہ سوچ سکتے تھے کہ وہ دن کیسا طلوع ہوا ہوگا جب نزہت تنہا اپنے کمرے سے نکلی ہوگی۔ کیا وہ دن ایک عورت کے لیے طلوع ہو سکتا ہے، جس کی رات میں اس کا روپ سہاگنوں جیسا ہو اور دن کے اجالوں میں اجاگنوں جیسے اس کا پیرہن چھوئے بن، بن برتے ٹھوکر مار کر چلا گیا ہو، اس سے بڑی اہانت کسی بھی عورت کے لیے دنیا میں اور کوئی نہیں ہوگی۔ دنیا کا وہ معاشرہ جس کا کوئی قاعدہ قانون یا ضابطہ اصول ہوگا، وہ اسے گوارہ نہیں کرتا تھا۔ یہ شادی کا ڈھونگ شہباز کے نزدیک ڈھونگ تھا، سوانگ تھا اور خود پر جبر کر کے انہوں نے سوانگ بھرا تھا تو یوں ہی سہی، فقط چند گھنٹے صرف دنیا داری کی خاطر وہ اس کمرے میں بنا اس کی طرف دیکھے، بنا اس سے بولے، بتا جاتے تو شاید اسے اتنی بڑی ذلت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ کل اور آج میں کچھ خاص فرق تو نہ تھا۔ کل ساری دنیا کے سامنے تماشا بنے چلا تھا اور آج گھر کے اندر اہلِ خانہ کے سامنے اور گھر آئے مہمانوں کے سامنے۔

اس نے اپنے دل کو تو سمجھا لیا تھا رو کر، اپنی ذلت کے نشان مٹانے کی کوشش کر لی تھی، سجدے میں سر رگڑ رگڑ کر اللہ کے سامنے آہ و زاریاں کر کے دل کا سکون بھی حاصل کر لیا تھا۔ صبح دم اسے پرسکون سی نیند بھی آ گئی تھی مگر دنیا... دنیا اسے اس طرح سکون کی نیند کیسے سونے دے سکتی تھی بھلا۔ وہ جانتی تھی اس کا شوہر اسے ناپسندیدگی کی سند عطا کر کے جا چکا ہے مگر دنیا نے کہا اس سانحے پر سونا نہیں، ماتم کرنا چاہیے۔ اونچے اونچے بین ڈالنے چاہئیں، سارے زمانے میں اپنی کم نصیبی کا واویلا کرنا چاہیے۔

پہلی چیخ عالیہ بھابھی کی تھی۔ اسے کمرے میں پرسکون انداز میں سوتے دیکھ کر، ادھ کھلا دروازہ، بیڈ کے دوسری طرف بے شکن بستر اور کیپٹن شہباز کا ڈریسنگ کے ساتھ پڑا غائب بیگ...... انہیں پل بھر میں خاکے سمیت کہانی کے پیچ دار مراحل سے آگاہ کر گیا تھا۔

پھر عالیہ بھابھی کے واویلے کے ساتھ ہی بہت سی مہمان خواتین بھی کمرے میں آ گئیں۔ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اس کا ذہن اس ہنگامے پر نیم سویا، نیم جاگا سا تھا۔ ایک تو رات بھر کا رت جگا وہ بھی آنسوؤں کے چراغوں کے ساتھ۔ اس کا دماغ ویسے ہی ٹرین کے بھاری انجن جیسا ہو رہا تھا اوپر سے یہ ہنگامہ۔

"آخر ایسی بھی کیا آفت آ گئی شہباز میاں پر کہ راتوں رات چند گھنٹوں کی بیاہی دلہن کو چھوڑ چھاڑ کر نوکری کو

سدھارے۔ کیا فوجی سپاہی شادی وادی نہیں کرتے۔ انہوں نے تو نرالا ہی تماشا کھڑا کر رکھا ہے' کل پرسوں سے سب دیکھ رہے ہیں۔ کیوں نزہت! اب رات کو ایسی کیا بات ہو گئی کہ صاحبزادے بالکل ہی اٹھ کر چل پڑے۔"

شاید یہ عالیہ بھابھی کی والدہ محترمہ تھیں' وہ خاموش رہی۔ نہ اس کے پاس ان کے لایعنی سوالوں کے جواب تھے' نہ انہیں اس کے جواب سے مطمئن ہونا تھا' سو چپ رہی۔

"ارے اچھا بھلا تو کمرے میں آیا تھا' موڈ بھی ٹھیک لگ رہا تھا۔ باہر سے تو ہنستا کھیلتا ہی کمرے میں گیا تھا۔ اب اندر اللہ جانے کیا پتا پڑی کہ دولہا میاں نو دو گیارہ ہو گئے۔ عالیہ! اپنی ساس کو بتاؤ جا کر جو بیٹے کو حجلۂ عروسی میں بھیج کر شانت ہو کر سو رہی ہیں۔"

دوسری خاتون کو خیال آیا۔ "ہاں تو نزہت کیا کیا شہباز نے۔ بھلا دلہن پسند نہیں آئی' کوئی بہانہ بنا دیا یا سیدھا سیدھا منہ پر کہہ دیا کہ تم مجھے پسند نہیں۔"

خاتون منہ پھٹ تھیں۔ پُرشوق نظروں سے تکتے ہوئے بولیں تو نزہت نے ایک زخمی نگاہ ان پر ڈالی۔

"ارے اس کو بہانے کی کیا ضرورت۔ آج کل کے مرد لڑکی پسند نہ آئے منہ پر کہہ جاتے ہیں' اٹھیں کس کا ڈر اور دلہن کی بے فکری دیکھو' کوئی غم' کوئی افسوس نہیں۔ مزے سے سو رہی ہے۔" تیسری خاتون نے دونوں طرح کے تبصرے کیے۔

"پہلے ہی آپا جان سے کہا تھا۔ یہ زبردستی کی کھیر نہ کھلائیں اسے' نتیجہ اس سے مختلف اور کیا ہونا تھا بھلا۔" عالیہ بھابھی کیوں پیچھے رہتیں' ناک چڑھا کر بولیں۔

"ہیں۔ زبردستی کی کھیر۔ کیا شہباز میاں راضی نہ تھے۔ یہ تو نئی سنی ہم نے۔" سب سے پیچھے کھڑی متجس نگاہوں والی دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت آگے آ کر بولی۔

"ہاں تو اور کیا' سب کو پتا ہے اتنے دنوں سے ادھر اور کیا ہو رہا ہے۔ یہاں نے ہاتھ پیر جوڑ کر تو اسے ادھر بلایا تھا۔ آگے..." فائزہ بی بی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی' پیچھے سے بولی۔

"پلیز فار گاڈ سیک۔" ان سب کے درمیان مجرم بنی بیٹھی نزہت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا' وہ ایکدم سے سر اٹھا کر زور سے چیخی۔

"چلے جائیں آپ لوگ یہاں سے' میں آپ لوگوں کے آگے جواب دہ نہیں ہوں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیں' چلے جائیں یہاں سے۔"

اس کی تیز آواز پر سب خواتین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ تیزی سے اٹھی اور واش روم کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

دروازہ لاک کر کے وہ واش بیسن کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور آنکھیں بے تحاشا دکھ رہی تھیں۔ اب تو شاید ان میں رونے کی بھی سکت بھی نہ رہی تھی۔ بھولے بھٹکے دو آنسو پلکوں پر آن ٹھہرے اور پھر ایک کے بعد ایک قطار بنتی چلی گئی۔ کمرے سے ابھی بھی آوازیں آ رہی تھیں۔

"آخر میں کیوں روؤں' صرف میں ہی کیوں۔" اس نے زور سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں اور ٹونٹی کھول کر پانی کے چھینٹے اپنی آنکھوں اور چہرے پر مارنے لگی۔

"بی بی! آپ بڑی بیگم صاحبہ کے کمرے میں ناشتہ کریں گی یا ادھر ہی لے آؤں۔" اسی وقت زیتون بانو نے دروازے پر آ کر اس سے پوچھا تو وہ چونک اٹھی۔

"پھپھو اٹھ گئی ہیں؟"

"جی اٹھ چکی ہیں اور آپ کا پوچھ رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' آپ ناشتہ ان کے کمرے میں لگائیں' میں فریش ہو کر ادھر ہی آ رہی ہوں۔" وہ اٹھ کر وارڈ روب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

مسز خان کے کمرے میں اظہر اور ایاز بھی موجود تھے۔ سینٹر ٹیبل پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔ مسز خان وہیل چیئر پر ٹیبل کے پاس ہی بیٹھی تھیں' جب وہ زیتون بانو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور سب کو سلام کر کے مسز خان کے ساتھ پڑی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ناشتہ سب نے بالکل خاموشی سے کیا' کسی نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ ناشتے کے فوراً بعد اظہر اور ایاز تو اجازت لے کر چلے گئے' وہ خاموشی سے چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتی رہی۔

"شاید پھپھو اب مجھ سے کچھ پوچھیں۔" وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔

اس کا کپ بھی خالی ہو گیا اور زیتون بانو ناشتے کے برتن بھی سمیٹ کر لے گئی۔ مسز خان نے اسے خود سے مخاطب نہ کیا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھپھو! میں سونا چاہتی ہوں' میرے سر میں درد ہے اور میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھاؤں گی۔" وہ انگلیاں چٹخا کر بولی' وہ ان کی خاموش نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔" ان کا جملہ ختم ہوتے ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔

پھر شام تک واقعی اسے کسی نے ڈسٹرب نہیں کیا۔ اس نے جی بھر کر نیند پوری کی اور جب اٹھ کر بیڈ روم سے باہر آئی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ویسے بھی موسم بدل رہا تھا' دن کافی جلدی سمٹ جاتا تھا' شام کو آنے کی بہت جلدی ہوتی تھی' وہ کچن میں جا کر اپنے لیے چائے بنانا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے ماچس کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ زیتون بانو بوتل کے جن کی طرح اس کے سر پر آن نمودار ہوئی۔

"بی بی! چھوٹے صاحب کا فون ہے' بیگم صاحب آپ کو بلا رہی ہیں۔ آپ ان کے کمرے میں چلیں' میں چائے وہیں لے کر آتی ہوں' کھانا نہیں کھائیں گی آپ؟"

"نہیں' صرف چائے۔ اگر ساتھ کچھ ہے تو لے آئیں' ورنہ خالی چائے۔" وہ باہر نکل آئی۔

گھر میں مکمل خاموشی تھی' لگتا تھا تمام مہمان جا چکے ہیں۔ مسز خان فون پر بات کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی پرجوش ہو گئیں۔ ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ صبح والی سرد مہری غائب تھی۔ "بہرحال جو بھی کیا تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس پر تو تب بات ہو گی جب تم آؤ گے' فون پر میں کیا بحث کروں۔ سب کیے کرائے پر تم نے پانی پھیر دیا۔ سب کی نظروں میں مجھے شرمندہ کرا دیا جس کی مجھے تم سے امید نہ تھی۔ اب تم جلد سے جلد پندرہ دن کی چھٹی لے کر آؤ ہنی مون کے لیے اور اب میں کوئی معذرت نہیں کروں گی۔ بہت تم نے اپنی من مانی کر لی۔ یہ لو نزہت سے بات کرو اور معذرت بھی کرنا۔"

بات کرتے کرتے انہوں نے کارڈ لیس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ذرا سا جھجک کر فون ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے کان سے لگاتے ہی دھیرے سے سلام کیا مگر دوسری طرف لائن بالکل بے جان ہو چکی تھی۔ بے عزتی کے احساس سے ایکدم ہی اس کے کانوں کی لوئیں دہک اٹھیں۔ مسز خان مسکراتے ہونٹوں اور مشتاق نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ غیر محسوس طریقے سے ذرا سا دروازے کی طرف کھسک گئی۔

"جی... جی... میں سن رہی ہوں۔" بہت آہستگی سے اس نے بے جان لائن کو مخاطب کیا' اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

"ہوں...." پھر وہ یونہی چند سیکنڈ اپنے ہونٹ ہلاتی رہی۔ مسز خان کی نظریں مسلسل اس پر جمی تھیں' اس نے فون بند کر کے ان کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"شرمندہ ہے نا' مجھ سے بھی معافی مانگ رہا تھا۔ بہت جلد باز ہے' متلوّن مزاج۔ جتنی جلدی ناراض ہوتا ہے' اتنی جلدی مان بھی جاتا ہے۔ دل کا بہت سادہ ہے میرا بیٹا۔ تم فکر نہ کرو' بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ اسے تسلی دے رہی تھیں' وہ ان کی طرف سے ذرا سا رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پچھلے لان میں انار اور آلوچے کے درخت تھے' شام ڈھلے پرندے شور مچاتے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے'

"تم سے کیا بات ہوئی؟" مسز خان ابھی بھی پُرجوش تھیں' نزہت نے غائب دماغی سے انہیں دیکھا اور پھر گردن موڑ کر شام کے ڈولتے رنگ دیکھنے لگی۔

"کیا لائن کٹ گئی تھی یا شہباز نے خود بند کیا تھا فون؟" وہ اس سے سننا چاہ رہی تھیں۔

"جی لائن کٹ گئی تھی۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر رخ پوری طرح سے ان کی طرف گھما لیا تھا۔

"آج کل یہ بڑا مسئلہ ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا' اگلے ہفتے چھٹی لے کر آؤں' میں نے بھی تاکید کی ہے' تم بھی دل بُرا نہ کرنا نزہت! بگڑے ہوئے معاملے کو سنوارنے کے لیے جی کو مارنا پڑتا ہے' انا کو کچلنا پڑتا ہے۔ وہ اگر تمہاری طرف متوجہ نہیں بھی ہوتا تو بھی تم اپنے التفات کا اظہار کرنے میں گریز نہ کرنا۔ میاں بیوی میں کوئی انا یا شرمندگی کی بات نہیں ہوتی۔ ایک اگر روٹھ جائے تو دوسرا ان کے منالے' تو یہ اس کی بڑائی ہوتی ہے۔ اس میں چھوٹا پن نہیں ہوتا۔ میرے بچے تمہارا معاملہ ابھی نیا نیا ہے' بہتر ہے اپنے جی کو مار کر اپنی گرہستی' اپنے سہاگ کو راضی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔ نکاح کے بولوں میں جادو ہوتا ہے' بڑے سے بڑے پتھر دل کو موم کر دیتا ہے۔ مان جائے گا وہ بھی پھر تم تو اس کی پسند ہو' کتنا عرصہ منہ موڑے گا۔ میں کوشش کروں گی وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے یا اس کی ٹرانسفر ادھر ہو جائے' جتنا دونوں قریب رہو گے' اتنی ہی الجھنیں کم ہوں گی' غلط فہمیاں دور ہوں گی۔"

☼ ☼ ☼
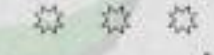
گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے تھے۔ اگر فضل دین بریک نہ لگاتا تو آگے لیٹا ہوا لڑکا یقیناً اب تک مرحومین کی صف میں جا کھڑا ہوتا۔ فضل دین غصہ میں پھنکارتا ہوا گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

"اوئے اندھے' الو کے کان' گدھے' نامراد' تجھے مرنے کے لیے یہی گاڑی نظر آئی تھی جو بیچ سڑک پر آن لیٹا بدبخت! میں مار بھی دیتا تو مجھے کسی نے کچھ نہیں کہنا تھا۔ تیرے پچھلوں نے ہی تیری بھری جوانی کو رونا تھا اور کسی نے انہیں رونے نہ دینا تھا' بے غیرت انسان۔"

فضل دین کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ اس نے جھٹکے سے نیچے لیٹے لڑکے کو ٹھڈا مارا جو پہلے ہی گاڑی کے ٹائروں سے ٹکرا کر کچھ دور جا پڑا تھا۔

"ہائے میں مر گیا' اندھے ہو نظر نہیں آتا' اچھا بھلا موڑ مڑنے لگا تھا کہ یہ کانٹا سارا ایڑی کے اندر چلا گیا۔ اس کو نکالنے جھکا تھا کہ تو نے وحشیوں کی طرح گاڑی میرے اوپر چڑھا دی' ہائے۔" وہ ہمت کرکے اٹھ بیٹھا۔ فضل دین نے جھک کر اس کا پاؤں دیکھا جس کی ایڑی میں کانٹا اندر تک چلا گیا تھا اور خون نکل رہا تھا۔

"تو پرے کہیں مر کر یہ کانٹا نکالنا تھا نا' ادھر سڑک پر دفن ہونے کی کیا ضرورت تھی۔" اب کے اس کی جھاڑ میں نرمی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر زور لگایا اور کانٹا باہر کھینچ ڈالا۔

عبدالمبین کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔

"جوان لڑکا ہے' کیا زنانیوں کی طرح چیخ رہا ہے۔" فضل دین نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے پاؤں پر باندھنا شروع کر دیا۔

"تجھے دیکھا ہے کہیں' یاد نہیں پڑتا۔" پٹی باندھتے ہوئے وہ اسے بغور دیکھ کر بولا۔

"صوفی صاحب کا چھوٹا بیٹا ہوں میں' عبدالمبین۔" وہ آہستگی سے بولا

"اوہ اچھا! یاد آیا۔" فضل دین پٹی کی گرہ لگا کر سرہلانے لگا۔

"صوفی صاحب تو چلے گئے ادھر سے بالکل اچانک ہی۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلا اور مل کر بھی نہیں گئے۔ کسی سے مجھے بھی کل پرسوں ہی پتا چلا۔"

وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا تو عبدالمبین بھی اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر ہائے ہائے کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں' یہی تو ہوا میرے ساتھ۔ میں مدرسے میں تھا' بابا صاب اچانک ہی چلے گئے' مجھے پتا چلا ہے کہ ان کا تبادلہ لاہور ہوا ہے۔ میں پرسوں ہی تو آیا ہوں ادھر' اب اس لیے بڑی سڑک کی طرف جا رہا تھا کہ لاہور جا کر ان کو

ڈھونڈوں۔" اس نے چہرے پر زمانے بھر کی مسکینی طاری کرکے کہا۔

"باؤلا ہوا ہے' لاہور کوئی تمیں چالیس گھروں کا پنڈ نہیں' انسانوں کا سمندر ہے اور ایک شخص کو اس سمندر میں سے ڈھونڈنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی مچھی (مچھلی) پکڑتا ہے۔ تو انہیں کہاں ڈھونڈے گا' جا چلا جا واپس' وہ خود ہی تجھے لینے آجائیں گے۔" فضل دین اسے نصیحت کرکے مڑنے لگا۔

"چاچا فضل دین! مجھے اپنے گھر جانا ہے' اپنے بابا صاب کو ڈھونڈنا ہے' وہ ادھر شہر میں ہیں' آپ ادھر ہی تو جا رہے ہو' مجھے شہر اتار دیں' میں خود ہی انہیں تلاش کر لوں گا' ہائے۔" اس نے بے چارگی کا احساس بڑھانے کے لیے اپنا کندھا دبایا اور پھر اپنے رگڑ شدہ گال کو سہلانے لگا۔ اس کے منہ پر اچھی خاصی رگڑ آئی تھی۔

"او پتر! میرے بچے! شہر جا کر کسی کو ڈھونڈنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ تو خود ادھر جا کر گم ہو جائے گا' یہ غلطی نہ کر۔ جا گاؤں جا کر بیٹھ۔ کوئی تجھے خود ہی لینے آجائے گا۔" فضل دین اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"نہیں چاچا! آپ مجھے بس شہر چھوڑ دو۔" وہ لجاجت سے بولا۔ "اچھا اگر وہ مجھے نہ ملے تو میں شام میں خود ہی واپس آجاؤں گا' وعدہ کرتا ہوں۔" وہ اس کا بازو تھام کر بولا۔

"اوئے احمقاں! میں چھوٹی بی بی کو کالج چھوڑنے جا رہا ہوں' چھوٹے شاہ جی کو علم ہو گیا تو میری کھال میں بھس بھروا دیں گے۔ اگر بی بی میرے ساتھ نہ ہوتیں تو ضرور تیری بات مان لیتا۔ چل جا شاباش گاؤں واپس پھر کسی دن لے جاؤں گا۔" فضل دین اسے پچکارتے سمجھاتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"نہیں چاچا! میں گاؤں واپس نہیں جاؤں گا' مجھے اپنے گھر جانا ہے' اماں جی کے پاس۔ اچھا تم جا کر چھوٹی بی بی سے اجازت لے لو' ان سے میرا مسئلہ بیان کرو' اگر انہوں نے اجازت نہ دی تو پھر بے شک نہ لے جانا۔"

وہ رو دینے کو تھا' فضل دین کچھ دیر تک افسوس بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر اپنی چادر کا پلو جھاڑ کر گاڑی کی طرف مڑ کر پچھلی کھڑکی کے ادھ کھلے شیشے کے پاس جا کر شہرینہ سے بات کرنے لگا۔ وہ پہلے ہی اس ساری صورت حال سے بیزار بیٹھی تھی۔

"بی بی! وہ بے چارہ رو رہا ہے۔ اسے میں شہر شروع ہوتے ہی اتار دوں گا' صوفی صاحب کے ہم پر بڑے احسان ہیں' ہمارے بچوں کو پڑھایا ہے انہوں نے' اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے گاڑی میں بٹھا لوں۔" ساری بات بتا کر فضل دین سفارشی لہجے میں بولا۔

"یہ ٹھیک بات نہیں۔" اس نے سوچ کر انکار کر دیا۔

"اچھا جی' میں اسے انکار کر دیتا ہوں۔" فضل دین مؤدب لہجے میں بولا اور جانے لگا۔

"اچھا سنو' بٹھا لو اسے مگر لالہ کو پتا نہ چلے۔" اسے شاید عبدالمبین کی خستہ حالت پر رحم آگیا تھا۔ جو بڑی مسکین نگاہوں سے گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اچھا جی' نہیں پتا چلے گا چھوٹے شاہ جی کو۔" فضل دین اپنی سفارش مانے جانے پر خوش ہو کر بولا۔

چند لمحوں بعد عبدالمبین فضل دین کے ساتھ بیٹھا شہر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ سفر کے دوران کن اکھیوں سے کبھی کبھی بیک مرر میں دیکھ لیتا تھا۔ شہرینہ نے مکمل نقاب کر رکھا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں باہر تھیں' جو کھڑکی سے باہر کے مناظر پر لگی تھیں۔ ایک دو بار جب عبدالمبین کے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے پر اس نے گھور کر اسے دیکھا تو اس نے ڈھٹائی سے مسکرا کر نگاہوں کا رخ بدل لیا۔

"کہاں اتاروں تمہیں۔" شہر کی حدود شروع ہوتے ہی فضل دین نے کچھ اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"فضل دین! پہلے مجھے کالج چھوڑ دو' مجھے دیر ہو رہی ہے۔" شہرینہ نے کلائی پر بندھی ریسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر بیزاری سے کہا تو فضل دین نے "جی اچھا" کہہ کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

شہرینہ کالج کے سامنے اتری تو فضل دین نے عبدالمبین کو بھی کالج گیٹ سے ذرا فاصلے پر بنے بس اسٹاپ پر اتار دیا۔ وہ لنگڑاتا ہوا نیچے اترا' اس کے منہ سے "سی سی" کی ہلکی آواز بھی نکل رہی تھی۔ پاؤں میں واقعی تکلیف

تھی اور کچھ کندھے میں بھی، باقی کی بے چارگی اس نے خود سے چہرے پر طاری کرلی تھی۔

"اچھا سنو، میں بی بی کو دو بجے لینے آؤں گا، اگر تم دو بجے تک ادھر آ سکتے ہو تو آجانا، میں تمہیں واپس گاؤں لے جاؤں گا۔"

"شکریہ چاچا! میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ مجھے لے کر جائیے گا، مجھے ادھر کے رستوں کا علم نہیں۔" وہ کہہ کر اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا تو فضل دین گاڑی موڑنے لگا۔

اور دوپہر کو دو بجنے میں دس منٹ تھے، جب وہ کالج کے گیٹ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ یہ الگ بات تھی، وہ کالج سے زیادہ دور کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ بس ارد گرد کی سڑکوں اور مارکیٹ میں آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔

"کچھ پتا چلا صوفی صاحب کا؟" فضل دین بھی اسی وقت پہنچا تھا، اس کی شکل دیکھتے ہی بولا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے ہاتھ سے بائیں ٹانگ کو آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

"تمہیں درد ہو رہا ہوگا، ایک تو کانٹا چبھا تھا، گاڑی کی چوٹ الگ اور پھر اس مشقت میں پڑ گئے۔ آؤ بیٹھ جاؤ گاڑی میں، بی بی آنے والی ہوں گی۔" فضل دین کی آفر پر وہ جھٹ سے فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ شہرینہ چند منٹوں بعد ہی آگئی تھی۔ کالج کے باہر زیادہ رش نہیں تھا۔ لگتا تھا چھٹی ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ عبدالمعین کو ترکیب سوجھی جیسے ہی فضل دین نے گاڑی اسٹارٹ کی، وہ بول پڑا۔

"چاچا! وہ سامنے..." اس نے انگلی کے اشارے سے "وہ" کو خوب کھینچ کر لمبا کیا۔ "جو آدمی نہیں کھڑا سفید گاڑی کے باہر، وہ آپ کو بلا رہا ہے۔"

اس نے سڑک پار ذرا فاصلے پر سفید گاڑی کے باہر کھڑے باوردی ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔ جو ادھر ہی دیکھ رہا تھا، بلکہ شاید دیکھ وہ گیٹ کی طرف رہا تھا۔

"اس نے مجھے کیوں بلا رہا ہے، میں تو اسے نہیں جانتا۔" فضل دین کچھ حیرانی سے بولا۔

"معلوم نہیں، جا کر پوچھ لو۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تو فضل دین نے گاڑی بند کی اور نیچے اتر گیا۔ عبدالمعین کے پاس چند سیکنڈ ہی تھے۔

"شہرینہ بی بی! آپ کو معلوم ہے جب چوٹ لگتی ہے تو بہت درد ہوتا ہے، مجھے بھی صبح گاڑی سے چوٹ لگی اور کانٹا چبھا، بہت درد ہوا، مگر آپ کو معلوم ہے، میں نے یہ چوٹیں خود کو خود سے لگوائیں اور درد بھی خود سہا..... کس لیے....؟" فضل دین واپس آرہا تھا۔

"صرف آپ کے لیے، آپ کے قریب آنے کے لیے، آپ کو قریب سے دیکھنے کے لیے کیونکہ..... کیونکہ آپ مجھے..... بہت اچھی لگتی ہیں بہت زیادہ..... "اور شہرینہ کا مارے حیرت کے برا حال تھا۔

"تمہاری تو لگتا ہے آنکھیں بھی اندھی ہو گئی ہیں، صبح کی چوٹ سے لگتا ہے بھیجا ہل گیا ہے تمہارا۔ وہ آدمی بھلا مجھے کیوں بلائے گا، خوامخواہ وقت برباد کیا۔" فضل دین اونچا اونچا بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

عبدالمعین کے چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ سامنے لگے چھوٹے سے آئینے میں شہرینہ کے تاثرات دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں حیرت اور غصہ تھا۔ اس نے خود پر ضبط کر کے اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی اس بے ہودہ بدتمیز لڑکے کو ابھی گاڑی سے اتار دے تو پھر اس کی لنگڑاتی ٹانگ کا خیال آ گیا۔

☆ ☆ ☆

"تم آج کالج نہیں گئے؟" نزہت لاؤنج میں داخل ہوئی تو معاذ کو کتابیں لے کر بیٹھے دیکھ کر بولی۔

"آج کالج میں اسپورٹس ڈے تھا اور کل ہمارے تین ٹیسٹ کیمسٹری کے ہیں، تین چیپٹرز کے، فزکس کے دو اور انگلش کا ٹیسٹ۔ اس لیے میں نے سوچا گھر پر رہ کر تیاری کرتا ہوں، بڑے اہم ٹیسٹ ہیں، اس لیے چھٹی ماری ہے۔" وہ نوٹس فائل میں ترتیب سے لگاتے ہوئے مصروف لہجے میں بولا۔

"ہوں، مجھے بھی ایف ایس سی میں بہت پڑھنا پڑا تھا مگر میں تمہاری طرح پڑھاکو نہ تھی۔ اصل میں مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کی لت لگ گئی تھی ان دنوں۔ اس لیے میرٹ نہ بن سکا، ویسے تھوڑے مارکس سے ہی میرا میڈیکل کا ایڈمیشن رہ گیا تھا۔ ابو جی کو بہت شوق تھا اپنے دونوں بچوں میں سے کسی ایک کو ڈاکٹر بنانے کا۔ سہیل بھائی تو شروع ہی سے میتھس کے کیڑے تھے، اس لیے ابو جی نے اپنی ساری امیدوں کا رخ میری طرف موڑ دیا اور جب میرے مارکس کم آئے تو انہیں بہت غصہ آیا تھا۔" بہت سارے دنوں بعد اس نے اتنی طویل بات کی تھی۔ وہ بھی سب کچھ بھول بھال کر (اپنی ٹریجڈی کا بھوت سر سے اتار کر)

"پھر تو انہوں نے آپ کو خوب ڈانٹا ہوگا؟"

معاذ نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس نے بھی شاید پہلی بار نزہت کا چہرہ آنسوؤں کے بغیر دیکھا تھا، اس کا دھیان بٹانے کو بولا۔

"ڈانٹا تو خیر بہت نہیں تھا۔ البتہ مجھ سے دو دن صحیح سے نہیں بولے تھے، بس چپ گروپ پھر ان کا غصہ نکلا تو میرے ڈائجسٹ کے ذخیرے پر، انہوں نے گھر بھر میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ڈائجسٹ اکٹھے کیے اور ایک بوری میں بھرے، اسٹور میں بوری رکھ کر اسٹور کو تالا لگا کر چابی اپنے لاکر میں رکھ لی۔ اف ابو جی کی یہ سزا بہت کڑی تھی اور ہاکر سے بھی سختی سے کہہ دیا تھا انہوں نے کہ کوئی ڈائجسٹ نہ لے کر آئے۔ اتنے انتظار کے بعد تو فراغت کے وہ دن نصیب ہوئے تھے۔ ڈائجسٹ پڑھنے کا خیال ہی تو مجھے جلدی جلدی نوٹس رٹنے کی طاقت دیتا تھا۔ ابو جی نے ساری خوشی پر پانی پھیر دیا۔ چند دن تو میں نے روتے بسورتے گزارے پھر ایک دن میں نے بھی کام والی کے ذریعے چابی بنانے والے کو بلوایا اور تالے کی ایک چابی اور بنوالی۔ روز ایک ڈائجسٹ نکالتی، پڑھ کر ابو جی کے آنے سے پہلے واپس رکھ آتی۔"

[illegible] بڑی پیاری مسکراہٹ تھی، وہ ماضی کے ان خوبصورت ان مول لمحوں کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔

"آپ نے ابو جی کو پتا نہیں چلا؟" معاذ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ ان کے سامنے تو میں بہت معصوم بن کر پھرتی تھی۔"

"یہی تو فن آتا ہے لوگوں کو۔ سب کچھ کر کرا کر بھی معصوم شکلیں بنا کر ساروں کی ہمدردیاں بھی سمیٹتے ہیں اور دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ڈنکا بھی پیٹتے ہیں۔ کسی بھی ہماشما سے لے کر سر پاور تک دیکھ لو، سب کی ایک ہی پالیسی ہے، چہرے پر چہرہ۔" عالیہ بھابی اچانک ہی ٹپکی تھیں اور آتے ہی زہر افشانی کرنے لگی تھیں۔ خدا جانے انہیں نزہت کی مسکراہٹ سے کیوں چڑ تھی، ضرور ہی اسے رلانے پہنچ جاتی تھیں۔ نزہت تو ہڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ معاذ کتابیں [illegible] لگا۔

"کیا باتیں کر رہے تھے بھئی! کرو نا، میں نے خوامخواہ رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ اتنی اچھی کمپنی میں خوشگوار باتیں ہو رہی تھیں۔" وہ کچو کا لگانا نہ بھولیں۔

"کوئی خاص بات نہیں ہو رہی تھی، میں بس معاذ سے اس کی کالج سے چھٹی کی وجہ پوچھ رہی تھی۔" نزہت سے رہا نہ گیا تو سنبھل کر بولی۔

"ارے تو میں نے کون سا پوچھا ہے کہ خیر سے کون سے راز و نیاز ہو رہے تھے۔"

وہ ٹھٹھا لگا کر ہنسیں۔ "خیر سے دونوں جوان جہان ہو، اس عمر میں تو یونہی بھی ہنسنے مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔ ساسو جی ہماری کھٹیا سنبھال کر بیٹھ گئی ہیں۔ پیا سدھار گئے پردیس تو کیوں نہ کریں عیش بھئی۔" وہ تیر جو ان کی زبان سے زیادہ نظروں سے وار کر رہے تھے، نزہت اور معاذ کو ہراساں کرنے کے لیے بہت کافی تھے۔ معاذ نے گڑبڑا کر کتابیں ہی سمیٹ لیں۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں بھابی! میں تو کچن میں جا رہی تھی، معاذ سے سبزی لانے کے لیے کہنے آئی تھی۔" نزہت کا رنگ یکدم ہی اڑ گیا۔ حلق خشک سا ہو گیا، لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے بی بی! میں نے وجہ پوچھی ہے تم سے اور تم کب بتاؤ گی مجھے اصل بات۔ اس گھر میں پوچھنے تاچھنے کا رواج خاک ہوا۔ اب تو جس کی جو مرضی میں آتا ہے' کر گزرو' چاہے سڑکوں سے لا کر لوگوں کو تخت پر بٹھالو۔ اب یہ اپنے معاذ میاں کو ہی دیکھو' بتاؤ بھلا کون کرتا ہے آج کل ایسی انھونی نیکیاں۔ ہمارے دیور جی کو بھی نیکیاں پالنے اور ان کو پروان چڑھانے کا شوق ہے' دیکھو کب تک رہتا ہے۔

اور جو معاذ میاں انہوں نے یہ نیکی بغیر کسی اجر کے کرنے کا سوچ ہی لیا ہے تو تم ہی کچھ خیال کرو۔ انسان میں کچھ تو غیرت ہونی چاہیے۔" ان کا حملہ بہت ڈائریکٹ تھا۔ معاذ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ خود پر ضبط کر کے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔" بہت نیچی آواز تھی اس کی۔

"لو بھلا میں نے تم سے کیا کہنا ہے۔ یہ تو تمہارے جاننے کی باتیں ہیں۔ اپنے گھر میں کتا بھی پالو تو وہ بھی گھر کی رکھوالی کرنا اپنا فرض جان لیتا ہے' تم اتنا ہی سوچ لیتے۔" معاذ کو ضبط کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"ہاں بھئی! بچے جو ٹھہرے' پرائی بچپنے میں نہ رہ جانا' مارے جاؤ گے۔ ہمارے دیور جی لاکھ نیکیاں پالنے کے شوقین سہی۔ تھوڑی بہت غیرت تو ہو گی ان میں۔ کوئی بھی کھیل سوچ سمجھ کر کھیلنا۔"

معاذ بچہ سہی مگر اتنا بھی نہیں کہ ان کی بکواس کا مطلب نہ سمجھ سکتا۔ اس نے جھک کر کتابیں اٹھائیں اور جانے لگا۔ اس سے بہتر جواب اسے ان کی بکواس کا نہیں سوجھا تھا۔

"ارے میاں! جاتے کہاں ہو' میں نے گھر کی رکھوالی کی مثال اس لیے دی تھی کہ کچھ غیرت دکھاؤ' آخر مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہو۔ گھر کا فرد بننے کا بڑا شوق ہے تو کچھ گھر کے کاموں کی بھی فکر کرو' باقی کے معاملات تم جانو' تمہاری یہ نئی نویلی آپی جانے اور ہمارے سیدھے سادے دیور جی جانیں۔ یہ بل پکڑو' بجلی کا بل ہے' اس کی آج آخری تاریخ ہے' اور آج ہی گیس کے بل کی بھی آخری تاریخ ہے اور فون کا بل بھی ہے جو ساتھ ہی پڑا آتا کل بھی تو جانا پڑے گا۔ یہ لو پیسے اور مجھے واپس آ کر رسید دینا' اب جلدی جاؤ اور یہ معمولی سا کام کر آؤ' واپس آ کر بے شک اپنی آپی کی خوشگوار کمپنی میں انجوائے کرنا' میں دخل اندازی نہیں کروں گی' مگر ہاں' واپس آ کر تمہیں گوشت بھی لانا ہے' وہ تو یہ قریب کی مارکیٹ سے مل جائے گا' دس پندرہ منٹ کا کام ہے۔ ٹھیک ہے' کھایا پیا بندہ حلال کرلے تو اچھا لگتا ہے۔"

انہوں نے بل اور رقم اس کے ہاتھ میں تھمائی اور زور زور سے زمین پر پیر مارتی چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

"شاہ جی! اس بار آپ نے باقاعدہ "سید ہاؤس" میرے نام کرنا ہے' پکے کاغذ' یعنی نو بوگس پیپرز۔ جو کام آپ نے پچھلی بار کیا تھا' وہ نہیں کرنا۔ اس بار آپ نے یہ کام ضرور کرنا ہے۔ میں نے ماں سے وعدہ کیا ہے اور ہم اس کے بعد "سید ہاؤس" میں منتقل ہو جائیں گے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا ہے' مجھے وہ گھر بہت پسند ہے۔" نین تارا ان کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

"اوکے اوکے' اس بار یہ نیک کام بھی کرلیں گے۔ ویسے تو رہنے کے لیے "گل کدہ" بھی نسبتاً مناسب ہے۔ ابھی دو سال پہلے تو خریدا تھا پھر تم دونوں ہی تو ہوتی ہو۔ "سید ہاؤس" تو تم دونوں کے لیے بہت بڑا ہے۔" سلطان بخت کا انداز سرسری سا تھا۔

"یہی تو بات ہے شاہ جی! "سید ہاؤس" کی کیا بات ہے۔ "گل کدہ" تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں پھر مجھے یہ بھی تو خیال ہے کہ "سید ہاؤس" آپ نے خود اپنے شوق' اپنی توجہ سے بنایا ہے۔ باہر سے آرکیٹیکچر بلوائے تھے اور عمارت کا خوبصورت آرائشی پتھر بھی امپورٹڈ ہے' جس پر آپ نے اتنی توجہ دی ہو گی۔ مجھے تو وہ چیز اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہو گی نا' محبوب کی پسند کو جی جان سے پسند کیا جاتا ہے' محبت کا یہی اصول ہے نا شاہ جی!" وہ نازو دم لہجے میں

انہیں محبت کے اصول ازبر کروا رہی تھی۔

"آف کورس' تمہاری یہی باتیں تو مائی ڈیر مجھے دیوانہ بنا دیتی ہیں۔"

"پھر تو آپ کی اس دیوانگی سے مزید فائدہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں زور سے کھلکھلائی۔

"بنے بنائے دیوانے کو کیا دیوانہ بنانا۔ اجی! ہم تو پہلے سے آپ کے دیوانے ہیں اور دیوانے سے جو جی چاہے کروالو' لکھوالو' منوالو۔" شاہ جی بھی فل موڈ میں تھے' انہوں نے دائیں طرف کروٹ بدلی۔

"رہنے دیں' بڑے ہوشیار دیوانے ہیں۔" نین تارا ناز سے بولی۔

"آزمائش شرط ہے جانِ جاں! آپ کے حق میں تو ہم سراپا دیوانے ہیں' ہوش کا کچھ بھی کام نہیں کر سکتے۔" سلطان بخت ہنسے۔

"یہ بات ہے تو دیکھتے ہیں اس بار دیوانے کی دیوانگی۔ سب سے پہلے "سید ہاؤس" کی منتقلی میرے نام اور اس کے ساتھ ہی نئی کار بھی۔ کیا خیال ہے مسٹر دیوانے۔" نین تارا نے اٹھلا کر نئی فرمائش جڑی۔

"ارے وہ تو ابھی زیر تعمیر ہے۔" سلطان بخت ذرا سا چونکے۔

"تو کیا ہوا' دو چار ماہ میں مکمل تو ہو جائے گا۔ میں آپ سے پہلے کہے دے رہی ہوں شاہ جی! یہ پلازہ اور "سید ہاؤس" میرے ہی نام ہونے چاہئیں' کم از کم اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے تو میرے پاس کوئی اپنا ذریعہ آمدن ہو۔ اب کیا ہر وقت آپ کو فون کھڑکاتے رہو' میرا بیلنس ختم ہو رہا ہے۔ رقم بھیجیں' مجھ سے یہ ہر وقت کی ٹینشن نہیں سہی جاتی۔ میرا اپنا بھی تو کوئی سورس آف انکم ہونا چاہیے نا۔ آپ کو تو خود خیال کرنا چاہیے تھا' میرے کہنے سے بھی پہلے۔" وہ ذرا سا روٹھ کر بولی۔

"اوکے بھئی' سوچتے ہیں اس بارے میں بھی۔ ویسے تو تمہارا بیلنس تو ہر وقت ہی نل ہونے پر تیار ہوتا ہے' اس میں کون سی نئی بات ہے۔" ان کا انداز کچھ چھیڑ جتانے والا تھا۔

"دیوانے سوچا نہیں کرتے' بس کر گزرتے ہیں۔ میں آپ سے کہہ رہی ہوں' پھر "سید ہاؤس" اس بار پورے استحقاق کے ساتھ میرا۔ ہائے شاہ جی! وہاں کتنا خوبصورت اور کتنا بڑا سوئمنگ پول بھی تو ہے۔ "گل کدہ" میں تو وہ بھی نہیں اور مجھے سوئمنگ سے جنون کی حد تک عشق ہے مگر یہ شوق پورا کہاں کروں' اسی لیے تو میں "سید ہاؤس" کے لیے اس قدر بے چین ہوں۔" وہ پھر سے یاددہانی کروانا نہ بھولی۔

"اوکے' کہا نا اس بار یہ کام بھی ہو جائے گا۔" اسے لگا سلطان بخت کا لہجہ کچھ خاص پر یقین نہیں پھر بھی اس نے جتانا مناسب نہ سمجھا۔ بہت پیچھے پڑنے سے کیا خبر چڑ جائیں' اس نے سوچا۔

"ویسے تو آپ اسلام آباد گئے ہوئے تھے' لیکن دو دن تو آپ نے جیسے موبائل آف ہی رکھا۔ مجھے یاد آیا' سب سے پہلے تو میں نے آپ سے یہ گلہ کرنا تھا۔" اس نے موضوع بدلا۔

"بھئی بتایا نا' میں اسلام آباد تفریح کے لیے نہیں گیا تھا' سیمینار تھا ادھر انٹرنیشنل لیول کا' کمپیوٹرز کے بارے میں پھر جرمن فرم سے ہماری میٹنگ تھی' ان ہی کے ساتھ ڈیل طے ہوئی ہے۔ ہم اپنا شوروم کھولیں گے' ابھی تو تمام کمپیوٹرز ادھر ہی سے منگوائیں گے پھر جلد ہی بنیادی مینوفیکچرنگ ہم خود شروع کریں گے۔ بڑا زبردست پلان ہے اور میرا پراجیکٹ بھی تم دیکھنا۔" سلطان بخت جوش سے اسے بتا رہے تھے۔

"شاہ جی! گاڑیوں کا شوروم کب شروع کریں گے۔ ہائے میں تو روز ایک نئی گاڑی بدلوں گی۔" وہ ان کے موضوع سے اکتا کر اپنے موضوع پر آ گئی۔

"تم ایک نہیں' دو بدلنا۔" وہ ہنسے۔ "کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔"

"آپ نے آنا کب ہے؟" اسے ایکدم خیال آیا۔

"ابھی چند دن تک نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی شاہ جی!" وہ منہ بنا کر بولی۔

"سمجھا کرو نا ڈیئر! ادھر گاؤں میں بھی تو سو کام ہوتے ہیں۔ کپاس کی فصل تیاری کے آخری مراحل میں ہے، چاول کی بوائی ہونے والی ہے، گندم کی فصل میں تو ابھی وقت ہے مگر باغوں کے فروٹ میں اس بار پیداوار بہت زیادہ ہوئی ہے اور میں ہر کام اپنی نگرانی میں کروانا چاہتا ہوں۔ اس بار جان! نوٹ ہی نوٹ ہوں گے۔ اللہ کے فضل سے ہماری فصلیں بہت اچھی ہوئی ہیں۔ فیکٹری اور کارخانے کی پیداوار نے بھی مقررہ ہدف سے بڑھ کر پیداوار کی ہے۔ آئی ایم سو ہیپی۔" سلطان بخت جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"پھر تو اس بار مجھے شاپنگ بھی خوب کرنی ہے بلکہ مجھے یاد آیا' دبئی کے وزٹ کا جو آپ نے وعدہ کیا تھا' یہ آپ ہی کی بات ہے جو میں دہرا رہی ہوں' ورنہ میرا تو لندن جانے کو بے تحاشا دل چاہتا ہے۔" اسے پھر سے اپنی خواہشات یاد آنے لگیں۔

"بس کچھ دن صبر کرلو' میں ان چند ایک موٹے موٹے کاموں سے فراغت پالوں پھر دبئی' لندن' پیرس ہر جگہ کم از کم ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے چلیں گے۔ میں تو خود بہت تھک گیا ہوں' ریلیکس ہونا چاہتا ہوں بلکہ فرصت سے تمہاری خوبصورت کمپنی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ ان دوریوں نے تو مجھے تھکا دیا ہے۔"

"یہی تو بات ہے شاہ جی! ہم جس قدر دور رہیں گے ایک دوسرے سے' اتنا ہی زیادہ تھکیں گے' مایوس ہوں گے۔ محبت تو تازگی ہے نا شاہ جی!" وہ رومانک لہجے میں بولی۔

"محبت تازگی ہی نہیں محبت زندگی ہے مائی ڈیئر لیڈی۔"

"شاہ جی! آپ آرہے ہیں۔" وہ بے چین لہجے میں بولی۔

"کہا نا ابھی کچھ دن......" اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"اوکے' کوئی آیا ہے۔ میں رات میں فون کروں گا' بائے ڈیئر' ٹیک کیئر۔" انہوں نے موبائل آف کردیا۔

"یس" موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

"حد ہے سلطان بخت تمہاری بھی' ہر وقت عورتوں کی طرح بیڈ روم ہی میں گھسے رہتے ہو' کوئی کام دھندے کی بھی فکر کیا کرو۔ دو گھنٹے سے منشی آیا بیٹھا ہے' سارے حساب کتاب کھولے گھنٹہ بھر سے مظفر ڈرائنگ روم میں سوکھ رہا ہے اور تمہارے یہ فون ہی تمام نہیں ہوتے۔"

سیدہ بولتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ سلطان بخت کا کھلا کھلا سا چہرہ تن گیا۔

"آپا! تین دن میں یہ کام ہی تو کرکے آیا ہوں' کچھ دیر ریسٹ کے خیال سے آکر لیٹ گیا تھا' آپ کو وہ بھی گوارہ نہیں۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا' آرام جتنا چاہو کرو مگر وہ جو آئے بیٹھے ہیں میں تو ان کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔" وہ ان کے تیور دیکھ کر کچھ نرم پڑگئیں۔

"سلطان بخت! ایک بات پوچھوں۔" وہ کچھ رک کر بولیں۔

"پوچھیں۔"

"صوفی صاحب گاؤں چھوڑ گئے' ان کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ سنا تھا بابا جان ہوتے تو انہیں کبھی ادھر سے جانے نہ دیتے۔ تم ان کے حجرے میں کیا کرنے گئے تھے؟" ان کا جملہ بہت اچانک تھا اور سیدہ کی نگاہیں ان کے چہرے پر ہی جمی تھیں۔

"آپ سے کس نے کہا میں ان کے حجرے میں گیا تھا۔"

"سلطان بخت! اتنی غافل نہیں ہوں میں تم سے۔" وہ کچھ تلخی سے بولیں۔

"ان سے ملنے' ان سے بات کرنے ہی گیا تھا۔" وہ گڑبڑا کر بولے۔

"کیا بات؟"

"واقعی میں بات کرنے گئے تھے؟" ان کا لہجہ مشکوک تھا۔

"آپا! آخر آپ یہ کس قسم کی انکوائری مجھ سے کررہی ہیں۔ آخر میں نے کیا کیا ہے۔ آج اگر وہ بدتمیز عورت ادھر نہیں ہے تو آپ سوالنامہ لے کر آن کھڑی ہوئی ہیں۔ آخر میں کس کس کے آگے جوابدہ ہوں۔" وہ بھڑک ہی اٹھے۔

"سلطان بخت! تم آرام سے بات نہیں کرسکتے' میں نے ایسا کچھ نہیں پوچھا تم سے۔ ہر ایک کو تم نے صالحہ ہی سمجھ رکھا ہے۔" وہ بھی غصے میں آگئیں۔

"وہ بھی صحیح جلتی کڑھتی ہے۔ کچھ تو تمہارا مزاج ہی اس درجے کڑوا ہوگیا ہے اور کچھ تمہیں اس کا خیال بھی نہیں۔ اب جو تین دن اسلام آباد لگا کر آئے ہو تو اسے بھی ساتھ لے جاتے' وہ بھی گھوم پھر آتی' اس کا مزاج بھی کچھ بہتر ہوجاتا۔"

"میں ادھر کام سے گیا تھا' سیر و تفریح کرنے نہیں گیا تھا۔"

"اب تو کام کے دوران ہی سیر و تفریح ہوسکتی ہے' ویسے تو تمہارے پاس نہ اس کے لیے وقت ہے' نہ سیر و تفریح کے لیے۔ ہنی مون کا پروگرام بھی تم نے کینسل کردیا۔ چلو بندہ گھوم پھر آتا' کچھ ایک دوسرے کے مزاج کی خبر ہوجاتی ہے۔"

وہ تو ہر صورت میں دونوں کی ذہنی ہم آہنگی چاہتی تھیں۔

"مجھے اس کے مزاج کا جتنا پتا چلنا تھا' چل چکا' مزید میں......" ان کے موبائل کی بیپ بجنے لگی' بات روک کر انہوں نے موبائل اٹھالیا۔

"جی...... میں بات کررہا ہوں۔" وہ دوسری طرف متوجہ تھے۔

"جی...... میں سلطان بخت ہی ہوں' جی ہاں۔" ان کے ماتھے پر بل سے پڑنے لگے۔

"جی کیا کہا...... دوائی کا ری ایکشن......" انہوں نے ہراساں نگاہوں اور پریشان چہرے سے سیدہ کی طرف دیکھا۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔"

سیدہ کا دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے لگا۔

● ● ● ● ● ● ●

"عبدالمبین' مبین! اٹھو نا مبین اٹھ بھی جاؤ۔" کوئی مسلسل اس کے پیر کا انگوٹھا ہلا کر اسے جگا رہا تھا۔ آواز بے حد مدھم تھی۔ اس نے گہری نیند سے بمشکل کچھ جھنجلا کر آنکھیں کھولیں۔ اسے اپنے پاؤں کی طرف جلیل کھڑا نظر آیا۔ اس کی نیند ایک دم سے اڑنچھو ہوگئی۔ اس نے زور سے آنکھیں جھپکیں' وہ جلیل ہی تھا۔ عبدالمبین تقریباً چھلانگ لگا کر اٹھ بیٹھا۔

"تم......؟ یہاں......؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں...... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ مجھے صوفی صاحب نے بھیجا ہے' چلو میرے ساتھ۔" جلیل اس کے پاس آکھڑا ہوا وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ عبدالمبین نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان تھوڑا تھوڑا سا گہرا نیلا تھا۔ صبح کی روشنی اپنے قدم جمارہی تھی۔ فضا میں خنکی سویرے کی ہلکی ہلکی سی تھی۔

"کہاں......؟ کہاں سے آئے ہو تم' کیا تم بابا صاحب کے ساتھ چلے گئے تھے اور اتنی صبح صبح۔" اس نے جلیل کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس پر سفر کی تکان تھی۔

"ہاں' میں ان کے ساتھ ہی گیا تھا۔ چلو اب پھر دن نکل آئے گا اور صوفی صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہیں جلد از جلد گاؤں سے لے کر چلا آؤں اور کسی سے ملوں بھی نہیں۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

"تم ماسٹر صاحب سے نہیں ملے؟" عبدالمبین حیرت سے بولا اور ایک نظر صحن سے آگے کھلے بیرونی دروازے کو دیکھا۔

"ماسٹر صاحب نماز پڑھنے کے لیے نکلے تو میں اندر آگیا۔ اب چلو جلدی سے۔ وہ آگئے تو پھر مجھے ان سے ملنا ہی پڑے گا۔" جلیل کچھ عجلت سے بولا۔ ماسٹر صاحب کے آنے کا دھڑکا اسے لگا تھا۔

"ہوں۔۔۔" عبدالمبین نے پرسوچ انداز میں اسے دیکھا۔ "وہ ایسا ہے جلیل بھائی کہ میں دوپہر میں آجاؤں گا۔ خود ہی، تم مجھے ایڈریس دے جاؤ۔ اس وقت میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ سر میں شدید درد ہے رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ کچھ دیر سوؤں گا تو پھر طبیعت ذرا تازہ دم ہوگی۔ ایسا نہ ہو' جاتے ہوئے بخار ہو جائے۔ جسم پہلے ہی درد سے ٹوٹ رہا ہے۔"

اس نے ہاتھ سے ماتھا دباتے ہوئے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جلیل نے اسے کچھ غصہ بھری نظروں سے دیکھا۔

"دیکھو عبدالمبین! مجھے صوفی صاحب نے حکم دیا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر آؤں۔ اماں جی بھی تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں اور۔۔۔ اور صوفی صاحب کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں' ہفتہ بھر بہت بیمار رہے ہیں۔ تم بس اب چلو' گھر جا کر آرام کر لینا۔ میں دو تین دن پہلے بھی تمہارے مدرسے گیا تھا۔ ادھر بھی تم نہیں ملے۔ بس اب اٹھو۔" وہ اصرار سے اور کچھ سختی سے بولا۔

"بھئی۔ میں نے کہا ناں۔ مجھے ابھی نہیں جانا۔ تم دوپہر تک رک سکتے ہو تو رک جاؤ۔ میں تو دوپہر کے بعد ہی آؤں گا۔" وہ ڈھٹائی سے دوبارہ تکیہ درست کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

"عبدالمبین! اماں جی تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں' اسی لیے میں آیا ہوں اتنی صبح سویرے میں اگر ادھر رکا تو سب کو میری آمد کا علم ہو جائے گا پھر وہ صوفی صاحب کے ایڈریس کے بارے میں ضرور پوچھیں گے خاص طور پر ماسٹر صاحب پھر۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ "مجھے انہوں نے رکنے سے منع کیا تھا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"میں نہیں سمجھتا تو تم سمجھ جاؤ۔ میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ ایڈریس دے کر جاتا ہے تو دے جاؤ ورنہ تمہاری مرضی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ اور ویسے بھی ادھر کون میرے فراق میں مرا جا رہا ہے۔ جاتے ہوئے کسی نے بتانا یا انتظار کرنا تو گوارا نہیں کیا اور اب ہرکارے بھیجے جا رہے ہیں۔ اب میری مرضی ہوگی تو میں جاؤں گا۔"

اس نے سر اٹھا کر سر کے نیچے رکھا تکیہ مزید اونچا کیا اور آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے لگا۔

"تم۔۔۔" جلیل اسے کچھ سخت سنانا چاہتا تھا پھر قمیص کی سائیڈ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ٹھیک ہے' تم اماں جی کو بتا دینا۔ میں شام سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔" عبدالمبین نے روکھے انداز میں کہہ کر کاغذ لے کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ جلیل پھر بھی کھڑا رہا کہ شاید وہ جانے کی ہامی بھر لے' عبدالمبین نے آنکھیں بند کر لیں۔

"خدا حافظ۔" جلیل نے ایک گہرا سانس لے کر آہستگی سے کہا۔ اور باہر نکل گیا۔

"ہوں۔۔۔" اس کے جانے کے بعد عبدالمبین نے تہ شدہ کاغذ تکیے کے نیچے سے نکال کر کھولا اور ایڈریس پڑھنے لگا۔ ایڈریس پڑھ کر اس نے کاغذ پھر سے تہ کر دیا اور ہاتھ سینے پر رکھ کر دن بھر کی پلاننگ سوچنے لگا۔ اس کا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔

"شہرینہ بی بی کے کالج جانے کا ٹائم ہونے والا ہے۔ فضل دین اسے لے کر صبح صبح نکلتا ہے۔ بس آج فیصلہ کن قدم اٹھا ہی لینا چاہیے۔ تیاری شروع۔۔۔" اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا' اس نے سر گھما کر اپنے دائیں طرف دیکھا۔ لکڑی کی میز پر میٹرک کے کورس کی کتابوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

"ماسٹر صاحب کو صحیح بے وقوف بنا رہا ہوں میں' ورنہ تو وہ مجھے یہاں ایک دن نہ ٹکنے دیتے۔" وہ خود ہی ہنسا۔ "پر اس کی قیمت بھی میں ہی چکا رہا ہوں' آدھی رات تک کتابیں رٹنے کی۔"

وہ حویلی کی طرف سے آنے والے راستے پر کھڑا تھا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ فضل دین کی گاڑی کچے راستے پر کم رفتار سے آتی دکھائی دی جیسے ہی گاڑی اس کے نزدیک پہنچی۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر ہاتھ سے گاڑی رکنے کا اشارہ دیا۔ فضل دین نے گاڑی تو نہ روکی مگر رفتار ذرا کم کر دی۔

"سلام چاچا! گاڑی کو روکو۔" اس نے کھڑکی کی طرف ذرا جھک کر سلام جھاڑا۔

"وعلیکم السلام' دیر ہو رہی ہے' ہمیں ہٹو راستے سے۔" فضل دین نے کچھ روکھے پن سے جواب دیا۔

"چاچا! ایک منٹ بس پلیز۔" اس نے منت بھرے انداز میں فضل دین کا کندھا پکڑ لیا۔ فضل دین کو مجبوراً رفتار بالکل ہی کم کرنی پڑی' عبدالمبین گاڑی کے ساتھ تیز تیز چل رہا تھا۔

"اے لڑکے! تیرے پاس اور کوئی کام نہیں سوائے مجھے تنگ کرنے کے' تیری شکایت مجھے چھوٹے شاہ جی سے کرنی ہی پڑے گی۔ تو نے مجھے بہت عاجز کر رکھا ہے۔"

"پلیز چاچا! صرف آج' صرف آج مجھے شہر تک چھوڑ دو۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں کرائے کے' میرے پاس اپنے گھر کا پتا ہے۔ بس آج میں گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہوں پھر نہیں آؤں گا نہ تمہیں تنگ کروں گا۔ یہ دیکھو میرے کپڑے' سامان بھی ساتھ ہے۔ بس آج آخری دفعہ۔" اس نے التجائیہ لہجے میں کہہ کر اپنے ہاتھ میں پکڑے بڑے سے شاپنگ بیگ کو اونچا کر کے دکھایا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سچائی تھی۔ فضل دین کا جی اس کی منت پر کچھ پگھل سا گیا۔ عبدالمبین نے اس کے چہرے پر نرمی کے آثار دیکھے تو اور پرجوش ہو گیا۔

"پلیز چاچا! مجھے بس آج شہر چھوڑ دو۔ میرے پاس پیسے نہیں اور کوئی ایسی چیز بھی نہیں جسے بیچ کر کرائے کے پیسے اکٹھے کر سکوں' اور ادھر ادھار مجھے کون دے گا۔ بس آئندہ میں آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔ آپ چاہے بی بی جی سے میری منت کرالیں۔ بس آج کا دن۔" وہ رو دینے کو تھا۔ سر اونچا کر کے اس نے پیچھے بیٹھی شہرینہ کو سنایا۔ جواب ندارد۔ وہ اس کی رام کہانی سن رہی تھی۔ اسے پہلے ہی کالج سے دیر ہو رہی تھی اور آج کل وہ سلطان بخت سے ہاسٹل میں رہنے کی اجازت لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"فضل دین! بٹھانا ہے تو بٹھا لو۔ ورنہ چلو' مجھے دیر ہو رہی ہے۔ روز کا تماشا ہے یہ تو' مجھے آج لالہ سے بات کرنا ہی پڑے گی۔" وہ کڑی نظروں سے عبدالمبین کو گھور کر بولی تو فضل دین نے جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ عبدالمبین جھٹ سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

جیسے ہی شہری حدود کا آغاز ہوا وہ بول اٹھا۔

"بس چاچا! مجھے یہیں اتار دیں۔" فضل دین نے گاڑی روکی تو وہ نیچے اتر گیا۔

"اوہو چاچا! گاڑی کے پچھلے دونوں پہیوں میں ہوا بالکل نہیں ہے۔ بے شک اتر کر دیکھ لو۔" اس سے پہلے کہ فضل دین گاڑی دوڑا لے جاتا عبدالمبین تیزی سے بولا۔ فضل دین نے کوفت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ گاڑی بند کر کے نیچے اتر آیا' جیسے ہی وہ پچھلی جانب مڑا عبدالمبین نے تیزی سے مٹھی میں بند کاغذ شہرینہ کی طرف اچھال دیا۔

"یہ آپ کے لیے۔" کہہ کر وہ تیزی سے سڑک کے دوسری طرف دوڑ گیا۔

اسی وقت فضل دین بڑبڑاتے ہوا گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

"اچھا خاصا لگا ہوا لگتا ہے صوفی صاحب کا یہ لڑکا۔"

شہرینہ نے اپنے پاؤں کے پاس پڑی کاغذ کی اس گولی کو کن اکھیوں سے دیکھا مگر اٹھایا نہیں۔

"فضل دین صحیح کہتا ہے۔" وہ سوچ کر سیدھی ہو گئی۔

جیسے ہی گاڑی اس کے کالج گیٹ کے پاس رکی اس نے وہ اپنا شولڈر بیگ اور فائل اٹھائی۔

پھر ذرا سا جھک کر اس نے کاغذ مٹھی میں دبایا اور گاڑی سے اتر گئی۔

پھر سارا دن کلاسز کے دوران بھی اس کا دھیان اپنے بیگ کی اندرونی جیب میں پڑے اس کاغذ کی طرف رہا مگر

کھول کر دیکھنے کا نہ تو وقت ملا نہ اس نے خود میں ہمت پائی۔

"گھر جا کر دیکھوں گی۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

"اچھا خاصا فاصلہ ہے گھر سے کالج کا۔ اتنی تھکاوٹ ہو جاتی ہے اور وقت برباد، پتا نہیں لالہ کیوں نہیں مانتے۔" سفر کی طوالت سے اکتا کر اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی آج اسے سفر کچھ اور بھی طویل لگ رہا تھا۔ جی تو جیسے اس کاغذ میں اٹکا تھا جسے پڑھنے کی اسے بے چینی ہو رہی تھی۔

جیسے ہی گاڑی حویلی کی طرف مڑی حویلی کے باہر اسے لوگوں کا ہجوم سا نظر آیا اس کا دل یک بیک تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا۔

"یہ گھر کے باہر لوگ کیوں جمع ہیں؟" اس نے کھڑکی سے آگے ہو کے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ فضل دین بھی لوگوں کا جمگھٹا دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ گاڑی حویلی کے پچھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ گیٹ پہلے سے کھلا تھا۔ ادھر بھی کافی لوگ آ جا رہے تھے اور کچھ رو بھی رہے تھے۔ شہرینہ کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔

وہ گاڑی سے اتر کر تیزی سے اندرونی عمارت کی طرف دوڑی۔

ہال کمرے سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ رک کر کسی سے پوچھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

ہال کمرے کے دروازے کے پاس ہی اسے سیدہ سفید لباس میں سرخ بھیگا چہرہ لیے روتی نظر آ گئیں۔

"آپا۔۔۔ آپا! کیا ہوا آپا؟" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ان کی طرف بڑھی۔

"شہرینہ! میری بچی! میری بہن! ہم لٹ گئے ہم یتیم ہو گئے، ہمارے بابا جان ہم سے روٹھ گئے۔ ہمیشہ کے لیے۔ تیرا بھی کچھ خیال نہ کیا انہوں نے۔ اللہ سے ملنے گئے تھے۔ اللہ نے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ شہرینہ! بابا جا چلے گئے۔" سیدہ کے بین اور چیخیں جیسے اس کا سینہ چیر گئے۔

"نہیں بابا! بابا جان نہیں نہیں۔۔۔۔" یہ شاک اس قدر اچانک تھا وہ ان کی بانہوں میں جھول گئی۔ صالحہ۔

☆☆☆

بارش ابھی کچھ دیر پہلے ہی شروع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تیز سنسناتی بجاتی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام ہی سے گہرے بادلوں نے اطراف میں اندھیرا کر رکھا تھا۔ خزاں کی سحر زدہ خاموشی نے ساری فضا کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، اس موسم میں تو دل کی اداسی کچھ اور بھی سوا ہو جاتی تھی۔ عجیب ہی بے کلی تھی اس کی طبیعت میں، جی چاہ رہا تھا ابھی ایسی خزاں کی اداس شام اوڑھ کر کسی کونے کھدرے میں جا چھپے اور اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر چپ چاپ روئی جائے۔

دن تو کسی نہ کسی طور کٹ ہی جاتا تھا جیتے جی کی سو مصروفیات ہوتی ہیں سو وہ دن چڑھتے ہی خود کو ان مصروفیات میں گم کر لیتی، ناشتہ خود بناتی پھر دوپہر کا کھانا بھی، صفائی والی کے سر پر کھڑے ہو کر گھر کا کونہ کونہ صاف کرواتا بلکہ صاف ستھرے گھر کو خواہ مخواہ رگڑوانا اس کی خاص مصروفیت تھی۔ پھر دوپہر میں سوتی نہ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ ایک پل کو بھی سو گئی تو پھر شب بھر جاگنا پڑے گا۔ دوپہر میں کوئی نہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی۔ مسز خان کی ایک شرٹ پر اس نے شیڈ ورک شروع کر رکھا تھا۔ ان کے دوپٹوں پر فارغ بیٹھی کروشیے کی بیلیں بناتی رہتی۔ شام کی چائے اور رات کا کھانا بھی خود تیار کرتی کہ کسی طرح یہ بدن تھکن سے چور ہو جائے اور رات کو ٹوٹ کر نیند آئے مگر اس کی یہ کوشش ہر روز نقش بر آب ہی ثابت ہوتی۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ وضو کرتی۔ جیسے ہی کمرے میں جا کر عشاء کی نماز کے لیے مصلّے پر کھڑی ہوتی آنکھوں میں نیند کے گھنیرے بادل اڈنے لگتے۔ شیطان تھپکیاں دے دے کر میٹھی نیند کا چوگا دکھانے لگتا۔ بس طوعاً" کرہاً" نماز سے فارغ ہو کر کلام پاک پڑھتی اور لائٹ آف کر کے بستر پر ڈھے جاتی۔ بس وہی آخری پل ہوتا تھا اس دھوکے باز نیند کی آمد کے گمان کا۔ پھر تو اس کی آنکھیں یوں کھلتیں کہ کروٹیں بدل بدل کر آدھی سے زیادہ

رات بیت جاتی۔ جہازی سائز بیڈ کی دوسری خالی جگہ اسے اپنے وجود کے خالی پن کا خوب احساس دلاتی۔

زندگی امتحان، مسلسل ثابت ہو رہی تھی۔ اور اس کی ہر دعا، ہر سعی اس کی طوالت کم کرنے میں فی الحال ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ بہت دنوں سے اس نے تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے ادا کرنا شروع کر دی تھی۔ خشوع و خضوع کے باوجود اکثر دل سکون سے خالی رہتا۔

اور جو خدا نے فرمایا ہے کہ ذکر الٰہی میں دل اطمینان پاتے ہیں تو اس کا دل مطمئن کیوں نہیں ہوتا تھا۔ کیوں اس کی بے کلی اسے پر سکون نہیں ہونے دیتی تھی۔

"شاید میری عبادت خام ہے۔ میری ریاضت میں کھوٹ ہے۔ اس میں غرض کی ملاوٹ اس قدر ہے کہ بے غرضی غالب آنے ہی نہیں پاتی۔ خالص عبادت خالص ذکر ہی سے تو دل اطمینان پاتے ہیں اور اس کا تو ہر ہر سجدہ صرف ایک شخص کی توجہ، محبت اور التفات کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے خدا کے حضور ہوتا تھا۔

اپنی عبادت کے ناخالص ہونے کا اس کے دل کے نہاں گوشوں کو علم تھا بظاہر وہ اس بات پر اللہ سے شاکی رہتی کہ اتنی عبادت کے باوجود بھی اللہ اسے سکون کیوں نہیں دیتا۔

کیونکہ اللہ کو دل کی باتوں کا پتا ہوتا ہے۔

اور اس کا دل تو ایک خاکی وجود کی محبت کا طالب تھا۔ اللہ کی محبت اور اس کی توجہ کا طالب کب تھا؟

سوچتے سوچتے اس نے سرد فضا میں ایک گہرا سانس لیا۔

"اب عبادت میں خلوص، اس حد تک خالص پن میں کہاں سے لاؤں، اللہ کو اصل بات کا پتا ہے تو میری بے بسی کا بھی علم ہو گا، میں خاکی بدن خاک پر رہنے والی اور خاکی وجود کی طالب خاک میں سمانے کی حقیقت سے گریزاں اس سچے رب کی خالص بے کھوٹ بے ریا محبت اپنے اندر کیسے پیدا کروں کیسے؟۔

جو دنیا کی طلب کرتے ہیں انہیں دنیا مل جاتی ہے اور جو اس کی طلب کرتے ہیں، وہ دنیا بھی پا لیتے ہیں اور سچے رب کی قرب بھی۔" کوئی اس کے اندر صاف صاف بول رہا تھا۔

"تو کیا میں دنیا کی طالب ہوں۔" اس نے خود سے سوال کیا۔ اسے لگا دور گھر کا گیٹ بج رہا ہے۔ بارش کے مدھم سروں میں گیٹ بجنے کی آواز زیادہ نمایاں نہ تھی۔ اسے یاد آیا کل سے ڈور بیل خراب ہے۔

"معاذ سے کہا بھی تھا۔ الیکٹریشن کو بلوا کر ٹھیک کرا لے۔" وہ دوپٹہ اچھی طرح اوڑھتے ہوئے بیڈ سے اتری۔

"شاید میرا وہم ہی ہے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے بھلا کون ہو گا۔" وہ ایک نظر کلاک پر ڈال کر کمرے سے نکل آئی۔

واقعی دروازے پر زور و شور سے دستک ہو رہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے باہر گیٹ کی طرف بڑھی۔

بارش کافی تیز ہو چکی تھی وہ کاریڈور کا دروازہ کھول کر سیڑھیاں اتری، یخ ٹھنڈی ہوا نے اس کا استقبال کیا اس نے جھرجھری سی لے کر گیٹ تک کا فاصلہ تقریباً" دوڑ کر عبور کیا۔

"کون۔۔۔؟" گہرے سناٹے میں اسے اپنی آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔

جواب میں چند ثانیے کو خاموشی چھا گئی۔ وہ جھنجھلا کر دوبارہ بولنا ہی چاہتی تھی کہ باہر سے جواب آ گیا۔

"میں شہباز۔۔۔" رات کے سناٹے کی طرح گمبھیر سنجیدہ اور سرد آواز اس کے سرد ہوتے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑا گئی۔ اس نے سامنے تنی گیٹ کی دیوار کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اس کے پار سب کچھ نظر آ رہا ہو۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ کیپٹن شہباز نے زوردار دھکے سے پورا گیٹ کھولا اور اس پر ایک بھی نظر ڈالے بغیر بوٹوں کی تیز دھمک پیدا کرتے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ اس کا دھیمے لہجے میں کیا گیا سلام جیسے اس کے اپنے منہ پر کسی زوردار تھپڑ کی طرح لگا۔ اس نے کچھ کھسیا کر گیٹ بند کیا اور خاصے سست قدموں سے اندر کی طرف بڑھی۔

نزہت جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ وارڈ روب میں سر گھسیڑے اپنے کپڑے نکال رہے تھے۔ وہ خاموشی

سے جا کر بیڈ کے کنارے ٹک گئی وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئے۔

"پھپھو نے تو ان کے آنے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید انہیں خود بھی معلوم نہیں ہو گا تو اس کا مطلب ہے یہ خود ہی اپنی مرضی سے آئے ہیں۔" اس کا دل انجانی سی خوشی سے معمور ہونے لگا۔ اسے لگا پتھر پر گرتا قطرہ قطرہ پانی پتھر کے قلب تک جا پہنچا ہے۔

"کھانا گرم کروں آپ کے لیے؟" جیسے ہی شہباز باتھ روم سے نہا کر نکلے وہ مستعدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تولیے سے بال خشک کرتے ان کے ہاتھ ایک ہی پل کو رکے' بس اور پھر سے انہوں نے بال رگڑنے شروع کر دیے وہ جواب کی منتظر کھڑی تھی۔ بال خشک کر کے وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھے اور برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگے۔ نزہت نے پھر حوصلہ کیا۔

"کھانا گرم کروں میں جا کر؟" وہ بس رو ہی دینے کو تھی۔

"نو تھینکس ... " خوب چبا کر کہا اور برش ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخ دیا۔ تو وہ جیسے بے دم سی ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے قریب سے ہو کر باہر نکل گئے۔

ارادہ گیسٹ روم میں ہی قیام کرنے کا تھا ادھر چونکہ الماری میں کپڑے پڑے تھے۔ اس لیے آنا پڑا ورنہ آنے سے پہلے وہ دل میں مصمم تہیہ کر کے آئے تھے کہ نزہت کی شکل بھی نہیں دیکھیں گے۔ بس ام جان کے پاس ایک دن گزار کر اگلے روز واپس آ جائیں گے۔ ماں سے دور اتنا عرصہ وہ کہیں بھی نہ رہتے تھے۔ اور اب مزید ان سے جدائی سہی نہ جا رہی تھی۔ ام جان بھی آج کل انہیں بہت ڈپریس لگ رہی تھیں۔ اسی بے چینی میں وہ بغیر اطلاع کے ہی چلے آئے۔ گیسٹ روم کی لائٹس آن تھیں۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ دھکیلا' اندر معاذ بیٹھا اپنے گرد کتابیں پھیلائے پڑھ رہا تھا' انہیں دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

"ارے شہباز بھائی آپ ....!" اس کے لہجے کی چہکار اس کے دل کی خوشی کا پتا دے رہی تھی۔ "سرپرائز ... آپ نے اطلاع بھی نہیں دی آنے کی۔"

"بس دیکھ لو میں نے کہا۔ سرپرائز دیتے ہیں' کیسے ہو؟" وہ اس کو گلے سے لگاتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

"فائن اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنا ئیں۔ اتنے دنوں بعد گھر کی یاد آئی ہے' ادھر آپ کے آسرے پر آیا تھا اور آپ مجھے ادھر ڈال کر ہی بھول گئے۔" شکوہ اس کے لبوں سے پھسل ہی گیا۔ شہباز نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ انہیں لگا یہ جملہ معاذ نے نہیں نزہت کے لبوں نے ادا کیا ہے اور آواز معاذ کی ہے۔

"آسرا تو سب سے بڑا اللہ کا ہے۔ میں کس قابل ہوں۔" وہ بولے سے کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ "اس وقت پڑھ رہے ہو؟" وہ یونہی اس کی کتابیں اٹھا کر ورق الٹ پلٹ کرنے لگے۔

"جی ایگزام ہونے والے ہیں نا اس لیے۔ آپ نے کھانا کھا لیا؟"

"نہیں بھوک نہیں' راستے میں اسنیکس لے لیے تھے۔ اپنے روم میں کیوں نہیں پڑھ رہے؟" وہ سرسری لہجے میں بولے۔

"ادھر کی ٹیوب لائٹ خراب ہے شام سے اور میرا کل ٹیسٹ ہے اس لیے ادھر پڑھ رہا ہوں۔" اس نے کتاب اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں تمہاری؟"

"اے ون! آپ چھٹی لے کر آئے ہیں نا' رہیں گے کچھ دن۔" معاذ نے پوچھا۔

"نہیں بس ایک دو دن۔ زیادہ چھٹی نہیں مل سکتی۔" انہوں نے ایک طویل جمائی لی۔ منہ کے آگے رکھے ہاتھ سے ہی نیند سے بوجھل آنکھوں کو ذرا سا مسلا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"آپ کو چھٹی لے کر آنا چاہیے تھا۔ اتنا عرصہ تو ہو گیا۔" معاذ کچھ افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے شہباز بھائی! آپ کو نیند آ رہی ہے۔ آپ جا کر آرام کریں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی میں کالج سے آ جاؤں گا تو

پھر۔" وہ ان کی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈوروں کو دیکھ کر بولا۔

"ہاں چلتا ہوں' بس تھکاوٹ کی وجہ سے نیند بہت آ رہی ہے۔ تم بھی سو جاتے جا کر۔ کافی رات تو ہو چکی ہے۔" انہوں نے اس کا ارادہ جاننا چاہا تھا۔

"نہیں بھائی! میں تو شاید رات بھر پڑھوں۔ دن میں تو بالکل ....." اس نے ایک دم سے بات روکی۔ "پڑھ نہیں سکا اس لیے آج تو جاگنا پڑے گا۔"

"او کے! پھر شب بخیر میں چلتا ہوں۔" وہ کہتا کر باہر نکل آئے۔

"ام جان کے کمرے میں سونے سے صبح ایک اور کنہ کھل جائے گا' ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں تو ویسے بھی بہت ٹھنڈ ہوتی ہے۔ دونوں کمروں میں فل سائز کھڑکیاں تھیں۔ جن کی وجہ سے دونوں کمرے اکتوبر کے آخر میں ہی رات کو یخ ہو جاتے تھے۔

"میں بھلا اس سے ڈرتا ہوں' مجھے اپنے کمرے میں جا کر سونا چاہیے۔" انہوں نے اپنی سوچوں کو لتاڑا اور اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔

کمرے کی لائٹ بجھ چکی تھی۔ کمرے میں آتے ہی انہیں خوشگوار گرماہٹ کا احساس ہوا۔ زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں نزہت کروٹ لیے شاید سو چکی تھی۔ غصے کی ایک لہر سی ان کے بدن میں دوڑ گئی۔

"اب میں کہاں سوؤں بھلا مہارانی بیڈ پر سوئی پڑی ہیں۔"

انہوں نے جھنا کر سوچا اور صوفے کا رخ کیا۔ نیند اس قدر غالب آ رہی تھی کہ مزید سوچنے یا کسی اور ٹھکانے کے بارے میں غور کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ صوفے پر ہی ڈھیر ہو گئے' چند منٹوں بعد ہی ان کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔ نزہت یہ موسیقی سنتی رہی پھر اسے بھی نیند آ گئی۔ ویسے بھی رونے سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ شہباز کے باہر جاتے ہی وہ جی بھر کر روئی تھی۔

"کیا اسی طرح میں ... کے ساتھ ساری عمر۔ پتھر دل' پتھر نظر۔" اپنی بے قدری پر وہ رہ کر آنسو بہے چلے آ رہے تھے۔

رات کا اللہ جانے کون سا پہر تھا جب شہباز کی آنکھ کھلی' کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ شاید لائٹ جا چکی تھی اور سردی سے ان کا پورا جسم اکڑا ہوا تھا' اندھیرے سے مانوس ہونے میں انہیں چند منٹ لگے۔

"لاحول ولا قوۃ میں ادھر صوفے پر بغیر چادر اور کمبل کے پڑا ہوں احمقوں کی طرح وہ بھی اپنے کمرے میں۔" وہ خود کو کوستے ہوئے سردی سے کپکپا کر اٹھ بیٹھے۔ سامنے بیڈ پر نزہت مزے سے سر تک کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔

"یہ میری بیوی ہے بے حس' میری کوئی پروا نہیں۔ خود مزے سے کمبل اوڑھے سو رہی ہے۔ اور میں یہاں سردی سے اکڑ کر مر جاؤں یہ مزے کرتی رہے اور سب کی ہمدردیاں علیحدہ بٹورے ہو نہہ۔" وہ ٹھٹھرا کر اٹھے اور بیڈ کے دوسری طرف جا لیٹے ہاتھ بڑھا کر کمبل' اس کے سوتے وجود سے کھینچا اور اپنے اوپر تان لیا اور اس بات کا انہیں پتا بھی نہیں چل سکا کہ کمبل کنارے کے ساتھ گھسیٹتا اس کا نرم گرم ہاتھ بھی ان کے ہاتھوں میں آ سمایا۔ نزہت کے سوئے بدن میں جیسے تیز برقی رو دوڑ گئی اس نے کسمسا کر اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا' چند لمحوں کی مزاحمت نتیجہ خیز ثابت ہوئی' ہاتھ تو ان سے نہ چھڑا سکی بس اس کا سارا وجود ہی کسی بے جان شے کی مانند اس مزاحمتی رو میں بہتا چلا گیا۔

بارش کافی دیر سے رکی ہوئی تھی مگر اب ایک دم سے پھر برسنے لگی تھی۔ ایک گھنٹہ پہلے برسنے والی بارش اس کے بے چین دل کو ساگا رہی تھی۔ اور ایک گھنٹہ بعد برسنے والی بارش جیسے اس کے بنجر دل کی ساری زمین سرسبز کرنے چلی تھی۔ ٹپ ٹپ بوندیں کھڑکی کے شیشے پر پورے زور و شور سے پڑ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

عبدالمبین تو جلیل کے ساتھ نہ آیا مگر جلیل جو خبر لے کر آیا اس نے جیسے صوفی صاحب پر بجلی ہی گرا دی۔

"جی میں گاؤں سے باہر ہی عبدالمبین کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اماں جی سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ اسے ساتھ لے کر آؤں گا۔ میں نے سوچا۔ دو تین گھنٹے تک ضرور شہر جانے کے لیے روانہ ہو گا۔ تو میں اس کے ساتھ ہی چل پڑوں گا مگر دوپہر سے پہلے ہی گاؤں میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ سارے گاؤں میں خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ جی کہ بڑے شاہ جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہیں سعودی عرب ہی میں۔ ابھی تو شاید عمرہ ہی کر رہے تھے اس کے دوران ہی۔ میں نے دو تین لوگوں سے پوچھا جو حویلی جا رہے تھے یا ادھر سے آ رہے تھے پھر میں مزید ادھر نہ ٹھہر سکا کہ آپ کو بتاؤں آ کر۔"

جلیل ان کے پاس کھڑا تفصیل بیان کر رہا تھا اور صوفی صاحب سے تو کافی دیر تک کچھ بولا ہی نہ گیا۔ رابعہ بی بی کے تسبیح کرتے ہاتھ خوامخواہ لرزنے لگے۔ وہ کب تک صوفی صاحب کے چہرے کے اڑے اڑے رنگ کو دیکھ رہی تھیں، خبر ہی اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ان کے تو پورے خاندان کی زندگی کی کشتی بھنور میں پھنس گئی تھی۔

"تت..... تم نے کس کس سے پوچھا؟" کافی دیر بعد صوفی صاحب نے ہکلا کر پوچھا۔

اور سوال کے غیر اہم ہونے کا انہیں خود ہی احساس ہو گیا۔ وہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگے۔

"حاجی اللہ دتے کے بڑے بیٹے سے ماسی خیراں سے اور بشیر چاچا تو عورتوں کی طرح روتا ہوا آ رہا تھا۔ بڑے شاہ جی اسے بہت عزیز بھی رکھتے تھے اور ماسٹر صاحب بھی دو تین لوگوں کے ساتھ حویلی جا رہے تھے افسوس کرنے بچے بچے کی زبان پر یہ خبر تھی صوفی صاحب۔" وہ ان کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھا، بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

"یہ تم ہو نا باقی تھا میرے اللہ اب ہم کیا کریں گے۔" صوفی صاحب بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مڑ مڑ کر اماں جی کی شکل دیکھنے لگے جو خود سوالیہ نظروں سے انہیں تک رہی تھیں۔

"وہ خبیث تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟" انہیں اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنی توجہ عبدالمبین کی طرف مبذول کر کے بولے۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ اسے گاؤں میں کوئی ضروری کام ہے۔"

"کیوں اس نے اپنے باپ دادا کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جانا تھا، ملعون بے حیا اتنے دنوں سے مدرسے بھی نہیں گیا۔ بے شرموں کی طرح ماسٹر صاحب کے در پر بیٹھا روٹیاں توڑ رہا ہے۔ وہ غریب آدمی خود نہ جانے کس طرح گزارہ کرتا ہے اور یہ مردود جا کر ان کے گھٹنوں میں بیٹھ گیا۔" صوفی صاحب کو عبدالمبین کے بارے میں سوچتے ہی غصہ آنے لگتا تھا۔

"اب کیا کریں گے صوفی صاحب! آپ جائیں گے حویلی تعزیت کرنے۔" رابعہ بی بی نے ان کی توجہ عبدالمبین سے زیادہ اہم مسئلے کی طرف دلائی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، بھیڑیے کی کچھار میں منہ دینے چلا جاؤں، تمہیں خبر ہے نا اس چھوٹے شاہ جی کی وہ تو پہلے ہی غصے سے بل کھا رہا ہو گا۔ میری شکل دیکھ کر اسے سب کچھ از سر نو یاد آ جائے۔ اور جو تباہی میں کسر ہے وہ میں جا کر پوری کر دوں۔ احمق عورت کبھی تو عقل سے کام لے کر بولا کرو۔ جاہل گنوار، عقل سے پیدل۔"

صوفی صاحب کا تمام تر رنج اور افسوس، اب غصے اور کوفت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس افسوس ناک خبر کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ کس کا گلا دبائیں۔ رابعہ بی بی سر جھکا کر جلدی جلدی تسبیح کے دانے گرانے لگیں، ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

"میں جاؤں جی۔" جلیل ان کے غصے سے خائف ہو کر بھاگنے کی صورت نکال کر لایا۔

"جاؤ، عصر کا وقت ہونے والا ہے۔ جا کر صفیں درست کرو میں آتا ہوں ابھی۔" اس کی طرف مڑ کر غرائے تو وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا۔ کمرے میں جامد خاموشی چھا گئی۔ صحن میں بیٹھی زینب کی صورت اس خبر کو سنتے ہی اتر گئی تھی۔ وہ رات کے سالن کے لیے آلو چھیل رہی تھی۔ آمنہ سیڑھیوں میں کتاب لیے کافی دیر سے چپ چاپ

بیٹھی تھی۔ جویریہ اس کے پاس ہی زمین پر بوری بچھا کر اسکول کا کام کر رہی تھی۔

صرف وہی اس خبر کے اثرات سے بیگانہ لگ رہی تھی۔ نئے اسکول میں اس کا دل بھی لگ گیا تھا، دو چار سہیلیاں بھی بن گئی تھیں گاؤں اب اسے کچھ کچھ بھولتا جا رہا تھا۔ بچگانہ ذہن تھا۔ نقش بننے اور مٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

"پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ آزمائش پر آزمائش۔" صوفی صاحب کی پریشان آواز کمرے میں ابھری۔ آمنہ اور زینب کے سر کچھ اور جھک گئے۔

"میں تو گن گن کر ان کے آنے کے دن گزار رہا تھا۔ ادھر زندگی بتانا کس قدر دشوار ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ گاؤں والے سارے آرام و آسائش یہاں خواب ہونے چلے ہیں۔ یہ دو چار ماہ تو میں نے پس انداز کی ہوئی کچھ رقم کے بل پر گزار دیے ہیں۔ اب اگر مستقل ادھر رہنا پڑا تو رابعہ بی بی ہم..... ہم کیسے زندہ رہیں گے۔" آخر میں ان کی آواز بھرا سی گئی۔ وہ رک رک کر بول رہے تھے۔ پریشانی ان کے ایک ایک لفظ سے ہویدا تھی۔

رابعہ بی بی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی تو وہ اپنی محدود عقل کی شان میں قصیدہ سن کر بیٹھی تھیں۔ اب اتنی جلدی کیسے کوئی عقل کی بات کر سکتی تھیں۔ بس شوہر کا پریشان چہرہ دیکھ کر رہ گئیں۔

پورے گھر میں جیسے صف ماتم بچھ گئی اک جامد خاموشی۔

"میرے تو خواب و خیال میں بھی اس بات کا گماں نہیں تھا۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"صوفی صاحب! بڑے شاہ جی بہت اچھے انسان تھے۔ بہت نیک، غریبوں کے ہمدرد اور ہم جیسوں کے بہی خواہ، اللہ جنت نصیب کرے اور ان کے جنت میں درجات بلند کرے مگر آپ خود علم والے ہیں، عقل میں بھی خداوند تعالیٰ نے آپ کو بڑی خوبی سے نوازا ہے۔ آپ جانتے ہیں شاہ لاکھ اچھے سہی ہمارے بہی خواہ اور خیر خواہ سہی مگر خدا تو نہیں تھے، یا خدا سے بڑھ کر تو نہیں۔ انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ صوفی صاحب! وہ ہمارے وجود سے ہم سے زیادہ آگاہ ہے اور ہمارے وجود کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے اسی نے زندہ رکھا ہے، وہی زندگی کے اسباب پیدا کرتا ہے اور جب اور جس طرح اس کی مرضی ہوگی ہمیں اس خاکی زمین سے اٹھا کر اپنے پاس بلا لے گا۔ وہ رب ہے ربوبیت اس کی سب سے بڑی شان ہے صوفی صاحب! وہ سب کا پالن ہار ہے۔ آپ کا میرا، ہمارے بچوں کا وہی نگہبان، وہی مسبب الاسباب ہے۔"

رابعہ بی بی بے حد مضبوط لہجے میں اپنی بات بڑی سہولت سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئیں اور صوفی صاحب اپنی جگہ پر جیسے ششدر رہ گئے۔ پریشانی میں وہ اللہ کو تو بھول ہی گئے تھے۔ جس کے نام کا پرچار وہ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات کو آنکھ بند ہونے تک کرتے تھے، کیا اللہ صرف تسبیح کے دانوں پر پھرانے والا نام ہے یا نماز اور قرآن میں بار بار رٹنے والا ایک نام اور بس۔

رابعہ بی بی کی بات نے صوفی صاحب کی پیشانی عرق عرق کر دی۔

انہوں نے ہتھیلی کی پشت سے پسینہ صاف کیا۔ اور اپنی خفت کم کرنے کے لیے زور سے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ اور سر پر بندھا ہوا عمامہ اتار کر از سر نو باندھنے لگے۔

"ہائے اللہ اماں جی دیکھیں تو کون آیا ہے۔ مبین عبدالمبین۔" زینب کی اچانک چیخ نے گھر میں موجود سب افراد کو بے اختیار بیرونی سیڑھیوں کی طرف متوجہ کر دیا جس کے آخری زینے پر تھکا تھکا سا عبدالمبین کھڑا سر گھما گھما کر چھوٹے سے احاطے میں بنے اس کابک نما گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

"عبدالمبین، میرا بچہ، بسم اللہ، آ گئے تم۔" رابعہ جو چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھیں۔ زینب کی پکار پر بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور مڑ کر عبدالمبین کی شکل دیکھتے ہی بولیں۔

"السلام علیکم، اماں جی!" اس نے بھی گھر کا باقی جائزہ ترک کیا۔ اور آگے بڑھ کر اماں جی کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما گیا۔

"صبح جلیل کے ساتھ کیوں نہیں آیا' کتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی تمہارا' آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کو۔" وہ اس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ہاتھوں میں چہرہ لے کر دوبارہ چوما۔

"آپ لوگوں نے کون سا میرا خیال کیا۔ مجھے بتائے بغیر کوئی بھی اطلاع دیے بغیر چلے آئے۔"

وہ خفگی سے ان کے دونوں ہاتھ جھٹک کر ناراض لہجے میں بولا۔

"تو نہ آتے نواب کے بچے! تمہیں کسی نے خط نہیں لکھے تھے کہ آکر ہمیں اپنے دیدار کراؤ کہ ہم تمہاری یہ صورت دیکھنے کو مرے جا رہے ہیں۔" صوفی صاحب کمرے سے نکل کر اپنے اسی ناراض لہجے میں بولے۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ عبدالمبین کو دیکھتے ہی ان کا غصہ جیسے ابال کی طرح اٹھنے لگتا تھا اور کچھ نہیں تو اپنی چند لمحے بشتری خفت کا اثر بھی زائل کرنا تھا۔

"تم مدرسے کیوں نہیں گئے' ہفتہ ڈیڑھ ہفتے سے ادھر سے تم مسلسل غیر حاضر ہو اور ماسٹر صاحب تمہارے کون سے سگے لگتے ہیں جو بے شرموں کی طرح ان کے در پر جا بیٹھے۔"

صوفی صاحب غصیلا چہرہ لیے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ عبدالمبین ایک پل ان کے غصے سے خائف سا ہوا۔ دوسرے پل اس نے زور سے اپنا سر جھٹکا اور ان سے ذرا پرے ہو کر سیڑھیوں کی دیوار کے پاس پڑے تخت پر جا بیٹھا۔ وہ خود کو ان کے غصے سے لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ کم از کم آپ سے اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھ کو پہچاننے سے انکار نہیں کیا' آپ لوگ مجھے اپنا کچھ سمجھتے تو کم از کم مجھے بتا کر تو آتے۔ آپ نے مجھ سے جان چھڑانے کا اچھا طریقہ سوچا۔"

صوفی صاحب غصے سے پھنکارتے اس کے سر پر آکھڑے ہوئے تھے' وہ اس کی طبیعت مکمل طور پر صاف کرنے پر تلے نظر آ رہے تھے۔ اس کی لاپروائی کا کھولتے دماغ کے ساتھ معائنہ کرتے انہیں ایک دم سے عجیب احساس ہوا۔ عبدالمبین ان دو ڈھائی ہفتوں میں ہی انہیں خاصا بدلا بدلا دکھائی دے رہا تھا۔ نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی انہیں لگا' جیسے وہ بہت بڑا ہو گیا ہے' سوکھا سڑا سا اس کا وجود اور ہڈیوں والا چہرہ بھرا بھرا سا نظر آ رہا تھا۔ کندھوں کی ہڈیاں جو باہر نکلی نظر آتی تھیں۔ ان کی جگہ مضبوط اور چوڑے شانے اس کے ایک توانا جوان ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ ہاتھ پیر بھی نمایاں طور پر بڑے اور گوشت سے پُر دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے پر بھیگی مسوں کی جگہ ہلکی ہلکی براؤن کلر کی مونچھیں تھیں۔ چوڑی چھاتی اٹھی ہوئی گردن اور اس کا تو بیٹھا ہوا قد بھی عبدالمتین سے لمبا نظر آ رہا تھا۔

صوفی صاحب کے دل کی عجیب سی حالت ہو گئی' کچھ خوشی' کچھ بے چارگی اور کچھ کمزوری کی ملی جلی کیفیت تھی۔ خوشی اس کے جوان ہونے کی تھی' بے چارگی اور کمزوری اپنے بوڑھے ہونے کی اور عبدالمبین کے اکھڑے رویے کی بھی۔ پھر ایک دم سے عبدالمبین کی جدائی اور گستاخی کے دردناک لمحے انہیں یاد آ گئے۔ انہوں نے اپنے اٹھتے ہوئے دائیں ہاتھ کو بے اختیار مٹھی کی شکل میں لپیٹ لیا۔ ان کے کندھے جیسے جھک سے گئے۔ عبدالمبین ان کی ان تمام کیفیات سے بے نیاز آستین کے کف الٹنے میں مگن تھا۔ اماں جی خوفزدہ نظروں سے صوفی صاحب کے تیور بھانپ رہی تھیں۔ آمنہ نے کتاب بند کر دی تھی اور کمرے میں جانے کو کھڑی تھی۔ ابھی عبدالمبین کی دھنائی شروع ہونا تھی۔ سو اسی وحشت ناک منظر کے احساس کے تحت جویریہ نے بھی اپنا بستہ بند کر لیا تھا۔ اور اب بوری سمیٹ کر اندر جا رہی تھی۔

"چلا جاؤں گا۔ ادھر ہی چلا جاؤں گا میں..... کون سا اس ڈربے میں مستقل رہنے کو آیا ہوں۔ یہاں تو بندہ چار دن رہے اس کی سانس رک جائے۔ ویسے بھی میں ماسٹر صاحب کے پاس میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں' ادھر میں ایک دو دن کے لیے ہی آیا ہوں۔ اس لیے آپ ٹینشن نہ لیں۔ میرے ادھر رہنے کی۔"

آستین لپیٹ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے آرام سے صوفی صاحب کے مدمقابل کھڑے ہو کر اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اور مدرسے..... مدرسے کون جائے گا؟" بمشکل تمام صوفی صاحب نے اپنے لہجے کو ہموار کیا۔ اسی وقت نیچے سے موذن نے اذان دینا شروع کر دی۔

"اللہ اکبر اللہ اکبر۔" فضا گونج اٹھی۔

"وہ بعد میں دیکھ لوں گا ابھی تو میں آفندی کے ساتھ ہی امتحان دے رہا ہوں میری حفظ کی ڈگری سے مجھے کچھ نہیں مل سکتا۔ اماں جی! میں نہاؤں گا' میرے کپڑے نکال دیں پھر کھانا کھاؤں گا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے اور کھانے کے ساتھ ہی چائے کا بڑا پیالہ بھی صبح ماسٹر جی کے ہاتھ کا ناشتہ اور چائے پی کر نکلا ہوں۔ اب تو برا حال ہے۔ بس جلدی کریں۔" وہ صوفی صاحب کے آگے سے گزر کر سیڑھیوں کے پاس بنے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

تو صوفی صاحب بے حد سست قدموں سے نیچے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

"میں چائے آکر پی لوں گا۔" "اب جماعت ہونے والی ہے تم عبدالمبین کو کھانا دے دو۔"

صوفی صاحب رابعہ بی بی کی سوالیہ نظروں کو جواب دے کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔

☼ ☼ ☼

بھڑکائیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں
صحرا میرا چہرہ ہے سمندر تیری آنکھیں
بوجھل نظر آتی ہیں بظاہر مجھے آنکھیں
کھلتی ہیں بہت دل میں اتر کر تیری آنکھیں

دو لائنیں چھوڑ کر پھر دو اشعار تھے

دل میرا ایک کتاب کی صورت
جس میں وہ [illegible] ہے گلاب کی صورت
حسن گھڑے کا شیدائی
عشق موج چناب کی صورت

اس نے کوئی دسویں بار یہ اشعار پڑھ کر ان کا مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی اور بظاہر ان کا مفہوم کچھ ایسا مبہم بھی نہیں تھا۔ چار جماعتیں پڑھا شخص بھی ان کا مطلب بخوبی سمجھ سکتا تھا مگر اسے نہ جانے کیوں یہ سادا مطلب بھی الجھائے جا رہا تھا۔

"آخر اس نے یہ اشعار مجھے کیوں لکھے اس کی اتنی ہمت۔ سید سبطین شاہ کی بیٹی' سید سلطان بخت کی بہن کے ساتھ گھٹیا مذاق' یہ سب اس فضل دین بدمعاش کا کیا دھرا ہے۔ جو بار بار اس اوباش کو گاڑی میں بٹھا لیتا تھا۔ میں آج ہی لالہ سے بات کر کے اس بڈھے فضل دین کا انتظام کرواتی ہوں۔ اور اس کے بعد اس مولوی کے بچے کا' ذلیل گھٹیا' بدتمیز اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔" اس نے جٹ مٹھی میں بھینچی اور اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

آج سبطین شاہ کا دسواں بھی ہو چکا تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا ابھی بھی حویلی میں رش لگا تھا۔ صبح و شام زنانے اور مردانے میں قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ گٹھلیاں پڑھی جا رہی تھیں' مرحوم کی روح کے ایصال ثواب کے لیے زور و شور سے پڑھائی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ دس دن سے گاؤں کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا تھا' پہلے تین دن تو کھانا حسین شاہ ہی نے بھجوایا تھا۔ چھٹے دن سے جو حویلی کے پچھواڑے دیگیں چڑھنا شروع ہوئی تھیں ان کا سلسلہ آج بھی جاری تھا' دور و نزدیک سے آنے والے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ آدھا خاندان تو حویلی ہی میں مقیم تھا' سید سبطین شاہ خاندان کے سب سے بڑے بزرگ تھے اور پھر سارے خاندان میں ہر دل عزیز بھی اپنے ڈپلومیٹک فیصلوں سے انہوں نے کبھی خاندان کے کسی فرد کو ناراض نہیں کیا تھا۔ وہ سب کے ہمدرد تھے بظاہر۔ اسی لیے جوان کی موت کا سنتا بے اختیار دوڑا چلا آتا پھر سیدہ بھی خاندان میں ہونے والے ہر چھوٹے بڑے موقع پر

ضرور ہی شامل ہوا کرتی تھیں' تیرے سارے خاندان کے آنے کی ایک وجہ وہ چہ میگوئیاں بھی تھیں جو سلطان بخت کے کھلے ڈلے کردار اور شادی کے بعد دن رات کی لڑائیوں کی تھیں جن کی کن سوئیاں لینا تھیں اور اس میں بھی لوگوں کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔

سلطان بخت نے تو خیر باپ کی موت کے صدمے کو اس طرح اوڑھ رکھا تھا کہ ان کا بھرم قائم رہ گیا تھا۔ سب کو ہی یقین ہو گیا کہ سلطان بخت کے لغو کریکٹر کے بارے میں افواہیں محض افواہیں ہی تھیں۔ اگر ان میں کچھ سچ بھی تھا تو وہ اب نہ رہے گا کیونکہ سلطان بخت نے باپ کی موت کے صدمے کو دل سے لگا لیا ہے اور شادی کی ناکامی کا کچھ کچھ ثبوت صالحہ کے بے نیاز اور بیزار رویے سے مل رہا تھا۔ وہ اتنے مہمانوں کی موجودگی کے باوجود زیادہ تر وقت اپنے بیڈ روم میں گزارتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک بار بھی سیدہ کی تنبیہی نظروں کی پروا نہ کی تھی۔

"لیکن میں لالہ کو کیا بتاؤں گی کہ فضل دین نے کیا حرکت کی ہے' اگر لالہ کو علم ہو گیا کہ فضل دین نے اسے دو تین بار گاڑی میں لفٹ دی تھی تو جو حشر فضل دین کا ہو گا' سو ہو گا۔ میری بھی شامت آجائے گی کہ میں نے انہیں پہلی بار ہی کیوں نہ بتا دیا۔" کمرے میں ٹہلتے ہوئے وہ سوچے جا رہی تھی۔

بھڑکائیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں

اس نے بے اختیاری میں رقعہ پھر سے کھول لیا۔ پہلے ہی مصرع پر اس کے دل میں عجب سی گدگدی ہوئی۔ ایک سنسنی خیز لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ "شکل وصورت قدرت کا بھی اتنا برا نہیں مگر حرکت کیسی گھٹیا کی ہے۔ اپنا مقام اور مرتبہ کو سوچ لیتا۔" وہ عبدالمبین کی شکل وصورت کو نگاہوں میں لاتے ہوئے خود سے بولی۔

"محبت کب مقام اور مرتبے کو سوچتی ہے۔ یہ کوئی منصوبہ بندی سے تھوڑی ہوتی ہے' بس ہو جاتی ہے۔" وہی گدگدانے والی لہر اس کے اندر کسمسائی۔

"اور کوئی یہ رقعہ پڑھ لیتا تو؟" اس کے دل میں خدشے نے سر ابھارا۔ حویلی آتے ہی اس کا بیگ [illegible] سے بھابھی بیگم کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ کل سے وہ اپنا بیگ چپکے چپکے خود ہی تلاش کر رہی تھی۔ دل میں چور سا جو تھا۔ صبح صالحہ شاہ سے پوچھ ہی لیا تو نہ جانے کیوں بھابھی بیگم کے سخت تنتے ہوئے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ گہری نظروں سے شہرینہ کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔

"بھابھی بیگم! میرا بیگ۔ شاید پرسوں سے میں کالج جانا شروع کروں' ڈیڑھ ہفتے کی چھٹی لی تھی۔" اس نے ان کی معنی خیز نگاہوں سے نظریں چرا کر پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

"میرے کمرے میں رکھا ہے' جا کر لے لو۔ شکر کرو' تمہارے بھائی کے ہاتھ نہیں لگا۔"

"کیا مطلب؟" شہرینہ نے حیرت سے پوچھا مگر صالحہ شاہ وہاں سے جا چکی تھیں۔

"بھائی کے ہاتھ نہیں لگا' یہ بھابھی بیگم نے کیوں کہا۔" وہ رک کر سوچنے لگی۔

"کہیں انہوں نے خود تو میرے بیگ کی تلاشی نہیں لے لی اور یہ رقعہ وہ پڑھ چکی ہوں۔" اس کا ننھا سا دل اس خدشے پر کانپ ہی اٹھا۔

"نہیں' انہیں بھلا کیا ضرورت تھی تلاشی لینے کی۔" اس نے بڑبڑا کر رقعہ کھولا اور پھر سے بے خیالی میں اشعار پڑھنے لگی۔

"ہائیں! یہ کیا لکھا ہے؟" اچانک اس کی نظر کاغذ کے دوسری طرف کونے میں پڑی۔

"کالج کے پچھلے گیٹ پر دن بارہ بجے پرسوں۔" بہت باریک لکھائی میں لکھا تھا۔ اس نے کاغذ کو بالکل آنکھوں سے لگا کر پڑھا۔

"پرسوں کو تو بہت دن بیت گئے' وہ آیا ہو گا۔ کاش میں اس دن جا سکتی تو اس خبیث کو اس کی گھٹیا حرکت کا مزہ ضرور چکھاتی۔ خیر کوئی بات نہیں' پرسوں کالج جانا ہی ہے۔ دو چار دن کالج کے پچھلے گیٹ پر بارہ بجے جاؤں گی ضرور کسی دن تو آئے گا پھر اسے مطلب بتاؤں گی۔ ایک سید زادی سے اس طرح کے بیہودہ مذاق کرنے کا۔" وہ دل میں پلاننگ کرنے لگی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اچانک دروازہ کھلا اور صالحہ شاہ نے اندر جھانک کر کہا تو شہرینہ جیسے اچھل ہی پڑی۔ وہ تو اس وقت بالکل ہی اپنے دھیان کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ حال کے سب کردار تو اسے یکسر بھولے ہوئے تھے۔ اس نے گھبرا کر صالحہ کی طرف دیکھا جو تیکھی نظروں مگر مسکراتے ہونٹوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شہرینہ نے بہت آہستگی سے اپنی مٹھی پشت کی طرف کر لی۔ کاغذ مٹھی میں زور سے بھینچ لیا۔ اس کی یہ خفیف سی حرکت بھی صالحہ کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے فوراً' نظروں کا زاویہ اس کے پیچھے جاتے ہاتھ کی طرف کر لیا۔

"مصروف تھیں کیا؟" وہ دو قدم اندر بڑھیں۔

"نن... نہیں... بس یوں ہی کتابیں دیکھ رہی تھی۔ پرسوں کالج جانے کا سوچ رہی ہوں۔" اس نے تھوک نگل کر حلق کو تر کیا اور رقعے والی مٹھی بغل میں دبا کر رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔

"مگر بیگ تو تمہارا بند پڑا ہے اور کتابیں۔" صالحہ کا انداز بہت کچھ جتا دینے والا تھا۔ "کچھ پریشان لگ رہی ہو' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

اتنی ہمدردی صالحہ نے اس سے پہلے تو کبھی نہیں جتائی تھی بلکہ وہ تو سلطان بخت کی ضد میں شہرینہ سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھیں۔

"نہیں تو۔ بالکل نہیں۔" شہرینہ کرسی پر جا بیٹھی۔

"کوئی مسئلہ تو نہیں؟" پتا نہیں صالحہ اس سے کیا اگلوانا چاہ رہی تھیں۔

"آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا؟" اس کا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔

"نہیں' مجھے بھلا تم سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ تمہاری آپا جان ہی تمہیں یاد فرما رہی ہیں۔ جا کر ان کو حاضری دے آؤ۔" صالحہ [illegible] مڑیں اور باہر جانے لگیں۔ شہرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا'

"پتا نہیں اب کون کون میرا ہمدرد ہو گا بابا جان کے بعد۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں۔ نہ سچ کی' نہ جھوٹ کی' نہ کھرے کی' نہ کھوٹے کی۔ آپا جان مجھ سے کچھ اور چاہتی ہیں' لیکن کچھ اور... اور یہ بھابھی بیگم ان کی تو مجھے ذرا سمجھ نہیں' یہ تو بہت عجیب ہیں۔" وہ کرسی سے سر ٹکا کر سوچنے لگی۔ سبطین شاہ کی اچانک موت نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے صدمے کو کس سے شیئر کرے۔

"اور بھابھی بیگم میری سب سے بڑی ہمدرد بقول ان کے' ان کی تو لالہ سے نہیں بنتی تو مجھ سے یہ اچانک ہمدردی۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

اور شہرینہ کو علم نہیں تھا۔ صالحہ نہ صرف اس کے بیگ کی تلاشی لے چکی تھیں بلکہ وہ رقعہ پڑھ چکی ہیں جس پر عبدالمبین نے اشعار کے علاوہ جائے ملاقات لکھ رکھی تھی اور اس رقعے کی روشنی میں صالحہ حویلی پر تباہی کا ایک بم گرانے کی منصوبہ بندی کافی حد تک کر چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

محض ایک کمزور لمحے کی زد میں آکر اپنی نظروں میں گر جانا کیسا اذیت ناک' کیا شرمناک ہوتا ہے۔ اس کا حال کوئی کیپٹن شہباز سے پوچھتا جو رات ایک کمزور لمحے کی زد میں آکر اپنی ساری ضد' انا بھول کر بے اختیاری کے دھارے میں بہہ گئے تھے۔ بے اختیاری کا وہ احساس اس وقت انہیں ایک بچھو کی طرح ڈس رہا تھا' جب وہ سو کر اٹھے تو خود سے نگاہیں ملاتے شرم آرہی تھی۔ جس بات کو دل نہ مانے' اسے چھوڑ دو اور وہ دل کو اس بات پر قائل کر کے لائے تھے کہ اب جا کر ام جان سے کھل کر بات کر لی ہے کہ وہ نزہت کو "فارغ" کرنے میں ان کا ساتھ دیں۔ ان کا دل اس کی رفاقت پر نہیں مانتا' انہیں اس کشمکش کے عذاب سے نجات دلائیں ورنہ وہ خود کو کچھ کر بیٹھیں گے۔ اتنے دن جو گھر سے دور رہے ہیں تو یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہے ہیں کہ نہ تو ان کا دل' نہ ان کا ذہن نزہت کو قبول کر سکتا ہے۔ کبھی بھی' تو پھر ایسے فضول میں نام ساتھ جڑے رہنے سے کیا حاصل؟

اور حاصل کیا نکلا کہ ان کا خود پر اختیار ہی نہ رہا۔ اس نفس نے وجہ بنایا موسم کی شدت کو... کس قدر بودی وجہ

ہے اس انا کے قلعے میں شگاف ڈالنے کی۔

ان بے ترتیب سوچوں کی وجہ سے ان سے ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہ ہو پا رہا تھا' جب آنکھ کھلی تو نزہت کمرے میں موجود نہ تھی مگر ان کا شعور پوری طرح سے بیدار ہو چکا تھا۔ خود پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔ تو بجنے والے تھے جب خود سے ایک لمبی لڑائی لڑنے کے بعد وہ تیار ہو کر ام جان سے آ کر ملے تھے۔ ام جان کی خوشی دیدنی تھی تو ان کا مزاج بے حد چڑچڑا ہو رہا تھا۔

"اب تو ام جان سے بات کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔" ڈائننگ ٹیبل پر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے انھوں نے بے دلی سے سوچا۔

ٹیبل پر نزہت ہی ناشتہ سرو کر رہی تھی' رائل بلو کلر کے کڑھائی والے سوٹ میں اس کا نازک سراپا اور بھی دلکش لگ رہا تھا۔ ریشمی دوپٹے کے نیچے کھلے نم بال رات کی ساری کہانی کھول کر بیان کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ خود بہت خاموش تھی مگر اس کا حلیہ سب کچھ کہہ دے رہا تھا۔ نکھری نکھری اور کچھ ہشاش بشاش بھی۔

"نزہت! اب تم بھی آ کر ناشتہ کر لو' چائے زیتون بانو لے آئے گی۔" وہ گرم گرم خوشبودار آملیٹ کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر مڑنے لگی تو ام جان نے اسے پکارا۔

"آ رہی ہوں پھپھو! زیتون بانو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں' میں بس چائے لے کر آ رہی ہوں۔" وہ بہت مدھم لہجے میں جواب دے کر مڑی۔

"تم یہ آملیٹ لو نا۔" مسز خان شہباز کی طرف متوجہ ہوئیں تو انھوں نے خاموشی سے پلیٹ اپنی طرف کھسکا لی۔

نزہت نے گرما گرم چائے دانی ٹیبل کے سینٹر میں رکھی اور کیپٹن شہباز کے بالمقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

کیپٹن شہباز نے چائے اپنے کپ میں انڈیلی۔ ایک چمچ چینی ملائی اور کپ ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ تم کہاں چل دیے؟" ام جان نے ٹوکا۔

"میں ذرا اظہر بھائی اور بچوں سے مل لوں' وہ ابھی نکلے نہیں ہوں گے۔" انھوں نے کرسی کھسکائی۔

"پتا نہیں اس کے دماغ کا خناس کب کم ہو گا' تم سے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔" انھوں نے جھکے سر کے ساتھ ناشتہ کرتی نزہت سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" سوکھا سا لقمہ اس کے حلق میں اٹکا۔ آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ اس کے آتے ہی وہ اٹھ کر چل دیے تھے' اس سے بڑی بے عزتی اور کیا ہو گی۔

اور رات' رات کا افسانہ بھی عجب تھا۔ "ضرورت" کی تھی وہ داستان اور تو اس فسانے میں کوئی رنگ نہ تھا۔ کوئی سرگوشی' سرخوشی' کوئی پیاں' نہ کوئی معذرت' نہ معافی' نہ محبت' نہ گواہی' نہ کوئی سوال' بس جیسے ہر طرف "ضرورت" ہی کی کارفرمائی تھی اور صبح جب وہ سو کر اٹھی' یہ اس کا پہلا احساس تھا اور اب تک یہ احساس اس کے دماغ سے کسی جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا کہ اسے محض "ضرورت کی تکمیل" کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نزہت تو رات کے آخری پہر میں کہیں تھی ہی نہیں' بس جسم ہی جسم تھا جس کی "ضرورت" تھی اور نزہت کا صبح سے جی چاہ رہا تھا۔ اپنے جسم پر پیٹرول چھڑک کر خود کو آگ لگا لے' اپنے اس جسم کو راکھ کر دے۔

"تم ناشتہ تو ٹھیک سے کرو۔" ام جان کی آواز اسے پھر سے ناشتے کی میز پر لے آئی۔ وہ پلیٹ آگے رکھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر مسز خان کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر چائے دانی اٹھا لی۔

"میرا ناشتہ کو جی نہیں چاہ رہا' بس چائے لوں گی۔" کہہ کر اس نے چائے کپ میں نکالی۔ مسز خان نے ایک دکھ بھری نظر سے اسے دیکھا۔

"ام جان! یہ معاذ کو کیا گھر والوں نے مفت کا ملازم سمجھ لیا ہے۔ میں دوپہر سے دیکھ رہا ہوں وہ جب سے کالج سے آیا ہے' سب اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے دوڑائے جا رہے ہیں۔ عالیہ بھابھی اور فائزہ بھابھی کے کام ہی تمام نہیں ہو رہے۔ میرے خیال سے تو اس نے ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا آ کر ابھی۔ رات کے کھانے پر

بھی وہ غائب تھا۔" کیپٹن شہباز خفگی سے مسز خان کے کمرے میں آ کر بولے۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں' ایک دو بار میں نے معاذ کو ٹوکا' عالیہ اور فائزہ کو بھی جھاڑنے کی کوشش کی مگر معاذ نے مجھے روک دیا کہ اگر میں گھر کے چھوٹے موٹے کام نہیں کروں گا تو مجھے لگے گا میں ادھر مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہوں۔ آپ پلیز گھر والوں سے کچھ نہ کہیں' اگر میں یہ چھوٹے چھوٹے کام کر دیتا ہوں تو کسی پر احسان تو نہیں کرتا۔ کیا یہ میرا گھر نہیں' اگر آپ مجھے غیر سمجھتی ہیں تو پھر بے شک انھیں روک دیں پھر میں ادھر نہیں رہوں گا۔" مسز خان نے کچھ بے چارگی سے کہا۔

"ام جان! یہ سب ایک حد تک تو ٹھیک ہے مگر اس طرح ذرا ذرا سے کاموں کے لیے اسے بھگاتا اس طرح تو اس کی اسٹڈیز متاثر ہو گی' وہ ادھر محض اپنی تعلیم کے لیے رہ رہا ہے۔ بہر حال آپ اپنی بہوؤں کو سمجھائیں ورنہ میں خود ان سے بات کر لوں گا۔" وہ خفگی سے بولے۔

"میں نے سوچا تھا' تم کچھ زیادہ دن کی چھٹی لے کر آؤ گے تو نزہت کو اپنے ساتھ گھماتے' موسم بھی آج کل اچھا ہو رہا ہے' پھر تو سردی شروع ہو جائے گی۔ تم چھٹی دو چار دن اور بڑھوا نہیں سکتے۔"

"ام جان! میرے ایگزام ہونے والے ہیں' ڈپارٹمنٹ کی طرف سے اس لیے چھٹی نہیں مل سکتی۔" وہ کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔

"اچھا تو امتحانوں کے بعد چھٹی لے لینا۔" وہ اصرار سے بولیں۔ شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کل ذرا فیکٹری کا تو چکر لگا آؤ اور ساتھ ہی جو ہمارا نیا سٹی پلازہ بن رہا ہے' اس کے تینوں فلورز پر تو شاپس اور شوروم ہیں اور تینوں ہی بک ہو چکے ہیں۔ اب میں اظہر سے کہہ رہی تھی کہ فورتھ فلور پر جو فلیٹس بن رہے ہیں' کیا خیال ہے ان ہی مالکانہ حقوق پر نہ دے دیا جائے۔ وہ فلیٹس لینا بھی انھیں شوروم کے اور دکانوں کے مالک چاہ رہے ہیں۔"

"کیوں' آپ کو ایسی کیا بڑی رقم کی ضرورت آن پڑی۔ جیسے دکانیں اور شوروم رینٹ پر دے رکھے ہیں' اسی طرح فلیٹس بھی رینٹ پر دے دیں۔"

"ہاں' میں نے بھی اظہر کو یہی مشورہ دیا تھا کہ کل کو اگر پلازہ سیل کرنا پڑ جائے تو پھر مشکل ہو گی۔ بہر حال تم ایک دفعہ ادھر جا کر وزٹ کر آؤ' بس دو چار ہفتوں میں ادھر کام مکمل ہونے والا ہے۔"

"لگا آؤں گا' آج تو سارا دن دوستوں سے ملنے ہی میں گزر گیا۔ اب تو بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے' آپ بھی اب آرام کریں۔" انھوں نے جمائی روکی اور کمرے سے جانے لگے۔

"شہباز بیٹا! میری ایک بات مانو گے۔" وہ پیچھے سے نرم لہجے میں بولیں تو ان کے جاتے قدم رک گئے۔

"جی بولیں ام جان! میں نے کبھی آپ کی کسی بات سے انکار کیا ہے؟" وہ پاس آ کر نرمی سے بولے۔

"بیٹا! درگزر اچھی چیز ہے اور اللہ کی پسندیدہ بھی۔ اپنے دل کو ذرا اور وسیع کر لو تو زندگی بہت سہل ہو جائے گی' تمہاری بھی اور تم سے منسلک دوسرے لوگوں کی بھی۔" وہ ان کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولیں۔

"کوشش۔" انھوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "ام جان! میں اس سلسلے میں صرف کوشش کر سکتا ہوں' توفیق اللہ دینے والا ہے' دعا کریں مجھ سے' میرے وجود سے' کبھی کسی کو کوئی ضرر نہ پہنچے' شب بخیر۔"

معاذ پھر گیسٹ روم میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے' تمہارے کمرے کی لائٹ ٹھیک نہیں ہوئی۔" وہ کچھ بیزاری سے بولے۔

"نہیں بھائی! وہ ٹیکنیشن کہہ رہا تھا۔ بورڈ کے اندر کوئی فالٹ ہے' کل دن میں آ کر ٹھیک کروں گا۔ آپ آئیں' بیٹھیں۔" وہ بیڈ پر اپنے قریب کتابیں اٹھا کر جگہ بناتے ہوئے بولا۔

"نو تھینکس' مجھے نیند آ رہی ہے' دن بھر تو ریسٹ نہیں کیا' تم پڑھو۔" وہ مڑے۔ "اور ہاں' اپنی توجہ صرف پڑھنے کی طرف لگاؤ' یہ چھوٹے چھوٹے گھر کے کاموں میں اپنی توانائی کو برباد مت کرو۔ تم اگر کام سے انکار کر دو تو کوئی تم سے حجت نہیں کر سکتا اور یہ تمہاری ذمہ داری ہے بھی نہیں' آئندہ میں تمہیں صرف اور صرف پڑھتے

ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں' انڈر اسٹینڈ۔" وہ اس کے پاس کھڑے کچھ سخت لہجے میں بولے۔

"جی بھائی!" وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولا۔

"اوکے شب بخیر۔" کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔

کمرے میں زیرو کے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نزہت کل کی طرح بیڈ کے ایک جانب سر تک کمبل اوڑھے سو رہی تھی یا شاید جاگ رہی ہو۔ وہ جا کر صوفے پر دراز ہو گئے۔ آج صبح ناشتے کے بعد جو وہ گھر سے نکلے تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی لوٹے تھے۔ دوپہر کا کھانا اور رات کا ڈنر بھی دوستوں کے ساتھ ہی کیا تھا۔

"ٹائم بھی تو بہت ہو گیا ہے۔" بارہ بجنے کو تھے' ان کی آنکھوں میں نیند آنے لگی اور ساتھ ہی پچھلی شب کا آخری پہر بھی۔ جس پر ندامت کے احساس نے انہیں سارا دن نزہت کی شکل نہ دیکھنے دی۔ یہ ضد کی انا ہی تو تھی جس نے ایک جائز نعمت کو ان کے لیے ممنوع بنا رکھا تھا۔

"مجھ میں انا ہے تو ضد اس میں بھی ہے۔ یہ خود سے مجھے نہیں بلا سکتی۔" کروٹ بدل کر انہوں نے کمبل میں لپٹی نزہت کو دیکھا۔

"وہ تو تمہیں اول دن سے بلا رہی ہے' معافیاں مانگ رہی ہے اور کیا کرے۔" دل تو پہلے دن سے اس کے حق میں تھا' فوراً بولا۔

اور مجھے اس کی صورت دیکھتے ہی بے وقعتی کا احساس زیادہ ہونے لگتا ہے۔ عجب سی نفرت گھیراؤ کرنے لگتی ہے' اس لیے بہتر ہے میں اس کی شکل ہی نہ دیکھوں' جیسے آج کا دن اچھا گزرا۔ بس کل کا دن ہے' پرسوں صبح تو نکل ہی جانا ہے یا شاید کل شام کو۔ کل شی پلازہ جاؤں گا اور ام جان کے وکیل سے ملنا ہے اور......"

وہ کل کی مصروفیات ترتیب دیتے دیتے نہ جانے کب نیند کی وادی میں اتر گئے۔

اور رات کے آخری پہر پھر اسی شدت کی سردی نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ ہاتھ اپنے گھٹنوں میں جکڑے اور ٹانگیں سینے سے لگائے صوفے پر پڑے تھے۔ سردی کے احساس نے کل کی طرح آج بھی انہیں زیادہ سوچ بچار کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت بھی ضرورت صرف اور صرف گرم بستر کی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بیڈ پر جا لیٹے۔ ہاتھ بڑھا کر کمبل کھینچا' چند لمحوں میں ہی گرم کمبل کی حرارت نے ان کے جسم کو سکون بخشا' جسم کے گرم ہوتے ہی اس کی ضرورتیں بھی جاگ اٹھیں۔

اور پاس لیٹا نیم خوابیدہ جسم پھر سے ایک "ضرورت" کا عنوان بن گیا۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ "ضرورت" بھی اپنے استعمال پر رویا بھی کرتی ہے۔ ان کی بانہوں کے حصار میں بے حس پڑی نزہت چپکے چپکے رو رہی تھی۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کے کانوں کی لو سے ہوتے ہوئے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

• • •

"شاہ جی اور کتنا تڑپائیں گے۔ آخر میں کب تک آپ کی پابندیوں کی قید میں جکڑی رہوں گی' بس میں گاؤں آ رہی ہوں آج ہی۔ آخر آپ کے بابا جان میرے بھی تو کچھ لگتے تھے۔ آخر کب تک اس تعلق کو آپ کسی گناہ کی طرح چھپائیں گے' یہی تو موقع ہے' جب سب کو میری حیثیت کا اور آپ کی محبت کا علم ہو جائے تو اچھا ہے۔" نین تارا نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

سلطان بخت ہال کمرے میں تعزیت کے لیے آنے والوں کے پاس سوگوار چہرہ بنائے بیٹھے تھے' جب ان کے موبائل کی ٹیون بجی تھی۔ اسکرین پر نین تارا کا نمبر دیکھتے ہی وہ حاضرین سے معذرت کرتے ہوئے کمرے کے کونے میں چلے آئے تھے۔

"تم بات کو اور پوزیشن کو سمجھتی ہو۔ اس وقت حالات ادھر کس قدر نازک ہیں' میں تمہیں کیسے بتاؤں اور میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ ابھی چند دن مجھے فون مت کرنا اور تم آنے کی بات کر رہی ہو۔" انہیں اس پر شدید غصہ آ رہا تھا' جھنجلا کر بولے۔

"تمہاری ماں کا ہی مطالبہ تھا' یہ پردہ داریاں......" وہ چبا چبا کر مدھم لہجے میں بولے۔

"تو اب میری ماں اس مطالبے سے دستبردار ہو جاتی ہے' بس آپ مجھے ادھر آنے کی اجازت دیں تو میں......"

"نین تارا! فار گاڈ سیک۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں' مجھے اور زچ مت کرو اور ضروری نہیں میری زندگی کے سارے رنگ تمہاری ماں کے مطالبوں کے مطابق طے ہوں۔ میری اپنی بھی کچھ مجبوریاں ہیں' میں صرف تمہارا شوہر ہی نہیں۔ ادھر ایک پورا خاندان' ایک پورا علاقہ میری ذمہ داری بن گیا ہے اور مجھے سب طرف نظر رکھنی ہے۔ اب جہاں تم نے اتنا صبر کیا ہے' وہاں صرف دو چار دن اور۔ کل چالیسواں ہے۔ اس کے بعد میں دو ایک روز ہی میں ضرور تمہاری طرف چکر لگاؤں گا۔ اب تم فون بند کرو۔"

"آخر اس ہار کو گلے میں ڈالنے کی ضرورت کیا تھی۔ نین تارا کو یوں بھی اپنے بستر کی زینت بنایا جا سکتا تھا۔ سلطان بخت تمہاری جلد بازیاں ایک دن تمہیں برباد کریں گی۔" وہ دل ہی دل میں خود کو کوس بھی رہے تھے۔

"پھر وہی بہلاوے......" وہ جواباً تڑخ کر بولی۔ "میں تنگ آ چکی ہوں' میں...... میں گاؤں آ رہی ہوں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"نین تارا یو آر میڈ ناؤ۔ اس وقت مجھے پاگل مت کرو' میں تمہیں رات کو فون کروں گا' خدا حافظ۔"

"شاہ جی! آپ کا فون ہے۔" چند منٹوں بعد ایک ملازم نے آ کر انہیں اطلاع دی تو انہوں نے ملازم کو گھور کر دیکھا اور پھر سب سے معذرت کر کے اٹھ گئے۔

"کس قدر احمق عورت ہے یہ اور سلطان بخت! یہ تو طے ہے کہ قدرت نے زمانے بھر کی احمق اور چغد عورتیں تمہارے نصیب میں لکھ رکھی ہیں۔ کیا نین تارا...... کیا صالحہ بیگم......"

وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کمرے سے نکل کر اندر لاؤنج میں آئے فون سیٹ کا ریسیور سائیڈ پر دھرا تھا۔ انہوں نے بیزاری سے ریسیور اٹھا لیا۔ ان کا ارادہ نین تارا کو سخت سست سنانے کا تھا۔

"ہیلو۔" وہ کچھ اسی انداز میں غرائے۔

"ہیلو سلطان بخت! السلام و علیکم' میں بڑے شاہ جی کا لیگل ایڈوائزر ابرار احمد بات کر رہا ہوں۔" وہ دوسری طرف کی آواز سن کر ٹھٹک سے گئے۔

"جی جی...... میں نے پہچان لیا ہے' کیسے کیسے حال ہیں آپ کے۔"

"شکر ہے اللہ کا' آپ سنائیں کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ ہمیشہ بڑے شاہ جی سے بات ہوتی تھی تو اب ان کے بغیر سب بہت عجیب لگ رہا ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"جی بالکل درست فرما رہے ہیں آپ ان کے بغیر تو سب ہی کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔" وہ لہجے کو افسردہ بناتے ہوئے بولے۔

"بس ہم لوگوں کی زندگی ہی کچھ ایسی مصروف ہوتی ہے کہ پہلی دفعہ کے بعد کوشش کے باوجود چکر ہی نہیں لگا سکا۔" وہ معذرت خواہ لہجے میں بولے۔

"میں نے ابھی اس لیے فون کیا ہے آپ کو کہ کل چہلم کے بعد میں آپ کا کچھ ٹائم لینا چاہوں گا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کیوں۔"

ان کی بات پر سلطان بخت کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"جی!" وہ ہولے سے بولے۔

"اصل میں کل آپ کے خاندان کے چیدہ چیدہ افراد تو ہوں گے اور میں کل بڑے شاہ جی کا وصیت نامہ آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس موقع پر سب کو ان کی وصیت کی خبر ہو جائے اور باقی جو بھی قانونی کارروائی ہو' وہ آپ کے مشورے اور حکم سے میں مکمل کر سکوں۔"

"جی ضرور کیوں نہیں' اچھا ہے سب لوگوں کی موجودگی ہی میں وصیت نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔ ویسے کیا بابا جان جانے سے پہلے وصیت نامہ لکھوا گئے تھے۔" وہ ذرا رک کر بولے۔

"جی وصیت نامہ تو انہوں نے کوئی سال بھر پہلے سے لکھوا رکھا تھا مگر اس میں کچھ ترامیم دو تین ہفتے پہلے کروائی تھیں انہوں نے آپ کی شادی کے فوراً بعد۔ ان ہی ترامیم کی وجہ سے میں یہ وصیت نامہ سب کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔" ان کی بات پر سلطان بخت کا دل جیسے کسی بھنور میں آ گیا۔

"کیسی ترامیم۔" وہ اچنبھا کر بولے۔

"یہ تو اب کل ہی آپ کو پتا چل سکیں گی۔ اوکے، پھر مجھے اجازت دیں، میں انشاء اللہ کل دوپہر کے بعد حاضر ہو جاؤں گا، خدا حافظ۔"

"لالہ! آپ ادھر اکیلے بیٹھے ہیں۔" شہرینہ کی آواز پر وہ چونک اٹھے۔

"کالج تو جا رہی ہو نا، اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔" وہ اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر کے پھر سے بیٹھ گئے۔

"جی بالکل ٹھیک۔" وہ انہیں چپ چپ سی لگی۔

"سلطان بخت! شہرینہ اب کے بعد تمہارے حوالے ہے۔" انہیں سبطین شاہ کی آخری التجا یاد آئی تو بے اختیار بہن پر پیار آ گیا۔

"چپ چپ کیوں ہو گڑیا! کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہو، میں ہوں نا۔"

"کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں، بہن بھائی میں۔" صالحہ اچانک ہی داخل ہوئیں۔ شہرینہ نے گڑبڑا کر انہیں دیکھا۔ سلطان بخت کے ماتھے پر البتہ بہت سی شکنیں نمودار ہو گئیں مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔

"آئیں بھابی بیگم! کچھ خاص بات تو نہیں ہو رہی تھی۔" شہرینہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"خاص ہی ہو گی جو یوں اکیلے ہی میٹنگ ہو رہی ہے۔" وہ سامنے بیٹھ گئیں۔

"وہ بس میں لالہ سے کہہ رہی تھی۔ کالج گاؤں سے خاصا دور ہے، گاڑی میں بھی روز آتے جاتے میں دو ڈھائی گھنٹے لگ جاتے ہیں، اس قدر تھکاوٹ ہو جاتی ہے کہ پھر پڑھا نہیں جاتا۔ اگر لالہ مجھے ہاسٹل میں داخل کروا دیں تو اچھا ہے۔" وہ ذرا اٹک اٹک کر بھائی کی شکل دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں، بالکل صحیح بات ہے۔ تمہارے لالہ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ آخر تمہیں پڑھنا بھی تو ہے، خوب ڈھیر سارا۔ اس خاندان کا نام روشن کرنا ہے، کیوں شاہ جی۔" ان کا انداز مسخرانہ تھا۔ سلطان بخت نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا شہرینہ! کالج سے آ کر گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کر لیا کرو مگر ہاسٹل میں نہیں۔"

"پلیز لالہ!" وہ ملتجی انداز میں بولی۔

"اس وقت مجھے تنگ مت کرو، کل چہلم ہو جائے پھر اس مسئلے پر بات کریں گے، باہر لوگ بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

وہ اپنی شال جھٹک کر باہر نکل گئے، حقیقتاً ان کا دل بیرسٹر صاحب کی "ترامیم" میں اٹکا ہوا تھا، کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا اور کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم فکر نہ کرو شہری! میں تمہارے لالہ سے سفارش کروں گی کہ تمہیں ہاسٹل میں داخلہ لے دیں، تم ذرا فکر نہ کرو کسی بھی بارے میں۔ دیکھنا تم میں تمہاری راہ کے سارے کانٹے کیسے دور کرتی ہوں۔"

صالحہ نے اس کے قریب آ کر اسے تسلی دی تو شہرینہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

صالحہ کے چہرے پر وہی پراسراری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ شہرینہ کو ذرا خوف سا محسوس ہوا، اس کے کندھے پر صالحہ کے ہاتھ کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اور چہرے کی مسکراہٹ بھی۔

شہرینہ نے ایک جھٹکے سے اپنا کندھا ان سے چھڑایا اور بھاگ کر باہر نکل گئی تو صالحہ خود بخود زور سے ہنسنے لگیں۔

"بچی۔۔۔ معصوم لڑکی۔" وہ اب بھی ہنس رہی تھیں بے وجہ۔

● ● ● ● ● ●

"ویسے تو سبطین شاہ صاحب مرحوم، اللہ ان کی مغفرت فرمائے انہوں نے تقریباً سال بھر پہلے ہی وصیت نامہ لکھوا رکھا تھا اور اس میں کوئی بھی انوکھی بات نہیں لکھوائی گئی تھی، اسلام کے موروثی قوانین کے عین مطابق۔ پراپرٹی کا آدھا حصہ سید سلطان بخت کے نام اور اس کا نصف دونوں صاحبزادیوں سیدہ بتول بی بی اور سیدہ شہرینہ بی بی کے نام ہے۔ سید سلطان بخت ان کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کے تنہا وارث ہیں۔ سیدہ بی بی کا حصہ انہیں اس کارروائی کے بعد ان کو منتقل کر دیا جائے گا اور چھوٹی صاحبزادی شہرینہ بی بی کا حصہ ان کی شادی تک سلطان بخت کے زیرِ انتظام ان کی تحویل میں رہے گا۔ صاحب زادی کی شادی جو کہ شاہ صاحب کی وصیت کے مطابق خاندان میں ہی ہونی چاہیے اگر ان کی شادی غیر سید گھرانے میں ہوئی تو پھر انہیں اپنے حصے سے محروم ہونا پڑے گا۔ شادی پر صاحبزادی کا حصہ ان کو ٹرانسفر کر دیا جائے گا۔ یہاں تک تو وصیت میں کوئی پیچیدگی نہیں۔"

بیرسٹر صاحب کی باتیں سلطان بخت کے اندر کے شاہ جی کو خوب بھا رہی تھیں۔ ان دیکھی خوشی کی لہر تھی جو اندر ہی اندر اترتی جا رہی تھی۔ حسین شاہ کے چہرے پر تلخی اور کچھ کچھ کوفت کے آثار تھے۔ حسین شاہ کا بیٹا جواد بھی وہیں تھا، سولہ سترہ سال کا لاابالی نوجوان۔ اسے بیرسٹر صاحب کی گفتگو بالکل بے مزہ محسوس ہو رہی تھی۔ خاندان کے دو تین بڑے بزرگ بھی محفل میں موجود تھے۔

"اس میٹنگ کے بعد کچھ ضروری کاغذی کارروائی ہے، جس کے بعد کل شام تک تمام پیپرز پر سلطان بخت کے دستخط ہو جائیں گے تو پراپرٹی قانونی طور پر ان کے نام منتقل ہو جائے گی البتہ۔"

انہوں نے پیپرز سے سر اٹھایا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے حاضرین کی طرف دیکھا۔

"حج پر جانے سے پہلے ایک رات بڑے شاہ جی میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے اس وصیت نامے میں کچھ ترامیم کروائی تھیں جس سے سلطان بخت کے لیے اپنے اختیارات استعمال کرنے میں کچھ مشکل تو ہو گی لیکن میرا خیال ہے ایسی کوئی پیچیدگی کی بات بھی نہیں۔ گھر کا ہی معاملہ ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔"

بیرسٹر صاحب نے سلطان بخت کو کچھ پریشان کر دیا تھا اور باقیوں کو بے چین۔

"اصل میں سید سلطان بخت کی زوجہ محترمہ سیدہ صالحہ شاہ کو بڑے شاہ جی نے آئندہ بیس سال تک ہر معاملے میں ان کا حصے دار قرار دیا ہے۔ سلطان بخت کوئی بھی پراپرٹی یا کوئی اور چیز جس کی مالیت ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہو گی نہ تو صرف اپنے دستخط شدہ چیک کے ذریعے خرید سکتے ہیں، نہ بیچ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ان کے چیک پر ان کی مسز صالحہ شاہ کے سائن ہونا از حد ضروری ہوں گے۔ جس کے بغیر چیک کیش ہو گا، نہ کوئی کریڈٹ کارڈ بھی Valid ہو گا۔ مسز سلطان بخت کے دستخط کے بغیر ان کے تنہا سائن کام نہیں کر سکیں گے اور سلطان بخت پر یہ پابندی صرف بیس سال تک ہے، بیس سال بعد وہ اس شرط سے آزاد ہوں گے اور صرف اپنے دستخط سے ہی سارا انتظام چلا سکیں گے۔"

"اس کی وجہ شاہ جی نے یہ لکھوائی ہے کہ چونکہ سلطان بخت تھوڑے جذباتی ہیں اور کچھ شاہ خرچ بھی۔ کسی کی مدد کا معاملہ ہو یا بزنس کنسرن کا، یہ اکثر بہت گہرائی میں جائے بغیر فیصلہ کر لیتے ہیں جو کہ سودمند نہیں ہوتا، اس لیے ان کی مشاورت اور پراپرٹی کے نظم و نسق کو بہتر انداز میں چلانے کے لیے ان کی مسز کو ان کا شریک کار بنایا گیا ہے اور بڑے شاہ جی کا خیال تھا کہ سلطان بخت کو ان کا یہ اقدام ناگوار نہیں گزرے گا۔ بس یہی بنیادی ترمیم تھی۔ اب جیسے ہی تمام پراپرٹی سلطان بخت کے نام ٹرانسفر ہوتی ہے یہ شرط بھی لاگو ہو جائے گی اور خدانخواستہ مسز سلطان بخت اگر حیات نہیں رہتیں تو یہ حق بڑی صاحبزادی سیدہ بتول کو تفویض کر دیا جائے گا بیس سال تک اور خدانخواستہ ان دونوں کی اگر علیحدگی ہو جاتی ہے تو بھی یہ شرط موجود رہے گی۔ امید ہے سب کو بات سمجھ میں آ گئی ہو گی۔"

"البتہ سلطان بخت اپنا ذاتی اکاؤنٹ اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔" بیرسٹر صاحب نے فائل بند کرتے ہوئے آخری سطر پڑھی اور سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔

"یہ فائل میں شاہ صاحب! آپ کی اسٹڈی کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں' اس میں اگر کوئی نقطہ یا پوائنٹ کلیئر نہ ہو تو آپ کل صبح تک مجھے انفارم کر سکتے ہیں' کیونکہ کل شام تک تمام کاغذی کارروائی قانونی طور پر مکمل کر لی جائے گی۔ آپ کے سائن جہاں ضروری ہیں وہ اسپاٹس میں نے مارک کر دیے ہیں۔"

انہوں نے فائل سلطان بخت کی طرف بڑھائی۔ سلطان بخت نے فائل لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ چند لمحے بیرسٹر صاحب کو گھورتے رہے پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"آپ فائل چھوڑ جائیے گا' مجھے ایک ضروری کام سے ابھی جانا ہے' ایکسکیوز می۔"

انہوں نے بہت مشکل سے یہ دو جملے ادا کیے۔ ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ غصے اور رنج کے ملے جلے جذبات نے ان کا چہرہ تاریک کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے تیز تیز قدم اٹھاتے وہ ہال کمرے سے باہر نکل گئے۔ سب لوگ کچھ تعجب سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ حسین شاہ کو البتہ کوئی تعجب نہیں تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت صالحہ شاہ کی بھی تھی۔ سیدہ البتہ مضطرب و بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر یونہی کھڑی ہاتھ مسلتی رہیں پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ انہیں سلطان بخت کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ بے چینی سے باہر کی طرف لپکیں۔

جس تیزی سے سلطان بخت نے گاڑی ریورس کی تھی اس سے ٹائروں کی رگڑ حویلی کے اندر تک گونجی تھی۔ دربان نے دوڑ کر حویلی کا آہنی گیٹ وا کر دیا۔ سلطان بخت کی بی ایم ڈبلیو گرد کا ایک طوفان پیچھے چھوڑ کر گولی کی رفتار سے گیٹ سے نکلی تھی۔ گاؤں کی کچی پگڈنڈی پر بھی انہوں نے رفتار کم نہ کی۔ کھیتوں میں شام کے آخری کام نمٹاتے کسانوں نے کچھ حیرت سے اپنے ہاتھ روک کر اتنی اسپیڈ سے جاتی گاڑی کو دیکھا۔

اور سلطان بخت کو تو کچھ ہوش نہیں تھا۔ غم اور غصے نے ان کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جیسے منجمد کر دی تھیں۔ اسٹیئرنگ کو انہوں نے اتنی زور سے اپنی آہنی انگلیوں میں بھینچ رکھا تھا

"بابا جان.... بابا جان! تو آخر آپ نے اپنا انتقام لے ہی لیا۔ اپنی بیٹی کے گھر کو بچانے کی خاطر آپ نے میری زندگی سے ہر خوشی کو نوچ پھینکا' آپ کا کیا خیال ہے' اس طرح سے میں آپ کی تمام نیک خواہشات کو پورا کر دوں گا' کبھی نہیں' کبھی نہیں۔"

انہوں نے اسٹیئرنگ وہیل پر دو بار مکے مارے اور وہیل کو اس تیزی سے گھمایا کہ گاڑی دائیں بائیں پوری طرح سے ڈولنے لگی۔ ان کا دماغ پک رہا تھا' اگر بابا جان اپنی زندگی میں یہ کام کرتے اور مجھے خبر ہو جاتی تو خدا کی قسم آج سے بہت دن پہلے ان کا چالیسواں ہو چکا ہوتا۔"

انہوں نے کلچ سے ٹانگ ہٹا کر سامنے زوردار ٹھوکر ماری۔

"ایسی فقیرانہ زندگی سے بدرجہا بہتر تو موت ہوگی۔ اس مکار اور قابل نفرت عورت کے آگے میں ساری زندگی بھیک مانگتا رہوں اور وہ میری خوشیوں کی قاتلہ اپنی کمین فطرت کے ہوتے مجھے بھیک نہ دے گی۔ بابا جان! کاش آپ کی جگہ مجھے موت آ گئی ہوتی یا میں نے صالحہ شاہ کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا ہی نہ ہوتا یا بہت پہلے میں اس حویلی کو آگ لگا چکا ہوتا۔"

غصے سے وہ اوٹ پٹانگ باتیں سوچے جا رہے تھے۔ گاڑی اب مین روڈ پر بہت اسپیڈ سے دوڑ رہی تھی۔ جب ان کی بی ایم ڈبلیو "گل کدہ" کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو شہر کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ اگرچہ ان کے اپنے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ "گل کدہ" کا گیٹ کھلا ہی تھا۔ نین تارا کی گاڑی ابھی چند لمحے پہلے اندر داخل ہوئی تھی۔ سلطان بخت نے اپنی گاڑی گیٹ کے بیچوں بیچ کھڑی کر دی۔ نین تارا نے گاڑی سے نکلتے ہی مڑ کر سلطان بخت کی گاڑی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ کھل سا گیا۔ وہ تقریباً "دوڑتی ہوئی ان کی گاڑی تک آئی۔

"شاہ جی! آپ.... آ گئی آپ کو میری یاد؟" سلطان بخت نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ خود اسی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ نین تارا ذرا سا اندر ہو کر خوشی اور شکایت سے بولی۔

"نین تارا کم ان سائیڈ۔" سلطان بخت نے سنجیدگی سے سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"ابھی شاہ جی!" وہ تعجب سے بولی۔

"ابھی اور اسی وقت۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھے۔ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر جما رکھے تھے

"کہاں جانا ہے؟" وہ دروازہ تھام کر کھڑی تھی۔

"تم اندر آ کر بیٹھو' تمہیں پتا چل جائے گا۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر رکھا اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا۔

"میں مام کو تو بتا آؤں۔" وہ ہچکچا کر رکی۔

"یہ سارے ملازم اندھے ہیں' بتا دیں گے۔ نہیں تو تم ادھر آ کر فون کر لو مگر اب مزید دیر مت کرو' آؤ۔"

انہوں نے اسے جھٹکے سے اوپر کھینچ کر تقریباً" اپنے اوپر گرا لیا۔ نین تارا جلدی سے سیدھی ہو کر سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی کا کھلا دروازہ بند کرنے لگی۔ سلطان بخت نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ نین تارا اپنے چہرے پر آئے بال ہٹانے لگی۔ اسکارلٹ ریڈ شرٹ اور بلیک اسکن ٹائٹ ٹراؤزر میں اس کا نازک جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ سلطان بخت نے گاڑی بائیں طرف موڑتے ہوئے ایک ترچھی نظر اس کے قاتل سراپے پر ڈالی تو ایک پل کو انہیں کچھ دیر پہلے کی ساری کوفت' ساری ذلت محو ہو گئی۔

"کیا بات ہے شاہ جی! موڈ بڑا آف لگ رہا ہے۔" نین تارا نے اپنے بریسلٹ کا لاک ذرا ٹائٹ کرتے ہوئے سلطان بخت کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ہوں!" سلطان بخت کا دھیان اب ٹریفک کی طرف تھا' جہاں گاڑیوں کا اژدہام دوڑ رہا تھا۔

"جانا کہاں ہے؟" وہ ہاتھ بڑھا کر کیسٹس چیک کرنے لگی۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"زیادہ دور نہیں جانا۔"

چند منٹ بعد ان کے جواب پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا' گاڑی "سید ہاؤس" کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔ ان کی پہلی آواز پر ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔

"آپ کم از کم آنے کی اطلاع تو کر دیتے۔ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ راستے میں موڈ نہ بنا' اس لیے جلدی واپس آ گئی۔ شاید دل کو آپ کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔"

بیڈ روم میں داخل ہو کر نین تارا بولی۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں ذرا فریش ہو کے آؤں' آج ___ "رت جگا" منائیں گے۔"

سلطان بخت نے جھک کر جوتے اتارے اور واش روم کی طرف جاتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا تو ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی اپنا جائزہ لیتی نین تارا نے ذرا چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ اندر جا چکے تھے۔ نین تارا کے لبوں پر دلکش سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے آئینے میں دیکھ کر اپنا میک اپ درست کرنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئے تو ان کا موڈ کافی حد تک بحال ہو چکا تھا۔ گنگناتے ہوئے وہ کمرے کے بغلی حصے کی طرف بڑھے جسے وڈورک کے ایک خوبصورت سیٹ کے ذریعے بیڈ روم سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ نین تارا نے لپ اسٹک کا آخری کوٹ کیا اور لپ اسٹک ٹیبل پر رکھ کر سلطان بخت کے پیچھے گئی۔ انہوں نے سامنے کی دیوار میں بنی خوبصورت الماری کا لاک کھولا' الماری کے کھلے پٹ کے سامنے بالکل سپاٹ لکڑی کی دیوار تھی۔ سلطان بخت نے ایک طرف سے اسے ذرا سا دبایا تو سامنے ایک بڑا سا ریک کھل گیا جس میں مختلف اقسام کے ڈرنکس کی بوتلیں قطاروں میں لگی تھیں۔ سلطان بخت نے ہاتھ بڑھا کر ایک بوتل باہر نکال کر الماری لاک کر دی۔

نین تارا نے آگے بڑھ کر الماری کے دوسرے خانے میں لگے کرسٹل کے جام میں سے دو اٹھائے اور بیڈ روم والی سائیڈ میں آ گئی۔ فرج سے برف کا سانچہ نکال کر ٹیبل کے پاس بیٹھ کر برف کرسٹل کے نازک صراحی دار گلاسوں میں ڈالنے لگی۔ سلطان بخت نے بوتل اس کے آگے رکھ دی۔ اس وقت ان کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔ انہوں نے سائیڈ ریک پر پڑا موبائل اٹھایا۔ اسکرین پر سیدہ کا موبائل نمبر تھا۔

"گو ٹو ہیل آل آف یو۔" وہ منہ میں بڑبڑائے اور موبائل آف کر کے اسے بیڈ کی طرف اچھال دیا۔
"شاہ جی! آج سب وعدے پورے کرنے ہیں' اس بار میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گی۔ نئی گاڑی اور "سید ہاؤس" کے پیپرز میرے نام ہوں گے تو آپ ادھر سے جا سکیں گے۔ ماں نے سب پیپرز تیار کر رکھے ہیں' صرف آپ کے سائن ہوں گے۔" نین تارا ڈرنک گلاسوں میں انڈیلنے لگی۔
"جان سلطان بخت! آج کی رات کچھ نہیں' کوئی وعدہ نہیں' کوئی پیمان نہیں' جام ہی جام' بس پیار ہی پیار.... نشہ ہی نشہ۔"
نین تارا کچھ بول ہی نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

پانچویں پیریڈ کے بعد وہ فری تھی۔ ابھی فضل دین کے آنے میں بھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔
"اگر میں ہاسٹل میں ہوتی تو اب تک ہاسٹل جا چکی ہوتی۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں کالج میں کیا جھک ماروں؟"
شہرینہ نے جھنجلا کر گھاس پر پڑے چھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر ماری۔
"سید ہاؤس" میں رہ لوں' کنالوں پر پھیلا محل بھلا نوکروں کے عیش کے لیے بنا ہے۔" اسے غصے میں ایک اور نقطہ سوجھا۔ "اس بار تو میں ڈٹ کر لالہ سے بات کروں گی۔ یہ روز روز کی مشقت مجھ سے نہیں ہوتی۔ فضول کی بیگار دو گھنٹوں میں لڑھک لڑھک کر پہنچو اور دو گھنٹے میں گھسٹ گھسٹ کر واپس آؤ۔ ذرا دیر ہو جائے تو پہلا پیریڈ مس ہو جانے کی تلوار الگ سر پر لٹکتی رہے' ہونہہ!" وہ خود ہی بڑبڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔
"کل سے لالہ بھی غائب ہیں' خدا جانے کدھر۔ ان کے چکر بھی سمجھ میں نہیں آئے۔ غائب ہیں تو گھر میں سکون ہے ورنہ تو ان کے بیڈ روم میں ہر وقت ٹاپ کلاس ایکشن پنجابی موویز چلتی رہتی ہے۔ بھابھی بیگم تو ان کے لیے جیسے مولا جٹ ہی بن گئی ہیں اور لالہ سلطان راہی اور آپا بھلا کیا ہیں؟"
وہ رک کر حیرت سے دیکھنے لگی۔ اسے خیالات کی یلغار میں پتا ہی نہیں چلا تھا کہ وہ پچھلے گیٹ پر پہنچ گئی ہے۔
"ذہن جو ہر وقت ڈسٹرب رہتا ہے' گھر کی ٹینشن کی وجہ سے۔" دل نے معصومیت سے اس غائب دماغی کی توجیہہ پیش کی۔

بھڑکائیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں
صحرا میرا چہرہ ہے سمندر تیری آنکھیں

جھپاک سے ایک شعر اور ساتھ ہی عبدالمبین کا خیال آ گیا۔ لبوں پر شعر دہراتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔
"لگتا تو نہیں اس کا شعری ذوق اتنا اچھا ہو گا' کیا نام تھا اس کا بھلا۔"
وہ سوچنے لگی۔ "ہاں.... عبدالمبین۔ بھلا اس نے مجھے یہ اشعار کیوں لکھے تھے' ایک بار ملتا تو ضرور خبر لیتی اس روز تو بابا جان کی خبر آ گئی۔"
اس نے افسردگی سے یونہی ذرا سی گردن اونچی کر کے گیٹ کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔
"وہ تو تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے کا رقعہ تھا' جب اس نے ادھر آنے کا لکھا تھا اب تو وہ بھول بھال بھی گیا ہو گا۔"
وہ سوچتے ہوئے ذرا سا گیٹ سے آگے ہو کر باہر جھانک رہی تھی۔ اس نے اپنے بڑے سے دوپٹے کو کانوں کے پیچھے اڑس کر نقاب کر لیا تھا۔ ماتھا بھی اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔
"ہیلو! السلام علیکم۔ کیا حال ہے۔ آپ کو آج مجھے تلاشنا یاد آیا ہے۔ میں تو ادھر گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے کھڑا ہوں۔ یہ عشق تو نری خواری ہے۔ اب مجھے پتا چلا مجنوں' مہینوال اور رانجھا کیوں مر کھپ گئے' اسی راہِ محبت میں رُل کر۔"
اس کی آواز ہی شہرینہ کو چونکا دینے کے لیے کافی تھی اور اس کے ڈائیلاگ اس کے دل کو غیر متوازن تال میں دھڑکانے کو۔ وہ بالکل بیٹ کے بائیں طرف دیوار سے جڑا کھڑا تھا۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے چمک رہا تھا مگر ہونٹ دلکش مسکراہٹ لیے ہوئے تھے جیسے ابھی کھل کر ہنس پڑیں گے۔ اس نے آنکھیں شہرینہ کے گیٹ سے

نکلے چہرے پر ہی جما رکھی تھیں۔ شہرینہ اس کی ٹکٹکی سے ایک لمحے کو ہی مبہوت سی ہوئی تھی۔
"اچھا لگ رہا ہوں نا میں۔ شکر ہے آپ نے پہچان لیا ورنہ......"
"شٹ اپ!" شہرینہ نے اس کی بات کاٹی۔ "تم...... تمہیں اتنی جرات کیسے ہوئی کہ تم مجھے' سید سبطین شاہ کی بیٹی کو ایک واہیات رقعہ لکھو۔ اگر میں لالہ کو وہ رقعہ دکھا دوں تو تم اس زمین پر چلتے پھرتے کہیں بھی نظر نہ آؤ۔"
وہ غصے میں آ گئی تھی یا غصہ دکھا رہی تھی۔ عبدالمبین کو فرق جانچنے میں صرف ایک پل لگا۔ دوسرے پل وہ پھر سے مطمئن تھا۔
"تو اتنے دنوں سے دکھایا کیوں نہیں رقعہ اپنے لالہ کو۔ میں ڈرتا ہوں ان سے' میں تو کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ شہرینہ جی! جو محبت کرتے ہیں' وہ پھر کسی سے نہیں ڈرتے۔ محبت تو کام ہی جان پر کھیل جانے والوں کا ہے۔"
اس نے پھر سے بڑے اسٹائل سے ہونٹوں کو گول کر کے ڈائیلاگ مارا' وہ اب تھوڑا سا گیٹ کے اندر کھسک آیا تھا۔ چوکیدار گیٹ سے خاصے فاصلے پر کھڑا کسی وین والے سے گپ شپ لڑا رہا تھا۔ شہرینہ نے چور نظروں سے باہر دیکھا۔ اس گیٹ پر رش نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی ابھی چھٹی بھی نہیں ہوئی تھی۔
"تم..... تمہیں معلوم ہے تم کیا بکواس کر رہے ہو' اگر میں نے رقعہ نہیں دکھایا تو اس وجہ سے کہ یہ تمہارے دماغ کا خلل ہو گا۔ مفت میں اس خلل کی وجہ سے مارے جاؤ گے' ورنہ جانتے ہو تم آگ کے شعلوں سے کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔" وہ اسی لہجے میں غصے سے پھنکاری۔
"محبت کا دوسرا نام ہی آگ سے کھیلنا ہے۔ یہ پھولوں کی سیج تو ہے نہیں اور کیا مجھے نہیں پتا کہ میں کون ہوں تم کون ہو' میرا کیا درجہ ہے' تم کس رتبے کی حامل ہو۔ جس باعزت خاندان سے تمہارا تعلق ہے میرا گھرانہ اس کی جوتیاں سیدھی کرتا ہے تو بھی کوئی خاص عزت نہیں پاتا۔ میں یہ سب باتیں پہلے دن سے جانتا ہوں' اس دن سے جب پہلی بار تم کو دیکھا تھا اور اس پل بھی جب دل نے تمہیں پانے کی ناممکن خواہش اس دل میں پالی تھی اور اس روز بھی جب تمہاری گاڑی کے آگے جان بوجھ کر آنے کی جسارت کی تھی اور اس گھڑی بھی میں اپنی اوقات اور تمہارا مقام ہرگز نہیں بھولا تھا جب رات کے آخری پہر گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد میں نے تمہارے حسن کی تعریف میں چند لائنیں گھسیٹی تھیں' اگر وہ لائنیں کسی اور کے ہاتھ لگ جاتیں' میرا کیا انجام ہوتا' مجھے سب احساس تھا مگر میں کیا کروں' محبت کرنے والا دل ان ڈراووں سے ڈرتا ہی نہیں۔ اس کی تو ایک ہی رٹ تھی' شہرینہ.... شہرینہ اور بس۔"
"اگر میں یہاں سے دفعان ہو جاؤں' اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھو اور دوبارہ تمہیں نظر بھی نہ آؤں تو کیا تمہارا دل یہ جدائی سہہ سکے گا؟ ایسا ہے تو تم مجھے ڈھونڈ کیوں رہی تھیں۔ ذرا پوچھو تو اپنے دل سے۔ میرا یہاں کھڑا ہونا تم سے بات کرنا کیسا لگا ہے اسے؟"
وہ محبت بھرے انداز میں اس کے ذرا پاس ہو کر بہت دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ شہرینہ کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔
"اگر میرے بغیر رہ سکتی ہو تو پھر کہو' میں تمہارے رستے میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ شاید تمہاری جدائی میں اس جہان ہی سے گزر جاؤں کیونکہ مجھے تو اس زمین پر زندہ رہنے کا سبب تم ہی نظر آتی ہو۔" وہ لہجے کو ذرا اداس بنا کر بولا۔
"فلمیں بہت دیکھتے ہو اور لگتا ہے فارغ بھی بہت ہو۔" وہ طنز سے بولی۔ "اپنے دماغ کو کسی ڈھنگ کے کام میں لگاؤ تو یہ خرافات نہ آئیں تمہاری کھوپڑی میں۔"
"یہ خرافات نہیں' زندگی کا انمول تحفہ ہے محبت! اک محبت کو تو دنیا کیا' کوئی بھی آسمانی زمینی مذہب فرقہ نہیں جھٹلا سکتا تم اسے خرافات کیسے کہہ سکتی ہو۔ سیدہ شہرینہ شاہ! جس کو یہ خرافات لاحق ہو جاتی ہیں' وہ تو قدرت کے منتخب کردہ ہوتے ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں ان میں سے ایک ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ آئی لو یو شہرینہ! آئی ریلی لو یو۔"

اس نے کہہ ہی دیا اور یہ آخری جملہ شہرینہ کے لیے اس قدر سخت تھا جس کی اسے توقع نہ تھی۔ اس کے تو پاؤں ہی زمین سے اکھڑ گئے۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ عبدالمبین نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیے۔ شہرینہ کا پورا جسم جیسے کسی جلتی بھٹی میں جا گرا اور ہاتھ کٹ کر کہیں دور۔ اس نے بے اختیار کپکپی سی لی ہاتھ چھڑانے کی اس کی کوشش بالکل معمولی سی تھی۔ اصل میں تو اسے لگا جیسے اس کی ساری طاقت ہی نچڑ گئی ہے' اس کے دونوں بازو ہاتھوں سمیت مفلوج ہو گئے ہیں۔

"پلیز۔" اس کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آ گئے۔

"اوکے۔" اس نے بے حد نرمی سے اس کے ہاتھوں کو دبا کر چھوڑ دیا تو جیسے شہرینہ پھر سے جی اٹھی' اس کی سانسیں آنے جانے لگیں۔

"شہرینہ! میرے دل میں جو کچھ تھا میں نے بتا دیا' تمہارا دل اب جو فیصلہ کرے وہ تم خوب سوچو اور پھر مجھے بتاؤ۔ اگر تمہارا دل میری محبت کو خوشی سے قبول کر لیتا ہے تو میں سمجھوں گا روئے زمین پر آج تک مجھ سے زیادہ خوش نصیب شخص اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوا اور اگر تمہارا دل میری محبت کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو بے شک تم مجھے ٹھکرا دینا' میں دوبارہ تمہاری راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔" وہ بہت سنجیدہ تھا۔ شہرینہ کے اندر تو ابھی سے جنگ چھڑ گئی تھی۔ عبدالمبین کے لمس نے اس کے اندر حیات کی ایک دنیا بیدار کر دی تھی۔ انوکھا سا احساس' عجیب سی لذت اور گھٹا گھٹا سا درد۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"دیکھو! تمہیں معلوم ہے مجھے یہ سب پسند نہیں' نہ میں یہ محبت وغیرہ افورڈ کر سکتی ہوں اور نہ کروں گی اور نہ میرے ماحول کے سیٹ اپ میں اس کی گنجائش ہے۔ تم پلیز جاؤ اور آئندہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں رخ پھیر کر بولی۔

"شہرینہ! میری طرف دیکھ کر مجھے جانے کا بولو۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"میں کل گاؤں جا رہا ہوں' تمہارا جواب سننے وہیں آؤں گا۔ ابھی تم کچھ مت کہو تھوڑا سا سوچ لو ایسا نہ ہو کہ ابھی جلد بازی کا فیصلہ تمہارے لیے ساری زندگی کا روگ بن جائے' زندگی تو شاید جی لو مگر دل مر جائے تو مرے ہوئے دل کے ساتھ زندگی جینا کتنا دشوار ہو گا' تم سوچ سکتی ہو۔"

وہ اسے نہ جانے کن بھول بھلیوں میں پھنسا رہا تھا۔ اسے تو کوئی جملہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"کل میں تمہارا جواب لینے کہاں آؤں؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ اسے چپ دیکھ کر خود ہی بولا۔ "حویلی کے پچھلے دروازے پر یا ڈائریکٹ تمہارے کمرے میں؟" وہ خود کو بہت نڈر پوز کر رہا تھا۔ شہرینہ کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔

"نن..... نہیں..... بالکل نہیں۔"

"مگر مجھے تو جواب لینا ہے۔"

"میں نے کہہ جو دیا....."

"نہیں' یہ جواب نہیں' یہ تو جذباتی فیصلہ ہے۔ وہ فیصلہ جو تم رات بھر سوچ کر دو' وہ جواب چاہیے۔" وہ بچوں کی طرح اسے سمجھا کر بولا۔

"مجھے نہیں پتا' تم جاؤ ادھر سے۔" وہ جیسے تنگ آ کر بولی۔

"اوکے' کل رات عشاء کی نماز کے بعد تقریباً آٹھ نو بجے کے درمیان حویلی کے پچھلے باغ کی جو ٹوٹی دیوار ہے جہاں سے حویلی کے قبرستان کو رستہ جاتا ہے میں اسی منڈیر کے پاس موجود ہوں گا۔ تم آ جانا' میں تمہیں وہیں ملوں گا۔" وہ بڑے آرام سے بولا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ کھڑے رہنا چاہے قیامت تک' میں پاگل نہیں ہوں جو آؤں گی۔"

"تمہیں آنا ہو گا' میں تمہارا انتظار کروں گا۔ صبح تک اگر تم نہ آئیں تو دن چڑھے بھی میں وہیں کھڑا رہوں گا۔

اسی دیوار کی طرف تمہارے کمرے کی کھڑکی کھلتی ہے نا' کل رات کو آٹھ اور نو کے درمیان میں آؤں گا تم رات بھر میں جب مرضی آ جانا میں وہیں ہوں گا۔ اوکے' خدا حافظ۔" وہ قطعی انداز میں کہہ کر مڑا اور گیٹ سے نکل گیا۔

ابھی تو چھٹی ہونے میں دیر تھی ورنہ تو ادھر بھی کافی رش ہو جاتا تھا۔ شکر ہے ادھر کوئی تھا نہیں۔ اس کے جاتے ہی شہرینہ نے ارد گرد دیکھا اور گراؤنڈ میں دو تین لڑکیوں کے چار پانچ گروپ بیٹھے تھے۔

"میں کیوں آؤں گی بھلا' میں کوئی احمق ہوں جو آؤں گی۔ میں نے مرنا ہے اگر کسی نے دیکھ لیا تو لالہ تو اسی قبرستان میں میری قبر کھود دیں گے لاحول ولا قوۃ۔"

☼ ☼ ☼

"اماں جی! ایک بات پوچھوں آپ سے۔" آمنہ گھر کی صفائی کرنے کے بعد اماں جی کے پاس آ بیٹھی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے لیے روٹیاں پکا رہی تھیں۔ زینب اور آمنہ نے میلے کپڑے دھوئے تھے۔ جس کی وجہ سے صفائی لیٹ ہو گئی تھی۔ کپڑے دھونے کے بعد زینب کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

"میں اب صفائی نہیں کروں گی' بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ جویریہ ابھی اسکول سے آئی تھی۔ یونیفارم بدل کر آمنہ کے پاس آ گئی۔

"بڑی آپی! کوئی کام تو نہیں ہے؟ میں کر دیتی ہوں۔" وہ آمنہ کے پاس آ کر محبت سے بولی۔

"نہیں' تم منہ ہاتھ دھو لو' ابھی باباصاحب کو نیچے سے آ جائیں گے۔ تم دوپہر کے کھانے کے لیے دستر خوان بچھا کر برتن رکھ لینا۔" آمنہ نے بستر کی چادر بچھاتے ہوئے جواب دیا۔ عبدالمبین بھی ابھی باہر سے لوٹا تھا۔ صبح گیارہ بجے کے قریب اور خوب تیار شیار ہو کر جو نکلتا تو دوپہر کو ہی آتا تھا۔ اس کی سرگرمیاں عجیب پُراسرار سی ہو چلی تھیں۔ باباصاحب بھی اب اسے کچھ نہ [illegible] تھے۔

"بولو بچے!" اماں جی نے آخری روٹی توے پر ڈالی۔

"اماں جی! آپ کو پتا ہے نا' میرے امتحان ہونے والے ہیں ایک دو ماہ میں۔" وہ خاصی کم آواز میں بول رہی تھی۔

"تو پھر یہ سب کیا ہے؟۔" وہ کچھ تلخی سے بولی۔

"کیا؟" اماں جی قطعاً نہیں سمجھیں۔

"یہ جو ماسی صغراں رشتے دکھانے کو دن رات اوٹ پٹانگ..... " وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "اماں جی اس طرح تو میں بالکل نہیں پڑھ سکتی۔"

"معلوم ہے مجھے بچے!" اماں جی نے گہری سانس لے کر روٹی چمٹے میں پکڑ کر سینکنی شروع کی۔ "پر تمہارے باباصاحب کو کون سمجھائے۔ تمہیں پتا ہے نا ان کے دماغ میں جو چیز سما جائے جب تک اس کو کر نہ لیں چین سے نہیں بیٹھتے۔" انہوں نے روٹی سینک کر چنگیر میں پڑی دوسری روٹیوں کے ساتھ دستر خوان میں لپیٹی۔

"تو پھر میں پڑھنا چھوڑ دیتی ہوں' میں اس طرح امتحان نہیں دے سکتی۔" وہ جل کر بولی۔

"نہ بیٹا! پڑھائی تو بہت ضروری ہے آج کل کے زمانے میں' اس کے بغیر تو گزارا نہیں۔"

"پہلے آپ یہ فیصلہ کر لیں کیا ضروری ہے۔ پڑھائی لکھائی یا یہ اوٹ پٹانگ لوگوں کا آنا جانا۔" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔

"بس بیٹا! سمجھو ان حالات میں دونوں ہی ضروری ہیں۔ اب ماسی صغراں بھی بے چاری کیا کرے۔ اس علاقے کی بساط اور ہماری اوقات کے مطابق وہ کئی ایک رشتے لے کر تو آئی ہے' تمہارے باباصاحب کی آنکھ میں سمائے نہیں آتے۔ پڑھا لکھا بھی ہو' گھرانہ بھی ان کی طرح خوب شریف اور دین دار ہو۔ لڑکا اچھا کماتا ہو' حلال طریقے سے۔ خوب نمازی پرہیزگار بھی ہو اور تھوڑے کھاتے پیتے بھی۔ اب بھلا جن فرشتوں میں یہ ساری خوبیاں ہوں گی کیا وہ ادھر دھکے کھانے آئیں گے' ان چوباروں میں۔ یہاں کیا رکھا ہے بیٹی کو دینے کے لیے چار جوڑے کپڑوں کے' دو چار برتن اور ایک آدھ بستر' لوگ اندھے ہیں' ہونہہ!"

وہ خود اس سلسلے سے بیزار بیٹھی تھیں' پھٹ کر بولیں۔

"مٹھائی والا' پان والا' نان چنے فروش اور سبزی فروش اور ہاں ایک کلرک کا بھی آیا تھا جسے تمہارے بابا صاحب نے یہ کہہ کر دھتکار دیا 'اوپر کی کمائی" بہت کھاتا ہے۔ ادھر سے تقریباً سب رشتے تمام ہوئے تو اب بے چاری شاہدہ رشتے لانے شروع ہو گئی ہے۔ اس نے اپنی استعداد بڑھائی ہے' ہم کیا کریں اور سب سے بڑھ کر مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے روز انتظام کہاں سے ہو۔ صوفی صاحب یہ باتیں نہیں سوچتے۔ اب تو گھر میں چائے کے لیے پتی بھی نہیں کہ مہمان کو خالی چائے ہی پیش کر دی جائے۔"

وہ انھیں اور غسل خانے میں ہاتھ دھونے چلی گئیں۔ جویریہ صحن ہی میں دستر خوان بچھانے لگی۔ کمرے تو ویسے ہی چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ آمنہ بے دلی سے اٹھ کر برتن رکھنے لگی۔

"نکل آؤ تم دونوں بھی' اندر کیا کوئی مراقبہ کر رہے ہو زینب! عبدالمبین!" آمنہ نے بیزاری سے ان دونوں کو آواز لگائی۔

"تمہارا مذاکرہ ختم ہو گیا ہو تو ہمارا مراقبہ بھی سمجھو تمام ہوا۔" عبدالمبین تو شاید آواز کا ہی منتظر تھا' نئے سرے بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد نکھرا نکھرا سا باہر آگیا۔

"نہیں' کوئی مذاکرہ یا مکالمہ نہیں کر رہی تھی۔ یوں بھی ادھر مذاکرہ ہو یا مناظرہ کیا حاصل؟" وہ افسردگی سے بولی۔

"اجازت کی منتظر رہو گی تو یونہی جلتی کڑھتی رہو گی۔" زینب اندر سے آتے ہوئے بولی۔

"تم کچھ بلا اجازت کر سکتی ہو تو کر کے دکھاؤ۔" آمنہ کا موڈ آج خراب تھا۔

"کر کے دکھاؤں گی' ذرا دھیرج رکھو۔ وقت آنے پر ضرورت پڑی تو بہت کچھ بلا اجازت بھی کر کے دکھاؤں گی۔" اس کی سوچ کا قرینہ اور گفتگو کا انداز عبدالمبین سے بہت میل کھاتا تھا۔ دونوں میں بغاوت کے جراثیم بہت تھے۔

"خوش کیا زینب کی سوچ نے۔" عبدالمبین فوراً بولا۔

"یہ خوشی دینے والی سوچ نہیں ہے۔" آمنہ نے پانی کا جگ لا کر رکھا۔

"تو کیا دکھ دینے والی ہے۔ اس کنویں میں' اندھیری کوٹھڑی میں بیٹھی رہو اور یہ سوچ کر کڑھتی رہو۔ کوئی اجازت دے گا تو نکلنے کا سوچیں گے۔ ادھر سے نکلے تو کدھر جائیں گے۔ یہ سب تو باہر نکل کر ہی پتا چلے گا کہ روشنی کدھر ہے' رستے کدھر ہیں۔" اس موضوع پر زینب اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی۔

"اپنی اپنی سوچ ہے' مجھے ہر کام اجازت سے اور جائز طریقے سے کرنا اچھا لگتا ہے۔ میرے خیال میں یہی ہمیشہ کی خوشی کا ذریعہ ہے۔" آمنہ سنجیدگی سے بولی۔

اسے دونوں کی سوچ جو کہ سراسر صوفی صاحب کے خلاف تھی ذرا پسند نہ آئی تھی۔

"جس میں اپنا دل خوش نہ ہو' دوسروں کی خوشی کے لیے خود کو خوش ظاہر کرنا خوشی نہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گا اپنے دل کو خوش کرنے سے کیسی سچی خوشی ملتی ہے اور میں وہ کام کروں گا جس میں میرے دل کی خوشی ہو گی اور جو دوسروں کی پروا کرتے ہیں وہ کبھی کچھ نہیں کر سکتے اور میں تمہیں بہت کچھ کر کے دکھاؤں گا' اتنا کچھ کہ تم کہو گی یہ تم ہو عبدالمبین۔۔۔ اور میرے پاس تمہیں جواب دینے کو ٹائم بھی نہیں ہو گا۔" وہ کالر جھاڑ کر شیخیاں بگھار رہا تھا۔

"ہاں کیونکہ تمہارے سر پر سینگ جو اگ آئیں گے اور تمہیں احمقوں کی جنت کا داروغہ جو بنا دیا جائے گا پھر میں تمہیں بھلا کیسے پہچان پاؤں گی۔" آمنہ نے روٹیوں کی چنگیر دستر خوان پر رکھی۔

"میں صحیح کہہ رہا ہے آمنہ! خوشی وہی ہوتی ہے' جس میں ہمارا اپنا دل خوش ہو۔ ابھی تم دیکھنا میں یہ خوشی کیسے حاصل کرتی ہوں۔ آج میں سب کو ایک سرپرائز دوں گی۔ ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش۔ پہلی کوشش۔"

زینب بھی ان کی بحث میں شریک ہو چکی تھی۔

"تم دونوں کے پرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں' ابھی بابا صاحب آئیں گے۔ انہوں نے ایک گرجدار آواز لگانی ہے اور

عبدالمبین کے غبارے کی ساری ہوا نکل جاتی ہے۔" آمنہ نے جویریہ کو گلاس لانے کا اشارہ کیا۔

"یہ بھی ماضی بعید کی باتیں ہیں' اب بابا صاحب مجھے کچھ نہیں کہتے۔" عبدالمبین رعب سے بولا۔

"کیوں' تم ڈپٹی بن گئے ہو یا کوئی نیا امریکہ دریافت کر بیٹھے ہو؟"

"پہلے سے دریافت شدہ امریکہ نے دنیا کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے' میں ایسا بیہودہ کام ہرگز نہیں کروں گا مگر بابا صاحب سے ڈرنے والا مشغلہ بھی میں نے ترک کر دیا ہے۔ اپنے پاس ٹائم ہی نہیں ان باتوں پر غور کرنے کا۔" وہ پھر سے کالر جھاڑ کر بولا۔ آمنہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔ وہ آج کل ویسے ہی ہواؤں میں اڑتا نظر آ رہا تھا۔

"اپنا بھی جیک لگنے والا ہے۔" اس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ صوفی صاحب کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی تو سب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

"یہ فضول کی بک بک باپ کے سامنے نہ شروع کر دینا' وہ ویسے ہی آج کل پریشان بہت ہیں۔" اماں جی غسل خانے سے وضو کر کے ہی نکلی تھیں' وہ ان کی باتیں وضو کے دوران سنتی رہی تھیں۔ ململ کے دوپٹے سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

صوفی صاحب کے سامنے یہ سب "چھوڑنے" کی کس میں ہمت تھی۔ ان کے آتے ہی سب خاموشی سے کھانا کھانے لگ گئے۔

"یہ۔۔۔ یہ آج پھر دال۔ اماں جی رات کو بھی دال تھی' کل دوپہر کو بھی۔ پرسوں آلو اور اس سے ایک دن پہلے چنے۔ میں نہیں کھاؤں گا دال۔"

ڈونگے سے ڈھکن اٹھتے ہی وہ دال کی شکل دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ صوفی صاحب کا بھی لحاظ نہ کیا۔

"تو نواب کی اولاد جاؤ' کہیں سے کچھ کما کر لے آؤ۔ ننھے چوزے تو نہیں ہو' اٹھارہ انیس سال کے بچے کٹے ہو دیکھنے میں عقل کے کورے نہیں' ہاتھ پیر ہلاؤ تو پھر یہ نخرے دکھانا۔ نظر نہیں آتا باپ کا پیشہ کیا ہے۔ صبح سے رات گئے تک اللہ کے چار حرفوں کا سبق لوگوں کو پڑھاتا ہوں تو یہ دال روٹی ملتی ہے' جو تم جیسوں کے حلق میں اٹکتی ہے۔ شکر ادا کر کے کھاؤ۔"

صوفی صاحب نے اس کی اچھی خاصی خبر لے لی۔ بے شک اب انہوں نے اسے مارنا پیٹنا موقوف کر دیا تھا مگر لفظوں کے تیر ہر وقت نوک زبان پر اس کے لیے تیار رکھتے۔ اس کے لیے ان کے پاس ہمیشہ ٹیڑھی نظر ہی ہوتی تھی۔

"پہلے بھی آپ کا یہی پیشہ تھا' پہلے تو دالوں کا ہفتہ نہیں منایا جاتا تھا۔" وہ بے دھڑک بولا۔

"پہلے کے خواب دیکھنے چھوڑ دو اور گئے وہ دن سارے۔ وہ تمہارے دادا مرحوم شاہ جی کو ان کی مہربانیاں تم سب کو اتنا بڑا کر گئیں۔"

"ان کی مہربانیاں ہی تو ہمیں ان حالوں کو پہنچا گئی ہیں' بھول گئے آپ!" عبدالمبین کب چوکنے والا تھا' فوراً جتا کر بولا۔

"بکواس مت کرو' کھانا کھانا ہے تو کھاؤ نہیں تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ غصے سے بولے۔

"کھانا تو میں نے کھانا ہے مگر یہ دال نہیں' یرقان زدہ۔" وہ ڈھٹائی سے دال کی کٹوری ہاتھ سے پرے دھکیل کر بیٹھا رہا تو صوفی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ وہ بیٹھا سب کو گھورتا رہا۔ اسی وقت سیڑھیوں کے پاس سے جلیل کی آواز آئی۔

"آہا' آ گیا من و سلویٰ۔" عبدالمبین اچھل کر کھڑا ہوا اور جلیل کے ہاتھ سے ٹرے لے آیا۔

"پالک گوشت ہے اماں جی! آپ لیں گی؟" اس نے پلیٹ اپنے آگے رکھتے ہوئے اماں جی سے پوچھا' صوفی صاحب کو قطعاً نظر انداز کر کے۔ انہوں نے ایک نظر اسے گھور کر دیکھا اور یہی بات تو یہ تھی' دال کھانے کو ان کا

بھی جی نہ چاہ رہا تھا بس زہر مار ہی کر رہے تھے۔ اب جو گرم گرم پالک گوشت کی پلیٹ سامنے دیکھی تو انہیں دال اور بھی نگلنی مشکل لگنے لگی۔

"لاؤ' ادھر دکھاؤ مجھے۔" انہوں نے رعب سے کہہ کر ہاتھ بڑھایا۔

اماں جی نے جلدی سے پلیٹ اٹھا کر صوفی صاحب کو دینی چاہی۔

"اماں جی! ایک منٹ۔" اس نے جلدی سے سالن اپنے لیے علیحدہ پلیٹ میں نکال ہی لیا۔

"آج مہینے کی سولہ تاریخ ہے۔ ابھی مہینہ ختم ہونے میں چودہ دن باقی ہیں یعنی تنخواہ ملنے میں اور ان چودہ دنوں میں شاید دال بھی نہ ملے۔ یہ اس طرح کا کوئی بھولا بھٹکا خوان آجائے تو آجائے' یا تو تم کچھ کام کرو یا مدرسے واپس جاؤ۔ میں اتنے کنبے کو اس طرح نہیں پال سکتا۔ وہ ایک دفع ہو گیا نا عبدالمتین جسے میں نے ساری زندگی سونے کا نوالہ کھلایا۔ مجھے منہ پر گالی دے کر چلا گیا بدبخت۔ تم بھی اب مجھ سے کسی بڑی بھلائی کی توقع نہ رکھنا کہ میں تمہارے لیے تر نوالوں کا بندوبست کروں گا اور تم بیٹھ کر پلنگ توڑو گے۔" صوفی صاحب نے گھورتے ہوئے اسے ہری جھنڈی دکھائی۔

"وہ تو آپ پہلے بھی نہیں کرتے تھے۔ سب کچھ عبدالمتین کے لیے ہی تو ہوتا تھا۔ میں تو بچپن میں ہی پل گیا ہوں۔ ویسے فکر نہ کریں میں ادھر زیادہ دن رہوں گا بھی نہیں۔ دیکھیں تو لوگ بھی کتنے سیانے ہیں اپنے لیے اچھی اچھی بوٹیاں رکھ لیتے ہیں اور مسجد میں یہ ہڈیاں اور چھیچھڑے بھیج دیتے ہیں۔" اس نے ہڈی نکال کر پلیٹ میں پٹخی۔

"میں کل گاؤں جا رہا ہوں۔" اس نے اطلاع دی۔

"مدرسے؟ اپنا حفظ پہلے مکمل کرو۔" صوفی صاحب اس کے جانے کا سن کر خوش ہو گئے۔ ایک تو وہ انہیں پسند ہی نہیں تھا دوسرے اسے دیکھ کر انہیں خوامخواہ عبدالمتین کی یاد ستانے لگتی۔ جس نے پلٹ کر ان کی خبر بھی نہ لی تھی۔

"نہیں پہلے میں میٹرک کا امتحان دوں گا' ماسٹر صاحب کے پاس جاؤں گا۔" وہ قطعی انداز میں بولا۔ ان کے مشورے کو رد کر کے۔

"اور جو حفظ پر اتنا عرصہ لگا' وہ بے کار گیا؟" صوفی صاحب سے بھی بوٹی نہیں ٹوٹ رہی تھی۔

جویریہ نے ایک دو بار نیچی نظروں سے ان کی پلیٹ میں پڑی بوٹی کو دیکھا۔ اس کا بہت جی چاہ رہا تھا بوٹی کھانے کو' کتنے دنوں سے گوشت کا ذائقہ چکھا ہی نہیں تھا۔ اماں جی نے جویریہ کی "ندیدی نظر" کو تاڑا تو اسے ہولے سے ٹھوکا مار دیا۔ وہ سر جھکا کر روٹی دال میں ڈبو کر کھانے لگی۔

"وہ آپ کی ضد تھی۔" وہ گستاخی سے بولا۔

"عبدالمبین!" صوفی صاحب دھاڑے۔ بوٹی نہیں ٹوٹی تھی۔ انہوں نے ثابت ہی نگل لی۔ عبدالمبین ان کے لیے ایسی ہی بوٹی ثابت ہو رہا تھا۔ ان کو ساری محنت اکارت جاتی نظر آ رہی تھی۔

"میں کب انکار کر رہا ہوں حفظ کرنے سے مگر بابا صاحب! میں پہلے میٹرک کا امتحان دوں گا۔ ماسٹر صاحب اگر مجھے امتحان دلوا رہے ہیں تو مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے دیں۔ ویسے میں مدرسے بھی جاتا رہوں گا' چھوڑوں گا تو نہیں نا' باقی کا امتحان کے بعد۔"

وہ ایک دم سے لہجہ بدل کر بولا۔ اسے اب سارے فن آتے جا رہے تھے۔ کون سی ٹون کب اور کہاں استعمال کرنی ہے' کس کو کس طرح رام کرنا ہے۔ اس وقت اس کی ساری ذہنی توجہ شہر جانے کو پٹانے میں تھی اور کسی سے الجھ کر وہ اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔

"اچھی بات ہے میٹرک کر لے۔ بعد میں چھ آٹھ ماہ میں حفظ بھی کرے گا تو آپ ہی اسے کسی اچھی جگہ نوکری دلوا دیجیے گا۔ آپ کے شاگرد تو ہر محکمے میں اچھی جگہ کام کر رہے ہیں۔"

اماں جی نے فوراً اس کی سائیڈ لی۔ "ویسے اللہ بھلا کرے ماسٹر صاحب کا جو تمہیں میٹرک کروا کے ہمارے ساتھ نیکی کریں گے۔"

"اگر یہ کرے تو؟" صوفی صاحب نے پالک کی پلیٹ اچھی طرح نوالے سے چمکائی۔ "اور یہ بات بھی لکھ لو رابعہ بی بی! یہ لاکھ مجھے چکر دے' دسویں بارہویں کیا یہ ایک جماعت بھی پاس نہیں کر سکتا' نہ حفظ کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک اپنی نیت کے چور سے خود آگاہ ہو کر اسے بھگا نہ دے۔ یہ بات تم میری لکھ لو۔ اس کے سارے چلتر میں جانتا ہوں۔"

انہوں نے دسترخوان سے ہاتھ صاف کیے۔ عبدالمبین اب بھی دلجمعی سے کھانا کھا رہا تھا البتہ ماتھے پر بے شمار شکنیں دور سے نظر آ رہی تھیں۔

"نہ صوفی صاحب! ایسے نہ کہیں۔ ماں باپ کی بری بات بھی خدانخواستہ بددعا بن جاتی ہے۔ دعا کریں اللہ اسے کامیاب کرے۔" رابعہ بی بی نے دہل کر نظروں ہی سے بیٹے کی سات بلائیں دور کیں۔

"تم چاہے اس کے لیے دعائیں کرو' چاہے بددعائیں۔ تمہارے ہمارے یہ کسی کام کا نہیں نکل سکتا۔" وہ اسی حقارت سے بولے۔ عبدالمبین نے سر اٹھا کر ایک طنزیہ نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔

"تم سناؤ زینب! تیاری کر رہی ہو امتحان کی؟" انہوں نے اپنا رخ پھیرا۔ زینب کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"کک... کون سے بابا صاحب؟" وہ ہکلا کر بولی۔ جویریہ منہ نیچا کر کے مسکرانے لگی۔

"میٹرک کے اور کون سے۔ میں نے کہا تھا نا کہ آمنہ کے ساتھ دینے ہیں تم نے بھی۔ ابھی ایک دو ماہ ہیں' تیاری کر سکتی ہو۔ نویں جماعت کی تیاری تو تم نے کر ہی رکھی ہے۔ دسویں کے چیدہ چیدہ باب آمنہ سے پوچھ کر تیار کر لو۔ میں دونوں کا داخلہ اکٹھا ہی بھیجوں گا۔" وہ حتمی انداز میں بولے تو زینب کا سانس رکنے لگا' اس کی تو ذرا بھی تیاری نہ تھی۔

"بابا صاحب! میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔ میری تیاری نہیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"میں نے تمہیں کئی ماہ سے کہہ رکھا ہے۔ اب تو تمہیں دینے ہی ہوں گے۔" کہہ کر وہ اٹھے اور اندر کمرے کی طرف جانے لگے۔

"بابا صاحب!" زینب اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا ایک لمحے کو تو اس کا دل ڈرا اور دوسرے ہی پل اس نے خود کو مضبوط کر لیا۔

"بابا صاحب! میں ایک بات پر امتحان دوں گی۔"

شرط کے لفظ کو اس نے قصداً "حذف کر دیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا

"اگر ہم پاس ہو جائیں میں اور آمنہ' تو آپ ہمیں کالج میں داخلہ دلوا دیں گے۔" وہ ہمت کر کے کہہ ہی گئی۔ ان کی "گھوری" میں شدت آ گئی۔

"بابا صاحب! سب ہی لوگ تو کالج میں پڑھتے ہیں۔ ہم تو چار سالوں سے اسکول بھی نہیں جا رہے پھر ادھر تو کالج بھی انٹر تک ہے' صرف دو سال کے لیے بابا صاحب! ریگولر کی سند کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ پرائیویٹ تو..."

اس کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا' ٹانگیں لرزنے لگیں' وہ ماتھے پر جما دوپٹہ درست کرنے لگی۔

"تم نے اہمیت پیدا کر کے کیا کرنا ہے؟" وہ اسی بارعب لہجے میں بولے۔

وہ کچھ نہیں بولی' بس اندر ہی اندر کھڑی لرزتی رہی' اماں جی اس کی جرات پر تلملا رہی تھیں۔ آمنہ بھی ششدر بیٹھی تھی۔

اچھا تو یہ سرپرائز تھا اس کا۔" آمنہ نے سوچا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے اگر تم دونوں کے نمبر اچھے آئے تو میں تمہیں داخلہ دلوا دوں گا۔ ان کا پروانۂ اجازت اس

قدر اچانک اور ناقابلِ یقین تھا کہ زینب پر جیسے شادیٔ مرگ طاری ہو گیا۔ حلق سے نکلنے والی چیخ کو اس نے بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔ صوفی صاحب کمرے میں چلے گئے تو وہ پلٹ کر آمنہ سے لپٹ گئی۔

"دیکھا میں اپنی بات کہہ سکتی ہوں اور منوا بھی سکتی ہوں ہرّا۔ یہ تھا سرپرائز، ہم کالج جائیں گے۔" وہ اس کے کان کے پاس دھیمی آواز میں چیخی تو آمنہ کو جہاں خوشی ہوئی وہیں اپنے اندر اظہار کی طاقت نہ ہونے پر ایک ان دیکھے ملال نے بھی آن گھیرا۔ عبدالمبین اس سارے منظر سے بے نیاز غسل خانے میں کلیاں کر رہا تھا۔

کلیاں کر کے وہ منہ صاف کرتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا اور مسجد کے اندر بنے حجرے کی طرف بڑھا۔ جلیل سامنے زمین پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

"تم کیا پڑھ رہے ہو؟" عبدالمبین بے تکلفی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے بھی میٹرک کا امتحان دینا ہے۔ اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اہا.... "اب عبدالمبین نے خوب اونچا قہقہہ لگایا۔ "بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ ادھر تو ایسے لگ رہا ہے جیسے سب کو میٹرک کا ملیریا ہو گیا ہے۔ "ایک سے دوسرے کو۔ مزا آیا؟ اچھا لطیفہ ہوا۔"

❁ ❁ ❁

وہ دو راتیں جو اس کی ہزار مناجاتوں کا ثمر بن کر آئی تھیں اسے کسی قیامت سے کم نہیں لگی تھیں۔ اس کے دل و دماغ کی دنیا سرتاپا بدل گئی تھی۔ امید اور خوش فہمیوں کا ایک اور جہان منور ہوا تھا۔ یہ تو اسے یقین تھا کیپٹن شہباز ایک نہ ایک دن ضرور اس کی طرف لوٹ آئیں گے اور جب بھی آئیں گے تو نہ صرف اپنے پچھلے رویے کی تلافی کریں گے، بلکہ معذرت بھی اور اپنے بدنما سلوک کا بدل اپنی بھرپور محبت سے دیں گے تو اس کے آنسوؤں اور دکھوں کا کفارہ بڑے خوبصورت انداز میں ادا کریں گے۔

مگر ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ یہ تو ایسے ہی تھا جیسے کسی قافلے کا رہنما رہزن نکلے سب کچھ لوٹ کر منہ پھیر کر چل پڑے نہ کوئی معافی نہ کوئی معذرت اور پھر بھی رہنما کا رہنما۔ اس کی قیادت پر کسی کو شبہ بھی نہیں اور جس کی قیمتی متاع لوٹی گئی اس کے زخموں کے لیے کوئی مداوا بھی نہیں۔ کوئی آس کوئی امید کوئی خواب بھی نہیں۔ اس کی تو آنکھیں بھی بے خواب ہو چلی تھیں بھلا اب کس کے خواب دیکھے۔

فارمیلٹی کے سارے خواب تو بمعہ سود کے پورے کر دیے گئے تھے۔ دنیاداری کی نظر سے دیکھا جائے تو اب تو اسے کسی بھی بات کی چاہ، تشنگی محسوس نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اب تو وہ ایک "مکمل سہاگن" تھی اور اس سہاگ پنے کے باوجود اس کے صحنِ دل میں ویرانیاں، آندھیوں کے بگولوں کی صورت اڑتی پھرتی تھیں جو اس کے سپنوں کی خاک لیے۔ خوابوں کی نوخیز کلیوں اور شگوفوں کے زرد بدن لیے کہ ان کو دفن کرنے کے لیے بھی اسے اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

کیپٹن شہباز تیسرے دن صبح ہی اس کے بیدار ہونے سے پہلے جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ وہ سوجی آنکھوں کے ساتھ بمشکل اٹھی۔ وہ بیگ باہر لے کر نکل رہے تھے ایک اجنبی سی نظر اس رات کی ضرورت پر ڈالی اور بیگ گھسیٹ کر دروازے تک گئے۔

"جو کچھ ہوا اس پر میرا کچھ اختیار نہ تھا۔ بہرحال میں ایک بشر بھی تو ہوں اور بشریت کے تقاضے کس قدر منہ زور ہوتے ہیں کہ سب اختیار بہہ جاتے ہیں مگر شعور کی بھی کچھ ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔" وہ رکے۔ "میں کوشش کے باوجود اپنے شعور کو اپنے ذہن کو تمہاری طرف سے مطمئن نہیں کر سکا یہ آخری حجت تھی جس کے بعد ہمارے رشتے کی تکمیل ہو گی اگر اس کے بعد بھی دل نہ مانے تو پھر ضرور سوچنا چاہیے اور جو کچھ سوچنا چاہیے وہ میں نے سوچ لیا ہے۔

گنجائش اور وسعت کی جو امید تھی وہ ان دو راتوں میں کھلنے کی بجائے مرجھا کر دم توڑ گئی ہے نزہت! میرے دل میں اب تم کہیں بھی نہیں، میں اپنے دل کو ٹٹول ٹٹول کر تھک گیا ہوں اس لیے اب جا رہا ہوں کسی بھی حتمی فیصلے پر

پہنچنے کے لیے اب شاید میں نہ آسکوں میرا فیصلہ پہلے آئے گا تم اپنے لیے ادھر سے جانے کے لیے یا ادھر ہی رہنے کے تمام امکانات سوچ لینا۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے بیگ آگے دھکیلا اور دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔

دل کی دل تک رسائی کیسے ہوتی ہے اسے آج پتا چلا جو کچھ اس کے دل میں تھا وہی کچھ شہباز کے دل میں بھی تھا۔ اس کے دل کی کلی بھی اس کی قربت میں نہ کھل سکی تھی تو اس کا منطقی نتیجہ تو اب اس فیصلے کی صورت ہی نکلے گا جس کا یہ کہہ گئے ہیں۔

اس نے تھک کر بیڈ کی پشت سے سر ٹکا دیا اور آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی بوجھل آنکھوں سے گرنے لگے۔

پھر دن ایک ہی انتظار کی کیفیت میں گزرنے لگے کہ کب فیصلے کی وہ گھڑی چوکھٹ پر آکر دستک دیتی ہے۔ اس کا دل اور بھی بجھ گیا تھا۔ اب تو کسی کام میں بھی جی نہ لگتا تھا۔ سارے ہی ولولے جیسے دم توڑ گئے تھے۔ وہ کئی کئی گھنٹے کسی کو مخاطب کرنا ہی بھول جاتی۔ مسز خان اسے دیکھ کر سرد آہیں بھرتی رہتیں۔ شہباز کا فون آجاتا تھا۔ بھولا بھٹکا مہینے پندرہ دن بعد مگر وہ اب بھی نزہت سے بات نہ کرتا تھا اور نہ ماں سے اس کا ذکر۔

نزہت کے کان تو اسی آخری پیغام کی پکار پر لگے تھے۔ وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ پر بیٹھی نہ جانے کس ادھیڑبن میں گم رہتی۔ عبادت میں بھی یکسوئی کم ہو گئی تھی اور اس راہ میں تو یوں بھی ذرا سا اٹکاؤ پہاڑ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو کھینچ کھانچ کر نماز کے لیے لے جاتی تھی۔

"نزہت بیٹا! دیکھنا ذرا جا کر معاذ کو کیا بات ہے وہ آج کالج بھی نہیں گیا۔ ناشتہ بھی نہیں کیا۔ زیتون بانو بلانے گئی ہے دوبار پھر بھی اٹھ کر نہیں آیا۔" وہ ناشتے کے بعد دوپہر کے لیے سبزی لے کر بیٹھی بے دلی سے مٹر چھیل رہی تھی کہ مسز خان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"جی اچھا!" وہ کہہ کر اٹھ گئی۔ بہت دنوں سے اس نے معاذ کی خیر خبر رکھنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اول تو وہ خود ہی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ وہ دن کالج تو شام تک بھابیوں کے گھر کے کام اور آدھی رات تک پڑھتے رہتا۔

معاذ تو مجھے نظر بھی نہیں آیا۔" وہ سوچتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ یوں بھی عالیہ بھابھی کے گھٹیا ریمارکس کے بعد وہ خاصی محتاط ہو گئی تھی۔

"معاذ! معاذ اٹھو نا۔ کیا بات ہے دس بج رہے ہیں اور تم ابھی تک سو رہے ہو کالج بھی نہیں گئے۔" وہ کمبل میں منہ سر لپیٹے بے سدھ پڑا تھا۔ نزہت نے اس کا کندھا ہلا کر اسے جگایا۔

"اٹھتا ہوں آپی! طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اس لیے کالج بھی نہیں گیا۔"

کمزور آواز میں کہتے ہوئے اس نے سر کمبل سے باہر نکالا اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نزہت نے یونہی اس کا ماتھا چھوا۔

"او مائی گاڈ! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ کل کہاں سارا دن پھرتے رہے تھے اتنی بے آرامی کرو گے تو بیمار ہی پڑو گے نا۔" وہ کچھ ڈانٹ کر بولی۔

"میں کب پھرتا رہا ہوں۔ عالیہ بھابھی اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار لے گئی تھیں واپسی پر گاڑی بند ہو گئی پھر جو خود انہوں نے مجھ سے دھکے لگوائے ہیں کہ خدا یاد آگیا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"لیٹے رہو تم، اور کیا ضرورت ہے اس قدر مروت دکھانے کی جب تمہیں معلوم ہے ان کی عادت کا، تم ترجیح صرف اپنی تعلیم کو دو، کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔"

"میں انکار نہیں کر سکتا کسی کو بھی۔" وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"بھگتو پھر، جو اتنی مروت دکھاتے ہیں وہ زندگی میں کسی نہ کسی بڑے نقصان سے خود کو دوچار کر لیتے ہیں۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"اچھا تم اب لیٹے رہو میں پتا کرواتی ہوں ڈاکٹر حبیب کا، اگر وہ ابھی کلینک نہیں گئے تو جانے سے پہلے تمہیں چیک کر لیں۔" وہ باہر نکلنے لگی۔

"آپی! رہنے دیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ایک بخار کی گولی اور کوئی پین کلر دے دیں ' دوپہر تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے تو آج کالج بھی ضرور جانا تھا۔ آج کل بڑے اہم لیکچرز ہوتے ہیں۔ دو ہفتوں بعد ہی تو فائنل ایگزام ہیں ' اگلے ہفتے تک تو یوں بھی ہمیں فری کر دینا ہے۔ آج تو مجھے جانا تھا۔"

ملال نے اسے آن کھیرا پڑھائی سے ناغہ تو اس نے "سائبان" میں بھی کبھی نہیں کیا تھا اُدھر آ کر مروت کے بھنور میں الجھ گیا تھا۔ عالیہ اور فائزہ بھی اس کی مروت سے خوب فائدہ اٹھاتی تھیں۔

"نہیں ہم خلق خدا کی خدمت کرو کسی فلاحی ادارے کے رکن بن جاؤ یا کسی این جی او کے۔ تمہیں اسٹڈیز کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا یہی حال رہا تو شاید ہی تمہارا میرٹ بن سکے۔" نزہت اسے ٹھیک ٹھاک ڈانٹ رہی تھی۔

"خدا نہ کرے آپی! دعا نہیں دے سکتیں تو بددعا تو نہ دیں۔" میرٹ میں تو اس کی جان اٹکی تھی۔

"تم کام بھی دعاؤں والے نہیں کر رہے۔ اچھا میں ڈاکٹر صاحب کا پتا کرتی ہوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل آئی۔ مسز خان کو معاذ کی طبیعت کا بتا کر وہ ڈاکٹر صاحب کو فون کرنے لگی۔

"وہ تو کلینک کے لیے نکل چکے ہیں۔" ان کے ملازم نے بتایا تو اس نے مایوس ہو کر فون رکھ دیا پھر خود ہی اس نے ایک بخار کی ٹیبلٹ اور ایک درد کم کرنے والی دوا دی۔

"نزہت! اسے خالی پیٹ دوائی نہیں دینا پہلے تھوڑا بہت کچھ کھا لے ' چائے ' دودھ میں آدھی چمچی پتی ڈال دو یا کسٹرڈ بنا دو پھر دوا دینا۔" مسز خان نے اسے دوائی لے جاتے دیکھ کر آواز لگائی تو وہ سر ہلا کر کچن کی طرف مڑی۔

ایک دم سے اسے کچھ ہوا۔ زیتون بانو نے کچن میں چولہے پر خدا جانے کیا چڑھا رکھا تھا ' شاید مکھن کا گھی بنا رہی تھی۔ عجیب کھٹی کھٹی سی بو پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ کچن میں تو بہت زیادہ تھی ' نزہت کا جی الٹنے لگا۔ ایک دم متلی سی ہونے لگی اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ اس نے دوائی کچن کے کاؤنٹر پر ہی پھینک کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ بھاگ کر واش روم تک پہنچی اسے دروازہ بند کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔ اس کے قے کرنے کی آواز سن کر زیتون بانو اس کے پیچھے آئی '

"بی بی! بی بی! خیریت تو ہے بی بی!" وہ اس کے پیچھے آ کر بولی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ بیسن کو مضبوطی سے تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔ زیتون بانو نے اسے پیچھے سے سہارا دیا تو وہ جیسے ہوش ہی میں نہ رہی۔

❁ ❁ ❁

دریائے ٹیمز کے کنارے اس کی سبک رو لہروں کو ہولے ہولے بہتے دیکھ کر بھی نہ جانے کیوں دل کی بے کلی کو چین نہیں آ رہا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ گزشتہ رات کی برفباری سے سردی میں یکدم اضافہ ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی تیز سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ اگرچہ سارا دن سورج لندن شہر کے باسیوں کو اپنا چہرہ نہیں دکھا سکا تھا مگر اس کی روشنی نے بادلوں کے پیچھے سے بھی شہر کو اتنا روشن ضرور کیے رکھا تھا کہ اس کے ہونے کا احساس مٹا نہیں تھا۔ گھڑیاں دیکھ کر سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ سورج اب آسمان کے کس رخ پر ہو گا۔

اب تو بہت دنوں سے بلکہ بہت مہینوں سے اس پر قنوطیت کا یہ دورہ نہیں پڑا تھا۔ جاپان میں تو انہوں نے صرف ایک ہی سال گزارا تھا اس دوران فخر حیات نے لندن میں اپنی فرم کی پراڈکٹس امپورٹ کرنا شروع کیں۔ ادھر رسپانس بھی اچھا تھا اور ڈیمانڈ بھی زیادہ تھی۔ جاپان میں ان کے قدم نہیں جم رہے تھے بس ایک سال بعد ہی وہ لندن اٹھ آئے تو پھر لندن کی سحر زدہ فضا نے جیسے انہیں اپنے حصار میں ہی جکڑ لیا۔ سال بھر ہی میں فخر حیات کی فرم کا کام عروج پر جا پہنچا تھا۔ محنت بھی انہوں نے دن رات کی تھی اور رعنا حیات نے بھی سوشل سرکل میں انہیں پروموٹ کرنے میں بہت سرگرمی دکھائی تھی۔ دنوں میں ہی بزنس کمیونٹی میں ان کا اچھا مقام بن گیا تھا۔ فخر حیات کی کاروباری ساکھ ایک بار پھر جم رہی تھی۔ کچھ ایسا بھی تھا کہ دوسرے تمام "مشاغل" سے انہوں نے فی الوقت منہ موڑ لیا تھا۔ بزنس اور صرف بزنس۔ ان کی محنت شاقہ بالآخر رنگ لے ہی آئی تھی۔

"فخر! ہم واپس کب جائیں گے۔" فخر حیات آج کل اس پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ ایسے ہی خوشی کے ایک پل میں اس نے پوچھ لیا۔

"ابھی نہیں۔ کم از کم دو تین سال کے لیے تم پاکستان کو بھول جاؤ۔" فخر حیات نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔

"گزشتہ تین برسوں سے بھی تو بھولی ہوئی ہوں اور کتنا صبر کروں؟" وہ کچھ بے چارگی سے بولی۔

"وہاں رہ کر بھی کیا حاصل تھا ' صبر تو ادھر بھی تھا۔ جب انسان کے اختیار میں کچھ نہ ہو تو پھر صبر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مجبوری ہے۔"

"ایک آس تو تھی ' امید۔" اس کی آنکھیں بے اختیار جھلملانے لگیں۔

"آس اور امید تو مرتے دم تک آدمی کی انگلی تھامے رکھتی ہے۔" فخر حیات کے پاس اس کی ہر بات کا جواب موجود تھا۔

"آپ اپنے بزنس کو پاکستان ٹرانسفر کر دیں ' بے شک ادھر مہینے میں دو چکر لگاتے رہیں لیکن پاکستان میں۔۔۔" وہ بے چین ہو کر بولی۔

"ابھی نہیں جان! ابھی بالکل نہیں۔ دو تین سال مجھے اپنے بزنس کو مضبوط کر لینے دو پھر جو تم کہو گی وہی کریں گے ' پہلے بھی ان ہی جلد بازیوں نے میرے بزنس کو تباہ کیا تھا۔" فخر حیات میں یہ خوبی تھی انہوں نے کڑے سے کڑے وقت میں بھی رعنا کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔

"ادھر رہنا بھی تو۔۔۔" وہ چپ کر گئی۔

"تم ادھر خوش تو ہو۔ این جی او کی چیئر مین شپ تمہارے پاس ہے ' پاکستان سوسائٹی کی سوا ایکٹیویٹیز میں سارا دن تو تمہیں فرصت نہیں ملتی رات کو کوئی نہ کوئی گیدرنگ۔ پھر یہ فضول کی یاسیت کہاں سے پال لیتی ہو تم۔" وہ کچھ جھنجھلا کر بولے۔

"فخر! مجھے خود پتا نہیں چلتا۔ ہنستے ہنستے بھی ایک دم سے جی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں اس کے پاس۔" وہ بس رو دینے کو تھی۔ ٹشو کے کونے سے آنکھ کے گوشے صاف کیے۔

"وہ جیسے تمہارے پاس ہی تو ہے۔" فخر حیات ہنکارے۔ "فزیکل ایکٹیویٹیز کے ساتھ اپنے ذہن کو بھی مصروف کرو۔ لندن لائبریری دنیا کی مشہور ترین لائبریری ہے۔ تمہارے پاس اس کی ممبر شپ بھی ہے اور کبھی تمہیں پڑھنے کا بھی بہت شوق ہوتا تھا اس کو جگاؤ ' وقت نکال کر ادھر چلی جایا کرو۔" ان کے پاس مشورے بے حساب ہوتے تھے۔

"آپ نے بھی تو خود کو حد درجہ مصروف کر لیا ہے اور اب یہ رات کی شفٹ بھی۔"

"مجبوری ہے۔ تمہیں پتا تو ہے کڑے حالات ہو گئے تھے۔ خدانخواستہ ادھر بھی قدم نہ جمتے تو پھر ہم کیا کرتے؟ شکر کرو ہماری فرم کی ریپوٹیشن دن بدن بہترین ہوتی جا رہی ہے ' میرا یہ نائٹ شیڈول بس دو ایک سالوں کی بات ہے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سنی کی اسٹڈیز تو ٹھیک جا رہی ہیں نا؟"

انہیں ایک دم سے خیال آیا تو اس کا دھیان بٹانے کو پوچھ بیٹھے۔

"اسی کی تو فکر ہے مجھے ' اسٹڈیز تو بس سو سو ہی جا رہی ہیں مگر دوسری ایکٹیویٹیز میں بہت ایکٹو ہو چلا ہے۔ فخر! سنی کے لیے ادھر کا ماحول بالکل بھی ٹھیک نہیں وہ ادھر کی خرافات میں پڑتا جا رہا ہے اسی لیے تو میں آپ سے واپس جانے کا کہہ رہی ہوں۔"

"تو رعنا ڈارلنگ واپس جانا کوئی مذاق نہیں ' واپسی کا تو ابھی سوچو بھی نہیں۔ سنی پر خود توجہ دو یہی عمر ہے اس کے بگڑنے اور سنورنے کی۔"

"وہ بگڑ رہا ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"اور میرے پاس ٹائم نہیں اس کو سدھارنے کا۔ یہ کام تو تمہیں ہی کرنا پڑے گا۔"

"فخر! وہ میری سنتا کب ہے، بہت خود سر ہو جاتا ہے۔ جب سے آپ نے رات کی شفٹ بھی شروع کی ہے وہ رات کو بھی بہت دیر سے آنے لگا ہے۔ مجھے اس کے ایک دوفرینڈز نے بتایا ہے وہ کسی نائٹ کلب میں بھی جانے لگا ہے کچھ کہوں تو چیخنے چلانے لگتا ہے، میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"میں بات کروں گا اس سے۔" فخر حیات نے سرسری لہجے میں کہا۔

"آپ سے تو وہ پہلے ہی نالاں سا رہتا ہے۔ آپ اسے ٹائم جو نہیں دیتے۔"

"اب میں بزنس کو ٹائم دوں یا گھر کو، کم از کم گھر پر توجہ دینا تو تمہارا کام ہے نا، اتنا تو تم کر سکتی ہو۔ کہ بے کار کی سوچوں میں بیٹھ کر کھوئے رہنے سے بہتر ہے تم اپنے اردگرد دھیان دو۔ جو کچھ بگڑ رہا ہے کم از کم اسے تو سنوارنے کی کوشش کر سکتی ہو۔" فخر حیات تلخی سے بولے۔ تھوڑی دیر پہلے والی حلاوت ان کے لہجے سے غائب ہو چکی تھی پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئے۔

اور اب اسے دریا کے کنارے بینچ پر بیٹھے شاید دو گھنٹے ہو چلے تھے۔

"فخر! آپ کے نزدیک یہ بے کار کی سوچیں ہیں اور میرے لیے یہی سوچیں راحت بخش ہیں مگر آپ نہیں سمجھیں گے۔"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر ویران ساحل کو دیکھا۔ برج پر تو کافی لوگ جا رہے تھے مگر ساحل بالکل ویران پڑا تھا۔ لمبے لمبے اوور کوٹ پہنے بے حد مصروف انگریز لوگ ان کو اپنے سوا کسی کی کچھ فکر نہیں ہوتی۔ اس نے تیز قدموں سے آتے جاتے انگریزوں کو دیکھ کر سوچا۔ چاروں طرف دھند پھیل رہی تھی۔ اوس سے بھیگی دھند نے ہر چیز کو گیلا گیلا کر دیا تھا اس نے اپنے کوٹ کے اوپری بٹن بھی بند کیے اور سست قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔

"سب ہاتھوں سے نکل گیا تو فخر حیات آپ کا یہ پیسہ اور بزنس ہمارے ہاتھوں سے پھسلتی اس آخری خوشی کو بھی نہیں تھام سکے گا۔"

گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے سوچا مگر فخر کو وہ یہ بات نہیں سمجھا سکتی تھی۔ ان پر آج کل صرف اور صرف بزنس کی دھن سوار تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی گاڑی اجنبی شہر کی اجنبی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

❊ ❊ ❊

"یہ ادھر سائن کردو۔" سید سلطان بخت نے میگزین کی ورق گردانی کرتی صالحہ کے آگے کوئی اسٹامپ پیپر ٹائپ کاغذ آگے کیا۔

"یہ کیا ہے؟۔" اس نے میگزین بیڈ پر رکھ کر پیپر ہاتھ میں لے کر کڑے لہجے میں پوچھا۔

"میں "سید ہاؤس" سیل کرنا چاہتا ہوں اس کے پیپرز ہیں۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر ریوالونگ چیئر پر جا بیٹھے۔

"کیوں....؟۔" وہ تیکھے چتون سے بولیں۔

"میری مرضی۔" وہ چیئر جھلاتے ہوئے بولے۔ صالحہ خاموشی سے پیپر پڑھنے لگیں۔

"مگر میں سیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔" چند منٹوں بعد سر اٹھا کر وہ نارمل لہجے میں بولیں۔

"میں نے تم سے تمہاری مرضی نہیں پوچھی، صرف سائن کرنے کو کہا ہے۔" وہ بے نیاز لہجے میں بولے۔

"مگر جب میری مرضی ہی نہیں تو میں سائن کیوں کروں۔" انہوں نے پیپر ان کی طرف اچھال دیا۔

"یو بِچ، اسٹوپڈ عورت! تمہاری اتنی مجال کہ تم انکار کرو۔" وہ غصے سے تن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا تو کیا کریں گے؟ میرا گلا گھونٹ دیں گے، مجھے گولی ماردیں گے تو بصد شوق....۔" وہ ہنس دیں۔ "مگر پھر بھی آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا مسٹر سلطان بخت! آئندہ بیس سال تک سارے آپ کے پتے قدرت نے میرے ہاتھ میں رکھ دیے ہیں۔" وہ بڑا تول تول کر بول رہی تھیں۔ ساتھ ہی سلطان بخت کے تاثرات سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"یہ بھول ہے تمہاری کہ بیس سال تک میں تمہیں برداشت کروں گا۔ تم میرے پیروں کی میل ہو۔ دیکھنا کیسے

جان چھڑاتا ہوں تم سے۔" وہ حقارت سے بیڈ کے پائے کو ٹھوکر مار کر بولے۔

"اچھا کیسے! ذرا مجھے بھی تو بتائیں۔ ایسا کوئی طریقہ ہے آپ کے زرخیز ذہن میں؟۔" وہ پھر ہنسیں۔ بس اس دن سے تو انہیں بات بات پر ہنسی آئے جا رہی تھی، جس دن سے وصیت نامے کی اس شق کا علم ہوا تھا۔ وہ آج کل اتنی مسرور تھیں کہ سلطان بخت کی دو دن کی غیر حاضری بھی نہیں کھلی تھی۔

"یہ تمہیں وقت بتائے گا کہ میں تم سے کیسے جان چھڑاتا ہوں، ابھی تم اس پر سائن کرو۔" انہوں نے کاغذ پھر سے ان کے آگے پٹخا۔

"سائن کرتی ہے میری جوتی مسٹر سلطان بخت! اور یوں بھی میں سید ہاؤس کو کبھی فروخت کرنا نہیں چاہوں گی بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں آج کل جا کر چند ہفتے ادھر گزاروں، مو ہنجو داڑو کی اس حویلی میں مجھے پڑے پڑے سڑ کر نہیں مرنا۔ حسین لالہ بھی مجھ سے کہہ رہے تھے سید ہاؤس بہت خوبصورت ہے۔ تمہارا جی خوش ہوگا ادھر جا کر۔" وہ اٹھلا کر اٹھیں اور ٹہلتی ہوئی ان کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔

"ایسی کی تیسی تمہارے حسین لالہ کی۔ وہ کون ہوتا ہے ہمارے گھر کے معاملات میں اپنے مشورے دینے والا۔" سلطان بخت نے سارا ادب لحاظ بالائے طاق رکھا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو مسٹر سلطان بخت! میرے بھائی کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ شیرنی کی طرح غرا کر بولیں۔

"اچھا! تو جواب ہوگا تم دیکھنا۔ بس چند دن کی زندگی کے جو مزے لینے ہیں یہیں لے لو۔" وہ آنکھیں سکوڑ کر اسے دھمکی دیتے ہوئے بولے۔

"کیا؟ کیا کرلیں گے آپ مجھے مار ڈالیں گے۔ ہاں ہاں مجھے مار ہی ڈالنا چاہتے ہیں، پہلے دن سے پہلے روز سے یہ میں ہوں جو سب کچھ برداشت کر رہی ہوں، اپنے بھائی کو خبر کردوں تو دیکھیں ادھر خون کی نہریں بہہ جائیں، یہ میں ہوں جو تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگیں۔

"اس سے کہو اپنے طرم خان بھائی کو، آئے اور خون کی نہریں بہا دے۔ ادھر بھی کسی نے چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ ابھی دو حرف تمہارے منہ پر ماردوں تو اس گھر میں کھڑے ہونے کو تمہارے پاس ایک انچ کی جگہ نہ رہے۔ جا کر اسی بھائی کے گھر دھکے کھاؤ تم بدبخت عورت۔" ان کے منہ سے مارے غصے کے کف نکلنے لگا۔ ان کے ناک کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔

"میرا بھائی مجھے سر آنکھوں پہ بٹھائے گا، تم سہار لو گے اپنی اس بڑھیا کٹنی بہن کو جس نے میرے نصیبوں میں یہ سیاہی پھیری ہے۔ زبان کی میٹھی مکار ڈائن، دونوں گھروں میں جس کی حکومت ہے، لے آؤ جا کر اسے اپنے گھر میں خود بخود ادھر سے چلی جاؤں گی پر یاد رکھنا وہ ادھر بھی نہیں آئے گی دست برداری اسے بھی گوارا نہ ہوگی۔ تم سب نے میری زندگی تباہ کی ہے۔ میں تم سب کی زندگی تباہ کردوں گی۔ جو کالک میرے نصیبوں میں بھری ہے تم لوگوں کے مونہوں پر پھیر دوں گی نہ تم سب کے منہ کالے کیے تو صالحہ شاہ...۔"

"تڑاخ.... تڑاخ.... تڑاخ...." سلطان بخت نے کس کس کے ایک نہیں تین بھرپور تھپڑ ان کے منہ پر جڑ دیے ان کا ہونٹ پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ آنکھوں میں وحشت اور ہونٹوں پر چیخیں ساری حویلی میں گونجنے لگیں۔

"سلطان بخت! سلطان بخت! کیا ہوا کیا ہوگیا؟۔" سیدہ کی تیز گھبرائی ہوئی آواز دروازے کے باہر سے آرہی تھی۔ سلطان بخت نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

"لے جائیں اٹھا کر اس فسادن کو، بدزبان، بے حیا عورت کو اس نے میری زندگی دوبھر کردی ہے۔ بس تنگ آگیا ہوں میں اس زندگی سے، اگر یہ میرے سر پر ایسے ہی سوار رہی تو آپا خدا کی قسم میں اپنی زندگی ختم کرلوں گا۔" وہ صالحہ شاہ سے دگنا چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔

"زندگی تم کیا ختم کرو گے، بزدل بے غیرت انسان۔ دیکھیں اس نے میرا کیا حشر کیا ہے۔ کسی ہم زور مرد سے پنجہ

لڑایا ہوتا تو آج تمہاری گردن پر یہ چہرہ ہی نہ ہوتا گھٹیا انسان۔"

صالحہ شاہ ساری حدیں پار کر گئی۔ وہ اپنا زخمی تھپڑ زدہ چہرہ لیے سیدہ کے سامنے آکھڑی ہوئیں اور سیدہ تو دونوں کے انداز گفتگو پر حیرت زدہ سی کھڑی تھیں۔

"بے غیرت تو تو ہے، جو میرے دھتکارنے کے باوجود اسی دہلیز سے جڑی بیٹھی ہے اور وہ تیرا بدمعاش بھائی جس نے بلیک میلنگ کے ذریعے تجھے میرے گلے سے لٹکایا ہے۔" وہ شاید پھر اس پر پل پڑتے اگر سیدہ بیچ میں نہ آجاتیں۔

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ تم دونوں کو کوئی خیال، کوئی لحاظ، شرم ہے، ساری حویلی میں تمہارے اس بیہودہ ہنگامے کا واویلا مچا ہے، ملازموں کے بیچ تم دونوں نے اس حویلی کی عزت کو دو کوڑی کا کر دیا ہے۔"

"آپ کو حویلی کی شان کے دو کوڑی ہونے کا غم کھایا جا رہا ہے، میری جیتی جاگتی زندگی دوزخ بنا ڈالی اس کا کچھ دکھ نہیں، کوئی ملال نہیں۔"

صالحہ کے منہ میں تو زبان کی جگہ قینچی فٹ تھی، ہر ہر منٹ کے بعد کتر کتر پیوند ادھڑے جاتی۔

"تمہاری زندگی بے سکون ہوتی ہے تو ہم سب کی زندگیوں میں کون سا سکون رہ گیا ہے۔ ایسی یہ منحوس شادی ہوگئی ہے، ہمارا تو سارا خاندان، علاقے میں تماشا بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے بابا جان چلے گئے ابھی ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ تم دونوں کے جھگڑوں نے ہر احساس کو تہس نہس کر ڈالا ہے۔" سیدہ چیخ اٹھیں۔

"منحوس تھی یہ شادی تو کیوں کروائی؟ کیوں میری زندگی تباہ کی۔ میں چیختا رہا مگر کسی نے پروا نہ کی۔" سلطان بخت نے دھاڑ کر کہا۔

"آخر اب کیا افتاد پڑی ہے اب۔ جھگڑا کس بات پر ہے۔" سیدہ کو خیال آیا اگر اسی طرح سب ایک دوسرے کو الزام دیتے رہے تو صبح ہو جائے گی مگر کمرے کا ماحول ٹھنڈا نہیں ہوگا۔

"پوچھیں اس سے۔" سلطان بخت نے نفرت سے صالحہ کو دیکھا۔

"اپنے منہ سے اپنے کرتوت کی تفصیل بتا دیں تو اچھا ہے، میں کچھ زیادہ کہہ دوں گی تو تمہیں مرچیں لگ جائیں گی۔" وہ آئینے کے آگے جا کر ٹشو سے اپنے ہونٹ کا بہتا خون صاف کرنے لگیں۔

"دیکھا، دیکھا آپ نے اس کی زبان۔" سلطان بخت نے چلا کر سیدہ کو متوجہ کیا۔

"دیکھ رہی ہوں سب، اب تم دونوں کچھ کہو گے بھی، آخر یہ فساد کس بات پر اٹھایا ہے؟"

"میں سید ہاؤس سیل کرنا چاہتا ہوں، اس دو ٹکے کی عورت کو سائن کرنے کو کہا تو اسے آگ لگ گئی جیسے میں اس کے باپ کی جائیداد فروخت کرنے جا رہا ہوں۔"

"آج اپنے باپ کی فروخت کرنے جا رہے ہو کل میرے باپ کی بھی فروخت کرنے کی نوبت آجائے گی۔" وہ نخوت سے بولیں۔

"مگر تم سید ہاؤس کیوں سیل کرنا چاہتے ہو۔ بابا جان نے کس چاؤ سے تمہارے لیے بنوایا تھا کہ شہر جا کر تمہیں ہوٹلوں میں نہ رہنا پڑے۔" سیدہ کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا۔

"میرے لیے بنوایا تھا، اب میں ہی فروخت کرنا چاہتا ہوں میری مرضی۔" وہ ڈھٹائی سے بولے۔

"یہ تو اچھی بات نہیں سلطان بخت! اچھی بھلی کروڑوں کی پراپرٹی تم یونہی دل چاہنے پر سیل کر دو۔" سیدہ بیچنے کے حق میں کبھی بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔

"تو کروڑوں کی پراپرٹی کو سینے سے لگا کر رکھیں مجھے کہیں سے زہر لا دیں، اگر میں اپنی مرضی سے ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا تو ایسی زندگی سے مرجانا ہی اچھا۔" سلطان بخت نے شدید غصے کے عالم میں کہا اور دروازے تک راستے میں آئی ہر چیز کو ٹھوکر مارتے باہر نکل گئے۔

"سلطان! سلطان بخت! بات تو سنو۔ دیکھو ادھر آؤ بیٹھ کر بات کرو یوں غصے میں باہر نہ جاؤ۔ سلطان!" سیدہ

کاریڈور تک ان کے پیچھے گئیں مگر انہوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

"اگر میرے بھائی کو کچھ ہو گیا تو اپنی زندگی کے پل بھی گن رکھنا صالحہ شاہ! ہمارے صبر کو اور نہ آزماؤ۔" دروازے میں کھڑے ہو کر ایک حقارت بھرے انداز میں سیدہ نے صالحہ شاہ کو مخاطب کیا اور تیز قدموں سے چلتی کاریڈور سے آگے سیڑھیاں اتر گئیں۔

"یہ دھمکیاں مجھے مت دو۔ اپنے مینٹل بھائی کو سنبھالو سیدہ بھابھی!"

"صالحہ ادھار رکھنے کی قائل نہیں تھیں۔ پیچھے لپک کر کاریڈور سے چلائیں، سیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ نیچے جا چکی تھیں۔ صالحہ نے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور مڑ کر اپنے بیڈ روم میں جانے لگیں تو شہرینہ کو اپنے کمرے کے دروازے میں دھواں دھواں سا چہرہ لیے کھڑے دیکھا۔ جیسے ہی صالحہ کی نظر اس پر پڑی وہ محبت سے اندر کی طرف مڑ گئیں اور دروازہ بند کر لیا۔

سلطان بخت اور صالحہ کے جھگڑے کی آوازیں وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سنتی رہی تھی، اس سے رہنا مشکل ہو گیا ان کے جھگڑے کے زوردار اختتام سے ڈر کر وہ باہر نکلی تھی۔ سیدہ اور سلطان بخت جا چکے تھے۔ شہرینہ اپنے کمرے میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا، اسے لگتا تھا دونوں میں ایک دوسرے کو یقیناً "مار ڈالے گا" آج نہیں تو کل۔

وہ دو گھنٹے کمرے میں بیٹھی بابا جان کو یاد کر کے روتی رہی۔ جب ملازمہ نے دروازہ کھٹکھٹا کر اسے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ اس لیے نیچے آگئی کہ شاید لالہ واپس آچکے ہوں یا بھابھی بیگم کمرے سے نکل آئی ہوں، جس کی امید تو کم ہی تھی۔ جہازی سائز ڈائننگ ٹیبل جس پر چار اقسام کی لذیذ ڈشز چنی گئی تھیں۔ خوبصورت نازک، انگلش کراکری، ٹھنڈے مشروبات، دو قسم کی سویٹ ڈشز اور ویران کرسیاں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

"چھوٹے شاہ جی تو اطلاع دے چکے ہیں، انہوں نے کہہ دیا ہے کہ انہیں بھوک نہیں۔ بیگم صاحب نے اپنے کمرے میں کھانا منگوا لیا ہے اور بڑی بی بی تو شام کو ہی چلی گئی تھیں۔" اس کے استفسار پر ملازمہ کے جواب نے اسے مایوس کر دیا۔ اس نے دو چار چمچ پلاؤ کے لیے اور ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا میرا کسی کو بھی خیال نہیں، کیا میں اس گھر میں بالکل فالتو ہوں۔ نا ماں، نہ باپ، نہ بھائی کی ترجیحات میں سے نہ بہن کے لیے ضروری تو پھر میں کیوں ہوں۔" کمرے میں آکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آج سے پہلے اس طرح کا احساس تنہائی اس کے اندر نہیں جاگا تھا۔ حویلی میں نوکروں کا راج تھا۔ صالحہ کو کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ جب حویلی کے مالک کو ہی اس سے دلچسپی نہ تھی تو وہ کیوں لیتی۔ سیدہ کتنی نگرانی کر سکتی تھیں اور ویسے بھی جب سے صالحہ نے انہیں ہر وقت ادھر رہنے کا طعنہ دیا تھا تو سیدہ نے آنا کم کر دیا تھا۔

مسلسل رونے سے اس کا سر دکھنے لگا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا، ابھی تو صرف نو بجے تھے۔

"آٹھ اور نو بجے کے درمیان میں آؤں گا۔"

ایک دم سے اسے یاد آیا، وہ سارا رونا دھونا بھول کر مارے تجسس کے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر جا کھڑی ہوئی۔ نیچے حویلی کا پائیں باغ تھا اور اس سے آگے دیوار جو ایک جگہ سے چند اینٹیں اکھڑنے سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ دیوار سے آگے قبرستان تھا۔ اسی ٹوٹی دیوار کے پاس جا کر اس کی نظریں جم گئیں۔ ادھر نیم اندھیرے میں کوئی کھڑا تھا۔

"عبدالمبین ۔۔۔ تو یہ آگیا اپنے وعدے کے مطابق۔ صرف میری خاطر۔" وہ بڑبڑائی۔ "میں کیا کروں، جاؤں۔ ہاں، آج تو جی چاہ رہا ہے ادھر سے بھاگ جاؤں۔ کسی سے تو اپنے دل کی بات کہوں، کوئی تو میری بھی سنے، کوئی تو ہو جسے میں مخاطب کروں، وہ مجھ سے کلام کرے، جس کے آگے میں اپنا سینہ کھول دوں، کوئی تو ہے نا جس کو میری پروا ہے، میری ضرورت ہے۔"

وہ بے خودی کے عالم میں اس تاریک سائے کو تکتے ہوئے سوچنے لگی۔

● ● ● ● ● ●

وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں دروازے سے باہر نکلی تھی' کاریڈور میں مکمل خاموشی تھی' اب تو رات بہت بھیگ چکی تھی' دوسرے گھر میں کشیدگی' جاگنا بھلا کس نے تھا' جب گھر کے مالکان کو گھر کی پروا نہیں تھی تو ملازمین کیوں ہلکان ہوتے پھرتے' وہ بھی سرِ شام ہی جا کر اپنی کوٹھریوں میں دبک جاتے تھے۔
شہرینہ کے لیے ادھر سے نکلنا بے حد آسان تھا۔
اس نے زینے کے پہلے قدم پر پاؤں دھرا۔
''یہ میں کیا کرنے جا رہی ہوں۔''
اچانک اس کا اوپر کا پاؤں اوپر ہی رہ گیا۔ اس نے پہلے قدم کو مکمل کرنے سے یکسر انکار کر دیا' ایک چیخ سی تھی جو اس کے اندر سے لپکی تھی۔ ''لالہ بھی گھر پر ہیں' نہ بھی ہوں تو اس حویلی کی پتھریلی دیواروں میں بھی آنکھیں جڑی ہیں جو کسی کو خبر ہو گئی تو؟'' اس کا دل خوف سے دھڑ دھڑانے لگا۔
''لالہ تو میری لاش کی بھی کسی کو ہوا نہیں لگنے دیں گے اور آپا... '' وہ کانپ اٹھی۔ ''سیدہ آپا نے مجھے دیکھ لیا تو... نہیں... '' وہ جھرجھری سی لے کر پلٹی اور بے جان قدموں سے واپس اپنے کمرے کی طرف چلی پڑی۔
''جو بھی ہو' مجھے یہ حماقت زیب نہیں دیتی۔ اس وقت گھر کے حالات کس قدر پریشان کن ہیں اور میں سب کے لیے ایک اور پریشانی کھڑی کر دوں اور وہ دو ٹکے کا لڑکا' وہ بھلا کیا مدد کرے گا۔ دو چار فلمیں دیکھ کر سمجھنے لگا ہے کہ وہ بہت ہیرو لگتا ہے' اپنے قدم ابھی زمین پر نہیں اور میری خاطر زمانے سے ٹکرانے کی شیخیاں بگھارتا ہے۔ شہرینہ! تم بھی احمق ہو' کیا بچکانہ حرکت کرنے چلی تھیں۔ ایک اجنبی کو اپنے گھر والوں پر فوقیت دینے چلی تھیں' کس قدر افسوس کی بات ہے۔ نہیں' یہ میں ہرگز نہیں کروں گی۔''
کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے باہر کی طرف دیکھے بنا کھڑکی بند کر دی۔ کمرے کی مین لائٹ بند کر کے اس نے نائٹ بلب جلایا اور بستر پر لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

''اوہ شاہ جی آپ! میں آپ ہی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ دیکھیں تو ابھی صرف تین نمبر ہی ڈائل کیے تھے کہ آپ میرے سامنے موجود۔ اس کو کہتے ہیں سچے دل کی لگن' سچے دل سے طلب کرو تو اللہ بھی سامنے آ کھڑا ہو۔ ایم آئی رائٹ شاہ جی؟''
نین تارا جو واقعی موبائل پر نمبر ڈائل کر رہی تھی' اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ پر چونک کر مڑی اور سلطان بخت کو دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ اس کی آواز میں ایک انوکھی سی چہکار تھی جو بہت دنوں بعد سلطان بخت کو اس کے لہجے میں سنائی دی تھی۔
''صحیح۔'' سلطان بخت نے ایک گہرا سانس سینے سے خارج کر کے کین کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھنا چاہا' مگر نین تارا نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔
''یہاں نہیں شاہ جی! اندر چلیں' آپ کو ایک بہت زبردست خبر دینی ہے بلکہ خوشخبری۔''
اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا' دھوپ کی تمازت اتنی نہیں تھی' جتنا اس کا چہرہ دمک رہا تھا' ہلکی ہلکی سرخی سے آنکھیں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ سلطان بخت کو اس میں کسی انوکھی تبدیلی کا احساس ہوا۔
''ایسی کیا بات ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی' دھوپ اچھی لگ رہی ہے' کچھ دیر بیٹھتے ہیں ادھر ہی۔'' سلطان بخت نے سرسری انداز میں کہا۔
''نہیں نا' اندر چلتے ہیں۔ آئیں نا' میں رات سے آپ کا بہت بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ صبح بھی آپ کا نمبر ڈائل کیا تو شاید آپ کی مسز نے ریسیو کیا اور میں نے بند کر دیا۔ اب مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔'' وہ بے صبری سے ان کا بازو کھینچ کر بولی۔
''نین تارا! میں نے تمہیں منع کیا ہے نا' تم حویلی فون مت کیا کرو۔ وہ مینٹل عورت اور پاگل ہو جاتی ہے' ذہنی

مریضہ ہے وہ۔ ساری حویلی کو سر پر اٹھا لیتی ہے۔'' سلطان بخت نے پژمردگی سے کہا۔
''معلوم ہے مجھے شاہ جی! اسی لیے تو ادھر فون نہیں کرتی مگر خبر ہی ایسی تھی کہ مجھ سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا۔''
''آخر ایسی کون سی خبر ہے' بتا بھی دو اب۔''
سلطان بخت کچھ اکتا کر بولے۔ رات کے جھگڑے سے پہلے ہی ان کا ذہن بہت ڈپریس ہو رہا تھا' اس وقت ان کا کوئی بھی ''پہیلی'' بوجھنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔
''پہلے اندر آئیں' بات بتانے کی نہیں' آپ کی اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمانے کی ہے۔'' نین تارا کی شوخی اسی طرح بحال تھی۔ سلطان بخت نے ایک گہری نظر اس کے خوش خوش چہرے پر ڈالی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
وہ انہیں اپنے بیڈ روم کی طرف لے گئی۔ اندر کمرے میں قدرے خنکی تھی۔ باہر دھوپ سے اٹھ کر آئے تھے' اسی لیے ٹھنڈک کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑے رہے۔ بیٹھنے کا ان کا ارادہ نہیں تھا۔ نین تارا نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھولی اور ایک سفید لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔
''اس میں کیا ہے؟'' انہوں نے الجھن بھری نظر سے دیکھا۔
''خود ہی پڑھ لیں۔'' نین تارا نے شرمگیں مسکراہٹ سے نظریں چرا لیں۔ انہوں نے الجھ کر لفافہ کھولا' اندر نین تارا کے میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ تھی اور سامنے خوب بڑا سا لکھا ''پوزیٹو'' ان کا منہ چڑا رہا تھا۔
''واٹ نان سینس!'' انہیں جیسے آگ ہی لگ گئی۔ ہاتھ میں پکڑی رپورٹ انہوں نے نین تارا کی طرف پھینکی۔
''شاہ جی!'' نین تارا کا مسکراتا چہرہ یک لخت تاریک ہو گیا۔ وہ ان کے ری ایکشن پر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی [illegible] ہی خوشی سے پاگل ہو جائیں گے۔ رات سے وہ خود کو کئی بار ان کی بانہوں کے بے اختیار [illegible] میں خود [illegible] بھی چکی تھی۔
''تمہارا دماغ ٹھیک ہے' جو ان خرافات میں پڑ رہی ہو۔'' ان کی آنکھوں سے شعلے سے لپکنے لگے۔
''میں... میں پڑ رہی ہوں شاہ جی! ان خرافات میں۔'' اس نے حیرت اور رنج سے شہادت کی انگلی اپنے سینے کی طرف کرتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا۔
''نین تارا! Listen to me carefully'' وہ دانت پیس کر بولے اور دو قدم اس کے قریب بڑھ آئے۔ اپنے آہنی ہاتھ کا شکنجہ اس کے نازک کندھے پر دبا کر درشتی سے بولے۔
''میں نے تم سے نکاح ضرور کیا ہے' تمہیں اپنی بیوی بھی بنایا ہے' محض تمہاری معصومیت کو کسی بھی گندے رشتے کے تحفظ سے بچانے کے لیے مگر اس کے باوجود تمہیں اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے تھی۔ تم ایک طوائف کی بیٹی ہو اور رہو گی۔ چاہے مجھ جیسے دس سید زادے دس ہزار بار تمہیں اپنے عقد میں لے لیں مگر اپنی نسل کبھی خراب نہیں کریں گے' انڈراسٹینڈ۔''
ان کی انگلیوں کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ نین تارا کو لگا اس کے کندھے کی ہڈیاں ٹوٹ کر گوشت کے اندر سرایت کر رہی ہیں۔ وہ کتنی دیر حیرت زدہ سی ان کے لفظوں پر غور کرتی رہی۔ اسے تو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا' نہ ان کے جملوں کا مفہوم سمجھ میں آ رہا تھا اور جب چند لمحوں بعد سمجھ میں آیا تو اسے لگا کسی نے اسے کھینچ کر ساتویں آسمان سے زمین کے پاتال میں دے مارا ہے۔ اس نے اپنا کندھا ان سے چھڑا کر انہیں ایک زوردار دھکا دیا۔ غصے اور نفرت کی چنگاریاں اس کی خوبصورت آنکھوں سے لپک رہی تھیں۔
''مسٹر سلطان بخت! اوقات تو شاید آپ اپنی بھول جاتے ہیں۔ آپ کو خبر ہی نہیں ہوتی جب آپ ''نگل کدے'' کی اس کیچڑ میں بڑے آرام سے قدم اٹھا کر میری خوابگاہ تک چلے آتے ہیں۔ آپ اپنی اوقات' اپنے مقام سے کتنا گر چکے ہیں کہ اگر آپ اب سات ہزار بار بھی کسی گنگا جل میں خود کو جا کر پاک کرنا چاہیں تو بھی اس غلاظت سے پیچھا نہ چھڑا سکیں گے کیونکہ یہ اقرار تو آپ کرتے ہیں کہ آپ نے اس گندگی سے ایک کنول اٹھا کر

اپنے لباس ہی نہیں' اپنے پورے وجود کی زینت بنایا ہے۔ خود کو دن رات اس گھٹیا گندگی میں لتھیڑا ہے اور تعجب ہے نہ آپ کو اس کے تعفن کی بدبو محسوس ہوئی' نہ آپ کو اس غلاظت سے گھن آئی بلکہ آپ تو دن رات اس گندگی کو چومتے چاٹتے رہے ہیں۔ اوقات تو آپ اپنی بھولے ہوئے ہیں مسٹر سید زادے!" سلطان بخت کو لگا' نین تارا کے منہ میں اس کی نہیں' کسی اور کی زبان بول رہی ہے۔ ایسی زبان نین تارا نہیں بول سکتی تھی۔

"شٹ اپ نین تارا!" وہ غصے سے چلا اٹھے۔

"یو شٹ اپ مسٹر سلطان بخت! آپ نے مجھے ہی نہیں' اپنے ہونے والے بچے کو بھی گالی دی ہے اور میں یہ گالی ہضم نہیں کروں گی' آپ کو اس کا تاوان بھرنا ہی پڑے گا۔"

وہ خونخوار شیرنی کی طرح غرا رہی تھی۔

"نین تارا! تم اس ڈرامے کو یہیں تمام کر دو تو تمہارے حق میں اچھا ہے۔ میں اگر تمہیں اس گندگی سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا سکتا ہوں تو دوبارہ تمہیں اسی گٹر میں محض تین لفظ بول کر پھینک بھی سکتا ہوں' سنا تم نے؟" سلطان بخت کا وار بہت سخت تھا' نین تارا کے تمام اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

انہوں نے کوٹ کی جیب سے چیک بک اور پین نکالا۔ چیک پر دو لائنیں گھسیٹیں اور چیک پھاڑ کر نین تارا کی طرف پھینکا۔

"اس رقم کے ذریعے اس سے جتنی جلدی جان چھڑا لو' تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اب مجھ سے تبھی رابطہ کرنا جب یہ "نیک کام" کر چکو۔ اگر نہ کرنا چاہو تو مجھے بتا دینا' میں تمہیں تمہاری ثابت قدمی کے انعام کے طور پر ڈائیورس پیپرز رجسٹری کروں گا' انڈر اسٹینڈ۔"

نین تارا پتھر کے کسی مجسمے کی طرح ان کی شکل دیکھے جا رہی تھی۔

"زیور گل بہت پروفیشنل ہے اور ایسے کاموں میں یقیناً ایکسپرٹ بھی۔ اس نے تمہیں راہ نہ دکھائی؟ جاؤ جا کر ماں سے بات کرو۔ وہ بھی تمہیں تمہاری اس حماقت پر پھٹکارے گی اور آئندہ سے "اس معاملے" میں محتاط رہنا۔ اگر تمہیں میرے ساتھ کچھ وقت اور گزارنا ہے تو۔ چلتا ہوں' خدا حافظ۔"

کہہ کر وہ تیز تیز ڈگ بھرتے کمرے سے نکل گئے۔ نین تارا اپنی جگہ ساکت کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ ان کے باہر جاتے ہی وہ اسی جگہ کارپٹ پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر اس "انوکھی ملاقات" پر غور کرنے لگی۔

❁ ❁ ❁

سلطان بخت آندھی طوفان کی طرح گاڑی اڑاتے حویلی واپس آ گئے۔ غصے اور کوفت سے ان کا برا حال تھا۔ انہیں نین تارا سے اس "جرأت" کی توقع نہ تھی۔

"غلطی میری ہی تھی' مجھے ہی خیال رکھنا چاہیے تھا۔" حویلی کے گیٹ پر پہنچ کر انہوں نے جیسے خود کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ حویلی کا بیرونی دروازہ ان کی گاڑی کے ہارن کی آواز پر کھل چکا تھا۔ وہ گاڑی بند کر کے باہر نکلے تو سامنے برآمدے میں کسی لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ سیدہ کھڑی نظر آئیں۔ وہ دوسری طرف سے ہو کر اندر آ گئے۔ اسی وقت سیدہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"کہاں چلے جاتے ہو سلطان بخت! تمہارا کچھ پتا نہیں چلتا۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"اب کیا ہو گیا ہے؟" وہ اکتا کر بولے اور صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اب تم شادی شدہ ہو' تمہیں خیال ہونا چاہیے' گھر کو بھی تمہاری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے کی طرح نہیں کہ تم منہ اٹھائے جدھر مرضی کئی کئی گھنٹوں کے لیے نکل جاؤ۔" سیدہ اسی خفگی سے بولیں۔

"آخر ہوا کیا ہے' ایسا کیا اب میں نے کر دیا۔ دو گھنٹے کے لیے ہی تو گیا تھا باہر۔ ذرا چشتی صاحب کے آفس تک گیا تھا' آپ نے آتے ہی کلاس لینی شروع کر دی۔ شادی شدہ کا مطلب ہے' میں گھر میں گھسا رہوں' باقی کے معاملے کون دیکھے گا۔" وہ چڑ کر بولے۔

"تمہیں معلوم ہے نا صالحہ کس "حال" میں ہے' خدانخواستہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس ہر وقت کسی کو تو ہونا چاہیے۔ پہلے ہی وہ تمہاری وجہ سے اس قدر ٹینشن میں رہتی ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی۔ ذہنی طور پر وہ بہت ڈپریس ہے' اسے خوش رہنے کی ضرورت ہے۔ دیکھو سلطان بخت! میری بات دھیان سے سنو۔"

وہ ان کے پاس ہی آ بیٹھیں اور سلطان بخت کے لیے یہ انکشاف ہی خاصا حیران کن تھا کہ صالحہ اس "حال" میں ہے' کب سے' انہیں خبر نہ تھی۔

"دیکھو میرے بھائی! یہ لڑائی جھگڑے' یہ آپس کی رنجشیں تو تمام عمر ہی چلتی رہتی ہیں۔ بندے کا چھٹکارا ان جھگڑوں سے قبر میں ہی جا کر ہو سکتا ہے مگر یہ وقت تو انسان کی زندگی میں بہت اہم اور نازک ہوتا ہے۔ وہ تمہیں وارث دینے جا رہی ہے۔ اس سونی حویلی کا وارث۔ ہماری نسل کا امین۔ اسے اس وقت جتنی تمہاری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے' پہلے کبھی نہ تھی۔ چلو جو تعلق تم دونوں میں ہے' وہ گلے پڑا ڈھول ہی سہی' بجانا پڑ رہا ہے مگر اس حویلی کو جتنی ضرورت وارث کی ہے' اس سے تم بھی بے خبر نہیں۔ ڈاکٹر اسے خوش اور پرسکون رکھنے کا کہہ کر گئی ہے جو کسی بھی خوراک یا دوائی سے نہیں مل سکتا۔ سوائے تمہاری محبت اور دلداری کے۔"

سیدہ بہت دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھیں اور سلطان بخت کو تو سوائے آنے والے وارث' ہونے والے جانشین کی دلکش آواز کے اور کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا اور اس وارث کو پیدا کرنے والی صالحہ کتنی ہی ان کی ناپسندیدہ سہی مگر تھی تو ان کی خاندانی جائز بیوی اور نین تارا لاکھ ان کی پسندیدہ من کی مہارانی مگر وہ اسے اپنے بچے کی ماں بنانا کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے' کسی بھی قیمت پر نہیں۔

"پر آپا! آپ کو تو معلوم ہے' وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ میری محبت اور توجہ کو ڈھونگ' فریب اور مکاری سمجھتی ہے اور بابا جان جو فساد اس کی شرافت کے حوالے سے چھوڑ گئے ہیں' اس کے بعد سے تو اس کے تیور ہی بدل گئے ہیں۔ میری ہر بات کو بھی وہ کسی نہ کسی مطلب یا مقصد کے ضمن میں لیتی ہے اور میں ایسی بددماغ عورت کے ناز اٹھاؤں' نا ممکن۔"

صالحہ کی آتش فشاں طبیعت کا خیال آتے ہی چند لمحے پہلے والی خوشی جیسے ہرن ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا نا' پہلے کی بات اور تھی' تمہارے لیے بھی اور اس کے لیے بھی اور اللہ تعالیٰ جب میاں بیوی کو تیسرے بندھن میں باندھتا ہے تو از خود دلوں میں اس کی محبت اور نرمی ڈال دیتا ہے۔ سمجھا دیا ہے میں نے اچھی طرح صالحہ کو کہ اس کا یہ جلال اور فضول کا غصہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ اس کے بچے کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں چاہے پڑھی لکھی عورت ہو یا کوئی ان پڑھ جاہل گنوار عورت ہی کیوں نہ ہو' بچے کے لیے بہت حساس ہو جاتی ہے۔ ان کہی باتیں بھی اس کی سمجھ میں خود بخود آنے لگتی ہیں۔ اندر سے بہت خوش ہے وہ۔ ہر لڑکی جب پہلی دفعہ ماں بننے لگتی ہے تو اس کے جذبات اسی طرح پرجوش ہوتے ہیں' اپنے بچے کے بارے میں اور اس سلسلے میں وہ کوئی کوتاہی یا رکاوٹ برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ بچے کی خاطر عورت ہر حد سے گزر سکتی ہے' خواہ وہ اپنے پر جبر جیسا ستم ہی کیوں نہ ہو' چاہو تو اس سے مل کر میری بات کی آزمائش کر لو۔"

سیدہ پریقین لہجے میں کہہ رہی تھیں اور سلطان بخت کا دماغ سیدہ کے جملوں کی بازگشت کے ساتھ "گل کدے" کے اس بند کمرے میں گھوم رہا تھا' جہاں وہ نین تارا کو خونخوار شیرنی کے روپ میں چھوڑ کر آئے تھے۔

"اپنے بچے کی خاطر عورت ہر حد سے گزر جاتی ہے۔" انہوں نے اپنا سر جھٹکا۔

"اگر ایسا ہے تو مجھے اور کیا چاہیے۔ میرا دماغ خراب ہے جو اس کے ساتھ منہ ماری کرتا پھروں۔ میں تو یہی کہتا ہوں نا کہ میری زندگی میں بے جا دخل نہ دے' وہ اس حویلی کی بلا شرکت غیرے مالک و مختار ہے۔" سلطان بخت نے پرسکون ہو کر صوفے سے ٹیک لگائی۔

"بہر حال' وہ کمپرومائز پر آمادہ ہے تو تم بھی اپنے رویے میں لچک پیدا کر لو۔ بابا جان ہوتے تو اس مبارک موقع پر سات گاؤں میں شادیانے بجواتے' اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ پوتے کی آرزو میں تو وہ تمہاری

بیس بائیس برس کی عمر میں شادی کر دینا چاہتے تھے۔ تم نے ہی اپنی ہٹ دھرمی میں ان کی خواہش کو تشنہ رکھا۔"

سیدہ کی بے وقت کی راگنی سلطان بخت کو قطعاً پسند نہیں آئی۔ یوں بھی بابا جان کی وصیت کے بعد سے انہیں بابا جان کے ذکر سے بھی چڑ ہو گئی تھی۔

"بدلہ تو اس تشنگی کا جاتے جاتے وہ لے ہی گئے۔" سلطان بخت بڑبڑائے۔

"کیا کہا تم نے؟" سیدہ نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔

"کچھ نہیں' اچھا۔ میں چلتا ہوں' آرام کروں گا' تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ آپ ابھی اِدھر ہی ہیں نا؟"

"ارے نہیں میں تو بس جا رہی ہوں۔ شام کو چکر لگا تو آ جاؤں گی' ورنہ کل سہی۔ یہ تو مجھے صالحہ نے فون کر کے بلوایا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ اچھی نہیں۔ دوسرے ایک اور بات۔" وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئیں۔

"جی!" سلطان بخت ہمہ تن گوش تھے۔ بہت دنوں بعد انہیں سیدہ آپا کی ہر بات اچھی لگ رہی تھی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ صالحہ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس خوش رہے' خوراک کھائے اور دوسرے اگر تھوڑا بہت سفر کسی دوسری جگہ کا کرلے تو اس کے لیے تبدیلی آب و ہوا ہو جائے گی۔ یوں بھی جب سے اس کی شادی ہوئی ہے تم اسے کہیں بھی نہیں لے کر گئے۔ لے کر جاؤ گے تو اسے یقین بھی ہو جائے گا کہ اب تمہاری تمام تر توجہ اسی کی طرف مبذول ہے پھر تم دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ کچھ وقت کسی پُرفضا جگہ پر اکٹھا گزارو گے تو مزاج کی بہت سی گتھیاں آپوں آپ ہی سلجھ جائیں گی۔"

"او کے آپا! میں کوشش کروں گا۔" وہ گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کوشش نہیں' جانا ہے تم نے۔ ہفتہ دس دن کہیں گزار آؤ جا کر۔ میں بیٹھی ہوں' اِدھر دیکھ بھال کے لیے۔ اس کا دل بہل جائے گا۔" سیدہ مصر تھیں۔

"ٹھیک ہے' آپا! میں جیسے ہی کوئی پروگرام سیٹ کرتا ہوں' آپ کو بتا دوں گا۔"

"جیتے رہو' اللہ بیٹے کی صورت خوشی دے' اس حویلی کے آنگن میں اس کی کلکاریاں گونجیں۔ بابا جان اماں جان کی روحیں کس قدر شاد ہو جائیں گی۔"

سلطان بخت مسکراتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئے تو سیدہ بھی مطمئن انداز میں اٹھ کر باہر آنگن میں آ گئیں۔

صالحہ کروٹ لیے شاید سو رہی تھی کیونکہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے کھٹکے پر بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا' ورنہ وہ تو ہر وقت چوکنی بلی کی طرح ہوشیار رہتی تھی۔ سلطان بخت نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔ وہ ذرا کی ذرا ہلی۔ سلطان بخت اس کی سائیڈ پر پڑی روم چیئر پر جا بیٹھے۔ وہ نیم مندی آنکھوں سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ سلطان بخت کی نظروں میں آپ ہی آپ اکلوتے کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اُمڈ آیا۔ انہوں نے بڑی محبت سے اس کی پیشانی پر آئے بال سنوارے۔

"ٹھیک ہے اب طبیعت؟" ایسا میٹھا لہجہ تو شاید وہ کبھی نین تارا سے بھی نہیں بول پائے تھے۔

"آ گیا خیال گھر آنے کا اور طبیعت پوچھنے کا؟" صالحہ اپنے مزاج کے کڑوے پن سے مجبور ہو کر بولی' ورنہ سیدہ تو اسے خوب گھول گھول کر نصیحتیں پلا کر گئی تھیں جن پر عمل کرنے کا اس نے ان کے سامنے تو نہیں' دل میں عہد کر لیا تھا مگر اب سلطان بخت کو سامنے دیکھ کر لہجہ ازخود کڑوا ہو گیا۔

"خیال آیا ہے تو یہاں موجود ہوں نا۔" وہ اسی نرم لہجے میں بولے۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟"

دل چاہ رہا تھا' آج ساری محبت جو اس رشتے کی متقاضی ہے' لٹا دیں۔

"مجھے خود کب علم تھا۔" وہ شرمیلے لہجے میں نظریں جھکا کر بولی۔

"ڈاکٹر کون سی دوائیں لکھ کر دے گئی ہے؟" سلطان بخت نے نسخے کی تلاش میں سائیڈ ٹیبل پر دیکھا۔

"وہ سیدہ بھابھی لے گئی ہیں' دوائیں منگوانے کے لیے۔"

"تم نے کچھ کھایا پیا' جوس پی لیتا تھا۔" سلطان بخت کو وہ کافی کمزور سی لگ رہی تھی۔

"جوس پی لیا ہے' اب میں آرام کروں گی پھر اٹھ کر کچھ کھا لوں گی۔"

"او کے' میں فریش ہو کر ذرا نیچے جا رہا ہوں۔ مردان خانے میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ تم اٹھو گی تو پھر اکٹھے کھانا کھا لیں گے۔"

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ صالحہ نے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"اماں جی! بھوک لگی ہے' کچھ بھی نہیں ہے کھانے کو۔ صبح بھی میں چائے کے ساتھ آدھی سوکھی روٹی کھا کر گئی تھی۔ سارا دن پیٹ میں درد ہوتا رہا۔"

اماں جی ظہر کے بعد کی تسبیحات میں مشغول تھیں۔ جب جویریہ ان سے آ کر لپٹ گئی۔ ان کے تسبیح کے دانوں پر چلتے ہاتھ رک گئے۔ وہ اسے کیا جواب دیتیں' دوپہر میں واقعی کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی اس کا سر سہلاتی رہیں۔

"اماں جی! بھوک لگی ہے۔" وہ گود میں سر گھسیڑے زور سے منمنائی۔

"اچھا بچے! میں آمنہ سے کہتی ہوں' تمہیں کچھ کھانے کو دے۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔

"آمنہ.... آمنہ بیٹا۔" انہوں نے منہ اونچا کر کے آواز لگائی۔

"جی اماں جی!" وہ کتاب ہاتھ میں لیے باہر آ گئی۔

"بچے! اس کو کچھ کھانے کو دو اگر ہے تو۔" ان کے لہجے میں عجیب سی عاجزی تھی' آمنہ کو رونا آنے لگا۔

"اماں جی!" وہ تو سب کچھ قرآن کے پاس تخت پر ہی آ بیٹھی۔ "آج تو کچھ بھی نہیں ہے' دال بھی ختم ہو چکی ہے اور آٹا شاید دو یا تین روٹیوں کا رہ گیا ہے۔ میں نے سوچا تھا نمک ڈال کر بابا صاحب کو اور آپ کو پکا دوں گی۔" وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی جیسے کوئی سن نہ لے۔

"بابا صاحب کو۔" جویریہ چمک کر بولی۔ "اور جو مجھے بھوک لگی ہے وہ۔ اماں جی!" اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں' ماں سے فریاد کرتے ہوئے۔

"جا آمنہ! اس کو پکا دے' یہ کھا لے۔ باقی بابا صاحب کو پکا دینا۔"

"مگر اماں جی! اس کے ساتھ۔ چائے کے لیے نہ دودھ ہے نہ پتی۔"

"نمک مرچ کی چٹنی گھول لو' تھوڑا سا دھنیا اور پیاز میں نے پڑا دیکھا ہے ٹوکری میں۔"

"اماں جی! مرچیں بھی ختم ہیں۔ چلیں نمک ڈال کر بنا دیتی ہوں۔ پر ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں' تھوڑے سے تو دن رہ گئے ہیں امتحان میں۔ جویریہ کی بچی! تجھے بھی بے وقت کی بھوک لگتی ہے۔"

آمنہ نے بڑبڑا کر جویریہ کو گھورا جو اٹھ کر اس کے پیچھے ہی چل پڑی۔

"یا اللہ' یہ اب کون سی آزمائش ہے۔ ابھی تو صوفی صاحب کو تنخواہ ملنے میں بھی پورے سات دن باقی ہیں' ان سات دنوں میں کیا کریں گے۔ تو زندگی دینے والا ہے اور زندگی کو برقرار رکھنے والا' ہمارے حال پر رحم فرما۔" تسبیح کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

انہیں یکایک گاؤں کے اسٹور میں رکھے گھی کے دو کنستر' چاولوں کی تین بوریاں' دو گندم کی بوریاں' دالوں کے مٹکے' گڑ کی آدھی بوری اور چینی کا تھیلا یاد آنے لگا۔ ابھی تو ان کا روز کا معمول بن گیا تھا' رات کو سونے سے پہلے ان تمام وظائف کا آدھی رات تک ورد کرنا جن سے رزق خود چل کر گھر کی دہلیز تک آتا ہے مگر نہ جانے ان وظائف کی تاثیر کہاں چلی گئی تھی۔ کچھ اثر ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ دن بدن گھر کی معاشی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور جب دن کڑے آتے ہیں تو زمین بھی تنگ پڑنے لگتی ہے۔ رزق بھی ہوا کے ساتھ اڑا جاتا ہے اور انسان کا تو پہلا امتحان ہی شکم سے شروع ہوتا ہے کہ شکم کی مار سب سے سخت ہوتی ہے۔ رزق کی تنگی بندے کو کفر تک لے

جاسکتی ہے۔ "یا اللہ اس وقت کی سختی کے آنے سے بچانا۔" وہ بے اختیار سجدے میں گر کر گڑگڑاتے ہوئے دعا کرنے لگیں۔

"آمنہ! میرے لیے بھی روٹی پکا دینا۔ صبح سے پڑھ پڑھ کر معدے سے دھواں اٹھنے لگا ہے۔" زینب بھی کتاب ہاتھ میں لیے آمنہ کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

"صرف تین روٹیوں کا آٹا ہے' ایک مجھے جویریہ کو دینی ہے اور دو بابا صاحب کے لیے۔" آمنہ روٹی بیلتے ہوئے رُکھائی سے بولی۔

"تو ہم۔" زینب چلائی۔ "میں کیا کھاؤں گی' مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔ مجھے تو تم یہی والی روٹی دے دو' بابا صاحب خود ہی کچھ کھالیں گے نیچے مسجد سے۔ مجھ سے تو صبر نہیں ہوتا۔" وہ ندیدوں کی طرح آمنہ کے بالکل پاس ہی بیٹھ گئی کہ روٹی توے سے اترے اور وہ جھپٹ لے۔

"زینب! بابا صاحب نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اب آنے والے ہیں' بابا صاحب کہہ رہے تھے' شام کو آٹا منگوا دیں گے۔ شام ہونے میں چند گھنٹے ہی تو ہیں۔ کچھ دانے پڑے ہیں بھونے ہوئے ہم دونوں وہ کھالیں گے۔ جویریہ تو اسکول سے آئی ہے' اسے بھوک لگی ہے۔" آمنہ نے اسے تحمل سے سمجھایا۔

"ہاں ہاں' سارے زمانے کو بھوک لگی ہے' سب کا خیال ہے اور ہمارے لیے بھونے چند دانے۔ آخر کس حکیم نے مشورہ دیا تھا بابا صاحب کو گاؤں چھوڑ کر آنے کا۔ وہاں کم از کم گن گن کر لقمے تو نہ ملتے تھے۔ میں تنگ آگئی ہوں ان فاقوں سے۔ دالیں کھا کھا کر میرے منہ کا ذائقہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ آخر ساری دنیا ہی تو مزے کر رہی ہے' ہم ہی کیوں یہ سزا جھیل رہے ہیں۔ آخر ہم.....'' وہ کمر پر ہاتھ رکھے خوب اونچا اونچا بول رہی تھی۔

"زینب! دماغ ٹھیک ہے تمہارا' کیوں اول فول بول رہی ہو۔" اماں جی کی کڑک دار آواز پر وہ ٹھٹک سی گئی۔

"اماں جی! میں غلط نہیں کہہ رہی۔ میں تنگ آچکی ہوں' کچھ کر بیٹھوں گی۔ مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔" وہ رو دینے کو تھی' ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"زینب پتر! نفس کے اتنے غلام نہیں ہوتے' اسے تھوڑا سختی میں بھی ڈالتے ہیں۔ اگر ایک وقت کم خوراک ملے یا اچھی نہ ملے تو یوں واویلا کرنا اللہ کے بندوں کو زیب نہیں دیتا۔" اماں جی نے پیار سے اس کا کندھا تھپکا۔

"کیا اللہ کے بندے صرف ہم ہی ہیں۔" وہ تنک کر بولی۔ "کھانا کھانا نفس کی غلامی ہے کیا؟۔ اگر غلامی ہے تو اللہ نے ہی اس نفس کو ہمارے ساتھ لگایا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاتھ' پاؤں' آنکھیں' کان دے کر ہمیں پیدا کیا ہے' اسی طرح نفس کو بھی ہمارے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اب اگر اس کی ضرورت ہمیں ستاتی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔" وہ معصوم سا چہرہ بنا کر بولی۔

"بچے! نفس کی ضرورتوں کا ہر وقت ہی خیال نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی اسے فراموش بھی کر دینا چاہیے۔"

"اماں جی! ہمارے گھر میں کبھی کبھی نہیں' ہر روز ہی نفس کو فراموش کر دینا پڑتا ہے۔ بہرحال مجھے بھوک لگی ہے۔ آمنہ! اگلی روٹی میری پکاؤ۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

"اماں جی! ایک بات کہوں۔" روٹی بنتے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

"بولو۔"

"اماں جی! آپ عبدالمتین بھائی کا پتا کروائیں' جلیل کے ذریعے۔ وہ تو ادھر کہیں نوکری بھی کرتے تھے' وہ کچھ نہ کچھ تو ہمیں بھیج دیا کریں۔" زینب آہستگی سے بولی۔

"زینب! آج یہ بات کہی ہے' آئندہ مت کہنا۔ تمہارے بابا صاحب کو پتا چل گیا تو زمین آسمان ایک کر ڈالیں گے۔"

"اماں جی! بابا صاحب سے کہیں زمین آسمان ایک نہ کریں' ہم سب کو ایک ایک کر کے زمین کے اندر اتار دیں۔ ان کا بڑا کرم ہو گا ہم پر۔" وہ جل کر بولی۔

"بدتمیز' بے ادب لڑکی! تیرا تو دماغ ہر وقت الٹا چلتا ہے۔ اس بے حیا کو اگر خیال ہوتا تو وہ خود نہ پلٹ کر خبر لیتا کہ بوڑھے ماں باپ' جوان بہنوں کے ساتھ کس حال میں ہیں۔ لوگ بیٹوں کے پیدا ہونے کی آرزو میں مرے جاتے ہیں اور ہمیں اللہ نے دو دیے اور دونوں ہی بے حس اور نافرمان۔ دوسرے کو ادھر سے گئے دس بارہ دن ہونے کو آئے۔ مدرسے کا کہہ کر گیا تھا اور تمہارے بابا صاحب بتا رہے تھے' وہ مدرسے پہنچا ہی نہیں۔"

"اماں جی! آپ لوگوں نے بھی خوامخواہ مدرسے کی رٹ اس کے ساتھ لگا رکھی ہے۔ اس نے کچھ نہیں پڑھنا وڑھنا' روٹی کس کے ساتھ کھاؤں؟۔" روٹی توے سے اترتی دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خبردار' یہ بابا صاحب کے لیے ہے۔" آمنہ نے چنگیر جلدی سے دوسری طرف کرلی۔

"ارے تم رہنے دو' یہ تو میں ہی کھاؤں.....'' اسی وقت صوفی صاحب کے کھنکھار کر آخری سیڑھی پر قدم رکھنے کی آواز آئی۔ زینب اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔ صوفی صاحب جا کر تخت کے دوسری طرف بیٹھ گئے۔

"دسترخوان نہیں لگایا۔" انہوں نے بغیر کسی کو مخاطب کیے پوچھا۔

"میں نے تو ابھی کلام پاک پڑھنا ہے' صبح دیر سے ناشتہ کیا تھا۔ آمنہ اور زینب کہہ رہی تھیں ہم تھوڑی دیر میں پڑھ کر کھائیں گے۔ جویریہ کو بھوک لگی تھی' وہ کھا رہی ہے۔ آپ کے لیے کھانا لگائے آمنہ؟" اماں جی نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ "صبح بھی آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا۔"

"نہیں' میرا روزہ ہے آج۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"روزہ!" وہ تعجب سے بولیں۔ "سحری کے وقت تو آپ نے کچھ لیا ہی نہیں؟"

"میں صبح اٹھا تو نیت کر چکا تھا۔ تم لوگ کھاؤ' میں ذرا آرام کروں گا۔" وہ اٹھ کر جانے لگے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے' بہت خپ خپ سے لگ رہے تھے۔ اماں جی کا دل دکھ سا گیا۔

"وہ شام کے لیے آپ کہہ رہے تھے' آٹا اور دال منگوا دیں گے۔" وہ جھجک کر بولیں۔

"ہاں' جلیل کو پیسے دے آیا ہوں وہ آٹا' دال' تھوڑے سے چاول اور آلو پیاز ساتھ میں ایک سبزی لے آئے گا ابھی۔ وہ بچہ تھا ناصر' اس نے قرآن ختم کر لیا تھا' اس کے والد صبح دو سو روپے دے گئے تھے کہ پچاس روپے کی مسجد کے بچوں میں شیرینی منگوا کر بانٹ دیجیے گا' باقی آپ رکھ لیجیے گا' وہی پیسے میں جلیل کو دے آیا ہوں۔ لینے گیا ہے وہ سودا۔" وہ وضاحت کر کے اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اماں جی افسردگی سے انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔ "کتنے کمزور ہو گئے ہیں' ان جیسا آدمی تو کوئی نہیں ہی۔"

"اماں جی! جلیل سے کہیں' ایک پاؤ بڑا گوشت ہی لے آئے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں گوشت کا ذائقہ چکھے ہوئے۔" زینب پاس آکر فوراً ندیدے پن سے بولی۔

"بچے! ان پیسوں میں سات دن کا آٹا دال آجائے تو اللہ کا شکر ادا کرو' جاؤ جا کر تم روٹی کھاؤ اور اب مجھے تنگ نہیں کرنا۔"

وہ آنکھیں بند کر کے تسبیح کرنے لگیں اور زینب برا سا منہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو' ہاں شہباز۔ وعلیکم السلام' جیتے رہو۔" مسز خان جیسے خوشی سے چہک اٹھیں۔

"میں نے رات کو بھی تمہیں فون کیا تھا' کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ صبح بھی ڈرائی کی' تم ملے نہیں۔ اچھا ہوا' اب تمہارا فون آگیا۔ میں شدت سے تمہارے فون کی منتظر تھی۔"

ان کے لہجے سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"رات کو مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ صبح وقت نہ مل سکا' اس لیے اب کر رہا ہوں' خیر تو ہے۔ ویسے مجھے بھی آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔" کیپٹن شہباز کا لہجہ اسی طرح نارمل سا تھا' جیسے کئی مہینوں سے چلا آرہا تھا۔

"تم فون بھی تو اب کئی کئی دن نہیں کرتے۔ آج تم پندرہ دن بعد فون کر رہے ہو۔" وہ گلہ کرتے ہوئے بولیں۔

"ام جان! جب بھی وقت ملتا ہے' سب سے پہلے آپ کو فون کرتا ہوں۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"
"اللہ کا شکر ہے' میں تو آج کل اپنی سب بیماری بھولے ہوئے ہوں۔" وہ اسی رواں لہجے میں بولیں۔
"خیریت' ایسی کیا بات ہے۔" ان کے لہجے نے بالآخر کیپٹن شہباز کو چونکنے پر مجبور کر ہی دیا۔
"خوشخبری' میرے بچے! بہت بڑی خوشخبری۔" وہ سسپنس پیدا کرتے ہوئے بولیں۔
"ابھی کیا میری زندگی میں کسی خوشخبری کی گنجائش باقی ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔
"کیا کہا' میں نے نہیں سنا۔" مسز خان سن کر بھی انجان بن گئیں۔
"کچھ نہیں' آپ کیا کہہ رہی تھیں ام جان! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے' آپ میری بات سن لیں۔"
"تم آ کب رہے ہو۔" وہ ان سنی کر کے بولیں۔
"ابھی فی الحال نہیں۔" وہ کچھ اکتا کر بولے۔
"بولو کیا بات ہے۔ کوئی بات ہوتی ہے تو تمہیں ماں کو فون کرنا یاد آتا ہے۔"
"ام جان! میں نے بہت سوچا ہے' بہت غور کیا ہے' اتنی سوچ بچار کا نتیجہ جو نکلا ہے اس لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے کہ میں نے فیصلہ کیا ہے....."
"دیکھو شہباز بیٹا! پتا نہیں تم کیا کہنے جا رہے ہو' تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کوئی لمبی بات ہے تو بچے ایسی باتیں سامنے بیٹھ کر کرنے والی ہوتی ہیں۔ میرا ابھی دل تم سے ملنے کو بہت چاہ رہا ہے' تم چلے آؤ اور جو خوشخبری میں تمہیں سنانے جا رہی ہوں۔ اس کے بعد تم رک بھی نہیں سکتے' فوراً دوڑے چلے آؤ گے۔" وہ شہباز کی لمبی چوڑی تمہید سے بیزار ہو کر بولیں۔
"پھر سنا چکیں آپ ہی اور میں ابھی نہیں آسکتا' یہ بھی سن لیں آپ!" وہ جیسے جل کر بولے۔
"شہباز! زہت تمہیں بہت قیمتی گفٹ دینے جا رہی ہے جو نہ تو دنیا کی دولت پر بکتا ہے' نہ سارا مال و دولت دے کر خریدا جا سکتا ہے۔ تم نے تو اسے اب تک کوئی ایسی خوشی کوئی ایسا گفٹ نہیں دیا جو اس کے چہرے پر خوشی بن کر جھلک سکے۔ شہباز! تم باپ بننے والے ہو اور میں دادی۔ بولو ہے اس خوشخبری کا کوئی مول۔"
بہت کچھ جتاتے ہوئے انہوں نے بالآخر وہ خوشخبری اگل ہی دی جس نے کل سے ان کی آنکھوں کی نیند تک چرالی تھی۔ دوسری طرف ایک لمبی خاموشی تھی' وہ ڈر سی گئیں کہ شاید لائن ڈس کنیکٹ ہو گئی ہے یا.....
"ہیلو... ہیلو... شہباز بیٹا! تم سن رہے ہو' تم نے سنا؟" وہ رک رک کر بولیں۔
"جی ام جان! سن لیا۔" ایک لمبے وقفے کے بعد انہوں نے ایک گہرا سانس لیا جیسے ان کے کندھوں پر منوں من بوجھ آن گرا ہو۔
"تمہیں خوشی نہیں ہوئی سن کر۔" وہ حیرت سے بولیں۔
"پتا نہیں ام جان! میں جو کچھ دل کی خوشی کے لیے' اپنے لیے کرنا چاہتا ہوں' وہ خدا کو کیوں منظور نہیں ہوتا۔ میرے لیے اس زمین پر کچی خوشی کیوں عنقا ہو گئی ہے' میں کچھ سوچتا ہوں' اس پر عمل کرنا چاہتا ہوں کہ سب کچھ الٹ پلٹ جاتا ہے' سب کچھ۔" وہ بے معنی سے جملے بول رہے تھے یا شاید مسز خان کو لگا۔
"شہباز! تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا! تم ٹھیک تو ہو نا' میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" وہ الجھ کر بولیں۔
"ام جان! یہی تو مصیبت ہے ساری۔ آپ اول دن سے ہی میری کوئی بات نہیں سمجھ پا رہیں نہ سمجھنا چاہ رہی ہیں اور اب شاید میں آپ کو کبھی بھی نہ سمجھا پاؤں۔ خدا حافظ —" فون بند ہو چکا تھا۔
"عجیب لڑکا ہے یہ' نہ کوئی ریسپانس دیا نہ کوئی ڈھنگ کی بات کی۔ اوٹ پٹانگ بات کر کے خود ہی فون بند کر دیا۔ پتا نہیں کیا کہنا تھا اس نے' مجھے تو اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ معلوم نہیں اسے ہو کیا گیا ہے۔" وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے خود سے کہے جا رہی تھیں۔

"ام جان! خیریت' آپ کس سے باتیں کر رہی ہیں۔" عالیہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔ انہوں نے گڑبڑا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور مسکرانے لگیں۔
"کسی سے بھی نہیں' شہباز کا فون آیا تھا' ابھی بند ہوا ہے نا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔
"ہاں' کل اظہر کے پاس بھی آیا تھا۔ بتایا نہیں اس نے کب آنا ہے؟"
"جلدی آنے کا کہہ رہا تھا۔" وہ اطمینان سے سرہلا کر بولیں۔
"مگر کل بھائی سے تو کہہ رہا تھا' ابھی وہ نہیں آسکتا' دو تین ماہ تک۔" عالیہ کرسی پر بیٹھ گئی۔
"اچھا' مجھ سے تو ایسا کچھ نہیں کہا اس نے۔" وہ آرام سے بولیں۔
"میں اس لیے آئی تھی' کل آپ نے مٹھائی بھیجی تھی' کوئی خوشخبری ہے کیا۔؟" وہ متلاشی نظروں سے ساس کا جائزہ لے رہی تھی۔
"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرا کل کھانے کو جی چاہ رہا تھا' منگوائی تھی پھر سوچا بچے بھی کھالیں' سے اس لیے دونوں طرف بھی بھجوا دی۔" وہ ابھی عالیہ کو کسی بھی خوشخبری کی ہوا نہیں لگنے دینا چاہ رہی تھیں۔
"اچھا۔" وہ اچھا کو خوب لمبا کر کے بولی۔ "کل ڈاکٹر عاطف کی مسز آئی تھیں' ڈاکٹر سائرہ۔ خیر تو تھی؟" "اف کس قدر باخبر عورت ہے یہ۔" مسز خان نے جھنجلا کر سوچا۔
"خیر تھی' میرا بی پی لو ہو گیا تھا' میں نے بلوایا تھا۔"
"اچھا' میں سمجھی شاید۔" اس نے ذو معنی انداز میں ادھورا جملہ چھوڑ دیا۔
"آپ کی بہو بیگم نظر نہیں آ رہیں۔" عالیہ نے یونہی ادھر ادھر کمرے میں دیکھا جیسے بہو بیگم کسی دیوار پر ٹنگی نظر آجائیں گی۔
"تمہیں بہو بیگم تو تمہیں ہو' سامنے بیٹھی ہو۔" مسز خان نے طنز اسی کی طرف لوٹایا۔
"اگر وہ تو آپ کی خاص الخاص ہو تی ہیں۔" وہ زور دے کر بولی۔
"اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے' ویسے اپنے کمرے ہی میں ہو گی۔"
"خیر' وہ زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں پائی جاتی ہیں۔ یہ شہباز اسے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا؟ آخر آرمی میں اتنی سہولت تو ہوتی ہے کہ بندہ فیملی کو ساتھ رکھ سکے۔ اب تو شادی کو بھی آٹھ نو ماہ ہونے کو آئے ہیں"
"ابھی تو زہت میرے پاس ہی رہے گی۔ شہباز کو ابھی اپنے کیریر کی فکر ہے' چند ماہ میں اس کے ایگزام ہونے والے ہیں' اسے ابھی اتنا ٹائم نہیں ملتا کہ بار بار ادھر دوڑا آئے۔ میں نے خود اسے کہہ رکھا ہے کہ یکسوئی سے اپنے امتحان دے لے پھر دیکھی جائے گی۔ معاذ... معاذ بیٹا! یہ فون تو ذرا رکھ دو۔"
وہ دروازے کے باہر سے گزرتے معاذ کو دیکھ کر انہوں نے آواز لگائی۔ اس نے اندر آ کر ان کے بستر پر پڑا فون اٹھا کر سائیڈ ریک میں رکھ دیا۔
"اور زیتون بانو سے کہنا' میں آرام کرنے لگی ہوں۔ چائے میں اٹھ کر ہی پیوں گی۔ دوا میں نے لے لی ہے' اس لیے غنودگی سی آ رہی ہے۔ سر بھاری ہو رہا ہے' تھوڑا آرام کروں گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ تم نے کھانا کھا لیا؟"
"جی!" وہ مختصر جواب دے کر باہر جانے لگا۔
"معاذ! تم فارغ ہو نا' ذرا میرے ساتھ مارکیٹ تک جانا ہے۔ مجھے کچھ کچن کا سامان لینا ہے' سب کچھ ہی ختم ہے۔" عالیہ ساس کی غنودگی کا سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ معاذ متذبذب سا کھڑا رہ گیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں پڑھنے ہی جا رہا تھا۔ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ مسز خان نے اس کی شکل دیکھی۔
"عالیہ! معاذ تمہارے ساتھ کل چلا جائے گا' ابھی اسے زیتون بانو کے ساتھ بازار جانا ہے۔ اسے بھی کچن کا سامان اور سبزی وغیرہ لینی ہے۔ میں نے ابھی زیتون بانو کو بلا کر فہرست اور پیسے دیے ہیں' تم کل چلی جانا۔ معاذ! تم

جاؤ' زیتون بانو کے ساتھ۔"

مسز خان نے دوٹوک انداز میں کہہ کر تکیہ کمر کے نیچے سے اوپر کی طرف کھسکایا اور لیٹ گئیں۔ عالیہ کو غصہ تو بہت آیا مگر ساس کے منہ پر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔ معاذ بھی باہر جانے لگا۔

"معاذ بیٹا! تم جا کر پڑھو' زیتون بانو نے کہیں نہیں جانا' یہ دروازہ بند کر جانا۔" مسز خان کی بات پر معاذ نے کچھ حیرت سے انہیں دیکھا پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

• • •

"نین تارا! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔۔؟" زیور گل کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"فائن مما!" وہ بیڈ پر بیٹھی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"میڈ۔ یسن لے لیں تم نے۔۔؟"

"یس مما!" وہ ماں کی طرف دیکھے بغیر جواب دے رہی تھی۔

"کیسا زرد رنگ ہو گیا ہے میری معصوم بیٹی کا۔ کہا تھا اس کھیل میں مت پڑنا۔۔۔" زیور گل پاس بیٹھ کر اس کے بال سنوارنے لگی۔

"پلیز مما! میں اس ٹاپک پر اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ اسی طرح میگزین کے رنگین صفحے پر نظریں جمائے سرد لہجے میں بولی۔

"اوکے میری جان۔۔!" زیور گل نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"اب اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہے تو ذرا باہر آجاؤ یا باہر گھوم پھر آؤ۔ تین دن سے کمرے میں بند پڑی ہو جب سے کلینک سے آئی ہو۔"

"شام کو باہر جاؤں گی مما!"

"اس سید زادے کو فون کیا؟ بتا دینا تھا اسے خوشخبری کے بارے میں کہ اس کی جان چھوٹ گئی تم نے اپنی جان پر کھیل کر۔۔۔"

"صبح فون کر دیا تھا۔"

"پھر کیا کہہ رہا تھا وہ۔۔؟" زیور گل تنفر سے بولی۔

"کچھ خاص نہیں۔ انہیں کسی کام سے اسلام آباد جانا ہے اسی ہفتے۔ جانے سے پہلے شاید چکر لگائیں۔" نین تارا آہستگی سے بولی۔

"دھوکے باز فریبی!" زیور گل بڑبڑائی۔

"جان! تم دل پر مت لینا۔ پیڑ ہرا ہو تو پھل تو آتا ہی رہتا ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ اچھا ہے ان جھمیلوں میں پڑ کر خود کو مزید مشکل میں نہیں ڈالو۔"

"مما پلیز۔۔!" نین تارا نے میگزین بند کر دیا اور بیڈ سے ٹیک لگا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اچھا میری بات سنو نین تارا! وہ قریشی کا یونٹ مری جا رہا ہے۔ اس کی فلم کے کچھ شاٹس رہ گئے ہیں اس کے لیے وہ ہم دونوں کو ساتھ چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اچھا ہے تمہارا جی بھی بہل جائے گا اور طبیعت بھی فریش ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔۔؟"

"میں سوچوں گی۔"

"کیوں بیٹا! خیریت۔۔؟"

"ویسے ہی۔ آپ بتائیں تو۔۔؟"

"کچھ خاص تو نہیں ہے' جو آتا ہے' وہ روز مرہ کے اخراجات میں اٹھ جاتا ہے۔ معلوم ہے نا اس کلاس میں اسٹینڈرڈ مین ٹین رکھنے میں ہی سب کچھ لگ جاتا ہے' پھر پانچ گھریلو ملازمین' دو ڈرائیور' مالی' واچ مین ان سب کے

اخراجات۔ بینک بیلنس کیا خاک ہوگا اور پراپرٹی میں یہ گھر ہے۔ وہ ایک کنال کا پلاٹ اور چار دکانیں جو اچھے وقتوں میں اس شاہ کے بچے نے میرے نام سے خرید دی تھیں۔ تم "سید ہاؤس" اپنے نام کروا لیتیں تو ہمیں کہیں اور دیکھنا ہی نہ پڑتا۔"

وہ آزردگی سے بولی۔ نین تارا ماں کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

"مما! جو میں لاکھوں کے چیک آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کرواتی رہی ہوں شاہ جی سے لے کر وہ۔۔۔"

"سویٹ ہارٹ! بتایا نا اخراجات کم ہیں؟ پھر آئے دن کی پارٹیز' فنکشنز ان کے لیے تو ویسے ہی کھلا پیسہ چاہیے تمہیں معلوم تو ہے۔" زیور گل اٹھ کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

"تو کیا ضرورت ہے' اپنی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے کی۔ جب کہ آپ کو بھی آج کل کوئی خاص کام نہیں مل رہا نہ ٹی وی میں نہ فلم میں۔" نین تارا چڑ کر بولی۔

"میری جان! ڈیمانڈ۔ یہ ہماری کلاس کی ڈیمانڈ ہے۔ میرا دور تو چلو تمام ہوا۔ اب مجھے کیا کام ملے گا۔ اور ملا بھی تو محض چند ہزار کا۔ اب تمہارا ٹائم آنے والا ہے بلکہ آچکا ہے جسے تم اسٹارٹ ہی میں اس گدھے سید زادے کے پیچھے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ اب جو یہ حادثہ ہوا ہے' اس کا اثر کیا تمہاری فزیک پر نہیں پڑے گا' تمہاری چارمنگ بیوٹی نہ متاثر ہوگی' نین تارا! یہ تو خود کو کیش کرانے کا ٹائم ہے۔ اور تم ایک ہی بھنورے سے چمٹ کر رہ گئی ہو۔ جو کہ اب کسی بھی کام کا نہیں۔ محض ایک وہ "سید ہاؤس" تمہارے نام کرنے کو تیار نہیں' مسلسل سال بھر سے ولا سے پر رکھا ہوا ہے۔ تمہاری پاکٹ منی سکڑ کر محض چند ہزار رہ گئی ہے۔ وہ بھی دس فون کرنے پر۔ میری جان! کیوں اس طرح خود کو اسپوئل (ضائع) کر رہی ہو' وہ تمہارے ساتھ محض کھیل رہا ہے' اور میں دیکھ رہی ہوں بہت جلد اس کا اس کھیل سے جی بھرنے والا ہے۔ پھر تم کہاں ہوگی۔ ذرا سوچو۔"

زیور گل اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑی تھی اتنا کام تو نین تارا کا دماغ بھی کر رہا تھا شاہ جی کے چونچلوں میں اب وہ پہلے سی تراوٹ نہیں رہی تھی۔ بڑا اکتایا اکتایا بیزار سا انداز ہوتا تھا ان کا جیسے بہت مجبور ہو کر آتے ہوں' یہی چیز بہت دنوں سے نین تارا کے اندر بھی گھٹن بن کے جائے جا رہی تھی۔ اور وہ اس گھٹن کو سن کر بھی انجان بن رہی تھی۔

"تو مام! میں کیا کروں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"اس طوطے کو دوبارہ قابو کرنے کا ایک آخری طریقہ تو یہ ہے کہ مرغی پھر سے سونے کے انڈے دینے لگ جائے۔ تم اس سے آنکھیں پھیر لو اور اپنے لیے دانستہ طور پر کسی اور ڈالی کا انتخاب کرو۔ سلطان بخت سے اپنی انسلٹ کا بدلہ لینے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ اسے پتا چلے گا کہ تم اس کی رکھیل نہیں ہو اور بے بی! یہ ڈائیورس وغیرہ کی دھمکیوں سے ان کے گھروں کی شریف بیبیوں کے دم نکلتے ہیں۔ ہم جیسوں پر ان کا اثر نہیں ہونا چاہیے' اگر وہ تمہیں ڈائیورس دیتا ہے تو کھوائی فٹ۔ اچھا ہے اس فضول کے طوق سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ طلاق کی دھمکی پر اگر تم نہ ڈریں تو وہ ڈر جائے گا۔ پھر تمہارا کام بہت آسان ہو جائے گا مگر میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ اب اس کے ساتھ زیادہ چمٹنے کی ضرورت نہیں۔ سال چھ مہینے میں اگر یہ تمہارے نام کچھ اور پراپرٹی کرتا ہے تو ٹھیک' نہیں تو اسے فارغ کرو اور تمہارے پاس بھی محض پانچ سات سال ہیں' کریم سمیٹنے کے۔ اس کے بعد تو زرا چھاچھ ہی ملتا ہے۔ اب ہوش کے ناخن لو۔ پہلے میں تمہاری ہر ضد اس لیے مانتی رہی ہوں کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے یا تم اس کی محبت میں مری جا رہی ہو۔ ٹھیک تھا مگر اب اس اندھی محبت کا ایک نتیجہ تو تم نے بھگت ہی لیا ہے۔ اگر وہ تم سے سچی محبت کرتا' تمہیں اپنی زندگی میں جائز مقام دینے پر تیار ہوتا تو نین تارا! آئی سوئیر میں تمہیں کبھی رستہ بدلنے کا مشورہ نہ دیتی اگر وہ اس طرح بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ہلاک کر دینے کا سفاکانہ فیصلہ نہ سناتا۔ اسی سے اس کے دل کی کمینگی اور منافقت ظاہر ہے۔ اب تم اور کتنا خود کو دھوکا دو گی۔"

زیور گل اسے پوری طرح سے ٹریپ کر چکی تھی۔ باتیں اتنی سچی تھیں کہ نین تارا انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔

"بس اب اس فضول کی محبت سے اپنا دامن کھینچ لو۔ کچھ اپنے فیوچر کی سوچو۔ میری زندگی کا سوچو کہ میری زندگی تمہارے فیوچر سے ہی تو منسلک ہے۔ اب خود کو اس یوٹوپیا سے باہر نکالو میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

نین تارا نے ایک گہرا سانس لے کر ماں کی شکل دیکھی۔

"یس مام!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے بولی۔

"تو بس پھر خود کو اس قنوطیت سے باہر نکالو اور اپنے آپ کو فریش کرو۔ اس فیلڈ کی پہلی ڈیمانڈ ہی فریش نیس ہے۔ ٹھنڈے دل اور دماغ سے سارے حالات کا تجزیہ کرو اور آئندہ کے لیے پلاننگ کرو کہ جو تمہیں کرنا ہے میں ہر طرح سے تمہیں سپورٹ کرنے کو تیار ہوں' اس وقت ہر ٹاپ کلاس پروڈیوسر' ڈائریکٹر تمہیں ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار ہے۔ پھر اس ملک میں محض ایک ہی سلطان بخت نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ دولت مند صاحب حیثیت اور صاحب دل تمہیں بہت سے ملیں گے جو تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے چند لاکھ کی پراپرٹی نہیں اپنی پوری جاگیر تمہارے نام کر سکتے ہیں۔ اپنی اہمیت کا احساس تو اپنے اندر پیدا کرو۔ آنکھیں کھولو' خود کو دیکھو محسوس کرو اور پھر اپنی قیمت آپ لگاؤ۔ میں تمہیں صرف سمجھا سکتی ہوں۔"

زیور گل آج ہر صورت شاہ جی کے آکٹوپس سے اس کا پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نین تارا بستر سے اتر کر کھڑی ہو گئی اور خاموشی سے جا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی' ہیئر برش اٹھا کر اپنے الجھے ہوئے بال سنوارنے لگی۔

"مام! آپ پروگرام ارینج کریں۔ ہم قریشی کے یونٹ کے ساتھ بھوربن جائیں گے۔ فی الحال کسی پُرفضا مقام پر جا کر میں اپنے دماغ کو فریش کرنا چاہتی ہوں۔ باقی کی پلاننگ آ کر ہو گی۔" چند لمحوں بعد اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے جملوں نے زیور گل کو نہال کر دیا۔

"گڈ۔ ویری گڈ!" اس نے آگے بڑھ کر چٹاچٹ بیٹی کا منہ چوم لیا۔

"میں بھی یہی چاہتی ہوں' میں ذرا قریشی کو فون کر کے آئی۔ تم تیار ہو جاؤ پھر دونوں ماں بیٹی باہر چلیں گے۔ تھوڑی شاپنگ کریں گے اور لنچ تمہاری پسند کی جگہ پر مل کر کریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

زیور گل نے فٹافٹ پروگرام بنا لیا۔

"ٹھیک آپ فون کر آئیں' میں تیار ہوتی ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تو زیور گل خوش خوش کمرے سے باہر نکل گئی۔ نین تارا آئینے میں اپنے خالی خالی وجود کو چپ چاپ دیکھے گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالمبین کی راتیں جاگتے گزر رہی تھیں اور دن پریشان خیالوں میں۔ مسلسل پانچ راتیں ہو چکی تھیں اسے حویلی کے پچھلے قبرستان میں جا کر اس ٹوٹی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر ٹارچ سے سگنل دیتے ہوئے' اس ظالم حسینہ کا دل نہیں پگھلا تھا حالانکہ اسے تو امید تھی کہ شہرینہ پہلی رات نہیں تو دوسری رات ضرور ہی آ جائے گی۔ وہ ایک بار اس کے پیچھے دن میں کالج کا چکر بھی لگا آیا تھا۔ مگر شہرینہ سے وہاں بھی ملاقات نہیں ہو سکی تھی' شاید وہ اس قدر کچی نہ تھی جس قدر وہ سمجھا تھا۔ پھل پکنے کے لیے اسے ابھی اور محنت کی بلکہ شاید بہت محنت کی ضرورت تھی یا ہو سکتا ہے' یہ پھل پک تو جائے مگر اس کی جھولی میں نہ گر سکے۔ اسی طرح کے وسوسے اسے دن میں بھی ہراساں رکھتے اور رات کو قبرستان کی ہڈیوں کے گودے میں اتر جانے والی عجب سی خنکی۔ اسے لگتا' وہ دو چار راتیں اور آتا رہا تو یہ خنکی مستقل اس کی ہڈیوں میں جم کر اسے بھی ٹھنڈا ٹھار کر دے گی۔ پہلے کبھی اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ عام خنکی اور قبرستان کی خنکی میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ قبرستان کی ٹھنڈک تو جیسے آدمی کو اندر تک سرد کر دیتی تھی پل بھر میں۔

ماسٹر صاحب کا رویہ بھی بدل رہا تھا حالانکہ رات کے پہلے پہر پڑھنے کا ڈرامہ رچاتا تھا۔ کوٹھڑی کا بلب ساری

رات جلتا چھوڑ کر پچھلی کھڑکی سے باہر کود جاتا' کوٹھڑی کا اندرونی دروازہ بند کر جاتا تھا کہ کہیں ماسٹر صاحب چھاپہ مارنے نہ آ جائیں۔ دن میں بھی کتابیں کھول کر شہرینہ کی سنگ دلی پر غور کرتا رہتا' ماسٹر صاحب کا رویہ یوں بدل رہا تھا کہ اس کے اس قدر پڑھنے کے باوجود اسے کوئی بھی سوال مکمل طور پر یا صحیح طور پر یاد ہی نہیں ہوتا تھا۔ امتحان میں مہینہ بھر ہی رہ گیا تھا۔ اور ماسٹر صاحب کو پہلے جھنجلاہٹ ہوتی تھی اور اب غصہ آنے لگا تھا کہ اس کا دھیان پڑھنے میں نہیں کہیں اور لگا ہوا ہے۔ وہ بھی دل میں ماسٹر صاحب کے تجزیے کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ کتنا صحیح پہچانے تھے۔ ابھی بھی وہ اسے ٹھیک ٹھاک جھاڑ کر گئے تھے۔

"اگر تم نے نہیں پڑھنا تو بے شک بدر سے واپس چلے جاؤ۔ کم از کم مجھ پر یہ الزام تو نہیں آئے گا میٹرک بھی نہ کرا سکا اور اللہ کے نیک رستے سے بھی اٹھوا لیا۔"

اور اس نے ایک بار پھر ان سے جھوٹے سچے دس وعدے کیے تھے کہ وہ اس بار اسے امتحان میں بیٹھنے تو دیں۔ وہ ضرور انہیں کامیاب ہو کر دکھائے گا' ماسٹر صاحب پریشانی اور غصے سے بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے تھے۔

"میں یہ کن چکروں میں پڑ گیا ہوں' اگر رات کو کسی نے مجھے قبرستان میں پکڑ لیا یا ماسٹر صاحب کو پتا چل گیا تو شاید میرے مستقبل کے ٹوٹے پھوٹے نقشے میں بیل بوٹے جڑ جائیں۔ جیل یا تھانہ یا چھوٹے شاہ جی کا عقوبت خانہ' نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والا حال نہ ہو۔ یہ شہرینہ کی بچی اس قدر پختہ ارادوں کی مالک لگتی تو نہ تھی۔ یہ تو اس پہلی ملاقات ہی میں پگھلی جا رہی تھی۔ اب اس کے دماغ میں کیا خناس بھر گیا ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے اور کام بہت۔ ماسٹر صاحب شاید دو چار دن ہی مجھے اور برداشت کر سکیں' ماسٹرنی کے تیور الگ بگڑ چکے ہیں۔ آج دوپہر کے کھانے میں بھی انہوں نے ہری جھنڈی دکھا دی۔ آخر مفت کے اس مہمان کو وہ کب تک جھیلیں۔"

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"بس آج اور کل کی رات' دو راتیں اور' اگر شہرینہ نہ آئی تو کوئی بھی آخری قدم اٹھا لوں گا۔ اس کا کمرہ پچھلے باغ سے بہت اونچا نہیں اور وہ مکار لڑکی کھڑکی کھلی رکھ کر رات بھر میری بے بسی کا تماشا بھی دیکھتی ہے۔ میں اس کھلی کھڑکی کا فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔ بس یہ دو راتیں۔ اس کے بعد فیصلہ ہو جائے گا۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے مسلسل خود کو تھوک بجا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

"کتنے دنوں کا پروگرام بنایا ہے تم لوگوں نے۔؟" سیدہ نے سلطان بخت سے پوچھا۔ ملازمہ نے دو سوٹ کیس لا کر لاؤنج میں رکھے تھے صالحہ تیار ہو رہی تھی۔

"ابھی تو پندرہ دن کا ہے ویسے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔" سلطان بخت نے بہت مطمئن انداز میں جواب دیا۔

"اچھی بات ہے مگر پھر بھی خیال رکھنا' زیادہ اونچائی اترائی پر نہ چڑھے صالحہ' اور میرا تو مشورہ ہے' بس اسلام آباد میں ہی گھوم پھر لینا۔ بلکہ مہینہ بھر صالحہ ادھر اسلام آباد والی کوٹھی میں رہ لے تو زیادہ اچھا ہے۔ ادھر کا موسم آج کل بہت خوشگوار ہے اور کوٹھی ہے بھی بہت اچھی لوکیشن میں' صالحہ کا جی بہل جائے گا۔"

"وہ آپا! کوٹھی میں تو شاید ہم نہ رہیں۔" سلطان بخت گڑبڑا کر بولے۔

"کیوں' وہاں کیوں نہیں' پھر میں نے منع کیا ہے کہ مری' بھوربن' ایبٹ آباد وغیرہ کا رُخ نہ کرنا۔ صالحہ کے لیے ٹھیک نہ ہو گا۔"

"آپا! کوٹھی میں اصل میں کچھ کنسٹرکشن کا کام ہو رہا ہے' اس لیے وہاں تو ہم قیام نہیں کر سکیں گے۔"

"ادھر کیا کنسٹرکشن کا کام بھلا.... تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔ پھر پرسوں منظور آیا تھا اور ادھر کا واچ مین اس نے بھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔

"آپا! اسے یاد نہیں رہا ہو گا۔ اصل میں پچھلے دنوں بلکہ دو تین ماہ پہلے جو طوفان باد و باراں آیا تھا' اسی کے دوران پچھلے لان اور انیکسی کے سینٹر میں پانی پڑ گیا تھا۔ میں پچھلے دنوں گیا تو مجھے پتا چلا میں نے فوراً ہی کام شروع کرا دیا

تھا۔ اور ابھی رات کو میری مینیجر سے بات ہو رہی تھی کہ ابھی کام مکمل نہیں ہوا۔ کام کو ہاتھ لگاؤ تو چھوٹے چھوٹے بہت سے کام نکل ہی آتے ہیں۔ اب کنسٹرکشن کا کام مکمل ہو گا تو میں نے کہا پینٹ بھی ساتھ ہی کروا لیتے ہیں اس لیے مہینہ بھر تو ان کاموں میں لگ ہی جائے گا۔"

"حیرت ہے تم نے پہلے تو ذکر کیا نہیں۔ میرا تو خود دس پندرہ دنوں تک جانے کا پروگرام ہے۔ چلو میں خود بھی دیکھ آؤں گی جا کر۔ کیا کام ہو رہا ہے۔"

"آپ نے کس کام سے جانا ہے ادھر۔؟" سلطان بخت ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔

"جواد کا ایڈمیشن شاید ادھر کرواؤں' ارادہ ہے میرا؟"

"تو جواد میرے ساتھ چلا جائے گا۔ آپ کو جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"جیتے رہو۔ اس کے باپ کو تو فکر ہی نہیں کہ بچے کے لیے بہترین تعلیم اور تعلیمی ادارہ کس قدر ضروری ہے۔ یہ صالحہ نہیں آئی ابھی۔"

ان کے الفاظ منہ ہی میں تھے کہ صالحہ تیار ہو کر آ گئی۔ ڈارک براؤن ویلوٹ کے خوبصورت ڈریس میں اس کا سراپا بہت نمایاں لگ رہا تھا۔ کچھ وہ تیار بھی خوب دل لگا کر ہوئی تھی اور کچھ ان چند دنوں کی سلطان بخت کی توجہ نے اس کے چہرے کو بھی نکھار سا دیا تھا۔

"ماشاء اللہ' اللہ نظر بد سے بچائے۔ تم دونوں کی جوڑی یونہی سلامت رہے۔ سرسبز و شاداب رہو۔"

سیدہ اسے دیکھتے ہی محبت سے بولیں۔

"تو پھر تم لوگ کہاں رہو گے' فون وغیرہ کا رابطہ بھی تو ضروری ہے نا۔ مجھے فکر رہے گی' صالحہ کی صحت کے بارے میں۔"

"موبائل تو ہے نا آپا میرے پاس۔ ویسے ابھی تو میں نے پی سی میں بکنگ کروائی ہے ایک ہفتہ کی۔ اس کے بعد مری والا بنگلہ تو ہے نا۔"

"ہوٹل میں بیڈ رومز تو سیڑھیاں چڑھ کر ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو صالحہ کے لیے ٹھیک نہیں۔" سیدہ تشویش سے بولیں۔

"یہاں بھی تو بیڈ روم اوپر ہی ہے پھر آپا! پھر پی سی ہوٹل ہے کوئی چندو کا ڈھابا نہیں۔ بہت آرام دہ سیڑھیاں ہوتی ہیں' بہرحال آپ فکر نہ کریں میں ایک ڈاکٹر ساتھ لے لوں گا جو ہر سیڑھی پر اس کا چیک اپ کرتا رہے۔"

"سلطان بخت!" سیدہ ہنس پڑیں' صالحہ شرما گئی۔ اسی وقت شہرینہ اندر داخل ہوئی۔ وہ اندر کا منظر دیکھ کر کچھ حیران سی رہ گئی۔ کئی دنوں سے تو وہ اپنی ہی الجھنوں میں الجھی ہوئی تھی۔ عبدالمعین والے مسئلے نے اس کا دماغ اچھا خاصا خراب کر دیا تھا۔ وہ ہر رات قبرستان کے آس پاس موجود ہوتا' ساری رات لائٹ جلا بجھا کر اس کی نیندیں حرام کرتا رہتا۔

اور وہ دل کا یہ غبار اندر ہی اندر اٹھائے پھر رہی تھی۔ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی اور سنتا کس نے تھا۔ گھر کا ماحول بھی تو بہت کشیدہ تھا اور اب جو وہ اچانک اندر داخل ہوئی تو سب کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔ اس کی دوسری نظر ان سوٹ کیسوں پر پڑی۔

"کہیں... جا رہے ہیں آپ؟" وہ اٹک کر بولی۔

"ہاں شہرینہ! تمہیں نہیں پتا' تمہارے لالہ اور بھابی اسلام آباد جا رہے ہیں تقریباً" دو ہفتوں کے لیے۔" سیدہ نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"ہم... مگر مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔"

"تم کہیں نظر آؤ تو تمہیں کوئی بتائے نا۔ ہر وقت تو کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ آدھے سے زیادہ دن کالج میں گزار کر آتی ہو۔ تمہیں کون سا کسی کا خیال ہے کہ کسی کی خبر ہی لے لو۔" صالحہ نا معلوم کب سے اس کے خلاف بھری

بیٹھی تھی۔ فوراً" چمک کر بولی۔

"کالج میں آدھا دن گزار کر آتی ہوں تو اس میں میرا قصور ہے۔ دو گھنٹے کا آنے جانے کا راستہ ہے اور میری کون خبر لیتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے شہرینہ! صالحہ مذاق کر رہی تھی تم سے۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ہم سب کو تمہاری خبر ہے' ایسی کیا بات ہے۔" سیدہ نے اسے ساتھ لگا کر بہلانا چاہا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں' آج کل ویسے ہی اس کا دل گھر والوں کی طرف سے بدگمان ہوا جا رہا تھا۔ اب یہ سامان باندھے کہیں جانے کو تیار بیٹھے ہیں اور اسے خبر تک نہ دی۔ سیدہ نے سلطان بخت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ وہ شہرینہ کو تسلی دیں۔

"گڑیا! روتی کیوں ہو صرف پندرہ دن کے لیے تو جا رہے ہیں۔ پھر آ جاؤں گی تمہارے پاس بولو تمہارے لیے کیا لے کر آؤں؟" سلطان بخت کی لگاوٹ اوپری تھی۔ شہرینہ کو صاف لگا۔

"کچھ نہیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی تو صالحہ چمک اٹھی۔

"دیکھ لیا آپا! اس گھر کے بچوں تک کو میری ذرا سی خوشی گوارا نہیں' ہاں میں سیر سپاٹوں کے لیے جو جا رہی ہوں تو موڈ تو خراب ہو گا نا۔" صالحہ جاہلوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولی۔

"کیا ہو گیا ہے صالحہ تمہیں' شہرینہ نے ایسا کچھ تو نہیں کہا' یوں بھی تمہیں کم از کم شہرینہ سے تو ذکر کر دینا چاہیے تھا۔ ہفتہ بھر سے تیاریاں کر رہی تھیں۔ کیا حرج تھا جو اسے بھی بتا دیتیں۔ اس نے کون سا تمہارے ساتھ اٹھ کر چل پڑنا تھا۔"

سیدہ کو یکایک بہن پر ترس آیا۔

"ہاں! مجھے معلوم تھا بس میرا ہی قصور نکلنا ہے۔ ہر بار خاک میرے سر پر پڑتی ہے۔ آپ جو دن میں دس پھیرے لگاتی تھیں۔ یا کئی بار فون کرتی تھیں۔ آپ بتا دیتیں جو کچھ میں چھپانا چاہ رہی تھی۔"

صالحہ پوری طرح سے الٹ بولی ہو چکی تھی۔ سلطان بخت کو پھر سے پانی پت کی جنگ کے آثار نظر آنے لگے۔

"کرمو! کرمو! سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔" انہوں نے منہ دروازے کی طرف کر کے آواز لگائی۔ کرمو بھاگا بھاگا آیا اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر لے گیا۔

"آپا! یہ کیا فضول کی بحث آپ لوگوں نے شروع کر دی ہے۔ شہرینہ اب بچی تو نہیں ہے کہ اب ایک ایک بات اسے سمجھائی جائے۔ اسے خود گھر کے معاملوں کی خبر رکھنی چاہیے' بہرحال اب ہمیں چلنا چاہیے' یوں بھی دوپہر ہونے کو ہے' شام تک پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔"

سلطان بخت کے انداز اچھے خاصے بدل چکے تھے۔ سیدہ کچھ حیرت زدہ سی رہ گئیں۔ مگر شہرینہ آج ان کے سب رنگ دیکھ لینا چاہتی تھی۔

"لالہ پلیز' ایک منٹ' میری بات سن کر جائیں۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سلطان بخت جو پہلے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو چکے تھے۔ کچھ ناگواری سے اسے دیکھا۔

"اور میں آپ سے بہت دنوں سے بلکہ مہینوں سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے ہاسٹل میں داخل کروا دیں۔ یا پھر "سید ہاؤس" میں رہنے کی اجازت دیں۔ اس طرح روزانہ دو تین گھنٹے میں کالج سے آنے جانے میں میری پڑھائی کا بہت حرج ہوتا ہے۔ یوں بھی ادھر گھر میں رہ کر میں کون سا کسی کا بھلا کر رہی ہوں' یا کوئی کون سا مجھ سے خوش ہے۔ جو میری کمی محسوس کرے گا۔" اس نے صاف صالحہ پر چوٹ کی تھی۔

"شہرینہ! بہت بڑھتی جا رہی ہو۔ ابھی تم اتنی خود مختار نہیں ہو کہ اپنے فیصلے خود کرتی پھرو۔" سلطان بخت کچھ غصے سے بولے۔

"میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا' صرف آپ سے اجازت مانگی ہے اور میں آپ سے کتنے مہینوں سے تو کہہ رہی ہوں۔ آپ ٹال دیتے ہیں۔" اس نے پھر بھی لہجے کو نرم رکھا۔

"میں تمہیں ٹال نہیں رہا بلکہ تمہیں صاف صاف بتا چکا ہوں کہ نہ تمہیں ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت دے سکتا ہوں نہ "سید ہاؤس" میں اکیلے رہنے کی۔ تمہیں اگر پڑھنا ہے تو اسی طرح پڑھنا ہوگا بس ایک سال اور پڑھ لو۔ انٹر کے بعد آگے پڑھنے کا سوچنا بھی نہیں۔ آپا! آپ اس کے بارے میں سوچیں' ہمارے خاندان میں یوں بھی لڑکیوں کی اتنی تعلیم کا رواج نہیں' میں اس کی ضد سے مجبور ہو گیا تھا۔"

سلطان بخت نے آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں تو شہرینہ کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔

"نہیں مجبور ہونا تھا آپ نے میری ضد سے۔ پہلے ہی انکار کر دیتا تھا۔" وہ چیخ کر بولی۔

"دیکھ لی اس کی خود سری اور گستاخی۔" صالحہ فوراً بڑھ کر بولی۔

"میں خود سر اور گستاخ نہیں' آپ اپنی شکل آئینے میں دیکھیں۔" شہرینہ چیخی۔

"شہرینہ!" سلطان بخت نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا "تم اس قدر گستاخ ہو چکی ہو۔ مجھے خبر نہ تھی۔" شہرینہ تو جیسے اپنی جگہ پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی' اس کا چہرہ سُن ہو چکا تھا' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"تم ابھی کالج نہیں جاؤ گی' جب تک میں واپس نہیں آتا۔ آنے کے بعد تمہارے بارے میں فیصلہ ہوگا۔ چلو صالحہ! اچھا آپا! اجازت دیں۔"

سیدہ کا منہ خود سلطان بخت کی اس اچانک حرکت پر کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"سلطان بخت! جاتے وقت یوں بہن کا دل دکھا کر جاؤ گے۔ بہت بری بات ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئیں اور اٹھ کر شہرینہ کو اپنے ساتھ لگانا چاہا۔ اس نے زور سے ان کے بازو جھٹک دیے۔

"دیکھ لیا آپ نے' اس کی نظر میں کسی کی عزت' کسی کا احترام نہیں ہے۔"

"صرف چند ماہ میں تم ان ذمہ داریوں سے اکتا گئے سلطان بخت۔" سیدہ افسوس زدہ لہجے میں بولیں۔

"بس آپا! بحث نہیں' چلتے ہیں ہم۔ خدا حافظ....." انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بیزاری سے کہا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ مجبوراً سیدہ کو بھی ان کی تقلید کرنا پڑی۔ زبردستی آگے بڑھ کر صالحہ کو گلے سے لگا کر الوداع کہا تھا' ورنہ اس وقت شہرینہ کی حالت نے انہیں بہت رنجیدہ کر دیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ انہیں رخصت کر کے اندر آگئیں۔

شہرینہ وہیں صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں تھا۔ سرخ چہرہ لیے ساکت بیٹھی تھی۔

"شہرینہ میری بچی! تم ٹھیک تو ہو نا؟" سیدہ بے قراری سے آگے بڑھیں۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے پل بھر میں غصہ آتا ہے۔ تھوڑی دیر میں اتر بھی جاتا ہے۔ ابھی راستے ہی میں دیکھنا تمہیں فون کرے گا۔ بیٹا! بھائی کے غصے کو دل پر نہ لو۔" مگر وہ ان سنی کر کے کمرے سے نکل گئی۔

"دل پر تو میں اب کچھ بھی نہ لوں گی آپا! آپ دیکھیے گا' لالہ کو یہ تھپڑ کس قدر مہنگا پڑے گا۔ بہت میں نے ان کی عزت کا خیال رکھ لیا۔ وہ بیوی کی اس بے جا طرفداری پر پچھتائیں گے ضرور آپا! آپ دیکھیے گا۔"

وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سیدہ نے اسے جاتے دیکھا پھر اس صوفے پر جا بیٹھیں جس کے نزدیک فون رکھا تھا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

"ہیلو ہیلو۔ کون بات کر رہا ہے؟" وہ بارعب لہجے میں بول رہی تھیں۔ "میں حویلی سے سیدہ بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا منظور! ہاں' میں نے تم سے ہی بات کرنا تھی' سنو وہ کوٹھی میں جو کنسٹرکشن کا کام ہو رہا ہے' وہ کہاں تک پہنچا ہے؟"

"کون سا کام جی؟" منظور حیرت سے بولا۔

"کوٹھی میں جو پچھلے لاؤنج کے اور انیکسی کے سینٹر میں پانی پڑ گیا تھا اس سلسلے میں؟" وہ اس کے حیران لہجے پر

سنبھل کر بولیں۔

"نہیں جی۔ کوٹھی میں تو کوئی کام نہیں ہو رہا' اور سب کمروں کی چھتیں بالکل درست ہیں' ایسی کوئی بات ہوتی تو میں پچھلے ہفتے آپ سے ذکر نہ کرتا۔"

"کچھ عرصہ پہلے کام ہوا ہو؟" وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

"جی نہیں' کوٹھی میں پچھلے سال جو پینٹ ہوا تھا بڑے شاہ جی کے آخری بار آنے سے پہلے' اس کے بعد تو کوئی کام نہیں ہوا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"تمہارے چھوٹے شاہ جی آج آ رہے ہیں' ادھر ہی ٹھہریں گے نا؟"

"جی معلوم نہیں۔ انہوں نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔"

"سنو منظور! سچ بتانا۔" وہ کچھ لمحوں بعد بولیں۔

"جی مالکن! حکم کریں۔"

"ادھر کوٹھی میں کوئی ٹھہرا ہوا ہے یا آ کر کبھی کبھار ٹھہرتا ہے؟" انہوں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"جج... جی... جی... نہیں تو بیگم صاب! ادھر کوئی بھی نہیں رہتا۔ بس چھوٹے شاہ جی ہی کبھی کبھار آتے ہیں۔"

منظور کا ہکلاتا لہجہ جیسے سیدہ کو کوئی سرا پکڑا گیا۔

"منظور! میری ایک بات یاد رکھنا اگر میں نے تمہارے بیان میں جھوٹ پایا تو تم سمیت تمہارا پورا خاندان اس روئے ارض پر کہیں نہیں پایا جائے گا' سمجھے' یاد رکھنا۔"

انہوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ ان کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا جیسے وہ کسی بہت مشکل مرحلے سے گزر کر آئی ہوں۔ انہوں نے ایک دو روز میں خود اسلام آباد جانے کا فیصلہ کیا اور صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

"سلطان بخت! تمہاری حرکتیں میرے بابا جان کو قبل از وقت قبر کی تاریکیوں میں لے گئیں' مگر تم نہیں سدھرے۔" وہ ہونٹوں میں بڑبڑا رہی تھیں۔

● ● ● ● ● ●

"اگر تم آج رات کو مجھ سے ملنے پچھلے باغ میں نہ آئیں تو میں کھڑکی سے کود کر تمہارے کمرے میں آجاؤں گا اور وہیں خود کو ختم کر لوں گا' تمہاری آنکھوں کے سامنے اور اس بات کو دھمکی یا گیدڑ بھبکی نہ سمجھنا' میں نے آج قسم کھائی ہے' یہ کر گزروں گا۔"

شہرینہ کے ہاتھ سے "تزک بابری" دھڑام سے نیچے گر پڑی۔ وہ اس قدر اچانک ایک طرف سے نکل کر اس سے مخاطب ہوا تھا کہ شہرینہ کے حواس گم ہونے لگے۔ ایک تو وہ اس کے ادھر آنے کی توقع ہی نہیں کر رہی تھی پھر اس طرح اچانک۔

"تم سن رہی ہو نا۔" وہ آہستہ آواز میں دھاڑا۔ شہرینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کالج سے چھٹی ہوئی تو اس نے ڈرائیور سے کہا کہ اسے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ کالج روڈ پر ہی ایک بڑی سی بک شاپ تھی' ڈرائیور نے وہیں گاڑی روک دی۔ وہ کتاب لینے اندر آگئی۔ سیلز مین کو کتاب کا بتایا' وہ کتاب لینے گیا اور وہ یونہی ٹہلتی ہوئی مختلف کتابیں دیکھنے لگی۔ پچھلے ریک میں رکھی "تزک بابری" اس نے جونہی اٹھائی' وہ کسی شیطان کی طرح اس کے سامنے آموجود ہوا۔ شہرینہ کو سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے۔

"تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے تو کیا میں بھی تمہیں پاگل نظر آتی ہوں جو تم سے ملنے آؤں گی۔ تمہاری حرکتیں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ میں آج ہی لالہ سے بات کروں گی' تمہیں تو وہی درست کریں گے۔" غصے سے دھمکی دیتے ہوئے وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

"چھوٹے شاہ جی گاؤں میں نہیں ہیں' مجھے معلوم ہے اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اگر تم نے اس پر عمل نہ

کیا تو چھوٹے شاہ جی کے آنے سے پہلے بہت کچھ پتھروں کی اس حویلی میں ہو گزرے گا جس کا تم یا تمہارے لالہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کمزور مت سمجھنا، یاد رکھنا۔ میں نے آج قسم کھا رکھی ہے۔ آر یا پار۔"

اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ شہرینہ کے پورے جسم میں برقی رو دوڑ گئی۔

"چھوڑو میرا ہاتھ بدمعاش، آوارہ، لوفر۔" وہ پورا زور لگاتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچنے لگی۔

"یہ ہاتھ اب میری آخری سانسوں تک میرے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے اب مجھ سے نہیں چھڑا سکتی۔ آج آدھی رات کے بعد میں کھڑکی پر تین پتھر پھینکوں گا، اگر تم نہ آئیں تو چوتھے کا انتظار مت کرنا۔ میں خود آجاؤں گا تمہاری خواب گاہ میں۔ خدا حافظ۔"

اس نے اتنی زور سے اس کا ہاتھ دبایا کہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔

"بھولنا نہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ اس کا ہاتھ چھوڑ کر جس طرح اچانک آیا تھا، اسی طرح اچانک غائب ہو گیا۔ شہرینہ اپنا دکھتا ہوا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لے کر دبانے لگی۔

"یہ تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا کچھ علاج کرنا پڑے گا، میں آج ہی...."

"کس سے بات کروں۔ لالہ نے اسلام آباد جا کر ایک بار بھی میری خبر لینے کی یا مجھ سے بات کرنے کی زحمت نہیں کی۔ آپا جان سے فون پر بات کر لیتے ہیں اور میں.... میں جیسے انہیں بھول ہی گئی ہوں۔" اس کے آنسو بہنے لگے۔ "اور آپا سے.... آپا سے بھلا میں کیا بات کروں گی۔ وہ الٹا مجھے گھر بٹھا لیں گی۔ انہیں میرا کالج آنا جانا ویسے بھی پسند نہیں۔" اس نے گہرا سانس لے کر چہرہ صاف کیا۔

"ایک بابا جان کیا گئے، یکایک میں کس قدر تنہا رہ گئی ہوں، بالکل اکیلی۔ بابا جان کے ہوتے لالہ کس قدر مجھ پر مہربان تھے۔ میری ہر بات، ہر فرمائش پر جان چھڑکنے کو تیار اور اب.... اس روز مجھے تھپڑ کھینچ مارا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے اس طرح مارا تھا۔ مجھے تو کبھی بابا جان نے ڈانٹا تک نہیں تھا، کجا اس طرح مارنا۔" اس کے آنسو پھر بہنے لگیں۔

"مجھے پتا ہے، میں اس بھری دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ بھابھی بیگم بہت عجیب سی ہیں۔ کیسی مکاری ان کی آنکھوں سے جھلکتی ہے، کیسے لالہ کو اپنے آگے لگایا ہے۔ کہاں وہ انہیں ایک پل برداشت نہیں کرتے تھے، اس روز ان کی وجہ سے مجھے تھپڑ مار دیا۔ اسلام آباد جانے کی مجھے خبر تک نہ کی۔ میری کس کو پروا ہے، آپا کو نہ لالہ کو نہ کسی اور کو۔ آپا کو مجھ سے زیادہ حویلی کی دیکھ بھال، نوکروں کی فکر رہتی ہے۔ مجھ سے تو انہیں بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ میں کس سے اپنی پریشانی کہوں، کس پر بھروسا کروں۔ لالہ سے کہوں گی تو وہ اتنا عرصہ چھپانے پر مجھے ہی قصوروار سمجھیں گے۔ اب تو ویسے بھی انہیں مجھ سے ذرا پیار نہیں رہا تو میری پریشانی کی کیا فکر کریں گے۔"

وہ دکھی دل کے ساتھ سوچتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی، جہاں سیلز مین اس کی مطلوبہ کتاب لفافے میں ڈالے اس کا منتظر کھڑا تھا، اس نے ایک نظر بیرونی دروازے سے باہر سڑک پر دیکھا۔ شاید وہ پھر کہیں کھڑا نظر آجائے۔ گلاس ڈور سے باہر ڈرائیور اس کا منتظر کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے ادائیگی کی اور کتاب اٹھا کر باہر نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

منظر کچھ ایسا عجیب یا انوکھا بھی نہیں تھا مگر نین تارا کے حسب توقع بھی نہیں تھا۔

سید سلطان بخت اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ بیگز اٹھا رکھے تھے۔ ان کے ساتھ شاید نہیں یقیناً صالحہ شاہ تھیں۔ سج سج کر بوتیک کی سیڑھیوں سے قدم اتارتی ہوئی اور سارے شاپرز ایک ہاتھ میں منتقل کر کے سلطان بخت نے جلدی سے انہیں سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا جسے انہوں نے بہت نزاکت سے تھام لیا۔ اس کے بعد صالحہ شاہ کے چلنے والے محض تین قدموں میں ہی نین تارا نے جان لیا کہ صالحہ شاہ اس "حالت" میں ہے۔ جس "حالت" میں سلطان بخت نے نین تارا کو ایک پل کے لیے گوارا نہیں کیا تھا۔ نین تارا کی اس "حالت" کا سن کر ہی وہ آگ بگولہ ہو گئے تھے اور اب کس

طرح سنبھل سنبھل کر صالحہ شاہ کے ساتھ چل رہے تھے کہ کہیں اسے ذرا سا دھچکا نہ لگے، اس کے قدم نہ ڈول جائیں یا توازن نہ بگڑ جائے۔

نین تارا کا بے اختیار جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس دوغلے شخص کے چہرے پر تھوک دے، وہ تمام زہر جو اتنے دنوں سے اس کے اندر پل رہا تھا۔ محبت کا ڈرامہ رچانے والا ظالم انسان، جس نے اس کی کوکھ ہری ہونے سے پہلے ہی اجاڑنے کا حکم دے ڈالا تھا اور یہ زہر ان پانچ دنوں میں بھی کم نہ ہوا تھا، جب وہ قریشی کے فلمی یونٹ کے ساتھ بھوربن، ایبٹ آباد، نتھیا گلی کے پُرفضا مقامات پر قریشی کی والہانہ کمپنی میں گزار کر آئی تھی۔ انہیں ابھی اسلام آباد آئے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے، تھوڑی دیر پہلے قریشی نے نین تارا کو اسی بوتیک سے اور اس مارکیٹ کی شاید دس دکانوں سے کپڑوں، جوتوں اور جیولری کی بے تحاشا شاپنگ کروائی تھی۔ شاپنگ سے تھک کر وہ اس کیفے میں فریش ہونے آئے تھے۔ اسنیکس، کولڈ ڈرنک اور کافی کے بعد زیور گل اور قریشی خوش گپیوں میں مگن تھے۔ جب اپنے اندر کے سناٹے سے اکتا کر وہ باہر نکل آئی تھی یا شاید قدرت کو اسے سلطان بخت کا دیدار کروانا تھا، وہ بے حرکت کھڑی اپنے اس بے وفا ہرجائی خاوند کو دیکھ رہی تھی جو اب کسی اور کی دلداریوں میں مگن تھا۔

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سلطان بخت کے ہاتھ سے اچانک ایک شاپر نیچے گر گیا۔ وہ اٹھانے کو جھکے اور جیسے ہی شاپر اٹھا کر سیدھے ہوئے، ان کی نگاہ نین تارا پر ٹک گئی۔ ان کے لب ہولے سے کپکپائے، اس کا نام لے کر مگر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھا کر کیفے کے اندر جاتی، زیور گل اور قریشی باہر نکل آئے۔

"ارے ڈیر! تم باہر کیوں چلی آئیں۔ لگتا ہے، تھک گئی ہو۔" زیور گل نے ہونٹوں میں سگار دبا رکھا تھا۔ ایک بھرپور کش لے کر بولی۔ قریشی فکرمندی سے آگے بڑھا۔

"مائی سویٹ گرل! تم نے کہا کیوں نہیں کہ تم تھک گئی ہو۔ میرا خیال ہے، واپس چلتے ہیں۔ نین تارا واقعی تھک گئی ہے۔" قریشی نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھام لیا۔ قریشی کا یہ التفات اسے اندر تک شانت کر گیا۔

سید سلطان بخت نے ایک پھنکارتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھ گئے۔ نین تارا کے لب خود بخود مسکانے لگے تو قریشی کا من کسی پھول کی طرح کھل اٹھا۔ ان پانچ دنوں میں بہت کم کم نین تارا کے ہونٹ اس طرح مسکائے تھے، وہ بھی قریشی کی قربت میں۔

"چلیں ڈارلنگ!" وہ اس کے بالکل قریب ہو کر سرگوشی میں بولا۔

"چلیں۔" وہ سر ہلا کر آگے چل پڑی۔ قریشی نے اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنے قدم تیز کر لیے۔ زیور گل دونوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر مطمئن انداز میں کش لیتے ہوئے آہستہ قدموں سے ان کے پیچھے چلنے لگی۔

"تھام! میں ریسٹ کروں گی۔" ہوٹل پہنچتے ہی اس نے قریشی کو ہری جھنڈی دکھا دی اور اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ لاک کر لیا۔

"تو یہ تھی تمہاری اصلیت سید سلطان بخت! آئی ہیٹ یو۔"

اس نے دونوں سینڈل زور سے سامنے دیوار کی طرف اچھالے۔ پرس گھما کر بیڈ پر پھینکا اور خود دروازے کے ساتھ پڑے صوفے پر گر سی گئی۔ آنکھیں بند کیے صوفے سے ٹیک لگائے اسے چند منٹ بیت گئے۔ یکدم اس کے پرس میں رکھے موبائل کی بیپ بجنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دونوں آنکھوں کے کناروں سے گرم گرم دو بوندیں تیزی سے نکل کر اس کے کانوں کے پیچھے گم ہو گئیں۔

"اونہہ!" اس نے جھٹکے سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"No more Tears" (مزید رونا دھونا نہیں۔) وہ خود سے بولی۔ موبائل بجے جا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر پرس کھول کر موبائل باہر نکالا۔ اسکرین پر سید سلطان بخت کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

"مجھے امید تھی شاہ جی! یہ آپ ہی ہوں گے۔" وہ خواہ مخواہ ہنستے ہوئے بولی اور خود کو بیڈ پر گرا لیا۔ دوسرے پل وہ

الٹی لیٹی ٹانگیں کھڑی کر کے زور زور سے جھلا رہی تھی۔
"نین تارا! یہ کیا ناٹک ہے؟" وہ غصے سے دانت بھینچ کر بولے۔
"کون سا شاہ جی! آپ والا جو آپ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کا۔ ویسے ایکٹر تو آپ کمال کے ہیں' مان گئے بھئی۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنسی۔
"تم ادھر اسلام آباد میں کیا کر رہی ہو' وہ بھی اس گوشت کے پہاڑ کے ساتھ۔ کون تھا وہ۔" وہ دھاڑ کر بولے۔
"آہستہ شاہ جی! میرے کانوں کے پردے بہت نازک ہیں' کوئی انجری وِنجری ہو گئی تو عین ٹائم پر آپ نے تو فرار ہو جانا ہے۔ میں تمام عمر کے لیے بہری ہو جاؤں گی۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہنستی چلی جائے۔
"نین تارا نو جوک۔ میں پوچھ رہا ہوں' تم ادھر کیا کر رہی ہو۔؟" وہ اسی طیش کے عالم میں بولے۔
"جو آپ کر رہے ہیں سر! اپنی طبیعت فریش۔ آب و ہوا کی تبدیلی۔ وہ کیا شعر ہے کسی کا

رستہ بدل کر دیکھیں گے ارادہ بدل کر دیکھیں گے
زود رنج ہے اس شہر کی فضا ہم آب و ہوا بدل کر دیکھیں گے

بس یہی ارادہ تھا آپ کی طرح۔ آئی تھنک۔ یو لائیک اٹ۔"
"میرا خیال ہے تم اپنے حواسوں میں نہیں' تمہارے دماغ میں اس دو ٹکے کی [illegible] نے پھر کوئی کیڑا گھسا دیا ہے جو یہ خرافات بکے جا رہی ہو۔ مت بھولو کہ تم۔۔۔۔ تم۔۔۔۔" وہ اس سے [illegible] کیا کہنے جا رہے تھے' نین تارا کو معلوم تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"مائنڈ یور لینگویج مسٹر شاہ! میری ماں کے بارے میں ایک بھی اور بکواس منہ سے نکالنے سے پہلے سوچ لیں' میں آپ کے خاندان کی باپردہ و پاکیزہ صاحب زادیوں کے اگلے پچھلوں کو کنگال دوں گی' یوں بار بار مجھے میری اوقات یاد دلا کر اپنے گرے ہوئے taste کا احساس مت دلایا کریں۔ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میں کون ہوں اور آپ کس طرح کبھی اس گندر کرتے پڑتے تھے۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"
"نین تارا! میرے ضبط کو مت آزماؤ۔ تم نے ابھی میرا پیار دیکھا ہے' میرے جلال کی ابھی تمہیں خبر نہیں۔"
وہ لہجے کو حتی الامکان خونخوار بنا کر بولے۔
"سب خبر ہے شاہ جی! سب خبر ہے۔ چاہوں تو بھری عدالت میں سارے زمانے کے سامنے آپ کی خبر لے لوں۔ آخر کو آپ کی فرسٹ وائف ہوں۔ اپنے حق کو چیلنج کر سکتی ہوں کہ آپ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں اور یوں بھی طوائفوں کی کون سی عزت ہوتی ہے' بقول آپ جیسے سید زادوں کے' جو اس کی مجھے پروا ہو گی۔ فکر تو آپ اپنی ناموس کی کیجئے جو آپ میرے پاس گروی رکھوا چکے ہیں مسٹر شاہ جی! جس وقت چاہوں یہ جوا کا پتا کھیل کر آپ کو منہ کے بل گرا سکتی ہوں۔ آئندہ مجھ سے سوچ سمجھ کر بات کیجئے گا۔ آپ کو نہ سہی ہمیں تو خیال آتا ہے اپنی سابقہ محبت کا۔ آپ نے نہ سہی' ہم نے تو کبھی آپ سے دل لگایا تھا' پورے خلوص سے' پوری چاہت سے' تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"
نین تارا کا یہ روپ سلطان بخت نے کب دیکھا تھا۔ اس کی باتوں کے دوران انہیں لگا ان کے پیروں کے نیچے کی زمین ہولے ہولے تھرک رہی ہے۔ انہوں نے موبائل ایک کان سے دوسرے کی طرف منتقل کیا۔
"تم حد سے بڑھ رہی ہو اور حد سے بڑھنے والوں سے مجھے نپٹنا آتا ہے' بتا دینا اپنی ماں کو۔" انہوں نے لہجے کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔
"چچ۔۔۔۔ چچ۔۔۔۔ شاہ جی! آپ کو تو دھمکیاں بھی دینا نہیں آتیں۔" وہ کھنک دار آواز میں ہنسی۔ "ایسی بھی کیا بے بسی۔ صالحہ شاہ نے تو آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑا' ورنہ شاہ جی! آپ تو اسی لمحے آگے بڑھ کر میری گردن نہ دبوچ لیتے۔ چچ۔۔۔۔ چچ۔۔۔۔ آپ تو یہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شاہ جی! آپ نے کبھی چڑیا گھر میں شیر دیکھا ہے۔ قوی ہیکل' خوفناک چنگھاڑنے والا۔ دھاڑ ایسی کہ ایک چڑیا گھر تو کیا آس پاس کی عمارتوں کی دیواریں بھی لرز اٹھیں' مگر بے چارہ

ایک چڑیا پکڑ کر منہ میں نہ ڈال سکے۔ آپ کی طرح' چچ۔۔۔۔ چچ۔۔۔۔" وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنسی۔
"او کے شاہ جی! انجوائے یور ہنی مون ٹرپ اور یوں پھیکی پھیکی سی گیدڑ بھبھکیاں دے کر میرے ٹرپ کا مزہ بھی کرکرا نہ کریں۔ ایسا کچھ بھی سوچنے یا کرنے سے پہلے صرف اتنا جان لیں جس طرح آپ کو اپنی زندگی کو بھرپور اور مزے دار بنانے کے لیے ڈال ڈال پھرنے کا پورا حق ہے' اسی طرح کسی اور کو بھی۔ اگر میں آپ سے باز پرس کا حق نہیں رکھتی تو آپ بھی ایسا کوئی حق استعمال کرنے کا نہ سوچیں' ورنہ اس وقت یہ فون کال پہلے میں آپ کو کر رہی ہوتی کیونکہ وفاداری کا اصول پہلے آپ نے توڑا ہے۔ آپ کو اگر چاہنے والوں کی کمی نہیں تو ڈیئر شاہ جی! ہم بھی دنیا کے بازار میں بیٹھے ہیں۔ دو چار قدر دان تو ہمارے بھی ہو سکتے ہیں۔ آخر ایسی بھی شکل و صورت بری نہیں ہماری کہ کوئی نگاہ ہی نہ ڈالے۔ ٹھیک ہے نا شاہ جی؟" وہ کسی بچے کی طرح انہیں سمجھا رہی تھی۔
"نین تارا! ول یو شٹ اپ۔" انہوں نے دانت کچکچائے۔ ایسا بے بس انہوں نے زندگی میں خود کو کبھی محسوس نہ کیا تھا۔
"او کے شاہ جی! اب لاہور جا کر ملیں گے۔ میرا خیال ہے ہم شاید ادھر ایک دو دن اور رکیں گے۔ اگر ملنا چاہیں تو "گل کدے" کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ چاہو کے لیے اگر آئیں گے تو چشم ما روشن دل ماشا۔ اگر دھمکیوں کے لیے تشریف لانا چاہیں گے تو اس کا "علاج" بھی ہو جائے گا اور پلیز' اب مجھے ڈسٹرب نہ کیجیے گا' مجھے اب ریسٹ کرنا ہے۔ رات و فنکشن ہے' مجھے اس میں بھرپور طریقے سے شامل ہونا ہے۔ میں موبائل آف کر رہی ہوں۔ بے شک انگلیاں گھساتے رہیے' بائے۔" ایک خوبصورت ہنسی کی جھنکار کے ساتھ اس نے موبائل آف کر دیا۔
اب پھر وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی [illegible] رہی تھی۔
"شاہ جی! [illegible] اتنا لطف تو آپ کے چھچھورے پیار میں نہیں تھا جتنا مزہ اس رقابت بھری آگ میں ہے۔ کاش [illegible] آپ کے چہرے کے رنگ اس وقت دیکھ سکتی۔ صالحہ شاہ کے پنجرے میں پھڑپھڑاتے ہوئے میرے ہرجائی شوہر۔" وہ اونچی آواز میں خود ہی بولے جا رہی تھی۔
باہر دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔
"یہ کون اسٹوپڈ دروازہ بجا رہا ہے' بجا تا رہے۔" اس نے کمبل کھینچ کر ٹانگوں پر لیا اور کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ اتنا ہنسنے اور خوش ہونے کے باوجود جیسے دل پر ایک بوجھ سا آن گرا تھا۔ وہ پہلو جس میں دل دھڑکتا تھا' یوں جل رہا تھا جیسے وہاں کوئی انگارہ رکھ دیا ہو۔
"شاہ جی! میری سچی محبت کا مذاق اڑا کر آپ نے بہت برا کیا ہے' بہت برا۔" وہ نم آنکھوں کو بھینچے بڑبڑائی۔

☆ ☆ ☆

ڈیڑھ سو روپے کا جو سودا سلف آیا تھا' وہ بمشکل پانچ دن ہی چل سکا تھا۔ آج پھر گھر میں نہ آٹا تھا' نہ دال' نہ کوئی سبزی وغیرہ۔ صوفی صاحب کو رابعہ بی بی نے صبح ہی سارا احوال سنا دیا تھا۔ جب وہ تہجد کی نماز پڑھ کر فجر کے لیے نیچے آنے لگے تھے۔
"ناشتے کے لیے بھی آٹا نہیں۔ سوچتی ہوں' جویریہ کو کیا دوں گی۔" وہ فکرمندی سے کہہ رہی تھیں۔ جب صوفی صاحب خاموشی سے نیچے اتر آئے۔
نماز کے دوران بھی اور نماز کے بعد بھی ان کا ذہن اسی مسئلے میں الجھا رہا تھا۔ یہ دو تین دن کیسے بتائے جائیں' تنخواہ ملنے میں ابھی کم از کم تین دن باقی تھے۔ قرض لینے کی نہ تو کبھی عادت رہی تھی' نہ مانگنے کا طریقہ آتا تھا۔ آج تک اس سے مانگتے آ رہے تھے جو اکثر ہی بن مانگے ان کی جھولی بھر دیا کرتا تھا مگر آج کل نہ جانے کیا ہو رہا تھا یا تو انہیں مانگنے کا ڈھنگ بھول چلا تھا یا اوپر والا ہی ان کی ہر طلب سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ان کا ذہن بے حد پریشان تھا۔ کوئی ایسا مونس و ہمدرد نہیں تھا جس سے حالات کہتے۔ کسی سے کہنے میں یوں بھی غیرت آتی تھی۔ نہ انہیں

یہ گوارا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شکایت بندوں کے آگے کریں۔

اس نے اتنے دن بھی تو اچھے حالوں میں رکھا تھا اب ذرا کٹھن دن آئے تو کیا وہ واویلا مچا دیتے" ہر ایک سے اللہ تعالیٰ کے خلاف گلے شکوے کرتے پھرتے۔ یہ چیز بھی انہیں کسی سے اپنا حال کہنے سے روکتی تھی۔ گاؤں میں تو بڑے شاہ جی بن کے ہی عنایات کا انبار لگا دیا کرتے تھے۔

شہر وہ یوں بھی اٹھ آئے تھے کہ سال دو سال میں عبدالمتین کی اچھی نوکری لگ جائے گی۔ گاؤں دوبارہ نہ بھی لوٹ سکے تو خود کوئی مسجد سنبھال لیں گے اور عبدالمتین کی ذہانت اور اعلا تعلیمی ڈگری کے نتیجے میں ملنے والی نوکری ان کا توانا بازو بن جائے گی۔ شاید نہیں پھر پلٹ کر بڑے شاہ جی کی طرف دیکھنا ہی نہ پڑے مگر وائے نصیب۔ ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا تھا۔ عبدالمتین جو اس دن کالج بھجوا کر گیا اس نے پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔ چند دن پہلے یونہی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کی خبر لینے گئے تھے۔ اس نے کسی اچھی کمپنی میں پارٹ ٹائم نوکری کر رکھی تھی اور صبح میں اسی طرح یونیورسٹی جا کر اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ جی میں آیا جا کر اس سے ملاقات کریں۔ شاید وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو مگر پھر وہی خودداری، انا اور غیرت نے دامن پکڑ لیا۔

"اگر اس نے دیکھ کر بھی نہ دیکھا، جان کر بھی انجان بن گیا تو صوفی عبدالرحمان تمہارے پاس کیا رہ جائے گا۔ بھرم جتنا عرصہ چلتا ہے، قائم رہنے دو۔ کبھی تو اس کا خون جوش مارے گا، کبھی تو پلٹے گا۔"

وہ دل کو سمجھا کر واپس آ گئے۔

مگر اب رات سے پھر اس کی بے اعتنائی کا احساس انہیں کسی بڑے خسارے کا احساس دلائے جا رہا تھا۔

"کیا اس دن کے لیے میں نے اس پر اس قدر محنت کی تھی۔ جی جان سے اس کی پڑھائی کے لیے کوششیں کی تھیں۔ بڑے شاہ جی کی خفگی کی پروا کیے بغیر اسے شہر اعلا تعلیم کے لیے بھیجا تھا۔ اس دن کے لیے، جب یہ پودا تناور درخت بن جائے تو ہم اس کے پھل کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے بھی مجاز نہ ہوں۔" ان کا دل رات سے بے کل تھا۔

"عبدالمبین آیا تھا، دوپہر میں۔ جب آپ نیچے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھا اور پھر چلا گیا کہ خیریت معلوم کرنے آیا تھا، امتحان میں بیٹھے گا اس لیے جا کر پڑھنا ہے۔"

رابعہ بی بی کی یہ اطلاع ان کے شکست خوردہ دل پر بری طرح سے لگی۔ انہوں نے خود عبدالمبین کو آتے اور مسجد کے آگے سے گزر کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے دیکھا تھا۔ وہ مسجد کے صحن میں سامنے ہی تو بیٹھے تھے۔ وہ انہیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ ان کے دل پر گھونسا سا لگا تھا۔ ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ پہلے بھی ایک دن وہ ان کی غیر موجودگی میں آ کر ان سے ملے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے رنگ ڈھنگ عبدالمتین سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔ خیر اور بھلائی کی توقع تو انہیں اس سے کبھی نہ رہی تھی مگر وہ اتنی جلدی پر پرزے نکالے گا اس کی بھی انہیں امید نہ تھی۔

اور کل شام رشتے کرانے والی جس شخص کا رشتہ آمنہ کے لیے لے کر آئی، وہ محکمہ تعلیم میں سینئر کلرک تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا کالا کلوٹا، حبشی نما رنڈوا جو آمنہ کو دیکھنے ماسی کے ساتھ خود چلا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی صوفی صاحب کو جیسے آگ سی لگ گئی۔ انہوں نے ماسی کو تو جو سنائی تھیں، سنائیں۔ اس شخص کی بھی خوب خبر لی۔

"ہم شریف لوگ ہیں۔ یہ دکھاوے اور بردکھاوے ہمارے ہاں نہیں ہوتے۔ ہم کوئی بازار میں دکان سجا کر نہیں بیٹھے جو تم اپنی منحوس شکل لے کر خریدار بنے چلے آئے۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم صوفی عبدالرحمن کی بیٹی کو خود دیکھنے اور پسند کرنے چلے آئے ہو....."

وہ ابھی اتنا ہی بول سکے تھے کہ وہ شخص ان پر ہاتھ اٹھانے لگا۔ وہ تو ماسی نے آگے بڑھ کر اسے دبوچا پھر جو مغلظات اس شخص کے منہ سے نکلیں صوفی صاحب کو لاحول ولا قوۃ بھی بھول گیا۔ ایسی ایسی واہیات گالیاں جو ان کے گمان سے بھی نہ گزری تھیں، وہ مارے شرم اور غصے کے تیز تیز سیڑھیاں چڑھتے اوپر آ گئے۔ نیچے گلی میں لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ تماشا لگ چکا تھا۔ ان کی زندگی کا پہلا تماشا جس نے رات بھر ان کی نیند اڑائے رکھی۔ ان

کا دل چاہ رہا تھا وہ یہاں سے کہیں اور بھاگ جائیں۔ زندگی اس قدر خاردار ہو جائے گی ایسا تو انہوں نے گاؤں سے نکلتے ہوئے پہلے قدم سے لے کر آخری قدم کے دوران ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔

رات کئی بار ان کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا، دل سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں میں وہ کچھ امتیاز نہ کر پا رہے تھے۔ نہ اللہ سے کچھ مانگنے کو دل چاہ رہا تھا، نہ گلہ کرنے کو۔ سوچ کے عجب مرحلے پر وہ کھڑے تھے۔

رات بھر کی کشمکش پھر صبح فاقے کی خوشخبری۔ ان کے اعصاب بری طرح سے چیخ رہے تھے۔ بچے رحلوں پر سپارے رکھے زور زور سے ہلتے ہوئے اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔

"فویل للمصلین الذین۔" چھ سالہ لڑکے عامر کی زبان پر یہ الفاظ ہی نہیں چڑھ رہے تھے۔ وہ کوئی ساتویں بار ان لفظوں کو دہرا رہے تھے اور اس کی زبان ہر بار ہی لڑکھڑا جاتی تھی۔ سانس رستے ہی میں ٹوٹ جاتا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا، بہرے ہو، جس طرح کہہ رہا ہوں ویسے کہو۔ اب نہ بولے صحیح تو تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔" ان کا پارہ بری طرح سے ہائی ہونے لگا۔

لڑکے نے کانپتی آواز میں پھر اسی طرح ٹوٹا پھوٹا کہا ہی تھا کہ صوفی صاحب اپنے آپے میں نہ رہے۔

"الو کے کان کے پٹھے، احمق، خبیث۔ تجھے دو دن سے یہ چار حرف نہیں یاد ہو رہے۔ گھر جا کر کیا برتن دھوتے ہو یا باپ کی ٹانگیں دبانے بیٹھتے ہو۔ کام چور، بدحرام اور مفت ہمارا کھانے آ جاتے ہو۔ کوڑھ مغز، خر دماغ، کھیلنے کودنے کے سارے فن آتے ہیں نامرادوں کو۔ جان کھانے کو ہماری....."

وہ اسے بری طرح سے پیٹتے جا رہے تھے۔ پہلے لمبی سی چھڑی سے جو تھوڑی دیر میں ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری پھر مکوں سے، لاتوں سے، ہاتھوں سے۔ آخر میں انہوں نے اس کی رحل اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ خون کا ایک فوارہ تھا جو اس کے ماتھے سے نکلا تھا۔

"صوفی صاحب... صوفی صاحب... ہوش کریں۔ کیا جان سے مارنا ہے اسے۔"

مسجد کا موذن چلایا۔ جمیل نے انہیں پیچھے سے آ کر کھینچا۔ لڑکا اب نیچے گر چکا تھا۔ خون میں اس کا چہرہ، ہاتھ اور کپڑے لت پت ہوئے جا رہے تھے۔ سارے بچے سپارے رکھ کر خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دو چار تو مارے ڈر کے بھاگ ہی نکلے۔ انہوں نے سیدھا اس لڑکے کے گھر جا کر خبر کر دی۔

وہ ایک کلاتھ مرچنٹ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ ابھی دکان پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، جب اسے اکلوتے لخت جگر کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی وہ ننگے پاؤں دیوانہ وار مسجد کی طرف دوڑا۔ لوگ اس کے بچے کو اٹھا کر ڈسپنسری کی طرف لے جا رہے تھے۔ جمیل صوفی صاحب کو زبردستی چند لمحے پہلے اوپر لے گیا تھا۔ لڑکے کے ماتھے پر گہرا زخم آیا تھا، چار ٹانکے لگے۔

"میں پولیس میں ایف آئی آر لکھواؤں گا۔ مولوی کا بچہ خود کو سمجھتا کیا ہے، بدمعاش ہے کیا اس علاقے کا کہ اس کو کوئی پوچھ نہیں سکتا اور یہ معصوم بچوں کو ذبح کرتا رہے۔ میں اس کو نہیں چھوڑوں گا۔ پولیس کے حوالے کر کے ہی دم لوں گا۔ جلاد کہیں کا۔ پڑھاتا ہے بچوں کو کہ ان کی کھال اتارتا ہے۔ ظالم انسان۔"

"میں جا رہا ہوں تھانے، دیکھتا ہوں، مجھے کون روکتا ہے۔ نہ شام سے پہلے اس کو حوالات میں بند کروایا تو میرا نام نہیں۔" وہ بری طرح سے بپھرا ہوا تھا۔ لوگ اسے زبردستی پکڑ کر کھڑے تھے۔ وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں جی، صحیح کہہ رہا ہے بے چارہ۔ یہ کون سا طریقہ ہے پڑھانے کا، پکڑ کر بچے کو لہولہان کر دیا۔ پہلے بھی اس مولوی کی بہت سی شکایتیں ملی ہیں۔ بچوں کو یہ اسی طرح زدوکوب کرتا ہے۔ اس کا علاج تو ہونا چاہیے۔ علم کیا بچوں کی جان لے کر دیا جاتا ہے۔" محلے کا ایک اور آدمی بولا۔

"بالکل، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ چلو میرے ساتھ تھانے، وہی اس کو پوچھیں گے یہ کون سے طریقے سے پڑھاتا ہے۔" عامر کا باپ فوراً بولا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے مگر شریف آدمی ہے پھر اللہ کا نام لیوا۔ یوں جذباتی ہو کر تھانے جانے کی ضرورت نہیں۔

بس محلے والوں کو عرضی دو اور اس کو ادھر سے چھٹی کراؤ۔ خود ہی عقل ٹھکانے آجائے گی۔ یوں تھانے کچہری میں معاملہ اچھالنے سے اپنی بھی عزت خراب ہوگی اور وقت کی بربادی الگ۔ بہتر طریقہ ہے کہ سب مل کر عرضی لکھتے ہیں اور اس کو ادھر سے فارغ کرتے ہیں۔"

ایک اور سیانے نے آگے بڑھ کر صلاح دی تو یہ رائے سب کے دلوں کو لگی۔ عزت اور وقت ہی تو آج کل سب کی کمزوری ہے۔ سب سر ہلانے لگے۔

صوفی صاحب کپڑے بدل کر بستر پر جا لیٹے۔ گلی کی طرف سے کھلنے والی ادھ کھلی کھڑکی سے لوگوں کی آوازیں صاف آرہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا ان کا دماغ چل گیا ہے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ان کے دماغ میں عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سپاٹ چہرہ لیے وہ بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورے جا رہے تھے۔

رابعہ بی بی دہلیز کے پاس کلیجہ تھام کر کھڑی پریشانی کے عالم میں یک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔ آمنہ، جویریہ اور زینت بھی سہمی ہوئی نظروں سے صحن میں کھڑی باپ کو دیکھ رہی تھیں۔ جلیل چپ چاپ آخری سیڑھی پر سر جھکائے کھڑا تھا۔ "آگے نا معلوم کیا ہونے والا ہے۔" سب کے دلوں میں یہی خدشہ ابھر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم کیا ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ صالحہ صحیح تم سے خفا تھی۔ تمہیں کچھ گھر کی بھی خبر ہے یا نہیں۔ شہرینہ! اب تم بچی تو نہیں ہو۔ تمہاری عمر میں میں نے دو دو حویلیوں کے سارے امور سنبھال رکھے تھے۔ نری کتابیں ہی نہیں چاٹی تھیں اور کتابیں یوں بھی عملی زندگی میں کسی کام نہیں آتیں۔ تم انوکھی پڑھنے والی پیدا ہوئی ہو۔ اپنے اندر شعور پیدا کرو۔ دو چار مہینوں بعد صالحہ مصروف ہو جائے گی تو اس گھر کو کون دیکھے گا۔ کچھ تو احساس پیدا کرو اپنے اندر۔"

وہ جیسے ہی شام ڈھلے اپنے بیڈ روم سے نکل کر آئی، لگتا تھا سیدہ اس کی ہی تاک میں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر جیسے پھٹ ہی پڑی تھیں۔

"پہلے کون اس گھر کو دیکھتا ہے۔ بھابی بیگم اپنا اور اپنے مجازی خدا کا ہی دھیان کرلیں تو بڑی بات ہے۔" وہ چند سیکنڈ میں ہی ان کی ڈانٹ سے سنبھل کر بے خوفی سے بولی۔

"زبان بہت چلنے لگ گئی ہے تمہاری۔ سلطان بخت اس روز صحیح خفا ہوا تھا تم پر۔" سیدہ کو اس کی حاضر جوابی گراں گزری۔

"ہر شخص ہی صحیح خفا ہے میرے بارے میں۔ ایک میں ہی آپ کو غلط نظر آتی ہوں۔ ظاہر ہے میرا کوئی پوچھنے والا جو سر پر موجود نہیں۔"

وہ چیخ کر بولی۔ پہلے ہی ساری دوپہر عبدالمبین کی بات پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی جنگ خود سے لڑ لڑ کر نڈھال ہو چکی تھی اور کمرے سے باہر نکلتے ہی سیدہ کی پھٹکار۔۔۔ اس کی سرخ تھکی تھکی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ سیدہ اس کے یوں چیخنے پر ایک لمحے کو چپ سی رہ گئیں۔

"ہم مر گئے ہیں کیا؟" چند لمحوں بعد وہ شکست خوردہ لہجے میں بولیں۔ شہرینہ نے ایک زخمی نظر ان پر ڈالی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم گھر والوں سے اس قدر بدظن کیوں ہوتی جا رہی ہو؟" وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"اچھا خیر ہے۔ میرے گھر والوں کو میرا علم ہے۔" وہ چیخ کر بولی۔

"تم نے شام کو چائے بھی نہیں پی اور میرا خیال ہے تم نے دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔" وہ موضوع بدل کر نرمی سے بولیں۔

"کالج میں برگر کھا لیا تھا اس لیے دوپہر میں بھوک نہیں لگی۔" وہ ناخن کھرچنے لگی۔

"چلو اب کھانا تیار ہے، تم کہو تو لگواؤں۔ ویسے بھی ساڑھے سات تو ہو چکے ہیں پھر میں عشاء کی نماز پڑھ لوں گی۔"

"لگوا لیں۔" وہ بے دلی سے بولی۔ اس کے سر پر رات بارہ بجے کی تلوار لٹک رہی تھی۔

"میں شاید پرسوں صبح شام تک کے لیے اسلام آباد بھی جاؤں جواد کے ساتھ۔ اس کے ایڈمیشن کے سلسلے میں۔ رات سے پہلے لوٹ آؤں گی۔ تم اس روز کالج سے چھٹی کر لینا۔" ملازم کو کھانے کی ہدایت دے کر وہ بولیں۔

"دیکھوں گی۔" وہ ہنوز بیزار تھی۔

"کیا بات ہے، تم آج کل مجھے بہت بدلی بدلی نظر آرہی ہو جیسے کسی بات نے تمہیں الجھا رکھا ہے۔ کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے کہو۔" وہ اس کے چہرے کو غور سے تکتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اچھا! آپ کو لگتا ہے کہ میں پریشان ہوں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"شہرینہ! تم مجھ سے بات کس طرح کر رہی ہو؟" وہ خفگی سے بولیں۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیدہ فون اٹینڈ کرنے اٹھیں۔ دوسری طرف حسین شاہ تھے۔ وہ کل سے گھر نہیں جا سکی تھیں، اسی بات پر حسین شاہ کا موڈ اچھا خاصا آف تھا پھر حسین شاہ کو منانے اور بات کرنے میں ہی سیدہ کو بیس منٹ لگ گئے۔ ملازمہ اتنی دیر میں ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا چکی تھی۔

"توبہ ہے، میں تو گھن چکر ہی بن گئی ہوں۔ ایک طرف کی خبر نہ لوں تو دوسری طرف کا پلڑا ڈولنے لگتا ہے۔ دوسری طرف جاتی ہوں تو ادھر والے خفا۔ میری تو جان عذاب میں آگئی ہے۔" وہ فون رکھ کر بڑبڑاتی ہوئی ٹیبل تک آگئیں۔ ملازمہ اب گرم گرم روٹیاں لا رہی تھیں۔

"آپ کا اسلام آباد کا پروگرام اچانک کیسے بن گیا۔" جیسے ہی وہ کرسی پر بیٹھیں، شہرینہ کہنے لگی۔ سیدہ نے کچھ چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ بنا تو اچانک ہی ہے، وہی تو میں ابھی حسین شاہ سے بھی اجازت لے رہی تھی۔ جانا بھی ضروری ہے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکالنے لگیں۔

"جواد کے ایڈمیشن کو تو ابھی وقت ہے پھر وہ تو لالہ بھی کروا سکتے ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں ادھر، پھر آپ کیوں جا رہی ہیں؟" وہ پلیٹ میں چاول نکال رہی تھی۔

"کام ہے مجھے وہاں بہت ضروری۔" وہ منہ میں بڑبڑائیں۔ شہرینہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"ایسا کیا کام؟" وہ حیرت سے بولی۔

سیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں تو شہرینہ بھی کندھے اچکا کر چاول کھانے لگی پھر باقی کا کھانا دونوں نے خاموشی ہی سے کھایا۔

کھانا ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی کہ سیدہ بول اٹھیں۔

"ویسے تمہیں گلہ رہتا ہے کہ کوئی تمہارا خیال نہیں رکھتا اور تم خود ہر وقت اپنے حجرے میں گھسی رہتی ہو۔ میں اگر چند دنوں کے لیے آئی ہوں تو تمہیں کم از کم مجھے کمپنی دینے کے خیال ہی سے پاس آکر بیٹھنا چاہیے۔"

"مجھے پڑھنا ہے، میرا ٹیسٹ ہے کل۔" وہ جانے کو مڑی۔

"اچھی بات ہے۔ جتنا پڑھنا ہے، پڑھ لو۔ مجھے اب سلطان بخت کی بات پر غور کرنا چاہیے، یہی مناسب بھی ہے۔" وہ جیسے خود سے کہہ رہی تھیں۔

"کیا مطلب؟" شہرینہ جیسے تڑپ کر مڑی۔

"کچھ نہیں، جاؤ تم۔" وہ رکھائی سے بولیں۔ "اور جو پڑھنے لکھنے سے فرصت مل جائے تو گھرداری بھی سیکھ لو۔ آگے جا کر یہی سلیقہ کام آتا ہے۔ نری قلم دوات نہیں۔"

"ہونہہ!" وہ ناک چڑھا کر باہر نکل آئی۔
کچھ دیر باہر لان میں ٹہلتی رہی۔
"یہ آپا جان کو بھی مجھ سے خوامخواہ کا عناد ہو چلا ہے' ہر وقت میرے خلاف ہی چڑھی رہتی ہیں جیسے لالہ کی نظریں بدلی ہیں ان کی سوچیں بھی بدل گئی ہیں۔ نہ کسی کو میرا خیال نہ دھیان مگر طعنے تشنے سب کو یاد ہیں۔" وہ ٹہلتے ہوئے سوچتی رہی اور کڑھتی رہی۔
کمرے میں آکر بھی اس کا ذہن یکسو نہیں ہو پا رہا تھا۔ کتابیں اٹھائیں' کھولیں اور پھر بند کر کے رکھ دیں۔
"آخر وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔" وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔
"اتنا تو تمہیں معلوم ہے' وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔" کوئی کھٹاک سے اس کے اندر سے بولا۔
"پیار محبت' عشق عاشقی' سب کتابی افسانے ہیں اور اس گھر کا ماحول' آپا اور لالہ پہلے ہی میرے دشمن بنے ہوئے ہیں' یہ فضول کی عاشقی کر کے میں اپنی جان گنوا دوں۔" وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
"مگر اس سے پیچھا کس طرح چھڑایا جائے اور آج کی دھمکی........ وہ کمرے میں آ گیا تو۔۔۔؟" اسے جھرجھری سی آ گئی۔
کافی دیر وہ سوچتی رہی مگر کوئی حل اسے اس مسئلے کا نہیں سوجھا۔ اس نے گھڑی پر نگاہ کی تو نج چکے تھے۔
"تین گھنٹے بعد۔" وہ بیڈ پر جا بیٹھی۔ "میں سو جاتی ہوں کھڑکی بند ہے' آئے گا کدھر سے۔ خود ہی دفع ہو جائے گا۔" اس نے سوچا اور فوراً ہی عمل کر ڈالا۔ اٹھ کر مین لائٹ آف کی' زیرو کا بلب آن کیا اور بیڈ پر کمبل اوڑھ کر چت لیٹ گئی۔ آنکھیں بھی بند کر لیں کافی دیر گزر گئی۔ مسلسل آنکھیں بند کرنے کے باوجود نیند کا ذرا سا جھونکا بھی پاس نہ بھٹکا۔
"کیا مصیبت ہے؟" مسلسل کروٹیں لے لے کر اس کے پہلو دکھنے لگے تھے۔
"اس طرح بھلا نیند آئے گی۔" وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی۔
"آج مجھے جا کر اس سے دو ٹوک بات کرنی ہی پڑے گی' یوں روز ڈر ڈر کر اپنی جان ہلکان کرنے سے فائدہ۔ آپا جان تو اب نماز اور وظیفے کے بعد سو بھی چکی ہوں گی۔ بس چند منٹ کے لیے جاؤں گی اور اس کا دماغ درست کر کے آ جاؤں گی۔" اس نے دل میں سوچا اور فیصلہ کر لیا۔ اٹھ کر مین لائٹ جلائی اور کتابیں اٹھا کر پڑھنے لگی۔
ٹائم بھی بے حد سست روی سے گزر رہا تھا۔
آخر خدا خدا کر کے بارہ بجے تھے' وہ بے چینی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
"میں بھلا اس سے کیا کہوں گی۔" وہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگی جو سرد ہو رہی تھیں۔ اسی وقت کھڑکی کی بیرونی چوکھٹ سے کوئی پتھر آ کر ٹکرایا تھا وہ اچھل ہی پڑی۔
"وہ آ چکا ہے' نیچے۔ اگر میرے کمرے میں آ گیا تو لالہ بھی نہیں' جن کا ڈر ہو گا اسے۔" اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پیشانی پر پسینہ سا آنے لگا۔
چند منٹ بعد دوسرا پتھر آیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑکی کھولنے کے لیے بڑھے' دوسرے لمحے اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔
ساڑھے بارہ بجے تیسرا پتھر گرا تھا۔
"چوتھے کا انتظار نہ کرنا۔"
عبدالمبین کی آواز شہرینہ کے کانوں میں گونجی' اس نے فیصلہ کن انداز میں الماری کھولی اپنی سیاہ چادر نکال کر اپنا جسم اس میں اچھی طرح سے چھپایا' چہرہ' اور ماتھا نقاب سے ڈھانپ کر اس نے کمرے کی لائٹ آف کی اور دھک دھک کرتے دل کو سنبھال کر اس نے دروازہ کھولا' سلیپر پیروں میں ڈالے کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کیا اور باہر نکل آئی۔ کاریڈور اور سیڑھیوں میں مکمل خاموشی تھی' وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی' آپا کے کمرے کی لائٹ

آف تھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سب دروازے بند تھے وہ آہستگی سے قدم اٹھاتی ہوئی گھر کے پچھلی جانب چلی آئی۔ پچھلا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے آہستگی سے چٹخنی گرائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔
باہر اچھی خاصی خنکی تھی' سردی کی تیز لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر باہر کے لان میں جلتی تین لائٹوں میں سے دو بند کر دیں۔ لان خاصا بڑا تھا۔ اس نے سامنے قبرستان کی ٹوٹی دیوار کو دیکھا' اسے عبدالمبین نظر نہیں آیا۔
"جاؤں کہ نہ جاؤں۔" وہ پھر تذبذب میں پڑ گئی اس وقت ٹوٹی منڈیر پر ریڈ لائٹ جلتی بجھتی نظر آنے لگی۔
"آج آر یا پار ہو ہی جائے۔" اس نے دو ٹوک انداز میں قدم بڑھائے اور تیز تیز چلتی لان عبور کر گئی۔ جیسے ہی وہ دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح چھلانگ مار کر اس کی طرف آ گیا۔
"تھینک یو۔ تھینک یو۔ مجھے یقین تھا۔ تم ضرور آؤ گی۔" اس کا چہرہ لان کی دور سے آتی مدھم روشنی میں بھی مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔
"بکواس بند کرو' یہ بتاؤ مجھے ادھر کس لیے بلایا ہے۔" وہ غصے سے غرائی۔ "تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔"
"اب اس بات کا وقت گزر گیا ہے کہ میں اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہا۔ اپنے حق میں بہت برا تو میں نے اسی روز کر لیا تھا جس روز تم سے جی لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔
"تم نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے۔" وہ چبا چبا کر بولی۔
"تمہیں معلوم ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
وہ آنکھیں چرا گئی۔ "مجھے نہیں معلوم۔"
وہ خاموشی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔
"دیکھو تم آخر میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو' مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" وہ جیسے تھک کر بولی۔
"یہ تو مجھے نہیں پتا کہ کوئی کسی کے پیچھے کیوں پڑتا ہے' اور میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔ یہ تو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ شہرینہ آئی لو یو اور مجھے تمہاری محبت چاہیے جواب میں۔" وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔
"اور میں نے تمہیں اس روز بھی کہا تھا کہ فلمیں کم دیکھا کرو۔" وہ طنز سے بولی۔
"جب سے تمہیں دیکھا ہے اور کچھ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ اسی رومانٹک لہجے میں بولا۔
"میں اب جاؤں؟" وہ جیسے اکتا کر بولی۔
"ہے بھی اور چل بھی دیے حسن والوں کی یہ ادا نرالی ہے۔" وہ گنگنایا۔
"پلیز..." وہ کچھ عاجزی سے ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "مجھ سے اس وقت یہ بھونڈی شاعری مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت ٹینشن میں ہوں۔"
"شہرینہ! تم کیوں ٹینشن ہو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں تم میرے لیے اس دنیا میں پہلی اور آخری ہستی ہو' جس کے لیے میں ہر انتہا سے گزر سکتا ہوں' اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔ یہ احساس تو انسان کو خوشی اور فخر میں مبتلا کر دیتا ہے کہ کوئی اسے اس قدر چاہتا ہے نہ کہ ٹینشن اور اذیت میں...." وہ دیوار سے ہٹ کر دو قدم اس کے پاس آ کر بڑی محبت سے بولا۔
"مجھے تمہاری ان فضول باتوں سے کچھ بھی مطلب نہیں۔"
"مجھ سے بھی نہیں؟"
"نہیں...!"
"میری محبت سے بھی نہیں؟"
"نہیں..."
"تو پھر تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"تم سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔" وہ توقف سے بولی۔

"وہ تو تم اپنے کمرے میں' اپنے گھر کے اندر رہ کر بھی چھڑا سکتی تھیں۔ اصل میں تم مجھ سے نہیں ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے آئی ہو جو مسلسل مجھے سوچتی ہیں۔"

اس نے کتنی صحیح بات کی تھی۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ اس سے ذرا پرے کھسک کر بولی۔

"مگر افسوس..." وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"تم... اب کچھ بھی کر لو' کہیں سے بھی اس دردِ دل کا علاج کرا لو۔ افاقہ نہیں ہو گا۔ تم جی جان سے چاہو گی تو بھی میری سوچوں سے پیچھا نہیں چھڑا پاؤ گی۔ کیونکہ گہری محبت اثر رکھتی ہے' یہ اتنی آہستگی سے' اتنی سبک روی سے انسان کے دل کے اندر' اس کے دماغ کے اندر' اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کے اندر' اس طرح سرایت کرتی ہے کہ پھر اس سے چھٹکارے کا مطلب اپنی جان سے چھٹکارا پانا ہے۔ محبت سے پیچھا چھڑانے کا ابھی کوئی نسخہ اس دنیا میں دریافت نہیں ہوا۔ شہرینہ! میں تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہوں۔ تمہارے دل کے اندر' تمہارے دماغ کے اندر رینگتی ہر سوچ کے اندر میں ہوں' مجھ سے کیسے پیچھا چھڑاؤ گی؟"

اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر اس کا سرد ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ شہرینہ کا پورا جسم جیسے کسی جلتے لاوے میں جا گرا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ عبدالمبین نے مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"میرا نام عبدالمبین ہے' صوفی عبدالرحمن کا بیٹا۔ لوئر مڈل کلاس سے میرا تعلق ہے۔ دینی تعلیم ادھوری' دنیاوی تعلیم نامکمل' نہ کوئی نوکری' کاروبار' نہ روزگار' شکل و صورت بھی ایسی کہ کسی زمانے میں تم اس پر مرمٹنے کو تیار ہو گی۔ ان سب باتوں کے باوجود میرے دل نے چاند کو پانے کی تمنا کی ہے۔ کیونکہ دل تو دیواری کے تقاضوں کو نہیں جانتا' نہیں مانتا۔" وہ آہستگی سے پھر پیچھے دیوار سے جا لگا تھا۔ شہرینہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"تم اب جاؤ کل پھر اسی وقت آنا' اس کے بعد میں تمہیں پورا ایک ماہ نہیں ملوں گا۔ نہ ملنے کی کوشش کروں گا' اس ایک ماہ کے دوران تم اپنے دل میں خوب سوچنا' میرے بارے میں۔ اگر تمہارا دل تمہیں مجبور کرے تو ایک ماہ بعد ٹھیک اسی جگہ' اسی وقت آ جانا۔ میں تمہارا شدت سے انتظار کروں گا۔ اب تم جاؤ مگر کل ضرور آنا۔ خدا حافظ۔" شہرینہ کے ساکت جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اسے جیسے کسی نے ہپنا ٹائز کر دیا تھا۔

"سنو' ایک درخواست ہے' کمرے کی کھڑکی کھلی رکھا کرو۔"

وہ پیچھے سے بولا تھا۔ وہ کسی ٹرانس کے زیرِ اثر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لان عبور کر گئی۔ عبدالمبین اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر شہرینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا' ٹوٹی دیوار ویران تھی۔ وہ شاید جا چکا تھا۔

وہ تیزی سے مڑی' دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی سیڑھیوں تک آ گئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اپنا نقاب اور چادر اتار دی۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی' دروازہ اندر سے لاک کیا اور تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی' بڑی احتیاط سے کھڑکی کھولی' ٹوٹی ہوئی منڈیر کے اس طرف دیکھا اسے سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ دونوں لائٹیں آن کرنا وہ بھول گئی تھی۔ لان میں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔

❊ ❊ ❊

سیفی کو واش روم میں گھسے آدھ گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ رعنا اس کے کمرے کے دو چکر لگا چکی تھیں مگر وہ ابھی تک نہا کر نہیں نکلا تھا۔ انہیں کوفت ہونے لگی۔

"اُفوہ یہ لڑکا نجانے اندر کیا کر رہا ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ پارٹی مسز باقری کی ہے' ٹائم کے بارے میں جس قدر خبطی وہ ہیں شاید ہی کوئی اور ہو گا۔ اور مصیبت میری گاڑی بھی آج ہی خراب ہونی تھی۔ جو میں اس لڑکے سے ڈراپ کرنے کا کہہ بیٹھی' اس سے تو اچھا تھا کہ ٹیکسی سے ہی چلی جاتی۔"

وہ جھنجھلا کر اس کے کمرے میں ٹہلے جا رہی تھیں۔

"نو بج چکے ہیں' پارٹی اسٹارٹ ہو چکی ہو گی۔ پھر سب کی باتیں سنو۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"اب یہ نہا کر نکلے گا اور پورا گھنٹہ کپڑوں کی سلیکشن میں لگائے گا۔ میں خود ہی اس کے کپڑے نکال دیتی ہوں۔" انہیں ایک دم سے خیال آیا آگے بڑھ کر وارڈ روب کا دروازہ کھولا اس میں بس چھ سوٹ ہی لٹکے ہوئے تھے۔ باقی کپڑوں کا ڈھیر بغیر استری کے پڑا تھا۔ رعنا نے دوسرا دروازہ کھولا۔ سامنے لٹکا ہوا بلیک اور لائٹ اورنج سوٹ انہیں اچھا لگا۔ انہوں نے وہی نکال لیا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" ہینگر بیڈ پر رکھا "موزے بھی نکال دیتی ہوں۔" وہ الماری میں ڈھونڈنے لگیں۔ وارڈ روب کے اندر بنی چھوٹی سی علیحدہ الماری کا پٹ انہوں نے کھولا۔ الماری کا لاک کھلا تھا۔

دوسرا لمحہ انہیں اپنی جگہ منجمد کرنے کو کافی تھا۔

اوپر نیچے دونوں ریک وائن کی عمدہ ورائٹی سے سجے ہوئے تھے۔ لمبی صراحی دار گردن والی ہری' میرون رنگین آب والی بوتلیں ان کی نگاہوں کے سامنے تنی کھڑی تھیں۔

"یہ... یہ سیفی کے کمرے میں..." وہ سکتے میں کھڑی تھیں۔

"تو یہ اس حد تک جا چکا ہے۔" رعنا نے بے جان ہاتھوں سے پٹ بند کیا اور وارڈ روب آہستگی سے بند کر کے مردہ قدموں سے باہر نکل آئیں۔ باہر آ کر رعنا نے مسز باقر سے پارٹی میں آنے سے معذرت کر لی۔

"میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ بی پی لو ہو گیا ہے۔ آ نہیں سکوں گی۔" وہ جملے معذرت کے کہے اور چپ چاپ آ کر کمرے میں بیٹھ گئیں۔

"اسی لیے' اسی لیے میں آپ سے کہتی ہوں واپس چلتے ہیں۔ یہ لڑکا میرے بس سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ جس کا ڈر تھا مجھے آج وہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔" رات ساڑھے گیارہ بجے ڈنر کے بعد جیسے ہی فخر حیات بیڈ روم میں داخل ہوئے وہ برس پڑیں۔

"کیا ہوا؟ کیا ہو گیا بھئی؟" وہ لاپروائی سے اپنے بال برش کرتے ہوئے بولے۔ نظریں آئینے میں رعنا کے ہوائیاں اڑتے چہرے پر تھیں۔

"اس کے کمرے میں گئی تھی میں شام کو۔ پوری کیبنٹ وائن سے بھری پڑی تھی۔ اسٹڈیز میں وہ بالکل ویک ہو چکا ہے۔ رات کو دو تین بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹتا۔ مزید اور کیا ہو جانے کے منتظر ہیں؟"

"ریلیکس' ریلیکس مائی ڈیر وائف! تم یوں ٹینس کیوں ہو رہی ہو' بیٹھو' ادھر۔" انہوں نے رعنا کو کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور پھر خود بھی اس کے برابر آ بیٹھے۔

"تم... تم جن باتوں پر حواس باختہ ہو رہی ہو۔ مجھے ان کی خبر آج سے چھ ماہ پہلے سے ہے۔"

"کیا...؟" رعنا کو ایک اور کرنٹ لگا۔ "آپ کو خبر تھی تو آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا؟"

"تو تم کیا کر لیتیں؟" وہ مطمئن لہجے میں بولے۔ "اب کیا کر پا رہی ہو۔"

"فخر!" وہ بے بس سی ہو کر بولی۔ "اٹس ویری سیریس۔"

"معلوم ہے مجھے' تمہیں پتا ہے پچھلے سمسٹر میں سیفی بری طرح سے فیل ہو چکا ہے۔ کالج سے اس کا نام کٹتے کٹتے بچا ہے۔"

"اوہ نو!" وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"تم رعنا! عجیب ہو' کبھی کسی مسئلے کے پیچھے شدت سے پڑتی ہو اور کبھی اس کو بالکل فراموش کر دیتی ہو۔ سیفی کی

اسٹڈیز کے بارے میں گزشتہ سال سوا سال سے تم نے بالکل بے نیازی اختیار کر رکھی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے' اصل میں وہ تمہیں غلط سلط پروگریس رپورٹس اور جھوٹی تسلیوں سے بہلاتا رہا ہے۔ میں دوبار اس کے کالج گیا ہوں۔ اس کے اپنے کسی کلاس فیلو سے زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ پچھلے ماہ اپنی ایک گرل فرینڈ کی خاطر۔ یہاں کے بدنام نائٹ کلب کا وہ گزشتہ چھ ماہ سے باقاعدہ رکن ہے۔ یہاں کی کون سی بار یا پب ہے جہاں وہ باقاعدگی سے آتا جاتا نہیں۔" فخر حیات تلخی سے کہہ رہے تھے۔

"او مائی گاڈ فخر! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" رعنا کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

"دو تین گرل فرینڈز ہیں اس کی خاص' ایک فلیٹ بھی رینٹ پر لے رکھا ہے۔ سیفی کے بارے میں میں پچھلے تین ماہ سے اس قدر پریشان ہوں۔ تمہیں کیا بتاؤں' مجھے لگتا تھا میرا برین ہیمبرج ہو جائے گا اس لڑکے کے ہاتھوں" وہ پریشانی سے بتا رہے تھے۔

"تو..." رعنا کے چہرے کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔

"تو اب واپس چلنا ہے۔ اگرچہ اب بچا کیا ہے۔ مگر پھر بھی بہت کچھ تباہ ہونے سے رہ گیا ہے۔ شاید اللہ اسی میں کوئی بہتری کر دے۔ اس کو سنوارنے کی کوئی راہ نکل آئے' جس کی امید بھی کم ہی ہے۔"

"اس کا گریجویشن؟"

"ان تمام حالات کو سننے کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ یہ گریجویشن کر پائے گا؟"

"اور آپ کا ادھر کا سارا اسیٹ اپ بزنس' فرم وہ سب..." رعنا الجھ کر بولی تھیں۔

"وہ سب میں نے سوچ لیا ہے۔ یہاں سے سب کچھ سمیٹنا اتنی جلدی ممکن تو نہیں' مگر جتنا کچھ ہو سکا' وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ فرم ابھی ادھر ہی رہے گی۔ پاکستان میں' میں نے فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ زمین خریدی جا چکی ہے' نقشہ بھی تیار ہے' بلکہ ابتدائی کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ فیکٹری میں سفیان کے نام ہی سے لگا رہا ہوں اور اسی کے حوالے کروں گا۔ اب اگر اس نے پڑھنا ہو تو ادھر جا کر پڑھ لے گا ورنہ فیکٹری سنبھال لے گا۔ اکثر بگڑے ہوئے امیرزادے ذمہ داریاں پڑنے پر سنبھل جایا کرتے ہیں۔"

"پتا نہیں۔" رعنا بے حد مایوس تھیں۔

"دیکھو جہاں تک ہم سے بن پڑا ہم اسے سدھارنے کی پوری کوشش کریں گے' آگے جو اللہ کو منظور۔" انہوں نے تکیہ سیدھا کیا۔

"کب تک جانا ہو گا؟"

"دو تین ماہ تو لگ جائیں گے۔"

"اگر وہ جانے کے لیے نہ مانا تو؟" رعنا کو ایک نیا خدشہ لاحق ہوا۔

"ہاں اس کا امکان تھا مگر میں نے اس سے بات کر لی ہے کہ وہ فرم کے سلسلے میں ادھر آتا جاتا رہے گا۔ دوسرے فیکٹری اس کے نام ہو گی' سارا بزنس ایک طرح سے اس نے سنبھالنا ہے۔ میں اپنا عمل دخل کم کر رہا ہوں۔ اس بات پر وہ بخوشی راضی ہو گیا ہے' تمہیں معلوم ہے نا پیسے کی محبت تو اس کے خون میں شامل ہے۔"

ان کا لہجہ ایک بار پھر تلخ ہو گیا تھا۔ چہرہ بالکل سپاٹ۔

"آپ اس طرح اجنبی بن کر کیوں کہہ رہے ہیں؟" رعنا کو دکھ سا ہوا۔ "نوجوانی میں سبھی اس طرح کے کام کیا ہی کرتے ہیں۔"

"اسی لیے تو اس کی بہتری کی خاطر اپنا بزنس' اپنا سیٹ اپ داؤ پر لگا رہا ہوں۔ پھر بھی تمہیں گلہ ہے کہ میں اجنبی بن رہا ہوں۔" فخر حیات نے بیڈ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ ان کی نظریں چھت پر تھیں۔

"فخر! ہم نے اپنے بیٹے کے بارے میں ایسا تو نہیں سوچا تھا۔" رعنا کھو سی گئیں۔

"ایسا کب ہوتا ہے۔ جیسے ہم چاہتے ہیں ڈیئر۔" فخر حیات کا لہجہ بھیگا بھیگا سا تھا۔

"آپ اللہ سے اچھی امید رکھیں۔"

"اسی امید پر تو سب کچھ کر رہا ہوں۔" وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "تم بہرحال اپنی تیاری رکھو' ہو سکتا ہے ہمیں کچھ جلدی جانا پڑ جائے۔ جب جانا ہی ٹھہرا تو پھر۔"

"فخر اب تو کوئی پریشانی نہیں ہے نا' کم از کم بزنس کے حوالے سے..." رعنا نے کہا۔

"نہیں وہ سب تو..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ "سو جاؤ اب تم بھی' مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

"سیفی ابھی تک نہیں آیا۔" وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھیں۔

"وہ دو تین گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا۔ ابھی تو ادھر رات جوان ہوئی ہے۔ تم اب فضول کی فکر چھوڑو' لائٹ آف کرو اور مجھے بھی سونے دو۔" انہوں نے کروٹ لے لی تو رعنا نے بھی لائٹ آف کر دی۔

❁ ❁ ❁

"ام جان! مجھے چھ ماہ کے لیے ہارڈ ایریا میں بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں سے آتے ہی پروموشن مل جائے گی۔ میرے ٹیسٹ بھی آپ کی دعاؤں سے بہت اچھے ہوئے ہیں۔" کیپٹن شہباز فون پر مسز خان کو خوشی خوشی بتا رہے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! اللہ تمہیں بہت ترقی دے۔ ہارڈ ایریا میں تمہیں کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ یا تم نے خود اپلائی کیا ہے؟"

"ام جان! ضروری ہوتا ہے اس ٹیسٹ کے بعد ادھر جانا۔ مجھے کیا ضرورت تھی خود سے جانے کی۔"

"جانے سے پہلے تمہیں چھٹی تو ملے گی؟" انہوں نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں..." حالانکہ انہیں ایک ہفتے کی چھٹی مل چکی تھی۔ جو انہوں نے اسلام آباد میں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

"تو ہاں سے مل کر نہیں جاؤ گے؟" انہوں نے آخری حربہ آزمایا۔

"دل تو بہت زیادہ چاہ رہا تھا ام جان! لیکن میں کوشش کروں گا اگر ایک آدھ دن کے لیے آ سکا تو..." لہجہ کچھ شرمسار سا تھا۔

"معاذ ٹھیک ہے نا؟ اس کی اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟"

"نزہت کا نہیں پوچھو گے؟ اسے آج کل تمہارے پوچھے جانے کی کس قدر ضرورت ہے۔" انہوں نے شہباز کو احساس دلانا چاہا۔

"وہ آپ کے پاس ہے ام جان! اور مجھے معلوم ہے آپ اچھا خیال رکھتی ہیں۔"

"شہباز! یہ روش درست نہیں۔ ان رشتوں میں یہ گومگو رویے اچھے نہیں لگتے۔ جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہتے کیوں نہیں ہو' کیوں اس غریب کی جان کو بھی سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ اور جو میری اذیت ہے۔"

"آپ کو کیا خبر ام جان! میں تو فیصلہ کر چکا تھا۔ پیپرز بھی تیار کروا لیے تھے' بس سائن کرنے تھے اور آپ کو پوسٹ کرنے سے پہلے فون کر بیٹھا۔ آپ نے خوشخبری ہی سنا ڈالی اور مجھے پیپرز پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈالنے پڑے۔ ورنہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے ہی فیصلہ آپ کو مل چکا ہوتا۔" وہ دل میں سوچ کر رہ گئے۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" خاموشی کے لمبے وقفے پر ام جان نے کہا۔

"معاذ کے تو اب ایگزام ہونے والے ہوں گے ایتول۔"

"ہاں پڑھ رہا ہے۔ میڈیکل تو اس کا کریز ہے۔ آج کل ادھر عالیہ نے ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ کل اس کی ڈائمنڈ رنگ گم ہو گئی ہے۔ سارا گھر اس نے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ تم فون کر کے پوچھ لینا بھائی سے۔"

"ان کا تو کام ہی یہی ہے' کوئی نہ کوئی فساد ڈالے رکھنا۔"

"اسی لیے تو دونوں کو علیحدہ کر دیا تھا کہ یہ روز کی چخ چخ مجھے بہت تکلیف دیتی تھی تم مجھے آنے کا..."

"ام جان! ایک بہت ضروری بات ہے۔" عالیہ اور اظہر اکٹھے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں فون پر بات

کرتے دیکھ کر بھی نظر انداز کرتے ہوئے عالیہ نے اونچی آواز میں کہا۔ مسز خان نے ماتھے پر بل ڈال کر اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

"اوکے شہباز بیٹا! تم رات میں فون کرنا یا ذرا ٹھہر کر۔ میں عالیہ اور اظہر کی بات سن لوں اللہ حافظ۔" انہوں نے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"ہاں کہو' ویسے میرا خیال ہے کسی سے بات کرنے کے کچھ مینرز ہوتے ہیں بہو بیگم!" وہ ناگواری چھپا نہ سکیں۔

"ام جان! جب کسی کی کوئی قیمتی چیز گم ہو جائے تو اسے یوں جتا جتا کر مینرز نہیں بتائے جاتے کہ صدمے سے نڈھال وہ کوئی گستاخی کر بیٹھے۔" عالیہ فوراً بدتمیزی سے بولی۔

"کہو کیا بات ہے؟" انہوں نے فون اٹھا کر سائیڈ ٹیبل رکھ دیا۔

"میرے جیولر کا فون آیا تھا' ابھی اس کے پاس میری وہی رنگ کوئی لڑکا فروخت کرنے آیا ہے۔ جیولر میری رنگ پہچان گیا تھا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو میں نے یہ سب اس سے بنوایا تھا۔ جیولر کے شک کرنے پر وہ لڑکا تو بھاگ گیا مگر جیولر نے اس کا جو حلیہ بتایا ہے۔ اس سے ہمیں پتا چل گیا ہے" وہ جلدی جلدی بتانے لگی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ چور کا پتا چل گیا۔ تمہارا صدمہ تو رفع ہو گا۔"

"مگر یہ اچھی بات نہیں ام جان! کہ چور گھر کا فرد ہے۔" اظہر نے غصے سے کہا۔

"کیا مطلب؟" مسز خان نے تیوری پر بل ڈالے۔

"جیولر نے جو حلیہ بتایا ہے' وہ بالکل..." اظہر ذرا رکا' ماں کا چہرہ دیکھا۔ "وہ معاذ کا حلیہ ہے اور ہم اسے لینے آئے ہیں۔ جیولر کی دکان تک لے جانے کے لیے۔"

"تمہارا دماغ تو درست ہے نا۔ بولنے سے پہلے سوچ تو لینا تھا۔"

"ام جان! دماغ تو پتا نہیں کس کا خراب ہے۔ جو ایک انجان غیر لڑکے کو یوں اٹھا کر گھر میں بسا لیا ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا' یہ سب درست نہیں۔ نتیجہ دیکھ لیا نا۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بک بک کا؟" وہ غصے سے بولیں۔

"ثبوت کے لیے ہی تو اسے لے جانا چاہ رہے ہیں اور اگر آپ کو بھی اس پر یقین ہے تو اسے ہمارے ساتھ جانے دیں۔ ہم معاذ کو نہیں بتائیں گے۔ بس جیولر کی دکان پر لے جا کر پہچان ہی تو کروانی ہے۔ اس بات پر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ دیکھیں ام جان! آج چھوٹا نقصان ہوا ہے' کل کو بڑا بھی ہو سکتا ہے۔ بہتر نہیں کہ آج ہی معاملے کو گرفت میں لے لیا جائے۔"

"اظہر! مجھے بہت افسوس ہے۔ بیوی کی عقل کے پیچھے چلتے چلتے تمہیں انسانوں کی بھی پہچان نہیں رہی ہے۔" وہ افسوس بھرے لہجے میں بولیں۔ "معاذ... معاذ بیٹا! ادھر آؤ۔" انہوں نے منہ اونچا کر کے دروازے کی طرف آواز لگائی۔ چند سیکنڈ میں ہی معاذ دروازے پر نمودار ہوا۔

"جی ام جان!"

"معاذ بیٹا! تم اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ ذرا جاؤ' انہیں جیولر کی دکان تک جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے ام جان!" وہ سر ہلا کر ان دونوں کے ساتھ چل پڑا۔

انہیں گئے جب آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہونے لگا تو مسز خان کو پچھتاوا سا ہوا۔

"مجھے معاذ کو ان دونوں کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ وہ کبھی اس کا اچھا نہیں سوچیں گے۔ وہ تو شروع ہی سے اس کے یہاں رہنے کے خلاف تھے اور میں نے بے وقوفی میں اس کو ان کے ساتھ کر دیا۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف ان کے حسبِ توقع اظہر ہی تھا۔

"ام جان! ہم سچ کہتے تھے نا کہ یہ لڑکا اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ جیولر نے اسے پہچان لیا ہے اور......"

"اظہر! اسے گھر واپس لے کر آؤ' میں خود اس سے معلوم کروں گی۔" ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔ وہ جیسے چیخ کر بولیں۔

"ام جان! میں اس چور کو اب گھر واپس نہیں لا سکتا۔ ہاں حوالات ضرور پہنچا سکتا ہوں اور اب اسے ادھر پہنچا کر ہی آؤں گا۔ میں ایک چور پر مزید اعتبار نہیں کر سکتا کہ اسے اپنے گھر لا کر کوئی اور نقصان اٹھاؤں۔ ہم کچھ دیر تک آئیں گے اور......"

"اظہر! میں کہہ رہی ہوں کہ اسے گھر لے آؤ۔ میں خود سارا معاملہ دیکھوں گی۔ تم اس طرح کرنے کے مجاز نہیں ہو۔ اسے......"

"ام جان! میں آپ کے بعد ہی سہی' اس گھر کا کچھ لگتا ہوں۔ کچھ فیصلے کرنے کا اختیار بہرحال مجھے بھی ہونا چاہیے۔ ایک احمقانہ قدم شہباز نے اٹھایا۔ آپ نے فوراً اس کی تائید کر دی۔ ایسے ہزاروں لڑکے فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی انہیں اٹھا کر یوں اپنے گھروں میں نہیں لے آتا۔ میں اسے تھانے لے کر جا رہا ہوں' خدا حافظ۔"

اظہر نے مزید ان کی بات سنے بغیر بڑی بدلحاظی سے فون کھٹاک سے بند کر دیا اور جیسا اس کا موڈ لگ رہا تھا' اس نے ان کی بات ماننی یا سننی نہیں تھی۔ مسز خان نے بے بسی سے فون کو دیکھا۔

"اس کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔ "ہماری ہمدردی اسے مہنگی پڑی۔ یہ اظہر احمق..." "نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"نزہت... نزہت..." ذہنی خلفشار نے ایک دم سے ان کے سارے جسم سے توانائی نچوڑ لی تھی۔

"جی پھپھو جان۔" اس کی آواز شاید لاؤنج سے آئی تھی۔

"نزہت! ادھر آؤ' یہ انڈیکس پڑی ہے' اس میں شہباز کا موبائل نمبر لکھا ہے۔ دیکھ کر جلدی سے ڈائل کرو۔" اس کی شکل دیکھتے ہی وہ فوراً بولیں۔

نزہت ایک پل کو ان کی اس اچانک فرمائش پر جھجکی پھر ان کا پریشان چہرہ دیکھ کر فوراً انڈیکس اٹھا کر نمبر ڈھونڈنے لگی۔ نمبر ملنے پر اس نے سر اٹھا کر مسز خان کو دیکھا۔

نزہت نے نمبر ڈائل کیا' دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ نزہت کے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے۔

"ہیلو!" اس پتھر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"میں نزہت..." خشک ہوتے حلق سے چند سیکنڈ بعد ہی نکل سکا۔

"تو؟" لہجہ پتھر پھاڑ تھا۔

"تو کا ہی تو سارا جھگڑا ہے۔" اس نے شرمسار سی ہو کر ریسیور مسز خان کو تھما دیا۔

"شہباز! اگر اس غریب سے نیکی کی تھی تو اس کا خیال بھی رکھنا تھا۔ معاذ کو اظہر تھانے لے گیا ہے' اس انگوٹھی کی گمشدگی کے سلسلے میں۔ اس بچے کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ بن ماں باپ کا بچہ۔" مسز خان جیسے رو دینے کو تھیں۔

"او مائی گاڈ! ام جان! میں ٹرائی کرتا ہوں آنے کی رات تک۔ آپ انہیں چند گھنٹوں کے لیے تو روک لیں گی وہ میری کہاں سن رہا ہے۔ تم آؤ تو خود ہی کچھ کرو۔ اظہر کی آنکھوں پر تو بیوی کے پاگل پن کی پٹی بندھی ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں' اوکے اللہ حافظ۔"

نزہت ان کے بیڈ پر ہی بیٹھی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

"بیٹا! یہ فون رکھ دو ادھر۔" اس کی کیفیت کو جانچتے ہوئے انہوں نے نرمی سے کہا۔ وہ فون ریک پر رکھ کر فوراً باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

شہرینہ اگلے روز کالج ہی نہ جا سکی۔ رات بھر کی بیداری کا نتیجہ کہ اسے صبح تک بخار ہو چکا تھا۔ ٹمپریچر زیادہ نہیں تھا مگر سر میں بہت درد تھا۔ سیدہ نے اسے کالج جانے ہی نہ دیا۔ سارا دن وہ کمرے میں پڑی رہی اور آنے والی رات کے بارے میں سوچتی رہی۔

"میں اب کسی صورت نہیں جاؤں گی اس سے ملنے۔" وہ سارا دن وقفے وقفے سے یہ فقرہ دہراتی رہی تھی۔ خود کو تسلی دینے کے لیے اسے کمرے میں پڑے پڑے شام ہو گئی۔ بخار اس کا اتر چکا تھا۔

سیدہ اسے دو بار باہر آنے کی تاکید کر کے جا چکی تھیں۔ وہ اٹھ کر کچھ دیر کے لیے باہر گئی۔ تھوڑی دیر ہی بیٹھ سکی اور پھر اٹھ کر اندر آ گئی۔ رات کے کھانے کے بعد اس کی پریشانی سوا ہونے لگی۔

"شہرینہ! کیوں ڈر رہی ہو؟ وہ تمہارے کمرے میں تو نہیں آ سکتا یا اگر تم چلی جاؤ گی تو وہ تمہیں کھا تو نہیں جائے گا۔ یوں خود کو ہلکان کرنے سے کیا حاصل۔" اپنا سمجھانا بھی بے سود جا رہا تھا۔

"یا اللہ! میں کیا کروں؟" بارہ بجے تک اس کی بے چینی اور پریشانی کا عجب ہی عالم تھا اور اب تو دل بار بار جانے کا تقاضا کر رہا تھا۔ وہ دل کے تقاضے کو جھڑک کے جا رہی تھی۔ بارہ بجے کے بعد اس کی ہمت اپنی ہی ڈانٹ پھٹکار کے آگے بالکل دم توڑنے لگی تھی۔

"بس ایک بار چلی جاتی ہو۔" بار بار اندر سے فرمائش اٹھ رہی تھی مگر جا وہ پھر بھی نہ سکی تھی۔

"بس آج کے دن چلی جاؤں۔" دل گڑگڑایا۔

"نہیں۔" اس نے سختی سے سر جھٹکا۔

"شہرینہ! چلی جاؤ۔" دل نے پھر منت کی۔

"نہیں جا سکتی۔" کمزور سا انکار تھا۔

شاید وہ چند منٹوں بعد چلی ہی جاتی کیونکہ چادر وہ الماری سے نکال چکی تھی۔ جب چوتھا پتھر اس کے قدموں کے قریب آ کر گرا تھا اس کے ساتھ کوئی کاغذ لپٹا ہوا تھا اس نے جھک کر کاغذ اٹھایا۔

"تو تم نہیں آئیں۔ گویا تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا' میری چاہت کی قدر شاید تمہیں نہیں شہرینہ! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' اب پھر کہہ رہا ہوں' اس دنیا میں تمہیں مجھ سے زیادہ چاہنے والا اور کوئی نہیں ملے گا۔ آئی ریئلی لو یو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جیسے مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی شہرینہ! تم میرا پانی ہو' میری زندگی ہو اور وجہ زندگی بھی۔ اگر تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا تو میں زندہ رہنے کی اور کوئی وجہ تلاش نہ کر پاؤں گا اور میرا خون ناحق تمہارے پتھر دل کی سختی پر ہو گا۔ تمہیں میری محبت کا یقین کیوں نہیں آتا' تمہیں یقین دلانے کے لیے میں کیا کروں' تمہاری بے حسی بڑھتی جا رہی ہے اور میری بے قراری۔

اب میں جا رہا ہوں' ٹھیک ایک ماہ بعد اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا اور تمہیں آنا ہی ہو گا۔ میری خاطر' میری محبت کی خاطر اور اپنی خاطر بھی۔ مجھے یقین ہے تم میرے بغیر رہ نہیں سکو گی' مجھے یقین ہے۔

تمہارا اور صرف تمہارا

عبدالمبین!

وہ آخری لائن بمشکل پڑھ پائی تھی کہ کوئی زور سے دروازہ کھول کر کمرے کے وسط میں آن کھڑا ہوا تھا۔ شہرینہ کی جان اس کی شکل دیکھ کر ہی فنا ہو گئی تھی۔

• • • • • •

سید سلطان بخت عین سامنے کھڑے کڑی نظروں سے اس کو گھور رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھلا پیغام محبت تھا تو دوسرے ہاتھ میں چادر۔ سلطان بخت کے پیچھے داخل ہونے والی صالحہ شاہ تھیں جنہوں نے ایک ہی نظر میں شہرینہ کی کیفیت کو جان لیا تھا اور اب وہ بہت مضبوط قدموں سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ شہرینہ کو لگا' آج ابھی اسی وقت اس کی موت کا مقررہ وقت آن پہنچا ہے۔ اس کے پورے جسم میں دوڑنے والی حرکی لہریں بالکل ساکت

ہو چکی تھیں۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ ہاتھ میں پکڑا وہ رقعہ ہی مٹھی میں بھینچ لے۔

"تم ابھی تک جاگ رہی ہو' ٹائم دیکھا ہے' آدھی رات ہو رہی ہے۔ چادر لیے کہیں جانے کا ارادہ ہے کیا؟" سلطان بخت کی بھاری بھر کم غصیلی آواز اسے جیسے عالم فنا سے عالم ہوش میں لے آئی۔

"مم۔ میں۔ نن۔ نہیں۔ لالہ!" اس نے صدیوں کے پیاسے ہونٹوں اور حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب؟" ان کی غصیلی نظریں جیسے اس کے اندر اترتی جا رہی تھیں۔

"سونے والی تھی' میرا مطلب ہے پڑھ....." اس سے کوئی بھی مناسب بہانہ بن نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا اپنی موت کا پیغام آہستگی سے سمیٹا۔

"رات کے اس پہر پڑھائی' چہ خوب' عشق' وہ بھی ایسا۔" صالحہ کا طنز اور مختصر ہنسی اسے پھر سے وحشت زدہ کر گئی۔

"چادر لے کر کہیں جانے کا ارادہ تھا اور یہ دکھاؤ' شاپنگ لسٹ ہے کیا؟" صالحہ شاہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے رقعہ جھپٹ لیا۔

"میں سونے جا رہی تھی' صبح کے لیے یونیفارم الماری میں لٹکایا تھا اور اب یہ چادر رکھ رہی تھی۔ آپ کب آئے لالہ؟" ایک لمحے کی بات تھی' خدا جانے اس کے اندر اتنا اعتماد کہاں سے در آیا تھا۔ اس نے اسی چادر کو رقعے کے اوپر رکھا اور مڑ کر الماری میں رکھنے لگی۔

"ابھی آئے ہیں۔ سیدہ آپا شاید سو رہی ہیں' اس لیے انہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ تم اب سو جاؤ' محض پڑھائی کے لیے یوں خود کو آدھی رات تک ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے شاید صالحہ شاہ کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا' ان کی رقعے والی بات!

"جی لالہ! میں سونے والی تھی۔ آپ کو تو شاید دو چار روز بعد آنا تھا۔"

وہ اب مکمل طور پر پُر اعتماد ہو چکی تھی۔ الماری اس نے آہستگی سے بند کر دی اور اس سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ صالحہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں' آنا تو دو چار روز بعد ہی تھا پھر ادھر کے دورے اور کام..... اتنے دن تو میں سیر سپاٹا افورڈ نہیں کر سکتا تھا' اسی لیے آ گئے۔ ایک دو ضروری کام ارجنٹ نوعیت کے تھے۔ سو جاؤ' اب تم بھی۔ صبح ناشتے پر ملاقات ہو گی تو تمہیں تمہارا گفٹ دیں گے۔ صالحہ نے بہت اچھی شاپنگ کی ہے تمہارے لیے اور آپا کے لیے بھی۔" سلطان بخت کا لہجہ پہلے دنوں جیسا ہو چکا تھا۔ خیال رکھنے والا اور محبت بھرا۔

"تھینک یو لالہ!" (آپ کا اس طرح بولنا ہی میرے لیے گفٹ ہے۔ مجھے صالحہ شاہ کی اچھی شاپنگ کی قطعاً ضرورت نہیں۔) وہ دل ہی میں کہہ سکی۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے کمرے سے جانے لگے۔

"لالہ! آپ نے کھانا کھا لیا ہے؟" اس نے صالحہ کو جلانے کے لیے بڑی فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں' رستے میں کچھ اسنیکس لے لیے تھے' اب تو بس آرام کی ضرورت ہے۔ سخت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ آ جاؤ صالحہ! تم بھی ریسٹ کرو' اتنا لمبا سفر کیا ہے۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ صالحہ شاہ ابھی بھی کھڑی اسے کڑے تیوروں سے گھور رہی تھیں۔

"لگتا ہے بھابھی بیگم کو نیند نہیں آ رہی یا میرا گفٹ ابھی مجھے دے کر جائیں گی۔" وہ ذرا سا مسکرا کر بولی۔ اسے صالحہ کی کیفیت لطف دے رہی تھی۔ صالحہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"شہرینہ شاہ! تمہارا گفٹ تو واقعی میں تمہیں دوں گی مگر صبر شرط۔ جس طرح میں اس وقت کر رہی ہوں۔ اب تم بھی ایک بے خبر پُرسکون نیند کے مزے لے لو۔ جب تک تمہارے لالہ اسی طرح بھولپن کا شکار رہیں گے۔ تم عیش کر لو۔ آدھی آدھی رات تک پڑھائی کا چکمہ دے کر سب کھیل کھیل لو۔ ابھی میری باری نہیں آئی۔

"کیا مطلب میں کچھ سمجھی نہیں؟" وہ معصومیت سے بولی۔
"بہت جلد سمجھ جاؤ گی تم بھی اور سارے تمہارے پیارے بھی۔ بس تھوڑا انتظار۔" وہ جیسے گنگناتے ہوئے بولی
"مجھے تو آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ویسے بھابھی بیگم! آپ اچھی لگ رہی ہیں۔ لیٹ ہنی مون ٹرپ نے آپ کے حسن و صحت پر اچھے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مزاج کے تیکھے پن میں بھی خاصی بہتری ہوئی ہے۔" وہ جیسے صالحہ کو چڑانے کے لئے بولی ۔
"بہتری آئے گی ابھی تو اور بھی آئے گی تم آزما نا تو سہی۔ شب بخیر۔"
وہ کہتے ہوئے پیر پٹخ کر کمرے سے نکل گئیں تو شہرینہ ان کے باہر جاتے ہی زور سے ہنس پڑی، جیسے کئی گھنٹوں کے بعد اس کے پھیپھڑوں نے کھل کر ہوا میں تازہ سانس لیا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ لاک کیا اور پھر مسکرا کر کھڑکی بھی بند کی۔ منڈیر کے دوسری طرف مکمل اندھیرا تھا۔ اس نے ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ اور پھر بہت آہستگی سے الماری کھول کر چادر کے اندر دبا رقعہ نکالا۔ مین لائٹ آف کر کے زیرو کا بلب آن کیا اور اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو کر رقعہ پڑھنے لگی۔ ایک بار نہیں' دو بار نہیں اور پھر تین بار..... اسے لگا اس کا پورا وجود کسی سرور میں ڈوبا جا رہا ہے۔ اس نے بے اختیار رقعے کو اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ اس کا دماغ اب آہستہ آہستہ نیند میں ڈوب رہا تھا۔ ایک انوکھی پر کیف نیند.....

☆ ☆ ☆

رات کے ساڑھے دس بجے تھے' جب کیپٹن شہباز' معاذ کو اپنے ساتھ لیے مسز خان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے بستر پر تکیوں سے ٹیک لگائے ان کی ہی منتظر تھیں۔ نزہت ان کے دائیں طرف سنگل صوفے پر بیٹھی اخبار کو یونہی گود میں رکھے بیٹھی تھی۔
"آ گئے' اللہ تیرا شکر ہے۔ معاذ! بچے تم ٹھیک تو ہو نا؟" انہوں نے بے قراری سے معاذ کی طرف بازو پھیلائے۔
"جی ام جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی تک سوئیں نہیں۔" وہ ان کی بانہوں میں سماتے ہوئے بولا۔ چند منٹوں میں ہی اس کا چہرہ اتر گیا تھا اور آنکھیں جیسے اندر کو دھنس گئی تھیں۔
"زیادہ مسئلہ تو نہیں ہوا شہباز بیٹا؟" شہباز اب کرسی پر بیٹھے اپنے جوتوں کے تسمے کھول رہے تھے۔
"نہیں ام جان! کچھ خاص نہیں۔" جوتوں پر جھکے جھکے انہوں نے مختصر جواب دیا۔
"اظہر آ گیا ہے؟"
"جی!" انہوں نے ایک ایک کر کے دونوں جوتے اتارے اور پھر جرابیں بھی اتار کر جوتوں کے اندر رکھ دیں۔ دودھیا سفید مضبوط پاؤں کی انگلیوں کو اب وہ ایک ہاتھ سے دبا رہے تھے۔ نزہت کی نیچی نظریں ان کے پاؤں پر ہی تھیں۔ ایک لمحے کو بے اختیار اس کا جی چاہا وہ دونوں پاؤں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ دبائے کہ ان کی ساری تھکن اس کی انگلیاں چن لیں۔
ایک بے خود بے اختیار سا خواہش کا لمحہ..... دوسرے پل اس نے ایک گہرا سانس لے کر نظروں کا زاویہ اس دل چھو لینے والے منظر سے بدل لیا۔
"بہت بچکانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اظہر نے۔ محض بیوی کی باتوں میں آ کر۔" انہوں نے متاسف لہجے میں کہا۔ شہباز نے کوئی جواب نہ دیا۔
"معاذ! تم منہ ہاتھ دھو لو پھر کھانا کھاتے ہیں' تمہیں بھوک لگی ہو گی۔" شہباز نے معاذ کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔
"جی اچھا!" اس نے کہا مگر اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔
"تم بھی شہباز بیٹا! فریش ہو جاؤ۔ میں زیتون بانو کو آواز دیتی ہوں' کھانا گرم کرے بلکہ نزہت بیٹا! تم اٹھو' ذرا دیکھو یہ زیتون بانو کہیں کچن میں اونگھ تو نہیں رہی؟"

نزہت کوئی بھی جواب دیے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔ شہباز نے پنک کاٹن کے سوٹ میں ملبوس اس کے سراپے کو نظر بھر کر دیکھا۔ ایک متوقع تبدیلی کا ہلکا سا احساس انہیں اس کے وجود سے ہوا تھا۔ انہوں نے نظروں کا زاویہ بدل کر معاذ کو دیکھا۔
"شہباز بھائی!" ان کے متوجہ ہوتے ہی معاذ نے آہستگی سے کہا۔
"ہاں کہو۔" وہ کافی دیر سے دیکھ رہے تھے' وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا ہے۔
"مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد شہباز خان نے خود ہی کہا۔
"آپ کو معلوم ہے نا۔" اس کی آنکھیں چمکیں۔
"معاذ! دیکھو' ایک دو ماہ تک تمہارے فائنل امتحان ہونے والے ہیں۔ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا سنگ میل' اس لیے تم محض ادھر ادھر کی باتوں پر توجہ دے کر اپنا ذہن خراب کرنے کے بجائے صرف پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ تمہیں میرٹ بنانا ہے' بہترین رزلٹ شو کرنا ہے' میری اور ام جان کی امیدوں کو پورا کرنا ہے۔ اس کے بعد کا رستہ بہت آسان نہ سہی مگر اتنا دشوار بھی نہیں ہے۔ کم از کم منزل کا تعین تو ہو جائے گا نا۔ بس اب چپ کر کے ایگزام کی تیاری کرو خوب جی لگا کر۔ اب آئندہ اس طرح کے معاملات تمہیں ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ میں نے اس کا سدباب کر دیا ہے' تم اب ادھر۔"
انہوں نے اشارے سے دونوں بھائیوں کے پورشنز کی طرف اشارہ کیا۔ "کسی بھی صورت نہیں جاؤ گے اور نہ وہ لوگ تمہیں اپنی خدمت گاری کے لیے بلا سکیں گے۔ ام جان! میں نے اظہر بھائی اور ایاز بھائی دونوں سے سختی سے کہہ دیا کہ اب معاذ ان کی طرف نہیں آئے گا۔"
اسی وقت اظہر کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک تنفر بھری نظر مسز خان کے ساتھ جڑ کر بیٹھے معاذ پر ڈالی تھی۔
"آؤ اظہر بیٹا!" مسز خان نے کھلے دل سے کہا تو وہ خاموشی سے شہباز کے دوسری طرف آ بیٹھے۔
"آپ کو شہباز کو نہیں بلانا چاہیے تھا۔ میں بھی اس گھر کا دشمن نہیں ہوں۔" وہ تلخی سے بولے۔
"مجھے ام جان نے نہیں بلوایا' میں خود آیا ہوں۔ مجھے ایک ہفتے کی چھٹی ملی ہے' اس "معاملے" کا علم تو مجھے یہاں آ کر ہوا' اور دوسری بات' معاذ کو اس گھر میں' میں لے کر آیا ہوں۔ جب بھی اس سے متعلقہ کوئی بات ہو گی' اس کا علم سب سے پہلے مجھے ہی ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں بلکہ آپ کی نظروں میں مجھ پر یہ ایک الزام بھی ہے کہ میں بغیر جانچے پرکھے ایک اجنبی لڑکے کو اپنے گھر میں لے آیا ہوں۔ عمر اور تجربے میں' میں آپ سے کم سہی مگر انسانوں کی پہچان مجھے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر میرا یقین ہے' جو مجھے ہمیشہ کہتا رہا ہے کہ میرا فیصلہ غلط نہیں۔" انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
"تو ہم گھر والے تمہاری نظر میں جھوٹے ہوئے۔ تمہارے بھائی' تمہاری بھابھیاں۔" وہ بھڑک کر بولے۔
"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ معاذ! تم جا کر فریش ہو' میں ابھی آتا ہوں۔" انہوں نے نرمی سے کہا تو وہ ماحول کی گرماگرمی دیکھ کر فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔
"شہباز! تم اچھا نہیں کر رہے۔ نہ اپنے ساتھ' نہ ہمارے ساتھ اور نہ اس گھر کے ساتھ۔"
"مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں' البتہ آپ کو علم نہیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اظہر بھائی! ایک معمولی سی انگوٹھی کی چوری کے لیے آپ نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ اس گھر کی عزت کو داؤ پر لگا دیا۔ کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے سے پہلے آپ کو کم از کم مجھ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ آپ کی بیگم کی رنگ اس گھر کی ناموس سے زیادہ قیمتی نہیں۔ معاذ اس گھر کا فرد ہے۔ آپ لوگ تسلیم کریں یا نہیں مگر ہمارے پورشن کا وہ حصہ ہے اور رہے گا۔ آپ کی رنگ کی جو بھی مالیت تھی' وہ میں ادا کر دیتا ہوں۔ کتنے کی تھی وہ رنگ' دس ہزار کی' بیس' تیس یا چالیس پچاس ہزار کی تھی۔ میں دینے کو تیار ہوں مگر آپ کو یوں معاذ کو اٹھا کر تھانے لے جانے کا کوئی حق نہیں تھا جبکہ

آپ کو کنفرم بھی نہیں تھا کہ اس نے چوری کی بھی ہے یا نہیں۔" کیپٹن شہباز کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چلا تھا۔

"تو تمہارے خیال میں، میں نے یہ جان بوجھ کر کیا۔" وہ بھی غصے میں بولے۔

"یہ میں نہیں جانتا جبکہ ایسی چیز کوئی اور بھی اٹھا سکتا ہے۔ آپ کی کوئی ملازمہ یا...."

"یا کون؟ کہو ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"مجھے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں' آپ کو اپنے گھر کی خود خبر ہونی چاہیے۔ آپ کے بیٹے بھی اب ماشاء اللہ بڑے ہو رہے ہیں۔ ایسی نادانی ان میں سے بھی کسی سے سرزد ہو سکتی ہے۔"

"شہباز! زبان کو لگام دو۔" ظہر نے چیخ کر کہا۔

"آپ بھی کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچیں ضرور کہ دوسروں کی بھی کوئی عزت ہے۔ جو آپ کے اس کھیل تماشے سے مجروح ہو سکتی ہے مگر آپ کو تو صرف اپنے پندار کی فکر ہے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ ایک غیر اجنبی عفت پانچھے کے لیے....." وہ کف اڑانے لگے۔

"اب اگر میں کہوں کہ زبان سنبھال کر بات کریں تو آپ اسے بدتمیزی کہیں گے مگر آپ مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

"شہباز!" مسز خان نے دبی زبان میں کہا۔

"شٹ اپ شہباز۔ ام جان! اس کو کنٹرول کریں ورنہ بہت کچھ آوٹ آف کنٹرول ہو جائے گا۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ میں اس سے زیادہ بے ہودگی برداشت نہیں کر سکتا۔ سن لیا آپ نے۔" وہ غصے سے پیر پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

"ظہر.... اظہر.... میری بات سنو۔ ادھر آؤ ٹھنڈے دل سے....." مسز خان کی پکار ضائع گئی۔ شہباز نے اپنے جوتے اٹھائے اور کمرے سے نکل گئے۔

"میں ذرا فریش ہو لوں ام جان! مجھے بھوک بہت لگی ہے۔"

❀ ❀ ❀

جنتاں ڈرائنگ روم کی ڈسٹنگ کر رہی تھی' جب اس نے باہر آسمان پر اڑتے جہاز کی آواز سنی۔ اس کے تیزی سے چلتے ہاتھ رک گئے۔ وہ ڈسٹر سینٹرل ٹیبل پر چھوڑ کر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف لپکی اور کھڑکی سے سر نکال کر دور جاتے جہاز کو دیکھنے لگی۔

"شاید وہ لوگ آنے والے ہیں۔" وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور پھر سوچنے لگی۔

"ان کی دربدری کی ذمہ دار میں تو نہیں پھر احساس جرم میرے اندر سے کیوں نہیں جاتا اور یہ احساس جرم غریب کے اندر ہی کیوں پلتا ہے' کیوں اسے ہی پل پل ڈستا ہے۔ بڑے لوگوں کو اپنی غلطیوں' اپنے جرائم کا احساس ایک پل کو بھی کیوں نہیں ہوتا۔ وہ تو شاید کبھی بھی میرے غم پر نہیں روئے اور میں ان کے لیے لمحہ لمحہ مری ہوں۔ آخر یہ ضمیر نام کا زہریلا سانپ میرے اندر مر کیوں نہیں جاتا۔ اسے کیوں موت نہیں آتی۔ کیوں چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار بار پھن پھیلا کر میرے سامنے تن جاتا ہے جیسے..... میں نے....."

"سوئمنگ پول تو میں نے اچھی طرح صاف کر دیا ہے' تمہارے کہنے کے مطابق سرف اور سوڈا ڈال کر پھر بھی تم آکر اپنی تسلی کر لو پھر میں اس میں پانی چھوڑ دوں۔" کرم دین کھڑکی کے باہر ہی سے جھانک کر بولا۔ جنتاں نے جلدی سے بھیگی پلکیں اپنے ہاتھوں سے مسلیں۔

"آ رہی ہوں میں' مالی پر بھی نظر رکھنا۔ نیا بندہ ہے' ٹھیک کام بھی کر رہا ہے یا نہیں۔ ان کے آنے میں اب تھوڑی ہی دیر ہے' پھر صاحب مجھ پر خفا ہوں گے۔ لان صاف ستھرا نہ ہو تو صاحب کو شروع ہی سے غصہ چڑھ جاتا تھا اور مجھ ایسی بوڑھی جان نے کس طرح چند دنوں میں ملازم اکٹھے کیے ہیں' میں ہی جانتی ہوں۔ صاحب لوگ تو بس حکم دینا جانتے ہیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر لان کی طرف بڑھی۔

ایک گھنٹے بعد ہی گیٹ کے باہر ہارن کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی پورٹیکو میں کھٹا کھٹ گاڑیوں کے دروازے کھلنے کی۔ جنتاں ہانپتی کانپتی کچن میں ملازم کو چاول دم لگانے کی ہدایت کرتی پورٹیکو کی طرف بڑھی۔ رعنا اور فخر حیات اسے بالکل ایسے نظر آئے جیسے یہاں سے جاتے وقت تھے۔ بیتے سالوں کی دھول ذرا بھی ان کے خوبصورت چہروں اور جوان جسموں پر نہ جمی تھی۔

"کیا وقت ان لوگوں کو ان چھوئے گزر جاتا ہے' دولت کی باندی تلوار لیے سر پر کھڑی ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے وقت بھی ڈر ڈر کر ان کے پاس سے گزرتا ہے۔" جنتاں اپنے بوسیدہ بوڑھے بدن کو لے کر بمشکل چار سیڑھیاں اتری۔

"سلام بیگم صیب! صیب جی!" اس نے رعنا کے پاس جا کر تابعداری اور محبت سے سلام کیا جو گاڑی سے نیچے اتر کر اپنی گرے ساڑھی کی فال درست کر رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو جنتاں! ٹھیک تو رہیں؟" اس نے سرسری سی نظر کے ساتھ اپنی پرانی بوڑھی ملازمہ کو دیکھا۔

"اللہ کے کرم سے اور آپ کی مہربانیوں سے جی۔" وہ جھک کر رعنا کا ہلکا سا سوٹ کیس اٹھانے لگی' جبکہ دو ملازم پیچھے آنے والی گاڑی سے اترنے والا سامان اٹھا رہے تھے۔

"ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ۔ سیفی بابا تو کڑیل جوان ہو گئے ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ خوب بڑے ہو گئے ہیں۔" جنتاں نے پیچھے سے آتے سیفی کے چہرے کو ذرا سا چھو کر کہا۔

"ہاں بہت بڑے ہو گئے ہیں تمہارے سیفی بابا۔" رعنا کا لہجہ جنتاں کو ذرا عجیب سا لگا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی مالکن کو دیکھا جن کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔

"کیوں مما! میں بڑا ہو کر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا؟" سیفی نے بھی سن لیا تھا۔ برا سا منہ بنا کر ماں سے بولا۔

"بہت اچھے لگ رہے ہو' یہ بات بھلا کسی ماں سے پوچھنے کی ہوتی ہے۔" رعنا کا لہجہ اور چہرہ ابھی بھی بے تاثر تھا الفاظ کے برعکس۔ اس نے جھک کر گاڑی کی سیٹ پر پڑا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔

"چلو بھئی' جلدی چلو اندر۔ کیا ساری باتیں یہیں پر ہوں گی۔ مجھے تو زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ بس ہم ہاتھ منہ ہی دھوئیں گے' تم کھانا لگواؤ۔"

"بہت عرصے کے بعد اپنے گھر میں اپنی چھت تلے اپنے ٹریڈیشنل کھانوں کا مزہ لیں گے کیوں رعنا؟" فخر حیات کا لہجہ پہلے کی طرح فریش تھا۔ وہ اپنا بریف کیس اٹھا کر اندر کی طرف بڑھے۔

"سب کھانے آپ کی پسند کے پکے ہیں جی اور سب کچھ تیار ہے۔ بس آپ منہ ہاتھ دھو کر آجائیں' میں اتنے میں ٹیبل پر لگواتی ہوں۔" جنتاں ان کے پیچھے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔

"بھئی جنتاں! گھر تو تم نے خوب چمکا رکھا ہے۔ ویری گڈ۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم یہاں سے کبھی گئے ہی نہیں ہوں..... ہوم سویٹ ہوم۔ کیوں رعنا؟" فخر حیات لاؤنج کو گھوم گھوم کر دیکھ رہے تھے۔

"خیر' ایسے تو نہ کہیں۔ اتنے دنوں کی کڑی مسافت کے بعد تو گھر کی شکل نصیب ہوئی ہے۔" رعنا نے تھک کر خود کو صوفے پر ڈالا۔

"اسی لیے تو گھر اچھا لگ رہا ہے۔ بہت زیادہ اپنا اپنا سا۔" فخر حیات نے کہتے ہوئے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ جھانک کر اس کا جائزہ لیا اور پھر واپس آکر میز پر پڑا اپنا بریف کیس اٹھانے لگے۔

"میں ذرا فریش ہو جاؤں' تم بھی اٹھ جاؤ جلدی سے۔ مجھے واقعی بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ کہتے ہوئے لاؤنج سے نکلے۔

"آپ نے پلین میں بھی تو کچھ نہیں لیا تھا۔ شروع کی عادت ہے آپ کی' سفر کے دوران کچھ نہ کھانے کی۔"

رعنا نے گردن موڑ کے کہا۔ جواب نہ پا کر اس نے گردن سیدھی کی۔ فقرحیات جا چکے تھے۔

"مما! پتا نہیں میرا یہاں دل لگے گا بھی یا نہیں۔" سیفی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کچھ بیزاری سے بولا۔

"دل لگے یا نہ لگے۔ رہنا تو پڑے گا ہی ادھر۔" رعنا کا لہجہ ایک بار پھر خشک ہو گیا۔

"زبردستی تو نہیں ہے مام! میرا دل لگے گا تو میں ادھر رہوں گا ورنہ مشکل ہے۔" وہ ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ رعنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مڑ کر لاؤنج سے نکل گیا۔

رعنا کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ کراکری کی کھڑکھڑاہٹ پر اس نے گردن گھما کر پیچھے ڈائننگ روم کی طرف دیکھا۔ نیٹ کے وائٹ پردے کے پیچھے جناں ٹیبل پر برتن رکھتی نظر آئی۔

"بھابھی جان کا کوئی فون تو نہیں آیا؟" رعنا کمرے کی طرف جاتے جاتے اس کے پاس رک کر بولی۔

"آیا تھا جی! پرسوں بھی، کل بھی اور آج بھی دوبار۔ فلائٹ کا ٹائم پوچھ رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا، مجھے بالکل صحیح پتا تو نہیں ہے مگر صاحب جی نے کہا تھا لنچ ہم گھر آ کر ہی کریں گے۔" وہ بڑے مصروف انداز میں تینوں چیئرز کے آگے پلیٹیں اور چمچ سیٹ کر رہی تھی۔

"تو کیا کہا انہوں نے؟"

"کہہ رہی تھیں پھر تو ٹھیک ہے، ہم شام پانچ یا چھ بجے تک آ جائیں گے۔ فلائٹ کا صحیح ٹائم پتا ہوتا تو ایئرپورٹ چلے جاتے۔" جناں نے پلیٹیں سیٹ کر کے رعنا کی طرف دیکھا۔

"اچھا دیکھو، اب ان کا فون آئے تو کہہ دینا فلائٹ لیٹ ہو گئی ہے، اس لیے ہم لوگ رات کو دیر سے یا شاید کل صبح سویرے پہنچیں گے، سمجھ گئیں نا۔"

"جی سمجھ گئی۔ کہہ دوں گی۔" جناں سر ہلا کر بولی تو رعنا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

"کب تک دامن بچائیں گی۔ عفت آرا تو آپ کی جڑوں میں بیٹھی ہے بیگم صاحبہ۔" ایک طنزیہ مسکراہٹ جناں کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شہباز خان جب رات ساڑھے گیارہ بجے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو نزہت ہاتھ میں کوئی کتاب لیے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھی۔ شہباز سیدھے واش روم میں چلے گئے۔

"یہ آج گیسٹ روم میں نہیں سوئیں گے۔" وہ انہیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"اور اتنا بڑا سفری بیگ۔" اس نے کونے میں پڑے ان کے بیگ کو دیکھا۔ "اس دفعہ زیادہ دن رہنے کا حوصلہ کر لیا۔"

وہ ابھی یہیں تک سوچ پائی تھی کہ وہ واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے پھر جیسے ہی پلٹ کر بیڈ کے دوسری طرف آ کر بیٹھے نزہت نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شہباز خان نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا، وہ اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے باہر جانے لگی۔ جیسے ہی ان کے پاس سے گزری، انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

"تم اس طرح بیڈ روم سے جا کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تمہیں اپنے نفس پر مجھ سے زیادہ کنٹرول ہے یا مجھے اگنور کر کے بدلہ چکانا چاہتی ہو؟" وہ دھیمی آواز میں غرائے۔

"میں ایسا کچھ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتی۔" وہ کلائی سے اٹھتی درد کی ٹیسوں کو ضبط کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ "یہ تو آپ کے اپنے اندر کا Guilt (احساس جرم) ہے جو آپ کو ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے۔" اس نے بھرپور طنزیہ انداز میں جیسے انہیں چڑایا۔

"گلٹ میرے اندر نہیں، تمہارے اندر ہے۔ جو تم کسی سے نگاہیں ملا کر کسی کا سامنا نہیں کر سکتیں۔" ان کے لہجے میں حقارت سی تھی۔ نزہت کا جی چاہا اسی وقت فرشتہ اجل آ جائے، اللہ اپنا وعدہ پورا کرنے اسے ابھی بھیج

دے کہ وہ ان آنکھوں کی مزید نفرت نہ دیکھ سکے۔

"میرے اندر کوئی گلٹ نہیں۔ نہ میں نے ایسا کچھ کیا ہے، نہ مجھے ایسا کوئی احساس جرم ہے۔ آپ کے اندر کے چھوٹے انسان میں ہی حوصلہ یا ظرف نہیں کہ حقیقت کے آئینے کو نظر بھر کر دیکھ سکے۔ اگر آپ اس آئینے کو دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا، آپ کا قد کس قدر چھوٹا ہے۔ بالکل بونے نظر آتے ہیں آپ۔ آپ کی جھوٹی انا، آپ کی نام نہاد مردانگی، آپ کو کسی سے نگاہیں ملا کر بات کرنے کی اجازت نہیں دیتی مجھ سے بھی نہیں۔ آپ تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ جو شخص اپنے اندر کی کمزوری کا مقابلہ نہ کر سکے، اسے کسی دوسرے پر انگلی اٹھانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ میں اندر باہر سے مطمئن ہوں۔ مجھے کسی سے نگاہیں چرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی توجہ، آپ کی بے نیازی سے اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا جو میں بدلہ چکانے کا سوچوں۔ یہ آپ کا انداز فکر ہے، میرا نہیں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑائی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ہاں شاید میرے اندر کی کمزوری ہی تو ہے جو تم ابھی تک یہاں نظر آ رہی ہو۔" وہ جیسے اقرار کرتے ہوئے افسوس سے بولے۔

"مگر تم فکر نہ کرو، جس دن میں نے اس کمزوری کو پچھاڑ دیا، تمہاری یہ جھوٹی نیک نامی بھی تمہارے ساتھ ہی رخصت ہو جائے گی، جس کا میک اپ کر کے تم اماں جان کی نظروں میں بہت اچھی بنی پھرتی ہو۔" وہ چبا چبا کر بولے تھے۔ ان کے لفظ، ان کی نظریں، ان کا لہجہ...... نزہت کا ایک بار پھر مر جانے کو جی چاہا۔

"شاید اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ آپ کو ہمت کرنی پڑے۔ میں اس سے پہلے ہی بقول آپ کے اپنی نیک نامی سمیت یہاں سے دور چلی جاؤں اور آپ کو جو یہ گلے پڑا ڈھول بجانا پڑتا ہے، اس سے بھی نجات مل جائے گی۔" اس نے بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑا، الماری کھول کر اس کے نچلے کیبنٹ میں رکھا سنگل کمبل کھینچا اور باہر جانے لگی۔

"میں اس دن کا شدت سے انتظار کروں گا جب میں آؤں اور تم مجھے اس کمرے، اس گھر کے اندر نظر نہ آؤ اور میری بوجھل آنکھوں کو سکون مل جائے جو تمہیں دیکھتے ہی بے سکون ہو جاتی ہیں۔" نزہت نے پلٹ کر آنسوؤں بھری ایک زخمی نظر ان کے بے رحم چہرے پر ڈالی۔

"آپ کو یہ سکون بہت جلد مل جائے گا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر باہر نکل گئی۔

"کیا میں واقعی ایسا چاہتا ہوں کہ یہ یہاں سے چلی جائے۔" کمرے میں چھا جانے والی خاموشی کے چند منٹ بعد انہوں نے خود سے سوال کیا۔

"اگر یہ یوں اکڑنے کے بجائے مجھ سے معافی مانگ لے، اپنے جرم کا اقرار کر لے تو شاید میرا دل نرم پڑ جائے۔" ان کے اندر کا اکھڑ مرد بولا۔

"معافی کی ضرورت تو انہیں ہوتی ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو، اس کے باوجود نزہت نے تو پہلی رات بھی معافی مانگی تھی پھر بھی تم......" ان کے اندر بیٹھا شخص بزدل نہیں تھا۔ کم از کم ان کے سامنے نڈر ہو جاتا تھا۔

انہوں نے اٹھ کر مین لائٹ آف کی اور بستر پر آ کر لیٹ گئے۔ ٹھنڈا ٹھار تھا بستر اور بیچ کے تکیے کو ڈے مارتا ان کا ہرجائی ضمیر۔ انہیں لگا، وہ اب تمام رات نہیں سو سکیں گے۔

☼ ☼ ☼

"تم نے ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا۔ آخر اٹھتے ہی ایسے کیا کام یاد آ گئے ہیں جو صبح صبح ہی چل پڑے ہو تیار ہو کر۔" سیدہ نے سلطان بخت کو تیار ہو کر گاڑی کی چابی اور موبائل ڈائننگ ٹیبل سے عجلت میں اٹھاتے دیکھ کر فوراً ٹوکا۔

"صبح صبح کب ہے آپا جان! دس بجنے کو ہیں۔"

"آدھی رات کو تو تم سوئے ہو۔ صبح سے آرام بھی نہیں کیا۔ سفر کی تکان کیا اتری ہوگی اور تمہارا پروگرام تو ابھی ایک ہفتہ اور رہنے کا تھا۔ میرا تو خود آج ارادہ تھا ذرا اسلام آباد کا چکر لگانے کا۔" سیدہ اپنے ارادے کے چوپٹ ہونے پر خاصی بیزار سی تھیں۔ بیزار تو وہ رات کو ہی سلطان بخت کی آمد کا سن کر ہو چکی تھیں۔

"بہت دن رہ لئے آپا! ایک ہفتہ تو بہت مشکل تھا۔ ویسے مجھے پتا چلا تھا آپ کے آنے کا۔"

"کیسے، تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ چونک کر بولیں۔

"جواد نے کل فون کیا تھا، مجھے اسی نے بتایا تھا۔"

"اس کا تو دماغ خراب ہے۔ میں نے منع بھی کیا تھا۔" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔

"ایسا کیا کام ہے آپ کو ادھر؟"

"بتایا تو تھا جواد کے ایڈمیشن کے سلسلے......"

"کہہ جو دیا تھا میں نے آپ سے کہ میں لے جاؤں گا اسے ادھر۔ ویسے آپ فکر نہ کریں، میں نے جواد کے لیے بیگلے یونیورسٹی کا سوچ رکھا ہے۔ اسلام آباد میں ایسی کون سی خاص پڑھائی ہوتی ہے۔ اب جولوگا باہر بھیجیں میں دو چار ماہ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔"

سلطان بخت نے جھٹ پٹ انہیں اپنا منصوبہ سنا کر ان کا اسلام آباد کا رستہ ایسے بند کر دیا کہ سیدہ ذہن میں نیا بہانا سوچتی رہ گئیں۔

"صالحہ! تم کچھ لے نہیں رہیں۔" سیدہ کافی دیر سے دیکھ رہی تھیں، وہ اورنج جوس کا گلاس گھنٹہ بھر سے آگے رکھے بیٹھی تھیں۔

"لے رہی ہوں۔" ان کا موڈ سخت آف لگ رہا تھا۔ سلطان بخت نے ایک نظر ان کے بگڑے موڈ کو دیکھا، وہ ابھی واپس آنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ رات سے اسی بات پر ان کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔

"او کے آپا! میں چلتا ہوں۔ شام تک لوٹ آؤں گا۔ بہت کام ہیں آج۔"

سلطان بخت نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ صالحہ ایک بار شروع ہو جاتیں تو پھر شاید انہیں آدھا دن ادھر ہی لگ جاتا اور اب انہیں پتا تھا صالحہ، سیدہ پر ضرور ہی پھٹ پڑی ہوں گی۔ انہوں نے اگر ایک آدھ سوال ان سے اور پوچھ لیا تو...... گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ان کے لب مسکرائے۔ ان کا خود بھی ابھی واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا مگر نین تارا۔

نین تارا نے دو راتوں سے جیسے ان کے بستر میں ...... انگارے دہکا دیے تھے۔ اس کی گفتگو، اس کا انداز، اس کی ہنسی ایک ایک بات نے انہیں اندر تک جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

اگر صالحہ اس لمحے ان کے ساتھ نہ ہوتیں تو شاید وہ نین تارا کو شوٹ ہی کر دیتے۔

"میں تو واپس آگیا ہوں، اگر وہ ابھی نہ لوٹی تو؟" آدھے رستے میں انہیں خیال آیا۔

"نہیں وہ آگئی ہوگی۔ نہ بھی آئی ہوئی تو میں گاڑی کا رخ اسلام آباد کی طرف موڑ دوں گا۔ آج تو اس سے ملاقات ضروری ہے، ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ ایسا بے باک اور نڈر انداز بھی نین تارا کا نہیں ہو سکتا۔"

گل کدہ کے گیٹ کے آگے انہوں نے زور زور سے ہارن بجایا تھا۔ چوکیدار نے بغلی گیٹ کھولا۔

"مین گیٹ کھولو۔" وہ ڈپٹ کر بولے۔

"وہ جی بیگم صیب تو...... گھر میں...... نہیں ہیں۔" وہ بولا۔

"مجھے تمہاری بیگم صیب سے کوئی کام نہیں، چھوٹی بی بی تو گھر پر ہیں۔" وہ تیوری چڑھا کر بولے۔

"وہ بھی تو یہاں نہیں۔"

"کہاں گئی ہیں؟"

"وہ تو جی اسلام آباد......"

"حکومت، ان کے ہوٹل سے معلوم کروالیا ہے میں نے۔ وہ رات کو آچکی ہیں۔" انہوں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

"جی...... نہیں جی۔" وہ سخت گڑبڑایا تھا۔

"تم ادھر سے دفع ہوتے ہو کہ میں خود تمہیں دیکھ لوں۔" وہ جست لگا کر ڈرائیونگ سیٹ سے اترے اور جارحانہ انداز میں کھلے گیٹ کی طرف بڑھے۔

"صاب...... صاب ہماری نوکری کا سوال...... بیگم صیب خفا ہوں گی، انہوں نے منع کر رکھا ہے۔ بلا اجازت......" وہ گڑگڑاتے ہوئے ان کے پیچھے لپکا۔

"شٹ اپ......" انہوں نے پلٹ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا تھا۔

وہ اندرونی عمارت کا دروازہ جھٹکے سے کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ لاؤنج بالکل ویران تھا۔

"کیا چوکیدار ٹھیک کہہ رہا ہو۔" گہری خاموشی پر انہوں نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔

نین تارا کے کمرے کا دروازہ لاک تھا۔ انہوں نے ذرا زور سے دستک دے ڈالی۔ چند لمحے انتظار کیا کوئی جواب نہ ملا۔ انہوں نے دوبارہ دروازہ دھڑ دھڑایا۔

"کون ہے؟" نین تارا کی نیند میں ڈوبی آواز ان کے کان میں پڑی تو ان کا دل جیسے کھل اٹھا۔ انہوں نے کوئی بھی جواب دیے بغیر پھر سے دستک دے ڈالی۔

"کون ہے بھئی، جو پاگل ہوا جا رہا ہے۔" وہ غصے میں کہتے ہوئے اٹھی تھی۔ اور دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔

سلطان بخت کو سامنے دیکھ کر اس کی نیند میں مست آنکھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔

"آپ......" وہ بے اختیاری سلور گرے گاؤن کی ڈوریاں باندھنے لگی۔

"کیوں کیا میرے آنے کی توقع تمہیں نہ تھی؟"

انہوں نے گاؤن میں لپٹے اس کے قاتل سراپے کو نظر بھر کر دیکھا۔ دوپٹے سے بے نیاز صراحی دار گردن اور نیچے بہت نیچے تک جاتا گاؤن کا گہرا گلا...... ان کے دل کی دھڑکنیں بے تال ہونے لگیں۔ اس کے بدن سے اٹھتی بھینی بھینی کلون کی خوشبو انہیں بے قابو کرنے لگی۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی؟" وہ اس کے بالکل قریب آکھڑے ہوئے۔

ریشمی اخروٹی زلفیں شانوں پر جھول رہی تھیں۔ کچی نیند سے جاگا اس کا بے پروا حسن سلطان بخت کو پاگل بنا رہا تھا۔ چہرے کی سفیدی میں گھلی گلابیاں اور آنکھوں میں سرخ باریک ڈورے...... ان کے دل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔

"آچکے ہیں آپ اندر۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی اور فوراً پلٹ ہو گئی۔

"ناراض ہو مجھ سے؟" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ اس روپ میں تو اس کی ایک پل کی خفگی ایک قدم کی دوری ان سے نہ سہی جا رہی تھی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ ہیئر برش اٹھا کر بہت نرمی سے الجھے بال سنوارنے لگی۔

"نین تارا! یہ بیگانوں والے انداز مجھ سے مت برتو۔ خفا ہو تو پاس آکر کہو۔ گلہ کرو شکایت کرو۔ یوں دور دور رہ کر مجھے پاگل مت بناؤ۔" وہ اس کے ملائم شانوں کے بالکل قریب آکر بے اختیاری سے بولے۔

"پاگل تو آپ نے مجھے بنایا ہے شاہ جی! اور مزے کی بات میں پاگل بن بھی گئی محبت جو کی تھی آپ سے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"تو کیا اب نہیں کرتیں؟" انہوں نے بہت آہستگی سے اس کے بالوں کو چھوا۔

"یہ تو آپ خود اپنے دل سے پوچھئے۔ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں جتنی محبت آپ مجھ سے کرتے ہیں۔ میں بھی اتنی آپ سے کرتی ہوں۔ نہ رتی کم، نہ رتی زیادہ۔" اس نے جھٹکے سے زلفوں کی

آبشار دوسرے شانے پر گرائی۔

"کیوں تمہیں شک ہے۔ مجھ پر میری محبت پر۔" اس کے ٹھور انداز انہیں مارے دے رہے تھے۔

"شک!" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "ابھی شک کی گنجائش باقی ہے کیا؟"

"نیناں یوں بے اعتبار نہ ہو نہ میری محبت کو کرو۔" وہ دکھ سے بولے۔

"بس شاہ جی بس!" اس نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخا۔

"بہت ہو گیا یہ ناٹک پیار کا۔ محبت کا اور اعتبار کا۔ اب کچھ کاروبار کی بات ہو جائے۔ کچھ بیوپار کی 'حساب کتاب کی' خالی خولی محبت سے تو پیٹ کا دوزخ نہیں بھرا جاتا نہ خواہشوں کا سمندر۔

"واٹ۔۔۔!" وہ بے یقینی سے بولے۔

"آپ کی محبت نے مجھے کیا دیا سوائے اپنی ذلت کے 'بے اعتباری کے۔ میں نے تو آپ سے سچے دل سے محبت کی تھی۔ اس لیے تو آپ سے نکاح کیا تھا۔ شرعی رستہ اختیار کیا تھا۔ مگر آپ نے مجھے کیا سمجھا۔ محض ایک طوائف 'ایک کھلونا جس سے جب آپ کا دل دنیا کے دھندوں سے بیزار ہو جائے آپ کھیلنے چلے آئیں۔ کیا اس کھلونے کے سینے میں دل نہیں تھا۔ شاہ جی! میں نے آپ سے دل سے محبت کی تھی۔ دل سے۔" اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے ان کا سینہ ٹھوکا۔ "مگر آپ نے تو یہ دل ہی توڑ دیا۔" اس کی آواز نم ہوئی تھی پل بھر کے لیے۔

"نین تارا! مائی سویٹ ہارٹ۔" نین تارا نے ان کے لبوں پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔

"پلیز شاہ جی! بس کریں۔ بڑی مشکل سے اس دل کی کرچیوں کو سمیٹا ہے۔ اب محبت کی یہ بلیک میلنگ بند کریں۔ یہ الفاظ آپ کو خود معلوم ہے جھوٹے ہیں۔ آپ سوچتے بھی نہیں اور بول دیتے ہیں اور کوئی اپنی زندگی ہار دیتا ہے ان لفظوں پر اعتبار کر کے۔ مگر آپ کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی۔"

"نین تارا میری جان! تمہیں مجھ سے جو دکھ پہنچا تھا۔ جو تکلیف ہوئی ہے۔ مجھ سے کہو یوں اجنبی مت بنو۔ دور دور کھڑے ہو کر مجھے نہ ترساؤ۔"

انہوں نے اسے کھینچ کر اپنی بانہوں میں لینا چاہا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہو گئی۔

"ابھی نہیں شاہ جی! یہ کھلونا آپ کا ہے۔ آپ کی دسترس میں ہے۔ مگر اس بار اس سے کھیلنے سے پہلے آپ کو مجھ سے کچھ معاملات طے کرنے ہوں گے۔ پھر اپنا بناوٹی محبت کا کھیل کھیلیے گا۔" اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو۔ تم میری بیوی ہو۔" ان پر محبت کا حسن کا نشہ چڑھ رہا تھا اور وہ بار بار انہیں اس نشے میں دھتکارے جا رہی تھی۔

"اوٹ پٹانگ نہیں شاہ جی 'اب ہی تو اپنا حق مانگنے کا سلیقہ آیا ہے۔ بیوی ہونے کی حیثیت سے آپ کی اس زر خرید لونڈی کو۔" وہ بالکل ڈری نہیں تھی ان کے غصے سے۔

"مطلب؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔

"مجھے میرا حق چاہیے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"کیسا حق؟" ان کے ماتھے پر پڑے بل گہرے ہو رہے تھے۔

"آپ کی بیوی ہونے کا جس کا آپ نے ابھی اقرار کیا تھا۔"

"سب حقوق تو تمہیں حاصل ہیں اور کیا حق چاہیے۔" وہ الجھ کر بولے اس کی بے خوفی انہیں اندر سے پریشان کر رہی تھی۔

"مجھے سب سے پہلے ایک گھر چاہیے۔ اپنا گھر 'میرا اپنا۔" سید ہاؤس کے لیے آپ کے آگے گڑگڑاتی رہی۔ آپ ہنسی میں اڑاتے رہے مگر اب نہیں شاہ جی! اب نہیں بہلوں گی آپ کے جھوٹے وعدوں سے۔ مجھے گھر چاہیے۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"گھر ہے تو تمہارے پاس۔ میری ساری جائیداد تمہاری ہے پھر یہ گھر بھی تو ہے۔ یہ کیا چھوٹا ہے تمہارے

نازک سے وجود کے لیے۔" وہ یونہی ہنسے۔

"آپ کی جائیداد آپ کو مبارک اور کیپ ان مائنڈ شاہ جی! یہ گھر میری ماں کا ہے۔ میں نے اس لیے آپ سے شادی نہیں کی تھی کہ شادی کے بعد بھی اپنی ماں کے گھر رہوں۔ میں آپ کو صرف ایک ماہ کی مہلت دوں گی کم از کم دو کنال کی خوبصورت فرنشڈ کوٹھی ڈیفنس یا کسی اور پوش ایریے میں مجھے چاہیے۔ "سید ہاؤس" پر تو آپ کا اپنا اختیار نہیں۔ وہ صرف جعلی کاغذات میں ہی آپ میرے نام کر سکتے تھے۔" وہ طنزاً بولی۔

"نین تارا!" وہ جیسے غصہ ضبط کر کے بولے۔

"چیخیں نہیں شاہ جی! گھر کے علاوہ نئے ماڈل کی گاڑی میں پسند کر آئی ہوں شوروم میں صرف تیس لاکھ کی ہے۔ مجھے چاہیے اپنے گھر کے گیراج میں۔"

"میں نے کبھی تمہارے اخراجات میں کمی رکھی ہے؟" وہ اس کی فرمائشیں سن کر حیران تھے۔

"اخراجات کی بات بھی ابھی ہو گی۔"

"اچھا۔۔۔ ابھی اخراجات رہتے ہیں۔" وہ طنزیہ ہنسے۔

"آپ کے دیے جانے والے کبھی کبھار جیب خرچ کے نام پر بیس تیس ہزار روپے میری اوقات سے بہت کم ہیں۔ وہی اوقات جو آپ نے مجھے ان دو چار ماہ میں بارہا یاد دلائی ہے۔ مجھے ماہانہ پچاس ہزار روپے چاہئیں صرف جیب خرچ کے لیے۔ گھر کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔" وہ ایک پل کو رکی۔ ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔

"اگر آپ کو میری یہ شرائط منظور ہیں اور آپ ان پر عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں تو جس وقت گھر پسند کر لیں "اس کی رقم کی ادائیگی کر لیں۔ اصل کاغذات میں گھر کی ملکیت میرے نام منتقل ہو جائے۔ گاڑی میں خود لوں گی آپ کے ساتھ جا کر۔ اس کی پے منٹ کر دیں تو پھر آپ کو نین تارا اسی رات اس عالیشان گھر کے سجے سجائے کمرے میں نئی نویلی دلہن کے روپ میں مل جائے گی۔ آئی پرامس پھر آپ کے اور میرے درمیان ایک پل ایک انچ کی بھی دوری نہ ہو گی۔"

"اور اگر میں یہ سب ماننے سے انکار کر دوں تو؟"

"آئی ڈونٹ کیئر۔ فکر کی تو کوئی بات نہیں 'میں اپنا حق کورٹ کے ذریعے وصول کر لوں گی۔ آپ کے خلاف دھوکا دہی کا بڑا مضبوط کیس بن سکتا ہے۔ آپ نے جو شرائط نکاح نامے میں لکھوائی ہیں 'یہ میری فرمائشیں تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں 'با آسانی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہوں 'خلع کے لیے بھی درخواست دے سکتی ہوں۔ دونوں صورتوں میں آپ کو اپنی جیب ٹھیک ٹھاک خالی کرنا پڑے گی۔ عزت کی نیلامی کا تاوان علیحدہ۔ ان دونوں صورتوں کے مقابلے میں میری یہ تین فرمائشیں تو بہت معمولی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے نا۔"

وہ انہیں غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہارا دماغ آخر خراب کس نے کیا ہے۔ زیور گل کدھر ہے 'میں یہ تماشا ابھی تمام کرتا ہوں۔ تین حرف تمہارے منہ پر مار کر۔" انہوں نے بیڈ کے پائے کو زوردار ٹھوکر ماری۔

"نہ۔۔۔ نہ شاہ جی! یہ ستم مت کیجیے گا۔ آپ ہی رسوا ہوں گے اپنی زبان سے۔ آپ یہ تین حرف چاہے تین کروڑ دفعہ کہہ ڈالیں 'اس گھر کی دیواروں سے زیادہ کوئی نہیں مانے گا اور دیواریں چپ۔۔۔ ان کی تو زبان ہی نہیں ہوتی۔ وہ آپ کے تین حرفوں کی کیا گواہی دیں گی۔ اس صورت میں بھی مجھے یہ تین حرف سنانے کے لیے آپ کو کورٹ کا سہارا لینا پڑے گا۔ میں آپ کو لے کر جاؤں گی 'وہاں آپ سے درخواست کروں گی کہ اب تین حرف کہیں اور اس کا ہرجانہ بھی بھگتیں۔ بھئی! میں ٹھہری طوائف زادی 'میرا مذہب 'شرع اور حرام حلال سے کیا واسطہ۔ آپ کے 'یہاں اس تنہا کمرے میں کہے گئے تین حرفوں سے مکرنا میرے لیے کیا مشکل۔ کیوں شاہ جی! آپ کو تو معلوم ہے نا میری اوقات 'حسب نسب 'ذات قبیلہ۔"

وہ بہت نڈر ہو کر بول رہی تھی۔ سلطان بخت کو اس کی باتیں سن کر لگا وہ کسی آہنی جال میں جکڑے جا رہے ہیں۔ جال کے باریک خاردار تار ان کے گوشت میں گڑے جا رہے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اپنے ہاتھوں سے پہلے ہی وہ جعلی دستاویز لکھ کر اپنی موت کا سامان ان طوائفوں کے ہاتھوں میں دے چکے ہیں۔

"تمین تارا... مائی ڈارلنگ! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ آئی ایم سوری' آئی ایم رئیلی سوری۔ تم اگر مجھ سے خفا ہو کسی بات پر تو میں دل و جان سے اس کے لیے....."

"اسٹاپ اٹ شاہ جی! میں ذرا باتھ لینے جا رہی ہوں' اس کے بعد میں بریک فاسٹ لوں گی پھر مجھے ذرا اسٹوڈیو جانا ہے۔ آپ کو اگر رات تک اور اس کے بعد آنے والی کئی راتوں تک بھی ادھر بیٹھنا ہو تو بصد شوق بیٹھیے مگر ایک ماہ بعد میری طرف سے کورٹ کے بلاوے کے منتظر ضرور رہیے گا۔ گڈ بائے۔"

وہ تیزی سے اٹھی اور بیڈ روم کے دوسرے کونے میں بنے واش روم کے دروازے سے اندر گھس گئی۔ دروازے کا لاک لگانے کی آواز صاف سنائی دی تھی۔

سلطان بخت کو اتنی بڑی شکست' اتنی ذلت کا سامنا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ ان کا پورا وجود جیسے سناٹوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ انہیں اب اگلا قدم نہیں سوجھ رہا تھا کہ اٹھ کر کوئے یار سے کدھر جائیں۔

☆ ☆ ☆
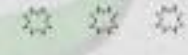
"ایک بات کہوں صوفی صاحب آپ سے۔" رابعہ بی بی نے جیسے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ دونوں تہجد کی نماز کے بعد فارغ بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ فجر کی اذان ہونے میں ابھی دس پندرہ منٹ باقی تھے۔

"ہوں۔" صوفی صاحب نے آہستگی سے کہا۔ اس دن بچے کو پیٹنے والے واقعہ کے بعد وہ بہت چپ چپ رہنے لگے تھے۔ بچوں کو پڑھاتے وقت بھی بہت محتاط ہوتے تھے۔ بمشکل ہی کسی بچے پر ہاتھ اٹھاتے تھے۔ مجلس کی طرف سے انہیں تنبیہی نوٹس مل چکا تھا کہ آئندہ اگر ان کی کوئی شکایت آئی تو انہیں نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا اور نوکری سے برخاستگی کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ صرف روزگار کے نام پر جو دو چار ہزار روپے آتے تھے نہ صرف ان سے ہاتھ دھونا تھا' بلکہ سر پر تنی اس چند گز کی چھت سے بھی محروم ہونا پڑتا اور اس چھت کے علاوہ بھری دنیا میں ان کا اور کون سا ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ وہ چھڑے چھانٹ تو تھے نہیں کہ نوکری کو لات مار کر اس ذلتی نوٹس کا جواب دے دیتے۔ ایک پورا کنبہ اور پھر جوان ہوتی تین بیٹیاں ان کے سر کو نیچا ہی نیچا کیے جا رہی تھیں۔

اور معاشی حالات تھے کہ کسی خون آشام بھیڑیے کی طرح ان کے گرد پنجے اور نوکیلے دانت پھیلائے کھڑے تھے۔ دن بدن گزارا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تنخواہ صرف پندرہ دن تک دال روٹی کے ساتھ بمشکل چلتی تھی۔ گوشت کا ذائقہ انہیں چکھے جیسے عرصہ ہو چلا تھا۔ محلے سے کبھی کھانا آ جاتا تو آ جاتا' محلے والے بھی ان سے اس واقعے کے بعد اچھے خاصے متنفر ہو چکے تھے اور روزگار بڑھانے کا اور کوئی طریقہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"آپ عبدالمتین کو خط لکھیں یا جلیل کے ذریعے پتا....." رابعہ بی بی نے چند لمحوں کے توقف سے کہا۔

"بس۔" انہوں نے تسبیح والا ہاتھ بلند کر کے قہر بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ "آج یہ بات کہی ہے' آئندہ مت کہنا ورنہ شاید تمہیں بھی اس چھوٹے سے گھر میں جگہ نہ مل سکے۔" حالات کی سختی کے باوجود ان کے کس بل باقی تھے۔

"بہت درد اٹھ رہا ہے تمہیں بیٹے کی محبت کا۔" وہ چبا چبا کر بولے۔

"نن..... نہیں..... میں تو گھر کے حالات....." وہ گڑبڑا کر بولیں۔

"کیا ہوا ہے گھر کے حالات کو۔ ابھی تک تو کوئی فاقوں سے نہیں مرا یا بستر مرگ پر نہیں پڑا۔ جس دن اس گھر کا آخری فرد آخری سانس نہیں لے لیتا' تم عبدالمتین سے رابطے کا سوچنا بھی نہیں۔" ان کا غصہ انتہا پر پہنچ چکا تھا۔

"پالا پوسا ہے ہم نے اسے' حق ہے ہمارا اس پر۔ اب اگر پھل کھانے کا وقت آیا ہے تو اس کی نادانی کی وجہ سے

ہم اسے چھوڑ دیں۔ بچہ ہے' دنیا کی سمجھ نہیں اسے۔ اتنی شاندار نوکری کر رہا ہے شہر میں' مجھے جلیل نے بتایا تھا۔ ہم نے بیٹیوں کا بھی آگے کچھ کرنا ہے۔ ان حالات میں تو دال روٹی محال ہو رہی ہے۔ آپ ایک بار پیار سے اسے سمجھائیں گے تو سمجھ جائے گا۔ پہلے بھی صرف آپ کی بات مانتا تھا۔"

رابعہ بی بی پست آواز میں منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ نگاہوں میں التجا تھی۔

"بس یا تم نے اس خبیث کی حمایت میں مزید بکواس کرنی ہے؟"

طیش سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ رابعہ بی بی اپنی زبان دانتوں تلے دبا کر سر جھکائے تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔ نظریں مصلے پر بنے خانۂ خدا کے عکس پر تھیں۔

ان کے جھکے سر کو دیکھ کر صوفی صاحب نے بھی مزید کچھ نہ کہا۔

"یہ عبدالمبین اب کیوں آیا ہے؟" کچھ دیر بعد انہوں نے خود ہی پوچھا۔

"امتحان دے رہا ہے اس نے بھی دسویں کے۔ بہنوں کے ساتھ ہی دے گا' دو دن تو رہ گئے ہیں"

"اچھا... وہ پاس کرے گا۔ اسے پڑھنے لکھنے کی تمیز ہے یا علم سے کچھ شغف۔ مدرسے میں تو میرا منہ کالا کروا دیا ہے نا' میں اس کے قاری عبدالحفیظ سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہا۔ وہ بھی کہتا ہوگا' صوفی عبدالرحمٰن کا فرزند اور ایسا نالائق' ناخلف۔ بے ادب' قرآن کو رستے میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ میں تو اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔" وہ غصے سے بولے۔

"آپ ناحق خود کو پریشان کرتے ہیں۔ وہ کہہ تو رہا ہے' امتحان دیتے ہی مدرسے سے چلا جائے گا۔ بائیس دن کا تو امتحان ہے۔ وعدہ کیا ہے اس نے مجھ سے۔ اب تو خوب دل لگا کر پڑھ رہا ہے۔ ایک سند تو ہاتھ آ جائے گی۔ کچھ نہ کچھ تو کرنے لگے گا۔" وہ بیٹے کی حمایت میں بولیں۔

"یہ بھی تم مجھ سے لکھوا لو وہ نحوست ڈگری بھی کبھی زندگی میں حاصل نہیں کر سکتا۔ حفظ میں تین سال برباد کیے۔ کچھ حاصل نہ کر سکا۔ اس جیسے نالائق زندگی میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔" وہ طنز سے بولے۔

"یہی تو وہ کہہ رہا تھا۔ اگر تین سال پہلے وہ میٹرک کا امتحان دے لیتا تو آج تیرہویں کے پرچے دے کر فارغ ہو چکا ہوتا۔" وہ فوراً بولیں۔

"دیکھا نہیں آپ نے ماشاءاللہ بڑا بڑا لگتا ہے۔ اتنا تو قد کاٹھ نکالا ہے اس نے۔ قد میں تو یہ عبدالمتین کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ آپ تو نظر بھر کر نہیں دیکھتی اسے۔" وہ جیسے فخر سے کہہ رہی تھیں۔

"ہاں یہی تو کمال کیا ہے اس نے' ان برسوں میں سوائے بڑھنے کے۔ تین سال پہلے تو اسے نویں دسویں پہاڑ لگ رہی تھی' اسکول سے روز بھاگ جاتا تھا۔ تم مجھ سے لکھوا لو' یہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کم از کم شرفا والا کوئی اچھا بہتر کام۔"

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں صوفی صاحب! مایوسی کفر ہے۔" انہوں نے جیسے یاد دلایا۔

"یہ مقولہ اس جیسے خبیث کے لیے نہیں ہے۔" وہ بے نیازی سے بولے تو رابعہ بی بی نے بحث ترک کر دی۔

"وہ رشتے والی ماسی دوبارہ تو نہیں آئی؟" چند لمحوں بعد انہیں خیال آیا۔

"نہیں۔"

"اب کے آئے بھی تو اسے منع کر دینا۔ ہمیں اس کے اوٹ پٹانگ لائے گئے رشتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"جی اچھا... اور اب آگے کیا سوچا ہے آپ نے۔ دونوں میٹرک تو اب کر ہی لیں گی۔ دونوں کی تیاری اچھی ہو گئی ہے۔ جویریہ بھی ساتویں پاس کر کے آٹھویں میں چلی جائے گی۔ تینوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک جتنی لگنے لگی ہیں۔ گھر ایکدم سے بھرا بھرا لگنے لگا ہے۔ یہ گھر چھوٹا ہے' شاید اس لیے۔" انہوں نے خود ہی توجیہہ گھڑی۔

"زینب سے تو میں وعدہ کر چکا ہوں۔

"کیساوعدہ۔" وہ حیرانی سے ان کی شکل دیکھنے لگیں۔

"اس نے دو سال کالج میں پڑھنے کا وعدہ لیا تھا مجھ سے۔"

"کالج کی پڑھائی کا خرچہ بھلا کہاں سے پورا ہوگا؟" وہ حیرت سے بولیں۔

"اللہ مالک ہے۔"

"اللہ تو مالک ہے۔ پر روزی کو گھر کی دہلیز تک لانے کے لیے ہاتھ پیر بھی تو مارنے پڑتے ہیں۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں' میرا تبادلہ کسی گاؤں میں ہو جائے۔ وہاں کم از کم دالیں چاول مفت نہ سہی' سستے داموں مل جاتے ہیں۔ چلو یہ بعد کی بات سہی' فی الحال میں نے بچوں کو قرآن پڑھانے کا انتظام کیا ہے۔ اس سے کچھ رقم آجایا کرے گی۔ کم از کم دونوں کی فیس نکل آیا کرے گی۔"

"کتنی رقم مل جائے گی بھلا۔ دو سو' تین سو۔" وہ مایوسی سے بولیں۔

"امیر گھرانے کے بچے ہیں۔ زیادہ دیں گے۔ شام کو عصر کے بعد جایا کروں گا۔ دیکھو اگر دو تین ٹیوشنز اور بھی مل جائیں تو۔" وہ خاصے پُرامید نظر آرہے تھے۔

"صوفی صاحب! دونوں میٹرک کرلیں گی تو کالج میں پڑھانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ ایک آدھ سال میں ہو ہی جائیں گے دونوں کے رشتے۔ اللہ کا نام لے کر ان کے ہاتھ پیلے کردیں۔"

"رشتوں کا حال تم دیکھ ہی چکی ہو رابعہ بی بی! اور جب تک کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملتا' اس وقت تک یہ کچھ پڑھ لیں۔ کوئی ڈگری' کوئی ہنر ان کے ہاتھ آجائے گا تو مجھے فکر نہ رہے گی۔ بھائیوں کے تیور تم دیکھ ہی چکی ہو۔ ان سے تو تم کوئی امید نہ رکھو۔ دونوں انٹر کرلیں گی۔ دو سال تو لگیں گے شاید۔ اس دوران کوئی اللہ کی رحمت ہو جائے' کوئی اچھا رشتہ مل جائے' وقت بھی ضائع نہ ہوگا ان کا۔ اور ذہن بھی درست سمت میں لگا رہے گا۔ علم سے بڑھ کر کون سی اچھی مصروفیت ہے۔" صوفی صاحب کی منطق رابعہ بی بی کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

"اچھا وہ جلیل سے کہیں' اگر اوپر کی چھت تو صاف کر جائے۔ عنبرین چھوٹی ہیں۔ میں لڑکیوں کو اوپر نہیں بھیجتی اور رات کو جھاڑو دینا اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا کہہ دوں گا۔ ویسے میرا خیال ہے' اسے بھی بخار ہو رہا ہے۔"

"بخار؟" رابعہ بی بی پریشانی سے بولیں۔

"بیماری کا نہیں رابعہ بی بی!" وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اسے بھی میٹرک کے امتحان کا بخار ہوا ہے۔ اسی کے دن رات رٹے مارتا رہتا ہے۔ چلو اس کا تو فائدہ ہے' چار حرف پڑھ لے گا تو کہیں چپراسی کلرک تو لگ ہی جائے گا' اس لیے میں نہیں روکتا ٹوکتا اسے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے' ہمیں اور کیا چاہیے۔" وہ اٹھ کر عمامہ درست کرنے لگے۔ اذان کا وقت ہو چلا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" رابعہ بی بی نے سراہایا۔

"یہ عبدالمبین کہاں سوتا ہے؟" وہ باہر جاتے جاتے دہلیز پر رک کر بولے۔

"باہر برآمدے میں چارپائی بچھا دیتی ہے زینب اندر تو کمرے میں بمشکل تینوں کے بستر آتے ہیں۔"

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر باہر نکل گئے۔ "بچیوں کو اٹھا دو' نماز کا وقت ہو چلا ہے۔"

حالانکہ کمرے میں جگہ تھی مگر اماں بی نے خود ہی ان تینوں سے کہہ دیا تھا کہ عبدالمبین کا بستر باہر ہی لگاتا۔ صوفی صاحب کی شکی طبیعت سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ وہ تو جوان ہوتے بہن بھائی کے رشتے میں بھی بہت سختی کے قائل تھے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔ بھئی! حد ہو گئی' صبح سے تین بار فون کر چکی ہوں' کوئی اٹینڈ ہی نہیں کر رہا۔ کل سے یہ جتاں بی بی نے ایک ہی گردان لگا رکھی ہے۔ فلائٹ لیٹ ہے' فلائٹ لیٹ ہے۔ جیسے اس نے اڑا کر لانا تھا جہاز اور جہاز بھی اس کی طرح بوڑھا اور سٹھیایا ہوا۔"

عفت آرا کی پاٹ دار آواز سے لاؤنج میں بیٹھے تینوں نفوس ٹھٹک سے گئے۔ ابھی رعنا نے فخر حیات کی فرمائش پر کافی کے تین کپ بنا کر بیٹھی تھی۔ ناشتا کیے انہیں کچھ ہی دیر گزری تھی۔

رعنا اٹھ کر بھاوج سے گلے ملنے لگی۔ فخر حیات نے بھی اٹھ کر نواز بھائی سے معانقہ کیا۔

"یہ فرزین ہے' پہچانا تم نے۔ رات سے ضد لگا رکھی تھی پھپھو سے ملنے میں ضرور جاؤں گی۔ باقی دونوں تو بڑی ہو گئی ہیں۔ ویسے بھی بڑی تو ماشاء اللہ اسکول میں پڑھانے جاتی ہے۔ دوسری کو کالج جانا تھا' عفان بھی اسکول گیا ہے' تینوں دوپہر تک آجائیں گے۔ اس نے آج چھٹی کرلی' پھوپھی کی چاہ میں۔" عفت آرا نے سمٹی شرمائی سترہ اٹھارہ سال کی فرزین کو رعنا کے آگے کیا۔ رعنا نے ہاتھ بڑھا کر پیار سے اسے سینے سے لگالیا۔

"ماشاء اللہ فرزین تو بہت بڑی ہو گئی ہے۔" رعنا نے بھتیجی کو غور سے دیکھا۔

"ہاں تو فرسٹ ایئر میں ہے۔ چار چھ مہینے بعد سیکنڈ ایئر میں چلی جائے گی....."

اسی وقت عفت آرا کی نظر اندر آتے سیفی پر پڑی۔ ان کی چلتی زبان جیسے یک بیک تھم سی گئی تھی۔

"ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ۔ یہ..... سیفی ہے نا سفیان۔" وہ جیسے کسی سحر کے تحت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔

سیفی بھی مہمانوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"رعنا! یہ سیفی ہے نا؟"

عفت آرا نے عجیب سے لہجے میں رعنا سے تصدیق چاہی اور پھر رعنا کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ کر سیفی کو اپنی باہوں میں لے لیا۔

"کتنا سوہنا' کتنا جوان نکل آیا ہے ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ۔ نظر بد سے اللہ بچائے۔ تصویروں میں تو اتنا بڑا نہیں لگتا تھا۔"

"یہ تمہاری ممانی ہیں سیفی! پہچانا تم نے۔" رعنا جو عفت آراء کے انداز پر کچھ ہراساں سی کھڑی تھی' سنبھل کر بولی۔

"آداب مامی جی!" اس نے کچھ شرما کر کہا۔ عفت آراء کے اتنے پیار بھرے انداز پر وہ کچھ شرما سا گیا تھا۔

"تمہارے ماموں نواز!" رعنا نے اس کا بازو پکڑ کر نواز کے سامنے کیا۔ نواز نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور پھر گلے سے لگالیا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی تھی۔ فخر حیات نظریں چرا کر سامنے دیوار پر لگی مونالیزا کی پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگے۔

"سیفی! یہ فرزین ہے' تمہاری سب سے چھوٹی کزن۔ جب ہم ادھر سے گئے تو یہ چھوٹی سی تھی۔" رعنا نے تقریباً کھینچ کر سیفی کو نواز سے الگ کیا اور فرزین کے سامنے کھڑا کر دیا جس نے جھجکتے ہوئے سلام کیا تھا۔

"سلام سیفی بھائی!" اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ سیفی کی آنکھوں میں پرجوش چمک ابھری تھی اور ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ۔ وہ بھرپور نظروں سے فرزین کا جائزہ لے رہا تھا۔

"جتاں! ابھی جلدی سے کچھ تواضع کو لاؤ۔ بھابھی اور بھائی آئے ہیں' تم کدھر کونے کھدرے میں چھپ جاتی ہو کام کے وقت۔" رعنا کی اونچی آوازوں نے جیسے سب کو ہوش دلا دیا۔ عفت آراء بغور نظریں گھما گھما کر پورے گھر کا جائزہ لینے لگیں۔ نواز' فخر حیات کا احوال پوچھنے لگے۔ فرزین ماں کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ سیفی نے اس کے سامنے ہی صوفہ سنبھال لیا تھا۔ وہ ابھی بھی میٹھی میٹھی نظروں سے فرزین کو دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ لوگ شام تک ادھر ہی رہے۔ عفت آراء کی باتیں تو یوں بھی تمام ہونے والی نہ تھیں۔ فخر حیات دو گھنٹوں کے لیے اٹھ کر باہر گئے تھے۔ دوپہر کو لنچ سے پہلے عفت آراء کی دونوں بڑی بیٹیاں اور بیٹا عفان بھی آگیا تھا۔ رعنا کا پروگرام بھی اس روز اپنی پرانی احباب سے ملنے جانے کا تھا مگر مہمانوں کی وجہ سے اس نے اپنا پروگرام کل پر رکھ دیا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے وہ لوگ شام سات بجے رخصت ہوئے۔ وہ بھی نواز بھائی کو کوئی ضروری کام تھا' ان کے تین

فون آگئے تھے۔ اگرچہ عفت آراء کا ابھی ارادہ نہیں تھا۔

"اچھا بھئی! اب پرسوں سنڈے کو ہمارے ہاں دعوت ہے' دوپہر اور رات کا کھانا۔ آپ لوگوں نے ضرور آنا ہے۔" عفت آراء اور نواز نے جاتے سمے بڑے اصرار سے انہیں دعوت دی۔

"نہیں نواز بھائی! صرف رات کو ہم آسکیں گے۔ مجھے تو ابھی ادھر بہت کام ہیں۔ سنڈے کو بھی آف نہیں کرسکتا۔ ہاں ڈنر میں آجائیں گے اور اگر میں نہ آسکا تو میری پیشگی معذرت قبول کرلیجئے گا پھر کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔"

فخر حیات نے سلیقے سے اپنی معذرت پہلے ہی پیش کردی۔ وہ محض ایک کھانے کے لیے عفت آراء کی بے سروپا گفتگو سے اپنا بھیجا خالی نہیں کروانا چاہتے تھے۔

"نہیں' یہ کیا بات ہوئی۔ وہ بھی صرف ڈنر اور آپ نے آنا نہیں۔" عفت آراء کو بحث کے لیے موضوع مل گیا۔

اوکے بھابھی! ہم دیکھیں گے انشاءاللہ ضرور پہنچیں گے۔ آپ انوائٹ کریں اور ہم نہ آئیں ایسا تو نہیں ہوسکتا نا۔ ہمارا آپ کے سوا قریبی رشتہ دار اور کون ہے۔ فخر بھی آئیں گے ہمارے ساتھ انشاءاللہ۔ کیوں فخر!" رعنا نے بحث کو جلدی سے سمیٹا۔

"بالکل' کیوں نہیں۔" فخر حیات نے یونہی سرہلا دیا تو عفت آراء اور نواز دوبارہ تاکید کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فخر حیات کا ڈرائیور انہیں چھوڑنے جارہا تھا۔

"اوکے پریٹی گرل! بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔" "انتظار کروں گا؟"

پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھتی فرزین سے سیفی نے ہولے سے ہنس کر کہا تھا۔ وہ جلدی سے شرما کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رعنا نے ایک نظر بیٹے کے بشاش چہرے کو دیکھا اور دوسری نظر فرزین کے سرخ گلال چہرے پر ڈالی۔ رعنا کے اندر عجیب سی بے چینی کلبلانے لگی تھی جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔ اس نے یونہی سر گھما کر فخر حیات کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر لکھی بیزاری دور سے پڑھی جارہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی کنپٹی دبا رہے تھے۔ سیفی البتہ بہت خوش تھا' نامعلوم کیوں؟

"مما! فرزین اچھی لگی نا آپ کو' ہے نا پیا! شی از پریٹی' اور کتنی معصوم سی ہے۔ نا مما!" وہ اپنی رو میں کہے جارہا تھا۔ "مجھے وہ بہت اچھی لگی ہے مما! اب مجھے لگتا ہے میرا پاکستان میں دل لگ جائے گا۔"

ڈنر کے لیے وہ تینوں بیٹھے کھانا کھارہے تھے۔ جب سیفی نے بے اختیار کہنا شروع کیا۔ فخر حیات کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور رعنا کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر پلیٹ میں گرگیا۔ اس نے انتہائی خوف زدہ نظروں سے فخر حیات کی طرف دیکھا جو خود گنگ بیٹھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پانی کا جگ لاتی جنتاں کے ہاتھ سے جگ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ البتہ ڈھیر سارا پانی چھلک کر اس کے کپڑے اور قالین کو بھگو گیا تھا۔ وہ بھی حیران نظروں سے سیفی کے خوش باش چہرے اور بے فکرے انداز کو دیکھ رہی تھی۔ سیفی کی باتوں نے جیسے اس کے پیروں تلے سے بھی زمین نکال دی تھی۔

● ● ● ● ● ●

"پچاس پچپن سال آزادی کے گزارنے کے باوجود میں سمجھتی ہوں بلکہ ہماری قوم کا ہر باشعور فرد یہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد نہیں۔ معاشی ابتری' اخلاقی گراوٹ اور اخلاقی قدروں کی پامالی نے ہم سب کی ذہنی آزادی کو سلب کررکھا ہے۔ دوسری قوموں نے جس تیزی سے ترقی کی ہے اور کررہی ہیں ہم محض جاہلانہ انداز میں گردن اٹھائے یا تو انہیں حیرت اور حسرت سے دیکھ رہے ہیں یا پھر ان کی تہذیب کے تمام تر منفی اثرات کو بڑے بے ڈھنگے طریقے سے اوڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اور اس کوشش میں شاید اپنی ہنسی بھی اڑوا رہے ہیں مگر ہمیں

احساس نہیں۔" رعنا فخر حیات نے ایک گہرا سانس لیا۔

"ہمیں احساس نہیں کہ اس وقت ہم اقوام عالم سے تعلیمی' تہذیبی' اخلاقی' معاشی اور اقتصادی طور پر کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں۔

زندگی کی اذیت ناکی کی یہ ہولناک تصویر آپ روز اخبارات میں دیکھتے ہیں۔ آئے دن خودسوزی کے کیسز ہمارے معاشرے کے بے انصاف طبقاتی فرق کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ معاشی بدحالی نے عوام کو بے حال کررکھا ہے تو ہمارے حکمرانوں کو اپنے عیش و عشرت سے فرصت نہیں وہ ہاتھ اٹھائے ایک ہی سلوگن الاپ رہے ہوتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ کیا آپ کے خیال میں سب ٹھیک ہے۔؟" اس نے سوالیہ نظروں سے جہازی سائز ٹیبل کے دونوں اطراف بیٹھی کچھ بیزار کن شکلیں لیے بور ہوتا طبقے کی نزاکت پسند خواتین کو دیکھا۔

"یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں اور نہ ہو پارہا ہے۔ بہت کچھ ٹھیک کرنے کے چکر میں بہت کچھ بگڑتا جارہا ہے' بکھرتا جارہا ہے' حکمران بے نیاز ہیں۔ عوام کی حالت سے اور عوام بے حسی کی انتہاؤں سے گزر رہے ہیں۔ حکومت کوئی سی بھی ہو کسی کی بھی ہو وہ ہمارے ساتھ کچھ بھی کر گزرے یا کر گزرنے کے عزائم رکھتی ہو۔ ہمیں اس سے ذرا بھی غرض نہیں۔

ہماری حالت تو ان بوجھ ڈھونے والے گدھوں کی سی ہوچکی ہے جنہیں صرف بوجھ ڈھونے سے غرض ہے۔ ان کا مالک کون ہے کوئی چور ٹھہرایا سادھو انہیں اس سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا۔

میری ان تمام خشک باتوں کا مقصد آپ کو حالات حاضرہ سے باخبر کرنا نہیں۔ وہ تو آپ لوگ آئے دن نیوز پیپرز میں پڑھتی ہی رہتی ہیں۔ میرا مقصد آپ کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنا اور اس سنگینی کو کم کرنے کے لیے اپنا کردار طے کرنا ہے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں اس پلیٹ فارم پر' جس کے تحت ہم سب آج یہاں جمع ہیں۔

میں نے پانچ چھ سال بیرون ملک گزارے۔ صرف ایک ملک میں نہیں ہمارا قیام دنیا کے ترقی یافتہ چار پانچ ملکوں میں رہا وہاں میں نے ایک ہی بات نوٹ کی۔ ان لوگوں کی علم سے محبت اور تعلیم سے لگاؤ۔ اور یہی وجہ ہے جس نے انہیں دنیا بھر میں سربلند کررکھا ہے۔ وہاں تعلیم عام ہے اور مفت ہے۔ قوم کا ہر فرد پڑھا لکھا باشعور ہے۔ اپنے مقام اور حکومت کے فرائض سے بخوبی آگاہ ہے۔ اعلا طبقے کی ایک بھی لغزش ان کی تیز نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکتی اور ہمارے یہاں علم سے دوری اور جہالت نے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کردیا ہے کہ ہم غیروں سے کیا اپنوں سے بھی سر اٹھا کر بات نہیں کرسکتے۔

ہماری ترقی کا صرف ایک ہی زینہ ہے۔ ایک ہی رستہ ہے کہ ہماری قوم کا ہر فرد باعلم' باہنر ہوجائے' ہمیں ترقی کے حصول کے لیے مغربی اقوام کے اوٹ پٹانگ فیشن اور منفی رویوں کو اپنانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ آپ لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔؟"

رعنا نے بالآخر اپنی بات کو سمیٹا کیونکہ بیگمات کے چہرے خاصے بیزار ہوچکے تھے۔

"بہت اچھا جائزہ پیش کیا رعنا! آپ نے' مجھے خوشی ہوئی ہے آپ کے خیالات جان کر میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ ہم اپنی قوم کی ترقی میں کوئی رول پلے کریں۔ جو کچھ اور جتنا ہماری رینج اور تنظیم کے دائرہ کار میں ہوسکتا ہے' کیونکہ صرف فیشن ورک' سیاستدانوں کے ساتھ میٹنگز میں خواتین کے مسائل پر بات کرنا' تصاویر اتروانا' اسکولوں کی تقریبات کا افتتاح کرنا یا کسی چھوٹی موٹی عمارت کے مکمل ہونے پر فیتہ کاٹنے سے ہم کوئی بھی مثبت کام نہیں کررہے' صرف ایک این جی او بنانے سے یا مہینے میں دو چار بار اس کی میٹنگز کرلینے سے معاشرے میں کوئی فعال کام نہیں کررہے۔ اس سلسلے میں رعنا اگر آپ کے ذہن میں کوئی پلان ہو۔؟"

مسز سرفراز آج کل ان کی این جی او کی صدر تھیں۔ خاصی پڑھی لکھی سلجھی ہوئی اور سنجیدہ خاتون تھیں' رعنا کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے بولیں۔

"پلان تو یہی ہے جو میں ذکر کرچکی ہوں' تعلیم کا پھیلاؤ' پورے معاشرے میں تعلیم کو عام کرنا' شہروں کی بات

رہنے دیں' شہروں میں تو پہلے ہی بے تحاشا انگلش میڈیم اور سرکاری اسکول موجود ہیں' امراء کے لیے علیحدہ اور عوام کے تین چار طبقوں کے لیے علیحدہ' ہماری تو تعلیم بھی بٹی ہوئی ہے۔ ہماری طبقاتی فکر کی طرح میں دیہات اور ان کے قرب و جوار کا ذکر کر رہی ہوں' شہروں کی تو کوئی سڑک جو کسی افسر کے گھر کے آگے سے گزرتی ہے تو وہاں سے گزرنے والے افسر پریشان ہو جاتے ہیں اور اکثر شام سے پہلے اس سڑک کی تعمیر نہ سہی اس پر پیوند ضرور لگ جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں کی بات آپ رہنے دیں۔"

"میں تو دور دراز علاقوں......"

"اف اس قدر گرمی میں اور دور دراز کے علاقے؟ مسز حیات! آپ کو معلوم ہے چند دنوں تک کیسی غضب ناک گرمی پڑنا شروع ہو جائے گی۔ اور پھر چھ ماہ تک الامان' بندہ اے سی سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔" سب سے زیادہ نازک مزاج' نازک بدن اور نازک خیالات کی مسز خالد تڑپ کر بولیں۔ کئی چہرے مسکرا اٹھے تھے۔

"ہوں گرمی! گرمی تو بہت صدیوں سے جھیل رہے ہیں مسز خالد! اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تو کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ آنے والے اچھے دنوں کے لیے ہم چند سال کے لیے اس موسمی تغیر کو ذہن سے نکال دیں۔" مسز سرفراز نے کچھ سنجیدگی سے کہا تو مسز خالد نے کچھ ناگواری سے اپنے قریب پڑی منرل واٹر کی بوتل اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلنا شروع کر دیا۔

"میرا خیال ہے' اب کچھ پریکٹیکل باتیں ہو جائیں۔ رعنا کی تجویز اچھی ہے' ابھی بھی اس ملک میں ایسے دیہات کی کمی نہیں جہاں ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کام باقی ہو' عائشہ محسن' فرخندہ جبیں اور مسز وحید آپ تینوں کے ذمے یہ کام ہے۔ ایک ہفتے کے اندر لاہور کے ارد گرد جتنے بھی دیہات ہیں۔ آپ وہاں سروے کرائیں کہ کہاں کہاں ہماری ضرورت ہے۔ ہم اپنا کام شروع کریں اور اگر سروے والا یہ کام بقول مسز خالد کے شدید گرمی شروع ہونے سے پہلے مکمل ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔" مسز سرفراز نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے میری بھی ایک تجویز ہے۔" مسز وحید بولیں۔

"جی کہیے۔"

"ہم ایک ماڈل اسکول بنائیں گے' وہاں تین شفٹیں ہونی چاہییں مارننگ میں بچوں کی کلاسز دوپہر میں عورتوں کی کیونکہ عورتیں اس وقت عموماً فارغ ہوتی ہیں اور شام میں مردوں کی' کیا خیال ہے......؟"

"اچھا آئیڈیا ہے مگر یہ تو بہرحال بعد کی بات ہے' پہلے تو آپ سروے کریں پھر ہمیں ادھر زمین اور اسکول کی بلڈنگ اگر کوئی بنی بنائی مل جائے تو اچھا ہے۔ اور ہماری ممبر ذاتی صاحب ثروت تو ہیں کہ دو چار اسکول بنوا سکیں کیا خیال ہے آپ لوگوں کا......؟"

"شیور' شیور ہم تو خود کام کرنا چاہتے ہیں' اپنی انرجیز اپنے لوگوں کی سروس میں لانا چاہتے ہیں۔ اپنے لوگوں کے کام آ کر ہمیں خوشی ہوگی۔" فرخندہ جبیں جوش سے بولیں۔

"بہت اچھی بات ہے۔ اگلی میٹنگ ایک ہفتے بعد ٹھیک اسی وقت ہوگی۔ اس دوران آپ تینوں اپنا سروے مکمل کر لیں۔" کہتے ہوئے مسز سرفراز نے بات ختم کی تو سب خواتین کرسیاں پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر نے کیس تو نارمل ہی کہا ہے نا' کوئی پیچیدگی تو نہیں......؟" جیسے ہی صالحہ شاہ' سلطان بخت کے برابر گاڑی میں آ کر بیٹھیں تو سلطان بخت نے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا اور ساتھ ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"ہوں ویسے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ابھی تو نارمل ہی ہے ویسے بھی ابھی تو تین چار ماہ ہیں' ڈاکٹر کہہ رہی تھیں ابھی فی الحال کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اب ہم کدھر جا رہے ہیں' حویلی......؟"

"نہیں "سید ہاؤس" ویسے میں سوچ رہا تھا کیوں نہ ہم اپنے بچے کی ڈلیوری لندن میں کروائیں' ایک تو اسے

وہاں نیشنیلیٹی مل جائے گی۔ دوسرے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوگی' میرا مطلب ہے کیس سے متعلق......" سلطان بخت بہت احتیاط اور کم رفتار سے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت تو نہیں' ویسے بھی اس آئیڈیے کے لیے کم از کم سیدہ بھابھی نہیں مانیں گی۔" صالحہ شاہ اپنی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولیں۔

"آپا کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں انہیں منا سکتا ہوں۔ ویسے بھی یہ آپا کا نہیں ہمارا مسئلہ ہے۔ بچے کی سیفٹی اور بہتری کے لیے ہم جو بھی فیصلہ کریں' انہیں اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں' تم ان کی فکر مت کرو۔ اپنا خیال بتاؤ۔"

صالحہ شاہ نے کچھ مسکراتے ہوئے حیران نظروں سے اپنے اکھڑ شوہر کی طرف دیکھا۔ چند ماہ میں وہ کس قدر بدل گئے تھے۔ اگر یہ تبدیلی صرف آنے والے کی مرہون منت تھی تو صالحہ شاہ کے دل کی خوشگوار دھڑکنیں ایک ہی دعا کر رہی تھیں کہ ننھے مہمان کی آمد کا سلسلہ دراز سے دراز ہوتا چلا جائے۔

"میرا تو خیال ہے اس کی ضرورت نہیں' اب تو ہمارے اپنے ملک میں میڈیکل کے ہر شعبے میں بہت ترقی ہو چکی ہے۔ پھر آپ کو کیا کمی ہے' آپ کی ایک کال پر ڈاکٹرز کی لائن لگ سکتی ہے......"

"معلوم ہے مجھے مگر گاؤں کی ننانوے فیصد عورتوں اور حویلی کا وارث پیدا کرنے والی صالحہ شاہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" سلطان بخت کے جملے نے گویا صالحہ شاہ کو ہواؤں میں اڑا دیا۔ اسے لگا وہ دنیا کی پہلی معتبر عورت ہیں جو یہ معرکہ انجام دینے جا رہی ہیں۔

"آپ اس قدر رجی اپنے بچے کے بارے میں ہیں یا میرے بارے میں......؟" کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ بولیں۔

"دونوں کے بارے میں۔" سلطان بخت کی نظریں سڑک کی ٹریفک سے ایک پل کو ہٹیں اور صالحہ شاہ کو محبت بھری میٹھی مسکان سے دیکھا ان کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"ایک بات کہوں صالحہ!" گردن موڑ کر سلطان بخت نے بہت آہستہ گمبھیر آواز میں کہا۔

"کیا......؟" صالحہ کی آواز جیسے گہرائی سے آئی۔

"تم آج کل بہت خوبصورت ہو رہی ہو بہت حسین کہ میری نظریں تمہارے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ سکتیں۔" انہوں نے بہت آہستگی سے اپنے بائیں ہاتھ میں ان کا خوبصورت ڈائمنڈ رنگز سے سجا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

"مجھے کیا پتا۔" وہ بری طرح سے بلش کر گئی تھیں۔ بمشکل پلکیں اٹھا کر بولیں۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے ایکسیڈنٹ کروائیں گے کیا؟" انہوں نے ان کی توجہ سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کی طرف دلائی۔

"شاید آج ایکسیڈنٹ ہو ہی جائے۔" وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر ہونٹوں میں بڑبڑائے۔

"ایک بات کہوں۔" وہ چند لمحوں بعد خود پر قابو پا کر بولیں۔

"یس' کہو۔" وہ فراخدلی سے بولے۔

"آخر آپ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ میں سیکس انکوائر کیوں نہیں کرتے......؟" وہ جھجک کر بولیں۔

"کیونکہ مجھے یقین ہے ہمارے ہاں بیٹا ہی ہوگا۔ تمہاری کوکھ میں اس حویلی کا وارث ہے' میرا دل پکار پکار کر مجھ سے کہہ رہا ہے' کیا تمہیں یہ پکار سنائی نہیں دیتی۔" سلطان بخت پر یقین لہجے میں بولے۔

"لیکن اگر......"

"پلیز' اس وقت کوئی نیگیٹو بات نہیں کرنا۔ میرا موڈ بہت اچھا ہے۔" انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ بے ساختہ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔

"تمہیں معلوم ہے نا' ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی پیدائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ تمہارے بابا اور میرے

بابا دونوں بھائی تھے اور ان کے بابا اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے۔ صرف آپا اور شہرینہ پانچ نسلوں کے بعد دو بہنیں اکٹھی ایک گھر میں پیدا ہوئیں ورنہ تو یہ خاندان بیٹیوں کا ترسا ہوا ہے۔ اسی لیے تو بابا جان آپا کو مجھ پر بھی فوقیت دے جایا کرتے تھے اور مجھے شہرینہ اسی وجہ سے پیاری ہے۔ اب اس موضوع پر اور کچھ نہ کہنا اور نہ سوچنا کیونکہ اکثر بری سوچیں کبھی کبھار مجسم ہو کر آجاتی ہیں۔ ہمارے ڈر اکثر سچ ثابت ہو جاتے ہیں تم اچھی سوچ رکھو۔ خوبصورت صحت مند بیٹے کے بارے میں سوچو جیسی خوبصورت ڈھیر ساری تصاویر میں نے بیڈ روم میں سجا رکھی ہیں۔"

وہ اب مزید اس موضوع پر کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں اس لیے چپ ہو گئیں۔

"تو پھر ہمیں ڈلیوری کے لیے شہر آنا پڑے گا۔ پھر حویلی میں ہی سارا انتظام......" سلطان بخت بہت ایکسائیٹڈ ہو رہے تھے۔ جیسے کل ہی ولادت متوقع ہو۔

"پلیز سلطان بخت! ابھی تو بہت ٹائم باقی ہے۔ اس پر پھر بات کریں گے۔ ویسے بھی وہی ہو گا جو سیدہ بھابھی فرمائیں گی۔" آخر میں وہ کچھ تلخی سے بولیں۔

"پھر وہی سیدہ بھابھی!" سلطان بخت نے تنگ کر کہا۔ گاڑی "سید ہاؤس" کے عالیشان گیٹ کے آگے کھڑی ہارن بجا رہی تھی۔ چوکیدار نے بہت پھرتی سے گیٹ کھولا تھا۔

"واؤ! بہت زبردست، بہت آرٹسٹک گھر ہے، یہ تو محل لگتا ہے۔" صالحہ شاہ گاڑی سے اتر کر توصیفی نظروں سے اپنے سامنے کھڑی سید ہاؤس کی خوبصورت عمارت کو دیکھ کر بولیں۔

"تمہیں اچھا لگا گھر؟" سلطان بخت نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت...... بہت زیادہ۔" وہ پورچ سے آگے نکل آئے تھے۔

"بابا جان نے بہت شوق سے بنوایا تھا، آرکیٹیکچر ترکی اور اٹلی سے بلوائے تھے انہوں نے اس زمانے میں اس گھر پر دس کروڑ کی لاگت آئی تھی۔ ابھی اندر سے دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔" وہ فخر سے بتا رہے تھے۔

"اسی لیے آپ اسے سیل کرنا چاہ رہے تھے۔ اتنا خوبصورت گھر کسی کے خوابوں سے بھی حسین، میں تو کبھی اس کو سیل کرنے کا بھی سوچوں۔" صالحہ کچھ ناراضی سے گویا ہوئیں۔ بڑی احتیاط سے سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر انہوں نے کاریڈور میں قدم رکھا۔

"بزنس میں اپ اینڈ ڈاؤن آتے ہی رہتے ہیں۔ بابا جان نے ساری زندگی زمینداری پر اکتفا کیا، میں نے انڈسٹری کے شعبے میں بھی قدم پھنسا لیے۔ دونوں فیکٹریوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر تیسری فیکٹری جب شروع کی تو اس کی مشینری کے لیے مجھے بہت سرمائے کی ضرورت تھی، اس لیے اس کو سیل کرنے کا سوچا تھا۔"

"پھر بھی اس گھر کو کبھی سیل کرنے کا نہ سوچیے گا۔ ہمارے بچے اس گھر میں آ کر کس قدر خوش ہوں گے۔"

"صالحہ! باقی گھر تم صبح دیکھ لینا۔ کافی رات ہو گئی ہے۔ تھک جاؤ گی، چلو بیڈ روم کی طرف چلتے ہیں۔" سلطان بخت نے لاؤنج میں ہی اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاشم! ہاشم......" سلطان بخت نے ملازم کو پکارا۔

"جی شاہ صاحب!" اسی وقت ہاشم تقریباً دوڑتا ہوا آیا۔

"دیکھو گاڑی میں ایک پیکٹ پڑا ہے، گاڑی کی پچھلی سیٹ پر، وہ لے آؤ۔" انہوں نے گاڑی کی چابی اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ چابی لے کر مڑ گیا۔

"یہ بیڈ روم ہے۔" "Gorgeous (شاندار) ونڈرفل۔" "بہت کشادہ، بے حد خوبصورت اور لگژری اسٹائل میں سجے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی صالحہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ابھی تو ہمارا اچانک ادھر آنے کا پروگرام بنا، ورنہ میں اسے تمہارے شایان شان ضرور ڈیکوریٹ کرواتا۔" سلطان بخت اپنے موڈ کی انتہا پر تھے۔

"مجھے تو یہ سب بھی بہت اچھا، بہت زبردست......"

"صاحب! یہ پیکٹ جی۔" ہاشم نے اندر داخل ہو کر پیکٹ انہیں تھمایا اور گاڑی کی چابی دے کر نکل گیا۔

"یہ لو اس کو کھولو۔" انہوں نے پیکٹ صالحہ کو پکڑا دیا اور خود سٹنگ کاؤچ پر جا بیٹھے۔

"اس میں کیا ہے؟" وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"تم کھول کر تو دیکھو۔"

صالحہ دلچسپی اور شوق سے پیکٹ کھولنے لگیں اندرونی خوشی اور اپنی اس درجہ پذیرائی پر ان کا چہرہ گلگوں ہوا جا رہا تھا۔

"ڈائمنڈ نیکلس، زبردست...... یہ...... یہ کس کا ہے؟" روشنیاں ہر رخ سے نیکلس سے پھوٹ رہی تھیں، جو صالحہ کے ہاتھوں میں جگمگا رہا تھا۔

"تمہارے لیے، حویلی کی اکلوتی مالکن اور اس کے وارث کی والدہ محترمہ کے لیے" اور یہ کس لیے ہے" پوچھو ذرا۔" وہ ان کے بہت قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ انگلی سے ان کے سرد گرم رخسار کو ہولے سے چھو کر بولے۔

"کس لیے بھلا۔" ان کے موتیوں جیسے دانت ہونٹوں کی مسکراہٹ کا ساتھ دے رہے تھے۔

"آج تم پہلی بار سید ہاؤس آئی ہو نا اس لیے......"

"اوہ۔" وہ کسمسا کر رہ گئیں۔ چہرہ کچھ اور بھی دہکنے لگا تھا۔ سلطان بخت کی نظریں ان کے چہرے کے آرپار جا رہی تھیں۔

"تھینک یو سلطان بخت! تھینک یو فار دس یونیک ویلکم۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے سلطان بخت کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"موسٹ ویلکم۔" وہ مسکرائے۔

"مجھے خود پر یقین نہیں آ رہا، آپ مجھ سے اس قدر محبت کرنے لگے ہیں۔" وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"کرنے لگے ہیں؟ تو کیا پہلے نہیں کرتا تھا۔" وہ فوراً بولے۔

"نہیں پہلے تو......" انہوں نے فوراً زبان دانتوں تلے دبا لی۔

"وہ تو تم خوامخواہ مجھ سے جھگڑتی تھیں، مجھ پر شک کرتی تھیں۔ اس لیے مجھے بھی غصہ آجاتا تھا۔" انہوں نے جھک کر اپنے جوتے اتارنے شروع کیے۔

"میں جھگڑتی تھی بھلا وہ تو آپ خود......"

"پلیز صالحہ! ان خوبصورت لمحوں کو پھر کسی فضول بحث کی نذر مت کرو۔ مجھے یہ نیکلس پہن کر دکھاؤ۔" انہوں نے سر اٹھا کر انہیں ٹوکا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر نیکلس پہننے لگیں۔

"یہ زحمت تو آپ کو کرنی پڑے گی۔" وہ نیکلس کا کھلا لاک گردن کے پیچھے تھامے کھڑی تھیں، انہوں نے اٹھ کر لاک بند کر دیا۔

"زبردست، بیوٹی فل مائی پریٹی وائف۔" سلطان بخت نے ان کے بائیں کان کی لو کے بہت پاس کہا تھا، ان کے کندھے ان کے بازوؤں کے حصار میں تھے۔

"چھوڑیں نا، مجھے تو دیکھنے دیں۔" وہ اپنا آپ چھڑا کر پیچھے ہٹیں۔ اور خود کو آئینے میں دیکھنے لگیں۔ انہیں لگا نیکلس نے ان کی گردن کو اور حسین بنا دیا ہے۔

"کیا پتھروں میں بھی اتنی طاقت ہوتی ہے جو کسی کو اس درجہ حسین بنا دیں۔" اپنی سجی سنوری گردن کو دیکھتے

ہوئے انہوں نے سوچا۔
"صالحہ! ادھر آؤ۔" انہوں نے اسے بیڈ سے پکارا۔
"جی۔" وہ ان کے پاؤں کے پاس جا کر بیٹھ گئیں وہ نیم دراز تھے۔
"تم سے ایک بات کہنا ہے۔"
"کہیں نا۔" وہ ابھی بھی نیکلس پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔
"میرے دل کی ایک خواہش ہے۔ خوشی سمجھ لو۔" وہ ذرا سا اٹھ کر ان کے قریب ہو گئے۔
"بولیے نا۔" صالحہ پوری طرح سے متوجہ ہو کر بیٹھ گئیں۔
"پتا ہے میری خواہش ہے کہ جب میں اپنے بچے کو پہلی بار دیکھوں تو اسے کوئی ایسا زبردست گفٹ دوں کہ پیدا ہوتے ہی اس کے قدم زمین پر مضبوطی سے جمے ہوں۔"
"کیا مطلب؟" صالحہ نا سمجھی سے بولیں۔
"میں نے ایک کوٹھی دیکھی ہے۔ یہ گھر، حویلی، زمینیں یہ سب تو ہم دونوں کی ہیں نا، وہ کوٹھی صرف اور صرف میرے بیٹے کی ہو گی۔ بہت خوبصورت بہت شاندار سی سید ہاؤس کی طرح۔ اصل میں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایک دوست کو گھر خریدنا تھا۔ اتفاقاً میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے وہ کوٹھی دیکھی اور بس، میرا دل وہیں رہ گیا کہ یہ میں اپنے نومولود بچے کو گفٹ کروں۔ میں سرپرائز دینا چاہتا تھا تمہیں بھی۔ مگر بابا جان کے فیصلے نے مجھے باندھ رکھا ہے۔ ہم دونوں کا جوائنٹ اکاؤنٹ! میں اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اپنے دل کی ننھی سی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتا۔ ورنہ یہ تحفہ میں تمہیں بھی سرپرائز ہی دینا چاہتا تھا مگر کیا کر سکتا ہوں۔" جیسے صدیوں کا ملال سلطان بخت کے لہجے میں امنڈ آیا۔
"تو آپ خرید لیں نا وہ کوٹھی۔ اس میں مسئلہ کیا ہے؟" صالحہ ذرا بھی نہ سمجھیں۔ فوراً بولیں۔
"ڈھائی کروڑ کی ہے وہ کوٹھی اور مجھے صرف پچاس ہزار تک اکیلے سائن کرنے کی اجازت ہے۔ تم بولو میں کیسے اپنے دل کی خوشی پوری کر سکتا ہوں۔" وہ یاسیت سے بولے۔
"اتنی رقم ہو گی اکاؤنٹ میں؟" صالحہ نے پوچھا۔
"صالحہ......!" وہ ناراضی سے بولے۔ "تم نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے؟ اتنی رقم سے تین چار گنا تو شاید اسلام آباد کے اکاؤنٹ ہی میں ہو گی۔ جہاں ہمارا زیادہ کام بھی نہیں ہوتا۔"
"تو پھر آپ نکلوائیں، میں سائن کر دیتی ہوں۔" وہ بغیر کسی حجت کے بولیں۔ سلطان بخت کے چہرے کا رنگ سا بدل گیا۔ انہوں نے فوراً بیڈ کی سائیڈ والی ایک دراز میں سے چیک بک نکالی۔
"ویسے یار! یہ بھی فضول کا ٹنٹا ہے۔ جو بابا جان وصیت کر گئے ہم دونوں کے جوائنٹ سائن کا۔ اب دیکھو نا دو تین ماہ بعد مجھے کس قدر مشکل ہو گی۔ ذرا ذرا سے کاموں کے لیے تمہارے سائن چاہیے ہوں گے اور تم اس کنڈیشن میں...... یہاں سائن کر دو، رقم میں لکھ لوں گا۔" انہوں نے چیک بک اور پین اسے تھما دیا۔
"خیر۔ ابھی تو کچھ مسئلہ نہیں۔" صالحہ نے مسکرا کر سائن کیے اور چیک بک انہیں تھما دی۔
"پھر بھی صرف چھ ماہ کے لیے تم مجھے اٹارنی بنا دو تو اس جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔" وہ مطلب کی بات پر آ گئے۔
"اچھا دیکھیں گے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ بے نیازی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔
حسین شاہ نے اس معاملے میں انہیں سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کبھی سلطان بخت کو اٹارنی بنانے کی حماقت نہ کرنا، اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مار دو گی۔
"میں چینج کر لوں۔" کہتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم میں گھس گئیں۔
"بہت چالاک ہو تم صالحہ شاہ! مگر میرا نام بھی سلطان بخت ہے۔ نہ تمہیں الو بنایا تو میرا نام بدل دینا۔" انہوں

نے اٹھ کر الماری کے اندر کالا کر کھولا۔
"مائی سویٹ نین تارا! ایسا پہلی بار ہو رہا ہے۔ میں اس شہر کی فضاؤں میں ہوں اور تم سے مل نہیں سکتا۔ یہ ظلم بھی تمہاری طرف سے ہے۔ چلو اسی ہفتے میں اس ظلم کا حساب بھی بے باق کر دوں گا۔ بمعہ سود۔" انہوں نے چیک کو بے اختیار چوما اور چیک لاکر میں رکھ کر لاک لگا دیا۔
"آئی رئیلی مس یو۔" ان کے دل سے نین تارا کے لیے ہوک سی اٹھی تھی۔
انہوں نے کپڑے بھی چینج نہیں کیے اور مین لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹ گئے۔
آدھے گھنٹے بعد جب صالحہ ڈریسنگ روم اور واش روم سے فریش ہو کر آئیں تو ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ انہوں نے بلیک نیٹ کی خوبصورت نائٹی کے اوپر بلیک سلکی گاؤن پہن رکھا تھا۔ کھلے بالوں کے ساتھ لائٹ میک اپ اور ان کے بدن سے اٹھتی خوشگوار مہک، انہیں یقین تھا آج وہ سلطان بخت کی تمام تر محبتیں پا لیں گی۔ آج کی رات یادگار ہو گی۔" سوچتے ہوئے مسکراتے لبوں کے ساتھ جب وہ بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو مین لائٹس آف تھیں اور نائٹ بلب کی روشنی میں سلطان بخت بے خبر سو رہے تھے۔ ان کے ادھ کھلے منہ اور نتھنوں سے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔
صالحہ شاہ کے اندر جیسے بے اختیار آگ سی بھڑک اٹھی۔ ان کا جی چاہا اس خوبصورت بیڈ روم کو اس دھوکے باز سمیت آگ لگا دیں اور خود کو بھی اس آگ میں بھسم کر ڈالیں وہ وہیں کاؤچ پر ڈھیر ہو کر سسکنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اور کچھ تو نہیں چاہیے تھا تمہیں۔" جیسے ہی معاذ کیپٹن شہباز کے ساتھ شاپنگ مال سے نکلا انہوں نے مڑ کر اس سے پوچھا۔
"نہیں۔ پہلے ہی آپ نے بہت کچھ ایکسٹرا...... ارے یہ کیا ہے؟"
اس نے جھک کر گاڑی کے پہیے کے پاس گرا والٹ اٹھایا، براؤن کلر کا لیدر کا خوب پھولا پھولا سا والٹ۔
"کسی کا گر گیا ہو گا۔" انہوں نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔
"ادھر ادھر دیکھوں، کسی کا نہ ہو۔" معاذ نے والٹ کھولے بغیر گردن گھماتے ہوئے کہا۔ گاڑیوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ واچ مین پارکنگ لاٹ سے کافی دور کھڑا تھا اور کوئی شخص کچھ ڈھونڈتا ہوا اسے نظر نہ آیا۔
"آؤ بیٹھو گاڑی میں، والٹ کے اندر ہی مالک کا کوئی آئی ڈی کارڈ یا کوئی ایڈریس فون نمبر وغیرہ ہو گا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز پچھلی سیٹ پر رکھے اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔
"ہاں۔ واقعی ایڈریس یا فون نمبر تو اس میں ضرور ہی ہو گا۔" معاذ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کر کے والٹ انہیں تھما دیا۔
"ہوں، خوب موٹی رقم ساتھ لیے موصوف پھر رہے تھے۔" کیپٹن شہباز نے والٹ کی بیرونی جیب میں ہزار ہزار کے نوٹ گنتے ہوئے کہا۔
"تین تھاؤزنڈ اور کریڈٹ کارڈ بھی ہے۔" انہوں نے نوٹ اور کارڈ دوبارہ والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔
"ظاہر ہے شاپنگ کے لیے جو آئے ہوں گے۔ آپ ایڈریس دیکھیں نا۔" معاذ نے تجسس سے والٹ کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔
"تو باقی کی ریسرچ تم کر لو میں گاڑی نکالوں۔" انہوں نے والٹ اسے تھما دیا اور گاڑی ریورس کرنے لگے۔
"ہوں یہ ہے انڈکس اس میں دیکھتے ہیں۔" معاذ نے انڈکس نکالتے ہوئے کہا۔ والٹ گود میں رکھ کر اس نے انڈکس کھولی۔
"کوئی فخر حیات صاحب ہیں اور ایڈریس ہے۔" وہ ایڈریس پڑھنے لگا، ساتھ ہی فون نمبر اور موبائل نمبر بھی لکھا تھا۔

"چلو یہ تو مسئلہ ہی آسان ہو گیا۔ مگر ایسا ہے۔ اس وقت ان کا گھر تو ہمارے روٹ سے کافی ہٹ کر ہے۔ میرا خیال ہے رات کو یا پھر فریش ہونے کے بعد میں نکلوں گا تو دے آؤں گا یا پھر انہیں فون کر کے بلوا لیں گے۔ اب تو بہت تھکاوٹ ہو چکی ہے۔ بس چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ مجھے لنچ کے بعد چائے کی بہت بری عادت پڑ چکی ہے اور ہم کھانا کھاتے ہی گھر سے نکل آئے تھے۔" انہوں نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

شام کے تقریباً چھ بجنے کو تھے' سورج ڈوبنے کو تھا۔ سڑکوں پر گہما گہمی بڑھ چکی تھی۔ بڑے شہروں کی شامیں اور راتیں بہت پر رونق ہوتی ہیں۔ دوپہر کی نسبت سڑکوں پر رش بڑھ چکا تھا۔

"تمہارا پہلا پیپر کب ہے۔؟"

"اگلے ہفتے' منڈے کو۔" اس نے والٹ اٹھا کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

"تمہاری تیاری تو مکمل ہے؟"

"بالکل۔" وہ اعتماد سے بولا۔ "آپ کی چھٹی کتنی رہ گئی ہے۔؟"

"پرسوں صبح نکل جاؤں گا۔ اس ہفتے کا تو پتا نہیں چلا' مصروفیت اس قدر زیادہ رہی۔ ام جان کا مکمل چیک اپ کرایا پھر ان کے وکیل سے میٹنگز' پلازے کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔ اس کی ساری تفصیلات طے کرنی تھیں۔ تم نے دیکھا ہے نا پلازہ۔؟"

"جی ایک دو بار گیا ہوں ام جان کے ساتھ ہی۔"

"معاذ! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا؟" کچھ دیر بعد انہیں خیال آیا تو پوچھنے لگے۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔ آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ ورنہ آج تک تو یتیم خانے میں ہی۔۔۔" اس نے ہونٹ کچلے۔ ان دنوں کی تلخ یادوں نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں بلکہ بہت دفعہ کہ میں کون ہوں؟"

سامنے سیاہ تارکول کی چمکیلی سڑک پر نظریں جمائے اس کی آنکھیں ذرا سی نم ہوئی تھیں۔

"اونہوں! یہ کون سا ٹائم ہے سوچنے کا۔ وہ بھی ایسی باتوں کو جب کہ تمہارے فائنل ایگزام سر پر ہیں۔" انہوں نے ٹوکا۔

"جو لوگ یتیم خانوں میں پرورش پاتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور کبھی نہ کبھی ملنے آتا ہے اور پھر جب وہ ان یتیم خانوں سے باہر نکلتے ہیں۔ ان کے والدین کی شناخت کا کوئی نہ کوئی سرا تھاتے کوئی رشتہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ جب کہ مجھ سے آج تک کوئی بھی ملنے نہ آیا' نہ والدین کی کوئی شناخت' نہ حوالہ' نہ تصویر' نہ کوئی قصہ کہانی۔ بس میں ہی میں' ایک پورا وجود' پورا انسان بغیر کسی جڑ' تنے کے' ہے نا عجیب بات۔ کبھی کبھی جب میں بہت گہرائی سے سوچتا ہوں اور اپنی پہچان کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا تو مجھے بہت خوف آتا ہے۔ ان دیکھے اندیشے پریشان کرتے ہیں۔ کہیں میں کوڑے کے کسی ڈھیر کی پیداوار تو نہیں' اپنے والدین کے کسی خود فراموش لمحے کی لغزش۔۔۔ بھول۔۔۔ اگر ایسا ہو تو۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"میں کچھ بھی بن جاؤں' اس معاشرے میں' میں کہاں کھڑا ہوں۔۔۔" وہ اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

"بس کرو معاذ!" انہوں نے بے اختیار ہی اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اتنی دور مت جاؤ کہ وسوسے تمہارا گھیراؤ کر کے تمہیں بالکل ہی رستے سے بھٹکا دیں۔ دیکھو۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں' جس طرح حلال کے ایک لقمے کی تاثیر حرام کے ہزار لقموں سے بڑھ کر طاقتور ہوتی ہے اور اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ اسی طرح اچھے لوگوں کی جڑیں بھی اپنے گناہ کے بیج سے نہیں اگتیں' جو وقت کی کوئی بھول ہوتے ہیں۔ تم کون ہو' یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر جس طرح اتنے کم عرصے میں تم نے ہم سب کے دلوں میں گھر کیا ہے تمہاری صورت' تمہارے کردار کو دیکھ کر کوئی بھی اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ تم۔۔۔ خیر چھوڑو۔ تم یہ کیا فضول کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ بس دھیان سے ایگزام دو اور۔۔۔" انہوں نے ہوا میں یونہی لاپروائی سے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"مگر یہ سوال جو آج میرے وجود کے اندر بھنور کی طرح گھوم رہا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو سب کے لبوں پر ضرور آئے گا۔ کہ میں کون ہوں؟ میرے والدین کون تھے۔ مجھے کون یتیم خانے میں پھینک کر گیا۔" وہ ابھی تک اسی ٹرانس میں تھا۔

"اچھا جب ان سوالوں کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی' ابھی تو کم از کم چار پانچ سال تم ان کو بھول جاؤ۔ تم کچھ بن جاؤ گے' اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جما لو گے تو تم دیکھنا لوگ یہ سوال کرنا بھی بھول جائیں گے۔"

"میں آپ کی بات نہیں مانتا' یہ سوال ہر انسان کی بقا' اس کے Survival کا سوال ہے' کم از کم میں جیتے جی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا' جب تک میں جان نہ لوں۔" وہ جیسے دل میں عزم کیے بیٹھا تھا۔

"تم نے یتیم خانے سے نکلتے وقت وہاں کے منتظمین سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔"

"پوچھا تھا' انہوں نے مجھے کچھ تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ شاید سال بھر کے بچے کے کپڑے ہوں گے جو انہوں نے مجھے دیے اور یہ کہ ایک آدمی جس کا تعلق اس نے خود بتایا تھا کہ ملتان کے کسی دیہات سے تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر گیا تھا کہ اس بچے کے والدین روڈ ایکسیڈنٹ میں مارے گئے ہیں۔ اور یہ بچہ معجزاتی طور پر بچ گیا۔ میں اس کی پرورش کی ذمہ داری نہیں لے سکتا اس لیے۔۔۔" اس نے ایک بار پھر اپنے ہونٹ کچلے' آنکھوں میں آئی نمی کو پلکیں جھپک کر اندر اتارنے کی کوشش کی۔

"ویسے تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کہانی میں کوئی صداقت ہو سکتی ہے۔ کم از کم پچاس فیصد بھی؟" انہوں نے موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"اس آدمی کا کوئی ایڈریس تو ہو گا۔ جو انہوں نے تمہیں دیا ہو۔؟"

"ہے میرے پاس۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"چلو اگلی بار میں آیا تو پھر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے' ابھی فی الحال ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے تم یہ سب کچھ بھول جاؤ۔"

"آپ تو اب کافی مہینوں بعد آئیں گے۔" وہ یاسیت سے بولا۔

"ہاں یار! اگر آ تو جاؤں گا نا۔ تم دعا کرنا۔" انہوں نے گھر کے گیٹ کے آگے گاڑی روک کر ہارن بجایا۔

"دعا تو میں آپ کے لیے' اس گھر کے ہر فرد کے لیے' ہر لمحہ کرتا ہوں' جنہوں نے مجھے۔۔۔"

"بس! زیادہ احسان مندی دکھانے کی ضرورت نہیں' بلکہ نہیں وہ کیا کہتے ہیں مشکور ہونے کی۔ چلو اندر چل کر میرے لیے چائے کا آرڈر کرو۔ میں فریش ہو کر ام جان کے کمرے میں ہوں۔"

☆ ☆ ☆

آج اسے چوتھی رات تھی' خوار ہوتے ہوئے۔ چار راتوں سے سیدوں کے قبرستان کی ٹوٹی منڈیر کے پیچھے خوف اور رت جگے کی بے چین حالت میں وہ جاگ رہا تھا۔ مگر گوہر مقصود نہ تو ہاتھ آ رہا تھا نہ آ سکنے کے کوئی امکان نظر آ رہا تھا۔ شہر بانو کے کمرے کی کھڑکی تو کھلی ہوئی تھی مگر کمرے میں ہلکی روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہ پڑتا' ملگجا سا اندھیرا حویلی کے اس حصے میں پوری رات چھایا رہتا۔ پچھلے ویران باغ کی لالٹینیں بھی خاصی مدھم ہوتی تھیں۔ سلطان بخت چار راتوں سے گھر میں تھے اور کھڑکی کھلی ہونے کے باوجود وہ اس کو پھلانگنے کا خود میں حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔

اجالا پھیلتے ہی وہ مایوس و پژمردہ قبرستان کے پچھلے رستے سے باہر نکل آتا اور اب تو اس فضول ایڈونچر سے اس کا جی بھی بھر چکا تھا' مگر دل نے ایک ہی ضد پکڑ رکھی تھی کہ یہ معرکہ سر کرنا ہے۔ مگر آج چوتھی صبح تو اسے دل کی ضد کو بھی نظر انداز کرنا پڑ رہا تھا۔ تین دنوں سے وہ ماسٹر صاحب کا بن بلایا مہمان بلکہ ان کا بلائے جان بنا ہوا تھا۔ پہلے دو دن تو انہوں نے اسے اس لیے جھیلا کہ بقول اس کی لفاظی کے اس کے تمام پیپرز بہت اچھے ہوئے ہیں۔

امتحانی پرچے اس کے پاس تھے۔ ان پر نشان بھی لگے تھے۔ ماسٹر صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس نے ایگزام دیے ہیں۔ اس نے ماسٹر صاحب کی محنت کی بھی بہت ہی تعریف کی تھی وہ خوش بھی بہت ہوئے تھے۔ اس کی ایگزام میں شمولیت کا جان کر۔

"اب میرا خیال ہے جب تک رزلٹ نہیں آتا۔ تم مدرسے چلے جایا کرو۔ ادھر پڑھائی بھی تمہاری مکمل ہونے کو ہے۔ اتنی دیر میں رزلٹ بھی نکل آئے گا۔"

"ماسٹر صاحب کے مفت کے مشورے پر اس کا حلق نیچے تک کڑوا ہو گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے ماسٹر صاحب! مگر اصل بات یہ ہے۔" اس نے جھجکنے کی ایکٹنگ کی۔

"کیا؟ کیا بات ہے؟" وہ اس کی جھجک پر چونکے۔

"گھر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں خالی بابا صاحب کی تنخواہ میں گھر کا گزارہ نہیں ہو پا رہا میں چاہ رہا تھا کوئی جاب کر لوں۔ چھوٹی موٹی ہی سہی۔ کچھ تو ان کا ہاتھ بٹے گا۔ قرآن تو میں بابا صاحب کے پاس رات کے وقت ہفتے میں دو تین دن لگا کر بھی حفظ کر سکتا ہوں۔" اس نے آواز میں حساسیت پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ ماسٹر صاحب حیران رہ گئے۔

"بہت خوب بہت اچھی سوچ ہے تمہاری بہت خوشی ہوئی مجھے سن کر۔" "مگر بیٹا نوکری وغیرہ اتنی آسانی سے تو نہیں ملتی نا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"وہ تو مجھے پتا ہے اگر آپ کوشش کریں تو....." وہ پھر جھجکا۔

"میں..... میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ حیرانی سے بولے۔

"ادھر اسکول میں مجھے چپراسی وغیرہ ہی لگوا دیں۔ ساتھ ساتھ میں اپنی تعلیم بھی مکمل کر لوں گا۔"

"ارے بیٹا! میں تو ریٹائر ہو چکا ہوں اگر حاضر سروس بھی ہوتا تو بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ آج کل تمہیں پتا ہے چپراسی کی آسامی کے لیے بھی چاہے وہ کسی پسماندہ گاؤں ہی میں کیوں نہ ہو بہت ہاتھ پیر مارنے پڑتے ہیں۔ تم ادھر ہی شہر میں کہیں کسی دکان پر سیلز مین وغیرہ لگ جاؤ یا اس طرح کی کوئی اور جاب بلکہ میری مانو تو صوفی صاحب سے بات کرو ان کی بہتیری واقفیت ہے۔ وہ تمہیں ضرور نوکری دلوا دیں گے اور تم سے خوش بھی ہو جائیں گے۔"

"ہونہہ! انہیں تو اس بات پر بھی یقین نہیں کہ میں نے امتحان دیا ہے وہ تو آپ کو معلوم ہے ہر وقت مجھ سے خار کھاتے ہیں۔ ان سے کوئی بھی امید نہیں رکھ سکتا۔"

"ارے میں کہتی ہوں سبزی لے آئیں جا کر رات کو ہانڈی نہیں چڑھائی کیا۔ کھانے کو تو سب وقت پر آ جائیں گے میری بلا سے جان۔" اسی وقت ماسٹرنی کی تیز آواز گونجی تھی۔ ماسٹر صاحب جواب دینا بھول گئے تھے اور فوراً اٹھ کر سبزی لینے چل دیے۔

اور پھر رات کو انہوں نے اسے مژدہ سنایا تھا کہ وہ کل صبح اپنی بیٹی کے گھر جا رہے ہیں۔ وہاں ہفتہ پندرہ دن رہیں گے اور اس کے بعد دوسری بیٹی کی طرف جائیں گے۔ اس لیے مہینہ بھر تو لگ جائے گا۔ وہ اپنا آئندہ کے لیے کہیں اور بندوبست کر لے۔ اب ویسے بھی گاؤں میں اس کا کچھ کام نہیں۔

اشاروں کنایوں میں وہ اسے بہت کچھ جتلا گئے تھے اور اسے معلوم تھا یہ سازش بھی ماسٹرنی کی تھی۔

اور اب وہ ماسٹر صاحب کے گھر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان کے دروازے پر تالا لگا تھا نیند اور ذہنی کوفت سے اس کا برا حال تھا۔ اسے اس وقت صرف ایک آرام دہ بستر کی ضرورت تھی۔

"اس شہرینہ کی بچی کو تو میں دیکھ لوں گا نہ میں نے اس کی زندگی اسی طرح خوار کی تو میرا نام بھی عبدالمبین نہیں۔" شہر کی طرف جانے والی سڑک پر سست قدموں سے چلتے ہوئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"کرائے کے پیسے بھی پورے نہیں بھوک بھی لگی ہے اور اب تو اس کے لیے میں شہر سے گاؤں بھی نہیں آ سکتا۔ ماسٹر صاحب بھی ٹھینگا دے گئے۔ اب کیا کروں گا۔" ایک دم اس کے پیچھے گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ وہ

اپنے خیالوں میں گم سڑک کے درمیان میں چل رہا تھا شکر ہے گاڑی اوپر نہیں چڑھ دوڑی۔

"اندھے ہو نظر نہیں آتا۔ دن دہاڑے سڑک کے درمیان چل رہے ہو۔ یو باسٹرڈ!" پیچھے سے کسی نے اس کا کندھا پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور اسے پورا ہی گھما ڈالا۔ وہ تقریباً اسی کی عمر کا لڑکا تھا۔

لمبے لمبے کندھوں سے نیچے جھولتے سیاہ بال میلی سی شرٹ اسکن ٹائٹ جینز جو کبھی نیلی رہی ہو گی مگر اب جگہ جگہ سے سفید خیالی ہو چکی تھی۔ اس کے گلے میں دو موٹی موٹی زنجیریں جھول رہی تھیں۔ اللہ جانے سونے کی تھیں یا پیتل کی۔ اور بائیں کان میں گولڈ کا ٹاپس چہرے کے نقوش تو مردانہ تھے مگر ان میں نزاکت سراسر زنانہ تھی۔ ایک کلائی میں چاندی کا بریسلیٹ اور دوسری میں کالے رنگ کے بینڈ عبدالمبین نے اس کارٹون کو دیکھ کر بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔

"گونگے ہو گیا اگر میرا ایکسرے مکمل ہو گیا ہو تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ پہلے ہی میرا موڈ خاصا خراب ہے۔" اس نے ایک بار پھر اسے شانے سے پکڑ کر دھکا دینے کی کوشش کی تھی۔ عبدالمبین نے نظریں اٹھا کر اس کے پیچھے دیکھا۔ ایک ریڈ کلر کی اسپورٹس کار تھی۔ اس میں دو لڑکے اور بھی بیٹھے تھے۔ جو حلیے میں اسی کارٹون سے ملتے جلتے تھے۔

"آ جاؤ جیکی! دفع کرو اس رینگتی مخلوق کو۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" ایک لڑکا کھڑکی میں سے منہ نکال کر چلایا۔

"آ رہا ہوں صبح صبح ایسی شکلیں دیکھیں گے تو سوچو دن کیسا گزرے گا۔" وہ بڑبڑاتا ہوا گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ جیسے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا عبدالمبین کے ذہن میں جھماکا سا ہوا وہ ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کرنے لگا تھا۔ جب عبدالمبین دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔

"بھائی! آپ لوگ شہر جا رہے ہو؟" وہ عجلت سے دروازہ تھام کر بولا۔

"ہاں! تمہیں کیا تکلیف ہے یا تم نے کوئی ٹول ٹیکس لینا ہے۔" وہ اسی چھچھورے پن سے بولا۔

"مجھے لفٹ دے دو مجھے بھی جانا ہے۔ پیچھے پیچھے ہی اتر جاؤں گا۔ سیتھو پورہ کے پاس میرے پاس کرائے کے پیسے نہیں۔ اس لیے سوچتا ہوا سڑک کے درمیان۔ چل رہا تھا۔" اس نے لہجے کو مزید مسکین بنایا۔

"تاکہ جان بوجھ کر اپنا ایکسیڈنٹ کروا کر کسی سے لفٹ لے سکو۔" گاڑی کا ڈرائیور طنز سے بولا۔

"نن نہیں اس لیے کسی کی منت کر کے لفٹ لے سکوں۔ پلیز۔"

"اچھا بیٹھ جاؤ جہاں ہمارا دل کرے گا۔ اٹھا کر سڑک پر پھینک دیں گے۔"

"ارے یار! کیا کر رہے ہو؟ اللہ جانے کون ہے کون نہیں دفع کرو۔"

جیکی اسے گھورتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

"جیکی! کم آن یار اس مکوڑے نے ہمارے ساتھ کیا کرنا ہے۔ بیٹھنے دو اسے letsmove ہمیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ بٹھوا دے۔" آگے والے لڑکے نے بازو پیچھے کر کے عبدالمبین کی کلائی پکڑ کر اندر دھکیلا۔ وہ جلدی سے گاڑی کے اندر ہو گیا۔ پچھلی سیٹ پر ایک بڑا سا گٹار اور پیانو پڑا تھا اس کے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔

"پیچھے تو جگہ نہیں ہے گٹار اور پیانو پڑے ہیں اسے کہاں ڈھیر کرو گے۔" جیکی ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

"نیچے بیٹھ جاؤ۔" ڈرائیور لاپروائی سے بولا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ عبدالمبین کو زور کا دھکا لگا وہ سیٹ کے کونے میں ذرا سا ٹک کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں ہی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔

"Let's sing some thing (چلو کوئی گانا گائیں)

آگے والے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے لڑکے نے بال جھٹکتے ہوئے کہا تو چند لمحوں بعد تینوں کورس کی شکل میں کوئی بے سرا نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں گانا گانے لگے۔ عبدالمبین کا جی چاہا گاڑی سے چھلانگ لگا دے۔

"اوئے تجھے گانا آتا ہے؟" وہ عبدالمبین سے مخاطب تھا۔ عبدالمبین سوچ میں پڑ گیا۔

"ارے یار! اس مخلوق سے پوچھ رہے ہو۔ اسے گانا تو کیا آتا ہو گا رونا ہی ڈھنگ سے آ جائے تو بڑی بات

ہے۔ذرا رو کر دکھاؤ۔ہینڈسم مکوڑے۔" ڈرائیور لڑکے نے ایک ادا سے کہا تھا۔

"ویری یونیک' یار رو' نا رو کر دکھاؤ۔" جیکی نے عبدالمبین کی کلائی کو جھٹکا دیا۔عبدالمبین گرنے کو تھا۔ابھی وہ سنبھل ہی رہا تھا کہ تینوں بلند آواز میں قہقہے لگانے لگے۔بے ہنگم' بے سرے قہقہے۔

"واٹ اے پیس آف جوک' یار! یہ تو مجھے کسی مولوی کی اولاد لگتا ہے۔اس سے کہو کوئی نصیحت سنائے۔" ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا لڑکا پیچھے مڑ کر عبدالمبین کے بال ذرا سے کھینچ کر بولا۔

"اسے رونا نہیں آتا۔تم کہہ رہے ہو' وہ کچھ سنائے۔" جیکی بیزار ہو کر بولا۔

"او کم آن یار! سناؤ نا کچھ ورنہ ہم تمہیں یہیں اتار دیں گے اور یہاں سے تمہیں کوئی کنوینس بھی نہیں ملے گی۔اور لفٹ تو بالکل نہیں۔" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے لہجہ سخت بناتے ہوئے دھمکی دی۔

"سنا نہیں' سناؤ کچھ۔" جیکی نے اسے سیٹ سے دھکا دے دیا وہ نیچے گر گیا۔

ہماری سانسوں میں

آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے

"واؤ' مہدی حسن کا جانشین۔"

"جگجیت سنگھ کا اسپیئر پارٹ۔"

کبھی تو وہ بھی جلیں گے اس میں

جو آگ دل میں دہک رہی ہے

وہ بمشکل چار لائنیں ہی گا سکا تھا۔ان کے کمنٹس لگاتار جاری رہے تو وہ چپ ہو گیا۔

"تالیاں۔" جیکی زور زور سے قوالوں کے انداز میں تالیاں پیٹنے لگا۔

"سوری یار! میں تمہارے جیسی تالیاں پیٹوں گا تو ہم سب کو کندھوں پر سوار ہو کر گھر پہنچنا پڑے گا۔" ڈرائیور لڑکے نے معذرت کی۔

"نہ' تمہیں کوئی ڈھنگ کا گانا نہیں آتا۔انیس سو ڈیڑھ کے اِنتر بھاڑنے بیٹھ گئے۔" جیکی نے اسے بہت باریک چٹکی کاٹی تھی' لڑکیوں جیسی۔اور عبدالمبین کو بے ساختہ صوفی صاحب کی وہ مرمت یاد آ گئی جو انہوں نے یہی گانا گانے پر اس کی سلطان بخت کی شادی پر کی تھی' پورے پنڈال کے سامنے۔

"اور کچھ سناؤ نا۔" آگے والا کچھ مشتاق ہو کر بولا۔

"مجھے بس یہی آتا ہے۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"ویسے ایک بات ہے یار' آواز تو اس مکوڑے کی اچھی ہے۔ ہمارا بینڈ جوائن کرو گے۔" ڈرائیور نے مڑ کر فراخدلانہ پیش کش کی۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔اگر ان جیسی چیزوں نے ہمارا بینڈ جوائن کر لیا تو میں ریزائن دے دوں گا۔" جیکی چڑ کر بولا۔

"نہیں' تمہیں یہ ماننا پڑے گا۔اس کی آواز اچھی ہے۔" ڈرائیور لڑکا مڑ کر چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔

"تم کون سا ساؤنڈ ماسٹر ہو' تمہیں اس کمپی ٹیشن میں کس نے جج بنایا ہے؟" جیکی کا مزاج کچھ زیادہ ہی کڑوا تھا۔

"میں غلط کہہ رہا ہوں شیری! تم بتاؤ؟" اس نے اپنے ہمراہی کی تائید چاہی۔

"بھئی لڑو نہیں' ایک آئیڈیا ہے۔پتا چل جائے گا کہ کون صحیح کہہ رہا ہے' کون غلط۔" شیری نے صلح جو انداز میں کہا۔

"بولو۔" جیکی ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

"اس کو بھی کل شام کو اس آڈیشن میں بلا لیتے ہیں جو ہم نے دینے جانا ہے اسٹوڈیو۔دودھ کا دودھ' پانی کا پانی

ہو جائے گا۔" شیری اب تقریباً پیچھے مڑ کر بیٹھ چکا تھا۔

"گڈ آئیڈیا۔یہ صحیح ہے۔" ڈرائیور لڑکا خوش ہو کر بولا۔

"بوگس' ایک دم فلاپ۔یہ کیڑا مکوڑا اور آڈیشن۔تمہارا ابھی دماغ چل گیا ہے۔" جیکی کو اور غصہ آ گیا۔

"اوئے کھاخڑ! یہ پکڑ کارڈ اور کل شام کو اس ایڈریس پر پہنچ جانا۔وہاں آڈیشن ہو گا۔گانوں کا۔یعنی اچھی آواز کا اوپن کمپی ٹیشن۔جو کچھ ہو گا' سب کے سامنے ہو گا۔میڈیا کے لوگ ہوں گے۔تیری لک اچھی ہوئی تو تیری گڈی اونچی ہی اونچی' ورنہ دھکے تو کہیں نہیں گئے' گندے انڈوں اور ٹماٹر سمیت۔" شیری نے ایک سفید رنگ کا وزیٹنگ کارڈ اسے تھمایا اور دوسری ایڈریس کی چٹ۔

"ہمت ہوئی تو ضرور آنا۔" وہ اسے اکساتے ہوئے بولا۔

"اگر اس کے پاس اسٹوڈیو تک آنے کا کرایہ ہوا تو۔" جیکی ہنوز جلا بھنا تھا۔

"ورنہ لفٹ لینے میں تو یہ ماسٹر ہے۔آ جانا۔تیرا مستقبل سنور جائے گا' راتوں رات اسٹار۔" ڈرائیور لڑکے نے کہتے ہوئے ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی روکی تھی۔

"چل اتر' شیخوپورے کا موڑ آ گیا ہے' ادھر سے پیدل مارچ کر۔" شیری نے ہاتھ پیچھے کر کے لاک کھولا اور عبدالمبین کو کالر سے پکڑ کر باہر دھکیل دیا اور ابھی وہ پوری طرح اتر کر کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ گولی کی اسپیڈ سے گاڑی بڑھا لے گئے۔اس نے ہاتھ میں پکڑے کارڈ اور دور دھول اڑا کر جاتے اس سرخ شعلے کو دیکھا۔

"پتا نہیں کیا چیزیں تھیں یہ بھی اور مجھے کیا ضرورت ہے ایسی فضول جگہوں پر جانے کی۔بابا صاحب میری چمڑی نہ ادھیڑ دیں گے۔" اس نے کارڈ سڑک پر پھینک دیا اور دوسری طرف مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

"بڑی آپی! اماں جی کہاں ہیں۔" وہ باہر تخت پر بیٹھی اماں جی کی چادر کے کناروں پر کروشیے کی بیل بنا رہی تھی۔جب جویریہ ہاتھوں میں اپنی کتابیں اٹھائے اس کے پاس آئی۔

"اماں جی اور زینب شیخ ظہور صاحب کے گھر میلاد میں گئی ہیں۔تمہیں بتایا تو تھا میں نے اسکول سے آنے کے بعد۔" اس نے ایک نظر جویریہ کو دیکھا تھا اور پھر سے بیل بننے میں مگن ہو گئی تھی۔

"میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔" جویریہ نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں تخت پر پھینکیں۔

"میں۔۔۔ یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔کتابوں کی یہ بے حرمتی اور اسکول کیوں نہیں جاؤ گی۔تمہاری نئی نئی کلاس ہے' تمہیں تو ایک بھی چھٹی نہیں کرنا چاہیے اور تمہیں تو خوش خوش جانا چاہیے کہ تم آٹھویں جماعت باقاعدہ اسکول جا کر پڑھ رہی ہو۔" آمنہ نے دوپٹہ گود میں ڈال لیا تھا اور جویریہ کی روہانسی شکل کو دیکھنے لگی۔

"بڑی آپی! یہ۔یہ کتابیں ہیں۔دیکھ رہی ہیں آپ!" اس نے رو دینے والی آواز میں کتابوں کی طرف اشارا کیا۔

"ہاں تو کیا ہوا ہے انہیں' ذرا پرانی ہیں۔" آمنہ نے یونہی اردو کی پھٹی پرانی کتاب اٹھا کر کہا۔

"ذرا پرانی؟" جویریہ چیخی۔"یہ عبدالحسین بھائی کے آٹھویں کرنے کے زمانے کی ہیں۔انہوں نے بھی کسی سے لی تھیں پھر چھوٹے بھائی نے پڑھیں۔پھر آپ نے اور چھوٹی آپی نے۔دیکھیں تو ان میں بچا کیا ہے' سارے صفحات گلے ہوئے' پھٹے ہوئے ہیں اور جلدیں تو ہیں ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر ان کتابوں میں کئی چیپٹر جو نئے سلیبس میں ہیں' سرے سے ہیں ہی نہیں۔کلاس میں میں نے کیا خاک پڑھنا ہے۔" کہتے کہتے وہ جیسے بے دم سی ہو کر تخت پر بیٹھ گئی۔

"کتنی خوشی سے میں جا رہی تھی نئی کلاس میں۔ایک سال میں میں نے دو کلاسوں کا امتحان دیا ہے۔ہماری ہیڈ مسٹریس بھی میری اتنی تعریف کر رہی تھیں کہ کتنی ذہین بچی ہے' ایک سال میں دو جماعتوں کا امتحان دیا ہے۔گاؤں میں تو میں نے دو سال پانچویں پڑھی تھی' وہاں چھٹی جماعت کی کوئی ٹیچر جو نہیں تھی اور اب ساری لڑکیاں

میری پھٹی پرانی کتابیں اور کپڑے کے تھیلے کا بیگ دیکھ کر مذاق اڑاتی ہیں۔ مجھے ٹیچر نے مانیٹر بنایا ہے' کتنی دفعہ کلاس کو مجھے ہی پڑھانا پڑتا ہے۔ مس ایک دفعہ پڑھا کر مجھے پڑھانے کو کہتی ہیں اور میرے پاس کتاب یہ ہوتی ہے' لیروں لیر۔" وہ ایکدم سے کہتے کہتے رونے لگی۔ بے اختیار آنسو اس کے سرخ و سفید رخساروں پر بہنے لگے۔

"ارے جوئی! کیوں روتی ہو' کوئی اتنی سی بات پر بھی روتا ہے بھلا۔ تمہیں معلوم تو ہیں گھر کے حالات۔ بابا صاحب اکیلے کمانے والے اور ہم سب۔ آخر وہ بے چارے کیا کیا کریں' تم خود سوچو۔ چلو تھوڑے دنوں تک میں بابا صاحب سے کہہ کر تمہیں ایک ایک کر کے چاروں کتابیں منگوا دوں گی۔ ابھی تو تمہیں اسکول جانا چاہیے

"ہرگز نہیں' میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔ مجھ سے لڑکیوں کی ہنسی برداشت نہیں ہوتی۔ یونیفارم تو وہ میرا اتنا خراب ہو چکا ہے۔ بوٹوں میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ بارش ہو جائے تو سارے جوتے کیچڑ سے بھر جاتے ہیں۔ بارش نہ ہو تو چھوٹے چھوٹے پتھران سوراخوں سے اندر جا کر چلنا مشکل کر دیتے ہیں۔ آپ لیا کیا لے کر دیں گی' بہتر ہے میں آپ دونوں کی طرح گھر بیٹھ کر مڈل کا امتحان دے لوں۔" وہ جیسے سر ہلا کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔ آمنہ نے نظر بھر کر جویریہ کو دیکھا۔ ایک ڈیڑھ سال میں ہی جویریہ کتنی بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔ قد بھی اس کا اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ ناک نقشے کی اٹھان بھی خوب تھی۔ وہ سارے بہن بھائیوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ صراحی دار گردن کے اوپر سجا خوبصورت نقوش والا سرخ و سفید چہرہ' خوب گورے گورے ہاتھ پاؤں۔

آمنہ تو اسے دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔

"اسی لیے تو بابا صاحب آجکل بہت پریشان ہیں' تین تین جوان بیٹیاں۔" آمنہ کی آنکھوں کے آگے صوفی صاحب کا متفکر چہرہ پھر گیا۔

"دیکھو جلیل! میں جا رہا ہوں دو بچوں کو سبق دینے۔ تم اور موذن دونوں مل کر مسجد کے بچوں کو پڑھا لینا' ابھی آنے والے ہوں گے۔ میں مغرب تک آجاؤں گا۔

"مگر صوفی صاحب! میں بچوں کو کیسے۔" جلیل ہکلایا "پھر موذن صاحب تو اپنے حجرے میں پڑھ رہے ہیں' کس وقت تو بچے آپ ہی سے پڑھتے ہیں۔"

"میں لوگوں کے بچوں کا نوکر نہیں ہوں' جتنی تنخواہ سرکار بہادر مجھے دیتی ہے' اس میں مسجد کے تمام امور اور صبح کو بچوں کو قرآن شریف پڑھا دینا ہی بہت بڑا کام ہے' ورنہ اتنی تنخواہ تو آجکل سرکاری محکمے کا کوئی چپراسی نہیں لیتا اور لوگوں کے بچے ہونہہ!" انہوں نے تنفر سے ہنکارا بھرا۔

"میں ان لوگوں کے نخرے بھی اٹھاؤں اور یہ میری شکایتیں اوپر لکھ لکھ کر بھیجیں۔ بچوں کو اللہ کے کلام کی تعلیم بھی مفت دوں اور پھر یہ مجھے آنکھیں بھی دکھائیں۔ جو میں نے تم سے کہا ہے' وہ کرو اور آئندہ سے بچوں کو سبق بھی تم ہی دو گے اور یہ لو دس روپے' اوپر جا کر اپنی اماں جی سے پوچھ کر کوئی سبزی وغیرہ لے آؤ۔ میں چلتا ہوں اور ہاں' سیڑھیوں میں ہی کھڑے ہونا۔ سبزی وغیرہ دے کر فوراً مسجد آجانا۔" وہ اسے تاکید کرتے شاید چلے گئے تھے' اسی وقت کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ آمنہ نے جلدی سے دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ لیا۔ جلیل سیڑھیوں کے آخری سرے پر کھڑا تخت کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کیونکہ اماں جی عصر کے وقت عموماً یہیں بیٹھی ہوتی تھیں۔

"وہ۔۔۔ اماں جی کہاں ہیں۔۔؟" آمنہ سے نظریں ملنے پر وہ جھجک کر بولا۔

"اماں جی میلاد میں گئی ہیں۔" آمنہ نے ہاتھ بڑھا کر جویریہ کی کتابیں سمیٹیں۔

"بس۔ میں نے بتا دیا' میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔" جویریہ ایکدم سے پھر بپھر کر بولی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دوپٹہ شانوں پر بڑی بے نیازی سے پڑا تھا۔ براؤن بالوں کی لٹیں چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ وہ عین جلیل کے سامنے کھڑی تھی۔ آمنہ اسے گھور کر اس کے لاپرواہ اسٹائل کا احساس دلانا چاہ رہی تھی مگر وہ بے خبر آنسوؤں سے بھیگے چہرے اور آنکھوں کو صاف کر رہی تھی۔

"کیا۔۔۔ کیا ہوا جویریہ؟" جلیل کچھ اور جھجک کر ایک قدم اوپر آگیا۔

"یہ کیوں رو رہی ہے؟" اس نے آمنہ سے دریافت کیا۔

"یونہی' بے وقوف ہے۔ تم کس کام سے آئے تھے؟" آمنہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"یونہی نہیں رو رہی میں۔" جویریہ چمک کر بولی۔ "میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔ ساری لڑکیاں چم چم کرتی نئی نکور کتابیں' خوبصورت بیگ' نئے اجلے یونیفارم پہن کر آتی ہیں اور میں یہ چیتھڑوں کا پلندہ لے کر جاتی ہوں۔ پیلا' بدرنگ یونیفارم' پھٹے پرانے جوتے۔ بس میں نے کہہ دیا' کل سے میں اسکول نہیں جاؤں گی۔" وہ اسی طرح اونچا اونچا بول رہی تھی۔

"دکھاؤ اپنی کتابیں۔" وہ ذرا اور آگے بڑھا' جویریہ نے جھٹ سے کتابیں اٹھا کر اسے تھما دیں۔ اس نے بوسیدہ کتابوں کو یونہی دیکھا۔ "یہ کتابیں تو بہت بدحال ہیں۔"

"تو میں کیا غلط کہہ رہی تھی۔ میں باز آئی ایسی ریگولر پڑھائی سے۔" وہ جلیل کے بالکل پاس کھڑی اسی فری اسٹائل میں بول رہی تھی۔ آمنہ کو غصہ آ رہا تھا۔

اسکول بھی صوفی صاحب اسے اب فل نقاب اور چادر میں بھیجنے لگے تھے اور جلیل کا پردہ صرف زینب اور آمنہ سے ہی نہیں تھا بلکہ جویریہ سے بھی اور یہ بے وقوف۔۔۔۔ آمنہ نے اسے گھورا۔

"جلیل! تم کس لیے آئے تھے اوپر۔" اس نے کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جویریہ اب مڑے سے ایک ایک کلا ہوا صفحہ کھول کر دکھا رہی تھی۔

"اچھا۔ تم کل اسکول ضرور جانا' میں کل شام کو تمہیں چاروں نئی کتابیں لا دوں گا۔ میرے پاس کچھ پیسے جمع ہیں' تم چھٹی مت کرنا اور رونا بھی نہیں۔" جلیل کی بے اختیار نظریں جویریہ کے آنسوؤں سے دھلے چہرے پر جمی تھیں اور آمنہ کو اب سخت کوفت ہو رہی تھی وہ بالکل بھی آمنہ کے سوال کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔

"تم کہاں سے لا دو گے' بابا صاحب کو پتا چل گیا تو وہ خوب ہی ڈانٹیں گے۔" جویریہ نے کتابیں لپیٹ دیں اور براہ راست جلیل کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"میں لا دوں گا اور صوفی صاحب بھی کچھ۔۔۔"

"جویریہ! چلو اندر' سنا نہیں تم نے۔" آمنہ ایکدم سے اٹھی تھی اور ڈپٹ کر بولی۔ جویریہ ڈر کر ایکدم پیچھے ہٹی اور بڑبڑ کرتی اندر چلی گئی۔ جلیل نے اسے جاتے دیکھ کر پھر سے نظریں جھکا لیں۔

"تم اماں جی سے سبزی کا پوچھنے آئے تھے تو آلو اور دھنیا لے آؤ اور اب جاؤ' دیر ہو رہی ہے۔ مجھے کھانا بھی پکانا ہے' جلدی سے آنا اور بے شک کسی بچے کے ہاتھ بھیج دینا' خود آنے کی ضرورت نہیں۔

☼ ☼ ☼

"تم کہیں جا رہے ہو شہباز؟" مسز خان نے شہباز خان کے تیار حلیے کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"جی امی جان! ذرا باہر جا رہا ہوں' کام ہے۔ دوسرے ایک دو دوستوں سے بھی ملاقات کرنی ہے' اس لیے۔" انہوں نے تفصیلاً جواب دیا۔

"پرسوں صبح واپسی ہے تمہاری؟۔"

"جی اب تو آپ خوش ہیں نا' پورا ڈیڑھ ہفتہ آپ کے پاس گزار لیا ہے۔"

"پھر کب آؤ گے؟" وہ اداس سی لگ رہی تھیں۔

"چھ ماہ کی تو ڈیوٹی ہے' زیادہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ دیکھیں' ویسے میں فون وغیرہ کرتا رہوں گا۔ اصل میں ادھر لائنوں کا بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے' بہرحال میں کوشش کروں گا۔ آپ کو دو تین دن میں ایک بار ضرور کال کروں۔" وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولے۔

"بوڑھی ماں کی تو خیر ہے' اس کے حقوق کا تو تمہیں خیال رہتا ہی ہے۔ میری تاکید کی ضرورت نہیں۔ ڈیوٹی سے بھی پیار ہے۔ جی جان سے اپنی نوکری کی خدمت کرتے ہو' دل میں نرم جذبات بھی بہت ہیں۔ معاذ کا بھی

بھائیوں سے بڑھ کر خیال رکھ رہے ہو' دوستوں کی دوستی کا بھی بڑا خیال رہتا ہے۔ جب بھی آتے ہو' زیادہ وقت ان کی کمپنی میں ہی گزارتے ہو مگر شاید تم بھول رہے ہو۔ ان تمام تر حقوق کی ادائیگی کے باوجود تم ابھی بھی کچھ لوگوں کے حقوق سے چشم پوشی اختیار کیے ہوئے ہو۔ کیا تمہارا ضمیر تمہیں احساس نہیں دلاتا کہ تم صحیح نہیں کر رہے ہو۔" وہ بہت اکھڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"میں نے کس کے حق میں کوتاہی کی ہے' کوشش تو کرتا ہوں۔"

"کوشش بھی نہیں کرتے تم' نزہت کا ایک بھی حق ادا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ جب سے آئے ہو' ایک بار بھی میں نے تمہیں اس کی طرف ذرا توجہ دیتے نہیں دیکھا۔ معلوم ہے نا تمہیں' وہ کس حال سے ہے۔ آج کل اس حالت میں تو عورت ویسے ہی بڑی حساس ہو جاتی ہے۔ شوہر کی ذرا سی بے توجہی اسے دکھ دیتی ہے اور اس حالت میں ذرا سی ٹینشن' الجھن' پریشانی اس کے لیے اور نہ بچے دونوں کے لیے اچھی ہے۔ کچھ احساس ہے تمہیں شہباز؟" وہ اپنے پرانے بارعب لہجے میں بول رہی تھیں۔ انہوں نے جواب نہیں دیا' سر جھکا کر جوتوں کو دیکھنے لگے۔

"آپ کو کیا معلوم' آپ کی یہ گھنی نزہت' اس نے اس بار میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ڈیڑھ ہفتے سے علیحدہ سو رہی ہے جا کر جیسے میں کوئی شودر ہوں۔ جس کے چھونے سے یہ ناپاک ہو جائے گی۔ نقائص آپ کو مجھ ہی میں نظر آتے ہیں۔" وہ دل میں تلملائے۔

"بیٹا! وہ اگر زبان سے کچھ نہیں کہتی' کچھ طلب نہیں کرتی' مجھ سے تمہاری شکایت نہیں کرتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے دل میں کچھ ارمان نہیں۔ بیاہتا عورت کی تو اپنی خواہشیں ہوتی ہیں' چاہے اور چاہے جانے کی۔ پھر پہلی بار ماں بننے کا انوکھا احساس اور خوشی۔

جب میرے ہاں اظہر ہونے والا تھا' تمہارے والد مجھے بستر سے قدم نیچے نہیں اتارنے دیتے تھے اور تمہاری دادی روز بلاناغہ مجھے شام کو سیر کے لیے بھیجا کرتی تھیں اور ادھر تو اس بے چاری کے کچھ بھی ارمان پورے نہ ہوئے۔ میں بیمار' معذور' تم بے خبر انجان اور تمہارے بھائی بھابیاں..... انہوں نے خوامخواہ کا بیر اس سے پال رکھا ہے۔ کبھی اگر جھوٹے منہ سلام دعا نہیں کی جیسے وہ گھر سے....." کہتے کہتے انہوں نے جیسے اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔ شہباز خان نے ایک جتاتی ہوئی نظر ان کے شرمندہ سے چہرے پر ڈالی۔

"بہرحال' اب تم اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔" وہ اگلے ہی پل سنبھل کر بولیں۔

"کہاں' کہاں ساتھ لے کر جاؤں؟" وہ حیرانی سے بولے۔

"ابھی جو جا رہے ہو دوستوں کی طرف' ان کا پروگرام ملتوی کرو اور نزہت کو باہر ڈنر کرا لاؤ۔"

"مگر میں نے بتایا نا....."

"نزہت..... نزہت..... بیٹا! تیار ہو گئی ہو تو آجاؤ۔" انہوں نے شہباز کی بات سنے بغیر نزہت کو بلند آواز میں پکارا جیسے وہ دروازے سے لگی کھڑی ہو گی۔ شہباز خان کا موڈ سخت آف ہو گیا۔

کافی کلر کا نیٹ کا جدید تراش کا سلا ہوا سوٹ تھا جس پر ہم رنگ موتیوں کا ہلکا سا کام ہوا تھا۔ لائٹ جیولری کے ساتھ ریشمی لمبے بالوں کو ہاف کلپ کیے وہ جھجکتے ہوئے اندر آئی تھی۔

"جی پھپھو! آپ نے بلایا تھا۔" اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔

"اس کے بال اتنے لمبے ہیں۔" شہباز خان نے نزہت کے دراز ریشمی بالوں کو دیکھ کر سوچا۔

"ہاں' ماشاء اللہ۔ چشم بددور بہت پیاری لگ رہی ہو۔ تیار ہو نا تم۔" انہوں نے پاس بلا کر اس کا ماتھا چوما۔

"جی!"

"چلو شہباز! جاؤ بیٹا' رات تو سمجھو ہونے ہی کو ہے۔ ساڑھے سات تو ہو چکے۔ میری بچی کو سیر بھی کرانا۔ اس کا دل ذرا بہلے۔ سارا دن گھر میں پڑی رہتی ہے۔ بس معاذ امتحان دے لے میں اسے ڈرائیونگ سکھا دوں گی پھر ہم

ماں بیٹی کو سہولت ہو جائے گی۔"

"اچھی بات ہے۔ سیکھ لے گا چند دنوں میں' ذہین ہے۔" شہباز نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ نظریں خوامخواہ ام جان کے آس پاس کے منظر میں الجھ رہی تھیں۔

"اب جاؤ تم لوگ۔" انہوں نے جیسے یاد دلایا۔

"آپ بھی چلیں نا پھپھو!" وہ دھیرے سے بولی۔

"نا بیٹا! میرا تو اب آرام کا وقت ہو چلا ہے۔ کھانا میں کھا چکی ہوں' تھوڑی دیر تک دوا لوں گی۔ تمہارے گھومنے گھمانے کے دن ہیں۔ پہلے ہی....."

"اچھا ام جان! میں گاڑی نکالتا ہوں۔" اس سے پہلے ان کا لیکچر پھر سے شروع ہوتا' شہباز خان گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ جیسے ہی کمرے سے نکلے' ام جان نے نزہت کو بھی جانے کا اشارہ کر دیا۔

وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

انہیں سڑکوں پر فضول گاڑی دوڑاتے شاید آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا۔ دونوں کے درمیان خاموشی اور بیگانگی کی دیوار تنی تھی۔ نزہت کھڑکی سے باہر زندہ دلان شہر کی رونقیں دیکھنے میں مگن تھی۔

کیپٹن شہباز نے بھی عین اسی لمحے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں' نزہت نے بے اختیار نگاہیں جھکا لیں۔

"فرصت مل گئی باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے سے۔" وہ طنز سے بولے۔

"میرے متوجہ ہونے نہ ہونے سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ دل میں جھلسی۔

"آپ پرسوں صبح جا رہے ہیں۔" چند لمحوں بعد اس نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں اور تمہاری جان چھوٹ جائے گی میری موجودگی کی کوفت سے اور بیڈ روم کی بے دخلی سے۔"

"وہ تو میں آپ کی سہولت کے لیے کر رہی ہوں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"سہولت۔" انہوں نے زور دے کر کہا۔ "دل تو میرا بھی بہت چاہتا تھا۔ تمہیں بھی ایسی کوئی سہولت مستقل دے دوں' تمہاری اس ڈھونگ سے جان چھوٹ جائے مگر..... چلو چند ماہ اور اس کوفت کو جھیل لو۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"کچھ نہیں۔" وہ چڑ کر بولے۔

"دیکھیں' آپ یوں پہیلیاں نہ بجھوائیں' میرے اعصاب اب ان بجھارتوں سے ٹوٹنے لگے ہیں۔ جو بھی آپ کو کہنا ہے' فیصلہ کرنا ہے' کر گزریں۔ میں اب دن رات کی اس سولی پر مزید نہیں ٹنگی رہ سکتی۔ بہت تھک گئی ہوں میں۔" اس نے سیٹ سے سر ٹکرا کر جیسے بے بسی سے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' مجھے بہت شوق ہے اس برزخ میں جلنے کا۔" وہ چمک کر بولے۔

"فیصلہ تو ہو چکا ہے' بس چند ماہ انتظار کر لو پھر جی بھر کر اپنی تھکاوٹ اتار لینا۔ میں خود اب اس کھیل سے تنگ آچکا ہوں۔"

"آپ مجھے چھوڑ دیں گے۔" وہ ایکدم سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں ابھی بھی شک ہے؟" وہ چبا کر بولے تو وہ جیسے ایک لمحے کو سکتے میں آگئی۔

"ط..... طلاق دیں گے؟" اس کا چہرہ یکدم زرد ہو چلا تھا۔ انہوں نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

سامنے وینچ کا ہوٹل تھا۔ انہوں نے کوئی بھی جواب دیے بغیر گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ گاڑی بند کر کے وہ نیچے اترنے لگے۔

"م..... مجھے جواب دیں شہباز! آپ..... آپ نے کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر نیچے اترتے اس نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان کا گرم مضبوط ہاتھ اس کے ٹھنڈے یخ کانپتے ہاتھ کی

کمزور گرفت میں تھا۔

"تمہیں معلوم ہے، میں بارہا تمہیں بتا چکا ہوں، جس چیز پر آپ کا دل راضی نہ ہوا سے... اس کا ساتھ کہاں تک چل سکتا ہے۔" انہوں نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر اس نے اور مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

● ● ● ● ● ●

"میں چیز نہیں ہوں، آپ کو معلوم ہے... اور اب... اب... آپ مجھ سے جان چھڑائیں گے جبکہ یہ..."

وہ ایک پل کو رکی۔ اس کا واضح اشارہ اپنے بدن میں دھڑکتی اس زندگی کی طرف تھا۔ "شہباز! میں نے کچھ نہیں کیا، کبھی بھی۔ آپ کو آخر یقین کیوں نہیں آتا۔ آپ مجھے کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتے، آپ کو معلوم..."

وہ بے ربط انداز میں بول رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہنوز زرد تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بالآخر آنسوؤں کی لڑی دونوں آنکھوں سے نکل پڑیں۔

"یہاں یہ تماشا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ڈیڑھ ہفتے سے تو علیحدہ چھپ چھپ کر سو رہی تھیں، اس وقت یہ سوال و جواب کرنے تھے، اب اس طرح پبلک پلیس پر... اترو نیچے، گھر جا کر بات کرنا۔"

وہ سختی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ نزہت نے ایک گہرا سانس لے کر انہیں جاتے دیکھا اور اپنا چہرہ سامنے پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اچھی طرح صاف کیا۔

پھر کھانے کے دوران دونوں کے درمیان بالکل خاموشی رہی۔ اس نے بہت تھوڑا کھانا کھایا تھا۔ بس گھونٹ گھونٹ کولڈ ڈرنک ہی پیتی رہی۔ اس کا رویا رویا روپ شہباز خان کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ ان سے صحیح طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔

"تم کھا کیوں نہیں رہیں؟" چند منٹ کی صبر آزما برداشت کے بعد انہوں نے کچھ غصے سے کہا۔

"بھوک نہیں۔" اس نے جھکا سر اٹھا کر جوں ہی ان کا غصیلا چہرہ دیکھا تو جیسے سنبھل گئی۔

"کھا تو رہی ہوں۔" وہ جلدی جلدی پلیٹ میں چمچ گھمانے لگی۔ اتنی پریشان کن سوچوں کے ساتھ بھی کچھ کھایا جا سکتا ہے بھلا۔ اس نے بے دلی سے کھانے کو دیکھا۔

"اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ام جان کے سامنے فرمانبرداری کا ڈرامہ ضروری نہیں تھا۔ وہ یوں بھی تمہاری طرف دار ہیں، ہر حال میں۔ چاہے تم کچھ بھی کر گزرو۔" وہ چبا چبا کر بولے۔

"میں نے کیا کیا ہے ایسا جس کا ہر لحہ آپ مجھے طعنہ دیتے رہتے ہیں۔" اسے بھی غصہ آ گیا۔

"بہت معصوم ہو تم، اسی لیے تو ہر بار اس طعنے کی وجہ پوچھنے بیٹھ جاتی ہو۔" ان کا طنز اسے اندر تک کاٹ گیا تھا۔

وہ ہونٹ چبانے لگی۔ آنکھوں میں شبنم اترنے لگی۔

"آپ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔" وہ آنکھیں جھپکنے لگی۔ (کمبخت آنسو)

"اچھا!" انہوں نے "اچھا" کو خوب کھینچا۔ "ہاں تقدیر نے جیسے میرے ساتھ بڑا اچھا کیا ہے۔"

"تقدیر نے تو اپنے تئیں آپ کے ساتھ بڑا اچھا ہی کیا تھا۔ اب آپ کا مدعا بدل گیا ہے تو اس میں تقدیر کا کیا قصور۔ اس نے تو دینے میں کچھ کمی نہیں چھوڑی۔" وہ محض دل ہی میں سوچ سکی۔

"کھانا کھا لیا ہے تم نے؟" وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی جیسے یہاں ڈنر کرنے نہیں، اس بحث میں الجھنے آئی ہو۔

"جی کھا لیا ہے۔" وہ ٹشو کو صاف ہاتھوں میں یونہی مسلتے ہوئے بولی۔

"چلو اٹھو پھر۔" وہ یکدم کرسی کھسکا کر کھڑے ہو گئے۔ ٹیبل پر پڑی کھانے کی ڈشز اسی طرح بھری ہوئی تھیں۔ اس نے ایک حیران سی نظر ان پر ڈالی۔ انہوں نے والٹ سے بل کے پیسے نکال کر ایک پلیٹ کے نیچے رکھے۔ موبائل اور چابیاں اٹھا کر باہر نکل گئے۔ وہ بھی تیزی سے اٹھی اور ان کے پیچھے چل پڑی۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھتی وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکے تھے۔

وہ بہت سنجیدگی سے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور وہ کن اکھیوں سے تھوڑی دیر بعد انہیں دیکھتی جا رہی تھی۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" تھوڑی دیر بعد اس نے آہستگی سے کہہ ہی دیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، صرف ایک ترچھی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

"آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" پتا نہیں اسے کیا جان لینے کی جلدی تھی کہ بس پتا چل جائے جو ہونا ہے۔ آئینۂ غیب سے سارا منظر، سارا انجام نظر آ جائے۔

"میرا خیال ہے، میں بتا چکا ہوں۔" بے حد روکھا لہجہ تھا۔

"ایک دفعہ پھر بتا دیں۔"

"دیکھو، فیصلہ ہو چکا ہے بلکہ میں کر چکا تھا۔ طلاق کے پیپرز بھی میں تیار کروا چکا تھا۔ پچھلی بار ہی تمہیں سمجھا گیا تھا کہ اس تعلق پر میرا دل راضی نہیں ہے اور جس پر دل راضی نہ ہو، اس سے الگ ہو جانا ہی بہتر ہے، اس لیے بہت سوچ بچار کے بعد میں نے طلاق کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صرف پیپرز بھیجنے سے پہلے ام جان کو فون کر بیٹھا کہ انہیں اچانک صدمہ نہ ملے۔ اشارتاً انہیں بتا دوں تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔" وہ رکے۔

"ماں کی کس قدر فکر ہے۔ جس پر پہاڑ ٹوٹنا تھا، اس کے لیے ایک بار بھی دل نہ تڑپا۔" نزہت نے سنگ دل ہم سفر کو شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔

"ام جان نے مجھے تمہارے پریگننٹ ہونے کی خبر دی تو..." انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اب جو یہ خدا نے موقع دیا ہے، معلوم نہیں تمہیں یا مجھے۔ اگر تمہیں معجزوں پر یقین ہے تو دعا کرو، معجزہ ہو جائے اور میرا دل پلٹ جائے اپنی پچھلی سوچوں اور فیصلے سے، ورنہ میں چھ ماہ کے لیے جا رہا ہوں۔ شاید مزید چھ ماہ اور لگ جائیں، اس سے زیادہ بھی۔ شاید میں لوٹ آؤں، شاید نہ آ سکوں، اس لیے اب تم مجھ سے کم از کم کوئی امید مت رکھنا۔ میں اپنے آپ سے بہت لڑ چکا ہوں، مزید لڑنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔ ہونے والا بچہ میرا ہے، وہ میری ذمہ داری ہو گا، اس سے مجھے انکار نہیں۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"اور میں!" وہ الجھ کر بولی۔ "میں کس کی ذمہ داری ہوں۔"

"میرے دل میں جو تھا، جو ہے، میں بتا چکا ہوں اور اب آج کے بعد مجھ سے اصرار نہیں کرنا۔ میں جواب نہیں دوں گا، نہ کوئی وضاحت کروں گا۔ تمہیں اپنے لیے جو سوچنا ہے، سوچ لینا۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی، کوئی جبر نہیں ہو گا اور اگر تم رو دھو کر منت سماجت کر کے میرے دل کو نرم کرنے کی کوشش کرتی ہو تو یہ بے سود ہو گا کیونکہ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ یہ زندگی بھر کے معاملے یوں خود پر جبر کر کے نہیں نبھائے جا سکتے اور نہ ایسی سمجھوتے والی زندگی کی مجھے عادت ہے۔"

وہ ایسے تھے جیسے ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑے خود ہی سارے فیصلے، سارے معاملے طے کیے جا رہے تھے۔

"اس جبر کے بارے میں آپ نے نکاح نامے پر سائن کرتے وقت نہیں سوچا تھا۔" وہ سلگ کر بولی۔

"وہ میری مجبوری تھی۔ میں مجبور ہو گیا تھا ام جان کی وجہ سے۔"

انہوں نے خود کو ہر معاملے سے بری الذمہ قرار دینے کا عہد کر رکھا تھا۔

"آپ کی ہر مجبوری حق ہے، سچ ہے۔ تو کیا دوسرے کی کوئی مجبوری، کوئی بے بسی آپ کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتی۔" وہ آج سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ اپنی ہر مجبوری کو Justify کر سکتے ہیں، کیونکہ مذہب نے، معاشرے نے آپ کو اپر ہینڈ دیا ہے۔ چھوڑ دینے کا، الگ کر دینے کا، طلاق دینے کا۔" وہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

"آپ کی نام نہاد مجبوری نے مجھے بیچ بھنور میں کس طرح پھنسایا ہے، آپ کو احساس ہے۔"

"دیکھو ان باتوں کا ذرا بھی فائدہ نہیں، میرے دل میں تمہارے لیے جو کچھ تھا، میں نے وہ پہلی رات ہی تم سے کہہ دیا تھا بلکہ اس سے بھی پہلے جب ہر ہر موقع پر میں پیچھے ہٹتا رہا ہوں۔ تم انجان تو نہ تھیں جو میرے رویے کو

سمجھ نہ سکیں۔ اس وقت تم بھی کوئی فیصلہ کر سکتی تھیں۔ نہ آتیں میری مجبوری کی لپیٹ میں۔ پہلے بھی تو ایک بولڈ اسٹیپ اٹھا ہی چکی تھیں گھر سے نکلنے کا۔ دوسری بار تو کوئی الزام بھی نہ دیتا۔" وہ طنز سے بولے۔

"شٹ اپ شہباز خان! آپ کو کوئی حق نہیں یوں بار بار میری تذلیل کرنے کا' جبکہ آپ کے پاس میری اس منحوس مجبوری کا کوئی ثبوت بھی نہیں۔"

وہ کہتے ہوئے پوری کی پوری کھڑکی کی طرف گھوم گئی۔ اسے لگا وہ ایک پتھر سے سر پھوڑ رہی ہے۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں ہمارے حق میں علیحدگی ہی بہتر ہے۔ کوئی تمہیں تمہاری اس "مجبوری" کا طعنہ تو نہیں دے گا پھر جو جی چاہے کرتی پھرنا۔"

اسے یکا یک ان سے بے حد گھن آئی۔ وہ تو ابھی تک انہیں دل کا نرم سمجھتی تھی کہ ایک نہ ایک دن پگھل ہی جائے گا۔ پرانی محبت کا احساس دل کے کسی کونے کھدرے سے نکل کر ضرور ایک دن ہر کھوٹ سوچ پر غالب آجائے گا مگر ان کا دل تو مکمل طور پر اس سے بد ظن ہو چکا تھا۔ وہ کیا اس گھر میں' اس دل میں جگہ بنا سکے گی۔ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ اسے اب ان کی فضول منت سماجت نہیں کرنا چاہیے خود کو اس علیحدگی کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ ان آٹھ دس ماہ میں کیا ہو گیا جو اب ہو جائے گا یوں واویلا کرنے سے۔ وہ آج بھی ایک دوسرے سے یوں دور دور کھڑے تھے جیسے پہلی رات کو۔ تو پھر کیا فائدہ۔

وہ کشادہ سڑک کے دونوں اطراف لگی روشنیوں کو یک ٹک دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا۔ نزہت کو لگا جیسے آج ہی ان کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ اب دوبارہ انہیں مخاطب کرنا یا کوئی اور معاملہ کرنا ناجائز ہو گا۔ اس کے دل نے جیسے صبر کی اگلی تین چار سیڑھیاں پھلانگ... لیں۔

"اوہو' ایک کام تو میں بھول ہی گیا۔" اس نے شہباز خان کی آواز سنی۔ انہوں نے گاڑی دائیں طرف موڑلی تھی۔

❊ ❊ ❊

"واؤ' زبردست' ونڈر فل۔ واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز' مائی ڈریم ہاؤس۔"

نین تارا حیرت زدہ سی اپنے سامنے کھڑی پر شکوہ عمارت کو دیکھ رہی تھی۔ سلطان بخت نے گاڑی گیٹ سے ذرا اندر ہی روک دی تھی اور وہ فوراً" نیچے اتر گئی تھی۔ سنگ سیاہ سے بنی خوبصورت عمارت میں لگے جابجا شیشے دور ہی سے جگمگا رہے تھے۔ گول سیاہ مٹیالے چمکتے تین ستونوں پر وہ عمارت بڑی شان سے کھڑی تھی۔ اس کے ارد گرد چاروں جانب خوبصورت سرسبز لان تھے۔ قیمتی پھولوں اور پودوں کی قطاریں ان لانز کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھیں۔ کوٹھی کے دائیں طرف ذرا عقب میں بہت بڑا سوئمنگ پول تھا۔ اس کے چاروں کونوں پر سفید پتھر کے مور بنے تھے جن کی سنہری چونچوں سے پانی موتیوں کی شکل میں قطرہ قطرہ پول کے اندر گر رہا تھا۔ بے حد خوبصورت منظر تھا۔ نین تارا سر اٹھا کر عمارت کے سامنے والے حصے کو دیکھ رہی تھی۔

"کہو' پسند آئی۔" سلطان بخت اس کے انہماک کو دیکھ چکے تھے۔ قریب آکر بولے۔

"پسند۔" وہ تحیر زدہ سی مڑی۔ "شاہ جی ویری بیوٹی فل۔ میرے خوابوں سے بھی بڑھ کر' جیسی میں نے سوچ رکھی تھی۔ شاہ جی! یہ میرے نام ہے نا؟" وہ بے یقینی سے ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"ابھی بھی یقین نہیں آرہا۔ ابھی تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے وکیل نے تمام پیپرز اچھی طرح چیک کیے ہیں۔ تمہیں پڑھ کر سنائے ہیں' تمہارے سائن لیے ہیں اور اپنے لاکر میں تمہاری آنکھوں کے سامنے محفوظ کیے ہیں۔ مجھ پر تو تمہیں بے اعتباری ہے۔ کم از کم اپنے وکیل کا تو یقین ہے نا جس کے کٹہرے میں تم مجھے ابھی کھڑا کر کے لائی ہو۔" وہ کچھ رنج اور دبے دبے غصے سے بولے۔

"سوری شاہ جی! میرا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ آپ ہرٹ ہوں۔" اس نے کچھ لاپروائی سے اپنے تراشیدہ بال جھٹکے۔ "دیکھیں نا' ہو جاتا ہے کبھی کبھار ایسے بھی۔ پچھلی بار آپ نے یہی کھیل کھیلا تھا ہمارے ساتھ۔ کیسے مجھے ماما کی نظروں میں گرایا تھا۔ اب اگر میں نے صرف ماما کی تسلی کی خاطر یہ کرلیا تو آپ برا کیوں مان رہے ہیں۔" وہ

کہتے ہوئے کئی قدم ان سے آگے جا چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگے۔

"برا کب مان رہا ہوں۔ بس افسوس سا ہوا ہے کہ تمہیں اب مجھ پر' میرے پیار پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ تم نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں اپنا گھر چاہیے تو میں بھلا اس میں کوئی فراڈ کیسے کر سکتا تھا۔ تمہاری خوشی' تمہاری خواہش مجھے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے۔" وہ اس کے قریب آکر رکے۔

"تھینک یو شاہ جی! یہی مان تو ہے مجھے آپ پر' جب ہی تو چھوٹا منہ بڑی بات' اتنی بڑی فرمائش کر بیٹھی تھی۔ یقین تھا نا کہ آپ ضرور پوری کریں گے۔" وہ لاڈ سے ان کی پیشانی کے بال الجھا کر بولی۔

"دیکھ لو پھر پوری کر دی نا۔" اسے خوش دیکھ کر وہ بھی مطمئن سے ہو گئے۔

"ایسی ویسی پوری۔ پتا ہے یہ خوبصورت گھر چیخ چیخ کر مجھ سے کیا کہہ رہا ہے۔" وہ بڑے پیار سے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"کیا؟" انہوں نے مسکرا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں جھانکا۔

"کہ میں دنیا کی وہ خوش قسمت ترین عورت ہوں جسے سلطان بخت جیسے انمول شخص نے اپنی محبت کے قابل سمجھا ہے اور یقین ہی آپ کی آنکھوں کی طراوٹ' آپ کی محبوبۂ خاص ہوں۔ ہے نا؟"

"بالکل ہو' تم ہی ہو۔ اب تو تمہیں مجھ پر شک نہیں' اب تو خوش ہو نا مجھ سے؟"

"شک تو پہلے بھی نہیں تھا۔" اس نے ہاتھ چھوڑ دیے اور آگے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ "اور خوش تو شاہ جی! میں آپ سے تب بھی رہتی' بھلے آپ مجھے کروڑوں کی یہ کوٹھی نہ لے کر دیتے۔ دو چار گز کا کوئی کوارٹر لے دیتے مگر میری کوکھ کو تو آباد رہنے دیتے۔ آپ کی محبت کی نشانی میرے بدن سے جنم لیتی۔ پھلتی پھولتی تو شاید آج کی خوشی سے ہزار گنا خوشی اس وقت مجھے نصیب ہوتی۔" وہ چلتے ہوئے آہستہ آہستہ بول رہی تھی جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ سلطان بخت نے سب سن لیا تھا مگر انجان سے بن گئے۔

"چلو' اندر چل کر تو دیکھو ویسے ابھی انجینئرز والے کام کر رہے ہیں۔ ان کا کام دو چار دنوں کا اور ہے پھر یہ گھر مکمل ہو جائے گا۔ ایک آرٹسٹک گھر۔ تمہیں ان کے کام میں کوئی بھی خامی لگے تو انہیں چل کر بتا دو۔ جو آئیڈیاز ایک گھر کی مالکن کے ہو سکتے ہیں اپنے گھر کے متعلق' وہ دوسرے کیا جانیں۔" وہ اس سے دو قدم آگے بڑھ کر سیڑھیاں چڑھ گئے اور منقش اخروٹی دروازہ دھکیل کر اس کے لیے کھولا۔ نین تارا نے مسکراتے ہوئے اندر قدم رکھا۔

کوٹھی اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت تھی' جتنی باہر سے۔

ہر چیز کو دیکھتے ہوئے اسے عجب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

"آپ کیا پروگرام ہے؟" وہ لاؤنج میں لان کی طرف کھلنے والے بڑے سے دریچے کے آگے کھڑی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ جب سلطان بخت نے آکر پوچھا۔

"جو آپ کہیں۔" وہ لہجے میں ڈھیر سارا پیار سمو کر بولی۔

"پروگرام تو بڑا زبردست تھا۔" انہوں نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ "مگر میرا خیال ہے اس کو اگلے ہفتے پر نہ اٹھا رکھیں۔ یہ لوگ اپنا کام مکمل کر لیں تو پھر ہم بھی اپنا پیار کا پروگرام شروع کریں۔" وہ اس کی خوشبودار زلفوں پر جھک کر مخمور لہجے میں بولے۔

"شاہ جی! اگلے ہفتے آپ پورے ایک ہفتے کے لیے آکر میرے ساتھ رہیں گے۔ پورا ایک ہفتہ نہ ایک دن کم نہ۔ زیادہ البتہ ہو سکتا ہے۔"

"چلو پرامس' پورے سات دن تمہارے نام ہوں گے۔" انہوں نے فوراً" اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

"میرے نام نہیں' اپنے اس گھر کے نام۔ جہاں ہم سات دن اکٹھے رہ کر اسے گھر کا ماحول دیں گے۔ ایک مکمل گھر کا۔"

"بالکل۔ تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی۔"

"اور میری گاڑی؟" اسے جیسے یاد آیا۔

"گاڑی کل صبح۔ ویسے ابھی ڈنر میں ٹائم ہے۔ کہو تو ابھی چل کر پسند کر لیتے ہیں۔ نہیں تو کل صبح۔ میں ادھر کل شام تک تو ہوں۔" وہ بہت مہربان موڈ میں تھے۔

"کل دیکھ لیں گے' آج تو کافی..." اسی وقت نین تارا کے موبائل کی بپ بجی۔ اس نے جلدی سے شولڈر بیگ سے موبائل نکالا۔

"مام کا فون ہے۔" وہ نمبر دیکھ کر بولی۔

"نین تارا! تم آئیں نہیں ابھی تک' قریشی انتظار میں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔" زیور گل چھوٹتے ہی بولی۔

"اوہ مام! اتنی زبردست کوٹھی ہے' اتنی خوبصورت۔ آپ دیکھیں گی تو یقیناً بے ہوش ہو جائیں گی جو شاہ جی نے مجھے گفٹ کی ہے۔" وہ اس کی بات ان سنی کر کے بڑے جوش سے بولی۔

"ارے یہ شاہ کا بچہ دس نمبر کا جھوٹا اور بے ایمان ہے پھر تمہیں کوئی چکمہ دے جائے گا اور تم مزے سے بے وقوف بن جاتی ہو۔" زیور گل تنک کر بولی۔

"مام! آپ کو کل دکھاؤں گی' کل شام کو۔" اس نے زیور گل کی بات کا جواب نہیں دیا۔ سلطان بخت کی نظریں اس کے چہرے پر ہی تھیں۔

"ہیلو ہیلو مام! اونچا بولیں' آواز نہیں آ رہی۔ اوہو' میرا خیال ہے سگنل ڈاؤن ہو رہا ہے۔" کہتے کہتے وہ لاؤنج سے باہر نکل آئی۔

"مام! کیوں فکر کرتی ہیں۔ اب نین تارا وہ بے وقوف سی لڑکی نہیں ہے۔ جو بڑی آسانی سے اس شاہ کے ہاتھ آ جاتی تھی۔ آخر کو آپ کی بیٹی ہے۔ پکے کام کیے ہیں اس بار' گھر آ کر سب تفصیل بتاؤں گی۔"

"اور یہ جو قریشی میرے سر پر سوار ہے؟"

"اسے تو آپ چلتا کریں۔ میں شاہ جی کو لے کر گھر ہی آ رہی ہوں۔"

"نین تارا بے وقوف مت بنو' اسے گھر نہیں لانا اور قریشی تمہارے انتظار میں ادھر رات بھی گزار سکتا ہے۔ پرسوں اس کی فلم کا پریمیئر ہے۔ جس میں وہ تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں بات کرنا ہے اور میرے خیال میں وہ کیش بھی لایا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"مام! پورے ڈھائی کروڑ کی کوٹھی ہے۔ فی الحال مجھے قریشی کے کیش کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اسے کسی بھی طرح سے ٹال لیں اور پریمیئر میں تو میں ساتھ نہیں جا سکتی۔ گانے اس کی فلم کے گا دیے یہی بہت ہے۔ آپ سمجھائیے اسے' ابھی تو مجھے شاہ جی کو اور بھی نچوڑنا ہے۔ صبح گاڑی لینی ہے۔ ساتھ ستر ہزار روپے کے نوٹ لوں گی۔ اوکے' بائے۔ میں آتی ہوں ڈنر کے بعد۔" سلطان بخت کو سیڑھیاں اتر کر آتے دیکھ کر اس نے فوراً موبائل آف کر دیا۔

"چلیں شاہ جی! مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔" ان کے آف سے موڈ کو دیکھ کر وہ فوراً موبائل بیگ میں رکھ کر ان کی طرف بڑھی۔

"چلو ویسے ابھی تو صرف سات ہی بجے ہیں۔" انہوں نے رسٹ واچ کو دیکھ کر کہا۔

"میں نے لنچ بھی نہیں لیا تھا' آپ کے آنے کی خوشی میں۔ بس تیار ہی ہوئی ہوں آپ کا فون سن کر کہ آپ آ گئے۔"

"چلو پھر ہوٹل ہی چلتے ہیں۔ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا جاتے ہوئے اور آرڈر کرتے۔" وہ کہتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔

"کیا فرما رہی تھیں تمہاری والدہ صاحبہ؟" گاڑی ریورس کرتے ہوئے انہوں نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں

پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ ڈنر کے متعلق کہ ہم لوگ گھر آ رہے ہیں تو وہ ڈنر تیار کروائیں۔" وہ ہیئر برش اپنے بیگ سے نکال کر اپنے بالوں میں ہلکے ہلکے پھیرنے لگی۔

"ہوں۔" بڑا معنی خیز "ہوں" تھا ان کا۔ نین تارا نے آنکھیں سکوڑ کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کہیں انہوں نے میری مام کے ساتھ گفتگو سن تو نہیں لی۔ اسے یونہی شک سا ہوا۔

"شاہ جی! ڈنر کے بعد آپ میرے ساتھ گلبرگ ہی چلیں گے نا؟" اس نے برش بیگ میں رکھ کر میک اپ کٹ نکالی اور اپنا میک اپ ٹھیک کرنے لگی۔

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"کیوں؟" اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور میک اپ کٹ بند کر دی۔

"ویسے ہی۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"آپ... ناراض ہیں مجھ سے؟" وہ جیسے ڈر کر بولی۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔"

"تو پھر میرے ساتھ کیوں نہیں جائیں گے؟"

"تم جو میرے ساتھ جا رہی ہو۔"

"کہاں؟"

"سی ہاؤس وہیں رات ہوگی نا میرے ساتھ۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولے تو اس نے خوش خوش اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شاہ جی! پچھلے دنوں میرا جو رویہ آپ کے ساتھ تھا' آپ اس پر ناراض تو نہیں۔" اسے پھر خیال آیا۔

"نہیں۔"

"شاہ جی! میں اس رویے پر شرمندہ نہیں ہوں بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ میں حق بجانب تھی۔" اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

"وہ کیسے۔" انہوں نے ذرا سی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"شاہ جی! ایک بات پوچھوں؟" وہ آہستگی سے ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

"پوچھو۔"

"سچ بتائیں گے نا؟"

"بالکل میں نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا۔" وہ یقین سے بولے۔

"خیر یہ تو نہ کہیں۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "ایسا تو کئی بار کر چکے ہیں آپ۔"

"تم کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔

"شاہ جی وہ..." وہ رک گئی۔

"پوچھو نا۔" وہ اصرار سے بولے۔

"صالحہ شاہ پریگننٹ ہے؟" بہت مدھم آواز تھی اس کی۔ سلطان بخت نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر کے اس کی طرف دیکھا کہ تیز روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات کو وہ صحیح طرح سے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے؟" چند لمحوں کے توقف سے وہ پھر بولی۔

"ہاں' ہے۔" انہوں نے جیسے گہرا سانس لیا۔

"وہ آپ کی بیوی ہے نا؟" وہ ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"کم آن۔ اس سوال کا مقصد۔" وہ جھنجلا کر بولے۔

"میں بھی تو آپ کی بیوی ہوں نا۔"

"پھر؟" انہیں اب غصہ آنے لگا تھا۔

"پھر آپ نے یہ حق مجھ سے کیوں چھینا۔ مجھے کیوں اپنے بچے کی ماں نہیں بننے دیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"نین تارا! اس مسئلے پر بات ہو چکی ہے۔" وہ روکھے لہجے میں بولے۔

"شاہ جی! بات نہیں ہو چکی۔ میری اوقات طے کی جا چکی ہے اور مجھے آپ آئینہ دکھا چکے ہیں مگر پھر بھی میرا دل اس آئینے کے عکس کو سچ نہیں مانتا۔ شاہ جی! میں نے بھی تو آپ سے نکاح کیا تھا عین شرعی طریقے سے اور صالحہ شاہ نے بھی تو پھر فرق کیا ہوا؟" وہ الجھ کر بولی۔

"نین تارا! اس بحث سے کچھ حاصل نہیں۔ ماں بن کر تمہیں کیا کرنا تھا۔ میری جائیداد میری پراپرٹی کا وارث ہی پیدا کرنا تھا اور میرا تو سب کچھ ویسے بھی تمہارا ہے۔ میں تمہارا ہوں۔ صالحہ شاہ کے پاس تو کچھ بھی نہیں سوائے آنے والے بچے کے۔" وہ اسے بہلانے لگے۔

"یہی..... یہی تو سب کچھ ہے شاہ جی! یہی تو ایک عورت، ایک بیوی کا سب کچھ ہے۔ اسی مقصد کے لیے تو عورت کو پیدا کیا گیا ہے اور وہ اپنے عورت ہونے پر نازاں ہوتی ہے کہ ایک دن وہ ماں بنے گی تو خالق کی پیدا کردہ مخلوق میں سب سے ممتاز ہو جائے گی۔ آپ نے مجھ سے یہ فخر یہ اعزاز کیوں چھینا۔ میں آپ کی محبوبہ ہوں اور بقول آپ کے آپ کی محبت کی مختار کل بھی۔ صالحہ شاہ فقط آپ کی بیوی اور آنے والے بچے کی ماں۔ شاہ جی! وہ آپ کی محبت کی بھلے نہ سہی، آپ کی نشانی تو اس کی کوکھ میں پل رہی ہے۔ ایک پل، ایک لمحے کی بھرپور محبت کی نشانی جو مجھے ملا تو مگر آپ نے سب خاک کر دیا۔ جیتی تو وہ شاہ جی! فتح یاب تو وہ ہوئی۔ میں تو کھلونا ہوں۔ محبوبہ، طوائف، وقتی بہلاوا اور بس۔" وہ سر جھکائے رو رہی تھی۔

"نین تارا! اسٹاپ اٹ۔ تم کسی حال میں خوش کیوں نہیں ہوتیں۔ میری محبت، میری جاہ و حشم، میری جائیداد سب تمہارا ہے پھر بھی تم ناشکری ہو۔ ایک فضول بات کو ایشو بنا کر میرا موڈ خراب کر دیا ہے تم نے۔ جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں چلتی گاڑی سے دھکا دے دوں یا خود کود جاؤں۔" وہ غصے سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کے بولے۔

"سوری شاہ جی! آپ کا موڈ آف ہوا اس فضول ایشو سے۔"

وہ روتے روتے ہنس دی اور چپکے سے اس نے اپنا چہرہ صاف کر لیا اور سلطان بخت کے اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے ہاتھ پر اپنا نازک آنسوؤں سے بھیگا ہاتھ رکھ دیا۔

"آئی ایم سوری۔ میں بار بار بھول جاتی ہوں کہ آپ تو میرے ہیں نا شاہ جی!" وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"یہ ہی بات تو تمہیں سمجھاتا ہوں کہ میں تو تمہارا ہوں نا۔" انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر لبوں سے لگا لیا تو وہ چپ کر کے ان کے کندھے سے سر ٹکا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

❁ ❁ ❁

"مما! میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ لوگوں کا ادھر واپس آنے کا مقصد کیا تھا، وہ بھی یوں افراتفری میں۔"

سیفی نے الجھ کر رعنا سے پوچھا۔ وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ رات کا کھانا کھایا جا چکا تھا۔ اب جنتاں، رعنا اور فخر حیات کے لیے کافی لینے گئی تھی۔ جب سیفی نے یہ موضوع چھیڑا۔

"کیوں تمہیں پاکستان آنا اچھا نہیں لگا؟" رعنا نے یونہی پوچھا، ورنہ رعنا کو معلوم تھا کہ سیفی جب سے پاکستان آیا ہے، جھنجلایا ہوا ہے۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔" اس نے فوراً صاف گوئی سے کہا۔

"صاحبزادے! آپ کو اچھا لگے یا نہ لگے، آنا تو تھا واپس اور رہنا بھی ادھر ہی ہے مستقل۔" فخر حیات نے سویٹ ڈش کا آخری چمچ لے کر پلیٹ پرے کھسکا دی۔

"یہ تو آپ مجھے پہلے بھی دس دفعہ بتا چکے ہیں۔ مجھے بتائیں، میں ادھر کیا کروں۔ کم از کم میرا گریجویشن ہو لینے دیتے پھر واپس آ جاتے۔"

"سیفی! میری جان، ادھر کیا تعلیمی اداروں کی کمی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک یونیورسٹی موجود ہے۔ تم کہیں بھی داخلہ لے لو پھر تمہارے پاپا تو تمہیں خاص طور پر ادھر لائے ہیں کہ نئی فیکٹری جیسے ہی شروع ہوتی ہے بلکہ اس کی کنسٹرکشن کا کام بھی وہ تمہیں سونپ دیں گے۔" رعنا نے اسے پیار سے پچکارا۔

"پہلی بات تو یہ، ادھر کی ایجوکیشن اور یونیورسٹی کا باہر کی یونیورسٹی سے کیا مقابلہ۔ اور پھر میرا وہاں ایک سیٹ اپ بنا ہوا تھا۔ میں وہیں سے گریجویشن کرنا چاہتا ہوں اور پاپا کا فیکٹری والا پروگرام تو اچھا خاصا اپ سیٹ ہو چکا ہے اور مجھے اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں ادھر کیا کروں۔" وہ سخت کوفت کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"ہاں فیکٹری والا کام بھی لٹک ہی گیا۔ ساری غلطی میرے منیجر کی ہے۔ ایک تو اس نے جھگڑے والی زمین لے لی۔ دوسرے وہ فرنٹ سے خاصا ہٹ کر ہے۔ مجھے وہ جگہ فیکٹری کے لیے بالکل موزوں نہیں لگی۔ اس زمین کا کیس بھی چل رہا ہے کورٹ میں۔ زمین کے کچھ اور دعوے دار بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس لیے میرا ارادہ تو اس زمین کو لینے کا نہیں رہا۔ ابھی تو شکر ہے ہم نے فل پے منٹ نہیں کی تھی۔" فخر حیات نے کہا۔

"دیکھا مما! اب بتائیں اور کیا رہ گیا ہے میرے کرنے کو۔" سیفی منہ بنا کر بولا۔

"مائی سن! اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو۔ زمین دوسری جگہ میں پسند کر چکا ہوں۔ اسی لوکیشن میں ہے، بہت اچھی اور قیمتی جگہ، ڈیل ہو رہی ہے۔ بس ایک دو ہفتے میں خوشخبری سنا دوں گا تمہیں۔ ویسے تم آفس چلا کرو میرے ساتھ۔ کچھ آفس ورک ہی سیکھ لو۔" انہوں نے رسان سے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی بات بتائی آپ نے۔ سیفی! تمہیں معلوم ہے نا تمہارے پاپا جس کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں، اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں اور کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ تم اس دوران پنجاب یونیورسٹی میں آنرز کے لیے ایڈمیشن لے لو، آفس بھی کبھی کبھار چلے جایا کرو۔ تمہارا وقت بھی ضائع نہیں ہو گا اور بوریت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔" رعنا نے سیفی کا ہاتھ تھپتھپا کر مشورہ دیا۔

"تو مما! ادھر تو میں نے ایڈمیشن بالکل نہیں لینا۔" وہ منہ بسور کر بولا۔ "اور آپ نے فرزین والے معاملے میں بھی کوئی پیش رفت نہیں کی۔"

"کریں گے، میرا بیٹا پہلے کچھ بن تو جائے۔ تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے، اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تو پھر دیکھو کہ اس معاملے میں ذرا سی تاخیر تمہاری مما ہرگز نہیں کریں گی۔" فخر حیات نے کچھ گھور کر رعنا کو دیکھا۔

"اور آپ دوبارہ ماموں ممانی کی طرف بھی نہیں گئے۔ کم از کم اشارتاً تو انہیں بتا دیں۔" سیفی کی سوئی ادھر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"بیٹا! لاسٹ ویک تو گئے تھے، اب روز روز جانا تو اچھا نہیں لگتا نا۔" رعنا نے فخر حیات کی طرف دیکھا۔

"مامی تو روز آنے کو تیار ہوتی ہیں۔ لاسٹ ویک کے بعد سے دو چکر تو وہ یونہی لگا چکی ہیں اور ان کی کمپنی میں بیٹھنا اپنا بھیجا خالی کروانا ہے۔"

"ایسے نہیں کہتے۔ وہ ہم سے محبت کرتی ہیں اس لیے چلی آتی ہیں۔"

"اور محبت بھی بہت خاص قسم کی۔" فخر حیات نے دھیرے سے کہا۔

"خاص قسم کی کون سی محبت ہوتی ہے پاپا؟" سیفی نے سن لیا تھا۔

"یہ بھی ہوتی ہے محبت کی بڑی ظالم قسم۔ سمجھ جاؤ گے خود ہی آہستہ آہستہ۔ اب بتاؤ تمہارے ایڈمیشن کا کیا کیا جائے۔ میں کل پتا کرواتا ہوں یونیورسٹی سے۔" فخر حیات نے موضوع بدلا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے کہنے پر ایڈمیشن لے لیتا ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔"
"بولو بیٹا! ہم نے پہلے کبھی تمہاری کوئی فرمائش رد کی ہے۔" رعنا فوراً بولی۔
"پہلے آپ لوگ میری انگیجمنٹ کریں فرزین کے ساتھ' شادی بے شک جب دل چاہے کر دیں۔ پانچ چھ سالوں میں۔" اس کی فرمائش پر دونوں چپ سے ہو گئے۔
"مما! بولیں نا۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔
"سیفی! ہم نے آپ کی کبھی کوئی ضد یا فرمائش نہیں ٹالی تو کبھی آپ کو بھی میری کوئی خواہش مان لینی چاہیے۔" فخر حیات نے محبت سے اسے سمجھایا۔
"میں نے بھی ہمیشہ آپ کی ہر بات مانی ہے' اس لیے تو چپ چاپ نہ چاہنے کے باوجود ادھر آ گیا ہوں۔"
"چلو تم آنرز کر لو پھر تم جو کہو گے وہ ہم کریں گے۔"
"پلیز پاپا! آئی ایم نو مور اے چائلڈ۔" (میں کوئی بچہ نہیں ہوں) وہ غصے سے بولا۔ "جو آپ مجھے بچوں کی طرح بہلا رہے ہیں۔ جو بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں' اس پر ہاں یا نہ کہیں صاف صاف۔" اس نے زور سے ٹیبل پر مکا مارا۔
"سیفی! بی ہیو یور سیلف۔ تمہیں پیرنٹس سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ کہہ دیا ہے کہ کر دیں گے' فرزین بھاگی جا رہی ہے نہ تم۔ کل جا کر ایڈمیشن کرواؤ اپنا اور سنجیدگی سے پڑھائی کرو۔ ان مسئلوں کے لیے زندگی پڑی ہے۔ تمہارے پاپا نے کہہ دیا ہے نا کہ آنرز کر لو پھر دیکھیں گے۔"
رعنا نے غصے سے کہا تو وہ طیش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی کو ٹانگ سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔
"میں ایڈمیشن لوں گا نہ ہی کچھ اور کروں گا۔ جب تک آپ لوگ میری بات نہیں مان لیتے اینڈر اسٹینڈ۔" وہ زور زور سے زمین پر پاؤں مارتا چلا گیا۔
رعنا نے ایک گہرا سانس لیا۔
"دیکھ لیا تم نے۔" فخر حیات نے غصے سے کہا۔
"دیکھ لیا۔" رعنا نے آہ بھر کر کہا۔
"صاحب جی! یہ کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" ملازم نے کوئی وزیٹنگ کارڈ انہیں لا کر تھمایا۔
"کیپٹن شہباز خان' یہ کون ہیں؟" کارڈ پڑھ کر بولے۔
"کیا کہتے ہیں؟" انہوں نے ملازم سے پوچھا۔
"کہہ رہے تھے' آپ سے کچھ ضروری کام ہے۔"
"ٹھیک ہے' انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ' میں آ رہا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
"کون ہے؟" رعنا نے پوچھا۔
"معلوم نہیں' تم بھی آ جاؤ۔" کہتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گئے تو رعنا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"جنتاں! کافی ڈرائنگ روم میں لے آنا جو مہمان آئے ہیں' ان کے لیے بھی۔" جاتے جاتے رعنا نے ڈائننگ روم سے آگے کچن کے کاریڈور سے جنتاں کو ہدایت کی۔
"آئی ایم کیپٹن شہباز خان اینڈ۔۔۔ شی از مائی وائف۔" جب وہ اندر داخل ہوئیں تو ایک ہینڈسم سا نوجوان فخر حیات سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کی مسز اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔
"بیٹھیں آپ! یہ رعنا ہیں میری مسز۔" فخر حیات نے ان دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہوتی رعنا کا تعارف کروایا۔
"نائس ٹو میٹ یو۔" رعنا دونوں سے کہتے ہوئے ان کے بالمقابل پڑے صوفے پر جا بیٹھی۔
"ویسے معاف کیجیے گا' میں نے آپ کو فرسٹ ٹائم دیکھا ہے۔" فخر حیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی میں بھی فرسٹ ٹائم آپ سے مل رہا ہوں۔"
"آپ آرمی میں ہوتے ہیں' آج کل کہاں پوسٹنگ ہے آپ کی۔" فخر حیات نے پوچھا۔
"چھٹی پر آیا ہوا ہوں۔ اس کے بعد سیاچن جا رہا ہوں۔ پہلے میری پوسٹنگ پنڈی میں تھی۔"
"اوہ۔" فخر حیات نے ہونٹ سکوڑے۔ "رعنا! کافی کا کہہ دیا تھا یا آپ لوگ کولڈ ڈرنک لیں گے؟" فخر حیات نے پہلے رعنا سے کہا اور پھر شہباز خان سے پوچھا۔
"نو تھینکس۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ہم ڈنر کر کے آئے ہیں۔ اصل میں آپ کی۔۔۔"
"پھر تو کافی صحیح رہے گی۔" فخر حیات نے خود ہی کہا۔
"میں نے کہہ دیا ہے کافی کا پہلے ہی۔" رعنا نے جواب دیا۔ "آپ ٹھیک سے بیٹھیں نا۔" صوفے کے کنارے پر ٹکی روپا روپا سا روپ لیے نزہت کو رعنا نے دیکھ کر کہا۔ وہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے اس ماحول یا اس میں موجود کسی بھی فرد کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں اور ابھی اٹھ کر چل دے گی۔
"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا مگر اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔
اسی وقت جنتاں کافی لوازمات کے ساتھ ٹرالی میں گھسیٹ کر لے آئی۔
"یہ آپ نے خوامخواہ تکلف کیا' یقین کریں' کسی بھی چیز کی طلب نہیں ہے اس وقت۔" جنتاں ٹرالی رکھ کر چلی گئی تو رعنا اٹھ کر کافی سرو کرنے لگی۔
"ارے ینگ مین! تکلف کیسا۔ ہم بھی پینے لگے تھے' آپ لوگ ہمارا ساتھ دینے آ گئے۔ ویسے بھی کھانے کے بعد کافی کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔"
فخر حیات کا موڈ اچھا ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں انہیں یہ نوجوان اچھا لگا تھا۔
"آپ کا کچھ آج یا کل کھو گیا ہو؟" کیپٹن شہباز کی بات اس قدر اچانک تھی کہ رعنا کے ہاتھ میں پکڑا کافی کا مگ چھلک گیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔
"میرا؟" فخر حیات نے کچھ اچنبھے سے پوچھا۔
"جی آپ کا۔" شہباز خان نے کافی کا مگ تھام لیا۔ رعنا نزہت کو کافی تھما کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔
"نہیں۔۔۔ اوہاں یاد آیا رعنا! میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔ آج دوپہر میں نہیں بلکہ شام کو جب میں آفس سے شاپنگ مال گیا ہوں تو واپسی پر معلوم نہیں کس طرح میرا والٹ کوٹ کی جیب سے گر گیا۔ آئی تھنک مین تھا وزنڈ تھے اس میں' باقی کچھ کارڈز وغیرہ۔ میرا خیال ہے' یہی گم ہوا ہے میرا آج۔" فخر حیات نے سوچ کر کہا۔
"ٹھیک بتایا آپ نے۔ یہ آپ کا والٹ۔" کیپٹن شہباز نے اپنے کوٹ کی جیب سے ان کا والٹ نکال کر آگے بڑھایا جسے فخر حیات نے اٹھ کر تھام لیا۔
"میں بھول تو گیا تھا مگر سوتے وقت مجھے یاد آ جانا تھا۔ اصل میں اس میں ضروری تو ایک دو کارڈز تھے اور ایک بینک کارڈ جس کا پن کوڈ بھی ساتھ ہی تھا۔ کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے والٹ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔
"کافی بہت زبردست ہے۔" کیپٹن شہباز نے پہلا گھونٹ بھرتے ہی کہا۔
"ہماری ملازمہ پرفیکٹ ہے کافی بنانے میں۔ ویسے رعنا اس سے بھی اچھی کافی بنا لیتی ہیں۔ آپ ساتھ کچھ لیں نا۔" انہوں نے گم صم سی بیٹھی نزہت کو مخاطب کیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اسے تو کافی کا کپ ختم کرنا دشوار لگ رہا تھا۔
"آپ کیا کرتے ہیں؟" شہباز خان نے پوچھا۔
"چھوٹا موٹا بزنس ہے جو اکثر ڈوب جاتا ہے اور ہمیں بھی ڈبو جاتا ہے۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا۔ "ابھی حال ہی میں کئی ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد چار پانچ سال بعد پاکستان آئے ہیں۔"

کافی کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ رعنا کی ساری شگفتگی کھو چکی تھی۔ پتا نہیں کیوں طبیعت پر یکایک جیسے اوس سی آن گری تھی۔ عجیب سے نقصان کے احساس کا زہریلا درد اس کے دل میں ہلکورے لینے لگا تھا۔ سامنے ٹیبل پر پڑا والٹ جیسے انہیں بہت طنز سے دیکھ رہا تھا۔

"اوکے اب ہمیں اجازت دیں۔ میں واپس آؤں گا تو پھر آپ آیئے گا ہماری طرف۔ میرا کارڈ تو آپ کے پاس موجود ہے۔ بہت خوشی ہوئی میری ام جان کو آپ سے مل کر۔" کیپٹن شہباز کے الوداعیہ کلمات پر رعنا چونکی۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ انشاء اللہ ضرور چکر لگائیں گے۔ آپ آئیں تو پھر رابطہ ضرور کریں۔" رعنا اور فخر حیات انہیں گیٹ تک الوداع کہنے آئے تھے۔

"کیپٹن شہباز! ایک منٹ۔" رعنا نے انہیں آخری قدم باہر نکالنے سے پہلے روکا۔ نزہت باہر جا چکی تھی۔

"آپ کی مسز بہت خوبصورت ہیں مگر ان کے چاند چہرے کے گرد اداسی کا ہالہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ یہ اداسی کہیں آپ کی...." رعنا کے ادھورے فقرے پر کیپٹن شہباز نے ایک بے ساختہ سی نظر نزہت پر ڈالی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں پرسوں جا رہا ہوں تو شاید اس لیے۔" "نہیں فوراً" ہی بہانہ سوجھ گیا۔

"مگر یہ ہالہ تو مجھے مستقل ہی لگتا ہے۔ بہرحال خیال رکھا کریں۔ بیسٹ آف لک۔ خدا حافظ۔" رعنا نے کہا تو کیپٹن شہباز بھی خدا حافظ کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"کتنا زبردست کپل تھا۔" رعنا نے مڑ کر فخر حیات سے کہا۔

"ہماری طرح۔"

"اچھا! آپ کو یاد ہے۔" وہ طنز سے بولی۔

"کہو تو تمہیں بھی یاد دلا دوں۔" انہوں نے نزدیک ہو کر سرگوشی کی۔ آسمان پر چمکتا چودھویں کا چاند بھی جیسے نیچے جھکا جا رہا تھا۔

"بہت بہت شکریہ۔ میں نے بہت مشکل سے اپنے دل کو آپ کی بے اعتنائی پر راضی کیا ہے۔ اب اس کی عادت نہ خراب کریں۔" کہتے ہوئے وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

"یا اللہ! ہمارا جلدی سے رزلٹ نکل آئے۔ میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔ بابا صاحب مجھے فوراً کالج میں داخلہ لے دیں۔" آج کل زینب کی نمازیں طویل ہو گئی تھیں۔ سجدے طویل تر اور ہر نماز کے بعد وہ با آواز بلند دعا مانگا کرتی تھی۔

"دیکھو زینو! رزلٹ تو اپنے ٹائم پر نکلے گا اور نکلے گا بھی ویسا ہی جیسے تم پیپر دے کر آئی ہو۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے پھر ہر دعا میں جلدی کی رٹ کیوں لگاتی ہو۔ کہیں جلدی میں فرشتوں سے بھی کوئی چوک نہ ہو جائے۔" آمنہ مشین پر جھکی کچھ سی رہی تھی۔ اس کی بار بار ایک ہی دعا کی گردان پر سر اٹھا کر جھنجلا کر بولی۔

"دعا کرنے سے تقدیر بدل جاتی ہے تم رزلٹ کی بات کرتی ہو۔" کہتے ہوئے اس نے جائے نماز سمیٹی۔ "دیکھنا مجھے پکا یقین ہے میں پاس ہو جاؤں گی اور بابا صاحب مجھے داخلہ بھی لے دیں گے۔ میں تو داخلے کے لیے پیسے بھی جوڑ رہی ہوں۔" وہ رازداری سے اس کے پاس آ کر بولی۔

"ہاں تمہیں لے دیں گے جیسے میں ان کی سوتیلی ہوں نا۔" آمنہ چڑ کر بولی۔

"تم ان کی سوتیلی نہیں، لاڈلی مگر صابر بیٹی ہو۔ میں نے تو ان سے عہد لے رکھا ہے، اس لیے میرا تو ایڈمیشن پکا ہے نا۔"

"چھوٹی آپی! یہ دیکھیں میری نئی کتابیں۔ آپ نے نہیں دیکھیں نا۔" اسی وقت جویریہ اپنی نئی کتابیں اٹھائے چلی آئی۔

"واہ تم نے کہاں سے لے لیں نئی کتابیں۔ ادھر تو زہر کھانے کو کہیں سے پیسہ نہیں ملتا۔" اس نے کتابیں یونہی

الٹ پلٹ کر دیکھیں۔

"جلیل نے لے کر دی ہیں۔" جویریہ نے فخر سے جتایا۔

"واہ، یہ جلیل تم پر بڑا مہربان ہے۔ ہم پر تو کوئی ایسے آج تک مہربان نہ ہوا۔" زینب نے معنی خیز انداز میں پہلے جویریہ کو اور پھر آمنہ کو دیکھا۔ جویریہ حیرانی سے زینب کا منہ تکنے لگی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو زینب! ایسی باتیں کرتے ہیں چھوٹی بہن سے۔" آمنہ نے فوراً اسے لتاڑا۔ "جاؤ جویریہ! تم اندر جا کر پڑھو اور سنو، آئندہ کسی کو یہ کتابیں دکھانے اور بتانے کی ضرورت نہیں کہ جلیل نے لے کر دی ہیں۔ نہ بھائی کو نہ بابا صاحب کو۔ سن لیا تم نے۔" آمنہ نے سختی سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔

"زینب! تم کس قدر فضول ہو۔ بھلا اس طرح بات کرتے ہیں، وہ نا سمجھ ہے۔"

"آ جائے گی سمجھ اسے بھی۔ تم دیکھنا آمنہ! اس روز تم بھی جاتیں نا شیخ صاحب کے گھر۔ میلاد کے بعد اماں جی تو خواتین کو درس دینے لگیں۔ میں شیخ صاحب کی بیٹی صالحہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ مجھے چپکے سے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی اپنے کمرے میں۔ قسم سے اس کا علیحدہ کمرہ اتنا خوبصورت اور اتنا بڑا ہے جتنے ہمارے یہ دو ڈربے ہیں، دونوں کو ملا کر ایک۔ کمرے میں قالین بچھا تھا۔ پردے بھی لگے تھے۔ نرم فوم کا بیڈ اور سب سے زبردست بات۔ اس کے کمرے میں اپنا ٹی وی تھا۔ ساتھ میں پتا نہیں وہ کیا وی سی آر تھا یا کچھ اور۔ مگر وہ تو خیر اس نے نہیں چلا کر دکھایا۔ ٹی وی پر کیبل لگوا رکھی ہے اس نے۔ پورے ایک دو نہیں ستر چینل آتے ہیں کیبل پر۔ ہائے آمنہ! پھر جو اس نے مجھے ریموٹ سے چینل بدل بدل کر دکھائے۔ کہیں گانے، کہیں فلمیں، کہیں ڈرامے، کہیں جنگلی جانور، کہیں انگلش فلمیں تو کہیں کارٹون اور ایک دو سین جو میں نے دیکھے۔"

وہ آہستہ سے کہتے ہوئے آمنہ کے قریب ہو گئی۔ "قسم سے مجھے پسینہ آ گیا۔ خوب کھلے ڈلے سین تھے۔ انگریزوں کے ایک چینل پر تو صرف ساحل سمندر کی فلمیں آتی ہیں۔ سچ مجھ سے تو دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ انگریز ولی چٹی چٹی سی عورتیں ایک دم ننگ دھڑنگ ریت پر الٹی سیدھی لیٹی تھیں۔ وہ صائمہ تو خوب مزے لے کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے بار بار اکسانے پر میں نے دیکھا۔ پر اسی وقت اماں جی کا بلاوا آ گیا اور مجھے اٹھ کر آنا پڑا۔"

وہ کل سے یہ سب چھپائے بیٹھی تھی مگر اب ہضم کرنا مشکل ہو گیا تھا پھر تنہائی کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ چھوٹا سا گھر تھا، ایک کمرے میں بیٹھ کر بات کرو سب کو پتا چل جاتا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ اس وقت تو اماں جی سو رہی تھیں۔ عبدالمبین بھی اندر سو رہا تھا۔ بابا صاحب نیچے تھے تو زینب کو موقع مل گیا۔

"زینب! تم کو شرم نہیں آئی یوں آنکھوں کو گناہ گار کرتے ہوئے۔ تم بھول گئیں بابا صاحب کہتے ہیں۔ ان آنکھوں کو بھی حساب دینا ہے اللہ کے حضور کہ انہوں نے کیا کیا دیکھا۔"

"ارے جانے دو۔ میں نے تو اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے یہ سب کچھ اور جو روز دیکھتے ہیں۔ انہوں نے حساب نہیں دینا۔ تم ہزار سال پہلے کی بات کر رہی ہو۔"

"ان کا حساب کتاب ان کے ساتھ۔ ہمارا ہمارے ساتھ۔ وہ گڑھے میں چھلانگ لگائے تو تم بھی لگا دو گی؟"

"ارے رہنے دو یہ کتابی باتیں۔ ہمارے گھر میں ہے کیا۔ ایک ریڈیو تک تو ہے نہیں۔ ہر وقت دال روٹی کی نورا کشتی چلتی رہتی ہے۔ نمازیں پڑھ لو، قرآن پڑھ لو یا پھر بابا صاحب سے ڈر لو۔ دوپٹے اوڑھ اوڑھ کر بو بن جاؤ تو کیا ملتا ہے، کچھ بھی نہیں۔ اتنی اس کی عبادت، اتنی اس کی تابعداری کرتے ہیں پھر بھی کون سا اللہ ہم سے خوش ہو جاتا ہے۔ خوش تو وہ پھر بھی ان ہی لوگوں سے ہے، جو عیش و عشرت کے رستے پر چلتے ہیں۔ وہ انہیں خوب روپیہ پیسہ، دھیلا خوب مال و مال کیے جا رہا ہے اور ہم ترس ترس کر اپنی زندگی کو اور بھی مختصر کیے جا رہے ہیں پھر بھی اللہ کو ہم پر ترس نہیں آتا۔ یہ فقیروں جیسی زندگی، یہ پھٹے پرانے کپڑے، خالی برتن، خالی جیب۔ یہ صلہ ہے اللہ سے ڈرنے کا۔" وہ جیسے بھری ہوئی بیٹھی تھی پھٹ ہی پڑی۔

"بس کرو زینب! کفر کے جملے مت بولو۔ اللہ کے غضب کو آواز مت دو۔ جو عیش و عشرت کے رستے پر چلتے

ہیں' اس نے ان کا بھی حساب لینا ہے۔ بس انہیں ایک وقت مقررہ تک ڈھیل دے رکھی ہے اور ہماری زندگی کو کیا ہوا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ کھاتے پیتے ہیں' بھوکے نہیں سوتے۔ سر پر چھت ہے' سڑک پر تو نہیں رہتے۔ تن پر کپڑے ہیں' ننگے تو نہیں پھرتے پھر کس بات کا دکھ ہے تمہیں اس قدر۔"

"بس رہنے دو۔ ایسے کھانے پینے' پہننے اوڑھنے' رہنے سہنے سے ہم بے گھر ہی ہوتے تو کوئی ترس تو کھاتا ہم پر۔"

"نعوذ باللہ۔ تمہیں یہ پسند ہے کہ کوئی ترس کھائے تم پر؟"

"دیکھو آمنہ! تم یہ میری بات لکھ لو کہ ترس کا انجام ہمیشہ صبر نہیں ہوتا اور ایسا صبر تو نرا جبر ہے۔ اکثر ترس بہت خطرناک نتائج لاتے ہیں۔ میں کوشش کروں گی اور ضرور کروں گی جب بھی مجھے زندگی نے موقع دیا ذرا سا بھی کسی شارٹ کٹ کو اپنانے کا' میں اخلاقیات کی کسی شق کے بارے میں ایک لمحے کو بھی نہیں سوچوں گی' فوراً اس رستے پر چل پڑوں گی۔ یہ زندگی ہمیں ایک بار کے لیے ملی ہے اور میں اسے بھی گھٹ گھٹ کر بھوک و افلاس کے اندھیرے میں بسر کر کے مٹی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اپنی زندگی کے لیے ایک روشنی چاہیے' فقط ایک روشنی۔ اس کے بعد چکا چوند اجالے میں خود پیدا کروں گی۔ تم دیکھنا۔" وہ بہت عزم سے بول رہی تھی۔

"ویل سیڈ' ویل سیڈ۔ مائی سسٹر! ویل سیڈ۔ بہت اچھی' بہت اعلا سوچ ہے تمہاری۔ مجھے خوشی ہوئی ہے' بے حد' بہت زیادہ۔ کوئی تو ہے زندگی کی اس کال کوٹھری میں جو روشنی کی بات کرتا ہے' اجالے اور روشن سویرے کی بات کرتا ہے۔ آخر ہم ہی کیوں غربت کے ان اندھیروں میں بھٹکتے رہیں۔ جو روپے پیسے کی ریل پیل میں عیش کر رہے ہیں' وہ کیا زیادہ اللہ کا نام لیتے ہیں' زیادہ اس کی عبادت کرتے ہیں جو ہر نعمت ان کے قدموں میں ڈھیر کر دی گئی ہے اور ہمیں نرے وعدوں پر ٹرخایا جا رہا ہے۔ وہ بھی جنت کے وعدوں پر۔ وہ کیا ہے کہ "وہ غضب کیا تیرے وعدے پر اعتبار کیا اور خاک ہو جائیں گے ہم تجھ کو خبر ہونے تک" پنجابی کہاوت ہے نا۔ کون آیا ہے آج تک اس جہان خاموشاں سے یہ بتانے کے لیے کہ وہ جنت کے مزے لوٹ رہا ہے اور میں تو کہتا ہوں۔ جنت دراصل اسی دنیا میں ہے اور ان ہی لوگوں کو مل رہی ہے۔ جو پیسے میں کھیل رہے ہیں اور پیسہ کسے ملتا ہے۔"

عبدالمبین نہ جانے کب سو کر اٹھا تھا اور زینب کی جذباتی تقریر سن کر باہر آ گیا تھا۔ اس کے پاس اس موضوع پر ابھی کافی تقریر موجود تھی۔

"جو محنت کرتے ہیں۔" آمنہ نے آہستگی سے کہا۔ اس کے لیے دونوں کے خیالات حیران کن تھے۔

"وہ تم جیسے احمق ہوتے ہیں' جو محنت کرتے ہیں۔ روز کے چالیس پچاس کماتے ہیں۔ ان میں سے انچاس روپے روز کا خرچا اور ایک روپیہ یا اٹھنی بچا کر رکھ سکیں تو اپنی بچت پر نازاں ہوتے ہیں۔ وہ کبھی پیسے میں کھیلنا تو دور کی بات اکٹھے دس بیس ہزار دیکھ بھی نہیں سکتے۔" عبدالمبین نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"پیسہ ملتا ہے ان کو جو فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ اور ایک گولڈن چانس تو سب کو زندگی ایک بار ضرور دیتی ہے۔ جو فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ وہی اس دنیا میں جنت پاتا ہے۔"

"یہ تو ہونا ہی ہے۔ یہ تو پیدا کرنے والے نے انسان کی تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔ جسے جینا ہے اسے مرنا بھی ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑ رہے کہ جو جنت کے مزے لوٹتے ہیں وہ مرتے نہیں۔ ہم تو جینے کی بات کر رہے ہیں زندگی کی۔ اس کے روشن اجالوں کی اور مزے کی وہ کیسے لایا جائے۔ کیوں زینو؟" عبدالمبین نے زینب کی تائید چاہی۔

"بالکل اصل چیز تو جیے جانا ہے۔ موت کیسے آتی ہے کب اور کیوں یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ جیتے ہیں تو اپنی پسند سے جئیں گے' یوں سسک سسک کر جینا ہمیں گوارا نہیں۔" زینب اور جوش سے بولی۔

"تم دونوں احمق ہو اور بے وقوف بھی۔ چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والے' ہو سکتا ہے تم دونوں ایسی کسی جنت کو پا لو مگر اس کے بعد کے پچھتاوے' خدا نہ کرے تمہارا مقدر بنیں۔"

"عبدالمبین تم نے امتحان تو دے دیا ہے۔ مدرسے تم دوبارہ گئے نہیں۔ آگے تم نے کیا سوچا ہے؟" آمنہ

نے بحث کا موضوع بدل دیا۔

"بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ تم دیکھتی جاؤ۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"بات دیکھنے کی نہیں' غور کرنے کی ہے۔ بابا صاحب کی قلیل تنخواہ میں گھر کی گزر اوقات کس طرح ہو رہی ہے۔ یہ تم سے یا مجھ سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے بھی جاتے ہیں پھر بھی گزارہ مشکل ہے۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ عبدالمتین نے تو مڑ کر نہیں دیکھا تم کچھ کیوں نہیں سوچتے۔" آمنہ کئی دنوں سے عبدالمبین سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔

"سوچتا ہوں' بہت کچھ سوچتا ہوں۔ مگر ابھی فی الحال کچھ نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ ہنوز بے پروا تھا۔

"کیوں نہیں کر سکتے۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری' کہیں محنت مزدوری' کچھ تو کرو کہ بابا صاحب کے پریشان دل کو کچھ تو اطمینان حاصل ہو۔"

"اچھا ان کا دل بھی پریشان ہوتا ہے ہاہاہا۔۔۔ نئی خبر ہے میرے لیے۔" وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

"بدتمیزی نہیں کرو عبدالمبین! بابا صاحب بہت پریشان ہیں آج کل۔ تمہیں خود خیال ہونا چاہیے۔" آمنہ نے اسے جھڑکا۔

"اچھا جی' مجھے خیال نہیں ہے تو تم خیال کر لو۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"میں۔۔۔ میں کرنا چاہتی ہوں بہت کچھ مگر کیا کروں' تم بتا دو۔" وہ جیسے بے بس ہو کر بولی۔

"یہ' یہ دیکھ رہے ہو؟" اس نے کسی چھوٹے بچے کا ادھ سلا کرتا مشین کے بخیے کے نیچے سے نکال کر اسے دکھایا۔ "یہ میں سی رہی ہوں جو دو بچے مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آتے ہیں' ان کی ماں نے سلائی کے لیے دیا ہے۔ بیس روپے دو کی سلائی کے اور دونوں بچوں کی ٹیوشن ساٹھ روپے ہے میں اسی طرح کی چھوٹی موٹی محنت کر سکتی ہوں' بابا صاحب کا ہاتھ بٹانے کے لیے' مگر سلائی مشین جلیلہ نے مجھے ایک بچے کے گھر سے لا کر دی ہے۔ صرف آج کے لیے اور یہ مجھے آج ہی سینا ہے اور مشین واپس کرنی ہے۔ اب بتاؤ اور میں کیا کروں۔"

"تمہارا حال بھی اس ابابیل کا سا ہے' جو چونچ میں پانی لے کر جا رہا ہوتا ہے آتش نمرود بجھانے کے لیے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی گئی تھی۔ کسی نے پوچھا تمہارا یہ چونچ بھر پانی کیا آگ بجھا دے گا تو اس نے لاپروائی سے کہا' نہ بجھائے مگر روز قیامت میرا نام ان ناموں کی فہرست میں ہو گا جو اس آگ کو بجھانے میں کوشاں تھے۔ ویل ڈن' اچھی جاب ہے۔ لگی رہو' کسی نہ کسی دن تو اپنے بابا صاحب کی پریشانیاں کم کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔"

"بیس تیس روپے کمانے سے۔۔۔" زینب نے لقمہ دیا۔

"اور تم کچھ نہیں کرو گے؟" آمنہ نے افسوس سے کہا۔

"کم از کم اس طرح کی سروس نہیں۔ بیس تیس روپے والی' میں تو پہلی بار ہی لمبا ہاتھ ماروں گا اور یہ سارا منظر جادو کی چھڑی سے بدل دوں گا۔ تم دیکھنا۔" وہ شیخ چلی کی طرح بولا۔ دونوں ہی کچھ نہیں سمجھیں گے' آمنہ نے جان لیا تھا اور جھک کر کرتا مشین میں لگا کر سینے لگی۔ زینب گنگناتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"آمنہ!" عبدالمبین نے اسے پکارا۔

"ہوں۔۔۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" وہ آہستہ آواز میں بول رہا تھا۔

"کس لیے؟" اس کی توجہ ابھی بھی سلائی کرتی سوئی کی نوک پر تھی۔

"چاہیے نا!" وہ جھنجلا کر بولا۔

"کس لیے' وہی تو پوچھ رہی ہوں۔" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم اس بات کو چھوڑو' بتاؤ دو گی؟"

"کتنے پیسے؟"
"دو سو روپے۔"
"سی۔۔۔!" آمنہ کی انگلی سوئی کے نیچے آتے آتے رہ گئی۔ "تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟" اس نے انگلی کی پور کو منہ میں دبا کر کہا۔
"اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ جس کے لیے تم مجھے پاگل کہو۔"
"ہاں تم جیسے شیخ چلی کے لیے واقعی بڑی رقم نہیں ہے۔"
"واپس کر دوں گا نا پلیز! بہت اشد ضرورت ہے۔"
"پر میرے پاس تو ہیں ہی نہیں۔" وہ جھنجلا کر بولی۔
"کتنے ہیں؟" وہ جیسے سر ہو گیا۔
"اوں!" وہ سر اٹھا کر سوچنے لگی۔ بمشکل اسی روپے ہوں گے، وہ بھی میں نے آٹے کا تھیلا منگوانے کے لیے جمع۔"
"اس کو چھوڑو۔ تم پلیز مجھے دے دو۔ میں واپس کر دوں گا، آئی پرامس۔ بہت اشد ضرورت ہے۔ دیکھو پہلی بار مانگ رہا ہوں۔ بہن نہیں ہو آمنہ! پلیز۔" عبدالمبین باقاعدہ گڑگڑانے لگا تو آمنہ کو ترس آ گیا۔
"اچھا میں لے کر آتی ہوں۔ ابھی چاہیے؟" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
"ابھی چاہیے تو کہہ رہا ہوں نا!" وہ سرہلاتے ہوئے اندر چلی گئی۔
"باقی پیسے کہاں سے لوں؟" عبدالمبین اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے لگا۔

❋ ❋ ❋

میتوں تیرے جیا سوہنا ہوا لبھدا نہ
بیٹھی رہواں تیرے کول روح رجدا نہ

چھ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ ایک جیکی اور شیری وغیرہ کا بینڈ تھا۔ یہی دو لائنیں باری باری سب سے گوائی گئی تھیں۔ عبدالمبین کے لیے یہ بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ گانا تو اسے ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا اور سر تال کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کے باوجود اس کے گانے میں کمال اس کی آواز کا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں جو انوکھا سر تھا وہ بے قاعدہ طریقے سے گائے گئے چند بولوں کو بھی ممتاز کر دیتا تھا۔
اس روز اس نے شیری کے دیے گئے کارڈ کو سڑک پر پھینک دیا تھا، مگر چند قدم چلتے ہی اسے خیال آیا۔
"قسمت آزمانے میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر مجھے کچھ تو کرنا ہی ہے۔ فی الحال اور کچھ نہیں تو یہی سہی۔" یہ سوچ کر اس نے اپنے قدم پلٹائے اور کارڈ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ کچھ پیسے آمنہ سے لیے، کچھ زینب اور کچھ جلیل سے اور۔۔۔۔ اور اب وہ اسٹوڈیو کے اس کمرے میں بیٹھا تھا۔ جس میں نئے گانے والوں کا آڈیشن ہو رہا تھا۔ آڈینس میں عام شخص تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ممتاز موسیقار، گلوکار، میوزک انسٹرکٹر، پروڈیوسر اور شاعر حضرات تھے۔ پندرہ کے قریب لوگ بیٹھے تھے فرنٹ کی لائن میں تین ججز تھے۔ ان ہی ججز میں سب سے پہلے زیور گل تھی۔ اس کے ساتھ ماسٹر عاشق سہگل اور تیسرے فہیم لاشاری تھے۔ باری باری سبھی لڑکے لڑکیاں گا چکے تھے، آخری سے پہلا نمبر عبدالمبین کا تھا۔ ویٹنگ روم میں یہ سب امیدوار ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔
"یار اتنے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں۔ میں تو پتا نہیں گا بھی سکوں گا یا نہیں۔" ایک لڑکا دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ اور عبدالمبین نے تو ان بڑے بڑے لوگوں کی شکلیں تو کجا نام بھی نہیں سنے تھے۔ گاتے ہوئے اسے ایسے ہی لگا جیسے وہ گاؤں کے پنڈال میں بیٹھا ہے۔ اور سامنے یاروں کی منڈلی ہے۔" اس نے بہت اعتماد سے گایا تھا۔
رزلٹ اسی وقت اناؤنس کیا جانا تھا۔ اس لیے گانے کے بعد پندرہ منٹ کا وقفہ دیا گیا تھا، سب کو جوس کا ایک

ڈبہ بھی دیا گیا تھا۔
پندرہ منٹ میں ججز کی رائے اور تبادلہ خیال کے بعد رزلٹ اناؤنس کر دیا گیا تھا۔
فرحان رفیق اور میمونہ نجم کو کامیاب قرار دیا گیا تھا۔ زیور گل نے ڈائس پر آ کر کامیاب ہونے والوں کے ناموں کا اعلان کیا جس کے بعد باقیوں کے منہ اتر گئے۔
"اور خصوصی آواز، آج شام کی خصوصی آواز ایک اور امیدوار کی ہے۔ جو کامیاب تو ہے، مگر اسے کچھ ٹریننگ، میرا مطلب ہے ریاض وغیرہ کی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود پروڈیوسر ریاض صاحب نے انہیں اپنے ایک جنگل کے لیے بک بھی کر لیا ہے۔ ان کا نام ہے مسٹر عبدالمبین۔"
زیور گل نے عبدالمبین کا نام لیا تو اسے جیسے یقین ہی نہیں آیا وہ حیران سا زیور گل اور تالیاں بجاتے حاضرین محفل کو دیکھ رہا تھا۔
"مبارک ہو مسٹر عبدالمبین!" زیور گل نے اسے دیکھ کر کہا تو جیسے اس کا کافی دیر کا سانس بحال ہو گیا۔
"دیکھا میں نہیں کہتا تھا اس کی آواز میں سر ہے۔" شیری نے جیکی کے کان میں سرگوشی کی۔
"اپنی بکواس بند رکھو۔" جیکی کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
"میڈم! مجھے یقین نہیں آرہا۔" زیور گل اس کے پاس آئی تو اس نے آہستگی سے کہا۔
"تم ایک دن بہت اوپر جاؤ گے اس فیلڈ میں، میری بات لکھ لو۔" وہ اس کا کندھا تھپتھپا کر بولی۔
"میڈم! تھینک یو میڈم!" عبدالمبین کی آنکھیں بھر آئیں۔
"ارے، میرا کس بات کا تھینک یو۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی اپنی گرین سلک کی ساڑھی کا ڈھلکتا پلو ایک ادا سے کندھے پر ڈالا۔
"تھینک یو گاڈ کا بولو۔ جس نے تمہیں یہ گفٹ دیا ہے۔ اور تمہیں ان ٹائم اس کا احساس بھی ہو گیا ہے اور کئی ہو جو فوراً پہچانے بھی گئے ہو۔ کیوں ریاض صاحب ایم آئی رائٹ؟" زیور گل نے پاس کھڑے ریاض صاحب سے ایک ادا سے پوچھا۔
"زیور گل جی! آپ کبھی غلط کہہ ہی نہیں سکتیں۔ اچھی آواز تو پاتال سے آئے تو آپ کے جوہر شناس کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ویل ڈن ینگ مین! اچھا گا۔ بس اب ریاض کرو اور خوب نام کماؤ۔ میرا ایک جنگل ہے ڈیڑھ منٹ کا چاکلیٹ کوکیز کا۔ فی الحال میں تمہیں اس کا پانچ ہزار دوں گا۔ اگر وہ چل گیا تو میرے پاس ایک دو آفرز اور بھی ہیں۔"

● ● ● ● ● ●

عبدالمبین کو تو اس کی پہلی آفر پر ہی لگا وہ زمین پر نہیں کھڑا بلکہ آسمان پر پرواز کر رہا ہے۔ اکٹھے پانچ ہزار!! ناقابل یقین اس کے کان جیسے سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔
"کرو گے نا؟" ریاض صاحب نے اسے یوں کھوئے کھوئے دیکھ کر پوچھا۔
"ج۔۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔" اس نے اپنے ہونق چہرے کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔
"کہاں رہتے ہو؟" وہ بغور اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔ زیور گل کے لباس سے اٹھتی بھینی بھینی مسحور کن خوشبو اسے الگ ڈسٹرب کیے دے رہی تھی۔
"ش۔۔۔۔۔ شیخوپورہ میں۔۔۔۔" کوشش کے باوجود وہ جھوٹ نہیں بول سکا تھا۔
"اوکے، کل آجاؤ گے نا۔ کل صبح دس بجے۔۔۔۔ نہیں بلکہ صبح نو بجے، ریکارڈنگ میں خاصا ٹائم لگ جاتا ہے۔ تمہیں شاید دو تین دن لگاتار آنا پڑے۔"
"جی میں آجاؤں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔
"ارے ریاض صاحب! آپ اسے کہیں تو یہ تاعمر آتا رہے گا۔ وہ بھی سر کے بل۔" زیور گل ٹھٹھا لگا کر ہنسی۔

"آپ کہیں اور ہم نہ آئیں۔" عبدالمبین نے کچھ حیران نظروں سے زیور گل کی بے باک نظروں اور ہنسی کو دیکھا اس نے تو ایسی صورت بھی پہلی بار دیکھی تھی جو ایسے لباس میں تھی جس میں اس کا سارا برہنہ پیٹ سب کو نظر آرہا تھا' پھر بھی وہ ذرا نہیں ہچکچا رہی تھی۔ کھرے گلے سے جھانکتا معنی خیز خلا جیسے سب کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

اس نے تو اپنی زندگی میں اماں جی جیسی عورتیں ہی دیکھی تھیں۔ یا گاؤں کی محنت کش عورتیں 'کھیتوں میں کام کرتی۔ اپنی نسوانیت' اپنی جوانی و حسن سے بالکل بے خبر۔ عورت کا یہ روپ تو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ٹی وی وغیرہ دیکھنے کا بھی اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے قریب سے اس طرح کا نظارہ.....؟ اس کی عقل ماؤف سی ہو رہی تھی۔

"جی میں آجاؤں گا۔" وہ نظریں جھکا کر بولا۔

"فی الحال' کل میں تمہیں پانچ سو روپے دے دوں گا ایڈوانس۔ باقی ریکارڈنگ کے بعد۔ فارم بھی کل فل کرلینا۔ پڑھتے ہو؟"

"جی.....!"

"کون سی کلاس میں۔؟"

"جی ابھی پڑھ رہا ہوں۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"دیکھتے نہیں' ریاض صاحب! دنیا کو پڑھنے نکلا ہے اور اس پڑھائی کی کوئی کلاس 'کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ بس پڑھتے جاؤ' پڑھتے جاؤ۔ کورس ہی تمام نہیں ہوتا۔" وہ پھر سے ہنسی۔

"اور جو سلیبس آپ جیسا ہو گل جی! پھر تو عمریں بیت جاتی ہیں۔" ریاض صاحب نے معنی خیز نظروں سے اس کے کھڑی کمان جیسے تنے جسم کو بے باک نظروں سے دیکھا۔

"ارے جانے بھی دو۔ گئے وہ زمانے اب تو نیا سلیبس 'نیا زمانہ۔" زیور گل نے بڑی ادا سے ریاض صاحب کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"جھوٹ نہیں کہتا۔ ابھی بھی سڑک کے درمیان کھڑی ہو جاؤ' دونوں طرف کی ٹریفک گرین سگنل کے باوجود تھم جائے۔ کیوں عبدالمبین۔؟" اس نے عبدالمبین کو گھسیٹا' اس نے سر جھکا لیا۔

"بھئی' تمہارا نام بڑا مشکل ہے' پوری توجہ سے لینا پڑتا ہے۔ اس فیلڈ میں ایسے نام نہیں چلتے۔ ایسا لگتا ہے بندہ کسی حافظ قرآن سے مخاطب ہو' سب سے پہلے اپنا نام بدلو۔ کیوں گل جی؟"

ریاض صاحب کی بات پر اسے لگا کسی نے اس کے دل پر مکا دے مارا ہو۔ بابا صاحب نے سب کے نام رکھے تھے اور دونوں بھائیوں کے نام خاص طور پر قرآن سے نکال کر۔ "نام بدل لوں!" اس کے اندر کوئی کیڑا سا بولا۔

"ہاں بھئی' کوئی اچھا سا مختصر نام رکھ لو۔" زیور گل لاپروائی سے بولی۔

"اچھا بھئی' ریاض صاحب! میں چلتی ہوں۔ کوئی کام ہو تو یاد کر لیا کرو۔ تم نے تو اب بھولے سے بھی مجھے یاد کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

"شرمندہ نہ کرو گل جی! سب کام تمہارے ہیں' بس تمہارے اسٹینڈرڈ کا کام آج کل آ نہیں رہا۔ بڑی اچھل کود اور بے سُرا پن' ایسے میں کہتے ہوئے تو شرم آئے گی نا مجھے۔"

"ارے رہنے دو یہ بہانے بازیاں' سب سمجھتی ہوں۔ نئی نویلی بلبلیں پھنسا رکھی ہیں تم نے۔ ایسے میں ہم جیسی بوڑھی کو کل تمہیں کیا یاد آئے گی۔" وہ ناک سکوڑ کر بولی۔

"شک نہ کیا کرو' دوستوں کی محبت پر گل جی۔!" ریاض صاحب اس کی طرف پلٹ کر بڑی لگاوٹ سے بولے۔

"اچھا بھئی میں چلتی ہوں' او کے بائے۔" وہ کہتے ہوئے اسٹیج سے اتر گئی۔

"میں بھی جاؤں جی؟" عبدالمبین نے پوچھا۔

"ہاں جاؤ' کل صبح نو بجے۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ ریسپشن پر دکھا کر ڈی اسٹوڈیو میں آجانا' میں وہیں ہوں گا۔"

ریاض صاحب نے اسے اپنا کارڈ تھمایا تو وہ سر ہلا کر "خدا حافظ" کہتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ جیسے ہی وہ اسٹوڈیو سے نکل کر کار پارکنگ کی طرف آیا زیور گل اپنی شاندار کرولا میں بیٹھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ رک گئی اور اشارے سے بلانے لگی۔

"جی.....!" وہ پاس جا کر ادب سے بولا۔

"یہ میرا کارڈ ہے' کبھی ضرورت ہو' گانے میں مدد وغیرہ کے لیے یا گائیڈنس کی تو بلا جھجک "گل کدہ" چلے آنا۔ مجھے خوشی ہو گی تمہاری ہیلپ کر کے' اچھی آواز کا حق ہے کہ اس کی قدر کی جائے۔ پہچانا جائے اور مانا جائے اوکے وش یو گڈ لک۔"

وہ اس کے کندھے کو تھپتھپا کر ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

عبدالمبین غور سے اس کا کارڈ پڑھنے لگا۔

"کیا قسمت مجھ پر اتنی آسانی سے بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ یقین نہیں آرہا۔" وہ کارڈ پڑھ کر وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگا۔

❁ ❁ ❁

"او میرے خدا تم یہاں بیٹھی ہو' میں پورے کالج میں تمہیں ڈھونڈ آئی ہوں۔" نورین نے پیچھے سے آکر نوٹس بناتی شہرینہ کو چونکا دیا۔

"خیریت' تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں اگلا پیریڈ تو فری ہے۔" شہرینہ نے اس کے پھولی ہوئی سانسوں اور سرخ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے میں نے نہیں میڈم آفتاب نے تمہاری ڈھنڈیا پڑوائی ہے۔" وہ کچھ جھنجلا کر بولی۔

"میڈم آفتاب نے' وہ کیوں؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"تم اٹھو تو سہی یہ اسباب سمیٹ کر۔" اس نے شہرینہ کی کتابوں اور فائل کی طرف اشارہ کیا تو اس نے جلدی سے سب کچھ بیگ میں ڈال لیا۔

"تمہارے بھائی آئے ہیں تم سے ملنے یا شاید تمہیں لینے۔ میڈم آفتاب کے آفس کے ساتھ جو ویٹنگ روم ہے۔ وہیں بیٹھے ہیں جا کر مل لو۔ شاید انہیں کوئی ضروری کام ہے۔ میں کینٹین جا رہی ہوں۔ کچھ ٹھنڈا ٹھار پینے۔"

وہ اسے پیغام دے کر راستے کے درمیان ہی سے واپس مڑ گئی۔

"لالہ آئے ہیں؟" وہ حیران رہ گئی۔ نورین کا پیغام سن کر۔ "لالہ بھلا کس لیے آئے ہیں۔ پہلے تو وہ کبھی میرے کالج نہیں آئے۔" وہ تیز قدموں سے چلنے لگی۔

"شاید گھر جا رہے ہوں سوچا ہو کہ جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔" اس نے دل میں سوچا۔

"ویسے تو اب وہ اتنے اچھے رہے نہیں' پتا نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے ہر وقت بس بھائی بیگم' اور انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا اور سیدہ آپا بھی ان ہی کے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ جیسے وہ کوئی دنیا کا انوکھا بچہ پیدا کرنے جا رہی ہوں۔ میری تو نہ کسی کو پروا ہے نہ فکر۔" وہ پھر سے کڑھنے لگی۔

آج کل وہ ویسے بھی بہت پریشان تھی' عبدالمبین کتنے دنوں تک قبرستان کی منڈیر کے ادھر آتا رہا تھا۔ اور اب تین چار دنوں سے وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔

"وہ ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اب کبھی نہیں آئے گا کیا تھا تم ایک بار چلی جاتیں ملنے۔ اس سے بات کر لیتیں۔ سب کچھ اسے سمجھا دیتیں۔ یوں کسی کا دل توڑنا تو اچھی بات نہیں۔ وہ تو تم سے اس قدر محبت کرتا ہے اور تم نے کس بے دردی سے اسے ٹھکرا دیا ہے۔"

اس کا دل کئی دنوں سے مسلسل اسے لعن طعن کیے جا رہا تھا۔ اور اسے خود بھی تو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا تین راتوں سے مسلسل جاگ کر وہ اٹھ اٹھ کر کھڑکی سے جھانکتی کہ شاید وہ اسے نظر آجائے۔

پتا نہیں کیوں ان دنوں اس کا دل بے کل ہوا جا رہا تھا اس کی دید کی تڑپ میں بار بار اس کے خط نکال کر پڑھتی اور کئی بار رونے لگتی۔

"تو کیا مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے؟۔" کئی بار وہ اپنی حالت دیکھ کر خود سے سوال کرتی۔

"شاید۔۔۔" اس کا دل جواب دیتا اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ شاید سچ ہے۔ اسے واقعی اس سے محبت ہو گئی تھی۔

"اب میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔" آج صبح آتے ہوئے بھی پورے رستے وہ خود سے یہی سوال کرتی آئی تھی۔

جیسے ہی وہ ویٹنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی تو جیسے حیران ہی رہ گئی' وہ بے یقینی سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی۔

❋ ❋ ❋

ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی' امرود اور آلوچے کے درختوں کے سرسراتے پتوں کا دھیما دھیما شور کانوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا' گملے اور کیاریوں میں لگے گلاب' موتیا اور چنبیلی کے پھولوں سے آتی بھینی بھینی خوشبو نے فضا کو اور بھی معطر بنا رکھا تھا۔ شبنمی ہری ہری گھاس آنکھوں کو ٹھنڈک بخش رہی تھی۔ چڑیوں اور پرندوں کی چہکار کا شور صبح کی اولین ساعتوں کا پتا دے رہا تھا۔ مسز خان وہیل چیئر پر بیٹھی ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو بہت آہستہ آہستہ گھما رہی تھیں۔ ان کے لب خفیف انداز میں ہل رہے تھے ان کی آنکھیں اور کان ماحول کی خوبصورتی کی طرف متوجہ تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ماربل کے بینچ پر معاذ کتابیں اور نوٹس پھیلائے بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ سورج کی روشنی بہت آہستگی سے آسمان کی نیلاہٹیں چرا رہی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" انہوں نے تسبیح کو مٹھی میں لپیٹا اور بے اختیار سر اٹھا کر نیلگوں آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اتنی ساری بیش بہا نعمتیں تو نے بغیر کسی معاوضے کے ہمیں عطا کر رکھی ہیں اور ہم شکر کرنے سے بھی عاجز ہیں' زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں سے محرومی کا احساس ہمیں کس درجہ غیر مطمئن اور بے سکون کر دیتا ہے کہ ان پھولوں' ستاروں' ہوا' روشنی' غنچوں' بہاروں کے نظاروں جیسی انمول نعمتوں کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہی نہیں کہ ہم دل سے ایک بار ہی سہی اس ذات پاک کا شکر تو ادا کر سکیں۔ اللہ تیرا شکر ہے تو نے ہمیں یہ نعمتیں دیں بغیر کسی حساب کتاب کے اور ان کو محسوس کرنے والا دل بھی' نگاہ اور سماعت بھی۔" انہوں نے آہستگی سے وہیل چیئر کا وہیل گھمایا اور معاذ کی طرف دیکھنے لگیں۔

"السلام علیکم ام جان!" پیچھے سے شہباز خان کی آواز آئی تھی۔

"وعلیکم السلام' صبح بخیر جیتے رہو۔ خوش رہو۔ لمبی صحت مند عمر پاؤ۔" انہوں نے بشاش چہرے کے ساتھ شہباز خان کے جھکے سر کو چوما اور پیار کرتے ہوئے دعا دی۔

"یہ کیا؟ تم جا رہے ہو؟" لائٹ بلو کلر کی شرٹ اور بلیک پینٹ میں وہ تیار کھڑے تھے۔

"جی ام جان! میں نکلنے ہی والا تھا۔ اس لیے آپ سے ملنے آپ کے کمرے میں گیا تھا۔ اچھا کیا آپ نے جو اٹھ کر باہر آ گئیں۔ صبح کا سہانا وقت ہوا خوری کے لیے اور وہ بھی آپ کے لیے بہترین ہے۔"

"ہاں میں تو نماز کے بعد کمرے ہی میں رہتی تھی۔ نیند تو آتی نہیں تھی یہ تو اللہ بھلا کرے معاذ کا۔ کئی ہفتوں سے اس کا معمول ہے ادھر پڑھنے آتا ہے نماز کے بعد تو ساتھ مجھے بھی لے آتا ہے۔ بہت جی خوش ہوتا ہے صبح سویرے ادھر آ کر۔ ورنہ زیتون بانو کی محتاجی نے تو مجھے کمرے تک ہی محدود کر دیا ہے۔" ان کی صحت واقعی اچھی ہو رہی تھی۔

"اچھی بات ہے' اس سے آپ کی صحت پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔" شہباز خان نے محبت سے ماں کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"اب کب آؤ گے؟" ان کے چہرے سے یکا یک اداسی چھلکنے لگی تھی۔ شہباز خان نے ذرا رک کر ماں کے اداس چہرے کو دیکھا۔

"معلوم نہیں ام جان!" وہ کوشش کے باوجود جھوٹ نہ بول سکے۔

"کیوں۔۔۔؟"

"آپ کو پتا ہے ایک اسٹیشن پر کم از کم دو سال تو رہنا پڑتا ہے۔ اب دیکھیں۔" انہوں نے چہرے کے تاثرات کو نرم کیا۔

"پھر بھی چھٹی وغیرہ پر تو آؤ گے نا۔" بڑا آس بھرا لہجہ تھا ان کا۔

"اول تو ہارڈ ایریا میں اتنی جلدی چھٹی ملتی نہیں اگر ملی تو کوشش کروں گا۔"

"کوشش کیوں تمہیں آنا چاہیے۔ معلوم ہے نا بوڑھی معذور ماں کا' ایک ایک پل تمہاری راہ دیکھتے گزرتا ہے۔ اور پھر نزہت وہ بھی اس حال میں۔ کیا آنے والے کی امید تمہیں آنے پر مجبور نہ کرے گی۔" وہ جیسے جتا کر بولیں۔

"آپ ہیں نا ادھر اس لیے مجھے کچھ فکر نہیں۔" وہ ایک ہاتھ ان کے وہیل پر دوسرا ان کے کندھے پر رکھ کر ذرا سا جھکے۔

"میں اپنی جگہ' مگر تمہارا اپنا مقام ہے' یہ کیوں بھول جاتے ہو۔"

"میں تو نہیں بھول سکتا' ایک پل کو نہیں بھولتا دل۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولے۔

"کیوں کیا تم بھولنا چاہتے ہو۔؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔

"شاید ہاں' شاید نہیں۔" دوسرا فقرہ شاید انہوں نے ماں کا دل رکھنے کو کہا تھا۔

"شہباز! مجھ سے صاف صاف بات کیا کرو' کہا تو تمہیں اس عمر میں مجھ سے نہیں بوجھی جاتیں۔"

"کئی بار تو کہہ چکا ہوں مگر آپ سمجھتی ہی نہیں یا کوشش ہی نہیں کرتیں سمجھنے کی۔" وہ پلٹ کر ان کی وہیل چیئر کو آہستہ آہستہ دھکیلنے لگے۔ وہ چپ سی ہو گئیں۔

"تم جا کر فون وغیرہ تو کیا کرو گے نا؟" انہوں نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"جی ظاہر ہے۔ ہفتے میں ایک دفعہ تو لازمی کروں گا۔"

"بیٹا! نزہت سے بھی بات کر لیا کرو۔ نکاح کے پاک بولوں سے باندھا ہے تم نے اسے۔ تمہارے نام سے بندھ کر بیٹھی ہے وہ ادھر اور اب تمہاری امانت اس کی کوکھ میں پل رہی ہے۔ اتنا حق تو ہے نا اس کا تم پر کہ تم جدائی کے دنوں کو کچھ سہل کر سکو۔ دو چار دنوں بعد اس سے بات کر کے۔"

"ام جان! میں بار بار آپ سے کہہ چکا ہوں۔ میں کوشش کے باوجود اپنے دل کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا تو میں کیا کروں۔" وہ جیسے زچ ہو کر بولے۔

"شہباز خان! تم اس کے معاملے میں اللہ کے آگے جواب دہ ہو۔" بڑا شاکی سا انداز تھا ان کا۔ "اور تم اس قدر سخت دل بھی کبھی نہ تھے۔"

"ام جان! اسی اللہ نے مجھے بنایا ہے۔ میرے دل کی ساخت میں کون سی سختی شامل کی ہے' جو مجھے اس کے لیے نرم نہیں پڑنے دیتی' آپ لاکھ دلائل دے لیں' مگر میرے دل کو مجبور نہیں کر سکتیں۔" بڑا دو ٹوک سا انداز تھا۔

"بس۔۔۔" مسز خان نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "یہ میری زندگی کی بہت بڑی بھول تھی کہ نکاح کے بندھن میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت دلوں کے سب فاصلوں کو نگل جاتی ہے۔ مگر اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں میں نے ایک دن بھی تمہارے انداز' تمہارے خیال میں اس مظلوم لڑکی کے لیے لچک نہیں دیکھی۔ کاش میں نے شادی سے پہلے اس پہلو پر سوچا ہوتا تو کم از کم اس معصوم کی آہوں کی زد میں تو نہ آتی۔ تم نے بہت برا کیا میرے ساتھ' یا شاید میں نے خود۔" وہ جیسے بڑبڑا رہی تھیں۔ بڑا ہارا ہوا لہجہ تھا ان کا۔

شہباز خان! میری بات سنو۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"تم آج سے آزاد ہو' اپنے ہر فیصلے میں' ہر معاملے میں۔ جو تم چاہو اس پر عمل کر گزرو۔ میں نے تمہیں اپنی

مجبوری کے بندھن سے آزاد کیا۔ دیکھو ابھی وقت ہے۔ دو چار سالوں میں شاید یہ ہمت بھی چھن جائے۔ اور میں قبر میں جا کر بھی نزہت کی بددعائیں اور آہیں نہیں لینا چاہتی۔ ٹھیک ہے، بہت انتظار ہو گیا۔ ویسے تم میری طرف سے آزاد ہو۔ جو فیصلہ کرو گے میں تم سے باز پرس نہیں کروں گی۔ بلکہ اسے دل سے قبول کروں گی۔ صرف چھ سات ماہ انتظار کر لو بچہ ہو جائے پھر تم جو کچھ بھیجو گے جو کہلا بھیجو گے میں اسے دل سے قبول کروں گی اور تم سے ناراض بھی نہیں ہوں گی۔ کیونکہ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ دل کے معاملے دنیاوی مجبوریوں سے ماورا ہوتے ہیں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ آخر کب تک میری خاطر یہ مجبوری کا ڈھول گلے میں باندھو گے، کب تک یوں مارے بندھے زندگی گزارو گے اور میں تو تم دونوں کے چہروں پر اصل شادابی دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ سب میری وجہ سے ہوا، مجھے معاف کر دینا۔"

"پلیز ام جان!"

"نہیں میرے بچے! تم صحیح کہتے ہو۔ میں ہی نادان تھی۔ چلو اب تم جاؤ۔ اللہ کے سپرد۔ جا کر خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کرنا۔ نزہت خیروعافیت سے فارغ ہو جائے اس کے بعد میں انشاءاللہ تم دونوں کی سچی خوشی کا اہتمام دل سے کروں گی، جاؤ۔ اب تو دن نکل آیا ہے۔"

"ام جان! آپ ناراض ہیں مجھ سے۔؟" وہ ان پر جھکے۔

"ماں کی جان! میں تم سے ذرا بھی ناراض نہیں۔ بس اصل نکتے کو اب سمجھی ہوں اور دیر ہو جانے پر افسردہ ہوں۔ تم ذرا خیال نہیں کرنا کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ جاؤ اللہ کے حوالے۔" انہوں نے بیٹے کا ماتھا چوم کر دعا دی۔

"او کے ام جان! اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر مڑے اور معاذ کی طرف آ گئے۔

"او کے معاذ! میں جا رہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا اور خوب دل لگا کر پیپر دینا، زبردست سا میرٹ بننا چاہیے تمہارا، اور ام جان کا خیال رکھنا اور..... اس گھر کا بھی۔" انہوں نے ایک ہی سانس میں جیسے سب کچھ کہہ ڈالا۔ معاذ نے اداس سی مسکراہٹ سے انہیں دیکھا۔

"آپ دعا کریں گے تو میرا میرٹ ضرور بنے گا۔"

"میری دعاؤں سے زیادہ تمہاری محنت ضروری ہے۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے اس کے بال سہلائے اور جانے کے لیے مڑے۔ "اور ہاں..... " انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ "جب بھی واپس آیا تمہارا اتا پتا ضرور تلاش کریں گے۔ دونوں مل کر۔ میں نے تم سے پرامس کیا ہے نا۔ اللہ حافظ۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر چلے گئے۔

"انہیں یہ بات یاد ہے، سب کی ضروری غیر ضروری باتیں یاد رہتی ہیں تو پھر یہ نزہت آپی کو اگنور کیوں کرتے ہیں۔ کیا ان کا دل دکھنے کا انہیں احساس نہیں ہوتا۔" معاذ نے انہیں جاتے دیکھ کر بے اختیار سوچا۔

اظہر کا ڈرائیور انہیں چھوڑنے جا رہا تھا، اپنا سوٹ کیس وہ پہلے ہی گاڑی کے پاس رکھ آئے تھے۔ ڈرائیور پورچ کے پاس کھڑا تھا، جیسے ہی وہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگے۔ ایک دم سے نزہت ان کے سامنے آ گئی۔ ملگجا سا زرد کاٹن کا سوٹ، بکھرے بال۔ متورم آنکھیں اور زرد چہرہ۔ لگتا تھا وہ رات بھر سوئی نہیں۔ یا ابھی رو کر آئی ہے۔

"مجھ سے مل کر نہیں جائیں گے۔؟" بہت مدھم آواز تھی اس کی۔ شہباز خان ذرا کی ذرا شرمندہ ہوئے۔

"میں سمجھا۔ شاید تم سو رہی ہو۔" وہ یونہی ہلکا سا مسکرائے۔ اس کی طرف دیکھے بغیر۔

"جن کے نصیب سو جاتے ہیں۔ پھر ان کی آنکھوں میں نیند نہیں آتی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے۔ مجھے چلنا چاہیے۔" انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"دیر تو واقعی ہو گئی ہے۔ اور پتا بھی نہیں چلا۔" اس کی آواز بہت تھکی تھکی سی تھی۔ جیسے زبردستی بول رہی ہو۔

"بس آپ سے ایک بات کہنا تھی اس لیے رستے میں آ گئی۔"

"بولو!" وہ اپنے جوتوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"مجھے نہیں معلوم یا شاید معلوم ہے۔ میں اس پوائنٹ کو سوچنا نہیں چاہتی، بہرحال آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ مگر آپ مجھے..... طلاق..... نہ دیں۔ اگر آپ کہیں گے تو میں آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ کہیں اور مگر مجھے اس ذلت سے دوچار بھی نہ کریں۔" اس کی آنکھیں چھلکنے کو تیار تھیں۔

"کم آن، فلمیں کم دیکھا کرو، اگر حقیقت کو جان ہی لیا ہے تو اسے فیس کرنے کا بھی خود میں حوصلہ پیدا کرو۔ ڈائیورس اور سیپریشن میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور ابھی آٹھ دس ماہ تک میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ایسا کچھ بھی سوچنے کا، اس لیے تم بھی اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالو اور کے میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

کہہ کر وہ فوراً گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور لپک کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ نزہت نے ایک آخری آنسو بھری نگاہ ان پر ڈالی اور گاڑی روانہ ہونے سے پہلے واپس اندر کی طرف مڑ گئی۔ اس کا دل سخت بے قابو ہو رہا تھا۔ اندر جاتے ہی وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں گئی۔ دروازہ لاک کر کے بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی۔ پھر آنسوؤں اور گھٹی گھٹی چیخوں پر اس کا کچھ اختیار نہ رہا۔

❊ ❊ ❊

"تم..... تمہاری اتنی جرات کہ تم یہاں تک آؤ۔" شہرینہ، عبدالمبین کو اپنے سامنے دیکھتے ہی جیسے پھٹ پڑی۔

"محبت بذات خود جرات کا نام ہے مائی لو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں۔" وہ بے خوفی سے اس کے بے حجاب چہرے کو سراہتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ بہت زیادہ میرے تصور سے بھی بڑھ کر بے حد خوبصورت کہ جس سے انتقام لیتے لیتے ہی محبت ہو جائے۔"

وہ پہلی بار شہرینہ کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ رہا تھا۔ اور اس کا جگمگاتا حسین چہرہ دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔

"مائی گاڈ! تم یہ سب بکواس کرنے ادھر بھی آ گئے، میں بلاتی ہوں کسی چوکیدار کو، نہ تمہیں دھکے دے کر نکلوا دیا تو میرا نام بدل دینا۔" وہ سخت غصے میں تھی۔

"گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو اس کے حسن، اس کی خوشبو میں فرق نہیں آئے گا۔ کسی نے کس قدر سچ کہا ہے۔" وہ مخمور نظروں سے اسے تکتے ہوئے بے ساختگی سے بولا تو شہرینہ کو احساس ہوا وہ اس کے سامنے بے حجاب کھڑی ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے شانے پر پڑا دوپٹا اپنے چہرے پر لپیٹنا چاہا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں شہرزادے، آگ تو لگ چکی۔ اب صرف یہ سوچو اس آگ کو بجھایا کیسے جائے۔" وہ شہرینہ کی اس اضطراری حرکت کا مزہ لیتے کرتے ہوئے بولا۔

"شٹ اپ!" اس نے دوپٹے کو بطور نقاب کانوں کے پیچھے اڑس ہی لیا۔

"شکر ہے حسن کی اس آگ کے شعلے کچھ تو پس پردہ ہوئے، ورنہ فائر بریگیڈ والوں کو فون کرنا پڑ جاتا۔" وہ ہنس کر بولا۔ شہرینہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔

"کس لیے آئے ہو تم ادھر؟"

"یہ سوال مجھ سے کیوں کرتی ہو۔ میں پوچھتا ہوں اتنے دنوں سے جو میں دیوانوں کی طرح رات رات بھر تمہارے کمرے کے سامنے کھڑا رہا ہوں، تمہارا دل ایک بار بھی نہیں پگھلا۔ کیوں مجھ سے ملنے نہیں آئیں؟"

"دیکھو میرے ساتھ یہ فضول بحث مت کرو اور جاؤ یہاں سے۔ مجھے تم سے کچھ سروکار نہیں رکھنا۔ پہلے ہی تم نے میرا اچھا خاصا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ میں مجبور ہو کر لالہ سے سچ مچ تمہاری شکایت کر بیٹھوں۔"

"تو اب تک کی کیوں نہیں؟" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"کیونکہ مجھے یقین تھا کہ تم میں کچھ تو غیرت ہو گی جو اتنی بار ٹھکرانے پر دوبارہ میری طرف رخ نہیں کرو گے۔" وہ طنز سے بولی۔

"تمہیں معلوم ہے۔ محبت کا پہلا درس ہی بے غیرتی اور ڈھٹائی ہے۔" وہ ذرا سا اس کے پاس آتے ہوئے بولا۔
"تم اب کیا چاہتے ہو یہاں سے خود جاؤ گے یا میں کسی کو بلاؤں۔" وہ سختی سے بولی۔
"تو اس ایک ماہ میں تمہارے پتھر دل پر میری محبت کا کچھ اثر نہیں ہوا؟۔" وہ مایوس لہجے میں بولا۔
"نہیں۔" وہ بے دھڑک بولی۔
"شہرینہ! ایسے مت کہو تمہارا یہ دیوانہ مر جائے گا۔" وہ رو دینے کو تھا۔
"خدا کے لیے تم اب ادھر سے جاؤ کوئی آ گیا تو...... جاؤ یہاں سے۔" وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولی۔
"ایک بار چلا گیا تو پھر نہیں آؤں گا۔"
"مت آنا میں تمہیں نہیں بلاؤں گی۔"
"تو تم میری محبت کو ٹھکرا رہی ہو؟۔"
"جی بالکل مجھے آپ کی محبت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔" وہ چبا چبا کر بولی۔
"تو میں چلا جاؤں؟۔" وہ بے یقینی سے بولا۔
"تمہیں اب تک یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔" وہ زور دے کر بولی۔
"او کے!" اس نے گہرا سانس لیا۔ "اب میں دوبارہ تمہارے رستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔ مگر میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو شہرینہ! میں نے دل کی گہرائیوں سے تم سے محبت کی ہے۔ اور تم نے اس کی قدر نہیں کی۔ تمہیں احساس ہو گا مگر اس وقت جب شاید میں تمہاری صداؤں کے جواب میں پلٹ بھی نہ سکوں۔" وہ دکھی لہجے میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔
"چلو ٹھیک ہے میں تمہیں صداؤں کی تم نہ پلٹنا اور کچھ۔" وہ جیسے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔
"اور کچھ رہ گیا ہے۔" عبدالمبین نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر شہرینہ کو دیکھا۔
"اب جاؤ بھی۔" شہرینہ جھنجلا کر بولی۔
"کیا تمہیں ذرا بھی دکھ نہیں؟۔"
"اف خدایا!" اس نے جیسے سر پکڑ لیا۔ "کتنی بار بتاؤں۔"
"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔ مگر میری ایک خواہش پوری کر دو جانے سے پہلے۔"
"کیا مطلب؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی۔
"محبت کی کوئی نشانی۔ تم نے تو نہیں کی محبت مگر میں نے تو کی ہے نا۔ کچھ ایسا جسے میں دیکھوں اور تمہاری محبت کی یاد میرے بے قرار دل کو سکون بخش سکے۔" عبدالمبین کے پاس ڈائیلاگ ختم ہوتے جا رہے تھے۔
"میں ابھی بھی نہیں سمجھی۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔
"شہرینہ! یہ...... " وہ رکا اور اس کے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹاپس اپنے یہ ٹاپس مجھے دے دو۔ یہ میرے دل میں تمہاری یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اور یہ مجھے یاد دلاتے رہیں گے کہ میں نے کس بے وفا سے دل لگایا تھا۔" وہ لہجے میں افسردگی بھر کر بولا۔
شہرینہ نے پہلے تو اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو پھر ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور دوسرے لمحے اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ اور وہ بے حد طنزیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"آ گئے نا اپنی اوقات پر۔ یہی اوقات ہے تمہاری۔ مجھے پہلے بتانا تھا کہ تمہیں کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ اتنے مہینے یہ ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے پہلے بتایا ہوتا۔ مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوتی بہرحال یہ تو میں تمہیں نہیں دے سکتی یہ میرے لالہ کا گفٹ ہے اور بے حد قیمتی ہیں۔"

"تو میں بھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔
"تو مت جاؤ میں چلی جاتی ہوں۔" وہ جانے کو مڑی عبدالمبین نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کی کلائی کو زور سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔
"تم یہاں سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتیں میری خواہش پوری کیے بغیر چاہے تم شور مچاؤ چاہے چپ چاپ کھڑی رہو مجھے تو عزت بدنامی نیک نامی کا کچھ خوف نہیں۔ مگر سنا ہے تمہارے سید خاندان کو اپنی عزت نیک نامی ہر چیز سے پیاری ہوتی ہے۔ یہاں اسی حالت میں کھڑے ہو کر چند لمحوں کو سوچو۔ تمہارے بھیا کا یہ گفٹ زیادہ قیمتی ہے۔ یا تمہاری عزت......" وہ اس کے کان کے پاس غرا رہا تھا۔ "مجھے تو چار جوتے پڑ بھی جائیں گے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"
"چھوڑو میرا ہاتھ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔" شہرینہ نے پورا زور لگا کر اپنی کلائی اس سے چھڑانا چاہی۔
"مچاؤ شور مگر میں ایسے نہیں چھوڑوں گا۔" وہ بے خوفی سے بولا حالانکہ اس کی نظریں مسلسل بیرونی دروازے پر پڑے پردے کو دیکھ رہی تھیں۔ اگر چند لمحوں میں بھی کوئی آ گیا تو اس کی اتنے ماہ کی محنت اکارت چلی جائے گی۔
"تم انتہائی گرے ہوئے اور گھٹیا انسان ہو۔" وہ بے بسی سے نفرت زدہ لہجے میں بولی۔
"تھینک یو۔" اس نے شہرینہ کی کلائی پر دباؤ بڑھا دیا۔
"سی......" اس کے منہ سے درد کے باعث بے اختیار نکلا۔
"ٹھیک ہے میں دیتی ہوں چھوڑو میرا ہاتھ۔" اسے جان چھڑانے کا اور کوئی طریقہ نظر نہ آیا تو بولی۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
"ایک ہاتھ سے پہلے ایک اتارو دوسرا میں خود اتار لوں گا۔" اس نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔
"شٹ اپ یہ ایک ہاتھ سے نہیں اترے گا اور تم مجھے ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔"
"وہ تو میں لگا ہی چکا ہوں اور فائدہ بھی اٹھا لوں۔" وہ کمینگی سے ہنسا اور اس کی کلائی چھوڑ دی۔
شہرینہ کی کلائی اس طرح سے سرخ ہو چکی تھی وہ کچھ نہیں بولی۔ اور خاموشی سے دونوں ٹاپس اتارنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے سے خوبصورت ٹاپس جن میں تین تین سفید نگینے لگے تھے جو اسے بہت عزیز تھے۔
"نہیں عام نگینے نہ سمجھنا۔ بیچنے جاؤ تو یاد رکھنا۔ یہ ڈائمنڈز ہیں۔ بیچو گے تو تمہارے دو تین سال کسی اور امیر زادی کو پھانسے بغیر آرام سے گزر جائیں گے۔" اس نے دونوں ٹاپس عبدالمبین کی ہتھیلی پر پٹخے۔
"تھینک یو۔ تھینک یو مائی سوئیٹ لو۔ کسی اور کو پھانسنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں جو ایک بار پھنسا لیا پھر دو تین سال کیا تمام عمر آرام سے کٹے گی۔" اس نے ٹاپس مٹھی میں بند کر لیے۔ شہرینہ نے اسے گھور کر دیکھا۔
"ابھی میرا خیال ہے گیارہ بجے ہیں۔ تمہارے کالج کا گیٹ ساڑھے گیارہ بجے کھل جاتا ہے۔ میں ٹھیک بارہ بجے تمہارے کالج کے دوسرے گیٹ پر کھڑا ہوں گا۔ تم وہیں آ جانا۔" وہ اسے بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔
"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا۔"
"بالکل ٹھیک یہ تمہارے ٹاپس میری محبت کی نشانی اور تم سے قربت کے گواہ ہیں کہ میں نے تمہارے کتنے قریب کتنے پل گزارے ہیں۔ میرے ہاتھ تمہارے کانوں کی لوؤں تک جا پہنچے جب سلطان بخت اور تمہاری آپا جان کو اس دلنشین حقیقت کا ادراک ہو گا میری تو شاید کھال ادھیڑ دی جائے تمہارا کیا حشر ہو گا ذرا سوچنا۔ ابھی ایک آدھ گھنٹہ ہے۔"
وہ جانے کو مڑا۔ شہرینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"اور اگر تم نہ آئیں تو اس کو گیدڑ بھبھکی مت سمجھنا۔ یہ محبت کی نشانی لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر سلطان بخت اور تمہاری آپا جان کے سامنے شام سے پہلے پہنچ جاؤں گا کہ اب تم وعدوں سے مکر رہی ہو میرے اتنے قریب آ کر۔ وہ اپنا دیا گیا گفٹ تو پہچان ہی لیں گے نا۔"

اور اگر میں اپنی جان اور عزت کی پروا کیے بغیر ادھر آ سکتا ہوں تو یقین مانو مجھے سلطان بخت کا بھی کچھ ڈر نہیں، نہ تمہاری آپا جان کا۔ خدا حافظ۔" وہ دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

"تمہاری گاڑی ڈیڑھ بجے تک آتی ہے تمہیں لینے۔ میں تمہیں ٹھیک ایک بجے گیٹ کے آگے دوبارہ ڈراپ کر جاؤں گا۔ "بارہ بجے یاد رکھنا خدا حافظ۔"

اگلے پل وہ شہرینہ کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور وہ پریشان نظروں سے ہلتے پردے کو دیکھ رہی تھی۔

❋ ❋ ❋

"یہ کیا بکواس ہے؟"

نین تارا آنکھیں بند کیے لان میں پڑی کین کی کرسی پر ایزی اسٹائل میں بیٹھی تھی۔ جب کوئی چیز زور سے اس کے منہ پر آ کر لگی اور کسی نے دھاڑ کر کہا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے سلطان بخت غصیلا چہرہ اور شعلہ بار آنکھیں لیے کھڑے تھے اور نین تارا کے قدموں میں گرنے والی چیز فولڈ کیا ہوا اخبار تھا۔ اس نے بڑے آرام سے جھک کر اخبار اٹھایا۔ اور کھول کر دیکھنے لگی۔ سامنے ہی قریشی کی نئی فلم کے پریمئر کی تصاویر سے بھرا صفحہ تھا۔ اور وہ ہر جگہ قریشی کا ہاتھ تھامے مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔ اب اسے معلوم ہوا سلطان بخت کے یوں آگ بگولہ ہونے کا سبب۔

"میرے خیال سے یہ بکواس نہیں، اخبار ہے شاہ جی! آپ کو اس قدر غصہ کیوں آیا ہے۔ اس بے چاری سی چیز پر۔" وہ بڑے تمسخرانہ انداز میں بولی۔ اس نے ذرا بھی ظاہر نہ کیا کہ اسے شاہ جی کی یہ حرکت کس قدر ناگوار گزری ہے۔

"شٹ اپ نین تارا! مجھ سے اس وقت کوئی مذاق کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر اسے خوفناک انداز میں تنبیہہ کی۔

"مذاق اور میں۔" وہ زور سے کھلکھلا کر ہنسی۔ "اور وہ بھی آپ کے ساتھ۔" اس کی ہنسی اور پھیلی۔ "میں کیوں کروں گی شاہ جی! میری یہ مجال، یہ اوقات کہاں۔"

"بکومت میں اس وقت ان چوچلوں کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے بتاؤ تم نے یہ حرکت کیوں کی، جب میں نے تمہیں منع کر رکھا ہے کہ شوبز کی طرف تم نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کی نازک سی گردن دبوچ لیں۔

"آنکھ اٹھا کر حضور میں نے کب دیکھا ہے۔ دیکھ لیں آپ۔ سب تصویروں میں میری نظریں کیمرے کی طرف ہیں، آنکھ تو میں نے ایک بار بھی نہیں اٹھائی۔" وہ پھر سے مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔

"شٹ اپ شٹ اپ یو اسٹوپڈ......"

"یو شٹ اپ اینڈ ڈونٹ شاؤٹ مسٹر سلطان بخت! اور آگے ایک لفظ مت کہیے گا زبان میرے منہ میں بھی ہے اور آپ نے مجھے خرید نہیں رکھا۔" وہ ایک دم سے کرسی سے اچھلی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلائی۔

"تم..... تمہاری اس قدر مجال کہ تم مجھ سے اس لہجے میں بات کرو۔" وہ شاید اسے تھپڑ مارنے کو آگے بڑھے تھے کہ نین تارا نے ان کا فضا میں اٹھا ہاتھ تھام لیا۔

"شاہ جی! آپ بھول رہے ہیں یہ آپ کی حویلی نہیں۔ "گل کدہ" ہے۔ یہاں آپ کے اصول اور قاعدے نہیں چلیں گے۔ آپ اگر مجھ سے غلط بات کریں گے تو اس کا حق مجھے بھی حاصل ہے۔ پھر گلہ مت کیجیے گا۔" وہ بہت بے خوفی سے بول رہی تھی۔

"جانتا ہوں یہ "گل کدہ" ہے اور یہاں کس قسم کے گل کھلتے ہیں۔ اس کا بھی علم ہے کہ جیسی ماں تھی بیٹی بھلا اس کے رنگ سے جدا ہو سکتی ہے۔" سلطان بخت کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔

"اچھا!" وہ طنزاً بولی۔ "ویسے آپ کو تو پہلے روز سے ہی علم تھا کہ یہاں کس قسم کے گل کھلتے ہیں۔ پھر آپ اپنے قدم اس کی چوکھٹ پر رکھنے سے پرہیز کر لیتے۔" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو میں اس وقت یہ بکواس سننے نہیں آیا۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ تم نے میرے منع کرنے کے باوجود اس گندگی میں قدم کیوں رکھا۔ جب کہ میں نے تمہیں کہہ رکھا تھا جس دن تم اس گندگی میں جاؤ گی، نتائج کی خود ذمہ دار ہو گی۔" وہ ابھی بھی کھڑے تھے لہجہ ابھی بھی غصہ زدہ تھا۔ مگر نین تارا کی جرات نے اس کی حدت کم کر دی تھی۔

"تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔" وہ ذرا سا گنگنائی۔ "شاہ جی! مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے، جب ایک روز اسی طرح اخبار میں چھپنے والی ایک تصویر غالباً" آپ کی شادی کی تھی اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ اس وقت مجھ سے شادی کر چکے تھے، پھر بھی آپ نے میرا خیال کیے بغیر مجھ سے پوچھے بغیر اور مجھے انوائیٹ کیے بغیر بڑے دھڑلے سے دوسرا بیاہ رچایا تھا اور اسی طرح کی فوٹو چھپی تھی آپ کی اخبار میں۔ اور میں بے چاری چیخ چلا کر رو دھو کر آپ کی رسوائے زمانہ محبت کو اپنا جان کر چپ ہو گئی تھی۔ کچھ یاد آیا آپ کو؟"

جانے وہ پہلے بھی اس قدر ذہین تھی یا اب ہو گئی تھی کہ کوئی بھی موقع طنز کا یا کسی اور حوالے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ سلطان بخت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"ارے شاہ جی اتنا غصہ اچھا نہیں۔ بیٹھ جائیے۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں میں نے ایسا کچھ غضب نہیں کیا جو آپ ناحق اپنا خون جلا رہے ہیں۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔" اب کے اس نے لہجے میں خواہ مخواہ کا پیار سمو کر کہا۔

"میں اس وقت یہ گڑے مردے اکھاڑنے نہیں آیا۔ صرف تم سے باز پرس کرنے آیا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ کافی حد تک ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

"باز پرس کا لفظ بھی آپ کو سوٹ نہیں کرتا خیر آپ نواب ابن نواب ہیں۔ ڈکشنری کا کوئی بھی لفظ آپ کی پراپرٹی ہے جیسے چاہیں استعمال کریں۔" وہ پھر ہنسی۔ "آپ بیٹھیں تو سہی۔" سلطان بخت کو بادل نخواستہ بیٹھنا ہی پڑا۔ مگر ان کے تیور ابھی بھی بگڑے ہوئے تھے۔

"آپ کو معلوم ہے میں نے کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ اور کچھ بھی ایسا نہیں کیا جو آپ کو یوں غضب ناک کر ڈالے، صرف تین گانے گائے ہیں قریشی صاحب کی فلم میں، وہ بھی ان کے بے حد بے حد اصرار پر۔"

"اور یہ تصویریں بھی اس کے بے حد اصرار پر اور ہاتھ میں ہاتھ بھی۔" سلطان بخت نے میز پر پڑے اخبار کو ہوا میں اچھالا۔

"قریشی صاحب میری ماں کے پرانے خیر خواہ ہیں۔ ان کے بے حد اصرار کو میں ٹال نہیں سکتی تھی۔ پھر اگر میری ایک آدھ تصویر اخبار میں آ بھی گئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کی مجھ سے شادی کی خبر کس کو ہے۔ میں بتاؤں۔ آپ کو۔" وہ رکی "میرے گھر کے چند ملازمین کو، میری ماں کو۔ آپ کے سید ہاؤس کے چند ملازمین کو بلکہ وہ بھی شاید مجھے آپ کی خلوتوں کا کوئی کھلونا ہی سمجھتے ہوں۔ نکاح کی ان کو کہاں خبر ہو گی۔ اور اس کے علاوہ "گل کدہ" کی دیواروں کو، اس لان کے چند بیل بوٹوں کو، اس گھر کے بے جان فرنیچر کو، میرے بیڈ روم کو، میرے کاسمیٹکس کو، میرے ڈریسز کو اس شہر کی چند سڑکوں کو دو چار ہوٹلز کو اور......"

"نین تارا! اسٹاپ اٹ تم میرا مذاق اڑا رہی ہو یا اپنا۔"

"ظاہر ہے آپ کا مذاق اڑانے کی جرات تو میں نہیں کر سکتی۔ اپنا ہی اڑا رہی ہوں آپ ناحق خفا ہو رہے ہیں ان چند بے جان تصویروں سے کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا، کم از کم ہمارے اس خفیہ کاغذی رشتے پر نہ صالحہ شاہ آپ سے باز پرس کر سکے گی۔ نہ آپ کی اس طرح کی کوئی اور خفیہ محبت۔"

"اس وقت بات کسی اور کی نہیں ہو رہی۔ میری ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے نکاح میں ہو اور نکاح جیسا پاکیزہ بندھن میں نے تم سے اسی لیے باندھا تھا کہ تم ان خرافات میں نہ پڑو اور تم نے پھر وہی......"

"پلیز شاہ جی! میری دکھتی رگ پر ہاتھ مت رکھیں، میں نے بھی یہ پاکیزہ بندھن آپ سے اس لیے باندھا تھا کہ مجھے بھی ایک بیوی کے سب حقوق حاصل ہوں گے۔ مجھے بھی اپنی ماں کی طرح ہزاروں محبتوں کی طرف پیاسی چونچ اٹھا کر نہیں دیکھنا پڑے گا۔ مجھے صرف آپ کی، صرف ایک شخص کی محبت درکار تھی اور آپ نے مجھے کیا دیا۔"

"کیا نہیں دیا۔ ناشکری عورت!" وہ چلائے۔

"ڈھائی کروڑ کی کوٹھی۔ دس لاکھ کی گاڑی، ساٹھ ستر ہزار کا ماہانہ جیب خرچ، تھوڑے سے سیر سپاٹے، وہ بھی سیاہ شیشوں والی گاڑی میں۔ آپ اس رشتے کو کسی گناہ کی طرح چھپانا چاہتے ہیں۔ جب آپ مجھ سے شادی کر کے اس قدر شرمندہ ہیں تو شاہ جی! کچھ تو مجھے بھی سوچنا ہے نا کم از کم اپنے فیوچر کے بارے میں۔"

"کیا ہوا ہے تمہارے فیوچر کو؟"

"نہیں ہوا تو ہو سکتا ہے یہ رشتہ، جو ہم دونوں کے بیچ ہے۔ ایک بہلاوا ہے آپ کے نزدیک، کل کو اس بہلاوے سے آپ کا جی بھر جائے تو میرے پاس تو ایک آدھ بچے کی زنجیر بھی نہیں جسے ایسے من بھرے وقت میں آپ کے سامنے کھنکھنا سکوں، اس رشتے کے جوڑے رکھنے کی التجا کر سکوں۔ آپ مجھے بیچ رستے میں چھوڑ جائیں تو میں کیا کروں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تمہارے دماغ سے یہ بچے والا بھوت اتر کیوں نہیں جاتا۔" وہ زچ ہو کر بولے۔

"اترا ہے تو اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوئی ہوں۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"یہ..... یہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوئی ہو۔" انہوں نے زمین پر پڑے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔

"شاہ جی! یہ تو کچھ بھی نہیں۔ محض چند تصویریں ہیں۔ میں تو آپ کے کٹھور پن کے باوجود ابھی بھی اس رشتے کا پاس رکھ رہی ہوں۔ صرف تین گانے گائے ہیں۔ حالانکہ فلم میں کام کرنے کی میرے پاس ڈھیروں آفرز موجود ہیں اور مام کا اصرار بھی بہت ہے مگر صرف آپ کی خاطر یقین کریں میں نے کبھی ان آفرز کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اس کے باوجود آپ مجھے بے وفائی کا الزام دے رہے ہیں اور یہ تین گانے بھی تو آج کے نہیں۔ جب آپ نے صالحہ شاہ سے شادی کی، میں ان دنوں بہت فرسٹریٹ ہو رہی تھی پھر آپ کی طرف سے بھی توجہ یکایک کم ہو گئی تھی۔ بس اس صدمے اور دکھ کی کیفیت میں، میں نے قریشی صاحب سے ہامی بھر لی۔ حالانکہ میں جانتی ہوں، میری آواز میری ماں کی طرح بہت خاص نہیں اور میرا ریاض بھی کوئی خاص نہیں پھر بھی، قریشی صاحب کی مہربانی کہ انہوں نے مجھے اپنے ٹیلنٹ کو آزمانے کا موقع دیا اور دوسری بات وہی تھی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"کون سی؟"

"میرے وسوسے، کل کو آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں کیا کروں گی۔ میرے پاس کچھ تو ہو نا۔ میں ڈگری ہولڈر ہوں نہ میری ماں، میرا باپ اتنی جائیداد چھوڑ جائیں گے کہ میں بیٹھی تا عمر کھاتی رہوں اور تیسری بات......

تیسری بات آپ گاؤں چلے جاتے ہیں۔ اکثر کئی کئی ہفتے خبر نہیں لیتے۔ فون کرنے کی حویلی میں مجھے اجازت نہیں۔ شاہ جی! میں آپ کی محبت کے دریا کی جل مچھلی ہوں اور جس دن اس جل کا پانی سوکھ جاتا ہے۔ میں مرنے کے قریب ہو جاتی ہوں۔ ایسے میں کچھ ایکٹیویٹی کچھ کرنے کو بھی تو میرے پاس ہونا چاہیے۔ یہ گانا کچھ ایسا نازیبا فعل بھی نہیں کہ آپ مرنے مارنے پر اتر آئیں۔ میری تنہائی کا مشغلہ سمجھ لیں جو آپ سے دوری میں کام آتا ہے۔ آپ مستقل میرے پاس ہوں تو مجھے ان چیزوں کو دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔" اس نے بڑے سبھاؤ سے سلطان بخت کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"میں کچھ دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو یہ سب بتا دوں اور آپ سے اجازت بھی لے لوں۔ اگر کبھی کبھار ایک آدھ کام اس طرح کا پردہ اسکرین سے اوجھل رہ کر کر لوں تو آپ اجازت دے دیں گے نا؟" وہ بڑے لاڈ سے ان کے قریب کھسک آئی اور ان کا بازو تھام کر بولی۔ سلطان بخت نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا ان کا ذہن جیسے کہیں اور ہی پرواز کر رہا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ ایکدم سے اٹھے اور نین تارا کو دیکھے بغیر تیزی سے گیٹ کے پاس کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ نین تارا نے کچھ حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر اخبار اٹھایا اور تصاویر دیکھنے لگی۔

❊ ❊ ❊

عبدالمبین نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔

اس کی اتنے مہینوں کی محنت اکارت نہیں گئی تھی۔

شہرینہ فل نقاب کے شامیانہ ٹائپ چادر میں خود کو لپیٹے گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ عبدالمبین کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آگئی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے اسی کی طرف آرہی تھی۔

"میں کیا اس پر بیٹھوں گی؟" وہ اس کے پاس آکر دھیمی آواز میں غصے سے بولی۔

"تو اور کیا میں تمہارے لیے پجارو لے کر آتا۔ یہ بھی کرائے کی ہے، کون سی میری اپنی ہے۔" اس نے بڑے فخر سے بائیک پر ہاتھ پھیرا۔

"دیکھو تم نے جو بکواس مجھ سے کرنی ہے، ادھر ہی کر لو۔ میں کبھی ایسی سواری پر نہیں بیٹھی۔ میں گر جاؤں گی۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"تو میں کس لیے ہوں، میں تمہیں گرنے دوں گا۔" وہ گردن اکڑا کر بولا۔

"اچھا مت بیٹھو، پہلے ہی تمہاری گاڑی آنے میں تھوڑا وقت رہ گیا ہے پھر مجھے الزام نہ دینا۔"

"جانا کہاں ہے۔ دیکھو میرے ٹاپس واپس کر دو۔ تمہارے معاملے پر ضرور سوچوں گی۔ آئی پرامس۔"

"اب سوچنے کا نہیں، بات کرنے کا وقت ہے۔ تم بیٹھو گی یا میں جاؤں اور تمہارے گھر پہنچنے سے پہلے تمہارے ٹاپس تمہارے بھیا کے پاس ہوں گے۔"

وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولا تو اس نے بے بسی سے اس ڈھیٹ کو دیکھا اور موٹر بائیک کیریر کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے عبدالمبین سے ہٹتے ہوئے سیٹ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"اس طرح تو تم ضرور ہی گرو گی۔ آگے ہو کر بیٹھو۔" وہ رعب سے بولا۔

"مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔" وہ اترنے کو تھی۔

"بیٹھ جاؤ، ڈرو نہیں۔ بس پہلی بار بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد آدمی انجوائے کرتا ہے۔"

"یہ میں پہلی اور آخری بار بیٹھ رہی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے بادل نخواستہ اپنا نازک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر خود کو سنبھالا اور پھر فوراً ہی ہاتھ ہٹا لیا۔ عبدالمبین نے مسکراتے ہوئے موٹر بائیک اسٹارٹ کر دی۔

اس نے یہ کمال بھی چند دنوں میں سیکھا تھا۔ موٹر بائیک کرائے پر لیتا اور کسی سنسان سڑک پر جا کر ڈیڑھ دو گھنٹے آہستہ آہستہ چلاتا۔ ٹاپس لینے والے آئیڈیے پر تو اس نے "تکا" ہی مارا تھا۔ اس کا اندھیرے میں چلایا گیا تیر کام کر گیا تھا۔ اس کا دل ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس نے موٹر بائیک کی رفتار بڑھا دی اور تیز..... اور تیز.....

"آہستہ چلاؤ۔" تیز شائیں شائیں کان کے پاس آتی ہوا کے ساتھ شہرینہ کی پکار اسے سنائی دی۔ اس کا جوش اور بڑھ گیا۔ اس نے اسپیڈ اور بڑھا دی۔ "تم پاگل ہو گئے ہو، مار دو گے مجھے۔ روکو اس کو۔" شہرینہ نے زوردار مکا اس کے کندھے پر جڑا تھا اور زور سے چیخی تھی۔ عبدالمبین پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ "خدا کے لیے روکو اس کو۔" وہ اب رو دینے کو تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ سامنے کا کوئی بھی منظر واضح طور پر اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک تو ذہنی طور پر وہ اس قدر ڈسٹرب تھی، دوسرے پہلی بار بائیک پر بیٹھی تھی، وہ بھی جبراً۔ ہوا سے باتیں کرتی یہ غیر یقینی سی سواری۔ اس کی چیخیں نکلنا لازمی تھیں۔

"روکو، خدا کے لیے روکو۔" وہ بے اختیار رونے لگی اور اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عبدالمبین کے کندھوں کو جکڑ رکھا تھا۔ عبدالمبین کو لگا آج زمین اس کے پاؤں کے نیچے نہیں۔ وہ فضا میں، خلا میں اوپر ہی اوپر اڑا چلا جا رہا ہے۔ شہرینہ کا اس کے کندھے سے لگا سر اسے

بے حد طمانیت بخش رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اسپیڈ کم کردی جیسے ہی موٹر بائیک رکی۔ شہرینہ نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ موٹر بائیک کسی پارک کے سامنے کھڑی تھی۔

"بہت ڈرپوک ہو تم۔ چلو اترو۔" وہ نیچے اترتے ہوئے مزے سے بولا۔ شہرینہ کی بھیگی آنکھیں اور نقاب پر گرے آنسوؤں کے قطرے اسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"اب منزل دور نہیں۔" اس کے دل نے بے ساختہ کہا۔

"آؤ نا۔" عبدالمبین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے بھی بغیر کسی مزاحمت کے اپنا ٹھنڈا یخ ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دونوں چلتے ہوئے پارک کے اندر ایک بینچ پر آ بیٹھے۔ بھری دوپہر میں پارک بالکل سنسان تھا۔ بینچ گھنے درختوں کے سائے میں تھا۔ دونوں چپ چاپ اس پر بیٹھ گئے۔ شہرینہ نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"میں کچھ لے کر آتا ہوں۔" وہ ایکدم سے اٹھا اور پارک سے باہر نکل گیا۔

شہرینہ کا دماغ بالکل بھی حاضر نہیں تھا۔ گیٹ تک آنے سے پہلے اس نے خود سے بہت جنگ لڑی تھی۔ جائے یا نہ جائے۔ عبدالمبین کے جانے کے بعد اس نے کوئی پریڈ اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ ایک کونے میں بیٹھی سوچتی رہی تھی۔ "اگر اس نے تاپس لالہ کو یا آپا کو دکھا دیے جا کر۔" سب سے بڑا خوف جو اس کے سر پر سوار تھا۔

"آخر اتنے ماہ تو ہو گئے ہیں اسے تمہارے پیچھے خوار ہوتے۔ آخر تم مان کیوں نہیں جاتیں کہ وہ واقعی تم سے محبت کرتا ہے۔" سب سے مضبوط دلیل جو اس کا دل دیے جا رہا تھا۔ آخر دل کی اسی دلیل پر اس نے عبدالمبین کے ساتھ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"یہ لو پی لو۔" دو اورنج جوس کے پیک اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔ ایک اس کی طرف بڑھایا۔

"مجھے پیاس نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"پیو گی تو معلوم ہو گا کہ تمہیں پیاس لگی ہے۔" اس نے کہتے ہوئے جوس اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود دوسری طرف بیٹھ گیا۔ شہرینہ کچھ دیر جوس کو اسی طرح لے کر بیٹھی رہی پھر آہستہ آہستہ پینے لگی۔

"آخر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ میں سچ مچ تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت۔۔۔ بہت زیادہ۔" جوس کا آخری سپ لے کر عبدالمبین نے جوس کا خالی ڈبہ دور ڈسٹ بن کی طرف اچھالا۔ شہرینہ چپ رہی۔

"تم کچھ نہیں بولو گی؟" اس کی چپ پر وہ جھنجلا کر بولا۔

"کیا بولوں؟" وہ جیسے بے بس ہو کر بولی۔

"کچھ بھی، کچھ تو کہو۔ تم کچھ سوچ کر ادھر آئی ہو گی نا میرے ساتھ۔" وہ اس کی طرف منہ کر کے بولا۔

"کچھ خاص نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کچھ اپنے دل کا حال کہو۔" وہ اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔

"مجھے خود اپنے دل کا حال معلوم نہیں۔" وہ خالی الذہنی سے بولی۔

"میرے دل کا تو معلوم ہے نا۔ اس پر پھر لعن طعن کرو یا مذاق اڑاؤ۔"

"کیا مذاق اڑاؤں۔ مذاق تو خود میرا دل میرا اڑا رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہارے ساتھ جو آ گئی ہوں۔ سمجھو آگ پر چل کر آئی ہوں۔" وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"اور واپس جا کر۔۔۔"

"واپسی۔۔۔ اب واپسی کا کوئی رستہ نہیں۔" اس نے جوس سائیڈ پر رکھ کر براہ راست عبدالمبین کو دیکھا۔

"مطلب؟" وہ تھوڑا خوش ہوا تھوڑا حیران۔

"تم خوش قسمت ہو۔" وہ اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے بولی۔

"وہ کیسے؟"

"سب کچھ، اپنے دل کا حال زبان پر لا سکتے ہو۔"

"اور تم؟"

"میں۔۔۔" اس کی بڑی بڑی آنکھیں رونے سے دھلی دھلی لگ رہی تھیں۔ سیاہ شفاف آنکھیں۔

"میں نے بہت کوشش کی ہے میں تمہیں ٹھکرا سکوں، اپنے دل کے حال کو جھٹلا سکوں مگر۔۔۔" وہ رکی۔ "تم جیت گئے۔" اس کی لرزتی پلکیں اس کے بیان کی سچائی کی گواہ تھیں۔

"میں نہیں، ہماری محبت جیت گئی۔" عبدالمبین اس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

"اس محبت کا انجام کیا ہو گا۔ تم نے سوچا ہے؟" شہرینہ نے اس کو ہراساں نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا ملن اور کچھ نہیں۔"

"تم ابھی ناسمجھ ہو اور میں بھی۔ یہ سب اتنا آسان کبھی نہیں ہو گا۔ جبکہ نہ تمہارے پاس تعلیم ہے، نہ کوئی ڈگری، کاروبار، نہ کوئی نوکری اور پھر ہمارے خاندان میں باہر شادیاں نہیں کرتے۔ تمہیں معلوم ہے نا؟" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

"شہرینہ! مجھ پر یقین کرو میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا اور تم بھی نہیں رہ سکو گی اور خاندان سے باہر شادی نہ کرنا کسی حدیث میں نہیں لکھا۔ رہی نوکری یا ڈگری کا سوال تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں جب تم سے بندھن باندھوں گا، جب تمہارے قدموں کے نیچے زمین دینے کے قابل ہوں گا اور اس کے لیے میرا سفر شروع ہو چکا ہے۔ بس تھوڑے عرصے کا انتظار ہے جو تمہیں کرنا ہو گا۔" وہ بہت پختہ لہجے میں بول رہا تھا۔

"یہ سب خواب ہیں، سراب ہیں۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

"کیا محبت بھی خواب ہے، سراب ہے۔ دنیا میں نہیں ملتی؟" وہ اس کے چہرے کے قریب جھک آیا۔

"نہیں، محبت خواب نہیں۔ یہ حقیقت ہے، روشن دن کی طرح۔" شہرینہ نے مسکرا کر اس کے چہرے کو دیکھا، یکایک یہ چہرہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

"تو ہمارا ملن بھی خواب نہیں ہو گا، سراب نہیں ہو گا۔ تم دیکھنا۔" وہ عزم سے بولا۔

"اور تم نے مجھے بہت ستایا ہے، بہت تڑپایا ہے۔ اتنے مہینوں بعد اقرار کی صورت بنی ہے۔ بہت ظالم ہو تم۔"

"اور جو میں تڑپی ہوں خود سے جنگ لڑنے میں، تمہیں تو اس کی خبر بھی نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"سب خبر ہے تب ہی تو میں پیچھے نہیں ہٹا تمہاری لاکھ دل شکنی کے باوجود۔"

"چلیں اب۔" شہرینہ نے سر اٹھا کر پارک کے سناٹے کو محسوس کیا۔

"ہاں چلو۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں کل آؤں اسی ٹائم پر؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کل سنڈے ہے۔" وہ مسکرائی۔

"او ویلیس پرسوں بارہ بجے آؤں نا۔"

"نہیں۔" وہ اسے چڑاتے ہوئے بولی تو وہ ہنس دیا۔

"تاپس دوں تمہارے؟" وہ اس کے پیچھے سے بولا۔

"نہیں، اب یہ میری نشانی ہے تمہارے پاس۔"

"اتنا یقین آ گیا ہے مجھ پر؟" وہ بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اس سے بھی زیادہ۔" اس بار وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے آرام سے بیٹھی تھی بائیک پر۔ اب اسے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ نہ بائیک کی تیز رفتاری سے نہ کسی کے دیکھ لینے کا۔ اپنا ہاتھ عبدالمبین کے کندھے پر رکھے وہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔

❊ ❊ ❊

"حد ہو گئی، یہ سلطان بخت نے کیا مذاق بنا رکھا ہے۔ کبھی لاہور تو کبھی کہیں، گھر تو ٹک کر بیٹھتا نہیں۔ بھلا یہ

کوئی دن ہیں کہیں جانے کے۔ غلہ کٹا ہوا تیار پڑا ہے' منڈیوں میں ٹرک بھر بھر جا رہے ہیں۔ وصول کون کر رہا ہے' ناپ تول کون کر رہا ہے' کسی کو خبر نہیں۔ اب یہ گیا کدھر ہے؟۔"
سیدہ بہت غصے میں تھیں۔ بولتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ سامنے صالحہ شاہ صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھیں۔ سیدہ کی باتوں کا انہوں نے ذرا نوٹس نہیں لیا۔ ایک نظر ان کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھا اور پھر میگزین کے صفحے پر نگاہیں جما دیں۔
"میں سلطان بخت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" وہ اونچی آواز میں کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
"اسلام آباد کا کہہ کر گئے ہیں بلکہ مجھے فون کر کے بتایا ہے۔ ویسے کدھر ہیں' مجھے علم نہیں۔" صالحہ شاہ نے سیدہ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔
"تم نے روکا کیوں نہیں اسے جانے سے۔" بریزے چکن کے انگوری کلر کے سوٹ میں ان کا سرخ و سفید رنگ دمک رہا تھا۔ صحت مند چہرہ ایسا لال ہو رہا تھا جیسے ابھی خون ٹپک پڑے گا۔
"جیسے وہ میرے کہنے پر کہیں آتے جاتے ہیں۔" صالحہ جل کر بولیں۔
"بی بی! اسے سمجھا تو سکتی ہو نا' اب تو وہ تمہارے کہنے کا میں ہے نا' غلے کے حساب کتاب کا وقت ہے۔ سارے سال کی آمدنی کا دارومدار ہوتا ہے ان دنوں کی ہوشیاری پر اور یہ خدا جانے کدھر اڑے پھر رہے ہیں۔"
"جواد کے کام سے گئے ہیں اسلام آباد۔ اس کا یونیورسٹی میں داخلہ تو ہو چکا ہے۔ کہہ رہے تھے' ایک دو پیپرز نامکمل ہیں' اس لیے جانا پڑ رہا ہے۔"
"جواد کے کاموں کے واسطے اس کا باپ ابھی زندہ ہے' یہ تو اپنے گھر کی خبر لے۔ بابا جان نے بھلے وقتوں میں مین روڈ کے پاس زرعی زمین کا ایک قطعہ خریدا تھا۔ خیال تھا کہ ادھر ریسٹ ہاؤس اور شاید کوئی فارم ہاؤس بنائیں گے مگر وہ زمین ایسی زرخیز نکلی کہ ہماری تمام زمینوں کے نصف غلے کے برابر ادھر سے آتا ہے۔ سونا سمجھو۔ بابا جان تو اس زمین کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ سال بھر گندم کی کٹائی کے موسم تک اپنے بچوں کی طرح اپنی نگرانی میں اس زمین کا سارا کام کرواتے تھے اور اب جو میں نے منشی کو بلوایا' پوتے کے پیچھے کھاتے چیک کیے تو مجھے وہ بتا رہا ہے۔ اس سال اس زمین پر کچھ فصل نہیں اگی یا شاید تھوڑی بہت اگی ہے۔ یعنی لاکھوں کروڑوں کا نقصان۔ مجھے تو اس وقت سے آگ لگی ہوئی ہے۔ پر وہ بیچ میں نہ ہوتا تو میں اس منشی کا گریبان نوچ لیتی۔ حرام خور ہو رہے ہیں سارے ملازم۔ ظاہر ہے' جب مالکان سب کچھ ان کمیوں پر چھوڑ دیں گے تو یہی کچھ ہو گا اور خون جلانے کو رہ گئی میں۔" سیدہ بھڑک رہی تھیں۔
"تو آپ مت جلائیں خون' جا کر اپنی حویلی سنبھالیں۔" صالحہ شاہ رکھائی سے بولیں۔
"بی بی! میں یہ سارے جتن تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے ہی کر رہی ہوں' ورنہ فکر مت کرو۔ میں ادھر آ کر بیٹھنے سے رہی۔ اپنی حویلی ہی میں رہوں گی۔ کر لو بات' نیکی کا کوئی زمانہ نہیں۔ عقل کی بات کوئی نہ بتائے اجاڑے جاؤ سارا کچھ' باپ دادا کی صدیوں کی محنت کا۔۔۔۔" اسی وقت شہرینہ اندر داخل ہوئی۔ وہ کالج یونیفارم میں تھی۔ سیدہ کی چیخ و پکار سن کر شاید وہ ادھر ہی آ گئی تھی۔
"آ گئیں آپ بھی بیگم صاحبہ! بھلا یہ کالج سے لوٹنے کا ٹائم ہے۔" وہ شہرینہ پر برس پڑیں۔
"گاڑی میں آئی ہوں' ڈیڑھ دو گھنٹے کا رستہ ہے۔ ہزار بار کہا ہے' مجھے اس عذاب سے نجات دلائیں۔ صبح دوپہر کی یہ بیگار۔ کون سا میں بجلی کا پر میں آئی ہوں کہ گھڑی بھر میں پہنچ جاؤں۔" شہرینہ بھی چمک کر بولی۔
"تمہیں بجلی کا پر کی کیا ضرورت' تم تو آج کل ویسے ہی ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔"
"آپ کو بڑی خبر رہتی ہے میری کہ میں ہواؤں میں ہوں یا فضاؤں میں۔" وہ صالحہ کے سامنے آ کر بولی۔
"تمیز سے بات کرو بھابھی ہے تمہاری۔ اس گھر کا تو آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہے۔" سیدہ غصے سے بولیں۔
"تمیز کی ضرورت صرف مجھے نہیں آپا جان! باقیوں کو بھی ہے۔ انہیں بھی سمجھائیں۔" وہ جھٹ سے بولی۔

"دیکھ لیا آپ نے' کیا کیا اور کس کس کو سدھاریں گی۔" صالحہ شاہ نے فوراً کہا۔
"دیکھ رہی ہوں بی بی! دیکھ رہی ہوں۔ بس آ لے سلطان بخت' اس کا انتظام تو میں آپ کرتی ہوں۔" وہ شہرینہ کو دھمکا کر بولیں۔
"میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہوں۔ اب کچھ بھی سوچنے سے پہلے سوچ لیجیے گا۔ میں کوئی بے زبان جانور نہیں ہوں' ہونہہ۔" شہرینہ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔
"دماغ زیادہ خراب ہو رہا ہے اس کا۔" وہ بڑبڑائیں۔
"تم لاؤ مجھے فون تو دو' میں سلطان بخت کا پتا کروں' ہے کدھر۔ کم از کم آ کر اس منشی کو تو لگام ڈالے' حساب کتاب چیک کرے۔"
"ہاجراں! ہاجراں!" صالحہ نے فوراً" اٹھ کر فون دینے کے بجائے پکار کر کہا۔ اسی وقت ملازمہ دوڑی دوڑی آئی۔
"جی مالکن!"
"یہ فون دو بھابھی بیگم کو۔" صالحہ نے بے نیازی سے میگزین کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔ اس کی بے نیازی جیسے سیدہ کو آگ لگا گئی۔ ملازمہ نے فون اٹھا کر انہیں تھمایا اور وہ خاموشی سے نمبر ملانے لگیں۔
"لو موبائل بھی آف کر رکھا ہے اس نے۔" وہ خود ہی بڑبڑائیں۔
وہ کوئی دوسرا نمبر ملانے لگیں۔ بیل جا رہی تھی۔ وہ کان سے ریسیور لگا کر صالحہ کو گھورنے لگیں۔
"ہیلو' ہاں منظور! میں بول رہی ہوں حویلی سے' سیدہ۔" وہ بارعب لہجے میں بولیں۔
"جی میں نے پہچان لیا ہے مالکن! حکم۔" وہ فوراً" بولا۔
"سلطان بخت ہے ادھر؟"
"جی نہار ہے۔۔۔۔ جی ہیں۔" وہ بولتے ہوئے لڑکھڑا گیا۔
"نہار ہے ہیں تو انہیں کہو فارغ ہو کر مجھے فون کریں۔"
"جی وہ تو نہا کر جا چکے ہیں۔ ادھر نہیں ہیں۔" منظور نے کہا۔
"ابھی تو تم کہہ رہے تھے نہار ہے ہیں اور ادھر ہی ہیں؟۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔
"جی ابھی ادھر تھے' اب نہا کر تیار ہو کر جا چکے ہیں۔ کہہ رہے تھے باہر کے ملکوں کا ویزا جدھر لگتا ہے' اس دفتر میں جا رہے ہیں۔ ٹائم تھوڑا ہے۔" منظور جلدی جلدی بولا۔
"منظور! ایک بات یاد رکھنا' سلطان بخت بہر حال مجھ سے زیادہ بااختیار نہیں۔ جس دن میں ادھر آ گئی اور تمہارے بول کا پول کچھ اور نکلا تو میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ رکھا ہے۔ تمہاری نسلیں بھی زمین پر کہیں رینگتی نظر نہیں آئیں گی۔ یاد رکھنا۔" وہ بہت دھیمی آواز میں دھمکی دیتے ہوئے بولیں۔
"مالکن! جھوٹ نہیں بول رہا۔ آپ یقین۔۔۔۔"
"مجھے اب ادھر آنا ہی پڑے گا۔" کہتے ہوئے انہوں نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ صالحہ شاہ ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ سیدہ نے فون اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

❊ ❊ ❊

"اماں جی! یہ رکھ لیں۔" عبدالمبین نے اماں جی کے ہاتھ میں کچھ دیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ وہ برآمدے میں چولہے کے آگے بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ جب عبدالمبین چپکے سے ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔
"کیا ہے یہ؟" انہوں نے منہ پر آیا پسینہ ململ کے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تو ایکدم جیسے انہیں کرنٹ لگا۔ وہ ہزار کا نوٹ تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کہاں سے آئے تمہارے پاس؟" انہوں نے نوٹ ایکدم سے نیچے گرا دیا۔

"اماں جی! میری محنت کی کمائی ہے۔ اڑائے نہیں کسی کے، آپ رکھ لیں۔ گھر کا سودا وغیرہ منگوا لیجئے گا۔" اس نے کہتے ہوئے دوبارہ نوٹ انہیں تھمانا چاہا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے جھپٹا مار کر نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ تڑپ کر مڑا اور دھک سے رہ گیا۔

• • • • • •

صوفی صاحب ہاتھ میں ہزار کا نوٹ پکڑے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"یہ کہاں سے آئے؟" انہوں نے نوٹ اس کے چہرے کے آگے لہرایا۔

"مم۔۔۔ میرے ہیں۔" اس نے یکدم خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اچھا۔۔۔" انہوں نے غصے سے ہنکارا بھرا۔ "تو یہ کسر رہ گئی تھی چوری چکاری کی، باقی کے سارے بیل بوٹے برائیوں کے تیرے ماتھے پر سج چکے۔ اب یہ داغ تو نے ہمارے چہروں پر لگانا تھا۔ بولو کہاں سے آئے؟" ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور اس کے دائیں رخسار پر اس قدر زور سے پڑا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔

"حرام خور، بدبخت، منحوس، چور اچکے، ذلیل، گھٹیا۔ ایسی سوغاتیں رہ گئی تھیں میری اولاد بننے کو۔" وہ اس کے پیچھے عقاب کی طرح جھپٹے اور کالر سے اسے زور سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ اس کے گھنے گھنگھریالے بالوں کو دوسری مٹھی میں جکڑا اور دوسرا تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کرنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے پورا زور لگا کر خود کو جھکائی دی اور اپنا آپ چھڑا کر پیچھے ہو گیا۔

"میں نے کوئی چوری نہیں کی، یہ میری محنت کی کمائی ہے اور یہ میں آپ کے لیے لایا بھی نہیں۔ یہ اماں جی اور۔۔۔" اس نے گردن زور سے جھٹک کر اپنا گریبان درست کیا اور ہاتھ سے بال ٹھیک کرنے لگا۔ چہرے کے دائیں رخسار سے علیحدہ چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

"اماں جی۔۔۔ تیری تو۔۔۔" وہ پھر اس کی طرف جھپٹے۔ "نکل ادھر سے چور، ہمیں حرام کی لت ڈالنے آیا ہے۔ ہم بھوکے مر رہے ہیں فاقوں سے، ہماری آخری سانس سینوں میں اٹک رہی ہے اور تو ہمیں یہ ببول بھری عیاشی، جہنم کا ایندھن کھلانے آیا ہے۔ بدمعاش، بتا کس کے اٹھائے ہیں یہ پیسے؟" انہوں نے جیسے ہی مارنے کو مکا ہوا میں لہرایا۔ وہ ایک بار پھر انہیں جھکائی دے کر غسل خانے کے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ آمنہ، زینب اور جویریہ چھوٹے کمرے کی دہلیز سے چپکی کھڑی تھیں۔ اماں جی اپنا سینہ تھام کر بیٹھی تھیں۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں بابا صاب! یہ میرے اپنے پیسے ہیں اور میں نے خود کمائے ہیں۔" وہ ان کی "دہشت" سے سنبھل چکا تھا۔ بڑے آرام سے بولا تھا۔

"ایسا کون سا راتوں رات تجھے جادو سوجھ گیا ہے۔ جس میں پہلا ہاتھ ہی ہزار کے نوٹ پر پڑا ہے۔ میں پورا مہینہ مغز ماری کرتا ہوں، کتے کی طرح مارا مارا لوگوں کے گھروں میں ٹیوشن پڑھانے جاتا ہوں، اپنی جان حلال کر کے مجھے ایسے تین چار نوٹ نظر آتے ہیں اور تو ایک دن میں کما کر لے آیا ہے۔ سچ بتائے گا یا میں خود تجھے پولیس کے حوالے کروں۔"

ان کی آنکھوں میں ذرا بھی پہچان یا لحاظ نہیں تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ فوراً اسے وہ پولیس کے حوالے کر دیتے۔

"بابا صاب! یہ میرے پیسے ہیں، آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ یہ میں نے خود کمائے ہیں اور میرا کام آپ جیسا نہیں، جو رو رو کر دو تین ہزار روپے کماؤں۔ میں۔۔۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا ایسا پروفیشن یا جاب کا انہیں بتائے کہ صوفی صاحب مطمئن ہو جائیں۔

"عبدالمبین!" وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ جویریہ کی چیخ نکل گئی۔ اس کا دل بہت کمزور تھا۔ اونچی اور اچانک آواز سے وہ ایسے ہی ڈر جایا کرتی تھی۔ صوفی صاحب نے جویریہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"دفع ہو جاؤ تم تینوں اندر۔" ان کی کرخت آواز پر تینوں جلدی سے اندر کمرے میں مڑ گئیں۔

"مجھ کو یہ ہیر پھیر مت سنا، سچ سچ بتا یہ کدھر سے آئے ہیں۔ جوا کھیلا ہے، کوئی نشہ بیچا ہے یا کوئی اور کالا دھندا کیا ہے۔ بالکل سچ بول۔" وہ جیسے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے ذرا تحمل سے بولے۔

"کوئی ایسا غلط کام نہیں کیا، میرے ہیں یہ۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بے خوفی سے بولا۔

"ایسے نہیں بتائے گا تو یہ چاہتا ہے کہ پولیس میرے دروازے پر آئے اور تجھ سے سچ اگلوائے۔" انہوں نے نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"بابا صاب! میں کیسے سمجھاؤں آپ کو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو وہم۔۔۔" وہ تیزی سے اس کی طرف جھپٹے اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر دے مارا۔ عبدالمبین کے منہ سے ایک کراہ نکلی تھی۔ اس کے اوپری ہونٹ سے یکایک خون نکل پڑا تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔" اماں جی بے ساختہ تڑپ اٹھیں۔

"بتا کہاں سے آئے یہ پیسے؟" اسے یوں زخمی دیکھ کر صوفی صاحب کے دل کو عجیب سا اطمینان ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بولے۔

"میرے ہیں، میرے ہیں، میرے ہیں۔۔۔ ہزار بار لاکھ بار بھی پوچھیں تو بھی یہی کہوں گا۔" وہ زور سے چیخا اور قمیص کے دامن سے اپنا ہونٹ صاف کرنے لگا۔

"نکل جا ادھر سے، دفعان ہو جا۔ تیرے جیسے جھوٹے، فراڈیے، چور اچکے کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ دفع ہو جا نکل۔۔۔" انہوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس جا کر ہی سنبھل سکا۔

"یہ گھر میرا نہیں ہے تو آپ کا بھی نہیں ہے اور آپ چاہے مجھے دھکے دے کر نکال دیں میں تب بھی ادھر سے نہیں جاؤں گا۔ میں عبدالمتین نہیں ہوں بابا صاحب! میں عبدالمبین ہوں۔ اس گھر کو، اپنی اماں جی کو اور اپنی بہنوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، سنا آپ نے۔" وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخ رہا تھا۔

"چوری اور سینہ زوری۔ بدمعاش، ملعون، خبیث، شیطان دفع ہو گا یا۔۔۔" انہوں نے پاؤں میں پڑا اپنا جوتا اتارا اور کھینچ کر اسے دے مارا تھا۔ وہ فوراً پرے کھسک گیا۔ "میں تیرے منحوس وجود کو ایک پل اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا اور تو بھول جا کہ میں تجھے دوبارہ بھی اس گھر کی دہلیز عبور کرنے دوں گا۔ جہاں وہ منحوس بے دید دفعان ہوا، وہیں تو بھی چلا جا، میں سمجھوں گا میرے دونوں بیٹے بھری جوانی میں مر گئے۔ میری کوئی نرینہ اولاد۔۔۔"

رابعہ بی بی تڑپ کر آگے بڑھیں اور بے اختیار صوفی صاب کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"اللہ نہ کرے، کیوں ایسے کلمات منہ سے نکالتے ہیں۔ آرام سے پوچھیں اس۔۔۔"

"چلی جاؤ تم رابعہ بی بی اندر، مجھے اس حرام خور سے خود نمٹنے دو۔ ایسی ملعون اولاد تو کسی کی نہ ہو جیسی اللہ نے مجھے دی۔ نکل ادھر سے۔" وہ ایک پاؤں میں جوتا پہنے اسے مارنے کو لپکے۔

"جا رہا ہوں میں، مجھے خود اس دوزخ میں رہنے کا کچھ شوق نہیں مگر میں یہاں سے جاؤں گا نہیں۔ اماں جی! میری روٹی پکا لیجئے گا، میں کھانا کھاتا ہوں ابھی آ کر۔۔۔" وہ قمیص کے دامن سے مسلسل رستے ہونٹ کو صاف کرتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔

"یہ جہنم کا ایندھن بھی لے جا ادھر سے اور اپنی منحوس شکل لے کر ادھر دوبارہ مت آنا، ورنہ ان ٹانگوں سے سیڑھیاں نہ اتر سکو گے۔" وہ اسی طرح دھاڑے تھے اور ہزار کا نوٹ مروڑ کر اس کے پیچھے اچھال دیا تھا۔

"ہونہہ! میں کہیں نہیں جا رہا، بے فکر رہیں۔ ادھر ہی ہوں۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا اور آخری سیڑھی کے پاس اس کاغذ کی گولی کو جھک کر اٹھایا، کھول کر سیدھا کیا اور قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔ صوفی صاحب نے تنفر سے اسے ایک نظر دیکھا اور واپس مڑ گئے۔

"اب اگر میں نے اسے دوبارہ اس گھر میں دیکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا، سنا تم لوگوں نے۔" وہ پلٹ کر خالی صحن اور سامنے کمروں کی طرف دیکھ کر زور سے بولے تھے۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ غصے سے پیر پٹختے ہوئے

غسل خانے میں وضو کرنے چلے گئے۔

عبدالمبین نیچے اتر کر مسجد میں چلا گیا اور ٹونٹی کے آگے بیٹھ کر کلیاں کرنے لگا۔ کافی دیر تک خوب پانی ہونٹوں پر ڈالنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ خون رک گیا ہے تو وہ قمیص کے دامن سے منہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جلیل اس کے پیچھے کھڑا اسے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" اس نے عبدالمبین کے پھٹے ہونٹ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"نظر نہیں آرہا۔" وہ رکھائی سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔

"لگتا ہے صوفی صاحب نے "تواضع" کی ہے آج تمہاری بڑے عرصے بعد۔" جلیل اس کے پیچھے آہستگی سے بولا۔

"کیا کہا تم نے؟" عبدالمبین نے غرا کر کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"اندر کمرے میں کوئی ہے تو نہیں۔ میں تمہارے بستر میں سونا چاہ رہا ہوں، مجھے نیند آرہی ہے۔"

"نہیں، کوئی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں سونے جارہا ہوں۔" وہ کہہ کر مسجد کی بغل میں بنے چھوٹے سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"اور سنو۔" وہ رک کر بولا۔ "اگر بابا صاحب میرا پوچھیں تو کہہ دینا، میں ادھر نہیں آیا۔"

"ادھر کدھر؟" جلیل نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔

"تمہارے کمرے میں اور کدھر۔" وہ جھلا کر بولا۔

"تمہیں معلوم ہے، میں جھوٹ نہیں بولتا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"زیادہ میرے سامنے حاجی صاحب بننے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے میرے بارے میں بابا صاحب کو بتایا تو دیکھنا، میں تمہیں سچ جھوٹ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔" وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

"تم مجھے دھمکا رہے ہو؟" جلیل نے کچھ غصے سے کہا۔

"تم جو بھی سمجھ لو، ویسے میں بتا رہا ہوں۔ اگر کچھ کرنا ہوگا تو دھمکانے کی مہلت بھی نہیں دوں گا، سمجھے۔" وہ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتے ہوئے کمرے میں گھس گیا۔

"زیادہ ہی حضرت آج کل ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھنے لگا ہے یہ اور میں اس سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر صوفی صاحب نے پوچھا تو صاف بتا دوں گا۔" جلیل منہ میں بڑبڑایا۔

❊ ❊ ❊

گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس پر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ رعنا نے جلدی سے اپنا ہاتھ دونوں آنکھوں پر رکھ لیا جیسے ہی گاڑی کی لائٹس بند ہوئیں، وہ ہاتھ ہٹا کر گاڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ فخر حیات نے بریف کیس ڈرائیور کے حوالے کیا اور اتر کر اندر جانے لگے کہ اچانک ان کی نظر لان کے سنگی بینچ پر بیٹھی رعنا پر پڑی تو وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔

"خیریت، تم اس وقت تک جاگ رہی ہو؟" وہ رعنا کے پاس آکر بولے۔ رعنا سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔ تھکن ان کے چہرے سے اور ڈھیلے ڈھالے انداز سے ہویدا تھی۔

"ٹائم دیکھا ہے۔ ڈھائی بج رہے ہیں۔" فخر حیات نے پھر کہا۔

"آپ کو معلوم ہے ڈھائی بج رہے ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"معلوم ہے تو کہہ رہا ہوں تاتم سوئیں نہیں ابھی تک؟" وہ کچھ اکتا کر رعنا کے برابر بیٹھ گئے۔ فضا میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ نیلا آسمان تاروں سے جگمگا رہا تھا، پھولوں اور سبزے کی ملی جلی خوشبو نے سارے ماحول ہی کو

معطر کر رکھا تھا۔

"اگر رات کے ڈھائی بجے ہر انسان کو سو جانا چاہیے تو آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔" وہ طنز سے بولی۔

"رعنا! پلیز، میں اس وقت کوئی کسوٹی کھیلنے کے موڈ میں نہیں ہوں، بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ چلو اندر، باقی کے سوال جواب اندر جا کر کر لینا، میں اتنے میں فریش ہو جاؤں گا۔ مجھے بہت سخت نیند آرہی ہے۔" وہ سخت بیزار لگ رہے تھے۔

"رات کے ڈھائی بجے تک گھر سے باہر آپ بالکل نہیں تھکے جیسے ہی گھر کا گیٹ عبور کیا، آپ پر تھکاوٹ مکمل طور پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے فخر؟" وہ چبا چبا کر کہنے لگی۔

"اس کی وجہ... تم ہو۔" وہ سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"میں۔" رعنا نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ "مطلب؟" اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"تمہاری یہ فضول کی انکوائری۔ کچھ پوچھنا ہے تو سیدھے سیدھے پوچھ لو کہ فخر حیات صاحب! آپ رات کے ڈھائی بجے کدھر سے تشریف لائے ہیں۔ اگرچہ یہ بات پہلے سے تمہارے علم میں ہے کہ میں کدھر تھا۔" وہ جتا کر بولے۔

"رات ساڑھے گیارہ بجے کے بعد سے آپ کا موبائل مکمل طور پر آف ہے تو مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ آپ کہاں ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"بھئی بتا کر تو گیا تھا کہ صالح صاحب کی اکلوتی صاحبزادی کی برتھ ڈے تھی آج۔ جیم خانہ میں اتنا گرینڈ فنکشن تھا، کتنے منسٹرز تک آئے ہوئے تھے۔ وی آئی پیز کا ہجوم تھا۔ فنکشن بارہ بجے تو اسٹارٹ ہوا، بعد میں ڈنر اور دوسرے پروگرامز اور اس میں ڈھائی گھنٹے کچھ زیادہ نہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تفصیل بتانے لگے۔

"ہاں وہ ڈھائی گھنٹے اپنے رنگین فنکشن میں آپ کے لیے کچھ بھی زیادہ نہیں اور صالح صاحب کی صاحبزادی بزنس سرکل میں آج کل کس طرح سوسائٹی بٹر فلائی بنی اڑ رہی ہے۔ کیا مجھے اس کا علم نہیں۔" وہ پھر طنز سے بولی۔

"کم آن رعنا! ابھی تک تمہارا ذہن انیسویں صدی کی پچھلی دہائیوں میں گھوم رہا ہے۔ ڈیر! یہ سب کچھ ہماری سوشل ایکٹیو ٹیز کا لازمی حصہ ہیں اور مجھے ابھی ادھر آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ چیمبر کے الیکشن ہو رہے ہیں اور مجھے کسی مضبوط شخص کی فیور کے ساتھ ان الیکشن میں اپنے قدم جمانے ہیں اور صالح صاحب اس وقت شہر کے کاروباری حلقوں کا سب سے مضبوط ستون ہیں، تمہیں معلوم ہے نا۔ بزنس میں پیر جمانے کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے اور میں نے تم سے کہا تھا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو مگر تمہارے دماغ پر آج کل پھر وہی قنوطیت کا بھوت سوار ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ جڑ کر گھر میں تو نہیں بیٹھ سکتا۔"

"آپ پہلے کب جڑ کر گھر میں میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں تو اول روز سے تنہا تھی۔ آپ اور آپ کی بزنس ایکٹیو ٹیز... کتنا بھاگتی ہوں میں آپ کے ساتھ مگر پھر مڑ کر دیکھتی ہوں تو آپ ساتھ ہوتے ہی نہیں۔ مجھ سے آگے ہی آگے الگ تھلگ دوڑ رہے ہوتے ہیں۔" وہ جیسے تھک کر بولی۔

"پھر وہی ڈپریشن۔ یار! تم اپنا کنسلٹنٹ چینج کرلو۔ بجائے افاقہ ہونے کے تمہارا دماغ پھر الٹی سمت چلنے لگا ہے۔ چلو اب اندر چل کر ریسٹ کرلو۔ نیند نہیں آرہی تو کوئی دوائی لے لو مگر خود کو یوں سوچ سوچ کر ہلکان مت کرو۔ اس طرح ڈپریس رہو گی تو بعد میں مصیبت بھی مجھے ہی اٹھانی پڑے گی۔" آخری فقرہ وہ بڑبڑانے والے انداز میں انہوں نے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" رعنا نے سر اٹھا کر گہرا سانس لیا۔ "اب آہستہ آہستہ میں آپ کو مصیبت ہی تو لگنے لگی ہوں۔"

"رعنا پلیز... اتنی رات کو اتنی بور فرسٹریشن سے بھرپور گفتگو مت کرو۔ تمہاری دلجوئی کے لیے اس وقت میرے پاس جذبات تو ہیں مگر اظہار کے لیے ڈھیر سارے جملے نہیں۔ میں بہت تھک چکا ہوں۔" وہ بینچ سے سر ٹکا کر بولے۔

"آپ کے پاس میری دلجوئی کے لیے نہ تو جذبات ہیں' نہ الفاظ۔ بس دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔" وہ دکھ سے بولی۔

"تمہاری این جی او کی ورکنگ کمیٹی کا ایجوکیشن پراجیکٹ کیسا جا رہا ہے؟۔ آئی مین 'تم لوگ کچھ ماڈل اسکول وغیرہ جو پلان کر رہے تھے' ایجوکیشن اویرنس (آگاہی) کے سلسلے میں؟۔" انہوں نے موضوع بدلا۔

"ابھی ہوم ورک ہو رہا ہے۔" رعنا نے اپنی کنپٹی دبائی۔

"سیفی سو گیا۔" فخر حیات اب اندر بھاگنے کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں یہاں کس لیے بیٹھی رو رہی ہوں۔" وہ جھلا کر بولی۔

"مطلب؟"

"سیفی گھر پہ نہیں ہے' وہ شام پانچ بجے گھر سے نکلا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا۔ اس کا موبائل بھی آف ہے۔ میں اسی لیے تو اس قدر پریشان تھی۔ آپ دونوں باپ بیٹے یونہی بے فکر ہو کر گھر سے نکلتے ہیں۔"

"اس نے کال بھی نہیں کی کوئی؟" فخر حیات فکر مندی سے بولے۔

"نہیں' کوئی بھی نہیں۔ حالانکہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ مما! میں ڈنر آپ کے ساتھ کروں گا' میں نے اس کے انتظار میں کھانا بھی بارہ بجے کے بعد کھایا ہے پھر بھی...."

"او تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" فخر حیات پھر بیٹھ گئے۔ "اس کے فرینڈز سے معلوم کیا تھا۔"

"کیا تھا' اس کے فرینڈز ادھر ہیں ہی کتنے۔ عامر بتا رہا تھا' وہ رات دس بجے کے قریب اس کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا کہ وہ اب گھر جا رہا ہے اور ابھی تک نہیں پہنچا۔" رعنا بہت فکر مند تھی' فخر حیات بھی ہو گئے تھے۔

"اچھا چلو اندر' میں ادھر ادھر فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔" وہ پھر اٹھے کہ رعنا کی گود میں پڑے موبائل کی بیپ بج اٹھی۔

"او سیفی کا فون ہے۔" رعنا نے بے اختیار کہا۔

"ہیلو سیفی جان! تم کہاں ہو' اتنا ٹائم ہو گیا اور...."

"مام میری گاڑی خراب ہو گئی تھی' اس لیے دیر ہو گئی۔" وہ جلدی سے بولا۔

"تو بیٹا! مجھے انفارم تو کر دیتا تھا۔ میں ادھر پریشان بیٹھی تھی۔" وہ بے قراری سے بولی۔

"بس گاڑی کی پریشانی میں لگا رہا۔ آپ سو جائیں آرام سے' میں ٹھیک ہوں۔" وہ شاید آف کرنے لگا تھا۔

"تم گھر نہیں آؤ گے کیا' کہاں سے بول رہے ہو؟"

"مام! میں اب صبح آجاؤں گا۔ میں ماہی کی طرف سے بول رہا ہوں۔ گاڑی ان کے گھر کے پاس آکر خراب ہوئی تھی۔ میں نے کھانا بھی ادھر ہی کھا لیا تھا۔ اب بہت رات ہو چکی ہے' ماموں جان اور ماہی مجھے آنے نہیں دے رہے۔ اب میں صبح ہی آؤں گا۔ آپ بھی سو جائیں' کوئی فکر نہ کریں۔ گڈ نائٹ۔ پاپا کو بتا دیجئے گا۔" اس نے کال آف کر دی۔

"کہاں سے بول رہا تھا؟" فخر حیات نے جلدی سے پوچھا۔

"بھائی جان کی طرف سے' ان کے گھر کے قریب گاڑی خراب ہو گئی ہے اس کی۔" وہ جیسے نظریں چرا کر بولی۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ کتنی دیر انہیں اسی طرح خاموش بیٹھے گزر گئی۔ رات کا آخری پہر اور لان کا سناٹا جیسے خاموشی متکلم ہونے لگی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" کافی دیر بعد فخر حیات نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"مجھے کیا سوچنا ہے۔" رعنا نے ایک طویل گہرا سانس لیا۔ "انسان جو کچھ سوچتا ہے ہمیشہ وہ کب ہوتا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"میں نے شہر بھر کے بلکہ کراچی اور اسلام آباد کے بہترین کالجز اور یونیورسٹیز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارمز نکلوا کر سیفی کے آگے رکھے کہ جہاں اس کا دل چاہے اس کا ایڈمیشن ہو جائے گا مگر اس نے رسپانس نہیں دیا۔ وہ بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہے یہاں پڑھنے میں۔" فخر حیات نے لان کی مدھم لائٹس میں رعنا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر وہ کیا چاہتا ہے؟۔" وہ تلخی سے بولی۔

"میرا خیال ہے' ہم نے جلد بازی کی۔" فخر حیات آہستگی سے بولے۔ "واپس آنے میں۔"

"تو وہاں کون سا وہ قابلیت کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ تعلیمی کارکردگی اس کی زیرو سے کچھ اوپر تھی اور کریکٹر ڈویلپمنٹ کے لحاظ سے وہ زیرو سے بھی نیچے جا رہا تھا۔"

"وہ ٹھیک ہے مگر تین چار سال میں اس کی تعلیم تو کسی نہ کسی طرح مکمل ہو جاتی۔ وہاں کی ڈگری لو گریڈ میں ہو تو بھی ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہے۔ ویسے بھی اس نے کون سا جاب کرنی ہے۔ اگر فیکٹری کا مسئلہ کھٹائی میں نہ پڑ جاتا تو میں اسے کسی نہ کسی طرح ادھر ہی نکالیتا۔"

"پھر اب آپ کیا کہتے ہیں۔ میں اسے دوبارہ ادھر بھیج دوں۔ شراب اور شباب کے سمندر میں غرق ہونے کے لیے۔" وہ ترشی سے بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' ادھر وہ یہ 'شغل' ترک کر چکا ہے۔ رعنا! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ادھر یہ کام چھپ چھپا کر کرتا تھا' یہاں اسے اتنا بھی ڈر نہیں رہا۔ ضد میں آکر ہر دوسرے چوتھے روز کسی نہ کسی جگہ پر رات گزارتا ہے۔ تمہارے علم میں نہیں شاید اور پھر یہ فرزین کا چکر' بتاؤ اب کیا کریں۔" وہ جیسے زچ آکر بولے۔

رعنا چپ رہی۔

"میرا خیال ہے' اسے لندن بھجوا دیتے ہیں۔ میرا تو یوں بھی وہاں مہینے دو مہینے بعد وزٹ لازمی ہے۔ وہاں کی مین برانچ پر ہی ابھی ہمارے ادھر کے سارے بزنس کا انحصار ہے۔ ادھر ابھی بھی میری توجہ کی ضرورت ہے۔"

"تو پھر ابھی واپس آنے کی کیا ضرورت تھی' دو چار سال اور گزار لیتے۔"

"تم خواہ مخواہ اس قدر جذباتی ہو رہی ہو۔ تین چار سال کی بات ہے' وہاں رہے گا تو کوئی نہ کوئی ڈگری ہاتھ آجائے گی۔ دیکھنا تم' تین چار سال بعد ایک بالکل چینج سیفی تمہیں ملے گا۔ ادھر آفس میں بھی کسی نہ کسی سیٹ پر میں اسے ایڈجسٹ کر لوں گا۔ مصروف بھی ہو جائے گا' تم یقین کرو۔" وہ اسے قائل کر رہے تھے۔

"مجھے تو اب کسی بھی بات کا یقین نہیں رہا۔" وہ بڑبڑائی۔

"اچھا اب اندر تو چلو' میرا تو جسم تھکن سے اکڑ گیا ہے۔ صبح اس پر مکمل ڈسکشن کریں گے۔ آجاؤ اندر۔" وہ ایکدم سے اٹھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اندر کی طرف چلے گئے۔ رعنا نے ایک گہرا سانس لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ تنگ بینچ پر بیٹھے بیٹھے اس کا اپنا جسم بھی اکڑ گیا تھا۔ وہ سست قدموں سے چلنے لگی۔

وہ سرونٹ کوارٹرز کے پاس سے گزر رہی تھی جب اس کی یونہی نظر جنتاں کے کوارٹر کے ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔ کوارٹر کے صحن میں جنتاں بان کی کھری چارپائی پر منہ کھولے بے خبر سو رہی تھی۔ حالانکہ بلب کی روشنی میں اس کے سر پر منڈلاتے مچھروں کا غول دور سے نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ بے خبر سو رہی تھی۔

"کس قدر خوش نصیب ہے یہ عورت جسے ایسی پُرسکون نیند نصیب ہے۔" رعنا نے ایک رشک بھری نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

❋ ❋ ❋

"آہم... کیا ہو رہا ہے سسٹرز۔" عبدالمبین نے کمرے میں داخل ہو کر کھنکھارتے ہوئے پوچھا تو زینب جو

کرسی پر بیٹھی جمائیاں لے رہی تھی' سیدھی ہو گئی۔

"بابا صاحب! نیچے گئے تھے ابھی۔" زینب نے دبی آواز میں اسے بتایا۔

"معلوم ہے مجھے۔ وہ ٹیوشن پڑھانے گئے ہیں' اسی لیے تو اوپر آیا ہوں۔" وہ آرام سے آمنہ کے دوسری طرف پلنگ کی پائنتی پر ٹک گیا۔

"دوپہر سے کہاں تھے؟" زینب نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"جلیل کے بستر میں سو رہا تھا۔ بڑے مزے کی نیند آئی۔"

"ہاں دھنائی بھی تو بہت دنوں بعد ہوئی تھی۔" زینب نے سر ہلا کر کہا۔

"ہم ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔" اس نے کالر جھاڑا۔

"تم نے پیسے کہاں سے لیے تھے؟" آمنہ نے پوچھا۔

"چلو ایک تم رہ گئی تھیں بابا صاحب کی جانشین' ہر بات ان کی طرح سر پر سوار کرنے والی۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"میں کون سا....."

"تم لوگوں کا رزلٹ کب ہے؟" وہ آمنہ کی بات کاٹ کر بولا۔

"جب تمہارا ہے۔" زینب فوراً بولی۔

"اپنا تو سمجھو نکل آیا۔" وہ فوراً بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کو چھوڑو' تم دونوں نے آگے کالج میں داخلہ لینا ہے؟"

"وہ تو لازمی لینا ہے۔" زینب جھٹ سے بولی۔

"چاہے فیل ہو جاؤ۔" عبدالمبین نے اسے چڑایا۔

"تمہارے منہ میں خاک۔ بابا صاحب کو بتا کر تمہاری اور خاطر کرواؤں گی۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"اب ایڈمیشن خالی پاس ہونے سے تو نہیں ہو جاتا زینب بی بی!" عبدالمبین نے جیسے اس کی دھمکی کو سنا نہیں۔

"معلوم ہے' پیسوں سے ہوتا ہے۔ بابا صاحب نے وعدہ کیا ہے' وہی دیں گے۔"

"وہ کہاں سے دیں گے۔ ان کے پاس تو گھر کے خرچ کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔"

"ہاں' وہ تم لا کر دیتے ہو نا۔" آمنہ بڑبڑائی۔

"چپ!" عبدالمبین نے آمنہ کو چھیڑا۔ "ویسے زینب! تم کالج کا سپنا بھول جاؤ تو اچھا ہے۔"

"عبدالمبین! تم اب مجھ سے پٹو گے۔ سب کچھ تو چھوڑ دیا ہے۔ اپنا گھر' گاڑی' اچھی خوشحال زندگی۔ اب یہ خواب بھی چھوڑ دیں پھر ہم زندہ کس لیے ہیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"اچھا رو مت۔ یہ لو اپنے داخلے کے لیے رکھ لو۔" اس نے جھٹ جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر زینب کے آگے کیا۔

"ایں....." اس کی آنکھیں جیسے پھٹ سی گئیں۔ "یہ صبح والا نوٹ ہے' اب کیا مجھے پٹواؤ گے۔" زینب نے دل چاہنے کے باوجود نوٹ نہیں تھاما۔

"صبح والا نہیں ہے۔ تمہارے لیے ہے۔ لینا ہے تو لے لو پھر یہ موقع نہیں آئے گا۔" عبدالمبین نے نوٹ والا ہاتھ اور آگے کیا تو زینب نے ایک پل کو سوچا اور نوٹ تھام لیا۔

"تم عقل مند ہو زینو! اچھا میرے لیے ایک چائے کا کپ تو بنا کر لاؤ' سر میں درد ہے۔ فٹافٹ لانا' بابا صاحب کے آنے سے پہلے مجھے ادھر سے رفوچکر ہونا ہے۔"

زینب سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی مٹھی میں نوٹ کیا آیا تھا' اس کی ساری سستی رفع ہو گئی تھی۔

وہ تیزی سے چائے بنانے چلی گئی۔

"تمہارے پاس آخر اتنے پیسے آئے کہاں سے؟" آمنہ اس کے جاتے ہی بولی۔

"میں نے کمائے ہیں۔ اب میں کماؤ پوت ہو گیا ہوں۔" وہ فخر سے بولا۔

"میں نہیں مانتی۔ نہ تو تم گھر سے زیادہ دیر تک غائب رہے ہو' نہ کہیں باقاعدگی سے جاتے رہے ہو تو کیا سوتے میں کماتے رہے ہو؟"

"بس سمجھ لو جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو سوتے میں بھی چھپر پھاڑ کر مہربان ہو جاتی ہے۔"

"مبین! دیکھو' یہ اچھی بات نہیں ہے' تم اس طرح کسی بھی غلط رستے پر چل کر پیسوں کے لالچ میں خود کو تباہ کر لو' یہ ہم میں سے کسی کو بھی منظور نہیں۔ ایسا پیسہ خوشی یا خوشحالی نہیں لاتا' دکھ اور خدانخواستہ تباہی لاتا ہے۔"

"اچھا استانی صاحبہ! بھئی آخر تم لوگ مان کیوں نہیں لیتے کہ میں اتنے پیسے کما بھی سکتا ہوں۔ آج کے زمانے میں یہ کوئی انہونی بات تو نہیں۔" وہ جھلا کر بولا۔

"تم جیسوں کے لیے یہ انہونی ہی ہے۔ جبکہ تم میں ہمیں نہ کوئی قابلیت نظر آتی ہے' نہ ڈگری' نہ ہنر۔"

"اف میں کیسے سمجھاؤں تمہیں آج کل پیسے' ڈھیروں ڈھیر پیسہ کمانے کے لیے ان تینوں میں سے کوئی بھی بات ضروری نہیں۔ آج کل تو لوگ جو میرے جیسے نکمے ہوتے ہیں' چاہیں تو وہ بھی راتوں رات نوٹ چھاپ سکتے ہیں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح آمنہ کو سمجھائے۔

"ہم شاید تمہاری طرح غیر معمولی ذہین نہیں ہیں' اس لیے نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے کون سے نکمے لوگ ہوتے ہیں جو نوٹ چھاپ سکتے ہیں۔"

"تم پکی بابا صاحب کی چیلی ہو!" وہ دانت کچکچا کر بولا۔ وہ چپ رہی۔

"ویسے بات ہے تو واقعی ناقابلِ یقین مگر یہ کڑوا سچ ہے۔ میں نے نہ تو یہ پیسے کسی کے چرائے ہیں' نہ کسی کی جیب کاٹی ہے' [illegible]"

"پھر کہاں سے لیے؟" وہ جیسے زچ ہو کر بولی۔

"بتا دیا تو تم لے لو گی؟"

"بالکل سچ بتانا۔"

"بالکل سچ بتاؤں گا مگر تم وعدہ کرو کہ پھر تم لے لو گی۔"

"بشرطیکہ حلال طریقے سے کمائے ہوں۔" وہ سوچ کر بولی۔

"اف میرے خدا..... یہ آج کل کے زمانے میں کون دیکھتا ہے' حلال ہے کہ حرام۔ آج کل ایسے ایسے ذرائع آمدن نکل آئے ہیں کہ حلال حرام کے درمیان اتنی باریک لکیر ہوتی ہے کہ اکثر نظر بھی نہیں آتی' وہاں بندہ کیا کرے۔" وہ جیسے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"حلال وہ ہوتا ہے جس پر آپ کا ضمیر آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ ضمیر مطمئن ہو جائے تو سمجھو سب درست ہے۔"

"میرا ضمیر تو مطمئن ہے۔"

"تو پھر تمہیں ڈر کس بات کا ہے' سب کو سچ بتاؤ۔"

"سب کو نہیں' صرف تمہیں۔ تم وعدہ کرو کسی کو نہیں بتاؤ گی؟"

"اگر تمہارا ضمیر مطمئن ہے' تمہیں معلوم ہے تمہارا ذریعہ آمدن حلال ہے تو پھر کیوں چھپانا چاہ رہے ہو؟"

"آمنہ بحث نہیں' میں صرف تمہیں بتاؤں گا اور تم کسی کو نہیں بتاؤ گی وعدہ کرو۔"

"اوکے' وعدہ۔ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔" وہ جیسے ہار کر بولی۔

"اور مجھ سے پیسے بھی لے لو گی۔" اس نے دوسری شرط لگائی۔

"اچھا بابا! لے لوں گی، بولو اب۔" وہ تنگ آ کر بولی۔ وہ چند لمحے چپ رہا۔
"تمہیں میری آواز کیسی لگتی ہے؟"
"اچھی ہے۔ تلاوت کرو تو بہت اچھی لگتی ہے۔ تمہارے حلق میں اللہ میاں نے ایک خوش الحان پرندہ رکھا ہے۔ خاص طور پر جب تم سورہ رحمٰن کی تلاوت کرتے ہو تو بس سامنے والے پر سحر ہی طاری ہو جاتا ہے۔ مجھے تمہاری آواز اس وقت بہت اچھی لگتی ہے۔ بابا صاحب کو بھی تمہاری قرات اچھی لگتی ہے۔ وہ ایک دفعہ تعریف کر رہے تھے نا۔" وہ صاف گوئی سے بولی تو وہ جیسے چپ ہو گیا۔
"آگے تو بولو تم نے یہ سوال کیوں کیا؟" اسے چپ بیٹھے دیکھ کر وہ بولی۔
"تلاوت کے علاوہ بھی میری آواز اچھی ہے نا؟" وہ آہستگی سے بولا۔
"ہاں اچھی ہے ٹھیک ہے۔ ہم سب سے مختلف اور منفرد ہے۔"
"اگر گانا گاؤں تو بھی اچھی لگتی ہے نا۔"
"یہ فضول خیال کہاں سے آیا تمہارے دل میں۔ ہمارے خاندان میں شاید سو پشتوں نے بھی اس واہیات کام کا نہیں سوچا ہو گا۔" وہ ناگواری سے بولی۔
"آج کل یہ قابل عزت پروفیشن ہے فن اور ہنر ہے۔" وہ کمزور لہجے میں بولا۔
"ہو گا مگر گویوں اور میراثیوں کے لیے۔ ہم جیسوں کے لیے نہیں۔"
"میں نے ٹیلی ویژن پر ایک بسکٹ کے اشتہار کے لیے جنگل گایا تھا جس کے مجھے یہ پیسے ملے ہیں۔ اب بتاؤ میں نے کون سا ڈاکا ڈالا ہے۔ بیٹھے بٹھائے قسمت مجھ پر مہربان ہو گئی ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔
"اسے تم مہربانی کہتے ہو۔" وہ شاکی لہجے میں بولی۔ "اگر بابا صاحب کو پتا چل گیا تو انہیں کس قدر دکھ ہو گا۔"
"بھوکے مرنے سے بہتر ہے کہ انسان کچھ کرے، جو کچھ وہ کر سکتا ہے۔"
"اس کے علاوہ بھی دنیا میں بہتیرے کام ہیں۔ تمہیں اور کوئی نہیں سوجھا۔"
"کیا بجری ڈھوتا، روڑے اٹھاتا، قلی بن جاتا یا پیرا گری کرتا اور سارا دن اپنی ہڈیاں تڑوانے کے بعد بھی اتنے نوٹوں کی شکل تو کجا پرچھائیں بھی نہ دیکھ پاتا۔"
آمنہ کو اب کوئی جواب نہ سوجھا۔
"بہر حال میں یہی کام کروں گا، کسی کو اعتراض ہے تو ہوتا رہے۔ مجھے سسک سسک کر نہیں جینا۔ قدرت اگر مجھے آگے بڑھنے، ترقی کرنے کا موقعہ دے رہی ہے تو میں کیوں اسے لات ماروں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"یہ ہزار روپیہ تمہارے داخلے کا اور یہ اماں جی کو دے دینا گھر کے خرچ کے لیے۔ چاہو تو خود رکھ کر گھر کا خرچ چلا لینا۔ دل چاہے تو کسی کو نہ بتانا۔ دل چاہے تو سب کو بتا دینا۔ میں نیچے جا رہا ہوں، جلیل آ کر چائے لے جائے گا۔"

❁ ❁ ❁

"آپ کہیں جا رہے ہیں۔" سیدہ نے حسین شاہ کے نک سک سے تیار حلیے پر نظر ڈالی۔
"ہاں۔" انہوں نے بارعب لہجے میں مختصرا" کہا اور پرفیوم اٹھا کر خود پر چھڑکنے لگے۔
"کہاں؟"
"اسلام آباد۔" انہوں نے ایک تنقیدی نظر آئینے پر ڈالی۔ اپنا جائزہ لیا اور پرفیوم کی بوتل ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔
"خیریت؟"
"خیریت ہی ہے۔ اجلاس ہے سینٹ کا، آخری ہی سمجھو۔ اس کے بعد تو نئے الیکشن ہوں گے۔" وہ مڑ کر بولے۔
"کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟" سیدہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"صرف ایک دن کے لیے، کل رات تک واپسی ہے۔"
"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟" سیدہ نے خوشامدی انداز میں کہا۔
"بولو۔" حسین شاہ کا لہجہ ہنوز بے نیاز سا تھا۔
"میں... میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔" وہ کچھ ڈرتے ڈرتے بولیں۔
"کیوں تم نے کیا کرنا ہے ساتھ چل کر؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔
"وہ کام ہے ادھر مجھے کچھ۔" حسین شاہ کے ماتھے کے بل گہرے ہو گئے تو وہ فورا" بولیں۔ "وہ بابا جان نے ادھر جو کوٹھی لے رکھی ہے۔ میں کہہ رہی تھی میں ذرا ادھر چکر لگا آتی۔ کافی عرصے سے ادھر جا ہی نہیں سکی۔"
"سیدہ! مجھے سمجھ میں نہیں آتا تمہاری ساری فکریں چاچا جان کے ترکے اور اولاد کی فکروں سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ کبھی اتنی تشویش تمہیں اس حویلی کے معاملات کے بارے میں بھی ہوئی۔" وہ جتا کر بولے۔
"شاہ سائیں! ادھر آپ جو ہیں سب معاملات کو خوش اسلوبی سے دیکھنے والے۔ ادھر مجھے ساری فکریں صالحہ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اسے ابھی سب معاملات کو دیکھنا اور سنبھالنا نہیں آتا۔ جوں جوں وہ حویلی کے معاملات کو سمجھتی جائے گی میں خود بخود پیچھے ہٹتی جاؤں گی۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولیں۔
"ہوں!" حسین شاہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
"پھر میں چلوں، اگر آپ کہیں۔" سیدہ نے ان کی "ہوں" کو نیم رضامندی سمجھ کر پوچھا۔
"تیاری میں کتنا وقت لگے گا تمہیں؟"
"بالکل بھی نہیں۔ میں تیار ہوں، بس ایک آدھ سوٹ رکھ لیتی ہوں۔" وہ فورا" بولیں۔
"چلو پھر آ جاؤ، پانچ منٹ میں۔ میں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے عجلت میں باہر نکل گئے تو سیدہ جلدی سے اپنی وارڈ روب کی طرف بڑھیں۔
رات کے نو بج رہے تھے، جب ان کی گاڑی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ سیدہ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ملازمین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
"شاہ جی! آپ اطلاع کر دیتے ہم کچھ اہتمام وغیرہ۔" منظور نے آگے بڑھ کر حسین شاہ کا بریف کیس لیتے ہوئے گھبرا کر کہا۔
"اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کوئی غیر ہیں، اپنا گھر ہے۔ مجھے تو خیر ہوٹل جانا تھا لیکن تمہاری بیگم صاحبہ کا اچانک پروگرام بن گیا۔" وہ کہتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ سیدہ پہلے ہی اندر جا چکی تھیں۔
"منظور آدھے گھنٹے تک کھانا لگواؤ، تیار نہیں ہے تو بازار سے منگوا لو۔ اتنی دیر میں شاہ صاحب فریش ہو جاتے ہیں۔" سیدہ نے بارعب آواز میں لاؤنج سے پکار کر کہا تو منظور الٹے قدموں واپس مڑ گیا۔ حسین شاہ نہانے جا چکے تھے۔ سیدہ نے اٹھ کر ساری کوٹھی کا سروے شروع کر دیا۔ سب کمرے کھلے تھے، کہیں بھی کسی خاص تبدیلی کے آثار نہیں تھے۔ وہ تین سال پہلے ادھر آئی تھیں، سبطین شاہ کے ساتھ ان کے چیک اپ کے سلسلے میں۔ اس کے بعد آج آئی تھیں۔
"کنسٹرکشن کا کام کہیں بھی نہیں ہوا تو پھر سلطان بخت نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" وہ سارے کمروں کی چھتوں اور دیواروں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے خود سے بولیں۔
انہوں نے سلطان بخت کے زیر استعمال بیڈ روم کا دروازہ کھولنا چاہا، وہ لاکڈ تھا۔ وہ ٹھٹک گئیں۔ جھک کر لاک کے سوراخ میں اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر اندھیرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آ سکا۔ انہوں نے زور زور سے ہینڈل گھمایا، دروازہ کھینچا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔
"کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئیں دوبارہ لاؤنج میں آ گئیں پھر کھانا بھی انہوں نے بے دلی سے کھایا اور بے صبری سے حسین شاہ کے سونے کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ کھانا کھاتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے کل کی میٹنگ کے لیے کچھ نوٹس تیار کرنے ہیں' میرے لیے کافی بنوا کر بھجوا دو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔
"ٹھیک ہے' میں بھجوا دیتی ہوں۔ مجھے تھکاوٹ ہو رہی ہے' میں دوسرے بیڈ روم میں سو جاتی ہوں۔" سیدہ نے فوراً کہا تو حسین شاہ سر ہلا کر باہر نکل گئے۔
"سلطان بخت کا بیڈ روم لاکڈ کیوں ہے؟" چند منٹوں بعد ہی منظور ان کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔
"جی وہ شاہ جی خود لاک کر کے جاتے ہیں۔"
"بکواس مت کرو' سلطان بخت کو ادھر سے گئے تین دن ہو چکے ہیں اور بیڈ روم سے پرفیوم کی فریش خوشبو آ رہی ہے جیسے ابھی کوئی لگا کر گیا ہو۔ کیا سلطان بخت اے سی چلتا چھوڑ گئے ہیں کمرے کا دروازہ' ہینڈل اور اندر سے آتی ٹھنڈک اس بات کی گواہ ہے کہ اے سی کچھ دیر پہلے ہی بند کیا گیا ہے۔ دیکھو منظور! میرے ساتھ کوئی گیم کھیلنے کی کوشش مت کرو' ورنہ تم شاید مجھے جانتے نہیں۔" وہ غصے سے بولیں۔
"بیگم صاحب! میں غریب آدمی ہوں' میری کیا مجال ہے کہ میں آپ کے ساتھ کوئی گیم کروں جی!" وہ گھگھیا کر بولا۔
"سلطان بخت کی غیر موجودگی میں اس کا بیڈ روم کون استعمال کرتا ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولیں۔
"کوئی نہیں جی!" منظور نے ذرا سی آنکھیں اٹھا کر سیدہ کے غصیلے چہرے کو دیکھا۔
"تو تم یوں نہیں مانو گے۔"
"میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔" منظور اب باقاعدہ کانپ رہا تھا۔
"تو میں لاک تڑوا دوں۔" سیدہ اٹھتے ہوئے بولیں تو منظور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
"نن..... نہیں جی..... وہ شاہ جی....."
"کیا شاہ جی..... بولو۔" وہ غرائیں۔
"وہ ناراض ہوں گے جی۔"
"ان کو پتا نہیں چلے گا' کسی بھی بات کا۔ میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دیتی ہوں اور یہ لو لاک کھولو جلدی سے جا کر۔" سیدہ نے ہزار ہزار کے دس نوٹ اپنے پرس سے نکال کر منظور کے آگے بڑی میز پر پھینکے۔ منظور نے کن انکھیوں سے نوٹوں کو دیکھا مگر اٹھائے نہیں۔
"نن..... نہیں جی..... مگر شاہ جی....." وہ اب رو دینے کو تھا۔
"شاہ جی اگر تمہاری کھال کھنچوا سکتے ہیں تو میں تمہاری شہ رگ بڑی آسانی سے کٹوا سکتی ہوں۔ سوچ لو' تمہیں کون سی موت پسند ہے۔" سیدہ بے رحمی سے بولیں۔
"میرے پاس کمرے کی چابی نہیں ہے جی۔" اس نے آخری کوشش کی۔
"میرے پاس پسٹل ہے۔ چلو میرے ساتھ' میں اس کا لاک اڑا دیتی ہوں۔" سیدہ نے جھک کر اپنے پرس سے لیڈیز پسٹل نکالا تو منظور ہکا بکا رہ گیا۔
"میں..... وہ..... شاہ جی....."
"سلطان بخت کو علم نہیں ہو گا' اگر لاک پسٹل کے فائر سے ٹوٹا تو پھر تم خود سوچ لو وہ تمہارا کیا حشر کرے گا۔"
"میں چابی لے کر آتا ہوں جی۔" وہ گھبرا کر مڑا۔

"ہوں۔ تو یہ وجہ ہے سلطان بخت کے اسلام آباد بھاگ بھاگ کر آنے کی۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی سیدہ کو جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔
"کب سے یہ کھیل ہو رہا ہے ادھر؟" سیدہ نے مڑ کر منظور سے پوچھا۔
"جی....." اس نے سر جھکا لیا۔ "ڈیڑھ سال یا کچھ اوپر۔" سیدہ نے آگے بڑھ کر وارڈ روب کھولی۔ سارا ریک لیڈیز خوبصورت اور اسٹائلش ملبوسات سے بھرا ہوا تھا۔ نیچے والے ریک میں لیڈیز سینڈل اور ضرورت کا دوسرا

سامان رکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا امپورٹڈ سامان رکھا تھا۔
"یہ اب کہاں ہے؟" سیدہ نے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ہوشربا حسن کی مالک لڑکی کی تصویر کو ہاتھ میں لے کر پوچھا۔
"بھوربن' شاہ جی کے ساتھ۔"
"جھوٹ' سلطان بخت تو آج صبح گاؤں میں تھا۔" وہ پھنکار کر بولیں۔
"وہ شام کو آئے تھے اور انہیں لے کر چلے گئے۔" وہ سر جھکا کر بولا۔
"نکاح کر رکھا ہے یار کھیل ہے؟" سیدہ نے تصویر بیڈ پر پٹخی۔
"نکاح کیا تھا جی!" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔
"کھیل بنا رکھا ہے نکاح کو بھی اس نے۔" وہ بڑبڑائیں۔
"واپس کب آئیں گے؟"
"معلوم نہیں جی۔"
"اچھا میں سونے جا رہی ہوں' تم کمرہ لاک کر دو۔" سیدہ کے کندھے جیسے یکدم جھک گئے تھے۔ وہ بمشکل اپنا وجود گھسیٹتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

❁ ❁ ❁

"سر..... سر پلیز..... میری بات تو سنیں۔" عبدالمبین نے کاریڈور سے اپنے آفس کی طرف جاتے ہوئے ریاض صاحب کو بڑے ملتجی انداز میں پکارا۔
"اوہو بھئی کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے مڑ کر جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ان کے موٹے شیشوں والی عینک پھسل کر ناک کی نوک پر رکی تھی۔ دائیں ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کے پلندے کو انہوں نے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔
"سر! میں ایک ہفتہ بھر سے آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ پلیز سر! کچھ تو سوچیں میرے بارے میں۔" وہ ان کے پاس پہنچ کر پیچھے گڑگڑایا۔
"میاں! تم تو ہفتہ بھر سے آ رہے ہو۔ جاؤ باہر جا کر دیکھو' لوگ سالوں سے ادھر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں' قطاروں میں کھڑے ہیں' آڈیشن دے دے کر نڈھال ہو چکے ہیں پھر بھی انہیں اسٹوڈیو اور کیمرے کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ تم تو خوش قسمت ہو جو پہلے ہی آڈیشن میں کامیاب بھی ہو گئے اور کام بھی مل گیا۔ اب کیا کہتے ہو؟" ریاض صاحب سخت اکتائے ہوئے لگ رہے تھے۔
"سر اب کیا ایک ہی کام پر اکتفا کر لوں۔ مجھے آگے بھی تو کچھ کام دیں نا۔"
"او بھائی! میں نے تم سے کوئی ایگریمنٹ نہیں کیا تھا کہ ایک کام دینے کے بعد تمہاری ساری زندگی کا بیڑہ میں اٹھاؤں گا۔ جاؤ مجھے معاف کرو' مجھے بہتیرے کام ہیں آج' سر کھپانے کی فرصت نہیں۔" وہ آفس کا گلاس ڈور دھکیل کر اندر چلے گئے۔
"پلیز سر..... میں تو ادھر آپ کی حوصلہ افزائی اور آپ کی محبت کی وجہ سے ہی آیا ہوں۔ اگر آپ مجھے یوں نظر انداز کریں گے تو میرا ٹیلنٹ تو بیکار گیا نا۔ آپ جیسی جوہر شناس نظریں کس کی ہوں گی' آپ نے میرے اندر سوئے ہوئے فنکار کو جگایا ہے اور میں تو ادھر آپ کی نظر کرم کی وجہ سے ہوں۔ اب آپ ہی بتائیں' میں کدھر جاؤں۔ مجھے اور کسی کا علم بھی نہیں۔ پلیز سر!"
اس نے لہجے میں سارے زمانے کی عاجزی اور مسکینی سمو کر خوشامدی انداز میں کہا۔ ریاض صاحب نے کاغذوں کا پلندہ ٹیبل پر پٹخا اور عبدالمبین کو عینک کے موٹے عدسوں کے پیچھے سے گھور کر دیکھا پھر کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکایا اور کوئی نمبر ڈائل کر کے کسی سے بات کرنے لگے۔ اسی دوران کوئی اور پروڈیوسر صاحب ان کے کمرے میں آ گئے اور ساتھ ہی دو تین غیر مقبول فنکار بھی۔ تھوڑی دیر میں ان کا کمرہ اسی

نوع کے لوگوں سے بھر چکا تھا۔ عبدالمبین ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ریاض صاحب کی مصروفیت کا عجب عالم تھا۔ کبھی کسی ایکٹر کا اسکرپٹ سنتے' کبھی فون پر مصروف ہو جاتے' کبھی ان کا موبائل بج اٹھتا۔ دوبارہ وہ اٹھ کر آفس سے باہر گئے۔ بیٹھے بیٹھے عبدالمبین کی کمر اکڑ گئی۔ وہ نو بجے ان کے آفس آیا تھا اور اب بارہ بجنے کو تھے۔ آج اس کو شہرینہ سے بھی ملنے جانا تھا۔ اب اس کا دل چاہ رہا تھا سگریٹ کے دھوئیں سے اٹے اور مختلف خوشبوؤں اور مصنوعی چہروں کے اس ہجوم زدہ کمرے سے بھاگ نکلے۔

"ہاں بھئی عبدالمبین ابھی تک بیٹھے ہو۔" ریاض صاحب باہر سے آکر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوئے وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ایسا ہے کہ آپ پرسوں صبح دس بجے آجانا ایک اشتہار ہے بمشکل ایک منٹ کا جنگل ہے میرا خیال ہے پرسوں ہی ریکارڈنگ ہو جائے گی اس کے علاوہ... وہ سوچنے لگے ایک پلے ہے جو جعفر صاحب کر رہے ہیں اس میں تین تین منٹ کے دو سین ہیں کوئی بڑا رول نہیں بس سرسری سا ہے کر لو گے نا؟"

"جی جی کر لوں گا" وہ فوراً بولا۔

"بس تو پرسوں آجانا' جعفر صاحب کی ریکارڈنگ تو مسلسل تین چار دن ہو گی تمہارا کام البتہ پرسوں ہی ہے میں کہہ آیا ہوں ان سے تم پرسوں صبح میرے آفس میں آجانا" وہ مڑ کر اپنی نشست کی طرف بڑھے۔

"بہت بہت شکریہ سر بہت مہربانی۔" وہ ان کی توجہ پا کر نہال سا ہو گیا۔

"دیکھو عبدالمبین! میں یہ مانتا ہوں تمہاری آواز بہت اچھی ہے اتنی کہ میں نے تمہیں پہلے آڈیشن پر ہی لے لیا تھا مگر تمہاری آواز اصل میں ابھی بریکنگ پیریڈ سے گزر رہی ہے۔ پختگی دو طرح سے آئے گی ایک تو کچھ ٹائم گزرے گا میرا خیال دو تین سال تک دوسرے تم ریاض کرو۔ تمہیں سنگنگ میں نام پیدا کرنا ہے تو محنت کرو ریاض کرو چاہو تو کوئی بینڈ جوائن کر لو کسی کی شاگردی اختیار کر لو ساتھ کام بھی کرتے رہو تو بہت اچھا ہے تمہارا ٹیلنٹ خود بخود نکھرتا جائے گا شرط محنت اور... اے ندیم میاں! عدیلہ ہے تم ادھر بیٹھے ہو آفس کرا دو ادھر میڈم فاخرہ تمہاری تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہیں چلو جلدی سے مجھے اپنا رول سناؤ اور ان کے آفس جاؤ ان کی ریکارڈنگ اسٹارٹ ہونے والی ہے اب تو وہ سیٹ پر بھی جا چکی ہوں گی" وہ مڑ کر کسی ندیم سے مخاطب ہوئے۔

"اوکے سر میں اب جاؤں۔" عبدالمبین کو یقین تھا اب وہ مشکل ہی سے ادھر متوجہ ہوں گے۔

"ہاں ٹھیک ہے جاؤ۔" وہ بے خیالی میں سر ہلا کر بولے تو وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔

ٹھیک بارہ بج کر دس منٹ پر وہ شہرینہ کو پک کر رہا تھا۔

"اتنی دیر لگا دی میں تو اب واپس اندر جانے لگی تھی" وہ بیٹھتے ہی ناراضی سے بولی۔

"بس ایک کام کے سلسلے میں پھنس گیا تھا بڑی مشکل سے بھاگا ہوں ادھر سے۔" اس نے جلدی سے بائیک اسٹارٹ کی۔

"میں سمجھی شاید تم بھول گئے۔" وہ شائستگی سے بولی۔

"کم ان شہو! میں تمہیں بھول سکتا ہوں؟ اب تم کبھی بھول کر بھی نہ سوچنا" اس کی طبیعت ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی ایک تو کام مل گیا تھا دوسرے شہرینہ کا ساتھ۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"یہی کہ تم میرے ساتھ بیٹھی ہو میرے اتنے قریب ہو کہ چند جھونکے ہی ہمارے درمیان گزر سکیں وہ بھی تمہاری احتیاط کی وجہ سے" شہرینہ چپ رہی۔

"تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔" عبدالمبین نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"پہلے نہیں لگتا تھا سوچ کر الجھن ہوتی تھی اور پریشانی بھی..."

"اور خوف بھی" عبدالمبین نے لقمہ دیا "اور اب؟"

"اب... اب اچھا لگتا ہے۔"

"چلو آج کچھ کھاتے ہیں۔"

"نہیں مجھے بھوک نہیں۔"

"فاسٹ فوڈ بھوک کے لیے نہیں ہوتی۔ بس واہٹ چلتے ہیں۔"

"تم کون سا کام کرتے ہو؟" شہرینہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"تم کہہ رہے تھے نا ایک کام میں پھنس گیا تھا۔"

"اوہ... وہ بتاؤں گا کبھی۔" وہ ہولے سے ہنسا۔

"کبھی کیوں ابھی کیوں نہیں۔"

"ابھی۔" وہ سوچ میں پڑ گیا "چلو ابھی بتا دیتا ہوں کہیں اطمینان سے بیٹھتے ہیں تو پھر بتا دیتا ہوں۔"

"یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔" شہرینہ بولی۔

"کیا... کیا ٹھیک نہیں ہے؟"

"میرا تم سے یوں ملنا۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے تمہارے برادر صاحب لائیں گے تمہیں مجھ سے ملوانے۔"

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے کسی نے دیکھ لیا' کسی کو پتا چل گیا تو..."

"تو مائی ڈیئر! جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا' میرا خیال ہے یہی محاورہ ہے شہرینہ محبت کا کمزور پودا ڈر اور خوف کی فضا میں ہی پنپ کر مضبوط اور تناور درخت بنتا ہے تم کس بات سے ڈرتی ہو اور یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں نا تم اکیلی تو نہیں ہو اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو کیا میں تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا کبھی نہیں دیکھنا عبدالمبین پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہے آؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

اس نے ایک فاسٹ فوڈ کارنر کے آگے بائیک روک کر کہا تو شہرینہ نے اترتے ہوئے احتیاط سے اپنا نقاب چیک کیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے عبدالمبین کے ساتھ ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"پیاری اماں جان!

السلام علیکم

بہت سارے دنوں بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں امید ہے خیریت سے ہوں گی اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں آپ بالکل ٹھیک ہوں اور ٹھیک رہیں اور میرے لیے دعا کرتی رہیں۔ بابا صاحب کے بارے میں نہیں پوچھوں گا کیونکہ انہوں نے مجھے گھر ہی سے نہیں دل سے بھی نکال پھینکا ہے ان جیسا سخت دل اور پتھر باپ میں نے کہیں نہیں دیکھا نہ سنا ہے اور نہ کتابوں میں پڑھا ہے۔ سال بھر بلکہ اس سے بھی اوپر ہو گیا میں انتظار کرتا ہی رہا کہ شاید بابا صاحب مجھے منانے آجائیں میری محبت میں ملنے آجائیں مگر میری تمام امیدیں نقش بر آب ثابت ہوئیں بابا صاحب کا پتھر دل جیت گیا۔ سو آج میں نے بھی ان کو اپنے دل سے نکال پھینکا ہے۔ جس طرح انہوں نے مجھے اپنے گھر اور زندگی سے نکال دیا ہے۔

اماں جان! مجھے ادھر بہت اچھے لوگ مل گئے ہیں بہت اچھے انہوں نے میری زندگی سے ہر محرومی ہر کمی کو دور کر دیا ہے میری تعلیم تقریباً مکمل ہونے کو ہے اب مجھے مزید پڑھنے کے لیے باہر بھجوا رہے ہیں شاید میں لندن چلا جاؤں پھر کب لوٹوں گا کچھ پتا نہیں بہرحال جب بھی لوٹا اس قدر کمزور نہیں ہوں گا کہ بابا صاحب جب چاہیں مجھے گھر کی سیڑھیوں سے دھکیل دیں اور میری بات لکھ لیں میں آئندہ سالوں میں جب بھی واپس آؤں گا بابا صاحب خود مجھے ملنے آئیں گے اس وقت انہیں احساس ہو گا کہ ان کا اپنی اولاد کے ساتھ سنگ... [illegible] بد صورت

تھا اور گھٹیا بھی اور اس کا انتقام وقت ان سے لے گا جب وہ خالی ہاتھ خالی دامن میرے پاس آئیں گے آپ میری بات لکھ لیں پھر میں انہیں بتاؤں گا کہ غصہ نفرت وحشت و بربریت ہی اولاد کی تربیت کے طریقے نہیں ہوتے محبت اور بلکہ ادر رویہ اور وقت کی نبض کو دیکھ کر چلنے والے انسان ہی کامیاب اولاد کے والدین ہوتے ہیں اور ان جیسے ناکام منہ کے بل گرنے والے ہوتے ہیں یہ ان کی ناکام حکمت ہی تھی جو گاؤں سے یوں ذلیل ہو کر آپ سب کو لیے چلے آئے اس طرح ادھر کسمپرسی کی زندگی گزارنے۔

بہر حال میرا اب ان تمام باتوں سے کچھ تعلق نہیں رہا میں ویسے ہی اس ملک سے دور جا رہا ہوں بس خیال آیا کہ جاتے وقت آپ کو خدا حافظ کہہ جاؤں اگر زندگی نے بھی موقع دیا تو ملنے آؤں گا آمنہ ' زینب اور جویریہ کو میرا پیار اور عبدالمبین سے کہئے گا خود ہمت کرے اور اپنا مستقبل بنائے بابا صاحب کے زیر سایہ رہا تو وہ اسے مار مار کر دہشت گرد بنا ڈالیں گے کہ اس کے علاوہ تربیت کا انہیں اور کوئی طریقہ آتا نہیں۔

خدا حافظ

آپ کا بیٹا عبدالمتین

آمنہ 'اماں بی کو خط سناتی جا رہی تھی اماں بی کی آنکھوں سے آنسو پھسلتے جا رہے تھے۔ خود آمنہ کی بری حالت تھی زینب بھی اماں بی کے پاس ہی بیٹھی تھی کس قدر نفرت بھری تھی عبدالمتین کے دل میں بابا صاحب کے خلاف کہ اس کا اندازہ ان تینوں کو بالکل نہیں تھا اماں بی تو یہی سمجھے بیٹھی تھیں کہ ناراض ہے کچھ مہینوں تک خود ہی من جائے گا اور ملنے چلا آئے گا اس نے تو آج ہر ناتا ہر تعلق ہی توڑ ڈالا تھا اس نے کیا سنتا تھا۔

آمنہ نے خط تہہ کر کے آنسو بھری آنکھوں سے اماں بی کی طرف دیکھا جن کا چہرہ گریہ وزاری سے سرخ ہو گیا تھا آنسوؤں سے پورا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

"عبدالمتین! میں تجھے کیا کہوں۔ اس پیٹ سے جنا ہے۔ بددعا بھی نہیں دے سکتی کہ تو نے میرے سر کے سائیں کو اتنا غلط اتنا برا بھلا کہا ہے چودھویں صدی کی اولاد ہے ناقیامت کی سب نشانیاں پوری ہو کر رہیں گی۔" وہ روتے روتے بولیں دوپٹے کے پلو سے اپنا ناک منہ صاف کرنے لگیں۔

"ایسی ہوتی ہے اولاد اور ایسے ہوتے ہیں بیٹے کہ جن کی آرزو میں انسان سجدوں میں گر کر گڑگڑاتا ہے بدنصیب تجھ سے تو سب سے زیادہ محبت تھی اور تو آستین کا سانپ بن کر ڈسنے لگا۔ آہ میں کس بات کو روؤں تیری بد نصیبی کو یا اپنی کہ خدا نے دو بیٹے بھی دیے اور دونوں کھوٹے نکلے۔۔۔

آمنہ! میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے آخری بار جاتے وقت پوچھا کیا میرے بعد بھی دنیا میں آؤ گے تو انہوں نے جواب دیا ہاں پانچ بار آؤں گا ایک بار والدین کے دل سے اولاد کی محبت نکالنے' دوسری بار اولاد کے دل سے والدین کی محبت اور احترام نکالنے تیسری بار رزق سے برکت نکالنے' چوتھی بار عمر سے برکت نکالنے اور پانچویں بار وقت سے برکت نکالنے۔ دیکھو تو کیسے ساری باتیں پوری ہو رہی ہیں پانچوں کی پانچوں۔۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"اماں بی! حوصلہ کریں اس طرح روئیں گی تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

زینب نے ان کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"لندن جا رہے ہیں تو جائیں جب انہیں ہمارا احساس نہیں تو آپ کیوں رو رہی ہیں ایسے پتھر کے لیے۔ وہ بابا صاحب کو پتھر دل کہتے ہیں اور خود۔۔۔۔" زینب کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

"آمنہ اس خط کو پھاڑ دو یا جلا دو کہیں تمہارے بابا صاحب نے دیکھ لیا تو۔۔۔" وہ ایک بار پھر رونے لگیں اسی وقت صوفی صاحب کے کھنکھارنے اور آخری سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔

آمنہ نے جلدی سے خط مٹھی میں چھپا لیا اور اماں بی نے سیدھے ہو کر اپنا منہ دوپٹے سے رگڑ کر صاف کیا۔

"چلو تم دونوں جا کر کھانا لگاؤ دستر خوان پر میں آ رہی ہوں۔" ان کے کہنے پر وہ دونوں جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

گاڑی کس قدر طوفانی رفتار سے گیٹ کی طرف بڑھی تھی اگر عبدالمبین پھرتی سے پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اب تک اس کی کچلی ہوئی لاش گیٹ کے ساتھ چپکی ہوتی اس کا دل بے اختیار تیز تیز دھڑکنے لگا تھا اپنی متوقع موت کا سوچ کر ہی۔ اس نے کچھ غصے سے گھور کر گاڑی کی طرف دیکھا ایک خوبصورت کم عمر سی لڑکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی اب اس کا ہاتھ مسلسل ہارن پر تھا اس نے تو شاید عبدالمبین کو دیکھا بھی نہیں تھا' وہ شدید غصے میں لگ رہی تھی اس کے تیور دیکھ کر عبدالمبین اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہ گیا۔

"اسی وقت گیٹ برق رفتاری سے کھلا تھا اور وہ گولی کی طرح زوں کر کے گاڑی گیٹ کے اندر لے گئی تھی چوکیدار پھرتی سے گیٹ بند کرنے لگا تھا جب عبدالمبین تیزی سے آگے بڑھا۔

"مجھے میڈم سے ملنا ہے یہ ان کا کارڈ ہے۔" اس نے فوری طور پر زیور گل کا وزیٹنگ کارڈ چوکیدار کی آنکھوں کے آگے لہرایا چوکیدار بھی مالکوں کی طرح کڑوے مزاج کا لگتا تھا کارڈ کو سرسری نظر سے دیکھ کر اس نے عبدالمبین کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لے ڈالا۔

"تم کون ہو؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا جیسے عبدالمبین اسے بالکل پسند نہیں آیا۔

"میں عبدالمبین ہوں میڈم زیور گل سے ملنا ہے انہوں نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا گھر آ کر ملنے کے لیے" وہ جلدی جلدی بولا مبادا چوکیدار گیٹ ہی بند نہ کر دے۔

"کیا نام بتایا تم نے؟" وہ اسی تیکھے چتون سے بولا۔

"عبدالمبین۔"

"ٹھیک ہے میں بول دیتا ہوں میڈم سے بلانا ہوا تو بلا لے گی تم باہر کھڑے ہو جا کر۔" اس نے تیزی سے گیٹ کے دونوں پٹ بند کر کے اس کا منہ چڑا دیا۔ عبدالمبین باہر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"اگر آج نہ مل سکا تو شاید پھر کبھی نہ مل سکوں۔" اس نے سر اٹھا کر "گل کدے" کی پر شکوہ عمارت کو دیکھا گل کدہ صرف نام کا گل کدہ نہیں تھا گیٹ کی بیرونی دیواروں سے لے کر اندر جہاں تک عبدالمبین کی نظر گئی خوبصورت جنگلی پھولوں کی بیلوں اور پھولدار شاخوں سے اس طرح سجا ہوا تھا گویا دیواریں ریت اور سیمنٹ کی نہیں سرخ سفید پیلے جامنی گلابی نیلے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھولوں کی بنی ہوئی ہیں۔

"بہت باذوق لوگ لگتے ہیں۔" اس نے توصیفی نظروں سے در و دیوار کو دیکھا اس وقت ذیلی گیٹ کھل گیا۔

"آ جاؤ" وہی چوکیدار کہہ رہا تھا عبدالمبین جھٹ سے گیٹ کے اندر ہو گیا۔

"اسے اندر میڈم کے پاس لے جاؤ" چند قدموں پر ایک دوسرے کھڑے ملازم سے چوکیدار نے کہا تو عبدالمبین اس کے پیچھے چل پڑا۔

کاریڈور سے آگے ایک بڑا سا کمرہ تھا ملازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

کمرے میں تین بے حد قیمتی صوفہ سیٹ لگے تھے۔ چھت تک بڑی بڑی خوبصورت کھڑکیاں تھیں جن پر قالین کے ہم رنگ ویلوٹ کے بھاری پردے پڑے تھے کمرے میں روشنی باہر کی نسبت خاصی کم تھی اس لیے عبدالمبین کو شروع میں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کمرے کے کس رخ کی طرف جائے نہ اسے دائیں طرف صوفے پر بیٹھی زیور گل پر نظر آئی وہ کچھ پریشان سا کھلے دروازے میں کھڑا رہا۔

"اندر آ جاؤ۔" اس نے فوراً" آواز کی سمت نظر اٹھائی دائیں طرف بڑے صوفے پر زیور گل بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس دن کے حلیے کے برعکس آج وہ بالکل سادہ تھی میک اپ اور خوبصورت لباس سے بے نیاز وہ پنک کلر کا کاٹن کا سوٹ پہنے بغیر دوپٹے کے وہ دونوں ٹانگیں صوفے پر رکھے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم میڈم" عبدالمبین نے جھک کر سلام کیا تو زیور گل نے سر کے اشارے سے جواب دے کر اپنے دوسری طرف پڑے سنگل صوفے کی طرف اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"شکریہ جی۔" وہ بیٹھتے ہوئے کے آہستگی سے بولا۔

"تمہارا نام اس قدر آوٹ آف فیشن ہے کہ مجھے پہلے یاد ہی نہیں آیا کہ میں اس نام کے کسی شخص کو جانتی بھی ہوں میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اپنا نام بدل لینا۔" یہ وہ اپنی ازلی بے تکلفی سے بولی۔
"جی!"
"کیا پیو گے ٹھنڈا یا گرم؟" وہ اپنے ہاتھوں پر کسی کریم کا مساج کر رہی تھی۔
"جی کچھ نہیں۔"
"آنا کیسے ہوا؟"
"جی وہ اس دن آپ نے کہا تھا کہ اگر کبھی کوئی ضرورت پڑے تو..." وہ جھجک کر بولا۔
"اوہ!" وہ زور سے ہنسی "اتنی جلدی ضرورت پڑ گئی۔" عبدالمبین خجل سا ہو گیا۔ "ریاض نے ایک ہی ایڈ دیا ہو گا اس کے بعد ہری جھنڈی۔ ہے نا؟"
"جی، وہ کہتے ہیں ابھی کچھ کام نہیں دوسرے وہ کہہ رہے تھے تم ریاض کرو کسی اچھے ماسٹر سے۔"
"یہ بڑے فن آتے ہیں اس ریاضے کو۔ تمہارے ایڈ کا رسپانس تو اچھا گیا نا؟"
"جی وہ یہی کہہ رہے تھے۔"
"تم ابھی کم عمر ہو۔" زیور گل نے اپنے تیزی سے چلتے ہاتھ روک کر عبدالمبین کا جائزہ لیا۔ "بہت نام پاؤ گے مگر دو یا تین سال بعد۔ ریاض درست کہتا ہے۔"
"تو اب کیا کروں جی، مجھے تو کام چاہیے نا اس کے بغیر تو گزارا نہیں۔"
"ہاں بھئی۔ کام کے بغیر تو نکھٹو عورت بھی نہیں رہتی تم تو ہینڈسم ہوائے ہو فلموں میں کام کرو گے؟"
"جی" زیور گل کی اچانک آفر اسے حیران کر گئی۔
"یہی چھوٹا موٹا رول، فی الحال تجربے کے لیے۔ اس فیلڈ میں آتے ہو چار جانب ہاتھ پاؤں مارو گے تو اس کی گہرائیوں کو سمجھو گے۔"
"مجھے فلم میں کام کون دے گا۔" وہ مایوسی سے بولا "میری تو کوئی واقفیت بھی نہیں آپ کے سوا۔"
"او میرے ننھے!" زیور گل پھر ہنسی آپ آگئے ہو نا (گل کدہ) بس تو سمجھو اپنی منزل تک آن پہنچے ہو فلم میں چھوٹا موٹا کام دلوانا کچھ مشکل نہیں ویسے بھی ہماری فلمیں جو جھنڈے کامیابی کے گاڑ رہی ہیں ان میں چھوٹا موٹا کام کون سی بڑی بات ہے۔"
"پر جی مجھے تو گانا ہے گلوکاری میں نام بنانا ہے۔" وہ جھجک کر بولا۔
"اسی کے لیے تو رستہ بنا رہی ہوں۔ یوں تو کوئی اٹھا کر تمہیں راتوں رات سٹار نہیں بنا دے گا۔ محنت کرو گے تو نام پاؤ گے نا۔ اوہ چار بجنے کو ہیں۔" "نین تارا تم کیا کر رہی ہو ادھر سے زیور گل نے کمرے کے آخری سرے پر ریوالونگ چیئر پر موبائل کان سے لگائے جھولتی نین تارا کو پکار کر کہا تو عبدالمبین نے بے اختیار اس جانب دیکھا وہ گاڑی والی لڑکی تھی۔
"جی مام!" وہ اسی وقت اٹھ کر آگئی بلیک ٹراؤزر پر پنک ٹی شرٹ پہنے بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔
"قریشی نے کتنے بجے آنا ہے؟"
"معلوم نہیں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔
"پانچ بجے تک آئے گا وہ میرے خیال میں تم تو سو جاؤ۔"
"مام! میں ابھی نہیں جا سکتی۔" وہ گرنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔
"ابھی تو نہیں جانا۔ آتے آتے وہ گوشت کا چار چھ سات بجائے گا۔ تم ابھی ریسٹ کرو اور ہاں بھئی یہ عبدالمبین ہے۔" زیور گل نے اس کا تعارف کرایا۔
"اس، یہ کیا نام ہے؟" وہ چونکنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

"یہ کون حضرت ہیں مام! گڈ لکنگ ہے ہینڈسم بھی ہے چہرے سے "گاؤدی" لگتا ہے" وہ بلا جھجک بولی۔
"یہی تو میں کہہ رہی ہوں بے چارے کو کام چاہیے آج قریشی سے بات کر کے اسے کوئی کام دلوا دو۔ دوسرے ماسٹر جی کا فون نمبر میری ڈائری میں لکھا ہے۔ وہ مجھے دینا یہ ان سے ریاض سیکھے گا اصل میں اس کی آواز بہت اچھی..."
"مام! آپ ہر ایرے غیرے کو سر پر نہ بٹھا لیا کریں اور میں شاہ جی کو دیکھیں خدا جانے اسلام آباد میں کون سا تیل کا کنواں کھود رہے ہیں کہ ہفتہ بھر سے آنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔
"تو تم کیوں مری جا رہی ہو نہیں آتے تو مت آئے۔" زیور گل ناک چڑھا کر بولی ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں اس جاگیردار کے پیچھے اپنی جوانی کو خوار مت کرو۔ قریشی کی نئی فلم سائن کر لو پورے دو کروڑ کا پروجیکٹ ہے پھر وہ آفریدی صاحب۔ تمہارے ایک جلوے کے لیے مرے جا رہے ہیں۔"
"معلوم ہے مجھے۔"
"تو پھر کیا سوچا تم نے؟"
"فلم تو میں سائن کر رہی ہوں مجھے شاہ جی کا کچھ ڈر نہیں اس سلسلے میں اور آپ کو معلوم نہیں آفریدی صاحب کے ساتھ میں اس ویک اینڈ پر ان کے فارم ہاؤس میں جا رہی ہوں انہوں نے میرے اعزاز میں وہاں کوئی پارٹی رکھی ہے۔ چار کنال کا پلاٹ بھی میرے نام کر رہے ہیں پرسوں تک پیپرز تیار کر کے گھر دے جائیں گے۔"
"اس... یہ تم نے بالا ہی بالا معرکے مارنے شروع کر دیے مجھ کو بتائے بغیر" زیور گل پر جیسے شادیٔ مرگ طاری ہو گئی۔
"مام! میں اب بڑی ہو گئی ہوں اور میں شاہ جی کو بتانا چاہتی ہوں کہ اگر وہ مجھے ایک احمد پور کی حویلی نہیں دے سکتے تو کیا ہوا دنیا ایسی سینکڑوں حویلیاں میرے قدموں پر نچھاور کرنے کو تیار ہے۔"
عبدالمبین نے چونک کر نین تارا کو دیکھا احمد پور اور شاہ جی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور بہت سی کڑیاں مل گئیں۔
اب اس "گل کدہ" سے نہیں جانا شاہ جی کی اپنی حویلی میں نقب لگانے کا ایک اور رستہ مل گیا۔ وہ دل ہی دل میں مسرور ہوا۔
"میڈم! میرے بارے میں کیا حکم ہے" وہ جلدی سے بولا۔
"تم ادھر ہی رہو ابھی قریشی آئے گا تو تمہارے سامنے بات کروں گی شاید آج ماسٹر صاحب بھی آجائیں ان سے بھی بات کر لوں گی۔" زیور گل کی "مہربانی" اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"تھینک یو تھینک یو میڈم یو آر سو کائنڈ۔" وہ عقیدت مندی سے بولا۔
"مام! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تھک گئی ہوں ریسٹ کروں گی" نین تارا اٹھ کر باہر نکل گئی۔
"ابھی نہیں تھکنا نین تارا! ابھی تو سفر شروع ہوا ہے مائی پریٹی ڈول۔"
زیور گل بڑبڑائی۔
"اور میڈم میں اس سفر میں آپ کے ساتھ ہوں۔"
عبدالمبین نے بہت آہستگی سے لب ہلائے اور بڑے سکون سے صوفے پر جم کر بیٹھ گیا۔

● ● ● ● ● ●

یاد یار کے جیسی
بھیگی بھیگی شام دسمبر کی
بہت کچھ یاد دلاتی ہوئی، ذیر لب دہراتی ہوئی
اس کی زلفوں کے شبنمیں قطرے
اور قطرہ قطرہ بھیگی شام دسمبر کی

اپنے دامن میں سمیٹے
بارہ مہینوں کی سرد و گرم نرم و تلخ شامیں لیے آتی بھیگی شام دسمبر کی
ہجر کا بوجھ اٹھائے میرا تھکا تھکا سا بوجھل دل اس کی رخصتی پر نہ ملول ہے نہ شاد ہے
جو میرے بوجھل دل پر دستک دے رہی ہے اور ہولے ہولے اپنی سرد بانہوں میں مجھے لیے کہہ رہی ہے
کل یکم جنوری ہے
اور اس کے بعد تین سو چونسٹھ دنوں کا بھرا بھرا سال
اپنے بوجھل دل کو جواں کر لو امیدوں کو پھر سے ہرا کر لو
تین سو چونسٹھ دنوں میں اک پل اک گھڑی اک دن
ایسا بھی آسکتا ہے، جو ہر زخم کا مداوا بن جائے دل کی بنجر زمیں کو ہرا بھرا کر دے
کہ زندگی اک روشنی
اک امید سے عبارت رہتی ہے دم آخر تک
امیدوں کو اپنی ہرا کر لو آنکھوں کو سپنوں سے روشن کر لو
اپنے دل کو جواں کر لو
زیر لب دہراتی ہوئی بھیگی شام دسمبر کی

❁ ❁ ❁

صوفی صاحب کو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پچیس منٹ ہونے کو آئے تھے جو ملازم انہیں یہاں تک چھوڑ کر گیا تھا اس کے بعد سے ابھی تک کسی ذی نفس نے ادھر قدم نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے اکتا کر کوئی گیارھویں بار ڈرائنگ روم کا تفصیلی جائزہ لینا شروع کیا۔ بہت بڑا ہال کمرہ تھا جو کسی گھر کا ڈرائنگ روم کم اور کسی فائیو اسٹار کا سجا سجایا ہال کمرہ زیادہ لگ رہا تھا۔

بیش قیمت فرنیچر، امپورٹڈ بے حد قیمتی قالین اور پردے، چھت سے لٹکے بیش قیمت سنہری فانوس، نادر و نایاب ڈیکوریشن پیسز، دیوار پر لگی بے حد قیمتی اور اچھوتے مناظر سے سجی پینٹنگز۔ گھر کے مالک کے ذوق اور دولت کی فراوانی کا پتا دے رہی تھیں۔

"کیا عبدالمتین اتنا امیر ہو گیا ہے محض ان ساڑھے چار سالوں میں؟" انہوں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک خود سے پچاسویں بار یہ سوال کیا تھا۔ وہ تو اس سے ملنے آئے تھے کسی پدرانہ شفقت، محبت یا جدائی سے بے حال ہو کر نہیں بلکہ اپنے حالات سے عاجز آکر۔ بہت راتیں جاگ جاگ کر سوچ سوچ کر انہوں نے خود کو اس جھکاؤ پر آمادہ کیا تھا۔ وہ آج سے پانچ چھ سال پہلے عبدالمتین کو کس طرح دھتکار کر اپنے گھر سے نکال چکے ہیں، اس آخری منظر کو یادوں کے فریم سے نکال کر۔

"عبدالمتین میرا سب سے لائق، ذہین، فرمانبردار اور سمجھ دار بیٹا ہے، وہ میرے ان حالات کو ضرور سمجھے گا اور میرے کہنے سے پہلے ہی سب کچھ جان جائے گا، ساری ناراضی کو بھلا دے گا مجھ سے دل سے پیار جو کرتا ہے، مجھے یقین ہے۔"

یہ آخری سوچ تھی جو بار بار ان کے دل کے دروازے پر دستک دیے جا رہی تھی جس کی ٹھک ٹھک سے مجبور ہو کر وہ آج عبدالمتین سے ملنے چلے آئے تھے جو بیرون ملک سے اعلا تعلیم مکمل کر کے واپس آچکا تھا۔

"جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟" کمرے کی ٹھنڈی خاموشی میں اچانک ابھرنے والی اس آواز نے انہیں بے اختیار چونکا دیا۔ چھریرے بدن کا دراز قد ادھیڑ عمر شخص سلیٹی کلر کا ٹو پیس پہنے آنکھوں پر نازک شیشوں کی خوبصورت عینک سجائے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"جی عبدالمتین سے۔" وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا۔ عبدالمتین سے۔" اس آدمی نے سر ہلایا۔

"او کے میں بھجواتا ہوں اسے، ویسے وہ ابھی نکلنے ہی والا تھا آفس کے لیے۔ بائی دا وے آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" وہ جانے کے لیے کھڑا تھا پھر یکدم رکتے ہوئے بولا۔

"جی میں۔" صوفی صاحب کی زبان کبھی اس طرح لکنت زدہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ آج تک کسی کے سامنے اس طرح نہیں ہکلائے تھے حتیٰ کہ سید سبطین شاہ کے سامنے بھی وہ بے حد اعتماد سے بات کر لیا کرتے تھے مگر آج تو جیسے ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ اس بے حد قیمتی گھر کی طاقت انہیں مغلوب کر رہی تھی یا اپنی کمزوری کہ ان سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

"میرا خیال ہے۔ آپ اس کے مولوی صاحب ہوں گے اس کے گاؤں میں۔ بتایا تھا اس نے مجھے اور آپ کے حلیے سے میں نے آپ کو پہچان لیا۔ بہت عزت کرتا ہے وہ آپ کی کہ کس طرح ماں باپ کے مرنے کے بعد آپ نے اس کی دینی و دنیاوی تعلیم کا خیال رکھا۔ ایسے اچھے نیک لوگ آج کے زمانے میں کم ہی پائے جاتے ہیں جو عبدالمتین جیسے یتیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اینی وے میں اسے بھیجتا ہوں جا کر۔ جو چاہیے ہو گا کھل کر بیان کیجیے گا اب اس کے پاس روپے پیسے کی کچھ کمی نہیں۔ آپ کے سب احسان اتارنے کے قابل ہو چکا ہے وہ۔" وہ بے حد فخر سے بتا رہے تھے۔

"میرا داماد ہے وہ مگر داماد بعد میں پہلے میرا بیٹا ہے۔ بہت اچھا بہت نیک، لائق اور فرمانبردار، بیٹھیں آپ۔ میں کچھ آپ کی تواضع کو بھی بھجواتا ہوں۔"

وہ شخص صوفی صاحب کے قدموں کے نیچے سے زمین سرکا کر انہیں بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔

"یتیم، بے سہارا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد۔" صوفی صاحب کے کانوں میں جیسے سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ پیت جھڑ کے موسموں میں چلنے والی تیز گرد آلود آندھیوں کی سیٹیاں! آندھی کا طوفانی شور۔

انہیں لگا یہ شور، یہ آندھی انہیں کہیں اڑا کر لے جا رہی ہے۔ ان کے قدم زمین سے اکھڑ رہے تھے مگر جسم جیسے کسی چٹان کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ بے حد قاصر۔ ان کا نفس تیز تیز چلنے لگا۔ سینے کے بائیں جانب ہلکا ہلکا درد اس آندھی کے شور میں بھی صاف اپنے ہونے کا پتا دے رہا تھا۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے چمکنے لگے۔ درد کو ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

"مونا! تم پلیز گاڑی میں بیٹھو جا کر۔ میں تو کسی مولوی کو نہیں جانتا۔ پاپا بھی حد کرتے ہیں۔ ہر ایک سے کرٹسی (مروت) نبھانے بیٹھ جاتے ہیں چاہے وہ شخص جان پہچان کا ہو یا نہ ہو۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں آیا۔" عبدالمتین کی آواز انہوں نے اس آندھی کے ہولناک شور میں بھی باآسانی پہچان لی تھی۔ جیسے ہی عبدالمتین نے کمرے میں قدم رکھا۔ آندھی، اس کا جان لیوا شور، طوفان سب کے سب ایک دم سے غائب ہو گئے۔ کمرے میں بس اے سی چلنے کی ہلکی سی گھوں گھوں تھی یا عبدالمتین کے آخری جملوں کی بازگشت۔ انہوں نے زخمی نظروں سے گردن گھمائے بغیر اپنے لخت جگر کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ایک پل کو پہچان کی لہر سی ابھری تھی اور دوسرے پل ڈوب گئی۔ اس کا ماتھا شکنوں سے اٹ گیا۔ ہونٹ بھینچ گئے اور چہرہ تن گیا۔ آنکھوں میں سرد، بے حد سرد پہچان کے بجھے بجھے سے دیے ٹمٹما رہے تھے۔

"آپ......" آواز اتنی مدھم تھی کہ صوفی صاحب نے بمشکل سنی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ آپ کا اب مجھ سے کیا تعلق ہے۔ آپ تو مجھے اپنی زندگی سے نکال چکے ہیں اور... اور میں بھی آپ کو بھول چکا ہوں تو پھر۔"

"بھول نہیں چکے، تم ہمیں مار چکے ہو۔" خود پر قابو پا کر صوفی صاحب اونچی آواز میں غرائے۔

"بے شرم، بے غیرت... بے حیا انسان! جیتے جی والدین کو قبر میں اتار دیا، روپے پیسے کی خاطر خود کو یتیم بنا لیا، ارے اس طرح تو جھوٹے بھکاری بھی نہیں کرتے۔ چند سکوں کی خاطر وہ بھی ایسا جھوٹ بولنے سے پہلے......"

"بس کریں..." وہ ہاتھ اٹھا کر دبی آواز میں غرایا "میں نے جھوٹ بولا یا سچ آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

میں آپ کو نہیں جانتا آپ نے خود مجھے دھتکارا تھا۔ اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اور جو لوگ زندگی سے نکل جاتے ہیں وہ زندہ بھی ہوں تو بھی مر جاتے ہیں اور میرے لیے آپ لوگ اسی دن مر گئے تھے جب آپ نے مجھے دھکے دے کر نکالا تھا۔" اس کا لہجہ ہر قسم کی پہچان سے عاری تھا۔

"عبدالمتین! یہ تم... ہو... تم؟" وہ بمشکل بول پائے۔

"ہاں یہ میں ہوں۔ اتنے برس آپ نے میری خبر نہ لی اب پتا چلا ہو گا کہ میں کیا بن چکا ہوں' چاہوں تو آدھا شہر خرید کر جیب میں ڈال سکتا ہوں تو آپ کے پتھر دل میں میری محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اگر والدین آپ کی طرح بے حس ہوں تو اولاد کے دل بھی پتھر کے بن جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے موقع شناس والدین کے ہونے سے یتیم ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔" وہ بڑی نفرت سے پھنکار رہا تھا۔

"بہرحال میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو آئینہ دکھاتا پھروں آپ کو یقیناً پیسوں کی ضرورت ہو گی جس کے لیے آپ نے اپنی سنگلاخ انا کو کچل کر مجھ تک آنا گوارہ کیا۔ یہ کچھ روپے ہیں' رکھ لیں اور مجھے ایڈریس دے جائیں۔ ہر ماہ آپ کو ایک معقول رقم بھجوا دیا کروں گا۔ آپ کو دوبارہ ادھر آنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے سات آٹھ نوٹ نکال کر ان کے سامنے میز پر پھینکے اور باہر کی سمت مڑنے لگا۔

"ایڈریس لکھوا دیں مجھے۔" جانے سے پہلے رکتے ہوئے اس نے کہا اور جیب سے چھوٹی سی انڈکس اور پین نکال کر بولا۔ صوفی صاحب نے ایک افسوس بھری نگاہ اس پتھر دل بیٹے پر ڈالی جس کی پیدائش کی خوشی میں کئی دن اور راتیں سو نہیں سکے تھے۔ اس ننھے وجود نے انہیں کئی دن تک نہال رکھا تھا۔ تو یہ تھی وہ خوشی! مستقبل کی امید! آنے والے کل کا سہارا۔

انہوں نے سینے میں کب کا رک کر آتا سانس بڑی سہولت سے خارج کیا۔ ایک نظر میز پر پڑے ان نئے نوٹوں پر ڈالی' خود کو لمحہ بھر میں مجتمع کیا' زمین میں گڑے قدم اٹھائے اور باہر کی طرف بڑھے۔

"ایڈریس تو لکھوا دیں۔" عبدالمتین نے انہیں پکارا۔

"اس کی ضرورت نہیں اور تمہیں معلوم نہیں مُردوں کے ایڈریس نہیں ہوا کرتے' قبرستان چلے جاؤ۔ کسی بھی مٹی کی بے نام قبر پر ہاتھ رکھ کر کہہ دینا یہ میرے ماں باپ کی قبریں ہیں۔ دل چاہے تو کبھی کسی بے نام قبر پر فاتحہ پڑھ لینا اگر تمہارا اسٹیٹس اس کی اجازت دے۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور کبھی تمہیں زندگی میں ایسے حالات سے دوچار نہ کرے کہ تمہاری اولاد کو تمہیں جیتے جی قبر میں اتارنا پڑے اور اس درد کا زہر تمہیں ٹکڑے ٹکڑے مار ڈالے۔ ٹکڑے ٹکڑے منوں مٹی تلے اتار دے' منوں مٹی تلے۔" ان کی آنکھوں میں آئی نمی نے اب واضح شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے اور باہر نکل گئے۔ عبدالمتین نے جھک کر نوٹ اٹھائے جیب میں ڈالے اور باہر نکل گیا۔

"ابھی جاؤ' اتنی دیر لگا دی۔" اس کی بیوی گاڑی میں بیٹھی ناگواری سے بولی۔

"کون تھا تمہارا اوزیٹر؟" جیسے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مونا نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ مونا نے ایک نظر اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اس نے شاید صوفی صاحب کو باہر جاتے نہیں دیکھا تھا جیسے ہی گاڑی مین روڈ پر پہنچی۔ سرخ سگنل کے اشارے پر رکتے ہوئے عبدالمتین نے دائیں طرف فٹ پاتھ پر بیٹھے صوفی صاحب کو دیکھا۔ وہ گولیوں کی شیشی میں سے ایک گولی نکال کر اپنی زبان کے نیچے رکھ رہے تھے۔

"متین! تمہارے پاس کچھ ریزگاری ہو گی؟" مونا کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"نہیں۔" وہ سرد مہری سے بولا۔ "کیوں؟"

"یہ بابا بے چارا جو دوائی کھا رہا ہے اس کو دیتے ہیں کتنا غریب لگ رہا ہے کپڑوں پر پیوند لگے ہیں۔ ایسے لوگ ہی

تو اصل مستحق ہوتے ہیں۔ تھینک گاڈ کہ اس نے مجھے غریب نہیں بنایا ورنہ... توبہ غربت تو بہت مشکل زندگی ہے۔ چینج ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں۔" پہلا سگنل کھلتے ہی عبدالمتین نے تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا گاڑی کسی اندھی کھائی میں دے مارے۔

❁ ❁ ❁

"ہاں۔ ادھر سے دبا ذرا زور سے۔ جان نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں۔" سیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ گاؤں کی دائی نیچے زمین پر بیٹھی ان کی پنڈلیاں اور پاؤں دبا رہی تھی۔ گزرتے وقت نے سیدہ کو جوڑوں کے درد اور بڑھاپے کا تحفہ دیا تھا۔

"ہاں ادھر سے۔" سیدہ نے پرسکون انداز میں آنکھیں بند کیں کچھ دیر یوں ہی گزری۔

صالحہ بی بی کے پاؤں دبا آئی ہو؟"

"نہیں جی میں گئی تھی ان کے کمرے میں' وہ سو رہی تھیں۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

"اتنا سوتی ہے یہ صالحہ' کہیں کمبخت پھر نہ لڑکی ہو۔" سیدہ منہ میں بڑبڑائیں۔

"جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" دائی نے سن کر بھی انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تیرے کان بڑے بجتے ہیں' دائی اپنے کام سے کام رکھ۔" انہوں نے ایک ہلکی سی لات اس کے گھٹنے پر ماری۔

"تیرا اندازہ کیا کہتا ہے' کب تک ہو گی صالحہ بی بی کے ہاں بچے کی پیدائش؟" چند لمحوں کے بعد سیدہ نے پوچھا۔

"اگلے مہینے چڑھے چاند کی پہلی تاریخیں جی۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"ہوں۔ ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اللہ کرے اس بار ہماری امیدیں بر آئیں۔ پانچ سالوں میں تین بیٹیاں کبھی اس حویلی میں پہلے نہ ہوئی تھیں۔ اب تو کان بیٹے کی آواز سننے کو ترس گئے ہیں۔ کب اس حویلی کا وارث پیدا ہو گا۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

"آمین اللہ سوہنا اس بار یہ خوشی ضرور دکھائے گا جی۔" دائی خوشامدی لہجے میں بولی۔

"وہ اسکریننگ کرائی ہے بی بی؟"

"نہیں۔ ہمارا ان چیزوں پر یقین نہیں اللہ کے شریک بنتے ہیں یہ لوگ ہم تو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے وہ اس بار ہماری ضرور سنے گا۔" سیدہ نے دوسری ٹانگ اس کے آگے کی۔

"مجھے اس بار اللہ کے گھر سے پوری امید ہے' اس بار تو صالحہ کی ساری نشانیاں ہی الٹ ہیں۔ چال بھی بدلی ہوئی ہے۔ میرا تو دل پکا ہے بیٹا ہی ہو گا اس بار۔ دیکھنا' پورے سال کا جشن مناؤں گی گاؤں بھر میں۔ اللہ ہمیں یہ خوشی دکھاوے۔" سیدہ جوش میں آ کر بولیں۔

"تیرا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔ پکا کوٹھا' پانچ سال کے دانے' گڑ' گھی ڈلوا دوں گی کپڑا لتا اتنا کہ تیری آل اولاد ایک پھاڑے ایک اتارے پھر بھی ختم نہ ہو گا۔" سیدہ ہونے والے بچے کے خیال سے ہی خوشی میں بولے جا رہی تھیں۔

"آمین جی ثم آمین! انشاء اللہ جی اللہ سوہنے کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بیٹا ہو گا جی اس بار شاہ جی کے گھر۔ میں تو سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے ایک ہی تسبیح کرتی ہوں کہ اللہ سائیں اس بار حویلی کے وارث کی شکل دکھا دے ہم سب کو۔ بادشاہوں جیسا نصیب لے کر پیدا ہو' زمینوں' حویلیوں میں اضافہ ہو۔ دھن دولت میں بڑھوتری ہو۔" دائی کے ہاتھوں میں طاقت بڑھ گئی تھی اور رفتار بھی۔ وہ بڑی لگن سے دبا رہی تھی۔

"انشاء اللہ' انشاء اللہ۔" سیدہ سرہلا کر بولیں۔

"ایک بات کہوں جی؟" چند منٹوں بعد دائی پھر سے بولی۔

"ہاں بولو۔" سیدہ نے پھر ٹانگ بدلی۔

"وہ جی میرے پتر کا سنگی دوست ہے طارق، شہر میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے بلکہ پڑھ لی ہے اس بار پنڈ آیا تو بڑی دیر ہمارے ویڑے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اس نے ایک بڑی عجیب بات کہی جی۔" دائی نے پاؤں کی انگلیاں آہستہ آہستہ دباتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" سیدہ نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"وہ کہہ رہا تھا جی، عجیب سی بات ہے پر یہ تو ہمارے بڑے سیانے بھی کہتے ہیں کہ رزق عورت سے اور اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے۔ پر کہہ رہا تھا سینس (سائنس) کہتی ہے کہ اگر مرد کے گھر لگاتار لڑکیاں ہوں تو ڈاکٹر اس کا کوئی علاج کرتے ہیں جس سے پھر لڑکے پیدا ہونے لگ جاتے ہیں اور۔۔۔"

"کیا بکواس کی تو نے۔" سیدہ نے ایکدم سے ٹانگیں کھینچیں۔

"دفع دور۔ حرامزادی کتیا۔ میری باوضو زبان کو پلید کیا تو نے مسٹنڈی تیرا مطلب ہے شاہ جی میں نقص ہے، خرابی ہے، علاج کرائیں اپنا۔ حرام خور! تیرا نہ علاج کراؤں میں۔ تیرا بھیجا نہ درست کراؤں میں تجھے الٹا لٹکا کر۔" سیدہ نے ہاتھوں اور لاتوں سے دائی کو پیٹنا شروع کر دیا۔

"نہیں سائیں۔۔۔ نہیں بیگم صیب میرا یہ مطبل (مطلب) نہیں جی۔۔۔" لاتیں گھونسے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔

"دفع دور ہو جا یہاں سے کُتیا۔ آئندہ میں تیری صورت نہ دیکھوں۔ اس حویلی کے ارد گرد ہزار کوس کے اندر۔ نہ تیری نہ تیری آل اولاد کی۔ دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔ بشیراں، فیضاں، رسولاں۔۔۔ کہاں مر گئیں ساری، دھکے دے کر نکالو اس حرام خور کو۔" سیدہ کی چیخ و پکار پر آناً فاناً ساری ملازمائیں اکٹھی ہو کر آ گئیں اور چند منٹوں میں روتی دھوتی معافی مانگتی دائی کو اٹھا کر حویلی سے باہر پھینک آئیں۔ سیدہ کا جلال بھرا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ ہاتھ دائی کو مار مار کر سرخ ہو چکے تھے اور ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

"نمک حرام، بے غیرت بکواس کرتی ہے آگے سے۔ شاہ جی اپنا علاج کرائیں۔ رسولاں ٹھنڈے جوس کا گلاس لے کر آ میرے لیے جلدی سے۔" سامنے سے آتی ملازمہ کو دھاڑ کر انہوں نے حکم دیا۔ وہ الٹے قدموں پلٹ گئی۔

"خیر تو ہے آپا! کس پر چلا رہی ہیں اس وقت؟۔" سلطان بخت اندر داخل ہوتے ہوئے۔ مسٹرڈ کلر کا سفاری سوٹ پہنے ہاتھ میں گولڈن کی چین گھماتے وہ کہیں جانے کو تیار دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کنپٹیوں پر سفید گرے بال مل جل کر ان کی میچورٹی کا اعلان کر رہے تھے۔ چہرے کا رنگ البتہ اسی طرح سرخ و سفید تھا۔ مضبوط توانا جسم کڑی کمان کی طرح تنا تھا۔ سیدہ نے دل ہی دل میں بھائی کی نظر اتاری۔

"میرے صحت مند شہزادے کو تو کسی کالی زبان والی کی، بدخواہ کی نظر نہ لگے۔ سات بیٹیوں کا منہ دیکھ کے خوشی دھن دولت اس کی چوکھٹ کی لونڈی رہے۔" وہ دل ہی دل میں بھائی کی بلائیں اتار رہی تھیں۔

"تھی اک نمک حرام۔ دفع کرو اس کے ذکر کو۔ تم کہیں جا رہے ہو؟" وہ اب خود پر قابو پا چکی تھیں۔ آرام سے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"بھول گئیں آپ، آج ہماری ملٹی نیشنل کمپنی کی سب برانچ کی افتتاحی تقریب ہے وہیں جا رہا ہوں۔ کل تک واپسی ہو گی۔ حسین شاہ تو آئیں گے نا ادھر، آپ نے تاکید کی تھی؟"

"ہاں کی تھی، دیکھو کہہ تو رہے تھے آگے ان کی مرضی۔ تم شام تک واپس نہیں آ سکتے؟۔"

"کیوں خیریت، کوئی کام ہے؟۔"

"کل بابا چراغ شاہ کے مزار پر چادر چڑھانی ہے۔ لنگر تو خیر ادھر ایک ماہ سے جاری ہے۔ حویلی کی طرف سے سو محتاجوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ کل حضرت پیر ولی کے سرکار بھی جانا ہے۔ انہوں نے آخری تعویز دینا ہے۔ اس کے بعد تو ضرورت نہیں جانے کی۔ بس پھر خوشی کی دیگیں چڑھانے ہی جائیں گے۔" وہ جلدی جلدی بتانے لگیں۔

"آپا! آپ خود ہی ہو آئیے گا میں رات کو جانے کب فارغ ہوتا ہوں۔ آج کل رات کا سفر یوں بھی خاصا ڈینجرس ہو چکا ہے۔ میں کل صبح ہی آ سکوں گا۔"

"کل صالحہ نے چیک اپ کے لیے بھی جانا ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔" ان کے چہرے کے تاثرات یکایک بدل گئے تھے پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔

"کل ڈاکٹر مکمل چیک اپ کے بعد ایکوریٹ ڈیٹ بتاوے گی۔ الٹرا ساؤنڈ بھی کرے گی اور دوسرے ایک دو ٹیسٹ بھی۔" سیدہ نے بھائی کی ناگواری کو محسوس کرنے کے باوجود بیان جاری رکھا۔

"کل اس سے معلوم کرتی جیے گا اس بار صالحہ بی بی کیا "گل" کھلانے والی ہیں۔" وہ طنز سے بولے۔

"اللہ کا نام لو سلطان شاہ! پچھلی بار تیسری بیٹی کی دفعہ "اتفاقاً" صالحہ کو پہلے علم ہو گیا تھا کہ بچی ہونے والی ہے تو دیکھا کیسا ڈیپریشن ہوا تھا اسے، مرتے مرتے بچی تھی۔"

"مری تو نہیں تھی نا۔" وہ تلخی سے بولے۔

"اور مریں گی بھی نہیں، بے فکر رہو تم۔ تمہارے سینے پر مونگ دلنے کو زندہ رہوں گی ہزار برس تک بلکہ اس سے بھی زیادہ۔" صالحہ جانے کب کمرے میں داخل ہوئی تھی اور سلطان بخت کا آخری جملہ سن کر تیزی سے دھاڑی۔

"اور تم مرنے والی ہو بھی نہیں۔ مر بھی جاؤ گی تو تمہاری منحوس روح میری زندگی کے پیچھے پڑی رہے گی۔ میں نے تو اب اس گھڑی کو بھی رونا چھوڑ دیا ہے جب تم میری زندگی کو عذاب بنانے چلی آئی تھیں۔" سلطان بخت نفرت بھرے لہجے میں بولے۔

"عذاب تو میں سہ رہی ہوں اس دوزخ میں آنے کے بعد۔"

"تم۔۔۔ تم عذاب سہہ نہیں رہی، عذاب پیدا کر رہی ہو۔ ہر سال ایک ننگی تلوار ایک بیٹی کی شکل میں، ایک عذاب کی صورت میں میری زندگی پر مسلط کر رہی ہو منحوس عورت۔" سلطان بخت غصے سے چلائے۔

"سن رہی ہیں آپ یہ ساری بکواس۔" صالحہ ہانپتے ہوئے چلائی۔

"سن رہی ہیں، دیکھ رہی ہیں اور بھگت رہی ہیں تمہاری صورت میں جیتا جاگتا عذاب کا تحفہ۔ چیخنے کی ضرورت نہیں۔" سلطان بخت نے دانت پیستے ہوئے باہر کا رخ کیا۔

"ہمت ہے تو یہاں کھڑے ہو کر مقابلہ کرو مجھ سے۔۔۔ میں بھگت رہی ہوں، جیتے جی برزخ میں جل رہی ہوں۔ پتا نہیں کب میرا چھٹکارا ہو گا اس سے۔" وہ لہرا کر گرنے کو تھی کہ سیدہ نے لپک کر اسے تھاما۔

"صالحہ! صالحہ! ہوش کرو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو، وہ تو بے وقوف ہے تم تو نادان نہیں۔۔۔ رسولاں! کہاں مر گئی جوس لے کر آ جلدی سے۔"

❊ ❊ ❊

"گریجویٹس نوجوان ٹرینڈ، ان ٹرینڈ لیڈی ٹیچرز کی فوری ضرورت ہے۔ ڈاکومنٹس ہمراہ لائیں، انٹرویو کل صبح نو بجے ہو گا، معقول تنخواہ اور الاؤنسز دیے جائیں گے۔"

"پڑھا تم نے؟۔" آمنہ نے اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے زینب سے پوچھا۔

"پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑی تم نے جو سنا دیا ہے۔"

"کیا خیال ہے پھر؟۔" آمنہ کچھ بے تابی سے بولی۔

"کس بارے میں؟۔"

"بھئی اپلائی کرنے کے بارے میں؟۔"

"تم نے پڑھا نہیں انہوں نے گریجویٹس ٹیچرز ڈیمانڈ کی ہیں۔"

"تو کیا میں گریجویٹ نہیں ہوں۔" آمنہ جلدی سے بولی۔ "اب تم کالج میں رہ جانے کے شوق میں پانچواں

سال بھی ادھر لگا رہی ہو تو میرا کیا قصور بالکل گھر کے پاس ہے اسکول۔ تمہارا اور جویریہ کا کالج بھی پاس ہے اگر مجھے ادھر جاب مل جائے تو بس۔" وہ جوش سے اسکول کی نئی خوبصورت عمارت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو بس۔" زینب نے اس کی نقل اتاری۔

"بابا صاحب کو پتا چل گیا تو وہ بھی تمہاری "بس" کردیں گے۔"

"کالج میں پڑھنے کی اجازت بھی تو انہوں نے دی تھی نا' اب میں چھ ماہ سے گھر میں فارغ بیٹھی کیا کمال کر رہی ہوں۔ گھر کے حالات دیکھے ہیں نا تم نے۔ بابا صاحب بے چارے کیا کریں' دو تین سال ان کی ریٹائرمنٹ میں رہ گئے ہیں پھر ہم کیا کریں گے۔" آمنہ نے ایک بار پھر مڑ کر اسکول کی عمارت کو دیکھا۔

"اس میں بھی زیادہ قصور بابا صاحب کا خود اپنا ہے۔ کیوں اس قدر ضدی ہیں وہ' دونوں بھائیوں کو نکال باہر کیا تو اب خود ہی ساری ذمہ داریاں بھگتیں گے نا' اس قدر بھی انسان کو انا پرست نہیں ہونا چاہیے۔" زینب نے اپنا موقف دہرایا۔

"تو ان دونوں نے کون سا پلٹ کر خبر لے لی۔ اگر بابا صاحب غصے میں آ کر انہیں برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال چکے ہیں تو وہ پلٹ کر معافی مانگ لیتے' دو چار بار معافی مانگ لیتے تو کیا بابا صاحب ان کو معاف نہ کر دیتے؟ کسی باپ کا دل اس قدر سخت نہیں ہوتا کہ اولاد کو یوں خود سے الگ کر پھینکے اور معافی مانگنے پر معاف بھی نہ کرے۔ ان دونوں کے دل تو بابا صاحب سے بھی سخت نکلے۔" آمنہ نے ہمیشہ کی طرح باپ کی طرف داری کی۔

"کسی باپ کا دل اس قدر سخت نہیں ہوتا مگر بابا صاحب کا تو ہے نا اور وہ دونوں بھی ان کے بیٹے ہیں۔ عبدالمتین کو کیسے انہوں نے نکالا۔ اماں جی اور ہمارے ہزار اصرار پر بھی کبھی دوبارہ پلٹ کر اس سے رابطہ نہیں کیا۔ جلیل نے بتایا نہیں کہ وہ شہر میں کیسی اعلا زندگی گزار رہے ہیں۔ کسی بہت بڑے آدمی کے داماد بن کر کروڑوں میں کھیل رہے ہیں اگر بابا صاحب اپنی انا کو اپنی ضد کو پس پشت ڈال کر ایک بار ان سے ملنے چلے جاتے تو کیا بھائی کا دل نرم نہ ہو جاتا۔" زینب تیزی سے بولی۔

"بھائی کو خود کون سا خیال آگیا۔ صرف بابا صاحب نہیں اماں جی بھی تو ہیں ہم تینوں بھی تو ہیں انہوں نے کسی کا بھی خیال نہ کیا اور وہ ان کا آخری خط یاد ہے نا تمہیں؟"

"کیسی فضول باتیں لکھی تھیں بابا صاحب کے بارے میں۔ ہمیں وہ پڑھ کر اس قدر غصہ آیا اگر بابا پڑھ لیتے تو نہ جانے ان کا کیا حال ہوتا۔"

"تمہیں خبر ہے کہ وہ دل میں پچھتاتے ہیں؟" آمنہ تنک کر بولی۔

"ارے آمنہ بی بی! میں اتنی بھی نا سمجھ نہیں ہوں مجھے معلوم ہے آج کل جو گھر کے حالات جا رہے ہیں بلکہ گزشتہ چار پانچ سالوں سے بابا صاحب دل ہی دل میں خوب پچھتا رہے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ اگر کر انہیں آج تک کچھ بھی نہیں ملا۔ جھک جائیں تو شاید بہت کچھ پالیں۔" وہ دونوں بے حد سست رفتاری سے گھر کی طرف جا رہی تھیں کالج میں کانووکیشن تھا آمنہ اپنی ڈگری لے کر آئی تھی اور زینب اس کے ساتھ گئی تھی۔

"ہاں چھ سال ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ گھر کے تنگ حالات نیچے ہی نیچے جا رہے ہیں اور کوئی حل نظر نہیں آ رہا جویریہ کے کالج کے اخراجات بھی شامل ہو گئے ہیں اگر عبدالمبین یوں چھپ چھپا کر ہماری مدد نہ کرتا تو شاید ہم دونوں پڑھ بھی نہ سکتے مگر گھر کے خرچ کے معاملے میں بابا صاحب کی کڑی نظر ہوتی ہے ہم عبدالمبین کے دیے ہوئے پیسے خرچ میں شامل نہیں کر سکتے۔ وہ اس کمائی کو حلال کب سمجھتے ہیں۔ اس کا ایک آنہ بھی خود پر حرام قرار دے رکھا ہے۔" آمنہ افسردگی سے بولی۔

"اتنے سال ہو گئے عبدالمبین چھپ چھپا کر آتا ہے۔ ایک دو بار بابا صاحب سے معافی بھی مانگی' انہوں نے اسے کون سا معاف کر دیا۔ آمنہ! میں اب تھکنے لگی ہوں۔" زینب ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"تو تیز چلو نا' تم ہی من من کے قدم اٹھا کر سست رفتاری سے چل رہی ہو۔ سر پر دھوپ چمک رہی ہے اور تم چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہو۔ تھکنا تو ہے۔" آمنہ تیزی سے بولی۔

"میں اس تھکن کی بات کب کر رہی ہوں۔" زینب کے قدم اور سست پڑ گئے۔

"تو پھر کون سی تھکن؟" آمنہ نے رک کر پوچھا۔

"ہماری زندگیاں تو لگتا ہے گندے جوہڑ کے رکے پانی کی سی ہو گئیں۔ ایک ہی جگہ' ایک ہی مقام پر جیسے ساکن ہو گئی ہیں۔ کہیں بھی کوئی تازگی' کوئی نیا پن نظر نہیں آتا اور نہ ان کٹھن حالات سے نجات کا کوئی حل' کوئی رستہ' آخر یہ بیکار سی تکلیف دہ زندگی ہم کب تک یونہی جیتے رہیں گے؟ ترس ترس کر دال روٹی کے چار نوالے ملتے ہیں اور تن ڈھانپنے کو جو کپڑے ہوتے ہیں۔ یقین مانو خود پر ترس آتا ہے۔ ہمارے تو چہروں سے بھوک اور مسکینی ٹپکتی ہے۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں صوفی عبدالرحمن کی بیٹی ہوں پھر بھی نہ جانے کیسے سارے کالج کو میرے پہلے قدم سے ہی پتا چل گیا تھا کہ میں ایک مولوی کی بیٹی ہوں' جس کی تنخواہ میں اس دوزخ جیسی زندگی کی سانسوں کا رشتہ بمشکل برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ تم نے دیکھا ان چار سالوں میں کسی بھی اچھی معقول لڑکی نے ہم سے دوستی کرنے کی کوشش بھی نہیں کی' نہ ہمارے قریب آنے کی جیسے ہمیں کوئی موذی روگ لگا ہو جو ہمارے قریب آنے سے ان کو بھی لگ جائے گا۔ آخر ہماری اس بے کار زندگی کا مصرف کیا ہے اور آخر کب تک ہم اسے یونہی جیتے چلے جائیں گے؟" زینب رو دینے کو تھی' اسے معلوم تھا کہ اب آمنہ ایک لمبا لیکچر جھاڑے گی' بہت سوں سے بہتر زندگی گزارنے پر مگر وہ تین منٹ گزر گئے' پختہ سڑک پر اس کے قدموں کی ہلکی چاپ تو سنائی دیتی رہی مگر آمنہ کچھ نہ بولی۔ زینب نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ آمنہ سپاٹ نظروں سے گھر کی طرف جاتی گلی کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

"میرے پاس اس کا کچھ جواب نہیں سوائے اس کے کہ تم اس زندگی' اپنی اس بیکار زندگی کے بارے میں جتنا زیادہ سوچو گی' اتنا ہی اسے گزارنا مشکل ہو جائے گا' آتی جاتی سانسوں کا بہاؤ رک جائے گا۔ اسے چپ چاپ اسی طرح جیتے جاؤ' اس کے متعلق سوچو نہیں' ورنہ پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ بہت جگہوں سے ضبط کے ٹانکے اکھڑ جائیں گے تو آنے والے سیلاب کو کون روکے گا۔" آمنہ جیسے خود سے بڑبڑا رہی تھی۔

"تم..... تم بھی مایوس ہو اندر سے؟" زینب نے گویا سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"میں کل ادھر اسکول میں انٹرویو دینے آؤں گی۔" آمنہ نے گلی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیسے' بابا صاحب اجازت دے دیں گے؟" زینب حیرت سے بولی۔

"ضرور دیں گے' بہتر ہے میں لوں گی اجازت۔ میں بھی کنویں میں رہ کر جیتے جی اپنے مرنے کا تماشا نہیں دیکھ سکتی' کسی کو تو اس کنویں کی منڈیر سے باہر جھانکنا ہو گا۔ کب تک ہم دونوں بھائیوں کے خیالات بدلنے کا انتظار کریں کہ وہ آئیں اور ہمارے ہاتھ پکڑ کر ہمیں اس اندھے کنویں سے باہر نکالیں۔ ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔ خود ہی۔" کہتے ہوئے آمنہ تیزی سے گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ زینب ابھی تک حیران تھی آمنہ کے خیالات سن کر۔ وہ بہت سست قدموں سے چل رہی تھی۔

"یہ ایک اچھی خوش آئند نشانی ہے کہ آمنہ بی بی کے خیالات بدل گئے ہیں۔ اب ضرور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔" خوشگوار جھونکے کی سرسراہٹ کا احساس اس کے اندر جاگا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آمنہ کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

• • •

"میرا ماسٹرز کا رزلٹ آگیا ہے۔" شہرینہ نے چھوٹتے ہی فون پر عبدالمبین سے کہا۔

"اچھا۔" عبدالمبین نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر جماہی روکی۔

"پوچھو گے نہیں کیا آیا ہے؟" وہ کچھ خفگی سے بولی۔

"مجھے معلوم ہے' تم بہت اچھے مارکس لے کر پاس ہوئی ہو گی اور میرے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دو گی۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"مگر تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا' اول تو فون تمہیں خود کرنا چاہیے تھا۔ میں تمہیں بتا چکی تھی کہ آج صبح میرا رزلٹ آؤٹ ہونے والا ہے۔ سارا دن' ساری شام میں نے تمہارے فون کا بے تابی سے انتظار کیا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے خود فون کیا۔" وہ گلہ کرتے ہوئے بولی۔

"شہو جان! تمہیں معلوم ہے میں آج کل کس قدر مصروف ہوں۔ اوہ گاڈ! آج کل میرے پاس سر کھجانے تو کیا کھانے پینے کی فرصت نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آئے ہیں ہزار انتظار کے بعد۔

چار سال کی دن رات محنت اور جُل خواری کے بعد اب جو میرا کچھ مقام بننے چلا ہے' لوگ مجھے پہچاننے لگے ہیں' میں زندگی کے کہکشاں بھرے آسمان پر میں ایک اسٹار بننے چلا ہوں تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو قربان کرنا پڑے گا۔ تمہیں خود بھی تو میرے کچھ بن جانے کا انتظار تھا' اب گلہ کیوں کرتی ہو؟۔"

عبدالمبین نے وضاحت پیش کی مگر لہجہ ابھی بھی کچھ بیزار سا تھا۔

"مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مجھے ہی فراموش کر ڈالو۔ آج کتنے دنوں بعد فون پر ہماری بات ہو رہی ہے تمہیں کچھ اندازہ ہے؟"

"پھر وہی گلہ' بھئی کہہ جو رہا ہوں کہ مصروفیت ہے آج کل۔ میری تین فلمیں اکٹھی آن ایئر آرہی ہیں' میرا دوسرا البم آرہا ہے۔ اگلے ماہ مارکیٹ میں اس کی افتتاحی تقریب ایک بڑے ہوٹل میں ہو گی بڑے پیمانے پر' یہ البم میرے کیریئر کا سنگ میل ہو گا۔ اس کے بعد ایک خوبصورت زندگی کو جاتی شاہراہ پر راستہ بالکل سیدھا اور صاف ہو گا پھر ہم دونوں کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا پھر یہ چھپ چھپ کر ملنے اور فون کرنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ بس ایک بار مجھے اپنا کچھ نام بنا لینے دو پھر میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا' تمہیں اٹھا کر لے آؤں گا۔ مجھ سے اب یہ دوری نہیں سہی جاتی اور یہ روکھی پھیکی ملاقاتیں' چھپ چھپ کر دور دور ملنا' آدھی راتوں کو بستر میں چھپا کر فون کرنا' کوئی آرہا ہے' کہہ کر نازک لمحوں میں فون بند کر دینا مجھ سے اب نہیں برداشت ہوتا۔" وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"ہمارے پاس اب شاید یہ چند ماہ ہی ہوں۔" شہرینہ اسی مدھم لہجے میں بولی۔

"اب کیا ہو گیا؟" وہ جیسے تنگ آکر بولا۔

"صالحہ بھابھی کے فارغ ہوتے ہی اس بار آپا مجھے شاید ایک ماہ کی بھی مہلت نہ دیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب بھی میں بتاؤں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"میں واقعی نہیں سمجھا۔" وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر بولا۔

"آپا نے بڑی مشکل سے میرے ماسٹرز کو ہضم کیا ہے۔ اب وہ میری شادی کے لیے ایک دن بھی نہ رکیں گی۔ بھابھی بیگم کے فارغ ہوتے ہی۔۔۔"

"تمہاری بھابھی بیگم فارغ ہوں گی تو تمہاری آپا جان کو سوگ یا خوشی منانے میں مہینے لگ جائیں گے۔ ویسے تو قرین از قیاس ہے' اس بار بھی وہ حویلی کی ایک اور وارثہ کو جنم دیں گی۔" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"خدا نہ کرے عبدالمبین! کم از کم تمہیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔" شہرینہ نے دہل کر کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ مجھے ہی یہ کہنا چاہیے بلکہ اس کے لیے باقاعدہ منت ماننی چاہیے۔"

"کیوں' تمہارا کیا مفاد ہے اس میں؟" وہ کچھ غصے سے بولی۔

"میرا مفاد تو اس میں ہے کہ شہرینہ بنت سبطین شاہ میری ہو جائے اور یہ دوریاں دور ہو جائیں اور مجھے حویلی سے کچھ غرض نہیں چاہے وہاں لڑکیوں کی قطاریں لگیں یا لڑکوں کی۔" وہ فوراً بات بدل کر بولا۔

"تم نے بتایا نہیں تمہارے مارکس کتنے آئے ہیں؟"

"تمہیں اس سے کیا۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"پھر وہی فضول کی خفگی۔ اچھا ملنے کب آرہی ہو۔ تمہاری کامیابی کی خوشی میں ٹریٹ تو بنتی ہے اور گفٹ بھی۔ اس بار ڈنر کسی اچھے سے ہوٹل میں نہ کریں؟۔" شہرینہ کو لگا' آج اس کا دماغ بہک گیا ہے۔

"نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو' میرا خیال ہے تمہیں نیند آرہی ہے۔ سو جاؤ جا کر۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"تمہاری آواز سن کر تو میری نیند اڑ جاتی ہے اور جو یہ بہکی بہکی باتیں ہیں' یہ تو پیار کا نشہ ہے۔" وہ لہجے کو مخمور بناتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے اب بس کرتے ہیں' کافی ٹائم ہو گیا ہے۔" شہرینہ اس کے انداز سے ڈر کر بولی۔

"تم فون بند نہیں کرو بلکہ میری بات غور سے سنو۔ میں ذرا پانی کا ایک گھونٹ بھر لوں۔" کہہ کر اس نے پاس پڑی بوتل کا کارک ہٹا کر منہ سے لگایا' دو تین لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور بوتل رکھ دی۔

یہ "تحفہ" اس نے "گل کدہ" سے حاصل کیا تھا' جہاں ہر دوسرے فنکشن میں اس کا کھلے عام استعمال ہوتا تھا اور زیور گل کا منہ بولا بیٹا ہونے کے ناتے وہ اس بلا سے کتنے دن بچ سکتا تھا اور اب تو خود بھی وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

"شہو ڈارلنگ! تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ' ان دو چار ماہ میں ہمارے خفیہ پیار کے رشتے کو نام ملنے والا ہے۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے' میں اب تم سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا۔ بس دو چار ضروری کام نبٹانے ہیں۔ ہم دونوں اب شادی کر لیں گے' تم میرے ساتھ آنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔"

"شادی' مگر کیسے۔۔۔؟" شہرینہ حیران رہ گئی۔

"جیسے سب کرتے ہیں۔ ہم کورٹ میرج کریں گے یا دو چار گواہوں کی موجودگی میں خفیہ نکاح' وہ بھی اس لیے کہ تم حویلی سے [illegible] ورنہ میں تو ڈنکے کی چوٹ پر بارات لانے کو تیار ہوں۔"

"نہیں' نہیں۔" شہرینہ کانپ گئی۔

"کیا نہیں نہیں۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟" وہ بگڑ کر بولا۔

"کیوں نہیں کرنا چاہتی مگر اس طرح۔۔۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اسی طرح ہو گی ڈیئر ہماری شادی' تم ذہن میں رکھو اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ اور اب تم مجھ سے دامن چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کر سکتیں کیونکہ میں تمہارے پیار کی دلدل میں گھٹنوں تک دھنس چکا ہوں۔ اب اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں؟۔"

"معلوم ہے مجھے۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ اسے عبدالمبین کے ان خطرناک ارادوں کا پہلے سے اندازہ نہیں تھا۔ اس کے جارحانہ عزائم بتاتے تھے کہ وہ اسے اغوا بھی کر سکتا تھا۔ وہ بری طرح سے ڈر گئی تھی۔

"تو پھر یہ ہچکچاہٹ کیوں؟۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے اس طرح۔"

"وہ تو تمہیں اول روز سے لگتا ہے۔ اب سب کچھ اسی طرح ہو گا جس طرح میں کہہ رہا ہوں۔" اسی وقت اس کے پاس پڑے ٹیلی فون سیٹ کی بیل بج اٹھی۔ اس نے گردن گھما کر سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔ نین تارا کا فون تھا۔

"اسے بھی یہی وقت ملا تھا فون کرنے کو۔ اب ایک گھنٹہ اس کے ساتھ عشق بگھارو۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

"اوکے ڈارلنگ! باہر ڈور بیل بج رہی ہے۔ میں ذرا دیکھوں باہر کون ہے۔ کل فون کر کے ملنے کی ڈیٹ اور جگہ بتاؤں گا' اوکے بائے۔" اس نے شہرینہ کو اگلی بات کا موقع دیے بغیر موبائل آف کر دیا۔ اسے معلوم تھا شہرینہ ایک بار پھر کال کرے گی' اسی لیے اس نے موبائل آف کر دیا اور فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

* * *

”لیجئے ام جان! سنبھالیے اپنے اس شیطان کو۔ ایڈمیشن کروا آیا ہوں میں اس کا پلے گروپ میں۔ یہ حضرت تو ابھی سے اسکول میں بیٹھنے کو تیار تھے۔ زبردستی لے کر آیا ہوں۔ دو تین بچوں سے پکی دوستی بھی گانٹھ آئے ہیں۔ ایک کیوٹ سی بے بی تو کلاس روم کے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی انہیں۔ یہ ابھی سے اتنے سوشل ہیں تو بڑے ہو کر کیا عالم ہو گا ان کی شہرت کا۔“ معاذ نے خوبصورت، صحت مند، سرخ و سفید رنگت اور شرارتی آنکھوں والے چار سالہ ارتضیٰ کو مسز خان کی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ مسز خان نے چٹاچٹ تین چار بار ارتضیٰ کا منہ اور ماتھا چوم ڈالا۔

”میرا بیٹا ہے ہی اتنا پیارا اور اٹریکٹو بھی کہ جو کوئی دیکھتا ہے، خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اس میں میرے جگنو کا کیا قصور۔“ مسز خان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بچے کو اپنی آنکھوں کے رستے دل میں چھپا لیں۔

”بالکل دادو! ہم ہیں ہی اتنے پیارے، بیوٹی فل اور.....“ وہ سوچنے لگا۔ ”سمارٹ کہ سب ہم سے پیار کرتے ہیں۔“ وہ مسز خان کی گود میں اور پھیل کر بیٹھ گیا۔

”پرنسپل صاحب تو مان نہیں رہی تھیں کہ یہ تین سال کے ہیں۔ وہ تو میں نے زبردستی یقین دلایا اور پر سے یہ خود بار بار کہے جائیں، ہم چار سال کے ہیں، ہم چار سال کے ہیں۔ آپ بھول رہے ہیں معاذ بابا۔“ معاذ نے بتایا۔

”زیتون بی! ہمیں بھوک لگی ہے، جلدی سے کچھ لاؤ۔“ ارتضیٰ نے کہا۔

”کیوں؟ معاذ نے تمہیں رستے میں کچھ نہیں کھلایا۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ معصوم شکل بنا کر بولا۔

”ارتضیٰ کے بچے! پوچھو گے مجھ سے۔ ایک جوس کاٹن، چپس کے دو پیکٹ اور ایک چاکلیٹ اور واپسی پر آئس کریم کس نے ٹھونسی تھی۔“

”آپ نے میں نے تو صرف چکھی تھی۔“ وہ چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور زیتون بانو کو کھینچنے لگا۔

”زیتون بی! اٹھو۔ فرج کی، کچن کی تلاشی لو، مجھے بھوک لگی ہے۔“

”میاں! تلاشی تو آپ پہلے لے چکے ہوں گے۔ کچھ نہیں ملا ہو گا تو میرا خیال آیا ہو گا۔ کتنا اچھا دن ہے۔ آج ہمارے ارتضیٰ میاں اسکول میں داخل ہو گئے، اسی خوشی میں اٹھ جاتی ہوں۔ آج ان کے والدین.....“

”زیتون بانو! ارتضیٰ جو کہہ رہا ہے، اسے بنا دو۔“ مسز خان فوراً سخت لہجے میں بولیں تو زیتون بانو جلدی سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ارتضیٰ کے پیچھے باہر نکل گئی۔

”تمہارا ہاؤس جاب کب سے شروع ہو رہا ہے؟“ مسز خان معاذ سے بولیں۔

”اگلے ماہ۔“ وہ کرسی پر ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہاؤس جاب مکمل ہو جائے تو میں تمہیں کلینک سیٹ کروا کے دوں گی، بڑا عالیشان قسم کا۔ میری بڑی تمنا تھی کہ میرا کوئی بیٹا ڈاکٹر بنے۔ ایاز اور اظہر کا ذہن اعلا تعلیم کی طرف ویسے ہی نہیں تھا۔ دونوں بزنس کی طرف نکل گئے۔ شہباز کو ویسے ہی آرمی کا جنون تھا، سو میرا خواب تشنہ ہی رہ گیا۔ دیکھو لو، قدرت نے تمہاری شکل میں وہ بھی پورا کر دیا۔“

”آپ لکی ہیں ام جان! جو قدرت نے آپ کا کوئی بھی خواب تشنہ نہیں رہنے دیا۔“ وہ جوتے اتارنے کو جھکا۔

”تم بھی ایسا سمجھتے ہو؟“ وہ ایکدم سے دکھی ہو کر بولیں۔

”سوری ام جان! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اسے ایکدم سے احساس ہوا تو فوراً سیدھا ہو کر بولا۔

”کوئی بات نہیں، مجھے معلوم ہے، تم اب فارغ ہو؟“

”جی، کوئی کام ہے؟“

”ہاں ہے تو سہی اگر تم کر دو گے۔“

”آپ کہیں اور میں انکار کروں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”جیتے رہو، تمہاری فرمانبرداری دیکھتی ہوں تو جیسے بہت سے زخموں کو مرہم مل جاتا ہے۔ ذرا یونیورسٹی تک جانا ہے۔“

”وہ کیوں؟“ وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

”مشی کو لے کر آنا ہے۔ اس کی گاڑی آج خراب ہو گئی تھی، صبح اظہر اسے ڈراپ کر آیا تھا۔ ابھی ابھی اس کا فون آیا ہے۔ گھر میں کوئی اور تو ہے نہیں، میں نے اس سے کہہ دیا کہ آدھے گھنٹے تک تم اسے پک کرنے آ رہے ہو۔“

”ام جان!“ وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ ”آپ کو معلوم ہے، مجھے یہ سب.....“ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

”معلوم ہے مجھے، پر بیٹا! اب مجبوری ہے۔ جاؤ، بچی انتظار کر رہی ہو گی۔ پتا نہیں کیسے آئے گی۔ تم سے تو بہت محبت سے پیش آتی ہے، اپنے والدین کے برعکس۔“

”معلوم ہے مجھے۔“ وہ ترشی سے بولا۔

”اچھا اب جاؤ، اس کا فون آئے بھی آدھا گھنٹہ ہو چلا ہے۔ انتظار کر رہی ہو گی۔“ مسز خان کے کہنے پر وہ دل میں کڑھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اظہر بھائی کی یہ صاحبزادی سب سے زیادہ اس پر فریفتہ تھی۔ معاذ کے خشک اور اجنبی رویے کے باوجود وہ معاذ کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مشی کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی رنگت اور چال کی روانی میں اس طرح نمایاں فرق آ جاتا کہ ایک اجنبی کو بھی اس تبدیلی کا فوراً علم ہو جاتا۔ مسز خان اس کی دیوانگی سے آگاہ تھیں اور انہیں بظاہر کچھ اعتراض بھی نہیں تھا مگر معاذ اس سے بے حد چڑتا تھا۔

”آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا اس [illegible] کے معصوم دل کی خوشی کو۔“ مسز خان سوچتیں۔

”[illegible]“ [illegible] توقع اسے گیٹ کے پاس ہی کھڑی مل گئی۔ اپنی دوستوں کو ہاتھ ہلاتی وہ گاڑی کے پاس آ رکی۔

معاذ نے کوئی جواب نہیں دیا، ہاتھ بڑھا کر [illegible] دروازے کا لاک کھول دیا۔

”تمہیں میرا ڈرائیور بننے کا بہت شوق ہے۔“ اس نے فرنٹ ڈور کھولا اور بیٹھ گئی۔ ”مگر مجھے تمہارے ساتھ بیٹھنے کا شوق ہے، گریز ہے بلکہ میرا خواب ہے تمہارے ساتھ زندگی کے لمبے سفر میں ساتھ ساتھ رہنے کا۔“ وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے بڑے [illegible] سے بولی۔

”تم نے ام جان سے جھوٹ کیوں بولا؟“ معاذ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کچھ خفگی سے کہا۔

”کون سا جھوٹ؟“ وہ اپنے ہینڈ بیگ سے ہیئر برش نکال کر آہستہ آہستہ اپنے بالوں میں چلانے لگی۔

”تمہاری گاڑی خراب ہے جبکہ صبح میں نے خود تمہیں گاڑی ڈرائیو کرتے یونیورسٹی جاتے دیکھا تھا۔“ معاذ نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے گھورا۔

”بڑی نگرانی کرتے ہو چھپ چھپ کر۔ سامنے آ کر جو اس قدر ہماری خبر رکھو تو شاید ہم خوشی سے مر ہی جائیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”تم یہ فضول قلمی ڈائیلاگ بولنا بند کرو اور میری بات کا جواب دو۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”یار! خوامخواہ تپ نہ جایا کرو۔ ویسے میری گاڑی صبح ہی سے نخرے دکھا رہی تھی۔ ابھی ایک دوست کو ضرورت تھی، اس نے کہا۔ میں گاڑی کا مکمل چیک اپ بھی کروا دوں گا اور صبح واپس بھی کر دوں گا اور میں نے بھی سوچا اتنے سہانے موسم میں اکیلے اتنی بڑی گاڑی، بڑی بڑی ویران تنہا سڑکوں پر ڈرائیو کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کوئی ہینڈسم سا ہم سفر ہونا چاہیے پھریوں لگے۔ ”ہم چلے تو ہمارے سنگ سنگ یہ نظارے چلیں۔“

”اور تمہارے پاپا کو تمہارے اس ون وے رومانس کی خبر ہو جائے تو.....“ معاذ نے اسے ڈرایا۔

”تو میری جان!“ وہ اس کی طرف جھکی۔ ”فکر تم کرو، پاپا کی میں جان ہوں۔ پاپا میرے ون وے رومانس کو دو طرفہ

بنادیں گے ہر صورت' ہر حال میں۔ تم اگر میرے روحانوی اثرات سے بچنا چاہتے ہو تو دعا کرو میرے پاپا بے خبر رہیں' ورنہ تمہاری خیر نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تم بہت ڈھیٹ ہو۔" معاذ نے دانت کچکچا کر کہا۔

❁ ❁ ❁

"آپ ڈاکٹر کو چیک کروا ہی آتے تو اچھا تھا۔ اتنی لمبی رات پڑی ہے' خدانخواستہ اگر درد بڑھ گیا تو..." اماں جی نے آہستہ آہستہ صوفی صاحب کا سینہ مسلتے ہوئے کہا۔

"درد بڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جان سے چلا جاؤں گا۔" صوفی صاحب اپنے چہرے سے تکلیف کے اثرات کم کرتے ہوئے بڑی مشکل سے مسکرائے۔

"اللہ نہ کرے بابا صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" آمنہ نے دہل کر کہا۔ وہ ان کے بازو دبا رہی تھی' زینب ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی اور جویریہ سرہانے کی طرف چھوٹی میز پر بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی۔

صوفی صاحب کی طبیعت دوپہر سے خراب تھی۔ جب سے وہ عبدالمتین کی طرف سے ہو کر آئے تھے' ان کے سینے کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ سہ پہر تک وہ ضبط کرتے رہے اور مغرب پڑھ کر جو اوپر آئے تو پھر عشاء کے لیے نیچے مسجد بھی نہ جا سکے۔ ان کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا' سینے میں درد تھا تو دل میں درد کا طوفان' مگر وہ اس طوفان سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

"بابا صاحب! جلیل سے کہہ کر ڈاکٹر کو ادھر بلوالیں۔" زینب نے آہستگی سے کہا۔

"ڈاکٹر کیا کرے گا زینب بیٹا! دوا میں نے کھالی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی وہی دینی تھی۔ اب آہستہ آہستہ ہی آرام آئے گا نا۔ تم لوگ سو جاؤ جا کر' رات کافی ہو گئی ہے۔ میں بھی سو جاؤں گا۔ دوا میں نیند بھی تو ہوتی ہے۔"

وہ بہت نرم لہجے میں بات کر رہے تھے۔ پتا نہیں وقت نے یہ نرمی ان کے لہجے میں بولی تھی یا اپنی بے بسی کے احساس نے۔ وہ اب تینوں بیٹیوں سے بھی بہت نرمی سے بات کرتے تھے' البتہ دونوں بیٹوں کے نام لینے کے بھی روادار نہیں تھے۔

"جب تک آپ نہیں سوئیں گے' ہمیں نیند نہیں آئے گی۔" جویریہ نے آہستگی سے کہا۔ "آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"جویریہ! تم جا کر سو جاؤ' صبح تمہیں کالج بھی جانا ہے۔" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولے۔

"بابا صاحب! اب آپ ٹھیک ہیں نا' طبیعت کچھ بہتر ہوئی؟" آمنہ بولی۔

"ہاں بچے! اللہ کا شکر ہے' کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" وہ محبت سے اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"بابا صاحب! آپ سے ایک بات کہنی تھی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

زینب نے بے اختیار آمنہ کی طرف دیکھا۔ اشارے سے اسے بات کرنے سے منع کیا کہ ابھی موقع نہیں ہے۔ صبح انٹرویو تھا اور آمنہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے زینب کی تنبیہہ کو نظر انداز کر کے نظریں صوفی صاحب پر جما دیں۔

"تم نے اس وقت کیا کہنا ہے؟" اماں جی ناگواری سے بولیں۔

"بابا صاحب! آپ سے ایک اجازت لینا تھی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"بولو' جویریہ بیٹا! یہ سامنے کی کھڑکی کھول دو۔ تازہ ہوا آئے گی۔" ان کے کہنے پر جویریہ نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور یونہی غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر سنسان گلی کو اس نے ایک نظر دیکھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا' وہ تیزی سے آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور صوفی صاحب کا سر دبانے لگی مگر اب اس کے ہاتھوں میں پہلے جیسا دم نہیں تھا' انگلیاں بھی آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی تھیں۔

"بابا صاحب! ہمارے کالج کے سامنے ایک مڈل اسکول کھلا ہے' وہاں لیڈی ٹیچرز کی ضرورت ہے' بچوں کے

لیے گریجویٹ ٹیچرز۔ صبح انٹرویو ہے' معقول تنخواہ ہے اور گھر سے زیادہ دور بھی نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو..." آمنہ نے ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کر دی۔

"آمنہ!" صوفی صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بابا صاحب پلیز... آخر میں نے اتنا پڑھا ہے' گھر بیٹھ کر کیا کروں گی۔ میری تعلیم کسی کے کام آئے گی' خود ہمارے اپنے بھی۔ میں اس تعلیم کو سینے میں سمیٹ کر بیٹھی رہوں اور وہیں دفن کر دوں تو اس کا کیا فائدہ ہوگا"

"آمنہ! بحث نہیں کرواپنے بابا صاحب سے۔ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔" اماں جی نے اسے ٹوکا۔

"ٹھیک ہے' تم جو اچھا سمجھو۔ اگر تمہیں اس اسکول کا ماحول اچھا لگے۔ ویسے میں خود بھی صبح پتا کروں گا' پھر تمہیں بتاؤں گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"پر بابا صاحب! انٹرویو تو صبح ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"انٹرویو تم دے آنا اور..." اسی وقت پتھر میں لپٹی کاغذ کی ایک گولی کھلی کھڑکی سے آ کر صوفی صاحب کے سینے پر گری۔

اس سے پہلے کہ اسے کوئی اور ہاتھ بڑھا کر اٹھاتا' صوفی صاحب نے فوراً اس چھوٹے سے پتھر کو مٹھی میں لے لیا۔ جویریہ کی تو پورے جسم سے جیسے جان نکل گئی۔ صوفی صاحب جلدی سے اٹھے اور پتھر کے گرد لپٹا کاغذ کھول کر پڑھنے لگے۔

"جوئی! آج اتنے دن ہو گئے تمہاری صورت دیکھے۔ پلیز چند منٹ کے لیے کھڑکی میں آؤ' میں منتظر کھڑا ہوں۔" دو لائنیں کسی نے جلدی سے کاغذ پر گھسیٹی تھیں۔

صوفی صاحب جھٹ کر اٹھے اور کھلی کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ نیچے گلی میں کھڑکی کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی صوفی صاحب کو لگا ان کا ہارٹ فیل ہونے لگا ہے۔ ان کے جسم میں خون کی جگہ جیسے آگ کے شرارے دوڑنے لگے۔

انہوں نے جلدی سے کھڑکی کی چوکھٹ کو تھاما اور دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور مڑ کر جویریہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جویریہ کا جسم سوکھے پتے کی طرح کپکپا رہا تھا۔ صوفی صاحب مڑے اور اس کی طرف بڑھے۔

اماں جی' زینب اور آمنہ کو لگا' وہ آج جویریہ کو مار ہی ڈالیں گے۔ سب کی سانسیں رکنے لگیں۔

● ● ● ● ● ● ●

"حد ہو گئی' بابا صاحب نے بھی جیسے قسم کھا رکھی ہے کہ اس گھر میں اپنے سوا اور کسی مرد کو رہنے نہیں دینا۔" زینب بے حد اکتا کر بولی "بے چارہ جلیل چہ چہ۔"

اس نے سر جھکائے آٹا گوندھتی جویریہ کو افسوس بھری نظروں سے دیکھ کر تو سی بھری' جویریہ نے ایک پل کو سر اٹھا کر ایک غصیلی نگاہ بہن پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

"بابا صاحب نے ویسے زیادتی کی ہے۔" آمنہ نے آہستگی سے کہا۔ "وہ تو اس قدر اچھا تھا' ہم سب کے کام آنے والا اور..."

"ہم سے بے حد محبت کرنے والا بھی تو... کہ ہمیں دیکھے بغیر رہ نہیں سکتا تھا' ہم نظر نہ آتے تو اس کی آنکھیں دکھنے لگتی تھیں۔ دل میں درد سا اٹھنے لگتا تھا۔" زینب جان بوجھ کر "ہم" پر خوب زور دے رہی تھی' آواز بلند تھی اور "ہم" سراسر تمسخرانہ اور مخاطب بھی جویریہ تھی۔

"اچھا خاصا تماشا ہو گیا پرسوں رات کو۔" آمنہ نے شاید زینب کے جملوں اور ان میں چھپے طنز پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اسے پرسوں رات کا منظر یاد آ رہا تھا۔ کس طرح بابا صاحب کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ نیچے جانے سے پہلے انہوں نے جویریہ کو زوردار دھکا دیا تھا۔ وہ دیوار سے بری طرح سے ٹکرائی تھی اور بابا صاحب کسی جوان لڑکے

کی طرح سیڑھیاں پھلانگتے نیچے اتر گئے تھے اور نیچے گلی میں کھڑکی کی طرف دیکھتے جلیل کو پیچھے سے جا دبوچا تھا پھر بابا صاحب کو خود پر جیسے قابو نہ رہا تھا ہاتھوں اور پیروں کے ساتھ ان کی زبان بھی جیسے بارود کے گولے برسا رہی تھی چنگھاڑتا ہوا انداز پل بھر میں سارے محلے کو جگا گیا تھا لوگ دروازے کھول کھول کر باہر نکل آئے تھے ویسے بھی ابھی کون سی رات گہری ہوئی تھی اور صوفی صاحب تو لگتا تھا اسے مار کر ہی دم لیں گے۔

"آخر ہوا کیا؟ اس نے کیا کیا ہے۔ صوفی صاحب! کچھ بتائیں تو سہی کیا اسے جان سے مار ڈالیں گے۔" ہر کوئی انہیں روکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں' میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ زندہ دفن کروں گا اس آستین کے سانپ کو اس حرام خور کو۔ ارے بلی بھی سات گھر چھوڑ کر حملہ کرتی ہے تو اس قدر احسان فراموش نکلا' ایسا مردار۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور اسے مارتے مارتے وہ ہانپنے لگے تھے سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور سینے میں ہونے والا ہلکا ہلکا درد اب تیز ہو رہا تھا مگر انہیں اس کی کچھ پروا نہیں تھی نہ تو ان کے ہاتھ رک رہے تھے نہ زبان۔

"خدا کے لیے صوفی صاحب! کچھ تو ہاتھ ہولا رکھیں' کیا جان سے مار دیں گے اس غریب کو سامنے والے خان صاحب نے صوفی صاحب کو قابو کرنا چاہا مگر صوفی صاحب کے اندر تو جیسے کوئی جن سما گیا تھا کسی طور قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

"میں جان سے مار ڈالوں گا۔ اس نمک حرام کو۔ یہ صلہ دیا اس نے میری بے غرض محبت کا' نیک تربیت کا۔ میں اس کو کیا سمجھتا رہا اور یہ کیا نکلا سنپولیا۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا چھوڑ دو مجھے۔" جس کے منہ سے واقعی خون نکل رہا تھا اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

"آخر اس نے کیا کیا ہے کچھ پتا بھی تو چلے۔ جلیل! تم ہی بتاؤ آخر صوفی صاحب کے اس درجہ جلال کی وجہ کیا ہے۔ ایسا کیا کر دیا تم نے ان کے ساتھ۔" ایک شخص تنگ آ کر بولا۔

"یہ کیا بولے گا' کیا بتائے گا بے شرم' اپنے منہ سے اپنی نمک حرامی کی داستان کوئی بے حیا ہی سنا سکتا ہے۔" انہوں نے زوردار لات سے اسے دھکا دیا تھا۔

"میں نے چوری کی ہے جی! ان کی ڈاکا ڈالا ہے اور مجھ سے بڑا بے غیرت بھی کوئی نہیں۔"

جلیل نے بمشکل جواب دیا تھا۔ اس کے جواب پر صوفی صاحب کے ہاتھ جیسے ڈھیلے پڑ گئے۔ پورا جسم ہی جیسے لٹک گیا انہوں نے ایک بے جان سا تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

"چوری کی ہے؟ کیا چرایا ہے بولو؟" شیخ صاحب نے غصے میں اس کا گریبان نوچا۔

"بتا نہیں سکتا۔" وہ آہستگی سے بڑبڑایا۔ "بس آپ میری ان سے سفارش کر دیں یہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کریں۔" وہ جیسے منت کرتے ہوئے بولا۔

"پولیس کے حوالے' میں اسے زندہ چھوڑوں گا تو یہ پولیس کا نام لے گا۔" وہ پھر جوش و خروش سے اس کی طرف بڑھے تو محلے والوں نے بڑی مشکل سے جلیل کو ان سے چھڑا لیا انہوں نے اسی وقت اسے نکال دیا تھا وہ جاتے وقت اپنا ایک جوڑا اور چند کتابیں لے گیا۔

"صوفی صاحب! ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں مگر آپ مجھے غلط سمجھے۔" جاتے جاتے وہ رک کر بولا اور اگلے ہی لمحے رات کے اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

"ویسے آمنہ کیسی عجیب سی بات ہوئی ہے۔ ہے نا' ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔" زینب کی آواز پر وہ چونکی۔

"کون سی بات؟"

"یہ گھریلو لوا فیئر۔" وہ آہستگی سے بولی' آمنہ نے اسے گھور کے دیکھا۔

"ہاں ہوئی تو عجیب سی مگر جلیل اچھا لڑکا تھا۔ شروع سے ساتھ رہ رہا تھا' سب کام کرتا تھا۔ محنتی بھی بہت تھا۔

دیکھا نہیں اس نے سب امتحانوں میں ہم سب سے اچھے مارکس لیے تھے۔ گریجویشن میں بھی مجھ سے زیادہ ہمیشہ فرسٹ ڈویژن آئی تھی اس کی۔ اس کے رزلٹ پر تو عبدالمتین کی یاد آئی تھی۔ بھائی کی طرح اعلا پوزیشن آتی تھی اس کی' اب تو وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا' مقابلے کے امتحان کی' ساری ساری رات پڑھتا تھا۔" آمنہ کو صحیح معنوں میں جلیل کے جانے اور اس طرح بے عزت ہو کر جانے کا بہت دکھ ہوا تھا۔

"مقابلے کے امتحان کی تو وہ واقعی تیاری کر رہا تھا' وہ بھی راتیں جاگ جاگ کر۔"

مگر مقابلہ کر نہیں سکا۔ وہ بھول گیا تھا' جتنی مرضی تیاری کر لے بابا صاحب سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔" زینب نے پھر طنز کیا۔ جویریہ نے آٹا گوندھ لیا تھا اور اب پرات پرے دھکیل کر ہاتھ دھو رہی تھی۔ سر اسی طرح جھکا ہوا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ وہ بابا صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔۔۔"

"عزت کرتا تھا جب ہی تو ان کے برابر آنا چاہتا تھا' ویسے آمنہ! یہ جویریہ کس قدر گھنی نکلی۔ ہماری ناک کے نیچے کھیل ہوتا رہا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی اور ہم اتنے بدھو کے بدھو رہے مگر بالکل اناڑی۔"

"چھوٹی آپی! میں آپ کے منہ نہیں لگنا چاہتی بہتر ہے کہ آپ مجھ سے بات نہ کریں۔" جویریہ جیسے پھٹ پڑی' اور روتے ہوئے اندر کمرے میں بھاگ گئی۔

"ہاں' تمہارا منہ جو بہت سوہنا ہے' کسی اور کے منہ جو لگنا چاہتی تھی۔ اچھا منہ کے بل گری ہو۔" زینب نے بلند آواز میں جویریہ کو سنایا۔

"ہاں سنا ہے محبت کرتے ہوئے کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہ نشہ ہی ایسا ہے کہ کچھ سجھائی دیتا ہے نہ سنائی دیتا ہے تو پتا کیا چلنا تھا۔ یہ تو دوسروں کو پتا چلتا ہے بھلا عشق اور مشک کب چھپتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"تم بہت خبیث ہو۔" آمنہ نے دانت کچکچائے اور اٹھ کر جانے لگی۔

"رکو تو میری بات سنو۔" زینب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اب کیا ہے؟" آمنہ جھلا کر بولی۔

"مجھے بازار جانا ہے ایک بک خریدنے۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ بابا صاحب کو پتا چل گیا تو۔ ابھی پرسوں والا قصہ گرم ہے' تمہیں بازار جانے کی سوجھ رہی ہے۔" آمنہ نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"ایسے واقعات تو ہمارے گھر کا معمول بن چکے ہیں۔ پہلے عبدالمتین کے ساتھ پھر عبدالمبین کے ساتھ اور اب جلیل کے ساتھ۔" زینب منہ بنا کے بولی "مجھے بی ایس ایلیٹ کی ایک ریفرنس بک لینی ہے۔ بابا صاحب تو بچوں کو پڑھانے گئے ہوئے ہیں ڈیڑھ دو گھنٹے تک آئیں گے۔ چلو نا' اماں جی سے پوچھ لیتے ہیں۔" زینب جیسے سب کچھ سوچ چکی تھی۔

"تمہیں بی ایس ایلیٹ کی بک کیا کرنی ہے۔ تمہارے پاس کوئی لٹریچر ہے؟"

"میری دوست ہے ناز' اس کو چاہیے۔"

"کیوں وہ خود نہیں جا سکتی بازار؟" آمنہ نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"اس کی کزن کی شادی ہے بلکہ آج بارات ہے۔ صبح اسے یہ کتاب ضروری چاہیے اس نے بہت منت کی تھی اور پیسے بھی دے رکھے ہیں پلیز چلو نا۔" زینب منت پر اتر آئی۔

"زینب! یہ اچھی بات نہیں۔ بابا صاحب پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہیں۔ انہوں نے تمہیں بھی لاسٹ وارننگ دے دی ہے۔ چھ ماہ بعد تمہارے فائنل ایگزام ہیں اگر تم اس بار بھی کامیاب نہ ہوئیں تو گھر بیٹھو گی جویریہ کے ساتھ' اور تمہیں اوٹ پٹانگ حرکتیں سوجھ رہی ہیں۔"

"بس آج چلی چلو آمنہ! آئندہ نہیں کہوں گی ذرا اماں جی سے پوچھ کر آتی ہوں تم چادریں نکالو۔" وہ جھٹ پٹ

اٹھ کر اندر بھاگی اماں جی سے اجازت لینے تو آمنہ گہرا سانس لے کر چادریں لینے کے لئے کمرے میں آ گئی اسے معلوم تھا وہ اماں جی سے اجازت لے کر ہی آئے گی، جویریہ اندر پلنگ پر منہ تک چادر اوڑھے شاید سو رہی تھی۔

"جویریہ! سو گئی ہو؟" آمنہ نے چادریں نکالتے ہوئے پوچھا۔ جویریہ نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر باہر آ گئی۔

"چلو، بڑی مشکل سے اماں جی کو منایا ہے۔ انہیں بھی جلیل کے جانے کا صدمہ جویریہ ہی کی طرح لگا ہے۔ پرسوں سے گم صم سی پڑی ہیں۔ چلو اب دیر نہ کرو بابا صاحب کے آنے سے پہلے آ جائیں گے۔" زینب نے جلدی جلدی چادر اوڑھ کر نقاب چہرے پر اچھی طرح کیا اور دونوں سیڑھیاں اتر گئیں۔

"ہم جا رہے ہیں اماں جی!" آمنہ نے سیڑھیاں اترنے سے پہلے آواز لگائی۔

بازار میں کچھ خاص رش نہیں تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ کتابوں کی دکان تقریباً خالی تھی، ایک دو کسٹمر کتابیں دیکھ رہے تھے زینب نے سیلز مین کو کتاب کا نام بتایا۔ وہ کتاب لینے گیا

"چلو آمنہ! آ جاؤ لے لی ہے میں نے کتاب۔" زینب اسے آواز دے کر باہر نکل آئی۔ کتاب دکاندار نے کسی اور دکان سے منگوا کر دی تھی، اسی میں پندرہ منٹ لگ گئے تھے اب زینب کو کچھ کچھ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"گھر پہنچنے تک اگر بابا صاحب آ گئے تو؟" اس نے لرز کر سوچا تھا۔ اسی تیزی میں وہ دکان سے نکلی تھی اور دکان کی آخری سیڑھی پر کسی سے بری طرح سے ٹکرا گئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا کتاب کا شاپر نیچے گر پڑا تھا اور اس کے کندھے سے ٹکرانے والا کسی کا توانا کندھا اسے پوری طرح سے ہلا گیا تھا "ہائے" کی آواز کے ساتھ وہ بمشکل گرتے گرتے بچی تھی۔

"سوری۔ چوٹ تو نہیں لگی آپ کو؟" وہ نوجوان ذرا سا نیچے جھکا، اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا تو اس کے ہاتھ سے الجھ کر زینب کا ڈھیلا ہو جانے والا نقاب چہرے سے سرک گیا۔ اٹھانے والے کے ہاتھ اور آنکھیں جیسے ساکت ہو گئیں۔

"اوہ۔" اس کے ہونٹوں نے جیسے سرگوشی کی، زینب بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ خوبصورت، اونچا لمبا، پرکشش نقوش اور براؤن آنکھیں اور آنکھوں میں بے تحاشا چمک۔ زینب چند لمحوں سے زیادہ نہ دیکھ سکی۔

"آپ کو کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ آپ کس قدر خوبصورت ہیں اور اس ہوشربا حسن کو نقاب میں چھپا کر رکھتی ہیں تو اچھا کرتی ہیں ورنہ آپ کا یہ حسین چہرہ ساری کائنات کو ساکت کر دے بالکل ساکت، جیسے مجھے کر دیا۔" وہ بہت آہستگی سے بولا تھا۔ زینب اپنا کندھا اس سے چھڑا کر نقاب درست کرنے لگی۔

"چلو نا۔" آمنہ نے پیچھے سے آ کر زینب سے کہا تو وہ جیسے ہوش میں آ کر سیڑھیاں اترنے لگی

"مس! یہ آپ کا شاپر۔" اس نے شاپر آمنہ کو تھمایا جو اس نے کچھ حیرت سے تھام لیا۔

"یہ کون تھا؟" وہ زینب کے پاس آ کر بولی۔

"پتا نہیں۔"

"خوبصورت تھا اور ہینڈسم بھی۔ ہے نا؟" آمنہ نے آہستگی سے کہا تو زینب چپ رہی۔ وہ جان بوجھ کر آمنہ سے ایک قدم آگے چل رہی تھی، اس کا دھڑکتا دل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم ذرا آہستہ تو چلو بھاگ رہی ہو۔ ایسی کیا آفت آ گئی اب۔" آمنہ اس کے پاس آ کر جھنجلاتے ہوئے بولی۔

"بابا صاحب آنے والے ہوں گے۔" زینب آہستہ سے بولی۔

"تو پہلے سوچنا تھا، بے وقت گھر سے نکلتے ہوئے۔" آمنہ نے جتا کر کہا تو زینب نے کوئی جواب نہ دیا۔

"پتا نہیں مجھے جاب ملے گی یا نہیں۔ انٹرویو تو اچھا ہوا تھا۔ میڈم کہہ رہی تھیں اپائنٹمنٹ لیٹر آپ کے گھر بھیج دیا جائے گا۔ اگر آپ سلیکٹ ہو گئیں تو۔"

اسکول کے پاس سے گزرتے ہوئے آمنہ کو یاد آیا تو اس نے کہا۔ زینب نے جیسے سنا ہی نہیں اس کے کان تو

کسی اور ہی بازگشت پر لگے تھے۔

"آپ کو کسی نے بتایا نہیں کہ آپ کس قدر خوبصورت ہیں۔" "کس قدر خوبصورت۔" اس کے اندر جیسے ٹرین سی چل رہی تھی، اور وہ قرب و جوار سے بے خبر جیسے بھاگی جا رہی تھی اس ٹرین کے تعاقب میں۔

❁ ❁ ❁

"شہرینہ! کہاں جا رہی ہو؟" سیدہ کی بارعب آواز نے نک سک سے تیار ہو کر دبے پاؤں جاتی شہرینہ کے قدم بے ساختہ روک دیے۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر خائف نظروں سے سیدہ کی طرف دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔

"سنا نہیں کیا، کچھ پوچھ رہی ہوں کہاں جا رہی ہو اس وقت؟" سیدہ کے لہجے میں اور بھی سختی آ گئی۔ شہرینہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ اصل میں تو اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ سیدہ ادھر آئی ہوئی ہیں۔ صبح انہوں نے خود ہی فون کر کے کہا تھا کہ وہ آج نہیں آئیں گی۔ اسی لیے تو شہرینہ نے فون کر کے عبدالمبین کے ساتھ "سیٹنگ" کی تھی اب آپا سامنے موجود تھیں۔

"ایک دوست سے ملنے جا رہی ہوں اور کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔" اس نے بے حد سست لہجے میں جواب دیا قدم ابھی تک اسی جگہ پر گڑے تھے۔

"اتنی تیاری کے ساتھ شاپنگ؟ تم کس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو سیدہ شہرینہ بی بی!"

وہ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے ترشی سے بولیں۔ شہرینہ نے ڈارک میرون کلر کا شیفون کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کی آستینیں ہاف تھیں اور قمیص پر بڑے بڑے سیاہ پھول بنے تھے ساتھ میچنگ نگوں والے ٹاپس اور گلے میں چین تھی۔ کلائی میں بریسلیٹ اور یہ ہلکی پھلکی تیاری آپا کو ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔

"بتایا نا دوست کی طرف جاؤں کی پہلے۔" وہ کچھ جھلا کر بولی۔

"شہرینہ! ادھر آ کر بیٹھو میرے پاس۔" وہ کچھ سرد لہجے میں بولیں۔

"آپا مجھے دیر ہو رہی ہے مجھے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے، چاچا فضل دین انتظار کر رہا ہے میرا گاڑی میں۔" اس نے بری طرح چڑ کر کہا۔ میرون کلر کی لپ اسٹک اس نے بہت ہلکی لگائی تھی مگر اس کے گورے رنگ پر خوب نمایاں ہو رہی تھی۔ سیدہ کے دل کو یکایک کسی بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا شہرینہ میں، انہوں نے اسے غور سے دیکھا تو جیسے اپنی بے خبری کا یقین سا ہو گیا۔

"یہ شاپنگ کا کون سا ٹائم ہے چار بجنے کو ہیں۔ ابھی تمہیں جانا ہے، دوست سے ملنا ہے، پھر مارکیٹ جانا ہے جبکہ میں تین دن پہلے گئی تھی شاپنگ پر اور تم سے پوچھا بھی تھا کہ تمہیں کچھ منگوانا تو نہیں اور تم نے صاف جواب دے دیا تھا۔ اب ایسی کون سی اچانک ضرورت آن پڑی ہے جو کہ یوں بن ٹھن کر زیداری کو نکل رہی ہو۔" وہ اس کے سراپے پر نگاہیں جما کر درشتی سے بولیں۔

"پرسوں واقعی مجھے کچھ نہیں منگوانا تھا اور آج مجھے اشد ضرورت ہے، میں سات بجے تک آ جاؤں گی۔ خدا حافظ۔"

شہرینہ نے بے خوفی سے جواب دیا اور جانے کو مڑ گئی۔ اس کی بلیک سینڈل کی باریک ہیل کی ٹک ٹک نے سیدہ کے ارد گرد جیسی گھنٹیاں سی بجا دیں اور سیدہ سن سی ہو کر ان گھنٹیوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

گاڑی شہرینہ نے "آواری" کے سامنے رکوائی تھی۔

"چاچا فضل دین! یہ لسٹ ہے کچھ چیزوں کی۔ مین مارکیٹ کے سپر اسٹور سے سب کچھ مل جائے گا اور یہ پیسے ہیں آپ ایک گھنٹے میں جا کر سب کچھ خرید لائیں، یاد رہے ادھر ایک گھنٹے بعد آنا ہے۔" گاڑی سے اترتے ہوئے شہرینہ نے فضل دین کو لسٹ اور رقم تھماتے ہوئے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"میں جی۔" وہ جھجک گیا۔ اس نے تو اس شاپنگ کا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"ہاں تم۔ جاؤ۔" وہ سختی سے بولی پھر کچھ سوچنے لگی۔ "اصل میں ہوٹل میں میری دوست کی انگیجمنٹ

میرا مطلب منگنی ہے اور آپ کو پتا ہے سیدہ آپا مجھے کبھی ہوٹل کا سن کر آنے نہ دیتیں اور میں اپنی دوست کی منگنی چھوڑ نہیں سکتی۔ اس لیے دوست سے ملنے اور شاپنگ کرنے کا بہانہ کر کے آئی ہوں، تم نے گھر میں کسی کو نہیں بتانا کہ میں ہوٹل گئی تھی منگنی میں شرکت کے لیے اور یہ لو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے بلیک پرس کی اندرونی جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر اسے تھمایا۔ "اس سے اپنے بچوں کے لیے کچھ خرید لینا اب جاؤ اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد آنا میں تمہیں اسی گیٹ پر ملوں گی۔" کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوٹل کے اندر چلی گئی۔ فضل دین نوٹ اور لسٹ ہاتھ میں تھامے مشکوک انداز سے اندر جاتی شہرینہ کو دیکھ رہا تھا۔

"ہمیں کیا، آم کھاؤ پیڑ مت گنو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" دوسرے لمحے اس نے کندھے اچکائے اور گاڑی میں بیٹھ کر مین مارکیٹ کو روانہ ہو گیا۔

شہرینہ بڑے آرام سے چلتی ہوئی مخصوص ٹیبل تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس ہوٹل میں گزشتہ تین سالوں سے اسی ٹیبل پر آکر بیٹھتے تھے۔ ہال کے کونے میں رکھی گئی یہ ٹیبل بالکل الگ تھلگ تھی۔

"اتنی دیر لگا دی۔" عبدالمبین نے شہرینہ کو دیکھ کر کچھ بے چینی سے کہا۔

"گھر سے نکلنا آسان ہے کیا؟ پھر جتنا لمبا راستہ، تم تو آنے کا کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہو میں کس طرح آتی ہوں۔ مجھے پتا ہے۔" اس نے تھک کر پرس میز پر رکھا اور خود گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

"معلوم ہے مجھے بس اب یہ ٹینشن بھی ختم کر دینی ہے۔" عبدالمبین نے گہری نظروں سے اس کی تیاری کا جائزہ لیا۔

"کیا مطلب؟" شہرینہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی پھر اس کی خوب باریک بینی سے جائزہ لیتی نظروں سے سمٹ سی گئی۔

"بہت اچھی بہت دلکش لگ رہی ہو۔ اس خوبصورت شام کی طرح۔" وہ اس کی طرف ذرا سا جھکتے ہوئے رومانٹک لہجے میں بولا۔

"تھینک یو۔" وہ آہستگی سے نظریں جھکا کر بولی۔

"صرف تھینک یو۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"مبین!" شہرینہ نے احتجاجاً اسے دیکھا۔ "بہت مشکل سے آئی ہوں زیادہ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

"اب مشکلیں تمام ہونے کو ہیں۔" عبدالمبین نے گہرا سانس لے کر دور کھڑے ویٹر کو اشارے سے پاس بلایا۔

"مطلب؟" شہرینہ نے آس بھری نظروں سے دیکھا، عبدالمبین نے مینیو کارڈ ویٹر سے لے کر اسے تھما دیا اور دوسری خود دیکھنے گیا۔

"جو مرضی منگوا لو چائے یا کافی کے ساتھ کھانے کا نہ تو ٹائم ہے نہ مجھے بھوک ہے۔" شہرینہ نے مینیو کارڈ بند کر دیا تو عبدالمبین ویٹر کو آرڈر نوٹ کروانے لگا۔

"پرسوں میرا کنسرٹ ہے۔" ویٹر کے جانے کے بعد وہ بولا۔

"بتایا تھا تم نے۔" شہرینہ نے کچھ بے چینی سے کہا۔

"اس کے بعد میری البم مارکیٹ میں آجائے گی اور مجھے امید ہے بہت گرما گرم رسپانس ملے گا اس البم کا۔"

"تمہارا شو کون فنانس کر رہا ہے؟" شہرینہ کو ایکدم سے خیال آیا۔

"میڈم کر رہی ہیں اور کچھ ان کے خاص مہربان دوست۔"

"میڈم کون؟" شہرینہ نے شکی لہجے میں پوچھا۔

"میڈم زیور گل اور کون، وہی تو میری گارجین ہیں اس فیلڈ میں۔"

"اور ان کی بیٹی؟" شہرینہ جیسے اصل بات کی طرف آئی۔

"وہ تو میری دوست ہے۔" عبدالمبین اس کے تاثرات سے لطف اندوز ہوا۔

"صرف دوست؟"

"ہاں صرف دوست شکی لڑکی۔" وہ چڑ کر بولا "ویسے سچ بتاؤ تم یہ فضول بحث کرنے آئی ہو اتنی دور سے۔"

"نہیں۔" شہرینہ نے گہرا سانس لیا "تم کہو میں سن رہی ہوں۔" وہ ٹیبل کے سینٹر میں پڑے گلدان میں لگے گلاب کے پھولوں کو چھیڑنے لگی۔

"اگلے ہفتے میری فلم کی اوپننگ ہے، بہت بڑا فنکشن ہوگا۔ میری تو خواہش تھی کہ اس فنکشن میں تم میرے ساتھ ہوتیں۔ خیر یہ بھی جلد ہی ممکن ہو جائے گا۔" وہ جیسے خود کو تسلی دے کر بولا۔

"تمہارا پلان کیا ہے؟" شہرینہ نے پوچھا۔

"اگلے ماہ کے اینڈ تک ہم دونوں نکاح کر لیں گے۔ میں گھر کا بندوبست کر رہا ہوں۔"

"عبدالمبین! میں اس طرح کیسے نکاح کر سکتی ہوں بغیر گھر والوں کی رضامندی اور شمولیت کے۔"

"نہ تم پاگل ہو نہ میں۔" وہ مطمئن لہجے میں بولا "اب یہ تو ممکن نہیں کہ میں تمہارا پرپوزل لے کر تمہارے لالہ کے پاس جاؤں وہ سوچنے کے لیے رسماً دو چار دن مانگیں اور پھر ہاں کر دیں اور ہماری دھوم دھام سے شادی ہو جائے تمہارے گھر والوں کی رضامندی اور شمولیت کے ساتھ۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟" بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم بھی تو بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ کیا وہ مان جائیں گے؟"

"نہیں۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔

"تو پھر؟"

"پھر کیا۔ مجھے خود نہیں پتا۔" اس نے بے بسی سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔ تمہیں رات کے اندھیرے میں ہی حویلی چھوڑ کر میرے ساتھ آنا ہوگا۔ یہی ہماری محبت کا منطقی انجام ہو سکتا ہے۔" وہ بڑی بے رحمی سے بولا۔ شہرینہ نے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتی عبدالمبین! یہ ممکن نہیں۔" وہ رونے کو تھی۔

"اسٹاپ اٹ شہرینہ! تمہارے یہ فضول ڈائیلاگ اور فلمی ہیروئن والے آنسو میں گزشتہ چھ ماہ سے دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں یہ سب کچھ مجھ سے محبت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب تم یا میں مر کر ہی اس محبت کے آسیب سے اپنی جان چھڑا سکتے ہیں۔ کیا تم مکر سکتی ہو میری محبت سے؟" وہ تیز لہجے میں بولا شہرینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر؟"

"پھر میں کیا کروں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اپنے گھر کو، اپنی حویلی کو، اپنے گھر والوں کو ہمیشہ کے لیے ایسے کیسے چھوڑ دوں، ناقابل یقین سی بات ہے۔"

"بالکل بھی ناقابل یقین اور ناقابل عمل نہیں۔ بس ایک ڈیڑھ ماہ انتظار کر لو پھر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔ چائے آگئی۔ چلو انجوائے کرتے ہیں چائے کے بعد لانگ ڈرائیو پر جانے کا پروگرام ہے نا۔ تمہیں تمہاری پسند کا گفٹ خرید کر دوں گا۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ میں بیس منٹ بعد چلی جاؤں گی۔ فضل دین باہر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔" وہ روئے روئے سے لہجے میں بولی۔

"چلو کر لو اپنی من مانی۔ ہمارے ارمانوں کا خون کچھ دن اور پھر دیکھنا ہم ہوں گے تم ہو گی اور ہمارا حکم ہوگا۔ اور تم مانو گی۔ کوئی پابندی کوئی ڈر خوف نہیں ہوگا بس کچھ دن اور....." اس نے گرما گرم کپ اپنی طرف کھسکایا۔

شہرینہ بے جان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

وہ بے وفا ہے۔

ہرجائی ہے۔

محبت سے منکر ہے۔

عہدو پیماں کی ہر قسم سے انکاری ہے۔

"میں ہر بار کاسۂ محبت لیے اس کے دل کی چوکھٹ تک جاتا ہوں "اور وہ ہر بار مجھے دغا دے کر جھوٹی الفت کا سکہ کھن سے اس کاسے میں ڈال دیتی ہے۔ کب تک؟ کب تک.... میں ان جھوٹے سکوں سے خود کو بہلاؤں جبکہ میں جانتا ہوں وہ میری نہیں ہے۔

وہ کسی کی بھی نہیں ہے۔

وہ ایک حسین جل پری ہے۔

جو دن رات میں ہزاروں بار سمندر کی نیلگوں کوکھ سے سر اٹھاتی ہے اور ساحل پر کھڑا اس کی دید کا ہر دیوانہ اس کی محبت بھری اک نظر کے لیے مرنے کو تیار ہے (مجھ سمیت) اور وہ....!

ستم گر ظالم کسی کی بھی نہیں۔

وہ کسی ایک کی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔

وہ تو طوائف ہے۔ (بے وفائی جس کا مذہب ہے)

مگر....

وہ نین تارا ہے۔ نین تارا ہے۔

میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ خود سے الگ کیسے سوچ سکتا ہوں۔

مگر اس کی بے وفائی....!" انہوں نے زور سے اپنی کنپٹی دبائی' دوسرے ہاتھ میں دبا سگار سائیڈ ٹیبل پر پٹخ دیا۔

سلطان بخت! طوائف کو چھوڑنا کیا مشکل ہے۔

تم کیوں اپنے دامن میں یہ گند سمیٹے بیٹھے ہو۔ کیوں یہ ذلت تمہیں اس قدر پیاری ہے۔ چھوڑ دو اس کو۔

چھوڑ دو اس حرافہ کو۔ بدچلن آوارہ کو....

تم نے اس کی خاطر کیا نہیں کیا' وہ پھر بھی تمہاری نہیں بن سکی' وہ تمہاری کبھی بھی نہیں بن سکتی۔ زمانے میں کیا حسن کا کال پڑ گیا ہے۔ یا جوانی کی قلت پڑ گئی ہے۔ جو تم اس بے وفا پر قناعت کر بیٹھے ہو۔

"دفع کرو اس کو چھوڑو۔" وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور شکستہ دلی سے اپنا بکھرا بکھرا حلیہ دیکھنے لگے' ملگجا لباس الجھے ہوئے بال' ستا ہوا چہرہ' آنکھوں میں سرخ ڈورے۔

"تم نے ایک مرد ہو کر اس کی بے وفائی میں اپنا یہ حال کر لیا ہے۔ آخر تمہیں کس چیز کی کمی ہے کیوں اس خوبصورت زندگی کو یوں قطرہ قطرہ ختم کر رہے ہو چھوڑ دو اس دشمن جان کو۔"

"چھوڑ دوں۔" وہ جیسے آئینے پر غرائے "تاکہ وہ کھل کر عیش کر سکے۔ خوب انجوائے کرے میری بے بسی کو اور میری بخشی ہوئی دولت پر۔ تف ہے مجھ پر جو اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اسے اپنا نہ بنا سکا۔ میں مر تو جاؤں گا مگر اسے نہیں چھوڑوں گا۔" وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ "گل کدہ" سے آئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنے کے باوجود نین تارا نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کسی نئے عاشق کے ساتھ اپنی فلم کے سیٹ پر گئی ہوئی تھی۔ دو چار روز میں فلم کی اوپننگ تھی اور تین بار سلطان بخت کے کال کرنے پر بھی وہ شاہ جی ابھی آئی ہوں۔ بس دس منٹ میں' بس پانچ منٹ میں ابھی پہنچی ہوں۔ جھوٹی تسلیوں سے وہ انہیں ڈیڑھ گھنٹہ بے وقوف بناتی رہی اور آخر وہ آگ بگولہ ہو کر وہاں سے اٹھ آئے۔ زیور گل بھی موجود نہیں تھی ورنہ وہ اسے ہی ٹھیک ٹھاک سنا کر آتے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"بس۔" انہوں نے گہرا سانس لے کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سنوارے۔

"کیا بات ہے؟ کب سے کمرے میں بند ہو۔ موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔ تمہارے منیجر کے دو فون آ چکے ہیں اسے کسی فائل پر تمہارے سائن چاہئیں اور تم نے آفس آنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ بے چارہ اب تمہارے انتظار میں وہاں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔" سیدہ دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے کچھ خفگی سے بولیں۔

"اس سے کہہ دیں آپ میں اب صبح آؤں گا۔ اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"تھکے ہوئے تو اب تم ہمیشہ ہی لگتے ہو۔ سائن بہت ضروری ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کوئی بینک کی کنسائنمنٹ ہے۔ میں نے اسے گھر بلوالیا ہے' آتا ہی ہوگا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انہوں نے تشویش سے بھائی کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" وہ کچھ بیزاری سے بولے۔

"میں گھر جا رہی تھی تمہارے انتظار میں بیٹھی تھی۔ تم سے ایک بہت اہم بات کرنا تھی۔" وہ خود ہی آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"جی بولیں۔" وہ بادل نخواستہ ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولیں۔

"کس بارے میں؟" وہ کچھ چونکے۔

"شہرینہ کے بارے میں۔"

"کیوں اسے کیا ہوا ہے؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔

"ہونا اسے کیا ہے' شادی کے قابل ہے۔ اس کی عمر میں' میں دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس کی شادی تو آج سے چھ سات سال پہلے ہی ہو جانا چاہیے تھی مگر اس کی پڑھنے کی ضد اور تمہاری بے جا حمایت..... خیر اب میں اس کے سلسلے میں ایک سال تو کیا چند ماہ کی بھی تاخیر نہیں کر سکتی۔"

"کوئی رشتہ آیا ہے؟"

"پروپوزل اب بچا ہی کون سا ہے۔" وہ جیسے سرد آہ بھر کر بولیں۔ "دو رشتے تھے آج سے پانچ برس پہلے سید طالب حسین کا اور سید زبیر تحسین کا' دونوں کو تم نے اور شہرینہ نے ٹھکرا دیا اور اب تو خاندان بھر میں نہ تو کوئی اس کا ہم عمر کنوارا بچا ہے اور نہ عمر سے کچھ بڑا۔"

"تو پھر!"

"پھر کیا' شادی تو کرنی ہے نا اس کی۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"ہاں تو میں کب انکار کر رہا ہوں۔ کوئی رشتہ بھی تو ہو۔"

"سید ہاشم بخاری کو جانتے ہو نا!"

"کون؟" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولے۔

"وہ جو بابا جان کے کزن ہیں۔ آج کل سینٹ کے ڈپٹی چیئرمین ہیں اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔"

"وہ ہاشم بخاری..... وہ تو....." سلطان بخت کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے اپنی الجھن بیان کریں۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ مطمئن لہجے میں بولیں۔

"ان کے دو جوان بیٹے ہیں اور وہ خود بابا جان کے ہم عمر نہ سہی ان سے دو چار سال ہی چھوٹے ہوں گے۔" سلطان بخت نے جیسے انہیں یاد کرایا۔

"معلوم ہے مجھے۔ ان کے دونوں بیٹے شادی شدہ ہیں۔ ایک نیویارک میں' دوسرا مانچسٹر میں ہارٹ سرجن ہے دونوں سیٹ ہیں۔ باپ پر ان کا کچھ بوجھ نہیں' ہاشم بخاری کی بیوی سالوں پہلے مر کھپ چکی بڑی موٹی آسامی ہے۔ بے تحاشا زمینیں دولت جائیداد ارب پتی ہیں۔"

"ان کا پروپوزل آیا ہے؟" سلطان بخت نے پوچھا۔

"انہوں نے شہرینہ کو سال بھر پہلے دیکھا تھا جب حسین شاہ سینٹ کے ممبر بنے تھے اور ہم نے حویلی میں ہی

فنکشن کیا تھا۔ وہاں دیکھا تھا انہوں نے۔"

"مگر آپا جان! شہرینہ کا اور ہاشم بخاری کا کیا جوڑ؟" ان کی الجھن زبان پر آہی گئی۔

"وہ ہماری ذات برادری کے ہیں۔ دونوں پڑھے لکھے ہیں حیثیت میں بھی کم نہیں۔ ہمارے ہم پلہ ہیں۔ شہرینہ کو بہت خوش رکھیں گے۔ اپنی عمر سے دس سال کم ہی دکھتے ہیں۔ اس عمر میں بیوی اور وہ بھی جوان بیوی ملے تو مرد ناز اٹھاتے نہیں تھکتا۔"

"مگر آپا جان! یہ کیسے ممکن ہے؟" سلطان بخت کے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی۔

"کیوں ممکن نہیں؟ کیا بہن کو خاندان برادری سے باہر دو گے؟" وہ تیزی سے بولیں۔

"بالکل نہیں۔" وہ فوراً بولے۔

"تو بس پھر اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں ہمیں دو ماہ میں پورا خاندان کھنگال چکی ہوں۔ شہرینہ سے میں بات کرلوں گی۔ میرا ارادہ ہے کہ صالحہ کے فارغ ہوتے ہی اگلے ماہ نکاح کے بعد رخصتی کردیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"جی!" سلطان بخت کچھ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پارہے تھے۔

"انہیں آج ہی فون کرکے ہاں کہہ دیتی ہوں۔ وہ جمعہ کے دن ادھر آرہے ہیں۔ چھوٹا سا گھر میں فنکشن کرلیتے ہیں انگوٹھی پہنانے کی رسم ہوجائے گی اور سب کو پتا بھی چل جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ جلدی جلدی سارا معاملہ طے کرتے ہوئے بولیں۔

"جب آپ نے سب کچھ سوچ لیا ہے تو پھر مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

"یہ سب کچھ بہت ضروری ہے ہمارے لیے بھی اور شہرینہ کے لیے بھی، یہی عمر ہوتی ہے ان کاموں کی اور دیر سویر ہوجائے تو خدانخواستہ پچھتانا پڑجاتا ہے۔ میں چلتی ہوں اب تم صالحہ سے دل چاہے تو بات کرلینا ورنہ رہنے دینا۔ میں خود ہی کرلوں گی۔ اسے کون سی دلچسپی ہے نند کے معاملے میں۔ جمعہ میں تو صرف چار دن ہیں کل آکر کچھ تیاری کا سوچتی ہوں اور شہرینہ سے بات بھی کرلوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئیں اور دروازے سے لگی شہرینہ کے مردہ حواسوں میں جیسے جان آئی۔

"تو آپا جان یوں مجھے ٹھکانے لگانے کا سوچے بیٹھی ہیں۔ کسی کوڑے کرکٹ کی طرح اٹھا کر پھینک دینا چاہتی ہیں، سر پر پڑے بوجھ کی طرح۔ اتنا ہی اچھا رشتہ ہے تو اپنی بیٹی حنا کے لیے کیوں نہیں سوچ لیتیں۔ اس صلیب کے لیے میں ہی انہیں نظر آئی، آپا جان! دیکھ لی آپ کی محبت اب جواب میں میری محبت بھی دیکھیے گا۔ میں آپ لوگوں کے لیے مری جارہی ہوں اور آپ کے دلوں میں یہ مقام ہے میرا۔ اب مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہوگا کچھ بھی کرنے پر۔" اس نے دل میں سوچا اور چپکے سے اپنے کمرے میں آگئی۔

❁ ❁ ❁

"مے آئی کم ان میڈم!" آمنہ نے آفس کے دروازے پر کھڑے ہوکر رعنا حیات سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔

"یس۔" انہوں نے گولڈن فریم کے نازک گلاسز سے جھانکتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔ آمنہ اپنی فائل اور چادر سنبھالتے ہوئے اندر آگئی۔

"بیٹھیں!" رعنا حیات نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا وہ "شکریہ" کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"میڈم! یہ میرا اپائنمنٹ لیٹر۔" اس نے فائل میں سے سفید لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

"ہوں!" لفافہ کھول کر لیٹر پڑھنے کے بعد وہ بولیں "آپ کو ابھی فی الحال ٹرائل بیسز پر رکھا گیا ہے وجہ آپ کی ناتجربہ کاری ہے، اگر آپ کی کارکردگی اچھی ہوئی تو آپ کو مستقل جاب مل جائے گی۔ ابھی آپ کو چھوٹی کلاسز ملیں گی نرسری سے ففتھ تک۔ میں نے آپ کا اکیڈمک ریکارڈ پڑھا اچھے مارکس اور ڈویژن حاصل کرتی رہی ہیں،

آپ میٹرک تک پرائیویٹ امتحان دینے کے باوجود آپ نے فرسٹ ڈویژن لی تھی اس طرح سیکنڈ ایئر اور فورتھ ایئر میں بھی۔ اصل میں ہمیں ایسے ہی قابل اور ذہین ٹیچرز کی ضرورت ہے جو ہمارے اس ماڈل اسکول کو کامیابی سے چلانے میں ہماری مدد کرسکیں اسکول میں تین شفٹیں چلتی ہیں۔ مارننگ میں بچوں کے لیے، دوپہر میں خواتین کے لیے اور ایوننگ میں نوجوانوں کے لیے۔ مقصد ظاہر ہے شرح خواندگی کو بڑھانا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں آپ جیسی محنتی ٹیچرز کی ضرورت ہے جو ہم سے مکمل تعاون کریں اس لیے تجربے کو ضروری نہیں قرار دیا گیا۔ تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ کی تفصیل آپ لیٹر میں پڑھ چکی ہوں گی۔"

"جی میں نے پڑھ لی ہے۔" آمنہ انہیں پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

"تو قابل قبول لگیں آپ کو؟" رعنا مسکرائیں۔

"جی ٹھیک ہے۔"

"صرف ٹھیک ہے۔ ہوں صحیح کہا تم نے بھی۔" انہوں نے اپنے سامنے پڑا رجسٹر کھولا اصل میں آج کل کی معاشی زندگی اس قدر مشکل ہوچکی ہے کہ اگر ہر فرد کی تنخواہ سو فیصد بھی بڑھادی جائے تو بھی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے، ہے نا۔"

وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں تو آمنہ نے بھی صرف مسکرانے پر اکتفا کیا، رعنا نے بیل بجائی اسی وقت ایک ماسی اندر داخل ہوئی۔

"دیکھو انہیں اسٹاف روم میں لے جاؤ وہاں مس فرخندہ ہوں گی ان سے انہیں ملوادو، وہ آپ کو آپ کی کلاسز اور ٹائم ٹیبل سمجھادیں گی۔ ٹھیک ہے اب آپ جاؤ۔"

"تھینک یو میڈم!" کہہ کر وہ ماسی کے پیچھے نکل گئی۔

کل ہی اسے اپائنمنٹ لیٹر ملا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ گھر کے حالات واقعی بہت دگرگوں جارہے تھے۔ اس لیے جانے کے باوجود صوفی صاحب نے بھی کوئی خاص اعتراض نہیں کیا تھا۔ اماں جی نے البتہ کوئی رسپانس نہیں دیا تھا جس دن سے جمیل گیا تھا انہیں ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ دونوں بیٹے اور بھی شدت سے یاد آنے لگے تھے۔ ہر وقت ان کی آنکھیں روئی روئی سی رہتی تھیں اور ناک سرخ۔ صوفی صاحب کے سامنے وہ خود کو بہت کمپوزڈ ظاہر کرتی تھیں۔ گھر کے کاموں میں بھی ان کی دلچسپی بہت کم ہوگئی تھی یوں گھر کے کاموں کا سارا بوجھ آمنہ اور زینب پر آگیا تھا۔ خود وہ ہر وقت بیٹھی یا تو کچھ سوچتی رہتیں یا عبادت میں مصروف رہتیں۔ جویریہ کو صوفی صاحب نے پہلے ہی گھر بٹھا لیا تھا۔

"یہ اب کالج نہیں جائے گی۔ پڑھنے کا اگر بہت شوق ہے تو گھر بیٹھ کر پڑھے۔ زینب کے پاس صرف تین چار ماہ ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی گھر بیٹھے گی۔" صوفی صاحب نے ایک بار نہیں تین چار بار غصے کے عالم میں زینب کو باور کرایا تھا کہ اس کے پاس آزادی کے صرف تین چار ماہ ہیں اور زینب بھی جیسے اس آخری چانس سے خوب فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اس لیے پابندی سے روز کالج جارہی تھی۔

"آمنہ! میں کالج سے تمہارے اسکول آجاؤں گی، دونوں اکٹھے ہی گھر جائیں گے۔" صبح اس نے کالج جاتے ہوئے آمنہ سے کہا۔

"تم تو گیارہ بارہ بجے فارغ ہوجاتی ہو۔ میری تو اسکول سے ڈیڑھ بجے چھٹی ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کرلوں گی گھر آکر میں نے کرنا کیا ہے جویریہ ہے نا کام کاج کے لیے، دو چار روٹیاں بیلنے کے لیے اور دالوں کو تڑکا لگانے کے لیے۔ میں اتنی جلدی گھر آکر بور ہی ہوں گی۔" اس نے صاف کہہ دیا تھا۔

اور اب وہ حسب وعدہ سوا بارہ بجے ہی اسکول میں موجود تھی پہلے کافی دیر باہر برآمدے میں بیٹھی رہی۔ پھر گرمی لگی تو اسٹاف روم میں آگئی۔ ایک ٹیچر بیٹھی تھی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر اس کا پیریڈ اسٹارٹ ہوا تو وہ بھی اٹھ کر چلی گئی۔

”افوہ! یہ آمنہ کب آئے گی؟“ اس نے جھنجلا کر گھڑی دیکھی۔ ابھی تو صرف ایک بجا تھا آمنہ کی کلاس ڈیڑھ بجے ختم ہونا تھی۔ وہ باہر آ کر پھر برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ ایک دو بار پرنسپل کے آفس میں بھی جھانکا' آفس میں کوئی نہیں تھا وہ شاید کسی کلاس میں تھیں۔ صاف ستھرا سجا سجایا آفس۔ زینب چند منٹوں بعد آفس میں آ گئی پنکھا فل اسپیڈ سے چل رہا تھا اور اس کی ہوا سے ٹیبل پر رکھا اخبار پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ اخبار اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پر بیٹھ گئی اور اخبار کی شہ سرخیوں پر نظر دوڑانے لگی' گھر میں تو ان کے کبھی اخبار نہیں آیا تھا' کبھی کبھار کالج میں پڑھ لیتی تھی' ورنہ اسے کچھ خاص شوق نہیں تھا۔ آج بھی ٹائم پاس کرنے کو لے کر بیٹھ گئی تھی۔

”اوں ہوں... ایکسکیوزمی۔“ کسی نے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔

اس نے چونک کر اخبار چہرے کے آگے سے ہٹایا تو اسے جھٹکا سا لگا' اس کے سامنے اس دن والا نوجوان کھڑا تھا جو اسے بازار میں ٹکرایا تھا۔ اس کا دل جیسے تیزی سے دھڑکنے لگا' دو دن پہلے کی وہ اتفاقیہ ملاقات نہ تو وہ بھولی تھی نہ اس کے خوبصورت جملے بھولنے دے رہے تھے۔ رات کو سوتے میں جتنی بار بھی آنکھ کھلی ”آپ بہت خوبصورت ہیں“ کی بازگشت ضرور سنائی دیتی اور پھر کافی دیر تک وہ سو نہ پاتی۔

”آپ!“ وہ بھی کچھ حیران' کچھ شاداں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ وہی ہیں نا جو اس دن شام کو بازار میں ملی تھیں' حسن کی دیوی۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھا تو زینب کو احساس ہوا وہ بے حجاب بیٹھی ہے۔ اس کی چادر اس کے شانوں سے ڈھلک کر سینے پر پڑی تھی۔ اس نے جلدی سے چادر درست کرنا چاہی۔

”رہنے دیں نا۔ آپ کو کیا خبر آپ کے قاتلانہ حسن سے کسی کی آنکھیں کیسی ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔“ کسی کو زندگی کی خوبصورتی کا بے تحاشا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ حسن اگر مجسم ہو تو وہ کیسا ہوتا ہے۔ تین راتوں سے ڈھنگ سے سو نہیں سکا' آپ کے دل کش خدوخال نے میری آنکھوں سے نیند چرا لی ہے کیا آپ کو میں یاد نہیں آیا؟“ وہ بے تکلفی سے بولتے ہوئے اس کے قریب آ گیا تھا۔

”مم مجھے... میں جا رہی ہوں پلیز۔“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی' کوشش کے باوجود وہ چہرہ نہیں ڈھانپ سکی تھی اس کے ہاتھ بری طرح سے کپکپا رہے تھے اور آنکھیں ان دیکھے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں' وہ اس کے سامنے تنا کھڑا تھا اور زینب کو بھاگ جانے کا رستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کی بے داغ وائٹ شرٹ سے اٹھتی بھینی بھینی کولون کی خوشبو بری طرح سے اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

”اس دن تو آپ چلی گئی تھیں میری زندگی کا سارا سکون لوٹ کر' آج میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔“ اس نے بے اختیار ہی اس کا ٹھنڈا برف ہاتھ تھام لیا تھا۔

”چھ... چھوڑ دیں مجھے۔ کون... کون ہیں آپ؟“ اب وہ رو دینے کو تھی ایسے حسین ایڈونچر کا خواب تو دیکھ سکتی تھی مگر سامنا ہونے پر کیا حال ہو گا اس کا اندازہ اب ہو رہا تھا۔

”ایک بار آپ کا ہاتھ تھام لیا ہے تو اب نہیں چھوڑوں گا۔ میں سیفی ہوں' سفیان فخر حیات' جو شاید اس دنیا میں فقط آپ کے لیے بھیجا گیا ہے' صرف آپ کے لیے' آپ کا سیفی۔“

”آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے نا... کک... کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ اس نے اپنی پوری توانائی صرف کر کے اس کے جادوئی سراپے سے نگاہیں ہٹا کر کہا۔

”پہلے ٹھیک تھا' آپ کو دیکھنے کے بعد تو نہ دماغ' نہ دل گردے پھیپھڑے کچھ بھی صحیح سے کام نہیں کر رہے۔ پلیز رحم کرو مجھ پر۔ میرا تو پورا باڈی سسٹم ہی ڈس آرڈر ہو گیا ہے۔ اس تخریب کار دیوی کا نام پوچھ سکتا ہوں میں پلیز۔“ زینب کا ہاتھ اب تک اس کی مضبوط گرفت میں تھا اور زینب کا پورا وجود جیسے بجلی کے جھٹکوں کی زد میں تھا۔

”زینب! تم یہاں آ کر بیٹھو...“ آمنہ اندر آتے ہوئے بولی مگر سامنے کھڑے نوجوان اور اس کے اونچے لمبے

سراپے کے پیچھے چھپی کھڑی زینب ایک پل کو اسے نظر نہ آئی تھی۔

”تم... میں آ رہی ہوں چلو۔“ سیفی نے اسی لمحے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور زینب دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگی۔ آمنہ نے حیرت سے پہلے سیفی کو اور پھر زینب کو دیکھا۔ اسے کچھ ہو جانے کا احساس سا ہوا تھا۔

”آؤ نا رک کیوں گئی ہو؟“ زینب نے نقاب درست کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر آمنہ سے جھنجلا کر کہا۔

”یہ کون تھا؟“ آمنہ اس کے پاس آ کر بولی۔

”کوئی نہیں' چلو تم...“ وہ جیسے بھاگ رہی تھی۔

”زینب! مجھے بتاؤ یہ کون تھا؟“ وہ سختی سے بولی۔

”مم... مجھے کیا معلوم' میں تو آفس میں تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ یہ آ کر کسی کا پوچھنے لگا' ساتھ ہی تم بھی آ گئیں اور بس...“ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آئی ہو۔

”تم نہیں' اس نوجوان کا چہرہ دیکھا دیکھا سا لگ رہا ہے' ہے نا۔ کہیں دیکھا ہے اسے۔“

”معلوم نہیں' چلو اب۔“ زینب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر راستہ طے کر لے۔

اور آفس میں ریوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے سفیان کو لگا اس نے زندگی کو دریافت کر لیا ہے۔ ایک حسین روشن زندگی کو۔

☼ ☼ ☼

کبھی تو تم کو یاد آئیں گی وہ بہاریں وہ سماں
تم سے بچھڑے صدیاں بیتیں پھر بھی تم یاد آئے
سایہ بن کے آہٹ بن کے آج بھی تم ڈھلتے ہو
زندگی کتنی بیزار ہے' تم نے کبھی تو مجھ سے کہا تھا
تم سے پیار ہے
کہاں گئیں وہ پیار کی قسمیں پیار کا وعدہ کیا ہوا...

پرانے گانے کی ری مکسنگ تھی اور عبدالمبین عرف مبلی کی دلکش آواز کا جادو' رات کا آخری پہر اور پنڈال سے آتی ہزاروں لوگوں کی ایک سرمئی بجتی تالیوں کی آواز۔ مجمع جھومتے ہوئے سن رہا تھا جیسے کوئی جادوگر ان پر کوئی سر پھونک رہا ہو اور وہ سب اس کی آواز کے زیروبم میں گم ہوتے جا رہے ہوں۔

”ونس مور' ونس مور...“ جیسے ہی گانا تمام ہوا مجمع نے ہاتھ ہلا ہلا کر خوب ہی شور مچایا اور لوگوں کے اصرار پر مبلی کو گانا دوبارہ گانا پڑا تھا۔ یہ اس کنسرٹ کا آخری گانا تھا۔ پچھلے دو گھنٹے سے وہ مسلسل گا رہا تھا۔ گانے کے ساتھ ناچنے کودنے کی ایکسر سائز علیحدہ' اب تو اس کے جسم کا جوڑ جوڑ تھک چکا تھا' اور سکون سے کہیں بیٹھنے لیٹنے کی شدید خواہش کر رہا تھا۔

”اوکے گائیز پھر ملیں گے' امید ہے آپ کو میرا نیا البم پسند آیا ہو گا اور میری پرفارمنس بھی۔ یہ چند کیسٹس آپ لوگوں کے لیے' بہت محبت' بہت چاہت سے' جس جس کو مل جائیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی چھ سات آڈیو کیسٹس مجمع کی طرف اچھالیں ”ہو ہاؤ... واؤ“ کا زبردست شور اٹھا تھا۔ اسٹیج پر مختلف فون نمبرز اور موبائل نمبر کی پرچیوں کا ڈھیر لگا تھا جو اس کے لیے مجمع کی طرف سے آئی تھیں۔ کتنی حسیناؤں نے اپنے کانٹیکٹ نمبرز اس کی طرف اچھالے تھے۔ وہ ان پرچیوں سے نظریں چراتا ہاتھ ہلاتا اسٹیج کے پیچھے چلا گیا۔ چہرے پر آئے پسینے کو اس نے کرسی پر پڑے تولیہ سے خوب رگڑ کر صاف کیا۔

”اوکے حامدی صاحب! مجھے اب اجازت' باقی کے معاملات کل طے کر لیں گے۔ اس وقت میں بہت تھک چکا ہوں' پھر اس سے پہلے باہر رش لگے اور لوگ آٹوگراف کے چکر میں مجھے پاگل کر دیں' میں اب چلتا ہوں۔“ وہ اپنے منیجر سے بولا تھا۔

"کچھ ریفریشمنٹ سوہی صاحب!" حامدی نے آگے بڑھ کر لجاجت سے کہا۔

"نو تھینکس۔ اس وقت کچھ نہیں۔" اس نے ٹھنڈے کنٹینر میں لگی کولڈ ڈرنکس میں سے ایک کاٹن اٹھا کر منہ سے لگالیا۔

"ذرا چیک کروائیں، باہر میری گاڑی آگئی ہے۔" ایک طویل گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے اس نے کہا۔

"جی گاڑی تو آپ کی کھڑی ہے۔ مس نین تارا آپ کو لینے آئی ہیں اور کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"اوہ تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اوکے، بائے۔" وہ عجلت میں دو تین بڑے بڑے گھونٹ بھرتا باہر نکل گیا۔

کھلے پنڈال کے پیچھے یہ چھوٹا سا کمرہ سائیڈ روم کے طور پر کام کر رہا تھا۔ پارکنگ پنڈال کے باہر تھی مگر نین تارا کی گاڑی اس کمرے کے پیچھے بنے طویل برآمدے سے آگے کھڑی تھی۔ برآمدے کے سامنے بنا چھوٹا سا لان اس وقت بالکل ویران تھا۔ عبدالمبین لمبے لمبے ڈگ بھرتا نین تارا کی پوٹھوہار کے پاس آگیا۔

"ہائے کیسا رہا کنسرٹ؟" وہ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا، نین تارا نے خوش دلی سے پوچھا۔

"زبردست بہت بہت زبردست۔ بہت اچھا ویلکم ملا۔ لوگوں نے سب گانوں کو بہت پسند کیا۔ ہر گانا دو دو بار سنا گیا۔ آج میں بہت خوش ہوں نین تارا! بہت خوش۔ آج میری محنت رنگ لائی ہے۔ تم کنسرٹ میں کیوں نہیں آئیں؟" ایک دم سے یاد آیا تو پوچھ بیٹھا۔ نین تارا نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

"آئی تھی تھوڑی دیر کے لیے پھر مام کا فون آگیا' کچھ امپورٹنٹ گیسٹ آئے ہیں' ان سے میرا ملنا ضروری تھا' اسی لیے گھر چلی گئی تھی۔ وہ لوگ ابھی گھر میں ہی بیٹھے تھے کہ میں تمہیں لینے چلی آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہاری کھٹارا ورکشاپ میں کھڑی ہے اور تم نے گلفام سے اسے ورکشاپ سے لانے کو کہہ رکھا ہے۔"

"اور دیکھا تم نے گلفام کا کام' گاڑی ابھی تک لے کر نہیں آیا۔ تم نہ آتیں تو میں ابھی تک ادھر ہی بیٹھا ہوتا' حامدی سے لفٹ لینے کے لیے۔"

"تم نئی گاڑی کیوں نہیں لے لیتے؟ اتنی بار مام نے تم سے کہا ہے۔"

"اب لے لوں گا' اس کنسرٹ سے مجھے اتنی انکم ہو جائے گی کہ میں دو گاڑیاں آرام سے خرید سکتا ہوں۔ اگلے ہفتے ایک کنسرٹ کراچی میں ہے اور اس کے تین دن بعد اسلام آباد میں۔ اب تو گاڑیاں ہی گاڑیاں آگے پیچھے۔"

وہ بہت خوش تھا' بہت پرجوش۔ اس نے ٹانگیں آگے تک پھیلائیں اور گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کر ایزی ہو گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر مام نے بھی تو آفر کی تھی' تمہیں اتنی دفعہ کہا۔ کیا ہم تمہارے لیے غیر ہیں۔" نین تارا نے گلہ کیا۔

"یہ مت کہو' ایسی بات کبھی سوچنا بھی نہیں۔ میں اپنے لیے تو غیر ہو سکتا ہوں مگر میڈم کے لیے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ نین تارا! جس طرح تم لوگوں نے مجھے سپورٹ کیا ہے' مجھے سہارا دیا ہے' مجھے میرے قدموں پر پورے وجود کے ساتھ کھڑا کیا ہے' میں اس کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گا۔" وہ تشکر بھرے لہجے میں بولا۔

"ایسے مت کہو کہ احسان کیا۔ تم میں ٹیلنٹ تھا تو کچھ بن سکے ہو' ورنہ مام نے تو بہت لڑکوں اور لڑکیوں کو سپورٹ کیا ہے۔ اتنا شائننگ اسٹار تو کوئی بھی نہیں بن سکا جتنا نام تم نے کمالیا ہے۔ اتنا تو شاید مام بھی نہیں کر سکی تھیں' میرا ذکر تو اور بات ہے۔" شہر کی سڑکیں سنسان تھیں۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ صرف پول لائٹس روشن تھیں۔ اکا دکا گاڑیاں آجا رہی تھیں۔

"ٹیلنٹ! ہونہہ۔" وہ ہنسا۔ "خالی خولی ٹیلنٹ سے کیا ہوتا ہے' ٹیلنٹ تو نہ جانے کتنا ہمارے پسماندہ علاقوں میں رل رہا ہے۔ کون اسے پہچانتا ہے' کس کو فرصت ہے کہ جا کر اسے تلاشے' اسے پالش کرے اور اگر کوئی خود سے دھکے کھاتا میڈیا تک پہنچ بھی جائے تو جب تک اسے مناسب سپورٹ نہ ملے' اس کا ٹیلنٹ بیکار ہے' کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں۔"

"ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن سپورٹ اپنی جگہ' ٹیلنٹ اپنی جگہ۔ اکثر لوگ صرف اونچی سیڑھی کے سہارے ہی آتے ہیں' مگر ان میں ٹیلنٹ نہیں ہوتا اور وہ چند دن سے زیادہ نہیں چمک سکتے۔ تمہیں قدرت نے دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔ تمہیں فل چانس دیا گیا ہے کہ اپنے ٹیلنٹ کو بھرپور طریقے سے آگے لاؤ اور خود کو منواؤ۔ تمہارا یہ البم خوب چلے گا اور ہماری نئی آنے والی فلم کے گانے تو پہلے ہی لوگوں میں خوب پاپولر ہو چکے ہیں۔ مان لو سوہی ڈیئر! کہ تم لکی ہو' پارس پتھر' میری پہلی فلم تو سو سو گئی تھی مگر یہ والی تو لگتا ہے سپرہٹ جائے گی۔" نین تارا نے مسکرا کر کہا۔

"پارس پتھر' کوئی یونہی نہیں بن جاتا نین تارا!" وہ افسردگی سے بولا۔ "تمہیں کیا معلوم میں نے اس راہ سے کن کن پتھروں کو کاٹا ہے۔ دودھ کی نہر نکالنا آسان ہے مگر خود کو منوانا مشکل ہے اور اس منزل تک پہنچنے میں میرے پاؤں کیسے آبلہ پا ہو گئے ہیں' میں چاہوں بھی تو تمہیں نہیں بتا سکتا۔" وہ ذرا سا رکا۔

"شروع شروع میں میڈم نے چند دن کی سرپرستی کے بعد مجھ سے بے نیازی برتنا شروع کر دی تھی۔ ماسٹر جی نے بھی چند دن کے ریاض کے بعد ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ میرے پاس ان کو خوش کرنے کے لیے کچھ بھی تو نہ تھا پھر خالی ہاتھ' خالی جھولی۔ بس کچھ پاس تھا تو دل میں لگن تھی' شوق تھا' جذبہ تھا۔ کچھ کر گزرنے کا' اور یہی جذبہ مجھ سے کیا کیا کروا گیا' سوچوں تو مجھے خود یقین نہیں آتا۔ ماسٹر جی کے نذرانے کے لیے میں قلی بنا۔ مزدور بنا سارا سارا دن ریت' بجری ڈھوتا' کڑی دوپہروں میں سیمنٹ کے تھیلے اٹھا اٹھا کر کئی منزلہ سیڑھیاں چڑھتا۔ میں نے لوگوں کے بوٹ بھی پالش کیے۔ موتیے کے ہار گجرے بھی بیچے' لوگوں کی گاڑیوں کے آگے بھاگ بھاگ کر ان کے شیشے چمکائے' گاڑیاں دھوئیں' اخبار بیچے' تنور میں روٹیاں لگائیں' سیلز مین بنا' ہاکر بنا' ہیرا گیری کی' ورکشاپ میں کام کرتا رہا۔ وہ کون سا کام ہے جو میں نے نہیں کیا۔ ہر طرح سے چند روپے کمائے مگر کبھی کوئی جرم نہیں کیا' کسی کی جیب نہیں کاٹی' چوری نہیں کی' کسی کے پیچھے لے کر نہیں بھاگا۔ بس کچھ بن جانے کی لگن تھی۔ محنت مزدوری الگ کرتا تھا' دن میں ایک بار میڈم کے پاس حاضری ضرور دیتا تھا اور اسٹوڈیو کے دھکے علیحدہ۔ ٹی وی اسٹیشن' ریڈیو اسٹیشن' غرض جہاں جو کام مل گیا۔ ماچس کا اشتہار' بسکٹ کا' ٹافی کا یا پان سپاری کا۔ میں نے ہر کام منت سے اور محنت سے حاصل کیا۔ کچھ بھی تو مجھے پلیٹ میں سجا سجایا نہیں ملا۔ بس دل میں ایک عہد کر لیا تھا کہ مجھے ٹاپ کلاس سنگر بننا ہے۔ ایک شائننگ اسٹار اور دیکھو' آج میں اسی ہائٹ' اسی پیک (چوٹی) پر کھڑا ہوں۔ بغیر ہاتھ ہلائے سب کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہوں اور اب میں اپنی یہ کتھا کسی کو سناؤں تو کوئی یقین نہ کرے کہ میں نے اتنی ٹف لائف گزاری ہے۔

ان پانچ چھ سالوں میں کتنی راتیں میں نے بھوکا رہ کر گزاری ہیں کہ خالی پیٹ نیند بھی نہیں آتی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر صبح کرتا تھا کہ دن چڑھے اور مجھے کہیں سے سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ہی مل جائے۔ کئی بار کتنے ٹائم کے فاقے کے ساتھ "گل کدہ" جاتا' تم اور میڈم مجھے دیکھ کر بھی نہ دیکھتیں۔ میرے سلام کا جواب بھی نہ دیتیں اور آپ دونوں کی بے نیازی اور حقارت کے باوجود میں چپکا رہتا۔ میڈم مجھے بہانوں سے ٹالتیں۔ انجان بن کر چل دیتیں' مجھے دیکھتے ہی کسی فضول سے کام میں مصروف ہو جاتیں' موبائل پر خوامخواہ نمبر پش کرنے لگتیں اور اس وقت میں چپکے سے ان کے کچن میں چلا آتا' پانی پینے کے بہانے نوکروں سے کچھ نہ کچھ سامنے پڑا مانگ کر کھا لیتا۔ اس وقت مجھے وہ ذرا سی نعمت بھی دنیا جہان کی نعمتوں سے بڑھ کر لگتی تھی اور میرے دل سے میڈم کے لیے دعائیں نکلتیں اور دیکھو وہ وقت بھی گزر گیا اور میرے پاس ان تکلیف دہ دنوں کو یاد کرنے کا اب وقت بھی نہیں۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

"صبح مجھے اسٹوڈیو ایک گانے کی وڈیو ریکارڈ کروانے جانا ہے۔ اس کے فوراً بعد حامدی صاحب سے میٹنگ ہے فلم کی لانچنگ کے سلسلے میں۔ دوپہر کو ہالی ڈے ان میں فنکشن ہے اور خان فریدی صاحب کی فلم کے دو گانے بھی کل ہی ریکارڈ کروانے ہیں۔ اف! بہت مصروفیت ہے اور آرام کے لیے صرف یہ دو تین گھنٹے۔"

"واقعی، بہت محنت کے بعد تم نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ مجھے تو مام کے نام نے سب کچھ دلا دیا ورنہ تو اس دشت کی سیاحی میں پاؤں واقعی آبلہ پا ہو جاتے ہیں تمہاری اسٹرگل (جدوجہد) قابل تحسین ہے صحیح کہا ہے کسی نے صبر کا پھل واقعی میٹھا ہوتا ہے۔" وہ اسے سراہتے ہوئے مسکرائی۔

"یہ یونیورسل ٹروتھ (آفاقی سچائی) ہر دفعہ سچ نہیں ہوتا، کچھ لوگوں کو کچھ بھی کیے بغیر میٹھا پھل تا عمر ملتا رہتا ہے۔ اس کی بہترین مثال تم ہو اور تمہارے شادی ہیں۔" وہ جان کر اس موضوع کی طرف آیا۔ "ان جیسے لوگوں کو تو یہ سویٹ فروٹ حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔"

"ان کا ذکر اس وقت کدھر سے آگیا؟" نین تارا ناگواری سے بولی۔ "ان کا نام مت لو میرے سامنے۔"

"کیوں؟ کیا آج کل ان کے ساتھ پھر ٹھنی ہوئی ہے؟"

"ان کے ساتھ بنی کب ہے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ مجھے لگتا ہے عمریں بیت گئیں نہ میں انہیں چھوڑ سکتی ہوں نہ وہ مجھے چھوڑتے ہیں، نہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ پتا نہیں اس جبراً "ساتھ" کا انجام کیا ہوگا۔"

"انجام کی کیا بات ہے۔ جن سے محبت کی ہو، جن سے دل ملے ہوں چھوٹے موٹے جھگڑے تو ان کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور ان ہی میں مزہ ہے۔" عبدالمبین نے کن انکھیوں سے نین تارا کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"رہنے دو۔ یہ محبت، چاہت، سب دکھاوا ہے۔ جھوٹ اور فریب۔ نظر کا دھوکہ۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں مگر کچھ کنڈیشنز کے ساتھ اور میں ان کی محبت چاہتی ہوں ہر کنڈیشن سے بالاتر پھر یہ محبت تو نہ ہوئی۔ یہ تو سوچا سمجھا منصوبہ ہو گیا جو مسلسل فیل جا رہا ہے، میں اس محبت کے ڈرامے سے تنگ آچکی ہوں۔ انہیں چھوڑ دینے کی دھمکی دے کر کچھ نہ کچھ اینٹھ لوں چند دن ان کا دل بہلاؤں اور پھر اکڑ جاؤں پھر وہ بھی اکڑ جائیں پھر کچھ دینے دلانے پر کسی سودے پر مصالحت ہو جائے پھر لڑائی۔ یہ سائیکل کہاں رکے گا کچھ خبر نہیں۔ میں تو فیڈ اپ ہو چکی ہوں۔" اس نے زور سے اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ مارا۔

"تو چھوڑ دو انہیں۔ نکل آؤ اس سائیکل سے۔"

"یہ آسان کب ہے کہ وہ مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں اور میں...." وہ کھو سی گئی۔ "میں چھوڑنا چاہتی ہوں اور چھوڑ نہیں سکتی۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "تم سناؤ نیا گھر لے رہے ہو؟ مام بتا رہی تھیں۔"

"ہاں دو چار کوٹھیاں دیکھی ہیں مگر مجھے کچھ خاص پسند نہیں آئیں سوچ رہا ہوں زمین لے کر کسی اچھے آرکیٹیکٹ سے خود گھر بنواؤں۔ خوبصورت بہت آرٹسٹک سا اپنی ہر حسرت کو اس کی بنیادوں میں دفن کروا کے خوابوں کا محل تعمیر کرواؤں۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اوہو! یہ ارادے ہیں جناب کے۔"

"ارادے تو اور بھی بہت ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "مگر اب ایک ایمرجنسی آن پڑی ہے۔"

"ایمرجنسی کیا مطلب؟" نین تارا نے گاڑی "گل کدہ" کی سڑک کی طرف موڑی۔

"مجھے لگتا ہے گھر سے پہلے گھر والی آجائے گی اس کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔" عبدالمبین کی بات پر نین تارا کا دل زور سے دھڑکا۔

"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں؟"

اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔

"مطلب اس وقت نہیں سمجھا سکتا، مجھے لگتا ہے مجھے جلد ہی میڈم سے بات کرنا پڑے گی اس سلسلے میں ان کی اجازت تو سب سے ضروری ہے۔" اس کی معنی خیز بات پر نین تارا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"تم بھی کوشش کرو اور اس ایموشنل سائیکل سے نکل آؤ زندگی بہت حسین ہے اور ایک بار ملتی ہے اسے انجوائے کرو یوں جل جل کر کڑھ کڑھ کر اسے ضائع مت کرو۔ جتنی تم خود حسین ہو اتنی حسین اپنی زندگی بنا سکتی ہو اگر چاہو تو۔" وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی "گل کدہ" کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔

"میں سمجھی نہیں۔" وہ ڈھیلے سے انداز میں بولی۔

"وقت آنے پر سمجھ جاؤ گی۔" کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر ہارن بجانا شروع کر دیا۔ اگلے پل چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ عبدالمبین کو اب بری طرح سے نیند آرہی تھی اور نین تارا کو لگا اس کی نیند کم از کم آج رات کے لیے اڑ چکی ہے۔

❁ ❁ ❁

آپریشن تھیٹر کے باہر ٹہل ٹہل کر سیدہ کی ٹانگیں شل ہونے کو تھیں۔ اسی وقت ڈاکٹر نائلہ تھیٹر سے باہر آئیں۔

"ڈاکٹر صاحبہ! صالحہ ٹھیک ہے، آپریشن ہو گیا؟" انہوں نے بے تابی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"ابھی کچھ بھی ٹھیک نہیں۔ بی پی کنٹرول نہیں ہو رہا اس لیے آپریشن میں دیر ہو رہی ہے آپ دعا کریں۔" وہ مصروف لہجے میں کہہ کر دوبارہ آپریشن تھیٹر میں گم ہو گئیں اور سیدہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"اگر صالحہ کو کچھ ہو گیا تو؟"

"اگر پھر... خدانخواستہ۔" ان کا دل اسی خدشے پر تو جیسے بند ہونے کو تھا۔

اسی وقت سلطان بخت، حسین شاہ کی معیت میں آگئے۔

"ہو گیا آپریشن؟" حسین شاہ نے پریشان چہرے کے ساتھ سیدہ کو دیکھا۔

"ابھی نہیں۔" وہ بمشکل آہستگی سے بولیں۔

"اچھا بھلا نارمل کیس ہو رہا تھا پھر آپریشن کی نوبت کیوں آگئی؟" حسین شاہ نے سیدہ سے پوچھا تو وہ نظریں چرا گئیں۔ اب کیا بتاتیں کہ صالحہ اور سلطان بخت میں کس قدر زوردار جھگڑا ہوا تھا۔ وہ نین تارا کا فون اٹینڈ کر بیٹھی تھی بس پھر... اور جھگڑے کے دوران ہی وہ چکرا کر گر پڑی اور اس کی حالت خراب ہو گئی ایمرجنسی میں اسے ادھر لانا پڑا تھا اور یہ بات وہ حسین شاہ کو نہیں بتا سکتی تھیں سو منہ پھیر کر دل میں دعا کرنے لگیں۔

"مبارک ہو سیدہ صاحبہ آپ کو۔" اسی وقت ڈاکٹر نائلہ کا خوش خوش چہرہ ان کے سامنے آگیا اور ان کی آواز پر تینوں نفوس کے چہرے جیسے کھل اٹھے تھے۔

"آپریشن ہو گیا؟"

"جی بالکل کامیاب ہو گیا۔ آپ کی بھابی بالکل خیریت سے ہیں اور...."

"اور...." سیدہ نے پُرامید، روشن نظروں سے ڈاکٹر کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔

● ● ● ● ● ●

"جڑواں...." ڈاکٹر ایک لحظہ کے لیے رکی تھی۔ سیدہ کے چہرے پر شادیٔ مرگ والی کیفیت تھی۔ حسین شاہ اور سلطان بخت کے دلوں نے بھی جیسے ایک پل کے لیے دھڑکنا موقوف کر دیا تھا۔

"بیٹیاں ہوئی ہیں۔" ڈاکٹر نے ڈرامائی انداز میں جملہ پورا کیا۔ سیدہ کو یوں لگا شہر کے اس مہنگے ترین خوبصورت ہاسپٹل کی وسیع — بلڈنگ ان کے سر پر آن گری ہے۔ بے اختیار انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ خود کو بچانے کی لاشعوری کوشش۔

اور سلطان بخت کا چہرہ ایک دم سے جیسے سیاہ پڑ گیا تھا۔ کسی حسینہ کی سیاہ زلف کی طرح۔ دوسرے پل ان کا چہرہ بے رنگ سا ہو گیا تھا۔ بالکل سپاٹ، بے تاثر اور تیسرے ہی پل غصے اور طیش سے سرخ انگارہ جیسے کسی نے

انہیں جلتی ہوئی بھٹی میں لا پٹخا ہو۔ انہوں نے ایک غصیلی نفرت بھری نظر حسین شاہ کے ساکت چہرے اور سیدہ کے نیم مردہ وجود پر ڈالی۔ ایک ٹھوکر پاس پڑے صوفے کو زور سے ماری اور پیر پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔

ڈاکٹر نے کچھ حیرانی سے سلطان بخت کو اس طرح جاتے دیکھا اور پھر سیدہ کے فق چہرے کو۔ بات سمجھ میں آگئی۔ ڈاکٹر نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے گاؤں سے ان دیکھی گرد جھاڑی۔

"ہم آپ کی پیشنٹ کو تھوڑی دیر تک روم میں شفٹ کر دیتے ہیں' بے بیز کو نرسری میں بھیج دیتے ہیں۔ آپ پلیز... بے بیز کے کپڑے اور دوسرا سامان بھجوا دیں۔" کہہ کر وہ رکی نہیں اور دوبارہ آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔ اس کے پیچھے آپریشن تھیٹر کا چوں چاں کی آواز کے ساتھ جھومتا دروازہ جیسے آکر سیدہ کے منہ پر طمانچے مارتا رہا۔

"بشیراں!" کافی دیر بعد ان کے ساکن جسم سے آواز برآمد ہوئی۔ برآمدے کے پچھلے حصے میں فرش پر بیٹھی دونوں ملازمائیں فوراً" حرکت میں آئیں۔

"جی سائیں!" بشیراں جھکے سر کے ساتھ بے حد مؤدب تھی۔ "خوش خبری" ان کے کان بھی سن چکے تھے۔

"بچے کے کپڑوں کا بیگ لے آؤ۔"

سیدہ نے بہت مشکل سے یہ جملہ کہا تھا اور پھر خود کو گھسیٹ کر انہوں نے صوفے پر گرا لیا۔ سر اٹھانے کی ہمت تھی نہ کچھ کہنے کی۔ سیدہ کو یوں لگا جیسے آج کے بعد وہ کبھی سر اٹھا کر بات نہیں کر سکیں گی۔ کسی سے بھی۔

بابا جان کی سربلند حویلی انہیں مٹی کا گھروندہ لگ رہی تھی جو طوفانی جھکڑوں کی زد میں دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ ایسے ہی بے تحاشا زور زور کے جھولے ان کے سر کو بھی آرہے تھے۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پر گرتی چلی گئیں۔

"سیدہ! سیدہ!" حسین شاہ بے اختیار ان کی طرف بڑھے۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی۔ آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

عین اس کے قریب گاڑی کے چرچراتے ٹائر اور پھر مخاطب کی آواز۔ زینب ایک دم سے بدک کر دور ہٹی تھی اور خوف زدہ نظروں سے سامنے کھڑی وائٹ سیلون کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے سیفی کو دیکھنے لگی جو زینب کے اس طرح ڈر جانے سے جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ زینب کو اور تپا گئی۔ اس نے غصیلی نظروں سے سیفی کو دیکھا اور ہاتھوں سے لڑھکتی فائل اور کندھے سے نیچے گرتے شولڈر بیگ کو سنبھالا اور گردن جھٹک کر آگے جانے لگی۔

آج کل کالج میں اسپورٹس ڈے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کی دوست فرزانہ نے "ہیر رانجھا" میں حصہ لیا تھا۔ اسی کی ریہرسل دیکھنے کے لیے وہ رک گئی تھی۔ ریہرسل تو ابھی بھی جاری تھی مگر دیر ہو جانے کے خیال سے وہ نکل آئی اور اس کے ساتھ جو محلے کی دو لڑکیاں جاتی تھیں' وہ پہلے ہی گھر جا چکی تھیں۔ نتیجتاً" اسے اکیلے گھر جانا پڑ رہا تھا۔ سارا کالج تقریباً" خالی ہو چکا تھا۔ صرف ریہرسل کرنے والی لڑکیاں ہال میں موجود تھیں۔ زینب تیز قدموں سے جا رہی تھی۔ اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا' وقت کافی ہو چکا تھا اگر بابا صاحب دوپہر کے کھانے کے لیے اوپر آگئے ہوں تو اسے فائل سے پہلے ہی گھر بٹھالیں گے۔

"پلیز آئیں نا۔ میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" شاید اللہ نے اس کو جلدی گھر بھجوانے کا یہ انتظام ––– کیا تھا مگر اسے قسمت کی یہ مہربانی گوارا نہیں تھی۔

"شکریہ۔" اس نے دھیمی آواز اور خشک لہجے میں کہا اور قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ وہ جیسے بھاگی جا رہی تھی۔ دھوپ میں چمکتی وائٹ سیلون سست رفتاری سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

"پلیز آئیں ناں۔" اس نے اصرار کیا۔ زینب جھنجلا گئی۔ وہ جیسے بھاگنے لگی۔ سال خوردہ جوتے سے یہ تیزی برداشت نہ ہوئی اور اس کے بائیں جوتے کی دونوں اسٹریپ نکل گئیں۔ پاؤں مڑا اور جوتا پاؤں سے نکل کر دور

جا گرا۔

"ایک اور آفت!" اس نے رنجیدگی سے ٹوٹے بے وفا سینڈل کو دیکھا۔ پاؤں کے درد کو وہ پی گئی تھی۔

"اب تو آجائیں۔ اب تو لفٹ لینے کی جنوئن ریزن موجود ہے۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ جوتے نے بروقت ٹوٹ کر اس کے دل کی مراد پوری کر دی تھی۔

"اے میاں! کیا بات ہے... کیوں لڑکی کو ستا رہے ہو' یوں پیچھے پیچھے گاڑی دوڑا کر۔" ایک ادھیڑ عمر آدمی نے ڈپٹ کر سفیان سے کہا۔ وہ کافی دیر سے دونوں کی تکرار کو دور سے ملاحظہ فرما رہا تھا۔

"لڑکی...!" سفیان پہلے تو ذرا سا جھجکا پھر نڈر سا ہو کر بڑے میاں کو دیکھنے لگا۔

"یہ میری بہن ہے۔ میں دیر سے لینے آیا ہوں۔ اس لیے خفا ہو گئی ہے۔ اب آ بھی جاؤ۔ گھر میں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ مجھے اور ڈانٹ پڑواؤ گی۔"

زینب نے حیرت سے اس کی دیدہ دلیری دیکھی اور اس کے سفید جھوٹ کو بھی۔ سفیان تیزی سے گاڑی سے اترا' اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کی طرف کھینچنے لگا۔

"چھوڑیں مجھے۔" وہ کسمسائی۔

"جلدی چلو ورنہ اور لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ کیا تماشا بنواؤ گی سب کے سامنے۔ میری تو خیر ہے۔ اپنا سوچو۔" اس کی دھمکی واقعی بہت خوفناک تھی۔ تماشے کا سن کر تو اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی اگر تماشے کی خبر بابا صاحب کو ہو گئی تو؟ اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکی اور سیفی کے کھنچاؤ کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ اس کے ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرا ننگا۔

جیسے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بیٹھی۔ سیفی نے دروازہ بند کر کے گاڑی تیزی سے اسٹارٹ کر دی۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی ابھی بھی دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ... آپ کس قدر جھوٹے ہیں۔ کوئی اس قدر فضول جھوٹ بھی بولتا ہے۔"

"محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ میں نے جھوٹ موٹ کسی اجنبی کے سامنے تمہیں بہن کہہ دیا تو کیا تم میری بہن ہو گئیں؟ نہیں نا۔" وہ مزے سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

زینب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی اور بھینی بھینی خوشبو خاصی مسحور کن تھی۔ یہ زینب کی زندگی کا گاڑی میں پہلا سفر تھا۔ وہ بھی اتنی زبردست گاڑی میں۔ نرم بے حد گداز سیٹیں۔ اسے یک بہ یک ہی بہت خوشگوار سا احساس ہوا۔ بہت بہت اچھا لگنے کا احساس۔

اس نے ایک گہرا سانس لے کر ایئر فریشنر کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

"یہ... یہ آپ کدھر جا رہے ہیں۔" گاڑی بازار کے رستے پر جا رہی تھی' وہ گھبرا کر بولی۔

"پہلے تمہیں جوتا تو لے دوں۔ کیا ننگے پاؤں گھر جاؤ گی۔" وہ خاصی بے تکلفی سے بولا جیسے ان دونوں میں پرانی جان پہچان ہو۔

"پلیز' مجھے جوتا وو تا نہیں لینا۔ آپ مجھے گھر چھوڑ دیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"بے فکر رہو۔ میں تمہیں گھر ہی چھوڑوں گا۔ کہیں اور بھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔ پہلے جوتا تو لے لو۔" وہ بے فکری سے بولا۔

"نہیں... مجھے جوتا نہیں لینا۔ مجھے گھر جانا ہے۔ پلیز۔" اس کا رنگ اڑنے لگا تھا۔ "بابا صاحب کو پتا چل گیا تو؟" اس کا خون خشک ہونے لگا۔

"بس دس منٹ لگیں گے۔ لو آگیا بازار اور یہ شو ہاؤس۔ چلو اترو۔ میں تمہیں سینڈل لے دوں۔" گاڑی واقعی بازار کی سب سے بڑی جوتوں کی دکان کے آگے کھڑی تھی۔ زینب سیٹ پر جیسے جم کر بیٹھ گئی۔

"مجھے نہیں اترنا۔"

"عجیب لڑکی ہو۔ ہر کام' ہر بات میں ضد۔ پہلے ادھر سڑک پر ہجوم لگوانے لگی تھیں۔ اب ادھر بازار میں۔ اب میں نے گاڑی روکی ہے تو اس کا مطلب ہے ہم یہاں کچھ خریدنے آئے ہیں۔ میں تمہاری منت کرتا رہوں گا اور تم یونہی اکڑی رہو گی تو آتے جاتے لوگ کیا سمجھیں گے ذرا سوچو۔" اس نے پرانی دھمکی دی۔

"مجھے نہیں پروا۔ آپ مجھے گھر چھوڑ دیں یا پھر میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔" اسے ایک دم سے خیال آیا تو اترنے لگی۔ یہاں سے گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنا چاہا تو نظر اپنے ننگے پاؤں پر پڑی۔ ٹوٹا جوتا تو وہیں چھوڑ آئی تھی۔ اس کا ہاتھ گاڑی کے لاک پر رہ گیا۔

"اترو تو لوگ بھی دیکھیں اور انجوائے کریں کہ یہ لڑکی شاید کوئی کرتب دکھانا چاہ رہی ہے۔ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر۔" وہ اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا' مزے سے بولا۔ زینب کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے

"چلو آؤ شوز لے لو پھر میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔" وہ کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا کیونکہ اب اسے یقین تھا کہ زینب اس کے پیچھے ضرور اترے گی اور واقعی اگلے منٹ وہ دکان کے اندر اس کے ساتھ جوتا پسند کر رہی تھی۔ دیر ہو جانے کے خوف سے جو پہلا جوتا اس کے پاؤں میں پورا آیا اس نے فوراً سر ہلا دیا۔

"یہی ٹھیک ہے۔"

"اوکے۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے وہ اس کی طرف مڑا۔

"تم پہن لو یہ جوتے۔ یوں ننگے پاؤں نکلو گی تو اتنی بڑی شاپ کی بھی انسلٹ ہو گی۔" زینب جو شاپر ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی۔ جلدی سے ڈبہ باہر نکال کر جوتے پہننے لگی۔

"یہ تو بہت مہنگا جوتا ہے۔ میں آپ کے پیسے کیسے واپس کروں گی۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

"قسطوں میں کر دینا۔" وہ اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے بولا۔

"قسطوں میں۔ کیا مطلب؟" وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔

"تھوڑے تھوڑے کر کے دیتی رہنا۔ بھی تو قیمت چکتا ہو ہی جائے گی۔" اس کی بات پر وہ چپ ہو گئی۔

"پیسے دینے کے لیے پھر آپ سے ملنا پڑے گا؟"

"ظاہر ہے۔"

"مجھے نہیں لینا یہ جوتا۔" اس نے فٹافٹ دونوں جوتے اتار دیے۔ سفیان نے ایک نظر اس کے سفید نازک پیروں پر ڈالی۔

"تمہارے پاؤں بہت خوبصورت ہیں۔ ان کی خوبصورتی کا خراج سمجھ لو یہ [illegible] سی جوتی۔" اس نے اتنے رومانٹک انداز میں کہا کہ زینب نے جلدی سے جوتے پہن کر پاؤں سیٹ کے نیچے کر لیے۔

"آپ......" اس سے کچھ کہا نہ گیا تو سر موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"ہم دونوں اچھے دوست بھی تو بن سکتے ہیں۔ دوستی کا پہلا تحفہ سمجھ لو۔" سفیان بولا۔ زینب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "مرد اور عورت میں دوستی؟" پہلی بار اتنی عجیب بات اس نے سنی تھی۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"کیا کریں گے میرا نام جان کر۔"

"ادھار نہیں لیتا جوتوں کی قسط۔ نام پتا ہو گا تو پیسے ملیں گے نا!" وہ مسکرا کر بولا۔

"کچھ کھائیں؟" ایک ریسٹورنٹ کے آگے اس نے گاڑی روک دی اور بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

"نہیں پلیز' خدا کے لیے مجھے گھر چھوڑ دیں۔" اس نے بے ساختہ دونوں ہاتھ سفیان کے آگے جوڑ دیے۔

"اوکے۔ میں ابھی آیا۔" کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بندھے ہاتھ یکسر نظر انداز کر کے۔ گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے آگے کھڑی تھی۔

"آج تو میری موت یقینی ہے۔" زینب نے دل میں سوچا۔

"تو بھئی۔ بڑے مزے کے چکن سینڈوچ ہوتے ہیں ان کے اور ساتھ میں ٹھنڈی ٹھار پیپسی۔" چند منٹوں میں ہی وہ سینڈوچ اور پیپسی کے دو ٹن لیے گاڑی میں آ کر بولا۔

"مجھے نہیں کھانا کچھ بھی۔ پلیز' مجھے گھر چھوڑ دیں' مجھے' بہت دیر ہو چکی ہے۔ میرے بابا صاحب تو مجھے جان سے مار دیں گے۔" وہ اب باقاعدہ رو پڑی تھی۔

"ارے ارے' آپ تو سچ مچ رو پڑیں۔" وہ گھبرا کر بولا۔ "بھئی میں دل کا بڑا کمزور ہوں کسی کے آنسو نہیں دیکھ سکتا اور پونچھنے کا تو بالکل بھی تجربہ نہیں' نہیں تو آج یہ تجربہ بھی کر دیکھوں؟" اس نے زینب کے آنسو پونچھنے کے لیے ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھایا۔ زینب بدک کر پیچھے ہٹی تو وہ ہنس پڑا اور ٹشو باکس سے ٹشو کھینچ کر اسے پکڑا دیا۔ زینب آنکھیں اور چہرہ صاف کرنے لگی۔

"پلیز چلیں اب۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"چلتے ہیں' پہلے آپ کچھ کھا تو لیں۔" وہ اسی ڈھٹائی سے بولا۔

"مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے۔" وہ غصے سے بولی۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں بھی گاڑی اسٹارٹ نہیں کروں گا۔" وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"میں رکھ لیتی ہوں۔ گھر جا کر کھا لوں گی۔ اب تو چلیں۔" اس نے سینڈوچ والا لفافہ اٹھا لیا۔

"اور کولڈ ڈرنک۔" اس نے ٹن اس کی طرف بڑھایا۔ زینب نے ایک گہرا سانس لے کر ٹن پکڑ لیا۔

"اب تو چلیں۔" سیفی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زینب جھنجلا کر بولی۔

"یہ ہاتھ میں پکڑی ہے۔ پیو تو سہی اسے۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"اسی بہانے ہم بھی اپنی آنکھوں کو سکون بخش لیں گے۔ ذرا جو حجاب کے یہ بادل ہٹیں۔ چاند کا نظارہ ہم بھی کریں۔" وہ [illegible] سے بولا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔ زینب اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ سیفی نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

راستہ بھر دونوں خاموش رہے۔

"نہیں کل [illegible]" گھر سے تھوڑی دور پہلے وہ بولا۔

"جی۔ نہیں بالکل نہیں۔"

"میں گاڑی آپ کے گھر کے سامنے لے جاؤں؟"

"نہیں نہیں۔ مروائیں گے مجھے۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"پھر اپنا نام بتاؤ۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"زینب...... زینب عبدالرحمٰن!" وہ دھیمے لہجے میں جلدی سے بولی۔

"بہت خوبصورت نام ہے تمہاری طرح۔" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"زینب! تمہارے گھر فون لگا ہے؟"

"نہیں...... بس یہیں روک دیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ ان کی گلی چند قدموں پر تھی۔

"پھر رابطہ کس طرح ہو گا؟" وہ گاڑی روک کر بولا۔

"مجھے نہیں ضرورت رابطے کی۔" وہ جھلا کر گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی۔

"مگر مجھے تو ہے' اگر تم کل بارہ بجے کالج گیٹ کے آگے نہ ملیں مجھے تو میں تمہارے گھر آ جاؤں گا اور آج کے سفر کی داستان بغیر کسی ترمیم کے آپ کے والد محترم کے گوش گزار دوں گا اور تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا۔"

"آپ۔ آپ پاگل تو نہیں؟" وہ ششدر رہ گئی۔ سفیان کی ڈھٹائی بتاتی تھی' وہ یہ بھی کر گزرے گا۔

"پاگل تھا تو نہیں۔ تمہارے حسن' تمہاری محبت نے کر دیا ہے' تو پھر ملو گی نا؟"

"نہیں۔" وہ سختی سے بولی۔

"تو پھر میں کل تمہارے والد سے مل لوں گا۔ جوتے خریدنے کی رسید وغیرہ سب ہے میرے پاس اور بھی بہت

کچھ۔۔۔''

''بہت کچھ کیا؟'' وہ چونکی۔

''ہم دونوں کی یہ ٹیپ شدہ گفتگو۔'' اس نے گاڑی کے ڈیک کی طرف اشارہ کیا۔ زینب نے بے ساختہ ادھر دیکھا۔ کیسٹ چل رہی تھی اسے لگا آج اس کی زندگی کا منحوس ترین دن ہے۔

''یہ۔۔۔یہ بلیک میلنگ ہے۔''

''یہ محبت ہے۔ تو پھر کل ملو گی نا؟'' وہ پھر بولا تو زینب بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اب اس جال میں پھنسنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ جال بھی وہ جو بہت پرکشش اور بیش قیمت ہے۔ اس کا دل خود متمنی تھا، اس جال میں جکڑے جانے کا۔ وہ گاڑی سے اتر آئی۔

☼ ☼ ☼

''نین تارا! تمہارے شاہ جی۔'' عبدالمبین کی نئی گاڑی کی ڈرائیو سے محظوظ ہوتی نین تارا سے عبدالمبین نے اچانک کہا تھا۔ نین تارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں سے سڑک کے دوسری جانب اشارہ کر رہا تھا۔ نین تارا نے گردن گھمائی۔ شہر کا مہنگا ترین میٹرنٹی ہاسپٹل تھا جس کے مین گیٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے والا وہ شخص یقیناً ''سلطان بخت تھا۔ نین تارا نے آنکھیں سکوڑ کر سلطان بخت کو اندر جا کر غائب ہوتے دیکھا۔

''ایک منٹ موبی یار! گاڑی ادھر روکو ذرا۔ میں ابھی آئی شاہ جی سے ملاقات کر کے۔ میں بھی کہوں۔ اتنے دنوں سے رابطے میں کیوں نہیں آ رہے۔'' وہ کہتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر نیچے اترنے لگی۔

''مبارک باد کے لیے کوئی پھول شول تو لے جاؤ۔ آخر کو تم بھی مالکن ہو۔ دو دو خوبصورت لڑکیوں کی سوتیلی سہی، شاہ جی کی منظور نظر بیوی کی حیثیت سے۔'' عبدالمبین نے جتا کر کہا۔

''او یس۔ مجھے کچھ لے کر جانا چاہیے۔ تھینک یو ری مائنڈ کروانے کا۔''

وہ کہتے ہوئے اپنا شولڈر بیگ جھلاتی باہر نکل گئی۔ عبدالمبین ٹانگیں پھیلا کر سیٹ پر گانے کی دھن بجانے لگا۔ نین تارا نے ہاسپٹل کی برابر میں بنی فلاور شاپ سے للی کے پھولوں کا ایک خوبصورت بکے خریدا اور ہاسپٹل کے اندر آ گئی۔ ریسپشن سے صالحہ کا روم نمبر پوچھا اور پھول سنبھالتی اپنے سراپے کو ناقدانہ نظروں سے جانچتی وہ روم نمبر فائیو کے سامنے کھڑی تھی، چند ثانیے کو اس نے کچھ سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

''یس!'' سلطان بخت کی بھاری آواز سنائی دی۔

''ہیلو شاہ جی!'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی کھنک دار آواز میں سامنے صوفے پر بیٹھے سلطان بخت سے مسکرا کر کہا۔ ایک لحظے کو سلطان بخت کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔

''ہائے ایوری باڈی۔'' اس نے دوسرا اسلام صالحہ کے بیڈ کے بالکل پاس بیٹھی سیدہ کو جھاڑا تھا جن کے ماتھے پر بے شمار بل اسے دیکھ کر ہی آ چکے تھے۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک نین تارا کا جائزہ لے ڈالا۔ بلیک ٹراؤزر پر اس نے جینز کا بلیو کرتہ پہن رکھا تھا۔ کندھے پر لٹکا بیگ۔ شام کے ہلکے پھلکے میک اپ میں بلاشبہ وہ بہت پرکشش نظر آ رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' سیدہ نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کڑے لہجے میں پوچھا۔ صالحہ تکیوں کے سہارے آنکھیں موندے نیم دراز تھی۔ نین تارا کی آمد کے ساتھ ہی اس نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں اور اب حیرانی سے اس الٹرا ماڈرن اجنبی لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس نے بڑی بے تکلفی سے آتے ہی سلطان بخت کو مخاطب کیا تھا۔

''شاہ جی! لگتا ہے، آپ نے میرا تعارف نہیں کروا رکھا۔'' اس نے شکوہ کناں نظروں سے ہونٹ کاٹتے سلطان بخت کو دیکھا۔ وہ کہہ کر آگے بڑھی اور پھولوں کا بکے صالحہ کے تکیوں پر ٹکا دیا۔

''بیٹیاں مبارک ہوں صالحہ سلطان بخت!'' مبارکباد دیتے ہوئے اس نے صالحہ کے خوب پھیلے ہوئے وجود اور

چہرے کا جائزہ لے ڈالا۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر آ چکا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں ہم تم ہو کون؟'' سیدہ جلدی سے بولیں۔

''میرا بھی آپ سے کچھ ایسا ہی رشتہ بنتا ہے۔'' اس نے کن اکھیوں سے صالحہ کو دیکھا اور خواہ مخواہ ہنسی۔ ''ویسے میں شاہ جی کی بڑی پرانی دوست ہوں۔ پرانی سے مراد عمر رسیدہ نہ سمجھ لیجیے گا۔ بہت قریبی اور بہت خاص، کیوں شاہ جی؟'' سلطان بخت کے ضبط کی حد تمام ہو گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''دوست ہو سلطان بخت کی۔ عام یا خاص ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں۔ تمہیں یہاں آنے کی اجازت کس نے دی؟'' سیدہ غصے میں آ چکی تھیں۔

''دوستوں سے ملنے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان سے تو جب دل چاہا مل لیا۔'' وہ لاپروا انداز میں کچھ اٹھلا کر بولی سیدہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

''دیکھو لڑکی! تم جو کوئی بھی ہو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ تم جیسی حسین بلائیں یونہی راہ چلتے دولت مند مردوں کے کندھوں پر سوار ہوئی پھرتی ہیں اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہوتا اور ہو بھی کیسے، وہ تو خود نا معلوم کس بیج کا پھل پھول ہوتی ہیں۔ کدھر آ گتی ہیں، کدھر گرتی ہیں۔ تمہیں سلطان بخت نے ذرا منہ لگایا۔ تم دوست بن بیٹھیں۔ سلطان بخت!'' وہ کڑک کر سلطان بخت سے بولیں۔ ''اپنے اس ''دوستانے'' کی سوغات کو اٹھا کر ہاسپٹل سے باہر پھینک آؤ تو تمہارے اور اس کے حق میں زیادہ بہتر ہو گا۔ تحسین شاہ آنے والے ہیں پھر مجھ سے گلہ مت کرنا۔'' سیدہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھا کر نین تارا کو کمرے سے باہر پھینک دیں۔ سلطان بخت کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''چلو ادھر سے۔'' وہ نین تارا کے قریب آ کر دھیمے مگر غصیلے لہجے میں بولے۔

''جا رہی ہوں چپ چاپ۔ ترس آتا ہے مجھے آپ جیسے لوگوں پر۔ ڈرے ہوئے، خوف زدہ، کھل کر اپنے خوف کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ آپ حسین شاہ سے ڈرتی ہیں اور میں انہیں بھی بتا سکتی ہوں کہ میں کون ہوں۔'' وہ نڈر لہجے میں سیدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''دفع ہوتی ہو تم یہاں سے کہ نہیں؟'' سیدہ چلاتے ہوئے اٹھیں۔

سلطان بخت نے نین تارا کو باہر کی طرف کھینچا۔

''یہ اپنا منحوس تحفہ بھی لے جاؤ۔''

سیدہ نے پھولوں کا بکے اس کی طرف اچھالا جو نین تارا کی کمر سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ نین تارا نے پلٹ کر ایک نفرت بھری نظر سیدہ پر ڈالی دوسرے پل وہ خود کو نارمل کر چکی تھی۔ دروازے کے دوسری طرف بے بی کاٹ پڑے تھے اور خوبصورت سرخ و سفید صحت مند بچیاں گلابی اور پیلے فراکوں میں میٹھی نیند سو رہی تھیں۔

''بیوٹی فل!'' نین تارا رہ نہ سکی تو انہیں دیکھ کر ستائش بھرے لہجے میں بولی۔

''نین تارا! چلو ادھر سے۔'' سلطان بخت نے دروازہ کھول کر اسے باہر دھکیلا۔

''شاہ جی! آپ بڑے قسمت کے دھنی ہیں۔'' وہ باہر نکلتے ہی بولی۔ سلطان بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اصل میں تو وہ نین تارا کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینا چاہ رہے تھے۔ مگر اس کے لیے انہیں تنہائی کی ضرورت تھی اور ہاسپٹل میں اس وقت وزیٹرز کا رش لگا تھا۔

''آپ جیسے لوگ اس دنیا میں بھی مزے میں ہیں اور آخرت میں بھی جنت کے حق دار۔'' وہ چلتے ہوئے بول رہی تھی۔ سلطان بخت نے سختی سے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

''آپ نے بھی سن رکھا ہے اللہ کا وعدہ، جس نے تین بیٹیوں کی پرورش کی وہ جنت کا حق دار ہے۔ چلو جی آپ کو بیٹھے بٹھائے اس دنیا میں ہی اس جنت کا ٹکٹ بھی مل گیا۔'' اسے سیدہ کے ہاتھوں ہونے والی اپنی بے عزتی کا جیسے ذرا بھی ملال نہ تھا۔

"ویسے ایک اور بات بھی ہے۔" اس کی زبان میں مسلسل کھجلی ہو رہی تھی۔ سلطان بخت بس چلتے جا رہے تھے۔ بالکل خاموش لب بھینچے بیرونی دروازے کی طرف۔

"جتنی خوبصورت آپ کی بیٹیاں ہیں ہمارے گھرانوں میں ایسے انمول ہیروں کی پیدائش پر دنوں نہیں مہینوں جشن مناتے ہیں۔ آپ تو خاصے بدذوق..."

"شٹ اپ!" سلطان بخت کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ ایک زوردار تھپڑ اس کے نازک گال پر جما دیا۔ تھپڑ کھا کر نین تارا تو جیسے پتھر کی ہو گئی۔ آتے جاتے لوگ بھی حیرت زدہ ہو کر دونوں کو دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا جناب؟" پاس سے گزرتا ایک لڑکا فوراً رک کر بولا۔ نین تارا گال پر ہاتھ رکھے ڈبڈبائی آنکھوں سے سلطان بخت کو دیکھ رہی تھی۔

"اب جس طرح ادھر آئی تھیں' اسی طرح چلی جاؤ۔ تم زندہ سلامت جا رہی ہو' جا کر اپنی زندگی بچ جانے پر جشن مناؤ ورنہ جو حرکت آج تم نے کی ہے ہاسپٹل آنے کی۔ اس پر تمہارا میرے ہاتھوں سے بچ جانا ہی معجزہ ہے۔ قسمت کی دھنی ہو۔ میں نہیں تم جاؤ اب۔" کہہ کر وہ رکے نہیں۔ تیز تیز قدموں سے واپس پلٹ گئے۔ نین تارا کے قدم تو جیسے ہمیشہ کے لیے زمین میں پیوست ہو چکے تھے۔ اتنے شدید ردعمل کی توقع اسے سلطان بخت سے نہیں تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے کیا حماقت سرزد ہو چکی ہے۔ اور اسے معلوم تھا کہ اس حماقت کی سزا صرف یہ تھپڑ ہی نہیں ہو گا۔ سلطان بخت کا غصہ کیسے ٹھنڈا کیا جائے۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زینب! اٹھو کیا منہ سر لپیٹے پڑی ہو' جب سے کالج سے آئی ہو نیند سوار ہے تمہارے سر پر۔" آمنہ نے تقریباً اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔

"کیا... کیا مصیبت ہے۔ سونے دو مجھے۔" زینب نے جھنجلا کر اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں رات سونے کے باوجود سوجی سوجی تھیں۔

"پہلے تو تم دن میں کبھی نہیں سوتی تھیں۔ آخر آج کیا آفت آئی ہے۔" آمنہ اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"اچھا' اگر پہلے میں کبھی دن میں سوئی نہیں تو کیا میں نے لکھ کر دے دیا ہے کہ میں زندگی بھر کبھی دن میں نہ سوؤں گی۔" وہ جھلا کر اٹھ بیٹھی اور ہاتھوں سے اپنے بکھرے بال سمیٹنے لگی۔

"تم نے کالج سے آ کر کھانا بھی نہیں کھایا ورنہ تو بھوک کی پکار تمہاری سیڑھیوں ہی سے سنائی دینے لگتی تھی۔ آخر معاملہ کیا ہے؟" آمنہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ گڑبڑا کر بال سمیٹتے ہوئے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ پلنگ کے نیچے ذرا جھک کر اپنی چپل دیکھنے لگی۔

"زینب! میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔" آمنہ نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔

"بھئی! معاملہ کیا ہے۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "کالج میں اسپورٹس ڈے کی ریہرسل تھی۔ سارا دن وہی دیکھتے رہے۔ کینٹین تو تمہیں پتا ہے میں پہلے بھی کبھی نہیں گئی۔ پیسے ہی نہیں ہوتے۔ گھر آ کر بھوک تو لگ رہی تھی مگر نیند تھکان کی وجہ سے زیادہ آ رہی تھی۔ اسی لیے بغیر کچھ کھائے پیے سو گئی۔" وہ وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

"اور سچی بات کہوں؟" آمنہ رکی۔ "تم تو مجھے سوئی ہوئی بھی نہیں لگ رہیں۔" آمنہ کی نظریں جیسے اس کے وجود کے آرپار جا رہی تھیں۔

"اچھا تو میں کیا خوامخواہ جھوٹ موٹ لیٹی تھی۔ اپنی بھوک کو دھوکا دے کر۔" وہ تنک کر بولی۔ "اٹھو اور میرے لیے کچھ کھانے کو لاؤ۔" وہ پھر سے سر جھکا کر اپنی چپل تلاشنے لگی۔

"زینب! یہ جوتا کس کا ہے؟" آمنہ کا دوسرا سوال بھی گڑبڑا دینے والا تھا حالانکہ زینب نے بہت احتیاط سے دبے پاؤں کمرے میں آ کر جوتا پلنگ کے بالکل نیچے رکھا تھا۔ آمنہ کی عقابی نظروں نے پھر بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

"کک... کون سا جوتا؟" وہ ہکلائی۔

"جو تم کالج سے پہن کر آئیں۔ پلنگ کے نیچے پڑا ہے۔" وہ سکون سے بولی۔

"وہ... وہ..." زینب نے ایک پل کو سوچا۔ "شازیہ کا ہے۔"

"کون شازیہ؟" آمنہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"میری کلاس فیلو۔"

"تم اس کا جوتا کیوں پہن کر آئیں؟"

"میرا جوتا ٹوٹ گیا تھا اس کے گھر کے قریب تو اس نے مجھے اندر سے اپنا جوتا لا دیا۔ آخر تم اس قدر انکوائری کیوں کر رہی ہو؟" وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہاری کلاس فیلو اس قدر امیر ہے کہ اس نے تمہیں اندر سے اپنا نیا کور جوتا لا دیا جس پر سے قیمت کا اسٹیکر بھی وہ اتارنا بھول گئی تھی۔ آٹھ سو کا جوتا اور اس نے اٹھا کر تمہیں دے دیا' وہ بھی بغیر پہنے۔" آمنہ نے جھک کر جوتا پلنگ کے نیچے سے نکالا اور زینب کے آگے کر دیا۔

"تو... اس میں حرج کیا ہے؟ اس نے مجھے ایک دن کے لیے دیا ہے۔ کوئی ساری عمر کے لیے تو نہیں۔" زینب چڑ کر بولی۔

"زینب! جھوٹ مت بولو۔ کوئی اپنا اتنا قیمتی نیا جوتا کسی کو یونہی ایک دن کے لیے پہننے کے لیے نہیں دیتا۔ معاملہ کیا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہو چکا ہے۔ کوئی معاملہ نہیں ہے۔ چار بچوں کو پڑھانے سے تم خود کو بہت افلاطون سمجھنے لگی ہو جیسے ساری دنیا تمہیں چکر دے رہی ہے اونہہ!"

وہ باہر جانے لگی۔ آمنہ کو اس کے انداز خاصے بدلے بدلے سے نظر آ رہے تھے۔

"زینب! ادھر آ کر بیٹھو میرے پاس۔" آمنہ نے ٹھنڈے لہجے میں اسے پکارا۔

"میں نہیں آ رہی۔ کھانا کھانے جا رہی ہوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ رکے بغیر بولی۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔ میں وہی تو تمہیں سنانے آئی تھی مگر تمہارے انداز نے مجھے الجھا دیا۔"

"کیسے انداز..." زینب ٹھٹک کر رک گئی۔

"پھر بتاؤں گی' پہلے ادھر آؤ۔" وہ صاف ٹال گئی۔

"اس کا مطلب ہے آمنہ کی گرفت میں میری کوئی غلطی' کوئی کمزوری آ چکی ہے۔" وہ دل میں سوچتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

"ہاں بولو۔" وہ کھڑے کھڑے لٹھ مار انداز میں بولی۔

"یہ دیکھو۔" آمنہ نے اپنے دوسرے ہاتھ کو آگے کیا۔ اس کے ہاتھ میں کسی آڈیو کیسٹ کا کور تھا۔

"یہ کیا ہے؟" زینب نے جھک کر کور پکڑ لیا۔

"دیکھو۔" آمنہ نے گہرا سانس لیا۔

"مست ملنگ... مست... مولی والیوم ٹو۔" وہ کور سے پڑھتے ہوئے بولی دوسرے لمحے اس کی نظریں لفظوں سے پھسل کر سنگر کی تصویر پر جا رکیں۔

"آمنہ... یہ تو..." وہ اٹکی۔ نظریں مسلسل تصویر پر جمی تھیں "عبدالمبین۔"

"ہاں وہی ہے۔" آمنہ نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

"مبین کی کیسٹ' بھائی کی۔" وہ جوش میں آ گئی۔ "گانے کون سے ہیں۔" وہ کور الٹ کر پڑھنے لگی۔

"کیسٹ کدھر ہے؟" کور اندر سے خالی تھا۔

”یہ میں اپنی کولیگ سے لائی ہوں۔ وہ آج اسکول میں اپنی فرینڈز کو دکھانے لائی تھی۔ اسٹاف روم میں دونوں دیکھ رہی تھیں۔ میری نظر پڑی تو مجھے شک سا ہوا۔ میں نے غور سے کر دیکھا تو عبدالمبین تھا۔“ آمنہ نے تفصیل بتائی۔

”تو مبین نے اپنی منزل پالی۔ مولی!“ زینب دبے دبے جوش سے بولی وہ پھر سے کور اٹھا کر تصویر دیکھ رہی تھی۔

”آمنہ! مبین اتنا خوبصورت ہے ہینڈسم ڈیشنگ، دیکھو تو۔“ اس نے تصویر آمنہ کے سامنے کی۔

”ہاں ہے تو۔“

”بھائی کتنا اچھا لگ رہا ہے اور اب تو مشہور بھی ہو گیا ہے۔ لڑکیاں مرتی ہوں گی اس پر۔ پیسہ بھی خوب آگیا ہوگا۔ ادھر تو اس نے کتنے مہینوں سے چکر نہیں لگایا۔“ وہ یک ٹک تصویر کو تکے جا رہی تھی۔

”ہاں فرحت وغیرہ بتا رہی تھیں۔ آج کل یہ کیسٹ بازار میں ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے بلکہ ادھر تو شارٹ ہے۔ اس کے بھائی نے لاہور سے اسے لا کر دی ہے۔ ہر طرف مبین کے گانوں کی دھوم مچی ہے۔ راتوں رات وہ ایک جگمگاتا اسٹار بن چکا ہے۔ اس نے کور مجھے بڑی مشکل سے دیا تھا۔“ آمنہ کچھ افسردہ سی تھی۔

”تم نے بتایا 'یہ ہمارا بھائی ہے۔'“ زینب عجیب سرخوشی کے عالم میں تھی۔

”نہیں۔“

”پاگل ہو تم! بتا دینا تھا۔ تمہاری ٹور بن جاتی ایک دم سے 'تم نے وی آئی پی بن جانا تھا۔ میں اماں جی کو دکھا کر آؤں۔“ وہ کور لے کر پلٹنے لگی۔

”احمق مت بنو! انہیں دکھ ہوگا۔“ آمنہ نے اس کا بازو کھینچا۔

”اس۔۔۔ مشہور ہو جانے کا دکھ۔ ان کا بیٹا پاپولر ہو گیا' راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے' دکھ اس میں کہاں سے آگیا؟“

”زینب! ہوش کرو' وہ بھانڈ میراثی بن گیا۔ یہ اماں جی کے لیے خوشی کی بات ہوگی؟ کیا ہماری نسلوں میں کسی نے یہ ڈگڈگی بجانے 'گانے ناچنے کا کام کیا ہے جو یہ عبدالمبین۔۔۔ عبدالمبین نے خاندان کی عزت کو بٹا لگا دیا۔ اماں جی تو صدمے سے بستر سے اٹھ نہیں سکیں گی۔ پہلے ہی وہ بہت پریشان ہیں۔“

”آمنہ! یہ تم کس زمانے کی بات کر رہی ہو۔ عزت کو بٹا لگا دیا۔۔۔ کون سی عزت یہ۔۔۔ یہ ہے عزت۔“ اس نے ہاتھ پھیلا کر دیواروں اور لکڑی کے شہتیروں والے ڈربے نما کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ۔۔۔ یہ عزت۔“ اس نے سیمنٹ کے اکھڑے فرش' سال خوردہ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کو بھلا کیا بٹا لگ سکتا ہے میری بہن!“ وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

”اس عزت کو تو کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہ خریدے' کباڑیے بھی اس عزت کو دیکھ کر منہ پھیر کر چل دیں۔ تم کس دنیا میں رہ رہی ہو۔“

”عزت اینٹ گارے' لکڑی تانبے یا کاغذ کے رنگ برنگے نوٹوں میں نہیں ہوتی۔ عزت تو نسلوں کی کمائی ہوتی ہے جسے یہ گانے بجانے والے نوٹوں کی بوریاں دے کر بھی نہیں خرید سکتے۔ خرید سکتے ہوتے تو شرفاء کی آبادیوں سے دور الگ تھلگ بڑے بڑے محلوں' کوٹھیوں میں نہ رہ رہے ہوتے۔“ آمنہ جواباً بولی۔

”اونہہ! پاگل ہو تم۔“ زینب بے تاثر لہجے میں بولی۔ ”میں جویریہ کو بتانے جا رہی ہوں' تم اس عزت کو سوچ کر خوش ہوتی رہو۔“ وہ کور لے کر جانے لگی۔

”زینب! جب بابا صاب کو پتا چلے گا تو؟“ آمنہ اٹھ کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کے سوال پر زینب بھی چپ سی ہو گئی۔ دوسرے لمحے کندھے اچکا کر باہر نکل گئی۔

اور اسی شام صوفی صاحب ٹیوشن پڑھا کر نکلے تو انہیں یاد آیا۔ آمنہ نے آتے ہوئے کہا تھا کہ ”چاول نہیں ہیں' آتے ہوئے لیتے آئیں۔“ وہ چاول لینے کے لیے رستے میں رکے تھے۔ کریانے والے کی دکان کے ساتھ ہی

میوزک سینٹر تھا اور ڈیک پر لگے تیز بے ہنگم میوزک کا شور سارے بازار میں گونج رہا تھا۔ پاس کی دکانوں پر کھڑے گاہکوں کو دو دو تین تین بار اپنی ڈیمانڈز دہرانی پڑ رہی تھیں۔ صوفی صاحب نے بھی میوزک میں مست دکاندار کو دوبار اونچی آواز میں آدھا کلو چاولوں کا کہا تھا' تب اس نے سنا تھا۔

”لاحول ولا قوۃ۔۔۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اس شیطانی چرخے نے ساری خدائی کو جیسے جکڑ لیا ہے۔ کسی کو بھی اس شورِ قیامت سے وحشت نہیں ہوتی۔“ وہ منہ میں بڑبڑائے اور گردن گھما کر میوزک سینٹر کی دکان کو گھورنے لگے جو یہ صورِ اسرافیل پھونک رہی تھی۔

دکان کی راہداری کو گھورتے گھورتے ان کی نظریں دکان کے شیشے کے دروازے میں لگے بڑے سے پوسٹر پر جا رکیں۔

”مست ملنگ و مست۔“ بہت بڑا بڑا لکھا تھا اور اس سے بڑی۔۔۔ بہت بڑی نیچے تصویر لگی تھی۔ ان کی نظریں اس تصویر تک پہنچیں تو جیسے پتھرا سی گئیں۔

”عبدالمبین!“ ان کے لب پھڑپھڑائے۔ آنکھیں جیسے باہر ابلنے کو تھیں۔

”یہ عبدالمبین۔“ وہ خود کو یقین دلانے والے انداز میں بڑبڑائے۔

سینے سے ہوتی ہوئی بائیں بازو میں ہاتھ کی انگلیوں تک درد کی ایک تیز لہر اٹھی تھی۔

”یہ لیں صوفی صاب چاول!“ دکان دار نے شاپر ان کے آگے کیا۔ انہوں نے اجنبی نظروں سے دکان دار کو دیکھا۔ ان کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔

”خیر تو ہے صوفی صاب! کیا ہوا؟“ دکان دار نے ان کے چہرے کو دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔“ انہوں نے بمشکل انگلی سے اس پوسٹر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ پوسٹر جی!“ وہ بولا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ مولی ہے جی! بڑا غضب ہے۔ اللہ نے بڑا گلا دیا ہے اسے 'کیا آواز ہے۔ جادو ہے جادو۔ راتوں رات شہرت کی ساری سیڑھیاں پھلانگ گیا ہے۔ ہاتھوں ہاتھ اس کی کیسٹ بک رہی ہے۔ بڑا قسمت کا دھنی ہے۔ اسی کا گانا تو لگا ہوا ہے ڈیک میں۔ اچھا میوزک ہے نا۔ آپ نے لینی ہے کیسٹ تو لا دوں جی!“ آخر میں وہ جیسے ان سے مذاق کرتے ہوئے بولا۔ شور کی وجہ سے وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ ان کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

”مم۔۔۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“ کہہ کر وہ اس کا جواب سنے بغیر باہر پڑے اسٹول پر بیٹھ گئے۔ ان کا سر چکرا رہا تھا مگر سینے کا درد۔۔۔ درد کی لہریں انہیں بے حال کر رہی تھیں۔

”یہ۔۔۔ یہ دونوں بیٹے میری جان لے کر ہی ٹلیں گے۔“ وہ سینے کو دباتے ہوئے خود سے بولے۔ میوزک کا شور ان کے سر پر پتھر کوٹنے والے انجن کی طرح گڑ گڑ گزر رہا تھا۔

❋ ❋ ❋
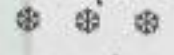
”کنوارا باپ' آج کی نئی شاہکار فلم جسے ایک بار دیکھیں اور پھر بار بار دیکھنے آئیں۔“ وہ اس کی شکل دیکھتے ہی باآوازِ بلند بولی تھی۔

”شٹ اپ مشی!“ معاذ نے کچھ غصے سے کہا۔

”غلط تو نہیں کہہ رہی۔ یہ بالشت بھر کا بچہ تمہیں 'بابا' کہتا ہے اور تم کسی شفیق باپ کی طرح اس پر نہال ہوئے جا رہے ہو۔ دیکھنے والوں کو تو یہی یقین ہو جائے گا کہ باپ سے کس درجہ الفت ہے بچے کو اور ہم جیسے دل میں کنوارا باپ جیسی شاہکار فلم بنانے کا منصوبہ سوچتے رہیں گے اور یہ ہمارا خون جلاتے رہیں گے۔“ وہ دل جلے انداز میں بولی۔ معاذ ارتضیٰ کا ہاتھ پکڑ کر پیلی گرافی کی کاپی میں ایلفابیٹس کی مشق کرا رہا تھا۔

”سوچتی رہو' سوچتے رہنے میں کیا حرج ہے۔ اکثر رکشہ ویگنوں پر لکھا ہوتا ہے نا 'جلنے والے کا منہ کالا۔“ وہ اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

"ناٹ یو شٹ اپ۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"ارتضیٰ جانو! آپ دادو کے پاس جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔" ارتضیٰ حیران چہرہ لیے معاذ اور مشی کے مکالمے سن رہا تھا۔ معاذ کے کہنے پر سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

"اس کو کمرے سے باہر مت بھیجو۔ کچھ دیر کے لیے جب میں تمہارے پاس آتی ہوں تو اسے اپنے دل اور دماغ سے باہر بھیج دیا کرو۔" وہ تپے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی۔

"دل اور دماغ سے میں ارتضیٰ کو نکال دوں؟ امپاسبل۔" وہ پنسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ "ہاں بہتر ہے جب میں اور ارتضیٰ بیٹھے ہوں تم ادھر آنے سے گریز کیا کرو۔"

"اور اگر میں یہ وعدہ کر لوں تو میرا خیال ہے۔ تم واش روم بھی اس ننھی بلا کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔" وہ دانت کچکچا کر بولی۔

"یو آر رائٹ۔" وہ مسکرایا۔

"معاذ!" وہ چلائی۔

"کیوں اپنا خون جلا رہی ہو۔ یہ معصوم تمہیں کیا کہتا ہے؟"

"وہ مجھے کچھ نہیں کہتا اور کہہ بھی نہیں سکتا مگر تم تو وہ کہو جس کے لیے میں دن رات تمہارے پیچھے خوار ہو رہی ہوں۔" وہ بلا جھجک بولی۔

"خوار بھی تم اپنی مرضی سے ہو رہی ہو، میرے کہنے سے نہیں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "اور میں تمہیں بتاؤں۔ اس خواری میں تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا، سوائے مایوسی اور فرسٹریشن کے۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"تم جتنا جی چاہے مجھے مایوس کرو مگر میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ تمہاری محبت اب میری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔"

"فلمیں کم دیکھا کرو جنٹل لیڈی! اور ایکسکیوزمی! مجھے ذرا ام جان سے کام ہے، راستہ دیں گی آپ!" وہ دروازے میں اس طرح کھڑی تھی کہ اسے ہٹائے بغیر معاذ باہر نہیں جا سکتا تھا۔

"ام جان کے پاس نہیں بلکہ یوں کہو اس شیطان کے بغیر چند لمحوں میں تمہارا دم الجھنے لگا ہے۔" وہ جل کر بولی۔

"تم اس سے اس قدر جیلس کیوں ہوتی ہو؟"

"اس کے ماں باپ نے اس کی پروا کی جو تم اس کے لیے مرے جا رہے ہو۔"

"اس کے ماں باپ نے میری تو پروا کی تھی نا۔ ان کی اسی پروا، اسی محبت کا تو قرض ہے۔ جس سے میرے کندھے جھکے ہوئے ہیں اور مجھے ان کے جگر گوشے کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔" وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

"تم اس بچے کی آڑ لے کر کب تک مجھ سے گریزاں رہو گے۔"

"تاعمر۔" وہ بلا توقف بولا۔

"اور اگر یہ ہی نہ رہے تو۔" وہ سنگ دلی سے بولی۔

"مشی!" معاذ کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا۔ "سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ یہ بچہ میری جان ہے، شہباز بھائی اور نزہت آپی کی میرے پاس امانت اور میں اس امانت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کروں گا، سمجھیں تم۔" وہ غصے سے بولا۔

"بہت سر چڑھ کر بول رہا ہے، اس بالشتیے کی محبت کا بھوت اتار دوں گی، دیکھنا تم۔" وہ دھمکی دیتے ہوئے واپس مڑ گئی۔

"پاگل، احمق پتا نہیں میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔" وہ اس کے جاتے ہی بڑبڑایا۔

اسے تو آج بھی وہ راتیں یاد تھیں، جب ارتضیٰ ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ایک دو ماہ بعد ہونے والا

تھا تو رات کو بہت رویا کرتا تھا۔ اکثر اس کی آنکھ ارتضیٰ کے رونے سے کھل جایا کرتی تھی۔ وہ بے چین ہو کر نزہت کے کمرے کے دروازے تک تو جاتا مگر اندر جانے کی خود میں ہمت نہ پاتا تھا۔

"نزہت! ارتضیٰ رات کو اس قدر کیوں روتا ہے؟" ام جان نے کئی دفعہ نزہت سے دریافت کیا۔ وہ اکثر گول مول جواب دیتی یا ٹال دیتی۔ اس دن ناشتے کے دوران بھی ام جان نے یہی پوچھا تھا۔

"میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"ایں!" مسز خان کے ہاتھ سے سلائس پلیٹ میں جا گرا۔ "وہ کیوں، ابھی تو وہ سال کا بھی نہیں ہوا۔"

"آپ کو آسانی ہو گی۔" وہ اسی انداز میں بولی۔

"کیوں، تم کہیں جا رہی ہو خدانخواستہ اسے چھوڑ کر جو ہماری آسانی کا سوچ رہی ہو؟ اوٹ پٹانگ باتیں۔" وہ آخر میں منہ میں بڑبڑائیں۔

"جا بھی تو سکتا ہے۔" نزہت کا چہرہ ہنوز بے تاثر تھا۔

معاذ بہت گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم!" مسز خان نے کڑے لہجے میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، آپ کو پریشانی نہیں ہو گی بلکہ شاید آپ کی ساری پریشانیاں ہی تمام ہونے کو ہیں۔" اس کا لہجہ مبہم سا تھا اور انداز پراسرار۔

"نزہت! مطلب کیا ہے تمہارا؟ میں قطعاً نہیں سمجھی۔" مسز خان پریشان ہو کر بولیں۔

"سمجھ جائیں گی، آپ ناشتہ تو کریں۔" اس نے فوراً بات پلٹی۔

"آپی! میرا تو خیال ہے ارتضیٰ کی سالگرہ کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ اگلے ماہ تو اس کی برتھ ڈے ہے۔" معاذ نے موضوع بدلا تھا۔

"ہاں تو تم کرو۔" وہ چائے کا کپ یونہی ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

"کیوں، آپ نہیں کریں گی؟"

"تم جو ہو اس کا.... سب.... کچھ.... بہت کچھ....." وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"نزہت! یہ کیا کہا تم نے اللہ رکھے ارتضیٰ کے ماں باپ ہیں اور....." مسز خان نے فوراً اسے ٹوکا تھا۔

"اور وہ رات....."

فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے اس کی سوچ کے ارتکاز کو توڑا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر کوریڈور میں رکھے فون کی طرف بڑھا۔

• • •

"آج تمہارا آف ہے؟" رعنا کو خلاف معمول گھر پر دیکھ کر فخر حیات نے پوچھا۔

"ہاں، ہفتے میں تین دن تو جانا ہوتا ہے۔ آج ویسے آف تو نہیں تھا۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، اس لیے نہیں گئی۔" وہ کسل مندی سے کہہ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"خیریت۔" فخر حیات نے اپنے سامنے پڑی فائل سے نظریں ہٹا کر رعنا کا بغور جائزہ لیا۔ وہ چہرے سے واقعی تھکی تھکی سی نظر آ رہی تھیں۔

"ویسے ہی کچھ تو سر میں درد تھا، کچھ دل نہیں چاہ رہا تھا۔" رعنا نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑا میگزین اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔

"سیفی چلا گیا فیکٹری؟"

"نہیں، تیار ہو رہا ہے بس جانے والا ہے، آپ نہیں گئے آفس؟"

"نہیں، آج یو کے سے ایک ڈیلی گیشن آ رہا ہے۔ ایک بجے کے قریب ان کی فلائٹ ہے۔ انہیں ریسیو کرنے

ایرپورٹ جانا ہے۔ پہلے لنچ کے لیے ہالی ڈے ان لے کر جانا ہے پھر میٹنگ ہے پھر چیمبر کے پریذیڈنٹ کی طرف سے انوائیٹڈ ہیں وہ لوگ۔ بہت دیر ہو جائے گی آج تو شاید گھر آتے آتے بھی۔" انہوں نے پیپر پر نظریں دوڑاتے ہوئے تفصیل بتائی۔

"یعنی آج آپ کا بزی ڈے ہے؟"

"بالکل۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"اچھا میں نے تو سوچا تھا۔" وہ چپ ہو گئیں۔

"کیا؟" فخر حیات نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "کیا سوچا تھا؟"

"آج کا دن آپ کے ساتھ گزاروں گی' لنچ باہر کریں گے یا پھر ڈنر۔"

"تم نے پہلے پوچھا ہی نہیں' ورنہ میں تمہیں بتا دیتا۔ چلو کل سہی۔ کل تو میں بالکل فارغ ہوں گا۔ آفس سے بھی جلدی آ سکتا ہوں لنچ کے لیے۔"

"نہیں' کل تو ہماری بھی میٹنگ ہے۔ مجھے اپنے اسکول کی پروگریس رپورٹ پیش کرنی ہے۔ مارننگ میں اسکول کا بھی وزٹ کریں گی ہماری پریذیڈنٹ صاحبہ' کل تو مشکل ہے۔"

"تو تم آج چلو میرے ساتھ' سارا دن ہمارے ساتھ رہو' اچھا لگے گا تمہیں۔" انہوں نے آفر کی۔

"اوہ نہیں' آپ کی بزنس ڈیلنگز نری سردرد ہوتی ہیں۔ مجھے تو اس فراخدلانہ آفر سے باز ہی رکھیں۔" رعنا نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ دیے۔

"ایزیو لائیک۔ یہ سیفی تیاری میں ہی آدھا دن لگا دیتا ہے' کام کیا کرتا ہو گا ادھر۔"

"آپ خود بھی چیک رکھا کریں نا۔ ہفتے میں ایک آدھ دن فیکٹری کا وزٹ کیا کریں۔ ابھی وہ نا تجربہ کار ہے۔"

"بھئی! میں اکیلا بندہ کدھر کدھر دیکھوں۔ تم چکر لگا لیا کرو۔" وہ فائل کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

"میں تو لگا لیتی ہوں چکر مگر مجھے ان کاموں کا تجربہ نہیں۔"

"تجربہ بھی آتے آتے آتا ہے۔ ویسے اب سیفی صحیح کام کر رہا ہے۔ میرا کانٹیکٹ اس کے منیجر سے رہتا ہے۔ میں کہتا تھا نا' تین چار سال ابروڈ لگا آئے گا تو سدھر جائے گا۔ تعلیم بھی مکمل ہو گئی اس کی اور دھیان بھی بٹ گیا۔ دیکھا آکر دوبارہ نام لیا فرزین کا؟" فخر حیات نے کہا۔

"ہاں' یہ بات تو ہے۔ ویسے بھی آتے ہی فیکٹری میں جت گیا ہے۔ ذہن اس کا ادھر ہی لگ گیا۔ بھابھی جان کی طرف ویسے بھی کم ہی گیا' جب سے باہر سے آیا ہے' فقط دو بار ادھر گیا ہے بلکہ بھابھی جان گلہ کرتی ہیں کہ سیفی سے کہو' آ کر مل جائے۔"

"وہ خود جو آ جاتی ہیں ہر دوسرے دن ملنے۔"

"ان کی تو پرانی عادت ہے۔ ویسے ہمیں بھی اب سوچنا چاہیے۔"

"کس بارے میں؟" انہوں نے فائل بند کر دی۔

"سیفی کی شادی کے بارے میں۔ اب تو وہ سیٹل ہو گیا ہے۔"

"ابھی ایک آدھ سال ٹھہر جاؤ۔ بزنس میں قدم جما لینے دو اسے۔ شادی کے جھمیلے کے لیے تو عمر پڑی ہے۔"

"میں کون سا ابھی کرنا چاہ رہی ہوں۔ لڑکی ڈھونڈنے میں' پسند کرنے میں وقت لگتا ہے۔ منگنی کر دیں گے' ایک آدھ سال میں شادی۔" رعنا جوش سے بولیں۔

"تم لڑکی پسند کرنے کے منصوبے بنا رہی ہو' کیا پتا صاحبزادے پہلے سے کسی کو پسند کر بیٹھے ہوں اور تمہیں زحمت ہی نہ کرنی پڑے' اس لیے لڑکی کی تلاش میں نکلنے سے پہلے سیفی سے ضرور پوچھ لینا۔ آ گیا ہے تیار ہو کر' بہتر ہے ابھی پوچھ لو۔"

سامنے سے سیڑھیاں اتر کر آتے سیفی کو انہوں نے دیکھ کر کہا۔ چاکلیٹ کلر کی شرٹ کے ساتھ بلیک ٹو پیس

میں وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ رعنا نے دل ہی دل میں بیٹے کی نظر اتاری۔ اس کے لاؤنج میں آتے ہی لاؤنج خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔

"ماشاء اللہ۔ میرا بیٹا تو بہت پیارا لگ رہا ہے' اپنی نظر اتار کے جانا۔ رستے میں کسی فقیر کو کچھ پیسے دے جانا۔" رعنا نے پیار بھرے لہجے میں سیفی سے کہا۔

"تھینکس ماما! آپ دونوں آج گھر پر ہیں۔"

"نہیں بھئی! میں تو جا رہا ہوں تیار ہونے' تمہاری ماما البتہ آج گھر پر ہیں۔ چاہو تو انہیں گھر پر رہ کر کمپنی دے سکتے ہو۔" فخر حیات اٹھتے ہوئے بولے۔

"اوہ سوری' میرا تو ابھی فیکٹری پہنچنا ضروری ہے۔ آل ریڈی آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔" اس نے عجلت میں گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور جانے لگا۔

"یہ کیا تم ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو' دو گھڑی میرے پاس بیٹھ جایا کرو۔" رعنا نے کہا۔

"سوری ماما! پھر سہی' مجھے دیر ہو رہی ہے۔ رستہ بھی تو گھنٹہ بھر کا ہے' اوپر سے ٹریفک' اللہ کی پناہ۔ اللہ حافظ۔" کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

"اچھا بھئی بیگم! ہم بھی چلے تیار ہونے۔" فخر حیات' رعنا کا جواب سنے بغیر لاؤنج سے چلے گئے۔

"حد ہے۔ میں ہی فارغ ہوں ادھر۔" رعنا جھنجلائیں۔ "میرا خیال ہے یوں بیکار گھر میں پڑے رہنے سے بہتر ہے' آج پارلر چلا جائے۔ فیشل کروا لیتی ہوں اور بالوں کا کلر بھی چینج کروا لیتی ہوں۔ بہت دنوں سے یہ معاملہ بھی ٹل رہا ہے۔" خود سے کہتے ہوئے رعنا اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

سیفی گاڑی چلاتے ہوئے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

"اگر چھٹی ہو چکی ہو' جو کہ لازمی بات ہے' اس نے میرا انتظار نہ کیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اف یہ ٹریفک۔" سڑک پر گاڑیوں کی لمبی قطار تھی جو رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ سیفی کا ہاتھ مسلسل ہارن پر تھا۔ اس کے آگے پیچھے گاڑیوں والے اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا۔ اس کی گاڑی کالج کے مین گیٹ کے پاس پہنچی۔ اکا دکا لڑکیاں باہر نکل رہی تھیں۔ چھٹی ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے وہ جا چکی ہے۔" اس نے مایوسی سے گاڑی موڑی اور آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے پچھلی سڑک کی طرف نکل آیا۔ سامنے ہی زینب سست روی سے جا رہی تھی' بالکل اکیلی۔

سیفی کے دل کی کلی کھل گئی۔

• • •

"مبارک ہو' مبارک ہو ہاشم بھائی! آپ کو بھی اور سیدہ بھابھی! آپ کو بھی۔" انگوٹھی پہنانے کی رسم ہوتے ہی حاضرین میں سے تقریباً سب ہی نے بلند آواز میں مبارک باد دی تھی۔

"شکریہ' شکریہ۔" سیدہ اور ہاشم نے مسکرا مسکرا کر جواب دیا۔ سلطان بخت بہت ریزرو بیٹھے تھے اور شہرینہ گھونگھٹ کی آڑ میں کوفت زدہ تھی۔ لائٹ پرپل اور زنک کلر کے کامدانی قیمتی سوٹ میں اگرچہ اس کا پورا وجود دوپٹے میں اچھی طرح سے چھپا ہوا تھا مگر اس کے باوجود دیکھنے والوں کو نظر آ رہا تھا کہ یہ کلر' یہ سوٹ اس پر کس قدر جچ رہا ہے اور دیکھنے والے کچھ تو دل ہی دل میں اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اور کچھ افسوس۔ رشک کرنے والوں کو ہاشم بخاری کی لمبی جائیداد' تین شہروں میں عالیشان کوٹھیاں اور تین کارخانوں کی تفصیل نظر آ رہی تھی اور جو افسوس کر رہے تھے' وہ ہاشم بخاری اور شہرینہ کی عمروں میں اتنے بڑے فرق کو دیکھ رہے تھے۔

"بیچ بیچ..... بیچاری۔" ایک دو نے تو ہیں افسوس سے کہہ ڈالا۔

"رسم ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے شہرینہ کو کمرے میں بھیج دیتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنر شروع کرواتے ہیں۔"

سیدہ نے سلطان بخت اور حسین شاہ سے مشورہ لیا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو سیدہ نے شہرینہ کے پاس بیٹھی حنا کو اشارا کیا اسے لے جانے کا تو وہ شہرینہ کا بازو تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاشم بخاری نے بھرپور نظروں سے اس کے سانچے میں ڈھلے نازک بدن کو دیکھا تو ان کی گردن میں جیسے اور کلف آگیا۔ شہرینہ جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اس نے دوپٹہ نوچ کر سامنے بیڈ پر اچھال دیا۔

"یہ کیا؟" حنا حیرانی سے بولی۔ "اتنی پیاری تو لگ رہی تھیں، مجھے ڈھنگ سے دیکھنے بھی نہیں دیا۔"

"شٹ اپ۔" شہرینہ غصے سے چلائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "جاؤ تم یہاں سے۔" اس نے حنا کو تقریباً "دھکا دے کر کمرے سے باہر دھکیل دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر دروازے کے ساتھ لگی کھڑی رہی پھر بیڈ پر گر کر رونے لگی۔

"دیکھا بابا جان! میرے بھائی، بہن نے میرے ساتھ کیا کیا؟ اسی سالہ بڈھے کو میرے پلے باندھ دیا۔ دیکھ لی میں نے ان کی محبت۔" روتے روتے وہ جیسے سبطین شاہ کی روح سے مخاطب ہو کر بولی۔

"میں ان سے اس زیادتی کا ایسا بدلہ لوں گی کہ یہ یاد کریں گے۔ میں کبھی بھی اس بڈھے کے ساتھ رخصت نہیں ہوں گی۔ آپا! میں آپ کو اس زبردستی کا مزہ ضرور چکھاؤں گی۔" وہ کہتے ہوئے غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور الماری کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگی۔

"میرا موبائل۔" اسے موبائل نہیں مل رہا تھا۔ "اوہ وہ تو میں رات کو اسٹڈی میں چھوڑ آئی تھی۔

"ہیلو... ہیلو... میں شہرینہ۔"

"کیسی ہو کولی مارو۔ سنو میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔" وہ چھوٹتے ہی بولی تھی۔

"ہاں ہاں، ابھی کر سکتے ہو تو میں ابھی تیار ہوں۔"

"پاگل نہیں ہوئی۔ پورے ہوش و حواس میں بول رہی ہوں۔" وہ کچھ غصے سے بولی۔

"منگنی کر دی ہے انہوں نے میری اس اسی سالہ بڈھے کے ساتھ اور [illegible] ہوں۔ میں اس کے ساتھ رخصت ہو کر جانے سے بہتر زہر کھا لینا سمجھتی ہوں۔ سنا [illegible]" وہ غصے سے [illegible] رہی تھی۔

"تم جو کہنا چاہتے ہو کہو میں سن رہی ہوں۔"

"ہاں، عمل کرنے کے لیے بھی تیار ہوں، اسی لیے تو تمہیں فون کیا ہے۔" وہ دوسری طرف عبدالمعین کی بات غور سے سننے لگی۔

"معین! میں بہت ڈیپریس ہوں، بہت پریشان۔ آپا جان اور لالہ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے میری رائے تک نہیں لی۔ میرے انکار کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ میرے چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر یوں میری انگلی میں منگنی کی انگوٹھی ڈلوا دی جیسے کسی گائے بکری کو کھونٹے سے باندھتے ہیں۔" وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"میں نے تم سے محبت کی ہے، دلہن بھی تمہاری بنوں گی۔"

"روپ... تمہیں اس وقت میرے روپ کی پڑی ہے۔ میں اپنے اس روپ کو آگ لگا دوں گی جو تمہارے علاوہ کسی اور کے لیے ہو۔ سن رہے ہو تم۔" وہ دھیمی آواز میں چلائی۔

"پلیز مجھے ساری تفصیل بتاؤ، تمہارا کیا پلان ہے۔ میں اب اس پتھروں کی حویلی میں جہاں پتھر دل انسان رہتے ہیں، ایک منٹ اور نہیں رہ سکتی۔"

"آج رات۔"

"کل رات ٹھیک ہے۔"

"سامان، سامان کون سا؟"

"اچھا ٹھیک ہے، جتنی جیولری میرے پاس ہے، وہ بھی اور جو گھر میں نقدیا زیور... ٹھیک ہے۔" بولتے بولتے یکدم اسے اپنے پیچھے آہٹ کا احساس ہوا تو اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔

اسے یاد آیا اس نے دروازے کا لاک نہیں لگایا تھا، اسے لگا وہ پتھر کی ہو چکی ہے۔ مڑ کر نہیں دیکھ سکے گی اور اس کے پیچھے کوئی کھڑا خاموشی سے سانسیں لے رہا تھا۔

• • • • • •

بالکل غیر محسوس طریقے سے اس نے موبائل آف کر دیا اور موبائل والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

صالحہ شاہ بہت سکون سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ بھابی بیگم...!" اس نے خشک حلق میں تھوک نگلا "خیریت...!"

"میرے ساتھ تو خیریت ہے تم البتہ... لگ رہا ہے کسی ایمرجنسی میں گرفتار ہو یا ہونے جا رہی ہو۔" صالحہ شاہ کی تیز نظریں شہرینہ کے چہرے کے تاثرات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہی تھیں۔

"ارے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے کیوں کسی ایمرجنسی میں گرفتار ہوں گی بھلا۔" وہ ذرا سا ہنسی۔ "معلوم نہیں یہ کیا کچھ سن چکی ہیں۔" اس نے دل میں سوچا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" صالحہ نے نگاہوں کا رخ بدلا۔ "بہت اچھی" "یوں باتیں بناتے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولیں۔

"ک... کیسی باتیں؟" شہرینہ کا دل جیسے سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

"تم نے موبائل کب لیا؟"

"کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"یا کسی نے گفٹ دیا ہے۔" پھر سے ذومعنی انداز میں بولیں۔

"نہیں [illegible] گفٹ دینا تھا۔ میں نے خود [illegible] ہے۔"

"اچھا مجھے [illegible] تمہاری اس شاپنگ کا [illegible] علم نہیں۔" وہ اس کی حالت کا مزہ لے رہی تھیں۔

"[illegible] اپنے معاملات [illegible] خرید و فروخت سے باخبر رکھتا ہے جو میں اپنی شاپنگ سے سب کو خبردار کرتی پھروں۔" آپ کے وہ کڑے لہجے میں بولی۔

"خبردار" صالحہ ہنسی "ہوں خبردار تو یہاں کوئی بھی نہیں تمہاری..." وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا میری؟" شہرینہ کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اس بلی چوہے کے کھیل سے۔

"شہرینہ! تمہیں ڈر نہیں لگا؟" وہ یکایک پھر سے بات بدل کر بولیں۔

"کس بات کا ڈر؟"

"جو کچھ تم کر رہی ہو۔" صالحہ کی آنکھوں میں واضح اشارہ تھا کہ وہ شہرینہ کی بہت سی باتیں سن چکی ہیں۔

"کیا؟ میں کیا کر رہی ہوں؟" وہ خود کو نڈر ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

"چلو جو کچھ تم کرنے جا رہی ہو۔" صالحہ کی بات پر وہ ایک لمحے کو سناٹے میں آگئی۔

"تو یہ سب کچھ سن چکی ہیں۔" اس سے جواب نہیں بن پا رہا تھا۔

"اگر تمہارے لالہ کو یا بھابی بیگم کو علم ہو جائے یا میں بتا دوں۔" صالحہ نے اس کے خوف زدہ چہرے پر نظریں گاڑیں۔

"کیا... کیا بتا دیں آپ؟" اس کا رنگ اڑنے لگا تھا۔

"جو کچھ تم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔"

"میں... معلوم نہیں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تو چیلنج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اور بس۔" وہ وارڈروب کی طرف بڑھی۔

تمہیں اس "چیلنج" کی قیمت کا اندازہ ہے؟ لہجہ پھر ذومعنی تھا۔

"مطلب؟" وہ مڑے بغیر بولی اور الماری کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔
"مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو جو کچھ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ انجان بن رہی ہو تو علیحدہ بات ہے۔"
"آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کھل کر کہیں۔" وہ سندھی اجرک کا بلیک سوٹ منتخب کرتے ہوئے پلٹ کر بولی۔
"اگر میں نے سب کچھ کھل کر کہہ دیا تو جانتی ہو اس حویلی میں بھونچال آجائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔ سب کچھ تہس نہس ہو جائے گا کیا تم ہم سب کی بربادی چاہتی ہو؟"
"بھابی بیگم! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت اچھی نہیں، پلیز جا کر ریسٹ کریں اور مجھے ڈسٹرب مت کریں میں پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہوں اس نئے کھڑاگ سے۔" اس نے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی ڈائمنڈ کی انگوٹھی انگلی سے نکال کر بیڈ پر اچھالی صالحہ اس کو دیکھتے ہوئے اب کچھ سوچ رہی تھیں۔
"ڈسٹرب تم نہیں ہو۔ تم تو شاید بہت کچھ سوچ کر اب کسی فیصلے پر پہنچ چکی ہو۔" وہ جیسے خود کلامی کر رہی تھیں۔
"اور مجھے ابھی کسی فیصلے پر پہنچنا ہے بہت جلد۔" وہ بڑبڑائیں۔
شہرینہ کو یقین ہو گیا کہ وہ سب کچھ سن چکی ہیں۔ اس نے کپڑے بیڈ پر رکھ دیے اور خود جیسے بے جان سی ہو کر کرسی پر گر گئی۔
"آپ نے جو کچھ سنا۔ معلوم نہیں کیا سمجھیں، میں اپنی دوست کو فون کر رہی تھی بلکہ اس کا فون آیا تو مجھے مبارک باد دینے کے لیے تو میں جذباتیت میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی اور آپ نے جانے کیا سمجھا۔" وہ بہت آہستہ آواز میں اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔ صالحہ نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی نادان بچے کی باتوں پر محظوظ ہوتا ہے۔
"اس حویلی کی پرکھوں کی عزت داؤ پر لگی ہے شہرینہ! اور تم کہہ رہی ہو جذباتی پن میں، وہ کون ہے؟ بتاؤ مجھے۔" انہوں نے اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کون کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟"
"جس سے تم ابھی فون پر بہت کچھ طے کر رہی تھیں۔" صالحہ کا لہجہ پرسکون تھا۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ اپنی بد نصیبیوں کا بدلہ مجھ سے لینا چاہ رہی ہیں۔ مجھ پر یوں جھوٹے الزام لگا کر۔" وہ بدتمیزی سے چلائی۔
"آپ سے برداشت نہیں ہو رہا کہ میں اتنی اچھی جگہ پر جا رہی ہوں جہاں آپ کی طرح نہ سیدہ آپا جیسی نند ہیں اور نہ لالہ جیسے سخت گیر شوہر۔ آپ جل رہی ہیں مجھ سے۔ اس لیے گھٹیا پن پر اتر آئی ہیں۔ دیکھیں آپا جان یہ بھابی بیگم مجھ پر الزام تراشی کر رہی ہیں۔" شہرینہ نے کھلے دروازے سے اندر آتی سیدہ کو دیکھ کر بے ساختہ پینترا بدلا تھا۔ اس وقت اسے اپنے بچاؤ کا یہی رستہ نظر آیا تھا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو تم میں کیوں جلوں گی تم سے۔ میں کیا بھوکی ننگی ہوں، کچھ دیکھا نہیں میں نے کبھی جو میں تمہاری اس بڈھے سے منگنی پر جل جاؤں گی۔ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اب یہ ڈرامہ رچا رہی ہو۔" صالحہ کون سی کم تھیں فوراً چیخ کر بولیں۔
"صالحہ! یہ کیا تماشا ہے۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور تم یہ کون سا جھگڑا کھڑا کر رہی ہو۔ اسی کی کسر رہ گئی ہے کیا؟" سیدہ نے اس جھگڑے کو بھی صالحہ کی جھگڑالو طبیعت کا شاخسانہ جانا۔
"دیکھ لیں آپ! یہ میرے کمرے میں آکر چھپ چھپ کر میری باتیں سنتی ہیں اور پھر الٹے سیدھے الزام لگاتی ہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ان سے، میں تو اپنی دوست سے فون پر بات کر رہی تھی کہ انہوں نے نہ جانے کیا الٹی سیدھی داستان گھڑ لی۔"
شہرینہ جھٹ سیدہ کے پہلو سے جا لگی اور روتی آواز بنا کر بولی۔

"بہت افسوس کی بات ہے صالحہ! تم تو اس کی بڑی بھابی ہو اس کی ماں کی جگہ، بجائے اس کی خوشیوں پر خوش ہونے کے تم نے مقابلے بازی شروع کر دی ہے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔" سیدہ کے الزام نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ صالحہ بھڑک اٹھیں۔
"بکواس کر رہی ہے یہ جھوٹی، ڈرامہ باز۔ اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگنے کے پروگرام طے کر رہی ہے، آپ دونوں بہن بھائی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ دیکھنا دیواروں سے سر ٹکرا کر روئیں گے آپ دونوں، پھر کہیں ہم نے صالحہ کی بات کیوں نہ سنی یہ بہت بڑا گیم کھیل رہی ہے، اس حویلی کی عزت کے ساتھ، ہماری نسلوں کے ساتھ اور اب ڈرامہ کر رہی ہے مظلوم بننے کا۔ پوچھیں اس سے کون سا یار ہے اس کا جس کے ساتھ۔" ان کی بات ابھی منہ ہی میں تھی کہ سلطان بخت نے کمرے میں داخل ہو کر ایک زوردار تھپڑ ان کے منہ پر جڑ دیا۔ ان کی آگ اگلتی زبان یک دم چپ ہو گئی تھی۔ وہ حیران نظروں سے گال پر ہاتھ رکھے سلطان بخت کو دیکھے گئیں۔ شہرینہ کی سسکیاں اب کمرے میں گونج رہی تھیں۔ سیدہ اسے اپنے ساتھ لگائے تھپکیاں دے رہی تھیں، سر سہلا رہی تھیں۔
"آئندہ اس قسم کی بکواس کی تو زندہ دیوار میں چنوا دوں گا حرام ——"
سلطان بخت نے منہ پر آئی گالی بڑی مشکل سے روکی۔ "میری معصوم بہن پر اتنا گھٹیا الزام لگانے سے پہلے تم مر کیوں نہ گئیں۔ منحوس صورت پہلے میری زندگی حرام کی تھی اب میری بہن کی پہلی پہلی خوشیوں کو بھی آگ لگانے چلی ہو۔ خبیث عورت۔ دفع ہو چلی جاؤ یہاں سے اور آپا اس کو لے جائیں یہاں سے، جب تک میری بہن اپنے گھر رخصت نہیں ہو جاتی اس کا منحوس سایہ اس پر نہ پڑے۔ میں آخری بار آپ سے کہہ رہا ہوں حسین شاہ سے کہہ دیں لے جائیں اس عذابوں کی گٹھڑی کو اپنے ساتھ، جسے ہمارے سر پر مسلط کیا ہے تو جیسے خوشیاں اس حویلی کا راستہ ہی بھول گئی ہیں۔ جب تک شہرینہ ادھر ہے میں اس کی شکل یہاں نہ دیکھوں سنا آپ نے۔" وہ زوردار آواز میں کہتے ہوئے تیزی کی طرف سے باہر نکل گئے۔
"پچھتاؤ گے تم سلطان بخت! بہت پچھتاؤ گے، روؤ گے اس وقت کو۔ اس کے کھوئے ہوئے نشان ڈھونڈتے پھرو گے پھر تمہیں صالحہ کی سچائی بہت دکھ دے گی بہت دکھ۔ یہ حویلی روئے گی۔ اس کے در و دیوار روئیں گے آج میں رو رہی ہوں کل سب روئیں گے۔" صالحہ کا جیسے دماغ چل گیا تھا۔ نفی میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔
"کیا بات ہوئی ہے صالحہ کے ساتھ شہرینہ! مجھے سچ سچ بتاؤ؟" سیدہ اس کے جانے کے بعد اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔
"آپا جان! آپ بھی مجھ پر شک کر رہی ہیں۔" وہ رونے لگی۔ "لالہ نے تو مجھ پر شک نہیں کیا۔ کیا میں کچھ ایسا کر سکتی ہوں جس پر آپ یا لالہ کا خدانخواستہ سر جھکے" آپ خود سوچیں ذرا۔"
"شہرینہ میری جان! بیٹیوں کے معاملے ایسے نازک ہوتے ہیں کوئی ذرا سی انگلی اٹھائے تو ڈر لگتا ہے۔ صالحہ غصے کی تیز ہے، زبان بھی بے قابو ہو جاتی ہے مگر دل کی بری نہیں۔ تم اس کی باتوں کو دل پر نہ لینا بس چند دنوں کی تو بات ہے۔ ایک ماہ بعد تو رخصتی ہے۔ ہنستے کھیلتے اس گھر سے رخصت ہو تو اچھی بات ہے۔ پھر کون سا تم کو روز روز ادھر آنا ہے۔ معاف کر دینا اسے، وہ تمہارا برا نہیں چاہ سکتی۔" سیدہ اس کے یوں رونے پر سنبھل کر بولیں۔
"آپ ساری زندگی اس عورت کی حمایت کرتی رہی ہیں۔ جس نے ہمارے بھائی کی زندگی کو دوزخ بنا رکھا ہے اور اس گھر کو برزخ۔ معلوم نہیں آپ کس مٹی کی بنی ہیں۔ ہمیشہ ہی اس کی طرف داری ہونہہ!" اس نے جھک کر بیڈ پر پڑے اپنے کپڑے اٹھائے اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ "آپا جان! میں باتھ لے کر ریسٹ کروں گی۔ دماغ خراب کر دیا ہے آپ کی نند صاحبہ نے۔" کہتے ہوئے وہ باتھ روم کے اندر چلی گئی تو سیدہ باہر نکل آئیں۔ معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر دل میں جیسے کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ کہیں کچھ غلط ہو جانے کا۔ کیونکہ انہیں یقین تھا

صالحہ جتنی بھی بری سہی۔ جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"تو کیا پھر شہرینہ جھوٹ بول رہی ہے۔" وہ گم صم سی برآمدے کے ستون کو تھام کر کھڑی ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"تم کیا سمجھتی ہو میں تم سے فلرٹ کر رہا ہوں۔" وہ کتنی منتوں کے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ نہ تو دھوپ کڑی تھی نہ سڑک پر لوگوں کا رش تھا بظاہر لفٹ لینے کے لیے کوئی بھی عذر نہیں تھا مگر دل کے عذر سے بڑا بہانہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے مستقل اصرار پر مسلسل انکار کرتی رہی۔ گاڑی فٹ پاتھ کے پاس کھڑی تھی اور وہ خود فٹ پاتھ پر کھڑی سفیان کی تکرار پر انکار کیے جا رہی تھی۔

"اچھا صرف ایک بار بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اس کے بعد میں تم سے قسم کھا کر کہتا ہوں نہ کبھی تمہارے راستے میں آؤں گا نہ تمہیں اپنے ہمراہ چلنے کو کہوں گا آئی پرامس۔" اس کی آخری بات زینب کے دل کو لگی تھی۔ وہ مجبور ہو کر با دل نخواستہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد سفیان نے اس سے یہ فقرہ کہا۔

"اس کے علاوہ میں اور کیا سمجھ سکتی ہوں جب میرا اور آپ کا کچھ بھی برابر کا نہیں۔" وہ بھرائے سے بولی۔

"دل 'دل تو ہے نا برابر کا۔ ایک جیسا۔ وہ تو خدا نے سب کے سینوں میں ایک جیسے بنائے ہیں نا۔ اس دل کے ہاتھوں ہی تو مجبور ہو کر میرے ساتھ آئی ہو' کہو سچ ہے نا؟" وہ واقعی سچی بات کہہ رہا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے' آپ کہیں جو آپ کو کہنا ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے گھر جانا ہے۔" گاڑی کی خوشبودار خنک فضا' آرام دہ نشست خوبصورت خوش لباس ہم سفر' درحقیقت ایک لمحے کے لیے بھی اسے گھر کا خیال نہیں آیا تھا۔

"دیر..... ابھی تو کالج میں چھٹی ہوئی تھی۔ کوئی اتنی دیر نہیں ہو رہی ذرا تھوڑی دور تک چلیں پھر میں بات کرتا ہوں۔" وہ اس کے ریلیکس انداز کو بھانپ رہا تھا۔

"نہیں۔ پلیز مجھے دیر ہو جائے گی۔" وہ جز بز ہو کر بولی۔

"بس آدھے گھنٹے بس کچھ فرق نہیں پڑے گا جتنی دیر میں تم نے پیدل گھر پہنچنا تھا اتنی دیر میں' میں تمہیں پہنچا دوں گا۔" اب گاڑی کالج کی مخالف جانے والی سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

"اچھا۔ اب جلدی سے بات کریں اور مسٹر۔"

"سفیان 'سیفی میں نے پہلے بھی بتایا ہے۔ مجھے تمہارے منہ سے اپنا نک نیم سننا بہت اچھا لگے گا۔" وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

"یہ شہر اس قدر بڑا نہیں کہ میں یوں حجاب اوڑھ کر جس کے ساتھ چاہوں پھرتی رہوں اور کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ صوفی عبدالرحمٰن کی بیٹی اگر اس طرح گاڑی میں گھر یا کالج آئے جائے گی تو آپ سوچیں میرے گھر والوں کی کیا عزت رہ جائے گی؟"

"مجھے احساس ہے زینب! مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگ رہا اسی لیے کہ آج آپ سے گاڑی میں آخری بار بیٹھنے کی درخواست کی ہے۔ مجھے..... میں....."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ زینب نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محبت بھری بھرپور نظر۔ زینب کا دل جیسے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے لگا اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا اور ہاتھوں کی انگلیوں کو اضطراری انداز میں موڑنے لگی۔

"آئی لو یو زینی! آئی ریئلی لو یو' آئی کانٹ لیو وِد آؤٹ یو۔" (میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا) وہ بالکل اس کے کان کے پاس ہوتے ہوئے بولا۔ اور اپنا اسٹیئرنگ پر رکھا ہاتھ اس نے آہستگی سے زینب کے کانپتے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

ٹھنڈے یخ کپکپاتے ہاتھ نرم گرم مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آ چکے تھے۔ زینب کے کانوں کی لوئیں حدت دینے لگیں اور اس کی زبان جیسے تالو سے جا لگی۔ جسم میں شرارے سے پھوٹنے لگے تھے۔ وہ ہاتھ چھڑانا چاہ رہی تھی مگر جیسے ساری مزاحمتی قوت دم توڑ گئی تھی۔ وہ بے حس سی اسی طرح بیٹھی رہی۔ سفیان کے ہاتھ کی گرفت لحظہ بہ لحظہ مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے ارد گرد دور دور تک سڑک بالکل سنسان تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آدھ تیز رفتار گاڑی گزرتی یا اکا دکا موٹر سائیکل۔ نہ جانے یہ کون سی سڑک تھی۔

اس کا ہاتھ متحرک ہوا اور بہت آہستگی سے سانپ کی طرح اس کی نازک پتلی کمر کے گرد حمائل ہو گیا۔ زینب کا سینے میں دم رکنے لگا۔ پیٹ میں ایک دم سے مروڑ سا اٹھا تھا مگر وہ احتجاج نہ کر پا رہی تھی۔ سفیان نے اسے کھینچ کر اپنے بے حد قریب کر لیا۔

"پ..... پلیز....." اس کے تھرتھراتے لبوں سے نکلا تھا۔

"ہم..... تمہارا وجود سراپا نشہ ہے زینی! یہ تو آگ ہے۔ بھڑکی ہوئی اور کوئی اس کے پاس آ کر بھی نہ بھڑکے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب دل پاس ہو تو کون کافر فرشتہ رہنا چاہے گا۔" لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے بے خودی کے انداز میں" وہ گستاخی کر ڈالی جس کا گمان تک زینب کو نہ تھا۔ اسے جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا۔

"مم..... مجھے..... گھر..... یہیں اتار دیں آپ..... پلیز مجھے گھر جانا ہے۔" وہ اسے پرے جھٹک کر بولی۔ اس کا جسم بھی ابھی تک کانپ رہا تھا جیسے جاڑے کا بخار ہو گیا ہو۔ اور گردن کا وہ حصہ جسے ابھی سفیان کے ہونٹوں نے چھوا تھا وہاں جیسے کسی نے جلتا ہوا سکہ رکھ دیا تھا' بہت تیز چبھن تھی' ناقابل برداشت جلن اور اس جلن کے اندر کہیں ہلکا سا سرور۔

"سوری!" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "معاف کرنا' مجھے معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اس میں قصور میرا نہیں' تمہارے حسن دیوانگی کا ہے۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔

"مجھے یہیں اتار دیں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"بس ابھی چلتے ہیں' تمہیں اپنی فیکٹری تو دکھا دوں۔ بس آنے والی ہے۔" وہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا' بالکل سنسان۔ زینب کو خوف سا محسوس ہوا۔

"ن..... نہیں' مجھے نہیں دیکھنی پلیز مجھے یہیں اتار دیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"پاگل ہوئی ہو' یہاں کیسے اتار دوں۔ چلو فیکٹری پھر کسی دن دیکھ لیں گے' واپس چلتے ہیں۔" اس نے گاڑی موڑ لی۔ زینب کی جان میں جان آئی۔

"یہ لو حلق تر کرو کولڈ ڈرنک سے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر پچھلی نشست پر پڑے شاپر میں سے پیپسی کے دو ٹن نکالے ایک اسے تھما دیا۔

"مجھے نہیں پینا' مجھے بس جلدی گھر چھوڑ دیں۔" وہ لیتے ہوئے متردد ہوئی۔

"زینی! پلیز' ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔" اس کے جھڑک کر کہنے پر زینب نے ٹن تھام لیا۔

"وہ ضروری بات....." سفیان نے ڈرنک کا لمبا گھونٹ لے کر کہا۔

"زینب! آئی وانٹ ٹو میری یو۔" (میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں) وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا اور وہ جو ٹن کی ٹھنڈک کو اپنے تپتے ہوئے ہاتھوں میں جذب کر رہی تھی' ساکت رہ گئی۔

"میں اپنی مما کو تمہارے گھر لانا چاہ رہا ہوں۔" اس کی دوسری بات نے ٹن کی ٹھنڈک جیسے زینب کے اندر تک اتار دی۔

"تم سمجھتی تھیں نا کہ میں تم سے فلرٹ کر رہا ہوں' ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں پہلی نظر میں تمہیں اپنا دل دے بیٹھا ہوں اور تمہارا ہمیشہ کے لیے ساتھ چاہتا ہوں۔" زینب کو یوں لگا جیسے اسے اس دنیا میں ہی جنت کی نوید مل گئی ہو۔ وہ جنت جس کے لیے اس کے بابا صاحب راتوں کو اٹھ اٹھ کر سجدے کرتے تھے' وہی جنت..... وہ حیرت زدہ

تھی، بالکل گنگ۔

"میں اپنے پیرنٹس کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کی کروڑوں کی پراپرٹی کا اکیلا وارث۔ اب اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہوں۔ ادھر جو فیکٹری ہے وہ آج کل میرے انڈر کنٹرول ہے۔ وہی تو تمہیں دکھانے لے جا رہا تھا۔ مما، پپا نے میری شادی کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی۔ یورپ، امریکہ، کئی سال رہ کر آیا ہوں مگر کوئی لڑکی دل کو نہیں بھائی، سوائے تمہارے۔ تمہیں دیکھا ہے تو جیسے اب کہیں اور دیکھنے کی حسرت نہیں رہی۔ میرا دل تمہاری طلب میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ کیا تمہارے دل تک میری محبت کی تپش نہیں پہنچ رہی زینی!" اس کا لہجہ بے حد سچا تھا۔ زینب کے دل میں اتر گیا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے سفیان! ہمارا تمہارا کیا جوڑ پھر تمہارے پیرنٹس، وہ کبھی بھی مجھے پسند نہیں کریں گے نہ میرے گھر والوں کو اور مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ بہت معمولی سی لڑکی ہوں۔"

"غیر معمولی اور خاص تو تم میرے لیے ہو۔ یہ تم میرے دل سے پوچھو، تم ہو جس نے میرے دل کے بند دروازے کو دھڑلے سے کھول ڈالا ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کون خاص ہوگا پھر شادی مجھے کرنی ہے زندگی مجھے بسر کرنی ہے۔ اس میں اعتراض کرنے والے میرے والدین کون ہوتے ہیں پھر زینی! انہوں نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ اپنی مرضی سے لڑکی میں پسند کرلوں۔ وہ اوکے کردیں گے، انہیں تو صرف میری پسند سے غرض ہے۔" اس کی گفتگو بہت متاثر کن تھی۔

"پھر بھی سیفی! میں۔۔۔ تمہیں معلوم تو ہے، میرے والد ایک معمولی امام مسجد، چند ہزار تنخواہ پانے والے۔ نہ ہمارا گھر، نہ زمین، نہ روپیہ پیسہ، پھر کس طرح یہ ممکن ہو سکتا ہے۔" وہ متذبذب تھی۔

"اب مجھے بتاؤ، میں نے یہ سوچ کر تو دل نہیں لگایا کہ جس سے محبت کر رہا ہوں، وہ میری کلاس کی ہے یا نہیں۔ محبت میں پلاننگ کب ہوتی ہے، منصوبہ بندی کون کرتا ہے۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے بالکل اچانک۔۔۔ ساون کی بارش کی طرح جیسے مجھے تم سے پہلی نظر میں ہوئی۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی، ابھی تک کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا؟"

"میں نے یہ کب کہا؟" وہ اب پن کھول کر اعتماد سے حجاب کے نیچے سے بول رہی تھی۔

"تو میں تمہیں پسند ہوں نا؟"

وہ چپ رہی۔ ہونٹوں پر مسکان تھی مگر زبان پر تالا۔

"بولو نا۔" وہ مصر تھا۔

"نہیں بول سکتی نا تم خود سمجھ لو۔" وہ بمشکل بولی تو وہ ہنس پڑا۔

"زینو! ایک ریکویسٹ ہے۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"وہ کیا؟"

"یہ حجاب اتار دو۔"

"نن۔۔۔ نہیں۔" وہ گھبرا گئی۔

"پلیز میری خاطر، گھر کے قریب پہن لینا۔" اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ سختی سے بولی۔

"اچھا چہرہ دکھا کر پھر نقاب کرلینا۔" اس کے اصرار پر اس نے آہستگی سے حجاب کھسکا دیا۔ وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لمحے زینب نے نقاب کرلیا۔

"چلو کچھ تو زاد سفر ہوا میسر۔" وہ گنگنایا۔

"اب مجھے گھر اتار دیں۔"

"ہاں چل رہے ہیں زینب! کل میں تمہیں صبح نو بجے کالج کے پچھلے گیٹ پر پک کرنے آؤں گا، تمہیں شہر کی سیر

کراؤں گا۔ تھوڑی شاپنگ کریں گے۔ گھومیں پھریں گے، اچھے سے ہوٹل میں لنچ کریں گے۔"

"نہیں۔"

"پاگل، تمہیں پہلے مما سے ملواؤں گا اس کے لیے مناسب تیاری تو ہونا چاہیے۔ اس کی شاپنگ کریں گے پھر تمہیں ایک دو دن تک مما سے ملوانے لے جاؤں گا۔ تمہیں دیکھتے ہی انہوں نے راضی ہو جانا ہے۔"

"اچھا دیکھیں گے۔" اس کے گھر کی سڑک نزدیک آرہی تھی۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"پھر کل صبح نو بجے بیگ میں کلرڈ کپڑے لے آنا، کالج میں چینج کرکے باہر نکل آنا، میں پچھلے گیٹ پر ویٹ کروں گا۔" گھر کی سڑک پر اتارتے ہوئے وہ اسے تاکید سے بولا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر نیچے اتر گئی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے سفیان کو خدا حافظ کہا اور تیز قدموں سے اپنی گلی کی طرف بڑھ گئی۔ سفیان نے سرشار ہو کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

☼ ☼ ☼

"مما، پاپا! مجھے آپ دونوں سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔" رات کے کھانے کے بعد اظہار اور یاسمین اٹھ کر ڈائننگ ہال سے جانے لگے تھے کہ مشی نے ان سے کہا، وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ مشی کا رویہ کچھ دنوں سے وہ ویسے ہی بدلا بدلا محسوس کر رہے تھے۔ الجھی سی، کھوئی کھوئی سی اور آج تو اس نے کھانا بھی برائے نام کھایا تھا۔

"آپ دونوں کو ام جان کی طرف جانا ہوگا۔" اپنے دونوں ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں ایک دوسرے میں جکڑتے ہوئے وہ بولی۔

"ام جان کی طرف؟" اظہر کا لہجہ استفہامیہ تھا۔ "ام جان کی طرف تو ہم جاتے رہتے ہیں، اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے۔"

"نہیں آج آپ کو ایک خاص کام کے لیے ام جان کی طرف جانا ہوگا۔" اس کا لہجہ دونوں کو اچھا خاصا پراسرار سا لگا۔

"میرا پرپوزل لے کر۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے گویا دھماکا کیا۔

"پرپوزل۔" یاسمین جیسے خواب سے جاگیں۔ "کیسا پرپوزل؟"

"معاذ کے لیے میرا پرپوزل۔" وہ بے خوفی سے بولی بغیر کسی جھجک کے۔

"واٹ۔" اظہر کو ہزاروں وولٹ کا کرنٹ لگا۔ "Are you in your senses" (کیا تم اپنے حواسوں میں ہو)

"میں پوری ہوش مندی سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کو میرا پرپوزل، ڈاکٹر معاذ کے لیے ام جان کے پاس لے کر جانا ہوگا اور اسے منظور کروا کے ہی آنا ہوگا۔" وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے ام جان سے کسی کالج ٹرپ پر جانے کی اجازت چاہ رہی ہو۔

"دیکھ رہی ہو تم صاحبزادی کے اطوار۔" اظہر نے بے حد غصے میں یاسمین سے کہا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔" یاسمین اظہر سے زیادہ غصے میں تھیں۔

"آپ اسے میرے دماغ کا خلل سمجھیں یا کچھ اور، مجھے معاذ ہی سے شادی کرنا ہے ہر صورت میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"بے شرم، بے حیا۔۔۔" اظہر کا ہاتھ اس پر اٹھنے لگا تھا کہ یاسمین نے جلدی سے اظہر کو تھام لیا۔

"پلیز ریلیکس اظہر! وہ پاگل ہو رہی ہے۔ تم تو اپنے حواس کنٹرول میں رکھو، مشی! تم دفع ہو جاؤ اپنے کمرے میں اور آئندہ اس قسم کی بکواس کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچ لینا، یہ تمہارے حق میں زیادہ اچھا ہوگا۔ معاذ سے تمہارا رشتہ تو در کنار اس دو ٹکے کے پیراسائیٹ کا نام بھی اس گھر میں لینا گناہ ہے۔ سمجھیں تم۔" یاسمین کڑے تیوروں سے بیٹی کو گھورتے ہوئے تنبیہہ کر رہی تھیں۔

"مما! آپ کا داماد صرف اور صرف ڈاکٹر معاذ ہی بنے گا۔ آپ بھی یاد رکھیں، اگر آپ میرا پرپوزل لے کر نہ

گئیں تو آپ کو اپنی بیٹی کی زندگی سے ہاتھ دھونا ہوں گے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور اپنی پسند کا اظہار کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں خواہ وہ کوئی پیرا سائیٹ ہو یا آپ کی کلاس کا کوئی نودولتیا۔ مجھے میری پسند کے حق سے کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ یاسمین سے بھی زیادہ واضح اور دوٹوک انداز میں بولی۔

"یہ... یہ... تربیت کی ہے تم نے اس کی۔" اظہر نے بے یقینی سے انگلی اٹھا کر مشی کی طرف اشارہ کیا۔ صدمے سے اظہر کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"میں نے... میں نے کی ہے۔ لاڈ پیار تمہارا تھا اور اب اس کے بگاڑ کا سارا الزام مجھ پر آئے گا۔" یاسمین جیسے تڑپ کر بولیں۔

"مائیں... مائیں کرتی ہیں بیٹیوں کی تربیت اور تم نے اس بے حیائی پہ تربیت کی ہے کہ آج یہ ہمیں ہمارے منہ پر یہ سب خرافات کہہ رہی ہے۔" اظہر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مشی کو شوٹ کر ڈالیں۔

"میں نے کوئی خرافات نہیں کی صرف اپنی پسند کا اظہار کیا ہے۔" وہ اسی بے خوفی سے بولی۔

"پسند اونہہ!" وہ نفرت سے پھنکارے۔ "یہ ہے تمہاری پسند۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا دو ٹکے کا ملازم، تم یہ چاہتی ہو ہم اسے اپنے برابر لے آئیں۔ اس ڈائننگ ٹیبل پر اپنے ساتھ بٹھا لیں اس چوراچکے کو۔" اظہر اب چیخ رہے تھے۔ ملازم گھبرا کر دوڑا ہوا آیا۔

"جی صاحب!" وہ تینوں کے چہرے دیکھ کر گھبرا گیا۔

"دفع ہو جاؤ تم، یہاں تمہیں کس نے بلایا ہے؟" اظہر نے دھاڑ کر ملازم سے کہا تو وہ الٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔

"اچھا کیا کرو گی تم اگر ہم تمہاری اس فضول واہیات فرمائش پر کان نہ دھریں تو؟" اظہر نے غصے سے سرخ چہرہ اس کی طرف موڑا۔

"میں... "وہ ایک پل کو رکی۔ "اپنی زندگی ختم کر لوں گی، معاذ کے بغیر مجھے زندہ نہیں رہنا۔" وہ بے حس لہجے سے بولی۔

"تو جاؤ پھر جا کر مرجاؤ، یہاں کیوں بیٹھی ہو، میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا، سنا تم نے۔" اظہر نے ایک بار پھر چیختے ہوئے کہا۔

"او کے بعد میں اپنے اس جلدی کے فیصلے پر پچھتایئے گا مت۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تقریباً دوڑتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گئی۔

"اسٹوپڈ، احمق مجھے سبق سکھانے چلی ہے۔" اظہر بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "کل فون کر کے ابراہیم بھائی کو ان کے بیٹے کے پروپوزل کے لیے ہاں کر دو۔ بس ایک آدھ ماہ میں، میں اس سرکش لڑکی کی رخصتی کر دوں گا۔ اس کے تیور خطرناک ہیں اور یہ سب تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ احمق عورت!" اظہر کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

"مجھے الزام مت دیں، سارا لاڈ پیار آپ کا تھا۔" یاسمین دوبدو چیخیں۔

"بس!" اظہر نے ہاتھ اٹھایا۔ "اب کوئی بحث نہیں ہوگی۔" کہتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

رات کے تین بجے تھے جب زیتون بانو نے معاذ کے کمرے کا دروازہ بری طرح سے دھڑ دھڑایا تھا۔

"معاذ... معاذ... بیٹا! دروازہ کھولو۔" وہ اس کی پکار پر آنکھیں ملتے ہوئے باہر آیا تھا۔

"خیر... خیریت ہے نا زیتون بانو! اماں جان تو ٹھیک ہیں نا؟" وہ اس کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر گھبرا گیا۔

"اماں جان ٹھیک ہیں۔ اظہر کی بیٹی مشی نے خود کو شوٹ کرنے کی کوشش کی ہے، شدید زخمی ہے۔ پتا نہیں بچے گی بھی یا نہیں۔ اس وقت اس حالت میں کوئی بھی ڈاکٹر اسے نہیں دیکھ رہا۔ کہتے ہیں، پہلے پولیس کارپرچا کٹے گا۔ اظہر صاحب نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ جلدی سے آؤ اور اسے کہیں لے کر جاؤ۔" وہ باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں، بُنیا کا خون بہے جا رہا ہے۔ ایاز میاں بھی گھر نہیں ہیں۔" زیتون بانو جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"او میرے خدایا، اس احمق لڑکی سے مجھے یہی توقع تھی کہ وہ ایک دن یہی کچھ کرے گی۔" معاذ نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور اسی بکھرے حلیے میں باہر نکل گیا۔

"اماں جان کو خبر ہے؟" اس نے جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"نہیں، ویسے وہ جاگ رہی ہیں۔ مجھ سے اٹھنے کی وجہ پوچھ رہی تھیں۔ میں نے نہیں بتایا۔"

"اچھا کیا، ابھی بتانا بھی نہیں۔"

"معاذ بیٹا! جا کر فون کر دینا، بچی کی حالت کے بارے میں۔" زیتون بانو نے پیچھے سے تاکید کی۔

"اچھا!" وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکلا۔

گیٹ کے باہر گاڑی میں اظہر پریشان صورت لیے گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہے تھے جیسے ہی وہ گاڑی میں بیٹھا، انہوں نے گاڑی دوڑا دی۔ مشی زخمی حالت میں پچھلی نشست میں یاسمین کی گود میں نیم بے ہوش پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی اتنی بڑی تھی کہ گلی میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر داخل ہو بھی جاتی تو بھی کسی شخص کے گزرنے کی جگہ باقی نہ بچتی، اس لیے عبدالمبین نے گاڑی گلی کے موڑ پر ہی پارک کی اور اپنے شاندار براؤن ٹوپیس پر ہاتھ پھیرتا گھر کی طرف چل پڑا۔ اردگرد سے گزرتے لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اتنی شاندار گاڑی اور اتنا ہی شاندار اس کا مالک اس ٹوٹی پھوٹی پسماندہ گلی میں سب کے لیے ہی حیرت کا باعث تھا۔

سیڑھیوں کا دروازہ کھلا تھا۔ مسجد کے [illegible] میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ عبدالمبین بے دھڑک سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ تقریباً [illegible] سال بعد ادھر آیا تھا۔

[illegible] تھی کہ وہ گھر والوں سے چاہنے کے باوجود رابطہ نہیں رکھ سکا تھا۔ [illegible] تھی کے پتے توڑ رہی تھیں۔ تخت پر اماں جی لیٹی ہوئی تھیں۔ بہت کمزور اور مضمحل دکھائی دے رہی تھیں۔ سفید چکن کا سوٹ جو کبھی سفید رہا ہوگا۔ اب اچھا خاصا پیلا ہو چکا تھا۔ ان کے چہرے کی رنگت سے میل کھا رہا تھا۔ آنکھیں بند کیے معلوم نہیں وہ سو رہی تھیں یا جاگ رہی تھیں۔ زینب اس منظر میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ جوتوں کی ہلکی آہٹ پر آمنہ نے سب سے پہلے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔

"السلام علیکم اماں جی!" عبدالمبین نے اونچی آواز میں مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ آمنہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جو [illegible] دیکھنے لگی۔

"عبدالمبین [illegible]..." اتنے دنوں بعد بھائی کو سامنے دیکھ کر آمنہ کو عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ [illegible] کے پاس آئی۔ اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے اس کے خوبرو چہرے کو دیکھنے لگی۔

"کیسی ہو آمنہ؟" وہ بھی بڑے پیار سے مخاطب ہوا تھا۔

"کون کون آیا ہے؟" اماں جی کپکپاتی آواز کے ساتھ اٹھ بیٹھیں۔

"عبدالمبین، میرا مبین، میرا بچہ... جیتے جی دونوں نے ماں کو دفن کر دیا، بھول گئے۔ ایسے بیٹے زمانے میں کسی کے ہوتے ہیں، کسی کے سنتے ہیں۔"

اماں جی آبدیدہ لہجے میں بولیں۔ عبدالمبین آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گیا۔

"اماں جی، میری اچھی اماں جی، معاف کر دیں۔ بہت یاد کیا تھا۔ آپ کو بھولا نہیں تھا، بس مصروف تھا۔ آپ کو بھول سکتا ہوں، کبھی بھی نہیں۔ آپ، بابا صاحب مجھے سو بار دھکے دیں تب بھی میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ ان کے سینے میں سر گھسائے کہہ رہا تھا۔ اماں جی نے بے اختیار اس کا سر اور ماتھا چوم لیا۔ اس کے چوڑے شانوں پر ہاتھ پھیر کر اسے محسوس کرنے لگیں۔ اس کے خوبصورت لباس سے اٹھتی دل فریب مہک کو اپنے اندر جذب کرنے لگیں۔

"دھکے ہم کیوں ماریں گے میرے لعل! پر تو نے کام بھی تو دھکوں والے کیے ہیں۔ اب یہ کسر رہ گئی تھی بھانڈ میراثی بننے کی' بتا مجھے۔ تم دونوں بھائیوں نے میرا چنا چونڈا اپنے باپ کے ہاتھوں اس عمر میں ذلیل کروانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ کل وہ بازار میں تیرے گانے والی کیسٹ دیکھ آئے پھر جو گھر آکر انہوں نے میری عزت افزائی کی ہے' کل سے بھوری پڑی ہوں۔" اماں جی نے اس کا چہرا اپنے سامنے کیا' زینب کمرے سے نکل آئی تھی۔

"عبدالمبین! مولی! ہائے اللہ کتنے پیارے ہو گئے ہو۔ کتنے ہینڈسم' مال دار اور پیسے والے' ہے نا۔" وہ پیچھے سے ہی آکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"زینب کی بچی! ویسی کی ویسی ہو۔" وہ چمک دار آنکھیں لیے پلٹا۔

"خوبصورت... ہے نا۔" وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں لالچی... اور فضول۔"

"اور..." وہ آنکھوں میں خفگی بھر کر بولی۔

"اور بہت خوبصورت اور خوش مزاج میری طرح۔" وہ ہنسا۔

"ہاں' باقی سارے تو یہاں سڑے مزاج کے ہیں نا تو کیوں آئے ہو پھر یہاں؟" آمنہ فوراً خفگی سے بولی۔

"وہ تو تمہارا ہے' چاہے تم مائنڈ کرو۔ زینب تم سب میں زندہ دل ہے اور جوئی! میری جوئی کا کیا حال ہے۔ اماں جی! یہ تو بڑی بڑی ہو گئی ہے اور لگتا ہے' اس کی زبان خاصی چھوٹی ہو گئی ہے۔ لگتا ہے خوب چلائی ہے۔ جو گھس گئی ہے۔ بھائی کے پاس نہیں آؤ گی۔" وہ محبت سے دور بیٹھی جویریہ سے بولا جو سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بھائی کی فرمائش پر اٹھ کر اماں جی کے تخت پر آ گئی۔

"یہ بہت بڑی چیز ہو گئی ہے مولی!" زینب بولی۔ جویریہ نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے زینب کو ٹہوکا دیا۔ "چپ رہو تم۔"

"کیسی ہو جوئی! میں تمہیں بہت مس کرتا ہوں' کون سی کلاس میں ہو؟" وہ اس کے نرم چھوٹے چھوٹے ہاتھ تھام کر بولا۔

"کلاس... ہاہ... بڑی اونچی کلاس۔" زینب ہنسی۔

"زینب! چپ رہو تم۔" اماں جی نے اسے جھڑکا۔ "تم مجھ سے بات کرو۔"

"جی بولیے۔" وہ اماں جی کی طرف مڑ گیا۔

"تم نے یہ کام کیوں کیا بھانڈوں والا' عبدالمبین! تجھے اپنے باپ کی' اپنے خاندان کی عزت کا' اپنے پیشے کا کچھ خیال نہ آیا۔" وہ دکھی ہو کر بولیں۔

"اماں جی! آج کل کوئی بھی پیشہ برا نہیں' اب مجھے زندگی گزارنے کو کچھ تو کرنا تھا۔ تعلیم میرے پاس نہیں تھی' ہنر مجھے کوئی نہیں آتا تھا۔ مزدور بننے سے میں رہا۔ لے دے کر اللہ کی عطا کردہ یہ نعمت ہی تھی جسے کام میں لایا ہوں تو زمانہ مبہوت ہو کر سننے لگا میری آواز کو۔"

"ارے کم نصیب! اللہ نے یہ آواز تو تجھے اپنے پیارے کلام کی تلاوت کے لیے عطا کی تھی۔ سورہ رحمن کتنی خوبصورت قرأت میں پڑھتے تھے تم کہ راہ چلتے لوگ رک رک جاتے تھے تجھے سننے کو اور تو نے اللہ کی عطا کردہ اس نیک نعمت کو اس منحوس گندے دھندے میں لگا دیا۔" وہ افسوس سے بولیں۔

"اماں جی! آپ نہیں سمجھیں گی' کوئی کام گندا نہیں ہوتا پھر جس سے بندے کی روزی بندھی ہو' وہ دھندا کیسے گندا ہو سکتا ہے۔ میری روزی رب نے ایسے لکھی تھی۔"

"ہائے بھائی! ہمیں بھی لے چلو اپنے ساتھ۔ تمہارا تو اب خوب بڑا سا گھر ہو گا' گاڑی بھی۔" زینب اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر نیچے ہی دوزانو بیٹھ گئی۔

"ہاں۔ لینے ہی تو آیا ہوں اماں جی! میں آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں' میرے ساتھ چلیں۔ بہت بڑا سا گھر لیا ہے

میں نے۔ ابھی اپنا تو نہیں مگر جلد ہی اپنا بھی بنا لوں گا۔ چلیں گی نا آپ میرے ساتھ؟" وہ آس بھری نظروں سے اماں جی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کیسے سوچ لیا تم نے کہ ہم سب تمہارے ساتھ چلیں گے۔ ابھی تمہارا باپ' تمہارا غیرت والا باپ زندہ ہے۔ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں روکھی سوکھی وہی' ہمیں بہم پہنچا رہا ہے اور بڑی عزت کے ساتھ۔ رہے ساتھ جا کر حرام کھاؤں اور اپنی بچیوں کو بھی حرام کھلاؤں تم نے یہ کیسے سوچ لیا عبدالمبین!" وہ فوراً بولیں بغیر کسی لگی لپٹی کے۔

"اماں جی! میں حرام نہیں کماتا' محنت کرتا ہوں۔" وہ دکھ سے بولا۔

"نہیں عبدالمبین! یہی محنت اگر تو اللہ کے کسی پسندیدہ کام میں لگاتا تو ماں باپ کے دل جیت لیتا۔ پر تو نے وہی کچھ کیا جس سے تیرے بابا صاب تیرے بارے میں شروع سے ڈرتے آ رہے تھے۔ حفظ تو نے درمیان میں چھوڑ دیا۔ اب شہر جا کر وہاں کے سارے چھچھن اپنا لیے۔ اس کے بعد بھی توقع رکھتا ہے کہ ہم تیرے ساتھ چلیں گے۔ عبدالمبین تو نے ہمیں جیتے جی مار دیا' کبھی مڑ کر آیا ہی نہیں اور تو نے ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔ کم نصیب ماں ہوں۔ میں دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی ان پر فخر نہیں کر سکتی۔ الٹا تمہارے بابا صاب کے سامنے مجھے شرمندگی سے سر جھکانا پڑتا ہے۔ جب وہ مجھے تم دونوں کے طعنے دیتے ہیں۔" اماں جی نے اپنا غبار نکالا جو کل صوفی صاحب سے [illegible] جلی کٹی سنائی تھیں۔

"اماں جی! ہم کوئی چور اچکے نہیں' بدمعاش نہیں جو آپ کو شرمندگی ہو۔" وہ بھی گرم ہو گیا۔ "خیر..." اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "جب آپ کا دل ہی قائل نہیں' میری کمائی کو اچھا نہیں سمجھتیں' میرے پیسے کو گناہ جانتی ہیں تو میرے ساتھ کیسے چلیں گی۔ میں اصرار نہیں کرتا اور زبردستی بھی نہیں' صرف آپ سے درخواست کر سکتا ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ جب بھی کوئی ضرورت پڑے' میرے پاس آ جائیں' مجھے بلا لیں' میں سر آنکھوں پر آپ کے بلاوے کو دیکھوں گا۔ ویسے بھی [illegible] تو چکر لگاتا رہوں گا۔"

اس نے جیب سے کارڈ نکال کر تخت پر رکھا۔ اب تینوں بہنیں ایک حسرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ کچھ پیسے ہیں' رکھ لیں۔" اس نے ہزار ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر کارڈ کے ساتھ رکھ دی۔

"حرام خور! حرام کھانے والے گدھ' خبیث' شیطان کے چیلے تو پھر آگیا میرے گھر میں نوٹوں کا یہ سنہری جال پھینکنے۔ ابھی میں زندہ ہوں' یہ بڈھا ابھی زندہ ہے' ان سب کو چند لقمے روکھی روٹی کھلانے کے قابل۔ تو نے سمجھ کیا رکھا ہو گا بڈھا' جا کر ان نوٹوں کی چمک دکھا کر پھسلاؤں۔ نکل یہاں سے' نکل۔" صوفی صاحب نہ جانے کب اوپر آئے' انہوں نے عبدالمبین کو کالر سے پکڑ کر کھینچا اور پرے دھکا دے دیا۔ اس عمر میں بھی ان میں بلا کا زور تھا۔ عبدالمبین چار قدم تک لڑکھڑا گیا۔ "اور یہ تیرا شیطانی حربہ' یہ نوٹوں کا طلسم' حرام کی کمائی یہ..." انہوں نے تخت پر پڑی نوٹوں کی گڈی جھپٹی اور دوسرے لمحے وہ ایک ایک نوٹ کھینچ کر اس کے ٹکڑے کرنے لگے۔ وہ نوٹ پھاڑتے جا رہے تھے' ایک جنون کے عالم میں۔

"صوفی صاب... صوفی صاب... واپس کر دیں' ایسے نہ کریں۔ یہ میرے بچے کی کمائی..."

"رابعہ بی بی!" صوفی صاحب اتنی زور سے دھاڑے کہ اماں جی کی آخری سانس لبوں تک آتے آتے رہ گئی۔ "یہ نہ ہو کہ میرا اگلا جملہ تمہیں اس گھر سے باہر دھکیل دے۔" "اپنی زبان اور خیال کو لگام دو۔ اور نکل جا ادھر سے اور دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔" ہزار ہزار کے نئے کرارے نوٹ پھاڑتے ہوئے ان سب کو وہ ایک جنونی پاگل بڈھے ہی لگ رہے تھے۔ زینب کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ سارے نوٹ ان سے جھپٹ لے۔

"نکل یہاں سے۔" وہ نوٹوں کے ٹکڑے عبدالمبین کی طرف اچھالتے ہوئے حقارت سے بولے جس کی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کے ساتھ نمی اتر آئی تھی۔ اس کی محنت کی کمائی اس کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔

"خدا حافظ اماں جی!" وہ دکھی دل سے کہہ کر مڑا اور سست قدموں سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اماں جی کا دل سینے میں تڑپ اٹھا۔ بے ساختہ چاہا کہ اس کے جاتے قدموں کو روک لیں مگر صوفی صاحب کا آتشیں چہرہ انہیں ایک پل میں ٹھنڈا ٹھار کر گیا۔

☆ ☆ ☆

"آپا جان! میں شہر جا رہا ہوں، کل واپس آؤں گا۔" سلطان بخت نے لاؤنج میں بیٹھی سیدہ سے گزرتے ہوئے کہا۔

"رکو سلطان بخت!"

"جی!" وہ رک گئے مگر پاس نہیں آئے۔

"تم نے صالحہ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"

"تو کیا معافی مانگوں جا کر؟" وہ چڑ کر بولے۔

"میں یہ نہیں کہتی، وہ غصے میں حسین شاہ کے پاس چلی گئی ہے۔"

"تو کیا جا کر حسین شاہ کے پاؤں پکڑ لوں۔"

"میں یہ کب کہہ رہی ہوں، تم ادھر تو آؤ۔"

"کیا کروں گا ادھر آ کر۔" وہ جیسے تھکے تھکے سے انداز میں مڑے اور قریبی صوفے کے کنارے پر رک کر بولے۔

"تم شہر جا رہے ہو، صالحہ حویلی جا چکی ہے اور میں بھی تھوڑی دیر میں نکلنے والی ہوں۔ رات کو حسین شاہ کے کچھ خاص مہمان ڈنر پر آ رہے ہیں، مجھے جا کر دعوت کا انتظام کرنا ہے۔ میں ادھر رات نہیں رک سکتی۔ اب تم بھی جا رہے ہو تو ادھر [illegible] رہے گا۔ شہرینہ اکیلی ہے گھر میں۔" انہوں نے اصل مسئلہ بتایا۔

"تو کیا کروں، شہرینہ کو ساتھ لے جاؤں یا میں گھر میں چپ کر بیٹھ جاؤں۔ ضروری کام ہے اس لیے تو جا رہا ہوں، کل واپس آ جاؤں گا۔" سلطان بخت کا موڈ اچھا خاصا بگڑا ہوا تھا۔

"میں کب تمہارے ضروری کام پر اعتراض کر رہی ہوں، تم جا کر صالحہ کو لے آؤ۔ اسے ادھر چھوڑ کر پھر بے شک چلے جانا۔"

"کیا... میں اسے لینے جاؤں۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ "اس کا دماغ پہلے ہی ساتویں آسمان پر رہتا ہے اور وہاں اپنے بھائی کے گھر میں اس نے تماشا کھڑا کر دیا ہے اور میرے دماغ میں اتنا بھیجا نہیں کہ اس کے ساتھ مغز ماری کروں۔ آپ سے جو ہوتا ہے۔ کریں میں جا رہا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا سنو، بیٹھو تو سہی۔" خلاف توقع سیدہ کا موڈ اچھا تھا۔ وہ سلطان بخت کی کڑوی کسیلی بھی آرام سے ہضم کیے جا رہی تھیں۔

"جی بولیے، مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"شہرینہ کی رخصتی ایک ماہ بعد کر دیتی ہے۔ پہلے صالحہ کا تم سے جھگڑا رہتا تھا یا شہرینہ ہم دونوں سے الجھتی تھی میں اس بات کا دل میں شکر ادا کرتی تھی کہ نند بھاوج کی آپس میں نہیں لگتی مگر اب کل کے جھگڑے کے بعد میں سوچ رہی ہوں، جتنی جلدی ہو سکے شہرینہ کی رخصتی کر دی جائے۔ اس سے پہلے کہ صالحہ کی الزام تراشیاں کچھ اور رنگ اختیار کریں یا شہرینہ کی سوچ آلودہ ہو۔"

"اچھی بات ہے!" وہ اکتا کر بولے۔

"تم اب بہن کی رخصتی کی تیاریاں کرو۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے۔"

"آپا جان! ہم کوئی بھوکے ننگے ہیں۔" وہ تنگ کر بولے "جس جس چیز کی ضرورت ہے اس کی لسٹ بنا کر منیجر کو فون کر دیں۔ ساتھ جانا چاہیں تو ساتھ چلی جائیں۔ وہ سب کچھ ایک ہفتے میں پرووائیڈ کر دے گا شہرینہ خود شاپنگ کے لئے جانا چاہے تو آپ ساتھ چلی جائیں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" انہوں نے چٹکیوں میں مسئلہ حل کر دیا۔

"سلطان بخت! شادیاں اس طرح نہیں ہوا کرتیں۔"

"پھر بتائیں مجھے، کس طرح ہوا کرتی ہیں۔" وہ چڑ کر بولے۔ "آپا جان! میں اس لمبی بحث کا میرے پاس وقت نہیں ہے اور ہاں۔" وہ رکے "ایک ضروری بات مجھے بھی آپ سے کرنا تھی۔"

"وہ کیا؟"

"بس... مجھے۔" انہیں جیسے صحیح جملہ نہیں سوجھ رہا تھا "اس حویلی کو ایک وارث کی ضرورت ہے۔"

"اس میں شک والی کون سی بات ہے۔"

"میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے کو تو سیدہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور جو اسلام آباد میں تحفہ رکھا ہے اگر وہ یہ انکشاف طشت ازبام کر دیتیں تو اب تک حسین شاہ انہیں کب کا فارغ کر چکے ہوتے۔

"تمہیں معلوم ہے سلطان بخت! تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ ہولے سے بولیں۔

"جو آپ نے سنا ہے۔"

"[illegible] اس بات کے نتائج سے تم آگاہ ہو نا؟" وہ جیسے بے یقینی سے بولیں۔

"آپا جان! کیا میری زندگی آپ کی زندگی کے عوض رہن رکھ دی گئی ہے۔ اگر میں دوسری شادی کر لوں گا تو کیا ہو گا۔ حسین شاہ آپ کو طلاق دے دے گا۔ آخر اس دوسرے نے اور میری زندگی کتنی تباہ کرنی ہے آپا جان! کیا میرا اپنی زندگی پر کچھ حق نہیں اور میں یہ سب اپنے لیے نہیں کرنا چاہ رہا اس حویلی کے لیے اس کے وارث کے لیے۔ کیا آپ چاہتی ہیں میں بے نشاں مر جاؤں۔" وہ تیز تیز بول رہے تھے۔

"خدا نہ کرے۔ کیسی بدفال باتیں منہ سے نکال رہے ہو۔"

"آپا جان! میں نے بہت سوچا ہے۔ کیا آپ نہیں سوچتیں پھر آپ میری کیسی خیر خواہ ہیں۔ اپنی خاطر میری زندگی کو [illegible] جا رہی ہیں۔ صالحہ نے مجھے کوئی ذہنی دلی خوشی دی ہے جو میں آسودہ حال رہوں۔ اس پر اکتفا کر لوں [illegible]" وہ [illegible]

"تمہارا کیا خیال ہے میں کچھ نہیں سوچتی اس حویلی کے متعلق۔" سیدہ کو غصہ آ گیا۔

"سوچتی ہیں مگر پہلے اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر۔ مجھے پالنے کا اچھا تاوان لیا ہے آپ نے اور کتنا خراج دوں آپ کی قربانیوں کو۔ رحم کریں اب مجھ پر، تو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ یہ ہو کر رہے گا ایک دن۔ خدا حافظ۔" تیز تیز بولتے وہ رکے نہیں اور آگے [illegible] سیدہ کی پکار کو نظر انداز کر کے باہر گاڑی میں آ بیٹھے۔

"مجھے کھلونا سمجھ لیا ہے انہوں نے اور میری زندگی کو کھیل۔ پانچ بیٹیوں کا طوق گلے میں پڑ چکا ہے پھر بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی [illegible] حسین شاہ چھوڑیں۔ مجھے نہ چھوڑیں۔ ایک ہی رٹ۔" وہ بڑی تیزی سے گاڑی حویلی سے نکال لے گئے۔ سیدہ کھڑکی میں کھڑی ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہیں۔

"نین تارا۔" کھلی فضا میں آتے ہی انہوں نے اپنا ذہن بدلا کیا آج اس کی خاطر تو وہ شہر جا رہے تھے اس دن کی تلخ ملاقات کے بعد نین تارا نہ ان کا کوئی فون اٹینڈ کر رہی تھی نہ اس نے خود انہیں فون کیا تھا۔ ایک دن جلدی میں "گل کدہ" بھی گئے تھے وہ ملی نہیں تھی۔

"اس کو منانا بھی ایک علیحدہ دردِ سر ہے۔" انہوں نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

نین تارا اس روز واقعی ان کے لئے دردِ سر ثابت ہوئی تھی۔ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

"شاہ جی! میں مر تو سکتی ہوں اس دن کی تذلیل، وہ تھپڑ کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"کتنی بار تو معافی مانگ چکا ہوں۔ تمہیں معلوم بھی تھا اس روز میرا ذہن کس کیفیت میں تھا پھر بھی تم میرا مذاق اڑانے چلی آئیں، تمہیں تو مجھ سے محبت کا دعوا ہے پھر یہ کیسی محبت ہے نین تارا جو تم میرا مسخرا اڑانے چلی آئیں، میرے زخموں پر نمک چھڑکنے۔ تمہیں ذرا بھی میرے احساسات کی فکر نہ تھی۔" وہ دکھی لہجے میں بولے تو نین تارا کو یکایک احساس ہوا کہ اس روز واقعی اس نے غلط کیا تھا۔

"تمہیں حویلی کی چاہ تھی نا پاگل! حویلی تو بندش ہے' رکاوٹ ہے پابندی ہے آزاد زندگی کے لیے۔ تم ادھر ہر طرح سے آزاد ہو۔ میں نے تمہیں کیا کچھ نہیں دے رکھا۔ تمہارے ایک اشارے پر بھاگا چلا آتا ہوں۔ جب چاہتی ہو ملکوں ملکوں میرے ساتھ گھومنے چل پڑتی ہو نئی گاڑی' نیا گھر' روپیہ پیسہ کس چیز کی کمی ہے تمہیں۔ پھر شوبز میں بھی اپنا شوق پورا کر رہی ہو۔ تم نے کون سا میری پابندی کی پروا کی ہے۔ جاؤ جا کر حویلی میں دیکھو صالحہ کیسی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں' نہ شوہر نہ اس کی محبت نہ توجہ ہمدردی' آزادی کچھ بھی نہیں۔ اس کا سب کچھ تو تم نے لوٹ لیا ہے۔ وہ تو اب صرف نشانِ عبرت بن کر رہ گئی ہے' ہر وقت ڈیپریشن کی مریضہ۔ تم میری محبت میری زندگی ہو اور وجۂ زندگی بھی۔" اتنے پیار اتنی نرمی سے نین تارا کو سلطان بخت نے کبھی نہیں سمجھایا تھا اس کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے وہ اسے بہت پیار' بہت دھیان سے سمجھا رہے تھے۔ ان کی نرم انگلیوں کا لمس سیدھا اس کے دل میں جا اترا تھا۔

"سوری شاہ جی! میں نے اس دن واقعی غلط کیا تھا۔ آئی ایم سوری۔" وہ فوراً "من گئی تھی۔

"اٹس او کے۔ تمہارا بھی قصور نہیں۔ سوکن کی جلن ہی ایسی ہوتی ہے کہ بندے کا خود پر سے اختیار اٹھ جاتا ہے' چلو آج ڈنر باہر کرتے ہیں پھر گھر چلیں گے۔ آج رات بس ادھر ہی رہوں گا۔ سارے اپنے رویے کی تلافی کروں گا۔" وہ آج دل و جان سے اس کے ہو رہے تھے۔

"شاہ جی! ایک فرمائش۔" وہ ان کے مضبوط ہاتھوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟" وہ تو سراپا محبت بھری نظر بنے ہوئے تھے۔

"گاڑی... میری گاڑی پرانی ہوگئی ہے۔ نئی چاہیے۔" اب وہ ان کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔

"کل صبح چلیں گے اور کچھ؟" وہ دل نواز مسکراہٹ سے بولے۔

"کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے اس کے لیے۔" وہ چہکی۔

"کل صبح چیک لکھ دوں گا' جتنے کا کہو گی اور کچھ۔"

"بس۔ میں ڈنر کے لیے تیار ہوتی ہوں۔" اس کے دل کا پیالہ ان کی محبت کے سرور سے لبالب بھر گیا تھا۔

پھر ڈنر کے دوران ہی سلطان بخت کو نہ جانے کیا ہوا۔ عجیب سا خیال آ رہا تھا۔

اگر آپا جان بھی چلی گئی ہوں تو شہرینہ اکیلی ہوگی اور وہ ضدی لڑکی تو کبھی بھی نہیں آئے گی۔ مجھے حویلی جانا چاہیے۔" کھانے کے دوران بھی یہ سوچ بار بار ان کا ذہن بھٹکاتی رہی۔

"ٹھیک سے کھا نہیں رہے آپ' کیا بات ہے؟" نین تارا نے انہیں ٹوکا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" وہ مسکرائے۔

"نین تارا! ایسا ہے کہ میں کل صبح گیارہ بجے کے قریب آجاؤں گا تمہیں شوروم لے جانے کے لیے۔ ابھی مجھے حویلی جانا ہے۔ ایک اہم کام یاد آگیا ہے پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔ کل کی رات تمہاری۔" گل کدہ کے آگے ہی انہوں نے گاڑی روک لی تھی۔ نین تارا نے چہرے کے تاثرات ایک دم سے بدل گئے تھے۔

"کیا مطلب؟"

"ضروری کام ڈیئر! بس کل رات کا۔" نین تارا الجھ سی گئی اس نے ایک نظر اپنی تیاری پر ڈالی۔ سکارلٹ ریڈ کلر کی شارٹ شرٹ' بلیک ٹراؤزر' میچنگ جیولری اور میچنگ میک اپ۔ اسے تو تیار ہونے میں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا نذیر کے بارے میں کیا خیال ہے؟" صوفی صاحب کی آواز رات کے سناٹے میں بخوبی سنی جا سکتی تھی۔ زینب کو نیند نہیں آ رہی تھی کمرے میں گھٹن تھی کچھ اسے۔ آج کل رات کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔ مرمریں خوابوں کی تعبیریں اسے سونے ہی نہیں دیتی تھیں۔ وہ چپکے سے باہر تخت پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ صوفی صاحب کی

آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"کون نذیر!" اماں جی کی آواز کافی مدھم تھی۔ کمزوری کی وجہ سے آج کل بہت دھیمی آواز میں بولنے لگی تھیں۔

"یہ جو نیا مؤذن آیا ہے مسجد میں۔ تم نے دیکھا ہے نا۔"

"کچھ خاص نہیں دیکھا۔ پچھلے جمعے کو کھانے کی ٹرے اوپر دینے آیا تھا تو سیڑھیوں کے پاس ذرا سی جھلک دیکھی تھی آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں اس سے زینب کا رشتہ طے کر رہا ہوں۔" ننھا سا ایک بم تھا جو رات کی تاریکی اور سناٹے میں زینب کے بالکل پاس آکر پھٹا تھا وہ جو تخت پر نیم دراز فضا کی خنکی کو محسوس ہی کرنے لگی تھی ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا۔ کیا مطلب؟" اماں جی کو بھی یقیناً "کرنٹ لگا تھا۔

"مطلب کیا... میں نے کوئی مشکل بات کی ہے۔" صوفی صاحب نے ناگواری سے کہا۔ "اچھا لڑکا ہے۔"

"صوفی صاحب! وہ لڑکا نہیں چالیس سال کا مرد ہے' کمزور' تختی سا' آدمی سا" اماں جی نے جیسے انہیں یاد دلایا۔

"مرد بھی چالیس سال کا نہیں ہوتا۔ کنوارا ہے ابھی تک۔ شادی نہیں کی' گاؤں میں اپنا پکا کوٹھا ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے ادھر اور بس ایک بہن ہے شادی شدہ ہے۔ ادھر تنخواہ بھی پاتا ہے اور ایک دو سرے مدرسے میں پڑھانے بھی جاتا ہے۔ ادھر بھی اچھا ہدیہ لے لیتا ہے۔ بیوی کا بوجھ بخوبی اٹھا سکتا ہے۔ شریف ہے' عقل مند ہے گھر بنانے کا شوقین بھی۔ میں نے اسے ان چھ ماہ میں اچھی طرح پرکھ لیا ہے۔ کوئی خامی مجھے اس میں نظر نہیں آئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ایک دو ماہ تک زینب کا نکاح کر کے اسے رخصت کر دوں گا آمنہ کے لیے بھی میں نے اپنے ایک واقف کار سے کہہ رکھا ہے۔ دو چار دنوں تک وہ بھی کوئی نہ کوئی اچھا رشتہ لے آئے گا۔ بس اب میں اپنے ان فرائض سے جلد سے جلد سبکدوش ہونا چاہ رہا ہوں۔ میری ریٹائرمنٹ میں دو سال ہیں۔" صوفی صاحب جیسے سب طے کیے بیٹھے تھے۔

"معاف کیجیے گا صوفی صاحب! اس کو سبکدوش ہونا نہیں سر سے بوجھ اتارنا کہتے ہیں۔"

"تم اس کو جو بھی کہو میں نے یہ سب سوچ لیا ہے۔ ان دونوں کے بعد جویریہ بھی ہے میں تو بلکہ سب سے پہلے جویریہ ہی کا کرنا چاہ رہا تھا مگر نذیر نے زینب کی خواہش ظاہر کی تو میں نے ہامی بھر لی۔"

"ہامی بھر بھی لی۔" اماں جی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اماں کی چارپائی زور سے چرچرائی تھی۔

"وہ پولیو زدہ' منحوس' مدقوق بیمار نذیر میرے لیے رہ گیا ہے۔" زینب تخت پر بیٹھی مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

"ہاں تو اور میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں اتنی دیر سے۔" صوفی صاحب اپنے اسی بارعب لہجے میں بولے۔

"صوفی صاحب! آپ کو زینب کی خبر ہے نا۔"

"کیا۔ کیا خبر ہے مجھے زینب کے بارے میں۔" وہ غصے سے بولے۔

"وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔" وہ بے بسی لہجے میں بولیں۔

"رابعہ بی بی!" صوفی صاحب دھیمے لہجے میں دھاڑے۔ "کیا تمہاری تربیت ایسی ہے کہ وہ ایک جائز بات پر ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔"

"بہر حال میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں اپنی ہی زندگی میں ان تینوں فرائض سے فارغ ہونا چاہتا ہوں عزت اور آبرو کے ساتھ۔ خدا نے دو بیٹے دیے تھے۔ کبھی سوچا تھا دونوں میرا بوجھ بٹائیں گے میرے بازو بنیں گے ایک نے جیتے جی مجھے مار ڈالا دوسرا حرام کاموں میں الجھ گیا اور آگ کے انگارے بھر بھر کر ادھر بھی لاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ تم یا تمہاری بچیاں ان انگاروں کو جسم و جاں کی حرارت کے لیے فرطِ اشتیاق سے اپنے دامن میں بھریں۔ میں ان سے بچنے کا انتظام کرنا چاہتا ہوں۔ آمنہ اور زینب کا نکاح ان شاء اللہ ایک دو ماہ میں اکٹھے کروں گا جو کچھ تم نے جمع کر رکھا ہے اس کی تفصیل بھی مجھے ایک دو دن میں بتا دینا۔ میں نے بھی کچھ لوگوں سے جن کے گھروں میں بچوں کو

قرآن پاک پڑھانے جاتا ہوں' ان سے کہہ رکھا ہے بڑے بڑے لوگ بڑی زکوۃ نکالتے ہیں۔ انشاءاللہ ہم اپنی بچیوں کو بڑے اچھے طریقے سے رخصت کر سکیں گے۔ اس کے بعد جو رہ جائے گی۔ اس کا بھی اللہ نے چاہا تو اس سال کے آخر تک کہیں نہ کہیں کر دوں گا۔" وہ رکے "رابعہ بی بی! میں دل کا مریض ہوں۔ میری زندگی کا اب کچھ بھروسا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد میری بچیاں دربدر کی ٹھوکریں کھائیں یا بھائیوں کے آگے جا کر ہاتھ پھیلائیں۔ یہ میرا بوجھ ہیں۔ انہیں میں ہی اٹھاؤں گا تم بس دعا کرنا۔"

"مگر صوفی صاحب! اس طرح جلد بازی میں رشتے ناتے طے نہیں کیے جاتے۔ آپ کچھ دن اور دیکھ بھال کر کچھ اور رشتے......"

"رابعہ بی بی! بس اب میں اس موضوع پر اور کچھ نہیں سنوں گا۔ زینب کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ آمنہ کا چند دنوں تک ہو جائے گا۔ بہتر ہے تم زینب سے کہو اب کالج جانا بند کر دے۔ اپنی زبان میں اپنی اس گستاخ لڑکی کو سمجھا دینا مجھے کچھ کہنے کی نوبت نہ آئے۔ اب سو جاؤ صبح پھر تہجد کے لیے آنکھ نہیں کھلتی۔" انہوں نے کہتے ہوئے کروٹ لی تھی۔

"سمجھاؤں گی تو میں اب آپ کو بابا صاحب! زینب کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے جسے آپ نذیر جیسے کلو کے پلے سے باندھ دیں گے۔ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔ ذرا جا کر سیفی کے دل سے تو پوچھیں۔ آپ چاہتے ہیں۔ میں ایک زندان سے نکل کر دوسرے میں دفن ہو جاؤں۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔" وہ دور زور سے سر ہلا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سلطان بخت کو حویلی آتے آتے بھی ایک بج گیا تھا معلوم نہیں کیوں ان کا دل تنگ سا ہو رہا تھا۔

"آخر کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل اس قدر نیچے نیچے کیوں جا رہا ہے۔" انہوں نے پریشانی سے سوچا۔ ان کی گاڑی اب حویلی کی طرف جانے والی کچی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

"بہت دیر ہو گئی۔ آپا تو چلی گئی ہوں گی۔" دل کی کیفیت کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ ادھر ادھر کی باتیں سوچ رہے تھے۔

گاؤں میں ہو کا عالم تھا۔ دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں' قریب کے کسی کھیت میں کوئی گیدڑ رو رہا تھا۔ اس کی منحوس آواز اور ان کا دل برا کر رہی تھی۔ ان کی گاڑی کچی پگڈنڈی پر ڈولتی جا رہی تھی کہ سامنے سے آتی ایک اور گاڑی نے جیسے ان کا رستہ روک لیا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائیٹس میں انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اس وقت حویلی کی طرف سے کس کی گاڑی آ رہی ہے؟" ان کا ماتھا ٹھنکا۔

"کون...... کون ہیں آپ؟" سلطان بخت نے گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر دوسری گاڑی کے ڈرائیور سے سخت لہجے میں پوچھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ انہیں اب صاف دکھائی دے رہا تھا بلیک ٹوپیس میں وہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکا تھا جس کا روشن چہرہ دور سے انہیں کچھ دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا۔

"اور کدھر سے آ رہے ہیں؟" اس کے چہرے پر نظریں جما کر انہوں نے اسی درشتی سے پوچھا۔

"جی میں رستہ بھول گیا تھا' آپ کی حویلی کے ملازم نے گائیڈ کر دیا ہے' مین روڈ سے بھٹک گیا تھا اب جا رہا ہوں۔" اس کی آواز بے حد صاف تھی اور لہجہ پر اعتماد۔

سلطان بخت کی نگاہیں ابھی بھی غیر مطمئن تھیں' پھر بھی انہوں نے خفیف سا سر ہلا کر اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

عبدالمبین نے ایک گہرا سانس لے کر سیٹ کے نیچے بیٹھی شہرینہ کو دیکھا اور گاڑی اس کچی پگڈنڈی سے نکالنے لگا۔

☼ ☼ ☼

صبح بہت ہنگامہ خیز تھی اور بہت خوف ناک بھی۔

شہرینہ پوری حویلی میں کہیں نہیں تھی۔

سلطان بخت رات کو حویلی لوٹے تو تقریباً" سب ملازمین سو چکے تھے۔ حویلی کی مین لائٹس بجھ چکی تھیں چوکیدار سے انہیں اس نوجوان کے بارے میں پوچھنا یاد نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے ذرا سی دیر کو شہرینہ کے کمرے کے آگے رکے بھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ لاکڈ تھا اور دروازے کے نیچے سے نائٹ بلب کی روشنی کی ہلکی سی لکیر باہر آ رہی تھی' وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

صبح ناشتے کے لیے بھی وہ جلدی اٹھ گئے۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر ملازمہ کو شہرینہ کو بلانے کے لیے بھیجا جس نے آ کر بتایا کہ شہرینہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔

اس کی اطلاع اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ اخبار کا اسپورٹس والا صفحہ ان کے ہاتھ سے ہی نیچے گر گیا۔

"کیا بک رہی ہو؟" وہ قہرناک نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے غرائے۔

"شاہ جی! میں ان کے کمرے کے باتھ روم' اسٹڈی' لاؤنج سب طرف دیکھ آئی ہوں اور حویلی میں تو میں نے انہیں صبح سے نہیں دیکھا۔ میں تو جی فجر ویلے سے اٹھی ہوئی ہوں۔"

وہ بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔ ان کا اگلا جملہ کیا ہونا چاہیے وہ اس کے پریقین لہجے پر ٹھٹک کر سوچنے لگے۔

"اوہ مجھے یاد آیا۔ آپا رات کو دیر سے آیا تھا۔ شہرینہ نے مجھے آپا کی طرف چلنے کو کہا تھا۔ میں ہی اسے ادھر چھوڑ کر آیا تھا۔ تم وہ کارڈلیس اٹھا کر لاؤ میں آپا کو فون کرتا ہوں۔"

وہ سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔ ملازمہ کی نظریں صاف اس کے بے یقین ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ وہ جلدی سے کارڈلیس اٹھا لائی۔

"اور تم۔۔۔" ملازمہ جانے لگی تھی کہ سلطان بخت نے اسے روکا۔

"جی!" وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"تم ادھر جا کر [illegible] بیٹھ جاؤ۔ ابھی تم اس کمرے سے باہر نہیں جاؤ گی۔" انہوں نے ڈانٹ کر اسے ڈائننگ روم کے [illegible] کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کیوں شاہ جی؟" ملازمہ نئی لگتی تھی جو یوں سوال کرنے کی جرأت کر رہی تھی اور سلطان بخت نے اسے حویلی میں دیکھا بھی پہلی بار تھا۔

"جو میں نے تم سے کہا ہے وہ کرو سوال مت کرو' دفع ہو جاؤ۔" وہ زور سے دھاڑے تو وہ سہم کر اس کمرے کی طرف دوڑی اور چھوٹے صوفے کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔ سلطان بخت مدھم آواز میں سیدہ سے بات کرنے لگی۔

"آپا! میں ابھی پوری حویلی چیک نہیں کر سکتا اگر یہ خبر ذلت بھری یہ خبر درست ہوئی تو ہم سب کو نہ زمین کے نیچے جگہ ملے گی نہ اوپر۔ آپ فوراً" جلدی ایک پل سے بھی پہلے یہاں آئیں اور آ کر خود دیکھیں اور اس نواب زادی کو بھی لے کر آئیں جس کے دفع ہو جانے کی وجہ سے وہ یہاں سے جانے کی جرأت کر سکی ہے۔"

انہوں نے شعلہ بار نگاہوں سے دور بیٹھی سہمی ہوئی ملازمہ کو گھورا اور فون بند کر دیا ان کے خون میں جیسے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں لمحہ بہ لمحہ فشارِ خون بلند ہوتا جا رہا تھا۔

سیدہ گیارہویں منٹ میں صالحہ کے ساتھ حویلی میں موجود تھیں۔

ان دونوں نے خود ہی آدھ گھنٹے میں پوری حویلی چھان ماری۔

شہرینہ اس عالیشان حویلی کے ماتھے پر بدنامی اور ذلت کا جھومر سجا کر جا چکی ہے۔ انہیں یقین ہو گیا اور اس یقین کی سند اس کے بیڈ روم کے دراز سے بھی مل گئی۔

"آپا جان اور لالہ! آپ دونوں نے میرے ساتھ بے حد زیادتی کی۔ کیا میں آپ دونوں پر اس قدر بوجھ تھی کہ مجھے اٹھا کر آپ نے اسی سالہ بڈھے کے سر پر تھوپ دیا۔ میرے بابا جان زندہ ہوتے تو کیا میرے ساتھ وہ یہ زیادتی ہونے دیتے؟ میں نے تو ان کے بعد آپ دونوں کو ہی اپنا سب کچھ سمجھا تھا اور آپ نے شدید دھوکا کیا میرے ساتھ اور میرے احتجاج' انکار کو کچھ بھی نہ سمجھا تو پھر میں آپ لوگوں سے مزید کیا توقع رکھوں جب آپ کو میری پروا

میری فکر نہیں تو مجھے بھی آپ کا خیال نہیں' نہ آپ کا' نہ آپ کی عزت و آبرو کا۔ مجھے اپنی زندگی اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے گزارنے کا پوری طرح سے حق حاصل ہے' میں بالغ ہوں' آزاد اور خود مختار اپنے لیے' جو بہتر سمجھوں کر سکتی ہوں۔ ابھی میں ادھر سے کچھ بھی نہیں لے کر جا رہی۔ سوائے تھوڑی بہت نقدی اور زیور کے۔

لیکن میں اپنے حق سے دست بردار نہیں ہو رہی۔ اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جمانے کے بعد اپنا حق لینے ضرور آؤں گی اور وہ دن کل صبح کا بھی ہو سکتا ہے اور چند ماہ بعد کا بھی۔ آپ لوگ تیار رہیے گا۔

میں اس طرح جانا نہیں چاہ رہی تھی' آپ لوگ اپنا فیصلہ اگر اس طرح مجھ پر نہ ٹھونستے تو شاید میں یہ قدم کبھی نہ اٹھاتی۔ ہر کلمہ گو متقی' مسلمان اللہ کا پیارا ہوتا ہے۔ صرف سید زادے نہیں اور مجھے کلمہ گو' نیک' ہم عمر مسلمان ہم نوا کی ضرورت ہے' اسی سالہ ارب پتی بڈھے کی نہیں۔ میں اس کی دولت کا کفن پہن کر بھری جوانی میں مرنا نہیں چاہتی' نہ سونے کے ڈھیر میں دفن ہو کر خود کو جیتے جی قبر میں اتار سکتی ہوں۔

امید ہے آپ لوگوں کو میری بات سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ مجھے ڈھونڈنے کی حماقت مت کیجئے گا اور پولیس تو آپ یقیناً نہیں لیں گے۔

میں خود ہی چند دنوں تک آپ سے رابطہ کر لوں گی۔

شہرینہ

"ڈھونڈنے۔" سلطان بخت نے مٹھیاں بھینچیں۔ "بد بخت اب تجھے ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی۔ میں تیرے ہونے کا جواز ہی ختم کر دوں گا۔ بے غیرت تیرا ہر نشان مٹا دوں گا۔"

دور کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی ملازمہ پر نظر جمائے دانت بھینچے شدید غصے کے عالم میں بڑبڑائے۔ سیدہ ہاتھ میں کاغذ لیے بے حس بیٹھی تھیں' صالحہ کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔

"اب کیا کریں سلطان بخت؟" سیدہ کی آواز کسی قبر سے آئی تھی۔

"کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں' آپا! اس کو باہر نہیں جانے دینا۔" سلطان بخت باہر جاتے ہوئے اس ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے جو اب رونے کو تھی' "سلطان بخت کدھر گیا ہے۔" سیدہ سوچنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

بروقت طبی امداد ملنے سے مشی کی جان تو بچ گئی تھی مگر خون بہت بہہ گیا تھا اور زخم بھی بہت گہرا آیا تھا' حالت بھی خطرے سے باہر نہیں بتائی جا رہی تھی' ابھی وہ آئی سی یو میں ہی تھی۔

یاسمین اور اظہر آئی سی یو میں کئی گھنٹے سے مسلسل ٹہل رہے تھے۔ معاذ صوفے پر بیٹھا ان دونوں کی پریشان صورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خود کچھ ہی دیر پہلے آئی سی یو سے باہر آیا تھا۔

"آپ لوگ بیٹھ جائیں۔ اب مشی ٹھیک ہے۔" کافی دیر انہیں یوں بے قراری سے ٹہلتے دیکھ کر معاذ نے کہا۔

"میری بچی' اسے کچھ ہو جاتا تو میں تو اس کے ساتھ ہی مر جاتی۔" یاسمین سینے پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے بولی۔

"کچھ ہو' یہ تو اپنی ہی وجہ سے ہوتا۔" اظہر تلخی سے بولے۔

"اس نازک گھڑی میں تو آپ اسے کچھ مت کہیں۔" یاسمین روتے ہوئے بولی۔

"چپ کر جاؤ تم۔ تمہاری تربیت اور لاڈ کا نتیجہ ہے جو نوبت یہاں تک آ گئی۔" اظہر غصے سے چلائے۔

"پلیز اظہر بھائی! ہاسپٹل ہے۔ پھر آئی سی یو کے باہر یوں بولنا۔ آیئے ادھر ویٹنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" معاذ ان کا بازو تھامتے ہوئے بولا۔

"نہیں' میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔" وہ آہستگی سے اپنا بازو اس سے چھڑاتے ہوئے بولے تو معاذ دوبارہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

صبح کا اجالا ہر طرف پھیل چکا تھا جب ڈاکٹر نے آ کر بتایا کہ مشی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ ہم تھوڑی دیر تک انہیں روم میں شفٹ کر رہے ہیں تو دونوں میاں بیوی کی جان میں جان آئی۔

پھر تھوڑی دیر بعد اسے روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ ایک ہی رات میں وہ اتنی لاغر دکھائی دے رہی تھی جیسے برسوں سے بستر پر پڑی ہو' رنگ زرد' پپڑی زدہ ہونٹ' اندر کو دھنسی آنکھیں اور بے جان جسم۔

"احمق لڑکی!" معاذ اسے دیکھتے ہی بڑبڑایا' یاسمین دیوانوں کی طرح اس کے ہاتھ' منہ چومے جا رہی تھی۔

"پلیز آپ ایسا نہ کریں۔ ابھی انہیں ریسٹ کرنے دیں' یہ نیند کی دواؤں کی وجہ سے سو رہی ہیں۔ انہیں ابھی سونے دیں۔" سسٹر نے ان کی دیوانگی دیکھ کر بے نیازی سے ٹوکا تو یاسمین دل پر صبر کر کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"اظہر بھائی' بھابی! میرا خیال ہے' آپ لوگ اب گھر جائیں' میں ہوں مشی کے پاس۔" دونوں کے ستے ہوئے چہرے اور ملگجے حلیے دیکھ کر معاذ نے از راہ ہمدردی کچھ دیر بعد کہا۔

"معاذ! تمہارا شکریہ' تم ساتھ نہ آتے تو یہاں کوئی بھی ڈاکٹر اسے اٹینڈ نہیں کرتا۔" اظہر نے جھجکتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا' معاذ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "یہ تو میرا فرض تھا۔" جیسا روایتی جملہ بھی وہ نہ بول سکا۔

"میرا خیال ہے' پھر میں چلتا ہوں' گھنٹے دو گھنٹے تک آ جاؤں گا' مشی کے لیے سوپ وغیرہ بنوا لاتا ہوں۔" اتنی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا تو دونوں نے سر ہلا کر اسے جیسے جانے کی اجازت دے دی۔

"معاذ! ام جان کو علم ہے؟" اظہر نے دروازے کے پاس اسے پکار کر پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تو نہیں۔" وہ رک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا کہ "جا کر بتا دوں۔"

"میرا خیال ہے اب جا کر بتا دو' نہ بتایا تو وہ خفا ہوں گی کہ مجھے لاعلم رکھا۔" اظہر کے کہنے پر وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اور گھر آ کر جب اس نے ام جان کو بتایا تو وہ فوراً چلنے کو تیار ہو گئیں۔

"غضب خدا کا! اس گھر میں میری اب یہ اہمیت رہ گئی ہے' اتنا بڑا سانحہ ہو گیا اور مجھے کسی نے خبر تک نہ کی۔ میں بستر میں پڑی بے قرار ہوتی رہی کہ میرے دل کو چین کیوں نہیں۔ میری بچی موت کی دہلیز سے واپس آئی۔ اللہ میں کیسے تیرا شکر ادا کروں۔" وہ اونچا اونچا بول رہی تھیں۔

"ام جان! میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ رات بھر کے رتجگے سے سر بھاری ہو رہا ہے' میں ذرا کمر سیدھی کر لوں پھر ساتھ لے کر آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" معاذ بیزار چہرے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم تھک گئے ہو تو رہنے دو' میں کسی اور کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔"

"نہیں' ام جان! یہ بات نہیں۔ اچھا آپ ٹھہریں' میں چینج کر کے ابھی آتا ہوں۔" وہ انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا' سو اٹھتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

"پتا نہیں یہ لڑکی کیا چاہتی ہے مجھ سے' کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اظہر بھائی نے اپنے منہ سے نہیں بتایا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے' اس نے خودکشی کی کوشش کیوں کی ہے۔"

وہ تیار ہوتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی' مشی اس پر جتنا فدا ہوتی معاذ کو اس سے اسی قدر چڑ ہوتی جا رہی تھی' کچھ اس کی حرکتیں بھی صاف چڑانے والی ہوتی تھیں۔ بچپن ہی سے ماں باپ کے بہت زیادہ لاڈ پیار نے اسے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا' جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتی' وہ اس کی ہونا لازمی تھی اور اب یہ "چیز" معاذ تھا جس پر اس کی ضدی نگاہیں جمی تھیں اور وہ معاذ کو حاصل کرنے کے لیے بے قرار تھی اور پسند کی چیز مل جانے کے بعد وہ اس کا کیا حشر کرتی ہے یہ بھی معاذ کے علم میں تھا اور اگر ایسا ہو جاتا تو معاذ کو اپنا انجام بہت خراب نظر آ رہا تھا۔

"میں ایسا کبھی بھی نہیں ہونے دوں گا۔ ضدی' جاہل لڑکی۔" وہ دل میں پختہ عزم کرتے ہوئے مسز خان کو ہاسپٹل لے آیا۔

مگر اس کے سارے پختہ ارادے عہد اور عزم خاک کا ڈھیر ہو گئے۔ جب ایک ہفتے بعد مشی کو ڈسچارج کر دیا گیا۔

اگرچہ اب وہ کافی بہتر تھی مگر مسز خان کا زیادہ وقت ادھر ہی گزر رہا تھا اور ساتھ میں معاذ کو بھی گھسیٹ لائیں اب وہ مارا بندھا مشی کے کمرے میں بیٹھا تھا جو نظروں ہی نظروں میں اپنی بے قرار دل کی شدتیں اس پر وارے جا رہی تھی اُسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔

"پھر ام جان آپ نے کیا سوچا ہے؟" اظہر نے پوچھا تھا معاذ کی حسیات الرٹ ہو گئیں۔ وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"کس بارے میں؟"

"معاذ اور مشی کے رشتے کے بارے میں؟" یاسمین جلدی سے بولی۔

"دیکھو یاسمین! یہ رشتے ناتے تو دلوں کے معاملے ہوتے ہیں اور عمر بھر کے سلسلے" وہ رکیں۔ "میں نے معاذ سے بات کی تھی۔" وہ ذرا کی ذرا رکیں۔

"پھر کیا کہا معاذ نے؟" یاسمین بے قراری سے بولی۔

معاذ پر سکون ہو کر بیٹھ گیا۔ مشی کا دھیان بھی اب باہر ہونے والی گفتگو پر تھا۔

"وہ نہیں مانتا اظہر۔" ام جان بے بسی سے بولیں۔

"کیوں... کیوں ام جان؟"

"وہ کہتا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا اور مجھے ابھی شادی کرنی بھی نہیں، مجھے ابھی کیریئر بنانا ہے۔"

"ابھی شادی نہ کرے منگنی کر لے، جب کہے گا تب شادی کر لیں گے ام جان۔"

"ہماری ایک ہی بیٹی ہے، وہ موت کے منہ سے نکل کر آئی ہے اور میں دوبارہ اسے کسی کڑے مرحلے سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ پلیز! آپ اس سے بات کریں اسے سمجھائیں وہ آپ کی بات نہیں ٹالتا۔" یاسمین رو دینے کو تھی۔

"یاسمین! بچوں جیسی باتیں نہیں کرتے۔ ایسی ایک حماقت میں زہت اور شہباز کے معاملے میں بھی کر چکی ہوں۔ دیکھا ہے ساری دنیا نے اس کا انجام...

ہائے... میرا کلیجہ کٹتا ہے سوچتی ہوں جب، دونوں کی صورتوں کو ترس گئی ہوں کہ کیوں میں نے زبردستی کی۔ کیوں اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو تباہ کیا۔ تم دونوں بھی یہ غلطی مت کرو۔" وہ رو پڑیں۔

"ام جان! ہم کیا کریں۔ بتائیں کیا کریں۔" اظہر بے بسی سے بولا۔

"سمجھاؤ اس کو، یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ دل ملنے کی بات ہے۔ یہ زبردستی کے سودے نہیں ہوتے۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"ام جان! سمجھا چکے ہیں بہت اور اس کا نتیجہ آپ بھی دیکھ چکی ہیں۔ وہ نہیں مانتی۔ آپ بتائیں کیا کریں؟"

انہیں اس وقت ام جان ہی آخری سہارا نظر آ رہی تھیں جو ان بیٹی کی زندگی کی ڈوبتی نیا کو پار لگا سکتی تھیں۔

"کیوں اسے اتنا سر چڑھایا تھا کہ وہ اس قدر خود سر ہو گئی۔" انہوں نے نظریں یاسمین پر ٹکائیں۔

"ام جان! اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں، آپ معاذ سے بات کریں۔"

"وہ نہ مانے تو کیا زبردستی کروں؟" وہ درشتی سے بولیں۔

"کیوں نہیں مانے گا اتنا اچھا رشتہ اور کہاں سے ملے گا اسے اور آپ نے کیا نہیں کیا اس کے ساتھ"

"ام جان! یاسمین احمق ہے۔ بے وقوف ہے اسے بات کرنا نہیں آتی۔ پلیز آپ غصہ نہیں کریں۔ آپ کوشش تو کریں، اپنی محبت کا واسطہ دیں۔ وہ مان جائے گا۔ مشی کی زندگی کا سوال ہے۔"

"اظہر! میرے بچے کیوں مشی کو تباہ کرنے پر تلے ہو۔ یہ حماقت میں بھی تو کر چکی ہوں۔ پانچ برس ہونے کو آئے اپنے بچے کی شکل کو ترس گئی ہوں۔ پانچ برس پہلے ڈیپوٹیشن پر جرمنی گیا تھا۔ ابھی تک نہیں لوٹا اور میرے دل کا کیا حال ہے۔ کس سے کہوں۔" وہ رو دینے کو تھیں۔ ان کا ضعیف دل تو اب بات بات پر بھر آتا تھا۔

"شہباز کا فون بھی نہیں آتا اب؟"

"آیا تھا، چار ماہ پہلے۔ میں نے کہہ دیا کہ اب تو فون نہ کیا کر۔ ایک ہی بار ماں کے مرنے کا فون تجھے آئے گا تو پھر کر لینا۔ اس کے بعد دوبارہ نہیں آیا۔"

"وہ آتا کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے۔ کس منہ سے آؤں۔"

"زہت نے حرکت بھی تو ایسی کی ہے۔ کوئی مرد کہاں تک ایسی عورت کو برداشت کرے۔" یاسمین جلدی سے بولی۔

"یاسمین! کیوں اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے پر تلی ہو، جس بات کا علم نہیں۔ اس کو مت بڑھا چڑھا کر بیان کرو۔ میں نے ان دونوں کا معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کر دیا ہے وہی بہتر کرے گا، بس دل کٹتا ہے تو اس معصوم ارتضیٰ کو دیکھ کر اور تو..." وہ شاید اپنے آنسوؤں پر پھر قابو نہیں رکھ سکی تھیں۔

معاذ اٹھ کر کھڑا ہو گیا مزید "مکالمہ" سننا اب اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے جانے کے لیے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ مشی اپنے بستر سے تیزی سے اٹھی اور اس کے قدموں میں آ گری۔ اس نے معاذ کے جوتوں میں قید پاؤں دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔

"پلیز معاذ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ پلیز۔" اس کی ڈبڈبائی آنکھوں میں کیا تھا بلکہ کیا کچھ نہیں تھا۔ التجا، فریاد، رحم کی بھیک اور سب سے بڑھ کر محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور محبت تو اللہ کا تحفہ ہے، جس خوش نصیب کو مل جائے اس پر گویا خدا مہربان ہو جاتا ہے اور میں مسلسل اس کی مہربانی اس کے تحفے کو ٹھکرائے جا رہا ہوں بنا کسی جواز کے۔ معاذ کا دل ایک دم جیسے پگھل کر پانی ہو گیا۔

"مشی کیا کر رہی ہو۔ اٹھو۔" وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانے لگا۔

"نہیں پہلے میری محبت قبول کرنے کا اقرار کرو۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"مشی! میں کچھ بھی نہیں۔ تم لوگوں کے ٹکڑوں پر پلنے والا ایک حقیر سا انسان، تمہیں میں کیا دے سکوں گا۔" وہ آہستہ آہستہ کہتے ہوئے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم میرے لیے کیا ہو۔ یہ میرے دل سے پوچھو اور تم مجھے اگر کچھ بھی نہ دو صرف اپنا ساتھ، اپنا نام دے دو تو میں سمجھوں گی اللہ نے مجھے کل کائنات دے ڈالی۔ حقیر تو میں ہوں معاذ! مجھے تمہاری محبت کی بھیک مل جائے تو میں امیر ہو جاؤں گی اس دنیا میں سب سے امیر۔" وہ اسی طرح اس کے پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔

"اس قدر چاہتی ہو مجھے؟" وہ اس کے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹاتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"اس سے بھی زیادہ۔ کہو تو جان سے گزر کر دکھا دوں۔"

"دکھا تو چکی ہو، چلو اب آنسو پونچھ لو اور بیڈ پر جا کر لیٹو۔ ابھی تمہارا زخم کچا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تمہاری محبت مل جائے گی تو سارے زخم سل جائیں گے۔"

"میں کہتا تھا نا، اس قدر فلمیں مت دیکھا کرو۔" وہ اسے بیڈ تک لے آیا۔

"زندگی بھی تو فلم ہے اور میرا رول تو یہی ہے محبت کی بھکارن۔" وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا کمزوری کی وجہ سے آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ رہا تھا۔

"تم نہیں سدھرو گی۔" معاذ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "میں چلتا ہوں۔ سنو اب بستر سے نہیں اٹھنا۔"

"معاذ!" اس نے بے قراری سے پکارا "کہاں جا رہے ہو؟"

"تمہاری سوکن کے پاس۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"کیا؟" وہ اچھل ہی پڑی۔

"بھئی۔ ارتضٰی کے پاس جا رہا ہوں۔ کتنے دنوں سے تمہاری پٹی سے لگا بیٹھا ہوں۔ اسے بالکل اگنور کر رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر میں آ تا ہوں۔ تم اب سو جاؤ۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا تو مشی نے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆ ☆ ☆

اتنا بڑا شاپنگ آرکیڈ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا جس میں اتنی بڑی بڑی شاپس تھیں اور ان میں اتنی قیمتی چیزیں ڈھیروں ڈھیر پڑی تھیں جیسے یہ مفت ملتی ہوں۔ پہلے تو اس کی آنکھیں شہر میں داخل ہوتے ہی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ "اتنا بڑا ہوتا ہے؟" شہر بڑی بڑی کھلی کشادہ سڑکیں، بے تحاشا لوگ، بڑی بڑی قیمتی خوبصورت گاڑیاں، ٹریفک کا ہجوم، سر بفلک خوبصورت عمارتیں، عالیشان محل نما گھر، سنگ مرمر کے بنے ہوئے بنگلے، سبزے اور ہریالی سے سجے ہوئے۔ بڑی بڑی دکانیں مارکیٹیں ۔۔۔ وہ تو ساتھ بیٹھے سیفی کو بھی بھول چکی تھی اسے یوں لگ رہا تھا گاڑی کی کھڑکی سے باہر کوئی پروجیکٹر پر تیز تیز فلم چلا رہا ہے اس نے تو کبھی سینما گھر بھی نہیں دیکھا تھا بس سن رکھا تھا کہ اس میں ایسے فلمیں دکھاتے ہیں۔

"بس بھی کرو زینو! ایک نظر میری طرف بھی دیکھ لو ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔" سیفی کی آواز پر وہ چونک کر مڑی جیسے پہلی بار پتا چلا ہو کہ گاڑی میں کوئی اور بھی موجود ہے۔

"میں نے کبھی شہر نہیں دیکھا اس لیے۔" وہ جھینپ کر بولی۔

"ابھی تو تم بہت کچھ دیکھو گی جو پہلے کبھی نہیں دیکھا تو کیا یونہی محو ہوتی رہو گی خود سے بھی بے خبر۔ اور یہ بے خبری بڑی خطرناک ہوتی ہے۔"

وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" وہ ٹی ٹاور کی بلند و بالا عمارت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"فی الحال شاپنگ پر۔"

"مگر آپ تو کہتے تھے کہ آپ مجھے اپنی مدر کے پاس لے جا رہے ہیں۔"

"کیا اس حلیے میں لے جاؤں؟"

وہ اس کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا حالانکہ وہ اپنا سب سے اچھا اور قیمتی جوڑا پہن کر آئی تھی۔ یہ سوٹ اس نے پچھلی عید پر بنایا تھا جب عبدالمبین نے اسے پانچ سو روپے دیے تھے اور آج وہی جوڑا اپنے بیگ میں رکھ کر کالج لے آئی تھی۔ کالج میں تو وہ دس منٹ بھی نہیں رکی تھی بس لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آئی جہاں سیفی اس کا منتظر کھڑا تھا۔ آمنہ سے اسپورٹس ڈے کا کہہ کر آئی تھی کہ چار پانچ بجے لوٹے گی آمنہ اس نے زینب کو منع بھی کیا تھا کہ بابا صاحب پوچھیں گے تو خفا ہوں گے مگر زینب نے صاف کہہ دیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا اب بابا صاحب کے ڈر سے وہ کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتی تو پڑھائی بھی نہیں کر سکتی۔ وہ پانچ سے پہلے نہیں آئے گی۔ اس کی بے خوفی پر آمنہ حیران اور متفکر نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"یہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کس خاص الخاص ہستی کو اتنے دھیان سے سوچا جا رہا ہے؟"

"کسی کو نہیں، ہم جلدی چلے جائیں گے نا گھر۔ میں بس دو تین گھنٹے کا کہہ کر آئی ہوں۔"

"کالج ٹائم کے بعد دو تین گھنٹے نا۔" گاڑی لاہور کی خوبصورت سڑکوں پہ دوڑ رہی تھی۔ زینب پھر سے باہر کی رونقوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"نہیں۔ بس آپ جلدی کریں۔" وہ بے سوچے سمجھے بولی۔

"میں تو بہت جلدی کرنا چاہ رہا ہوں، تمہیں کیا معلوم۔" سیفی کی ذو معنی بات پر زینب نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا تھا جس نے زینب کو دوبارہ رخ موڑنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ کا گھر کب آئے گا؟" وہ چند لمحوں بعد اتنی لمبی ڈرائیو سے گھبرا کر بولی۔

"گھر سے پہلے شاپنگ مال، چلو اترو۔" گاڑی شہر کے مہنگے ترین خوبصورت شاپنگ مال کے آگے کھڑی تھی۔

اور ایسا سپر اسٹور اور اتنی قیمتی اشیاء ایک ہی جگہ زینب کو پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

سیفی اسے اپنی پسند کے ڈریسز لینے کو کہہ رہا تھا اور اسے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نظریں مختلف ریکس میں سجی اشیاء اور خوبصورت ملبوسات پر بھٹک رہی تھیں۔ قدم ایک ایک چیز کے آگے جم رہے تھے۔

"یار چلو نا پسند کرو۔ تم تو ادھر ہی شام کر دو گی۔"

سیفی اس کی محویت سے اکتا کر بولا پھر اس نے خود ہی زینب کے لیے تین خوبصورت ڈریسز منتخب کر لیے ساتھ میچنگ جوتے اور جیولری بھی۔

"اتنا کچھ اور اتنا مہنگا میرے لیے؟" اس کی آنکھیں جیسے پھٹی جا رہی تھیں۔ اتنا خوبصورت لباس، خوشبودار پیراہن اسے لگ رہا تھا وہ کسی سہانے سپنے میں سانسیں لے رہی ہے۔

"زینو! یہ ٹرائی روم میں جا کر پہن آؤ۔" سیفی نے مسٹرڈ اور براؤن کلر کا سوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا "یہ ادھر ہے ٹرائی روم۔" اس نے کاؤنٹر کے آخر میں بنے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ شاپر پکڑتے ہوئے جھجک رہی تھی اور حیرت زدہ بھی۔ شاپ کے اندر جا کر اپنے کپڑے چینج کرنے پر اسے لگ رہا تھا وہ کوہ قاف اور پرستان سے یہاں آ گئی ہے۔

"جاؤ نا!" اسے اسی طرح جمے کھڑے دیکھ کر سیفی نے کہا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔

"اور پلیز یہ حجاب وغیرہ اتار کر آنا اس شہر میں تمہیں کوئی پہچاننے والا نہیں۔" وہ اس کے ساتھ آتے ہوئے بولا۔ زینب پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

"کیا؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر پلٹی "حجاب اتار دوں۔"

"ہاں نا، میں جو کہہ رہا ہوں ابھی ہم نے ہوٹل بھی جانا ہے لنچ کے لیے تو کیا تم یہ پردے کی بو بوبن کر جاؤ گی؟ پلیز اب جاؤ نا سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

سیفی کچھ بیزار سا ہو کر بولا "کس قدر ریف پروجیکٹ ہوتی ہیں یہ دیہاتی لڑکیاں۔" وہ دل میں تلملایا۔

زینب اس کا بگڑا موڈ دیکھ کر مرے مرے قدموں سے ٹرائی روم میں گھس گئی۔

"او مائی گاڈ! یہ تم ہو؟ زبردست۔" چند منٹ بعد وہ ڈریس زیب تن کر کے آئی تو سیفی حیران رہ گیا۔ حجاب کے بغیر اور اس خوبصورت لباس میں شہر کی کوئی الٹرا ماڈرن لڑکی لگ رہی تھی۔ تن کے ساتھ چپکی ہوئی بے حد ٹائٹ شرٹ کے ساتھ ماڈرن طرز کا سلا ہوا ٹراؤزر اور چھوٹا دوپٹہ جس کو اس نے اپنے سر اور سینے کے گرد لپیٹنے کی کوشش کی تھی اور وہ مشکل اس کے آدھے سر اور گردن کو ہی چھپا سکا تھا۔

"زینب! تم اس قدر خوبصورت ہو آئی اسمارٹ تمہارا فگر تو قیامت ڈھا رہا ہے مائی گاڈ!"

سیفی اس کے بے حد قریب آ کر اس کے سانچے میں ڈھلے جسم کو دیکھ کر بولا تو وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ "میں اپنی چادر لوں کی کپڑے میں نے پہن لیے ہیں۔" وہ جلدی سے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ میں سے اپنی چادر نکالنے لگی۔

"خبردار۔" سیفی نے شاپر اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا "چلو آؤ ادھر ایک پارلر ہے ادھر چلتے ہیں۔ مما کو تو تم نے آج بے ہوش کرنا ہے۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھا تو مجبوراً زینب کو اس لباس کے ساتھ اس کے پیچھے چلنا پڑا۔ اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ڈولتے قدموں کے ساتھ نظریں نیچی کیے وہ جیسے سب سے چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

پارلر والی نے اسے آدھے گھنٹے میں جیسے پالش ہی کر دیا۔ وہ باہر نکلی تو سیفی دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔

"زینب! تم زینب ہو نا!" وہ پاس آ کر بولا "تم نے آئینے میں دیکھا ہے خود کو۔" زینب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

مارے شرم کے اس کی نگاہیں نہیں اٹھ رہی تھیں اس کے سیدھے باریک بالوں کو انہوں نے شارٹ اسٹائل دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بالکل پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

"چلیں نا اب یہاں سے۔" وہ سیفی کی نظریں اپنے اوپر گڑے دیکھ کر کسمسائی۔

"چلو!" سیفی جیسے ہوش میں آکر بولا۔ وہ فیصلہ جو وہ کئی دنوں سے نہیں کر پا رہا تھا یہیں کھڑے کھڑے اس نے طے کرلیا۔

لنچ کے لیے وہ اسے چائنیز لے آیا تھا۔

زینب سے تو کچھ کھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ارد گرد ٹیبلز پر رش کم تھا مگر پھر بھی اسے لگ رہا تھا وہاں بیٹھے سارے لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

"زینب! بھئی ریلیکس ہو جاؤ۔ تم اپنے گھر سے میلوں دور بیٹھی ہو ارد گرد تمہارا کوئی فیملی ممبر دیکھ بھی لے گا تو بھی نہیں پہچانے گا۔ کھانا اچھا نہیں ہے کیا؟"

"بہت اچھا ہے۔" اتنا اچھا کھانا اور اتنی وافر مقدار میں اس نے کب دیکھا تھا جن نعمتوں کے لیے وہ ترسا کرتی تھی اب سامنے میز سجی ہوئی تھی مگر اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کچھ بھی کھانے کو۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اس مصنوعی ماحول سے بھاگ جائے۔

"زینب! مجھ سے شادی کے بعد تمہیں اسی حلیے میں رہنا ہے اسی ماحول میں موو کرنا ہے پھر اس قدر اپ سیٹ کیوں؟ جان!" سیفی نے اس کا ٹھنڈا یخ ہاتھ تھام کر محبت سے کہا۔

"آپ اپنی مما سے کب ملوائیں گے مجھے؟" سیفی کے گرم مضبوط ہاتھ نے جیسے اس کے پتے کی طرح لرزتے دل کو سہارا دیا تھا۔

"ابھی ادھر ہی تو لے کر جا رہا ہوں۔ تم اچھی طرح کھانا تو کھالو۔ پھر چلتے ہیں۔ مما کے سامنے یوں کانپنا نہ شروع کر دینا" کانفیڈنس سے ان سے بات کرنا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ "زینب یہ سب انسان ہیں۔ ان میں کچھ بھی انوکھا نہیں سوائے پیسے کی فراوانی کے اور اب تو تم بھی ان لوگوں میں شامل ہونے جا رہی ہو۔ اس لیے خود کو سنبھالو مضبوط بنو میں تمہارے ساتھ ہوں پھر بھی تم ڈرتی ہو۔ اپنے گھر والوں کا ڈر ہے تو ان کے ساتھ اب تو محض چند دن کے لیے ہو۔ بس مما تمہیں اوکے کردیں پھر میں چند دن بھی صبر نہیں کر سکوں گا اور وہ تو مجھ سے ابھی بھی نہیں ہو پا رہا۔"

زینب کا دل کچھ مطمئن سا ہو گیا اور وہ مطمئن ہو کر کھانے لگی۔

کھانا کھا کر دونوں اٹھے جیسے ہی بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ ایک دوسرا جوڑا دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ سیفی سائیڈ سے ہو کر باہر نکل گیا۔ زینب نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کا اٹھا سر اور قدم دونوں اپنی جگہ جیسے ساکت ہو کر رہ گئے۔

وہ عبدالمتین تھا اس کا بڑا بھائی۔ زینب کو لگا اس کا دل اس کا سینہ توڑ کر باہر نکل جائے گا یا وہ یہیں کھڑے کھڑے زمین میں گڑ جائے گی۔ عبدالمتین بھی اسے الجھی الجھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" عبدالمتین کی بیوی پلٹ کر ساکت کھڑے شوہر سے بولی جو ایک الٹرا ماڈرن لڑکی پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔

"ہاں چلو۔" وہ بڑبڑایا اور جاتے جاتے پھر ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔

"کیا تم جانتے ہو اس لڑکی کو؟" زینب نے اس کی بیوی کی آواز سنی۔

"پتا نہیں جانتا بھی ہوں یا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"جو میں سمجھا ہوں یہ وہ نہیں ہو سکتی اور مشابہت اس قدر کیسے ہو سکتی ہے۔" وہ جیسے الجھ کر بولا۔

"اوہو بہت سے چہرے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں تمہیں کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔"

"ہاں شاید دھوکا ہی ہے۔" عبدالمتین کی دور سے آواز آئی تھی۔ زینب کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔

"دھوکا۔ کوئی دن میں بھی دھوکا کھا سکتا ہے کھلی آنکھوں روشن دن کے ساتھ بھی دھوکا کھا سکتا ہے؟" وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔

"ارے بھئی، آ بھی جاؤ۔" سیفی اسے دوبارہ لینے آیا تھا جھلا کر بولا۔ زینب ایک گہرا سانس لے کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

واپسی کا سفر خاموشی سے کٹا۔

"تمہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے نا؟" سیفی نے اس سے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ ابھی تو یہ سب خواب لگ رہا ہے۔" زینب چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"خواب!" وہ ہنسا "شاید خواب ہی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں، یہ لو تمہارا گھر آگیا۔" گاڑی ایک بے حد خوبصورت کوٹھی کے گیٹ کے آگے کھڑی تھی۔

"یہ آپ کا گھر ہے؟" وہ سر اٹھا کر دور نظر آتی سنگ مرمر کی عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"پہلے میرا تھا۔ اب تمہارا ہوگا۔" "آؤ نا!" وہ دروازہ کھول کر اس کے باہر نکلنے کا منتظر کھڑا تھا۔ زینب نے کچھ جھجک کر سیفی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف ہرے بھرے کشادہ لان تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ خوبصورت پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے اندر جا رہی تھی۔

"کوئی بھی نظر نہیں آرہا۔" چند لمحوں بعد ہی اسے وہاں پھیلے گمبھیر سناٹے کا احساس ہوا۔

"ہونا کس نے ہے، پاپا آفس میں ہوں گے مما اپنے روم میں، ملازمین کچھ کچن میں باقی اپنے کاموں میں لگے ہوں گے اور میں تمہارے ساتھ۔ تم آؤ گی ادھر تو رونق ہوگی۔ دو چار ہمارے چیاؤں پیاؤں ہو جائیں پھر رونق ہی رونق۔"

سیفی کی بات پر اس نے ایک دم اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کا سرخ و سفید رنگ دن کے اجالے میں دمک رہا تھا۔

"آؤ نا یار، آئی ایم جسٹ جوکنگ!" وہ اس کی معترض نگاہوں کے جواب میں بولا۔ دونوں اندر آگئے۔

بڑے بڑے سجے سجائے خوبصورت کمرے اور ان میں ایسا ایسا سامان تعیش سجا تھا جس کے بارے میں زینب نے نہ کہیں پڑھا تھا نہ سنا تھا۔

"آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔" وہ مبہوت سی چلتے ہوئے بولی۔

"اب تمہارا ہے۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"اچھا تم ادھر بیٹھو۔ میں مما کو لے کر آتا ہوں۔" وہ شاید ڈرائنگ روم تھا۔ وہ اسے صوفے پر بٹھا کر باہر نکل گیا۔

وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ دیواروں پر لگی بڑی بڑی پینٹنگز اہل خانہ کے ذوق کا پتا دے رہی تھیں۔ دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سیفی نہیں تھا۔ ملازمہ کولڈ ڈرنکس لے کر آئی تھی۔

وہ خاموشی سے کولڈ ڈرنک اس کے آگے رکھ کر باہر نکل گئی۔ پانچ سے دس منٹ گزر گئے "یہ سیفی کدھر رہ گیا مجھے دیر ہو رہی ہے" اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی۔ دو بج رہے تھے۔

"اوہ سوری یار! مجھے دیر ہو گئی۔ مما باتھ لے رہی تھیں بس آ رہی ہیں چند منٹ تک۔ تم نے یہ پیا نہیں۔" اس کا لباس بدلا ہوا تھا اور موڈ بھی۔

"نہیں میرا جی نہیں چاہ رہا۔ سیفی مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"بس تھوڑی دیر اور۔ تم یہ پیو نا مما کے کوئسچنز کے جواب بھی دینے ہیں۔ خشک حلق کو تر کر لو بس مما آ رہی

ہیں۔" سیفی نے گلاس اسے تھمایا تو مجبوراً وہ پینے لگی اسے واقعی پیاس لگ رہی تھی۔ چار گھونٹوں میں ہی اس نے گلاس خالی کر دیا۔

سیفی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ گلاس رکھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا' اندر جیسے ٹھنڈک سی اتر گئی۔ اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

"زینو!" سیفی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"ہوں!" آنکھیں بند کیے مسکراتے ہوئے لبوں سے وہ ہولے سے بولی۔

"تم ریڈی ہو نا!" آواز اس کے بے حد قریب سے آئی تھی۔

"ہوں... بست اچھا ڈرنک۔" وہ مسکراتے ہوئے بے خود سے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ ذہن جیسے میٹھی نیند کے ہچکولے لے رہا تھا۔

سیفی نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا زینب بے حس پڑی رہی۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔" وہ سرگوشی میں اس کی گردن کے پاس آکر بولا۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس کا ذہن سو رہا تھا۔ جاگ رہا تھا' اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

"چلو نا۔ اٹھو بھی۔ اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہو رہا۔" سیفی نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کرکے اسے کھڑا کر دیا وہ لڑکھڑاتے قدموں' ادھ کھلی آنکھوں سوئے جاگے ذہن کے ساتھ ڈولتی ہوئی سیفی کے پہلو سے لگی چلنے لگی۔

• • •

"ڈاڈا تھے؟" مین روڈ پر آتے ہی شہرینہ سیٹ کے نیچے سے اٹھ کر اوپر بیٹھ گئی اور عبدالمبین کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر پوچھنے لگی' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ گاڑی کی اسپیڈ بہت تیز تھی' اسپیڈومیٹر کی سوئی اسی نوے کے درمیان تھرک رہی تھی۔ باہر رات کا اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا کہیں کہیں پول لائٹس جل رہی تھیں اور کہیں بالکل اندھیرا تھا۔ سڑک کے ارد گرد تاریکی ہی تاریکی تھی۔

"یہ میں نے کیا کیا؟" یک بیک شہرینہ اندھیرے سے خوف زدہ ہو کر خود سے بولی۔

"تم بولتے کیوں نہیں' بولو نا میرا دم گھٹ رہا ہے۔" وہ اسٹیئرنگ پر رکھے عبدالمبین کے ہاتھ کو جھنجوڑ کر چیختے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟" وہ کچھ غصے سے بولا۔ "دیکھ نہیں رہیں۔ میں ڈرائیو کر رہا ہوں' ہمیں جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہیے' سلطان بخش حویلی جا چکا ہے اگر اسے جاتے ہی تمہارے اس طرح گھر سے نکل جانے کا علم ہو گیا تو وہ اب تک ہماری تلاش میں بندے دوڑا چکا ہو گا خاموشی سے بیٹھو۔ مجھے یہاں سے نکل جانے دو۔"

عبدالمبین نے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ اور بڑھا دی۔ گاڑی جیسے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ رات کے اس پہر سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی کئی منٹوں بعد' ایک آدھ گاڑی ٹرک یا ٹریکٹر وغیرہ گزرتا تھا چند لمحے تو رات کا سکون ہیجان میں بدلتا۔ اس کے بعد پھر ہوتا سناٹا۔

"بس مجھے واپس چھوڑ آؤ۔" چند لمحوں بعد وہ روتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ چپ کرکے بیٹھو' مجھے بھی پاگل مت کرو۔ اس وقت میں کچھ نہیں سن رہا۔" وہ پھر غصے میں آ گیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو" اپنے دل کی کیفیت جو تھی سو تھی' اسے عبدالمبین کا رویہ بری طرح سے چبھ رہا تھا۔

"شہرینہ' ڈونٹ ڈسٹرب می!" عبدالمبین نے گردن اس کی طرف موڑی۔

"میں گاڑی کہیں دے ماروں گا۔ خاموش ہو کر بیٹھو۔" وہ سہم سی گئی۔ عبدالمبین کا دل خود اس وقت الجھنوں کے بھنور میں گھرا ہوا تھا۔

"یہ میں نے غلط کیا یا درست۔ بھلا اپنے کیریر کے اس نازک موڑ پر مجھے یہ حماقت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چند سال ٹھہر کر بھی یہ ریڈیکل جوک کیا جا سکتا تھا۔" اس کے اندر بیٹھا ناصح عبدالمبین اسے جھڑک کر بولا۔

"یہ سب اس شہرینہ کی بچی کی جلد بازیوں کا نتیجہ ہے۔" اس نے جھنجلا کر سہمی ہوئی شہرینہ کی طرف دیکھا۔

"اب یوں منہ بسور کر کیوں بیٹھ گئی ہو' بس دس منٹ اور پھر ہم اپنی منزل سے قریب تر ہو جائیں گے تم دل برا مت کرو۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تسلی دینے لگا۔ شہرینہ نے شکوہ آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اور اپنی ہتھیلیوں کو مسلنے لگی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ شاید رو رہی تھی۔ "میں نے اچھا نہیں کیا۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ سب کچھ غلط ہو جائے گا۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔" عبدالمبین نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا ہو جیسے اسے شہرینہ سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔

"مبین! مجھے بتاؤ نا' میں نے صحیح کیا یا غلط؟" وہ اس کی خاموشی سے تنگ آکر بولی۔

"مجھے کیا پتا' خود اپنے دل سے پوچھو۔" وہ اسے تنگ کرنے کو بولا۔

"میرا دل... تو" اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میرا دل تو میرے سینے میں ہی نہیں' گم ہو گیا شاید۔" وہ عجیب بہکی بہکی سی باتیں کر رہی تھی۔

"کہاں گم ہو گیا؟" وہ مسکرایا۔

"کسی کے پاس امانتاً رکھوا دیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے سنبھالا بھی یا نہیں۔"

وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"آج کل زمانہ خراب ہے۔ کوئی اپنی چیزوں کی حفاظت نہیں کر سکتا کسی دوسرے کی کیا کرے گا۔ تمہیں خیال نہیں آیا۔"

"آیا تھا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "مگر جانے والا مصر تھا وہ اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرے گا میں نے اس کی باتوں پر بھروسا کر لیا۔"

"جب بھروسا کر لیا تو اب کیوں ڈانواڈول ہو رہی ہو۔"

"کوئی خود کب ڈانواڈول ہوتا ہے۔ یہ تو دل کے اندر سے پکار پڑتی ہے۔ مبین! میرے اندر بھی محشر بپا ہے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ آوازیں ہی آوازیں طوفانی۔ جھگڑوں کی آوازیں ہیں اور رونے پیٹنے کی آوازیں اور اس سناٹے میں یہ آوازیں اور بھی بلند ہو رہی ہیں۔ رات کو اس قدر خاموشی اور سناٹا کیوں ہوتا ہے کہ اندر کی آوازیں پاگل کرنے لگتی ہیں۔" وہ زور زور سے سر ہلا رہی تھی۔

"تم دھیان کیوں دیتی ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ" اس نے سرسری انداز میں تسلی دی۔

"تم نہیں سمجھ رہے میری کیفیت۔" وہ جیسے تھک گئی' اپنا آپ سیٹ کی پشت سے ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

"میں ہی تو سمجھ سکتا ہوں تمہاری کیفیت۔" وہ آہستگی سے بولا۔ شہرینہ نے سنا بھی مگر کوئی جواب نہیں دیا وہ شاید اندر کی آوازوں میں گم ہو گئی تھی۔

آدھے گھنٹے کی مزید ڈرائیو پر وہ شہر کی حدود میں داخل ہو گئے سڑکیں پول لائٹس اور سائن بورڈز کی مرکزی لائٹس سے جگمگا رہی تھیں سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی مگر مضافات جیسا سناٹا بھی نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر روشنی تھی۔

روشنی جو سویرے کی تمہید ہے' زندگی کی علامت ہے' اسے لگا وہ دوبارہ زندہ ہو گئی ہے' اسے نئی زندگی ملی ہے۔ واقعی یہ سفر اسے نئی زندگی کے موڑ پر ہی تو لے آیا تھا۔ اب آگے کیا ہو گا۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے روشنی بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی اس نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"نیند آرہی ہے کیا؟" عبدالمبین نے پوچھا۔
"نہیں۔"
"روشنی سے ڈر لگ رہا ہے؟"
"ہاں۔" اس نے فوراً اقرار کرلیا۔
"روشنی سے ڈر۔" وہ ہنسا۔ "ویری اسٹرینج۔"
"یہ اجنبی روشنی ہے' بالکل غیر' مجھے اس ناواقف روشنی سے خوف آرہا ہے۔" وہ آنکھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔
"کم آن شہو! کیسی پاگلوں جیسی باتیں کررہی ہو۔ لگتا ہے کہ تم میرے ساتھ آنے سے خوش نہیں ہو۔" عبدالمبین کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ منزل بہت پاس دکھنے لگی تھی۔ سارے ڈر وسوسے پیچھے رہ گئے تھے۔
"شاید نہیں۔" وہ تھکن زدہ لہجے میں بولی۔
"تو پھر کیوں آئی ہو؟" وہ تنک کر بولا۔
"معلوم نہیں۔" وہ اپنے ہاتھ کھول کر دیکھنے لگی' اسے لگا اس کی ہتھیلیوں میں آئینے لگے ہیں اور ان آئینوں میں حویلی کی چیخ وپکار بھاگ دوڑ لالہ کا غضب' آپا کے بین' پریشانی' صالحہ کی ہنسی۔ شریکوں کا تمسخر سب دکھائی دے رہا ہے اس نے جلدی سے ہتھیلیاں بھینچ لیں۔
"چلو جب کچھ معلوم ہی نہیں تو کیوں خود کو ہلکان کررہی ہو لیکن ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہونے جارہے ہیں لو ہماری منزل آگئی۔" کہتے ہوئے اس نے براؤن گیٹ کے آگے گاڑی روک دی اور ہارن بجانے لگا۔
"یہ...یہ کون سی جگہ ہے ہمارا گھر۔" وہ گیٹ سے آگے دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔
"فی الحال اپنا ہی سمجھو۔" وہ بے فکری سے بولا۔
"مبین ہم ابھی نکاح کرلیں گے نا!"
"بالکل' ڈونٹ وری اندر وکیل صاحب موجود ہوں گے گواہوں کے ساتھ۔" گیٹ کھل رہا تھا چوکیدار نے عبدالمبین کو دیکھ کر دونوں پٹ وا کردیے۔
"یہ کس کا گھر ہے؟" شہرینہ کا دل اب بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔
"میری گاڈ فادر بلکہ مدر سمجھ لو زیور گل کا "گل کدہ" تم نے نیم پلیٹ نہیں پڑھی۔" شہرینہ کو رات کے اس سمے یہ ہوش ہی کہاں تھا چپ چاپ عبدالمبین کے ساتھ چلتی رہی۔ دونوں ایک بڑے سے کمرے میں کھڑے تھے۔
"میڈم کہاں ہیں؟" عبدالمبین نے ساتھ آئے ملازم سے پوچھا۔
"سٹنگ روم میں آپ کا ویٹ کررہی ہیں۔"
"اوکے...." وہ شہرینہ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کرکے ایک اور کمرے میں داخل ہو گیا۔
زیور گل میرون اور گرے کلر کے سلکی گاؤن میں کاؤچ پر نیم دراز کوئی میگزین دیکھ رہی تھی عبدالمبین کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔
"اوہ کم آن موبی! اٹس ٹو لیٹ۔ کب سے تمہارا ویٹ کررہی ہوں' نیکسٹ ڈے اسٹارٹ ہو گیا ہے۔" اس نے کچھ بیزاری سے کہتے ہوئے شہرینہ کو سرسری نظر سے دیکھا۔
"سیپ کا موتی.... اچھا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔
"آپ کو معلوم تو تھا' اتنی دیر ہو جائے گی۔ سب کچھ ریڈی ہے نا۔"
"ہاں لائر صاحب کب سے آئے بیٹھے ہیں بلکہ بیٹھے بیٹھے سو بھی چکے ہوں گے تم لوگ بیٹھو۔ میں کچھ کھانے کو بھجواتی ہوں۔" وہ جانے کو مڑی۔
"نہیں میڈم! اس وقت بھوک نہیں۔ شہرینہ! تمہیں بھوک ہے؟"

"نہیں۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ زیور گل کے حلیے نے اسے کچھ مشکوک سا بنا دیا تھا کہ وہ اچھے لوگوں میں نہیں آئی۔
"اوکے۔ تو چلیں پھر۔" وہ بولا۔
"کہاں؟"
"اوہو.... یہ بے خبری۔" زیور گل ٹھٹھا لگا کر ہنسی۔

دیکھیں کہاں نصیب لے چلے
گھر سے تو فراز چل پڑے ہیں

شہرینہ جیسے کٹ کر رہ گئی۔
"نکاح کے لیے۔" مبین نے اس کی مشکل آسان کی تو وہ سر ہلا کر چادر درست کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی۔
اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ کم از کم عبدالمبین اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کررہا' وہ اس سے نکاح کے لیے ہی تو اس طرح اپنے گھر سے آئی تھی اور نکاح ہونے جارہا تھا۔
کمرے میں پانچ افراد موجود تھے۔ انہیں آتے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند رسمی باتوں کے بعد وکیل صاحب نے کاغذات کھولے ایک نظر ان کا جائزہ لیا۔
"آپ تیار ہیں؟" اس نے شاید عبدالمبین سے پوچھا تھا۔ شہرینہ کی نگاہیں تو جھکی ہوئی تھیں۔ دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ کانوں کی لوئیں دہک رہی تھیں۔ زندگی کا اتنا نازک اور اہم موڑ اور وہ بالکل تنہا' اپنوں سے میلوں دور۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
دس منٹ بعد وہ عبدالمبین کی بیوی کی حیثیت سے اس کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی' عبدالمبین ان لوگوں کو باہر چھوڑنے گیا تھا۔
"اللہ میرے ساتھ بہت اچھا کرنا اگرچہ میں نے اپنوں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا مگر تو گواہ ہے میرا یہ فعل ان کے رویے کا ردعمل ہے' میں معافی مانگ لوں گی جلد ہی' لالہ سے بھی اور آپا سے بھی۔" وہ اپنی انگلیاں چٹخاتے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
"اب کیا بے چینی ہے؟" عبدالمبین نے کمرے میں داخل ہو کر اسے بے چینی سے ٹہلتے دیکھ کر پوچھا۔
"کچھ نہیں۔" وہ سر جھکا کر دھیرا سا مسکرائی۔ اسے یکایک ہی عبدالمبین سے ڈھیروں شرم آنے لگی تھی۔
"چلیں اب...." وہ اس کے جھکے سر کو دیکھ کر بولا۔
"کہاں؟" وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"اپنے گھر جو تمہاری' میرا مطلب ہے ہماری منزل ہے۔"
"وہ کہاں ہے۔"
"میرے ساتھ آؤ گی تو پتا چلے گا نا۔" اس نے آگے بڑھ کر شہرینہ کا ہاتھ بڑے استحقاق سے تھام لیا۔ شہرینہ کے ہاتھ میں کرنٹ سا دوڑ گیا' وہ جھجک کر پیچھے ہونا چاہتی تھی کہ عبدالمبین نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔
"بہت ظلم کررہا ہوں خود پر' جانتا ہوں مگر مجبور ہوں۔ بہت مجبور۔" وہ اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے چھو کر سرد لہجے میں بولا اور اسے چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "آجاؤ۔" شہرینہ حیران حیران سی اس کے پیچھے چل پڑی زیور گل دوبارہ نظر نہیں آئی۔ دونوں گاڑی میں آبیٹھے۔
اسے یکایک عبدالمبین سے خوف سا آنے لگا تھا' اس کا چہرہ اسے بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ وہ بار بار مٹھیاں کھولتی بند کرتی کن اکھیوں سے اس بدلے بدلے ہم سفر کو دیکھتی رہی کہ کب اس کے چہرے کے زاویے پہلے جیسے

لائم ہوں اور وہ کچھ پوچھنے کی ہمت کرے مگر وہ سختی سے منہ بھینچے جبڑے کسے آنکھیں سکیڑے اجنبی بنا بیٹھا تھا۔

باہر رات گہری تھی۔ کالی سیاہ تاریک رات روشنیوں کے باوجود ساری کائنات کو اپنی سیاہ چادر میں لپیٹے خوف کا تاثر پھیلائے چپ چاپ کھڑی تھی۔ رات کے ڈھائی بجے وہ اپنی زندگی میں پہلی بار رات کے اس پہر یوں سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھی۔ رات کے اس پہر تو وہ کبھی جاگی بھی نہیں تھی گھر سے نکلنا تو دور کنار...... صرف ایک بار لالہ کی شادی میں مہندی کی رات...... لالہ آہ۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ صبح بیدار ہوں گے اور مجھے نہ پا کر ان پر...... کیا بیتے گی۔ لالہ! آپ کوئی تو رستہ میرے لیے کھلا رکھتے۔ محبت کا 'نہ' کا 'دوستی کا' 'واپسی کا...... میری کوئی تو بات سمجھنے کی کوشش کرتے پھر شاید میں اتنا بڑا قدم کبھی نہ اٹھاتی۔

آخر لوگ بیٹیوں کو پھولوں کی طرح پالتے ہیں۔ جوان ہوتے ہی انہیں کانٹوں میں کیوں پھینک دیتے ہیں ان نازک کلیوں کے جذبات کا خیال کیوں نہیں کرتے جنہوں نے آگے جا کر بھی ساری زندگی صبر اور ضبط کی بھٹی میں جلنا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

تیز میوزک اور شور کی آواز پر وہ جیسے ایک دم سے سیدھی ہو بیٹھی' چوڑی سی روشن گلی تھی جس کے دونوں اطراف گھر بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف روشنیاں تھیں' شور ہنگامہ آوازیں جیسے کسی کی شادی کا فنکشن ہو تقریباً ہر گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے اس گلی میں رات اپنے خوفناک تاثر کو قائم کرنے میں بالکل ناکام نظر آرہی تھی۔

"یہ...... وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ گاڑی ایک گھر کے آگے رک گئی تھی۔

"اترو نیچے۔" عبدالمبین اجنبی بنا اس کی طرف کا دروازہ کھولے کھڑا کہہ رہا تھا۔ وہ آہستگی سے باہر نکل آئی اور سر اٹھا کر سامنے کے گھر کو دیکھنے لگی۔ گھر دو منزلہ تھا اور دونوں فلورز خوب روشن تھے۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر کی سنوری عورت دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بہت گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ پیپ گلے کی شاکنگ پنک قمیص اسے بے حد ٹائٹ تھی۔ آنکھوں میں بھر بھر کر کاجل لگا رکھا تھا۔ رنگ اس کا اچھا خاصا سانولا تھا۔ عبدالمبین اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ بھی دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ عبدالمبین نے اسے سلام کیا۔

"آگئے۔" وہ کھل کر مسکرائی۔

"یہ سرور کہاں گیا ہے؟" عبدالمبین نے پوچھا۔

"میں نے کسی کام سے بھیجا ہے۔ کیوں؟" وہ عورت بولی اس کی نظریں شہرینہ پر جمی تھیں۔

"میرے گھر کی چابی اس کے پاس ہے' میں اسے دے گیا تھا کہ گھر صاف کروا کے ذرا اچھی سیٹنگ کروا دے اور ڈیکوریٹ بھی کروا دے۔" دونوں ابھی تک باہر ہی کھڑے تھے۔ "یہ شہرینہ ہے میری وائف۔"

"ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ بہت حسین۔" عبدالمبین نے اسے گھورا۔

"تم دونوں کی جوڑی بہت حسین ہے۔ تم لوگ اندر آجاؤ۔ سرور آتا ہی ہو گا۔" وہ عورت شہرینہ کا ہاتھ پکڑنے کو آگے بڑھی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"آجاؤ۔ تھوڑی دیر اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر میں آتا ہے مجھے تو اب سخت تھکن ہو رہی ہے۔" عبدالمبین سرسری لہجے میں کہتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا تو مجبوراً وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

چھوٹا سا بیٹھک نما کمرہ تھا۔ نیچے زمین پر چٹائی بچھی تھی۔ کمرے کی دو دیواروں کے ساتھ لکڑی کے صوفے لگے تھے جن پر چیک دار کشن پڑے تھے۔ بیٹھک کے بیرونی دروازے کے سامنے دو کرسیاں پڑی تھیں کمرے کے وسط میں چھوٹی سی لکڑی کی میز پڑی تھی سامنے کی دیوار سے پھولوں کی ایک باسکٹ لٹک رہی تھی جو کمرے کی واحد ڈیکوریشن تھی۔ بیرونی دیوار میں دو کھڑکیاں تھیں۔ میلے سے دو پردے ان پر پڑے تھے۔

"آؤ بیٹھو۔" وہ عورت اندر آتے ہوئے بولی۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

"میں کچھ کھانے پینے کو لاتی ہوں۔"

"نہیں اس وقت کسی شے کی طلب محسوس نہیں ہو رہی۔" عبدالمبین نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"تمہیں نہیں مگر یہ غریب تو میلوں کا سفر کر کے آئی ہے۔ اسے تو ہو گی۔" وہ عورت میٹھے لہجے میں بولی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"چلیں نا گھر' مجھے اچھا نہیں لگ رہا یہاں۔" وہ کچھ ہی دیر صبر کر سکی تھی۔

"ہوں۔" وہ چونکا۔ "چلتے ہیں میں پہلے اس سے چابی تو لے آؤں' دیکھتا ہوں باہر جا کر اسے۔ قریب ہی میں اس کا گیراج ہے' ادھر نہ گیا ہو وہ۔ تم بیٹھو ادھر میں آتا ہوں ابھی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں ادھر۔ اکیلی......" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"میں ادھر ہی ہوں ڈیر! میں ابھی آتا ہوں پانچ منٹ میں' تم ڈرو نہیں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ "اور ہاں۔" اس نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا۔ "تم اتنی دیر میں یہ پڑھو' میں آتا ہوں۔" وہ کاغذ اسے تھما کر رکا نہیں' دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

یہ...... وہ حیران سی تکتی رہ گئی پھر بے اختیار کھول کر پڑھنے لگی۔

"بتانے لگتا تو شاید رات سے صبح ہو جاتی اس لیے لکھ رہا ہوں وہ بھی مختصر۔

سنو۔ تم کبھی میری محبت نہیں تھیں نہ ہو اور نہ ہو گی۔"

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

"تمہارا عیاش امیرزادہ بھائی' جس نے میری معصوم بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالا' میں نے اسی دن دل میں عہد کر لیا تھا کہ جو نقب تمہارے بدمعاش بھائی نے ہماری عزت کی فصیل میں لگائی ہے وہی زخم ایک دن میں بھی اسے لگاؤں گا۔ آج میں نے اپنا عہد پورا کر لیا ہے۔ اب کل کے اخباروں میں میں یہ خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ لگواؤں گا کہ...... سلطین شاہ کی صاحبزادی اور سلطان بخت کی بہن رات کے تاریک اندھیرے میں ان کی عزت کی چادر اوڑھ کر ان کا منہ کالا کر کے گھر سے فرار۔

نکاح اس لیے کیا کہ تم گناہ کی اذیت کئی گنا محسوس کرو......" اس سے مزید کچھ نہیں پڑھا جا رہا تھا۔

دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف جھپٹی' بیرونی دروازہ باہر سے لاک ہو چکا تھا۔ اس نے بے اختیار نظریں اٹھائیں۔ اندرونی دروازہ پہلے ہی بند تھا۔ وہ اس دروازے کی طرف دوڑی' زور سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ بھی لاک تھا۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

"کھولو۔ دروازہ کھولو...... عبدالمبین! میرے ساتھ یہ کھیل مت کھیلو' کھولو پلیز۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میرے بھائی کے جرم کی سزا...... پلیز کھولو میں واپس چلی جاؤں گی' کھولو......"

میوزک کا شور تو اسے پہلے بھی سنائی دے رہا تھا۔ یہ تو طبلے اور گھنگھروؤں کی آواز تھی۔ گھنگھروؤں کی آواز...... اس کا دل نیچے ہی نیچے ڈوبتا چلا گیا۔ آنکھیں اتھاہ اندھیروں میں ڈوبنے لگیں ان اندھیروں میں لالہ اور آپا اسے پکار رہے تھے ان کی روتی آنکھیں' ڈوبتی شبیہہ۔

وہ دہرے کے ساتھ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

• • • • • •

"کہاں سے آرہی ہو تم۔ یہ تمہارے گھر آنے کا وقت ہے؟"

جیسے ہی زینب نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا۔ تخت پر بیٹھی آمنہ اٹھ کر اس پر جھپٹ پڑی۔ زینب کو بے حد نقاہت ہو رہی تھی۔ جسم اس طرح ٹوٹا ہوا تھا جیسے کسی نے ڈنڈوں سے پیٹا ہو۔ سر ابھی تک سویا سویا سا تھا۔ آنکھوں پر جیسے کسی نے بھاری پتھر رکھے ہوں۔ وہ بمشکل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی۔ اس نے وہی براؤن اور مسٹرڈ کلر کا خوبصورت اور قیمتی لباس پہن رکھا تھا جو اب مسلا ہوا اور میلا کچیلا سا لگ رہا تھا۔ چہرے پر مٹے مٹے سے میک اپ کے نشان تھے۔ بال الجھے ہوئے جیسے کسی نے بری طرح سے کھسوٹے ہوں۔ اس کے قدم بھی الٹے

سیدھے پڑ رہے تھے۔ ہاتھ میں وہی شاپنگ بیگ تھا۔ اس نے آمنہ کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ سیدھا سامنے اپنے اور آمنہ کے مشترکہ کمرے میں دوڑ گئی اور دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگالی۔

"زینب! زینب... دروازہ کھولو۔ میں کہہ رہی ہوں' دروازہ کھولو۔" آمنہ نے دروازے پر آہستگی سے دستک دی' لہجہ البتہ بہت سخت تھا۔ اماں جی اس وقت سو رہی تھیں' انہیں زینب کے اس وقت آنے کی خبر نہیں ہونی چاہیے اسی لیے آمنہ احتیاط کر رہی تھی۔

"دروازہ کھولو زینب... کھولو ورنہ میں..." آمنہ کو شدید غصہ آرہا تھا۔

"آمنہ! مجھے تنگ مت کرو میں سونا چاہ رہی ہوں۔" اس کی ڈوبی ڈوبی سی آواز آئی تھی۔

"ہم سب کو پریشانیوں کے حوالے کر کے تم ایسے کیسے سو سکتی ہو۔ کھولو دروازہ۔ میں کہتی ہوں۔" اب کے وہ غصے سے چلائی۔ آواز بھی خاصی اونچی تھی۔

"نہیں... نہیں کھولوں گی۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔" وہ ضدی اور اکھڑ لہجے میں چیخی۔

"کھولو' میں کہتی ہوں ورنہ میں اسے توڑ بیٹھوں گی۔" اس نے زور زور سے دروازے کو جھٹکے دیے۔ وہ واقعی لرزنے لگا تھا۔ اس بوسیدہ سال خوردہ دروازے کو تو ایسے تین سے چار جھٹکے ہی اکھاڑنے کے لیے کافی تھے اندر کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی۔ زینب نے اس کی دھمکی کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ آمنہ نے دوبارہ جھٹکے کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ زینب نے دروازہ کھول دیا۔

آمنہ نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا وہ بھی آمنہ کو گھور رہی تھی۔

زینب کپڑے تبدیل کر چکی تھی۔ بالوں کو کھینچ کر جوڑا سا بنا کر اس پر پونی چڑھالی تھی اور اب چادر لپیٹ رہی تھی۔ آمنہ نے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ کڑیٹ... شدید کڑیٹ کا الارم سا اس کے اندر بج اٹھا تھا۔

"ٹھہرو!" آمنہ نے اس کے چادر لپیٹتے ہاتھ روک دیے۔

"یہ کیا ہے؟" اس کی گردن پر تین جگہ سرخ بھڑکتے ہوئے نشان تھے ایک چہرے پر اور...

"چھوڑو مجھے۔" زینب نے غصے سے اس کے ہاتھ جھٹکے اور چادر لپیٹ کر مڑ گئی۔

"زینب... زینب!" آمنہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اپنے سوال نامے کو کہاں سے شروع کرے۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ اس وقت آئی ہو گھر' شام ڈھلے اور وہ بھی اس حلیے میں۔ یہ لباس کس کا ہے اور تمہارا یہ حال...؟" آمنہ نے اس کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف موڑا اور اس پر نظریں جما کر بولی۔

"تم نہ خود چین سے رہتی ہو نہ دوسرے کو جینے دیتی ہو۔ میں کہاں گئی تھی؟ کہاں سے آئی ہوں؟ تمہیں اس سے کیا مطلب؟ جاؤ جا کر آرام کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔" وہ بے حد اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ کر مڑی اور بستر پر گر سی گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ تم اس طرح کی بکواس کر کے بچ جاؤ گی۔ بولو کہاں سے آرہی ہو؟" آمنہ نے آگے بڑھ کر غصے سے اس کا گریبان کھینچا تھا اور اسے چارپائی سے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا تھا۔ زینب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا یہ غصیلا روپ دیکھ رہی تھی۔ آمنہ کو تو اس نے کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا وہ بھی اتنے شدید غصے میں۔

"چھوڑو مجھے۔" وہ اپنا آپ چھڑانے لگی۔ اس سے مزاحمت بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ سارا جسم ہی بے جان سا ہو رہا تھا۔

"کہاں سے آرہی ہو اور کیا گل کھلا کر آئی ہو۔ زینب! سچ بالکل سچ بولنا ورنہ۔" وہ دانت پیس کر شدید غصے سے بولی۔

"ورنہ کیا کر لو گی تم۔ گولی مار دو گی مجھے تو مار دو' مار دو مجھے۔ لاؤ پستول مار دو مجھے مار دو۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی اور اپنا گریبان اس سے چھڑانے لگی۔

"تم یہ ڈرامے بعد میں کرنا۔" آمنہ کا زوردار ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر چار انگلیوں کا نشان چھوڑ گیا۔ زینب کی کی آنکھیں جیسے باہر ابلنے کو تھیں۔

"تم... تم..." اس نے اپنا لرزتا ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا... "تم نے مجھے مارا... مجھے۔"

"ہاں۔ میں نے تمہیں مارا اور اس سے بھی زیادہ مار بیٹھوں گی۔ بتاؤ کہاں سے آرہی ہو تم۔" آمنہ کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ زینب کو لگا۔ اس کے اندر صوفی صاحب کی روح حلول کر گئی ہے' وہ اسی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہونٹ بھینچے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بولو بکو۔ کہاں سے آرہی ہو۔" آمنہ نے اس کا گریبان اس زور سے مٹھی میں بھینچا کہ اس کا انگوٹھا زینب کے نرخرے کو سختی سے دبانے لگا۔ اس کا سانس تنگ ہونے لگا۔ آنکھوں میں پانی سا آگیا۔

"چھوڑو مجھے۔" زینب نے پوری طاقت سے اسے دھکا دیا مگر اس کا دھکا آمنہ کو ایک انچ بھی نہ ہلا سکا۔ پتا نہیں زینب کی ساری طاقت کہاں جا سوئی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ تو دکھ رہا تھا۔

"اچھا میں بتاتی ہوں۔ تم چھوڑو مجھے... مجھے بیٹھنے دو۔ میں گر جاؤں گی۔"

وہ واقعی گرنے کو تھی۔ ملتجی لہجے میں بولی تو آمنہ نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ چارپائی پر گر گئی۔

"میں... میں کالج سے آرہی ہوں۔ اسپورٹس ڈے..."

"زینب..." آمنہ چیخی۔ جھوٹ مت بولو سچ سچ بتاؤ۔ کہاں سے آرہی ہو۔ تم کالج گئی ہی نہیں۔"

"نہیں... سچ بتا رہی ہوں۔" اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ذہن جیسے کسی گہری نیند میں ڈوبا جا رہا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔

"تم سچ یوں نہیں بولو گی۔ آج فیصلہ ہو جائے گا۔ پاپا صاحب ابھی آنے والے ہیں اور اب میں ان سے ایک حرف نہیں چھپاؤں گی۔ تمہارا ایر دیر سے گھر آنا' قیمتی تحائف چھپا چھپا کر لانا۔ قیمتی کپڑے' جوتے لے کر آنا مجھے پہلے ہی انہیں باخبر کر دینا چاہیے تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم کیا کھیل کھیل رہی ہو۔" آمنہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "تمہاری کلاس فیلو نورین آئی تھی۔ گیارہ بجے تمہیں لینے۔ اس نے بتایا کہ کالج میں تو کوئی اسپورٹس ڈے نہیں ہو رہا۔ بلکہ ایگزام ہونے والے ہیں۔ وہ ڈیٹ شیٹ لے کر آئی تھی کہ زینب کالج نہیں آرہی آج کل۔ کہیں بیمار نہ ہو۔ گھر جا کر دے آئے ڈیٹ شیٹ۔ اسے کیا معلوم' ہماری تو قسمت ہی بیمار پڑ چکی ہے بستر مرگ پر جس کا کسی کے پاس علاج نہیں۔"

"تم... تمہاری مسرہ نئی تھی۔ کوئی نہ کوئی گل کھلانے کی۔ بول دو کہاں سے آرہی ہو۔ اس مشکوک حلیے میں۔" زینب بمشکل اسے دیکھ پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے آمنہ کی کچھ باتیں سنائی دی تھیں مگر سمجھ میں نہیں آئی تھیں اور کچھ تو اس نے سنی ہی نہیں تھیں۔

"زینب... زینب! تمہیں ہوا کیا ہے؟" آمنہ جیسے تھک کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تم نے کوئی نشہ پیا ہے؟" آمنہ اس کی حالت دیکھ رہی تھی اور یہ کوئی پوچھنے والی بات بھی نہیں تھی۔ زینب اپنے حواسوں میں قطعاً نہیں لگ رہی تھی۔

"نہیں!" وہ بمشکل بولی۔

"کس کے ساتھ گئی تھیں؟"

"کس کے ساتھ..." اس کی زبان لڑکھڑائی۔ بھاری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آمنہ بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مر جاؤ اللہ کرے۔ اب دوبارہ اٹھو ہی نہیں۔ ایسی بیٹیوں کو مر ہی جانا چاہیے جو ماں باپ کی عزت کا جنازہ چپکے سے دفن کر آئیں۔ انہیں خود بھی کہیں دفن ہو جانا چاہیے۔ کسی کو بھی منہ دکھائے بغیر۔" آمنہ کے سر پر عجیب سی وحشت سوار ہوئی۔ وہ اٹھ کر اسے کندھوں سے جھنجوڑنے لگی اور پھر تابڑ توڑ تھپڑ اس پر برسانے لگی "مر جاؤ

زینب! تم ہم سب کو زندہ در گور کر جاؤ گی' مر کر بھی۔ بابا صاحب! آپ کی ساری اولاد کیسی نکلی۔ کیسی۔" وہ بے اختیار رونے لگی۔

"آپی! آپ لوگ ادھر کیا ڈراما لگا کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ادھر اماں جی کب سے بے ہوش ہیں۔ میں انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی ہوں مگر ان کی آنکھیں نہیں کھل رہیں۔ دیکھیں انہیں آکر۔" جویریہ اندر آکر اونچی آواز میں چلائی تھی۔ اماں جی کو ہفتے بھر سے بخار تھا اور کمزور تو وہ ویسے بھی بہت ہو چکی تھیں۔

آمنہ بے ساختہ مڑی اور اپنا چہرہ صاف کر کے کمرے سے نکل گئی۔

زینب وہیں گٹھری بنی سو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو گڈ مارننگ!" عبدالمبین ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا جب نین تارا اندر داخل ہوئی تھی گلابی رنگ کی سلیولیس ٹاپ کے ساتھ اس نے سیاہ ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ آدھے بال کلپ میں تھے۔ باقی لٹوں کی شکل میں ادھر ادھر جھول رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی بیدار ہو کر آئی تھی۔ چہرہ دھلا ہوا تھا' چمک دار روشن رو شن تھا۔ میک اپ سے بے نیاز۔ لپ اسٹک کے بغیر بھی اس کے ہونٹ گلابی تھے جیسے۔ عبدالمبین کوئی استعارہ نہیں سوجھا اس وقت یوں بھی اس کا دماغ حاضر نہیں تھا۔ اس کے سامنے پڑا ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔ وہ ناشتے میں ہمیشہ گھی میں تر تر بل دار پراٹھا' آملیٹ یا رات کا چا سالن لیتا تھا۔ دوپہر کو صرف سلاد یا پھل کھاتا تھا۔ پراٹھا اس کی کمزوری تھا مگر آج تو اسے وہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے آگے کپ میں پڑی چائے بھی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

"گڈ مارننگ!" وہ پھیکی سی مسکراہٹ لیے بولا "آؤ ناشتہ کر لو!" اسے اس وقت نین تارا کی آمد غنیمت لگی تھی کم از کم ان ظالم سوچوں سے تو نجات ملے گی جنھوں نے رات بھر اسے ایک پل کو نہیں سونے دیا تھا۔

"تھینکس۔" کہہ کر وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"کیا لو گی؟" وہ میزبان بنا بیٹھا تھا۔ گل کدہ میں ذرا سی خاموشی کے وقفے بھی اسے ڈس رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔ صرف فریش جوس۔ صائمہ! اس نے ملازمہ کو آواز دی جو اگلے پل حاضر ہو گئی۔ "میرے لیے فریش اورنج جوس لے آؤ۔" اس نے ملازمہ سے کہا' وہ سر ہلاتے ہوئے چلی گئی۔

"تم کچھ نہیں لے رہے؟" اس نے ٹیبل پر سجے تمام ان چھوئے لوازمات کا جائزہ لیا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" عبدالمبین نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"دل!" نین تارا سر ہلا کر بولی۔ "مبارک ہو بہت بہت۔" وہ اس کی طرف عجیب دکھی سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں کی مبارک باد بھی بے تاثر تھی۔

"کس بات کی؟" عبدالمبین نے ٹھنڈی چائے کا بد مزہ گھونٹ نگلا۔

"شادی کی۔ رات کی تاریکی میں ہونے والی تمہاری شادی خانہ آبادی کی۔" اس کا لہجہ بہت کچھ جتا دینے والا تھا مگر آنکھوں میں جیسے وحشت اتر رہی تھی۔

"ویسے تو یوں بھی سب شادیاں رات کی تاریکی ہی میں ہوتی ہیں۔ فیشن ہے نا آج کل۔" عبدالمبین آرام سے بولا۔ "اور مبارک باد کا شکریہ اگر تم اس کو شادی سمجھتی ہو تو۔ اور ہاں یاد آیا۔" وہ کچھ یاد کر کے بولا۔ "رات کی تاریکی پر یاد آیا۔ غالباً" تمہارا عقد مبارک بھی تمہارے شاہ جی سے رات کی تاریکی ہی میں ہوا تھا۔"

"خوب یاد دلایا۔" ملازمہ جوس سے بھرا جگ ٹرے میں رکھ کر لے آئی تھی۔ آگے رکھ کر شیشے کے گلاس میں انڈیلنے لگی۔

"اور ایسے تاریک اندھیروں میں جڑنے والے رشتے کتنے پائیدار ہوتے ہیں۔ تمہیں میرے افسانے سے سبق نہ ملا۔" جونہی ملازمہ گئی۔ وہ بولی۔
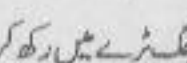
"کوئی کسی سے سبق نہیں سیکھتا۔ مائی ڈیر! سب کے لیے زندگی نے علیحدہ علیحدہ اسباق تیار کر رکھے ہوتے ہیں۔" اس نے چائے کا بھرا کپ پرے دھکیل دیا۔ "تم سنگاپور کب جا رہی ہو؟"

"آج رات کو بلکہ آدھی رات کے بعد۔" وہ گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔ "تمہیں بہت مس کروں گی میں۔ اگر تم بھی ساتھ چلتے تو کتنا اچھا لگتا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ تم میرے اصرار کے باوجود ہمارے ساتھ کیوں نہیں چل رہے۔ تم نے یہ کارنامہ میرے سر سجانے والا جو انجام دینا تھا۔"

"ساتھ جانے کا کوئی فائدہ ہے نہ ضرورت۔ فلم کا میوزک میں دے چکا ہوں۔ گانے ریکارڈ کروا چکا ہوں اور میرا فلم میں کوئی رول بھی نہیں۔ اور ساتھ نہ جانے کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ میرے گھر کا پرابلم تھا فلیٹ میں پچھلے مہینے خالی کر چکا تھا۔ گھر کا مسئلہ اس ہفتے یہاں رہ کر حل کرنا تھا۔ سو کر بھی لیا۔ بڑا زبردست گھر لیا ہے۔ بہار کا تحفہ ہے۔ آج میں ادھر شفٹ ہو رہا ہوں۔ میرا سامان تو جا رہا ہے۔ میں بھی بس اب نکلنے والا تھا۔ ناشتے کے بعد۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"مجھ سے تو بہتر..." نین تارا نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں شکایت کے علاوہ کیا کیا امیدیں بلوریں لے رہی تھیں۔ عبدالمبین سے بہت زیادہ دیر تک ان تیرتی ڈوبتی امیدوں کی طرف دیکھا نہ گیا۔

"میں تمہیں سارپرائز دینے کی جاتا۔ پہلی انٹری تو تمہاری ہونا تھی۔ اور پھر گھر کے بارے میں تمہارے کمنٹس میرے لیے بڑے اہم ہوں گے۔" وہ پتا نہیں اس کا دل رکھ رہا تھا یا واقعی نین تارا کے کمنٹس اس کے لیے اہم تھے۔

"گھر دیکھنے تو میں ابھی آ گئی۔ بہت خوب جا رہے ہو۔" وہ جتا کر بولی۔ تو عبدالمبین نے مسکرا کر محض کندھے اچکا دیے۔

"بائی دا وے تمہاری گھر والی ہے کدھر؟ اور تم اپنے ولیمے والے دن اکیلے اکیلے بیٹھے یہ پینڈوؤں والا ناشتہ تناول فرما رہے ہو۔ پراٹھا اور بھجیا۔ مام بتا رہی تھیں بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے۔" اسے پھر اصل دکھ دینے والا موضوع یاد آ گیا تھا۔

"نہ اونچا نہ نیچا۔ دیکھو خالی ہاتھ ہوں میں بالکل۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑ کر اسے دکھائے۔

"شہر بانو ہے۔ مام بتا رہی تھیں۔ وہ تو تم نے بھی بتایا تھا مجھے۔" وہ یاد کرتے ہوئے بولی۔ "کیا نام بتا رہی تھیں ہے؟" وہ سوچنے لگی۔

"شہر بانو۔" "اوہ یس یہی نام لے رہی تھیں وہ۔ احمد پور۔ احمد پور سے تعلق۔" وہ اٹک اٹک کر بولتے ہوئے کھڑے عبدالمبین کی شکل دیکھنے لگی جیسے کوئی عقدہ اس سے حل نہ ہو پا رہا ہو۔

"شاہ جی کی چھوٹی سسٹر کا نام بھی تو شہر بانو ہے' وہ بھی احمد پور... اور تمہاری... موبی کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں؟" وہ اٹھ کر اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

"ہاں!" عبدالمبین نے بے نیاز نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

"کیا شہر بانو گھر سے بھاگ کر تمہارے ساتھ... او مائی گاڈ! شاہ جی کی بہن۔ ناقابل یقین۔" وہ بے یقینی سے تکے جا رہی تھی۔

"کیوں یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ شاہ جی کی بہن گھر سے نہیں بھاگ سکتی۔" وہ چڑ کر بولا۔

"اور... شاہ جی کو اس کی... اس واقعے کی خبر ہے۔" اس کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

"نہیں ہو گی تو اب تک ہو چکی ہو گی اور یار! اب بور مت کرو۔ چلنا ہے میرے ساتھ تو چلو ورنہ میں چلتا

ہوں۔" عبدالمبین پیچھا چھڑانے کے سے انداز میں بولا۔

"وہ۔ وہ ہے کہاں؟" وہ مضطرب نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

"کیا کرو گی یہ جان کر؟ اپنے شادی کو خبر کرو گی؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ تم بتاؤ تو سہی۔" وہ بے قراری سے بولی۔

"اوہ یس نین! تم شاہ زی کو فون کرو۔ انہیں بلیک میل کرو۔ اس سے اچھا موقع تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ آؤ میں تمہیں راستے میں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔ جو کچھ تم نے اس سید زادے سے منوانا ہو' اس ڈیل کے عوض منوا لینا۔ ساری زندگی میرا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکو گی۔" وہ جوش سے بولا۔

"شکریہ تو میں ادا کرتی اگر تم اپنی رفاقت کے لیے شہرینہ کے بجائے۔۔۔۔ مبی! تم کچھ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"او کم آن گوڈیس آف بیوٹی! تمہارے منہ سے یہ پچھتاوے' ملال اچھے نہیں لگتے۔ تم تو بس خوش خوش ہنستی مسکراتی ہی اچھی لگتی ہو۔ کھلے ہوئے گلاب کی طرح فریش۔ ناؤ کم آن!" وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے باہر لے جانے لگا۔

"میں مام کو تو بتا دوں۔"

"راستے میں بتا دینا۔ آؤ تو۔ اتنے دنوں بعد تو ملاقات ہو رہی ہے تمہارے ساتھ یوں تنہائی میں۔۔۔۔ جی بھر کر دل کی باتیں کریں گے۔ انجوائے کریں گے۔ آج لنچ اور ڈنر میری طرف سے۔ آج میرا آف ہے ہر کام سے۔ کل پھر سے مصروفیت ہو گی۔ آؤ اپنے آج کو انجوائے کریں۔" وہ خوش خوش پلاننگ کرنے لگا۔

"میرے کپڑے تو دیکھو۔ میں چینج تو کر لوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"نہیں بھئی۔ تم اس وقت کسی سیٹ پر شوٹنگ کے لیے نہیں جا رہی ہو۔ اپنے دوست' اپنے فرینڈ مبی کے ساتھ ہو۔ اس لیے نو تکلفات۔ بس یونہی چلو۔"

وہ اسے گھسیٹتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے آیا۔ کچھ عبدالمبین کا انداز اتنی اپنائیت لیے ہوئے تھا۔ کچھ شہرینہ کے بارے میں جاننے کا تجسس اور کچھ عبدالمبین کا نیا گھر دیکھنے کا شوق۔ نین تارا چپ کر کے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی عبدالمبین نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

منگنی کی رسم خاصی سادگی سے انجام پائی تھی۔ سادگی لڑکے والوں یعنی مسز خان کی طرف سے تھی ورنہ اظہر اور یاسمین نے تو اپنے چیدہ چیدہ قریبی سب دوست' احباب اور رشتہ داروں کو انوائٹ کیا تھا پھر مشی کی دوستیں بھی اچھی خاصی تعداد میں تھیں۔ اس لیے کافی اچھی تقریب ہو گئی تھی۔ مہندی اور آف وائٹ کے کمبی نیشن کے ساتھ شرارے میں مشی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ عام دنوں سے ہٹ کر بہت خوبصورت اس میں کچھ تو اس کی بیوٹیشن کا کمال تھا۔ کچھ دل کی مراد پوری ہونے کی خوشی جو اس کے کھلے ہوئے چہرے اور چمکتی آنکھوں سے عیاں تھی۔

"ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔" جب معاذ کو مشی کے ساتھ لا کر بٹھایا گیا تو ہر ایک کی زبان سے یہی نکلا مسز خان کو ماضی کے کچھ مناظر یاد آنے لگے۔ نزہت اور شہباز ان کے سینے میں رکھے دو دہکتے انگارے تھے جو نہ جلتے تھے نہ بجھتے تھے۔

معاذ آف وائٹ سوٹ میں زبردست لگ رہا تھا۔ مسز خان دل ہی دل میں اس کی نظر اتارے جا رہی تھیں۔

"کیا تھا اگر شہباز بھی آ جاتا۔ دیکھتا جو نازک شاخ باہر کی اڑتی دھول اور ناموافق ماحول سے بچا کر اس نے گھر کے آنگن میں لگائی تھی' وہ تناور درخت بن کر کیسی بہار دکھا رہی ہے۔" ان کے دل سے ہوک سی اٹھی۔

پر اس کا آخری فون آئے بھی تو تین ماہ بیت چکے تھے۔ اور مسز خان کے پاس اس کا نمبر بھی نہیں تھا۔ اس نے

شاید جان بوجھ کر انہیں نہیں دیا تھا اگر ہوتا بھی تو شاید وہ خود سے اسے فون نہ کرتیں انہوں نے خود کو جبراً اس عادتی ناراضی پر مجبور کر رکھا تھا ورنہ دل تو شاید اسے دیکھ کر ایک پل بھی ناراض نہ رہ پاتا۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ معاذ' مشی کو انگوٹھی پہنا چکا تھا۔ اب وہ اپنے نازک' مہندی اور زیورات سے سجے ہاتھ سے اسے انگوٹھی پہنا رہی تھی۔

"آہا! آج میرے بابا کی شادی ہے۔" اچانک ارتضیٰ اچک کر معاذ کی گود میں جا بیٹھا' مشی کا نازک ہاتھ ارتضیٰ کی اس اچانک "کود" کو سہہ نہ پایا اور انگوٹھی اچھل کر اسٹیج سے بھی نیچے جا گری۔

"ہائے۔ ہائے کیسی بد شگونی ہو گئی۔" یاسمین' مشی سمیت سب لوگوں کے دلوں میں بے اختیار یہ بات آئی اور مشی کا تو جی چاہ رہا تھا۔ اٹھ کر ارتضیٰ کو کس کس کر تین چار تھپڑ جڑ دے۔ اس کا حلیہ بگاڑ دے پھر انگوٹھی اسے دوبارہ دے بھی دی گئی۔ اس نے پہنا بھی دی مگر اس کا موڈ نہ درست ہوا۔

اس کے بعد کھانا تھا۔ اس کے بعد میوزک کا پروگرام جس کے دوران ہی معاذ ارتضیٰ کو سلانے اٹھ کر چلا گیا تھا پھر مشی چند منٹ ہی بیٹھ سکی اور سب لوگوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر تنتناتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اس کا جی چاہ رہا تھا۔ ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی ڈائمنڈ رنگ کو اتار کر ڈسٹ بن میں ڈال دے۔

اس نے اپنا سجا سنورا روپ زخمی نظروں سے آئینے میں دیکھا جسے ایک بار بھی اس کے محبوب نے سراہتی نظروں سے نہ دیکھا تھا۔ نہ کوئی پیار بھرا رسیلا جملہ' جو اس کے کان میں گیا تھا حالانکہ اس کی فرینڈز کہہ رہی تھیں۔ وہ آج پہچانی نہیں جا رہی۔ اس پر اتنا روپ آیا ہے کہ نظر نہیں ٹھہر رہی۔ مما نے دوبارہ اس کی نظر اتاری تھی اور ایک وہ سنگ دل ہے کہ ذرا بھی تعریف نہیں کی۔ ایک بھی میٹھی نظر نہیں ڈالی۔ وہ رو دینے کو تھی۔

"دیکھو' تمہاری ایک چوائس ہے۔ وہ تمہاری خاطر نہیں بدلے گا۔ تمہیں وہ چاہیے تھا۔ وہ تمہیں پسند ہے تمہارے دل کی یہی تکرار تھی نا تو تمہیں اپنی پسند کی خاطر بہت کچھ سہنا پڑے گا۔" رات گئے جب وہ اسی لباس میں سلگتی پھر رہی تھی۔ یاسمین نے اسے پیار کرتے ہوئے سمجھایا تھا۔

"مما! مجھ سے یہ سب نہیں ہو گا۔" وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر بولی۔

"یہ سب تو کرنا پڑے گا' سہنا پڑے گا میری جان! وہ نہیں بدلے گا۔ ہاں شادی کے بعد بدل سکتا ہے۔ اتنی جلدی تم اس سے بہت سی توقعات مت لگاؤ۔ اپنے اندر برداشت پیدا کرو۔ اس ارتضیٰ کا تو میں بندوبست کرتی ہوں جلد ہی۔ باپ عیش کرتا پھر رہا ہے۔ بیٹا ادھر ہمارے سینے پر مونگ دلنے کو پڑا ہے۔ مفت میں پلا پلایا مل جائے گا تم دیکھنا' میں جلد ہی اس کا کوئی نہ کوئی انتظام کر لوں گی۔ تم کچھ عرصے تک اس کو سہہ لو بہتر ہے۔ اس کی موجودگی میں اپنے چہرے کے زاویے درست رکھو معاذ کو قابو کرنا ہے تو اس شتونگڑے کے ساتھ کچھ میٹھا بول لو۔ معاذ تمہاری مٹھی میں آ جائے گا۔ بس کچھ دنوں تک میری جان۔" یاسمین اسے سمجھا رہی تھی۔

اور پھر صبح تک واقعی اس نے خود کو راضی کر لیا تھا کہ وہ جا کر معاذ سے ملے

معاذ ناشتہ کر رہا تھا بلکہ ارتضیٰ کو کروا رہا تھا۔ مسز خان بھی بیٹھی تھیں مشی کچھ جھجکتے ہوئے ڈائننگ روم میں داخل ہوئی۔ دادی اور معاذ کو سلام کر کے وہ مسز خان کے کہنے پر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"ناشتہ کرو گی مشی؟" مسز خان نے محبت سے پوچھا۔

"نو دادو! میں کر کے آئی ہوں۔"

"اتنی صبح اول تو میری گڑیا اٹھتی نہیں۔ بحالت مجبوری اٹھ بھی جائے تو کچھ کھاتی نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔" مسز خان نے مسکراتے ہوئے اس کے نکھرے نکھرے روپ کو دیکھا۔

"آپ کو معلوم تو ہے دادو!" وہ بھی جواباً مسکرائی۔ "ارتضیٰ اسکول جا رہا ہے۔" اس نے خود ہی اس ننھے شیطان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

"آپ دیکھ تو رہی ہیں۔ میں اسکول جا رہا ہوں' اس کا صاف مطلب ہے کہ میں اسکول جا رہا ہوں۔" وہ تڑخ کر بولا۔ مشی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے ضبط کا گھونٹ بھرا۔

"کیسی جا رہی ہیں ارتضیٰ کی اسٹڈیز؟" اس نے پھر ہمت کی۔

"اچھی جا رہی ہیں تو اسکول والے مجھے برداشت کر رہے ہیں۔" اتنا سا بچہ اور اتنے بڑے بڑے جواب...... مشی سلگ کر رہ گئی۔

"ارتضیٰ جانو! بری بات۔ بڑوں کو یوں جواب نہیں دیتے۔" معاذ اس کا خوبصورت گھنے بالوں والا سر چوم کر لاڈ سے بولا۔

سوری!" وہ لٹھ مار انداز میں بولا۔

"معاذ! آج رات کو "آواری" میں، میں اپنی فرینڈز کو ڈنر دے رہی ہوں۔ انگیجمنٹ کی خوشی میں۔ آپ تیار رہیے گا۔ آٹھ بجے تک چلیں گے۔" اس نے بڑے میٹھے لہجے میں معاذ سے کہا تو معاذ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مشی! تمہیں معلوم ہے نا۔ میرا ہاؤس جاب چل رہا ہے۔"

"مگر...... آج کل تو تم نہیں جا رہے۔ میرا خیال ہے چھٹی پر ہو۔" وہ اس سے اتنی غافل نہیں تھی۔

"ہم ایک میڈیکل کیمپ لگا رہے ہیں۔ شیخوپورہ کے دیہاتی علاقوں میں ایک ہفتے کے لیے۔ آج تو مجھے دیر ہو گئی نکلنے میں۔ کل سے میں علی الصبح ہی جاؤں گا اور ابھی بھی میں ارتضیٰ کو ڈراپ کر کے ادھر ہی جا رہا ہوں۔ رات بھی بہت دیر میں واپسی ہو یا شاید نہ ہی آ سکوں۔ تم میری طرف سے اپنی فرینڈز سے ایکسکیوز کر لینا۔"

اتنی صفائی سے انکار۔ مشی کا جی چاہا ناشتے کی ٹیبل اس پر الٹ دے۔

"معاذ! یہ ڈنر تمہارے اعزاز میں ہے۔ یعنی ہم دونوں کی خوشی میں۔ اگر تم ہی نہ ہو گے تو......" وہ بمشکل بولی۔

"سوری مشی! آئم ریئلی سوری۔ تم پروگرام مجھ سے پوچھ کر بناتیں۔ مجھے آج ادھر لازمی جانا ہے۔ نہیں آ سکوں گا۔ ہفتے بھر کا تو پروگرام ہے سارا۔ ایک ایک دن قیمتی ہے۔" معاذ نے نرمی سے کہا۔

"معاذ بیٹا! مشی کہہ رہی ہے تو چلو۔ شام کو جلدی آ جانا۔ بچی کا دل رہ جائے گا۔"

مسز خان کو پوتی کے تیور بہت کچھ بتا رہے تھے۔ دخل دینا پڑا۔

"سوری ام جان! آج پہلا دن ہے۔ میں نہیں آ سکوں گا۔ ہمارے سینئر پروفیسرز موجود ہوں گے۔ کسی کی بھی غیر حاضری برداشت نہیں ہو گی۔ میں کوشش بھی کروں تو نہیں آ پاؤں گا۔" اس نے پھر نرمی سے کہا۔

"مشی بیٹا! تم اپنی فرینڈز سے معذرت کر لو۔ کسی اور دن کا پروگرام بنا لو۔ بس معاذ فارغ ہو جائے۔" مسز خان نے میٹھے لہجے میں کہا۔

"تھینک یو اس مہربانی کا ڈنر تو آج رات کو ہے اور آپ مسٹر معاذ کو اپنی زبان میں سمجھا دیجیے گا، انہیں رات آٹھ بجے میرے ساتھ چلنا ہے میں نے اپنی فرینڈز نے انسلٹ نہیں کروانی پروگرام چینج کر کے۔ اوکے میں چلتی ہوں۔" وہ جھٹکے سے اٹھی اور تیز تیز چلتی باہر نکل گئی۔

"معاذ بیٹا! خواہ مخواہ ضد مت کرو۔ جذباتی سی لڑکی ہے۔ تم آ جانا شام کو جلدی' ابھی سے ضد بازی شروع ہو گئی تو"

"پلیز ام جان! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا اور آپ کو معلوم بھی ہے میرا کیریئر میرا کریز ہے۔ میری دیوانگی، میرا جنون اور جو کوئی میرے، جنون کے رستے میں بلاوجہ آئے گا۔ اس کی کسی بھی خواہش کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔ میں مشی کے ڈنر کے لیے اپنے پروفیشن سے کیے گئے کمٹمنٹ سے منکر نہیں ہو سکتا اوکے...... چلو ارتضیٰ! اللہ حافظ ام جان۔"

✲ ✲ ✲

"حکیم صاحب ابھی تھوڑی دیر میں بیٹھ جائیں گے اپنی دکان میں۔ ماں کو لے کر چلی جانا اور اچھی طرح ساری حقیقت بتانا اور پوچھنا' اس طرح غنودگی سی کیوں رہنے لگی ہے ہر وقت سوئی رہتی ہیں۔ بخار بھی نہیں اتر رہا اور

کمزوری بھی بہت محسوس کرتی ہیں۔"

چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کا ناشتا کرتے صوفی صاحب چولہے کے پاس بیٹھی آمنہ کو ہدایات دے رہے تھے اماں جی کی طبیعت یوں تو کئی دنوں سے اچھی نہیں تھی مگر گزشتہ دو دن سے تو وہ بالکل نڈھال سی تھیں۔ ہلکا ہلکا سا ٹمپریچر بھی ہر وقت رہنے لگا تھا۔ نیم بے ہوش بستر پر پڑی رہتیں۔ نہ کچھ کھاتیں نہ پیتیں ہر چیز سے دلچسپی تو بہت عرصے سے ختم ہو چکی تھی ان کی مگر یوں خود سے بھی بیگانگی نہ تھی۔

"بابا صاحب! حکیم صاحب کی دوا تو پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کھا رہی ہیں۔ ذرا بھی افاقہ نہیں ہو رہا۔ پھر ان کی دوا کڑوی بہت ہوتی ہے۔ اتنی بڑی بڑی پڑیاں' کئی بار تو ان کے کھانے سے اماں جی کو قے آ گئی طبیعت بھی جوں کی توں ہے۔" آمنہ نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

"تو پھر؟" انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کسی ڈاکٹر کو دکھا دیں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی اور توے سے روٹی اتار کر جویریہ کے آگے پڑی چنگیر میں رکھ دی جویریہ چنگیر اٹھا کر اندر کمرے میں لے گئی۔ اماں جی کو ناشتہ کروانے۔

"دکھایا تو تھا تین بار ڈاکٹر کو بھی۔ سرخ پیلی دوائیاں پانی میں گھول گھال کر شیشیاں پکڑا دیتا ہے۔ اتنے پیسے الگ سے بٹورتا ہے اور اس سے کون سا افاقہ ہو گیا تھا۔ یہ کون سا لائق ڈاکٹر ہے' اسے تو تمہاری ماں کے مرض کی ہی سمجھ نہیں آئی۔ حکیم کو کم از کم بیماری کا تو علم ہے نا!" انہوں نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتارا اور پیالہ تخت پر رکھ کر ہاتھ دھونے چلے گئے۔

"بابا صاحب! اب اماں جی کا علاج بھی تو ضروری ہے اگر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیں۔ میرا مطلب ہے اسپیشلسٹ کو۔" وہ ان کے واپس آنے تک ہمت کر بولی۔

"اچھا! ڈاکٹر دھڑ سے چار سو روپے مشورے کے لیتا ہے' اتنے کی دوائیاں لکھ دے گا۔ اتنے پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولے۔

آمنہ چپ سی ہو گئی۔ ماں کی حالت بھی اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی اور باپ کی جیب کا بھی علم تھا۔ اس کی اپنی تنخواہ سے گھر میں کچھ اضافی راشن آنے لگا تھا۔ اب کم از کم مہینے کے آخری دس دن فاقوں کی نذر نہیں ہوتے تھے۔ سوکھی روٹی اور چائے تو مل ہی جایا کرتی تھی۔

"میں چلتا ہوں۔ محلے کے بچے ابھی پڑھ رہے ہیں۔ انہیں چھٹی دے کر آتا ہوں پھر میں ہی تمہاری ماں کو حکیم کے پاس لے جاتا ہوں۔ اچھی طرح انہیں دیکھنے کو کہوں گا۔ یہ زینب آج پھر کالج چلی گئی ہے؟" وہ سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے رکے۔

"جی!" اس نے سر جھکا کے جواب دیا۔

"جب میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اب گھر میں بیٹھے۔ گھر آتا ہوں تو کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ آج آ لینے دو اسے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے نیچے اتر گئے۔

اس دن کے بعد آمنہ نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ہفتہ ہونے کو آیا تھا' وہ روز صبح اٹھتی' کالج کے لیے تیار ہوتی اور اکثر ناشتے کے بغیر ہی کالج چلی جاتی۔ آمنہ اس کے بعد اسکول جاتی تھی'

زینب دو ڈھائی بجے سے پہلے نہیں آتی تھی۔ معلوم نہیں کن خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔ اتنا سا منہ نکل آیا تھا۔ نہ ڈھنگ سے کچھ کھاتی' نہ پیتی تھی' نہ کسی سے بات کرتی تھی۔ کالج سے آ کر تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرتی' منہ سر لپیٹ کر پڑ جاتی۔ شام کو اٹھ کر یونہی گم صم بیٹھی رہتی یا پھر اسی طرح بستر میں پڑے پڑے رات کر دیتی۔ صوفی صاحب کی موجودگی میں تھوڑا سا الرٹ ہوتی' ان کے جاتے ہی پھر بستر میں گھس جاتی۔

آمنہ کا کئی بار جی چاہا کہ اسے جھنجوڑ کر پوچھے کہ اسے ہوا کیا ہے۔ اس کی خاموشی میں آمنہ کو کوئی بڑا طوفان سر اٹھاتا محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ اماں جی کی طبیعت بھی اچھی نہیں تھی' اس لیے بھی آمنہ نے زینب کو نہیں چھیڑا تھا

کہ خوامخواہ گھر میں فساد اٹھائے گی اور اسے کون سا اماں جی کی پروا تھی۔ ایک بار بھی ان کے پاس نہیں آئی تھی خبر گیری کو۔

"جویریہ۔۔۔ آکر ناشتہ کرلو۔" روٹی توے سے اتار کر اس نے جویریہ کو آواز لگائی۔

"اماں نے بس یہ دو نوالے لیے ہیں اور چائے تو پی نہیں۔" جویریہ اماں کا ناشتہ جوں کا توں واپس لے آئی تھی۔ اس نے ایک دکھ بھری نظر ٹرے پر ڈالی اور اپنے لیے چائے نکالنے لگی۔

دونوں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگیں۔

"تم اپنا ایڈمیشن بھیج رہی ہو انٹر کے لیے؟" آمنہ نے اس سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ لاتعلقی سے بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"میری ابھی تیاری نہیں۔" اس نے بات ہی ختم کردی۔ آمنہ نے دیکھا تھا اس کی دلچسپی پڑھائی میں بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ جب سے بابا صاحب نے اسے اسکول سے اٹھایا تھا' وہ جیسے اپنے اندر ہی کہیں گم ہو گئی تھی۔ گھر کے سب کام کسی معمول کی طرح کرتی مگر کھل کر کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ بابا صاحب کے سامنے تو آتی بھی کم تھی۔

آمنہ نے کچھ بے بسی سے اسے دیکھا۔

"کیا ہمارے گھر کا حال ہو گیا ہے' دونوں بھائیوں نے پلٹ کر نہیں پوچھا اور یہ دونوں گھر میں رہتے ہوئے بھی موجود نہیں۔" وہ چائے پینے لگی۔

"آمنہ! چلو میرے ساتھ۔ ماں کو بھی تیار کرلو۔ ادھر ایک میڈیکل کیمپ لگا ہے۔ فری علاج' ٹیسٹ' دوائیاں وغیرہ۔ سب فری ہے اور بہت اچھے لائق ڈاکٹر شہر سے آئے ہیں۔ ایک ہفتے کے لیے کیمپ لگا ہے۔ لیڈی ڈاکٹرز بھی ہیں۔ مجھے ابھی آکر کسی نے بتایا ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"مجھے اسکول جانا ہے بابا صاحب! آپ جویریہ کو لے جائیں۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔

"جویریہ! تم اماں جی کو کپڑے بدلوا دو میں بھی چینج کر کے ابھی آتی ہوں۔"

وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ پہلے بھی ایک دفعہ اماں جی کو سرکاری اسپتال لے کر گئے تھے مگر ڈاکٹروں نے بڑی بے توجہی سے دیکھا تھا۔ دو چار دوائیاں لکھ دیں جو اسپتال کے اسٹور سے ملی ہی نہیں۔ یہ کیمپ بھی ایسا ہی ہو گا' تیار ہوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

کیمپ کا شاید آج پہلا دن تھا یا شاید دوسرا' بہت رش تھا۔

"بابا صاحب! ادھر تو باری ہی نہیں آئے گی۔" وہ پریشان ہو گئی۔ پہلے ہی بہت چل کر آئے تھے۔ اماں جی ہانپ رہی تھیں اتنا چل چل کر۔ کیمپ لگا بھی تو آبادی سے ہٹ کر تھا۔

"اب چیک اپ تو کرانا ہے' میں پرچی بنوا کر لاتا ہوں' تم ماں کو لے کر بیٹھو۔"

وہ اسے بینچ پر بٹھا کر بھیڑ میں گم ہو گئے۔ دکھی انسانیت کا ہجوم لگا تھا۔

"پانچ ڈاکٹر بیٹھے ہیں اور دو ڈاکٹرنیاں پھر بھی اتنا رش ہے۔ میں تو منہ اندھیرے سے آئی بیٹھی ہوں۔ ابھی تک باری نہیں آرہی۔" ان کے ساتھ بیٹھی اماں بولی تو آمنہ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

انہیں بیٹھے آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا' جب صوفی صاحب اسے آتے دکھائی دیے۔

"آمنہ! اٹھو بیٹا! ادھر تو باری آنے کی کوئی امید نہیں تھی مگر اللہ نے سبب لگا دیا۔ میں پرچی بنوا لایا ہوں' قطار میں کھڑا تھا کہ پیچھے سے کسی آدمی نے دھکا دیا۔ میں گرنے کو تھا کہ پاس سے گزرتے ڈاکٹر صاحب رک گئے اور مجھے اٹھنے میں مدد دی۔ پرچی بنوا کر دی اور مریض کو اپنے دفتر لانے کو کہا۔ اب دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہونے کو ہے۔ ابھی فوراً دکھا دیں تو اچھا ہے۔" صوفی صاحب اسے رستے میں تفصیل بتا رہے تھے۔

کمرے میں میز کے دوسری طرف بیٹھے نوجوان ڈاکٹر کے علاوہ تین چار لوگ اور بھی تھے جنہیں ڈاکٹر چیک کر رہا تھا۔ پاس ہی ایک نرس بھی کھڑی تھی جو مریضوں کا بی پی اور نبض وغیرہ چیک کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر وہ اب اماں جی کا بی پی لے رہی تھی۔ بخار کے لیے تھرمامیٹر منہ میں لگایا۔

"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے بلا لیا' ورنہ ادھر تو شام تک ہماری باری نہ آتی۔" صوفی صاحب عام طور پر کسی کا شکریہ ادا نہیں کیا کرتے تھے۔ داڑھی میں خلال کرتے ہوئے بولے تو ڈاکٹر مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد باقی کے مریض جا چکے تھے تو اماں جی کی باری آگئی۔ وہ بہت دھیان سے انہیں چیک کر رہا تھا۔

"یہ کب سے بیمار ہیں؟" ان کی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر چیک کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی مہینہ ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر نے یونہی غور سے صوفی صاحب کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجیے گا اگر نقاب تھوڑا سا ہٹا دیں' میں ان کا گلا وغیرہ چیک کرنا چاہتا ہوں کہ ان سے کچھ کھایا پیا کیوں نہیں جا رہا۔" اس کے کہنے پر آمنہ نے اماں جی کا نقاب چہرے سے نیچے کر دیا تو وہ ان کا گلا چیک کرنے لگا۔

"ان کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروانے ہوں گے' بلڈ ادھر دے جائیں' ٹیسٹوں کی رپورٹ کل شام تک آئے گی۔ ابھی میں عارضی طور پر دوا لکھ رہا ہوں۔ وہ آپ کو ادھر سے مل جائے گی مگر اصل علاج ٹیسٹوں کی رپورٹ کے بعد شروع۔۔۔"

وہ کہتے کہتے پھر صوفی صاحب کو غور سے دیکھنے لگا جو بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"آپ۔۔۔ میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں۔" وہ کچھ جھجک کر بولا۔

"صوفی عبدالرحمٰن کہتے ہیں مجھے۔" وہ متانت سے بولے۔

"آپ کسی گاؤں وغیرہ میں پہلے رہ چکے ہیں۔" وہ اپنی کنپٹی پر انگلی مارنے لگا۔ "مجھے گاؤں کا نام نہیں یاد آرہا' کسی مسجد وغیرہ میں۔۔۔"

"آپ۔۔۔" صوفی صاحب نے الجھے الجھے انداز میں اسے دیکھا۔

"میرا نام معاذ ہے' آپ کو شاید یاد ہو۔ وہ لڑکا جو ایک رات زخمی حالت میں بارش اور کیچڑ میں لت پت مسجد کے دروازے پر آپ کو گرا ملا تھا۔۔۔" وہ صوفی صاحب کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارے تم معاذ ہو' ماشاء اللہ' جزاک اللہ۔۔۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے تمہیں کہیں نہ کہیں دیکھ رکھا ہے۔ ڈاکٹر بن گئے ماشاء اللہ۔"

صوفی صاحب جوش بھرے انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو معاذ مسکراتے ہوئے ان سے گلے ملنے لگا۔

"آپ کی مہربانی سے صوفی صاحب! آپ نے مجھے پناہ دی تھی' ورنہ شاید میں آج ادھر نہ ہوتا۔" وہ مشکور لہجے میں بولا۔

"مقدر بنانے والا تو اللہ ہے۔ پر آج دیکھ لیا بیٹا کہ کبھی کبھی انسان خود بھی اپنا مقدر بناتا ہے۔ بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر' بہت زیادہ۔" وہ حقیقتاً خوش تھے۔ ایسے لائق فائق نوجوانوں سے مل کر یوں بھی انہیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ معاذ تو پھر ان کا پسندیدہ رہ چکا تھا۔

"سوچا کرتا تھا' کبھی آپ سے ملنے جاؤں گا' بس وقت نے مہلت ہی نہ دی۔ آپ گاؤں چھوڑ کر ادھر آگئے ہیں؟" اس کا سوال بہت تکلیف دہ تھا۔ صوفی صاحب کی ساری بشاشت رخصت ہو گئی۔

"ہاں' کافی سالوں سے۔" وہ مرجھائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"تم آؤ نا ہمارے گھر' یہ ادھر مسجد کے اوپر رہائش ہے ہماری۔" وہ اسے دعوت دیتے ہوئے محبت سے بولے۔

"ضرور ضرور' انشاء اللہ میں چکر لگاؤں گا۔ ابھی کچھ دن ادھر ہوں۔ اماں جی کے علاج کے بارے میں اب آپ بے فکر ہو جائیں۔ کل شام رپورٹس وغیرہ میں خود لے آؤں گا آپ کے گھر' وہیں آکر انہیں چیک بھی کرلوں گا۔ ادھر ابھی مریضوں کا بہت رش ہے' معاف کیجیے گا' ورنہ میں آپ کی صحبت میں کچھ اور دیر رہنا چاہتا تھا۔ یہ میرے

لیے باعث مسرت تھا۔" وہ مروت بھرے انداز میں معذرت کر رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں' معلوم ہے مجھے۔ اللہ خوش رکھے تمہیں اجر دے۔ اب چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سسٹر! انہیں یہ دوائیں جو میں نے لکھی ہیں' دے دیں اور اماں جی کا بلڈ بھی لے لیں۔ انشاء اللہ میں کل شام میں آؤں گا۔ اماں جی کو گھر جا کر ریسٹ کروائیں اور ہلکی غذا جیسے دودھ' دلیہ' کسٹرڈ وغیرہ دیں۔" آخری ہدایت اس نے شاید آمنہ کو دی تھی' وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آمنہ! اماں کا ہاتھ پکڑلو۔" صوفی صاحب کہتے ہوئے ڈاکٹر معاذ کے ساتھ آفس سے نکل آئے۔

اور آمنہ سہارا کر اماں جی کو سہارا دیتے ہوئے باہر لے آئی۔

☆ ☆ ☆
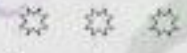
"سیفی! یہ تم کدھر بھاگے جا رہے ہو۔ دو گھڑی کے لیے ماں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ کتنے دنوں کے بعد آج صبح میں تمہاری شکل نظر آئی ہے۔ رات کو بارہ بجے سے پہلے نہیں آتے اور صبح منہ اندھیرے نکل جاتے ہو جیسے کسی محاذ پر جانا ہو۔ آخر ایسی کیا آفت آگئی ہے کہ تمہاری مصروفیت کا کوئی وقت ہی نہیں رہا۔" رعنا نے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر سفری سوٹ کیس ہاتھ میں لیے سفیان کو ڈائننگ ٹیبل ہی سے پکارا۔

"اوہ سوری مام! میں ذرا جلدی میں ہوں پھر بات کریں گے' میری فلائٹ ہے نو بجے اور اب آٹھ بجنے کو ہیں۔ ایئرپورٹ جاتے جاتے ہی گھنٹہ لگ جائے گا۔" وہ مصروف لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب' تم کہاں جا رہے ہو؟" رعنا حیرت زدہ رہ گئیں۔

"میں نے آپ کو بتایا نہیں شاید۔ رات کو آپ کے کمرے میں گیا تھا۔ آپ سو چکی تھیں مام! میں ایک ہفتے کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔"

"خیریت' کراچی میں کیا اتنا ضروری کام آن پڑا ہے۔"

"میرا ایک دوست اینجل ڈیوڈ لندن سے آیا ہے' بزنس کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے کونفیس کیا ہے کہ اگر سرمایہ لگانا ہے تو ادھر پاکستان میں لگائے۔ دنوں میں ایک کے چار ہو جائیں گے۔ وہ اسی سلسلے میں آیا ہے۔" سیفی کو بروقت بہانا سوجھا۔

"نہ تو تم اتنے لائق بزنس مین ہو جو غیر ملکی سرمائے کو کھینچ کر پاکستان لا سکو نہ تمہارے دوست اتنے سرمایہ دار ہیں کہ وہ اپنے پیسے کو بزنس جیسی غیر ضروری عیاشی میں جھونکیں' سیفی! مجھے ٹھیک سے بتاؤ۔ تم کراچی کیوں جا رہے ہو؟" وہ کچھ خفگی سے بولیں۔

"شک وہی شک۔" وہ ایک دم سے بھڑک اٹھا۔ "آخر آپ دونوں کو مجھ پر یقین کیوں نہیں ہے۔ یقین ہو بھی نہیں سکتا چاہے میں آپ دونوں کو سونے کا بن کر دکھا دوں۔ آپ دونوں میرا ابھی یقین نہیں کریں گے اور جب کسی کے والدین کو ہی اس پر بھروسا نہ ہو تو غیر کیا اس پر اعتبار کریں گے۔" وہ غصے سے بولا۔

"سیفی! میری جان! ایسی بات کر رہے ہو تم۔ ہم دونوں کو خدانخواستہ کیوں تم پر یقین نہیں ہو گا۔ یقین ہے تو فخر نے تو جھے سے زیادہ بزنس تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ اس پر بھی تمہیں ہماری محبت پر شک ہے۔" رعنا دل برداشتہ سی ہو کر اٹھ آئیں۔

"بھروسا۔" وہ پھنکارا۔ "یہ ہے بھروسا دس روپے کا چیک کیش کروانا تو پہلے پاپا کے سائن ہوں گے۔ پھر وہ چیک کیش ہو گا۔ میری حیثیت تو ایک سپروائزر کی سی ہے۔ سارے کام کی نگرانی کرنا اور بس' بلکہ کچھ اختیارات تو اس کو بھی حاصل ہوتے ہیں مجھے تو وہ بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

"سیفی! ایسے نہیں بولتے بیٹا! یہ سب کچھ تمہارا ہی تو۔۔۔"

"بس ماما! میں یہ راگنی بہت سن چکا ہوں' سب کچھ میرا ہی تو ہے میرے مرنے کے بعد ہو گا کیا' یا نہیں بوڑھا ہو

جاؤں گا تب میرا ہو گا۔ ہر انسان اپنی عمر جیتا ہے تو کیا مجھے خدانخواستہ پاپا کے مرنے کا انتظار کرنا ہو گا اختیار ہاتھ میں لینے کے لیے۔" وہ گستاخ لہجے میں چلایا۔

"سیفی۔" رعنا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے گئیں۔

"ایسی سوچ ہے تمہاری۔" "اتنی زہر آلود اتنی نفرت انگیز۔" وہ لبوں میں بڑبڑائیں۔

"آپ لوگوں کے رویے نے میری سوچ کو ایسا بنایا ہے۔ آئینے میں جا کر ذرا اپنے رویوں کے بدصورت چہرے تو دیکھیں مما! آپ دونوں نے کبھی مجھ پر ٹرسٹ نہیں کیا۔ مجھے بھروسے کے قابل سمجھا ہی نہیں' تب ہی تو شیخوپورہ والی فیکٹری کا بھی صرف انتظام میرے ہاتھ میں ہے اور ایک دھیلا لینے کی اجازت نہیں۔ گستاخی معاف ماما! یہ صورت حال اب میری برداشت سے باہر ہے۔ آپ پاپا سے بات کریں۔ نہیں تو مجھے کچھ اور سوچنا ہو گا۔ اللہ حافظ۔" وہ تیز تیز کہتے ہوئے سوٹ کیس دھکیلتا' رعنا کا جواب سنے بغیر باہر نکل گیا۔

لاؤنج کے دروازے میں شکست خوردہ سے فخر حیات کھڑے تھے۔ وہ نظرانداز کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"یہ لیے صاحبزادے کے لچھن۔" وہ بت بنی رعنا کے پاس آ کر بولے۔

"دونوں کے باپ بیٹے کے۔" وہ گہری سانس لے کر بولیں۔ "آپ دونوں کے۔" وہ صوفے پر گر سی گئیں۔

"کیوں' مجھے کیوں اس ناخلف کے ساتھ گھسیٹ رہی ہو۔"

"آپ نے جیسا بویا ہے ویسا ہی کاٹیں گے۔ ابھی تک۔" رعنا نے ہونٹ کاٹے۔ "رات کو آپ تین بجے آئے تھے۔ رات کے تین بجے کون سی بزنس میٹنگ' ڈنر یا ڈیل ہوتی ہے کچھ بتانا پسند کریں گے آپ؟" وہ چبا چبا کر بولیں۔

"نہیں' کبھی نہیں۔" وہ زور سے سرہلا کر بولے۔ "بزنس کے علاوہ کیا میری پرسنل لائف کوئی معنی نہیں رکھتی۔" وہ اونچی آواز میں چیخے۔

"آپ کی زندگی' آپ کی ذاتی زندگی' آپ کا گھر' آپ کی فیملی ہے جو رات کے تین بجے تک آپ کے گھر آنے کی منتظر جاگ رہی ہوتی ہے۔ آپ کو احساس ہے؟"

"تمہیں پھر بے خوابی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ بہتر ہے نیند کی پلز اب روز ہی لے لیا کرو اور اپنی قنوطیت کی وجہ مجھے نہ گردانا' تمہارا بیٹا بھی اب کافی کچھ کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ میں آفس جا رہا ہوں۔ گڈ بائے۔"

وہ رعنا کو سرونگاہوں سے دیکھتے ہوئے انہیں قدموں پر پلٹ گئے جن پر اندر آئے تھے۔

اور رعنا کو لگا' وہ پوری کائنات میں بالکل تنہا ہیں۔ اکیلی بے وزن' بے وجہ' بے مقصد' اپنے ہونے کی کوئی بھی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

پاپا! میں بچپن میں اسکول میں قاری صاحب سے پڑھتے ہوئے ایک فقرے میں اکثر الجھ جایا کرتا تھا۔

"اہل عرب زمانہ جاہلیت میں اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے کیوں؟"

اسکول ٹیچر نے قاری صاحب نے' میرے ٹیوٹر نے حتی الامکان مجھے اس کیوں کی لاجک سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ بیٹی کا وجود باعث شرم کیوں ہو سکتا ہے۔ بیٹیاں' بہنیں تو بہت اچھی بہت خوب صورت' بہت پیاری ہوتی ہیں۔ رات کے پچھلے پہر گھر کے آنگن میں اتری سبک رو خوب رو ننھی پریاں پھر انہیں جیتے جی سانس لیتے ہوئے کوئی کیسے زمین میں گاڑ سکتا ہے کیوں؟

بڑے ہونے پر بھی مجھے اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"اور آج؟" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "اتنے سالوں بعد۔۔۔۔ شہرینہ! مجھے یہ مطلب اس طرح سمجھا گئی ہے کہ اس کا منحوس مطلب مرتے دم تک جب میری آنکھوں کے آگے موت کے تاریک اندھیرے چھا رہے ہوں گے۔ یہ مطلب' یہ مفہوم' یہ وجہ میرے ذہن سے اوجھل نہیں ہو گی۔" تاریک کمرے میں سیدہ اور سلطان بخت بہت دیر سے بیٹھے تھے جب سلطان بخت نے کہنا شروع کیا۔

سیدہ بخت کے پاس ہر بات، ہر سوال، ہر دلیل کا مدلل جواب ہمیشہ تیار ہوتا تھا۔ انہیں سلطان بخت کو سمجھانے تسلی دینے کو کوئی فقرہ، جملہ تو بجا کوئی لفظ بھی نہیں سوجھا۔

کمرے میں دونوں کی آتی جاتی سانسوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ گونج رہی تھی۔

"سلطان بخت! اٹھ کر باہر جاؤ۔ حویلی میں افسوس کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہے۔" بہت دیر بعد باہر سے آنے والی آوازوں کو سن کر سیدہ نے روبوٹ کی سی مشینی آواز میں کہا تھا۔

"آپا! میں کیا کروں گا باہر جا کر۔۔۔" انہوں نے جیسے کراہ کر سسکی لی تھی۔ سیدہ خاموش ہو گئیں۔

"آپا! میرا کیا بنے گا۔" بہت دیر بعد ان کی آواز کسی کنوئیں سے آئی تھی۔ سیدہ پھر چپ رہیں۔

"آپا میرے گلے میں تو موت کے پانچ طوق لٹک رہے ہیں۔ کیا میں اپنی زندگی میں پانچ بار اور مروں گا، ایسی اذیت ناک زندگی آپا! ایسا کبھی کوئی جیا ہو گا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر تکلیف دہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ سیدہ تڑپ اٹھیں بے ساختہ جی چاہا اٹھ کر اپنے شیر جوان بھائی کو اپنے کلیجے میں چھپا لیں۔ ان کے سارے غم، سارے دکھ اپنی پلکوں پر چن لیں سیدہ کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی اکٹھا ہونے لگا۔ ان کے حوصلے کا در بڑا تھا

"آپا! میں کہاں جاؤں۔" سلطان بخت زخمی لہجے میں بولے۔

اسی وقت کسی نے لائٹ جلائی۔ موبائل کی بجتی بیپ ان کے پاس آ گئی۔

"شاہ سائیں! یہ آپ کا فون جی بجے جا رہا ہے۔" مقبولاں ان کے سر پر کھڑی تھی ان کا موبائل لیے۔ انہوں نے جھکے سر کے ساتھ موبائل اس سے لے لیا اور بے جان قدموں سے کمرے سے نکل گئے۔

"کہو کیا بات ہے؟" بے حد اجنبی بیگانہ لہجہ تھا ان کا۔ نین تارا بے مزہ تو بہت ہوئی مگر یہ وقت جی جلانے کا نہیں تھا بلکہ شاہ جی کو تڑپانے کا تھا۔

"ایک خبر ہے میرے پاس آپ کے لیے شاہ جی! بڑی فنٹاسٹک۔" وہ شوخ لہجے میں گویا ہوئی۔ سلطان بخت نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

"ایک سید زادی جس نے رات کی تاریکی میں۔"

"ٹھہرو سنو۔" سلطان بخت نے بارعب لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ایک خبر میرے پاس بھی ہے۔ ہے تجھ سے متعلقہ مگر شاید تمہارا ابھی اس سے کچھ تعلق نکل آئے۔"

انہوں نے جو خبر نین تارا کو سنائی۔ وہ اتنی اچانک تھی کہ اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اتنی خوفناک خبر۔ وہ زرد چہرہ لیے سن کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنی "دھماکہ خیز نیوز" بھی بھول گئی وہ منہ کھولے شاہ جی کی متعلقہ خبر کے زیر اثر کھڑی تھی۔

• • • • • •

اب کیا فرما دیا تمہارے شاہ جی نے کہ تم برف کا حسین مجسمہ بن کر کھڑی ہو گئی ہو۔ کہیں تمہیں حویلی لے جانے کا وعدہ تو نہیں کر رہے صرف یہی ایک بات تمہیں کھڑے کھڑے فریز کر سکتی ہے۔"

عبدالمبین نے اسے یوں ساکت کھڑے دیکھ کر کہا۔ وہ ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا، نین تارا نے اس سے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ وہ سلطان بخت کو فون کرنے لگی ہے۔ عبدالمبین اسے تنہائی میں بات کرنے کا موقع دینے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر نین تارا کے قدموں میں گرا موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر موبائل آف کر دیا۔

"ہاں بولو کیا ہوا ہے؟" نین تارا اب اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"موبی!" وہ آہستگی سے بولی۔

"ہوں، کہو نا۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"شہرینہ مر گئی۔" وہ اسی سحر زدہ لہجے میں بولی۔

"ایں!" وہ اپنی جگہ بے حس ہو گیا۔ "کیا مطلب؟" ایک لمحے کو تو اس کو یہ خبر بالکل سچ اور بالکل اچانک لگی تھی۔

"کل شام کو شہرینہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ شہر گئی تھی۔ اپنی شادی کی شاپنگ کرنے، واپسی پر گاڑی کا ٹائر کچے میں اتر گیا اور گاڑی الٹ گئی۔ جس سے فوری طور پر اس کے انجن میں آگ بھڑک اٹھی۔ لمحوں میں وہاں آسمان تک بلند شعلے اٹھنے لگے۔ لوگوں کے پہنچنے یا کسی اور مدد کے ملنے تک وہاں سوائے راکھ اور سلگتے کوئلوں کے اور کچھ بچا ہی نہیں۔ ایک گھنٹے بعد شہرینہ کی تدفین ہے۔ شاہ جی اسی وجہ سے بہت غمگین اور افسردہ تھے اور مصروف بھی۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں اسے تفصیل بتا رہی تھی۔

"اوہ!" عبدالمبین نے سینے میں رکا ہوا سانس خارج کیا۔ "تو یہ میجک (جادو) دکھایا ہے تمہارے شاہ جی کی مکار فطرت نے۔ واٹ اے پرفیکٹ اسٹوری۔ کہیں بھی جھول نہیں اور لاشوں کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں نا۔ راکھ کا بھی بھلا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ ہیں نا!" وہ جیسے خود سے بول رہا تھا۔

"تمہارا سارا پلان فیل ہو گیا موبی ڈارلنگ!" نین تارا طنزاً بولی۔

"میرا پلان؟" وہ چونکا۔ "میرا کون سا پلان تھا؟"

"بنو مت مائی ڈیئر! تم نے شاہ جی کو بلیک میل کرنے کا خوب لمبا چوڑا پلان بنا رکھا تھا۔ اب چاہے تم جیتی جاگتی شہرینہ کو دنیا کی کسی بھی کورٹ میں پیش کر دو۔ تم ایک جھوٹے بلیک میلر اور فراڈیے کے سوا اور کوئی خطاب نہ پاؤ گے۔" نین تارا نا معلوم کب سے اس کے اندر تک جھانکنے لگی تھی۔

"ریش!" اس نے ہاتھ ہلا کر جیسے ہوا میں مکھی اڑائی۔ "ایسا کچھ کرنا ہوتا تو اب تک شہرینہ یہاں ادھر بے بس پڑی ہوتی۔ اپنے خالہ سے ہمکلام ہوتی۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ البتہ تمہیں اس کی آفر کی تھی میں نے اور تم اسی پر عمل کرنے جا رہی تھیں کہ شاہ جی نے تمہاری ساری بساط تم پر ہی الٹ دی چہ چہ۔ ویری سیڈ نین جی!"

عبدالمبین خود کو سنبھال چکا تھا۔ "حقیقتاً اس کی یہ پلاننگ بھی تھی کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم شاہ جی کو زچ ضرور کرنا ہے۔ اس حد تک کہ وہ خود کشی کرنے پر مجبور ہو جاتے مگر شاہ جی کی عیار ذہنیت نے اس کی سازش کو اسی کی طرف الٹ دیا تھا۔ الٹا شہرینہ اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ شکر ہے وہ پہلے ہی اس سے پیچھا چھڑا چکا تھا۔

"خیر معاف تو اس امیر زادے کو میں نے ابھی بھی نہیں کرنا۔ شہرینہ بی بی جس گھنگھرو طبلے اور سارنگی کے میوزیکل قفس میں قید ہے۔ اس جھنکار کی میٹھی سریلی آواز بھی کبھی تو شاہ جی کو سنوا ہی دینا چاہیے۔ ان کے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔" وہ اپنی سوچ پر خود ہی مسکرایا۔

"اب تمہاری سوچوں نے کون سا شیطانی ٹچ لیا ہے جو یوں مسکراتے جا رہے ہو۔" نین تارا جو اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی فوراً بول اٹھی۔

"کچھ بھی نہیں۔ تمہارے شاہ جی کی ذہانت کی داد دے رہا ہوں کہ کس صفائی سے انہوں نے ذلت کی کالک کا ایک دھبہ بھی اپنے پاکیزہ چہرے پر لگنے نہیں دیا جو تقدیر نے ان کے نامۂ مقدر میں ثبت کر دیا ہے زبردست۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "خیر یہ کرپٹ سیاست دان اگر اس طرح اپنے خلاف کی جانے والی سازشوں اور تقدیر کے کھیلوں کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو ایک پل کے لیے بھی اپنی مسند شاہانہ پر ٹک نہ سکیں۔ اینی وے۔ جانے دو پھر اس موضوع پر بات کریں گے، شاہ جی کی اس چال کا جواب تیار کرنے کے لیے تھوڑا سا وقت تو ملنا چاہیے مجھے بھی۔" اس نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"اور ہاں ایک اہم بات بلکہ گڈ نیوز جو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ امیزنگ۔ اتنی اہم خبر اور میں بھول گیا۔"

"ایسی کیا خبر ہے جو اتنی اہم ہے اور تم بتانا بھی بھول گئے۔"

"تمہیں بتایا تھا نا مسٹر میوزک والوں کے ساتھ میں نے کنٹریکٹ کیا تھا دو ماہ پہلے۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے یاد ہے۔"

"بس بھئی۔ اسی سلسلے میں ایک چین آف شوز ہونے جارہے ہیں۔ لندن، جرمنی، ٹورنٹو، بیلجیئم، انگلینڈ اور آخر میں دبئی شارجہ میں۔ اس کے دو ماہ بعد اسٹیٹس جانے کا شیڈول ہے اور کل شام تو تمہیں معلوم ہے ناپی سی میں بسنت نائٹ اسپیشل ہو رہا ہے، بہت بزی ہو رہا ہوں میں آج کل کچھ بھی سوچنے کو ٹائم نہیں۔" وہ جلدی جلدی اسے بتا رہا تھا۔

"واپس کب تک آؤ گے؟" نین تارا کچھ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تقریباً" اٹھائیس دن کا پروگرام ہے۔" وہ بخاری صاحب کی انڈو پاک مشترکہ ٹیلی فلم کے دو شوٹس بھی لندن میں ہی ہونے ہیں۔ کنسرٹس کے فوراً بعد ان کے ساتھ ڈیٹ ہے میری۔ اس لیے آتے آتے ایک ماہ سے ہفتہ بھر اوپر لگ ہی جائے گا۔ تم بھی چلو نا میرے ساتھ۔" اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر اس نے آفر کی۔

"تم جارہے ہو میرے ساتھ سنگاپور؟" وہ شکایتاً بولی۔

"یار! ادھر کچھ اہم کام ہیں لندن جانے کے سلسلے میں۔ پاسپورٹ وغیرہ بنوانا ہے پھر کل میرا ایک فنکشن بھی ہے۔ تم بھی چلو میرے ساتھ۔ تمہارے شاہ جی تو اب اپنی ہمشیرہ کا چالیسواں کرکے ہی تمہیں اٹینڈ کریں گے۔ تم اکیلی ادھر بور ہو گی۔ میرے ساتھ چلو خوب انجوائے کریں گے۔" وہ اسے اکسا رہا تھا۔

"اچھا۔ سوچوں گی۔" وہ نیم رضامند لہجے میں بولی۔

"گھر دیکھا تم نے۔ اچھا ہے نا؟" عبدالمبین کو یاد دیا۔

"اچھا ہے زبردست۔ پر تم تو اڑنے جارہے ہو بیرونی دوروں پر۔ ادھر کون رہے گا۔"

"ادھر...." وہ کھو سا گیا۔ شہرینہ کی ڈری سہمی صورت اس کی آنکھوں کے آگے لہرائی۔ "دیکھو شاید اماں جی وغیرہ کو لے آؤں اگر وہ مان گئیں تو۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"مولی! مجھے اپنے پیرنٹس سے تو ملواؤ کبھی۔" نین تارا پرشوق لہجے میں بولی۔

"توبہ توبہ! مرواؤ گی مجھے۔ میرے بابا صاحب میری شکل دیکھنے کو تیار نہیں۔ تمہیں ساتھ دیکھ لیا تو شاید قتل کر ڈالیں اور انہیں قتل کرنے سے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر ہنسا۔

"اتنے سخت ہیں وہ۔" نین تارا کچھ ڈر کر بولی۔

"اتنے سے بھی بہت زیادہ۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے اب چلنا چاہیے۔ کچھ شاپنگ کرنے جانا ہے مجھے ساتھ چلو گی نا!"

"ہاں چلو میں آج شام تک تو فارغ ہی ہوں۔" نین تارا سست لہجے میں بولی۔ پتا نہیں کیوں دل اداس سا ہو رہا تھا۔

"چلو پھر تم گاڑی میں بیٹھو جاکر۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو نین تارا خالی ذہن کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اسے شہرینہ کی اچانک موت والی بات نے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ شاہ جی کو ساری صورت حال بتا دے مگر پھر سلطان بخت کا سخت اجنبی لہجہ اسے خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

معاذ اگلی شام اماں جی کے ٹیسٹوں کی رپورٹس لے کر صوفی صاحب سے ملنے چلا آیا۔ وہ صوفی صاحب کے ساتھ اوپر آیا تو چھوٹے سے احاطے میں بنے ان کی رہائش کے دو کمرے اور مختصر سا صحن اسے حیران کر گیا۔ سال خوردہ در و دیوار بوسیدہ چھتیں جیسے ابھی سر پر گر پڑیں گی سیمنٹ اکھڑے سیاہ مٹیالے فرش جھولتے لٹکتے گھن کھائی لکڑی کے دروازے، ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں اور سامان کی ابتر حالت، جھلنگا چارپائیاں پیوند لگی چادریں صحن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا، مٹی کے دو چار برتن، لکڑی کی پرانی چھوٹی سی الماری پر دھرے تھے۔ بہت مختصر

سامان تھا۔ وہ بھی پرانا اور آؤٹ آف فیشن۔

"یہ ہمارے معظم دین کا طرز رہائش اور سر چھپانے کا ٹھکانا ہے۔ وہ معلم دین جو دنیا کے آفاقی، فطری اور بہترین مذہب کی تعلیم ہماری نئی نسلوں کے دل و دماغ پر نقش کرتا ہے۔ جس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر پانچ وقت لوگ سر جھکا کے خالق دو جہاں کی بڑائی اور کبریائی کی ثنا کرتے ہیں۔ یہ اس عالم دین کی زندگی گزارنے کی جگہ ہے جہاں کوئی ذی نفس دس منٹ سے زیادہ ٹھہرے تو اسے فضا میں آکسیجن کی شدید کمی کا احساس گیارھواں منٹ آخری سیڑھی تک لے جائے۔ یہاں اس ڈربے نما چار دیواری میں یہ پورا کنبہ سالوں سے دن بھی اور رات بھی زندگی بتائے جارہا تھا۔ معاشی طور پر اتنے بدحال شخص نے دین کی ترویج کا بھلا کیا کرنی ہے۔ وہ تو صرف معاشرے میں "رٹو طوطے" پیدا کر رہا ہے، جو ایک بار قرآن پڑھ لیتے ہیں پھر زندگی بھر اس کا مفہوم، مقصد اور اس کے پوشیدہ فوائد کو جانے بغیر تیزی سے بس پارے پہ سپارہ پڑھے جاتے ہیں اور بس۔

"بیٹھو بیٹا!" صوفی صاحب اسے اماں جی کے کمرے میں ہی لے آئے تھے۔ وہ بستر پر لیٹی اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ چند سال پہلے گاؤں میں اس نے حجرے کی درز سے جس اماں جی کو دیکھا تھا وہ ایک صحت مند سرخ و سفید رنگت والی دیہاتی عورت تھیں، جو اپنے بچوں کے بیچ نہال چولہے کے پاس بیٹھی تھیں اور یہ جو بستر پر لیٹی تھیں وہ اس کا کمزور عکس لگ رہی تھیں۔ پیلی رنگت، سفید ہونٹ، بے رونق آنکھیں۔

وہ اماں جی کو سلام کرکے صوفی صاحب کی پیش کردہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا حال ہے آپ کا اماں جی اب؟" اس نے محبت سے پوچھا۔

"بہتر ہوں بیٹا! اللہ کا شکر ہے۔" ان کا ماتھا آنکھوں تک پیلے کاٹن کے دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ آہستگی سے بولیں۔

"کل تو میں نے آپ کو جو دوائیں لکھ کر دی تھیں، وہ ٹیسٹوں کی رپورٹس کے بغیر تھیں۔ ان میں سے دو تو ابھی بھی جاری رکھنی ہیں۔ دو اور میں لکھ کر دے رہا ہوں۔ یہ میں ساتھ لے آیا ہوں۔ تین ٹائم باقاعدگی سے دوا لینی ہے آپ نے اور اچھی خوراک بھی۔ اصل میں صوفی صاحب! انہیں کمزوری بھی بہت ہے۔ آپ انہیں دودھ، گوشت، پھل وغیرہ ذرا زیادہ استعمال کروائیں۔ انشاءاللہ بہت جلد یہ صحت یاب ہو جائیں گی۔" اس نے لکھا ہوا نسخہ اور دواؤں کا لفافہ پاس پڑی تپائی پر رکھا۔

"معاذ بیٹا! خدانخواستہ کوئی پیچیدہ بیماری تو نہیں؟" صوفی صاحب نے پوچھا۔

"نہیں صوفی صاحب! ابھی تو ایسا کچھ نہیں لیکن اگر دوا اور علاج باقاعدگی سے نہ کروایا گیا تو خدانخواستہ۔ بہرحال آپ انہیں دوائیں دیں۔ یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"اصل میں ان کا جگر خون نہیں بنا رہا زیادہ سیریس مسئلہ نہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد اچھی ہو جائیں گی۔ اماں جی! آپ نے اپنی بیماری سر پر سوار نہیں کرنا ہے۔ زندگی ہو تو انسان بیمار شمار ہوتا ہی رہتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھار بیمار ہونے سے انسان کو۔ مشینی روٹین سے کچھ آرام بھی مل جاتا ہے مگر صرف چند دن کی بیماری۔ آپ کو بھی اپنی ول پاور سے بہت جلد بیماری کو شکست دینا ہے اور بستر کو خدا حافظ کہہ دینا ہے۔" ان کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا۔

"کوشش کروں گی بیٹا!" وہ بہت ہولے سے بولیں۔

"اچھا تو میں اب چلتا ہوں صوفی صاحب! یہ میرا کارڈ ہے۔ شہر میں میں جس ہاسپٹل میں جاب کر رہا ہوں جب بھی خدانخواستہ اماں جی کی طبیعت خراب ہو یا ویسے ہی آپ کو مجھ سے ملنا ہو تو ادھر آکر میرا پوچھ لیں۔ مجھے آپ کے کسی بھی کام آکے خوشی ہو گی۔" اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر صوفی صاحب کو تھمایا۔

"شکریہ بیٹا! تمہاری اس توجہ اور محبت کا لیکن تم ایسے کیسے جاسکتے ہو، چائے تیار ہے۔ کھانا کھا کر جانا ہے۔

چائے میں لا رہا ہوں۔" صوفی صاحب میٹھے لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

اماں جی نے انہیں جاتے دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"اماں جی! آپ مایوس سی کیوں ہیں؟" چند ثانیے بعد وہ بولا۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر آنکھیں جھپکنے لگیں۔ وہ آنکھوں سے امڈتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"اماں جی! آنسوؤں کو روکا نہ کریں۔ انہیں رستہ دیا کریں۔ یہ آپ کے بوجھل دل کو اپنے بوجھ سے آزاد کر کے اسے ہلکا پھلکا کر دیں گے۔ کبھی کبھی رونا صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔" وہ انہیں بغور دیکھ رہا تھا بولا۔

"اور جو ہر وقت رونا چاہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ آنسو آنکھوں کے کناروں سے بے دھڑک نکل آئے تھے۔

"Excess of everything is bad

(ہر چیز کی زیادتی بری ہے) جس طرح بالکل نہ رونا دل کے بوجھ کو بڑھا دیتا ہے' اسی طرح ہر وقت کا رونا زندگی کو بوجھ بنا دیتا ہے۔" معاذ کا دل ان کی حالت پر بہت اداس ہو چلا تھا۔

"جب زندگی ہی بوجھ بن جائے اور اس بوجھ کو ڈھوتے ڈھوتے کمر کاندھے جھکنے لگ جائیں تو ایسے بوجھ کو اتار ہی پھینکنا چاہیے۔" وہ مایوسی سے بولیں۔

"اماں جی! مایوسی کفر ہے۔"

"ایمان تو امید کا نام ہے۔ امید روشنی ہے اور روشنی زندگی اور جس کی زندگی میں کوئی امید ہی نہ ہو' اس کا ایمان کفر ہی تو ہو گا میرے بچے۔" وہ بہت پژمردہ تھیں بہت بیزار۔

"اللہ نہ کرے اماں جی! آپ کے ایمان پر کفر کا سایہ بھی پڑے۔" وہ بے اختیار بولا۔ "اگر لوگوں میں ایمان بانٹنے والے' ایمان پر ان کا یقین پختہ کرنے والے یوں مایوسی کا شکار ہو جائیں گے تو معاشرہ تو تباہ ہو جائے گا۔" اس کا دل دہلا تھا۔

"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔" اسے ان سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

"جس ماں کے دو جوان پلے پلائے بیٹے اس عمر میں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جائیں' وہ ان کی صورتیں دیکھنے کو ترس جائے' ایسی مایوس ماں ایمان تو کیا خدا سے بھی منکر ہو جائے تو ناقابل یقین بات نہیں۔" انہوں نے بالآخر دل کا درد کہہ ہی ڈالا۔

"اوہ!" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کہاں ہیں دونوں؟ آپ کے بڑے بیٹے کو تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن عبدالمبین ہی نام تھا نا دوسرے والے کا۔ میں اس سے ملا تھا۔ وری انرجیٹک ینگ مین تھا۔ بہت پوٹینشل تھا اس میں کچھ کر دکھانے کا۔ کہاں ہے آج کل؟" معاذ کو اپنے ماحول اور بابا صاحب کی بے جا سختی سے نالاں وہ "باغی" عبدالمبین یاد آیا تھا۔

"گویا بن گیا ہے۔ شہر میں گاتا ہے۔" وہ دھیرے سے بولیں جیسے وہ کسی بڑے جرم میں ملوث ہو۔

"اچھا سنگر بن گیا ہے۔" معاذ کو زیادہ حیرت نہ ہوئی کیونکہ عبدالمبین کے خیالات جہاں تک وہ جان پایا تھا' اسے اسی نہج تک لے کر جا سکتے تھے۔

"میراثی کہو۔ بہت خفا ہیں صوفی صاب اس سے۔ جیتے جی اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں اور میں... میں کیا کروں میں تو..." وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگیں۔

"حوصلہ کریں اماں جی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس نوجوانوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ انہیں کوئی نہ کوئی تخلیقی سرگرمی چاہیے ہوتی ہے۔ کچھ کر دکھانے کا شوق۔ عارضی لگن ہے' اتر جائے گی خود بخود تو نارمل ہو جائے گا وہ بھی..." معاذ نے انہیں سمجھایا۔

"وہ تو ٹھیک ہو گا یا نہیں مگر صوفی صاب اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ان کا غصہ عارضی ہوتا ہے نہ نفرت وقتی۔ انہوں نے تو مرن جیون ختم کر ڈالا ہے دونوں بیٹوں سے اور مجھے جیتے جی قبر میں اتار......"

"یہ لو معاذ بیٹا! چائے پیو اور کھانا تم نے کھا کر جانا ہے۔" صوفی صاحب ٹرے اٹھا کے اندر داخل ہوئے۔ ٹرے انہوں نے کرسی کے دوسری طرف پڑی تپائی پر رکھ دی اور خود بھی دوسری طرف پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"شکریہ صوفی صاب! مگر کھانا وغیرہ نہیں۔ مجھے ابھی گھر کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔ انشاء اللہ دوبارہ حاضر ہوا تو ضرور آپ کو زحمت دوں گا۔" ٹرے میں چائے کے دو مگ اور نمکو کی پلیٹ پڑی تھی۔

"نہیں بیٹا! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پھر آؤ گے تو پھر بھی کھا لینا۔" وہ بہت محبت و اصرار سے بولے تو اماں جی نے ایک دکھ بھری نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔

"اتنا اصرار' اتنی محبت کبھی اپنے کسی بیٹے سے نہ جتائی صوفی صاحب آپ نے۔" وہ دل میں کڑھیں۔

"عبدالمبین آج کل کہاں ہوتا ہے صوفی صاحب؟" اس نے چند لمحوں بعد پوچھا تو صوفی صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں واضح ناخوشگوار تاثر تھا۔

"معلوم نہیں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے روکھے لہجے میں کہا۔ "میں اسے گھر سے نکال چکا ہوں۔ تم کہو' چائے اچھی ہے نا اور منگواؤں۔" انہوں نے واضح طور پر موضوع بدلا تھا۔

"جی بہت اچھی ہے' شکریہ۔ اب میں چلتا ہوں۔ اماں جی کی یہ دوا پندرہ دن کی ہے۔ اگر طبیعت ٹھیک رہی تو صرف ایک یہ دوا مزید ایک مہینہ جاری رکھیں' باقی کی ختم کر دیں' ٹھیک ہے۔ اماں جی! اب آپ نے اپنی صحت کا خود خیال رکھنا ہے۔ ایک انسان کی زندگی کتنوں سے بندھی ہوتی ہے۔ وہ اگر سوچتے بیٹھتے تو اپنے پیاروں کے لیے ہی اپنا ضرور خیال رکھے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اماں جی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

"کچھ دیر اور بیٹھتے۔" صوفی صاحب کے لہجے میں واضح تشنگی تھی۔

"ابھی ہمارا کیمپ ادھر چار دن کا اور ہے۔ فراغت ملی تو حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ اماں جی کا خیال رکھیے گا۔" وہ انہیں تاکید کرتے ہوئے اماں جی کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ صحن بالکل خالی تھا۔

اور آمنہ جو اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی پیچھے آتے صوفی صاحب کو دیکھ کر فوراً" دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

"دانہ ڈالنے کے لیے اچھا مرغا ہے' ناٹ بیڈ۔" زینب جو برے چارپائی پر لیٹی تھی' آمنہ کو تیزی سے باہر جاتے اور پھر فوراً" دروازے کے پیچھے ہوتے دیکھ کر بولی تو آمنہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"انسان کو آئینے میں ہمیشہ اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔"

"نہیں' اپنی صورت کے ساتھ اکثر دوسروں کی حسرتیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ اگر دیکھنے والی نظر ایکسپرٹ ہو۔" وہ جواباً" بولی۔

"جیسے آپ کی..." جویریہ جل کر منہ میں بڑبڑائی۔

"بی مینڈکی کو زکام ہوا۔" وہ جھٹ جویریہ کی طرف رخ کر کے بولی۔

"میں آپ کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔" وہ بے رخی سے کہہ کر جھٹ سے اٹھی اور وہ باہر نکل گئی۔

"منہ لگنے کے لیے کچھ پلے بھی تو ہو بندے کے اور تمہارے جو پلے ہے اس کا گواہ تو پورا محلہ ہے۔"

"تمہاری ذہنیت واقعی بہت گھٹیا ہے۔" آمنہ اسے غصے سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی۔

تو زینب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سیلن زدہ دیواروں پر شام اتر چکی تھی۔ گھٹی شام میں ان بے رنگ و روغن دیواروں کا رنگ اور بھی سیاہ اور بھی منحوس لگتا تھا۔ شام ڈھلے تو اس کا جی ہزار دفعہ چاہتا تھا' وہ یہاں سے بھاگ جائے' کہیں دور کسی کھلی فضا میں۔ مگر کہاں' کس کے پاس' کس کے ساتھ...؟ ساتھ دینے والا تو نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری دونوں بہنوں کی شادی طے کردی ہے میں نے اور کیوں نہ کرتی۔ دونوں کی عمریں ڈھلی جارہی ہیں۔ خدا خدا کرکے تو کام کے رشتے ملے ہیں۔ اچھے رشتوں کے انتظار میں دونوں بوڑھی ہوئی جارہی تھیں۔ رعنا بی بی سے ہزار کروڑ دفعہ کہا کہ بی بی تمہارے حلقے میں بڑی بڑی رئیس زادیاں لیڈیاں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ ذرا غریب بھتیجیوں کا بھی خیال کرلو۔ نہیں جی' بھلا یہ کب گوارا ہوگا کہ ان کے مقابل کوئی اچھے خاندان میں بیاہا جائے۔ احسان فراموش بھول گئی۔ میں نے کیسا اپنا کلیجہ کاٹ کر اس کی جلتی بلتی ممتا ٹھنڈی کی تھی' ورنہ تو وہ اب تک باولی ہوکر گلیوں میں دھکے کھارہی ہوتی۔"

عفت آرا کی فراٹے بھرتی زبان کہیں بھی بل کھاکر نہیں رکی تھی۔ سفیان جو بڑے دھیان سے ان کی گفتگو سن رہا تھا' ایک گہرا سانس لے کر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

"چھ ماہ کا تھا تو میرے لعل جب رعنا کا بچہ چھنا وہ رو رو کر پاگل ہورہی تھی اس وقت۔ میں نے اپنے کلیجے پر پتھر صبر کا رکھا اور تمہارے باپ کی بات کے لیے بلکہ فرمائش کہو جس نے امیر بہن کے واسطے کے آگے بیوی کی ممتا کی پروانہ کی اور تمہیں لے جاکر بہن کی جھولی میں ڈال دیا۔ کتنی راتیں میں سونہ سکی' اٹھ اٹھ کر اپنے پہلو کے خالی بستر کو دیکھتی رہتی اور گھٹ گھٹ کر روتی رہتی۔ رات بھر مجھے یہ خیال آنکھ نہ لگانے دیتا کہ تو رونہ رہا ہو' تجھے بھوک نہ لگی ہو۔ اس لینڈلیڈی کی آیا جو اس نے تمہارے لیے رکھی تھی' وہ کمبخت تو رات بھر سوئی مری رہتی تھی' تم رو رہے ہو اور وہ حبشن سو رہی ہو۔ میرا دل اس خیال ہی سے پگھل پگھل جاتا۔ آنکھوں میں رات کٹتی اور صبح سویرے ہی میں بہانے بہانے رعنا گھر پہنچ جاتی۔ شروع میں تو دونوں میاں بیوی میری خوب قدر کرتے۔ خاطر تواضع کے لیے بچھے جاتے' پر آہستہ آہستہ انہوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیرنی شروع کردیں۔ ادھر میں جاتی' ادھر ان کے ماتھے شکنوں سے لبریز ہوجاتے۔ میری ممتا تو تجھے ایک نظر دیکھنے کو ترسی جاتی تھی۔ وہ سمجھتے' میں کچھ مانگنے آئی ہوں۔ ارے بھکاری تو وہ تھے جو میرے گھر کا سب سے انمول ہیرا لے اڑے۔" عفت آرا نے بے اختیار احساس محبت سے مغلوب ہوکر سفیان کو اپنے ساتھ لپٹالیا۔ اس کا سر ماتھا چومنے لگیں۔

"اری نیک بخت! نیکی کی تھی تو اس کا اجر بھی اللہ سے مانگنا تھا۔ پر تم تو شروع دن سے بدنیت تھیں۔ اب بھی بددیانتی کر بیٹھی ہو۔ جو عہد کیا تھا اس سے پھر گئی ہو۔ ان بے چاروں کو خبر بھی نہیں کہ تم سفیان کو اپنے نیک کارنامے کی ساری داستان نمک مرچ لگاکر سنا بھی چکی ہو' وہ تو ان بھول ہیں۔ تم نے تو ان سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھاؤ گی کہ ہم اس کے ماں باپ ہیں۔ انہوں نے بھی تمہیں دینے سے ہاتھ نہ کھینچا۔ روپیہ پیسہ' زیور کتنا جو تم نے مانگا ہمیشہ دوگنا دیا۔ تم نے بدلہ چکایا ان کی محبت کا۔ پیسے کے لالچ میں آکر زبان سے مکر گئی ہو۔ بڑا گناہ کیا ہے عفت آرا تم نے۔" نواز جو دور بیٹھے کتاب پر نظریں جمائے ماں بیٹے کی گفتگو بڑے دھیان سے سن رہے تھے' رہ نہ سکے تو بول پڑے۔

"ہاں ہاں میں زمانے بھر کی گناہ گار اور تم سب تمہاری بہن بہنوئی زمانے بھر کے نیکوکار۔ کبھی کسی نے میرے دل میں جھانکا' کس برزخ میں جلتی رہی ہوں میں۔ میں نے بچہ دیا' نیکی کی اور وہ اسے لے کر سات سمندر پار چلی گئی' صاف مجھے ٹھینگا دکھا کر۔ میں جو ہفتہ چار دن بعد جاکر اس کی صورت دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر آتی تھی' ظالم اس سے بھی محروم کرگئی اور اب...... اب دیکھو کیسی بے انصافی۔ ارے چور تو ان کے دلوں میں ہے۔ محنت کرے میرا بیٹا۔ اپنا خون پسینہ دن رات ایک کرکے دھوپ میں جل کر اس نے فیکٹری بنوائی۔ کھڑے کھڑے غریب کی کمر اور ٹانگیں تختہ ہوجاتی تھیں اور جب فیکٹری نوٹ چھاپنے لگی تو اس غریب کو اجازت نہیں کہ اپنی مرضی سے ایک دھیلا اپنی جیب میں ڈال لے۔ سب دستخط' انگوٹھے نخرمیاں کے چلتے ہیں۔ میرا بیٹا تو مفت کی بیگار کررہا ہے۔ اس کھلی دھاندلی پر تو میں صبر نہ کروں گی۔ ممتا کو تو صبر کی زہر بھری گولی دے کر موت کی نیند سلادیا پر

یہ تو بڑا ظلم ہے اور ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانے والا' ظالم کا ساتھی' اس سے بڑا ظالم۔ میرا بچہ کب تک خاموش رہے' بس اب سفیان آگے کھل کر بات کرتا کہ ان دونوں کے دلوں کی چالاکی سامنے آئے۔ فیکٹری تیرے نام ہے۔ آدھے سے زیادہ بزنس تیرے نام ہے۔ اسلام آباد والی کوٹھی تیرے نام' کاغذات ان کے پاس' مری کا اپارٹمنٹ تیرے نام۔ کاغذات ان کے قبضے میں۔ چالاکی دیکھو ان کی۔ میں کہوں اس نام کرنے کا کیا فائدہ جب تو ان سے کوئی فیض نہ اٹھاسکے۔" وہ زوردار لہجے میں بولیں تو سفیان سرہلانے لگا۔

"بس بہت ہوگئی' اب ان سے بات کرو۔" وہ پھر بولیں۔

"میں بھی تنگ آچکا ہوں امی! اس روز روز کے ہاتھ پھیلانے سے۔ دس ہزار' بیس ہزار۔ بھلا یہ کوئی رقم ہوتی ہے۔ میری اپنی سو ضروریات ہوتی ہیں اور میں سب کچھ ہوتے ہوئے فقیروں کی سی زندگی گزار رہا ہوں۔" سفیان نے بھی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی تو نواز صاحب افسوس سے انہیں دیکھنے لگے۔

"صبر نہ ماں سے ہوسکا' نہ بیٹے سے۔ ارے بے صبرے کو کچھ نہیں ملتا۔ نہ اللہ کی رحمت' نہ دنیا کی نعمت۔ اپنی بے قراریوں سے خود ہی تڑپ تڑپ کر لوٹتا ہے' ہاتھ کچھ نہیں آتا۔"

"ہاں ہاں' تم تو چاہو گے جیسے تڑپ تڑپ کر میں نے' میرے بچوں نے زندگی گزاری ہے یہ معصوم بھی گزار دے۔ ہائے دہائی ہے' دہرا ظلم۔ پہلے ماں کی ممتا سے محروم کیا' اب دولت پیسے کے ہوتے ہوئے روپے پیسے کی محرومی۔ کیا جرم کیا ہے میرے بچے نے۔" وہ چمک کر بولیں۔

"جرم تو میں نے کیا ہے' جو تم جیسی عورت سے شادی کی۔" وہ منہ میں بڑبڑائے۔

"سن رہے ہو' سٹھیا گیا ہے یہ۔ چھوڑو اس کو۔" وہ الٹا ہاتھ مار کر بولیں۔ "تم بس پچاس لاکھ کا انتظام کرو' مجھے چاہیے اگلے ماہ کی سترہ تاریخ تک۔ دونوں داماد کو سلامی میں ایک ایک گھر اور ایک ایک گاڑی دینی ہے۔ میں نے گورنمنٹ کے افسر ہیں دونوں' پر گورنمنٹ کا افسر بھی تو فقط افسر ہی ہوتا ہے۔ دس بیس ہزار روپے مہینے کے کمالے تو کیا کمالے۔"

"توبہ توبہ کرو عفت بیگم! اپنی ہوس کے ہاتھوں توبہ کرو' اللہ کے آگے۔" نواز صاحب کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔

"اپنی ہیرا جیسی اولاد لوگوں کی محرومیاں دور کرنے کے واسطے ان میں بانٹتی پھروں' ترسوں بھی میں اور پھر توبہ بھی میں کروں۔ ارے نواز میاں! جاؤ خدارا تم توبہ کرو۔ چھوڑو میری جان۔ بہت زندگی عذاب بنادی تم نے میری۔ اب میرا بیٹا میرے دلدر دور کرے گا۔ گلزار بنائے گا میری زندگی اور میرے بچے تو چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ ان کی جائیداد کا شمار لاکھوں کروڑوں میں نہیں' اس سے اوپر ہوتا ہے۔ جتنی جلدی ہوسکے اس بہتی گنگا کو اپنے قابو میں کرلو۔ وہ دونوں بڈھا بڈھی ابھی نہیں مرنے کے۔ سانپ بن کر اور پچاس برس تک اس خزانے کے منہ پر بیٹھے رہیں گے۔ ارے ہر کوئی اپنی عمر جیتا ہے' کوئی پٹے پر لکھوا کر آیا ہے کہ بڈھا ہے تو جلد مرے گا۔ جوان ہے تو دیر سے۔ ارے آج کل تو بوڑھے سو سو سال جی رہے ہیں۔ ایسی دنیا کی ہوس ہے کہ ادھر سے جانے کا کمبخت کا جی ہی نہیں چاہتا۔ بڈھی کھوسٹ ہوچکی ہے یہ رعنا' ابھی تک بیوٹی پارلر جاکر الٹرا دوشیزہ بن کر نکلتی ہے' تو کیا ان کے مرنے کے انتظار میں بیٹھا ترستا رہے گا۔ جا ان سے دوٹوک بات کر۔"

عفت آرا کی زبان کے آگے خندق ہی نہیں' بڑے بڑے طوفانی ندی نالے بھی شرماتے تھے۔ سفیان نے سر ہلادیا۔ وہ خود آج کل شدید تنگی کا شکار تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں سات آٹھ لاکھ تھے۔ جن میں سے اکثر وہ بڑی بڑی رقمیں نکلواتا رہتا تھا' جب سے عفت آرا نے اس راز سے پردہ اٹھایا تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ رعنا اور فخر حیات کا نہیں۔ اس وقت سے تین چار لاکھ تو وہ بٹور چکی تھیں۔

اس کے اکاؤنٹ میں مشکل سے ساٹھ ستر ہزار روپے تھے اور اپنے اخراجات کے لیے اسے یہ رقم بہت حقیر لگ رہی تھی۔ وہ خود رعنا اور فخر حیات سے آر یا پار والا معاملہ کرنا چاہ رہا تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کی فیکٹری

اور فرم کی آمدنی پر اس کا اختیار ہونا چاہیے تھا۔
"آپ فکر نہیں کریں' میں دو چار روز ہی میں ان سے بات کر کے آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔" اس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو عفت آرا کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔ اسی دن کے لیے تو انہوں نے یہ مہرہ بازی میں لگایا تھا۔ بظاہر مات ہوئی تھی مگر آنے والی شاندار جیت کے احساس نے انہیں کبھی مرجھانے نہ دیا تھا۔ اسی دن کا تو انہیں انتظار تھا جب رعنا حیات کی چمکتی دمکتی ایمپائر کے ماتھے پر عفت آرا کی ملکیت کا نیون سائن جگمگا رہا ہوگا۔ "وہ وقت آ گیا ہے۔" وہ مسکرائیں۔

☼ ☼ ☼

"تم کہاں جا رہی ہو؟" صوفی صاحب نے گرج دار آواز پر کالج یونیفارم میں سلیقے سے چادر اوڑھے اور کتابیں سینے سے لگائے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی زینب سے کہا تو اس کے قدم بے اختیار کانپ کر رہ گئے۔
"کا... کالج بابا صاب..." اس کی زبان یوں لڑکھڑائی جیسے بابا صاحب کو خبر ہے کہ وہ کالج نہیں' کہیں اور جا رہی ہے۔
"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم اب کالج نہیں جاؤ گی۔" وہ غصیلی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولے۔
"بابا صاحب! امتحان..." اس نے تھوک نگلا۔ "امتحان ہونے والے ہیں۔ بس چند دن اور جاؤں گی۔" اس نے اپنا خشک ہوتا حلق تھوک سے تر کرنا چاہا۔
"ایک دن بھی نہیں' سنا تم نے۔ جتنا پڑھ لیا' بہت ہے۔ پاس ہونا ہوتا تم نے تو دو سال برباد نہ کرتیں۔ اب ایک دن بھی نہیں۔ امتحان کا اتنا شوق ہے تو پرائیویٹ تیاری کر کے دے ڈالو مگر کالج کا اب نام نہیں لینا۔" وہ اسی غصیلے لہجے میں دوٹوک بولے۔
"بابا صاحب! پلیز صرف چند دن... میں پھر... چھٹیاں ہو جائیں گی کالج میں... نہیں جاؤں گی پھر۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔
"تم چند دن کی بات کر رہی ہو' اب ایک دن بھی نہیں۔ تم اپنے بھائیوں کی طرح غیر ذمہ دار' خود غرض اور لاپروا ہو۔ تمہیں کچھ خبر ہے کہ تمہاری ماں کی کیا حالت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم گھر کے کاموں میں ذرا دلچسپی نہیں لیتیں۔ گھر کا سارا کام' ماں کی دیکھ بھال اور میرے ذاتی کام بھی آمنہ یا جویریہ کرتی ہے۔ تم گھر میں ہوتی ہو تو پلنگ توڑتی ہو یا پھر یہ کالج کا ڈرامہ۔ تمہارا بابا صاب بوڑھا ہو گیا ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ تم پر نظر نہ رکھ سکے' سمجھیں تم۔" وہ گرج رہے تھے۔
"آمنہ کو اسکول جانا ہوتا ہے پھر بھی وہ ساری ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہے اور تمہیں ذرا سا بھی احساس نہیں۔ ان دونوں نافرمانوں کی طرح... بہر حال یہ کتابیں شتابیں اندر جا کر رکھو اور کپڑے بدلو' میں بیٹھا ہی ہوں۔ جو میں نے کہا ہے' اس کو ماننا ہی نہیں' عمل بھی کرنا ہے۔ جاؤ اب۔" روکھے لہجے میں کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔
آمنہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکل آئی تھی۔ بابا صاحب کا حکم نامہ اس نے بھی سن لیا تھا۔
"ناشتہ میں نے اماں جی کو کروا دیا ہے اور دوا بھی دے دی ہے لیکن دوپہر کے کھانے سے پہلے انہیں گولی دینی ہے جو ان کے سرہانے رکھی ہے۔ باقی میں آ کر کھانے کے بعد کی دے دوں گی۔"
"میں تمہاری ملازمہ نہیں جو مجھے حکم دے رہی ہو۔ جا کر اس گنوں کی پوری جویریہ کو دو' اسے بڑا شوق ہے نیک بی بی بننے کا۔ بابا صاحب کی گڈ بکس سے تو اس کا نام کٹ گیا۔ اب وہ تمہارے سامنے بہت نیک پروین بنتی ہے۔ سگھڑ بی بی۔ میں کالج جا رہی ہوں اور مجھے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ سنا تم نے۔" وہ چیخ کر کہتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ابھی اس نے پہلا قدم ہی سیڑھی پر رکھا تھا کہ ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر آ کر لگا اور وہ تیورا کر پیچھے دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کا سر دیوار سے لگا تھا اور وہ خود گرتے گرتے بچی تھی۔ اس کی کتابیں

اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سیڑھیوں پر لڑھک گئی تھیں۔
"مجھے نہیں خبر تھی کہ تم اس حد تک آگے بڑھ چکی ہو' ورنہ تمہیں اتنی پرواز کی جرأت کبھی نہ ہوتی۔ میں پہلے دن ہی تمہارے پر کتر دیتا مگر زینب بی بی! دیر ابھی بھی نہیں ہوئی۔ پہلے میں اتنی جلدی نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اب زیادہ دیر نہیں کروں گا' صرف ایک دو ہفتے۔ تمہاری ماں کی ذرا سی طبیعت سنبھل لے' تمہیں ادھر سے چلتا کروں گا۔ سمجھیں تم اور اب یہاں سے دفع ہو جاؤ' میں تمہاری صورت نہ دیکھوں گا۔"
صوفی صاحب شاید سیڑھیوں ہی میں کھڑے تھے۔ زینب جیسے ہی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ انہوں نے دو قدم اوپر چڑھ کر اس کے گال پر زناٹے دار تھپڑ جمایا تھا جس سے وہ تیورا کر پیچھے جا گری تھی۔
وہ چادر سے الجھتی اپنے گال پر ہاتھ رکھے اونچا اونچا روتے ہوئے اندر کمرے میں بھاگ گئی۔ آمنہ نے کچھ ڈر کر صوفی صاحب کی طرف دیکھا۔ غصے سے ان کا آتشیں چہرہ دہک رہا تھا۔
"تم چلو' تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"
وہ اس کی طرف دیکھ کر کچھ نرم لہجے میں بولے۔ آمنہ نے سر ہلا کر نقاب سے اپنا چہرہ ڈھانپا اور ایک نظر مڑ کر زینب کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور صوفی صاحب کے پیچھے سیڑھیاں اتر گئی۔
جویریہ اماں جی کے کمرے کے دروازے میں کھڑی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ آمنہ کے جاتے ہی وہ باہر چولہے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دوپہر کے لیے اسے اماں جی کا پرہیزی کھانا بھی تیار کرنا تھا اور باقی سب کے لیے بھی سالن اور ابھی گھر کی صفائی بھی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بہت سے کام۔ اسے معلوم تھا' زینب اب نہ تو کمرے سے باہر نکلے گی' نہ کوئی کام کرے گی مگر دوسرے لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ زینب کمرے سے اپنے اسی تیار حلیے میں نکل آئی تھی۔ سلیقے سے بال بنائے' صاف ستھرا چہرہ اور یونیفارم پر چادر اوڑھتے ہوئے وہ اندر سے نکل آئی۔
"میں کالج جا رہی ہوں۔ بابا صاحب کو بتانا چاہو تو بے شک بتا دینا مگر میں رک نہیں سکتی' سنا تم نے۔" وہ جارحانہ انداز میں کہتے ہوئے نقاب چہرے پر جماتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔
"میرے خدا' یہ چھوٹی آپی کس قدر ضدی اور دلیر ہیں۔ پتا نہیں انہیں کالج سے اتنا پیار کیونکر ہو گیا ہے۔ انہوں نے تو کبھی اچھی ڈویژن تک نہیں لی اور اب پڑھنے سے یہ عشق چہ معنی۔" وہ سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔ "ضرور کوئی اور چکر ہے' ورنہ..." اسے خود ہی یہ خیال سوجھا تھا اور اس کے دل نے بھی اس کی تائید کی تھی۔
شکر یہ ہوا کہ صوفی صاحب اس دوران ایک بار بھی اوپر نہیں آئے۔ زینب' آمنہ کے آنے سے دو منٹ پہلے ہی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ لال بھبھوکا چہرہ لیے وہ غصے میں اندر کمرے میں چلی گئی۔
"مجھے بھوک نہیں' کوئی مجھے کھانے کے لیے نہ بلائے۔" کہہ کر ٹھک اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ آمنہ جو ابھی اوپر آئی تھی' زینب کی بات پر استفہامیہ نظروں سے جویریہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جویریہ کندھے اچکا کر اماں جی کے کمرے میں آ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں ہاں' میں ابھی زندہ ہوں۔ جب مر جاؤں پھر بے شک چلے آنا کندھا دینے کے لیے۔ دل چاہے تو تب بھی نہ آنا۔ آ کر دیکھو' ماں کو کتنی لمبی سزا دی ہے تم نے اس جرم کی جو اس بدنصیب نے انجانے میں تمہاری بہتری کے لیے کر ڈالا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں جو تمہاری زندگی کا گلشن آباد کرنے چلی ہوں' اپنی جھولی میں بدنصیبی اور محرومی کے کانٹے بھر رہی ہوں۔ بس کر شہباز اور ماں کو کتنا تڑپائے گا۔ رحم کر اس حرماں نصیب پر۔ مت دل دکھا اور میرا۔"
مسز خان اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ پاس بیٹھا ارتضیٰ حیران ہو کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں دادی پر جمائے

انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے بے اختیار رونے پر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کا چہرہ صاف کرنے لگا۔ مسز خان نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔

''دیکھ اس معصوم کو آکر' بالکل تیرا بچپن ہے۔ اتنا پیارا' اتنا معصوم کہ راہ چلتے رک رک کر پیار کرتے ہیں اور ماں باپ ایسے بدنصیب کہ اپنے بچے کے بچپن سے خود کو محروم کرلیا۔ شہباز بیٹا۔۔۔ آجا اب۔'' وہ رئیں۔

''اور جس کی وجہ سے تو نے گھر آنا چھوڑ دیا' ماں کی ممتا کا جی بھر کر امتحان لے رہا ہے' وہ ''وجہ'' تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔ اب تیری کس سے لڑائی ہے' کسی اور سے نہیں بلکہ مجھ بوڑھی جان سے تو بدلہ لے رہا ہے' میرے ناکردہ جرم کی سزا دے رہا ہے۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں نا۔'' وہ غصے سے بولیں۔

''میں غلط نہیں کہہ رہی' صحیح کہہ رہی ہوں۔ اچھا سنو' اگر تم اگلے ماہ تک نہ آئے تو شہباز! میرا یہ بوڑھا لرزتا ہاتھ تیرے بیٹے کے سر پر ہے' اس کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ دوبارہ نہ تو کبھی تیری آواز سنوں گی نہ تجھے آنے کو کہوں گی۔ خدا کی قسم مرجاؤں گی سنا تم نے۔ تیس دن کے اندر اگر تم نہ آئے۔ آج پندرہ ہے' اگلی پندرہ کو اگر تم میرے سامنے نہ بیٹھے ہوئے تو سولہ کو میری موت کی خبر سنو گے اور اگر مجھے اپنی قسم نبھانے کے لیے حرام موت بھی مرنا پڑا تو خدا کی قسم مرجاؤں گی۔ اس دنیا میں تیری نفرت' جدائی کا عذاب سہا ہے۔ آخرت میں بھی تو جاتا ہے میں خدا کے قہر کا نشانہ بنوں تو یونہی سہی۔'' وہ روتے ہوئے زور زور سے کہہ رہی تھیں۔ آنسو ان کے جھریوں بھرے چہرے پر رواں تھے اور کارڈلیس ان کے نحیف ہاتھ میں لرز رہا تھا۔

''ام جان! ام جان! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

معاذ اچانک اندر داخل ہو کر ان کے ہاتھ سے کارڈلیس لیتے ہوئے بولا۔ اس نے فون کان سے لگایا تو لائن بے جان ہو چکی تھی۔ مسز خان پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

''ہائے میں مرجاؤں۔ کیا ہو گیا ام جان! اللہ خیر کرے' فون آیا ہے کوئی۔ شہباز تو ٹھیک ہے نا؟'' یاسمین کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسز خان کو اس بری طرح سے روتے دیکھ کر بولی۔ مسز خان کو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ان کی ہچکیاں رکی تو نہیں مگر دھیمی پڑ گئیں۔

''ٹھیک ہے سب' کچھ نہیں ہوا۔'' رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے انہوں نے سنبھل کر جواب دیا۔

''کیوں رو رہی ہیں اس بری طرح سے۔ شہباز نے تو کچھ نہیں کہہ دیا؟'' یاسمین ہمدردی سے پاس بیٹھ کر بولی۔

''نہیں' یونہی اس کی جدائی پر دل بھر آیا۔ واپس آنے کا کہہ رہا ہے۔ دیکھو کب تک آتا ہے۔'' وہ اب سنبھل سنبھل کر بول رہی تھیں۔ ارتضیٰ ابھی بھی ہراساں نظروں سے دادی کو دیکھ رہا تھا۔

''ارتضیٰ! میرے پاس آؤ تم۔'' معاذ نے آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ یاسمین نے ایک گہری نظر معاذ اور گود میں بیٹھے ارتضیٰ پر ڈالی۔

''اتنا انجی نہ کرو بچے کو۔ کل کو تم مصروف ہو جاؤ گے تو یہ ڈسٹرب نہ ہو کر رہ جائے۔'' وہ میٹھے لہجے میں معاذ سے بولی۔

''میں جتنا بھی مصروف ہو جاؤں' اپنے بیٹے کے لیے وقت نکال لوں گا۔'' وہ بڑے پیار سے اس کے گال چومتے ہوئے بولا۔

''نہیں' جو تمہارا پروگرام ہاسپٹل بنانے کا ہے۔ اس کی کنسٹرکشن' فنشنگ' سیٹنگ اور سارا انتظام۔ اف' کوئی ایک بکھیڑا ہوتا ہے ہاسپٹل بنانے کا' خود سوچو تمہارے پاس تو پھر شاید اپنے لیے بھی ٹائم نہ بچے' یہ تو پھر بچہ ہے ڈسٹرب ہو کر رہ جائے گا۔ تمہیں اتنا مصروف پاکر۔'' یاسمین کے کہنے پر معاذ کچھ الجھ سا گیا۔

''مصروفیت تو واقعی بہت ہو جائے گی مجھے معلوم ہے اس پروفیشن میں اپنی ذات' اپنی ترجیحات کی بھی نفی کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال میری حتی الامکان کوشش ہوگی کہ یہ اگنور نہ ہو۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' یاسمین نے کچھ بددل ہو کر کہا۔

''اس وقت تو اللہ جانے کیا ہوگا۔ ابھی دیکھ لو تم جلدی چلے گئے ہاسپٹل تو اس نے ناشتہ نہیں کیا۔ تم نے اس کی عادتیں اتنی بگاڑ دی ہیں کہ تمہارے ہاتھوں کے سوا اور کسی کے نوالے بھی اسے پسند نہیں اور اب ایک گھنٹے سے اسکول سے آیا بیٹھا ہے۔ ہزار منتیں کر چکی ہوں۔ کچھ کھالو۔ کہتا ہے مجھے بھوک نہیں۔ ابھی زیتون بانو بتا رہی تھی اس کا تو لنچ بھی جوں کا توں واپس آیا ہے۔ اب بتاؤ بھلا میں اس کی کیا خبر گیری کروں جو خود محتاج ہو۔'' مسز خان' ارتضیٰ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''کیوں کامریڈ! یہ کیا شکایتوں کا سلسلہ ہے۔'' معاذ نے ارتضیٰ کو گدگدایا۔

''مجھے بھوک نہیں۔ اس لیے نہیں کھا رہا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بمشکل بولا۔

''دیکھا جو میں کہہ رہی ہوں۔ ام جان! ابھی معاذ زیادہ مصروف نہیں اور ارتضیٰ اگنور ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کچھ ماہ تک اس کا ہاسپٹل والا پراجیکٹ شروع ہو جاتا ہے پھر شادی وغیرہ۔ بچہ تو نظر انداز ہو کر رہ جائے گا۔'' یاسمین نے لوہا گرم دیکھ کر پھر چوٹ لگانے کا ارادہ کیا۔

''ہاں دلہن تو کہہ رہی ہوں۔ میں محتاج کیا کروں گی۔ ایک بچہ سنبھالنا میرے بس کی بات ہے بھلا۔'' وہ کچھ لاچاری سے بولیں۔

''ام جان! کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا سب' اور فکر نہ کریں ارتضیٰ کبھی اگنور نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے میرا بیٹا۔ پھر کچھ اور۔'' معاذ نے پھر اسے گدگدایا۔

''میں تو کہتی ہوں ام جان! ارتضیٰ کو آپ ہاسٹل میں داخل کروا دیں' وہاں کی لائف بڑی ڈسپلنڈ ہوتی ہے۔ بچوں کو بہت انڈیپنڈنٹ بنا دیتی ہے' بڑا اعتماد اور کانفیڈنٹ دیکھیے گا اس کی شخصیت میں ماں باپ کی کمی سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے' وہ ہاسٹل جاکر خود بخود فل ہو جائے گا۔ وہاں پر بچے کو انفرادی توجہ جو ملتی ہے۔ بہت پالش ہوں گی اس کی ویلیوز' ادھر رہ کے۔''

وہ ارتضیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی' مسز خان چپ سی ہو گئیں۔

''جی نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں' گھر کے ہوتے ہوئے ارتضیٰ ہاسٹل کیوں جائے گا۔ دیکھیے گا۔ ادھر ہی میں اس کی پرسنالٹی کیسے پالش کروں گا۔ ایک دم بریلینٹ اسٹوڈنٹ نکلے گا۔ کیوں کامریڈ؟'' معاذ نے پھر ارتضیٰ کو چھیڑا۔

''ہاں یاسمین! میرا دل نہیں کرتا۔ اتنا سا تو بچہ ہے۔ اٹھا کر اسے اپنوں سے دور تھانے والوں کے ہتھے چڑھا دوں۔'' مسز خان بھی فوراً بولیں۔

''ہاں بھئی۔ کھانا کیوں نہیں کھایا۔ آؤ ذرا آج میں تمہاری کلاس لیتا ہوں۔'' معاذ ارتضیٰ کو گود میں چڑھائے باہر آگیا۔

''زیتون بانو! ذرا ارتضیٰ کا کھانا لائیں۔'' اس نے ڈائننگ ٹیبل کے گرد پڑی دو کرسیاں کھینچیں۔ ایک پر خود بیٹھ گیا۔ دوسری پر ارتضیٰ کو بٹھا دیا۔

''بابا! میں نے اسکول میں کھالیا تھا۔ اسی لیے بھوک نہیں ہے۔'' وہ ٹانگیں جھلا کر بولا۔

''جھوٹ۔ ام جان بتا رہی تھیں' تمہارا لنچ باکس Intact (سالم) آیا ہے۔''

''وہ میرے فرینڈ کی ماما ہیں ناں انہوں نے مجھے کھلا دیا تھا چکن سینڈوچ اور جوس کا پیکٹ۔ سینڈوچ بہت مزے کا تھا۔ چھٹی کے وقت وہ اپنے بیٹے کو لینے آئیں تو مجھ سے بھی ملیں۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ انہوں نے پوچھا تو میں نے نہ نہیں کہا۔'' وہ جلدی جلدی بتانے لگا۔ معاذ ٹھٹک گیا۔

''کون سی آنٹی؟ کس نے کھلایا تمہیں؟'' وہ اسے گھور کر بولا۔

''میرے فرینڈ کی ماما!'' وہ اسی لاپروا لہجے میں بولا۔

''میں نے تمہیں منع کیا ہے نا۔ کسی سے کچھ نہیں لے کر کھاتے۔'' معاذ کچھ غصے سے بولا۔ ''وہ پہلے بھی تم

سے ملی ہیں؟"

"نہیں تو، کبھی بھی نہیں۔ آج ہی آئی تھیں میرے فرینڈز کو لینے تو مجھ سے ملیں۔ میں صبح بریک فاسٹ نہیں کر کے گیا تھا۔ لنچ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا مجھے بھوک لگی تھی۔ آنٹی نے اصرار کیا تو میں نے کھا لیا۔"

"کل بھی آئیں گی وہ؟" معاذ نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میں نے نہیں پوچھا۔"

"اچھا!" معاذ سوچنے لگا۔ "میں کل تمہیں لینے آؤں گا۔" وہ کہتے کہتے رک گیا مگر دل میں ٹھان لی کہ کل وہ ارتضیٰ کو خود لینے جائے گا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو گڈ ارننگ کیا بات ہے ابھی بستر میں ہو۔" سلطان بخت کی فریش آواز سن کر نین تارا کے خوابیدہ حواس ایک دم سے بیدار ہو اٹھے تھے وہ سنگاپور سے تین دن کی شوٹنگ کے بعد رات ایک بجے تو لوٹی تھی اور ابھی اس کا بارہ بجے تک سونے کا ارادہ تھا اور ابھی تو صرف نو بجے تھے۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ سلطان بخت کو اس نے اپنے سنگاپور جانے کا نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنا موبائل زیور گل کے پاس چھوڑ گئی تھی کہ اگر شاہ جی کا فون آئے تو کوئی بہانہ کر دے سنگاپور وہ دوسرا موبائل لے کر گئی تھی۔

"ہاں۔ بس رات دیر تک جاگتی رہی۔ اس لیے ابھی سو رہی تھی۔" اس نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"خیریت رات دیر تک کیوں جاگتی رہیں؟" سلطان بخت بہت اچھے موڈ میں لگ رہے تھے۔

"رات آپ کی یاد آتی رہی اور نیند آنکھوں سے روٹھی رہی۔" وہ لبوں میں گنگنائی۔

"زہے نصیب کیا ہماری محبت آپ کے دل نازبر از سر نو حملہ آور ہوئی ہے؟"

"از سر نو کیوں شاہ جی! آپ کو دل ایک پل تو بھولتا نہیں۔ خیر رات تو میں ایک اور طرح سے آپ کو یاد کر رہی تھی۔" وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

"میں ٹھیک تین گھنٹوں میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ تم ایک بیگ اپنے بہت اچھے ڈریسز اور جیولری کا تیار کر لو اور خود بھی بہت چارمنگ قیامت سا روپ اپنا لو۔ میں آؤں تو تم ریڈی ہو بالکل۔ ہم کوئی پندرہ دنوں کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف جا رہے ہیں جہاں صرف میں اور تم ہوں گے اور قدرت کے ہوشربا نظارے اور تمہاری پاگل کر دینے والی رفاقت۔ کہو ہے نا سرپرائز؟" وہ واقعی موڈ میں تھے اور ایک خوبصورت پروگرام بنا کر نکلے تھے۔

"زبردست سرپرائز مگر۔" وہ ایک دم خوشی سے چلائی۔ "سنگاپور سے واپسی پر جو سارے راستے یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی آئی تھی کہ سولی تو اپنے ٹرپ پر نکل چکا ہوگا۔ لندن جرمنی وغیرہ وہ اسے بتا بھی چکا تھا فون پر رابطہ کر کے اور ایک ماہ کتنا طویل ہوتا ہے اسے سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ وہ اپنی خوفناک بوریت سے کیسے چھٹکارا پائے گی اور رستے بھر پچھتاتی بھی رہی تھی کہ کاش وہ سولی کی بات مان لیتی اور اس کے ساتھ ہی چلی جاتی اور اب سوچ رہی تھی اچھا ہوا وہ اس کے ساتھ نہیں گئی ورنہ سلطان بخت تو ادھر طوفان اٹھا دیتے۔ وہ واقعی بال بال بچ گئی تھی ان کے قہر کا نشانہ بننے سے۔

"شاہ جی! اتنے مہربان یقین نہیں آرہا۔"

"تم تو سدا کی بے یقین ہو مائی سویٹ ہارٹ اور اس بار تمہیں ہر چیز کا یقین دلا دوں گا۔ اپنی دائمی محبت سمیت سب باتوں کا۔ اس بار تمہیں قطعاً کوئی مایوسی نہیں ہوگی۔ کچھ ایسا نہیں ہوگا کہ تم مانگو اور ہم عطا نہ کریں۔ اس بار نین تارا! تم ہماری اس محبت کو مجسم دیکھو گی جو ہمارے دل میں تمہارے لیے ہے۔" وہ گمبھیر لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "اس بار ہماری محبت کا ساون ٹوٹ کر تم پر برسے گا اور تم اس بارش میں بھیگ جاؤ گی۔ چاہو بھی تو گریز نہ کر پاؤ گی۔ آئی پرامس۔"

"جو مانگوں گی دیں گے؟" نین تارا کی آنکھیں چمکیں۔

"میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں تم جو مانگو گی میں ضرور دوں گا۔ چاہے تم آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی فرمائش کرو۔ پوری کروں گا۔" وہ دل و جان لٹانے کو تیار تھے۔

"پکا وعدہ؟"

"پکا ایلفی سے بھی مضبوط۔ اوکے بی ریڈی آئی ایم جسٹ کمنگ۔"

وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔ "ملتے ہیں ابھی تین گھنٹوں بعد پھر کھل کر تمام باتیں ہوں گی۔ تمام وعدے وعید عہد و پیماں اور محبت کے کھیل بھائے۔"

کہتے ہوئے انہوں نے موبائل آف کر دیا۔ نین تارا "یاہو۔" کا زوردار نعرہ لگا کر بستر سے اتر آئی۔

پھر تین گھنٹے جیسے تین منٹوں میں گزر گئے۔ سفر کے لیے کپڑوں کی پیکنگ، میچنگ جیولری کاسمیٹکس سینڈل اور بہت جلدی کیا کیا نہ کرتے بھی اس کے دو بیگ تیار ہو گئے۔ ابھی اس کی اپنی تیاری رہتی تھی۔

"دیکھو نین تارا! بھو یہ ہمارے پاس آخری موقع ہے اس جاگیرزادے کو نچوڑنے کا۔ دو ماہ تک تمہاری تینوں فلمیں آن ایئر آجائیں گی پھر دیکھنا یہ شاہ جی تمہارے ہاتھوں سے کیسے پھسلتے ہیں۔ ان کے طوفان کا مقابلہ کون کرے گا۔ مجھے تو سوچ کر کپکپی چڑھ جاتی ہے۔ جو کمانا ہے، جو بچانا ہے، سمیٹنا ہے اس دورے میں سمیٹ لینا۔ اس کے بعد تو زندگی بچانے کی نوبت آجائے گی۔ اب کوئی کسر نہ چھوڑ کر آنا۔"

زیور گل اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہوئے ہدایت نامہ اس کے ذہن میں ٹھونس رہی تھی۔

"سن لیا، سمجھ لیا۔ اماں! مجھے تیار ہونے دیں۔ شاہ جی آنے ہی والے ہیں۔" اس نے زیور گل کی کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اسے تو شاہ جی کی پر لطف سنگت کا حسین خیال ابھی سے بے چین کیے دے رہا تھا۔

ٹھیک تین گھنٹے بعد سلطان بخت کی گاڑی ان کے گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ وہ اندر نہیں آئے۔ ملازم نے نین تارا کے بیگ گاڑی میں جا کر رکھے اور فریش فریش سی نکھری نکھری نین تارا ان کے برابر جا بیٹھی۔

انہوں نے سراہنے والی نظروں سے اس کھلتے کنول میں اترتے روپ کو دیکھا اور مسکرا کر سر ہلا دیا۔

نین تارا کو اپنی "فرمائش" کی کامیابی کا سو فیصد یقین ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے عبدالمبین کی گہری نیند کو توڑ ڈالا تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔" اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر بجتے فون کو دیکھا ابھی رات کے تین بجے تو وہ دبئی سے لوٹا تھا ایک مہینے کے مسلسل شوز میں پرفارمنس نے اسے اس طرح تھکا کر رکھ دیا تھا کہ اب کم از کم ایک ہفتہ اس کا ارادہ مکمل ریسٹ کرنے کا تھا مگر یہاں تو ایک رات کی پوری نیند بھی لینا محال تھا۔ اس نے غصے سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"سولی حد ہو گئی۔" گھنٹے سے فون کر رہی ہوں۔ موبائل تمہارا آف ہے اور فون تم نہیں اٹھا رہے۔" زیور گل نے اس کے "ہیلو" کہنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا چھوٹتے ہی بولی۔

"آخر ایسی کیا ایمرجنسی نازل ہو گئی ہے جو یوں رات کے چار بجے فون کر رہی ہیں۔" وہ جھلا کر بولا۔

"صبح کے چار کہو اسے رات نہیں کہتے۔" زیور گل اس سے زیادہ جھلاہٹ کا شکار تھی۔ "اور اب یہ نیند و یند کو گولی مارو اور جلدی پہنچو تم جو عذاب میرے گلے منڈھ گئے تھے وہ آج رنگ لایا ہے۔ شہرینہ نے خود کو شوٹ کر لیا ہے۔ جلدی پہنچو۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

زیور گل نے کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا۔ عبدالمبین کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

"شہرینہ نے خود کو شوٹ کر لیا ہے۔" زیور گل کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں جھنجھنا رہی تھی۔

”بس کریں شاہ جی! اور کتنا پئیں گے یہ زہر۔“ نین تارا جو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے سلطان بخت کو مسلسل ڈرنک کرتے دیکھ رہی تھی رہ نہ سکی۔ وہ ان کے ہاتھ سے چوتھا بھرا ہوا گلاس چھینتے ہوئے ترشی سے بولی۔

”مت روکو مجھے پینے دو۔“ سلطان بخت لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں مخمور آنکھیں اس پر جما کر بمشکل بولے۔

نین تارا کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شاہ جی بھی کبھی اس کے سامنے یوں بے بسی کی حالت میں بیٹھے ہوں گے۔ وہ تو اکثر دو تین پیگ بغیر پانی ملائے بغیر اس کے سامنے چڑھا جاتے تھے اور کبھی ان کی سوچ تو کیا زبان تک نہیں لڑکھڑائی تھی اور اب محض چار گلاسوں میں وہ یوں بے خود ہو چکے تھے۔

”ایک تم اچھی ایک... یہ اچھی۔“ انہوں نے لڑکھڑاتے ہوئے بوتل کی طرف اشارہ کیا اور سر بید کی کرسی کی بیک پر گرا دیا۔ نین تارا کو وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔

”سب نے چھوڑ دیا۔ سب چھوڑ دیں گے۔ سب چھوڑ ہی دیا کرتے ہیں‘ نہیں ملتی دل کی... دل کی تمنا نہیں ملتی مجھے دل کی کلی نہیں کھلتی۔

تیری حسین زلفوں کے گھنے سائے... میرے سر پر محبت کا سائبان۔ جس سے وفا کرو‘ پیار کرو وہ پیار کرو نہیں پیار کرو۔ وہ چھوڑ جاتا ہے زندگی بے وفا محبت بے وفا۔ جا دیکھ لیا تجھے ارے بے وفا۔“

وہ سر بیخ کر عجب بہکی بہکی سی باتیں کر رہے تھے۔

ایک تو ڈھلتی کہر آلود شام کا دھندلکا۔ ٹیرس کے بالکل سامنے آسمان سے باتیں کرتے برف پوش ہیبت ناک پہاڑ اس تاریک منظر میں کسی قوی ہیکل دیو کی طرح تنے کھڑے تھے اور ان کے قدموں تلے پر اسرار سرسراہٹ اور دھیمے دھیمے شور کے ساتھ بہتا دریائے سوات اس بالکنی سے اتنا قریب تھا کہ ذرا سا نیچے لٹک کر ہاتھ سے چھو لو تو ٹھنڈا انھار برفیلا پانی سارے جسم میں موت کی جھرجھری دوڑا دیتا تھا۔

”رات... ایک اور طویل بے درد رات آنے والی ہے۔“ نین تارا نے سر اٹھا کر چاندوں سے اوپر سیاہ ہوتے آسمان کو دیکھا۔

”پتا نہیں شاہ جی کا اس خوفناک ویرانے میں اور کتنے دن رہنے کا پروگرام ہے۔“ اس نے کچھ اکتا کر بے دم سے پڑے سلطان بخت کی طرف دیکھا۔ اتنی شدید سردی میں بھی انہوں نے ہاف سویٹر کے علاوہ کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے موسم کی شدت سے بے خبر پڑے تھے۔ ایک بیک ان کی حالت پر بہت ترس آیا تھا۔

اس نے اندر سے گرم چادر لا کر ان پر ڈالی تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگے تھے۔

”اندر چلیں شاہ جی! ادھر بہت سردی ہے۔“ اس نے ملائمت سے ان کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

”ہاں‘ چلتے ہیں‘ چلنا ہی جانا ہے۔“ وہ ہونٹوں میں بڑبڑائے۔

”شاہ جی! آپ اس قدر ڈیپریس کیوں ہیں؟ آپ کو کیا چیز تنگ کر رہی ہے؟ پلیز مجھ سے شیئر کر لیں۔ آپ کے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دو زانو ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”دل کا بوجھ‘ آہ!“ وہ ہنسے۔ ”دل کا بوجھ کم ہو جائے گا تو شانوں کا بڑھ جائے گا۔ نین تارا! تم نہیں سمجھو گی میرے دل کے بوجھ کو۔ تمہارے لائف سیٹ اپ میں ایسے بوجھ کو بوجھ نہیں کہتے۔ خود ساختہ دیوانگی کہتے ہیں۔ تمہاری سوسائٹی کی ویلیوز ہماری قدروں سے بالکل مختلف ہیں‘ میں تمہیں سمجھانا بھی چاہوں تو سمجھا نہیں پاؤں گا۔ یہ غیرت و مردانگی کی الجھنیں ہیں‘ جو تم سے نہیں سلجھیں گی میری جان یو آر ویری ڈیلیکیٹ۔“ وہ اس کے گال کو ذرا سا چھو کر بولے۔

”شاہ جی! میں آپ سے علیحدہ ہوں کیا؟“ اس نے لاڈ سے شکوہ کیا۔

”نہیں۔ تم تو میری جان ہو۔“ انہوں نے بے اختیار اس کے گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

”پھر میری ویلیوز آپ سے مختلف کیسے ہو سکتی ہیں۔ میں تو آپ سے جڑی ہوں۔ ازل سے آپ سے بندھی ہوں۔ چاہوں بھی تو خود کو آپ سے الگ نہیں کر سکتی۔“ وہ ان کے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرماتے ہوئے بولی۔

”تم الگ ہو کر کہیں بھاگ بھی نہیں سکتیں۔ تم تو میری ہو جب تک میرے سینے میں یہ سانسوں کا زیر و بم جاری ہے۔ تم میری ہو‘ صرف میری۔“ ان کی آنکھوں کی طرح ان کا لہجہ بھی خوب نشیلا ہو رہا تھا۔

”میں کہیں بھاگ بھی نہیں سکتی شاہ جی! میں تو سرتاپا آپ کی ہوں۔ جب بھی آپ نے پکارا‘ کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی۔ آپ کی تمام تر سابقہ کج ادائیاں‘ بے وفائیاں نظر انداز کر کے۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے شانوں کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے اک ادا سے بولی۔

”تم بہت اچھی ہو نین! بہت اچھی۔ میری توقعات سے بڑھ کر اچھی نکلی ہو۔ شروع شروع میں تو میں تمہاری طرف صرف دل بہلانے کو ہی بڑھا تھا مگر جب واپس پلٹنا چاہا تو پتا چلا۔ دل تو تمہارے قدموں سے لپٹا بیٹھا ہے۔ اب دل کے بغیر میں کیسے پلٹ جاتا۔ بس پھر سارے کا سارا تمہارا ہوتا چلا گیا۔ تمہیں اپنا مانا لیا۔ سمجھ لیا۔ بتاؤ کبھی کوئی کمی چھوڑی ہے میں نے۔ تمہیں دینے میں کبھی ہاتھ کھینچا۔ سیم و زر کی بات ہو یا پیار محبت کی۔ کبھی کوئی کمی رکھی؟ اس لیے کہ تم مجھے سب سے بڑھ کر عزیز ہو۔ اپنی زندگی کی سب ترجیحات سے بڑھ کر۔“

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہے تھے جیسے انہیں لفظ جوڑنے میں دقت ہو رہی ہو۔

”سب ترجیحات نہ کہیں شاہ جی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کیوں بولو کیا کمی دیکھی تم نے میرے پیار میں؟“

”بتاؤں تو آپ بھڑک اٹھیں گے۔“ وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹک کر سیاہ پڑتے بہتے پانیوں کو دیکھنے لگی۔

”نہیں نین! میں تم سے ناراض نہیں رہ سکتا‘ ناراض یا خفا ہو تو سکتا ہوں مگر تادیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی گواہ تم بھی ہو۔“ وہ اب بہت مدہوش نظر آ رہے تھے۔

”چلیں اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔“ نین تارا کو بلند و بالا ہیبت ناک پہاڑوں سے ایکدم ہی خوف سا آیا تھا۔ یوں جیسے پہاڑ دھیرے دھیرے اس کی طرف سرک رہے ہوں‘ پانی میں قدم جماتے ہوئے۔ نہ جانے سلطان بخت کو اس منحوس ہوٹل میں کیا نظر آیا تھا جو دریا کے ساتھ جڑا کھڑا تھا اور ادھر سے جانے کا نام بھی نہیں لے رہے تھے۔ نین تارا یہ بات کئی بار سوچ چکی تھی مگر کہہ نہ سکی۔

”چلو!“ سلطان بخت بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ کو معلوم ہے‘ رات کو ادھر لائٹ چلی جاتی ہے۔ مکمل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ گھپ اندھیرا۔“ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ یہ لوگ جنریٹر سے بجلی حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے رات کو جنریٹر آف کر دیتے ہیں۔“ سلطان بخت کہتے ہوئے بیڈ پر گر گئے۔

”باہر بوتل پڑی ہے یار! ایک گلاس تو بھر لاؤ۔“ تھوڑی دیر بعد وہ بولے۔

”شاہ جی پلیز۔ بس کریں۔“ وہ ان کے پاس آ کر لجاجت سے بولی۔ ”میرے ہوتے ہوئے بھی آپ کو کسی نشے کی ضرورت ہے۔“ وہ پاس بیٹھ کر ان کے بال سلجھانے لگی۔

”اسی لیے تو تمہیں ادھر لے کر آیا ہوں۔“

وہ گہرا سانس لے کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”چند دن‘ چند اچھے دن باہر کی ظالم دنیا سے کٹ کر بالکل علیحدہ‘ ہر فکر سے آزاد تمہاری زلفوں کی چھاؤں میں بتا سکوں‘ دل پر غم زیست کا بوجھ کچھ تو کم محسوس ہو۔“

”شاہ جی! مجھے پتا ہے۔ آپ اپنا غم تو مجھے بتائیں گے نہیں۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی‘ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک ننھا سا وقفہ آیا۔

”شاہ جی! میری ایک بات‘ ایک فرمائش مانیں گے۔“ وہ ان کا مہربان موڈ دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”ایک نہیں دس منواؤ۔“ وہ اس کی کلائی میں پڑی نازک سی بریسلٹ سے کھیلتے ہوئے بولے ٹپ ٹپ کی آواز آنے لگی۔

”لگتا ہے باہر بارش ہو رہی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”حسب معمول یہاں تو روز ہی بارش ہوتی ہے جان من!“ وہ لاڈ سے بولے۔

”اتنی بارشوں کے باوجود کوئی یہاں سے پیاسا چلا جائے تو یہ زیادتی نہیں شاہ جی؟“ وہ ان کی مخمور آنکھوں میں جھانک کر اک ادا سے بولی۔

”یہ زیادتی نہیں مائی ڈیر! اس پیاسے کی بدنصیبی ہو گی۔“

”شاہ جی! میری فرمائش۔“ نین تارا نے جیسے انہیں یاد دلایا۔

”تم کہو تو سہی۔“

”پوری کریں گے؟“

”اگر میرے بس میں ہے تو۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

”وہ صرف آپ ہی کے بس میں تو ہے۔“ وہ اپنے ہاتھوں میں ان کے ہاتھ لیتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”تم کہو۔“

”کہنے کو تو کہہ دوں۔“ وہ جھجکی ”یہ نہ ہو کہ خواہش بھی پوری نہ ہو اور میری بات کا بھرم بھی جائے۔“

”اس حسین رات‘ حسین جگہ پر جو کہو گی۔ مانوں گا۔ تم سے میری خاص محبت کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ جب ساری دنیا مجھے پرائی لگنے لگی تو میں صرف تمہیں لیے چند دنوں کے لیے ہی سہی۔ اس گوشہ عافیت میں چلا آیا اور کیا ثبوت مانگتی ہو میری محبت کا؟“ وہ پوری طرح سے مہربان تھے۔

”ثبوت۔ ہاں ثبوت ہی تو چاہیے مجھے۔“ وہ بڑبڑائی ”شاہ جی! مجھے اپنی محبت کی نشانی‘ کوئی تحفہ‘ کوئی جیتا جاگتا ہنستا کھیلتا سانس لیتا ثبوت دے دیں جو میرے جینے کا جواز ہو‘ میری زندگی کا مقصد۔“ وہ بہت ڈر ڈر کر بہت آہستہ آہستہ سلطان بخت کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

سلطان بخت اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ نین تارا کی فرمائش حقیقتاً انہیں بہت بری لگی تھی۔ نین تارا ان کے چہرے کے پتھریلے تاثرات سے ڈر کر ذرا سی پرے کھسک گئی۔ سلطان بخت نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ اس کا خوبصورت معصوم چہرہ صرف ان کی محبت کی لو سے دمک رہا تھا۔

”آخر کب تک میں اس کی اس معصوم فرمائش کو ٹھکراؤں کب تک جو اس کا حق بھی ہے۔ میں کب تک اس کا حق غصب کرتا رہوں۔

صالحہ نے پانچ بیٹیاں پیدا کر لیں۔ پانچ طوق!

ایک طوق اس کی طرف سے بھی سہی۔

وہ دینے والا مجھے دینے میں کمی نہیں کر رہا تو میں بانٹنے میں کنجوسی کیوں کروں؟“ ان کی نظروں میں اپنی وسیع و عریض جاگیر‘ کارخانے‘ بے حساب بینک بیلنس اور نہ جانے کیا کیا۔ گھوم گیا میری منکوحہ ہونے کے ناتے اس سارے میں اس کا بھی تو حصہ ہے صرف صالحہ کیوں؟ جس نے میری زندگی کو حبس زدہ کر رکھا ہے۔ یہ کیوں نہیں جو بہار کا نرم جھونکا ہے‘ خوشبو گیت‘ نغمہ۔“

”تم آج جو بھی مانگو گی‘ ملے گا۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے نا!“ وہ اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے محبت پاش نظروں سے دیکھ کر بولے۔

”لگتا ہے آج کی ”پی“ شاہ جی کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ اتنی بڑی عطا۔“ نین تارا بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی۔

”کیا تم خوش نہیں ہوئیں؟“ اس کی جامد چپ پر وہ بولے۔

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں شاہ جی!“ وہ خواب کے سے عالم میں بولی۔

”بالکل سچ۔“

”کیا میں آپ کے بچے کی.... شاہ جی! آپ کی اولاد کی ماں بن سکتی ہوں۔ کیا واقعی؟“ وہ بری طرح سے بے یقینی کا شکار تھی۔

”یقیناً نین! میں نے تم سے نکاح کیا ہے تو پھر یہ تمہارا حق بھی ہے ہمارے تعلقات میں کئی بار اتار چڑھاؤ آئے مگر میں نے جب بھی تمہاری بے لوث محبت کی بانہوں میں پناہ لینا چاہی۔ تم نے کبھی انکار نہیں کیا تو پھر میں اتنا سنگدل کیسے ہو سکتا ہوں کہ تمہیں تمہارے حق سے محروم رکھتا چلا جاؤں۔“ یہ تو کوئی اور ہی سلطان بخت تھے۔

”کیا آپ اس بچے کو Own بھی کریں گے۔“ وہ آنکھیں پھیلائے پوچھ رہی تھی۔

”کم آن نین تارا! کیوں فضول میں الجھ رہی ہو‘ جب میں نے کہہ دیا ہے اور ہمارے پاس اب ادھر صرف تین دن ہیں فقط تین راتیں اب ان کو فضول کے واہموں‘ خدشوں کی نذر کر کے برباد مت کرو۔ میری سچی محبت میرے پیار کی گہرائی کو محسوس کرو اور بس۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر نشیلے لہجے میں بولے۔

پھر باقی کے تین دن نین تارا کو اپنی فرمائش کی یاد دہانی نہ کروانا پڑی۔ اس بار قسمت اس پر مکمل طور پر مہربان تھی۔

☆ ☆ ☆
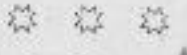
”کس قدر احمق ہو تم موبی! بھلا یہ کوئی طریقہ ہے۔ ایک نجیب الطرفین شریف خاندان کی نیک فطرت معصوم لڑکی کو نکاح کا جھانسہ دے کر یوں بیچ بازار میں بٹھا دینا۔ تمہارا کیا خیال تھا وہ محض موت کے ڈر سے جھٹ پٹ کال گرل بننے پر آمادہ ہو جائے گی۔ کبھی نہیں۔ اس کے لیے تو یہی صدمہ کم نہیں تھا کہ وہ گھر سے بھاگ کر آئی ہے۔ اسے یاروں کو رسوائی کے گڑھے میں دھکا دے کر ابھی وہ اس جانکاہ صدمے سے نہیں نکلی تھی کہ تم اس کا سودا بھی کر آئے۔ شکل سے تو تم اتنے احمق نہیں لگتے ہو‘ جتنی بڑی حماقت کا تم نے ثبوت دیا ہے۔“ زیور کل ہاسپٹل کے کوریڈور میں ٹہلتے ہوئے مسلسل اس پر برسے جا رہی تھی۔

”تو پھر کتنا احمق لگتا ہوں آپ کو؟“ وہ غصے سے چڑ کر بولا۔

”میری توقع سے بڑھ کر۔“ وہ رک کر قدم جھٹکتے ہوئے بولی۔

”مہتاب نے علیحدہ میری جان کھائی ہوئی تھی کہ لڑکی ”مسید ھی“ نہیں ہو رہی۔ جب سے آئی ہے ہمارے گھر میں رو رو کر صرف ماتم مچا رکھا ہے اس نے روتے روتے غش کھا کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کھانے پینے کی طرف تو وہ آمادہ نہیں ہو رہی تھی اس نے تو رقم لگائی تھی۔ وہ اس کی جان چھوڑتی بھلا۔ تم تو رقم بٹور کر مزید نوٹ چھاپنے چلتے بنے اس نے....“

”رقم میں نے بٹوری تھی؟ وہ چیک تو میں آپ کو ہی دے گیا تھا۔“ وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”چیک ان سے وصولا تو تم نے تھا‘ پھر بھلے کالے چور کو دیتے جا کر۔“ وہ چمک کر بولی۔

”مہتاب نے بھی آر یا پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر کب تک انتظار کرتی‘ آرے سیٹھ گیلانی اس کا خاص الخاص کسٹمر ہے۔ صرف ایک رات کا اس نے اتنا بڑا معاوضہ ادا کیا تھا اس شریف زادی کے لیے کہ جتنا مہتاب پورے پانچ سالوں میں کماتی۔ وہ تو خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ قیمت کا تمیں گنا جو مل رہا تھا۔ اس نے تو پاگل ہونا ہی تھا۔ نشہ پلا کر اسے بنا سنوار گیلانی کے آگے پیش کر دیا اور وہ بھی زمانے بھر کا بے صبرا۔ اس کے ہوش و خرد سے بیگانہ ہونے کا بھی انتظار نہ کیا اور یہ نیند میں بھی اس قدر ہشیار نکلی گیلانی کے ریوالور سے ہی گولی اپنے سینے میں چلا دی۔ دوسری گولی گیلانی کو ماردی جو اس کے بازو کو ذرا سا زخمی کر کے نکل گئی ورنہ تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ ادھر تو دہری افتاد پڑ گئی گیلانی نے جو مہتاب کا حال کیا‘ وہ علیحدہ یہ مسئلہ جو اس غریب کے گلے پڑا وہ علیحدہ۔“

زیور گل سانس لینے کو رکی۔ عبدالمبین کو اس بے ہودہ گفتگو سے سخت کوفت ہو رہی تھی حالانکہ شوبز میں "اِن" ہونے کے بعد یہ ساری باتیں اس کے لیے بھی اجنبی نہ تھیں بلکہ اب تو اس کا اپنا گزارہ ان کے بغیر نہیں ہوتا تھا مگر شہرینہ۔ اس کے لیے یہ سب بکواس۔ اس کے خون میں شرارے سے دوڑ رہے تھے پیشانی پر پڑے دو بل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"میں نہ پہنچتی تو یہ ڈاکٹر۔ ارے ساری کی ساری دنیا حرام خور ہے جب تک مٹھی نہ گرم کرو وہ بھی ٹھیک ٹھاک 'تب تک کوئی جائز و ناجائز کام کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ اس منحوس شریف زادی کو چار ہاسپٹلز میں لے کر پھرے مجال ہے کوئی ڈاکٹر ہاتھ ڈالے۔ کمبخت قانون کے مارے۔ پولیس کیس ہے جی۔ ہم نے مرنا ہے۔ بس وہ تو میرا ہی مغز پھر گیا تھا جو ڈاکٹر وحید کا کلینک بروقت یاد نہ آیا پھر اس کی حالت اچھی نہیں۔ کیا کہوں اسے ہے تو ابھی تمہاری بیوی ہی نا۔ زوجہ منکوحہ ہاہاہا۔۔۔۔"

وہ فضول سا ٹھٹھا مار کر ہنسی عبدالمبین کو زیور گل کبھی اتنی بری نہیں لگی تھی۔

"یا تم اس کے وارث 'نہیں بنتے تو کہو' اس کے وارثوں کو اطلاع کروں جنہوں نے اس کے فرار کے اگلے ہی دن ملک کے تین بڑے اخباروں میں اس کی تصدیق شدہ موت کی خبریں شائع کروائی تھیں۔ اگلے دن قل کی خبر بھی پہلے صفحے پر لگوائی تھی ویسے بڑا تماشا رہے گا اگر تم کہو تو ذرا پریس والوں کو نہ ایک فون گھما دوں۔ ایمان سے تہلکہ مچ جائے گا۔" زیور گل ایک آنکھ دبا کر چٹخارا لیتے ہوئے بولی۔ "ذرا سلطان بخت کی پاک پوتر پگڑی کو بھی تا تھیا تا تھیا نہ کروائیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔" عبدالمبین نے ہنوز کوئی جواب نہ دیا۔

"تم نے آنا سامنے۔ میں آج کل فارغ ہوں۔ یہ نین تارا بھی جا کر بیٹھ گئی سوات کالام اپنے شاہ جی کا غم غلط کرنے۔ وہ سوات سے آئے تو نئی کیم شروع ہو۔ کچھ پچھلے حساب بھی نکلتے ہیں اس کی طرف میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔ اس شاہ کو تھوڑا سا ناچ نچواؤں۔ میری نازک سی پری کو جلوا بنا رکھا ہے اس نے۔ میرا تو خیال ہے نین تارا کی دوستی کا اتنا تو حق ہے نا مجھ پر۔" زیور گل کی آنکھیں اپنے ہی ارادے پر چمک رہی تھیں۔

"ابھی یہ بچ جائے تو پھر یہ عالیشان منصوبے بنائیے گا۔" عبدالمبین کچھ بیزاری سے بولا۔

"ہاں یہ بھی ہے۔ ڈاکٹرز کب تسلی دے رہے ہیں۔ گولی کمبخت کے سینے کے پنجر میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ نکلے گی تو بچے گی نا۔ تین گھنٹے سے تو لگے ہیں آپریشن تھیٹر میں چیر پھاڑ کرتے۔"

زیور گل نے منہ کھول کر ایک بھرپور جمائی لی۔

"مجھے تو اب سخت نیند آ رہی ہے 'لے کے اس مہتاب کی بچی نے گہری نیند سے جگا دیا۔ میں تو لعنت بھیجتی ہوں سائنس کی ان بیہودہ ایجادات پر۔ ٹیلی فون کیا کم تھا جو یہ سیل فون کی آفت آ گئی۔ راتوں کی نیند بھی اب تو انسان پر حرام ہو گئی ہے۔" کہتے کہتے وہ صوفے پر گر کر ڈھیر ہو گئی۔

"یہ شہرینہ تو گلے کا کانٹا بن گئی نہ اگلنے کے قابل نہ نگلنے کے لائق۔ مر ہی جائے تو اچھا ہے۔" عبدالمبین اپنا سر پکڑ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ایک نڈھال سا ڈاکٹر باہر نکلا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا حال ہے مریضہ کا؟" وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس آیا۔

"بہت مشکل ہے آپ دعا کریں۔ بہت تکلیف میں ہے وہ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔ کبھی کبھی جب مریض اتنی تکلیف میں ہو تو ڈاکٹر بھی دعا۔ خیر۔۔۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "گولی تو نکال لی ہے مگر بچانے والا تو اللہ ہے آپ دعا کریں۔" وہ کہتے ہوئے دائیں طرف بنی لیبارٹری میں گھس گیا۔

"اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔" عبدالمبین بڑبڑایا۔

"یا اللہ اگر یہ بچ بھی گئی تو کیا کرے گی۔ میں۔۔۔ میں کیا کروں گا اس کا۔ اور وہ تو میری شکل پر اب تھوکنا بھی گوارا نہیں کرے گی اور اس کے گھر والے وہ تو اس کی نماز جنازہ بھی پڑھا کر فارغ ہو چکے ہیں۔ زندہ سلامت بھی سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں تو نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ زندگی تو اس کے لیے موت سے بھی مشکل ہے۔ یا اللہ تو اسے موت ہی دے دے۔"

وہ پوری لگن سے آنکھیں بند کر کے دل میں شہرینہ کی موت کی آرزو کرنے لگا ٹک ٹک گھڑی کی سوئیاں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ زیور گل صوفے پر بے ہنگم طریقے سے ہاتھ پاؤں چھوڑے ہلکے ہلکے خراٹے لیتے ہوئے سو رہی تھی نہ جانے کتنا وقت گزر گیا جب آپریشن تھیٹر کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ دو ڈاکٹر باہر آئے۔ دونوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے اور قدم بے حد تھکے تھکے۔

عبدالمبین کا دل بے اختیار دھڑکا۔

"تو شہرینہ مر گئی۔" اس سے اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں گیا۔

☆ ☆ ☆
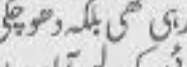
عصر کے بعد کا وقت تھا۔ شام دھیرے دھیرے ان کے چھوٹے سے تاریک آنگن میں اپنے قدم جما رہی تھی۔ جویریہ غسل خانے کے پاس بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی بلکہ دھو چکی تھی۔ اب وہاں سے سامان سمیٹ رہی تھی۔ آمنہ سلائی مشین کے آگے بیٹھی محلے سے سلائی کے لیے آیا سوٹ سی رہی تھی۔

"جویریہ! یہ زینب ابھی تک سو رہی ہے۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔" مشین چلاتے چلاتے آمنہ کو خیال آیا۔ زینب آج صبح پھر کالج گئی تھی جیسے ہی صوفی صاحب کسی کام سے باہر گئے۔ وہ تیار ہو کر کالج چلی گئی تھی اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی واپس آ گئی تھی۔ آتے ہی وہ یونیفارم سمیت جو چارپائی پر گری تھی پھر ساری دوپہر اسی طرح پڑی رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے پر بلانے کے باوجود نہیں آئی تھی۔

"اس کا دماغ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ کر رہا ہوں میں اس کا بندوبست۔ بس ہفتہ دس دن اور ٹھہر جائے۔ ہو جائے گا اس کا دماغ درست۔" کھانا کھاتے ہوئے صوفی صاحب نے غصے سے کہا تھا اور جویریہ کو اسے دوبارہ کھانے کے لیے بلانے سے بھی روک دیا تھا وہ پھر بھی اٹھ کر نہیں آئی تھی۔

جویریہ نے آمنہ کو کوئی جواب نہیں دیا اور دھلے ہوئے کپڑوں کا تسلہ اٹھا کر اوپر چھت پر ڈالنے کے لیے چلی گئی۔

"میں خود ہی دیکھتی ہوں اسے جا کر۔" آمنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر زینب کے پاس کمرے میں چلی آئی' زینب جاگ رہی تھی اور سپاٹ نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"زینب! کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

آمنہ کو اس پر ایک دم سے بہت ترس آیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ جیسے پورے گھر سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ الگ تھلگ' اداس پریشان' الجھی الجھی سی' نہ ڈھنگ سے کچھ کھاتی نہ پیتی۔ رات کو بھی آمنہ نے اکثر اسے جاگتے دیکھا تھا ورنہ تو وہ تو بہت زندہ دل تھی۔ بہت باتونی اور بھوک کی کچی اور آج کل وہ دو دو ٹائم کے فاقے کر رہی تھی۔

زینب چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ کوئی بھی جواب دیے بغیر۔ اس کا رنگ روپ جیسے کملا کر رہ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ الجھے ہوئے بال۔ بکھرا ہوا حلیہ۔

"زینب! کیا بات ہے؟" آمنہ اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ پھر بھی نہیں بولی۔

"اٹھو نا' شام ہو رہی ہے۔ اٹھ کر کچھ کھا پی لو۔ کھانا لے کر آؤں تمہارے لیے۔" آمنہ نے اس کے ماتھے پر آئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے محبت سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔

"زینب! میری بہن! تمہیں کیا پریشانی ہے۔ دیکھو تو اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔ مجھ سے کہو' تم تو مجھ سے دل کی ہر بات کر لیا کرتی تھیں۔ اب کیا بات ہے۔" وہ اس کے چہرے کو پیار سے سہلاتے ہوئے بولی۔ زینب کی آنکھوں میں اکٹھا ہونے والا پانی بہہ نکلا۔

"زینب! میری بہن! بولو نا۔ تم صبح کالج گئی تھیں پھر تھوڑی دیر میں لوٹ بھی آئیں۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟"

"آمنہ۔۔۔ آمنہ۔۔۔" وہ بے اختیار اس سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

"زینب! زینو! کیا ہوا۔ کیا بات ہے زینب!" آمنہ اس کے یوں بے اختیار رونے پر گھبرا کر بولی۔
"آمنہ! وہ مجھے نہیں ملتا۔ کہیں نظر نہیں آتا۔ میں گھنٹوں گیٹ کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی رہتی ہوں۔ ہر جگہ اسے تلاش کر چکی ہوں۔ اس نے جو فون نمبر دیا تھا۔ ہزار بار ادھر فون کر چکی ہوں۔ کوئی نہیں اٹھاتا۔ آمنہ! میں مرجاؤں گی۔ اس کے بغیر میں مرجاؤں گی۔"
وہ اس کے ساتھ چمٹی زور زور سے روئے جا رہی تھی۔
"کون؟ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" آمنہ نے اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش کی۔
"سیفی..... سیفی پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ کبھی نہیں۔ وہ ایسا نہیں تھا۔ آمنہ! مجھے معلوم ہے۔" وہ ابھی بھی اس سے لپٹی رو رہی تھی۔
"کون سیفی؟" آمنہ کے لئے تو یہ انکشاف ہی بہت انوکھا اور پریشان کن تھا اسے کچھ شک تو تھا کہ زینب ضرور کسی لڑکے کے ساتھ انوالو ہے مگر اسے اس کا یقین نہیں تھا۔ "رو مت تمہاری آواز باہر تک جا رہی ہے۔ بابا صاحب آنے والے ہوں گے پھر اماں جی..... کون سیفی بتاؤ مجھے۔"
"وہ..... " زینب اس سے الگ ہو کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ آمنہ منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"بولو نا کون سیفی؟" آمنہ نے اس کا کندھا ہلایا۔
"وہ پہلی بار مجھے بازار میں ملا تھا۔ تم میرے ساتھ تھیں۔ دوسری بار تمہاری پرنسپل کے آفس میں..... اور تیسری بار میرے کالج کے باہر۔ پھر میں اکثر..... " وہ جھجک کر چپ سی ہو گئی۔
"کیا کہہ رہی ہو تم؟" آمنہ پریشان ہو کر بولی۔ "کون ہے یہ سیفی؟"
"تمہاری پرنسپل کا بیٹا۔ شہر میں گھر ہے ان کا۔ ادھر فیکٹری بھی ہے اور بہت سی دوسری جائیداد اور بہت روپیہ پیسہ ہے۔ اتنی بڑی گاڑی۔"
"تمہاری پرنسپل تو فرزانہ حبیب ہیں اور وہ تو غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کا بیٹا کہاں سے آگیا۔" آمنہ کچھ الجھ کر بولی۔
"نہیں اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ تمہاری پرنسپل کا بیٹا ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے۔ یہ جھوٹ نہیں تھا۔"
"یہ کب کی بات ہے؟" آمنہ کو کسی بہت بڑی گڑبڑ کا احساس ہولانے لگا تھا۔
"جب تم نے جاب کی تھی اسکول میں شاید پہلا یا دوسرا دن تھا تمہارا ادھر۔" زینب یاد کرتے ہوئے بولی۔
"اچھا کہیں تم مسز رعنا حیات کی بات تو نہیں کر رہیں، وہ تو دوسرے ماہ ہی چلی گئی تھیں۔ ان کا شوہر بخار اتر گیا تھا تو اس کے بعد فرزانہ حبیب ان کی جگہ..... مگر تمہارا اس لڑکے سے کیا تعلق ہے؟" آمنہ نے زینب کو آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔
"وہ میں..... مجھ سے..... اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ..... " زینب سے بات نہیں بن پا رہی تھی۔
"کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔" آمنہ نے اس کا ادھورا فقرہ پورا کیا۔
"ہاں!" زینب نے سر جھکا کر گردن ہلائی۔
"بے وقوف! احمق لڑکی! کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں کر بیٹھیں۔"
زینب چپ رہی۔
"بولو زینب! میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔"
"آمنہ! اسے ڈھونڈنے میں میری مدد کرو پلیز۔ میں بہت پریشان ہوں۔ بہت زیادہ۔ میرے سر میں درد ہے۔ مجھے چکر آرہے ہیں۔ مجھے وہ کیوں نہیں مل رہا۔ وہ کہاں چلا گیا۔" وہ اپنا سر گھٹنوں میں دے کر رونے لگی۔
"وہ کوئی سوئی نہیں جو گم ہو گیا ہے۔ اس کا یقیناً "مطلب" نکل گیا ہو گا جو اس نے تمہاری چھٹی کر دی۔ پاگل

لڑکی! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اوہ میرے خدایا۔" آمنہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
"اس ذلت کی کسر رہ گئی تھی۔ بابا صاحب اور اماں جی کی کمریں تو پہلے ہی دونوں بیٹوں سے ٹوٹی ہوئی ہیں اور اب تم بھی..... "
"آمنہ! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مرجاؤں گی۔" اس نے جیسے آمنہ کا دکھ بھرا واویلا سنا ہی نہیں تھا۔
"مرجاؤ تم اللہ کرے۔ تم جیسی ناخلف احسان فراموش اولادوں کو مر ہی جانا چاہیے۔" آمنہ نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ اسی وقت اسے سیڑھیوں کے پاس مدرسے کا ایک بچہ کھڑا نظر آیا۔
"کیا بات ہے؟" آمنہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔
"باجی! نیچے کوئی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں اماں جی کو دیکھنے۔ صوفی صاحب تو نیچے نہیں ہیں۔ انہیں اوپر لے آؤں جی؟" وہ کھڑا پوچھ رہا تھا۔ آمنہ نے کچھ دیر سوچا۔
"لے آؤ انہیں۔" وہ کہتے ہوئے اماں جی کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ وہ جاگ رہی تھیں۔
"اماں جی! وہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ اب بابا صاحب تو نیچے نہیں ہیں۔ آپ انہیں چیک کرا دیں۔"
"معاذ بیٹا ہے۔" اماں جی کی آنکھیں چمکیں "ہاں بلا لو۔" وہ اپنی چادر سینے پر درست کرتے ہوئے ماتھا ڈھکنے لگیں۔ اسی وقت وہ بچہ معاذ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ آمنہ نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے آدھا چہرہ ڈھانپا اور دروازے سے ذرا ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔
"السلام علیکم اماں جی! کیا حال ہے آپ کا اب؟" وہ آمنہ کے پاس سے گزرتے اماں جی کی طرف بڑھا۔
"وعلیکم السلام بیٹا! اللہ کا شکر ہے آپ سناؤ۔" اماں جی تکیوں کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھیں۔
"آج تو ماشاء اللہ کافی بہتر نظر آرہی ہیں۔ دراصل آج ادھر ہمارے کیمپ کا آخری دن تھا۔ میں نے سوچا جانے سے پہلے آپ کو دیکھ جاؤں۔" وہ اپنے بیگ سے بی پی آپریٹس نکالتے ہوئے بولا "صوفی صاحب مجھے نیچے نہیں ملے۔"
وہ اب اماں جی کا بی پی چیک کر رہا تھا۔
"اس وقت وہ بچوں کو گھر پر قرآن پاک پڑھانے جاتے ہیں۔ بس آنے والے ہی ہیں۔" اماں جی بولیں۔ "آمنہ! معاذ بیٹا کے لیے چائے بناؤ۔" اماں جی نے دروازے کے پاس کھڑی آمنہ سے کہا۔
"ارے نہیں۔ شکریہ۔ بس میں چائے پی کر ہی آرہا ہوں۔ ویسے بھی مجھے کافی دیر ہو گئی ہے۔ گھر کے لیے روانہ ہو چکا تھا کہ آپ کا خیال آگیا۔ اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ انشاء اللہ پھر کبھی سہی۔" اس نے فوراً چائے سے معذرت کر لی۔
"اللہ کرے وہ میرے جانے سے پہلے آجائیں ورنہ پھر کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔ اماں جی! آپ کا بی پی بالکل ٹھیک ہے۔ بخار بھی نہیں ہے۔ آپ دوا اسی طرح باقاعدگی سے لیتی رہیں۔ انشاء اللہ بالکل تندرست ہو جائیں گی۔" وہ اب اسٹیتھوسکوپ ان کی کمر سے لگائے انہیں چیک کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جانے کے لیے اجازت طلب کی۔
"بیٹا! کچھ دیر انتظار کر لیتے۔ صوفی صاحب آتے ہی ہوں گے۔" اماں جی اسے جانے کے لیے کھڑے دیکھ کر بولیں۔
"اماں جی! صوفی صاحب سے نہ ملنے کا افسوس تو مجھے بھی ہے مگر انشاء اللہ میں جلد ہی کسی چھٹی والے دن ان سے ملنے ضرور آؤں گا اور آپ کو چیک کرنے بھی۔ اب مجھے واقعی دیر ہو رہی ہے۔ ورنہ ضرور رکتا۔ آپ اللہ کے فضل سے اب بالکل ٹھیک ہیں۔ خوش خوش رہا کریں۔ زندگی اونچ نیچ کا ہی نام ہے۔ میں کسی دن وقت نکال کر آؤں گا پھر آپ سے خوب باتیں کروں گا۔ اب اجازت اماں جی!"
اس نے محبت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اپنا سر ذرا سا ان کے آگے جھکایا تو انہوں نے اس کے سر پر پیار دیا۔

"جیتے رہو۔ اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے۔ زندگی میں کامیابیاں عطا فرمائے۔ اپنے ہر نیک مقصد میں کامیاب ہو۔ اللہ کی امان میں رہو۔"

وہ ان کی دعائیں لیتا سلام کرکے باہر نکل آیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ صحن میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ بلب کی بیمار روشنی اس کی تاریکی دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"سنیے ایک منٹ۔" وہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اسے پیچھے سے کسی نے پکارا۔ وہ ذرا سا مڑا۔ آمنہ دوپٹے کے نقاب سے اپنا نصف چہرہ ڈھانپے کھڑی تھی۔

"جی فرمایئے!" وہ نظریں جھکا کر بولا۔

"یہ آپ کی امانت۔ شاید آپ کو یاد ہو۔" اس نے اپنی گلابی ہتھیلی اس کے آگے کھولی۔ اس پر سنہری گولڈ میڈل چمک رہا تھا۔ معاذ کو حیرت کا خوشگوار جھٹکا سا لگا۔

"یہ... یہ آپ کے پاس تھا؟" وہ مسکراتے ہوئے حیران سا بولا۔

"جی!"

"مگر کیسے؟ میں تو سمجھا تھا شاید یہ کہیں گر گیا ہے۔"

"یہ آپ تکیے کے نیچے بھول گئے تھے۔ بابا صاحب کے حجرے میں۔ مجھے وہیں سے ملا تھا۔ میں نے سوچا تھا، بابا صاحب کو دے دوں گی کہ آپ تک پہنچا دیں مگر ان ہی دنوں ہمیں بہت جلدی میں گاؤں چھوڑ کر آنا پڑا پھر ادھر آکر میں بھول گئی۔ اس روز آپ کو دیکھا تو مجھے آپ کی یہ امانت یاد آگئی۔" وہ آہستہ آہستہ تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بہت بہت شکریہ... بہت بہت زیادہ۔ واقعی یہ ایک میموریل ہوتا ہے اپنی محنت کا بہت خوبصورت ریوارڈ... اور میں تو بھول چکا تھا۔ ونس اگین تھینک یو۔" اس نے مسکراتے ہوئے میڈل اس کی ہتھیلی سے اٹھایا۔ اس کی انگلیوں نے ذرا سا آمنہ کی ہتھیلی کو مس کیا تھا۔ بجلی کی ایک لہر سی اس کے ہاتھ سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اگر میں نہ ملتا تو..." اس نے آمنہ کی روشن روشن سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔ "آپ اسے یونہی سنبھالے پھرتیں۔"

"تب کی تب دیکھی جاتی۔ اب تو آپ مل گئے ہیں نا!" وہ آہستگی سے بولی۔

"آپ کو میرے ملنے کی زیادہ خوشی ہوئی ہے یا امانت پہنچا دینے کی؟" نہ جانے کیوں معاذ کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ گفتگو طویل ہو جائے اور لمبی طویل تر۔

"ظاہر ہے۔ امانت پہنچانے کی۔"

"یعنی میرے ملنے کی خوشی نہیں ہوئی آپ کو؟" وہ یونہی اسے چھیڑنے کو بولا تھا۔

"وہ تو..." "آ... ہائے میں مرگئی۔" اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی تھی اور دوپٹے کا کونہ جس سے اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ ہراساں قدموں سے چھلانگ لگا کر سامنے کے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی اور خوف زدہ نظروں سے زمین پر اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں موٹی تازی چھپکلی پڑی تڑپ رہی تھی اور معاذ کے بے ساختہ قہقہے پر وہ خائف سی ہو کر چہرہ جھکا لیا۔

"اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ آپ کو مجھ سے ملنے کی کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔" اس کی بات پر آمنہ کو بے اختیار ہی احساس ہوا کہ وہ بے حجاب کھڑی ہے دوسرے پل وہ تیزی سے اندر کمرے کی طرف مڑ گئی جہاں زینب اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ آمنہ ٹھٹک سی گئی۔

"میں اگر سچ بولوں تو ڈوب مرنے کی مستحق۔ والدین کی ناشکری اور ناخلف اولاد ٹھہروں اور تم نیک بی بی بردے

کی آڑ میں سارے مزے لو پھر بھی والدین کی پسندیدہ 'نیک' اچھی اور پیاری شرم والی بیٹی۔" وہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ "گھر میں بیٹھی سب گل کھلا رہی ہو۔" آمنہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی۔ زینب کو اس وقت جواب دینے کا مطلب اس کی فرسٹریشن کو ہوا دینا تھا۔

اور سیڑھیاں اترتے ہوئے معاذ سوچ رہا تھا۔ صوفی صاحب سے ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا ورنہ اب تو ان سے ملنے دوبارہ آنا ہی پڑے گا۔"

آمنہ کا سادہ نقوش والا گندمی روشن چہرہ جیسے اس کی بصارتوں پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج شام ایک عجیب بات ہوئی۔

عجیب بات وہ ہوتی ہے، جو ہمیں لگتی ہے۔

ورنہ تو روزانہ ہی بہت سی باتیں، واقعات جنہیں ہم درخور اعتنا بھی نہیں جانتے، اپنے اندر بہت سے عجائبات لیے ہوتے ہیں۔

وہ اپنے دوست کے ساتھ اینجل فاسٹیس کے سیلون کٹنگ کروانے گئے تھے۔ سیلون تو کھلا تھا مگر اینجل موجود نہیں تھا اور وہ اینجل کے سوا اپنا کام کسی اور سے نہیں کرواتے تھے۔ اینجل کے ہیلپر نے بتایا کہ وہ اپنی ماں سے ملنے ایڈز سینٹر گیا ہے اور یہ تو انہیں معلوم ہی تھا کہ اینجل ہر ویک اینڈ پر اپنی ایڈز زدہ ماں کے پاس تین گھنٹے گزارنے جاتا ہے جبکہ یہ تین گھنٹے وہ بھی ویک اینڈ پر اس کے سیلون پر بہت رش کا وقت ہوتا تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنی ماں سے ملنے ضرور جاتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس کی ماں پورا ہفتہ ان تین گھنٹوں کے انتظار میں گزارتی تھی اور وہ اپنی ماں کے انتظار کو کبھی بھی نہیں بدل سکتا تھا۔

اور عجیب بات انہیں یہ لگی کہ اینجل کے ہیلپر نے مزید بتایا کہ اینجل کی ماں اپنے زمانے کی مشہور کال گرل رہ چکی ہے۔

اور اس کے باوجود وہ اپنی ماں سے اتنی محبت کرتا ہے۔ اس کی اتنی کراہیت انگیز بیماری کو نظر انداز کرتے ہوئے، ہر ہفتے اس سے ملنے جاتا ہے۔ اپنی ماں کے قابلِ نفرت ماضی کو جانتے ہوئے بھی۔

مغرب میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

"اور مشرق میں مجھ جیسی مثالیں بھی بہت کم ملیں گی۔

"میری ماں جو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے۔ جس نے اپنی معذوری کے باوجود کبھی مجھ پر اپنی توجہ، محبت اور التفات کو کم نہیں کیا۔ میری ہر جائز و ناجائز کو ہمیشہ اپنی ترجیحات سے بھی مقدم جانا۔ میں نے اس کے محبت بھرے دل کو اس بڑھاپے کے عالم میں کیا صلہ دیا ہے۔

نزہت میری ہی تو ضد تھی کہ مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔ ام جان نے بابا جان کی مخالفت لے کر یہ رشتہ طے کر دیا۔ دونوں بھائی اس رشتے سے ناخوش تھے مگر ام جان نے فقط میری خوشی کی خاطر کسی کی ناراضی کی پروا نہ کی۔ میں نے آرمی جوائن کی تو بابا جانی پھر خفا ہو گئے کہ ان کا اتنا بڑا بزنس کون سنبھالے گا۔ سب سے بڑھ کر میں ان سے دور چلا جاؤں گا، میری اس ضد کو بھی ام جان نے سب سے بخوشی منوایا۔

اور چھوٹی بڑی کتنی ہزاروں باتیں سوچوں تو شمار نہ کر سکوں جو ام جان نے میری خوشی کی خاطر مانیں اور میں نے ان کی اس خصوصی توجہ اور محبت کا انہیں یہ صلہ دیا کہ انہیں اس بڑھاپے میں معذوری و بیماری کی حالت میں تنہا چھوڑ دیا کہ وہ پانچ برسوں سے میری شکل کو ترس رہی ہیں۔

ان کا گناہ کیا ہے؟"

باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ شدید سرد یخ بستہ ہوا کھڑکی سے اندر آ رہی تھی مگر انہوں نے کھڑکی بند نہ کی۔

"کہ انہوں نے میری پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے نزہت سے میری شادی کردی اور میری ناراضی کی وجہ..... کہ اب میری پسند نزہت کے لیے بدل چکی تھی اگر وہ نزہت سے میری شادی نہ کرتیں جبکہ نکاح میری پسند کے بدل جانے سے پہلے ہوچکا تھا اگر وہ میری ضد پر نزہت کو چھوڑ دیتیں تو اپنے ضمیر کا سامنا کیسے کرتیں اور میں..... میں کیا ساری زندگی آئینہ دیکھ سکتا اگر یہ سب کچھ ہو جاتا۔"

آج کی رات بہت ظالم تھی۔ گزشتہ پانچ سالوں سے گہری نیند سوئے سوالوں کے نوکیلے پنجے ان کے شل ہوتے دماغ میں پیوست ہوتے جارہے تھے۔

"شاید میں نزہت کے سوا کسی سے بھی شادی نہیں کرسکتا تھا۔ آج بھی اپنا دل چاک کرکے دیکھوں تو اس میں نزہت کے سوا کوئی اور ہے بھی نہیں۔ ان پانچ سالوں کی صحرا نوردی نگر نگر گھومنے کے بعد بھی میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ آج تک کوئی لڑکی مجھے نزہت سے بڑھ کر نظر آئی ہی نہیں۔

"تو پھر یہ کیسی سزا ہے؟" انہوں نے کھڑکی کی بریکٹ پر بے چینی سے مکا مارا۔

"میں یہ سزا کس کو دے رہا ہوں' ام جان کو' نزہت کو' اپنے بیٹے کو یا پھر خود کو۔" انہوں نے سر اٹھا کر بے بسی سے آسمان سے گرتے سفید سفید روئی کے سے نرم گالوں کو دیکھا۔

"وہ قدرت جو اس سپاٹ آسمان میں سے برف برسا رہی ہے' وہی ہم انسانوں کی تقدیر لکھنے والی ہے وہی ہمارے دلوں کے' سوچوں کے رخ پھیرنے والی ہے۔ کب نزہت کی طرف سے میرا دل متنفر ہوا اور ایسا ہوا کہ پھر مڑنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی یا شاید میں نے پلٹ کر سوچنا ہی نہیں چاہا بس اپنی تمام تر سوچوں کو ایک ہی نقطے پر فریز کرکے اپنی ہٹ پر اڑ گیا۔

زندگی جو ایک بار ملتی ہے۔ جوانی اس زندگی کا بہترین حصہ ہوتی ہے میں اس حصے کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کرچکا ہوں۔ کررہا ہوں۔ صرف اپنی انا کی وجہ سے۔ اپنی ایک ضد کے لیے۔

ہم سے روزانہ دیدہ و دانستہ ہزاروں گناہ چھوٹے بڑے سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں اور ہمارے خالق کا ہم سے وعدہ ہے کہ ایک بار اس کی بارگاہ میں رو کر معافی مانگ لیں وہ ہمارے سارے گناہ معاف کردے گا اور بہت سے ایسے گناہ جن میں سے اکثر تو ہمیں یاد ہی نہیں ہوتے کہ انہیں بخشوانے کا سوچیں۔ اس کے باوجود وہ ہمیں اپنی گرفت میں نہیں لیتا۔

انجانے میں اس ایک خدائے واحد کے ساتھ بہت سے شریک بناتے رہتے ہیں مگر اس کی انا تو جوش میں نہیں آتی۔ اس کی غیرت کو تو ضد نہیں آتی کہ میں اب اس کو ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ کردوں گا۔ کبھی معاف نہیں کروں گا چاہے روئے' چاہے معافی مانگے گڑگڑائے میں نہیں معاف کروں گا۔

وہ ہمارا خالق ایک بار معافی مانگنے پر بڑے سے بڑا گناہ بخش دیتا ہے اور میں کیا نعوذ باللہ اس سے بھی بڑھ کر ہوں کہ کسی کی غلطی کو معاف ہی نہیں کرپا رہا جبکہ وہ ہزار بار رو رو کر مجھ سے کہہ چکی ہے کہ اس سے وہ غلطی سرزد ہوئی ہی نہیں۔

اور مزہ تو تب تھا نا' میں نزہت کو سزا دے کر خود لائف انجوائے کررہا ہوتا اپنی زندگی میں بہت خوش ہوتا بہت مطمئن مگر یہاں خوشی اور اطمینان تو دور کی بات۔ مجھے تو اپنی زندگی سے ہی نفرت ہو چلی ہے۔ ایک سزا ایک بوجھ بن گئی ہے یہ میرے لیے کیونکہ میں نے اپنوں کے دل دکھا کر خود کو' اپنی انا کو' اپنے نفس کو خوش کرنا چاہا ہے اور یہ انا' یہ نفس ایسے ظالم نامراد ہیں کہ آپ ان کو خوش کرنے کے لیے ساری دنیا کو بھی بم سے اڑا دو تو بھی یہ خوش نہ ہوں گے۔ انہیں تو آپ کا خون چوس کر بھی مکمل خوشی نہیں ملے گی پھر میں یہ کیا کررہا ہوں۔ ان سے تو نجات کا ایک ہی طریقہ ہے جہاں یہ سر اٹھانے لگیں ان کی نفی کرکے ان کا پھن کچل دو ورنہ یہ من مانی کے زہریلے ڈنک سے آپ کی ہنستی کھیلتی' مطمئن' قناعت پسند زندگی کو ہمیشہ کے لیے بے سکون کردیں گے جیسے میری۔"

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

ذہن پر لگے سارے جالے ایک ایک کرکے اترتے چلے گئے۔

"یہ رات پہلے میری زندگی میں کیوں نہ آئی۔" انہوں نے سوچا۔

"نزہت اگر گناہگار ہے بھی تو وہ بہت سزا پاچکی اور اس اکیلی نے یہ سزا کب کاٹی ہے۔ میں خود بھی تو قطرہ قطرہ اس عذاب میں جلا ہوں اور ام جان نے اگر میری یہ ناجائز ضد نہیں مانی تو بھی میں انہیں بہت ستا چکا ہوں اور سب سے بڑھ کر میرا وہ ننھا قرض خواہ جس کی چار سالہ محبتوں کا قرض میری اس ناآسودہ زندگی کو مزید بے سکون بنا رہا ہے' جہاں کسی چھوٹے بچے کو کھیلتے کودتے دیکھتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے۔ میری زندگی کے کتنے پل اس کی ہنسی میں گم گئے

"بس شہباز خان! بہت ہوگیا سزا کا یہ مکروہ' تکلیف دہ کھیل۔ بہت ہوگیا اب اس انا کا خون کرکے اپنی اور اپنے پیاروں کی خوشیوں کو نئی زندگی دو۔"

انہوں نے کھڑکی بند کردی اور اپنا رخ اندر کمرے کی روشنی کی طرف کردیا یہ دیکھنے کے لیے کہ خود احتسابی کا جو عمل اندھیرے سے گھبرا کر ان کے اندر شروع ہوا تھا۔ وہ روشنی میں آکر نظریں تو نہیں چرا رہا۔ کسی نے سچ کہا ہے' بدلنے کے لیے اکثر ایک پل ہی کافی ہوتا ہے۔ "زندگی کا تو دوسرا نام ہی روشنی ہے۔ اندھیرے تو ابہام پھیلاتے ہیں۔ خود آگہی کی روشنی اب میرے اندر نہیں باہر بھی پھیل چکی ہے۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر سامنے جلتی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے جیسے بہت زمانوں بعد انہوں نے یہ روشنیاں دیکھی ہوں۔

دو دن بعد وہ وطن واپسی کی تیاری کررہے تھے۔

انہوں نے گھر فون کرکے ام جان کو بھی آنے کا نہیں بتایا تھا۔ وہ انہیں بہت بڑا سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ اب تو خود ان کا دل اڑ کر اپنے گھر اپنے وطن اور ام جان کے پاس جانے کو چاہ رہا تھا۔

"اور سب سے بڑھ کر نزہت اور ارتضیٰ کے پاس۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک خوبصورت لیڈیز سوٹ ہینگر سے اتارتے ہوئے سوچا۔ آج ان کی شاپنگ کا آخری دن تھا۔ کل شام پانچ بجے ان کی فلائیٹ تھی اور انہیں آج رات تک اپنی سب تیاری مکمل کرنی تھی اور آج کا سارا دن تو انہوں نے صرف نزہت کی شاپنگ میں ہی گزارا تھا۔ اس کا ناراض ناراض سا روپ دیکھنے کے لیے دل بے چین ہوا جارہا تھا۔ وہ جلدی جلدی شاپنگ مکمل کرنا چاہ رہے تھے۔ رات کے آٹھ تو بج رہے تھے۔

انہوں نے ٹرالی کا رخ موڑا اور ریسپشن کی طرف بڑھے۔

"ایکسکیوزمی آپ شہباز خان ہیں نا۔" ایک اجنبی آواز انہیں اپنے عقب سے سنائی دی تو ان کے تیزی سے اٹھتے قدم رک گئے۔

• • •

"میرا فرینڈ' فہد راشد۔" ارتضیٰ اپنے جیسے یونیفارم میں ملبوس اپنے ہم عمر لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معاذ سے بولا۔

"ہیلو بیٹا! ہاؤ آر یو!" معاذ نے بچے کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے گرم جوشی سے پوچھا۔

"آئی ایم فائن انکل۔ آپ ارتضیٰ کے بابا ہیں۔" بچہ اچھا خاصا ہوشیار تھا۔

"یس!" معاذ نے کہتے ہوئے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسکول میں چھٹی ہو چکی تھی بچے گیٹ سے تیزی سے نکل رہے تھے اور اپنی اپنی کنوینس کا رخ کررہے تھے جو گیٹ کے ارد گرد سڑک پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

آج تیسری دفعہ مسز خان نے معاذ کو بتایا تھا کہ ارتضیٰ اس بچے کی آنٹی سے کچھ نہ کچھ لے کر کھالیتا ہے بلکہ ایک بار جب ڈرائیور لیٹ ہوگیا تھا۔ وہ بچہ اپنی آنٹی کے ساتھ اسے گھر تک بھی ڈراپ کر گیا تھا۔ معاذ کو فکر لاحق ہوئی۔ وہ کل بھی آیا تھا مگر کل فہد چھٹی پر تھا۔

"آپ کس کے ساتھ جاتے ہیں؟" معاذ نے فہد سے پوچھا۔

"ڈرائیور کے ساتھ۔" بچہ ذرا سا اچک کر معاذ کے پیچھے دیکھنے لگا' شاید وہ اپنی گاڑی دیکھ رہا تھا۔

"روز آپ ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہو؟" معاذ نے پھر پوچھا۔

"جی!" وہ دو تین قدم گیٹ سے باہر ہوکر جھانکنے لگا۔

"ہائے گرینی!" اس نے کسی کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
"انکل! میری گرینی!" اس نے معاذ سے تعارف کرایا۔ ایک دراز قد فربہی مائل گوری چٹی ادھیڑ عمر عورت سیاہ چشمے کے ساتھ آسمانی کلر کی ساڑھی میں ملبوس اس بچے کے پاس کھڑی تھی۔
"گرینی! یہ میرے فرینڈ ارتضیٰ کے پاپا ہیں۔" بچے نے اس عورت سے معاذ کا تعارف کرایا۔
عورت نے سر کو ذرا سا خم دیتے ہوئے معاذ کے سلام کا جواب دیا تھا۔
"آپ تو کافی ینگ ہیں۔ بابا لگتے تو نہیں۔" عورت اچھی خاصی جہاندیدہ تھی۔ "ویسے فہد کافی ذکر کرتا ہے اپنے دوست ارتضیٰ کا۔" وہ عورت بات کرتے ہوئے مسلسل مسکرا رہی تھی۔ "چلو بیٹا گاڑی میں بیٹھو چل کر۔ او کے جی اجازت دیجیے۔ کبھی آئیے گا ہمارے گھر اپنے بیٹے کو لے کر۔" وہ جلدی میں لگ رہی تھی۔
"روز آپ ہی فہد کو لینے آتی ہیں؟" اس سے پہلے کہ وہ جانے کے لیے مڑتی، معاذ نے اس سے پوچھا۔
"نہیں کبھی کبھار ورنہ تو یہ ڈرائیور کے ساتھ ہی آجاتا ہے۔ آج تو میں شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی اس لیے اسے لینے آگئی۔" وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آئے۔ ارتضیٰ دونوں کے پیچھے تھا۔
"اور فہد کے ماما پاپا میرا مطلب ہے وہ آپ کے ساتھ رہتے ہیں؟" معاذ اس گتھی کو آج ہی سلجھا لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے یوں روز ارتضیٰ کے اسکول آنے کا ٹائم نہیں مل سکتا تھا۔ وہ عورت معاذ کا سوال سن کر رک گئی۔ ایک نظر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے فہد کو دیکھا اور پھر معاذ کی طرف مڑی۔
"اس کے پیرنٹس کی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو چکی ہے جب یہ محض ایک سال کا تھا اور اتفاق سے میرے پاس ہی رہ گیا تھا۔ بس اس دن سے میں ہی اس کی مما ہوں اور میں ہی پاپا۔ خدا حافظ!" وہ اپنے چہرے پر آئے تکلیف دہ تاثرات کو چھپاتی تیزی سے مڑی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ معاذ اس باہمت عورت کو دیکھتا رہ گیا۔
"تو پھر وہ کون ہے جو ارتضیٰ سے ملتی ہے۔" اس کی الجھن پھر بھی نہیں سلجھ سکی تھی۔
"ارتضیٰ! وہ کون ہیں جو آپ سے ملتی ہیں فہد کی گرینی!" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے معاذ نے ارتضیٰ سے پوچھا۔
"نہیں۔ وہ تو فہد کی آنٹ ہیں۔ میں نے آئس کریم کھانی ہے۔" وہ سیٹ پر اچھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اب فہد کی آنٹ سے ملوں یا پرنسپل سے ملوں۔" وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا مشی سے ہو گیا۔ شاید معاذ کو اس سے سامنا ہو جانا گوارا نہ گزرتا اگر وہ اسے اتنے فضول حلیے میں نہ ملتی۔ اس نے ریڈ جارجٹ کی سلیولیس کی شارٹ شرٹ کے ساتھ بلیک ٹائٹس پہن رکھی تھی اور اس کے گہرے میک اپ سے لگ رہا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہے۔
"تھینک گاڈ! تم جلدی آگئے میں تمہارا ہی ویٹ کر رہی تھی۔ لنچ کے لیے جانا ہے۔" وہ جلدی جلدی بولی اور ارتضیٰ کے باہر نکلتے ہی فرنٹ ڈور پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔
"اس حلیے میں۔" معاذ نے ایک ناگوار سی نظر اس کے سراپے پر ڈالی۔
"کیوں کیا ہوا ہے میرے حلیے کو۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی۔ بلیک کلر کے بڑے بڑے ایررنگز اس کے گالوں کو چھو رہے تھے۔
"تم پروگرام سیٹ کرنے سے پہلے کم از کم مجھے انفارم کرنے کی زحمت تو کر لیا کرو۔" معاذ نے فوراً موضوع بدلتے ہوئے لہجہ کچھ نرم کیا۔ "مجھے ابھی کھانے کے فوراً بعد سائیٹ پر جانا ہے۔ کلینک کے لیے زمین دیکھ رہا ہوں نا۔ ڈیلر کے ساتھ میری دو بجے اپائنمنٹ ہے۔ اس کے بعد ہاسپٹل آج میری نائٹ شفٹ ہے تم یہ پروگرام کسی اور دن کے لیے رکھ لو۔" وہ گاڑی سے اترتے ہوئے دروازہ بند کر کے بولا۔
"تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے، جب میں تمہیں کہیں چلنے کو کہتی ہوں۔ تمہیں ہاسپٹل، کلینک، مریض،

گیپ اور نہ جانے کیا کیا بکواسیات یاد آجاتی ہیں۔ کیا تمہاری نظر میں یہ فضولیات مجھ سے بڑھ کر ہیں۔" وہ غصے میں آگ بگولہ ہوتے ہوئے اس کے سامنے تن کر آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔
"مائنڈ یور لینگویج پلیز۔" معاذ کو بھی غصہ آگیا۔ "تمہیں اگر میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو ان فضولیات کو نہ صرف سہنا ہوگا بلکہ انہیں میری اولین ترجیح کے طور پر برداشت بھی کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے اس خواب کو مجسم کرنے کے لیے بہت... جدوجہد کی ہے۔ اور محض تمہاری خاطر میں اپنے خوابوں کو ملیامیٹ نہیں کر سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ یو انڈر اسٹینڈ۔" وہ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔
"مائی فٹ!" اس نے اپنی نازک سی چپل ہیل کا ہونا زور سے زمین پر مارا۔
"اگر تمہیں میرے ساتھ لائف شیئر کرنا ہے تو مجھے اور صرف مجھے اپنی Top Priority (اولین ترجیح) سمجھنا ہوگا ورنہ..."
"ورنہ کیا کرو گی تم؟" وہ اسے گھور کر بولا۔
"میں... [illegible] نے ہونٹ بھینچے۔ "تم ول نیل یو۔" کہہ کر وہ پیر پٹختے ہوئے ادھر سے چلی گئی۔
"کیا مصیبت ہے... مفت کی بلا میرے گلے پڑ گئی ہے۔" وہ جھنجلا کر گاڑی لاک کرنے لگا۔
اور لاؤنج کی کھلی کھڑکی سے مسز خان ان دونوں کے انداز گفتگو سے اندازہ لگا رہی تھیں کہ آیا یہ بیل منڈھے چڑھے گی بھی یا اس کا حال بھی [illegible] اور شہانہ..." اس سے آگے وہ سوچ نہ سکیں۔

☼ ☼ ☼

"تم دیکھ رہی ہو سیفی کے تیور آج کل۔" فخر حیات نے اپنے سامنے پڑی فائل کو پرے کرتے ہوئے پاس بیٹھی رعنا حیات سے [illegible] اپنے [illegible] فائل کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ [illegible]
[illegible]
"ہاں۔ دیکھا ہے۔" وہ ایک گہرا سانس [illegible] لے کر بولیں۔
"کتنا بدلا بدلا سا نظر آرہا ہے وہ۔" ان کا لہجہ عجیب دکھی سا ہو رہا تھا۔
"ہوں!" رعنا خود اس موضوع پر بات کرتے گھبرا رہی تھیں۔
"فیکٹری بھی نہیں جا رہا آج کل اور آفس تو اس نے کئی دنوں سے جانا چھوڑ رکھا ہے۔"
"اس کی وجہ [illegible] آپ کو بتا دی تھی۔" وہ شکستہ لہجے میں بولیں۔
"اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا میرا بھی خراب ہے۔" وہ چمک کر بولے۔ "اپنے ہاتھ پیر کٹوا کر اسے [illegible] کر لو صاحبزادے، جو تمہارے جی میں آئے کرتے پھرو، سیاہ کرو، سفید کرو، چاہے ہمیں تباہ کرو چاہے فنا۔ تمہیں کھلی چھٹی ہے۔"
"خیر۔ اب ایسا بھی نہیں وہ۔" رعنا کا لہجہ کمزور سا تھا۔
"تمہاری خوش فہمیاں ابھی تک رفع نہیں ہوئیں۔" فخر حیات نے گلہ آمیز نگاہوں سے پاس بیٹھی بیوی کو دیکھا۔
"خوش فہمیاں نہ پالوں تو اور کیا کروں۔ حقیقتوں کے ناگ بہت زہریلے ہیں۔ ان کا تو ایک ڈنک ہی مجھے مار دینے کے لیے کافی ہے۔"
"اسی لیے خود فریبی میں مبتلا ہو۔" وہ طنز سے بولے۔
"آپ اس کے نام فیکٹری تو کر چکے ہیں۔ اس کے تمام معاملات بھی اس کے حوالے کر دیں۔ خوامخواہ کا جھنجٹ۔ آپ کی جان بھی چھوٹ جائے گی ویسے اتنے زیادہ بکھیڑوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔" رعنا جھنجلا کر بولیں۔

"اس میں کچھ احساس ذمہ داری تو پیدا ہو جائے۔ سب کچھ اسی کا تو ہے۔ ہم تو محض چوکیدار ہیں۔" فخر حیات تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

"آپ اس کے حوالے کر دیں، خود ہی اس کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے گا۔"

"رعنا! میں یہ غلطی دوسری بار نہیں کرنا چاہتا۔ ایک بار پہلے بزنس میں سب کچھ لٹا کر میں نے زیرو سے اسٹارٹ لیا تھا۔ اب جو کچھ بھی کرتا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر۔"

"اور کتنا سوچیں گے آپ؟ مما! آپ نے بات نہیں کی ان سے۔" سیفی کی ان کے عقب سے سیڑھیاں اتر کر اچانک سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"کی ہے بیٹا بات اور.....!"

"میں..... مت کہیں مجھے بیٹا۔ نہیں ہوں میں آپ کا بیٹا۔" وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولا تو رعنا کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا اور فخر حیات کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم۔" وہ آہستگی سے غرائے۔

"وہی جو آپ نے سنی اور جو سچ ہے۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"سیفی!" رعنا چیخیں۔ "تمہیں والدین کا احترام بھی بھولتا جا رہا ہے۔"

"آپ کے نزدیک اہم بات کیا ہے۔ والدین کا احترام۔" وہ تمسخر سے ہنسا۔

"وہ تو میں کرتا ہوں۔ اپنے والدین کا۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"کیا مطلب؟" رعنا نے برہم نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ مطلب وطلب کو گولی ماریں۔ آپ مجھے یہ بتائیں۔ آپ نے بہت کچھ میرے حوالے کرنے کے لیے پیپرز تیار کروا لیے ہیں یا نہیں۔ میں پچھلے ہفتے آپ کو فائنلی کہہ چکا ہوں۔" وہ بے لحاظی سے بولا۔

"کیسے پیپرز؟" فخر حیات ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔

"سب کچھ میرے نام کرنے کے۔"

"سب کچھ تمہارے نام ہی ہے۔ تھوڑا صبر کر لو۔" وہ درشتی سے بولے۔

"کتنا صبر..... " وہ چہرہ جھکا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ کے مرنے تک کا صبر۔ اس کی بات پر رعنا بے ہوش ہونے کو تھیں۔

"چلو یہی سمجھ لو۔" وہ غصے سے اٹھنے لگے۔

"اتنا صبر تو میں نہیں کر سکتا۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"تو پھر ابھی مار ڈالو مجھے۔ تمہارا صبر بھی تمام ہو جائے گا اور....."

"سیفی!" رعنا نے اٹھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

"ہاں سیفی کو ماریں۔ کون سی آپ کی اپنی اولاد ہے۔ میں تو کھلونا ہوں نا جو آپ نے میری ماں سے چھینا تھا۔ اپنا دل بہلانے کے لیے۔ اپنے دکھی دل پر پھاہا رکھنے کے لیے۔ کیا صلہ دیا آپ نے اس قربانی کا مجھے۔ میری ماں کو۔" وہ چیخ کر بولا۔

"وہ سب پیسے پیسے کو ترستے رہتے ہیں اور آپ دونوں اس خزانے پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں۔ مجھے بھی کسی چیز کو چھونے، ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔ کون ہوں میں آپ کا۔" وہ زور سے دھاڑا۔

"کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں۔ صرف آپ نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے مجھے اپنایا تھا۔ غم غلط ہو گیا۔ آپ کا مطلب نکل گیا۔ اسی لیے تو مجھے کوڑی کوڑی کو محتاج کر رکھا ہے کہ سدا آپ کے آگے ہاتھ پھیلاتا رہوں۔ چھوڑ کر نہ بھاگ سکوں نہ اپنے ماں باپ کے پاس نہ کہیں اور..... مگر مجھ سے اب صبر نہیں ہوتا۔ آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔ آپ دونوں یا میں....."

کہتے ہوئے اس نے انتہائی پھرتی سے پینٹ کی جیب سے چھوٹا سا سیاہ ریوالور نکالا اور فق چہرہ لیے فخر حیات پر تان لیا۔

"سیفی! سیفی! کیا کر رہے ہو تم۔ باپ ہے یہ تمہارا۔ پالا....."

"پالا نہیں۔ تمسخر اڑایا ہے آپ لوگوں نے ہماری غربت کا۔ آج میں سارے حساب چکا دوں۔" کہتے کہتے اس نے ٹریگر دبا دیا اور پھر دبا تا ہی چلا گیا۔

لاؤنج اندوہناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

• • • • • •

"آمنہ! خدا کے واسطے ——— تمہیں اللہ کا واسطہ تم تو بہت اچھی ہو اس گھر میں ایک تم ہی تو اس قدر اچھی ہو، جس سے یہ گھر گھر لگتا ہے۔ اس گھر سے باہر جا کر واپس آنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہاری گھر میں موجودگی سب کے لیے ڈھارس ہے، تم سب پر مہربان ہو سب کا خیال رکھتی ہو سب سے محبت....."

زینب پاگلوں کی طرح تیز تیز بولے جا رہی تھی۔ اس نے آمنہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ رکھے تھے۔

"بس کرو پاگل ہو گئی ہو زینی! اور یوں بھی میں اس قدر اچھی نہیں ہوں اور جو گھر سے جا کر لوٹ آنے کا خیال میری وجہ سے ہے تو تیرے دونوں بھائی یوں گھر چھوڑ کر ہم سے ایسے منہ موڑ کر تو نہ چلے جاتے۔ ہمارا گھر تو ان سے قائم تھا ہمارا ہنستا بستا گھر ان کے بغیر کس قدر ویران..... " وہ اداس سی ہو کر بولی۔

"ہنستا بستا مت کہو اس گھر کو، اس گھر میں بابا صاحب کی دہشت نے کبھی کسی کو کھل کر ہنسنے ہی نہیں دیا۔ انہوں نے تو ہم سب کی زندگی کو خوف اور دہشت کی علامت بنائے رکھا، بہت اچھا ہوا جو عبدالمتین اور عبدالمبین یہ زندگی چھوڑ کر چلے گئے۔ لڑکے تھے اڑ سکتے تھے ہمارے تو پر بھی نہیں کہ اس دہشت خانے سے کہیں بھاگ جائیں جہاں زندگی کی کچھ سانسیں تو کھل کر لے سکیں۔ بابا صاحب نے ہمیں فرشتے بنانے کے چکر میں انسان بھی نہیں بننے دیا، نارمل انسان آمنہ! ہم سب ابنارمل ہیں۔ میں، تم، جویریہ، بھائی، ہم سب ابنارمل ہیں اور ہماری اس ذہنی ابنارملٹی کے ذمہ دار بابا صاحب ہیں۔ بتا سکیں بابا صاحب جیسے انسان شادی کیوں کرتے ہیں۔ گھر کیوں بساتے ہیں۔ گھر بسا لیں تو بچے کیوں پیدا کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں تو پھر انہیں انسان کے بچے کیوں نہیں سمجھتے انہیں محض کوئی شے کیوں سمجھتے ہیں۔ جنہیں وہ ساری زندگی توڑ موڑ کر اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کے سانچوں میں فٹ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی مار پیٹ کر، کبھی چیخ چلا کر، کبھی ڈرا دھمکا اور بالآخر ہم جیسے عجیب و غریب انسان ان سانچوں سے باہر آتے ہیں۔ ہیں نا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

آمنہ کو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا ہو رہا تھا۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ مرجھایا ہوا رنگ و روپ، آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، خشک ہونٹ، بے رونق بکھرے ہوئے بال اسے جیسے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

"زینب! تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ تم نے اپنے حلیے پر کبھی نظر ڈالی ہے۔ ابنارمل تو تم خود اپنے آپ کو بنا رہی ہو۔ کیوں پہلے کی طرح ہنستی بولتی نہیں ہو۔ اماں جی کی نظریں ہر وقت تمہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ وہ بدقت چل کر تمہارے پاس آتی ہیں کہ زینب مجھے صبح سے نظر نہیں آ رہی۔ کم از کم ان کی خاطر ہی پہلے جیسی بن جاؤ۔" آمنہ نے اسے احساس دلانا چاہا۔

"پہلے جیسی ہونہہ! میں تو ویسی نہیں بن پائی۔ جیسی بابا صاحب بنانا چاہ رہے تھے اور اب وہ بھی نہیں بن سکتی۔ جیسی خود بننا چاہ رہی تھی۔ پہلے میں ہنستی بولتی رہتی تھی تو مجھے قوی امید تھی کہ میں اس عقوبت خانے سے ایک نہ ایک دن چھٹکارا پا لوں گی۔ بابا صاحب کی آمریت سے کہیں دور بھاگ جاؤں گی مگر اب۔"

وہ پژمردہ سی اپنا سر دیوار سے ٹکا کر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ کیسی وحشت سی برسنے لگی تھی آج کل اس کی آنکھوں سے۔

"اب کیا ہو گیا ہے، یہ ناامیدی کیوں زینب؟ تم یوں پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اچھے

دن بھی آئیں گے، بلکہ آنے ہی والے ہیں وہ بھی تمہارے۔" آمنہ نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو محبت سے دبایا۔

"ہونہہ! اچھے دن وہ بھی اس نارچر سیل میں نہیں۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "آمنہ! تمہیں ابھی بھی امید ہے کہ اچھے دن آئیں گے؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر یاسیت سے بولی۔ "ہاں آ بھی سکتے ہیں۔" پھر وہ خود ہی بولی۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔" آمنہ خوش ہو کر بولی۔ "بس تم ہمت کرو، خود کو پہلے جیسا..."

"پلیز آمنہ! مجھے کوئی نصیحت مت کرو تم میرا ایک کام کر دو پلیز۔"

"کیسا کام!" آمنہ نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری وہ جو سابقہ پرنسپل تھیں نا رعنا حیات مجھے ان کے گھر کا ایڈریس لا دو، کہیں سے بھی۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ خناس ابھی تمہارے دماغ سے نکلا نہیں۔" آمنہ تلخی سے بولی۔ "بھول جاؤ اس فراڈیے کو۔"

"نہیں بھول سکتی میں اسے۔" زینب زور سے چیخی۔ آمنہ نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آہستہ بولو۔" وہ "دا زدیا" بولی۔

"آہستہ بولو، آہستہ چلو، آہستہ ہنسو، آہستہ کھاؤ، آہستہ پیو، آہستہ روؤ، آہستہ مرو، ساری زندگی اس ایک لفظ سے عبارت ہے ہماری۔ بے فکر رہو آہستہ آہستہ مر رہی ہوں۔ میں مر جاؤں گی۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے اپنے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

"زینب! کیوں اپنا دماغ خراب کر رہی ہو، اب جبکہ سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے جا رہا ہے، اماں جی کی صحت اللہ کا شکر ہے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ آج تو وہ سارا دن باہر بیٹھی رہی ہیں۔ بابا صاحب بھی اب ہمیں اتنا نہیں ڈانٹتے ڈپٹتے۔ میری تنخواہ میں پورے دو سو روپے کا اضافہ ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر..."

اس نے سسپنس پیدا کرنے کی کوشش میں جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اور سب سے بڑھ کر کیا....؟" زینب سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اسی مہینے بابا صاحب تمہارا نکاح نذیر سے کر رہے ہیں۔ اس کا گاؤں میں اپنا گھر ہے، بابا صاحب دیکھ کر آئے ہیں۔ بہت بڑا، ہمارے پہلے گھر جیسا۔ وہ تمہیں ادھر ہی رکھے گا اور..."

"شٹ اپ آمنہ!" وہ غرائی۔ "اس سے آگے مزید بکواس نہ کرنا میں کچھ اٹھا کر مار دوں گی۔"

"کیا مطلب اس میں بکواس کیا ہے؟" آمنہ کو اس کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

"تم خود ہی تو پہلے شادی کو تمام دکھوں کا حل قرار دیتی تھیں۔ بھول گئیں۔" آمنہ کچھ شرارت سے بولی۔

"شادی کو قرار دیتی تھی بربادی کو نہیں اور آمنہ میرے سامنے اس ٹی بی کے مریض کا نام مت لینا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ اس سے اگلے ہفتے نکاح کر لیں خود بابا صاحب۔ اس سے نکاح کرتی ہے میری جوتی۔" وہ ترخ کر بولی۔

"بدتمیز! ایسے بولتے ہیں۔ بابا صاحب نے سن لیا تو۔ پھر اس میں کیا برائی ہے؟"

"اتنا ہی تمہیں پسند ہے تو تم کر لو اس سے نکاح۔ یوں بھی تم بڑی ہو پہلا حق تمہارا ہے۔ پھر بابا صاحب یہ نیکی میرے ساتھ ہی فرمانے کا ارادہ کیوں رکھتے ہیں۔ ہاں سمجھ گئی ہوں وہ بھی بے چارے۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔

"کیا مطلب؟" وہ اس کی ہنسی کا مطلب نہیں سمجھی۔

"بابا صاحب کو ڈر ہے میں کہیں بھاگ نہ جاؤں۔" وہ زور سے ہنسی "میں یہ بھی کر گزرتی اگر..." آخری جملہ وہ لبوں میں دبا گئی۔

"اچھا تم بولو۔ میرا یہ کام کرو گی کہ نہیں۔" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک تم سے مجھے اچھائی کی امید تھی سو وہ بھی نہیں رہی اور یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں۔ میں خود جا کر تمہارے اسکول کے آفس سے یہ ایڈریس لے سکتی ہوں۔ تم سے صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ دیکھوں تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ چلو کوئی بات نہیں۔ میں خود کر لوں گی۔" وہ آرام سے بولی۔

"تم آخر ان کے ایڈریس کا کرو گی کیا؟" آمنہ زچ ہو کر بولی۔

"اشتہار چھپواؤں گی ان کی نیک نامی کا۔" وہ جل کر بولی۔ "صفت کی نیکیاں کما رہی ہیں وہ دور افتادہ دیہات میں اسکول کھلوا کر کچھ روشنی علم کی پھیلاتی ہیں، کچھ اپنے لائق فرزند کے وجاہت کی۔ جدھر سے جاتی ہیں پیچھے ان کی عزت کے ڈنکے بجتے ہی رہتے ہیں۔"

"زینب! تم کیا کرنا چاہتی ہو؟" آمنہ کچھ ڈر کر بولی۔

"بتا تو دیا ہے۔" وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔

"تم اس سے ملنے جاؤ گی؟"

"شاید ہاں، شاید نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تم ایسا نہیں کرو گی، ورنہ بابا صاحب کو..."

"پلیز اب مزید بابا صاحب نامہ نہ کھول کر بیٹھ جانا۔ میں سونا چاہ رہی ہوں۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"مغرب کا ٹائم ہو رہا ہے نحوست ہوتی ہے اس وقت سونا۔"

"جو خود منحوس ہو اس کا وقت کی نحوست کیا بگاڑے گی۔ سونے دو مجھے جاؤ تم یہاں سے۔" وہ کہتے ہوئے دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

"ٹھیک نہیں ہو۔ تم دن رات پلنگ توڑتے توڑتے۔" آمنہ کچھ جل کر بولی، مگر زینب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آمنہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر باہر آ گئی۔

☼ ☼ ☼

کتنی ساری قیامتیں ایک ساتھ نواز صاحب پر ٹوٹ پڑی تھیں۔

سیفی اور عفت آرا کی سر جوڑ سازشوں کا ایک نہ ایک دن کوئی غلط نتیجہ تو انہیں نکلتا نظر آ ہی رہا تھا، مگر وہ اس طرح اتنی دیدہ دلیری سے فخر حیات اور عتار پہ پستول تان کر نہ صرف کھڑا ہو جائے گا بلکہ انہیں یوں گولیوں سے بھی بھون دے گا اس کا تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ عفت آرا خود یہ خبر سن کر نیم پاگل سی ہو گئی تھیں ایسی بے خوفی اور جرات کی توقع تو انہیں بھی اپنے لاڈلے سپوت سے نہیں تھی۔

سی سی یو کے باہر ٹہل ٹہل کر نواز صاحب کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں عفت آرا دور صوفے پر بے جان سی پڑی تھیں۔

"عورت کی فطرت خدا نے کتنے کمینے مادے سے بنائی ہے۔ اس کی ہوس کا پیٹ تو دوزخ کے منہ سے بھی بڑا ہے، جس میں دنیا جہان کی نعمتیں ڈالتے جاؤ سیر نہیں ہوتا۔ یہ عورت ساری زندگی دھن دولت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی رہی اور ہاتھ کیا آیا؟" وہ تھک کر رک گئے۔ "مگر سب عورتیں اس جیسی بھی نہیں ہوتیں، بہت نیک صابر اور قناعت پسند عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اور ایسی صابر شاکر عورتیں جن کے نصیب میں ہوتی ہیں ان سے بڑا مال دار بھی کوئی نہیں ہوتا۔ کاش اللہ میرا شمار بھی ایسے مال داروں میں کر دیتا۔" وہ حسرت سے سوچ رہے تھے۔

"مگر میں تو وہ کم نصیب ہوں جیسے نا صرف عورت ہی لالچی اور کمینی فطرت ملی، بلکہ اولاد بھی سفیان جیسی جو اس عمر میں مجھے ذلت اور رسوائی کا وہ تاج پہنا گئی ہے کہ میں اپنا سر بھی کاٹ ڈالوں تو بھی یہ تاج میرے نام کے ساتھ جڑا ہی رہے گا۔" سی سی یو کے باہر پولیس کی وردی میں ملبوس تین گارڈز کو دیکھ کر انہوں نے سوچا۔ اخباری پورٹرز تھوڑی تھوڑی دیر بعد برآمدے میں منڈلا رہے تھے۔ ایسی مسالے دار خبر ضرور ان کے اخبار کی سیل کو

دوگنا کرسکتی تھی کہ بیٹے نے ماں باپ کو قتل کرنے کے لیے اندھا دھند ان پر فائرنگ کرڈالی۔

جیسے ہی سفیان نے رعنا حیات پر فائر کھولا۔ پہلی دو گولیاں تو ان کے کندھے اور سینے میں لگیں۔ تیسری گولی چلنے سے پہلے جنتاں نہ جانے کہاں سے ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ تین گولیاں جنتاں کے سینے میں بھی اتریں۔ ایک گولی اس نے بے حد سفاکی سے فخر حیات کے سر میں ماری تھی رعنا جو تڑپ کر شوہر کے سامنے آئی تھی۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔

تینوں نا حال بے ہوش تھے جنتاں اور فخر حیات کی حالت بہت سیریس تھی اور بچنے کے چانسز بھی بے حد کم تھے۔ ابھی تو ڈاکٹرز نے رعنا کے بارے میں بھی تسلی نہیں دی تھی۔ اسے تو نروس بریک ڈاؤن بھی ہوا تھا ڈاکٹرز نے کہا تھا اگر اگلے دو گھنٹے تک اسے ہوش نہ آیا تو شاید وہ کومے میں چلی جائے۔

سیفی جاتے جاتے گیٹ پر کھڑے گارڈ کو بھی زخمی کر گیا تھا اور اب مفرور تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ حیات ولا کے باہر بھی پولیس کا سخت پہرہ تھا گھر کو سیل کردیا گیا تھا۔

"اگر فخر حیات یا جنتاں کو کچھ ہو گیا تو سیفی کا کیا بنے گا؟" نہیں سوچتے سوچتے جھرجھری سی آگئی۔

"اور رعنا؟"

"رعنا کو ہوش آگیا تو کیا میں اس سے نظریں ملا پاؤں گا' کبھی اس کے سامنے جا پاؤں گا میرے خدا!" وہ وہیں زمین پر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر اکڑوں بیٹھ گئے۔ پولیس اہلکار سپاٹ نظروں سے انھیں زمین پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو!" سیل فون کی بیپ بجنے پر نین تارا نے کسل مندی سے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ اسے کالام سوات سے آئے تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے مگر ابھی تک جیسے اس کی تھکان ہی نہیں اتر رہی تھی کچھ اس خوش گوار سفر کی حسین یادیں تھیں جنھیں سوچتے ہوئے اس کا جی چاہتا کوئی ان یادوں میں مخل نہ ہو اور وہ اکیلی پڑی ان خوشگوار لمحوں کو سوچتی جائے جن میں شاہ جی نے اپنی تمام تر محبت کا خزانہ اس پر خالی کردیا تھا شاید یوں اس پر "مہرباں" ہوں گے اس کا یقین تو اسے ابھی تک نہیں آرہا تھا اور اب وہ اکیلی بیٹھی سوتے جاگتے ان خوبصورت محبت بھرے لمحوں کا کوئی من چاہا جیتا جاگتا رزلٹ آنے کی خدا سے دعا کرتی رہتی تھی۔

شاہ جی اسے چھوڑ کر گاؤں چلے گئے تھے۔ جس دن گاؤں گئے تھے صرف اسی دن انھوں نے نین تارا کو فون کیا تھا۔ اس کے بعد چودہ دن بیت گئے نین تارا ان کے موبائل پر جب بھی کال کرتی وہ آف ملتا۔ حویلی فون کرنے کی شاہ جی نے اسے سختی سے ممانعت کر رکھی تھی اور آج کل وہ واقعی ان کے فون نہ کرنے پر کچھ پریشان سی ہو چلی تھی۔

"تم مجھ سے ابھی آدھے گھنٹے کے اندر ایئرپورٹ پر ملنے آسکتی ہو' وی آئی پی لاؤنج میں' میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" اس کا ہیلو سنتے ہی سلطان بخت نے کوئی بھی تمہید باندھے بغیر اسے جیسے حکم دیا۔

"خیریت شاہ جی! اور اتنے دن آپ نے مجھے فون بھی نہیں کیا۔ میں تو سخت فکرمند تھی کہ خدا خیر کرے۔" وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی ان کی آواز نے جیسے اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی۔

"نین تارا! یہ باتیں ملنے پر ہوں گی آسکتی ہو تو آجاؤ' پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا ایک گھنٹے بعد فلائٹ ہے میں تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔" کہتے ہوئے انھوں نے اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

"واہ شاہ جی! آپ بھی شاہ جی ہی ہیں۔ جب چاہا' جس کو چاہا' جس گھڑی چاہا کرنٹ لگا دیا' چاہے اگلے کا موڈ کرنٹ کھانے کا ہو یا نہ ہو۔" وہ کچھ تاسف سے سرہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھڑی پر نگاہ کی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے گویا سلطان بخت کی فلائٹ چھ بجے کی ہے اور اسے آدھے گھنٹے تک ایئرپورٹ پہنچنا ہے آدھے گھنٹے کا تو راستہ ہی ہے پھر اگر راستے میں ٹریفک زیادہ ہو تو دس پندرہ منٹ زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔ "اور کیا میں اس حلیے میں

اٹھ کر چل پڑوں۔" اس نے کچھ جھنجلا کر خود کو آئینے میں دیکھا پیچ کلر کا کاٹن چکن کا جدید تراش کا سلا ہوا سوٹ اس نے دوپہر میں ہی پہنا تھا اور ابھی بھی اس کی استری خراب نہیں ہوئی تھی۔

"چلے گا' یہی چلے گا۔" اس نے جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر اپنے بالوں میں چلایا' ہلکا پھلکا میک اپ کیا' سینڈل پہنی۔ شولڈر بیگ لے کر سن گلاسز پہنتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل آئی اس تیاری میں اسے بمشکل پانچ منٹ لگے تھے۔

"کہاں جارہی ہو؟ بخاری صاحب کی طرف نہیں جانا۔ چھ بجے ان کے ہاں ٹی پارٹی ہے۔" زیور گل لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔ اسے یوں تیزی سے باہر جاتے دیکھ کر فوراً بولی۔

"مام مجھے دیر ہو رہی ہے' میں ایک گھنٹے تک آجاؤں گی' وہ رکے بغیر تیزی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔ زیور گل اسے پکارتی ہی رہ گئی۔

شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی اس لیے ٹریفک بھی کچھ کم ہی تھا پھر بھی اسے ایئرپورٹ پہنچتے پہنچتے چالیس منٹ لگ گئے۔

"میں نے تم سے کہا تھا آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤ اور تم۔" سلطان بخت اسے دیکھتے ہی تیکھے لہجے میں بولے۔

"میرے کیا پر تھے جو اڑ کر۔" اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی وہ تو سلطان بخت کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی تھی۔ یہ وہ والے سلطان بخت تو نہیں تھے جو پندرہ دن قبل اسے گل کدے ڈراپ کر کے گئے تھے یہ تو اس خوش باش صحت مند وجیہہ سلطان بخت کا سایہ لگ رہے تھے۔

"آپ۔ آپ کو کیا ہوا شاہ جی؟" سفید بے داغ لٹھے کے کڑکڑاتے شلوار کرتے میں بھی وہ اچھے خاصے کمزور اور مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے رنگ بھی سنولایا ہوا تھا۔

"کیا ہوا مجھے؟" وہ کچھ پھیکی سی مسکراہٹ لیے بولے۔ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ۔ آپ بیمار ہیں؟" وہ دم بخود سی ان کا ہاتھ ہولے سے تھام کر بولی تو سلطان بخت اسے دیکھتے رہ گئے۔ چند لمحے کچھ بول ہی نہ سکے۔

"بتایئے نا۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے' کیا ہوا ہے آپ کو؟" وہ بے تابی سے ان پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

"نین تارا! اگر تم زیور گل کی بیٹی نہ ہوتیں تو زندگی بھر مجھے اپنے انتخاب پر فخر رہتا۔"

"کیا اب آپ مجھے منتخب کرنے پر شرمندہ ہیں؟" وہ ایک دم تلخی سے بولی۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

"ویسے یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔" کہتے ہوئے اس نے آہستگی سے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کے لیے ہاتھ میں پکڑے گلاسز آنکھوں پر لگانے لگی۔

"ٹھیک ہوں میں۔" وہ بھی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"شاید آپ نے مجھے کبھی دل سے اپنی بیوی سمجھا ہی نہیں۔ صرف محبوبہ ہی سمجھا۔

"بیوی تو تم میری ہو مگر محبوبہ واقعی زیادہ ہو خیر میرا دل تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاتا مگر جانا اچانک پڑا ہے اس لیے۔"

"کہاں جارہے ہیں؟"

"نیویارک۔"

"خیریت کیوں اچانک؟ پتا نہیں آپ جواب دینا پسند کریں گے بھی یا نہیں۔" وہ کچھ افسردگی سے بولی۔

"تم ہی تو ایک ہو جس سے میں اپنے دل کی ہر بات بے دھڑک کرلیتا ہوں۔ پھر بھی تمہیں میری محبت پر شک رہتا ہے۔"

انھوں نے کہتے ہوئے ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ نین تارا نے ان کے پاس دھرے بڑے سے سفری سوٹ کیس اور ایک خوب پھولے ہوئے لیدر بیگ کو دیکھا۔

"کتنے دنوں کا پروگرام ہے؟"

"تقریباً" تین ماہ کا۔"

"اتنے دن۔" نین تارا تڑپ کر بولی۔ "اتنے دن رہ لیں گے میرے بغیر؟"

"پتا نہیں۔" وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولے۔ "رہ نہ پایا تو جلدی آجاؤں گا۔"

"جانس لیے رہتے ہیں۔ بتاتے بھی نہیں۔" وہ کچھ جھنجلا کر بولی۔

"چیک اپ کے لیے۔"

"کیا چیک اپ۔۔۔" وہ بھونچکی رہ گئی۔

"تیرہ دن قبل اچانک اس دل بے قرار نے اچھی خاصی بے وفائی دکھائی تھی۔ اب اسی کے کان کھنچوانے جا رہا ہوں۔" وہ کچھ ہنس کر بولے نین تارا شاک کی حالت میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"ہارٹ پرابلم۔" وہ بڑبڑائی۔

"یس۔ میری زندگی کا اوٹ انگ بیمار دل۔"

"آپ نے مجھے خبر بھی نہ کی۔"

"میں خود اپنے آپ سے بے خبر تھا تو تمہیں۔"

"شاہ جی! میں اتنی غیر ہوں آپ کے لیے۔" وہ جیسے رونے کو تھی۔

"غیر سمجھتا تو ان آخری لمحات میں تم سے ملے بغیر بھی جا سکتا تھا۔"

"غیر ہی سمجھتے ہیں آپ مجھے۔" وہ تلخی سے بولی "کیا میں صرف آپ کی طرف سے بخشی گئی خوشیوں اور عنایات کی حق دار ہوں، آپ کے دکھ درد سے میرا کچھ واسطہ نہیں۔ آپ نے واقعی مجھے کال گرل سمجھا ہے شاہ جی اور کچھ نہیں۔"

"پلیز نین تارا! اس وقت کسی بھی تکلیف دہ موضوع کو نہ چھیڑنا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں غلط کہہ رہی ہو۔" وہ جیسے تھک کر بولے۔

"نہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ نے ہمیشہ مجھے اپنے سے الگ سمجھا۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"کیسے؟ کہہ ڈالو جو کہنا چاہتی ہو۔"

"آخر ایسا کیوں ہے شاہ جی! آپ سے متعلق انتہائی ضروری اور اہم خبریں مجھے ہمیشہ اخباروں کے ذریعے ہی ملتی ہیں۔" وہ کچھ دکھی ہو کر بولی۔

"صالحہ شاہ سے آپ کی شادی کی خبر بھی مجھے اخبار سے ملی اور شہرینہ کے گھر چھوڑنے کی بھی" اس کی بات پر سلطان بخت کے چہرے کا رنگ ایک ہی پل میں زرد ہو گیا اور آنکھیں جیسے پتھرا سی گئیں۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"یہ نام آئندہ کبھی تمہاری زبان پر آیا تو نین تارا! میں تمہاری زبان گدی سے کھنچوا دوں گا۔ تم نے صرف سلطان بخت کی محبت دیکھی ہے اس کا غصہ اور نفرت نہیں دیکھا، اور آئندہ کبھی یہ نام لے کر میرے غصے کو دعوت نہ دینا انڈر اسٹینڈ اب تم چلی جاؤ۔ ہو سکا تو تمہیں فون کرتا رہوں گا، خدا حافظ۔" وہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دور کھڑا ملازم انہیں یوں اٹھتے دیکھ کر تیزی سے لپکا اور دونوں ہاتھوں میں سامان اٹھا کر ان سے دو قدم آگے بڑھ گیا۔

"شاہ جی! شاہ جی! آئی ایم سوری۔ ریئلی سوری۔ پلیز یقین کرو آئندہ ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔ جو یوں آپ کو خفا کرے، یوں ناراض ہو کر مت جائیں۔ پلیز شاہ جی!" وہ تیز تیز چلتی ان کا بازو تھام کر بولی تو وہ اسے گھور کر دیکھنے لگے۔

"ٹھیک ہے۔ میں ناراض نہیں ہوں جاؤ اب فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے خدا حافظ اور ہاں۔۔۔"

وہ جاتے جاتے رکے اور ویسٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ چیک اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ تمہاری ضروریات کے لیے، اگر میں لیٹ ہو گیا یا کچھ کمی محسوس کرو تو مجھے فون کر کے بتا دینا۔" وہ نارمل لہجے میں بولے۔

اس نے مرے مرے ہاتھوں سے چیک کھول کر دیکھا۔ دو لاکھ کی رقم درج تھی۔

"شاہ جی! یہ میں نہیں لوں گی۔ کم از کم آج نہیں۔" وہ انہیں چیک لوٹاتے ہوئے بولی تو آنکھوں میں نمی تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے بولے۔ پہلی بار نین تارا نے ان سے رقم لینے سے انکار کیا تھا۔

"شاہ جی! اگر آج میں نے یہ چیک لے لیا تو مجھے لگے گا میں واقعی ایک کال گرل ہوں آپ کی بیوی نہیں۔ آپ جس سفر پر جا رہے ہیں میرا خدا آپ کو اس سے بخیریت لائے تو پھر میں آپ سے ڈبل رقم لوں گی، صرف آج اس لمحے مجھے ایک بیوی کی طرح آپ کو رخصت کر لینے دیجیے۔ پلیز شاہ جی!" وہ چیک ان کی مٹھی میں دباتے ہوئے رو پڑی۔

"نین تارا! میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا۔"

"شاہ جی! ہمیشہ سے آپ ہی دیتے رہے ہیں۔ آپ ہی دیں گے مگر آج نہیں۔ آج میں آپ سے کچھ نہیں لوں گی بلکہ آپ کو دوں گی۔ ڈھیر ساری دعائیں جو ایک بیوی دور دیس کے سفر پر جاتے ہوئے اپنے شوہر کو دیتی ہے۔ شاہ جی پلیز۔"

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ سلطان بخت حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس طرح تو صالحہ شاہ بھی نہیں روئی تھی، اس کا چہرہ ضرور دھواں دھواں ہو رہا تھا مگر نہ آنکھیں نم ہوئی تھیں نہ اس نے اپنی زبان کو کسی جذبے کے اظہار کی اجازت دی تھی۔

"اوکے ریلیکس، اور بہت شکریہ تمہاری دعاؤں کا، آج واقعی میں تم سے لینے کا حق دار ہوں، دینے کا نہیں۔ آج میں واقعی اقرار کرتا ہوں کہ تم ایک اچھی بیوی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا رویا رویا چہرہ دیکھ کر بولے۔

"تھینکس۔" وہ بھیگے چہرے کے ساتھ ہنسی تو سلطان بخت کو لگا اس سے زیادہ خوبصورت منظر ان کی آنکھوں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

"اب اس اقرار پر قائم رہیے گا۔ ہو سکتا ہے جلد ہی آپ کو یہ اقرار از سر نو ری وائنڈ کرنا پڑے پھر آپ نے منکر نہیں ہونا۔" وہ اب ٹشو سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ دودھیا رنگت میں سرخیاں سی گھل رہی تھیں۔

"کیا مطلب؟" وہ سمجھے نہیں۔

"جب واپس آئیں گے تو اس کا مطلب بھی سمجھا دوں گی۔ ابھی آپ جائیے اور پلیز شاہ جی! فون ضرور کرتے رہیے گا۔"

"اوکے ضرور فون کروں گا۔ اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔"

"آپ کو اللہ کی امان میں دیا اینڈ ٹیک کیئر اللہ حافظ۔" نین تارا نے ان کی آخری بھرپور الوداعی نظر کو اپنی نظروں میں جذب کیا اور ان کی چوڑی پشت کو بصارتوں سے اوجھل ہونے تک دیکھتی رہی اسے لگا وہ یکایک اتنے بڑے کمپاؤنڈ میں بالکل تنہا کھڑی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود، اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"کچھ پتا چلا اس عورت کا جو ارتضیٰ سے ملتی ہے؟" معاذ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو مسز خان نے اس سے پوچھا۔

"نہیں ام جان! میں نے بہت کوشش کی بلکہ اب میں سوچ رہا ہوں اسکول کی پرنسپل سے یہ معاملہ ڈسکس کروں۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"پرنسپل سے... کیا کہو گے؟" وہ اس پر نظریں جماتے ہوئے بولیں۔

"یہی کہ کوئی عورت... لیکن ارتضیٰ تو کہتا ہے کہ وہ فہد کی آنٹی ہے، جبکہ فہد کی گرینی کہتی ہیں کہ فہد کے ماں باپ نہیں ہیں اور وہ ان کے ساتھ ہی رہتا ہے تو پھر......" وہ جیسے خود الجھ گیا۔

"کبھی کبھی تو... " وہ رکیں۔ "مجھے لگتا ہے کیا پتا وہ نزہت ہی ہو۔" مسز خان کچھ دیر بعد جیسے خلا میں گھورتے ہوئے بولیں۔

"کیا بات کرتی ہیں آپ ام جان! آپی تو... نہیں وہ بھلا کیسے ہو سکتی ہیں جبکہ میں نے خود... نہیں نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ فہد کی کوئی جاننے والی خاتون ہوں گی اور اپنے بچے کو لینے آتی ہوں گی تو انہیں ارتضیٰ پر پیار آیا ہو گا بس اتنی سی بات ہے۔" اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی۔

"تم جو بھی کہو معاذ! مجھے یقین نہیں آتا کہ نزہت اس طرح..." وہ امید بھری نظروں سے معاذ کو دیکھنے لگیں۔

معاذ کا حوصلہ نہیں پڑا کہ وہ ان کی امیدوں کو جھٹلائے۔ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

"اچھا ہی ہوا جو بھی ہوا۔ اس بے چاری کے ساتھ اس گھر میں کیا سلوک ہو رہا تھا' پتا نہیں کبھی کبھی زندگی کسی انسان کے ساتھ اتنی سنگدل کیوں ہو جاتی ہے کہ ستم در ستم اور معافی کہیں بھی نہیں' ہم دکھ جھیلے ہیں"

مسز خان بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"اور ارتضیٰ تو ایسا بچہ ہے کہ کوئی پتھر بھی اسے دیکھے تو اس کی معصومیت پر پگھل جائے... بالا" انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"شہباز بھائی کا کوئی فون نہیں آیا؟" معاذ چند لمحوں بعد بولا۔

"اس سے بڑا پتھر بھی ہو گا کوئی زمانے میں۔" مسز خان تیزی سے بولیں۔ "اس شقی کا دل نہ تو بیوی کے لیے پگھل سکا' نہ ماں کے بڑھاپے اور بیماری پر اور نہ اس معصوم کے بچپنے پر' پتا نہیں اس لڑکے کو کیا ہو گیا۔ وہ تو بالکل بھی ایسا نہیں تھا۔ فضول سی ضد کے پیچھے اس نے تین زندگیاں دائمی دکھوں کے حوالے کر دیں۔ دن رات سوتے جاگتے دعا کرتی ہوں کہ میرے مولا اس کا دل خود بخود پھیر دے' اس کے ذہن پر لگے غلط فہمی اور رنجش کے جالے اتر جائیں' اسے خود ہی احساس ہو جائے کہ وہ کیا حماقت کیے جا رہا ہے۔ یہ تو انہونی دعا مگر دعا کا دوسرا نام ہی معجزہ ہے' جو بات ہمارے بس میں نہیں ہوتی۔ اسی کی دعا تو ہم خدا سے کرتے ہیں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ خدا میری یہ دعا رد نہیں کرے گا۔ ایک ماں کے دکھی دل کی دعا۔"

معاذ نے ان کے یقین بھرے لہجے پر دل میں زور سے آمین کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ وہ یقیناً دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔" وہ ہولے سے بولا۔

"تم نے اپنے کلینک کے لیے زمین پسند کر لی؟" چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا۔

"ام جان! میں ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر جانا چاہتا......"

"پلیز معاذ بیٹا! اگر شہباز میرے پاس ہوتا' نزہت — اتنی بڑی ذمہ داری میرے کندھوں پر نہ ڈال جاتی تو میں تمہیں کبھی نہ روکتی مگر اب سارے حالات تمہارے سامنے ہیں پھر بھی تم..."

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"زمین میں دیکھ رہا ہوں جیسے ہی کوئی جگہ پسند آئی آپ کو بتا دوں گا۔" وہ چند لمحے بعد بولا' مبادا مسز خان اس کی خاموشی کو اس کی خفگی نہ سمجھ لیں۔

"تم آج کل نائٹ شفٹ کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ ابھی تو مارننگ چل رہی ہے۔"

"تو پھر شام کو کدھر غائب ہوتے ہو۔"

"میں نے پروفیسر داؤد کا کلینک جوائن کر لیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا وہ شہر کے مشہور ترین کارڈیالوجسٹ ہیں۔ ان کے اسٹاف میں کام کرنا بھی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ وہ تو مجھے پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھے رکھ لیا۔ میں نے سوچا کہ ابھی باہر نہیں جا سکتا تو پروفیسر صاحب کے ساتھ مل کر کچھ تجربہ ہی حاصل کر لوں۔ میں نے ٹھیک کیا نا ام جان؟" اپنی بات مکمل کر کے اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ جوائن کرنے سے پہلے پوچھنا تھا نا۔" وہ مسکرائیں۔

"آپ کو اچھا نہیں لگا؟"

"اس طرح تم نے خود کو بہت مصروف کر لیا ہے۔ ابھی تمہارے کیمپ کی مصروفیات تمام نہیں ہوئیں کہ"

"میں گھر پر تو پورا پورا وقت دے رہا ہوں۔ ارتضیٰ کی اسٹڈیز بھی چیک کرتا رہتا ہوں' اور ام جان! اس فیلڈ میں تو جتنا انسان ان ٹچ رہے پریکٹس کرتا رہے۔ اتنا ہی اس کی مہارت میں نکھار آتا ہے۔"

"مگر تمہیں اپنے سے متعلقہ لوگوں کا بھی سوچنا چاہیے۔"

"میں نے کس کی حق تلفی کی ہے ام جان! میں تو..."

"مشی کل مجھ سے گلہ کر رہی تھی۔ پرسوں شام تم اس کے ساتھ باہر گئے تم دونوں میں پھر جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ سب کیا ہے معاذ؟" وہ تاسف بھرے لہجے میں پوچھنے لگیں۔

"ماں کا دل!" وہ جیسے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "ام جان! آپ کی یہ پوتی تو مجھے کوئی سائیکو کیس لگتی ہے۔" وہ چند لمحوں بعد بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ اسے گھور کر بولیں۔

"پرسوں ہم ڈنر کے لیے گئے تھے۔ آپ کہتی ہیں کہ مجھے کچھ وقت اسے بھی دینا چاہیے۔ ہم آواری کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے اندر جا رہے تھے کہ ایک لڑکی نے مجھ سے حفیظ سینٹر کا ایڈریس پوچھا۔ وہ چائنیز لگ رہی تھی' میں نے اسے ایڈریس سمجھایا۔ بس اس بات پر مشی کا پارہ ہائی ہو گیا کہ میں اس لڑکی کو ایڈریس نہیں سمجھا رہا تھا۔ بلکہ اس کا "امپرے" کر رہا تھا وہ تو وہیں مجھ سے تیز تیز بولنا شروع ہو گئی کہ میں اگر اس کے ساتھ باہر نکلتا ہوں تو اپنی نظروں کو کنٹرول میں رکھا کروں اور نہ جانے کیا کیا۔ ارد گرد کھڑے لوگ مجھے تمسخرانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے بلکہ کئی ایک کی نظروں سے تو صاف رحم ٹپک رہا تھا مت پوچھیں ام جان! اس اسٹوپڈ نے تو مجھے اپنی پراپرٹی سمجھ رکھا ہے۔ آپ اسے سمجھا لیں ورنہ پھر مجھے کچھ مت کہیے گا۔ میری برداشت کی بھی ایک حد ہے۔ میں نے آپ کو آج کچھ نہیں بتایا اور اس کی ڈھٹائی دیکھیں۔ غلط ہونے کے باوجود آپ کو سب کچھ بتا گئی معاف کیجیے گا ام جان! مجھے یہ گاڑی بہت دور تک چلتی نظر نہیں آ رہی۔ اس کی اور میری ذہنیت میں بہت فرق ہے' آپ پلیز پاپا تو اسے سمجھا لیں۔ جس کا شاید ہی کوئی فائدہ ہو یا پھر...... میں چلتا ہوں مجھے کلینک جانا ہے۔ رات کو دیر سے آؤں گا۔"

وہ تیز تیز کہتے ہوئے رکا نہیں اور مسز خان کچھ حیران سی اور کچھ تاسف زدہ اسے دیکھتی رہ گئیں' کوشش کے باوجود وہ اسے رکنے کا نہ کہہ سکیں۔

"شاید معاذ ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے اس معاملے پر از سر نو سوچنا چاہیے کہیں جانے بوجھتے میں پھر نزہت اور شہباز والی کہانی دہرا بیٹھوں۔" وہ خود سے کہتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو دو ہزار روپے۔" صوفی صاحب نے اماں جی کی طرف ہزار ہزار کے دو نوٹ بڑھائے۔

"یہ کس لیے؟" انہوں نے حیران ہوتے ہوئے نوٹ پکڑے۔

"ان سے زینب کے لیے ایک دو جوڑے اور ایک نذیر کے لیے اچھا سا مردانہ سوٹ لے آنا جا کر۔ میں اب دس پندرہ روز تک اس قرض سے فارغ ہو جانا چاہتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ اپنی داڑھی میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلانے لگے۔

"اتنی جلدی۔" اماں جی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یہ تمہارے لیے جلدی ہے رابعہ بی بی!" وہ ایک دم ان کی طرف دیکھ کر غرائے۔ "میں اپنے حساب سے پہلے ہی خاصی دیر کر چکا ہوں اور اس سے زیادہ دیر نہیں کر سکتا۔ نذیر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے اپنے گھر والوں کو خبر کرنے۔ پرسوں تک آجائے گا تو تاریخ رکھ لیں گے۔ ویسے بھی اس کا ٹرانسفر اسی گاؤں میں ہونے والا ہے۔ اگلے مہینے تک وہ ادھر ہی چلا جائے گا۔ بس اب تم مزید تاخیر کا مت سوچو۔ کل بازار جا کر ضرورت کی کچھ چیزیں لے آنا میرے پاس بس یہی پیسے ہیں اور کوئی توقع نہ رکھنا۔"

وہ تلخی سے کہتے ہوئے لیٹ گئے۔

"اور اس نواب زادی سے بھی کہہ دینا اپنا دماغ ٹھکانے پر لے آئے۔ بہت گستاخ ہو گئی ہے وہ بہت دنوں سے برداشت کر رہا ہوں میں۔" وہ درشتی سے بولے۔ "تمہاری طبیعت تو اب اچھی رہتی ہے نا؟" انہیں یکایک خیال آیا۔

"جی۔" وہ بہت آہستگی سے بولیں۔

"اچھا ڈاکٹر ہے یہ معاذ! ملنے جاؤں گا کسی دن اس سے کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"نذیر کا گھر بار خاندان وغیرہ میرا مطلب ہے آپ نے سب پتا کر لیا [illegible]" صوفی صاحب نے [illegible] گردن ٹیڑھی کر کے انہیں خشمگیں نگاہوں سے گھورا تو وہ جیسے گڑبڑا گئیں۔

"بیٹی کا معاملہ ہے نا۔" وہ نظریں نیچی کرتے ہوئے بولیں۔

"معلوم ہے مجھے۔ بچہ سمجھ رکھا ہے۔" ان کے منہ میں جیسے کونین گھلی ہوئی تھی۔ "ایک بوڑھی ماں ہی تو ہے اس کی بہن شادی شدہ کوئی لمبا چوڑا خاندان نہیں۔ تم یونہی فکروں میں [illegible] ہو ویسے بھی تمہاری صحت ان فضول فکروں کو پالنے کی اجازت نہیں دیتی۔" وہ کچھ طنز سے بولے۔

"اور آمنہ... آمنہ کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟ وہ بڑی ہے زینب سے پہلے اس کا..."

"اس کا بھی ہو جائے گا۔ وہ اس نالائق سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ مجھے اس لحاظ سے اس کی زیادہ فکر نہیں۔ بہرحال میں نے کہہ رکھا ہے آمنہ کا بھی۔" پھر رابعہ بی بی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر بولے۔ "غفور صاحب کے پچھلے پورشن میں جو ماں بیٹا آکر رہ رہے ہیں تمہیں معلوم ہے اس کے بارے میں؟ بڑی بھلی عورت ہے۔ گھر سے چہرہ ڈھانپ کر پردہ کر کے نکلتی ہے۔"

"کون... میں سمجھی نہیں؟"

"وہ ایک دو بار اپنے نواسے کے کپڑے بھی آمنہ سے سلوانے کے لیے لائی ہے۔ مجھے حاجی صاحب نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ ویسے تو اس کا بیٹا بھی اچھا ہے۔ خوش شکل ہے، تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ محکمہ جنگلات میں ملازم ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں، ویسے وہ عورت رشتے بھی کرواتی ہے۔ میں نے حاجی صاحب کے توسط سے آمنہ کے لیے کہلوایا ہے۔ اس نے بڑی امید دلائی ہے۔ ہفتہ دس دن میں شاید وہ کسی اچھے نیک شریف خاندان کے لڑکے کا رشتہ لے کر آئے گی۔"

دوسرے کمرے میں بیٹھی آمنہ اور زینب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"مجھے یاد آیا کلثوم بی بی نام ہے اس کا۔ اچھی عورت ہے۔ ملی ہے مجھ سے عیادت کو بھی آئی تھی میری جمعہ یہ

ہیں کون لوگ آپ نے پتا کروایا ہے؟" اماں جی کو وہ گوری صحت مند کلثوم بی بی یاد آگئی تھی جو بہت میٹھے لہجے میں بات کرتی تھی۔ اور پہلی ملاقات میں ہی مقابل کا دل موہ لیتی تھی۔

"لاہور سے آئے ہیں۔ وہیں اپنا ذاتی گھر بھی ہے۔ بیٹے کا ٹرانسفر ادھر ہوا ہے تو ادھر آگئے ہیں۔"

"پتا نہیں کیا لکھا ہے میرے بچوں کے نصیب میں۔ کسی کی بھی خوشی تو دیکھی نہیں ابھی تک۔ اللہ ہماری خطاؤں کو معاف کرنے والا ہے۔ وہ میرے بچوں پر رحم کرے۔" اماں جی نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صوفی صاحب بھی بمشکل سن پائے تھے۔ اماں جی نے آنکھیں موندیں تو وہ بھی خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔

"سن لیے تم نے اپنے والد محترم کے شاندار پلان ہمارے مستقبل کے بارے میں، جو ان کے تنگ ذہن نے ایجاد فرمائے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد زینب آمنہ سے بولی۔ آمنہ اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔

"تم نے میرا کام نہیں کیا نا۔ میں کل خود جاؤں گی تمہارے اسکول۔" وہ جیسے خود سے بولی۔

"تم کیا کرو گی اس مکار کا پتا لے کر۔"

"ایک ہی سوال بار بار۔ آمنہ! تم تو بہت کوڑھ مغز ہو۔" وہ تنک کر بولی "ملوں گی اس بے وفا سے جا کر اور کیا سر پھوڑوں گی اس کے گھر کی دیواروں سے ٹکرا کر۔"

"اگر اس نے [illegible] انکار کر دیا۔ پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تو کیا رہ جائے گا تمہارے پاس۔" آمنہ اس پر نظریں جما کر بولی۔

"مجھے تم سے ایسے ہی فضول خدشات کی توقع ہے۔ انسان کی اگر شکل اچھی نہ ہو تو منہ سے بات تو اچھی نکالے۔ وہ مجھے پہچاننے سے انکار کرے گا تو اپنی بدبختی کو دعوت دے گا، ویسے تم فکر نہ کرو یہ میرا ہیڈک ہے اور میں اس سے نپٹنا اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"زینب! وہ تمہیں دھوکا دے کر جا چکا ہے۔ تمہارے جذبات سے کھیل کر وہ اب تمہیں پہچانے گا بھی نہیں۔ [illegible] جس کے لیے تڑپ رہی ہو، اگر اس کے دل میں تمہارے لیے کچھ ہوتا تو وہ ضرور تم سے ایک بار تو رابطہ کرتا، اپنی مجبوری کی وضاحت کر دیتا جبکہ تم اتنی بار ان جگہوں پر بھی جا چکی ہو، جہاں وہ ملا کرتا تھا۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ وہ ایک دھوکے باز تھا۔" آمنہ زچ ہو کر بولی۔

"آگئی ہے ساری بات سمجھ آگئی ہے آمنہ! ایک بار صرف ایک بار مل کر اس کا سامنا کر کے میں حقیقت کو اپنی آنکھوں سے جانچ لینا چاہتی ہوں۔ ایک بار اس دل کی تسلی کے لیے۔ صرف ایک بار میں اس سے ملنا چاہتی ہوں، اگر یہ سب سچ نکلا تو پھر جو تم کہو، جو بابا صاحب کہیں، زینب اف نہیں کرے گی۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

"بہت ضدی ہو زینب!" آمنہ دھیرے سے بولی۔

"چائے۔" جویریہ نے دونوں کے مگ ان کے سامنے لا کر رکھے "باہر اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ کالے سیاہ بادل آئے ہوئے ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور بوندیں بھی پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔" جویریہ نے ان دونوں کو اطلاع فراہم کی۔

"تو؟" زینب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر دیکھا۔ "جاؤ جا کر چھت پر آزادانہ بھیگو، گاؤ، ناچو، خوش ہو پھر دیکھنا بابا صاحب کیسے ٹانگیں توڑ کر تمہارے خوبصورت ہاتھوں میں تھماتے ہیں۔"

"آپ تو پاگل ہی ہو گئی ہیں چھوٹی آپی!" جویریہ کہتے ہوئے تیزی سے اپنا مگ لے کر باہر نکل گئی۔

"زینب! اس سے ایسے مت بولا کرو وہ تو خود بہت چپ چپ سی ہو گئی ہے۔ بابا صاحب کی غلط فہمی نے اس سے اس کا بچپن چھین لیا ہے پھر ہمارے گھر کے حالات پہلے کون سے اتنے خوشگوار ہیں، جو ہم یوں ایک دوسرے کو بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑیں۔" آمنہ نے اسے سمجھایا۔

"ہمارے حالات تو پیدائشی ایسے ہیں اور ایسے ہی رہیں گے مرتے دم تک۔"

اس نے مگ اٹھا کر لبوں سے لگالیا' تیز گرم چائے نے اس کا منہ جلا ڈالا مگر اس نے سی بھی نہیں کی۔
"میں رعنا حیات کا ایڈریس لے آئی تھی آج۔" آمنہ چند لمحوں بعد بولی۔
"کیا؟ کیا واقعی؟" زینب خوشی سے یوں اچھلی جیسے اسے سیفی مل گیا ہو۔
"ہاں' اب کیا کرو گی؟" آمنہ اس کے پرجوش چہرے کو دیکھ کر رسان سے بولی۔
"کل صبح دس بجے تک چلیں گے۔ بابا صاحب کے اوپر آنے سے پہلے واپس آجائیں گے' ٹھیک ہے نا۔ میں صبح تمہارے ساتھ ہی نکل جاؤں گی کہہ دینا اسکول میں کسی فنکشن کی تیاری ہو رہی ہے اس سلسلے میں مجھے بھی ساتھ لے کر جارہی ہو۔"
زینب نے جلدی جلدی خود ہی سارا پلان تیار کرلیا۔
"میں... میں تمہارے ساتھ جاؤں گی؟" آمنہ حیرت سے بولی۔
"تو کیا میں اکیلی جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔" وہ رعب سے بولی تو آمنہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
اگلی صبح وہ آمنہ سے بھی پہلے تیار ہو چکی تھی۔
"آمنہ کے اسکول میں فنکشن ہے۔ اسی لیے تو یہ دیر سے جارہی ہے میں بھی اس کے ساتھ جارہی ہوں۔ گھر میں بیٹھ بیٹھ کر بور ہو گئی ہوں۔"
جویریہ نے اس سے پوچھا بھی نہیں تھا وہ تو کل سے اس سے ناراض تھی اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی۔ زینب خود ہی وضاحت کرنے لگی جویریہ نے جواباً کچھ نہیں کہا' خاموشی سے برتن دھوتی رہی۔
وہ دونوں گھر سے ساڑھے نو بجے نکلی تھیں۔ اس وقت صوفی صاحب کسی اور مدرسے میں بچوں کو قرآن پاک پڑھانے جاتے تھے۔
"زینب! موسم کے تیور بھی ٹھیک نہیں لگ رہے اور ہم اتنی دور جارہے ہیں بالکل اجنبی راستوں پر۔ اب بھی آسمان پر بادل ہیں رات بھر بھی وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی' مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"
"کچھ نہیں ہوتا اب گھر سے نکل پڑے ہیں واپس تو نہیں جاسکتے اور ویسے بھی ہمیں کون سا پیدل جانا ہے ویگن میں بیٹھیں گے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک پہنچ بھی جائیں گے۔ اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے۔" آمنہ کو وہ آج پہلے والی زینب لگ رہی تھی نڈر اور پرجوش۔
دونوں بمشکل ویگن میں سوار ہوئیں۔ ویگن پہلے ہی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی انہیں بمشکل آخری سیٹ پر ذرا سی جگہ ملی تھی دونوں تقریباً ایک دوسرے کی گود میں سوار ہو کر بیٹھی تھیں۔ آمنہ تو دل میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی تھی۔ بار بار نقاب درست کرتی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے جبکہ زینب تو گردوپیش سے بے خبر سیفی کی یادوں میں گم ہو چلی تھی۔ ویگن جگہ جگہ رکتی رہی بھانت بھانت کے مسافر چڑھتے اترتے رہے وہ دونوں سکڑی سمٹی کونے میں بیٹھی تھیں پہلی بار تو دونوں اس طرح گھر سے نکلی تھیں اگر کسی نے دیکھ لیا' کوئی مل گیا تو...
آمنہ بار بار خوفزدہ ہو کر زینب سے ان خدشوں کا اظہار کرتی رہی مگر زینب کو تو جیسے کسی بھی بات کا ڈر نہیں تھا۔
خدا خدا کر کے ویگن کا سفر تمام ہوا۔
رکشے نے انہیں "حیات ولا" سے تھوڑا پہلے ہی اتار دیا تھا۔
"آپ کو کہاں جانا ہے جی!" رکشے والے نے تیسری دفعہ پوچھا۔
"حیات ولا' بتایا تو ہے۔" زینب نے اونچی آواز میں جواب دیا تو رکشے والے نے گردن گھما کر دونوں کو کچھ عجیب نظروں سے دیکھا۔
"وہ سامنے جو سفید گیٹ والی بڑی سی کوٹھی نظر آرہی ہے وہی "حیات ولا" ہے۔ آپ چلی جایئے۔" اس نے رکشے کا انجن بند نہیں کیا تھا۔
"تو تم آگے لے جاؤ۔ پیسے بھی تو پورے لے رہے ہو۔" زینب اڑ کر بولی۔

"زینب! اتر جاؤ یہیں' بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دو قدم تو ہیں۔" آمنہ نے اس کا ہاتھ دبایا اور کہتے ہوئے نیچے اتر گئی۔ رکشے والے کو پیسے دے کر دونوں کوٹھی کی طرف بڑھیں۔ آسمان پر بادل گھرے ہو چکے تھے' دوپہر میں شام کا سماں لگ رہا تھا۔
"کتنی خوبصورت' کتنی بڑی کوٹھی ہے۔ بالکل بالکل..." زینب سحر زدہ سی سر اٹھا کر کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"بالکل تمہارے خوابوں جیسی' ہے نا؟" آمنہ طنزاً بولی۔
"کبھی کبھی خواب سچے بھی تو ہو جاتے ہیں آمنہ!" وہ اب بھی پرامید تھی جیسے گیٹ کھلتے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔
"یہ احمقانہ سوچ صرف خوابوں میں رہنے والوں کی ہی ہو سکتی ہے ورنہ حقیقت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے اور پلیز تھوڑا تیز چلو ابھی ہمیں واپس بھی جانا ہے' موسم کے تیور بھی ٹھیک نہیں لگ رہے۔" اس نے کہتے ہوئے قدم تیز کرلیے تھے۔
"دیکھیں یہ رعنا حیات صاحبہ کا ہی گھر ہے نا؟" کوٹھی کے قریب پہنچ کر اس نے گیٹ کی طرف سے آتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔
"جی مگر آپ کون ہیں؟" وہ شخص دونوں کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔
"ہمیں سفیان صاحب سے ملنا ہے' وہ اندر ہی ہیں نا۔" زینب جلدی سے بولی۔
"وہ تو..." وہ آدمی کہتے کہتے رکا وہ ان دونوں کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ آمنہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں جلدی سے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ دھک سے رہ گئی۔ اس طرف تو دونوں کا دھیان ہی نہیں گیا تھا' کوٹھی کے اردگرد پولیس موجود تھی اور سڑک کے دوسری طرف بھی پولیس کی اچھی خاصی نفری موجود تھی۔
"یہاں پولیس کس لیے ہے؟" آمنہ نے گھبرا کر پوچھا۔
"آپ دونوں سفیان صاحب کو کیسے جانتی ہیں؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا آمنہ کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔
"نن... نہیں ہم تو نہیں جانتے۔ چلو زینب!" آمنہ نے زینب کا ہاتھ زور سے پکڑا اور پیچھے مڑی۔
"کیا کرتی ہو۔ اندر تو جانے دو' مجھے سیفی سے ملنا ہے۔" زینب اس کے یوں پلٹنے پر جھنجلا گئی۔
"چلو تم..." آمنہ نیچی آواز میں غرائی تو زینب چل پڑی۔
"کون ہیں یہ دونوں نقاب پوش لڑکیاں؟" اسے اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی' جو یقیناً کسی پولیس مین کی تھی۔
"جناب! وہ سیفی صاحب کو پوچھ رہی تھیں۔" اس آدمی نے جواب دیا۔
"کیا؟ روکو ان کو... ارے جو حرام زادہ اپنے ماں باپ پر گولی چلا سکتا ہے اس کی تو ایسی بہت سی معشوقائیں ہوں گی۔ ان سے ہمیں اس کے بارے میں بہت سے کلیو مل سکتے ہیں۔ پکڑو انہیں جانے نہ دینا۔"
اس کی تیز آواز پر آمنہ اور زینب کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔
"زینب دوڑو۔" آمنہ نے کہا اور دونوں تیزی سے بھاگنے لگیں' انہیں اپنے پیچھے ——— بھاری بوٹوں کے لمحہ بہ لمحہ قریب آنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
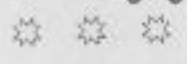
"جی میں شہباز خان ہوں آپ کون؟" شہباز خان نے مڑ کر پکارنے والی اس خاتون کو دیکھا' جو حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔
"آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟"

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔

"نزہت آپ کے ساتھ نہیں؟" اس نے ان کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ بے تکلفی سے پوچھا۔

"نہیں۔" "نہیں اس کا سوال بہت تکلیف دہ لگا۔

"کیوں؟" وہ جرح والے انداز میں بولی۔

"کیوں کا مطلب تو محترم خاتون لڑائی ہوتا ہے۔" وہ کچھ تلخی سے بولے تو اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "نزہت پاکستان میں ہے۔ میں ادھر اکیلا آیا تھا' ویسے میں کل واپس جا رہا ہوں پاکستان۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

"سوری آپ کو برا لگا۔ اصل میں شہباز بھائی! آپ مجھ سے صرف ایک بار ملے تھے وہ بھی نزہت کی منگنی والے دن اور یہ بات یقیناً بہت پرانی ہے۔ میرا نام راحیلہ ہے میں نزہت کی اکلوتی بیسٹ فرینڈ ہوں۔ نزہت کیسی ہے؟" وہ بہت جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"ٹھیک۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" وہ اس کے سوال کو ٹال گئے۔

"اس کے ساتھ جو کچھ اس کی بھابی ریشم نے کیا اس کی سزا تو قدرت کی طرف سے اس ظالم عورت کو مل ہی گئی' مگر مجھے بہت عرصے تک اس بات کا قلق رہا کہ میں مشکل پڑنے پر نزہت کی ٹھیک طرح سے مدد نہیں کر سکی۔ اصل میں' میں بھی مجبور تھی اور اسی مجبوری میں' میں نے اسے لاہور کے لیے کوچ میں بٹھایا اور بعد میں اس کا پتا بھی نہیں کر سکی کہ آیا وہ صحیح جگہ پہنچ گئی ہے یا نہیں۔ مگر میں نے اس کے لیے بہت دعا کی تھی اور مجھے یقین تھا آپ اور اس کی پھپھو جس قدر اچھے اور اس پر مہربان ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں' آپ نے یقیناً کھلے دل سے اس کی ناکردہ خطا کو نظرانداز کر دیا ہوگا اور۔۔۔۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کہیں بیٹھ کر باتیں کر لیں۔" شہباز خان کو اسے ٹوکنا پڑا۔

"اوہ سوری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" وہ ایک بار پھر شرمندہ ہو گئی تھی۔ "ویسے اس وقت نہیں۔ میرے ہسبینڈ باہر گاڑی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ یہ میرا ایڈریس رکھیں۔ آپ کل شام کو مجھ سے ملنے آ سکتے ہیں۔" اس نے اپنے پرس سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر انہیں تھمایا۔

"سوری' کل شام کو تو میری فلائٹ ہے واپسی کی۔" انہوں نے کارڈ پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

"اوہ!" وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی "اصل میں مجھے آپ سے کسی کو ملوانا تھا۔ بہت ضروری۔ نزہت ہوتی تو زیادہ اچھا تھا بہرحال۔" وہ رکی۔

"کل کس وقت آپ میری طرف آ سکتے ہیں؟" اس نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"آپ کو کچھ کہنا ہے تو ابھی کہہ ڈالیں یا میں گھر جا کر آپ کو موبائل پر رنگ کر لیتا ہوں۔"

"نہیں' یہ بات نہیں۔ مجھے آپ سے کسی کو ملوانا ہے' بہت ضروری۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اوکے۔ میں کل صبح نو بجے آپ سے ملنے آ جاؤں گا۔" وہ جان چھڑانے کو بولے۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کا ویٹ کروں گی۔ شہباز بھائی! آپ کا اس شخص سے ملنا بہت ضروری ہے۔ آپ کے لیے شاید نہ ہو مگر اس کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں نا؟" وہ آہستگی سے بولی تو انہوں نے سر ہلا دیا چند لمحوں بعد وہ انہیں اللہ حافظ کہہ کر جا چکی تھی۔

"آخر ایسا کون سا شخص ہے' جو مجھ سے ملنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے اپنا سامان لے کر شاپنگ سینٹر سے باہر آ گئے۔

ایک نئی الجھن۔" وہ سوچوں میں گھرے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔

• • • • • •

"زینب! تیز بھاگو۔" آمنہ نے اس کا ہاتھ خوب مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ تیز دوڑتے ہوئے پھولے سانسوں کے درمیان وہ بولی۔ دونوں نے اندھا دھند بھاگتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے سڑک سنسان تھی' بھاگتے بھاری قدموں کی آواز تو آ رہی تھی مگر پچھلے موڑ سے۔ دائیں طرف ایک خوبصورت کوٹھی کا گیٹ انہیں کھلا نظر آیا۔

"ابھی اس کوٹھی میں نہ چھپ جائیں۔" آمنہ نے جلدی سے کہا۔

"وہ آ رہے ہیں' پکڑ لیں گے۔" زینب سخت خوف زدہ ہو رہی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

"ہم بہت زیادہ نہیں بھاگ سکتے اور آگے دور تک کوئی موڑ بھی نظر نہیں آ رہا۔ چلو۔"

آمنہ نے کہا اور اس کا ہاتھ اسی طرح پکڑے کھلے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ گیٹ کے دونوں اطراف کے وسیع ہرے بھرے لان ویران پڑے تھے۔ سامنے کوٹھی کی عمارت کے دروازوں میں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ آمنہ نے جلدی سے مڑ کر گیٹ بند کر کے اس کا لاک لگا دیا۔ زینب تو اب باقاعدہ کانپ رہی تھی' دونوں ڈرتے ڈرتے اندر کی طرف بڑھیں۔

"دیکھو ان دونوں کو' ادھر ہی ہوں گی۔ کسی کوٹھی میں نہ گھس گئی ہوں۔" باہر سے انہیں بلند آواز آئی تھی۔ دونوں نے دوڑ کر سامنے نظر آتا پہلا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئیں۔

"اے کون ہو تم دونوں؟" باہر رو تخص سے اندر آئی تھیں۔ فوری طور پر کچھ نظر نہیں آ سکا تھا۔ بائیں طرف سے آنے والی کڑک دار آواز پر دونوں اچھل ہی پڑیں۔ سر گھما کر آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگیں۔

"کون ہو دونوں چورنیاں' ڈاکا ڈالنے آئی ہو؟" ملازموں جیسے حلیے کا درمیانی عمر کا منحنی سا شخص کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔ زینب تھوڑا سا آمنہ کے پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس پر خوف سے لرزہ سا طاری تھا۔ ساری بہادری ہوا ہو چکی تھی۔

"بولتیں نہیں' گونگی ہو کیا؟"

وہ پھر گرجا۔ "دبلے پتلے جسم میں بلا کا ایئر کرافٹ ہے۔" آمنہ نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔

"تمیز سے بات کرو' ہم تمہارے صاحب سے ملنے آئے ہیں' ان کی کزن ہیں۔ انہیں اطلاع کرو جا کر۔" آمنہ اس سے زیادہ بارعب اور بلند آواز میں بولی۔

"صا۔۔۔ صاحب کی کزنیں۔۔۔" وہ کچھ گڑبڑایا پھر مشکوک نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"کون سی کزنیں؟" اب کے اس کا لہجہ کچھ پست سا تھا۔

"صاحب کے رشتہ داروں کا حساب کتاب کیا تمہارے پاس ہے جو تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ جاؤ جا کر اطلاع کرو' ان کے چچا کی بیٹیاں۔۔۔ شیخوپورہ سے آئی ہیں۔" جلدی میں آمنہ کے منہ سے یہی کچھ نکل سکا تھا۔ وہ مشکوک نظروں سے پہلے تو انہیں کھڑا گھورتا رہا پھر باول نخواستہ چل ہی پڑا۔

"دونوں یہاں سے ہلنا نہیں' میں اطلاع کر کے آتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ دونوں۔" وہ جاتے جاتے انہیں تنبیہہ کر کے بولا تو آمنہ نے زینب کو دو قدم پرے پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔" زینب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پھنسی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب تو جو بھی مصیبت آئے گی' وہ تمہاری ہی بلائی ہوئی ہے۔" آمنہ چیخ کر بولی۔

"صاحب جی!" ملازم نے عبدالمبین کے کمرے کا بند دروازہ ہولے سے بجایا۔

"کیا تکلیف ہے؟" وہ اندر سے چلایا۔

"جی وہ آپ کی کوئی مہمان آئی ہیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کمرے کے دروازے سے ذرا سا اندر ہو کر کہا۔

عبدالمبین اپنے بیڈ پر بیٹھا تھا بائیں بازو کی آستین فولڈ کیے سرنج میں کوئی دوائی بھر کر دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ وہ ملازم کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

”کون سی مہمان۔۔۔ میں نے تم سے بکواس کی تھی کہ تین گھنٹے مجھے بالکل ڈسٹرب نہ کرنا۔“ وہ اب آنکھیں بند کیے سرنج کی سوئی بائیں بازو کے گوشت میں کھونپے کچھ آہستگی سے بولا۔ ملازم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے مالک کو دیکھ رہا تھا۔

”صاحب۔۔۔ جی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔“ وہ پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔

”تمہیں اس سے مطلب اور دفع ہو جاؤ جو بھی ہے کہہ دو۔ مجھے اس وقت کسی سے نہیں ملنا‘ شام کو آئے۔“ اس نے خالی سرنج کھینچ کر باہر نکالی۔ سوئی والی جگہ کو ہاتھ سے ہلکا سا سہلایا۔ سرنج بیڈ کے پاس پڑی باسکٹ میں پھینکی اور خود ٹانگیں پھیلا کر بیڈ کے کراؤن سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

”وہ جی کہہ رہی ہیں‘ آپ کے چچا کی بیٹیاں ہیں۔۔۔ ش۔۔۔ شیخوپورہ سے آئی ہیں۔“ وہ پھر بھی نہیں ٹلا۔ اسے ادھر ملازمت کرتے ابھی ایک ماہ ہوا تھا‘ صاحب کی ہر قسم کے نشے کے استعمال کی کھلی ڈلی عادت کے بارے میں تو اس نے آتے ہی باقی ملازمین سے سن لیا تھا مگر ملاحظہ کرنے کا حسین اتفاق آج ہوا تھا۔ اس کے لیے تو سارا منظر ہی انوکھا تھا۔

”اوئے گدھے‘ الّو‘ لیچڑ! تو دفع ہوتا ہے کہ نہیں۔۔۔ نہ میرا کوئی باپ‘ نہ چچا‘ نہ تایا تو ان کی بیٹیاں کہاں سے اگ آئیں۔ جا میرا دماغ نہ خراب کر۔ مجھے سکون لینے دے تین چار گھنٹے۔ رات کو پھر میرا شو ہے‘ مجھے کچھ ریسٹ کر لینے دو۔ اب کوئی میرے کمرے میں نہ آئے‘ ورنہ میں اس کا سر پھاڑ دوں گا۔۔۔ سمجھے۔“ اس نے واقعی سر پھاڑنے کے لیے کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں گھمائیں تو ملازم الٹے قدموں نکلتے ہوئے دروازہ بند کر کے دوڑ گیا۔

”پاگل کا پتر‘ میرے چاچے کی بیٹیاں شیخوپورہ سے۔۔۔“ وہ سر تکیے پر ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”شیخوپورہ سے۔۔۔“ نیند میں ڈوبتا اس کا ذہن ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ وہ کتنے دنوں سے میں نے شہر پتا نہیں کیا‘ کہیں کوئی۔۔۔ اس سے زیادہ اس کا میٹھی نیند کی وادی میں اترتا ذہن کچھ سوچنے نہ دے رہا تھا۔

”شہرینہ کے واقعے نے ہر چیز‘ ہر منظر گم۔۔۔ گم۔۔۔ کھو گیا ہے۔“ اس کے بڑبڑاتے ہونٹ ہلتے رہ گئے۔ وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے زینب! بخیریت نکل آئے۔“ دونوں ویگن کی سیٹ پر بیٹھیں تو آمنہ نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں!“ زینب نے دھیرے سے کہا۔ ویگن چل پڑی تھی۔ کھچا کھچ بھری ویگن میں لوگ مرغوں کی طرح سر نیہوڑائے کھڑے بیٹھے تھے۔ باہر سڑکوں پر بھی سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے تو اتنی خلقت بھی پہلی بار دیکھی تھی۔ شام ہونے کو تھی اور بادل برسنے کو تیار‘ ہر کسی کو اپنے ٹھکانے پر جلد پہنچ جانے کی فکر تھی اسی لیے ٹریفک کا رش بھی بڑھ گیا تھا۔

”زینی! مجھے وہاں اس شاندار کوٹھی میں بیٹھے ایک عجیب سا خیال آیا تھا۔“ آمنہ پھر بولی۔ زینب نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”یہاں دونوں بھائی شہر میں ہیں اور سنا ہے‘ دونوں ہی بڑی شاندار کوٹھیوں میں رہ رہے ہیں۔ کیا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم جس کوٹھی میں پناہ لینے کے لیے پہنچی تھیں‘ وہ عبدالمتین کی ہو یا۔۔۔ عبدالمبین کی۔۔۔ ہے نا۔ ہو سکتا ہے نا۔“ آمنہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے زینب کی طرف دیکھا۔

”پتا نہیں۔“ زینب نے رکھائی سے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”ہاں‘ واقعی پتا نہیں۔ ایسے بھی بھائی ہوتے ہیں۔۔۔ بے حس‘ بے خبر‘ بے پتا۔“ آمنہ نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ ویگن کی کھڑکی کے شیشے پر پانی کی دو تین بوندیں پھسلیں۔

”دیکھ لیا‘ پتا چل گیا‘ کتنا خبیث نکلا وہ تمہارا سیفی۔ جو شخص اپنے ماں باپ سے وفا نہیں کر سکا‘ ان پر بندوق تان سکتا ہے‘ وہ تمہارے ساتھ سوچو کیا سلوک کرتا اور تم پاگلوں کی طرح اس کی تلاش میں کہاں تک نکل

آئیں۔ ہمارے گھر تو اخبار بھی نہیں آتا‘ ورنہ اس خبیث کا کچا چٹھا تو پہلے ہی معلوم ہو جاتا۔ ہم اس طرح گھر سے ہی نہ نکلتیں۔ زینب! اگر ہم دونوں خدانخواستہ پکڑی جاتیں‘ جس میں کچھ کسر بھی نہیں رہ گئی تھی تو سوچو‘ ہمارا کیا حال ہوتا۔“

”تم نے آج مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اب دعا کرو گھر پہ بابا صاحب نہ ہوں اور اللہ کرے بارش بھی تیز نہ ہو‘ ورنہ آج سے بر اون بھی ہماری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔“ آمنہ پھر بولی۔

زینب نے پھر کچھ جواب نہیں دیا۔ اس پر تو جیسے موت کے گہرے سناٹے چھا رہے تھے۔

• • •

”آخر آپ مجھے کہاں لے کر جانا چاہتی ہیں۔“ شہباز خان نے راحیلہ سے اس سفر کے دوران تیسری بار پوچھا تھا‘ وہ بڑی مہارت سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گاڑی ایک بڑی سی بلڈنگ کے گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

”لیجیے‘ آگئی ہماری منزل۔“ اس نے گاڑی پارکنگ ایریا میں کھڑی کی۔ شہباز خان نے سر اٹھا کر بلڈنگ کا سر نیم پڑھا۔ ”ایڈز سینٹر“ بہت بڑا بڑا لکھا تھا‘ ان کی الجھن اور سوا ہو گئی۔

”ہماری منزل۔“ وہ بڑبڑائے۔

”آئیے پلیز۔“ وہ ان سے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ مختلف دروازوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے دونوں سفید دروازوں کی ایک قطار کی طرف بڑھے۔

”آپ نے چند سال پہلے اخباروں میں اس قتل کی خبر کے بارے میں شاید پڑھا ہو گا‘ جس میں سہیل نامی ایک شخص نے اپنی اوباش بیوی ریشم کو اس کے آشنا کے ہمراہ نازیبا حالت میں دیکھ کر گولی ماردی تھی اور خود بیرون ملک فرار ہو گیا تھا۔“ ایک سفید دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر راحیلہ نے میکانکی انداز میں بتایا۔

”کیا؟“ شہباز خان کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔

اس برآمدے میں داخل ہوتے ہی دونوں نے لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنے جوتے پہلے ہی اتار دیے تھے اور وہاں مہیا کردہ سلیپرز پہن لیے تھے۔ راحیلہ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ہولے سے دروازہ بجایا۔

”لیں!“ چند لمحوں بعد بہت مدھم آواز آئی تھی۔ دونوں آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹا سا مربع شکل کا کمرہ تھا جیسا ہسپتالوں میں ہوتا ہے۔ سینٹر میں ایک بیڈ لگا تھا۔ بیڈ کے دونوں اطراف دوائیوں کے ریک رکھے تھے۔ کمرے میں بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی وغیرہ بھی نہیں پڑی تھی۔ سامنے کی کھڑکی میں لگا سفید جالی کا مہین پردہ کھلی کھڑکی سے آتی نرم ہوا کے جھونکوں سے سرسرا رہا تھا۔ شہباز خان کی نظریں کھڑکی سے ہوتی ہوئی سیدھی بیڈ پر آٹھہری تھیں۔ بیڈ پر ایک نیم مردہ ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ پہلی نظر میں وہ شہباز خان کو کوئی مردہ ہی لگا تھا۔

راحیلہ دو قدم بڑھا کر بیڈ کے پاس جا پہنچی تھی۔ شہباز خان نے آہستگی سے ایک قدم بڑھایا۔

”السلام علیکم سہیل بھائی! میں راحیلہ ہوں‘ نزہت کی دوست۔ آپ سے پہلے بھی ملنے آئی تھی‘ آپ کو یاد ہے؟“

وہ ذرا سا جھک کر نرمی سے کہہ رہی تھی۔ شہباز خان کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا‘ وہ تیزی سے آگے بڑھے اور بغور دیکھنے پر بھی انہیں فوری طور پر محسوس نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ سہیل ہے۔ اس کی آنکھوں کی جگہ دو اندھے گڑھے نظر آرہے تھے‘ جنہیں دیکھ کر بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں‘ گردن اور دونوں استخوانی ہاتھ بھی بالکل سیاہ مٹیالی رنگت کے ہو رہے تھے۔ راحیلہ کی بات کے جواب میں اس نے کچھ کہا نہیں‘ بس آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

”سہیل بھائی! ان کو پہچانا آپ نے؟“

وہ مڑ کر شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ سہیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں بھی شہباز کو نہیں لگ رہا تھا‘ ان اندھے گڑھوں میں نور کی کوئی بھی کرن بچی ہو گی۔

"ش... شہباز خان... ہے نا؟" چند لمحوں کی مہیب خاموشی کے بعد سہیل کی بے حد نحیف کمزور آواز جیسے کسی خالی برتن سے برآمد ہوئی تھی۔ شہباز خان حیرت سے آگے بڑھے۔

"سہیل... سہیل! تمہارا یہ حال... تم یہاں کیسے...؟" وہ اس پر ذرا سا جھک کر بولے۔ سہیل نے بدقت تمام اپنا استخوانی ہاتھ اٹھایا اور اس کی شہادت کی انگلی سے اوپر چھت کی طرف اشارہ کیا۔

"جو لوگ... اللہ کی زمین... پر بہت اکڑ اکڑ... کر... چلتے ہیں' ان کا حال میرے... میرے... جیسا ہوتا ہے اور... میری موت کا فرشتہ تو یہاں موجود تھا... اس لیے مجھے یہیں آنا پڑا' اپنی خوف ناک موت کو گلے لگانے..." وہ بولتے بولتے ہانپنے لگا۔

"شہباز بھائی! اگر آپ ان کی چادر گردن سے نیچے ہٹا کر دیکھیں تو شاید آپ چیخیں مارتے ادھر سے بھاگ جائیں۔ بہت اذیت' بہت تکلیف میں ہیں یہ۔ میں ادھر اپنے ایک سسرالی عزیز کو دیکھنے آئی تھی تو انہیں باہر لان میں نرس کے ہمراہ دیکھا۔ میں تو شاید انہیں نہ پہچانتی' انہوں نے مجھے پہچان لیا اور آپ سے اور نزہت سے ملنے کی التجا کی تھی۔ نزہت تو مجھے نہ مل سکی' میرا اس سے رابطہ بھی نہیں تھا' پاکستان ابھی میرا جانا ممکن نہیں تھا۔ شکر ہے آپ مل گئے۔ ہو سکتا ہے۔ آپ سے ملنے کے بعد ان کو جان کنی کے اس عذاب سے نجات مل سکے۔"

راحیلہ بہت آہستگی سے انہیں تفصیل سے آگاہ کر رہی تھی۔

"شہباز! تم بہت... لکی ہو۔ زمین پر ہی تمہیں... جنت... جنت کا تحفہ ملا۔ ایک باکردار پاکیزہ بیوی..." سہیل اٹک اٹک کر بولا۔ "اور میں بہت بدنصیب... میں نے اپنی معصوم بے حیا بہن پر اس... اس بازاری عورت کے کہنے میں آکر... اسے گندے الزامات کی دلدل میں دھکیل دیا۔"

بولتے بولتے اس کی آواز ڈوب گئی۔ کتنے لمحے اس کے بعد بے جان خاموشی کی نذر ہو گئے۔ سہیل کی سانسوں کا زیروبم بتا رہا تھا' وہ اگلے جملوں کے لیے اپنے ناتواں جسم کی تمام توانائیاں جمع کر رہا ہے۔

وہ روتی رہی' گیٹ سے سر ٹکراتی رہی۔ اپنی نیکی پاکیزگی... کی دوائی دیتی رہی اور میں... میں پتھر سنگ دل چٹان بنا اس خوبصورت بلا کی مکاریوں کے جال میں پھنسا اسے ٹھوکریں مارتا مارتا..." وہ اب شاید رو رہا تھا۔ اس کے گلے سے عجیب خرخر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ سفید چادر اس کے نحیف جسم کے جھٹکوں سے ہولے ہولے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔

"نزہت تو شاید مجھے معاف کر دیتی مگر اللہ کا انصاف' زندگی کا قانون' مکافات عمل سے میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا..."

"میں اس حسین چمکتی صورت کے حسن پر مرمٹا اور اپنے شریف ماں باپ کی عزت کی بے داغ چادر کو روندتا اسے سر پر بٹھا لایا۔ اپنی... اپنی اس اذیت ناک موت کا پروانہ ہاتھ میں لیے... میں تین ماہ کے کورس پر جرمنی آرہا تھا۔ فلائٹ دھند کی وجہ سے دو گھنٹے لیٹ ہو گئی اور میرا ایک... ضروری پیپر گھر رہ گیا تھا' میں لینے... لوٹا... وہ ذلیل عورت اپنے کسی نئے شکار کو میری معصوم بہن کے اس کے دھوکے میں آجانے کی ساری کہانی قہقہے لگا لگا کر اور میری زن مریدی' اندھے پن کو خوب ہنس ہنس کر... بیان... کر رہی تھی۔ اس کا یار مجھے دیکھ کر بھاگ نکلا مگر وہ... میری گولی سے نہ بچ سکی... میں اس کے ناپاک مردہ جسم کو باتھ روم میں بند کر کے گھر کو لاک کر کے ایئرپورٹ... مجھے کیا معلوم تھا' میری سزا تو ادھر شروع ہو گی۔ قانون کی سزا سے میں بچ گیا۔ اللہ سے کیسے..." وہ اب سر دائیں بائیں مار رہا تھا۔

"گھر کے کاغذ میں نے نزہت کے نام کر دیے ہیں... ڈاکٹر رابرٹ کے پاس امانت... شہباز! جاتے ہوئے وہ ضرور لے جانا..."

"نزہت سے کہنا' مجھے معاف... معاف... میرے اللہ... معافی..." اس کی سانسیں بری طرح سے اکھڑنے لگی تھیں۔

"اوہ کس قدر جاہل ہیں آپ لوگ۔ کیا اسے فرشتوں کے حوالے کر کے جائیں گے۔ جاؤ ادھر سے..." سفید اوور لیپ میں ملبوس موٹی خرانٹ چہرے والی نرس دوڑی دوڑی آئی تھی اور رواں جرمن میں انہیں لتاڑتے ہوئے باہر دھکیلنے لگی۔

"اللہ حافظ سہیل۔ اللہ تمہاری مشکل آسان کرے اور..." شہباز خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے سہیل کے ہڈیوں بھرے چہرے کو ذرا سا چھوا اور دونوں باہر کی طرف بڑھ آئے۔

"شہباز! نزہت کی امانت... لے جاؤ... ڈاکٹر رابرٹ..." وہ پوری قوت سے چلایا تھا۔ نرس نے پیچھے سے زور سے دروازہ بند کر لیا۔

راحیلہ بری طرح سے رو رہی تھی۔ شہباز خان سے اپنے آنسو ضبط کرنا محال ہو رہے تھے۔

اور جب ان کا جہاز پاکستان کے لیے ٹیک آف کر رہا تھا تو ان پر اندر کی دنیا کے بہت سے راز منکشف ہو رہے تھے۔

"جو گناہ سہیل سے سرزد ہوا' وہی تو میں نے کیا اور مسلسل کرتا چلا آرہا ہوں۔ اس کی معصومیت کو مسلسل نشانہ بناتے ہوئے' اس بے گناہ کے ناکردہ گناہ کو اشتہار بناتے ہوئے' اسے مسلسل ذلیل کرتا رہا۔ یہ دنیا مکافات عمل ہے۔ اگر میرا دل اللہ نہ پلٹتا تو شاید چند سال بعد میں بھی سہیل کی جگہ..."

سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے انہیں بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔

"بے گناہ' معصوم' باکرہ عورت پر بنا ثبوت کے بہتان باندھنا اللہ کے نزدیک کس قدر ناپسندیدہ ہے کہ وہ اس ناراضی کے اظہار کے لیے آسمان سے اپنا پیغام بھی نازل کر سکتا ہے اور ایسے بہتان باندھنے والوں کی سزا... کیا وہ مرتے دم تک سہیل کی حالت کو بھلا پائیں گے۔

"کبھی نہیں... کبھی نہیں۔"

"میں نزہت سے کہوں گا' وہ سہیل کے لیے بہت دعا کرے' اس کی دعاؤں میں یقیناً بہت اثر ہے۔ اللہ اس کے لیے آسانی فرمائے گا۔ دیار غیر میں اس طرح کی موت... دنیا میں ہی اتنی بڑی سزا مل گئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی آخرت سہل کرے۔" دل کا جام... نزہت کی محبت سے لبالب بھر گیا تھا۔

"کیا میں نزہت کو سہیل کے بارے میں بتا پاؤں گا۔"

☼ ☼ ☼

"گھر سے تیار ہو کے نکلے چلے ہو... تالے گلے کھلے ہو..."

نین تارا خوب اونچا اونچا سریلی آواز میں گاتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ زیور گل جو کہیں جانے کے لیے خوب نک سک سے تیار بیٹھی تھی۔ نین تارا کی باآواز گنگناہٹ پر ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے' بہت خوش اور یہ تم صبح سے غائب کدھر تھیں؟" زیور گل نے اپنی دھانی سلکی ساڑھی کا پلو اپنے عریاں کندھوں پر نزاکت سے جماتے ہوئے پوچھا۔

"خوش تو مام! میں بہت ہوں' بہت زیادہ۔" وہ اس کے بازو سے ذرا سا لٹک کر بولی۔

"ہاں' وہی تو پوچھ رہی ہوں اور جلدی کرو' مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"آج مولی کا شو ہے' بہت زبردست... بہت بڑے پیمانے پر۔ منسٹر لیول کے گیسٹ انوائٹ ہیں۔ وہ مجھے شو میں اپنی گاڈ فادر کے طور پر انٹروڈیوس کروائے گا۔" زیور گل نے اکڑی ہوئی گردن کو مزید اکڑا کر کہا۔

"زبردست۔ آج کل تو تمام ہر طرف مولی سونگ کا کریز ہو رہا ہے' اسپیشلی ینگ جنریشن میں بہت اونچی گڈی اڑ رہی ہے اس کی۔ ویسے مام! یہ مولی بڑا محسن ٹائپ بندہ نکلا ہے۔ اس سے ذرا سی نیکی آپ نے فرمائی' یہ گلے پڑ گیا۔"

"دل کا بہت اچھا ہے' بس دنیا اچھے دل والوں کی قدر نہیں کرتی ہے۔ دیکھتی ہوں تو بے اختیار خیال آتا ہے۔ کاش تم نے شاہ جی والی حماقت نہ کی ہوتی یا پھر اس سے اب تک گلو خلاصی کرلی ہوتی تو......"

"پلیز مام! یہ دیکھیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کھول کر ماں کے چہرے کے پاس کیا۔

زیور گل ماتھے پر بل ڈال کر کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگی۔ جوں جوں اس کی نظریں سطروں پر پھسلتی گئیں' اس کے ماتھے کے بل گہرے ہوتے چلے گئے۔

"یہ کیا بکواس ہے تم پھر یہ حماقت کرنے چلی ہو۔ پچھلی دفعہ کا انجام بھول گئی ہو۔" زیور گل پھٹ پڑی تھی۔

"مام! ڈونٹ شاؤٹ۔" اس نے چہرہ جھکا کر کاغذ تہہ کیا۔ "یہ میرے دل کی سب سے بڑی خوشی ہے' میں شاہ جی کے بچے کی ماں بنوں' میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش......" وہ رک رک کر بولی تھی۔

"نین تارا!" زیور گل نے اسے تھپڑ مارنے کو ہاتھ اٹھایا' جسے نین تارا نے رستے ہی میں تھام لیا۔

"مام! آپ کو اس کا کوئی حق نہیں۔" وہ سرد لہجے میں غرائی۔

"ماں بننے کا بڑا شوق ہے' پہلے ماں کے حقوق تو جان لو۔" وہ طنز سے بولی۔

"ماں کے حقوق پہچانتی ہوں تو اب تک بلا چوں و چرا آپ کی ہر بات مانتی آئی ہوں مگر اپنے دل کی یہ اکلوتی خوشی جو میں نے دوسری بار بہت مشکل سے حاصل کی ہے۔ اب اسے کسی کے بھی کہنے پر برباد نہیں ہونے دوں گی۔ نہ ماں کے کہنے پر' نہ شاہ جی کے کہنے پر اور نہ کسی اور کے کہنے پر۔ انڈر اسٹینڈ۔" وہ کہتی ہوئی بھاگ گئی اور اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

"نین تارا! چلو' شو میں نہیں جانا۔ مولی کے تین فون آچکے ہیں۔ تم نے اپنا موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔" تھوڑی دیر بعد زیور گل دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مام! آئندہ کے سات ماہ میں بغیر کسی انتہائی ضرورت کے میں نہ تو کمرے سے باہر جاؤں گی' نہ کسی ایرے غیرے سے ملوں گی اور ایسی مخلوط محفلوں میں تو بالکل بھی نہیں۔ مجھے شاہ جی کی نسل کو ایسی محفلوں کے ہر طرح کے سائے سے بچا کر اپنی کوکھ میں پالنا ہے۔ آپ جائیے' میں مولی سے خود معذرت کرلوں گی۔" وہ دروازہ کھولے بغیر مزے سے بولی تھی۔ باہر کھڑی زیور گل کو گویا آگ ہی لگ گئی۔

"نیا فتور اٹھا ہے تمہارے دماغ میں۔ تم چاہے سات ہزار پردوں میں چھپ کر بھی اس جاگیردار کی نسل کی افزائش کرو' وہ پھر بھی صرف تمہارا بچہ کہلائے گا۔ سلطان بخت اسے کبھی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ چاہو تو میری اس بات کو حرف بہ حرف لکھ لو۔ احمق' بے وقوف لڑکی!"

"ہونہہ۔ ایسا ہلکا سمجھ رکھا ہے مجھے۔ شاہ جی جان نچھاور کرتے ہیں مجھ پر۔ مام! تمہیں کیا خبر' یہ سب کچھ میں نے ان سے باقاعدہ اجازت لے کر ان کی خوشی سے یہ خوشی اوڑھی ہے۔ اب بھلا وہ اس کو تسلیم نہ کریں گے۔ ہونہہ! احمق میں نہیں' بھولی میری ماں ہے۔" کہتے ہوئے وہ فون اٹھا کر سلطان بخت کو فون کرنے لگی۔ تیسری ٹرائی میں کال مل ہی گئی۔

"شاہ جی! کیسے ہیں آپ؟" ان کی آواز سنتے ہی اس کی خوشی جیسے دوبالا ہوگئی تھی۔ "خوشخبری" چھپانا محال لگنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" آواز بہت مدھم آرہی تھی۔

"کب آرہے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں' چیک اپ نہیں ہوا؟"

"ہوگیا ہے؟" آواز اور بھی کم ہوگئی تھی۔

"پھر؟"

"بائی پاس ہوگا۔" اس نے بمشکل سنا۔

"کیا...... مائی گاڈ۔" وہ چلائی۔ "میں آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں پلیز۔"

"نہیں۔ سیدہ آپا آرہی ہیں اگلے ہفتے تک۔" اسی وقت نین تارا نے دوسری طرف ایک مترنم ہنسی کی جھنکار سنی۔

"آپ کے پاس کون ہے؟" وہ جلدی سے بولی۔

"تم ہو میری جان۔" وہ گمبھیر آواز میں بولے۔ لائن اب کچھ صاف ہوگئی تھی۔

"شاہ جی! کافی......" دوسری طرف ہلکی سی نسوانی آواز ابھری تھی۔

نین تارا کی ساری حسیات جاگ اٹھیں۔

"شاہ جی! آپ سے کون بات کر رہا ہے۔"

"تمہارا وجدان۔ کہہ جو رہا ہوں' تم ہو مائی سویٹ ہارٹ۔" وہ کچھ جھلا کر بولے تھے۔

"شاہ جی! مجھے آپ کو ایک خوش خبری سنانا ہے۔" اس کی نظریں سائڈ ٹیبل پر پڑے کاغذ پر پھسلیں۔

"کہو۔" لائن پھر خراب ہو رہی تھی۔

"نہیں۔ آپ آئیں گے تو آپ کو خوش خبری آل...... دکھاؤں گی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"او کے میں تمہیں کل فون کروں گا۔" انہوں نے شاید اس کا جملہ سنا ہی نہیں تھا۔

"کیا صالحہ شاہ بھی آرہی ہے؟" وہ رہ نہ سکی' پوچھ بیٹھی۔

"مجھے بائی پاس کرانا ہے اپنا' ہارٹ فیل نہیں۔ او کے۔ اللہ حافظ۔" وہ جلدی میں تھے شاید۔ لائن بے جان ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

"معاذ بیٹا! وہ تقی تو ابھی تک نہیں آیا۔" وہ ہاسپٹل سے جیسے ہی گھر میں داخل ہوا' زیتون بانو نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسی کے اسکول سے آرہا ہوں' وہ اپنے دوست فہد کے ساتھ چلا گیا ہے اور فہد کے گھر کا مجھے علم نہیں۔ ایڈریس لینے گیا تو آفس بند ہوچکا تھا۔ اوپر سے ام جان کی حالت اچھی نہیں۔ میں ہاسپٹل میں انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر ارتقی کو لینے گیا تھا۔" وہ پریشانی سے صوفے پر اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"بیگم صاحب کی طبیعت ابھی سنبھلی نہیں؟" زیتون بانو بھی پریشان تھی۔ مسز خان گزشتہ تین دن سے پروفیسر داؤد کے کلینک میں ایڈمٹ تھیں۔ تین دن پہلے اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔

"کل شام کو تو کچھ بہتر ہوگئی تھیں مگر صبح سے پھر خراب ہے۔ بہت محسوس کر رہی ہیں شہباز بھائی کی کمی۔ بار بار مجھ سے پوچھتی ہیں۔ کوئی فون تو نہیں آیا۔ گھر فون کرکے پوچھو' شاید کوئی فون آیا ہو۔ مجھے امید تو تھی کہ وہ آجائے گا۔ کچھ ایج فیکٹر ہے' کچھ بیماری کی انتہا پھر بھی ام جان کی بڑی ہمت ہے۔ اوپر سے اس بدتمیز نے تنگ کر رکھا ہے۔ پتا نہیں کہاں ہے۔ اس نے یہ فہد کی دوستی پال لی ہے۔ اب بھلا چھٹی کے بعد اس کے گھر جانے کی کیا تک۔ ڈرائیور نہیں تھا تو میں تو چلا گیا تھا اسے لینے۔ آج میں اس کی اچھی طرح کلاس لوں گا۔ چوکیدار کو بھی خوب سنا کر آیا ہوں' ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری ہی نہیں۔ بچہ چاہے' جس کے ساتھ مرضی چلا جائے۔"

وہ صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے غصے سے بولا۔ وہ مسز خان کی وجہ سے بہت پریشان تھا' ان کی صحت تو دن بدن گرتی جارہی تھی مگر اب تو جیسے ان کی دل پاور بھی دم توڑتی چلی جارہی تھی۔

"اگر ام جان کو کچھ ہوگیا تو میں شہباز بھائی کو کیا جواب دوں گا جو اپنے کندھوں کی ساری ذمہ داریاں مجھ پر ڈال گئے ہیں۔" اب اسے شہباز پر بھی غصہ آرہا تھا۔ آخر ایسی بھی کیا ناراضی۔

"کیا بات ہے' اب میرے علاوہ کیا ہواؤں سے بھی لڑنا شروع کردیا ہے' وہ بھی اکیلے میں۔" مشی خدا جانے کہاں سے نازل ہوئی۔ اس کا موڈ اور بگڑ گیا۔

"ہوا سے لڑنے کے لیے بھی کسی ریزن کا ہونا ضروری ہے جبکہ تم سے....." اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یعنی مجھ سے لڑنے کے لیے..... مطلب 'میں بلاوجہ لڑ پڑتی ہوں۔ گویا پاگل ہوں نا میں۔" وہ ابرو اچکا کر غصے میں بولی۔ یوں بھی اسے غصہ دلانا کون سی مشکل بات تھی۔

"میں نہیں' یہ تم خود فرما رہی ہو' وہ بھی اپنے بارے میں۔"

"معاذ! تم آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھے پھر سے لڑنے کو تیار کھڑی تھی۔

"پلیز' اس وقت کوئی جھگڑا نہیں کرنا۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ ام جان کی طبیعت اچھی نہیں اور ارتضیٰ ابھی تک گھر نہیں آیا۔ مجھے ابھی ہاسپٹل بھی جانا ہے۔" وہ کچھ بیزاری سے بولا۔

"تمہارا مطلب ہے میں لڑتی ہوں' جھگڑالو ہوں' کیا میں جاہل ہوں جو بلاوجہ....." وہ حسب عادت تیز تیز بولنا شروع ہو گئی۔

"تم تو یار! اچھی خاصی سائیکی ہو۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت ارتضیٰ اسکول بیگ گلے میں لٹکائے اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم۔" عادت کے مطابق اس نے بلند آواز میں سلام جھاڑا۔

"کہاں سے آ رہے ہو تم اور کس کے ساتھ؟" معاذ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا' گلے سے بیگ اتارتے ہوئے کچھ غصے سے بولا۔

"فہد کے ساتھ۔ اس کی گرینی اور آنٹ کے ساتھ۔ ڈرائیور مجھے لینے نہیں آیا تو انہوں نے مجھے پک کر لیا۔ راستے میں آئس کریم بھی کھلائی اور چپس بھی۔" وہ مزے سے بتا رہا تھا۔

"کیا ان کی گاڑی ہے باہر؟" وہ پوچھتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

"نہیں تو' وہ تو مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے۔" وہ کہتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھا۔

"بس تم ان ہی بے سروپا الجھنوں میں الجھتے بوڑھے ہو جانا مگر میں تمہیں وارن کر رہی ہوں کہ اب تمہارے یہ فضول معاملات میری برداشت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ بہتر ہے تم ان پر غور کر لو۔" وہ جاتے جاتے وارننگ کے سے انداز میں غرائی تھی۔

"تم رعب کس کو دے رہی ہو اور کس چیز کا دے رہی ہو' کر چکا میں غور۔ سنا تم نے؟" معاذ نے غراتے ہوئے اچانک پلٹ کر اس کی کلائی اپنے مضبوط پنجے میں جکڑ لی تھی۔ مشی حیرت اور غصے سے لمحہ بھر کو گنگ سی رہ گئی تھی۔

"آر یو ان یور سینسز۔" (تم اپنے حواسوں میں ہو۔) وہ اس کی آنکھوں میں غصے سے دیکھ کر بولی۔ معاذ کی آہنی انگلیاں اس کی نازک کلائی میں کھبی جا رہی تھیں۔

"میرے حواس صحیح کام کر رہے ہیں۔ تم اپنا علاج کراؤ اور جب کرا چکو تو پھر مجھے اپنی یہ فضول شکل دکھانا۔ تم نے علیحدہ زچ کر رکھا ہے اور آئندہ مجھے دھمکی نہیں دینا' ورنہ یہ ایک انگوٹھی کا رشتہ تو کچے دھاگے سے بھی نازک ہے' اتار کر سڑک پر پھینک دوں گا۔ سمجھیں۔" اتنے غصے میں مشی نے معاذ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تم..... تمہاری یہ ہمت..... ہمارے ٹکڑوں....."

"شٹ اپ۔" اس کا ہاتھ رک نہیں سکا۔ کلائی چھوڑ کر اس نے اپنا آہنی پنجہ اس کے چہرے پر جما دیا تھا۔ اتنا زوردار طمانچہ مشی نے اپنی زندگی میں پہلی بار کھایا تھا۔ چار قدم تیورا کر پیچھے صوفے پر جا گری۔ آنکھوں کے آگے رنگ برنگے تارے سے چمکنے لگے۔

"تم جنگلی' وحشی' بھوکے' ننگے فقیر' ہمارے گھر میں پلنے والے کتے....." وہ غصے میں بالکل آؤٹ ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی ڈائمنڈ رنگ اتار کر معاذ کے منہ پر دے ماری۔

"میں تو خود تم جیسے نیچ' گھٹیا' پیراسائٹ سے رشتہ جوڑ کر پچھتا رہی ہوں۔ اب بہتر ہے' اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور کہیں اور جا کر ٹھکانا کرو' ورنہ مشی اب تمہیں اس گھر میں نہیں رہنے دے گی۔ کمی کمین' فقیر تم سے اچھے۔ مانگتے ہیں تو دینے والے کا احسان بھی مانتے ہیں۔ تم تو فقیروں سے بھی بدتر نکلے۔ اس گھر کا کھاتے بھی ہو اور آنکھیں بھی دکھاتے ہو۔ یو بیاسٹرڈ....."

"شٹ اپ! شٹ اپ یور ماؤتھ یو....." گالیوں کا ایک طوفان تھا جو اس نے دانت بھینچ کر روکا تھا۔ وہ غصے میں کانپتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر لان میں کڑی دھوپ تھی' دودھیا سفید چمکتی۔ وہ سیڑھیوں میں ہی بیٹھ گیا۔

"یہ دھوپ' اس کی چبھن زندگی کے امتحانوں سے تو کڑی نہیں' جن سے میں گزر رہا ہوں۔ بے نشان' بے وقعت' بے توقیر اور بے کار..... اور یہ دونوں میاں بیوی ذمہ داریوں کی گٹھڑی جو میرے کندھوں پر ڈال گئے ہیں۔ جی کرتا ہے' اسے پھینک پھانک اس ذلت کدے سے بھاگ جاؤں۔" وہ تیز دھوپ میں بیٹھا جھلس رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ دن کسی جیتی جاگتی فلم کی طرح پھرنے لگا۔ جب ارتضیٰ کی پہلی سالگرہ سے ایک دن پہلے نزہت ارتضیٰ کا جوتا اور مسز خان کا سوٹ ٹیلر سے لینے معاذ کے ساتھ گئی تھیں اور.....

اور پھر..... کچھ ختم ہو گیا۔ ایک ہی پل میں' ایک ہی جھٹکے میں..... اس کا دماغ جلتی ہانڈی کی طرح پک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رعنا حیات کو ہوش آ چکا تھا۔ اگرچہ ان کا نروس بریک ڈاؤن بھی ہوا تھا مگر اس کے باوجود ڈاکٹرز کی توقع کے برعکس انہیں بہت جلد ہوش آ گیا تھا۔

"فخر کہاں ہیں' فخر ٹھیک ہیں' مجھے ان کے پاس لے چلیں۔" آنکھ کھلنے سے لے کر اب تک ان کی ان تین سوالوں کی مسلسل تکرار سے ڈاکٹرز اور نرسز تقریباً تنگ آ چکے تھے۔ ان کی زبان ہر ایک منٹ بعد ان تین سوالوں کو دہرائے بغیر رکے جا رہی تھی۔

"مسز حیات! فخر صاحب ٹھیک ہیں' ان کی حالت خطرے سے باہر ہے مگر ابھی انہیں ہوش نہیں آیا اور آپ کی حالت بھی ابھی ایسی نہیں کہ ہم آپ کو ان کے پاس لے جا سکیں۔ پلیز آپ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے خاموشی سے لیٹ جائیں' ورنہ خدانخواستہ آپ کی طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔ ہمارا یقین کریں' فخر حیات صاحب بفضل تعالیٰ حیات ہیں۔ بہت جلد' بہت جلد آپ کے پاس ہوں گے۔ آپ بھی دل میں ان کے لیے بہت دعا کریں کہ وہ جلدی جلدی ہوش میں آ جائیں۔"

ڈاکٹر رفاقت ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے۔ تینوں میجر آپریشن ان کی نگرانی میں ہی ہوئے تھے۔ خود آ کر انہیں تسلی دے رہے تھے۔

"اگر وہ حیات ہیں' زندہ ہیں تو خدارا مجھے صرف ایک لمحے کے لیے ان کے پاس لے چلیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ میں انہیں ایک نظر دیکھ لوں پھر جو آپ کہیں گے' کروں گی۔" وہ بہت لاچاری سے ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

"مسز حیات..... مسز حیات! گناہگار نہ کریں۔ میرا یقین کریں' اچھا صرف ایک گھنٹہ اور انتظار....."

"ڈاکٹر..... ڈاکٹر صاحب! جلدی آئیے' بیڈ نمبر تین کی پیشنٹ جو ان کے ساتھ ہیں' ان کی حالت بگڑ گئی ہے۔" حواس باختہ نرس اندر آ کر چلائی۔ ڈاکٹر رفاقت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"سسٹر! آپ کو کسی نے اتنا نہیں بتایا کہ کسی دوسرے سیریس پیشنٹ کے سامنے اس دیوانگی سے آ کر چلانا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔" وہ سخت طیش میں آ کر بولے۔

"سوری سر! بٹ وہ پیشنٹ....." وہ آہستگی سے معذرت کرتے ہوئے اٹک کر بولی۔

"چلیں میں دیکھتا ہوں۔ مسز حیات! آپ پلیز ریلیکس....."

"ڈاکٹر صاحب! اس کی حالت خطرے میں ہے' کس کی بات کر رہی ہے سسٹر؟"

رعنا حیات کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ ڈرپ کی سوئیوں سے جکڑے دونوں بازو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ اٹھنے لگی تھیں۔

"پلیز مسز حیات! کیوں آپ اپنے ساتھ ہماری بھی زندگی خراب کرنے چلی ہیں لیٹ جائیں پلیز۔ ڈاکٹر! انہیں کوئی سکون آور انجکشن دیں۔" ڈاکٹر رفاقت ڈاکٹر فرہاد سے جاتے ہوئے تیزی سے بولے۔

"ڈاکٹر صاحب میرا بچنا بہت مشکل ہے' مجھے پتا ہے۔" جنتاں بمشکل سانس لے رہی تھی۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ سے باقاعدہ ہلتا نظر آ رہا تھا۔

"مایوسی گناہ ہے اماں! اللہ سے اچھی امید رکھیں۔ جنہوں نے زندگی دی ہے' وہ صحت بھی دے گا۔" ڈاکٹر جلدی سے اس کے زخم دیکھتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں ناامید نہیں مگر مجھے معلوم ہے۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ آپ مہربانی کر کے میرا ایک کام۔۔۔ صرف ایک کام کر دیں۔" اس کے سینے سے زور زور سے آوازیں نکل رہی تھیں۔

"کیا کام؟" ڈاکٹر اب اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اسے جنتاں کا کام تمام ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"مجھے میری بیگم صیب کے پاس۔۔۔ پاس لے چلیں یا انہیں میرے پاس۔۔۔"

"ابھی دونوں کام ناممکن ہیں' تم۔۔۔"

"ڈاکٹر صاب! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔۔۔" تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں باہر کو نکل رہی تھیں۔ "میرے سینے پر بڑا بھاری بوجھ ہے' ان کی ایک امانت' ایک راز پہنچانا ہے۔ قبر میں لے کر جاؤں گی تو قبر بھی پناہ نہیں دے گی۔ وہاں جا کر بھی تڑپتی رہوں گی۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم۔۔۔ کریں۔" وہ اپنا سر پٹخ رہی تھی۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔" ڈاکٹر کو اس کی طبیعت واقعی اچھی نہ لگ رہی تھی۔

بمشکل رعنا حیات کو وہیل چیئر پر بٹھا کر جنتاں کے بیڈ کے پاس لایا گیا۔

"جنتاں! تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے فخر حیات کی زندگی بچائی۔۔۔ میں چاہوں بھی تو تمہارا یہ احسان۔۔۔" رعنا حیات جنتاں سے کہہ رہی تھیں کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

"بیگم صیب! وقت نہیں ہے میرے پاس ان باتوں کا۔ صاب کی زندگی بچا کر میں نے احسان نہیں کیا' اپنے سر پر پڑے اس بھاری قرض کا تھوڑا سا بوجھ ہلکا کیا ہے۔ وہ بھی اگر میرے مولا کو۔۔۔ منظور ہوا تو شاید معافی۔۔۔

بیگم صیب! میرے بندھے ہاتھ دیکھیں۔" اس نے بہت مشکل سے ڈرپ لگے ہاتھوں کو جوڑنا چاہا۔

"ارے ارے کیا کر رہی ہو اماں! صرف منہ سے بات کرو۔ وہ بھی صرف دو منٹ اور۔۔۔ میں بیگم صاحب کو دوسرے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔" پاس کھڑے ڈاکٹر نے جلدی سے اس کے دونوں بازو سائیڈوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بیگم صیب! میں آپ کی مجرم' آپ کی دوشی' خطار کار۔۔۔ بیگم صیب! آپ کا نمک کھایا۔ ساری زندگی بھی نمک حرامی کا سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ نے ایک دن میرے ساتھ ناحق ظلم کمایا۔ مجھ بیوہ کی کمائی' میرا حاصل۔ میرے مرحوم شوہر کی نشانی' میرا بچہ میری نظروں کے سامنے کیسے۔۔۔

یاد ہے بیگم صیب! آپ کو وہ منحوس دن جب میری گود اجڑی تھی۔ میں نے تو کبھی آپ کی ذرا سی بھی حکم عدولی نہ کی تھی پھر بھی آپ نے میرے ساتھ کیسی بے رحمی کی کہ میں۔۔۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو جنتاں! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" رعنا حیات کا سر گھومنے لگا تھا۔

"بیگم صیب! سمجھ کر بھی انجان بنیں تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے میری گود اجاڑی' میں نے آپ کا گھر سونا کر دیا۔ آپ کا بیٹا یاد ہے نا آپ کو۔ گیارہ ماہ کا پاؤں پاؤں چلتا' صحت مند' سرخ و سفید بچہ۔۔۔"

''جنتاں! جنتاں۔۔۔ میں اس کو بھول سکتی ہوں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو' اپنے جگر گوشے کو جو میری کل کائنات

تھا۔ میرا سب کچھ۔ میری زندگی اور کسی ظالم نے۔۔۔" رعنا تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔

"بیگم صیب! اسی طرح میرا جگر گوشہ' میرا لخت جگر بھی آپ کے ظلم کی نذر ہو گیا۔ آپ اپنے بچے کو نہیں بھول سکتیں تو کیا میں ماں نہیں تھی؟"

جنتاں کی کھلتی بند ہوتی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ناچ رہی تھی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں تو شاید قدرت کے اس فیصلے پر صبر کر لیتی پر میرے چاچے کا پتر جو میرا دیور بھی تھا' میرے بچے کا چاچا' جب وہ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آیا۔ ساری بات کا اسے پتا چلا تو مجھ سے کچھ بھی کہے بغیر وہ اٹھ کر چلا گیا اور اگلے دن چھوٹے بابا صاب گھر سے غائب تھے۔ سارے ملازموں کو تھانے لے جایا گیا۔ کئی کوششیں کی گئیں بابا صاب کو ڈھونڈنے کی مگر کسی کو کچھ پتا ہوتا تو پتا چلتا نا۔"

"جنتاں! جلدی بولو میں مر جاؤں گی۔" رعنا حیات اس پر جھک کر ازحد بے قراری سے بولیں۔

"بیگم صیب! اسی طرح قطرہ قطرہ میں مری ہوں عمر بھر۔۔۔" وہ طنز سے ہنسی۔

"میرے چاچے کے پتر فضل داد نے بابا صاب کو کوٹھی سے اغوا کیا اور پنڈی کے کسی یتیم خانے میں داخل کرا دیا۔ اس نے مجھے بھی دو دن بعد بتایا تھا۔"

"کیا۔۔۔ تم۔۔۔ تمہیں علم تھا؟" رعنا حیات پاگلوں کی طرح چلائیں۔

"بیگم صاب! پلیز آہستہ۔۔۔" ڈاکٹر نے رعنا حیات کے کندھوں پر ہولے سے ہاتھ رکھا جسے رعنا حیات نے زور سے پرے جھٹکا تھا۔

"بیگم صیب! بیگم صیب۔۔۔" جنتاں کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔

"بولو' جلدی بولو جنتاں! میرا بچہ کہاں۔۔۔ میرا بچہ۔ بولو۔" وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ رہی تھیں۔

"میرے۔۔۔ گاؤں۔۔۔ گھر میں۔۔۔ صندوق۔۔۔ کو۔۔۔ تالا۔۔۔ کپڑوں کے نیچے۔۔۔ کاغذ پر۔۔۔ یتیم خانے کا پتا۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔۔۔ اللہ معاف۔۔۔ معافی۔۔۔" جنتاں کا کوئی بھی فقرہ پورا نہیں ہو سکا تھا مگر وہ اپنے سینے کا سارا بوجھ اتار گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ماپنے والی مشین بالکل سیدھی سپاٹ لائن دکھا رہی تھی۔ اس کے لب خاموش ہو چکے تھے' سینے کا شور ختم ہو چکا تھا اور گلے کی گھر گھر بھی۔۔۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بند کر دیا۔

"جنتاں۔۔۔ جنتاں۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔ میں کسے الزام دوں۔ جنتاں۔۔۔ میں تجھے بددعا دوں کہ دعا۔" رعنا حیات اس کے بیڈ سے سر ٹکا کر رونے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"زینب۔۔۔! زینب۔۔۔ کہاں ہے یہ زینب۔۔۔ آمنہ! بلاؤ اس کو۔" اماں جی نے تیسری بار زینب کو پکارا تھا۔

"اماں جی! وہ سو رہی ہے' رات بھر سوئی نہیں۔ ابھی آنکھ لگی ہے اس کی۔" آمنہ جو صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ آہستہ آواز میں بولی۔

"کیوں نہیں سوئی رات بھر' خیر تو ہے۔ مجھے تو دو دن سے اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی۔ میں اٹھ کر خود جا کر دیکھتی ہوں۔" وہ اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اماں جی! اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ کل صبح بھی اس نے کچھ نہ کھایا' دوپہر کو بھی کھانے کے لیے بلاتے رہے' نہیں آئی۔ شام کو اٹھ کر دو دن کی باسی چنے کی دال رات کی روٹی کے ساتھ کھالی۔ بس رات بھر الٹیاں' موشن کرتی رہی ہے' اس لیے سو نہیں سکی۔ اب کچھ اس کی حالت سنبھلی تھی تو سو گئی ہے۔ میں نے ناشتے کے لیے بھی نہیں اٹھایا۔ ابھی دوپہر میں اس کے لیے جویریہ کھچڑی بنا رہی ہے' ابھی اٹھاتی ہوں پھر آپ کے پاس لے آؤں گی۔ آپ کی طبیعت اب اچھی ہے نا۔" وہ ان کے پاس ہی آ بیٹھی تھی۔

"بچے! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کل تمہارے ساتھ بازار بھی تو گئی تھی۔ ساری تیاری تو ہو گئی ہے نا مکمل۔ اچھے جوڑے مل گئے ہیں زینب اور نذیر کے۔ تم نے اپنے بابا صاب کو دکھائے تھے نا۔"

"جی اماں جی! رات کو ہی دکھا دیے تھے۔"

"پسند آئے انہیں؟"

"جی!"

"وہ تو اب ہمارے پاس دو دن کی مہمان ہے۔ تمہارے بابا صاب نے بھی ایسی جلدی مچائی ہے۔ کیا کہے گی میری بچی' ماں نے ڈھنگ سے رخصت بھی نہ کیا۔ تم نے ٹرنک کا سارا سامان جو میں نے تمہارے لیے جمع کر رکھا تھا' نکال کر ترتیب سے رکھ دیا ہے نا۔"

"جی اماں جی! رکھ دیا ہے۔" وہ کچھ سستی سے بولی۔

"ٹرنک ادھر لے آؤ۔ میں بھی دیکھوں ذرا۔" وہ شوق سے بولیں۔

"میں صفائی کر لوں پھر لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کر دوبارہ جھاڑو لگانے لگی۔

شام ہونے کو تھی جب اماں جی زینب کے پاس آئیں' وہ جاگ رہی تھی مگر اوہ موٹی سی بستر پر پڑی تھی۔

"میری بچی! میری زینی! کیسی ہو بیٹا! ماں سے کیوں روٹھی پڑی ہو۔ کل سے بے کل ہو رہی ہوں تمہیں دیکھنے کو۔ ماں سے ناراض ہو کیا؟" وہ اس کے بال سلجھاتے ہوئے بڑے پیار سے بولیں۔

"آمنہ! اسے تو بخار بھی ہے۔" ان کے بال سنوارتے ہاتھ اس کے ماتھے پر آ کر ٹھٹک گئے تھے۔

"جی اماں جی! الٹیاں بھی نہیں رک رہیں اور اس نے کچھ کھایا بھی نہیں۔" آمنہ بھی ان کے پاس آ بیٹھی۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"کیا بتاتی اماں جی! یہ خود ہی ہوش نہیں کر رہی۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔ پاگل کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔" وہ بہن کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کون سی بات سمجھا سمجھا کر؟" اماں جی نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ اٹھے' چلے پھرے' گھر کے کاموں میں دلچسپی......"

"زندگی پڑی ہے ان کاموں میں جتنے کو۔ صحت تو دیکھو اس کی' کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ اٹھ زینب! میری بچی! میں تجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔ تمہارے بابا صاب کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت قرآن پڑھانے جاتے ہیں' معلوم تو ہے آپ کو؟"

"میری اور اپنی چادریں لاؤ' اسے ڈسپنسری لے جاتی ہوں' سات بجے تک کھلی ہوتی ہے۔ جلدی کرو' شام ہونے کو ہے۔ تمہارے بابا صاب آ گئے تو پھر حکیم صاب سے کوئی دوا لا دیں گے۔ پرسوں اس کا نکاح ہے اور یہ بستر سے لگی پڑی ہے۔ بچی میں جان نہیں ہو گی تو دلہن بن کیا سجے گی۔ اٹھو تم۔" پھر اماں جی نے زینب کی ایک نہیں سنی۔ زبردستی اسے چادر اوڑھا کر ڈسپنسری تک لے ہی آئیں۔

ڈسپنسری میں زیادہ رش نہیں تھا۔ ہفتے میں تین دن ڈاکٹر آتی تھی۔ تین دن وہ کسی دوسرے کلینک میں بیٹھتی تھی۔ آج خوش قسمتی سے موجود تھی۔

ڈاکٹر نے زینب کی نبض دیکھی' بخار چیک کیا۔

"الٹیاں اور موشن کب سے آ رہے ہیں؟"

"جی پرسوں سے۔" زینب آہستگی سے بولی۔ وہ اس کی آنکھیں چیک کرنے لگی۔

"آپ ذرا اندر آ کر چیک کروائیں پلیز۔" وہ اسے اٹھا کر اندر لے گئی۔

"پرسوں سے اپنی جان ہلکان کر رہی تھی۔ تم دونوں بہنوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی کیا۔ بھلا مجھے تو بتاتیں کیا خدانخواستہ اس کے مرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔" ڈاکٹر کے اندر جاتے ہی اماں جی اس پر برس پڑیں۔

آمنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو یہی سمجھے ہوئے تھی کہ اسے سیفی کی جدائی کا غم لگا ہے۔ دو چار دن میں سنبھل جائے گی۔

"اماں جی! آپ پلیز ادھر آئیں۔" ڈاکٹر نے باہر آ کر اماں جی سے اپنے قریب پڑی کرسی پر آ کر بیٹھنے کے لیے کہا تو اماں جی اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھیں۔

"ٹھیک ہے تو ڈاکٹر صاب! یہ بہت کمزور لگ رہی ہے۔ خدانخواستہ کوئی خطرے والی بات تو نہیں۔" اماں جی پاس بیٹھی زینب کو تشویش سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"خطرے والی بات ابھی تو کوئی نہیں مگر آپ مزید دیر کر دیتیں تو شاید ہو بھی جاتی۔ میں یہ دوائیں لکھ کر دے رہی ہوں۔ باقاعدگی سے استعمال کروائیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی اور ایسی حالت میں یہ الٹیاں وغیرہ تو آپ کو پتا ہے ہو ہی جاتی ہیں۔ معمول کی بات ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

وہ تیزی سے پیڈ پر قلم دوڑاتے ہوئے بول رہی تھی۔

"ک... کیسی حالت میں؟" اماں جی اٹک کر بولیں۔

"آپ کی بیٹی ماشاء اللہ امید سے ہے۔ کتنے ماہ ہوئے ہیں شادی کو۔ کمزور ہے نا' اس لیے یہ حالت ہو گئی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی' یہ دوائیں استعمال کروائیں۔"

اماں جی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھیڑ عمر تجربہ کار ڈاکٹر کو تکے جا رہی تھیں۔

"آپ کی بیٹی امید سے ہے۔" انہیں لگا' پوری کائنات میں صرف اسی ایک جملے کی بازگشت گونج رہی ہے اور کہیں کوئی آواز نہیں۔

• • • • •

"صوفی صاحب! ایک بات پوچھوں؟"

صوفی صاحب عشاء کی نماز کے بعد اپنے معمول کے وظائف سے فارغ ہو کر بستر پر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ رابعہ بی بی نے بے حد پست لہجے میں ان سے پوچھا۔ سر سے عمامہ اتار کر تکیے کے دوسری جانب رکھتے ہوئے ان کے ہاتھ ایک پل کو رکے۔ پھر عمامہ رکھ کر انہوں نے کچھ غور سے بیوی کی شکل دیکھی۔ آج رابعہ بی بی نے عشاء کی نماز بھی مختصر پڑھی تھی اور معمول کے وظائف پڑھے بغیر بستر پر آ کر لیٹ گئی تھیں کافی دیر سے صوفی صاحب بیوی کا یہ کھویا کھویا انداز اور ٹھنڈی آہیں نوٹ کر رہے تھے۔

"پوچھیں!" انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر گویا اجازت دی اور خود پلنگ کی پشت سے کندھا لگا کر بیٹھ گئے۔

"آپ کا دل کتنا مضبوط ہے؟" وہ متذبذب لہجے میں بولیں۔

"میرا دل؟" رابعہ بی بی کے عجیب سے سوال پر وہ سوالیہ انداز میں بولے۔ "تمہیں ابھی اندازہ ہی نہیں ہوا رابعہ بی بی! کہ میرا دل کتنا مضبوط ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولے۔ "جو شخص اپنے جوان بیٹوں کو محض اپنے اصولوں کی خاطر گھر سے باہر دھکیل سکتا ہے۔ درختوں پر خوب اچھے پھل آئیں اور مالی اپنے ہاتھوں میں آری لے کر خود ان درختوں کو کاٹ ڈالے تو کیا تمہیں اس کے دل کی مضبوطی پر کوئی شک ہو سکتا ہے؟"

انہوں نے اپنے چہرے کا رخ چھت کی طرف کر لیا کہ کہیں ان کی آنکھوں کے بھیگے گوشے بیوی کی نظروں میں نہ آ جائیں۔

"بات اس سے بڑی ہے۔" رابعہ بی بی سر جھکا کر شکست خوردگی سے بولیں۔

"پھر تو قیامت کا ہی کچھ ذکر ہو گا۔" وہ پھر اسی بھیگے لہجے میں بولے۔

"ہم جیسے سفید پوش عزت داروں کی عزت پر حرف آنے لگے تو پھر یہ قیامت ہی ہوتی ہے۔" وہ اور بھی مدھم آواز میں بولیں۔

"رابعہ بی بی!" صوفی صاحب کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا تھا' تڑپ کر بولے۔ "کیا کہنا چاہتی ہو' صاف صاف کہو۔"

"آپ زینب کا... میرا مطلب ہے نذیر کو ابھی کچھ عرصہ کے لیے انکار... ابھی ٹال دیں۔" صوفی صاحب کی خونخوار نگاہوں کو دیکھ کر بات بدلتے ہوئے بولیں۔

"رابعہ بی بی!" وہ مدھم آواز میں غرائے۔ "ہماری عمریں اب بجھارتیں بوجھنے کی نہیں ہیں۔ جو بات ہے صاف صاف کرو۔"

"یہ بجھارت تو رابعہ بی بی سے خود بھی بوجھنا گویا قیامت ہو گیا تھا جب ڈاکٹر کے ہاں سے آتے ہی انہوں نے زینب کو کمرے میں بند کر کے پہلی بار... جب سے قدرت نے انہیں ماں بنایا تھا۔ پہلی بار انہوں نے زینب کو اس وقت پیٹا تھا۔ ہاتھوں سے 'لاتوں سے' تھپڑوں سے 'مکوں سے' جوتیوں سے اور پھر مار مار کر خود ہی نڈھال ہو کر گر پڑی تھیں۔ انہوں نے بچوں کو کبھی نہیں مارا تھا۔ صوفی صاحب خود ہی ان کی اتنی اچھی طرح "خبر" لے لیا کرتے تھے کہ ماں کو کبھی انہیں انگلی سے بھی نہیں چھونا پڑا تھا اور آج... آج اس بدبخت زینب نے ان کی مامتا کا عمر بھر کا حساب لے لیا تھا۔

"بتا کب ہماری عزت کی سفید بے داغ چادر کو تو نے گندے کیچڑ میں لت پت کر دیا' جیتے جی کب تو نے بوڑھے ضعیف ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکی' کب...؟" ان کے ہاتھوں اور بازوؤں میں اب مزید اسے پیٹنے کا دم نہیں رہا تھا مگر وہ پھر بھی لپک لپک کر اس بے جان گٹھڑی کو جھنجھوڑے جا رہی تھیں۔

"بول کب میرے دودھ نے تیرے اندر ایسی غلاظت بھری سوچ کو جنم دیا۔"

وہ اسے مار مار کر ادھ موئی ہو گئی تھیں اور زینب بھی شاید پاپ کی اس گٹھڑی کو اٹھائے تھک چکی تھی حرف بہ حرف اپنی خواہشوں' اپنی آرزوؤں کا ذلت بھرا انجام سنانے لگی۔ اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا اور رابعہ بی بی ایک ٹک پلک جھپکے بغیر اس کی جراتوں کی داستان سنے گئیں۔

"زینب! ہم نے تو تم لوگوں کو رزق حلال کھلایا تھا۔ ایک ایک لقمہ جانچ پرکھ کر پھر... پھر یہ حرام خواہشوں کا تھوہر تم سب کے جسموں میں کیسے پروان چڑھا' کیسے؟ اگر آج کے حلال کھانے والے والدین اپنی اولاد سے تم جیسے اعمال کا ثمر پائیں تو میرے مولا قیامت کی گھڑی لے آ... اس زمین کو غرق کر دے جس کے اندر میری جیسی مائیں غرق ہو سکیں۔" وہ کتنا روئی تھیں۔ حرام جاننے کے باوجود شام سے اب تک ان گنت بار اپنی موت کی تمنا کر چکی تھیں اور اب... صوفی صاحب کو سب کچھ بتاتا... ان کی پیشانی عرق عرق ہوئی جا رہی تھی۔ ضعیف سینے میں مصائب کے بوجھ تلے دبا کمزور دھڑکتا دل ڈوب ڈوب جا رہا تھا۔

"کیا؟ کیا بکواس کر رہی ہو رابعہ بی بی!" صوفی صاحب تو چنگھاڑتے ہوئے سیدھے اٹھ کھڑے ہوئے تھے نیم روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیوی کو دیکھ رہے تھے کہ کہیں ان کا دماغی توازن تو نہیں بگڑ گیا۔

"بکواس! کاش صوفی صاحب! یہ بکواس ہوتی۔ بالکل بکواس اور آپ اس ہذیان بکنے پر مار مار کر میری کھال کھینچ لیتے مگر کاش یہ واقعی بکواس ہوتی..."

وہ بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگیں۔ صوفی صاحب بے حس و حرکت کھڑے انہیں دیکھے جا رہے تھے اور بیرونی دیوار سے چپکی آمنہ کا دھڑ دھڑاتا دل جیسے سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے کو مچل رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے بے بس بوڑھے والدین کو اپنے اندر کہیں کسی گوشۂ عافیت میں چھپا لے۔

رات کے سناٹے میں رابعہ بی بی کی سسکیاں فضا کو اور بھی وحشت ناک بنا رہی تھیں۔ فضا میں حبس بے تحاشا بڑھ گیا تھا۔ کھلی کھڑکیوں کے باوجود ہوا جیسے اس مکان سے باہر ہی کہیں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ پسینے سے بھیگی قمیص بدن سے چپکی جا رہی تھی۔

"بس کرو رابعہ بی بی! بس۔ کچھ آنسو بچا لو آنے والے کل کے لیے۔" بہت دیر بعد صوفی صاحب کی سرد آواز کمرے میں گونجی تھی۔ اماں جی کی سسکیاں اگلے پل ہی تھم سی گئی تھیں۔

"کون ہے وہ لڑکا۔ کیا بتاتی ہے وہ؟" وہ بیٹھتے ہوئے بہت نارمل انداز میں پوچھ رہے تھے۔ آمنہ کی طرح رابعہ بی بی بھی بے حد حیرانی سے صوفی صاحب کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جس پر چند لمحے پہلے ٹوٹ پڑنے والی قیامت کے آثار بالکل معدوم ہو چکے تھے۔

"ج... جی..." وہ حیرانی سے یہی کہہ سکیں۔

"دیکھو اب رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔" وہ چند لمحوں بعد جیسے سوچ کر بولے۔

"اب یہ عبدالمتین یا عبدالمعین تو ہے نہیں کہ ان کی حرکتوں پر نالاں ہو کر جیسے انہیں میں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے بھی دھکا دے دوں۔ یہ تو بیٹی کا معاملہ ہے 'عزت کا معاملہ!"

وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے اور آمنہ مارے حیرت کے پورے جسم کو کان بنائے صوفی صاحب کو سن رہی تھی۔ "کیا بیٹی کا معاملہ بابا صاحب جیسے غصیلے انسان کو اسی طرح ٹھنڈا ٹھار کر دیتا ہے؟"

"اسی سوچ نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے صوفی صاحب! اور وہ لڑکا جسے ہم جانتے تک نہیں اس سارے معاملے کے بعد سے غائب ہے۔ میرا تو دماغ شل ہو رہا ہے۔" اماں جی کو بابا صاحب کے ٹھنڈے لہجے سے جیسے حوصلہ ملا تھا۔

"مسئلہ اس وقت لڑکے کا نہیں اس "مسئلے" پر قابو پانے کا ہے۔ کیونکہ وہ لڑکا اگر مل بھی جائے تو وہ ہم سے کسی بھی تعلق پر راضی نہیں ہو گا۔ اس جیسے امیر زادوں کے لیے تو یہ معاملے کسی "کھیل" سے کم نہیں ہوتے اور ہماری بدنصیبی کہ ہماری اولاد..." وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ "میں زینب کے معاملے میں اسی دن سے ڈرتا تھا۔ خیر اب رونے دھونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔" وہ پُرسکون لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"تو پھر کیا کریں؟" اتنے دوستانہ انداز میں تو انہوں نے کبھی بیوی سے کسی اچھے اور خوش کن موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ کجا اب اتنے "تکلیف دہ مسئلے" پر وہ اتنے آرام سے بات کر رہے تھے۔

"دیکھو اس مسئلے کے دو حل ہو سکتے ہیں۔" وہ کچھ آہستگی سے بولے۔

"وہ کیا؟"

صوفی صاحب آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور رابعہ بی بی کے پلنگ پر آ بیٹھے۔ پھر بے حد مدھم آواز میں انہیں دونوں "حل" بتانے لگے جنہیں بے حد کوشش کے باوجود آمنہ سن نہیں پا رہی تھی۔ وہ تھوڑا اور دروازے کی طرف کھسکی۔

"ہوں ٹھیک کہتے ہیں آپ..." اماں جی سر اٹھا کر اونچی آواز میں بولیں۔

"ٹھیک ہے نا؟" صوفی صاحب نے ایک بار پھر تائید چاہی۔

"بالکل ٹھیک۔" اماں جی بے حد مطمئن لہجے میں بولیں۔

"تو چلو اب آرام سے سو جاؤ۔ صبح اٹھ کر دیکھیں گے ویسے اب زینب ٹھیک ہے نا؟" وہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف بڑھے۔

اسی وقت زینب کمرے سے نکل کر غسل خانے کی طرف دوڑی۔ اور آمنہ اس کے پیچھے کھڑی کچھ خوف زدہ نظروں سے ماں باپ کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تین مارچ کا ایک عام سا دن تھا۔

نہیں بلکہ وہ عام نہیں بہت خاص دن تھا کیونکہ وہ تین مارچ کا اندھا دن تھا۔ اس دن نے بہت سے بے خبر' زندگی کی مستیوں میں گم نفوس کو جو خوشی خوشی اپنے گھروں سے کچھ ضروری اور کچھ غیر ضروری کام کرنے اس شاپنگ پلازہ میں آئے تھے۔ سڑک پار جس کے عین سامنے معاذ نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ رش بہت زیادہ تھا اور شاپنگ مال کے پارکنگ ایریا میں ایک گاڑی تو کیا ایک موٹر سائیکل پارک کرنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

"آپی! آپ پھر جلدی سے جائیے اور دونوں کام کر آئیں میں ادھر آپ کا ویٹ کرتا ہوں۔" معاذ نے گاڑی کے آدھ کھلے فرنٹ ڈور میں کھڑے ہو کر شاپنگ سینٹر کے رش کا جائزہ لیتے ہوئے نزہت سے کہا۔

"اُفوہ معاذ! اتنا رش ہے۔ میں اکیلی جاؤں۔ تم آجاؤ نا ساتھ۔" وہ یوں بھی گھر سے کم نکلتی تھی۔ معاذ ہمراہ نہ ہوتا تو وہ زیتون بانو کو ساتھ لے لیتی کہ وہ اکیلی شاپنگ کے لیے نہیں جا پاتی۔

"اگر میں بھی آپ کے ساتھ چل پڑا تو گاڑی ابھی لفٹر اچک لے جائے گا پھر کون گاڑی چھڑانے کے پیچھے خوار ہوتا پھرے گا۔ پلیز ذرا سا تو کام ہے اور وہ بھی خواتین سے متعلق آپ خود ہی ہو آیئے۔ دس منٹ بھی نہیں لگیں گے۔" وہ ہچکچاتی ہوئی نزہت کو جیسے دلاسا دے رہا تھا۔

"پھر بھی..... میں تو اس طرح کبھی بھی اکیلی..... " وہ متذبذب کھڑی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"آپی پلیز..... اب جائیے بھی۔ اتنی دیر میں تو آپ واپس بھی آجاتیں۔" وہ اب کے کچھ بیزاری سے بولا تو نزہت سست قدموں سے آگے بڑھی۔ معاذ کی نظروں کے سامنے وہ شاپنگ سینٹر کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر جگجیت سنگھ کی کیسٹ لگائی اور سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر غزل کے مدھم سُروں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

یکایک اسے احساس ہوا کہ نزہت کو گئے آدھے گھنٹے سے زائد ہونے کو ہے۔ ٹیلر کی دکان تو تیسرے چوتھے نمبر پر تھی اور کھسنہ شاپ جہاں سے ارتضیٰ کا کھسنہ لینا تھا' وہ بھی ٹیلر کی دکان سے چند قدم پر تھی۔ وہ کچھ پریشان ہو کر گاڑی سے نکل آیا۔

گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے سڑک کراس کی اور شاپنگ سینٹر میں آ گیا۔ پانچ سات منٹ ادھر ادھر دکانوں میں تاک جھانک کے باوجود اسے نزہت کہیں نظر نہ آئی۔ وہ دوبارہ باہر آ گیا کہ شاید وہ گاڑی کے پاس جا چکی ہو سڑک کے دونوں اطراف رش بڑھ چکا تھا۔ وہ گاڑی کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی۔

"کمال ہے۔ اتنی دیر اتنے سے کام میں کیسے لگ سکتی ہے۔" وہ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پریشانی سے سوچنے لگا۔

"دوبارہ جا کر پتا کروں۔" سوچتے ہوئے ابھی اس نے سڑک کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے زوردار دھماکوں سے سڑک کے ارد گرد ہی کیا' دور تک کی عمارتیں لرز گئی تھیں۔

اور سامنے..... سامنے شاپنگ پلازہ جیسے مٹی کی بھربھری عمارت کی طرح دھوئیں اور آگ کے بادلوں میں زمیں بوس ہوتا صاف نظر آرہا تھا۔ معاذ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی اور یہ چیخ صرف اس کے منہ سے نہیں نکلی تھی پورے علاقے میں کہرام مچ گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار آگ اور خاک کے اس سر بفلک طوفان کی طرف لپکا تھا۔

پھر اس بھیانک تباہی کی زد میں صرف نزہت ہی نہیں آئی تھی نہ جانے کتنی دوسری نزہت اور معاذ بھی آ گئے تھے۔ جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے موت کی آغوش میں جا سمائے تھے۔

لاشیں بہت کم صحیح و سالم ملی تھیں شام تک جب آگ بجھی اور ملبے کو ہٹانے کا کام شروع ہوا تو کچھ بھی نہیں بچا تھا مردہ جسم تک نہیں پھر نزہت کی لاش کہاں سے ملتی۔

اس نے کیسے جا کر مسز خان کو بتایا اور کس طرح قیامت کی وہ گھڑیاں گزریں اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ اسے تو جیسے اپنے اردگرد کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ نزہت مر سکتی ہے' وہ اس کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی باتیں کرتی 'ہچکچاتی'۔ "کاش میں ان کے ساتھ چلا جاتا یا انہیں جلدی لے کر باہر آجاتا۔"

بغیر مُردے کے بھلا کیا جنازہ اٹھنا تھا۔ بس ایک صفِ ماتم تھی جو پورے گھر میں بچھ گئی تھی۔ اسے ہوش تو اس دن آیا جب اس نے سر جھکائے وہ چہ مگوئیاں سنی تھیں۔

"ارے پہلے بھی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ بھائی نے قبول کرنے سے انکار کر دیا' دھکے دے کر نکالا تو ادھر آ گئی۔ بے چاری پھپھی اچھی نکلی۔ بڑے دل کی مالک' بیٹے کی بیوی کے طور پر قبول کر لیا مگر بیٹے نے قبول نہ کیا۔ اچھی خاصی دونوں میاں بیوی میں ناراضی چل رہی تھی یا شاید علیحدگی ہو چکی تھی۔ دو سال سے تو شہباز کی شکل نہیں دیکھی۔ ہم نے تو سنا ہے وہ مری وری کوئی نہیں پھر سے بھاگ گئی ہے۔ ارے جس کو لت لگی ہو حرامزدگی کی وہ یوں تن تنہا چڑھتی جوانی کے ساتھ کتنے دن رہ سکتی تھی۔"

یہ کون کہہ رہا تھا' پیچھے مڑ کر دیکھنے کے باوجود معاذ کو پتا نہیں چل سکا۔ پھر یہ چہ مگوئیاں گونج دار سرگوشیوں میں بدل گئیں۔

اظہر اور ایاز نے چوتھے دن سوگ ختم کرنے کا اعلان کر کے افسوس کے لیے آنے والوں سے معذرت کر لی تھی۔

"امی جان! موت وہ ہوتی ہے جس میں کوئی مرا ہوا نظر آتا ہے۔ وہاں اتنے لوگوں کی اور بھی تو لاشیں ملی ہیں نا ایک بس نزہت کی نہیں ملی۔ اللہ جانے کیا چکر ہے کیا نہیں۔ آپ پلیز یہ ماتم ختم کریں۔ یہ سب آپ کی صحت کے لیے بھی اچھا نہیں اور لوگ افسوس کے بہانے آکر گھٹیا طنز کی کند چھری سے ہمیں ذبح کر جاتے ہیں آخر ہم کب تک یہ سب برداشت کریں گے۔"

اظہر نے مسز خان کے کمرے کی دہلیز پہ کھڑے ہو کر جلے کٹے انداز میں کہا تھا اور مسز خان سر جھکا کر رہ گئیں۔ اور ساری افواہوں کو جیسے ثبوت مل گیا۔ یوں اس بدنصیب کی موت کو بھی کسی نے موت تسلیم نہیں کیا بلکہ بدنامی اور ذلت کے نئے اشتہار لگ گئے اور ان اشتہاروں کو نئی پرانی سرخیوں سے سجانے والی مسز خان کی دونوں بڑی بہوئیں تھیں۔

ان دنوں شہباز خان کا رابطہ گھر سے مکمل طور پر منقطع تھا۔ نزہت کی موت کے چھ سات ماہ بعد جب شہباز خان نے مسز خان کو فون کیا تو انہوں نے نہ جانے کیوں شاید اس کی موت سے جڑی گھٹیا کہانی سے گھبرا کر نزہت کی موت کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا بلکہ اس دن کے بعد سے کسی نے بھی ان کے منہ سے نزہت کا نام تک نہ سنا۔ انہوں نے جیسے چپ سی سادھ لی تھی۔

اور ذلت سہنے کو رہ گیا معاذ جس نے اس واقعے کے فوراً بعد (جس میں معاذ کو بھی انوالو کیا جا رہا تھا) بارہا گھر چھوڑ کر جانا چاہا اور ہر بار مسز خان آنسو بھری آنکھوں اور خاموش لبوں سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیتیں تو وہ بے بس ہو کر رہ جاتا۔

لوگوں کی باتیں سن سن کر اس کے دل میں بھی کبھی کبھی یہ شک جڑ پکڑنے لگتا کہ کیا واقعی نزہت اس حادثے کا شکار نہیں ہوئی لیکن اگر وہ مری نہیں تو پھر کہاں جا سکتی ہے۔ وہ بھی ارتضیٰ کو چھوڑ کر جبکہ اس شہر میں اس کا اور کون ساتھ کا نام ہو سکتا ہے؟۔ مسز خان نے پنڈی میں سہیل کو بھی اطلاع کروائی تھی اس نے آنے کے بجائے فون پر ہی کہہ دیا تھا۔ "خس کم جہاں پاک!"

اس دن کے بعد سے اس گھر میں جیسے نزہت کا نام لینا گناہ سمجھا جانے لگا تھا۔

"لیکن یہ سب کب تک یونہی چل سکتا ہے۔ یہ پنڈورا باکس اس دن پھر کھلے گا جب شہباز خان واپس لوٹیں گے یا ارتضیٰ شعور کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھے گا تو اس کا پہلا سوال یہی ہو گا۔ "میری ماں کہاں ہے اور اس کا جواب گھر سے زیادہ باہر والے دیں گے اور یہ جواب سن کر وہ....."

معاذ کو جھرجھری سی آ گئی۔

دھوپ میں اس کا پورا بدن جیسے جل چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اسے آج مسز خان کو ہاسپٹل سے ڈسچارج بھی کروانا تھا اور پھر انہیں یہ "خوشخبری" بھی تو سنانا تھی کہ مشی منگنی کی انگوٹھی اس کے منہ پر مار کر جا چکی ہے۔ اسے پھر سے اپنی انسلٹ کا منظر یاد آ گیا وہ جھلسا بدن اور سلگتا دماغ لیے اندر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر شاید پنڈورا باکس کھلنے کا وقت آ گیا تھا۔

شہباز خان محض سرپرائز دینے کے چکر میں سیدھا اپنے پورشن میں جانے کے بجائے دونوں سوٹ کیس دھکیلتے ہوئے اظہر کے پورشن میں داخل ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا اور گھر کے سارے دروازے انہیں کھلے ہوئے ملے تھے۔ اگلے چند لمحوں بعد اچانک انہیں سامنے پا کر سب کی خوشی اور حیرت سے جو کیفیت ہوگی اسے سوچ کر ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ لاؤنج سے آوازیں آرہی تھیں ان کے قدم ادھر ہی اٹھتے چلے گئے۔

اظہر اور یاسمین باتیں کر رہے تھے لاؤنج کے دروازے پر ان کا دایاں پاؤں اٹھنے کا اٹھا رہ گیا۔

"یہ سب اس بدمعاش معاذ کا چلایا ہوا چکر تھا۔ جب سے یہ آوارہ گھر میں آیا ہے ہمارے گھر پر جیسے نحوست نے پر پھیلا لیے ہیں۔ شہباز، عقل کا اندھا جوان بیوی کو چھوڑ چھاڑ نہ جانے کدھر کدھر کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔ بیوی بھی ایسی جس سے نہ اپنے جذبات سنبھالے جا سکیں نہ اپنی جوانی۔"

یاسمین کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ انہیں لگا وہ پانچ سال بعد نہیں محض پانچ منٹ بعد اس پورشن میں آئے ہیں۔

"اب اس منحوس کا کیا ذکر۔" اظہر جل بھن کر بولے۔ "عزت تو اب ہماری داؤ پر لگی ہے۔ سو بندوں کے بیچ انگوٹھی پہنائی تھی اس گھٹیا انسان نے مشی کو جسے تمہاری جذباتی بیٹی اکیلے میں جا کر اس کے منہ پر مار آئی یہ طور طریقے ہوتے ہیں شرفاء میں رشتے توڑنے جوڑنے کے؟" شہباز خان کے ماتھے کے بل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"بس کرو۔ اپنی نرالی شرافت کے سبق مجھے نہ رٹاؤ۔ بڑے شریف ہو نا تم لوگ، تمہارے بھائی نے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو بخوشی اپنی سیج پر گوارا کر لیا، اس وقت تم لوگوں کی شرافت کون سے عشرت کدے میں آرام فرما رہی تھی اور وہ لو فرو دوبارہ بھاگ گئی اتنا بڑا ڈرامہ رچا کر، اور میں تو کہتی ہوں اس کمینے معاذ کو سب خبر ہے۔ ہر وقت تو اس کا دم چھلا بنا رہتا تھا۔ اب دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کو مشی سے منگنی کا ڈرامہ کر لیا۔ کیا دیکھا نہیں تم نے کتنا ہتک آمیز سلوک تھا اس کا مشی کے ساتھ، آخر وہ کہاں تک برداشت کرتی۔ اس نے تو کبھی کسی کے ماتھے کے بل نہیں سہے۔ کہاں اس دو ٹکے کے نزہت کی ہر وقت کی بیزاری۔ مشی نے جو کیا اچھا کیا۔" کہانی شہباز خان کی سمجھ میں آتی جا رہی تھی مگر نزہت کہاں گئی؟

"لو فرو دوبارہ بھاگ گئی۔" یاسمین کا جملہ ان کے دماغ میں گڑ کر رہ گیا تھا۔

"اس نے منگنی توڑ ڈالی اپنی مرضی سے تو اب کیا مسئلہ ہے؟ اب وہ کس بات کا سوگ منا رہی ہے؟" اظہر جیسے تنگ آکر بولے۔

"وہ کہتی ہے کہ اس بدمعاش کو گھر سے چلتا کرو۔ اس نے مشی کو بہت دھمکیاں دی ہیں کہ وہ اس سے اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لے کر رہے گا۔ مشی نے جو اس کی انسلٹ کی تھی منگنی توڑ کر وہ اس کا جواب ضرور دے گا، مشی اندر سے سخت خوفزدہ ہے۔ میری معصوم بچی کن چکروں میں پڑ گئی۔ آپ اپنی والدہ صاحبہ سے بات کریں یا نہ کریں مگر میں آج کل تک اس مفت خورے کو ضرور ڈنڈا ڈولی کر کے باہر پھنکواؤں گی۔ دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے۔" یاسمین خونخوار لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"تم فضول میں بات کو نہ بڑھاؤ۔ کچھ دار ہوا تو اتنی عزت افزائی پر خود ہی گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میں اماں جان سے بات کرتا ہوں۔ تم مجھے دو چار دن کی مہلت دو۔" اظہر کا لہجہ سوچتا ہوا سا تھا۔

"یہی تو اس کی چال ہے۔ پہلے نزہت کو بے وقوف بناتا رہا اور میری بات کو لکھ لو، وہ بھاگی بھی اس کے ساتھ ہی تھی یہ تو سب کو معلوم ہے کہ خدا جانے دونوں صبح سویرے کدھر گئے تھے۔ یہ تو اسی مسٹنڈے نے آکر کہانی گھڑی اور قدرت نے بھی اس کی خوب مدد کی۔ نزہت کہاں ہے، اس کو سب خبر ہے۔ میری بات لکھ لیں۔" یاسمین پر زور لہجے میں بول رہی تھی۔

"نزہت کا ذکر کہاں آ گیا، کیوں فضول میں گڑے مردے اکھاڑتی ہو۔ بھاگ گئی، مر کھپ گئی، راکھ ہو گئی۔ ہماری

بلا سے۔ تم اپنی سوچو، اس نادان لڑکی کے بارے میں جو اس سارے قصے میں....."

شہباز خان سے اور کچھ بھی نہیں سنا گیا۔

"کیا ایک بار پھر وہی ذلت بھری کہانی دہرائی جائے گی۔" جس کی شہ سرخیاں وہ ابھی سن چکے تھے۔ کیا یہی ذلت کمانے ایک بار پھر وہ سات سمندر پار کر کے آئے تھے میرے خدا!" ان کا دماغ جیسے ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

"وہ لو فرو دوبارہ بھاگ گئی۔" ان کا دماغ اسی ایک چنگاریاں اڑاتے جملے میں بھڑ بھڑ جلنے لگا تھا۔

وہ خاموش قدموں سے چلتے باہر تک آئے، کس طرح انہوں نے وہ وزنی سوٹ کیس دھکیل کر گیٹ سے باہر نکالے اور کب وہ جا کر اس ٹیکسی کے پاس کھڑے ہو گئے، جس سے چند منٹ پہلے اتر کر خوشی خوشی اندر گئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنی گاڑی کو چمکا رہا تھا۔

شہباز خان کو اپنے سامنے کسی پتھر کی دیوار کی طرح جامد کھڑے دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

انہوں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا، خود کو سیٹ پر گرایا اور دروازہ بند کر لیا۔

"چلو..." بڑی مشکل سے ان کی زبان نے یہ لفظ ادا کیا تھا۔

"کہاں سر؟" ٹیکسی ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا پھر ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر جلدی جلدی سوٹ کیس ٹیکسی کے اوپر رکھنے لگا۔

انہیں لگا وہ پھولوں پر چل کے یہاں تک آئے تھے اور اب ٹوٹے کانچ کی کرچیوں پر چل کر واپس جا رہے ہیں۔ سمندر کے پاس آکر جنموں کی پیاس لے کر جا رہے ہیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

رعنا حیات نے ڈسچارج ہونے تک ڈاکٹرز کو مصیبت میں ڈالے رکھا۔ ہر گھڑی ان کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے ڈسچارج کریں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں پلیز۔" وہ ملتجی لہجے میں ایک ایک ڈاکٹر سے کہتیں۔

"بیگم صاحبہ صرف دو چار دن اور۔" ہر ڈاکٹر ان سے زیادہ منت بھرے لہجے میں کہتا۔

فخر حیات کو آئی سی یو سے روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا مگر ابھی تک وہ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہوش میں آچکے تھے مگر بالکل چپ رہتے تھے۔ رعنا حیات کو ان سے ملنے کے لیے لے جایا گیا تو انہوں نے صرف ایک فقرہ کہا تھا "تم ٹھیک ہو نا؟" اور رعنا حیات سے اس کا جواب بھی نہیں دیا جا سکا تھا۔

رعنا حیات کے سگے بھتیجے نے جسے دونوں نے اپنے بیٹے سے بڑھ کر چاہا۔ کسی شہزادے سے بڑھ کر اس کی پرورش کی تھی۔ اس نے یہ صلہ دیا کہ دونوں موت کی دہلیز سے لوٹے تھے۔

"جھناں کہاں ہے؟" دوسرے دن فخر حیات نے کچھ بے چین لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک..." رعنا حیات سر جھکا کر بے بسی سے بولیں۔

"مطلب؟" وہ ان کے جواب پر الجھ کر بولے۔

"وہ دوسرے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ آپ زیادہ سوچیں نہیں۔" رعنا نے انہیں تسلی دی۔

"بالآخر ساتویں دن رعنا حیات کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اور امید تھی کہ آٹھ دس دنوں میں فخر حیات کو بھی چھٹی مل جائے گی۔

مگر رعنا کی بے چینی کی وجہ تو جھناں کا کوارٹر تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی وہ سیدھا اس کے کوارٹر میں گئی تھیں۔ چارپائی کے نیچے پرانے لوہے کے ٹرنک میں کپڑوں کی تہوں کے نیچے انہیں وہ انتہائی قیمتی کاغذ کا پرزہ مل گیا تھا۔ انہیں لگا ہفت اقلیم کی دولت ان کے ہاتھ آگئی ہے جسے وہ سینے سے لگائے اپنے بیڈ روم میں چلی آئیں۔

سب سے پہلے انہوں نے کمرے میں آکر منیجر کو فون کر کے راولپنڈی کے اس یتیم خانے کا پتا چلانے کو کہا جس کا ایڈریس اس کاغذ پر لکھا تھا۔

"جلد از جلد مجھے سب معلومات حاصل کر کے فون کرو۔ میں ویٹ کر رہی ہوں۔" کہتے ہوئے انہوں نے فون رکھ دیا۔

"جنتاں..." ان کے منہ سے بے اختیار نکلتے نکلتے رہ گیا۔ کس قدر عادی تھیں وہ جنتاں کے بے ضرر سے وجود کی۔ مگر بے ضرر کب۔ وہ تو انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا گئی تھی۔

"اس نے تو پھر جاتے جاتے اس کی تلافی کر دی مگر میں نے۔ میں نے کیا کیا؟ اس بے بس عورت کے ساتھ۔" انہوں نے بے ساختہ خود سے پوچھا۔

ان کی نظروں کے سامنے جنوری کی وہ سرد ترین صبح آ گئی جب فخر حیات نے گھر میں بہت بڑی پارٹی ارینج کی تھی۔ گھر میں ایک نہیں بیس بیس ملازم تھے مگر جنتاں کی اپنی اہمیت تھی۔ رعنا حیات کی شادی کو ابھی دو سال کا عرصہ ہوا تھا۔ ان کی گود میں گیارہ ماہ کا بچہ تھا اور جنتاں نے نئی نئی بیوگی کی چادر اوڑھی تھی۔ اس کا شوہر بھی حیات ولا کا پرانا ڈرائیور تھا۔ وہ فیکٹری کے کام سے شہر سے باہر گیا تھا جب ایک ٹرک نے اس کی گاڑی کچل ڈالی تھی۔ جنتاں کے آنسو ہی خشک نہ ہوتے تھے۔ اس واقعہ کو بیتے بھی سال ہونے کو آیا تھا۔ اس کا بچہ پانچ چھ ماہ کا تھا۔ انتہائی کمزور لاغر اور بیمار سا، کچھ پیدائش سے پہلے یتیمی کے سائے نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ کچھ ماں کی بے توجہی نے۔ وہ دن بدن مزید لاغر ہوتا چلا گیا۔ ان دنوں سردی بھی بہت شدید پڑ رہی تھی۔ ٹھٹھرتا دسمبر گزرا تھا کہ بھیگتی جنوری نے ہر طرف قیامت کی سردی پھیلا رکھی تھی۔ جنتاں کے بچے کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔

"بیگم صیب! میرا بچہ بیمار ہے میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہے کچھ پیسے..." وہ ہاتھ جوڑے مریل سے بچے کو سینے سے لگائے گھگھیا گھگھیا کر بول رہی تھی۔ باہر تیز طوفانی بارش کے ساتھ ہوائیں چل رہی تھیں۔ بچے نے ناکافی کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ اچھا خاصا نیلا ہو رہا تھا۔ ماں کے سینے سے چمٹنے کے باوجود۔

"تو کام تیرا باپ کرے گا۔ سب کچھ تو بکھرا پڑا ہے اور شام ہونے کو ہے۔" رعنا حیات بجلی کی طرح کڑکی تھیں۔

"بیگم صیب! آج نہیں... آج جی میرا بچہ صحیح نہیں جی، مجھے معافی (معافی) دے دیں وہ فیس کے پیسے۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

پیسے دے دوں ان مفت خوروں کو، ہڈ حراموں کو، جب کام کا وقت آتا ہے تو سو حیلے سو بہانے، جا دفع ہو یہاں سے اپنا منہ کالا کر، کوئی پیسہ دھیلا..." کہتے کہتے رعنا حیات نے جو اسے زوردار دھکا دیا۔ وہ کمزور لاغر کانپتی مردہ ٹہنی کی طرح لڑھکتی ایک ہی دھکے سے سامنے ماربل کے پلر سے ٹکرائی تھی۔ بچہ پہلے پلر سے ٹکرایا پھر اس کے کمزور ہاتھوں سے چھوٹ کر ماربل کے ننگے گیلے فرش پر کانچ کے نازک برتن کی طرح گرا اور وہیں ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ منہ سے ہلکی سی چیخ نکال کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

جنتاں اپنے ماتھے سے رستے خون سے بے پروا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی عمر بھر کی کمائی کو یوں ریزہ ریزہ ہوتے دیکھتی رہ گئی۔

اور اس کے بعد محض چند ہی دنوں بعد ان کی گود بھی یونہی اجڑ گئی۔

اس دن سے وہ قطرہ قطرہ شمع کی طرح پگھلتی اس دائمی غم میں گھلی جا رہی تھیں۔

"اب بھی اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو یہ جنتاں کچھ عرصہ اور شاید مرتے دم تک کچھ نہ بکتی۔ خبیث، مکار بڑھیا..." انہیں پھر سے اس پر شدید غصہ آیا تھا۔

"تم نے تو اس کی دنیا ہی اجاڑ ڈالی تھی جو پھر کبھی آباد نہ ہو سکی۔ اس نے تو تمہارے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کیا۔ تمہارا بچہ اب جوان ہو گیا ہو گا، گبرو جوان اور جنتاں کی یہ قربانی جو وہ فخر حیات کی زندگی بچا گئی۔ یہ تو اس لیے تم سے بھی نہ ہو سکا کہ سینہ تان کر فخر حیات کے آگے آ کھڑی ہوتیں۔ یہ تو اس نمک حلال ملازمہ کی ہمت تھی جو اپنے مالک پر قربان ہو گئی۔ تم نے تو اپنی ساری عیش بھری زندگی میں ایک پل بھی اس کے اس گھاؤ کے متعلق نہ

سوچا جسے صرف موت ہی بھر سکی۔ رعنا حیات! تم اس معمولی ملازمہ سے بڑھ کر ظالم، بے حس اور شقی القلب ہو۔ تم تو اس رعایت کی بھی مستحق نہیں تھیں جو جاتے جاتے وہ تم سے کر گئی۔" کوئی پوری قوت سے ان کے اندر چیخا تھا۔

"ہاں جنتاں! تم بہت عظیم ہو۔ اپنی غلطی کا کفارہ بھی ادا کر گئیں اور میں نے تو ایک بار بھی اس گناہ اس معصوم کے قتل کے بارے میں سوچا تک نہیں جو میرے ان خون آلود ہاتھوں سے سرزد ہوا اور میں ہر طرح کی سزا سے بھی بچ گئی۔" وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"سزا تو مجھے بھی عمر بھر کی ملی ہے، میری ممتا کو سزا ملی ہے۔" اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"یس..." بمشکل وہ خود کو کمپوز کر پائی تھیں۔

"میڈم! میں نے سب پتا لگا لیا ہے۔ اس نام کا یتیم خانہ تو اب ادھر نہیں ہے وہ تو آج سے تقریباً بیس بائیس برس پہلے ہی ختم ہو گیا تھا جب اس کے مالک کی ایک حادثے میں دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اس نے یتیم خانہ ختم کر دیا تھا۔ میرے لیے اور کوئی حکم میڈم؟" منیجر تفصیل بتاتے ہوئے مؤدب لہجے میں بولا۔

"اور یہ کہ تم دفع ہو اور اچھے خاصے کم عقل انسان بھی۔ نہ جانے فخر نے کیا سوچ کر تمہیں اتنی اہم سیٹ دے رکھی ہے۔ یہ تمام معلومات تو میں خود بھی یہاں بیٹھی فون پر حاصل کر سکتی تھی۔ تم ابھی اپنی سیٹ سے اٹھو اور راولپنڈی جاؤ اور کل صبح آ کر مجھے رپورٹ دو کہ اس یتیم خانے کے بچے کہاں گئے۔ انہیں کہاں شفٹ کیا گیا۔"

"میرے مالک میری ممتا کا اور کتنا امتحان باقی ہے۔ معاف کر دے۔ مجھے میرے بچے سے ملا دے۔ میرے صدیوں سے بے چین بے قرار دل کو قرار دے دے۔ میرے اللہ۔" وہ بے اختیار ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"شادی! کتنے دنوں کا آپ مجھ سے کہہ کر گئے تھے اور کتنے دن آپ ادھر لگا چکے ہیں، کچھ احساس ہے آپ کو؟" وہ نین ناراضگی کرتے ہوئے بولی۔

"معلوم ہے مجھے۔ دیکھو اگر بائی پاس ہو جاتا تو میں اب سے مہینہ بھر پہلے آ چکا ہوتا۔ ڈاکٹرز نے کہا کہ سب کچھ میڈیسن کے ذریعے ہی ریکور ہو جائے گا۔ اس ٹریٹمنٹ کی وجہ سے اتنا ٹائم لگ گیا۔ میں تو خود اب ادھر رہتے رہتے تنگ آ چکا ہوں۔ تمہاری بہت یاد آ رہی ہے۔ کیسی ہو؟" وہ مشتاق لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"کچھ بے ڈھنگی۔" وہ مسکراہٹ دبا کر آہستگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔ آپ جو نہیں اس لیے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ مجھے بھی آنے نہیں دے رہے۔ سیدہ آپا کیا ابھی بھی آپ کے پاس ہیں؟"

"نہیں وہ تو بمشکل دو ہفتے رہ سکیں۔ جواد اور حنا کی شادی کر رہی ہیں وہ دو چار ماہ میں۔ اس لیے میں بھی اب جلد وطن لوٹنا چاہ رہا ہوں۔ سیدہ آپا کے روز فون آ رہے ہیں، شاید اگلے ماہ تک آ جاؤں۔" وہ اچھے خاصے اکتائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"ادھر آپ کے پاس کون ہوتا ہے؟" وہ کریدنے والے انداز میں بولی۔

"تمہاری خوبصورت یادیں اور حسین چہرے کی تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت رہتی ہے۔"

"شادی! میں مذاق نہیں کر رہی۔"

"بھئی ملازم ہیں دو تین اور کس کو ہونا ہے۔"

"شادی! میرے پاس آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔"

"کیا ہے نین! ہر کال پر یہی ایک فقرہ بولتی ہو۔ پوچھتا ہوں تو بتاتی بھی نہیں ہو، آخر کیا مسئلہ ہے؟ ایک تو تم نے

مجھے بے چین کر رکھا ہے۔" وہ کچھ جھلا کر بولے۔
"مسئلہ تو نہیں شاہ جی! خوشخبری ہے۔" وہ "خوشخبری" پر زور دے کر بولی۔
"وہی تو پوچھ رہا ہوں۔" وہ اکتا کر بولے۔
"آپ آئیں گے تو پھر خود ہی دیکھ لیجئے گا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔
اسی وقت عبدالمبین اندر داخل ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے وش کرتا ہوا نین تارا کے سامنے پڑے صوفے پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔
"اوکے شاہ جی! پھر بات کریں گے۔ خدا حافظ۔" اس نے جلدی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔
"کس کی تھی اور بات۔ میرے سامنے کیا شرم آتی ہے۔" وہ ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولا۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ کارڈلیس سائیڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔
"ہاں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے شرم اور تم! وہ الگ چیزیں ہیں۔"
"مبی!" وہ تنبیہی انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔
"تم شاہ جی کو خیر سے یہ "خوشخبری" سنا کیوں نہیں دیتیں۔"
"سناؤں گی وہ آ تو جائیں۔"
"جانے ان کا کمزور دل اتنی بڑی خوشی کی خبر کو سہار ہی نہ سکے اور..." وہ شرارتی لہجے میں جملہ ادھورا چھوڑ کر نین تارا کو دیکھنے لگا۔
"مبی! فضول باتوں کی ضرورت نہیں۔" وہ سائیڈ ٹیبل پر پڑی مساج کریم اٹھا کر ہاتھوں کا مساج کرنے لگی۔
"نین تارا! تم یہ کیا پاگل پن کر رہی ہو۔ تم بچے وچے کا کروگی کیا اور پھر تمہارے خیال میں شاہ جی اس بچے کو Own (اپنا) کرلیں گے۔ کبھی نہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔
"مبی! ایسے مت کہو۔ میں مر جاؤں گی۔ اگر ایسا کچھ بھی ہوا تو۔" وہ دہل کر بولی۔
"حماقت تو تم خود کر رہی ہو۔ اچھا اگر یہ سب کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو تم شاہ جی سے اس کا ذکر تو کرو، دیکھو تو سہی وہ کیا ریسپانس دیتے ہیں۔ تم کیوں اپنا آپ داؤ پر لگا رہی ہو۔" وہ بھی سنجیدگی سے بولا۔
"اگر یہ خود کو داؤ پر لگانے والی بات ہے تو یہی سہی۔ مبی! میں بچے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ بھی سید سلطان بخت کا بچہ۔ تمہیں میں کیا بتاؤں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"کیا تم شاہ جی کا وارث پیدا کر کے ان کی وراثت میں حصے دار..."
"پلیز مبی! میری نیک نیتی کو غلط رنگ مت دو۔ مجھے اگر محض ان کی دولت و جائیداد کی ضرورت ہوتی تو وہ میں ان سے یوں بھی بڑے آرام سے ہتھیا سکتی تھی۔ تمہیں معلوم ہے۔"
"تو پھر؟"
"مجھے ان کا نام لیوا چاہیے، وہ بھی وہ، جو میرے وجود کا حصہ ہو۔ اسے تم میرے دماغ کا خلل سمجھ لو۔ چھوڑو اس موضوع کو۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "آج کل بڑا اونچا اڑ رہے ہو۔ ٹی وی آن کرو تو تقریباً" ہر چینل پر تمہارے ہی نمبرز چل رہے ہوتے ہیں۔ پانچویں والیوم کا ریسپانس کیسا رہا؟"
"زبردست، بہت شاندار۔"
"اتنی مدت سے سینماؤں میں فلاپ فلمیں چل رہی ہیں اور تم اپنی لک دیکھو، صرف دو فلموں میں کام کیا اور دونوں سپرہٹ گئی ہیں۔ انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں ٹاپ آف دی لسٹ رہی ہیں۔ بہت بڑی بات ہے۔ میں واقعی تم سے بہت امپریس ہوئی ہوں۔ اگر انسان کے اندر لگن ہو، کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو تو پھر یہ کچھ معنی نہیں رکھتا کہ آپ کا بیک گراؤنڈ کیا ہے اور آپ کا تعلق کس کلاس سے ہے۔ آپ کا کام، آپ کا بیک گراؤنڈ اور آپ کی کلاس

بن جاتا ہے، ہے نا؟" وہ متاثر ہو جانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔
"بالکل درست کہا تم نے۔" عبدالمبین نے گہرا سانس لیا۔
"آج کل کیا کر رہے ہو؟"
"فی الحال تو تین دن مکمل ریسٹ کر رہا ہوں، چوتھے دن کی شام کو یو کے جا رہا ہوں۔ ڈیڑھ ماہ کا ٹور ہے۔ تقریباً" سات شہروں میں میگا شوز ہوں گے۔ کچھ فلم والے بھی ادھر پروگرام کر رہے ہیں۔ اس میں شرکت کرنا ہے لمبی مصروفیت۔" وہ اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکاتے ہوئے بولا۔
"ویسے تم یہ کیا حماقت کر رہے ہو۔" نین تارا اچانک بولی۔
"کیا مطلب؟"
"حیدر۔ انڈر گراؤنڈ مافیا کا سرغنہ اور شوبز میں ہونے والی تمام ترفی سرگرمیوں کا مرکز... مام بتا رہی تھیں۔ تم آج کل اس کے ساتھ بہت دیکھے جا رہے ہو۔ یہ تم بہت غلط کر رہے ہو۔ اس سے تمہاری بھی ریپوٹیشن خراب ہو سکتی ہے۔"
"ہونہہ، کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بہت اچھا انسان ہے بہت نیک دل اور دوستی میں بالکل فیئر۔ ایک دو فنکشنز میں ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے اور میں اس سے تھوڑا بہت انسپائر ہوا۔ یوں دوستی ہو گئی، جہاں ملتا ہے محبت اور خلوص سے ملتا ہے۔"
"اور تم محبت کے ترسے ہوئے ہو۔" وہ طنز سے بولی۔ "میں نے تو سنا ہے تم اس وائٹ پیلس میں ہونے والی ہر تقریب میں انوائٹڈ ہوتے ہو اور موج مستی کے پروگرام میں بھرپور حصہ لیتے ہو؟" وہ اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔
"او کم آن نین تارا! تمہیں یہ اماؤں والی باتیں سوٹ نہیں کرتیں، دوستی میں یہ سب چلتا ہے۔" وہ اٹھنے لگا۔
"جس دن یہ دوستی تمہارے گلے پڑ گئی نا تو لگ پتا جائے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔ سنا تو ہوگا تم نے اور مام بتا رہی تھیں تم نے بہت ڈرگز استعمال کرنا کر دیے ہیں۔ وائٹس پر ایم ووڈ یو مائی فرینڈ۔ کیوں خود کو تباہ کر رہے ہو۔ اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔ بیمار لگنے لگے ہو۔"
وہ اس پر بہت دنوں کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

بیمار تو ہم ہیں تمہارے عشق کے بیمار
مٹا دے جو عمر رائیگاں کا احساس بھی
ایسا ہی کوئی خواب کوئی خواہشِ شدید بن کر آؤ
پھوٹے جس کی ہر لہر سے نغمۂ بہاراں
شوق تمنا کے اس دریا کی تمہید بن کر آؤ

"اب یہ کیا ہے؟" نین تارا نے اس کو گھور کر دیکھا۔
"کچھ نہیں۔" وہ یونہی ہنس دیا۔ "ڈنر پر چلو گی رات کو میرے ساتھ؟"
"نہیں شکریہ۔" وہ روکھائی سے بولی۔
"اب بھلا ناراضی کی کیا بات ہے؟"
"کوئی ناراضی نہیں اور ڈنر تم باہر جا کر نہیں کرو گے، بلکہ یہیں گھر میں ہمارے ساتھ۔ اوکے، تم ذرا مام کے پاس چل کر بیٹھو۔ میں فریش ہو کر آتی ہوں پھر باہر لان میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" نین تارا کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اچھا آئیڈیا ہے۔ تم آؤ پھر گپ شپ کرتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو کون؟" گہری نیند سے بمشکل جاگ کر معاذ نے سرہانے بجتے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"مم... معاذ... مم... مشی... تم... آ... " وہ شدید تکلیف کے باعث شاید بول بھی نہیں پا رہی تھی۔

"کیا ہوا مشی؟" معاذ کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"معاذ! مجھے... بہت شدید... تکلیف ہے... شاید... شاید اپنڈکس پین ہے... مما' پپا... ہائے... آہ... ہاہ... کہ نہیں' پلیز آجاؤ تم... ہائے میں مرگئی... میں..." کہتے ہوئے ریسیور شاید اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ معاذ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں آ رہا ہوں۔" اس نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور جلدی سے لائٹ آن کرتے ہوئے ریک میں پڑا اپنا فرسٹ ایڈ باکس اٹھایا۔ پیروں میں سلیپر پہنے اور کمرے سے نکل گیا۔ ایک نظر مسز خان کے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔ انہیں ہاسپٹل سے آئے ابھی دو ہی دن ہوئے تھے' اب ان کی حالت کافی بہتر تھی۔

"زیتون بانو بھی اس وقت سو رہی ہوگی' ورنہ اسے ضرور بتا جاتا۔" وہ سوچتے ہوئے ہوا باہر نکلا۔ باہر سے جانے کی بجائے اس نے تینوں پورشنز میں جانے والا اندرونی راستہ اختیار کیا۔ اسے مشی کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی درمیان والے پورشن یعنی ایاز بھائی کے پورشن میں داخل ہوا۔ سامنے لان کی سیڑھیوں میں اسے ایاز بھائی بیٹھے نظر آئے۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹھک سا گیا۔ رات کے اس پہر وہ یہاں بیٹھے بھلا کیا کر رہے تھے۔ وہ بھی اسے دیکھ کر کچھ حیران رہ گئے۔

"کیا بات ہے خیریت۔ تم ادھر کدھر؟" آپوں آپ ان کا لہجہ روکھا ہو گیا۔

مشی کے تعلق سے دونوں بھائیوں نے معاذ کو جو کچھ دن اہمیت دی تھی' وہ اس تعلق کے ٹوٹنے کے بعد پھر سے صفر ہو کر رہ گئی تھی۔

"وہ مجھے ابھی مشی نے فون کیا ہے کہ اسے شاید اپنڈکس کا شدید پین ہو رہا ہے اور گھر میں کوئی نہیں تو میں اس لیے..."

وہ بھی ان کے سرد لہجے پر کچھ خائف سا ہو کر بولا۔ نہ جانے کیوں شروع دن سے ہی اسے ان دونوں پورشنز میں آکر جو عجیب سی توہین کا احساس ہوتا تھا' وہ آج تک قائم تھا۔ سوائے ان چند مہینوں کے جو وہ مشی کے ساتھ انگیجڈ رہا۔ اس نے ثبوت کے طور پر ہاتھ میں پکڑا فرسٹ ایڈ بکس تھوڑا سا اوپر کیا۔

"ہوں۔" اظہر بھائی اور یاسمین بھابی کسی فنکشن میں گئے ہیں شاید۔ تم جاؤ میں فائزہ کو لے کر ابھی آتا ہوں۔ ویسے شام تک تو وہ اچھی بھلی تھی۔"

آخری جملہ انہوں نے دھیرے سے ادا کیا تھا۔ معاذ کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔ اظہر بھائی کے پورشن میں بالکل اندھیرا تھا' صرف نائٹ لائٹس کی مدھم روشنیاں گھر کو ہلکی سی پراسراریت بخش رہی تھیں۔

ایک پل کو تو اس کا جی چاہا کہ الٹے قدموں واپس چلا جائے اب بھلا میرا مشی سے کیا تعلق؟ اس کا چچا موجود ہے' وہ خود اسے کہیں لے جا کر میڈیکل ٹریٹمنٹ دلوا سکتے ہیں۔ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔" وہ کچھ جھلا کر باکس پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کاریڈور کی طرح بڑھا۔ مشی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ ناک کیا۔

"ہائے... آئے... آہ... ہوں..." مشی کی دردناک مدھم کراہیں اسے سنائی دیں۔

"مشی... مشی... تم ٹھیک ہو نا؟" وہ تشویش سے کہتے ہوئے جلدی سے اندر بڑھا۔ سامنے بیڈ پر اسے مشی نظر نہیں آئی۔ وہ گردن موڑ کر پیچھے پڑے صوفے کی طرف دیکھنے ہی لگا تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا اور ساتھ ہی کوئی اس پر جھپٹا تھا۔

"کک... کون...؟ مشی مشی... کون ہے؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"میں ہوں مشی! میں آج تم سے اپنی انسلٹ کا ایسا انتقام لوں گی کہ جب بھی سوچو گے شرمسار ہو کر رہ جاؤ گے۔" وہ اس کی گردن کے قریب غرائی۔ اس کی گرم سانسیں معاذ کی گردن کو نم کر رہی تھیں۔ معاذ نے زور لگا کر اسے اپنی پشت سے پرے دھکیلنا چاہا مگر وہ تو اس بری طرح سے اس سے چپکی تھی کہ معاذ کو اپنی سانسیں بھی رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس کے منہ سے غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

"مشی... مشی! چھوڑو مجھے' پاگل ہوئی..." معاذ نے پوری قوت سے اپنی گردن سے لپٹا اس کا بازو پرے ہٹانا چاہا۔ مشی نے دوسرا زوردار ہاتھ مار کر اس کی شرٹ کے اگلے سارے بٹن توڑ دیے تھے۔ دوسرے پل وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔

"بچاؤ... بچاؤ... کوئی ہے' مجھے بچاؤ... ہیلپ... مما' پپا..."

معاذ کو اس کی خوف ناک چیخوں سے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ اس نے اپنا پورا زور لگا کر مشی کو دھکا دے کر خود سے علیحدہ کیا۔ اس کی پنک نائٹی کی ڈوریاں کھل چکی تھیں۔ گاؤن کے اندر سے جھانکتا نیم برہنہ سینہ اور اس پر لگے سرخ سرخ نشان' سوجا ہوا ہونٹ' بکھرے بال' رخساروں پر گہرے سرخ نشان' بہت' بہت کچھ کہہ رہے تھے۔

وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

"بچاؤ بچاؤ... کوئی ہے' مما! آپ کہاں ہیں... مما' پاپا..." وہ ایک بار پھر معاذ پر جھپٹی جس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ مشی نے پورا زور لگا کر معاذ کو پھٹے گریبان سے کھینچا اور اپنے اوپر گرا لیا۔

عین اسی وقت پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

نیم برہنہ خستہ حالت میں مشی' معاذ کے نیچے تھی اور وہ پھٹے گریبان اور سرخ چہرے کے ساتھ

"معاذ! کا... اظہر یہ کیا ہے؟" یاسمین کی دلدوز چیخ نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔

"مما! مما... بچاؤ مجھے یہ درندہ' وحشی' بدمعاش مجھے... مجھے..." وہ تیزی سے اٹھی اور ماں سے لپٹ گئی۔

"مما! مما نہیں..." کہتے کہتے وہ آنکھیں بند کر کے ماں کی بانہوں میں لڑھک گئی۔

"بدمعاش' کمینے' لچے' گھٹیا' آوارہ..." اظہر کے منہ سے مغلظات نکل رہی تھیں اور اس کے پیچھے کھڑے ایاز نے آگے بڑھ کر تھپڑوں' مکوں اور لاتوں سے معاذ کو پیٹنا شروع کر دیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا' کچھ نہیں۔ یہ مکار لڑکی..."

وہ ایاز کو پرے دھکیل کر اٹھتے ہوئے چلایا۔ ایاز نے ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر مارا۔ اس کے دونوں ہونٹوں سے خون ابل پڑا۔

"ارے اس بدمعاش کو پولیس کے حوالے کرو' اس لفنگے کو ہمارا ہی گھر ملا ہے لوٹ مچانے کے لیے۔ ہم لٹ گئے' برباد ہو گئے۔ پتا نہیں کس گندی نالی کا کیڑا ہے جسے اٹھا کر ان ماں بیٹے نے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ آستین کا سانپ' حرام زادہ..." یاسمین چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ایاز اور اظہر اس پر تابڑتوڑ لاتے اور گھونسے برسا رہے تھے۔

اس نے کئی بار ان کی اشتعال انگیزی کے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے اسے ایک پل کی مہلت نہیں دی تھی۔ کھٹا کھٹ ساری لائٹس جل اٹھی تھیں۔ سارے گھر کے ملازمین اکٹھے ہو چکے تھے جب زیتون بانو کے ساتھ مسز خان اندر داخل ہوئیں' معاذ زخمی حالت میں ایاز اور اظہر کے ہاتھوں ابھی بھی پٹ رہا تھا اور مشی صوفے پر کسی گٹھری کی مانند بے ہوش پڑی تھی۔

"ٹھہرو' ابھی میں اس گھر میں زندہ ہوں۔" مسز خان کی کڑک دار آواز پر اظہر اور ایاز پھولی سانسوں اور غصیلے چہروں کے ساتھ پیچھے مڑے تھے۔ معاذ نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو۔" عشاء کی نماز کے بعد صوفی صاحب نے ایک چھوٹی سی پڑیا لا کر رابعہ بی بی کو تھمائی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"حکیم صاحب نے دی ہے۔" وہ جھکی نظروں سے کہتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"کیسی رہی اس کی طبیعت دن بھر؟" صوفی صاحب تو سارا دن اوپر آئے ہی نہیں تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی نیچے ہی منگوالیا تھا اور صبح ناشتہ تو کر کے ہی نہیں گئے تھے اور اب رات کے کھانے میں بھی برائے نام دو چار لقمے لیے تھے۔

"اچھی نہیں....." رابعہ بی بی نے گہرا سانس لیا۔ "پتا نہیں کیا ہو گیا ہے' اس کے اندر کوئی چیز ٹک ہی نہیں رہی۔ نرم غذا دینے کے باوجود' ابھی سیون اپ کی بوتل منگوا کر دی' آمنہ نے کسٹرڈ بھی پکا کر دیا مگر اس سے کچھ بھی ہضم نہیں ہو پا رہا۔ ڈاکٹرنی کی دوائی تو..... میں دن بھر آپ کا انتظار کرتی رہی دوا کے لیے۔"

"صبح حکیم صاحب کے پاس رش بہت تھا' کافی دیر بیٹھا رہا ان کے فارغ ہونے کے انتظار میں' کیسے اپنا مدعا بیان کرتا۔ آخر ظہر سے پہلے اٹھ کر آ گیا۔" انہوں نے پلنگ سے کمر ٹکائی۔ "ابھی بھی مغرب کے بعد گیا تھا' زبان سے لفظ ہی ادا نہیں ہو رہے تھے۔"

"خیر..... تم یہ پڑیا ابھی جا کر دے دو۔ اُلٹیاں رک جائیں گی۔ صبح تک طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بہت تسلی دی ہے حکیم صاحب نے۔" انہوں نے کہتے کہتے آنکھیں بند کر لیں۔

"اس لڑکی نے تو ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔ نہ نگل سکتے ہیں' نہ اُگل سکتے ہیں۔ حکیم جی کو کیا بتایا؟ کچھ بتایا؟ کیا نذیری سنائیں؟" رابعہ بی بی اٹھتے ہوئے بولیں۔

"کچھ خاص نہیں' میں نے کہہ دیا ابھی کچھ مسئلہ ہو گیا ہے' اس لیے دو چار ہفتے ٹھہر جائے اور کیا کہتا۔" انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔ رابعہ بی بی نے ایک نظر رک کر اپنے غیرت مند شوہر کی بند آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر باہر چلی گئیں۔

آمنہ' زینب کے پاس چارپائی پر بیٹھی تھی۔ زینب کسی بے جان مُردے کی طرح پڑی تھی۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ بالکل خشک پپڑی زدہ۔ ان کا دل کٹ سا گیا۔ بھی نکل گئی جوان بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر۔ جویریہ بھی اپنی چارپائی پر پاؤں لٹکائے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"آمنہ! پانی لاؤ اور اسے یہ دوا دے دو۔" رابعہ بی بی کی آواز پر زینب نے آنکھیں کھولیں'

"کچھ طبیعت اچھی ہوئی؟" چاہنے کے باوجود رابعہ بی بی اپنے لہجے میں ملائمت نہیں لا سکی تھیں۔ بہت غصہ تھا انہیں زینب پر۔

وہ جواب دینے کے بجائے انہیں خالی خالی نظروں سے تکتی رہی۔ عجیب سی وحشت اور ہراس اس کی نگاہوں سے ٹپک رہا تھا۔ آمنہ پانی کا گلاس لے آئی۔ جویریہ نے آگے بڑھ کر زینب کو کندھوں کے پیچھے سے تھوڑا سا سہارا دے کر بٹھایا۔

آمنہ اسے دوا کھلانے لگی۔

"اماں جی! اسے کسی ڈاکٹر کو....."

"ٹھیک ہو جائے گی اور کتنے ڈاکٹروں کے پاس جا کر اپنی ہنسی اڑواؤں گی۔ اس نے تو ہمیں کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا..... اللہ جانے کس گناہ کی اتنی کڑی سزا دی ہے۔ کسی اولاد نے کلیجہ ٹھنڈا نہ کیا' کرموں کا لکھا بھگت رہے ہیں۔ اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں میری بچی!" رابعہ بی بی کہتے ہوئے رکیں نہیں۔ زینب نے دوا پانی کے ساتھ نگل لی تھی اور پھر فوراً ہی بے دم ہو کر لیٹ گئی تھی۔ جویریہ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

"گھر کی فضا کس قدر سوگوار ہو رہی ہے جیسے خدانخواستہ کسی کا ماتم ہو رہا ہو اور آمنہ کا تو شام ہی سے دل گھبرا رہا تھا۔ کچھ زینب کی حالت' کچھ ماں باپ کے گم صم رویے۔ اسے اندر ہی اندر بہت ڈر لگ رہا تھا۔

وہ اسی طرح زینب کی پائنتی پر بیٹھی رہی پھر تھوڑی سی آڑی ہو کر نیم دراز ہو گئی۔ بازو کا تکیہ بنا کر زینب کو یک ٹک دیکھنے لگی۔

"خواہش کا بچھو اگر ایک بار انسان کو ڈنک مار لے پھر اس کا تریاق کہیں نہیں ملتا۔ خواہش پالو مگر انہیں بچھو نہ بناؤ کہ وہ تمہارا سارا بدن نیل و نیل کر ڈالیں۔"

کہیں پڑھی ہوئی بات اسے یاد آئی۔ اسے لگا زینب کے چہرے پر لکھا ہوا ہے کہ۔

"اچھی زندگی تو ہر پیدا ہونے والے انسان کا حق ہوتی ہے۔ کسی کو پیدائشی طور پر یہ حق مل جاتا ہے۔ کوئی اس کے لیے ہزار جتن کرتا ہے اور کوئی محض اس کی خواہش میں ہی خود کو ہلاکت میں ڈال لیتا ہے۔ یہ خواہشوں کا آکٹوپس کیوں انسان کے ساتھ چمٹ کر اس دنیا میں آتا ہے کہ اسے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیتا۔"

عجیب و غریب باتیں سوچتی نہ جانے کب وہ گہری نیند سو گئی۔

"آں!" زوردار کراہ پر اس کی ایک دم آنکھ کھلی تھی۔ زینب اپنا سینہ اور گلا دونوں ہاتھوں میں جکڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آمنہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جویریہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ رات کافی بیت گئی تھی۔ آمنہ نے ٹک ٹک کرتے کارنس پر رکھے ٹائم پیس پر نظر ڈالی' رات کے پونے تین بج رہے تھے۔

"زینب! کیا ہوا؟ خیر تو ہے۔"

"م..... میرا گلا..... آمنہ! میں مر گئی۔ میرا سینہ کوئی چھری سے کاٹ رہا ہے۔ آف..... ہائے....." وہ دہری ہوئی جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے' درد ہو رہا ہے یا قے آ رہی ہے؟" آمنہ اٹھ کر اسے کندھے سے تھامتے ہوئے بولی۔

"م..... مجھے سانس نہیں آ رہا۔" اس نے سر اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے آمنہ کو دیکھا۔

"باہر لے جاؤں؟ آؤ باہر چلتے ہیں۔" آمنہ نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ جھکی جھکی سی اٹھی تھی۔ چارپائی کی چرچراہٹ سے جویریہ کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ بھی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

آمنہ اور جویریہ [illegible] اسے باہر صحن میں لائی تھیں۔

وہ [illegible] ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھی۔

نالی پر جھکی کتنی دیر زور لگا کر قے کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر اس کے گلے میں جیسے کوئی پتھر کوئی اینٹ پھنس کر رہ گئی تھی۔ سینہ پیٹ آنتیں جیسے کٹی جا رہی تھیں اور دم گھٹتا جا رہا تھا۔

دس پندرہ منٹ کی ناکام کوشش کے بعد وہ نڈھال ہو کر غسل خانے کے باہر ہی گر گئی۔ جویریہ اور آمنہ بڑی مشکل سے اسے کھینچ کھانچ کر تخت تک لائی تھیں اندر کمرے میں صوفی صاحب تہجد کی نماز کے لیے مصلے پر کھڑے ہو چکے تھے۔ زینب کی آواز سن کر رابعہ بی بی نیت توڑ کر باہر آ گئیں۔

"کیا ہوا زینب! کیا ہوا؟" وہ فکرمندی سے اسے ہلا رہی تھیں۔ زینب کی آنکھیں اوپر کو پلٹ رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا' زینب ہوش کر؟" رابعہ بی بی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"صوفی صاحب! صوفی صاحب! دیکھیں آ کر زینب کو کیا ہوا ہے۔"

وہ وہیں سے چلائیں۔ صوفی صاحب کتنی دیر سے رکوع میں جھکے تھے اسی طرح سکون سے جھکے رہے۔ رابعہ بی بی کے بار بار ہلانے پر زینب نے آنکھیں کھولیں ماں کو دیکھا پھر دیکھتی رہی۔

"اماں جی! مجھے معاف کر دیں۔ پر میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ صرف..... صرف..... اچھی زندگی' تھوڑی سی روشنی..... اندھیرا..... مجھے اندھیرا اچھا نہیں لگتا۔ اندھیرا ہر طرف ہو رہا..... اماں جی!"

وہ رک رک کر بمشکل بول رہی تھی۔ میں ٹھیک ہوں۔ سوؤں گی۔" اگلے پل وہ گردن سیدھی کر کے آمنہ کی گود میں لیٹ گئی۔

"میری بچی! میری زینی..... تجھے اللہ کی امان ہو۔ کیوں تو نے یہ نادانی کی؟" رابعہ بی بی رونے لگیں۔

"رابعہ بی بی! اندر آ کر اپنی نماز پڑھیں' وہ اب ٹھیک ہے۔"

صوفی صاحب کی گونج دار آواز پر ان کے آنسو اور سسکیاں وہیں تھم گئیں وہ بے بسی سے آنکھیں بند کر کے لیٹی زینب کو دیکھتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

پھر تقریباً سوا گھنٹے بعد زینب کی پھر وہی حالت ہو گئی۔

"آمنہ! میرا گلا... کوئی میرا گلا دبا رہا ہے۔ آمنہ! میں مر رہی ہوں۔ مجھے نہیں مرنا..." وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا گلا پکڑے چیخی۔

"میں مر گئی اماں جی! آمنہ... بھائی!" وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تخت پر تڑپ رہی تھی۔

"زینب... زینب پانی پیو۔" آمنہ نے گلاس اس کے منہ کو لگانے کی کوشش کی۔

"نہیں... پانی نہیں... میں مر گئی... آ... اماں... بابا صاب... بابا صاب... مجھے معاف... آمنہ... جوئی... پانی۔" وہ زور زور سے اپنا سر پٹخ رہی تھی گٹھری کی طرح ادھر ادھر لڑھک رہی تھی۔

"اماں جی! بابا صاحب! زینب! چھوٹی آپی دیکھیں آ کر..." جویریہ روتے ہوئے چلائی۔

"زینب... زینی ہوش کرو..." آمنہ اسے جھنجوڑ رہی تھی اس کے منہ سے سفید پانی سا نکل رہا تھا' آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"آمنہ! اس سے کہو کلمہ پڑھے۔" صوفی صاحب کتنی دیر سے بلند آواز میں سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہے تھے۔ تلاوت روک کر وہ اونچی آواز میں بولے۔

"ک... کلمہ..." آمنہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے آواز تڑپتی زینب اور اس کے پھڑ پھڑاتے جسم کو دیکھا۔

اگلے پل فضا میں اللہ اکبر کی آواز گونج اٹھی۔

اس کے ساتھ ہی جویریہ اور آمنہ کی چیخیں...

صوفی صاحب آخری آیات پڑھ رہے تھے۔

"کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو دوبارہ پیدا کر دے۔ ضرور قادر ہے' بڑا پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے۔ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا' بس وہ ہو جاتی ہے۔ تو اس کی پاک ذات ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔"

صوفی صاحب سجدے میں گر چکے تھے۔

● ● ● ● ● ●

اور زینب مر گئی۔

آمنہ اور جویریہ کو لگا اس گھر سے زندگی کی آخری امید' آخری کرن' آخری آواز بھی مر گئی۔ صرف جیتے جاگتے سانس لیتے چار لاشے زندہ بچ گئے جو اس کی جواں مرگی پر گھٹی گھٹی سسکیوں' بچی نظروں اور بند کانوں کے ساتھ اسے رو رہے تھے۔

"آخر یہ سب کیا ہو گیا۔ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی بچی تھی۔ تینوں بہنوں میں ہنس مکھ' باتونی اور محبت کرنے والی۔ میں جتنی بار بھی صوفی صاب کے گھر آئی' ہمیں پاس آ کر بیٹھا کرتی۔ ماں کے گھورنے کے باوجود باتیں کیے جاتی۔ سارے محلے کا پوچھتی' نہ جانے بے چاری کو گھڑی پل میں کیا ہو گیا۔ ہائے کیسی جوان موت۔"

پتا نہیں کون سی عورت تھی جو پیچھے بیٹھی افسوس سے کہہ رہی تھی۔ آمنہ تو زینب کی چارپائی کے ساتھ جڑ کر بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روئے جا رہی تھی۔ اماں جی تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر پر لیے ململ کے پیلے بوسیدہ دوپٹے کا گولہ سا بنا کر منہ کے آگے رکھ لیتیں۔ بے اختیار نکلتی چیخوں کے آگے بند باندھنے کی انہیں اور کوئی صورت نظر نہ آتی۔ جب وہ زینب کے وجود سے رخصت ہوتی زندگی کو دیکھ کر پہلی بار چیخی تھیں تو صوفی صاحب اندر سے باہر نکلے۔

"کسی واویلے' کسی چیخ و پکار کی ضرورت نہیں۔ رو ضرور مگر ایسے جس کی شرع میں اجازت ہے مگر میں نہ کسی کا بین سنوں نہ چیخ۔ اس کا اس دنیا میں جتنا وقت تھا' پورا ہو گیا۔ چیخنے چلانے سے یہ زندہ نہیں ہو جائے گی۔"

سر پر عمامہ درست کرتے' کرتے کی شکنیں ہاتھوں سے صاف کرتے سیڑھیوں پر پہلا قدم دھرنے سے پہلے وہ سرد لہجے میں کہہ کر نیچے اترے تھے۔ اماں جی نے اپنی آدھی چیخ منہ میں ہی روک لی تھی۔

"تھی تو بہت اچھی۔ باتونی ہنس مکھ ملنسار بھی پر..." دوسری عورت پہلی عورت سے سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"پر کیا؟" اس نے حسب توقع تجسس سے پوچھا۔

"تھی تو صوفی صاحب کی بیٹی... پر کیا کہوں... کردار کی کچھ اچھی نہ تھی۔"

"ہیں!" پہلی نے منہ کے آگے چادر کر کے کہا۔ "کیا مطلب؟"

"پڑھتی پڑھاتی تو اللہ جانے کیا تھی' پر کالج بڑا آتی جاتی تھی۔ دو بار تو شاید فیل بھی ہو چکی تھی۔ گھر والوں کے قابو میں نہ تھی۔ وہ ایک بار تو میرے بڑے بیٹے نے اسے خود کسی امیر لڑکے کی گاڑی میں آتے جاتے دیکھا۔ وہ گھر سے دور اسے اتار دیتا تھا۔ گھر والے اندھے بنے بیٹھے تھے تو کیا سارا زمانہ اندھا تھا۔ میرے بیٹے کی طرح کئی اور لوگوں نے بھی دیکھا ہو گا۔ محلے میں تو اچھی خاصی بات پھیلی ہوئی ہے۔"

جویریہ کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے بے اختیار بہتی آنکھیں' چادر سے مسلیں اور ذرا سا سر اٹھا کر چارپائی پر چادر کے نیچے پڑی مردہ زینب کو دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔

"یہ ہیضے ویضے کا بھی مجھے تو ڈرامہ ہی لگتا ہے' کچھ اور ہی چکر ہے۔ صوفی صاحب خود تو اتنے سخت' زمانے بھر کے پارسا بنتے ہیں اور اولاد میں سارے گن موجود ہیں۔ ایک بیٹا تو ان کا گویا ہے۔ تم نے بھی اس کی کیسٹیں سنی ہوں گی۔ آج کل بڑا مشہور ہو رہا ہے۔ یہ مولوی لوگ تو بس دکھاوے کے ہی نیک ہوتے ہیں۔ اندر کے حال دیکھو تو توبہ توبہ کرو۔"

دوسری عورت کے پاس اچھی خاصی "معلومات" تھیں۔ جویریہ نے چارپائی کے سرہانے سر ٹکائے روتی اماں جی کو دیکھا۔ کہیں ان کے کانوں میں تو یہ معلومات نہیں پڑ رہیں مگر اماں جی تو اپنے اردگرد سے بھی بے خبر زینب کے خون نچڑے پیلے زرد چہرے کو یک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔

یہ خوبصورت' جوان دلنشین نقوش سے سجا چہرہ جسے انہوں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا' پاؤں پاؤں چلنے سے لے کر جوان ہونے تک اس کی کتنی معصوم دل موہ لینے والی ادائیں انہیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کی آواز کی سریلی چہکار اس کی بے ساختہ جلترنگ سی ہنسی کی آبشار اور چھوٹی چھوٹی باتوں' فرمائشوں اور ضدوں کے پورا نہ ہو سکنے پر روٹھ جانے کی ادا... وہ اس کی کس کس بات کو یاد رکھیں گی۔

"زینب! میری بچی! جانے کی عمر تو میری تھی۔ تیرے تو ارمانوں کے پھول کھلنے کے دن تھے پھر تو نے یہ لمبی اڑان کیوں بھر لی۔ ہاں تو اس گھر سے' اس کے گھٹے ہوئے ماحول سے خائف تھی' اپنے باپ کی سختیوں سے نالاں' اسی لیے تو نے یہ لمبی اڑان بھری۔ پر تو نے ماں کا کیوں نہ سوچا میری بچی! تو نے ان بوڑھی آنکھوں کی اکلوتی چمک کا خیال کیوں نہ کیا جو تجھے دیکھ کر ان آنکھوں میں جاگتی تھی۔ زینب یہ تو نے کیا کیا..."

وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھیں۔ دھیرے دھیرے ہلتے لب اور آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لڑی ان کے دکھ کی غماز تھی۔

"اگر میری بچی اس لڑکی کی جگہ ہوتی تو میں اسے خود زہر دے دیتا۔ ماں باپ کی عزت کو پیروں میں رولنے والی بیٹیوں کا قتل واجب ہو جاتا ہے۔"

مردوں کے ہجوم میں مغموم بیٹھے صوفی صاحب کے کانوں میں اچانک جیسے اپنی ہی آواز گونجی۔ شاید یہی الفاظ تھے یا اس مفہوم سے ملتے جلتے جو انہوں نے جھومر کے گاؤں سے بھاگ جانے پر کہے تھے بہت حقارت بھرے

لہجے میں۔
اور تقدیر پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ صوفی عبدالرحمٰن کے ان حقارت بھرے جملوں پر۔
"کیا یہ سب کرنا آسان ہوتا ہے؟" زینب کا باپ ان کے اندر کراہا۔
"صوفی صاحب! بہت افسوس ہوا۔۔۔" کوئی ان سے کہہ رہا تھا۔
صوفی صاحب خالی خالی نظروں سے اس افسوس کرنے والے کو تک رہے تھے۔ اسے بھی شاید ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ تھا۔ افسردہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
"جو ہوا ٹھیک ہوا۔ زینب نے جو کچھ کیا تھا' اس کے ساتھ یہی کچھ ہونا تھا' ہونا چاہیے تھا۔ اس نے میرا' میری عزت کا' اپنے پریشان حال دکھی گھر والوں میں سے کسی کا بھی خیال کیا تھا جو اس کے ساتھ اچھا ہوتا۔۔۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔۔۔" انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر جیسے فیصلہ سنایا۔
"ٹھیک ہوا' اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔" انہوں نے اپنے جھکے ہوئے کندھے سیدھے کیے اور سر اٹھا کر چاروں جانب دیکھا۔
"زینب۔۔۔ کوئی اور نہیں۔۔۔ زینب مر گئی۔۔۔ ٹھیک ہوا۔" کوئی اندر بیٹھا انہیں کچوکے لگائے جا رہا تھا۔
"ہاں' ٹھیک ہوا۔" وہ اپنے ازلی ہٹ دھرم انداز میں خود سے بولے تو اندر بیٹھے وجود تک خاموشی چھا گئی۔ انہیں اس خاموشی سے اطمینان سا ہوا۔
"مگر زینب۔۔۔ زینب کہاں ہے۔۔۔ ضدی زینب جو ہر وقت میرے لیے کوئی نہ کوئی فرمائش تیار رکھتی تھی۔۔۔ زینب میرے گھر کی بلبل' میری چڑیا۔۔۔ میرے گھر کی رونق۔۔۔ اپنی آواز۔۔۔ زینب۔۔۔ زینب۔۔۔ زینب۔۔۔ نہ جانے کیسا شور مچا تھا۔ ان کے اندر چھڑی جنگ کا واویلا سینے کی دیواریں توڑ کر باہر نکلا آ رہا تھا۔ ان کے سارے بدن میں ایک سنسناہٹ سی دوڑی تھی۔ جسم کا دایاں حصہ ایک پل کو اس سنسناہٹ سے سن سا ہو کر رہ گیا تھا۔
"زینب! زینب! زینب۔۔۔" کوئی دیوانوں کی طرح ان کے اندر چیخے جا رہا تھا۔ وہ بھرے مجمع میں گھٹی گھٹی ہچکیوں سے رونے لگے۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" مسز خان کے نحیف بدن سے گرج دار آواز نکلی تھی۔
"آپ کو نظر نہیں آ رہا کیا ہو رہا ہے یہ' مزید تشریحات کی ضرورت ہے۔ ہائے ہائے میری بچی کا حال تو دیکھو۔ اس درندے نے کیا کر ڈالا۔ منحوس تھی وہ گھڑی جب یہ سنپولیا اس گھر میں آیا۔ ہائے میرے دشمنوں نے سانپ کو دودھ پلا پلا کر مجھے ڈسنے کو پالا پوسا۔ لو آج ساروں کے ارمان پورے ہو گئے' ہائے سب کے کلیجوں میں ٹھنڈ۔ میری پھول سی بچی کانٹوں میں رل گئی۔ اللہ تیرا قہر کیوں نہیں ٹوٹتا ان ظالموں پر' جن کے دل کینے سے بھرے ہوئے ہیں۔" یاسمین سینے پر دوہتڑ مار مار کر رونے لگی۔ مسز خان نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔
"بہو! جوش میں ہوش کو نہ بھولو۔ ایسا نہ ہو کہ ہوش میں آؤ تو تمہیں اپنے کہے ہوئے الفاظ سوچ کر خود سے بھی ندامت محسوس ہونے لگے۔ یہ باتیں ایسی رونے دھونے سے' بہت پہلے سوچنے کی ہوتی ہیں' جن پر تم جیسی مائیں توجہ نہیں دیتیں۔" وہ چبا چبا کر بول رہی تھیں۔
"ہاں ہاں' خاک ڈلوا کر سارے زمانے کی میرے سر پر۔ ظلم کا پہاڑ بھی ہم پر ٹوٹا ستم بھی ہم پر ہوا اور سزاوار بھی ہم ٹھہرے۔ ظلم کی انتہا ہے۔ میں تو جب سے اس گھر میں آئی' ناانصافی اور تعصب ہی سہہ رہی ہوں۔ آج اس تنگ نظری کا شکار میری معصوم بچی بھی ہو گئی پھر بھی پتھر کا کلیجہ سینے میں لیے دادی مجھے ہی کوس رہی ہے۔ کوئی ہے اس ظلم نگر میں ہمارا بھی ہمدرد' میں تو پولیس میں جاؤں گی۔ اس ننگ مادر کو نہ زمانے بھر کی خاک چٹوائی تو میرا نام بدل دینا۔ بہت سن لی میں نے سب کی بکواس۔" یاسمین غصے میں آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ مشی کو جھنجوڑنے لگی۔
"اٹھ میری بچی! تجھے اسی حالت میں رپٹ لکھوانے لے جاؤں گی۔ سارا زمانہ دیکھے گا اور ان پر تھو تھو کرے گا' اٹھ۔" وہ اسے پاگلوں کی طرح جھنجوڑ رہی تھی۔ مسز خان نے انتہائی غصے کے عالم میں اس پاگل عورت کو دیکھا۔
"تم نے ایک نہ ایک دن یونہی میرا سر شرم سے جھکانا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ ایک پل کو بھی تمہیں میرا یا شہباز کے ان احسانات کا خیال نہ آیا جن کو آج تک تم پر کسی نے جتایا نہیں۔ اس کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے تم مر کیوں نہ گئے۔ یہ صلہ دیا میری پُرخلوص محبت اور بے ریا ممتا کا۔" وہ چوٹوں اور زخموں سے بے حال معاذ پر برس پڑیں۔
"ام جان! یہ جھوٹ ہے' بکواس ہے' بہتان۔۔۔"
"تم کیوں مانو گے' تم جیسے عادی مجرم بھی کبھی آسانی سے مانتے ہیں۔"
اظہر نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ دھکا تو زوردار تھا مگر معاذ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ پوری قوت مجتمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نائٹ سوٹ گریبان سے پھٹ چکا تھا۔ ہونٹوں کے کناروں سے خون بہہ رہا تھا۔ پیشانی پر بھی دو جگہ سے گومڑے ابھر آئے تھے۔ ایک سے تو خون بھی رس رہا تھا۔
"ام جان! آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتی ہیں۔" وہ دکھ بھری آواز میں مسز خان سے بولا۔
"ابھی کسر باقی ہے تجھے سمجھنے میں۔ تجھے اب میں سمجھاؤں گا۔ تو نے کیا سمجھا تھا کہ ہم لولے لنگڑے ہیں۔ تیری بدمعاشی کو اپنی عزت کی بدنامی سمجھ کر چپ چاپ پی جائیں گے؟ میں پولیس کو فون کرنے جا رہا ہوں' دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔" اظہر منہ سے کف اڑاتے خونخوار لہجے میں کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھے۔
"ٹھہرو' پولیس کو بلانے کی ضرورت نہیں۔" مسز خان تحکم سے بولیں۔ "لڑکے! کل صبح نکلنے والا سورج تمہیں اس گھر میں نہ دیکھے' یہ تمہارے حق میں اچھا ہو گا اور شاید ہم سب کے حق میں بھی۔ تم نے ہماری نیک نیتی کا صلہ بہت اچھے انداز میں دیا ہے۔ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا' کسی پر احسان کرنے سے پہلے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" مسز خان سرد لہجے میں معاذ سے بولیں تو وہ ایک پل کو ششدر سا رہ گیا۔ بے یقینی سے انہیں دیکھے گیا۔
"جاؤ یہاں سے۔" مسز خان زور سے بولیں تو اس نے دکھ بھری نظر ان پر ڈالی اور دوسرے پل باہر جانے لگا۔
"ام جان! میں اسے ایسے نہیں جانے دوں گا۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے مجرم کو آپ یوں جانے کا موقع دے رہی ہیں۔ آپ تو اس کے ساتھ مزید نیکی کر رہی ہیں۔" ایاز نے پھر سے معاذ کا گریبان پکڑ لیا تھا۔
"تو کیا کروں' پولیس بلوا کر سارے زمانے میں اپنی عزت کا پرچہ کٹواؤں۔ تم لوگوں کو کیوں سمجھ میں نہیں آتا' یہ ہم سب کے حق میں نہیں بلکہ مشی کے حق میں بہت برا ہو گا۔ جانے دو اسے۔ غیرت والا ہو گا تو کبھی زندگی بھر اس حرکت کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں اور اتنی غیرت کی توقع تو مجھے ہے اس سے۔ جانے دو اس کو۔"
مسز خان اجنبی نظروں سے معاذ کو تکتے ہوئے بولیں تو اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اگلے پل وہ ایاز سے اپنا گریبان چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔
"مجھے معلوم تھا آپ یہی کریں گی اس کے ساتھ۔ آپ کے دل میں کبھی میرے لیے یا میری اولاد کے لیے ذرا سی ہمدردی و پیار نہیں ہو سکتا۔ یہ آخری چرکہ بھی مجھے آپ کی وجہ سے اس گھر میں لگنا تھا۔ کل کا سورج اس مردود تو اس گھر میں دیکھے گا یا نہیں مگر کل کا سورج مجھے اور میری بچی کو بھی اس گھر میں نہیں دیکھے گا۔ بہت عذاب سہہ لیے میں نے یہاں' بیس بائیس سال۔ اظہر نے اگر ہمارے پیچھے آنا ہوا تو آ جائے' ورنہ ماں کے قدموں سے لپٹا بیٹھا رہے۔"
یاسمین نے غصے سے کہتے ہوئے مسز خان کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور مشی کی الماری کی طرف بڑھی۔
"یہ تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے' چلو زیتون بانو!" مسز خان نے سرد لہجے میں جواب دیا اور پیچھے کھڑی زیتون بانو کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہیل چیئر موڑتے ہوئے یکایک ان کی نظر بیڈ کی بیک کے پیچھے پڑی ایک چیز پر لمحے بھر کو اٹک سی گئی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنے جھریوں بھرے کمزور دودھیا ہاتھوں کو تکتے ہوئے

کچھ سوچ رہی تھیں پھر رات کے باقی پہر انہیں ایک پل کو بھی نیند نہیں آئی اور صبح تک وہ نتیجے پر پہنچ چکی تھیں۔

"زیتون بانو! ایاز کو بلا کر لاؤ۔" جیسے ہی صبح کی روشن کرنیں ان کے کمرے کی مشرقی کھڑکیوں سے اندر داخل ہوئیں' انہوں نے زیتون بانو سے کہا۔

"جی' وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے کہیں گئے ہیں۔"

"اچھا جاؤ پھر معاذ کو بلا کر لاؤ۔" وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

"معاذ کو؟" زیتون بانو استعجاب بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"ہاں معاذ کو۔ سنا نہیں تم نے؟" وہ کچھ جھلا کر بولیں۔ رات بھر کی بے خوابی سے ان کا سر اچھا خاصا بھاری ہو رہا تھا۔

"جی وہ تو رات کو اسی وقت چلا گیا تھا۔ جاتے ہوئے اپنی چند کتابوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہیں لے کر گیا۔ ایک کپڑا جوتا تک نہیں۔" زیتون بانو کچھ دکھی لہجے میں آہستہ آہستہ بتا رہی تھی۔

"کیا؟" مسز خان بھونچکی سی رہ گئیں۔

"آپ نے خود ہی تو اسے جانے کا کہہ دیا تھا' وہ تو پھر ایک منٹ بھی نہیں رکا۔ صرف کپڑے بدلے' دو چار کتابیں کاغذات لیے اور نکل گیا۔"

"اوہ!" ان کے سینے سے ایک گہرا سانس خارج ہوا۔

"یہ میں نے کیا کیا؟" وہ تاسف بھرے لہجے میں خود سے بولیں۔

"جی!" زیتون بانو حیران نظروں سے انہیں تک رہی تھیں۔

"اس نے ہی حرکت بھی تو اتنی غلط کی تھی۔ آپ نے تو کچھ بھی برا نہیں کیا اس کے ساتھ۔" زیتون بانو دھیمے لہجے میں بولی۔

"اس نے کچھ برا نہیں کیا تھا' کوئی خطا نہیں تھی اس کی۔" وہ بڑبڑائیں۔

"آپ کو کیسے پتا جی؟ آپ نے رات کو مشی بی بی کی حالت نہیں دیکھی تھی۔ مجھے تو سوچ کر شرم آ رہی ہے۔ یہ معاذ اندر سے اتنا گرا ہوا۔۔۔"

"بس زیتون بانو! آگے کچھ مت کہنا' پہلے میں بھی یہی سمجھی تھی مگر وہ بچہ تو کندن ہے۔ ڈھلا ڈھلایا سونا۔۔۔ تم نے مشی کے بیڈ کے پیچھے پڑی وہ چیز نہیں دیکھی تھی؟" وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

"کون سی چیز جی؟" زیتون بانو کو پہلی بار اپنی عمر رسیدہ مالکن کی ذہنی حالت پر شک سا گزرا۔

"میں نے دیکھی تو اسی پل مجھے معاذ کے بے قصور ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ پتا ہے وہ چیز کیا تھی؟" ان کی آنکھیں اس خیال سے ہی چمکنے لگی تھیں کہ معاذ جس پر اتنے سالوں ان کے دل نے اندھا اعتبار کیا تھا' وہ آج بھی اعتبار کے قابل ہے۔

"وہ۔۔۔" اسی وقت فون کی بیل بجنے لگی۔ "سنو جا کر۔" انہوں نے تھک کر بیڈ کے پشت سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ زندگی پھر سے انہیں ایک لمبی مسافت کی نوید سنا رہی تھی جس کی تھکن ابھی سے ان کی پلکوں پر آ رکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔ میڈم! میں رضا کھوکھر بات کر رہا ہوں۔" رعنا حیات نے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف منیجر کی آواز سنائی دی۔

"ہوں۔ وعلیکم السلام۔"

"میڈم! میں نے ادھر سب پتا کر لیا ہے۔ جس جگہ بچے کو جمع' میرا مطلب ہے' جس یتیم خانے میں داخل کرایا گیا تھا اس کا مالک تو اسے کسی اور کے سپرد کر کے خود باہر چلا گیا تھا۔۔۔"

"یہ سب۔۔۔ تم مجھے پہلے بتا چکے ہو۔ آگے بولو۔" وہ جھنجلا کر بولیں۔

"میڈم! میں نے اس شخص کو ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ اب بیرون ملک سے آ چکا ہے اور پنڈی ہی میں رہائش پذیر ہے۔"

"تمہاری ملاقات ہوئی اس سے؟" وہ جلدی سے بولیں۔

"یس میم! میں ان سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے یونس بیگ کا ایڈریس دیا جس کے حوالے وہ یہ یتیم خانہ کر گئے تھے اور اس کے بچے بھی۔۔۔"

"تم یونس بیگ سے ملے؟" ان کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

"یس میم! میں ان سے مل چکا ہوں۔"

"پھر؟"

"میم! جو نشانیاں میں نے انہیں بتائیں' ان کے پاس اس طرح کا ایک بچہ آیا تھا' اس کی انہوں نے تصدیق کی ہے۔"

"تھا۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ بے صبری سے چلائیں۔

"میم! اب تو وہ یقیناً جوان ہو چکا ہو گا نا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اتنی عقل ہے مجھ میں' آگے بتاؤ وہ کیا کہتا ہے؟"

"میم! وہ یہ تو مان رہے ہیں کہ اس عمر' حلیے' لباس والا بچہ ان کے پاس جمع کروایا گیا تھا پھر وہ بچہ کہاں گیا' وہ اس کے بارے میں مزید بتانے کو تیار نہیں۔ میرے بہت مجبور کرنے پر انہوں نے مجھے یہی بتایا کہ وہ بچہ کسی مالدار' بے اولاد شخص کو دے دیا گیا تھا۔ وہ شخص کون ہے' کہاں کا تھا' اس بارے میں یونس بیگ مجھے کچھ بھی بتانے کو راضی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ راز ان کے پاس امانت ہوتا ہے جسے وہ کسی بھی صورت نہیں بتائے گا۔ میم! آپ۔۔۔ کو خود آنا پڑے گا۔" وہ کچھ جھجک کر بولا۔

"رضا کھوکھر صاحب! اگر تم جیسے نکمے ورکر ہوں تو آنرز کو ہر جگہ خود جا کر اپنا کام آگے بڑھانا پڑتا ہے۔" وہ تلخی سے بولیں۔

"میم! میں بہت کوشش کر چکا ہوں مگر وہ کہتا ہے کہ اول تو وہ مجھے اس بچے کے بارے میں کچھ بھی بتانے کا مجاز نہیں۔ دوسرا وہ بچہ بالکل لاوارث یتیم۔۔۔"

"شٹ اپ' جسٹ شٹ اپ۔ یو ایڈیٹ۔" رعنا حیات تڑپ کر چیخیں۔

"تم ادھر رکو کل کے دن بھی۔ کل فخر حیات کو ڈسچارج کیا جا رہا ہے' کل شام جو بھی پہلی فلائٹ ملے گی اس پر میں پنڈی آ جاؤں گی۔ تم ہالی ڈے ان میں کوئی بھی روم بک کرا لو۔ اوکے۔"

"یس میم!" وہ آہستگی سے بولا۔

"اور سنو۔ اب اگر دوبارہ فون کرنا ہو تو میرے سیل فون پر کرنا اور کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ تم کس کام سے پنڈی گئے ہو۔ انڈر اسٹینڈ۔" وہ اسے ہدایت دیتے ہوئے بولیں۔

"یس میم! آئی انڈر اسٹینڈ اٹ۔"

"اوکے۔" رعنا حیات نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اسی وقت ملازم اندر داخل ہوا۔

"وہ جی نواز صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" اس نے اطلاع دی تو رعنا کو جیسے اندر تک کوئی چیز تلخ کر گئی۔ وہ ملازم کو گھورنے لگی۔

"جی کہہ دوں آپ گھر پر نہیں؟" وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔

"نہیں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور الماری کھول کر کھڑی ہو گئیں۔ چند لمحے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈتی رہیں۔

”یہ انہیں دے دو جا کر اور میرا پوچھے تو کہہ دینا آرام کر رہی ہوں۔“ نیلے نوٹوں کی ایک گڈی ملازم کو تھماتے ہوئے وہ بولیں۔ وہ نوٹ ہاتھ میں لے کر باہر نکل گیا۔

”اور کس لیے ملنے آئے ہوں گے مجھ سے‘ ساری زندگی ان کا یہی تو رشتہ رہا ہے۔“ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے خود سے بولیں۔

اسی وقت پھر دروازے پر دستک ہوئی۔

”یس۔“ وہ ٹہلنا موقوف کر کے بولیں۔

”رعنا!“ نواز اس کے سامنے نوٹ ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔

”کیا کم ہیں اور دوں؟“ وہ کہتے ہوئے تیزی سے بڑھیں اور الماری کی دراز کھول کر مزید رقم نکالنے لگیں۔

”بس کرو اور کتنا مجھے زمین میں دھنساؤ گی۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے نوٹ سینٹرل ٹیبل پر رکھتے ہوئے مردہ لہجے میں بولے۔

”کیوں‘ اس میں زمین میں دھنسانے والی کون سی بات ہے۔ یہ تو پر ہیں جو بندے کو ہوا میں اڑاتے ہیں۔ آپ نے کیا یہ پہلی بار ہاتھ میں لیے ہیں جو اس کے بوجھ سے خود کو زمین میں دھنستا ہوا محسوس کرنے لگے ہیں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

”رعنا! یوں بات مت کرو مجھ سے۔ زندگی پہلے ہی ایک اذیت ناک بوجھ بن گئی ہے۔ اوپر سے تمہاری باتیں مجھے پاتال میں گراتی جا رہی ہیں۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ اگرچہ میں نے کیا بھی نہیں چاہا تھا۔ تم میرے بارے میں جانتی ہو پھر بھی.....“ وہ بے بسی سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”کاش سب جانتی ہوتی کہ آپ کا خون کس قدر بے وفا‘ سنگدل.....“

”نمک حرام کہو‘ نمک حرام۔“ وہ جلدی سے بولے۔

”مجھے اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔

”عفت آرا ہاسپٹل میں ہے۔“ وہ چند ثانیوں بعد پھر بولے۔

”رقم چاہیے علاج کے لیے‘ اسی لیے تو دے رہی ہوں اور بھی ہے..... کتنی کم ہے.....؟“

وہ تیزی سے الماری سے اور رقم لینے کو بڑھیں۔

”بلکہ آپ مجھے ایک ہی بار بتا دیں کہ آپ کو مجھ سے اور کتنا خرچ چاہیے‘ اس مہربانی کے عوض جو اور آپ نے آپ کی بیوی نے مجھ پر کبھی فرمائی تھی۔ ایک بار ہی اس کا معاوضہ وصول کر لیجیے۔ کل اخراجات کو گھر آنا ہے۔ اس شخص کے سامنے بار بار آ کر دامن پھیلا کر مجھے مزید اس کی نظروں میں مت گرائیے گا۔ جتنا چاہیے‘ مجھ سے آج ہی لے لیجیے۔ پر نہیں‘ آپ کا ایک بار سے کب پورا پڑے گا۔ آپ تو مجھے قطرہ قطرہ آخری قطرے تک نچوڑنا پسند کریں گے۔ جسم سے لہو کی آخری بوند تک‘ ہے نا.....“

”رعنا!“ نواز کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

”سچ کہہ رہی ہوں نا۔ اچھا مجھے ہاسپٹل جانا ہے‘ الماری کے تمام لاکرز کھلے پڑے ہیں۔ کہتے ہیں تو چیک بک پر بھی سائن کیے دیتی ہوں۔ آپ کو جو چاہیے‘ پیسہ‘ رقم اس میں سے لے لیجیے مگر آئندہ ادھر مت آئیے گا۔ مت آئیے گا۔ میرے زخموں کو ادھیڑنے میں آپ کو کیا مزہ آتا ہے۔ کیسے بھائی ہیں آپ۔ بار بار میرے زخموں میں خنجر گھونپنے چلے آتے ہیں۔“

وہ زور زور سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں تو نواز آنکھوں میں آنسو لیے شکستہ قدموں سے اس کے پیچھے باہر نکل آئے۔

”میں کیسے اسے اپنی ندامت‘ اپنی بے بسی اور مجبوری کا یقین دلاؤں۔“

کوٹھی کا پھاٹک عبور کرتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

”ہیلو..... ہیلو..... کون..... شاہ جی..... جی میں نین تارا ہوں۔ آواز بالکل نہیں آ رہی..... لائن بار بار ڈراپ ہو رہی ہے۔ ہیلو.....“

نین تارا ریسیور کان سے لگائے زور زور سے بول رہی تھی۔ اسے سلطان بخت کی آواز بہت ہلکی‘ بہت مدھم سنائی دے رہی تھی۔ وہ پوری توجہ سے انہیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جی میں ٹھیک ہوں‘ آپ ٹھیک ہیں۔“ دوسری طرف کی آواز اور بھی کم ہو گئی۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ وہ اور اونچا بولی۔ ”کیا مصیبت ہے‘ بالکل آواز نہیں آ رہی۔ میں بند کر رہی ہوں‘ دوبارہ کریں یا میں کرتی ہوں۔“ انہوں نے جواباً فون بند کرنے کو کہا۔

”مجھے آواز نہیں آ رہی۔“ وہ بے بس ہو کر بولی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”ہیلو نین تارا! اب آواز آ رہی ہے۔“ اب اسے کافی صاف آواز آئی تھی۔

”جی بہتر ہے‘ آپ کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ شاہ جی! اب تو میں آپ کی شکل بھی بھولتی جا رہی ہوں۔ کب آئیں گے واپس؟“ وہ رو دینے کو تھی۔

”اگلے ہفتے بدھ کی رات تین بجے کی فلائٹ ہے میری۔“

”کیا واقعی۔“ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔

”ڈاکٹرز نے سفر کی اجازت دے دی۔ آپ واقعی آ رہے ہیں؟“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”ہاں بھئی! میں آ رہا ہوں۔ ڈاکٹرز نے اجازت دے دی ہے تو آ رہا ہوں نا۔“

”سیدھا لاہور ہی آئیں گے نا؟“

”نہیں‘ اسلام آباد اتروں گا‘ وہاں دو تین کام ہیں‘ کچھ دن لگ جائیں گے۔“

”نہیں شاہ جی‘ یہ غلط بات ہے۔ آپ سیدھا ادھر آئیں لاہور‘ میرے پاس۔“ وہ اصرار سے بولی۔

”پگلی! جہاں اتنا صبر کیا ہے‘ وہاں دو چار دن اور نہیں کر سکتیں۔ اسلام آباد میں بہت ضروری کام ہیں‘ اسی لیے تو جلدی بھی آ رہا ہوں۔“

”کیا الیکشن ہو رہے ہیں؟“ اسے پتا تھا شاہ جی کے لیے پیسہ اور سیاسی ساکھ سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

”کہہ بھی سکتی ہو اور نہیں بھی۔ سینٹ کی سیٹ پر الیکشن ہے۔ بلا مقابلہ ہی کھڑا ہوں۔ بابا جان کی خاندانی سیٹ ہے۔ چند ضروری پیپرز جمع کروانے ہیں۔ اس کے فوراً بعد احمد پور جانا ہے پھر انشاء اللہ تمہارے پاس آؤں گا۔“

وہ اپنا پروگرام بتا رہے تھے۔ نین تارا اداس پڑ گئی۔

”سب سے آخر میں..... کس چیز کا بدلہ لے رہے ہیں آپ مجھ سے۔“ وہ تڑپ اٹھی۔

”سب سے آخر میں نہیں‘ سب کاموں سے فارغ ہو کر بالکل ریلیکس موڈ میں اپنی سویٹ ہارٹ کے پاس‘ پھر تمہیں یہ گلہ نہیں رہے گا کہ ابھی آئے اور ابھی چل دیے۔ پورا ایک ہفتہ رہوں گا۔ اس کے بعد سیدہ آپی کے دونوں بچوں کی شادیاں ہیں۔ اگلے مہینے کے اختتام پر ان تقریبات کی لمبی مصروفیات ہوں گی۔“

”شاہ جی..... میں..... شادی میں شرکت کروں گی۔“ وہ اپنی خواہش زیادہ دیر تک دل میں دبا نہ سکی۔

”اوکے نین تارا! روانگی سے قبل تمہیں کال کروں گا پھر وطن آ کر ہی تفصیلاً بات ہو سکے گی۔ ٹیک کیئر اینڈ بائے۔“ سلطان بخت نے اس کی خواہش کو سراسر ان سنی کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

نین تارا بوجھل دل کے ساتھ صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ آج کل یوں بھی بیٹھے بیٹھے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ باہر آنا جانا تو اس نے آج کل بالکل موقوف کر رکھا تھا۔

اسی وقت پھر فون کی بیل بج اٹھی۔

"لگتا ہے' شاہ جی کو میری خفگی کا احساس ہو گیا ہے۔ جو فوراً" ہی پھر فون کر دیا ہے۔" اس نے جلدی سے آنکھوں کے نم گوشے ہاتھ کی پشت سے صاف کیے اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔
"ہیلو۔۔۔ او لیزی گرل۔ کیا سو رہی تھیں؟" دوسری طرف عبدالمبین تھا۔
"اوہ۔۔۔ یہ تم ہو۔" اس نے گہرا سانس لیا۔
"کیا شاہ جی کا فون آنا تھا جو میری آواز سن کر جھٹکا لگا ہے۔" وہ فوراً" بولا۔ منہ پھٹ تو وہ بہت ہی تھا۔
"ایسی کوئی بات نہیں۔ شاہ جی سے ابھی بات ہو چکی ہے میری۔"
"لگتا ہے انہوں نے وہاں کوئی چوتھا' پانچواں یا چھٹا ساتواں بیاہ رچا لیا ہے۔ جو جا کر آنے کا نام نہیں لے رہے۔ مجھے ان کا ایڈریس لکھواؤ۔ اگلے ہفتے میرا لاس اینجلس میں شو ہے ذرا سن گن تو لے کر آؤں تمہارے بیمار مجازی خدا کی۔"
"اس کی ضرورت نہیں' وہ اگلے ہفتے آ رہے ہیں۔" نین تارا جلدی سے بولی۔
"مبارکاں پھر تو پیشگی۔"
"تھینک یو۔" وہ پھیکے لہجے میں بولی۔ "تم سناؤ' کیسا جا رہا ہے تمہارا ٹور؟"
"اچھا۔"
"صرف اچھا۔"
"نہیں بہت زبردست ہے لیکن۔۔۔" وہ رکا۔
"لیکن کیا؟"
"پتا نہیں نین تارا! کیا بات ہے دو چار دن سے طبیعت بڑی بوجھل سی ہے اور کل رات سے تو اس قدر ڈپریشن ہے کہ جی چاہتا ہے ارد گرد کی ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالوں یا سب کو آگ لگا دوں یا کہیں منہ چھپا کر ڈھیر سارا رو لوں۔" وہ زیادہ دیر تک اپنی کیفیت چھپا نہ سکا۔
"کیوں' ایسی کیا بات ہے؟" نین تارا بھی چونکی۔
"پتا نہیں مگر کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے جا رہا ہے یا ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے۔ نین تارا! میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ میوزک کے شور میں لوگوں کی ہاہو' چیخ و پکار میں مجھے رونے دھونے بین کرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میرا دل بہت پریشان ہے۔" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔
"اوہ!" نین تارا کچھ پریشان سی ہو گئی۔ "ہوم سک ہو رہے ہو۔"
"نہیں' کوئی پہلی بار تھوڑی گیا ہوں۔"
"تو واپس آ جاؤ اور اپنے گھر ہو آؤ جا کر' شاید ان کی طرف سے خدانخواستہ کوئی پریشانی ہو۔"
"واپس کیسے آ جاؤں' کنٹریکٹ کیا ہے۔ ابھی تو نیویارک' پیرس نہ جانے کدھر کدھر بھٹکنا ہے۔ ڈھائی ماہ کا ٹور ہے۔ تین بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ تھکا تھکا سا کہہ رہا تھا۔
"کیا محسوس ہوتا ہے؟" نین تارا ہمدردی سے بولی۔
"جو محسوس ہوتا ہے وہ کہہ تو چکا ہوں۔ ویسے اب جی کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہو رہا ہے۔ تم سے بات جو کر لی ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔
"تم اپنے گھر فون تو کر لو مولی!"
"ادھر فون کہاں' رابطے کی کوئی بھی تو صورت نہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔
"جو کسی کو دکھ دیتا ہے' سکون اسے بھی نہیں ملتا شاید۔" وہ بڑبڑایا۔
"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔؟" نین تارا نے سنا نہیں تھا۔
"کچھ نہیں۔"

"اپنے منیجر سے یا کسی ملازم سے کہو' جا کر پتا کر آئے۔"
"نہیں' رہنے دو۔ میں کوشش کرتا ہوں جلد آنے کی۔"
"اور ہاں' مام تم سے سخت خفا ہیں۔" نین تارا کو یاد آیا۔
"ایں' وہ کیوں؟ ابھی پچھلے ہفتے تو میری میڈم سے بات ہوئی ہے۔"
"مام تمہارے گھر گئی تھیں۔ ایکچوئلی ان کی گاڑی تمہارے گھر کے قریب ہی کہیں خراب ہو گئی۔ انہوں نے سوچا تمہاری گاڑی جو گیراج میں کھڑی ہے' وہ جا کر لے لیں گی مگر تم تو لگتا ہے گارڈز کی پوری فوج ہی گھر کے گرد الرٹ کروا گئے ہو۔ تمہارے گارڈز نے ماما کو اندر ہی نہیں جانے دیا۔ آخر ایسا کون سا خزانہ دفن کر گئے ہو جو اس قدر حفاظتی اقدامات ضروری تھے۔"
"اوہ' وہ۔۔۔" وہ ہنسا۔ "یار! ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں میں اوپر سے بھی ماڈرن نظر آؤں مگر ہوں تو مولوی کا بیٹا نا۔ گھر کے معاملے میں ذرا کنزرویٹو' بے چارے جلیل کو چودھواں سن لگا اور جو وہ بھول کر گھر کی ڈیوڑھی پار کر جاتا تو بابا صاب مار مار کر اس بے چارے کا بھرکس نکال دیتے تھے۔ سمجھو' وہی تنگ نظری میرے اندر لاشعوری طور پر پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی ہے۔ ویسے فوج ووج تو کوئی نہیں' صرف دو گارڈز ہی تو ہیں۔ وہ بھی چوکیدار کے نکمے پن کی وجہ سے رکھے تھے۔ میں کہہ دوں گا ان سے میڈم کے بارے میں۔"
"مام خود تم سے بات کریں گی اور تمہاری کلاس بھی لیں گی۔"
"شوق سے لیں مگر میرے آنے کے بعد۔ اوکے' اب اجازت دو۔ شو کا ٹائم ہونے والا ہے۔ فریش ہونے کے لیے کچھ لیتا ہوں۔ دو راتوں سے شوز اور اس ڈپریشن کی وجہ سے سو نہیں سکا' بائے۔"
"تم پھر ڈر گئے ہو گے۔۔۔" نین تارا اسے تنبیہ کرنے جا رہی تھی مگر اس نے فون بند کر دیا تھا۔
"آخر تمہارا چلہ کب پورا ہو گا اس منحوس گوشہ نشینی کا۔"
زیور گل خطرناک تیور لیے پیر پٹختے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔
"اب کیا ہو گیا؟" وہ سخت بیزاری سے بولی۔
"مجھے کیا پتا تھا' تم نے جوان ہو کر مجھے یہ دکھ دینے ہیں تو میں تمہارے پیدا ہونے کی آرزو ہی نہ کرتی۔ اس بڑھاپے میں ہمیں دو چار ہزار کے لیے دھکے کھاتی پھروں۔ تم جو یہ مفت کی مصیبت پال کر بیٹھ گئی ہو۔" زیور گل نے اس کے بڑھتے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے نفرت سے کہا۔
"مام! مجھے جو کہنا ہے' ہزار بار کہیں مگر میرے ہونے والے بچے کے بارے میں ایک حرف نہیں۔" وہ غرائی۔
"بڑا درد اٹھ رہا ہے ابھی سے اس منحوس اولاد کے لیے۔ مجھے بھی تو دیکھو' تمہیں ان ہی ناز نخروں سے پالا تھا۔ کیا اس دن کے لیے کہ اس بڑھاپے میں تمہاری منتیں کرتی پھروں۔ پروڈیوسرز سے' ساری امیدوار تگڑی اسامیوں سے جھوٹ بول بول کر میرا منہ ٹیڑھا ہو گیا ہے کہ تم ہانگ کانگ گئی ہوئی ہو' کبھی سنگا پور اور کبھی لندن۔۔۔"
"تو مت بولیں جھوٹ' بتا دیں سچ سب کو۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں نے کوئی گناہ کیا ہے جو چھپاتی پھروں۔" وہ تڑخ کر بولی۔
"پہلے تو یہ سچ اپنے اس سید زادے کو تو بتا پھر آ کر مجھ سے آنکھیں چار کر۔ تو وہ مانے گا کہ تیرے پیٹ میں ایک طوائف زادی کے بطن میں اس کا پاکیزہ خون پروان چڑھ رہا ہے۔ کبھی بھی نہیں۔ مان گیا تو آ کر میرے منہ پر تھوک دینا۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے میں نے۔" زیور گل ہزیانی انداز میں چلا رہی تھی۔
"کتنی رقم چاہیے آپ کو؟" نین تارا تحمل سے بولی۔
"جتنی بھی مل جائے۔ میرے اکاؤنٹ میں اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں' چاہے تو پتا کروا لو اور گھر میں راشن تک نہیں۔" وہ روکھائی سے بولی۔

"مام! اتنا جھوٹ بولیں جو آپ کی عمر کی کچھ تو لاج رکھ سکے۔ خیر اشرف کو بھیجیں، میں چیک لکھ دیتی ہوں۔"

"دس ہزار کا، بیس ہزار کا بس؟" زیور گل چلائی۔ "میرا اب ان خیرات کے چند روپوں میں گزارا نہیں ہوتا۔ سنا تم نے۔ اس دن کے لیے میں نے تمہیں جوان کیا تھا کہ ٹکے ٹکے کے لیے تمہارے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔"

"میرے پاس جو کچھ ہے' میں وہی دوں گی۔ آپ نے اپنے بڑھاپے کے آسرے کے لیے میری پرورش کی تھی نا' اس کے اخراجات مع سود میں چکا چکی ہوں اور اب میں بھی اپنے آنے والے بڑھاپے کے لیے کوئی آسرا چاہتی ہوں' اولاد کی شکل میں۔ کیا یہ میرا حق نہیں۔ اب پلیز مجھے آرام کرنے دیں۔" سرومہری سے کہتے ہوئے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

"یہ کبوتر کی طرح دو چار دن آنکھیں بند کرلو۔ جس دن اس سلطان بخت نے دھکے دے کر نکالا۔ روتے دھوتے میرے پاس آؤ گی' یاد رکھنا۔ اس دن زیور گل بھی تمہیں پناہ نہیں دے گی۔ دغاباز' فریبی لڑکی۔" زیور گل غصے سے بل کھاتی باہر نکل گئی تو نین تارا آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"اماں جی!" جویریہ قرآن پڑھتی اماں جی کے پاس آبیٹھی۔ انہوں نے متورم آنکھوں سے اسے دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

"اماں جی! چھوٹی آپی کے بغیر گھر کتنا سونا سونا لگ رہا ہے۔ اداس' ویران سا۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہوں۔" سورہ مریم زیر لب پڑھتے ہوئے انہوں نے آیت پر ذرا سا رک کر کہا۔

"صبح سے پڑھ رہی ہیں۔ اب بس کریں' تھک جائیں گی۔" وہ ان کے کندھے دباتے ہوئے بولی۔ انہوں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں سطروں پر دوڑتے دوڑتے بھیگ گئیں۔

"اماں جی!" اس نے ان کے کندھے پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔ "چھوٹی آپی اماں چلی گئیں۔ وہ ہم سے لڑتی تھی' سب سے خفا رہتی تھی۔ کتنے دنوں سے یونہی چپ چپ سی تھی۔ کسی سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ پتا نہیں شاید اسے اپنے یوں چلے جانے کا پہلے سے علم ہو گیا تھا۔ کیسی چپ سادھ لی تھی اس نے۔ اس کے باوجود اس کی کمی کتنی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔" جویریہ اداسی سے بولا۔

"کتنا پڑھیں گی' دن رات پڑھتی رہتی ہیں۔ آپ کی طبیعت بھی اچھی نہیں۔" چند لمحوں بعد وہ پھر بولی۔

"تو اور کیا کروں؟" انہوں نے قرآن پاک بند کر دیا۔ "اور کسی بھی طرح تو سکون نہیں ملتا' اس کی یاد' اس کی صورت بھلائے نہیں بھولتی اور وہ کیا اتنی جلدی بھلائے جانے کے قابل ہے۔ مڑ کر دیکھتی ہوں تو معصوم چہرے کو چھوٹے سے دوپٹے کے ہالے میں چاند کی طرح نکالے' ہاتھ میں نورانی قاعدہ پکڑے منہ بسورے کھڑی ہے۔ مجھے بابا صاب سے نہیں پڑھنا' بابا صاب مارتے ہیں' مجھے بابا صاب سے ڈر لگتا ہے' بابا صاب....." اماں جی کہتے کہتے ہچکیوں سے رونے لگیں۔

"اماں جی! نہ روئیں' بابا صاب آنے والے ہیں۔ کل رات کو بھی وہ جویریہ کے رونے پر کس قدر خفا ہوئے تھے کہ شرع میں صرف تین دن کا سوگ ہوتا ہے' صرف عورت اپنے شوہر کا سوگ چار مہینے دس دن تک منا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی کا سوگ جائز نہیں۔" آمنہ' ماں کے رونے کی آواز سن کر جلدی سے اندر آکر ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"انہوں نے تین دن بھی کیا سوگ منانے دیا ہے' قل تک تو بے چاری کے کرنے نہیں دیے۔ کہتے رہے تھے۔ بتاؤ کون سی حدیث میں یہ قل' ختم' چالیسواں ثابت ہے۔ کوئی چالیسواں' کوئی برسی کچھ بھی تو شرع میں درج نہیں۔ جو پیدا ہوتا ہے اس کا جانا اٹل ہے۔ وہ خدا کی امانت ہے اور امانت لوٹا دینے پر کیسا سوگ' کیسی حیل و حجت۔ کوئی صبح سے شام تک گٹھلیاں نہیں پڑھے گا' نہ کوئی جمعرات' نہ گیارہواں' اکیسواں۔ امام بخاری کی تینوں جلدیں اٹھا کر کھول لو' کہیں ان بدعات کا ذکر نہیں جو ہم نے اپنی زندگی کے معمولات میں شامل کرلی ہیں۔" جویریہ

ہاتھ مسلتے ہوئے دکھی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"سچ کہتے ہیں تمہارے بابا صاب!" اماں جی نے ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"اور سب لوگ کو دیکھا' کیسے دبی دبی باتیں کر رہے ہیں کہ دیکھو تو مولوی صاب اپنے گھر کے لیے کتنے سیانے ہیں۔ دوسروں کے ختم قل پر کیسے دعوتیں اڑانے جاتے تھے اور اب اپنے گھر بات آئی تو کیسی شرع تفسیریں نکالی ہیں۔ دوسروں پر فتوے جڑتے تو شرع کا خیال انہیں کبھی نہیں آیا۔ بریانی کی دیگوں اور قورمے کی ڈشوں پر ہاتھ صاف کرتے تو کبھی حدیثوں کا خیال نہ آیا اور اپنی بار......"

"ہم نے کیا حق ادا کیا زینب کا' وہ تشنہ لب اس دنیا میں آئی اور ناکام حسرتوں کا ماتم کرتی چلی گئی۔ ہم تو اسے ایک ٹائم کا اچھا کھانا بھی اللہ کے نام پر نہیں بھیج سکے۔ وہ زندگی بھر اچھی چیزوں' اچھے لباس' اچھے کھانوں کو ترستی چلی گئی اس کے مرنے کے بعد بھی بابا صاب نے ایسا کچھ نہیں کرنے دیا۔ پرسوں مسجد میں کھانا بھیجنے لگی تو کہنے لگے۔

"مہینہ سوا مہینہ کھانا کپڑے مسجد بھیج دو گی تو باقی کی عمر تو مردہ تمہارے کھانوں کے انتظار میں بھوکا ہی رہے گا۔ ارے نادانو! موت ان چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ بھوک تو ہم زندوں کی احتیاج ہے۔ ہمارے ہی گلے کا طوق اور پیٹ کا دوزخ جو جیتے جی بھگتنا پڑتا ہے۔ مردوں کو ان جمعرات کے کھانوں سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔"

آمنہ آہستہ آہستہ صوفی صاحب کی مسجد میں نماز عصر کے بعد کی تقریر سنا رہی تھی جو اس نے آخری زینے پر کھڑے ہو کر سنی تھی۔ شاید وہ اہل محلہ کے اعتراضات کا منہ بند کرنا چاہ رہے تھے۔

"درست کہتے ہیں تمہارے بابا صاب۔ مردہ ان چیزوں' ان ضرورتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ خود تو چلا جاتا ہے۔ بس پیچھے رہ جانے والوں کو مار جاتا ہے۔ زینب! تم مجھے کیوں نہیں نظر آتیں میری بچی' یہ تمہاری جانے کی عمر تھی۔"

اماں جی پھر سے دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگیں کہ صوفی صاحب کے سیڑھیاں چڑھتے قدموں کی آواز پر انہوں نے بے اختیار اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ لیا۔

"جاؤ' باپ کو پوچھو جاکر' میرا پوچھیں تو کہہ دینا سو رہی ہیں۔" اماں جی کروٹ لیتے ہوئے جلدی سے بولیں۔ آمنہ اور جویریہ نے دکھ بھری نظروں سے ماں کو دیکھا کہ وہ اب جی بھر کر روئیں گی اور صبر تو آتے آتے ہی آتا ہے۔

"بابا صاب! آپ کے لیے چائے لاؤں؟" آمنہ باہر آکر بولی۔ وہ تخت پر ہی بیٹھ گئے تھے۔

"نہیں۔" انہوں نے عمامہ اتار کر تخت کے سرہانے رکھا اور ٹانگیں اوپر رکھ کر ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے آہستہ آہستہ گرانے لگے۔ آمنہ اور جویریہ چپ چاپ اندر کمرے میں جاکر بیٹھ گئیں۔

"عبدالمتین' عبدالمبین کو میں نے گھر سے نکال دیا۔ اس کے باوجود میں زمانہ کے سامنے چٹان بن کر ڈٹا رہا۔ بیٹی کیا ہوتی ہے...... بیٹی..... اور بیٹی بھی زینب جیسی جس نے زندگی بھر مجھ سے ڈانٹ ہی کھائی۔ کبھی مجھے دل سے خوش نہ کیا۔ میری ضد میں ہمیشہ ہر الٹا کام کیا۔ وہ چلی گئی ہے تو مجھے لگتا ہے میں اندر سے ڈھے گیا ہوں' بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔ وہ میری موجودگی کا خیال کیے بغیر کیسے گھر بھر میں چہکتی پھرتی تھی۔ ہر فرمائش' ہر ضد کیسے دھڑلے سے میرے منہ پر کہہ دیا کرتی تھی۔ جبکہ اسے معلوم تھا کہ میں اس کا بے بس باپ اس کی چھوٹی سے چھوٹی جائز خواہش بھی پوری کرنے کے قابل نہیں پھر بھی...... پھر بھی اس بے وقوف نے خواہش سے اپنا تانا نہ توڑا بلکہ اور مضبوط کرلیا۔" وہ تسبیح کے دانے کو انگوٹھے اور انگلی کے بیچ پکڑے سوچے جا رہے تھے۔

"اور خواہش مکڑی کا وہ جالا جو بظاہر بے ضرر مگر موت کا سا طاقتور اور مضبوط جس کے اندر ایک بار جو پھنس گیا پھر اس کا بچنا محال ہوتا ہے۔ زینب بھی خواہشوں میں گھٹ کر مرگئی۔ میرے اللہ..... یہ تیری کیسی تقسیم ہے۔ تو نے کیوں انسانوں کے نصیب اتنے جدا جدا بنائے۔ بیٹے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے دکھ' ان کی جدائی نے مجھے کبھی یوں دکھی' رنجیدہ نہ کیا اور زینب..... میں نے عزت بچائی' زینب گنوادی پھر کیوں دکھی ہوں۔" وہ سر اٹھا کر غمگین نظروں سے اوپر دیکھنے لگے۔

"وہ یوں رخصت نہ ہوتی تو اس نے ویسے بھی تو آج اس نذیر کے ساتھ رخصت ہو ہی جانا تھا۔ بیٹیاں تو ہوتی ہی رخصت ہونے کے لیے ہیں مگر وہ رخصتی ایسی تو نہ ہوتی' اتنی بے رحم' اتنی دائمی۔"

"صوفی عبدالرحمن! تم نے ایک بیٹی تو ایسے رخصت کر دی' کیا باقی دونوں کو بھی ایسے ہی رخصت کرو گے؟۔" کوئی ان کے اندر وحشت بھری آواز میں بولا۔ وہ تڑپ کر سامنے کمرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ان کے دائیں بازو اور سینے کے دائیں حصے میں تیزی سنسناہٹ ہوئی اور ایک پل کو انہیں لگا ان کا دایاں حصہ آنکھ' گردن' ہاتھ' بازو' انگلیاں سب مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔

انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنا سر ہلایا۔ بازو جھٹکا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے' اسی وقت کلثوم بی بی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی' انہیں دیکھ کر سلام کرتے ہوئے جھجک کر رابعہ بی بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"آمنہ! باہر نکل کر دیکھو بیٹا! تمہاری ماں کے پاس کلثوم بی بی آئی ہیں۔" وہ کہتے ہوئے دوبارہ سیڑھیاں اتر گئے۔

انہیں اوپر اب بہت وحشت ہوتی تھی۔ کلثوم بی بی کو ہی انہوں نے آمنہ کے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ان چار پانچ دنوں میں اس نے اور اس کے بیٹے نے صوفی صاحب کے گھرانے کی بڑی دلجوئی کی تھی۔ پہلے دو دن تو تینوں وقت کا کھانا بھی ادھر ہی سے آتا رہا تھا۔ کلثوم بی بی نے افسردہ نظروں سے نیچے جاتے صوفی صاحب کو دیکھا اور رابعہ بی بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

رعنا حیات کا پنڈی جانا بھی بے فائدہ رہا۔

یونس بیگ نے بتایا کہ اس بچے کو ٹھیک تین ماہ بعد سلمان سبزواری نامی کوئی بزنس مین اڈاپٹ کر کے لے گیا تھا۔ اس کا ایڈریس جو یونس بیگ نے رعنا حیات کو دیا تھا جب وہ اس ایڈریس پر پہنچیں تو پتا چلا وہ شخص آج سے بائیس برس پہلے ہی اپنا سارا کاروبار اور گھر بار بیچ کر سٹی چلا گیا تھا۔ بچہ اس کے ساتھ ہی تھا۔ یہ ساری باتیں اس علاقے کے ایک پرانے رہائشی نے بتائی تھی۔ پھر لاکھ کوشش کے باوجود رعنا حیات سلمان سبزواری کے بارے میں اور کچھ بھی نہ جان سکیں۔

تیسرا دن تھا جب وہ فخر حیات کو سوپ پلا رہی تھیں۔ جب ملازم کارڈلیس اٹھائے فخر حیات کے پاس آیا۔

"سر! کسی سلیمان سبزواری کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔" رعنا حیات کے ہاتھ سے سوپ کا پیالہ گرتے گرتے بچا' ان کا جی چاہا کارڈلیس خود جھپٹ لیں۔

"کون سلیمان سبزواری' میں نہیں جانتا۔ فون بند کر دو۔" فخر حیات نے بیزاری سے کہا تو رعنا حیات کارڈلیس کی طرف جھپٹیں۔ انہوں نے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف لائن بے جان ہو چکی تھی۔ انہوں نے دھواں دھواں نظروں کے ساتھ اس بے جان آلے کو دیکھا۔

● ● ● ● ● ●

"آپ جانتے ہیں یہ... یہ کون ہے؟ سلمان سبزواری!" رعنا نے کارڈلیس کان سے ہٹا کر فخر حیات سے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں۔" انہوں نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر اس کا فون کیوں آیا تھا آپ کے لیے؟"

"مجھے کیا معلوم' کوئی رانگ نمبر مل گیا ہو گا۔" وہ کچھ جھلا کر بولے۔ بیماری نے انہیں چڑچڑا کر دیا تھا۔

"کیا کہہ رہے تھے یہ صاحب! کہ کس سے بات کرنی ہے؟" رعنا فخر حیات کو چھوڑ کر ملازم سے بات کرنے لگیں۔

"جی انہوں نے یہی کہا تھا کہ فخر حیات صاحب ہیں تو میں نے کہہ دیا جی ہیں۔" ملازم جلدی سے بولا۔

"دیکھا' وہ آپ کو جانتا ہے۔" رعنا ایک دم سے چہک کر بولیں۔

"بھئی' میں اسے نہیں جانتا۔ میں تو یہ نام بھی پہلی بار سن رہا ہوں۔ آخر تمہیں کیا دلچسپی ہے اس شخص میں... اور تکیہ ہٹاؤ میرے پیچھے سے۔" وہ بے زاری سے بولے تو ملازم نے مستعدی سے آگے بڑھ کر تکیہ ان کے پیچھے سے نکال دیا۔ ان کے سینے کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے' اس لیے وہ ابھی زیادہ ہل جل نہیں سکتے تھے۔

رعنا پیچھے ہٹ کر صوفے پر بے دم سی ہو کر بیٹھ گئیں' جیسے کسی نے ان کے جسم کی ساری توانائی نچوڑ لی ہو۔

"منزل قریب آتے آتے دور ہو جاتی ہے۔ میرے اللہ! میری ماں کا اور کتنا امتحان باقی ہے۔"

رعنا کا جی چاہا اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں' ضبط کرتے کرتے بھی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کچھ پے در پے ہونے والے غیر متوقع واقعات اور کچھ بیٹے کے ملتے ملتے یا نہ ملنے والی کیفیت نے انہیں بہت زود رنج کر دیا تھا۔ بات بات پر آنکھ بھر آتی تھی۔

"اب کیا سوچنے لگیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔

"تم نے مجھے جنتاں کی موت کا کیوں نہ بتایا؟" چند لمحوں بعد فخر حیات بولے۔ "کتنی بڑی قربانی دے گئی وہ۔ میری ذات پر ایسا احسان کر گئی جس کا میں اسے کوئی بدلہ بھی نہیں دے سکتا۔ اس کے کوئی آگے پیچھے بھی نہیں جس کی کفالت کر کے میں اس احسان کا کچھ بوجھ ہی کم کر سکوں۔"

وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے اور رعنا کا جی چاہا خوب چیخ چیخ کر اس مظلوم صورت مکار جنتاں کا کارنامہ بتائیں' کس طرح اس نے ان کی گود اجاڑ کر ان کے گھر کی خوشیاں برباد کیں مگر پھر اس طرح انہیں اپنے اس مکروہ فعل کا بھی بتانا پڑتا جس کے ردِعمل ——— میں جنتاں نے ان کی گود اجاڑی تھی۔ یہی سوچ کر وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

"تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟" فخر حیات رعنا کی عدم توجہی محسوس کر کے بولے۔

"کہیں نہیں۔" وہ بے دلی سے بولیں۔

"میں گھر میں پڑ گیا ہوں۔ تم میری تیمارداری سے عاجز آ گئی ہو۔؟" وہ چند لمحوں بعد خود ترسی کی کیفیت میں گھر کر بولے۔

"نیگیٹو باتیں نہ سوچیں' اس طرح آپ کو بہتر ہونے میں مزید ٹائم لگے گا۔" رعنا نے کچھ مشینی انداز میں ان کی دلجوئی کی تھی' ورنہ اس وقت وہ شوہر کا دل بہلانے کے موڈ میں قطعاً نہیں تھیں۔

"تسلی دینے کا شکریہ۔" فخر بھی بیوی کا انداز سمجھ کر طنزیہ لہجے میں بولے۔

"فخر! ایک بات کہوں۔" رعنا نے فخر حیات کے طنز پر غور نہیں کیا۔

"ہوں۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولے۔

"کیا... کیا آپ کو کبھی خیال آتا ہے؟۔" وہ کچھ پرجوش سی ہو کر سیدھی ہو گئیں۔

"کس بات کا؟" وہ اسی طرح بند آنکھیں کیے بولے۔

"اگر ہمارا بیٹا ہمیں مل جائے' اگر وہ..." وہ اٹھ کر ان کے قریب چلی گئیں۔

"ایک بار لے پالک کے ہاتھوں زندہ بچ گیا ہوں۔ اپنا بیٹا شاید یہ رعایت بھی نہ دے۔" وہ تلخی سے بولے۔

"اونہوں فخر! ہمارا بیٹا ہمارا اپنا بیٹا۔" وہ محبت سے ان کے ماتھے کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

"کون سا ہمارا بیٹا؟۔" انہوں نے الجھ کر آنکھیں کھول دیں۔

"ہمیں کون سے اللہ نے دس پانچ بیٹے دیے تھے۔ ایک ہی تو بیٹا ہوا تھا' بھول گئے کیا؟" وہ رنجیدہ ہو کر بولیں۔

"اپنی اولاد کو بھی کوئی بھول سکتا ہے مگر بائیس برس رعنا! ایسا کچھ بھی بھلا دینے کو بہت ہوتے ہیں۔ سمجھو میں بھی بھول گیا۔" وہ آہ بھر کر بولے۔

"مگر میں تو نہیں بھولی۔ ایک لمحہ' ایک پل بھی نہیں بھولی۔" ان کی آنکھوں میں پھر ساون اترنے لگا۔

"معلوم ہے مجھے۔"

"شکر! میرا دل کہتا ہے ہمارا بیٹا ہمیں ضرور ملے گا۔ میرے دل کو یکایک بہت امید بندھ گئی ہے۔ ہمارا اللہ ضرور۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

ان بائیس برسوں میں کب انہوں نے اللہ کے آگے جھک کر سر بسجود ہو کر خوب گڑگڑا کر اپنی پیشانی زمین پر رگڑ کر اس کے آگے دست سوال دراز کیا تھا۔ بس دنیاوی وسائل کے گھوڑے دوڑاتی رہیں۔ ایک رات بھی ان بائیس برسوں میں ایسی نہ آئی جب ان کے دل کی تڑپ نے بستر میں کانٹے اگائے ہوں اور وہ اندھیری رات کے دل چیر دینے والے سناٹے کو ہمراز بنا کر مالک کائنات کے آگے جھکی ہوں۔ اس بادشاہ کے آگے جھولی پھیلائی ہو جو ساتویں آسمان سے پہلے آسمان پر آکر خود پکارتا ہے۔ کوئی ہے مجھ سے مانگنے والا' میں اس کے دل کی مراد پوری کروں' اس کی جھولی بھروں۔ کوئی ہے ہاتھ پھیلانے والا ایسی پکار پر تو ایک بار بھی انہوں نے اٹھ کر لبیک نہیں کہا تھا۔ ساری زندگی بے سکون رہیں اور یہ لطیف نکتہ سمجھ ہی نہ سکیں۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھیں اور تیز قدموں سے باہر نکل گئیں۔ اس سے مانگنے کا خیال آیا تھا جس نے یہ نعمت بے مول ان کو دے کر چھین لی تھی اور اب وہ دوبارہ اسی سے مانگنے چلی تھیں' پورے جذبے اور یقین کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

چلتے چلتے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔

اسے لگ رہا تھا اس کے قدم نہیں چل رہے' رستے چل رہے ہیں۔ سڑک آگے ہی آگے بھاگی جارہی ہے اور وہ رستے کے تعاقب میں بھاگا جا رہا ہے' کسی بھی سمت کا تعین کیے بغیر۔ جیسے اب تک کی زندگی اس نے کچھ بھی سوچے بغیر' کچھ بھی طے کیے بغیر حالات کے دھارے پر بہہ کر گزار دی اور آج حالات کے اسی ریلے نے اسے بہا کر کس قابل نفرت مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ اسے اس واقعہ کے بارے میں سوچتے ہوئے خود سے نظریں ملاتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ اسے یقین تھا اگر آئینہ آپوں آپ چل کر اس کے سامنے آجائے تو وہ تب بھی اس میں اپنی صورت نہیں دیکھ پائے گا۔ اپنی ہی مسخ شدہ صورت دیکھنے کا حوصلہ کس میں ہو گا بھلا؟

حاذ نے ایک گہرا سانس لیا تو اسے شدید تھکن کا احساس ہوا۔ زخموں میں اٹھنے والی ہلکی ہلکی ٹیسوں کا خیال آیا اور سب سے بڑھ کر بے مقصد مسافت کی تھکن کا احساس جو دماغ کی شریانوں سے سفر کرتا ہوا اس کی ٹانگوں اور پیروں میں اتر آیا تھا۔ قدم چلنے سے انکاری تھے مگر دماغ رکنے پر راضی نہیں تھا۔ کہیں گھپ اندھیرا' کہیں نیالی سی روشنی' کہیں گھپ تاریکی اور کہیں چکا چوند روشنی کے جھماکے۔

اس نے زندگی کا سفر بھی تو یونہی طے کیا تھا۔ روشنی کو اندھیرا سمجھتا رہا اور اندھیرے کو روشنی اور کس وقت یہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اسے ان طویل تاریک راہوں میں چھوڑ گئے اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔

"غلطی' میری کیا غلطی تھی؟" پیر تو پہلے ہی رکنے کا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کو رک کر سوچنے لگا۔ دماغ' جسم تھکن کے ساتھ شل ہوا جا رہا تھا۔

"مجھے پہلے دن ہی اس گھر سے چلے جانا چاہیے تھا۔ آخر میرا ان لوگوں سے تعلق ہی کیا تھا۔ انہوں نے تو مروت اور اپنائیت کے ناتے اصرار کیا اور میں ڈھیٹ بن کر وہاں پڑا رہا' محض [illegible] مطلب نکالنے کے لیے۔ اس سے تو اچھا تھا میں مزید تعلیم حاصل ہی نہ کرتا۔ فٹ پاتھوں پر دھکے کھاتا ہوا کہیں محنت مزدوری کر لیتا تو آج یوں اپنی نظروں میں تو نہ گرتا۔ ٹھوکر کھایا ہوا انسان اٹھ سکتا ہے' میرے جیسا' نظروں سے گرا ہوا کیسے اٹھے گا۔ احسان تو کسی کا تنکے برابر بھی ہو' وہ بھی وقت پڑنے پر جتانے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ تو پھر مٹی کے جیتے جاگتے انسان تھے اور انہوں نے تو مجھ پر منوں من احسانات کی مٹی لاد رکھی تھی۔ ایسے نہ مجھے ذلیل کرتے' جتاتے۔ میں تو پہلے دن سے اس گھر کے ماحول میں مس فٹ تھا اور میں سمجھا ہی نہیں۔ مجھے اس گھر کی کسی بھی دیوار میں چنا جاتا۔

میری حیثیت ایک اضافی اینٹ سے زیادہ کی نہیں تھی۔ ایسی اینٹ جو ساری دیوار کی خوبصورتی اور یکسانیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اب چاہے اس اینٹ کو چھپانے کے لیے قیمتی سے قیمتی خوبصورت کلر کا پینٹ کرو' پوسٹر لگاؤ' کوئی شاہکار پینٹنگ لگاؤ اس کا وجود نظروں کو چبھتا ہی رہے گا۔ اس کا صرف ایک ہی حل تھا کہ اس اینٹ کو ہتھوڑی سے توڑ پھوڑ کر اس دیوار کی جان چھڑائی جاتی۔ جیسے آج مجھے بے غیرتی کے طعنے کی ہتھوڑی سے چور چور کر کے ان سڑکوں پر پٹخ دیا گیا۔ ہاں میں اسی قابل تھا۔ مجھ جیسے ڈھیٹ' بے شرم' پیراسائٹ کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ میں جو اپنی جڑوں سے بھی ناواقف ہوں کیسے ایک شاندار عمارت والی شخصیت کے طور پر متعارف ہو سکتا تھا۔ مشی ٹھیک کہتی تھی' اس نے بالکل ٹھیک کیا' میں اسی قابل تھا۔" اس کے اندر کی چوٹیں اور زخم پھر سے سسکنے لگے۔ "محبت پیار آج کل کے مادی دور میں ایک پر فریب مکڑی کے جالے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پھنس گئے تو نکل نہیں سکتے' دھتکارے گئے تو چکنا چور۔ میں پھنس نہیں سکتا' اس لیے چور چور ہوں۔" پاؤں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا۔ پول کی پیلی چمکدار روشنی میں اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

ریلوے اسٹیشن کی سرخ عمارت کے ماتھے پر لگا کلاک صبح کے چار بجا رہا تھا۔ دور سے کہیں ٹرین کے آنے کی وسل بج رہی تھی۔ فٹ پاتھ کے اردگرد سبزے کے قطعات پر اس جیسے بے نشان' بے گھر لوگ بے سدھ سوئے تھے۔

ٹرین کی تیز وسل اور مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکرز سے بلند ہونے والی اللہ اکبر کی پر اثر پکار ان کی مدہوش نیند میں خلل نہیں ڈال سکی تھی۔

"بے نشان ہی تو ہوں میں۔ نامعلوم کون سے کوڑے کے ڈھیر سے کسی نے مجھے اٹھا کر یتیم خانوں کی پتھریلی عمارت تک پہنچایا ہو گا اور میں اپنی ذہانت' اپنی خودی کے زعم میں شاندار نیم پلیٹ والی پر شکوہ عمارت تعمیر کرنے کی بے سود کوششیں کرتا رہا اور اب جب بھی میں یہ کوشش کروں گا میری بے نشانی کا بھاری پتھر میری ساری ریاضت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ مشکلات سے لڑنا آسان ہے مگر تقدیر کے انمٹ لکھے سے لڑنا بہت مشکل ہے اور یہ احساس ذلت۔۔۔۔ میں جتنا نیک با مقصد ظاہر کرنے کی کوشش کروں' میرے اندر گڑا بیٹھا ہے۔ کب تک اس کو اکھاڑنے کی بے کار کوششیں کرتا رہوں گا۔ سب بے سود ہے' بے فائدہ۔"

اس نے تھک کر خود کو بنچ پر گرا لیا۔ میری بے کار زندگی میرے کسی بھی کام کی نہیں۔ میرا یہ اتنا بڑا مضبوط وجود میرے لیے باعث فخر نہیں' باعث شرم ہے اور اس ذلت سے پیچھا چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ میں اس کو بھول جاؤں' فراموش کر دوں۔ یاد رکھوں تو صرف اتنا کہ میرے ہاتھ میں جو ہنر ہے وہ کسی دکھی بدن کے دکھ چننے کے کام آسکے۔ شاید دوسروں کے دکھ چنتے چنتے میرے وجود میں ان دیکھے مقام میں گڑی بے نامی کی سوئیاں بھی چن لی جائیں۔

☼ ☼ ☼

صوفی صاحب سامنے تخت پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ناشتے کے دوران اور ناشتہ کر چکنے کے بعد بھی وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنا دایاں بازو اوپر اٹھاتے اور زور سے اسے دو تین جھٹکے دیتے۔

آمنہ روٹی پکاتے ہوئے صوفی صاحب کی اس اضطراری حرکت کو بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ معلوم نہیں انہیں کیا پریشانی تھی۔ ان کا چہرہ ان کی اندرونی کیفیت کی عکاسی کر رہا تھا۔ وہ اچھے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ انہوں نے ناشتہ بھی پورا نہیں کیا تھا۔ آدھی روٹی ویسے ہی چھوڑ دی تھی۔

"پتا نہیں ہمارے گھر کی پریشانیاں کب ختم ہوں گی۔" آمنہ نے روٹی توے سے اتارتے ہوئے پرملال انداز میں سوچا۔ "ختم نہ ہوں' کم ہی ہو جائیں۔ بابا صاحب پریشان ہیں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے آرڈر آنے والے ہیں اور میں؟ میں اپنی پریشانی کیسے بتاؤں۔ دو ماہ سے مجھے تنخواہ نہیں مل رہی۔ اسکول بند ہونے کے قریب ہے۔" رعنا حیات کی این جی او نے یہ ماڈل اسکول معاشرتی بھلائی کے لیے کھول تو لیا مگر لوگوں نے جواباً" اس جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا تو ان کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

تین شفٹوں کے آئیڈیے میں سے صرف ایک شفٹ میں کام ہو رہا تھا۔ بچوں کی تعداد بھی دن بدن اسکول میں کم ہوتی جارہی تھی۔ کسی بھی کلاس میں پندرہ سے زیادہ بچے نہیں تھے۔ ٹیچرز بھی بددل ہو چکی تھیں۔ دو ٹیچرز تو یہ اسکول چھوڑ کر کسی دوسرے اسکول میں چلی بھی گئی تھیں۔ این جی او کے ہیڈ آفس سے اسکول کی تنخواہوں کا چیک آ ہی نہیں پا رہا تھا۔

اسکول کا اکاؤنٹ بالکل خالی تھا۔ آمنہ بھی کسی دوسرے اسکول میں جاب کرنے کا سوچ رہی تھی مگر دوسرے سب ہی اسکول ان کے گھر سے کافی فاصلے پر تھے۔ دوسرے معلوم نہیں صوفی صاحب اسے اجازت دیتے یا نہیں۔ وہ خود آج کل خاصے الجھے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے بابا صاب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا' بازو میں تکلیف ہے کیا؟" اس بار جو انہوں نے زور سے بازو جھٹکا تو آمنہ رہ نہ سکی۔ اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی اور ان کے پاس کھڑی ہو کر نرم لہجے میں پوچھنے لگی۔

"آں نہیں' کچھ نہیں۔" وہ بری طرح سے چونکے۔

"میں آپ کا بازو دبا دوں۔" اسے ان کی تکلیف کا سوچ کر ہی پریشانی ہو رہی تھی۔

"نہیں' درد تو نہیں ہے۔" وہ ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ گئے۔

"تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایسے لگتا ہے جیسے سن ہو گیا ہے۔ عجیب سی سنسناہٹ سی ہونے لگتی ہے اس میں۔" وہ اپنے جوتے سیدھے کر کے پہننے لگے۔

"آپ کسی ڈاکٹر کو دکھا لیں نا۔" وہ تشویش سے بولی۔ "کافی دنوں سے ہے آپ کو یہ تکلیف۔"

"ہوں' ٹھیک ہو جائے گا خود ہی۔" وہ جوتے پہن چکے تھے۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" آمنہ کو ان کی پریشان صورت بے چین کر رہی تھی۔

"آرڈر کینسل کرانے کی کوششیں کر رہا ہوں' ابھی میرا ایک سال باقی ہے۔ حالانکہ سیدا اور ڈائریکٹریٹ آفس کے دونوں بڑے افسر میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ایک بار میں ان سے مل کر اپنی عرضی پیش بھی کر چکا ہوں مگر اب جب بھی جاتا ہوں چپراسی ملنے ہی نہیں دیتا' کہہ دیتا ہے سر میٹنگ میں ہیں یا وہ ابھی آئے ہی نہیں۔ سوچ رہا ہوں صفدر صاحب کے گھر جا کر مل لوں۔" وہ پرسوچ انداز میں جیسے خود سے مشورہ کر رہے تھے۔

"آپ کا کیا خیال ہے چپراسی جھوٹ بولتا ہے یا ایسا اپنے افسر کے کہنے پر کرتا ہے؟" آمنہ کو ان کی افسر کے گھر جانے والی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

"پتا نہیں دونوں ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ بہرحال اس وقت تو مجھے غرض ہے' وہ جو بھی کہیں مجھے ماننا پڑے گی۔"

"آج کل دفتروں کا کچھ ایسا چلن ہو گیا ہے۔ اگر آپ چپراسی کو کچھ دے دلا کر... میرا مطلب ہے..." آمنہ ان کی غصیلی نظروں سے گڑبڑا گئی۔

"میں چلتا ہوں' تم اپنی ماں کو دیکھو جا کر۔ مجھے پھر اس کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی۔ دوا تو باقاعدگی سے دے رہی ہو نا؟" وہ جاتے جاتے بولے۔

"جی وہ تو دے رہی ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ ان کی آدھی سے زیادہ دوا تو کئی دنوں سے ختم ہے۔

"آپ دوپہر کے کھانے تک آجائیں گے؟"

"معلوم نہیں' کوشش کروں گا۔" وہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے تو آمنہ سوچ میں پڑ گئی۔ دوپہر کے لیے تو آٹا بھی نہیں ہے۔ آج صبح بھی جویریہ نے کنستر جھاڑ کر یہ چار روٹیوں کا آٹا نکالا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر پلٹی۔

"بڑی آپی! آپ نے ناشتہ نہیں کرنا کیا؟" وہ صرف اپنا ناشتہ دیکھ کر بولی۔

"نہیں' میں صرف چائے لوں گی اور جویریہ..." وہ جاتے جاتے رکی۔

"جی!" جویریہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"تم مجھے اب بڑی آپی نہ کہا کرو' صرف آپی کہہ لیا کرو۔ تمہاری چھوٹی آپی تو چلی گئی' اب کون سی..." آگے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹک گیا تھا۔ جویریہ بھی ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

زینب کے جانے کے بعد تو اس چھوٹے سے گھر میں اور بھی سناٹے گونجنے لگے تھے۔ خاموشی اور وحشت بھی چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا اعلان کرنے لگی تھی۔ اماں جی کی حالت بھی اسے کچھ اتنی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دو دن سے تو ان کی دوا ویسے ہی ختم ہو چکی تھی' جو ایک آدھ گولی آمنہ انہیں زبردستی دینے کی کوشش بھی کرتی تو وہ لینے سے انکار کر دیتیں۔ ان کے تمام جسم اور خصوصاً چہرے پر سوجن دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اور وہ مستقل غنودگی میں رہنے لگی تھیں۔

آمنہ نے باہر آکر گرم چائے کے تین چار گھونٹ بے دلی سے پیے اور اٹھ کر اماں جی کے پاس آگئی۔ وہ جاگ رہی تھیں اور دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

"اماں جی! آپ جاگ رہی تھیں' میں تھوڑی دیر پہلے دیکھ کر گئی تو آپ سو رہی تھیں۔" وہ ان کو یوں بیٹھے ہوئے دیکھ کر لہجے کو بشاش بنا کر بولی۔

"کیا جاگنا کیا سونا' سب ایک برابر لگتا ہے۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولیں۔

"اماں جی! آپ ڈاکٹر کو دکھا لیں' مجھے آپ کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی۔" وہ ہولے ہولے ان کے ہاتھ اور بازو دباتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر کی فیس ہے تمہارے پاس۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں تو آمنہ نظریں چرا گئی۔

"ہو جائے گی' ابھی مجھے دو چار دن میں تنخواہ مل جائے گی۔"

"جب تنخواہ مل جائے تو سب سے پہلے گھر میں آٹا' دالیں اور ضرورت کا دوسرا سامان ڈالنے کے بارے میں سوچنا۔ مجھے اب میرے حال پر چھوڑ دو۔ دوائیں اب مجھ پر کچھ اثر نہیں کریں گی۔"

"اماں جی! ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔" وہ شکوہ بھرے انداز میں بولی۔

"نہیں میری بچی! یہ مایوسی نہیں' اپنے حال پر مکمل طور پر قانع ہو جانے کی کیفیت ہے۔"

"کیا مطلب؟" آمنہ کو ان کی بات سے خوف سا محسوس ہوا۔

"زینب..." وہ بولیں۔ "زینب کو گئے آج کتنے دن ہو گئے۔" وہ اچانک بولیں۔

"اماں جی..." اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "اماں جی! جانے والوں کو اتنا نہیں سوچا کرتے۔ آپ کی طبیعت..." اس کا دل تو پہلے ہی بھر بھر آرہا تھا۔

"تم بہت بہادر ہو اپنے بابا صاب کی طرح۔ زندگی کا مقابلہ ڈٹ کر کیا جاتا ہے' ہتھیار ڈال کر نہیں۔" وہ اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"اماں جی!" وہ پریشان ہو گئی۔ آنسو پونچھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ "میں اتنی بہادر نہیں ہوں اور اگر پہلے تھی بھی تو اب نہیں رہی۔ بہت ڈرنے لگی ہوں میں۔"

"تم جویریہ کا بہت خیال رکھنا اور اپنا بھی۔ اُدھر زینب تو اکیلی ہے نا' وہ تم دونوں سے زیادہ ڈرپوک تھی۔ اندھیرے میں بلی کو دیکھ کر چیخنے لگتی تھی۔" وہ جیسے اپنی آنکھوں کے سامنے ڈری سہمی زینب کو دیکھ رہی تھیں۔

"اماں جی..." آمنہ کچھ تیز آواز میں بولی۔ "خدا کے لیے اماں جی! ہمیں اور نہیں ماریں ایسی باتیں کر کے ہم تو پہلے ہی..."

"تمہارے بابا صاب چلے گئے؟"

"جی!"

"بتا کر گئے کہاں گئے ہیں؟"

"اسی سرکاری دفتر۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے آرڈر تبدیل کروانے۔ بہت پریشان تھے۔"

"انہوں نے تم سے اپنی پریشانی منہ سے کہی؟"

"جی۔" وہ کچھ نہیں سمجھی۔

عبدالمتین بڑا بیٹا ہونے کے علاوہ لائق ذہین اور فرمانبردار بھی تھا اس لیے ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ پھر اسے بھی ان کی بھرپور توجہ اور محبت کی ایسی چاٹ لگی کہ وہ ان کی نظروں میں خوب اچھا بننے کے لیے بہت لگن سے پڑھتا۔ اول آتا اور — کوئی بچہ نہ تو لائق تھا نہ عبدالمتین کی طرح ہشیار۔ وہ ان کی ساری شاباشی وصول کر لیتا۔ ننھے عبدالمعین کے حصے میں کچھ بھی نہ آتا۔ کچھ وہ شرارتی بھی بہت تھا۔

بابا صاب کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے ننھے ذہن نے دوسرے طریقے سوچ لیے۔ صوفی صاب گھر میں داخل ہوتے تو وہ ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ وہ برے دھکیلتے۔ وہ کندھے سے جھول جاتا۔ وہ پھر جھٹکتے تو وہ ان کا عمامہ کھول دیتا۔ وہ اسے جھڑکتے تو وہ عمامہ یا ان کی تسبیح یا گھڑی اٹھا کر بھاگ لیتا۔

صوفی صاب جو عبدالمتین کے ساتھ محبت بھری گفتگو میں مگن ہوتے عبدالمعین کی شرارتوں پر خفا ہو کر اسے ڈانٹنے ڈپٹنے اور مارنے پیٹنے میں لگ جاتے۔ یوں وہ ان کی توجہ حاصل کر ہی لیتا۔" رابعہ بی بی بہت مگن سے انداز میں بول رہی تھیں۔ وہ ماضی کے اس کھلے وسیع آنگن میں اپنے بچوں کے درمیان کھوئی ہوئی تھیں۔

"انہیں اس کی معصوم شرارتیں بھی شیطانیاں اور بے ادبیاں نظر آتیں۔ وہ یہی زبردستی کی توجہ ڈھونڈنے کے لیے سبق سے بھی بھاگنے لگا۔ اسے باپ کا پیار تو نہ ملا ان کے دل میں اس نے ایک مستقل چڑ کی جگہ حاصل کر لی۔" وہ سانس لینے کو رکیں۔

"عبدالمتین لائق اور ذہین تھا مگر جب اس نے شہر جا کر وہاں کی رنگینی اور دلکشی دیکھی تو محض بابا صاب کی محبت پانے کے لیے خوب محنت کرنے کا شوق اسے فضول سا لگنے لگا۔ وہ ان رنگینیوں کی طرف کھنچنے لگا۔ اسے ماں باپ سے چھوٹے چھوٹے جھوٹ بولنے کا فن آنے لگا۔ میں نے صوفی صاب کو خبردار کیا مگر ان کا بھی عجیب جو فیصلہ جو رائے ایک بار کسی کے بارے میں طے کر لیتے تو پھر کسی کے بھی کہنے پر اس میں ردوبدل نہیں کرتے عبدالمتین کے دل میں والدین اور گھر کی محبت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ وہ ان سے فرار اور اونچے درجے کی کامیابی حاصل کرنے کے طریقے سوچنے لگا۔ عبدالمتین کو واپس لایا جا سکتا تھا۔ اگر صوفی صاب اس کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ پہچان کر اسے واپسی کا احساس دلانے کی کوشش کرتے اپنے رویے میں تھوڑی سی لچک پیدا کر لیتے۔

اسی لچک اسی وسعت کی ضرورت عبدالمعین کے معاملے میں بھی تھی۔ وہ ضدی اور سرکش تھا مگر بے تمیز اور نافرمان نہیں تھا۔ شروع شروع میں صرف باپ کی توجہ پانے کے لیے ان کی مرضی کے خلاف کام کرتا رہا پھر انہیں چڑانے کے لیے کہ شاید بابا صاب سمجھ جائیں مگر جہاں بھی صوفی صاب نے پہلی رائے کو حتمی قرار دے دیا۔ جو وقت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتے وقت انہیں خود بدل دیتا ہے۔

زینب کی فطرت بھی بڑی حد تک عبدالمتین کی طرح تھی۔ اسے تو محبت توجہ پیار اور من پسند چیزیں سب ایک ساتھ چاہیے تھیں اور اس میں وہ بھی کسی سمجھوتے یا انتظار کے لیے تیار نہ تھی۔ برملا ہر حد تک جانے کا اظہار کر دیتی کہ شاید اس کی آرزوؤں کی شنوائی ہو سکے۔ یہ سب رویے صوفی صاب کے انتہائی رویے کی ضد میں پیدا ہوئے۔

عبدالمتین کو اس کی من پسند دنیا مل گئی پکا چوند کرتی ہوئی تو اس نے صوفی صاب کی سنگلاخ صحبت سے کنارہ کر لینے میں ہی عافیت جانی۔ عبدالمعین تو تھا ہی شروع سے ایسا ان کی ضد میں مرضی کے راستے پر چل پڑا۔ صوفی صاب کی پیشن گوئیاں سچ ثابت کرنے کے لیے اور زینب بے صبری اور بے وقوفی کی وجہ سے اپنی خواہشوں کے

اندھے جال میں پھنس کر رہ گئی۔ آخر تک وہ بہت کچھ پا لینے کی امید لگائے بیٹھی تھی اس لیے واپسی کا رستہ نہ مل سکا نہ اس نے پلٹنے کی کوشش کی ورنہ تو بڑے بڑے گناہ کرنے والے بھی توبہ کر کے عذاب کی دلدل سے نکل جاتے ہیں۔ ایک میرے بچے ہیں.....؟" وہ پھپک پھپک کر رونے لگیں۔

"تمہارے بابا صاب کا ایک ہی اصول تربیت تھا الف سیدھا۔ وہ انسانوں کو بطور انسان قبول نہیں کرتے تھے۔ انہیں تو بالکل سیدھی راہ پر گامزن نیک کامیاب فرمانبردار یعنی فرشتے.... فرشتے درکار تھے۔ انہوں نے کسی کے لیے بھی لچک نہیں رکھی۔ کسی کو بھی پلٹنے کا معافی مانگ لینے کا عفوودرگزر کا موقع نہیں دیا۔ پہلا اور آخری فیصلہ سنا ڈالا۔ خود بھی ٹوٹ گئے میرے بچوں کو بھی تباہ کر دیا۔

"غضب ہے میرے پیارے دین میں اتنی سختی کب ہے اتنا جبر۔ اگر اسلام اسی جبر اسی تلوار کے زور پر پھیلا ہوتا تو آج مسلمان مٹھی بھر تعداد میں بھی نہ ہوتے۔ میرے پیارے اللہ نے تو یہ میٹھا سچا مہربان دین اتارا ہی دلوں میں گھر کرنے کے لیے ہے۔ اس کا لب لباب سنا دو یہ خود بخود دلوں میں اترتا چلا جاتا ہے جیسے خشک سوکھے پودوں کو پانی دو تو خود بخود جڑوں کی رگ رگ میں اتر کر پودوں کو دیکھتے ہی دیکھتے ہرا بھرا کر دیتا ہے۔

ایسا ہی ہے میرا اسلام ایسا ہی ہے میرا دین۔ یہ تو خود بخود دلوں میں اتر جانے والا ہے۔ صوفی صاب کو اللہ نے اتنا علم دیا مگر انہوں نے سارا علم نماز روزے قرآن مسجد مکتب کے احکام پر سختی سے عمل کرنے تک محدود کر دیا۔ ان چار پانچ حدوں سے باہر تو کسی کو سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دی۔ دیکھو کیسے میرا آشیانہ اجڑ گیا ہرا بھرا گھر نسل خالی ہو گیا۔ میرے شیر جوان بیٹے میری شہزادیوں سی آن بان والی زینب..... میں ان تینوں کو نہ دیکھوں اور جیتی رہوں سانس لیتی رہوں کیسے..... ہائے میری بچی.....؟" وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔

"ارے کہاں گئے سب لوگ۔ آمنہ بیٹی رابعہ بہن.....؟" باہر سے کلثوم بی بی کی بشاش آواز اندر آئی تھی۔ اماں جی نے جلدی سے اپنا چہرہ دوپٹے سے رگڑا۔ آمنہ بھی پلنگ سے نیچے اتر آئی۔

"السلام علیکم۔ معافی چاہتی ہوں بہن جی آپ کو بے آرام کیا۔" وہ اپنی چادر کی بکل کو ذرا ڈھیلا کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولیں۔

"وعلیکم السلام۔ ایسی کوئی بات نہیں آپ کا اپنا گھر ہے۔" اماں جی خود کو سنبھال چکی تھیں۔ متورم چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولیں۔ آمنہ کلثوم بی بی کو سلام کر کے باہر چلی گئی۔

"آمنہ! خالہ کے لیے چائے لے آؤ۔"

"نہ بہن! اس وقت چائے نہیں میں تو منہ میٹھا کرنے آئی ہوں۔ ایسی خوش خبری لائی ہوں کہ صوفی صاحب سنیں گے تو کھل اٹھیں گے بس مان لیں گے۔" وہ خوب اونچا اونچا بول رہی تھی۔ جویریہ بھی کمرے سے باہر نکل کر سننے لگی۔

"اتنا اعلا رشتہ اپنی آمنہ بیٹی کے لیے۔ لڑکا سمجھو شہزادہ آسمان سے اترا ہے سیدھا۔ آپ کی نیک طینت بیٹی کے لیے۔ صورت سیرت سب میں یکتا۔ شہر کے پوش ترین علاقے میں گھر ہے۔ اپنا کاروبار گھر گاڑی سب کچھ۔ سمجھو آپ کی تو لاٹری نکل آئی وہ بھی گھر بیٹھے۔ صوفی صاحب کہاں ہیں انہوں نے آج شام کو ہی آنا ہے۔ لڑکا بھی ساتھ آئے گا صوفی صاحب خوب تسلی کر لیں۔ وہ ہیں کہاں؟" وہ تان اسٹاپ بولتے ہوئے رکیں۔

آمنہ تو اپنی جگہ سن سی کھڑی رہ گئی تھی۔ جویریہ کی بھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اس خبر پر وہ کس کیفیت کا اظہار کرے۔ اس گھر سے تو مدتوں سے خوشیوں نے منہ موڑ رکھا تھا۔ وہ تو خوشیوں کا استقبال کرنا بھی بھول چکے تھے۔ دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"یام.... مام اے ویری گڈ نیوز آئی ایم سو ہیپی۔" نین تارا اپنے کمرے سے جوشیلی آواز میں کہتے ہوئے باہر آئی تھی۔ اس کا چہرہ کسی اچانک مل جانے والے خوشی کے احساس سے تمتما رہا تھا اور سانسیں اچھی خاصی بے

ترتیب ہو رہی تھیں اور آج کل وہ جس بے ہنگم وجود کے ساتھ پھر رہی تھی۔ زیور گل کو تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی سخت کوفت ہوتی تھی یا تو اس کا پارہ ہائی ہو جاتا یا بیٹھے بیٹھے بی پی لو ہو جاتا اور ابھی اس کوفت زدہ حالت میں مزید ڈیڑھ دو ماہ گزارنے تھے۔

"اب کیا ہو گیا؟" زیور گل کے لہجے میں زمانے بھر کی بیزاری در آئی۔ "تمہاری گڈ نیوز ملنے میں تو ابھی ڈیڑھ دو ماہ کا طویل عرصہ ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

زیور گل رات کے کھانے کے لیے ملازم کی نگرانی میں ڈائننگ ٹیبل سیٹ کروا رہی تھی۔ آنا تو کسی خاص مہمان نے نہیں تھا مگر کوئی آ بھی سکتا تھا "گل کدے" کے دروازے 'زیور گل کے شناساؤں کے لیے دن بھر تو کیا رات بھر بھی کھلے رہتے تھے۔

"شاہ جی آ رہے ہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"وہ تو میں کئی ماہ سے سن رہی ہوں' اس میں گڈ نیوز والی کون سی انوکھی بات ہے۔" وہ چمچ' کانٹے پلیٹوں کے دائیں بائیں سیٹ کرتے ہوئے اسی اکتاہٹ بھرے انداز میں بولی۔

"او نہوں ماما وہ لاہور آ رہے ہیں۔" اس نے سامنے لگے کلاک کو دیکھا۔ "ابھی پندرہ بیس منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ آپ کھانا ان کے آتے ہی لگوا دیجئے گا۔ میں ذرا تیار ہو جاؤں۔" وہ اپنے سفید کاٹن کے شکنوں بھرے لباس کو دیکھتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو وہ گھڑی آن پہنچی۔" زیور گل کا چمچے رکھتا ہاتھ ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ "تم جاہے' جتنی مرضی نک سک سے تیار ہو جاؤ' شاہ جی کو بھا جاؤ تو میں سمجھوں گی دنیا میں ابھی بھی معجزے رونما ہوتے ہیں۔" وہ لاتعلقی سے کہتے ہوئے اب نیپکن سیٹ کر رہی تھی "اور تمہارے شاہ جی نے کھانا تو کیا پانی تک نہیں پینا' اس لیے ان کا انتظار فضول ہے اور مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں کھانا لگوا رہی ہوں' تم کو آنا ہو تو جلدی سے آ جاؤ۔" وہ اب پلٹ کر ملازم کو آواز دے رہی تھی۔

"ہونہہ ماما کو تو خدا جانے کیا بیر ہو گیا ہے میرے ساتھ' ہر وقت اکھڑی اکھڑی رہتی ہیں جیسے میں کوئی دنیا کا شرمناک ترین فعل انجام دینے جا رہی ہوں' جیسے خود تو ماں بنی نہیں تھیں بلکہ میں آسمان سے اتر کر ان کی گود میں آ سمائی تھی۔" نین تارا بڑبڑاتے ہوئے ماں کے اجنبی رویے پر کلستی ــــ اپنے کمرے میں تیار ہونے چل دی۔

آج کل تو یوں بھی اس کے سارے خوبصورت ڈریسز بے کار ہو گئے تھے۔ اسے ڈھیلے ڈھالے لبادے سلوانے پڑے تھے۔ لباس کی خوبصورتی تو جسم کی خوبصورتی سے نمایاں ہوتی ہے اور اس کا جسم آج کل اپنی چال بھی بھولا ہوا تھا۔ کوئی لباس اس پر کیا سجتا تھا۔

وہ باہر آئی تو اس نے گولڈن اور ڈارک براؤن کلر کا ٹائٹ سا ملبوس زیب تن کر رکھا تھا' گولڈن اور براؤن لائٹ میک اپ اور لائٹ میچنگ جیولری میں اس کے چہرے کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ممتا کے نور نے اس کے چہرے کو تقدس سا بخش دیا تھا' وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

زیور گل نے کن انکھیوں سے نظر بھر کر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ نین تارا ڈائننگ ٹیبل کی چیئر پر بیٹھ گئی اور گلاس میں پانی ڈال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ سارا جوش اب گھبراہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

"اگر ماما کے خدشے درست ثابت ہوئے تو..." پہلے گھونٹ کے حلق سے نیچے جاتے ہی اسے خیال آیا۔ شاہ جی کے غصے کی تو اسے خبر تھی۔ کیسا خوف ناک غصہ آتا تھا انہیں' مگر انہوں نے یہ حق خود دیا تھا مجھے پورے ہوش و حواس کے ساتھ پھر وہ کیوں غصہ کریں گے۔"

"نادان لڑکی! بادشاہ صفت لوگ مہربان ہوں تو ایسی مہربانیاں ان کمزور لمحوں کی گرفت میں آ کر ہی جایا کرتے ہیں۔ یہ تو..." اسے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی تھی۔

اسی وقت ملازم گرم گرم بھاپ اڑاتے اشتہا انگیز کھانوں کی ڈش ٹرے میں رکھے چلا آیا۔ نین تارا کو غصہ تو

بہت آیا۔ ماما دس منٹ صبر نہیں کر سکتی تھیں۔ زیور گل صوفے سے اٹھ کر اپنی نشست پر آ بیٹھی اور ملازم کو کھانا ٹیبل پر رکھتے ہوئے کچھ بے صبری سے دیکھنے لگی۔

"میرے خیال سے شاہ جی آ گئے۔" پورٹیکو میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ نین تارا بے چینی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی پھر پلٹ کر بیٹھ گئی۔ زیور گل بیٹی کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے ملازم کو گرم چپاتیاں اور چاول لانے کی ہدایت کرتے ہوئے سلاد ٹونگنے لگی۔ نین تارا کے دھڑکتے دل کی گواہی بالکل درست تھی۔

سیاہ ڈنر سوٹ میں اپنے دراز قد اور شاندار پرسنالٹی کے ساتھ سید سلطان بخت ڈائننگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔ باہر کی صحت افزا فضاؤں نے ان کو جیسے اور بھی پرکشش بنا دیا تھا۔ بھری بھری سی ذرا سی باہر نکلتی توند جو یہاں سے جانے سے پہلے محسوس ہوتی تھی۔ اب بالکل غائب تھی۔

شانے اسی طرح مضبوط اور تنے ہوئے تھے۔ کنپٹیوں پر ہلکے ہلکے سفید بال روشنی میں آتے ہی نمایاں ہو کر انہیں کچھ اور گریس فل بنا رہے تھے۔ آنکھوں میں چیتے کی سی چمک تھی جو ان کے چہرے کا خاصا تھی اور خلاف معمول داخل ہوتے سے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی جو نین تارا کو سامنے دیکھ کر مزید کھل گئی تھی۔

"آ... آداب شاہ جی! اتنی دیر لگا دی۔ میں تو کافی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔" نین تارا کو ان سے عجیب سی شرم اور گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سارا اعتماد رخصت ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دل تو خیر بے ہنگم طریقے سے دھڑک ہی رہا تھا۔ اسے اپنی پیشانی سے بھی پسینہ پھوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں' دیر تو نہیں ہوئی۔ میں تو..." وہ خوش دلی سے کہتے ہوئے آگے بڑھے اور فقرہ مکمل کرتے کرتے رک گئے۔ زیور گل فرائیڈ فش اپنی پلیٹ میں نکالتی ترچھی نظروں سے سلطان بخت کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ دل تو اس کا بھی پہلے ہی انداز میں دھڑک رہا تھا مگر وہ خود کو بے نیاز پوز کر رہی تھی۔

نین تارا شاہ جی کے استقبال کو کھڑی ہو چکی تھی۔ پورے وجود اور قد کے ساتھ اس کا قد تو اتنا ہی تھا مگر وجود... سلطان بخت کی نظریں اس پر پھسل کر رک گئیں۔ انہیں لگا وہ جیسے بھڑکتے شعلوں کی زد میں آ گئے ہیں۔ ان کے پورے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ سر کا درجہ حرارت ایک دم سے اوپر چڑھتا محسوس ہوا تھا۔ دل تو پہلے بھی اپنی دلربا سے ملنے کی خوشی میں خوب ترنگ میں دھڑک رہا تھا مگر اب اس کے دھڑکنے کی رفتار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

"یہ... یہ..." وہ انگلی اٹھا کر فقط اتنا ہی کہہ سکے' اشارہ واضح طور پر نین تارا کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ تو فریش' اسمارٹ' پرکشش نین تارا سے ملنے آئے تھے بلکہ اپنے سفر کی تھکان اس کے دلربا بدن کی خوبصورتی میں گم کرنے آئے تھے مگر یہاں تو انہیں سب کچھ ہی بدلا بدلا بلکہ بہت کچھ بدل جانے کا اعلان کرتا محسوس ہوا۔

"یہ ہی تو وہ خوش خبری تھی شاہ جی! جو میں آپ کو... فون پر بتانا... چاہ رہی تھی... س... سرپرائز..." وہ کچھ ڈری ڈری کچھ جوشیلی کانپتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"تو یہ تھا تمہارا سرپرائز۔" وہ کسی ٹوٹتی چٹان کی طرح تڑخے تھے۔

"آپ... آپ آئیں تو بیٹھیں نا۔ میں..." نین تارا کی گھبراہٹ ان کے انداز دیکھ کر بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں واضح طور پر کانپتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"تو نکلیں نا تم بھی وہی زیور گل طوائف کی بیٹی۔ دے دیا ثبوت اپنی کلاس' اپنی ذہنیت کا مگر تمہارے اس ڈرامے کے فریب میں میں نہیں آنے والا۔ نین تارا! تم خود کو دھوکا دے سکتی ہو مگر مجھے نہیں۔ آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" وہ پھنکارتے ہوئے کہہ کر پلٹے اور قدموں کی دھمک پیدا کرتے باہر جانے لگے۔

نین تارا کو پہلے تو ان کا لب و لہجہ پھر ان کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا اور جب بات سمجھ میں آئی تو اس کے گویا ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے اڑی اڑی رنگت سے اطمینان سے کچر کچر سلاد کھاتی ماں کو دیکھا جو کندھے

اچکا کر جیسے کہہ رہی تھی۔ "دیکھا میں نہ کہتی تھی۔" نین تارا ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے ہلی اور تقریباً "دوڑتے ہوئے باہر نکلی۔

"شاہ جی... شاہ جی... آپ اس طرح نہیں جاسکتے۔ آپ اس طرح کیسے جاسکتے ہیں۔ میں نے اتنے ماہ مر مر کر آپ کا انتظار کیا' ایک ایک صبر آزما لمحے کو اپنے اوپر گزرتے محسوس کیا اور آپ..." وہ ان کے خوشبو لٹاتے وجود کے پاس آکر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ وہ اس کے سامنے کسی آہنی چٹان کی طرح کھڑے تھے۔

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ میری نظروں نے تمہارا غلط انتخاب کیا تھا۔ میں تمہیں تمہاری کلاس سے الگ کچھ منفرد سمجھا تھا مگر نہیں' تم کیسے اپنی کلاس سے الگ ہو سکتی ہو۔ ایک رات کا لاکھوں کمانے والی اتنے مہینوں کا خسارہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں..." وہ چبا چبا کر نظروں میں نفرت لیے بول رہے تھے۔

"شاہ جی! آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں یہ خدانخواستہ کوئی غلط یا ناجائز نہیں۔ یہ آپ کا اپنا جائز بچہ ہے۔" وہ پوری طاقت مجتمع کر کے بولی۔

"شٹ اپ۔" ان کا مضبوط ہاتھ فضا میں اٹھا مگر نین تارا کے چہرے کے پاس آکر رک گیا۔

"آئندہ یہ بات تمہاری زبان پر آئی تو تمہاری زبان میں گدی سے کھنچوا دوں گا' سنا تم نے۔" وہ خونخوار شیر کی طرح غرائے تھے۔

"کیوں' سچ بات ہے اس لیے بھول گئے۔ آپ شاہ جی! سب کچھ بھول گئے۔ میرا پیار' میری محبت میں..." وہ ان کی کوٹ کی آستین تھام کر بے اختیار رونے لگی۔

"بھولا ہوتا تو ادھر آتا ہی کیوں۔ میں تو اسی پیار' اسی محبت کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا تم نے محض چند دنوں کے انتظار کے بعد اپنے بھوکے جسم پر "فار سیل" کا اسٹیکر چپکا کر خود کو ہی نہیں' مجھے بھی اپنی نظروں میں کتنا گرا دیا ہے۔"

"شاہ جی! یہ جھوٹ ہے' بہتان ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔" وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی۔

"میں غلط سوچ رہا ہوں اور تم غلط ترین کر گزریں پھر بڑے فخر سے اسے میرے "کھاتے" میں شمار بھی کر ڈالا۔ میں داد دیتا ہوں تمہاری جرأت کی۔" ان کی نگاہوں سے اجنبیت اور غیریت کے شرارے نکل رہے تھے۔

"شاہ جی..." وہ چیخی۔ "آپ مجھ پر اتنا گندہ الزام مت لگائیں' یہ سب کچھ میں نے آپ سے پوچھ کر آپ کی اجازت سے..."

"نین تارا!" وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ گیٹ پر کھڑا چوکیدار اپنی گن سیدھی کر کے ادھر دیکھنے لگا۔ "اپنے جسم کی دکان بھرے بازار میں سجانے کی میں نے تمہیں اجازت کب دی تھی۔"

"شاہ جی! یہ "تحفہ" بازار کا نہیں' آپ کی محبت کا ہے۔ بھول رہے ہیں یا میرے ساتھ بھولپن کا ڈراما کر رہے ہیں۔ بھول رہے ہیں تو یاد کروائے دیتی ہوں۔ جب آپ جانے سے پہلے مجھے اپنے ساتھ وادی سوات لے کر گئے تھے' اپنی بہن کے گھر سے بھاگ جانے کا غم غلط کرنے کے لیے' اس وقت آپ نے اپنی خوشی سے میری یہ "خوشی" پوری کی تھی۔"

"بکواس بند کرو اپنی' دو ٹکے کی طوائف زادی ہو تم..." وہ بہن کے نام پر تڑپ اٹھے تھے۔ "بہت سن رہا تھا تمہاری پارسائی کے قصے اس بازاری گوتیے کے ساتھ' دن رات پیار کی پینگیں بڑھا رہی تھیں۔ مجھے وہاں بیٹھے تمہارے سارے کارناموں کی خبریں مل رہی تھیں۔ بہتر ہے مزید پیسہ ہتھیانے کے چکر میں تم مجھ پر یہ گھٹیا تہمت تھوپنے کے بجائے خود ذہن پر زور ڈالو اور اطمینان سے بیٹھ کر سوچو' تمہارے اس غلیظ "تحفے" کا صحیح حقدار کون ہے۔ یاد آجائے تو جا کر اس کے گلے پڑنا' نہ یاد آئے تو کسی بے وقوف دولت مند آشنا کو بلیک میل کر لینا اور نہ کوئی ایسا بے وقوف ہتھے چڑھے تو اس کے باپ کا کوئی خوبصورت سا فرضی نام سوچ کر سارے جگ میں اس کے

مرحوم ہو جانے کا ڈھنڈورا پیٹ ڈالنا' یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ انڈراسٹینڈ اور آئندہ مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا' آج سے میرے اور تمہارے راستے جدا جدا' گڈ بائے۔" ان کے لیے تو یہ محبت شناسائی گویا ایک کمزور دھاگا تھا جسے انہوں نے ایک جھٹکے سے توڑا اور جھٹک کر آگے چل دیے۔

"شاہ جی... شاہ جی... آپ بھلے مجھ سے اپنے راستے جدا کر لیں مگر اس بچے کو آپ کو اپنانا پڑے گا۔ یہ آپ کا بچہ ہے۔ مجھ سے نہیں' اپنے دل سے پوچھیے' آپ کا دل سب جانتا ہے۔ یوں جھوٹ بول کر آپ اپنا دامن چھڑا کر نہیں جاسکتے۔ یہ آپ کا بچہ ہے' آپ کا جائز... ہمارے پیار کی نشانی۔ شاہ جی! خدا کے لیے مجھے یوں ٹھوکر مار کر نہ جائیں۔ میں برباد ہو جاؤں گی۔ زمانے بھر کی نظروں میں مجھے یوں تماشا بنا کر نہ جائیں شاہ جی..." وہ ان کے کوٹ کا کونا پکڑے بے قابو ہو کر روئے جا رہی تھی۔

"بند کرو یہ ڈرامے بازی' اپنی ماں سے اچھی ایکٹر ہو۔ اس "دھندے" سے فارغ ہو جاؤ تو بڑھاپے کے لیے ایکٹنگ سے مزید چار پیسے بنا لینا مگر آئندہ مجھ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا' سنا تم نے۔" وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھے۔ گاڑی میں بیٹھے اور زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھی دھواں دھار روتی نین تارا کو دیکھے بغیر آندھی طوفان کی طرح گاڑی ریورس کر کے کھلے گیٹ سے باہر نکال لے گئے۔

"کہا تھا نا میں نے نین تارا! یہ حماقت مت کرو۔ یہ امیر زادے وقتی دل لگی کے لیے ہمارے پاس آتے ہیں۔ اللہ کے سامنے یا اپنے مردہ ضمیر کے سامنے سرخرو ہونے کو نکاح کے دو بول بھی پڑھوا لیتے ہیں مگر بچہ... نہیں' کبھی ہم سے نہیں چاہتے۔

☼ ☼ ☼

باقی کے تمام معاملات جیسے "نا" "فانا" طے ہوتے چلے گئے۔

سرمد عثمانی چھبیس ستائیس سال کا خوش شکل' خوش قامت' اعلا تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر مستحکم نوجوان تھا جسے پہلی نظر دیکھتے ہی صوفی صاحب کو جیسے ساری عمر کی کلفتیں دور ہوتی محسوس ہوئیں۔ بہت سلجھا ہوا پڑھا لکھا' شریف نوجوان جسے انہوں نے پہلی نظر دیکھتے ہی اوکے کر دیا تھا۔

"بہت نیک' شریف اور مہذب ہے میرا بیٹا۔ باہر کے ملکوں میں تعلیم حاصل کی ہے اور ابھی بھی زیادہ تر بزنس باہر ہی ہے مگر اس کی شرط یہی تھی کہ لڑکی کسی مذہبی گھرانے کی نیک سیرت' شریف والدین کی اولاد ہو۔ مجھے دولت پیسہ کچھ نہیں چاہیے۔ بس لڑکی کا مذہبی ہونا شرط ہے۔"

سرمد عثمانی کی والدہ سلجھی ہوئی' پڑھی لکھی' چہرے مہرے سے ہی خاندانی عورت لگ رہی تھیں۔ آسمانی رنگ کی قیمتی ساڑھی میں ملبوس لائٹ جیولری کے ساتھ ان کے چہرے پر تکبر یا گھمنڈ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"تین سال یہ فرانس میں رہا اور دو سال لندن میں۔ وہاں کی عورت آزادی کے نام پر جو بے حیائی کے کارنامے کرتی پھر رہی ہے' بس میرا بچہ اسی سے بیزار ہو گیا کہ میں شادی کروں گا تو کسی مذہبی گھرانے میں۔ میری بیٹی دوبئی میں ہوتی ہے۔ آج کل خیر سے اس کے گھر خوشی کی خبر آنے کو ہے' ورنہ وہ ہمارے ساتھ آتی۔ دوسرا بیٹا میرا انگلینڈ میں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ سرمد کے ادھر بھی دو کارخانے ہیں۔ ایک گلاس کا اور ایک لیدر گڈز کا۔ اس کے علاوہ دوبئی' مڈل ایسٹ وغیرہ سے جیولری لا کر ادھر بھی شوروم چلا رہا ہے۔ اللہ کا بڑا فضل ہے' بس گھر میں بیٹی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تو شادی کے لیے مان ہی نہیں رہا تھا' خدا خدا کر کے اس نے ہامی بھری۔ میں تو چاہتی ہوں کل کا دن نہ طلوع ہو اور میں اپنے دل کا یہ مدتوں کا ارمان خوب دھوم دھام سے پورا کروں۔"

وہ بہت رسان سے باتیں کر رہی تھیں' جیسے مدتوں سے ان کا اس ڈربہ نما گھر میں آنا جانا رہا ہو۔ انہیں اس کی تنگی سے بھی کوئی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی' نہ ان کے پہلو میں سر جھکائے اپنے چمکتے سیاہ بوٹوں پر نظریں جمائے سرمد عثمانی کو۔

"بس اس کی ایک ہی شرط ہے کہ لڑکی کو ایک نظر خود دیکھے گا' اب ماشاءاللہ کلثوم بہن نے صوفی صاحب کی اتنی تعریف کی کہ مجھے تو یہ شرط پیش کرتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ پر کیا کریں' آج کل لڑکے ان باتوں کو نہیں

سمجھتے۔ امید ہے، بہن جی! آپ محسوس نہیں کریں گی۔" وہ بہت لجاجت سے اماں جی سے کہہ رہی تھیں۔ اماں جی نے نظریں اٹھا کر صوفی صاحب کو دیکھا۔

"جی شرع کا حکم ہے' اس میں کیا عار ہے' جیسی آپ کی خوشی۔" اماں جی سمیت جویریہ اور آمنہ کو لگا دونوں بے ہوش ہو جائیں گی۔ کیا زینب کے مرنے کے بعد واقعی بابا صاب میں اتنی لچک آگئی ہے۔

کلثوم خالہ نے آمنہ کو مشروب کی ٹرے لانے کا اشارہ کیا تو وہ خوف زدہ نظروں سے بابا صاب کی طرف دیکھنے لگی' جنہوں نے خفیف سا مثبت انداز میں سر ہلا کر سر جھکا لیا تھا۔

وہ تینوں کو کانپتے ہاتھوں سے مشروب دے کر چند لمحوں کے لیے سرمد عثمانی کے سامنے پڑی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا نام ہے آپ کا۔" وہ پورے اعتماد سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"آمنہ!" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے آپ نے۔" اس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"گریجویشن... ایکسکیوز می۔" اس سے زیادہ نہ تو اس میں حوصلہ تھا' نہ ہمت۔ وہ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اندر چلی آئی۔

اگلے دن صوفی صاحب اور اماں جی خالہ کلثوم کے ساتھ ان کے گھر ہو آئیں۔ واپس آکر بھی خالہ کلثوم جیسے واپس نہیں آئی تھیں۔

"ماشاء اللہ اتنا بڑا گھر' یونہی پھرنے بھی لگو تو صبح سے دوپہر ہو جائے۔ اتنے بڑے بڑے وسیع گھاس کے ہرے بھرے لان' بادامی رنگ کا پتھر سارے گھر میں لگا کیا آنکھوں کو بھا رہا تھا۔ صوفی صاب! یہ ہوتا ہے صبر کا پھل۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو آزماتا ہے تو ان کی آزمائش کا یوں انعام بھی دیتا ہے۔" وہ تھوڑی تھوڑی وقفے کے دوران بولیں تو صوفی صاب سرخ تمتماتے چہرے کے ساتھ محض سر ہلا کر رہ گئے۔

دل تو ان کا بھی خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا' مگر اپنے جذبات پر قابو رکھنے کا انہیں ہنر آتا تھا۔

"اللہ نیک نصیب کرے میری بچی کے۔" اماں جی بھی خوش تھیں۔ انہیں تو اتنا اچھا رشتہ مل جانے کا ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کہتے ہیں۔ منگنی اس ہفتے کریں گے اور شادی ایک دو ماہ بعد۔ ان کی بیٹی خیر سے فارغ ہو جائے تو پھر..."

"منگنی پر خرچا کلثوم بہن!" اماں جی بولیں۔

"ایک پائی نہیں لگنے کی آپ کی۔ دو تین لوگ آئیں گے' صرف بچی کو انگوٹھی پہنانے۔"

"پھر بھی۔" اماں جی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

وہی ہوا' تین دن بعد جمعہ کی شام کو وہ صرف پانچ لوگ آئے تھے' خالہ کلثوم چھٹی پر تھیں۔ منگنی کا سامان بہت شاندار تھا تو جوڑا بہت عالی شان اور ڈائمنڈ کی انگوٹھی۔ اس چھوٹے سے کبوتر خانے میں یہ سب جیسے کوئی عجوبہ لگ رہا تھا۔

"میں ناپ تو لے کر گئی تھی پھر بھی انگوٹھی تمہیں ڈھیلی ہے۔ چلو دو چار دنوں میں آکر بدلوا جاؤں گی۔" اس کی ساس انگلی میں گھومتی انگوٹھی کا جائزہ لے کر بولیں۔ سرمد عثمانی نیچی نظروں سے وقفے وقفے سے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر نظریں جما لیتا۔

☼ ☼ ☼

"حیات ولا" میں رنگ و نور کا سماں بندھا تھا۔

آج فخر حیات کے غسل صحت کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ شہر بھر کی بزنس کمیونٹی کی کریم اور اعلا سرکاری افسران جمع تھے۔ وسیع لان میں سارا انتظام کیا گیا تھا۔ ہلکا ہلکا میوزک پس پردہ بج رہا تھا۔ اسٹیج پر آرکسٹرا کی میٹھی

دھن بج رہی تھی مگر کسی کا اس طرف دھیان نہیں تھا۔ سب لوگ مشروبات کے گلاس ہاتھ میں لیے خوش گپیوں میں مگن تھے۔

"ارے رعنا! ادھر آؤ ذرا۔" فخر حیات نے خوشگوار لہجے میں بے حد قیمتی آتشیں ساڑھی اور جیولری میں سجی سنوری پاس سے گزرتی رعنا کو پکارا تھا۔

"جی!" وہ پاس آکر بولیں۔ دھیان ابھی بھی اشارہ کر کے بلاتی بیگم صمد کی طرف تھا۔

"ان سے ملو' یہ ہیں سلمان سبزواری۔ تم اس دن پوچھ رہی تھیں نا۔" فخر حیات کسی کا تعارف کرا رہے تھے۔

• • • • • •

رعنا حیات' سلمان سبزواری کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں بڑے تکلف سے اکڑ کر بیٹھیں' کیا صرف صوفے کے کنارے پر ذرا سا ٹکیں اور ناقدانہ نظروں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگیں۔

کل رات فنکشن میں سلمان سبزواری سے مل کر انہیں جو خوشی حاصل ہوئی تھی اس کو وہ کسی بھی پیمانے سے ناپ نہیں سکتی تھیں مگر کوشش کے باوجود وہ رات سلیمان سبزواری سے اس مسئلے پر بات نہ کر سکیں' جس کی وجہ سے وہ جلد از جلد ان سے ملاقات کرنا چاہتی تھیں' لیکن انہیں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا اگر اس شخص سے بھی کوئی نشان پتا نہ مل سکا۔ وہ تو مر جائیں گی۔

مہمانوں کے ساتھ رات سلمان سبزواری بھی رخصت ہونے لگا تو وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکیں جیسے ہی فخر حیات اپنے کسی دوست کو الوداع کہنے گیٹ سے آگے تک گئے تو رعنا حیات نے سلمان سبزواری سے اس کے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کر ڈالا وہ لمحہ بھر کو کچھ حیران سا ہوا پھر مسکرا کر موسٹ ویلکم کہتے ہوئے اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ ان کو تھما دیا۔

رات بھر وہ سو نہیں سکی تھیں اور باقی کا دن بھی اسی اضطراب میں کٹا۔ انتظار کی گھڑیاں کتنی طویل اور قیامت خیز ہوتی ہیں انہیں زندگی میں پہلی بار اس کا احساس ہو رہا تھا۔ پانچ بجے سے پہلے ہی وہ گھر سے چل پڑی تھیں حالانکہ انہوں نے چھ بجے تک آنے کا کہا تھا۔ ملازم ابھی انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گیا تھا۔ چند لمحے بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر ٹہلنے لگیں۔

"معذرت چاہتا ہوں' مجھے آنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ بہرحال مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ عموماً میں آفس سے چھ اور سات کے درمیان لوٹتا ہوں۔ آج آپ نے آنے کا کہہ رکھا تھا سو میں جلدی گھر آگیا۔ آپ پلیز تشریف رکھیں نا' کیا لیں گی ہاٹ اور کولڈ؟"

سلمان سبزواری شاید ابھی ابھی آفس سے آیا تھا۔ اس نے براؤن کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور صرف کوٹ ہی اتارا تھا۔

"جی شکریہ' کچھ نہیں۔ مجھے آپ سے ایک اہم سلسلے میں بات کرنا تھی۔" وہ اپنی ہتھیلیاں مسلتے ہوئے بولیں۔

"موسٹ ویلکم پلیز آپ تشریف رکھیں نا۔ میرا خیال ہے کولڈ ڈرنکس منگوا لیتا ہوں۔"

دروازے کے قریب کھڑے ملازم کو اس نے اشارہ کیا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

"جی' اب بتایئے کیا مسئلہ ہے ویسے معاف کیجئے گا' اگر میں بھول نہیں رہا تو ہم کل رات سے پہلے تو کبھی نہیں ملے۔" اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ کیونکہ پہلی رسمی ملاقات کے بعد رعنا حیات کا یوں اگلے دن ان کے گھر چلے آنا کچھ الجھن آمیز تھا۔

"ہم کل رات کو ہی پہلی بار ملے تھے۔" رعنا حیات کہتے ہوئے گہری سانس لے کر بیٹھ گئیں۔

"آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولیں۔

"جی میں' اور میرا بیٹا' میری مسز کا تقریباً پانچ برس پہلے انتقال ہو گیا تھا۔"

"آپ کا بیٹا..." وہ پل بھر کو رکیں۔ "وہ کہاں ہے؟" وہ جھجک کر بولیں۔

"آفس میں ہوتا ہے، آنے ہی والا ہوگا۔ ایجوکیشن تو اس کی مکمل ہوگئی ہے۔ میں نے اسے الگ آفس سیٹ کر کے دیا ہے۔ اصل میں ہمیں ادھر آئے زیادہ عرصہ......" وہ تفصیل میں جانے لگا تھا جس سے رعنا کو کوئی غرض نہ تھی۔

"آپ کے بیٹے کا نام کیا ہے؟" انہوں نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

"شعیب سبزواری۔"

نام سن کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئیں، اُسی وقت ملازم کولڈ ڈرنکس لے کر آیا اور دونوں کے آگے سرو کر کے چلا گیا۔

"یہ آپ کا وہی بیٹا ہے جو آپ نے تقریباً بیس بائیس سال پہلے پنڈی کے ایک یتیم خانے سے ایڈاپٹ کیا تھا، یونس بیگ نامی شخص کے یتیم خانے سے؟"

وہ سلیمان سبزواری کی طرف دیکھ کر بولیں۔ جس کے چہرے کا رنگ لمحہ بھر کو متغیر ہوا۔

"نہیں، یہ میرا اپنا بیٹا ہے، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"دیکھیں سلیمان سبزواری صاحب میرے پاس سب معلومات اور ثبوت ہیں اور یونس بیگ کا ایڈریس بھی اگر یہ آپ کا اپنا بیٹا ہے تو آپ ایک بار میرے ساتھ چل کر یونس بیگ کے سامنے بات کر لیں تو......"

"بیگم صاحبہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ کیا آپ نے بچہ ایڈاپٹ نہیں کیا تھا؟" وہ کچھ درشتی سے بولیں۔

"میں مانتا ہوں اس بات کو۔" وہ جیسے تھک کر بولا۔ "میں نے یونس بیگ کے یتیم خانے سے بچہ ایڈاپٹ کیا تھا۔ بہت خوبصورت، بہت کیوٹ بچہ تھا تقریباً دو برس کا بہت معصوم صورت جسے دیکھتے ہی پیار آجائے اسی لیے تو میں نے اور میری مسز نے اسے بہت سے بچوں میں سے پسند کیا تھا۔ ہم اسے خوشی خوشی گھر لے آئے تھے شادی کے سات برس گزر جانے کے بعد بھی ہم دونوں اولاد سے محروم تھے۔ میری بیوی یا مجھ میں بھی کسی کی وجہ سے ہم نے بچہ ایڈاپٹ کیا تھا۔ ہم اسے سنی کہتے تھے، ہم نے اپنے دلوں میں چھپا سارا پیار تو اُسے دیا تھا۔ ڈھیروں کھلونے، کپڑے اور نہ جانے کیا کیا۔ اسے ہمارے پاس آئے چھ ماہ ہوئے تھے۔ پتا نہیں قدرت کو ہماری کون سی ادا بھائی کہ ساتویں مہینے میری بیوی کے یہاں امید پیدا ہوئی۔ بغیر کسی علاج اور دوا کے۔ ہم دونوں بے حد حیران، بے حد خوش تھے۔ یہ بچہ ہمارے لیے رحمت بن کر آیا تھا۔ مجھے تو وہ اور بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ میری بیوی کا رویہ اس سے بدلتا جا رہا تھا سرد اور بے مہر، وہ اس کے پاس آتا تو وہ جھنجلا جاتی۔ خوامخواہ اسے جھڑکنے لگتی۔ وہ کچھ فرمائش کرتا تو وہ ملازمہ پر برسنے لگتی، پہلے پہل تو میں سمجھتا رہا کہ ماں بننے کے مراحل سے گزرنے کی وجہ سے وہ چڑچڑی ہوتی جارہی ہے۔ مگر تین چار ماہ کے دوران میں نے ایک بار بھی اس کا رویہ سنی کے ساتھ نارمل نہیں دیکھا ویسے وہ بہت خوش رہتی تھی۔ اُس کی موجودگی ہر لمحہ اسے کھٹکنے لگی تھی۔ آخر ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے تو اس نے صاف کہہ دیا کہ میں اس بچے کو دوبارہ یتیم خانے میں چھوڑ آؤں، اب جب کہ ہمارا اپنا بچہ ہونے جارہا ہے۔ ہم اس کے حصے کی توجہ اور محبت کسی اور کو کیوں دیں۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمارے اتنے وسائل ہیں کہ ہم با آسانی دو بچے افورڈ کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے دل اتنے تنگ ہیں کہ تھوڑی سی محبت اس معصوم کو دیں گے تو اپنے بچے کے لیے کم پڑ جائے گی، پھر یہ بھی تو سوچو اس کے مبارک قدموں سے تو خدا نے ہم پر یہ رحم فرمایا ہے مگر عورت کئی معاملوں میں بہت ہٹ دھرم ہوتی ہے۔ اس پر میری باتوں کا رتی بھر اثر نہیں ہوا، اپنی اولاد کے معاملے میں وہ کسی دوسرے کی اولاد کو ایک بوند محبت بھی دینا نہیں چاہ رہی تھی، اسی کشمکش کے دوران ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوا شعیب سبزواری۔

اس کے بعد تو میری بیوی اور بھی غصیلی ہوگئی۔ سنی بے چارہ شعیب کے کاٹ کے پاس بھی چلا جاتا تو وہ اُسے پیٹ ڈالتی، ہر وقت اس پر چیخ چلاتی رہتی۔ آخر گیارھویں دن وہ مجھ سے مکمل طور پر ناراض ہوگئی کہ اُس وقت

تک دوبارہ بات نہ کرے گی جب تک اس منحوس کو یتیم خانے میں پھینک کر نہ آؤں۔ بچہ بھی بری طرح سے سہم کر رہ گیا تھا۔

میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ اس وقت ہم لوگ پنڈی سے لاہور شفٹ ہو چکے تھے۔ آخر بیوی کی ضد سے تنگ آکر میں اس بچے کو دوبارہ یتیم خانے میں داخل کر آیا۔ اس کے خرچے کا ذمہ میں نے اُٹھالیا بلکہ اس کو اسکول داخل کرانے اور پہلے تین سالوں کی فیس اور دوسرے اخراجات کے لیے بھاری رقم بھی دے کر آیا تھا مگر یہ تلافی......"

"کون سے یتیم خانے میں داخل کروا کے آئے تھے آپ؟" وہ تھکے تھکے لہجے میں پوچھنے لگیں۔

"سوری مجھے یاد نہیں، سانڈہ کا نام سنا ہوگا آپ نے، وہیں ایک چھوٹا سا یتیم خانہ تھا۔ اب نہ تو مجھے اس کے منتظم کا نام یاد ہے نہ یتیم خانے کا... اس کے چند ماہ بعد تو ہم آسٹریلیا چلے گئے تھے پھر......"

"کیا... آپ یاد نہیں کرسکتے، آپ نے کہیں لکھ رکھا ہو وہ ایڈریس......" رعنا حیات رو دینے کو تھیں۔

"سوری بیگم صاحبہ! مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ وہ بچہ آپ کا کون تھا؟"

"پتا نہیں......" رعنا حیات کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں اور کچھ بھی کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئیں تو سلیمان سبزواری کو اس "پتا نہیں" سے بہت کچھ پتا چل گیا۔

"کاش میں اس بچے کو اس بے رحمی سے یتیم خانے میں نہ پھینک آیا ہوتا تو آج بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں اتنی ویرانیاں نہ ہوتیں۔"

رعنا حیات گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں، جب انہوں نے شعیب سبزواری کو اندر داخل ہوتے دیکھا وہ سلیمان سبزواری کی کاپی تھا۔

تو سلیمان سبزواری سچ کہہ رہا تھا۔

"میں تمہیں اب کہاں تلاش کروں میرے بچے؟" اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر بے اختیار رو دیں۔

☆ ☆ ☆

زیتون بانو کمرے میں داخل ہوئی تو مسز خان فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ رہی تھیں۔

"کھانا لے آؤں جی؟" زیتون بانو نے پوچھا۔

"نہیں......" وہ جیسے چونک کر بولی تھیں۔ "بڑی عجیب سی بات ہے۔"

"کون سی بات جی؟"

"شہباز خان کی کچھ خیر خبر نہیں، اتنے دنوں سے دل عجیب وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے فلیٹ پر کال ملاتی ہوں تو آنسر مشین سے ایک ہی جواب آتا ہے کہ آپ پیغام ریکارڈ کروا دیں، ابھی مجھے شہباز کے دوست نے فون کر کے بتایا ہے کہ شہباز خان پاکستان آچکا ہے، کئی دنوں پہلے۔"

"واقعی جی!" زیتون بانو خوش ہو کر آگے بڑھی۔ "تو پھر وہ گھر کیوں نہیں آئے؟"

"یہی تو مجھے فکر ہے اگر وہ پاکستان آچکا ہے تو اس نے مجھے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔"

اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی آواز آئی۔ اظہر کے پیچھے یاسمین اور مشی داخل ہوئیں۔ تینوں سلام کر کے بیٹھ گئے۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی ام جان!" اظہر نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" مسز خان نے دزدیدہ نظروں سے بہو کے روٹھے انداز کو دیکھا، جب کہ مشی بالکل لاتعلق سی بیٹھی تھی۔

"ام جان میں نے آپ کو بتایا تھا ناں آج شام کو چھ بجے ہماری فلائٹ ہے۔" اظہر نے چند لمحوں بعد کہا۔

"تو تم جا رہے ہو۔" بیٹے کی طرف شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے مسز خان نے کہا۔

"چلے جاتے، بس کے مرنے کا تو انتظار کر لیتے۔" وہ پژمردہ سی ہنسی کے ساتھ بولیں۔ اظہر نے جز بز ہو کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر بیوی کے لاتعلق چہرے کو۔

"کون جانے کس کی پہلے آجائے۔ بعض لوگ تو لوہے کی سانسیں لکھوا کر آتے ہیں، اور آج کل تو موت نہ جوان دیکھتی ہے نہ بچہ۔" یاسمین جلے کٹے انداز میں طنز سے بولی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو بہو! مجھ جیسے بوڑھے تو شاید موت کا بھی امتحان بنے ہوئے ہیں۔ کیسے کیسے غم کے پہاڑ ٹوٹے ہیں، اور میں واقعی سینے میں لوہے کے سانس لیے جیسے جا رہی ہوں۔" مسز خان سر ہلا کر بولیں۔

"یاسمین کا یہ مطلب نہیں تھا ام جان!" اظہر جلدی سے بولے۔

"یاسمین دودھ پیتی بچی نہیں اظہر! جو تم اس عمر میں بھی اس کے جملوں کے خفیہ مطالب کی وضاحت کرتے پھرو، خیر۔" وہ گہرا سانس لے کر بولیں۔

"کب تک لوٹو گے امریکہ سے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا ام جان! ابھی تو سیٹل ہونے کا ارادہ ہے۔ اگر سیٹ ہو گئے تو پھر جلدی چکر لگاؤں گا آپ سے ملنے کے لیے۔" اظہر نے بتایا۔

"یہ ساتھ دیوار ملی ہے تو تم مہینہ مہینہ مجھے اپنی شکل سے ترساتے رہتے ہو، اب تو پھر سات سمندر پار جا رہے ہو۔ کبھی بھولے سے فون ہی کر لو گے تو میں سمجھوں گی تم ملنے آگئے۔"

"ملاحظہ فرمائیے طنز؟" یاسمین زیر لب شوہر سے بولی۔

"بہو! یہاں کوئی غیر نہیں بیٹھا، اونچا بولو۔"

"میں پہلے ہی بہت اونچا بول کر بری بن چکی ہوں، اس لیے آپ میری زبان نہ ہی کھلوائیں تو مہربانی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو مشی! ہو گئی سلامی۔"

اس نے مڑ کر لاتعلق سی اپنے ناخنوں سے کھیلتی مشی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو مشی نے ایک نظر دادی کے چہرے کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے پاس آگئی۔

"اوکے دادو! اپنا خیال رکھیے گا۔ خدا حافظ۔" وہ ذرا سا ان کا ہاتھ دبا کر ماں کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔

مسز خان اس کے اجنبی رویے کو دیکھتی رہ گئیں۔

"مجھے یقین تھا اظہر! تم ایک دن مجھے ضرور جدائی دے جاؤ گے۔ آخر کب تک بیوی کی فرمائش ٹالتے جس کے دونوں بھائی برسوں سے امریکہ میں سیٹل ہیں۔" مسز خان، یاسمین کے باہر جاتے ہی بولیں۔

"ام جان! آپ کے سامنے میں نے یہاں کوشش کی ہے سیٹ ہونے کی، ایک ہی بیٹی ہے میری اور جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، اب مجھے اس کا کہیں تو کرنا ہی ہے۔ یہاں تو وہ نفسیاتی مریضہ بنتی جا رہی ہے۔ ابراہیم بھائی کا بیٹا ہے۔ وہ بہت عرصے سے رشتہ مانگ رہے ہیں۔ مشی اتنی دور بیاہ کر چلی گئی تو پھر ہم دونوں یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ اسی لیے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔" اظہر کچھ شرمندہ سے کہہ رہے تھے۔

"یہی کچھ کرنا تھا تو اس غریب کو کیوں نکلوایا تمہاری لاڈلی بیٹی نے؟" مسز خان کچھ غصے میں بڑبڑائیں۔

"آپ ابھی بھی اس کو بے قصور سمجھتی ہیں۔ جب کہ سب کچھ تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا تھا۔" اظہر تلخی سے بولے۔

"اظہر میاں! زندگی میں صرف آنکھوں سے ہی نہیں دیکھا جاتا۔ کسی اور چیز سے بھی بصارت کا کام لیتے ہیں۔ خیر تمہیں یہ بات کہاں سمجھ میں آئے گی، تم تو مدت سے یاسمین کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو۔"

"ام جان! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔" اظہر احتجاجاً بولے۔

"فون تو کیا کرو گے نا؟" مسز خان کچھ عاجزی سے بولیں۔

"کیوں نہیں ام جان! سیٹ ہو گیا تو پھر ان شاء اللہ آپ کو بھی بلواؤں گا۔" وہ جلدی سے بولے۔

"نہیں میرے بیٹے! مجھے تو اب صرف اس بلاوے کا انتظار ہے جو آ نہیں رہا، جاؤ تم، اللہ تمہارا نگہبان۔ پتا نہیں یہ بوڑھی آنکھیں دوبارہ تمہارا چہرہ دیکھ پائیں گی یا نہیں، جب تک جیتی رہوں گی دعاؤں کے خط، تحقیق لکھتی رہوں گی۔" مسز خان کے آبدیدہ ہونے پر اظہر نے بے اختیار انہیں اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"ام جان! میں آپ کو بھول سکتا ہوں۔ کبھی نہیں۔" وہ ان کے بوڑھے وجود کی خوشبو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

"کوئی دعا نہ کرو، میں نے تمہیں ہر پابندی سے آزاد کیا۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔" مسز خان نے اظہر کا ماتھا چوم کر الوداعی دعا دی تو اظہر نے ان کے دونوں ہاتھ چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ اور دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئے۔

مسز خان کے جھریوں بھرے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیر رواں ہو گئی۔

زیتون بانو چپ چاپ بیٹھی ان کی ٹانگیں دباتی رہیں۔

"یہ ہوتی ہے اولاد، زیتون بانو! جس کے لیے آدمی مرا جاتا ہے۔" جب کچھ دیر کے بعد ان کا دل سنبھلا تو وہ بولیں۔ زیتون بانو نے [illegible] ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ویسے بیگم صاحبہ! وہ کیا چیز [illegible] کی جو آپ اس دن کہہ رہی تھیں کہ مشی بی بی کے بیڈ کے نیچے دیکھ کر آپ کو معاذ کی بے گناہی کا ثبوت مل گیا تھا۔" زیتون بانو کو اچانک خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"معاذ کا فرسٹ ایڈ باکس وہ کہہ رہا تھا تاکہ مشی نے اسے خود بلایا تھا کہ اسے درد ہو رہا ہے اور مجھے جو معاذ پر یقین تھا نہ جانے کیسے ان لمحوں میں اٹھ گیا۔ شاید مسلسل بیماری اور بڑھتی عمر کے تقاضے نے مجھ میں قوت برداشت اور قوت فیصلہ دونوں کی کمی کر دی [illegible] مگر زیتون بانو! شہباز کہاں چلا گیا ہے۔ مجھے اس کی فکر لگ گئی ہے۔" [illegible] آیا تو بولیں۔

"واقعی بیگم صاحبہ! یہ تو فکر کی بات ہے۔"

"کس سے پتا کراؤں۔۔۔ ارتضیٰ آگیا اسکول سے؟"

"جی ابھی تو نہیں آئے۔ آنے والے ہوں گے۔"

"آج کتنے دنوں بعد تو وہ اسکول گیا ہے۔ معاذ سے کس قدر اٹیچ تھا۔ ایاز بھی گھر پر نہیں ہوگا کہ میں اس سے بات کرتی۔" وہ بے چینی سے بولیں۔

"جی وہ گھر پر ہی ہیں۔ اظہر صاحب کو ایئرپورٹ چھوڑنے جانا تھا۔"

"اچھا وہ [illegible] نہیں چھوڑ کر آجائے تو کہنا میں نے بلایا ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے معاذ جس قدر مجھ سے خفا ہے اور یہ شہباز جو روٹھ کر چھپ گیا ہے۔ دونوں کو بلانے کے لیے مجھے اخبار میں اپنی موت کی خبر کا اعلان کروانا پڑے گا، پھر ہی دونوں آئیں گے۔ انتظار کی اب تاب نہیں، نہ مہلت ہے۔"

"اللہ نہ کرے بیگم صاحبہ!" زیتون بانو جلدی سے بولی تو مسز خان نے کچھ جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر کے سر بیڈ کی پشت سے ٹکا دیا۔

☆ ☆ ☆

"اماں جی! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" جویریہ ان کے سر میں تیل لگا رہی تھی۔ پوچھنے لگی۔

"تمہیں کیسی نظر آرہی ہوں؟"

"آج کل ماشاء اللہ اچھی نظر آرہی ہیں۔" جویریہ پیار سے گال چوم کر بولی۔

"تو پھر اچھی ہی ہوں گی۔۔۔ آمنہ کہاں ہے؟"

"اسکول گئی تھیں، ابھی واپس آئی ہیں۔ کپڑے بدل رہی ہوں گی۔ ان کا اسکول بھی بند ہی ہونے والا ہے۔"

"چلو اچھا ہے، اب اسے یہ چھ سات سو کی نوکری کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کے سسرال والے لکھ پتی

ہیں۔ اس روز بھی بیگم عثمانی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ آپ بچی کی نوکری چھڑوا دیں۔"

"اماں جی! آپ کو یہ لوگ کیسے لگے ہیں؟" جویریہ نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں، تمہیں پسند نہیں آئے؟"

"اماں جی! بات پسند ناپسند کی نہیں 'بڑوں کا تجربہ بچوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کو ان سے مل کر کچھ تو اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ کیسے لوگ ہیں؟"

"بیٹا! آج کل کچھ ایسا زمانہ آگیا ہے کہ تجربہ کچھ نہیں بتاتا۔ پیسے کی کرشمہ سازیاں اتنی ہو گئی ہیں۔ پیسے کی چمک دمک سامنے والے کی نظروں کو کچھ اس طرح سے خیرہ کرتی ہے کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ پیسے کے علاوہ آدمی کو اچھائی برائی کے کس پیمانے سے ناپا جائے۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔

"کلثوم خالہ کا اپنا بیٹا بھی شہر میں کہیں اچھی جگہ نوکری کرتا ہے۔"

"پھر؟"

"اماں جی! میں بات کر رہی تھی کہ دیکھے بھالے لوگ......"

"یہ کسی کو جانچنے کا کوئی معیار نہیں۔ کبھی صدیوں سے ساتھ رہنے والے ایسا رنگ دکھاتے ہیں کہ بندہ یقین نہیں کر پاتا کہ یہ ہمارا اپنا ہے اور کبھی غیر اتنے اچھے نکل آتے ہیں کہ یقین نہیں آتا۔ میرا تو خیال ہے کہ اچھے لوگ ہیں۔ اب اپنے دونوں بھائیوں کو دیکھ لو...... جویریہ! عبدالمبین بہت دنوں سے نہیں آیا۔" انہیں ایک دم سے خیال آیا۔

"جی اماں جی! بہت دن ہو گئے۔ اب تو انہیں شاید...... آپی کی......" اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

"ہاں 'ہمیں تو ابھی خود یقین نہیں آیا کہ زینب جا چکی ہے۔ تمہارے پاس وہ کارڈ تھا جو عبدالمبین اس دن دے گیا تھا۔ اگر اس پر کچھ پتا وغیرہ لکھا ہے تو مجھے دو' میں کلثوم بہن سے کہوں اپنے بیٹے کے ذریعے عبدالمبین کو پیغام بھجوائے۔" وہ کچھ بے تابی سے بولیں۔

"اماں جی! اس پر فون نمبر لکھا تھا' دو تین بار آمنہ آپی نے پی سی او سے فون کیا ہے۔ ادھر جو بھی اٹھاتا ہے کہتا ہے مولوی صاحب ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"ملک سے باہر...... ہم سے ملے بغیر۔" وہ حیرت زدہ لہجے میں بولیں۔

"یہاں تو انہوں نے بابا صاب کے جوتے کھانے ہوتے ہیں' اسی لیے ملنے نہیں آئے ہوں گے۔ ویسے بھی اماں بی! اب وہ بڑے آدمی ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس ہماری طرف آنے کو کیا سوچنے کا بھی ٹائم نہیں ہوگا۔" وہ اماں بی کی چوٹی گوندھ رہی تھی جب آمنہ اندر داخل ہوئی اور اماں بی کو سلام کر کے وہیں بیٹھ گئی۔

"آمنہ! عبدالمبین کی خبر لینا تھی۔" اماں بی کچھ لجاجت بھرے لہجے میں بولیں۔

"اچھا اماں بی!" اس نے بحث نہیں کی۔ اگرچہ وہ کئی بار فون کر چکی تھی مگر عبدالمبین سے بات نہیں ہو سکی تھی۔

"تمہارے اسکول کا کیا بنا؟" اماں بی اسے چپ دیکھ کر بولیں۔

"ابھی تو کچھ نہیں۔ ویسے آج میں ایک اور اسکول میں انٹرویو دے کر آئی ہوں۔"

"کیا ضرورت ہے اب نوکری کرنے کی۔ تمہارے سسرال والے اچھا نہیں سمجھتے۔" اماں بی نے کہا تو آمنہ کو ایکدم سے جیسے کوئی بھولا ہوا خیال آیا۔ اس نے بے ساختہ اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری خالی انگلی کو دیکھا۔ اس کی ساس انگوٹھی لے گئی تھیں کہ سائز چھوٹا کروا کے لائیں گی۔ منگنی کے بعد وہ صرف ایک دفعہ آئی تھیں اور آمنہ تو اکثر اس بات کو بھول جایا کرتی تھی۔

"ابھی تو میں ادھر ہی ہوں اور مجھے ضرورت ہے۔" آمنہ ست لہجے میں بولی۔

"اماں بی! وہ لوگ تو جلد شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔" جویریہ بولی۔

"ہاں' مگر جب تک ان کی بچی نہیں آجاتی۔ وہ تو چھوٹے بیٹے کے لیے جویریہ کا بھی رشتہ مانگ رہے تھے مگر صوفی صاحب نے منع کر دیا کہ پہلے صرف آمنہ کی کریں گے۔" وہ آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

اسی وقت سیڑھیوں پر صوفی صاحب کے قدموں کی آواز آئی تو آمنہ جلدی سے دوپٹہ سر پر اوڑھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ جویریہ پہلے ہی تیل کی بوتل لیے باہر نکل رہی تھی۔

صوفی صاحب اوپر آکر باہر بیٹھے تخت پر ہی بیٹھ گئے ورنہ تو وہ سیدھا رابعہ بی بی کے کمرے کی طرف آیا کرتے تھے۔

"جاؤ' اپنے بابا صاب سے کھانے کا پوچھو۔" رابعہ بی بی نے آمنہ کو اشارہ کیا تو وہ باہر آگئی۔ صوفی صاحب سر جھکائے تخت پر بیٹھے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔

"بابا صاب! کھانا لگاؤں؟" آمنہ پاس جا کر پوچھنے لگی۔

"نہیں 'ابھی نہیں۔" وہ کچھ چونک کر بولے۔

"آج آپ جلدی آگئے' دوسرے مدرسے پڑھانے نہیں گئے؟"

"نہیں۔" وہ ایک گہرا سانس بھر کر اسے دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے بابا صاب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ان کی پریشان صورت دیکھ کر وہ رہ نہ سکی۔

انہوں نے خاموشی سے تخت پر رکھے ہاتھ میں دبا خاکی لفافہ آمنہ کے آگے کر دیا۔ آمنہ نے کچھ تشویش سے ان کی طرف دیکھا اور لفافے میں سے ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر پڑھنے لگی۔

"اوہ!" چند لمحوں بعد اس کے منہ سے نکلا۔ صوفی صاحب کو ملازمت میں توسیع نہیں مل سکی تھی۔ وہ اس ہفتے مسجد اور مدرسے سے فارغ کیے جا رہے تھے۔ ٹھیک چار دن بعد انہیں نئے قاری صاحب کو چارج دینا تھا اور ساتھ ہی یہ گھر بھی۔ ہاں گھر کے لیے انہیں تین ماہ کی مہلت دی جا رہی تھی۔

آمنہ نے پریشان نظروں سے صوفی صاحب کو دیکھا جو اب کسی خیال میں گم اپنا بازو جھٹک رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تم ڈائن' حرافہ باز نہیں آؤگی۔ کیوں سلطان بخت کے گلے سے اتر نہیں جاتیں۔ ٹکے ٹکے کے لیے ناچنے والی کیوں میرے بھائی کا پیچھا چھوڑ نہیں دیتیں اور کتنا پیسہ چاہیے تمہیں اپنی عیاشیوں کے لیے۔ جاؤ اب کسی اور کے گلے پڑو۔ آئندہ حویلی فون کیا تو یاد رکھنا تیرے اگلے پچھلوں کو جیتے جی زمین میں گڑوا دوں گی حرام خور......"

اس سے زیادہ سننے کی زیبو میں تاب نہیں تھی' اس نے روتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ کئی دنوں سے سلطان بخت کے موبائل پر فون کر رہی تھی۔ اسے یا تو موبائل آف ملتا یا وہ اس کی کال ریسیو ہی نہ کرتے۔ مجبوراً آج اسے حویلی فون کرنا پڑا۔ وہاں شاید سیدہ نے فون اٹھایا تھا۔

"یہ ہوتی ہے شریفوں کی پاک شائستہ زبان۔" اس کے کانوں میں سیدہ کی گالیاں گونج رہی تھیں۔

"اب کیوں روتی ہو' اپنی جان کی دشمن ہو رہی ہو اس حال میں۔" زیور گل اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"تو کیا کروں' جی تو چاہتا ہے کچھ کھا مروں۔ یہ سب سزا مل رہی ہے مجھے آپ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے۔ ایک طوائف زادی۔ سنا آپ نے۔" اس نے سارا غصہ ماں پر نکالا۔

"یہ تو بڑا پرانا مقدمہ ہے میرے نصیبوں کا۔ ابھی تک پیشی پہ پیشی بھگت رہی ہوں۔ تیری جان اتنی آسانی سے کیسے چھوٹ جائے گی۔" زیور گل پھیکے لہجے میں بولی۔ "اب ان باتوں سے جی جلانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ ان دنوں میں کوئی فضول کی ٹینشن پالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ شریف زادہ نہیں مانتا اسے اپنی اولاد تو نہ مانے تو کیوں مری جا رہی ہے دفع کر۔"

"کیسے دفع کر دوں۔" زیبو تڑپ کر بولی۔ "ماما! میں اس کے لیے اپنی جان لڑا دوں گی اور یہ منوا کر چھوڑوں گی کہ یہ شادی کا بچہ ہے۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

"نین تارا! تو پاگل ہو گئی ہے، تجھے ان امیرزادوں کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ کیوں اپنی، میری اور اس بچے کی جان کی دشمن ہو رہی ہے۔ سلطان بخت کبھی نہیں مانے گا۔ ہاں اگر تو انتظار کرے تو دیکھنا وقت خود اس سے یہ بات منوائے گا، وہ خود خوار ہو کر تیرے قدموں میں آئے گا۔ نہ صرف اس بچے کو تسلیم کرے گا، بلکہ اس کا اعلان بھی کرے گا۔ اگر تو اس وقت صبر کر کے بالکل خاموشی اختیار کر لے تو بہت کچھ پا لے گی۔" زیور گل تجربہ کار انداز میں اسے سمجھانے لگی۔

"مام! مجھ میں صبر نہیں۔ جب میں حق پر ہوں تو وقت کا انتظار کیوں کروں۔ خود وقت کی آواز کیوں نہ بن جاؤں۔" وہ جذباتی پن سے بولی۔

"نین تارا! ہر کام میں عجلت اور حق پہ ہونا کافی نہیں ہوتا بے وقوف! اس وقت وہ طاقت اور دولت کے نشے میں کسی بھی گری ہوئی حرکت پر اتر سکتا ہے۔ تمہاری یا تمہارے بچے کی خدانخواستہ جان بھی لے سکتا ہے۔ ان شریف زادوں کو اپنی عزت، نیک نامی ہر چیز سے بڑھ کر پیاری ہوتی ہے۔ اس نفس کی لذت سے بھی زیادہ جس کے بے لگام ڑانس میں یہ ہمارے قدموں میں غلیظ کتوں کی طرح لوٹ لگاتے ہیں۔ پر اب تو نشہ اترنے کے بعد کا موسم ہے اور یہ موسم ہر خفیہ شادی کرنے والی عورت کو صبر ہی سے جھیلنا پڑتا ہے۔" زیور گل دانش مندی سے کہہ رہی تھی۔

"مام!" نین تارا احتجاجاً بولی۔

"مگر مجھے تو آج ہی گھر جانا ہے۔ بہت پریشان رہا ہوں سب کی خیریت سے متعلق۔"

"جہاں اتنے دن گزار آئے ہو وہاں چند دن اور سہی۔ تمہاری دوست کو اس وقت تمہاری اشد ضرورت ہے۔" زیور گل اصرار سے بولی۔

"میری نہیں میڈم! شاہ جی کی۔ آپ بھول رہی ہیں۔"

"بھول تو اس نادان سے ہو چکی ہے، جو شاہ جی جیسے طوطا چشم نواب سے دل لگا بیٹھی اور یہ حماقت بھی کر بیٹھی۔ سمجھا سمجھا کر میں تھک گئی لیکن مجال ہے جو اس کے پلے کچھ پڑا ہو۔ اب بیٹھی رو رہی ہے۔" زیور گل کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"کیا ہوا فرینڈ! کیا پھر کوئی جھگڑا ہو گیا۔ شاہ جی تو شاید اس ہفتے لوٹے ہیں تو کیا آتے ہی پڑیں؟" وہ بولا تو وہ یکدم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے ارے نین! یہ کیا کر رہی ہو، حوصلہ۔ بے وقوف اتنی جلدی ہمت نہیں ہارتے۔ بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟"

"مائی ہلیوڈ میم!" وہ ہنستے ہوئے الگ ہوا۔

"ارے موٹی بلی! کیسی ہو اور پھیل گئی ہو۔" اس نے نین تارا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت زبردست لگ رہے ہو، ایک دم سے اسمارٹ اور قیامت خیز۔ ہے نا تارا! دیکھو تو اس کو۔" زیور گل ستائشی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی تو عبدالمبین جھینپ گیا، اور کی رنگ جھلاتے ہوئے نین تارا کے سامنے جا بیٹھا۔

"دیکھیں میڈم! آفت اور اتنی بڑی قیامت تو نین تارا بھی ہو گئی ہے۔" وہ اس کے پھیلے ہوئے جسم کو دیکھ کر شرارت سے بولا۔

"آنے کی اطلاع تو کی ہوتی۔ میں تمہیں خود ایئرپورٹ پر لینے آتی۔" زیور گل اسی خوشگوار لہجے میں بولی۔

"سرپرائز میڈم۔"

"کب آئے ہو؟" نین تارا پوچھنے لگی۔

"ادھر تو ابھی تمہارے سامنے آیا ہوں۔"

"بھئی لاہور کب پہنچے؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"بارہ بجے، سکھوں کے ٹائم۔"

"اور آکر فون تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔ کیسا رہا ٹور تمہارا؟"

"میں نے سوچا اب صبح ہی جا کر ملوں گا اور ٹور اے ون رہا۔"

"یہ تمہاری صبح ہے، بارہ بجنے کو ہیں۔" زیور گل شکایتی لہجے میں بولی۔

"میڈم! میری تو صبح ہے، میں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

"رئیلی! میں لگواتی ہوں ناشتہ اور اب تم آ گئے ہو نا تو ابھی ادھر ہی رہو گے، کم از کم ایک ہفتہ اس احمق بے وقوف لڑکی کے پاس۔"

زیور گل ایک دم سے خود کو توانا محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔

"کیوں، اس نے پھر کوئی بے وقوفی دکھا دی ہے؟"

"اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟"

"مام! اور میں نے کبھی صبر کیا ہے، نہ کروں گی۔ یہ بچہ پیدا ہو گا تو دیکھنا خدا کی قسم میں اسی لمحے اسے حویلی لے جاؤں گی اور ساری دنیا کے سامنے اسے شاہ جی کو پیش کروں گی اور انہوں نے اس وقت بھی اسے اپنانے سے انکار کیا تو مام! قسم سے میں وہیں کھڑے کھڑے اس کی جان لے لوں گی۔ چاہے بعد میں خود بھی جان سے جاؤں یا ہوش و حواس سے، اور میں منوا کر چھوڑوں گی اور صبر تو آپ کو معلوم ہے مجھ میں ہے نہیں اور نہ میں کروں گی۔" نین تارا اتنے خوف ناک لہجے میں کہہ رہی تھی کہ زیور گل کو لگا وہ یہ سب کر گزرے گی۔ ضدی تو وہ شروع ہی سے تھی۔

"خبردار جو تم نے ایسا کچھ کرنے کا سوچا بھی تو۔"

"ارے موٹی! مائی ڈارلنگ، ہاؤ آر یو۔ بہت انتظار کرایا تم نے لڑکے۔" اندر داخل ہوتے عبدالمبین کو دیکھ کر زیور گل حقیقتاً کھل اٹھی تھی۔ بڑے جوش میں اٹھ کر اس کو گلے سے لگا لیا۔

"بہت مس کر رہی تھی میں تمہیں۔" وہ تو زیور گل کے ویلکم کے انداز ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ عبدالمبین کو کتنا مس کر رہی تھی۔

وہ گھبرا کر اٹھا اور اس کے پاس بیڈ کے کنارے پر ٹکا، اپنی جیب سے ٹشو نکال کر اس کے رخساروں پر بہتے آنسو صاف کرنے لگا۔

"تھینک یو۔" اس نے ٹشو مبین کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کیا ہوا، کچھ بتاؤ گی نہیں؟" چند لمحوں بعد عبدالمبین کے پوچھنے پر وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ عبدالمبین غور سے سننے لگا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو کون، بیگم رعنا حیات؟" ان کے سیل فون پر کوئی اجنبی آواز ابھری تھی۔

"جی بول رہی ہوں۔" وہ کچھ اکتائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"بیگم صاحب! مجھے پہچانا آپ نے؟" مخاطب کو نہ جانے کیا خوش فہمی تھی۔

"نہیں۔" وہ اور بیزار ہو گئیں۔

"میں سلمان سبزواری۔" وہ کچھ مایوس ہو کر بولا۔

"اوہ اچھا۔ کیسے ہیں آپ؟" وہ مروتاً بولیں۔ "سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

ورنہ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھیں، جب سے مل کر آئی تھیں ان کی راتیں اور بھی بے چین ہو گئی تھیں۔ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر اللہ کے آگے گڑگڑاتیں، ٹہلتی رہتیں۔ کئی بار تو جا کر ساندہ ہو آئی تھیں۔ شہر کے باقی علاقوں کی طرح بیس بائیس سالوں میں ادھر بھی بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ بہت زیادہ گنجان

آباد اس علاقے کے یتیم خانے میں بھی وہ کئی بار ہو آئی تھیں مگر انہیں اپنے بیٹے کا کچھ بھی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اب تو انہیں لگتا وہ چل چل کر تھک گئی ہیں۔ ان کے اعصاب شل ہو چکے ہیں۔ تین دن سے وہ اس پریشانی میں گھر پر پڑی تھیں۔ آج این جی اوز کی میٹنگ میں شرکت کے لیے گھر سے نکلی تھیں تو پھر سلمان سبزواری ان کے زخم ادھیڑنے۔ آموجود ہوا۔

"بیگم صاحب! آپ کے لیے ایک گڈ نیوز ہے میرے پاس۔ آپ فوری طور پر میرے آفس آسکتی ہیں۔" وہ دبے دبے پرجوش لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کیسی گڈ نیوز؟" وہ ذرا سا چونکیں۔

"آپ کے بچے کے متعلق۔"

"کیا؟" ان کے ہاتھ میں اسٹیئرنگ ڈول گیا۔

"جی۔"

"آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔" انہوں نے گاڑی سڑک کے ایک طرف کھڑی کرلی۔

"نہیں بیگم صاحب! میری اتنی جرأت نہیں کہ آپ سے مذاق کرسکوں پھر اس نازک مسئلے پر کوئی بھی صاحب دل کسی ماں سے مذاق نہیں کرسکتا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"پھر؟" نہیں لگا ان کی آواز کانپ رہی ہے۔

"آپ فوراً میرے آفس آجائیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہو گئیں۔

"خدا کی قدرت دیکھیں، میں آفس میں بیٹھا تھا کہ میرے پی اے نے مجھے انٹرکام پر بتایا کہ کوئی یتیم خانے والے آئے ہیں چندہ مانگنے کے لیے۔ یتیم خانے میں تعمیرات کا کام ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا ورنہ ایسے کاموں کے لیے میرے پی اے کے پاس ہدایت ہے کہ تھوڑا بہت جتنا وہ کہیں انہیں باہر ہی سے دے کر رخصت کر دیا کرے مگر آج میں نے اس شخص کو اندر بلوا لیا اور اسے دیکھ کر میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا کہ یہ وہی شخص تھا جس کے پاس یتیم خانے میں ہمیں آپ کا بچہ جمع کروا کے آیا تھا۔ بیس برسوں میں بھی اس شخص میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے چند لمحوں میں پہچان لیا تھا۔"

"وہ... وہ کیا کہتا ہے؟" رعنا حیات کپکپاتی آواز میں بولیں۔

"وہ بھی مجھے پہچان گیا ہے۔ اس کا یتیم خانہ دوسری جگہ منتقل ہو چکا ہے۔ آج سے تقریباً اٹھارہ انیس سال..."

"تو وہ بچہ، میرا بچہ..."

"جی وہ کہتا ہے ہمارے یتیم خانے میں لڑکیوں کو بارہ سال کی عمر تک اور لڑکوں کو سولہ سال کی عمر تک رکھا جاتا ہے۔ جو نشانیاں میں نے اسے بتائی ہیں، وہ اس بچے کو شناخت کر چکا ہے۔ اب آپ آئیں تو ہم دونوں اس کے ساتھ یتیم خانے چلتے ہیں۔"

"تو وہ یتیم خانے میں ہے؟"

"ارے نہیں بیگم صاحب!" سلمان سبزواری جلدی سے بولا۔

"انہوں نے تو اسے سولہ سال کی عمر میں فارغ کر دیا تھا۔ ان کے پاس اس کی تصاویر ہیں جس سے آپ کو اب اسے ڈھونڈنے میں آسانی ہوگی۔ آپ آ رہی ہیں نا پھر؟"

"آپ پلیز مجھے اپنے آفس کا ایڈریس سمجھائیں۔" وہ جلدی سے بولیں تو سلمان سبزواری انہیں آفس کا پتہ سمجھانے لگا۔

☼ ☼ ☼

ایبٹ آباد کے ڈسٹرکٹ ہاسپٹل کے چلڈرن وارڈ میں معاذ سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ راؤنڈ پر تھا۔ وہ باری باری

سب بچوں کے بیڈز کے قریب رکتے، اس کی فائل اٹھا کر چیک کرتے، تیمارداروں اور نرسز کو مختلف ہدایات جاری کرتے باہر کی طرف آرہے تھے۔

"میرا خیال ہے پرائیویٹ رومز کا وزٹ دس پندرہ منٹ بعد رکھ لیتے ہیں۔ شاید ایم ایس میٹنگ کے لیے کال کریں۔ ویسے آپ ڈاکٹر معاذ! ذرا ان رومز کا ایک وزٹ کر آئیں، اگر کوئی سیریس پرابلم ہو تو آ کر مجھ سے ڈسکس کرلیں۔" ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر فواد کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تو معاذ نے پرائیویٹ رومز کا رخ لیا۔

اسے ادھر اپائنٹ ہوئے تقریباً مہینہ ہو چکا تھا، اس دوران وہ صرف ایک بار لاہور گیا تھا، وہ بھی اپنے کچھ ضروری ڈاکومنٹس لینے اور پروفیسر اوو سے معذرت کرنے کہ وہ ابھی انہیں جوائن نہیں کرسکتا۔ لاہور سے واپسی پر ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ مسز خان کی خیریت فون کے ذریعے دریافت کرے مگر پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ اس رات کی اذیت کوئی بھلا دینے والی تو نہیں تھی۔

"ارے فہد! تم یہاں؟" وہ جیسے ہی روم نمبر تھری میں داخل ہوا بیڈ پر لیٹے فہد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بے ساختہ اسے ارتضیٰ کی یاد آئی جسے وہ بہت دنوں سے مس کر رہا تھا۔ فہد کی ٹانگ پر ٹخنے کے پاس پٹی بندھی تھی۔

"انکل! آپ یہاں..." وہ بھی حیران ہوا۔ "آپ ڈاکٹر ہیں؟" اسے دوسری حیرانی نے آن گھیرا۔ "گرینی... گرینی... ادھر آئیں، دیکھیں کون آیا ہے۔" وہ خوشی سے چلانے لگا۔

"آہستہ فہد بیٹا! اور یہ چوٹ کیسے لگی تمہیں؟" وہ اس کی فائل اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"سلائیڈ سے گرا ہوں۔ گرینی کے اسکول کے بچوں کے ساتھ پکنک پر آئے تھے اور آج تو ہمیں واپس جانا تھا۔" وہ منہ بسور کر بولا، اسی وقت فہد کی گرینی واش روم کا دروازہ کھول کر نکلیں تو معاذ کو دیکھ کر انہیں بھی خوشگوار حیرت سی ہوئی۔ رسمی سلام دعا کے بعد معاذ فہد کی چوٹ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"انکل! ارتضیٰ اسکول کیوں نہیں آرہا؟" وہ بات جو معاذ فہد سے پوچھنے کے لیے دل میں بہانے گھڑ رہا تھا فہد نے خود ہی پوچھ لی۔

"اسکول نہیں آرہا؟" اس نے کچھ چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

"ہاں، اس کی اپلیکیشن دوبار آئی ہے کہ اس کا بخار نہیں اتر رہا۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ اس کا بخار کیوں نہیں اتر رہا۔ آپ جو ادھر ہیں۔" اس نے خود ہی معاذ سے کہہ کر اسے کسی لمبے چوڑے جھوٹ سے بچا لیا۔

"بس والدین ادھر ادھر ہو جائیں تو بچے یونہی بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ویسے فہد کو ادھر کتنے دن لگیں گے؟" گرینی فہد کے بال سنوارتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"معمولی چوٹ ہے، شاید کل تک فارغ کر دیں۔ او کے جی میں فارغ ہو کر چکر لگاؤں گا۔ آپ اسے تھوڑی دیر کو سلا دیں تو زیادہ بہتر ہے، دوا لے چکا ہے نا؟" معاذ نے فائل رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں دوا تو کھلا دی ہے، اسکول کے بچوں کو ابھی میں واپس بھجوا رہی ہوں۔ ویسے اگر اسے بھی شام تک ڈسچارج کر دیا جائے تو مجھے آسانی ہوگی۔"

"میں بات کرتا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔ او کے جی ٹیک کیئر۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔

"باقی کمروں کے وزٹ کے بعد جب وہ دوبارہ روم نمبر تھری کے سامنے سے گزر رہا تھا تو کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا اور بیڈ کے پاس کوئی کھڑا تھا یونہی معاذ کی نظر پڑی اور جیسے وہیں جم کر رہ گئی۔

وہ چہرہ جسے لاشعوری طور پر وہ بہت دنوں سے تلاش کر رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا جیتا جاگتا اس کے سامنے تھا اور وہ یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا جس نے اس چہرے کو بے اختیار اس کی طرف متوجہ کیا تھا اور اب کے ٹھٹھکنے کی باری اس کی تھی۔ نظروں کا تصادم ہوا اور بہت سے عقدے وا ہونے کو بے چین نظر آنے لگے۔

• • •

"میں یہ کیا حماقت کر رہا ہوں۔ ادھر پڑا کتنی نیکیاں کما رہا ہوں۔ اگر واپس آ کر یونہی منہ چھپا کر کسی کونے میں

بنا تھا تو اس سے بہتر تھا میں واپس ہی نہیں آتا۔" شہباز خان اکتائے ہوئے لہجے میں کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھ کر خود سے سوال کر رہے تھے۔

"پورے تئیس دن ہو چکے ہیں مجھے اس ہوٹل میں پڑے ہوئے' آخر یہاں بلا مقصد رہنے کا جواز کیا ہے۔ میں کیوں حالات کا سامنا نہیں کر سکتا اور کچھ نہیں تو ام جان کا خیال ہی مجھے کیوں گھر جانے پر مجبور نہیں کر پا رہا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گی۔" وہ کھڑکی سے جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔ سامنے گھنے درختوں کے پیچھے سے طلوع ہوتا سورج ایک نئے دن کی آمد کا پتا دے رہا تھا۔

"نیا دن یا پرانا..... آخر میں کیوں یونہی دن گنوائے جا رہا ہوں؟"

"نزہت زندہ ہے یا مر گئی یا کہیں بھاگ گئی۔ ان تینوں میں سے ایک بات تو ہے اور میرے اندر اتنا حوصلہ کیوں نہیں کہ میں اس حقیقت کا سامنا گھر جا کر کروں۔ کیا میرے یہاں چھپ کر بیٹھے رہنے سے حقیقت بدل جائے گی اور میں تو اسے ہر الزام سے بری کر کے یہاں تک آیا تھا پھر یہاں آ کر اذیت کا نیا دور..... میری زندگی کتنی بے مقصد گزر رہی ہے' صرف ایک اس ایشو نے مجھے کیا سے کیا بنا ڈالا ہے۔ حالات سے فرار کے لیے میں نے جاب بھی چھوڑ دی جو کبھی میری زندگی کا بڑا خوبصورت مقصد تھا اور اب یہ بے مقصد..... آخر کب تک؟" وہ پلٹ کر کمرے میں آ گئے۔

"مجھے گھر جانا چاہیے' کم از کم ام جان اور ارتضیٰ کی خاطر اور اگر سب کچھ ویسا ہوا جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا طعنے اور بھابیوں کے طنز تو میں ام جان اور ارتضیٰ کو لے کر کہیں اور شفٹ ہو جاؤں گا۔ آخر کب تک اس چار دیواری میں منہ چھپا کر پڑا رہوں۔ مجھے آج یا کل یہ فیصلہ کر لینا چاہیے....." دروازے پر ہونے والی دستک نے ان کی سوچوں کا ارتکاز توڑا۔

"یس۔" ویٹر دروازہ کھول کر اندر آیا اور ٹرے میں رکھا اخبار ان کے سامنے پیش کرنے لگا۔

"سر بریک فاسٹ۔"

"ابھی نہیں۔" وہ اخبار کھول کر دیکھنے لگے۔ چند منٹ صفحات پلٹ کر دیکھے اور پہلے صفحے کے نچلے حصے میں سب سے نمایاں خبر جو تصویر کے ساتھ چھپی تھی اس نے انہیں چونکا کر رکھ دیا۔

دوسرے پل وہ ریسپشن پر فون کر رہے تھے کہ ان کے واجبات کا بل کمرے میں بھیج دیا جائے' وہ چیک آؤٹ کرنا چاہ رہے ہیں۔ محض دس منٹ بعد وہ گھر جانے کے لیے تیار تھے۔ اخبار ان کے ہاتھوں میں تھا اور نظریں ایک بار پھر اس خبر اور تصویر پر ٹکی تھیں۔ جس نے چند منٹ میں ان سے اتنا مشکل فیصلہ کروا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼
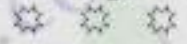
صوفی صاحب ناشتہ کرنے کے لیے آمنہ کے بلانے پر کمرے سے باہر نکل رہے تھے' جب جویریہ اماں بی کو اٹھانے اندر داخل ہوئی۔

"اماں جی نہیں اٹھیں؟" جویریہ نے صوفی صاحب سے پوچھا۔

"نہیں' رات دیر تک باتیں کرتی رہیں پھر کچھ طبیعت بھی مجھے تمہاری ماں کی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ تہجد کے لیے بھی نہیں اٹھیں۔ کہہ رہی تھیں صوفی صاحب! اٹھا نہیں جا رہا۔ فجر کے قریب آنکھ لگی' اسی لیے میں نے اٹھایا نہیں۔ اب کافی سو چکی ہے' تم ناشتے کے لیے اٹھا لو اور بعد میں دوا بھی دے دینا۔" صوفی صاحب تفصیلاً کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھے' رات بھر تو وہ خود بھی نہیں سو سکے تھے۔ ملازمت ختم ہو گئی تھی اور گھر تلاش کرنے کا کٹھن مرحلہ سر پر آن پڑا تھا۔ سرکاری آرڈرز تو آ گئے تھے مگر انہوں نے رات اپنے دل کو طفل تسلیوں سے بہلا لیا تھا کہ وہ دوبارہ اپنے شاگرد افسروں کی جا کر منت سماجت کریں گے تو شاید آرڈر واپس لے لیا جائے' ورنہ دوسری صورت میں انہوں نے ہفتہ بھر کے اندر آمنہ کی رخصتی اور جویریہ کی بات کہیں طے کر کے اس کے نکاح کا فیصلہ کر لیا تھا۔ باقی دونوں میاں بیوی ہوں گے' کہیں بھی صوفی صاحب بچوں کو قرآن پڑھا کر تھوڑے بہت

زندگی گزارنے کے وسائل پیدا کر ہی لیں گے۔ ایسی ہی تسلیاں وہ رات بھر رابعہ بی بی کو بھی دیتے رہے تھے جو سرکاری حکم نامہ ملنے پر اچھی خاصی پریشان تھیں۔

"اماں جی..... اماں جی..... اٹھیں نا..... دیکھیں کتنا دن چڑھ آیا ہے۔ آج آپ نے نماز بھی قضا کر دی۔ اماں جی....." جویریہ بہت آہستہ آہستہ ان کا کندھا ہلا کر انہیں جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اماں جی..... اماں جی....." اس نے ان کا بازو پکڑ کر اٹھایا جو کسی مردہ شے کی طرح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پہلو میں جا گرا۔

"اماں جی..... بابا صاب..... اماں جی....." اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور صوفی صاحب جو پیچھے پلٹنا چاہ رہے تھے' یکدم انہیں لگا ان کا سر چکرا رہا ہے اور قدم جیسے زمین کے اندر گڑ گئے ہیں۔ وہ گرنے کو تھے' سنبھلنے کے لیے قریب کوئی سہارا نہیں تھا۔ الٹے قدم چل کر وہ زور سے دیوار سے ٹکرائے تھے۔ آمنہ بھاگی بھاگی اندر گئی۔ آمنہ اور جویریہ چیخ چیخ کر اماں کو آوازیں دے رہی تھیں اور صوفی صاحب دیوار سے لگے آدھے کھڑے آدھے بیٹھے کچھ کہنے کی کوشش میں گردن دائیں طرف گھمانا چاہ رہے تھے مگر انہیں لگا وہ ایسا نہیں کر پائیں گے' ان کا جسم ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔

وہ کس کو پکاریں کہ انہیں سہارا دے۔

ان کی نگاہوں میں عبدالمتین اور عبدالمبین کے تنومند جسم آ گئے۔

• • • • • •

ایک ساتھ دو قیامتیں ان کے گھر ٹوٹی تھیں۔

ایک ساتھ دو طاقتور اور مضبوط ستون گرے تھے۔ دو ستون تو پہلے ہی اس مٹی کے گھروندے کو چھوڑ کر جا چکے تھے ان کے جانے کے بعد یہ گھروندا ان ہی دو ستونوں پر تو کھڑا تھا' آج وہ بھی ڈھے گئے۔

اور ملبے کے نیچے سے صوفی صاحب کا آدھا زندہ آدھا مردہ جسم نکلا تھا۔ جب کہ سفید کفن اوڑھے رابعہ بی بی کا پُرنور پُرسکون چہرہ جو ہر بے سکون اور پریشان حال دل سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

"جو لوگ عمر بھر متوازن رستوں پر چلتے ہیں ان کے آخری لمحات ایسے ہی پُرسکون ہوتے ہیں۔"

انہوں نے سبک رفتار ہوا کے نرم جھونکوں کی مانند زندگی گزاری تھی۔ ہوا جو ہولے ہولے چلتی رہے تو اس کے پاس ہونے کی خبر بھی نہیں ہوتی اور جو پل بھر کے لیے بھی سانسوں سے دور ہوتی محسوس ہو تو حلقۂ حیات تنگ پڑتا محسوس ہونے لگتا ہے۔

وہ تو صوفی صاحب کی طرح بچوں کی معمولی یا غیر معمولی لغزش پر آپے سے باہر ہوتی تھیں اور نہ ان کی محبت میں کسی انتہا کو چھوتی تھیں۔ ہر جذبے کو انہوں نے ساری زندگی صبر کی ہلکی آنچ پر پکا کر ہی سینے میں سمایا تھا۔

وہ ماں تھیں اور ایک ماں کی سی زندگی گزار کر چپکے سے آنکھیں موند لی تھیں۔ ایک تکلیف وہ حسرت بھری زندگی گزار کر کسی سے بھی ان تکلیفوں کا تذکرہ کیے بغیر کسی کو بھی برا بھلا کہے بغیر وہ نزع کے تکلیف دہ لمحات کو بھی خاموشی سے سہہ گئی تھیں کہ پاس' بالکل پاس وہ ہاتھ پر لیٹے عمر بھر کے ساتھی کو بھی خبر نہ ہو سکی تھی کہ کب تیس سالہ طویل رفاقت کا یہ سفر چپکے سے تمام ہو گیا۔ کب رابعہ بی بی کا ہاتھ بے حد آہستگی سے صوفی عبدالرحمن کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔

مگر جب خبر ہوئی..... تو صوفی عبدالرحمن کے حوصلے اور ضبط کا آخری بند بھی ٹوٹ گیا۔ وہ لاچاری سے بے بس' وحشت بھری نظروں سے آخری نیند سوئی رابعہ بی بی کے پلنگ کے اردگرد آتے جاتے روتے' افسوس کرتے ترس بھری نظروں سے دیکھتے' لبوں میں کوئی نہ کوئی ہمدردی بھرا فقرہ کہتے لوگوں کو بس دیکھتے رہ گئے تھے۔ انہیں تو ان چہروں میں ایک بھی اپنا شناسا چہرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا' یوں جیسے وہ اجنبی لوگوں کے ہجوم میں گھر گئے ہوں۔ ان کا وجود جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ انہیں تو ملگجی اوڑھنیاں اوڑھے بے آسرا ہوتی آمنہ اور جویریہ بھی کہیں نظر نہیں

آرہی تھیں۔ ان کے شناسا منظر' جانے بوجھے چہرے' ان کا دماغ جیسے آج جان بوجھ کر انہیں نہیں پہچان رہا تھا سب کچھ دھندلا دھندلا گرد اور کہر کی گہری چادر میں لپٹا' نامانوس سے شور اور اجنبی آوازوں کے ساتھ ان کے اعصاب کو شل کر رہا تھا۔

اور کلمۂ شہادت کی بلند تکبیروں کے ساتھ رابعہ بی بی انجان لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جوان' صحت مند' خوبصورت بیٹوں اور جیتے جاگتے شوہر کے ہوتے ہوئے اجنبی لوگوں نے انہیں آخری کاندھا دیا تھا۔ انہیں لگا رابعہ بی بی کفن سے سر نکال کر شکوہ بھری نظروں سے انہیں مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہیں۔

جویریہ اور آمنہ کی بے قابو ہوتی چیخیں اور پچھاڑیں کھا کھا کر ماں کے پلنگ سے لپٹنے کا منظر ان کے اندر کے غصے اور ناراضی کو جھنجوڑ رہا تھا۔ جویریہ کا دوپٹہ اتر اتر کر کندھوں اور سینے پر آرہا تھا گویا اسے جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ ماں کی جدائی کے غم میں پاگلوں کی طرح بال بکھرائے چیخ رہی تھی۔ اجنبی عورتیں' مرد دونوں کو پکڑ پکڑ کر رابعہ بی بی کے پلنگ سے پرے ہٹا رہے تھے۔

"اماں جی..... اماں جی..... ہمیں چھوڑ کر کہاں جارہی ہیں۔ اماں جی..... ہم کیا کریں گے اماں جی..... آجاؤ۔"

اور ان کی دل خراش چیخیں پتھر سے پتھر دل کو پگھلا رہی تھیں اور صوفی صاحب دیوار سے ٹیک لگائے پتھر ہوتے جسم کے ساتھ غصے اور غم کے ادھیڑبن میں کئی بار اٹھنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے کہ انھیں اور ان دونوں کو پکڑ کر اپنے سینے میں سمالیں' چھپالیں۔ یہ کیوں نامحرموں کے درمیان یوں چیخ چیخ کر اپنے معصوم چہرے ننگے کر کے صوفی صاحب کے نام کو تہمت لگا رہی ہیں مگر ان سے تو ہلا بھی نہیں جارہا تھا۔ بائیں ٹانگ اور بازو تو وہ آرام سے ہلا رہے تھے مگر نچلا دھڑ اور دائیں ٹانگ' دایاں بازو اور بار بار چکر کھاتا سر کوشش کے باوجود منہ کے اندر دانتوں کے پیچھے بھنچی ہوئی زبان ایک بھی لفظ ادا کرنے سے قاصر محسوس ہو رہی تھی۔

"یا اللہ! یہ مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔"

انہوں نے آخر تھک کر اکھڑی اینٹوں کی دیوار کے ساتھ گردن ٹکا کر سر پر تنے شامیانے کے آخری کنارے سے اوپر شام کے تاریک سائے میں ڈوبتے آسمان کو دیکھا اور بے اختیار فریاد کی۔

"دیکھا بابا صاب! اماں جی میرے پاس آگئیں۔" انہیں لگا زینب کھلکھلا کر تالی بجا کر ہنسی تھی' آسمان کے اسی آخری سرخ ہوتے کنارے سے۔ انہوں نے جلدی سے نگاہوں کا رخ بدل کر آمنہ اور جویریہ کو تلاشا۔ جنازہ اٹھ جانے کے بعد اب دونوں اجنبی عورتوں کے سینوں میں منہ چھپائے گھٹی گھٹی آواز میں رو رہی تھیں۔

ان کا بے اختیار دل چاہا دونوں کو زوردار آواز میں پکار کر کہیں۔ اوپر چلو' اوپر چل کر ماں کے چلے جانے کا سوگ منانا۔ یوں گلی کے بیچوں بیچ ننگے سر بیٹھ کر رونا دھونا بند کرو۔"

"توبہ..... اللہ معاف کرے۔ ایسے بھی کیا گناہ کہ بے چاروں کی شامت ہی آگئی ہے۔" کوئی عورت کہہ رہی تھی۔ جو صوفی صاحب کو تاحد کوشش گردن موڑنے کے باوجود نظر نہیں آسکی تھی۔

"کہتے ہیں۔ غم' قربِ خدا کی نشانی ہے۔ پر ایسا قرب..... اللہ معاف کرے ہم گناہگاروں کو' ہم ایسے قرب کے متحمل کہاں؟ پہلے جوان بیٹے چھوڑ کر چلے گئے۔ اللہ جانے کیا چکر تھا' پھر جوان جہان بیٹی مر گئی۔ اس کے لچھن کون سے اچھے تھے اور اب یہ بے چاری' نیک بے زبان روح کب تک غم جھیلتی اور صوفی صاحب کو دیکھو' اللہ جانے کیا ہوا ہے۔ پتھر بنے پڑے ہیں۔ ہٹو ہٹو سب کو دیکھے جارہے ہیں جیسے یہ جنازہ ان کی بیوی کا نہیں' محلے کی کسی عورت کا ہے۔ دیکھو تو سنگ دلی جنازے کو کندھا تک نہیں دیا۔ ساتھ تک نہیں گئے۔ ایسی بھی کیا شقی القلبی۔"

عورتیں اب جنازے سے فارغ ہو کر کھل کر باتیں کر رہی تھیں۔ ان آوازوں کی بھنبھناہٹ میں اس عورت کا تبصرہ جو یقیناً صوفی صاحب کے کہیں قریب ہی بیٹھی تھی' سب سے نمایاں تھا۔

"ہوا ہو گا کوئی بڑا جھگڑا' بے چاری دل پر لے کر چلی گئی۔ توبہ تلا کرے صوفی صاحب کا گھرانہ۔ میں تو کہتی ہوں'

آیت کریمہ کا ورد کرنا چاہیے انہیں ہر روز سوا مہینہ تک سوا لاکھ دفعہ' اللہ ان کے گناہ معاف کرے۔ کوئی صدقہ کریں۔ یہ تو خود لوگوں کے گناہ بخشواتے پھرتے ہیں' ان کا یہ حال ہے تو عام بندے کا سوچو۔ توبہ میری۔"

صوفی صاحب نے سر گھمانے کی آخری بے سود کوشش میں سر پٹخ دیا تھا۔

"یہ تو حال ہے آج کل کے مولویوں کا۔ اب بھلا بتاؤ بندہ کس کو نیک سمجھے' کس کو بد۔ نہ جانے کہاں سے آئے ہیں' پیچھے کیا گل کھلا کر آئے ہیں۔ جب سے آئے ہیں بے چاروں کے اوپر ایک کے بعد ایک آفت ٹوٹ رہی ہے۔ اِدھر بھی اب چند دنوں کا مہمان سمجھو۔ سنا ہے مسجد کی ڈیوٹی سے تو فارغ ہو چکے ہیں بے چارے۔" وہ منہ پھٹ عورت پھر بولی تھی۔ ان کو لگا ان کا طیش آخری حد کو چھو کر پلٹا تھا۔

انہوں نے پھر سے نگاہوں کا رخ بدلا۔

آمنہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آنسوؤں سے تر چہرہ لیے ان کی طرف آرہی تھی۔

بہلا مانوس بے حد اپنا چہرہ۔ وہ رابعہ بی بی کی دائمی جدائی کا غم اس پل بھلا کر اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگانا چاہ رہے تھے اور صوفی عبدالرحمٰن اس بے بسی کے عالم میں کسی مردہ کیڑے کی طرح زمین پر پڑا رہے یہ تو ان کی غیرت کو ہرگز گوارہ نہیں تھا۔

انہوں نے اپنے جسم کی پوری طاقت کو مجتمع کیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ بازو پھیلا کر دو قدم پر کھڑی آمنہ کو گلے سے لگاتے' ان کی دائیں ٹانگ نے ان کے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ سارا وزن بائیں حصے پر ڈال کر وہ فقط چند پل ہی کھڑے رہ سکے اور بائیں ہاتھ کو پھیلا کر دیوار پر کوئی سہارا تلاشتے بھربھری مٹی کی طرح دائیں طرف گرتے چلے گئے۔

"بابا صاب..... بابا صاب....."

انہوں نے سن ہوتے دماغ کے ساتھ آمنہ کی چیخیں سنی تھیں۔ درد کی تیز لہر کے ساتھ وہی ظالم سنسناہٹ ان کے جسم کے دائیں حصے میں دوڑ گئی تھی اور ان کا وجود جیسے کسی پہاڑ کے نیچے دبتا چلا جا رہا تھا۔

• • • •

"بیگم صاحب..... بیگم صاحب! دیکھیں تو کون آیا ہے۔" زیتون بانو کی آواز خوشی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی اور کتاب پڑھتی مسز خان نے کتاب اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔

زیتون بانو حواس باختہ سی اندر داخل ہوئی تھی۔

"کیا ہوا زیتون....." ان کا فقرہ پورا ابھی نہیں ہوا تھا جب شہباز خان اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ سے چشمہ چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔

"ش..... شہباز..... شہباز....." وہ کپکپاتے لبوں سے محض سرگوشی میں کہہ سکی تھیں۔

"امّ جان..... امّ جان..... میں آگیا ہوں آپ کے پاس..... آپ سے معافی مانگنے....." وہ کہتے ہوئے ان کے زانوؤں پر سر رکھ کر بے اختیار رو پڑے۔

"شہباز! میری جان' میرے بیٹے' میرے کلیجے کی ٹھنڈک۔ کتنا انتظار کرایا تم نے۔ کتنا اس بوڑھی جان کو تڑپایا۔ شاید اس جوانی کے عالم اس کی سرمستی میں تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا۔"

وہ لرزتے کانپتے ہاتھوں میں شہباز خان کا چہرہ لیے برستی آنکھیں لیے کہہ رہی تھیں۔

"امّ جان! مجھے معاف کر دیں' میں آپ کا مجرم' آپ کا گناہگار' امّ جان! بہت مس کرتا رہا ہوں آپ کو بہت زیادہ۔" وہ ماں کے ہاتھ چومتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"تو تمہارا کیا خیال تھا' ماں کا دل تمہاری یادوں سے خالی ہو گیا ہے۔ جو تم اسے یاد نہ آتے ہو گے۔ میرے بچے! پل پل ان بجھتے دیوں نے تیری راہ دیکھی ہے۔ ان پانچ سالوں میں کون سا پل' کون سی گھڑی ایسی تھی جب تیرے پلٹنے کی دعا نہیں کی میں نے۔"

وہ ایک بار پھر شہباز خان کو اپنے سینے میں بھینچتے ہوئے بولیں۔

"آپ کی دعاؤں نے ہی تو میرے دل کی حالت بدلی ہے کہ آپ کی طرف' آپ کی خاطر لوٹ آیا ہوں۔ میری پیاری امّ جان!" وہ بھی وارفتگی سے ان کے نحیف وجود کو اپنی مضبوط بانہوں میں بھرتے ہوئے بولے۔

"اب تو نہیں جاؤ گے نا؟" وہ ہاتھوں کے پیالے میں بیٹے کا چہرہ سجا کر بے اختیار بولیں۔

"کبھی نہیں امّ جان! ابھی بھی نہیں۔ اپنی جنت کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔ آپ کی قسم۔" وہ ان کے دونوں ہاتھوں کو باری باری محبت سے چومتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"واقعی سچ کہہ رہے ہو نا؟" وہ بے یقینی سے بولیں۔

"اپنے سر کی قسم امّ جان! بالکل سچ' آپ کے بغیر در در بھٹکا ہوں سکون کی تلاش میں' اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرا سکون' میرا قرار تو آپ کے پاس ہے' آپ کے قدموں میں۔ میری ضد اور انا نے مجھے محض بے سکونی ہی دی ہے اور کچھ بھی نہیں۔" وہ تھکے تھکے سے بولے۔

"میری دعائیں بے اثر نہیں جائیں گی۔ مجھے یقین تھا خدا مجھے مرنے سے پہلے یہ مبارک لمحے ضرور دکھائے گا۔ وہ بڑا رحیم ہے' بڑا مہربان' بڑا غفار۔ ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں سے چشم پوشی اختیار کرکے ۔ نوازنے والا وہ کسی کے بھی آنسو' دعا رائیگاں نہیں جانے دیتا۔۔۔۔" وہ بے خودی کے عالم میں جیسے خود سے کہہ رہی تھیں۔

"امّ جان! ارتضیٰ۔۔۔ ارتضیٰ کہاں ہے؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہباز خان نے سر اٹھا کر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا تو مسز خان نے ایک شاکی نظر ڈالی۔

"اسکول گیا ہوا ہے۔" وہ اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے محبت سے بولیں۔

"وہ اسکول جانے لگا ہے؟" وہ خوشگوار حیرت سے بولے۔

"ہاں' ماشاء اللہ پانچ سال کا ہونے والا ہے۔ خوب بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے۔ پڑھائی میں بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ بغیر کسی ٹیوٹر کی مدد کے صرف معاذ سے۔۔۔" وہ کہتے کہتے ایکدم سے چپ ہو گئیں۔

"او یاد آیا امّ جان! میں اسی لیے آیا ہوں۔ میرا مطلب ہے مجھے آئے تو ادھر۔۔۔"

"معلوم ہے مجھے' تمہیں پاکستان آئے کتنے دن ہو چکے ہیں۔" وہ جلدی سے خفگی بھرے لہجے میں بولیں۔

"امّ جان! آپ کا سامنا کرنے کا خود میں حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔" وہ خجالت سے سر کھجاتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر ماں کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ مسز خان نے آنکھیں پونچھتے ہوئے زیتون بانو کو کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنے کا اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتے باہر نکل گئی۔

"تو آج کیسے حوصلہ کرلیا۔" وہ کچھ تیکھے لہجے میں بولیں۔

"اس اشتہار کی وجہ سے۔" وہ کوٹ کی بیرونی جیب سے تہہ شدہ اخبار نکالتے ہوئے بولے۔

"امّ جان! معاذ کہاں ہے؟" انہوں نے اخبار پھیلا کر مسز خان کے آگے کردیا۔ مسز خان ان کے سوال کا جواب دیے بغیر نیچے گری ہوئی عینک اٹھا کر آنکھوں پر لگاتے ہوئے اخبار میں اس جگہ دیکھنے لگیں جہاں شہباز خان نے انگلی رکھی تھی۔

جوں جوں سطروں پر نظریں دوڑتی گئیں' ان کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

• • •

"دیکھیں بیگم صاحبہ! ہمارے پاس تو بچے میٹرک تک رہتے ہیں۔ تقریباً دو تین سال کی عمر کا بچہ ہم لیتے ہیں۔ اس کے بعد بچیوں کو تو بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہم لڑکیوں کے کسی ادارے میں بھیج دیتے ہیں۔ البتہ لڑکوں کو تقریباً سولہ سترہ سال تک ہمارے ادارے میں رہنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اگر کوئی پڑھ لے تو میٹرک تک ورنہ عمر کا حساب تو "سائبان" کے رجسٹر میں ہوتا ہی ہے۔"

ادھیڑ عمری سے آگے کے سالوں کی طرف گامزن وہ شخص اپنی ناک پر پھسلتی عینک جماتے ہوئے رعنا حیات کو

تفصیل بتا رہا تھا۔

"تو یہ بچہ جس کی میں نے آپ کو تمام نشانیاں بتائی ہیں' میرا بیٹا علی شبریز فخر حیات۔۔۔۔ کیا آپ کو یقین ہے آپ کے پاس ہی تھا؟"

وہ بے چینی سے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ سلمان سبزواری یک ٹک رعنا حیات کی مضطرب و بے قرار چہرے کو تکتے ہوئے دل میں ان کی ممتا کی پیاس بجھنے کی دعا کر رہے تھے۔

"جو نشانیاں آپ نے بتائی ہیں' وہ ہو بہو ہمارے ریکارڈ میں درج ہیں۔ ریکارڈ کا وہ رجسٹر جو میری ریٹائرمنٹ تک ریکارڈ روم میں محفوظ تھا اب کی مجھے خبر نہیں۔ اصل میں آپ کا بیٹا معاذ۔۔۔"

"علی شبریز فخر حیات!" وہ جلدی سے ان کی بات کاٹ کر بولیں۔

"اسے پہلے دن سے پنڈی والے یتیم خانے میں بھی معاذ کے نام سے داخل کروایا گیا تھا' مجھے اس کے ساتھ ملنے والا ریکارڈ یاد ہے۔ کیوں صاحب! آپ کو تو علم ہے نا" آپ نے ہی اسے ہمارے پاس لا کر اس کا نام بتایا تھا۔"

وہ شخص سلمان سبزواری سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جی مسز حیات! میں نے بھی اسے اسی نام سے داخل کروایا تھا۔ وہ ہمارے پاس جتنے دن رہا ہم اسے محض منیو کے نام سے پکارتے رہے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اسے کوئی اچھا سا نام دیں کہ ہمارے ہاں خدا کی رحمت۔۔۔"

"ہاں مجھے یاد آیا۔" وہ سر ہلا کر بولیں۔

"جی کیا؟" وہ شخص جلدی سے بولا۔

"جبّار کے بیٹے کا یہی نام تھا۔ کہتی تھی بیگم صاحبہ! میں اسے اللہ کا سپاہی بناؤں گی' فوج میں بھیجوں گی اپنے بیٹے کو۔ تو مجھے ہنسی آگئی تھی۔ اس مریل سے بیمار بچے کو تم اللہ کا سپاہی بناؤ گی تو اس نے اپنے بیٹے کے نام سے ہی شبریز کو یتیم خانے میں داخل کرایا تھا۔" وہ سوچتے ہوئے نام کا عقدہ حل کر رہی تھیں۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ؟" وہ شخص بولا۔

"کچھ نہیں' آپ آگے بتایئے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولیں۔

"میں آگے کیا بتاؤں' آپ ابھی چلیے میرے ساتھ "سائبان" وہاں اپنی آنکھوں سے ریکارڈ چیک کرلیں۔ آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ آپ ہی کا بیٹا ہے یا نہیں۔ بہت ذہین' بہت لائق بچہ تھا۔ شروع میں تو بہت اچھے مہنگے اسکول میں داخل کروا گئے تھے۔ سلمان صاحب اسے' دو تین سال تک اس کے اخراجات بھی جمع کرواتے رہے' پھر شاید دھندوں میں الجھ کر بھول گئے تھے۔"

سلمان سبزواری نے کچھ شرمسار ہو کر گردن جھکالی۔

"بہرحال' میں نے اس بچے کا شوق اور لگن دیکھ کر پانچویں کے بعد اسے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ ہر جماعت میں اول آتا تھا۔ بہت نیک' شریف' سلجھا ہوا۔ اسے دیکھ کر ہی محسوس ہوتا تھا کہ کسی نیک ماں باپ کی اولاد ہے۔ آپ کو "سائبان" سے اتنی مدد مل سکتی ہے کہ اس کے میٹرک کے رزلٹ کے ساتھ جو تصویر ہے' اسے دیکھ کر آپ اسے آسانی سے تلاش کرسکیں گے۔ ٹاپ کیا تھا اس نے دسویں جماعت کے امتحان میں' ہمارے ادارے کا نام روشن کیا تھا اس نے۔ اس کی تصویریں "سائبان" کے آفس میں بھی لگی ہیں۔"

"چلیں۔" رعنا حیات فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" سلمان سبزواری بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو رعنا حیات نے انہیں منع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں تو بس ایک ہی لگن لگی تھی کہ جلد سے جلد اپنے گوہرِ مقصود کو پالیں۔

اور انہیں لگا اب کوئی معجزہ ہی رونما ہونے والا ہے۔

علی شبریز اس روز جس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ جوتے' موزے' سویٹر' نیچے کی بنیان کا سائز' بالوں کی رنگت' کٹنگ' آنکھوں کی رنگت' چہرہ' ہونٹ' ہاتھ' پاؤں' وزن' قد اور آخری بڑی نشانی کان کی لو کے نیچے گردن

سے اوپر سیاہ تل' بالکل ویسا ہی جیسا فخر حیات کے کان کے پیچھے تھا۔ سب کچھ ریکارڈ میں حرف بہ حرف درج تھا۔ اندراج نامہ پڑھتے پڑھتے خوشی سے ان کا جسم کانپنے لگا تھا اور آنکھیں شفاف پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

"کیا میں واقعی اپنے بیٹے سے ملنے جا رہی ہوں؟ وہ واقعی زندہ ہے' مجھے مل جائے گا؟ مجھے یقین کیوں نہیں آرہا۔"

ملازم کا پیش کردہ ٹھنڈے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا کر وہ اب ٹکٹکی باندھے گولڈ میڈل لیے اس پرکشش چہرے والے لڑکے کو غور سے دیکھ رہی تھیں' جس کے چہرے کا ایک ایک نقش انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ کھلی کھلی سیاہ شفاف ذہین آنکھیں' چوڑی پیشانی' گھنے سیاہ بال' کھڑی ناک کے نیچے بھینچی بھینچی مسکراتے لب..... وہ ہاتھ پھیر پھیر کر اسے محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"اب اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے مسز حیات!" وہ سلمان سبزواری کی آواز پر چونکی تھیں۔

"آپ اخبار میں اس تصویر کے ساتھ اشتہار دیں۔ ویسے تو میڈیکل کالجز سے بھی پتا کروایا جا سکتا ہے۔ اتنا لائق لڑکا ضرور ڈاکٹر بنا ہو گا مگر اس طریقے میں بہت ٹائم صرف ہو گا۔"

"جی درست کہا آپ نے اور اب مجھ میں انتظار کی مزید تاب نہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولیں "اور ابھی تو فخر حیات کو بھی یہ سب بتانا ہے' وہ سن کر کس قدر حیران ہوں گے۔"

وہ ریکارڈ کی تفصیل' مہیا کردہ فوٹو کاپی اور تصویر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اپنے شولڈر بیگ سے چیک بک نکال کر انہوں نے پانچ لاکھ کی خطیر رقم "سائبان" کے لیے لکھی تو "سائبان" کے موجودہ منتظم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دوسرا چیک انہوں نے اس شخص کے نام لکھا جو انہیں یہاں تک لے کر آیا تھا۔ "سائبان" کے سابقہ منتظم اعلا کو دو لاکھ کا چیک۔

"نہیں نہیں بیگم صاحب! مجھے اس کی ضرورت نہیں' یہ تو....."

"پلیز اسے میری خوشی سمجھیں اور میرے حق میں دعا کریں۔"

جانے سے پہلے انہوں نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر جتنے ہزار ہزار کے نوٹ تھے سب نکال کر میز پر رکھ دیے۔

"ان پیسوں سے آج "سائبان" کے تمام بچوں کے لیے اچھا کھانا اور مٹھائی منگوا دیجیے گا۔ میں ان شاء اللہ اب آتی جاتی رہوں گی۔ مجھے تو کبھی زندگی بھر اس کا احساس ہی نہیں ہوا کہ ان زندان خانوں میں پلنے والے معصوم پیاری پیاری صورتوں والے بچے ہماری توجہ اور محبت کے کتنے مستحق ہوتے ہیں۔ حالات اور تقدیر کی ٹھوکروں کی زد میں آئے یہ ننھے ننھے پھول کیسے منتظر نگاہوں سے زندگی کی ہر اس آسائش کا انتظار کرتے ہیں جو ہم یونہی اپنے بچوں کو فراہم کر دیتے ہیں اور کبھی ایک پل کو ان کے بارے میں سوچتے بھی نہیں جن کے معصوم دل بھی ہمارے بچوں جیسے ہوتے ہیں۔

اور سلمان صاحب! ہم لوگ ساری زندگی ایک ٹھوکر کے منتظر کیوں رہتے ہیں کہ یہ سبق آموز ٹھوکر ہمیں لگے اور ہمیں ان تلخ حقیقتوں کا ادراک ہو۔ ٹھوکر کے بغیر ہمیں اپنے اردگرد بسنے والے ان بے شمار انسانوں کی موجودگی کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہماری ذرا سی توجہ' محبت ان کی زندگیاں بدل سکتی ہے۔"

وہ گہرا سانس لیتے ہوئے دھول اڑاتے چھوٹے سے مٹی کے احاطے میں کھیلتے بچوں کو دیکھ کر دکھی لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"صحیح کہتی ہیں آپ۔" سلمان سبزواری سر ہلاتے ہوئے بولے۔

اور یہ کتنی بڑی خوشخبری تھی فخر حیات کے لیے' اس کا اندازہ تو رعنا حیات کو انہیں یہ ساری بات بتانے کے دوران ہوا۔ انہیں لگا فخر حیات کے چہرے کا دوران خون یک لخت بڑھ گیا ہے۔

"رعنا! کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" وہ جوش جذبات میں رعنا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ کر سرگوشی نما آواز میں بولے۔

"بالکل سچ۔ یہ دیکھیے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے پرس میں سے تصویر اور ریکارڈ نکال کر دکھانے لگیں۔

اور آج اخبار میں اشتہار دیے دوسرا دن تھا۔

ساری رات مارے بے چینی کے انہیں نیند نہیں آئی تھی' سلیپنگ پلز لینے کے باوجود۔ انہوں نے تصویر کے ساتھ انعام کی لمبی چوڑی رقم بھی رکھی تھی مگر اس کے باوجود وہ لاؤنج میں بے مقصد ٹہلے جا رہی تھیں جیسے کوئی آنے والا ہو۔

اسی وقت فون کی تیز بیل بجی تو وہ دوڑتی ہوئی فون کی طرف لپکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو فیلو کیوٹ سٹرانگ گرل بلکہ مدر" نین تارا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب عبدالمبین ہشاش بشاش لہجے میں کہتا ہوا اس کے پاس آ کر بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر عبدالمبین کو دیکھا اور ایک بجھی ہوئی پژمردہ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

"مہربانی آپ کی' ایسی بیمار مسکراہٹ سے مجھے ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہے۔ تازہ ہوا میں بیٹھنے کے باوجود جناب کے دل کی کلی کھل نہیں رہی۔ ہوں' کیسی فریش ایئر ہے خوشبودار۔" اس نے ناک کے نتھنوں سے زور سے ہوا اندر کھینچتے ہوئے کہا۔

"جب اندر کا موسم ایسا پژمردہ ہو رہا ہو تو باہر کی تازگی کیا کرے گی۔"

وہ اسی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم گاڑی میں نہیں آئے۔"

نین تارا نے کچھ چونک کر سڑک سے آگے پورچ کی طرف نگاہ کر کے پوچھا۔

"میڈم! اس شہر میں ہمارے دو پہیے کسی کام کے نہیں۔ جب تک آپ چار پہیوں پر سوار نہ ہوں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے کنوینس لازمی ہے۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔" وہ ٹانگیں پھیلا کر کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

"کیوں خیریت۔ بیٹھو گے نہیں۔؟"

"دل کے خراب موسم کے ساتھ کیا آپ کی نظر بھی خراب ہو چکی ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"بھئی! میں بیٹھا تو ہوں تمہارے اتنے پاس۔ کہو تو اور پاس آ جاؤں۔" وہ اس کے قریب جھکتے ہوئے بولا۔

"شٹ اپ....." نین تارا نے ذرا سا ہنس کر اسے ہاتھ سے پرے دھکیلا۔

"ایسے شٹ اپ پر حضور سو بار قربان جاؤں۔" وہ تالی بجا کر بولا۔

"آج کل کیا ہیجڑوں کے ساتھ زیادہ اٹھنے بیٹھنے لگے ہو۔" نین تارا اس کا انداز دیکھ کر ہنسی۔

"ہیجڑوں کا تو پتا نہیں' آج کل تو آپ کی کمپنی میں اٹھ بیٹھ رہا ہوں۔"

"اچھا..... گاڑی اندر کیوں نہیں لائے۔؟" وہ زچ آ کر بولی۔

"بھئی! جلدی میں ہوں نا۔"

"کیوں' تمہاری کہیں گاڑی چھوٹ رہی ہے۔؟"

"وہ دن بھی کبھی آ ہی جائے گا۔" نین تارا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو' کیا نینوں کے رستے دل میں قید کرو گی۔"

"مبی! تمہیں ہو کیا گیا ہے۔" وہ چند لمحوں بعد بولی۔

"کیوں' میرے کیا سینگ نکل آئے ہیں یا تمہاری طرح....." وہ شرارت سے اس کے حلیے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"شٹ اپ۔" وہ سمٹ سی گئی۔ "بہت نشہ کرنے لگے ہو کیا؟"
"بہت تو نہیں بس تھوڑا تھوڑا نشے میں ہوں۔" وہ نظریں نشیلی کر کے بولا۔
"اپنی شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں؟"
"روز دیکھتا ہوں لڑکیوں کی فون کالز اور مسڈ کالز بڑھتی جا رہی ہیں۔"
"برسوں کے بیمار لگ رہے ہو اگر اسی طرح تمہاری صحت گرتی رہی تو لڑکیاں کیا کوئی بھی منہ نہ لگائے گا تمہیں اور مام بتا رہی تھیں کہ تمہارے انڈر مافیا کے دوست کیا نام ہے..." وہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی۔
"اوہ لیو اٹ ڈیر! مام کی اوٹ پٹانگ رپورٹوں پر دھیان نہ دیا کرو۔ ان سے کہو اب ان کی عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے ادھر ادھر کن سوئیاں لینے کی نہیں اور تم بھی ان باتوں پر نہ سوچو۔ ان دنوں تمہاری صحت کے لیے مفید نہیں۔ میں چلتا ہوں۔" وہ ایک دم سے موضوع بدل کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"کہاں جا رہے ہو...؟" نین تارا کچھ حیرانی سے بولی۔ "ابھی تو تم آئے ہو بیٹھو تھوڑی دیر اور..."
"کچھ دیر تو رک جاؤ برسات کے بہانے..." وہ گنگنایا۔ "تم ذرا برسات کا انتظام کرو میں پھر آتا ہوں رکنے کے لیے۔" اس نے پھر اسے ٹالا۔
"مولی..." نین تارا نے اسے خفگی سے پکارا۔
"بھئی گھر جا رہا ہوں اماں جی سے ملنے بہت دن ہو گئے بابا صاب کے جوتے کھائے۔ باہر بھی بے چین رہا ہوں اور اب ادھر آ کر بھی مصروفیات جان نہیں چھوڑ رہیں۔ کل شام کراچی کی فلائٹ ہے میری وہاں پندرہ بیس دن لگ جائیں گے وہاں سے سیدھا اسلام آباد وہاں دیکھو کتنے دن لگتے ہیں اس لیے سوچا ہے پہلے گھر ہو آؤں۔"
"تم کچھ زیادہ ہی مصروف نہیں ہوتے جا رہے...؟" نین تارا شکایتاً بولی۔
"تو کیا کروں پھر؟" کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر نین تارا کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔
"کسی کا ہاتھ کیوں نہیں تھام لیتے تم یوں تنہا کب تک ان فضول مصروفیات میں خود کو الجھاتے رہو گے۔"
"تمہارا ہاتھ نہ تھام لوں تم ذرا بڈھے کھوسٹ شاہ جی سے ہاتھ تو چھڑاؤ۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تو نین تارا کا دل خوامخواہ زور سے دھڑکا تھا اور پلکیں لرز کر رہ گئی تھیں۔
"اور یہ فضول مصروفیات کب ہیں۔ روزی روٹی کا چکر ہے یار! تم بھی تو تنہا ہو شاہ جی کے نام کا خفیہ اسٹیکر چپکانے کے باوجود اپنی تنہائیوں کی تو کچھ خبر لو۔" اس نے نین تارا کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔
"کیا کہوں؟" وہ رو دینے کو تھی۔ "مرجانے کو جی چاہتا ہے۔"
"بھری جوانی میں اور اس عالم وحشت میں۔ نہ نہ میری جان! مریں تمہارے دشمن جو تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔" ہنس کر بولا۔
"تم کیوں مرو اپنی زندگی میں نے خود حرام کی ہے میں کیوں نہ مرجاؤں۔"
وہ سچ مچ رو پڑی۔
"نین! بری بات اب اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے تو حوصلہ بھی کرو۔ میری جان! میں ہوں نا تمہارا ہر دکھ شیئر کرنے کے لیے تمہارا دوست تمہارا مولی۔" وہ قریب آ کر محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔
"کب ہوتے ہو میرے پاس۔ ہوا کے جھونکے کی طرح آتے ہو اور پل بھر میں اٹھ کر چل دیتے ہو۔" وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔
"اوکے پرامس۔ بس گھر سے ہو آؤں اور یہ مہینہ بھر کے شوز کا پروگرام نپٹالوں پھر تمہاری قسم کم از کم دو ماہ تک کوئی اور کنٹریکٹ سائن نہیں کروں گا۔ آ کر تمہیں فل ٹائم دوں گا پکا وعدہ۔" وہ شاید اسے بہلا رہا تھا۔
"چلو شکریہ تمہارے ان بہلاووں کا۔" وہ اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے طنزاً مسکرا کر بولی۔
"پھر شک دوستی پر شک بری بات ہے۔ پریٹی فرینڈ!" عبدالمبین نے انگلی اٹھا کر گویا اسے تنبیہہ کی۔

"اوکے میں اب چلتا ہوں۔ کل آؤں گا کراچی جانے سے پہلے۔ ٹیک کیئر بائے۔" وہ کہتے ہوئے مڑ گیا۔
"مام سے نہیں ملو گے؟" نین تارا پیچھے سے پکاری۔
"کل ان شاء اللہ۔ بائے۔" وہ ہاتھ ہلاتا نکل گیا۔
"کاش میں شاہ جی کی محبت کے جال میں اس بری طرح سے نہ الجھ گئی ہوتی تو مولی تمہاری دوستی میرے لیے ایک پرائڈ ہوتی۔
Just like a pride of Love" وہ کرسی سے سر ٹکا کر خود سے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نزہت... نزہت آپی...!" معاذ کے لب بے اختیار کپکپائے تھے مگر قدم ابھی بھی اسی جگہ جمے تھے۔ نزہت کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک گہری سنجیدگی نے لے لی تھی۔ وہ فہد کی گرینی سے معذرت کر کے سست قدموں سے باہر نکل آئی۔
"نزہت آپی! آپ یہاں..." وہ اس کے پاس آنے پر محض یہی کہہ سکا۔
"آپ زندہ ہیں۔" اگلے پل اس کے منہ سے نکلا۔
"زندگی کی قید میں ہوں تو تمہارے سامنے کھڑی ہوں نا۔" وہ تلخی سے بولی۔
"اب میری سمجھ میں آیا کہ ارتضیٰ کو اسکول میں فہد کی کون سی آنٹی جوس اور اسنیکس وغیرہ کھلاتی تھیں تو وہ آپ تھیں۔" وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے معاذ کو پلک جھپکے بغیر دیکھ رہی تھی۔
"پیاسی ممتا کو کب تک بہلاووں سے ترساتی۔ خود کو تو سمجھا لیتی تھی مگر ایک ماں کے دل کو کیسے سمجھاتی۔" وہ آہ بھر کر بولی۔
"مگر آپ نے یہ کیا کیا۔ کیوں یہ حماقت کی؟" معاذ جلدی سے بولا۔
"کیا یہیں کھڑے کھڑے سب پوچھ لو گے؟" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔
"ارتضیٰ کیسا ہے؟" وہ چند لمحوں بعد بولی۔
"پتا نہیں۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔
"کیا مطلب؟"
"میں گھر چھوڑ کر آ چکا ہوں بلکہ مجھے نکال دیا گیا ہے۔" وہ اسٹیتھو اسکوپ بے چینی سے ہاتھ میں گھماتے ہوئے بولا۔
"چلیں کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔" معاذ نزہت کی کتھا سننے کو بے چین تھا۔
"ہوں۔" وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔
"ڈاکٹر معاذ! پلیز ذرا ایمرجنسی میں آ جائیے۔ ایک کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے جلدی ذرا۔" پاس سے گزرتے جونیئر ڈاکٹر عرفان نے معاذ سے کہا تو اسے مجبوراً وہاں سے ہلنا پڑا۔
"آپی! آپ کو کہیں جانا نہیں ہے۔ پلیز میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔" وہ تاکید کرتے ہوئے مڑ گیا تو نزہت اسے جاتے دیکھ کر کچھ سوچنے لگی۔
"معاذ سے رابطہ کا مطلب پھر اسی اذیت ناک صورت حال کا سامنا کرنا پھر یہ مجبور کرے گا اور میرا دل تو پہلے ہی بہانے ڈھونڈ رہا ہے ارتضیٰ کے پاس جانے کے لیے اور جو خود سے وعدہ کیا ہے کہ اب دوبارہ اس بندی خانے میں نہ جانے کا... وہ اس کا کیا ہو گا... نہیں..." وہ دیوار سے لگی سوچے جا رہی تھی۔
تقریباً پونے گھنٹے بعد معاذ روم نمبر تھری میں آیا تو فہد کا خالی بستر اور خالی کمرہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ پاس سے گزرتی نرس نے پوچھنے پر تصدیق کر دی کہ وہ لوگ بچے کو ڈسچارج کرا کے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے لے جا چکے ہیں۔

"تو زہت آپی! آپ میرا سامنا نہیں کرنا چاہتیں۔ کم از کم آپ کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ دونوں میاں بیوی کو ہر مسئلے کا ایک ہی حل نظر آتا ہے 'فرار۔ حالات سے فرار' حقیقت سے فرار۔ آخر آپ دونوں یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آپ دونوں کے مسائل کا حل فرار نہیں ہے اور یہ کب تک چلے گا۔ آپ دونوں کو احساس ہی نہیں کہ آپ کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے کی بھینٹ وہ معصوم چڑھ رہا ہے' جس کا اس سارے قصے میں کہیں کوئی قصور نہیں۔ آپ دونوں کی اناؤں کی جنگ میں اگر ارتضیٰ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گیا تو قصوروار کون ہو گا؟" وہ کھڑا کڑھتا رہا۔

"میں آپ کو یہ احساس دلا کر رہوں گا' میں ارتضیٰ کو اپنے جیسی محرومیوں بھری زندگی گزارنے نہیں دوں گا۔ وہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے کیوں یتیموں کی طرح جیے۔ میں آپ کو گھر لے جانے تک آپ کا تعاقب کروں گا۔ زہت آپی! میں آپ کو ارتضیٰ کے پاس پہنچا کر دم لوں گا۔ اب اس بلی چوہے کے کھیل کو ختم ہونا چاہیے۔ چاہے مجھے اس کے لیے کتنی ہی ذلت کیوں نہ سہنی پڑے۔"

وہ اپنے کمرے میں آ کر چھٹی کی درخواست لکھتے ہوئے دل میں ارادہ باندھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

صوفی صاحب ہاسپٹل میں ایک ہفتہ ایڈمٹ رہنے کے بعد کل شام ہی ڈسچارج ہو کر گھر آئے تھے۔ ان پر فالج کا بہت شدید اٹیک ہوا تھا اور ڈاکٹرز حیران تھے کہ اتنے شدید اٹیک کے باوجود نا صرف ان کی دماغی حالت بالکل درست رہی تھی بلکہ یادداشت کا کوئی بھی حصہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ حملے کے اثرات صرف جسم کے دائیں حصے پر پڑے تھے' وہ بھی زیادہ شدید نہیں تھے اور ڈاکٹرز پُرامید تھے کہ جتنی وِل پاور صوفی صاحب میں ہے' وہ چند ہفتوں میں ہی اپنے قدموں پر اٹھ کر چلنے پھرنے لگیں گے۔ دایاں بازو تقریباً پیرالائز ہو چکا تھا جبکہ دائیں ٹانگ بے حد کوشش کے بعد تھوڑی بہت حرکت کر رہی تھی' بروقت ہاسپٹل پہنچ جانے کی وجہ سے ان کی کافی بچت ہو گئی تھی اور اب گھر آ کر بھی وہ تیزی سے روبہ صحت تھے۔

گھر آنا تو ان کے لیے دشوار ترین لمحات میں سے ایک تھا جس کا ہاسپٹل میں سوچتے ہوئے بھی انہیں وحشت سی ہو رہی تھی۔ سونا سونا' اجڑا ہوا' خالی خالی گھر۔ ابھی تو ان کا دماغ زینب کی غیر موجودگی کو صحیح سے تسلیم نہیں کر پایا تھا کہ رابعہ بی بی ہاتھ چھڑا کر چل پڑیں' عمر بھر کا ساتھی۔ شادی کے بعد کبھی انہوں نے اپنا گھر رابعہ بی بی کے وجود کے بغیر نہ پایا تھا اور آج جب وہ دو آدمیوں کے سہارے بمشکل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو کونے میں سکڑی سمٹی آمنہ اور جویریہ تنہا کھڑی انہیں رابعہ بی بی کے چلے جانے کا ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے گھسٹتے ہوئے اندر بستر تک آئے تھے۔ اسی پل انہوں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں بہت جلد محض چند دنوں میں اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اسی رعب سے جینا ہے جو ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ صرف اور صرف جویریہ' آمنہ کی خاطر۔ انہوں نے رابعہ بی بی کے جدائی کے تکلیف دہ احساس کو بھلا کر ساری توجہ خود کو صحت مند کرنے کی طرف مبذول کر لی تھی۔

مدرسے کا ایک لڑکا ان کی خدمت پر مامور تھا' دوسرا لڑکا دو ٹائم انہیں ایکسرسائز کروانے آتا تھا جس کی مدد لینے سے انہوں نے تیسرے دن ہی انکار کر دیا تھا اور چھڑی کے سہارے دیوار کے ساتھ ساتھ خود چلنا شروع کر دیا تھا۔

"مجھے اپنی بیٹیوں کے سامنے کمزور نہیں پڑنا۔" بھیگی آنکھوں کے ساتھ دوپٹے میں چہرہ چھپائے ساتھ چلتی آمنہ کو دیکھ کر انہوں نے دل میں قطعی فیصلہ کر لیا تھا۔

اور یہ سچ اسی شام کھل کر سامنے بھی آ گیا کہ وہ صرف جسمانی طور پر کچھ لاغر ہوئے ہیں' ورنہ ان کی دماغی حالت ابھی بھی پہلے کی طرح توانا اور مضبوط ہے اور وہ ابھی بھی اپنے فیصلے پر اڑ جانے کی قوت رکھتے ہیں۔

نہ جانے کیسے عبدالمتین کو خبر ہو گئی تھی کہ اماں جی پانچ روز پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر گئی ہیں۔ بابا صاحب

کی ضدی طبیعت کا خیال اسے روکتا بھی رہا مگر پھر بھی وہ شام ڈھلے اس کابک نما گھر میں بے چین سا ہو کر چلا آیا۔

صوفی صاحب گاؤ تکیے کے سہارے آمنہ کے ہاتھوں سے یخنی کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ جویریہ پائنتی کی طرف بیٹھی ہولے ہولے ان کا دایاں پاؤں دبا رہی تھی۔

عبدالمتین چھوٹے سے صحن سے اندر آتے ہوئے کمرے کی چوکھٹ سے قدرے سر جھکا کر اندر آیا تھا۔ سیاہ ٹوپیس میں اونچا لمبا صحت مند عبدالمتین۔ ایک دم سے چھوٹا سا گھر اور بھی مختصر لگنے لگا اور کمرے میں جویریہ اور آمنہ کو ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی جہاں وہ اپنے بڑے بھائی کو بیٹھنے کے لیے کہتیں۔

بلب کی پیلی زرد روشنی میں صوفی صاحب نے سامنے آ کر کھڑے عبدالمتین کو جونہی دیکھا' ان کے حلق سے غراہٹ سی نکلی تھی۔

"تم ادھر کیوں آئے ہو؟" وہ پوری قوت سے حلق کے بل دھاڑے۔ ان کی بل کھاتی زبان ذرا سی لڑکھڑائی تھی۔ آنکھوں سے جیسے شعلے سے لپکنے لگے تھے۔

"بابا صاب! میں اماں جی۔۔۔" عبدالمتین کو اپنی ساری جرأت صوفی صاحب کی گھن گرج کے آگے ریزہ ریزہ ہوتی محسوس ہوئی۔

"کون بابا صاب؟ کون اماں جی۔۔۔؟ تم۔۔۔ تو انہیں سات آٹھ برس پہلے قبر میں اتار چکے ہو۔ اب ادھر۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا لینے آئے ہو۔۔۔ دفع۔۔۔ ہو جاؤ نکلو۔۔۔" وہ اپنی فطری آواز میں چلا رہے تھے۔ صرف زبان کی لڑکھڑاہٹ راہ میں مانع تھی۔

"بابا صاب! بس کریں اور کتنی سزا دیں گے ہمیں اپنی اولاد ہونے کی۔ ان دونوں کو دیکھیں' کیا یہ آپ کو زندہ لگتی ہیں۔ آپ نے تو ہم سب کو جیتے جی مار ڈالا۔ اگر میں نے ذرا سا اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے اس حقیقت کو زبان سے ادا کر ڈالا تو کیا برا کیا۔" عبدالمتین جیسے پھٹ پڑا۔

"تم نے بہت برا عمل کیا۔۔۔ برا ہیں نے کیے تجھے اپنا خون جگر پلا کر جوان کیا۔۔۔ تعلیم دی' پڑھایا' خواب دیکھے اور پھر تو نے ان خوابوں کو چور چور کر دیا۔۔۔ چھوٹا۔۔۔ وہ چھوٹا کیوں پیچھے رہتا' وہ بھی تیری راہ پہ چلا۔ ہمیں جیتے جی مار کر دنیا کی رنگ رلیوں میں مزے کرنے۔ اب مردوں کو اٹھانے کیوں آئے ہو' جاؤ۔۔۔" صوفی صاحب زور زور سے اپنا بایاں ہاتھ دفع دور کرنے کے لیے جھٹک جھٹک کر کہہ رہے تھے۔

"چھوڑ دیں اپنی ضد کو' کچھ نہیں دیا آپ نے ہمیں سوائے جنم دینے کے یا چند برسوں کی روٹی دینے کے۔ وہ بھی گھروں سے مانگ مانگ کر آپ نے ہمیں دیا۔ کیا ہے سوائے نفرت' طیش اور غصے کے۔ واپسی پر آپ کیا چاہیں گے جو دیا ہے' وہی پائیں گے نا!" وہ بھی دوبدو چلا کر بولا۔

"حساب کتاب کرنے آئے ہو تو کرو حساب۔" وہ آمنہ کے ہاتھوں سے منہ تک جاتا نوالہ پرے پھینک کر غصے میں چلائے۔

"میں کوئی حساب کتاب کرنے نہیں آیا۔ اماں جی چلی گئیں' رہ نہیں سکا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مردود۔۔۔ تیری ماں کا جنازہ غیروں نے اٹھایا تو بیٹا تھا' کہاں مر گیا تھا اس وقت کر حساب' بے شرم' بے غیرت!۔" صوفی صاحب چیخ رہے تھے۔

"بابا صاب! پلیز' آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" جویریہ ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر بولی۔

"اسے حساب کرنے دو' یہ۔۔۔" وہ ہانپنے لگے تھے۔

"بابا صاب! آپ کو یہاں نوکری سے بھی فارغ کر دیا گیا ہے اور اس گھر میں بھی دو تین مہینوں کی مہلت ہے۔ آپ اس تلخ حقیقت سے کیوں نظریں چرا رہے ہیں۔ آپ تینوں کو میں کہیں چھوٹا سا گھر لے دیتا ہوں' ماہانہ خرچ کو بھی معقول رقم دیتا رہوں۔"

"تو نے خود اپنے ہاتھوں سے کبھی ایک روپیہ بھی کمایا ہے۔ بے شرم! دوسروں کی کمائی ہم میں بانٹ کر سخی بنے

آیا ہے۔ تو تو خود دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر زندگی گزار رہا ہے۔ ہمیں کیا دے گا فقیر، منگتے۔" صوفی صاحب پھولے سانسوں کے درمیان ہاتھ نچا کر بولے۔

"بابا صاب! اتنا کچھ برباد ہو گیا مگر آپ کو عقل نہیں آئی۔" وہ افسوس سے گردن ہلا کر بولا۔ "ٹھیک ہے، جانے پر راضی نہیں تو یہ رقم رکھ لیں۔ آپ کے علاج اور گھر کے خرچ....."

وہ کوٹ کی جیب سے دو پھولے ہوئے لفافے نکال کر ان کے سرہانے رکھتے ہی لگا تھا کہ صوفی صاحب یوں تڑپ کر پلٹے جیسے کسی بچھو نے انہیں کاٹا ہو۔ بایاں ہاتھ گھما کر انہوں نے دونوں لفافے اٹھا کر عبدالمبین کے منہ پر دے مارے تھے۔

"چلا جا اپنی یہ زکوٰۃ اور خیرات لے کر۔ اتنا عرصہ ہم کھائے پیے بغیر نہیں جیتے رہے جو اب تیرے ان نوٹوں کی چمک میں آ جائیں گے۔ چلا جا ورنہ میں نیچے سے کسی کو بلاتا ہوں، تجھے دھکے دے کر ادھر سے نکالے۔"

وہ بے قابو ہو کر چلا رہے تھے، ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور سارا جسم لرز رہا تھا۔

"جائیں، اب کیا انہیں مار کر جائیں گے۔ نہیں چاہیے ہمیں آپ کی یہ امداد۔" آمنہ سے باپ کی حالت دیکھی نہیں گئی تو وہ چلا اٹھی۔

"رہو مرو اس گندی زندگی میں۔ میں ہی پاگل ہوں۔" وہ دونوں لفافے اٹھا کر پیر پٹختا ہوا جس طرح آیا تھا، اسی طرح نکل گیا۔

صوفی صاحب زور زور سے سانس لے رہے تھے۔

اور اگلی صبح ان کی طبیعت کچھ ہی بہتر ہوئی تھی۔ آمنہ معمول کے کاموں کے بعد کلام پاک کھول کر بیٹھی تھی کہ کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی چاپ سنائی دی۔ اس نے کلام پاک بند کر کے بے ساختہ سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ عبدالمبین مسکراتا چہرہ لیے آ رہا تھا۔ آمنہ نے خوف زدہ نظروں سے آنکھیں بند کیے صوفی صاحب کو دیکھا۔

"السلام علیکم۔" عبدالمبین نے آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی بلند آواز میں نے اس نے بالخصوص کسی کو سلام نہیں کیا تھا۔ نہ صوفی صاحب کو نہ آمنہ کو۔ دونوں کی طرف ایک مسکراتی ہوئی تازہ دم مسکراہٹ اچھالتے ہوئے آگے بڑھا۔ اگرچہ آمنہ کو اس کے چہرے پر پہلے کی نسبت تازگی اور تندرستی مفقود نظر آ رہی تھی پھر بھی اچھا لگ رہا تھا۔ آمنہ نے کلام پاک بند کر، صوفی صاحب کے چہرے کے نقوش ایکدم جیسے تن گئے۔ آنکھوں میں سرد مہری اتر آئی تھی۔

"کیسی ہو آمنہ؟" وہ خوش دلی سے کہتے ہوئے آمنہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

دوسرے پل اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ صوفی صاحب سامنے بستر پر تقریباً بے حس و حرکت پڑے تھے، وہ بھی دن کے گیارہ بجے۔ اس کی زندگی کا حیران کن واقعہ..... اس نے فوری طور پر بغور باپ کے چہرے کی طرف دیکھا جو اسے سرد مہر نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جن کا وہ بہت عرصے سے عادی ہو چکا تھا۔

"بابا صاب! خیریت۔ آپ اس طرح کیوں لیٹے ہیں؟" وہ کچھ تشویش سے بولا۔

آمنہ اب نظریں نیچی کیے کلام پاک کے زرد مٹیالے رنگ کے غلاف کو دیکھتے ہوئے آنے والے لمحوں کا کوئی تصور تراشنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں۔

"کیوں..... آئے ہو؟" اپنی زبان کی لکنت اور آنکھیں لہجے کو بے حد کنٹرول کرتے ہوئے صوفی صاحب بظاہر متحمل لہجے میں بولے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" عبدالمبین نے ان کے بے حد زرد پڑتے چہرے کو جیسے ابھی دیکھا تھا، ہاتھوں کی رنگت بھی پیلی ہو رہی تھی، سینے پر دونوں ہاتھ بے حس تھے، ان کی آنکھیں بالکل سفید ہو رہی تھیں، بے رونق۔ وہ بہت بوڑھے، بہت کمزور لگ رہے تھے۔ عبدالمبین کے دل میں درد کی ایک لہر ابھری تھی۔ اتنے

توانا، غصیلے اور شہ زور باپ کی اس کمزور حالت کو دیکھ کر۔

"تم کیوں..... آئے..... ہو؟" "آ ئے" پر آ کر ان کی زبان کوشش کے باوجود دور تک پھسلی تھی۔

"آمنہ..... آمنہ..... کیا ہوا ہے بابا صاب کو؟" وہ ان کے سوال کو دوسری بار نظر انداز کر کے آمنہ کی طرف مڑا اور بے قراری سے پوچھنے لگا۔ آمنہ کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ غلاف پر دھری مخروطی انگلیاں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ سامنے کمرے کی دہلیز پر میلے کچیلے لباس میں کھڑی جویریہ بھی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

"بولو نا، کیا ہوا ہے؟" وہ آمنہ کا ہاتھ زور سے ہلاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں اب خیال آیا یہ پوچھنے کا کہ کیا ہوا ہے؟" آمنہ خود پر جیسے ضبط کھو بیٹھی۔ زور سے چیخ کر بولی۔

"میں یہاں نہیں تھا، کیا ہوا ہے؟" وہ قدرے پست آواز میں بولا۔

"تم یہاں کبھی بھی نہیں تھے۔ تم یہاں ہوتے تو دیکھتے ہم کیسی بے کسی کی زندگی بتا رہے ہیں۔ کشائش رزق تو کبھی بھی نصیب نہیں تھا، جس نے تمہیں اس گھر سے منہ موڑنے پر مجبور کیا اور اب تو اس مختصر سے آنگن میں زندگی بھی اپنا دامن کھینچے جا رہی ہے۔" وہ کلام پاک پر ہاتھ رکھے بہت کمزور آواز میں کہہ رہی تھی۔

"جویریہ! اماں جی کہاں ہیں، زینب؟" عبدالمبین بے بس سا ہو کر بولا۔

"ہم سے کیا پوچھتے ہو بھائی! جا کر مٹی کی ڈھیریوں سے پوچھو۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے جہاں انہوں نے جا کر اپنے گھر بسا لیے ہیں۔" جویریہ حلق سے ابلنے والی چیخوں کو بمشکل دباتے ہوئے چلائی تھی۔

"کک..... کیا..... کیا بکواس..... کیا کہہ رہی ہے یہ آمنہ! بولو، بتاؤ..... اماں جی، زینی کدھر ہیں؟" اس نے آمنہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"چلی گئیں دونوں چلی گئیں۔ کیا رکھا تھا ان کے لیے اس دکھ بھری زندگی میں۔ کانٹے چنتے چنتے اماں جی کی انگلیاں فگار ہو گئی تھیں اور زینب..... زینب میں تو اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ نادیدہ آنے والے اچھے دنوں کا انتظار کرتی وہ بہت کمزور، بہت نازک اور تھوڑی سی نادان، بے صبری تھی۔ اتنی بھاری بوجھل زندگی کے بوجھ سے اس کے کندھے اتنی کم عمری میں ہی تھک گئے تھے۔ جب زندگی پہاڑ جیسا بوجھ بن کر کندھوں پر آ جائے تو کمر ٹوٹ ہی جایا کرتی ہے۔" وہ اب سسکیاں لے رہی تھی۔

"اوہ..... میرے خدا..... میرے اللہ..... یہ میں کیا سن رہا ہوں، زینی، اماں جی..... نہیں آمنہ! پلیز یہ مت کہو، یہ سب..... میں مر جاؤں گا اماں جی..... !" وہ بے اختیار اپنے بال نوچتے ہوئے سسکنے لگا تھا۔

"ہم مرے ہیں، جو تم مر جاؤ گے..... تم تو بہترین آسائشوں بھری زندگی کے سنہری محل میں رہ رہے ہو، مرنا بھی چاہو گے تو اس حسین زندگی کی کشش تمہیں مرنے نہیں دے گی۔ کبھی کسی رئیس کو خود سے اپنا گلا گھونٹتے دیکھا ہے۔"

آمنہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ صاف کیا اور سرخ آنکھوں سے بے آواز آنسوؤں سے روتے عبدالمبین کو دیکھنے لگی۔

"تم لوگوں نے مجھے کیوں نہ بتایا؟" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

"چہ خوب..... کتنے ہرکارے تھے ہمارے پاس جو تمہیں خبر کرنے کو دوڑاتے۔" وہ طنز سے بولی۔ اسے عبدالمبین پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے اماں جی کا جنازہ غیروں نے اٹھایا تھا۔ بہن کی ڈولی کو آخری کندھا دینے کو دونوں میں سے ایک بھائی بھی موجود نہیں تھا۔ ان تکلیف دہ مناظر کو یاد کرتے ہوئے آمنہ کا جی چاہا وہ عبدالمبین کا گریبان پکڑ کر چیر پھاڑ دے، اس کے جمائے خوبصورت بال اور صاف ستھرے لباس کی دھجیاں کر ڈالے، اسے کبھی معاف نہ کرے۔ اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ صوفی صاحب کو دیکھتے ہوئے اس کے سسکتے دل نے فیصلہ سنایا تھا۔

اسی وقت چارپائی چرچرانے کی آواز خاموش فضا میں ابھری۔ صوفی صاحب اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے ایک جھٹکے سے بائیں کہنی کے بل اٹھ بیٹھے۔ بائیں ہاتھ سے بستر کے دوسری جانب پڑی چھڑی اٹھائی اور بستر پر رکھ دی' پھر بائیں ہاتھ سے دونوں ٹانگوں کو باری باری چارپائی سے نیچے لٹکایا۔ چھڑی اٹھا کر بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر اب وہ بوجھل نظروں سے آنسو بہاتے عبدالمبین کو دیکھ رہے تھے۔

"اب اگر تم رو چکے اپنی ماں اور بہن کو... تو... جاؤ... یہاں سے۔" اب کے وہ کافی صاف اور بہتر آواز میں بولے تھے۔

"بابا صاب! بس کریں اور کتنا تاوان لیں گے مجھ سے اپنی اولاد ہونے کا۔" وہ بے بسی سے چلایا۔

"ہاں' یہ میری قسمت کہ تم میری اولاد ہو... اور میں قسمت بدلنے پر قادر... نہیں... مگر تم دونوں کے ہونے کو میں... فراموش تو کر سکتا ہوں۔ جاؤ... یہاں سے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر لکنت زدہ آواز میں کہہ رہے تھے۔

"نہیں جاؤں گا کیا کریں گے آپ؟" وہ آنسو پونچھ کر جارحانہ انداز میں بولا۔

"میری حالت پر نہ جانا... وہ غرائے۔ 'بہتر ہے چلے جاؤ۔" ان کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"ہاں چلا جاؤں گا مگر آپ تینوں کو یہاں سے لے کر۔" وہ پرعزم لہجے میں بولا۔

"ابھی ہم تینوں زندہ ہیں... مر... جائیں گے تو آ کر... چار اسی طرح کے چھوٹے آنسو بہا لینا۔ اب... جاؤ۔" ان کے بائیں ہاتھ کے دباؤ کے نیچے دبی چھڑی کپکپا رہی تھی' وہ اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بابا صاب! بس کریں اور کتنی خود کو اور ان معصوموں کو جینے کی سزا دیں گے۔ میں آپ تینوں کو یہاں سے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ چلو آمنہ' جویریہ۔"

وہ دونوں بہنوں کے بے تاثر چہروں کو دیکھ کر بولا جن کی نظریں صوفی صاحب پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم ہمارے کیا لگتے ہو؟" وہ اسی لہجے میں چلائے تھے جس میں پہلے... لفظوں کی لہریں دور دور تک پھیل کر بھنور سا بناتے ہوئے اپنا مکمل صوتی تاثر قائم نہیں کر سکی تھیں۔

"بابا صاب! میں آپ کا بیٹا ہوں۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"تم میرے بیٹے نہیں ہو۔ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ دو بیٹے تھے' دونوں بھری جوانی میں مر گئے۔ تم... کون ہو؟"

ان کا لہجہ' آنکھیں' لفظ اور لفظوں کی ادائیگی اتنی اجنبی تھی کہ عبدالمبین کو شدید غصے کے باوجود رونا آ گیا۔ یہ وہ بابا صاب تو نہیں تھے جن کی ایک کڑک دار آواز سے اس کا خون خشک ہو جاتا تھا۔

"بابا صاب! مجھے معاف کر دیں۔ اگر میں نے آپ کی مرضی کے برخلاف کچھ کیا ہے... خدا کے لیے میرے ساتھ چلیں۔" وہ اٹھ کر ان کے پاس آیا اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دو زانو بیٹھتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولا۔

"جب ہمارا... تم سے کوئی تعلق... ہی نہیں تو تمہارے ساتھ... جانے نہ جانے کا کیا سوال؟" وہ بیگانگی کی انتہا سے بولے۔

"بابا صاب! اتنی ضد' اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ پلیز چلیں' مجھے معاف کر دیں۔ سوچیں' آپ اس حال میں ہیں' ان دونوں کا کیا بنے گا' کون ان کی حفاظت کرے گا۔" وہ انہیں حالات کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

"میرا اللہ... جو بڑا طاقتور ہے... ہر کمزور کی طاقت... اس کے بعد میں... جس دن میں مر جاؤں... آ کر بے شک... انہیں لے جانا' مگر ابھی تم یہاں سے... دفع ہو جاؤ' چلے جاؤ... جاؤ۔"

وہ زور زور سے اپنا بایاں ہاتھ اسے پرے دھکیلنے کے لیے ہوا میں لہرا رہے تھے' اتنے میں ہی ان کا لاغر جسم کانپنے لگا تھا۔ منہ کے دہانوں سے رال سی نکلنے لگی تھی۔

"بابا صاب! پلیز..." وہ لاچاری سے بولا۔

"جاؤ... جاؤ... میں تمہاری شکل نہیں... دیکھنا... جاؤ... آمنہ! میں مر جاؤں گا تو بھی اس مردود کے

ساتھ... نہ جانا۔ اس نے میرا نام بیچا... میرے عمامے کی حرمت... بھرے بازار میں گا گا کر... فروخت کی۔ یہ بیوپاری ہے... دنیا کے مال کا۔ یہ میرا بیٹا نہیں' یہ تمہارا بھائی نہیں۔ یہ بیوپاری ہے' یہ دنیا کی خاطر سب کچھ بیچ دے گا۔ اپنا جسم' اپنی آواز' آنکھیں' چہرہ' عزت... غیرت... یہ تمہیں بھی بیچ دے گا۔ سوداگر... جھوٹا... فراڈیا' جاؤ..."

وہ زور زور سے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر ہذیانی انداز میں بول رہے تھے۔ آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں اور منہ سے رال بہنے لگی تھی۔ ان کے سانسوں کا زیر و بم بے ہنگم ہوا جا رہا تھا۔

"عبدالمبین! جاؤ یہاں سے..." آمنہ ان کی حالت دیکھ کر چلائی اور کلام پاک تخت کے سہارے رکھ کر بستر پر گرتے ہوئے صوفی صاحب کی طرف لپکی۔

"آمنہ! میں بابا صاب کو اور تم لوگوں کو اس حالت میں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔ میں ڈاکٹر کو..."

"ہماری بہن اس سے بری حالت میں بغیر علاج کے مر گئی' اماں جی بغیر کسی دوا کے چپ چاپ اذیتیں سہہ کر مر گئیں۔ اس وقت تو تمہیں خیال نہ آیا کہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ اب کیا کرنے آئے ہو' جاؤ یہاں سے۔"

وہ صوفی صاحب کو سہارا دیتے ہوئے بستر پر لٹانے لگی۔ انہوں نے پوری قوت سے آمنہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اسے کہو' دفع ہو... ہمیں اس کی خیرات نہیں چاہیے۔ جائے یہاں سے میرے سامنے سے ہٹ... جاؤ۔"

انہوں نے پوری طاقت سے بائیں ٹانگ اٹھا کر عبدالمبین کو ٹھوکر لگائی تھی۔ ٹھوکر عبدالمبین تک تو نہ پہنچی مگر ان کا اپنا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

"جاؤ عبدالمبین! کیا انہیں مار کر جاؤ گے... چلے جاؤ' ہمیں کہیں نہیں جانا تمہارے ساتھ۔ کبھی بھی نہیں۔ اگر ہمارے بابا صاب تمہارے ہو... فیض یاب نہیں ہو سکے تو ہم بھی کبھی تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے۔ ہمیں اپنے نصیبوں کے ساتھ جینے دو... تم جاؤ اپنی رنگ و بو کی دنیا میں... چلے جاؤ۔"

وہ پھر سے صوفی صاحب کو کندھوں سے پکڑ کر لٹا رہی تھی مگر وہ لیٹنے پر آمادہ نہیں تھے۔

"آمنہ! انہیں ڈاکٹر کی' اچھی کیئر کی ضرورت ہے۔ یہ تو بیمار ہیں' تم سمجھ سکتی ہو۔ بے جا ضد نہ ان کی صحت کے لیے اچھی ہے' نہ تمہارے لیے۔" وہ نرم لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا۔

"تمہیں آج پتا چلا' انہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے عبدالمبین! یہ تو بہت سالوں سے بیمار ہیں مگر تمہارے خوددار باپ نے کبھی کسی کے آگے دامن نہیں پھیلایا۔ آج تمہاری حرام کی کمائی کا علاج کیسے قبول کر لیں گے۔ ڈاکٹر' دوا جس کی بھی ضرورت ہوگی' ہم خود کر لیں گے۔ نہ ہمیں' نہ بابا صاب کو تمہاری ضرورت ہے۔ بہتر ہے' ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔" آمنہ پر جیسے کوئی جنون طاری ہو گیا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو' مار دو گی انہیں گھر میں رکھ کر۔" وہ غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا۔

"مر جائیں گے تو تمہیں زحمت نہیں دیں گے۔ تمہارے مشاغل میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔"

"میں جا رہا ہوں' ڈاکٹر کو لینے۔" وہ کہتے ہوئے مڑا۔

"تمہیں شاید عزت سے جانا پسند نہیں۔ آج تمہیں یہ دروازہ کھلا مل گیا ہے۔ دوبارہ نہیں ملے گا۔"

صوفی صاحب بہت کمزور آواز میں بولے تھے۔ عبدالمبین نے ایک تاسف بھری نظر صوفی صاحب اور آمنہ پر ڈالی۔ دونوں ہی کی آنکھوں میں اس کے لیے شدید بیزاری کے عکس نمایاں تھے' اسے لگا۔ اب کچھ بھی کہنا لاحاصل ہوگا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ جویریہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر سسکیاں دباتی اندر بھاگ گئی۔ اسے آمنہ سے ایسی سنگ دلی کی توقع نہیں تھی۔ آمنہ اب صوفی صاحب کا سینہ سہلا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسی شام عصر کے بعد کلثوم بی بی آ گئی۔

صوفی صاحب صحن میں ایک طرف چھڑی کے سہارے' دوسری طرف آمنہ کا سہارا لیے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ایک لمبے وقفے کے بعد اٹھائے جانے والے قدم کے دوران وہ کس اذیت سے گزر رہے تھے' وہ ان کے چہرے سے مترشح تھی۔ کلثوم بی بی سلام کرکے تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔ صوفی صاحب بمشکل گھسٹتے ہوئے اپنے بستر پر آبیٹھے۔

"اب تو آپ اللہ کے فضل سے بہت بہتر معلوم ہو رہے ہیں۔" اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"اللہ کے فضل سے۔" وہ تکلیف ضبط کرکے دانت بھینچتے ہوئے بمشکل بولے۔

"آمنہ! چائے رکھو۔" انہوں نے کمرے کی طرف مڑتی آمنہ سے کہا۔ جوریہ تو عبدالمبین کے جانے کے بعد سے کمرے سے ہی نہیں نکلی تھی۔ ساری دوپہر اس نے روتے گزار دی تھی۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ آمنہ نے بھی اسے نہیں چھیڑا تھا۔ لب بھینچے چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگی رہی۔

"بہت شکریہ صوفی صاحب! میں ابھی چائے پی کر ہی آرہی ہوں۔" وہ فوراً ہاتھ اٹھا کر آمنہ کو روکتے ہوئے بولی۔

"میں بنا لیتی ہوں۔" آمنہ نے دہلیز پر کھڑے کھڑے تکلفاً کہا۔

"نہیں بیٹی! شکریہ۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے اور تمہارے بابا صاب کو صحت دے کہ تم دونوں کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش کرے' ساتھ خیریت کے ساتھ۔"

اس نے گویا صوفی صاب کے دل کی بات چھیڑ دی تھی جو وہ کئی دنوں سے کلثوم بی بی کو بلا کر کہنا چاہ رہے تھے۔ آمنہ آہستگی سے اندر چلی آئی۔ جوریہ سوجی آنکھوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھی تھی' بے حد چپ اور غمگین۔ آمنہ کو اس پر ترس بھی آیا اور پیار بھی۔

"کھانا لاؤں تمہارے لیے؟" جوریہ نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ بھی خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ کر سرہانے رکھی کتاب کے اوراق الٹنے پلٹنے لگی۔

"بیگم عثمانی بہت دنوں سے نہیں آئیں۔" دونوں کا دھیان باہر ہونے والی گفتگو پر خود بخود لگ گیا۔

"یہی تو میں بتانے آئی ہوں' وہ اپنی بیٹی کے سلسلے میں کل شام کی فلائٹ سے دبئی چلی گئی ہیں۔" کلثوم بی بی نے گلا صاف کرکے جواب دیا۔

"کتنے دن رہیں گی؟" صوفی صاحب چند لمحوں بعد بولے۔

"اللہ بہتر جانتا ہے' ویسے مجھے تو دو یا تین ہفتوں کا کہہ کر گئی ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں مہینہ لازمی لگ جائے گا۔"

"مگر وہ تو اسی ماہ رخصتی لینا چاہ رہی تھیں۔" صوفی صاحب کچھ بے چینی سے بولے۔

"اسی ماہ۔۔۔" کلثوم بی بی اچنبھے سے بولی۔ "ابھی تو اللہ بخشے رابعہ بی بی کو گزرے دو ہفتے ہوئے ہیں' مرحومہ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔ ابھی چالیسویں تک تو میرا خیال تھا کہ آپ یہ ذکر بھی نہیں چھیڑیں گے۔" وہ دل کی بات کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"حدیث' فقہ' دین کی کسی بھی کتاب میں چالیسویں' دسویں' گیارہویں کا حقیر سا بھی تذکرہ موجود نہیں۔ یہ سب بدعتیں ہیں' جو بے حد خاموشی سے ہمارے دین کا۔۔۔ حصہ بن گئی ہیں۔ دین سے تھوڑی بہت واقفیت۔۔۔ کی بنا پر میں ان کو نہیں۔۔۔ مانتا۔"

وہ بہت آہستگی سے رک رک کر بول رہے تھے۔ کلثوم بی بی ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اندر بیٹھی آمنہ اور جوریہ کے دل یکدم دو ہفتے پہلے گزری ماں کے لیے بے تحاشا اداس ہو گئے۔ جوریہ تو ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی۔

"آپ نے جوریہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" چند لمحوں کی خاموشی کو کلثوم بی بی کے سوال نے توڑا۔

"ابھی میں۔۔۔ آمنہ کے فرض۔۔۔ سے فارغ ہو جاؤں تو۔۔۔"

"میں نے تو پہلے بھی آپ سے ذکر کیا تھا۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

"کیا؟"

"سرمد عثمانی کا بھائی سعد عثمانی ماں کے ساتھ ہی دبئی سے آئے گا۔ اگر آپ اس کے بارے میں سوچ لیتے تو دونوں کی اکٹھے رخصتی کرا لیتے۔"

جوریہ رونا دھونا بھول کر کلثوم بی بی کے پیش کردہ نئے "فتنے" کو سننے لگی۔ یہ بات آمنہ کے لیے بھی حیران کن تھی۔

"کلثوم بی بی! وہ لوگ انجان لوگ ہیں۔۔۔ پہلے۔۔۔ میں بڑی کا کرلوں تھوڑا۔۔۔ ان کے طور طریقوں کا۔۔۔ پتا چل جائے۔۔۔ اچھے لگے تو مجھے جوریہ کے لیے زیادہ سوچنا نہیں پڑے گا۔ سرمد اچھا لڑکا ہے' اس کا بھائی۔۔۔ کیسا ہے میں نہیں جانتا۔ یوں اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا۔" وہ لفظ سنبھال سنبھال کر بول رہے تھے پھر بھی قرینے سے ادائیگی محال لگ رہی تھی۔

"ملیں گے تو آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ سرمد سے بھی اچھا ہے۔ باہر سیٹل ہے۔ اپنا گھر نوکری ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ بہرحال آپ کی مرضی جیسے ہی بیگم عثمانی واپس آتی ہیں' میں ان سے کہہ کر دو چار دنوں میں ہی کوئی بھی تاریخ رکھوا لوں گی۔"

"بہت شکریہ بہن!"

"نہیں صوفی صاحب! میری اپنی بچیاں ہیں پھر آپ اس قدر نیک اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ آپ کے کسی کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔" وہ انکساری سے بولی۔

"بس جتنی جلدی ہو سکے۔۔۔ مجھے یہ بھی جلد خالی۔۔۔ کرنا ہے۔ نئے امام صاحب آچکے ہیں۔۔۔ اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے بچوں کو بلوا لیا ہے' اس لیے۔۔۔ جتنی۔۔۔ جلدی ہو اچھا ہے۔" پھر ٹھہر ٹھہر کر انہوں نے طویل جملے بولے۔

"تو آپ کہاں جائیں گے؟" کلثوم بی بی کچھ حیرت سے بولیں۔

"میں۔۔۔" وہ غالباً ہنسے تھے۔ "میرا کیا ہے' پتا نہیں دونوں کو رخصت کرکے۔۔۔ اگلی گھڑی جیتا بھی ہوں یا نہیں۔"

"اللہ نہ کرے صوفی صاحب! آپ کی عمر دراز ہو۔ اللہ آپ کا نیک سایہ ہم پر قائم رکھے پھر بھی آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"گاؤں۔۔۔ چلا جاؤں گا۔۔۔ میرے بڑے اچھے دوست ہیں ادھر ماسٹر صاحب۔۔۔ بیوی کو رخصت کرکے۔۔۔ وہ بھی میری طرح چھڑے چھانٹ۔۔۔ ہو چکے ہیں۔ خوب گزرے گی ہم دونوں کی۔"

آمنہ نے جوریہ کی طرف دیکھا۔ صوفی صاحب کے اس ارادے کی دونوں کو خبر نہیں تھی اور یوں بھی صوفی صاحب نے اپنے ارادوں کی خبر اپنے سوا کسی کو نہیں ہونے دی تھی۔

کلثوم بی بی شاید جا چکی تھی۔ باہر اب مکمل خاموشی ہو چکی تھی مگر جوریہ کے اندر جیسے بے تحاشا شور جاگ اٹھا تھا۔ محبت کے اولین دنوں کی وہ خوشبودار کونپل جو ابھی کھلی بھی نہیں تھی کہ اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ وہ رات اس کے دل میں پوری جزئیات کے ساتھ دھڑکنے لگی' جب صوفی صاحب نے جلیل کو مار مار کر ادھر سے نکالا تھا۔ جوریہ آنکھیں بند کیے دل کے بند دریچوں میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آمنہ خاموشی سے اٹھ کر چائے بنانے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"کم از کم آپ کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا زہت آپی! آپ نے مجھے بھی غیر سمجھا' ان جیسا؟"

معاذ"زہت کے سامنے بیٹھا شکوہ آمیز لہجے میں بولا۔ پورے دن کی جدوجہد کے بعد وہ زہت کا ایڈریس حاصل کرپایا تھا۔

"غیر تو ہر وہ چیز ہوتی ہے جو اپنے من سے باہر ہو۔" وہ لبوں میں بڑبڑائی' معاذ قطعاً نہیں سمجھا۔

"پلیز مجھ سے پہیلیوں میں بات مت کیجئے گا۔ مجھے بتائیں آپ نے ایسا کیوں کیا؟" وہ خاصی بے تابی سے بولا۔ کچھ عرصہ اس راز کی پرتیں از خود کھولنے کی اس نے سعی کی تھی مگر کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

"پہیلی۔" وہ ہنسی۔ "زندگی تو خود ایک پہیلی ہے۔"

"اگر زندگی ایک پہیلی ہے بھی تو بھی آپ نے اسے مزید الجھا کر نہ سلجھنے والی بجھارت بنادیا ہے۔"

"صحیح کہا تم نے' میں اس پہیلی کے تانوں بانوں میں خود ہی الجھ کر رہ گئی ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"میں آپ سے پوچھ رہا ہوں' آپ نے ایسا کیوں کیا؟ شہباز بھائی کا سلوک کچھ نیا تو نہیں تھا۔ اتنے معصوم چھوٹے سے بچے کو چھوڑتے ہوئے آپ کا دل ذرا بھی نہیں لرزا۔" معاذ کی بات پر زہت نے تڑپ کر دیکھا۔

"یہ دل ہی تو خانماں برباد ہے۔ جو کسی طور ارتضیٰ کے معاملے میں مجھ سے سنبھل نہیں پایا' ورنہ شاید تم مجھے کبھی نہ ڈھونڈ پاتے۔"

"ڈھونڈ تو میں نے آپ کو تب بھی لینا تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اسے میری خود غرضی کہہ لو۔ ارتضیٰ کی محبت نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "کیا تمہیں میرے مرنے کا یقین نہیں آیا تھا۔"

"شروع کے دنوں میں مجھے یقین آگیا تھا مگر پھر بعد میں جوں جوں آپ کے جانے سے پہلے کے دنوں میں آپ کے رویے' لہجے اور باتوں پر غور کرتا رہا۔ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ آپ کی گمشدگی حادثہ نہیں بلکہ طے شدہ منصوبہ تھا۔"

"منصوبہ..... ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔ "بہت کچھ آدمی سوچتا ہے' کر بھی گزرتا ہے مگر ایسا ہو نہیں پاتا کیونکہ اللہ کو جو منظور نہیں ہوتا۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"میں نے شہباز خان کے رویے اور ان کے سلوک سے سمجھوتہ کرلیا تھا پھر ارتضیٰ میرے پاس ان برے دنوں میں خدا کی طرف سے بہت خوبصورت تحفہ بن کر آیا تھا۔ میں تو باقی کی زندگی بھی اسی کے سہارے بڑے آرام سے گزار سکتی تھی اور تم گواہ ہو میں گزار رہی تھی۔ میں نے یہ تکلیف دہ واقعہ بھلا کر اس نئی زندگی میں گم ہو جانا چاہا مگر سب کچھ من چاہا تو نہیں ہوتا اور میرے ساتھ تو یہ شروع سے ہو رہا تھا۔ ارتضیٰ کی سالگرہ آنے والی تھی' تمہیں یاد ہے نا؟"

"میں بھلا سکتا ہوں ان دنوں کو۔ آخری بار آپ میرے ساتھ ہی تو اس دن شاپنگ کے لیے گئی تھیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اس سے پہلے تقریباً ڈیڑھ دو ماہ پہلے جب پھپھو کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ پانچ دن ہاسپٹل بھی رہ کر آئیں' وہ گھر آچکی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ میں نے جی جان سے ان کی خدمت کی تھی۔ اپنے کسی مفاد یا لالچ میں نہیں بلکہ ان کی محبت میں پھر میرے اندر کا احساس کہیں نہ کہیں مجھے پن کرتا رہتا کہ اس بوڑھی بیمار عورت کا بیٹا جو اسے اپنی اولاد میں سب سے پیارا ہے' محض میری وجہ سے اس سے دور ہے۔ پھپھو بھی ان دنوں بہت چپ چپ رہنے لگی تھیں۔ مجھ سے تو خصوصاً بات کرنے سے گریز کرتیں۔ ان کا یہ گریز مجھے اور اپنی نظروں میں مجرم بنائے جاتا۔ ایک شام میں اسی ادھیڑبن میں الجھی بیٹھی تھی' جب اظہر بھائی میرے پاس آئے۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد انہوں نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہا کہ ان کے گھر کی یہ حالت محض میری وجہ سے ہو گئی ہے۔ امّ جان کا بار بار ہاسپٹل جانا' شہباز کا ان سے اس قدر دور ہو جانا کہ وہ اب مہینوں انہیں فون نہیں کرتا۔ امّ جان کی بیماری کو اور بڑھا رہا ہے اور آخری بات جو انہوں نے مجھ سے کہی۔ میری

برداشت سے باہر تھی۔

"زہت! تم میری بہن ہو پھر بھائی کے رشتے سے ہماری بھابھی بھی' ہمیں جی جان سے عزیز ہو اور بھی عزیز تر ہو تیں اگر شہباز تمہارے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہا ہوتا۔

کل شام کو شہباز کا میرے پاس فون آیا تھا امّ جان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے تو میں نے کہا کہ تم خود امّ جان کو فون کرو' وہ تمہارے فون کی منتظر ہیں تو اس نے صاف لفظوں میں مجھ سے کہا کہ بھائی جان' جب تک وہ بدکردار عورت وہاں موجود ہے۔ میں نہ وہاں فون کروں گا' نہ امّ جان سے ملنے آؤں گا۔ مجھے اس سے شدید نفرت ہے تو میں نے کہا۔ تم اسے اس قدر ناپسند کرتے ہو تو اسے طلاق دے دو تو اس نے کہا کہ وہ امّ جان کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا جن کے کہنے پر زبردستی اس نے زہت کو اپنایا تھا۔" ان کی باتیں میرے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ میں اپنے آنسوؤں پر بند باندھے انہیں سن رہی تھی' جب انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"زہت! تم یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں دور بہت دور۔ تمہیں جتنی رقم' جتنا پیسہ چاہیے میں دے دیتا ہوں مگر تم یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ بھی اس طرح کہ امّ جان کو خبر نہ ہو۔ امّ جان کی شہباز میں جان ہے' یہ تم بھی جانتی ہو۔ وہ اس کو کچھ دن اور نہیں دیکھیں گی تو مر جائیں گی اور ان کا خون تمہارے سر ہوگا۔" اتنی بڑی بات وہ آرام سے کہہ گئے اور اس روز بھی میری خاموش درد بھری دعا کے باوجود نہ زمین میرے لیے شق ہوئی' نہ آسمان ٹوٹ کر گرا۔ میں ڈھیٹوں کی طرح سب کچھ سنتی چلی گئی۔

"ہم..... میں کہاں جاؤں۔" ان کی اتنی اچانک فرمائش مجھے پوری کرنا محال نظر آئی تو میں سسکتے ہوئے بولی تھی۔

"کہیں بھی چلی جاؤ' کسی دارالامان میں' کسی ادارے میں۔ تمہیں یہاں پناہ نہ ملتی تب بھی تمہارا ٹھکانہ ایسا ہی کوئی ادارہ ہونا تھا۔ دیکھو' ہمارا ایک اسٹیٹس ہے' معاشرے میں ایک باعزت مقام ہے اور ہمارا بھائی بہت غیرت والا ہے۔ ماں کی محبت میں تم سے شادی تو کر بیٹھا ہے مگر اسے نبھا نہیں پا رہا اور نبھا سکتا بھی نہیں۔ تمہیں بھی اتنے دنوں میں اس کا اندازہ ہو چکا ہے۔ تم میں اگر تھوڑی سی بھی غیرت ہے تو....."

"بس کریں اظہر بھائی! مجھے اور کتنا پستی میں گرائیں گے۔ چلی جاؤں گی میں یہاں سے ارتضیٰ کو لے کر۔" میں رو پڑی۔

"خبردار ارتضیٰ کا نام نہیں لینا۔ تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتیں۔" وہ غرا کر بولے۔

"مجھے آپ لوگوں کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک طرف تو مجھے بدکردار سمجھتے ہیں' دوسری طرف اگر ارتضیٰ کا وجود میری پاکیزگی کا گواہ بنتا ہے تو آپ اس گواہی کو بھی تسلیم نہیں کرتے مگر ارتضیٰ کے وجود سے بھی منکر نہیں ہوتے۔ آخر ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا ہے مجھ سے جو کسی کی بھی نظر میں قابل معافی نہیں۔ کیا آپ سب کو اللہ کا وجود بھول گیا ہے۔" میرے آنسو بے قابو ہو گئے تھے۔

"دیکھو' تمہارے یہ آنسو ہم دو ڈھائی سالوں سے دیکھ رہے ہیں' اب مزید بہانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں سے جاؤ گی تو شہباز آئے گا' ورنہ اس کی بوڑھی ماں یونہی اس کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے گی پھر تم اس الزام سے بچ نہیں سکو گی اور جو ارتضیٰ کو اپنے ساتھ لے جاؤ گی۔ ذرا بڑا ہوا تو اس کے سوالوں کے کیا جواب دو گی کہ اس کے باپ نے تمہیں کیوں نہ بسایا؟ اس کے ساتھ تم جہاں بھی جاؤ گی' وہ تمہارے کردار کے لیے ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا۔ سوچ لو اور فیصلہ کرلو تمہارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔"

وہ میرے لیے زندگی کے سب دروازے بند کرتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

پھر میں نے اس کے بعد بہت سوچا' بہت سارے دن بہت ڈھٹائی سے رہنا بھی چاہا مگر امّ جان کا رویہ مجھ سے بہتر نہ ہوا' نہ شہباز خان کا کوئی فون آیا۔ آرمی سے انہوں نے ریزائن لے لیا تھا۔ ان کی خود ساختہ جلاوطنی ماں کے لیے احتجاج کا ایک طریقہ تھا۔

ام جان کی بے قراری ڈھکی چھپی نہیں تھی اور نہ ان کی آنکھوں سے جھانکتی بیزاری جو مجھے دیکھتے ہی نمایاں ہو جاتی۔

بالآخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس روز جب میں تمہارے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تمہیں باہر ٹھہرا کر میں شاپنگ مال کے اندر گئی۔ میرا ارادہ کچھ بھی خریدنے کا نہیں تھا۔ میں شاپنگ مال کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر رکشے میں بیٹھ کر ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ بم بلاسٹ ہو گیا اور یوں خدا نے میرا بھرم رکھ لیا۔ یقیناً سب نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہو گا مگر سب کے سمجھ لینے سے کوئی جیتا جاگتا انسان مردہ نہیں ہو جاتا۔

میں چند ماہ ایک دارالامان میں رہی۔ وہیں میری فہد کی کریجی سے ملاقات ہوئی۔ انھیں اپنی مونٹیسوری کے لیے ایک پُرخلوص اور محنتی ایڈمنسٹریٹر کی ضرورت تھی۔ دو چار ملاقاتوں میں ہی اللہ نے ان کا دل میری طرف مائل کر دیا۔ انہوں نے مجھے جاب بھی دی اور یہ چھت بھی' اس دن سے میں ادھر ہی ہوں۔ جب جب ممتا کی بے قراری بے چین کرتی تھی' مکمل نقاب کر کے دور سے ارتضیٰ کو دیکھ آتی تھی۔ جب بھی تم اسے گھر سے باہر لے کر نکلتے تھے پھر جب اس کا اسکول شروع ہوا تو بھی اسے تقریباً روز جا کر دور سے دیکھ آتی تھی۔ پس چند دنوں سے دل پر اختیار نہ رہا تو اسے اسنیکس' جوس دینے کے بہانے اپنی پیاس بجھانے لگی۔ جس کے نتیجے میں' میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ کیسی ہیں ام جان؟" وہ ساری تفصیل کے اختتام پر بولی۔

"پتا نہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

"ہاں تم نے شاید بتایا تھا کہ تم گھر چھوڑ آئے ہو۔ کیوں؟"

"پچھتاؤں گا۔" وہ ٹال گیا۔ "آپ نے اب کیا سوچا ہے؟"

"کیا سوچنا ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں۔"

"کیا؟"

"ارتضیٰ کا کیا قصور؟ نہ اس کے پاس باپ ہے' نہ ماں۔"

نزہت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انگلیاں چٹخاتی رہی۔

"آخر اظہر بھائی نے ایسا کیوں کیا؟" چند لمحوں بعد معاذ بولا۔

"اظہر بھائی اگر ایسا نہ کرتے تو مجھے تعجب ہوتا۔" وہ سر ہلا کر بولی۔

"پھر بھی۔"

"ازل سے زر' زمین انسان کی دشمن رہی ہے۔ شہباز میری وجہ سے پہلے ہی نام نہاد غیرت کے ہاتھوں اپنا منہ چھپائے پھرتے تھے۔ اظہر بھائی کے اکسانے پر میں ایک بار پھر گھر چھوڑ آئی۔ دوسرے لفظوں میں پھر بھاگ گئی۔ قدرت نے اس پر میری موت کا پردہ ڈالنا چاہا مگر مجھے یقین ہے اظہر بھائی جیسے شخص نے اس پردے کو بھی بہت سے رنگ دیے ہوں گے۔ شہباز جیسا شخص جو اپنی انا کے بے در گنبد میں مقید ہے' میرے جانے کا سن کر اور بھی نظر بند ہو کر رہ گیا ہو گا۔ سارا بزنس' پلازے کے کرائے وغیرہ سب کچھ دونوں بھائیوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا۔ اظہر بھائی نے اپنے حصے کے علاوہ شہباز کے نام کی ایک مارکیٹ تو سیل بھی کر دی تھی۔ اسی پاور آف اٹارنی کے تحت جو شہباز نے جانے سے پہلے ان کے نام کی تھی۔"

"آپ کے اندازے کافی حد تک درست ثابت ہوئے۔ اظہر بھائی اس کے علاوہ بھی بہت کچھ بیچ باچ کر سمیٹ چکے ہیں۔" معاذ بولا۔ "شاید وہ اب یہاں ہوں بھی یا نہیں۔ ان کا بہت عرصے سے امریکہ سیٹل ہونے کا پلان تھا۔"

"ہوں۔" نزہت کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"نزہت آپی! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"شہباز خان اب آپ کے دل کے کون سے حصے میں ہیں؟"

"حصے۔۔۔" وہ مسکرائی۔ "دل ہی ختم ہو گیا تو کیسے حصے بخرے۔"

"پھر بھی۔"

"نہیں معاذ! اب کچھ نہیں بچا۔ اتنی "عزت افزائی" کے بعد کوئی عورت اس مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جو بارہا اسے سب کے سامنے بدکردار کہہ چکا ہو۔ میں اس موضوع پر اس شخص کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ تم پلیز کھانا کھا کر جانا' میں کھانا لگواتی ہوں۔" وہ بات ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ معاذ اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

کھانا کھا کر وہ نزہت سے پھر آنے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔

"مجھے شاید ادھر بار بار آنا پڑے۔ ہو سکتا ہے نزہت آپی کے دل میں اس پتھر دل انسان کی محبت کی کوئی چنگاری کہیں دبی پڑی ہو۔" وہ سڑک کے کنارے کھڑا سوچ رہا تھا۔

"کیا فائدہ اس چنگاری کو کریدنے کا۔ اگر شہباز بھائی نے ایک بار پھر اسے رسوا کر دیا تو یہ عورت شاید تیسری بار جی نہ پائے پھر اس کی موت کی ذمہ داری معاذ میاں تمہارے کندھوں پر ہو گی۔" اسے فوری دوسرا خیال آیا تھا۔

"کچھ بھی ہو' مجھے کوشش کرنی ہے۔ ارتضیٰ کے لیے' ان دونوں کی محبت کا قرض چکانے کے لیے ایک آخری بھرپور کوشش۔" سامنے سے آتے رکشے کو ہاتھ دیتے دیتے بے اختیار اس کی نظر سامنے سے گزرتی گاڑی پر پڑی۔ ایک لمحے کو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

"مجھے کم از کم ایک دعوت کی چھٹی تو لینی پڑے گی۔" رکشہ جونہی روانہ ہوا' وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پہچانا آپ نے مجھے۔" فخر حیات سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے شہباز خان نے پوچھا۔

"آپ۔۔۔؟" فخر حیات نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔ "چہرہ آپ کا اچھا خاصا دیکھا بھالا محسوس ہو رہا ہے۔ ہم پہلے ایک سے زائد بار مل چکے ہیں۔"

انہوں نے شہباز خان کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ رعنا حیات پہلے ہی سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک روز پہلے شہباز خان نے رعنا حیات کو فون کر کے ان کے گمشدہ بیٹے کے بارے میں اطلاع دینا چاہی تھی اور ان سے گھر آنے کی اجازت لی تھی۔ رعنا حیات تو اسی وقت ان سے ملنا چاہ رہی تھیں مگر شہباز خان نے کہا کہ وہ فخر حیات کی موجودگی میں یہ ملاقات کرنا چاہ رہے ہیں جو ایک بزنس ڈیل کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے اور آج شام ہی لوٹے تھے۔ رعنا حیات بھی شہباز خان کو دیکھ کر کچھ چونکی تھیں مگر اس وقت ان کا ذہن صرف اور صرف اپنے بیٹے کے بارے میں ملنے والی اطلاع میں اٹکا ہوا تھا جو شہباز خان نے انھیں فراہم کرنا تھی۔

"جی ہم دو بار مل چکے ہیں۔ کیا بیگم صاحبہ! آپ نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔" وہ گم صم سی بیٹھی رعنا حیات سے مسکراتے ہوئے بولے تو رعنا حیات نے ہلکی سی مسکراہٹ پر اکتفا کرتے ہوئے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا میں آپ کو ہنٹ دیتا ہوں۔ میں آپ کی کوئی گمشدہ چیز آپ تک پہنچانے آیا تھا۔"

"او یس' آئی ری ممبر۔" فخر حیات نے خوشی سے چٹکی بجائی۔ "کیپٹن شہباز خان۔۔۔ ہے نا۔"

"جب ہم لاسٹ ٹائم ملے تھے تب میں واقعی کیپٹن تھا۔ اب اگر میں آپ سے پانچ برس بعد مل رہا ہوں تو کم از کم میجر تو ہو چکا ہوتا' اگر میں نے ریزائن نہ دے دیا ہوتا ۔۔۔۔ آپ نے مجھے ٹھیک پہچانا۔"

"مگر بھئی! آج تو میرا والٹ میری جیب میں ہے۔ ایئر پورٹ سے میں سیدھا گھر آیا ہوں۔" انہوں نے جیب میں بڑا سیاہ والٹ نکال کر انہیں دکھایا۔

"مگر آپ کا کچھ تو گم ہوا ہے۔ جس کا اشتہار آپ نے اخبار میں دیا ہے۔" اب کے وہ کچھ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"اوہ..." فخر حیات کا مسکراتا چہرہ بھی یکدم مدھم پڑ گیا۔

"تو آپ اس اشتہار سے متعلق کچھ بتانا چاہ رہے ہیں۔" فخر حیات نے بے چینی سے پہلو بدلتی بیوی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آف کورس۔" کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ رعنا حیات کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ چہرے کی رنگت سرخی مائل ہو چلی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں چند لمحوں کو خاموشی چھا گئی۔

"بتا بھی دیں، بتاتے کیوں نہیں۔ کہاں ہے میرا بیٹا؟" جب خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو رعنا حیات کھڑے ہوتے ہوئے جیسے پھٹ پڑیں۔ ان کی حالت دیدنی تھی۔

"بیگم صاحبہ! پلیز ریلیکس ہو جائیں۔ میں بتا رہا ہوں۔" شہباز خان، رعنا حیات کی کیفیت دیکھ کر کچھ گھبرا کر بولے۔

"رعنا! بیٹھ جاؤ۔ شہباز! آپ تسلی سے، آرام سے بتائیں، جہاں اتنے برس بیٹے پر پتھر رکھ کر اس گھڑی کا انتظار کیا ہے، وہاں کچھ پل اور سہی۔ خدا کا شکر ادا کرو رعنا! ہم تو یقیناً ناامید ہو چکے تھے۔" فخر حیات ٹھہر ٹھہر کر پر سکون لہجے میں بولے تو رعنا حیات ایک گہرا سانس لے کر بیٹھ گئیں مگر ان کے چہرے کے تاثرات نہیں بدلے تھے۔

"کیا آپ اپنے بیٹے کو پہچان سکتے ہیں اگر وہ آپ کے سامنے آ جائے؟" شہباز خان نے پوچھا۔

"کیا آپ کو یہ سوال ایک ماں سے پوچھنا چاہیے؟" رعنا حیات [illegible]

"ہاں، پوچھنا چاہیے۔ اگر اس کا لخت جگر بے حد کم سنی میں اس سے چھڑا ہو۔"

"میں اسے پہچان لوں گی، یوں بھی "سائبان" سے ہمیں اس کی سولہ سترہ سال کی عمر میں اتاری گئی تصاویر ملی ہیں۔ میں نے ان تصاویر میں بھی اسے شناخت کر لیا ہے تو پانچ چھ مہینوں میں اس میں کتنا چینج آیا ہو گا۔" وہ بے قراری سے بولیں۔

"درست کہا آپ نے۔" شہباز خان نے کہہ کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔

"میں معاذ کو دیکھا کرتا تھا تو سوچا کرتا تھا، وہ یقیناً کسی بہت اچھی معزز فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مزاج، طبیعت، خودداری اس کے اچھے خاندان سے تعلق کی نشانیاں تھے۔ خیر میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں وہ مجھے ملا۔" اس کے بعد انہوں نے معاذ کا ان کی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہونے سے لے کر وہ گم کر جانے تک سب کچھ سنا ڈالا۔

"آپ اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟ ہم ابھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔" سارا کچھ سنتے ہی رعنا حیات بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور فخر حیات کی طرف دیکھنے لگیں کہ وہ اٹھے کیوں نہیں۔

"وہ یقیناً آپ ہی کا بیٹا ہے مگر..."

"مگر کیا؟" ان کی برداشت لحظہ بہ لحظہ تمام ہوتی جا رہی تھی۔

"وہ... میں... تین چار سالوں سے بیرون ملک تھا، معاذ میری والدہ کے پاس ہوتا تھا۔ میری غیر موجودگی ہی میں اس نے اپنا ایم بی اے مکمل کیا اور ہاؤس جاب بھی..." وہ کہتے کہتے پھر چپ ہو گئے۔

"پلیز جلدی بتایئے۔"

"کچھ دن پہلے وہ ایک مسئلے پر ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

ان کی بات پر جیسے رعنا حیات کے جسم سے جان ہی نکل گئی، وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں۔

"بیگم صاحبہ! اسی لیے میں فخر حیات کی موجودگی میں یہ ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن پلیز آپ فکر نہیں کریں، میں دو چار دنوں میں ہی اس کا پتا لگا لوں گا۔ آج کل وہ ایبٹ آباد میں ہوتا ہے لیکن کل ہی اس نے ایک ماہ کی لانگ لیو لے لی ہے، ورنہ میں ایبٹ آباد جا کر اسے لے آتا۔ بہر حال ادھر بھی میں اس کے جاننے والوں سے پتا لگا کر آپ کو دو تین دنوں میں ہی اس کے بارے میں بتا دوں گا۔" وہ تسلی دینے کے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"انتظار... انتظار... انتظار!" کہتے کہتے وہ رونے لگیں۔ "آخر یہ انتظار تمام کیوں نہیں ہوتا۔ میرے مولا کی یہ آزمائش مجھ پر سے ختم کیوں نہیں ہوتی۔ میں مر جاؤں گی اس کرب کے ہاتھوں۔ یا اللہ مجھ پر رحم کر۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

"رعنا! بی بریو یار! تم تو بہت بہادر ہو۔ اس سارے معاملے میں اس طرح کے اپس اینڈ ڈاؤن تو آتے ہی ہیں۔ اب تو بس دو چار دنوں کی بات ہے، پلیز خود کو سنبھالو۔"

فخر حیات بیوی کے پاس آ کر مہربان لہجے میں بولے تو رعنا حیات کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔ فخر حیات کچھ بے بسی سے شہباز خان کی طرف دیکھنے لگے جواب سوچ رہے تھے، انہیں اتنی جلد بازی نہیں دکھانی چاہیے تھی۔ چند دن میں معاذ کو ڈھونڈ کر اپنے ساتھ لے آتے تو آج ایک ماں کے جذبات یوں مجروح نہ ہوتے۔

☼ ☼ ☼

عبدالمبین دوسرے دن پھر آیا تھا۔

مگر کوئی گھر میں نہیں تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر لکڑی کے بوسیدہ خوردہ دروازے کے کنڈے میں اتنا بڑا سیاہ تالا جھول رہا تھا۔ اسی دن آمنہ کو دوسرے اسکول میں جاب مل گئی تھی۔ آج اس کا ادھر پہلا دن تھا۔ جویریہ، کلثوم بی بی کے گھر گئی تھی اور صوفی صاحب کلثوم بی بی کے بیٹے کے ساتھ اپنا چیک اپ کرانے گئے تھے اور انہوں نے ہی بطور خاص جویریہ کو کلثوم بی بی کے گھر رکنے کو کہا تھا۔ شاید انہیں علم تھا عبدالمبین اگلے روز ضرور آئے گا۔

وہ ڈھلتے گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ انتظار کی کوفت سے گزر رہا تھا۔ ساری رات پھر وہ سو نہیں سکا تھا۔ بیوی ڈر گئی کہ لینے کے باوجود اسے ٹھیک سے نیند نہیں آ سکی تھی۔ اماں جی اور زینب کا سوچ سوچ کر وہ رات کو کئی بار اٹھ کر رویا تھا پھر سب سے بڑھ کر صوفی صاحب کی حالت۔

"کاش... میں نے بابا صاب کو اس حد تک ناراض نہ کیا ہوتا۔ طبلے، سارنگی، ساز سے جس قدر انہیں نفرت تھی، میں نے اس فیلڈ میں آ کر انہیں خود سے اتنا متنفر نہ کیا ہوتا۔"

وہ جتنی بار بے چینی سے جاگا اتنی بار پچھتایا تھا۔ اسے یاد تھا صوفی صاحب کو بچپن سے لے کر لڑکپن تک اس کی آواز بہت پسند تھی اور جب وہ چھوٹی چھوٹی سورتیں تلاوت کرتا تو صوفی صاحب کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔

"ماشاء اللہ بی بی! ذہین تو واقعی عبدالمتین ہے، ڈیڑھ سال کے قلیل عرصے میں اس نے قرآن پاک حفظ کر لیا مگر جو کشش، جو بہاؤ اور نرماہٹ عبدالمبین کی آواز میں ہے اس کی تلاوت سنو تو لگتا ہے آدمی اس کے بہاؤ میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ اللہ نے بہت خوبصورت آواز دی ہے اسے۔ نالائق! اگر دل لگا کر حفظ کر لے تو سال بھر میں اس کا بیڑا پار لگ سکتا ہے۔ دیکھنا میری گدی یہی سنبھالے گا۔"

وہ جوش میں آ کر کہتے مگر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس کے بارے میں ان کی رائے بدلتی چلی گئی اور آج وہ اس کی صورت سے بھی نفرت کرنے لگے تھے۔

طویل انتظار نے اسے تھکا دیا۔ رات بھر کی بے چین نیند، ٹینشن، ذہنی کوفت اور اپنی بے وقعتی کے احساس نے اس کے اندر کے غصے کو ابھارنا شروع کر دیا۔ سڑک پر آتے جاتے لوگ اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ آدھے چہرے کو کیپ سے چھپائے سیٹ پر نیم دراز تھا۔ بچے بار بار آ کر بند شیشے بجانے لگتے۔ اس کا انتظار بالآخر اشتعال میں بدل گیا۔

"آخر کیا سمجھتے ہیں بابا صاب خود کو جیسے بڑے ولی ہیں کہیں کے۔ جیسے انہوں نے ساری زندگی حرام کی طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

سخ ہی نہیں کیا۔ بڑے سید صاحب کی نوازشیں کیا ان کی محنت کی کمائی ہوتی تھی جسے وہ خوشامد کر کے حاصل کرتے تھے۔ آج میری محنت کی کمائی بھی انہیں پلید نظر آرہی ہے اور یہ آمنہ...... کس قدر دماغ خراب ہو چکا ہے اس کا۔ باپ کی چمچی جیسے میں تو ان کا کچھ لگتا ہی نہیں۔ اماں جی کی بیماری، موت سب چھپایا مجھ سے۔ میں ہر لمحہ ان کے لیے تڑپتا رہتا ہوں اور یہ بے حس پتھر دل لوگ۔ مجھے ادھر آنا ہی نہیں چاہیے۔ عبدالمتین بالکل درست کرتا ہے' یہ ہیں ہی نہیں اس قابل۔ جب انہیں میری پروا نہیں تو میں کیوں ان کے لیے مرا جا رہا ہوں'

طوفانی رفتار سے گاڑی دوڑاتے وہ واپس آگیا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں آکر کھولتے دماغ کو اس نے پوری بوتل سے مدہوش کیا تھا۔

نوکر کے بار بار دستک دینے پر وہ بمشکل اپنے چکراتے سر کو تھام کر اٹھا تھا۔ فریش ہو کر باہر آیا تو اس کی نئی البم کا اسپانسر وحید بٹ بیٹھا تھا۔ اگرچہ آج اس کا کسی سے ملنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر وحید بٹ نہ صرف اس کا دوست تھا بلکہ وہ حنیف گوگی کا رائٹ ہینڈ بھی تھا۔ حنیف گوگی انڈر ورلڈ مافیا کا کرتا دھرتا۔

''صوفی ڈیئر! اس پر سائن کروانے تھے۔'' عبدالمبین کو دیکھتے ہی وحید بٹ کھل اٹھا۔ ایک [illegible] آگے کرتے ہوئے بولا۔

''کیسے سائن؟'' اپنی بےزاری چھپا کر وہ بمشکل بولا۔

''چیریٹی شو ہے ہمسایہ ملک میں۔ ادھر سے ادھر سے چوٹی کے سنگر [illegible] ہو رہے ہیں۔ شو بعد میں دبئی' شارجہ اور مڈل ایسٹ کے تقریباً تمام ممالک میں پرفارم کرے گا۔ اس سلسلے میں یہ ایگریمنٹ ہے۔''

''میرا جی نہیں چاہ رہا۔'' کہتے کہتے وہ رک گیا۔

''کب جانا ہے؟''

''کل شام کی ٹکٹ کروائی ہے میں نے تمہاری ' گوگی یار بھی جا رہے [illegible] تم سائن کر دو [illegible] کنفرم کروا دوں گا۔'' بے تکلفی سے اس کے ہاتھ میں پین دیتے ہوئے بولا۔

''کتنے دن لگیں گے؟'' اس نے متذبذب نظروں سے اسے دیکھا۔

''یار! تم نوٹ گنو' دن کیوں گننے لگے۔ چل کلکی (سائن) مار۔'' وہ عبدالمبین کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

''اچھا ہے' میں یہاں سے چلا ہی جاؤں۔ انہوں نے کون سا مجھے یا میری محبت کو کسی [illegible] شمار کرنا ہے۔ روز جاتا رہوں گا' روز دھتکارتے رہیں گے۔ ادھر رہ کر جلنا کڑھنا ہی ہے' بہتر ہے' یہاں سے دور چلا جاؤں۔'' تلخ سوچ اس کے دماغ میں ابھری اور دوسرے پل اس نے سائن کر دیے۔

''زبردست۔ بھئی چل تیاری پکڑ' میں اور دوسرے ضروری انتظامات کر لوں' کل صبح چکر لگاؤں گا۔'' کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

عبدالمبین نے اپنا بوجھل سر صوفے کی بیک پر ٹکا دیا۔ چند لمحوں میں وہ بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا۔

● ● ● ● ●

ایک بہت بڑا معجزہ!

یہ یقیناً معجزہ ہی تو تھا جو سب کی آنکھوں نے دیکھا۔ صوفی صاحب جن پر انجائنا اور فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا وہ بھی اس طرح کہ بچنے کی امید بھی کم لگ رہی تھی اور جس طرح وہ صاحب فراش ہوئے' ان کی عمر کا تقاضا' ان کی کمزور صحت' گھریلو زندگی میں آنے والی اچانک آفتیں اور نہ حل ہونے والے مسائل کا انبار' وسائل کا فقدان مگر ان سب کے باوجود صوفی صاحب اتنی جلدی اپنے پیروں پر کھڑے تھے نا صرف کھڑے تھے بلکہ جما جما کر زمین پر قدم رکھتے ہوئے چل بھی رہے تھے۔ تکلیف برداشت کرنے کے احساس سے ان کا چہرہ سرخ قندھاری انار کی طرح دہک رہا تھا وہیں اپنی کامیابی پر خوشی سے چمک بھی رہا تھا۔ جب کہ آمنہ اور جویریہ تو باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

انہیں تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ بابا صاحب دوبارہ اپنے قدموں پر چل بھی سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حیران تھے۔

''صوفی صاحب! یہ یقیناً بیماری کی شکست اور آپ کی مضبوط قوت ارادی کی جیت ہے۔ اصل میں انسان تب ہی پیرالائز (معذور) ہوتا ہے جب مایوسی اور ناامیدی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے اور وہ بے دم ہو کر ہتھیار ڈال دیتا ہے اور جو اس بیماری کو شکست دینے کی ٹھان لیتے ہیں وہ آپ کی طرح چند ہفتوں یا مہینوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں' مبارک ہو بہت آپ کو۔''

وقت رخصت ڈاکٹر نے ان سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا' مگر خیال رہے یہ بیماری اگر مضبوط قوت ارادی سے شکست کھا سکتی ہے۔ تو کسی کمزور لمحے میں جب آپ اپنے حوصلوں کو دم توڑتا محسوس کرنے لگیں تو یہ چپکے سے دوبارہ حملہ آور بھی ہو سکتی ہے اور اس کا دوسرا اٹیک یقیناً بہت شدید اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اس لیے کبھی بے حوصلگی اور بے اعتمادی کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیجیے گا۔ مسئلے مسائل' پریشانیاں' زندگی کا حصہ ہیں۔ زندگی سے بڑھ کر نہیں۔ اپنے لیے' اپنی خاطر اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

نوجوان ڈاکٹر کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی بہت حوصلہ افزا تھے۔ صوفی صاحب کا زندگی سے بھرپور ولولہ لیے ہوئے توانا دل ہر کٹھنائی کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔

آج بہت دنوں بعد وہ صبح صبح اٹھ کر تیار ہوئے تھے۔ اپنے سب سے اچھے کپڑے استری کروا کے پہنے' اپنے بالوں کو' چہرے کو' ڈاڑھی کو' اپنے ہاتھوں سے سنوارا تھا۔ اپنے جوتے آمنہ کے اصرار کے باوجود خود پہنے۔ اپنے ہاتھوں سے خود ناشتہ کیا اگرچہ ان کے دائیں بازو اور ہاتھ میں ابھی بھی مستقل لرزاہٹ موجود تھی مگر انہیں اس بات کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ وہ وقفے وقفے سے دونوں بازوؤں کو اوپر نیچے لا کر ورزش کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ یہ بھی چند ہفتوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔

وہ ناشتہ [illegible] آمنہ کے ساتھ ہی گھر سے [illegible] تھے۔

''بابا صاب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' [illegible] اترتے ہوئے بالآخر آمنہ نے پوچھ ہی لیا۔

''ایک بہت ضروری کام ہے' [illegible] کر آتا ہوں گڑیا' بس۔ چھٹی کتنے بجے ہو گی؟'' وہ دیوار کا سہارا لیے' بہت سنبھل سنبھل کر اتر رہے تھے۔

''ایک بجے۔'' آمنہ ان پر نظریں جمائے ٹھہر ٹھہر کر اتر رہی تھی۔

''چلو اس وقت تک میں بھی آ ہی جاؤں گا۔'' وہ آخری قدم پر پہنچ کر بولے۔ ''اسکول تک میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔'' انہوں نے کہا تو آمنہ سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ بابا صاب مجھے دیر ہو جائے گی' آپ بہت آہستہ چل رہے ہیں۔

''پڑھائی کیسا ہے؟''

''جی' اچھا ہے۔''

راستے بھر میں انہوں نے صرف یہی پوچھا تھا اور اسے اسکول چھوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔

وہ تقریباً ایک بجے واپس لوٹے تھے' ان کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔ دایاں بازو ہاتھ سمیت بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پکڑی چھڑی ان کی ہتھیلی میں جیسے کھب کر رہ گئی تھی۔ شاید وہ کافی دور سے پیدل آرہے تھے' یا پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کی یہ حالت ہو گئی تھی۔

''جویریہ پانی!'' وہ تخت پر تقریباً گرتے ہوئے بمشکل بولے۔ جویریہ الٹے قدموں پانی لینے دوڑی۔

''بابا صاب! آپ ٹھیک ہیں نا؟'' کانپتے ہاتھوں سے پانی پیتے ہوئے پانی ان کی ڈاڑھی اور کپڑوں پر چھلک چھلک کر گرا' منہ کے دہانوں سے بھی ادھر ادھر بہہ نکلا تھا۔ جویریہ ڈر گئی کہیں پھر......

''بابا صاب! میں پلا دوں؟'' اس نے گلاس تھامنا چاہا۔

''نہیں' یہ لو۔'' انہوں نے تقریباً تین چوتھائی گلاس خالی کر کے اسے تھما دیا۔ جویریہ گلاس رکھنے گئی تو وہ تخت

کے سرہانے پڑے رومال سے اپنا چہرہ اور داڑھی صاف کرنے لگے۔ جویریہ ان سے چند قدم کے فاصلے پر آکر کھڑی ہو گئی۔

صوفی صاحب نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا۔ ان کے ہاتھ میں خاکی رنگ کا پھولا پھولا سا لفافہ تھا۔ جسے وہ سارے رستے رکشے سے اترنے کے بعد بغل کے نیچے بازو سے دبا کر لائے تھے۔ انہوں نے وہ لفافہ تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"بابا صاب! آپ کے لیے کھانا لے آؤں؟" جویریہ نے پوچھا۔

"نہیں ابھی آمنہ آتی ہے تو پھر کھاتے ہیں۔"

انہوں نے ذرا سا جھک کر اپنے جوتے اتارے اور آہستہ سے دونوں ٹانگیں اوپر کرکے بیٹھ گئے۔ جویریہ نے اندر سے گاؤ تکیہ لا کر ان کی کمر کے پیچھے رکھ دیا صوفی صاحب اب خود کو کافی بہتر محسوس کر رہے تھے۔ نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ جیسے دنوں بعد دیکھ رہے ہوں۔ جویریہ چپکے سے اندر جانے لگی۔

"جویریہ! میرے پاس آکر بیٹھو۔" ان کی نرم آواز نے جویریہ کے قدم جکڑ لیے۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پلٹی اور تخت کے کونے پر ٹک گئی۔

"تم مجھ سے... ناراض ہو...؟" وہ اس کی طرف بغور دیکھ کر بولے۔ جویریہ پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"بابا صاب اور اس لہجے میں۔"

"نج... جی... جی نہیں تو۔" وہ جلدی سے بولی اور سر جھکا لیا۔

"پھر اس قدر چپ کیوں رہتی ہو؟" ان کا دوسرا سوال بھی حیران کر دینے والا تھا۔ "کیا انہیں خبر ہے کہ میں چپ رہتی ہوں۔"

"نہیں... تو بابا صاب!" وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی۔

"دیکھو ماں باپ کا ہر فیصلہ اولاد کی بہتری کے لیے ہوتا ہے..." جویریہ کی نظروں کے سامنے مرتی ہوئی زینب کا چہرہ پھر گیا، تڑپ تڑپ کر مرتی ہوئی زینب اس کا سر مزید جھک گیا۔

"تم مجھے بہت پیاری ہو، چھوٹا بچہ ماں باپ کو سب سے پیارا ہوتا ہے۔ پھر تمہاری عادتیں شروع سے بے ضرر سی رہیں اس لیے بھی مجھے اچھی لگتی تھیں...." ان کی بات پر اس نے ایک شکوہ بھری نظر سے انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"مجھے اعتراف ہے، زندگی کے بہت سے معاملات جنہیں اگر جذباتی پن کے بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے سلجھاتا تو شاید ہماری زندگیوں میں اس قدر الجھنیں نہ ہوتیں، لیکن ایسا ہونا طے تھا اور تقدیر کے لکھے یونہی ہو کر رہا کرتے ہیں۔ مجھے نہ فخر ہے نہ بے حد خوشی، مگر تھوڑا سکون ضرور ہے کہ میں نے زندگی بھر برائی کا نہ ساتھ دیا نہ اس رستے پر چلا اور نہ اسے اپنے سامنے پنپنے دیا۔ میرا اللہ اور تم سب شاہد ہو کہ میں برائی کے رستے میں کس طرح ڈٹ کر کھڑا ہوا۔

عبدالمتین کی آنکھوں پر دولت کی چربی چڑھ گئی تھی۔ اس کے دماغ سے حرام حلال کا تصور اٹھ گیا تھا اور حرام کچھ کرے نہ کرے آدمی کو گناہ کی دلدل میں کھینچتا چلا جاتا ہے۔ سو میں کوشش کرتا تو بھی عبدالمتین کو اس دلدل سے نہیں نکال سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے یہ پرکشش عذاب اپنے لیے خود منتخب کیا تھا۔" ذرا کی ذرا وہ رکے۔

"اور عبدالمبین کا معاملہ تم لوگوں کے سامنے ہے۔ ناچ گانے سے سمجھوتا کسی بھی حالت میں ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ پھر میں کیسے اسے اپنا حصہ بنائے رکھتا۔

زینب نے خواہشوں کے حصول کے لیے بہت جلد بازی میں شارٹ کٹ اختیار کرنے کی کوشش کی، اللہ اس کی مغفرت کرے اور... میرے... ہمارے گناہ معاف کرے... بے شک توبہ بڑے سے بڑے گناہ کو چاٹ جاتی ہے۔ اور توبہ کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔"

انہوں نے سب معاملوں میں خود کو Justify کر ڈالا۔ جویریہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ اسی وقت آمنہ اسکول سے آگئی۔ سلام کرکے صوفی صاحب کے اشارہ کرنے پر وہ دیوار سے لگی اکلوتی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ حجاب اتار کر گردن کے گرد لپٹی چادر ڈھیلی کرکے پیروں کو جوتوں سے قدرے آزاد کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہاری ماں اللہ بخشے نیک جنتی عورت تھی۔ اس نے ساری زندگی میری تابعداری میں گزاری، کبھی میری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ ہمیشہ میری تابع فرمان رہی۔ اور نیک بیویاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ اپنی ذات اور وجود کی نفی کرکے گھر کے لیے مر مٹنے والی۔

ویسے تو یہ دنیا کا دستور بھی ہے کہ شادی سے پہلے تک والدین کا عمل دخل بیٹیوں کے معاملات میں رہتا ہے مگر شادی کے بعد ان کا اختیار بیٹیوں کے سلسلے میں تقریباً ختم ہو جاتا ہے، پھر بھی بیٹیوں کو جب کوئی رنج یا دکھ پہنچتا ہے شوہر یا سسرال سے تو وہ دوڑی دوڑی ماں باپ کی طرف آتی ہیں۔ جن کے ماں باپ سلامت ہوں...."

وہ دونوں کو باری باری دیکھ کر بولے۔

"تم میکے کی طرف اس آس سے شاید نہ دوڑ سکو.... تم دونوں میری جنتی اچھی بیٹیاں ہو، مجھے امید ہے شادی کے بعد اچھی بیویاں بھی ثابت ہو گی۔ صابر اور خدمت گزار۔ آج اگر رابعہ بی بی زندہ ہوتی تو وہ یہ سب باتیں تم سے کر رہی ہوتی۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، ہمیں چند دنوں تک یہ گھر خالی کرنا ہے۔ کیونکہ میں بار بار امام صاحب سے مہلت نہیں مانگنا چاہتا، اس لیے مجھے، شاید تم دونوں سے اس طرح دوبارہ فرصت سے باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکے۔" وہ اشاروں کنایوں میں انہیں بہت کچھ سمجھا چکے تھے۔

"بابا صاب! ایک بات کہوں۔" آمنہ نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور دھیمی آواز میں بولی۔

"ہوں...." وہ بھی شاید بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بولے۔

"ہم کوئی چھوٹا موٹا ایک دو کمروں کا گھر کرائے پر دیکھ لیتے ہیں، آپ کی پینشن اور میری تنخواہ سے اتنا تو ہو ہی جائے گا۔"

"نہیں اب اور دیر نہیں۔" وہ قطعیت سے بولے۔ "معذوری ایک دن کی ہو، چند ہفتوں یا مہینوں کی یا عمر بھر کی انسان کو یہ سمجھانے کے لیے کافی ہوتی ہے کہ اگلے لمحے سے پہلے جو کچھ صحت مندی کے ساتھ ساتھ نپٹا سکتے ہو نپٹا لو۔ آمنہ بیٹی! زندگی کے پاس بہت مہلت نہیں ہوتی اور دو تین مواقع تو کسی کو بھی نہیں ملتے، مجھے قدرت نے جو یہ دوسرا موقع دیا ہے میں اسے گنوانا نہیں چاہتا، تم اب دیر جلدی کے چکر میں خود کو ہلکان نہ کرو صرف یہ دعا کرو کہ اللہ تمہارے بابا صاب کو خیر و خوبی سے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش کرے اور بس۔"

لہجہ اگرچہ نرم تھا مگر انداز اٹل۔ آمنہ مزید کچھ کہہ ہی نہ سکی اور جویریہ کے حلق میں تو جیسے نمی گھلنے لگی تھی۔ آنسو روکنا محال ہو رہا تھا۔

"اور یہ اندر جا کر تالے چابی میں رکھ لو۔" انہوں نے تکیے کے نیچے سے پھولا ہوا لفافہ نکال کر تکیے پر رکھا۔ آمنہ نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھا لیا۔

"یہ..." وہ کھولے بغیر بولی۔

"یہ تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے، کچھ تو میرے واجبات تھے اوقاف والوں کی طرف، کچھ فنڈ کی رقم اور کچھ جو میں نے تم دونوں کے لیے جمع کر رکھا تھا۔ میں دونوں بیٹیوں کو خالی ہاتھ تو رخصت نہیں کروں گا۔"

"بابا صاب! ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ آپ ابھی مکمل طور پر تندرست نہیں ہوئے، ابھی آپ کو ان کی ضرورت ہے۔"

"آمنہ! میں اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے زندگی بھر دنیا کے باپوں جیسی اپنی اولاد کو کوئی خوشی نہیں دی، ورنہ آج یہاں تمہاری ماں بیٹھی ہوتی۔ سامنے عبدالمتین اور عبدالمبین بیٹھے ہوتے، میرے دائیں بائیں، پیچھے تم، زینب اور جویریہ ہوتیں تو یہ گھر کتنا مکمل، کتنا روشن اور زندہ ہوتا۔ یہاں ایسی ویرانیاں، سناٹے اور

بے رنگی نہ ہوتی۔ کاش میں دنیا کے عام باپوں جیسا باپ ہوتا۔ اولاد کی غلطیوں کو نظر انداز کر دینے والا۔ ان کو آخرت کے لیے تیار کرنے کے بجائے دنیا کی تیاری میں لگا رہنے دیتا تو میرا آنگن بھی سب گھروں جیسا ہنستا کھیلتا ہوتا مگر میں نے ان کی دنیا کے بجائے عاقبت سنوارنا چاہی۔ بس یہی جرم ہے میرا۔ میرے اللہ! آمنہ! یہی جرم ہے میرا۔ میں اپنے بچوں کو تیرے نام لیواؤں کی صف میں سب سے آگے دیکھنا چاہتا تھا۔ سب سے آگے۔ ہراول دستے میں اور... سب مجھ سے روٹھ گئے۔ ناراض ہو گئے' چلے گئے۔" صوفی صاحب ایک دم سے رونے لگے۔

"بابا صاب! بابا صاب! پلیز...." آمنہ اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔

جویریہ بے اختیار روتی ہوئی ان کا بازو ہولے ہولے دبانے لگی۔ صوفی صاحب کا روتا ہوا شکست خوردہ چہرہ آمنہ کے اندر جیسے بہت کچھ توڑ پھوڑ گیا۔ اس نے تو کبھی انہیں یوں شرمندہ ہو کر روتے نہیں دیکھا تھا' آج ہی لائبریری میں وہ ایک دکھی شہزادے کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ شیکسپیئر جس کا اپنی زبان میں بیان کرتا ہے۔

Time is out of joint o'crsed spite
That ever I was born to set it right

ان لوگوں کا دکھ جو سب کچھ ٹھیک کرنے کا بیڑہ اٹھاتے ہیں اور آخر میں لاحاصل جدوجہد کا نتیجہ یہ دکھ' تنہائی کہ وہ اپنے نا ہونے کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ ان کا یہ دکھ آمنہ کو تڑپا گیا۔

"بابا صاب! آپ نے کچھ غلط نہیں کیا' کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ نے اپنی اولاد کی نیک تربیت کرنا چاہی تھی۔ انہیں کبھی حرام نہیں کھلایا اور کبھی حرام مال پر نظر نہیں رکھی۔ آپ اپنی اولاد کی آخرت سنوارنا چاہتے تھے۔ اگرچہ آپ کو اس کا حکم ایک حد تک دیا گیا تھا مگر پھر بھی آپ نے اس حد سے آگے تک کوشش کی تو جو خلوص دل صدق دل سے کوشش کرتے ہیں اللہ ان کی کوشش کو بے ثمر نہیں رہنے دیتا۔ آپ آخرت کے لیے کوشاں تھے نا' تو اس کا نتیجہ اس کا ثمر بھی آپ کو آخرت ہی میں ملے گا۔ دنیا کی واہ واہ [illegible] کبھی تمنا نہیں کی تھی تو پھر کیوں شرمندہ ہوتے ہیں بابا صاب! آپ یقین رکھیں۔ آپ نے [illegible] کہ آپ کی اولاد آپ کے بیٹوں سمیت آخرت میں اللہ کے حضور آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دے گی۔ وہ یقیناً اللہ کے نام لیواؤں کی صف میں سب سے آگے نہیں تو سب سے پیچھے بھی نہیں ہوں گے۔ آپ نے بیج بویا ہے۔ ابھی تو فصل پوری طرح سے تیار بھی نہیں ہوئی۔ یہ فصل اللہ کے نام کی تیار ہوگی۔ آپ دیکھیے گا یہاں نہیں تو وہاں آپ یقیناً دیکھیں گے۔ بابا صاب! آپ تو دنیا کے تمام باپوں کے لیے ایک [illegible] برائی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والے اپنے پیچھے قابلِ تقلید مثال چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ قابلِ فخر ہیں۔ دنیا کی [illegible] لذتوں کو چھوڑ کر جو شخص آخرت کی خاطر کانٹوں بھرا راستہ چنے اس سے زیادہ بہادر اور قابلِ رشک کوئی نہیں ہوتا۔ آپ میری باتوں کو محض تسلی نہ سمجھیں بابا صاب! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ قابلِ فخر ہیں۔"

اس نے پریقین نظروں سے صوفی صاحب کی بے یقین آنکھوں میں دیکھا۔

"جویریہ! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" تو جویریہ اثبات میں سر ہلا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"بابا صاب! ہم دونوں تو ہیں نا آپ کے ساتھ۔ آپ کیوں غم کرتے ہیں۔"

وہ اپنی انگلیوں کی نرم پوروں سے ان کی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

"زندگی ہمیں بھلے سب کچھ دے ڈالے تو بھی آپ جیسی نیک تربیت نہیں دے سکے گی۔ بابا صاب! آپ کی بھی آپ کی کوشش کچھ بھی رائیگاں نہیں گئی۔" وہ اس پریقین لہجے میں بولی تو ایک مدھم سی مسکراہٹ صوفی صاحب کے خشک لبوں پر ابھری۔

اسی وقت ظہر کی اذان ہونے لگی۔

"تم دونوں نماز پڑھ کر کھانا لگاؤ' میں بھی نماز پڑھ آؤں۔" وہ نیچے اترنے لگے۔

"بابا صاب! پھر سیڑھیاں اتریں گے' ادھر ہی پڑھ لیں۔" جویریہ بولی۔

"نہیں' جب تک اس جسم میں دم ہے۔ مجھے ہمت نہیں ہارنی۔"

☼ ☼ ☼

جیسے ہی سید سلطان بخت ڈائننگ ٹیبل کی سینٹرل چیئر پر آ کر بیٹھے ملازمہ نے گرم گرم ناشتہ سرو کرنا شروع کر دیا۔ صالحہ پانچوں بچیوں کے ساتھ پہلے ہی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں۔ وہ تینوں بڑی بچیوں کو بڑے انہماک اور توجہ سے ناشتہ کروا رہی تھیں۔ جبکہ دونوں چھوٹی بچیاں اپنی بے بی چیئرز پر بیٹھی آگے پڑے کھلونوں اور جھنجھنوں سے کھیل رہی تھیں۔ تینوں بڑی بچیاں صاف ستھرے استری شدہ یونیفارم پہنے سلیقے سے بالوں کی چھوٹی چھوٹی پونیاں بنائے اپنی پلیٹوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ حالانکہ باپ کے آنے سے پہلے تینوں ناشتہ کرنے میں خوب نخرے دکھا رہی تھیں۔ صالحہ منتوں سے انہیں ایک ایک نوالہ بنا کر کھلا رہی تھیں۔ جیسے ہی سلطان بخت سامنے آ کر بیٹھے' وہ تینوں سہم کر آگے پڑی پلیٹوں پر جھک گئیں۔ ملازمہ نے گرم گرم قیمے کا پراٹھا سرونگ ڈش میں ان کے آگے رکھا جس میں سے اٹھتی خوشبودار بھاپ ان کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی مگر ان کی توجہ پراٹھے کی طرف مبذول نہ ہو سکی۔ وہ ابھی بھی سر اٹھائے تینوں بچیوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔

بڑی شانزہ کے بال سنہری تھے اور آنکھیں شربتی' وہ بالکل شہرینہ کی کاپی تھی۔ اسی کی طرح دمکتی شہد جیسی رنگت' ویسے ہی چہرے کے تیکھے نقوش۔ اس کے ساتھ علیزہ بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ کتابی تھا مگر رنگت اس کی بھی شہرینہ جیسی تھی اور ناک بھی بالکل اسی کی طرح اٹھی ہوئی اور تیسری شہنیل۔ وہ تو پوری شہرینہ تھی... یا وہ ہی شہرینہ....

یکایک انہیں لگا ان تینوں کرسیوں پر [illegible] ہی شہرینہ بورڈنگ جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے' اور ان کے یوں گھورنے پر مسکراتے ہوئے ان کا منہ چڑا رہی ہے۔ منہ چڑاتے ہوئے وہ ایکدم سے بڑی ہو گئی۔

"[illegible]... شہرینہ... شانزہ... شہرینہ... تینوں جوان' خوبصورت' قاتل سراپا' قاتل [illegible]

[illegible] انہیں [illegible] ان [illegible] سی اڑا [illegible]

"صالحہ بیگم!" وہ اپنے بے قابو ہوتے [illegible] پر قابو پاتے ہوئے خاصی اونچی آواز میں دھاڑے۔

"جی...." صالحہ جو تینوں میں مگن تھیں [illegible] کر بولیں۔

"فوہ علیزہ! جلدی کرو' دیر ہو رہی ہے۔ حاکماں.... دیکھو ڈرائیور نے گاڑی باہر نکالی۔" وہ گردن موڑ کر ملازمہ سے بولیں۔

"یہ تینوں اسکول نہیں جائیں گی' کبھی بھی۔ سنا تم نے۔" وہ تیز آواز میں دھاڑے۔

"کک... کیا...؟" صالحہ حیرت سے بولیں۔

"میں نے کہا۔ یہ تینوں اسکول نہیں جائیں گی۔" اب تینوں بچیاں بھی حیران ہو کر باپ کی شکل دیکھنے لگیں۔

"کیوں؟" اب کے صالحہ نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"تینوں کو ٹیوٹر گھر پہ پڑھانے آجایا کرے گا مگر تینوں اسکول نہیں جائیں گی اور یہ میرا حکم ہے جسے آج سے ہی لاگو سمجھو۔ ان کو ناشتہ کروا کے کمرے میں لے جاؤ اور کپڑے تبدیل کراؤ۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ مگر میں ابھی پاگل نہیں ہوئی۔ میرے جیتے جی میری بچیوں کی تعلیم کے رستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سنا آپ نے۔" صالحہ اپنے پرانے انداز میں جواباً چلائیں۔

"تو کیا ان کو اسکول بھیجنے سے روکنے کے لیے تمہارا مرنا ضروری ہے تو میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا مگر یہ تینوں آج سے اسکول نہیں جائیں گی' انڈر اسٹینڈ۔"

"لاوارث نہیں ہوں میں اور نہ بھیک منگی۔ آپ کے دماغ سے یہ خناس نکل کیوں نہیں جاتا۔ کرتی ہوں میں ابھی آپ کی آپا جان اور حسین لالہ کو فون۔ نہ میں اس فضول حکم کو مانتی ہوں نہ مانوں گی۔ چلو تم تینوں اٹھو۔ تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔"

صالحہ چلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ساتھ ہی تینوں بچیوں کو بھی اٹھا لیا۔

"صالحہ! جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔" وہ پھنکارے۔

"ورنہ... ورنہ کیا کرلیں گے آپ؟" وہ بے خوفی سے بولیں۔

"کچھ بھی۔" وہ غرائے۔

"وہ کچھ بھی ذرا میں بھی تو دیکھوں۔" وہ طنز سے بولیں تو انہوں نے یکدم سامنے پڑے گرم سالن کا ڈونگا اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا۔ ماربل کا باؤل ایک دھماکے سے چکنا چور ہو کر زمین بوس ہوا۔ سالن کے چند چھینٹے علیزہ پر پڑے۔ وہ ڈر کر چیخیں مارنے لگی۔ "ماما... ماما..." وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ شانزہ اور ونیہل پہلے ہی صالحہ کے پیچھے چھپی کھڑی تھیں۔

"بس ہمیں ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والی نہیں۔ جو کر سکتے ہیں کر کے دکھائیں۔ چلو بچو۔"

صالحہ نے تینوں کو اپنے ساتھ لگایا اور باہر لے گئیں۔ چند لمحوں بعد باہر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو سلطان بخت نے ہاتھ مار کر ٹیبل پر سجے ناشتہ کے سارے برتن دیوار پر دے مارے اور پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں آگئے۔

"یہ تینوں اسکول نہیں جائیں گی، یہ میرا فیصلہ ہے۔ ورنہ میں ان پانچوں کو آج ہی زہر دے دوں گا۔"

وہ کمرے میں آکر زور سے چلائے۔ اسی وقت ان کے سیل فون کی بپ بجنے لگی۔ انہوں نے مارے غصے کے نمبر بھی نہیں دیکھا اور موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

"بڑے بے وفا ہیں شاہ جی! مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی۔" دوسری طرف نین تارا انہیں آگ لگانے کو موجود تھی۔

"نہیں تھی نا توقع تو اب ہو گئی۔ اب کیا چاہتی ہو، میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ منہ مانگے سے زیادہ سمیٹ چکی ہو۔ اب اور کیا چاہتی ہو؟"

وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ نین تارا کو اپنے کان کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔

"اپنے بچے کا حق، آپ کا نام..."

"گالی مت دو مجھے طوائف کی بچی۔" وہ بنا کسی لحاظ کے چلائے۔

"گالی تو آپ نے مجھے دی ہے۔ اب میں یہ گالی سنبھال کر رکھوں گی۔ شاہ جی! صرف چند دن انتظار کریں، آپ کو طوائف کی بچی بن کر دکھاؤں گی۔ اس بچے کو ذرا دنیا میں آنے دیں، ایسی دھوم دھام سے پریس کانفرنس، الیکٹرانک میڈیا کانفرنس، سجاؤں گی کہ پوری دنیا میں آپ کو منہ چھپانے کے لیے ایک کونہ نصیب نہیں ہوگا، یاد رکھیے گا۔ اب ہم بھی وہ کمزور طوائفیں نہیں جو کسی کونے میں ٹی بی کی مریض بن کر کھانستی، خون اگلتی چپ چاپ عیش پرست امیرزادوں کے ستم سہہ جائیں گی۔ اب ہماری آواز بھی ساری دنیا سنتی ہے۔ گل کھلائے ہیں تو خوشبو سونگھنے کا حوصلہ بھی پیدا کریں۔"

انہوں نے پہلی بار نین تارا کی ایسی پھنکار اور ایسے الفاظ سنے تھے۔ لمحہ بھر کو تو وہ دھک سے رہ گئے۔ دوسرے پل اس کی دھمکی نے ان کا بھیجا الٹا دیا۔

"میں سمجھتا تھا تم اپنی "نسل" سے کچھ ہٹ کر ہو مگر نہیں، اندر سے تم اپنی کلاس سے بھی بدتر ہو۔ گندی نالی کا کیڑا، گند کا ڈھیر۔ خوبصورت خوشبودار لبادے پہننے سے تمہارا اندر تو اجلا خوشبودار نہیں ہو سکتا۔ آوارہ عورت۔" انہوں نے آخر میں ایک واہیات گالی دی۔

"آوارہ میں نہیں، آوارہ مزاج آپ ہیں۔ خوبصورت لبادے میں نے نہیں، آپ نے چڑھا رکھے ہیں۔ گند میرے اندر نہیں، سڑانڈ آپ کے گھناؤنے وجود سے اٹھ رہی ہے اور میں اس سڑانڈ کو ساری دنیا کے سامنے بے نقاب کر کے رہوں گی۔ یہ بچہ آپ کی نام نہاد شرافت کا ڈنکا پوری دنیا میں بجائے گا۔ آپ نے نین تارا کی محبت دیکھی تھی، اب اس کی نفرت بھی دیکھیے گا۔ ایک طوائف کو آپ نے جگایا ہے۔ اب صرف موت کی نیند ہی اسے دوبارہ سلا سکتی ہے۔ یاد رکھیے۔" وہ خوب تول تول کر بول رہی تھی۔

"یاد تو میں رکھوں گا سانپوں کی اولاد۔ سانپ کو جتنا بھی دودھ پلاؤ وہ ڈسنے سے باز نہیں آتا۔ مجھے اب یہ نقطہ سمجھ میں آگیا ہے۔ تم لاکھ کینچلی بدلو، ہو تو ناگن ہی نا اور اس ناگن کا سر کچلنا مجھے آتا ہے۔ تمہارے سر اٹھانے سے پہلے نہ تمہارا سر کچلا تو مجھے شاہ جی نہ کہنا۔ کچھ کر سکتی ہو تو کر دیکھو۔"

کہہ کر انہوں نے شدید طیش کے عالم میں موبائل آف کر کے دور بیڈ پر اچھال دیا اور خود طوفانی رفتار سے کمرے سے نکل گئے۔ دروازے کے باہر ہی صالحہ کھڑی شاید ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔ انہوں نے ایک زوردار دھکا انہیں دیا۔ وہ بمشکل دیوار کے سہارے گرنے سے بچیں۔ خود وہ دیوانہ وار سیڑھیاں اتر گئے۔

"نذر داد... نذر داد..." ان کی دھاڑ اوپر کھڑی صالحہ نے بھی سنی۔ وہ اپنے کارندہ خاص کو پکار رہے تھے۔

"لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ دیکھا سلطان بخت جگہ جگہ منہ مارنے کا نتیجہ۔ اب تمہاری شرافت کے چرچے ہوں گے اور ہم سنیں گے۔" صالحہ زور سے ہنسی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا میں نے یہاں رک کر غلطی کی ہے۔" معاذ کو اس فلیٹ میں بند ہوئے چھٹا دن تھا۔ وہ اس دوران دو بار نزہت کے پاس گیا تھا کہ اسے کسی طرح آغا جان کے پاس جانے کے لیے راضی کر سکے۔

"معاذ! تم لاحاصل مقصد کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ مجھے اگر واپس جانا ہوتا تو میں وہاں سے نکلتی ہی نہیں۔ تم ادھر آنا چاہتے ہو مجھ سے ملنے تو سو دفعہ آؤ لیکن خبردار آئندہ اس گھر کے مکینوں کا میرے سامنے ذکر نہ کرنا۔" وہ انتہائی بیزاری سے بولی۔

"اور [illegible]" اس نے [illegible] پوچھا۔

"ہاں [illegible] بھی نہیں۔" [illegible] سر جھٹک کر بولی۔ "مجھے اگر اسے حاصل کرنا ہوگا تو میرے لیے قانون کے دروازے کھلے ہیں مگر میں اس کے معصوم ذہن کو اپنے سے متعلقہ کہانیوں سے پراگندہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں اس کے لیے مر چکی ہوں۔ مجھے مرا رہنے دو۔" وہ اس سختی سے بولی۔

"اور شہباز خان..."

"مت نام لو میرے سامنے اس بے حس پتھر انسان کا۔ میں اس کی کچھ نہیں، نہ وہ میرا۔ اگر تمہیں اس سے تسلی نہیں ہوئی تو سن لو، میں واقعی مر کر دکھا دیتی ہوں۔ کیوں آگئے ہو تم میری پرسکون زندگی کو بے سکون کرنے۔ خدا کے لیے چلے جاؤ۔ میں تم سے اپنے ماضی کے کسی بھی کردار سے نہیں ملنا چاہتی۔ چلے جاؤ۔" معاذ بیٹھا رہا تو وہ خود ہی اٹھ کر چلی گئی۔

پھر دوسری بار وہ گیا تو نزہت نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر آگیا۔

"اگر میرے اندر ہمت نہیں تو مجھے اس کام کا بیڑہ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ یوں بزدلوں کی طرح نزہت آپی کے ذرا سا جھاڑنے پر منہ چھپا کر بیٹھ گیا ہوں۔ اب مجھے دوسرے محاذ پر کوشش کرنا چاہیے۔ مجھے صرف ایک ماہ کی چھٹی ملی ہے، ایک سال کی نہیں۔" اس نے خود کو سرزنش کی اور اٹھ کر تیار ہونے لگا۔

یہ فلیٹ اس کے ایک دوست کے کزن کا تھا اور فی الحال اس کے اس ٹھکانے کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کے قریبی جاننے والوں کو بھی نہیں۔ وہ تیار ہو کر فلیٹ سے نکل آیا۔

باہر ایک روشن چمکدار دن اپنی رونقوں کے ساتھ عروج پر تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی اور ٹریفک کی گہما گہمی تھی۔ زندگی بھاگ دوڑ رہی تھی۔

"آخر ہماری زندگیاں ہی کیوں ایک جگہ پر ٹھہر گئی ہیں۔ ان پر جمود کیوں طاری ہو گیا ہے۔ اب ان کو آگے بڑھنا

چاہیے۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے ایک پی سی او میں گھس گیا۔

بہت جھجکتے ہوئے اس نے نمبر ملایا۔

اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"ہیلو!" چوتھی بیل پر فون اٹھا لیا تھا۔ آواز سنتے ہی اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس سے جواباً بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہیلو کون ہے بھئی؟" دوسری طرف سے بیزاری سے کہا گیا۔ اسے لگا اگلے ہی پل فون رکھ دیا جائے گا۔ اس نے ہمت باندھی۔

"میں۔۔۔" جملہ پھر بھی نہ بن سکا۔

"میں۔۔۔ یہ میں کون؟" دوسری طرف اچنبھے سے پوچھا گیا۔

"آپ شہباز خان بات کر رہے ہیں نا؟" وہ چند لمحوں کے سکوت کے بعد بولا۔

"آف کورس۔۔۔ اوہ۔۔۔ کون۔۔۔ کون بات کر رہا ہے؟" وہ کچھ ٹھٹک کر بولے۔

"پہچانا نہیں۔" معاذ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"معاذ۔۔۔ معاذ کے بچے، تم کہاں روپوش ہو؟" شہباز خان اتنی زور سے چیخے کہ معاذ کو ریسیور کان سے پرے کرنا پڑا۔

"جہاں آپ روپوش تھے۔"

"او بھائی! خدا کا نام لو، اس جگہ جا کر نہ روپوش ہونا جہاں میں احمق ہوا تھا۔" وہ جلدی سے بولے۔

"تو آج آپ نے مان لیا؟"

"ہاں بھئی مان لیا کہ مجھ سے بڑا احمق اور کوئی نہیں ہے روئے زمین پر۔" وہ ہنس کر بولے۔ "اچھا فضول بک بک بند کرو اور جلدی سے گھر آؤ یا مجھے ایڈریس بتاؤ میں پہنچ رہا ہوں۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک بریکنگ نیوز ہے۔" وہ بے تابی سے بولے۔

"میں ایک شرط پر آؤں گا۔" اس نے سوچ کر کہا۔

"ایک چھوڑو میں تمہاری دس شرطیں ماننے کو تیار ہوں۔ تم گھر آ جاؤ، سب مان لوں گا۔"

"صرف ایک شرط۔ بولیں مانیں گے؟" وہ اڑ کر بولا۔

"یار میرے بھائی، میرے باپ! سب مانوں گا۔ چاہے تم قسم لے لو۔" وہ جلدی سے بولے۔

"تم آؤ تو سہی۔"

"آپ سوچ سمجھ کر بولیں۔ ہو سکتا ہے میری بات سن کر آپ سوچ میں پڑ جائیں۔" معاذ نے انہیں دھمکایا۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں جو تم کہو گے مانوں گا۔ ارے آ کر اپنے اس لاڈلے کو سنبھالو جو میری شکل دیکھتے ہی رونے لگ جاتا ہے۔"

"کون، کس کی بات کر رہے ہیں؟" معاذ کو خوشگوار سا احساس ہوا۔

"ارتضیٰ اور کون؟" وہ منہ بنا کر بولے۔ "تم کب تک پہنچ رہے ہو؟"

"آپ میری بات مانیں۔۔۔"

"ارتضیٰ کی قسم! مانوں گا۔ اب تو آ جاؤ۔" وہ بے تابی سے بولے۔

"اوکے، میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔"

"واؤ، زبردست۔ میں گیٹ پر کھڑا ہوں، جلدی پہنچو۔" انہوں نے کہہ کر فون رکھ دیا تو وہ بھی مسکراتے چہرے کے ساتھ فون بند کر کے پیمنٹ کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اب اس کا رخ بس اسٹاپ کی طرف تھا۔

"میں بھی کس قدر احمق تھا۔ نزہت آپی سے سر پھوڑ رہا تھا۔ اگر وہ مان جاتیں اور شہباز بھائی نہ مانتے تو میری نزہت آپی کی نظروں میں کیا عزت رہ جاتی۔ لگتا ہے میری عقل بھی گھاس چرنے چلی گئی ہے۔"

وہ خود سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ اسے پیچھے سے مسلسل ہارن بجاتی گاڑی کا بھی احساس نہیں ہوا۔

رعنا حیات بروقت بریک نہ لگاتیں تو معاذ کا ہٹ ہونا یقینی تھا، وہ اچھل کر پلٹا۔

"اندھے ہو یا نیند میں چل رہے ہو یا کسی دیہات سے آئے ہو۔ سڑک پر چلنے کی تمیز نہیں۔ جاہل گنوار پھرتے ہیں، گاڑی والے کا قصور ہے۔ ال مینرڈ جنگلی۔"

وہ کھڑکی سے منہ نکال کر بری طرح سے اس پر برس پڑی تھیں۔ وہ منہ کھولے انہیں دیکھتا رہ گیا اور وہ ہوا کی طرح گاڑی آگے بڑھا لے گئیں۔

"ان امیروں کے مزاج کا بھی پتا نہیں چلتا، کہاں برہم ہو جائیں۔" اس نے پیچھے سے اٹھتی دھول کو دیکھ کر سر جھٹکا اور سامنے سے گزرتے رکشے کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔

• • •

"ماما۔۔۔ ماما کہاں ہیں آپ؟" نین تارا خوشی سے چلاتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئی اور اب زیور گل کو ڈھونڈتی اس کے کمرے تک آ گئی تھی۔

"کیا ہو گیا، کون سا خزانہ ہاتھ لگ گیا جو یوں باؤلوں کی طرح چلا رہی ہو۔" زیور گل جو ایک ایوننگ فنکشن کے لیے الماری کھولے اپنے لیے لباس سلیکٹ کر رہی تھی، پلٹتے ہوئے کچھ جھلا کر بولی۔

"ماما خزانہ ہی سمجھو اور ہاتھ لگا ہی سمجھو۔" وہ زیور گل سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"اوہو، ہٹو۔ آج کل تو یہ بچوں والی حرکتیں چھوڑ دو۔" زیور گل نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔

"جیدو، ذرا مشکل ہے ماما! ابھی تو بس۔۔۔" وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے مزے سے بولی۔

"کیا ہوا ہے؟" زیور گل الماری بھی چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھی اور اس کے چمکتے چہرے کو دیکھنے لگی، جہاں کسی انہونی خوشی کے اچانک مل جانے کا نیون سائن پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ "شاہ جی پلٹ آئے کیا، معذرت نامے سمیت۔" وہ جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"شاہ جی بھی پلٹ آئیں گے بلکہ ان کے والد حضور بھی یہ خبر سن کر قبر سے نکل آئیں گے۔ اب۔۔۔ اب ماما! ساری گیم ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ٹرمپ کارڈ میری پاکٹ میں۔ دیکھنا پھینکوں گی تو ساری بساط ہی الٹ جائے گی۔ شاہ جی ناک رگڑتے نہ میرے تلوے چاٹنے آئے تو نام بدل دینا میرا۔" وہ سرخوشی کے عالم میں کہے گئی۔

"کچھ بتا بھی چکو۔" زیور گل اکتا کر بولی۔

"ماما ہم چیک اپ کے لیے گئی تھی۔"

"اوہ ہاں مجھے یاد آیا۔ آج تو تمہاری اپائنٹمنٹ تھی اور میں بھول گئی۔"

"ہر اچھی فکر مند ماں کی طرح۔۔۔ ہے نا۔" نین تارا طنز سے بولی۔

"میں نے ایسا دعوا بھی نہیں کیا جبکہ مجھے معلوم ہے میں کیسی ماں ہوں۔ جتانے اور بے جا مظاہرے کرنے کا مجھے شوق نہیں۔" زیور گل ناک چڑھا کر بولی۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے، کون سی تاریخ دی ہے؟"

"اگلے مہینے کا پہلا ہفتہ۔"

"وہ خوشخبری تو تمہاری بیچ ہی میں رہ گئی۔"

"بیچ میں کہاں ماما! یہی تو خوشخبری ہے۔" نین تارا مزے سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کی تھی ماما! میں سید سلطان بخت کا اکلوتا وارث، جانشین پیدا کرنے جا رہی ہوں۔ ٹھیک

دس بارہ دن بعد۔" نین تارا نے آنکھیں بند کر کے جیسے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"واقعی۔۔۔ اچھا۔۔۔" زیور گل کھل کر بجھی تھی۔

"چلو کچھ تو ہونا ہی تھا بیٹا یا بیٹی۔ تمہاری آرزو پوری ہونا تھی یا میری۔"

"کیوں' آپ کو بیٹے کی آرزو نہیں تھی؟"

"بے وقوف؟ ہماری کلاس کی عورتیں بھول کر بھی بیٹے کی تمنا نہیں کرتیں۔"

"او مام! کم آن۔ آج کل جس طرح شرفاء کی کلاس میں بیٹی اس اہمیت کی حامل ہو چکی ہے جس طرح کبھی ان کے ہاں بیٹے ہوا کرتے تھے' اسی طرح ہماری کلاس میں بھی بیٹے اتنے ہی اہم ہو چکے ہیں جتنی بیٹیاں۔" نین تارا ٹانگیں پھیلا کر بولی۔

"تجھے بڑی رپورٹیں ہیں نئے رجحانات کی۔" زیور گل کچھ چونک کر بولی۔

"مام! آج کل کے دور میں وہی کامیاب ہے جو باخبر ہے۔"

"اچھا گولی مارو باخبری کو۔ شاہ جی تو تمہارا ماں بننا قبول نہیں کر رہا' اس بچے کو کہاں مانے گا۔ تو تو پگلی ہے' ابھی تک خوش فہمیوں کے جھولے میں جھول رہی ہے۔ میں تو اس کے تیور بھانپ چکی ہوں۔ اس سے ایسی آس رکھنا فضول ہے۔ چپ کر کے بیٹے کو پالنا ہے تو پال لو' فضول میں اس سے پنگا نہیں لینا۔" زیور گل افسردگی سے کہنے لگی۔

وہ شاہ جی کا جلا کڑھا چہرہ سوچ کر مسکرانے لگی۔ یک دم دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ حالانکہ دروازہ پہلے ہی ادھ کھلا تھا' اندر داخل ہونے والے نے کلاشنکوف کا بٹ بھڑے ہوئے پٹ پر مارا تھا۔ زیور گل اپنی جگہ سے اچھلی تو نین تارا کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ خونخوار تیور لیے اچھی خاصی مجرموں جیسی شکلوں والے دو گن مین کھڑے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

"ک۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔ تمہاری اتنی جرأت کیسے ہوئی بغیر اجازت میرے بیڈ روم میں داخل ہونا۔۔۔ صر۔۔۔!" زیور گل نے اپنے چوکیدار کو پکارا۔

"دھیرج رکھو' ماڈل انیس سو ساٹھ۔ اب اپنے بیڈ روم کے دروازے کس لیے بند کرتی ہو بڑھیا۔ اس بجھے ہوئے حسن میں سے گرمی کی چنگاری ڈھونڈنے کون دیوانہ آئے گا۔"

ڈارک براؤن شلوار قمیص والے دراز قد تنومند شخص نے ذرا آگے بڑھ کر کلاشنکوف زیور گل کے سینے سے لگاتے ہوئے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "اور جو چوکیدار کی خبر لینی ہے تو ہم سے لو' دونوں اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں سمیت گیٹ کے اندر پڑے تڑپ رہے ہیں اور تمہیں تو اب یوں بھی چوکیدار رکھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے حسن کا کون سا موتی چھپا پڑا ہے جسے کوئی لوٹنے آئے گا اور تمہاری یہ بیٹی جو سارے زمانے کا گند سمیٹ کر ماں بننے چلی ہے اور کیچڑ اچھالتی ہے شریفوں پر۔ کہو تو ابھی اس کا ماں بننے کا شوق نہ پورا کر دوں۔" وہ سفاکی سے کہتے ہوئے نین تارا کی طرف بڑھا جو ڈر کر بیڈ کے کونے میں سمٹ گئی تھی۔

"ن۔۔۔ نہیں۔۔۔ کون ہو تم۔ خبردار میری بیٹی کو۔۔۔" زیور گل جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی۔ اس نے بالکل اچانک پلٹ کر کلاشنکوف کا بٹ اس کے ماتھے پر دے مارا تھا۔ خون کی ایک باریک لکیر اس کے ماتھے سے بہنے لگی۔

"مام۔۔۔!" نین تارا زور سے چلائی۔

"تمہارے منہ سے چیخ تو کیا بھاپ بھی نہیں نکلنی چاہیے' ورنہ۔۔۔" وہ جن نما شخص آگے بڑھا اور دوسرے لمحے نین تارا کو کسی گڑیا کی مانند دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر اوپر تک لے گیا۔

"مام۔۔۔ مام۔۔۔" وہ چلا رہی تھی۔

"چھوڑو' چھوڑو اسے۔ ظالم۔! رحم کرو اس کی حالت پر۔ تم نے کسی ماں کے پیٹ سے جنم نہیں لیا۔"

زیور گل اپنا زخم بھول کر پاگلوں کی طرح اس کی طرف لپکی۔ اس نے مڑ کر ایک نفرت بھری نظر زیور گل پر ڈالی اور نین تارا کو زور سے بیڈ پر پٹخ دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل کر رہ گئی۔ دوسرے لمحے وہ اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھے اپنی چیخیں دبا رہی تھی۔

"تم نام نہ نکلے تم دونوں کے منہ سے سلطان بخت کا۔ اگر کچھ دن اور جینے کی تمنا ہے تو' سنا۔" وہ غراتا ہوا زیور گل کو دھکا دے کر باہر نکل گیا۔ اگلے پل دونوں باہر جا چکے تھے۔

"نین۔۔۔ تم ٹھیک ہو میری بچی۔۔۔!" زیور گل اس پر جھکی جو گٹھڑی بنی اپنی چیخیں دبائے اثبات میں سر ہلائے جا رہی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں اس حرامزادے کو۔۔۔" زیور گل گالیاں دیتی پلٹی اور ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے موبائل کو اٹھا کر تیزی سے نمبر پش کرنے لگی۔

"ظالم' درندے' بھیڑیے' انسانوں کا خون چوسنے والے' آدم خور! تجھے میں نے ساری دنیا کے سامنے ننگا کیا تو زیور گل نہ کہنا مجھے۔ ہم تو ہیں ہی پیدائشی بے عزت لوگ۔ اب تیری عزت کی دھجیاں نہ میں نے گلی گلی اڑائیں تو میرے منہ پر آ کر تھوک دینا تو مجھے۔۔۔" وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔

"مام۔۔۔!" نین تارا کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی تھی۔ وہ پیٹ کے نیچے ہاتھ رکھے دوہری ہوتی چلی گئی۔ زیور گل کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا۔ وہ اپنے خون آلود چہرے کے ساتھ نین تارا کی طرف لپکی جس کی چیخیں اب بالکل خاموش ہو چکی تھیں۔ زیور گل پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

مسز عثمانی والدہ پاکستان آچکی تھیں اور کلثوم بی بی کے ساتھ جا کر صوفی صاحب ایک ہفتے بعد آمنہ اور جویریہ کے نکاح کی تاریخ بھی رکھ آئے تھے۔ مسز عثمانی کا چھوٹا بھائی بھی انہیں جویریہ کے لیے دل و جان سے پسند آیا تھا۔ گھر آتے ہوئے وہ مٹھائی بھی لے آئے تھے اور سارے محلے میں بٹوا بھی دی تھی۔

آمنہ اور جویریہ بالکل گم صم تھیں۔ انجانا سا خوف دونوں کے دلوں کو دھڑکا رہا تھا۔ اتنی جلدی جلدی سب کچھ ہو رہا تھا کہ دونوں کی زبانیں گنگ اور دماغ جیسے پتھرا کر رہ گئے تھے۔

"جمعہ کو نکاح ہے' ہفتہ والے دن یہ گھر خالی کر دیں گے ہم۔ میں ایک دو دن نیچے حجرے میں ٹھہروں گا۔ اس کے بعد تم دونوں سے ملنے کر گاؤں چلا جاؤں گا۔" صوفی صاحب خود ہی ساری پلاننگ کیے بیٹھے تھے اور وہ دونوں جیسے مورتیاں بنی بیٹھی تھیں۔ صوفی صاحب کے اصرار کے باوجود دونوں خریداری پر جانے کے لیے راضی نہیں ہوئی تھیں۔ آج وہ مجبور ہو کر کلثوم بی بی کی طرف آئے تھے کہ اس کے ساتھ دونوں کو خریداری کے لیے بھیج سکیں۔

کلثوم بی بی کے گھر کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

انہوں نے ہولے سے دستک دی۔ بیل تو ان کی خراب تھی۔ اندر گمبھیر خاموشی تھی۔ دستک کا کوئی ردعمل نہ ہوا۔ انہوں نے ایک بار اور ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ آہستگی سے کھل گیا۔

"او' یہ تو کھلا ہوا ہے۔" اب وہ سوچ میں پڑ گئے کہ اندر جائیں یا نہیں۔ اسی پل انہیں کلثوم بی بی کی کسی سے باتیں کرنے کی آواز آئی تو وہ مسکراتے ہوئے سر جھٹک کر آہستگی سے اندر بڑھ گئے۔

"کلثوم بی بی کہتی تھی۔ صوفی صاحب! میں آپ کی بہن ہوں اور بندہ' بہن کے گھر تو بلا اجازت آجا سکتا ہے۔ اب خدا کے لیے دروازے کھٹکھٹانے اور گھنٹیاں بجانے کی تکلیف نہ کیا کریں۔"

مگر انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا اور آج وہ بلا اجازت اندر چلے ہی گئے۔

"ارے میں نے کب کہا تھا کم بخت یہ نکاح کی بیخ لگاؤ۔ ہمیں لڑکیاں آگے جا کر بیچنی ہیں۔ کوئی گھر نہیں بسانے جو یہ شادیاں منگنیاں کرتے پھریں۔" مسز عثمانی کی آواز سن کر وہ ایک پل کے لیے خوش ہوئے تھے کہ اچھا ہے کلثوم

بی بی اور مسز عثمانی دونوں کو اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جائیں گی مگر دوسرے پل ان کی گفتگو پر صوفی صاحب کے کان کھڑے ہوگئے۔

"اب ان کمبختوں کا باپ جو مولوی منکا ہے۔ نکاح کے بغیر لڑکیاں ہمارے حوالے تو کرنے سے رہا اور نکاح کون سا اصلی ہوگا۔ جعلی نکاح نامے' آدھے گھنٹے بعد پھاڑ دینا اور دیکھو ستارہ بیگم! اب کے مجھے ساٹھ فیصد پرافٹ ملنا چاہیے۔ دوسرا دانہ میں نے بڑی مشکل سے گھیرا ہے۔ اس کی پوری قیمت تو مجھے ملنی چاہیے ہاں۔" کلثوم بی بی دھڑلے سے کہہ رہی تھی اور صوفی صاحب کی آنکھوں کے آگے نیلے پیلے تارے جھلملا رہے تھے۔

"اچھا تو ان دونوں لڑکوں کا حصہ پھر دبئی لے جانے کا خرچا' نکاح نامے جعلی ہوں گے۔ اب پاسپورٹ اور ویزے تو جعلی ہونے سے رہے۔ معلوم ہے آج کل کس قدر سختی ہورہی ہے۔ امیگریشن والوں کے ہاں لڑکیاں لے کر جارہے ہیں' کوئی رسک نہیں لینا۔ وہاں ایک دفعہ پہنچ جائیں پھر تم ساٹھ فیصد تو کیا سو فیصد لے لینا ادھر جاکر تو خود ہی دونوں کی قیمتیں ہر رات سوگنا بڑھیں گی۔ فریش مال ہے۔ صوفی صاحب کی گدڑی کا۔" اندر بیٹھے ہوئے نفوس قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

صوفی صاحب کانپتے جسم اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے دروازے کی طرف بڑھے۔ شام گہری نہیں ہوئی تھی مگر ان کے چاروں اور اندھیرے' تاریک اندھیرے چھا رہے تھے۔ وہ جلدی سے ادھر سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ان کی لاٹھی ادھ کھلے کواڑ سے ٹکرائی۔ قہقہوں کے بعد خاموشی ہوئی۔ فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔

"باہر کوئی ہے' دیکھو سرمد!" مسز عثمانی تیز آواز میں چلائی تو صوفی صاحب تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ اندر سے تیز قدموں کی آواز باہر کی طرف آرہی تھی۔ ان کا پورا جسم کسی ٹوٹی شاخ کی طرح لرز رہا تھا۔

چوکھٹ سے صرف دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا جو ان سے طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ اندر سے تیز قدموں کی آواز بالکل قریب چلی آرہی تھی۔ انہوں نے اپنا پورا زور لگایا۔ کانپتی ہوئی لاٹھی دروازے سے ٹکرا کر ارتعاش پیدا کررہی تھی۔ بازو کی کپکپاہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ اور دونوں ٹانگیں جیسے زمین میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ زمین کے نیچے موجود کسی طاقت ور مقناطیس نے ان کے قدم جکڑ لیے تھے۔

انہوں نے بے بسی و لاچاری سے سر اٹھا کر ڈیوڑھی کی تاریک چھت کو دیکھا۔ ساری زندگی میں آنے والے اس اندھے موڑ پر ضرور چلا کر پوچھتا۔

"اس کا محافظ فرشتہ کہاں گیا۔ خدا کا فضل جس پر اس کا یقین تھا' کدھر تھا؟"

"اوہ۔ ہو۔ زہے نصیب۔ ہم جیسے گناہ گاروں کے گھر اوتار آئے۔ بھاگ جاگ اٹھے اس کٹیا کے ہمارے نصیبوں کے۔ سجنوں کے پاپ دھلیں' سو نسلیں ان مبارک قدموں کے صدقے بخشی جائیں۔ کیوں بیگم صاحب!" یہ کلثوم بی بی کی تازہ دم آواز تھی۔ صوفی صاحب نے گردن گھما کر بے یقینی سے ادھر دیکھنا چاہا۔ جدھر سے آواز آئی تھی مگر ان کی گردن میں شدید اکڑاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر قدم اٹھانے کی ناکام کوشش کی۔ اس بار ان کا دایاں پاؤں تھوڑا سا گھسٹتا ہوا دروازے کی طرف چلا تھا۔

"نہ نہ۔ صوفی صاب۔ یہ غضب مت کیجئے گا۔ اگر ہم گناہ گاروں' سیاہ کاروں پر رحم آہی گیا۔ آپ نے ادھر کا رخ مبارک کر ہی لیا ہے تو یوں اتنی عجلت میں منہ موڑ کر نہ جایئے۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ لوگ تھو تھو کریں گے ہم پر۔ گھر آئی لکشمی کی ہم قدر نہ جان سکے' خدا کی رحمت خود چل کر ہمیں نوازنے آئی اور ہم نادان سمجھے ہی نہیں۔"

مسز عثمانی کی آواز کلثوم بی بی سے بھی زیادہ بشاش تھی۔

"آیئے نا' رک کیوں گئے' کیا کوئی بات بری لگی ہے جو دروازے ہی سے منہ موڑے چلے جارہے ہیں۔ ہم

بدنصیب اندر بیٹھے یہ جان کو کھا جانے والے مسائل کی گتھیاں بیٹھے سلجھاتے رہے۔ ہمیں قطعاً" آواز نہیں آئی کہ آپ جیسے دیوتا ہماری گتھیوں کو سلجھانے از خود چلے آئے ہیں۔ اب تو یہ الجھنیں رفع ہونے میں چند پل بھی نہ لگیں گے۔ ہماری اس غفلت پر یوں ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ کچھ تو تلافی کا موقع دیں۔

کلثوم بی بی کی چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی مکار آنکھوں سے دنیا جہاں کی شیطانیت چھلک رہی تھی۔ وہ بڑی بے خوفی سے ان کے سامنے تن کر آکھڑی ہوئی تھی۔

"نن۔ نہیں۔ ابھی۔ نہیں۔ میں جلدی میں ہوں۔ پھر۔ کبھی۔" لکنت زدہ زبان سے انہوں نے بمشکل جواب دیا۔

"پھر کبھی کس نے دیکھا ہے۔ جو ہے' سو ابھی ہے۔ کل کی کس کو خبر۔ پل کی کس کو خبر۔ ہمیں یوں شرمندہ نہ کیجئے' ایک موقع دیجئے۔ اندر آجایئے۔"

عثمانی۔ وہ لڑکا جسے انہوں نے اپنی ورنایاب جیسی بیٹی کے لیے پہلی نظر میں پسند کرلیا تھا۔ انہیں اپنی عقل پر کیسا ناز تھا کہ ان کی نظر کبھی دھوکا کھا ہی نہیں سکتی' اور وہ کتنا بڑا دھوکا کھا چکے ہیں۔ اس کا پتا انہیں ان لمحوں میں چلا جب تدارک کی کوئی مہلت ہی نہیں تھی۔

"چلیں اندر۔" وہ سختی سے ان کا لرزتا ہوا بازو دبوچ کر بولا۔

"نن۔ نہیں۔ مجھے جانے دو۔" انہوں نے بے اختیار گڑگڑا کر التجا کی تھی۔

"جلدی کرو سرمد! انہیں کوئی اور نہ آجائے۔" کلثوم بی بی گلی سے گزرتے کسی آدمی کو دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ بھیڑتے ہوئے بولی۔ سرمد عثمانی نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی چھینی اور گھما کر اندر صحن میں پھینک دی۔ کلثوم بی بی نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

کی بات۔ صوفی صاحب کو لگا کہ موت بالکل پاس دائیں طرف یا بائیں طرف ساتھ جڑ کر آکھڑی ہوئی ہے۔ گوشت پوست کا بنا جسم بے روح سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کے قدموں نے ان کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ سارے اعضاء نے دل اور دماغ کی مرضی کے خلاف کام کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ گرنے کو تھے مگر وہ اپنی مرضی سے گر بھی نہیں سکتے تھے۔ ابلیس کے اس نمائندہ خاص نے جو اس گھڑی شاید ان کے لیے ملک الموت بن کر آیا تھا بہت مضبوطی سے انہیں تھام رکھا تھا۔

"چلو اندر۔" وہ انہیں کھینچتے ہوئے تیز آواز میں غرایا۔

"اندر لے جاکر کیا کروگے' نرا وقت کا ضیاع۔ ایک ہاتھ کی مار ہے بڈھا۔ یہیں قصہ تمام کرو۔" مسز عثمانی بے حد سفاکی سے بولیں اور اپنی سلکی ساڑھی کا ڈھلکتا پلو برہنہ کندھوں پر جمانے لگیں۔

"یہ بھی ٹھیک ہے' اندر لے کر جاؤ پھر اس کی لاش کو باہر اٹھا کر لاؤ۔ وقت اور انرجی دونوں کا ضیاع۔ یو آر بریلینٹ۔" اس نے ہنستے ہوئے مسز عثمانی کو داد دی۔

"ادھر آؤ۔" سرمد نے دوسرے لڑکے کو جو چند منٹ پہلے تک اس کا بھائی بنا ہوا تھا' اشارہ کیا اور صوفی صاحب کو دھندلاتی بینائی کے ساتھ نہ تو اس لڑکے کی شکل ہی پوری طرح سے دکھائی دے رہی تھی اور نہ اس کا نام یاد آرہا تھا۔ وہ دوسری جانب ان کا دوسرا بازو دبوچ کر کھڑا ہوگیا۔

"چہ چہ۔ جلد بازو۔ بیچارے صوفی صاب کی آخری خواہش تو پوچھ لو۔" کلثوم بی بی ہنسی۔

"معلوم ہے ہمیں۔ میری بیٹیوں کو اپنے نکاح میں لے لو جلد سے جلد تاکہ میں بے حد سکون سے مر سکوں۔ ہے نا صوفی صاحب!"

سرمد عثمانی ان کے ناتواں کندھے پر تھپک جما کر بے شرمی سے ہنسا۔ صوفی صاحب نے دانت بھینچ کر باہر نکلتی آہ کو لبوں میں دبایا تو ان کے منہ سے سسکی سی نکلی۔ چہرے پر چھایا کرب پتھر کا کلیجہ چیرنے کو کافی تھا۔ ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر سفید ریش میں جذب ہوگئے۔

"آمنہ... جویریہ... میری بچیو... تمہیں اللہ کے حوالے... میں نے تمہاری حفاظت کے لیے خود پر مان کیا تھا۔ اللہ کو شاید بھول گیا تھا۔ دیکھو اس جھوٹے مان کا نتیجہ..."

دو ہاتھ ان کی گردن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ پر بینائی پر سلیٹی سی دھند چھاتی جارہی تھی۔

"نہ... نہیں... میں... میں... مجھے مت مارو... میں نے کیا کیا؟" زندگی نے آخری مزاحمت کے طور پر آنکھیں کھول کر فریاد کی تھی۔

"ارے اے صوفی صاحب! نانا... بری بات... یوں بچوں کی طرح روتے نہیں۔ چپ چپ... آپ تو اللہ کے پیارے بندے ہو' نیک اور پرہیزگار۔ آپ نے تو ساری زندگی نیکیوں کے انبار کمائے ہیں' دنیا کی آرام و آسائش کو ٹھوکر پر رکھا۔ آپ کو زندگی کا لالچ کاہے کو۔ آپ تو موت کی تمنا کرو۔ جنت کے باغوں کی تمنا جہاں دودھ کی نہریں' حوروں کے مور چھل' میووں کے درخت' قسم قسم کی نعمتیں آپ کی منتظر ہیں... ہائے برا تو ہمارے ساتھ ہوگا۔ ساری زندگی نہ کوئی نیکی کمائی' نہ نیکی کا ارادہ ہی کیا۔ ساری زندگی گناہ کمائے' گناہ کھائے اور گناہ کے مزے اڑائے۔ مرنے سے تو ہم جیسے ملعونوں کو ڈرنا چاہیے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ ہم تو آپ کو آپ کی منزل کے قریب تر کر رہے ہیں۔ شاید اس ذرا سی نیکی کے عوض ہم بھی بخشے جائیں... آمین ثم آمین۔" سرمد عثمانی کا شیطانی انداز۔ ان کا جی چاہا اس کے منہ پر تھوک دیں۔

"بس اب تیاری پکڑو۔ اتنا ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔" اس نے بے نیازی سے کہتے ہوئے لڑکے کو اشارہ کیا تھا۔

"میرے اللہ مجھے بخش دینا۔ میرے بچوں کی حفاظت فرمانا۔ آمنہ جویریہ تیرے حوالے... تو میرے ہر عمل کا گواہ... مجھے معاف..."

ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ سرمئی آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں... آہنی شکنجہ ان کی گردن پر آکر جم گیا تھا۔

اسی پل بے اختیار زینب کے آخری لمحات ان کے سامنے آرکے۔ مرتی ہوئی' تڑپتی ہوئی' چیختی ہوئی زینب۔ اس کی شکوہ کرتی ملامتی نظریں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑ گئی۔

"یا اللہ مجھے معاف کر دینا... زینب میری بچی... میرے اللہ..." ان کی گردن پر دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ ان کی سانسیں رکنے لگیں۔

"جلدی کرو کوئی آرہا ہے۔" ان کی سماعتوں میں اس دنیا کی آخری آواز پڑی۔

ان کے سینے میں رکی سانسیں باہر آنے کو مچلنے لگیں۔ نیچے کا دھڑ جو بے جان ہو کر لٹک رہا تھا' بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

"بڑی جان ہے اس بڈھے میں۔ آں... آں..." اس لڑکے نے کہتے ہوئے اپنا پورا زور لگایا تھا۔ ان کی آنکھیں جیسے باہر کو ابل پڑیں۔

"صوفی عبدالرحمن احمد پور... بچپن گلیاں... لڑکپن قرآن مجید... جوانی... رابعہ بی بی... کل نفس ذائقۃ الموت...

زینب... معاف... اللہ..."

"لا الہ الا اللہ..." ان کے منہ سے آخری پھٹی پھٹی آواز نکلی۔ بے تحاشا ابلی ہوئی سرمئی آنکھوں میں حیرت اور رنج کا سمندر موجزن تھا۔ ان کا نچلا دھڑ بے جان ہو کر لٹک گیا۔ دوسرے پل دونوں بازو ٹوٹی شاخوں کی طرح دونوں اطراف آگرے تھے۔ ان کے جسم نے آخری زوردار جھٹکا کھایا اور منہ سے باہر لٹکی زبان' حلقوں سے ابلی ہوئی سرمئی آنکھیں اور مزاحمت میں لرزتا سر یک لخت بے جان ہوگئے تھے۔ نبض اور دھڑکن تھم گئی۔

چند لمحے تک وہ لڑکا انہیں اسی قوت سے دبوچے کھڑا رہا۔ چاروں نفوس خاموش دانت بھینچے بہت غور سے ان پر گزرتے آخری لمحات کو دیکھ رہے تھے جیسے یہ سب ان کے لیے روز کا منظر ہو جیسے ہی ان کا جسم آخری جھٹکا کھا کر بے جان ہوا' چند لمحوں بعد اس لڑکے نے اپنے دونوں ہاتھ آہستگی سے کھینچ لیے۔

"ہائے ہائے... میں مرگئی' ہائے میں مرگئی۔ ہم لٹ گئے' برباد ہوگئے۔ لوگو کیا قہر ہے اللہ کا' اپنے پیارے بندوں پر۔ دیکھو تو قہر سا قہر۔ اے اللہ تجھے ذرا رحم نہ آیا۔ لوگو دیکھو تو... ہائے قیامت ہے قیامت..."

اپنے سینے پر دو ہتڑ مارتی زور زور سے چلاتی' بین کرتی کلثوم بی بی نے آہستگی سے بند دروازے کی چٹخنی گراتے ہوئے دونوں کواڑ کھول دیے اور باہر نکل کر واویلا کرتی زور زور سے چلانے لگی۔

دونوں لڑکے صوفی صاحب کو بے حد آرام سے نیچے لٹا چکے تھے۔ سرمد نے بہت آہستگی سے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پپوٹے بند کر دیے۔ ان کا عمامہ آدھا کھول کر گردن کے گرد یونہی لپیٹ دیا۔ مسز عثمانی نے ان کی چھڑی لاکر ان کے دائیں ہاتھ کے پاس رکھ دی اور اب پاس بیٹھی پھپک پھپک کر رو رہی تھیں۔ دونوں لڑکے بے حد غم زدہ چہرے لیے ان کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھے تھے۔

"آمنہ! آمنہ! تم نے سنا' باہر شور کیسا ہے؟" جویریہ حواس باختہ سی کمرے سے نکلی تھی۔

"تمہیں باہر شور سنائی دے رہا ہے۔ میرے اندر نہ جانے کیسا طوفان اٹھا ہے۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جویریہ کو دیکھ رہی تھی۔ جویریہ اس کی خاموشی پر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ شور سیڑھیوں کے قریب آگیا تھا۔

"میری شہزادیوں! میری بچیو! تمہارا بابل چلا گیا۔ تمہیں اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنے کا ارمان دل میں لیے ہائے ربا... قہر ہے قہر۔" کلثوم بی بی کی چیخ و پکار صاف انہیں سنائی دے رہی تھی۔

"بابا صاحب..." جویریہ کی دل دوز چیخ نے گھر کے در و دیوار ہلا دیے تھے اور اس کے پیچھے اترتی آمنہ سیڑھیوں کے تیسرے قدم پر بے جان ہو کر بیٹھتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تھینک گاڈ تم آگئے۔" جیسے ہی معاذ رکشے والے کو پیسے تھما کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ ایک دم سے شہباز خان گیٹ کے اندر سے نکلے اور بے حد گرم جوشی سے اسے گلے لگالیا۔

"کیسے ہو یہ پوچھنے کی تو ضرورت نہیں' ماشاء اللہ سے میرے بازوؤں میں نہیں سما رہے۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور تم جوان۔" وہ اسے دونوں کندھوں سے تھام کر بے حد محبت سے بولے تو معاذ جھینپ کر رہ گیا۔

"اتنے ینگ لگ رہے ہیں پہلے کی طرح اسمارٹ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ڈیشنگ اور خود کو بوڑھا کہہ کر تعریف کروانا چاہ رہے ہیں تو سن لیں ابھی لڑکیوں کی قطار آپ کے پیچھے ہاتھ باندھے چل سکتی ہے' جو آپ ارادہ فرمائیں۔" وہ بھی انہیں ویسی ہی نظروں سے تکتا ہوا بے تکلفی سے بولا۔

"ارے بھیا! ہم تو ایک لڑکی کو نہ باندھ سکے تم لڑکیوں کی قطار بندھوانے کی بات کر رہے ہو۔ کہو کیسے ہو؟" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔

"جیسا آپ کو نظر آرہا ہوں اور لڑکی کو نہ باندھ سکنے میں آپ جناب کی کمزوری شامل تھی ورنہ کون کافر ہوگی جو آپ سے بندھن جوڑ کر توڑنا چاہے گی۔" وہ ذو معنی انداز میں بولا۔

"ہوں' کافی ترقی کرلی ہے۔ خوب جملے بازی کرنے لگے ہو۔ یہ تم میڈیکل پڑھ رہے تھے یا کچھ اور؟" وہ اسے گھورتے ہوئے بولے۔ "چلو اندر۔ میں امی جان سے تمہاری اسٹڈیز کی تفصیل پوچھتا ہوں۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔

"آپ بات کو چاہے جس رخ پر لے جائیں' اس موضوع پر آئے بغیر آپ کی جان نہیں چھوٹنے والی۔" وہ انہیں گویا دھمکاتے ہوئے بولا۔ "دوسرے امی جان۔ شہباز بھائی! میں امی جان کا سامنا نہیں کر سکتا۔" وہ اچانک رکتے ہوئے بولا۔

"شرم کرو کتنے دنوں سے تم نے ان کی خبر تک نہیں لی' اس لیے میں تمہیں یہ ذمہ داری سونپ کر گیا تھا؟۔ ام جان اُس وقت سے نہایت بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں جب سے میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم آ رہے ہو اور جس بات کی وجہ سے تم جھجک رہے ہو اس کا تو وجود بھی مٹ چکا۔ بھائی' یاسمین بھابی اور مشی کے ساتھ امریکہ جا چکے ہیں۔ یوں بھی وہ سارا مشی کا ڈرامہ تھا تمہیں حاصل نہ کر سکنے پر انتقاماً" تمہیں سب کی نظروں سے گرانے کا۔ اس بات کو ایاز بھائی بھی سب پر واضح کر چکے ہیں اور تم سچ پر ہونے کے باوجود بزدلوں کی طرح بھاگ نکلے۔ ام جان کے وقتی غصے کو ان کی نفرت اور ناراضی جان کر۔ اس لیے اب مہربانی فرما کر اگر اپنی جان عزیز ہے تو ام جان کے سامنے اس فضول شرمندگی کا ذکر نہ کرنا۔" وہ اسے خفگی سے گھورتے ہوئے بولے۔

"اس وقت ایاز بھائی کو خیال نہ آیا کہ میرے حق میں ایک جملہ ہی بول دیتے۔" معاذ روٹھا سا کوئی لہجے میں بول اٹھا۔ "جیسی شرمندگی میں نے اس رات اٹھائی آپ ہوتے تو دیکھتے۔"

"جانتا ہوں میں۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "خیر چھوڑو اور میرا مشورہ مانو تو تکلیف دینے والی یادوں اور باتوں کو بھلا دیا کرو بہت فائدہ مند چیز ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

"آپ بھلا سکتے ہیں نزہت آپی کے متعلق ہر بات' ہر جھوٹ سچ' فضول قصہ گوئی کو؟" وہ تیزی سے بولا تو وہ اسے ایک لمحے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"یہاں اس بات کا کوئی ذکر نہیں۔" وہ کہہ کر آگے کی طرف بڑھے۔

"آپ مجھ سے میری بات ماننے کا وعدہ کر چکے ہیں۔" وہ وہیں رک کر بولا۔

"یار میں مرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ تم اندر تو آؤ۔" وہ پہلی سیڑھی پر کھڑے تھے۔ "تم نے آنے میں پندرہ بیس منٹ کی تاخیر کی ورنہ کوئی بہت بے چینی سے تمہارا انتظار کرتے ہوئے ابھی گیا ہے۔"

"کون؟" وہ استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔ "راستے میں ... ہوئے ... ورنہ میں ... پندرہ منٹ قبل پہنچ چکا ہوتا۔"

"تمہارے گیراج میں چار چار گاڑیاں کھڑی ہیں اور تم رکشوں میں دھکے کھاتے پھر رہے ہو؟" وہ آہستگی سے بولے۔

"کیا مطلب؟" معاذ ان کے قریب آ چکا تھا۔

"بس چلو اب اندر۔ ام جان سے ملو۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے مطلب سمجھا دوں گا۔" وہ اسے بازو سے گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئے تھے۔ سامنے ہی ام جان وہیل چیئر پر بیٹھی تھیں۔ معاذ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"معافی مانگنے کا موقع تو دیتے مجھے۔" وہ جیسے ہی ان کے گلے لگا وہ کہہ اٹھیں۔

"ام جان! گناہ گار نہ کریں مجھے۔"

"تو کوئی ایسے روٹھتا ہے کہ اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتا۔ اتنے سارے دن کتنی پریشانی میں گزرے نہ تمہارا کوئی اتا پتا نہ شہباز کی کوئی خبر۔ تم بوڑھی جان کو اتنا طاقت ور سمجھ رکھا ہے تم دونوں نے۔" وہ خفا لہجے میں بولیں۔

"ام جان پھر وہی دکھ دینے والی باتیں دہرا رہی ہیں۔ ساتھ آئی خوشی کو خراب کرنے والی بات۔ دکھ دینے والی یادوں کو بھول جائیں تو زندگی بہت سہل ہو جائے گی۔"

"دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت۔" ام جان بڑبڑائیں۔

"رافع کہاں ہے؟" معاذ نے مشتاق نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"اس کے ایک دوست کی برتھ ڈے ہے شام کو اس کے ساتھ چلا گیا ہے بلکہ میں ہی چھوڑ کر آیا تھا۔ اگر اسے تمہارے آنے کا پتہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ ابھی تک مجھ سے مانوس نہیں ہوا۔ زیتون بانو! کچھ کھانے پینے کو لے آؤ۔ ام جان! میں ذرا ایک ضروری فون کر لوں پھر چلتے ہیں۔" وہ عجلت میں کہتے ہوئے اندر کی طرف بڑھے۔

"اب کدھر جانا ہے؟" معاذ نے پوچھا۔

"ابھی آ کر بتاتا ہوں۔" انہوں نے کمرے کے اندر سے جواب دیا۔

چائے پیتے ہی شہباز خان نے چلو چلو کی رٹ لگا دی۔

"جانا کہاں ہے' پتا بھی تو چلے؟" معاذ نے پھر پوچھا۔

"تم چلو تو سہی راستے میں بتاتا ہوں۔" وہ ام جان کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولے۔

"شہباز! انسانی اعصاب بھی اتنے مضبوط ثابت نہیں ہوتے جتنی ہم توقع کرتے ہیں۔ تم معاذ کو سب کچھ ابھی بتا دو۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی مسز خان بولیں تو معاذ نے الجھن بھرے انداز میں شہباز خان کو دیکھا۔

"چلو بھئی معاذ میاں! بیٹھو تمہیں آج ایک کہانی سناتے ہیں۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ویسے تمہیں پتا کیسے چلا کہ میں پاکستان آ چکا ہوں؟" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی انہیں بھولا ہوا سوال یاد آیا۔

"میں نے آپ کو اسی گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" معاذ بے دھیانی سے بولا۔ اس کا ذہن کہانی سننے کو بے چین تھا۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

"تم نے شاید کبھی نام سنا ہو فخر حیات کا۔ بزنس کمیونٹی کا ایک چمکتا دمکتا نام۔ اگر نہیں بھی سنا تو اب سن لو۔" پھر شہباز خان اسے بتاتے چلے گئے۔ وہ گم صم سا سنتا جا رہا تھا۔

"ایک لمبی تھکا دینے والی تلاش بسیار کے بعد بالآخر رعنا فخر حیات نے تمہیں یعنی اپنے بیٹے علی شبیر یعنی معاذ کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ اسے میں ایک ماں کا جذبہ محبت ہی کہہ سکتا ہوں اور اب تم ہو اس "حیات ولا" اور اس کے لمبے چوڑے بزنس' بینک بیلنس کے اکلوتے وارث فخر حیات کے بیٹے۔ تمہیں اپنی پہچان کی تلاش تھی نا اور تم اپنے بارے میں مشکوک بھی ہو جایا کرتے تھے۔ اندر آؤ اور خود کو پہچانو۔ تمہیں کسی سے بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ فخر حیات کے ساتھ تمہیں کھڑا کر دو تو ان کی جوانی مقابل آ کھڑی ہوتی ہے۔ میری ان سے پہلی ملاقات چند سال پہلے ہوئی تھی اور مجھے ان کے چہرے پر کسی اور کے چہرے کا گمان ہوتا رہا جسے میں کوشش کے باوجود نہ سمجھ پایا کہ وہ دراصل تمہارا چہرہ تھا۔"

گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ معاذ ساکت سا سامنے کھڑی پرشکوہ عمارت اور پیچھے رہ جانے والے قوی ہیکل آہنی گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔

برسوں پہلے جب وہ اس شہر میں آیا تھا اور اگر اس کی یادداشت دھوکہ نہیں کھا رہی تھی تو یہی وہ کوٹھی تھی جس کے گیٹ سے اندر جانے پر چوکیدار اس کے پیچھے چور چور کہہ کر بھاگا تھا اور وہ شہباز خان کی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا تھا۔

"اب تم گھر ہو' اترو نیچے۔ وہ دیکھو سامنے۔" شہباز خان کی آواز پر وہ بے اختیار چونکا۔ وہ اس کی طرف کا دروازہ کھولے اس کے منتظر کھڑے تھے۔ وہ کسی معمول کی طرح باہر نکل آیا۔

پورٹیکو سے مین بلڈنگ کی طرف وہ بالکل غائب دماغی سے آیا تھا۔ لاؤنج کے کھلے دروازے میں چہروں پر بے تحاشا خوشی کی چمک اور ڈھیر ساری مسکراہٹ لیے ایک خوب صورت عورت اور مرد اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"لیجیے جناب! میں وعدے کے مطابق آپ کی امانت آپ تک لے آیا ہوں۔ لگتا ہے اللہ میاں نے مجھے آپ کے گھر اس ڈیوٹی پر لگا دیا ہے کہ آپ چیزیں گم کرتے جائیں۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا جاؤں گا۔" شہباز خان کی چہکار پر وہ پھر چونکا تھا۔

رعنا حیات سے چند گھنٹے پہلے سڑک پر ہونے والی مڈبھیڑ اسے یاد آئی تھی۔

وہ دونوں اب پلکیں جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرخ چہروں اور چھلکتی آنکھوں کے ساتھ۔

شہباز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دونوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ معاذ کی عجیب ذہنی کیفیت ہو رہی تھی۔

"میرا بیٹا! میرا بچہ! فخر! مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔" رعنا حیات کپکپاتی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ ان کی

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"علی شبریز! مجھے کسی نشانی کی ضرورت نہیں۔ یہ ہی میرا بیٹا ہے۔ میرے دل کو یقین ہے۔ بے نا فخرا!" وہ اس کو دونوں بازوؤں سے تھام کر بولیں۔

"بیگم صاحبہ! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ معاذ کو اس کے اسی نام سے پکاریں گی ورنہ تو وہ خود کو اور بھی اجنبی محسوس کرے گا۔" شہباز خان نے انہیں یاد دہانی کرائی جسے انہوں نے سنا ہی نہیں۔ انہوں نے بے اختیار روتے ہوئے معاذ کو جھپٹ کر سینے سے لگا لیا تھا۔

"میرے دل میں جو یہ جذبات امڈ رہے ہیں یہ مجھے چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ تم ہی ہو میرے جگر کے ٹکڑے میرا لعل میری گمشدہ متاع جس کی تلاش نے برسوں مجھے دیوانہ بنائے رکھا۔ نہ دن کو قرار تھا نہ رات کو چین میں تمہاری تلاش میں بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوتی رہی۔ میرے چاند!" وہ اسے اپنے ساتھ چمٹائے روئے جا رہی تھیں۔ کبھی اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر پیار کرتیں کبھی دونوں ہاتھوں کو چومتیں۔

"فخرا دیکھیں کوئی کہہ سکتا ہے یہ فخر حیات کا بیٹا نہیں۔ یہ تو بنے بنائے آپ ہیں"

معاذ کے اندر تو جیسے کوئی طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ برسوں سے اندر ہی اندر جنم لینے والا سوالوں کا جو بھنور تھا جو سر اٹھاتا اور خود بخود دم توڑ دیتا آج اپنی پوری جولانی پر آ گیا تھا۔ اس کا دل کس انداز میں دھڑک رہا تھا یہ تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر خون میں جذبات کا جو طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کی بے نام شناخت کی ڈولتی کشتی اپنی اصل منزل پر آ چکی ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور وہ بے اختیار فخر حیات کے کندھے پر چہرہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ساری زندگی کی اذیتیں ان لمحات میں مجسم ہو کر اسے رلانے لگی تھیں۔ کیسے اس نے اپنے ماں باپ کے ہوتے ہوئے یتیم خانے میں پرورش پائی ایک سوکھی روٹی اور ٹھنڈے ننگے فرش پہ سونے کے لیے کیسے لاتیں ٹھوکریں کھائیں۔ کیسے ایک ایک پیسہ جوڑ کر تعلیم کا سلسلہ جوڑے رکھا۔ کیسی کیسی حسرتیں دل و دماغ میں لیے وہ بڑا ہوا تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے۔ آنسو سارے بند توڑ کر بہنے لگے۔ فخر حیات نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ انہیں لگا ان کے بوڑھے وجود میں جوانی کی لہریں دوڑنے لگی ہیں ان کے جسم کی شکستہ گرتی ہوئی دیواروں کے سامنے جیسے کوئی مضبوط توانا ستون آ گیا ہو۔ عجیب سا سکون انوکھا سا اطمینان تھا جو فخر حیات کو معاذ کو گلے لگاتے ہی محسوس ہوا تھا۔

مسز خان اور شہباز بھیگی آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ اس خوب صورت ملاپ کو دیکھ رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

آپریشن تھیٹر کے باہر ٹہل ٹہل کر زیور گل کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں دو گھنٹے سے نین تارا اندر تھی۔ وہ ایک نرسوں کے آنے جانے کے سوا اور کوئی قابل ذکر فرد دو گھنٹوں میں باہر نہیں آیا تھا۔ اندر مکمل خاموشی تھی جو زیور گل کو مزید ہراساں کیے جا رہی تھی۔

پہلے تو وہ کافی دیر تک یہی سمجھ کر چیخ چیخ کر روتی رہی کہ نین تارا گزر گئی۔ شاک کے عالم میں وہ اس کے پاس بیٹھی دیکھتی رہی پھر چلا چلا کر رونے لگی شاید اس کی چیخوں سے ہی نین تارا کے اندر حرکت پیدا ہوئی تھی اس کے کراہنے پر زیور گل کو ہوش آیا اور وہ اسے اٹھا کر ہاسپٹل لے آئی۔

ڈاکٹرز اسے دیکھتے ہی آپریشن تھیٹر میں لے گئے تھے۔ زیور گل کے اپنے سر اور ماتھے پر چوٹیں آئی تھیں۔ فوری طور پر مرہم پٹی کروانے کے باوجود مسلسل سر سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر کے بقول اس کا کافی خون بہہ گیا تھا۔ اسے بھی ایڈمٹ ہو جانا چاہیے مگر نین تارا کی حالت دیکھ کر اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

اس کی تشویش بے جا بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نین تارا کو لے جاتے ہوئے کہہ گئی تھی کہ "دعا کریں اب تو کوئی معجزہ ہی اس کی اور اس کے بچے کی جان بچا سکتا ہے۔ جس حالت میں آپ اسے یہاں لے کر آئی ہیں۔"

"دعا یا معجزہ؟" وہ تھک کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میری زندگی میں تو کوئی معجزہ نہیں ہوا سوائے مجھ جیسی عورت کی نین تارا جیسی بیٹی ہے۔ کاش وہ بھی میرے جیسا دل و دماغ لے کر آتی محض پیسے کے لیے دھڑکنے اور سوچنے والا۔ کاش وہ اس منحوس محبت کے چکر میں نہ پڑتی اور دعا کے تو شاید زمانے بیت چکے تھے بہت خاص خاص موقعوں پر اس دل نے بھی بڑی لگن سے بڑی محبت سے دعائیں مانگی تھیں۔ جب پے در پے یہ دعائیں شرف قبولیت پائے بنا واپس آ گئیں تو اس نے دعا مانگنا ہی چھوڑ دی۔

"میں نے دعا مانگنا چھوڑ دی مگر میرے اللہ تُو نے مجھے دینا تو نہیں چھوڑا۔ بے دعا بے ایمان بھی تُو مجھے نوازتا رہا۔ زندگی گزارنے کی تمام آسائشیں آرام سہولتیں دولت جھوٹی سہی دکھاوے کی بے تحاشا محبتیں کتنی بے شمار نعمتیں جو میں نے کبھی گنی بھی نہیں۔

دشمن بھی تجھ سے مانگتے ہیں دوست بھی تیرے آگے دامن پھیلاتے ہیں حاسد بھی تیرے سامنے جھکتے ہیں اور رشک کرنے والے بھی۔ غریب بھی امیر بھی کنگال بھی کروڑ پتی بھی نیکوکار بھی اور مجھ جیسے بدکار بھی۔ جو ہونے ساری زندگی گناہ کی دلدل میں ہی دھنسے گزار دی اور جسے اپنی حالت خبر بھی نہیں تو اسے سنوارنے کی طرف دھیان کیسے جا سکتا ہے۔ اب اسی گندی لتھڑی ہوئی حالت میں ناپاک پلید تیرے سامنے دوزانو بیٹھی ہوں نہ میرے پاس نیکیوں کا ذخیرہ ہے نہ کوئی اچھا عمل جس کے بدلے میں اپنی بیٹی کی زندگی مانگ سکوں۔ اپنے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ گناہ میرے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے مجھ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ سو نین تارا کی زندگی کے بدلے بہت نیک ہو جانے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتی۔ توبہ کر سکتی ہوں مگر توبہ پر قائم نہیں رہ سکتی۔ میری یہ حالت اب تیرے سامنے ہے۔ ایسی بھکارن جس کا کشکول بھی خالی ہے اور لب صدا کے ہنر سے ناواقف ہی نہیں نادم بھی ہیں۔ کبھی مانگا جو نہیں بن مانگے ملنے والی ساری زندگی غرور کیا اس پر جو میرا تھا ہی نہیں۔ نہ یہ حسن نہ جوانی نہ تیزی نہ طراری نہ محبت نہ کشکول نہ مال و دولت۔ سب کچھ بھی تو میرا اپنا کمایا ہوا نہیں پھر بھی اس نفس نے کبھی سوچا نہیں جانے نہ کبھی تیرے آگے سر جھکایا نہ اس طرف دھیان گیا۔ سو کیسے مانگوں کیا دعا کروں کیسے کروں؟ میری جھولی میں تو گناہ ہی گناہ ہیں ندامتیں ہی ندامتیں۔

"مجھے مانگنا نہیں آ رہا۔ مجھے معافی دے دے اس سے۔۔۔ تو اچھا ہوتا کہ میں گونگی ہوتی ان پڑھ جاہل اندھی۔۔۔ یا تیرے وجود ہی سے ناواقف رہتی اس تکلیف دہ مرحلے سے تو نہ گزرتی کہ مجھے دعا مانگنی نہیں آتی۔ میری بیٹی کو میری بھی زندگی لگا دے وہ ابھی بہت کم عمر ہے۔ اس نے دیکھا ہی کیا ہے۔"

آخر تھک کر اس نے اپنے لب بھینچ لیے۔ کوئی بھی تو جملہ اس کے دل کا مدعا بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوا کہ اس کے پاس تو دعا کا ہتھیار بھی نہیں۔

"مبارک ہو میڈم اللہ نے آپ کی بیٹی کو نئی زندگی دی ہے اور چاند سا بیٹا بھی وہ بھی بغیر آپریشن کے۔ آپ کی دعائیں اللہ نے قبول کر لیں۔"

ڈاکٹر اس کے پاس کھڑی کہہ رہی تھی اور وہ بے یقینی سے اسے تکے جا رہی تھی۔

"کنڈیشن کچھ ایسی تھی کہ ہم آپریشن کر نہیں سکتے تھے اس لیے انتظار کرنا پڑا اور اسی میں۔۔۔ بچے کی حالت کچھ اتنی اچھی نہیں۔ بہرحال دعا کریں۔ آپ کی بیٹی البتہ ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر بعد آپ اس سے مل سکتی ہیں۔ ہم اسے ابھی روم میں شفٹ کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر زیور گل کی گم صم حالت دیکھ کر اس کے کندھے تھپکتے ہوئے آگے بڑھ گئی تو زیور گل ایک گہرا سانس لے کر اوپر چھت کو تکنے لگی۔

"کیا واقعی اللہ نے میری دعا سن لی۔"

✡ ✡ ✡

بہت برا خواب تھا اور بہت خوفناک بھی۔

عبدالمبین چیخ مار کر اٹھ بیٹھا تھا۔
اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا مگر اس کا جیسے دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنا سینہ مسلنے لگا۔ دوسرے پل اس نے ساری لائٹیں آن کر دیں۔
ابھی تو ڈھائی بجے تھے۔ گویا اسے لیٹے ہوئے محض آدھا گھنٹہ ہوا تھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب تو اس کا فنکشن ختم ہوا تھا اور آج تو اس نے خلاف معمول ڈرگز بھی نہیں لی تھیں۔ ویسے ہی بہت تھکاوٹ ہو رہی تھی۔
دن کے گیارہ بجے تھے جب وہ اس گلی میں داخل ہوا جس کے سرے سے ایک ہجوم نمودار ہو رہا تھا۔ ایک جنازہ کندھے پر رکھے ہوئے، کلمہ شہادت کی صدا بلند کرتا ہوا۔ اس کا پورا جسم بے جان ہو گیا تھا اور دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔
"تو وہ ہو گیا جس کے ہونے کا خوف مجھے میلوں دور سے یہاں بھگا کر لایا۔" اس کی چھٹی حس اسے الارم دے رہی تھی کہ ایسا ہو چکا ہے مگر وہ اس الارم کو سننا نہیں چاہ رہا تھا اور اب اس کی خواہش کے بالکل برعکس وہ الارم مجسم ہو کر سامنے آ گیا تھا۔
تکبیریں پڑھتا ہجوم ایک لمحے کو اسے بالکل سامنے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔
پلنگ کا سامنے والا پایا شیخ صاحب نے تھام رکھا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھے اور آہستگی سے وہ پایا عبدالمبین کے کندھے پر رکھ دیا اور عبدالمبین بہت کوشش کے باوجود یہ نہیں پوچھ سکا تھا کہ یہ جنازہ کس کا ہے۔ وہ کچھ دیر اور اس خوش فہمی میں رہنا چاہتا تھا کہ یہ جنازہ صوفی صاحب کا نہیں۔
کلمہ شہادت پڑھتا وہ ہجوم مختلف بازاروں سے گزر کر شہر خموشاں میں داخل ہو گیا تھا۔
گورکن قبر کھود چکا تھا۔ تازہ گیلی مٹی دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔
جنازہ بے حد آہستگی سے قبر کے قریب رکھ دیا گیا۔ سارے راستے جنازے کو کاندھا دینے کے باوجود اس کے [illegible] کندھے میں تھکن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ بس ایک شدید خوف [illegible] احساس تھا جس نے اس کے [illegible] رکھا تھا۔
نماز جنازہ بھی پڑھ لی گئی۔
دو تین آدمی باہر سے دوڑے دوڑے آئے۔
"ہم چہرہ نہیں دیکھ سکے... لیٹ ہو گئے تھے، ایک نظر بس..."
ان میں سے ایک آدمی کو عبدالمبین پہچانتا تھا۔ وہ صوفی صاحب کا بہت پرانا شاگرد تھا۔ اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس کی بے تابی کا عالم دیکھ کر عبدالمبین کا ذہن جھنجھنا اٹھا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس آدمی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ چہرے سے پہلے چادر اور پھر کفن کا کپڑا ہٹایا گیا۔
"ماشاء اللہ... کتنا نور ہے۔ سبحان اللہ صوفی صاحب تو..." وہ آدمی کہہ رہا تھا۔
عبدالمبین پھٹی پھٹی آنکھوں سے صوفی صاحب کے پرنور زرد رنگت اور بند آنکھوں والا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن سے ہمیشہ جلال ٹپکتا تھا، جو ہمیشہ عبدالمبین کو قہربار نظروں سے گھورا کرتی تھیں۔ ہمیشہ ناراض، خفا اور غصے میں رہتی تھیں۔ آج بند تھیں، بالکل بند۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود عبدالمبین کے سامنے ہونے کے باوجود بالکل بند...
"بابا صاب..." اس کا ضبط جواب دے گیا تھا اور اس کی چیخ نے جنازہ گاہ میں موجود لوگوں کو دہلا دیا تھا۔
"بابا صاب... نہیں، آپ یہ نہیں کر سکتے۔ یوں مجھ سے خفا ہو کر نہیں جا سکتے... بابا صاب... بابا صاب..."
وہ ان کے پلنگ کے پائے سے ٹکریں مار رہا تھا، زور زور سے اندھا دھند۔
"ارے بیٹا! حوصلہ... صبر... صبر کرو بچے... یہ تو حکم ربی ہے۔ کب ٹل سکتا ہے۔ یوں رونے سے انہیں تکلیف ہو گی۔ بہت نیک انسان تھے۔"

کوئی اسے کندھوں سے پکڑے کہہ رہا تھا مگر اسے ہوش کہاں تھا۔
"آپ یوں مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے، مجھ سے ایسے خفا ہو کر نہیں جا سکتے، مجھے معاف کیے بغیر۔ بابا صاب... اٹھیے، آنکھیں کھولیے۔ مجھے ماریے، گالیاں دیجیے مگر ایسے چپ نہ ہوں۔ ایسے تو آنکھیں بند نہ کریں۔ بابا صاب... بابا صاب..."
مسلسل ٹکروں سے اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا تھا۔ دو تین آدمیوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ کر پیچھے کیا۔
"جلدی کرو بھئی! کل شام کے فوت ہوئے ہیں، اب اور دیر نہ کرو۔ اچھا ہوا بیٹے نے منہ دیکھ لیا۔"
اس کی چیخ و پکار کے باوجود کلمہ شہادت کے ورد کے دوران صوفی صاحب کے جسد خاکی کو لحد میں اتار دیا گیا۔
"تو بیٹا! مٹی ڈالو۔ تمہارے دل کو صبر ملے گا۔" کوئی کدال اسے پکڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر کسی نے رومال باندھ دیا تھا، وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے مٹی سے پر ہوتے اس خلا کو دیکھ رہا تھا جس میں ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے بابا صاب گم ہوئے تھے ہمیشہ کے لیے۔

☼ ☼ ☼

"نین تارا! دیکھو تو..." زیور گل کہتی ہوئی تیزی سے اندر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سامنے خالی بیڈ دیکھ کر اس کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔
"نین تارا... کہاں ہو تم؟" وہ کمرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی۔
آگے بڑھ کر ہولے سے واش روم کا دروازہ پہلے کھٹکھٹایا پھر آگے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ صاف ستھرا باتھ روم بالکل خالی تھا۔
"نین... کہاں ہو تم؟" وہ اب گھبرا کر باہر کی طرف پلٹی۔ کاریڈور بالکل خالی تھا۔
"کہاں گئی؟" وہ دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کا موبائل موجود نہیں تھا۔ الماری کے پٹ کھول کر دیکھے، دوسرا سارا سامان موجود تھا بس نین تارا کا ہینڈ بیگ موجود نہیں تھا۔
"کہاں چلی گئی؟ آدھا گھنٹہ پہلے تو میں اسے واک کرا کے گھر گئی ہوں۔ اب تو اچھی خاصی شام ہو رہی ہے۔ کہاں جا سکتی ہے۔" وہ تیزی سے نرسنگ روم کی طرف بڑھی۔
"شاید بچے کو دیکھنے چلی گئی ہو۔" اسے ابھی تک آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ بچے کو سانس کا پرابلم تھا۔
زیور گل پریشانی کے عالم میں بے بی وارڈ کی طرف جا رہی تھی، جب ایک نرس دوڑتی ہوئی اس کی طرف آئی۔
"دیکھیے... میری..."
"میڈم! آپ کے لیے ایک بہت بری خبر ہے۔"
وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ زیور گل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔
"آپ کا نواسا، مس نین تارا کا بیٹا نرسری میں موجود نہیں ہے۔" نرس پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اٹک اٹک کر بولی۔
"کیا مطلب...؟" زیور گل حواس باختہ سی ہو کر بولی۔
"ہم... میں ابھی نرسری سے ہو کر آ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے چیک کیا تو بچے کی حالت بالکل اچھی نہیں تھی۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گئی تو انہوں نے دو انجکشن لکھ دیے جو فوری طور پر اسے لگانے تھے، میں انجکشن لے کر پہنچی تو بے بی کا کاٹ خالی تھا۔" وہ جلدی جلدی تفصیل بتا رہی تھی۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے، ناممکن۔" زیور گل زور سے نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "یہ اس ہاسپٹل کی انتظامیہ کی غیر ذمہ داری کی انتہا ہے۔ ایک بچہ دن دیہاڑے نرسری سے اغوا ہو جائے، وہ بھی اتنے لوگوں کی موجودگی میں۔ کیا نرسری میں کوئی اٹینڈنٹ موجود نہیں ہوتا۔"

زیور گل اب زور زور سے بول رہی تھی' ارد گرد سے گزرتے اسٹاف کے لوگ اور دوسرے وزیٹرز ان کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔

"ہم... ہوتے ہیں میڈم! ابھی بھی سائیڈ سسٹر اور ایلس موجود تھیں۔ جب میں بچے کی کنڈیشن بتانے ڈاکٹر کو گئی آپ خود چل کر معلوم کر لیں۔"

نرس اچھی خاصی نروس ہو چکی تھی۔ زیور گل کے تیور اسے بوکھلائے دے رہے تھے

"میں اس ہاسپٹل کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ اگر میرے نواسے کا کچھ پتا نہ چلا۔ میں نے شہر کے اس مہنگے ترین ہاسپٹل کا انتخاب اس لیے نہیں کیا تھا کہ ہمارے بچے کو مناسب طبی سہولیات تو کیا سیکیورٹی بھی نہیں مل سکے۔ یہ تو سرکاری دواخانوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ دس منٹ میں اگر میرا بچہ مجھے نہ ملا تو میں پولیس کو کال کروں گی' بتا دو جا کر اپنے بڑوں کو۔"

وہ غصے میں زور زور سے چلا رہی تھی۔ ایک حقیری نظر اس نے کانپتی نرس پر ڈالی اور مڑ کر نین تارا کے کمرے میں آ گئی۔

نین تارا اور بچے کا اکٹھے غائب ہونا اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

"یہ شیطانی یقیناً سلطان بخت کی ہو گی' وہ اب اپنا دامن بچانے کے لیے نین تارا اور اس کے بچے کا صفایا کرنا چاہے گا۔ فیوڈل مائنڈ یہیں تک سوچ سکتا ہے' جو چیز اپنی عزت کے لیے خطرہ بن جائے' اس کا نام و نشان مٹا دو۔"

وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے نین تارا کے کمرے کی تلاشی لے رہی تھی۔

اس نے بڑے دھیان سے ایک بار پھر نین تارا کے ہینڈ بیگ اور موبائل کو تلاش کرنا چاہا۔ دونوں چیزیں غائب تھیں۔ بیڈ کے پاس پڑے ہاسپٹل کے سلیپرز اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ نین تارا اپنے سینڈل پہن کر گئی ہے۔ بیڈ کے دوسری جانب موجود اس کے براؤن سینڈل جو ملازم ... گاڑی کے اندر رکھے تھے' نین تارا کو تو بے ہوشی کی حالت میں ہاسپٹل لایا گیا تھا۔

"کیا نین تارا کو اغوا کرنے والے نے پہلے اسے سینڈل پہنائے ہوں گے۔" الماری کا مکمل جائزہ لینے کے بعد وہ دونوں ہاتھ تھام کر سوچنے لگی۔

"صرف یہ شو کرنے کے لیے کہ نین تارا اپنی مرضی سے گئی ہے' اس کے سینڈل غائب کیے گئے ہیں۔" زیور گل نے خود کو ایک اور جھوٹی تسلی دی' ورنہ اس کا دل تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔

کمرے سے باہر شور بڑھ رہا تھا' آوازوں کا بھی اور بھاگتے دوڑتے قدموں کا بھی۔ زیور گل نے ایک آخری نظر کمرے پر ڈالی اور اپنا ہینڈ بیگ سنبھال کر باہر نکل آئی۔

"آپ کی بیٹی اپنے روم میں ہے میڈم؟" ڈاکٹر نورین پریشان صورت لیے اسے کاریڈور ہی میں مل گئی تھی۔

"بچے کا کچھ پتا چلا۔؟" زیور گل اس کا سوال نظر انداز کر کے ترشی سے بولی۔

"ن... نہیں... عجیب بات' بہت عجیب بات ہوئی ہے۔ ہمارے ہاسپٹل میں آج تک ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم خود سخت پریشان ہیں' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"ڈاکٹر نورین! غور سے سنیے' اگر میرے نواسے یا میری بیٹی کو کچھ ہوا تو یاد رکھیے' میں اس ہاسپٹل کی بلڈنگ کو اس کے مالکان سمیت ہلا کر رکھ دوں گی۔ میری بیٹی نہ تو لاوارث ہے' نہ کسی ٹٹ پونجیے کی اولاد جو آپ کی اس لاپروائی اور غیر ذمہ دارانہ حرکت کی نذر ہو جائے اور آپ پر کوئی حرف بھی نہ آئے۔ یہ بات ذہن سے نکال دیجیے' میں ابھی آئی ہوں اور میرے آنے تک بچے کا پتا چل جانا چاہیے' ورنہ یہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہو گا۔"

زیور گل جس تنتنے سے بول رہی تھی' ڈاکٹر نورین کا رنگ زرد ہو گیا۔ زیور گل نے ایک تحقیر بھری نظر اس پر ڈالی اور پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

وہ اپنا شک کی تصدیق کرنا چاہ رہی تھی' اس لیے "فوراً" سے پیشتر گھر جانا چاہ رہی تھی۔

"نین تارا بہت جلد باز ہے۔ جذباتی اور احمق۔" وہ پاگلوں کی طرح اندھا دھند گاڑی دوڑاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"گھر جانے سے بہتر ہے' میں پہلے معلوم کر لوں۔" وہ سگنلز توڑتے ہوئے ٹریفک سارجنٹ کے پیچھا کرنے پر ایک چھوٹی سی ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ گاڑی سائیڈ پر روک کر اس نے گھر کا نمبر ملایا۔

"اشرف... نین تارا ابھی گھر آئی تھی کیا؟" ملازم کی آواز سنتے ہی وہ زور سے بولی۔

"جی!" وہ شاید اس کی تیز آواز پہ گھبرا گیا تھا' ٹھیک سے سن نہ پایا۔

"جی کے بچے' حرام خور! میں بکواس کر رہی ہوں۔ چھوٹی بی بی ابھی کچھ دیر پہلے گھر آئی تھی؟" وہ اتنے زور سے چیخی کہ اشرف کو لگا اس کے کان کا پردہ پھٹ جائے گا۔

"جج... جی آئی تھیں..."

دوسری طرف اشرف جو کچھ بتا رہا تھا' اسے سن کر اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا' وہ موبائل آف کر کے تیزی سے گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی ریورس کرتے ہوئے واپس موڑنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اداس شام رات کے دامن میں منہ چھپا رہی تھی' جب عبدالمبین اپنے تھکے ہارے وجود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے اوپر آیا تھا۔ صحن میں بچھی دریوں پر اب کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ مدقوق بلب کی منحوس زرد روشنی میں ہر طرف ویرانی' اداسی اور وقت کے سائے منڈلاتے محسوس ہو رہے تھے' جیسے وہ اس گھر کی بچی کھچی خوشیوں کو تلاش رہے ہوں۔

وہ سر جھکا کر تخت پر ہی بیٹھ گیا۔

اس نے تو کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہو گا اور صوفی صاحب نہیں ہوں گے۔ ایسا خیال تو صوفی صاحب نے شدید تکلیف کے دنوں میں بھی نہیں گزارا۔ کل سے سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہو جانے کے باوجود صوفی صاحب کو خود اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتار دینے کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہر لمحے یہ گمان سا لگا رہتا کہ ابھی اس مختصر سے گھر کے کسی کونے سے صوفی صاحب اپنی بھاری آواز میں کھنکھارتے' ناراض نظروں سے گھورتے نکل آئیں گے اور پھر اسے جی بھر کر کوسیں گے' برا بھلا کہیں گے۔

"کوسیں' جی بھر کر برا بھلا کہیں' مجھے کبھی معاف نہ کریں' مگر یوں ہمیشہ کے لیے منہ چھپا کر مٹی اوڑھ کر تو نہ سوئیں۔ بابا صاب! اتنی بڑی سزا نہ دیں مجھے بابا صاب پلیز..." وہ اپنے گریبان پر جھکا ہولے ہولے سسکنے لگا۔

آمنہ اور جویریہ صوفی صاحب کے کمرے میں دو تین خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ تینوں خواتین چند منٹوں بعد اٹھ کر باہر نکل آئیں۔ عبدالمبین کے سر پر ہاتھ پھیرتی' دلاسے' تسلی کے دو چار فقرے کہتی نکل گئیں۔

عبدالمبین نے سر اٹھا کر کمرے کی دہلیز پر لٹی پٹی سی اداس صورتوں والی دونوں بہنوں کو دیکھا' بالکل خالی تہی دامن' بے آسرا سی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ جی چاہا دوڑ کر جائے اور دونوں کو اپنے اندر کہیں سمو لے' ساری دنیا کے دکھوں سے کہیں دور چھپا لے۔

"جویٰ... آمنہ... ادھر آؤ۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ آمنہ سر جھکا کر اپنے پیروں کو تکنے لگی۔ جویریہ عبدالمبین کو دیکھتے ہوئے بے اختیار رونے لگی اور پھر بے قابو سی ہو کر روتی ہوئی آگے بڑھی اور عبدالمبین کے زانو پر سر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"بھائی! بابا صاب چلے گئے' ہمیں چھوڑ کر' یوں اکیلا' بابا صاب..."

وہ ہچکیوں کے درمیان تڑپ تڑپ کر کہنے لگی۔ عبدالمبین اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا خود بھی رو رہا تھا۔ آمنہ کی آنکھوں سے بے آواز آنسو ٹپ ٹپ اس کے قدموں میں گر رہے تھے۔

"حوصلہ... جویٰ... میری ننھی بہن... تم نے اس چھوٹی سی عمر میں کتنے بے شمار غم دیکھ لیے ہیں۔ زیست کو

زہر پیا کرنے کے لیے ایک ہستی کا غم ہی بہت ہے۔ اس پر مفلسی کا عذاب اور یہ دائمی جدائیوں کے پہاڑ کس کس غم کو روؤ گی۔ صبر کرو، حوصلہ کرو اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔"

"صبر... صبر... بھائی! کتنا صبر؟" وہ سر اٹھا کر سرخ آنکھوں کے ساتھ چلائی۔

"اتنے غم، اتنے صدمے ان پر صبر نہیں ہو سکتا۔ صرف سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ زندہ رہنے کا ہرجانہ یہ سمجھوتہ ہے، مجبوری ہے۔ پر صبر نہیں، صبر نہیں۔ یہ دکھوں کے پہاڑ جو ہم پر اس آدھی زندگی میں ٹوٹے ہیں، باقی آدھی زندگی میں خوشیوں کے انبار بھی مل جائیں تو بھی ہمارے سینوں سے ان پہاڑوں کو نہ سرکا سکیں گے پھر صبر کیسا..." بہت دنوں بعد اس نے اپنے اندر کی بھڑاس نکالی تھی۔

"صبر کہو، سمجھوتہ یا مجبوری، زندہ رہنے کے لیے کرنا ہی پڑے گا۔" عبدالمبین ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

اسی وقت سیڑھیوں سے مدرسے کا لڑکا اوپر آیا۔

"آپ کو نیچے امام صاحب بلا رہے ہیں۔" وہ ذرا سا سر اندر کر کے اطلاعی انداز میں بولا تو عبدالمبین اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" کہہ کر سیڑھیاں اتر گیا۔

"دکھ تو جی آپ کا ایسا ہے کہ اس زخم کو بھرتے بھرتے بھی زمانے لگیں گے پھر بھی میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ بہن بھائیوں کو صبر جمیل عطا کرے اور صوفی صاحب جیسے نیک برگزیدہ بندے کو آخرت کا سکون۔" امام صاحب کہہ رہے تھے۔ "اگرچہ یہ بات کرنے کا ابھی موقع تو نہیں مگر میں بھی بڑا سخت مجبور ہوں۔ صوفی صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل شام تک گھر خالی کر دیں گے۔ اصل میں میرا گاؤں ادھر سے بہت دور ہے، دو گاڑیاں بدل کر جانا پڑتا ہے۔ اس میں بھی چھ سات گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ادھر گاؤں میں میری بیوی دو چھوٹے بچوں کے ساتھ اکیلی ہے۔ میرے بچے دونوں بیمار ہیں۔ کل شام کو میری بیوی اپنے بھائی کے ساتھ وہاں سے چل پڑے گی۔ میرا اس سے ایسا کوئی رابطہ بھی نہیں کہ میں اسے منع کر دوں۔ وہ چار روز اور رک جائے اور شہر میں ایسا کوئی واقف کار نہیں کہ بیوی بچوں کو ادھر ٹھہرا دوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔"

مولوی صاحب جھجک جھجک کر اپنا مدعا بیان کر رہے تھے۔

"جی سمجھ رہا ہوں۔ سمجھ گیا ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "آپ فکر نہیں کریں، میں کل شام سے پہلے آپ کو گھر خالی کر دوں گا۔"

"تو آپ لوگ..."

"بہت شکریہ، بہت معافی جی! آپ کو اس کڑے وقت میں ایسی بات نہ کہتا، مجبوری..."

"کوئی بات نہیں۔ گھر پھر بھی خالی کرنا ہی تھا۔ دو چار دن بعد نہ سہی، کل سہی۔"

آمنہ چولہے کے پاس چوکی پر بیٹھی تھی اور جویریہ تخت پر۔

"کل شام سے پہلے امام صاحب کو گھر خالی چاہیے، تم دونوں اپنا ضروری سامان ایک بیگ میں رکھ لو، باقی ادھر ہی رہنے دو۔ ہم کل دوپہر تک ادھر سے نکل جائیں گے۔" عبدالمبین تخت پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تو ہم جائیں گے کہاں؟" چولہے کے سوراخوں میں سے تنکے کے ذریعے میل نکالتی آمنہ بولی۔

"میرے گھر اور کہاں۔" عبدالمبین بولا۔

"تمہارا گھر... ناچ گانے کی حرام کمائی سے بنا گھر جس پر میرے باپ نے کبھی تھوکنا گوارا نہیں کیا۔ مفلسی میں آخری سانسیں بتا دیں۔" آمنہ سرد لہجے میں بولی۔

"وہ میرا ذاتی گھر نہیں، کرائے کا ہے۔" عبدالمبین چند لمحوں بعد تحمل سے بولا۔

"کرایہ بھی تو اسی کمائی سے دیتے ہو نا۔ 'محنت' کی کمائی سے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"آج کل آدھی دنیا یہی کر رہی ہے۔"

"تو کیا دنیا اپنا منہ کالا کرے، کنویں میں کود جائے یا آگ سے خود کو جلا ڈالے۔ لازم ہے ہم بھی وہی کریں؟" وہ چیخ کر بولی۔

"مسٹر مبین! گناہ ہمیشہ گناہ رہے گا اور نیکی ہمیشہ نیکی۔ زمانہ بدلنے سے ان کے پیمانے نہیں بدل سکتے اور اس معاملے میں انسان کو دوسروں کی پسند و ناپسند کے بجائے اپنے ذاتی نفع و نقصان کو مدنظر رکھنا چاہیے۔"

وہ اسے ان ہی بیگانہ نظروں سے تک رہی تھی۔ "اور تمہیں شاید یاد نہیں کہ ہمارے باپ نے ہماری تربیت اس طرح نہیں کی کہ ہم اس دنیا کے نفع کی خاطر آخرت کا گھاٹا کما لیں۔ تمہارے نظریات تمہارے ذاتی ہیں، وہ تمہیں زمانے بھر کا نفع پہنچا رہے ہیں، سو تم جو جی چاہے کہہ سکتے ہو۔" وہ چبا چبا کر کہہ رہی تھی۔

"ابھی کچھ کہنا باقی ہے یا سب کچھ کہہ چکیں۔" عبدالمبین کچھ جل کر بولا۔ "بہرحال اس وقت اس مباحثے سے کچھ حاصل نہیں، تم لوگ کل صبح جلدی تیار ہو جانا۔ ہم صبح چل پڑیں گے۔" وہ گویا اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم نکل تو جائیں گے مگر تمہارے ساتھ نہیں۔" آمنہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ پلٹا۔

"ہم کہاں جاتے ہیں، کہاں ٹھکانا کرتے ہیں، اس سے تمہیں کچھ غرض نہیں ہونا چاہیے جیسے کل صبح سے پہلے تک تمہیں ہم سے کچھ غرض نہیں تھی کہ ہم جی رہے ہیں یا مر رہے ہیں، بالکل اسی طرح۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"اب تو ٹھیک ہوا ہے، تمہاری خدمات سے ہمارے باپ نے آخری دم تک فیض نہ اٹھایا، اپنے اصولوں کی خاطر اور تمہارا خیال ہے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہم ان کے اصولوں کو قدموں تلے روندتے ہوئے تمہارے ساتھ چل پڑیں گی، ہرگز نہیں۔"

آمنہ... عبدالمبین نے کچھ پریشان نظروں سے جویریہ کی طرف دیکھا۔

"آپی! ابھی یہی مناسب ہے، ہم اور کہاں جائیں گے۔" جویریہ دھیمی آواز میں بولی۔

"ہم تو سدا سے اس قفس سے نکلنا چاہتی تھیں۔ سو تمہیں اللہ نے موقع دیا، تم چلی جاؤ، میں نہیں جاؤں گی۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔" جویریہ حیرت سے بولی۔

"اب ہم سب بالغ ہیں اور باشعور بھی۔ اپنے بارے میں ہمیں جو فیصلہ درست اور بہترین نظر آتا ہے، وہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ جو تمہیں بہتر نظر آئے، وہ تم کرو۔ جو مجھے مناسب لگے گا، میں کروں گی اور مجھے یقین ہے ہم پر کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔" وہ ایک تیکھی جتاتی ہوئی نظر عبدالمبین پر ڈالتے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی جو تخت پر سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے تمہیں بھی فرصت ملی ہم غریبوں سے ملنے کی، ورنہ میں تو تم سے باقاعدہ اپائنٹمنٹ لینے کی سوچ رہا تھا۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی شہباز خان نے معاذ کی طرف دیکھ کر طنز سے کہا۔

"یہ مصروفیت کا جال بھی آپ نے میرے گرد بنا ہے۔"

"اور دیکھو تمہاری اس معصوم خواہش کے ساتھ بطور بونس اللہ میاں نے تمہیں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ کیسا لگ رہا ہے؟"

"اچھا بھی اور... کچھ بے یقین سا بھی۔" وہ رک کر بولا۔

"بے یقین کیوں؟"

"پاپا، ماما دونوں اتنے اچھے ہیں کہ مجھے پہلے ایک دو روز تو ان کی اتنی محبتوں کو دیکھ کر عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ بہت مشکل لگ رہا تھا یوں ایک دم سے دو اجنبی لوگوں کو اتنے قریبی رشتوں کی جگہ دیکھنا۔ میں سائبان بھی گیا

تھا اور اس سے آگے تک جہاں سے میری شناخت کا سفر شروع ہوتا ہے' خود کو یقین دلانے کے لیے۔"

"پھر آیا یقین؟" وہ کچھ خفگی سے بولے۔

"وہ تو آنا ہی تھا' بس دکھ ہوا تو اس بات کا کہ میری گمشدگی کی جڑیں کسی کے انتقامی جذبے سے جا ملتی ہیں۔ جنتاں' جس کے بچے کے ساتھ اتنا بدنما سلوک کیا ماما نے کہ مجھے یقین نہیں آتا ان کی سویٹ نیچر دیکھ کر لیکن نہیں۔" وہ خود ہی نفی میں سر ہلا کر بولا۔

"ماما کی سویٹ نیچر کو دیکھ کر کوئی بندہ ایسا سوچ نہیں سکتا کہ انہوں نے جنتاں کے ساتھ یہ کیا ہوگا لیکن اس روز ان کی گاڑی کے آگے آجانے پر جس حقارت بھرے انداز میں انہوں نے مجھے جھڑکا تھا' ماما نے یقیناً جنتاں غریب کے ساتھ ایسا ہی کیا ہوگا۔" وہ خود ہی مسکرا دیا تھا۔

"تمہیں جھڑکا تھا' کب؟" شہباز خان حیرت سے بولے تو معاذ انہیں بتانے لگا کہ کس طرح وہ اس دن اپنے خیالوں میں گم جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کا ہارن نہیں سن پایا تھا۔

"اسٹائل میری جان' ویل کلاس اسٹائل۔ آہستہ آہستہ تمہیں بھی یہی اسٹائل آجائے گا' سب کچھ ایک اشارۂ ابرو پر مل جانے' ہو جانے' گزر جانے کا اسٹائل۔" شہباز خان ہنسے۔

"مجھے کم از کم ایسی بددعا تو نہ دیں' میں نے زندگی گلیوں میں گزاری ہے بلکہ یتیم خانے کے ننگے فرش پر۔ خدا نہ کرے' میں ان دنوں کی تلخ یادوں کو کبھی بھلا سکوں۔ آپ پرسوں ماما کی گرینڈ پارٹی میں آرہے ہیں نا جو انہوں نے میرے اعزاز میں بلکہ مجھے اپنی کلاس میں متعارف کرانے کے لیے ارینج کی ہے۔" معاذ کو یاد آیا تو پوچھ بیٹھا۔

"بھئی بورژوا کلاس کا تو دعوت نامہ ملنا ہی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ کون اس میں شرکت کرنے سے انکار کرتا۔ ایسا گستاخ سمجھ رکھا ہے مجھے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔

"آپ کے طرح کچھ بڑھتے نہیں جا رہے؟" معاذ انہیں گھور کر بولا۔

"بھئی' جناب کا رتبہ بھی تو بڑھ گیا ہے۔ مجھے اپنا سر عزیز ہے گردن ... سے ... بات کروں گا۔ اب کوئی آپ پہلے والے معاذ تھوڑی ہیں۔"

"شہباز بھائی! ایک بات بتائیں۔"

"پوچھو۔"

"آج کل آپ اتنے خوش کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ مطمئن ہوں۔"

"اور اس اطمینان کی وجہ؟"

"تمہیں تمہاری منزل تک پہنچانے کی خوشی' ام جان سے ملنے کی خوشی' ارتضیٰ کا ساتھ۔ بتاؤ میں کیوں خوش نہیں ہوں گا۔"

"ایک اہم ساتھ کو آپ بھول رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ کچھ چونکے

"ابھی بتاتا ہوں۔" گاڑی اب ایک نسبتاً کم آباد سڑک کی طرف مڑی تھی۔

"تم جا کہاں رہے ہو؟"

"آپ کو منزل تک پہنچانے۔ ضروری ہے کہ آپ مجھے ہی مقروض کرتے جائیں۔ کچھ قرض تو مجھے بھی چکتا کرنے دیں۔"

"مطلب؟" گاڑی اب ایک گیٹ کے آگے کھڑی کرکے دونوں باہر نکل آئے تھے۔

گیٹ کھولنے کوئی ملازم آیا تھا جو معاذ کی شکل دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

"یہ کس کا گھر ہے؟" شہباز ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"ارتضیٰ کے کلاس فیلو فہد کا۔"

"اوہ۔ اچھا۔۔۔ ہاں ارتضیٰ اکثر ذکر کرتا ہے مگر ہم یہاں کیوں آئے ہیں' وہ بھی ارتضیٰ کے بغیر۔۔۔"

ابھی وہ کہہ ہی رہے تھے کہ ڈارک براؤن پلین سوٹ میں نزہت اندر داخل ہوئی۔ نزہت کو دیکھ کر جہاں شہباز خان کے الفاظ منہ میں رہ گئے' وہیں نزہت کے قدم جیسے زمین میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ نگاہوں کے بے اختیار تصادم کا اختتام کچھ غصے اور بیزاری کی شکل میں ہوا تھا۔

"نزہت تم۔۔۔" شہباز خان نے ایک گہرا سانس لے کر کمرے میں چھائے سکوت کو توڑا تھا۔

"معاذ! تم یہ بہت غلط کر رہے ہو میرے ساتھ' بہت غلط۔" وہ بھنچی آواز میں غصے سے بولی۔

"پلیز نزہت آپی! مجھے غلط مت سمجھیں' آپ دونوں ایک بار بیٹھ کر اطمینان سے' ٹھنڈے دل سے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سن لیں' اس طرح۔۔۔"

"بس بہت کہہ سن چکی۔ اب مزید کی گنجائش نہیں۔ میں ان کے لیے اور یہ میرے لیے مر چکے اور گڑے مردے باہر اکھاڑو تو بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا' سوائے اپنے ہاتھ میلے کرنے کے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"جینے کی صورت اگر ایسی اذیت ناک ہو جیسی ہم پر بیت رہی ہے تو سوچو مرنے کی تکلیف کس درجے زیادہ ہو گی۔ ہم دن میں دس بار ان تکلیفوں سے نجات پانے کے لیے مرنے کی تمنا کرتے ہیں' جو سچ مچ مرنا پڑ جائے تو کیا تم ایک بار بھی مہلت نہ مانگو گی زندگی سے' کچھ پل' کچھ دن' کچھ لمحے اور جینے کے لیے۔" شہباز خان اس کے پیچھے آکر بولے تھے۔

"نہیں' بالکل نہیں۔ میں تو کب سے ان خوش نصیب لمحوں کی منتظر ہوں۔ جب موت مجھے اس تکلیف دہ زندگی سے نجات دلانے آئے گی۔" وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑی۔

"زندگی کی تکلیفیں تمہیں احساس دلا رہی ہیں نا کہ تم زندہ ہو۔ کبھی سوچا تم نے کہ ہماری زندگی اتنی تکلیف دہ اتنی بوجھل کیوں ہے؟"

"بہت عرصہ ہوا۔ میں نے اس پر سوچنا چھوڑ دیا ہے اور نہ مجھے سوچنے کی ضرورت ہے اور پلیز' آپ لوگ میرا پیچھا چھوڑ دیں' ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟ ایک بار پھر مرنے کا ڈھونگ رچاؤ گی۔" وہ بے اختیار بولے تو نزہت نے ایک کٹیلی نگاہ ان پر ڈالی۔

"میری تو پوری زندگی ایک ڈھونگ ہے' رچانے کی کیا ضرورت۔" وہ کہہ کر رکی نہیں اور دوڑتے قدموں سے باہر نکل گئی۔ یقیناً اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟" معاذ نے انہیں اس غلط جملے کا احساس دلایا جو ان کی زبان سے پھسلا تھا۔

"منہ سے نکل گیا۔" وہ خفت بھرے انداز میں سر ہلا کر بولے۔

"کس خوشی میں بھلا؟" معاذ چڑ کر بولا۔

"نزہت کو زندہ سلامت اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر۔" وہ اقرار کرتے ہوئے بولے۔

"تو یہ معاملہ ہے۔ گویا اب میرے واسطے کی ضرورت تو نہیں رہی۔ آپ خود ہی روٹھے یار کو منانے کے جتن کر لیں گے۔" وہ سکون بھرا سانس لے کر بولا۔

"ظاہر ہے کرنے تو پڑیں گے مگر تمہارے واسطے کی بھی ضرورت ہے' ورنہ یہ محترمہ پھر کہیں روپوش ہو جائیں گی۔ حالانکہ حالات سے فرار کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ پانچ سال میں نے بھی روپوش رہ کر دیکھ لیا کہ اس سے خود اذیتی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"کیا آپ نزہت آپی کو منا لیں گے؟"

"اسے ماننا پڑے گا جیسے میں نے خود کو منایا ہے ارتضیٰ کی خاطر۔ ایک بار قدم غلط رستے پر اٹھ جائیں تو پلٹنا

بہت مشکل ہوتا ہے مگر پلٹنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا۔ بس سعی پیہم۔" وہ مسکرائے۔ "چلو چلتے ہیں۔" انہوں نے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔

اسی وقت ایک ہینڈسم، دراز قد نوجوان پولیس کی یونیفارم میں انہیں کاریڈور سے اندر جاتا دکھائی دیا۔ اس نے ان دونوں کو نہیں دیکھا۔ دونوں چند لمحے کھڑے رہے پھر اس سوالیہ سوچ کو لے کر باہر آگئے۔

"میں نے اس سے پہلے تو اس نوجوان کو ادھر نہیں دیکھا۔" معاذ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا اور کن انکھیوں سے شہباز خان کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے جواباً کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

اور کمرے کی کھڑکی کے آگے کھڑی اشک بہاتی نزہت سوچ رہی تھی "اسے آج کل میں یہاں سے کہیں دور چلے جانا چاہیے۔" یہ شخص جواب بہت اچھا بن کر آیا ہے جیسے ہی مجھے تنہائی میں ملے گا پھر انہیں شرمناک الزامات کو دہرائے گا پھر وہی سوال' وہی جواب' وہی بے یقینی' وہی بدگمانی' حقارت' نفرت' تضحیک ـــــ کیا اسی دن کے انتظار میں یہ دوسری بے نام زندگی جی رہی تھی۔ نہیں' ہرگز نہیں۔ مجھے دوسری بار اس شخص کا سامنا نہیں کرنا جس کے الوژنز سے پیچھا چھڑانے میں مجھے زمانے لگے ہیں۔ اب بھی یہی سمجھوں گی' یہ ملاقات' سانحہ بھی ایک الوژن ہی تھا' ایک واہمہ' ایک خواب اور بس۔ مجھے اب یہاں نہیں رہنا' بالکل نہیں۔ وہ زاروقطار روتے ہوئے دل میں مصمم ارادے باندھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے اپنا ضروری سامان پیک کرلیا ہو تو چلیں؟"

صبح گیارہ بجے کے قریب عبدالمبین نے کمرے میں جھانک کر آمنہ اور جویریہ سے کہا جو اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھیں۔ جویریہ نے عبدالمبین کی آواز پر ایک نظر کچھ فاصلے پر پڑے اٹیچی کیس کو دیکھا اور دوسری ڈری ڈری سی نظر آمنہ کے بے تاثر چہرے پر ڈالی تھی۔

"سامان تو پیک ہے' چند جوڑے کپڑے' کچھ یادیں اور بس۔" جویریہ ہولے سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آمنہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھی تھی۔

"لیکن ہم تمہارے ساتھ نہیں جارہے۔" آمنہ سکون سے بولی۔ جویریہ کی طرح عبدالمبین بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"تو کہاں جاؤگی؟"

"کہیں بھی' اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔" وہ اجنبیت کے آخری کنارے پر کھڑی تھی۔

"آمنہ..." عبدالمبین غصے سے دانت بھینچ کر بولا۔

"جویریہ! تم میرے ساتھ چلوگی یا اپنے اس عزت مآب سنگر بھائی کے ساتھ؟"

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ جویریہ کی طرف پلٹ کر بولی۔

"آپی! اور ہم کہاں جائیں گے؟" وہ متذبذب سی ہو کر بولی۔

"یوں کہو تم اس کے علاوہ اور کہیں جانا ہی نہیں چاہتیں۔ اچھا تو پھر خدا حافظ۔" وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکلی تھی۔ جویریہ بوکھلا کر اس کے پیچھے لپکی۔

"آپی... آپی... کہاں جائیں گے؟" وہ عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"فی الحال کلثوم بی بی کی طرف۔ ویسے میں نے گرلز ہاسٹل میں بات کر رکھی ہے۔ کل ڈیوز جمع کرا کے ادھر چلی جاؤں گی۔"

اس نے ایک شاپنگ بیگ میں شاید کپڑوں کا ایک جوڑا رکھا ہوا تھا۔ "اور یہ رقم جو بابا صاب نے میرے پاس امانتاً رکھوائی تھی۔ تم رکھ لو تمہارے بھائی کی حرام کی کمائی کے مقابلے میں یہ معمولی رقم تمہاری آئندہ زندگی میں بہت کام آسکتی ہے۔ اگر تم اسے یقین سے استعمال کروگی تو۔" اس نے شاپنگ بیگ سے وہی خاکی لفافہ نکال کر

جویریہ کو تھمایا جو اسے صوفی صاحب نے دیا تھا۔ عبدالمبین کا چہرہ آمنہ کی بات پر سرخ ہوگیا تھا۔

"آمنہ! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔" وہ اس کے پاس آکر بولا۔

"مجھے میری حدود کا علم ہے' تمہاری طرح لامحدود نہیں۔" وہ ایک آخری نظر اجڑے ہوئے بوسیدہ در و دیوار پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ایک گہرا سانس لیا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"آمنہ! دیکھو' مجھے غلط نہیں سمجھو۔ اچھا تم جو کہوگی' میں وہی کروں گا۔ گلوکاری چھوڑ دوں گا' مزدوری کرلوں گا مگر تم یوں اکیلے نہ جاؤ۔ پلیز۔" آمنہ کے تیور بھانپ کر عبدالمبین منت سماجت پر اتر آیا۔

"اچھا!" وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اتنا نیک خیال تمہیں ماں باپ کی زندگی میں کیوں نہ سوجھا تو کیا یہ شوق محض ان بدنصیبوں کے دل جلانے کے لیے اپنایا تھا اور اب ان سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں اس سے ہاتھ اٹھا رہے ہو۔"

وہ بدگمانی سے کہہ رہی تھی اور عبدالمبین بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی آمنہ ہے' جس کی عقل مندی' متحمل مزاجی اور برداشت پر اسے سب سے بڑھ کر بھروسا تھا۔

"اچھا... تم مجھ سے ناراض ہو... بے شک رہو۔ تم میرے گھر چل کر وہاں کا پانی نہ چکھنا۔ یہ بابا صاب کے پیسوں سے چند دن گزارا کرلینا۔ میں تمہیں الگ جگہ لے دوں گا اور تمہیں جاب بھی دلا دوں گا۔"

"آمنہ... آمنہ... رکو... دیکھو یہ حماقت نہیں کرو۔ سنو تو..." عبدالمبین اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑا تھا۔ جویریہ اس کے پیچھے تھی اور ان دونوں کے نیچے پہنچنے تک وہ تیز رفتاری سے گلی عبور کرکے کلثوم بی بی کے آخری سرے پر بنے گھر کے کھلے دروازے میں اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ایک آخری اجنبی نظر خود کو پکارتے عبدالمبین پر ڈالی اور گھر کا دروازہ بند کرکے اندر چلی گئی اور اب اس کے پیچھے جانا محلے والوں کے لیے ایک نئے تماشے کا اہتمام کرنے کے مترادف تھا۔

"بھائی! یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ مجھے یہ عورت اچھی نہیں لگتی۔ پتا نہیں بابا صاب اس پر کیسے اعتبار کر بیٹھے تھے اور اب آپی..." جویریہ اس کے پیچھے کھڑی کہہ رہی تھی۔

"ہم اب کیا کرسکتے ہیں جوی! جو خود ڈوبنا چاہے' اسے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے اللہ کے۔ تم چلو آؤ میرے ساتھ۔" وہ اٹیچی لینے اوپر چلا گیا۔

دس منٹ بعد ان کی گاڑی ان گلیوں سے باہر نکل رہی تھی جن میں وہ اپنے سارے پیاروں کو کھو آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

سید سلطان بخت زمینوں سے آئے تو سیدھا ہال کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کا شک درست نکلا۔ اندر سیدہ آپا موجود تھیں اور صالحہ کے ساتھ باتیں کررہی تھیں۔ سلطان بخت ان کا حال چال پوچھ کر صوفے پر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ اپنا بایاں بازو دبانے لگے۔

"خیر تو ہے' سلطان بخت طبیعت تو اچھی ہے نا؟" سیدہ تو بھائی کے چہرے کی ایک ایک لکیر پڑھ لیا کرتی تھیں۔

"ٹھیک ہوں آپا! بس تھکن سی ہوگئی ہے۔"

"تو کیا ضرورت ہے ہفتے میں دو دو بار زمینوں کا دورہ کرنے کی۔ سارے ملازم' حرام خور مرگئے ہیں کیا" وہ اپنے مخصوص لہجے میں تیزی سے بولیں۔

"آپا! مالک سر پر نہ ہوں تو مزارعوں کو کیا پڑی ہے' دھیان سے کام کریں۔ اب میں نہیں دیکھوں گا تو اور کون دیکھے گا۔"

"صالحہ! خیال رکھا کرو اس کا۔ دیکھو تو کس قدر کمزور ہو رہا ہے۔ آنکھوں کے گرد بھی حلقے پڑے ہیں۔ خدانخواستہ کون سی فکریں پال لی ہیں تم نے۔" سیدہ پرتشویش لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"یہ خیر سے اپنا خیال خود رکھنے کو کافی ہیں بھابی بیگم! مجھے یا میری فکر کو کیا سمجھتے ہیں۔"

صالحہ بے اعتنائی سے بولیں تو سلطان بخت نے ایک دکھ بھری نظر اس کے بے مہر چہرے پر ڈالی۔ اسی وقت ان کے موبائل کی بیپ بج اٹھی۔ اسکرین پر نظر ڈالتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کے دوسرے کونے میں جا کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

"اس کلموہی طوائف زادی کے عشق کا بھوت اس کے سر سے اترا نہیں ابھی۔" سیدہ جلے کٹے انداز میں بولیں۔

صالحہ تنفر بھرے لہجے میں بولیں تو صالحہ کا چہرہ تکتے' سیدہ کی نظروں کے سامنے انجانے میں ہی برسوں پہلے اسلام آباد کی کوٹھی کا وہ ماسٹر بیڈ روم گھوم گیا' جہاں انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے سلطان بخت کے عشق کا ایک اور بھوت ملاحظہ کیا تھا۔

صالحہ کی بات پر سیدہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔

سلطان بخت موبائل آف کر کے پھر سے صوفے پر آبیٹھے۔ ان کے چہرے سے سیدہ کوشش کے باوجود کچھ بھی نہ جان پائیں۔

"جواد کی بیوی کیسی ہے؟" معنی خیز خاموشی کو سلطان بخت نے ہی توڑا۔

"اچھی ہے۔" سیدہ نے مبہم سا جواب دیا۔

"آپ نے بہت جلدی کی جواد کی شادی کرنے میں۔" سلطان بخت سرسری لہجے میں بولے۔

"شادی لڑکی کی ہو یا لڑکے کی' وقت پر ہو جائے تو اچھی رہتی ہے' ورنہ سو مسائل جنم لے لیتے ہیں جیسے۔"

تم دونوں کی' کہتے کہتے ان کی زبان رک گئی۔ صالحہ نے ایک تیز نظر ان پر ڈالی۔ سیدہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

"خیر سے دوسرے ہی سے ہے جواد کی بیوی۔ اللہ اسے بیٹا دے۔ میں نے یہی سوچ رکھا ہے کہ اسے لا کر تمہاری جھولی میں ڈال دوں گی۔ میں نے تو کہا تھا ایک بار اور کوشش کر لیتے مگر تم دونوں تو..."

"تاکہ ایک طوق اور گلے میں ڈال لیتا۔" سلطان بخت غصے سے بولے۔

"اور یہ جواد کے بچے کی خوشی اپنے تک ہی رکھیں' مانگے کی خوشیاں ابھی سے کو ... زبردستی دوسروں کی خوشیاں نوچ کر ان ویران در و دیوار پر ٹانکنا چاہتی ہیں۔ اس حویلی کی قسمت میں وارث بنے ہی نہیں۔ آخر آپ اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں۔" سلطان بخت بہت دنوں کا دبا غصہ نکال رہے تھے۔

"تم مایوس ہو سکتے ہو۔ میں نہیں' میں ابھی بھی اللہ کے کرم سے پرامید ہوں۔ اس حویلی کو وارث ضرور ملے گا۔ یہ حویلی ویران نہیں ہے اور نہ رہے گی۔ تم دیکھنا میرا اللہ ایک دن ضرور میری دعا سنے گا۔"

سیدہ نہ جانے کس لہر میں تھیں۔ پرجوش آواز میں کہے گئیں۔ صالحہ اور سلطان بخت نے سیدہ کے بوڑھے چہرے کو یوں دیکھا جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو۔

اسی وقت باہر نامانوس سا شور ابھرا تھا جو ان کے کمروں کی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔

"سید سلطان بخت کہاں ہو تم؟ دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے؟" آواز تھی کہ للکار' سید سلطان بخت سمیت سیدہ اور صالحہ بھی اپنی جگہ اچھل کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اور ہراساں نظروں سے سلطان بخت کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"بہت اچھا کیا بچی تم نے۔ بہت اچھا' میں تمہاری خالہ نہیں' ماں ہوں۔ تمہاری ماں جیسی نیک' پرہیزگار تو نہیں' تمہاری جیسی محبت ضرور تم سے کرتی ہوں۔ اسی محبت کی کشش ہے جو تم اپنے اس گانے بجانے والے بھائی کی دولت کو ٹھوکر مار کر اس غریب ماں کی محبت پر بھروسا کر کے چلی آئیں۔ جیتی رہو' ہر خوشی پاؤ' تم نے ادھر آکر میرا مان بڑھایا ہے۔ میرے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے۔"

کلثوم بی بی اسے سینے سے لگائے بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہے جا رہی تھیں۔ اس کی باتوں سے آمنہ کے دل میں رہے سہے وسوسے بھی ہوا ہو گئے وہ تو سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کلثوم خالہ یوں اکیلے اسے ادھر رہنے بھی دے

"شکریہ خالہ! میں کل تک گرلز ہاسٹل میں اپنا انتظام کر لوں گی۔" وہ سیدھا ہوتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"نہ میری بچی! میری بیٹی! اللہ نے شاید اسی دن کے لیے مجھے کوئی بیٹی نہیں دی تھی کہ اس نے تیری شکل میں یہ رحمت میرے گھر میں اتارنا تھی۔ اگر میرا مان بڑھایا ہے تو اس پر بھروسہ بھی کرنا' ویسا بھروسہ جیسا صوفی صاحب نے آخری دم تک اس غریب بڑھیا پر کیا' دیکھنا میں کیسے اس مان پر پورا اترتی ہوں۔ اللہ صوفی صاحب کی مغفرت کرے۔ بہت نیک' بہت پرہیزگار انسان تھے۔ ہائے ان کے دم قدم سے تو اس محلے پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے تھے۔ ورنہ ہم جیسے گناہ گار تو اس دھرتی کا بوجھ ہیں۔ وہ تو پھول کی طرح رہتے' خوشبو بن کر اس دھرتی کو معطر کرتے رہتے' کتنی دنیا ان کے علم سے فیض یاب ہوئی۔ علم کا سمندر تھے اور ہم جہالت کا دریائے بے کنار۔"

کلثوم بی بی نے کچھ اس طرح صوفی صاحب کا ذکر چھیڑا کہ آمنہ کا بھی دل بھر آیا۔

"کیسی تمنا تھی ان کے دل میں کہ دونوں بچیوں کو آج کے دن اپنے ہاتھوں سے رخصت کریں۔ موت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی۔ پرسوں ہی بات کرنے کو میری طرف آئے تھے۔ سرمد کی ماں اور بھائی تینوں کو اسی لیے بلایا تھا۔ سارے معاملات طے ہو گئے تھے۔ اچھے بھلے ہنستے کھیلتے ہم سے رخصت لے کر باہر نکلے کہ قضا نے دہلیز عبور کرنے کی مہلت نہ دی' ہائے سوچتی ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے کہ میرے گھر تو وہ اللہ کی رحمت بن کر آئے تھے۔ میرے تو قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کہ مجھ ناچیز پر اتنا بڑا بھروسا کیا انہوں نے' دونوں بیٹیوں کے ہاتھ میرے کہنے پر دونوں لڑکوں کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ قدرت کو بھی میرا یہ مان نہ بھایا' بس یہی کانٹا حلق میں گڑا رہ گیا ہے' وعدہ کیا تھا انہوں نے ایفا بھی نہ کر پائے۔" کلثوم بی بی چھکوں پھکوں رونے لگی۔

"کلثوم خالہ!" آمنہ نے چہرہ پونچھا اور صاف آواز میں بولی۔

"خالہ صدقے میری بچی۔" وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر محبت سے بولی۔

"میں اپنے بابا صاحب کا قول نبھاؤں گی۔ آپ مجھے چند دن صرف سنبھلنے کا موقع دیں۔"

"وہ کیا ... میں جھکا کے کہہ رہی تھی اور کلثوم بی بی کو لگا' دو جہاں کی دولت کسی نے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی ہے۔

"میں صدقے' میں قربان اپنی بچی کے' نیک والدین کی نیک اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔ بالکل ایسی میری بچی! تو نے میرا مان بڑھایا' میرے ڈوبتے دل کو سہارا دیا۔ ورنہ میں تو پرسوں سے مری بیٹھی تھی۔ کہ اب میری زبان کا کیا بنے گا۔ کس منہ سے اس معزز عورت کو جواب دوں گی۔ کیا کہوں گی صوفی صاحب کیا گئے" کلثوم بی بی جھولی پڑ گئی۔ سات بندوں میں زبان دی تھی' کیسے پھروں۔" وہ ایک بار پھر آمنہ کو گلے سے لگا کر رونے لگی۔

"صوفی صاحب کی روح کو کیسا قرار ملا ہو گا اپنی نیک بخت بچی کی بات سن کر اور جویریہ کا خیال نہ کرو آمنہ! تو ان کی روح کو سکون کرنے کا مجھے تو یہی ایک رستہ نظر آتا ہے کہ مرتے دم ان کے دل و دماغ میں یہی بات تھی کہ آمنہ اور جویریہ کو اگلے ہی پل اپنے گھروں کی کر دوں' بیٹی اگر تم اجازت دو تو..." وہ جھجک کر چپ ہو گئی۔

"جی کہیے۔"

"بیٹا! نیک کام جس کا ارادہ باندھا ہے کل بھی کرنا ہے' پرسوں بھی اور چند دن بعد بھی۔ اگر صوفی صاحب کی روح کو سکون مل سکتا ہے وہ کب قائل تھے۔ سوئم چالیسویں کے۔ تم تو انہیں سب سے زیادہ جانتی ہو۔ میری بات سمجھ سکتی ہو۔" کلثوم بی بی صوفی صاحب کا حوالہ دے کر اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی۔

آمنہ چند لمحے چپ رہی۔

"ٹھیک ہے' آپ کل شام کو ان لوگوں کو بلا کر نکاح پڑھا دیں۔ میں تیار ہوں۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"میری بچی' میری بچی! ایسی نیک بخت اولاد رب سب کو دے' تو نے مجھے نئی زندگی دی ہے' جیتی رہو' سدا خوش رہو۔" وہ جھولی پھیلا پھیلا کر اسے دعائیں دیتی گئی۔

وہ سر شام ہی سر درد کی گولی لے کر سوئی تھی گولی کھاتے ہی اس کا سر بھاری پتھر کی طرح ہو گیا تھا۔ چند

منٹوں میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ اور اسے پتا بھی نہیں چلا کب وہ تینوں' سرمد عثمانی' اس کی نام نہاد ماں اور بھائی کلثوم بی بی کے گھر آئے تھے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب ایک ڈراؤنے خواب نے آمنہ کو جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ اس کا شعور اسی خواب کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا مگر دماغ جیسے ابھی بھی سُن تھا۔ نہ جسم میں حرکت پیدا ہو رہی تھی۔

اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا۔ پونے تین بج رہے تھے۔

"دن کے یا رات..." اس نے بند کھڑکی کے پار دیکھنے کی کوشش کی' زیرو پاور بلب کی روشنی میں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"رات ہی ہوگی' جو ہر طرف سناٹا ہے۔" اس نے دکھتے سر کو دبایا' وہ کلثوم بی بی کی بیٹھک میں سوئی تھی۔ جس کا ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا دوسرا اندر صحن میں۔

"اس کو کہتے ہیں۔ آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا' بلکہ سونے کی چڑیا آ گئی کیسا...؟" مردانہ آواز اور ایک زوردار قہقہہ' آمنہ کا ذہن ایک جھٹکے سے بیدار ہو رہا تھا۔

"دیکھو بھئی کلثوم بی بی اب کے تمہیں ففٹی پرسنٹ نہیں مل سکتا۔ اس میں تمہاری کوئی محنت نہیں' شکار خود چل کر آیا ہے۔" اس کے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے۔ یہ آواز بیگم عثمانی کی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"شکار صرف چل کر آیا تھا۔ اسے کل کے لیے نکاح پر شیشے میں کس نے اتارا اور جو اس دن مولوی صوفی خود خراماں خراماں لنگڑاتا ادھر آ کر ہماری باتیں نہ سن لیتا تو ساری محنت میری تھی۔ ایک نہیں دو دو سونے کی چڑیاں پھانس چکی تھی میں۔ اس بڈھے نے سب کچھ سن لیا اور مجبوراً اس کا ٹینٹوا دبانا پڑا ورنہ تو میں اپنی ذہانت سے ساری بساط بچھا چکی تھی۔ تم لوگوں کو تو ذرا ہاتھ پیر نہیں ہلانے پڑے... میرا حصہ بلا مبالغہ ساٹھ ستر فیصد بنتا ہے' میں بتا رہی ہوں۔" کلثوم بی بی پاٹ دار آواز میں کسی اور ہی دنیا کی بات کر رہی تھی۔

"آہستہ بولو کمبختو... وہ جاگ نہ جائے۔ اس دن بھی تم لوگوں کے اونچا بولنے سے کام خراب ہو گیا تھا۔ اس بڈھے نے سب کچھ سن لیا تھا۔"

"ارے جو گولی میں نے اسے دی ہے۔ کل دوپہر سے پہلے نہیں اٹھے گی اور اس وقت تو سارا زمانہ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے' چاہو تو یہ بکواس لاؤڈ اسپیکر پر کر لو جا کر۔"

آمنہ نے بے حد آہستگی سے بیٹھک کے بیرونی دروازے کی چٹخنی کھولی' دوپٹے میں اپنا چہرہ اور وجود اچھی طرح چھپاتے ہوئے اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا' دروازہ ہلکی سی چوں کے ساتھ کھل گیا۔

وہ تیزی سے باہر نکلی' گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ گلی کے آخری سرے پر کھمبے میں لگا بلب فیوز تھا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندھا دھند گلی میں بھاگ نکلی۔

اسی وقت کھٹکے کی آواز سرمد کے کانوں میں پڑی تھی۔

"لڑکی بھاگ گئی۔" اسے صاف سنائی دیا تھا۔ اس نے اپنی رفتار بڑھا لی۔ ٹوٹی پھوٹی گلی کے پتھر اس کے رستے میں آ رہے تھے اسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

گلی کے سرے پر بنی مسجد کا دروازہ اس کے لیے مقناطیس ثابت ہوا۔ وہ پاگلوں کی طرح بند دروازے کی طرف بڑھی اور اسے اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ بند ہی نہیں مقفل بھی تھا۔ کنڈی میں لٹکتا تالا اسے دکھائی نہیں دیا تھا اس نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"کھولو' کھولو' خدا کے لیے کھولو۔" سناٹے میں اس کی آواز گونجی۔

وہ تینوں اس کے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔

"کھولو کون ہے۔ جس نے خدا کے گھر کو تالے لگائے ہیں۔ کھولو... میں تو مسجد کی بیٹی ہوں۔ مجھ پر یہ دروازہ کیوں بند ہے۔ کھولو۔" وہ زور زور سے اپنا سر بند دروازے سے ٹکرا رہی تھی۔

وہ تینوں اس کے بالکل قریب آ چکے تھے' آمنہ کے حواس جواب دے گئے اور دروازہ پیٹتے اس کے ہاتھ بے جان ہو کر لٹک گئے اور وہ لہرا کر گری تھی۔

● ● ● ● ●

نرس نے بے حس پڑے بچے کو کچھ گھبرا کر دیکھا۔

اس نے جلدی جلدی بچے کی نبض چیک کی جو بالکل خاموش تھی۔ سینہ ٹٹولا جس میں دھڑکتا دل نہ جانے کس پل سرد ہو چکا تھا۔

"اومائی گاڈ!" اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ مارا۔

"کیا کروں؟" اس نے کن اکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سائیڈ روم میں موجود دونوں نرسیں موبائل فون سے کھیل رہی تھیں۔ فائزہ کے "فرینڈ" کی تصاویر تھیں جس میں دونوں محو تھیں۔ ایک پل کو اس کا جی چاہا کہ شور مچا دے کہ بچے کو آ کر چیک کیا جائے کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا۔

"یہ یقیناً مر چکا ہے' کیوں خود کو دھوکا دے رہی ہو۔" کسی نے اس کے اندر چپکے سے سرزنش بھری سرگوشی کی۔ دوسرے پل اس کا دھیان بغل میں دبے اس لفافے کی طرف چلا گیا جس میں ان گنت نیلے نوٹ تھے جو چند منٹ پہلے نین تارا نے اسے دیے تھے اپنا سارا ہینڈ بیگ خالی کر کے۔

"مجھے فقط آدھے گھنٹے کے لیے میرا بچہ لا دو اور اس آدھے گھنٹے کے دوران کوئی میرے روم کا رخ نہ کرے۔ یہ رقم اس ڈیوٹی کی ہے۔ کم ہے تو یہ بھی لے لو۔"

اس نے ننھے ننھے ڈائمنڈز کی بنی بیش قیمت گھڑی تکیے کے نیچے سے نکال کر اس کے ہاتھوں پر پڑے نوٹوں کے اوپر دھر دی۔ جس مالیت کی وہ گھڑی تھی' نرس کی آنکھیں پل بھر میں چندھیا گئی تھیں۔

"نن نہیں..." اس نے گھڑی واپس کرنی چاہی۔ "اوکے میم! میں بچے کو لے کر آ رہی ہوں لیکن فقط آدھے گھنٹے کے لیے... بچہ ابھی آئی سی یو میں ہے... ہم اس طرح بے بی کو لا نہیں سکتے۔ اگر آپ کی بے قرار ممتا مجھے مجبور..."

"زیادہ لفاظی کی ضرورت نہیں' جلدی کرو۔" نین تارا اس کی بات کاٹ کر عجلت بھرے انداز میں بولی اور بیڈ سے ٹانگیں لٹکا کر سائیڈ پر پڑے اپنے جوتے ڈھونڈنے لگی۔

نرس نے مردہ بچہ اٹھا کر کمبل میں لپیٹا' اس کے کاٹ میں ایک چھوٹا سا کشن رکھ کر اس پر کپڑا ڈال دیا اور محتاط قدموں سے پچھلی سیڑھیوں سے اتر کر اس نے بچہ نین تارا کے حوالے کر دیا تھا۔

"میم! اگر آپ تیس منٹ بعد بے بی مجھے دے دیں' یہ ٹھیک نہیں..." اس نے کمبل میں لپٹے بچے کو تھماتے ہوئے کچھ منت بھرے انداز میں کہا۔

"شٹ اپ! تم آدھے گھنٹے کی قیمت وصول کر چکی ہو... اور یہ لو نمبر میری مدر کا۔ انہیں جا کر فون کر آؤ کہ وہ فوراً میرے پاس پہنچیں۔ میرے موبائل سے ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔" اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا نمبر نرس کی طرف بڑھایا' نرس ایک پل کو ہچکچائی۔

"میم! اس دوران کوئی ادھر آ گیا تو..."

"کوئی نہیں آئے گا۔ اب جاؤ تم۔" وہ کہتے ہوئے ذرا سا کمبل سرکا کر بچے کا چہرہ دیکھنے لگی۔ نرس کا دل زور سے دھڑکا۔ نین تارا نے کمبل دوبارہ بچے کے چہرے پر ڈال دیا تھا۔

نرس کے باہر نکلتے ہی نین تارا نے پھرتی سے بیڈ کی سائیڈ پر پڑی چادر اٹھا کر اوڑھی۔ شولڈر بیگ اور موبائل اٹھایا اور بچے کو سینے سے لگائے چادر میں چھپا کر بالکل نارمل انداز میں چلتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی تھی' جہاں اس کا ڈرائیور ابھی اس کی گاڑی پارک کر کے گیا تھا۔

چند لمحوں میں اس کی گاڑی ہوا سے باتیں کرتی سلطان بخت کی حویلی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

اور جب نرس رانگ نمبر پر بار بار ٹرائی کرنے کے بعد مایوس نین تارا کے روم کی طرف بڑھی' اس وقت تک بچے کی گمشدگی کی بھگدڑ چاروں طرف مچ چکی تھی اور زیور گل انتہائی غصے کے عالم میں ڈاکٹر کو جھاڑ پلا رہی تھی۔ نرس پیچھے سے چلتی ہوئی اسٹاف روم کے اٹیچ واش روم میں گھس گئی۔

"صد شکر' بچہ لے کر جاتے مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔" اس نے واش روم میں لگے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا اور لفافہ کھول کر نوٹ گننے لگی۔

☼ ☼ ☼
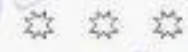
عین اسی لمحے گلی کے موڑ پر کوئی گاڑی آکر رکی تھی۔ اس کی تیز فرنٹ لائٹس آمنہ کے گرے ہوئے وجود پر پڑ رہی تھیں۔

آمنہ کے پیچھے دوڑ کر آتے ہوئے قدم اس پل ساکت ہو گئے تھے اور جس لمحے گاڑی کا دروازہ کھلا اور اونچے لمبے قد کے سوٹ میں ملبوس کوئی شخص باہر نکلا۔ وہ چاروں سائے دھیرے سے کھسکتے ہوئے گھروں کے درمیان اور دیواروں کی اوٹ میں ہو گئے۔

اس شخص نے سر اٹھا کر اندھیرے میں ان کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔

"جو کوئی ہے' وہ سامنے آئے۔" اس نے کڑک دار آواز میں کہا۔ اس کے بلند ہاتھ میں کوئی سیاہ چیز بھی چمکی تھی۔ کلثوم بی بی نے تو اس کے بلند ہاتھ کو دیکھ کر آتی جاتی سانسوں کو بھی روک لیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال باقی نفوس کا بھی تھا۔

"احمق لڑکی! اگر مجھے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو ــــ"

اس نے جھک کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ والے کھلے دروازے سے اسے اندر کیا۔

گھر آ کر اسے ایک پل کو بھی تو چین نہیں آیا تھا۔ کہنے کو تو اس نے جویریہ سے کہہ دیا تھا کہ جو خود کو بچانا چاہے اسے کوئی بھی نہیں بچا سکتا مگر اپنے دل کا کیا کرتا جو مسلسل ان دیکھے خطرے کی گھنٹی بجائے جا رہا تھا۔

جویریہ تو اس کی اتنی خوبصورت اور بڑی کوٹھی کو دیکھ دیکھ کر ہی حیران اور پر جوش ہوئی جا رہی تھی۔

"بھائی! آپ کا اپنا گھر ہے۔ اتنا بڑا' اتنا خوبصورت۔" وہ سارے گھر میں گھوم آئی تو گم صم بیٹھے عبدالمبین سے بولی۔

"تم اپنے لیے کوئی سا بھی کمرہ پسند کر لو' ملازم اسے تمہارے لیے سیٹ کر دیں گے۔" وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا جس کی توجہ عبدالمبین کے بجائے ادھر ادھر بڑی قیمتی اشیاء پر بھٹکتی پھر رہی تھی۔

"میں اکیلی ایک کمرے میں۔ اس گھر کے تو کمرے بھی اتنے بڑے بڑے ہیں' جتنا ہمارا پورا گھر تھا۔" کہتے کہتے اس کی زبان میں لکنت آ گئی۔ اس کی ساری بھٹکی بھٹکی توجہ ایک دم سے سمٹ آئی۔ اس کے پر جوش چہرے پر ایک دم سے اداسی اور محرومی کا غبار سا چھا گیا۔ وہ وہیں پڑی کرسی پر ڈھے گئی۔

"بھائی! آمنہ آپی ادھر اکیلی ہیں۔ آپ مجھے واپس چھوڑ آئیں' پلیز۔" وہ کہتے کہتے آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔

"اچھا' شام کو چلیں گے۔ تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ' کھانا کھاؤ' تھوڑا آرام کر لو پھر دیکھتے ہیں۔ مجھے گھنٹے بھر کے لیے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ واپس آؤں گا تو پھر لے چلوں گا۔ تم زیادہ فکر نہیں کرو' وہ ٹھیک ہو گی۔" وہ اسے ٹال کر تسلی دیتے ہوئے الجھ کر باہر آ گیا تھا۔

اس کا گھنٹے بھر کا کام پانچ گھنٹوں میں سمٹا تھا اور گھر کا رخ کرتے ہی اسے آمنہ کی یاد نے اس بری طرح سے گھیرا کہ اس نے بے اختیار گاڑی کا رخ مخالف سمت میں موڑ دیا تھا۔

اس کا دل واقعی غلط دہائی نہیں دے رہا تھا اور صد شکر وہ بالکل وقت پر پہنچا تھا' ورنہ شاید وہ ایک اور ناقابل فراموش دائمی غم کا سامنا کر بیٹھتے۔

بہت مشکل سے ڈرائیو کرتے اس نے آمنہ کی سیٹ پر لڑھکی ہوئی گردن کو ایک ہاتھ سے سیدھا کیا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

آمنہ اس کے خوب ہلانے اور بار بار پکارنے پر بھی ہوش میں نہیں آئی تھی۔ کہیں کوئی سیریس مسئلہ نہ ہو۔ وہ جلد از جلد اسے کسی ہاسپٹل میں لے جانا چاہ رہا تھا اور دور اسے کسی ہاسپٹل کی عمارت دکھائی دی تو اس نے اسپیڈ بڑھا دی۔

☼ ☼ ☼

"آپ نزہت آپی سے دوبارہ ملنے نہیں گئے۔" معاذ نے شہباز خان سے پوچھا تو وہ جیسے نظریں چرا گئے۔

"اس آفس میں بیٹھے بہت جچ رہے ہو۔ کیسا لگ رہا ہے مسیحائی کی خواری میں ہونے والی بھاگ دوڑ چھوڑ کر یوں کرسی گھما گھما کر حکم چلانا۔"

وہ چند لمحوں کی معنی خیز خاموشی کو توڑتے ہوئے بولے۔ معاذ پلکیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی چبھتی ہوئی نظریں جیسے ان کے آر پار جا رہی تھیں۔

"ایسے کیا گھور گھور کر دیکھ رہے ہو۔ کیا میرے سینگ اگ رہے ہیں۔" وہ اس کے یوں دیکھنے پر کچھ جھلا کر بولے۔

"سینگوں والے جانور تم از کم انسان سے تو اچھے ہوتے ہیں۔" وہ سینے سے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے کچھ افسردگی سے بولا۔

"وہ کیسے بھئی؟ وضاحت کرو۔" وہ لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"شہباز بھائی! ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانیں گے۔" وہ ٹیبل پر ذرا سا آگے ہو کر انہیں اپنی گہری نظروں کی گرفت میں لے کر بولا۔

"چھوڑو یار! تمہاری باتوں کا میں نے کبھی برا نہیں مانا اور پلیز! یہ میرا ایکسرے لینا بند کرو۔" وہ اس کی چبھتی ہوئی نظروں پر کچھ جھلا کر بولے۔

"میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ معاف کیجئے گا' آپ کا مسئلہ کیا ہے؟"

شہباز خان نے کچھ غور سے اسے دیکھا اور پھر یونہی ایک کھوکھلا سا قہقہہ فضا میں اچھال دیا۔

"تم نے ہاسپٹل جانا چھوڑ دیا ہے کیا؟" وہ اس کا سوال صاف نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

"نہیں۔ میں اسپیشلائزیشن کے لیے چند ایک ماہ میں برطانیہ جانے والا ہوں اور اپنے سوال کو نظر انداز کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" وہ کچھ خفا لہجے میں بولا۔

"او میرے بھائی! مائنڈ نہیں ہو۔ چھوٹے بھائی ہو۔" وہ پھر سے اسے ٹالنے والے انداز میں بولے۔

"تو آپ مجھے جواب نہیں دیں گے۔" وہ کچھ دھمکانے والے انداز میں بولا۔

"کیسا جواب؟" وہ کچھ اکتا کر بولے۔

"آپ آئینے کا سامنا کیوں نہیں کرتے؟"

"تمہیں کیا خبر' میں کب سے آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔" وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"صرف سامنے کھڑے ہونے کی مشقت اٹھا رہے ہیں مگر اس سے نظریں نہیں ملا رہے۔" معاذ کی بات پر انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"آپ مجھ سے کہا کرتے تھے۔ معاذ! یہ زندگی بہت قیمتی ہے' بہت انمول اور اس کے بیش قیمت ہونے کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس کے ایک ایک لمحے کی قدر جانتے ہیں۔ آپ لمحوں کو ہی نہیں گھنٹوں' دنوں' مہینوں اور سالوں کو برباد کر رہے ہیں بلکہ کر چکے ہیں اور ابھی بھی آپ کا انداز اسی طرح کا ہے۔ آخر کیوں؟" وہ ڈٹ کر ان سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم۔" "کم از کم تو آپ نزہت آپی کو معاف کر کے انہیں ڈھونڈنے کے لیے بے چین تھے

اب جبکہ اس دن ان سے مل بھی آئے ہیں تو پھر اس گریز کی وجہ؟" ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے پھر سوال اٹھایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولے۔

"تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے..... شہباز بھائی! آپ خود کو ٹٹولیں۔ آپ نے شاید انہیں دل سے معاف نہیں کیا' صرف معاف کرنے کی کوشش کی ہے اور بس....."

"ہوں۔"

ان کی "ہوں" پر معاذ کا جی چاہا' اپنا سر دیوار سے دے مارے۔

"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے' آپ جیسی بہترین شخصیت کا مالک اپنے فیصلوں اور ارادوں میں اور اس قدر کمزور اور غیر مستقل مزاج کیوں ہے۔"

"بہت ساری چیزیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ یہ ہماری شخصیت کے کمزور پہلو ہوتے ہیں جو ہر آزمائش کے لمحے میں سامنے آکر ہمیں ہماری بے بسی کا احساس دلاتے ہیں۔" وہ شکست خوردہ سے لہجے میں بولے۔

"یہ ایک الگ بحث ہے۔ ایک ہی انسان کے اندر اللہ نے اتنے بے شمار رنگ پیدا کیے ہیں کہ اسے خود بھی ان کے بارے میں علم نہیں ہوتا اور کسی انجانے موڑ پر منکشف ہونے والے یہ رنگ ہمارے لیے تو حیران کن ہوتے ہی ہیں۔ ہمارے اردگرد رہنے والوں کے لیے بھی یکسر اجنبی ہوتے ہیں جو ہماری طویل رفاقت کی بنا پر یہ دعوا کرتے ہیں کہ ہم آپ کو سمجھ چکے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ یہ واقعی ایک لمبی بحث ہے' مجھے اس وقت آپ صرف یہ بتائیے' آپ دوبارہ ان سے ملنے کیوں نہیں گئے۔ آپ کو کس چیز نے روکا؟" اس نے پرزور لہجے میں پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ او کے معاذ! میں اب چلتا ہوں اور تم پلیز شام کو ضرور آنا۔ ام جان نے تمہیں بلوایا ہے اور ارتضیٰ بھی تمہیں بہت مس کر رہا ہے۔" کہتے ہوئے وہ واپسی کے لیے مڑے۔

معاذ نے انہیں اتنی عجیب نظروں سے دیکھا کہ انہیں لگا وہ چند ثانیے اور ان نظروں کی گرفت میں رہے تو یقیناً اپنے قدرت سمیت زمین بوس ہو جائیں گے اور جب اٹھیں گے تو اپنے قد سے کئی فٹ چھوٹے ہو چکے ہوں گے۔ کسی بونے' کسی بالشتیے کی مانند..... یہ احساس اس قدر جان لیوا تھا کہ وہ اسے خدا حافظ کہے بغیر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہ اس کے آفس سے نکلے تھے' ان کا ذہن کس سمت میں پرواز کر رہا تھا' اس کی خبر انہیں بھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ان کی گاڑی پارکنگ میں کھڑی ہے۔ وہ بھاگتے ہوئے قدموں سے پیدل ہی چلے جا رہے تھے۔ وہ ان پالی پالی کرتی نظروں سے دور بہت دور بھاگ جانا چاہتے تھے۔ چلتے چلتے ان کا سانس پھول گیا اور قدم بے سمت رستوں پر بھاگتے بھاگتے سست پڑے اور پھر تھم گئے۔

"یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔" انہوں نے فٹ پاتھ کے پیچھے بنے چھوٹے سے پارک کے جنگلے سے ٹیک لگاتے ہوئے گہرے گہرے سانس لیے۔

"آخر میں کیوں بھاگ رہا ہوں اور کس سے۔" وہ سر اونچا کر کے گہرے گہرے سانس لینے لگے۔

معاذ کی ان نگاہوں میں کیا تھا' کیا اس نے جان لیا ہے کہ میں نزہت سے۔ ملنے کیوں نہیں جا سکا۔ کیا اسے پتا چل گیا ہے کہ میرے گریز کی وجہ وہ نوجوان ہے۔ جو انہیں اس دن نزہت کے گھر نظر آیا تھا اور جس استحقاق سے وہ رہائشی کمروں کے اندر داخل ہو رہا تھا' وہ اسے اس گھر سے کسی قریبی تعلق کی خبر دے رہا تھا اور اس گھر میں نزہت اتنے سالوں سے رہ رہی ہے..... اس تکلیف دہ سوال کے بھنور میں اس دن سے میرا پورا وجود چکرا رہا ہے اور میں معاذ کو کیسے بتاؤں کہ کوشش کے باوجود میں اس بھنور میں کسی بے جان کھلونے کی طرح چکر کھائے جا رہا ہوں۔

تو اس کا مطلب ہے' میں نزہت کو واقعی دل سے معاف نہیں کر سکا یا خدا! میں کیا کروں' کدھر جاؤں۔ بار بار سمجھانے کے باوجود میرے دل میں اس کا یقین راسخ کیوں نہیں ہو پا رہا۔

اسے جب سے ہوش آیا تھا' وہ "بابا صاب' بابا صاب!" کہہ کر روئے جا رہی تھی اور جب عبدالمبین نے بے حد اصرار اور بصد منت اس سے یوں انہیں یاد کر کے رونے کا سبب پوچھا تو وہ اور شدت سے رو پڑی۔

"مبین! ہمارے بابا صاب طبعی موت نہیں مرے' انہیں ان شقی القلب لوگوں نے انتہائی بے رحمی و بے دردی سے گلا گھونٹ کر مارا تھا۔ ہمارے بابا صاب یوں اس طرح مارے جائیں گے' کبھی سوچا تھا تم نے....."

وہ پھٹی پھٹی آواز میں روتے ہوئے بولی تو عبدالمبین کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ وہ اسی وقت گاڑی میں اپنے دو تین حواریوں کے ساتھ آندھی طوفان کی طرح وہاں پہنچا تھا مگر ان لوگوں کی خوش بختی کہ وہ دن چڑھنے سے پہلے ہی وہ علاقہ چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے' ورنہ وہ جس غصے کے الاؤ میں بھڑکتا وہاں پہنچا تھا' پتا نہیں کیا کر ڈالتا۔

"آمنہ! صبر کرو' اب ہمارے پاس صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں' ان کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ اگر میرے ہاتھ وہ لوگ لگ جاتے تو خدا کی قسم میں ان کا وہ حال کرتا کہ انہیں اپنی اس قبیح حرکت پر پچھتانے کا موقع بھی نہ ملتا۔ صد افسوس' وہ بد بخت بھاگ گئے۔" وہ کوفت بھرے انداز میں ہاتھ ملتا ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آمنہ کے بے قرار دل کو قرار نہیں آ رہا تھا' نہ اس کے آنسو تھم رہے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال جویریہ کا بھی تھا۔

"وہ کتنے اچھے' کتنے نیک' پرہیز گار ہمارے بابا صاب اور یوں ان ظالموں نے انہیں مار ڈالا۔ انہوں نے تو اس موذی بیماری کو بھی شکست دے دی تھی پھر بھی موت نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ انہیں ہم سے چھین کر ہی ٹلی۔" صوفی صاحب کے قتل کیے جانے کا [illegible] ان کے کچے زخموں کے ٹانکے از سر نو ادھیڑ گیا تھا' ورنہ تو پہلے ان کی جدائی پر دل کچھ سنبھل ہی چکے تھے۔

"ہر انسان کو اپنے وقت مقررہ پر ادھر سے جانا ہی پڑتا ہے۔ اللہ ہمارے بابا صاب کی مغفرت کرے۔ میں تو اس بات کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ میں بروقت پہنچ گیا۔ کہیں وہ ظالم لوگ تمہیں لے کر نکل نہیں گئے۔ اس سے بڑی قیامت ہم [illegible] اللہ کا شکر ہے' تم ان کے چنگل سے بخیریت نکل آئیں۔" عبدالمبین اس کے پاس کرسی پر [illegible] بیٹھا۔

"ہاں بھائی! اللہ کا شکر ہے۔ ان کی شکلیں دیکھی تھیں' کیسی سیدھی' کیسی شریف۔ بابا صاب تک دھوکا کھا گئے۔ ہم اپنے اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کریں' کم ہے کہ آپ ان کے جال سے زندہ سلامت ہمارے پاس پہنچ گئیں۔"

جویریہ نے بھی آمنہ کا ہاتھ تھام کر محبت سے کہا تو آمنہ نے ایک شکوہ بھری نظر اس پر ڈالی۔

"آپی! قسم سے بھائی سے پوچھ لیں' میں تو ادھر آتے ہی پچھتانے لگی تھی کہ آپ کو اکیلا چھوڑ کر کیوں آگئی' میں نے تو ان سے وعدہ لے لیا تھا کہ یہ مجھے شام تک آپ کے پاس واپس چھوڑ آئیں گے ہے نا بھائی۔"

جویریہ نے آمنہ کی نظروں سے گھبرا کر خود ہی اپنی صفائی پیش کی۔

"جویریہ ٹھیک کہہ رہی ہے' آمنہ! یہ تو....."

"ہم دونوں ادھر زیادہ دن نہیں رکیں گے' عبدالمبین! تمہیں معلوم ہے نا۔"

آمنہ نے اس کی بات کاٹ کر کچھ تند لہجے میں کہا اور اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ڈھلکی چادر درست کر کے سر پر لی۔ عبدالمبین کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

"تت..... تو ہم کہاں جائیں گے آپی؟" عبدالمبین کے بجائے جویریہ ہکلا کر پوچھنے لگی۔

"وہ کہیں بھی' مگر ادھر نہیں۔" وہ سختی سے بولی۔

"آمنہ! تم اپنے اندر کچھ لچک پیدا نہیں کر سکتیں۔ دیکھو' یہ پیشہ اتنا برا نہیں جتنا برا تم خیال کرتی ہو' چلو اگر ایسا ہے بھی تو تم لوگ کہو گی تو میں بہت جلد اسے چھوڑ بھی دوں گا۔ اور....." عبدالمبین کچھ دھیمے لہجے میں بولا۔

"یہ ہمارا ہیڈک نہیں عبدالمبین کہ تم اسے چھوڑتے ہو یا نہیں' تمہیں اگر خیال ہوتا تو کم از کم بابا صاحب کی زندگی میں یہ سب کچھ چھوڑ دیتے۔ اب ایسا کرو گے تو ہمیں اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے کہیں نہ کہیں ہزار دو ہزار کی جاب مل ہی جائے گی۔ اس کے علاوہ بھی دنیا میں محنت کرنے کے سو طریقے ہیں مگر ہمیں تمہارے

یہاں نہیں رہنا ہاں جویریہ اگر رہنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جویریہ! تم اچھی طرح سوچ کر پھر جو مناسب سمجھو وہ فیصلہ کرلو۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

"پتا نہیں اس کے دماغ میں کیا بھس بھرا ہے' ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی آئی ہے کہ باہر دنیا کا کیا حال ہے۔ ہر طرف جنگل کا قانون نافذ ہے۔ بچ گئی ہے۔ اسی لیے ہضم نہیں ہو رہا' احمق بے وقوف!" عبدالمبین آمنہ کی پتھریلی صورت دیکھ کر دل میں کلستے ہوئے سوچنے لگا۔

"اوکے جیسی تمہاری مرضی۔ ابھی کچھ دن تو ہو نا ادھر۔ گھر دیکھ لو۔ ذرا اٹھ کر گھومو پھرو اور پلیز خود سے مجھے بتائے بغیر یہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں' اور کچھ نہیں بھائی تو ہوں نا میں تمہارا۔ چند دن کی میزبانی کا حق تو ہے نا مجھے' پھر جو تم کہو گی۔ میں مان لوں گا۔"

"آپی! آپ نے بھائی کو دیکھا' کتنے کمزور لگ رہے ہیں' اور آنکھوں کے گرد حلقے' سیاہ ہونٹ جیسے کوئی بیمار ہو۔" جویریہ چند لمحوں بعد بولی۔

"بری صحبت کے برے نتیجے ہوتے ہیں۔ عبدالمبین جس دلدل میں پیر دھر چکا ہے' وہاں سے اس کا بچ نکل آنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ جوئی! اسی لیے تو میں ادھر آنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اور اب [illegible] سے جلد ہمیں ادھر سے چلے ہی جانا چاہیے۔ ہم اس ماحول میں زیادہ دن نہیں رہ پائیں گے۔ تمہیں خود ہی احساس ہو جائے گا اور میری باتوں کا یقین بھی آجائے گا۔ یہ ادھر واش روم ہے نا۔" وہ کہتے کہتے اٹھ کھڑی ہوئی تو جویریہ نے سر ہلایا۔ وہ دائیں طرف بنے واش روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

"آپ کو کیا پتا' مجھے ان چند گھنٹوں میں احساس ہو چکا ہے [illegible] کل سے جو ادھر عجیب و غریب مشکوک شکلوں اور حلیے کے لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہی ہوں' مگر مجھے نا جانے کیوں خوش فہمی سی ہے کہ ہم ادھر رہیں گے تو شاید بھائی کے قبلے کا رخ موڑ سکیں آپی بہنوں کی محبت میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پھر اب ہمارا بچا ہی کون ہے۔ ایک بھائی ہے اسے بھی یوں دلدل میں دھنستا چھوڑ کر خود غرضی [illegible] مجھے یقین ہے۔ آپ اس بات کو سوچیں گی تو بھی بھائی کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا[illegible]

☆ ☆ ☆

"باہر نکلو' سید سلطان بخت! دیکھو کون آیا ہے۔" نین تارا نے حویلی کے کھلے گیٹ میں اندھا دھند گاڑی دوڑاتے ہوئے حویلی کی بڑی سی عمارت کے اندرونی حصے کے پاس گاڑی روک کر باہر نکلتے ہی سلطان بخت کو للکارا تھا۔ اس نے کمبل میں لپٹے ہوئے بچے کو سینے سے لگا رکھا تھا۔

رات بھر وہ طوفانی رفتار سے ڈرائیو کرتی آئی تھی۔ بچے کو اس نے دوسری سیٹ پر لٹا رکھا تھا [illegible] وحشت اور سر پر سوار جنون کے دوران وہ ایک بار اسے خیال آیا کہ اتنی طویل ڈرائیو کے دوران بچہ ایک بار بھی نہ [illegible] تھا۔ اس نے ہاتھ پیر مارے تھے جب کہ نرس تو کہہ رہی تھی کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے خیال آنے پر بچے کو دیکھنے کا سوچا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ اگر سوتے سے اٹھ کر اس نے رونا شروع کر دیا تو وہ اسے کیسے چپ کرائے گی۔ جب کہ اس کے پاس تو بچے کے لیے دودھ یا کچھ اور بھی نہیں۔ بس اس پر تو جلد سے جلد سلطان بخت کا سامنا کرنے کی دھن سوار تھی۔ اور اس کی قسمت کہ وہ بلا رکاوٹ حویلی پہنچ گئی تھی۔ صرف دو جگہ رک کر راستہ پوچھنا پڑا تھا اور شومئی قسمت حویلی کا پھاٹک بھی کھلا تھا اور کھڑے دربان اس کی گاڑی کو کسی طوفان کی طرح اندر داخل ہوتے دیکھ کر دوڑے آئے تھے۔ مگر وہ اس سے پہلے اندر پہنچ چکی تھی۔

سلطان بخت اس کی للکار سن کر چہرے پر شدید غصے کے آثار لیے بھاری قدموں سے چلتے ہوئے اس سے چند منٹ کے فاصلے پر بنی سنگی سیڑھیوں پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

"تو تم زندہ بچ گئیں؟" وہ اس کے زرد چہرے پر بچی غصیلی نگاہوں کو تنفر سے دیکھ کر غرائے۔

"نہ صرف بچ گئی بلکہ تمہارے لیے ایسا انمول تحفہ بھی لائی ہوں جو تمہاری یہ خاندانی' امیر کبیر بیوی اتنے

سال ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھی تمہیں نہ دے سکی اور جس سے محرومی کا احساس تم جیسے زمیندار کو اندر ہی اندر چاٹے جا رہا ہے۔" اس نے شہادت کی انگلی اٹھا کر سلطان بخت کے پیچھے کھڑی صالحہ اور سیدہ کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا تھا۔ حویلی کے ملازمین اس منظر نامے سے ذرا فاصلے پر ارد گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے' ان کی آنکھیں ایک انہونا منظر دیکھ رہی تھیں۔

"یہ دیکھو تمہارا بیٹا' اس حویلی کا اکلوتا جائز وارث۔ ہمت ہے تو دن کی روشنی جیسے جگمگاتے اس سچ کو جھٹلا سکو تو جھٹلاؤ۔ ابھی چند منٹوں میں ادھر میڈیا والے' پریس والے پہنچ رہے ہیں۔ ان ہی لوگوں سے جان جاتی ہے نا تم فیوڈل لارڈز کی' دیکھنا ابھی وہ تمہارے ولی عہد کی رونمائی کرنے کے لیے پہنچنے والے ہیں۔ اس کے بعد بھی تمہیں کس گواہی' کسی ثبوت کی ضرورت ہوگی۔ بھلا۔" وہ خوب اونچا اونچا بے خوف لہجے میں بول رہی تھی۔ حالانکہ اس طرح چیخ چیخ کر بولنے سے اس کی جسمانی تکلیف اور کمزوری بڑھ رہی تھی۔ اس کی وحشت اور جنون اس تکلیف پر غالب آ رہا تھا۔

"اے طوائف زادی! تمہیں تمہاری اوقات سے زیادہ مل گیا تو تم سمجھیں کہ میں تمہارے عشق میں اس قدر دیوانہ ہو چکا ہوں کہ تم جو سارے زمانے کا گند سمیٹ کر میری جھولی میں ڈالو گی تو میں چوم کر اسے سینے سے لگا لوں گا۔ مجھے اس قدر بے غیرت سمجھنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی۔"

سید سلطان بخت نے [illegible] اپنے آہنی ہاتھ کو اٹھنے سے روکا تھا' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس سوا پانچ فٹ کی لڑکی کو وہ اپنے پیروں تلے کچل کر اس کا قیمہ بنا ڈالیں۔ آج اس کی موہنی صورت' اس کا حسین سراپا' قاتل نگاہیں' انہیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ لڑکی سر بازار ان کی اور ان کے آباء کی پگڑیاں اچھالنے آئی ہے اور بس۔

"تو تم نہیں مانتے کہ یہ تمہارا بچہ [illegible] یاد کرو' وہ حسین یادیں' سوات کے پر فضا مقام پر گزرے وہ دن' وہ نشیلی [illegible]

[illegible] جہاں والے...!"

سلطان بخت اس کے الفاظ سنتے ہی پاگل ہو اٹھے۔" اس گند کو اٹھا کر حویلی سے کئی سو میل دور کسی ویرانے میں پھینک آؤ۔ جہاں چیل کوے اس [illegible] جسم کی بوٹیاں نوچ جائیں۔"

سلطان بخت کی غراہٹ اتنی [illegible] تھی کہ ایک پل کو تو صالحہ بھی اپنا دل تھام کر رہ گئیں اور سیدہ کے سینے میں جیسے کسی نے ٹھنڈے میٹھے چشمے کا منہ کھول دیا ہو۔ انہیں پہلی بار اپنے نجیب الطرفین اور خاندانی ہونے پر بے تحاشا فخر محسوس ہوا۔

نین تارا کی حالت' ان دونوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کا چہرہ ہی نہیں جسم بھی جیسے زلزلے کے جھٹکوں کی زد میں تھا۔ اس نے زور سے بچے کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ آنکھوں میں اترتی بے تحاشا دھند کو بمشکل بارش بننے سے روکا۔ سامنے سے ملازم دوڑتے ہوئے آئے تھے اور اپنے مالک کی قہر بار نظروں سے ملنے والے آخری اشارے کے منتظر کھڑے تھے۔ سر پر رستی دھوپ نیزے کی انی کی طرح جسموں میں اترتی جا رہی تھی۔

"تو یہ تمہارا بچہ نہیں۔ میں تمہاری بیوی نہیں۔" نین تارا نے اپنے چکراتے سر اور گرتے بدن کو بمشکل پیچھے کھڑی گاڑی کا سہارا دے کر کمزور لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔" سلطان بخت کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

"شاہ جی! یہ ہمارا بیٹا ہے۔ خدا کے لیے میرا یقین کرو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں' بالکل سچ۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے رو دی۔

تمہارا خون' نہیں' تو میرا بھی اس سے کوئی رشتہ' کوئی تعلق نہیں' میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تم اسے نہیں اپناؤ گے تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دوں گی۔"

کہتے کہتے اس نے وحشت بھرے انداز میں بچے پر لپٹا کمبل کھینچ کر پرے اچھالا۔ ایک آخری نظر اس کے معصوم سوئے ہوئے چہرے پر ڈالی اور بے حد جنونی انداز میں اپنا دایاں پنجہ اس کے ننھے سے گلے پر پورے زور سے جمادیا۔

"پاگل! پاگل..... ہوگئی ہو۔ تم کتیا۔ دفع ہوجاؤ۔ بند کرو یہ ڈرامہ....."

سلطان بخت اس کی اس جنونی حرکت پر بے اختیار چیختے ہوئے دو قدم آگے بڑھے تھے۔ صالحہ اور سیدہ بھی اس کی اتنی اچانک حرکت پر پل بھر کو پتھرا سی گئیں۔

شاید بچے نے ایک ہی جھٹکا کھایا تھا' شاید اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکلی تھی۔ شاید اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی۔ اس کو جنم دینے والے ایک پل کو اس کے بارے میں اس محبت کے ہزارویں حصے کے برابر ہی سوچ لیتے جس کے تحت وہ اس دنیا میں آیا تھا تو شاید اس کی زندگی بچ جاتی۔

اور جب تک سلطان بخت' سیدہ اور صالحہ! اس سے بچے کو جھپٹنے کے لیے آگے بڑھتے وہ بے جان ہو کر گوشت کے لوتھڑے کی طرح نین تارا کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔ نین تارا کی آنکھوں میں اترا خون اور وحشت اس کے چہرے پر بھی نظر آرہی تھی۔ وہ پلک جھپکے بغیر بکھری وہ سہری چمکتی روشنی میں اس کے معصوم چہرے کو تکے جارہی تھی۔ اس کی چمکتی زرد پیشانی میں ادھ کھلی فریاد کرتی بلوریں آنکھیں جو نین تارا کی آنکھوں میں براہ راست دیکھ رہی تھیں' اس کا چھوٹا سا سرخ ہونٹوں والا دہانہ' بچہ بے حد خوبصورت تھا۔ نین تارا کو یوں لگا جیسے اس نے پہلی بار اسے دیکھا ہو۔ اس کے لمس کی حدت کو پہلی بار اس کے ہاتھوں نے محسوس کیا ہو۔ اور ممتا کے اس ابلتے چشمے کو بھی جو اس بچے کو اپنے ہاتھوں سے مار دینے کے بعد اس کے بدن کے اندر ایک دم سے پھوٹا تھا۔

"مم... میرا بچہ' میرا بیٹا' میری جان... میں نے... میں نے تمہیں مار ڈالا' میرا بچہ میرا لعل....." وہ یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ اس کے جسم سے جان نکلنے لگی تھی ٹانگوں نے اس بے جان ہوئی لاش کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا' وہ اسی جگہ زمین پر گرتی چلی گئی۔ اس کی نظر بس ابھی بھی [illegible] وہ بالکل بے خبر ہوچکی تھی۔ سلطان بخت کے قدموں کے پاس ہی وہ ڈھیر ہوگئی۔ مگر ایسے کہ بچہ ابھی بھی اس کے بازوؤں کے بستر میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اور وہ اس کو دیکھے جارہی تھی۔

اسی وقت کھلے گیٹ سے تین گاڑیاں آگے پیچھے اندر داخل ہوئی تھیں' وہاں موجود سارے نفوس جیسے ہوش میں پلٹے تھے۔ تینوں گاڑیوں کے دروازے زور زور سے کھلے اور ان میں موجود لوگ دیوانہ وار زمین پر گری نین تارہ کی طرف لپکے تھے۔

☼ ☼ ☼

نجد کو بے حد سمجھا کر' منا کر بالآخر وہ نزہت کے پاس آنے کو تیار ہوہی گئے تھے۔ ارتضیٰ کو بھی ساتھ لے لیا۔

"چلو تمہیں تمہارے دوست فہد سے ملوالاؤں۔" انہوں نے اس کی خوشی کو دوبالا کرتے ہوئے کہا..... وہ تو اسی میں نہال تھا کہ پاپا اسے اپنے ساتھ باہر لے کر جارہے ہیں۔

رستے بھر سوچتے آئے کہ نزہت سے کیا کہیں گے' ساتھ چلنے کو؟ اپنے رویے پر ندامت کے چند الفاظ یا بھولی بسری محبت کی کوئی یاد دہانی۔

"معلوم نہیں' اتنے دنوں میں اس نے کیا سوچا ہوگا' وہ کب' خوشی میرے ساتھ آنے کو تیار ہے۔ میں خود ہی سارے فیصلے اپنے دل سے کررہا ہوں۔ اور یہ بھول گیا ہوں اب تو جو ہوگا' اسی کی رضا سے ہوگا۔ اور اس کی رضا کیا ہے۔ کاش میں جان سکتا۔"

"پاپا! آگیا فہد کا گھر۔" ان کی الجھی بکھری سوچوں کو ارتضیٰ کی آواز نے منتشر کردیا تھا۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر گاڑی گیٹ کے باہر ہی روک لی۔

"کیا صرف فہد سے ملنے کی خوشی ہے' میرے بیٹے کو؟" گاڑی لاک کرتے ہوئے انہوں نے ارتضیٰ کے مسرور چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"جی پاپا! اب چلیں اندر....." وہ کچھ بے قراری سے بولا "اور وہاں وہ فہد کی آنٹی بھی تو ہیں' ان کے ساتھ باتیں کرنے میں بھی بہت مزہ آتا ہے پاپا! بس آج ادھر شام تک رہوں گا۔" وہ جلدی جلدی بولا۔

"نہیں بیٹا! اتنی دیر نہیں۔ آپ اسکول میں روز تو فہد سے کھیل لیتے ہو۔ اس وقت تو بس تھوڑی دیر کے لیے' اوکے۔" وہ اس کے بنے ہوئے بال بگاڑتے ہوئے بولے۔

"تو آپ کیا کریں گے ادھر۔ میرا مطلب ہے' آپ کا تو کوئی دوست نہیں ہے تو پھر آپ کس سے باتیں کریں گے۔" وہ پوچھتے ہوئے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ شہباز خان بیٹے کی ذہانت پر مسکرائے — اس کی تقلید میں چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ گیٹ کے سامنے دور تک جاتی سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ یونہی آوازوں پر ان کا دھیان دائیں لان کی طرف چلا گیا۔ لان میں فہد فٹ بال کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ سامنے ہی نزہت کریم کلر کے سوٹ میں ملبوس کھلی کھلی سی فہد کی کرتی سے باتیں کررہی تھی۔ اس کے بالکل بالمقابل پڑی کرسی پر اسی رنگ والا [illegible] بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا ایک رخ شہباز خان کو دور سے دکھائی دے گیا' ان کے چہرے پر جلتی بجھتی چلی گئی۔ اس نوجوان کے باتیں کرنے کی آواز گیٹ تک آرہی تھی۔ وہ دونوں اس کو سن رہی تھیں۔ شہباز خان کے قدم زمین نے پکڑ لیے تھے۔

"پاپا! آئیے نا۔" ارتضیٰ جو فہد کو اچھلتے کودتے دیکھ کر بے قرار ہوگیا تھا۔ ان کا ہاتھ ہلا کر بولا۔

"ارتضیٰ بیٹا تم جاؤ کھیلو۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے' میں آدھے گھنٹے میں تمہیں لینے آجاؤں گا۔ ٹھیک ہے' کھیلو جا کر۔" وہ کہہ کر رکے نہیں اور مڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتے باہر نکل گئے۔ اسی وقت نزہت کی نظر ان پر پڑی تھی۔ وہ بے چین سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اتنی دیر میں وہ گیٹ کراس کرچکے تھے۔ وہ ست سی ہو کر دوڑتا ہوا ارتضیٰ [illegible] کی طرف آرہا تھا۔ نزہت کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی انوکھی سی [illegible]

"شہباز خان! میرے لیے زندگی کا کوئی دروازہ تو کھلا چھوڑ دیجیے گا۔" وہ دل میں ابھرتے دکھی سے احساس کو روندتے ہوئے ارتضیٰ کی طرف بڑھی۔

☼ ☼ ☼

آمنہ اور ہر بہت مشکل سے [illegible] تھی۔

جویریہ کے لاکھ سمجھانے اور منت کرنے کے باوجود کہ اگر وہ دونوں کوشش کریں تو عبدالمبین کو نئی زندگی کی طرف لوٹا سکتے ہیں۔ وہ یہاں رکنے کو تیار نہیں تھی۔

"جویریہ! لاحاصل کوششوں میں خود کو برباد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں' گناہ کی لذت ایسی بری ہے کہ آدمی چاہے بھی تو اس لت سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ عبدالمبین اپنی مرضی' اپنے دل کی خوشی سے اس زندگی میں داخل ہوا ہے۔ اور یہ اس وقت تک پلٹ نہیں سکتا جب تک یہ خود سے نہیں چاہے گا۔ میری یا تمہاری کوشش کچھ اثر نہیں دکھا سکتی۔ اب یہی دیکھ لو۔ یہ ہم سے کہہ رہا تھا کہ وہ جلد خود کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ اور اب جیسے اس قسم کی بات سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ میں دو تین اسکولوں میں انٹرویو دے آئی ہوں۔ امید ہے کہیں نہ کہیں سے مجھے کال آجائے گی۔ بس اس کے بعد ہمیں ادھر نہیں رہنا۔" وہ حتمی انداز میں بولی۔

"ہوں....." جویریہ مایوسی سے سر جھکا کر بولی۔

"تم نے دیکھا ہے اس کا رہن سہن' ہر دوسرے چوتھے جو گاڑیاں بھر بھر کر مشکوک لوگ آتے ہیں' بند کمروں میں اونچا اونچا گلا ہوتا ہے۔ وہ حرام چیز اس گھر میں یوں کھلے عام چلتی ہے جیسے پانی کی بوتلیں' مجھے تو رات رات بھر نیند نہیں آتی کہ بابا صاحب کی روح کیسی بے چین ہوگی۔ ان کی اولاد کس حرام زندگی کے شکنجے میں جکڑی جارہی ہے۔ جویریہ! خدا کے لیے خود کو اس گھر کی آسائشوں اور راحتوں کا عادی نہ بنانا۔ بس ایک آدھ ہفتے سے زیادہ ہمیں ادھر نہیں رہنا۔"

وہ بے چین سی اٹھتے ہوئے بولی' جب سے اس نے عبدالمبین کو ڈرگ کا انجکشن لگاتے' نشے میں دھت ہوتے دیکھا تھا۔ اسے اور بھی اس سے نفرت ہوگئی تھی۔

"اس کا ہم سے محبت' ہمدردی کا رویہ نرا ڈھکوسلہ ہے جب اسے خود پر' اپنے نفس پر کوئی قابو ہی نہیں تو یہ ہماری کوششوں سے کیا بدلے گا اور جو سچ پوچھو تو میں خود کو اس گھر میں بالکل محفوظ نہیں سمجھتی' مجھے لگتا ہے میں ایک کلثوم بی بی کے جنگل سے نکل کر جو راہ میں آکھڑی ہوئی ہوں' جہاں ہر آتی جاتی گندی نگاہ میرے بدن کو پلید کر رہی ہے۔ مجھے تو اس گھر کے ملازم بھی قابل اعتبار نہیں لگتے۔ جویریہ! دعا کرو ہم ادھر سے جلد از جلد بحفاظت نکل سکیں۔ عبدالمبین نشے میں ہو تو اسے اپنی خبر نہیں ہوتی۔ ہماری نگہبانی وہ کیا کرے گا۔" وہ کہتے کہتے دکھی سی ہوگئی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" جویریہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

اور اس دن آمنہ کے شکوک جیسے یقین میں بدلنے لگے۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد بلا مقصد لاؤنج میں ٹہل رہی تھی۔ جب اس نے ایک ملازمہ کو چپکے سے کھانے کی سجی سجائی ٹرے کچن کے پچھلے دروازے سے باہر لے جاتے دیکھی۔ کچن میں اس وقت اور کوئی بھی نہیں تھا۔

آمنہ چپکے سے اس کے پیچھے ہولی۔

ملازمہ بہت احتیاط سے دبے پاؤں سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی۔ یہ ملازمہ آمنہ کو شروع دن سے بہت پراسرار سی لگی تھی۔ کام میں مگن' بالکل چپ چاپ۔ اور آج اس وقت بھری دوپہر میں یہ کھانے کا خوان سجا کر کس کے پاس لے جا رہی تھی۔

اس نے سیڑھیوں کے نیچے رک کر اس کے اوپر پہنچنے کا انتظار کیا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ اوپر پہنچ چکی ہے تو وہ دبے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

ملازمہ تیسرے کمرے کے دروازے سے باہر آرہی تھی۔ آمنہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔

"کون ہے اندر' کس کو کھانا دے کر آئی ہو؟" آمنہ تیز لہجے میں بولی۔

"کس۔ کوئی نہیں بی بی! آپ نیچے جائیں' صاب نے منع کیا ہے۔"

"ہٹو پیچھے' دیکھنے دو مجھے۔" آمنہ اسے دھکا دے کر تیزی سے بند ہوتے دروازے کے اندر گھس گئی۔ دروازہ بند کرتے ہاتھ ایک دم سے ٹھٹک گئے اور آمنہ تو اسے دیکھ کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"تم۔؟" چند ثانیوں بعد اس کے ہونٹ ہولے سے وا ہوئے تھے۔ آنکھوں میں بے تحاشا تحیر امڈ آیا تھا۔

وہ تو اس کے یہاں ہونے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

• • • • •

"نین تارا! میری بچی! تب سے پہلے تیزی سے اس تک آنے والی زیور گل تھی جو گاڑی سے ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے ہوش و خرد سے بے گانہ نین تارا سے لپٹ گئی تھی۔ نین تارا نے زیور گل کو ایک ہاتھ سے پرے دھکیلا' اس کی نظریں بدستور دوسرے بازو میں محو خواب بچے پر لگی ہوئی تھیں۔

"ماں! دیکھیں یہ رو نہیں رہا' ماں! میں نے اسے مار ڈالا۔ میں نے خود اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ماں! اسے درد تو ہوا ہوگا۔ پھر یہ رویا کیوں نہیں۔ ماں! جب درد ہوتا ہے تو سب روتے ہیں تو یہ کیوں نہیں رو رہا۔ ماں دیکھیں' اس کو چیک کریں یہ کہیں مر تو نہیں گیا۔ نہیں۔ نہیں یہ نہیں مر سکتا۔ یہ' یہ تو اس حویلی کا وارث ہے۔ یہ تو بہت منتوں مرادوں سے پیدا ہوا ہے۔ شاہ جی نے تو ابھی اس کے پیدا ہونے کا جشن بھی منانا ہے۔ بہت بڑا' بہت یادگار جشن۔ اس علاقے کے لوگ مدتوں یاد رکھیں گے۔ ہاں' مجھے تو ابھی سے ڈھول کی آواز سنائی دے رہی ہے' ماں آپ سن رہی ہیں نا ڈھول باجا۔ مگر آپ کیوں رو رہی ہیں۔ شش بری بات' خوشی کے موقع پر رونا نحس ہوتا ہے۔ آپ ہی تو کہتی ہیں۔ اسے اٹھائیں نا یہ کیوں نہیں آنکھیں کھولتا۔"

وہ پتھرائی ہوئی نظریں بچے پر جمائے ارد گرد سے بے خبر بے ربط فقرے بول رہی تھی۔

"میری بچی میری جان! یہ مر چکا ہے۔ اور اچھا ہی ہوا یہ مر گیا ورنہ آئندہ زندگی میں اس نے جو ذلت اٹھانی تھی۔ اپنے باپ کے ہوتے بے نامی اور یتیمی کی بے رحم حالت سے گزرنا تھا۔ اچھا ہوا جو یہ مر گیا۔' اس نے اپنے سنگ دل بے رحم اور پتھر باپ کی صورت دیکھے بغیر آنکھیں موند لیں تو اچھا کیا۔ اس بے رحم دنیا کی کوئی بھی بدصورت شبیہ اس کی معصوم بصارتوں پر نقش نہیں ہو سکی۔ یہ معصوم' معصوم ہی چلا گیا۔ اچھا ہوا!' اٹھو چلو یہاں سے۔ یہ پتھروں کی بستی ہے اور تو کانچ سے بنی ہے۔ میری بچی! بھی یوں لہولہان ہوئی ہے' اٹھ چل یہاں سے' یہ انسانوں کی نہیں جنگلی جانوروں کی بستی ہے۔ تیرے اس نیم مردہ جسم کی بھی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے' اٹھ چل۔"

زیور گل اب آواز لگاتے ہوئے اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں ماں! میں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے بچے کو اس کے اصل گھر میں لے آئی ہوں' اب بھلا میں کہاں جا سکتی ہوں۔ اب تو میں وہیں رہوں گی جہاں یہ رہے گا۔ اور بھلا شاہ جی اپنے اکلوتے وارث کو گلی کدے میں رہنے دیں گے۔ کبھی نہیں۔ میری بات اور تھی۔ اب تو یوں بھی سب کو پتا چل گیا ہے۔ میں اس حویلی کے اکلوتے وارث کی ماں ہوں۔ اب تو میں یہاں بڑی شان سے رہوں گی۔ دیکھنا ماں' اسے اٹھاؤ نا یہ کیوں سو رہا ہے؟ اس کی نیند کیوں نہیں ٹوٹ رہی۔"

نین تارا اب ہولے ہولے ہچکیاں لے کر سسکنے لگی۔ اسی لمحے پیچھے کھڑے کسی پرائیویٹ چینل کے کیمرہ مین نے ذرا آگے ہو کر کھٹا کھٹ تین تصویریں اتار لیں۔ کیمرے کا فلیش دھوپ میں چمکا تو جیسے پتھر کا بت بنے سلطان بخت کو ہوش آگیا۔ رباب' صالحہ شاہ پہلے ہی اندرونی دروازے کی آڑ میں ہو چکی تھیں۔

"او ئے۔" سلطان بخت نے قہر بھرے انداز میں ہاتھ اٹھا کر زور سے کہا تو ان سب لوگوں کو جیسے سلطان بخت کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کئی وفادار سلطان بخت کے وفادار' کیمرہ مین سے کیمرہ چھیننے کے لیے اس کی طرف لپکے۔

"خبردار' ہم اپنے اخبار اور میڈیا کو سب بتا کر آئے ہیں۔ یہاں کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں نتائج کے ذمہ دار آپ لوگ خود ہوں گے۔"

اسی کیمرہ مین نے نڈر لہجے میں ان ملازموں کو گویا اطلاع دی تو سلطان بخت کا جلال بھی کسی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"کرم داد! یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کے لیے مہمان خانہ کھلواؤ۔ اتنی دھوپ میں آپ لوگ ادھر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چل کر بیٹھیں۔"

سلطان بخت نے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں ان ساتوں رپورٹرز سے کہا۔ اور ساتھ ہی اپنے ملازموں کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"شکریہ' ہم ادھر ہی ٹھیک ہیں۔ جی بیگم صاحبہ! آپ کچھ کہنا چاہیں گی؟"

وہ اکھڑ سا کیمرہ مین زیور گل کی طرف جھکا تو سلطان بخت کے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہو گئیں۔ بھنویں اوپر کو تن گئیں۔

"جو پوچھنا ہے' آپ لوگ مجھ سے پوچھیں۔ پہلی بات یہ کہ آپ لوگ بلا اجازت حویلی میں داخل ہوئے ہیں جو کسی بھی جرم سے کم نہیں لیکن پھر بھی میں آپ کو مہمان جان کر آپ کی یہ گستاخی نظر انداز کرتا ہوں کہ اب بہتر ہے۔ آپ لوگ اندر چل کر آرام سے بیٹھیں۔ اور جو پوچھنا ہے اندر چل کر پوچھیں۔ یوں سرراہ آپ کو کوئی بھی تماشا بنانا زیب نہیں دیتا ہے۔ کرم داد مہمان خانے کا دروازہ کھولو۔"

وہ جاتے ہوئے اپنے ملازمین سے بولے تو زیور گل نے تڑپ کر اس شقی القلب انسان کی طرف دیکھا۔

"خدا کرے تم اس اونچی حویلی کی دیواروں میں یونہی بے نام و نشان موت کو ترسو اور تمہیں موت نہ آئے۔

زیور گل حلق پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ جب ایک تومند ملازم نے اسے بازو سے پکڑ کر یوں گیٹ سے باہر اچھالا جیسے وہ حویلی کی کوئی بیکار و بے وزن چیز ہو۔ زمین پر گرتے ہی اس کا ادھیڑ عمر بدن چیخ اٹھا مگر تکلیف کے اس عالم میں بھی وہ اپنے درد کو سمیٹتی نین تارا کی طرف دوڑی تھی۔

"اٹھ میری بچی! اٹھ! یہاں سے چل۔"

وہ گرتی پڑتی اس تک پہنچی تھی۔ اور اب نین تارا کے پتھر وجود کو ہلانے اور اٹھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آنسو بہا رہی تھی۔

آج پہلی بار اسے پتا چلا کہ اس کی عمر پچاس کا سن تجاوز کر چکی ہے۔ اس کے بنے سنورے جسم میں طاقت نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس کی معمولی سی کمزور نظر اس لمحے تیزی سے اندھے پن کی طرف دوڑنے لگی تھی۔ زور زور سے آنکھیں ملنے کے باوجود زیور گل کو بہت سے منظر دھندلے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں خود کو اتنا بے بس بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"ممند! فارغ ہو گئے ہو تم۔ ان "بدذاتوں" کو باہر نکال کر تو اندر آ کر مہمانوں کو دیکھو۔" سلطان بخت کے [illegible] خاص کی کراری آواز مالک کے گہرے تنفر کا پتا دے رہی تھی۔

ممند نے اگلے ڈیڑھ منٹ میں زیور گل اور نین تارا کو اس کے مردہ بچے سمیت گاڑی میں ڈال کر ان کی گاڑی کو حویلی سے بیس فٹ دور سڑک پر لے جا کر چھوڑ دیا تھا۔

اور حویلی کے اندر پینٹری میں کھڑی صالحہ شاہ آنسو بہاتے ہوئے ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔

"اللہ تیرا لاکھ شکر تو نے مجھے صالحہ شاہ بنایا۔ میں جب سے اس حویلی میں آئی تھی دن میں ہزار بار تجھ سے گلہ کرتی تھی کہ تو نے مجھے نین تارا کیوں نہیں بنایا۔ تو نے مجھے صالحہ شاہ کیوں بنایا۔ میں نین تارا ہوتی تو کم از کم سلطان بخت کی محبت بھری نگاہ کا تارا تو ہوتی۔ پر نہیں، آج مجھے پتا چلا سلطان بخت کی محبت اس زہریلے سانپ کا زہر ہے جو ڈسنے میں بے حد رسیلا اور نشہ آور ہوتا ہے۔ اور تاثیر میں [illegible] کی تلخ ترین موت سے بھی [illegible] اور شرم ناک۔ میرے مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر تو نے مجھے صالحہ شاہ بنایا۔"

وہ ایک ہی بات کی تکرار کرتے دیوار سے سر ٹکائے روئے جا رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد مہمانوں کی بھرپور تواضع اور مدارات کے بعد سید سلطان بخت انہیں خود بیرونی دروازے تک الوداع کہنے آئے تھے۔

"اور باقری صاحب! آپ کو تو معلوم ہے ان کسبی عورتوں کا حال، کیسی بدذات ہوتی ہیں۔ جہاں روپیہ پیسہ دیکھا۔ مکھی کی طرح منڈلانے لگتی ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ بھلا کیا، گلی گلی مجرا کر کے چار پیسے کماتی تھیں۔ میں نے انہیں بیرونی دورے کروائے۔ عزت دلوائی۔ اور یہ ہاتھ دھو کر میرے ہی پیچھے پڑ گئیں۔ سچ کہا ہے [illegible] رنڈی، طوائف بھی بھی کسی کی بنی ہے۔ ان کی اپنی تو کوئی عزت ہوتی نہیں۔ اسی لیے ذرا ذرا سی بات پر کپڑے اتار، پریس کے سامنے سج کر بیٹھ جاتی ہیں۔ سارے زمانے میں مظلوم بن کر سب کی ہمدردیاں سمیٹنے اور ہم جیسے عزت داروں کی پگڑیاں اچھالنا تو ان بدبختوں کا ازلی پیشہ ہے۔ پہلے تو یہ بازار حسن تک محدود تھیں۔ اب تو سوسائٹی کے پوش ترین علاقوں تک ان کی رسائی ہو چکی ہے۔ پیسے اور جسم فروشی کے بل بوتے پر جس کو چاہے اپنا ہمنوا بنا لیتی ہیں۔

اب خدا جانے کس کا گند تھا جو لا کر میرے سر منڈھنا چاہتی تھیں اور آپ لوگوں کو بھی ان کے ساتھ چلتے ہوئے کچھ خیال کرنا چاہیے کہ ہر من گھڑت مسالا دار کہانی سچ نہیں ہوتی۔ اور میں تو کہتا ہوں ان جیسی بدکار اور سینہ زور معاشرے کے ناسوروں کو میڈیا ہی عوام کے سامنے ننگا کر سکتا ہے۔ اور میڈیا کو اپنا یہ کردار ادا بھی کرنا چاہیے پوری دیانت داری سے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم معاشرے کو اس سر اٹھاتی گندگی سے پاک نہ کر سکیں۔ یہ آپ لوگوں کی کمزوری ہے جو آئے دن کوئی نہ کوئی جھوٹا اسکینڈل اٹھ کھڑا ہوتا ہے کسی بھی عزت دار پر کیچڑ

اچھالنے کے لیے۔ اس سلسلے کا کوئی تدارک ہونا چاہیے۔ اور آپ لوگ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔"

ایک رپورٹر کا قلم اپنے پیڈ پر تیزی سے چل رہا تھا۔ جب کہ باقی تائیدی انداز میں زور و شور سے سر ہلا رہے تھے۔

"کرم داد!" سلطان بخت نے پیچھے مڑ کر آواز لگائی تو کرم داد بوتل کے جن کی طرح اسی فوٹو گرافر کا کیمرہ اور سات لفافے ہاتھ میں لیے دوڑتا ہوا آیا تھا۔

"یہ آپ کا کیمرہ اور یہ ہماری طرف سے تحفہ آپ سب کے لیے۔ امید ہے آپ لوگ آئندہ بھی ہماری مہمان نوازی کا خیال رکھیں گے۔"

سلطان بخت نے انتہائی بااخلاق لہجے میں ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ایک ایک لفافہ ان ساتوں کی طرف بڑھایا جسے انہوں نے ایک ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ تھام لیا اور سلطان بخت سے مصافحہ کر کے اپنی گاڑیوں میں جا بیٹھے۔

☼ ☼ ☼

"تم!" آمنہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ چند ثانیے تو اسے ماضی کی گرد میں چھپے اس چہرے کو پہچاننے میں لگے تھے اور پہچان کا اگلا پل بے حد استعجاب لیے ہوئے تھا۔

"ہاں، میں۔" [illegible] نے تو شاید اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر آمنہ جیسا تحیر نہیں تھا۔ گزرتے سالوں نے شہرینہ کے [illegible] کی لو بھی کچھ مدھم کر دی تھی۔ چمکتی دمکتی سرخ و سفید رنگت جو سید سبطین شاہ کی حویلی کے مکینوں کی خاص پہچان تھی۔ خاصی میلی پڑ چکی تھی۔ بڑی بڑی براؤن آنکھوں کے گرد سیاہ گہرے حلقے تھے اور شنگرفی ہونٹ مرجھائے ہوئے پھولوں کی پتیاں لگ رہے تھے۔

"تم یہاں کیسے؟" ملازمہ دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر چپکے سے سیڑھیاں اتر گئی۔

"مجھے [illegible] اپنے مکار بھائی سے پوچھو۔"

[illegible] اندر کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ کمرے میں فرنیچر یا آرائش کے نام پر کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ فقط ایک میٹرس بچھا تھا جس پر پرشکن پرانی سی چادر پڑی تھی۔ تکیے کے نیچے سے دو تین کتابیں جھانک رہی تھیں۔ میٹرس کی دیوار کے ساتھ پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ جس پر ڈس پوزایبل کپ اور دو گلاس رکھے تھے [illegible] پانی کی بوتل [illegible] رہی تھی۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جس پر دبیز پرانا سا پردہ پڑا تھا اور بس۔

"عبدالمبین سے؟" [illegible] شہرینہ کا مکار بھائی سے کہنا خاصا چبھا۔

"ہاں، اسی عبدالمبین سے جو دنیا بھر کے لیے معتبر اور حقیقت میں ایک مکار، دھوکے باز، چرسی، نشئی اور شرابی [illegible] ہے۔" وہ انتہائی نفرت سے بولی۔

شہرینہ کے الزام غلط نہیں تھے۔ آمنہ دو چار دنوں میں ہی عبدالمبین کا یہ دوسرا روپ دیکھ چکی تھی۔ وہ شرمسار سی ہو گئی۔

"مگر تم یہاں کیسے ہو؟ میرا مطلب ہے اس طرح کسی قیدی کی مانند اور پھر عبدالمبین کے گھر میں میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"قیدی! ہاں قیدی ہوں میں اپنے ضمیر کی قید میں۔ جب کوئی شخص اپنی نظروں میں گر جاتا ہے تو یوں بری طرح خود کو محبوس کر لیتا ہے، جیسے جی ساری دنیا سے کٹ جاتا ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"مگر تم نے خود کو یہ سزا کیوں دے رکھی ہے۔ تم تو حویلی میں تھیں پھر عبدالمبین کے ساتھ تمہارا کیا تعلق، جو تم یہاں اس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو۔ یہ گھر اتنا بڑا اور عالیشان ہے۔ سامان تعیش کی بھی ادھر کمی نہیں، پھر تم یوں فقیروں کے سے حال میں یہ قید کیوں جھیل رہی ہو۔" آمنہ بولتی چلی گئی۔

”یہ زندگی بھر کی قید بامشقت ہے۔ اور اس میں کمی یا تخفیف کے لیے میں نہ تو کسی عدالت میں جاؤں گی' نہ کسی سے فریاد کروں گی۔“ وہ تھک کر میٹرس پر گر گئی۔ اس کا صحت مند خوبصورت سراپا کسی سوکھی ہوئی سال خوردہ شاخ کی مانند لگ رہا تھا۔ ہر کشش سے عاری۔

”آخر کیوں؟ تم نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟“ آمنہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کا جرم سیاہ رات کی تاریکی سے بھی زیادہ ہولناک ہوتا ہے۔ جسے کبھی کوئی عزت دار گھرانہ دن کی روشنی میں معاف کرنا تو در کنار اس کا ذکر کرنا یا سننا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”تم حویلی سے بھاگیں۔ میرا مطلب ہے تم نے گھر چھوڑ دیا۔ کیوں؟“

”جب محبت کسی دل میں بسیرا کرتی ہے تو پھر بہت سی انہونیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ سمجھ دار' دانا و ہوشیار انسان جب بے وقوف بنتا ہے تو اس محبت کے ہاتھوں جو خود بھی اندھی ہوتی ہے' اور محبت کرنے والے کو بھی اندھا کر دیتی ہے' وہ جانتے بوجھتے سامنے نظر آتے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میری طرح۔“ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے کہہ رہی تھی۔

”تو تم نے کسی کی محبت میں مبتلا ہو کر حویلی چھوڑ دی۔“ آمنہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا شہرینہ! تم تو بہت سمجھ دار' محبت کرنے والی۔“

”مت نام لو میرے سامنے اس موذی محبت کا۔ مجھے اس لفظ سے نفرت ہے۔ یہ دھوکا ہے' فریب ہے' سراب ہے' اس نے مجھے لوٹ لیا۔ مار ڈالا' جیتے جی منوں مٹی تلے اتار دیا۔ صرف میرا بدن ہی نہیں میری روح' میرا چین' میرا سکون سب کچھ دفن ہو گیا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں قید تنہائی کی طویل سزا جھیلنے کے باوجود مجھے سکون نہیں مل رہا۔ اس دھوکے باز محبت کا کفارہ ادا نہیں ہو پا رہا اور موت مجھ سے کوسوں دور کھڑی ہنستی ہے۔ میرا مذاق اڑاتی ہے۔ میں کہاں جاؤں' کہاں خود کو چھپالوں کہ ماضی کا یہ گناہ [illegible] ہو سکے۔“

وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ آمنہ کی سمجھ میں نہیں آیا [illegible] کمرے میں شہرینہ کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ آمنہ یونہی بے بسی سی ہو کر اسے روتا دیکھتی رہی۔

”تم کہاں سے آئی ہو؟“ ایک دم شہرینہ نے سر اٹھا کر اس سے پوچھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”میں۔۔۔“ آمنہ کچھ حیرانی سے بولی۔ ”میرے پیچھے بھی ایک کہانی ہے' کیا کرو گی سن کر؟“ وہ زخمی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولی۔

”تم احمد پور سے آئی ہو نا؟“ شہرینہ اس پر اپنی وحشت زدہ نظریں جما کر بولی۔

”احمد پور!“ آمنہ کو لگا اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ یہیں سے تو اس اذیت ناک سفر کا آغاز ہوا تھا جس کا اختتام اب بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے سر جھکا کر گویا شرمندگی سے اعتراف کیا تو شہرینہ کے وجود پر جیسے گہرے سناٹے چھا گئے۔ اس کی تلاش جیسے نڈھال ہو کر کہیں گر پڑی تھی۔ وہ سر جھکائے ہاتھ پیر چھوڑے پتھر کے بت کی مانند بیٹھ گئی۔ باہر کہیں گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو خاموشی کا یہ تکلیف دہ لمبا وقفہ ٹوٹا۔ آمنہ ایک جھرجھری سی لے کر چونکی۔ شہرینہ ابھی بھی ویسے ہی بیٹھی تھی۔

”شہرینہ! تم عبدالمبین کو کیسے ملیں' یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں؟“ آمنہ کے سوال پر شہرینہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”عبدالمبین سے تمہارا کیا تعلق ہے جو تم یہاں اس کے گھر میں ہو؟“ اب کے اس نے قدرے نرمی سے پوچھا تھا۔

”منکوحہ ہوں میں اس دھوکے باز فریبی کی جس نے میری پرسکون زندگی پر محبت کا شب خون مارا اور سب کچھ برباد کر دیا۔“ وہ ایک دم چیخ کر بولی۔

”محبت۔۔۔ تو تم نے عبدالمبین سے محبت کی تھی؟“ آمنہ کو دھچکا سا لگا۔

”ہاں' میں نے محبت کی تھی۔ اس نے دھوکا کیا۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ میرے گرد محبت کا جال بنا اور مجھے شکار کیا۔“ وہ دانت پیس کر نفرت سے بولی۔

”مگر کیوں' وہ ایسا کیوں کرنے لگا؟“ آمنہ کو عبدالمبین سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ کچھ اسے شہرینہ کی بات پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ کب اپنے حواسوں میں دکھائی دے رہی تھی۔

”تمہاری وجہ سے۔ صرف تمہاری وجہ سے اس نے میری زندگی برباد کر دی۔ جاؤ یہاں سے۔“ اس نے اتنا اچانک آمنہ کو دھکا دیا کہ وہ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود پیچھے الٹ گئی۔

”تم جھوٹے' پیچ' کم ذات لوگ' اس خبیث نے ثابت کر دیا اور تم اس کی بہن ہو' ہمدردی جتا کر پھر مجھے کسی کوٹھے پر بٹھانے کے لیے راضی کرنے آئی ہو' جاؤ۔ چلی جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہارا ابھی خون کر دوں گی۔“ [illegible] ایک دم سے اٹھی اور آمنہ پر دیوانہ وار جھپٹ پڑی۔ اس نے آمنہ کو دو تھپڑ مارتے ہوئے دروازے سے باہر [illegible] شروع کر دیا۔

”شہرینہ! شہرینہ! [illegible] میری بات سنو۔۔۔“ آمنہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو شہرینہ نے پوری قوت سے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر [illegible]

”دفع ہو جاؤ' چلی جاؤ' مجھے کچھ نہیں [illegible]۔۔۔ مجھے سکون سے مرنے دو' مرنے دو مجھے۔“

وہ اب آمنہ کو دھکے دیتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ آمنہ جیسے ہی دروازے کی چوکھٹ سے باہر ہوئی شہرینہ نے زور سے دروازہ بند کر کے اندر سے [illegible] لگا لیا۔

آمنہ [illegible] ہوئے گندھے اور [illegible] ہوئے رخسار پر ہاتھ رکھے بند دروازے کو کھڑی دیکھتی رہی۔

”[illegible]“ [illegible] سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”صرف تمہاری وجہ سے۔ صرف تمہاری وجہ سے اس نے میری زندگی برباد کر دی۔“ اس کے ذہن میں شہرینہ کا جملہ گونجا۔

☼ ☼ ☼

”رکو معاذ! ذرا میری بات سن کر جانا۔“ وہ ناشتے کے بعد ہسپتال جانے کے لیے ٹیبل سے اٹھنے لگا تھا جب رعنا حیات نے اسے روکا۔ وہ سامنے بیٹھے کفر حیات کو دیکھتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا۔

”جی ماما! کوئی خاص بات؟“ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بات خاص ہے تو تمہیں روکا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ تم نے اس پروفیشن کو کچھ زیادہ ہی سر پر سوار کر رکھا ہے۔ [illegible] تو تمہاری صحت خراب ہو جائے گی۔ رات کو بھی تم خاصے لیٹ آتے ہو۔“ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”آپ کو بتایا تو ہے ماما! شام کو میں پرویز داؤد کے کلینک میں ہوتا ہوں۔ ابھی آپ مجھے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر بھی نہیں جانے دے رہیں۔ تو یہاں فی الحال بہترین مہارت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ پروفیسر داؤد ہیں۔ وہ اپنی فیلڈ میں یکتا ہیں۔ ان کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنا بھی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ رہ گئی بات سر پر سوار کرنے کی تو ماما! میں نے آپ کو پہلے دن سے بتا دیا تھا کہ میں نے یہ پروفیشن کسی پیشے کے طور پر یا پارٹ ٹائم جاب کے لیے نہیں اپنایا تھا نہ ہی اس ڈگری کو سر پر محض تاج بنا کر سجانے کے لیے۔ میں نے اس فیلڈ میں ایک مشن' ایک مقصد کے لیے قدم۔۔۔“

”اوکے اوکے' کہ تم دکھی انسانیت کی خدمت کرو گے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم اپنے پروفیشن کے بارے میں کتنے پکے ہو اور کتنے کمٹڈ ہو کہ ذرا سی تنقید بھی تمہیں ناگوار گزرتی ہے مگر میری جان! اس ساری مصروفیت کے درمیان تمہاری اپنی ذات بھی تو معلق ہے۔ کبھی اس کا خیال آیا تمہیں؟“ وہ محبت سے معاذ کو تکتے ہوئے بولیں تو کفر حیات کے چہرے پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اس کے بارے میں مجھے خیال کرنے کی ضرورت نہیں' آپ جو ہیں۔"
معاذ نے پر اعتماد لہجے میں رعنا حیات کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔
"تھینک یو مائی سویٹ سن! اور اسی خیال کے لیے تو میں نے تمہیں روکا ہے۔"
"بھئی' تم ذرا بات مختصر کرو۔ ہم دونوں ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔ اور بیگم صاحبہ کا سسپنس طویل ہوتا جا رہا ہے۔" آپ کے فخر حیات نے کچھ جھنجھلا کر کہا تو معاذ بھی ان کی تائید میں سر ہلانے لگا۔
"بھئی میں چاہتی ہوں کہ اب معاذ شادی کر لے۔ میں نے ایک عرصہ اس کی جدائی میں تنہا تڑپتے ہوئے گزارا ہے۔ اور اس کے مل جانے کے بعد بھی صورت حال تقریباً ویسی ہی ہے کہ آپ دونوں صبح کے نکلے آدھی رات کو شکل دکھاتے ہیں اور میں صبح سے رات کرتی نڈھال ہو جاتی ہوں۔"
"ویسے بیگم صاحبہ! ہسپتال جانے کے بعد آپ کو گھر بھی کچھ زیادہ پیارا ہو گیا ہے۔ ساری باہر کی سرگرمیاں ترک کر کے گھر کی ہو بیٹھی ہیں۔ اس لیے تنگ تو پڑیں گی' ویسے آئیڈیا ہے زبردست' کیوں معاذ؟" فخر حیات نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو معاذ بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔
"تھینکس' یہ آپ کو میرا آئیڈیا تو پسند آیا۔ اب پوچھیں اس سے اگر کوئی اس کی پسند ہو تو جائے' ظاہر ہے ترجیح تو معاذ کی چوائس کو دی جائے گی۔"
"بالکل بالکل۔" فخر حیات نے فوراً کہا۔
"سوری ماما! اول تو میری کوئی پسند نہیں اور اگر کوئی پسند آئی تو سب سے پہلے آپ سے کہوں گا۔ اس وقت میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ او کے ماما' او کے پاپا' اللہ حافظ۔" کہتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔
"ماما تو لگتا ہے' دو چار دنوں میں ہی میرے سر پہ سہرا سجا دیں [illegible] ہیں۔ اور میری پسند کا یوں پوچھ رہی تھیں جیسے اب تک میں لڑکیاں پسند....."
دفعتاً اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔
حجاب سے جھانکتی دو سیاہ بھنورا سی آنکھیں' دراز قد' سانچے میں ڈھلا پرکشش سراپا اور کھنک دار سریلی آواز۔
"آمنہ!" چند لمحوں میں ہی اس کا دماغ یہ عقدہ حل کر چکا تھا۔ "میں بھی کیسا بھلکڑ ہوں کہ ایک بار بھی پلٹ کر صوفی صاحب کی خبر نہیں لی۔ حالانکہ اس وقت مجھے خود بہت اچھی طرح محسوس ہوا تھا کہ ان کا گھرانہ شدید کرائسس سے گزر رہا ہے۔ اور میں نے آخری بار وہاں سے لوٹتے وقت دل میں یہ ارادہ بھی کیا تھا کہ آتا جاتا رہوں گا۔ اور اپنی زندگی کی الجھنیں سلجھتے ہی میں ان کے مسائل تو کیا انہیں بھی بھول گیا۔ بہت برا کیا میں نے' بس آج ہی شیخوپورہ جاؤں گا۔ صوفی صاحب سے ملنے۔"
اور اس دن وہ لنچ کے فوراً بعد صوفی صاحب سے ملنے چل پڑا۔
"کیا پتا وہ یہاں سے جا چکے ہوں۔" گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس کے دل میں خیال گزرا۔
وہ گاڑی لاک کر کے نیچے اتر آیا۔
"جی صوفی صاحب؟" مسجد کے باہر ہی اسے ایک شخص مل گیا تھا۔ صوفی صاحب کے بارے میں پوچھنے پر کچھ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
"لگتا ہے آپ بہت عرصے بعد ادھر آئے ہیں۔" وہ اس کا اچھی طرح جائزہ لے کر بولا۔
"ہاں عرصہ تو واقعی طویل نہیں لگا۔ پہلے صوفی صاحب کی بڑی بیٹی کیا بھلا سا نام تھا اس کا....." وہ کنپٹی پر انگلی رکھ کر سوچنے لگا۔
"آمنہ!" معاذ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
"شاید... یہی ہو۔ اس نے خودکشی کر لی' قیاس یہی ہے۔"

"جی!" معاذ بھونچکا رہ گیا۔
"پھر تھوڑے ہی دنوں میں صوفی صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔"
"کیا... بیمار تو وہ تھیں مگر اتنی بھی نہیں کہ....." وہ بڑبڑایا۔
"بس جی موت تو پیچھے لگی ہے۔ صحت بیماری کب دیکھتی ہے۔ اس کے بعد تو جیسے صوفی صاحب بے چارے جیتے جی قبر میں اتر گئے۔ ایسا بیماری کی پکڑ میں آئے پھر خدا کے فضل سے بھلے چنگے بھی جلدی ہو گئے۔ بڑی موذی بیماری کو شکست دی تھی انہوں نے۔ پر موت کے آگے ہار گئے۔ قضا انہیں لے کر ہی ٹلی۔" وہ شخص دکھ بھرے لہجے میں بولا۔
"او مائی گاڈ۔" معاذ نے سر تھام لیا۔
"ہاں جی' سب ہی کو جس جس نے سنا' دیکھا بہت دکھ ہوا۔ بڑے بھلے مانس اچھے اور نیک انسان تھے۔ آج کل تو ایسے انسان بھی نایاب ہو چکے ہیں۔ سچ ہے اچھے لوگ اٹھتے جا رہے ہیں۔ قیامت ہم جیسے بروں پر ہی قائم ہو گی۔" وہ گہرے دکھ سے بولا۔
اور ان کی [illegible] بیٹیاں چھوٹی....." معاذ نے آہستگی سے پوچھا۔
"معلوم نہیں جی کدھر گئیں ویسے صوفی صاحب اس مسجد سے تو فارغ ہو چکے تھے۔ اس لیے انہیں گھر بھی خالی کرنا پڑا۔ شاید بھائیوں کے پاس چلی گئی ہوں۔ بیٹے بڑے بے وفا نکلے۔ صوفی صاحب کو بس یہی روگ قبل از وقت قبر میں لے گیا ورنہ تو....."
"اچھا جی شکریہ' آپ کا وقت لیا میں نے۔ خدا حافظ۔" معاذ نے جلدی سے اس سے مصافحہ کیا اور گاڑی کی طرف پلٹ آیا۔
"[illegible] جس صورت حال کہہ رہی تھی کہ کہیں میں نے دیر تو نہیں کر دی۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اس [illegible] صوفی صاحب کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔
"کاش میں تھوڑا پہلے آ جاتا' شاید ان سے آخری ملاقات ہو ہی جاتی۔"
"مگر آمنہ نے خودکشی..... ناممکن' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اسٹیئرنگ پر دھرے اس کے ہاتھوں کی گرفت مزید ڈھیلی پڑ گئی۔
"شاید اپنے بھائیوں کے پاس چلی گئی ہوں۔ عبدالمبین' ہاں وہ تو اسٹار سنگر بن چکا ہے۔ اس کا ایڈریس با آسانی مل سکتا ہے۔ آمنہ نہیں مر سکتی۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ ابھی تو میرے دل کی کلی نے اس کا نام لے کر مسکانا سیکھا ہے کہ اس [illegible] ہونے کی انسول خبر۔ ناممکن..... میں آج ہی عبدالمبین کو ٹریس آؤٹ کرتا ہوں۔"
اس خیال نے اس کے اندر توانائی سی بھر دی تھی۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

☼ ☼ ☼

"تو یہ وجہ تھی ہماری تقدیر میں آنے والی بے حساب گردشوں کی۔ میں اکثر ہی سوچتی کیوں ہمارے نیک اعمال' ہماری صدق دل سے مانگی دعائیں' ہماری فریادیں آہیں رد کی جا رہی ہیں کہ ہم تو کسی مظلوم کی آہوں کی زد میں تھے پھر ہماری دعائیں مقبول کیسے ہو سکتی تھیں۔ کیسے رب تعالیٰ ہماری فریادوں پر کان دھر سکتا تھا کہ ہم سے وابستہ ایک شخص نے کسی پر ظلم کی انتہا کر رکھی تھی۔ بہت بہت افسوس ہوا ہے مجھے عبدالمبین! بہت زیادہ' یہ تم ہو؟"
رات کے ڈھائی بجے عبدالمبین مقامی ہوٹل میں ہونے والے کنسرٹ سے فارغ ہو کر تھکا ہارا گھر لوٹا اپنے کمرے میں آ کر ابھی اس نے لیدر کی جیکٹ اتار کر پھینکی ہی تھی کہ آمنہ نے دھاڑ سے دروازہ کھولا اور اسے سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولنے لگی۔
"کیا مطلب' اب کیا ہو گیا ہے؟"
عبدالمبین پہلے تو اسے یوں آدھی رات کو اپنے سامنے دیکھ کر چونکا اور پھر قدرے بے زاری سے جھنک کر

جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں کچھ رت جگے سے اور کچھ پینے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے اٹھتے بو کے بھبکے اسے خود بھی محسوس ہو رہے تھے۔ اسی لیے اسے آمنہ کو سامنے دیکھ کر کوفت سی ہو رہی تھی کہ اگر آمنہ کو پتا چل گیا تو۔۔۔ وہ کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر اسے ٹھیک ٹھاک لتاڑ کر رکھ دے گی۔ مگر وہ تو پہلے ہی کوئی کیس تیار کیے سر پر کھڑی تھی۔

"تم نے شہرینہ کے ساتھ کیا ظلم کیا ہے؟" وہ بپھرے ہوئے انداز میں اس کے بالکل سامنے آکھڑی ہوئی اور شعلے برساتی نگاہیں اس پر جما کر بولی۔

"اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔"

عبدالمبین نے جرابیں اتار کر جوتوں میں رکھیں۔ اور جوتے صوفے کے نیچے دھکیل دیے۔ پھر ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلا کر آمنہ کو دیکھنے لگا جو اب بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس حد تک بھی گر سکتے ہو۔"

"بھئی تم اچھی طرح جی بھر کر سوچ لو کہ میں ایک بے حد گرا ہوا انسان ہوں، سو ہر حد سے آگے جا سکتا ہوں۔" عبدالمبین نے قدرے بے زاری سے اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑے۔

"اور اب خدا کے لیے مجھے دو گھڑی آرام کرنے دو۔ تھکن سے میرا برا حال ہے۔"

"کسی کی زندگی برباد کر کے، سکون تباہ کر کے تم سونا چاہتے ہو۔ اس مظلوم لڑکی کو یوں زنداں میں قید کر کے تمہیں پرسکون نیند آجاتی ہے؟ بولو۔" وہ زور سے چلائی۔

"بھئی میں نے اسے قید نہیں کر رکھا۔ جاؤ جا کر دیکھ لو اب بھی اس کے دروازے پر کوئی تالا نہیں ہے۔ وہ نیلم دل والی اپنی خوشی سے قیدی بنی بیٹھی ہیں۔ اور مظلومیت کا ڈھنڈورا ابھی پیٹ رہی ہیں۔"

"تم نے اس کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق ہے جو کسی کا سامنا کرے۔ کہاں جائے وہ؟" آمنہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔

"میں نے اسے اغوا نہیں کیا تھا۔ نہ وہ دودھ پیتی بچی ہے۔ اپنی خوشی اور مرضی سے آئی تھی میرے ساتھ۔ اور اب جاؤ یہاں سے۔"

عبدالمبین اٹھتے ہوئے آمنہ کو ذرا سا پرے دھکیل کر خاصی بے رخی سے بولا۔ اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ جسم بری طرح سے اینٹھنے لگا تھا۔

"کیسے چلی جاؤں، تمہیں بتانا پڑے گا سب کچھ مجھے۔" وہ اسے بازو سے کھینچ کر اپنی طرف گھماتے ہوئے سختی سے بولی۔

"بابا صاحب کی کاپی کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ اس کے تحت لہجے پر چڑ کر بولا۔ "آمنہ! اس وقت میرا دماغ مت خراب کرو۔ میں صبح تمہاری ساری بک بک سن لوں گا اور ہر فضول سوال کا جواب بھی پوری تفصیل سے دے دوں گا۔ اب خدا کے لیے جاؤ یہاں سے۔" وہ بیڈ پر گرتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولا۔

"کیسے چلی جاؤں، وہ اپنی اس حالت کی ذمہ دار سراسر مجھے ٹھہرا رہی ہے۔ کیوں۔۔۔؟ تم نے اسے دھوکا دیا، کیوں محبت کا جھوٹا خواب دکھا کر اسے اس قید تنہائی کی دوزخ میں ڈال دیا اور اس کے ان سارے ناقابل بیان دکھوں کا سبب بنی میں؟ کیسے بتاؤ مجھے، ابھی اسی وقت ورنہ میں رات بھر سو نہیں سکوں گی۔ بولو عبدالمبین۔"

وہ اس کے قریب آ کر اس کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے ترشی سے بولی تو عبدالمبین کہنی کے سہارے ذرا سا اٹھتے ہوئے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بولو جواب دو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا جو وہ میری وجہ سے دربدر ہوئی۔ میں تو خود تقدیر کی ٹھوکروں میں پڑی ہوں، پھر میں کسی اور پر ظلم کا باعث کیسے بن سکتی ہوں۔ بولتے کیوں نہیں تم، بہت اذیت سے گزر رہی ہوں میں۔ بتاؤ مجھے۔"

اس نے گم صم بیٹھے عبدالمبین کو زور سے ہلایا۔ وہ جیسے گہری نیند سے جاگا۔ ایک دم جھٹکے سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے تک کھینچتا ہوا لایا اور اسے دروازے سے باہر دھکیل دیا۔

"جس چیز کا علم انسان کو کسی گہرے دکھ سے آشنا کر دے۔ بہتر ہے اسے نا ہی جانا جائے۔ وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ بعد میں میرے دل سے اتر گئی۔ اس کا بھی نشہ اتر گیا۔ میں اس سے کہہ چکا ہوں وہ جانا چاہے تو بے شک چلی جائے۔ اب وہ اپنی مرضی سے ادھر بیٹھی ہے۔ اور اس سے زیادہ نہ مجھے علم ہے نہ مجھ سے کچھ پوچھنا۔ اب سو جاؤ جا کر۔ وہ اپنی ذلت بھری زندگی کا سبب خود ہے۔ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اب دوسروں کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہے۔ اب دوبارہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھنا، سونے دو مجھے بھی اب۔ شب بخیر۔" اس نے کہہ کر زور سے دروازہ بند کر لیا اور باہر کھڑی آمنہ پہلے غصے سے بند دروازے کو گھورتی رہی پھر بے بس ہو کر بے اختیار رونے لگی۔

اور اپنے بازو میں انجکشن لگا تا عبدالمبین صرف چند لمحوں کے لیے اس کی سسکیوں سے ڈسٹرب ہوا اس کے بعد اس کے اندر گہرا سکون اترتا چلا گیا۔ ساری کلفت، ساری پریشانی رفع ہو گئی۔ اس کا دماغ سرور کے انوکھے نشے میں ہلکورے لینے لگا۔ اس کا آدھا دھڑ بیڈ سے نیچے آڑا ترچھا لٹک رہا تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی غافل ہو چکا تھا۔

آمنہ نے ادھ کھلی کھڑکی سے اس کو یوں مدہوش سوئے ہوئے دیکھا۔ پاس پڑی خالی سرنج نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

"یا اللہ ابھی اور کتنے امتحان باقی ہیں۔ عبدالمبین! واپس آجاؤ۔ اب ہمارے پاس برباد کرنے کو کچھ بھی نہیں بچا، میرے بھائی! کل تو اس ذات کے کھڑے ہے۔ کچھ ہمارا ہی خیال کر لو۔ عبدالمبین! میرے بھائی۔"

☼ ☼ ☼

"یہ تمہاری امانت تمہارے پاس پہنچا رہا ہوں سے۔" شہباز خان نے ایک بڑا سا خاکی لفافہ نزہت کی طرف بڑھایا۔ وہ لفافے کو گھور کے بغیر سوالیہ نظروں سے دیکھنے گئی۔

"یہ تمہارے پنڈی والے گھر کے کاغذات ہیں جو سہیل نے تمہارے نام کر دیا تھا۔" وہ اس کے صبیح چہرے کو نظروں میں جذب کرتے ہوئے بولے۔

"سہیل بھائی نے۔۔۔ مگر وہ تو میری شکل دیکھنا نہیں چاہتے، پھر یہ گھر میرے نام۔۔۔ وہ خود کہاں ہیں؟ پنڈی میں؟ کیا ابھی بھی مجھ سے نہیں ملنا چاہتے، پھر یہ گھر۔۔۔" وہ لفافہ پکڑے بغیر ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

شہباز خان نے ایک گہری نظر اس کے دکھی چہرے پر ڈالی اور آگے بڑھ کر لفافہ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"وہ تم سے نہیں مل سکتے۔" وہ عجیب سے لہجے میں کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"اگر وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے تو پھر گھر میرے نام کرنے کا مطلب؟ میں نے کب ایسی کوئی خواہش کی تھی آپ بے شک یہ کاغذات انہیں لوٹا دیں۔" وہ آنسو پیتے ہوئے رخ پھیر کر بولی۔

"کہاں جا کر لوٹاؤں؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر قدرے بے بسی سے بولے۔

"جہاں وہ ہیں۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر انہیں مجھ سے ملنا پسند نہیں تو میں اس گھر کا کیا کروں گی۔"

"وہ جہاں ہے وہاں سے اگر کوئی چاہے تو بھی کسی سے ملنے نہیں آسکتا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"کیا مطلب؟ کہاں ہیں وہ۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ٹھٹکی۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں۔" شہباز خان نے کہتے ہوئے اس کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ زور سے چلائی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا۔ کبھی نہیں۔ اس وقت بھی نہیں جب انہوں نے مجھے دھکے دے کر سڑک کے بیچ کھڑا کر دیا تھا۔ تب بھی نہیں۔ پھر وہ کیسے۔۔۔" وہ ایک دم سے نیچے بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اس کی زندگی میں پہلے کون سے سکھ ہیں جو میں اک اور دکھ بھری کہانی کا اضافہ کروں۔"

وہ سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ بے اختیار ہی ان کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیں۔ ظالم انا کی ہر دیوار گرا کے۔ آخر کب تک یہ فاصلے ان دونوں کے درمیان تنے رہیں گے۔ وہ کیوں دریا کے اتنے قریب آ کر پیاسے ہیں۔

وہ تو اپنی گزشتہ غلطیوں پر شرمندہ تھے، محبت کی ایک نئی دنیا استوار کرنے آئے تھے۔ اور آج اتنے بے شمار دن گزر جانے کے باوجود وہیں کھڑے تھے، جہاں پہلے دن تھے۔

اب یہ جدائی بہت جاں لیوا لگ رہی تھی۔ رگ و پے کو کاٹتی ہوئی۔

"نزہت!" ان کے لب کپکپائے۔ وہ دھواں دھار روتے ہوئے ان کے تڑپتے دل کی پکار نہ سن پائی۔

باہر کھٹکا سا ہوا شہباز خان نے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

وہی نوجوان پولیس یونیفارم میں اسی بے تکلفی کے ساتھ گاڑی سے نکل کر اندر کی جانب آ رہا تھا۔

ان کا نرم پڑتا پگھلتا دل ایک دم سے جیسے کسی آہنی ٹکڑے میں ڈھل گیا۔

نزہت کا شبنمی حسن ہوا میں ہی کہیں تحلیل ہو کر رہ گیا انہوں نے ایک نظر نیچے بیٹھی نزہت پر ڈالی۔

"تم نے کیا سوچا ہے اپنے بارے میں۔ ارتضیٰ کے بارے میں؟" کوشش کے باوجود وہ لہجے کو زہریلا ہونے سے نہ روک سکے۔

نزہت نے روتے ہوئے ایک حیران سی نظر ان کے اس اجنبی روپ پر ڈالی۔

"میں کچھ سوچ بھی لوں تو آپ کون سی پروا کریں گے۔ آپ صرف من پسند فیصلے دوسروں پر مسلط کرنے کے عادی ہیں۔ سوچو کرنا چاہتے ہیں خود ہی کر ڈالیں۔ میں عادی ہو چکی ہوں۔ تقدیر کے تھپیڑے کھانے کی۔ ایکسکیوز می۔ آپ بیٹھیں، میں چائے بھجواتی ہوں۔" وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"اس طرح یہ گتھی کیسے سلجھے گی، میں نزہت کو منانے آتا ہوں اور دل میں ایک نئی گرہ ڈال کر چلا جاتا ہوں اور وہ بھی تو مسلسل اکڑے جا رہی ہے۔ میری خاطر نہ سہی ارتضیٰ کی خاطر کچھ جھکاؤ دکھائے تو شاید میرا ڈانواڈول ہوتا دل ٹھہر جائے۔ میں اکیلا ہی کب تک جھکتا رہوں گا۔ جب اسے ضرورت نہیں۔"

سوچتے سوچتے انہیں اچھا خاصا تاؤ آ گیا اور جب وہ گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو انہوں نے نزہت کو اسی نوجوان کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ ان کے اندر سلگتا الاؤ بھڑک اٹھا۔

☼ ☼ ☼

آمنہ نے کلام پاک پڑھنے کے بعد بند کیا اور اٹھ کر الماری میں رکھنے لگی۔

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور پورے گھر میں زندگی رنگوں اور روشنیوں کے ساتھ قہقہے لگاتی جاگ رہی تھی۔

آرکسٹرا کی تیز دھن سے سارے گھر کی زمین تھرتھرا رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گانے کی آواز کانوں کو پھاڑے دے رہی تھی۔

خدا جانے کون سی تقریب تھی۔ شہر بھر کی کریم بقول عبدالمبین کے یہاں جمع تھی۔ اس نے تو آمنہ اور جویریہ سے بھی بہت اصرار کیا تھا کہ وہ بھی آ جائیں۔ آمنہ نے تو خاصی رکھائی سے اسے انکار کر دیا تھا۔ البتہ جویریہ کا دل چاہ رہا تھا اور وہ آمنہ کے منع کرنے کے باوجود اٹھ کر فنکشن دیکھنے گئی تھی۔

جویریہ کم عمر تھی، پھر اتنی سی عمر میں اس نے اتنے بڑے بڑے غم دیکھ لیے تھے کہ اب ان چمکتے دمکتے رنگوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار سی ہو جاتی تھی۔ آمنہ اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی اور خود بھی جلد از جلد اسے لے کر اس ماحول سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر کوشش کے باوجود کئی جگہوں پر انٹرویو دینے اور بھاگ دوڑ کرنے کے باوجود اسے ابھی تک جاب نہیں مل سکی تھی۔

عبدالمبین اور شہرینہ والے معاملے کے بعد تو وہ اور بھی دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ وہ دو تین بار شہرینہ سے ملنے گئی تھی۔ مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔

"بس ہم کل ہی ادھر سے چلے جائیں گے۔ ہاسٹل تو میں دیکھ ہی آئی ہوں، دو چار ماہ کی رقم بھی ہمارے پاس ہے پھر اس دوران اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی جاب مل ہی جائے گی۔ جویریہ کا اب یہاں مزید رہنا ٹھیک نہیں۔" الماری بند کرتے ہوئے کھٹکے پر وہ سمجھی کہ جویریہ واپس آئی ہے۔

"جویریہ! بہت غلط کر رہی ہو تم، ابھی چھپ چھپ کر دیکھنے جاتی ہو پھر آہستہ آہستہ اس کی کشش تمہیں بھی۔۔۔" وہ تنبیہی انداز میں کہتے ہوئے مڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

بھاری تن و توش کا ایک دیو ہیکل شخص شراب کے نشے میں دھت دروازے کا پٹ تھامے بے خود نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی موٹی موٹی سیاہ انگلیوں میں زمرد و یاقوت لگی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں موٹی موٹی سونے کی زنجیریں۔

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ مولی یاروں کا یار اور ایسا گھنا نکلا۔ گھر میں کیسی خوش رنگ، نازک حسین تتلی چھپا رکھی ہے اور دوست کالی ڈال بے رنگ کلیوں کے پیچھے خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔ واہ مولی یار، اچھی یاری نبھائی چل اس حسین رات کے صدقے تیری یہ خطا بھی معاف۔ محفل عروج پر ہے اور مزہ ندارد، دل میں سوچوں کہ ماجرا کیا ہے۔ اب سمجھ آئی۔"

وہ جھومتا لڑکھڑاتا دروازہ بھیڑ کر آمنہ کی طرف بڑھا اس کی آنکھوں میں شیطانیت چمک رہی تھی۔

"کک۔۔۔ کون ہیں، نکلیں یہاں سے۔۔۔" وہ دوپٹہ منہ پر رکھ کر باہر کی طرف بھاگنے لگی۔ اس نے اپنا آہنی ہاتھ گھما کر راستے میں ہی اس کی کلائی دبوچ لی۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اس نے ایک جھٹکے سے آمنہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے منہ سے آتے بو کے بھبکے سے آمنہ کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ جو اسے نشے میں سمجھ رہی تھی اس میں تو بلا کی طاقت تھی۔ اسے لگا اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ پورا زور لگا کر اسے پرے دھکیلنے لگی تو وہ منہ اٹھا کے زور زور سے بے ہنگم قہقہے لگانے لگا۔

باہر کانوں کو پھاڑ دینے والا آرکسٹرا کا شور تھا۔

آمنہ کھڑکی کی طرف بڑھنے کے لیے زور لگانے لگی۔

"میری جان، یہ تو حسن والوں کی ادائیں ہیں۔ یہ ناز یہ نخرے حضور سر آنکھوں پر، اک ذرا پاس تو آنے دیجیے۔ ساری اداؤں کی قیمت ادا کریں گے۔" وہ مخمور لہجے میں کہتے ہوئے آمنہ کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا گیا۔

"عبدالمبین! عبدالمبین!" وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

باہر آرکسٹرا کا شور تھا، اندر اس دیو کے قہقہے۔ آمنہ کی چیخیں اس شور میں ہی کہیں گم ہو کر رہ گئیں۔

اسی وقت ایک دم سے لائٹ چلی گئی، ہر جانب گھور اندھیرا چھا گیا۔

"عبدالمبین۔۔۔ عبدالمبین۔۔۔" اس دیو نے اپنا آہنی ہاتھ اس کے منہ پر زور سے جما دیا۔

آمنہ کی سانسیں رکنے لگیں۔ آنکھیں حلقوں سے باہر کو ابلنے لگیں۔

آرکسٹرا خاموش ہو چکا تھا۔

خود کو چھڑانے کے لیے وہ پورا زور لگانے لگی مگر کسی بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ وہ پوری طرح سے شیطانی حصار میں جکڑی جا چکی تھی۔

• • • • • • •

اس کریہہ دیو کا آہنی ہاتھ آمنہ کے منہ پر اتنی سختی سے جما ہوا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا اور آنکھیں باہر کو ابلنے لگیں۔

پوری طاقت سے مزاحمت کرتے ہوئے بھی آمنہ کا جسم محض پھڑپھڑا ہی سکا تھا اور نشے میں ہونے کے باوجود اس دیو کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔

اسی وقت باہر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجنے لگی اور ساتھ ہی چیخ و پکار بھی۔ اندھیرا تو پہلے ہی ہر طرف چھا چکا تھا۔ نامعلوم کیا ہو رہا تھا۔

زمین کو تھرتھرا دینے والا آرکسٹرا تو کب کا خاموش ہو چکا تھا مگر اب دوسرا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ شاید باہر لڑائی ہو رہی تھی۔

"کیا ہم سب کا انجام ایسا ہی عبرتناک ہوگا؟" ڈوبتی نبضوں کے درمیان آخری تکلیف دہ سوچ آمنہ کے دھیان کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگی۔

"پہلے زینب پھر اماں جی، اس کے بعد بابا صاب اور اب میں۔ عبدالمبین اور جویریہ۔ جویریہ کہاں ہے؟"

یہ آخری سوال اتنا پریشان کن تھا کہ اس نیم جان جسم میں جیسے کوئی برقی رو دوڑ گئی تھی۔

جویریہ فنکشن دیکھنے کے شوق میں چپکے سے باہر گئی تھی۔ عبدالمبین کے ہلچل مچا دینے والے گانے سننے، آمنہ کے منع کرنے کے باوجود۔ "وہ کہاں ہوگی؟"

آمنہ نے ایک آخری بھرپور کوشش کے طور پر اپنی دونوں ٹانگیں زور سے اوپر کو اچھالیں اور کھڑکی کے پاس رکھا لکڑی کا اسٹینڈ لہراتا ہوا اس کے جسم کے ساتھ آ لگا۔

ایک لمحے کو اس درندے کی گرفت آمنہ کی کمر کے گرد کمزور پڑی تھی۔ اس نے خود کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور لڑکھڑاتی ہوئی کھڑکی کے چوکھٹے سے جا ٹکرائی۔

وہ وحشیوں کی طرح اندھیرے میں اس کی طرف جھپٹا۔

آمنہ نے وہی اسٹینڈ اٹھا کر پوری قوت سے اسے دے مارا تھا۔ ایک مکروہ چیخ اس کے حلق سے نکلی۔

پھر اس نے وہی بھاری اسٹینڈ اٹھا کر پے در پے زمین پر تڑپتے اس [illegible] بچاؤ کرتا ہوا ادھر ادھر لڑھک رہا تھا۔

باہر فائرنگ اور چیخ و پکار میں تیزی آ چکی تھی۔

آمنہ نے ایک آخری زوردار ضرب اس کراہتے ہیولے کو لگائی اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ اس وقت وہ لان کی طرف سے باہر جانے والے دروازے تک بھی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ پچھلے حصے کی طرف اندھادھند بھاگ رہی تھی۔ راستے میں پڑی اینٹ سے وہ الجھ کر بری طرح سے گری تھی۔ شاید اس کے پیر کے انگوٹھے کا ناخن اکھڑ گیا تھا۔ اس کی کہنیاں بھی چھل گئی تھیں اور تھوڑی پر بھی شدید چوٹ لگی تھی کوئی اس کے پیچھے زور سے چیخا تھا اس نے اٹھتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

وہی وحشی خون سے تر چہرہ اور لباس لیے اس کے پیچھے چیختا ہوا آ رہا تھا محض چند قدموں کے فاصلے پر۔

آمنہ کے منہ سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔

وہ کانٹوں بھری باڑ میں الجھی تھی۔

اس کا سارا جسم جگہ جگہ سے چھد گیا تھا اور کاٹن کا سوٹ پتا نہیں کہاں کہاں اٹک کر چیتھڑوں میں بدل گیا تھا مگر اس وقت اسے کوئی زخم کوئی خراش تکلیف نہیں دے رہی تھی۔

دوسری طرف کوٹھی کی اگلی جانب سے پولیس گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

آمنہ کے جسم میں جیسے کسی نے بجلی بھر دی تھی۔

بھاگتے بھاگتے اس کا سانس پھول گیا، سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ ایک پل کو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا تھا، اسے سامنے کچھ دکھائی نہیں دیا اور چشم زدن میں وہ گویا اڑتی ہوئی کسی گاڑی کے بونٹ پر جا گری تھی۔

ہنگامہ کس طرح شروع ہوا یہ تو عبدالمبین کو بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔ مگر جب اس کا نشہ کچھ ہرن ہوا تو تھوڑی دیر پہلے والا خوشگوار پُرلطف کیف و رنگ کا منظر ایک وحشت ناک ابتری میں بدل چکا تھا۔

اردگرد میں افراتفری جاری تھی۔ کون کس پر گولیاں برسا رہا تھا سر جھٹک جھٹک کر دیکھا مگر پتا نہیں چل رہا تھا۔

"بھاگو مومی لینڈ مافیا کے گروپ والوں نے حملہ کر دیا ہے زندگی چاہتے ہو تو بھاگ نکلو۔" پتا نہیں کون تھا جس نے اندھیرے میں اسے زور سے کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"آمنہ، جویریہ اندر ہیں۔" باہر کی طرف دوڑتے ہوئے اس کے قدم بے اختیار تھم گئے۔

وہ دوسری جانب سے گھوم کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا جو کچن سے اندر جاتا تھا۔

"آمنہ! جویریہ! آمنہ۔۔۔۔" وہ کمروں میں چلاتا پھر رہا تھا۔

"کہاں گئیں دونوں؟" وہ دیوانوں کی طرح اندھیرے میں چکرا رہا تھا۔ بار بار گھومتے ہوئے سر کو تھام کر زور سے جھٹکتا۔

"میں تو بڑے مان سے انہیں تحفظ دینے کو لایا تھا یہ کہہ کر کہ میں نے اپنی پاک باز بہنوں کی حفاظت۔" یہ چیختا چلاتا اندھیرا اس پر برسنے لگا۔

"اسی لیے [illegible] میں ان دونوں کے ساتھ تم جیسے مردود کے گھر نہیں آنا چاہتا تھا مجھے پتا تھا تمہارا اسہارا دنیا کے بودے ترین سہاروں میں سے ایک ہے۔ ارے تم تو اپنی حفاظت نہیں کر سکے تو ان دونوں کی کیسے کرتے لعنت ہو تم پر عبدالمبین۔"

اسے لگا صوفی صاحب اندھیرے میں کھڑے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے کوس رہے ہیں۔

وہ ایک کمرے سے بھاگ کر دوسرے میں آیا۔

صوفی صاحب کا ہیولہ ادھر بھی موجود تھا۔ وہ ادھر سے بھاگا۔

آوازیں [illegible]

شہرینہ [illegible] ایک بجلی کی لہر اس کے دماغ میں کوندی وہ پاگلوں کی طرح سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

شہرینہ سیڑھیوں کے پاس ہی متوحش سی کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"تم۔۔۔ کیا ہوا ہے ادھر؟" اس نے دوڑ کر عبدالمبین کا بازو پکڑا۔

"نکلو یہاں سے نکل چلو زیادہ دیر ہوگئی تو کچھ نہیں بچے گا۔ بھاگو۔" عبدالمبین اسے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے لے آیا۔

دونوں بھاگتے ہوئے پچھلی دیوار پھاند کر اس کانٹوں بھری باڑ میں گرے تھے۔

"اف میں مر گئی۔۔۔ سی سی۔۔۔" شہرینہ کے منہ سے بے اختیار ربا ربا چیخیں نکلی تھیں۔ زندگی پھولوں کی سیج پر گزارنے والی شہرینہ کو اس لمحے پتا چلا زندگی کے کانٹے کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

"بھاگو اگر عزت و جان سلامت چاہیے جلدی۔" عبدالمبین اسے سنبھالتے ہوئے خود منہ کے بل گرا تھا اس کے ماتھے سے بے اختیار خون بہنے لگا۔ وہ شہرینہ کو گھسیٹتے ہوئے سڑک پر لے آیا۔

سڑک رات کے اس پہر بالکل ویران تھی۔ کچھ علاقہ بھی شہر سے ذرا ہٹ کے تھا۔ دائیں ہاتھ پر چند ایک خالی پلاٹ تھے جن پر جنگلی گھاس پھوس اور درخت اگے ہوئے تھے۔ وہ دونوں وہیں آ کر رکے۔

"تمہارے ماتھے سے خون نکل رہا ہے۔" فگار جسم سے اٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے شہرینہ نے عبدالمبین کی جانب دیکھا۔

"مجھے چھوڑو سنو۔" عبدالمبین نے اس کا ماتھے کی جانب بڑھتا ہاتھ جھٹکا۔

"میں جا رہا ہوں تم آج سے اس لمحے سے میری طرف سے آزاد ہو جہاں جی چاہے چلی جاؤ اور اب دیر نہ کرو جاؤ۔" عبدالمبین نے سر کے زخم سے اٹھتی ٹیس کو دباتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

"کہاں۔۔۔؟ کہاں جاؤں اب میں۔" چند لمحوں کے وحشت ناک سکوت کے بعد شہرینہ اپنی کٹورا سی آنکھوں میں آنسو بھر کر حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کہیں۔۔۔ کہیں بھی چلی جاؤ مگر اس وقت اس علاقے سے نکل جاؤ اور کہیں۔" وہ جھنجلا کر بولا اور خود ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بائیں طرف مڑنے لگا۔ پولیس گاڑیوں کے بجتے سائرن' ساری طرف گونج رہے تھے۔

"تمہیں چھوڑ کر اب میں کہیں بھی نہیں جا سکتی اگر جانا ہی ہوتا تو بہت پہلے نہ چلی گئی ہوتی۔" شہرینہ اس کی آستین تھام کر رقت بھرے لہجے میں بولی تو عبدالمبین نے پہلی بار کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھو یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ہے' میرا ساتھ تمہیں سوائے کسی اذیت ناک یا بے حد ذلت آمیز موت کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتا۔

میں ابھی شاید اگلے ہی کسی موڑ پر کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا' میرا ساتھ تمہیں ایک تکلیف دہ رفاقت کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتا' تم پہلے ہی اپنے ساتھ بہت ظلم کر چکی ہو۔ میرا مشورہ ہے اب خود پر رحم کھاؤ اور جاؤ یہاں سے۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "کچھ نہیں دے گا میرا ساتھ تمہیں کچھ نہیں۔" اس کا سر چکرانے لگا تھا وہ [illegible] میں بڑبڑایا۔

"چند قدموں کی ہمراہی بھی نہیں۔" شہرینہ نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہونہہ چند قدم' اتنے برس ساتھ رہ کر بھی تمہیں مجھ سے کوئی امید باقی ہے۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔

"تم سے نہیں' محبت سے۔ اس محبت سے۔ جو میں نے تم سے کی ہے۔" وہ اس کی خون کے آلودہ پیشانی کو تشویش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ محبت نہیں تھی۔ سراسر تمہاری حماقت تھی اور میرا انتقام تھا۔ سو آج میرا انتقام پورا ہوا' سید سلطان بخت کی بہن یوں آدھی رات اس بے سروسامانی کے عالم میں تنہا سڑک پر کھڑی ہے۔ اس سے بڑھ کر میں نے نہیں سوچا تھا جاؤ اب۔" وہ کہہ کر مڑنے لگا۔

"تم نے اس سے آگے نہیں سوچا تھا مگر میں نے سوچا تھا بہت۔" وہ اس کے آگے [illegible]۔

"عبدالمبین خدا کی خدائی کی کوئی حد ہوگی مگر محبت کی کوئی حد نہیں' مجھ میں اس سے بچ کر کہاں بھاگوں میں تو وہ بلبل ہوں جسے قفس میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اور صیاد سے محبت۔ اب صرف موت ہی میرے دل سے تمہاری محبت کو نکال سکتی ہے میں پہلے کیا تھی کون تھی؟ برسوں ہوئے میں بھول چکی ہوں۔ اب تو زمانے ہوئے تمہارے ہی نام کے سائے تلے بیٹھی ہوں' اس سائے سے باہر ہر سو تپتی دھوپ ہے۔ جلتا ریگستان اور ننگے پاؤں' میرے سر پر اپنی نام نہاد ہی سہی اس جھوٹی محبت کی اوڑھنی رہنے دو عبدالمبین' میرا سر اپنے نام کی اوڑھنی سے ڈھکا رہنے دو میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔ سوائے تمہارے ساتھ کے۔

بہت سوچا تھا میں نے' بہت کوشش کی تھی اس قفس سے نکل جاؤں' بھاگ جاؤں تم سے نفرت کرنے کی کوشش بھی کی مگر تمہاری قید تمہاری جھوٹی محبت میری روح کو ایسی بھائی کہ اسے کسی اور جہان کی طلب نہیں رہی ہر خواہش ہر تمنا کی حد تم پر آ کر ختم ہو گئی ہے۔ عبدالمبین مجھے اپنے شہر محبت سے جلا وطن نہ کرو' میں تمہیں چھوڑ کر اب کہیں بھی نہیں جا سکتی اور تم کیسے مرد ہو عورت کی اس بے بس محبت کو سمجھتے ہی نہیں جس پر اس کا اپنا بھی اختیار نہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی تم جہاں بھی جانا چاہ رہے ہو مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ عبدالمبین میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے یوں دھتکار کر اور میری نظروں میں نہ گراؤ مجھے' اپنا بنا لو مجھے۔ اپنا بنا لو۔" وہ کہتے کہتے وہیں نیچے بیٹھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے رونے لگی اور عبدالمبین سیاہ رات کے مہیب اندھیروں میں جلتی اس شمع محبت کو بے اختیار ایک ٹک تکے جا رہا تھا جو اس کے پہلو میں قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی اور وہ دنیا بھر میں ذرا سی روشنی کی تلاش میں دیوانہ وار بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اسے لگا کہ آج اس کی تلاش کا سفر تمام ہو گیا ہے۔

اس کی تمام نادانیوں اور گناہوں کے باوجود قدرت نے اس کی زندگی کو کیسی جگمگاتی روشنیوں سے بھر دیا تھا۔

"اٹھو!" اس کا دل اس وقت شہرینہ کی محبت میں مضطرب ہوا جا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا اسے اٹھا کر اپنے سینے کے اندر اپنے دل کے اس گوشے میں محفوظ کر لے جہاں سچ مچ شہرینہ کی محبت بستی ہے وہ گوشہ جسے اس نے نظر انداز کرنے اور جھٹلانے کی سعی کی تھی۔

"چلو چلیں' تم تو پاگل ہو مجھ جیسے گھٹیا انسان سے محبت کر رہی ہو' سچ کہا ہے کسی نے عورت واقعی بے وقوف ہوتی ہے جو اسے تباہ و برباد کرتا ہے یہ اس کی پوجا کرتی ہے۔" وہ جھک کر اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے بے حد رسیلے لہجے میں بولا اس کی نگاہیں اس گھڑی کیا کہہ رہی تھیں شہرینہ زیادہ دیر ان گہری گہری آنکھوں میں دیکھ نہ سکی۔

"اور میں جو خود کو رشتوں کے معاملے میں دنیا کا بدنصیب ترین انسان مان چکا تھا اس پر اللہ کا یہ خاص انعام' شہرینہ! تم ایک بار پھر سوچ لو اس تاریک رات کی تاریکی سے خوفزدہ ہو کر یہ فیصلہ کر رہی ہو تو چلو تم جہاں کہو میں تمہیں وہیں چھوڑ دیتا ہوں مگر میرا ساتھ تمہیں سوائے تباہی کے کچھ نہیں دے سکتا تم اچھی طرح سوچ لو۔" وہ ایک بار پھر اس سے کہہ رہا تھا۔

"عبدالمبین! میرے کاسۂ طلب میں صرف محبت کا سکہ چاہیے۔ نقصان جمع تفریق' آبادی' بربادی کچھ بھی نہیں سوائے محبت کے یہی میری طلب ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجب پیاسے لہجے میں بولی۔

"تو چلو پھر ایک بار اس سکہ محبت کی طاقت کو آزماتے ہیں' اس سیاہ رات سے پرے جو روشن دن طلوع ہو رہا ہے اس کے تلخ حقائق اس سکے کی کیا قیمت لگاتے ہیں میں تم سے ان ساعتوں میں ایک بار پھر پوچھوں گا۔" عبدالمبین نے شہرینہ کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبایا' چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔

* * *

"اے کون ہو تم؟" جامن کے گھنے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے وہ سیاہ لباس میں بالکل کسی گٹھری کی طرح دونوں گھٹنوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اس پولیس آفیسر کی یونہی اس اندھیرے کونے کی طرف نگاہ بھٹکی تو اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اس نے سرچ لائٹ کی تیز روشنی اس پر ڈالی تو اسے ایک لڑکی دکھائی دی۔

"کون ہو تم بولو؟" پہلی بار کے پکارنے پر بھی اس نے سر نہ اٹھایا تو آفیسر نے آگے بڑھ کر درشتی سے پوچھا۔ لڑکی کا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ یہ آفیسر کو اس کے قریب جانے پر پتا چلا۔ جیسا ہنگامہ ابھی تھوڑی دیر پیشتر برپا تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کے دوران ہلاک و زخمی ہونے والوں کو دیکھ کر یوں خوفزدہ ہونا لازمی تھا۔ شاید یہ لڑکی ڈر کر اسی ہنگامے کے دوران ادھر آ چھپی تھی۔ آفیسر نے اس کے خوف کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

ارد گرد پولیس فورس کے جوان دوڑتے پھر رہے تھے۔ زخمیوں کو جلدی جلدی اٹھا کر گاڑیوں میں ڈال کر ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ واپڈا کا عملہ پہنچ چکا تھا۔ اور فوری طور پر بجلی کی تاروں کی مرمت کر رہا تھا ایسے میں کسی کا بھی دھیان اس آفیسر کی طرف نہیں تھا۔

"لڑکی! میں تم سے پوچھ رہا ہوں کون ہو تم' اور ادھر چھپی کیا کر رہی ہو؟" اس بار اس کے لہجے میں پولیس کا روایتی دبدبہ اور مشکوک انداز نمایاں تھا۔ جویریہ نے اپنے لرزتے وجود کو سنبھال کر بدقت سر اٹھا کر آفیسر کی طرف دیکھا جو اب قدرے جھکا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تیز روشنی جویریہ کے چہرے پر پڑی تو آفیسر کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھری تھیں وہ اب الجھن بھری نظروں سے جویریہ کو دیکھ رہا تھا۔

"تم۔۔۔ تم جویریہ ہو۔۔۔ جویریہ ہو نا تم۔" بے یقینی سے کانپتی ہوئی مدھم آواز میں پوچھتے ہوئے اس نے بے اختیار جویریہ کا کندھا ہلا دیا تھا۔ جویریہ نے اپنے جسم کے گرد لپٹی سیاہ چادر کا کونا اور بھی مضبوطی سے مٹھی میں بھینچ لیا۔

"بولو... تم جویریہ ہو نا!" وہ ایکدم اس کے پاس دوزانو بیٹھ گیا تو اس کے یوں یک ٹک دیکھنے پر جویریہ کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ اسے یوں لگا اس نے نہیں پہ یہ چہرہ بہت قریب سے دیکھ رکھا ہے یا یہ چہرہ اس کے تخیل کو اتنا ازبر ہے کہ اسے اپنے دھیان کو ٹٹولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کے سرخ دہکتے ہوئے ہونٹ محض پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ بھیگتی آنکھیں زور و شور سے برسنے لگیں۔

"او میرے خدا! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے یہاں اس جگہ ملاقات ہوگی وہ بھی ایسی حالت میں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔

"تم یہاں کیسے؟" جویریہ کی سسکیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔

"یہ کھرے..." اس کے ماتھے پر الجھن بھری شکنیں تھیں اسی وقت ارد گرد بھاگتے دوڑتے قدموں میں تیزی آئی، شاید کوئی اعلا افسر آیا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ، اٹھو جلدی کرو، اس سے پہلے کہ تمہیں بھی شامل تفتیش کرلیا جائے ابھی تمہیں کسی نے نہیں دیکھا۔" تیزی سے کہتے ہوئے اس نے سرچ لائٹ بند کردی۔ اور جویریہ کا ٹھنڈا برف ہاتھ اپنے گرم مضبوط ہاتھ میں جکڑتے ہوئے اسے کھینچنے لگا۔

"کہاں... کہاں جاؤں گی میں۔" وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

"آؤ میرے ساتھ سوال نہیں کرو۔" وہ اسے کھینچتے ہوئے باہر کھڑی ایک گاڑی کے قریب لے آیا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے یونیفارم میں ملبوس نوجوان سے اس نے کچھ کہا تو وہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر باہر نکل آیا اس نے برق رفتاری سے جویریہ کو دوسری نشست پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بے حد تیزی سے گاڑی وہاں سے نکال لے گیا۔

معاذ نے کسی کو تیزی سے بھاگ کر گاڑی کے آگے آتے دیکھا۔ اس نے بریک لگایا لیکن وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹکرا کر نیچے گر چکا تھا، معاذ گاڑی بند کرکے تیزی سے باہر نکلا تو گرے ہوئے شخص کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

وہ ایک لڑکی تھی اور وہ بھی بے حد خستہ حال میں۔

اس کا جسم سر پر لگنے والی چوٹ کے علاوہ جگہ جگہ سے زخمی تھا اور اس کا لباس بھی سالم نہیں تھا۔

"پتا نہیں زندہ بھی ہے کہ گزر چکی۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے لڑکی کو پہلو کے بل سیدھا کیا۔

وہ چہرہ جو کئی دنوں سے اس کے شعور اور لاشعور کی چوکھٹ کے بیچ بڑے طمطراق سے براجمان تھا اتنی بری حالت میں یوں سر راہ اس کے سامنے تھا۔ معاذ کا دل یکبارگی تو زور سے دھڑکا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار اس کے دل اور کلائی کی دھڑکنوں کو ٹٹولنے لگے۔ دوسرے پل وہ اسے سرعت سے اٹھا کر گاڑی میں ڈال چکا تھا۔

"چوٹیں زیادہ گہری نہیں، تحسین ہمریہ اس وقت اس حال میں..." اس کا ذہن رش ڈرائیونگ کے دوران بھی الجھ رہا تھا آمنہ کے جسم پر تو کوئی کپڑا بھی پورا نہیں تھا۔ حتی کہ دوپٹہ بھی نہیں اور اس حال میں وہ اسے کہاں لے جائے۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

فخر حیات اور رعنا حیات آج شام ہی کو لندن گئے تھے۔ جہاں فخر حیات کا مکمل میڈیکل چیک اپ ہونا تھا۔ اور ان دونوں کی واپسی ڈیڑھ ہفتے بعد تھی یوں اس حال میں وہ اسے گھر بھی نہیں لے جاسکتا تھا۔

اس کی گاڑی آپوں آپ جانے پہچانے رستوں پر مڑنے لگی۔

☆ ☆ ☆

ارتضی کو بہت تیز بخار تھا، ڈاکٹر کو چیک کرانے اور دوا دینے کے باوجود آدھی رات تک اس کا بخار کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دوبار معاذ کو بھی کال کرچکے تھے، جو ہسپتال میں موجود نہیں تھا، ڈاکٹر داؤد کے ساتھ شہر سے باہر کہیں گیا ہوا تھا۔

"پتا نہیں اس بچے کو کیا ہو گیا ہے، آئے دن اسے بخار چڑھا رہتا ہے۔ صحت دیکھو اس کی، کتنی خراب ہو چکی ہے۔ اللہ جانے اتنی سی جان کو کیا غم لگ گیا ہے۔" زیتون بانو ارتضی کو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کر رہی تھیں اور مسز خان فکر مند لہجے میں اسے دیکھتے ہوئے شہباز خان سے کہہ رہی تھیں۔

"ام جان بچہ ہے، اور بچے بیمار ہوتے ہی رہتے ہیں، اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"شہباز خان مجھے بچوں کے بارے میں یوں نہ پڑھاؤ میں نے بھی تین بچے پالے ہیں اور آگے سے ان کے بچے بھی کوئی بھی بچہ یونہی بیمار نہیں ہوتا، تم نے خود کو کاروباری مصروفیات میں گم کرلیا ہے، اور میں صحت کی وجہ سے اس بچے کو ٹائم نہیں دے پاتی، سارا دن اسکول سے آنے کے بعد بولایا بولایا پھرتا ہے، آخر یہ سب کب تک چلے گا۔" وہ ایکدم غصے میں آکر بولیں۔

"کیا مطلب؟ کیا اب بچے..." وہ کچھ حیران ہو کر بولے۔

"شہباز خان اس بچے کو مکمل توجہ کی ضرورت ہے تم کیوں نہیں سمجھتے۔" وہ ان کی حیرت پر جھلا کر بولیں۔

"ام جان کوشش تو کرتا ہوں شام کو جلدی آکر اسے ٹائم دوں۔ اب یہ بھی آپ کی خواہش تھی کہ میں بزنس کو توجہ دوں، محض کرائے پر انحصار کرکے نہ بیٹھ جاؤں، اب نئے کاروبار کو جمانے کے لیے ٹائم اور توجہ کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے آپ کو معلوم ہے۔"

"شہباز خان تم تم بزنس کرو مگر اس بچے کا بھی سوچو۔"

"کیا سوچوں۔" وہ اب کے جھنجلا کر بولے۔

"تم دوسری شادی کرلو۔" وہ نخوت سے میں بولیں تو ایک پل کو شہباز خان کچھ بول ہی نہ سکے۔ نزہت چھم سے ان کے سامنے آکھڑی ہوئی وہ کچھ عجیب نظروں سے مسز خان کو دیکھنے لگے "کیا ام جان نزہت کے زندہ ہونے کی خبر سنا رہی ہیں۔" انہوں نے ان کے وجود کو دیکھ کر جانچ کرنا چاہا تھا تو جواب نفی میں ملا "ابھی نہیں۔"

"پہلے کون سے سکھ دے دیے جو دوسری کرلوں۔" وہ بڑبڑائے۔

"ام جان دوسری بیوی سوتیلی ماں ہوتی ہے آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں۔" وہ تلخی سے بولے۔

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں زمانے میں اچھی لڑکیوں..."

"پلیز ام جان پھر کبھی بات کریں گے میں ارتضی کو سلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس نے دوا لی ہوئی ہے اسے اب سو جانا چاہیے۔" انہوں نے آگے بڑھ کر خالی خالی نظروں سے تکتے ارتضی کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

ارتضی ان کے کمرے میں آکر آدھے گھنٹے میں سو گیا تھا مگر ان کی نیند جیسے کوسوں دور چلی گئی تھی۔

"نزہت کے ہوتے دوسری شادی... دوسری بیوی، دوسری محبت کا خیال ہی اس قدر مضحکہ خیز چونکا دینے والا تھا کہ انہیں لگا کہ وہ اس خیال کو سوچتے رہے تو شاید زندگی بھر آنکھ نہیں جھپک سکیں گے۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔" ٹہلتے ٹہلتے انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر وہ یاں کیوں نہیں کرلیتے کیوں بے چینیاں یہ اضطراب پال رکھا ہے۔" ان کے اندر کوئی چلایا۔

"میرا اگر بڑا اپنی جگہ وہ ماں ہو کر نہیں سوچ سکتی، ارتضی کی خاطر اپنی انا کو لات نہیں مار سکتی، بچے کی جدائی اس کی بیماری دنیا کی کسی بھی ماں کو بے چین و بے قرار کرنے کے لیے کافی ہے تو یہ کیسی ماں ہے۔" انہوں نے سارا بوجھ نزہت کی انا پر ڈال کر خود کو خاصا ہلکا محسوس کیا۔

"ماں بننے سے پہلے وہ ایک بیوی بنی تھی تم اسے بیوی کا مقام، رتبہ، مان کچھ بھی نہ دے سکے تو ایک ماں کی قدر کیا کروگے۔" "پتا نہیں اندر کا انسان اتنا ظالم ناقد کیوں ہوتا ہے کچھ بھی چھپا رہنے نہیں دیتا۔" انہیں اور غصہ آیا۔

"ٹھیک ہے میں کل آخری بار جاؤں گا اور اسے ساتھ آنے کو کہوں گا اگر وہ نہ مانی تو بس..." انہوں نے رک کر فیصلہ کیا۔

"ہاں اگر وہ نہ مانی تو دونوں کے راستے الگ۔ تم اسے آزاد کردینا اور کسی دوسرے راستے کے بارے میں ارتضی

کی خاطر ہی سوچنا شروع کرو۔" اندر کوئی بڑے آرام سے بولا وہ اس آخری مشورے پر پھر ڈگمگا گئے۔

"شہباز خان تم نزہت کو چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ چاہو بھی تو نہیں، تم آج بھی اس سے اسی طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہو جیسے شادی سے پہلے کرتے تھے، تم اس سچ کو مانو چاہے نہ مانو۔" وہ ظالم پھر ہنسا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

ان ہی بے چین سوچوں میں رات قطرہ قطرہ بیت رہی تھی۔

نہ جانے کون سے پہر انہیں ہلکی سی اونگھ آگئی جب ڈور بیل بہت بے تابی سے چیخی تھی ام جان کی نیند نہ ٹوٹ جائے کی خیال کرکے وہ سیپر پہن کر تیزی سے باہر آگئے تھے۔

"معاذ تم۔" وہ رات کے اس پہر معاذ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"شہباز بھائی زیتون بانو تو سو چکی ہوں گی۔" وہ ان کے سوال کو نظر انداز کرکے بولا۔

"ہاں کیوں خیریت تو ہے نا!"

"اچھا میں گاڑی اندر لا رہا ہوں، آپ گیٹ کھولیں۔" وہ انہیں جواب دیے بغیر گاڑی کی طرف پلٹ گیا۔

"معاذ یہ کون ہے۔؟" دونوں آمنہ کو سہارا دے کر اندر لائے تھے اس کے سر پر پٹی بندھی تھی اور معاذ نے اسے اپنا کوٹ پہنا رکھا تھا۔

"بتاتا ہوں سب، آپ پہلے زیتون بانو کو اٹھا کر لائیں وہ ذرا انہیں لباس تبدیل کروا دے اور دودھ وغیرہ لا دے تو میں دوا دوں۔" وہ آمنہ کو بیڈ پر لٹا کر پلٹتے ہوئے بولا وہ نیم بے ہوش تھی۔

"نزہت آپی کا کوئی لباس تو ہوگا وارڈ روب میں۔" وہ شہباز خان کے جواب کا انتظار کیے بغیر وارڈ روب کی طرف بڑھا تو شہباز خان زیتون بانو کو اٹھانے چل دیے۔

"اب بتاؤ کیا چکر ہے۔" زیتون بانو آمنہ کو کپڑے تبدیل کروانے لگی تو شہباز خان نے لاؤنج میں بیٹھے پانی پیتے معاذ سے بے تابی سے پوچھا۔

"بتاتا ہوں۔" اس نے پانی کی بوتل ٹیبل پر رکھی۔ "یہ آمنہ ہے صوفی عبدالرحمن کی بڑی صاحبزادی۔" وہ آہستہ آہستہ انہیں بتانے لگا۔ وہ پر تجسس انداز میں سننے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا۔" زیور گل نے خاموشی سے کمرے سے نکلتے ڈاکٹر سے پوچھا۔ نین تارا بیڈ پر نیم دراز خاموش نظروں سے کبھی زیور گل کو دیکھتی اور کبھی ڈاکٹر کو۔

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے پیڈ سے نسخہ الگ کرکے زیور گل کو تھمایا۔

"پتا نہیں بیگم صاحبہ! اصل میں انہیں تکلیف کوئی نہیں ہے۔ بس ان کا ذہن ایک نقطے پر اٹک گیا ہے آپ سمجھیں یہ اس لمحے کی قید میں آگئی ہیں جب ان کا نومولود بچہ مر گیا ان کا دماغ اس حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہا ہے یقیناً ان کا مرض ہے ایسے مریض کبھی تو جلدی حقیقت کا ادراک کرکے ٹھیک ہو جاتے ہیں اور کبھی انہیں اس سچ کو قبول کرنے میں سالوں لگ جاتے ہیں بہرحال آپ انہیں یہ دوائیں جاری رکھیں یہ جو کہتی ہیں آپ مانتی جائیں ان سے اختلاف رائے نہ کریں اور نہ پھر انہیں زبردستی بتانے کی یا سمجھانے کی کوشش کریں وہ سائیکاٹرسٹ جس کا میں نے آپ کو بتایا ہے ہفتے میں ان کے ساتھ ان کی ایک یا دو میٹنگز کروائیں، ان شاء اللہ آپ کو خود فرق محسوس ہونے لگے گا۔ اب اجازت۔" وہ اپنے روایتی لہجے میں اسے تسلی دیتے ہوئے اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا تو زیور گل خالی خالی نظروں سے ہاتھ میں لیے نسخے کو دیکھنے لگی اور کبھی بے خیال سی بیٹھی نین تارا کو۔

"کچھ کھاؤ گی نین!" ایک گہرا سانس لے کر وہ اٹھتے ہوئے ان کے پاس آکر بولی۔

"شش! ماما وہ ابھی سویا ہے اس کی نیند خراب ہوگی اور مجھے تو آپ کو معلوم ہے لیڈی ڈاکٹر نے صرف فروٹ جوس لینے کو کہا ہے۔ پریگنینسی میں جتنا فروٹ لو اتنا بچہ صحت مند اور خوب صورت ہوتا ہے۔ بس ایک گلاس اورنج جوس بھجوا دیں۔" وہ مدھم آواز میں بولی تو زیور گل کا جی چاہا اپنا سر دیوار سے دے مارے۔

مسینہ بھر ہونے کو آیا تھا نین تارا اسی طرح کی باتیں کرتی۔ بچے کی اس کی نیند کی، پریگنینسی کی، شادی کی۔ آئے یا انہیں فون کرکے خوش خبری سنا دیں۔ اور بس۔

پتا نہیں ان ذلت انگیز مناظر کو اس کے ذہن نے کیوں جگہ نہیں دی تھی کہ حویلی تک جانے کے بعد کی کوئی بھی بات اسے یاد نہیں تھی۔

زیور گل نم آنکھوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔

اس کی تو زندگی کا آسرا ہی ٹوٹ گیا تھا۔

نین تارا اس کے بڑھاپے کا سرمایہ، جس بینک میں ساری زندگی محنت کرکے پیسہ پیسہ اور سپنے جمع کرواتی رہی اس عمر میں آکر جا چلا وہ تو بینک میں ڈوب گیا، اس تمام تر سرمائے کے ساتھ، زیور گل دنوں میں سالوں کی منزلیں طے کر آئی تھی۔

روز سوچتی اب نین تارا کل نہیں ہوئی، زیور گل کی ساری امیدوں کے چراغ گل ہوئے ہیں وہ بھی جب رات تھی اندھیری ہے، بینک بیلنس دن بدن سکڑتا جا رہا تھا، اسی طرح بینک سے رقم نکلتی رہی تو انہیں سڑک پر آنے میں ایک دو سال بس زیادہ کا عرصہ نہیں لگے گا، اس سوچ نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔

"کیسی ہو زیور گل! کچھ دماغ ٹھکانے آیا تمہارا اور تمہاری بیٹی کا۔" وہ جو غم زدہ چہرے کے ساتھ بیٹھی اس ادھیڑ بن میں لگی تھی سلطان بخت کی آواز پر اچھل ہی پڑی۔

سلطان بخت اسی طمطراق اور رعب کے ساتھ اس کو طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"تم تم... کتے اب کیا لینے آئے ہو، ہم بےبات عورتوں کے پاس۔" وہ خونخوار لہجے میں دھاڑی۔

"زبان ابھی تک وہی ہے، لگتا ہے ابھی بھی دماغ ساتویں آسمان پر ہے۔ شکر کیوں نہیں کرتیں۔ ہماری مہربان طبیعت کی بدولت اس دنیا میں موجود ہو ابھی بھی تم، کہاں ہے ہماری سویٹ ڈارلنگ نین تارا۔" وہ ڈھٹائی سے زیور گل کے چہرے اور شعلہ اگلتی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے نین تارا کے کمرے کی طرف بڑھے۔

"اگر تم نے ایک قدم بھی اس کے کمرے کی طرف بڑھایا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے یہ تمہارے باپ کی حویلی نہیں زیور گل کا گھر ہے اور نین تارا اس کا تو تم نام بھی زبان پر لائے تو خدا کی قسم! اپنی جان پر کھیل کر تمہارے ٹکڑے کروا دوں گی۔" زیور گل کا غضب ناک چہرہ دیکھنے کے قابل تھا اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور سارے غصے کے کپکپانے لگا تھا۔ سلطان بخت اس کے رد عمل کو دلچسپ نظروں سے دیکھ کر گویا حظ اٹھا رہے تھے۔

"بڑھیا تم نے یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کیے۔ جو بلا وجہ کا طیش اپنی طاقت سے بڑھ کر دکھا رہی ہو اس وقت ہوش ——— کرتا تھا۔ جب تمہاری معصوم بچی خیر سے گل کھلانے چلی تھی کیا تمہیں نہیں معلوم تھا کہ گھنگھروؤں کی چھن چھن کے ساتھ ڈھولک کی تھاپ پر ناچنے والیوں کے بطن سے شریف زادے جنم نہیں لیا کرتے جس دن یہ ہو گیا وہ دن اس سیاہ زمین پر زندگی کا آخری دن ہوگا۔ اتنی بڑی حقیقت سے تم نے کیوں نظریں چرائیں، اب کاہے کو چلاتی ہو۔" سید سلطان بخت نے پتھریلے لہجے میں کہتے ہوئے زیور گل کو تحقیر بھری نظروں سے دیکھا۔

"جو ہوا سو ہوا اس کو آگ تو لگ ہی چکی اور مٹی بھی پڑ چکی، اب ہمارا تم جیسے مکار نام نہاد شریف زادے سے کوئی تعلق نہیں، بہتر ہے تم اپنی عزت کی ٹوکری اپنے سر پر سجا کر یہاں سے دفع ہو جاؤ کہ کہیں تمہاری عزت کے چیتھڑے میں باہر نکل کر سارے زمانہ میں اڑا دوں۔"

"دھمکی، مائی ڈیئر مدران لا۔" "وہ جو مجتے" دیا نہیں کرتے عمل کیا کرتے ہیں، خیر! یہ تم جیسی عورتوں کی عادت ہوتی ہے بات بے بات دھمکانے کی، وہ کیا کہتے ہیں بھونکنے والے کتے کاٹا نہیں کرتے اور کتے وہی بھونکتے ہیں جن کے منہ میں ہڈی نہ ہو۔ مجھے احساس ہے، تمہیں بہت دنوں سے ہڈی نہیں ملی میوں خالی ذہن کوئی بھونکنے کے سوا اور

کرے تو کیا۔؟" وہ زیور گل کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہہ رہے تھے۔ جب نین تارا کمرے سے دوڑتی ہوئی آئی۔

"اوہ شاہ جی! حد کردی آپ نے' میں کب سے آپ کا نمبر ملا رہی تھی۔ آپ نے موبائل کیوں آف کر رکھا ہے۔ پھر میں حویلی کرتی تو آپ خفا ہوتے۔ مجھے نا آج چیک اپ کے لیے جانا تھا سوچا آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ اب تھوڑے دن تو رہ گئے ہیں' ڈاکٹر کہہ رہی تھی اب ہر ہفتے آنا ہوگا چلیں۔"

نین تارا پرجوش لہجے اور کھلے چہرے کے ساتھ سید سلطان بخت کے بازو سے لپٹتے ہوئے بالکل نارمل انداز میں کہہ رہی تھی۔ ایک پل کو تو سید سلطان بخت نے بھی خاصی حیران نظروں سے اس کے اس روپ کو دیکھا اس کے چہرے پر کسی بھی نفرت' غصے یا تضحیک کا تاثر نہیں تھا۔ انہوں نے فوری طور پر زیور گل کی طرف دیکھا جو کسی جھاگ کی طرح صوفے پر نڈھال ہو کر بیٹھ چکی تھی۔

"شیور کیوں نہیں میری جان! میں آج آیا ہی اس لیے ہوں کہ اپنی جان کو اپنے ساتھ چیک اپ کے لیے لے کر جاؤں بعد میں ڈھیر ساری شاپنگ کریں گے۔ ڈنر باہر' اور بعد میں سید ہاؤس' چلو گی نا۔" وہ جلدی جلدی اس کے ساتھ پروگرام طے کرتے ہوئے بولے تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگی

"بکواس بند کرو تم اسے کہیں نہیں لے کر جاؤ گے تم یہاں سے دفع ہوتے ہو یا میں پولیس کو فون کروں۔" زیور گل اٹھتے ہوئے دانت پیس کر غرائی۔

"اماں کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ شاہ جی کیسے بات کر رہی ہیں' وہ میرے ہسبنڈ ہیں' مجھے کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔ آپ پلیز چھوٹے شاہ جی کا خیال رکھیے گا۔ اس کی نیند بڑی کچی ہے کہیں اٹھ نہ جائے۔" نین تارا نے آگے بڑھ کر زیور گل کے گلے میں بازو حمائل کر کے اس کا منہ چوما' پھر پلٹ کر سلطان بخت کو دیکھنے لگی۔

"اب زیور گل! میں ڈنر کے بعد نین تارا کو ادھر ہی ڈراپ کر دوں گا' اور تم بھی چاہو تو کسی اپنی فرینڈ کے ساتھ جا کر کرلو' تمہارا ذہن ہلکا پھلکا ہو جائے گا۔ یہ ایک لاکھ روپے کا چیک ہے۔ ظاہر ہے کیش ہوگا۔ آج شام کے لیے فی الحال اس میں گزارا کرلو' دس بارہ کے قریب ہیں۔" سلطان بخت نے کوٹ کی جیب سے چیک نکال کر زیور گل کی گود میں پھینکنے کے بعد ہزار ہزار کے دس بارہ نوٹ اس کی گود میں اچھالے اور چند لمحوں میں نین تارا کو لیے مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے اور زیور گل کسی پتھر کے بت کی مانند اس کھلکھلاتے چیک اور مسکراتے نوٹوں کو دیکھنے لگی۔

اب نین تارا فی الحال اس کے کسی کام کی نہیں تھی۔

نہ اس کا حسن' نہ اس کی آواز اور نہ اس کا جسم' کچھ بھی منافع بخش نہیں رہا تھا۔ اور یہ سچ تھا زیور گل بیٹی کے دکھ پر بے حد دکھی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس نے بہت دنوں بعد اتنے سارے نوٹ اکٹھے دیکھے تھے اور اتنا بڑا چیک بھی اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ کتنے دنوں سے بیٹی کے دکھ کی وجہ سے گھر بیٹھی خود بھی نیم پاگل ہو رہی تھی اور یہ بھی سچ تھا وہ بہت دنوں سے کسی اچھے دوست کے ساتھ ایک اچھی شام نہیں منا سکی تھی۔

اس چیک اور نوٹوں کو دیکھتے دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔

نین تارا کا حسن' آواز اور لچک دار جسم کچھ بھی منافع بخش نہیں رہا تو کیا ہوا اس کی دیوانگی' کیسا ہرا بھرا منظر اس کی آنکھوں کو دکھانے لگی تھی کہ کئی دنوں سے بڑھاپے کے درد سے چٹختا اس کا جسم یکدم جیسے تن اٹھا تھا۔ وہ اب اپنے پرانے دوستوں کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کس کو فون کر کے اچھی شام بتانے کا پروگرام بنائے۔

☆ ☆ ☆

دیکھو نزہت! جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کرو' جتنی تاخیر کرو گی فیصلہ دشوار ہوتا جائے گا۔ اور الجھن بڑھتی جائے گی اگر تم رستہ الگ کرنا چاہتی ہو تو طلاق لے لو۔" فہد کی گرینی کی بات پر نزہت نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"تو طلاق نہیں لینا چاہتیں۔" وہ مسکرائیں "اور انا کے گھوڑے سے بھی نیچے نہیں اترنا چاہتیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں' آپ کو معلوم ہے میں نے بہت دفعہ خود کو ان کے قدموں میں گرا کر بھی معافی مانگی ہے۔ اس گناہ کی جو میں نے کیا ہی نہیں مگر اس کے باوجود کسی نے میرا یقین...."

"نزہت! یہ سب پہلے کی باتیں ہیں وہ بھی میرا خیال ہے یہ سب کچھ بھلا کر تمہاری طرف آیا ہے۔"

"تو پھر کیا چیز انہیں روکتی ہے۔ کھل کر کہتے کیوں نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "ابھی تک انہوں نے ایک بار بھی اپنے دل کی بات نہیں کہی اس کشمکش کو میں کیا سمجھوں۔"

"تم مجھے اپنے دل کی بات بتاؤ۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔" وہ جیسے تھک کر بولی۔ "پاس آتے ہیں تو انہیں دور جھٹک دینا چاہتی ہوں' دور جاتے ہیں تو بے قراری سی لگ جاتی ہے۔" وہ ہولے سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

"یہی محبت ہے تم دونوں کے بیچ' وہ مضبوط دھاگا جس کا ایک ایک سرا تم دونوں نے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ مگر اس کا اقرار نہیں کرتے۔"

"ایسی بات نہیں' وہ میرے اقرار کو میری کمزوری سمجھتے ہیں۔ میرے اقرار کا کچھ بھی فائدہ نہیں۔"

"نہیں یہ ایک گمان ہے' جو تم نے طے کر رکھا ہے کہ ایسے ہی ہوگا۔ نزہت! کبھی ایسا نہیں ہوتا جیسا ہم نے حساب لگا رکھا ہوتا ہے کہ ہم جھکیں گے تو وہ ہمیں کم تر یا کمزور سمجھے گا۔ نزہت! میاں بیوی کے رشتے میں سب سے بڑی دشمن کمہ لو یہ انا ہوتی ہے کیا پتا تم پہل کرو اور وہ تمہاری پہل کا منتظر ہو۔"

"نہیں میں پہل نہیں کروں گی' ایک بار نہیں بہت بار خود کو گرا کر دیکھ چکی ہوں۔ اب یوں گڑگڑا کر محبت [illegible] کرتی مجھے پتا ہے۔" وہ آنکھوں میں اتری نمی کو ہاتھوں سے صاف کرنے لگی۔

"تو ارتضیٰ' اس کے بارے میں تم دونوں نے' چلو تم نے کیا سوچا ہے۔ اس کی زندگی کے یہ ابتدائی قیمتی سال جس میں اس کی نفسیات ڈیولپ ہو رہی ہے' تم دونوں کی یہ خود پسندی کیا رول پلے کرے گی۔ ایک نہ ایک دن تو حقیقت اس پر منکشف ہوگی۔ تب وہ کس اذیت سے گزرے گا۔ بروکن فیملیز کے بچے کیسی نفسیات لے کر بڑے ہوتے ہیں' یہ تمہیں اتنے سالوں کا تجربہ کم از کم تمہیں یہ تو بتا ہی چکا ہوگا کیا تم اپنے بچے کو ایک غیر متوازن شخصیت کے روپ میں دیکھ پاؤ گی؟" نزہت کی آنکھیں برسنے لگیں۔

"اس وقت اسے تم دونوں کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے کل جب وہ اس ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گا تب اس کی محبت اور توجہ کی ضرورت تمہیں اس کی طرف لے جائے گی' سو جو وہ تمہاری خالی جھولی میں ڈالے گا۔ وہی تاج اسے ملا ہوگا۔ غلط کہہ رہی ہوں میں؟" وہ بہت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نزہت کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔

"پلیز آنٹی بس کریں۔" مزید سننا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"سنو نزہت! ان سب تلخ باتوں کو سنو جو تم دونوں کا بدصورت انا پسند رویہ تمہارے اردگرد کے ماحول کو بدصورت بنا رہا ہے۔ اس کے اتنے قیمتی سال' بچپن سے قیمتی کوئی سرمایہ نہیں ہوتا تم دونوں کی ضد کے نتیجے میں برباد ہو رہے ہیں وہ ماں باپ کے ساتھ' طبعی' قانونی اور شرعی طور پر موجود ہونے کے باوجود یتیموں کی سی زندگی گزار رہا ہے۔ کیوں؟ تم میرے صرف اس سوال کا جواب دو جب قدرت ایک عورت کو ماں اور مرد کو باپ بناتی ہے تو اس بچے کی پرورش کے کٹھن مراحل کے دوران بار بار انہیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان ذاتیات' اس بچے کی احتیاجات' ضروریات کے مقابلے میں غیر اہم ہیں اور تم دونوں اس وقت صرف اور صرف اپنے بارے میں اپنی ذات کے بارے میں حساس ہو رہے ہو' اس معصوم کے بارے میں نہیں جس کی ذمہ داری قدرت نے تم دونوں کے کندھوں پر ڈالی ہے؟"

نزہت نے ایک نظر ان کے ناراض چہرے پر ڈالی اور کوئی بھی جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں آگئی اور بستر پر لیٹ جانے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ جن باتوں سے بچنے کے لیے وہ اس کمرے میں آچھپی ہے وہ تو پہلے سے اس کے تکیے کے نیچے سے سر اٹھائے جھانک رہے ہیں۔

"کاش صرف میرا جھکنا کام آسکتا تو ارتضٰی میری جان میں سو بار جھک جاتی میں ایک نظروں سے گری ہوئی بیوی بن کر تو رہ سکتی تھی۔ مگر اپنے بیٹے کے سامنے اس کی ماں کی تذلیل نہیں سہہ سکتی یہ بہت مشکل ہے، بہت مشکل' یہ میری خود غرضی سہی مگر میں یہ نہیں کر سکتی۔ کاش میں ہمت کرکے، بہت پہلے ہمت کر کے یہ شہر چھوڑ کر جا چکی ہوتی تو آج ان کڑے سوالوں سے بچ جاتی۔" روتے روتے وہ تھک گئی تھی۔

"فرار کب تک' تم دونوں اس مسئلے سے بھاگتے رہو گے۔" کھڑکی سے جھانکتے چاند نے سوال کیا تو اس نے تکیے میں منہ چھپا لیا۔

رات بھی اتنی طویل تھی کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کا جسم دکھنے لگا اسی وقت کال بیل بجی۔

"اس وقت کون آ گیا۔" اس نے ڈھائی بجانے والی کلاک کی طرف تشویش سے دیکھا۔ شاید چوکیدار نے دروازہ کھول دیا تھا۔

قدموں کی آواز کاریڈور سے آتے آتے اس کے کمرے کے آگے آکر رک گئی۔ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

"دیکھیں۔" کہتے ہوئے اس نے خود ہی دروازہ کھول دیا۔

"ارے یہ جویریہ۔ جویریہ۔" کاریڈور میں جلتے نائٹ بلب کی ہلکی روشنی میں اس نے سیاہ چادر میں لپٹی اس کم سن پر کشش چہرے کو دیکھا جس کی متورم آنکھیں اس کے بے تحاشا رونے کا پتا دے رہی تھیں۔ اور ہونٹوں پر جمی پپڑی اس کے پیاسے ہونے کی۔

کوئی سوال پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

"آ جاؤ۔" اس نے جویریہ کو رستہ دیا۔

"میں جا رہا ہوں۔ اس وقت آن ڈیوٹی ہوں' آپ پلیز اس کو کچھ کھلا پلا دیں۔ میں صبح جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" وہ کہہ کر رکا نہیں اور خدا حافظ کہتا واپس مڑ گیا۔

نزہت نے ایک گہرا سانس لے کر دروازہ بند کیا اور مسکراتے ہوئے سہمی کھڑی جویریہ کو دیکھنے لگی۔ جو آنکھوں میں اترتے آنسوؤں کو پلکیں جھپک جھپک کر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے واہ یہ اچھا آپ لوگوں نے گھر کو یتیم خانہ بنا رکھا ہے۔ جو زمانے میں بے سہارا لاوارث ملتا ہے اٹھا کر لے آتے ہیں' نہ آگے کا پتا ہوتا ہے نہ پیچھے کا' اور پھر بھی مہمانی کافی نہیں ہوتی' بلکہ اسے تاعمر ادھر ہی گھر کا مکین بڑی محبت و مہمانی سے بنا لیا جاتا ہے۔ واہ ایسے سخی تو نہ دیکھے نہ سنے۔" یاسمین کے جانے کے بعد ایاز کی بیوی نے اس کی سیٹ سنبھال لی تھی۔ اور وہ اس کا کردار بڑی خوبی سے ادا بھی کر رہی تھی۔

"بہو! انسان کو بولنے سے پہلے کم از کم ایک پل کو سوچنا ضرور چاہیے۔ مگر پتا نہیں قدرت نے مجھے دونوں بہوئیں اس وصف سے عاری کیوں عطا کیں۔" مسز خان نے کچھ دکھی لہجے میں کہا۔

"چلیں خدا نے تیسری بہو تو سارے گنوں والی دی تھی۔ آپ نے تو اس کو بھی نہ ٹکنے دیا۔" وہ فوراً چمک کر بولی تو شہباز خان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

"اچھا تم گڑے مردے نہ اکھاڑو یہ بتاؤ اب کیا مسئلہ ہے؟" مسز خان نے قدرے اکتا کر کہا۔

"کون ہے یہ لڑکی؟ اور ادھر کیوں رہ رہی ہے۔ کیا اسے بھی خیر سے شہباز میاں لائے ہیں؟ آپ تو جہاندیدہ ہیں۔ کم از کم کسی نزاکت کا ہی خیال کر لیں۔" وہ ترخ کر بولی۔

"بھابھی!" شہباز خان نے جتنا ضبط کر لیا ان کے نزدیک کافی سے زیادہ تھا۔ وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایاز نے بھی بیوی کو گھور کر دیکھا۔ مگر وہ کندھے اچکا کر مسز خان کے دوسری جانب سر جھکا کر بیٹھی آمنہ کو تمسخر بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آج مجھے روک رہے ہو' کل کو سارا زمانہ کہے گا پھر کس کس پر آنکھیں نکالو گے۔ بھئی شہباز میاں! تمہارا تو ہر کام نرالا۔" وہ اسی جلے کٹے انداز میں بولی تو شہباز خان نے کچھ بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا جو انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا کہہ رہی تھیں۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" شہباز خان نے ضبط بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بھئی کیا فارسی بول رہی ہوں' یہ لاوارث لڑکی کون ہے اور ادھر ڈیرے ڈالے کیوں بیٹھی ہے۔ اور آپ لوگوں کے ارادے کیا ہیں؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"معاف کیجئے گا' آمنہ لاوارث نہیں اور نہ اس کے ادھر ڈیرے ڈالنے کے ارادے ہیں کیونکہ میں اسے لے جا رہا ہوں مما پاپا آپ کے یہی اور ارادے۔" معاذ کہتے کہتے رکا اور مڑ کر شہباز خان اور مسز خان کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں آمنہ سے نکاح کر رہا ہوں' یہ ارادے ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تو آمنہ نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ماشاء اللہ بہت نیک ارادے ہیں۔ زمین سے اٹھایا اور سیج پر بٹھایا' بہت خوب بھئی ایاز ہمیں تو جگ سے نرالا سسرال ملا اور عجوبہ روزگار سسرالی۔ ویسے معاذ میاں! آپس کی بات ہے لڑکی سے پوچھ لیا یا اس کی بھی ضرورت نہیں۔" اور آنکھیں گھما کر آمنہ کو دیکھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں بولی۔

"آمنہ پلیز! آپ ان کی فضول باتوں کا برا نہ منائیں یہ ان کی عادت ہے۔ جس سے یہ مجبور ہیں۔" معاذ آمنہ کو روتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

"مگر میں آپ سے شادی ہرگز نہیں کروں گی' آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟" وہ غصے سے ـــــ ایک دم چیخی تو کمرے میں ایک پل کو سناٹا چھا گیا۔

● ● ● ● ●

"کمرے میں چند ثانیے کے لیے سناٹا چھا گیا' صرف آمنہ کی دبی دبی سی سسکیاں تھیں جو اس سناٹے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

معاذ نے ایک نظر آمنہ کو دیکھا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

"نہ رو بچی! تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔" مسز خان نے ہاتھ بڑھا کر آمنہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ انہوں نے شہباز خان کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے معاذ کے پیچھے جانے کو کہا۔ ایاز کی بیوی نے آنکھیں سکیڑ کر اس اشارے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ شہباز خان اٹھ کر باہر نکل گیا تو ایاز نے بھی بیوی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"توبہ ہے' ایک ہی ڈرامہ بار بار دہراتے اس گھر کے لوگ تھک نہیں رہے۔ ابھی ایک مظلوم بی بی کے ذکر پر خاک پڑی نہیں تھی کہ انہوں نے دوسری بے چاری خدا جانے کون سی سڑک سے برآمد کر لی۔ اس گھر کا تو نام ہی بے سہاروں کا سہارا رکھ دینا چاہیے۔ مفت کی پبلسٹی علیحدہ ثواب الگ۔"

آمنہ نے گھبرا کر اپنا سر مسز خان کے سینے سے ہٹا لیا اور خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی' ورنہ آنسو تو رک ہی نہیں رہے تھے۔

اسے لگ رہا تھا اس وقت وہ پوری دنیا میں بالکل تنہا کھڑی ہے اور ان اجنبی چہروں کے ہجوم میں کوئی بھی اپنا نہیں۔ یہی خیال بار بار اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر دیتا اور اب معاذ کا یوں سب کے سامنے ترس کھا کر اسے پرپوز کرنا۔ اپنی بے بسی پر اسے اور بھی رونا آنے لگا۔

"آمنہ بیٹا! میں تمہارے آنسوؤں کا سبب جانتی ہوں۔ جب تک ماں باپ زندہ رہتے ہیں' وہ زمانے کا ہر تیکھا

نوکیلا تیر اپنے سینے پر کھاتے ہیں اور اپنے بچوں تک ان تیروں کی ذرا سی آنچ بھی نہیں پہنچنے دیتے اور جب ماں باپ نہ رہیں تو بچوں کو خود بہادر بن کر ان تیروں کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہیے' ورنہ یہ ظالم دنیا چند ہی ٹھوکروں میں انہیں کچل کر رکھ دے گی اور بہت خاص ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو تقدیر زمانے کے سامنے سینہ سپر ہونے کا موقع دیتی ہے اور جب وہ بہادری سے ڈٹ کر دنیا کے حقائق کا مقابلہ کرتے ہیں تو کچھ اور بھی خاص ہو جاتے ہیں' ورنہ تو بہت سے ان تلخ حقائق کے سامنے آتے ہی ہمت ہار دیتے ہیں۔ یہ سختیاں تو خام بندوں کو کندن بناتی ہیں اور کندن بننے سے پہلے کے مراحل واقعی بہت اذیت ناک' ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ ہر بندہ انہیں سہہ نہیں سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

انہوں نے اس کے جھکے سر پر ہولے سے ہاتھ پھیرا۔ آمنہ نے جھکی ہوئی بھیگی پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"یہ سب آزمائشیں تمہارے کردار کی مضبوطی جانچنے کے لیے تھیں اور جب ہم ان آزمائشوں پر پورا اترتے ہیں تو قدرت ہمیں اس کے بدلے ایسا انعام عطا کرتی ہے کہ ہم اپنی پچھلی تمام تر آزمائشیں بھول جاتے ہیں۔ آزمائش کے بعد جزا کا عمل شروع ہوتا ہے اور یہ لمحات بھی بڑے نازک ہوتے ہیں۔ سختیوں کا مارا بندہ اتنی جلدی اپنی خوش بختی کو قبول نہیں کر پاتا۔ اکثر خوش بختی اس کے دروازے پر دستک دیتی رہتی ہے اور وہ کان لپیٹے اس دستک کو بھی کسی آزمائش کا پیش خیمہ جان کر بیٹھا رہتا ہے اور کبھی خوش قسمتی مایوس ہو کر پلٹ جاتی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تمہیں اللہ نے ایسی روشن آنکھ دی ہے کہ تم آزمائش اور جزا میں [illegible] فرق کر سکتی ہو۔"

وہ آمنہ کے ہاتھ کو اپنے ضعیف جھریوں بھرے ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

"جی!" وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"تمہاری بدبختی کے دن گزر چکے۔ اچھا بتاؤ' تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟" ان کے چہرے پر کیسی ملاحت' کیسی نرمی تھی کہ آمنہ کوشش کے باوجود اس میں بیگانگی یا غیریت تلاش نہ کر سکی۔

"آپ بہت اچھی ہیں۔" وہ بے حد آہستگی سے بولی۔ اس کا ہاتھ [illegible]

"بیٹا! اچھی میں نہیں' تم ہو۔ اسی لیے میں تمہیں اچھی نظر آتی ہوں۔ آپ نے یہ پچھلی بات سنی [illegible] اپنائیت' غیریت یہ سب دلوں کے رابطے ہوتے ہیں۔ آپ کو دوسرے کے لیے اپنے دل میں وہی کچھ نظر آئے گا جو مقابل کے دل میں آپ کے لیے ہے۔ کسی کی محبت اور نفرت کو پرکھنے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ اپنے دل میں جھانک لو جتنی پروا آپ کے دل کو دوسرے کی ہوگی' اتنی ہی دوسرے کو آپ کی ہوگی۔ نہ رتی کم' نہ رتی زیادہ۔ جب دل چاہے اس کسوٹی کو پرکھ لینا۔" آمنہ کچھ بھی کہے بغیر انہیں دیکھتی رہی۔

"آمنہ! تم زندگی کے اس موڑ پر کھڑی ہو' جہاں تمہارے آس پاس کوئی بھی اپنا خون کا رشتہ موجود نہیں کہ جس پر بندہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ بھی کوئی فارمولا نہیں کہ خون کے رشتے ہمیشہ ہی آپ کے اعتبار پر پورا اتریں گے۔ جس حال میں تم اپنے بھائی کے گھر سے عزت اور جان بچا کر نکلیں۔"

انہوں نے آمنہ کے کچے زخم کو چھیل دیا۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے دھند چھانے لگی۔

"میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا' صرف یہ بتانا تھا کہ اگر ایسا اپنا کوئی بھی پاس نہ ہو سہارے کے لیے تو پھر آدمی کو اپنے اندر کی آنکھ سے کام لے کر اعتبار کے رشتے ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ اب تم نے ہم پر اعتبار کیا ہے تو ادھر بیٹھی ہو' ورنہ چند روز پہلے تک نہ تم ہمیں جانتی تھیں' نہ ہم تمہیں۔"

وہ سانس لینے کو رکیں۔ آمنہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

"میرا تم سے کوئی خون کا رشتہ نہیں' اس کے باوجود کیا تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو؟" انہوں نے شہادت کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی ذرا سی اوپر کو اٹھائی۔ آمنہ نے روئی روئی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"بولو بیٹا! مجھ پر تو اعتبار ہے نا؟"

"جی....." اس نے خفیف سا سر ہلایا۔

"تو پھر اپنے اعتبار کے دائرے کو تھوڑا سا اور پھیلا کر اپنے دل کو یقین دلاؤ کہ تم اچھے لوگوں میں ہو اور تمہاری خوش قسمتی دستک دے رہی ہے۔ معاذ کو ان ہی بوڑھے ہاتھوں نے پروان چڑھایا ہے اور ان آنکھوں نے اس بچے کو ہمیشہ اعتبار کی نظر سے دیکھا ہے۔ میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتی' نہ اپنا کوئی فیصلہ یا ارادہ تم سے زبردستی منوانا چاہتی ہوں۔ میری تو بس یہ خواہش ہے کہ تم اس وقت زندگی کے جس اندھے موڑ پر کھڑی ہو' میں روشن رستے کا پتا تمہیں بتا سکوں۔ میں صرف تمہیں اس رستے کے بارے میں بتا سکتی ہوں' اس کے روشن یا تاریک ہونے کی گواہی تمہارا وجدان ہی دے سکتا ہے۔ معاذ کے کردار میں اگر کوئی کھوٹ یا کجی ہوتی تو وہ تمہیں اس اندھیری رات میں ادھر کبھی نہ لاتا۔ اس کے کردار کے مضبوط ہونے کی گواہی تم اپنے دل سے بھی لے سکتی ہو' چاہو تو اس معاملے میں سوچ بچار کر لو' ایک دن' دو دن مگر زیادہ نہیں..... میں تمہیں یہاں ہمیشہ کے لیے بھی رکھ سکتی ہوں مگر دنیا کے طعنے اور ظالم نظریں تمہیں چند ہی دنوں میں لہولہان کر دیں گی۔ یوں بھی مجھے تو اپنی اگلی سانس کا بھی اعتبار نہیں' اس لیے میری دلی خواہش ہے کہ تم معاذ جیسے مضبوط سہارے کا ہاتھ تھام لو۔ جلد یا بدیر تمہیں [illegible] کا کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ رک کر [illegible] کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ وہ متذبذب سی اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ مسز خان کی نظروں کا ارتکاز اپنے چہرے پر محسوس کر کے [illegible] نے نظریں اٹھائیں۔

"میری' بس جویریہ بھابی..... [illegible] کے بغیر میں یہ کیسے کر سکتی ہوں خود سے۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"ایک بار تم اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جما لوگی تو پھر ان کی تلاش زیادہ سہل طریقے سے کر سکوگی۔ وہ کہتے ہیں نا ایک سے دو بھلے۔ معاذ تمہارے ساتھ ہوگا تو دیکھنا' دنیا بھر کی انمول خوشیاں کیسے تمہاری جھولی میں آ کر گریں گی۔"

[illegible] ڈھیر سارے [illegible] جگنو اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ آمنہ اپنی ہتھیلی کھولے ان کے [illegible]

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" مسز خان اس کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھیں۔

"مجھے ڈر لگتا ہے بہت زیادہ اپنی قسمت سے..... میں اتنی خوش قسمت کبھی بھی نہیں رہی....." وہ کہتے کہتے رو پڑی۔ انہوں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یہی قسمت جو آج تک تمہیں ڈراتی رہی ہے' دیکھنا تمہارے مردہ دل کی زمین پر کیسے خوش رنگ خوشبودار پھول اگاتی ہے اور تمہیں یوں لگے گا کہ یہ گزرا تلخ ماضی شاید کبھی تھا ہی نہیں کیونکہ یہ میرے رب کا وعدہ ہے کہ وہ ہمارے [illegible] دنوں کو ایسے ہماری زندگی سے نکال دیتا ہے کہ جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ میرے اللہ نے چاہا تو تم اپنے فیصلے پر کبھی نہیں پچھتاؤ گی۔"

٭ ٭ ٭

"دو میڈیم سائز ٹیڈی بیئرز' تین باربی ڈولز' الیکٹرانک گٹار' پیانو' دو اسپورٹس کاریں' ایک عدد مقناطیسی بورڈ گیم' چار بابا سوٹ' دو پینٹرز....."

سیلز مین ایک ایک چیز شاپنگ بیگز میں ڈالتے ہوئے میکانکی انداز میں بول رہا تھا۔

"اکیس ہزار سات سو ستر روپے سر!" کمپیوٹر کے آگے بیٹھے دوسرے سیلز مین نے رسید نکال کر سلطان بخت کے آگے کی تو ایک پل کو ان کا جی چاہا سارا سامان اٹھا کر اسی سیلز مین کے سر پر دے ماریں یا اپنا سر پھوڑ لیں۔ انہوں نے ایک غصیلی نگاہ ذرا سی گردن موڑ کر پاس کھڑی نین تارا پر ڈالی جو تمتماتے چہرے کے ساتھ شاپنگ بیگز میں پڑے سامان کو دوبارہ چیک کر رہی تھی۔ سید سلطان بخت نے خون کا گھونٹ بھرتے ہوئے والٹ نکال کر رقم کاؤنٹر پر رکھی اور خود تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گئے۔

اس طرح کی بیہودہ اور فضول شاپنگ انہوں نے نین تارا کے کہنے پر پہلی بار نہیں کی تھی۔

گزشتہ چھ ماہ کے دوران وہ کئی بار اس طرح کی بلکہ اس سے کئی گنا مہنگی شاپنگ کرچکی تھی اور سید سلطان بخت صرف اس خوشی میں کہ نین تارا نے انہیں "معاف" کردیا ہے' ہنسی خوشی یہ شاپنگ کروادیتے تھے مگر اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ نہ جانے اس کی یہ کیسی دیوانگی تھی جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کبھی کبھی تو انہیں یہ سب نین تارا کا ڈھونگ لگتا۔ وہ ان کی بے بسی کو انجوائے کررہی ہے اور کبھی اس کی وحشت سے انہیں ایسا خوف آتا کہ وہ دل میں اس کی دیوانگی کبھی نہ ختم ہونے کی دعا مانگتے' ورنہ جس دن وہ ہوش میں آگئی نہ جانے سلطان بخت کا کیا حشر کرڈالے۔ صرف ایک بار انہوں نے اس کی اس فضول شاپنگ سے تنگ آکر اسے غصے میں جھنجوڑتے ہوئے بتانے کی کوشش کی تھی کہ جس بچے کے لیے وہ یہ خرافات خریدتی پھر رہی ہے' وہ مرچکا ہے۔ اس لمحے ایک پل کو تو نین تارا کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا مگر دوسرے لمحے اس نے اپنے کئی انچ لمبے خوفناک زہریلے ناخنوں سے سید سلطان بخت کا پورا چہرا چھیل ڈالا تھا اور جب تک وہ اس کے اس جنونی انداز کو سمجھتے ہوئے اپنا بچاؤ کرتے' ان کا چہرہ لہولہان ہوچکا تھا۔ وہ تو شاید انہیں مار ہی ڈالتی۔ اگر وہ خود کو بچا کر وہاں سے بھاگ نہ نکلتے اور پھر اس زخمی چہرے کے زخم بھرنے تک وہ کئی دن تک اسلام آباد کی کوٹھی میں جاکر چھپے رہے تھے۔ رخساروں کے ڈیڑھ ڈیڑھ انچ زخم بھرنے میں بہت دن لگے تھے۔ اس کے بعد وہ ڈھائی ماہ نین تارا سے نہیں ملے تھے مگر پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر کہ اس دل کی مجبوری نے ہی انہیں ساری ذلتیں دی تھیں۔ اس سے ملنے گئے تو وہ ان کی بے وفائی کا گلہ کرتے ہوئے بہت معصومیت سے ان کے چہرے کے مندمل زخموں کے نشانوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اس لمحے ان کے دل میں احساس جاگا کہ وہ نین تارا کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ کیا ہوا جو وہ تھوڑی سی دیوانی ہوگئی تھی۔ یہ دیوانہ پن بھی تو ان ہی کی دین تھی۔

"چلیں شاہ جی! شہروز بابا کی شاپنگ کرنا ہے۔ میں کتنے دنوں سے آپ کا انتظار کررہی تھی۔"

وہ جیسے ہی ایک دو مہینوں بعد "گل کدے" میں قدم رکھتے' نین تارا انہیں فوراً سے پہلے شاپنگ کے لیے گھسیٹ لے جاتی۔ وہ جتنے کھلے دل سے اسے شاپنگ کراتے اس کا موڈ اتنا ہی خوشگوار ہوجاتا۔ صرف اس کے چہرے پر کھلتے ان خوبصورت رنگوں کو دیکھنے کے لیے سلطان بخت اپنے پرس کا منہ کھول دیتے نہ صرف نین تارا کے لیے بلکہ اس بڈھی گھوڑی زیور گل کے لیے بھی جو سلطان بخت سے شدید نفرت کرتی تھی مگر سانسوں کی ڈور سے جڑی تعیش کی ہوس اسے اس خاموش سمجھوتے پر مجبور کردیتی۔ نوٹوں کی ایک دو گڈیوں کے عوض وہ نین تارا کو ایک آدھ رات کے لیے ان کے ساتھ سید ہاؤس جانے کی اجازت آرام سے دیتی۔

کبھی کبھی ان کا دل اس بلی چوہے کے کھیل سے بری طرح اوب جاتا تو وہ کچھ دنوں کے لیے غائب ہوجاتے مگر پھر نین تارا کے حسن کا جادوئی سحر انہیں اپنی جانب کھینچنے لگتا۔

"اوکے' سویٹ ہارٹ! میں اب چلتا ہوں۔ اگلے ہفتے آؤں گا۔" سید سلطان بخت نے نین تارا کو "گل کدے" کے باہر ہی ڈراپ کردیا۔

"اندر نہیں آئیں گے۔" وہ بمشکل ڈھیر سارے شاپنگ بیگز سنبھالتے ہوئے بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"نہیں' اندر گیا تو پھر لیٹ ہوجاؤں گا۔ ٹیک کیئر' اینڈ بائے۔" وہ گاڑی آگے بڑھا لے گئے تو نین تارا کے چہرے پر یکدم سخت' تنی ہوئی جلد والا درشت چہرہ ابھر آیا۔ اس نے ایک انتہائی نفرت بھری نظر دور جاتی بی ایم ڈبلیو پر ڈالی اور گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

چند لمحوں بعد وہ اپنی گاڑی میں سارے شاپنگ بیگز رکھے شہر کے نواح میں واقع یتیم خانے کی طرف جارہی تھی۔

"تم نے میری گود اجاڑی' اللہ تمہارا سکون اجاڑ دے۔ تم یونہی بے قرار و مضطرب رہو شاہ جی! تمہیں کہیں سکون نہ ملے۔" ہر بار کی طرح گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سخت چہرہ لیے بڑبڑا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا۔۔۔ ایک لاوارث' یتیم' مسکین' بے نام و نشان لڑکی کو میں اپنے اکلوتے بیٹے کی بیوی بنالوں' امپاسبل۔"

رعنا حیات تو آمنہ کے بارے میں سن کر ہی بھڑک اٹھی تھیں۔

"ماما! مت بھولیں' آج سے چند ماہ پہلے تک آپ کا بیٹا بھی لاوارث' یتیم' مسکین' بے نام و نشان تھا۔ لوگوں کی دی ہوئی زکوٰۃ خیرات پر پلنے والا' ایک بے حد معمولی انسان۔" معاذ نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ "اور ماما! مجھے چاہے ایک دنیا کی بادشاہت مل جائے تو بھی میں اپنی وہ حیثیت' وہ اوقات نہیں بھول سکتا۔"

رعنا حیات کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"مگر ہمارا سوسائٹی میں ایک اسٹیٹس ہے' ایک مقام جو ڈیمانڈ کرتا ہے کہ ہماری بہو ہماری ہم مرتبہ نہ سہی مگر اس قدر حقیر۔"

"پلیز ماما! اسٹاپ اٹ۔۔۔ ابھی بھی آپ حیثیت' مرتبے' مقام اسٹیٹس جیسے بے حقیقت تصورات کے ذریعے بلیک میل ہوسکتی ہیں۔" معاذ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"رعنا! بھول گئیں' جنتاں کی موت کے بعد تم نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ انسان کو صرف انسانیت کی نظر سے دیکھوگی' دولت و مرتبے کی عینک سے نہیں۔"

فخر حیات نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا تو رعنا حیات پہلو بدل کر رہ گئیں اور پھر اختلاف کی گنجائش تھی بھی نہیں۔ وہ برسوں بعد ملنے والے بیٹے کو پاکر پھر سے کھودینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

آمنہ کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے وہ ایک لمحہ کو جز بز سی ہوئیں۔ اپنی این جی او کے ایک معمولی سے اسکول کی معمولی سی ٹیچر کو اپنے اکلوتے لخت جگر کی شریک سفر بنانے کے خیال سے۔

انسانی نفس بڑا ڈھیٹ ہے۔ اسے بار بار سرزنش کے درے پڑتے رہیں

فخر حیات نے بیوی کی ہچکچاہٹ کو تنبیہی نظر سے دیکھا تو رعنا حیات نے ایک گہرا سانس لے کر بے حد قیمتی ڈائمنڈ جڑی انگوٹھی آمنہ کی انگلی میں پہنا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"آج سے پہلے یہ لڑکی جو بھی تھی' اس کی وہ حیثیت اس کے ماضی کا حصہ ہے۔ ابھی اس لمحے سے یہ میرے معاذ کی پسند' اس کی چاہت کی حیثیت سے مجھے بھی معاذ ہی کی طرح عزیز ہونی چاہیے۔" آمنہ کی ٹھنڈی پیشانی کے بوسے میں نہ جانے کیسا لمس انہیں محسوس ہوا کہ چند لمحات پہلے کے محسوسات اور ہی طرح کے احساس میں ڈھل گئے تھے۔ ڈھیر سارا ان دیکھا اطمینان ان کے اندر اتر گیا تھا۔

مسز خان کے بزرگ چہرے کی نرم مسکراہٹ جو آمنہ کے لیے تھی' انہیں ذرا سا شرمندہ کرگئی۔

"یہ عورت حیثیت و مرتبے میں مجھ سے کسی بھی طور کم نہیں مگر بے سہارا انسانوں کے لیے قدرت نے اس کے سینے میں کتنا بڑا دل رکھا ہے اور میری ذات پر تو ان کے احسانات کا بوجھ اتنا ہے چاہوں بھی تو ان کا بدل نہ دے سکوں۔"

مسز خان' آمنہ کو پیار کررہی تھیں اور رعنا حیات ان کے بے لوث انداز کو دیکھ کر بہت کچھ سیکھ رہی تھیں۔

"کل شام کو نکاح ہوگا' ولیمہ البتہ دو دن بعد ہم خوب دھوم دھام سے کریں گے۔" شہباز خان نے انگوٹھی معاذ کو پہنائی تو فخر حیات نے گویا اعلان کیا۔

"چلو بھئی معاذ میاں! آج سے تم سے دوہرے رشتے ہوگئے اور یاد رکھنا' دوسرا رشتہ مجھے پہلے سے زیادہ عزیز ہے۔ آمنہ میری چھوٹی بہن ہے' ہمیشہ یہ بات یاد رکھنا۔" شہباز خان نے معاذ کو گویا یاد کرایا۔

"میں تو آپ کی ہر بات یاد رکھتا ہوں' آپ کو بھول جانے کی عادت ہے۔ حتیٰ کہ رشتے بنا کر بھی بھول جاتے ہیں۔" معاذ نے جتا کر کہا تو وہ ان سنی کرکے دوسری طرف دیکھنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"کیا جواب دیا جویریہ نے نزہت آپی؟" جیسے ہی نزہت کمرے میں داخل ہوئی، جلیل نے بے قراری سے پوچھا۔

"تمہاری بے قراری اگر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی تو شاید اقرار ہی کر لیتی۔" نزہت اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

"تو کیا اس نے انکار کر دیا؟" جلیل نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔"

"اقرار بھی نہیں کیا، انکار بھی نہیں تو پھر۔" وہ پریشانی میں قدرے جھلا کر بولا۔

"میرے ہونق بھائی!" نزہت نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے، اتنی جلدی اپنے دل میں ان نازک جذبات کو جگہ نہیں دے سکتی۔ وہ مان جائے گی، تھوڑا انتظار کر لو۔"

"جب تک وہ ملی نہیں تھی تو یہ بے قراری نہیں تھی مگر اب صبر نہیں ہوتا۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"اللہ رے، یہ بے قراری۔ بھیا! ابھی منہ دھو رکھو، وہ اتنی جلدی نہیں مانے گی۔ وہ اپنی بہن اور بھائی کے لیے بہت پریشان ہے۔ کچھ پتا چلا ان دونوں کا؟"

"نہیں، کوٹھی تو سیل کر دی گئی ہے اور میں نے اپنے ہر ممکن ذرائع سے ان کا پتا لگانے کی کوشش کی ہے مگر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ میں خود جویریہ سے بات کر لوں؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"کر لو بات۔ ویسے چند دن انتظار کر لو تو اچھا نہیں۔ وہ تمہارے جذبات کو سمجھتی ہے۔"

"وقت......" اس نے ایک آہ سی بھری۔ "نزہت آپی! یہ وقت، بہت ظالم چیز ہے اور مجھے اس پر اعتبار نہیں۔ بے اختیاری سے بڑھ کر تکلیف دہ احساس اور کوئی نہیں۔ میں اس لمحے سے بے اختیاری کے برزخ میں جل رہا ہوں۔ جب صوفی صاحب نے مجھ پر شک کر کے اپنے گھر سے نکالا۔ ٹھیک ہے کہ ان کا شک غلط نہیں تھا، میں نے جویریہ سے محبت کی تھی اور اس نوخیز محبت کے جوش میں، میں نے صوفی صاحب کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی مگر یہ بھی سچ ہے، اس عمر میں اگر محبت ہو جائے تو کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ ان دنوں میں خود پر تھوڑا کنٹرول کر لیتا تو بھی صوفی صاحب کو پتا چل جانا تھا۔ میری حالت ہی کچھ ایسی تھی۔" وہ ہولے سے ہنسا۔ "اور صوفی صاحب محبت جیسی خرافات کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں، مجھے معلوم تھا۔ اس کے باوجود مجھ سے یہ جرم سرزد ہو گیا جسے میں نے تسلیم بھی کیا مگر ان کا جلال...... اللہ توبہ...... شکر ہے انہوں نے مجھے مار نہیں ڈالا۔ صوفی صاحب کے مجھ پر اس احسان کے علاوہ ان گنت احسانات ہیں، جنہیں میں ساری زندگی نہ چکا سکوں۔ انہوں نے مجھ سے یتیم، لاوارث کو خاک سے اٹھا کر اپنے برابر بٹھایا۔ مجھے علم کی روشنی سے متعارف کرایا، ورنہ شاید میں آج کسی یتیم خانے یا کسی فٹ پاتھ پر بیٹھا بھیک مانگ رہا ہوتا اور بھٹکنے کے لیے تو وہ لمحات بھی بہت نازک تھے، جب انہوں نے بیچ رستے میں مجھے دھتکار دیا۔ اگر آنٹی (فہد کی گرینی) مجھے نہ ملتیں، مجھ پر اعتبار کر کے اپنے سایۂ شفقت میں پناہ نہ دیتیں تو شاید آج میں اس باعزت مقام پر نہ ہوتا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو پوری زندگی میں مجھے کہیں بھی اپنی ذات سے متعلق خصوصی توجہ، محبت کے حوالے سے کوئی میٹھا جذبہ، خوشی کا احساس دل کے تار نہیں ہلاتا، سوائے ایک جویریہ کے خیال کے۔ سو بے اعتبار سا ہو رہا ہوں کہ کہیں زندگی کو ملنے والی یہ اکلوتی خوشی بھی نہ چھن جائے اور صبر یوں بھی مجھ سے نہیں ہو رہا کہ مجھے آفس کی طرف سے گھر الاٹ ہو گیا ہے اور اب میں اس گھر کو آباد کرنا چاہتا ہوں۔ اس اکلوتے خواب کی تعبیر سے جو میری آنکھ نے دیکھا ہے۔" جلیل آہستہ آہستہ بولتے ہوئے آخر میں جیسے جبراً مسکرایا تھا۔

"اللہ تمہارا خواب مبارک کرے اور گھر بھی مبارک ہو۔ اگر جویریہ تمہیں نہ ملتی تو......" نزہت نے پوچھا۔

"تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ صوفی صاحب کے پاؤں پڑ جاتا مگر یہ طے تھا کہ میری ہم سفر جویریہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔" وہ دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا تو اس کی نظر ادھ کھلی کھڑکی سے نظر آتے گلابی آنچل پر

پڑی، اسی پل اس آنچل کی اوٹ سے دو حیران سی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھہریں۔ جلیل کو اپنی جانب دیکھتے پا کر جویریہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئی تو جلیل کے لبوں پر بڑی جان دار سی مسکراہٹ ابھری۔

"تو مبارک ہو، جویریہ مان گئی ہے۔" نزہت اس کی مسکراہٹ پر بولی تو وہ اسے گھورنے لگا۔

"تو آپ میرے جذبات کی گہرائی جانچ رہی تھیں۔"

"جانچ چکی جناب! آپ ہی ہیں مجنوں، رانجھے اور مہینوال کے رنگیل جانشین۔ میں نے آنٹی سے بات کر لی ہے، اسی ہفتے نکاح کر دیتے ہیں تم دونوں کا۔ اب خوش۔"

"اسی ہفتے نہیں بلکہ کل شام کو، میں سارے انتظامات کر آیا ہوں اور میں نے چھٹی کے لیے بھی اپلائی کر دیا ہے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"تو گویا تمہیں جویریہ کے انکار اقرار کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تم مجھے بیوقوف بنا رہے تھے؟" نزہت خفگی سے بولی۔

"جلیل! یہ غلط بات ہے، رکو......" وہ نزہت کی پکار کو نظرانداز کرتا باہر نکل گیا۔

اسی لمحے معاذ ملازم کے ساتھ اندر داخل ہوا تو نزہت کا سارا جوش یکدم سرد پڑ گیا۔

"یوں منہ نہ لٹکایئے، میں آپ کے پتھر دل صنم کا کوئی پیام نہیں لایا ہوں۔ یہ انوی ٹیشن کارڈ ہے اور آپ کو آنا ہے، لازمی۔ ویسے شہباز بھائی کراچی گئے ہیں ایک ہفتے کے لیے، آپ آسانی سے آ سکتی ہیں۔" اس نے کھڑے کھڑے کارڈ تھماتے ہوئے تاکید کی۔

"بہت خوب۔ اکیلے اکیلے دلہا بھی بن گئے اور ہمیں ولیمہ کا کارڈ دینے چلے آئے۔ رہنے دیجئے، کیا ضرورت تھی۔" نزہت کارڈ دیکھ کر طنز سے بولی۔

"دلہا نہیں بنا، صرف پیپر سائن کیے تھے۔ دلہا تو اب ہی بنوں گا اور آپ نے آنا ہے لازمی، وعدہ کریں۔" وہ اصرار سے بولا۔

"وعدہ، آؤں گی۔ ضرور آؤں گی...... بلکہ میرے ساتھ دو گیسٹ اور بھی ہوں گے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"دو چھوڑ آپ دس گیسٹ لائیں مگر آنا ضرور ہے، ولیمہ میں خود آپ کو لینے آ جاؤں گا۔"

"جلیل! ادھر آؤ۔" نزہت نے باہر کی طرف جاتے جلیل کو پکارا تو وہ اندر آ گیا۔ "معاذ! یہ ایس پی جلیل ہے۔ تمہاری طرح میرا منہ بولا بھائی اور آنٹی کا بڑا فرمانبردار بیٹا اور جلیل! یہ معاذ ہے جس نے تمہیں بتایا تھا۔"

جلیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گرمجوشی سے معاذ سے مصافحہ کیا۔

"مگر میرا نمبر پہلا ہے، یاد ہے نا آپ کو؟" معاذ ہنستے ہوئے جتا کر بولا۔

"مجھے تو سب یاد ہے لیکن......" وہ کہتے کہتے رک گئی تو معاذ نے جلیل کو نزہت کے ساتھ آنے کی دعوت دی جسے قبول کرتے ہوئے جلیل خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"پھپھو آئیں گی؟" نزہت نے پوچھا۔

"مشکل ہے۔ ان کی صحت اب اس کی اجازت نہیں دیتی۔" معاذ نے جواب دیا تو نزہت چپ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"ام جان! آپ سے ایک بات کہنا تھی۔" رات گئے جب شہباز خان ماں کے کمرے سے اٹھ کر جانے لگے تو دہلیز تک پہنچ کر واپس مڑے، بغیر بولے اور یہ بات تو مسز خان کافی دیر سے نوٹ کر رہی تھیں کہ وہ کوئی بات کہنا چاہ رہے ہیں۔

"میں سن رہی ہوں شہباز خان۔" چند لمحوں کے معنی خیز سکوت کے بعد مسز خان نے نرم لہجے میں کہا تو شہباز خان کے حوصلے کی طنابیں پھر سے ہاتھوں سے نکلنے لگیں۔ وہ انہیں قدموں پر کھڑے سوچنے لگے۔

"حق بات پر بھی اس قدر سوچ بچار کی ممانعت کی گئی ہے شہباز خان!"

"ام جان۔۔۔" وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے ان کے پاس آئے اور دوزانو ہو کر نیچے کو جھکے۔ مسز خان کے سینے پر پڑے ضعیف ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں دیکھنے لگے۔

"ام جان۔۔۔ زہت زندہ ہے۔" ان کے ہاتھوں کو ذرا سا دبا کر انہوں نے بے حد مدھم سُر میں کہا اور ماں کے ردِّعمل کے انتظار میں ان کا چہرہ تکنے لگے جو پہلے کی طرح پُرسکون تھا۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ اسی پُرسکون لہجے میں بولیں۔

"آپ کو معلوم ہے؟" شہباز خان کی حیرت دوچند ہوئی۔ "کب سے۔۔۔ کیسے۔۔۔ آپ نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟" وہ شکوہ آمیز لہجے میں بولے۔

"بتایا تو خیر تم نے بھی مجھے نہیں۔ میں نے تو گلہ نہیں کیا۔ مجھے چند روز پہلے معاذ نے بتایا تھا۔۔۔" انہوں نے ذرا سا سر اونچا کر کے کہا۔

"میں چاہتی تھی اس بار فیصلہ تم خود کرو۔" وہ رکیں۔ "اور جو بھی فیصلہ کرو' بس اتنا ذہن میں رکھ لینا۔ چند سالوں بعد جب ارتضیٰ سوال کرنے کے قابل ہو گا تو اپنی ماں کے بارے میں تم سے چند چبھتے ہوئے سوال ضرور کرے گا۔ تم ان کے جواب ذہن میں تیار رکھنا۔۔۔ اب جاؤ' آرام کرو۔ آج آمنہ اپنے گھر کی ہو گئی۔ چند دن ہی وہ لڑکی اس گھر میں رہ کر گئی ہے اور یوں لگ رہا ہے جیسے سالوں سے ادھر ہی تھی۔ ساری فضا اس کے جانے سے اداس سی لگ رہی ہے۔ بیٹیاں خوشبو کی طرح ہوتی ہیں۔ رخصت ہو جائیں تو پیچھے بے نام سی اداسی چھوڑ جاتی ہیں۔ اللہ اسے بہت سی خوشیاں اور نعمتیں عطا کرے۔ ہم جیسے چراغِ سحری کے ہاتھوں میں تو بس دعا کے دیے ہوتے ہیں جو کسی کی زندگی کو روشنی کی آس دلا سکیں اور بس۔"

کہتے کہتے انہوں نے آنکھیں موند لیں تو شہباز خان عجیب سے احساسِ ندامت میں گھر کر باہر نکل آئے۔

"ام جان! بنا ہوا انسان کبھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا' اس لیے میری طرح بے چین رہتا ہے۔ میں خود اپنی ذات کے بھنور میں چکرا رہا ہوں۔ ارتضیٰ کے سوالوں کے کیا جواب دوں گا۔"

☆☆☆

یہ وہی گھر تھا جس میں داخل ہونے کی ناکام حسرت دل میں لیے زینب اس دنیا سے چلی گئی۔ اس طرح کے گھر اس طرح کی خواہشیں اس پارہ صفت لڑکی کو کتنا بے چین رکھتی تھیں۔ کاش زینب! تم تھوڑا دھیرے چلتیں تو شاید ایسی ہی کوئی تعبیر تمہاری تقدیر کا بھی حصہ بن جاتی۔ خواہش جتنی زور دار ہو گی' آدمی کی زندگی اتنی ہی تنگ کروے گی۔ میری بنت اللہ تمہاری آخری آرام گاہ میں تمہیں ڈھیر سارا سکون دے' اور تم اس جہان میں اماں جی اور بابا صاحب کے ساتھ بہت آرام سے ہو۔"

آمنہ نے آنکھوں کے بھیگتے گوشوں کی نمی کو چپکے سے ہتھیلی پر اتارا۔ بہت ساری رسموں کے بعد ابھی ابھی رخشہ حیات اپنی ملازمہ اور چند خواتین کے ساتھ اسے اس سجے سنورے کمرے میں بٹھا کر گئی تھیں جسے اس نے ایک نظر دیکھ کر ہی چہرہ جھکا لیا تھا کہ اتنے کی تمنا تو اس کے دل نے کبھی نہیں کی تھی۔ اتنے کی تمنا تو وہ کھلکھلاتی ہنسی والی زینب کرتی تھی اور اس پر بھی آمنہ اسے ٹوک دیا کرتی تھی۔

"جویریہ' عبدالمبین۔۔۔ کاش تم دونوں ہی میرے پاس ہوتے۔" وقت اور تقدیر دونوں کتنے بے رحم ہوتے ہیں۔ کوئی اپنا پاس ہو یا نہ ہو' وہ اپنا فیصلہ منوا کر ہی چھوڑتے ہیں۔

"میں اس ملاپ کو اتفاقیہ تو نہیں کہوں گا' مگر یہ میری اور تمہاری پلاننگ کا بھی یقیناً حصہ نہیں تھا تو پھر یہ ہماری قسمتوں کی ملی بھگت ہوئی نا جو ہم دونوں کو مخالف کناروں سے گھسیٹ کر اس خوبصورت بیڈ روم میں لے آئی ہے۔ کیا خیال ہے آمنہ! تمہارا اس بارے میں؟" معاذ اس کے پاس کس وقت آ کر بیٹھا' اپنی سوچوں میں گم اسے پتا ہی نہیں چل سکا۔ جواب میں اس کی جھکی گردن کچھ اور بھی جھک گئی۔

"دیکھو' تقدیر کے لکھے کی سزا انسانی اعضاء کو دینا کسی طور پر بھی انصاف ہے نہ عقل مندی' گردن کو اتنا جھکاؤ گی تو بہت کچھ غیر متوازن ہو کر بالآخر تمہیں ہی تکلیف دے گا۔ پلیز ذرا میری طرف دیکھو۔" معاذ نے اس کی جھکی گردن کو اٹھانے کے لیے شہادت کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا تو وہ کچھ اور بھی سمٹ گئی۔

"آمنہ! کیا اپنے ہم سفر کے طور پر تم نے کبھی میرے بارے میں سوچا تھا؟" وہ اس کے سجے سنورے روپ کو نگاہوں کے رستے دل میں اتارتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھنے لگا۔

"بولو نا۔" آمنہ لب بھینچے آنکھیں میچے کسی مورتی کی طرح ساکت تھی۔ معاذ کے اصرار پر اس نے خفیف سا سر نفی میں ہلا دیا۔

"تو پھر یہ ہوئی نا قسمتوں کی ملی بھگت۔ اب ہم دونوں کو مجبوراً یہ سب بھگتنا پڑے گا۔ کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے بے بس لہجے میں کہا تو آمنہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ نظریں ملتے ہی معاذ ہنس پڑا تو ایک دھیمی سی مسکان اس کے لبوں پر بھی دوڑ گئی۔

"ہاں' اب تو مجبوری ہے۔" وہ بھی شرارت سے بولی۔

"تمہاری مجبوری کی ایسی کی تیسی محترمہ! آپ کی تلاش میں معلوم ہے' میں کدھر کدھر پھرتا رہا ہوں۔ نہ جانے کس کونے میں روپوش ہو گئی تھیں۔"

معاذ نے آمنہ کی گود میں دھرے دونوں حنائی مہکتے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے قدرے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ آمنہ کو اس کی جسارت پہ کرنٹ سا لگا۔ تڑپ کر نگاہیں اٹھائیں اور دوسرے پل گھبرا کر پھر سے جھکا لیں۔

"ایسا کیا چرا لیا تھا میں نے؟ آپ کا میڈل تو واپس کر دیا تھا۔" وہ ہاتھ چھڑانے کے لیے مزاحمت کرتے ہوئے بولی۔

"میڈل واپس [illegible] چرا لیا تھا' اتنی قیمتی شے کے چور کو نہ تلاشتا بھلا؟" وہ اس کے قریب نیم دراز ہو کر [illegible]

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ کسمسا کر اپنے ہاتھ چھڑانے لگی۔

"مگر یہ تو جھوٹ نہیں کہ پہلی نگاہ کا تصادم میرا جاں لیوا تھا۔ اسی پل میں نے سچے دل سے تمہیں پانے کی دعا کی تھی اور آج مجھے یقین آ گیا کہ اللہ دل سے کی گئی دعا کو کبھی رد نہیں کرتا۔ تم تک پہنچنے میں مجھے کچھ تاخیر ضرور ہوئی' میری دلی خواہش تھی کہ میں اماں جی اور صوفی صاحب کی دعاؤں کے سائے میں تمہیں رخصت کرا کے لاتا۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ آمنہ! ہر انسان اپنے لیے ایک اچھے اور نیک ہم سفر کی تمنا کرتا ہے اور صوفی صاحب نے تمہاری تربیت جس ڈھب سے کی ہے' مجھے یقین ہے کہ تمہارا ساتھ میرے لیے اور میرے گھر کے لیے کسی انمول نعمت سے کم نہیں ہو گا۔ میرے والدین نے ایک عرصے تک میری جدائی سہی ہے' اس لیے میری یہ کوشش ہے اور ہو گی کہ میری طرف سے انہیں کبھی کوئی دکھ نہ ملے۔ کیا میری اس خواہش کی تکمیل میں تم میرا ساتھ دو گی۔" آمنہ نے معاذ کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا حنائی ہاتھ رکھ دیا۔

"میں زندگی کے ہر قدم' ہر موڑ پر آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کے ہر فیصلے میں آنکھیں بند کر کے پورے یقین کے ساتھ شریک۔۔۔"

وہ مستحکم لہجے میں پورے اعتماد سے بولی تو معاذ کو لگا آدھی عمر کی تھکن ان الوہی لمحات نے چپکے سے چرا کر کہیں ڈھیر ساری ان چھوئی خوشیاں اس کے دامن میں بھر دی ہیں۔ ایسی ہی سرشار کیفیت آمنہ کے دلفریب چہرے پر موجزن تھی۔ دونوں کے دل ان اچھوتے لمحات میں یقین کی دولت سے مالا مال ہو رہے تھے کہ جس کو یقین مل گیا' زندگی کی ساری روشنی مل گئی۔ معاذ نے آمنہ کے مہکتے ہاتھوں پر اپنے لب رکھتے ہوئے یقین کی مہر ثبت کی تو رات کی تاریکی میں جیسے ڈھیر سارے جگنو ٹمٹمانے لگے۔

☆☆☆

نزہت کے لیے وہ لمحہ بھی اس کی زندگی کے مشکل ترین لمحات میں سے ایک تھا۔ جب وہ ولیمہ کی تقریب میں شرکت کے لیے جویریہ اور جلیل کے ساتھ ہوٹل کی داخلی دروازے تک پہنچی رعنا حیات بے حد محبت سے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ چکی تھیں اور معاذ اسے دیکھتے ہی اسٹیج سے اتر کر فوراً اس کے پاس آ پہنچا تھا۔ اس کے پاس واپس مڑ جانے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ شہباز خان کی نظروں کے حصار میں تو وہ آتے ہی جکڑی گئی تھی۔ بھاگ تو وہ مسز خان کی نظروں سے کہیں اور جانا چاہتی تھی جو یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھیں' آمنہ کے بالکل پاس اسٹیج پر بیٹھی۔ مسز خان نے نزہت کو آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ نزہت کے دونوں قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔ رعنا حیات اس سے گرم جوشی سے معانقہ کرنے اور چند شکریہ کے الفاظ کہنے کے بعد دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں جبکہ وہ کسی پتھر کے بت کی طرح وہیں ایستادہ تھی۔

"آپی! اب آ بھی جائیں۔" معاذ کی سرگوشی اسے صور پھونکنے سے کم نہ لگی۔ اس نے یونہی بچاؤ کے لیے پیچھے کھڑی جویریہ کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا؟" جویریہ کی حالت تو اس سے بھی دگرگوں تھی۔

سجا سجایا چہرہ' بنا سنورا روپ جیسے آندھیوں کی زد میں تھا۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسو اب اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ وہ یک ٹک اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جویریہ... جویریہ... کیا ہوا... کیا بات ہے؟" نزہت اس کی حالت پر گھبرا گئی۔ معاذ اور جلیل نے بھی پلٹ کر جویریہ کو دیکھا جو سب کی نظروں سے بے خبر جھر جھر بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہیں اور ہی پہنچی ہوئی تھی۔

"آمنہ آپی... آمنہ آپی...!" اس کی بڑبڑاہٹ سب سے پہلے معاذ نے سنی تھی اور پھر جلیل نے... اس سے پہلے کہ وہ بھی پہچان کی منزلیں طے کرتے' کچھ کہتے' وہ تقریباً بھاگتی ہوئی آمنہ تک پہنچی تھی جو خود حیران سی جویریہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مسز خان [illegible]

"آمنہ آپی... آمنہ آپی... کہاں تھیں آپ؟" جویریہ اس [illegible]

"جویریہ... میری بہن... کہاں چھپ گئی تھیں تم۔" آمنہ دیوانہ وار اسے چومے جا رہی تھی جبکہ وہ اسی رفتار سے رو رہی تھی۔

"آپی! چھپ تو آپ گئی تھیں۔ ہم سب گم ہو گئے' نہ جانے کہاں کہاں۔" وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولی۔

"بس کرو جویریہ! سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ تم نے تو بھئی ولیمہ کی دلہن کو رلا دیا' ورنہ تو آج تک ولیمہ کی دلہن کو ہنستے ہی دیکھا گیا ہے' بس کرو میری بہن!"

نزہت نے پیچھے سے آ کر جویریہ کو آمنہ سے الگ کرتے ہوئے کہا تو دونوں کو جیسے موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ ہال میں موجود ہر شخص کی نظریں ان پر تھیں۔ نزہت نے ٹشو سے جویریہ کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے صاف کیا۔

"آپ کی شادی ہو گئی آپی!" وہ اپنی جذباتی کیفیت سے سنبھلی تو بچوں کی طرح پوچھنے لگی۔ آمنہ نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

"بھئی! اسے کیوں شرمندہ کر رہی ہو' تمہاری بھی تو ہو گئی ہے۔" اب حیران ہونے کی باری آمنہ کی تھی۔

جویریہ سرخ پڑتے چہرے اور لرزتی پلکوں کے ساتھ آمنہ کو کتنی خوبصورت لگی۔

"کب... کس کے ساتھ؟" وہ حیرانی سے گویا ہوئی۔

"جلیل... ایس پی جلیل صاحب کے ساتھ۔ جویریہ بتا رہی تھی کہ تم جانتی ہو جلیل کو؟"

نزہت خود کو مسز خان کی بولتی نظروں سے بچانے کے لیے ان دونوں بہنوں سے جان بوجھ کر محو گفتگو تھی۔

نزہت کے بتانے پر آمنہ نے بے اختیار معاذ کے ساتھ آتے جلیل کو دیکھا تو اس کا دل ایکدم پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔

"پھپھو...!" آمنہ' جلیل سے مل رہی تھی' جب نزہت ہولے سے مسز خان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"اچھا! تمہیں یاد ہے کہ میں تمہاری پھپھو ہوں۔" وہ ناراضی سے منہ پھیر کر بولیں تو نزہت کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ وہ وہیں کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا مگر یہ جگہ رونے کے لیے بالکل غیر موزوں تھی۔

"شاید تم نے مجھے کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔" وہ سر اونچا کر کے اسے دیکھنے لگیں تو نزہت بے دم سی ہو کر ان کے پاس پڑی کرسی پر گر سی گئی۔

"کتنا ظلم کیا تم نے میرے ساتھ' اس معصوم کے ساتھ اور... اپنے ساتھ۔" انہوں نے بچوں کے ساتھ کھیلتے ارتضیٰ کو دیکھ کر ہولے سے کہا۔ نزہت نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"مانتی ہوں' تمہارے ساتھ بھی کچھ زیادتی ہوئی مگر کیا اس کا حل صرف فرار تھا اور وہ بھی ایسا تکلیف دینے والا۔ تمہیں ایک پل کو بھی مجھ ضعیفہ کا خیال نہ آیا کہ مجھ پر کیا گزرے گی۔" وہ اس پر ناراض نظریں جما کر بولیں۔

"میں کیا کرتی...؟" اس نے ایک سسکی سی لی۔ "مجھے معاف کر دیں' میں آپ کی اور ارتضیٰ کی مجرم ہوں۔" اس نے بھیگی پلکوں کو جھپکا۔

"سزا کے لائق صرف تم نہیں' یہ نالائق بھی ہے۔ بولو یوں بھاگ کر تم دونوں کو کیا ملا۔ سوائے دکھ' اذیت اور پچھتاوے کے اور اس معصوم کا بچپن تم دونوں کی ضد کی بھینٹ چڑھ گیا۔" وہ دو قدم پر کھڑے شہباز خان کو دیکھتے ہوئے ملامتی لہجے میں بولیں۔

"ارے بھئی شہباز! مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ یہ آپ کی مسز ہیں۔ پہلی نظر میں مجھے کچھ شناسائی کا احساس ہوا مگر یہ کافی سال پہلے کی بات ہے جب آپ دونوں ہمارے گھر آئے تھے۔ رئیلی مسز شہباز! بہت خوشی ہوئی مجھے دوبارہ آپ کو سامنے دیکھ کر۔ آپ دونوں کا کپل تو مجھے پہلی نظر میں ہی بہت شاندار لگا تھا۔"

رعنا حیات اسٹیج پر آتے ہوئے نزہت سے... نزہت کو ہاتھ ملا کر گرمجوشی سے بولیں تو نزہت اور شہباز نے ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں چرا لیں۔

"بھئی آج کا دن' یہ فنکشن بہت مبارک ہے۔ میری بیٹی کو اپنی بہن مل گئی اور شہباز خان! آپ کیوں روٹھے روٹھے سے کھڑے ہیں۔ کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں۔ آپ دونوں آئے بھی الگ الگ ہیں... او... ہاں مجھے یاد آیا۔ معاذ نے ذکر تو کیا تھا شہباز بری بات... میاں بیوی میں لڑائی ہونی چاہیے محبت کی علامت ہے مگر اتنی طویل نہیں کہ عنوان بن جائے۔ آنٹی! آپ نے نہیں سمجھایا؟"

رعنا حیات کا موڈ آج بہت خوشگوار تھا۔ شہباز خان نے انہیں پہلی بار اتنا بولتے دیکھا تھا۔

رعنا حیات اب مسز خان سے باتوں میں مگن تھیں اور نزہت شہباز کی گہری نظروں سے ہراساں ہوئی جا رہی تھی۔

"ام جان! چلیں اب۔" فنکشن اختتام کے قریب تھا۔ جب شہباز نے آ کر کہا۔

"بھئی ان کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔ یہ دادی پوتا میرے ساتھ آ جائیں گے۔ آپ اپنی مسز کو لے کر نکلیں۔" رعنا حیات کھنکتی آواز اور تازہ دم لہجے کے ساتھ نہ جانے کس کونے سے آ نکلی تھیں۔ شہباز خان نے کچھ پریشان نظروں سے پہلے ماں کی طرف اور پھر ان کے پاس بیٹھی نزہت کو دیکھا جو ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تو گویا فیصلے کی گھڑی آ پہنچی۔" نزہت نے مٹھی میں جکڑے ٹشو کو بھینچا۔

مسز خان' رعنا حیات' معاذ' شہباز خان سب کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے دھند سی چھانے لگی۔

"وہ بہت بار اس شخص کے سامنے جھکی تھی اور ہر بار اس کا جھکنا شہباز خان کے طنطنے میں اضافہ ہی کرتا چلا گیا اور اب پھر حکم کہ وہی جھکے... ایک بے فائدہ مشق بار بار دہرانے سے جس کا انجام ہر بار اس کی ذلت پر منتج ہوتا

رہا ہے" ایک بار پھر دہرا ڈالے۔

اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور جسم کسی مردہ لاش کی طرح بے جان ہوا جا رہا تھا۔ وہ عقل کے فیصلے پر دل ـــ کو راضی نہیں کر پا رہی تھی۔

کاش وہ ادھر نہ ہی آئی ہوتی۔ آخری کاش جو اس کے ذہن کی دیواروں سے ٹکرایا۔

"چلیں پھر ـــ" بے حد گمبھیر محبت بھری مدھم سرگوشی اس کے کانوں میں گونجی اور اس کا کچ کپکپاتا ہاتھ شہباز خان کے مضبوط گرم توانا ہاتھ کی آغوش میں پناہ گزین ہو گیا۔

زندگی سے بھرپور گرم گرم لہریں سنسناتی ہوئی اس کے پورے بدن میں دوڑ گئیں۔ وہ کسی پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہو کر اپنی نشست سے اٹھی اور اسی مضبوط سہارے کے حصار میں چلتی باہر تک آ گئی۔

"کچھ کہو گی نہیں؟" رات بہت گہری ہو چکی تھی' سیدھی شفاف سڑکیں پول لائٹس میں چمکتی شناسا سی لگ رہی تھیں۔

اسے لگا وہ ان رستوں سے گزرتی رہی ہے۔ کتنے اپنے اپنے سے رستے لگ رہے تھے۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے دائیں جانب بیٹھے اس شخص کو دیکھا جس کے وصل میں بھی اس نے ہجر کا دکھ اٹھایا تھا اور آج اس لمحے ـــ جیسے سب فیصلے ہونے جا رہے تھے' وصل میں ہجر یا ـــ ایک طویل ہجر کے بعد صبحِ وصل کا حسین آغاز۔

گاڑی کی مہکتی فضا میں شہباز خان کا جملہ کسی بازگشت کی طرح لہرا کر چپ ہو گیا۔ انہوں نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا جو انہیں آج بھی اتنی حسین اور پرکشش لگ رہی تھی' جتنی ـــ جتنی ہمیشہ لگا کرتی تھی۔ شاید یہ اس کے حسن کا ہی بے اختیار جادو تھا جس نے انہیں کبھی کسی انتہا پر نہیں پہنچنے دیا۔

"میں اپنے حصے کے سب لفظ بول چکی ہوں۔ انہیں ایک بار پھر دہرانے کا فائدہ ـــ" بہت دیر بعد نزہت سوچ سوچ کر بولی تھی۔ اس نے ایک بار پھر فیصلے کی گیند شہباز خان کے کورٹ میں پھینک دی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" انہوں نے گاڑی کی اسپیڈ بے حد آہستہ کر دی۔

"اتنے برس کی جدائی ہو تو آخر کام کر جاتی ہے۔" انہوں نے اس کے ملیح چہرے پر اپنی نگاہیں جمائیں۔ "ان برسوں میں میری سوچیں کس کس انتہا تک نہیں پہنچیں۔ میں اس بارے میں کیا کہوں ـــ بس یہ سن لو میں محبت گمشدہ کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹکتا رہا اور مجھے پتا چلا کہ میری گمشدہ محبت تو میرے اندر بسی ہے تو مجھے اپنی اس لاحاصل جستجو پہ بہت رونا آیا۔ جب اتنا بھٹکنے کے بعد بھی تم میرے پہلو میں بیٹھی ہو تو جان لو۔

I cant live without you (میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔)

میرا خیال ہے دنیا کے پہلے مرد نے دنیا کی پہلی عورت سے یہ الفاظ کہے ہوں گے اور خوش قسمتی سے تم نے بھی سن لیا ہوگا۔ آج ان لمحوں میں' میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے بہت سوچا بہت کوشش کی مگر تمہارے خیال سے نہیں بھاگ سکا۔ فاصلے' دوریاں کچھ بھی نہیں آ سکیں۔ تم تو میرے اندر براجمان تھیں پھر میں کہاں بھاگتا' میرا تو یہ احوال ہے۔ فرار تو تم بھی حالات سے ہوئی تھیں' ہم کہو ـــ"

گاڑی رک چکی تھی اور شہباز خان کی گرم نگاہیں اس کے چہرے کے بے حد قریب اپنا جادو جگا رہی تھیں۔

"اگر میرے ساتھ بھی یہی کچھ نہ بیتا ہوتا تو میں اس وقت آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔ بہت پہلے اپنی زندگی کا حتمی فیصلہ کر چکی ہوتی۔" اس نے لرزتی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں سے بمشکل کہا۔ گاڑی میں ایک پل کو معنی خیز خاموشی چھا گئی۔

"پھر تو ہم دونوں پاگل ہیں۔ ایک دوسرے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے وہیں تک آ پہنچے۔" ان کی مدھم سی ہنسی نزہت کو بہت اپنی اپنی سی لگی۔

"بعض اوقات جذبات انسان سے مشکل ترین فیصلہ پلک جھپکتے میں کرا دیتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا میں وہی

نزہت ہوں' جس کی شکل سے آپ کو نفرت ـــ" شہباز خان نے بے اختیار اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم وہ نزہت ہو جس کے بغیر شہباز خان کے لیے زندگی' زندگی نہیں رہتی۔ ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ مجھے اس تھکا دینے والی مسافت نے صرف یہ نکتہ سمجھایا ہے' اس کے علاوہ میں کچھ اور نہیں سمجھنا چاہتا۔ تم میرے پاس میرے بے حد قریب ہو گی تو بہت سی قلبی ذہنی کثافتیں خود بخود محبت کے فلٹر سے کشید ہو کر نتھر جائیں گی۔ بہت ساری ذہنی فرسٹریشن محبوب سے دوری کا بھی تو نتیجہ ہوتی ہے۔ دوریاں' وسوسے اور شکوک کو جنم دیتی ہیں۔ میں آج ان دوریوں کو ختم کرتے ہوئے پورے یقین کے ساتھ اس شہرِ محبت میں داخل ہونا چاہتا ہوں جہاں صرف تمہاری حکومت ہے' جہاں ڈھیر ساری سچی خوشیاں اور ڈھیر ساری روشنیاں ہم دونوں کی منتظر ہیں۔ بس اس ظالم انا اور خود پسندی کے بھنور سے نکلنے کے لیے میرا ہاتھ تھام لو۔" ان کے لہجے' ان کی نگاہوں سے کیسی آنچ نکل رہی تھی کہ نزہت کا پورا وجود جیسے پگھلنے لگا۔ اس نے بے اختیار ان کے پھیلے ہاتھوں پر اپنا چہرہ گرا دیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو ان ہتھیلیوں پر گرے تو شہباز خان نے جھک کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"بس نزہت! تم اپنے حصے کے سارے آنسو بہا چکیں۔ اب تمہارے حصے کی ہنسی تمہارے لبوں سے آزاد ہونے کو بے چین ہے۔ کیا مجھے ان خوبصورت لمحوں میں یہ حسین تحفہ نہیں دو گی۔ ایک میٹھی مسکان کہ میرے ڈولتے دل کو یقین آ جائے کہ یہ سارے خیالات میرے نہیں' تمہارے بھی ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لیے بے خود ہوئے جا رہے تھے۔ نزہت کو ایکدم ہنسی آ گئی۔

"ویسے آپ بھول رہے ہیں' یہ شاہراہ عام ہے' آپ کا بیڈ روم نہیں۔" کہتے ہوئے وہ ذرا سا پرے کھسکی۔ انہوں نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔

"یہی شاہراہ عام ہمیں شاہراہ دل تک لے گئی ہے۔ اے سڑک تیرا شکریہ۔ کیا خیال ہے' شکریہ سے کام چل جائے گا؟"

"پہلے کا نہیں دو ڑے گا۔ اب جلدی چلیں تا کہ پھپھو اور دار تنفی نہ ـــ"

"اوہو یہ بے چینیاں ـــ" ان کے ذو معنی انداز پر وہ جھینپ کر باہر دیکھنے لگی۔ اسے پہلی بار رات کی ان تاریکیوں پر اس قدر پیار آیا تھا۔ ان تاریکیوں نے ہی تو کب سے کچھ چھینا تھا اور ان ہی تاریکیوں نے آج سب کچھ لوٹا دیا تھا۔ نزہت نے ایک مسکراتی نگاہ آسمان پر چمکتے ستاروں پر ڈالی تو وہ بھی جیسے اس کے ساتھ ہنس پڑے۔

☼ ☼ ☼

"آمنہ! جلدی چلو' تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔" معاذ نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی سامنے بیٹھی آمنہ سے کہا تو وہ حیرانی سے تکنے لگی۔

"کیسا سرپرائز؟"

"تم چلو گی تو خود سے دیکھ لینا۔ چلو اب اور دیر نہیں کرو۔" وہ اس کا بازو کھینچ کر باہر کی طرف لے جانے لگا۔

"اُف ـــ مما گھر پر نہیں ہیں۔ میں چادر تو لے لوں۔"

"دس ملازم گھر میں موجود ہیں اور یہ سات گز کا تنبو نما دوپٹہ کسی چادر سے کم تو نہیں۔ ٹھیک ہے' لے آؤ تم ـــ" معاذ نے اس کی ایک نہیں سنی۔

"آخر کچھ بتائیں تو سہی۔" جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی' آمنہ رہ نہ سکی۔

"سب سے اچھی خاموشی مائی وائف ـــ ایک منٹ اترو۔ ادھر سے پھولوں کا گجرا لینا ہے اچھا سا۔" معاذ نے ایک فلاور شاپ کے سامنے گاڑی روکی تو آمنہ بھی اس کے پیچھے اتر آئی۔

پھول لے کر دونوں باہر نکلے۔ معاذ گاڑی کی طرف بڑھا اور آمنہ کی نظر یونہی ـــ بالکل اتفاقاً سامنے گاڑی سے اترتے کپل پر ٹھہر گئی۔

عبدالمتین اپنی بیوی کے ساتھ بالکل اس کے سامنے تھا۔ اس کی نظریں بھی آمنہ کے چہرے پر رکی تھیں۔ ایک سرد سی شناسائی کی لہران نگاہوں میں تھی۔

"چلو نا۔" عبدالمتین کی بیوی نے اس کی محویت پر اسے ٹہوکا دیا پھر شوہر کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

"یہ... آپ جانتے ہیں کون ہے؟" وہ متجسس لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں... کوئی نہیں...." اس نے اسی اجنبی آواز میں کہا اور دوسری جانب مڑ گیا۔

سامنے سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں شور مچانے لگیں۔

"نہیں' کوئی نہیں... نہیں کوئی نہیں... نہیں..."

سامنے شاپنگ آرکیڈ کی گلاس لفٹ بجلی کی سی تیزی سے شور مچاتی اوپر نیچے دوڑنے لگی۔ "نہیں' کوئی نہیں... نہیں کوئی...."

وہ سر تھام کر گرنے کو تھی کہ معاذ نے اسے سہارا دیا۔

"کیا ہوا آمنہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ اس کی اڑی رنگت دیکھ کر بولا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" وہ خود کو سنبھال کر گاڑی میں جا بیٹھی۔

سارا راستہ وہ غائب دماغ سی بیٹھی رہی۔

گاڑی کسی کلینک کے سامنے آ کر رکی تھی۔

وہ کسی معمول کی طرح معاذ کے ساتھ چلتے ہوئے ٹھنڈے کاریڈور سے گزرتی اس روم میں داخل ہوئی۔

سامنے سفید براق بستر پر نحیف و نزار.... شاید.... عبدالمبین کا ڈھانچہ پڑا تھا اور اس کے سرہانے.... کمزور پژمردہ ملگجے لباس میں شہرینہ....

آمنہ کو زور کا چکر آیا' اس نے بہت مضبوطی سے معاذ کا بازو تھام لیا۔

"یہ... یہ عبدالمبین... اس حال میں...." وہ بے اختیار ... شاید سمجھا یا بے ہوش ... وہ تھی دیر بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی اور شہرینہ بے تاثر چہرہ لیے کسی روبوٹ کی مانند بیٹھی رہی۔

"کثرت سے نشہ آور ادویات کے استعمال سے اس کا یہ حال ہوا ہے۔ بہرحال علاج شروع کروا دیا گیا ہے۔ انشاء اللہ عبدالمبین جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔" معاذ نہ جانے کس کو دلاسا دے رہا تھا' بت بنی شہرینہ کو یا روتی آمنہ کو۔

ایک گھنٹے بعد وہ نڈھال سی گھر واپس آ گئی۔

دونوں بھائی ملے اور دونوں نے اس کو نظر بھر کر دیکھا تک نہیں۔

"تم فکر نہیں کرو' عبدالمبین جلد ٹھیک ہو جائے گا۔" معاذ اسے راستہ بھر تسلیاں دیتا آیا تھا۔

اور اس کی یہ ساری تسلیاں دوسرے دن ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔

"خدا جانے دونوں رات ہی میں کہاں چلے گئے بہت ڈھونڈا مگر...." معاذ اگلی صبح اسے تھکا تھکا سا بتا رہا تھا۔

آمنہ بھر بھری ریت کی طرح بیٹھتی چلی گئی۔

"میرا خیال ہے وہ اس شہر میں ہی نہیں' میں نے ہر جگہ کوشش کی ہے۔" معاذ نے ایکدم اس کی آس بھری نظروں کے جواب میں آہستگی سے کہا تو آمنہ ایک آہ بھر کر چپ کر گئی۔

اس نے تو جویریہ کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ یوں بھی بتانے کو تھا بھی کیا۔

☆ ☆ ☆

فائیو اسٹار ہوٹل میں گرینڈ فنکشن تھا' مکس گیدرنگ کے ساتھ۔

فخر حیات نے معاذ کے ہاسپٹل کی تکمیل کے اعزاز میں یہ شاندار تقریب رکھی تھی۔

اگرچہ اس گھر میں اس طرح کے فنکشن روز کا معمول تھا مگر آمنہ ابھی تک اس معمول کی عادی نہیں ہو سکی

تھی۔ اس وقت بھی وہ فل سلیوز کے ساتھ سر پر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے معاذ کے پہلو میں فخر حیات کے بالمقابل کھڑی آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔

شروع شروع میں رعنا حیات نے آمنہ کے لباس پر تنقید کی تھی مگر معاذ نے انہیں فوراً ٹوک دیا۔

"مما! مجھے آمنہ اسی طرح اچھی لگتی ہے۔ پلیز آپ اسے ٹوکیں نہیں۔" اور معاذ کی خوشی رعنا حیات کی کمزوری تھی۔

"مسٹر عبدالمتین اور مسز اور یہ میری ڈاٹر ان لاء آمنہ معاذ اور یہ میرا بریلینٹ سن معاذ حیات۔ آپ تو پہلے بھی مل چکے ہیں۔" فخر حیات کی فریش آواز آمنہ کی سُن ہوتی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے اپنے ماں جائے کو تکنے لگی۔

"ارے آمنہ! یہ تم ہو' ریئلی۔ ان بلیوایبل...." آمنہ کو لگا وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ عبدالمتین اسے کندھوں سے پکڑے گرمجوشی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں آمنہ کو؟" فخر حیات کچھ حیران ہوئے۔

"یس سر! مائی رئیل سسٹر۔ آمنہ کیسی ہو تم' کیا پہچانا نہیں۔ اصل میں میں ایک عرصہ تو باہر رہا ہوں فیملی کے ساتھ...."

"کیسے ہیں بھائی آپ!" آمنہ بمشکل مسکرائی۔

"اے ون۔ تم سناؤ' ایلیٹ کلاس کی ممبر شپ مبارک ہو۔" اس کی سرگوشی اتنی بلند تھی کہ آمنہ کے ساتھ پاس کھڑے معاذ نے بھی سن لی۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"تو آپ صرف ان ہی لوگوں ... کو اعزاز بخشتے ہیں جو اس کلاس کی ممبر شپ حاصل کر سکیں۔ بہت ذہین ہیں آپ!" معاذ کے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے عبدالمتین مسکرانے لگا تو آمنہ کو بہت عجیب لگا۔

"تو آج دولت نے سفید خون کو پھر سے سرخ کر دیا۔" وہ پاس کھڑے مسکرا کر باتیں کرتے عبدالمتین کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

"آؤ آمنہ! تمہیں ایک اسپیشل گیسٹ سے ملواؤں۔" معاذ کچھ دیر بعد اسے دوسری طرف لے گیا۔

"ان سے ملو' یہ ہیں مس شاہ۔ امریکہ سے اپنی میڈیسن کی تعلیم مکمل کر کے چند ماہ پہلے ہی لوٹی ہیں۔ دو تین سیمینارز میں ہمارا اکلوز کانٹیکٹ ہوا تو میں ان کے خیالات سے بہت متاثر ہوا۔ سوچا تمہیں ضرور ملواؤں گا۔"

آمنہ کو لگا ہال کی ساری روشنیاں اس پری چہرہ کے حسن کے سامنے مدھم پڑ گئی ہیں۔

میرون اور ڈیپ ریڈ کنٹراسٹ میں وہ شعلہ جوالہ سارے ہال میں منفرد دکھائی دے رہی تھی۔ آمنہ نے اپنی زندگی میں اتنا مکمل حسن شاید ہی دیکھا ہو کہ مدمقابل سلام کا جواب دینا بھول جائے۔ معاذ اسے چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گیا۔

"آمنہ.... آپ ہیں۔ ڈاکٹر معاذ نے بہت ذکر...." کہتے کہتے رک کر وہ کچھ الجھن بھری نظروں سے آمنہ کو دیکھنے لگی۔ کچھ ایسا ہی حال آمنہ کا تھا۔

"جھومر!" آمنہ کے لبوں سے سرگوشی سی نکلی۔ "آپ.... تم احمد پور...."

مس شاہ نے ایک گہرا سانس لیا۔

"تو گویا میں تمہیں یاد ہوں۔ آؤ ادھر بیٹھتے ہیں۔" وہ دونوں سائیڈ میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"تم تو چلی گئی تھیں' شاید حویلی کے کسی ملازم کے ساتھ۔ مجھے ٹھیک سے نام یاد نہیں۔" آمنہ نے قصداً اس کے بھاگ جانے کا ذکر نہ کیا' ان دنوں جب زینب اور وہ بلکہ پورے گاؤں کی زبان پر جھومر کے حسن کے چرچے تھے۔

"نہیں، میں کسی کے ساتھ نہیں بھاگی تھی۔ میں چھوٹے شاہ جی سید سلطان بخت کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی تھی، جہاں انہوں نے مجھ سے نکاح کیا اور پھر مجھے وہیں رکھا۔ مجھے دولت مند بننے کا شارٹ کٹ چاہیے تھا اور شاہ جی حسن کے دلدادہ۔ سودا برا نہیں تھا۔ وہ مہینے دو مہینے بعد چار پانچ دنوں کے لیے آتے اور باقی وقت میں اس چار کنال کی کوٹھی میں پاگلوں کی طرح پھرتی۔ بس پھر میں نے پڑھنے کا فیصلہ کیا اور پڑھتی چلی گئی۔ شکر ہے شاہ جی نے مجھے اس معاملے میں روکا نہیں۔ اب میری تعلیم مکمل ہو گئی ہے اور میں یہیں آ کر سیٹل ہونا چاہتی ہوں مگر شاہ جی۔۔۔۔ انہیں یہ بات پسند نہیں۔" وہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

"تو کیا تم واپس چلی جاؤ گی؟"

"ہاں مگر امریکہ نہیں، اپنے گاؤں سوات کے اس مضافاتی گاؤں میں جہاں آج بھی زندگی کی بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں ہیں۔ وہاں اسپتال بنا رہی ہوں، بہت بڑا نہیں مگر اتنا کہ اس پچھتاوے کا کچھ کفارہ ادا ہو سکے جو میں نے اپنے ماں باپ کو دکھ دے کر مول لیا۔ تم سناؤ، زینب کہاں ہوتی ہے۔ اس کے بھی تو بڑے بڑے خواب تھے خوب دولت حاصل کرنے کے بارے میں۔۔۔"

جھومر کے سوال پر آمنہ کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔

"زینب وہاں ہے جہاں ہر خواب، ہر خواہش مٹی میں مل جاتی ہے۔ انسانی جسم کے ساتھ۔۔۔"

"کیا۔۔۔!" اس نے بے اختیار اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور آمنہ کو لگا وہ کچھ دیر اور ادھر بیٹھی رہی تو اس کا دل ضبط غم سے پھٹ جائے گا۔ وہ ایکدم سے اٹھی اور "ایکسکیوزمی" کہہ کر واش روم میں چلی گئی۔ جھومر افسوس بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

"میرے اللہ۔۔۔ تو نے آدمی کو خواب دیکھنے والی آنکھ کیوں دی۔ کیوں۔۔۔؟"

وہ ٹیبل پر سر رکھ کر اپنے آنسوؤں کا رستہ روکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"اُف۔۔۔ آپ کو کچھ احساس بھی ہے، گھر میں فاطمہ اور توحید مما پپا کو کتنا تنگ کر رہے ہوں گے۔ آج ہمیں گھر سے نکلے تیسرا دن ہے اور اب بھی آپ کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔"

آمنہ کچھ تو اس تیز برستی بارش سے خائف ہو رہی تھی، کچھ معاذ کے بے فکر رویے سے۔

"میری جان! ہم شادی کے پورے آٹھ سال بعد اس ننھے منے سے ہنی مون کے لیے نکل سکے ہیں، وہ بھی تمہیں تین دن سے چبھ رہا ہے اور ان ننھے شیطانوں میں دادا، دادی کی جان ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے تو تمہارے سامنے مما پپا سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے ہمیں جب دل چاہے واپسی کا عندیہ دیا ہے۔" معاذ نے برستی بارش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ بارش کی وجہ سے گاڑی کی اسپیڈ بھی خاصی کم تھی۔

"اور آپ کو کھلی چھٹی مل گئی اور اتنی ناشکری کیوں کر رہے ہیں۔ اسپشلائزیشن کے لیے تین سال آپ یو کے میں گزار کر آئے ہیں، چھ ماہ کے لیے میں بھی آپ کے ساتھ تھی۔ ایک نہیں کانٹا نکلتا آپ کے دل سے تو اس ہنی مون کا۔" آمنہ قدرے جھلا کر بولی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا، اسپشلائزیشن کے لیے جانا تو کہیں سے بھی ہنی مون نہ ہوا۔ وہ تو ابھی بھی (due) ڈیو ہے۔" وہ شرارت سے اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بولا۔

"یہ۔۔۔ یہ گاڑی کدھر موڑ رہے ہیں آپ!" موڑ پر اس نے سنگ میل پر کیا پڑھا تھا کہ اس کی بصارتیں چونک سی گئی تھیں۔ اندھیرے میں کچھ ٹھیک سے پڑھ نہیں سکی تھی۔

"پروفیسر داؤد کے بہت خاص پیشنٹ ہیں ادھر۔ حال ہی میں سرجری کروا کے آئے ہیں۔ ان کی فریش رپورٹس مجھے لے کر جانی ہیں پروفیسر صاحب کے لیے۔ بس اتنا سا کام ہے۔"

"مجھے آپ یہیں اتار دیں، دماغ خراب ہے۔ اتنے طوفانی موسم میں رپورٹیں جمع کرتے پھرو۔ چلیں واپس آپ۔" وہ خفگی سے بولی۔

"یار! موسم کے تیور دیکھو ذرا، اس وقت یہی بہتر ہے کہ کچھ دیر کہیں رک جایا جائے جیسے ہی یہ طوفانی بارش تھمے گی، ہم واپس نکل پڑیں گے۔ ابھی تو بہت سفر باقی ہے۔" معاذ نے اسے نرمی سے سمجھایا تو وہ بھی چپ کر گئی۔ بارش کے ساتھ ہوا بہت زوردار تھی اور وقفے وقفے سے بجلی بھی چمک رہی تھی۔

جس وقت ان کی گاڑی حویلی کے گیٹ میں داخل ہوئی، آمنہ کی ساری نیم خوابیدہ حسیں جیسے ایک جھٹکے سے بیدار ہوئی تھیں۔

"یہ۔۔۔ یہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔" اس نے اپنی چادر سر پر جماتے ہوئے پوچھا۔

"جا نہیں رہے، پہنچ گئے۔" گاڑی رک گئی تھی اور میزبان استقبال کو برآمدے میں کھڑے تھے۔ آمنہ کے کسی سوال کی گنجائش نہیں تھی۔

وہ رسمی سلام دعا کے بعد صالحہ شاہ کے ساتھ زنان خانے میں آ گئی اور معاذ سید سلطان بخت کے ساتھ بیرونی گیسٹ روم میں۔

صالحہ شاہ بہت کم گو تھیں یا گزرتے وقت نے انہیں ایسا کر دیا تھا۔ کچھ ایسی ہی گم صم سی ان کی پانچوں بیٹیاں، ایک تو بالکل شہرینہ کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ آمنہ کے زخم جیسے ہرے ہو گئے۔

گیسٹ روم کی کھڑکیوں سے سر ٹکراتی بارش اور بین کرتی ہوا اسے یادوں کے دکھ بھرے جہان کی طرف بلا رہی تھی۔

"مضبوط سنگی دیواریں، یہ دروازے اور چھریلی چھتیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسی وہ بچپن میں دیکھا کرتی تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا، بدلی تھی تو اس کی زندگی کی کہانی جسے اس حویلی کی سنگلاخ دیواروں نے جنم دیا تھا اور پھر سب کچھ ہاتھوں سے نکلتا چلا گیا۔

"اگر وہ اسی گاؤں میں رہتے تو شاید۔۔۔۔ شاید اس کی پچھلی زندگی کی یادیں اتنی کربناک نہ ہوتیں۔

وہ طوفانی رات آمنہ کے دل و دماغ میں بھی جیسے بہت سے طوفان جگا گئی۔ باہر برستا آسمان اور اندر یادوں کا رت جگا، وہ رات بھر آنکھ نہ جھپک سکی۔

صبح منہ اندھیرے وہ دونوں واپسی کے لیے تیار تھے میزبان کے بہت اصرار کے باوجود۔ آسمان رات بھر برسنے کے بعد بالکل صاف ہو چکا تھا۔ نیلے آسمان پر ٹمٹماتے ستارے ایک روشن دن کے طلوع ہونے کی خبر دے رہے تھے۔

آمنہ نے آخری الوداعی نظر صالحہ شاہ اور اس کے ساتھ ایک قطار میں کھڑی ان پانچوں سید زادیوں پر ڈالی اور دوسری نظر اس ڈھلتے سورج جیسے ادھیڑ عمر جاگیردار پر ڈالی جو نازک سنہری فریم کی عینک اور کھچڑی ہوتے بالوں کے ساتھ ہاتھ میں صندلی چھڑی لیے اسی طمطراق سے کھڑا تھا جو اس خاندان کے جاگیرداروں کا خاصا تھی۔ سید سلطان بخت نے بے حد سرسری نظر آمنہ کے چہرے پر ڈالی اور ایک نمائشی مدبرانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجالی۔

"اگر اس روز بھی تیری یہ نظر اتنی ہی سرسری، اتنی ہی عام ہوتی جتنی آج ہے تو سید سلطان! میرا خاندان یوں دربدر ہو کر برباد نہ ہوتا۔ تیری ایک میلی نگاہ نے ہماری زندگی کی ساری روشنیاں گل کر کے سیاہ اندھیرے بھر دیے۔ میں بددعا نہیں دیتی مگر اللہ تیری وہ میلی نگاہ، تیری کسی بیٹی کی طرف نہ لوٹائے۔" آمنہ چادر کے پلو کو منہ پر سرکا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی چل پڑی۔ ابھی تو چار سو اندھیرا سا تھا، صبح صادق کی روشنی یکسر افق سے نمودار ہونے کی تیاری کر رہی

تھی۔

”بہت اچھے، بہت مہمان نواز ہیں سید صاحب۔ رات میں نے واپسی کا بہت اصرار کیا مگر انہوں نے جانے ہی نہیں دیا۔ مہمان نوازی تو ان لوگوں کا خاصا ہوتی ہے۔“

معاذ کہہ رہا تھا۔ آمنہ گم صم سی کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ سرد نم ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔

حی الصلوۃ حی الصلوۃ.....

حی علی الفلاح حی علی الفلاح.....

موذن کی دل میں اتر جانے والی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

”کیا خیال ہے، میں نماز نہ پڑھ لوں؟“ معاذ نے کہہ کر خود ہی گاڑی کا رخ آواز کی جانب موڑ دیا۔

مسجد کے مینار دیکھتے ہی آمنہ کے دل سے ہوک سی اٹھی۔

اسے لگا ابھی صوفی صاحب بارعب پر جلال چہرے کے ساتھ مسجد کے بیرونی دروازے سے نکلیں گے۔

آمنہ گاڑی میں ساکت بیٹھی تھی، معاذ مسجد کے اندر جا چکا تھا۔

مسجد میں نمازی ابھی نہیں آئے تھے۔ پہلی صف میں کوئی شخص بیٹھا قرآن کھولے بڑے لحن سے سورہ رحمٰن کی تلاوت کر رہا تھا۔

اس کی آواز میں جانے کیا جادو تھا، آمنہ خود کو روک نہ سکی۔

فبای الاء ربکما تکذبن..... (تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں سے انکار کرو گے)

اس کے کانوں میں جیسے کوئی سحر پھونک رہا تھا۔

”عبدالمبین.....“ آمنہ اپنی چیخ دبا نہ سکی۔

”آمنہ! تم..... آ گئیں.....“ وہ حیران نہیں تھا، یوں جیسے پہلے سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔

”مجھے یقین تھا، تم ضرور آؤ گی، مجھے بہت دنوں سے تمہارا انتظار تھا۔“ اس نے کلام پاک بند کر کے طاق میں رکھا اور اس کی طرف مڑا۔

”آؤ..... آ جاؤ..... گھر نہیں چلو گی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر باہر لے آیا۔ مسجد سے ملحقہ ان کا کچا کوٹھا پختہ گھر میں ڈھل چکا تھا۔ عبدالمبین نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔

وہ صبح آمنہ کی زندگی کی حسین ترین صبحوں میں سے ایک تھی۔ شہرینہ چولہے کے سامنے بیٹھی دیسی گھی میں تر بتر بل والے پراٹھے آمنہ اور معاذ کے لیے پکا رہی تھی اور عبدالمبین اپنی سیاہ خوبصورت داڑھی کو بار بار سلجھاتے ہوئے آمنہ کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔

ذرا پرے پختہ برآمدے میں بڑا عبدالرحمٰن اور چھوٹا عبدالمتین اپنے کھلونوں سے بڑے مگن انداز میں کھیل رہے تھے اور چھ ماہ کی صحت مند گل گوتھنی زینب کاٹ میں پڑی زور زور سے ہاتھ پاؤں چلاتی غوں غاں کر رہی تھی۔

”عبدالمبین! مجھے لگ رہا ہے، میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔“ وہ لبوں میں بڑبڑائی۔

”وہ تو تمہاری پرانی عادت ہے، مجھے یاد ہے تمہیں بہت طویل اور افسانوی قسم کے خواب آیا کرتے تھے۔“ عبدالمبین ہنسا۔

”ان میں سے اکثر سچے بھی ہوتے تھے جیسے یہ خواب۔“ وہ لپک کر اٹھی اور کاٹ میں پڑی زینب کو اٹھا کر اپنی گود میں بھر لیا۔

”اور بابا صاحب کا بھی تو یہی خواب تھا کہ تم اتنی خوش الحانی سے تلاوت کرو اور ان کی گدی سنبھالو۔ ایسے لگ رہا ہے، ماں اور بابا صاب میرے ارد گرد ہیں ہیں۔“

سچی خوشی کی چمک آمنہ کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ معاذ نے اتنے سالوں میں پہلی بار آمنہ کو اتنا خوش دیکھا تھا۔

”ہاں، وہ ہیں نا ہمارے آس پاس۔ پتا ہے آمنہ! میں نے اس گھر میں آ کر اصل زندگی پائی ہے۔ روشنی اور رنگوں سے بھرپور۔ جب آپ کو سب کچھ مل جائے مگر سکون نہ ملے تو پھر پلٹ کر دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ حاصل کیا گیا ہے، وہ درست ہے کہ غلط۔ اس کچے گھر میں ہم جن تعیشات کو ترسا کرتے تھے، مجھے وہ سب مل بھی گئیں مگر وہ پرسکون نیند چھن گئی جو اس گھر میں آیا کرتی تھی۔ بڑا لمبا سفر کیا ہے میں نے اس گھر میں آنے کے لیے۔ ایک ہی زندگی میں دوسرا جنم۔ اگر شہرینہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں وہیں کسی گٹر کے کنارے زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہوتا۔“

اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ تھی۔

”اس گھر نے مجھے پھر سے جینا سکھایا ہے۔ میرے بچے عبدالرحمٰن اور عبدالمتین تو بنیں گے لیکن مذہب کی اصل روح سے پیار کرنے کے ساتھ جدید تعلیم سے آشنا اور ہم دونوں کی بھرپور توجہ اور محبت کے سائے میں مضبوط، باہمت، باعزم انسان۔“

عبدالمبین نے کہا تو آمنہ کے ذہن میں چھپا آخری خوف بھی زائل ہو گیا جو وہ عبدالمبین کے مدبر، پررعب چہرے کو دیکھ کر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر شہرینہ کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی طرح خوبصورت اور پرکشش لگ رہی تھی۔ محبت کا اعتماد جو اس کے ساتھ تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ستارے اس آنگن کی محبت بھری فضا کے گواہ تھے۔ آمنہ کے دل پر پڑا برسوں کا بوجھ جیسے اس روشن صبح کی فضا میں کہیں تحلیل ہو گیا۔ ننھے پیر بھری بابا صاب کے قرض کی گٹھری یکدم سے پھول کی طرح ہلکی ہو گئی۔ اسے لگا آج سارے قرض ادا ہو گئے۔

”آج کے دن بابا صاب، اماں جی کی روحیں کتنی خوش ہوں گی۔“ وہ تصور میں ان کے شاداں چہروں کو دیکھ سکتی تھی۔

عبدالمبین اور شہرینہ انہیں رخصت کرنے باہر تک آئے۔ اتنی جلدی اسے اس لیے جانے دیا گیا تھا کہ بہت جلد وہ جویریہ اور جلیل کو لے کر ملنے کے لیے آئے گی اور اپنے دونوں بچوں کو بھی۔

معاذ کی ہمراہی نے پہلے ہی اس کی زندگی کے سارے کانٹے چن لیے تھے۔ اس صبح کے حسین لمحات نے اس کی حیات کے سارے راستے جگمگاتی روشنیوں سے بھر دیے تھے۔ وہ بار بار مسکرا کر ڈرائیونگ کرتے معاذ کی طرف دیکھتی اور ہر سانس کے ساتھ اپنے رب کا شکر ادا کرتی جس نے اسے اسی ایک زندگی میں ہزار زندگی کی خوشیاں اور نعمتیں عطا کر دی تھیں۔

”بس کرو اور کتنا دیکھو گی، کیا نظر لگاؤ گی مجھے؟“

معاذ نے اسے یوں بار بار خود کو دیکھنے پر بے اختیار ٹوکا تو وہ زور سے ہنس پڑی۔

اسے ہنستے دیکھ کر معاذ بھی ہولے سے ہنس دیا۔

روشن چمکتا دن ان کی ہنسی پر مسکرا دیا۔ گاڑی سبک رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

● ● ● ● ● ● ●